اردو دائرہ معارف اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہ پنجاب لاہور

شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب، لاہور

جلد ۶

(تاء ....الثور)

باراوّل: ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء
بارثانی: ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء

ادارۂ تحریر

مجلس انتظامیہ

باراول ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۲ء

بارثانی۔ دسمبر 2005

زیرِ نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف صدر شعبہ

اختصارات ورموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اور ان کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ = اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ آ، ت = اسلام انسیکلوپیدیسی (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع = دائرة المعارف الاسلامیة (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن ا یا ۲ = Encyclopaedia of Islam (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، بار اوّل یا دوم، لائیڈن.

ابن الابّار = کتاب تکملة الصلة، طبع کودیرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابّار = تکملہ = M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez: Apendice a la adicion Codera de Tecmila، در Misc de estudios y textos arabes، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابّار، جلد اوّل = ابن الابار = تکملة الصلة، Texte arabe d' apres un ms.de Fes, tome I, completant les deux vol. edites par F. Codera، طبع A. Bel و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ا یا ۲ یا ۳ یا ۴ = کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فاینان = Annales du Maghreb et de l' Espagne، ترجمہ فاینان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال = کتاب الصلة فی اخبار ائمة الاندلس، طبع کودیرا F. Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II).

ابن بطوطہ = تحفة النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار (Voyages d' Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از C.Defremery و B.R.sanguinetti، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بردی = النجوم الزاہرة فی ملوک مصر والقاہرة، طبع W. Popper، برکلے و لائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ببعد.

ابن حوقل، کریمرز ـ وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں.

ابن حوقل = کتاب صورة الارض، طبع J.H.Kramers لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (BGA,II، بار دوم)، ۲ جلدیں.

ابن خرداذبہ = المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje)، لائیڈن ۱۸۸۹ء (BGA, VI).

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر ...، بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ = Prolegomenes d'Ebn Khaldoun، طبع E.Quatremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (Notices et l'Extraits, XVI-XVII).

ابن خلدون: روزنتھال = The Muqaddimah، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان = Les Prolegomenses d' Ibn Khaldun، ترجمہ وحواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (طبع دوم ۱۹۳۴ء).

ابن خلکان = وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وستنفلٹ (F.Wustenfeld)، گوٹنجن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں).

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol
دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء.
ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII).
ابن رستہ، ویت Les Atours precieux: Wiet، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء.
ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۰ء.
ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) و لیوی پروونسال (E.Levi-provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء.
ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ء (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیئے گئے ہیں).
ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA, V).
ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۴ء
ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء.
ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء.
ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء.
ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite de l' arabe en franciaz، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء و ج ۲/۲، از St.Guyard، ۱۸۸۳ء.
الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de Espagne، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.
الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء.
الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸ء/۱۳۱۹ھ.
الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۴ء. (اناستاتیک).
الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء.
الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA, I) و بار دوم (نقل بار اول) ۱۹۲۷ء.
الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابوالفرج الاصفہانی: الاغانی، بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ بعد.
الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E.Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء.
الانباری: نزہتہ = نزہتہ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ.
البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء.
البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger و S.D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.
البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء.
البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.
بیہقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمیار، تہران ۱۳۱۷ش.
بیہقی: تتمہ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء.
بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl.Indica.
ت ا = تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ
تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس.
تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء.
تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ء/۱۹۱۱ تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء.
تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء.

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدھر، دمشق ۱۳۰۴ھ.

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء.

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء.

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yaltkaya) و محمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء.

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ.

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V.Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS,XI، سلسلہ جدید).

حمد اللہ مستوفی: نزہۃ = حمد اللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII).

خواندامیر: حبیب السیر تہران ۱۲۷۱ھ و بمبئی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء.

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدر آباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ.

الدمیری = الدمیری: حیٰوۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرہ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء.

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدر آباد (دکن) ۱۳۱۵ھ.

رحمان علی = رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء.

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ.

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن و حسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء.

زبیری، نسب = معصب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء

الزرکلی، اعلام = خیر الدین الزرکلی: الاعلام قاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۰ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء.

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ.

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء.

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS. XX).

السمعانی، طبع حیدر آباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبد المعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدر آباد ۱۳۸۲ھ، ۱۴۰۲ھ/۱۹۶۲ء-۱۹۸۲ء.

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ.

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء.

الضبی، الضبی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ربیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH, III).

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ.

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ تا ۱۹۰۱ء.

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ.

العقد الفرید = ابن عبدربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ.

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ و جغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/۱۸۹۵ تا ۱۸۹۹ء.

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء.

عیون الانباء = طبع ملر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.

غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء.

غوثی ماندوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، ممبئی ۱۸۳۲ء.

فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ ھ ش.

فرہنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء.

فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء.

فلٹن و لنگز: Alexander S. Fulton و Martin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء.

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء.

(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء.

الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.

الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء.

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰، جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ.

م آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ.

مآثر الامراء = شاہ نواز خان: مآثر الامراء، Bibl Indica.

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش.

مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدر آباد (دکن) ۱۳۳۹ھ.

مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ھ ش.

المسعودی: مروج: مروج الذہب، طبع باربیہ مینارد (C.Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء.

المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۴ء (*BGA*, VIII).

المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۷ء (*BGA*, VIII).

المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، *Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء.

المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء.

منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ.

میر خواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء.

نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدر آباد ۱۹۴۷ء ببعد.

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پروونسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء.

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء.

الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D.H.Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء.

یاقوت طبع وسٹنفلٹ: معجم البلدان، طبع وسٹنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع اناستاتیک، ۱۹۲۴).

یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (*GMS*,VI): معجم الادباء (طبع اناستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.

یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (W. Th. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء.

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۲ء (*BGA*, VII).

یعقوبی، ویت = Wiet: *Yaqubi, Les pays*، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء.

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed.,Leiden 1927.

Barkan: Kanunlár= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I, II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*. Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*, II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam, Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan :*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Noldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergstrrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher:*Muh.St.*=I.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher:Vorlesungen^2=2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

1835-43.

Hammer-Purgstall:*Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*,2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l'histoire des Seldjoucides.* Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch=Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding= Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale.* Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2ne ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal:Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*, Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects. and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer:Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*, Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole,* Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*

Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in fruh-Islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed, Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart:*Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djamb-atán Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed.by A.U.Pope,Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner:*Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrsiage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen, Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen:*Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbers.

Abh. G. W. Gott=*Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.*

Abh. K.M.=*Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.*

Abh. Pr. AK. W.= *Abhandiungen d. preuss. Akad. d. Wiss.*

Afr. Fr.=*Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.*

Afr. Fr. RC=*Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.*

AIEO Alger=*Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.*

AIUON=*Annali dell' Instituto Univ. Orient, di Napoli.*

AM=*Archives Marocaines.*

And=*Al-Andalus.*

Anth=*Anthropos.*

Anz. wien=*Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.*

AO=*Acta Orientalia.*

Arab.=*Arabica*

ArO=*Archiv Orientalni*

ARW=*Archiv fur Religionswissenschaft.*

ASI=*Archaelogical Survey of India.*

ASI, NIS=*the same, New Imperial Series.*

ASI, AR=*the same, Annual Reports.*

AUDTCFD=*Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.*

As. Fr. B= *Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.*

BAH=*Bibliotheca Arabico-Hispana.*

BASOR=*Bulletin of the American School of Oriental Research.*

Bell=*Turk Tarih Kurumu Belleten.*

BFac. Ar. = *Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.*

BEt. Or. = *Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.*

BGA=*Bibliotheca geographorum arabicorum.*

BIE=*Bulletin de l' Instutut Egyptien.*

BIFAO=*Bulletin de l' Institut Francais J ' Arachcologie Orientale du Caire.*

BIS=*Bibliotheca Indica series.*

BRAH=*Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.*

BSE=*Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), Ist ed.*

BSE^2=*the Same, 2nd ed.*

BSL(P)=*Bulletin de la Societe de Linguisttq (de Paris).*

BSO(A)S=*Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.*

BTLV=*Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).*

BZ=*Byzantinische Zeitschrift.*

COC=*Cahiers de l' Orient Contemporain.*

CT=*Cahiers deTunisie.*

EI^1=*Encyclopaedia of Islam, 1st edition.*

EI^2=*Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.*

EIM=*Epigraphia Indo-Moslemica.*

ERE=*Encyclopaedia of Religion and Ethics.*

GGA=*Gottinger Gelehrte Anzeigen.*

GJ=*Geogra phical Journal.*

GMS=*Gibb Memorial Series.*

Gr. I. ph=*Grundriss der Iranischen Philologie.*

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.
Hesp.=Hesperis.
IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).
IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.
IC=Islamic Culture.
IFD=Ilahiyat Fakultesi.
IG=Indische Gids.
IHQ=Indian Historical Quarterly.
IQ=The Islamic Quarterly.
IRM=International Review of Missions.
Isl.=Der Islam.
JA=Journal Asiatique.
JAfr. S.=Journal of the African Society.
JAOS=Journal of the American Oriental Society.
JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.
JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.
JE.=Jewish Encyclopaedia.
JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.
JNES=Journal of Near Eastern Studies.
JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.
JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.
JQR=Jewish Quarterly Review.
JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.
J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.
J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.
JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.
JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.
JSS=Journal of Semetic studies.
KCA=Korosi Csoma Archivum.
KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).
KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).
LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).
Mash.=Al-Mashrik.
MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesells chaft.
MDVP= Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.
MEA=Middle Eastern Affairs.
MEJ=Middle East Journal.
MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.
MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.
MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.
MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.
MI=Mir Islama.
MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.
MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.
MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.
MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.
MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.
MO=Le Monde oriental.
MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.
MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).
MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.
MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Afr. Studien.

MSOS As.= fitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Westasiatische Studien.

MTM=Mili Taebbuler medjmuast.

MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch -agyptischen Gesellschaft.

MW=The Muslim World.

NC=Numismatic Chronicle.

NGW Gott.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Gottingen.

OA=Orientalisches Archiv.

OC=Oriens Christianus.

OCM=Oriental College Magazine, Lahore.

OCMD=Oriental College Magazine, Damima, Lahore

OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.

OM=Oriente Moderno.

Or.=Oriens.

PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.

PELOV=Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.

Pet.Mitt.=Petermanns Mitteilungen.

PRGS=Proceedings of the R. Geographical Society.

QDAP=Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.

RAfr.=Revue Africaine.

RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.

REI=Revue des Etudes Islamiques.

REJ=Revue des Etudes Juives.

Rend. Lin.=Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.

RHR=Revue de l' Histoire des Religions.

RI=Revue Indigene.

RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.

RMM=Revue du Monde Musulman.

RO=Rocznik Orientalistyczny.

ROC=Revue de l' Orient Chretien.

ROL=Revue de l' Orient Latin.

RRAH=Rev. de la R. Academia de la Histoira, Madrid.

RSO=Rivista degli Studi Orientali.

RT=Revue Tunistenne.

SBAK. Heid.=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.

SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.

SBBayr. AK.=Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.

SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin. Sozietat in Erlangen.

SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin.

SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).

SI=Studai Islamica.

SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).

Stud. Isl.= Studia Islamica.

S.Ya.=Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).

SYB=The Statesman's Year Book.

TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.

TD=Tarih Dergisi.

TIE=Trudi instituta Etnografih (Works of the Institute of Ethnography).

TM=Turkiyat Mecmuasi

TOEM=Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmu ast.

TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal, Land en Volkenkunde.

Verh. Ak. Amst.=Verhandelingen der Koninklijke

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI.NS=the same. New Series.

Wiss. Veroff. DOG=Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes.

ZA=Zeltschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG=Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

※ مقالہ، ترجمہ از آ، لائیڈن

⊗ جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[ ] اضافہ، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

بعد = f.,ff.,sq.,sqq.

بذیل مادّہ (یا کلمہ) = s. v.

دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے = see; s.

رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک باں (رجوع کنید باں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے = q.v.

بمواضع کثیرہ = passim.

کتاب مذکور = op.cit.

دیکھیے لغوی مفہوم (قارب یا قابل) = cf.

ق۔م (قبل مسیح) = B.C.

م (متوفی) = d.

محل مذکور = loc. cit.

کتاب مذکور = ibid.

وہی مصنف = idem.

ھ (سنہ ہجری) = A.H.

ء (سنہ عیسوی) = A.D.

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ (ـَ) = a

کسرہ (ـِ) = i

ضمہ (ـُ) = u

(ب)

Long Vowels

ا، آ = ā (آج کل: āj kal)

ی = ī (رحیم: Sim)

و = u (ہارون الرشید: Harūn al-Rashīd)

اے = ai (سیر: Sair)

(ج)

ـٖ = e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)

ـٗ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)

ـٗ = u کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (تورکیہ: Turkiya)

ـٗ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کورل: kol)

ـٓ = ȁ کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اَرَجَب: ȁrȁdjȁb؛ رَجَب: rȁdjȁb)

ـْ = علامت سکون یا جزم (بِسْمِل: bismil)

متبادل اردو عربی حروف

حرف			حرف			حرف			حرف		
ب	=	b	ح	=	ḥ	س	=	s	گ	=	g
بھ	=	bh	خ	=	Kh	ش	=	sh،ch	گھ	=	gh
پ	=	p	د	=	d	ص	=	ṣ	ل	=	l
پھ	=	ph	دھ	=	dh	ض	=	ḍ	لھ	=	lh
ت	=	t	ذ	=	d̄	ط	=	ṭ	م	=	m
تھ	=	th	ڈ	=	dط	ظ	=	ẓ	مھ	=	mh
ٹ	=	t	ڈھ	=	dh	ع	=	‹	ن	=	n
ٹھ	=	ṭh	ر	=	r	غ	=	gh	نھ	=	nh
ث	=	th	رھ	=	rh	ف	=	f	و	=	w
ج	=	dj	ڑ	=	ṛ	ق	=	ḳ	ہ	=	h
جھ	=	djh	ڑھ	=	ṛh	ک	=	k	ء	=	ع
چ	=	č	ز	=	z	کھ	=	kh	ی	=	y
چھ	=	ch	ژ	=	ž, zh						

تَاء: عربی حروف تہجی کا تیسرا حرف ۔ حساب جُمَّل میں اس کی قیمت ۴۰۰ ہے ۔ قدیم خطوط میں اس حرف کی کتابت کے متعلق جزئیات کے لیے ۱۱ (انگریزی) طبع اول کا مادۂ Arabia ، حصۂ ۱ ، ص ۳۸۲ ب و ۳۸۳ ب، لوحۂ ۱ ملاحظہ ہو۔

تَأَبَّطَ شَرًّا: قبیلۂ فَہْم کے قدیم عرب شاعر اور بدوی بہادر ثابت بن جابر بن سفیان کا لقب [پورے نسب کے لیے دیکھیے مُفَضَّلیّات ، ص ۱، س ۱۶ ۔ اسے شَعْل بھی کہتے تھے (لسان العرب ، ۱۳ : ۳۷۷) ۔ ادارہ] ۔ یہ شخص قصوں اور قدیم روایتوں میں بہت مذکور ہے ۔ کتب مصادر میں اس کے لقب کی تشریح مختلف طریقوں سے کی گئی ہے [رکّ بہ خزانۃ الأدب، ۱ : ۶۶ ، جہاں چار طریق سے اس لقب کی توجیہ کی گئی ہے اور أغانی، ۱۸ : ۲۱۶ ، س ۱۷ ، جہاں لکھا ہے: ''سُمِّیَ تأبّطَ شرًّا ببیتٍ قاله'' (اس نے ایک شعر کہا تھا، جس کی وجہ سے اسے تأبط شرا کہنے لگے) ۔ ادارہ] ۔ أغانی ہی میں ہے کہ یہ شخص 'شرّ' کو اپنی بغل میں دبا لایا یعنی ایک تلوار یا ایک چھرے (حاسۃ) یا ایک مینڈھے کو جو بعد میں غول بیابانی ثابت ہوا ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ 'شرّ' چمڑے کا تھیلا تھا، جس میں زہریلے سانپ بھرے ہوئے تھے (أغانی) ۔ ایک بیان کے مطابق اس کی ماں زنگن تھی (در فرسنل Fresnel)، لیکن أغانی میں ہے کہ وہ قبیلۂ فَہم کی عورت تھی اور اس کا نام اُمَیمَۃ تھا ۔ اس عورت نے بعد میں ابو کبیر الہُذَلی سے شادی کر لی، جو اپنے سوتیلے بیٹے کی جان لینے کے درپے ہو گیا ۔ تأبط شرا تمام عمر بنو ہُذَیل اور بنو بَجِیلۃ کا دشمن بنا رہا اور ہذیل کے خلاف لڑتے ہوئے دیار ہذیل میں مقام نُمار پر مارا گیا ۔ یاقوت نے مشترک، ۲۲۴ [اور معجم البُلدان، ۴ : ۸۱۲] میں نُمار کو 'پہاڑ' لکھا ہے [مگر بکری (ص ۴۰۴) نے اسے 'وادی' بتایا ہے ۔ تأبط شرا کے مرثیے میں اس کے لاشے کو رَخْمان میں چھوڑنے کا بھی ذکر ہے ۔ ابوعُبَیدۃ نے ان دو قولوں میں تطبیق کی ہے، دیکھیے بکری، محل مذکور ۔ ادارہ] ۔ ابن قُتَیبۃ کے ایک بیان کے مطابق، جس کا حوالہ باور Baur (دیکھیے مآخذ) نے دیا ہے، تأبط شرا نَوفَل بن معاویۃ النُفاثی الدُئلی کا ہمعصر تھا، جو ساٹھ سال تک جاہلیت میں اور ساٹھ سال تک اسلام میں زندہ رہا [رکّ بہ إصابۃ، بذیل نوفل] ۔ تأبط شرا نے خود بھی نوفل نفاثی، عامر ابوبراء، عامر بن الطفیل وغیرہ کا ذکر ایک قصیدے (أغانی، ۱۸ : ۲۱۴) میں کیا ہے ۔ یہ سب لوگ آنحضرتؐ کے معاصر ہیں ۔ تأبط شرا کے سوانح حیات میں اور ان اشعار میں جو اس کی طرف منسوب ہیں سربسر قدیم عرب جاہلیت کی روح پائی جاتی ہے ۔ اس کے کردار میں ان تمام روایتی خصوصیات کا خاکہ کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے جو جاہلیت میں پیدل لڑنے والے، تیز دَو اور دلاور ''صعالیک'' و ''لصوص'' عرب میں پائی جاتی تھیں ۔ اس نے اپنے ایک جنگی ساتھی شنفری کا مرثیہ کہا [جس کے لیے دیکھیے أغانی، ۲۱ : ۱۳۶ اور الطرائف الأدبیۃ ، قاہرۃ، ۱۹۳۷ء، ص ۳۸ جس میں یہ مرثیہ مفصّل تر ہے ۔ ادارہ] ۔ اس نے اپنے ایک رشتہ دار کی یاد میں، جو کسی لڑائی میں ہلاك ہو گیا تھا ایک نظم لکھی، جو اس کی چار طویل نظموں میں سب سے بہتر ہے اور جس سے مشہور و معروف

شاعر گوئٹے نے متأثر ہو کر خود بھی اسی طرز پر ایک نظم لکھی۔[دیوان تأبط شرا مرتبۂ ابن جنّی کے اجزاء ایسکوریال میں ہیں، دیوان کا نسخہ بخط قدیم صاحب خزانة الأدب (۳ : ۵۰ بعد) کے پاس تھا۔ لسان العرب میں اس شاعر کے تقریباً ستاون متفرق شعر (بحذف مکررات) درج ہیں، دیکھیے فہارس لسان العرب۔ ادارہ].

مآخذ: (۱) ابوتمام: حماسة، ص۳۳ بعد و ۳۴۴ بعد و ۳۸۲ بعد (قب ترجمۂ روکرٹ Rückert)؛ (۲) أغانی، ۱۸: ۲۰۹ تا ۲۱۸؛ (۳) قزوینی، طبع ویسٹنفلٹ، ۲: ۳۱ و ۵۶ تا ۵۸ و ۶۱؛ (۴) ابن قتیبة: کتاب الشعر، ص ۱۷۴ بعد و ۲۲۴ بعد و ۳۴۷؛ [(۵) خزانة الأدب، ۱: ۶۶ و عینی: ۲: ۱۶۵ - ادارہ]؛ (۶) الکریوس[؟]: غوضة العرب[؟]، ص۷۴ بعد؛ (۷) کتاب شرح أشعار الهذلیین، طبع کوسگارٹن (Kosegarten)، ص ۲۴۷ بعد؛ (۸) ڈیساسی (De Sacy): *Schol. zu Hariri*، ص ۱۶۰؛ (۹) *Anthol.*: ص ۳۴۴؛ (۱۰) فرینل: *Prem. lettre sur l'histoire des Arabes*، ص۹۶ بعد؛ (۱۱) فریتاغ (Freytag): *Carmen arab.*، مطبوعۂ گوٹنگن ۱۸۱۴ء؛ (۱۲) گوئٹے (Goethe): *Noten zum w.ö. Diwan*؛ (۱۳) باسے (Basset): *La poésie arabe*، ص ۳۷؛ (۱۴) براکلمان: ۱: ۲۵ [و تکملہ، ۱: ۵۲ - ادارہ]؛ (۱۵) لائل (Lyall): *Four Poems of Ta'abbata Sharrá* در *J. R. A. S.*، ۱۹۱۸ء؛ (۱۶) گوسٹاف باور (Gustav Baur) در *Z.D.M.G.*، ۱۰: ۷۴ بعد.

(ادارہ و براؤ H.H. BRÄU)

تابع: (عربی) جمع تابعون - پیرو، کسی امیر کا پس رو یا چاکر، کسی استاد کا شاگرد، کسی عقیدے کا معتقد۔ باب مفاعلة کا فعل تابَعَ ہے؛ مثلاً 'تابَعَ جالینوس' یعنی اس نے (علم طب میں) جالینوس کی پیروی کی.

یہ کلمہ علم حدیث میں خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ ان اشخاص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو رسول کریم کے اصحاب کے بعد ہوئے۔ اصحاب وہ لوگ ہیں، جنھوں نے آنحضرت کی زیارت کی اور براہ راست آپ سے واقف تھے۔ تابعین وہ لوگ ہیں، جو آنحضرت سے بعد کے طبقے میں سے تھے یا آپ کے ہم‌عصر تھے، لیکن انھیں آپ سے ذاتی تعارف حاصل نہ تھا، البتہ کسی صحابی کو جانتے تھے [دیکھیے حاشیہ (۱) در ذیل - ادارہ].

دوسرے طبقے والے ''تابعوالتابعین'' کہلاتے ہیں، جو تابعین میں سے کسی کو جانتے تھے و علی هذا القیاس۔ احادیث کی قدر و قیمت بیش و کم اس اعتبار سے ہوتی ہے کہ وہ زیادہ متقدم یا کم متقدم طبقے کے واسطے سے پہنچی ہوں اور اس اعتبار سے بھی کہ تابعی، جو حدیث کا پہلا راوی ہے، وہ زیادہ صاحب اعتبار اور مشہور ہے یا کم، اس لیے 'مشہور' حدیث وہی سمجھی جاتی ہے جو پہلے طبقے کے کسی تابعی تک پہنچے اور دوسرے طبقے کے کئی تابعین اور ان کے جانشینوں کے ذریعے سے پہنچ کر روایت ہوئی ہو (دیکھیے مادۂ حدیث) [نیز دیکھیے حاشیہ (۲) در ذیل - ادارہ]، اس طرح قراءت قرآن اور تصوف کے متعلق احادیث کے رواۃ طبقہ بہ طبقہ چلے آئے ہیں۔ طبقۂ اولی کے تابعین کے مشاہیر میں حضرت حسن بصری بھی ہیں [دیکھیے حاشیہ (۳) در ذیل - ادارہ].

مآخذ: (۱) محدثین، بخاری، مسلم وغیرہ؛ (۲) کارا ڈوو: *Les Penseurs de l'Islam*، پیرس ۱۹۲۳ء، ۳: ۱۷۶ و ۲۸۲ بعد؛ (۳) الہجویری: کشف المحجوب، ترجمہ آر۔ اے۔ نکلسن، لائیڈن - لنڈن ۱۹۱۱ء.

(کارا ڈوو B. CARRA DE VAUX)

حواشی از دائرة المعارف الاسلامیة عربی

ج ۴، عدد ۷: ص۳۶۴ و ۳۶۷:

حاشیہ (۱): تابعین، صحابہ کے بعد کے یعنی دوسرے طبقے میں شامل ہیں۔ ان میں سے

فرد واحد کو 'تابع' یا 'تابعی' کہتے ہیں - ان کے بہت سے درجے ہیں: بعض تو ایسے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلّم کے زمانے میں موجود تھے، لیکن آپؐ کو نہیں، آپؐ کے اصحاب کو دیکھا تھا؛ بعض لوگ آپؐ کے زمانے کے بعد ہوے، لیکن صحابہ میں سے ایک یا چند سے ملے؛ کچھ ایسے بھی ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلّم کی حیات میں پیدا ہوے اور کم سنی کے باعث براہ راست آپؐ سے روایت کو یاد رکھنے کے قابل نہ تھے؛ ایسے تابعین کی تمام روایت صحابہ سے ہے.

حاشیہ (۲): اس کلام کا نہ تو مطلب واضح ہے نہ یہ محدثین کے علمی قواعد کے مطابق لکھا گیا ہے - جو حدیث، تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلّم سے روایت کرے یعنی براہ راست آپؐ سے منسوب کرے اور جس صحابی سے سنی ہے اس کا نام نہ لے، اس حدیث کو ''الحدیث المرسل'' کہتے ہیں - اس حدیث کے حجت ہونے میں اختلاف ہے - بعض علماء کا یہ مسلک رہا ہے کہ ایسی حدیث حجت ہو سکتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ ایسی حدیث اس وقت حجت ہوگی، جب یہ تابعی اونچے درجے کے تابعین میں سے ہو جس کی ملاقات صحابہ کی ایک کثیر تعداد سے ثابت ہو اور اسی حدیث کو کسی اور تابعی نے بھی روایت کیا ہو تاکہ اسے قوت حاصل ہو جائے - انھیں علماء میں امام شافعیؒ بھی شامل ہیں، چنانچہ آپ نے یہ مسئلہ بہ تفصیل بیان کیا ہے، یہاں اس کے بیان کا موقع نہیں؛ اس کے لیے امام شافعیؒ کی کتاب الرسالۃ کے (جو ہماری تحقیق سے چھپی ہے) فقرات ۱۲۶۳ تا ۱۳۰۸ ملاحظہ کیجیے - اکثر علماے حدیث نے امام شافعیؒ سے اس بارے میں اختلاف کیا ہے، ان کی قطعی راے ہے کہ حدیث مرسل کسی حالت میں بھی حجت نہیں - اس مسئلے کی توضیح میں نے کتاب الرسالۃ، ص ۴۶۵ کے حاشیے میں کی ہے - نیز دیکھیے ابن الصلاح: کتاب علوم الحدیث (مع شرح الحافظ العراقی)، ص ۵۵ تا ۶۲، نیز میری شرح بر ابن کثیر: إختصار علوم الحدیث، ص ۳۷ تا ۴۱، اور ابن حزم: الاحکام لاصول الأحکام (۲: ۲ تا ۶)، اور اس فن کی دیگر کتابیں.

حاشیہ (۳): الحسن البصری مشہور تابعی اور قرّاء کے اماموں میں سے ہیں، اسی طرح حدیث، فقہ اور وعظ کے بھی امام ہیں - ۲۱ھ میں پیدا ہوے اور ۱۱۰ھ میں وفات پائی - آپ کے حالات ابن سعد: طبقات، ج ۷، قسم ۱: ص ۱۱۳ تا ۱۲۹؛ ابونُعیم: حلیۃ الأولیاء، ۲: ۱۳۱ تا ۱۶۱؛ ابن الجزری: طبقات القرّاء، ج ۱: ۳۵ اور التہذیب اور ابن خلّکان وغیرہ میں ملیں گے - صوفیہ تصوف کی اسانید بھی انھیں تک پہنچاتے ہیں، مگر یہ اسناد علماے حدیث کے نزدیک حجت نہیں.

(احمد محمد شاکر)

تات: (تَت) ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ خارجی عناصر جو ترکی ممالک میں شامل ہیں (ٹامسِن Thomsen).

۱ - اس اصطلاح کی تاریخ کچھ پیچیدہ سی ہے - یہ لفظ ''اورخون'' (Orkhon) کے کتبوں میں (جو آٹھویں صدی میلادی سے متعلق ہیں) سب سے پہلے وامبیری (Vambéry) کی نظر سے گذرا - *Noten zu d. alttürk. Inschriften Mém. Soc. Finno-Ougr*، شمارہ ۱۲: (ہِلسِنگفورز Helsingfors) ۱۸۹۹ء، ص ۸۸ تا ۸۹) - ٹامسِن (*Turcica*، دیکھیے محل مذکور، XXXVII، ۱۹۱۶ء: ص ۱۰) نے ان الفاظ *on ok oghliña tatiña*

tägi (اون اوق اوغلیکا تاتیکہ تاغی) کا ترجمہ یوں بتایا ہے : دس تیروں کے بیٹوں (ابناء السّہام العشرۃ = اتراك غرب) اور ان کے تات یعنی ان کی غیرملکی رعایا تک۔ اس لفظ کے اصلی ماخذ کے سلسلے میں ٹامسن اس بات کو نظر انداز کرتا ہے کہ کورش (Korsch) نے تات (*tat*) کو کلمۂ تنگت (*Tangut*) ; (*Slovo* "*baldak*" *i dolgota v turetskikh yazikakh Zivaya Starina*، ۱۹۰۹ء، کراسہ ۲ و ۳ : ۱۵۶ تا ۱۶۱) کی مخفف صورت بتایا ہے۔ تات کی تاریخ کے سلسلے میں تگت، تنگت، توت (*Taut*) کو شاید کچھ اس طرح کی اهمیت حاصل ہو، جو احزاب ووگل (Woguls) اور اوستیاق (Ostiaks) دریاے ارتش کو دیتے ہیں، قب مارکوارٹ (Marquart) : *Streifzüge*، ص ۹۹۔

دیوان لغۃ الترك (تالیف ۴۶۶ھ / ۱۰۷۴ء) [برسم المقتدی بامراللہ ۴۶۷ھ/۱۰۷۵ء تا ۴۸۷ھ/ ۱۰۹۴ء - ادارہ] ۲ : ۲۲۴ کے مطابق تمام ترك لفظ ''تت'' (*tat*) (کذا) سے ایرانی (''الفارسی'') مراد لیتے ہیں، خاص کر یغما اور تخسی (*Tukhsi*) قبائل میں یہ اصطلاح اویغور کے لیے مستعمل ہے؛ دونوں صورتوں میں 'تات' اور 'تت' کے معنی میں حقارت کا مفہوم موجود ہے جیسا کہ ان امثال سے واضح ہے : ''کانٹے کی جڑ پکڑ اور تت کی آنکھ میں بھونک''، ''اگر تت نہ ہوتے، تو ترك بھی نہ ہوتے؛ جیسے سر نہ ہو، تو ٹوپی کی بھی ضرورت نہیں (جو اس سر کو ڈھانپے)''۔

اس کے بعد کے زمانے میں ترك فاتحین کی زبان میں لفظ 'تت' مفتوح ایرانیوں کے لیے مخصوص ہوگیا، چنانچہ مولانا جلال الدین رومی بھی اپنے ترکی اشعار میں (گب Gibb : *A History of Ottoman Poetry*، ۱ : ۱۵۰ اور بالخصوص مارٹینووچ Martinović : *Zap.*، ۲۴، ۱۹۱۷ء، ص ۲۲۱) طط (کذا!) اور ططجہ کی اصطلاح ایرانیوں اور ان کی زبان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب عبارت میں (جس کی طرف خانیکوف بھی توجہ کر چکا ہے)، پیترو دلا والے (Pietro della Valle) (فرانسیسی ترجمہ، ۱۶۶۳ء، ۲ : ۳۶۸ تا ۳۶۹) جو صفوی عہد کا روزمرّہ استعمال کرتا ہے، قزلباش (ركّ بآں) سے 'تت' کا مقابلہ کرتے ہوے لکھتا ہے کہ ''قزلباش تو ایک ایسی نسل کے آدمی ہیں، جو اسمعیل صفوی کے ساتھ ساتھ.... آئی اور 'تت' وہ عوام اور اراذل ہیں، جو مستقیماً قدیم اور حقیقی ایرانیوں کی اولاد ہیں''۔ ترکوں کا قبیلہ قشقائی بھی، جو فارس میں آباد ہے، غیر ترك کے لیے 'تت' (یا تات) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ قب Romaskevič : *Pesni kashkaitsev, Sborn. muzeya Anthrop. pri Akademii 'nauk* ۵/۲ : ص۵۸۷؛ آذربایجان میں ترکی بولنے والے پیروان مذهب اهل حق بھی لفظ تات کو انھیں معنوں میں استعمال کرتے معلوم ہوتے ہیں، جو ان کے مفروضہ آبا و اجداد یعنی ترکمانان قراقویونلو کے ہاں مروج تھا۔ قب منورسکی (Minorsky) : *R.M.M.*، ۴۰ : ۲۴۲، قب مادہ ماکو۔

ماوراے بحیرۂ خزر کے ترکمان لفظ تات کو ایرانی تاجیکوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے پہلے بقول سموئیلووچ (Samoilovič) وہ اهل خیوہ کو تت کہا کرتے تھے [کیا یہ خوارزم کی قدیم ایرانی آبادی کی یادگار نہیں ہے؟ قب احمد زکی ولیدی *Hwarezmische Sätze*، در *Islamica* ج ۲/۳ ۱۹۲۷ء : ص ۱۹۰ تا ۲۱۳]۔

'تت' کی اصطلاح دوسرے مختلف نسلی عناصر کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ شلٹ برگر (Schildberger) (۱۳۹۴ تا ۱۴۲۷) ہمیں بتاتا ہے کہ ''کفار'' کرک کیری (Karckeri) (غالباً قرق-یر = چفت قلعہ،

جو کریمیا کے جنوب مغربی پہاڑوں میں ہے) اس کے باشندوں کو 'تت' کہتے ہیں ۔ ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے کہ کریمیا کی ایک بولی 'کوتھیا' (Kuthia) کہلاتی ہے اور ''کفار'' اسے 'تت' کہتے ہیں (*"die siebent sprauch haisst Kuthia sprauch und die haiden haissents That"*) اس سے ظاہر ہے کہ پندرھویں صدی کے مسلمانان قپچاق طوروس (Taurus) کے گوتھوں یا قُوطوں (Goths) کو جن کی سلطنت کو عثمانیوں نے ۱۴۷۵ء میں تباہ کر دیا تھا 'تت' کہا کرتے تھے۔

بعد میں جانی بیگ گرای کے یرلیق یعنی فرمان (مجریہ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۸ء) (قب ولیامی نوف۔ زرنوف (Veliaminov-Zernov) : *Materialî dlia istorii Krim. khantsva*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۴ء، ص ۲۶) سے خوانین کریمیا کے القاب و خطابات میں سرکاری طور پر ''تات بیله طوغاج نک اُلغ پادشاهی'' کے الفاظ استعمال ہونا شروع ہوے۔ بوداگوف (Budagov) : *Slovar*، ۱ : ۳۲۹ میں 'تات' کے معنی ''اهل جنوا'' (Genoa) بتاتا ہے لیکن اس کے وجوہ بیان نہیں کرتا (اس خطاب میں 'طوغاج' کے معنی ابھی تک مبہم ہیں)۔ آج کل کے زمانے میں بھی نوغاے تاتاری جو شمالی کریمیا میں رہتے ہیں اس جزیرہ نما کے جنوبی ساحل پر رہنے والے کل مسلمانوں کو 'تت' ہی کہکر پکارتے ہیں ۔ یہ ان مختلف اقوام کے مخلوط لوگ ہیں جو یہاں رہتے رہتے مسترك ہو گئے ہیں یعنی ترك بن گئے ہیں (یہ تصریحات سموئلوویچ سے ذاتی طور پر حاصل کردہ معلومات پر مبنی ہیں)۔ قب نیز راڈلوف (Radloff): *Versuch eines Wörterbuches*، ۳ : عمود ۸۹۹، بذیل ۵ ب.

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''یونانیوں'' (یعنی فرقۂ اورتھوڈوکس) کی ایک جماعت بھی جو ۱۷۷۸ء میں ماریوپول میں آ کر آباد ہوگئی تھی، 'تت' کہلاتی ہے ۔ یہ 'تت' کریمیا کے جنوبی ساحل سے ہجرت کر کے آئے تھے اور یونانی زبان کی ایک بولی بولتے ہیں، تاهم ماریوپول کے اُن یونانیوں کو 'تت' نہیں کہا جاتا جو ترکی زبان بولتے ہیں (اور جسے وہ یونانی حروف میں لکھتے ہیں) اور جو طورس کے قُوطوں (Goths) کی حقیقی نسل میں سے ہیں ۔ قب گریگورووچ ۔ بلاؤ (Grigorowitsch-Blau): *Über die griechisch-türkische Mischbevölkerung in Mariupol*، در *Z.D.M.G.*، ۲۸ : ۱۸۷۴ء، ص ۵۷۶ تا ۵۸۳؛ اور مجلۂ مذکور ص ۵۶۲ تا ۵۷۶؛ ٹوماشک (Tomaschek): *Die Gothen in Taurien*، وی انا ۱۸۸۱ء، ص ۵ و ۴۸؛ براؤن (Th. Braun): *Mariupolskiye Greki, Živaya Starina*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱/۲، ۱۸۹۰ء : ص ۸۷ تا ۹۲۔

بقول ٹوماشک، محل مذکور ص ۴۵، مَجری (Magyars) یعنی اهل هنگری سلوواك قوم کو 'توت' Tót (*Tat?>) کہتے ہیں ۔

لفظ 'تت' (غیر ترك، غیر ملکی) کے لغوی معنی شیخ سلیمان افندی کی چغتائی، ترکی لغات (طبع کونوس (Kunos)، ص ۱۸۴) میں یہ ہیں: ''وہ اقوام جو ترکی حکومت کے زیر فرمان آ گئیں، مثلاً تاجیک (Tăčik)'' [تاهم ص ۱۷۹ پر یہی مصنف لکھتا ہے کہ غیر ملکی نسل کے باشندے جو ترکی زبان بولتے ہیں 'تت' کہلاتے ہیں اور جو لوگ فارسی بولتے ہیں تاجیک ۔ اس سلسلے میں زکی ولیدی کا بیان بھی قابل غور ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ ترکستان میں (چودھویں صدی میں؟) 'تت' کے لفظ کا اطلاق تمام حضری آبادی پر ہوتا تھا جس میں وہ ترك بھی شامل ہیں جو مغول کے آنے سے پہلے ملک میں آباد تھے] ۔ احمد وفیق :

لہجۂ عثمانی، استانبول ۱۳۰٦ء، ص ۲۸٦ میں 'تت' کے معنی یوں لکھتا ہے: ''ان صوبوں کے قدیم کردی (کذا!) اور ایرانی باشندے جو ترکی حکومت کے زیر فرمان آ گئے''۔ مگر اس کی یہ تشریح دولت عثمانیہ کے مقامی حالات سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ باربیہ د مینار (Barbier de Meynard) اپنی لغات میں احمد وفیق ھی کے دیے ہوے معنی اختیار کرتا ہے لیکن اس کے خیال میں ان کا اطلاق ترکستان پر ہوتا ہے۔

چغتائی زبان کی لغتوں میں 'تت' کے ثانوی معنی بھی دیے ہیں؛ مثلاً ''وہ لوگ جنھیں مطیع کیا گیا ہو اور شہر کے باہر رہتے ہوں'' (؟قب مذکورۂ بالا بیان زکی ولیدی)، ''آوارہ'' وغیرہ۔ قب ولیامی‌نوف - زرنوف : *Slovar' djaghatai-turetskii*، [ابشقہ] سینٹ پیٹرز برگ ۱۸٦۸ء؛ پاوہ د کورتی (Pavet de Courteille) : *Dictionnaire turc oriental*، ۱۸۷۰ء، ص۱۹۳؛ راڈلوف : *Versuch*، ۳ : عمود ۸۹۹، بذیل ہ ج و د اور ملیورنسکی (d. Melioransky) نے جس نے لفظ 'تت' کا خاص مطالعہ کیا ہے، *Zap.*، ج ۱۲، ۱۸۹۹ء، ص ۱۰۳ تا ۱۰۸ میں یہ ثابت کیا ہے کہ ان معنوں کی مثالیں، جو میر علی شیرنوائی کی تصانیف سے ماخوذ ہیں، بہت مشکوک ہیں۔

۲۔ایک خاص (اور بظاہر ثانوی) معنوں میں 'تت' کی اصطلاح بعض ان ایرانیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جنھیں خود ایرانی بھی اپنے آپ سے الگ بتاتے ہیں۔ایسے تات عناصر ایران اورماوراے قفقاز میں ملتے ہیں۔

(الف) شمالی ایران میں لوگوں کی کچھ ایسی الگ تھلگ آبادیاں ہیں جن کی اپنی اپنی بولیاں ہیں۔ فارس کی ''جنوبی'' بولیوں کو ایرانی لوگ تاجیکی کہتے ہیں [فارس میں صرف قشقائی ترک ہی 'تات' کا لفظ استعمال کرتے ہیں - قب سطور بالا]؛ اگر لفظ 'تات' کا اطلاق ان لوگوں پر ہو جو شمالی بولیاں بولتے ہیں تب بھی فارسی زبان میں 'تت' کے لفظ کا اطلاق صرف شمال مغرب کی بعض بولیوں ہی پر ہوتا ہے؛ مثلاً کاشان کے علاقے میں اس کا استعمال اب تک کہیں دریافت نہیں ہوا۔

'تات' کا نہایت اہم عنصر قزوین کے مغرب اور جنوب مغرب میں پایا جاتا ہے۔ تات لوگ ذیل کے دیہات میں آباد ہیں: اشتہارد، جال [شال در نزہۃ - ادارہ]، اسپیورین، اسفیورین، شادمان، سگزی‌آباد [سگز آباد، در نزہۃ - ادارہ]، ابراہیم آباد، خیارک، دنیس فان اور سیادیہون [سیادھن در مسعود گیہان: ۲ : ۳۷۱ - ادارہ] سیادیہون قزوین سے ہمدان اور زنجان کو جانے والی سڑکوں کے سنگم پر واقع ہے اور کوئی دو ہزار گھروں کا گاؤں ہے۔ قزوین کے نواح میں 'تات' لوگ علاقے کے دوسرے کسانوں سے بظاہر ممیز نہیں ہو سکتے۔ تاتی بولیاں جو ایران میں بولی جاتی ہیں تقریباً غیر معروف ہیں۔ کاشان اور اصفہان کی زبانوں کی طرح سیادیہون کی مقامی زبان کا مطالعہ ژکووسکی (Žukovsky) اور مان (O. Mann) نے کیا ہے۔ یہاں ہم چند مخصوص الفاظ لکھتے ہیں: ''اسپہ'' (*äspä*) بمعنی کتا، ''بار'' (*bär*) بمعنی پھاٹک، ''سو'' (*sö*) بمعنی تین؛ ''از میزنہ'' (*äz mīzūnä*) بمعنی میں جانتا ہوں، ''اما میزانو'' (*āmä mizūnū*) بمعنی ہم جانتے ہیں، ''او آدمین ہاما میزانندہ'' (*au ādamīn hāmä mīzūnīndä*) بمعنی یہ سب آدمی جانتے ہیں، ''بشکس'' (*bishkas*) بمعنی دیکھو!، ''تامگو کا شی'' (*tä mugo kā shi*) بمعنی تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ - ژکووسکی (*Mater. dlia Izuč pers. narečii*، ۱ : ۹) اشتہارد

(= اشتہارد) زبان کے چند فرہنگ کلمات بھی دیتا ہے۔ کوشکہ (جو طہران سے ہمدان جانے والی سڑک پر ہے) کی بولی کے متعلق قب نیز بروگش Brugsch : *Reise*، ۱ : ۳۳۷ کے تعلیقات۔ یہ ممکن ہے کہ ان تمام بولیوں کا اس نام نہاد ''پہلوی سرہ'' سے تعلق ہو جو بقول صاحب نزہۃالقلوب، ص ۶۲، چودھویں صدی میں زنجان میں بولی جاتی تھی۔

رابینو (Rabino) (*Le Guilân, R.M.M.*، ۳۲ : ۲۱۰ میں) لکھتا ہے کہ رستم آباد کے علاقہ میں تاتی بولی جاتی ہے، جو سفید رود کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور جہاں 'تالشی' اور 'کردی' بھی بولی جاتی ہے۔ یہی مصنف اپنی تالیف *Māzandarān and Astarābād*، در *G.M.S.*، ۱۹۲۸ء، ص ۶۳ اور ۷۰ میں لکھتا ہے کہ اشرف اور سدن رستاق میں 'تات' موجود ہیں مگر ان کی بولی کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ آذربایجان میں مرند اور جلفا کے درمیان 'تات' کی ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کے چاروں طرف دوسری زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیمان۔ ہاؤپٹ (Lehmann-Haupt) : *Armenien*، ۱ : ۱۸۶ تا ۱۸۷ میں گلن قیا (Gälin-ḳaya) کی بولی کے یہ لفظ دیتا ہے: ''دی'' : دو، ''ہرہ'' : تین، ''اسبہ'' : کتا، ''اوسپہ بندور'' : گھوڑے جوڑ دیے گئے ہیں۔ (حسب اطلاع محمد خان قزوینی) ہرزن کے گاؤں کی بولی کا نمونہ یہ ہے : ''ایزی'' : یہاں، ''امرو'' : آج، ''زیر :'' کل گذشتہ، ''انجمنوئی'' : انجمنیں۔ ایسی ترکیبیں مثلاً ''آمیرے''، ''بیرند''، ''شیرندو''، جو فارسی کے آمدہ، بودند اور شدند کے مرادف اور متبادل الصوت 'د' (ذ) کی 'ر' سے باقاعدہ تبدیلی کے باعث خاص طور پر دلچسپ ہیں (جیسا کہ آگے ذکر آئے گا)۔ ہرزن کی بولی سیادیہون کی 'تاتی' سے بالکل مختلف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آذربایجان میں غیر معلوم تاتی بستیاں اور بھی موجود ہوں۔ ''چیسیون یا کولیون [قب لولی] پر الاب انستاس (Father Anastase) نے جو مقالہ لکھا ہے اس میں وہ مبہم طریق سے یہ ذکر کرتا ہے کہ ''اسکی'' (Uski) کے پہاڑوں میں 'تات' کا ایک قبیلہ رہتا ہے (اسکی کے بجائے اسکو پڑھیے، 'اسکویہ' تبریز کے جنوب میں واقع ہے)؛ ممکن ہے کہ کلید کی (جو دریائے آرس کے بائیں کنارے پر 'اوردوباد' کے نزدیک واقع ہے) بولی بھی، جو اب معدوم ہو چکی ہے، آذربایجان کی تاتی بولیوں سے تعلق رکھتی ہو (قب پس خلوف (Paskhalov) : *Kilit* در *Sborn. mater. dlia opisaniya Kawkaza*، تفلیس ۱۳، ۱۸۹۲ء : ص ۳۳۴ تا ۳۴۳)۔

(ب) قفقاز میں 'تت' کی اصطلاح ان ایرانی مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو 'تاتی' زبان بولتے ہیں۔ یہ خاص بولی دوسری متعدد قوموں کے لوگ بھی بولتے ہیں : مثلاً یہودی اور ارمنی۔ ان تین بڑی قسموں کے علاوہ اس بولی کی اور بھی کئی قسمیں ہیں جن کے درمیان ابھی تک واضح طور پر تمیز نہیں ہو سکی۔

قفقاز کی تاتی بولی کا علم ہمیں بیشتر ملر (Vsevolod F. Miller) کی تصانیف سے حاصل ہوا ہے۔ اس بولی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ''رارات'' یعنی ابدال بہ رآء rhotacism بہت نمایاں ہے (برن = فارسی بودن، یار = فارسی یاد)، اس بارے میں مذکورۂ بالا سطور بھی دیکھیے۔ ذیل کی جدول سے تاتی زبان کی بعض دوسری خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں :

تاتی	فارسی	شمالی بولیاں
دانْ ۔ (جاننا)	دانْ ۔	(کردی) زان
گول (پھول)	گل	(سمنانی) وال (*väl*)
ورف/وہر (برف)	برف	(کردی) وفر

تاتی میں اضافت بہت کم آتی ہے، اس کی جگہ اسکی اپنی ہی ایک ترکیب مستعمل ہے : خوبہ خنہ =

(فارسی) ''خانۂ خوب'' وغیرہ ۔ اس بولی میں حروف ملحقہ (post-position) کی کثرت ہے (—رواز (rävâz-) = مع، ساتھ) اور اسی طرح اسم مصدر سے بنائے ہوے اسم صفت (Gerundials) بھی کثرت سے ھیں (چنین بیرانی (činin bä-birāni) = چنین ببودنی) ۔ ترکی زبان کے دخیل الفاظ بھی بہت ھیں ۔ ایران کی دوسری مقامی بولیوں کی طرح تاتی کی خصوصیات میں بھی باقاعدگی بہت زیادہ نہیں ہے ۔ عام طور پر ہم کہہ سکتے ھیں کہ موجودہ فارسی زبان اور بحیرۂ خزر کی مختلف بولیوں کے درمیان یہ زبان ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے (خزری بولیوں میں بھی کہیں کہیں رارات rhotacism پائی جاتی ہے، یعنی اور حرفوں کو رآء میں بدل دیا جاتا ہے) ۔

مسلم تات جنھیں تاتی زبان بولنے والے لوگوں میں اکثریت حاصل ہے باکو [رکۂ بان]، قُبّہ [رکۂ بان]، شماخی اور گوک چاے کے علاقوں میں رہتے ھیں ۔ ان میں سے بعض گنجہ اور جنوبی داغستان (اضلاع قیتق و تبسران جو دربند کے مغرب میں اس کے بالکل متصل ھیں قب کزبسکی Pamiat. Knižka Dagestan. oblasti : Kozubsky تمرخان شورا، ۱۸۹۵ء، ص ۱۳۴) میں بھی آباد ھیں ۔

'تات' کی زیادہ تعداد کوہ قفقاز کے انتہائی مشرق حصے کی ڈھلانوں پر آباد ہے اور جزیرہ نماے 'آبشاران' Apsheron میں بھی، باستثناے جنوب مشرق حصہ، ان کی کثرت ہے ۔ رتّخ (Rittich) (قبل از ۱۸۷۷ء) نے قفقاز کی مختلف نسلوں کا جو نقشہ تیار کیا ہے اس میں 'تات' کی مجموعی تعداد ۶۴،۶۵۶ بتائی ہے ۔ کندرتنکو (Kondratenko) کے نقشے میں جو *Zapiski Kawk. Otd. Russ. Geogr. Otshč* کی اٹھارھویں جلد کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل ہے، باکو کے علاقے میں ۱۸۸۶ء میں 'تات' کی تعداد ۵۸،۶۲۱ دکھائی گئی ہے ۔ *The Great Russian Encyclopaedia*، ج ۳۲/۲، ۱۹۰۱ء میں ان کی مجموعی آبادی ایک لاکھ پینتیس ہزار بتائی گئی ہے ۔ سوویٹ حکومت کی ۱۹۲۳ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد بلحاظ زبان ۹۸،۰۲۰ ہے اور بلحاظ قومیت ۲۸،۷۰۵؛ پہلی قسم میں ماوراے خزر کے ۹۷۰ 'تات' بھی شامل ھیں (یعنی تاجیک جنھیں ترکمان 'تات' کہتے ھیں)۔ اس کے علاوہ آذربایجان کی سوویٹ جمہوریہ میں گیارہ ہزار افراد فارسی زبان بولتے ھیں، جن میں کچھ 'تات' بھی ضرور شامل ہونگے۔ ہم یہ کہہ سکتے ھیں کہ زیادہ سے زیادہ نوے ہزار آدمی ایسے ہونگے جو 'تاتی' زبان بولتے ھیں۔ تات کی تعداد میں کمی کی وجہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ترک بن رہے ھیں۔

وہ یہودی جو تاتی زبان بولتے ھیں (''پہاڑی یہودی''؛ ترکی: داغ چفوتی) ۱۸۸۶ء میں ان کی تعداد اکیس ہزار تھی یعنی دس ہزار دیہات میں اور گیارہ ہزار شہروں میں؛ ان کی سب سے بڑی نو آبادیاں قُبّہ (۶۲۸۰)، دربند، تمرخان شورا، گروزنی اور نالچک (قبارطاے Kabarda کے علاقہ کے ایک چرکسی ضلع) میں ھیں ۔ یہ لوگ قُبان Kubān کے اطراف [رکۂ بان] میں بھی پائے جاتے ھیں ۔ ان یہودیوں کی بولی حروف حلقیہ کے لیے مشہور ہے ۔ اس میں ھمیں 'حا' 'عین' 'طا' اور 'ضاد' کا استعمال خالص ایرانی الفاظ میں بھی ملتا ہے (حَفد = سات، اسب (= عسب؟) = گھوڑا، ضَنسدہ = جان، طر = تر) ۔ ملّر ''یہودی تاتی'' کی خصوصیات یوں بیان کرتا ہے: ''یہ ایک ایرانی بولی ہے، جس کا لب و لہجہ سامی ہے، جس کی اصوات، اوزان و ابنیہ (جزوی طور پر) ترکی نمونے پر ڈھالی گئی ھیں''۔ لب و لہجے کے متعلق صرف یہی بات کافی ہے کہ یہ یہودی پہلے عربی بولا کرتے تھے یا زیادہ سادہ طریق سے یوں کہا

جا سکتا ہے کہ داغستان کے لوگوں کے قرب کی وجہ سے ان کا لب و لہجہ ایسا ہے۔ اہل داغستان نہ صرف ''ع'' اور ''ح'' کی آوازوں سے آشنا ہیں، بلکہ ہمیشہ عربی ادب سے بھی بہرہ مند ہوتے رہے ہیں اور ماضی قریب تک ان کی خط و کتابت بھی عربی زبان ہی میں ہوتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان تاتیوں کے ہاں بھی ''ع'' اور ''ح'' کی آوازیں موجود ہیں۔ تاتی زبان پر ترکی زبان کے اثرات کو زیادہ مبالغے کے ساتھ بیان نہیں کرنا چاہیے۔ ملّر نے تکوین و ترکیب کلمات کے مظاہر اور ایک ہی لفظ کے مقاطع میں جو صوتی ہم‌آہنگی کا اثر assimilation دریافت کیا ہے اس کی نظیریں خالص فارسی الفاظ میں بھی ملتی ہیں۔ ایرانی اثر ان یہودیوں کی صرف زبان ہی پر نہیں پڑا، بلکہ ان کے شعبی اساطیر (فوک لور) میں بھی اس کا عکس پایا جاتا ہے؛ مثلاً (سرآوی = جل پری، اژدھاے مار = اژدھا وغیرہ)۔

ارمینیہ (مَدرسی [مدرسہ] کے چھوٹے قصبے، کلْوال وغیرہ) کی تاتی زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ حروف مدّہ کی آوازوں کو زیادہ سادہ یعنی مقصور بنا دیا جاتا ہے۔ (آ > ا) اور بعض حروف صحیحہ کے آخر میں ہای مخلوط کی آواز بڑھا دی جاتی ہے۔

قفقاز کے تات آج کل چاروں طرف سے ترکوں اور داغستانیوں سے گھرے ہوے ہیں۔ ان کا موجودہ وطن اور مقام اور ایرانیوں کی آبادی کا بڑا حصہ ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہا ہوگا۔ قفقاز کے مشرقی سلسلۂ کوہ کے ساتھ ساتھ اور دربند کی جانب کو نکلتی ہوئی ان کی آبادی کی موجودگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے جغرافیائی محل وقوع سے مقصود یہ ہوگا کہ کوہستان کے قدرتی خط دفاع کو شمالی حملہ آوروں کی روک تھام کے لیے ایرانی نوآبادیوں کے ذریعے سے مزید مضبوط و مستحکم بنایا جائے۔ ایک دلآویز گمان یہ ہے کہ یہ تات لوگ ان قدیم نوآبادیوں کے اخلاف ہیں جنھیں ساسانی بادشاہوں نے دربند کے استحکام کے لیے داغستان میں لا بسایا تھا۔ بقول بلاذری، ص ۱۹۴، انوشیروان (۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) نے دربند تا شابران (قبّ شیروان) کے علاقوں میں سِیسْکان (Sisakan) کے باشندوں (السِّیاسیجین) کو لا کر آباد کیا تھا۔ سیسکان کا صوبہ دریاے اَرَس کے بائیں کنارے پر آذربایجان کے عین شمال میں واقع تھا اور عملی طور پر نَخْچُوان اور اس کے گرد و نواح کے پہاڑی علاقے پر مشتمل تھا۔ سیسکان کے باشندے عیسائی تھے لیکن سیاسی اور لسانی لحاظ سے سلطنت ارمینیہ میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ۵۷۱ء میں انھوں نے ساسانی بادشاہ سے درخواست کی کہ ان کے علاقے کو ارمینیہ سے علحدہ کرکے آذربایجان میں شامل کر دیا جائے، قبّ مارکوارٹ (Marquart): *Erānšahr*، ص ۱۲۰ تا ۱۲۲؛ Hübschmann: *Die altarmen. Ortsnamen. Indog. Forschungen, XVI.*، ۱۹۰۴ء: ص ۲۶۳ تا ۲۶۶ و ۳۴۷ تا ۳۴۹۔ ایک متاخر تالیف دربندنامہ مرتبۂ کاظم بیگ *Mém. présentés à l. Académie des sciences par divers savants, VI.*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۱ء: ص ۴۶۱ میں لکھا ہے کہ ''انوشروان نے دربند کے گرد و نواح میں آذربایجان اور فارس کے آدمی آباد کیے (شابَران۔ مشکور کا علاقہ؛ قبّ لفظ قُبّہ) اور دربند کے جنوبی شہروں میں عراق اور فارس کے باشندوں کو لا کر بسایا۔ مگر اسی مصنف کے قول کے مطابق (ص ۵۰۳) دربند کے گرد و نواح کے قلعے عباسی خلیفہ المنصور (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) کے زمانے میں از سرِ نو تعمیر ہوے اور اس موقع پر موصل اور شام کے عربوں کو ان میں آباد کیا گیا۔ جو مقامات بطور خاص مستحکم کیے گئے ان میں مُطاعی اور کَماخی وغیرہ خاص

طور پر قابل ذکر ہیں جن میں آج کل 'تات' آباد ہیں۔ ان حالات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مطاعی وغیرہ میں 'تات' کی موجودگی آٹھویں صدی سے بعد کے انتقال آبادی پر دلالت کرتی ہے، لیکن دربندنامہ کا متن، جس کا فارسی اصل ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا (قب بارٹولڈ (Barthold): *Irān*، ج ۱، لین گراڈ ۱۹۲۶ء: ص ۴۳ تا ۵۸)، یقینی نہیں (کلاپروٹ (Klaproth) کے ترجمے کے مطابق تین سو خاندان، جو مطاعی میں آ کر آباد ہوے، تبسرن (Tabasaran) سے آئے تھے!)۔ غرض تاریخی مآخذ جو ہمیں دستیاب ہو سکے ہیں ان سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ دربند کی نوآبادیاں نسلی اعتبار سے بہت کچھ مخلوط ہیں۔ اس کے برعکس تاتی اپنی عام خصوصیات کے لحاظ سے موجودہ زمانے کی زبان معلوم ہوتی ہے جس میں (سوائے حرف ر کے غلبے کے) قدامت کے خاص آثار کچھ نہیں پائے جاتے، حالانکہ ایسی زبان کے لیے، جو مدت سے متروک ہو چکی ہو، یہ آثار ضروری ہیں۔ یہودیوں کی تاتی بولی کا سوال ضمنی سا ہے، کیونکہ اگر وہ داغستان میں تات کے آنے سے پہلے (قب میلر: *Introduction*، ۱۸۹۲ء) بھی آباد ہوے ہوں تو بھی یہ ممکن ہے کہ انھوں نے اپنی پرانی زبان (عربی؟) کی جگہ یہی زبان اختیار کر لی ہو۔

باقی رہا تاتی زبان کے عام تعلقات کا سوال، سو آذربایجان کی کئی ایرانی آبادیوں میں آج تک تاتی بولیوں کے مطابق حرف ر کے غلبے کی مثالیں ملتی ہیں اور اردبیل کے علاقے میں تو ایسی مثالیں چودھویں صدی سے موجود ہیں (احمد کسروی: آذری، زبان باستان آذربایجان، طہران ۱۳۰۴ھ/ ۱۹۲۷ء)۔ اسی طرح ارمنی زبان میں ایرانی کے جو دخیل الفاظ قدیم زمانے سے موجود ہیں (*Māδa>Mar*؛ *spāδpat>rappsēt*)، ان سے بھی یہ ظاہر ہے کہ ارمنیوں کے ہمسائے ایرانیوں میں یہ خصوصیت بڑے قدیم زمانے سے موجود تھی (مارکوارٹ: *Ērānšahr*، ص ۱۲۴، حاشیہ ۶؛ Bartholomae: *Indogerm. Forsch.*؛ ضمیمہ جلد ۱۹، ۱۹۰۶ء: ص ۳۴، حاشیہ ۱)۔ دوسری عجیب و غریب خصوصیت لاہیج شہر کا نام ہے، جس میں تات (گوک چای کے منبع پر) آباد ہیں اور شاید گرجستانی تاریخ میں بروسہ (Brosset): ۱: ۳۶۳) ۱۱۲۰ء کے تحت اسی شہر کا ذکر ہے (Laidjk یا Lidatha)۔ وہاں کے باشندوں کا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ لاہیجان (رک بان) سے آئے تھے۔ میلر نے ۱۹۲۸ء میں موقع پر تحقیقات کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ لاہیج کی زبان کی اپنی ہی چند خصوصیات ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ تات کی کچھ نوآبادیاں دوسروں کی نسبت ذرا بعد کے زمانے میں علاقۂ ماورائے قفقاز میں قائم ہوئی ہوں اور زیادہ تعداد والے گروہ کی زبان نے آس پاس کے علاقے کی بولیوں کو ہموار کر دیا ہو (باقی خانوف کی گلستان ارم، باکو ۱۹۲۸ء، ص ۴۱ کے مطابق مسکینجہ (Miskinlja) کے باشندوں کے اسلاف علاقۂ سمور میں شاہ طہماسپ اول کے عہد میں استرآباد سے آئے تھے)۔

مآخذ: (۱) بیریزین (Bérézine): *Recherches sur les dial. persans*، قازان ۱۸۵۳ء، ص ۲ تا ۴۲ (تاتی زبان کی صرف و نحو)؛ (۲) ڈورن (Dorn) کے مواد کے لیے دیکھیے اس کی *Caspii*، روسی طباعت، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۵ء، ص xli، ۲۰۳، ۳۵۳، ۳۹۳ اور خاص کر میلر: ۱۹۰۷ء (مذکور ذیل)؛ (۳) میلر Vsevolod F. Miller: *Materialī dlia izučeniya yewreisko-tatskago yazika*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۲ء (مآخذ [۳۰ مقالے روسی زبان میں]، تمہید، متن [۸ تاریخی کتابیں] مفردات؛ (۴) *Armiano-tatskiye teksti*، *Sbornik materialov dlia opisaniya Kawkaza* تفلیس ۱۸۹۳ء، ج ۲/۲۰: ص ۲۵ تا ۳۲؛ (۵) کایگر

(Geiger) :Die kaspischen Dialecte، در Grund. d. iran. Phil. ج ۱/۲ : ص ۳۵۰ تا ۳۷۳ (بمواضع کثیرہ؛ مواد بہت کم) ؛ (۶) ملّر : Očerk fonetiki yewr.-tat. narečiya, Trudî po vostok. Lazar. Instituta، کراسہ ۳، ماسکو ۱۹۰۰ء؛ (۷) ایضاً : Očerk morfologii yewr.-tat. nareč، محل مذکور، کراسہ ۷، ۱۹۰۱ء؛ (۸) ایضاً : Tatskiye etüdî، حصۂ ۱، محل مذکور، کراسہ ۲۳، ۱۹۰۵ء (ص ۱ تا ۲۹ : لاہیج کے تات مسلمانوں کی بولی میں گیارہ تاریخیں؛ ص ۳۳ تا ۹۷ : تاتی روسی فرہنگ)؛ حصۂ ۲، محل مذکور، کراسہ ۲۶، ۱۹۰۷ء (صرف ونحو)؛ (۹) ایضاً : Yewr.-tat ma'ni, Zap.، ۱۹۱۳ء، ج ۲۱، کراسہ ۴ : ۱۷.. تا ۲۹..؛ (۱۰) کورش (Korsch) : Slédî dialect. Drevnosti vostoč rhotacizma v srednepe's. yazîke، ج ۲/۳، ماسکو ۱۹۰۳ء : ص ۱ تا ۱۰؛ (۱۱) قفقاز کے تاتوں کے متعلق قب؛ اریکرٹ (Erckert) : Der Kaukasus und seine Völker، لیپزگ ۱۸۸۷ء، ص ۲۲۰؛ (۱۲) کووليوسکی (Kowalewski) : O yuridičeskom bîtê tatov, Izvestiya Obshč. Liubit. Yestestvoznaniya، ماسکو ۱۸۸۸ء، ۴۳، کراسہ ۲ : ص ۲۴ تا ۴۹؛ (۱۳) لاہیج پر قب محمد حسن افندی Mamed-Hasan Efendiew : در Sborn. mater، ج ۲۹، تفلیس ؛ (۱۴) پہاڑی یہودیوں کے متعلق قب مآر کے ماخذ اور قب H. Rosenthal در Jewish Encyclop.، ج ۳، ۱۹۰۲ء : ص ۶۲۸ تا ۶۳۱؛ (۱۵) کردوف (Kurdov) : Gorskiye yewrei Daghestana, Russ. antropol. journal، ماسکو ۱۹۰۵ء، کراسہ ۳ اور ۴ : ص ۵۷ تا ۸۸؛ (۱۶) ایضاً : Gorks. yewrei Shemakh uyezda، محل مذکور، ۱۹۱۲ء، کراسہ ۲ اور ۳ : ص ۸۷ تا ۱۰۰؛ (۱۷) ایضاً : Tatî Daghestana، محل مذکور، ۱۹۰۷ء، کراسہ ۳ و ۴ : ص ۵۶ تا ۹۶ (مصنف یہ ثابت کرتا ہے کہ نسلی نقطۂ نظر سے دربند کے مغرب کے سات گانووں کے تات باکو کے تاتوں اور ایرانی تاتوں سے بالکل الگ ہیں اور ترکوں سے ان کا تعلق زیادہ معلوم ہوتا ہے).

(V. MINORSKY منورسکی)

تاتار : تتار اور تتر بھی لکھا جاتا ہے، ایک قوم کا نام مگر اس کلمے کا مفہوم مختلف زمانوں میں مختلف رہا ہے - آٹھویں صدی میلادی کے 'اورخونی' (Orkhon) کتبوں میں جو ترکی زبان میں ہیں 'تیس تاتاروں' اور 'نو تاتاروں' کا ذکر آتا ہے، جیسا کہ ٹامسن (Thomsen : Inscriptions de l'Orkhon، ہلسنگفورز ۱۸۹۶ء، ص ۱۴۰) کا خیال ہے اس نام کا اطلاق اس وقت بھی مغولوں یا کسی مغولی شعبے پر ہو رہا تھا لیکن ترکوں کے لیے یہ اصطلاح س وقت بھی مروج نہ تھی - بقول ٹامسن تاتاری بیکال کے جنوب مغرب میں بستے تھے اور تقریباً کیرولین (Kerulen) تک پھیلے ہوئے تھے - قتائیوں [رک بہ قرہ ختای] کی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد ترکوں کو موجودہ منگولیا سے نکال دیا گیا اور مغول قبائل نے ان کی جگہ لے لی - علاقۂ اُتوکان (Ütükän) جس کا ذکر کتبات 'اورخون' میں ترکوں کے مسکن کی حیثیت سے بار بار آیا ہے، بقول محمود کاشغری (۱ : ۱۲۳) اس کے اپنے زمانے (یعنی پانچویں صدی ہجری = گیارھویں صدی میلادی کے دوسرے نصف) میں تاتاریوں کے ملک میں شامل تھا [''اسم موضع بفیافی تتار'' - ادارہ]؛ یہ امر کہ تاتاریوں کی زبان ترکی زبان سے مختلف تھی، محمود کاشغری پر بھی روشن تھا (کتاب مذکور، ۱ : ۳۰) - تاتاریوں کے کئی دستے ترکوں کے ساتھ شامل ہو کر کچھ اور مغرب کی طرف چلے گئے - حدود العالم میں (قب Zap.، ۱۰ : ۱۲۱ ببعد) جس کا مصنف نامعلوم ہے، تاتاریوں کو تُغزغُز (Tughuzghuz) [قب مادۂ غُز] (قب بارٹولڈ : Otčet o po'ezdk'e v Srednyuyu Aziyu، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء، ص ۴۳) کا جزو بتایا ہے اور گردیزی (کتاب مذکور ص ۸۲ ببعد) نے قوم کیماک (Kimäk) [رک بآن] کا جو دریاے اِرتش [رک بآن] پر آباد ہے - کتاب مجمل التواریخ (حدود

۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء) [طہران ۱۳۱۸ شمسی - ادارہ] میں جس کا مصنف معلوم نہیں (ص ۱۲۴ پر) پادشاہان مشرق کے القاب کی فہرست میں (مذکور در بارٹولڈ : ترکستان، ۱ : ۲۰) ایک تاتاری بادشاہ کے لقب سیمون بیوی‌حیار (یا شیمون بیـوی‌ جیار؟) کا ذکر ہے لیکن کسی اور جگہ یہ لقب نہیں ملتا - سلطان محمد بن تکش (دیکھیے مادۂ خوارزم شاہ) نے قپچاق [رکّ باں] کے خلاف جو حملے کیے ان میں سے ایک سنہ ۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء تا ۱۲۱۹ء) میں قدر خان بن یوسف تاتاری (طبقات ناصری، ترجمۂ ریورٹی (Raverty)، ۱۸۸۱ء، ۱ : ۲۶۷) کے خلاف بھی تھی۔

ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی میلادی) کی مغول فتوحات کے زمانے میں تمام دنیا (چین، اسلامی دنیا، روس اور مغربی یورپ) میں ہر جگہ فاتحین کو تتر کہتے تھے (چینی: تاتا (*Ta-ta*) - یہی نام ابن الأثیر (طبع ٹورن برگ، ۱۲ : ۱۲۸ ببعد ۲۳۶ ببعد) [ملاحظہ ہو طبع قاہرۃ ۱۳۱۳، ج ۱۲ : ص ۱۳۷ ببعد و ۱۹۳ ببعد-ادارہ] میں چنگیز خان کے پیشروؤں کے لیے استعمال ہوا ہے، یعنی قبیلۂ نایمان (Naiman) کے لیے جن کا سردار کوچلوك (Küčlük) تھا (دیکھیے مادۂ قرہ‌ختای)؛ بقول ابن الأثیر (کتاب مذکور ص ۲۳۷، [طبع قاہرۃ ۱۳۱۳، ۱۲ : ۱۴۰- ادارہ]) یہ 'پہلے تاتار' (التتر الأولی) تھے - رشیدالدین جو بظاہر عہد مغول سے قبل لفظ تتر کے استعمال اور اس کے شیوع عام سے بالکل ناآشنا ہے تاتاریوں کا ذکر اس طرح سے کرتا ہے گویا وہ مغول سے بالکل علحدہ ہیں، جن کا خاص مرکز کبھی بوئر نور (Buir or Buyer Nor) (کیرولین کے جنوب مشرق) کا ملحقہ علاقہ تھا - بقول رشیدالدین ''چنگیز خان کی فتوحات کے بعد بہت سے لوگ جنھوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی اپنے آپ کو ''مُغُول'' (Mongol) کہنے لگے۔ان سے پہلے کے زمانے میں تاتاری بھی بڑے طاقتور تھے اور بہت سی قومیں اسی نام سے موسوم تھیں - یہی وجہ ہے کہ بلاد ختای، ہندوستان، چین، ماچین میں، قرغزوں کے درمیان، کلار (پولینڈ)، باشقرد (ھنگری)، دشت قپچاق اور بدووں کے شمالی ملکوں اور شام، مصر، مغرب میں، غرض ہر جگہ ترکوں کو آج تک 'تاتار' ہی کہتے ہیں'' (متن در *Trudi. Vost. Otd. Arkh. Obshč.*، ۷ : ۶۴ پر)۔

جو شعوب نسل اور زبان کے اعتبار سے مغل ہیں بظاہر وہ اپنے آپ کو ہمیشہ تاتار کہتے رہے تھے مگر چنگیز خان کے عہد کے بعد منگولیا (مغولستان) اور وسط ایشیا میں تاتار کا لفظ کاملاً متروك ہوگیا اور اس کی جگہ 'منگول' نے لے لی، جسے چنگیز خان نے سرکاری طور پر جاری کیا - (اسلامی مخطوطات میں یہ کلمہ مُغُول یا مُغُول ہے، افغانستان کے ان باشندوں کے روزمرہ میں جو مغولی الاصل ہیں اور جنھوں نے اپنی زبان کو آج تک بر قرار رکھا ہے اس کا تلفظ مُغُول (Moghol) ہے) مغول سلطنت کے انتہائی مغربی حصوں میں کلمۂ مغل کو کبھی فوقیت حاصل نہ ہو سکی، گو وہاں بھی جیسا کہ یورپین سیاحوں نے لکھا ہے یہ لفظ سرکاری طور پر جاری کیا گیا تھا (John of Pian de Carpini اور William of Rubruck؛ *Hakl Soc.*، ۱۹۰۵ء، اشاریہ، بذیل مادّہ Mongol اور Tartar)۔ آلتون اُردو (Golden Horde) (دیکھیے مادہ‌ھاے باتو خان و برکہ (Berke)) کی سلطنت اور بعد میں اس علاقے کی دوسری چھوٹی حکومتوں کے لوگوں کو ہمیشہ 'تاتار' کہتے تھے - کریمیا کے ترکی بولنے والے لوگوں کو نہ صرف عثمانی (اور روسی) 'تاتار' کہا کرتے تھے بلکہ وہ اپنے آپ کو خود بھی 'تاتار' ہی کہتے تھے یہ بات ان کثیرالتعداد تحریروں سے واضح ہوتی ہے جو لین گراڈ کی پبلک لائبریری میں محفوظ ہیں۔

فتوحات کے زمانے میں ایک مغل لشکر کو ایشیاے کوچک میں بھیج دیا گیا ۔ اُن کی اولاد کو (جو بلاشبہ سب کے سب ترک بن گئے) قرہ تاتار (کالے تاتاری) کہا کرتے تھے ۔ تیمور کے حملے کے زمانے میں یہ لوگ اماسیہ [رَكَ بآں] اور قیصریہ [رَكَ بآں] کے درمیان خانہ‌بدوشوں کی زندگی بسر کیا کرتے تھے ۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً تیس چالیس ہزار ''خانہ‌وار'' (کنبے) تھی (ظفر نامہ ، کلکتہ ۱۸۸۸ء، ۲ : ۵۰۲ ببعد) ۔ تیمور نے ان تاتاریوں کو بقول ابن عرب شاہ (طبع Manger : ۲ : ۳۳۸) سلطان بایزید کے مشورے سے وسط ایشیا میں (خانہ کوچ) بھیج دیا اور علاقۂ کاشغر کے ایک جزیرے میں جو بحیرۂ ایسیک کول [رَكَ بآں، ایسِغ کول در تاریخ رشیدی ۔ طی] میں تھا (اور اب ناپید ہوگیا ہے)، نیز خوارزم میں انھیں رہنے کے لیے مکان دیے گئے ۔ ان میں سے ایک شعبہ بلاد آلتون اردو کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہو گیا ۔ تیمور کی موت کے بعد قرہ تاتار ایشیاے کوچک میں واپس آ گئے ۔ ۱۴۱۹ء میں انھیں (یا ان کے ایک حصے کو) بلقان میں جلا وطن کر دیا گیا، جہاں وہ فلبہ (Philippopolis) کے مغرب میں جا کر آباد ہو گئے ۔ شہر 'تاتار بازار جغی' (Tatar-Pazardjik) انھیں کے نام کی یادگار ہے ۔ (ہامر GOR: J. von Hammer، طبع دوم، پسٹ ۱۸۳۴ء، ۱ : ۲۹۲)۔

بعد کے زمانے میں روس اور مغربی یورپ میں ہم اکثر اوقات یہ دیکھتے ہیں کہ تاتار کا لفظ عثمانیوں کے سوا تمام ترکی‌الاصل اُمم کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے ۔ اس لفظ کا یہ استعمال راڈلوف کی کتاب *Aus Sibirien* ، لیپزگ ۱۸۸۴ء، میں اب بھی جا بجا ہوا ہے ۔ اہل چین کی مثال کی پیروی میں یہ نام مغول کے لیے بھی استعمال ہونے لگا؛ خاص کر مانچوؤں کے لیے (قب پیکن کا ''تاتار شہر'') ۔ کسی قوم کے مخصوص نام کی حیثیت سے (اب) کلمۂ تاتار دریاے والگا کے طاس میں ترکی بولنے والے لوگوں کے لیے خاص ہو گیا ہے جو قازان تا استراخان، کریمیا (یا قریم) اور سائبیریا کے ایک حصے میں آباد ہیں، اسی لیے اتحاد سوویٹ کی مشمولہ اقوام کی فہرست (*spisok*) بابت ۱۹۲۷ء میں تاتار کریمیا، تاتار والگا، تاتار قاسموف [رَكَ بآں]، اور تاتار ٹوبولسک (Tobolsk) کو علیحدہ اقوام مانا گیا ہے ۔ سفید روس کے وہ تاتار انکے علاوہ ہیں جن کے آبا و اجداد کریمیا کے قیدیوں کی حیثیت سے پولینڈ کو جلاوطن کیے گئے تھے ۔ انھوں نے سفید روس کی زبان تو اختیار کر لی لیکن مذہب اسلام پر قائم رہے ۔ کریمیا میں اب لوگ تاتار کا نام قبول نہیں کرتے ۔ استراخان کے ترکی بولنے والے باشندوں کے متعلق حال ہی میں یہ محقق ہو چکا ہے کہ وہ نوغاے نسل سے ہیں ۔ والگا کے درمیانی حصے میں بھی تاتاریوں کے عیسائی ہم‌وطن (یعنی ''Kryashen'' (از روسی *kreščeniy*=''بپتسمہ دیا ہوا'') (راڈلوف: *Wörterbuch*، ۳ : ۱۰۱ ببعد) انھیں تاتار ہی کہتے ہیں ۔ یہ لوگ اس بات کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ انھیں 'تاتار' کے بجاے 'مسلمان' کہا جائے، کیونکہ لفظ تاتار ان کے کافر آبا و اجداد کے لیے زیادہ موزوں تھا ۔ اسی طرح مدت سے عثمانی بھی اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ انھیں 'ترک' نہ کہا جائے ۔ انقلاب سے ایک سال پہلے تک، جب کہ قومیت کا اصول جالب توجہ ہو چکا تھا، اس سوال پر بڑی بحث ہوتی رہی کہ انھیں ترک کہا جائے یا تاتار (*M.I.*، ج۱، ۱۹۱۲ء، : ص ۲۷۰ ببعد) ۔ اس زمانے میں لفظ 'تاتار' ہی غالب آیا ہے اور ۱۹۲۰ء سے ایک خود مختار اشتراکی (سوشلسٹ) سوویٹ جمہوریہ قائم ہو چکی ہے، جس کا صدر مقام قازان [رَكَ بآں] ہے ۔ اس کی آبادی ستائیس لاکھ

اسّی هزار (۲۷,۸۰,۰۰۰) نفوس پر مشتمل ہے، جن میں سے نصف سے کچھ کم یعنی تیرہ لاکھ چھ هزار دو سو بانوے (۱۳,۰٦,۲۹۲) تاتار ہیں۔ قبّ اجناس امم کا جائزہ. (اوچرك očerk) مصنفۂ پروفیسر ڈی۔زولوتارف (Zolotarev) در سفر نامۂ موسوم بہ *Povolžye*، ۱۹۲٦ء، ص ۹۹ بعد (اعداد و شمار سفرنامے کے ص ۱۲۳ و ۱۲٦ پر دیے گئے ہیں)۔

مآخذ مقالے میں آ چکے ہیں۔

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

تاج: فارسی زبان کا لفظ ہے جو عربی میں مستعار لیا گیا ہے۔ اس کی اصل قدیم فارسی لفظ تگ *Tag** ہے، قبّ ارمنی: (*Tag*)، آرامی: تاگا۔ عربی میں تاج کی جمع مکسّر تیجان آتی ہے اور اس سے باب تفعیل تتویج (تاج پہنانا) اور باب تفعل 'تتوّج' (تاج پہننا) بنتا ہے اور 'تائج' بمعنی 'تاجور' یا 'تاجدار' ہے (هورن (Horn): *Grundriss der neupersischen Etymologie*، سٹریسبرگ، ۱۸۹۳ء، ص ۸۱؛ صدّیقی: *Studien über die persischen Fremdwörter im klassischen Arabisch*، گوٹنگن ۱۹۱۹ء، ص ۷۴ و ۸۴؛ فرینکل (Fraenkel): *Die aramäischen Fremdwörter im Arabischen*، لائیڈن ۱۸۸٦ء، ص ٦۲)۔ اپنے نام کی طرح تاج بذات خود قدیم ایران سے آیا ہے۔ قدیم ایرانی بادشاہوں کے تاجوں کی وضع قطع سے جس کا پتا ہمیں ان کے سکوں سے بطریق احسن چلتا ہے عربی علم ادب بھی ناآشنا نہ تھا۔ مثال کے طور پر مسعودی ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے رنگین تصویروں کی ایک پرانی کتاب دیکھی تھی جس میں قدیم ایرانی بادشاہ تاج پہنے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں ہشام بن عبدالملک بن مروان اموی کے لیے ہوا (کتاب التنبیه والاشراف، مطبوعۂ لائیڈن ۱۸۹۴ء، ص ۱۰٦)۔ اس قسم کی کتابوں کا ایک سلسلہ جن کے نام کتاب سیر الملوك، کتاب التاج وغیرہ تھے، بظاہر اسی مضمون پر ہوگا لیکن یہ کتابیں اب ناپید ہو چکیں۔ کتاب التاج پر قبّ زکی پاشا کا دیباچہ جو اس نے جاحظ کی کتاب التاج پر لکھا (قاهرة ۱۳۳۲ھ/[۱۹۱۴ء])۔ ہمارا گمان ہے کہ حمزۂ اصفہانی کی کتاب تأریخ سنی ملوك الأرض و الأنبیاء (برلن، کاویانی پریس، ص ۱۷ و ۲۴ بعد، ۳۲ و ۳۵ بعد) میں ایرانی تاج کے متعلق جو بیانات درج ہیں، وہ اسی قسم کے مصادر پر مبنی ہونگے۔ یہی حال مجمل التواریخ کا ہے جس میں حمزہ کا مواد استعمال ہوا ہے اور طبری کے بیانات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ (ان کتابوں کے مآخذ کے باہمی تعلق کے متعلق قبّ نولڈیکه (Nöldeke): *Geschichte der Perser und Araber*، لائیڈن ۱۸۷۹ء، تمہید؛ ایرانیوں کے ہاں تاج کے رواج کے متعلق ملاحظہ ہو بالخصوص ص ۹۵ و ۲۲۱ و ۳۰۴ و ۳۸۵ و ۴۰۳؛ A. Christensen: *L'Empire des Sasanides*، کوپن ہاگن ۱۹۰۷ء، ص ۱۴ و ۸۹ بعد و ۱۰٦؛ ایضًا: *Le Règne du Roi Kawadh I et le Communisme mazdakite*، کوپن ہاگن ۱۹۲۵ء، ص ۲۲ بعد)۔ عربی زبان میں اوائل کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ سب سے پہلے ضحّاك نے تاج پہنا (دیکھیے قلقشندی: صُبح الأعشٰی، قاهرة ۱۳۳۱ھ/[۱۹۱۳ء]، ۱: ۴۱۵)۔

اسلامی زمانے کے مخطوطات کی نقاشی (miniatures) میں جو قدیم ایرانی بادشاہ دکھائے گئے ہیں وہ باقاعدہ تاج پہنے ہوئے ہیں، لیکن ان تاجوں کی شکل و صورت کو کسی طرح بھی مستند نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایسی تصویروں میں فرشتوں نے بھی تاج پہن رکھے ہیں، بالخصوص معراج کی فرضی تصویروں میں براق کے سر پر بھی تاج دکھایا گیا ہے۔ (دیکھیے اویغوری زبان کا

معراج‌نامہ، طبع پاوہ دُکُورتِیّ (Pavet de Courteille)، پیرس ۱۸۸۲ء)۔

عربوں کو تاجوں کی واقفیت پہلے پہل زمانۂ جاہلیت میں ہوئی، کیونکہ ایرانی بادشاہ کبھی کبھی اپنے باجگذار عرب بادشاہوں کو ان کے رتبے کی علامت کے طور پر تاج دیا کرتے تھے؛ مثلاً انھوں نے امرؤالقیس لخمی (م ۳۲۸ء) کو تاج دیا۔ (قب Clermont-Ganneau، *Recueil d'Archéol Or*، ۶ : ۳۰۷ : *Le roi de "tous les Arabes"* اور ۷ : ۱۶۷ ببعد؛ *Le Tâdj-dâr Imrou 'l-Qais et la royauté générale des Arabes*؛ لڈزبرسکی (Lidzbarski) : *Ephemeris*، ۲ : ۳۰ و ۳۷۵۔ اِکلیل اور تاج کے باہمی فرق کی بابت بھی دیکھیے کتاب مذکور۔ مؤخر الذکر یعنی تاج سے بظاہر سر پر پہننے کا سیدھا سادا زرین حلقہ مراد ہے)۔ اسی طرح انھوں نے نعمان ثالث لخمی کو تاج دیا (روتھ شٹائن (Rothstein): *Die Dynastie der Lahmiden in al-Ḥīra*، برلن ۱۸۹۹ء، ص ۱۲۸) اور ذوتاج ہَوْذَة بن علی کو جو رسول [مقبول ؐ] کے زمانے میں یمامہ کا عیسائی حاکم تھا اور روایت ہے کہ اسے آنحضرت ؐ نے اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دی تھی (ابن ہشام : طبع ویسٹنفلٹ، ص ۹۷۱؛ قلقشندی : ۶ : ۳۷۹؛ فرینکل : ص ۶۲؛ طبری : ۱ : ۹۸۵؛ نولڈیکہ : *Geschichte d. Perser u. Araber*، ص ۲۵۸) ۔ تاج اور تاجداروں کی شان و شکوہ کا ذکر شعراء نے اکثر کیا ہے (دیکھیے صدّیقی : ص ۸۴؛ مبرّد : کامل، ص ۲۳۹ ببعد جس میں تاج کو یمن کی خصوصیت بتایا گیا ہے۔ ممکن ہے یمن اور اہل حبشہ کے پرانے تعلقات کی یاد اس میں مضمر ہو۔ اہل حبشہ کے تاج کے متعلق قب نولڈیکہ : *Geschichte*، ص ۲۲۵ و ۲۳۳)۔

خسرو ثانی کا مشہور تاج اس مال غنیمت میں شامل تھا، جسے عربوں نے طَیسفون سے حاصل کیا (کرسٹن سن : *L'Empire*، ص ۱۰۶)، لیکن تاج عربوں میں کچھ غیر ملکی اور نادر و غریب ہی سا رہا۔ حدیث میں آیا ہے "العَمَائِمُ تِیجَانُ العَرَبِ" "عمامے عربوں کے تاج ہیں" یعنی لسان العرب [۱۵ : ۳۲۰] وغیرہ کی عام تشریح کے مطابق "عمامے بھی عربوں کے لیے ایسے ہیں جیسے بادشاہوں کے لیے تاج،" کیونکہ عام طور پر بدوی ننگے سر ہوتے ہیں یا قَلانس (ٹوپیاں قب مادۂ قَلَنْسُوَة) پہنتے ہیں؛ عمامے ان کے ہاں کم مستعمل ہیں۔

اسلام میں کسی طرح کا باقاعدہ شاہی تاج یا رسم تاجپوشی نہیں ہے جسے اہل مغرب کی طرح شاہی اقتدار کی علامت سمجھا جاتا ہو۔ جب تاجوں کا کہیں ذکر آتا ہے تو مراد غیرملکی بادشاہوں مثلاً اکاسرہ یا قیاصرہ وغیرہ ہی سے ہوا کرتی ہے۔ 'تاجُ البابا' سے پوپ کی مثلّث کلاہ مراد ہے۔ 'تاجُ الاسقف' بشپ یا لاٹ پادری کی بُرطُل یعنی وہ ٹوپی جس کی چوٹی پر گھرا کٹاؤ ہوتا ہے، البتہ صرف 'تاجُ الخلافۃ' سے ہمارا ذہن بادی‌الرأے میں کسی مسلم بادشاہ کے تاج کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ خلیفہ کا یہ تاج جو 'الآلاتُ الملوکیۃ' یعنی بادشاہت کی علامات میں شامل سمجھا جاتا ہے، اس کا ذکر عباسی دور سے پہلے کہیں نہیں ملتا اور کہا گیا ہے کہ اس خاندان نے قصداً خلفاے راشدین[رض] اور بنوامیہ کے معمول کے خلاف ایرانی روایات کی تقلید کی (نولڈیکہ : *Geschichte*، ص ۴۵۳)۔ خلیفہ یہ تاج اعیاد کے مواکب میں پہنا کرتا تھا۔ قلقشندی (۳ : ۴۷۲ و ۴۸۳ - ویسٹنفلٹ، *Calcaschandi*، ص ۱۷۲ و ۱۸۲) مصر کے فاطمی خلیفہ کے تاج کا حال بیان کرتا ہے، اس کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہ باقاعدہ تاج نہ تھا، بلکہ ایک عمّامہ تھا جس میں افراط سے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ ان جواہرات میں سے ایک بہت ہی بڑا تھا جسے 'الیتیمۃ' کہتے تھے، اس کا وزن سات درہم تھا۔

عمامے کا رنگ فاطمیوں کے شعار کے مطابق سفید تھا اور اس کی صحیح بندش (''شدّ التاج الشریف'') کے لیے ایک خاص عہدہ دار ('شادّ' بعد کے زمانے میں 'لفّاف') کو مقرر کرتے تھے (قب Inostrancev: *The ceremonial procession of the Fāṭimid Caliphs*، بزبان روسی، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۵ء، ص ۳۶؛ ابن الصَّیْرَفی : قانون دیوان الرسائل، طبع بہجة، ص ۲۷ س ۱) ــــ حفصی سلطان بھی اپنے 'مواکب' کے موقع پر تاج پہنا کرتا تھا (قب ابن فضل اللہ : مسالک الأبصار، اقتباس: وصف أفریقیه و الأندلس، طبع حسن حسنی عبدالوهاب، تونس (حدود ۱۹۲۲ء) ص ۳۲، عدد ۲).

جیسا کہ اکثر اوقات صراحةً مذکور ہے ان خلعت ہاے فاخرہ میں جو خلیفہ یا سلطان والیوں اور سفیروں وغیرہ کو بھیجا کرتے تھے، عام طور پر ایک 'تاج' بھی شامل ہوا کرتا تھا، چنانچہ قلقشندی (ج ۸ : ص ۳۰۷ ببعد) لکھتا ہے کہ تخت نشینی کے موقع پر خلیفہ نے خلعت، تلوار وغیرہ کے ساتھ ایک تاج مُذَہّب (''التاج المرصّع''، قب نیز ویسٹنفلٹ : *Statthalter*، ۳ : ۳۸) امیرالامراء کو بھجوایا ـ عہد مملوك کے امیروں کے شعاروں (نشانہاے خانوادگی arms) پر اس قسم کا تاج بھی امتیازی نشان کے طور پر ملتا ہے.

سلاطین عثمانیه کے لباس سر کو بھی تاج ہی کہا کرتے تھے، یہاں تک کہ عثمان اول کے متعلق بھی مشہور ہے کہ اس نے 'تاج خراسانی' زیب سر کیا (ڈوساں (d'Ohsson) ۲ : ۱۳۰) ـ فاتح قسطنطنیه کی جو تصاویر بلینی (Bellini) نے بنائیں ان سے ہمیں یقینی طور پر اس کے لباس سر کا پته چلتا ہے ـ وہ ایک بڑا عمامه اور تاج پہنے ہوتا ہے، اس عمامے کی اندرونی کلاہ مقطوع الرأس محروطه ہے جس کا رنگ عموماً سرخ ہے اور جو موج دار (بخیه دوز؟) ہے ـ اس کلاہ کے گرد باریک کپڑے کا اصل عمامه (''صاریق'') لپٹا ہوتا ہے ـ فاتح کے عمامے کا نمونه جو اس کی تصویروں میں ہے تمغوں پر بھی کنده ہے ـ جب ہم ایک تمغے کی پشت پر تین رسمی تاج دیکھتے ہیں جن کے بارے میں یه یقین کیا جاتا ہے که ان سے ولایت ہاے ایشیا، یونان اور طرابزون مراد ہیں جو متحده طور پر حکومت عثمانیه کے زیرنگین تھیں، تو یه بات غالباً واضح ہوتی ہے که اس تمغے کی تجویز و تکمیل کسی یورپی ماہر فن ہی نے کی ہو گی (قب ہل (G. F. Hill در *Numismatic Chronicle*، ۱۹۲۶ء، ص ۲۸۷ تا ۲۹۸ اور لوحه xiv) ـ کاراباسک (Karabacek) سلاطین عثمانیه کے تاجوں کے متعلق پوری تفصیل دیتا ہے ـ اس کے نزدیک ایرانی ترکی تاج عربی بولنے والے ملکوں کے طُرطُور سے ملتا ہے جو ایک اونچی ٹوپی ہے جس کی تصویر بہت ہی ابتدائی زمانے یعنی ساتویں صدی میلادی کے ایک ورقِ بردی پر ملتی ہے اور جس کی وضع قطع مرور زمانه سے بدلتی رہی ـ انہیں ان زنانی ٹوپیوں ''ہِنین'' (hen [n] in) سے بہت مشابہت ہے جو چودھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک فرانس اور ہسپانیه کی خواتین استعمال کرتی رہیں ـ کاراباسک کا خیال ہے که یه ٹوپی (اپنے عربی نام حَنِینی سمیت) براہ راست مشرق سے آئی ـ اس لباس سر کے خاص خاص نمونے آج بھی عورتوں میں مروج ہیں؛ مثلاً لبنان کے دُرزیوں (Druses) کے ہاں اور الجزائر اور تونس میں ـ موجوده زمانے کے مصر میں 'قُرص' کا استعمال عورتوں کے لباس سر کی حیثیت سے جو وجود میں آیا ہے، وہ بھی اسی کی ترقی یافته صورت ہے ـ قرص رکابی کی شکل کی آرائشی چیز ہے جو سونے اور جواہرات سے بنائی جاتی ہے، اسے اونچی سی ٹوپی کے چندوے پر سی دیتے ہیں اور بعض اوقات اس کا وزن خاصه ہوتا ہے ـ یه قرص عورت کے جنازے کے 'شاہد' یا بالائی حصے پر

رکھ دیا جاتا ہے، جیسے مرد کی میّت پر عمامہ۔ (قبّ لین (Lane): *Manners and Customs of the Modern Egyptians*، ضمیمۂ الف؛ لین: *Arabian Society in the Middle Ages*، ص۲۱۸ و ۲۳۴)۔ دلھنوں کے لیے ایک خاص قسم کے تاج کا استعمال جو دنیا بھر میں رائج ہے، کبھی کبھی کہیں کہیں عالم اسلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ (لین: *The Thousand and One Nights*، ۱ : ۴۲۴؛ لاگارڈ (Lagarde): ...... *Arabes mitrati, Nachrichten Göttingen*، ۱۸۹۱ء، ص ۱۶۰ ببعد؛ اور مشہور کتاب تاج العروس کا نام بھی اسی پر شاھد ہے، مشرق ترکستان کے لیے قبّ براکلمان در *Asia Major*، ۲ : ۱۲۲).

درویشوں میں لباس سر کی حیثیت سے 'تاج' کو خاص مذہبی اہمیت دی گئی ہے۔ تاج کا پہننا ''شدّ'' [بذیل مادّہ] کا ایک ضروری جزء قرار دیا گیا ہے۔ درویشوں کے ہر طریقے کا تاج امتیازی نمونے اور رنگ کا ہوتا ہے۔ اس میں اکثر اوقات بارہ اماموں کی نسبت سے بارہ قطعے (تـرك) ہوتے ہیں، بعض میں نو، سات وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ ان کے بیشمار نام اور بہت سی کنائی تعبیریں ہیں (دیکھیے احمد رفعت: مرآۃ المقاصد، استانبول ۱۲۹۳ء، ص۲۱۲ تا ۲۱۵؛ براؤن: *The Dervishes*، ص۱۴۸ ببعد؛ تصاویر در دوسان، ۲ : ۲۹۷؛ ایک بڑا رنگین نقشہ بھی ہے جس میں چودہ نہایت اہم درویشی طریقوں کی تفصیل دی ہے۔ اس میں ان کے تاجوں کی تصاویر اور ان کے بانیوں کے سلسلے بھی درج ہیں۔ یہ نقشہ استانبول میں محمودبک کے پریس میں چھپا اور ضیاءبک کے ''صنائع نفیسہ رسِم خانہ سی'' کی طرف سے ۱۵ شعبان ۱۳۱۴ھ کو شائع ہوا)۔ ایران میں شیخ حیدر (بذیل مادّہ، 'تاج حیدری' اسی سے ماخوذ ہے) اور شاہ اسمٰعیل [رکّ بآن] کے عہد میں ہمیں صوفی 'تاج' کا ذکر ملتا ہے، جو بادشاہ، درباریوں، فوج اور دیگر عہدہداران سرکار کا لباس سر تھا اور جو خاص رسوم کے ساتھ عطا ہوا کرتا تھا، لیکن غالباً اس کا رواج ان دونوں کے زمانے سے پہلے بھی تھا۔ (دیکھیے کاراباسک: کتاب مذکور، ص۸۷؛ بابنگر (Babinger): *Islām*، ۱۱ : ۸۴، ۱ سطر؛ قزلباش کے موضوع پر).

'تاج' کا لفظ مجازاً بھی کئی طرح استعمال ہوا ہے۔ متأخر دوروں میں اس لفظ کا استعمال القاب میں بہت عام ہے۔ اس قسم کے القاب جس قدر عہد ممالیک میں مقبول تھے، غالباً اور کسی دور میں نہ تھے۔ اول اول تو معمولی سادہ لقب پر اکتفا کیا جاتا تھا، جیسے سپاہیوں کے لیے ''تاج الدین'' (قَلْقَشَنْدِی، ۵ : ۴۸۸)؛ یا عیسائی کاتبوں کے لیے ''تاج الدولہ'' (قَلْقَشَنْدِی، ۵ : ۴۸۷)، پھر دھرے القاب شروع ہوے؛ مثلاً ''عَضُدالدولة و تاج المِلّة'' (۵ : ۴۹۲)، ''تاج العلماء و الحُکّام'' قاضیوں کے لیے (۶ : ۱۴ ببعد) وغیرہ وغیرہ۔ غیرمسلم بادشاہوں کے لیے ''بَقِیّة أبْنَاء التُخُوت و التِیْجان'' (۶ : ۸۵)، ''مُخَوِّل التُخُوت و التِیْجان'' (۶ : ۱۷۵) اور ''وَارِث الأسِرّة و التِیْجان'' (۶ : ۱۷۷) کی طرح کے القاب استعمال ہوتے تھے۔ کتابوں کے ناموں میں تاج کا لفظ مضاف الیہ کے ساتھ استعمال کرنے کی رسم جس کی بےشمار مثالیں ملتی ہیں۔ شاید انھیں القاب کی تقلید میں شروع ہوئی۔

علم ہیئت میں ''تاج سَعْدان'' سے مراد زحل ہے اور ''تاج الجبّار'' سے ایک ستارہ جو کوکبۃ الجبار کے قریب ہے، ''تاج عُمود'' سرستون کو کہتے ہیں (دیکھیے زارے وھیرتس فیلٹ (Sarre-Herzfeld): *Archaeol. Reise*، ۲ : ۱۸۵)۔ مرغ اور اسی قسم کے دوسرے پرندوں کی کلغی کو بھی تاج کہتے ہیں۔ عربی زبان میں دریاے Tagus کا نام تاج ہے [کذا۔ مگر معجم البلدان اور نفح الطیب میں دریا کا نام ''تاجُہ'' دیا ہے، البتہ

سامی بک :قاموس الاعلام میں تاج ہے۔ ادارہ]—خلفاے بغداد کے ایک مشہور محل کا نام 'قصرالتاج' تھا ۔ یہ محل خلفاے معتضد و مکتفی کے زمانے میں [قصر کامل اور۔ ادارہ] مدائن کے قصر [ابیض کسروی ۔ ادارہ] کے بقایا سے تیار ہوا تھا اور دنیا کے سات عجائبات میں سے شمار ہوتا تھا، المقتفی کے زمانے میں بجلی گرنے سے جل گیا (۵۴۹ھ)، اسی کے عہد میں دوبارہ تعمیر ہوا لیکن پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا اور المستضیء کے زمانے میں بالکل تباہ کر دیا گیا (۵۷۴ھ)۔ [اور اس کے مسالے سے ایک نیا محل تعمیر کیا گیا ، جسے یاقوت کے زمانے میں التاج کہتے تھے۔ ادارہ] (یاقوت، ۱ : ۸۰۶ تا ۸۰۹ ترجمہ در *Z.D.M.G.*، ۱۸ : ۳۰۳ تا ۳۰۶)؛ ساسی (Sacy) : *Chrestomathie*، ۱ : ۷۴ ؛ کریمر (v. Kremer) : *Kulturgeschichte*، ۲ : ۵۴ (زارے و ہیرتس فیلٹ : ۱ : ۹۲؛ ۲ : ۶۳ و ۱۳۸)۔ قاہرہ میں خلفاء کے تفرج خانوں '(مَناظِر)' میں سے ایک کا نام 'مَنْظَرَۃ التاج' تھا، جسے بدرالجمالی [رکّ بآن] نے تعمیر کیا، مگر مَقْریزی کے زمانے میں برباد ہو چکا تھا ۔ (المَقْریزی، ۱ : ۴۸۱؛ ۲ : ۱۲۹؛ یاقوت، ملحق، ۵ : ۱۵؛ ساسی : *Chrestomathie*، ۱ : ۲۲۴ و ۲۲۸)۔

مآخذ: متن میں خاص حوالہ جات کا ذکر آیا ہے ان کے علاوہ قب عام طور پر (۱) ڈوزی (Dozy): *Dictonnaire des vêtements* ، بذیل کلمۂ تاج؛ (۲) ہیسٹنگز (Hastings) : *Encyclopaedia of Religion and Ethics* بذیل مادہ *'Crown'* ؛ (۳) کاراباسک : *Abendländische Künstler in Konstantinopel im* **15. u. 16.** *Jahrhundert*, **I.** *Italienische Künstler am Hofe Muhammeds II. des Eroberers* **1451—1481**, *Denkshriften d. k. Akad. d. Wiss. Wien*, **lxii**، جلد ۱، ۱۹۱۸ء۔

(W. BJÖRKMAN)

تاج الدولہ رکّ بہ تُتُش.

تاج الدین رکّ بہ السُّبکی.

تاج الدین بن زکریا بن سلطان العثمانی (القرشی) العَبْشَمی النقشبندی الحنفی السنبھلی مہاجر مکہ ۔ آپ شہر سنبھل (ضلع مراد آباد، علاقۂ روہیل کھنڈ) میں پیدا ہوے، وہیں آپ کی نشو و نما ہوئی، وہیں تعلیم حاصل کی، پھر شیخ طریقت کی تلاش میں بہت سے شہروں مثلاً اجمیر (مزار حضرت خواجہؒ پر) اور ناگور (مزار شیخ حمیدالدین ناگوریؒ [الصوفی، السوالی م ۶۷۳ھ] پر) اور دیگر مقامات پر گئے اور وہیں مدت تک ذکر میں مشغول رہے۔ اس کے بعد پھر طلب شیخ کامل میں نکل کھڑے ہوے ، بالآخر شیخ اللہ بخش شطّاری گڈھ مکتیسریؒ کی خدمت میں پہنچے.

جناب شیخ کا یہ دستور تھا کہ تعلیم طریقت دینے سے پہلے خدمات و ریاضات شاقہ سے آزما لیتے تھے اور ایسی خدمت لیتے تھے جس سے نفس کو شکستگی اور تزکیہ حاصل ہو جائے، چنانچہ شیخ تاج الدین کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ باورچی خانے کے لیے لکڑی لائیں اور پانی بھرا کریں ۔ تین مہینے کے بعد حضرت گڈھ مکتیسریؒ نے ان کو طریقۂ عشقیہ (شطّاریہ) کی تلقین کی ۔ یہ مرشد کے پاس رہ کر اس طریقے کے اشغال میں مشغول رہے، حتّٰی کہ درجۂ تکمیل کو پہنچ گئے اور مرشد نے انھیں عشقیہ، قادریہ، چشتیہ اور مداریہ طریقے کی اجازت مرحمت فرمائی ۔ تاج الدین دس سال تک شیخ اللہ بخشؒ کی خدمت اقدس میں رہے [اسی طرح شیخ نجم الدین کبریؒ کی روحانیت سے انھیں طریقۂ کبرویہ کی اجازت ملی ۔ نزھۃ ۔ ادارہ] .

حضرت خواجہ محمد باقیؒ دھلوی جب ابتداے سلوک میں پہلی مرتبہ ہندوستان آئے تھے ، اس وقت

شیخ تاج‌الدین کی ملاقات ان سے ہو گئی تھی۔
جب خواجہ صاحب دوسری مرتبہ لاہور آئے تو شیخ اللہ بخش گڈھ مکتیسری کا انتقال ہو چکا تھا۔ خواجہ‌صاحب نے شیخ تاج‌الدین کو بلوا کر تین دن میں سلسلۂ نقشبندیہ کا تمام سلوک طے کرا دیا اور مرید کرنے کی اجازت بھی اپنی طرف سے مرحمت فرما دی۔ آپ دس سال تک حضرت خواجہ کی صحبت میں رہے۔

۱۰۱۲ھ میں خواجہ کی وفات کے بعد جناب شیخ نے بلاد ہند، عراق اور عرب کی سیاحت کی، آخر میں مکۂ معظمہ میں اقامت گزین ہو گئے۔

ابن فضل‌اللہ محمد المحبّی نے خلاصۃ الأثر، قاهرة ۱۲۸۴ھ، (۱ : ۴۶۴) میں آپ کے ترجمے میں بعض اکابر وقت کے نام لکھے ہیں، جنھوں نے آپ سے فیض حاصل کیا ہے۔

آپ سے فیض پانے والے ہزاروں مریدوں میں سے چند کے اسماء یہ ہیں: (۱) استاد احمد ابوالوفاء، (۲) شیخ محمد مرزا بن محمد المعروف السروجی الدمشقی، (۳) امیر یحیی بن علی پاشا، (۴) شیخ عبدالباقی بن الزجاجی الزبیدی، (۵) شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالرحمٰن الحضرمی العیدروسی، (۶) شیخ محمد علّان، (۷) شیخ ابراهیم بن حسن الحنفی الأحسائی، (۸) شیخ ابوبکر بن سعید بن ابی‌بکر الحضرمی، (۹) شیخ عبیداللہ بن محمد باقی الدهلوی (المعروف به خواجۂ خُرد)، (۱۰) سید محمود بن اشرف الحسینی الامروهی (آپ کے مرید اور داماد) جنھوں نے آپ کے سوانح حیات قلمبند کیے۔

جناب شیخ کی تالیفات محبّی کی رو سے حسب ذیل ہیں:

(۱) نفحات‌الأنس جامی کا عربی ترجمہ [دیکھیے کشف‌الظنون، طبع اول، استانبول، ۲ : ۶۰۹؛ کتاب کے نسخوں کے لیے دیکھیے تکملہ براکلمان، ۲ : ۲۸۶، ایک نسخہ کتاب خانۂ رام پور میں بھی ہے ـ ادارہ]؛ (۲) تعریب رشحات‌عین الحیاۃ از علی بن حسین الواعظ الکاشفی (رشحات کا عربی ترجمہ)؛ (۳) رسالۂ طریقۂ نقشبندیہ، اس میں حضرت خواجہ عبدالخالق غُجْدُوانی کے کلمات مشہورہ کی بہترین شرح کی ہے؛ (۴) الصراط المستقیم؛ (۵) النفحات الالٰهیه فی موعظۃ النفس الزکیۃ؛ (۶) جامع‌الفوائد؛ (۷) ایک رسالہ جس میں رنگ برنگ کے کھانے پکانے کی ترکیبیں ہیں؛ (۸) ایک رسالہ جس میں درختوں کے نصب کرنے کا طریقہ دیا ہے؛ (۹) رسالہ در باب انواع طب؛ [(۱۰) رسالۃ فی بیان سلوک الکبرویۃ، (محبی، ۱ : ۴۶۹، نزهۃ ۵ : ۹۹)؛ ایک رسالہ جس کا نام تکملۂ براکلمان ۲ : ۶۱۸ میں رسالۃ فی سلوک خاصۃ السادۃ دیا ہے، شاید مذکورۂ بالا رسالوں ہی میں سے کوئی ہو ـ ادارہ]؛ (۱۱) [آداب‌المریدین، تکملۂ براکلمان محل مذکور ـ ادارہ].

شیخ تاج‌الدین سنبھلی اپنے وقت کے شیخ حرم تھے۔ حجاز میں کثیرالتعداد اشخاص آپ کی صحبت میں رہ کر نسبت نقشبندیہ سے مستفیض ہوے۔ آپ صاحب تصانیف عالیہ تھے۔ آپ نے چہارشنبے کے دن مغرب سے کچھ پہلے ۱۸ جُمادی‌الأولی ۱۰۵۰ھ کو انتقال فرمایا [خلاصۃ الأثر، ۱ : ۴۷۰ ـ ادارہ] اور جمعرات کے دن ۱۹ جُمادی‌الأولی کو، حرم مکۂ معظمہ میں اس رباط کے اندر جسے خود بنایا تھا، مدفون ہوے، مگر شیخ کے ہموطن مصنف اسراریۃ نے سال وفات ۱۰۵۱ھ دیا ہے۔ یہ قبر جبل قُعَیقعان کے پاس ہے، شاہ ولی اللہ نے آپ کی قبر کی زیارت کی (مکتوبات مع مناقب بخاری و فضیلت ابن تیمیۃ، مطبع احمدی دهلی، ص ۳۰)؛

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی‌ؒ نے اپنے چند مکتوبات میں آپ کا ذکر کیا ہے ۔ ایک میں فرماتے ہیں کہ شیخ تاج الدین سنبھلیؒ حضرت خواجہ محمد باقیؒ کے پہلے خلیفہ تھے ، آخر میں [اپنے پیر کے وصال کے بعد] مکۂ معظمہ میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں سپرد خاک ہوئے ۔ میں نے اہل مکہ کو متاخرین مشایخ ہند میں کسی کا اتنا معتقد نہیں پایا جتنے وہ شیخ تاج الدینؒ کے معتقد ہیں ؛ مکے والے ان کی بہت سی کرامات بیان کرتے ہیں ۔ (ترجمۂ اقتباس از مکتوب شاہ ولی اللہؒ در رود کوثر مؤلفۂ شیخ محمد اکرام، طبع کراچی، بدون تاریخ طباعت، ص ۴۰۵) ۔

ایک دوسرے مکتوب میں ہے : شیخ تاج الدین سنبھلی الوطن اور عثمانی النسب ہیں ، شیخ احمد سرہندیؒ کے پیر بھائی اور خواجہ محمد باقی دہلویؒ کے خلفاء میں سے ہیں ۔ اذکار نقشبندیۃ جو شیخ علیہ الرحمۃ نے لکھے ہیں میں نے اپنے والد ماجد (حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ) سے پڑھے ، انھوں نے خواجہ خُردؒ سے اور خواجہ خُردؒ نے انہیں براہ راست شیخ تاج الدینؒ سے اخذ کیا ۔ سلطان روم نے غائبانہ ان سے حسن عقیدت کا اظہار کیا [مکتوبات مع مناقب بخاری، محل مذکور] ۔

الانتباہ فی سلاسل أولیاء اللہ (احمدی، دہلی ۱۳۱۱ھ ، ص ۳۴) میں بھی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آپ کا ذکر کیا ہے اور آپ کا ایک پورا رسالہ (جو تصوف میں ہے اور جسے حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے والد ماجد سے سبقاً سبقاً پڑھا ہے) مِن و عَن درج کر دیا ہے ۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں ایک مکتوب شیخ تاج الدینؒ کے نام بھی ہے (مکتوبات امام ربانی ، ۱ : ۳۰۶ ، مطبع احمدی، دہلی) ۔

علامہ سید مرتضی البلگرامی ثم الزبیدی شارح قاموس نے النفحۃ القدسیۃ میں شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ نے بصرے، یمن، احساء، نجد اور حجاز میں طریقۂ نقشبندیہ کو پھیلایا اور ان علاقوں میں ان کے مریدوں کی بہت بڑی تعداد تھی (رود کوثر، کراچی، ص ۴۰۵) ۔

مولانا کشمیؒ نے اپنے ایک دوست صالح نامی کی زبانی بیان کیا ہے کہ اس نے ۱۰۳۷ھ کے حج میں عرفات کے میدان میں شیخ تاج الدینؒ کی زیارت کی تھی ۔ ان کا حال یہ تھا کہ زیادہ عرصہ ہو جانے کی وجہ سے احرام نہایت مبلا تھا، چہرہ غبار آلود تھا، بالوں میں ژولیدگی نمودار تھی، ڈاڑھی سفید تھی، آنکھیں سفر کی مشقت بلکہ بادۂ معرفت کی سرشاری کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں ۔ میں انھیں دیکھ کر بہت متاثر ہوا (خواجہ محمد ہاشم کشمی : المقامات، ص ۷۷، مطبوعۂ محمود پریس، لکھنئو) ۔

ایک روایت کے مطابق شاہجہان بادشاہ نے شیخ تاج الدینؒ کو لکھا کہ مکۂ معظمہ سے آ کر اپنے دیدار سے مشرف فرمائیے ۔ شیخ نے جواب میں لکھا کہ بادشاہوں کا دستور ہے کہ بیت اللہ شریف میں اپنے وکلاء مقرر کرتے ہیں، میں آپ کی طرف سے یہاں وکیل کی حیثیت سے رہوں گا ۔

آپ کے صاحبزادے کا نام محمد حارث تھا جنھوں نے ۱۰۵۱ھ میں باپ سے پانچ روز پہلے مکۂ معظمہ میں انتقال کیا ۔ دوسرے صاحبزادے کا نام محمد معاذ تھا ۔ یہ ۱۰۶۰ھ میں ہندوستان آئے اور شاہجہان کی خدمت میں تبرکات مکہ پیش کیے ۔ بادشاہ بہت خوش ہوا (اسراریۃ، ورق ۲۱۴ ب و ۲۱۵ الف، نسخۂ خطی رام پور) ۔

مآخذ : [علاوہ مندرجۂ متن کتابوں کے ملاحظہ ہوں : (۱) سید محمود بن اشرف الحسنی الامروہی : تحفۃ السالکین فی ذکر تاج العارفین (شیخ کا مفرد ترجمہ جو اب نہایت کمیاب ہے)؛ (۲) حکیم عبدالحی : نزہۃ الخواطر، طبع حیدر آباد دکن، ج ۵ (۱۳۷۵ھ) : ۹۹؛ (۳) براکلمان : G.A.L. ۲ : ۵۰۲؛ تکملۂ براکلمان ۲ : ۶۱۸ و ۲۸۶؛ (۴) سٹوری : ص۹۵۶ و ۹۶۵؛ سید محمد کمال بن سید محمد لعل سنبھلی : اسراریہ، قلمی نسخہ کتاب خانۂ رام پور میں ہے - مطبوعہ فہرست میں درج نہیں۔ اس پر سنہ تالیف ۱۰۶۸ھ و ۱۰۶۹ھ درج ہے مگر اس میں ۱۰۷۴ھ تک کے واقعات ہیں - اقتباسات، جو غالباً اسراریہ کے اسی نسخے سے لیے گئے ہیں، مقالہ نگار کے پاس ہیں جن میں امروہے کے بزرگوں کا حال دیا ہے - ادارہ].

(نسیم احمد فریدی امروہی)

تاج محل : شہنشاہ شاہجہان [رک بان] نے اپنی چہیتی بیوی ارجمند بانو بیگم کے لیے یہ خوبصورت مقبرہ آگرے کے مقام پر بنوایا تھا - 'تاج محل' بیگم کے لقب 'ممتاز محل' کی تحریف ہے - وہ ملکۂ نور جہاں [رک بان] کے بھائی آصف خان کی بیٹی تھی - [تقریباً بیس] برس کی عمر میں اس کی شادی [۹ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ/] ۱۰ مئی ۱۶۱۲ء کو شاہجہان سے ہوئی - اس سے چودہ اولادیں ہوئیں - ایک لڑکی کی پیدائش کے بعد حالت زچگی میں [۱۷ ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ] جون ۱۶۳۱ء کو برہان پور میں فوت ہو گئی - [باغ] زین آباد نواح برہان پور میں اسے امانۃً دفن کر دیا گیا، لیکن شاہجہان نے جسے اس کی موت سے شدید قلق ہوا یہ عہد کیا کہ وہ اس کی شان کے مطابق مقبرہ تیار کرا کے باہمی محبت کی یاد کو زندۂ جاوید کر دے گا، اس لیے اس کی میت آگرے میں لائی گئی جہاں راجہ جے سنگھ سے ایک قطعۂ زمین حاصل کر کے اسے دوبارہ امانۃً دفن کیا گیا۔ اور اسی موقع پر مقبرۂ تاج [بصرف پنجاہ لک روپیہ - عمل صالح] تعمیر ہوا - اس مقبرے کی تعمیر اپنی ملحقہ عمارتوں کے ساتھ بائیس برس سے زیادہ مدت [قب عمل صالح ۱ : ۴۰۲] تک جاری رہی اگرچہ اس مدت میں بیس ہزار کاریگر لگاتار کام کرتے رہے۔ ملک بھر کے بہترین مہندسان معماری اور ماہرین عمارت کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں نقشے پیش ہوئے، جو نقشہ بالآخر منظور ہوا وہ استاد عیسلی کا تھا، جو ترکی یا شیراز کا باشندہ تھا۔ اطالوی آباء اغسطینیہ (Augustinian) کے ایک فرد آب منریق (Father Manrique) کی اس روایت کی تصدیق کہ اس کا میرعمارت شہر وینس کا ایک باشندہ جیرونیمو ویرونیو (Geronimo Veroneo) نامی تھا، نہ تو مقامی تاریخوں سے ہوتی ہے، نہ اس کا ذکر ٹاوَرنیہ (Tavernier) برنیہ (Bernier) تیونو (Thévenot) کے سفر ناموں میں ہے - ان سیاحوں کی رائے میں یہ عمارت خالصۃً مشرق ہے اس کے علاوہ یہ بات کچھ قرین قیاس بھی معلوم نہیں ہوتی - مقبرہ جو جودھ پوری سنگ مرمر سے تیار ہوا، ایک اونچے چبوترے پر قائم ہے جو ۱۸ فٹ اونچا اور ۳۱۳ فٹ مربع ہے اور اس کی روکار بھی سنگ مرمر کی ہے - اس کے ہر کونے پر ایک نہایت خوبصورت تناسب کا منار ہے جو ۱۳۳ فٹ بلند ہے اور جس کے اردگرد تین چھجے ہیں اور چوٹی پر ایک کھلی قبہ‌دار چھتری - اس چبوترے کے عین وسط میں مقبرہ ہے "جو ۱۸۶ فٹ مربع ہے جس کے کونے ۳۳ فٹ ۹ انچ کی گہرائی تک تراش دیے گئے ہیں - عمارت مقبرے کی روکار کی بلندی چبوترے سے ۹۲ فٹ ۳ انچ تک پہنچی ہے - مقبرے کے وسط میں سب سے بڑا گنبد ہے جس کا قطر ۵۸ فٹ ہے اور جو چھت سے ۷۴ فٹ یعنی چبوترے سے ۱۹۱ فٹ بلند ہے" - عمارت کے ہر رخ (واجہہ) پر بلند محراب‌دار رواق ہے اور ہر رخ پر ایک چھوٹا سا دو منزلہ نشیمن ہے، جس پر قبہ‌دار چھتری ہے اور ہر

رواق میں باہر والے تین رخوں میں چھے محراب‌دار طاق ہیں، جو دو منزلوں میں منقسم ہیں اور جن سے جالی‌دار کھڑکیوں میں روشنی آتی ہے ۔ ان طاقوں اور بڑے رواقوں پر محرابی چھتیں ہیں ۔ گنبد کے نیچے عین وسط میں ممتاز محل کی قبر کا تعویذ ہے اور اس کے پہلو میں شاھجہان کی قبر کا ۔ دونوں تعویذ کتبوں سے مزین ہیں ۔ ان کے عین نیچے تہخانے میں، جو زمین کی سطح کے برابر ہے، اصلی قبریں ہیں جن پر نقش و نگار تعویذوں کی نسبت کم ہیں ؛ تعویذوں والے مرقدوں کے ارد گرد سفید سنگ مرمر کا باریک جالی دار پردہ (محجّر) ہے ''جو ھندی فن کاری کا لطیف ترین شاھکار ہے'' ۔ رواقوں کے ارد گرد عربی خط کے آرائشی کتبے ہیں اور ساری عمارت کی خوبصورتی کو پچی کاری کی مفرط اور دلآویز آرائش سے چار چاند لگ گئے ہیں ۔ تمام سنبوسکوں (spandrels)، زاویوں اور اھم تعمیری جزئیات کو قیمتی پتھروں مثلاً سنگ یمانی(agate)، یشب، مرجان، حجرالدم اور عقیق سلیمانی (cornelian) وغیرہ سے مرصع کیا گیا ہے اور ان قیمتی پتھروں کو باہم ترکیب دے کر ایسے سہرے، پیچکیں اور کنگریاں بنائی گئی ہیں جن کا نقشہ ایسا ھی لاجواب ہے جیسے ان کے رنگ دلفریب ہیں ۔ روشنی ''صرف سفید سنگ مرمر کے دھرے باریک جالی دار پردوں'' کے ذریعے اندر آتی ہے ۔ ''جالی کا کام بےحد نازک اور نفیس شکل کا ہے ۔ ایک جالی دیوار کے بیرونی اور ایک اندرونی طرف ہے''۔ مقبرے اور اس کے چبوترے سے پرے دائیں اور بائیں بازو کی عمارتیں ہیں جن میں سے ایک نہایت خوبصورت مسجد ہے ۔ ''ان عمارتوں کے مجموعے سے باغ کے صحن کا ایک پہلو ترکیب پاتا ہے ۔ یہ صحن ۸۸۰ فٹ مربع ہے اور اس سے پرے بیرونی صحن ہے جس کی چوڑائی تو اتنی ھی ہے، لیکن اس کی لمبائی (depth) اس سے نصف کے قریب ہے''۔ فنون لطیفہ کے بعض مدعیوں نے تاج محل کی عمارت کو یونانی اور قُوطی فن معماری کے اصول کی رو سے جانچنے کی کوشش کی ہے، مگر حقیقت میں انھوں نے فن کا منہ چڑایا ہے ۔ فرگوسن (Fergusson) نے سچ کہا ہے کہ ''اتنے محاسن کے اجتماع نے اور اس اسلوب کامل نے، جس سے ایک خوبی کو دوسری خوبی کے تابع رکھا گیا ہے، ایسی مکمل چیز پیدا کر دی ہے جس کا جواب دنیا میں نہیں مل سکتا''۔

مآخذ : (۱) عبدالحمید لاھوری : بادشاہ نامہ، کلکتہ ۱۸۶۷ء [۱/۱ : ۳۸۳، عمل صالح ۱ : ۳۳۵] ؛ (۲) E.B. Havell : *A Handbook to Agra and the Taj*، لندن ۱۹۱۲ء ؛ (۳) محمد معین‌الدین : *The History of the Taj*، آگرہ ۱۹۰۵ء ؛ (۴) جیمس فرگوسن (James Fergusson) : *History of Indian and Eastern Architecture*، طبع James Burgess اور R. Phené Spiers، لندن ۱۹۱۰ء ؛ (۵) یول (H. Yule) اور برنل (A. C. Burnell) : *Hobson-Jobson*، طبع ولیم کروک (W.Crooke)، لندن ۱۹۰۳ء، [بذیل 'تاج'] ؛ [(۶) محمد عبداللہ چغتائی : *Le Tadj Mahal d'Agra* (مقالۂ درجۂ دکتری)، برسلز ۱۹۳۸ء ۔ ادارہ].

(T. W. Haig ھیگ)

تاج الملوک : رکّ بہ بُوری.

تاجُہ : عربی وادی تاجُہ، لاطینی : *Tagus*، ھسپانوی : *Tajo*، پرتگیزی (*Tejo*) ۔ آئبیریا کے جزیرہ نما (مشتمل بر ھسپانیہ و پرتگال) کا سب سے لمبا دریا جو کورۂ کونکہ کے پہاڑوں (Serrania de Cuenca) میں سے تقریباً ۶,۰۰۰ فٹ کی بلندی سے نکلتا ہے اور لزبن (لشبونہ) کے پاس بڑا سا دھانہ ('خَور') بنا کر سمندر میں گرتا ہے، وھاں تک اس کی کل لمبائی کوئی ۵۵۰ میل ہے (جس میں سے ۱۹۰ میل کی لمبائی پرتگال کے علاقے میں ہے

[مگر قب اینسائکلوپیڈیا بریٹانیکا، ۱۹۵۰، ۲۱ : ۷۰۳]) اس کے کنارے پر دریا کے بہاؤ کے رخ چلیں تو ذیل کے قابل ذکر مقامات ہیں : اُرَنْیش (Aranjuez)، الگُدر (Algodor)، طُلَیطلہ (Toledo) اور طَلبِیْرۃ الملکۃ (Talavera de la Reina) ہسپانیہ میں، ابرانتیس (Abrantès)، شَنْتَرِین (Santarem) اور لزبن پرتگال میں.

عرب جغرافیہ‌دان تاجہ (ٹیگس) کو ایک اہم دریا قرار دیتے ہیں اور طلیطلہ اور لزبن کے بیان میں اس کا ذکر خاص طور پر کرتے ہیں۔ وہ سنگ خارا کے مشہور رومن پل ['الداموس' - ادارہ] کا ذکر بھی کرتے ہیں، جو ۱۰۵ء میں قیصر ٹریجان (Trajan) یا ترایان نے القَنْطَرۃ کے مقام پر، جسے عرب 'قَنْطَرَۃ السَّیف' کہا کرتے تھے، تعمیر کرایا تھا قب مادۂ القنطرۃ؛ نیز دیکھیے مادۂ لزبن و طلیطلہ.

مآخذ : (۱) الاِدْرِیسی : صِفَۃ الأنْدَلُس، متن ص ۱۸۷ و ترجمہ ص ۲۲۸؛ (۲) فانیان (E. Fagnan) : *Extraits inédits relatifs au Maghreb*، الجزائر ۱۹۲۴ء، اشاریہ.

(لیوی پرووانسال E. LÉVI-PROVENÇAL)

تاجیک : پرانا تلفظ 'تازیک' و تاژیک (محمود کاشغری، ۱ : ۳۴۳ تَژِك)، ایک قوم کا نام، اس کلمے سے ابتداء میں 'عرب' مراد تھے (بعد میں اس معنی کے لیے کلمۂ 'تازی' مخصوص ہو گیا) اس کے بعد اس کا مفہوم 'ایرانی' بمقابلۂ 'ترک' ہو گیا۔ یہ لفظ عرب قبیلۂ طیؓ کے نام سے مأخوذ ہے۔ ایرانیوں سے نزدیک ترین عرب قبیلہ بنوطیؓ کا تھا، اس لیے اس قبیلے کا نام تمام عربوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ طائیوں کو "تیسری صدی کے آغاز میں ایک الرُّہاوی (Edessene) نے دیگر شرقیین (Saracens) کے ساتھ تمام بدووں کا نمایندہ لکھا ہے" Cureton : *Spicil. Syr.* ص ۱۶ سطر آخر در نولڈیکہ : *Z.D.M.G.*، ۶۹ : ۷۱۳)۔ عرب کے معنی میں اس کا مترادف لفظ پہلوی زبان میں تاچیک ہے۔ ارمنی میں تَچِک (Tačik) (قب *Grundr. d. iran. Phil*، ۱ : ۲ و ۱۸۷) اور چینی میں تشی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وسط ایشیا کے ایرانی لوگ بھی مسلمان فاتحین کو تازیک کہکر پکارا کرتے تھے۔ چونکہ یہ خیال اس وقت عام طور پر غالب تھا کہ اگر کوئی ایرانی اسلام قبول کر لیتا تو وہ بھی عرب بن جاتا (قب طَبَری، ۲ : ۱۵۰۸ سطر ۱۳)، اس لیے ترکوں کو یہ لفظ پہنچا تو اس کے معنے تھے "مسلمان" یا "دارالاسلام سے آنے والا"۔ چونکہ غیر ترک مسلمانوں میں، جن سے ترک واقف تھے، ایرانیوں کی کثرت تھی، اس لیے ترکی میں تَجِیک کے معنی ایرانی کے ہو گئے۔ محمود کاشغری (کتاب مذکور) لفظ 'تَژِیک' کی تشریح 'الفارسی' سے کرتا ہے۔ قُوتَدغُو بِلک (خاص کر ص ۸ سطر ۱) میں جو اسی زمانے میں لکھی گئی 'تجیک کو' عربوں سے متمیز کر کے، فارسی تصوّر کیا گیا ہے قب راڈلوف : *Versuch eines Wörterbuches der Türk-Dialecte*، ۳ : ۱۰۹۶)۔ اس زمانے میں خود ایرانی بھی اپنے آپ کو ترکی امراء کے مقابلے میں "تازیک" کہنے لگے تھے، قب مثلاً بَیْہَقی، طبع مورلے، ص ۶۷۴ س ۲۳، ترك اور تاجیک کے درمیان جو فرق ہے اس پر اکثر زور دیا گیا ہے، چنانچہ یہ کہا گیا کہ ترك اور تاجیک کے باھمی تعلقات کا انجام ہمیشہ خراب رہا اور کوئی تاجیک کسی ترك پر کبھی اعتماد نہیں کر سکتا (ظہیرالدین مَرْعَشی، طبع ڈورن، ص ۲۴۸ ["تازیک را ہرگز با ترك اعتماد نبود"۔ادارہ] اور ۲۰۳ ببعد. ["میان ترك و تازیک مسالک تاریک و مہالک باریک درمیان است و ہمیشہ دوستی و خویشی بعداوت و ناخوشی انجامیدہ است" ۔ ادارہ] ۔ لفظ

تاجیک کا لفظ 'سارت' سے کیا تعلق ہے۔ اس کے لیے قب مادۂ 'سارت'۔ ان دو لفظوں کے استعمال سے ایرانی قوم کی تاجرانہ اہمیت ظاہر ہے۔'سارت' کا لفظ ترکی زبان میں اول اول ایسے اسم کی حیثیت سے نظر آتا ہے، جس کے معنے سوداگر کے ہیں، بعد میں یہ کلمہ ایرانیوں کا نسلی نام ہو گیا جو زیادہ‌تر تاجروں کی قوم سمجھے جاتے تھے۔ اس کے برعکس بعد میں لفظ تاجیک (تِـزِك) کم از کم تاتاریوں کے ہاں، جو دریاے والگا (نہر اِتِل) کے کنارے آباد تھے ''سوداگر'' کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ۱۵۵۲ء میں روسیوں نے قازان فتح کیا تو اس فتح کے حالات کے ایک اصلی مأخذ (شہزادہ کربسکی کے بیان) کے مطابق قازان کے قلعے کے گرد ''تازیکوں کی خندق،، ("*tezickiy*" or "*teshickiy*" *rov*) محیط تھی اور تـزك کے لفظ کے معنے ''سوداگر'' بتائے ہیں (قب *Ist. gos. Ross.* : Karamzin، ۸ : ۱۱۰ ؛ *Očork. drevney Kazani* : Zarenskiy، ۱۸۷۷ء، ص ۸)۔

موجودہ زمانے میں 'تاجیک' کا لفظ کبھی کبھی خالص فارسیوں کے مقابلے میں مشرق ایرانیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ علاقہ جو استرآباد [رَكَ باں] اور یزد کے درمیان ہے، تاجیکوں کے مساکن کی مغربی حد سمجھی جاتی ہے۔ترکستان میں، خصوصاً ازبکوں کے عہد میں، 'تاجیک' بتدریج میدانوں سے بے دخل کر کے پہاڑوں کی طرف نکال دیے گئے ہیں۔ اہل روس ترکستان کے تمام ایرانیوں کو تاجیکوں کے ذیل میں شامل کرتے ہیں یعنی نہ صرف تاجیکی زبان والے خالص تاجیکوں کو، بلکہ پنج (قب آمودریا) کے اور بالائی زرافشان کے کوہستانیوں کو بھی، جنھیں زبان کے لحاظ سے ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ کلمۂ 'تاجیک' کے اس استعمال کے مطابق ۱۹۲۴ء میں تاجیکستان کی خود مختار جمہوریت قائم ہوئی، جس کا پاےتخت دوشنبہ ہے (جو بالائی کافر نہان پر واقع ہے)۔ اسی سال کی مردم شماری کے مطابق تاجیکوں کی تعداد ۸,۷۱,۵۳۲ تھی۔ خود تاجیک لوگ 'تاجیک' کا لفظ مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں: متعدد کوہستانی اضلاع مثلاً شُغنان اور رَوشَن کے باشندے اپنے آپ کو 'تاجیک' کہتے ہیں اور اپنے ہمسایہ دَرواز کے باشندوں کو جو تاجیکی زبان بولتے ہیں 'پارسی گوے' کہتے ہیں۔ اس کے برعکس بالائی زَرافشان کے لوگ جو فارسی زبان کی ایک بولی بولتے ہیں اپنے آپ کو 'تاجیک' کہتے ہیں اور دریاے یَغنوب کے کناروں پر بسنے والوں کو، جو ایک خالص بولی بولتے ہیں، 'غَلچہ' کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلچہ بھی اپنی 'یغنوبی' کو تاجیکوں کی زبان سے الگ سمجھتے ہیں۔

'تاجیک' کے نژادی نام کا پرانا اشتقاق (جو اب تک *Grundr.*، ۲ : ۴۰۲ میں موجود ہے اور) جس کی رُو سے کلمۂ تاجیک سر کے لباس یعنی تاج سے نکلا ہے، لسانی اور تاریخی وجوہات کی بنا پر قطعی طور پر مسترد کیا جا سکتا ہے۔

مآخذ: (۱) خانیکوف (N. de Khanikof) : *Mémoire sur l'ethnographie de la Perse*، پیرس ۱۸۶۶ء (*Recueil de voyages et de mémoires*, viii) ؛ (۲) A. Shishov : *Tadžiki. Etnografičeskoye i antropologičeskoye izslledovaniye*، تاشکنت ۱۹۱۱ء، (*Srednyaya Aziya*, God ii) ؛ (۳) بارتولد : *Tadžiki. Istoriceskiy Očerk* (*Tadžikistan*، تاشکنت ۱۹۲۵ء، ص ۹۳ تا ۱۱۲)؛ (۴) M. Andreyev : *Po ethnografii tadžikov. Nekotorïye svedeniya*، (وہی کتاب، ص ۱۰۱ تا ۱۷۸)۔

(بارتولد W. BARTHOLD)

تاجیکی : تاجیکوں کی زبان [رک بہ تاجیک]، ادبی زبان کی حیثیت سے ''تاجیکی زبان موجودہ فارسی زبان سے اپنے لکھنے یا بولنے والے کی قابلیت اور تعلیمی معیار کی نسبت سے کم یا زیادہ دور ہوتی ہے''۔ چنانچہ اس قسم کی تاجیکی زبان (جسے ایرانی ادیبوں کی فصاحت و بلاغت تو ملحوظ رہتی تھی مگر وہ ''مقامی بولی کے رنگ سے بھی عاری نہ تھی'') ازبکان بخارا [رک بآن] کے عہد حکومت میں سرکاری اور کاروباری زبان تھی اور ۱۹۲۰ء کے انقلاب کے بعد تک اس کی یہی کیفیت رہی، مگر ۱۹۲۴ء سے تاجیکی اس خودمختار جمہوریہ کی حدود تک محدود ہوگئی، جو اسی سال وہاں قائم ہوئی تھی۔ پچھلی چند صدیوں میں اس علاقے کے ایک حصے میں، جس میں تاجیکی بولی جاتی تھی، ترکی زبان نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اس کے برعکس کوہستانی علاقوں میں اس نے دوسری بولیوں (مثلاً یغنوبی) کو بیدخل کر کے اپنے رقیب کو اور وسعت دے دی ہے۔ تاجیکی کی لسانی حیثیت اور دوسری خصوصیات کے لیے قب *Grundr. d. ir. Phil.*، ج ۱/۲ : ص ۴۰۷ ببعد اور اس پر فرائی مان (A. Freiman) کے ملاحظات جو اس نے M. Andreyev کی بحث پر *Tadžikistan*، تاشکنت ۱۹۲۵ء، ص ۱۶۲ میں پیش کیے ہیں۔

(W. Barthold بارٹولڈ)

تادلا : (یا تادلا) جسے الحسن بن محمد الوزان الزیاتی (Leo Africanus) نے ''تدلہ'' *Tedle* لکھا ہے۔ مراکو کا ایک ضلع جو نہ صرف ان سطوح مرتفع پر مشتمل ہے جو مغرب کی طرف اُم الرَّبیع کی بلند وادی تک پھیلی ہوئی ہیں، بلکہ وادی العَبید سے منابع مُلُوِیَۃ Moluya تک وسطی اطلس کی مغربی ڈھلانیں بھی اس میں شامل ہیں۔ تادلا سے قدیم فصیح اسم نسبت تادلی ہے، مگر وہ اب شرفاے علاقہ کے لیے تو مستعمل ہے ورنہ متروک ہے اور بجاے اس کے مقبول عام اسم نسبت تادلاوی ہے۔

سطوح مرتفع کے علاقہ میں چھے عربی الاصل نیم خانہ بدوش قبیلے آباد ہیں۔ اُرْدِیغَۃ، بنی خَیران، بنی زُمُور، سُماعَلَۃ، بنی عامِر اور بنی موسیٰ جن کے مرکزی مقامات وادِ زم، بجد (= بجعد بجاے قدیم فصیح نام اُبوالجَعد کے) اور دار اُلد (ولد) زِیدُوح ہیں۔

بلند وادی ام الربیع (پرانی وادی وانسیفن) کے وسطی حصے میں وہ قوم آباد ہے جسے آیت ربوع کہتے ہیں۔ اس میں ایسے قبیلے شامل ہیں جو قریب قریب تمام خانہ نشین ہیں اور عربوں اور بربروں کی مخلوط نسل سے ہیں۔ ان کے نام گُطایہ (Gṭāya)، سمگت (Semget)، بنی مادان اور بنی ملال ہیں۔ ان قبائل کے دو بڑے مرکز قصبۂ تادلا اور قصبۂ بنی ملال ہیں۔

وسطی اطلس کی مغربی ڈھلانوں پر شمال سے جنوب کو آئیں تو ہمیں یہ بربر قبیلے ملتے ہیں۔ آیت سُری، آیت عَطّا، آیت بُوزید، آیت عیّاط اور آیت عتاب۔

کوہستان کے بربری لوگ زناگہ گروہ (= صَنْہاجہ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ میدانوں میں پہلے پہل زَناتہ آباد تھے یعنی وہ بربر جو بکناس اور ام الربیع کے درمیان خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کیا کرتے تھے اور لَواتَۃ (زَنارَۃ)۔ یہاں کے قدیم ترین عرب قبائل جُشَم (بنو جابر و زرارۃ) تھے، ان کے بعد خُلط آئے، یہ بنو سعد تھے جنھوں نے قوم مَعْقِل کے قبائل کو ملک میں داخل کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں تادلا میں ایسے لوگ آباد تھے جو مذہباً کم و بیش عیسائی یا یہودی تھے۔ جب ادریس ثانی نے یہ علاقہ ۱۷۲ھ (۷۸۹ء) میں فتح کر لیا تو روض القرطاس کے مصنف کے بیان کے مطابق اسے

یہاں مسلمان بہت کم ملے اور عیسائی اور یہودی بہت زیادہ۔ لیو افریقی (الحسن بن محمد الوزّان الزّیاتی) جو سولھویں صدی میلادی کے شروع میں تادْلا میں موجود تھا وھاں کی بڑی بڑی یہودی نوآبادیوں کا ذکر کرتا ھے۔ تافزة میں، جو اس زمانے میں یہاں کا پایۂ تخت تھا، کوئی دو سو گھر یہودیوں کے تھے جو سب کے سب سوداگر اور مالدار صنعت کار تھے۔ موجودہ زمانے میں بھی بجْعد اور قصبۂ بنی ملّال میں بہت سے یہودی آباد ھیں۔ قصبۂ بنی ملّال کا محل وقوع وھی ھے جو زمانۂ قدیم کے 'مدینة اُدای' کا تھا۔ مدینۃ اُدای عربی بربری مخلوط نام ھے جس کے معنی ''مدینۃالیہود'' کے معلوم ھوتے ھیں۔ تادْلا ان اضلاع میں سے تھا، جنھیں ادریس ثانی کے بیٹوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ روض القرطاس کے مصنف کے قول کے مطابق یہ شہر احمد کے حصے میں آیا، لیکن البکری کہتا ھے کہ 'دای' (Dāi) جو اس علاقے کا پایۂ تخت تھا یحیی کے قبضے میں تھا۔

تادلا کچھ عرصے کے بعد شالّہ [رکّ بان] کے بنویفْرَن (Banu Yafran) (دسویں صدی میلادی سے گیارھویں صدی میلادی تک) کی مملکت میں شامل ھو گیا۔ ۴۴۹ھ (۱۰۵۷-۱۰۵۸ء) میں جب مرابطین نے اَغمات پر قبضہ کر لیا تو وھاں کا حاکم لقّوط (Laggūt) بن یوسف مغراوی بچ کر نکل گیا اور اس نے تادلا کے بنویفرن کے ھاں جا کر پناہ لی۔ عبداللہ بن یاسین، جو مرابطین کا سردار تھا، اس کے تعاقب میں وھاں پہنچا اور یہ صوبہ بھی فتح کر لیا۔ ایک مقامی روایت ھے کہ شہرِ دای مرابطین کے سلطان یوسف بن تاشفین نے منہدم کروا کر اس کی جگہ شہر تاگرارت تعمیر کرایا، جس کے کھنڈرات اب تک اس کے قریبی نواح میں دکھائی دیتے ھیں۔ یہ واقعہ، جس کا تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا، شاید یوسف بن تاشفین کے عہد میں ھوا ھو جس نے فَزار کے (جو تادلا کے شمال میں ایک متصلہ علاقہ ھے) قلعوں پر حملہ کیا تھا۔

۵۲۶ھ (۱۱۳۱-۱۱۳۲ء) میں سلطان عبدالمؤمن الموحّدی نے تادلا پر قبضہ کر لیا اور اس وقت سے یہ صوبہ، جو فاس اور مرّاکش کی درمیانی شاھراہ پر عین وسط میں واقع تھا، رقیب خاندانوں کا میدان جنگ بن گیا۔ اس شہر کی تاریخ عبارت ھے ان خاندانوں کی باھمی آویزش اور متواتر فتنوں کی تاریخ سے، جو وھاں کے رھنے والے عرب اور بربر قبائل برپا کرتے رھے۔

۶۶۰ھ (۱۲۶۱-۱۲۶۲ء) میں مَرینی خاندان کا سردار یعقوب بن عبدالحق مراکش پر حملہ کرنے آیا تو خاندان موحدین کے سلطان المرتضی نے اپنے عمزاد بھائی ابودبّوس کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ مَرینی فوج نے، جو وادی امّ الربیع کے کنارے پر صف آرا تھی، امّ الرِّجلَین کے مقام پر شکست کھائی۔ شاید یہ دریا وھی گھاٹ ھو جسے آج کل امّ الرّجیلات کہتے ھیں۔

۶۶۶ھ (۱۲۶۷-۱۲۶۸ء) میں مرینی سلطان یعقوب نے تادلا پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر ڈالا۔ اس نے خُلْط پر بھی چڑھائی کی جو قبیلۂ بنو جُشَم کی ایک شاخ تھی، یہ لوگ موحّدین کے حلیف تھے، لہٰذا موحّدین ان کی مدد کو آئے، لیکن انھیں شکست ھو گئی، کیونکہ عین لڑائی کے وقت ان کے عرب حلیف بنو جابر ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ۷۶۱ھ (۱۳۵۹-۱۳۶۰ء) میں وزیرالحسن ابن عمر نے، جو مرینی سلطان سالم ابراھیم کی طرف سے مرّاکش کا والی تھا، اپنے آقا کے خلاف بغاوت کی اور تادلا میں جا کر پناہ لی، جہاں بنو جابر نے اس کی آؤ بھگت کی، لیکن جب مرینی افواج نے دباؤ ڈالا تو وہ بھاگ کر کوھستان میں

زناگہ کے ہاں جا پہنچا، جنھوں نے آخرکار اسے اس کے تعاقب کرنے والوں کے سپرد کر دیا۔

بنوسعد کی آمد پر ایک بار پھر تادلا میں وادی العبید کے گھاٹ ابوعقبۃ پر فیصلہ کن جنگ ہوئی، جہاں ماہ صفر ۹۴۳ھ (جولائی ۱۵۳۶ء) میں بنی مرین کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سترھویں صدی میلادی میں المنصور کے عہد میں اس سلطان کا بیٹا زیدان تادلا پر حکمران تھا۔ اسی صدی کے وسط میں تادلا نے بنوسعد کے تسلط کا جوا اتار پھینکا اور زاویۂ دلاء کے زناگہ بربروں کی مملکت کا ایک صوبہ بن گیا۔ ان میں سے ایک امیر محمد بن الحاج نے سعدیہ خاندان کے سلطان محمد الشیخ کو ابوعقبۃ کے گھاٹ پر ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰-۱۶۴۱ء) میں شکست دی۔ دلائیوں کی بادشاہی اس علاقے پر قائم رہی، تاآنکہ علوی سلطان الرشید نے ان کا زاویہ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸-۱۶۶۹ء) میں تباہ کر دیا۔ ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳-۱۶۷۴ء) میں علوی سلطان اسمٰعیل نے ابوعقبہ پر اپنے بھتیجے احمد بن محرز کو، جس نے اس کے خلاف بغاوت کی تھی، شکست دی۔

۱۰۸۸ھ (۱۶۷۷-۱۶۷۸ء) میں مولاے اسمٰعیل کو تادلا کے زناگہ کی ایک بہت بڑی شورش دبانا پڑی۔ انھوں نے احمد بن عبداللہ دلائی کی انگیخت پر بغاوت کی تھی۔ ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۷-۱۶۸۸ء) میں اسے ایک اور مہم پر جانا پڑا اور اس کے نتیجے کے طور پر اس نے ادخسان (نزد خنیفرۃ)، تادلا اور دلاء کے مقامات پر نئے 'قصبے' تعمیر کیے۔ ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹-۱۷۰۰ء) میں مراکش کے صوبے تقسیم ہوے تو تادلا مولاے اسمٰعیل کے بیٹے مولاے احمد کے حصے میں آیا، جو اپنے باپ کے تعمیر کردہ 'قصبے' میں رہا کرتا تھا، جسے ''قصبۃ تادلا علی ام الربیع'' کہا کرتے تھے۔

۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹-۱۷۳۰ء) میں سلطان مولاے عبداللہ کو تادلا میں پھر آیت یمور کے خلاف جنگ کرنا پڑی اور انھیں تتر بتر کر دیا گیا۔ ۱۱۷۹ھ (۱۷۶۵-۱۷۶۶ء) میں سلطان سیدی محمد بن عبداللہ کو مجبور ہو کر انھیں کچھ مدت کے لیے فاس کے قریب جبل سلفاط میں جلا وطن کرنا پڑا، ان کی جگہ عارضی طور پر گطایہ (Gṭāya)، سمگت اور مجاط کے قبیلوں کو آباد کیا جنھیں بعد میں الغرب کی طرف واپس بھیج دیا گیا۔ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴-۱۷۸۵ء) میں اسی بادشاہ کو بجد کے زاویے کو تباہ اور سردار زاویہ محمد العربی الشرقاوی کو قید کرنا پڑا۔ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷-۱۸۰۸ء) میں سلطان مولاے سلیمان نے بنی موسٰی، آیت عتاب، رفالۃ اور بنی عیاط کے خلاف ایک تعزیری مہم بھیجی۔ ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹-۱۸۱۰ء) میں ایک اور فوج کشی ہوئی جو بربران تادلا (آیت سری) کے خلاف تھی۔ اسی طرح اردیغہ عربوں کے خلاف بھی ایک مہم بھیجی گئی۔ مولاے سلیمان ہی نے بجد کی مسجد اور ام الربیع کا پل تعمیر کرایا تھا۔

۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲-۱۸۵۳ء) میں سلطان عبدالرحمٰن بن ہشام نے بنی موسٰی سے، جنھوں نے اپنے والی احمد بن زیدوح کو قتل کر ڈالا تھا، بدلہ لیا۔ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲-۱۸۷۳ء) میں سلطان سیدی محمد بن عبدالرحمٰن نے تادلا کے عرب قبائل اور بنی موسٰی کے خلاف فوج کشی کی جنھوں نے اپنے والی کے خلاف بغاوت کی تھی (سماعلۃ بنی زمور، بنی عمیر)۔

۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸-۱۸۷۹ء) میں سلطان مولاے الحسن نے علاقے میں سکون پیدا کرنے کی غرض سے بنی موسٰی اور بنی عمیر پر حملہ کیا۔ اگلے سال وہ آیت عتاب کو سزا دینے کے لیے دوبارہ آیا۔

تادلا عَلی امّ الرّبیع ھی میں وہ ۱۳۱۱ھ (جون ۱۸۹۴ء) میں فوت ھو گیا۔

ضلعے کا بڑا مذھبی مرکز بُجَد کا زاویہ ھے جس کی بناء محمد الشّرقی نے بنی زمور کے درمیان سولھویں صدی میں رکھی تھی۔ مرابطین شرقاوة [رَكْ بآن] کی اھم جماعت اس کی اولاد ھیں .

مآخذ : (۱) الحسن بن محمد الوزّان الزّیاتی (Leo Africanus): *Description de l'Afrique*، طبع شیفر (Schefer)، ج ۱/۵ : ص ۲۸۹ تا ۳۱۰؛ (۲) Peyronnet : *Tadla* در *Bull. Soc. Géogr. Alger*، ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء ؛ (۳) J. Cimetière : *Notice sur Bou Djad* در *R.M.M.*، ۱۹۱۳ء، ج ۲۳ : ص ۲۷۷ تا ۲۸۹؛ (۴) E. F. Gautier : *Médinat-Ou-Dai* در *Hespéris*، ج ۶ (۱۹۲۶ء) : ص ۵ تا ۲۵.

(G. S. Colin کولن)

تارِم : (Tarim) مقامی (ترکی) تلفّظ تِرِم۔ موجودہ چینی ترکستان کا سب سے بڑا دریا (تقریباً بارہ سو میل لمبا) ھے ۔ غالباً یہ وھی دریا ھے جسے بطلیموس (۶ : ۱۶) نے اوئخارِدیس (Oikhardēs) لکھا ھے ۔ پھلی صدی ھجری (ساتویں صدی میلادی) میں اس دریا کا ذکر چینی زائر یوان چوانگ Hiou.n-Thsang : *Mémoires* ترجمہ از Stan Julien، ۲ : ۲۲۰) نے کیا ھے جو اس کا نام سیتو (سنسکرت سِیتا) لکھتا ھے ۔ پانچویں (گیارھویں میلادی) صدی میں محمود کاشغری (۱ : ۱۱۶) دریائے اُسْمِی تَرِمْ کا ذکر کرتا ھے جو ''بلادالاسلام سے نکل کر (بلاد) اُیغُر میں چلا جاتا ھے اور وھاں ریت میں جذب ھو جاتا ھے''۔ اسی مآخذ سے (کتاب مذکور، ص ۳۳۲) یہ بھی پتہ چلتا ھے کہ 'اُسْمِی تَرِم' کُچا کے قریب ''اُیغُر'' کی سرحد پر ایک مقام ھے جس کے پاس سے یہ دریا بہتا ھے ۔ اس زمانہ میں آج کل کی طرح تارم کا نام اس دریا کے نیچے کے حصے کے لیے استعمال ھوتا تھا، اوپر والے حصے کو، بلکہ اکثر پورے دریا کو بھی اس کے دھانے تک، چینی ترکستان کے پائے تخت یارقند کے نام پر یارقند دریا کہتے ھیں۔ یارقند دریا کا منبع رَسْکَمْ دریا ھے جو ھندوستان کی سرحد پر کوھستان قرہقوروم میں واقع ھے ۔ تیمور کی تاریخ (ظفر نامہ، کلکتہ ۱۸۸۷–۱۸۸۸ء، ۲ : ۲۱۹) میں ایک مقام پر تارم کا ذکر آتا ھے جو بائے [ییلاق۔ ادارہ] اور کُوسَن (کُچا) [قشلاق۔ ادارہ] سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ محمد حیدر کی تاریخ رشیدی (ترجمہ ای۔ ڈی۔راس، ص ۶۷)میں بھی تارم مذکور ھے ۔ اس کتاب میں تارم کا ذکر تُورفان، لوب اور کَتَک کے ساتھ ایک علاقے کے نام کی حیثیت سے آیا لیکن ان مآخذ میں دریا کا ذکر کہیں نہیں آیا ۔ بقول صاحب تاریخ رشیدی (کتاب مذکور، ص ۱۱) شہر 'لَوب۔ کَتَک' (یالوب اور کتک کے شہر) آٹھویں (چودھویں) صدی میں ریت کے طوفان میں تباہ ھو گیا۔(یا ھو گئے)سوِن ھیڈِن(*Through Asia*، لندن ۱۸۹۸ء، ص ۸۰۵) نے تحقیق کیا کہ اس شہر (شہر کَتِیک (Köttek) یا شہر کَتَک) کی بربادی کی داستانیں اب تک سننے میں آتی ھیں، گو کسی نے اس شہر کے کھنڈر دیکھے نہیں ھیں۔ تارم کی ایک شاخ کو، جو دریا کے نیچے کے حصے میں ھے، کَتِک تِرِم کہتے ھیں (کارنیلو (Kornilow: *Kashgariya*، تاشکنت ۱۹۰۳ء، ص ۱۶۴) ۔ محمود کاشغری کے وقت میں اسلام ظاھراً ابھی تارم کے نیچے کے حصے تک نہیں پھیلا تھا ۔ اس کے برعکس مارکو پولو (باب ۵۷) شہر لُوب اور صحرائے لوب کے باشندوں کو مسلمان لکھتا ھے ۔

دریائے یارقند پہاڑوں سے نکل کر جب قرچُون کے گاؤں کے قریب میدان میں پہنچتا ھے تو اس کے بائیں کنارے پر 'قزیل سُو' یا 'کاشغر دریا' 'آقسو' یا 'آقسو دریا' مُزَرْت یا 'شاہ یار دریا' اور 'کونچہ دریا' اس سے آ ملتے ھیں، اسی طرح

دائیں کنارے پر 'تزنب'، 'ختن دریا' اور 'کریا
دریا' آ ملتے ہیں ۔ دائیں طرف کے معاون صرف اس
وقت تارم تک پہنچتے ہیں جب ان میں سیلاب ہو۔
آقسو کے دھانے کے قریب تارم کا پاٹ کوئی چار
سو گز کے قریب ہے ۔ اس علاقے میں اس کی کئی
شاخیں ہو جاتی ہیں، سب سے بڑی شاخ 'اُگن دریا'
ترک کےمقام پر کوئی ۱۷۰ گز چوڑا ہےاور اسی جگہ
سے سون ہیڈن نے اسے عبور کیا تھا (*Through Asia*،
ص ۸۳۷) ۔ مختلف شاخیں لوب یا لوب نور
(لوب بزبان مغولی = جھیل) کے طاس میں جا کر
ختم ہو جاتی ہیں اور اسی میں چرچن دریا
بھی آ گرتا ہے اور سولیہو (Su-li-ho) بھی مشرق کی
جانب سے آ کر یہیں گرتا ہے ۔ بقول سون ہیڈن
(*Through Asia*، ص ۸۷۱) آج کل لوپ (یا لوب) اس
سارے علاقے کا نام ہے جو شمال میں 'اُگن دریا'
اور تارم کے دھانے سے شروع ہو کر جنوب میں
چرخ لق کے گاؤں تک (جو 'چرچن دریا' کے جنوب
میں ہے) پھیلا ہوا ہے ۔ پیلیو (Pelliot) (*.Journ. As*،
عدد سلسلہ ۱۱ جلد ۷ : ۱۱۹) کی رائے ہے کہ
اسی لفظ لوپ کو سنہ میلادی کے شروع میں چینی
زبان میں Leou-lan سے تعبیر کرتے تھے ۔ 'لوپ نور'
اور 'تارم گول' (گول بزبان مغول = دریا؛ J. Klaproth
کے ۱۸۲۹ء کے نقشے پر 'تارم گول' ہی لکھا گیا
ہے) کی اصطلاحات سے ظاہر ہے کہ جھیل کے طاس
اور تارم کے نیچے کے حصے کے قدیم ترین حالات
علمائے فرنگ کو مغولی (یا قلماقی Kalmük) ماخذ سے
حاصل ہوئے ۔ بالکل حال ہی میں تارم کے نیچے کے
حصے کے جغرافیائی حالات اور آثار قدیمہ کی تحقیق
بےشمار مہموں کے ذریعے سے کی گئی ہے اور بہت
سعی کی گئی ہے کہ موجودہ مقامات کو ان مقامات سے
تطبیق دی جائے جن کا ذکر ادبی بالخصوص چینی
ماخذ میں آیا ہے ۔ سر آرل سٹائن کی تحقیق کے مطابق
جو قریب ترین زمانے کی بات ہے (یعنی ۱۹۱۴ء کی؛
قب *.Geogr. Journ* اگست و ستمبر ۱۹۱۶ء) جہاں
اب لوب کی خشک قرار گاہ ہے وہاں غالباً ایک بہت
بڑا ڈیلٹا تھا لیکن تاریخی زمانے میں اس مقام پر
کسی بڑی جھیل کا وجود نہ تھا.

گو تارم کا محل وقوع جنوبی ہے تاہم اس کی
آب و ہوا میں اقلیمی شدت ہے (continental climate)
اور وہ سال بھر میں تین مہینے برف سے ڈھکا رہتا ہے۔
تارم کے نیچے کی گذرگاہ میں مقامی باشندے (لوپ لق)
مخصوص ساخت کی کشتیوں میں بیٹھ کر مچھلی پکڑتے
ہیں ۔ سون ہیڈن نے ایک اسی قسم کی کشتی میں بیٹھ
کر لوب نور کے علاقے میں اکتشافی گردش کی تھی ۔
تارم میں صحیح معنوں میں کبھی بھی کشتی رانی
نہیں ہوئی ۔ محمود کاشغری کے زمانے کی طرح
یہ دریا جھیل کے مقرّ تک پہنچنے سے پہلے ہی
صحرا میں خشک ہو جاتا تھا، اس لیے ماہی گیروں
کے گاؤں 'کوم چپ غن' کا ہیڈن (کتاب مذکور،
ص ۸۸۳) نے ''تارم کی قبر کا مدخل'' نام رکھا ہے۔

مآخذ :- اہم ترین ماخذ کا خصوصی مکمل ذکر
کارنیلو کی تصنیف *Kashgariya*، تاشکنت ۱۹۰۳ء،
ص ۱۰۷ ببعد میں ہے جو اس کی ذاتی تحقیق و تفتیش
اور Prževalski، ہیڈن، Pievtzow اور کوزلو Kozlow
وغیرہ کے بیانات پر مبنی ہے .

(W. BARTHOLD بارٹولڈ)

تارم : (Tārom or Tārum) (۱) قزیل اوزن Kïzïl-
Uzän پر ایک کورہ یا ولایت (قب سفید رود) ۔
نام: عرب اسے طرم، طرم (متنبی)، طیرم (Ṭïrm:
.B.G.A، ۳ : ۳۰۳ و ۳۰۸) کہتے ہیں ۔ یاقوت اس کا
دو جگہ یعنی بذیل طرم اور تارم ذکر کرتا ہے ۔
مستوفی اس کا عربی تثنیہ طارمین استعمال کرتا
ہے یعنی دو طارم ۔ موجودہ فارسی تلفظ تاروم
(Tārom) ہے ۔ تاروم (Tārom) 'بلوک' (علاقہ) کا نام
ہے، لیکن اس نام کا ایک قصبہ بھی دریائے قزیل

اوزن کے دائیں کنارے پر آباد ہے (وِنی سرا اور کَلج کے درمیان)، ایک اور گاؤں تاریم (< تاروم) کے نام کا اَرْدَبِیل سے مِیانہ کی سیدھی سڑک کی دائیں جانب بلوک تارم سے باھر واقع ہے۔

بلوک تارم اپنے ملحقہ علاقے خَلْخال کی طرح ابھی تک پوری طرح دیکھا بھالا نہیں جا سکا۔ میانہ [رک بآن]سے نیچے قِزِیل اوزن، پِرْدَلِیس کے پل کے قریب اپنے انتہائی شمالی نقطے پر پہنچ جاتا ہے، وھاں سے چل کر اس مقام تک جہاں یہ شاہ رود کلاں [رک بآن] سے مل جاتا ہے قِزِیل اوزن کوئی سو میل تک بہتا ہوا چلا جاتا ہے اور اس کے بہاؤ کا عمومی رخ شمال مغرب سے جنوب مشرق کی جانب ہے۔ تارم کا علاقہ اس دریا کے تقریباً درمیانی حصے میں پڑتا ہے۔

جنوب میں چِلّہ‌خانہ وغیرہ کے پہاڑ تارم کو زنجان [رک بآن] سے جدا کرتے ہیں۔ مشرق کی طرف تارم کی آخری حد اس مقام پر ختم ہوتی ہے جہاں قزیل اوزن کلاں شاہ رود سے مَنْجِیل کے پل سے اوپر آ ملتا ہے۔ شمال مشرق میں گِیلان کے پہاڑ قزیل اوزن کے طاس کو ماسُولہ (گِیلان) سے جدا کرتے ہیں۔ شمال اور شمال مغرب میں تارم خلخال سے متصل ہے۔ جنوب مغرب میں اس کی سرحد پر وہ علاقے ہیں جو زنجان کے توابع میں سے ہیں (بالخصوص کاغذ کُنان کا قدیم بلوک)۔

قزیل اوزن نے اپنے شمالی موڑ میں ایک ناقابل گذر گھاٹی کو کاٹ کاٹ کر اپنا راستہ بنایا ہے۔ اس گھاٹی کی گہرائی ۲,۲۰۰ فٹ سے ۲,۷۰۰ فٹ تک ہے۔ اس تنگنائے کے پہلوؤں کے اوپر کے مرتفع میدانوں میں (بلندی ۵,۲۰۰ تا ۶,۰۰۰ فٹ) خلخال کے گاؤں اور قابل کشت زمینیں واقع ہیں۔ یہ گہری آب کند میان سرا تک یعنی کوئی ۶۰ میل تک چلی جاتی ہے جہاں قزیل اوزن کا اتصال شاہ رود خرد سے ہو جاتا ہے (شاہ رود کلاں جو طالَقان سے آتا اور دائیں کنارے پر مَنْجِیل کے مغرب میں قزیل اوزن میں مل جاتا ہے، ایک الگ دریا ہے)۔ مذکورہ آب کند سے نیچے قزیل اوزن کی وادی کوئی ساٹھ میل کے طول تک کشادہ ہوگئی ہے اور اس کے دونوں کناروں پر کئی گاؤں آباد ہیں۔ دربند کے قریب چٹانیں پانی کی گذرگاہ کو تنگ کر دیتی ہیں، لیکن اس کے بعد وادی پھر وسیع ہو جاتی ہے اور (بارہ یا تیرہ میل کے طول میں) منجیل سے بالکل ادھر تک یہی کیفیت رھتی ہے۔

تارم خاص کا علاقہ اس مقام سے شروع ہوتا ہے جہاں سے دریاے قِزِیل‌اوزن گہری گذرگاہ کو چھوڑتا ہے اور دربند کی تنگنائے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ ان میں سے ایک بالائی حصہ ہے اور ایک زیرین۔ بلوک تارم کا مفصل حال نُزہۃالقلوب (۱۳۴۰) میں موجود ہے لیکن قلمی نسخوں میں مواضعات کے نام مسخ ہو گئے ہیں۔

(الف) بالائی حصے میں مفصلۂ ذیل بلوک ہیں: ۱- دِز آباد سُفلٰی جس میں پچیس مواضع ہیں۔ اس کی حدود نِمَہِل، گُلْچِین اور کَلاسَر (کَلْہار، Klhār؟) کے مواضع سے واضح ہوتی ہے جو تنگنائے کے دھانے اور قزیل اوزن کے دونوں کناروں پر آباد ہیں۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بلوک کا بالائی حصہ (دز آباد عُلیا، نزھۃ، ص۶۶) پہلے شہر کاغذ کُنان (خُوْنَج قدیم) کے تابع تھا، لیکن اس شہر کے صحیح محل وقوع کا پتہ نہیں چل سکا۔ ۲- بلوک طارم عُلیا (جو یک صد دھات پر مشتمل ہے) صحیح معنوں میں قزیل اوزن کے دونوں کناروں پر واقع ہے۔ اس کے حدود کی تعیین قَلّات (قب یاقوت: قِلاط) کے ان مواضع سے

ہو سکتی ہے جو (اب تک موجود ہیں اور) قزیل اوزن کے دائیں کنارے پر اور اس سڑک کے، جو بائیں کنارے پر زنجان سے آخ کدوک (Akh-Güduk) اور درّام ہوتی ہوئی آتی ہے، دائیں طرف واقع ہیں۔ ۳-تیسرے بلوک یعنی نسبار (؟) بریدون (؟) کے حدود واضح نہیں ہیں؛ سوائے اس صورت کے کہ پہلے نام سے پسبار (؟) مراد ہو جو روسی نقشے میں بائیں کنارے پر اس اوبر کے نزدیک دکھایا گیا ہے جس کا ذکر رالنسن (Rawlinson) نے کیا ہے۔ رالنسن کی رائے میں بالائی تارم میں (جسے تارم خلخال کہنا چاہیے؟) صرف وہی پتلا سا قطعۂ زمین شامل ہے جو دائیں کنارے پر واقع ہے، اس کے مقابل کے بائیں کنارے کو 'پشت کوہ' کہتے ہیں (پشت کوہ یعنی بلحاظ گیلان!)۔ مگر نزھۃالقلوب اور فورٹیسکیو (Fortescue) کی شہادت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تارم کے کچھ گاؤں قزیل اوزن کے دونوں کناروں پر آباد ہیں۔ اس کے برعکس دریا کے دائیں کنارے والا تنگ قطعۂ زمین کچھ ایسا بہت تنگ بھی نہیں اور بہت سے نالے ان پہاڑوں سے، جو تارم کو زنجان سے جدا کرتے ہیں، اترتے ہیں اور قزیل اوزن تک پہنچنے سے پہلے ہی آبپاشی کی نہروں میں تقسیم ہو کر غائب ہو جاتے ہیں۔

(ب) طارم سفلی کے بلوک یہ ہیں: ۴-وہ بلوک (۵۰ گاؤں) جو قلعۂ شمیران کے توابع میں سے ہے اور دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہے (دائیں کنارے پر موضع کلج جس کا ذکر نزھۃ میں ہے اب بھی موجود ہے۔ 'الون' ضرور التین کش ہی ہوگا جو دائیں طرف دریا کی ایک چھوٹی سی معاون ندی پر آباد ہے-قب مرآۃ البلدان اور روسی نقشہ)۔ ۵-بلوک مشتمل بر توابع قلعۂ فردوس (۲۰ گاؤں)، اس کا موقع قریۂ سرذان سے ظاہر ہے جو التین کش سے اوپر ایک معاون ندی کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ نزھۃالقلوب میں ایک اور مقام (ص۲۱۷) پر لکھا ہے کہ ۶- بلوک برہ بھی جہاں شاہرود کلاں قزیل اوزن سے دوبارہ آ ملتا ہے، تارم ہی کے علاقے میں تھے۔ عالم آرا ص۳۳۵ کی ایک عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد صفوی میں منجیل اور خرزویل بھی، جو شاہرود کے مشرق میں ہیں، تارم کے توابع میں شمار ہوتے تھے۔ آج کل منجیل کا اہم شہر، جو شاید قدیم زمانے کا 'ھرکام' (یاقوت، ۴: ۹۶۳) ہو، صوبۂ گیلان میں شامل ہے (رابینو Rabino : *R.M.M.*، ۳۲ : ۲۰۹)؛ وادی سفیدرود کے راستے سے گیلان میں داخل ہوں تو یہ شہر دہانۂ وادی پر مشرف ہے۔ آخر میں بقول نزھۃالقلوب، ص۶۷، بلوکات ۷-نیرک (حرکات غیریقینی)، مرجمنان (بدون ضبط) اور اندجن (قب یاقوت بذیل اندجن) کے محاصل (حقوق دیوانی) تارم اور قزوین کے درمیان تقسیم ہو جاتے تھے۔ یہ بلوک یوزباشی چای (ملا علی کی تنگنائے) کے منبع پر واقع ہونگے جو بائیں کنارے سے شاہ رود میں آملتا ہے [روسی نقشے میں یہاں مرچین اور انده کا محل وقوع دکھایا گیا ہے].

خلخال: تارم کی ان سرحدات کا حال، جو خلخال کی طرف ہیں، بہت کم معلوم ہے۔ تارم کا علاقہ عام طور پر عراق عجم (قب Schwarz ۷۳۶، اور نزھۃ، ص۶۵ ببعد) کے توابع میں شمار کیا جاتا تھا۔ باقی رہا خلخال، وہ آذربایجان (صحیح تر یہ کہ آذربایجان کی تومان اردبیل) کا حصہ سمجھا جاتا تھا (نزھۃ، ص۸۱)۔ یاقوت (۲: ۴۵۹) سے پہلے خلخال کے نام کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

آذربایجان کے خلخال کا نام ماورائے قفقاز کے صوبۂ اوتی کے قدیم شہر خلخال سے وابستہ

ہوگا [قب شکی] جس کے متعلق دوسری اور پانچویں صدی کے درمیان یونانی اور ارمنی مصنفین لکھتے ہیں کہ وہ شاہان ارمینیہ اور ان کے بعد شاہان البانیہ (ارّان) کی سرمائی قیام گاہ تھی، قب مارکوارٹ (Marquart): *Ērānšahr*، ص۱۱٦ ۔ ممکن ہے کہ عہد اسلامیہ کی پہلی صدیوں میں اس تمام خطّۂ ملک کا نام جو اردبیل اور قزیل اوزن کے درمیان واقع ہے اَلْبَبْر ہو (اَلْبَبْر کی قراءت پورے طور پر منضبط نہیں؛ نولڈیکہ: *Geschichte*، ص۱۸۳) ۔ یہ پرانی اصطلاح اکثر اوقات طَیلَسان = تالِش (قب بلاذُری: ص ۳۸ ۱، ۳۲۲، ۳۲۷؛ ابن خُرداذبہ: ص ۵۷، ۱۱۹؛ قُدامَة: ص ۲۴۵، ۲٦۱؛ دِینَوَری: ص۱۹۷؛ مسعودی: مروج، ۱: ۲۸۷) کے ہمراہ [یعنی ''اَلْبَبْر و الطَّیْلَسان'' کی شکل میں] استعمال ہوتی ہے ۔ قزیل اوزن مواصلات کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے، اسی لیے وہ آذربایجان اور عراق عجم کے درمیان مناسب اداری حد فاصل کا کام دیتا ہے ۔ خلخال کے نام کا مأخذ اسی نام کا ایک شہر تھا جو پرانے صدر مقام فیروزان (حالیہ 'قَبَغْ') کے معدوم ہو جانے کے بعد صدر مقام بنا ۔ خلخال کا نام عملی طور پر ٹھیک اس معاون وادی پر منطبق ہوتا ہے جو قزیل اوزن کے بائیں کنارے میں آکر ملتی ہے ۔ اس دریا کا ایک دھارا شمال کی جانب سے آتا ہے (یعنی درۂ قزیل یوقوش سے جو 'اردبیل-پردلیس' والی سڑک پر ہے) اور سَنْجاوا کے گاؤں کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے (یاقوت، ۳: ۱٦۰؛ سِنْجَبْذ یا سِنْجَاباذ؛ نزھة، طبع لیسٹرینج، ص۱۸۰، ۲۲۳: سَنجیدہ وغیرہ؛ Olearius [۱٦٦۳ء]، ص ۲۰۷: Sengoa) ۔ دریا کے دوسرے دھارے کا منبع شمال مشرق کی طرف کوہ تالِش کی مغربی ڈھلانوں میں ہے (موجودہ خلخال کے مرکز ہِرو < ہِرآباد [مسعود کیہان ۱٦۸: ہرو آباد (ہراب آباد)] کے قریب) ۔ اس دھارے کا نام دیہ کوئی کے نام پر ہے (نزھة، طبع لیسٹرینج ص۲۲۳: کَدیو، کَذیُو، لیکن ص۸۳ پر کُوئی) ۔ دونوں دھارے موضع قَبَغ کے قریب آ کر مل جاتے ہیں اور آخر میں اس دریا کے بائیں کنارے پر پرانے شہر خلخال کی ندی بھی اس میں آ گرتی ہے (اب خلخال نام کے کئی گاؤں اس وادی میں آباد ہیں) اور پھر یہ پردلیس (قب نُزھة القُلوب [و ترجمہ] ص۸۱: بَرْدَلیز Bardalis، ص ۱۸۰: بروِلژ Barūläz) کے پل سے ذرا نیچے قزیل اوزن میں جا ملتی ہے ۔ دریاے کوئی مشرق سے مغرب کو ایک بڑی سی قوس بناتا ہے ۔ ہِرو کے جنوب میں آغ داغ کا بلند اور گنجان پہاڑ ہے جس کی شاخیں کوئی کی وادی کو تارم کے علاقے سے جدا کرتی ہیں ۔ درۂ مَجَرہ (یا بَرَنْدَق) کے جنوبی رخ سے ہِرو کے ٹھیک جنوب میں 'شاہ رود' خرد آتی ہے (نزھة القلوب، ص۲۲۳ میں اسے اب 'شال رود' کہا ہے جس نے موضع شال سے، جو ابھی تک موجود ہے، یہ نام پایا) جو میانہ سراے کے قریب بائیں طرف سے دریاے قزیل اوزن میں آ گرتی ہے (اس جگہ قزیل اوزن گہری تنگنائے سے باہر نکلتا ہے) ۔ نزھة، ص۸۲ میں توابع اردبیل میں شاہرود خرد کی وادی (تیس گاؤں) کا اور دارمَرزین کے بڑے ضلع (۱۰۰ گاؤں) کا بھی ذکر آتا ہے ۔ دارمرزین کا علاقہ مشخص نہیں ہو سکا ۔ بہر حال خلخال، دارمرزین اور شاہرود کے ہوتے ہوئے بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے کہ قزیل اوزن کے بائیں کنارے پر بھی تارم کے کچھ توابع ہوں.

رسل و رسائل و ارتفاعات: اردبیل اور زنجان کے درمیان بڑا راستہ (پردلیس کے پل کی راہ سے جو قزیل اوزن کی تنگنائے کے وسط میں ہے) خلخال سے ہوتا ہوا تارم کے مغرب سے گزرتا ہے ۔ قافلے تارم سے ایک چھوٹا رستہ (اردبیل - ہِرو - برندق -

قَلات-ه-اَخ گُدُوك-ه-زَنْجان) اختیار کرتے ہیں لیکن انھیں قزیل اوزن کو عبور کرنے کے لیے کشتیاں (کَلَک *kälük*) استعمال کرنا پڑتی ہیں - اردبیل اور زنجان کی درمیانی آمد و رفت اہم نہیں ہے - پہلوی حکومت کی یہ تجویز ہے کہ قُوِین (واقع گیْلان) کو زَنْجان کے ساتھ ایک سڑك کے ذریعے ملا دیا جائے جو تارُم سے ہو کر گذرے .

بقول یاقوت تارُم سخت پہاڑی علاقہ ہونے کے باوجود حاصل خیز ہے (مَعَ ذَالِکَ مُعْشِبَةٌ یعنی گیاہ ناك ہے) - اعلیٰ قسم کی کپاس جس کا نام بقول یاقوت تارم کے نام کے ساتھ وابستہ تھا بلوک دز آباد سے آتی ہوگی ، کیونکہ کاغذ کنان (''وہ جگہ جہاں کاغذ بنتا ہے'') کے کارخانے کپاس کے بغیر جاری نہیں ہو سکتے تھے - خَلْخال کے اونچے میدان تیرھویں انیسویں صدی کے آغاز تک بھی اناج گھر تھے جن سے عبّاس مرزا گندم کے ذخائر حاصل کیا کرتا تھا - رالِنسن (Rawlinson) نے ۱۹۲۱ء میں وھاں میوے کے باغ بھی دیکھے تھے، لیکن فورٹسکیو (Fortescue) کو تو یہ علاقہ کچھ اچھا معلوم نہ ہوا - مرآۃالبُلدان کے قول کے مطابق تارم میں سیسے، تانبے اور زاج (vitriol) کی کانیں بھی ہیں .

قصبات اور گاؤں : نزھۃ، ص ۶۵ کے مطابق تارم کا صدر مقام پہلے فیروزآباد تھا (علاقۂ زیرین میں؛ یہ فیروز آباد خَلْخال سے بالکل علٰحدہ مقام ہے) - زمانۂ مغول میں صدر مقام اس کی جگہ أَنْدَر (؟ بالائی حصے میں) بنا - بقول رالنسن، وِینیسارْد (Wenïsard)، (روسی نقشہ : وِنِی سرا [ونی سر در جغرافیۂ مفصل ایران، ۲ : نقشہ مقابل ص ۳۷۴ - ادارہ] جو دائیں کنارے پر ہے، تارم کا مرکزی مقام تھا مگر فورٹسکیو کے نزدیک یہ مرکزی حیثیت بَنَری کو حاصل ہے (جو بائیں کنارے پر ہے) - یہ نئے مرا کز اردبیل-ہ-ھِرو-ہ-زنجان کی سڑك کی طرف جھکتے نظر آتے ہیں .

قلعۂ سَمیْران (شَمیْران) کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جہاں مِسْعَر بن مُہَلْہِل، ناصِر خُسرو اور یاقُوت بھی آئے - شمیران کا اصلی محل وقوع تو معلوم نہیں ہو سکا، لیکن ناصرِ خسرو کے سفرنامے سے اس کا خاصا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے - یہ سیاح قَزوین کی جانب سے خَرزَوِیْل پہنچا (جو مَنْجیل سے نیچے ہے)، وہاں سے تین فرسخ کی اترائی کے بعد وہ برزالخیر (Brzal<u>kh</u>yr) (تلفظ معلوم نہیں) میں جو تارم کے مضافات میں تھا آیا، پھر وہ قریۂ خَنْدان میں پہنچا جو شاہ‌رود پر اس کے دھانے کے قریب آباد تھا - خندان میں امیر تارم کے لیے دریا عبور کرنے کا محصول (بَاجْ) وصول کیا جاتا تھا - یہاں سے وہ شمیران گیا اور اس کے نزدیک یہ فاصلہ کوئی تین فرسخ تھا - حقیقت یہ ہے کہ خرزویل سے شاہ‌رود بخط مستقیم پانچ میل سے زیادہ نہیں- شاہ‌رود کے مغرب میں جہاں علاقہ زیادہ کھلا ہوا ہے، تین فرسخ کا فاصلہ زیادہ میلوں کے برابر ہوگا- یاقوت کہتا ہے کہ سمیران ایک بڑے دریا کے کنارے پر واقع تھا- ان تمام تفصیلات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شمیران دربند کے نزدیک تھا- فی‌الواقع رالنسن بھی لکھتا ہے کہ یہاں ایک ''بڑے اور بہت مضبوط قلعے کے'' کھنڈر موجود ہیں (گِلوان سے تین میل نیچے) اور روسی نقشے میں ''قلعے کے آثار'' بائیں کنارے کی ایک ایسی چٹان پر دکھائے ہیں جس کی ڈھلان عمودی تھی (شاہ‌رود کے دھانے کے تقریباً سات میل اوپر)- جنگی لحاظ سے شمیران کی اہمیت یہ تھی کہ وہ قزیل اوزن کی وادی کی جانب سے تارم میں داخل ہونے کی راہ کی حفاظت اس

کے تنگ‌ترین حصے میں کرتا تھا ، اسی طرح قلعۂ قلات، زنجان کی جانب کے مدخل کا محافظ تھا.

تاریخ : ہمیں اس کے متعلق کچھ علم نہیں کہ علاقۂ تارم کے اصلی باشندے کون تھے - رالنسن نے قزیل اوزن کے اس حصے میں قدیم زمانے کے قادوسیّہ (Cadusii) باشندوں کا پتہ لگایا ہے [جو ساحل بحر خزر کی ایک جنگجو قوم تھی- ادارہ] اور اس دعوے کے ثبوت میں جیہانی (اشکال‌العالم ؟) کی سند پیش کرتا ہے جو (گیارھویں صدی میلادی؟ میں) اس تمام علاقے کو قادوستان (؟) ہی کہتا ہے - تارم اور خلخال کے وحشتناک اور دورافتادہ علاقے نے صرف (بنو) مسافر [رک بآن] کے زمانے میں تاریخی اہمیت حاصل کی، جب شمیران اس علاقے کا صدر مقام تھا اور ان کی حکومت آذربایجان، اراّن، گیلان اور رے کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھی - چوتھی صدی کے عشرۂ ثانی ہی میں یعنی ۳۱۶ھ (۹۲۸ء) میں ہم دیکھتے ہیں کہ 'سلّار بن أسوار' شمیران کا والی ہے - قب ابن الأثیر؛ ۸ : ۱۴۲- یاقوت نے [بذیل سمیران ۳ : ۱۴۸- ادارہ] مسعر بن مہلہل (نواح ۳۳۰ھ) کا بیان نقل کیا ہے کہ سمیران میں ۲,۸۵۰ سے کچھ اوپر چھوٹی بڑی عمارتیں تھیں - اسی نے آل بویہ کے وزیر صاحب ابن عبّاد طالقانی کا ایک دلچسپ خط نقل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تارم پہلے قزوین کے تابع تھا، پھر محمد بن مسافر نے اسے علحدہ کر لیا، کیونکہ یہاں کا قلعہ دیکھ کر اسے اس علاقے کے متعلق لالچ پیدا ہو گیا- الصاحب قلعۂ شمیران کی اہمیت کا بیحد معترف ہے اور اسے ''قلعۂ الموت کی بہن'' کہتا ہے. مقدسی ص ۳۶۰ پر سمیروم (کذا!) کے قلعے کی آرایش و زیبایش کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے کہ اس پر سونے کے شیر، چاند اور سورج بنے ہوے ہیں - ۳۷۹ھ میں آل بویہ کو ایک شادی کے سلسلے میں یہ قلعہ مل گیا ، لیکن فخرالدولہ کے انتقال کے بعد بنو مسافر کے حکمران ابراہیم نے زنجان، ابہر، سرجہان (ابہر کے شمال میں صائن قلعہ = قہود قدیم کے نزدیک ایک ضلع) اور ''شہر زور'' (قراءت مشتبہ، لیکن یہ جگہ وہی ہوگی جسے نزہۃالقلوب، ص ۶۵ میں ''شرزورلرد'' یا ''شروزلر'' کے نام سے طارم سفلی کے توابع میں شمار کیا ہے) فتح کر لیا - شمیران کو واضح طور پر ان علاقوں میں شمار نہیں کیا گیا ، لیکن ۴۳۸ھ (۱۰۴۶ء) میں ناصر خسرو نے شمیران (سمیران) میں ایک ہزار قلعہ گیر فوج اور بنو مسافر کا ایک شہزادہ موجود پایا [مگر قب سفرنامہ پیرس ۱۸۸۱ء؛ ص ۵] - یہ سیاح کہتا ہے کہ قلعہ ایک ایسی چٹان پر واقع تھا جس کی ڈھلان عمودی تھی؛ یہ چٹان قصبے پر مشرف تھی ، اس کے گرد تین دیواریں تھیں ، ایک زمین دوز راستہ ('کاریز') دریا تک جاتا تھا جس سے پانی مہیّا ہوتا تھا - یاقوت کہتا ہے [۴ : ۱۵۶- ادارہ] کہ یہ قلعہ صاحب‌الموت نے ویران کر دیا تھا ، مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے اس اقدام کا سبب کیا تھا - یاقوت کے زمانے میں قلعۂ قلاط صاحب‌الموت کے قبضے میں تھا .

عہد مغول میں خصوصاً جب پاے تخت سلطانیہ [رک بآن] میں منتقل ہوا، تارم کی اہمیت بڑھ گئی - کتاب نزہۃ القلوب (۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء) اس علاقے کے متعلق اس وقت کی صحیح معلومات کی آئینہ‌دار ہے - اولجائیتو کے ماتحت تارم میں ایک شحنہ مسمی بہ گراے (؟) حکومت کیا کرتا تھا؛ یہ وہ شخص ہے جس نے ۷۰۰ھ (۱۳۰۷ء) میں گیلان میں مہم بھیجی (ڈورن (Dorn) : *Auszüge*، ص ۱۳۹) - تیموریہ خاندان کے عہد میں خوانین خلخال (قب مادّۂ تبریز بذیل ۷۸۷ھ/[۱۳۸۵ء])

و تارم (شیخ زاھد تارمی؛ ڈورن : *Auszüge*، ص۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۳، ۳۸۲) نے قدرے اھم وظائف انجام دیے۔ شمیران کو از سر نو تعمیر کیا گیا ھوگا، کیونکہ مؤرخین گیلان ھمیں اسی کی تفصیل بتاتے ھیں کہ کس طرح یعقوب کی موت کے بعد جو آق قیونلو سے تھا (۸۹۶ھ) مرزا علی سلطان گیلان کی طرف سے کارکیا [محمد سپہ سالار لاھیجان] نے ایک فوجی تدبیر سے اس قلعے پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد ایک شخص زین العابدین تارمی نے مرزا علی کے خلاف بغاوت کی، لیکن اسے کامیابی نہ ھوئی ۔ آق قیونلو خاندان کے حکمران رستم بیگ (۸۹۷ھ تا ۹۰۲ھ) کے زمانے میں اس کے جرنیل دەدە بیگ (Dädä-beg) نے دس ھزار کی جمعیت کے ساتھ تارم کے قلعے پر دوبارہ قبضہ کر لیا، لیکن بعد میں جب آق قیونلو خاندان کے حکمرانوں اَلْوَنْد اور محمدی (۹۰۵ھ تا ۹۰۶ھ) میں جنگ ھوئی تو مرزا علی نے تارم کو ترکوں کے قبضے سے چھڑا لیا (قب مرآۃ البلدان، ج ۱ ص۳۳۶).

جب اسمعیل اول کا زمانہ آیا تو نوجوان بادشاہ کارکیا کے علاقے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس علاقے اور اس کے بزرگوں کے وطن اَرْدَبیل کے درمیان جو بغایت بے زحمت راستہ تھا تارم اس پر واقع تھا ۔ ۹۰۵ھ میں اسمعیل نے جو راستہ اپنے مشہور کوچ میں اختیار کیا تھا وہ یہ تھا : تارم ـ برندق ـ نساز ـ کوئی ـ حفظ آباد ـ اَبَرْق ـ اردبیل (قب راس (E.D. Ross): *The Early Years of Shāh Ismāʿīl* در *J.R.A.S.*، ۱۸۹۵ء ص۳۳۲) ۔ تارم کا ذکر تاریخ عالم آرا [مثلاً ص۱۹، ۳۱۲، ۳۳۰ ـ ادارہ] میں کئی بار اس لحاظ سے آیا ھے کہ یہاں فلاں فلاں صفوی بادشاہ نے ۹۰۵ھ کا موسم سرما گذارا اور شکار بھی کھیلا (۱۰۰۲ھ و ۱۰۰۳ھ) اور یہیں سے صفویوں نے گیلان کو مہم بھی بھیجی۔

ترکی عناصر نے آھستہ آھستہ ایرانی (یعنی دَیلَمی اور گیلانی) عناصر کو جذب کر لیا ۔ نادر کے عہد میں 'عمرلو کرد' منجیل کے علاقے اور پشت کوہ تارم میں آباد کر دیے گئے ۔ رالنسن کے نزدیک وہ لُولُو قبیلے کے لوگ تھے (لولو؟ جن کے کچھ بقایا اب بھی بالائی شام [Le Coq]، حوالی طہران [Brugsch وغیرہ] میں ملتے ھیں، لیکن اس کے وقت میں سب کے سب ترک بن چکے تھے، تاھم رابینو : (*R.M.M.*، ۳۲ : ۲۶۱) (سلیمانیہ والے) ریشوند کردوں، جنھیں عباس اول نے منجیل کے قریب آباد کیا تھا، اور عمرلو ترکوں (؟) میں جو نادر کے زمانے میں آئے، تمیز کرتا ھے ۔ خیر کچھ بھی ھو آج کل تارم میں ترک آباد ھیں ۔ فورٹسکیو کہتا ھے کہ گلوان کے بعد کسان فارسی زبان نہیں سمجھ سکتے ۔ تسمیۂ مقامات کے سلسلے میں ترکی ناموں کے پیوند نے رفتہ رفتہ تمام پرانے ایرانی ناموں کی اصلیت کو چھپا دیا ھے (قب پردلیس [از پرد بمعنی پل]، نمہل، نیاب، گلچین وغیرہ) ۔ آذربایجانی مواضع کے قدیم ایرانی ناموں کا مطالعہ ابھی تک نہیں ھوا، لیکن یہ ظاھر ھے کہ مقامی بولیاں اس گروہ سے تعلق رکھتی ھیں جنھیں ''شمال مغربی'' کہتے ھیں [قب تات].

مرآۃ البلدان، : ص۳۳۵ کے مطابق قاچاروں نے تارم کو ایک علحدہ مستقل حکومت بنا کر اسے اقطاع و تیول کے طور پر محمد خان بیگلر بیگی دولو اور اس کے بیٹے اللہ یار خان آصف الدولہ وغیرہ کو دے دیا ۔ رضا شاہ کی تخت نشینی کے بعد ایک تعزیری مہم خلخال میں بھیجی گئی اور کئی مقامی خوانین (رشید الممالک وغیرہ) کو پھانسی دی گئی ۔

مآخذ : (۱) قب مادەھاے سفیدرود و شاەرود (مؤخر الذکر میں بلوک برہ (Bara) کے محل وقوع کی تصحیح کر لی

جائے؛ (۲) حمداللہ مُستَوفی : نُزْھۃالقُلوب، طبع لیسٹرینج، ص۶۵، ۸۱، ۱۸۰، ۲۲۳؛ (۳) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص۲۹۷؛ (۴) محمد حسن خان صنیع الدولہ : مرآۃالبُلدان، طہران ۱۲۹۴ھ، ۱ : ۳۳۳ تا ۳۳۷؛ (۵) Olearius : *Moscowitische und persian. Reisebeschreibungen*، طبع Schleswig، ۱۶۶۳ء، باب ۲۸ : ص۷۶۱ تا ۷۶۵، (بوزَن-ـ-Sengoa [= سَنجاوا]-ـ-پَرْدلیس)؛ (۶) Morier : *A Second Journey*، لندن ۱۸۱۸ء، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸، (أرْدبیل-ـ- ھِروِ-ـ-پرس-ـ- سَمئو-ـ- آق‌قند-ـ-زنجان)؛ (۷) Jaubert : *Voyage en Arménie*، پیرس ۱۸۲۱ء، ص۱۹۵ : 'أرْدبیل-ـ-ھِرِز-ـ-غنجیہ (؟) -ـ- خَلْخال -ـ- زنجان؛ (۸) Monteith : *Journal of a Tour through Azerdbijan*، (sic !)، *J.R.G.S.*، ۱۸۸۳ء، ۳ : ۱۰ تا ۱۲ : میانہ -ـ- مَنجیل، قزیل اوزن کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ (بیان کچھ ژولیدہ سا ہے)؛ (۹) رِٹّر (Ritter) : *Erdkunde*، ۸ : ۶۳۳ تا ۶۳۹؛ (۱۰) رالِنسن : *Notes on a Journey from Tabriz*، در *J. R. G. S.*، ۱۸۴۰ء، ج ۱۰ : (زنجان-ـ-آق داغ -ـ- قِشلاق-ـ-دَرّام-ـ-گوکَنْد-ـ-اوبر، دَربند-ـ-مَنْجیل)؛ (۱۱) زارے (Sarre) : *Reise v. Ardabil nach Zendschan*, در *Pet. Mitt.* ۱۸۹۹ء، ۴۵ : ۲۱۵ تا ۲۱۷؛ (کوریم-ـ-سَنْجاوا-ـ-چای -ـ- قوْجی -ـ- اَفْشار -ـ- پَردلیس) ؛ (۱۲) de Morgan : *Etudes géographiques*، ج ۱، ۱۸۹۴ء : لوحہ ۱۹۴، lxi اور lvii ("pont de Leis") کے بجاے پردلیس (Pardalis) پڑھیے!)؛ (۱۳) لیسٹرینج : *The Lands of the East Caliphate*، ص ۱۷۰، ۲۲۵ تا ۲۲۶ (اس میں کئی غلطیاں ہیں)؛ (۱۴) Fortescue : *The Western Elburz and Persian Azerbaijan* در *J.R.G.S.*، اپریل ۱۹۲۴ء، ص ۳۰۱ تا ۳۱۸ (مَنْجیل-ـ-بَنْری-ـ-بَرْنَدَق-ـ-نَمِہل-ـ-قرہ بولاق-ـ-کَجَل-ـ-پَردلیس-ـ-میانہ)؛ (۱۵) Schwarz : *Iran im Mittelalter*، (۶ ب : ۱۹۲۶ء)، ص ۷۳۶ تا ۷۳۹ (اس کے لیے عربی مآخذ سے کام لیا گیا ہے)۔ خَلْخال کی تفصیل کے لیے قب خانیکوف (Khanikov) : *Map of Azerbaijan* در *Zeitschrift d. allgem. Geographie*، ۱۸۶۳ء، ج ۱۳۔

(۲) فارس کا چھوٹا سا ایک شہر [یاقوت : طَرْم : فارس نامہ، طبع لیسٹرینج : تارم (Tār(u)m)] جو آخر حدود فارس میں بسمت کرمان یعنی صوبۂ فارس کے انتہائی مشرق میں واقع ہے۔ یہ شہر شاید وہی تاروا ہے جو یَوْتیا (Yautiyā) کی سرزمین میں واقع تھا (بِہِسْتان، ۳ : ۷)۔ تارم آج کل 'بُلوک سبعہ' کا ایک ناحیہ ہے۔ قب حسن فسائی : فارس نامۂ ناصری، طہران ۱۳۱۴ھ، ص ۲۱۷ تا ۲۱۸۔ قب (۱) Dupré : *Voyage en Perse*، ۱ : ۳۷۳ تا ۳۷۶؛ (۲) رِٹّر (Ritter) : *Erdkunde*، ۸ : ۷۷۴؛ (۳) صنیع الدولہ : مرآۃالبُلدان، ص ۳۳۳؛ (۴) Preece : *Journey from Shiraz to Jashk Supp. Papers, Proceed. R. Geogr. Soc.*، 1885، ج اول، حصۂ سوم : ص ۴۰۳ تا ۴۳۷؛ (۵) لیسٹرینج : ..... *The lands*، ص ۲۹۱ تا ۲۹۵؛ (۶) Schwarz : *Iran*، ۲ (۱۹۱۰ء) : ۱۰۷ تا ۱۰۸؛ (۷) Bartholomae : *Altiran. Wörterbuck*، عمود ۶۳۸، ۸۶۸، ۹۰۸، ۱۸۵۴.

(مِنورسکی MINORSKY)

تارُودانْت : مراکو کے جنوب میں، وادی سُوس کے دائیں کنارے پر، علاقۂ سُوس کا ایک بڑا شہر ہے جو مرّاکش سے کوئی ایک سو میل جنوب مغرب میں اور آگادیر سے (جو بحر ایطلانتک کے ساحل پر ہے) پینتالیس میل مشرق کو واقع ہے۔ ان دونوں شہروں اور تارودانت کے درمیان کچی سڑک ہے جس پر گاڑیاں چل سکتی ہیں۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی آبادی سات ہزار کے قریب ہے۔ قصبے کے متعلق مزید تفصیل اور اس کی تاریخ کے لیے دیکھیے مادۂ السُّوس الاَقْصیٰ .

(لیوی پرووانسال E. LÉVI-PROVENÇAL)

تاریخ : (مقالۂ اوّل)؛ (عربی)۔ ۱۔ اس لفظ سے عام طور پر مراد ہے قوموں کے عام وقائع کا بیان، حولیات یعنی وقائع کا بیان بہ ترتیب سالیانہ annals، شرح وقائع بترتیب تاریخی۔ یہ کلمہ بہت سی تاریخی کتابوں کے نام کا جزو ہے؛ مثلاً تکملۃ تأریخ الطَّبری، تاریخ بغداد، تأریخ مکۃ وغیرہ اور تاریخ الاَنْدلُس؛ یہ لفظ ایسی تصانیف کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو بالکل

مختلف قسم کی ہیں؛ مثلاً ہندوستان پر البیرونی نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام تأریخ الہند ہے، حالانکہ یہ کتاب عرفی تاریخ کے بجائے زیادہ‌تر علوم ہند کے متعلق بحثوں پر مشتمل ہے ۔ خاص قسم کی معاجم کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے؛ مثلاً تاریخ الحکماء از ابن القفطی جو علماے متقدمین اور یونانی روایات کے عرب حاملین و متقلدین کے تراجم اور ان کے مؤلفات کے بارے میں ایک کتاب ہے ۔

۲۔ کسی عصر خاص کی ابتداء کی تعیین (era)، حساب ازمان، حوادث کے وقت کی دقیق تعیین (date) ۔ مسلمانوں کے ہاں تاریخ ہجری [رك بآن] کے علاوہ کئی اور تاریخیں بھی مستعمل رہی ہیں؛ مثلاً دنیا کی پیدائش کی تاریخ (''تاریخ العالم'')۔ اس کا شمار بہت غیر یقینی ہے اور یہودیوں، عیسائیوں اور مجوس کے درمیان اس کے متعلق بڑا اختلاف ہے ۔ البیرونی اور عیسائی مؤرخ ابوالفرج (ابن العبری) یہودیوں کو مطعون کرتے ہیں کہ انہوں نے خلق عالم کے بعد کے سالوں کو اتنا گھٹا دیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی تاریخ ''مسیح'' کی آمد کی پیش گوئیوں کے ساتھ مطابق نہ رہی، چنانچہ انہوں نے حضرت آدمؑ کے بیٹے شیثؑ (Seth) کی پیدائش صحیح تاریخ سے سو سال پہلے کر دی اور یہی روش انہوں نے دوسرے بزرگان اسرائیل (patriarchs) کے متعلق حضرت ابراہیمؑ تک جاری رکھی جس کی رو سے ان کے شمار کے مطابق خلقت عالم سے عہد مسیحؑ تک بقول توراۃ کے تقریباً ۵۵۸۶ برس کے بجاے صرف ۴۲۱۰ برس ہوتے ہیں ۔ بقول البیرونی یہود کو یہ توقع تھی کہ ظہور مسیح ۱۳۳۵ سکندری کے آخر میں ہوگا، گو ان کی پیدائش عام راے کے مطابق سنہ سکندری کے تین سو گیارھویں سال میں ہوئی، اسی طرح طوفان نوح کی تاریخ کو بھی مسلمانوں نے استعمال کیا ہے؛ اس کے متعلق بھی عیسائیوں اور یہودیوں میں اختلاف ہے ۔ ابومَعْشَر فلکی نے اسے اپنے قانون (*Canon*) میں استعمال کیا ہے — اسی طرح بُخت‌نَصّر اول (Nebuchadnezzar I) کے سنہ کو جسے بطلموس نے اپنی کتاب المِجِسْطی (*Almagesta*) میں قالپس (Callipus) کے ادوار زمنی (Cycles) کے ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے — یہی حال فلپ اَرِیدِیوس (Philip Arrhidaeus)، سکندر کے باپ کے عہد کے سنہ کا ہے جسے ثاون (Theon) اسکندرانی نے اپنے قانون (*Canon*) میں برتا ہے — اسی طرح تاریخ سکندری بھی استعمال ہوتی رہی ہے جس میں یونانی مہینے ہیں اور جسے تاریخ سولوقیان بھی کہتے ہیں ۔ یہ تاریخ اس سال سے شروع ہوتی ہے جب سولوق نیقاطور شہر بابل میں داخل ہوا اور یہ سکندر کی موت سے بارہ سال بعد کا واقعہ ہے ۔ اس تاریخ کا سریانیوں اور یہودیوں میں بھی رواج رہا اور اسے ''قرار ناموں کی تاریخ'' (era of the Contracts) کہتے ہیں ۔ رومی بھی اسے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ کام میں لائے، آنحضرتؐ ۸۸۲ سکندری میں پیدا ہوے تھے [متن مطبوعہ: ۸۱۲ بجاے ۸۲۲، دائرۃ المعارف الاسلامیہ عربی میں اس مادے کے حاشیے پر محمود حمدی پاشا الفلکی المصری کی تحقیق دی ہے کہ مولد مبارك شب دوشنبہ، ۹ ربیع الاول ۲۱۶ از تاریخ عربی (جاہلی) کو ہوا جو ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق ہے ۔ ادارہ]؛ اسی طرح آگسٹس کی تاریخ بھی رائج رہی ۔ یہی حال انطونیوس کی تاریخ کا تھا جسے بطلیموس نے ستاروں کے مقامات درست کرنے کے لیے استعمال کیا — تاریخ دَقْلَطْیانُوس یا تاریخ شہداء، یہ سنہ دقلطیانوس (Diocletian) بادشاہ کے عہد حکومت کے پہلے سال یعنی ۵۹۶ سکندری سے شروع ہوا ۔ اس سنہ کو قبطی استعمال کرتے تھے — ایران میں اور زردشتیوں کے ہاں یزدجرد ثالث کے دو سنہ

مستعمل ہیں ؛ ایک اس کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا اس کی موت سے ۔

ایران میں اسلامی حکومت کے دور میں تقویم کے متعلق ایک دلچسپ اصلاح عمل میں آئی - خلیفه المعتضد نے پارسی نوروز کو اتنا پیچھے کر دیا کہ وہ زراعتی فصلوں کے موسموں کے مطابق ہو جائے، کیونکہ لوند کے دن (ایام نسیٔ کے) اڑا دینے کی وجہ سے یہ سال بہت آگے بڑھ گیا تھا ۔ 'خانی' یعنی 'ایل‌خانی' سنه ایران میں غازان محمود نے یکم رجب ۷۰۱ھ کو جاری کیا - یه شمسی سال ہے - سلطان ملک شاہ سلجوقی نے تاریخ جلالی قائم کر کے ایک اور اصلاح کی—یکم مارچ ۱۶۷۶ء (بحساب قدیم) کو عثمانیوں نے ایک شمسی تقویم جاری کی جو تقویم جولیانی پر مبنی تھی اور اس کا نام ''عثمانی تقویم مالی'' رکھا - جولیانی سال قمری سال سے کوئی گیارہ روز پہلے شروع ہوتا تھا اور جنتری کی تاریخیں سنه ہجری کی تاریخوں کے مطابق نہیں رہتی تھیں - اکبر بادشاہ نے سنه الٰہی اپنے عہد کے تیسویں سال میں جاری کیا - اس کی ابتداء ۵ ربیع الثانی ۹۶۳ھ (۱۹ فروری ۱۰۰۶ء) یعنی اکبر کی تخت نشینی کی تاریخ سے ہوئی - اس کے سال بھی شمسی تھے - موجودہ زمانے میں مختار پاشا غازی نے ایک اور شمسی تقویم حیرت‌انگیز صحت کے ساتھ تیار کی ہے جس کی رو سے سو صدیوں میں صرف دن کے ۰٫۲۸ء حصے کا فرق پڑتا ہے - ۱۹۲۶ء میں کمالی ترکوں نے اسلامی قمری تقویم کا استعمال ترک کر کے یورپی طریق کی تقویم اختیار کر لی ۔

مختلف تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے یه بتادینا بھی ضروری ہے که حساب جُمَّل جو بعض اوقات ادبی کتابوں میں ملتا ہے، کیا ہے۔ اسکا طریق یه ہے که لفظ یا جمله بنا کر کسی واقعے کی تاریخ نکالی جاتی ہے، یه تاریخ حرفوں کی ابجدی قیمت سے نکلتی ہے؛ مثلاً اس جملے ''نجاةالخَلْق مِنَ الكُفْر بمُحَمَّد'' (کفر سے خلق کی نجات محمدؐ کے ذریعه ہے) کے حروف کی ابجدی قیمت نکال کر اعداد کو جمع کیا جائے تو ۱۳۳۰ کی تاریخ نکلتی ہے (مثال مأخوذ از البیرونی) [الآثار الباقية متن ص ۱۸ ببعد، ترجمه ص۲۲ - لیکن اس جملے سے ۱۳۳۰ اسطرح برآمد ہوتے ہیں که نجاة کی 'ت' کو 'ہ' شمار کیا جائے؛ اس بارے میں دیکھیے آزاد : سبحة المرجان ص۶۶، الآثار الباقية میں دو مثالیں اور دی ہیں، ان دو میں سے صرف پہلی ۱۳۳۰ کے برابر ہے دوسری میں واو بڑھانے کی ضرورت ہے - اداره]

مآخذ : (۱) البیرونی : آثار الباقية (*Chronology of ancient nations*)، تصحیح متن اور ترجمه از زخاؤ (E. Sachau)، لندن ۱۸۷۹ء، باب ۳ و دیگر مواضع کثیره؛ (۲) ابوالفرج : تاریخ مختصر الدُّوَل، طبع صالحانی، بیروت ۱۸۹۰ء؛ (۳) E. Lacoine : *Table de concordance des dates des Calendriers arabe, copte, grégorien, israélite, etc.*، پیرس ۱۸۹۱ء ۔

(B. Carra de Vaux کارا ڈ وو)

تأریخ (مقالۂ دوم) : (عربی) عصر (era)، حساب، تعیین وقت (date) - مقالۂ تأریخ (اول) کا نہایت ضروری تکمله مادۂ ''زمان'' میں آیا ہے اور مقالۂ تأریخ (اول) اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے جب اسے مادۂ ''زمان'' کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے - اس مادّے کو ان دونوں مادّوں 'تأریخ اول' و 'زمان' کا تکمله سمجھنا چاہیے - اس میں ہم وقتاً فوقتاً دوسرے بہت سے مادّوں کا بھی حواله دیں گے جو اس موضوع کے لیے لازمی ہیں ۔

لفظ تأریخ مادۂ و-ر-خ سے مشتق ہے جو سامی زبانوں میں مشترک ہے؛ مثلاً عبرانی زبان کے لفظ یا رےاح = ''چاند'' اور یِرَح = مہینه، میں

یہی مادّہ موجود ہے۔ اس مشابہت کی بنا پر قیاس کریں تو تأریخ کے معنے ہونگے، ''مہینے کی تعیین کرنا''، چنانچہ ایک طرف تو تأریخ کے معنی ہوے کسی واقعے کا زمانہ معین کرنا اور روداد وقائع اور دوسری طرف وقائع کے وقتوں (dates)، اعصار (era) اور ترتیب زمانی کی تعیین (chronology)، البیرونی میں ایک ایسی روایت باقی رہ گئی ہے جو دلچسپ ہے (الآثارالباقیۃ، طبع زخاؤ ص۲۹)۔ یہی روایت الخوارزمی کی مفاتیح العلوم (طبع فان فلوٹن van Vloten ، ۹۷) میں بھی موجود ہے، لیکن وہ صریحاً اس کو رد کرتا ہے۔ اس روایت کے مطابق یہ کلمہ فارسی ''ماہ روز'' کا مُعرَّب ہے۔ اس میں بھی ایک مبہم سا احساس ضرور پایا جاتا ہے کہ اس لفظ کو مہینے کی ابتداء کی تعیین سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ ممکن ہے اس نظریے کو اس روایت سے تعلق ہو (جو متعدد مؤرخین نے بیان کی ہے) جس کی رو سے اسلامی سنہ کو ہجرت کے سال سے شروع کرنے کا مشورہ حضرت عمرؓ کو الہُرمُزان (رَكَ بآن) نے دیا تھا۔ قبّ نیز البیرونی محل مذکور۔

مہینوں کے قدیم عربی نام جو مادّۂ زمان میں البیرونی سے منقول ہیں وہ آثار طبع زخاؤ (Sachau) کی اس جدول سے لیے گئے ہیں جو صفحۂ ۶۹ پر دی ہے۔ یہی نام تھوڑے سے تفاوت سے جسے بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس فہرست اور ان اشعار میں بھی مذکور ہیں جو اسی تصنیف کے ص ۶۰ تا ۶۲ میں درج ہیں۔

اس کے بعد ص۶۳ پر البیرونی نے قوم ثمود کے مہینوں کے نام دیے ہیں اور ساتھ ہی ابو سہل عیسٰی بن یحیی المسیحی (اس کے متعلق قبّ دیباچۂ زخاؤ بر الآثارالباقیۃ ص xxxii؛ نیز ابن ابی اُصیبعۃ طبع ملّر (Müller)، ۱ : ۳۲۷، بعد اور براکلمان : *G.A.L.*، ۱ : ۲۳۸) کے وہ اشعار بھی جن میں اس نے ان ناموں کو سہولت حفظ کے لیے منظوم کیا ہے۔ مہینے کے ہر دن کا نام الگ تھا۔ قبّ البیرونی ص۶۴۔

ہفتے کے سات دنوں کے پرانے عرب ناموں کے متعلق، قبّ فِشر (Fischer) : در *Z.D.M.G.*، ۵۰ : ۲۲۰ تا ۲۲۶۔ ایک دن کو جو ۲۴ گھنٹوں کی ایک اکائی ہوتا ہے یوم کہتے ہیں اور لیل سے امتیاز کرنے کے لیے نہار۔ ''یوم و لیلۃ'' کی ترکیب میں 'یوم' کا لفظ ہمیشہ 'لیلۃ' پر مقدم ہوتا ہے مگر 'نہار' کا لفظ ہمیشہ 'لیل' کے بعد آتا ہے۔ اس کا سبب فشر نے یوں بیان کیا ہے "*Tag und Nacht*" *im Arabischen und die semit. Tagesberechnung* (*Abh. Phil.-hist. Kl. d. Sächs. Ges. d. Wiss.* xxvii, No.: 21)، ۱۹۰۹ء کہ 'یوم و لیلۃ' تو قدیم سامی دستور شمار کے مطابق ہے جس کی رو سے ایک دن کا شمار ایک غروب آفتاب سے دوسرے غروب تک ہوتا تھا، لیکن لیل و نہار سے بعد کے زمانے کا طریق شمار منعکس ہوتا ہے یعنی ایک شام سے دوسری شام تک جس کا تعلّق قمری سال سے ہے۔ ''یوم'' کو ایک جامع اصطلاح سمجھا جاتا تھا اور اسی لیے اسے مقدم رکھا جاتا تھا، لیکن ''نہار'' سے وقت کا ایک ایسا عام تصور مراد ہے جو ''یوم'' کی صورت صرف اس حالت میں اختیار کرتا ہے جب وہ ''لیل'' کے ساتھ مذکور ہو، اسی لیے ترتیب کے اعتبار سے وہ دوسرے درجے پر ہے اور یہی ترتیب درست سمجھی جاتی تھی۔

ایام الفجار سے مراد ''ایّام غدّاری'' نہیں، بلکہ اس سے مراد مقدس مہینے کی بے حرمتی تھی یعنی مقدّس مہینے میں جنگ کرنا [دیکھیے فِجار]، البتہ ایک سال کا نام ''عام الغُدْر'' تھا۔

البیرونی : ص۳۳، سطر ۸؛ (گنزیل (Ginzel) : *Handbuch der Chronologie*، ۱ : ۲۰۱، میں یہ وضاحت سے مذکور نہیں ہے) ۔ البیرونی کی دی ہوئی ترتیب کے مطابق (کتاب مذکور سطر ۱۰) یہ غداری ''عام‌الفیل'' سے پہلے وقوع پذیر ہوئی تھی، تاہم فجار جس کا عام طور پر ذکر آتا ہے آنحضرت[ص] کے عہد شباب کا واقعہ ہے ۔

ہجرت رسول[ص] کے اور اسلامی سنہ کے بارے میں جس کی ابتداء اس واقعے سے ہوئی دیکھیے مادّہ‌ہاے ''ہجرت'' و ''نسیء'' ۔ اس بات کا فیصلہ اب تک قطعی طور پر نہیں ہو سکا کہ یکم محرم ۱ھ کو کونسا دن تھا اور نہ بُول کی سیرت‌الرسول[ص] (بُول Buhl : *Das Leben Muhammeds* ترجمہ از H. H. Schaeder، (۱۹۳۰ء، ص۹۶) ہی میں کچھ ایسی معلومات ہیں جن کے ذریعے سے یہ عقدہ حل ہو سکے ۔ بابنگر (Babinger): *G.O.W.* (قب نیز *M.O.G.*، ۲ : ۲۶۹) کی تقلید کرتے ہوئے مائر (J. Mayr) اس راے کا اظہار کرتا ہے کہ ۱۵ جولائی ۶۲۲ء دراصل ہجری سال کا پہلا دن تھا ۔ بعد میں علم ہیئت کی رو سے مشکلات پیدا ہو گئیں تو انہیں دور کرنے کے لیے ایک غیر معمولی لوند کا دن بڑھانے کے بجاے اس تاریخ کو ۱۶ جولائی میں تبدیل کر دیا گیا ۔ بابنگر ایک تعلیقے میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ سلیم اول کے وقت تک ۱۵ تاریخ ہی کو یکم محرم کی تاریخ مانا جاتا رہا ۔ عاشق پاشازادہ ص ۲۷۳ سطر ۹ میں جو جمعرات کا دن لکھا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے ۔ مصر کی فتح کے بعد ۱۶ تاریخ سے شمار کرنا شروع کر دیا گیا، لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی ۔ ویسٹنفلٹ اور مالر کی جداول (*Vergleichungstabellen*: میں ہجری سال ۱۶ جولائی سے شروع ہوتا ہے جیسے مالر خود درست تسلیم نہیں کرتا (قب طبع دوم ۱۹۲۶ء کا دیباچہ) (قب نیز مادۂ زمان) ۔ بہرحال یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی اسلامی تاریخ اسی وقت بدون شک و شبہ معین ہو سکتی ہے جب معلوم ہو کہ اس روز ہفتے کے دنوں میں سے دن کونسا تھا کیونکہ ۱۵ جولائی ۶۲۲ھ کو جمعرات کا دن تھا اور ۱۶ کو جمعہ (مزید معلومات کے لیے دیکھیے گنزیل : ۱ : ۲۵۸ ببعد) ۔

اسلامی مہینوں کے نام (قب زمان) مرّاکش اور جزائر شرق‌الہند میں بدل گئے ہیں ۔ یہ تبدیلی کہیں جزوی ہے کہیں کلّی ۔ قب گنزیل : ۱ : ۲۵۳ (مراکو) و ۴۱۷ (جاوا) و ۴۲۷ (دوسرے جزائر) ۔ مدغاسکر (رک بآن) میں مہینوں کے لیے بارہ جانوروں کے نام استعمال ہوتے ہیں جو ایک دور کی صورت میں ترتیب دیے گئے ہیں اور گاہے مہینوں کے ایسے نام رکھے گئے ہیں جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں ۔ دیگر معلومات کے لیے وہ متفرق مقالے ملاحظہ ہوں جو مہینوں کے ناموں پر سپرد قلم کیے گئے ہیں ۔

ہر مہینے کی ابتداء اگر رویت ہلال سے کی جائے تو کشاف اصطلاحات‌الفنون (طبع سپرنگر (Sprenger) بذیل مادۂ ''تاریخ'') کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ چار مہینے تو تیس تیس دنوں کے اور تین مہینے انتیس انتیس دنوں کے ایک دوسرے کے بعد علی‌الترتیب آنے ممکن ہیں ۔ مالیے کی وصولی کے لیے شمسی سال جاری کرنے کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان کے متعلق قب گنزیل : ۱ : ۲۶۴ ببعد؛ البیرونی، ۳۱ ببعد و ۶۸؛ گوٹ شمٹ (A. v. Gutschmid) : *Kl. Schr. ii*، (۱۸۹۰ء) : ۵۱۰، ۵۱۳، ۵۷۷ ۔

اس کے لیے جس کی ابتداء طوفان نوح[ع] سے ہوتی ہے (تاریخ الطوفان قب مادۂ تاریخ)، دیکھیے البیرونی، ص ۲۳ ببعد اور جدول ص ۱۳۷ - اس کے قول کے مطابق ہیئت دانوں نے اس سنہ کی ابتداء کو زحل اور مشتری کے پہلے قران کے حساب سے مقرر کیا ہے جو طوفان نوح[ع] سے ۲۲۹ سال اور ۱۰۸ دن قبل ہوا تھا - بخت نصّر اوّل طوفان نوح[ع] کے ۲،۶۰۴ سال بعد تخت نشین ہوا تھا (لیکن جدول میں دونوں ادوار کے درمیان ۸،۶۰،۱۷۳ دن ہیں اس لیے ۲،۶۰۴ سال بظاہر قران زحل و مشتری کی تاریخ سے شمار ہوئے ہیں) اور بخت نصر اور اسکندر اعظم (یعنی تاریخ سلوقی (Seleucid era) کے درمیان ۴۳۶ سال کی مدت ہے - بزعم ابومعشر طوفان اس وقت آیا تھا جب تمام کواکب آخر حوت اور اول حمل میں تھے یعنی ۲،۷۹۰ کبیسہ والے (یعنی شمسی) سال، ۷ مہینے اور ۲۶ دن تاریخ سکندری سے پہلے- البیرونی (صفحہ ۲۵) دونوں حسابوں کے درمیان فرق بتاتا ہے - اگر مذکورۂ بالا ۲،۶۰۴ سال کا حساب زحل اور مشتری کے قران سے کیا جائے (یعنی طوفان ۲،۶۰۴-۲۲۹ = ۲،۳۷۵ سال قبل از بخت نصّر) تو نتیجہ تقریباً یکساں ہی نکلتا ہے ۔

تاریخ بخت نصّر (رکّ بان) کو تاریخ قدیم قبط بھی کہتے ہیں (کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۵۹ سطر ۱۲) اس سنہ کی ابتداء تاریخ سلوقی کی ابتداء [یعنی ۲۶ فروری ۷۴۷ قبل مسیح ، بقول گنزیل ، ۱ : ۱۴۳] سے بقول بیرونی ۱،۵۹،۲۰۲ دن پہلے اور بقول شرام ۱،۵۹،۴۳۶ دن پہلے ہوئی، یعنی مطابق ۴۳۶ سال مذکورۂ بالا ، اس سنہ میں مہینوں کے نام قبطی ہیں - سال کے بارہ مہینے ہیں اور ہر مہینے میں تیس دن، علاوہ ازین پانچ دن مزید لوند کے ہوتے ہیں جو آخری مہینے میں بڑھا دیے جاتے ہیں - تاریخ فلپس (Philippic era) سنین و شہور میں اسی کے مطابق ہے مگر ۴۲۴ سال (= ۱،۵۴،۷۶۰ دن بقول البیرونی، ص ۱۳۷) بعد شروع ہوئی ہے (گنزیل، ۱ : ۱۴۷)، اس کا مبدأ ۱۲ نومبر ۳۲۴ قبل مسیح ہے ۔

تاریخ اسکندر کو جدید قبطی سن بھی کہتے ہیں (کشاف اصطلاحات الفنون)، ۱ : ۵۸،اس کا مبدأ تاریخ سلوقی سے ۲،۱۷،۲۹۱ دن، مگر بقول البیرونی، آثار (ص ۱۳۷) ۲،۱۹،۲۴۲دن و تفہیم [ورق ۱۷۴]، ۲،۱۷،۴۱۵ دن اور بقول شرام Schram ۲،۱۷،۳۲۱ دن بعد ہے - تاریخ سلوقی سے مراد تاریخ سلوقی بعہد دقلطیانوس (Diocletian) ، یعنی گنزیل کی تاریخ دقلطیانوس، قب الآثارالباقیۃ، ۱ : ۲۲۹، مبدأ ۲۹ اگست ۲۸۴ع میلادی)،اصل میں تاریخ اسکندر قیصر اغسطس کے عہد سے شروع ہوتی ہے (گنزیل، ۱ : ۲۲۴ ببعد) اور اس صورت میں اس کا مبدأ ۱۴ فروری ۲۷ قبل از مسیح ہے ۔

تاریخ سلوقی کا مبدأ بقول کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۵۷، ۳،۴۰،۷۰۰ دن، بقول البیرونی ۳،۴۰،۷۰۱ دن، بقول شرام، ۳،۴۰،۷۳۱ دن قبل از ہجرت تھا اور بقول گنزیل ۳ : ۴، اس دن یکم اکتوبر ۳۱۲ ق-م اور بقول شرام یکم ستمبر ۳۱۱ق - م [قب سطور بالا] تھا - یہ تاریخ سکندر کی وفات (۳۲۳) سے پورے بارہ شمسی سال کے بعد ایک دوشنبے کے دن شروع ہوئی ، مگر بقول دیگران سکندر کی تخت نشینی سے چھے سال بعد شروع ہوئی - بعض یہ کہتے ہیں کہ اس کے عہد کے آغاز سے اس کی ابتداء ہوتی ہے (یہ وھی عام غلطی ہے جس کی بنا پر سکندر اعظم اور سکندر چہارم (Aigos) کو آپس میں خلط ملط کر دیا جاتا ہے) بقول البیرونی (ص ۲۸) سکندر

اعظم جب دارا کے خلاف فوج کشی کے ارادے سے بلاد یونان سے نکلا تو اس کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ جب وہ بیت المقدس میں آیا تو اس نے یہودیوں کو حکم دیا کہ تاریخ موسیٰ[ع] و داؤد[ع] کو ترک کر کے اس کی عمر کے ستائیسویں سال سے ایک نئی تاریخ کا آغاز کریں۔ یہود نے اس کے احکام کی پیروی کی، مگر نئی تاریخ کا آغاز اس کی عمر کے چھبیسویں سال سے کیا، کیونکہ احبار کی طرف سے موسیٰ[ع] کے بعد ہر ہزار سال کے گذرنے پر تاریخ بدلنے کی انھیں اجازت تھی اور ہزار سال سکندر کے چھبیسویں سال میں تمام ہوتے تھے۔ (قب نیز گنزیل، ۱ : ۱۷۶، ۲۶۳ - مہینوں کے متعلق علحدہ مادّے دیکھیے)۔

ایرانی تقویم کی تشریح ابھی کافی طور پر نہیں ہوسکی۔ یہ یقینی بات ہے کہ قدیم ایرانی سال بھی بارہ ہی مہینوں کا شمسی سال تھا جس میں بارہ مہینے تو تیس تیس دن کے ہوتے تھے اور ان کے علاوہ پانچ دن لوند کے بھی شامل ہوتے تھے یعنی سال کل ۳۶۵ دن کا ہوتا تھا۔ ہر مہینے کے دنوں کے نام مقرر تھے۔ ناموں کی ژندی اور پہلوی صورتیں گنزیل، ۱ : ۲۸۱ میں درج ہیں اور موجودہ ایرانی نام البیرونی (الآثارالباقیة ص ۴۰) میں موجود ہیں۔ ہر مہینے کے آٹھویں، پندرھویں اور تیئیسویں دن کا ایک ہی نام ہوا کرتا تھا (دیکھیے ذیل کا بیان، بقول البیرونی ص ۴۶ ببعد، سغدیوں اور خوارزمیوں کے ہاں بھی یہی دستور تھا، دیکھیے گنزیل، ۱ : ۳۰۷ ببعد؛ خوارزمیوں کی تقویم کے متعلق دیکھیے مادۂ خوارزم)۔ مہینوں کے نام حسب ذیل ہیں (ان ناموں کی صورتیں وہ ہیں جو علحدہ علحدہ مادّوں کے لیے اختیار کی گئی ہیں۔ وہ نام جن پر ہماری اس کتاب میں مادّے موجود ہیں ان پر ستارے (*) کا نشان دے دیا ہے : *فروردین (۱۹)؛ *مرداذ (۷)؛ *آذر (۹)؛ *اردی بہشت (۳)؛ *شہریر (۴)؛ *ذے (۸، ۱۵، ۲۳)، *خرداذ (۶)؛ *مہر (۱۶)؛ *بہمن (۲)، تیر (۱۳)، *آبان (۱۰)؛ اسفندارمذ (۵)۔ ان ناموں کے معانی کے متعلق دیکھیے گنزیل : ۱ : ۲۷۸ ببعد۔

مہینوں کے تمام نام دنوں کے ناموں کی صورت میں بھی ملتے ہیں، چنانچہ اس دن کا عدد جو مہینے کا نام بھی ہے قوسین میں دکھا دیا گیا ہے۔ ان میں تمیز کرنے کے لیے مہینہ مراد ہو تو نام کے آخر میں لفظ ماہ اور دن مقصود ہو تو لفظ روز بڑھا دیا جاتا ہے وہ دن جس میں مہینے اور دن کا نام ایک ہو تہوار کا دن سمجھا جاتا تھا؛ قب تبصرہ درگنزیل، ۱ : ۲۸۹ ببعد۔

چونکہ ۳۶۵ دنوں کا سال شمسی تقویمی سال (tropic year) سے تقریباً چھے گھنٹے کم ہوتا ہے اس لیے مختلف موسموں سے اس کا تعلق غیر متبدّل تبھی رہ سکتا ہے جب کہ ہر چار سال کے بعد ایک لوند کا دن بڑھا دیا جائے یا ہر ایک سو بیس سال کے بعد ایک لوند کا مہینہ زیادہ کر دیا جائے۔ روایت ہے (قب گنزیل، ج ۱ : فصل ۶۷ تا ۶۸) کہ مؤخرالذکر طریقہ استعمال تو ہوتا تھا لیکن اس کی پابندی سختی سے نہیں کی جاتی تھی۔ کتابوں میں یہ بیان درج ہے کہ تکبیس یعنی لوند کا مہینہ اور لوند کے دن بڑھانے کا عمل ۱۴۴۰ سالہ دور میں باری باری سے ہر مہینے کے بعد ہوتا تھا۔ اس طرح پورا دور ختم ہونے تک پورے سال پر یہ عمل ہو چکتا تھا اور ۱۴۴۰ سال میں ایک سال بڑھ جاتا تھا۔ جس مہینے کے بعد لوند کا مہینہ بڑھاتے تھے وہی نام لوند کے مہینے کو دے دیتے تھے اور اس میں دوم کا لفظ شامل کر دیتے تھے۔ اس بیان کی نہایت عمدہ وضاحت گوٹ شمٹ نے یوں کی ہے : (*Über das iranische Jahr* در مجموعۂ *Kl. Schr.* ج ۳

۱۸۹۲ء، ص ۲۰۵ ببعد) کہ سال دھرا شمار کیا جاتا تھا یعنی ایک متحرّك اور ایک معین، ہر ایک سو بیس سال کا دور گذرنے پر معین سال کے ساتھ ایک لوند کا مہینہ بڑھا دیا جاتا تھا ۔ پہلی تکبیس تک لوند کے دن سال کے آخر میں آتے تھے ۔ پہلی تکبیس سے سنہ ایک سو اکیس متحرك کا فروردین ایک سو بیس معیّن کے ماہ فروردین دوم کے مطابق ہو گیا تھا ۔ اعمال تکبیس دونوں سالوں میں اسی مہینے میں ہوئے اور اگلے ۱۲۰ سال میں معین سال کے ماہ اسفندارمذ سے متاخّر رہے جو اگلے متحرك سال کے فروردین سے منطبق ہوا ۔ اب دوسرے ایک سو بیس سالہ دور کے بعد لوند کا مہینہ متحرك سال دو سو اکتالیس کے ماہ اُردی بہشت سے منطبق ہوا اور اُردی بہشت دوم اس کا نام ہوا ۔ لوند کے دن اس کے بعد ہی آئے اور اس سے اگلے ایک سو بیس سالہ دور میں متحرك سال کے ماہ اُردی بہشت سے یا یوں کہیے کہ پچھلے معیّن سال کے اسفندارمذ سے متاخّر رہے ۔ سال معیّن میں لوند کا مہینہ اور لوند کے دن ہمیشہ آخر میں آتے تھے، صرف متحرّك سال میں ان کا نام اور مقام بدلتا تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا ۔ اب چونکہ ایک لوند کا زمانہ انوشروان کے عہد میں آیا جس میں لوند کے دن آبان کے مہینے کے بعد آئے، لہذا اس وقت (یعنی ۵۳۰ء کے قریب) سب سے پہلے لوند پر ۸ × ۱۲۰ = ۹۶۰ سال کا زمانہ گذر چکا ہوگا اس لیے یہ دور لازمی طور پر ۴۳۰ ق-م کے قریب شروع ہوا ہوگا ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے کنزیل، ۱ : ۲۹۷ ۔

عہد انوشیروان کی تکبیس کے بعد دوسری تکبیس تقریباً ۶۵۰ء میں ہوئی ہوگی، لیکن اس زمانے تک ایران مذہب اسلام اختیار کر چکا تھا ۔ چونکہ ایران میں کوئی معین سنہ یا تاریخ نہ تھی، بلکہ ہر نئے بادشاہ کے عہد حکومت سے ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوتا تھا اور شاہان ایران کا سلسلہ یزدجرد ثالث پر آ کر ختم ہو گیا، اس لیے لوگ اسی کے عہد (یعنی ۶۳۲ء) سے اپنا سال شمار کرتے رہے اور اس طرح یزدجرد سنہ کا آغاز ہوا اور اس سنہ کا نام عین اسی حکمران کے نام پر رکھا گیا، جس کے عہد میں یہ سلطنت برباد ہوئی تھی ۔ یہ دور ۱۶ جون ۶۳۲ء کو سہ شنبے کے دن شروع ہوا تھا = ۱۹,۵۲,۰۶۳ دن مطابق تقویم یولیوسی (Julian) (شرام Schram) = ۳,۶۲۲ یا ۳,۶۲۳ دن بعد از ہجرت (قب کنزیل، ۱ : فصل ۶۰ ؛ کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۵۸) ۔ چونکہ تاریخ یزدجردی کی پہلی صدیوں میں لوند نہ تھا، اس لیے لوند کے دن متحرك سال آبان ماہ کے آخر میں برابر آتے رہے، اس لیے سنہ یزدجردی کے حساب سے تاریخوں کا شمار کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس مصنف نے یہ تاریخ دی ہے اس نے لوند کے دن کہاں شامل کیے ہیں ۔ شرام نے اپنی تالیف (*Kalendariographischen Tafeln*) میں اسفندارمذ ماہ اور نیز آبان ماہ دونوں کے آخر میں لوند کے ایام دیے ہیں ۔

لوند کے مذکورہ حذف کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ یزدجردی کا نوروز آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا، تاآنکہ سلجوق سلطان جلال الدین ملک شاہ بن الپ ارسلان نے تقویم کی اصلاح کی ۔ اس سنہ کے متعلق دیکھیے مادۂ ”جلالی“ ۔ کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۵۹، کے مطابق یہ تاریخ جمعے کے دن ۱۸ فروردین، تقویم قدیم = روز ۴۴۸ء ۱,۶۳,۳ یزدجردی کو شروع ہوئی جسے اول فروردین ماہ جلالی (یعنی از تقویم جدید) شمار کیا گیا ۔ یہ تاریخ ۱۰ رمضان ۴۷۱ھ (۱۵ مارچ ۱۰۷۹ء قب کنزیل، ۱ : فصل ۷۰) کے مطابق ہے ۔ اس زمانے سے چل کر آئندہ ہر چار سال کے بعد ایک چھوٹے لوند کے دن کا اضافہ ہونے لگا اور

وقتاً فوقتاً ایک سال چھوڑ بھی دیا جاتا تھا
قب نیز مادۂ نوروز.

اس تقویم میں ایلخان غازان محمود (رک بآن) نے ایک جدید اصلاح کی۔ گنزیل (۱ : ۳۰۴) حمداللہ مستوفی قزوینی (رک بہ قزوینی) کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس ایلخانی تاریخ کا مبدأ پنجشنبہ ۱۳ رجب ۷۰۱ھ (۱۳ مارچ ۱۳۰۲ء) سے ہوا۔ اگر ویسٹنفلٹ اور مالر (Wüstenfeld-Mahler) کی رائے کے برعکس ہم ۱۵ جولائی ۶۲۲ کو سنہ ہجری کا مبدأ مان لیں تو یہ دونوں تاریخیں آپس میں مطابق ہو جاتی ہیں، لیکن دن آپس میں مطابق نہیں، کیونکہ پہلی رجب ۷۰۱ھ کو پنجشنبہ یا جمعہ تھا اور ۱۳ تاریخ کو سہ شنبہ یا چہار شنبہ، اس انتشار پر طرہ یہ ہے کہ کشاف اصطلاحات الفنون (۱ : ۵۹) میں اس تاریخ کا مبدأ دوشنبے کو قرار دیا گیا ہے اور اس سال کی ابتداء ۲۲۴ جلالی سے کی گئی ہے، جو ۱۳۰۲ء کے مطابق ہے۔ ایلخانی تاریخ کی تفصیلات کی ابھی پورے طور پر تشریح نہیں ہو سکی، گو یہ تاریخ کچھ ایسی زیادہ اہم نہیں ہے۔

شہنشاہ اکبر کی تقویم کے متعلق دیکھیے، گنزیل : ۱ : فصول ۱۰۸ تا ۱۰۹۔

کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۶۰ بر ترکان قدیم کی تقویم کی پوری تفصیلات درج ہیں جن سے مختلف امور کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب اس کتاب کا مصنف ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ترکوں کا سال حقیقۃً شمسی سال (دیکھیے کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۲۲۷ بذیل سند) تھا تو اس کی مراد شمسی قمری سال سے ہے (دیکھیے الشمس) یعنی بارہ قمری مہینوں کا سال جس میں ۳۵۴ یا ۳۵۵ دن ہوتے تھے اور جسے شمسی سالوں کے ساتھ لوند کے مہینے بڑھا کر مطابق کیا جاتا تھا اور یہ اضافہ ایک مقررہ اور معینہ ترتیب میں ہوا کرتا تھا۔ لوند کے سالوں کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ ہر تیس سال کے دور میں اس قسم کے سال گیارہ ہیں "جیسا کہ عربوں کے ہاں دستور ہے" : اس میں اشارہ اسلامی سال کی طرف ہے جو ۳۵۵ دنوں کا ہوتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ۱۹ سال کی مدت میں لوند کا مہینہ بظاہر صرف سات دفعہ شامل کیا جاتا تھا، جیسا کہ اہل چین کا دستور ہے، جن سے قدیم ترکوں نے اپنی تقویم لی تھی (گنزیل، ج ۱، فصل ۱۳۶ : قدیم ترکی کتبوں کی ترتیب تاریخی ٹامسن Thomsen : *Alttürkische Inschriften aus der Mongolei* در *Z.D.M.G.*، شمارہ ۷۸ : ۱۳۲ ببعد) اور جیسا کہ یہود کا دستور ہے ؛ مگر نتیجہ یکساں ہی رہا، کیونکہ ۱۱/۳۰ اور ۷/۱۹ میں صرف ۱/۵۷۰ کا فرق ہے۔ مہینوں کے جو نام مصنف نے دیے ہیں وہ اویغور قوم کے مہینوں کے مطابق ہیں جیسا کہ گنزیل، ۱ : ۵۰۳ نے الغ بیگ کے حوالے سے دیے ہیں۔ تکبیس چینیوں کے طریقے کے مطابق جاری رہی (گنزیل ۱ : ۴۷۶ ببعد)۔ اہل چین کے طریق پر سال کو چوبیس حصوں (tsie اور k'i) میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ضروری تھا کہ ان میں سے ہر دو حصے ایک مہینے میں آتے اگر دوسرے حصے کا کچھ حصہ اگلے مہینے میں آ جاتا تو اس مہینے کو لوند کا مہینہ یا کبیسہ ('زائد' ترکی میں شون آی، یعنی چینیوں کا جُن (jun)؛ گنزیل ۱ : ۴۷۴) سمجھا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ لوند کا مہینہ سال کے کسی معین مقام میں واقع نہیں ہوتا۔ سال کا آغاز ۱۶ درجے الدلو سے ہوتا ہے۔ یہ بھی چینی حساب کے مطابق ہے (گنزیل، ۱ : ۴۷۰ ببعد)۔ ایک سال کی مدت ۳۶۵،۲۴۳۶ دن (۰،۰۰۰۱ دن = ۸،۶۴ ثانیہ = ایک فنک)

محسوب کی گئی ہے = ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے صفر منٹ ۳۶٫۴۹۸ ثانیہ - یہ اندازہ نمایاں طور پر غلط ہے، مگر متن کی خرابی کی وجہ سے نہیں، کیونکہ اس کی تصدیق اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ سال کو چوبیس برابر حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر حصے میں پندرہ دن ۲۱۸۴ ۵/۶ فنک ہوتے ہیں - مہینے حقیقی قمری ہیں، یعنی قرانی قمری مہینے جن میں سے ہرایک اجتماع حقیقی یعنی قران سیارتَین کے وقت سے شروع ہوتا ہے (دیکھیے مادۂ القمر) - لوند کے دور میں کسی سال کے محل و موقع کو معین کرنے کا طریق یہ ہے کہ تاریخ یزدجرد کے ہم زمانہ سال سے ۶۳۲ کو تفریق کرکے باقی کو ۳۰ پر تقسیم کر دیا جاتا ہے اور سال ۳۶۵ دنوں کا شمار ہوتا ہے - تقسیم میں اگر باقی ۳۰ سے کم رہ جائے اور وہ ۲ یا ۵ یا ۷ یا ۱۰ یا ۱۳ یا ۱۶ یا ۱۸ یا ۲۱ یا ۲۴ یا ۲۶ یا ۲۹ کا عدد ہو تو وہ لوند کا سال ظاہر کرتا ہے - یہ طریق حساب جو لوند کے مہینے سے متعلق ہونے کی نسبت سال کے ۳۰۰ ویں دن سے زیادہ وابستہ ہے لازم ہے کہ ۶۳۲ یزد جردی = ۱۲۶۳ء ہی میں شروع ہوا ہو۔

قدیم ترکوں کے دستور ہی سے مصنف کو یہ بات معلو ہوئی کہ چینیوں نے دن کو دو دو گھنٹے کی مدّت (’چاغ‘ دیکھیے ریڈ ہاؤس (Redhouse) بذیل کلمۂ چینی *schi* قبّ گنزیل، ۱ : ۳۶۵) میں تقسیم کر رکھا تھا - پھر اس دو گھنٹے کی مدّت کو آٹھ کھنّ (کھنا ؟ چینی *k'o* قبّ گنزیل محل مذکور) میں تقسیم کیا ہے - مصنف ترکوں کے واسطے سے اہل چین کے ساٹھ ساٹھ حصوں والے دور (الدورالستّونی) سے بھی واقف ہے جو دور عشری اور دور اثناعشری سے مرکب تھا (گنزیل، ۱ : ۵۰۴ ببعد) - وہ اثناعشری دور کے سلسلے میں کہتا ہے کہ ان کے نام حیوانوں کے مشہور ناموں پر تھے جن کی طرف ہر سال منسوب ہے (گنزیل، ۱ : ۵۰۳) - کسی خاص دن کے انتخاب (’اختیار‘ دیکھیے مقالۂ ’’علم احکام نجوم‘‘) کے لیے بارہ دن کا ایک دور تھا جس میں ہر دن ایک مخصوص رنگ کی طرف منسوب تھا۔

تاریخ کا مبدأ خلق عالم ہے، چنانچہ ۸۶۰ یزدجردی میں خلق عالم کے بعد ۸,۸۶۳ قرن اور ۹,۹۶۰ سال گذر چکے تھے - یہ دنیا ۳۰۰,۰۰۰ قرن تک قائم رہے گی اور ہر ایک قرن میں دس ہزار سال ہونگے۔

ترکیہ میں جو تقویم استعمال ہوتی ہے اس کے لیے دیکھیے مادۂ سالنامہ -

اسلام میں علم ترتیب تاریخ (Chronology) بہت حد تک علم الہیئۃ (رکّ بآں) کے ارتقاء کے مطابق ہے - آثار طبیعی کا علم جو قرآن سے مترشح ہوتا ہے، اس کا مطالعہ ابھی خاص طور پر نہیں ہوا - علم ہیئت اور تقاویم سنین کے حوالے نلینو (Nallino) کی تالیف علم الفلک تاریخہ عند العرب فی القرون الوسطی (روما ۱۹۱۱ء) ۸۳، ۱۰۴ تا ۱۱۲ میں تفصیل سے دیے ہیں قبّ نیز مادۂ ’’المنازل‘‘ اور ’’نسیء‘‘ نیز پلسنر کا مقالہ مجلۂ *Der Islam* میں ۲۱ : ۲۲۶ تا ۲۲۸-اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ البیرونی کی کتاب الآثار الباقیۃ (جس کا انگریزی ترجمہ *Chronology of ancient Nations* کے نام سے لندن سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا) علمی تصانیف کی دنیا میں ایک بالکل نئی چیز ہے، کیونکہ اس میں پہلی بار اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ تمام معلومہ اقوام کی تمام تواریخ کو جمع کرکے ان کا تنقیدی مطالعہ علم ہیئت کے نقطۂ نظر سے کیا جائے اور پھر تاریخی اعتبار سے انکا باھمی مقابلہ کیا جائے -

الآثار کا خلاصہ خود البیرونی نے اپنی تصنیف کتاب التفہیم لأوائل صناعة التنجیم ورق ۱۶۱ تا ۱۹۳ میں دے دیا ہے ۔ تفہیم کا حامل المتن انگریزی ترجمہ بقلم R. Ramsay Wright : *The Book of Instruction in the Elements of the Art of Astrology* کے نام سے لندن میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا ۔ متن برٹش میوزیم کے قلمی نسخے شمارۂ Or. 8349 سے نقل کیا گیا ۔ ان دونوں کتابوں کے حسابات میں قدرے اختلاف ہے جیسا کہ سطور بالا میں واضح ہوا ۔

عالمی تاریخوں کی تمہید میں بھی کچھ مواد اس قسم کا ملتا ہے؛ مثلاً الطبری، ۱ : ۳ ببعد میں، اس سے زیادہ مختصر بیان ابن الأثیر ۱ : ۹ ببعد میں ہے ۔ ان تاریخوں میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ابتداے آفرینش سے جو زمانہ اب تک گذر چکا ہے اس کا اندازہ یہودیوں کے نزدیک ۴,۳۴۲ سال کا ہے، لیکن یہ اندازہ یہودیوں کی تقویم کے مطابق نہیں ہے ۔ یونانیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ابتداے آفرینش سے لیکر ہجرت تک ان کا اندازہ ۵,۹۹۲ سال اور ایک مہینے کا ہے اور مجوس کے نزدیک گیومرث سے لے کر ہجرت تک کے زمانے کا اندازہ ۳,۱۳۹ سال کا ہے ۔

گیتی شناسی (cosmography) کی کتابوں میں بھی اچھا خاصا مواد موجود ہے؛ مثلاً القزوینی کی عجائب المخلوقات، طبع ویستنفلٹ ۶۲ تا ۸۷ میں؛ النویری کی نہایة الأرب ۱ : ۱۵۷ تا ۱۹۷ میں بھی ادبی اور علمی اعتبار سے دلچسپ معلومات ملتی ہیں؛ مثال کے طور پر نہایة ص ۱۶۷ و ۱۶۸ میں ۸ھ اور ۳۹ھ کے درمیانی [سات ۔ ادارہ] سالوں کی ایک فہرست ہے جنھیں بعض واقعات کی بناء پر جو ان سالوں میں پیش آئے تھے، خاص نام دیے گئے ۔ وہ ہیئتی اطلاعات، جو حسابات میں خصوصاً موسموں کے متعلق حسابات میں در کار ہیں، رسائل اخوان الصفاء، ۱ : ۹۶ ببعد، ۲ : ۱۶ ببعد میں ملیں گی ۔

مآخذ : (۱) وہ تصانیف جن کا ذکر متن مادہ میں کر دیا گیا ہے؛ (۲) علم ہیئت اور متعلقہ موضوعات پر مختلف مادے؛ (۳) سارٹن (Sarton) : *Introduction to the History of Science*، ۱۹۲۷ء ببعد، مختلف منجموں کے ذیل میں؛ (۴) البتانی عربی متن الزیج الصابی (*Opus astronomicum*)، طبع و ترجمۂ لاطینی نلینو (C. A. Nallino)، ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۷ء؛ (۵) ونسنک Wensinck : *Handbook* بذیل مادۂ Calendar؛ (۶) گرے (Gray) در *Grund. der Ir. Phil.*، ۲ : ۶۷۵ تا ۶۷۸ (صرف اس لحاظ سے مفید ہے کہ اس مبحث سے وابستہ کتابوں کی مکمل فہرست اس میں دی ہے)؛ (۷) [ابوالفضل : آئین اکبری، طبع بلاخمن، ۱ : ۲۶۵ تا ۲۷۹، ترجمۂ جیرٹ، جلد ۲، طبع دوم، ص ۱ تا ۳۲ ۔ ادارہ] .

(M. Plessner پلسنر)

تاریخ [سوم] ("علم التاریخ") : ادبیات کی ایک اصطلاح ہے، جس میں سالنامے (وقائع سالیانہ، حولیات) اور سیر دونوں شامل ہیں (لیکن معمولاً اس میں تاریخ ادب کو شامل نہیں کرتے) ۔ عربی اور فارسی تاریخ نگاری کے ارتقا کا حال ایجاز کے ساتھ ذیل کے چار شعبوں میں تقسیم کرکے بیان کیا جاتا ہے :

(ا) ابتداے تاریخ نگاری سے تیسری صدی ہجری تک.

(ب) تیسری صدی ہجری سے چوتھی صدی ہجری تک.

(ج) چوتھی صدی کے آخر سے لے کر دسویں صدی کے آغاز تک .

(د) دسویں صدی ہجری سے تیرھویں صدی تک ۔

عثمانی ترکوں کے تاریخی ادب کے لیے دیکھیے مادۂ ترك (ب) ... عثمانیان III (الف) ؛ ترکی اسلامی ادب، بنارھویں صدی؛ اور جو تاریخی مواد ملائی زبان

میں لکھا گیا اس کے لیے دیکھیے مادۂ ''ملایا'' مقالے کا آخری حصہ)۔

(الف)

عربی میں تاریخ نگاری کی ابتداء کیونکر ہوئی، یہ مسئلہ ابھی تک قطعی طور پر حل نہیں ہو سکا ۔ زمانۂ جاہلیت کے ملک عرب کی اساطیری اور زبان زد عوام روایتوں اور داستانوں اور دوسری صدی ہجری کی نسبۃً علمی اور دقیق تاریخ نگاری کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے، جسے ابھی تک پر نہیں کیا جا سکا ۔ زمانۂ حال کے متعدد مصنفین کا ایک نظریہ یہ ہے کہ اس ارتقاء کے سلسلے میں فارسی کی کتاب شاہ نامے کے نمونے کا قطعی اثر پڑا [دیکھیے فصل الف/۴ در ذیل (ص ۴۳ الف)]، لیکن غالب گمان یہ ہے کہ عربی میں تاریخ نگاری مختلف قسم کے تاریخی اور نیم تاریخی نگارش کے دھاروں کی آمیزش اور اختلاط کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ زیادہ آسانی اس میں رہے گی کہ ہم ان سب پر یہاں علٰحدہ علٰحدہ بحث کریں۔

(۱) زمانۂ جاہلیت کی تاریخی روایت: توقع تو یہ تھی کہ یمن میں، جو ایک قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہ چکا ہے اور جس کی یادگاریں اب تک معینی (Minean)، سبائی اور حمیری کتبوں کی صورت میں محفوظ چلی آتی ہیں، کسی نہ کسی قسم کی تحریری تاریخی روایت دستیاب ہوگی، لیکن جو کچھ اس سلسلے میں ہم تک پہنچا ہے اس پر صرف زبانی روایت کے نقوش موجود ہیں یعنی چند پرانے بادشاہوں کے نام، زمانۂ بعید کی مبہم اور مبالغہ آمیز داستانیں اور اسلام سے قبل کی آخری صدی کے واقعات کی مقابلۃً صحیح تر لیکن دھندلی سی یاد [دیکھیے سبأ اور ابرھہ]۔ پہلی صدی ہجری میں ان زبانی روایات کو تخیل کے زور سے بڑھا چڑھا کر داستانوں کی صورت میں بیان کیا جاتا تھا اور یہی داستانیں قدیم تاریخ عرب سمجھی جاتی ہیں۔ اس قسم کی داستانوں کو وَھْب بن مُنَبِّہ (رَکَ بآن) اور عَبید (عُبَید) بن شَرْیَة کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ ان دونوں کی کتابوں میں اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ قدیم عربوں میں تاریخی حس اور نظری تناسب کے ادراک (Perspective) کا فقدان تھا اور یہ نقص اس وقت بھی موجود ہوتا ہے جب وہ تقریباً معاصر وقائع کا ذکر کرتے ہیں۔ دیکھیے کرینکو (F. Krenkow) : *The Two Oldest Books on Arabic Folklore* در *Islamic Culture*، ج ۲ : بایںہمہ بعد کی نسلیں ان بیانات کو عموماً صحیح تسلیم کرتی رہیں اور مؤرخین اور مصنفین نے انھیں واقعات کو اپنی تصانیف میں شامل بھی کر لیا ۔ ابن اسحٰق (رَکَ بآن، نیز دیکھیے در ذیل) عُبید کے راویوں میں سے تھا اور عبدالملک بن ہشام (رَکَ بآن) نے وھب کی کتاب التیجان کو اس کی موجودہ صورت میں نشر کرنے کے لیے مرتب کیا ۔ اور تفسیر طبری جیسے کارنامۂ فضل میں اس سے جابجا استفادہ کیا گیا ۔ یہ سچ ہے کہ ابن خلدون نے ان میں سے بعض یمنی روایات کی بیہودگیوں کو پوست کندہ طریق سے واضح کیا ہے (۱ : ۱۳ ، ۱۴)، لیکن پھر بھی وہ انھیں روایات کو اپنے نظریوں کے اثبات میں پیش کیے چلا جاتا ہے ۔ الغرض اس قسم کی روایات کا مواد عربوں کی تاریخ نگاری میں برابر شامل رہا اور حسّ تنقیدی کے نشو و نما اور قدیم تاریخ کے مسائل کو واضح طور پر سمجھنے میں مانع رہا۔

شمالی حصے کے عربوں میں ذرا مختلف صورت حالات نظر آتی ہے ۔ اگرچہ وہاں ہر قبیلے میں اپنی روایات محفوظ ہوتی تھیں جو بہت سی صورتوں میں قبائلی افق سے بلندتر ہو گئی تھیں اور ان میں انساب کے متعلق ایسے مجموعی تصورات بھی شامل ہو گئے تھے جو سب عربوں پر حاوی ہوں،

لیکن ان روایات میں ایسی بات مطلق نظر نہیں آتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ شمالی عربوں کی کوئی واحد یا مشترکہ تاریخی روایت بھی تھی - قبائلی روایات نے جو صورت اختیار کی وہ بھی بجائے خود بڑی اہمیت رکھتی ہے - زیادہ‌تر یہ روایات ''ایّام‌العرب'' سے متعلق ہیں، جبکہ ایک قبیلہ یا اس کی کوئی شاخ کسی دوسرے قبیلے یا شاخ سے بر سر پیکار ہوئی تھی [دیکھیے ایّام‌العرب] - ان واقعات کے متعلقہ بیانات میں عام طور پر شعر بھی ملتے ہیں - بیانات کے ان منثور اور منظوم عناصر کی باہمی نسبت ہمیشہ یکساں نہیں وہی - بعض مثالیں تو ایسی ہیں جن میں شعر صرف کسی واقعے کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ایک آلۂ کار کا کام دیتا ہے - دوسری صورتوں میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منثور بیان صرف شعروں کی تشریح و تفسیر ہے، لیکن دونوں صورتوں میں روایات کو دائر و سائر رکھنے کا کام اشعار ہی نے انجام دیا اور جونہیں قدیم اشعار حافظے سے جاتے رہے، متعلقہ قدیم روایات بھی غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ قبائلی تاریخ کے زیادہ قریب کے واقعات نے نئے اشعار کی شکل میں لے لی - ایسی قبائلی روایات لازمی طور پر یک طرفہ، واقعات کی تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مبہم اور اکثر اوقات افسانوی حد تک مبالغہ‌آمیز تو ضرور ہوتی تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ حقیقت سے بالکل خالی نہیں ہوتی تھیں، اور بعض اوقات تو ان میں معتدبہ مقدار مغز صداقت کی موجود ہوتی تھی - اسلامی فتوحات نے قبائلی روایت کے طریقے کو موڑ تو دیا، لیکن اس کے خصائص میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی اور جدید روایات کا پس منظر تو وسیع‌تر ہو گیا، مگر نثر و نظم کا اتصال بدستور قائم ہے اور حسب سابق بیانات میں مبالغہ آمیزی بھی ہے اور نادرستی اور بےدقّتی بھی - اس کا اثر اسلامی علم تاریخ پر پڑنا ہی چاہیے تھا، اس لیے کہ قبائلی روایات ہی میں وہ مواد موجود تھا، جسے بعد کے مؤلفین نے دور خلافت راشدہ اور بنوامیہ کی تاریخ نویسی کے لیے استعمال کیا (دیکھیے فصل الف/۲ در ذیل [ص ۱۰ ب]) -

قبائلی روایات میں دوسرا عنصر یہ تھا کہ قبیلے کے انساب محفوظ رکھے جائیں، مگر بنوامیہ کے ابتدائی دور میں محکمۂ دیوان کی وجہ سے اور حریف عرب گروہوں کے حامیوں کی انگیخت کے باعث علمائے انساب کی سرگرمیوں سے یہ حالت پیدا ہو گئی کہ ''علم''الانساب میں عجیب قسم کی الجھن پیدا ہو گئی - (دیکھیے گولڈ تسیہر: *Muh. St.*، ۱ : ۱۷۷ تا ۱۸۹) -

ہجری کی دوسری صدی میں قبائلی روایت کا میدان، جو اس وقت تک راوی اور نسّاب ہی کے لیے مخصوص تھا، ماہرین لسانیات کی جولانگاہ بن گیا، جنھوں نے یہ کوشش کی کہ قدیم شعر و سخن کے سلسلے میں جو کچھ باقی رہ گیا ہے، اسے جمع کریں اور اس کی تشریح کریں - اس عظیم‌الشان مواد کے جمع کرنے اور اسے علٰحدہ علٰحدہ کرنے اور ترتیب دینے میں انھوں نے علم تاریخ کی شاندار خدمات انجام دیں - اس قسم کی سرگرمیوں کا نمونہ ابوعبیدۃ (رک بآں) (۱۱۰ھ تا ۲۰۹ھ / ۷۲۸ع تا ۸۲۳ع) نے پیش کیا - وہ عراقی‌نژاد موالی میں سے تھا، تقریباً دو سو مفرد رسائل اس کی طرف منسوب ہیں، لیکن ان میں سے ایک بھی اس کے نام سے ہم تک نہیں پہنچا، گو ان میں سے بہت سوں کا مواد بعد کی تصانیف میں شامل کر لیا گیا - یہ رسائل شمالی عرب کی تمام و کمال روایات پر حاوی ہیں، ان میں انھیں آسان موضوعات کے ماتحت ترتیب دیا گیا ہے؛ مثلاً انفرادی قبائل اور بطون قبائل کی روایات اور وہ روایات جو ''ایّام عرب'' سے متعلق

تھیں ۔ یہ سلسلہ مابعد اسلام کی روایات پر بھی مشتمل ھوا اور اس میں وہ روایات بھی تھیں جو مختلف صوبوں کی فتح، اھم واقعات اور جنگوں کے متعلق تھیں اور وہ بھی جو ایسے گروھوں کی بابت تھیں، جیسے قضاۃالبصرۃ، خوارج اور موالی ۔ ابوعبیدۃ پر یہ الزام تھا کہ وہ شعوبیۃ (رَكَ بآن) کی جانب داری میں عربوں پر طعن کرتا ھے، لیکن جو الزام اس پر عائد کیے جاتے ھیں ان کی تدقیق سے تو یہ متبادر ھوتا ھے کہ کسی عصبیت کا ثبوت ھونے کے بجاے، وہ گویا اسکی غیرجانبداری کی دلیل ھیں.

کچھ اسی قسم کا کام ہِشام بن محمد الکلبی (م-نواح ۲۰۴ھ/۸۱۹ع) [دیکھیے مادّۂ الکلبی اور دیباچۂ طبقات ابن سعد، ۳ : ۲۱ تا ۲۳ میں زخاؤ کا بیان] نے بھی سرانجام دیا ۔ جو مواد اس کے اپنے والد (م-۱۴۶ھ/۷۶۳ع)، عَوانۃ اور ابو مِخْنَف (دیکھیے سطور ذیل) نے جمع کیا تھا، ھشام نے اسے ترتیب دیا اور اسے پھیلایا ۔ اس کے مفرد رسائل بھی زیادہ‌تر انھیں موضوعات پر ھیں جو ابوعبیدۃ کے رسائل کے تھے، لیکن خاص بات یہ ھے کہ اس نے تحریری مآخذ سے وہ تاریخی معلومات جمع کیں جو شہر الحِیرۃ اور ملوك حِیرۃ سے متعلق تھیں ۔ اس تصنیف کے متعلق یہ کہا جاتا ھے کہ اس کا مسالا الحِیرۃ کے گرجوں کے وثیقوں اور ایرانی مواد سے مأخوذ تھا ۔ اس مواد کو ھشام نے ترجمہ کرا کے استعمال کیا ۔ علمی تاریخ‌نویسی کی جانب یہ ایک اھم اقدام تھا اور گو اس کے مواد کے صرف اقتباسات ھی محفوظ رہ سکے، تاھم اس کی روایت کی عام صحت موجودہ تحقیق و تدقیق سے ثابت ھو چکی ھے ۔ کہتے ھیں کہ اپنی اور تصنیفات میں بھی ھشام نے یہی طریقہ اختیار کیا اور کتبے اور دیگر تحریری مواد جو اسے ملے، استعمال کیے، لیکن اس کے باوجود قدیم طرز کے زیادہ محافظہ کار فضلاء کے ھاتھوں سے وہ نہ بچ سکا اور ناقابل اعتبار ھونے اور جعل سازی کرنے کے الزام اس پر شد و مد سے عاید ھوتے رھے ۔

۲ ۔ صدر اسلام : ہِشام‌الکَلْبی نے حِیرۃ کے مآخذ سے جو استفادہ کیا، اس کے علاوہ عربی زبان میں علمی‌تاریخ نویسی کی ابتداء آنحضرت[ص] کی سیرت اور سرگرمیوں کے مطالعے سے وابستہ ھے، اسی لیے اس علم کے منابع کا پتا احادیث نبوی[ص] کے مجموعوں میں ملتا ھے (دیکھیے مادّۂ حدیث) اور بالخصوص اس کا تعلق ان حدیثوں سے ھے جو آنحضرت[ص] کے غزوات سے متعلق ھیں (چنانچہ ایک عام اصطلاح ''مغازی'' (''فوجی مہمیں'') مروج ھو گئی جو ابتدائی زمانے کی کتب سیرت کے لیے استعمال ھونے لگی) ۔ ان مطالعات کا مرکز اوّلین مدینہ تھا اور کہیں دوسری صدی میں جا کر مغازی پر لکھنے والے مصنف دوسرے مراکز میں بھی نظر آنے لگے ۔ چونکہ علم المغازی کا ارتباط علم حدیث سے تھا، اس لیے تاریخ نویسی کے اسلوب تالیف پر اسناد کے استعمال کی وجہ سے بڑا گہرا اثر پڑا، یہی وجہ ھے کہ اس وقت سے عربوں کے تاریخی معلومات کی اختصاصی صفات میں اور ان معلومات کی تنقیدی صحت میں عظیم‌الشان تبدیلی پیدا ھو گئی ۔ یہاں پہنچ کر پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ھوتا ھے کہ ھم علم تاریخ کے اعتبار سے ٹھوس زمین پر کھڑے ھیں، گو بعض صورتوں میں ھمیں یہ بھی ماننا پڑتا ھے کہ [موضوع] احادیث میں ایسے مشکوك عناصر بھی موجود ھیں، جو آنحضرت[ص] کی مکی اور مدنی دونوں ادوار کی زندگی کے متعلق ھیں [اس باب میں مفصل بحث کے لیے دیکھیے مادّۂ ''سیرۃ''].

اس ارتقاء کے اعتبار سے مسلمانوں کے دوسرے قرن کے لوگ اتنے جامعین مواد نہیں ھیں، جتنے وہ مآخذ کی حیثیت رکھتے ھیں، البتہ ایسے لوگوں میں سے دو شخص، اَبان بن عُثمان (رَكَ بآن) اور عُروۃ بن الزبیر

(رَكَ بآن) ''کتب مغازی'' کے مصنف بھی بتائے جاتے ھیں، لیکن بعد کے مصنفوں کی کتابوں میں ان کتابوں کے اقتباسات ناپید ھیں - بعد کے قرن میں کئی محدّث ایسے گذرے ھیں جو احادیث مغازی کے جمع کرنے میں مشہور تھے، خصوصاً محمد بن مسلم ابن شِہاب الزُّہری (رَكَ بآن) جنھوں نے عمر ثانی[رح] یا ہِشام کی درخواست پر احادیث کو قلمبند کیا اور یہ نسخہ خلفاء کے خزانے میں محفوظ کرلیا گیا، مگر بعد میں معرض تلف میں آ گیا - الزُّہری کو یہ امتیاز بھی حاصل ھے کہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مختلف مآخذ سے حدیثیں جمع کر کے انھیں ایک مسلسل بیان کی صورت میں مرتب کیا (قبَ مثلاً حدیثِ الإفْک) - تاریخی مواد کے پیش کرنے کے سلسلے میں یہ بھی ترقی کی جانب ایک قدم تھا، گو اس میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ کم محتاط محدثین اس سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے تھے .

اس سے بعد کے قرن کے تین مؤلفوں نے مغازی پر کتابیں لکھیں جو زھری کی جمع کردہ احادیث پر مبنی ھیں - ان تصانیف میں سے دو کتابیں اور دو مزید کتابیں جو احادیث زھری پر مبنی نہ تھیں یا تو بالکل ضایع ھو چکیں یا ان کے صرف چند متفرق اجزا ملتے ھیں - البتہ تیسری مشہور کتاب یعنی سیرۃ محمد ابن اسحٰق بن یسار (رَكَ بہ ابن اسحٰق) (م ۱۵۱ھ/۷۶۸ء) اپنے پیش رووں اور معاصرین کی تصانیف کے مقابلے میں ایک وسیع تر تصور کا نتیجہ تھی، کیونکہ اس میں نہ صرف آنحضرت[ص] کی سیرت قلمبند کی گئی تھی، بلکہ اس میں تاریخ نبوت لکھنے کا اہتمام ھوا تھا - اصلی صورت میں بظاھر اس کتاب کے تین بڑے حصے تھے: ''المبتدأ'': اس میں زمانۂ جاھلیت کی تاریخ ابتداے آفرینش سے لکھی گئی تھی اور اس میں زیادہ‌تر وھب بن مُنَبِّہ [دیکھیے سطور بالا] اور اسرائیلیات سے استفادہ کیا تھا؛ ''المَبعث'' اس حصے میں آنحضرت[ص] کی زندگی کے حالات سنہ ۱ھ تک کے درج تھے اور ''المغازی'' جس میں آنحضرت[ص] کی حیات [طیبہ] کے حالات آپ کے زمانۂ وصال تک دیے گئے تھے - اس کتاب پر گو شدید نکتہ چینی ھوئی کہ اس میں بہت سی کم وزن، مجعول احادیث اور اشعار شامل ھیں، لیکن [بعض لوگوں نے] اس کتاب کو زمانۂ جاھلیت اور صدر اسلام کی تاریخ پر ایک مستند کتاب قرار دیا - معلوم ھے کہ یہ کتاب متعدد روایات میں موجود تھی - افسوس یہ ھے کہ وہ تمام نسخے جو بعد کے عراق مؤلفین نے استعمال کیے اور اس اعتبار سے بظاھر بہتر نسخے تھے [قبَ الخطیب البغدادی، ۱ : ۲۲۱ سطر ۳ تا ۸] ضایع ھوگئے اور اس طرح سے میدان ایک . . . . . تلخیص کے لیے خالی رہ گیا، جسے ایک مصری مؤلف عبدالملک ابن ھشام (رَكَ بآن) (م نواح ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) نے مرتب کیا .

یہ بات بھی قابل ذکر ھے کہ مغازی کے موضوع پر یہ تمام لکھنے والے موالی ھی تھے، اگرچہ اس زمانے میں بھی یہ لازم نہیں ھوا تھا کہ ھر مولٰی غیر عربی‌الاصل ھو، لیکن ابن اسحٰق تو یقینی طور پر عراق الاصل تھا - اس کا دادا یسار ۱۲ھ (۶۳۳ء) میں العراق میں گرفتار ھوا تھا، تاھم جس تصور کے مطابق ابن اسحٰق نے یہ کتاب مرتب کی اس میں سوائے دور کے بالواسطہ اثر کے کوئی راست ایرانی اثر تلاش کرنا لغویت ھے - اس کی اس تصنیف اور وھب بن مُنَبِّہ کی تصنیف کے درمیان جو تعلق ھے، وہ ایک طرف اور مدینے کے دبستان حدیث کا وجود دوسری طرف پکار پکار کر کہہ رھا ھے کہ یہ تصنیف خالص عربی اور اپنی ترتیب و تدوین میں عربی علم حدیث کے ضوابط کے زیر تصرف ھے .

اس سے بعد کے قرن میں تاریخ کے مطالعے اور تاریخ نویسی کے کام کا نطاق اور وسیع ھو جاتا ھے -

خود ابن اسحٰق کی طرف ایک کتاب الخلفاء بھی منسوب ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مختصر اور موجز سی تصنیف تھی ۔ اس کے مشہور جانشینوں میں سے محمد بن عمرالواقدی (رک بآں) (۱۳۰ھ تا ۲۰۷ھ/۷۴۷ء تا ۸۲۳ء) نے نہ صرف مغازی نبی[ص] کے موضوع پر کتابیں لکھیں، بلکہ اس نے بعد کی اسلامی تاریخ کے کئی حوادث پر بھی کچھ نہ کچھ لکھا اور اس کے علاوہ عہد ہارون تک کی ایک بڑی تاریخ کتاب التاریخ الکبیر بھی لکھی ۔ اس طرح علم تاریخ ، جو علم حدیث پر قائم ہوا تھا، اب اس تاریخی مواد سے بھی متمتع ہونے لگا، جو فقہاے لغت نے جمع کیا تھا، گو مواد پیش کرنے کے لیے وہی ایراد حدیث کا اسلوب خاص باقی رکھا گیا ۔ الواقدی کی تصانیف میں سے صرف اس کی کتاب المغازی ھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ رہ سکی ھے لیکن واقدی کے مواد کا بہت بڑا حصہ اس کے اپنے کاتب محمد ابن سعد (رک بآں) (م ۲۳۰ھ / ۸۴۴ - ۸۴۵ء) نے آنحضرت[ص]، آپ کے صحابہ[رض] اور تابعین کی سیرت نگاری میں استعمال کیا ہے ۔ اس کی کتاب طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے ۔ فن تاریخ کے سلسلے میں اس قسم کی معجم تراجم کا تصور ھی فن تاریخ میں ایک جدید ارتقاء کی دلیل ہے اور ثابت کرتی ہے کہ اس دور تک تاریخ کا فن حدیث سے کتنا قریبی تعلق تھا، کیونکہ اس تالیف کا بڑا مقصد یہی تھا کہ تنقید حدیث کے لیے مواد جمع کیا جائے ۔

ابن سعد کی تصنیف کا وہ حصہ، جس کی آخری ترتیب و تدوین اس نے خود کی، سیرت نبی[ص] (کتاب مطبوع کی ج ۱ و ۲) تھا اور اسے دھری اھمیت حاصل ہے ۔ تاریخ مغازی میں اس نے آنحضرت[ص] کے اوامر و نواھی اور خطوط کا اضافہ کیا اور اس کے لیے (واقدی کی تقلید میں) ایسی اسناد و وثائق سے فائدہ اٹھایا جو اس وقت دستیاب ہو سکیں ۔ اس سے بھی زیادہ اھم وہ ابواب ھیں جو صفۃ اخلاق النبی[ص] اور علامات النبوۃ سے متعلق ھیں ۔ یہی مواد علی الترتیب بعد کے زمانے کی کتب شمائل و دلائل کا پیش خیمہ ثابت ہوا ۔ اس ترقی سے ایک منزل اور طے ہوئی ۔ صحیح احادیث کے عناصر کا دوسری قسم کی روایت احادیث سے (جو سیرۃ مؤلفۂ ابن اسحٰق میں ہم دیکھ چکے ھیں) میل ہوا ۔ یہ دوسری قسم کی روایت قصاص کے ہاں موجود تھی [دیکھیے مادۂ قصّہ] ۔ اس طرح ایک قسم کے مقبول عوام ادب کی طرف مراجعت ہوئی جو وھب بن منبّہ کی تصانیف کی جنس کا تھا ۔ سیرۃ نے جو نئی جہت اختیار کی (جس کی تقلید بعد کے زمانے میں آنحضرت[ص] کے تمام سیرت نگاروں نے کی) ، اس سے ظاھر ہے کہ اس قسم کے ادب کی تخلیق سے سیرت نگاری نے اسلوب تاریخی کے ارتقاء میں جو حصہ لیا تھا، اس کا خاتمہ ہو گیا ۔

۳۔ تاریخ خلافت : آنحضرت[ص] کے وصال کے بعد سے مختلف وقائع کے متعلق مفرد رسائل لکھنے کا جو رواج ہو گیا تھا، اس کی تفصیل پہلی فصلوں میں آ چکی ہے ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ سرگرمی عراق تک ھی محدود تھی ۔ شام، عرب یا مصر میں پہلی دو صدیوں کے دوران میں علماء نے اس قسم کا کوئی رسالہ نہیں لکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراق اور اس کی روایات کو بعد کی تاریخی تصانیف میں اولیت کا مقام حاصل ہو گیا ۔ عہد راشدین کی تاریخ کے لیے، البتہ مدینے کی احادیث و روایات کی بدولت مصنفین (مثلاً واقدی) کو ایسا مواد میسر ہوتا رہا، جس کا تعلق مدینے کے دبستان حدیث سے تھا ۔ یہ امر مشکوک ہے کہ مدینے میں کچھ مخطوط وثیقے موجود تھے ، گو

حدیث مدنی میں ترتیب سنین کے مطابق جو مواد دیا ہے اس کی صحت سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا مواد ضرور موجود ہوگا ۔ بنی امیہ کے زمانے میں تو اس قسم کے وثائق کی موجودگی دمشق اور عراق دونوں جگہ بے شمار حوالوں سے ثابت ہے (دیکھیے بالخصوص گروہمان (A. Grohmann): *Allgemeine Einführung in die arabischen Papyri* (وی انا ۱۹۲۴ء) ص ۲۷ تا ۳۰)۔ غالب گمان یہ ہے کہ اسی قسم کے مواد کی مدد سے بعد کے مؤلفین کو سنین کی ترتیب سے ایک صحیح اور مرتب ڈھانچہ میسر آیا، جس میں گورنروں اور امرامے حج وغیرہ کی ہر سال کی فہرستیں موجود تھیں۔

اس مواد سے تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایسے مواد کے استعمال کی ضرورت بھی پیش آئی، جسے جمع کرنے میں محدّثین اور ماہرین لسانیات کے طریقوں کو متحد کر دیا گیا تھا ۔ ان میں زیادہ نمایاں عراق کے عربی قبیلوں کی روایات تھیں۔ ان میں سے ایک تو قبیلۂ اَزْد تھا، جن کی روایات کو (دوسروں کی روایات کے ساتھ) ابو مِخْنَف (رَكَ بآن) (م ۱۵۷ھ/۷۷۴ء) نے جمع کیا تھا اور ہشام الکلبی [دیکھیے ص۹۴ الف] نے ان کی روایت کی؛ یہ روایتِ کوفہ ہے جو حضرت علی[رض] کے حق میں اور شامیوں کے خلاف تھی ۔ کلبی روایت جو عوانۃ بن الحَکَم (م ۱۴۷ھ/۷۶۴ء یا ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) نے پیش کی اور جس کا راوی یہی ہشام الکلبی ہے وہ حضرت علی[رض] کے خلاف ہے اور اس میں شامیوں کی حمایت کا شائبہ پایا جاتا ہے (ان ماخذ کے متعلق دیکھیے ولہاؤزن (Wellhausen) : *Das arabische Reich*، دیباچہ) ۔ ایک تیسری روایت تمیمی ہے جس کی نشر و اشاعت سیف بن عمر (رَكَ بآن) (م نواح ۱۸۰ھ/۷۹۶ء) نے فتوحات اسلامیہ کے ایک تاریخی رومان کی صورت میں کی ۔ اس کا انحصار زیادہ‌تر شاعرانہ مواد پر ہے جس کا اتصال منثور بیان سے تقریباً اسی طرح ہے؛ جیسا کہ ادبیات ایام‌العرب میں ہوا ہے ۔ دوسرے قبائل کی روایات کے اجزاء بھی ملتے ہیں؛ مثلاً قُتَیْبَۃ بن مُسْلِم کی جنگوں کے متعلق باہِلَۃ کی روایت ۔ سیر حاصل اور جاندار تفصیل اور واقعات کی دلیرانہ تشریح کی وجہ سے قبائلی روایات میں اور ان کے معاصرین یا بعد کے مصنفین کی سالیانہ ترتیب کے مطابق لکھی ہوئی تاریخوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے، گو یہ قبائلی روایات جانبدارانہ اور یک طرفہ قسم کی ہیں، لیکن یہ نہیں ہے کہ علم تاریخ کے اعتبار سے ان کی قیمت کچھ بھی نہ ہو، بالخصوص اس لیے کہ ان کے ذریعے اسلامی تاریخ کے پہلی صدی کے اندرونی عاملوں پر خاصی روشنی پڑتی ہے ۔ یہ پھر یاد دلایا جاتا ہے کہ قبائلی روایات کے جمع کرنے والوں نے، چونکہ قواعد اسناد کی بڑی احتیاط سے پابندی کی ہے، اس لیے ظاہری شکل کے اعتبار سے یہ مجموعے علم حدیث سے متصل ہو جاتے ہیں (اور حق تو یہ ہے کہ اس سرگرمی کا آغاز کوفے کے مشہور ترین محدّث الشَّعْبِی (رَكَ بآن) (نواح ۱۱۰ھ/۷۲۸ء) کے نام کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے اور ان کے اسلوب یا نفس مضمون میں کسی قسم کا خارجی اثر نظر نہیں آتا ۔

تیسری صدی ہجری کے آغاز میں ادبی سرگرمیوں میں مادّی تہذیب و تمدن کے مسلسل بڑھتے ہوے معیار اور کاغذ کی ایجاد نے ایک نئی جان ڈال دی اور اس کا اثر ادب کے ہر شعبے پر پڑا۔ کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ بغداد میں ۱۷۸ھ (۷۹۴ء - ۷۹۵ء) میں قائم ہوا تھا ۔ قدیم‌ترین ادبی تصانیف کے قدیم‌ترین مخطوطات جو ہم تک پہنچے ہیں، اسی زمانے سے متعلق ہیں، لیکن تحریر کے اس دستور کے باوجود شفاہی روایت سے

مواد کے مجموعوں کو منتقل کرنے کا سلسلہ فوراً ختم نہیں ہوا ، بلکہ اس صدی کے آخر تک جاری رہا ۔ اس لیے یہ بات یقینی نہیں کہ بصرے کے علی بن محمد المدائنی (رک باں) (م ۲۲۵ھ / ۸۴۰ء) کے نام سے جو دو سو تیس مفرد رسالے منسوب کیے جاتے ہیں ان میں سے کتنے اس کے حین حیات قید کتابت میں آ گئے تھے ۔ ان میں سے بہتیرے تو غالباً ابوعبیدۃ ہی کے مجموعوں کی فقط اصلاح شدہ نقل تھے ۔ البتہ ان رسالوں سے زیادہ اہم اس کی وہ بڑی تصانیف تھیں جو خلافت کی تاریخ سے متعلق تھیں یا اس کے وہ مفرد رسالے جو اس نے بصرے یا خراسان کی تاریخ پر لکھے ۔ اس نے عراق روایات کے مواد کو دبستان مدینہ کے صحیح اصول تنقید کے مطابق جانچا ، اس لیے اس کی تصانیف کو معتبر اور مستند ہونے کی حیثیت سے ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ وہ بعد کے زمانے کی تالیفوں کے لیے اہم‌ترین کتب مأخذ متصوّر ہونے لگیں اور موجودہ تحقیق و تدقیق نے بھی انھیں عام طور پر صحیح ہی پایا ہے۔

ان تطوّرات میں سب سے نمایاں چیز کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ گو ابتدائی زمانے کے بعض علماے دین نے ‘اخباریون’ کی مخالفت کی ، تاہم امت اسلامی میں تاریخ کے متعلق شعور پیدا ہو گیا ۔ اس شعور کے پیدا کرنے میں قرآن [پاک] کے تاریخی دلائل ، وسیع سلسلۂ فتوحات کے پیدا کردہ فخر اور بجا فخر اور عرب قبائل کی باھمی رقابت نے بلاشبہ بہت زیادہ مدد دی ، لیکن اس سلسلے میں ایک جاذب توجہ بات یہ بھی ہے کہ ماہرین لسانیات سے قطع نظر تاریخی روایات کو جمع کرنے والے تقریباً سب کے سب علماے دین اور محدّثین ہی تھے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا اسباب کے علاوہ تاریخی شعور کا کوئی اور گہرا سبب بھی موجود تھا ۔ علم دین کے نقطۂ نظر سے بنی نوع انسان کی حکومت کے لیے خدائی تدبیر کا مظہر تاریخ ہی ہے ۔ گو ابتدائی قرون کا تاریخی مطمح نظر صرف اسی بات تک محدود تھا کہ وہ اس تدبیر الٰہی کا پتا انبیاء کے یکے بعد دیگرے آنے میں لگائیں جن کا سلسلہ آنحضرت[ص] پر ختم ہوا ، تاہم تمام اسلامی مذاھب اس پر متفق ہیں کہ تدبیر الٰہی صرف بعثت رسل ہی پر ختم نہیں ہو جاتی ۔ اہل السنّت و الجماعت کے مذاہب میں یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں نظام الٰہی کا استمرار امّت‌الله یعنی اہل اسلام ہی سے وابستہ ہے ، اس لیے قرآن [پاک] میں وحی الٰہی اور حدیث کے مطالعے کا ایک ضروری اور لازمی تکملہ یہ ہے کہ تاریخ امت کا بھی مطالعہ کیا جائے ۔ علاوہ بریں اہل سنت کے سیاسی مذھبی عقائد کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تاریخ کو استمرار حاصل ہے ۔ شیعہ جماعت کے نزدیک حکومت الٰہیہ کا تسلسل سلسلۂ ائمہ میں جاری رہیگا اور جن جامعین روایات کا ذکر پہلے آ چکا ہے ان میں سے واحد شیعہ راوی ابو مِخْنَف جو کوفے کی شیعی تحریکوں کی تاریخ پر اتنی توجہ مرتکز کرتا ہے تو وہ اسی مذہبی انہماک کا اظہار کرتا ہے ۔ ان عقائد کی وجہ سے اس بات کی کہ علم تاریخ کو مذہبی خیالات میں ایک خاص مقام حاصل تھا اور بھی قوی‌تر شہادت یوں ملتی ہے کہ مشتبہ تقوی اور مذھبی مباحثات نے نہ صرف جنبہ دارانہ اور مدافعانہ ، بلکہ مصلحت‌آمیز تحریفات کا دروازہ کھولنا شروع کر دیا تھا ۔ اس کی حیرتناک مثال سَیْف بن عمر نے اپنی دوسری تصنیف میں جو [حضرت] عثمان[رض] کی شہادت کے متعلق ہے ، پیش کی ہے ۔ اس زمانے کے بعد سے تاریخ نویسی اسلامی تہذیب و تمدّن کا ایک جزو لاینفکّ بن گئی ۔ بحیرۂ روم کے ممالک میں پرانی تاریخی روایات کی

جگہ یا تو نئے مواد نے لے لی ہے یا انہیں روح اسلامی کے مطابق نئے قالب میں ڈھالا گیا ہے اور ان مہذب مشرق ممالک میں جہاں کوئی تحریری تاریخ موجود نہ تھی اور جامد افریقہ میں جہاں علم و ادب کا نام و نشان تک نہ تھا، دونوں میں جہاں اسلام کے قدم جمے وہیں تاریخی ادبیات کو فروغ حاصل ہونے لگا۔

۴ - وسیع معنوں میں تاریخی تالیفات کی ابتداء تیسری صدی کے وسط سے ہوئی، وسیع معنوں سے مراد یہ ہے کہ سیرۃ کے مواد مذکورۂ بالا، مفرد رسائل اور دوسرے مآخذ کو ملا جلا کر اس سے مربوط تاریخی بیان مرتب کیا گیا ۔ اس صنف کا سب سے پہلا مؤلف احمد بن یحییٰ البلاذُری (رک بآن) (م ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء) تو ''کلاسیکی'' یعنی قدیم روایات کو جاری رکھتا ہے، وہ ابن سعد اور المدائنی دونوں کا شاگرد تھا اور اس کی دو تصنیفیں جو موجود ہیں ان سے نہ صرف ان اساتذہ کے اثر کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس زمانے کے تنقیدی مذاق کا بھی بہترین مظاہرہ ہو جاتا ہے ۔ تاہم اس دور کی امتیازی تالیف تو تاریخ عالم ہی ہے جس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر تمام دنیا کی تاریخ کا خلاصہ چھوٹے یا بڑے پیمانے پر خالص اسلامی تاریخ کے مقدمے کے طور پر مذکور ہے ۔ یہ تصوّر کوئی نیا نہیں ہے، اصل میں یہ ابن اسحٰق کی تصانیف کے زیر نظر مقصد کی توسیع ہے، جس میں امت اسلامی کی تاریخ کے ساتھ زمانۂ جاہلیت کی تاریخ کا ایک وسیع جزء بڑھا دیا گیا ہے ۔ اس لیے یہ تاریخ عالم اس ترکیب کے صحیح ترین معنوں میں تمام دنیا کی تاریخ نہیں ہے ۔ ظہور اسلام کے بعد سے مصنف تاریخ کو دوسری اقوام کے حالات قلمبند کرنے میں کوئی زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

اس منزل پر پہنچ کر پہلی مرتبہ (صرف ہشام الکلبی کی تصنیف اس سے مستثنیٰ ہے) عربی تاریخ نویسی کی رَو میں ایرانی روایات بھی آکر شامل ہو جاتی ہیں، گو اس میں شک نہیں کہ ایرانی خداے نامہ کا ترجمہ کوئی ایک صدی سے زیادہ مدت پہلے ابن المُقَفّع (رک بآن) (م نواح ۱۳۹ھ / ۷۵۶ء) عربی زبان میں کر چکا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے (اسرائیلیات یعنی) یہودی اور نصرانی افسانوی مواد بہت عرصہ پہلے سے تفسیر کے پردے میں عربی تاریخ میں شامل ہو چکا تھا، جو پورے طور پر اس کے لیے سودمند بھی ثابت نہ ہوا ۔ اسی طرح ایرانی روایات کا اثر بھی کچھ ناموافق ہی رہا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس دور میں تاریخ، علم حدیث کے تابع تھی اس وقت عربوں کی زود اعتقادی کا علاج اور ان کے ذہنوں سے ماضی کی رومانویت کے نشے اتارنے والی ترشی وہ دانش تھی، جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتی ہے اور وہ احترام تھا، جو نقد و نظر کے معیاروں کا ان (عربوں) میں موجود تھا اور یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کے بغیر کسی صحیح قسم کی تاریخ نویسی ممکن ہی نہیں، مگر جونہیں علم تاریخ نے خالص اسلامی ماحول سے باہر قدم رکھا، افسانوی اور نیم افسانوی اور تاریخی عناصر میں امتیاز کرنے کی مشکلات پھر عود کر آئیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ رجحان بھی عود کر آیا کہ جو مواد بھی دستیاب ہو سکے، لے لیا جائے اور اس پر اعتماد کر لیا جائے ۔ اس رجحان کو ان مآخذ کی مخصوص نوعیت سے مزید تقویت حاصل ہوئی، جن سے عرب مصنّفین نے ایران اور دوسرے ممالک کی قدیم تاریخ کے لیے ضروری مواد جمع کیا ۔ خود خدائے نامہ کی ابتدائی فصول افسانوی (mythical) شخصیتوں، موبدانہ افکار، اوستائی خرافی داستانوں اور قصۂ سکندر کی صدائے

بازگشت پر مشتمل تھیں اور ساسانی مملکت کے ذکر میں تو صحیح روایات پر بھی اکثر اوقات حماسی (epic) اور مصنوع (rhetorical) عناصر کی تہ جمی ہوئی ہے (دیکھیے نولڈیکہ Th. Noldeke : *Das Iranische Nationalepos*، طبع دوم ۱۹۲۰ء) - اس کے ساتھ ہی سریانی تراجم کے ذریعے یونانی علوم کے مطالعے نے حیات نو پائی اور اس کی وجہ سے یہودی، نصرانی اور یونانی عتیقیات میں بھی دلچسپی برقرار رہی، مگر اس دلچسپی کے لیے جو مواد ملا وہ کسی صورت میں بھی خدائے نامہ سے زیادہ قابل وقعت نہ تھا؛ مثلاً اس میں آرامی زبان کی وہ تصنیف بھی شامل تھی جسے مغارۂ گنج (*Meʿārat gazzē* = معارت گزّے) کہتے ہیں۔

اسی قسم کے مآخذ سے وہ مواد حاصل کیا گیا جو اسلامی تاریخ کے مجموعۂ نوشتجات میں ابوحنیفہ الدّینوری (رکّ بآن) (م ۲۸۲ھ / ۸۹۵ء) اور ابن واضح الیعقوبی (رکّ بآن) (م ۲۸۴ھ / ۸۹۷ء) جیسے مؤلفین نے شامل کر دیا، مگر الیعقوبی کی کتاب کا نطاق تو اتنا وسیع ہے (اس نے شمالی علاقے کے باشندوں اور چینیوں تک کو شامل کر لیا ہے) کہ ہم اس کی تصنیف کو تاریخ عالم کے بجائے ایک قسم کی تاریخی دائرۃالمعارف قرار دے سکتے ہیں - اسی صنف کی تصانیف میں محدّث ابن قتیبۃ (رکّ بآن) (م ۲۷۶ھ / ۸۸۹ء) کا ''کتابچۂ تعلیقات'' معروف بہ کتاب المعارف اور اس سے اگلی صدی میں حمزۃالإصفہانی (رکّ بآن) (م نواح ۳۶۰ھ/۹۷۰ء) اور المسعودی (رکّ بآن) (م نواح ۳۴۵ھ/۹۵۶ء) کے باقی ماندہ آثار بھی شامل ہیں - المسعودی کے متعلق بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عربی میں لکھنے والے اکابر مؤرخین میں سے تھا، لیکن اس کی بڑی تصانیف ضائع ہو گئیں اور موجودہ تصانیف صرف انکا خلاصہ ہی ہیں،

اس لیے اس کے صحیح طریقۂ تألیف و تصنیف کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اس قسم کی تصانیف سے ظاہر ہے کہ ایک نیا فکری عنصر عربی تاریخ نویسی کے فن میں داخل ہو چکا تھا - اس نئے عنصر کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ علم کی خواہش تھی صرف علم کی خاطر - یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ الیعقوبی اور المسعودی کے پائے کے مصنّف صرف مؤرّخ ہی نہ تھے، بلکہ وہ جغرافیہ دان بھی تھے اور انہیں جغرافیائی معلومات زیادہ تر طویل سیاحت کے باعث حاصل ہوئی تھیں - اس ارتقاء میں ہم بلا شک و شبہ ہیلینی ثقافت کے اس ورثے کو بھی مصروف عمل پاتے ہیں جو دوسری اور تیسری صدی میں اسلام کی ہر ذہنی سرگرمی میں داخل ہو رہا تھا۔ جہاں تک تاریخ نویسی کا تعلق ہے، یونانی تمدّن کا اثر کچھ زیادہ نہ ہوا، لیکن اس طریق سے تاریخ اور جغرافیے کے درمیان جو تعلق قائم ہو گیا اسے بعد کے زمانے کے مصنفین نے بھی یکے بعد دیگرے عثمانیوں کے عہد تک قائم رکھا [دیکھیے نیز مادّۂ جغرافیہ]۔

تاہم محمد بن جریر الطّبری (رکّ بآن) (م ۳۱۰ھ / ۹۲۳ء) کی مشہور و معروف تصنیف تأریخ الرّسل و الملوك اس قسم کے مخل ہونے والے عناصر سے پاك ہے (بشرطیکہ اس میں سے تاریخ ایران کو علٰحدہ کر دیں) - اس میں قدیم تاریخی روایت اپنے نقطۂ اوج پر نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو طبری محدّث پہلے تھا کچھ اور بعد میں، دوسرے اس نے اپنی تاریخ میں اس مقصد کو مدنظر رکھا ہے کہ تاریخ کے ذریعے وہ اسلامی تاریخی روایات پیش کرنے میں اسی تفصیل اور تنقید کا پابند ہو، جس کا سابقاً وہ اپنی تفسیر میں تھا اور اس طرح اپنی تأریخ کو

وہ اپنی تفسیر قرآن کا تکملہ بنائے ۔ یہ کتاب جس صورت میں ہم تک پہنچی ہے، بظاہر اس عظیم الشان تصنیف کا خلاصہ ہے، جو اصل میں لکھی گئی تھی؛ البتہ جہاں تفسیر میں مصنف کی تنقید صریحی ہے، تاریخ میں وہ تنقید ضمنی ہے ۔ اس تاریخ میں آثار ضعف وہی پائے جاتے ہیں، جن کی توقع قدرتی طور پر ایک محدّث سے ہو سکتی تھی ۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ طبری نے سیف کی نیم تاریخی تصنیف کو الواقدی کی تاریخ پر ترجیح دی ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ واقدی کو محدّثین کے زمرے میں مشتبہ محدّث مانا جاتا ہے، مگر ان (امور) کے مقابلے میں ہمیں باقی تاریخ طبری کے محاسن اور قطعی خوبیوں کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے جن کی حجت اور جامعیت ایسی تھی کہ ان پر ایک دور تاریخ نگاری ختم ہوا۔ کسی بعد کے مصنف نے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے متعلق اس مواد کو از سر نو جمع کرنے اور جانچنے کا قصد نہیں کیا ۔ مصنّفین نے یا تو الطبری کے اس مواد کا خلاصہ تیار کر لیا (جس میں بعض اوقات البلاذری کے مواد کا اضافہ بھی کر دیا گیا) یا اپنی تاریخ وہاں سے شروع کی جہاں الطّبری نے اپنی تصنیف ختم کی تھی ۔

لیکن الطّبری کی تصنیف کے آخری حصے کی تہی‌دستی اور کم‌مایگی سے یہ انتباہ بھی لازم آیا کہ تاریخ نگاری کے لیے محض محدّثانہ روایات پر اعتماد کرنے کا زمانہ ختم ہو گیا ۔ دفتری نظام حکومت کی وجہ سے اہل‌کار اور درباری ان لوگوں کی صف اول میں آگئے جن کی طرف سیاسی تاریخ مرتب کرنے کے لیے رجوع لازم ہوگیا ۔ اس نظام نے علماے مذہب کو میدان تاریخ نویسی میں صف دوم میں ڈال دیا۔ اس وجہ سے بھی تیسری صدی ہجری وہ زمانہ ہے جب عربی تاریخ نویسی کا ایک دور ختم ہو گیا اور دوسرا شروع ہوا ۔

(ب)

جب علم تاریخ کو بجاے خود ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل ہو گئی تو اب اس کی توسیع بڑی تیزی سے ہونے لگی اور تیسری اور چھٹی صدی کے درمیان جو تصانیف معرض وجود میں آئیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ اس زمانے کے عام رجحانات کا جائزہ لینے کے سوا زیادہ تفصیلات میں جانا ہمارے لیے ناممکن ہے ۔

۱۔تیسری صدی ھی میں یہ رواج جاری ہو گیا تھا کہ مختلف علاقوں کے فضلاء اپنی مقامی روایات کو جمع کرنے لگے تھے ۔ تاریخ مکّۃ [دیکھیے الأزرق] کو چھوڑ کر جو لازمی طور پر تالیفات سیرت کے دائرے میں آتی ہے ۔ قدیم‌ترین علاقائی تاریخ وہ کتاب ہے جو مصر اور فتوحات مغرب کے حالات میں عبدالرحمٰن بن عبداللہ ابن عبدالحَکَم [رکّ بآن] (م ۲۰۷ھ/۸۲۱ء) نے لکھی تھی ۔ یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ اس تصنیف میں بھی وہی امتیازی خصائص کا حامل مواد موجود ہے جو مذکورۂ بالا عام تاریخوں میں ہے، لیکن ان کا سا تنقیدی انداز اس کے صفحات سے غائب ہے ۔ فتوحات کا ذکر زیادہ‌تر مدنی اور غیر معتبر مقامی روایات پر مبنی ہے ۔ اس کا مقدمہ اصلی اور خالص مصری مواد سے اخذ نہیں کیا گیا، بلکہ زیادہ‌تر اُن یہودی مآخذ اور اُن عربی روایات سے حاصل کیا گیا ہے جو دبستان مدینہ کے توسط سے آئی ہیں ۔ اسی طرح افسانوں اور کم و بیش صحیح روایات کو چھانے پھٹکے بغیر ملا دینے کا عمل اندلس کے ابتدائی اسلامی دور کی تاریخ میں بھی کیا گیا جو عبدالملک ابن حَبیب (رکّ بآن) (م ۲۳۸ھ/۸۵۳ء) کی طرف منسوب ہے اور یہی حال الھَمْدانی (رکّ بآن) (م ۳۳۴ھ/۹۴۵-۹۴۶ء) کی الاکلیل کا ہے جو یمنی عتیقیات کا

دائرۃ المعارف ہے - زیادہ سنجیدہ اور حقائق پر مبنی غالباً مختلف شہروں کی مقامی تاریخیں تھیں جو تیسری صدی میں لکھی گئیں، لیکن یہ ساری کتابیں تأریخ بغداد کی ایک جلد کے سوا (دیکھیے مادۂ ابن ابی طاہر طَیفُور) ضائع ہو چکی ہیں - بعد کی صدیوں میں اس قسم کی مقامی تاریخوں کی مفرط فراوانی ہو گئی، جن میں مصنف کے ذوق اور رجحان کے مطابق یا تو تراجم پر زور دیا جاتا تھا (دیکھیے فصل ب/۴ در ذیل [ص ۵۰۸ ب]) یا تاریخی وقائع پر - تاریخی وقائع کی صنف والی کتابیں، جو ہم تک پہنچی ہیں وہ ہر صورت میں رومانوی عناصر سے مبرا تو نہیں، لیکن ان میں ایسا قیمتی مواد ضرور موجود ہے، جو بڑی بڑی تاریخوں میں شامل نہیں کیا گیا اور اس اعتبار سے وہ خاصی اہمیت رکھتی ہیں (دیکھیے مثلاً النَّرشَخي، ابن القُوطِیّة، عُمارة، ابن اِسفَندیار)- چونکہ اسلوب تحریر اور طریق کار کے اعتبار سے یہ مصنّف اپنے اپنے علاقے اور زمانے کے عام دستور کے پابند تھے اس لیے یہاں ان پر مزید بحث نہیں کی جا سکتی، البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ محلی تاریخیں عربی اور فارسی کی اسلامی تاریخ نویسی کا کچھ کم وزن جزو نہیں ہیں [اس سلسلے کی ایک کتاب مظہر شاہ جہانی ہے جو یوسف بن میرک بن ابوالقاسم الحسینی نے شاہ جہان کے سال ہفتم جلوسی (۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء) میں لکھی - (نسخہ مجموعۂ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی)- کتاب کے دو حصوں میں سے دوسرے میں تاریخ سندھ ذیل کے چار باب میں دی ہے: (۱) بھکر، (۲) سیوی، (۳) ٹھٹّہ، (۴) سہوان - ادارہ]۔

۲-تاہم چوتھی صدی کے وسط کے بعد عام تاریخ اور مقامی تاریخ میں کوئی امتیاز قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے - اس زمانے سے خالص تاریخی تالیفات کی عام طرز اپنے اپنے زمانے کے ایک وقائع نامۂ سالیانہ کی شکل اختیار کر گئی جس کے ساتھ اکثر اوقات تاریخ عالم کا ایک خلاصہ بھی دیباچے کے طور پر بڑھا دیا جاتا تھا - اس قسم کے سالناموں میں مصنّف کی دلچسپیاں اور معلومات کسی صورت میں بھی ''عالمگیر'' نہیں ہو سکتی تھیں، بلکہ اس سیاسی ماحول میں محدود نظر آتی تھیں، جہاں مصنف کی سکونت ہے اور وہ شاذ ہی ایسے واقعات سے بحث کر سکتا ہے جو دور دراز علاقوں میں پیش آئے ہوں - اس طرح سے نظر کے محدود ہو جانے کو ذہنی زندگی میں کس حد تک اسلامی سیاسی اتحاد کے فقدان کا شبیہ و نظیر قرار دیا جاسکتا ہے، ایک ایسا سوال ہے جو قابل بحث ہے اور رہیگا - ہمارے لیے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ سیاسی تاریخ نویسی کا کام زیادہ‌تر سرکاری عمّال اور درباریوں میں منتقل ہو گیا - اس تبدیلی سے ایسی تاریخ نویسی کے اسلوب تحریر، نفس مضمون اور اس کی روح سب پر یکساں اثر پڑا - مشاق منشیوں اور کاتبوں (سکرٹریوں) کے لیے تو یہ ایک سہل اور مرغوب مشغلہ تھا کہ وہ مسلسل طریق کی وقائع نگاری کر ڈالیں - ان کی معلومات کے ضروری مآخذ سرکاری دستاویزات، ذاتی میل ملاقات اور عمّال اور درباریوں کی عام غپ شپ کی شکل میں موجود تھے - اس لیے تاریخ نگاری کے ڈھانچے میں یہ تبدیلی ہوئی کہ اب مفصل اِسناد کے بجائے مجملاً مآخذ کا ذکر کر دیا جاتا، بلکہ بعد کے مؤلفین نے تو اکثر اوقات اسناد کا ذکر ہی بالکل ترک کر دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ناگزیر ہو گئی کہ ان کی وقائع نگاری میں ان کے اپنے اپنے طبقے کے تمدنی، سیاسی اور مذہبی تعصبات اور تنگ نظری بھی منعکس ہو- قدیم دینی تصوّر کو جس کی وجہ سے علم تاریخ کی شان اور وسعت کو چار چاند لگ گئے تھے، بالکل ترک کر دیا گیا اور سالنامے کی طرز کی تاریخ نویسی کا رجحان زیادہ سے زیادہ کسی حکمران اور اس کے دربار کی سرگرمیوں

پر ہی مرکوز رہنے لگا ۔ اس کے برعکس کاتبوں کی ان تاریخوں سے — یہ مان کر بھی کہ کوئی مصنف اپنی حدّ وسع سے آگے نہیں بڑھ سکتا — اس زمانے کے خارجی سیاسی واقعات کے متعلق جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ عموماً معتبر ہیں ۔ معاصر سالنامے جو ابن مِسکویه (رکّ بآن) (م ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) یا ہلال الصابی (دیکھیے الصابی) (م ۴۴۸ھ/ ۱۰۵۶ء) نے لکھے ان سے ظاہر ہے کہ انھوں نے سخت کوشی کے ساتھ معیار صحت کو بلند اور سیاسی تعصب سے اپنے آپ کو نسبةً آزاد رکھا اور یہ بات کہ اس معیار کو سب نے تسلیم بھی کیا ان اجزاء سے ثابت ہے جو عبیداللہ بن احمد المُسَبِّحی (م ۴۲۰ھ / ۱۰۲۹ء) اور ابن الحیّان القُرطبی (م ۴۶۹ھ/۱۰۷۶-۱۰۷۷ء) کی تاریخ مصر و اندلس میں سے اب باقی ہیں اور ہم صرف دو نہایت بلند ناموں ہی کا ذکر کرتے ہیں، پوری فہرست نہیں دیتے ۔

دنیاوی اسلوب پر تاریخ نویسی کے رواج کی بدولت ایک اور اہم نتیجہ بھی برآمد ہوا ۔ ابتدائی زمانے میں تو علم تاریخ کے مطالعے کی ضرورت مذہبی اور دینی وجوہات کی بنا پر بتائی جاتی تھی، اب اس کی جگہ مؤرخین نے یہ کہا کہ اس کا مطالعہ اخلاقی لحاظ سے قیمتی ہے : تاریخ نیک اور بد اعمال کے نقوش کو دوام بخشتی ہے اور انہیں آنے والی نسلوں کی تہذیب اخلاق کے لیے مثال کے طور پر پیش کرتی ہے (قبّ ابن مسکویه کی تصنیف تجارِبُ الاُمَم اور ہلال الصابی کی کتاب الوُزَراء کے دیباچے) ۔ اس قسم کا دعوی بہتیرے اخلاقیین اور فنون لطیفه کے بوالہوس شائقین کے حلقوں میں بےحد مقبول ہوا، یعنی اگر تاریخ صرف علم الاخلاق ہی کی ایک شاخ ہے اور مستقل علم نہیں تو پھر وہ اپنی مفروضہ تاریخی مثالوں میں تصرف کر کے انہیں اپنے مقاصد کے لیے توڑنے مروڑنے میں کیوں متأمل ہوں؟ علم ''ادب'' اور ''مرایا الامراء'' ایسی کتابیں اس قسم کی تحریفات سے پُر ہیں، جن سے عوام کے مذاق اور قوّت فیصلہ کو بگاڑنے میں ان کا اثر دور تک پہنچا اور اس متعدّی مرض سے مؤرخ اور وقائع نگار تک بھی ہر حال میں محفوظ نہ رہ سکے ۔

۳ ۔ اس سلسلے میں ان تاریخی جعل سازیوں کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، جو اس زمانے میں یا اس کے کچھ بعد عام طور پر نشر ہوئیں ۔ سیف بن عمر کی تصانیف کا ذکر تو پہلے ہی آ چکا ہے [فصل ۱ ۳ در فوق (ص ۵۲ الف)]، ان کی طرح ان افتراکاریوں میں زیادہ‌تر تو ایسی ہیں جنھیں خالص جعل نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ان کی بنیاد صحیح روایات پر ہے، لیکن انہیں مقبول عوام روایات، رومانی داستانوں اور جانبدارانہ یا دعاوۃ (پروپیگنڈا) کے مواد کے ساتھ عام طور پر اس لیے مخلوط کر دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے کوئی معین سیاسی مقصد یا دینی غرض پوری ہو (مثالوں کے لیے دیکھیے مادہ‌ہاے ابن اَعْثَم، ابن قُتیبة، المرتضی الشّریف، الواقدی) ۔

۴ ۔ گو سیاسی تاریخ نویسی کے لیے محدثین اور فضلاء نے اپنی جگہ عمّال حکومت کے لیے خالی کر دی تھی، لیکن ان کے قبضے میں سیرت نگاری کا وسیع میدان ابھی تک باقی تھا ۔ یہ موضوع بھی جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، کلاسیکی روایات کی ایک شاخ تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سیاسی تاریخ نویسی کو بادشاہی خاندانوں کے سالناموں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا، تو کتب سِیَر نے تاریخ نگاری کے قدیم تصوّرات کو زیادہ دیانت داری اور صداقت کے ساتھ محفوظ رکھا، کیونکہ اہل علم کی نظروں میں ''وَرَثَةُالنبی'' یعنی علماء کے تذکرے زود گزر (بعض اوقات خدا نشناس) سیاسی اداروں کے ذکر کے مقابلے میں اُمّةالله علی الارض کی صحیح

اور حقیقی تاریخ زیادہ سچّائی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں ۔ مختلف مذاہب کے محدّثین اور فقہاء کی طبقہ وار فہرستوں (رکّ به طبقات) کے ساتھ ساتھ، جن کے ذریعے محض ایک اصطلاحی ضرورت پوری ہوتی تھی اور اصلی معنوں میں انھیں سِیَر میں شمار بھی نہیں کیا جا سکتا، نمایاں شخصیتوں کے متعلق ضروری مواد بھی قدیم سے علٰحدہ مجموعوں کا موضوع بنا رہا ہے ۔ اس قسم کی قدیم‌ترین تصانیف میں سے ، جو اب تک محفوظ چلی آتی ہیں، خلیفۂ عمر (ثانی) بن عبدالعزیز[رض] کی سیرت ہے، جو مذکورۂ بالا ابن عبدالحکم کے بھائی نے لکھی تھی اور اس کا مواد مصنف کے بیان کے مطابق، کچھ تو تحریری دستاویزات سے حاصل ہوا اور کچھ ان متّقی بزرگوں کی روایات سے ، جو زیادہ‌تر مدینے کے رہنے والے تھے ۔ عام دستور یہ ہے کہ اس قسم کی تالیفات میں ایک گروہ یا ایک ہی قسم کے لوگوں کا مفصل ذکر آ جاتا ہے، مثال کے طور پر متصوفین کے ہاں متعدد تصنیفیں ایسی ہیں جو اولیاءاللہ کی زندگی کے حالات کے لیے مخصوص ہیں، بالخصوص ابونُعَیم الاصفہانی (رکّ بآں) (۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء) کی ضخیم تصنیف جو حِلْیۃ الاولیاء کے نام سے مشہور ہے ۔ اسی طرح فرقۂ شیعہ میں نہ صرف ایسی کتابیں متداول رہیں جو شیعہ علماء اور ان کی تصانیف (رکّ بہ الطوسی) سے متعلق تھیں، بلکہ خاصہ لٹریچر اہل بیت علی[رض] کے شہداء کے متعلق بھی تھا ۔ اس دور کی ایک ممتاز تصنیفی صنف علماء و مشاہیر کے تراجم کے معجم ہیں، جو کسی ایک شہر یا صوبے سے تعلق رکھتے تھے، جیسے مقامی علماء ہی تالیف کیا کرتے تھے اور اکثر اوقات ایسی کتاب بے حد ضخیم ہوا کرتی تھی، مثال کے طور پر الخطیب البغدادی (رکّ بآں) (م ۴۶۳ھ / ۱۰۷۱ء) ہی کی تصنیف کو لے لیجیے جو چودہ

مطبوعہ جلدوں پر مشتمل ہے ۔ ان میں سے اکثر تصانیف تلف ہو چکی ہیں، لیکن ابن عساکر (رکّ بآں) (م ۵۷۱ھ / ۱۱۷۶ء) کی تصنیف ''تاریخ'' دمشق جو غالباً عربی ادبیات میں اپنی قسم کی نہایت ہی جامع کتاب ہے، اب تک محفوظ ہے اور اسی طرح اندلس والوں کے تراجم (دیکھیے ابن‌الفَرَضی، ابن بَشْکُوال اور ابن الأبّار) کا ایک سلسلہ اور چند مختصر معاجم بھی موجود ہیں ۔

جیسی کہ توقع تھی تراجم کا لٹریچر دوسرے ذرائع سے بھی جمع کیا گیا ۔ ان میں ایک پُربار اور مثمر ذریعہ فقہ اللغۃ (Philology) تھا، جس میں اس کی تنگ‌تر شاخ اور ادبیات سے وابستہ وسیع‌تر شاخ دونوں شامل تھیں ۔ پہلی صنف کے تحت تو نحویوں کے طبقات اور مشہور و معروف ماہرین فقہ اللغۃ کے تراجم مرتب ہوئے اور دوسری صنف میں شعراء اور ادباء کے تراجم کے متعلق نہایت وسیع ادب پیدا ہو گیا (دیکھیے ابن قُتَیبۃ اور الثّعالبی) ۔ اسی قسم کی کتابیں دوسرے ارباب حرفہ کے حالات کے لیے بھی مخصوص تھیں؛ مثلاً طبقات اطباء و منجمین، و ماہرین فن موسیقی، چنانچہ موسیقی کی وجہ سے پہلی صدیوں میں تراجم کی عظیم‌ترین کتاب کتاب‌الأغانی لکھی گئی جس کا مصنّف ابوالفَرَج الإصفہانی تھا (رکّ بآں) (م ۳۵۶ھ/۹۶۷ء) ۔

اس کے برعکس خودنوشت سوانح عمریوں نے بہت کم فروغ پایا اور اس دور کی صرف دو ایسی کتابیں محفوظ رہ سکی ہیں یعنی مؤیّد فی‌الدّین (رکّ بآں) (م ۴۷۰ھ / ۱۰۷۷-۱۰۷۸ء) اور عثمان بن مُرشِد بن مُنْقِذ (رکّ بآں) (م ۵۸۴ھ/ ۱۱۸۸ء) کی آپ بیتی ۔

اس قسم کی تمام کتب، سیرت اور زمانۂ مابعد کی اسلامی سیرت نگاری میں کچھ مشترک باتیں پائی جاتی ہیں ۔ طریقۂ اسناد کی پابندی عموماً

بڑی احتیاط سے کی گئی ہے - تاریخوں کا ترتیب‌وار مواد (بالخصوص سال وفات) انتہائی صحت کے ساتھ معیّن کیا گیا ہے اور مترجَم کی زندگی کے ضروری حالات مختصراً بیان کیے گئے ہیں - معمولی تراجم تو صرف انھیں موضوعات تک محدود ہیں، لیکن اگر شخص مترجَم مصنف ہے تو اس کی تصانیف کی فہرست، اور شاعر ہے تو اس کے کلام کا اقتباس ضرور شامل کر دیا گیا ہے، البتہ زیادہ ضخیم سوانح عمریوں میں بیشتر حصہ ان نوادر اور حکایات میں صرف کر دیا جاتا ہے جن کی ترتیب بظاہر نہ تو سن‌وار ہوتی ہے اور نہ حسب مضمون - اس قسم کی تصنیف میں شخص مترجَم کے کردار کے متعلق اکثر اوقات بالکل واضح نقش ذہن میں بن جاتا ہے، لیکن گاہے اس نقش میں انتشار بھی پیدا ہو جاتا ہے، خصوصاً جہاں حکایات کے معتبر ہونے کی کوئی سند موجود نہ ہو - باوجودیکہ اس قسم کے ادب میں ضعف پایا جاتا ہے اور اس میں غپ شپ کی طرز کی چیزیں شامل ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ وہ لوگوں کی زندگیوں سے قریب ہے اس سے سیاسی سالناموں کے لیے ایک قسم کے تکملے اور تصحیح کا مواد ضرور مہیا ہو جاتا ہے -

٥ - شروع ہی زمانے میں سیرت اور تاریخ کی آمیزش سے ''سیرت پر مبنی تاریخیں'' لکھی جانے لگیں، یہ طرز وزراء کی تاریخوں کے لیے نمایاں طور پر موزوں تھی؛ مثلاً ان کتابوں کے لیے جو محمد بن عَبْدوس الجہشیاری (م ۳۳۱ھ / ۹۴۲-۹۴۳ء) ہلال الصابی المذکور قبلاً (م ۴۴۸ھ / ۱۰۵٦ء) اور علی بن مُنجِب الصّیرفی (م ۵۴۲ھ / ۱۱۴۷-۱۱۴۸ء) نے تحریر کیں۔ ان میں سے صیرفی نے فاطمی خلفاء کے زمانے کی تاریخ الوزراء لکھی - اسی طرح یہ طرز قاضیوں کے تراجم کے لیے بھی موزوں تھی - اس موضوع پر قدیم ترین تصانیف میں سے قضاۃ مصر پر محمد بن یوسف الکندی (رک بآن) (م ۳۵۰ھ / ۹٦۱ء) کی کتاب اور قضاۃ قُرطبہ پر محمد بن حارث الخُشنی (م ۳٦۰ھ / ۹۷۰-۹۷۱ء) کی کتاب ہے - الصّولی (رک بآن) (م ۳۳۵ھ / ۹۴٦ء) کی کتاب الاَوْراق جو عہد عباسیہ کی تاریخ ہے، سیاسی اور ادبی تراجم کے اختلاط کا ایک عجیب نمونہ ہے - جب شاہی خاندانوں نے عروج پایا تو ان کے متعلق بھی یہی طریق عمل اختیار کیا گیا، البتہ پانچویں اور چھٹی صدی میں اس قسم کے شاہی خاندانوں کی تاریخوں نے عملی طور پر روایتی سالناموں کی جگہ پا لی اور کم از کم مشرقی ولایات میں سالناموں کو بالکل ہی ختم کر دیا - یہ ایک تباہ‌کن اقدام تھا، کیونکہ ذاتی عناصر کے غلبے کی وجہ سے عوامل شخصی بہت زیادہ بروے‌کار آنے لگے، خصوصاً جب حکمران شخصی طور پر اپنے عہد کے وقائع‌نگاری کے متعلق احکام صادر اور خود ان کی نگارش کی نگرانی کرنے لگے - اس طرح تاریخ نویسی محض نیرنگ‌کاری بن جاتی ہے اور سادگی بیان کی جگہ مترسلانہ پیچ در پیچ انشاپردازی (دیکھیے سجع) لے لیتی ہے - اس نئی طرز کی تاریخ نویسی کا موجد بظاہر ابراہیم الصابیٔ (م ۳۸۴ھ / ۹۹۴ء - (دیکھیے الصابی)) تھا جس نے آل بویہ کی تاریخ التّاجی کے نام سے لکھی جو اب ناپید ہے، اس طرز کو عام مقبولیت اس کے مشابہ کتاب الیمینی کی وجہ سے حاصل ہوئی جو العتبی نے (رک بآن) (م نواح ۴۲۷ھ / ۱۰۳۵ء) سُبُکْتگین اور محمود غزنوی کے متعلق لکھی تھی - ممکن ہے اس طرز جدید کا تعلّق مشرق میں فارسی کے احیاء اور ایرانی تاریخی روایات کی تجدید (دیکھیے فصل الف/۴ در فوق [ص ۴۵ الف]) سے ہو اور شاید ایرانی حماسی شاعری کے اثر کا بھی نتیجہ

ہو، جو اسی زمانے میں ساتھ ہی ساتھ معرض ظہور میں آ رہی تھی (دیکھیے دقیقی و فردوسی)۔ اس قسم کی ''سرکاری تاریخوں'' کے لکھنے والوں کو اگر دانستہ دروغ گوئی اور اس سے عام‌تر عیوب غلام صفتی اور اخفاے حق سے بری‌الذمہ بھی قرار دیا جائے، تو بھی ان کی لفاظی، گزاف گوئی اور قوت فیصلہ کا فقدان بہت ہی بدمزہ معلوم ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی متعدد تصانیف اور ان کی بےشمار اولاد (تصانیف مابعد) کو ادبی حلقوں میں اتنی زیادہ شہرت حاصل ہو گئی کہ عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا کہ وہ اسلامی تاریخ کے مستند نمونے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظریے سے اس علم تاریخ کے ساتھ بےانصافی ہوتی ہے، جسے قرون اولی کے مسلمان علماء نے پشتوں کی صبرآزما محنت کے بعد بتدریج ترقی دی۔

۶۔ اس ناموافق ماحول میں تاریخی کتابیں پھر فارسی زبان میں لکھی جانے لگیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان میں سے بہت سی قدیم‌ترین کتابیں عربی تصانیف کے ترجموں اور خلاصوں پر مشتمل تھیں اور اس سلسلے کی ابتداء الطبری کی کلاسیکی تاریخ کے اپنی پسند کے خلاصے سے ہوئی جو ۳۵۲ھ (۹۶۳ع) میں وزیر ابوعلی البلعمی (رک بآں) نے مرتب کیا تھا؛ گو جا بجا اس نے اہم اضافے بھی کیے (دیکھیے مثلاً مادۂ الگردیزی)، تاہم اس زمانے میں جو مقامی اور حکمران خاندان کی تاریخیں فارسی میں لکھی گئیں، ان میں سے شاذ ہی کوئی محفوظ رہی ہو اور نہ ان میں کوئی وجہ امتیاز ہی ہے، جس کے ذریعے ان میں اور اسی زمانے کی عربی تاریخوں میں جو ولایات شرق میں لکھی گئیں، کوئی فرق ظاہر ہو۔ کئی مصنف، مثلاً النسوی (رک بآں) تو ایسے ہیں جو حالات کے مطابق کبھی عربی میں لکھتے تھے اور کبھی فارسی میں، البتہ اس طبقے کی عام تالیفات کے مقابلے میں ایک نمایاں استثنائی صورت ابوالفضل بیہقی (رک بآں) (م ۴۷۰ھ / ۱۰۷۷ع) کے مفصل اور غیرجانبدارانہ روزنامچوں میں ضرور ملتی ہے، جو دور مغول سے قبل کے ادبیات میں ایک بےنظیر تصنیف ہے۔

ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی کے احیاء کی کوشش تو چوتھی صدی ہجری (دسویں میلادی) میں ایرانی خاندانوں کے عہد میں شروع ہوئی، مگر بعد کی صدیوں کے ترک حکام نے بھی اس بارے میں بہت کچھ کیا، کیونکہ وہ عام طور پر عربی زبان سے بالکل نابلد تھے۔ جوں جوں ان کی فتوحات کا سلسلہ مغربی جانب اناطولیہ (آناطولی) تک اور جنوب مشرقی جانب ہندوستان تک وسیع ہوتا چلا گیا، وہ اپنے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو بھی لیتے گئے اور چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی میلادی) کے آخر تک ان ممالک میں بھی تاریخیں فارسی زبان میں تحریر ہونے لگیں، چنانچہ ایشیاے کوچک میں محمد بن علی الراوندی (نواح ۶۰۰ھ / ۱۲۰۳ع) نے اور ہندوستان میں فخرالدین مبارک شاہ (م بعد ۶۰۲ھ / ۱۲۰۵-۱۲۰۶ع) نے تاریخیں لکھیں۔ یہ فخرالدین ہندی ایرانی مؤرخین کے لمبے سلسلے کا سر سلسلہ ہے۔

۷۔ اس سے اگلے دور کا تذکرہ شروع کرنے سے پہلے ادبی سرگرمیوں کی دو اور شاخوں کا مختصر سا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا تاریخ سے اتصال ہے۔ ترتیب سنین کی دریافت کے سلسلے میں علم ریاضی اور علم ہیئت کے استعمال کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ ایسی بحثوں کے آثار ابتدائی زمانے کی متعدد کتابوں میں ملتے ہیں، مگر اس سلسلے میں ایک نہایت ممتاز تصنیف الآثارالباقیۃ ابو ریحان البیرونی (رک بہ آں) (م ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ع)

نے یادگار چھوڑی ۔ دوسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جن کا میلان تاریخ کی نسبت آثار قدیمہ کی طرف زیادہ ہے ۔ ان کا موضوع ہے عرب قبائل کی بستیاں جو انھوں نے نئے ممالک میں بسائیں ۔ موضع نگاری کی وہ کتابیں جنھیں ''ادبیات خطط'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، بظاہر عراق سے شروع ہوئیں (ان میں سے سب سے بڑی تصنیف جو اب ناپید ہے هیثم بن عدی (م ۲۰۷ھ / ۸۲۲-۸۲۳ء) کی تھی)، لیکن خطط نویسی کی توسیع و ترق پر خاص توجہ مصر میں ہوئی (قب مادۂ مصر، فصل ۴)۔

پھر جب عربی زبان کا رواج مشرق کی نصرانی جماعتوں میں بھی ہو گیا، تو کلیساؤں کی تاریخیں بھی عربی میں لکھی جانے لگیں، جن میں کبھی کبھی عربوں اور بزنطینیوں کی تاریخ کو بھی مخلوط کر دیا جاتا تھا ۔ اس صنف کے مؤرخین میں سے ملکانی بطریق یوتی کِی اُوس (Eutychius) (رَکَ بآن) اور یعقوبی اُسقف سیویرس ابن المُقَفّع [رَکَ بآن کے] نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ اس سلسلے میں ایک عجیب تصنیف مصر اور مغربی ایشیا میں نصرانی دیارات کی تاریخ ہے جو ایک مسلمان مؤرخ علی بن محمد الشابُشْتی (م نواح ۳۸۸ھ / ۹۹۸ء) نے لکھی تھی۔

(ج)

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی میلادی) سے عربی اور فارسی زبان کی تاریخ نویسی میں بُعد زیادہ نمایاں ہونے لگا ۔ اول تو مغول کی فتوحات کی وجہ سے اُس عمل کی تکمیل ہوئی، جس سے ایرانی ترکی ثقافت کے علاقے میں ادبی زبان کی حیثیت سے عربی کی جگہ فارسی لے رہی تھی، پھر اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی توسیع اسلامی کی وجہ سے فارسی رواج پا گئی، اس طرح سے ان تمام ممالک میں فارسی تاریخ نگاری کا رواج بڑی تیزی سے شروع ہو گیا ۔ باینہمہ عربی زبان میں بھی تاریخ نویسی کے کام میں خاصا اضافہ ہوتا رہا ۔ اس قسم کے وسیع مواد علمی کے پیش نظر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی لٹریچر جو (I) عربی میں اور (II) فارسی میں پیدا ہوا اس پر علٰحدہ علٰحدہ بحث کی جائے۔

I ۔ اس دور کی عربی تاریخ نویسی گو زیادہ‌تر انھیں اصولوں پر کاربند رہی جو اس کے لیے تجویز ہو چکے تھے، لیکن بعض تازہ آمیزشوں کی وجہ سے اس میں امتیازی خصوصیات ظاہر ہوئیں ۔ ان تبدیلیوں میں سب سے زیادہ نمایاں دو تھیں: (۱) جو تراجم نگاری اور سیاسی وقائع نویسی کے باھمی تعلق میں پیدا ہوئی اور (۲) جو اس مواد کی نوعیت میں پیدا ہوئی جس پر تاریخ عمومی کی کتابیں مشتمل تھیں ۔ ان تبدیلیوں کے اساسی اجزاء مندرجۂ ذیل تھے: پہلی تبدیلی کے لیے یہ کہ عالم مؤرخ، سرکاری مؤرخ کے پہلو بہ پہلو پھر نمودار ہو گیا اور دوسری کے لیے یہ کہ عرب تاریخ نویسی کا مستقر عراق سے پہلے شام میں اور اس کے بعد مصر میں منتقل ہوا۔

۱ ۔ سالناموں میں نمایاں بات جس سے اس نئے دور کا آغاز ہوا یہ تھی کہ اس میں تاریخ عالم (از ابتدائے آفرینش) اور اکثر اوقات تاریخ عالم (از ابتدائے ظہور اسلام) کا احیاء ہوا ۔ اس طرح سے یہ قدیم اور نسبةً زیادہ ادبیاتی (humanistic) نظریہ کہ تاریخ، تاریخ الامۃ ھی کے حولیات کا نام ہے، بازیافت ہو گیا، گو پہلی صدیوں کی تاریخ کے متعلق کوئی جدید تحقیق و تفتیش نہیں کی گئی ۔ ادیبانہ مطمح نظر اس کوشش سے بھی نمایاں ہو جاتا ہے جو سالیانہ سیاسی وقائع اور تراجم نگاری کو یکجا کرنے کے لیے کی گئی، جیسا کہ پہلے بھی بعض قدیم تر مقامی تاریخوں میں ہوا تھا؛ مثلاً ابن القَلانِسی (رَکَ بآن) (م ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) کی تاریخ دمشق میں، البتہ مصنف کی اپنی دلچسپی کے مطابق تصانیف میں ان دونوں

عناصر کی مقدار کا باھمی تناسب مختلف ھے۔ بعض تاریخوں میں (دیکھیے ابن الجوزی، الذھبی، ابن دُقماق) اخبار وفیات سیاسی وقائع کے بیان پر اس قدر چھائی ہوئی نظر آتی ھیں کہ وقائع کا بیان صرف چند ناگہانی اور بے ربط جملوں تک ھی محدود رہ جاتا ھے، لیکن عزّالدین ابن الأثیر (رَكَ بآن) (م ٦٣٠ھ / ١٢٣٣ء) کی مشہور و معروف تصنیف الکامل میں یہی تناسب معکوس ھے۔ یہ تصنیف اس اعتبار سے بھی قابل توجه ھے کہ اس میں مصنف نے یہ کوشش کی ھے کہ تاریخ کو کم جامد طریق سے پیش کرنے کی غرض سے سالیانہ ڈھانچے کے اندر وقائع کی داستان‌بندی کی جائے۔ اگر ذرا گہری نظر سے اس تصنیف کو جانچا جائے، تو معلوم ہوگا کہ مواد کو پیش کرنے میں کچھ نقائص ضرور رہ گئے ھیں، لیکن اس تصنیف کی لطافت و زیبائی اور اس کی شگفتہ بیانی کی وجہ سے اسے فوراً ھی اچھی خاصی شہرت حاصل ھو گئی اور بعد کے مؤلفین اسے ایک معیاری تصنیف تسلیم کرنے لگے۔

بظاھر شاید یہ گمان خالی از صواب نہ ھو کہ تاریخ نگاری میں اس عالمی مطمح نظر کے اختیار کرنے میں عالمی خلافت کے تصوّر کے احیاء کا بھی جزوی طور پر دخل تھا، لیکن جو مثال اس طرح سے قائم ہوئی اس کی تقلید بہت سے بعد کے مؤرخین نے کی اور بعض نے تو مفرط تقلید کی اور ان کی اکثریت کا تو دار و مدار ھی ابن الاثیر کی تصنیف پر ھے (دیکھیے ابن واصل، سبط ابن الجوزی، ابن العبری (Barhebraeus)، ابوالفداء، بای برس المنصوری، ابن کثیر، الیافعی)، گو انھوں نے ابن اثیر سے استفادہ کرنے کے بعد مقامی اور بعد کے زمانے کے مواد کا بھی اضافه کیا ھے۔ شہاب الدین النُّوَیری (رَكَ بآن) (م ٧٣٢ھ / ١٣٣٢ء) نے جو مصر کا موسوعہ نویس مصنف تھا،

اور ابن الفُرات (رَكَ بآن) (م ٨٠٧ھ / ١٤٠٥ء) نے اپنے اپنے سالناموں میں البته ابن الاثیر سے کچھ الگ ھو کر چلنے کی کوشش بھی کی اور نصرانی مؤرخ جرجیس المکین (رَكَ بہ المکین) (م ٦٧٢ھ / ١٢٧٣ء) نے تو بالکل یوٹی کی اوس Eutychius [دیکھیے فصل ب/۷ (ص ٦١ ب)] کا تتبّع کیا ھے۔ اس بعد کے زمانے کی عمومی عربی تاریخوں میں سے وہ تاریخیں جو عام تاریخ نویسی کے لحاظ سے سب سے زیادہ دلچسپ ھیں اندلس اور المغرب میں تصنیف ہوئیں، اگر ان کا مقابلہ مشرق کی ھم زمانہ تصانیف سے کیا جائے تو یہ ظاھر ہوگا کہ المغرب کے مصنّفین اکثر اوقات تاریخ کا قدرے وسیع‌تر تصوّر پیش کرتے ھیں اور ان میں جنبہ‌داری کا رجحان کم ھے۔ ابن سعید المغربی (رَكَ بآن) (م ٦٧٣ھ / ١٢٧٤ء) کی بہت سی تصانیف میں سے لے دے کر چند اجزاء باقی رہ گئے ھیں جن سے یہ بخوبی ثابت ھے کہ یہ تصانیف سابقہ کتابوں کی مفصل اور صحیح نقلوں پر مبنی تھیں۔ یہ شخص ایک ان‌تھک سیاح اور محقق تھا جو ھلاکو خان ایسے خوفناك شخص سے ملاقات کی درخواست کرنے سے بھی نہ جھجکا۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون (رَكَ بآن) (م ٨٠٨ھ/١٤٠٦ء) کی شہرۂ آفاق تاریخ کے متعلق کما حقہٗ مفصل گفتگو کرنا یہاں ممکن نہیں۔ مؤرخ کی حیثیت سے تو اس کی تصنیف بعض اوقات کچھ مایوس کن بھی ھو جاتی ھے لیکن فلسفۂ تاریخ کا ماھر ہونے کی حیثیت سے ابھی یقینی طور پر اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ھے، گو بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ھے۔اسلامی تاریخ نویسی کے نقطۂ نظر سے ابھی تک یہ ایک عقدۂ لاینحل ھی رھا کہ مصر کے شاندار دبستان تاریخ کے باوجود، جس نے بعد کی صدیوں میں ضیا پاشی کی اور ترکیہ میں علم تاریخ پر گہری توجہ مرتکز

ہونے کے باوجود (جہاں اس کے مقدمے کا ترجمہ بارھویں صدی ھجری (اٹھارھویں صدی میلادی) میں ھو چکا تھا) کیوں ایسی کوئی علامت نہیں پائی جاتی، جس سے یہ ظاھر ھو سکے کہ اس کے جانشینوں میں سے کسی نے بھی اس کے پیش کردہ اصولوں کو استعمال کرنا تو درکنار، کبھی ان کے مطالعے کی زحمت بھی گوارا کی ھو.

۲-عمومی تاریخوں کے ساتھ ساتھ ایسی تاریخوں میں بہت زیادہ اضافہ ھوا جو علاقوں اور خاندانوں کی تاریخ اور تراجم پر مبنی تھیں اور جنھیں اکثر انھیں مصنفوں نے مرتب کیا جنھوں نے عمومی تاریخیں لکھی تھیں ۔ ایران اور عراق میں عربی ثقافت مغولوں کے حملوں کے نیچے تقریباً دب ھی کر رہ گئی چنانچہ وھاں تاج الدین ابن السّاعی (م ٦٧٣ھ / ١٢٧٥ع) کی تاریخ عباسیہ کے بعد جو ناپید ھوگئی ھے سوائے چند چھوٹی قسم کی تاریخوں کے خلاصوں کے کوئی خاص قابل ذکر چیز باقی نہیں رھی [دیکھیے ابن الطِقطَقی]، لیکن اس سے پہلے ھی عربی تاریخ نویسی کا مرکز ملک شام میں منتقل ھو چکا تھا، جہاں زنگی اور ایوبی خاندانوں کے عروج کی وجہ سے تاریخ نویسی کا ایک مستقل سلسلہ شروع ھو گیا تھا ۔ اس میدان کی طرف جن لوگوں نے کشش محسوس کی ان میں سے عماد الدین الاِصفہانی بھی تھا (رَکَ بآن) (م ٥٩٧ھ/١٢٠١ع) ۔ یہ شخص ایران و عراق کے دبستان سجع نگاری کا آخری نمایندہ تھا، لیکن شامیوں نے اس مسجّع اسلوب کی جگہ سیدھی سادی فطری نثر نویسی کو ترجیح دی جس کے ذریعے آئندہ زمانے کی عربی تاریخ کو بڑا فائدہ پہنچا ۔ بہاءالدین ابن شدّاد (رَکَ بآن) (م ٦٣٢ھ / ١٢٣٤ع) اور ابوشامَۃ (رَکَ بآن) (م ٦٦٥ھ / ١٢٦٨ع) کی اسی موضوع کی تصانیف عمادالدین کی تصانیف سے بدرجہا بہتر ھیں.

یہ سچ ھے کہ مسجّع قسم کی تاریخیں بھی وقتاً فوقتاً ظاھر ھوتی رھیں اور مصری کاتب (سکریٹری) ابن عبدالظاھر (رَکَ بآن) (م ٦٩٢ھ / ١٢٩٣ع) نے تو ایک نئے فیشن کی بنا بھی ڈال دی یعنی اس نے سلطان بای بَرس کے عہد کی تاریخ نظم میں لکھ ماری ۔ نظم کو اس طرح استعمال کرنا ایسا ھی تھا جیسا بدر الدین ابن حبیب (رَکَ بآن) (م ٧٧٩ھ / ١٣٧٧ع) کا سجع کو تاریخ نگاری کے لیے استعمال کرنا کہ ان دونوں کو بظاھر خارجی اثرات کی طرف منسوب نہیں کر سکتے، لیکن ابن عرب شاہ دمشقی (رَکَ بآن) (م ٨٥٤ھ / ١٤٥٠ع) کی مشہور مسجع تاریخ تیمور (جو ھتک آمیز اور رسوا کن ھے) بلا شک و شبہ ھم زمانہ ایرانی تصانیف کے اثرات کے ماتحت لکھی گئی (دیکھیے فصل II / ۲ در ذیل [ص ٦٧ ب]) ۔ اس کے برعکس فاطمی خاندان کے عہد کی جو تاریخ عیون الاخبار کے نام سے یمنی داعی عماد الدین ادریس بن الحسن (م ٨٦٢ھ / ١٤٥٧ع) نے بلیغانہ انداز میں لکھی ھے، پڑھنے میں یوں معلوم ھوتی ھے گویا پرانی ساسانی روایت کی متأخّر صدائے بازگشت ھے [دیکھیے فصل الف I/۴ص].

تاریخ نویسی کی جو سرپرستی ایوبیوں کے زمانے میں ھوئی وہ ان کے جانشین مملوک سلاطین کے عہد میں جاری رھی ۔ دمشق اور اس کے بعد حلب تاریخ نویسی کی نہایت پُرعمل سرگرمیوں کے مرکز تھے، جن کا باھمی تعلق قاھرہ کے مراکز سے تھوڑا بہت تھا تو سہی، لیکن یہاں بالخصوص تراجم نگاری میں ان سے انفرادی شان ھویدا تھی [دیکھیے فصل ج I / ۳ در ذیل (ص٦٥ ب)] ۔ مملوک سلاطین کے عہد کی آخری صدی میں کہیں جا کر مصریوں کے دبستان تاریخ نے ایک امتیازی اور انفرادی حیثیت اختیار کی ۔ اس دبستان نے مؤرخین کی ایک بُرّاق عقد ثریا پیدا کی جو اپنے شاندار کارناموں کی چمک

دمک دکھانے کے بعد آنکھوں سے اچانک اوجھل بھی ہو گئی ۔ یہ سلسلۂ تاریخ نویسی، کثیرالتصانیف فاضل تقی الدین المقریزی (رکّ بآن) (م ۸۴۵ھ / ۱۴۴۲ء) اور اس کے حریف العینی (رکّ بآن) (م ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء) سے شروع ہوا اور مقریزی کے شاگرد ابوالمحاسن ابن تغری (تنگری) بردی، (رکّ بآن) (م ۸۷۴ھ / ۱۴۶۹ء) اور اس کے ہم چشم علی بن داؤد الجوہری (م ۹۰۰ھ / ۱۴۹۵ء)، شمس الدین السخاوی [رکّ بآن۔ ادارہ] (م ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۷ء)، دانش مند بزرگ پایہ جلال الدین السیوطی (رکّ بآن) (م ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء) اور اس کے شاگرد ابن ایاس (رکّ بآن) (م نواح ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء) نے جاری رکھا ۔ اس سے اگلی پشت میں عثمانی فتوحات وغیرہ کا دوسرا مؤرخ احمد بن زُنْبُل (م بعد ۹۵۱ھ / ۱۵۴۴ء) بالکل مختلف دبستان سے تعلق رکھتا تھا ۔ گو ان مؤرخین میں بہت سے ایسے نقص پائے جاتے ھیں جو ابتدائی دور کے سالیانہ سیاسی وقائع لکھنے والوں میں موجود تھے، لیکن یہ مؤرخ ایک وقت نرے عالم تھے تو دوسرے وقت نرے درباری؛ یہی وجہ تھی کہ زیادہ وسیع النظر اور صائب الرّاے ہو گئے اور انھیں محض قصیدہ خوانوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کی تصانیف کی نمایاں خصوصیت یہ ھے کہ ان کی تمام تر توجہ مصر پر مرتکز ھے اور یہ جذبہ اس حد تک غالب ھے کہ وہ مؤرخ بھی، جو اپنی تاریخ کو تاریخ عمومی کے قالب میں ڈھالتے تھے، اس کا مواد مصری ھی ڈھانچے کے اندر ڈالتے تھے ۔ ان سب میں نمایاں شخصیت المقریزی کی ھے، صحت بیان کے اعتبار سے تو نہیں (کیونکہ اس کے بیان کی صحت طعن سے بالا نہیں ھے)، ھاں اپنی محنت کیشی کے لحاظ سے، اپنی دلچسپیوں کے دائرے کی وسعت کی وجہ سے اور اس لیے کہ وہ تاریخ کے زیادہ اجتماعی اور احصائی پہلوؤں پر بھی توجہ دیتا ھے۔

دوسرے علاقائی مؤرخین کی تصانیف اور ان لوگوں کی تصانیف میں جو فرق ھے وہ اتنا طریق کار یا شخصیت کا نہیں جتنا پیمانے کا ھے ۔ ایسی یمنی کتابوں، مثلاً ابن الوھّاس الخزرجی (م ۸۱۲ھ / ۱۴۰۹ء) یا ابن الدَّیبع (رکّ بآن) (م ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء) کی تصانیف میں بھی ایسا مواد ملتا ھے جیسا مصر کی تاریخوں میں، لیکن ان کا پیمانہ چھوٹا ھے ۔ یہی حال شاھی خاندانوں کی اور محلی تاریخوں کا ھے جو مغرب یا ھسپانیہ میں لکھی گئیں ۔ بعض مؤرخین — مثلاً عبدالواحد المراکشی (رکّ بآن) جو ساتویں صدی ھجری (تیرھویں صدی میلادی) کا مؤرخ ھے، یا ابن ابی زَرْع (رکّ بآن) جو آٹھویں صدی ھجری (چودھویں صدی میلادی) کا — دوسرے مغربی مؤرخین کے مقابلے میں مواد اور طریق ادا کے اعتبار سے کچھ فائق ھوں تو ھوں، لیکن ان میں سے صرف ایک یعنی غرناطی وزیر لسان الدین ابن الخطیب (رکّ بآن) (م ۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء) ھی ایسا ھے جو ذوق، ھنر اور مہارت فن کی وجہ سے ممتاز و سرفراز ھے اور اپنے کمال میں حد عبقریت (genius) تک پہنچا ھوا ھے، اگرچہ ایک نقاد مؤرخ کی حیثیت سے اس کا ھم عصر ابن عِذاری (رکّ بآن) جہاں تک ان دونوں کی موجودہ تصانیف کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ھے، اگر اس پر فوقیت نہیں رکھتا تھا تو غالباً اس کا ھم پلّہ ضرور تھا۔

۳ ۔ گو سیاسی تاریخ نویسی پر بہت سے مؤرخوں نے بہت زور مارا، تاھم عربی تاریخ نگاری کی صحیح روح کا سراغ وقائع نگاری کی نسبت

سیرت نگاری میں زیادہ ملتا ہے ۔ اس دور کے تقریباً تمام عربی مصنفین کی تصانیف میں سالیانہ سیاسی وقائع اور تراجم کا اتصال عمومی اور مقامی تواریخ دونوں میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ پہلے بھی مذکور ہوا، لیکن ابھی ہمیں اس کثیرالمقدار تاریخی ادب سے بحث کرنا ہے جو صریحاً غیر سیاسی تراجم کے لیے وقف تھا ۔

ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی میلادی) کے پہلے نصف میں اس سے پہلے دور کے متخصصانہ رجحانات نے [دیکھیے فصل ب/۴ (ص ۸۰ ب)] تراجم کے متعدد مجموعوں میں اپنا اوج کمال پایا ، جنھیں خاص اھمیت حاصل ہے ۔ عربی ادبیات کی چھے صدیوں پر مکمل تبصرہ یونانی الاصل یاقوت الرّومی (رَکَ بآن) (م ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء) کی تصنیف إرشاد الأریب میں موجود ہے ۔ ابتدائی زمانے کی تمام سرگرمی جو اسلامی علوم اور طب پر صرف ہوئی، اس کی آئینہ‌دار وہ معاجم ھیں جو ابن القِفْطی المصری (رَکَ بآن) (۶۴۶ھ / ۱۲۴۸ء) اور ابن ابی اُصَیْبِعَة الدمشقی (رَکَ بآن) (م ۶۶۸ھ / ۱۲۷۰ء) نے مرتب کیں ۔ علاقائی کتب تراجم کا سلسلہ تاریخ حلب مؤلفۂ قاضی کمال الدین ابن العَدیم (رَکَ بآن (م ۶۶۰ھ/ ۱۲۶۲ء) اور تاریخ غرناطہ مؤلفۂ ابن الخطیب اور ایسے ھی دوسرے مجموعوں میں جاری رھا ، جو اس فن کی سابقہ تصانیف کا تتمہ اور تکملہ تھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ فقہاء وغیرہ کے رسمی طریق کے ''طبقات'' [رَکَ بآن] ھیں اور اثری تحقیق و تدقیق کی کتابیں بھی ھیں؛ مثلاً مؤرخ ابن الأثیر کی تصنیف اُسْد الغَابَة فی معرفة الصَّحابة [اسی ذیل میں ابن الفُوَطی (م ۷۲۳ھ / ۱۳۲۳ء) کی مَجمع الآداب فی مُعجم الألقاب ہے جس میں القاب کو بترتیب معجم دے کر ھر زمانے کے مشاھیر کے حالات دیے ھیں، جو ان القاب سے موسوم تھے ۔ یہ نایاب کتاب پچاس جلدوں میں تھی (حاجی خلیفہ)۔ خود مصنف ھی نے بعد میں تلخیص مَجمع الآداب فی معجم الألقاب کے نام سے سات جلدوں میں کتاب کی مجدول تلخیص شائع کی جس کی صرف چوتھی اور پانچویں جلد اب تک ملی ہے، پانچویں جلد (ك تا م) اورینٹل کالج میگزین ، لاھور میں مع حواشی و زیادات شائع ھوئی (۱۹۳۹ء ببعد) ۔ چوتھی جلد (ع تا ق) کتابخانۂ ظاھریہ دمشق میں ہے، اس کے عکس پنجاب یونیورسٹی لائبریری نے حاصل کیے ھیں۔ اب یہ جلد اورینٹل کالج میگزین اور اس کے ضمیمے میں زیر طبع ہے ۔ کتاب کا نہایت قیمتی حصہ وہ ہے جو چھٹی اور ساتویں صدی کے مشاھیر سے متعلق ہے ۔ مصنف کے لیے دیکھیے میگزین مذکور بابت مئی ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۸ء ۔ادارہ]۔

اس قسم کی متخصصانہ تصانیف کے علاوہ شام میں دو نئی قسم کی جامع معاجم تراجم منصّۂ ظہور پر لائی گئیں اور رواج پذیر ھوئیں ۔ پہلی ہمہ‌گیر قسم کا موجد ابن خلِّکان (رَکَ بآن) (م ۶۸۱ھ / ۱۲۸۲ء) تھا ۔ اس تصنیف کو اپنی صحت اطلاعات اور ذوق سلیم کی بدولت عظیم اور بجا شہرت حاصل ھوئی ۔ بایں‌ہمہ اس کتاب میں ابن شاکر الکُتُبی (رَکَ بآن) (م ۷۶۴ھ / ۱۳۶۳ء) کے ضمیمے کو بھی شامل کر لیں، تب بھی حجم اور احاطۂ تراجم میں خلیل ابن ایبک الصَفَدی (رَکَ بہ الصفدی) (م ۷۶۴ھ / ۱۳۶۳ء) کی کتاب اس پر بہت زیادہ فوقیت رکھتی ہے اور حقیقت میں اسی ضخامت کی وجہ سے اب تک شائع نہیں ھو سکی ۔ پھر صَفَدی کی تصنیف پر بھی مؤرخ ابوالمحاسن نے ایک ذیل لکھا، جسکا نام المَنْہل الصّافی ہے ۔ دوسرے نئے نمونے کی معجم تراجم نے بھی اپنا جال تو دور دور تک پھینکا، مگر

واسطہ ایک محدود زمانے سے رکھا ۔ یہ طریق عمل غالباً الذہبی [دیکھیے فصل ج ۲/۱ در فوق (ص ۶۲ الف)] کی تاریخ عمومی سے مربوط ہے، جس میں تراجم کو ساتویں صدی کے آخر تک دس دس سال کے طبقات میں مرتب کیا گیا ہے اور اصل تاریخ سے اسے ایک مستقل تصنیف کی صورت میں علحدہ بھی کیا جا سکتا ہے ۔ اسی قسم کے سو سو سال کے طبقات کے مرتب کرنے کا خیال سب سے پہلے غالباً الذہبی کے معاصر البِرزالی (رک باں) (م ۷۳۹ھ/ ۱۳۳۹ء) کو آیا ۔ ابن حَجر العَسقلانی (رک باں) (م ۸۵۲ھ / ۱۴۴۹ء) کی کتاب الدُرر الکامنة کے وجود میں آنے سے یہ نیا طریقہ بخوبی رائج ہو گیا ۔ اس میں آٹھویں صدی کے تمام مشہور و معروف مردوں اور عورتوں کو ابجدی ترتیب میں مرتب کیا ہے ۔ وفیات نویسی کے نظام کا آخری نشان اس کتاب میں یوں محفوظ ہوا کہ ہر شخص کو اس صدی کے متعلق سمجھا گیا جس میں اس کی وفات ہوئی ہو ۔ اسی طرح نویں صدی کی معجم ابن حجر کے شاگرد مذکورۂ بالا السّخاوی (م ۹۰۲ھ / ۱۴۹۷ء) نے الضوء اللامع کے نام سے مرتب کی اور یہ سلسلہ بعد کی نسلوں نے بارھویں صدی تک جاری رکھا (دیکھیے فصل د، ۲/I [ص ۷۲ الف]) [السخاوی ہی نے الاِعلان بالتّوبیخ لِمَنْ ذَمّ التاریخ (قاہرۃ ۱۳۴۹) لکھی جو اسلامی زمانے کی تاریخ نویسی کی تاریخ ہے ۔ ادارہ] ۔

II / ۱ ۔ ایرانی دبستانہائے تاریخ نویسی میں، جو ساتویں اور دسویں صدی تک کے درمیان وجود میں آئے، بہت رنگا رنگی ہے، مگر ان سب میں ایک مشترکہ اساس ضرور موجود ہے، یعنی عمومی تاریخ اسلام جو روایت پر مبنی ہے، لیکن فارسی تاریخوں کی اہمیت اور انفرادیت کا دار و مدار اس پر ہے کہ انھوں نے اس مشترک اساس پر کیا عمارت کھڑی کی ۔ عمومی تاریخ کی کتابیں، خواہ وہ ایران میں لکھی گئی ہوں یا ہندوستان میں جن میں صرف ابتدائی مآخذ کے خلاصوں کے ساتھ کچھ زائد مواد اپنے زمانے تک کا درج کر دیا جاتا تھا، ایسی ہی تقلیدی اور ثانوی قسم کی تاریخیں ہیں جیسی کہ عربی زبان کی، بلکہ اکثر ان میں تنقیدی ملکہ اور بھی کم پایا جاتا ہے ۔ ایسی تصانیف، مثلاً منہاج الدین جُوزجانی (رک باں) (م بعد ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء) کی کتاب مقامی تاریخ کی حیثیت سے کچھ قدر و قیمت کی حامل ضرور ہیں، لیکن اصول علم تاریخ کے اعتبار سے وہ کچھ زیادہ دلچسپ نہیں، اس لیے ہم اپنی توجہ زیادہ تر مختلف ''دبستانوں'' کی ان تصانیف تک ہی محدود رکھینگے جنھوں نے مختلف زمانوں میں ایران اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں فروغ پایا اور جن کی وجہ سے کوئی ممتاز تاریخی ادب پیدا ہوا ۔

۲ ۔ مغربی ایشیا میں سلطنت مغول کا قیام ایسے ممتاز سلسلۂ تصانیف کا محرک اول بنا جس کا پیش خیمہ علاء الدین عطاء مَلِک جُوینی (رک باں) (م ۶۸۱ھ / ۱۲۸۳ء) کی منفرد اور طبعزاد تاریخ تھی، مگر جو بذات خود ''کاتبوں کی تاریخوں'' کی صنف کے ساتھ مربوط تھی جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے (فصل ب/۲ مذکورۂ بالا [ص ۷۰ الف]) ۔ خالص ''دبستان'' مغول کی ابتداء وزیر فضل اللہ رشید الدین طبیب (رک باں) (م ۷۱۸ھ / ۱۳۱۸ء) کی تصنیف جامع التواریخ سے ہوتی ہے جو ایلخانیوں کے مسلمان ہو جانے کا براہ راست نتیجہ تھی ۔ رشید الدین کی یہ کتاب فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں بتدریج تصنیف ہوئی ۔ اس کا پہلا حصہ تو بادشاہی خاندان کی تاریخ ہے جو زیادہ تر مغل روایات پر مبنی ہے بعد میں الجائتو کے

عہد کی تاریخ سے اس حصے کی تتمیم ہوئی، دوسرا حصہ عرب تاریخ نویسی کی موسوعاتی شاخ سے مربوط ہے [دیکھیے فصل الف/۴ (ص۵۴ الف)] (جس پر مدتوں سے کچھ لکھا نہیں گیا تھا) کیونکہ اس میں ہندوستان، چین اور یورپ کی تاریخ پر ملاحظات شامل ہیں ۔ پہلی کتابوں سے یہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس کا مواد ہم‌عصر راویوں سے اخذ کیا گیا ۔ تاریخ نگاری کا یہ تخیل خوب تھا، مگر پہلی تاریخوں کی طرح یہ بھی تشنۂ تکمیل رہا اور قوۃ سے فعل میں کم آیا ، ہاں جو کچھ ہو سکا اسے بھی نظرِ کم سے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ اس کے علاوہ یہ تصنیف حسن بیان وغیرہ جمالیاتی کیفیتوں کے مقابلے میں اسلوب نثر کی متانت اور صحت واقعات اور جزئیات کی تفصیل کے اعتبار سے بہت زیادہ جالب نظر ہے ۔ یہ بات کہ ان خوبیوں کے لیے داد حقیقۃً رشید الدین کو ملنی چاہیے یا عبد اللہ بن علی کاشانی کو، ہمارے نقطۂ نظر سے کچھ اہمیت نہیں رکھتی ۔ معنی‌خیز بات یہ ہے کہ اس تصنیف کو بے‌پناہ شہرت حاصل ہو جانے کے بعد اس کی نشر و اشاعت اچانک رک گئی اور اس دبستان کے دوسرے مصنفوں نے جو رشید الدین ہی کے متوسلین میں سے تھے، حتمی طور پر اس کے طریق عمل کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا، البتہ خلاصہ نویس بناکتی (رکّ بآن) (م ۷۳۰ھ/ ۱۳۲۹-۱۳۳۰ء) اور حمد اللہ مستوفی قزوینی (رکّ بآن) (م بعد ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء) جو تلخیص کے شائق ہیں، اس سے مستثنٰی ہیں ۔ ان مصنفین میں سے بہت سوں نے (بشمول قزوینی) اس کے بجاے یہ کوشش کی کہ وہ طویل حماسی تاریخیں، شاهنامے ہی کی بحر میں لکھ کر فردوسی سے بھی سبقت لے جائیں ۔ اس کے علاوہ صرف ایک ممتاز تصنیف نثر میں لکھی گئی ۔ یہ عبد اللہ بن فضل اللہ وصّاف (رکّ بآن) (م بعد ۷۱۲ھ/ ۱۳۱۲ء) کی بلیغانہ و پرصنعت تصنیف اور پرانے نمونے کی ایک "سرکاری تاریخ" ہے [دیکھیے فصل ب/۵ (ص ۶۰ الف)] ۔ یہ کتاب بھی انہیں تاریخوں کی طرح درجۂ اول کا نمونہ بن کر رہ گئی تاکہ وہ مستقبل کے مؤرخوں کی نسلوں کو لفاظی کی بادیہ پیمائی میں مصروف رکھے ۔

دبستان مغول کے خاتمے اور تیمور کے زمانۂ عروج کے درمیانی عرصے میں تاریخ نویسی سست و بےحال رہی ۔ تیمور کے ساتھ منشیوں (سکرٹریوں) کا باقاعدہ عملہ رہا کرتا تھا، جن کا کام یہ تھا کہ وہ اس کے جنگی کارناموں کی تاریخ مرتب کرتے رہیں اور وہ خود ان کی مکمل تصانیف کو پڑھوا کر سنا کرتا تھا ، چنانچہ اس کے عہد کی ایک تاریخ ترکی زبان میں تاریخ خانی کے نام سے نظم ہوئی اور نظام الدین شامی نے ایک تاریخ فارسی زبان میں لکھی ۔ اسے خاص طور پر تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ 'لفاظی اور صنائع بدائع کے استعمال سے احتراز کرے' باینہمہ اس کا ظفرنامہ اسی نام کی ایک اور تصنیف کے مقابلے میں جو شرف الدین (رکّ بآن) علی یزدی (م ۸۵۸ھ / ۱۴۵۴ء) نے صنائع بدائع سے آراستہ کر کے لکھا، تقریباً طاق نسیان میں دھرا رہ گیا ۔ ظفرنامۂ یزدی اب تک مشہور چلا آتا ہے اور لطف بیان اور خوبی سلیقہ کا بہترین نمونہ تسلیم ہوتا ہے ۔ یہ تاریخی سرگرمیاں تیمور کے جانشینوں کے عہد میں بالخصوص 'دبستان ہرات' میں اوج کمال کو پہنچیں ۔ اس دبستان نے آل تیمور کی سرپرستی میں رشیدالدین کی قائم کردہ روایات کو از سرنو تازہ کیا ۔ شاہ رخ نے حافظ ابرو (رکّ بآن) (م ۸۳۳ھ / ۱۴۳۰ء) کو مامور کیا کہ جامع التواریخ کا جدید ایڈیشن مرتب کرے اور اس کا ذیل لکھے [موجودہ جامع التواریخ کے دیباچہ

میں حافظ ابرو نے لکھا ہے کہ شاہ رخ نے جب اسے حکم دیا کہ کتاب رشیدی کا پہلا حصہ ضائع ہو گیا ہے اسے تمام کرے، تو حافظ ابرو نے اس تاریخ کا جو اس نے بایسنغر کے لیے لکھی تھی پہلا حصہ یعنی ربع اول، جو زمان آدم سے ابتدائی احوال (حضرت رسالت مآبؐ) تک ہے، نقل کرکے کتاب رشیدی میں لگا دیا۔ ادارہ]۔ اسی مصنف نے ایک اور تاریخ عمومی بھی شاہ رخ کے بیٹے بایسنغر کے لیے لکھی جس میں کوئی خاص جدت تو نہیں ہے، لیکن اس کا اسلوب بیان متین اور سادہ ہے۔ اسی قسم کی متانت فصیح الخوافی کی مجمل (تصنیف حدود ۸۴۰ھ/۱۴۳۶ء) اور فاضل اجل ہمہ دان سلطان الغ بیگ [رک بآن] (م ۸۵۳ھ / ۱۴۴۹ء) کی تصنیف تاریخ الوس اربعۃ میں بھی غالباً پائی جاتی ہے جو بظاہر اب صرف ایک ملخص کی صورت میں محفوظ ہے؛ لیکن جس طرز کی رنگین اور مرصع نثر حسین کاشفی (رک بآن) کی طرح کے معاصر مصنفوں نے لکھی اسے بھی تاریخ نگاری کے لیے ممنوع قرار دینا ممکن نہ تھا، چنانچہ تیموری عہد کے عام مصنفین مقلدانہ طور پر اسی طرز تحریر کے دام میں پھنس کر رہ گئے اور دبستان ہرات کے بعد کے دور کی تصانیف تو لفاظی اور صنائع بدائع کے سمندر میں اور بھی زیادہ ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ عبدالرزاق سمرقندی (رک بآن) (م ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء) نے نسبۃً اعتدال سے کام لیا، لیکن اس کی تصنیف کو میر خواند (رک بہ میر خاوند) (۹۰۳ھ/۱۴۹۸ء) کی روضۃ الصفاء کے پر صنعت اسلوب بیان کی سی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ میر خواند کا نواسہ خواند امیر (رک بآن) (م ۹۴۲ھ/۱۵۳۵-۱۵۳۶ء) دبستان ہرات کا یہ متأخر اسلوب بیان ہندوستان لے گیا اور وہ سرزمین بھی اس اسلوب کو بہت موافق آئی۔

۳۔ ہندوستان میں فتوحات غوریہ اور دہلی میں سلاطین کا مستقر قائم ہو جانے کی وجہ سے ایرانی طرز تاریخ نویسی کی جو ابتداء ہوئی اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے (فصل ب/۶ [ص ۶۱ الف])، اور بعد کی صدیوں میں ہندی فارسی سالناموں کا بڑا سلسلہ اسی قسم کے اسلوب بیان اور طرز روایت سے مربوط ہے۔ تاج المآثر مصنفۂ حسن نظامی (رک بآن) (حدود ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء) کے بعد اہم تصنیف ضیاءالدین برنی [رک بآن] (م بعد ۷۵۸ھ / ۱۳۵۷ء) کی ہے جس نے تاریخ جوزجانی کا ذیل لکھا۔ اس کے علاوہ سوائے چند تاریخوں کے جو تراجم پر مبنی اور ''تکلفات منشیانہ اور تصنعات مترسلانہ'' سے پر ہیں اور کچھ بھی نہیں، البتہ صوبۂ سندھ میں مقامی روایات کے بعض آثار موجود ہیں جو پہلی صدی ہجری (آٹھویں صدی میلادی) کی عرب فتوحات تک پہنچتی ہیں۔ غالباً اس تاریخ نما افسانے کا جسے ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی میلادی) میں چچ نامے کے نام سے شائع کیا گیا تھا، پس منظر یہ ہے۔ اسی طرح گجرات اور دکن کی مقامی تاریخ نویسی کا تعلق اور مقامات کی نسبت بظاہر فارس سے زیادہ وابستہ نظر آتا ہے۔

۴۔ اس سارے دور میں ادبیات کا میدان ترکی اور عثمانی مملکت میں بدستور فارسی روایات ادب کے قبضے میں رہا۔ ادبی نقطۂ نظر سے منثور تصانیف اور منظوم حماسی کتابیں جو اناطولیہ کے سلجوقیوں کے متعلق ہیں (دیکھیے 'ابن بی بی' اور 'ترک' : ۳ : ۱) بجائے خود کسی طرح بھی قابل ملاحظہ نہیں، لیکن اس لحاظ سے دلچسپ ضرور ہیں کہ انہوں نے نو ظہور ترکی تاریخ نویسی کے لیے نمونے کا کام دیا۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سادہ بیان کا گو پورا فقدان نہیں ہوا، لیکن آخر میں جا کر عبارت آرائی کے مقابلے میں اس قسم کا

طرز بیان کم مقبول ہوا اور ادریس بن علی بدلیسی (رک بان) (م ۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء) کی منثور تصنیف ''ہشت بہشت'' میں، جو بایزید ثانی کے حکم سے لکھی گئی تھی، لفاظی اور صنائع بدائع کا استعمال انتہا پر جا پہنچا ۔ اس کے ساتھ ہی لفاظی اور کلام مصنوع کو مبتذل اور غیرعلمی تحریروں کے برابر گرداننا ایک قسم کا سطحی اندازہ ہوگا ۔ حقیقت یہ ہے کہ بدلیسی کی تصنیف میں تاریخ وصاف نیز کئی دیگر مترسلانہ و منشیانہ تاریخوں کی طرح لفاظی کے غبار کے نیچے سنجیدہ اور تاریخی اعتبار سے بہت ذی‌قیمت روایت موجود ہے ۔

۵ ۔ عربی اور فارسی تاریخ نویسی میں نہایت نمایاں فرق یہ ہے کہ فارسی تصانیف میں ادبی تذکرہ نگاری کی ترقی تو بلاشک بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی ہے، مگر تاریخی تراجم نسبۃً کالعدم ہیں؛ ہاں متعدد عمومی تاریخوں میں معمولی طرز کی وفیات اور تراجم بھی درج ہیں یا ایسی کتابوں میں ایک علىحدہ فصل مشاہیر، بالخصوص وزراء، شعراء اور مصنفین کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے ۔ ان کے بعد سیر اولیاء و متصوفین کی باری آتی ہے ۔ ان سیر کی دو قسمیں ہیں: (۱) افراد کے تراجم، ان میں سے زیادہ قابل ذکر سیرت شیخ صفی‌الدین ہے جسے توکل بن بزاز [رک بان] نے (۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء میں) قلمبند کیا ۔ (۲) عام یا خاص گروہوں یا سلسلوں کے تراجم (دیکھیے عطار، جامی، مولوی) ۔ ''دبستان ہرات'' کے دو مصنفوں نے وزراء کے تراجم پر تصنیفیں لکھی ہیں، سیف‌الدین فضلی نے آثار الوزراء (جو ۸۸۳ھ / ۱۴۷۸ء میں لکھی گئی) اور خواند امیر نے دستور الوزراء (جو ۹۱۰ھ / ۱۵۰۹ء میں لکھی گئی) ؛ لیکن بعد کے دور تک یہ نوبت نہ آئی کہ فارسی زبان میں ایسی تصانیف لکھی جانے لگیں، جن کا مقابلہ عربی زبان کے ہم‌عصر معاجم تراجم سے ہو سکے ۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا سبب ہمیں اس گہرے تعلق میں تلاش کرنا چاہیے جو تراجم نویسی اور مذہبی مطالعات کے درمیان قائم ہو گیا تھا ۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صفویوں کے عہد سے پہلے تک علم دین اور علوم عقلیہ کی تصانیف ایران اور ہندوستان تک عربی ہی میں لکھی جاتی رہیں اور فارسی زبان کا استعمال خصوصی صرف شاعری، خالص ادبی تصانیف اور سرکاری وقائع نگاری تک ہی محدود تھا۔اس سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ فارسی زبان میں تراجم نویسی کا فقدان کیوں ہے ، مگر اس کی وجہ بتانا اتنا آسان نہیں کہ ترکی اور ایرانی علاقوں کے متعلق عربی میں بھی کتب تراجم کیوں نہ لکھی گئیں۔

(د)

دسویں صدی ہجری (پندرھویں صدی میلادی) کے پہلے ربع میں تقریباً تمام اسلامی دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک طاقتوں کی تقسیم جدید عمل میں آئی ۔ عثمانی ترکوں نے غربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں مراکو کی حدود تک اپنا اقتدار قائم کر لیا، صفویوں نے ایران میں ایک بذات خود مستقل شیعی حکومت بنا لی، شیبانیوں نے وسط ایشیا میں ازبکی ریاستیں قائم کیں، خاندان مغلیہ کی بنا ہندوستان میں رکھی گئی، ایک نئے شریفی خاندان نے مراکو میں ہسپانوی اور پرتگالی دباؤ کے رد میں دھاووں کا اہتمام شروع کیا اور دریاے نائجر کے حبشی بلاد نے آل سنغوئی (Songhoy) کے ماتحت حتمی طور پر اسلامی تنظیم حکومت کی شکل اختیار کر لی ۔ ان تحریکات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نئی ثقافتی جماعت بندیاں عمل میں آئیں اور امور کے رخ نئے سرے سے پھیرے گئے ، جس کا اثر ہر قسم کے

ادب اور بالخصوص علم تاریخ پر پڑا۔ عربی زبان کی تاریخ نویسی پر تو بہت برا اثر پڑا ھی، فارسی تاریخ نویسی کو بھی خود ایران کے فرقہ وارانہ انقطاع کی وجہ سے بڑا صدمہ پہنچا۔ اس کے برعکس اب ترکی زبان میں نیا اور زبردست تاریخی لٹریچر معرض وجود میں آ گیا جو پہلے ادب سے مربوط تو تھا، لیکن اس نے کسی حد تک اپنے ھی خطوط پر ترقی کی۔

I /۱۔ وسطی عربی ولایات عثمانی حکومت کے زیر تسلّط آ گئیں، اس لیے عربی تاریخ نویسی مقامی محرکات سے جن کی بنا پر اب تک کام ھو رہا تھا محروم ھو گئی اور یہ تاریخ نویسی دم توڑنے لگی۔ چند ادنٰی درجے کی عمومی تاریخیں (دیکھیے البَکری، الدّیار بکری، الجَنّابی) اور کچھ مقامی تاریخیں یا کتب سیر جو قدر و قیمت میں متفاوت ھیں، اس دور میں مصر، شام، عراق اور عرب کی خالص تاریخ نویسی کی کل کائنات ھیں اور یہ حالت تیرھویں صدی ھجری (انیسویں صدی میلادی) تک قائم رھی اور اس زمانے میں قدیم طرز کی عربی تاریخ نویسی کا پورے طور پر خاتمہ ھو گیا، البتہ دو قابل ذکر مصنف ضرور پیدا ھوے یعنی عبدالرحمٰن الجَبَرتی (رَکَ بآن) (م ۱۲۳۷ھ/ ۱۸۲۲ء) مصر میں اور حیدر احمد الشِہابی (م ۱۲۰۱ھ/ ۱۸۳۰ء) لبنان میں؛ تاھم وسطی، مشرق اور جنوبی عرب میں اس قسم کی تاریخ نویسی کا سلسلہ اس صدی کے آخر تک جاری رھا (دیکھیے دحلان) ۔ مغرب میں بھی الناصری السّلاوی (رَکَ بآن) (م ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) اس آخری طرز کا فاضل مؤرخ ضرور پیدا ھوا گو وھاں متذکرۂ بالا قسم کے چھوٹے درجے کے مؤرخین کا ایک سلسلہ (دیکھیے الوُفرانی، الزیّانی) اس سے پہلے بھی تھا۔اس سلسلے کے مؤرخین سے الگ ھونے والی شخصیتوں میں ایک ھی برجستہ اور ممتاز شخصیت نظر آتی ھے اور وہ ھے المَقَّری التِلِمسانی (رَکَ بآن) (م ۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۲ء) صاحب نَفح الطیب کی۔ اس کی تاریخ اندلس (Analects) اور سیرت ابن الخطیب، اندلسی اسلام کے آخری شاھکار ھیں جن پر اس شاندار روایت کا خاتمہ بالخیر ھوا۔

عربی تاریخی روایت اپنے اوطان میں زوال پذیر ھو گئی، مگر اس کی تلافی دو طرح سے ھو گئی؛ کچھ تو اس طرح کہ ترکی زبان میں تاریخ نویسی کا محدود ارتقاء عمل میں آیا۔ چنانچہ منجّم باشی (رَکَ بآن) (م ۱۱۱۳ھ / ۱۷۰۲ء) کی قابل قدر تاریخ عمومی اسی ارتقاء کا جزو ھے؛ کچھ اس طرح کہ تاریخ اب دور دست اسلامی بلاد میں بھی پہنچ گئی جہاں اسلام نسبۃً قریب کے زمانے میں پہنچا تھا۔ ھماری مراد خصوصیت سے مغربی افریقہ سے ھے۔ان ممالک میں متعدد مقامی تاریخیں لکھی گئیں جن میں اھم‌ترین تصنیفیں دو ھیں، یعنی عہد سُنغوئی (Songhoy) کی تاریخ مصنفۂ عبدالرحمٰن السَّعدی (رَکَ بآن) (م بعد ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء) اور مای اِدریس والی بورنو (Bornu) (دور حکومت ۹۱۰ھ تا ۹۳۲ھ / ۱۵۰۴ تا ۱۵۲۶ء) کے عہد کی تاریخ مصنفۂ امام احمد۔ مشرق افریقہ میں کِلوہ کی قدیم تاریخ اور ملک حبشہ میں احمد گرانژ (Ahmed Grañ) کی لڑائیوں کا حال محفوظ رہ گیا ھے ۔ احمد والی کتاب نواح ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں شہاب‌الدین عرب فقیہ نے لکھی تھی ان کے علاوہ عُمان کے دبستان اباضیہ میں بھی بعد کے زمانے میں چند تاریخی کتابیں لکھی گئیں۔ عرب اور ھندوستان کے مغربی ساحل کے درمیان گہرے تعلقات رہے ھیں، اس لیے یہاں بھی بالخصوص جنوبی حصے میں عربی کو ایک

سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کر لیا گیا، قب دستاویزات جو João de Sousa (لزبن ۱۷۹۰ء) نے شائع کی ہیں)، اس لیے یہ قابل تعجب بات نہیں کہ پرتگیزوں کی لڑائیوں کی تاریخ عربی زبان میں زین‌الدین المعبری (رک بآن) (م ۹۸۷ھ / ۱۵۷۹ء) نے لکھی؛ البتہ یہاں سے شمال کی طرف جائیں تو ان بلاد میں عربی کا مقابلہ فارسی سے ہوا اور صرف ایک عربی تاریخ محمد بن عمر اُلُغ خانی گجراتی (م بعد ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کی لکھی ہوئی محفوظ رہ سکی ہے - اس نے اپنی تصنیف کا بہت سا مواد فارسی زبان ہی کی تصانیف سے جمع کیا ہے - خود ایران میں صرف ایک یا دو مختصر سی تاریخیں عربی زبان میں لکھی گئیں ۔

۲/ - تاریخی روایت کے مقابلے میں تراجم نگاری نے اپنی قوت بالخصوص ملک شام میں بر قرار رکھی، کیونکہ اس کا انحصار سیاسی انقلابات پر نسبۃً کم تھا - فضلاے دمشق نے دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی کے مشاہیر کے معاجم تراجم کا سلسلہ قائم رکھا (دیکھیے البورینی، المحبی المرادی)، کچھ اور کتابیں بھی لکھی گئیں جن سے کسی ایک شہر یا علاقے کے علماء و فضلاء کی یاد کو تازہ رکھنا مقصود تھا - ان تصانیف کے ساتھ ساتھ مصر اور شام میں متکلفانہ اور مغلق نثر میں تراجم نگاری کا کام بھی جاری رہا - ان تصانیف کا تعلق مذکورۂ بالا تصانیف سے تقریباً وہی تھا جو مسجع تاریخوں کا سلیس کتب سیرت سے تھا - اس دبستان کا نمائندۂ عمدہ شہاب‌الدین الخفاجی المصری (رک بہ الخفاجی) (م ۱۰۶۹ھ /۱۶۵۹ء) تھا - اس کی تصنیف کی مقبولیت اس حقیقت سے واضح ہے کہ ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) میں علی خان بن معصوم (رک بہ علی خان احمد) نے اس پر ہندوستان میں ایک ذیل لکھا، جس کا اقتباس المحبی مذکور (م ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء) نے دیا ہے اور خود المحبی نے بھی اس پر دوسرا ذیل لکھا تھا ۔

ترکی اور ایرانی علاقوں تک میں بھی اہم تاریخیں عربی زبان میں لکھی گئیں - احمد بن مصطفی طاش کوپری زادہ (رک بآن) (م ۹۶۸ھ / ۱۵۶۱ء) قاضی استانبول کی کتاب الشقائق النعمانیة ترکوں کے اسلامی دور کی تاریخ پر ایک بنیادی تصنیف ہے جس پر بعد کے زمانے میں عربی اور ترکی دونوں میں ذیل لکھے گئے - جو تعلقات مختلف عرب شیعہ جماعتوں اور ایران و ہندوستان کے شیعوں کے درمیان تھے ان کا عکس ان شیعہ معاجم میں نظر آتا ہے، جن کے مصنف نہ صرف عرب تھے (دیکھیے الحُرّالعاملی) بلکہ ایرانی محمد باقر موسوی (خوانساری) اور ان کے ہندوستانی ہمعصر سید اعجاز حسین کنتوری (م ۱۲۸۶ھ-۱۸۶۹ء) بھی تھے - سنیوں نے بھی تراجم پر کئی کتابیں ہندوستان میں لکھیں ۔

مغرب میں تراجم نگاری کا سلسلہ بدستور جاری رہا (دیکھیے الوفرانی) - وہاں سے اس کا رواج مغربی سوڈان میں جا پہنچا جہاں احمد بابا (رک بآن) (م ۱۰۳۶ھ - ۱۶۲۷ء) تُمبُکتی ایک اچھا تراجم نگار گذرا ہے - مشرقی سوڈان میں بھی سلطنت فنج کے صلحاء و علماء کا ذکر خیر محمد واد = (ولد) ضیف اللہ (م ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء) نے اپنی تصنیف طبقات میں ہمیشہ کے لیے باقی رکھا ۔

II - اگرچہ ایران میں شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیے جانے پر بھی سلطنت عثمانیہ اور ہندوستان سے اس ملک کی علمی و ذہنی مواصلت بکلّی منقطع نہ ہوئی، تاہم اس فرقہ وارانہ افتراق کا اتنا نتیجہ تو ضرور نکلا کہ ایران اور ہندوستان میں تاریخ نویسی کے فن میں ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی - ان دونوں ممالک میں تاریخ نویسی کی ایک

نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ کام تقریباً تمام و کمال سرکاری وقائع نگاروں نے سر انجام دیا۔ نسبةً خود مختار اور غیر جنبہ دار عالم کہیں خال خال نظر آتا ہے اور تاریخ کا میدان صرف خوشامد گو منشی کے قبضے میں رہ جاتا ہے، جو متعلقہ اور غیر متعلقہ جزئیات کے مجموعے کو تکلف اور تصنع سے پُر لفاظی اور کم پایہ اشعار کے انبار کے نیچے دبا دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس سلسلے میں بعض استثنائی صورتیں بھی ہیں، جو بے شمار عمومی تاریخیں لکھنے والوں کے درمیان خصوصیت سے پائی جاتی ہیں، لیکن یہ لوگ پہلے گروہ کے بالکل برعکس انتہائی سادگی اور اختصار کی طرف مائل نظر آتے ہیں، اس لیے اس دور کی تاریخ نویسی میں ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں کی عمومی تاریخوں اور مقامی اور شاہی خاندانوں کی تاریخوں میں ملول کر دینے والی یک رنگی پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا زمانہ بھی آ جاتا ہے، جس میں سیرت سے ملتی جلتی طرز کی نسبةً بہتر کتابیں عموماً کسی شاہی سرپرست کی فرمائش سے لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں بعض اوقات خاصا مفید اور کار آمد مواد ملتا ہے، لیکن ان کا عیب یہ ہے کہ ان کے لکھنے والے تاریخ کو انشاء پردازی کا جزو قرار دینے پر مصر ہیں۔

۱۔ عمومی تاریخیں، خواہ وہ ایران میں لکھی گئیں یا ہندوستان میں، بیشتر جدت اور تناسب سے عاری ہیں اور وہ صرف اپنے اپنے زمانے کے حالات کے لیے مفید ہیں۔ ان کی ترتیب عام طور پر شاہی خاندانوں کی ترتیب پر مبنی ہوتی ہے، پھر بھی ان میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ایک جلد یا ایک فصل تراجم نگاری کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے اور بعض اوقات ان میں جغرافیائی ضمیمے بھی ہوتے ہیں۔ ان کتابوں میں سے، جو کسی اور اعتبار سے جالب نظر نہیں، مفصلۂ ذیل تصانیف قابل ذکر ہیں: نظام شاہی (رَكَ بآن) (م ۹۷۲ھ/ ۱۰۶۵ء) کی تاریخ؛ تاریخ اَلفی ایک مخلوط قسم کی تاریخ ہے، جو اکبر کے حکم سے ہجرت کے ہزار سال ختم ہونے کی یادگار میں لکھی گئی؛ صبح صادق، مصنفۂ محمد صادق آزادانی وقائع نویس (م ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۱ء)؛ خُلد برین از محمد یوسف والہ (تصنیف ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء)؛ تصانیف محمد بقا سہارنپوری (رَكَ بآن) (م ۱۰۹۴ھ/ ۱۶۸۳ء)؛ تُحفةالکِرام، مصنفۂ میر علی شیر قانع (م بعد ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷ء)، جس کے ساتھ تاریخ سندھ کے متعلق بھی ایک ذیل [جلد سوم] شامل ہے اور پچھلی صدی کی تین فارسی تصانیف (دیکھیے رضا قلی خان، سپہر، محمد حسن خان)؛ مصلح الدین لاری (۹۷۹ھ / ۱۰۷۲ء) کی مرآة الأدوار اس حیثیت سے دلچسپ ہے کہ وہ فارسی زبان میں سلطنت عثمانیہ کے متعلق آخری تصنیف ہے اور اسی طرح حیدر بن علی رازی (رَكَ بآن) کی تاریخ، جو ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) میں لکھی گئی، اپنی ترتیب کی جدت اور غیر سرکاری تصنیف ہونے کی وجہ سے قابل توجہ ہے۔ وسط ایشیا کی ترکمانی ریاستوں میں بھی سرکاری تاریخ نویسی کے لیے فارسی زبان استعمال ہوتی تھی۔ ان کتابوں میں بہت سی ہم تک پہنچی ہیں (دیکھیے ابوالخیر)۔

۲۔ صفوی خاندان کے بر سر اقتدار آنے کی وجہ سے قدرتی طور پر شاہی خاندانوں کے متعلق تاریخ نویسی کے سلسلے کی پھر سے تجدید ہوئی، جن میں سے اہم حسن رُوملُو کی احسن التواریخ ہے، جو مقابلۃً زیادہ ضبط اور احتیاط کے ساتھ لکھی گئی اور ۹۸۰ھ / ۱۰۷۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کے علاوہ دو تاریخیں شاہ

عباس کے عہد (۹۹۵ھ تا ۱۰۳۷ھ/۱۰۸۷ء تا ۱۶۲۷ء) کے متعلق بھی ہیں، یعنی تاریخ عباسی از محمد منجّم یزدی اور تاریخ عالم آرای عباسی از اسکندر بیگ منشی (رَكَ بآن) جو بہت ہی مفصل تاریخ ہے۔ اسی طرح نادر شاہ کے ذکر کو بھی مہدی خان استرآبادی (رَكَ بآن) (م بعد ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء) نے دو تصنیفوں کے صفحوں میں دوام بخشا ہے ــ ان میں سے دوسری تصنیف کا نام دُرّۂ نادرہ ہے جو مہدی خان کے اپنے قول کے مطابق اس نے وصّاف کے تتبع میں لکھی۔ اس کے علاوہ اس کے عہد کی ایک بہت بڑی تاریخ تین جلدوں میں محمد کاظم [وزیر مرو] نے لکھی؛ نادر شاہ کے مستوفی محمد محسن نے بھی ایک تاریخ عمومی لکھی جس میں نادر کا حال بھی دیا ہے۔ کم از کم تین شاہی خاندانوں کی تاریخیں اور ایک تاریخ عمومی فتح علی شاہ (۱۲۱۲ھ تا ۱۲۵۰ھ/۱۷۹۷ء تا ۱۸۳۴ء) کی فرمائش پر لکھی گئی، تاہم یہ فہرست کسی معنی میں بھی اس دَور کی مقامی اور خاندانی تاریخوں کی مکمل فہرست نہیں۔ مقامی تاریخوں میں سے بعض (خاص طور پر اپنے اپنے علاقوں کے متعلق) بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔ ان میں یہ خوبی بھی ہے کہ ان کا اسلوب بیان زیادہ سلیس اور فطری ہے، لیکن عام نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتب تاریخ کی اس تمام مقدار کی صحیح تاریخی قدر و قیمت اس کی ضخامت کے بمقابلے میں بہت غیر متناسب ہے اور ہندوستان میں جو تاریخیں اسی زمانے میں لکھی گئیں، ان کے مقابلے میں اس سارے مواد کی قیمت بہت کم ہے۔

۳۔ عہد مغول کی ابتداء میں ہم ہندوستان میں تین مختلف ادبی دھاروں کا اتصال پاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تھا ہندی فارسی روایت کا دھارا؛ یہ روایت دو قسم کی تھی، مقامی اور عمومی اور دور ماقبل سے مسلسل چلی آ رہی تھی (دیکھیے فصل ج II/۳ [ص ۶۹ ب])؛ دوسرا ''دبستان ہرات'' کی روایت کا دھارا (دیکھیے فصل ج II/۲ [ص ۶۷ ب])؛ تیسرا نئی طرزوں کا دھارا، جنھیں خود سلاطین مغول نے جاری کیا (دیکھیے متصل بعد کا فقرہ)۔ ان تینوں کے اتصال سے ایک امتیازی ہندی تاریخی روایت قائم ہو گئی، گو ممکن ہے کہ بعض ہندی مصنفین ان تاریخوں سے بھی متأثر ہوے ہوں جو ان کے معاصرین ایران میں لکھ رہے تھے۔ بارھویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی میلادی) کے آخر سے ایک نیا مؤثّر ان انگریز فضلاء اور مستشرقین کی صورت میں ظاہر ہونے لگا، جو ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے، لیکن اس کے نتیجے میں جو طرز عمل کی تبدیلی ظہور میں آئی وہ صرف آہستہ آہستہ ہی نمودار ہوئی۔

بظاہر شہنشاہ اکبر کے عہد (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) ہی میں یہ ہندی روایت اسلامی ہند کی ان عمومی تاریخوں میں پہلی مرتبہ واضح طور پر شکل پذیر ہوئی، جن کا آغاز عہد غزنویہ سے کیا گیا اور نظام الدین احمد (رَكَ بآن) اور عبدالقادر بدایونی (رَكَ بآن) نے لکھی تھیں (یہ دونوں مصنف ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵-۱۵۹۶ء میں فوت ہوے)۔ تاریخ بدایونی خاص طور پر قابل ذکر ہے، کیونکہ یہ تصنیف ایک ابتکار پسند اور اپنے رنگ میں نقّاد دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ ایک غیر سرکاری تصنیف ہے اور اس میں مشاہیر ہند کی تراجم نگاری اور سیاسی وقائع نویسی دونوں چیزیں موجود ہیں۔ اس کے جانشین محمد قاسم فرشتہ (رَكَ بآن) (م بعد ۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۳ء) نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے میدان کو وسیع تر

کردیا، گو اس میں تحقیق و تدقیق کی صلاحیت
نسبۃً کم ہے۔ کوئی ایک صدی کے بعد اس ملک
میں تاریخ نویسی کی آخری منزل آ پہنچتی ہے،
جب ہندو مصنفین بھی ہندی ایرانی وقائع نگاری
کے میدان میں اتر آئے (دیکھیے سجان رائے) اور
ہندو ہندوستان کی تاریخ کو بھی اسلامی ہند کی
تاریخ میں پیوست کر دیا گیا۔ منجملہ ان اسباب
کے جو بیان کیے جاتے ہیں، اس کام میں آسانی
اس وجہ سے بھی پیدا ہوگئی کہ سنسکرت کے
قدیم کلاسیکی ادبیات کا ترجمہ اکبر اور دوسرے
مغل بادشاہوں کے لیے فارسی زبان میں کرا دیا
گیا تھا۔

ان مساعی کے ساتھ ہی ساتھ مختلف بادشاہوں
کے عہد کی انفرادی تاریخیں بھی سرکاری طور پر
قلمبند ہوتی رہیں اور یہ دستور بھی اکبر ہی کے
زمانے میں شروع ہوا تھا۔ ان میں سے صرف بڑی
بڑی تصانیف کا ذکر کر دیا جاتا ہے: اکبر نامہ
تصنیف ابوالفضل علامی (رک بآں) (م ۱۰۱۱ھ/
۱۶۰۲ء) خصوصیت سے اپنی تیسری جلد
(آئین اکبری) کی وجہ سے شایان توجہ ہے کہ اس
میں اکبر کی سلطنت کے اداری نظام کو تفصیلاً
بیان کیا ہے۔ جہانگیر کے عہد کے واقعات خود
اس کی خود نوشت توزک (دیکھیے فقرہ (۴) درذیل)
میں درج ہیں اور اس کے وزیر معتمد خان (رک بآں)
(م ۱۰۴۹ھ / ۱۶۳۹ء) نے بھی قلمبند کیے
ہیں۔ [عہد شاہجہان کی تاریخ تین دہ سالہ
دفتروں میں لکھی گئی۔ پہلے دو دفتر عبدالحمید
لاہوری (م ۱۰۶۶ھ/ ۱۶۵۶ء) نے مرتب کیے
اور تیسرا دفتر اس کے شاگرد محمد وارث
(م ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء) نے۔ ادارہ]۔ اورنگ زیب کے
عہد کے حالات محمد کاظم (رک بآں) (م ۱۰۹۲ھ/
۱۶۸۱ء) اور محمد ساقی مستعد خان (رک بآں)
(م ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء) نے لکھے ہیں۔ مغلیہ
خاندان کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی تاریخ
غلام حسین خان (رک بآں) (حدود ۱۱۹۵ھ /
۱۷۸۱ء) نے لکھی، اور خیرالدین محمد الٰہ آبادی
(م بعد ۱۲۱۱ / ۱۷۹۶ء) نے شاہ عالم ثانی
کے عہد کے واقعات کو زیور تحریر سے آراستہ
کیا۔ اصطلاحی نقطۂ نظر سے زیادہ تسلی بخش
آل تیمور کی وہ تاریخ ہے جو محمد ہاشم خوافی
خان (رک بآں) (م۔ نواح ۱۱۴۰ھ / ۱۷۳۲ء)
نے لکھی۔ عہد اکبر کے تنقیدی حالات
جو اصلی مآخذ پر مبنی ہیں، امیر حیدر حسینی
بلگرامی نے نواح ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۵ء) میں
سوانح اکبری کے نام سے لکھے۔

ہر خود مختار یا نیم خود مختار خاندان شاہی
اور بنگال سے لے کر کرناٹک تک ہندوستان کے ہر
صوبے سے متعلق اسی قسم کی تاریخوں کا سلسلہ
موجود ہے اور گو وہ تاریخیں زیادہ مفصل نہیں تاہم
بحیثیت مجموعی مغل تاریخ نویسی کی خصوصیات کی
حامل ہیں۔ ہم ان میں سے صرف افغانوں ہی کی تاریخوں
کا ذکر کر دیں تو کافی ہوگا جو نعمت اللہ بن حبیب اللہ
ہَروی (رک بآں) (نواح ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء)
اور امام الدین حسینی (نواح ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء)
نے تصنیف کیں اور جن پر بعد کے زمانے کی
تاریخ مصنفۂ محمد عبدالکریم (رک بآں) (م بعد
۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء) مبنی ہے۔ تاریخ افغانستان
شمالی بلوکات کے نقطۂ نظر سے بھی لکھی گئی۔
اس تاریخ کا مصنف عبدالکریم بخاری (رک بآں)
(م بعد ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) ہے، گو اس نے
دُوَلِ خوانینِ وسط ایشیا کے متعلق اپنی تاریخ
در اصل استانبول میں بیٹھ کر لکھی تھی۔

(۴) ہندی فارسی تاریخ نویسی کی ابتکاری
خصوصیت ان بےشمار تزوکات سے ظاہر ہوتی ہے

جو اس زمانے میں مرتّب ہوئیں ۔ ان میں اور رسمی تاریخوں میں نہایت بیّن فرق ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دستور تیموریوں ہی نے شروع کیا تھا ۔ سب سے ابتدائی مثال توزک بابری (رکّ بہ بابر) ۹۳۷ھ - ۱۵۳۰ء) ہے، جو ترکی زبان میں لکھی گئی، لیکن بابر کے عم زاد بھائی میرزا حیدر دُوغلات (دیکھیے حیدر میرزا) (م ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء) کی توزک، جس کے ساتھ بعد کے زمانے کے چغتائیوں کی تاریخ بھی شامل ہے ، تاریخ رشیدی کے نام سے فارسی زبان میں لکھی گئی تھی ۔ ہمایوں (م ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کی سرگذشت آفتابچی جوہر نے لکھی تھی، لیکن ہمایوں کی سوتیلی بہن گلبدن بیگم (رکّ بآن) (م ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۳ء) کا ہمایوں نامہ اس سے بہت بہتر ہے، جو اس نے اکبر کی فرمائش پر لکھا تھا اور جو اسلامی تاریخ کی ان معدودے چند کتابوں میں سے ہے، جو درونی اور ذاتی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں ۔ جہانگیر (م ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) نے اپنے عہد کے پہلے سترہ سال کی تاریخ توزک جہانگیری کے نام سے لکھی، جسے [بقول ریو Rieu : ممکن ہے۔ادارہ] اس کے جانشین (شاہجہان) نے ترمیم و تنسیخ کے بعد دوبارہ شائع کیا ہو ۔ غالباً اسی زمانے میں تزوکات تیموری کے نام سے ایک جعلی تصنیف ہندوستان میں تیمور کے عہد کی مصدقہ اور مستند توزک کے پیرائے میں نشر کی گئی۔

صرف شاہی خاندان کے افراد ہی نے اس قسم کی تزوکات نہیں لکھیں، بہت سے غیر سرکاری لوگوں نے بھی اس قسم کے تاریخچے اور سرگذشتیں لکھی ہیں، جن میں بالکل سادی زبان اور بے تکلف انداز سے ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے، جو ان کے چشم دید تھے ۔ ان میں زیادہ مشہور و معروف تصانیف شیخ محمد علی حزین (رکّ بآن) (م ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء) کی تصنیف تذکرۃالاحوال اور مرزا محمد بن معتمد خان کا عبرت نامہ ہے، جو نواح ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸-۱۷۱۹ء) میں مرتّب ہوا ۔ باقی کتابوں میں سے اکثر سفرنامے ہیں جن میں تاریخی اہمیت کا مواد کم ہے۔

(ہ) اس دور کی فارسی تراجم نگاری میں بھ سابقہ دور کی نسبت کچھ ترقی پائی جاتی ہے ۔ پہلے زمانے کی طرح اس دور میں بھی ادبی تراجم نگاری (تذکرہ نویسی) کو پہلا مقام حاصل ہے، جو کثیر تعداد میں ایران اور ہندوستان کے شعراء کے تذکروں پر مشتمل ہے ۔ چند تصانیف تاریخی تراجم کے متعلق بھی ہیں، بالخصوص مآثرالأمراء، جو میر عبدالرزاق اورنگ‌آبادی (م ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء) کی تصنیف ہے ۔ فارسی زبان کی تراجم نگاری میں سب سے زیادہ وسیع‌النطاق تصنیف ہفت اقلیم ہے ، جو امین احمد رازی (رکّ بآن) کے زور قلم کا نتیجہ ہے ۔ یہ کتاب ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) [درست ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۳—۱۵۹۴ء ہے، قبّ سٹوری ۱ : ۲ : ۱۱۶۹-ادارہ] میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے اس کی ترتیب [دنیا کی سات اقلیموں ۔ ادارہ] کے تحت کی گئی ہے ۔ اسی قسم کی ایک اور کتاب جس میں ہندوستان کے حوالے خاص طور پر دیے گئے ہیں، مرتضٰی حسین بلگرامی نے بارھویں صدی کے اواخر میں حدیقۃالاقالیم کے نام سے تالیف کی تھی [انند رام مخلص، م ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء کی بدائع وقائع (نسخۂ دانش‌گاہ پنجاب)، جس میں مصنف نے اپنی زندگی کے بعض حالات اور شمالی ہند کے بعض واقعات کا ذکر کیا ہے، جو اس کی زندگی میں پیش آئے، اپنی طرز کی لاجواب کتاب ہے ۔ ادارہ]۔

اس کے برعکس وسیع‌الذیل معاجم تراجم جس طرح عربی زبان میں پائی جاتی ہیں، فارسی میں

بالکل مفقود ہیں ۔ ان سے مشابہت میں قریب ترین وہ تصانیف ہیں، جو اہل تشیع اور شیعہ علماء یا صوفیہ اور اولیاء اللہ کے متعلق فارسی زبان میں لکھی گئیں ۔ پہلی صنف کی تصانیف میں مجالس المؤمنین، نوراللہ بن شریف اَلمرعشی (رک بآن) (م ۱۰۱۹ھ / ۱۶۱۰ء) کی تصنیف ہے جو ہندوستان ہی میں لکھی گئی۔ اس میں اہل تشیع کی تراجم نگاری کی عربی روایت (دیکھیے فصل ب ۴، ص ۵۸ ب در فوق) کو نشو و نما دینے کی سعی کی گئی ہے ۔ محمد بن صادق بن مہدی نے نجوم السماء ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں لکھی تھی ۔ اس کتاب میں گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی کے شیعہ علماء کا ذکر ہے ۔ اولیاء اللہ اور متصوفین کے تراجم، جیسا کہ توقع ہو سکتی تھی، صرف ہندوستان ہی میں لکھے گئے اور خاص طور پر ان بزرگوں کا مشرح حال دیا گیا جو ہندوستانی تھے یا ہندوستان سے ان کا تعلق تھا ۔ ایسی کثیرالتعداد کتابوں میں سے، جو کسی ایک ولی اللہ کی زندگی یا سلسلوں یا گروہوں کے متعلق ہیں، سب سے زیادہ اہم یہ ہیں: [محمد بن مبارك کرمانی (آٹھویں صدی ہجری) کی سیرالاولیاء (دھلی ۱۳۰۲ھ) ۔ ادارہ]؛ حامد بن فضل اللہ (جمالی) (م ۹۴۲ھ/ ۱۵۳۰ - ۱۵۳۶ء) کی سیرالعارفین؛ [محمد غوثی کی گلزار ابرار تصنیف عہد جہانگیر، بیان ۱۰۱۴ھ و ۱۰۲۲ھ؛ اردو ترجمہ موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ ۔ادارہ]؛ عبدالحق بخاری دھلوی (رک بآن) (م ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) کی اخبارالاخیار؛ عبدالرحمن چشتی کی مرآۃالاسرار، جو ایک ضخیم کتاب ہے اور ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۵ء) میں تصنیف ہوئی تھی؛ [عبیداللہ خویشگی قصوری کی معارج الولایۃ، تصنیف ۱۰۹۴ھ / ۱۶۸۳ء ۔ ادارہ] ۔ چھوٹی کتابوں میں سے جن میں ہر زمانے کے صوفیوں کا حال درج ہے، خاص دلچسپی کی تصنیف سکینۃالاولیاء ہے جو بدنصیب شہزادے داراشکوہ (رک بآن) (م ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء) نے لکھی تھی۔

مآخذ: [(۱) السخاوی: الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ (قاہرۃ ۱۳۴۹) ۔ ادارہ]؛ (۲) براکلمان: G.A.L.، (ج ۱، طبع ویمر (Weimar)، ۱۸۹۸ء؛ ج ۲، طبع برلن ۱۹۰۲ء؛ تکملۃ، لائیڈن ۱۹۳۶ء ببعد)؛ (۳) ویسٹن فلٹ: *Die Geschichtsschreiber der Araber* (گوٹنگن ۱۸۸۲ء)؛ (۴) مرجلیوث (D. S. Margoliouth): *Lectures on Arabic Historians* (کلکتہ سنہ ۱۹۳۰ء)؛ (۵) Pons Boigues: *Ensayo Bio-bibliografico su los Historiadores y Geografos Arabigo-Españoles* (میڈرڈ ۱۸۹۸ء)؛ (۶) سٹوری (C.A. Storey): *Persian Literature, A Bio-bibliographical Survey*، جز ۲ (لندن ۱۹۳۰ء ببعد)؛ (۷) براؤن (E. G. Browne): *A Literary History of Persia*، (کیمبرج ۱۹۳۰ء)؛ (۸) ایلیٹ (Sir H. Elliot) اور ڈاؤسن (J. Dowson): *The History of India as told by its own Historians* (لندن ۱۸۶۷ء تا ۱۸۷۷ء)؛ (۹) مشرق خزائن مخطوطات کی بڑی بڑی فہرستیں (*Catalogues*)؛ (۱۰) انفرادی مؤرخین پر مفرد رسائل کے نام ان مؤرخین کے تراجم کے مآخذ کے ذیل میں ملیں گے؛ (۱۱) مؤرخین کے خاص گروہوں کے متعلق دیکھیے جوزف ہوروونز (J. Horovitz) کا مقالہ The Earliest Biographies of the Prophet در *Islamic Culture* (حیدر آباد ۱۹۲۸ء) اور لیوی پرووانسال (E. Lévi-Provençal) کی *Les historiens des Chorfa* (پیرس ۱۹۲۲ء) ۔

(گب H.A.R. Gibb)

تازا: مشرق مراکش کا ایک شہر جو فاس کے شمال مشرق کے مشرق میں کوئی ساٹھ میل کے فاصلے پر ہوگا ۔ یہ ایک بڑے نشیب میں واقع ہے، جسے 'حوض تازا' کہتے ہیں اور جو علاقۂ ریف کو

وسطی کوہ اطلس کے باہر کو نکلے ہوے شمالی حصوں سے علٰحدہ کرتا ہے ۔ قرون وسطٰی کے بعض مصنفین کے نزدیک (الاستبصار، المرّاکشی) تازا مغرب اقصٰی اور مغرب وسطٰی کے درمیان حد فاصل ہے ۔ چونکہ اس نشیب میں سے شرقاً غرباً گزرنے والی قدرتی اور بڑی شاہراہ کو زبردست اہمیت حاصل ہے اور اس مقام پر، جو ایک 'وادی' یا دریا کی گھاٹی کی وجہ سے محفوظ بھی ہے، قابض ہونے والے کو اقتصادی اور فوجی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں، اس لیے قدیم زمانے ھی میں لوگ تازا میں قدرے اہم بستی بسانے پر آمادہ ہوے ہونگے ۔ یہاں تاریخی زمانے سے قبل کی آبادیاں دریافت ہوئی ہیں اور جن چٹانوں پر یہ شہر تعمیر ہوا ہے ان میں غیر معلوم زمانے کی بہت سی قبریں بھی ملی ہیں۔

قرون وسطٰی کے شروع میں (آٹھویں سے دسویں صدی تک) اس علاقے میں جو نیم بدوی مکناسہ بربروں کے ایک گروہ کے قبضے میں تھا تازا کی آبادی کو انتہائی اہمیت حاصل تھی ۔ بقول ابن خلدون یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے ''رباط'' تازا کی بنیاد رکھی ۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ بیان اپنی اس شکل میں صحیح نہیں، کیونکہ 'تازا' اس زمانے تک 'رباط' شمار نہیں ہوتا تھا، البتہ اس مقام نے ادریسیوں کے خلاف فاطمیۂ قیروان کا حلیف بن کر اور پھر فاطمیہ کے خلاف اُمویانِ قرطبہ کا ساتھ دے کر دفاع میں نمایاں حصہ ضرور لیا ہوگا، تاہم تازا میں ایک مستحکم شہر اور 'رباط' کی بنیاد الموحّدین ھی نے رکھی۔ ۵۲۸ھ (۱۱۳۳ء) میں عبدالمؤمن، بالائی اور وسطی اطلس میں اقتدار حاصل کر لینے کے بعد، نشیب تازا میں پہنچا ۔ یہاں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاتح نے اپنی پیش قدمی روک لی ۔ کچھ عرصے کے بعد البتہ یہ ہوا کہ اُس نے 'ریف' کے سلسلہ ہاے کوہ پر تو قابو پا لیا، لیکن میدانوں میں اتر کر المرابطون کی فوجوں سے نبرد آزما ہونے کی کوشش نہ کی ۔ ہاں غالباً اس نے یہ ضرورت ضرور محسوس کی کہ اس فوجی مقام پر اپنا قبضہ جما کر یہاں ایک قلعہ تعمیر کرے اور اس میں کچھ فوج بھی مقرر کر دے ۔ الموحّدین کی سلطنت کے جو لوگ اس سرحدی چوکی پر قابض تھے انھوں نے قدرتی طور پر 'رباط' کے لوگوں سے مطابقت پیدا کی (ھمیں یہ معلوم ہے کہ الموحّدین کے خلاف جنگ کرنے کو جہاد کی دلکشی حاصل تھی)، اس لیے اس نئے 'قلعے' کو 'رباط' کے نام سے تعمیر کرنا اس پر تقدس کا رنگ چڑھانا تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ نے کبھی بھی 'رباط' کی مذہبی حیثیت حاصل نہیں کی، بلکہ یہ بدستور سابق فاس کے راستے کی ایک حفاظتی فوجی چوکی رھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمؤمن نے جو فصیل تعمیر کرائی تھی، اس کا بہت بڑا حصہ ابھی باقی ہے ۔ یہ سنگریزوں کی دیوار ہے، جس کے پہلوؤں میں غیر مساوی حجم کے برج ہیں ۔ جگہ جگہ اس کے سامنے بیرونی دیوار کے کچھ آثار بھی باقی ہیں۔

الموحّدین کی طرف سے مدافعین کی کمی کی وجہ سے تازا نے مرینی حملہ آوروں کا، یہ کہنا چاہیے کہ کچھ مقابلہ نہ کیا اور انھوں نے (۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں) اس پر قبضہ کر لیا ۔ اب نئے مالکوں نے بھی شہر کے دفاعی استحکامات کی طرف توجہ کی ۔ انھوں نے بڑی مسجد کی دو دفعہ (۱۲۹۴ء و ۱۳۰۳ء) مرمت کرائی اور اس میں مدارس قائم کیے ۔ ان کے عہد میں کم از کم ایک دفعہ 'تازا' نے بھی اس درے کی حفاظت کی خدمت کا حق ادا کیا، جب سلطان تلمسان، ابوحمّو ثانی، نے اس پر حملہ کرکے ۷۸۴ھ (۱۳۸۲ء) میں کوئی ایک ہفتے تک اس کا محاصرہ جاری رکھا تھا، لیکن اسے پسپا ہونا پڑا۔

سولھویں صدی کے آغاز میں حسن بن محمد الوزّان الزیّاتی (Leo Africanus) تازا کا حال ھمیں بتاتا ھے ۔ وہ اسے سلطنت کا تیسرا بڑا شہر شمار کرتا ھے، اس کا انتظام ایک قسم کی جاگیر کی طرح وطّاسی سلطانِ فاس کے دوسرے بیٹے کے سپرد تھا ۔ اس کی آبادی تقریباً پانچ ہزار خانہ وار پر مشتمل تھی، جن میں بہت سے یہودی تھے ۔ آبادی کو ہر وقت گرد و نواح کے پہاڑی حملہ آوروں کا خطرہ دامنگیر رھتا تھا ۔

جو چشمے شہر کو پانی مہیا کرتے تھے ان کی حفاظت اور الجزائری ترکوں کے حملے سے بچنے کی خاطر بنی سعد کے ایک 'شریف' ـــ شاید احمد المنصور ـــ نے یہاں ایک "بسْطیون" *bastiūn* یا برج تعمیر کرایا، جو اب تک فصیل کے جنوب مشرق کونے میں قائم ھے ۔ تاھم یہ بات قابل ذکر ھے کہ یہ قلعہ مشرق جانب کے حملہ آوروں کے خلاف کوئی مفید دفاعی صورت پیدا نہ کر سکا، بلکہ یوں کہیے کہ "یہ قلعہ [تازا] ھی ھر اس مدعیِ حکومت اور قسمت آزما کے لیے جاے پناہ بن جاتا رھا، جو اسے بنانے والی حکومت (مخزن) کے خلاف ان علاقوں میں بغاوت اختیار کرتا رھا" (باسے H. Basset اور Campardou)؛ چنانچہ سنین ذیل میں یہی صورت پیدا ھوئی : ۱۵۹۶ء میں الناصر نے، جو المنصور کا بھتیجا تھا، سلطان کے خلاف بغاوت کی اور تازا کو اپنے جنگی اقدامات کا مرکز بنایا؛ پھر ۱۶۶۴ء میں علوی خاندان کے پہلے سلطان الرشید نے فاس پر حملہ کرنے کی غرض سے اسے اعمال حربی کا مرکز بنایا؛ اس کے بعد ۱۶۷۳ء میں احمد بن محرز یہاں محصور ھو کر اپنے چچا سلطان مولای اسماعیل کا مقابلہ کرتا رھا؛ آخرالامر ۱۹۰۲ء میں شورش پسند ابو حمارہ نے عبدالعزیز کے خلاف لڑنے بھڑنے کے لیے اسے اپنا صدر مقام بنا لیا اور ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کو فرانسیسی فوجیں اس پر قابض ھو گئیں ۔

مآخذ : (۱) البکری : *Description de l'Afrique septentrionale*، الجزائر ۱۹۱۱ء، ص ۱۱۸، ۱۳۲؛ ترجمہ ڈیسلان (de Slane)، ۱۹۱۳ء، ص ۲۳۱، ۲۷۲؛ (۲) کتاب الاستبصار، ترجمہ فانیاں (E. Fagnan)، در *Recueil de la Soc. archéol. de Constantine*، ۱۸۹۹ء، ص ۱۳۳ تا ۱۳۵؛ (۳) عبدالواحد المرّاکشی : *Hist. des Almohades*، طبع ڈوزی (Dozy)، ص ۱۸۳، ۲۶۰؛ ترجمہ فانیاں، ص ۲۲۱، ۳۰۶؛ (۴) ابن خلدون : *Hist. des Berbères*، ترجمہ ڈیسلان، ۱ : ۲۶۶ و مواضع کثیرہ؛ (۵) ابن ابی زرع : القرطاس، بمواضع کثیرہ؛ (۶) حسن بن محمد الوزّان الزیّاتی (Leo Africanus)، طبع راموسیو (Ramusio)، وینس ۱۸۳۷ء، ص ۱۰۰؛ طبع شفر (Schefer)، ۲ : ۳۳۹؛ (۷) مارمول (Marmol) : *Description general de Affrica*، غرناطہ ۱۵۷۳ء، ج ۲، ورق ۱۶۱ ببعد؛ (۸) Roland Frejus : *Relation d'un voyage fait en Mauritanie*، پیرس ۱۶۷۰ء، ص ۱۲۳ ببعد؛ (۹) Lieutenant Campardou : *La Nécropole de Taza*، در *Bull. de la Soc. de géogr. d'Oran*، ج ۳۷، ۱۹۱۷ء؛ (۱۰) Campardou اور H. Basset : *Le Bastioun de Taza*، در *Archives berbères*، ۱۹۱۹ء؛ (۱۱) Ricard : *Le Maroc* (*Guide bleu*)؛ (۱۲) G. Marçais : *Manuel d'art musulman*، ص ۱۳۵، ۳۷۶ ببعد، ۲۷۸ ببعد ۔

(GEORGES MARÇAIS مارسے)

تاشفین بن علی : مرابطین (رک بہ المرابطون) خاندان کے بادشاھوں میں سے ایک تھا ۔

تاشکنت : عام طور پر عربی اور فارسی مخطوطات میں اسے تاشکند لکھتے ھیں، وسط ایشیا کا ایک بڑا شہر جو نخلستان چرچک میں واقع اور سیر دریا (رک بآن) کے داھنی طرف کی معاون ندیوں میں سے ایک ندی کے کنارے آباد ھے؛

معلوم نہیں چرچک میں آبادی کی ابتداء کب ہوئی۔ یونانی اور رومی مآخذ کے مطابق دریاے سیحون کے کنارۂ مقابل پر خانہ بدوش لوگ ہی آباد تھے۔ قدیم‌ترین چینی مآخذ میں (دوسری صدی قبل از مسیح سے) یو - نِی (Yu-ni) کی سر زمین کا ذکر ہے۔ بعد میں قرار دیا گیا کہ اس سے تاشکنت ہی کا علاقہ مراد ہے ۔ اس کے بعد یہ سر زمین چوچی (Čö-či) یا چوشی (Čö-s͟hi) یا محض شی (s͟hi) کے نام سے موسوم ہے ۔ چینی رسم خط میں اس نام کی تحریری علامت 'پتھر' کے معنی میں استعمال ہوتی ہے اور اسے اور بعد کے ترکی نام ('تاش' = پتھر اور 'کَند' = گاؤں، یعنی پتھریلا گاؤں) کو A. Chavannes (*Documents sur les Tou-kiue occidentaux*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۴۰) نے باہم مربوط کیا ہے۔ اس نام کی چینی تحریری صورت یقیناً مقامی نام 'چاچ' کے مطابق ہوگی، جسے اسلامی زمانے میں بھی لوگ جانتے تھے ۔ عربوں نے اپنے معمول کے مطابق 'چ' کو 'ش' ظاہر کیا ۔ عربی نام 'شاش' نے رفتہ رفتہ تحریری اور تقریری زبان میں اصلی نام کو استعمال سے خارج کر دیا ۔ یہ امر ابھی مشکوک ہے کہ موجودہ ترکی نام کو، جس کا ذکر سب سے پہلے پانچویں (گیارھویں) صدی میں آیا ہے، چاچ یا شاش سے تعلق ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیونکر ۔ E. Polivanov (در عقد الجمان براے بارتولڈ (W. Barthold)، تاشکنت ۱۹۲۷ء، ص ۳۹۰ ببعد) کی مجوزہ وجہ تسمیہ (تاژ کنت = شہرِ تاژیک یعنی اہل عرب) شاید ہی قابل قبول سمجھی جائے۔

چاچ کی سر زمین اور اس کے پاے تخت کے تفصیلی حالات اول اول ہمیں تیسری صدی مسیحی کے چینی مآخذ میں ملتے ہیں۔ پاے تخت مذکور کا محیط تقریباً دس 'لی' (تین میل سے کم) تھا ۔ یُئان اَنْ چُوانگ کے زمانے میں (*Mémoires sur les contrées accidentaux*، ج ۱، ۱۸۵۷ء، ص ۱۶) چاچ میں کوئی ایسا حکمران نہ تھا، جس کے ماتحت دوسرے ملکوں کے حکمرانوں کی طرح سارا ملک ہو۔ علٰحدہ علٰحدہ شہر ترکوں کی حکومت کو مانتے تھے۔ یہاں دوسری (آٹھویں) صدی میں عربوں کی جنگی فتوحات کے سلسلے میں 'مَلِک شاش' یعنی بادشاہ شاش کا ذکر اکثر آتا ہے ۔ اس کے پاے تخت کا نام بَلاذُری (طبع ڈخویہ، ص ۴۲۱) اور طَبَری (۲ : ۱۰۱۷، ۱۰۲۱) نے 'طارَبند' دیا ہے ۔ جغرافیے کی عربی کتابوں میں کسی اور سلسلے میں اس کا ذکر نہیں آتا [گو تاریخوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ادارہ]۔ مُلّر (D. H. Müller) کی راے میں طارَبند طُرار بند کا مخفف ہے (B.G.A، ۳ (مَقدسی) : ۶۱ پائین صفحہ)، مگر یہ امر بہت مشکوک ہے۔ شاش کا شاہی‌خاندان، احتمال ہے کہ ترکی الاصل تھا ۔ ترک خوانین کی بادشاہت کے بجاے بعض اوقات یہاں چینیوں کی حکومت قائم ہو جایا کرتی تھی ۔ ۷۵۰ء میں چینی گورنر کاؤسی این چی (Kau Sién Ci) (Chavannes: *Documents* وغیرہ، ص ۲۹۷؛ ہرث (F. Hirth): *Nachworte zur Inchrift des Tonjukuk*، ۱۸۹۷ء، ص ۷۰) نے شاش کے بادشاہ کو قتل کر دیا اور اس کے بیٹے نے عربوں سے امداد مانگی ۔ ابومسلم (رک بآن) نے زیاد بن صالح کو بھیجا جس نے چینیوں کو ذوالحجہ ۱۳۳ھ / جولائی ۷۵۱ء میں (قب ابن الأثیر، ۵ : ۳۴۴ [طبع ۱۳۰۱ھ، ۵ : ۲۱۴] دریاے تلاس (طراز، رک بآن) کے کنارے زبردست شکست دی اور کاؤسی‌ایں چی اس لڑائی میں مارا گیا ۔ اس لڑائی کی وجہ سے وسط ایشیا میں اسلامی سیاست کی دھاک بیٹھ گئی اور چینیوں نے پھر کبھی اس سے طاقت آزمائی کی ہمت نہ کی۔

عہد خلافت میں شاش کا علاقہ ترکوں اور

اسلام کے درمیان سرحد سمجھا جاتا تھا۔ خانہ بدوشوں کی یلغار کے خلاف حضریوں کی حفاظت کے لیے ایک دیوار بنائی گئی تھی، جس کے آثار اب تک باقی ہیں۔ (مطبوعات وقفیۂ گِب سلسلۂ جدید، شمارہ ۵ [یعنی بارٹولڈ : ترکستان ۔ ادارہ]: ۲: ۱۷۲)؛ تاہم یہ ملک ترکوں نے ۱۹۱ھ (۸۰۶-۸۰۷ء) میں فتح کر لیا جو غالباً اس وقت ان کے قبضے میں تھوڑی ہی مدت رہا ۔ طبری (۳ : ۷۱۲) شاش کے ایک بادشاہ (''صاحب الشاش'') کی بابت جو کچھ لکھتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''اپنے ترکوں سمیت'' رافع بن لیث باغی کا حلیف تھا ، مامون کے عہد میں شاش پھر خلیفہ کی سلطنت میں شامل ہوگیا اور جب ۲۰۴ھ (۸۱۹ء) میں سامانی ماوراء النہر کے مختلف اضلاع کے حاکم بن گئے، تو ان (سامانیوں) میں سے ایک شخص ابوالعباس یحیٰی بن اسد کو شاش کا علاقہ عطا ہوا [قب سامانیہ]؛ جو کچھ وہاں بیان ہوا ہے اس کے برعکس اس یحیٰی کی وفات کا ہم نہ صرف سال جانتے ہیں ، بلکہ ہمیں وہ دن بھی معلوم ہے جس دن وہ فوت ہوا ۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور ربیع الثانی ۲۴۱ھ کے خاتمے (۱۲ ستمبر ۸۵۵ء) میں ابھی پانچ راتیں باقی تھیں، قب الأنساب للسمعانی ۔ یعنی *G. M. S.*، ۲۰ : ۲۸۶ ب بذیل السامانی] ۔ جو علاقے سامانیوں کے سپرد تھے، ان کے گورنروں میں تقدم نوح بن اسد کو حاصل تھا ۔ وہ اسد کے بیٹوں میں سب سے بڑا تھا ۔ اس کی فوج نے ۲۲۵ھ (۸۴۰ء) میں اِسفیجاب کو (جسے اب سَیرام کہتے ہیں) فتح کر کے سامانیوں کی حکومت شمال کی جانب اور وسیع کر دی ۔ اس زمانے میں شاش کی ایک نہر بھی رواں کردی گئی جو اسلامی عہد حکومت کے ابتدائی زمانے میں مٹی سے اٹ گئی تھی ۔ خلیفہ المعتصم (۸۳۳ء تا ۸۴۲ء) نے بھی اس نہر کی صفائی کے لیے ۲۰ لاکھ درہم دیے (الطبری ۳ : ۱۳۲۶)۔

شاش کے متعلق جتنے جغرافیائی بیان اب موجود ہیں وہ عہد سامانی ہی کے ہیں (اور غالباً اکثر اسلامی ملکوں کے حالات اسی زمانے کے ہیں)۔ ان بیانات میں شاش کا نام صرف ملک کے لیے استعمال ہوتا ہے اور پایۂ تخت کا نام بِنْکَث ہے ، لیکن سکّوں پر ٹکسال کا نام ہمیشہ شاش ہی ثبت ہوا ہے ۔ شاذ و نادر صورتوں میں بِنْکَث کے نام کا بھی اس کے ساتھ اضافہ ہوا ہے ۔ یہ سارا علاقہ لمبائی چوڑائی میں صرف ایک فرسخ یعنی ۳½ میل تھا۔ آج کل کے تاشکنت کی وسعت کہیں زیادہ ہے لیکن بِنْکَث کا محل وقوع یا دیگر مقامات سے اس کا بُعد، جو عرب جغرافیہ دانوں نے بتایا ہے، تقریباً تاشکنت ہی سے ملتا جلتا ہے (بارٹولڈ : ترکستان؛ مطبوعات وقفیۂ گب، سلسلۂ جدید، ۵ : ۱۷۱) نہ کہ 'اسکی-تاشکنت' کے محلّ وقوع سے، جیسا کہ لیسٹرینج (Le Strange) کی کتاب *The Lands of the Eastern Caliphate* (طبع کیمبرج ۱۹۰۵ء ص ۴۸۰) میں مذکور ہے ۔ تاشکنت میں شافعی امام ابوبکر القفّال [محمد بن علی بن اسمٰعیل] الشّاشی م ۳۶۵ھ یا ۳۶۶ھ، (۹۷۶ء یا ۹۷۷ء) کی قبر اب تک دکھائی جاتی ہے ۔

یہ سوال کہ آیا تاشکنت کا نام ترکی فتوحات سے پہلے بھی مستعمل تھا، مشکوک ہے (سامانی خاندان کے قطعی زوال سے پہلے سیر دریا (سیحون) کا تمام علاقہ ۳۸۶ھ [۹۹۶]ء میں ترکوں کے حوالے ہو چکا تھا) ؛ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ''تاشکند'' کا لفظ اول اول البیرونی (تاریخ الہند، طبع زخاؤ ص ۱۴۹، ترجمہ، ۱ : ۲۹۸) میں ملتا ہے؛ نام کی صرفی ترکیب کو مدّ نظر رکھتے ہوے البیرونی اسے غلطی سے λίθινος πύργος (مارکوارٹ : *Ērānšahr*، برلن ۱۹۰۱ء، ص ۱۵۵) سمجھتا ہے

جس کا ذکر بطلیموس نے کیا ہے ۔ محمود کاشغری (۱ : ۳۶۹) لکھتا ہے کہ شاش کا نام تاشکند کے علاوہ ترکن (Terken) بھی تھا (جس کا ذکر 'علَم شاش' کی حیثیت سے اور کہیں نہیں ملتا) ۔ سکّوں پر تاشکنت کا نام سب سے پہلے عہد مغول میں کندہ ہوا ۔ پانچویں (گیارھویں) صدی کے دوسرے نصف میں اور چھٹی (بارھویں) صدی میں سکے بناکت، فناکت یا بناکت میں مضروب ہوئے جو اس کے قریب ہی سیر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے ۔ یہ ممکن ہے اس وقت یہ شہر، تاشکنت سے زیادہ اہم ہو ۔ مغول کے حملوں کے سلسلے میں ([تاریخ جہانگشای، جوینی جلد اول]، مطبوعات وقفیۂ گب، عدد ۱۶ : ۷۰ ببعد) جوینی تاشکنت کا ذکر نہیں کرتا، البتہ اس کے ہاں صرف تسخیر بناکت کا ذکر موجود ہے ۔ مغول کے دور حکومت میں ایسے وجوہات کی بنا پر، جو ہمیں معلوم نہیں، تاشکنت کا انجام بناکت کی نسبت اچھا رہا ۔ شہر تاشکنت برابر قائم رہا اور خوانین کبھی کبھی یہاں آیا جایا کرتے تھے [قب براق خان]، اس کے برعکس گو بناکت نے کبھی مغلوں کا مقابلہ نہیں کیا ، پھر بھی اس زمانے میں کھنڈر بن چکا تھا اور ۱۳۹۲ء تک جب کہ تیمور نے اسے دوبارہ بنا کر شاھرخیّہ نام رکھا اسکی یہی حالت رہی ۔

چغتائی (رک بآں) کی مغل سلطنت کے زوال کے بعد تاشکنت تیمور اور آل تیمور کی مملکت میں آ گیا ۔ ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں یہ شہر اور اس کے توابع ، خان مغول یونس کو سونپ دیے گئے، جو ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) میں اسی شہر میں فوت ہو گیا (تاریخ رشیدی، ترجمۂ راس، ص ۱۱۳ ببعد) ۔ اس کا مقبرہ ایک مقامی ولی شیخ خاوند طُہور (عوام شیخانتور) کی مسجد میں ہے ۔ اس کے زمانے کے متعلق (آٹھویں/چودھویں صدی) قب سیمینوف (A. Semenov) در *Protokoli Turk. Kuczka Ljub. Arkh.*، ج ۲۰، ۱۹۱۰ء: ص ۲۹ ۔ خان یونس کا جانشین اس کا بیٹا محمود خان ہوا ۔ ۱۵۰۳ء کے بعد تاشکنت ازبکوں کی سلطنت میں شامل ہو گیا ، لیکن اس خاندان کے بانی شیبانی خان [رک بآں و قب شیبانی (خوانین)] کی وفات کے تھوڑی مدت بعد ان کے ہاتھ سے جاتا رہا ۔ بعد کی چند صدیوں میں تاشکنت کبھی تو ازبکوں کے ماتحت رہا اور کبھی قازاق کے [رک بہ مادّۂ قیرغیز] اور ۱۷۲۳ء میں اسے قلماقوں نے فتح کر لیا ، لیکن اس پر فوراً قبضہ نہ کیا اور یہاں ایک قازاقی الاصل شہزادہ بدستور حکمران رہا، جو اب قلماق حکمرانوں کا باجگذار تھا ۔ بعض اوقات حکومت اس کے ہاتھ سے نکل کر خوجوں کے سپرد بھی ہو جایا کرتی تھی جو ایک مقامی ولی کی اولاد میں سے تھے (مثلاً *Z.D.M.G.*، ۳۸ : ۳۱۱) ۔

ان صدیوں میں تاشکنت کے قبضے کے سلسلے میں بہت سی خونریز لڑائیاں ہوئیں ۔ ان میں سے بعض جنگوں کے حالات شہر کی صورت وضعی کی کیفیت سمجھنے کے لیے ضروری ہیں ۔ عبداللہ خان بن سکندر (رک بآں) کے زمانے میں جو لڑائیاں تاشکنت میں ہوئیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ تاشکنت نے بارھویں صدی تک اپنی موجودہ صورت اختیار نہیں کی تھی ۔ شہر کے چار حصوں میں تقسیم ہونے اور ان کے ایک مشترکہ بازار کا ذکر کسی نے نہیں کیا(وہ چار حصے یہ ہیں : کوکچہ، شیخانتور ، سبزر اور بیش آغاچ) ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ہر حصے کا علٰحدہ حاکم ہوتا اور ہر ایک حصہ بطور خود ایک چھوٹی سی ریاست ہوتی جو بسا اوقات دوسروں سے بر سر پیکار بھی رہا کرتی تھی ۔

۱۷۸۰ء میں یونس خوجہ ، جو ربع شیخانتور کا رئیس تھا، سارے شہر کو اپنے ماتحت متحد کرنے

میں کامیاب ہو گیا ۔ یونس خوجہ قازاقوں کے خلاف تو کامیابی سے لڑا، لیکن خوقند کے ازبکوں کے ہاتھوں، جن کا سردار عالم خان تھا، بہت بری طرح شکست کھائی ۔ یونس خوجہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین سلطان خواجہ کے زمانے میں ۱۸۱۰ء سے کچھ پہلے تاشکنت کو خانانِ خوقند کی اطاعت قبول کرنا پڑی (اس زمانے کی تاریخ کے لیے قبّ خوقند) ۔

۱۵ / ۲۷ جون ۱۸۶۵ء میں روسیوں نے، جو Černyaiev کے زیر کمان تھے، تاشکنت پر قبضہ کر لیا ۔ سیر دریا کے کل علاقے کا پایۂ تخت اور ترکستان کے گورنر جنرل کا صدر مقام ہونے کی حیثیت سے تاشکنت کو بڑی رونق نصیب ہوئی ۔ قدیم ایشیائی شہر کے ساتھ ساتھ ایک نیا شہر آباد ہو گیا، جس میں سرکاری حکام رہنے لگے ۔ ۱۸۷۷ء سے دونوں شہروں کو ملا کر ایک شہر اور دونوں کے ادارات شہرداری (بلدیہ) کو مشترک بنا دیا گیا، لیکن روسی شہر کو، جس کی آبادی پرانے شہر سے نسبتًہ بہت کم تھی، خاص مراعات حاصل تھیں، اس لیے پرانے شہر کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر تھی ۔ صرف روسی حصے ہی میں فرنگی طرز کی اجتماعی زندگی ممکن تھی ۔ اس حصے میں سرکاری دفتر، مدرسے اور علوم و معارف کی مشہور مجالس اور انجمنیں تھیں ۔ ۱۸۹۷ء کی مردم شماری کے مطابق (پرانے اور نئے شہر دونوں کی مجموعی) آبادی ۱,۵۵,۶۷۳ تھی ۔

انقلاب روس کی وجہ سے روسی تاشکنت ان تمام مراعات سے محروم ہو چکا ہے، جو اسے پرانے شہر کے مقابلے میں حاصل تھیں ۔ جب سے وسط ایشیا میں قومیت اور قومی جمہوریتوں کا اصول مان لیا گیا ہے، تاشکنت اپنی ساری سیاسی اہمیت کھو چکا ہے ۔ یہ شہر اب ازبکستان میں ہے اور اس کے شمالی توابع قازاقستان کے ماتحت ہیں ۔ ازبکستان کا دارالحکومت سمرقند (رکّ بآن) ہے، مگر وسط ایشیا میں سب سے بڑا شہر ہونے کے باعث تجارت و تعلیم میں تاشکنت کی مرکزی حیثیت بحال ہے اور کل وسط ایشیا کی اقتصادی مؤتمر (ekonomičeskiy sovlet) کے اجلاس یہیں ہوتے ہیں ۔ ۱۹۲۰ء میں یہاں یونیورسٹی قائم ہوئی تھی ۔ ”وسط ایشیائی نوعیت“ کا بہت بڑا کتب خانہ اور ”بڑا عجائب خانہ“ (glavnîy musei) اور روسی جیو گریفیکل سوسائٹی کی وسط ایشیائی شاخ وغیرہ سب یہیں ہیں ۔ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی تجارت گھٹ رہی ہے، لیکن آبادی پہلے سے کہیں زیادہ ہے ۔

مآخذ : (۱) Tashkent v: A. J. Dobrosmîslov proshlom i nastoyashčem، تاشکنت ۱۹۱۲ء؛ (۲) شوارٹس (Fr. v. Schwartz) : Turkestan، Freiburg i. Br. : ۱۹۰۰ء، ص ۳۰۱ ببعد، (اس میں تاشکنت کے حالات ۱۸۷۳ء تا ۱۸۹۰ء درج ہیں، اسے احتیاط سے استعمال کیا جائے)؛ (۳) V. Masal'skiy: Turkestankiy Krai، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۳ء، ص ۶۰۷ ببعد؛ (۴) Tashkent 1877—1912 K tridcatipyātil etiyu gorodskoyo obsl'čestvennago upravleniya؛ (۵) بارٹولڈ (W. Barthold): Istoriya kulturnoi žizni Turkestana، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء، ص ۱۶۳ ببعد؛ (۶) Sredne-aziatskiy gosudarstvennîy universitet. K desyatilet-nemu yubileyu oktyabrskoi revolucii، تاشکنت ۱۹۲۷ء؛ —— قومیت کے اصول پر (۷) J. Vareikis i S. Zelenskiy : Nacional'no-gosudarstvennoie razmeževaniie Srednei Azii، تاشکنت ۱۹۲۳ء ۔

(W. Barthold بارٹولڈ)

تَافتَہ : (فارسی لفظ گندھا ہوا، بٹا ہوا، بل دیا ہوا)، ایک قسم کا ریشمی کپڑا، جسے مغربی زبانوں میں taffeta لکھا جاتا ہے ۔ کلاویخو (Clavijo) نے، جو ہنری سوم شاہ قشتالہ کا سفیر تھا، یہ کپڑا، جسے وہ (tafetanes)

لکھتا ہے، تبریز، سلطانیہ اور سمرقند کی منڈیوں میں دیکھا تھا ۔ یہ کپڑا خود ملک ھی میں تیار ہوتا تھا ۔ قرون وسطی کے اواخر میں اس کا استعمال مغربی ملکوں میں بڑھتا چلا گیا ۔

مآخذ : (۱) *Dict. des mots* : M. Devic *français d'origine orientale*، ص ۲۱۳؛ (۲) کلاویخو (Clavijo) : *Narrative*، ص ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۹۰؛ (۳) ھائڈ (W. Heyd) : *Hist. du commerce du Levant*، طبع فرنسوی از رینو (Raynaud)، لیزگ ۱۸۸۶ء، اشاریہ ۔

(Cl. Huart کلیمان ہوار)

تافیلالت : (اس سے اسم نسبت فیلالی بنتا ہے) جنوب مشرق مراکش میں ایک علاقے کا نام جو وادی زیز کے پھیلنے سے بنا ہے ۔ یہ ۱۲ میل لمبا اور ۱۰ میل چوڑا رسوبی میدان ہے، جس میں تقریباً دو سو 'قصور' (مٹی کے بنے ہوئے سنگر دار مکان) متفرق مقامات پر واقع ہیں ۔ یہ مکان باغات اور مزروعہ کھیتوں سے گھرے ہوئے ہیں ۔ جہاں کنووں کے ذریعے آبپاشی ممکن ہے، وہاں زمین کی زرخیزی حیرت انگیز ہے ۔ تافیلالت کی بڑی پیداوار کھجور کے درخت ہیں اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنعت بکری کی کھال کی دباغت ہے جسے کیکر (mimosa) کی چھال سے کمایا جاتا ہے اور جس میں سے ایک خاص قسم کا زرد رنگ مادہ (tanning gall) نکلتا ہے، جو چرم سازی کے لیے لازمی ہے ۔ فیلالی چمڑہ مشہور ہے اور تمام شمالی افریقہ میں اس کی مانگ رہتی ہے ۔ آبادی گھنی ہے ۔ تافیلالت کے ''قصور'' کی آبادی ۱۹۲۰ء میں ایک اندازے کے مطابق ڈیڑھ دو لاکھ کے لگ بھگ تھی ۔ تافیلالت کے علاقے کا تاریخی دارالحکومت سجلماسہ تھا (تافیلالت کی سیاسی تاریخ مادۂ سجلماسہ میں دیکھیے) یہاں صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ یہ علاقہ مراکش کے علوی شریفوں کے خاندان کا گہوارہ تھا، جنھیں فیلالی شریف بھی کہتے ہیں اور اب تک وہاں کا حکمران خاندان یہی ہے ۔ ان شریفوں میں سے بہت سے افراد اپنے خاندان کے بر سر حکومت آنے کے بعد یا تو تافیلالت ھی میں رہے یا تافیلالت میں واپس آ کر آباد ہو گئے، جہاں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے ۔ سلطان مراکش کا ایک 'خلیفہ' ان شریفوں میں اور وادی زیز میں دربار شاھی ('مخزن') کے اقتدار کی نمائندگی کرتا ہے ۔ سجلماسہ کے علاوہ، جس کے اب صرف کھنڈر باقی ھیں، تافیلالت کے چھوٹے قصبوں میں سے قصر 'بو عام' جو اس علاقے کا تجارتی مرکز ہے، قابل ذکر ہے، نیز قصر تیغمرت جس کے دفاعی استحکامات انیسویں صدی کے آخر میں سلطان مولای الحسن کے حکم سے تعمیر ہوئے ۔

مآخذ : (۱) قب مادہ سجلماسہ؛ (۲) اس کا وصف عام مع نقشہ ریکار (P. Ricard) کی کتاب : *Les Guides Bleus : Maroc*، پیرس ۱۹۱۹ء، ص ۲۸۵ تا ۲۸۸ میں دیا ہے ۔

(E. Lévi-Provençal لیوی پرووانسال)

تاکرنا : (Tākoronnā) اسلامی سپین میں اندلس کے جنوب کے مرکزی تودۂ کوھی کا نام، جسے اب سیرانیا دا رونده (Serrania de Ronda) کہتے ہیں ۔ یہ بلا شک و شبہ ایک بربری لفظ تاکرونہ (باضافۂ تشدید) ہے، جو شمالی افریقہ کے ناموں میں اکثر اوقات پایا جاتا ہے ۔ مختلف مصنفین نے تاکرنا کے مختلف تلفظ بتائے ہیں ۔ ان سب کو ولیم مارسے (W. Marçais) اور عبدالرحمن گویگہ (Guîga) نے حوالوں کے ساتھ ایک قابل قدر تعلیقے میں جمع کر دیا ہے، *Textes arabes de Takroûna* [in Tunisia]، جلد ۱، پیرس ۱۹۲۵ء، ص viii، حاشیہ ۱ ۔ قب نیز یاقوت : معجم، بذیل مادۂ [تاکرنی و] شیرس؛ ابن بشکوال : الصلۃ، طبع کدیرا، B.A.H، ص ۱۸۵، ۳۰۲؛ ابن عبدالمنعم الحمیری : الروض المعطار، [ص ۶۲-

ادارہ] بذیل مادہ۔ ڈوزی نے بربری سابقہ 'تا' اور لاطینی کُرونا (*corona*) کو جمع کر کے اس نام کی تشریح کرنے کی کوشش کی، لیکن پھر ھوشمندی کے ساتھ اس اشتقاق کو ترک کر دیا، کیونکہ ایسے ثابت کرنے میں بڑی مشکل کا سامنا تھا (*Hist. des Mus. d'E.*، ۱ : ۳۴۳، حاشیہ ۲، اور ۳ : ۳۳۹؛ قب نیز *Recherches*، طبع سوم، ۲ : ۳۴، حاشیہ ۱)۔ بہر حال مذکورۂ بالا مصنفین نے کسی توجیہ تسمیہ کو بھی تسلی بخش قرار نہیں دیا۔

تاکُرُنّا کے علاقے کا پایۂ تخت رُندہ تھا جو بعد میں بنو اِیْفران کی چھوٹی سی خود مختار حکومت کا بھی پایۂ تخت رہا۔ یہ حکومت بعد میں اشبیلیہ کی مملکت میں شامل کر لی گئی؛ عہد اسلامی میں اس علاقے کی مختصر تاریخ کے لیے قب مادۂ رندہ۔

(لیوی پرووانسال (E. LÉVI-PROVENÇAL)

تالِیْش : (تَلیش (TALĪSH))، ایران کے صوبۂ گیلان (رَکَّ بآن) کے شمال میں ایک علاقے (اقلیم) اور اس کے باشندوں کا نام جو صلح گلستان (۲۴/۱۲ اکتوبر ۱۸۱۳ء) کے بعد سے روس کے قبضے میں ہے۔ یہ نام مارکوارٹ Marquart : *Osteuropäische und Ostasiatische Streifzüge*، لپزگ ۱۹۰۳ء، ص۲۸۷ ببعد کے مطابق T'alish کی صورت میں داستان سکندر کے ارمنی ترجمے میں ملتا ہے، باب ۱۹۴ = ج ii، ۹۱، ص۹۷، طبع ملر(C.Müller)۔ عرب فتوحات کی تاریخ میں (بلاذری : طبع ڈ خویہ، ص۳۲۷؛ الطبری، ۱ : ۲۸۰۵) اس ملک کا نام الطَیْلَسان دیا ہے۔ الأصمعی کے قول کے مطابق جو یاقوت کے ہاں (۳ : ۵۷۱، سطر ۱۹) درج ہے اس کا فارسی تلفظ 'تَالِشان' تھا جو بظاہر جمع کا صیغہ ہے۔ بقول یاقوت (۱ : ۸۱۲، سطر ۱۸) 'تالَشان' (یہاں یہ کلمہ ان حرکات کے ساتھ ضبط ہوا ہے) صوبۂ گیلان کا ایک 'عمل' یعنی علاقہ تھا۔ مُقَدَّسی (B.G.A.، ۳ : ۳۷۳) نے سالُوس سے (جو طَبَرِسْتان اور گیلان کی درمیانی سرحد پر ہے) شَماخِیَہ (Shemākha) (قب شیروان) تک کی جو شرح منازل دی ہے، اس کے مطابق گیلان کا آخری شہر کہن رُوذ ہے، جو کُرّ (رَکَّ بآن) کے جنوب میں چار دن کی مسافت پر واقع ہے۔ حمداللہ مستوفی (نزھۃ القلوب، ص ۱۸۰ ببعد) ایک گاؤں تالِش کا ذکر کرتا ہے، جو سلطانیہ سے اَرْدَبِیل کو جانے والی سڑک پر واقع ہے اور اردبیل سے چھے فرسخ پر ہے۔ اس کی متعلقہ ولایت کو طَوالِش کہتے ھیں (ص۱۶۲، سطر ۱۲)۔

روس اور ایران کی لڑائیوں سے پہلے تالیش (Talīsh) کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ ایرانی دور حکومت میں یہ علاقہ ایک خاص خان کے ماتحت تھا اور موجودہ زمانے کی طرح اس کا صدر مقام شہر لِنْکُران تھا۔ اس تنگ قطعۂ زمین کی آب و ھوا جو تالیش کے جنوبی کوہ‌ھاے بلند (alps) اور بحیرۂ خَزَر کے درمیان واقع ہے، شمالی میدان کی نسبت بہت زیادہ مرطوب ہے (لِنْکُران میں ۵۰ انچ بارش ھوتی ہے اور باکو میں ۱۰ انچ)۔ یہ علاقہ جغرافیائی لحاظ سے ولایت گیلان کا حصہ ہے، ویسا ھی زرخیز اور مضر صحت۔ گیلان کی نسبت اس میں جانور زیادہ مختلف قسم کے پائے جاتے ھیں جن میں شیر بھی شامل ہے۔ روسی لوگ یہاں کے باشندوں کو تالیشی یا تالیشِنْچی کہتے ھیں، لیکن باشندے اپنے آپ کو تولیش (Tolīsh) کہتے ھیں۔ شمال کی طرف وہ موغان کے بےدرخت میدانوں تک آباد ھیں۔ یہاں یہ لوگ خانہ‌بدوشی کی زندگی بسر کرتے ھیں اور جنوب کی جانب بھی روسی سرحد کے جنوب میں کوئی تیس میل تک انہیں کی آبادی چلی جاتی ہے۔ ۱۹۲۲ء کی مردم شماری کے مطابق روسی علاقے میں تالیشوں کی کل تعداد ۷۷,۸۲۴ ہے۔ گیلانیوں کی طرح تالیش بھی شیعہ مذھب ھیں۔ ان کی بولی

گیلان کی بولی سے بہت کم اختلاف رکھتی ہے ۔

مآخذ: (۱) فہرست مصادر .Gr. Iran. Phil، ۱/۲: ۳۴۵ میں دی ہے؛ (۲) مار (N. Marr): Tallshi، پیٹرو گراڈ ۱۹۲۲ء، ص ۲۴ — (۳) لیسٹرینج (G. Le Strange): The Lands of the Eastern Caliphate، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۷۳ ببعد؛ (۴) وائڈن باؤم (E. Weidenbaum): Putevoditel' po Kavkazu، تفلیس ۱۸۸۸ء، اشاریہ؛ (۵) Spisok narodnostei S.S.S.R., pod redakciei I. I. Zarubina، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء، ص ۹ ۔

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

تامل زبان پر اسلام کا اثر: رک بہ ہندوستان ۔

تان سین کلاونت: جس کی بابت شیخ ابوالفضل [اکبر نامہ، ۳: ۵۳۷ - ادارہ] لکھتا ہے کہ ان ہزار سال میں شاید کم ہی کوئی کلاونت ہوا ہوگا جس میں ایسی شیرینی، خوش گوئی، اور نقشبندی پائی جاتی ہو [قب آئین اکبری، طبع سید احمد خان، ۱: ۲۰۹ - جہانگیر نے اسے اپنے عہد کا بےنظیر (فن کار) لکھ کر کہا ہے کہ کسی عہد اور زمانے میں اس جیسا نہیں ہوا (دیکھیے مآخذ)۔ بقول صاحب مآثرالامراء (۱: ۵۰۹) کبت اور دھرپد کی خوانندگی میں وہ موسیقی دانوں میں سرآمد تھا، کہتے ہیں کہ خوش آوازی اور نازک خیالی میں اس جیسا اور نہیں ہوا - ادارہ]۔ وہ گوالیار کا رہنے والا تھا اور پنّا (کذا در اکثر نسخ آئین، یا بھٹہ یعنی ریوا کما فی مآثرالامراء) کے راجہ رام چند بگھیلہ کے پاس ملازم تھا - راجہ اس کا نہایت قدردان تھا اور اس سے حد درجہ انس رکھتا تھا - کہتے ہیں کہ ایک موقع پر راجہ نے اسے ایک کروڑ تنکہ بطور انعام دیا [بدایونی ۲: ۳۳۵ - ادارہ]، سلطان ابراہیم سوری نے بہت کوشش کی کہ تان سین کو بہلا پھسلا کر آگرے میں بلوا لے، لیکن بےسود - اکبر نے اسے لانے کے لیے اپنے ندیم اور مقرب جلال خان قورچی کو رام چند کے پاس استمالت نامہ دے کر بھیجا - رام چند میں بھلا جرأت انکار کہاں تھی، چنانچہ اس نے تان سین کو ساز و سامان تجمل اور تحف و ہدایا دے کر شاہی دربار میں بھیج دیا، گو بقول بدایونی (محل مذکور) تان سین آنا نہیں چاہتا تھا - وہ جلوس اکبری کے ساتویں سال (۱۵۶۲ء - ۱۵۶۳ء) دربار میں پہنچا اور پہلی ہی محفل میں نغمہ سرا ہوا تو اکبر نے دو لاکھ روپیہ رائج الوقت انعام دیا [مآثرالامراء - ادارہ]۔ دربار اکبری میں رہ کر اس نے نغمہ سرائی اور مضمون بندی میں بہت ترقی کی - اس کی اکثر ”تصانیف“ اکبر کے نام پر ہیں اور اب تک لوگ انہیں گاتے ہیں - [جہانگیر نے اسے ”شعرائے ہند“ میں شمار کیا ہے اور اس کے بعض (ہندی) شعروں کا مضمون بھی دیا ہے - ادارہ]۔ اس کے دو بیٹے تھے، تان ترنگ خان، جو باپ کی طرح دربار اکبری کا ’گوینده‘ (گویّا) تھا اور بلاس، جس کا داماد لعل خان [کلاونت، گن سمندر - ادارہ] شاہجہان کے دربار کا بہترین نغمہ پرداز تھا - گوالیار گویّوں کے لیے مشہور تھا - دربار اکبری کے اٹھارہ گویندوں میں سے گیارہ وہیں سے آئے تھے - [میاں تان سین، جو مسلمان ہو گیا تھا، ۱۰ جمادی الآخرۃ ۹۹۷ھ (۲۶ اپریل ۱۵۸۹ء) کو فوت ہوا - اکبر کے حکم سے سب نغمہ پرداز اس کی تدفین کے وقت حاضر تھے - اکبر نے کہا کہ اس کی موت نغمے کی موت ہے (اکبر نامہ ۳: ۵۳۶) - وہ گوالیار میں محمد غوث گوالیاری کی قبر کے متصل مدفون ہے - قبر کی چھت ستونوں پر ٹکی ہوئی ہے اور مدخل کو چھوڑ کر تمام ستونوں کی درمیانی جگہ ڈھائی فٹ اونچی پتھر کی جالی سے بند کر دی گئی ہے - اس کی تصویر کے لیے دیکھیے سمتھ: Akbar، مقابل ص ۴۲۲ و ص ۴۲۳ ح ۱ ۔

تان سین کی کتاب بدھ پرکاش کا فارسی ترجمہ

تشریح الموسیقی کے نام سے حکیم محمد اکبر ارزانی نے کیا ۔ اس کا قلمی نسخہ مکتبۂ دارالعلوم اسلامیۂ پشاور میں ہے (فہرست دارالعلوم، ص ۳۲۸، شمارہ ۱۹۶۶-ادارہ)]۔

مآخذ: (۱) شیخ ابوالفضل: اکبر نامہ، متن [۲ : ۱۸۱-ادارہ] اور ترجمہ [۲ : ۲۸۰-ادارہ] از بیورج (H. Beveridge)؛ (۲) آئین اکبری، متن و ترجمہ بلاخمن (Blochmann) وجیرٹ (Jarrett)؛ (۳) [توزک جہانگیری، طبع سید احمد، علی گڑھ، ۱۸۶۴ء، ص ۲۰۳، ۲۶۱؛ (۴) شاہ نواز خان: مآثرالامراء، ۱ : ۵۰۹، ۲ : ۱۳۳-ادارہ]؛ (۵) عبدالحمید لاہوری: پادشاہ نامہ، متن؛ یہ سب کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے Bibliotheca Indica series میں ہیں؛ [(۶) سید غلام حسین خان طباطبائی: سیرالمتاخرین؛ (۷) سمتھ (V. A. Smith): *Akbar the Great Moghal*، آکسفورڈ ۱۹۱۷ء، بامداد اشاریہ؛ (۸) محمد اکرم امام خان: معدن الموسیقی، (تصنیف ۱۲۷۲ھ)، لکھنؤ ۱۹۲۵ء، ص ۲۳ بعد و ۱۳۷، ۲۳۳، ۲۳۵ بعد و ۲۳۹، ۲۴۲ بعد؛ (۹) *Annual Administration Report of the Archaeological Department, Gwalior State for* 1936-37، ص ۵ - ادارہ] -

(ادارہ و ہیگ T. W. HAIG)

تأویل: اس عربی لفظ کے مادے "اَوْل" (آل یَؤُول) کے لغوی معنی "اپنی اصل کی طرف لوٹنا" ہیں، لہذا لفظ "تأویل" کے لغوی معنی "اصل کی طرف لوٹانا" ہوے ۔ کلام عرب میں اور خصوصاً قرآن مجید میں یہ لفظ بیان حقیقت، حقیقی معنوں کی طرف رجوع کرنا ، توضیح معانی یا تفسیر یا اس کے مترادف معنی کے لیے استعمال ہوا ہے ۔ اس لحاظ سے "تفسیر" اور "تأویل" مترادف ہوے اور کچھ عرصے تک (غالباً تیسری چوتھی صدی تک) لفظ "تأویل" تفسیر کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا، چنانچہ ابن قتیبۃ (م ۲۷۶ھ) کی کتاب تأویل مشکل القرآن اور ماتریدی (م ۳۳۳ھ) کی تأویلات القرآن تفسیر کی معروف کتابیں ہیں، جو سند کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ ادّعا بالکل بے بنیاد ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ اس وحی کے لیے جو رسول اکرم صلعم پر نازل ہوتی تھی (بالفاظ دیگر خود قرآن کریم کے لیے) استعمال ہوا ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ یا تو آیات قرآنی کے حقیقی معنوں کے لیے استعمال ہوا ہے (وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ اِلَّا اللّٰهُ ۔ سورہ ۳ : ۷)، یا کسی واقعے کی اصل حقیقت کے لیے (سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۔ سورہ ۱۸ : ۷۸) یا تعبیر رؤیا کے لیے (اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ ۔ سورہ ۱۲ : ۴۵) وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان آیات کریمہ میں یہ لفظ اصلی لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ جب تک لفظ تأویل تفسیر کے تقریباً مترادف رہا عام طور پر علماء ان دونوں لفظوں کے مفہوم میں تھوڑا سا یہ فرق کرتے تھے کہ لفظ 'تفسیر' کا استعمال مشکل الفاظ اور مفردات کی تشریح کے لیے اور 'تأویل' کا استعمال جملوں اور معانی کی توضیح کے لیے ہوتا تھا ۔ لیکن یہ فرق سب علماء کے نزدیک مسلّم نہیں تھا جیسا کہ ابن قتیبۃ کی مذکورۂ بالا کتاب سے ظاہر ہے، کیونکہ اس کتاب کا موضوع اکثر و بیشتر مشکل الفاظ کی تشریح ہے ۔ بعد میں فقہاء وغیرہ نے 'تأویل' کے معنی کچھ اور ہی مقرر کر لیے، یعنی کسی آیت یا حدیث کے ایسے معنی استنباط کرنا جو الفاظ کے ظاہری معنی سے مختلف ہوں ۔ لہذا علماء کی عبارات میں اکثر اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں، جیسے "یہ آیت یا حدیث اتنی صریح ہے کہ اس میں تأویل کی گنجائش نہیں" یعنی اس کے کوئی ایسے معنی، جو اس کے الفاظ کے ظاہری معنی کے خلاف ہوں، ہو نہیں سکتے ۔ اس لیے کسی کلام

کے ظاھری معنی اور اس کے تأویلی معنوں میں یہ فرق ھوا کہ مؤخرالذکر کے لیے کسی دلیل یا قرینے کی ضرورت ھے ۔ قرینے کی موجودگی میں اگر ظاھری معنوں سے گریز کیا جائے تو یہ معنی مجازی معنوں سے مشابہ ھو جاتے ھیں ۔ بعد میں مسلمانوں میں ایسے فرقے پیدا ھو گئے جو سنّت کی راہ سے ھٹ گئے؛ مثلاً بعض صوفیوں کے فرقے، اخوان الصفاء اور بعض اھل تشیّع وغیرہ، اور تأویل کو اپنے ذاتی رجحانات و میلانات کے جواز کے لیے ایک بہت اچھا آلۂ کار بنا لیا، حتی کہ قرآن مجید کی محض مجازی اور تمثیلی تفسیر بھی کرنے لگے ۔ ان کے نزدیک قرآن کے ظاھری معنی اور روایتی تفسیریں ناقابل قبول ھو گئیں ۔ یہ لوگ تأویل کے مفہوم اور استعمال میں صحیح حد سے تجاوز کر گئے اور خاص کر آیات متشابہات کی طرح طرح کی تأویلیں کرنے لگے ۔ ان کا دعوی یہ تھا کہ قرآن مجید کا ایک مطلب ظاھری ھے اور ایک باطنی اور ان پر باطنی معنی منکشف ھو گئے ھیں ۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں عجیب و غریب مطالب بیان کرنے کا شوق تھا تاکہ انھیں شریعت سے رو گردانی کرنے کا بہانہ ملے ۔ ان کی اکثر آراء اسلام کے منافی تھیں، لیکن وہ اس قسم کی تأویلیں کر کے ان آراء کو اسلام پر چسپاں کرنا چاھتے تھے ۔ اسی قسم کے لوگوں کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ھے کہ (فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ (سورہ ۳ : ۷) ۔ یہیں سے صوفیہ کے بعض فرقوں نے تأویلات کے ماوراء اپنے لیے علٰحدہ علٰحدہ مسلک بنا لیے، یہاں تک کہ بعض نے احکام قرآنی کی پابندی کو بھی غیرضروری قرار دے دیا، حالانکہ اسلام ایک واضح اور روشن دین ھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے مسلمانوں کو ایک صاف اور کھلی شاھراہ دکھا دی ھے جو اس شاھراہ سے ھٹا، اس نے یقیناً صراط مستقیم سے انحراف کیا ۔

مآخذ : (۱) لسان العرب، ۱۳ : ۳۳ بعد؛ (۲) تاج العروس، ۷ : ۲۱۵؛ (۳) لین (Lane) : *An Arabic English Lexicon*، ص ۱۲۶ بعد؛ (۴) سیوطی : اتقان، ج ۲، قاھرہ ۱۲۸۷ھ، ص ۲۰۳ تا ۲۰۶؛ (۵) گولڈتسیہر (Goldziher) : *Die Richtungen der islamischen Koranauslegung* (*Veröffentlichungen der "De Goeje-Stiftung"* No. vi)، لائڈن ۱۹۲۰ء؛ (۶) ایضاً : *Streitschrift des Gazālī gegen die Bātinijja-Sekte* (*Veröffentl. der "De Goeje-Stiftung"*, No iii)، لائیڈن ۱۹۱۶ء، ص ۵۰ بعد اور عربی متن شمارہ ۱۰؛ [(۷) کلیات ابی البقاء، ۱۸۷، طبع آستانہ ۱۲۸۷ھ؛ (۸) کشاف اصطلاحات الفنون، ۱۱۱۶ تا ۱۱۱۷، طبع ھند؛ (۹) لسان العرب، ۱۳ : ۳۳-۳۵؛ (۱۰) شریف مرتضی : حقائق التأویل، طبع بغداد ۱۳۰۰ھ، ص ۷ تا ۱۳ اور دیگر کتب تفسیر وغیرہ ۔]

(R. Paret ۔ احمد محمد شاکر ۔ عابد احمد علی)

تاھَرت : (تیہرت بھی کہتے ھیں) ۔ قرون وسطی میں الجیریا (الجزائر) کا ایک شہر جو وَھران (Oran) کے موجودہ مرکز (department) کی مشرقی سرحد پر واقع تھا ۔ ادریسی کے قول کے مطابق اس نام کے دو بڑے شہر تھے ۔ ایک 'تاھرت قدیم' جو رومیوں کے وقت کی ایک قدیم جگہ ھے اور شاید یہ کسی ایسے مقامی خاندان کا صدر مقام تھا جو بزنطینی سلطنت کا باجگذار تھا یا حلیف (گزیل Gsell) ۔ یہ شہر اپنے کھنڈروں سے اٹھ کر موجودہ دور میں تیارت (Tiaret) کا صدر مقام بنا ۔ دوسرا شہر 'تاھرت جدید' جو تیارت کے جنوب مغرب کے مغرب میں کوئی چھے میل کے فاصلے پر ھے ۔ یہ جگہ تاقدمت (Tagdempt) سے کچھ دور نہیں جو امیر عبدالقادر (رک باں) کے مستحکم مقامات میں سے تھا ۔ اب اس کی گذشتہ شان و شوکت کے صرف چند مٹے ھوے آثار ملتے ھیں ۔

تاہرت جدید ۱۴۷ برس تک رُستمی خاندان کے اَباضِی (یا اِباضی، رکّ بآں) اماموں کا صدر مقام رہا۔ عبدالرحمن بن رستم عرب لشکروں کی واپسی پر، جو ابن الاشعث کی سرکردگی میں تھے، قیروان سے فرار ہو گیا اور اس نے مغرب وسطی کے اس حصے میں آ کر پناہ لی، جہاں خوارج کی کثرت تھی۔ اس نے ۱۴۴ھ (۷۶۱ء) میں تاہرت کی بنیاد ڈالی۔ موقع کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ گو یہاں کی آب و ہوا سخت ہے (البکری تاہرت کی سردی کی شدت کے متعلق کئی حکایتیں بیان کرتا ہے) لیکن اردگرد کی اراضی میں آبپاشی ہو سکتی تھی اور عمدہ قسم کے پھل پیدا ہوتے تھے۔ تاہرت کی ثروت زیادہ‌تر یہاں کی تجارت پر مبنی تھی۔ تاہرت جبل جِزُول کے دامن میں تلّ کی انتہا اور بےآب و گیاہ میدانوں کی شمالی سرحد پر واقع تھا، جہاں بدوی اور حضری آبادی سے اس کا اتصال تھا اور اس وجہ سے موجودہ تیاِرت کی طرح اس کا بہت بڑی منڈی بن جانا یقینی امر تھا۔ خانہ بدوش لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ مالدار بن جانے کی امید اور مذہب خوارج سے لگاؤ کے باعث غیر ملکی لوگ بالخصوص ایرانی بھی کھچے چلے آئے۔ انھوں نے عمدہ مکان اور ''سُوق'' بنوائے اور تاہرت کو لوگ 'العراق الصغیر' کہنے لگے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہاں کی مذہبی زندگی کیسی سخت اور مجاہدانہ تھی، اس لیے کہ یہ اس سلطنت کا پایۂ تخت تھا جس کی بنا مذہب پر تھی۔ یہاں کے ائمہ اور ان کے متبعین کی حیات عقلی کا حال بھی ہم کو بتایا گیا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس زمانے کے شہر اور اس کی عمارتوں کی صورت کیا تھی، لیکن اغلب ہے کہ عمارتیں بالکل سادہ قسم ہی کی ہونگی۔ البکری اس کے چار دروازوں اور قلعے کا ذکر کرتا ہے۔ قلعہ منڈی پر مشرف تھا۔

۲۹۶ھ (۹۰۸ء) میں تاہرت کو شیعی داعی ابو عبداللہ نے فتح کر کے بالکل برباد کر ڈالا اور اس وقت سے بربروں کی تاریخ میں اس کی اہمیت بہت ہی کم رہی۔ تیارت کو تاہرت کی اقتصادی خوشحالی کا جزوی حصہ ضرور ورثے میں ملا۔ یہ خوشحالی، جو نویں صدی کے الجزائری مرکز کو اس حیثیت سے حاصل ہوئی تھی کہ مَحل وقوع کے اعتبار سے وہ گویا بے درخت میدانوں کے لیے بندرگاہ کا حکم رکھتا تھا، اب پھر بڑھ رہی ہے، کیونکہ سِرسُو Sersū کی سطع مرتفع، جو اس سے ملحق ہے، جدید آبادکاری کا ایک اہم مرکز بن چکی ہے۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی: *Descriptio al maghribi*، طبع ڈ خویہ، ص۱۳؛ ترجمہ ۱۰۰ تا ۱۰۷؛ (۲) البکری: مطبوعۂ الجزائر ۱۹۱۱ء، ص۶۶ تا ۶۹؛ ترجمہ ڈیسلاں (de Slane)، ۱۹۱۳ء، ص۱۳۸ تا ۱۴۱؛ (۳) الادریسی، طبع ڈوزی (Dozy) اور ڈ خویہ، ص۸۷، ترجمہ ص ۱۰۰ تا ۱۰۱؛ (۴) ابن عذاری: بیان المُغرب، طبع ڈوزی، ۱: ۲۰۳ ببعد، ترجمۂ فانیاں (Fagnan)، ۱: ۲۸۳ ببعد؛ (۵) ابن صغیر: *Chronique*، نشر و ترجمہ C. Motylinski در *Actes du XIV^e Congrès des Orientalistes*، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۶) گزیل (Gsell): *Atlas archéologique de l'Algérie*، ورق ۳۳، عدد ۱۴۔

(ژورژ مارسے GEORGES MARÇAIS)

تَبالَۃ: ایک قصبے کا نام جو شمالی یمن کے مغرب میں اور مکۂ (معظمہ) کے جنوب مشرق میں کوئی سات دن کی راہ پر عَسیر کے اندرونی علاقے میں واقع ہے۔ اس کی سرسبزی اور شادابی عربوں میں ضرب المثل تھی۔ تَبالَۃ اور تُرَبَۃ کی وادی کو اکثر اوقات اَخْضَر (یعنی سرسبز) کے نام سے پکارتے تھے (دیکھیے الہَمْدانی: جزیرۃ، طبع ڈی۔ ایچ۔ مِلّر، لائیڈن ۱۸۸۴ء، ص ۱۶۵؛ یاقوت: معجم، طبع ویسٹنفلٹ، ۱: ۱۶۴)۔ بُرک ہارٹ کی کتاب *Travels in Arabia*، لنڈن ۱۸۲۹ء، ۱: ۴۴۵

میں حاجیوں کے اس راستے کے منازل دیے ہیں، جو مکے سے حجاز اور یمن کے سرحدی علاقوں سے گذرتا ہوا صنعاء تک جاتا ہے ۔ اس راستے کی نقشے پر نشان دہی برگ ہاؤس (Berghaus) کی تالیف *Arabien und das Nil-land* (گوتھا ۱۸۳۰ء، قب خصوصاً ص ۶۹) ہی کے زمانے میں ہو گئی؛ نیز دیکھیے نقشہ رٹر [۱۸۵۲ء، طبع کیپرٹ (H. Kiepert)] اس ٹکڑے کے لیے جو مکے سے تبالہ تک جاتا ہے ۔ تَبالۃ ان بلاد میں، جن میں قبیلۂ شُمران آباد ہے، سولھویں منزل پر ہے۔ الادریسی (دیکھیے *Géographie d' Édrisi* طبع ژوبیر (jaubert)، پیرس ۱۸۳۶ء، ۱ : ۱۳۸) تَبالۃ کو مقام حصین بتاتا ہے، جو مکۂ معظمہ کے زیر نگین تھا ۔ اس میں مستقل وسائل آبپاشی (''عیون'' و ''آبار'') موجود تھے اور اناج کے کھیتوں اور کھجور کے درختوں کی فراوانی تھی (یہی قول ابن خُرداذبہ *B.G.A.*، ۶ : ۱۳۰، ۱۸۸، ۱۹۲ کا ہے)۔ وسائل آبیاری کے متعلق قب الہَمْدانی، ص ۲۰۸، ۱۱۶ (۱۸۰)؛ کھجور کے درختوں کی فراوانی کے متعلق ملاحظہ ہو، الہَمْدانی، ص ۲۰۸ و الأزْرَق، (طبع ویسٹنفلٹ)، ص ۲۶۲ ۔ اس علاقے کی زرخیزی کا حال [معلقۂ لبید، طبع لائل (Lyall)، ص۸۶ و ۔ ادارہ] بکری (طبع ویسٹنفلٹ)، ص۱۹۱ سے بھی مستخرج ہو سکتا ہے اور بعد میں بدویوں [بتصحیح۔ادارہ] کے ہاتھوں سے اس زرخیزی کو جو نقصان پہنچا اس کا پتا الہَمْدانی (ص۲۰۸) سے چلتا ہے ۔ الادریسی (کتاب مذکور) یہ بھی لکھتا ہے کہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کی افواج نے تبالۃ پر قبضہ کر لیا، مگر اس موضع کو بالکل غیر اہم سمجھا گیا ۔ حجاج کو اس علاقے کا والی مقرر کیا گیا، لیکن وہ قریب پہنچا تو اسے اتنا حقیر پایا کہ اپنے عہدے کا جائزہ لینے کے لیے اس میں داخل ھی نہ ہوا اور وہیں سے واپس ہو گیا۔

یہیں سے ''أَهْوَنُ مِنْ تَبَالَةَ عَلَى الحَجَّاج'' (اس سے زیادہ حقیر جتنا تبالۃ حجاج کے نزدیک تھا) کی مثل رائج ہوئی (قب یاقوت : کتاب مذکور : ۸۱۶ و فریتاغ (Freytag) : *Proverbia*، ۲ : ۹۸۱، نیز لسان العرب، ۱۳ : ۸۰ ببعد و تاج العروس، ۷ : ۲۳۹ ببعد) ۔ [ان مآخذ میں مزید معلومات بھی ہیں۔ ادارہ]۔ الادریسی کے بیان کے مطابق تبالۃ مکۂ معظمہ سے چار روز کی مسافت پر اور عُکاظ کی منڈی سے تین دن کی راہ پر واقع ہے [مگر قب یاقوت، ۱ : ۸۱۶۔ادارہ]۔ مکۂ معظمہ سے صنعاء تک کی منازل کی جو تفصیل الادریسی نے دی ہے (دیکھیے ژوبیر کی محولۂ بالا کتاب، ص۱۳۳، عدد vi اور اس کے متعلق قب رٹر : *Erdkunde*، ۱۲ : ۱۶۸ ببعد و ۱۹۷)، اس کی رو سے تبالہ مکۂ معظمہ سے چھٹی منزل پر واقع ہے ۔ الادریسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ قصبہ ایک وادی کے نشیب میں آباد ہے، یہ وسیع نشیب طائف اور یمن کی پہاڑیوں کے دامن سے شروع ہوتا ہے، اس کے ابتدائی حصے میں پانی کی کثرت ہے اور اس میں تُرَبۃ اور بِیشۃ (یقطان، قب شپرینگر : *Das Leben und die Lehre des Mohammed*، ۳ : ۲۹۷) نامی قصبے بھی آباد ہیں۔ تَبالۃ اور صَعْدَۃ کے درمیان جن نو منازل کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے تبالۃ کے بعد کی منزل کو بیشۃ (یَقْطان) نام دیا گیا ہے۔ شپرینگر نے بیشۃ بَطْعان کی شکل میں اس کی تصحیح تجویز کی ہے (اسی طرح ان ناموں کو الہَمْدانیؔ (کتاب مذکور) نے ص۱۱۸ و ۱۲۷ میں لکھا ہے [مگر ہَمْدانی نے تمام مواضع میں بعطان لکھا ہے نہ کہ بطعان ۔ ادارہ] ۔ نیز مکہ تا صنعاء کی منازل میں ص ۱۸۷ [بتصحیح ادارہ] اور ص ۱۶۵ پر؛ ابن خُرداذبہ، کتاب مذکور ص ۱۳۴) ۔ نام کی یہ صورت شپرینگر کے پہلے بیان کردہ ہجاء سے مختلف

ہے - (دیکھیے *Z.D.M.G.*، بابت ۱۸۸۸ء، ۴۲ : ۳۲۱)-اسی مصنف کے قول کے مطابق خاص منزل تبالة مہجرة (چودھویں منزل) سے آٹھ منزل شمال کی جانب ہے - مہجرة میں ایک درخت موسوم بہ "طَلْحَةالمَلِک" ولایت مکہ اور ولایت یمن کے درمیان حد فاصل ہے (ابن خُرداذبہ : محولۂ بالا کتاب، vi : ۱۳۵) - زمانۂ حال کے مصنفین (قبّ برك هارٹ، کتاب مذکور، ص ۱۰۴ ؛ رِٹر، کتاب مذکور، ص ۲۰۰) ایک اور راستے کا بھی ذکر کرتے ہیں جسے وہ جادّہ قرار دیتے ہیں - یہ راستہ مکۂ معظمہ سے تُربَة اور طائف ہو کر رَنیّة اور تبالة کو جاتا ہے (رَنیّہ کے بجاے ادریسی نے الرُوَیثة لکھا ہے ، برك هارٹ نے الرُهیتة (al Roheyta) اور متأخر مصنفوں نے Rohe (i) ta) - اس قصبے کا جغرافیائی محل وقوع جنوب مغربی ساحل عرب کے بڑے نقشے ، لوحہ ۷، وادی بیشہ (*Wadi Bishe*) میں واضح طور پر نظر آتا ہے - یہ نقشہ جنرل سٹاف کے جغرافیائی سکشن کے لیے ۱۹۱۶ء کی پیمایش (سروے) سے تیار کیا گیا تھا-اس نقشے میں تبالة ("Teballa") کا محل وقوع گرینچ سے عرض ۱۹ درجہ ۵۰ دقیقہ شمالی اور طول ۴۲ درجہ ۳۱ دقیقہ شرقی بتایا گیا ہے- یہ اسی نام کی وادی پر واقع ہے اور یہ وادی بلقرن کے علاقے کی شمالی حد ہے [جو 'شمران' کے مشرق میں ہے] - اس کا محل وقوع اُس شاہراہ پر ہے جو طائف سے بئرالغزال ، ذرا اور تُربَة ہوکر جنوب مشرق کو آتی ہے اور یہیں تبالة میں اس شاہراہ اور اُس شاہراہ کا مقام تقاطع بھی ہے، جو جنوب مغرب کو السلیمہ اور حِلْبا (Hilba) ہوکر جاتی ہے اور بالائی حصے میں طائف سے شروع ہو کر جنوب کی طرف آتی ہے [سروے آف انڈیا، ڈیرہ دون کے نقشۂ عرب و خلیج فارس (مرتبۂ هنٹر، ۱۹۰۸ء، مع اضافات و تصحیحات تا ۱۹۱۶ء) سے اوپر کے بعض بیانات مطابقت نہیں رکھتے - ادارہ]-(وادی) بِیش اور بِیشة کے حوالے جو همدانی میں بار بار آئے ہیں، ان کا مقابلہ کر کے(در *Die alte Geographie Arabiens* ، برن Bern ۱۸۷۵ء، ص ۴۷) شپرینگر نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ همدانی کے نزدیک وادی بیشہ ، جسے اکثر اوقات بِیش سے ملتبس کر دیا جاتا ہے ، تبالة اور تَرج کو بھی سیراب کرتی ہے - مگر نہ یہ نتیجہ قابل قبول ہے نہ حال کے مصنفین کا یہ مفروضہ کہ تبالة وادی بیشہ میں واقع ہے - وادی تبالة (جس کا ذکر طَرَفة کے ایک اقتباس میں بھی آیا ہے، دیکھیے همدانی ص۱۷۳ [گو یہ شعر دیوان میں نہیں ہیں-دیکھیے همدانی، طبع مِلّر، ۲ : ۱۸۳]) وادی بیشہ میں جا ملتی ہے-همدانی نے بیشہ اور تَرج کی موضع نگاری کے سلسلے میں تبالة کا ذکر کئی دفعہ کیا ہے (دیکھیے ص ۷۲، ۹۴، ۸۳، ۱۲۷ [کلام شعراء میں تبالة کے مأسدہ (شیروں کا بن) ہونے کا جو ذکر آیا ہے اس کے لیے قبّ شپرینگر کی کتاب محولۂ بالا کے ص۱۶۰ و ۲۰۷؛ اور یاقوت : کتاب مذکور، ۱ : ۸۳۵ و ۹۱۷؛ ۴ : ۱۰۰۶؛ اور ابن حوقل : *B.G.A.* ، ۲ : ۳۰ اور بکری]- همدانی نے مراحل کے سلسلے میں بھی تبالة کا ذکر کیا ہے (دیکھیے ص ۱۸۷ ، ۱۸۹)، اور شعرا کے اقتباسات میں بھی (ص ۱۷۳ ، ۲۰۷ و ۲۱۰ ، ۲۰۸ پر)- تبالة کی سر زمین میں عَرّام بن الأَصْبَغ السُّلَمی نے (یاقوت : معجم ، ۲ : ۹۱۸) زُبَیْة کو، جسے بعض مصنفین نے رَنیّة بھی لکھا ہے، شامل کیا ہے - قبّ شپرینگر : کتاب مذکور، ص ۲۴۰ اور اس علاقے کا وہ نقشہ (ص ۲۳۹ پر) جو اس نے همدانی کے مواد سے تیار کیا ہے - همدانی (ص ۱۶۰) تبالة کا ذکر رُنْیہ کے ساتھ کرتا ہے(مِلّر کی طباعت میں رُنْیہ تلفظ ہے، لیکن اس کی صحت کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا - مخطوطوں میں اس عبارت میں حرکات

نہیں دی گئیں؛ یاقوت، کتاب مذکور، ۲ : ۸۲۶، اور المقدسی .B.G.A، ۳ : ۱۱۲ اور بکری میں همدانی (کتاب مذکور، ص۱۰۵ و ۲۰۹) کی طرح رنیّه ہے، دیکھیے ملر (D. H. Müller)، ۲ : ۳۲ اور شپرینگر : کتاب مذکور، ص۴۰ اور .Z.D.M.G، محل مذکور اور زمانۂ حال کے جغرافیہ دان)۔

شپرینگر کا مفروضہ یہ ہے (کتاب مذکور، ص۱۰۶، ۲۰۳) کہ بطلیموس (Ptolemy) کی کتاب ۶ : ۷، س ۳۳ میں 'تھوماتا' محرف ہے 'تھومالا' کا اور یہ بعینه وهی کلمه ہے جسے بلیناس (Pliny) کی کتاب .Nat. Hist، ۶ : ۱۰۴ میں توماله/ثوماله (T(h)omala) کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ یہ مفروضه اور وہ مزعومه، جو شپرینگر اس پر مبنی کرتا ہے کہ "توماله مقامی بولی میں 'توباله' یا اعلیٰ تعلیم یافته لوگوں کے تلفظ کے مطابق تَبالَة هی کی ایک صورت ہے"، دونوں غلط هیں۔ یہی رائے، کہ یہ دونوں کلمے ایک هی هیں، هارٹمان (M. Hartmann : *Die arabische Frage*، لیپزگ ۱۹۰۹ء، ص ۴۲۰) نے بھی اختیار کی ہے؛ مگر حضرموت سے شروع ہونے والے قدیم دروب حج (حج کی شاهراهوں) کے متعلق همدانی کے بیان (ص۱۸۸) کی اس تاویل سے، جو شپرینگر نے کی ہے، اس کی تائید نہیں ہوتی۔ شپرینگر کی تأویل کی رو سے یہ رستے تبالة میں آ کر مل جاتے تھے (کتاب مذکور ص۱۰۶، ۱۶۱)۔ بلیناس کی رائے میں ثوماله (Thomala) سبائیوں کا ایک شہر تھا (مزید اطلاع کے لیے دیکھیے پالی۔وسووا (Pauly-Wissowa)، بذیل مادۂ سبأ، عمود ۱۳۲۸)۔ شپرینگر کا یہ مفروضه (ص۲۰۳)، کہ ابتداء میں تبالة معینیون (Minaeans) کی سر زمین کا ایک حصہ تھا، غلط ہے۔ معینیون کے علاقے کی تعیین کے متعلق اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے بالکل غلط ہے (دیکھیے .Realencycl، عمود ۱۳۱۶ ببعد)۔

اس قصبے کی (جس کا نام حاجی خلیفه نے جہان نما، ص۵۲۰ پر 'تبالت' لکھا ہے) وجه تسمیه روایتی طور پر یہ ہے کہ عمالقه کی ایک عورت تَبالَة سے یہ نام مأخوذ ہے، مگر اس وجه تسمیه کو کوئی اهمیت حاصل نہیں، تاهم یہ فرض کرنے میں هم حق بجانب هیں کہ یہ قصبه بہت قدیمی ہے (یاقوت : کتاب مذکور، ۱ : ۸۱۶)۔ اس جگه زمانۂ جاهلیت میں ایک بت کی پوجا کی جاتی تھی [جو سفید پتھر تھا اور اس پر تاج کی سی شکل نقش تھی۔ اس بت کو ذوالخَلَصَة (یا ذوالخُلُص) کہتے تھے، لیکن رسول اللهؐ نے جریر بن عبدالله البَجَلی کو وهاں بھیجا تو انھوں نے بتکده کو ڈھا دیا اور بت کو آگ لگا دی اور باب مسجد تبالة کی دهلیز بنا دیا] (ابن هشام، سیرة ج۱ : ۵۵ ببعد) [یاقوت : کتاب مذکور، ۲ : ۴۶۲۔ اداره]؛ بنو خَثعَم کا ذکر سیرة میں تو اس بت کے دیگر پجاریوں [یعنی دَوس و بَجیله وغیره] کے ساتھ ہوا ہے، لیکن الهمدانی (ص۱۱۹) اور یاقوت (کتاب مذکور، ۲ : ۳۶۱ ببعد اور ۳ : ۸۰۶، ۸۰۰) نے تبالة کے سلسلے میں صرف خثعم هی کا ذکر کیا ہے)۔ وہ اشعار جن میں ذوالخَلَصَة یعنی تبالة کی الهام گاه (oracle) کا ذکر ہے، جہاں 'ازلام' (تیروں) کے ذریعے نتائج اخذ کیے جاتے تھے، [بقول ابن هشام امرؤالقیس سے منسوب هیں] (بت کے متعلق قَبَّ وہ معلومات جو لسان العرب، ۸ : ۲۹۵، میں جمع کیے گئے هیں نیز دیکھیے تاج العروس، ۴ : ۳۸۹)، تبالة کے متعلق اس حیثیت سے کہ وہ بت پرستی کا مستقر تھا قَبَّ ولهاؤزن (Wellhausen): *Reste arabischen Heidentums*، طبع دوم، ص۴۵ ببعد)۔ خَثعَم جنھیں ابن رُسته .B.G.A: ۷ : ۳۱۶، ۳۲۰ تقریبی طور پر تبالة کے باشندے خیال کرتا ہے، زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ تُربه اور بیشه نیز اس سر زمین کے رهنے والے هیں، جو تبالة کے عقب میں ہے۔ خاص تبالة کے باشندے بنو مازن هیں (ویسٹنفلٹ : *Die Wohnsitze und Wanderungen der arabischen Stämme*، شماره ۴۱، از

Abhandl. d. kön. Gesellsch. d. Wissensche.، گوٹنگن ۱۸۶۸ء، ص ۸۳ ، ۵۸ از روی بکری)۔ قدامة لکھتا ہے (دیکھیے مآخذ) کہ تبالة کے گرد و نواح میں بنو قیس کے منازل تھے (قب ابن خرداذبہ : کتاب مذکور، ص۱۸۸)۔ بقول ابن خلدون (طبع کے (Kay) : *Yaman*)، ص ۱۲۹ ببعد، تبالة بنو نہد کا علاقہ ہے۔ ذوالخلصة کو (جس کے متعلق کتب ذیل بھی ملاحظہ ہوں : بکری : ص۳۱۶ و ابن الکلبی : کتاب الاصنام، قاھرة ۱۳۳۲ھ/ [۱۹۱۴ء]) (یاقوت کا مواد اس کتاب سے منقول ہے، قب ولہاؤزن : کتاب مذکور، ص ۱۰ ببعد اور یاقوت : کتاب مذکور، ۲ : ۶۱۳ ببعد) نبی الیسن D. Nielsen نے اپنی کتاب *Handbuch der altarabischen Altertumskunde*، طبع کوپن ھیگن۔ پیرس۔ لیپزگ ۱۹۲۷ء، ص ۲۳۱ ، ۲۳۳ میں جسارت کے ساتھ عربوں کا ایک ناھیدی معبود (Venus-deity) قرار دیا ہے۔ ایک خاص قسم کی پوجا کا مرکز ہونے کی وجہ سے تبالة تجارتی مرکز بھی تھا، چنانچہ ہمدانی اپنی کتاب ۲۰۸ پر سلسلۂ آمد و رفت و تجارت کا ذکر بھی کرتا ہے۔ تاریخ اسلام میں تبالة اس لیے مشہور ہے کہ یہ ان شہروں میں سے ہے جنھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور اس طرح اپنی آزادی بر قرار رکھی (گولیوس Golius در *Alfraganus, Elementa Astronomica*، ایمسٹرڈم ۱۶۶۹ء، ص۸۵)۔

مآخذ : (۱) تصانیف برکھارٹ، شپرینگر، ولہاؤزن، رٹر، نیز کتب جغرافیہ دانان، لغت نویسان و نسابان عرب (الہمدانی، یاقوت، بکری، الادریسی) جن کا ذکر اس مقالے میں آ چکا ہے؛ (۲) ھامر۔ پورگشتال (J. V. Hammer-Purgstall) : *Jahrbücher der Litteratur*، وی انا ۱۸۴۰ء، ۹۲ : ۱۰۰ (مکے سے صنعاء تک کے منازل کے متعلق جو جہان نما میں درج ہیں) اور ج ۹۳ : ۹۳؛ (۳) شپرینگر کی کتاب *Die Post- und Reiserouten des Orients, Abhandl. f.d. Kunde des Morgenl.*، لیپزگ ۱۸۶۴ء، iii/۳ : ۱۲۰ ببعد، ۱۳۸ ببعد؛ (برائے مراحل ھمدانی) ص۱۲۸ ببعد (برائے مراحل ، قدامة و ابن خرداذبہ و ابن المجاور)۔

(J. TKATSCH)

تُبَّت : چین کے جنوب میں ایک ملک کا نام۔ یاقوت تُبَّت، تِبِّت اور تُبِّت بھی لکھتا ہے، لیکن پہلی صورت کو ترجیح دیتا ہے۔ تبت اور تبتی سلطنت کے متعلق قدیم ترین ملاحظات، جو عربی کتابوں میں ملتے ہیں، غالباً ترکی مآخذ سے لیے گئے ہیں۔ تبت کے بادشاہ کو خاقان کہا گیا ہے، تُپُّت (Tüpüt) اور "تُپُّت قاغان" کے نام تو 'اورخون' کے کتبوں کے زمانے میں بھی ملتے ہیں۔ تُبَّت کی خیالی مشابہت، جو ثابت اور تُبَّع سے ہے، اس کی وجہ سے یہ کہانیاں مشہور ہو گئی ہیں کہ تبتی سلطنت کی ابتداء یمن سے ہوئی؛ مثلاً الطبری ، ۱ : ۶۸۶ فوق؛ گردیزی در بارٹولڈ: *Otčet o poězdke v Srednyuyu Aziyu*، ص۸۷ ببعد۔ عربوں نے تبت کے متعلق جو ملاحظات دیے ہیں ان میں بہتیری اور باتیں ہیں جو افسانوی ہیں۔ یہ قصہ کہ جو اجنبی پہلے پہل تبت میں جاتا ہے ، بے سبب مسرت محسوس کرتا ہے اور ہنسنے کی خواہش سے مغلوب ہو جاتا ہے ، اول اول خرداذبہ (*B.G.A.* ۶ : ۱۷۰) میں پایا گیا ہے۔ اسلامی ادب میں اس قصے کا اکثر ذکر آیا ہے (قب نظامی : سکندر نامہ، کانپور ۱۳۲۰ھ، ص ۲۲۶ [شرف نامہ طبع برتلس، باکو ۱۹۴۷ء، ص۳۴۰]، اس میں مولانا نظامی نے بذیل عنوان 'رفتن اسکندر از ہندوستان بملک چین' لکھا ہے :

چو بر اوج تبت رسید افسرش
بخندہ در آمد ہمہ لشکرش
بپرسید کین خندہ از بہر چیست
بجایی کہ بر خود بباید گریست

نمودند کاین زعفران گونه خاك
کند بی سبب مرد را خنده ناك
عجب ماند شه زان بهشتی سواد
که چون آورد خندهٔ بی مراد - اداره]

یہاں تک کہ حدود العالم میں بھی، جس میں تبت کے متعلق بہترین اطلاعات درج ہیں، یہ ذکر موجود ہے (حدود العالم کا مصنف نامعلوم ہے؛ متن : *Comptes Rendus de l'Acad. de Russie*، ۱۹۲۴ء، ص ۳۷ پر دیکھیے)۔ یہی پہلا مصنف ہے جو لہاسا (Lhāsā) کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لہاسا میں ایک 'مزگت' (مسجد) بھی تھی اور کچھ مسلمان بھی آباد تھے، مگر انکی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔

وسط ایشیا میں عرب فتوحات کا زمانہ وہ نہ تھا جب تبت کی طاقت انتہائی عروج پر تھی اور چین کے خلاف وہ عموماً کامیابی کے ساتھ جنگ آزما ہوتا تھا۔چینی تاریخوں میں اکثر عربوں کو تبتیوں کا اور تبتیوں کو عربوں کا حلیف بتایا گیا ہے۔شاون (Chavannes) ان تعلقات کو مختصراً یوں بیان کرتا ہے:(*Documents sur les Tou-Kiue [Turcs] occidentaux*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص ۲۹۱) : ''تبتیوں نے جیسی مدد سیحون کی وادی میں عربوں کو دی ویسی ہی مدد عربوں نے تبتیوں کو کاشغریہ میں دی''۔ چن یوان (Čen-yuan) کے عہد (۷۸۵ء تا ۸۰۵ء) سے پہلے مسلمانوں نے تبت کے خلاف کبھی جنگ آزمائی نہیں کی۔ اُس وقت سے تبتیوں کو لگاتار اپنی افواج مغرب کی جانب بھیجنا پڑیں اور اس طرح چینیوں کے سرحدی اضلاع میں ان کی مار دھاڑ کم ہو گئی۔ (برٹ شنائڈر E. Bretschneider : *On the Knowledge possessed by the Ancient Chinese of the Arabs*، لندن ۱۸۷۱ء، ص ۱۰)۔ عربی مآخذ میں تبت سے نہ اتحاد کا ذکر ہے اور نہ اعراض کا۔ بقول طبری، موسٰی بن عبداللہ بن خازم (عرب باغی) کی حکومت کے زمانے میں (جس کی مدت پندرہ سال تھی : طبری، ۲ : ۱۱۶۰، پائین صفحہ، یعنی ۸۵ھ/۷۰۴ء تک) ترمذ پر حملہ ہوا۔ حملہ آور عَیاطِلَة یا هَیاطِلَة (دیکھیے مادۂ چین مطابق متن انگریزی ج ۱، ص ۸۴۰ ب)، تبتی اور ترک تھے(انھیں واقعات کو بَلاذُری نے ص ۴۱۸ پر بیان کیا ہے، مگر تبتیوں کا ذکر وہاں نہیں ہے)۔ حملہ آوروں نے شکست کھائی۔ بقول یعقوبی (۲ : ۳۶۲؛ نیز *B.G.A.*، ۷ : ۳۰۱ دربالای صفحہ) خلیفہ عمر بن عبدالعزیز[رض] ([۹۹ھ تا ۱۰۱ھ] / ۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) کے عہد میں الجَرّاح بن عبداللہ الحَکَمی، والی خراسان، کے پاس تبّت کے وفود یہ درخواست لے کر آئے کہ اس ملک میں ایک اسلامی مُبلِّغ بھیجا جائے۔ اس پر سَلِیط بن عبداللہ الحَنَفی کو اس کام کے لیے وہاں بھیجا گیا۔ اسی کتاب میں (ص ۴۷۹ پر) یہ بھی ہے کہ شاہ تبت ان بادشاہوں میں سے تھا، جس نے خلیفہ المہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ/ ۷۷۵ء تا ۷۸۵ء) کی اطاعت قبول کی۔ ہارون الرشید کے اواخر عہد حکومت (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ - ۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) میں سمرقند کی بغاوت میں باغی سردار رافع بن لیث کی امداد سپاہ ('جُنود') تبت نے بھی کی تھی (کتاب مذکور، ص ۵۲۸)۔ المأمون (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ - ۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) کے عہد کا ذکر ہے کہ شاہ تبت نے اسلام قبول کر لیا اور اس کے ثبوت میں اس نے خراسان میں سونے کا بت بھیجا جس کی وہ پوجا کیا کرتا تھا۔ یہ بت سونے کے جڑاؤ تخت پر رکھا ہوا تھا۔ مامون نے اسے مکّے میں بھیج کر لوگوں کو بتایا کہ شاہ تبت کو خدا نے ہدایت دی ہے (کتاب مذکور، ص ۵۵۰)۔ والی شہر یزید بن محمدالمخزومی نے ایک بغاوت کے دوران میں اس بت کے سونے سے سکے ضرب کرائے

(ص۳۳۵) - طبری (۳ : ۸۱۵) میں ''خاقان صاحب التّبت'' کا ذکر بذیل ۱۹۵ھ (۸۱۰-۸۱۱ء) آیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مأمون کے دشمنوں میں سے تھا اور مأمون کو الأمین پر حملہ آور ہونے سے پہلے اُس سے صلح کرنا پڑی۔ ۱۹۶ھ (۸۱۱-۸۱۲ء) میں الفضل بن سہل (رک بآن) کو مشرق ولایتوں یعنی ''ہمذان سے تبت تک'' کا والی مقرر کیا گیا (طبری، ۳ : ۸۴۱)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب جغرافیہ دانوں نے عموماً تُبّت سے تِبّت خُرد یعنی بلتستان (رک بآن) کا علاقہ مراد لیا ہے۔ تبت کے ساتھ خُتن (رک بآن) اور بدخشان (رک بآن) سے براہ واخان آمد و رفت ہوتی تھی۔ یہ ختن سے ناحیۂ تبّت تک ہی کی آنے والی سڑک تھی جس کے مسافروں کے متعلق البیرونی نے (آثارالباقیة، طبع زخاؤ، ص۲۶۲ سطر ۸، جہاں 'بیت' کی جگہ 'تُبّت' پڑھیے) نیز گردیزی نے بحوالۂ جیہانی لکھا ہے کہ اُن کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ ''ثقل لسان'' (mountain sickness) میں مبتلا ہو جاتے ہیں (کتاب مذکور، ص۸۸)۔ جِرمِ بدخشان کے متعلق دیکھیے .B.G.A، ۷ : ۲۸۸ پائین صفحہ۔ اسی مقام کے متعلق ابن رُستہ نے لکھا ہے کہ وہ تبّت کے علاقے کی طرف کی سڑک پر بلخ کے متصل مشرقی شہروں میں سے آخری شہر ہے۔ واخان میں سے ہو کر جانے والی سڑک کے متعلق مفصل ترین معلومات حدود العالم میں مذکور ہیں (ورق ۲۵ب)۔ اس نواح میں ماوراءالنہر کے سرحدی قلعے کی حیثیت سے ایک بڑے گاؤں ''سمرقنداق'' کا ذکر بھی آتا ہے (غالباً سمرقند خرد مراد ہے) جس میں ہندوستانی، تبّتی، واخانی اور مسلمان رہتے ہیں۔ اسلامی دنیا میں مشک اسی راستے سے لایا جاتا تھا (.B.G.A، ۱ : ۲۸۰ بالای صفحہ، ۲۹۷ پائین صفحہ)۔ تبت اور چین کی سرحدی چوکیوں کے سلسلے میں یعقوبی (۱ : ۲۰۸) نے جو کچھ خود لکھا ہے اس کی اور دیگر مؤرخین کے بیانات کی تردید کرتے ہوئے (۱ : ۲۰۳ پر) لکھا ہے کہ تبت والوں کے ساتھ کسی حملہ آور نے جنگ نہیں کی [و شَوکَتُہم شَدیْدَة فَلَیس یحارِبُہم اَحَد۔ادارہ]۔

غالباً تبت کے خلاف سب سے پہلا حملہ سلطانِ بنگال محمد بختیار خلجی (رک بآن) [م ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ - ۱۲۰۶ء - ادارہ] کا تھا جو چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی میلادی) میں ہوا (منہاج سراج نے ۶۴۱ھ / ۱۲۴۳ - ۱۲۴۴ء میں رکابی محمد بختیار سے اس مہم کے حالات لکھنوتی میں سنے؛ ملاحظہ ہو منہاج‌الدین جوزجانی کی کتاب طبقات ناصری (طبع نساؤ لیس (-W. Nassau Lees) اور مولوی خادم حسین اور مولوی عبدالحی ص ۱۵۳، ترجمہ راورٹی (Raverty) ص۵۶۰ ببعد؛ ایلیٹ (Elliot) : *History of India*، ۲ : ۳۱۰ ببعد)، [طبقات کے اس اقتباس کے مترجم نے بعض غلطیاں کر دیں جس سے بعض مطالب خبط ہو گئے، انہیں سطور بالا میں درست کر دیا گیا ہے۔ ادارہ]۔

تبّت کا نام (Tebet, Thebet, Thabet, Thibet) برٹ شنائڈر: *Mediaeval Researches*، ۲ : ۲۱ کے قول کے برعکس غالباً عربوں کے واسطے کے بغیر، عہد مغول کے یوروپین سیاحوں کے ذریعے براہ راست، یورپ میں پہنچا۔ تُبت (Tubbot) کا ذکر بارھویں صدی ہی میں بنیامین تُطیلة Benjamin of Tudela (ترجمۂ Adler، ص۵۹) نے کیا ہے، مگر غالباً اس کے بیان سے یورپ اس وقت باخبر نہ ہوا۔ بنیامین، جیسا کہ اب خیال کیا جاتا ہے، صرف بغداد تک گیا تھا۔ رائٹ (J. K. Wright) : *The Geographical Lore of the Time of the Crusades*، نیویارک ۱۹۲۸ء، ص۲۸۲)۔ اسلامی دنیا میں، جو اطلاعات اس نے غالباً

بھوٹیوں سے حاصل کیں، انھیں بہت ھی پریشان اور درھم برھم شکل میں پیش کرتا ھے ۔ اس کی ایک مثال یہ ھے کہ وہ کہتا ھے سمرقند سے تبت تک صرف چار روز کی راہ ھے ۔

سلطنت مغول کے متعلق رشیدالدین کی عظیم‌الشان تصنیف میں بھی تبت کا ذکر ھے ۔ بوری تبت کا نام (رشیدالدین *Trudî Vost. otd. Arkh. Obshč*, xiii، متن ، ص ۲۳۷) اس کے سوا اور کسی مسلمان مصنف نے نہیں لیا، ھاں غیر مسلم Plano Carpini نے تیرھویں صدی میں اس کا ذکر کیا ھے (Burithabet) اور چینی مآخذ (قب حوالہ‌جات در برٹ شنائڈر : کتاب مذکور) میں بھی اس کا ذکر ھے ۔ تبت، جو ساتویں صدی میلادی میں بدھ مذھب قبول کر چکا تھا، عہد مغول سے بدھ مت کی اشاعت کے لیے اھم ثابت ھوا ۔ رشیدالدین وضاحت سے (طبع بلوشہ (Blochet)، ص۵۰۴) لکھتا ھے کہ [قوبیلای قاآن کے عہد کے آخر میں اگرچہ ختائی اور ھندی بخشی بہت تھے ، لیکن] تبتی بخشیوں کو سب سے زیادہ اعتبار حاصل تھا ۔

شمالی ھند اور وسط ایشیا میں جب اسلام کو نویں صدی ھجری (پندرھویں صدی میلادی) میں قطعی اور حتمی کامیابی حاصل ھو چکی تو اس کے بعد مسلمان بادشاھوں نے جہاد کے نام سے تبت پر حملہ کیا ، بالخصوص تبت خرد (بلتستان) پر ۔

نویں صدی کے آخر تک بولور (کافرستان، رَکَ بآں) اور تبت کے وہ علاقے جو بدخشان اور کشمیر (رَکَ بآں) کے درمیان ھیں، والی کاشغر ابوبکر دوغلات (تاریخ رشیدی، ترجمۂ راس *Ross*، ص ۳۲ اور ۳۰۴) کے جرنیل میر ولی نے مطیع و منقاد کر لیے ۔ جب ابوبکر کو سعید خان نے (۱۵۱۴ء میں) نکال باھر کیا تو تبت (لدّاخ) میں جو قلعے بنائے گئے تھے، فوجوں نے انھیں خالی کر دیا اور قلعوں اور ان کے خزانوں پر تبتی قابض ھو گئے ۔ سعید خان کے عہد (۱۵۱۴ تا ۱۵۳۳ء) میں تبت ، لدّاخ اور ملحقہ علاقوں پر پہلے ۱۵۱۷ء میں میر مزید نے حملہ کیا، پھر ۱۵۳۲ء میں خود خان نے حیدر مرزا مؤرخ (رَکَ بآں) کی معیت میں حملہ کیا (کتاب مذکور، ص ۴۱۷ ببعد) ۔ ۱۵۳۳ء میں حیدر مرزا نے لہاسا پہنچنے کی کوشش کی جسے وہ اُرسنگ کہتا ھے اور جہاں سب سے بڑے مندر تھے، لیکن اسے مجبوراً 'اُسکابُرک' کے مقام سے واپس ھونا پڑا (ص۴۰۴)۔ یہ مقام لہاسا سے صرف ایک ھفتے کی مسافت پر ھے۔اُرسنگ غالباً حدودالعالم کا گرسانگ ھے، جہاں بڑے بڑے بتخانے تھے۔یہ بات کہ گرسانگ کا ذکر لہاسا سے الگ بھی آیا ھے، اس شہر کی شناخت کے خلاف بطور شہادت پیش نہیں ھو سکتی۔حدودالعالم تقریباً تمام کی تمام تحریری مآخذ سے تالیف ھوئی ھے، اس لیے ایک ھی نام کا ذکر اس میں بارھا دو دفعہ مختلف صورتوں میں آیا ھے، اس لیے کہ بظاھر یہ مواد مختلف مآخذ سے لیا گیا ھے۔ بعد ازآں شاہ کشمیر کی حیثیت سے (بعد از ۱۵۴۱ء) حیدر مرزا نے ۱۵۴۸ء میں لداخ اور بلتستان پر بھی حملہ کیا ۔

ان سب باتوں سے ظاھر ھوتا ھے کہ دسویں صدی میں بلتستان تبت میں شامل تھا (تاریخ رشیدی، ص۴۳۶، کے مطابق یہ علاقہ ''بولور اور تبت کے درمیان'' واقع تھا) اور اس وقت تک اس ملک میں اسلام کی اشاعت نہیں ھوئی تھی۔ کننگھم اور اس کے بعد کے مؤرخین بشمول فرانکہ (A. Francke): (*A History of Western Tibet* ، ص ۹۰) کا یہ خیال قطعاً ناقابل قبول ھے کہ بلتستان کو ۱۳۸۰ء اور ۱۴۰۰ء کے درمیان کشمیر کے بادشاہ سکندر نے مسلمان کیا (سکندر نے بقول زمباور (Zambaur) *Manuel: de Généalogie et de Chronologie*، ھانوور ۱۹۲۷ء،

ص۲۹۳)، از ۷۸۸ھ تا ۸۱۳ھ/از ۱۳۸۶ء تا ۱۴۱۰- ۱۴۱۱ء فرمانروائی کی)۔

سولھویں صدی کے دوسرے نصف تک تبت خُرد میں اسلام خود ایک سیاسی طاقت بن چکا تھا۔ خپلو (Kapulu) کے حاکم علی میر شیر خان نے سارے بلتستان کو زیرنگیں کر لیا اور اس سر زمین کو بدھ مت کے آثار اور بتوں سے پاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ لداخ کو فتح کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا، لیکن یہ قبضہ محض عارضی تھا۔ اس نے اسکردو شہر آباد کیا، جو بلتستان کا دارالحکومت ہے۔ تاریخ رشیدی (ص۴۰۵) میں اسکردو کی بابت صرف یہی لکھا ہے کہ یہ ایک درہ تھا جس میں سے کشمیر سے آنے والی سڑک گذرتی تھی اور اب یہ نابود ہے۔ بلتستان ھی ایک ایسا اسلامی علاقہ ہے جس میں تبتی لوگ آباد ھیں اور ۱۸۴۰ء سے کشمیر کی ریاست کے ماتحت [رھنے کے بعد اب ۱۹۴۸ء سے ان کی اپنی حکومت قائم ہے جسے وہ حکومت پاکستان کے مشورے سے چلا رہے ھیں]۔ کہتے ھیں کہ بالتی زبان میں تاریخی تصانیف موجود ھیں۔ ان کا خاص رسم الخط بھی ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اسلام لانے کے بعد اختیار کیا۔ تحریری حروف تو غالباً تبتی الاصل ھی ھیں، مگر ان پر عربی کا اثر پڑا ہے۔ الفاظ بائیں سے دائیں لکھے جاتے ھیں (گریئرسن Grierson : *Linguistic Survey of India*، ۳ : ۳۲ ببعد؛ فرانکہ : کتاب مذکور، ص۹۸ ببعد)۔ بالتی شروع ھی سے شیعہ مذھب کے پابند ھیں، لیکن محمود بن ولی کی کتاب بحرالاسرار (متن در .Zap، ۱۵ : ۲۳۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں مسلک اھل سنت غالباً تھوڑے عرصے کے لیے غالب آ گیا تھا۔ بادشاہ نے (جس کا نام نہیں دیا) سنی مذھب قبول کر لیا تھا، چنانچہ اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کو کافر گردان کر قتل کرا دیا تھا۔ سنی علماء کاشغر سے طلب کیے گئے تھے۔ تیس سال بعد ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء - ۱۶۳۵ء) میں ان واقعات کی اطلاع ایک شخص حسن خان نامی بلخ میں لایا۔ یہ شخص بلتستان کے شاھی خاندان کا قرابت دار تھا۔

نواح ۱۶۸۲ء میں جب وسطی تبت پر قلماق (رَلْدْ بان) حکمران تھے، مشہور و معروف خوجہ آپاق (آفاق) (جن کے مقبرے کو کاشغر میں اب بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے) اپنے خان اسمٰعیل (۱۶۷۰ء تا ۱۶۸۲ء) سے ناراض ہو کر لہاسا چلے گئے، جسے وہ بدھ کے ایک بڑے بت کی وجہ سے شہر جو (*Djū Shahri*) کہتے ھیں۔ ان کی درخواست پر دلائی لامہ نے (ایک ترکی دستاویز میں صیغۂ جمع 'دَلائی لامہ لَر' آیا ہے) انھیں 'گَلْدَن بوشوکتو' خان قلماق کے نام پروانہ راہ داری دیا۔ بوشوکتو نے خوجہ کو ساتھ لے کر ایک فوج کے ھمراہ کاشغر پر حملہ کر دیا اور اسمٰعیل خان کو قید کر کے اپنے ھمراہ لے گیا اور خوجہ کو بادشاہ بنا دیا (ھارٹمان (M. Hartmann): *Der islamische Orient*، ۱ : ۲۱۰، ۲۱۲، ۳۲۱ و ۳۲۶؛ *Zap.*، ۱۵ : ۲۰۰)۔

آخری چند صدیوں میں تبت کا اسلامی دنیا سے بہت ھی کم تعلق رھا ہے، گو مسلمان لہاسا میں اس وقت بھی داخل ہو سکتے تھے جب یورپ والوں کا داخلہ وھاں بند کر دیا گیا تھا۔ ھر تین سال کے بعد ایک وفد کشمیر کے تحائف لے کر وھاں جایا کرتا تھا۔ لہاسا کے ایک نقشے میں (جو وَیڈل A. Waddell : *Lhassa and its Mysteries*، لندن ۱۹۰۵ء میں دیا ہے) ایک مسجد، مسلمانان کشمیر کے لیے عدالت اور چینی مسلمانوں کے لیے ایک سرائے دکھائی ہوئی ہے۔

مآخذ : نفس مادہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

(W. BARTHOLD بارتھولڈ)

تَبرِیز : ایران کی ولایت آذربایجان (رک باں) کا مرکز ۔

جغرافیائی محل وقوع : یہ شہر اُس رسوبی میدان (پیمائش تقریباً ۳۰ × ۲۰ میل ہے) کے مشرق کونے میں واقع ہے جس کی خفیف سی ڈھلان جھیل اُرمیّۃ [ارومیہ یا رضائیۂ حالیہ۔ادارہ] کے شمال مشرق ساحل کی جانب ہے ۔ کئی ندیاں اس میدان کو سیراب کرتی ہیں جن میں سے سب سے بڑی آجی‌چای (''رود خانۂ تلخ'') ہے۔یہ ندی کوہ سَبلان (سَوَلان) کے جنوب مغربی رخ سے نکل کر قراجہ داغ کے ساتھ ساتھ بہتی ہے، کیونکہ جنوب میں یہ پہاڑ ایک سد کا کام دیتا ہے۔اس طرح یہ ندی میدانی علاقے میں پہنچ کر شہر کے شمال مغربی مضافات کا چکر کاٹتی ہے ۔ آجی‌چای کے بائیں کنارے کی معاون ندی مہران رود (جسے اب 'میدان چای' کہتے ہیں) شہر کے بیچوں بیچ بہتی ہے ۔ روسی نقشے کے مطابق تبریز کے مختلف محلوں کی سطحی بلندی مختلف مقامات پر تقریباً چار ہزار سے پانچ ہزار فٹ تک ہے ۔ شہر کے متصل شمال مشرق میں 'عَینَل زَینَل' (زیارت گاہ عون بن علی اور زید بن علی) کی پہاڑی ہے ، جو ۶,۰۰۰ فٹ بلند اور شمال و شمال مشرق کے سلسلۂ قراجہ داغ اور کوہ سَہند کے خارجی اطناف (بیرونی پہاڑیوں کے باہر نکلے ہوے حصے=outer spurs) کو ملاتی ہے ۔ سہند کی چوٹیاں (شہر کے جنوب میں کوئی تیس میل کے فاصلے پر) ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتی ہیں ۔ چونکہ قراجہ داغ کا علاقہ بہت سنگلاخ اور دشوار گذار ہے اور کوہ سہند کا عظیم‌الشان سنگین حجم تبریز سے مراغہ تک کے وسیع رقبے کو پُر کیے ہوے ہے، اس لیے سلسلۂ آمد و رفت و رسل و رسائل کے لیے صرف تبریز ہی ایک موزون راستہ ہے، جو مشرق (آستارہ [بحیرۂ خزر کے ساحل پر] ← اَردَبیل ← تبریز اور طہران ← قزوین ← میانہ ← تبریز)، اور مغرب (طرابزون ← اِرزروم ← خوی ← تبریز) اور شمال (تفلیس ← اریوان ← جُلفا ← مرند ← تبریز کو ملاتا ہے ۔ اس کے علاوہ کوہ سہند کی باہر کو نکلی ہوئی پہاڑیاں اس کے دامن میں جھیل ارمیہ کے مشرق کنارے کے ساتھ ساتھ بہت تنگ گلی چھوڑتی ہیں ، اس لیے شمالی علاقے (ماورای قفقاز ← قراجہ داغ) اور جنوبی علاقے (مراغہ ← کردستان) کی آمد و رفت کے لیے بھی تبریز ہی سے ہو کر جانا پڑتا ہے ۔

اس خوش بختانہ محل وقوع ہی میں یہ حقیقت مضمر تھی کہ تبریز اس وسیع اور دولت مند علاقے میں، جو ترکی اور روسی (یا سوویٹی) ماوراے قفقاز کے درمیان واقع ہے، ایک مرکزی مقام بن جائے، نیز عام طور پر ہندوستان اور قسطنطنیہ کے درمیان بہت بڑی اہمیت کے شہروں میں شامل سمجھا جائے (اس قسم کی اہمیت کے اور شہر صرف تفلیس، طہران، اصفہان اور بغداد ہی ہیں) ۔ تبریز کی موجودہ آبادی کوئی دو لاکھ کے قریب ہے [۲ لاکھ ۹۰ ہزار در مسعود کیہان، ۲ : ۱۵۲ - ادارہ] ۔

تبریز کا موسم سرما بہت سخت ہے اور اس میں شدید برف باری ہوتی ہے ۔ گرمیوں میں کوہ سہند کے قرب اور شہر میں بے شمار باغات کی موجودگی کی وجہ سے گرمی کی شدت کم اور ہوا معتدل ہو جاتی ہے ۔ آب و ہوا مجموعی طور پر صحت بخش ہے، مگر وبائی امراض، مثلاً ہیضہ اور تپ محرقہ (ٹائیفائڈ) کے حملے ہوتے رہتے ہیں، جو غالباً شہر میں صفائی کی حالت خراب ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں ۔

تبریز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں ۔ ان میں شدید ترین زلزلے سنین ذیل میں آئے : ۲۴۴ھ (۸۵۸ء)، ۴۳۴ھ (۱۰۴۲ء)، اس آخری زلزلے کا ذکر ناصر خسرو نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے (ابو طاہر شیرازی منجم نے اس کے متعلق پیشینگوئی کی تھی)، ۱۶۴۱ء (Arakel of Tabriz : ص ۴۹۶)، ۱۷۲۷ء، ۱۷۸۰ء (آوزلی (Ousely)، ۳ : ۴۳۶؛ رِتّر، ۹ : ۸۹۴) وغیرہ ۔ ۲۲ و ۲۳ ستمبر ۱۸۵۴ء اور ۳۰ اکتوبر ۱۸۵۶ء کے زلزلوں کا ذکر خانیکوف نے ذاتی مشاہدے کی بنا پر کیا ہے (دیکھیے *Bull. Hist. Phil. de l'Acad. de St. Péterbourg*، ۱۸۵۷ء، ص ۲۰۱، ۱۸۵۸ء، ص ۳۳۷ تا ۳۵۲)۔ تبریز میں زلزلے کے جھٹکے تو تقریباً روزانہ ھی محسوس ہوتے رہتے ہیں، ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ سہند میں آتش فشان مادہ مصروف عمل رہتا ہو، لیکن خانیکوف کا خیال یہ تھا کہ غالباً طبقات الارض میں سے کسی طبقے کے خود بخود زیر و زبر ہونے سے یہ جھٹکے لگتے رہتے ہیں۔

اس شہر کے استحکامات ناصرالدین شاہ کے عہد میں ملیامیٹ کر دیے گئے تھے (مرآۃ البلدان، ۱ : ۳۴۳)۔ شہر کا وہ حصہ جسے قلعہ کہتے ہیں (یعنی علاقۂ چار منار، سرخاب، دیویچی (Däwăči)، ویجویہ [تلفظ عام، ویرجی (Wărdji)]، مہاد مہین (تلفظ عام میار میار)، نوبر، مقصودیہ وغیرہ) اب شہر کے اس حصے سے علحدہ نہیں جو پہلے بیرون فصیل تھا، یعنی علاقۂ اھراب، لیل آباد (تلفظ عام لیلوا، چرنداب، خیابان، باغ میشہ وغیرہ ۔ شہر کے مغرب کی طرف کی پہلی آبادیاں بھی اب شہر میں شامل ہو گئیں، یعنی امیر خیز، چوسٹ دوزان، حکم آباد (تلفظ عام ھکمور) قرہ ملک، قرہ آغاج، اخونی، کوچہ باغ اور خطیب ۔ اسی طرح وہ آبادی، جو جنوب مشرق میں تھی، (یعنی مرلان) وہ بھی اب شامل شہر ہے ۔ شہر کی آبادی کے پھیلنے کا زیادہ رجحان مغرب اور جنوب مغرب کی طرف ہے۔

آذربایجان کی وسیع ولایت کا اداری اور اقتصادی مرکز تبریز ہے ۔ اس کی موجودہ ولایتی تقسیمات حسب ذیل ہیں : اردبیل (مع آستارہ، موغان وغیرہ)، قراجہ داغ (صدر مقام اھر) مرند (مع جلفا و گرگر)، خوی، ماکو، سلماس، ارمیہ (مع اشنو)، علاقہ مکری (صدر مقام : ساوج بلاغ)، صائن قلعہ، مراغہ، ھشت رود اور گرم رود (صدر مقام میانہ)، سراب اور تبریز کا مرکزی تومان۔

چودھویں صدی میں حمداللہ نے (قب اولیاء : ۲ : ۲۰۷) آخری علاقے (تومان) کی تقسیم [ناحیوں میں ۔ ادارہ] یوں بیان کی ہے : مہران رود شہر کے مشرق میں؛ سردرود جنوب مغرب میں؛ باویل رود (؟) سرد رود کے مشرق میں (بشمول مواضعات خسرو شاہ؛ اسکویہ، میلان)؛ ارونق، جھیل ارمیہ کے شمال مشرق میں بشمول مواضعات شبستر، صوفیان وغیرہ؛ رود قاب [رود قات در فرهنگ جغرافیائی ایران، تہران، ۱۳۳۰ش، ۴ : ۲۴۱ ۔ ادارہ] خانم آباد (؟) [حمداللہ مستوفی : خانم رود؛ اولیاء : جانم رود ۔ ادارہ] اور بدوستان (؟) [اولیاء : بدستان ۔ ادارہ]، یہ تینوں شہر کے شمال میں ہیں ۔ پرانے مرکزی تومان کی حدود بیسویں صدی تک تبدیل نہیں ہوئی تھیں۔

نام : بقول یاقوت (۱ : ۸۲۲) شہر کے نام کا تلفظ تبریز ہے ۔ یاقوت اپنی سند میں ابوزکریا التبریزی (شاگرد ابوالعلاء المعرّی، ۴۲۶ھ تا ۴۴۹ھ) کو پیش کرتا ہے، جس کی نسبت ہم جانتے ہیں کہ وہ مقامی ایرانی بولی (آذری) بولا کرتا تھا (قب السمعانی : کتاب الأنساب، نشر وقفیۂ گب بذیل التنوخی)، اور سید احمد کسروی تبریزی : آذری یا زبان باستان آذربایگان، طہران

۱۳۰۰ھ، ص ۱۱) ۔ تلفظ تبریز غالباً اس خاص بولی کی خصوصیت ہوگی، کیونکہ اس کا تعلق لہجہ ہای خزری (کیسپین) سے ہے ۔ موجودہ تلفظ صرف تبریز ہی ہے (یا تبریز، یہ صورت ابدال کی وجہ سے پیدا ہوئی جو آذربایجان کے اس کے علاقے کے مروجہ ترکی لہجے کی نمایاں خصوصیت ہے) ۔ ارمنی مآخذ سے فتحۂ تاے تبریز کی تصدیق ہوتی ہے ۔ فاسٹس (Faustus) بزنطینی (چوتھی صدی ھجری) تھوریژ (Thavrēž) اور تھوریش (Thavrēsh) لکھتا ہے، اسولک Asolik (گیارھویں صدی) تھوریژ اور وردان Vardan (چودھویں صدی) تھوریژ اور دوریژ (Davrēž)؛ ظاہر ہے کہ آخری طرز ارمنی اشتقاق عوامی کو مد نظر رکھتے ہوئے اختیار کی گئی ہے: دَ ۔ ا ۔ وریژ *da l vrēž* ''وہ ہے براے انتقام''؛ قب چمچان Čamčan: *History of Armenia*، وینس ۱۷۸۴ء، ۱ : ۳٦۵)؛ ہیبشمان (Hübschmann): *Armen. Gramm.*، ۱ : ۴۲؛ ایضاً : *Pers. Stud.*، ص ۱۷۹ ۔ پانچویں (چوتھی) صدی میلادی میں اس شہر کا نام، جس کی تصدیق ارمنی مآخذ سے ہوتی ہے، تھوریژ (Thavrēž)، < فارسی توریژ تھا (ہیبشمان ۔ فارسی کے اشتقاق عوام کے مطابق تبریز کے معنی تپ گرانے (بھگا دینے) والا ہے (اولیاء چلبی: *sîtma dökü̈dj̲ü*)، لیکن ممکن ہے اس نام کے معنی شاید یہ ہوں کہ ''وہ جس سے حرارت یا گرمی غائب ہو جائے''۔ ممکن ہے اس معنی کو کوہ سہند کی آتش فشانیوں سے کسی نہ کسی طرح کی مناسبت ہو (قب نیز بایزید اور وان کے درمیانی درے کا نام : تپریز) ۔ ارمنی زبان کے ھجاء کلمۂ میں شمالی پہلوی زبان کی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے (تو < تپ اور خصوصاً ریژ بجاے *ریچ)، اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نام بہت قدیم زمانے، یعنی قبل ساسانی اور شاید قبل اشکانی (pre-Arsakid) دور سے چلا آ رہا ہے (آذربایجان میں ترکی حملوں کی وجہ سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے لیے قب مادۂ تات) ۔

تاریخ : یہ سوال کہ تبریز کی تطبیق ماذہ یا میڈیا (Media) کے کسی قدیم شہر سے کرنی چاہیے، بہت سی قیل و قال کا موضوع بن گیا ہے (قب تلخیص بحث در رٹر، ۹ : ۷۷۰ تا ۷۷۹)۔ اس امر کا احتمال کہ تبریز بطلیموس، ج ٦، باب ۲ کے Γάβρις (از Τάβρις*) کے مطابق ہے، ارمنی کلمے کے مذکورۂ بالا تجزیے کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ کم اغلب ہو جاتا ہے ۔ رالنسن (Rawlinson) نے اپنے ایک مضمون *Memoir on the site of the Atropatenian Echatana* در *J.R.G.S.*، ۱۸۴۰ء، ۱۰ : ۱۰۷ تا ۱۱۱، میں تبریز اور گنزہ (Ganza) = الشیز کا باھمی التباس حتمی طور پر صاف کر دیا ہے (ارمنی زبان میں گنزہ کا کلمہ گنذزك شہستن ہے، جسے فاسٹس بزنطینی نے تھوریژ (Thavrēž) سے متمیز کیا ہے) ۔

ارمنی مؤرخ وردان Vardan (چودھویں صدی) کے قول کے مطابق اشکانی ارمنی خسرو (۲۱۷ء تا ۲۳۳ء) نے ساسانی بادشاہ اردشیر اول (۲۲۴ء تا ۲۴۱ء) کے خلاف انتقامی جذبے کے ماتحت تبریز کے شہر کی بنیاد ایرانی علاقے میں ڈالی، کیونکہ اردشیر نے پارتھیا (پارت) کے آخری بادشاہ اَرْتَبانُوس کو قتل کر ڈالا تھا (قب مارٹن (St. Martin): *Mémoires sur l'Arménie*، ۱ : ۳۲۳) ۔ کسی پرانے مآخذ میں یہ کہانی نہیں پائی جاتی اور غالباً محولۂ بالا عوامی اشتقاق سے اس کی توجیہ ہو سکتی ہے ۔ فاسٹس بزنطینی، ترجمۂ Lauer، جلد چہارم، باب ۲۰ اور ۳۹ اور جلد پنجم، باب ۲ کے مطالعے سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ ارمن بادشاہ اَرْشَک ثانی (۳۵۱ء تا ۳٦۷ء) کے عہد میں ارمن جرنیل وسک (Wasak) نے ساسانی بادشاہ شاپور ثانی (۳۰۹ تا ۳۷۹ء) پر اس وقت حملہ کیا جب وہ تھوریژ (Thavrēž) (تبریز) میں لشکر ڈالے پڑا تھا ۔

اس کے بعد وَسک نے ایرانی جرنیل بُییکان (Boyekan) کو وهاں قتل کر کے شاهی محل کو آگ لگا دی اور بادشاہ کے ایک مجسمے پر بھی تیر مارا۔ پھر مُشیغ بن وَسک نے تبریز کے مقام پر ایرانی فوجوں کو شکست دی۔

البته یه سوال باقی هے که آیا تبرمیس (Thebarmais) جہاں ۶۱۴ء میں شہنشاہ ہرقل (Heraclius) نے گنزگه کو ویران کرنے کے بعد شہر اور آتشکدے کو آگ لگا دی تھی(Theophanus، ص۳۰۷ : ἀπάρας ἀπὸ Γαζακῶ καταλαμβάνει τὴν Θηβαρμαΐς) ایک حد تک تهوریز سے التباس کے آثار تو ظاهر نہیں کر رها هے۔

عربوں کا عہد حکومت : آذربایجان کی فتوحات (بحدود ۲۲ھ / ۶۴۲ء) کے دوران میں ان کی زیادہ تر توجه تسخیر اردبیل کی جانب مبذول رهی ۔ جن شہروں میں سے ایرانی مرزبان نے اپنی فوج جمع کی تھی، اُن میں تبریز کا ذکر کہیں نہیں آیا (بلاذری : ص۳۲۶) ۔ جس پائمالی اور ویرانی کا ذکر فاسٹس نے کیا هے، اس کی وجه سے تبریز غالباً ایک معمولی گاؤں بن کے رہ گیا ہوگا (قب یاقوت) ۔ بعد کی روایت (نزهة القلوب، ۷۳۰ھ / ۱۳۲۹-۱۳۳۰ء، ص ۷۵) یه هے که هارون‌الرشید کی بیوی زبیدہ نے تبریز کو ۱۷۵ھ / ۷۹۱ء میں بسایا (''زبیده ..... ساخت'')۔ یه روایت شاید اس واقعے پر مبنی هے که بنی امیه کی جاگیروں کی ضبطی کے بعد وَرثان (جو آذربایجان میں رود ارس پر واقع هے) زبیده کو جاگیر میں ملا تھا ۔ بلاذری، ص۳۳۱ اور ابن فقیه، ص۲۸۵ (قب نیز یاقوت، ۱ : ۸۲۲) کے مطابق تبریز کی تعمیر جدید الرّوّاد الأزدی کے گھرانے کا کام تھا، خصوصاً اس کے بیٹوں الوَجناء اور اس کے بھائیوں کا، جنھوں نے شہر کے گرد دیوار بنوائی۔ طبری (۳ : ۱۱۷۱ = ابن الاثیر، ۶ : ۳۱۵) بابک کی بغاوت (۲۰۱ھ تا ۲۲۰ھ) کا حال لکھتے هوے اسے شکست دینے والوں میں سے ایک شخص محمد بن بَعیث کا بھی ذکر کرتا هے جو دو قلعوں کا مالک تھا، یعنی قلعهٔ شاهی کا جو اس نے الوَجناء سے لیا اور تبریز کا (جس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی) ۔ شاهی جس کا عرض دو فرسخ (؟) [کے قریب ۔ اداره] تھا تبریز سے زیاده مضبوط و محفوظ تھا [قب اس نام کے جزیره نما ''شاهو'' یا ''شاهی'' کے ساتھ جو تبریز کے جنوب مغرب میں جھیل اُرمیه پر واقع هے لیکن بلاذری کے نزدیک (دیکھیے ص۳۳۰)، بعیث کی جاگیر مَرَند تھی]۔

ابن خُرداذبه نے اپنی کتاب (ص ۱۱۹) لکھی (۲۳۲ھ/۸۴۶-۸۴۷ء) تو تبریز محمد بن الرَّوّاد کے قبضے میں تھا ۔ ۲۴۴ھ میں زلزلے کی وجه سے یه شہر تباہ هوگیا، لیکن المتوکل کا دور حکومت (۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ) ختم هونے سے پہلے اسے دوباره تعمیر کر لیا گیا تھا ۔ اس کے بعد تبریز کئی دفعه ایک مالک سے دوسرے کے هاتھوں میں منتقل هوا، کیونکه الاصطخری (نواح ۳۴۰ھ)، ص ۱۸۲ میں هے که وہ علاقه جس میں تبریز، جابَروان (یا دیه خَرقان؟) اور اُشنوه (رکّ به اُشنو) شامل هیں، قبیلهٔ حاکمهٔ بنو رُدینی کے نام سے مشہور تھا ۔ ابن حوقل کے وقت (نواح ۳۶۷ھ، ص ۲۸۹) تک آل رُدینی غائب هو چکے تھے ۔ تبریز کے ان مالکوں نے عملی طور پر خود مختارانه حکومت کی، کیونکه خاندان ابوالساج کی تاریخ میں (جو آذربایجان میں ۲۷۶ھ تا ۳۱۷ھ مالک و مختار رها) کسی جگه بھی یه ذکر نہیں آتا که اس نے کبھی تبریز کے معاملات میں دخل دیا هو۔قب ڈفریمری (Defrémery): *Mém. sur la famille des Sadjides*، در *J. A.*، ۱۸۴۷ء

(اس خاندان کا دارالحکومت پہلے مراغہ اور بعد میں اُرْدَبیل تھا؛ کتاب مذکور، نقل چاپی (reprint)، ص ۲۵ و ۳۱ و ۳۴ و ۵۰ و ۷۷)۔

آل ابن الساج کے دور کے خاتمے کے بعد ولایت آذربایجان بیشمار متخاصمین کی رزمگاہ بن گیا۔ لشکری بن مَرْدی نے، جو مَرْداویج زیاری کی طرف سے یہاں کا حاکم رہ چکا تھا، ۳۲۶ھ میں اس ولایت پر قبضہ کر لیا۔اسے دَیْسَم کُرد نے بھگا دیا (قبّ اکراد)۔ اس کُرد کو بھی دَیلمیانِ آل مسافر [رَکّ بہ (بنو) مسافر] سے ٹکر لینا پڑی۔ اهل تبریز نے دَیسم کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دی، لیکن المرزبان مسافری نے فوراً شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دَیسم تبریز چھوڑ گیا اور آذربایجان کے کل شہروں میں المَرزُبان کی حکومت کا اعلان ہو گیا (نواح ۳۳۰)۔

خاندان مسافریہ کا خاتمۂ کار واضح طور پر معلوم نہیں۔ ایوآر (Huart) نے اپنے مقالے: *Les Musāfirides de l'Adharbaidjan* (در عجب نامہ، طبع کیمبرج ۱۹۲۲ء) میں لکھا ہے کہ تارم میں اُن کی حکومت کا آخری ذکر ۳۸۴ھ تک ملتا ہے، لیکن راس Sir E.D. Ross خاندان مسافریہ کےساتھ آل روّاد کو ملحق کر دیتا ہے جن کے تبریز میں موجود ہونے کا ۴۴۶ھ تک پتہ چلتا ہے (دیکھیے راس: *On 3 Muhammadan dynasties*، در *Asia Major*، بابت ۱۹۲۵ء، ج ۲، ص ۲۱۲ تا ۲۱۵)، مگر یہ ممکن ہے کہ یہ روّادی، روّادالأزدی کی اولاد سے ہوں جو تبریز کی تعمیر جدید کرانے والے کا باپ تھا اور دیلمی مسافریوں سے (سوائے علاقۂ اِزدواج کے) ان کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ بہر حال واقعات ذیل ان روّادیوں کے متعلق ہیں: ۴۲۰ھ میں وَھْسُودان بن مَہلان (مَمْلان؟) [بملان بالکسر در برہان قاطع و فرہنگ ناصری ۔ ادارہ] نے تبریز میں غُزّ سرداروں کی ایک بڑی تعداد کا قتل عام کرایا (ابن الاثیر: ۹: ۲۷۹ [تاریخ درست نہیں ہے ۔ ابن الاثیر طبع سوم، ۷: ۳۴۰ میں اس واقعے کی تاریخ ۴۳۲ھ دی ہے اور وهی درست ہے ۔ ادارہ]؛ ۴۳۴ھ میں زلزلے کے باعث تبریز تباہ هوگیا اور امیر (غالباً یہی امیر [وهسودان۔ادارہ]) سلجوقی غُزّوں کے خوف سے اپنے ایک اور قلعے میں چلا گیا (ابنُ الاثیر: ص ۳۵۸ [طبع سوم، ۸: ۳۶ ۔ ادارہ])؛ ۴۳۸ھ میں ناصر خسرو جب تبریز پہنچا تو وهاں سیف‌الدولہ و شَرَف المِلّة ابو منصور وهسودان بن محمد (مَمْلان؟) مولٰی امیرالمومنین، کو بادشاہ پایا ۔ ۴۴۶ھ میں تبریز کے بادشاہ امیر ابومنصور وهسودان بن محمد الروّادی نے طغریل کی اطاعت قبول کی (کتاب مذکور، ۹: ۴۱۰)۔

تبریز صدر اسلام میں: ابن خُرّداذبہ، ص ۱۱۹؛ بلاذُری، ص ۳۳۱؛ طَبَری، ۳: ۱۱۷۱؛ ابن الفقیہ، ص ۲۸۵؛ بلکہ اصْطَخْری (ص ۱۸۱) تک بھی تبریز کا ذکر آذربایجان کے چھوٹے شہروں هی میں کرتے هیں البتہ المُقَدَّسی [ص ۳۷۸ ۔ ادارہ] تبریز کی تعریف میں رطب‌اللّسان نظر آتا ہے اور اس کا معاصر ابن حَوقَل (نواح ۳۶۷ھ / ۹۷۷ - ۹۷۸ء) اسے آذربایجان کا سب سے زیادہ آباد شہر بتاتے ہوئے لکھتا ہے "خرید و فروخت بکثرت هوتی ہے اور "ارمنی" نام کے پارچات بنانے کے کارخانے هیں" [مگر قبّ طبع جدید، ص ۳۳۶ س ۱۸۔ ادارہ]؛ ابن مِسْکَویہ (م ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) لکھتا ہے کہ "تبریز ایک شاندار شہر ہے، اس کے گرد مضبوط فصیل ہے اور یہ درخت زاروں اور باغوں سے گھرا ہوا ہے"۔ وہ کہتا ہے کہ "اس کے باشندے شجاع، جنگجو اور امیر هیں"۔ ناصر خسرو کے قول کے مطابق ۴۳۸ھ میں شہر کا کل رقبہ ۱٫۴۰۰×۱٫۴۰۰ قدم تھا جو تقریباً ایک مربع

میل کے صرف تیسرے حصے کے برابر ہوتا ہے۔

عہد سلاجقہ: سلاجقۂ کبار کے زمانے میں تبریز کا ذکر شاذ ہی آتا ہے۔ اس کے قرب و جوار میں طُغرِیل نے خلیفۂ وقت کی بیٹی (راحۃ الصدور، ص ۱۱۱) سے شادی رچائی تھی۔سلطان بَرکیارُق (Barkiyaruḳ) اور اس کے بھائی محمد میں منازعت ہوئی تو وہ ۴۹۴ھ میں تبریز کے جنوبی پہاڑی علاقے میں چلا گیا مگر جب بھائیوں میں صلح ہو گئی تو تبریز محمد کے حوالے ہوا۔ اس نے ۴۹۸ھ میں سعدالملک کو وہاں اپنا وزیر مقرر کیا۔ ۵۰۵ھ میں الامیر سُقمان القُطبی کو ہم تبریز کا مالک و مختار پاتے ہیں۔ یہ شاہان اَرمینیہ (شاہِ ارمن) کے خاندان کا بانی تھا، جس نے ۴۹۳ھ سے ۶۰۴ھ تک اَخلاط میں حکومت کی۔

سلجوقیان عراق کی اس شاخ کے عہد میں جن کا صدر مقام ھَمدان تھا، آذربایجان نے بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ ۵۱۴ھ میں سلطان محمود نے کچھ وقت تبریز میں اس غرض سے گذارا کہ وہاں کے باشندے، جو گُرجیوں کے حملوں سے گھبرا گئے تھے، مطمئن ہوجائیں۔اس زمانے میں آذربایجان کے اتابک کا نام کُن تُوغدی تھا۔ ۵۱۵ھ میں اس کی موت کے بعد امیر مَراغہ، اَقسُنقُر احمد ایلی، نے طُغرِیل (برادر سلطان) سے تبریز چھین لینے کی کوشش کی، لیکن اس ساز باز کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ محمود نے امیر جیوش موصل کو آذربایجان کا حاکم مقرر کیا، جو ۵۱۶ھ میں تبریز کے دروازے پر مارا گیا۔ محمود کے انتقال (۵۲۵ھ) کے بعد اس کے بھائی مسعود نے تبریز پر قبضہ کر لیا جہاں داؤد بن محمود نے اس کا محاصرہ کیا۔ آخرکار داؤد نے تبریز پر قابو پا لیا اور اس شہر میں رہ کر ایک وسیع ریاست پر، جس میں آذربایجان، اَرّان اور اَرمینیہ شامل تھے، حکومت کرتا رہا (۵۲۶ھ تا ۵۳۳ھ)۔ بعد میں صوبہ ھاے اَرّان اور آذربایجان طغریل اول کے پرانے غلام اتابک قَرَہ سُنقُر کے حوالے کر دیے گئے۔ اس کا پایۂ تخت غالباً اردبیل تھا (ابن الاثیر، ۱۱: ۵۲)۔ وہ ۵۳۵ھ میں فوت ہوا، تو امیر جاؤولی (چاوُلی) الطُغریلی اس کا جانشین بنا، لیکن بہت ہی جلد خاندانِ اتابکیہ، جو اس ولایت میں ۶۲۲ھ تک حکومت کرتا رہا، اس کے بانی ایلْدگیز نے آذربایجان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ آل ایلدگیز کی قوت کا مرکز پہلے پہل شمال مغربی آذربایجان میں تھا۔ اس زمانے میں تبریز، مراغہ کے احمد ایلی امیروں کے قبضے میں آچکا تھا، اس لیے کہ کہیں ۵۷۰ھ میں جا کر اتابک پہلوان بن ایلدگیز نے فلک الدین سے، جو اَقسُنقُر بن احمد ایلی کا پوتا تھا، تبریز چھین کر اپنے بھائی قِزِل ارسلان کو دیا تھا۔ قزل ارسلان کی اتابکی کے زمانے میں (۵۸۲ھ تا ۵۸۷ھ) تبریز قطعی طور پر صوبۂ آذربایجان کا پایۂ تخت قرار پا گیا۔

۶۰۲ھ میں امیر قرہ سنقر علاءالدین احمد ایلی نے اردبیل کے اتابک سے ساز باز کر کے قزل ارسلان کے جانشین، عیاش مزاج، ابوبکر سے تبریز چھین لینا چاہا۔ یہ کوشش ناکام رہی اور قرہ سنقر اپنے علاقے مراغہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایلدگیزی شُہزادے بڑے ٹھاٹھ سے رہا کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ان قصائد کے مطالعے سے ہو سکتا ہے، جو نظامی اور خاقانی جیسے شعراء نے ان کی شان میں لکھے۔ لیکن نَخْچوان [رَکّ بآن] کے کھنڈروں کے سوا ان کے عہد کی عمارتوں کا کوئی نشان ہمیں معلوم نہیں۔ ان کے جانشینوں کی سیاسی کمزوری کی تصدیق اس واقعے سے ہو سکتی ہے جو تاریخ گرجستان (جارجیا) میں درج ہے اور ۱۲۰۸ء تا ۱۲۱۰ء (۶۰۵ھ تا ۶۰۷ھ) میں پیش آیا۔ ایوانی (Iwane) اور زَخارہ (Zakʰare) ملکۂ ثمر (Tʰamar) کے دو جرنیل تھے، جنھوں نے ایک

پرخطر غارت گرانہ مہم کے سلسلے میں تمام شمالی ایران میں جرجان تک یلغار کی ۔ گرجستان (جارجیا) کے لشکر نے مرند سے آکر تبریز "Tʰawrēž" والوں سے زر فدیہ تو وصول کیا لیکن اور کسی طرح ملک کے امن میں خلل انداز نہیں ہوئے ۔ شہر میں تھوڑی سی فوج چھوڑ دی گئی تھی، جو یلغار پر جانے والی فوج کی منتظر رہی ۔ اس واقعے کا ذکر اسلامی مآخذ میں نہیں ملتا، لیکن کہانی کے جزئیات سے اس کی صحت کے متعلق کچھ نہ کچھ اعتماد ضرور پیدا ہوجاتا ہے، قب بروسه Brosset : *Histoire de la Géorgie*، ۱ : ۴۷۰۔

مغول : ۶۱۷ھ کے موسم سرما میں مغول تبریز کی دیواروں کے سامنے نمودار ہوئے ۔ عاجز و ضعیف اَتابَک ازبک بن پہلوان نے ایک رقم کثیر بطور زر فدیہ ادا کر کے انہیں واپس جانے پر رضامند کیا ۔ اگلے سال وہ پھر آ دھمکے، تو اتابک نخچوان کی طرف بھاگ گیا لیکن بہادر شمس الدین الطغرائی نے مقابلہ کرنے کا کچھ بندوبست کیا اور مغول دوبارہ فدیہ لے کر چلے گئے ۔ اس کے بعد ازبک تبریز میں واپس آ گیا ۔ ۶۲۱ھ میں مغولستان سے مغولوں کا ایک اور گروہ آ پہنچا اور ازبک سے یہ مطالبہ کیا کہ تبریز میں جتنے خوارزمی موجود ہیں ان کے حوالے کر دیے جائیں ۔ ازبک نے بلا چون و چرا فوراً اس کی تعمیل کر دی ۔

جلال الدین : خوارزم شاہ بہت جلد مراغہ سے آ پہنچا اور ۲۷ رجب ۶۲۲ھ کو شہر میں داخل ہوا جسے ازبک پھر چھوڑ گیا تھا ۔ باشندگان شہر بے حد خوش ہوئے کہ ایک مرد شجاع ان کی حفاظت کو آ گیا ، خصوصاً اس لیے کہ جلال الدین کو اپنی شخصی قوت و عظمت دکھانے کا موقع بھی جلد مل گیا اور وہ یوں کہ ایک مہم تو اس نے تفلیس کے خلاف بھیجی، اس کے علاوہ غارت گر ترکمانوں کو، جو قبیلۂ ایوا (الأیوائیۃ) کے لوگ تھے، قرار واقعی سزا دی ۔ جلال الدین نے ملکہ سے، جو پہلے ازبک کی بیوی تھی، شادی کر لی اور تبریز پر چھے سال حکمرانی کی ۔ لیکن اس مدت کے بعد اس کی سوء سیرت اور قبح تدبیر کی وجہ سے اس کے وقار کو بڑا دھکا لگا (ابن الاثیر، ۱۲ : ۳۲۳) ۔ ۶۲۷ھ ہی میں قبیلۂ قوش یلوہ (؟) کے ایک ترکمان سردار نے جو روئین دز (نزد مراغہ) کا والی تھا تبریز کے نواح میں لوٹ مار کی جرأت کی ۔ ۶۲۸ھ میں جلال الدین آذربایجان سے چلا گیا اور منگولوں نے تمام صوبے پر بشمول تبریز قبضہ کر لیا ۔ ''شہر تبریز بلاد آذربایجان کا دل (اصل) ہے، [کیونکہ] ہر شخص کا مرجع اسی کی اور اس کے باشندوں کی طرف ہے ۔'' (ابن الاثیر : طبع ٹورنبورغ، ۱۲ : ۳۲۸ ؛ طبع ۱۳۰۳ھ، ۱۲ : ۱۹۶، س ۶) ۔ مغولوں کے 'مَلک' (جورماغون نوین) نے زعماے شہر کو طلب کیا (صرف شمس الدین الطغرائی جگہ سے نہ ہلا) اور شہر پر ایک بھاری تاوان عاید کر دیا ۔ پارچہ بافوں کو حکم ہوا کہ وہ بڑے بادشاہ (اوکتای Ügedei) کے لیے خطائی کپڑے تیار کریں ۔ اس کے علاوہ سالانہ خراج بھی مقرر کر دیا ۔ گیوک کے عہد سلطنت سے ارّان اور آذربایجان کی حاکمی اور ملکی کا عہدہ ملک صدرالدین کے ہاتھ میں تھا جو مغولوں کا ایک ایرانی حلیف تھا ۔ قب جہان کشای، طبع محمد قزوینی، G.M.S.، ۲ : ۲۵۵ ۔

ایلخانی مغول : ۶۵۴ھ (۱۲۵۶ء) میں ہلاکو فتح بغداد کے بعد آذربایجان آیا اور مراغہ [رَکّ بآن] میں سکونت اختیار کی ۔ ۶۶۱ھ (۱۲۶۲-۱۲۶۳ء) میں شمالی قفقاز میں برکای کی فوجوں سے شکست کھانے کے بعد ہلاکو تبریز واپس آیا اور اس نے قپچاق اصل کے تجار کو، جو وہاں مقیم تھے، قتل کرا دیا ۔ ۶۶۲ھ

(۱۲۶۴ء) میں جاگیروں کی جدید تقسیم کے وقت ہلاکو نے صوبۂ تبریز کی نظامت پر ملک صدرالدین کو مستقل کر دیا۔

اباقا (۶۶۳ھ تا ۶۸۰ھ) کے دور حکومت میں تبریز کو سرکاری طور پر پایۂ تخت قرار دیا گیا اور الجایتو کے زمانے تک اباقا کے جانشینوں کے وقت میں بھی شہر کی یہ حیثیت قائم رہی۔ ۶۸۸ھ (۱۲۸۹ء) میں بعہد ارغون اس کے یہودی وزیر سعدالدولہ نے اپنے عمزاد بھائی ابومنصور کو تبریز کا حاکم مقرر کر دیا۔ کیخاتو کے زمانے میں ولایت تبریز کی آمدنی کا اندازہ ۸۰ تومان کے قریب لگایا گیا۔ ۶۹۳ھ (۱۲۹۴ء) میں تبریز میں نوٹ (یعنی چاؤ) کے جاری ہونے پر بغاوت ہو گئی۔ غازان خان کے زمانے میں تبریز کی شان و شوکت معراج کمال کو پہنچ گئی۔ بادشاہ ۶۹۴ھ (۱۲۹۵ء) میں شہر میں داخل ہوا اور اس محل میں اقامت اختیار کی جو ارغون نے شہر کے مغربی جانب موضع شام میں آجی چای کے بائیں کنارے پر تعمیر کرایا تھا (اس فارسی نام کی قدیم صورت ''شنب'' بمعنی گنبد تھی [کاترمیر (Quatermère)، *N.E.*، شمارہ ۱۴، ص ۳۱: گنبددار عمارت] لیکن چودھویں صدی ھی میں اسے 'شام' کہنے لگے تھے، قب نزھۃ القلوب)۔ فوراً ھی یہ احکام جاری ہوئے کہ بتکدے، گرجے، یہودیوں کے معابد اور آتشکدے منہدم کر دیے جائیں، لیکن کہتے ہیں کہ اگلے ھی سال یہ احکام ارمنی بادشاہ ہیثم (Hethum) کی درخواست پر منسوخ کر دیے گئے۔ ۶۹۹ھ/ ۱۲۹۹ء میں ملک شام کی مہم سے واپس آنے کے بعد غازان نے تعمیرات کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مذکورۂ بالا شام [شنب] کو اپنی آخری آرام گاہ بنائے۔ یہاں ایک عمارت بنائی گئی جس کا گنبد، سلطان سنجر کے گنبد واقع مرو سے بھی جو اس وقت اسلامی دنیا میں بلند ترین عمارت سمجھی جاتی تھی، زیادہ بلند تھا۔ اس گنبددار مقبرے کے حوالی میں ذیل کے ابواب البر (عمارات خیریہ) بنوائے گئے: ایک مسجد جامع، دو مدرسے (ایک مدرسۂ شافعیہ اور دوسرا مدرسۂ حنفیہ)، ''دارالسیادۃ'' (سادات کے لیے دارالاقامۃ)، دارالشفاء، مراغہ کے طرز کی ایک رصدگاہ، ایک بیت الکتب، ایک بیت القانون (archives)، ایک بیت المتولی، آب نوشی کے لیے ایک حوض خانہ، جس کے ساتھ گرمابۂ سبیل تھا [تاریخ مبارك غازانی، *G.M.S.*، ص ۲۰۹-ادارہ]؛ ان اداروں کے اخراجات کے لیے ایسے اوقاف علٰحدہ کر دیے گئے جن کی آمدنی ایک سو تومان زر [سے زیادہ-ادارہ] تھی (وصّاف [ص ۳۸۴-ادارہ])۔ نئے شہر کے ہر دروازے پر ایک ایک کاروانسرائے، چہار بازار اور حمام تعمیر کرائے۔ دور دراز ملکوں سے میوہ دار درخت اور [پودے، پھول اور غلے کے بیج (''ریاحین و حبوبات'')] منگوا کر لگوائے گئے۔

خود شہر تبریز میں اہم اصلاحات کی گئیں۔ اس وقت تک اس کی بیرونی فصیل (''بارو'') صرف چھے ہزار 'گام' (قدم) تھی، جہان نما میں بجای گام قلاج یعنی "fathom" [= ۶ فٹ، سیدھے خط میں پھیلے ہوے ہاتھوں کا طول - ادارہ] آیا ھے۔ غازان نے نئی دیوار بنوائی جو لمبائی میں پچیس ہزار گام (۴½ فرسخ) تھی۔ تمام باغات، کوہ ولیان، اور سنجران کے آباد محلے شہر میں شامل کر لیے گئے۔ فصیل کے اندر کوہ ولیان (حالیہ کوہ سرخاب یا عینَل زینَل) کی ڈھلانوں پر مشہور و معروف وزیر رشیدالدین نے متعدد نہایت خوبصورت عمارتیں بنوائیں، اسی لیے اس علاقے کا نام ''ربع رشیدی'' مشہور ہو گیا (نزھۃ القلوب، ص ۷۶)۔ رشیدالدین کا ایک خط اب تک محفوظ ھے جس میں اس نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا کہ وہ ملک

روم سے چالیس رومی غلام اور کنیزکیں بھیجیے، تاکہ وہ [جوار ربع رشیدی کے باغ کے پانچ میں سے ایک تریے میں ۔ ادارہ] انھیں آباد کر سکے (قبّ براؤن : *A Hist. of Pers. Liter.*، ۳ : ۸۲ [و مکاتیب رشیدی، ص ۲۰۵-ادارہ])۔

گویا اس امر کو یقینی طور پر ثابت کرنے کے لیے کہ اس وسیع سلطنت کا، جو دریاے جیحون سے لےکر مصر تک پھیلی ہوئی تھی، تبریز ہی اصلی مرکز تھا، اس وقت کے طلائی اور نقرئی سکّوں اور پیمانوں (کَیْلَۃ، گز) کا معیار تبریز کے مقرر کردہ معیار کے مطابق معین کیا گیا (ڈوسان، ۴ : ۱۴۴، ۲۷۱ تا ۲۷۷، ۳۵۰، ۳۶۶ تا ۳۶۹ [و تاریخ غازانی ص ۲۸۲-۲۹۱-ادارہ])۔

۷۰۳ھ (۱۳۰۴ء) میں غازان خان کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ قبّۂ شام میں دفن کیا گیا ۔ ۷۰۵ھ (۱۳۰۵ء) میں اس کے جانشین اُلجایتو کو سلطانیہ [زنگّ بان] میں ایک اور پاے تخت بنانے کا خیال پیدا ہوا، لیکن باشندوں کو وھاں لے جانا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء) میں ھم دیکھتے ھیں کہ قپچاق ازبکوں کے سفیر تبریز کے لمبے راستے ھی سے آئے اور انھوں نے چھوٹا راستہ مُوغان-و-اردبیل-و-سلطانیہ اختیار نہ کیا ۔ یہ بھی یاد رھے کہ تاج الدین علی شاہ (وزیر از ۷۱۱ھ - ۱۳۱۲ء) نے تبریز ھی میں (محلۂ مِہاد مِہین کے باھر) ایک عالیشان مسجد کی تعمیر شروع کر دی تھی۔

۷۱۷ھ (۱۳۱۷ء) میں ابوسعید کا زمانہ تھا کہ وزیر رشیدالدین سبکدوش ھو کر تبریز واپس آیا اور اگلے سال تبریز سے نکلا تو اس کو موت نے آ لیا ۔ اس کے املاك و جائداد کو ضبط کر لیا گیا اور رَبع رشیدی کو لوٹ لیا گیا (براؤن، ۳ : ۱۷) ۔ اس کے بیٹے غیاث الدین نے، جسے ابوسعید نے خود قلمدان وزارت سپرد کیا، ربع رشیدی کی توسیع جاری رکھی، البتہ پاے تخت سلطانیہ ھی رھا ۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ھے کہ ابوسعید گنبد سلطانیہ ھی میں دفن ھوا، جو اس کے حکم سے تعمیر ھوا تھا ۔ (ڈوسان، ۴ : ۷۲۰)۔

جب ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) میں اس کے جانشین اَرپہ کو تَغَتو (صواب بجاے بغتو) کی جنگ میں شکست ھوئی تو علی پادشاہ اویرات O.rat فاتح کے ھاتھوں ارپہ کا وزیر غیاث الدین قتل ھوا ۔ رشیدالدین کے گھرانے کا مال و متاع اھل تبریز نے لوٹ لیا ۔ اس موقع پر بیش بہا نوادر اور قیمتی کتابیں غائب ھو گئیں۔

جلائر اور چوپانی : ان ھنگاموں کی وجہ سے جو فوضویت ('انارکی') پھیلی تو جلائر (ایلخانی) خاندان، جس کی قسمت کا تعلق تبریز سے بہت گہرا تھا، عروج پذیر ھوا ۔ ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) میں حسن بزرگ جلائر نے اپنے نامزد امیدوار سلطان محمد کو تبریز کے تخت پر بٹھایا ۔ اگرچہ یہ واقعہ محض عارضی حیثیت رکھتا تھا، لیکن پرانے پاے تخت کی اولیت کی بحالی اس سے ضرور نمایاں ھوتی ھے ۔ حسن کوچک چوپانی اپنے نامزد امیدواروں کے ساتھ بہت جلد موقع پر آپہنچا ۔ حسن بزرگ بغداد چلا گیا اور حسن کُوچک ۷۴۰ھ (۱۳۴۰ء) نے سلیمان خان کو تخت پر بٹھا دیا اور عراق عجم، آذربایجان، اَرّان، مُوغان اور گرجستان پر اس کی حکومت قائم ھو گئی ۔ حسن کوچک کے جانشین اس کے بھائی اشرف نے ۷۴۴ھ (۱۳۴۴ء) میں ایک جدید نمائشی بادشاہ انوشیروان کی سلطنت کا اعلان کر کے اسے تو سلطانیہ میں بٹھا دیا، خود تبریز میں حقیقی حکمران کی حیثیت سے مقیم رھا اور فارس تک اپنی سلطنت کو وسعت بھی دی ۔ اس کی تحمیلات (گوناگون بار) اور ظلم و ستم کے خلاف جانی بیگ

خان تاتاریوں کے اردوے اَزرق یا نیلے لشکر Blue Horde (قپچاق شرق) کے سردار نے ''انسانیت کے نام پر دخل اندازی'' کی ۔ اشرف کو خُوَیّ اور مَرَنْد میں شکست ہوئی اور اس کا سر تبریز کی ایک مسجد کے دروازے پر لٹکوایا گیا (۷۵۶ھ / ۱۳۵۵ء) ۔ وزیر اخی جُوق کو جانی بیگ آذربایجان میں چھوڑ آیا تھا، اس نے محسوس کیا کہ اس کا اختیار و اقتدار کئی طرف سے خطرے میں ہے ۔ اویس بن حسن بزرگ جلائری نے، جو بغداد سے آیا تھا، تبریز پر عارضی قبضہ کر لیا ۔ اخی جوق اسے وہاں سے بھگا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ فارس کا مبارز الدین محمد مظفری، جس سے جانی بیگ نے تقاضا کیا تھا کہ اس کی سیادت قبول کر لے، ناراض ہو کر شیراز سے آیا اور اخی جوق کو میانہ کے مقام پر شکست دے کر تبریز پر قابض ہو گیا (۷۵۸ھ / ۱۳۵۷ء) ۔ دو سال بعد اسے اویس نے مار بھگایا (قب تاریخ گزیدہ، طبع وقفیۂ گب، ص ۶۷۷ تا ۶۷۹، ۷۱۵ تا ۷۱۷) اور بعد میں جلد ہی تبریز پر قبضہ کر کے اخی جوق کو قتل کر ڈالا۔

سلطان اُوَیس کی وفات (۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء) کی خبر فارس میں پہنچی تو شاہ شجاع، جو مبارزالدین کا جانشین تھا، شیراز سے تبریز کی طرف بڑھا، تاکہ اس پر قبضہ کر لے ۔ چنانچہ حسین بن اویس کو شکست دے کر تبریز پر قابض ہو گیا، لیکن اس کے چند ماہ بعد ہی اُوجان میں بغاوت ہوگئی اور شجاع کو مجبوراً شہر خالی کرکے وہاں سے ہٹ جانا پڑا ۔ حسین بغیر خون بہائے دوبارہ شہر پر قابض ہو گیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطانیہ شمال مغرب میں خاندان مظفر کی سلطنت کی انتہائی حد تھا ۔ (تاریخ گزیدہ، ص ۷۲۳ تا ۷۲۵)؛ ۷۸۴ھ (۱۳۸۲ء) میں حسین جلائر تبریز میں قتل ہو گیا اور اس کا بھائی سلطان احمد آذربایجان میں بادشاہ بنا، لیکن اس کا دور حکومت مختصر ہی تھا، کیونکہ اس واقعے کے تھوڑے ہی عرصے بعد یہاں تیمور آ دھمکا۔

خاندان جلائر کے غیرمسلسل عہد حکومت اور انقلابات کے باوجود انہیں اہل تبریز کی ہمدردی ہمیشہ حاصل رہی ۔ شیروان شاہ اور رؤسائے قرہ قویونلو اس خاندان کے حقوق کو صراحۃً تو نہیں مگر ضمنی طور پر تسلیم کرتے رہے ۔ تبریز میں ان کے عہد کی عمارات میں سے ایک تو وہ مقبرہ ہے، جسے دِمِشْقِیّہ کہتے ہیں ۔ ایک عمارت سلطان اویس کے وقت کی ہے ۔ بقول کلاویخو (Clavijo)، (طبع Sreznewski، ص ۱۶۹)، اس عمارت میں بیس ہزار کمرے تھے ("camaras apartadas è apartamientos") اور اسے دولت خانہ کہا کرتے تھے ("Tolbatgana ...... la casa de la ventura") ؛ قب Markow: *Katalog Djalair. monet*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء، ص i تا xliv: history of the Djalā'irs — سالہائے ذیل میں جو سکّے جلائروں نے تبریز میں مضروب کرائے ان سے ہم واقف ہیں: حسن بزرگ — ۷۵۷ھ، اویس — ۷۶۲ھ سے ۷۶۶ھ تک تمام سال و ۷۶۹ء و ۷۷۰ء، حسین — ۷۷۵ھ سے ۷۸۱ھ تک کے تمام سال، احمد — ۷۸۰ و ۸۱۰۔

دور تیمور: ۷۸۶ھ میں جب تیمور نے ایران پر پہلی دفعہ حملہ کیا تو سلطانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ سمرقند واپس چلا گیا ۔ اس کے حریف کبیر توقتمیش خان نے، جو آلتون اُردو سے تعلق رکھتا تھا، فوراً ہی، یعنی ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں ایک مہم دربند کی راہ سے آذربایجان کے خلاف بھیجی ۔ حملہ آوروں نے تبریز پر قبضہ کر لیا، کیونکہ امیر ولی (سابق شاہ جرجان [قب تغا تیمور] جسے تیمور نے وہاں سے نکال دیا تھا)

اور خانِ خلخال نے شہر کے دفاع کا انتظام اچھا نہ کیا تھا ۔ حملہ آوروں نے باشندوں کو لوٹ لیا اور بہت سوں کو (جن میں کمال خجندی شاعر بھی تھا قیدی بنا کر) دربند کی طرف لوٹ گئے (ظفر نامہ ۱ : ۳۹۲؛ براؤن: *Hist. Persian Literature*، ۳ : ۳۲۱) ۔
سلطان احمد جلائر تبریز پر قابض ہوا ہی تھا کہ اسے تیمور نے ۷۸۸ھ میں پھر نکال دیا ۔ اس دفعہ تیمور مسلمانوں کی حفاظت کرنے کے بہانے سے دوبارہ آیا تھا ۔ تیمور نے شام غازان میں ڈیرے ڈال دیے اور تبریز کے باشندوں پر ایک تاوان (''مالِ امان'') لگا دیا؛ قب ظفر نامہ، ۱ : ۳۹۸؛ العینی نے تیمور پر زیادہ سختی سے لے دے کی ہے؛ قب مارکوف (Markov) : *Catalogue*، ص xxvii ۔
۷۹۰ھ (۱۳۹۲ء) میں ''الوس ہلاگو'' (''تخت ہولاگو'') کی ایالت، جس میں آذربایجان، الرّے، گیلان، شیروان، دربند، اور ایشیائے کوچک کے ممالک شامل تھے، میران شاہ کو تفویض ہوئی (کتاب مذکور، ۲ : ۶۲۳ [قب ظفر نامہ، ۱ : ۷۸۳ ''از دربند باکو تا بغداد و از ہمدان تا روم'' نیز قب ج ۱ : ص ۶۲۳ ۔ ادارہ] اور تبریز اس علاقے کا پایۂ تخت قرار پایا ۔ تین سال کے بعد اس شہزادے کو خلل دماغ کا عارضہ ہو گیا اور اس نے بہت سی دیوانگی کی باتیں کیں (بے گناہوں کا قتل، عمارتوں کی تباہی، کتاب مذکور، ۲ : ۲۰۰ و ۲۱۳ اور براؤن : کتاب مذکور، ۳ : ۷)؛ ہندوستان سے واپس آتے ہی تیمور ۸۰۲ھ میں آذربایجان کی طرف روانہ ہوا اور جن لوگوں نے میران شاہ کے فسق و فجور میں حصہ لیا تھا، ان سب کو قتل کروا دیا ۔
۸۰۶ھ میں میران شاہ کے لڑکے مرزا عمر کو ''تخت ہلاگو'' کی ایالت سپرد کی گئی اور مغرب میں جو علاقہ تیمور نے فتح کیا تھا وہ بھی انھیں ممالک میں شامل کر دیا گیا ۔ میران شاہ کو (جو آران میں تھا) اور اس کے بھائی ابوبکر کو (جو عراق میں تھا) مرزا عمر بن میران شاہ کے تابع کر دیا گیا ۔ تیمور کی وفات کے بعد عمر اور ابوبکر کے درمیان طویل جنگ چھڑ گئی ۔ ۸۰۸ھ میں ابوبکر تبریز سے دو سو عراق تومان کا پیشکش وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ عمر تبریز میں واپس آ گیا، لیکن اس کے ترکمانوں نے لوگوں کو بے حد تنگ کیا اور ابوبکر نے تبریز پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔ وہ شہر چھوڑ کر گیا ہی تھا کہ ترکمان باغی، بسطام جاگیر، شہر میں آ گھسا، لیکن شیخ ابراھیم والیِ شیروان [رک بآن] کے پہنچ جانے پر وہ بہت جلد پسپا ہو گیا ۔ ۸۰۹ھ میں شیخ ابراہیم نے سلطان احمد جلائر کو تبریز کا حقیقی بادشاہ سمجھتے ہوئے یہ علاقہ اسے دے دیا ۔ اس موقع پر لوگوں نے بڑی خوشیاں منائیں ۔ قب مطلع سعدین، ترجمہ قاترمیر *N.E.*، ۱۴ : ۱۰۹ [مطلع طبع لاھور، ص ۱۲ ببعد ۔ ادارہ] ۔ ۸ ربیع الاول کو ابوبکر پھر شام غازان میں آ موجود ہوا، لیکن اسے شہر میں جانے کی ہمت نہ ہوئی، کیونکہ وہاں طاعون زوروں پر تھا ۔
آخری واقعات سے کچھ عرصہ پہلے ہنری سوم والی قشتالہ (Castile) کا سفیر کلاویخو بھی کچھ عرصے (۱۱ تا ۲۰ جون ۱۴۰۴ء اور چند وقفوں کے ساتھ ۲۸ فروری تا ۲۲ اگست ۱۴۰۵ء یعنی ۸۰۶ھ کے اختتام سے ۸۰۸ھ کے شروع تک) تبریز میں رہا ۔ اگرچہ تبریز طرح طرح کی مصیبتوں میں سے گذر چکا تھا، تاہم شہر میں بڑی رونق تھی اور تجارت کا کاروبار خاصا تھا ۔ کلاویخو تبریز کے بازاروں، منڈیوں اور عمارتوں کی تعریف کرتا ہے ۔
قرہ قوینلو : یکم جمادی الاولی ۸۰۹ھ کو قرہ یوسف، ترکمان قرہ قوینلو، نے رود ارس پر ابوبکر کو شکست فاش دی، جس نے اپنی پسپائی میں تبریز کو خوب لوٹا اور اس کے لشکریوں کی

لوٹ مار سے کوئی چیز، کیا مال، کیا جان، محفوظ نہ رہ سکی، قب مطلع السعدین، ص ۱۱۰ [وهی کتاب، طبع لاهور، ص ۹۴]۔ قرہ یوسف سلطانیہ تک بڑھا اور اس شہر کی آبادی کو تبریز، اردبیل اور مراغہ لے گیا۔ ابوبکر جلد هی آذربایجان میں واپس چلا آیا، لیکن قرہ یوسف نے بسطام کی مدد سے اسے سرد رود کے مقام پر (جو تبریز سے پانچ میل جنوب میں ھے) شکست دی۔ اس لڑائی میں میران شاہ مارا گیا اور تبریز هی میں سرخاب کے قبرستان میں دفن ھوا [مطلع (سمرقندی)، طبع لاهور، ص ۱۱۲ تا ۱۱۶۔ ادارہ]۔

از سر نو تقسیم مملکت کے بارے میں قرہ یوسف کو وہ تمام قراردادیں یاد تھیں جو اس نے سلطان احمد سے اس وقت کی تھیں، جب وہ دونوں مصر میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رھے تھے، اس لیے اس نے حکمت عملی سے کام لیا اور اپنے بیٹے پیر بداغ کو، جو سلطان احمد کا لے پالک بیٹا سمجھا جاتا تھا، بڑی دھوم دھام سے تبریز کے تخت پر بٹھا دیا (مطلع (سمرقندی)[۲ : ۱ : ۲۱۴] کے مطابق قرہ یوسف نے ۸۱۴ھ تک پیر بداغ کو ''خان'' کا خطاب نہیں دیا)۔ احمد نے ظاهری طور پر تو گویا اس بندوبست کو قبول کر لیا، لیکن جب قرہ یوسف ارمینیہ میں گیا ھوا تھا، اس نے تبریز پر قبضہ کر لیا۔ اسد (؟) کی لڑائی میں جو تبریز سے دو فرسخ پر ھے [بتصریح مطلع (سمرقندی)، ۱ : ۱۹۵۔ ادارہ] سلطان احمد کو قطعی شکست ھوئی (۲۸ ربیع الآخر ۸۱۳ھ/ ۱۴۱۰ء)۔ اسے قرہ یوسف نے قتل کیا اور وہ دمشقیہ میں ماں اور بھائی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اس موقع پر بھی لوگوں کی ھمدردی جلائر کے آخری بادشاہ هی کے ساتھ تھی۔ قب (ایوار (Huart): *La fin de la dynastie des Ilkhaniens*, در *Journ. As.* اکتوبر ۱۸۷۶ء ص ۳۱۶—۳۶۲۔

تبریز وہ مرکزی مقام تھا جہاں سے قرہ یوسف اپنی مہمیں بھیجا کرتا تھا۔ اور اس حیثیت سے اسکا ذکر باقاعدہ آ رہا ھے۔ ۸۱۷ھ میں سلطان شاہ رخ بن تیمور نے قرہ یوسف کے بڑھتے ھوے اقتدار سے خائف ھوکر اس کے خلاف پہلی مرتبہ فوج کشی کی، لیکن رے سے آگے نہ بڑھا [مطلع (سمرقندی)، ۲ : ۱ : ۲۴۷ و ۲۶۴۔ ادارہ]؛ (قاتر میر: ص ۲۳۸ و ۲۵۰)۔ ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں وہ یورش آذربایجان کے ارادے سے دوبارہ ایک مہم ترتیب دے کر روبراہ تھا کہ اسے قرہ یوسف کی موت کی اطلاع پہنچی (بتاریخ ۷ ذی قعد ۸۲۳ھ/۱۲ نومبر ۱۴۲۰ء)۔ ترکمانوں کے لشکر میں فوضویت پھیل گئی اور ایک هفتے بعد مرزا بایسنغر نے تبریز پر قبضہ کر لیا [مطلع (سمرقندی) ۲ : ۱ : ۳۱۴۔ ادارہ]، قب پرائس (Price): *Chronological Retrospect of the Events of Mahom. History*، لندن ۱۸۲۱ء، ۳ : ۵۰۱ بحوالۂ روضة الصفاء و خلاصة الأخبار۔ شاہ رخ، قرہ یوسف کے بیٹوں کو ارمینیہ میں شکست دینے کے بعد، ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) کے موسم گرما میں تبریز پہنچا۔ ۸۳۲ھ میں قرہ یوسف کے بیٹے اسکندر نے سلطانیہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہ رخ پھر لاؤ لشکر کے ساتھ شام غازان میں آ دھمکا اور تراکمۂ قرہ قوینلو کو سلماس کے مقام پر شکست دی۔ ۸۳۳ھ کے موسم سرما میں ولایت آذربایجان ابوسعید بن قرہ یوسف کو دے دی گئی، جو شاہ رخ کے دربار میں اطاعت قبول کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ اس کے اگلے هی سال اس کے بھائی سکندر نے اسے مار ڈالا [مطلع (سمرقندی)، طبع لاهور، ۲ : ۶۴۰۔ ادارہ]۔ ۸۳۸ھ (۱۴۳۴ء) کے موسم سرما میں شاہ رخ تیسری مرتبہ آذربایجان میں آیا۔ اسکندر نے مصلحت اس میں سمجھی کہ اس کے سامنے سے ھٹ جائے، لیکن اس کا بھائی جہان شاہ، شاہ رخ سے آ ملا۔ شاہ رخ نے ۸۳۸ھ کا موسم

کرما تبریز میں گذارا اور ۸۳۹ھ (۱۴۳۶ء) کی سردیوں کے شروع ہوتے ہی جہان شاہ کو اختیارات شاہی دے دیے [مطلع (سمرقندی)، طبع لاہور، ۲ : ۶۷۵ و ۶۸۳ و ۶۹۰-اداره]۔

یه تھا آغاز ایک ایسے شہزادے کے دور حکومت کا، جس نے تبریز کو ایک ایسی وسیع سلطنت کا پایۂ تخت بنایا، جس کی وسعت ایشیاے کوچک سے خلیج فارس اور ہرات تک جا پہنچی۔ تبریز کی سب سے شاندار عمارت ''نیلی مسجد (گوك مسجد Gök-masdjid)'' جہان شاہ ہی کا کارنامہ ہے (Berezin کے نزدیک یه کارنامه جہان شاہ کی ملکه بیگم خاتون کا ہے)۔ یه ممکن ہے که تبریز میں سرخاب اور چرنداب کے محلّوں میں فرقۂ اہلِ حق (قبّ سلطان اسحٰق) کی موجودگی جہان شاہ کے عہد ہی سے شروع ہوئی ہو، جن کے فاسد عقیدوں کے بارے میں قبّ منجّم باشی : ۳ : ۱۵۴۔

آق قوینلو: ۱۲ ربیع الثانی ۸۷۲ھ (۱۰ نومبر ۱۴۶۷ء) کو اوزن حسن بایندری نے، جو آق قوینلو ترکمان قبیلے کا سردار تھا، جہان شاہ پر آرمینیه میں اچانک حمله کیا اور [اس کے ایک لشکری نے] جہان شاہ کو قتل کر دیا [مطلع (سمرقندی)، طبع لاہور ۲ : ۱۳۱۰]۔ اسکندر کی دو بیٹیوں نے اپنے درویش بھائی حسین علی کی بادشاہی کا اعلان تبریز میں کر دیا، لیکن بیگم خاتون، بیوۂ جہان شاہ، نے اس تدبیر کو چلنے نه دیا، تاہم جہان شاہ کے مجذوب بیٹے حسین علی نے (جو دوسری بیوی سے تھا) تبریز پر قبضه کر لیا اور بیگم خاتون اور اس کے رشته داروں کو قتل کرا دیا (منجم باشی)۔

ابو سعید تیموری کی مدد کے باوجود حسن علی کو مرند میں شکست ہوئی [حسین علی بجاے حسن علی در مطلع (سمرقندی)، ۲ : ۱۳۳۱؛ اسی جلد میں ص ۱۳۱۹ پر اسے ''اکبر و ارشد اولاد مرزا جہانشاہ'' کہا ہے - اداره] اور بعد کے واقعات میں خود ابو سعید کی موت تک نوبت پہنچی۔ ۸۷۳ھ (۱۴۶۸ء) میں اوزن حسن نے تبریز پر قبضه کر کے اسے اپنا دارالسطنت بنایا۔ (اس نے اپنے اس فیصلے کی اطلاع عثمانی سلطان کو ایک خط کے ذریعے دی۔ فریدون بک : منشئات)۔

اوزن حسن کے دور حکومت کے بیان کے لیے وینس کے مآخذ بہت مفید ہیں [وینس کا پہلا قونسل (Consul)، جو ۱۴۶۳ء میں تبریز میں آیا، مارکو ڈا مولینو (Marco da Molino) تھا]۔ گیوسفا باربرو (Giosafa Barbaro) کو جمہوریۂ وینس نے ۱۴۷۴ء میں بھیجا تھا - وہ لکھتا ہے که تبریز میں خوب چهل پہل اور رونق ہے - یہاں تمام ملکوں سے سفراء آتے ہیں۔ باربرو کو عظیم الشان محل کے ایوان میں بلایا گیا، جسے وہ اہتستی (ہفت + ؟) کہتا ہے۔ وینس کا وہ گمنام سوداگر، جو تبریز میں اتنے مؤخر زمانے، یعنی ۱۵۱۴ء (؟) میں آیا تھا، اس وقت بھی اوزن حسن کے عہد کے تزك و احتشام کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے که ''اس کا ثانی آج تک ایران میں پیدا نہیں ہوا''۔ اوزن حسن ۸۸۲ھ (۱۴۷۸ء) میں فوت ہوا اور مدرسۂ نصریّه میں، جو اس نے تعمیر کرایا تھا، دفن ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یعقوب بھی اسی جگه دفن کیا گیا۔ یعقوب نے اپنے عہد حکومت میں، جس کی مدت بارہ برس (۸۸۳ھ تا ۸۹۶ھ) تھی اور جو نسبةً پر امن زمانه تھا، بہت سے ادیبوں کو اپنے دربار میں جمع کر لیا تھا (کُرد مؤرخ ادریس اس کا دبیر تھا) - ۸۸۸ھ میں اس نے باغ صاحب آباد میں وہ محل، جو ہشت بہشت کے نام سے موسوم ہے، تعمیر کرایا - (قبّ تاریخ یعقوب از فضل اللّٰه روز بہان؛ کتاب خانۂ ملّیه فرانس کا منحصر بفرد قلمی نسخه Bibl. Nat. de Paris،

ancient fonds pers., 101، ورق ۱۰۰ راست - وینس کے سوداگر مذکور نے بھی اس محل (ہشت بہشت، Astibiste) کا حال بیان کیا ہے - محل کے بڑے ہال کی چھت پر ایران کی تمام بڑی بڑی لڑائیوں اور سفارتوں وغیرہ کی تصویریں منقش تھیں - ہشت بہشت کے متصل ایک حرم بھی تھا، جس میں ایک ہزار عورتوں کے لیے سکونت کی جگہ تھی، نیز ایک وسیع میدان، مسجد اور شفاخانہ بھی تھا، جس میں ایک ہزار مریض رہ سکتے تھے (نیز قب اولیاء، ۲ : ۲۳۹)۔

عہد صفویہ اور ترکی ایرانی جنگیں: اسمعیل اول نے ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) میں شرور کے میدان میں مرزا الوند آق قوینلو پر فتح پائی اور تبریز پر قبضہ کر لیا - کہتے ہیں کہ شہر کی دو تین لاکھ کی آبادی میں دو تہائی کے قریب سنی تھے، لیکن صفوی بادشاہ نے لوگوں کو شیعہ بنانے میں زیادہ عرصہ نہ لگایا اور جس کسی نے چوں چرا کی، اس کے خلاف سخت گیری برتی ([قب] عالم آرا، ص ۳۱) - آق قوینلو سے اسمعیل کو اس قدر نفرت تھی کہ اس نے اپنے پیشروؤں کی ہڈیاں نکلوا کر جلوا دیں (تاریخ نگار یعقوب، ورق ۲۰۶ چپ؛ G.M. Angiolello) - وینس کا سوداگر مذکور اس مایوسی اور حرمان نصیبی کا ذکر کرتا ہے، جو کئی امیر اور شریف خاندانوں کو نوجوان شہزادے کی عیاشی اور اوباشی کی وجہ سے پیش آئی - جب اسمعیل الوند کے تعاقب میں ارزنجان کی طرف روانہ ہوا، تو الوند تبریز واپس آنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے مختصر سے قیام میں ''اس نے رعایا اور متمولین پر دست تعدی دراز کیا''۔ (عالم آرا، ص ۳۱)۔

جنگ چالدران (۲ رجب ۹۲۰ھ/ ۲۳ اگست ۱۵۱۴ء) کی وجہ سے عثمانیوں کے لیے تبریز کا راستہ کھل گیا اور اس لڑائی کے نو دن بعد ہی دوگین اوغلو وزیر اور دفتر دار پیری نے شہر پر قبضہ کر لیا اور ۶ ستمبر کو سلطان سلیم فاتحانہ انداز سے [''بجہت افتخار و مباہات''۔ عالم آرا، ص ۳۲ - ادارہ] اس شہر میں داخل ہوا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد ترکوں نے نرمی سے کام لیا (براؤن: Pers. Lit. in Modern Times، ص ۷۷)؛ البتہ انھوں نے ان خزانوں پر قبضہ کر لیا جنھیں ایرانی بادشاہوں نے جمع کر رکھا تھا - اس کے علاوہ ایک ہزار ماہر کاریگر بھی اپنے ساتھ قسطنطنیہ کو لے گیے - سلطان تبریز میں ہفتہ بھر ہی ٹھیرا، کیونکہ اسے اپنے علاقے میں جلد واپس جانا پڑا، اس لیے کہ جان نثاروں نے مہم جاری رکھنے سے انکار کر دیا تھا (ہامر v. Hammer: G.O.R، طبع دوم، ۱ : ۷۲۰)۔

۱۵۱۴ء کے واقعات کی وجہ سے ایرانی بہت کچھ متنبہ ہوگئے اور طہماسپ اول نے اپنا پایۂ تخت اور زیادہ مشرق کی طرف قزوین میں تبدیل کر لیا - سفیر وینس الیسانڈری (Alessandri) کی رائے ہے کہ طہماسپ اپنے لالچ کی وجہ سے آق قوینلو کے پرانے پایۂ تخت میں ہردلعزیز نہ تھا۔

اُلامۂ غدار (جو تکّہ ترکمانوں میں سے تھا) کی تحریک پر سلطان سلیمان اول کی افواج نے وزیر اعظم ابراہیم پاشا کے ماتحت ۹۴۱ھ (۱۳ جولائی ۱۵۳۴ء) میں تبریز پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد ییلاق (گرم سیر) اسد آباد (سعید آباد ؟) کو روانہ ہوا - ابراہیم پاشا نے شام غازان میں قلعہ بنوانا شروع کیا - اُلامہ کو آذربایجان کا والی مقرر کیا گیا - طہماسپ کے زمانے میں بھی وہ اس عہدے پر فائز تھا - ۲۷ ستمبر کو سلطان سلیمان بہ نفس نفیس تبریز میں وارد ہوا - تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے سلطانیہ تک یلغار کی اور بغداد پر قبضہ کر لیا - تبریز واپس آنے پر وہ چودہ روز تک علاقے کے نظم و نسق میں مصروف رہا - سردی کی شدت کے

باعث ترک واپس چلے جانے پر مجبور ہو گئے اور
ایرانی افواج فوراً وان تک بڑھ آئیں ۔ ۹۵۵ھ
(۲۸ جولائی ۱۵۴۸ء) میں طہماسپ کے بھائی
القاص مرزا کی انگیخت پر سلیمان نے تبریز پر دوبارہ
قبضہ کر لیا، لیکن یہاں وہ صرف پانچ ہی روز تک
ٹھہرا ۔ ایرانیوں کی چال یہ تھی کہ حملہ آور کا سامان
زیست تمام تباہ کر دیا جائے ۔ اس طرح قحط کی وجہ سے
ترک پھر ایک دفعہ واپس جانے پر مجبور ہو گئے ۔
ہفت اقلیم میں ہے کہ سلیمان نے اپنے سپاہیوں کا
یہ حق کہ وہ تین روز تک مفتوحہ شہر کو لوٹ
سکتے ہیں، خرید لیا تھا ۔ اس کے باوجود شہری لوگ
ترکوں کو خفیہ خفیہ قتل کرتے رہے ۔ سلیمان نے
القاص مرزا کا یہ مشورہ نہ مانا کہ سب شہریوں
کا قتل عام ہو یا ان کو قیدی بنا لیا جائے ۔ ڈارامون
(M. d'Aramon) شہنشاہ فرانسس اول کا سفیر تبریز
پر قبضہ ہونے کے وقت موجود تھا اور چشم دید
حالات کی بناء پر وہ اس بات کی تصدیق کرتا
ہے کہ سلطان نے شہر کی حفاظت کے لیے
کوشش کی (*Voyage*، ص۸۳) ۔ ۹۶۲ھ (۲۹ مئی
۱۵۵۵ء) میں آماسیہ کے مقام پر ترکیہ اور ایران کے
درمیان پہلا عہد نامۂ صلح ہوا ۔ یہ صلح کوئی
تیس برس تک قائم رہی (ہامر، ۲ : ۱۱۲
و ۱۲۰ و ۲۶۹؛ عالم آرا، ص۴۹ تا ۵۹) ۔

۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں مراد ثالث کا وزیر اعظم
اوزدمیر زادہ Özdemirzāde عثمان پاشا چالیس ہزار
فوج کے ساتھ تبریز پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے متعہد
ہوا ۔ وان کا حاکم چغالہ‌زادہ [سنان پاشا] چھے ہزار
سپاہی لے کر اس کے ساتھ شامل ہو گیا ۔ چالدران اور
صوفیان (Ṣofiyān) کے راستے سے ترک شام غازان کے
سامنے آ دھمکے ۔ ایرانی حاکم علی قلی خان دلیرانہ
حملے کے بعد، جس میں چغالہ زادہ کے تین ہزار آدمی
کام آئے، رات کے وقت بھاگ گیا ۔ ماہ ستمبر میں
ترکوں نے شہر پر قبضہ کر لیا ۔ متعدد سپاہیوں کے
قتل کی پاداش میں ترکوں نے شہر کو لوٹ لیا
اور متواتر تین روز تک باشندوں کا قتل عام ہوتا رہا ۔
ایرانی وزیر اعظم حمزہ میرزا نے، جو شہر کے گردا
گرد حربی نقل و حرکت میں مصروف تھا، کئی دفعہ
ترکوں کو شدید نقصان پہنچایا ۔ تبریز کی حفاظت کے
لیے عثمان پاشازادہ نے مربع شکل کا ایک قلعہ بنایا
تھا، جس کی دیواریں ۱۲,۷۰۰ ذرع (اولیاء [۲ :
۲۴۷ ۔ ادارہ]، معمار مکّی آرشونی) لمبی تھیں ۔ یہ قلعہ، جو
چھتیس روز میں تیار ہوا تھا، شہر کے اندر تھا
(عالم آرا، ص ۲۲۶ : "دولت خانۂ تبریز کے محل
کو قلعے کے لیے مناسب پایا"؛ اولیاء : "خیابان شاہ
کے اطراف میں") ۔ اس میں ۵۴ ہزار قلعہ گیر فوج
رہتی تھی ۔ جعفر پاشا خواجہ سرا تبریز کا گورنر مقرر
ہوا ۔ ۲۹ اکتوبر ۱۵۸۵ء کو عثمان پاشا مر گیا ۔
چغالہ‌زادہ، جسے اس نے اپنے بستر مرگ پر افواج
عثمانیہ کا سپہ سالار مقرر کیا تھا، ایرانیوں کو
شکست دینے میں کامیاب تو ہو گیا، لیکن ایرانی بہت
جلد اس قابل ہو گئے کہ ترکوں کو شہر
میں محصور کر لیں ۔ اڑتالیس معرکے ہوے، تب
کہیں جا کر فرہاد پاشا نے محصورین کی مکمل
خلاصی کرائی (ہامر، ۲ : ۳۵۴) ۔ ۹۹۸ھ
(۱۵۹۰ء) کی تباہ کن صلح کی رو سے شاہ
عباس کو ماوراے قفقاز اور مغربی ایران
کے تمام مفتوحہ علاقے ترکوں کے حوالے کرنا
پڑے ۔ اس وقت سے ترکوں نے اپنے قبضۂ تبریز کو
بجد ہو کر مناسب اہمیت دینا شروع کی ۔ تبریز اور
نواح میں ان کی کئی تعمیر کردہ عمارتوں کا، خاص
کر جو جعفر پاشا نے بنوائی تھیں، اولیاء نے ذکر
کیا ہے، لیکن ایرانی اپنے پرانے پاے تخت پر باز کی
سی نگاہیں جمائے بیٹھے تھے ۔

۱۶۰۳ء کے شروع میں 'سپاہیوں' نے جو

فتنہ بر پا کیا اس میں سلطان محمد ثالث کی کمزوری پائی جاتی تھی ۔ موسم خزان میں شاہ عباس اچانک اصفہان سے روانہ ہو کر بارہ روز کے بعد تبریز میں داخل ہوا ۔ علی پاشا کو حاجی حرامی کے مقام پر (جو شہر سے دو فرسخ پر ہے) شکست ہوئی اور اس کے بعد قلعے کی فوج نے بھی ہتھیار ڈال دیے ۔ شاہ عباس شکست خوردہ حریف سے مہربانی سے پیش آیا (قب تِکتَنڈر (Tectander) کا بیان؛ یہ شخص اس وقت تبریز میں موجود تھا)، لیکن مذہبی جوش کی وجہ سے باشندگان شہر نے شہر اور نواح شہر میں ترکوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کر دیا اور جو قرابت سببی اور دوستانہ تعلقات اس بیس سال کے عرصے میں، یعنی عہد عثمانیہ میں پیدا ہو چکے تھے، ان کا کچھ پاس نہ کیا ۔ عباس اول نے لوگوں کو بلا کر اشارہ کر دیا کہ عثمانی عہد حکومت کے تمام آثار معدوم کر دیے جائیں ۔ چنانچہ چند ہی روز میں انہوں نے نہ تو قلعے کا کوئی نشان باقی چھوڑا اور نہ [ان کے] خانہ و خانات، ابنیہ و عمارات، دکانوں، حماموں وغیرہ کا کوئی پتا رہا ۔ (عالم آرا، ص ۴۴۴ و ۴۵۱)۔

۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) میں کمزور سلطان احمد ثالث کے زمانے میں ترکوں نے پھر حملہ کرنے کی کوشش کی ۔ وزیر اعظم مراد پاشا لشکر لے کر تبریز کے سامنے ناگہاں آ نمودار ہوا، لیکن عباس اول کو تیاری کرنے کا موقع مل چکا تھا ۔ شہر کا دفاع حاکم شہر پیر بوداق خان کے سپرد تھا ۔ شاہ نے سرخاب کے شمال میں اپنے مورچے قائم کر لیے ۔ کوئی لڑائی تو نہ ہوئی، لیکن ملک میں سے، جسے ایرانیوں نے برباد کر دیا تھا، ذخائر رسد نہ ملنے کی وجہ سے ترکوں کو سخت عسرت کا سامنا کرنا پڑا ۔ پانچ روز بعد ترکی لشکر نے پچھلے پاؤں ہٹنا شروع کر دیا اور اس اثنا میں شاہ عباس اور مراد پاشا کے درمیان سفیر آتے جاتے رہے ۔ اس ترکی حملے کی وجہ سے تبریز میں بعجلت ایک اور قلعہ تعمیر ہوا ۔ پرانے ترکی قلعے کا موقع موزوں نہ سمجھا گیا، کیونکہ وہاں مہران رود سے سیلاب کا خطرہ تھا ۔ نیا قلعہ کوہ سُرخاب کے دامن میں ربع رشیدی کے علاقے میں تعمیر ہوا ۔ قلعے کی عمارت کا مسالا (شہر کی) منہدمہ عمارتوں، خصوصاً شام غازان کے کھنڈروں سے جمع کیا گیا ۔ (عالم آرا، ص ۵۸۳ و ۶۰۱) ۔ اس کے علاوہ مراد پاشا کے ناکام حملے کی وجہ سے ۱۰۲۲ھ (۱۰۱۳-۱۶۱۴ء) میں ایک اور عہد نامہ ہوا، جس کی رو سے ایرانی سابقہ صورت حالات، جو شاہ طہماسپ اور سلطان سلیمان کے زمانے میں تھی، بحال کرانے میں کامیاب ہو گئے (عالم آرا، ص ۶۰۰ و ۶۱۱؛ فان ہامر: ۲: ۷۳۶ و ۷۵۰)، البتہ عملی حد بندی کے وقت رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔

۱۰۲۷ھ (۱۶۱۸ء) میں کریمیا کے چند تاتاری خوانین کی انگیخت پر عثمانی افواج (ساٹھ ہزار آدمی) متعینہ وان نے دفعۃً آذربایجان پر حملہ کر دیا ۔ ایرانیوں نے تبریز اور اردبیل خالی کر دیے ۔ ترکوں کی رسد ختم ہو گئی تھی، اس لیے انھوں نے تبریز سے سامان خوراک پورا کیا اور سراب کی جانب پیش قدمی کی، جہاں قرچقای خان، سپہ سالار تبریز، نے ان پر شاندار فتح حاصل کی ۔ یہاں ایک اور عہدنامہ ہوا جس میں عہدنامۂ ۱۰۲۲ء کی شرائط کی توثیق کی گئی (عالم آرا، ص ۶۵۶ تا ۶۶۱؛ فان ہامر: ۲: ۷۷۴)۔

عباس اول کے انتقال کے بعد ترکوں اور ایرانیوں کی باہمی کشمکش بہت بڑے پیمانے پر ازسرنو شروع کی گئی ۔ شاہ عباس کے جانشین شاہ صفی کے زمانے میں سلطان مراد رابع نے ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں آذربایجان پر حملہ کیا اور

۱۲ ستمبر کو تبریز میں داخل ہوا ـ اس مہم کا مقصد فتح کم، لوٹ مار زیادہ تھا ـ مراد نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ شہر کو تباہ کر دیا جائے ـ اس طرح تبریز پر کاری ضرب لگا کر (اولیاء : *eyidje örseleyip*) مراد حملے کا موسم قریب الختم ہونے کی وجہ سے وان کی جانب جلد جلد واپس کوچ کرنے لگا ـ تبریز میں وہ صرف تین دن رہا ـ آئندہ موسم بہار میں ایرانیوں نے اریوان (Eriwān) تک اپنے سارے مقبوضات واپس لے لیے اور ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) کے عہدنامے کی رو سے وہ سرحدات قائم کرائیں جو عام طور پر اب تک قائم ہیں.

حاجی خلیفہ ۱۰۴۰ھ کی مہم کا عینی شاہد ہے ـ وہ لکھتا ہے کہ مراد رابع جو تباہی اور بربادی عمل میں لایا، اس کے بعد پرانی فصیلیں تو بالکل غائب ہو گئیں، ”صرف کہیں کہیں پرانی عمارتوں کے کچھ نشان ملتے تھے“ (جہان نما، ص ۳۸۱) ـ شام غازان تک بھی اس تباہی سے نہ بچ سکا ـ صرف اوزن حسن والی مسجد سلامت رہی ـ سپاہیوں نے ثمردار درختوں کو بھی کاٹ کر پھینک دینا چاہا، لیکن وہ اس کثرت سے تھے کہ سپاہی صرف دسواں حصہ ہی تباہ کر سکے.

گو اس وقت شہر کی حالت یہ تھی، لیکن وہ سیاح، جو چند سال کے بعد وہاں گئے، بیان کرتے ہیں کہ شہر شاندار طور پر سابقہ حالت کی طرف عود کر آیا ـ اولیاء چلبی (بعہد عباس ثانی ۱۰۵۷ھ [۱۶۴۷ء]) کی دلچسپ کہانی میں تبریز کے متعلق مفصل اعداد و شمار موجود ہیں یعنی مدرسے (۴۷) مکتب (۶۰۰)، کاروان سرائیں (۲۰۰)، شرفاء کے مکانات (۱۰۷۰)، درویشوں کے تکیے (۱۶۰)، باغات (۴۷,۰۰۰) اور متعدد بارونق تفرج گاہیں ـ اسی زمانے میں ٹاورنیہ (Tavernier) لکھتا ہے کہ گو مراد رابع کے ہاتھوں شہر کو بہت نقصان پہنچا ”تاہم اب سارا شہر تقریباً از سر نو تعمیر ہو چکا ہے“ ـ بقول شاردان (Chardin) (۲ : ۳۲۸) ۱۶۷۳ء میں، جب شاہ سلیمان اول کا زمانہ تھا، تبریز کی آبادی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ تھی (یہ اعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتے ہیں ـ)، پندرہ ہزار مکان تھے اور پندرہ ہزار دکانیں ـ یہ ”واقعی ایک بہت بڑا اور اہم شہر ہے، ... تمام ضروریات زندگی کی افراط ہے اور ہر شخص تھوڑے خرچ سے بآرام یہاں رہ سکتا ہے“ ـ تبریز میں راہبان کیپوچن (Capucins) کا ایک تکیہ بھی تھا جسے حکومت مہربانی کی نظر سے دیکھا کرتی تھی ـ تبریز کے بکلر بکی کے ماتحت خوانین قارص، ارمیہ، مراغہ اور اردبیل اور ۲۰ 'سلطان' (= مقامی سردار) تھے.

صفویوں کا خاتمہ اور نادر شاہ : ایران پر افغانوں کے حملے کی وجہ سے ایران میں کامل فوضویت کا دور دورہ ہو گیا ـ ولی عہد سلطنت، طہماسپ، اصفہان سے بھاگ کر تبریز آ پہنچا، جہاں ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ء) میں اس کی شاہی کا اعلان کیا گیا ـ جب ۱۲ ستمبر ۱۷۲۳ء کے عہد نامے کی رو سے طہماسپ ثانی نے بحیرۂ خزر کے صوبے روس کے حوالے کر دیے، تو ترکیہ نے اعلان کیا کہ بطور حفظ ما تقدم اسے تبریز سے لے کر اریوان تک کے علاقے پر قبضہ کرنا پڑے گا ـ اریوان، نخچوان اور مرند فتح کرنے کے بعد ترک ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ء) کے موسم خزاں میں سر عسکر عبداللہ پاشا کوپریلی کی قیادت میں تبریز کے سامنے آ گئے ـ انھوں نے دیویچی اور سرخاب کے محلوں پر قبضہ کر لیا ـ (جہاں سلیم اول بھی ایک دفعہ خیمہ زن ہوا تھا) ـ ایرانیوں نے شام غازان میں اپنے مورچے قائم کر رکھے تھے، اس لیے وہ مقابلے پر ڈٹے رہے ـ ترکوں کو تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی، لیکن موسم سرما آ جانے کی وجہ سے انھیں

مہینے کے ختم ہونے سے پہلے ہی مراجعت کرنا پڑی۔ اگلے موسم بہار میں کوپریللی ستّر ہزار کی جمیعت همراه لے کر دوبارہ آ پہنچا ۔ محاصرہ تو صرف چار روز تک ہی رہا، لیکن سات مستحکم محلوں میں گھمسان کا رن پڑا ۔ اس میں ایرانیوں کے تیس ہزار اور ترکوں کے بیس ہزار آدمی کام آئے ۔ قلعہ گیر ایرانی فوج میں سے کوئی سات ہزار آدمی بچ گئے تھے جو بلا مزاحمت اَرْدَبیل کی طرف نکل گئے (علی حزیں، طبع بالفور (Balfour) :ص۱۰۳؛ Hanway، ۲ : ۲۲۹)۔

۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں جو عہد نامہ اشرف افغان سے ہوا، اس میں اس بات کی تصدیق کر دی گئی کہ شمال مغربی ایران میں سلطانیہ اور اَبْہر کا علاقہ ترکوں کی ملکیت ہے ۔ اس کے دو سال بعد نادر نے تبریز کے نزدیک سُہَیلان (بزبان عوام : سَولان یا سینیخ کوہری) کے مقام پر مصطفٰے پاشا کے لشکر کو شکست دی ، ۸ محرم ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) کو شہر تبریز میں داخل ہوا اور رستم پاشا حاکم هشت رو' کو قید کر لیا۔

ترکیہ کے اندرونی مصائب سے فائدہ اٹھاتے ہوے طہماسپ نے پھر حملہ کیا، لیکن قُرجان (نزد ہَمَدان) [کوریجان ؟ فرہنگ جغرافیائی ایران، ۹ : ۳۸۱] کی لڑائی میں شکست کھائی اور سر عسکر علی پاشا ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) کے موسم سرما میں تبریز واپس آ گیا ۔ یہاں اس نے ایک مسجد اور مدرسہ بھی تعمیر کرایا ۔ کچھ عرصے بعد (۱۶ جنوری ۱۷۳۲ء میں) ایک عہدنامہ ہوا، جس کے مطابق ایرانیوں نے دریاے اَرَس کا تمام شمالی علاقہ باب عالی کے سپرد کر دیا، لیکن تبریز اور مغربی صوبے اپنے پاس رکھے ۔ چونکہ تبریز علی پاشا کے قبضے میں آ چکا تھا، باب عالی کو با دل ناخواستہ ہی اس شہر کی واپسی منظور کرنا پڑی اور عہد نامے پر دستخط ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد ہی وزیر اعظم کو موتوف کر دیا گیا (فان هامر، ۴ : ۲۸۱) ۔ دوسری طرف یہ صورت ہوئی کہ ما وراى قفقاز کے صوبے ترکی کے حوالے ہو جانے کے باعث نادر کو بھی طہماسپ دوم کو معزول کر دینے کا بہانہ ہاتھ آیا نادر کو بغداد کے قریب روک کر وان کے حاکم رستم پاشا نے تبریز پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۱۷۳۴ء میں نادر تبریز کو روانہ ہوا اور ماوراے قفقاز میں فتوحات حاصل کیں، جن کے باعث ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) کے عہد نامے سے ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) کے عہد نامے کی قائم کردہ سرحدات دوبارہ قائم ہوئیں۔

دور نادری کے آخری دنوں میں پھر بدنظمی شروع ہو گئی ۔ ایک گمنام جھوٹا دعوے دارِ تخت مدعی تھا کہ وہ سام میرزا ہے ۔ اہالیان تبریز نے اس کی طرفداری کا اعلان کیا ۔ ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں نادر کی موت کی وجہ سے باب عالی کو یہ موقع مل سکتا تھا کہ وہ ایران کے معاملات میں دخل دے، خصوصاً اس لیے کہ رضا خان بن فتح خان دیوان بیگی تبریز یہ درخواست لے کر روم میں آیا کہ ترک ایک (نادری) مدعی سلطنت کو مدد دیں (فان هامر، ۴ : ۴۷۴)، لیکن ترکی حکومت پورے طور پر غیر جانبدار رہی۔

نادر شاہ نے آذربایجان کا صوبہ اپنے بہادر عمزاد امیر ارسلان کے سپرد کر دیا تھا، جس کی فوج میں تیس ہزار آدمی تھے ۔ نادر کی موت کے بعد جرنیل ارسلان نے نادر کے بھتیجے ابراہیم خان کو اُس (ابراھیم خان) کے بھائی عادل شاہ (سلطان علی شاہ) کو شکست دینے کے لیے مدد دی، لیکن اسکے فوراً بعد ابراہیم خان خود اپنے حلیف ہی پر پل پڑا اور اسے قتل کر ڈالا ۔ پھر اس نے ایک لاکھ بیس ہزار نفوس پر مشتمل فوج جمع کی اور تبریز میں چھے ماہ گذارنے کے بعد (۷ ذوالقعدۃ ۱۱۶۱ھ کو) اپنی بادشاہی کا اعلان

کر دیا۔ (تاریخ بعد نادریہ، طبع O. Mann: ص ۳۶ تا ۳۷) مگر اسے نادر کے پوتے شاہ رخ نے بہت جلد مار ڈالا۔

کریم خان زند کے خاندان کے دور حکومت میں آذربایجان کے تاریخی حالات ابھی تک بہت کم معلوم ہیں۔ پہلے تو آزاد خان افغان اس صوبے کا فرمانروا تھا۔ ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء) میں محمد حسین خان قاچار نے عنان حکومت سنبھالی۔ اگلے سال کریم خان نے ارمیہ کے فتح خان افشار کو شکست دی اور آذربایجان کا بیشتر حصہ فتح کر لیا (مالکم (Malcolm) : Hist. of Persia)۔ ۱۷۸۰ء میں زلزلے کی وجہ سے تبریز کو بہت نقصان پہنچا۔

قاچار: ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) کے آواخر میں آقا محمد، بانی خاندان قاچار، آذربایجان پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ جو حاکم اس سے ملنے آئے ان میں خُوی کا پشتینی سردار حسین خان دُنبلی بھی تھا (قب مادۂ کُرد)۔ آقا محمد نے تبریز کو اس کی جاگیر میں شامل کر دیا۔ ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶ء) میں شاہ قاچار اول کے قتل کے بعد آذربایجان میں بدنظمی پھیل گئی۔ قبیلۂ شِقاق [رکّ بآں] کے صادق خان نے صوبے پر کامل طور پر قابو پانے کی کوشش کی، اور اپنے بھائی محمد علی سلطان کو حاکم تبریز مقرر کر دیا۔ خوانین دُنبلی نے اس بغاوت کو فرو کرنے میں مستعدی سے حصہ لیا۔ اس خدمت کے بدلے میں فتح علی شاہ نے جعفر قلی خان دنبلی حاکم تبریز کو وہاں مستقل حاکم مقرر کر دیا۔ جعفر قلی خان تبریز پہنچتے ہی ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں صادق خان، جو سراب میں دوبارہ متمکن ہو چکا تھا، اور ارمیہ والے افشار خان دونوں کا حلیف بن گیا، یعنی اس رہی سہی "تابعیت" کو بھی اتار پھینکا، "جو اتنی خفیف تھی کہ حقیقت میں کامل خود مختاری ہی کا حکم رکھتی تھی" اور شاہ کے نمائندوں کو نکال دیا۔ جعفر خان کے خلاف فوجیں بھیجی گئیں جو کردوں کی حمایت سے کچھ عرصے خُوی میں اڑا رہا۔ قب H.J. Brydges : The Dynasty of the Kajars، لندن ۱۸۳۳ء، ص ۵۰ و ۸۳ وغیرہ، ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں تخت ایران کا وارث عباس میرزا تبریز میں صاحب اختیار ہو گیا۔ اس نے احمد خان مُقدّم (مَراغۂ) کو اپنا بکلر بکی بنا لیا۔ جعفر خان نے ملک روس میں جا کر پناہ لی، (قب شِکّی) لیکن پھر بھی کچھ عرصے تک دنبلی خاندان کے بعض اور لوگ تبریز میں بدستور حکومت کرتے رہے۔ ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں نجف قلی خان دنبلی نے تبریز کا قلعہ پھر سے بنایا (مرآۃ البلدان، ۱ : ۳۴۳؛ ولسن (S. Wilson) : ص ۳۲۵)، جس کے گردا گرد عباس میرزا نے ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) میں خندقیں کھدوائیں۔

۱۸۰۱ء میں صوبۂ گرجستان کے روس میں شامل ہو جانے کی وجہ سے روس اور ایران کے درمیان پیچیدگیاں بتدریج بڑھنے لگیں ور تبریز ایرانی جد و جہد کا مرکز بن گیا۔ عباس میرزا اپنی فوج کو یورپین نمونے پر تربیت دینے کے اہتمام میں مصروف ہو گیا۔ ایک اہم مشن (رسالت)، جس میں ایران کے کئی مشہور اکتشافی سیّاح (Ouseley، ۳ : ۳۹۹؛ رِٹّر، ۹ : ۸۷۶ تا ۸۸۰) بھی تھے، تبریز میں آ کر مقیم ہوا۔ انگریزی اور روسی سیاسی مشن عباس میرزا کے دربار میں آئے (روسی مشن کا سیکرٹری اور بعد میں ناظم اعلٰی مشہور مصنف Gribyoedov تھا)۔ پُر جوش اور سرگرم وارث تخت، عباس میرزا، نے اسلحہ خانے، توپیں ڈھالنے کے کارخانے، گودام اور ورکشاپ تعمیر کیے۔ تبریز کئی کڑی آزمائشوں سے گزر چکا تھا، اس لیے اس وقت کے تبریز کو شاردان کے وقت کے تبریز سے وہی نسبت تھی جو اصل کو نقل سے ہوتی ہے۔ Tancoigne

(۱۸۰۷ء) نے اس کی آبادی کا اندازہ پچاس ساٹھ ہزار کے قریب لگایا تھا، جس میں کئی ارمنی خاندان بھی شامل تھے۔ ڈوپرے (Dupré) (۱۸۰۹ء) چالیس ہزار کے قریب کا اندازہ لگاتا تھا، ارمنی خاندان اسکے نزدیک پچاس تھے - کنّائر(Kinneir) تبریزمیں (''جو بہت نکمّے شہروں میں سے ہے'') صرف تیس ہزار باشندوں کا اندازہ لگاتا ہے۔ موریر Morier، جس نے اپنے پہلے سفر میں (۱۸۰۹ء) مبالغہ آمیز طور پر مکانوں کی تعداد کا اندازہ پچاس ہزار اور آبادی کا تخمینہ دو لاکھ پچاس ہزار نفوس بتایا تھا، اپنے دوسرے سفر میں صرف اسی بیان پر اکتفا کرتا ہے کہ تبریز کی قدیمی شان کا اب عُشرِ عشیر ہی باق ہوگا اور اس میں اب کوئی قابل ذکر عمارت موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد ۱۸۲۸ء تک کا زمانہ روس اور ایران کی لڑائیوں میں ختم ہوا - ۱۸۲۷ء کی مہم میں جنرل شہزادہ اِرِسٹوف (Eristow) علاقے کے چند ناراض خوانین کی امداد سے ۳ ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ کو تین ہزار سپاھی ھمراہ لے کر تبریز میں داخل ہوا۔ عباس میرزا موجود نہ تھا اور لوگوں میں اختلاف زاے او۰ اتفاق کلمہ تھا ۔ اللہ یار خان آصف الدولہ کا خیال تھا کہ لڑائی جاری رہے، لیکن ایک با اثر مجتہد اور امام، میرزا فتّاح، کا یہ اصرار تھا کہ اطاعت کر لی جائے، چنانچہ اس نے روسیوں کے لیے شہر کے دروازے کھلوا دیے۔(صلح کے بعد میرزا فتّاح کو ایران چھوڑ کر ماورائے قفقاز میں پناہ لینا پڑی)۔ روسیوں کا سپہ سالار کونٹ پسقاویچ(Count Paskewič) اب تبریز میں آیا اور عباس میرزا سے اس کی ملاقات دہ خُرقان میں ہوئی۔ عارضی صلح کے عہدنامے پر دستخط ہو گئے، لیکن دربار طہران نے شرائط منظور نہ کیں۔ روسیوں نے دوبارہ لڑائی شروع کر دی اور اُرمیہ، مَراغہ اور اَرْدَبیل پر قبضہ کر لیا ۔ ترکمان چای (۵ شعبان ۱۲۴۳ھ - ۲۲ فروری ۱۸۲۸ء) کی صلح میں سرحد دریاے اَرَس پر قائم ہوئی اور اس طرح روسی احتلال (''اُورُوس لُوغ'' = روس کا عارضی قبضہ) ختم ہوا ۔ ان واقعات کے لیے قب آة البلدان، ۱ : ۳۰۴ تا ۳۱۰؛ Miansarov: Bibliographia caucasica، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۴ء تا ۱۸۷۶ء، ص ۷۴۳ تا ۷۴۷؛ Détails sur ce qui s'est passé à Ta···is du 24 octobre au 5 novembre 1827 در Nouv. Annales de Voyages، پیرس ۱۸۲۸ء، ۱، ۳۸، ص ۳۲۵؛ P. Zubow: Kartinî voynî s Persiyei، ۱۸۲۶ تا ۱۸۲۷ء سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۳۴ء؛ ایضاً Persidskaya voina، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۳۷ء؛ Osten-Saken: Administra-tion de l' Ādharbāidjān pendant la guerre persane de 1827-1828 (روسی زبان میں) در Russki Inwalid، ۱۸۶۱ء، شمارہ ۶۷۰۔

عباس میرزا کے وقت سے تبریز ولی عہد سلطنت ایران کی رسمی قیام گاہ رہا ہے ۔ محمد شاہ کی تخت نشینی، یعنی ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) تک انگریزی اور روسی سیاسی رسالتیں اپنا وقت اکثر تبریز میں گزارتی رہیں (فریزر: Travels in Koordistan، ۲ : ۲۴۷) ۔ جب ان رسالتوں کو طہران میں منتقل کیا گیا، تو یہ علامت اس بات کی تھی کہ خاندان قاچار نے اپنا سیاسی دارالسلطنة قطعی طور پر اس شہر میں منتقل کر دیا ہے ۔ انیسویں صدی کے اواخر تک تبریزیوں کی ز‌ ‌ ‌ ‌گی میں کوئی واقعہ، جسے عام اھمیت حاصل ہو، ظہور پذیر نہ ہوا ۔ بتاریخ ۲۷ شعبان ۱۲۸۶ھ (۸ جولائی ۱۸۵۰ء) باب [رَكّ بان] کو تبریز میں 'جَبہ خانہ' کے پھاٹک کے سامنے ہلاك کر دیا گیا [اس تصحیح کے لیے قب در ولسن: Persian Life، ص ۶۲] - ۱۸۸۰ء میں یہ سن کر کہ کرد شیخ عبیداللہ (قب شَمْدِینان) کی

سر کردگی میں تبریز پر بڑھے آ رہے ہیں، اہالیان شہر میں سخت پریشانی پیدا ہوئی۔ محلّوں میں پھاٹک بنائے گئے تا کہ ضرورت پڑنے پر محلّے ایک دوسرے سے منقطع ہو جائیں، لیکن کُرد بناب سے آگے نہ بڑھے۔

دولت قاچار کے استحکام کے ساتھ ہی ساتھ آذربایجان میں امن قائم ہو گیا اور تبریز کی حالت بھی بہتر ہو گئی۔ گو ۱۸۳۰-۱۸۳۱ء میں طاعون اور ہیضے کی وجہ سے تبریز میں ہولناک تباہی ہوئی، پھر بھی ۱۸۴۲ء کی مردم شماری میں اس میں نو ہزار خاندان یعنی ایک لاکھ یا ایک لاکھ بیس ہزار نفوس کی آبادی درج ہے (Berezin)۔ ۱۸۹۰ء میں آبادی کا اندازہ ڈیڑھ دو لاکھ کے قریب تھا، جس میں کوئی تین ہزار کے قریب ارمنی لوگ تھے (ولسن، کتاب مذکور، ص۵۳)۔ بیس برس بعد آبادی یقینی طور پر دو لاکھ سے زیادہ تھی اور اگرچہ بلدیے کا نظام ابتدائی قسم ہی کا تھا، شہر میں خوشحالی کے تمام آثار نمایاں تھے۔ تبریز کی تجارت کساد بازاری کے دور کے بعد از سر نو چمک اٹھی تھی۔ خصوصاً ۱۸۳۳ء اور ۱۸۳۶ء کے درمیان یہ تجارت خوب زوروں پر تھی، لیکن مال کی بہت زیادہ درآمد کی وجہ سے ۱۸۳۷ء میں زبردست تجارتی بحران پیدا ہوا۔ حکومت نے ماورائے قفقاز (پوتی (Poti)-باکو) کی راہ کھول دی۔ اس سے متوازی راستے طرابزون-تبریز کے درمیان قابل حساب مقابلہ پیدا ہو گیا۔ ۱۸۸۳ء میں روسیوں نے ماورائے قفقاز کے آر پار کا راستہ بند کر دیا اور اس طرح شمالی ایران کی منڈیوں میں روسی تجارت کو فروغ ہونے لگا، لیکن 'طرابزون-تبریز' کے راستے سے بھی (جو مغرب کو جانے والی ایک ہی سڑک ہے) تجارتی مال کی آمد و رفت میں اضافہ ہوا۔

بیسویں صدی: ۱۹۰۴ء سے تبریز کی تاریخ بہت پرآشوب ہے۔ وہاں کے ترکوں نے (جو ایرانیوں اور غُزّوں، مغولوں اور ترکمانوں وغیرہ کے باہمی ازدواج کا نتیجہ ہیں) اپنی خصلت کی جدّیت و تندی اور اپنے مزاج کی حدّت و شدّت کی وجہ سے ایران کی قومی اور انقلابی تحریکوں میں نہایت اہم حصہ لیا۔ ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو تبریز میں کھلی بغاوت برپا ہو گئی۔ یہ وہی دن تھا جب تہران میں ایرانی 'مجلس' پر گولے برسائے گئے تھے۔ ستّار خان، سابق دلال اسپ، محلّۂ امیرخیز کا سردار بن گیا۔ اس کا اور اس کے ساتھی باقر خان کا نام تبریز کے بہادرانہ دفاع کے ساتھ مربوط ہے۔ گو ان کی فعالیت کے تاریک پہلو بھی تھے، جو اور تو اور ای جی براؤن: *The Pers. Revolution*، ص ۲۹۱ و ۲۹۲، کی نظر سے بھی نہیں بچ سکے۔ سرکاری فوج نے شہزادۂ عین‌الدولہ کی سر کردگی میں شہر کے گرد گھیرا ڈال لیا اور فروری ۱۹۰۹ء کی ابتداء میں پوری ناکہ‌بندی کر دی۔ ۲۰ اپریل کو وزارت لندن اور وزارت سینٹ پیٹرز برگ اس بات پر راضی ہو گئیں کہ تبریز میں کچھ روسی فوج بھیجی جائے ''تا کہ شہر میں رسد پہنچانے، سفارت خانوں اور غیر ملکی باشندوں کی حفاظت اور ان لوگوں کی امداد کے لیے، جو شہر سے نکل جانا پسند کریں، ضروری آسانیاں بہم پہنچائی جائیں''۔ روسی افواج جنرل Snarski کے زیر کمان ۳۰ اپریل ۱۹۰۹ء کو تبریز میں داخل ہوئیں (براؤن: کتاب مذکور، ص۲۷۴)۔ اس فوج کو واپس لینے کے لیے ۱۹۱۱ء تک بات چیت ہوتی رہی، مگر روسیوں کی جانب سے ۲۹ نومبر کو تہران میں انذارِ نہائی (الٹی میٹم) پیش ہونے کی وجہ سے ملک میں ایک تازہ شورش برپا ہو گئی۔ ۲۱ دسمبر کو تبریز کے فدائیوں نے روسیوں کی کمزور فوج پر، جو شہر کے مختلف حصّوں میں بٹی ہوئی تھی، حملہ کر کے اسے خاصا نقصان پہنچایا۔

اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ روسیوں نے Voropanov کے ماتحت ایک پورا بریگیڈ روانہ کیا جو نئے سال کی شام کو تبریز پہنچا ۔ روس کی فوجی عدالت نے بہت سے لوگوں کو موت کی سزا دی (ان قضا رسیدگان میں شیخی فرقے کے سر برآوردہ رکن ثقۃالاسلام بھی شامل تھے)۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں وہ ترکی فوجیں جنھوں نے آذربایجان کے مغرب کے متنازع فیہ اضلاع پر قبضہ کر رکھا تھا، واپس بلا لی گئیں، لیکن روسی ترکی سرحد [قب مقالۂ کُرد] کا پھر بھی کوئی فیصلہ نہ ہوا، اس لیے روسی فوج ۱۹۱۴ء تک آذربایجان ھی میں رھی، یہاں تک کہ جنگ عالمگیر شروع ھو گئی۔

ماہ دسمبر کے شروع میں کردوں کی بے قاعدہ فوج نے، جن کی کمان ترکی افسروں کے ھاتھ میں تھی، ساوج بُلاق سے مراغہ اور تبریز کی طرف نقل و حرکت شروع کی۔ اس کے ساتھ ھی انور پاشا نے صاری قمیش پر (جو قارص کے جنوب میں ھے) دھاوا کر کے علاقۂ قاف کی تمام روسی فوج کو خطرے میں ڈال دیا، چنانچہ آذربایجان کو خالی کر دینے کا حکم دے دیا گیا ۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء سے ۶ جنوری ۱۹۱۵ء کے درمیانی عرصے میں روسی فوجوں نے اور اُن کے پیچھے پیچھے مقامی عیسائی آبادی کی اکثریت نے تبریز خالی کر دیا ۔ ۸ جنوری کو احمد مختار بک شمخال کی سرکردگی میں کردوں کی فوج شہر میں داخل ھوئی ۔ یہ صورت حالات اچانک بدل گئی اور ۳۱ جنوری کو روسی بہت زیادہ فوج لے کر آئے اور انھوں نے تبریز پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔ (قب ان تفصیلات کے ساتھ جو سابق جرمن سفیر متعینۂ تبریز ولیم لٹن (W. Litten) نے اپنی کتاب *Persische: Flitterwochen*، برلن ۱۹۲۵ء، ص ۸ تا ۱۲۷ میں دی ھیں)۔

۱۹۰۶ء سے روسی گورنمنٹ کمپنی نے ایرانی حکومت سے امتیاز حاصل کر کے ایک پکی سڑک بنائی تھی جو تبریز کو روسی سرحد سے (یعنی جُلفا سے جو روسی ریلوے کا آخری سٹیشن ھے) ملاتی تھی۔ اب اس سڑک کو ریلوے لائن میں تبدیل کرنے کے لیے جلد جلد کام ھونے لگا اور مئی ۱۹۱۶ء میں اُس پر عام آمد و رفت شروع ھو گئی ۔ یہی ریلوے لائن، جو ۸۰ میل لمبی ھے اور جس کی ایک شاخ ۲۵ میل لمبی صوفیان سے جھیل ارمیہ تک جاتی ھے، پہلی مرتبہ ایرانی سر زمین پر تعمیر ھوئی۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے شروع میں ایرانی سرحد کی روسی فوج میں بد نظمی پیدا ھو گئی تھی۔ ۱۹۱۸ء کے شروع میں آذربایجان کو خالی کر دیا گیا۔ مرکزی ایرانی حکومت کے نمائندے، بلکہ شہزادۂ ولی عہد بھی سارا وقت اپنی اپنی جگہ پر قائم رھے، لیکن جب ۲۸ فروری ۱۹۱۸ء کو آخری روسی دستہ تبریز سے روانہ ھوا تو حقیقی اقتدار دیموقراطی جماعت کی مقامی کمیٹی کو منتقل ھو گیا، جس کا سردار اسماعیل نوبری تھا۔

اس دوران میں ترکوں نے سستی کو ترک کر کے جھٹ پٹ ان سرحدات پر قبضہ کر لیا، جنھیں روسی خالی چھوڑ گئے تھے ۔ ۱۸ جون ۱۹۱۸ء کو ترکوں کا ھراول دستہ تبریز میں داخل ھوا، ۸ جولائی کو جنرل علی احسان پاشا پہنچے اور ۲۵ اگست کو کاظم قرہ بکر پاشا سپہ سالار آرمی کور بھی آ گئے ۔ ترکی حکّام نے نوبری کو جلا وطن کر دیا اور مجدالسلطنۃ کو حاکم آذربایجان مقرر کرنے کی حمایت کی ۔ یہ بدنظمی کوئی ایک سال تک جاری رھی اور نیا گورنر جنرل (حاکم عام) ”سپہ سالار“ (جو ۱۹۱۹ء) تبریز میں آیا، تب کہیں جا کر حالات اپنے معمول پر آنے لگے ۔ مگر پورا پورا انتظام رضا خان ھی نے قائم کیا جو پہلے وزیر جنگ بنے بعد میں ایران کے بادشاہ ھو گئے۔

۲۶ فروری ۱۹۲۱ء کے عہد نامے کی رو سے سوویٹ حکومت نے ایران میں اپنے تمام پرانے امتیازات کو ترک کر دیا اور اس طرح سے جو ریلوے تبریز سے جُلفا تک روسی حکومت کے خرچ پر تیار ہوئی تھی، اب ایرانی حکومت کے قبضے میں آ گئی۔

آثار قدیمہ: تبریز کے قدیم ترین آثار دور مغول (ابتدای صدۂ چہاردهم میلادی) سے متعلق ہیں لیکن اس ضمن میں کوئی باقاعدہ مطالعہ یا تحقیقات علمی ابھی تک نہیں کی گئی۔ کچھ تو زلزلوں کے باعث اور کچھ ان عمارات سے، جو ان کے سنی پیشرووں اور حریفوں نے تعمیر کرائی تھیں، طبقۂ شیعہ کی بےرخی کی وجہ سے یہ آثار قدیمہ ویران ہو چکے ہیں، گو اُن کے بعض دلچسپ نشانات اب تک باقی ہیں۔

غازان خان کے عہد کی عالیشان عمارات جو قریۂ شنب یا شام میں تھیں (جہاں اب قرہ مَلِک نام کی نواحی بستی ہے) بالکل معدوم ہو چکی ہیں۔ آج سے بہت پہلے، یعنی ۱۶۱۱ء میں ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ عباس نے شام غازان کے کھنڈروں سے عمارتی سامان لے کر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ ۰ فروری ۱۶۴۱ء کے زلزلے سے مزید تباہی ہوئی۔ (*Arakel of Tabriz*، ص۴۹۶)۔ اولیاء چلبی (۲ : ۲۶۵) نے گنبد مزار کو قائم دیکھا تھا، جس سے غَلَطَه کے برج کی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہوئی (جہان نما میں بھی یہی مضمون ہے)۔ Mme. Dieulafoy اور Sarre نے بھی وہ ٹیلہ دیکھا، جس کے سوا اب شام غازان کے آثار میں سے کچھ باقی نہیں۔ اس ٹیلے میں اس زمانے کے ظروف گلی و چینی اس وقت تک بھی ملتے تھے۔

اس عجیب و غریب عمارت کی جزئیات کا مفصل حال بدرالدین العینی (م - ۸۳۰ھ/ ۱۴۳۱ء) کی کتاب عقدالجمان میں ملتا ہے۔ مملوک سلطان الناصر نے ایلخان ابو سعید کے زمانے میں ایک سفارت بھیجی تھی۔ یہ تفصیلات اس سفارت کے بیانات پر مبنی ہیں۔ (متن مذکور کا ترجمہ *Zap.*: Baron Tiesenhausen ، ا، ۱۸۸۶ء: ۱۱۳ تا ۱۱۸ نے کیا تھا)۔ مسجد کے متعلق بتایا گیا ہے کہ طیسفون (مدائن) کے ایوان کسریٰ کے قبے سے لگا کھاتی تھی۔ حمداللہ (۱۳۴۰) لکھتا ہے کہ مسجد کی تعمیر میں تعجیل ہوئی، اس لیے گر گئی (''فرود آمد'')۔ بُندُقی سوداگر (۱۵۱۴ء میں) اس کے خرابے کا ذکر پُر جوش طریق سے کرتا ہے، لیکن شاردان (Chardin) (۲ : ۳۲۳) نے 'منارہ' اور صرف اس کے پیچھے کا حصہ موجود پایا (جو چندے قبل پھر سے تعمیر ہوا تھا)۔ طاقِ علی شاہ'' (محراب علی شاہ) اس زمانے میں اس عظیم شکستہ خشتی عمارت کا نام ہے، جو شہر کے وسط میں قدیم محلّهٔ مہاد مہین (عوامی: میار میار، قب Berezin) کے دروازے پر واقع ہے۔ یہ اغلب ہے کہ مسجد قدیم جو معدوم ہو چکی ہے اور پاس کے قلعے میں التباس واقع ہوا ہے۔ مسجد کی ان جزئیات سے، جو ہم تک پہنچی ہیں، قلعہ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ 'اَرْك' کی تاریخ تعمیر کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دولت خانے (''Tolbatgana'') کی وسیع عمارت ہو، جس کا ذکر کلاویخو نے کیا ہے اور عالم آرا (قب سطور بالا) میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ عباس مرزا نے ارك کو اسلحہ خانے میں تبدیل کر دیا تھا، جو آج بھی تبریز کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار ہے۔

جہان شاہ کی خوبصورت مسجد (''کبود مسجد'') کا ذکر ٹاورنیہ (Tavernier) اور شاردان (Chardin) نے بھی کیا ہے۔ اس عمارت کا مکمل مطالعہ Texier، Mme. Dieulafoy اور Prof. Sarre نے کیا ہے۔ یہ

عمارت اب گر رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا استعمال اس لیے ترک کر دیا گیا ہو کہ اس کے بانی پر آق قوینلو نے زندیقیت کا الزام لگایا تھا ۔ اولیاء چلبی ''مسجد سلطان حسن'' کی تعریف بڑی گرم جوشی سے کرتا ہے، جس میں نجف کا پتھر استعمال ہوا ہے اور جس کے کتبے یاقوتِ مستعصمی ایسے خطاط نے لکھے تھے ۔ محراب کے دونوں طرف کہربا کی طرح کے نادر و کمیاب پتھر کے ستون تھے۔ یہ مسجد، جسے ''استاد شاگرد'' کہتے ہیں، حسن کوچک چوپانی (م ۷۴۱ھ/ ۱۳۴۰ء) نے بنوائی تھی (مرآۃ البلدان، ص ۳۴۱ بحوالۂ زینۃ المجالس، شاردان)۔ ایس ولسن کے قول کے مطابق اس نام کی نئی مسجد (جو پرانی مسجد کے موقع پر تعمیر ہوئی) اون منڈی کے قریب ہے ۔ یہ مسجد اوزن حسن کی مسجد سے مختلف معلوم ہوتی ہے، جس کی بابت بہت کم حالات معلوم ہیں ۔

اولیاء کہتا ہے کہ شاہ عباس کی مسجد ''استاد شاگرد'' کے سامنے تھی۔ خیابان شاہ صفی (قب اولیاء) بھی دور صفویہ کی یادگار ہے۔ قاچاریہ عہد کی یادگاریں یہ ہیں: حاکم اعلٰی کی جاے سکونت موسومہ بہ آلاقاپو (Ala-Kapi = باب سرخ)، خوبصورت 'باغ شمال' (گو وہ شہر کے جنوب میں واقع ہے)، شاہ گولی (''شاہ کی جھیل'') کا ایوان، جو شہر سے پانچ میل جانب جنوب واقع ہے (Berezin، ص ۸۰) وغیرہ ۔

تبریز کے آثار قدیمہ کی مفصل فہرست اولیاء چلبی: *Travels* میں ملے گی، شاردان کا منظر تبریز (ایٹلس *Atlas*، لوحہ ۱۱)، جس میں عماراتِ عمومی دکھائی گئی ہیں، شہر کے اوضاع طبیعی و ساختمانی کے مطالعے کے لیے قیمتی چیز ہے۔ مرآۃ البلدان، ۱ : ۳۴۶ تا ۳۴۸ اور امریکی پادری ولسن کی کتاب میں بھی مفید جزئیات موجود ہیں۔ تبریز کے فوجی اسکول کے طالب علموں نے ۱۸۸۰ء میں تبریز کا ایک نقشہ ۱ : ۸۸۲۰ کے پیمانے پر تیار کیا تھا ۔ یہ ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا ۔ قب ہوتم شنڈلر (Houtum-Schindler): *Geogr. journ.*، ۱۸۹۰ء، ص ۱۰۴؛ Berezin، ص ۵۲، نے شہر کے محلوں کا خاکہ دیا ہے ۔ براؤن کی کتاب *The Pers. Revolution*، ص ۲۸۴ پر بھی ایک چھوٹا سا ایرانی خاکہ درج ہے ۔ تبریز کا نہایت مفصل نقشہ ۱۹۱۲ء میں تفلیس میں شائع ہوا تھا ۔

مآخذ: قب مادۂ آذربایجان؛ قدیم مصنفین کے حوالوں کے لیے قب مآخذ جو سطور بالا میں دیے گئے ہیں — (۱) یاقوت، ۱ : ۸۲۲؛ (۲) زکریا قزوینی: آثار البلاد، طبع ویسٹنفلٹ، ص ۲۲۷ (جزئیات بہت کم)؛ (۳) حمداللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، ۷۴۰ھ (۱۳۴۰ء)، طبع لیسٹرینج (Le Strange) در *G.M.S.*، ص ۷۵ تا ۷۹ (اس میں اہم شرح حال دی ہے جس کو بعد کے مصنفین نے نقل کیا ہے)؛ (۴) ابن بطوطہ، طبع ڈفریمری (Defrémery)، ۱ : ۱۷۱؛ ۲ : ۷۱، ۱۲۷ تا ۱۳۱؛ (۵) قاضی احمد غفاری: نگارستان، ۹۵۹ھ (۱۵۵۲ء)، قلمی نسخہ مملوکۂ Bibl. Nat. Paris, Supp. Pers.، ۸۸۷، ورق ۵۶ راست (تبریز از روی نزہۃ القلوب) ورق ۱۲۰ چپ، (آل ایلدیگیز)؛ (۶) احمد رازی: ہفت اقلیم، ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۴ء) قلمی نسخہ مملوکۂ Bib. Nat. Paris، Supp. Pers. ۳۵۶، ورق ۴۶۴ چپ تا ۴۷۹ چپ (مشاہیر تبریز کا تفصیلی احصاء)؛ (۷) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۳۸۰ تا ۳۸۳؛ (۸) اسکندر منشی: عالم آرا، ۱۰۳۷ھ [۱۶۲۷-۱۶۲۸ء]، طہران ۱۳۱۴ھ، ص ۳۰ تا ۳۱، ۴۹ تا ۵۰، ۴۴۴، ۵۸۴ (بہت سا قیمتی مواد)؛ (۹) Arakel of Tabriz: *Livre d'histoires* (تاریخ ارمینیہ از ۱۵۷۴ء تا ۱۶۶۵ء)، فرانسیسی ترجمہ از بروسہ (Brosset): *Coll. d'historiens arméniens*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۴ء، ۱ : ۱۷۶، ۲۹۴، ۳۱۲، ۴۹۶، ۵۷۲ و مواضع کثیرہ؛ (۱۰) اولیاء چلبی: (حدود ۱۰۵۷ھ/[۱۶۴۷ء]، ۲ : ۲۴۵ تا ۲۷۶ (مفصل اور دلچسپ معلومات)؛ (۱۱) محمود لبیب: تحفۃ اللبیب،

۱۱۳۸ھ (۲۵-۱۷ء)؛ (۱۲) ایک تصنیف مشاہیر تبریز کے مقابر کے متعلق جو اب تک دوبارہ دستیاب نہیں ہو سکی۔ (ہامر: .G.O.R، ۸: ۵۲۵؛ (۱۳) بابنگر (Babinger): *Die Geschichtsschreiber der Osmanen*، لیپزگ ۱۹۲۷ء، ص ۲۳۷)؛ (۱۴) زین العابدین شروانی: حدائق السیاحۃ، قلمی نسخہ مملوکۂ .Bib. Nat Paris، .Supp. Pers: (ورق ۱۳۰۵)، ورق ۸۶ راست؛ (۱۵) وہی مصنف: بستان السیاحۃ، (تصنیف ۱۲۴۷ء)، حدائق السیاحۃ کی مفصل تر صورت، طہران ۱۳۱۵ھ، ص۱۸۶ تا ۱۸۸؛ (۱۶) محمد حسن خان صنیع الدولہ: مرآۃ البلدان، طہران سنہ ۱۲۹۴، ۱: ۳۳۷ تا ۴۱۹ (غیر مطبوعہ مواد سے اس کتاب کی تکمیل ہوئی)؛ (۱۷) مارکو پولو (Marco Polo)، باب ۲۶: Toris، Thoris، Tauris Tauriz وغیرہ (Barsamo مسیحی کی خانقاہ جس کا محل وقوع Ramusio نے علاقۂ تبریز میں بتایا ہے شاید St. Barthelemy کی خانقاہ ہے جو ماکو (رک بآن) میں ہے)؛ (۱۸) کلاویخو (Clavijo) (۱۴۰۵ء تا ۱۴۰۶ء): *Vida y hazeñas del gran Tamorlan*، Sevilla ۱۵۸۲ء، باب ۸۲ و ۱۴۳ (طبع Sreznewski، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۱ء، ص۱۶۷ تا ۱۷۲، ۳۵۸ تا ۳۷۶)؛ (۱۹) وینس کے سیاحوں (Barbaro Contarini، C. Zeno، Angiolello، گمنام سوداگر V. Alessandri) کے بیانات ایک جلد میں جمع کیے گئے ہیں، تالیف C. Grayfor، طبع The Hakluyt Society، لندن ۱۸۷۳ء؛ (۲۰) نیز قب Cornet: *Lettere di G. Barbaro*، وی انا ۱۸۵۲ء اور G. Berchet: *La repubblica di Venezia et la Persia*، ٹیورن Turin ۱۸۶۵ء؛ (۲۱) J. Chesneau: *Le Voyage de M. d' Aramon* (1547)، طبع شیفر (Schefer)، پیرس ۱۸۸۷ء، ص ۸۳ و ۲۸۲؛ (۲۲) Kakasch de Zalonkemeny (= اس کا کاتب السر (سکریٹری) (Tectander)): *Iter persicum* (1603)، طبع شیفر، پیرس ۱۸۷۷ء، ص ۴۷ تا ۵۱؛ (۲۳) Olearius (۱۶۳۶ء تا ۱۶۳۷ء) *Ausführliche Beschreibung*: وغیرہ، ۱۶۶۳ء، حصۂ ۵، باب ۲؛ (۲۴) ٹاورنیہ (Tavernier) (۱۶۳۸ء): *Les six voyages*، پیرس ۱۶۷۹ء، ۱: ۵۶ تا ۶۳؛ (۲۵) A. Poulet: *Nouvelles relations du Levant*، پیرس ۱۶۶۳ء، ص۱۶۱ تا ۱۶۳ (دونوں مسجدوں کا حال اس میں دیا ہے)؛ (۲۶) Petis de la Croix (۱۶۷۰ء): *Extrait des voyages*، ملحق بہ *Relation de Dourry Efendi*، پیرس ۱۸۱۰ء، ص۱۳۱ تا ۱۳۵؛ (۲۷) شاردان (Chardin) (۱۶۷۳ء): *Voyages*، طبع Langlès، ۲: ۳۱۹ تا ۳۶۰، اٹلس لوحۂ ۱۱ (منظر جو ''عین علی'' [کی بلندیوں] سے لیا گیا)؛ (۲۸) جان بل (John Bell) (۱۷۱۶ء): *Travels from St. Pétersburg*، اس کا فرانسیسی ترجمہ از Jean Bell d'Antermony، موسوم بہ *Voyages depuis St. Pétersbourg*، پیرس ۱۷۶۶ء، ۳: ۹۹ تا ۱۰۷؛ (۲۹) (P. Villotte): *Voyage d'un missionnaire de la compagnie. de Jésus en Turquie, en Perse etc.*، پیرس ۱۷۳۰ء، ص ۱۷۶ تا ۱۷۷؛ (۳۰) Hanway: *The Revolutions of Persia*، لندن ۱۷۵۳ء، ۲: ۲۳۷؛ (۳۱) Jaubert: *Voyage en Arménie* (1805)، پیرس ۱۸۲۱ء، ص ۱۰۰ تا ۱۶۳ و ۳۵۸؛ (۳۲) P. Tancoigne (۱۸۰۷-۱۸۰۸ء): *Lettres sur la Perse*، پیرس ۱۸۱۹ء، ۱: ۱۲۱؛ (۳۳) J. P. Morier: *A Journey through Persia* (1809)، لندن ۱۸۱۲ء، ص۲۷۵ تا ۲۹۱؛ (۳۴) A. Drupé (۱۸۰۹ء): *Voyage en Perse*، پیرس ۱۸۱۹ء، ۲: ۲۳۰ تا ۲۳۰؛ (۳۵) M. Kinneir: *A geogr. Memoir of the Persian Empire*، لندن ۱۸۱۳ء، ص ۱۵۰ تا ۱۵۲، ۲۷۷، ۳۸۰؛ (۳۶) J. P. Morier (۱۸۱۰ء تا ۱۸۱۶ء): *A Second Journey*

through Persia، لندن ۱۸۱۸ء، ص ۲۱۱ تا ۲۳۳، ۲۹۱؛ ص ۲۲۰ پر تبریز کا ایک منظر؛ (۳۷) Ker Porter: Travels in Georgia (1819)، لندن ۱۸۲۲ء، ۲: ۵۰۶؛ (۳۸) J. B. Fraser: Travels in Kurdistan، تاریخ ندارد، ۱: ۱ تا ۵۳؛ ۲: ۳۱۲؛ (۳۹) W. K. Stuart (۱۸۳۵ء): Journey of a Residence in Northern Persia، لندن ۱۸۵۴ء؛ (۴۰) Texier (۱۸۳۹ء): Description de l'Armenie، پیرس ۱۸۵۲ء، ۱: لوحے ۱۳ (عام منظر)، و ۴۲ تا ۴۲ (کبود مسجد)؛ ۲: ۳۳ تا ۵۹؛ (۴۱) Wilbraham: Travels in the Transcaucasian Provinces، لندن ۱۸۳۹ء؛ (۴۲) رٹر (Ritter): Erdkunde، ج ۹ (۱۸۴۰ء)، ص ۷۷۰ تا ۷۷۹، ۸۵۲ تا ۸۸۳؛ (۴۳) Berezin (۱۸۴۲ء): Puteshestwiye po sevĕr. Persii، قازان ۱۸۵۲ء، ص ۵۵ تا ۹۶؛ (۴۴) Flandin: Voyage en Perse، پیرس ۱۸۵۱ء، ۱: ۱۳۶ تا ۱۸۱؛ (۴۵) Lycklama a Nijeholt (۱۸۶۹ء): Voyage en Russie، پیرس ۱۸۷۳ء، ۲: ۴۰ تا ۷۹؛ (۴۶) گوبینو (Gobineau): Trois ans en Asie، پیرس ۱۸۵۹ء، ص ۵۰۸ تا ۵۰۹؛ (۴۷) von Thielmann (۱۸۷۲ء): Streifzüge im Kaukasus، لیپزگ ۱۸۷۵ء، ص ۱۷۹ تا ۱۹۸؛ (۴۸) Bakulin: Očerk torgowii Ādharbāidjāna، Wost. Sbornik 1870—1871، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۷ء، ۱: ۲۰۰ تا ۲۶۹؛ (۴۹) Heyd: Gesch. des Levantehandels، Stuttgart ۱۸۷۹ء، فرانسیسی ترجمہ، طبع لیپزگ ۱۸۸۶ء، ۲: ۱۰۷ تا ۱۳۰ و مواضع کثیرہ؛ (۵۰) کرزن (Curzon): Persia، لندن ۱۸۹۲ء، ۱: ۵۱۸ تا ۵۲۲ اور اشاریہ؛ (۵۱) St. Martin: Nouveau dict. de géographie universelle، پیرس ۱۸۹۳ء، ج ۶؛ (۵۲) Madame Dieulafoy: La Perse، پیرس ۱۸۸۷ء، ص ۴۴ تا ۶۷ (کبود مسجد، شام غازان کی سیر)؛ (۵۳) de Morgan: Mission, Études géogr.، پیرس ۱۸۹۴ء، ۱: ۳۲۰ تا ۳۳۳؛ (۵۴) ولسن (S. G. Wilson): Persian life and Customs، لندن ۱۸۹۶ء، ص ۵۲ تا ۷۰، ۳۲۳ تا ۳۲۵ و مواضع کثیرہ (دلچسپ جزئیات)؛ (۵۵) Lehmann-Haupt (۱۸۹۸ء): Armenien einst und jetzt، برلن ۱۹۱۰ء، ۱: ۱۸۹ تا ۱۹۹؛ (۵۶) بارتولڈ (Barthold): Istor.-geogr. obzor Irana، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۳۵ تا ۱۳۸؛ (۵۷) لیسٹرینج (Le Strange): The Lands of the Eastern Caliphate، لندن ۱۹۰۵ء، ص ۱۵۹ تا ۱۶۳؛ (۵۸) Frengian: Atrpatakan (ارمنی میں)، تفلیس ۱۹۰۵ء، ص ۶۰ تا ۶۵؛ (۵۹) A. V. W. Jackson: Persia Past and Present، نیویارک ۱۹۰۶ء، ص ۳۹ تا ۵۶؛ (۶۰) Sarre: Denkmäler persischer Baukunst، برلن ۱۹۱۰ء، ص ۵ تا ۷، ۲۵ تا ۳۲، لوحے ۲۳ تا ۲۹؛ (۶۱) Brit. Mus. Or. Coins، ج x، ص cxxiii تا cxxiv؛ (۶۲) ایضًا: Shahs of Persia، ص ۲۹۳ و ۲۹۴۔

(V. MINORSKY مینورسکی)

اَلتَّبْرِیزِی: ابو زکریا یحیی بن علی بن محمد بن الحسن بن محمد بن بِسطام الشَّیبانی الخطیب (یاقوت اس نسب نامے میں الحسن اور بسطام کے درمیان 'بن محمد بن موسیٰ' کا اضافہ کرتا ہے۔ فقہ لغت عربی کا مشہور و معروف ماہر، ۴۲۱ھ (۱۰۳۰ء) میں پیدا ہوا۔ اس کے استادوں میں سے نہایت ممتاز شخص ابوالعلاء المعرّی [رکّ بآن] شاعر مشہور تھا۔ کتاب التہذیب فی اللغۃ از ابوالمنصور الأزہری (براکلمان، G.A.L.، ۱: ۱۲۹؛ مگر قبّ Bergsträsser: Z. S.، ۲: ۱۸۹، عدد ۴۲) کہیں سے اس کے ہاتھ لگ گئی اور تبریزی مواد کتاب مذکور کی تحقیق اور اس کی صحیح روایت کے لیے ایک عالم لغت کی تلاش میں تھا۔ کسی نے اُس کو المعرّی کا پتہ دیا، اس پر وہ اس کتاب کو، جو کئی جلدوں میں تھی، ایک بوری میں ڈال تبریز سے المعرہ تک خود اٹھا کر لے گیا۔ چونکہ سواری کرایہ

کرنے کی اُسے توفیق نہ تھی، اس کا پسینہ بوری میں سے ہو کر کتابوں تک پہنچا اور اس کی نمی سے کتابوں پر داغ پڑ گئے ۔ ابن خلّکان نے (دیکھیے بذیل مآخذ) ابن القِفطی [رک بآن] کی گم شدہ کتاب اخبارالنُّحاۃ کے حوالے سے باحتیاط تمام لکھا ہے کہ ابن القِفطی نے اس کتاب کی چند جلدیں بغداد کے ''وقف'' کتب خانوں میں دیکھی تھیں، جنھیں دیکھ کر ناواقف کو گمان ہوتا تھا کہ گویا وہ کتابیں پانی میں پڑی رہی ہیں ۔ اس کے دوسرے اساتذہ اور شیوخ میں یہ لوگ تھے : ابوالقاسم عبیداللہ بن علی الرّقّی (م ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء)، ابومحمد (بقول ابن خلّکان، مگر بقول یاقوت وہ ہے الحسن بن رجاء بن) الدہّان (م ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء)، ابوالفتح سُلَیم (سلیمان ؟، یاقوت اور بعض دوسرے مصنفوں کے ہاں وہ سُلیم بن ایّوب الرّازی ہے ، (صُور Tyre کا شافعی فقیہ؛ قبّ ابن خلّکان عدد ۲۶۸ [و طبع مصر ۲ : ۲۳۳۔ادارہ]، ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد السّیاری Saiyārī (؟ڈیسلان (De Slane) [دیکھیے مآخذ] متن میں السّاوی پڑھتا ہے [یاقوت کے ہاں بھی الساوی ہی ہے] مگر نسخۂ بدل السّیادی (al-Saiyādī) بھی دیتا ہے) البغدادی، ابن بُرہان، المفضّل القصبانی، عبدالقاہر الجُرجانی (*G.A.L.* ، ۱ : ۲۸۷)، قاضی ابوالطّیّب طاہر بن عبداللہ الطّبری (قبّ السمعانی : ورق ۳۶۷ الف سطر ۱۲ ببعد) اور ابوالحسن التّنوخی (کتاب مذکور، ۱۱۰ ب سطر ۲۴) ۔ اس نے المعرّہ میں تعلیم پانے کے علاوہ صُور اور دمشق میں بھی تعلیم پائی۔ابھی وہ جوان ہی تھا کہ قاہرہ گیا جہاں اس نے ابن بابَشاذ (براکلمان : *GAL* ، ۱ : [illegible]) کو تعلیم دی ۔ پھر وہ بغداد چلا گیا جہاں وہ قاضی کے فرائض سرانجام دیتا رہا ۔ (کتاب الانساب، سمعانی، طبع وقفیّۂ گب ، عدد ۲۰ میں ورق ۱۰۳ پر قاضی کے بجائے 'قاطن' درج ہے، مگر صحیح قراءت 'قاضی' ہے ۔ دیکھیے نسخۂ کتاب الانساب، استانبول، کوپریلی، عدد ۱۰۱۰)، اور مدرسۂ نظامیہ میں مرتے دم تک مدرس مضامین ادب اور متولی خزانۃالکتب (لائبریرین) بھی رہا ۔ اس کی موت ۲۸ جُمادی الثانیۃ ۵۰۲ھ (۲ فروری ۱۱۰۹ء) کو منگل کے روز واقع ہوئی ۔ (بقول ابن خلّکان، یاقوت نے ''جُمادی الاُولیٰ'' دیا ہے جو غلط ہے ۔ جیسا کہ دن سے ظاہر ہے) اس کا مزار مقبرۂ باب اَبرز میں ہے ۔ کئی مآخذ اس کے مختلف شاگردوں میں الخطیب البغدادی، صاحب تاریخ بغداد کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ (براکلمان : *G.A.L.* ، ۱ : ۳۲۹)؛ لیکن یہ بیان جس کا راوی سمعانی ہے، اور جسے یاقوت : معجم (دیکھیے بذیل مآخذ) اور ابن خلّکان نے بھی قبول کیا ہے، کسی غلطی پر مبنی ہے، اس لیے کہ الخطیب البغدادی خود تبریزی سے عمر میں تقریباً تیس سال بڑا تھا [لازمی نہیں کہ اس میں غلطی ہو، اس لیے کہ رواۃ حدیث میں عمر کے تفاوت کی بہت مثالیں ملیں گی ۔ کئی باپ اپنے بیٹوں سے راوی ہیں ۔ دیکھیے ابن الجوزی : تلقیح فہوم اہل الاثر، طبع دھلی، بلا تاریخ طباعت، ص۳۷۸ سطر ۱۰ ۔ ادارہ] ۔ ابن خلّکان (بذیل مادۂ تبریزی) الخطیب البغدادی کے ترجمے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے ان دونوں کے تعلقات کے متعلق مزید تفصیلات دی ہیں، مگر اس عبارت میں کچھ ایسی معلومات نہیں ہیں، جن کا وہ ذکر کرتا ہے ۔ (عدد ۳۳ [طبع مصر، ۱ : ۲۷ ۔ ادارہ])، اس کے برعکس یاقوت خود اَرشاد میں بذیل مادۂ الخطیب البغدادی ایک قصہ دیتا ہے جس کی اسناد تبریزی تک پہنچتی ہے ۔ نسبت التبریزی تو وہاں درج نہیں ہے، لیکن اس کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ابو زکریا یحیی بن علی الخطیب اللُّغوی، سے ہمارا تبریزی ہی مراد ہے،

خاص کر جب کہ اس سلسلے کی کڑی ابوالفضل ناصر السّلامی ہے جو بظاہر ابوالفضل محمد بن ناصر السّلامی شاگرد تبریزی کا باپ ہے ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابوالفضل بن ناصر السلامی، کے بجائے ابوالفضل ناصر السلامی تحریر ہو گیا ہے، کیونکہ محمد بن ناصر السّلامی تبریزی کا شاگرد ہونے کے علاوہ السمعانی کا شیخ بھی مانا گیا ہے(قب برگ شٹراسر (Bergsträsser) در Z.S.، ۲ : ۲۰۵ عدد ۳۰۱)، اور اس کا باپ اول تو بالکل غیر معلوم شخص تھا اور پھر یہ غیر اغلب ہے کہ اس کی کنیت بھی ابوالفضل ہی ہو ۔ اس کے علاوہ راوی کی اپنی مفلسی، جو اس کہانی میں جا بجا نظر آتی ہے، تبریزی کی مفلسی کی کہانی کے عین مطابق ہے جس کا علم اس کے سفر المعرّہ کی داستان کی وجہ سے ہمیں حاصل ہے ۔ تبریزی ۴۵۶ھ میں ضرور دمشق میں آیا ہوگا اور اس نے ادب کی تعلیم الخطیب البغدادی سے حاصل کی ہوگی؛ اس کی طلب علم کی پیاس کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے ۔ تبریزی دمشق کی عظیم الشان مسجد کے ایک منار میں رہا کرتا تھا (یہ بھی اس کی مفلسی کی دلیل ہے) ۔ ایک دن الخطیب اس کی جاے سکونت پر گیا اور وہاں ایک گھنٹے تک ان کی گفتگو ہوتی رہی ۔ الخطیب نے جانے سے پہلے اسے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تحفے کے طور پر دے کر کہا کہ آپ اس سے قلم خرید لیں ۔ جب تبریزی نے کاغذ کو کھولا تو اس میں پانچ مصری دینار پائے ۔ الخطیب دوبارہ اس سے ملنے آیا اور اتنی ہی رقم بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ دے کر کہا کہ آپ اس سے کاغذ خرید لیں ۔ یاقوت کی یہ کہانی، جو اس نے تبریزی کے ترجمے میں خود اپنی کتاب [ارشاد میں دی ہے، معجم کی کہانی کے خلاف زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔ پس ظاہر ہوا کہ الخطیب اصل میں تبریزی کا استاد ہے، ورنہ بغدادی یقیناً اپنی کتاب تاریخ بغداد میں تبریزی کا ترجمہ بھی لکھتا ۔ تبریزی کے شاگرد یہ تھے : ابوالفضل محمد بن ناصر السّلامی (۴۶۷ھ تا ۵۵۰ھ ۱۰۷۴ تا ۱۱۵۵ء، قب سطور بالا)، ابوالحسن سَعدالخیر بن محمد بن سَہل (المقری، ۱ : ۸۹۵ میں سَعد) الأنصاری الأندلسی (الغزّالی کا شاگرد، ۵۴۱ھ / ۱۱۴۶ء در بغداد)؛ ابو طاہر محمد بن محمد بن عبداللہ السّنجی (۴۶۳ تا ۵۴۸ھ، ساکن مرو) اور بالآخر الجَوالیقی [رک بآن] جو اس کے بعد نظامیہ میں اس کا جانشین ہوا ۔ تبریزی کا عام چلن کچھ اچھا نہ تھا (کہتے ہیں کہ وہ شراب پیتا تھا اور ریشمی کپڑے اور مُذہّب عمامہ پہنتا تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد میں خوشحال ہو گیا تھا) لیکن اس کا مستند عالم ہوتا ایک مسلّمہ امر ہے۔

اس کی جن تصانیف کا نام معلوم ہے وہ سب عالمانہ کتابیں ہیں ۔ ابن خلّکان اس کے دو شعر نقل کرتا ہے اور ایک نظم بھی؛ العماد الفیّاض نے اُسے ایک نظم لکھ کر بھیجی تھی اور تبریزی نے اس کا جواب لکھا تھا ۔ اس کی تصانیف کی فہرست، جو ذیل میں دی گئی ہے، اس میں ان تصانیف کو، جن کا ذکر براکلمان کر چکا ہے، (G.A.L.، ۱ : ۲۷۹ ببعد) مکرّر صرف اسی صورت میں شامل کیا گیا ہے، جب ان کے متعلق ہمیں کچھ کہنا ہو۔

ابو تمّام [رک بآن] کے حماسہ پر تبریزی نے تین شرحیں لکھیں ۔ [اکبر، اوسط، اصغر (ابن خلکان) ۔ ادارہ] پہلی تو ایک چھوٹی شرح ہے جس میں پورا قطعۂ شعر دے کر اس کی شرح درج کی، دوسری شرح میں ہر بیت کی الگ الگ شرح کی، تیسری شرح طویل اور مفصل لکھی ۔ دوسری شرح فریتاغ (Freytag) نے شائع کی ہے ۔ مآخذ شرح کے متعلق قب دیباچہ

فریتاغ ۔ یاقوت کے پاس تبریزی کی خود نگاشتہ شرح القصائدالعشر تھی ۔ تبریزی نے کتب ذیل پر بھی شرحیں لکھیں : دیوان المتنبی (G.A.L.، ۱ : ۸۸)، المفضلیات، قصیدۂ بانت سعاد (اس کے اڈیشن کے متعلق قب مادۂ کعب بن زہیر)، مقصورہ ابن درید [رک بان]، کتاب اللمع فی النحو از ابن جنّی [رک بان]، نیز بقول حاجی خلیفہ، اس نے نہایۃ الوصول الی علم الاصول کی شرح بھی لکھی جس کا مصنف احمد بن علی بن السّاعاتی البغدادی ہے، مگر اس مصنف کی صحیح تعیین نہیں ہو سکی ۔ (اس نام کا مصنف جو براکلمان : ۱ : ۳۸۲ میں مذکور ہے، تبریزی کے بعد کے زمانے کا ہے) تبریزی نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی ۔ اسی مصنف کا بیان ہے کہ تبریزی نے ابن السکّیت [رک بان] کی کتاب اصلاح المنطق بھی تصحیح و تہذیب کے بعد تہذیب اصلاح المنطق کے نام سے شائع کی ۔ (قلمی نسخہ استانبول، عاطف، عدد ۲۷۱۶؛ قب ریشر (Rescher)، M.F.O.، بیروت ۱۹۱۲ء، ص۵۰۰)؛ طبع قاہرہ بلا تاریخ؛ اسی مصنف کی کتاب الالفاظ پر اس کی لکھی ہوئی شرح بھی بیروت میں چھپی ہے [۱۸۹۶ء تا ۱۸۹۸ء] ۔ الکافی فی علم العروض و القوافی کا ایک خلاصہ بھی شاید اس مجموعے میں، جو مجموع من مہمات المتون کے نام سے قاہرہ ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوا (ص ۵۰۰ بعد)، شامل ہے ۔ اس کے مصنف کا نام بیان نہیں ہوا ۔ بقول براکلمان (اشاریہ بذیل مادۂ کافی) اس کے دو اور مصنف بھی ممکن ہو سکتے ہیں ۔ ریشر (Rescher) : Z.A.، ۲۷ : ۱۵۶)، عروض کی ایک اور کتاب رسالۃ فی العروض کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے ۔ یہ رسالہ کتاب خانۂ حمیدیہ استانبول کا مخطوطہ عدد ۱۱۲۷ ہے، جو براکلمان کی مذکورہ دو کتابوں سے مختلف ہے ۔ ریشر اس کی شرح دیوان امرؤالقیس کے مخطوطے کا بھی ذکر کرتا ہے (Z.D.M.G.، ۶۸ : ۶۳)، لیکن کتب مآخذ میں اس تصنیف کا کوئی ذکر نہیں آتا ۔ تبریزی کی دوسری تصانیف (جن کا اب کچھ پتا نہیں) ابن الانباری اور یاقوت کے قول کے مطابق یہ ہیں : مقاتل الفرسان (ابن خلکان)، تہذیب غریب الحدیث (یاقوت)، مقدمہ فی النحو ۔

مآخذ (جو اوپر نہیں دیے گئے) : (۱) السّمعانی : انساب، طبع مرجلیوث (Margoliouth)، ۱۹۱۲ء، G.M.S.، ۲۰ : ورق ۱۰۳ الف ؛ (۲) ابوالبرکات ابن الانباری : نزہۃ الالبّاء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ، ص۴۴۳ تا ۴۴۸؛ (۳) ابن خلکان : وفیات الاعیان، طبع ویسٹنفلٹ، عدد ۸۱۰ : [طبع مصر ۲ : ۲۲۳-ادارہ] ؛ (۴) ایضاً : ترجمۂ انگریزی از ڈیسلان، ج ۴ (۱۸۷۱ء) : ص۷۸ بعد (مع بیش قیمت حواشی)؛ (۵) یاقوت : معجم، طبع ویسٹنفلٹ، ۱ : ۸۲۲ بعد؛ (۶) ایضاً : ارشاد، طبع مرجلیوث، G.M.S.، i/vi : ۲۵۴ بعد، vii/vi : ۲۸۶ بعد؛ (۷) سرکیس : معجم المطبوعات، ص ۶۳۵ بعد ۔

(M. PLESSNER پلسنر)

تبریزی : عام طور پر شمس تبریزی کے نام سے مشہور ہیں (نفحات، طبع کلکتہ، ص۵۳۵ میں انہیں شمس الدین محمد بن علی بن ملک داد تبریزی لکھا ہے) ۔ آپ صوفی اور مولانا جلال الدین رومیؒ کے مرشد تھے، جنھوں نے متصوفانہ غزلیات کے ایک دیوان کا بیشتر حصہ آپ کے نام سے لکھا ہے، جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے ۔ آپ تبریز [رک بان] میں پیدا ہوے، جہاں آپ کے والد بزازی کا کام کیا کرتے تھے ۔ کہتے ہیں کہ آپ نے تصوف کی تعلیم شیخ ابوبکر زنبیل باف (سلّہ باف)، شیخ رکن الدین سنجاسی [؟ نفحات، طبع کلکتہ، ص ۵۳۶ : سنجاسی، ص ۶۸۵ : سبخاسی] اور بابا کمال جندی سے حاصل

کی۔ بعد ازاں آپ درویش سیاح بن گئے اور ۶۴۲ھ میں قونیہ پہنچے۔ مولانا رومی پر آپ کی پر جوش شخصیت کا بہت گہرا اثر ہوا۔ مولانا کے شاگرد اس گہری عقیدتمندی کو دیکھ کر، جو انکے استاد کو اپنے مرشد اور پیارے دوست (شمس تبریز) سے پیدا ہوگئی تھی، بری طرح بگڑے اور انھوں نے شمس تبریزی کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ۔ کہتے ہیں کہ دمشق میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد آپ مولانا کے صاحبزادے بہاءالدین سلطان وَلَد کے ساتھ، جنھیں ان کی تلاش میں بھیجا گیا تھا، قونیہ میں واپس آ گئے ۔ ماہ شوال ۶۴۳ھ میں آپ پُر اسرار طریق سے غائب ہو گئے ۔ ان کے متعلق یہ کہانیاں کہ انھیں حکومت کے گرگوں نے مار ڈالا یا سازشیوں کے کسی گروہ نے قتل کر ڈالا، جن میں مولانا جلال الدین کا ایک لڑکا بھی شامل تھا، غیر مصدقہ ہیں اور بہترین مآخذ سے اس کی تائید نہیں ہوتی ، یعنی مثنویات سلطان وَلَد سے اور فریدون بن احمد کے رسالۂ سپہ سالار سے ، جس میں مولانا جلال الدین اور ان کے جانشینوں کا حال دیا ہے ۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں نواح ۷۲۰ھ میں لکھا گیا تھا ۔ عہد حاضر کے بعض فضلاء کا خیال ہے کہ شمس تبریزی صرف شاعر کے تخیل ہی میں تھے اور ظاہر میں ان کا کوئی وجود نہ تھا : "c'est son propre génie inspirateur" (رضا توفیق در *Textes Houroûfis*، *G.M.S.* ۹ : ۲۷۰، حاشیہ ۱)؛ لیکن اگر ہم سوانح نویسوں کی دی ہوئی تاریخوں اور دیگر مفصل جزئیات کو فرضی بھی خیال کر لیں ، پھر بھی اس نظریے کی بنیاد کمزور ہی معلوم ہوتی ہے ۔ شمس الدین کا معاملہ کچھ ایسا نہ تھا جس کی نظیر پیش نہ کی جا سکتی ہو ۔ شاعر تمجید و تکریم اور انتہائی گہری عقیدت ("deification") کے جن خیالات کا اظہار دیوان شمس تبریز میں شمس الدین کے لیے کرتا ہے، اسی طرز کے خیالات کا اظہار اس نے مثنوی میں حُسام الدین کے لیے اور اپنے ایک اور عزیز دوست صلاح الدین زَرکوب کے لیے بھی چند غزلیات میں کیا ہے ۔ جہاں تک زبان کی شہادت کا تعلق ہے، مولانا جلال الدین رومی کے ان تینوں منبعہاے فیض کی حیثیت یکساں ہے ، جو حکم ایک کا ہے، وہی باقیوں کا ہے، اور اسی لسانی شہادت کی تأویل معقول تر بنا پر اور طریق سے بھی ہو سکتی ہے ۔ جن لوگوں نے ڈانٹے (Dante) کا مطالعہ کیا ہے انھیں یہ بات کچھ عجیب معلوم نہ ہوگی کہ یہ جلیل القدر ایرانی صوفی اپنے گہرے روحانی تعلقات اور ذاتی واردات کو ان الفاظ میں ملبوس کرتا ہے جو ہمہ اوستی فلسفے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مآخذ : فریدون بن احمد : رسالۂ سپہ سالار، کانپور ۱۹۰۱ء، ص ۶۳ ببعد = ترکی ترجمہ از مدحت بہاری حُسامی، قسطنطنیہ ۱۹۱۳ء ص ۱۶۴ ببعد؛ (۲) افلاکی : مناقب العارفین، [آگرہ ۱۸۹۷ء، متن کی طباعت ناتمام] ترجمہ از ایوآر (C. Huart) در *Les saints des derviches tourneurs*، پیرس ۱۹۱۸ء اور ترجمہ از ریڈھاؤس (J. W. Redhouse) در *The Mesnevi*، جلد اول، لندن ۱۸۸۱ء ؛ (۳) نکلسن : *Selected Poems from the Diwān-i-Shams-i-Tabrīz*، کیمبرج ۱۸۹۸ء .

(R. A. Nicholson (نکلسن)

التبریزی : رَکْ بہ محمد حسین بن خَلَف .

تبسہ : (Tebessa) الجیریا کا ایک شہر، قسنطینہ سے جنوب مشرق کو ۱۰۶ میل کے فاصلے پر اور تونس کی سرحد سے ۱۲ میل پر، اس کا عرض بلد ۳۵ درجے ۲۵ دقیقے شمالی ہے اور طول بلد ۸ درجے ۵ دقیقے مشرق (گرینچ) ۔ آبادی ۱۰,۳۹۹ نفوس پر مشتمل ہے، جن میں سے ۱,۶۱۴ یورپی ہیں ۔ یہ ایک مخلوط ناحیہ (mixed communal) کا پاے تخت ہے جس کا رقبہ ۴۲۵ مربع میل ہے ۔ یہ وہی علاقہ

ہے جو نمانشہ (Namānsha) کی وفاقی ریاست کے قبضے میں تھا اور جس کی آبادی ۵٦,۹۹۱ نفوس پر مشتمل ہے، جن میں سے ۵٦,۹٦۳ مقامی باشندے ہیں۔

تَبِسّہ ایک سطح مرتفع کے عین وسط میں واقع ہے جس کی اوسط بلندی تین ہزار فٹ ہے۔ جبال مجتمعۂ اُسْمُر (Osmor) اور جبلِ دُکّان کے کُنجان پہاڑوں سے، جو جبل 'اوراس' کے مشرق ملحقات ہیں، گھرا ہوا ہے۔ پہاڑی ندیوں سے اس کی آب پاشی بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ علاقہ کُنجان اور گھنا جنگل تھا؛ اب شہر کے گرد و نواح کے سوا سب درخت کاٹ دیے گئے ہیں۔ شہر کے گردا گرد باغوں کا حلقہ ہے، یہ سر زمین غلّے کی کاشت کے لیے بہت موزوں ہے۔ یورپی اور مقامی باشندے دونوں غلّے کی کاشت کا کام کرتے ہیں۔ دیگر حالات کے علاوہ شہر کا محل وقوع ایسی سڑکوں کے مقام اتصال پر ہے، جو نومیڈیا (بلادالجرید) کی سطوح مرتفع سے وسطی اور جنوبی تونس کو جاتی ہیں، اس وجہ سے شہر تَبِسّہ ایک اہم منڈی بن گیا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں شہر کے قرب و جوار ھی میں فاسفیٹ قسم کے نمک نکالنے کا کام شروع ہوگیا، جو یہاں سے ریل کے ذریعے جنوب کی طرف سُوق اَھْرَاس میں بھیجے جاتے ہیں، اس وجہ سے تَبِسّہ کی رونق اور سرگرمی اور بھی بڑھ گئی ہے۔

تَبِسّہ اصل میں تھیوستہ (Thevesta) ھی ہے، جسے ۲۵ قبل از مسیح میں آغسطس (Augustus) نے اپنی تیسری فوج ''آغسطہ'' (Third Legion Augusta) کا صدر مقام بنایا۔ اس چھاؤنی کے قریب جو شہر آباد ہوا، اس میں ٹراجان (Trajan) کے عہد تک تیس ہزار باشندے آباد تھے۔ سپٹیمیس سیورس (Septimius Severus) نے اسے نوآبادی (مستعمرہ) کا درجہ عطا کیا اور اس زمانے میں قرطاجنہ کے بعد رومانی افریقیہ میں یہی شہر سب سے زیادہ اہم اور آباد سمجھا جاتا تھا۔ بعض مصنفین اس کی آبادی ایک لاکھ بتاتے ہیں۔ اس زمانے کے بعد یہ شہر زوال پذیر ہوگیا۔ چوتھی صدی کے معاشری اور مذہبی آشوب و حوادث میں بہت تکالیف اٹھانے کے بعد ونڈالوں (Vandals) نے پانچویں صدی میں اس پر قبضہ کر کے لوٹ لیا۔ اس کے بعد بزنطینیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور سولومن (Solomon) نے اس کی از سر نو تعمیر کی۔ اس نے اس کے گرد استحکامات تعمیر کرائے، جن کے کچھ حصے کی تعمیر کے لیے. پرانی عمارتوں کا مسالا استعمال کیا اور اس طرح اسے ایک وسیع قلعے کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ بایں ھمہ موروں، یعنی بربروں نے ۵۹۵ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر ٦۸۲ء ([؟] ٦٥ھ [؟]) میں ایک جنگ کے بعد، جس کا ذکر ''فتوح افریقیہ'' میں موجود ہے، عرب قابض ہوے۔ اس زمانے کے بعد سے تبسہ افریقہ کے اس حصے کے مآل کار میں شریک حال رہا۔ اس پر اغلبی، پھر فاطمی (جن سے ابو یزید نے اس شہر کو کچھ عرصے کے لیے چھین لیا تھا) اور پھر زیری اور الموحدین حکمران رہے۔ ابن غانیَة نے دو مختلف موقعوں پر اسے فتح کیا، لیکن مستقل طور پر اسے اپنے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ آخر کار وہ بنوحفص کے قبضے میں آیا جو صدیوں تک اس پر قابض رہے، لیکن ان کا قبضہ اکثر مخدوش ھی سا رہا۔ ترکوں نے غالباً سولھویں صدی کے آخر میں اسے فتح کیا اور یہاں ایک فوج بھی رکھی، تا کہ وہ بلاد تونس کی سرحدات کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ ان سرحدوں پر حَنانشہ اور نَمانشہ کی طاقتور وفاقی ریاستوں سے اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ اس زمانے میں تبسّہ میں ایک تو وہ قصبہ شامل تھا، جو بزنطینی عہد کی فصیل کے اندر آباد تھا، اور ایک زاویے کا گاؤں جس میں سیدی عبدالرحمٰن المرابط کی اولاد اور آزاد کردہ حبشی غلام رہا کرتے تھے۔

اس شہر کی آبادی بہت مخلوط قسم کی ہے. جس میں آس پاس کے چھوٹے قصبوں اُوکُس (Oukes) اور بیکاریہ (Bekāria) کے باشندوں کے کنبے، بلاد تونس اور بلاد الجَرِید کے مہاجر، کولہ گولی لوگ (Kuluglis)، یعنی قلعہ گیر فوج کے سپاہیوں کی اولاد، جو مقامی عورتوں سے پیدا ہوئی (و غیر ذلک)، شامل ہیں۔ آخری عنصر، یعنی کولہ گولی غالب آ گئے اور انھوں نے آبادی کے غالب حصے پر حنفی مذہب مسلّط کردیا ۔ جب ۱۸۳۷ء میں فرانسیسیوں نے قُسَنْطِینَہ کو فتح کرلیا تو ترکوں کی قلعہ گیرفوج تو بلاد تونس کی طرف فرار ہو گئی اور غیرمحفوظ شہر خانہ بدوشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ۔ اس صورت حال کا خاتمہ کرنے کے لیے بعض عمائد شہر نے فرانسیسیوں سے مدد کی درخواست کی ۔ اس پر فرانسیسی فوج پہلے ۱۸۴۲ء میں اور پھر ۱۸۴۶ء میں تبِسّۃ کے سامنے آ موجود ہوئی ۔ ۱۸۵۱ء میں یہاں مستقل فوج رکھی گئی جس کی وجہ سے چھاونی کے قرب میں ایک یورپی نو آبادی قائم ہونے لگی۔

مآخذ : (۱) البکری : مسالک، ترجمہ و اشاریہ : ۳ : ۱۱۳؛ (۲) حسن بن محمد الوزّان الزیّاتی (Leo Africanus): *Description de l'Afrique*، ترجمۂ شیفر (Schefer)، ۳ : ۱۱۳؛ (۳) کاسٹل (Castel) : *Tébessa, Histoire et description d'un territoire algérien*، پیرس ۱۹۰۵ء؛ (۴) Féraud : *Notice sur Tébessa* در *Rev. Africaine*، ۱۸۷۴ء؛ (۵) Masqueray : *Documents historiques sur l'Aurès*، در *Revue Africaine*، ۱۸۷؛ (۶) Vayssière : *Les Ouled Rochaîche* در *Revu Africaine*، ۱۸۷ ۔
(یور G. Yver)

*تُبُّو : (Tūbū, Tibbu) صحرائے اعظم کے مشرقی حصے کے باشندے ۔ تبو ایک بہت بڑے وسیع علاقے میں آباد ہیں، جس کے مشرق میں صحرائے لیبیا اور مغرب میں ھَجّر (Haggar) ہے اور یہ علاقہ دونوں کے درمیان واقع ہے ۔ فزّان اس کے شمال میں ہے اور علاقۂ چاڈ جنوب میں۔ فزّان میں ان کی بہت بڑی تعداد علاقۂ القطرون (Gatrūn) اور الکُفرہ (Kūfra) میں پائی جاتی ہے ۔ وہ تِبِیستی، بَرکُو، بودیل (Bodele) اور وادای کے شمالی حصے اور بحرالغزال کی وادی میں بھی آباد ہیں ۔ کانِم اور کَوَر کے نخلستان میں بھی ان کی بیشمار آبادی ہے ۔ اھل یورپ نے ان سب کو 'تُوبُو' یا تُبّو کا نام دے رکھا ہے، لیکن اُن کے مختلف شعُوب اور قبائل کے اپنے اپنے نام ھیں۔تِبِیستِی کے باشندوں کو خاص طور پر تُوبُو کہتے ھیں۔ کَنوری زبان میں اس کے معنی اھلِ 'تُو' یا 'تِبِیسْتی' کے رھنے والے ھیں۔ تِبِیستی کے باشندے اپنے آپ کو تیدا کہتے ھیں ۔ اسی طرح اَمّا بورکُوا (بورکُو Borkū) کَرِیدہ، نورِیہ اور شِیرافاد (Cheurafade) وادای میں اور کوھِردہ (Koeherda) بحرالغزال میں آباد ھیں۔ لسانیات کے اعتبار سے ان کے دو گروہ پہچانے جا سکتے ھیں گو بولیاں، جو وہ بولتے ھیں، مفردات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ھیں، یعنی تِبِستی کے تِیدا اور جنوبی اضلاع کے دَزاجَدہ (دزا گدہ) جنھیں عرب گُورَن (Gouran) کہتے ھیں ۔

تُبُّو ایک طرف سیاہ فام سوڈانیوں سے اور دوسری طرف عربوں اور بربروں سے بخوبی متمیز ہو سکتے ھیں ۔ عام طور پر وہ پست قامت، چھریرے بدن اور سانولے رنگ کے ہوتے ھیں، ان کی ناک ستواں، بعض کی عقاب کی چونچ کی طرح قدرے خمدار ہوتی ہے ۔ ان کے ہونٹ پتلے اور بال ہموار ہوتے ھیں؛ یہ جسمانی خصوصیات تِیدا لوگوں میں خاص طور پر نمایاں ھیں، کیونکہ وہ اپنے دور دراز پہاڑوں میں الگ تھلگ رھتے چلے آئے ھیں۔ یہ لوگ دزاجدہ (دزا گدہ) کے باشندوں کے اندر بھی، جن میں حبشی خون کی کم و بیش آمیزش ہے، بکھرے

ہوئے ملتے ہیں ۔ ان کے ملک کے افلاس نے انہیں ہمیشہ بدبخت و بدحال رکھا ہے ۔ ان میں سے کچھ تو بدوی ہیں اور کچھ حضری ۔ ان کی آمدنی کے اہم ذرائع یہ ہیں: کھجوروں اور غلے کی کاشت جو ''اِنّدی'' (''ennedi'') کی سیراب وادیوں میں کی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ تِیبستی میں بکریاں اور علاقۂ چاڈ میں مویشی بھی پالے جاتے ہیں۔ تِیدا لوگ اپنے اونٹ کرائے پر دے کر بھی کچھ روپیہ کما لیتے ہیں۔ وہ قافلوں کی رہنمائی بھی کرتے ہیں، مگر ان کا خاص پیشہ لوٹ مار ہے ۔ جب کبھی انہیں غارت گری کا موقع مل جائے وہ اس سے نہیں چوکتے۔ اس قسم کی طرز معاشرت کے باعث حیرت انگیز طور پر تکان اور بھوک کی سختیوں کا مقابلہ کر لینے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ غدار اور بے رحم ڈاکو بھی بن گئے ہیں اور اس بارے میں ناختیگل (Nachtigal) سے لیکر، جس نے سب سے پہلے ان کا مطالعہ کیا، آج تک کے تمام یورپی سیاح متفق ہیں ۔ حضری تُبُو گروہوں میں ملتے ہیں، لیکن ایسے گروہ اصولاً کچھ زیادہ تعداد پر مشتمل نہیں ہوا کرتے ۔ وہ یا تو پتھروں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتے ہیں جن پر کھجوروں کی شاخیں پھیلا دیتے ہیں یا درختوں کی ٹہنیاں کھڑی کر کے ان پر چھپر ڈال لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایسے غاروں میں بھی رہتے ہیں جن میں سامان یونہیں سا ہوتا ہے۔ جھونپڑیوں کے آس پاس جو معمولی سا باغیچہ ہوتا ہے، اس کی دیکھ بھال غلام کرتے ہیں اور تُبُو خود یا تو لڑنے بھڑنے میں مشغول رہتے ہیں یا گلے چراتے ہیں۔

تُبُو دو طبقوں میں منقسم ہیں: اشراف یا ماینہ (maina) اور عوام ۔ تِیدا لوگوں میں قبیلے یا مطلق الاختیار حاکم ہیں یا بردہ صفت محکوم ۔ حاکم قبائل تین ہیں: تُماغیرہ، گُونْدہ، جو تقریباً سب کے سب ہجرت کر کے فِزّان چلے گئے ہیں، اور تُزبہ ۔ سلطان تِیبستی یا دِرْدای، جو مجلس اشراف کی اعانت سے حکومت کرتا ہے، لازمی طور پر قبیلۂ تُماغیرہ ہی سے چُنا جاتا ہے ۔ اس کے برعکس تُبُو کے درمیان سودانیوں کی طرح 'حدّاد' (لہار، ماہی گیر اور شکاری) بالکل الگ طبقہ ہے، جسے چھوٹے درجے کی ذات سمجھا جاتا ہے اور سب اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ مذہبی نقطۂ نظر سے تُبُو سب مسلمان ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حال ہی کے زمانے میں انہیں مسلمان کیا گیا ہے ۔ عرب ان سے سخت حقارت کا سلوک کرتے ہیں اور انہیں کافر سمجھتے ہیں ۔ انہوں نے اشیاء پرستی کے توہّمات و رسوم کو تاحال محفوظ و برقرار رکھا ہے اور ان کی بعض رسمیں تو قرآنی احکام کے بالکل خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر وہ قتل ہو جانے کی صورت میں خون بہا (دیت) نقد قبول نہیں کرتے، نہ وہ خمر (شراب) کے استعمال کے متعلق امتناعی احکام مانتے ہیں ۔ اس کے باوجود تُبُو کچھ کم متعصب مسلمان نہیں، بالخصوص تِیبستی، بُرکو اور بحرالغزال میں تو بڑے کٹر عقیدے کے لوگ موجود ہیں۔ وہ زیادہ تر سنوسیوں، زاویۂ واُو Waū اور زاویۂ انگلکہ Anigalaka وغیرہ کے زیر اثر ہیں اور انہوں نے یورپی لوگوں کے داخلے اور نفوذ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے ۔

تُبُو کی تاریخ کے متعلق ہمارے پاس صرف نامکمل اور جزوی یادداشتیں موجود ہیں ۔ عرب مصنّفین مقریزی کے وقت تک اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے ۔ اس مصنف کی ایک عبارت پر انحصار کرتے ہوئے، جسے الحسن بن محمد الوزّان الزیّاتی (لیو افریقی Leo Africanus) نے نقل کیا ہے، انہیں مدتوں بربر خیال کیا جاتا رہا ہے ۔ پھر انہیں بَرْدَوا (Bardoa) شمار کیا جانے لگا، جن کا ذکر ان دونوں جغرافیہ دانوں نے کیا ہے ۔ بارث (Barth) نے اس

خیال کے ساتھ اپنی تحقیق کو کہ تُبّو اور کنوری زبانیں آپس میں ملتی جلتی ھیں، مطابقت دینے کی کوشش کی ھے ۔ اس کے برعکس اب اس امر پر اتفاق ھے کہ تُبّو اصل میں سوڈان کے باشندے ھیں، جہاں سے انھیں صحراء میں ھنکا دیا گیا ۔ جو کچھ بھی ھو، معلوم ھوتا ھے کہ انھوں نے کانم کی تاریخ میں خاصا اھم حصہ لیا ۔ بعض عشائر نے کانمیوں کے ساتھ شامل ھو کر اس سلطنت کی تأسیس میں کارھاے نمایاں انجام دیے ۔ بارھویں صدی میلادی کے آخر تک سلاطین کانم کا یہ دستور تھا کہ وہ تبو قوم کی عورتوں سے شادیاں کیا کرتے تھے ۔ تبوؤں کے کچھ آدمی کانم میں جا کر آباد ھوگئے تھے ۔ ان پر تیرھویں صدی میں وہ قبائل، جو تیبستی میں رہ گئے تھے، حملہ کرنے آئے ۔ سلطان دُوْنَم ثانی Dūname II کو ان سے ھفت سالہ جنگ لڑنا پڑی، جس میں اسے فتح ھوئی، لیکن اس کی سلطنت کے کل محاصل اس مہم پر صرف ھوگئے ۔ تبو چودھویں صدی میلادی میں بُولبہ Būlaba کے حلیف تھے اور انھوں نے کانم کے فتح کرنے میں بُولبہ کو مدد دی ۔ وہ جھیل چاڈ کے آس پاس کے علاقے میں بس گئے اور اپنے ھمسایوں کے نیک و بد میں شریک رھے [قب مادۂ بورنو و کانم] ۔ تیبستی کے تُبوؤں کے متعلق سترھویں اٹھارھویں صدی سے پہلے کچھ یقینی معلومات دستیاب نہیں ھو سکیں ۔ اس زمانے میں وہ بار بار بورنو اور فزّان پر حملے کرتے رھے ۔ ۱۷۸۸ء میں انھیں شکست ھوئی اور انھوں نے اس ملک پر حملے بند کر دیے، لیکن انیسویں صدی کے نصف ثانی میں انھیں خود وُلَد سُلیمٰن (اولاد سلیمان) اور تُوآرِگ (طوارق) کے متواتر حملوں سے اپنے آپ کو بچانا پڑا ۔

مآخذ: (۱) L. Bally: *Le Tibesti*، *Bulletin Comité Afrique française* ۱۹۱۴ء؛ (۲) بارث (Barth): *Reisen und Entdeckungen*......، گوتھا ۱۸۵۷ء؛ (۳) Comème: *Sammlung und Bearbeitung central-afrikanischer Vocabularien*، گوتھا ۱۸۶۲ء؛ (۴) Behm: *Land und Volk der Tebu*، در *Petermanns Mitteilungen*، Ergänzungsheft عدد ۸، گوتھا ۱۸۶۱ء؛ (۵) Blaisot: *Le Tibesti d'hier et de demain*، در *Bulletin Comité Afrique française*، ۱۹۲۱ء؛ (۶) H. Carbau: *La région du Tchad et du Wadaï*، پیرس ۱۹۱۲ء، شائع کردہ *la Faculté des Letters d'Alger*، ج ۴۸ و ۴۹ [؟]؛ (۷) d'Escayrac de Lauture: *Le Sahara et le Soudan*، پیرس ۱۸۵۵ء؛ (۸) F. Krasnel: *Mémoire sur le Ouadaï*، *Bulletin Sociét. Géographie*، پیرس ۱۸۴۹ء؛ (۹) کراؤزے (Krause): *Zur Völkerkunde Nord-Africas, (I) Die Teda und Kanūri, (II) Die Teda und die Garamanten*، در *Zeitschrift der Geogr. Gesellschaft*، برلن ۱۸۷۶ء؛ (۱۰) Martin: *Note sur les Toubou (Bulletin Comité Afrique française*، ۱۹۱۰ء؛ (۱۱) 'محمد' اور 'تُونسی': *Voyage au Wadaï*، ترجمہ از پیرون (Perron)، پیرس ۱۸۵۱ء؛ (۱۲) ناختی گال (Nachtigal): *Sahara und Sūdan*، برلن ۱۸۷۹ تا ۱۸۸۹ء.

(یور G. Yver)

تبوک: درب الحج پر ایک شہر جو دمشق ـ مدینہ ریلوے کا ایک سٹیشن بھی ھے ۔ (یاقوت کے بیان کے مطابق یہ الحِجر سے چار دن کی راہ پر ھے اور مدینۂ [منورہ] سے بارہ دن کی راہ پر)؛ یہ ریتلے میدان کی معمولی سی اونچائی پر واقع ھے اور اس کا کنواں بہت ھی اچھا ھے ۔ غالباً یہی وہ کنواں ھے جس کا ذکر قصص عرب میں بھی آیا ھے ۔ یہاں کی اھم‌ترین عمارت حاجیوں کا قلعہ ھے، جو ایک کتبے کے مطابق ۱۰۶۴ھ (۱۶۵۴ء) میں تعمیر ھوا ۔ اس کا قدیم‌ترین حصہ بعد کی ترمیمات سے بخوبی

متمیز ہے ۔ اس کے علاوہ دور حاضر کی ایک مسجد ہے، جس کی عمارت میں خوبصورت ترشے ہوے پتھر لگے ہوے ہیں ۔ اُوائٹنگ (Euting) نے اس عمارت کو تقریباً خالی پایا، کیونکہ اس میں صرف پانچ فوجی حفاظت کے لیے موجود تھے ۔ یوسان (Jaussen) اور ساونیاك (Savignac) کوئی چالیس گھروں کا ذکر کرتے ہیں، جن کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں اور جن کی چھتوں پر درختوں کی شاخیں اور ان پر ٹوٹے پھوٹے اینٹ پتھر پڑے ہوے تھے ۔ پھلوں کے درختوں کی حالت سے ظاہر تھا کہ ان سے بہت غفلت برتی جا رہی تھی ۔ نبی [کریم صلی اللہ علیہ و سلّم] کے زمانے میں تبوك بلاد عرب کی شمالی سرحد کے خط پر واقع تھا، اس سے پرے بزنطینی حد شروع ہو جاتی تھی ۔ جب ۹ ھ میں نبی [اکرمؐ] نے شمالی علاقوں کے خلاف غزوۂ عظیمہ شروع کیا تو اس جگہ کو تاریخی اہمیت حاصل ہوگئی ۔ جب آپ یہاں پہنچے تو رومی، عاملة، لَخم اور جُذام، جو یہاں جمع ہوگئے تھے، منتشر ہوگئے ۔ آپ نے اس مہم کو ترك کرنے کا فیصلہ کیا ۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے آپ یہاں دس راتوں سے کچھ زیادہ [طبقات ابن سعد : بیس راتیں] ٹھہر کر واپس ہوگئے ۔ ان ایام کے قیام سے آپ نے یہ فائدہ اٹھایا کہ [تبوک] اَیلَة ، اَذرُح ، مَقنا [اور الجَرباء] کے لوگوں سے آپ کی بات چیت ہوئی اور وہ مطیع ہوگئے ۔

مآخذ : (۱) یاقوت : معجم، طبع ویسٹنفلٹ، ۱ : ۸۲۴ ببعد؛ (۲) ابن ہشام، طبع ویسٹنفلٹ، ص ۹۰۲ ببعد؛ (۳) طبری، طبع ڈ خویہ، ۱ : ۱۶۹۲ ببعد؛ (۴) واقدی : ترجمہ از ولہاوزن، ص ۳۹۰ ببعد؛ (۵) البَلاذُری : طبع ڈ خویہ، ص ۵۹؛ (۶) Doughty : *Travels in Arabia Deserta*، ۱۹۲۳ء، ۱ : ۱۲۲ ببعد؛ (۷) اُوائٹنگ (Euting) : *Tagebuch einer Reise in Innerarabien*، ۱۹۱۴ء، ۲ : ۱۸۰ تا ۱۸۵؛ (۸) یوسان (Jaussen) اور ساونیاك (Savignac) : *Mission archéologique en Arabe*، ۱ : ۵۷ تا ۷۰۔

(FR. BUHL بول)

تِپتیر : (TEPTYAR) ترکی لوگ ہیں جو اپنے آپ کو تِپتیر یا باشقُرت کہتے ہیں ۔ بقول وامبیری (Vambéry) یہ لفظ فعل *tepte* سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں گھومنا پھرنا، جولان کرنا، اس لیے اس کے معنی ہوے گھومنے پھرنے والے، جوّال؛ مگر راڈلوف : *Wörterbuch*، (۳ : ۱۱۱۴) میں ایسے کسی فعل کا ذکر نہیں ہے اور صرف تِپتیر کے معنوں میں یہ لکھا ہے کہ یہ ایک "قبیلے کا نام ہے جو ولایت (gouvernement) اُورن بُورگ میں ہے" ۔ اٹھارھویں صدی کی روسی دستاویزات میں تِپتیر کے لفظ کو اکثر بوبیل (*bobil'*) کے لفظ کے ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے، جو کسی قبیلے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی ہیں "وہ کسان جس کا نہ کوئی گھر بار ہو، نہ زمین" ۔ بقول کرامزین (Karamzin) (ج ۱، حاشیہ ۳۷) تپتیر مخلوط النسل لوگ تھے، جن میں چرمیس (Čeremiss)، وتیاق (Votyaks)، چوواش (Čuwash) اور تاتاری شامل تھے، جو قازان [رک بآن] کی سلطنت کے زوال کے بعد سولھویں صدی میں باشکیروں [قب مادۂ باسجرت] کی طرف بھاگ آئے تھے ۔ موجودہ خیال کے مطابق تپتر وہ لوگ ہیں جن میں باشکیر عنصر غالب ہے، لیکن ان میں دریاے والگا اور یورال کے علاقے کے عناصر بھی شامل ہیں ۔ وہ باشکیر زبان بولتے ہیں ۔ تپتروں نے باشیکروں کی ۱۷۵۵ء والی بڑی بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا ۔ آج کل تپترؔ زیادہ تر ولایت اورن بورگ اور اُوفا اور پرم کی سابقہ 'ولایات' (gouvernements) میں بھی آباد ہیں ۔ ان کا علاقہ خود مختار باشکیری جمہوریہ میں شامل ہے ۔ وہ کاشتکار ہیں، نیز شہد کی مکھیاں پالتے ہیں ۔ ان کی مجموعی تعداد پرانے

بیانات کے مطابق اب بھی تین لاکھ کے قریب ہے۔ بقول وامبیری مسلمانوں کے علاوہ ان میں کافر بھی تھے اور قریب تر زمانے سے ان میں عیسائی بھی ھیں۔ آج کل عام طور پر سب تپتیر سنّی مسلمان شمار ہوتے ھیں۔

مآخذ : (۱) وامبیری Vambéry : *Das Türkenvolk in seinen ethnologischen und ethnographischen Beziehungen*، لیپزگ ۱۸۸۵ء، ص ۵۲۰ ببعد؛ (۲) I. Zarubin : *Spisok narodnostei Soyuza Sov. Soc. Respublik*، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء، ص ۲۹، عدد ۱۱۴۔

(W. BARTHOLD بارٹولڈ)

تُتُش بن اَلْپ اَرْسلان، تاج الدّولہ : ملک شام کا سلجوق حکمران، ۴۷۱ھ تا ۴۸۸ھ (۱۰۷۹ء تا ۱۰۹۵ء)۔ ۴۷۱ھ میں یا بقول ابن عساکر ۴۷۲ھ میں تُتُش کو جب اس کے بھائی سلطان مَلِک شاہ نے شام کی حکومت دے دی تو اس نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ یہ سچ ہے کہ اسے پہلے یہ ولایت فتح کرنا پڑی، کیونکہ چند سال پہلے ترکمان امیر اَتْسِز [رَکَ بآن] نے بیت المقدس اور سارا فلسطین ماسوا چند قلعوں کے فاطمیوں سے چھین لیا تھا، لیکن فاطمی اپنے دعاوی سے دست بردار نہ ہوے اور اس سے برابر لڑتے بھڑتے رہے، یہاں تک کہ اتسز کو وہاں قدم جمائے رہنا مشکل ہو گیا۔ اسی سال انھوں نے اسے دمشق میں محصور کر لیا اور اس لیے اس نے تُتُش سے مدد مانگی۔ تُتُش نے، جو اس وقت صرف ۱۴ برس کی عمر کا لڑکا تھا (وہ ۴۵۸ھ میں پیدا ہوا تھا)، اس کی درخواست قبول کر لی، لیکن (شہر فتح کرتے) ہی اُس نے فوراً بدقسمت اَتْسِز کو قتل کرا دیا، تاکہ شہر پر خود بلا شرکت غیرے قابض ہو جائے۔ پھر وہ حلب کی طرف متوجہ ہوا، جس کا اس نے ناکام محاصرہ کیا۔ وہاں سے لوٹ کے اس نے گرد و نواح کے ممالک (بُزاعَة، اَلْبِیرَہ وغیرہ) کو فتح کیا۔ اس کی عدم موجودگی میں حلبیوں نے مسلم بن قریش عُقَیلی سے مدد مانگی۔ مسلم مِرداسیوں کے حکمران خاندان کو نکالنے اور مَلک شاہ [رَکَ بآن] سے اپنی حکومت تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ لازمی طور پر تُتُش کو یہ بات پسند نہیں آ سکتی تھی، اس لیے وہ فوراً ہی عُقَیلی امیر (مسلم بن قریش) سے الجھ گیا، جس نے (۴۷۶ھ / ۱۰۸۳ء) میں اسے دمشق میں محصور بھی کر لیا۔ اس دشمن سے اس کا چھٹکارا یوں ہوا کہ وہ سلیمان کے خلاف لڑتے ہوے مارا گیا، جو سلاجقۂ روم ہی میں سے تھا۔ اب چونکہ سلیمان اور تُتُش حَلَب کے معاملے میں ایک دوسرے کے رقیب تھے، لہذا آپس میں لڑنے لگے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان لڑائی میں مارا گیا (۴۷۹ھ / ۱۰۸۶ء)۔ لیکن اس پر بھی تُتُش اس شہر پر قبضہ نہ پا سکا، کیونکہ ملک شاہ ان علاقوں کا خود انتظام کرنے کے لیے بڑی بھاری فوج لے کر آ پہنچا تھا۔ اس نے حلب کا علاقہ اپنے دوست آقسنقر [رَکَ بآن] کو دے دیا۔ تُتُش اس کے قریب آنے پر پیچھے ہٹ گیا اور اس بات پر قناعت کی کہ وہ آقسنقر اور بُوزان سے، جسے ملک شاہ نے الرُّھا کا ملک عطا کیا تھا، متحد ہو جائے۔ ۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) میں ان حلیفوں نے ملک شام میں (حِمص، اَفامیہ وغیرہ کے مقام پر) نمایاں فتوحات حاصل کیں لیکن جب وہ طرابُلُس میں پہنچے تو وہاں کے عامل ابن عمّار نے آقسنقر کو راضی کر لیا اور اُس نے ابن عمّار کے خلاف کوئی کاروائی کرنے سے بالکل انکار کر دیا اور اپنی فوجیں لے کر واپس چلا گیا۔ اس پر تُتُش نے اُسے بڑی لعنت ملامت کی۔ بُوزان بھی واپس ہو گیا، اس لیے تُتُش کو بھی واپس ہونا پڑا، لیکن ملک شاہ کی اچانک موت کے باعث صورت حالات یک لخت بدل گئی۔ جانشینی کی غیر یقینی حالت کو مدنظر رکھتے ہوے دونوں ترکی امیر تخت کے

دعوے دار تُتُش کی اطاعت قبول کرنے اور مشرق سہم میں اس کی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نصیبین، آمد، میافارقین اور الموصل نے قہراً اطاعت قبول کی اور نصیبین میں تتش خوفناک قتل عام کا مرتکب ہوا ۔ جب یہ معلوم ہوا کہ برکیارُق اپنے باپ کا جائز وارث ہونے کی حیثیت سے سامنے آ رہا ہے، تو تُتُش کو مشکل میں گرفتار چھوڑ کر دونوں امیر برکیارُق سے جا ملے، اس لیے تتش ملک شام کی طرف ہٹ آنے پر مجبور ہو گیا، لیکن اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ ان امیروں سے انتقام ضرور لے گا، چنانچہ اس نے ان امیروں کے خلاف نبرد آزمائی کرنے کے لیے نئی فوجیں اکھٹی کیں۔ اُدھر یہی عمل ان امیروں نے بھی کیا جنھیں برکیارُق کی جانب سے کَربُوقا کی حمایت حاصل تھی۔ دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ تَلّ السُّلطان کے مقام پر ہوئی جو حَلَب کے جنوب میں ٦ فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے (۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء) ۔ تُتُش کو فتح حاصل ہوئی ۔ آقسُنقُر کو گرفتار کر کے اسی وقت قتل کر دیا گیا ؛ کَربُوقا اور بُوزان حلب بھاگ گئے ، لیکن اُنھیں بھی بالآخر ہتھیار ڈال دینا پڑے ۔ تتش نے بوزان کو بھی قتل کرا دیا اور اس کا سر کاٹ کر اپنے ایک سپہ سالار کو الرّھا میں بھیجا، تاکہ باشندے ڈر کر اس کی اطاعت قبول کر لیں ۔ سب نے فاتح (تتش) کی اطاعت قبول کر لی اور وہ فوراً اپنی فوجوں کے ساتھ عراق میں داخل ہو کر ہمدان میں آ گیا ۔ برکیارُق کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی، اس لیے وہ اس کے مقابلے سے ہٹ کر اصفہان کی طرف فرار ہو گیا، جہاں اُس کے چیچک نکل آئی ؛ تاہم شہر کے امیروں نے تتش کی اطاعت قبول کرنے میں لیت و لعل کی اور جب برکیارُق کو شفا ہوئی تو اُسے سمجھایا کہ دونوں دعوے داران تخت کے درمیان صرف تلوار ہی کے ذریعے فیصلہ ہو سکتا ہے ۔ برکیارُق کے گرد اطراف و اکناف سے فوجیں جمع ہونے لگیں اور اس نے الرّے کے نزدیک دَشِیلُو کے مقام پر تتش پر حملہ کر ہی دیا (۱۷ صفر ۴۸۸ھ / ۲٦ فروری ۱۰۹۵ء)۔ تتش کو اس کے سپاہی چھوڑ کر بھاگ گئے ؛ تاہم اس نے بڑی داد شجاعت دی، لیکن کہتے ہیں کہ وہ اقسنقر کے ایک سپاہی کے ہاتھوں مارا گیا جو اپنے آقا کا بدلہ لینا چاھتا تھا ۔ شام کا ملک اس کے بیٹوں رِضوان (رَکّ بان) اور دُقاق کو منتقل ہو گیا ۔

مآخذ : مادۂ سلجوق میں جن تصانیف کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں سے یہاں خاص کر ذیل کے مؤرخین کا ذکر کیے دیتے ہیں : (۱) مؤرخ دمشق، ابن القَلانسی، طبع آمدروز (Amedroz)، قب اشاریہ؛ (۲) مؤرخ حلب ، کمال الدین : زُبْدَةُ الطَّلَب ، نیز اس کی بُغْیَةُ الطَّلَب ، بالخصوص دیکھیے ان کتابوں کے اقتباسات در *Historiens Orientaux des Croisades*، ج ۳ (ص ۵۰۳ تا ۶۰۷)، ترجمۂ آقْسُنْقُر؛ (۳) ابن خلّکان، طبع بولاق ۱۲۹۹ء، ۱ : ۱٦۸ ببعد.

(ہوتسما M. Th. Houtsma)

تِجَارَۃ : (ع) سوداگری، بیوپار، فعل تَجَرَ سے مصدر بمعنی ''بیوپار کرنا'' ؛ فعل مذکور خود 'تاجر' سے، جس کے معنی ''بیوپاری'' یا ''سوداگر'' ہیں، بنایا گیا ۔ عرب کی تجارتی زبان کی بہت سی مصطلحات کی طرح تاجر بھی آرامی زبان سے مستعار لیا ہوا لفظ ہے، جو عربی زبان میں زمانۂ جاہلیت سے پایا جاتا ہے ۔ (تاجر کے متعلق قب مثلاً سریانی زبان کا لفظ [illegible] اور [illegible] بمعنی سوداگر جو فعل [illegible] سے اور وہ بجائے خود لفظ [illegible] سے مشتق ہے، جس کے معنے ''قیمت یا اجر'' کے ہیں)۔ اس بات سے قطع نظر کہ مادۂ 'ت ج ر' کے مشتقات عربی میں نمایاں طور پر کم ہیں، اس لفظ کا غیر عربی ہونا اس امر سے بھی ثابت

ہے کہ اس کے ابتدائی معنی 'بائع خمر' یعنی مے فروش کے تھے ۔ زمانۂ قدیم میں آرامی تاجر، جنھیں عربوں سے واسطہ پڑا، ضرور تاجرانِ خمر ھی ھونگے ۔ جب عربی زبان نے اس لفظ کو اپنا لیا تو اس کے معنی میں وسعت پیدا ھوئی اور اس کے مفہوم میں ہر قسم کے سوداگروں کو شامل کر لیا گیا ۔ اس کے صیغۂ جمع کی غیریقینی صورت بھی اس کے غیر عربی ھونے پر دلالت کرتی ہے ۔ ابن الاثیر : النهایة (بذیل مادہ) اس لفظ کی باقاعدہ جمع کی صورتوں (تُجّار اور تِجار) کے علاوہ تُجار بھی لکھتا ہے (قب Fraenkel : *Die aramäischen Fremdwörter im Arabischen*، ص ۱۸۱ ببعد) ۔ [اس پر دیکھیے دائرۃ المعارف الاسلامیۃ ۴ : ۱۰ ص ۵۸۱ ح کا اعتراض]۔

اسلامی ممالک کی تاریخ تجارت قلمبند کرنے کا یہ موقع نہیں، خصوصاً اس لیے کہ اب تک اس باب میں ضروری ابتدائی کار تحقیق نہ ھونے کے برابر ھوا ہے ۔ (قب مثلاً متس Mez : *Die Renaissance des Islâms*، ھائیڈل برگ ۱۹۲۲ء، ص ۴۴۴ ببعد [ترجمه از صلاح‌الدین خدا بخش، ص ۷۴۰ ببعد (؟) ۔ ادارہ]) ۔ ھماری یہ کوشش بھی نہیں کہ ھم اسلامی تجارت کی روح اور تجارت کے معمولات کی خصوصیات کی تعیین کریں، بلکہ اس کے بجاے ھمارا مقصد اولین یہ معلوم کرنا ہے کہ (ا) اسلام کا رویہ، بحیثیت مذھب، تجارت کے مسئلے کے متعلق کیا ہے، (ب) تجارت کے بارے میں اسلام کے موقف کا بیان احادیث میں کیونکر ھوا ہے، اور (ج) کتب اخلاق میں اس سے متعلق میلانِ فکر کس جانب کو ہے ۔ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر فقہی نقطۂ نظر سے بحث کے لیے قب مادۂ بیع۔

(الف) آنحضرت[۴] خود تاجر تھے ، اس لیے مدینے کی تجارتی جمہوریت کی فضا میں ان کا حامیِ تجارت ھونا ایک قدرتی بات تھی، کیونکہ اس جمہوریت کی خوشحالی کا تمام و کمال انحصار تجارت ھی پر تھا ۔ کم سے کم دورِ مکّی اول کی سب سے پرانی سورتوں میں سے ایک، یعنی سورۃ ۱۰۶ [سورۃ قریش] کی تأویل، جس کا زمانہ اشرافِ مکہ اور اسلام کا تصادم شروع ھونے سے کچھ ھی پہلے کا ہے، اسی بات کو سامنے رکھ کر کرنا پڑے گی : ''لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ.... الخ'' (''چونکہ (اللہ نے) قریش کو جاڑے اور گرمی کے سفروں کی چاٹ لگا دی ہے، تو ان کو چاھیے کہ اسی چاٹ لگا دینے کی وجہ سے اس خانۂ (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں، جس نے انھیں بھوک میں کھانے کو دیا اور (لوٹ کھسوٹ کے) خوف سے ان کو امن میں رکھا'')۔

لیکن اس زمانے میں بھی ان برائیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی، جو تجارت کو ملوّث کرنے لگی تھیں اور اس پر زور دیا گیا کہ تجارت قانون اور انصاف کے مطابق ھونی چاھیے ۔ [ارشاد باری ہے]: ''خرابی ہے گھٹانے والوں کی وہ لوگ کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا بھر لیں اور جب ان کو ناپ کر دیں تو گھٹا کر دیں (سورۃ ۸۳ [المطفّفین] : ۱ ببعد) '' ۔ (نیز قب ۵۵ (سورۃ الرحمٰن) : ۶ تا ۸، اور مکے کے تیسرے دور کی سورۃ ۶ (الأنعام) : ۱۵۳ ؛ سورۃ ۷ (الأعراف) : ۸۳) ۔ اس کے بعد [ایک اور نقطۂ نظر سامنے آتا ہے] جس کی ابتداء ضرور مکّی دور ھی میں ھوئی ھوگی، لیکن اس کی شہادت قرآن [مجید] کے فقط مدنی دور میں ملتی ہے .... [اس کی رو سے تجارۃ کو ممنوع تو قرار نہیں دیا گیا، لیکن یہ پہلو نمایاں ھوتا ہے] کہ تجارت میں کچھ ایسی بات ہے جو مؤمنین کو خدا کی عبادت اور اداے نماز سے روک سکتی ہے ۔ یہ بات نہایت زبردست طریق

سے [اصحاب صُفّه] کا ذکر کرتے ہوے مدنی سورة ۲۴ (النور) : ۳۷ میں واضح کی گئی ہے [رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ الخ] : '' وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد ، نماز قائم رکھنے اور زکٰوۃ دینے سے غافل نہیں کرنے پاتی اور وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی ''.

بہر حال ان آیات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مذہبی زندگی پر تجارت کے نقصان دہ اثرات کے متعلق زور دیا گیا ہے ۔ اس قسم کے افکار کے تسلسل کا نتیجہ مدنی دور میں یوں نظر آتا ہے کہ جمعے کی نماز کے وقت [جو فقط عبادت اور انسانی، مدنی اور اخلاقی فرائض پر غور کرنے کا وقت ہے] تجارت کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ۔ (سورة ٦۲ (الجمعه) : ۹ تا ۱۱ [يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا نُوْدِیَ الخ] : '' اے ایمان والو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو یاد الٰہی کی طرف لپکو اور بیچنا (کھوچنا) چھوڑ دو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے بشرطیکہ تم کو سمجھ ہو، پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل پڑو اور خدا کے فضل (یعنی معاش) کی جستجو میں لگ جاؤ اور کثرت سے خدا کی یاد کرتے رہو تا کہ تمھارا بھلا ہو، اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا (ہوتا) دیکھیں، تو اس کی طرف کو چل دوڑیں اور تمھیں کھڑا چھوڑ جائیں، کہو کہ جو اللہ کے ہاں ہے وہ تماشے اور سودے سے بہت بہتر ہے اور اللہ (سب) روزی دینے والوں سے بہتر (روزی دینے والا) ہے '' ۔ دوسری جانب مدنی دور کے اواخر میں اثناے حج تک میں تجارت کی صریح اجازت موجود ہے (سورة ۲ (البقرہ) : ۱۹۴) [لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ .. الخ]، لیکن اس پر بھی زور دیا گیا ہے کہ کنبه، قبیلہ، مال و متاع اور اسباب تجارت اللہ اور رسول کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں، جنھیں ترجیح دی جائے (سورة ۹ (توبه) : ۲۴) [قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ .. الخ] ۔ اسی آخری دور سے متعلق وہ مشہور احکام ہیں جو معاهدوں کو تحریری صورت دینے کے بارے میں ہیں (سورة ۲ (البقرہ) : ۲۸۲ آیة المداينة) ۔

(ب) مجموعی حیثیت سے یہ موقف تجارت کے حق میں ہے اور یہی موقف حدیث میں بھی اختیار کیا گیا ہے ۔ اگرچہ سٹے (speculation) اور لین دین میں بددیانتی کی سختی سے مذمت کی گئی ہے، تجارت کو نفع بخش اور معزز پیشه خیال کیا گیا ہے اور مویشی پالنے اور دستکاری سے زیادہ آمدنی کا شغل سمجھا گیا ہے (کنزالعمال، ۲ : عدد ۴۲۱۱ و ۴۲۲۷ و ۴۳۴۷) ۔ شریف سوداگر کو بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ ایک حدیث میں ہے : ''امین، دوست دار صدق [الصّدوق]، مسلم سوداگر قیامت کے دن شہداء کے ساتھ اٹھایا جائے گا'' (ابن ماجه، التجارات، باب ۱) ۔ وہ بہشت میں داخل ہوگا ۔ اس کے بر عکس بد دیانت (فاجر) تاجر کو سزا کی توقع رکھنا چاہیے؛ چنانچه ایک اور حدیث میں ہے (ابن ماجه : التجارات، باب ۳) ''اے معشر تجّار! قیامت کے دن سوداگروں کو فاجروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا، سوا اس کے جو خدا سے ڈرتا ہے اور نیکوکار اور راست باز ہے'' ۔ [ایک اور حدیث ہے جس میں یہی مضمون زیادہ تیز الفاظ میں ادا کیا گیا ہے] اگرچہ یہ حدیث احادیث آحاد میں سے ہے ۔ آنحضرت [صلّی اللہ علیه و سلم] نے فرمایا، ''سوداگر فاجر ہیں'' ۔ اس پر کسی نے کہا، '' اے رسول خدا ! کیا اللہ تعالٰی نے خرید و فروخت کو حلال نہیں کر دیا'' ۔ آپ[ص] نے جواب دیا، ''یقیناً، لیکن وہ بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں اور قسمیں

کھاتے ہیں اور گناہ کماتے ہیں (احمد بن حنبل، ۳ : ۴۲۸ قب ۴۴۴) - اس کے برخلاف (ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ) خدا اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ تجارت سے نفع حاصل کر کے بال بچوں کا پیٹ پالا جائے، چنانچہ [مسند امام زیدؒ میں حضرت علیؓ سے روایت شدہ ایک اثر ہے] (مجموع الفقہ، طبع گرفینی Griffini، عدد ۵۳۹، قب عدد ۵۴۴)، [= المجموع الفقہی، طبع منار، مصر، ص ۱۰۳؛ حاشیہ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، ج ۴، ص ۵۸۳] جس میں ہے: ''کسب حلال جہاد (یعنی اللہ کے رستے میں لڑنا) ہے اور اگر تم اسے اپنے بال بچوں اور قرابت داروں پر خرچ کرتے ہو تو یہ صدقہ ہے اور بے شک جائز تجارت سے کمایا ہوا ایک درہم ان دس درہموں سے افضل ہے جو دوسرے طریقوں سے کمائے گئے ہوں''۔ تجارت میں یہ بات قابل تعریف ہے کہ تاجر کشادہ دل اور دلجوئی کرنے والا ہو، ناپ اور تول میں پورا دے اور تولنے میں (گاھک کے لیے) جھکتا تولے [ابن ماجہ : ص ۱۶۱ باب الرجحان فی الوزن، حدیث ۱، ۲ و ۳] - صبح کا وقت تجارت کے لیے خاص طور پر مستحب اور نفع بخش ہے - آمیزش اور فریب سے احتیاط کی تاکید ہے، کیونکہ اس سے تجارت کی برکت جاتی رہتی ہے - مال میں جو خرابی ہو وہ خریدار کو خوب سمجھا دینا چاہیے - ''اگر کوئی شخص ناقص مال نقص ظاہر کیے بغیر فروخت کرے گا تو اللہ تعالٰی اس سے ہمیشہ بیزار رہے گا اور فرشتے اس پر ہمیشہ لعنت بھیجیں گے،، (ابن ماجہ : تجارات، باب ۴۵)، لیکن اگر کسی شخص سے اس قسم کے گناہ سرزد ہوں تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ دے کر اس کا کفّارہ ادا کرے - احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت[ص] نے مال میں، بالخصوص غذائی چیزوں میں، آمیزش کی مذمت فرمائی ہے [مثلاً دیکھیے کنزالعمال، ۲ : عدد ۴۳۷۵ تا ۴۳۷۹ - ادارہ]۔

تجارت باہمی رضامندی سے ہونی چاہیے - طرفین میں سے کسی پر جبر و قہر کبھی نہیں چاہیے - جب معاملہ طے ہو جائے تو اسے بائع یا مشتری صرف اس وقت تک فسخ کر سکتے ہیں، جب تک ایک دوسرے سے علٰحدہ نہ ہوں، اس وقت کے اندر ضمنی رضامندی سے بھی بیع فسخ ہو سکتی ہے (احمد بن حنبل، ۲ : ۵۳۶) - [حنفی قانون کی رو سے معاملہ طے ہو جانے، یعنی ایجاب و قبول، کے بعد بیع فسخ نہیں ہو سکتی، چاہے فریقین کبھی تک ایک ہی جگہ بیٹھے رہیں، یعنی ان کے ہاں خیارِ مجلس نہیں (ہدایہ اخیرین، ۳ : کتاب البیوع، طبع لکھنئو، ص ۲۰) - ادارہ] - مال دوسری جگہ اسی صورت میں فروخت ہو سکتا ہے جب پہلے اس پر قبضہ ('' قبض '' یا ''استیفاء '') کیا جا چکا ہو (اس مضمون کی حدیث میں صرف 'طعام' کا ذکر ہے) [امام مالک : موطا، طبع مصر ۱۳۷۰ھ، ص ۶۵، س ۲ ؛ قب کتاب مذکور، ص ۶۷، س ۱۷ و ۱۸ - ادارہ] - لیکن شارحین ہمیں بتاتے ہیں کہ طعام محض مثال کے طور پر بیان ہوا ہے - درحقیقت ایک حدیث میں تو بیع بالمعنی العام مذکور ہے (احمد بن حنبل، ۳ : ۴۰۲) [کنزالعمال، ۲ : ۲۰۴، عدد ۴۳۶۴؛ قب کنزالعمال، ۲ : ۲۱۰، عدد ۴۵۳۳ و ۴۵۳۴ - ادارہ]) - اگر آپس کے جھگڑے میں فریقین میں سے کوئی بھی اپنا مدعا ثابت نہ کر سکے تو اس صورت میں یا تو بیع درست قرار دی جاتی ہے اور بیع کرنے والے کا بیان صحیح سمجھا جاتا ہے ـــــ یا دونوں کو اس سودے سے دست بردار ہونا پڑتا ہے [ابن ماجہ : ۱۵۹، باب البیّعان یختلفان - ادارہ] - اگر خرید مال کے دو شخص دعویدار ہوں تو اصل خریدار اسے قرار دیا

جائے گا جس نے پہلے خریدا ہو [مالک : موطا، (و شرحه تنویرالحوالک للسیوطی) طبع مصر ۱۳۷۰ھ، ج ۲، ص ۹۷، س ۷ (باب بیع‌الخیار) قب کنزالعمال، ۲ : ۲۱۰، عدد ۴۵۲۱ تا ۴۵۲۳ - ادارہ]۔

عام طور پر حدیث میں اُس کاروبار کے خلاف کچھ نہیں کہا گیا ہے جس میں ادائے قیمت کے لیے کوئی آئندہ تاریخ مقرر کی جائے یا ادھار پر سودا ہو (''نسیئۃ'')، لیکن اس صورت میں نہ قیمت میں دیر کرنے سے کسی قسم کا کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ وقت سے پہلے ادا کرنے میں کٹوتی کی اجازت ہے (مالک : البیوع، حدیث ۸۱ [قب مالک : موطا، طبع مذکور ۲ : ۸۰ باب مَاجَاءَ فِي الرِّبَا فِي الدَّيْنِ ببعد - ادارہ]) قرض کے سودے میں قیمت کے بدلے کوئی چیز رہن رکھنا بھی جائز ہے، کیونکہ آنحضرت[ص] نے ایک دفعہ رسد خریدی اور اپنا آہنی زرہ بکتر رہن رکھ دیا [ابن ماجه، ص ۱۷۸، س ۵ ببعد، ابواب‌الرہون - ادارہ]۔

حدیث [شریف] میں بارہا اس سے منع کیا گیا ہے کہ تاجر مال کی عمدگی وغیرہ کے اثبات کے لیے قسمیں کھائیں؛ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ : قسموں کے ذریعے مال فروخت تو ہو جاتا ہے، لیکن اس کی برکت اٹھ جاتی ہے - (بخاری : بیوع، باب ۲۶ [یعنی ۲ : ۱۳، س ۱۳ و ۱۴؛ قب ابن ماجه، ص ۱۶۰، پایین صفحه - ادارہ])۔ ایک اور حدیث [بخاری : الربع‌الثانی، باب ۲۷، یعنی ۲ : ۱۳، س ۱۶ و ۱۷ - ادارہ] کے مطابق قرآن [مجید]، سورۃ ۳ (آل عمران) : ۷۱ کا شانِ نزول بھی اسی کے متعلق ہے - گو فروخت کے وقت قسمیں کھانے سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں - اس کا مفہوم اور ہے - وہ اس مناسبت سے نازل نہیں ہوئی - اس کا شان نزول محض دینی ہے [آیت کا تعلق حلف فی‌البیع سے یوں ہے کہ اس میں '' و اَیْمَانِہِمْ'' صریحاً مذکور ہے اور مفہوم بالکل عام ہے - ادارہ]۔

متعدد چیزوں کی خرید و فروخت از روے حدیث بالکل منع ہے : اول تو وہ چیز جس کا فروخت کنندہ مالک نہ ہو (احمد بن حنبل، ۲ : ۱۸۹ و ۱۹۰) [نیز دیکھیے کنزالعمال، ۲ : ۲۰۴، عدد ۴۳۶۵؛ قب کنزالعمال، ۲ : ۲۰۳، فصل ثانی، فرع اول - ادارہ] - دوسرے بہت سی چیزیں جن کا استعمال منع ہے یا نجس سمجھی جاتی ہیں ــــ شراب، سور، کتے، بلّیاں، بت (''اصنام'')، مَیْتَة [رک بآن] [ابن ماجه : ص ۱۵۷ پایین صفحه - ادارہ] اور پانی - پانی ایک حدیث کے مطابق وقف عام، یعنی اُن تین چیزوں میں سے ہے جو سب میں مشترک ہیں اور اسکی قیمت لینا حرام ہے (ابن ماجه : رُہُون، باب ۱۶)[= باب المسلمون شرکاء فی ثلاث، ص ۱۸۰، س ۹ از آخر صفحه]۔

حدیثوں میں بڑے زور شور سے اس دستور کی مذمت آئی ہے جو اب تک بلادِ مشرق میں کثرت سے رائج ہے، یعنی مول تول میں حجت اور تکرار یا سودے بازی کرنا - بیچنے والے کے لیے بھی دوسروں کے مقابلے میں قیمت بڑھا دینا جائز نہیں [کنزالعمال، ۲ : ۲۰۴، عدد ۴۳۵۷ تا ۴۳۵۸ - ادارہ] - حدیث میں قیمتوں کے بڑھا دینے (نَجْش) کی مذمت بھی آئی ہے [ابن ماجه، ص ۱۵۸، باب مَاجَاءَ فِي النَّهْيِ عَنِ النَّجْشِ - مناجشة کی تشریح کے لیے دیکھیے ابن ماجه، مقام مذکور، حاشیه ۵ - ادارہ] - اور اسی طرح احتکار، یعنی خوراك کا ذخیرہ روك رکھنا بھی منع ہے (احتکار کے لیے قب فرینکل Fraenkel : کتاب مذکور، ص ۱۸۹) [نیز دیکھیے ابن ماجه، ص ۱۵۶، حاشیه ۱۰ - ادارہ] - وہ شخص، جو سامان خوراك اس لیے روکتا ہے کہ اسے مہنگا کر دے، '' وہ خطا کار ہے '' (احمد بن حنبل، ۲ : ۳۵۱) [قب ابن ماجه،

ص ١٠٦، سطر قبل آخر و ص ١٠٧، س ١ - ادارہ]-
وہ شخص، جو سامان خوراك مسلمانوں سے روك رکھتا ہے، اللہ اسے جذام اور افلاس کی سزا دے گا (ابن ماجه، التجارات، باب ٦، [ص ١٠٧، س ١]) - احتکار کرنے والا لعنتی ہے [ایضاً، ص ١٠٦، سطر قبل آخر] اور حدیثوں میں آیا ہے کہ اسے دوزخ کی گہرائیوں میں پھینک دیا جائے گا (الطیالسی [ص ١٢٥]، عدد ٩٢٨) - اس کے برعکس آنحضرت[ص] نے اور اس امر کو منافی عدل قرار دیا اور قحط کے زمانے میں طعام کی قیمتیں مقرر کرنے سے انکار کر دیا (ابن ماجه : 'تجارات' ، باب ٢٧ ببعد)، مگر مجموعی طور پر حدیث خوراك کے ہر قسم کے احتکار کی مذمت کرتی ہے - سامان خوراك کی اندازے سے (از روی 'جُزاف')، یعنی بغیر ناپ تول کے، خرید و فروخت منع ہے [ملاحظه ہو کنزالعمال، ٢ : ٢٠٨، عدد ٤٣٨٠ و ٤٣٨١؛ قب کتاب مذکور، ص ٢٠٢، عدد ٤٣٠٣ و ص ٢٠٤، عدد ٤٣٥٦ - ادارہ] - سامان خوراك کا اسی جگہ، جہاں سے خریدا جائے، فروخت کر دینا منع ہے، لیکن ان مخصوص منڈیوں میں، جو اسی غرض کے لیے قائم کی گئی ہوں، وہیں خرید کر وہیں بیچ دینا جائز ہے- اسی طرح تلقّی کا دستور بھی منع ہے، یعنی (آبادی سے باہر جا کر) قافلے والوں سے باہر ہی باہر مال خرید لینا [ابن ماجه، ص ١٠٨، س ١٦؛ کنزالعمال، ٢ : عدد ٤٣١٤؛ قب ٤٣١٨ - ادارہ] - شہری کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بدوی سے مال خریدے اور شہر میں آ کر نفع پر فروخت کرے [ابن ماجه : ص ١٠٨، س ١٢ ببعد؛ نیز ملاحظه ہو کنزالعمال، ج ٢ : ٢٠٦، عدد ٤٣١٩ تا ٤٣٢٣ - ادارہ]- اسی لیے دلّالی (سَمْسَرَة) کی بھی مذمت کی گئی ہے [ابن ماجه، ص ١٠٨، س ١٦؛ بخاری، الربع الثانی ص ٢٨، باب ٦٨، آخر حدیث بر آخر صفحه و باب ٧٠، س ١٤ - ادارہ].

آخر میں ہم کاروبار کی ان تمام شاخوں اور دستوروں کا سلسلہوار ذکر کیے دیتے ہیں ، جو احادیث میں ممنوع قرار دی گئی ہیں :

١ - سب سے پہلے ایک ہی معاہدے کے تحت دو سودے نہیں ہو سکتے؛ مثلاً مال کا ایک حصه قرض اور دوسرا نقد خریدا جائے (قب احمد ابن حنبل، ١ : ٣٩٨).

٢ - بیع العُربان : فروخت کا ایک طریقه، جس میں زر بیعانه (عُربان یا عُربون > עֵרָבוֹן > ἀρραβών؛ قب فرینکل : کتاب مذکور، ص ١٩٠) ادا کیا جاتا ہے اور اگر سودا نہ ہو تو وہ بیچنے والے کی ملک سمجھا جاتا ہے [دیکھیے ابن ماجه ص ١٥٩، س ١٥ - ادارہ] - (مگر احمد بن حنبل کے نزدیک بیعانه دینے کی اجازت ہے، قب ابن الاثیر : نہایة، مصر ١٣١١ھ، ٣ : ٧٨ (بذیل ماده)).

٣ - بیع المُزایَدة : (نیلام)، تین صورتوں میں اس کی اجازت ہے، سخت مفلسی میں، علالت میں یا بے حد مقروض ہونے کی صورت میں [معلوم نہیں کہ صاحب مقاله نے یہ کہاں سے لیا - حواله نہیں دیا ہے - ابن ماجه میں ص ١٥٩ کے خاتمے پر ایک حدیث موجود ہے جس میں اس سے ملتی جلتی تین شرطیں بھیک مانگنے کے لیے دی گئی ہیں نه که بیع مزایده کے لیے، بلکه آپ[ص] نے اسی حدیث کی رو سے بیع مزایده ایک انصاری کے لیے خود بنفس نفیس اختیار کی - بیع مزایده (نیلام) بلا کسی شرط کے جائز ہے (ابن ماجه : حدیث مذکور، قب هدایه، لکھنؤ ١٣١١ھ، ٣ : ٦٩ ببعد، بذیل "وَ عَنِ السَّومِ عَلٰی سوم غیره" و ص ٧٠، "لَا بَأْسَ بِبَیْعِ مَنْ یَزِیْدُ" و ص ٧٠، حاشیه ٢ اور حدیث کنزالعمال ، ٢ : ٢٠٨ ، عدد ٤٣٧٣ فقہاء کے نزدیک قابل اعتناء اور معمول به نہیں ہے-

ابن ماجه کی حدیث مذکور بالا اور مسند اسحاق بن زاھویه کی حدیث (ھدایه، حوالۂ بالا) اس کے مقابلے میں قوی تر ھیں؛ نیز قب بخاری، طبع لائیڈن، الربع ثانی، کتاب البیوع، ص ۲۵، باب ۵۹ - ادارہ] -

۴ - بیع المُزابنة: (غالباً یه بھی آرامی زبان سے مأخوذ ھے - قب فرینکل، ص ۱۸۹) یعنی کوئی مال جس کا وزن، کَیل یا عدد معلوم نه ھو، سارے کا سارا صرف تخمینے سے اس مال کے عوض دینا جس کی مقدار وزن، کَیل یا عدد کے ذریعے معیّن ھو؛ مثلاً رطب (خرماے تر) کو، جو ابھی درخت پر ھے، تمر (پخته کھجوروں) کے معین پیمانے کے عوض دیا جائے یا ماکولات کا بیج کسی مقررہ طعام کے عوض فروخت کیا جائے - اس قسم کے سودے میں غیر یقینی اور قماری عنصر ھوتا ھے - اسے حدیث کی رو سے یوں ناجائز قرار دیا گیا کہ پیداوار، جس کی مقدار وغیرہ اسوقت ظاھر نه ھوئی ھو، خریدار کو حسب اتفاق زر خرید سے کم یا زیادہ آمدنی دے سکتی ھے - (قب احمد بن حنبل ۲: ۶۴) [بخاری طبع لائیڈن، ص ۳۲ ببعد، باب ۸۲؛ ھدایه، طبع مذکور، ۳: ۵۶، بذیل بیع المزابنة - ادارہ] - اس قاعدے کا رخ ناواجب منافع اندوزی کو روکنے کی طرف ھے ——— لیکن آنحضرت [ص] کی ایک حدیث کے مطابق اس میں ایک استثناء بھی ھے، یعنی بَیعُ العَرَایَا؛ اس صورت میں ایک غریب آدمی، جس کے پاس اپنا کھجور کا درخت نه ھو، اپنے بال بچوں کے لیے خرماے تر حاصل کرنے کی غرض سے خرماے خشک کے عوض خرماے تر، جو ابھی درخت پر ھے، خرید سکتا ھے، لیکن اس کی قیمت ضرور جانچنی پڑے گی [دیکھیے نهایة، بذیل مادۂ زبن - ادارہ] - متعدد محدثین کی راے میں اس قسم کا سودا صرف ایسی حالتوں تک محدود ھے جہاں مال کی مقدار پانچ وسق [وَسْق = بار شتر، ساٹھ صاع - ادارہ] سے زیادہ نه ھو، حالانکه عبداللہ بن عمرو بن العاص [رض] کی روایت کے مطابق آنحضرت [ص] نے اسے بھی منع فرمایا (۱) (احمد بن حنبل، ۲: ۱۸۳) [بخاری طبع لائیڈن، الربع الثانی، ص ۳۳، باب ۸۳ ببعد] -

۵ - بیع المُعَاوَمَة: کھجوروں کے درختوں کی پیداوار کی خرید دو تین سال کے لیے بمدّ پیشگی، یه ان چیزوں کی فروخت کا معامله ھے جو سودا ھونے کے وقت معرض وجود ھی میں نه آئی ھوں [ابن ماجه، طبع مطبع فاروقی دھلی، ص ۱۶۱، باب بیع الثمار سنین - ادارہ] -

۶ - بیع المُنَابَذَة: بائع و مشتری میں مبادله ھوتا ھے - اس میں مبادلے کا معاھدہ ناقابل انفساخ طور پر کر لیا جاتا ھے لیکن فریقین مال کی دیکھ بھال یا جانچ پڑتال پہلے سے نہیں کرتے اس قسم کے سودے کی ایک اور صورت کا نام بیع الحصاة ھے (قب [ھدایه اخیرین، طبع مذکور، کتاب البیوع، ص ۵۶ - ادارہ] ابن الأثیر: نهایة، بذیل حصا [۱: ۲۳۵، س ۲] جہاں اس کی مختلف صورتیں دی ھیں، جو سب غَرَر (دیکھیے ص ۱۴۱، شمارہ ۸) کی وجه سے ناجائز ھیں؛ ابن ماجه: ص ۱۵۹، باب النهی عن بیع الحصاة - ادارہ]؛ یا بَیعُ إلقاء الحَجَر (قب احمد بن حنبل، ۳: ۵۹ و ۶۸ و ۷۱) جس میں معاھدے کی تکمیل کی علامت یه ھے کہ مشتری اصل مال کے اوپر ایک پتھر کا ٹکڑا ڈال

---

(۱) [دائرة المعارف عربی میں اس مقام پر حاشیے میں کہا ھے کہ حدیث سے بیع العرایا کی ممانعت ثابت نہیں ھوتی - مسند کی حدیث (عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدّہ) میں بیع العُرْبان کی ممانعت کا ذکر آیا ھے، مگر مسند میں چھاپے کی غلطی سے 'بیع العربات' چھپ گیا ھے، جسے راقم مقاله نے عَرِیّة کی جمع سمجھ لیا - حدیث مذکور لفظ العُرْبان کے ساتھ موطأ مالک، ۲: ۴۶ میں موجود ھے] -

دیتا ہے یا مال کے بدلے ایک پتھر دے دیا جاتا ہے (قب مطرزی : مغرب، مادۂ نبذ) [هدایه، حوالۂ بالا، جس میں القاءالحجر کی تشریح بھی ہے ۔ ادارہ]۔

۷ - بیع الملامسة : اس میں بھی مال کا آنکھوں سے دیکھے یا پہلے معاینہ کیے بغیر سودا کر لیا جاتا ہے اور ڈھکے ہوے مال کو صرف ہاتھ سے چھو لیا جاتا ہے [بخاری، لائیڈن، الربع الثانی، ص ۲۶، باب ۶۳؛ قب هدایه، حوالۂ بالا ۔ ادارہ]۔

۸ - بیع الغرر : (بیمناک یا مخاطرے کا سودا)، اس قسم کی تجارت کے لیے احادیث میں کئی مثالیں بیان کی گئی ہیں؛ مثلاً وہ دودھ جو ابھی تھنوں میں ہو، ایک بھاگا ہوا غلام، مال غنیمت تقسیم سے پہلے، مچھلیاں جو ابھی پانی میں ہوں وغیرہ (قب مثلاً احمد بن حنبل، ۱ : ۳۰۲ و ۳۸۸؛ ۳ : ۴۲ [ابن ماجه، ص ۱۵۹ مع حاشیه ۵ - ادارہ]) ۔ اس کی عام ترین مثال جو بڑی پیچیدہ ہے بیع حبل الحبلة ہے، یعنی حامله اونٹنی کی بیع، جو ذبح کرنے کی نیت سے بیع کی جائے، اس امید پر کہ وہ مادہ بچہ جنے گی اور وہ مادہ (جوان ہو کر) بچہ جنے گی ۔ [بخاری، لائیڈن، ربع ثانی، کتاب البیوع، ص ۲۵، باب ۶۱ ۔ ادارہ]۔

اس قسم کے تمام سودے حدیث کی رو سے ممنوع ہیں، کیونکہ ان میں ایک غیر یقینی عنصر موجود ہے ۔ روپے کے مبادلے (" صرف ") کے بارے میں اور منافع اندوزی (ربا) کی ممانعت کے لیے متعلقه مادے ملاحظہ ہوں ۔ مذکورۂ بالا لین دین کا ذکر حدیث کی ساری قدیم کتابوں میں موجود ہے۔ ان سے بھی زیادہ تعداد میں یہ معاملات بالتفصیل بعد کے مجامیع حدیث میں ملتے ہیں؛ مثلاً دیکھیے کنزالعمال (قب رٹر Ritter در *Isl.*، ج ۷ (۱۹۱۷ء) : ۲۸، جہاں کئی حدیثوں کا ترجمہ بھی دیا ہوا ہے)۔

(ج) [پہلی تین صدیوں میں جو احادیث جمع ہوئیں ان میں] سوداگر سے باعزت اور منصفانه طرز عمل کا مطالبه کیا گیا ہے ۔ اسے ہدایت ہے کہ وہ اپنے گاھکوں سے "بھائیوں کا سا سلوک کرے" اور انھیں کسی قسم کا دھوکا دینے سے پرہیز کرے ۔ اس لیے حدیث ایسے کاروبار کو بھی مورد اعتراض قرار دیتی ہے، جس میں لاعلمی کا عنصر موجود ہو اور جہاں بخت آزمائی کو بھی دخل ہو، تاکہ کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے ۔ مسلمانوں کے تجارتی فلسفۂ اخلاق کے یہ بنیادی اصول [امام] غزالی[۳] (م ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) نے احیاء علوم الدین (قاہرة ۱۳۲۶ھ، ۲ : ۴۸ ببعد) میں بیان کیے ہیں اور اس باب میں کلاسیکی حیثیت رکھتے ہیں ۔ بقول [امام مذکور] ہر شخص معاد کو مدنظر رکھتے ہوے اپنی روزی پیدا کرے ۔ ان کے نزدیک کسب معاش سعادت اخرویه (معاد) کا ایک ذریعہ ہے ۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو کچھ یہاں بویا جائے گا آخرت میں کاٹا جائے گا [الدنیا مزرعة الآخرة] ۔ لیکن غزالی[۳] تجارت کو کسب معاش کے دوسرے طریقوں سے علی الاطلاق بہتر نہیں خیال کرتے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ "تجارت کے ذریعے تاجر یا تو بقدر کفایت آسودہ حالی طلب کرتا ہے یا دولت اور کفایت سے زیادہ مال"۔ وہ ایسی دولت اندوزی کی مذمت کرتے ہیں جو اچھے کاموں ("خیرات و صدقات") پر صرف نہ ہو، لیکن بقول ان کے اگر ایک سوداگر اپنے اور اپنے کنبے کے لیے بقدر کفایت روزی حاصل کرتا ہے، تو یہ عمل بہر حال بھیک مانگنے سے بہتر ہے، مگر بعض لوگوں مثلاً عبّاد، علماء، و صلحاء، صوفی، اور ملازمان حکومت کے لیے اس قسم کے اشغال سے احتراز اولٰی ہے ۔ اس کے بعد غزالی تجارت کے اخلاقی پہلو پر تبصرہ کرتے ہیں، جس کا

یہاں ہم صرف خلاصہ ھی پیش کر سکتے ھیں :

ھو سکتا ھے کہ کوئی کاروبار حدود قانون کے اندر اور ناقابل ملامت تو ھو، مگر اخلاق کے خلاف اور دوسروں کے لیے نقصان دہ ھو، اس لیے کہ ھر ممانعت ھر معاھدے کو ناجائز نہیں بنا دیتی۔ اس کے بعد غزالی دو قسم کے کاروبار میں فرق بیان کرتے ھیں : ایسے کاروبار جو پوری ملت (community) کے لیے نقصان دہ ھوں اور ایسے کاروبار جن سے فقط فردِ معامل کو نقصان پہنچتا ھو ۔ پہلی قسم میں سامانِ خوراک خصوصاً اناج کو روک کر رکھنا ھے (یعنی احتکار) اور کھوٹے سکوں کو چلانا۔ کھوٹے سکوں کی بابت دکاندار کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاھیے : ۱۔ اگر کسی کے پاس کھوٹا سکہ آ جائے تو چاھیے کہ اسے کنویں میں پھینک دے ۔ ۲۔ اس کے لیے ضروری ھے کہ وہ ملک کے رائج سکوں سے بخوبی واقف ھو ۔ ۳ ۔ اگر وہ لینے والے کی رضامندی سے کوئی کھوٹا سکہ اُس کے حوالے کرتا ھے تو وہ جرم سے بری نہیں، کیونکہ لینے والا اسے پھر چلا سکتا ھے ۔ ۴ ۔ اگر وہ کھوٹا سکہ کسی شخص کو ممنون کرنے کی خاطر قبول کر لیتا ھے تو وہ اس برکت میں، جو حسنِ نیت کی صورت میں تجارت پر نازل ھوتی ھے، صرف اسی وقت شریک ھوگا جب اس کی نیت یہ ھو کہ وہ سکہ کنویں میں پھینک دے گا۔

اس کے بعد غزالی اس کاروبار کا ذکر کرتے ھیں جو صرف فردِ معامل کے لیے نقصان رساں ھو۔ تجارت کا اصل الاصول یہ ھے کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے وھی سلوک روا رکھے جس کی وہ خود توقع رکھتا ھے، اس لیے :

۱ ۔ بائع کو اپنے مال و اسباب کی تعریف نہیں کرنا چاھیے اوز نہ اس کی عمدگی کے پرزور اظہار کے لیے قسمیں کھانا چاھییں، بلکہ اسے صرف اپنے مال کی وھی خوبیاں بیان کرنا چاھییں جو در حقیقت اس میں موجود ھوں، مگر استعمال سے پہلے خریدار کو معلوم نہ ھو سکتی ھوں؛ مثلاً لونڈی غلام کی قابلیت۔

۲ ۔ اسے اپنے مال کے تمام نقائص بھی بتانے چاھییں۔ مثال کے طور پر وہ صرف اپنے مال کے محاسن ھی بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے ۔ اسی طرح کسی اندھیرے کمرے میں مال نہ دکھائے وغیرہ وغیرہ، کیونکہ یہ فریب دھی اور ترکِ نُصح (خیر خواھی) ھے در حالیکہ اس کے بھائی کو حق حاصل ھے کہ اس سے خیرخواھی کی توقع کرے ۔ سوداگر کو دو باتیں ضرور یاد رکھنا چاھییں: پہلی تو یہ کہ گو وہ اپنے سامان کے نقائص کو چھپا کر اسے بیچ تو سکتا ھے مگر ایسا کرنے سے وہ اس برکت سے محروم ھو جاتا ھے جو تجارت پر مترتب ھوتی ھے ۔ دوسرے یہ کہ اس دنیا کے مال کے فوائد تو زندگی کے ختم ھونے پر ختم ھو جاتے ھیں، لیکن ناانصافی اور گناہ، جو تجارت کے دوران میں اس سے سرزد ھوں، باقی رہ جاتے ھیں۔

۳ ۔ سوداگر کو چاھیے کہ انصاف کے ساتھ پورا ناپے اور پورا تولے۔

۴ ۔ اسے اس دن کے بازار کا نرخ ٹھیک ٹھیک ضرور بتا دینا چاھیے۔

اس کے بعد غزالی تجارت میں چھوٹی چھوٹی مہربانیوں اور خوش اخلاقیوں کو عمل میں لانے کا ذکر کرتے ھیں، یعنی ایک شخص کو چاھیے کہ دوسرے کو ایسی رعایتیں دے، جن کے دینے کے لیے (اگر بدقت دیکھیں تو) وہ مجبور نہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی مہربانیوں کی تفصیل یہ ھے : (۱) بائع اس قیمت کے قبول کرنے سے انکار کر دے جو بازاری نرخ سے بہت زیادہ ھو؛ (۲) مشتری ھی زیادہ قیمت دینے پر راضی ھو

جائے، جب بائع غریب ہو؛ (۳) بقایا کی وصولی میں کوئی شخص کچھ مطالبہ معاف کر دے یا اس کی ادائگی کی میعاد بڑھا دے؛ (۴) مقروض قرض خواہ کا روپیہ اسے تکلیف سے بچانے کی خاطر خود ہی ادا کرنے کے لیے لے آئے؛ (۵) معاهده کرنے والے کی درخواست پر سوداگر ایسی خرید کا معاهده منسوخ کر دے جو مکمل ہو چکا ہو؛ (۶) کوئی شخص غریب لوگوں کو مال قرض دے اور روپے کا تقاضا اس وقت کرے جب انہیں ادا کرنے کی توفیق ہو یا اپنی بہیوں میں ان کا حساب کتاب درج نہ کرے اور ادائگی کاملاً ان کی مرضی پر چھوڑ دے۔

سوداگر کو چاہیے کہ نفع کی جستجو میں نجاتِ اُخروی فراموش نہ کر دے، اس لیے سوداگر کو لازم ہے کہ: (۱) اپنے کاروبار کا آغاز نیک نیتی اور نیک عقیدے سے کرے؛ (۲) وہ تجارت کو ''اجتماعی فرض'' (فرض کفایہ) سمجھ کر اختیار کرے، کیونکہ اس کا یہ پیشہ اجتماع کے پیچیدہ نظام کا محض ایک جزو ہے؛ (۳) اسے دنیا کا بازار عقبٰی کے بازاروں سے غافل نہ کر دے، (یعنی وہ مسجد میں جانا اور نماز ادا کرنا ترک نہ کرے)؛ (۴) منڈی میں داخل ہوتے وقت اور جب تک وہاں رہے اکثر خدا کی طرف دھیان رکھے؛ (۵) منڈی اور تجارتی کاروبار وغیرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہ پڑے، یہ نہ ہو کہ سب سے پہلے اس میں داخل ہو اور سب سے آخر وہاں سے نکلے اور تجارت کے لیے سمندر کا سفر کرے [کیونکہ یہ دونوں باتیں مکروہ ہیں، احیاء العلوم، قاهرۃ، ۲ : ۵۷، س ۱۷]؛ (۶) صرف حرام ہی سے پرہیز نہ کرے، بلکہ مشبّہات، یعنی مشکوک اور مشتبہ کاروبار سے بھی احتراز کرے؛ مال (''سِلْعَة'') کے حالات معلوم کرے کہ کہاں سے آیا ہے۔ جو لوگ ظلم، خیانت، چوری اور ربا کے لیے بدنام ہیں، ان سے معاملہ نہ کرے؛ (۷) کاروبار میں الفاظ اور اعمال میں محتاط و مراقب رہے، کیونکہ حشر کے دن اسے ان کا حساب دینا پڑے گا۔

بقول امام غزالی[۳] سوداگر کی منڈی اس کے لیے میدانِ جہاد ہے، جہاں وہ اپنے همجنسوں سے معاملہ کرتے وقت اپنے نفس کے ساتھ جنگ میں مصروف ہوتا ہے۔ چونکہ غزالی کے نزدیک تجارت آخرت کی ابتدائی منزل ہے، جس میں وہ آخرت کے لیے تیاری کرتا ہے، اس لیے غزالی اس راهبانہ نظریے کو رد کرتے ہیں کہ معمولی انسان دنیا سے کنارہ کش ہو جائے؛ وہ اسے میدان جنگ سے فرار قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح کے خیالات ادب اور اخلاق کی کتابوں میں عام ملتے ہیں، اگرچہ وہ ہر صورت میں غزالی کے بلند اخلاقیات کا مقابلہ نہیں کر سکتے؛ مثلاً تاج الدین السُّبکی (صاحب طبقات الشافعیة الکبری) (م ۷۷۱ھ / ۱۳۷۰ء) اپنی کتاب مُعِیدُ النعم میں سوداگر کے احوال سے کئی جگہ بحث کرتا ہے۔ ان مباحث میں وہ بلا شبہ اپنے ہی زمانے کی نمایاں صورتوں کو مد نظر رکھتا ہے؛ مثلاً یہ کہ وراّق (کاغذ کا سوداگر) ان لوگوں کو ترجیح دے جن کی بابت وہ جانتا ہے کہ یہ لوگ دینی کتابیں (''کتب العلم'') لکھنے کے لیے کاغذ خریدتے ہیں (اس کے بر عکس اسے ان لوگوں کے ہاتھ کاغذ نہیں بیچنا چاہیے جن کی بابت اسے شبہ ہو کہ وہ فاسد عقیدے والی مصنّفات [''البدَع وَالاَهْوَاء''] کے مرتب کرنے کے لیے یہ کاغذ برتیں گے یا جعلی دستاویزات یا [المُرافعات (۱) (عرض داشتوں)]

(۱) انگریزی متن میں 'المرافعات' کو بمعنی 'زیادۃ الضرائب' لیا ہے۔

وغیرہ کے لیے استعمال کریں گے (طبع موھرمن (Myhrmann)، لندن ۱۹۰۸ء، ص ۱۸۸؛ ترجمه ریشر (Rescher)، قسطنطنیه ۱۹۲۰ء، ص ۱۳۸) - کتاب فروش ["دَلَّالُ الكُتُب"] کو ایسے لوگوں کے ہاتھ دینی کتابیں نہیں بیچنا چاہییں، جن کے متعلق اسے علم ہو کہ وہ انہیں تلف کر دیں گے یا اس لیے پڑھیں گے کہ ان پر نکته چینی اور طعن کریں - نیز اسے فاسدالعقیده [أَهْلُ البِدَع وَ الأَهْوَاء] کی کتابوں کے فروخت کرنے سے باز رهنا چاهیے - اسی طرح نجومیوں کی تصانیف اور جھوٹی کہانیوں کی کتابوں ("الكتب المكذوبة")، مثلاً سیرۃ عنتر وغیرہ کی فروخت سے بھی بچنا چاهیے - اسے مصحف یا حدیث اور فقه کی کتابیں کافروں کے ہاتھ نہیں بیچنا چاہییں [معیدالنعم، طبع مذکور، ص ۴۰ ۲ (الدَّلَّالُون) - اداره]۔(اس کے بارے میں قب الشّافعی[۲] : اُمّ، ۳ : ۱۳۲ [سطر ۱۹] اور Heffening : *Fremdenrecht*، ص۹۳، حاشیه ۵، جہاں "keine" کا لفظ "hanaf Werke" سے پہلے حذف کر دینا چاہیے) - اسی طرح دلّالِ املاک کو محتاط رهنا چاهیے که وہ کسی وقف چیز کو فروخت نه کر دے۔ طبع موھرمن، ص ۲۰۵؛ ترجمۂ ریشر، ص ۱۵۰ ببعد)۔

(د) اس کے برخلاف ایک اور کتاب ہے جسے رِٹّر (Ritter) نے ترجمه کر کے طبع کیا ہے، اس میں تجارت کے اندر زیاده خودغرضانه رفتارِ اخلاق کی طرفداری کی گئی ہے - اس کا نام کتابُ الاشارَة الٰی مَحَاسِنِ التِّجَارَة ہے، جو ۵ یا ۶ صدی هجری / ۱۱ یا ۱۲ صدی میلادی کے ایک مصنف ابوالفضل جعفر بن علی الدمشقی کی تصنیف ہے - اس کتاب کے دو حصے ہیں؛ ایک حصے میں سوداگر سے بحث ہے اور دوسرے میں اس کے مال سے - مال تجارت پر اور بھی کئی تصانیف ہیں - بعض تو مستقل ہیں اور کچھ مواد مشہور اسلامی موسوعات کے ضمن میں ملتا ہے - اس سے متعلق دیکھیے رِٹّر (Ritter) : کتاب مذکور، ص ۱۷ ببعد - یہاں ہمارا تعلق زیاده تر ان فصول سے ہے جن میں سوداگر کا ذکر ہے - تاجروں کے مشہور طبقات یه ہیں :

۱ - تھوك فروش (یعنی خَزّان)، وہ اپنا مال سب سے زیاده مفید مطلب حالات میں خریدنے کی کوشش کرتا ہے تاکه وہ اسے اس وقت فروخت کرے جب وہ کم یاب ہو جائے اور قیمت چڑھ جائے، اس لیے اسے مال کی پیداوار کے مقامات کی منڈیوں کی حالت سے اور ان کے راستوں کے پر امن ہونے کے متعلق صحیح طور پر واقف رهنا چاهیے تاکه ان کی خرید و فروخت کا بہترین موقع اس کے ہاتھ سے نه نکل جائے - جنس کو بڑی کھیپوں میں خریدنے والے کو مشورہ دیا گیا ہے که وہ معاملے کی تکمیل چار اقساط میں پندرہ، پندرہ روز کے وقفے سے کرے تاکه قیمتوں کی اچانک تبدیلی یا دوسرے غیر متوقع حالات کی وجه سے نقصان نه اٹھانا پڑے - تھوك فروش کو ملک کی حکومت کے حالات کو بھی زیر نظر رکھنا چاهیے که آیا حکومت عادل و قوی ہے یا عادل و ضعیف، یا ظالم ——— ۔

۲ - جگه جگه جا کر بیچنے والا سوداگر ('رَکّاض')، اسے خاص طور پر غور کرنا ہے که وہ کیسا مال خریدے اور اس معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکه اس کا سفر لمبا ہو سکتا ہے یا کوئی غیر متوقع حادثه اسے پیش آ سکتا ہے؛ مثلاً راستے کا خطره، جس کی وجه سے اسے رکنا پڑے اور اپنا مال پھر اسی جگه فروخت کرنا پڑے جہاں سے خریدا تھا اور اس وجه سے اچھا خاصا نقصان برداشت کرنا پڑے - اسے اوسط نرخ کا علم ہونا چاهیے، یعنی وہ قیمت جو اسے اپنے وطن میں

اس مال کی بل سکتی ہے ۔ اسی طرح شرحِ عوارض (چنگی وغیرہ) سے بھی واقف ہونا چاہیے مبادا اس کا نفع خریدنے سے پہلے ہی غیر ملک کی نذر ہو جائے ۔ اسے اپنی منزل مقصود پر ایک معتبر گماشتے اور مال کے لیے کوٹھی (' مَخْزَن ') کا انتظام بھی کر رکھنا چاہیے ۔۔۔

۳ ۔ مال دساور بھیجنے والا سوداگر (' مُجَهِّز ')، اسے آڑھت سے کام لینا پڑتا ہے ۔ جہاں وہ اپنا مال بھیجتا ہے وہاں اسے قابل اعتماد گماشتہ (وکیل) مقرر کرنا چاہیے، جس کے پاس وہ اپنا مال کسی معتمد اور محتاط شخص کی نگرانی میں بھیجتا رہے ۔ یہ گماشتہ مال بیچتا ہے اور اس کی جگہ اور خریدتا ہے اور نفع میں شریک ہوتا ہے ۔

سوداگروں کو اور بہت سے قیمتی مشورے دینے اور ٹھگوں اور فریب کاروں سے متنبہ کرنے کے بعد، الدمشقی کی تصنیف میں، اقتصادی نظریوں پر بھی مباحث موجود ہیں؛ مثلاً بازار کے نرخوں کی تعیین اور " اوسط نرخ " جس کے متعلق سوداگر کو صحیح اطلاعات حاصل رہنی چاہییں ۔ اس امر کی تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی کہ ان تمام باتوں کا قدماء کے اقتصادی تصورات سے کیا تعلق ہے ۔

ابن خلدون بھی مقدمۃ (قاہرۃ ۱۳۱۷ ھ، ص ۱۴۴ ببعد [طبع ۱۸۷۹ء، ۱ : ۳۴۵]، ترجمہ در *N.E.* ۲ : [۱۸۶۵ء] ۳۴۸ ببعد) میں اسی نوع کے خیالات کا اظہار کرتا ہے ۔ وہ بھی اپنے ملاحظات " خَزّان " (تھوک فروش) اور " رَكّاض " سوداگر کے عنوانوں کے تحت تقسیم کرتا ہے اور بظاہر مُجَهِّز (بر آمد کرنے والے) سوداگر کو چھوڑ جاتا ہے ۔ وہ تجارت کی تعریف یوں کرتا ہے : تجارت نام ہے اپنی دولت میں اس طرح سے اضافہ کرنے کا کہ مال خریدا جائے اور زیادہ قیمت پر بیچا جائے، اس طرح کہ اسے نرخ کے بڑھنے تک ذخیرہ کیا جائے، یا اسے کسی اور ملک میں جہاں نرخ زیادہ ہوں لے جایا جائے ۔

جو فیصلے عمومِ تجار سے متعلق ابن خلدون نے دیے ہیں وہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔ وہ لکھتا ہے کہ تجارت کے پیشے میں یہ ضروری ہے کہ تاجر میں چالاکی (' مُكَايَسَة ') اور جھگڑا لو پن (مُمَاحَكَة) (۱) ہو، اپنے گاہکوں سے بات چیت کرتے وقت مکاری اور ہٹ (تحذلُق اور مُمَارسَةُ الخُصُومات) کا ثبوت دے : یہ سب صفات ایسی ہیں کہ وہ انسان کے احساس آبرو (مُرُوّت) انصاف اور اس کے دیگر محاسنِ اخلاق پر برا اثر ڈالتی ہیں ۔ چھوٹا تاجر اس قسم کے تاثرات بہت جلد قبول کر لیتا ہے، کیونکہ اسے صبح و شام برابر اپنے گاہکوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے؛ البتہ اس سوداگر کا حال اس سے مختلف ہے جو موافق حالات کے باعث دفعةً امیر کبیر بن جائے اور لوگوں میں معزز سمجھا جانے لگے ۔ وہ کسی حد تک تجارت کے اثراتِ بد سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ اس کا کاروبار زیادہ‌تر اس کے گماشتوں کے ہاتھ میں رہ سکتا ہے اور اس کا کام صرف یہ ہوتا ہے، کہ وہ ان کی نگرانی رکھے اور انہیں عام ہدایات دیتا رہے ۔

(ھ) اس مقالے کے شروع میں جو سوال اٹھایا گیا تھا کہ تجارت سے متعلق اسلام کا کیا رویہ ہے، وہ اس مسئلے کا ایک پہلو ہے جس پر زمانۂ حال میں چند مرتبہ بحث ہو چکی ہے کہ اسلامی ممالک کی اقتصادی ترقی کے امکانات کیا ہیں ؟ جنگ عظیم سے تھوڑی مدت پہلے تک اسلامی ملکوں میں اقتصادی ترقی کے امکان سے انکار کر دیا

(۱) ' مماحکۃ ' دراصل سودا کرتے وقت دیر تک باہم جھگڑا کرنے کے معنی میں ہے ۔ المحک التمادی فی اللجاجۃ عند المساوۃ و الغضب و نحو ذلک .

جاتا تھا، جیسا کہ اب بھی بسا اوقات مسیحی تبلیغی حلقے انکار کرتے ہیں ۔ بارٹولڈ کا تمہیدی مقالہ، جو اس نے *Mir Islama* کے لیے لکھا، اپنی قسم کا پہلا مضمون سمجھا جا سکتا ہے جس میں تاریخی شواہد کی بناء پر ثابت کیا ہے کہ مندرجۂ بالا خیال معقول نہیں۔ میکس ویبر (Max Weber) کے مذہبی اور عمرانی مطالعات کا تتبع کرتے ہوے بکر (C. H. Becker)، یونگہ (R. Junge) اور قریب‌تر زمانے میں ایلفرڈ ریل (Alfred Rühl) نے اس مسئلے سے بحث کی ہے اور وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام اقتصادی ترقی کا مخالف کبھی نہیں رہا ۔ ہاں یہ درست ہے کہ اقتصادیات میں مشرقی نقطۂ نظر مغربی نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے، جس کی وجہ مشرق کے مخصوص حالات ہیں، بالخصوص بعض نسلی خصوصیات اور تقریباً ہر جگہ کی خشک آب و ہوا اور پانی کی بہم رسانی کے مسئلے کی عظیم اہمیت؛ ان حالات نے ہر فرد کا اپنی ملّت کے ساتھ نسبۃً زیادہ قریبی رابطۂ اتحاد پیدا کر دیا ہے؛ چنانچہ مشرق میں اصلِ غالب منافسۃ نہیں، بلکہ تعاون ہے ۔ اندریں حالات ہر شخص اسلامی اخلاق تجارت کے بنیادی اصول کو سمجھ سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر سوداگر کو ذہن‌نشین رکھنا چاہیے کہ گاھک اس کا بھائی ہے ۔ پھر اس زبردست احساس کو کہ ہم ایک ہی ملت کے فرد ہیں، مذہب تقویت دیتا ہے، جو ہر مسلمان کے لیے اس کے ہر کام میں مشعلِ ہدایت ہے ۔ کاروبار تجارت بھی مذہب ہی کے تابع فرمان ہے ، لہذا اس کا کوئی علحدہ اور مستقل ضابطۂ اخلاق نہیں ۔

ان تمام باتوں کے باوجود مسلمان ممالک میں یہ اہلیت موجود ہے کہ وہ کاروبار کے جدید طریقوں کو اپنا لیں ۔ اسلام نے اس سے پہلے بھی بارہا ارتقاء کی اہلیت اور ماحول سے مطابقت کی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے اور مختلف ممالک، مثلاً ترکی اور مصر موجودہ زمانے میں اس کمی کی تلافی کر رہے ہیں، جو ترقی کے مختلف ابواب میں مدتوں کی غفلت سے پیدا ہو گئی تھی ۔ بعض ایسی شخصیتیں جیسے ضیا گوک آلپ اور محمد عبدہ، شاہراہ ترقی پر سنگ میل ثابت ہوئی ہیں [کَأَنّه عَلَمٌ فِی رَأسِهِ نَارٌ].

مآخذ : اس مقالے میں جو حوالے دیے گئے ہیں ان کے علاوہ (۱) کتب حدیث میں کتاب البیوع یا تجارات؛ (۲) Wensinck : *A Handbook of early Muhammadan Tradition*، لائیڈن ۱۹۲۷ء میں وہ حوالے جو بذیل مادۂ *barter* دیے ہیں؛ (۳) رٹر (Ritter): *Ein arabisches Handbuch der Handelswissenschaft*، در *Isl.*، ج ۱۷ (۱۹۱۷ء)، ص ۱ ببعد ؛ (۴) بارٹولڈ کا مقالہ جرمن زبان میں ترجمہ ہوچکا ہے، ملاحظہ ہو *W.I.*، ج ۱ (۱۹۱۳ء)، ص ۱۳۸ ببعد؛ (۵) C. H. Becker: *Islam und Wirtschaft*، در *Archv f. Wirtschaftsforschung im Orient*، ج ۱ (۱۹۱۶ء)، ص ۶۶ ببعد [= *Islamstudien*، ج ۱ (۱۹۲۴ء)، ص ۵۴ ببعد]؛ (۶) R. Junge : *Das Wirtschaftsproblem des näheren Orients.*، در *Archiv f. Wirtschaftsforschung im Orient*، ج ۱ (۱۹۱۶ء)، ص ۱ ببعد؛ (۷) ایضاً : *Das Problem der Europäisierung orientalischer Wirtschaft*، ویمر (Weimar) ۱۹۱۵ء، ص ۱۰۸ ببعد، ۲۶۰ ببعد (روسی ترکستان سے بحث کرتا ہے)؛ (۸) Alfred Rühl : *Vom Wirtschaftsgeist im Orient*، لیپزگ ۱۹۲۵ء (الجزائر سے بحث کرتا ہے)۔ قب نیز R. Hartmann : *Die Krisis des Islam*، لیپزگ ۱۹۲۸ء (= *Morgenland*, H.15).

(HEFFENING و ادارہ)

اَلتِّجانی : تونس کا ایک عرب مصنف ۔ اس کی زندگی کے متعلق ہمارے معلومات بمنزلۂ صفر ہیں، یہاں تک کہ اس کا نام بھی ہم تک ایک

متفق علیه صورت میں نہیں پہنچا ۔ اس کی کتاب رحلۃ کے (ملاحظہ ہوں Rousseau اور Bel کی تصانیف، جو ذیل میں مذکور ہیں) تمام قلمی نسخوں میں اس کا نام ابو محمد عبداللہ لکھا ہے اور یہی نام ابن الخطیب بن قنفوذ (*G. A. L*، ۲ : ۲۶۱ [و تکملہ ۲ : ۳۶۶]) کی کتاب الفارسیۃ فی مبادی الدولۃ الحفصیۃ (در Cherbonneau در *J. A.*، ۴ : ۱۷، ۱۸۵۱، ص ۵۳، ترجمہ ص ۶۴) میں ملتا ہے ۔ اس کی کتاب تحفۃ العروس و نزھۃ النفوس کے سر ورق پر اس کا نام ابو عبداللہ محمد بن احمد لکھا ہے ۔ حاجی خلیفہ (عدد ۲۶۲۳) بھی یہی نام لکھتا ہے اور الزرکشی اپنی تاریخ الدولتین الموحدیۃ و الحفصیۃ (تونس ۱۲۸۹ھ، ص ۵۱) میں بھی یہی نام بتاتا ہے، سوا اس کے کہ وہ اسے ابن ابراھیم لکھتا ہے ۔ اس کی نسبت کے مقطع اول کی حرکات کے متعلق بھی کتب مراجع میں اختلاف ہے کہ آیا وہ تجانی ہے یا تیجانی ۔ اس امر کی تصدیق کہ ان دو کتابوں کا مصنف، جو تجانی کی طرف منسوب ہیں اور اب تک محفوظ ہیں، ایک ھی شخص ہے، دو واقعات سے ہوتی ہے ۔ اول یہ کہ الزرکشی، جو تحفۃ والا نام استعمال کرتا ہے اور ابن الخطیب، جو رحلۃ والا نام برتتا ہے، دونوں بیان کرتے ہیں (جیسے خود رحلۃ میں بھی مذکور ہے) کہ التجانی کا حفصی خاندان کے امیر ابویحیٰی زکریا بن ابی العباس احمد اللحیانی (۷۱۱ھ تا ۷۱۷ھ / ۱۳۱۱ء تا ۱۳۱۷ء سے رابطہ تھا ۔ دوم یہ کہ جن تصانیف کا ذکر تحفۃ میں آیا ہے وہ ایسے زمانے سے متعلق ہیں جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب آٹھویں صدی ھجری (چودھویں صدی میلادی) کی ابتداء میں لکھی ہوگی ۔

اس کی زندگی کے حالات کے متعلق ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اس نے اپنے آقا یعنی بادشاہ کی ہم رکابی میں تمام شمالی افریقہ کا سفر کیا، جس کا تذکرہ وہ رحلۃ میں کرتا ہے ۔ یہ سفر تونس سے جمادی الاولٰی ۷۰۶ھ کے اواخر (آغاز دسمبر ۱۳۰۶ء) میں شروع ہوا ۔ اس کے ہم سفر حج کے لیے مکے جا رہے تھے، مگر التجانی اس قافلے سے ماہ محرم ۷۰۹ھ (جون ۱۳۰۹ء) میں علحدہ ہوا، کیونکہ اسے علالت کی وجہ سے وطن واپس آنا پڑا؛ قافلہ ابھی طرابلس سے زیادہ دور نہیں گیا تھا، جس کا سبب یہ تھا کہ راستے میں ہر جگہ لمبے لمبے مقام کرنا پڑتے تھے ۔ یہ طویل مقام سفرنامے کے لیے سودمند ثابت ہوے، کیونکہ ہر وہ چیز، جو اس نسبۃً چھوٹے سے علاقے کے سفر میں کچھ بھی دلچسپ معلوم ہوتی، آسانی سے ضبط تحریر میں لائی جا سکتی تھی ۔ اس لحاظ سے رحلۃ اس ملک کے متعلق، جس میں اسے گذرنے کا اتفاق ہوا، جغرافیائی، علمی اور خاص تاریخی معلومات کا ایک خزانہ بن گئی ۔ اس میں دستاویزوں کی نقول ہیں اور دوسرے مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات بھی درج ہیں ۔ جن کتابوں سے اقتباس لیے گئے ان کے ملنے کی اب امید نہیں اور انہیں اس زمانے میں معدوم ہی سمجھنا چاہیے ۔ جب اللحیانی تخت حکومت پر بیٹھا تو تجانی کا شمار بڑے بڑے ارکان دولت میں ہونے لگا ۔ ہمیں نہ تو اس کی موت کی تاریخ معلوم ہے، نہ ہی اس کی پیدائش کی ۔

رحلۃ کا مکمل ایڈیشن اب تک تیار نہیں ہو سکا، مگر اس کے طویل اقتباسات M. Amari : *Biblioteca Arabo-sicula*، ۱۸۵۷ء، باب ۴۵ میں منقول ہیں ۔ ایک مختصر اقتباس مع ترجمہ A. Bel نے بھی دیا ہے، دیکھیے *Les Benou Ghânya* سلسلۃ (*Publications de l'École des lettres d'Alger*, xxvii., 1903)، (تتمہ ۔ روسو A. Rousseau نے ساری کتاب میں سے اقتباسات

لیے ھیں اور ان کا ترجمہ بھی دیا ھے (.J. A، ج ۴/ ۲۰ (۱۸۵۲ء)، ص ۷۵ ببعد؛ ج ۵/۱ (۱۸۵۳ء)، ص ۱۰۱ ببعد، ۳۵۴ ببعد)، مگر انتخاب کسی خاص اصول کے ماتحت نہیں کیا گیا ۔ علاوہ ازیں متن کی ترتیب ناقص ھے ۔ اور ترجمے کو بہت احتیاط سے پڑھنے کی ضرورت ھے ۔ متن کی کئی عبارتوں کا [بغرض تصحیح] ابن خلدون کی کتاب العِبَر سے مقابلہ کیا جا سکتا ھے۔

التجانی کی دوسری تصنیف عشق و محبت اور شادی کے مضمون پر ھے ۔ ۲۵ بابوں میں وہ بیوی کے انتخاب کے بارے میں مشورے دیتا ھے ۔ نسوانی خوبصورتی کی علامات کا ذکر جسم کے مختلف اعضاء کے ماتحت کرتا ھے اور بتاتا ھے کہ عورتوں سے کس طرح سلوک کرنا چاھیے ۔ پھر متأھل زندگی کا بیان ھے ۔ شادی اور اس کے لطف کو دوبالا کرنے کے طریقوں کا ذکر احادیث اور مختلف مصنفین کے اقتباسات کی صورت میں پیش کیا ھے جنھیں تقریباً تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا گیا ھے ۔ علمائے دین اور فقہاء کے کلام کو بڑی تفصیل سے نقل کیا گیا ھے، مگر اس استشہاد میں اخلاق اصول کو فقہ کی نسبت بیشتر ملحوظ خاطر رکھا گیا ھے ۔ اس کتاب کے مخطوطات اور مطبوعہ متون کے لیے ملاحظہ ھو براکلمان : .G. A. L، ۲ : ۲۵۷ [تکملة، ۲ : ۳۶۸]۔

مآخذ : مقالے میں دے دیے ھیں ، قب نیز Stori dei Musulmani di Sicilia : M. Amari، ج ۱، ۱۸۵۴ء، ص ۷ اور تصانیف جن کا حوالہ A. Bel نے کتاب مذکور میں دیا ھے ۔

(پلسنر M. Plessner)

تجانیّة : (تِجّانی اور تِجینی بھی لکھتے ھیں)، صوفیوں کا ایک طریقہ، جس کا سر سلسلہ ابوالعباس احمد بن محمد بن المختار بن سالم التِّجّانی (۱۱۵۰ھ تا ۱۲۳۰ھ / ۱۷۳۷ء تا ۱۸۱۵ء) تھا [احمد اصلاً بنو توجین، امراء تاھرت میں سے تھا ۔ تحفة الزائر، ۱ : ۸۰ ۔ ادارہ]۔

۱ - سرِ سلسلہ کے حالات زندگی : احمد مذکور عین ماضی میں پیدا ھوا تھا ۔ یہ گاؤں [اعمال وَھران کے جنوب مشرق میں] الأغواط (Laghuat) کے مغرب میں ۷۲ اور تَہمت کے مشرق میں ۲۸ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ھے ۔ شیخ کے خاندان کو ''اَوْلاد سِیْدی شیخ محمد'' کہتے تھے ۔ اس کے والدین ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۳ء) میں بعارضۂ طاعون فوت ھوگئے ۔ وطن ھی میں کچھ تعلیم پا کر وہ ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۸ء) میں تکمیلِ تحصیل کے لیے پہلے فاس، پھر اَبْیَض گیا، جہاں وہ پانچ سال تک مقیم رھا ۔ وھاں سے ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۸ء) میں تِلِمْسان اور ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۳ء) میں مکۂ [معظمہ] اور مدینۂ [منوّرہ] چلا گیا ۔ بعد ازاں قاھرہ آیا ۔ ان تمام مقامات میں وہ سماعِ شیوخ سے مستفید ھوا اور آخری مقام میں ایک شخص محمودالکُردی کے ایماء سے ایک نئے سلسلے کی بنیاد رکھی، گو اس سے پہلے وہ قادِریّہ، طَیْبِیّہ اور خَلْوَتیّہ سلسلوں میں داخل ھو چکا تھا ۔ اس کا نیا سلسلہ طریقۂ خلوتیہ ھی کی ایک شاخ سمجھا جاتا ھے ۔ اس کے بعد وہ المغرب میں لوٹ آیا اور فاس و تِلِمْسان سے ھوتا ھوا ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) میں صحرا کے مقام بُوسَمْغُون (Bu Semghun) میں پہنچا ۔ یہ ایک نخلستان ھے، جو البیّض (Geryville) کے جنوب مغرب میں واقع ھے ۔ یہاں اس کے اعتقاد کے مطابق آنحضرت[ص] کی طرف سے اسے اشارہ ھوا کہ وہ اپنے سلسلے کی اشاعت جاری رکھے ۔ اس کے ایک مرید علی حرازِم نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ فاس واپس چلا جائے، چنانچہ ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں وہ وھاں چلا گیا [اس وقت سلطان فاس مولای سلیمان

العلوی تھا - ادارہ] - فاس میں اسے ''حَوش المَرایات'' کا محل عطا ھوا - اپنی بقیہ عمر کا بہت سا حصہ اس نے اپنے سلسلے کے معاملات کی تنظیم کی غرض سے سفر میں گذارا، تاھم اس کی وفات تک اس کا صدر مقام فاس ھی رھا اور بعدِ وفات وھیں اس کے زاویے میں اسے دفن کیا گیا.

۲ - سلسلے کے عقائد اور اعمال و اشغال : اس طریقے والوں کو '' احبابہ'' کہتے ھیں اور انھیں کسی دوسرے 'طریقے' میں داخل ھونے کی سخت ممانعت ھے۔ ان کا 'ذکر' حسب معمول چند کلمات کو بار بار (عام طور پر سو بار) دھرانے پر مشتمل ھے - یہ 'ذکر' دن کے مخصوص اوقات میں کیا جاتا ھے۔ ڈیپوں Depont اور کوپولانی Coppolani نے صفحۂ ۴۱۷ پر ان کلمات کا ترجمہ دیا ھے - ان کا سب سے اھم اصول یہ ھے کہ اولوالامر کی اطاعت کی جائے؛ چنانچہ جب سے فرانسیسیوں نے الجزائر کو فتح کیا ھے ان کے تعلقات فرانسیسی حکومت سے عام طور پر اچھے رھے ھیں.

۳ - تاریخِ سلسلہ : ۱۲۳۰ھ میں سرِ سلسلہ کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹے (محمدالکبیر اور محمدالصغیر) محمود بن احمد التونسی کی اتالیقی میں رھے - اس کے بعد الحاج علی بن عیسیٰ ان کا سرپرست بنا - یہ شخص تِماسِین (Temasin) کے تجّانی زاویے کا شیخ تھا، جسے خود سرِ سلسلہ نے اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا - التونسی انھیں قریۂ عینِ ماضی میں لے آیا، کیونکہ اُس محل پر، جس میں ان کا باپ فاس میں رھا کرتا تھا، ایک نئے امیر یزید بن ابراھیم نے قبضہ کر لیا تھا - کچھ مدت کے بعد علی بن عیسیٰ انھیں عینِ ماضی کے زاویے کی تحویل میں چھوڑ کر خود تِماسین میں واپس آ گیا - ایسا معلوم ھوتا ھے کہ خود سرِ سلسلہ کی زندگی ھی میں سلسلے میں افتراق پیدا ھو گیا تھا اور اس نے مخالف فریق کو، جنھیں تَجاجنۃ کہتے تھے، عین ماضی سے نکال دیا تھا - ۱۲۳۵ھ (۱۸۲۰ء) میں ان مخالفین نے والی (بای) وَھران (Oran)، حسن سے امداد طلب کی - اس نے عین ماضی کا محاصرہ کر لیا، لیکن ھلّہ بول کر اسے فتح نہ کر سکا اور اس بات پر راضی ھو گیا کہ ایک رقم خطیر لےکر واپس چلا جائے - اس کے دو سال بعد والی (بای) تِیطِری (Titteri) نے اس آبادی پر حملہ کر دیا، لیکن ناکام رھا - ان فوجی کامیابیوں سے سرِ سلسلہ کے دونوں بیٹوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور انھوں نے مُعسکر (Mascara) کے ترکوں پر حملہ کر دیا، مگر وہ ۱۸۲۶ء (۱۲۴۱ - ۱۲۴۲ھ) اور ۱۸۲۷ء میں دونوں مرتبہ ناکام رھے اور آخری موقع پر محمد الکبیر مارا گیا [اور اس کا سر شہرالجزائر کے دروازے پر لٹکا دیا گیا، (تحفۃ)—ادارہ].

سیدی علی بن عیسیٰ تِماسِین ھی میں رھتا تھا، مگر اس کی ھدایت کے مطابق محمد الصغیر جو اب عینِ ماضی کا مدیر کل تھا، اپنے سلسلے کی اشاعت و تبلیغ میں مصروف ھو گیا (الصحراء اور سوڈان کے علاقے کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی) - یہ کوششیں خوب بارآور ھوئیں، سلسلے کی دولت اور طاقت میں اضافہ ھو گیا، تاھم علی اور محمد نے اب فوجی کاروائی کی جرأت نہ کی؛ چنانچہ جب فرانسیسیوں نے الجزائر پر حملہ کیا اور دِرقاوی '' مقدّم '' نے جہاد کے لیے تجّانیوں سے امداد طلب کی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا.

۱۸۳۶ء (۱۲۵۱ - ۱۲۵۲ھ) میں امیر عبدالقادر نے، جو فرانسیسیوں کو ملک سے نکالنا چاھتا تھا، ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن شیخ تجّانی نے جواب دیا کہ میں تو صرف ذکر و فکر کی پُرسکون زندگی بسر کرنا چاھتا

ہوں [ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا] ۔ آخر طویل اور بے نتیجہ خط و کتابت کے بعد ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں امیر ایک لشکر کے ساتھ عین ماضی کی دیواروں کے سامنے آ دھمکا اور مطالبہ کیا کہ شیخ تجّانیہ اس کی اطاعت قبول کرے ۔ اس مطالبے کو رد کر دیا گیا ۔ گو محصورین کی تعداد مقابلۃً بہت کم تھی، پھر بھی محاصرے نے آٹھ ماہ تک طول کھینچا ۔ امیر نے اس بستی کو تسخیر کرنے کی بہتیری تدبیریں کیں، لیکن تجّانی سردار اور اس کے مشیروں کی زیرکی کے مقابلے میں اس کی کچھ پیش نہ گئی ۔ آخر جب تجّانی نے دیکھا کہ مزید دفاع ناممکن ہے تو اس نے الأغواط (Laghuat) میں آ کر پناہ لی ۔ سلسلے کی شہرت کو اس طویل دفاع کی وجہ سے چار چاند لگ گئے ۔ اس سے اگلے ہی سال (۱۸۴۰ء) شیخ تجانی نے فرانس کے مارشل، والے (Valée) کو امیر عبدالقادر کے خلاف اپنی اخلاق اور مادی امداد پیش کی ۔ علی بن عیسٰی تماسین ہی میں مقیم رہا ۔ اس نے بھی فرانسیسیوں کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا ۔ ۱۸۴۴ء میں اس کی وفات ہوئی اور وہ سلسلے کی تنظیم کا کام سرِ سلسلہ کے فرزند باقی کے سپرد کر گیا، جس کا انتقال ۱۸۵۳ء میں ہوا۔ اس کے بعد علی بن عیسٰی کا پوتا محمد العائد سلسلے کا شیخ بنا ۔

سلسلے کے تیسرے شیخ کے بیٹے، احمد اور البشیر، اس کی وفات کے وقت خرد سال تھے، چنانچہ ایک شخص ریّان المشری انکا اتالیق بنا ۔ اس کا منشا یہ تھا کہ عین ماضی کا زاویہ مستقل حیثیت حاصل کرے اور تماسین کے زاویے کے ماتحت نہ رہے۔ اس وجہ سے دونوں زاویوں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے، گو قطع علائق تک نوبت نہ پہنچی ۔ ۱۸۶۹ء میں فرانسیسیوں کو دونوں بھائیوں پر بے وفائی کا شبہ ہوا، لہذا دونوں کو گرفتار کرکے الجزائر بھیج دیا گیا، مگر وہ فرانسیسیوں سے مصالحت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت سے شیوخ سلسلہ کے تعلقات فرانسیسیوں سے دوستانہ چلے آتے ہیں ۔

۴ ۔ اشاعتِ طریقہ : اگرچہ سلسلے کے مبلّغین نے اپنے عروج کے زمانے میں مصر، عرب اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں بھی مرید بنائے، لیکن طریقہ کو حقیقی ترقی فرانسیسی افریقہ میں نصیب ہوئی ۔ ایک شخص محمد الحافظ بن مختار بن حبیب کو، جسے 'بدّی' کہا جاتا تھا اور جو سرِ سلسلہ کی خدمت میں ۱۷۸۰ء کے قریب فاس میں حاضر ہوا تھا، یہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ مرّاکش کے انتہائی جنوب کے اہل صحراء میں سلسلے کی نشر و اشاعت کرے ۔ "شنقیط Shinqueti اور تجکجہ Tijikja کی راہ سے وہ گھر واپس آیا ۔ اس نے ۱۸۳۰ء تک، یعنی تقریباً تا دم مرگ، تجّانی سلسلے کی نشر و اشاعت نہایت کامیابی سے کی ۔ وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ قبیلۂ ادہ اَوْ علی (Ida Ou 'Ali) تمام کا تمام داخل سلسلہ ہو گیا ہے" (Paul Marty : *R. M. M* ۳۱ : ۲۳۹) ۔ اس کے جانشین کے زمانے میں، جو ۱۸۰۷ء میں فوت ہوا، یہ تعداد اور بھی زیادہ ہو گئی ۔ فریضۂ حج تو یہ لوگ بڑی پابندی کے ساتھ ادا کیا ہی کرتے تھے، اب یہ دستور بھی پڑ گیا کہ وہ سرِ سلسلہ کے مزار کی زیارت بھی فاس میں آ کر کیا کریں؛ چنانچہ یہ زیارت عام طور پر حج سے پہلے کی جاتی ہے۔ فرنچ گنی French Guinea میں اس سلسلے کی اشاعت الحاجّ عمر نے کی جب وہ حج کے بعد ڈنگرای (Dinguiray) واپس آیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈنگرای کا شمار اس علاقے کے اہم مقدس شہروں میں ہونے لگا ۔ "تجّانی سلسلے نے تقریباً ہر جگہ قادریہ سلسلے کی جگہ لے لی" (مجلّۂ مذکور، ۳۶ : ۲۰۲) ۔

۵ - مصنفات طریقه : ان کے عقائد اور ان کے اعمال و اشغال کے نہایت اہم مجموعے کا نام جواہر المعانی و بلوغ الأمانی فی فیض الشیخ التجّانی ہے - اسے الکناش بھی کہتے ھیں (قاھرہ ۱۳۴۵ھ) - روایت ہے کہ کناش، بانی سلسلہ نے حرازم کو املاء کرائی تھی - سرسلسلہ کے سوانح حیات کا سب سے بڑا مأخذ یہی ہے - دیگر تصانیف کا احصاء ڈیپوں و کوپولانی Depont and Coppolani، ص ۴۱۸ ح اور لیوی پروونسال (Lèvi-Provençal) : *Les Historien des Chorfa*، پیرس ۱۹۲۲ء، ص ۳۷۷ نے کیا ہے - اس سلسلے کے مشہور و معروف بزرگوں کے تراجم کی معجم کا نام کشف الحجاب عن من تلاقی مع التجّانی من الأصحاب ہے، جسے ابوالعباس احمد بن احمد العیّاشی سُکَیرِج نے تصنیف کیا (فاس ۱۳۲۵ھ و ۱۳۳۲ھ)۔

مآخذ : (۱) [محمد باشا بن الامیر عبدالقادر : تحفة الزائر، اسکندریه ۱۹۰۳ء، ۱ : ۸۰ - ادارہ]؛ (۲) *R. A.* : ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۳ء (Arnaud کے مقالے)؛ (۳) L. Rinn : *Marabouts et Khouan*، ص ۴۱۶ تا ۴۵۱؛ (۴) ڈیپوں و کوپولانی Depont et Coppolani : *Confréries*، ص ۴۱۳ تا ۴۴۴؛ (۵) L'Abbé Rouquette : *Les Sociétés secrètes chez les Musulmans*، ۱۸۹۹ء، ص ۳۱۱ تا ۳۲۷؛ (۶) P. Marty در *R.M.M.* (جس کا اقتباس اوپر دیا گیا ہے)؛ (۷) Henri Garrot : *Histoire générale de L'Algérie*، الجزائر ۱۹۱۰ء.

(D. S. MARGOLIOUTH مرجلیوث)

تجلید : یعنی جلد سازی - ۱۹۴۸ء تک ھمیں قدیم اسلامی جلد سازی کے صرف چند ھی نمونوں کا علم تھا، چنانچه اس صنعت کے آغاز اور ابتدائی ترقی کے متعلق صرف عام قیاس آرائی ھی ممکن تھی؛ لیکن یه ضرور سمجھ میں آتا تھا که یه صنعت اھم تھی کیونکه اسکا گہرا رابطه اسلامی تمدن کے اصل مبدأ و مأخذ،—ایک مقدس کتاب [قرآن مجید] سے تھا، جس کے واجب احترام کا تقاضا یه تھا که نه صرف اس کی کتابت حسین ھو، بلکه اس کی ''منزل و مقرّ'' [جلد] بھی دیده زیب ھو - بہر حال اسی سال یعنی ۱۹۴۸ء میں ژورژ مارسے (George Marçais) اور لوئی پوان سو (Louis Poinssot) نے اکھاڑی ھوئی جلدوں کے ایک بڑے سلسلے کو شائع کیا، جو پوان سو کو جامع کبیر قیروان کے ایک غیر مستعمل کمرے میں ملی تھیں (*Objets kairouanais' IX^e au 13^e siècle*، Notes et Documents, Direction des Antiquités et Arts، تونس ۱۱، کراسه ۱) - ان جلدوں میں پہلی اور دوسری صدی ھجری کی کوئی جلد نه تھی، لیکن ۵۸ جلدیں تیسری (نویں) صدی سے، ۱۹ جلدیں چوتھی (دسویں) صدی سے اور ۱۷ پانچویں (گیارھویں) صدی سے منسوب کی جا سکتی تھیں وعلی ھذا القیاس - ان قدیم جلدوں کی تقطیع ابتدائی اسلامی کتب کی طرح مستطیل اور افقی شکل کی ھوتی تھی - یہی تقطیع قرآن [مجید] کے نسخوں میں بھی مستعمل تھی - جلدیں لکڑی کی تختیوں سے بنائی جاتی تھیں، جن پر چمڑا منڈھا جاتا تھا اور جن سے رَقّ (پوست نوشتنی، parchment) کے مکتوبه جزء جڑے ھوتے تھے - ان جلدوں کی شکل نسبةً جدید طرز کی اسلامی کتابوں کی سی نه تھی، کیونکه اس وقت تک پنج گوشه بینی[1] (flap) کا، جو بائیں دفتی کے ساتھ جڑی ھوتی ہے، ارتقاء نہیں ھوا تھا، بلکه اس کے بجائے زیریں دفتیوں کا چمڑا چوبی تختیوں سے آگے بڑھا کر (شکل ۱)، تینوں برآمده حصوں کو عموداً کھڑا کر کے، سریش سے باھم چپکا دیا جاتا تھا؛ چوتھی طرف پشت کتاب تھی؛

(۱) جسے عربی میں ''اللسان'' کہتے ھیں ، الفنون الاسلامية، ص ۱۳۲۔

اس طرح صندوقچے کی شکل کی جلد بن جاتی، جس کے تین کھڑے پہلو بصورت قائم الزاویہ ہوتے اور بالائی دفتی اس صندوقچے کے ڈھکنے کا کام دیتی؛ دونوں دفتیاں چمڑے کے ایک تسمے کے ذریعے، جو نیچے کی دفتی سے لگا ہوتا تھا اور بالائی دفتی کی کیل سے باندھ دیا جاتا تھا، قابو میں رہتی تھیں (شکل ۲) - چمڑے پر آرائش عموماً اس طرح کی جاتی کہ بیرونی حاشیے کے چوکھٹے کے اندر ایک مستطیل صفیحہ (panel) بن جاتا - حاشیے اور اندرونی تختے پر اکثر ایک بٹے ہوئے رسے کی طرح کی آرائش بنا دی جاتی تھی جو بڑے پیمانے پر ہوتی - حاشیے پر یہ آرائش اکثر (مگر ہمیشہ نہیں) سیدھی سادی شکل کی ہوتی، لیکن اندرونی تختے پر یکے بعد دیگرے دو دو تین تین قطاروں میں پر تکلّف نقش بنائے جاتے (شکل ۳ تا ۷) - عربی خط کو بھی، جو اسلامی آرٹ (ہنر کاری) کا اتنا اہم جز ہے، اندرونی مستطیلوں کی زیبائش کے لیے استعمال میں لایا جاتا تھا؛ مثلاً 'ماشاء' بالائی دفتی (شکل ۸) پر اور 'اللہ' زیریں دفتی پر یا 'بسم' بالائی پر اور 'اللہ' زیریں پر - تمام آرائش و زیبائش، مثلاً مسلسل لکیروں والے نمونے، منفرد چھوٹے ٹھپے اور کوفی خط کی تحریرات، سب کی سب 'داغ کاری' سے مگر بدون طلاکوبی (blind tooling) بنائی جاتیں (یعنی چمڑے پر گرم ٹھپے کے نشان بغیر طلاکاری کے بنا دیے جاتے تھے) - اس ابتدائی اسلامی جلد سازی کے اصول فن اور نمایاں اشکالِ تزئینی (motifs) مصر کی قبطی صنعت جلدسازی سے مأخوذ تھے اور قبطی جلدیں وہ پہلی جلدیں تھیں جو قلمی کتب کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں، لیکن دونوں مذکورہ صنعتوں کے درمیان چند طرح کا تفاوت بھی ہے جو بالکل واضح ہے - یہ تفاوت خصوصیت کے ساتھ نقوش (ڈیزائنوں) کی ساخت و ترکیب (composition) اور ان کے انتخاب میں نمایاں ہے؛ جیسا کہ پیٹرسن (Theodore C. Peterson) نے ثابت کیا ہے (دیکھیے *Early Islamic Bookbindings and their Coptic Relations*، در *Ars Orientalis*، ۱۹۵۴ء، ص ۴۱ تا ۶۴) - بہر حال جلد کی مستطیل تقطیع (جو خود کتاب کی مستطیل شکل کی وجہ سے پیدا ہوئی)، نیز صندوقچہ نما جلد اور ایک ہی مستطیل صفیحے (oblong panel) کو جس پر باہم گتھے ہوئے متکرر ڈیزائن بنے ہوں، ترجیح دینا ایک نئی اختراع اور اسلامی صنعت تجلید کا مخصوص نشان ہے، جس کا تا حال اسلامی زمانے سے پہلے کی کتابوں میں پتا نہیں لگایا جا سکا۔

ان صنعت کاروں (مُجَلِّدوں یا جلد سازوں) کے ناموں کی فہرست ابن الندیم نے (الفہرست، طبع فلوگل (G. Flügel)، لیپزگ ۱۸۷۱ء، ص ۱۰) دی ہے - اس سے ظاہر ہے کہ چوتھی (دسویں) صدی تک لوگ جلد سازوں کی خدمات کا کچھ نہ کچھ اعتراف کرنے لگے تھے - پانچویں (گیارھویں) صدی میں جلدوں کے نقوش (ڈیزائن) زیادہ انبوہ دار اور پیچیدہ ہو گئے (شکل ۹)؛ نیز اسی زمانے میں ایک مرکزی زیبائشی نقش ایجاد ہوا جو اگرچہ ابتداءً تو پس منظری نقوش میں دبا ہوا ہے، لیکن جلد ہی اسے منفرد کر لیا گیا اور وہ سادہ، آرائش سے خالی بنایا جانے لگا (شکل ۱۰) - جوں جوں وقت گذرتا گیا اس نقش نے اتنی ترقی کی کہ وہ اسلامی تجلید کے مروج ترین نقوش اور اس فن کے معالم میں سے ہو گیا - ایک اور بنیادی تبدیلی ظہور میں آئی، وہ یہ کہ اسی (پانچویں) صدی میں اس مطوّل مستطیل تقطیع کا رواج ہونے لگا، جو یورپی ممالک میں تو معیاری حیثیت رکھتی ہی ہے لیکن اسلامی ممالک میں بھی معیاری بن گئی ہے،

مگر پانچویں صدی میں یہ رواج ایسا نہ تھا کہ اس تقطیع کے سوا اور کوئی تقطیع استعمال ہی نہ ہو: البتہ چھٹی اور ساتویں (بارھویں اور تیرھویں) صدی میں یہ تقطیع معیاری بن گئی (شکل ۱۱) ۔ صرف بلاد ''المغرب'' کی حیثیت استثنائی ہے جہاں اس زمانے میں بھی قرآن [مجید] اور باقی مخطوطات مربع شکل کے ہوتے ہیں ۔ تیسری انقلابی تبدیلی یہ تھی کہ چوبی تختیوں کو ترک کر دیا گیا ۔ ہمیں کاغذ کے وسیع تر استعمال کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس کے بعد سے جلد کا اندرونی حصہ مقوے سے بننے لگا، گو مصر میں بجائے اس کے بردی (papyrus) کا ردی مواد استعمال ہوتا تھا ۔ بعض صورتوں میں ایک نیا اصول فن (technique) بھی گاہے گاہے زیر عمل لایا جانے لگا، یعنی سریش میں تر کیے ہوئے ڈوری کے ٹکڑوں کو چمڑے کے نیچے رکھا جاتا اور اس طریق سے ابھرواں آرائش کی جاتی ، لیکن اسے تجلید کے سلسلے میں زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی ۔ نقوش عربی (ارابسک، arabesque) کی قسم کے گل بوٹے پہلی دفعہ اس فنی طریق میں بنائے گئے (شکل ۱۲) ۔ بعد کے زمانے میں اس فنی طریق کو تو کم لیکن مذکور زیبایشی پہلو کو بہت زیادہ ترقی دی گئی ۔ ارتقاء کی اگلی منزل پنج گوشہ بینی (flap) کی ایجاد تھی جو زیرین دفتی کے بائیں کنارے سے ملحق ہوتی تھی ، تاکہ ضخامت کتاب کو لپیٹ میں لے لے اور جب کتاب بند کر دی جائے تو اوپر کی دفتی کے نیچے آ جائے ۔ اس امتیازی چیز (feature) کی ابتدائی تاریخ کا سراغ تا حال نہیں لگایا جا سکا، لیکن یہ فرض کرنا ممکن ہے کہ اس کا ظہور (اقلاً اس کی نسبتہً زیادہ اشاعت) چھٹی سے ساتویں صدی ہجری (بارھویں سے تیرھویں صدی میلادی) کے درمیان ہوا ۔ ہمیں معلوم ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے کی بعض مصری جلدوں پر، جو تیسری سے ساتویں صدی میلادی تک کی ہیں، بینیاں لگی ہوئی تھیں، لیکن کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس عملی اور کارآمد چیز کو اسلامی صنعت میں متعارف ہونے کے لیے کیوں اتنا عرصہ صرف ہوا، حالانکہ بینی اب اسلامی جلد سازی کا نہایت امتیازی عنصر شمار ہوتی ہے ۔ قدیم ترین امضاء دار (دستخطوں والی) جلدیں جو ہم تک پہنچی ہیں، وہ بھی اسی زمانے (چھٹی صدی ہجری) کی ہیں ۔ ان میں سے ایک قیروان (شمارہ ۱۴۴) کی جلد ہے، جس پر ٹھپے سے ابن حسّان کا نام ثبت کیا گیا ہے ۔

بد قسمتی سے فاطمی اور ایوبی بلکہ سلجوقی عہد کی صنعت تجلید کے متعلق بھی ہماری معلومات تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں، یا یوں کہیں کہ وہ معلومات اس مطلب کے لیے کافی نہیں کہ ہم صحیح اندازہ لگا سکیں کہ ان صدیوں میں اس صنعت کی فنی اور جمالیاتی تطوّر کی کیفیت کیا تھی؛ البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ ان ادوار میں باقی فنون اور صنائع اوج کمال کی نئی بلندیوں تک پہنچ گئے تھے ۔ خوش قسمتی سے ہمیں اس تاریک زمانے کے دورِ آخر میں المغرب کے بارے میں قدرے بہتر معلومات حاصل ہیں، کیونکہ الموحّدین کے آخری اور مرینی خاندان کے ابتدائی عہد کی بعض جلدوں کا ہمیں علم ہے، جن پر تاریخیں دی ہیں (Prosper Ricard : *Sur un type de reliure des temps almohades* در *Ars Islamica*، جلد ۱، ۱۹۳۴ء، ص ۷۴ تا ۷۹؛ E. Gratzl، در *Islamische Bucheinbände des 14. bis 19. Jahrhunderts aus den Handschriften der Bayerischen Staasbibliothek*...، لیپزگ ۱۹۲۴ء، لوح ۱) ۔ ان جلدوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی ہشت گوشہ ستارے نے

بڑھتے بڑھتے ایک سر تا سر ہندسی نقش کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ یہ نقش مصر اور مغرب میں اب بھی مروج ہے اور ''مثمّن'' کہلاتا ہے ۔ جن جلدوں کے ساتھ بینی ہوتی ہے، اس پر بھی اس نقش کا کچھ حصہ بنا دیتے ہیں ۔ ایسی جلدوں میں سے ایک جلد سوَرِ قرآنی کے ایک مجموعے کی ہے، جو مرّاکُش میں الموحدین کے قبلِ آخر حکمران، ابوحفص عمر المرتضٰی، کے لیے تحریر ہوا (۶۵۴ھ / ۱۲۵۶ء) اور اب مدرسۂ ابن یوسف میں موجود ہے ۔ اس جلد پر پہلی دفعہ تذھیب نظر آتی ہے، جو ایک بڑی ہندسی شکل کی اندرونی درزوں کو متشابک (باھم گتھے ہوے) بیل بوٹوں سے پُر کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے ۔ فنی اعتبار سے یہ ایک اھم ترقی کا اقدام تھا اور یہ عمل اس زمانے میں اور اسکے بعد کی مشرقی جلد سازی کا جزو لاینفک بن گیا ۔ (شکل ۱۳) ۔ یوں تو ہندسی اشکال مصر میں عہد قبل اسلام کی جلدوں پر بھی بنائی جاتی تھیں لیکن اس صورت میں مسلم صنعت کاروں کا بےواسطہ سرمشق غالباً لکڑی کے دروازے اور نجّاری کے دیگر کام تھے [نہ کہ مخطوطوں کی قدیم قبطی جلدیں]۔

چونکہ ھمیں ایوبی عہد کی جلدسازی کی پوری حقیقت کا علم نہیں اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ آیا یہ شاندار جلدیں، جو مرّاکُش، فاس اور مغرب کے دوسرے مرکزوں میں بنائی جاتی تھیں، وھاں کے اصلی باشندوں کی قدیم صنعت کے ارتقاء کا نتیجہ تھیں یا ان پر بصورت امکان مصری صنّاعی، خصوصاً صنعتِ تجلید، کا اثر پڑا ۔ بہر حال دورِ ممالیک (۶۴۸ھ تا ۹۲۲ھ / ۱۲۵۰ء تا ۱۵۱۷ء) کی مصری جلدسازی مغربی جلدسازی کی قدرتی جانشین معلوم ہوتی ہے ۔ وہ یہی زمانہ تھا، جس میں اس صنعت نے زبردست ترقی کی اور نئی بلندیوں پر متصاعد ہوئی؛ چنانچہ بعض وہ جلدیں، جو مملوکوں کے کارخانوں میں بنیں، انکا شمار دنیا کے تمام ادوار کی ممتاز جلدوں میں ہے ۔ حسن اتفاق سے قرآن [مجید] اور بعض دیگر مخطوطات کی جلدیں بتعداد کثیر ابھی تک محفوظ ھیں ۔ ڈیزائن عموماً مجرّد اور خیالی قسم کے ھیں ۔ پوری سطح پر ہندسی اشکال کا، جو ایک ستارے (جیسا کہ المغرب کی ابتدائی جلدوں میں ہے) یا ستاروں کے ایک سلسلے پر مبنی تھیں، بہت زیادہ رواج رھا ۔ ان کے مقابلے میں نوکدار بیضوی یا مدال‌نما نقوش (medallions) (۱) کا رواج نسبۃً کم ہوا ۔ ان نقوش کے کثیر گوشوں والے قالب کے عمودی محور کے سروں پر نقوش عربی (arabesques) یا گل سوسن کے ملحقے لگا دیتے تھے ۔ اسی مدال‌نما آرائش کی طرح کا ایک چوتھائی آرائشی نمونہ ھر کونے میں بناتے تھے اور اس مکمل نقش کو خالی زمین پر جما دیا جاتا تھا (شکل ۱۴) ۔ درمیانی مدال‌نما آرائش، اس کے چوتھائی آرائشی نمونے، جو کونوں میں بنائے جاتے تھے اور بینیوں کو عموماً عربی نقوش سے بھر دیتے تھے، جو ابتداءً تو قدرے مجرد ھی سے تھے مگر بعد میں بتدریج زیادہ قدرتی شکل اختیار کر گئے ۔ یہ ڈیزائن پُرکار ھیں، مگر فن کاروں کے اعلٰی مذاق کے تقاضے نے انھیں کام کی بےجا اور بےتحاشا افراط سے بچا لیا ہے ۔ ان نقوش میں مختلف طرز کے نمونے اور مختلف کام والی ایسی سطحیں (textures) سامنے آتی ھیں(۲) جن میں طلاکوبی کے بغیر

(۱) medallion = ''صرة بیضاویة'' یعنی بیضوی تھیلی، جامة (جمع میں : ''جامات (المناطق)''، (الفنون الایرانیہ، ص ۱۳۶ و ۲۰۷) ۔

(۲) مثلاً ان پر گنجان گنجان یا کشادہ کشادہ نقطے بنا لیے جاتے یا باریک متوازی یا متقاطع خطوط کھینچ دیے جاتے ۔ ان سے ایسی سطحیں سامنے آتیں جو سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتیں اور ناظر کے ذھن میں جو مجموعی نقش بنتا اس پر مختلف اثرات ڈالتیں ۔

داغ کاری ہوئی ہے یا مختلف طریقوں کی تذہیب اور نیلے رنگ کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس زمانے سے دو نئے فنی طریقوں (techniques) کا رواج عام تر ہو گیا۔ ایک تو یہ کہ جلدوں کی اندرونی طرف یعنی چرمی استر پر بڑے بڑے قالبوں (blocks) سے عربی طرز کے پیچاں نقوش بنا دیتے، جن کا پس منظر نسبۃً تیرہ تر ہوتا اور جو عموماً قدرے بارز و برجستہ (ابھرے ہوئے) ہونے کی وجہ سے خوب نمایاں دکھائی دیتے۔ دوسرا طریقہ، جس کا غالباً بعد میں رواج ہوا، یہ تھا کہ چمڑے کے ٹکڑوں میں کٹاؤ کا کام(۱) کر کے طرح سازی کرتے اور انھیں کسی رنگین زمین پر (جو عموماً نیلے ریشم کی بنائی جاتی تھی) جما دیتے، کبھی یوں بھی ہوتا کہ زمین مختلف رنگوں کی ہوتی اور دی ہوئی سطح کے مختلف رقبوں میں ہوتی۔ یہ کٹاؤ کا کام مصر میں جلدوں کی بیرونی طرف بنایا جاتا۔ حقیقۃً یہ کوئی نیا فنی طریقہ نہ تھا؛ کیونکہ قبطی جلدوں اور اس سے کم پیمانے پر ابتدائی اسلامی عہد کی جلدوں پر بھی یہ کٹاؤ کا کام ("filigree") ہوتا تھا۔ چونکہ نہ تو دورِ ممالیک کی جلد سازی کا باقاعدہ استقصاء کیا گیا ہے نہ ان جلدوں کی مدد سے، جن پر تاریخیں دی ہیں، آرائشی نقشوں کو معین کیا گیا ہے، اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ تاریخی ارتقاء میں کون کون سے قدم اٹھائے گئے اور کب اٹھائے گئے اور آیا یہ مصری فن کار تھے (جیسا کہ اغلب ہے) یا ان کے ایرانی ہمکار جنھوں نے اول اول، اوروں سے پہلے، بعض امتیازی اشکالِ نمایاں (motifs) اور نقشہ ہاے زیبایش (decorative schemes) اور فنی طریقوں کی بنیاد رکھی۔ جب ۹۲۲ھ (۱۵۱۷ء) میں عثمانی ترکوں نے مصر فتح کیا تو بدقسمتی سے اس ملک میں اس فن کا اساسی (organic) نشو و نما رک گیا۔

ہمیں دورِ مغول (ساتویں صدی ہجری کے وسط/ تیرھویں صدی میلادی کے وسط) تک ایرانی صنعت تجلید کا تقریباً کچھ بھی علم نہیں۔ آثار قدیمہ کی ایک المانی اثری مہم کو، جو فون لوکوک A. von Le Coq کی سرکردگی میں چینی ترکستان گئی تھی، وہاں کے ایک مقام کوچہ (Khotcho) میں چھٹی سے نویں صدی ہجری تک کی جلدیں ملیں، جن میں داغ کاری بدون طلا کوبی (blind tooling) اور ٹھپوں کا کام کیا ہوا تھا اور سنہری زمین پر چمڑے کی تخریم و تثقیب کے ذریعے (یعنی کٹاؤ سے اور سوراخ کرنے سے) طرح سازی کی گئی تھی اور اس لیے فنی لحاظ سے یہ تجلید قبطی نقوش سے علاقہ رکھتی تھی۔ اس سے فرض کیا جاتا ہے کہ غالباً جلد سازی کی صنعت مصر سے ترکستان پہنچی اور ممکن ہے عیسائی (نسطوری) مبلّغ اس بارے میں واسطہ بنے ہوں۔ یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ ایسی ہی آرائش والی جلدوں کے نمونے ابتدائی اسلامی دور میں ایران میں بھی موجود ہوں گے۔ مجموعی طور پر اغلب ہے کہ ابتدائی ایرانی جلدسازی کے نمونے کم و بیش باقی مسلم ممالک کی طرح ہی ہوں گے اور اس جلد سازی پر عربی، بالخصوص مصری اور امکاناً عراقی اثر زبردست طور پر پڑا ہوگا (سوء اتفاق سے ہم عراقی صنعت کے متعلق بھی اتنی ہی کم واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ لاعلمی اس حیثیت سے اور بھی قابل افسوس ہے کہ عراقی جلدسازی مرکز خلافت یعنی بغداد کی نمائندہ تھی)۔ بہر حال ہم فرض کر سکتے ہیں کہ ایران میں چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی میلادی) کی

(۱) "cut out, open work ("filigree") patterns"؛ قب "الجلود....المخرمة من الورق و الجلد المقطوع بدقة کأنها الخیوط"، الفنون الایرانیة، ص ۱۳۶۔

نسبۃً بہتر جلدوں کی دفتیوں کے درمیانی صفیحوں (panels) میں سر تا سر پیچ در پیچ ڈیزائن بنائے جاتے ہونگے اور اسی طرح کے نمونے حاشیوں پر بھی بنتے ہونگے، لیکن ساتویں (تیرھویں) صدی کے ایک فارسی مخطوطے کی ادھوری جلد سے معلوم ہوتا ھے کہ وھاں حِلیۂ میانی یعنی مدال‌نما نقوش (medallions) کی 'طرحْ بندی' کا رواج بھی تھا - یہ جلد اس روسی مہم کو ملی تھی جو کوسلوف (P. K. Koslov) کی سرگردگی میں جنوبی منگولیا کے مقام قرہ خواجہ (Kara Khoto) گئی تھی - بہر صورت ساتویں / تیرھویں صدی کے اواخر اور آٹھویں/چودھویں صدی میں بیشتر مدال‌نما نقوش ھی کا رواج جلدوں پر ھو گیا اور ان نقوش کو اشکالِ عمدہ (main motifs) کا مرتبہ حاصل ہوا - پہلے پہل تو ان کی شکل سادہ سی نوکدار بیضوی بنائی گئی، جس میں ویسے ھی سادہ ٹھپے سے لگائے ہوے ڈیزائن بھرے گئے اور بیضوی شکل کے بالائی اور زیرین سروں پر ملحقات کا اضافہ کیا گیا - اس کے بعد مدال نما نقش میں بہت سے گوشے(۱) بننے لگے اور اس کے ایک اندرونی حصے کو پہلے تو ستارے کی شکل کے پیچیدہ سے نمونے سے اور بعد میں عربی نقوش سے بھر دیا جانے لگا - آٹھویں (چودھویں) صدی کے وسط میں درمیانی صفیحے (panel) کے کونوں کے مثلث‌نما کے نقوش نے جو ابتداءً چنداں اھم نہ تھے ترقی کر کے چار نہایت مزیّن ربع مدال کی شکل اختیار کر لی جو زیبائش یا تخطیط کے لحاظ سے مرکزی مدال کا چربہ تھے - آگے اور پیچھے کی دونوں دفتیوں کی آرائش بالعموم بالکل یکساں نہیں ھوتی تھی، لیکن ان کی عام خصوصیات ھمیشہ مشترک ھوتی تھیں - ۷۰۴ھ (۱۳۰۷ء) کی ایک قرآنی جلد غالباً پہلی جلد ھے، جس میں چرمی استر لگا ھے اور جس پر خفیف سے ابھرے ہوے عربی نقوش ٹھپے سے بنائے گئے ھیں - یہی جلد قدیم ترین ایرانی جلد ھے، جس پر تاریخ دی ھے اور جس پر عبدالرحمٰن جلد ساز کے دستخط ھیں - ایرانی جلدوں میں تذھیب کا استعمال سب سے پہلے ایک قرآن میں ملتا ھے، جس کے تیس مجلّد اجزاء موجود ھیں - یہ نسخہ ھَمدان میں مغول بادشاہ، الجائتو خدا بندہ، کے لیے تیار ہوا تھا (۷۱۳ھ/ ۱۳۱۳ء) (مالِ کتاب خانۂ ملّی قاھرہ) - نیلے رنگ کا استعمال اولاً ایک جلد پر ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں ہوا (فلیڈلفیا، عجائب خانۂ دانش گاہ) - ایسی اکثر جلدیں شمال مغربی اور مغربی ایران کے شہروں (مثلاً تبریز، مَراغہ، شیروان اور ھَمدان وغیرہ) میں تیار ہوئی تھیں - آٹھویں / چودھویں صدی کی جلد سازی کے مزید جزئیات کے لیے دیکھیے "The Covers of the Morgan *Manāfi* Manuscript and other early Persian Book-bindings" : R. Ettinghausen در *Studies in Art and Literature for Belle da Costa Greene*، طبع Dorothy Miner، پرنسٹن (Princeton) ۱۹۵۴ء، ص۴۵۹ تا ۴۷۳ -

ایران میں نویں (پندرھویں) صدی کا زمانہ جلد سازی کا دورِ زرّین تھا - اس عہد کی جلدوں کے متعلق کہا گیا ھے کہ وہ " ھر قسم کی امکانی زیب و زینت اور فن کاری کی جلوہ نمائی کے لحاظ سے تمام اقوام کے ھر عہد کے آرٹ کے نمونوں میں عدیم‌النظیر تھیں" (محمد آغا اوغلو) - اس زمانے میں تیمور لنگ کے جانشینوں کی سرپرستی میں اس کے بیٹے شاہ رخ (م ۸۵۰ھ/ ۱۴۴۷ء) اور پوتے بایسُنغُر (م ۸۳۷ھ / ۱۴۳۳ء) سے لے کر حسین بایقرا (م ۹۱۱ھ / ۱۵۰۶ء) تک کے دور میں انتہائی شاندار ایرانی مخطوطے تیار کیے گئے - جلد سازی کا سب سے بڑا مرکز

(۱) becomes polylobed

دارالسلطنت ہرات تھا، مگر اصفہان، شیراز اور یزد میں بھی عمدہ قسم کی جلدیں بنائی جاتی تھیں گو وہ کبھی بھی مرکز کے کام کی خوبی کو نہ پہنچ سکیں ۔ اس دور میں نقش و نگار کے نہایت عمدہ ڈیزائن (جو دونوں دفتیوں پر مختلف بھی ہو سکتے تھے) استر پر اور بینی کے اوپر نیچے بنائے جانے لگے ۔ حد سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی جدّتیں یہ تھیں : مناظرِ طبیعی جن کی تصاویر ہاتھ سے کھینچی جاتیں اور جن میں حقیقی یا خرافی جانور بنائے جاتے تھے ۔ ۸۴۹ھ (۱۴۴۶ء) اور اس کے بعد سے تو گاہے گاہے انسانی صورتیں بھی بنائی گئیں (شکل ۱۰) ۔ یہ نقوش دفتیوں کے بیرونی جانب طلا کوبی کے ساتھ یا بدون طلا کوبی داغ کاری کے ذریعے اور اندرونی جانب کے استر پر تخریم (باریک کٹاؤ کے کام، cut-out filigree) سے بنائے جاتے تھے ۔ اندازہ ہے کہ ہرات کی ایک جلد پر، جو ۸۳۹ھ (۱۴۳۵ء) کی ہے (مالِ کتاب خانۂ چیسٹر بیٹی Chester Beatty، ڈبلن، مخطوطۂ A-34) ساڑھے پانچ لاکھ خالی داغ کاری کے اور تینتالیس ہزار طلا کوبی کے نشان ہیں جو ٹھپوں سے لگائے گئے تھے ۔ اس جلد پر ایک اچھے صنعت کار کے تقریباً دو برس صرف ہوئے ہوں گے ۔ ان سے سادہ تر جلدوں پر بھی اس قسم کے دس ہزار ٹھپے لگائے گئے تھے ۔ استر پر کٹاؤ کے کام کی نہضتِ فنی کا دور (ابتدائی اسلامی جلدوں کے بعد) دوبارہ تقریباً ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) میں شروع ہوا ۔ کٹاؤ کے کام والے ڈیزائن کی قدیم ترین جلد جس کا ہمیں علم ہے، دیوانِ احمد جلائر کی جلد تھی جو ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) میں تبریز میں بنائی گئی (معرضِ فریر، Freer Gallery of Art، واشنگٹن، شمارہ ۳۲۰۲۹) ۔ کٹاؤ کے کام والے ڈیزائن نے ۸۴۱ھ (۱۴۳۸ء) تک تو اتنی ترقی کر لی کہ نہایت استادانہ اور پُرکار مناظر اس طریق سے بنائے جانے لگے ۔ اس کے ثبوت کے لیے وہ مخطوطہ دیکھیے جو اس سنہ میں شاہرخ کے لیے ہرات میں تیار کیا گیا (استانبول، طوپ قپو سرای مُوزِہ سی، شمارہ ۲۷۰/ ۳۰۵۹) (شکل ۱۶) ۔ ان مناظر کے خرافی جانور چینی تصاویر سے مأخوذ ہیں ۔ چینی نقوش کے اور نمونے (ڈیزائن) بھی بعض جلدوں میں ملتے ہیں؛ مثلاً پھول اور بادل، جو اس کے بعد سے ایرانی خزینۂ زینت کاری کے اہم ذخائر میں شمار ہونے لگے، ان جلدوں میں پائے جاتے ہیں ۔ (چینی پھول اول اول ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء کی ایک جلد پر بنائے گئے، مگر وہاں ان کی حیثیت فرعی اور تبعی ہے)؛ لیکن جب صنعت کاروں نے عربی نقوش کے سر تا سر اور مکررشدہ نمونے بنائے یا صرّہ نما نقوش کے نظام کو طرح کیا تو ان صورتوں میں بھی زبردست فنی مہارت کا مظاہرہ کیا (شکل ۱۷) ۔ اس عہد کے متنوع نمونے پہلے زمانے سے بھی زیادہ مذہبوں کی فن کاری کے رہینِ منت ہیں ۔ اس کا ثبوت نہ صرف تیموری مخطوطوں کی دفتیوں کے ڈیزائنوں اور آرائشی صفحات کے باہمی رابطے میں ملتا ہے، بلکہ ایک 'جُنگِ اشعار' کے مخطوطے (برٹش میوزیم Add. 27. 261) میں بھی، جو عمر شیخ بن تیمور کے لیے ۸۱۳-۸۱۴ھ / ۱۴۱۰-۱۴۱۱ء میں لکھا گیا، طلا کاری کے ایسے ڈیزائن موجود ہیں جن میں صرّہ نما نقوش، کونوں کے نقوش اور جلدوں کے حاشیوں کے نقش و نگار سب دکھائے گئے ہیں ۔ مزید برآں ایک ایرانی شاعر عماد کا ایک مخطوطہ تورک و اسلام آثاری مُوزِہ سی، استانبول (شمارہ ۱۰۹۱) میں ہے، جس کا کاتب زین العابدین بن محمد نسخۂ مذکور کا نہ صرف جلد ساز بلکہ مُذَہِّب بھی تھا ۔

تیموری عہد میں چند نئے طریقے اور اصول فن (techniques) ظہور میں آئے ۔ ان میں سے ایک اہم اصول

کی، جو جلد کی بیرونی طرف بڑے بڑے مناظرِ طبیعی کے بنانے سے متعلق تھا، پوری کیفیت ابھی مناسب طور پر سامنے نہیں آئی ۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ نقش بڑے بڑے بلاکوں (قالبوں یا سانچوں) سے بنائے گئے جو غالباً معدنی تھے ۔ اگر یہ رائے درست ثابت ہو جائے تو محنت بچانے کی یہ بہت اچھی ترکیب تھی اور چھوٹے ٹھپوں کے دیر طلب، پر زحمت کام کے مقابلے میں سریع تر اور ارزاں تر بھی تھی، لیکن بعض اور ماہرین اس رائے کو نہیں مانتے ۔ ان کی رائے یہ ہے کہ یہ بڑے بڑے مناظر اوّلاً داغ کاری اور ثانیاً سوئی کے ذریعے سے طرح ریزی (modelling) کر کے بنائے گئے ۔ اس مسئلے کا جو جواب بھی ہو، اتنی بات یقینی ہے کہ ۸۷۳ھ (۱۴۶۹ء) کی ایک جلد، جس پر عربی نقوش (ارابسک، arabesque) کی طرز کے اشکال متناسب بنے ہوے ہیں، اس پر جلد ساز نے نصف نقش کے لیے بلاک سے ٹھپہ لگایا اور پھر اس نے دوسرے نصف کے لیے یہی ٹھپہ لگایا، چنانچہ دونوں نشانوں کی درمیانی درز صاف دکھائی دے رہی ہے ۔

دوسرا طریقہ ابھرا ہوا آرائشی کام (''الزخارف البارزة'') بنانا تھا ۔ یہ کام بھی ٹھپے سے بنایا جاتا، مگر قالبی (mould) ٹھپے سے ۔ اسے بالخصوص ایسی جلدوں میں استعمال کیا جاتا، جن کے بیرونی طرف صرّہ نما نقش (medallions) اور ان نقشوں میں جانوروں کی تصاویر ہوتیں ۔ [یہ سب کام قالبی ٹھپے سے بنایا جاتا] ۔ اغلب ہے کہ اس دور کے خاتمے پر (بحدود ۹۰۵ھ / ۱۵۰۰) ایک تیسرا نہایت اہم طریقہ پہلی دفعہ استعمال ہونے لگا، یعنی سیاہ لاکھ والی زمین پر طلا کاری کی جانے لگی؛ جب نقش مکمل ہو چکتا تو اس پر شفاف لاکھ کا پچارا پھیر دیا جاتا ۔ بعد کی صدیوں میں ان تینوں صنعتی اصولوں کو رواجِ عام حاصل ہوا ۔ اس اثنا میں ایک چوتھے طریقے کو جو المغرب میں بہت مقبول ہوا اس موقع پر (حدود ۹۰۵ھ / ۱۵۰۰ء میں) امتحاناً استعمال کیا گیا، مگر فوراً ترک بھی کر دیا گیا ۔ اس صنعت میں رنگ دار ریشمی تاگوں سے چمڑے پر نقش کی کشیدہ کاری کی جاتی تھی ۔ ان کے علاوہ ایک اور طریقہ، جس سے شاذ و نادر ہی فائدہ اٹھایا گیا، چمڑے پر ابھرا ہوا کام بنانے کا تھا؛ رنگا رنگ چمڑوں کی کئی تہوں سے اسے تیار کیا جاتا تھا، پھر اوپر کی تہوں کو تھوڑا تھوڑا تراش دیا جاتا (نویں صدی ہجری کا آخر/ پندرھویں صدی میلادی) ۔ تیموری عہد کی صنعت جلد سازی پر بہترین سیر حاصل بحث، جس میں تصاویر کا نہایت عمدہ انتخاب ہے، محمد آغا اوغلو نے کی ہے، دیکھیے (*Persian Book-bindings of the Fifteenth Century*، Ann Arbor ۱۹۳۵ء)۔ اس کتاب میں مصنف نے قدیم تر مآخذ خصوصاً ان موضوعوں پر سکیسیان Armenag Sakisian کے رشحاتِ قلم کی فہرست بھی دے دی ہے ۔

دورِ صفوی اور بالخصوص دسویں اور گیارھویں (سولھویں اور سترھویں) صدی کی صنعت تجلید میں تیموری عہد کی روایات کو جاری رکھا گیا، لیکن اسلوبِ کار میں بعض نمایاں تبدیلیاں ہوئیں ۔ ایک قطعی میکانیکی میلان (آلات کے ذریعے کام سر انجام دینے کی طرف) ظاہر ہوا، جو محنت بچانے کے صریح رجحان کا نتیجہ تھا، مگر اس سے خوبیِ کار پر یقیناً بہت [نامناسب] اثر پڑا ۔ اس دور میں انتہائی ترقی لاکھ کے کام والی صنعت میں ہوئی ۔ یہ صنعت اس زمانے میں بڑی بڑی مجالسِ تصویر میں استعمال میں آنے لگی، جو افراد کی تصاویر پر مشتمل ہوتی تھیں؛ مثلاً بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے، شکارگاہ دکھائی گئی ہے یا بزم عیش وطرب، ایسے قدرتی منظر بھی پیش کیے گئے ہیں، جن میں حقیقی

یا خُرافی جانور دکھائے گئے ہیں (شکل ۱۸)۔ پہلے پہل لطیف (ہلکا) سنہری رنگ استعمال ہوتا تھا، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد سیاہ زمین پر شوخ رنگ استعمال کیے جانے لگے۔ سنہری لاکھ کے کام والی اکثر جلدوں پر بینیاں نہیں لگائی جاتی تھیں اور چمڑا صرف پشت پر لگا دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی صنعت کار فن کاری کے مروج ذرائع اظہار کی حدود سے آگے بھی نکل جاتے، مثال کے طور پر وہ جلدیں لیجیے جن میں لاکھ کی شان بڑھانے کے لیے انھوں نے سیپ کی پچی کاری کا اضافہ کیا۔ لاکھ والی جلدوں میں جو بھڑک اور شان اور نظر فریبی ہے وہ کسی اور قسم کی جلد میں، جو آج تک بنی ہے، نہیں پائی جاتی: اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایسی جلدیں صنعت جلد سازی کے بجائے نقاشی سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔ منبت کاری (embossing) کا طریقہ (ٹکنیک) قدرتی مناظر کے ڈیزائنوں اور زیادہ تر جانوروں کی ''مجالس'' کے لیے، جو مرکزی مدال نما نقوش کے اندر یا ان سے باہر بنائی جاتی تھیں یا پھولوں کے محدود ذخیرۂ نقوش یا نقوش عربی (arabesques) اور چینی بادلوں کی پٹیوں کے اظہار کے لیے بدستور وسیع پیمانے پر استعمال ہوتا رہا۔ ان سب میں اسی دور میں یا تو نسبۃً اونچا ابھرواں کام پایا جاتا ہے یا کام کی بلندی کہیں کم ہے کہیں زیادہ۔ اس طریقِ فن اور دیگر طریقوں کے اجراء میں تذہیب سے بہت کام لیا گیا ہے۔ کبھی کبھی دو مختلف رنگوں سے اس طرح تذہیب کی جاتی اور اس پر اس طرح سے کام کیا جاتا کہ ان دو سطحوں کی 'بناوٹ' (textu.e) مختلف معلوم ہونے لگے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ جلد کو ٹھپوں کے نقوش سے آراستہ کر کے اس پر تذہیب کر دیتے، پھر اور طرح کے ابھرے ہوئے مرکزی صرّہ نما ڈیزائن اور کونوں کے ویسے ہی ربعی ڈیزائن کو الگ تیار کر کے جلد میں جڑ دیا جاتا۔ کٹاؤ کے باریک کام کی صنعت میں فن کاروں نے ایک نیا اقدام کیا، یعنی چمڑے کے استعمال کے بجائے کٹاؤ کے نمونے کاغذوں سے تیار کیے جو نسبۃً بہت ارزاں تھے اور کام کرنے کے لیے آسان تر، مگر اس کے باوجود ان سے نہایت پیچ در پیچ نقش تیار ہو سکتے تھے۔ ان نقوش کو زیادہ پر اثر بنانے کے لیے یہ ترکیب کی جاتی تھی کہ جلدوں کے چرمی استر کے مختلف حصوں میں مختلف رنگوں کا کاغذ استعمال کرتے تھے تا کہ چمڑے سے جو اس زمانے میں عموماً ہلکے رنگ کا ہوتا تھا، تضاد نمایاں ہو۔ اس صنعتی دور کی آخری ارتقائی منزل میں آئینے کی طرح کا پس منظر پیدا کرنے کے لیے چمکیلی دھاتوں کے ٹکڑے بھی استعمال ہونے لگے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اقدام حسن ذوق کی شکست تھا۔ ایک خاص ڈیزائن، جو صفوی عہد کی بہت خاص چیز تھی اور جس کا تیموری جلدوں میں کہیں پتا نہیں، یہ تھا کہ حاشیوں میں طوماری آرائشیں (cartouches) بنائی جاتیں۔ ان کو اس ترتیب سے بنایا جاتا تھا کہ ایک طویل طومار آتا، اس کے بعد ایک گول نقش، جس میں کئی گوشے ہوتے تھے (poly-lobed)، [اسی طرح یہ طویل اور گول نقش یکے بعد دیگرے سارے حاشیے کو پُر کر دیتے]۔ یہ آرائش اس دور کے قالینوں میں بھی بنائی جاتی تھی۔ اس عہد میں بادلوں کی پٹی بھی جو چینیوں سے ماخوذ تھی تیموری عہد کے مقابلے میں بہت زیادہ مقبول ہوئی۔

گیارھویں صدی کے اواخر اور بارھویں صدی (سترھویں اور اٹھارھویں صدی) میں ڈیزائن زیادہ سادہ ہو گئے ہیں اور ان میں استادانہ چابک‌دستی کا اظہار بھی کم نظر آتا ہے، تاہم اس عہد میں بھی کچھ اختراعات ہوئیں: مثلاً رنگدار چمڑا،

بالخصوص سبز رنگ کا، استعمال کیا جانے لگا (حالانکہ اس سے پہلے صرف سیاہ اور قسم قسم کے ہلکے اور شوخ بھورے رنگ کا چمڑا استعمال ہوتا تھا) ۔ اس رنگ طرازی کو اور نمایاں کرنے کے لیے مختلف رنگوں کے مرکزی صرّہ ہای بیضاویہ (medallions) اور کونوں کے ربعی صرّے (quarter medallions) جڑ دیے جاتے، جن پر حسب معمول ٹھپے لگائے جاتے اور پھر فی الجملہ تذہیب کر دی جاتی ۔ سیاہ چمڑے پر یا ان پر لاکھ سے روغن شدہ مقوے پر مذہّب ڈیزائن بنانے اور ان پر کتبے لکھنے کا عام رواج ہو گیا تھا ۔ مجموعی طور پر بارھویں (اٹھارھویں) بلکہ اس سے بھی زیادہ تیرھویں (انیسویں) صدی میں لاکھ کی روغن کاری کی فنی نہضت ہوئی، لیکن نقوشِ عمدہ (motifs) عموماً زیادہ بھڑکیلے ہیں، یعنی روشن، زرافشاں زمین پر قدرتی پھولوں کی طرز پر پھول دکھائے جاتے اور ساری سطح پر درشت، چمکیلا لاکھی پچارا پھیر دیا جاتا۔

ایمیل گراتسل Emil Gratzl نے اپنے مقالے میں، جس میں بہت سی تصویریں بھی دی گئی ہیں، ایرانی صنعت جلد سازی کے پورے میدان کا (ان معلومات کی بنا پر، جو دوسری جنگ عظیم سے پہلے حاصل تھیں) بڑے سلیقے سے جائزہ لیا ہے ۔ دیکھیے عنوان "Book Covers" در پوپ (A. U. Pope) : *A Survey of Persian Art*، لنڈن و نیویارک ۱۹۳۸ء - ۱۹۳۹ء، ص ۱۹۷۵ تا ۱۹۹۴، الواح ۹۵۱ تا ۹٦۸ و ۹۷۱ تا ۹۸۰ ۔ اس کتاب میں سینتیس (۳۷) ایسی جلدوں کی فہرست دی ہے، جن پر تاریخیں ثبت ہیں اور جو آٹھویں تا دسویں (چودھویں سے سولھویں) صدی تک سے متعلق ہیں۔

چونکہ ترکانِ عثمانی کے دورِ حکومت میں فارسی ادب اور فارسی کتاب کو نہایت قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، نیز چونکہ بعض ایرانی شہروں، مثلاً تبریز، کی فتح کے بعد ایرانی صنعت‌کاروں کو قسطنطنیہ پہنچا دیا گیا تھا، اس لیے ترکی تجلید پر صفوی عہد کے جلدسازوں کا گہرا اثر پڑا؛ چنانچہ آج کل بہت سی صورتوں میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا گیارھویں اور بارھویں (سترھویں اور اٹھارھویں) صدی کی کوئی خاص جلد ایران کی ساخت ہے یا ترکی کی ۔ اگر کاریگر نے ایرانی محیط میں چند خاص ترکی نقوش (''تین گیندیں(۱)، لہریے اور بادل'' یا ''ترکی پھول'') نہ شامل کیے ہوں تو پھر صرف خط یا کاتب کے نام یا اس کے اصلی مالک کے نام ہی سے جلد کے ترکی الاصل ہونے کا درست سراغ مل سکتا ہے ۔ گیارھویں (سترھویں) صدی کے نصف کے بعد سیاسی اور اقتصادی حالات کے بگڑ جانے سے ایرانی جلدسازی کی صنعت بڑی سرعت سے انحطاط پذیر ہو گئی، مگر ترکی کے نسبۃً مستحکم حالات نے ایرانی طرز کی جلد سازی کے بلند معیار کو تیرھویں (انیسویں) صدی تک مسلسل طور پر قائم رکھا ۔ نویں سے تیرھویں (پندرھویں سے انیسویں) صدی تک کی ترکی جلد سازی کا جائزہ کمال چیغ Kemal Çiğ نے لیا ہے اور اسکو تصویروں سے خوب واضح کیا ہے، ملاحظہ ہو اس کی تورک کتاب قاپلری *Türk Kitap Kaplarī*، دارالعلوم انقرہ شعبۂ الٰہیات، تورک و اسلام صنعت‌لری تاریخی اینستی توسو، سایی ۳، انقرہ ۱۹۵۳ء۔

صفوی صنعتِ تجلید کا ہندوستانی مغلوں کے دور کی صنعت پر بھی زبردست اثر پڑا، بالخصوص جب ہمایوں جلاوطنی کے بعد شاہ طہماسپ ایرانی کے دربار سے ہندوستان واپس ہوا اور ایرانی نقاشوں کو ساتھ لیتا آیا؛ مگر چغتائی عہد کی جلدوں پر چونکہ خاص ہندوستانی نقوشِ عمدہ (motifs) زیادہ ہیں،

[(۱) ان گیندوں کے لیے دیکھیے وامبیری : *History of Bukhara*، لنڈن ۱۸۷۳ء، ص ۲۰۳، ح ۱ ـــ ادارہ] ۔

اس لیے ترکی جلدوں کے مقابلے میں انھیں زیادہ آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے ۔ ان ہندوستانی زیبائشی نقوش (motifs) کے مماثل اور بھی نقوش ہیں، جو غالباً دوسری ہندوستانی آرایشی صنعتوں سے مأخوذ ہیں، مثلاً پتھر کی خاتم کاری (''تخریم و تطعیم'')، پارچہ بافی اور کشیدہ کاری سے؛ چنانچہ کشمیری کشیدہ کاری کے ڈیزائنوں کا لاکھ والی روغنی جلدوں پر نمایاں اثر پڑا۔

باقی اسلامی ممالک میں جلدیں بڑے بڑے ملکوں کے اہم صنعتی مرکزوں کے ہنری نمونوں کو پیش نظر رکھ کر بنائی جاتی تھیں اور ان کی حیثیت عموماً مقامی (provincial) ہی ہوتی تھی؛ تاہم تمام ممالک میں عمدہ جلدیں تیار ہوتی تھیں، کیونکہ اسلامی ممالک میں صنعت و حرفت کی فنی خوبیوں کا معیار تیرھویں (انیسویں) صدی تک بہت بلند رہا اور صنعت چرم سازی نے بہت ترقی کر لی؛ مگر زیادہ متخصصانہ تحقیق تا حال نہیں ہوئی، گو گراتسل Gratzl نے شمالی افریقہ کی نویں (پندرھویں) صدی اور جنوبی عرب کی نویں اور دسویں (پندرھویں اورسولھویں) صدی کی جلد سازی کے بارے میں ہماری معلومات میں قیمتی اضافہ کیا ہے۔

اس وقت تک تجلید کے باب میں صرف ایک عربی رسالہ بعدِ تصحیح نشر ہوا ہے ۔ اس کا مصنف ابوالعباس احمد بن محمد السُّفیانی ہے اور رسالے کا نام صِناعۃ تَسفیر الکتب و حلّ الذّھب ہے ۔ یہ اشاعت ایک مخطوطے پر مبنی ہے، جس کی کتابت ۱۰۲۹ھ(۱۶۱۹ء) میں شہر فاس میں ہوئی اور اسے پراسپر ریکار (Prosper Ricard) نے فہرست اصطلاحات کے ساتھ شائع کیا (فاس، ۱۹۱۹ء) ۔ اس نوع کے اورمتون کا سراغ لگانا اور تجلید اور جلد سازوں کے متعلق حوالوں کی سلسلہ وار ترتیب کا کام ابھی باقی ہے ۔ [عمدۃ الکُتّاب و عُدّۃ ذوی الالباب کا باب ۱۲ : فی صفۃ التجلید و جمیع آلاتہ ہے ۔ یہ مختصرسا رسالہ پیشِ نظر نسخے کے دیباچے کے مطابق الامیر الاجلّ ''باب العزّ ابن بادیس المہدیّۃ'' (۴۰۶ھ - ۴۵۳ھ / ۱۰۱۶ء - ۱۰۶۱ء) کے لیے تالیف ہوا؛ قبّ براکلمان، ۱ : ۵۲۵ و تکملہ، ۱ : ۴۷۳ — ادارہ]۔

عربی اور ایرانی خطّاطی کی خوبی، تذہیب کے ماہرانہ انداز اور مواضع کشی (miniatures) کے چُہچُہاتے رنگوں کے مقابلے میں اسلامی ممالک کی متین اور کم بھڑکیلی تجلید کی ہنری خوبیوں کا اعتراف، جیسا ہونا چاہیے تھا، تا حال نہیں ہوا ۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان جلد سازوں نے قبطی نمونوں کی تقلید کی اور مُذَہّبوں اورمواضع کشوں (miniaturists) کے کام سے استفادہ کیا، لیکن مؤرخوں کو جلد سازوں کی احسان مندی کا شاید ضرورت سے زیادہ شدید احساس ہے ۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اپنی باری میں اسلامی جلدسازوں نے بھی جواباً اَور صنعتوں پر زبردست اثر ڈالا؛ مثلاً دسویں (سولھویں) صدی کے بہترین ایرانی قالینوں کے مدال نما نقوش کا نظام صنعتِ جلدسازی سے مأخوذ ہے (نہ کہ بالعکس)، اور یہ نقوش اس زمانے سے اب تک ایرانی قالینوں کی بافت میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں؛ نیز یورپی ممالک کی صنعت تجلید کی تاریخ اسلامی صنعت کے جانے بغیر سمجھی ہی نہیں جا سکتی، اس لیے کہ اسلامی جلدیں اس کے لیے نمونے کا کام دیتی تھیں، جن کی تقلید وہاں اکثر ہوتی رہی ۔ یہ اسلامی تجلید ہی کا اثر تھا کہ لکڑی کی لوحوں کے بجاے مقوّے استعمال ہونے لگا اور بہت سی دیگر فنی و زیبائشی خوبیوں کو اختیار کر لیا گیا ۔ اولاً یہ صورتِ حال ازمنۂ متوسطۂ قریبہ میں اور پھر پندرھویں اور سولھویں صدی

میلادی میں پیش آئی، چنانچہ بارھویں صدی میلادی کی انگریزی اور پندرھویں صدی کی وینس (Venice)، فلورینس (Florence) اور نیپلز (Naples) کی جلدوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، یہاں تک کہ سولھویں صدی میں لاکھ والی روغنی جلد سازی کا جو خالص ایرانی اصولِ صنعت کی چیز ہے، وینس کی سرکاری جلدوں میں چربہ اتارا گیا۔ مذکورۂ بالا بیانات سے ثابت ہے کہ جلد سازی نسبۃً اہم تر اسلامی صنعتوں میں سے تھی۔ دو اصول فن، یعنی چمڑے کے کٹاؤ کے کام میں اور رنگوں کی چرمی جلد سازی (polychromy) میں کوئی قوم بھی مسلمانوں سے سبقت نہ لے جا سکی اور مملوکی اور تبریزی عہد کی بہترین جلدوں کا شمار تو فنی لحاظ سے بہترین اور انتہائی کمال کے شاہکاروں میں ہے، انسانی ہاتھوں کو ان سے بہتر کام بنانے کی توفیق آج تک نہیں ملی۔

مآخذ: ان مطبوعات کے علاوہ، جن کا مقالے میں ذکر ہوا، مندرجۂ ذیل قابل لحاظ ہیں: (۱) آٹھویں سے لے کر تیرھویں (چودھویں سے انیسویں) صدی تک کی ممتاز جلدوں کے رنگین الواح (پلیٹوں) کا بہترین مجموعہ پروفیسر فریڈرک زارے (Friedrich Sarre) نے عام دیباچے اور انفرادی جلدوں کے تذکرۂ احوال کے ساتھ *Islamische Bucheinbände* میں شائع کیا ہے (برلن ۱۹۲۳ء)، جس کا انگریزی ترجمہ بہ عنوان *Islamic Bookbinding*، لندن ۱۹۲۳ء، میں چھپا؛ نیز دیکھیے (۲) Paul Adam: *Über türkisch - arabisch - persische Manuskripte und deren Einbände*، در *Monatschrift für Buchbinderei*، ج ۴ (۱۹۰۴—۱۹۰۵): ۱۳۱ تا ۱۳۳، ۱۳۵ تا ۱۵۲، ۱۶۱ تا ۱۶۸، ۱۷۷ تا ۱۸۰، و ج ۵ (۱۹۰۵—۱۹۰۶): ص ۳ تا ۹؛ (۳) جلال اسد ارسیون (Celal Esad Arseven): *Les Arts decoratifs turcs*، استانبول، بدون تاریخ، ص ۳۱۲ تا ۳۲۰، اشکال ۷۰۰ تا ۷۱۴ و لوح رنگین ۲۵؛ (۴) مہدی بہرامی: *Iranian Art. Treasures from the Imperial Collection and Museums of Iran. Catalogue.*، نیویارک ۱۹۴۹ء؛ (۵) مہدی بہرامی و مہدی بیانی: راہ نمای گنجینۂ قرآن، طہران ۱۳۲۸ شمسی (۱۹۴۹ء)، ص ۵۹ تا ۷۰، و الواح ۳۱ تا ۴۴؛ (۶) ڈمانڈ (M.S. Dimand): *A Handbook of Mohammedan Art*، طبع دوم، نیویارک ۱۹۴۷ء، باب "*Bookbinding*" (جلد سازی)، ص ۹۷ تا ۸۴؛ (۷) Theodor Gottlieb: *Katalog der Ausstellung von Einbänden. K. K. Hofbibliothek Wien. (Vienna)*، ۱۹۰۸ء، ص ۶ تا ۱۶، شمارہ ۲۲ تا ۵۰؛ (۸) T. Gottleib: "Venezianische Einbände des 15. Jahrhunderts nach persischen Mustern," در *Knnst und Kunsthandwerk*، ج ۱۶ (۱۹۱۳ء): ۱۵۳ تا ۱۵۹؛ (۹) Adolf Grohmann and Sir Thomas Arnold: *Denkmäler islamischer Buchkunst*, Firenze and München ۱۹۲۹ء، ص ۵۳ تا ۶۸، ۱۴۱ تا ۱۱۷، (ازگرومان)۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بہ عنوان *The Islamic Book,* شائع ہو چکا ہے (لندن ۱۹۲۹ء)؛ (۱۰) Jean Loubier: *Der Bucheinband von seinen Anfängen bis zum Ende des 18. Jahrhunderts.* طبع دوم، (Monographien des Kunstgewerbes)، ج ۲۰ و ۲۱)، لیپزگ ۱۹۲۶ء، ص ۱۱۷ تا ۱۴۱ و اشکال ۱۰۴ تا ۱۲۴؛ (۱۱) Julie Michelet: *A Loan Exhibition of Islamic Bookbindings. Chicago, March 20— May 20, 1932*، شکاگو، آرٹ انسٹی ٹیوٹ، شکاگو ۱۹۳۲؛ (۱۲) Arménag Sakisian: "La reliure turque du 15ᵉ au 17ᵉ siecle" در *La Revue de l'Art*، ج ۵۱ (۱۹۲۷ء): ص ۲۷۷ تا ۲۸۴؛ ج ۵۲ (۱۹۲۷ء): ص ۱۴۱ تا ۱۵۴، ۲۸۶ تا ۲۹۸؛ [(۱۳) زکی محمد حسن: الفنون الایرانیۃ فی العصر الاسلامی، قاہرۃ ۱۹۴۰ء، ص ۱۳۲ تا ۱۳۸ و لوحہ ۵۴ و ۵۵—ادارہ]؛ (۱۴) قبطی اور اسلامی

شکل ۱

شکل ۲

شکل ۳

شکل ۴

شکل ۵

شکل ۶

شکل ۱۰

شکل ۱۱

شکل ۱۲

شکل ۱۳

شکل ۱۵

شکل ۱۶

شکل ۱۷

صنعت جلد سازی کے بارے میں ایک مکمل فہرست مآخذ مع تعلیقات از Emil Gratzl و K. A. C. Creswell به عنوان *"Bibliographie der islamischen Einband-kunst, 1871-1954"*، در *Ars Orientalis*، ج ۲، ۱۹۵۷ء شائع کی جائیگی۔

(اٹنگھاوزن RICHARD ETTINGHAUSEN)

تَجْنِیس: یا جِناس، (عربی) paronomasia، رعایتِ لفظی ۔ علم بدیع کی ایک اصطلاح جو مُحَسِّنات لفظیه سے تعلق رکھتی ہے، یعنی ایک ہی جملے میں دو ہم آواز یا تقریباً ہم آواز، مگر مختلف المعنی، لفظ استعمال کیے جائیں ۔ لاطینی عبارت میں اس کی مثال یه ہے۔

"amantes sunt amentes"

I (۱) ۔ 'تجنیسِ تامّ' یه ہے که دو لفظ انواعِ حروف، اعدادِ حروف، ہیئت و ترتیبِ حروف میں متفق ہوں۔

(الف) اگر دو لفظ ایک ہی قسم کے ہوں (مثلاً دونوں اسم، دونوں فعل، یا دونوں حرف ہوں) تو اسے 'تجنیس مُماثِل' کہتے ہیں؛ مثلاً یومَ تقومُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ المُجْرِمُونَ ۵ مَا لَبِثُوا غَیْرَ سَاعَةٍ (سورۃ ۳۰ (الروم) : ۵۴، ۵۵ (جب قیامت (السّاعة) برپا ہو جائے گی، گنہگار قسم کھا کر کہیں گے که وہ (اپنی قبروں میں) گھنٹہ بھر (ساعة) سے زیادہ نہیں رہے)۔

(ب) دو لفظ اگر مختلف نوعیتوں کے ہیں، یعنی ایک اسم ہے اور دوسرا فعل، ایک اسم ہے اور دوسرا حرف یا ایک فعل ہے اور دوسرا حرف، تو اسے 'تَجْنِیسِ مُسْتَوفی' (کامل) کہیں گے؛ مثلاً ابو تمّام کا شعر ہے:

مَا مَاتَ مِنْ کَرَمِ الزَّمَانِ فَاِنَّهٗ
یَحْیَا لَدٰی یَحْیَی بْنِ عَبْدِاللّٰهِ

(کرمِ زمانه میں سے جو کچھ فوت ہوا وہ یحیی بن عبداللہ کے پاس زندہ (یَحْیَا) ہے) ۔ چونکه عبداللہ سخی ہے لہذا سخاوت اس کی وجه سے دنیا میں زندہ رہے گی (دیوان ابو تمّام، بیروت ۱۹۰۵ء، ص ۳۴۱)۔

(۲) دو لفظوں میں اگر ایک مرکب اور دوسرا مفرد ہے اور وہ لکھنے میں یکساں ہیں تو اسے 'جِنَاسُ التَّرْکِیب' کہا جائے گا۔

(الف) اگر دونوں لفظ مفرد اور مرکب لکھنے میں مشابه ہیں تو اس جناس کو 'مُتَشَابِه' کہیں گے، کیونکه دونوں لفظ لکھنے میں یکساں ہیں؛ مثلاً :

اِذَا مَلِکٌ لَمْ یَکُنْ ذَا هِبَةٍ
فَدَعْهُ فَدَوْلَتُهٗ ذَاهِبَةٌ

(ابوالفتح البُستی)

(بادشاہ اگر سخی (ذَا هِبَة) نہیں تو اس کی دولت جانے والی (ذَاهِبَة) ہے۔

(ب) دونوں لفظ اگر لکھنے میں یکساں نہیں تو اسے 'تَجْنِیسِ مَفْرُوق' (ایک دوسرے سے الگ [یعنی صورتِ کتابت میں جدا جدا۔ مختصرالمعانی]) کہتے ہیں؛ مثلاً :

کُلُّکُمْ قَدْ اَخَذَ الْجَامَ وَ لَا جَامَ لَنَا
مَا الَّذِی ضَرَّ مُدِیْرَالْجَامِ لَوْ جَامَلَنَا

(ابوالفتح البُستی)

(تم (سب نے (اپنے اپنے) جام لے لیے، مگر ہمارے پاس جام نہیں (وَلَا جَامَ لَنَا)، ساقی کا کیا بگڑ جاتا اگر ہم پر بھی مہربانی کرتا (لَوْ جَامَلَنَا))۔

II (۱) ۔ اگر دو لفظ ہیئاتِ حروف یا حرکات حروف میں مختلف ہیں تو اسے 'تَجْنِیسِ مُحَرَّف' کہیں گے، کیونکه [دو ہیئتوں میں سے] ایک میں دوسرے سے انحراف پایا جاتا ہے؛ مثلاً بُرد اور بَرد اس جملے میں : جُبَّةُ الْبُرْدِ، جُنَّةُ الْبَرْدِ

(دھاری دار کپڑے کا جبہ، سردی سے بچنے کے لیے ڈھال ہے) ۔ اسی طرح لفظ ''مُفْرِطٌ او مُفَرِّطٌ'' اس جملے میں : الجاھِلُ اِمّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ ، یعنی جاھل یا حد سے بہت آگے نکل جاتا ہے یا حد سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے (واضح رہے کہ اس مثال میں تشدید کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا) ۔ البِدْعَةُ شَرَكُ الشِرْكِ ۔ (بدعت یعنی دین میں نئی بات پیدا کرنا شرْك کا جال (شَرك) ہے ۔

(۲) اگر دو لفظوں میں تعداد حروف کے لحاظ سے موافقت نہیں ، یعنی ایک لفظ میں به نسبت دوسرے کے ایک یا ایک سے زیادہ حروف زائد ہیں تو اسے 'تَجْنِیسِ نَاقِص' کہیں گے [اس لیے کہ دو لفظوں میں سے ایک میں دوسرے سے کمی ہے ۔ مختصرالمعانی] ۔ یہ زاید حروف خواہ

(الف) شروع میں ہوں؛ مثلاً : وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ (سورة ۷۵ (القیامة) : ۲۹ (جب ایک پنڈلی دوسری سے لپٹ گئی (خوف کی وجه سے جو انسان پر طاری ہوگا)، تجھے، اے انسان، اس دن اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہوگا) ۔

(ب) یا بیچ میں ہوں؛ جیسے : جَدّی جُهْدی، میری قسمت (جَدّی) میری کوشش (جُهْدی) پر منحصر ہے ۔

(ج) یا آخر میں ہوں: جیسے ابوتمام کے شعر میں :

یَمُدُّونَ مِنْ اَیْدٍ عَوَاصٍ عَوَاصِمِ
تَصُولُ بِاَسْیَافٍ قَوَاضٍ قَوَاضِبِ

(وہ اپنے ہاتھ پھیلاتے ہیں جو ان کے دشمنوں کو مارنے والے (عَوَاصٍ ۱) اور ان کے دوستوں کو بچانے والے ہیں (عَوَاصِم) وہ اپنے دشمنوں پر تلواروں سے حملہ کرتے ہیں جو ان کے لیے موت بن جاتی ہیں (قَوَاضٍ) اور انھیں کاٹ دیتی ہیں (قَوَاضِب)، دیوان ابوتمّام، ص ۴۳) ۔

اس آخری قسم کو کبھی 'جِنَاسِ مُطَرَّف' بھی کہتے ہیں ۔

(د) کبھی دو لفظوں میں ایک حرف سے زیادہ حروف صامت (consonants) کا اختلاف ہوتا ہے؛ جیسا کہ خنساء (دیوان، بیروت ۱۸۹۶ء، ص ۲۵) کے اس شعر میں ہے :

اِنَّ الْبُکَاءَ هُوَ الشِّفَا
ءُ مِنَ الْجَوٰی بَیْنَ الْجَوَانِحْ

(رونا دھونا شفاء ہے اس سوز (جَوٰی) کی جو میرے اعضاء (جَوَانح) میں ساری ہے) ۔ جناس کی اس قسم کو کبھی 'مُذَیَّل' بھی کہتے ہیں ۔

(۳) اگر حروف کے انواع کے لحاظ سے دو لفظوں میں اختلاف ہے تو اس صورت میں ضروری ہوگا کہ ایک حرف سے زیادہ میں اختلاف نه ہو ۔

(۴) پھر اگر دو مختلف الفاظ متقارب ہیں تو اس جناس کو 'مُضَارِع' کہیں گے ۔

اس کی بھی تین قسمیں ہیں :

(*i*) یہ کہ اختلافی حروف الفاظ کے شروع میں ہوں؛ مثلاً : بَیْنِی وَ بَیْنَ کِنّی لَیْلٌ دَامِسٌ وَ طَرِیقٌ طَامِسٌ (میرے اور میرے مکان کے درمیان اندھیری (دَامِس) رات اور مٹا ہوا (طَامِس) راسته ہے ۔(المقامات الحریریة ، مرتبۂ ڈیساسی، مقامة ۱۶، ص ۱۸۵)) ۔

(*ii*) یہ کہ اختلافی حروف درمیان میں ہوں؛ مثلاً : وَ هُمْ یَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ یَنْئَوْنَ عَنْهُ (وہ لوگ اس سے دوسروں کو

(۱) عواص جمع عاصیةٌ از عَصَاه = ضربه بالعصاء (مختصرالمعانی)، تیغ زنی اس طرح سے کرتے ہیں گویا تلوار انکے ہاتھ میں لاٹھی ہے ۔

باز رکھتے ہیں اور خود (بھی) اس سے بچتے ہیں (سورۃ ۶ (الانعام) : ۲۶) ۔

(iii) یہ کہ اختلافی حروف آخر میں ہوں؛ مثلاً : اَلْخَیْلُ مَعْقُوْدٌ بِنَوَاصِیْهَا الْخَیْرُ (خوش قسمتی، (الخَیْر) گھوڑوں (الخَیْل) کی پیشانیوں سے وابستہ ہے) ۔ (یہ حدیث بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجه میں ہے) ۔

(ب) اگر دو حروف غیرمتقارب ہیں تو اس کو 'جِنَاسِ لَاحِق' (تقریبی) کہتے ہیں ۔ اس کی بھی تین قسمیں ہیں :

۱ ۔ غیر متقارب حروف شروع میں ہوں؛ مثلاً : وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (ہر عیب، جو اور نکتہ چین پر تباہی ہے (سورۃ ۱۰۴ (الھُمَزة) : ۱)) ۔

۲ ۔ درمیان میں ہوں: مثلاً :

لَیْسَ عَنْ ثَرْوَةٍ بَلَغْتُ مَدَاهَا
غَیْرَ اَنِّی امْرُءٌ کَفَانِی کَفَافِیْ

((یہ استغنا) مجھے اس ثروت سے حاصل نہیں ہوا جو بےنہایت ہو، بلکہ میں ایسا آدمی ہوں کہ (کَفَانِی) میرے لیے کافی ہے (کَفَافِی) روزی میں سے روزگذار (دیوانِ بُحتُری، بیروت ۱۹۱۱ء، ۱ : ۳۶۷)) ۔

۳ ۔ آخر میں ہوں؛ مثلاً : وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ (جب ان کے پاس کوئی خبر (اَمْر) امن یا خوف کی آتی ہے (سورۃ ۴ (النساء) : ۸۳)) ۔

(۴) اگر دو لفظوں میں ترتیب حروف صامت یکساں نہ ہو تو اس کا نام 'تَجْنِیْسُ الْقَلْب' ("palindrome" or "inversion") ہوگا؛ مثلاً : حُسَامُه فَتْحٌ لِّاَوْلِیَائِه وَ حَتْفٌ لِّاَعْدَائِه (اس کی تلوار اس کے دوستوں کے لیے فتح ہے اور اس کے دشمنوں کے لیے موت (حَتْف) ۔

(الف) اگر تمام حروف صامت کی ترتیب منقلب ہے تو اس کا نام 'قَلْبِ کُلّ' ہوگا؛ مثلاً : اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَ اٰمِنْ رَوْعَاتِنَا (اے اللہ! ہمارے عیبوں اور خللوں (عَوْرَات) کو چھپا لے اور ہمارے خوف و اندیشہ (رَوْعَات) کو تسکین دے۔ [الحدیث] ۔

(ب) اگر بعض حروف میں قلب ہے تو اسے 'قَلْبِ بَعْض' کہتے ہیں ۔ اس صورت میں اگر ایک لفظ سطر کے شروع میں ہے اور دوسرا سطر کے اخیر میں تو اسے 'مَقْلُوبِ مُجَنَّح' [جناح دار مقلوب] کہتے ہیں [اس لیے کہ دونوں لفظ گویا بیت کے دو جناح یا بازو ہیں ۔ مختصرالمعانی]؛ مثلاً :

لَاحَ اَنْوَارُ الْهُدٰی مِنْ کَفِّهٖ فِیْ کُلِّ حَالٍ

(ممدوح کے ہاتھ سے ہدایت کی روشنیاں ہر حال میں چمک اٹھیں) ۔

III ۔ جب دو متجانس لفظوں میں سے ایک دوسرے کے بعد آئے تو اسے مُزْدَوِج و مُرَدَّد و مُکَرَّر کہیں گے؛ مثلاً : جِئْتُکَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ (میں تیرے پاس سَبَأ سے خبر (نَبَأ) لایا ہوں (سورۃ ۲۷ (النحل) : ۲۲)) ۔

IV ۔ "جناس" کے لیے حسب ذیل دو شرطیں ہوتی ہیں :

۱ ۔ دونوں لفظ ایک ہی مادے سے مشتق ہوں؛ مثلاً : فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّیْنِ الْقَیِّمِ (اپنا منه غیر متغیر (قَیِّم) دین کی طرف اٹھا (اَقِمْ) (سورۃ ۳۰ (الروم) : ۴۳)) اس مثال میں لفظ "أَقِم" اور "قَیِّم" قَامَ یَقُوْمُ سے مشتق ہیں۔

۲ - یا دو لفظوں کے درمیان شبہ اشتقاق ہو، یعنی دو لفظ ایک دوسرے کے مشابہ ہوں، لیکن ان کے مادے مختلف ہوں؛ مثلاً: قَالَ اِنِّی لِعَمَلِکُمْ مِنَ الْقَالِیْنَ○ (اس نے کہا میں تمھارے کام سے البتہ بیزار ہوں - (سورۂ ۲۶ (الشعراء) : ۱۶۸)) اس میں "قالَ" اور "قالین" ایک ہی مادے سے مشتق نہیں ہیں [لیکن مشابہ ہیں]۔

ابوالفتح البُستی نے التجنیس الانیس البدیع التأسیس تالیف کی۔ یہ ایسے حکیمانہ مقولوں یا جملوں کا مجموعہ ہے جن میں الفاظ متشابہ یا تقریباً متشابہ ہیں، لیکن معانی میں اختلاف ہے [یتیمة الدهر طبع دمشق ۱۳۰۴، ج ۴ : ۲۰۶ ببعد، [قب کتاب المتشابه للثعالبی در ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۵۰ء، ص ۹]؛ یتیمة ۴ : ۲۳۳ پر ابوالفتح نے بتایا ہے کہ اسے متشابہ کا شوق کس کی تقلید میں پیدا ہوا، نیز دیکھیں وہی جلد ص ۳ بُستی کے ایک مقلد کے لیے اور ص ۵۲ و ۶۷ برای مدح و ذمّ تجنیس—ادارہ]۔ طاش کوپری زادہ کی کتاب مفتاح السعادة (جلد اول، ص ۲۲۹) میں اس کے بعض اقتباسات دیے ہیں۔

مآخذ : (۱) محمد علی بن علی النهانوی : کشّاف اصطلاحات الفنون، قسطنطنیه ۱۳۱۷ھ، ص ۲۴۸؛ (۲) فخرالدین محمد بن عمر الرازی : نهایة الایجاز فی درایة الاعجاز، قاہرہ ۱۳۱۷ھ، ص ۲۸؛ (۳) صلاح الدین الصفدی : جنان الجناس، قسطنطنیه ۱۲۹۹ھ؛ (۴) جرجانی : تعریفات، قسطنطنیه ۱۳۰۷ھ، ص ۳۵؛ (۵) الشریشی : شرح المقامات، بولاق ۱۳۰۰ھ، ۱ : ۳۶۹؛ (۶) ڈیساسی : [المقامات الحریریة] *Les séances de Hariri*، پیرس ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۳ء، ص ۸۰ و ۲۶۸؛ (۷) ابوالفتح نصراللہ بن محمد بن عبدالکریم الموصلی : المثل السائر فی ادب الکاتب و الشاعر، قاہرہ ۱۳۱۲ھ، ص ۹۸؛ (۸) ابو ہلال الحسن بن عبداللہ العسکری : کتاب الصناعتین، قسطنطنیه ۱۳۲۰ھ، ص ۲۴۹؛ (۹) یحیی بن حمزة بن علی بن ابراهیم العلوی الیمنی : کتاب الطراز، قاہرہ ۱۳۳۲ھ، ۲ : ۳۵۵؛ (۱۰) ابو یعقوب یوسف السکاکی : مفتاح العلوم، قاہرہ ۱۳۱۸ھ، ص ۱۸۱ : "جناس"، "تجنیس"؛ (۱۱) طاش کوپری زادہ : مفتاح السعادة، حیدرآباد دکن ۱۳۲۹ھ، ۱ : ۲۲۹ و ۲ : ۳۳۹؛ (۱۲) عبدالهادی نجا الابیاری : سعود المطالع، بولاق ۱۲۸۳ھ، ۱ : ۳۰۱؛ (۱۳) ابن رشیق [القیروانی] : العمدة، قاہرہ ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء)، ۱ : ۲۲۰؛ (۱۴) ابومنصور الثعالبی : فقه اللغة و اسرار العربیة، قاہرہ ۱۳۱۷ھ، ۲ : ۳۱۴؛ (۱۵) قاسم البکرجی الحلبی : حلیة البدیع فی مدح النبی الشفیع، حلب ۱۲۹۳ھ، ص ۱۴؛ (۱۶) عبدالحمید قدّس ابن محمد علی بن الخطیب : طالع السعد الرفیع فی شرح نور البدیع علی نظم البدیع، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ص ۱۲؛ (۱۷) ابن حجة الحموی : خزانة الادب، قاہرہ ۱۳۰۴ھ، ص ۲۰؛ (۱۸) عبدالغنی النابلسی : نفحة الازهار علی نسمات الاسحار، بولاق ۱۲۹۹ھ، ص ۱۲؛ (۱۹) جلال الدین القزوینی الخطیب : تلخیص المفتاح مع تعلیقات لعبدالرحمٰن البرقوقی، قاہرہ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء، ص ۳۸۷؛ (۲۰) سعدالدین التفتازانی : مختصر المعانی، قسطنطنیه ۱۳۱۸ھ، ص ۱۹۳؛ (۲۱) ایضاً : المطوّل، قسطنطنیه ۱۳۰۴ھ، ص ۴۳۵؛ (۲۲) "مجامیع" : (ا) سعدالدین التفتازانی : مختصر علی تلخیص المفتاح؛ (ب) ابن یعقوب المغربی : مواهب الفتاح فی شرح تلخیص؛ (ج) بهاءالدین السبکی : عروس الافراح فی شرح تلخیص، (برهامش)؛ (د) الخطیب القزوینی : الایضاح؛ (ہ) الدسوقی : حاشیه علی مختصر التفتازانی، بولاق ۱۳۱۷ھ، ۴ : ۳۲۲؛ (۲۳) شمس الدین محمد بن قیس الرازی : المعجم فی معاییر اشعار العجم، لائیڈن ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء، ص ۳۰۹؛ (۲۴) گارساں ڈ تاسی : *Rhétorique et prosodie des langues de l'Orient Musulman*، پیرس ۱۸۷۳ء، ص ۱۲۰ ببعد؛ [جناس کی فارسی مثالوں کے لیے دیکھیے

شمس الدین فقیر : حدائق البلاغت، کانپور ۱۸۸۷ء، ص ۹۳۔ اور اردو مثالوں کے لیے صہبائی : ترجمۂ حدائق البلاغت برحاشیہ، طبع مذکور، ص ۱۰۷ - ادارہ]

(محمد بن شنب و ادارہ)

تَجْوِید : عربی، تجوید قراءت قرآن کا فن ہے۔ [کلمۂ التجوید کے لغوی معنی ہیں التحسین، یعنی نیکو کردن، آراستہ اور درست کرنا ؛ اصطلاح میں فن قراءت کا نام ہے]۔ جس سے حروف قرآن کی قراءت درست ہو جاتی ہے۔ اس طرح کہ ہر حرف صحیح مخرج سے اپنی مکمل صورت میں بغیر افراط و تفریط، بلا تکلّف و تعسّف، نرمی و سہولت کے ساتھ ادا ہونے لگتا ہے اور ادا کرنے میں آواز نہ زیادہ زور کی ہوتی ہے اور نہ کمزور، نہ بیجا طور پر کرخت اور نہ سست اور نہ اس میں کوئی لَحن یعنی لغزش اور غلطی ہوتی ہے نہ بے جا تفخیم و ترقیق ۔ تجوید کی تین کیفیتیں ہیں :

(۱) تَرْتِیل (۲) حَدْر (۳) تَدْوِیر

(۱) ترتیل : الفاظ کو بآہستگی مطالب پر غور کرتے ہوئے ادا کرنا [مذہب وَرْش و عاصم و حمزہ]۔

(۲) حَدْر: جلدی اور تیزی سے پڑھنا [مذہب ابن کثیر و ابی عمر و قالُون] ۔

(۳) تدویر : اعتدال کے ساتھ پڑھنا ، جس میں نہ آہستگی ہو نہ تیزی [توسّط میانِ ترتیل و حَدْر ؛ مذہب ابن عامر و الکسائی]۔

تجوید ("حِلْیَۃُ القراءت") سے غرض یہ ہوتی ہے کہ کتاب اللہ کی تلاوت کے وقت زبان لحن سے بچی رہے ۔ اس میں پہلے تو حروف صامت (consonants) کے صحیح مخارج بتائے اور سکھائے جاتے ہیں اور حروف کو ان سے نکالنے کی مشق کرائی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ اصول و قواعد وقف (ٹھہراؤ)، اِمالہ (الف کو یاء کی طرف جھکا کر تلفظ کرنا) اور اِدغام کے قواعد بھی بتائے جاتے ہیں ۔

حروف صامت کی مخارج کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں :

(۱) حروف مُسْتَعْلِیَۃ (اونچے) : وہ حروف جن کے ادا کرنے میں زبان اوپر تالو کی طرف اٹھ جاتی ہے ۔ وہ حروف یہ ہیں : خ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ اور ق۔ یہ سارے کے سارے تفخیم کے ساتھ ادا ہوتے ہیں، یعنی پُر کر کے پڑھے جاتے ہیں ۔ ان میں سے ص، ض، ط، ظ میں بہ نسبت اوروں کے تفخیم (پُری) زیادہ ہے۔

(۲) حروف مُسْتَفِلَۃ (نیچے): وہ حروف جن کے ادا کرنے میں زبان تالو سے نیچے رہتی ہے ۔ حروف مُسْتَفِلَۃ سب کے سب ترقیق کے ساتھ ادا ہوتے ہیں (یعنی پُر کر کے نہیں پڑھے جاتے)، بجز 'رآء' کے اور اسم اللہ کے لام کے جو مندرجۂ ذیل حالات میں قاعدے سے مستثنیٰ ہیں :

رآءِ مضمومہ یا مفتوحہ کو بہر حال پُر پڑھا جائے گا (یعنی تفخیم کے ساتھ ادا کیا جائے گا) ۔ اگر مکسورہ ہو (کسرہ اصلی ہو یا عارضی)، تو تفخیم کے ساتھ پُر نہ پڑھی جائے گی۔ اگر 'رآء' ساکن ہو اور اس سے پہلے حرف پر کسرۂ اصلی ہو یا 'رآء' ساکن ہو) اور اس سے پہلا حرف مکسورہ ہو اور دونوں ایک ہی لفظ سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن رآء کے بعد حرف مستعلیہ نہ ہو، تو بھی پُر نہ پڑھی جائے گی ۔ کلمۂ اللہ اور اللّٰھُمّ کا لام فتحہ یا ضمہ کے بعد بالاجماع پُر پڑھا جائے گا؛ مثلاً : قَالَ اللہ، قَالَ اللّٰھُمَّ، یَقُولُ اللہ، یَقُولُ اللّٰھُمَّ۔

لفظ کے آخر کے نون اور تنوین کا تلفظ، اگر ان کے بعد چھے حرف حلقی (ء، ہ، ح، خ، ع، غ) میں سے کوئی ہو، باظہار ہوگا؛ اگر ان کے بعد ی، ر، م، ل، و، ن (یرملون) میں سے کوئی حرف ہو، تو نون ساکن اور تنوین کا اس میں ادغام ہو جائے گا

اور یہ ادغام سوائے رآء (اور لام) کے دیگر حروف میں غنّہ کے ساتھ ہوگا ۔ اگر نون ساکن اور تنوین کے بعد حروف حلقیہ کے سوا اور کوئی حرف صحیح ہو، تو پھر ان کا تلفظ اخفاء کے ساتھ ہوگا (یعنی ان کا تلفظ اصلی نہ رہےگا بلکہ ادغام اور اظہار کے بین بین ہوگا)۔ میم ساکنہ کی بھی یہی حالت ہے، یعنی اس کے بعد میم ہو تو اس میں مدغم ہو جائےگا۔ نون ساکن یا تنوین کے بعد اگر باء متحرکہ آ جائے، تو نون ساکن اور تنوین کا میم کی طرح تلفظ ہوگا، جسے اقلاب کہتے ہیں (سیوطی: اتقان، ص ۱۳۵ ببعد)۔ ایسی حالت میں میم ساکن کا تلفظ باخفاء ہوگا ۔ دوسری حالتوں میں میم کا تلفظ اپنے معمولی حال پر رہتا ہے۔

ادغام کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کبیر : دونوں حرف صحیح ایک سے ہوں (یا متجانس یا متقارب ہوں) اور دونوں متحرک ہوں جیسے ما سَلَکَکُمْ کو ادغام کے ساتھ ما سَلَکُّم پڑھیں (سورۃ ۷۴ (المدّثّر) : ۴۲)۔

(۲) صغیر : جب پہلا حرف صحیح ساکن اور دوسرا متحرک ہو ۔ اسے خیال میں رکھنا چاہیے کہ لام تعریف کا صرف حروف شمسیہ کے ساتھ ادغام ہوتا ہے ۔ 'الف' 'واؤ' یا 'یاء' جب ساکن ہوں اور ماقبل کی حرکت ان کے موافق ہو، تو یہ حروف مدّہ ہو جاتے ہیں اور کھینچ کر نکالے جاتے ہیں ۔ اگر واو یا یای ساکنہ سے پہلے فتحہ ہو تو یہ حرف لِیْن ہو جاتے ہیں اور کھینچ کر نہیں ادا کیے جاتے۔

ہمزہ کا تلفّظ بہ تحقیق ہوگا یا بہ تخفیف ۔ بحالت تخفیف اس کی حرکت اس سے پہلے حرف صحیح ساکن کی طرف منتقل کر دی جائےگی ۔ اگر ہمزہ ساکن ہے، لیکن نہ بوجہِ وقف، تو اسے اس حرف مدّہ میں بدلا جا سکتا ہے جو اس کے حرف ماقبل کی حرکت کے مطابق ہو ۔ اگر ہمزہ سے پہلے ایک اور ہمزۂ ملفوظۂ متحرکہ نہ ہو تو اس کا تلفظ بہ تسہیل ہوسکتا ہے، لیکن اگر اس سے پہلے ہمزۂ ملفوظۂ متحرکہ ہو تو دوسرے ہمزہ کی حرکت مشابہ بہ سکون ہوگی اور اسے اگر وہ مضمومہ ہے تو بصورت واؤ، اگر مکسورہ ہے تو بصورت یاء اور اگر مفتوحہ ہے تو بصورت الف لکھا جائےگا اور اسی کے مطابق تلفظ ہوگا؛ مثلاً : أُؤَنَبِّئُکُمْ، أَئِذَا اور أَأَنْتَ (اتقان، حسب بالا، ص ۱۴۲ سطر آخر ببعد)۔

اگر ایک جگہ دو ہمزۂ مفتوحۂ مُتّفق الحرکۃ، دو لفظ سے تعلق رکھنے والے جن میں سے ایک پہلے لفظ کے آخر میں اور دوسرا دوسرے لفظ کے شروع میں ہو، آ جائیں تو بعض قرّاء دوسرے ہمزہ میں تسہیل کرتے ہیں، بعض الف سے بدل لیتے ہیں، بعض دونوں کے بیچ میں الف بڑھاتے ہیں اور دیگر قرّاء دونوں کو بہ تحقیق پڑھتے ہیں؛ مثلاً : جَاءَ أَجَلُکُمْ (اتقان، ص ۱۴۳ سطر ۴)۔

اگرچہ آیاتِ قرآنی بذریعۂ علاماتِ اوقاف قطعہ قطعہ ہوئی ہیں، لیکن پڑھتے وقت ضروری نہیں کہ ہر علامت وقف پر ٹھہرا جائے ۔ وقفِ تام وہاں ہوتا ہے جہاں عبارت کا مفہوم مکمل ہو جائے اور ما بعد سے لفظاً یا معناً کوئی تعلق نہ رہے (قبّ اتقان، ص۱۲۲ س ۷ از آخر صفحہ) ۔ مطبوعہ معتبر قرآنی نسخوں میں علاماتِ وقف کا قاعدہ یہ ہے کہ جہاں ٹھہرنا منع ہوتا ہے وہاں نشان ''لا'' بنا دیتے ہیں، جس کے معنی ہیں وقف جائز نہیں۔ حرف مشدّد، مثلاً : هُنّ ۔ بِهِمّ ۔ عَمّ، پر وقف کرنا ہو تو اس کے آگے ایک هاء ساکنہ بڑھا دیتے ہیں (ہاے سَکْتَہ)۔

بعض قرّاء الفاظ مَنْقُوصَۂ مُنَکّرہ کی آخری یاء کو جو بحالت رفع و جرّ پڑھنے میں گر جاتی ہے،

جیسے ہادْ، واقْ، داعْ وغیرہ، بحالت وقف پھر بحال کر دیتے ہیں اور ہادی، واقی وغیرہ کر لیتے ہیں ۔ بعض یاء کو اور اس کی حرکت ماقبل کو گرا کر ہادْ، واقْ وغیرہ پڑھتے ہیں ۔ جب کسی لفظ کے آخر میں همزہ ہو اور اس کے پہلے 'ی' یا 'واؤ' ہو تو همزہ کو حرف هم جنس ماقبل میں بدل کر ماقبل میں ادغام کر دیتے ہیں؛ مثلاً 'بریٓء' کو 'برِیّ' کر لیتے ہیں۔ اگر همزہ کے پہلے بھی همزہ ہو تو خصوصیت سے ایسا کیا جاتا ہے ۔ تنوین بحالت نصب وقف کی صورت میں الف سے بدل جاتی ہے ۔ الفاظ مفردۂ مؤنثه کی تاے تانیث (بحالت وقف) بدل کر ہاے ساکن ہو جاتی ہے ۔ لفظ متحرک الآخر پر وقف کیا جائے تو آخری حرف کی حرکت گر جاتی ہے، لیکن ضم و کسر، رفع و جر کی صورت میں حرکت کو ذرا سا ظاہر کر دینا (رَوْم) یا ہونٹ کے اشارے سے بتا دینا (اِشمام) جائز بلکه مناسب سمجھا گیا ہے (قب اتقان، ص ۹۱، سطر ۲ ببعد)۔

مآخذ: (۱) سیوطی: اتقان (مطبع احمدی دہلی ۱۲۸۰ھ، ص ۱۰۵)، قاہرۃ ۱۳۰۶ھ، ۱: ۸۲ و ۱۰۵؛ (۲) تهانوی: کشاف الاصطلاحات، طبع قسطنطنیه، ۱: ۲۱۶؛ طبع کلکته، ۱: ۱۹۶؛ (۳) علی بن سلطان القاری: المنح الفکریة علی متن الجزریة اور حاشیے پر: (۴) زکریّا الانصاری: الدقائق المحکمة فی شرح المقدمة [الجزریة]، قاہرہ ۱۳۴۴ھ؛ (۵) سلیمان الجمزوری: فتح الأقفال بشرح تحفة الأطفال اور اس کے ساتھ ایک گمنام مصنف کی فتح الرحمٰن فی تجوید القرآن، قاہرۃ ۱۳۴۳ھ؛ (۶) شیخ طاہر الجزائری: تدریب اللسان علی تجوید البیان، ۱۳۲۱ھ میں تمام ہوئی، بیروت، تاریخ طباعت ندارد؛ (۷) شیخ متولی: فتح المعطی و غنیة المقری فی شرح مقدمة ورش المصری، قاہرہ ۱۳۰۹ھ؛ (۸) ابو ریمة: هدایة المستفید فی احکام التجوید، قاہرہ ۱۳۴۴ھ؛ (۹) جرجانی: تعریفات، بذیل مادۂ ترتیل؛ (۱۰) بستانی: محیط المحیط، بذیل مادہ، ۱: ۳۱۴؛ (۱۱) عبدالنبی بن عبدالرسول: جامع العلوم، حیدرآباد ۱۳۲۹ھ، ۱: ۲۷۳؛ (۱۲) ابن القاصح: سراج القاری المبتدی و تذکار القاری المنتہی، شرح حرز الأمانی و وجه التهانی للشاطبی، قاہرۃ ۱۳۴۱ھ، خصوصاً ص ۳۶ تا ۱۲۰؛ [(۱۳) یار محمد بن خداداد سمرقندی: قواعد القرآن (فارسی، تالیف بنام ابوالغازی عبیداللہ بہادر خان)، خطی، لاہور].

(محمد بن شنب، و مرغوب احمد توفیق)

تُجِیب (بَنو): ایک خاندان کا نام، جس کے کئی افراد نے اندلس کے اسلامی عہد میں، جب ملوك الطوائف فرماں روا تھے اور اس سے پہلے بھی، جب اموی خلفاء کا دور حکومت تھا، بڑا نام پیدا کیا۔ اس خاندان کی دو شاخیں ہو گئیں: (۱) بنو ہاشم، جن کا مقرّ سَرَقُسْطَة (Saragossa) میں تھا اور (۲) بنو صُمادِح، جن کا مقرّ اَلْمَرِیَّة میں تھا ۔ فتح اندلس کے زمانے میں یہ خاندان اراغون Aragon [ثغر اعلٰی] میں آباد ہوا تھا ۔ امیر محمد اول (۲۳۹ھ تا ۲۷۳ھ / ۸۵۲ء تا ۸۸۶ء) کے عہد میں بنو تُجیب کا سردار عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز التُّجیبی تھا اور اپنے قبیلے والوں پر اسے جو اقتدار حاصل تھا، اسے صاحب قُرطُبه نے بھی تسلیم کر لیا تھا ۔ مؤخر الذکر نے اس تدبیر سے ارغون کے ایک اور خاندان کے اقتدار کو ختم کر دینے کی کوشش کی، اس خاندان والے مغربی گوطی (Visigothic) نسل کے تھے اور بنو کَسی کہلاتے تھے ۔ بنو تُجیب کے متعلق قب مادۂ سَرَقُسْطَة ۔ یہ بعد میں پہلے قُرطُبه کے باجگزار بنے، پھر سَرَقُسْطَة کے خود مختار حکمران (بنو ہاشم) کے مطیع ہو گئے اور اس وقت تک بدستور ان کے مطیع رہے جب کہ تک بنو ہاشم کو بنو ہُود کے حق میں معزول نہ کر دیا گیا ۔

بنو تُجیب کی دوسری شاخ بنو صُمادِح کو

عبدالرحمن تجیبی کی اولاد نے پہلے ہی ارغون سے نکال دیا تھا ۔ پانچویں صدی ہجری کے نصف میں ابو الأصبغ معن (رکّ بآن) بن محمد بن احمد بن صمادح التجیبی، جو اس شاخ کا سردار تھا، المریّة کی چھوٹی سی ریاست پر قابض ہونے میں کام یاب ہو گیا، اس ریاست کی بنیاد ۱۰۲۰ء میں دو ''صقلبیوں''، خیران اور زہیر نے ڈالی تھی ۔ جب وہ ۴۴۳ھ/۱۰۵۲ء میں فوت ہوا تو ابو یحیٰی محمد، المعتصم کا لقب اختیار کر کے، اس کا جانشین ہوا ۔ اس وقت اس کی عمر صرف چودہ برس کی تھی اور تین برس تک اس کا چچا صمادح بن محمد مدارالمہام (ریجنٹ) کے طور پر کام کرتا رہا ۔ المعتصم نے المریّة پر اپنی وفات، یعنی ۴۸۴ھ (۱۰۹۱ء) تک حکومت کی اور اس کا طویل عہد حکومت عرب مؤرخین کے بیان کے مطابق نہایت شان دار تھا، جس میں خوش‌حالی عام تھی ۔ اس کا بیٹا احمد معزّالدولة اس کا جانشین ہوا، لیکن اپنی جانشینی کے بعد ہی وہ مرابطین کے سامنے سے پسپا ہو گیا ۔ جب مرابطین نے اشبیلیه (Seville) پر بھی قبضه کر لیا، تو وہ بجایة (Bougie) چلا گیا جہاں وہ اور اس کے بیٹے گم‌نامی کی حالت میں فوت ہو گئے ۔

مآخذ : (۱) تجیبیوں کی مفصّل تاریخ ڈوزی (R. Dozy) کے مضمون میں درج ہے: *Essai sur l'histoire des Todjibides, les Beni Hâchim de Saragosse et les Beni Çomâdih d' Almérie*، در *Recherches sur l'histoire et la littérature de l 'Espagne pendant le moyen-âge*، طبع سوم، پیرس و لائیڈن ۱۸۸۱ء، ۱: ۲۱۱ تا ۲۸۱ قب نیز ابن عذاری : البیان المغرب، ج ۳ (طبع لیوی پرووانسال، پیرس ۱۹۳۰ء)، حصۂ دوم، مواضع کثیرہ؛ (۲) A. Prieto Vives : *Los Reyes de taifas*، میڈرڈ ۱۹۲۶ء، ص ۳۴ تا ۳۵، ۶۱ تا ۶۲؛ (۳) ڈوزی: *Histoire des musulmans d'Espagne*، لائیڈن ۱۸۶۱ء، ۴: مواضع کثیرہ ۔

(E. Lévi-Provençal)

تحسین ۔ میر محمد عطا حسین خان المتخلص به تحسین (''مرصّع رقم'' کے لقب سے بھی مشہور ہیں) ۔ ایک ہندوستانی مصنف، بظاہر اٹاوے کے رہنے والے اور میر محمد باقر خان [طغرا نویس] المتخلّص به شوق کے بیٹے ہیں ۔ تحسین کا بیٹا [سیّد] قاسم علی خان نه صرف [شاعر] بلکه [قابل] موسیقی دان بھی تھا ۔ تحسین کی پیدائش اور موت کی تاریخیں صحیح طور پر نہیں بتائی جا سکتیں [قاموس الاعلام میں تاریخ وفات ۱۲۰۰ھ دی ہے] ۔ ان کی نہایت اہم تصنیف نو طرز مرصع کی تکمیل کی تاریخ تقریباً ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء ہے ۔ آپ جنرل سمتھ کے ہاں ملازم تھے اور اس کے ہمراہ لکھنئو سے کلکتے گئے ۔ اس کے بعد آپ پٹنے میں بھی رہے، پھر والد کے انتقال کے بعد فیض‌آباد میں مقیم ہو گئے ۔ فیض‌آباد میں اُن کے مربّیوں میں سے پہلے مربّی نواب شجاع‌الدوله (م ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۵ء) تھے، جن کی ملازمت میں انھوں نے نو طرز کی تصنیف کے کام کو، جو انھوں نے بظاہر پٹنے میں شروع کیا تھا، جاری رکھا — پھر آصف‌الدوله، جن کے زمانے (۱۱۸۹ھ تا ۱۲۱۲/۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) میں یه تصنیف مکمل ہوئی ۔ مصنف نے نو طرز کے دیباچے میں آصف‌الدوله کی شان میں ایک قصیدے کا بھی اضافه کیا ہے ۔ کہتے ہیں که مشہور و معروف ہندوستانی شاعر مرزا محمد رفیع سودا [م ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء در لکھنئو] کے اشعار کے مطالعے سے تحسین کو شوق پیدا ہوا که ہندوستانی ادب کی بھی خدمت کرے ۔

تصانیف : (۱) نو طرز مرصع، یه قصۂ چہار درویش فارسی کا ہندوستانی نظم و نثر میں ترجمه ہے؛ اصل کتاب امیر خسرو کی طرف منسوب ہے، مگر گاہے اسے انجب یا محمد علی معصوم کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں ۔ نو طرز ایک دشوار پسند

طرزِ انشاء کا نمونہ ہے [''کتاب کو بعبارت رنگین و متین تصنیف کیا'' (تذکرۂ خوش نویسان)، جس میں ''اغلاق بہت ہے'' (کریم الدین)] ۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اغراض کے لیے قصۂ چہار درویش کا ایک اور ترجمہ میر امّن دہلوی نے ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۱ء میں شروع اور ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۳ء میں ختم کیا ۔ یہی وہ ترجمہ ہے جو باغ و بہار کے نام سے مشہور ہے ۔ تحسین کی نو طرز بمبئی (۱۸۴۶ء)، لکھنئو (۱۸۶۹ء) اور کان پور (۱۸۷۴ء) میں طبع ہوئی ۔ [نو طرز کا ایک ناقص الاول مگر خوشخط قلمی نسخہ، جو رجب ۱۲۱۳ھ میں جینمس سارٹین کے لیے لکھا گیا، کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی میں ہے ۔ اس کا ایک عمدہ نسخہ پشاور کی ایک نجی لائبریری میں بھی ہے ۔ ادارہ] ۔ خود نو طرز کا ادبی اثر ایک اور ہندوستانی مصنف عظمت اللہ پر بھی ہوا، جو اپنی رومانی تصنیف، قصۂ رنگین گفتار، کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس نے اس تصنیف کے اسلوب تحریر میں تحسین کا تتبع کیا ہے ۔ اس کے بر عکس انڈیا آفس کے ایک قلمی نسخے میں (فہرست بلوم ہارٹ (Blumhardt)، عدد ۱۳۲) تحسین کے ترجمے کی تمہید اور پہلے درویش کی کہانی کو علے الترتیب تیسرے درویش اور شاہ آزاد بخت کی کہانیوں کے ساتھ، جن کو ایک دوسرے ادیب محمد ہادی نے ہندوستانی میں ترجمہ کیا تھا، ملا دیا گیا ہے ۔

(۲) نو طرز کے علاوہ تحسین نے فارسی زبان میں انگریزی صرف و نحو پر ضوابط انگریزی کے نام سے ایک کتاب لکھی اور (۳) ایک اور کتاب تواریخ قاسمی کے نام سے بھی لکھی جو علم تاریخ کی کتاب معلوم ہوتی ہے ۔ [(۴) نیز انشاء تحسین مرتب کی]۔

یوسف علی خان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ تحسین ایک مشہور و معروف خوش‌نویس بھی تھے [خط نستعلیق و نسخ و شفیعہ میں انھیں کمال دستگاہ حاصل تھی، غلام محمد : تذکرۂ خوش نویسان، ص ۶۲] ۔ ان تحسین کے علاوہ محمد حسین خان نام ہی کے ایک اور مصنف متخلص بہ تحسین ہوے ہیں ، جن کے نعتیہ کلام کا ایک مجموعہ بزبان فارسی و ہندی گلستانِ نعت کے نام سے ۱۸۷۳ء میں دہلی میں طبع ہوا تھا ۔ اسی طرح مختلف مآخذ سے جمع کیے ہوے نعتیہ قطعات، جو محمد حسین خان تحسین (وہی [جن کا ابھی ذکر ہوا] ؟) کی تالیف سے ہیں، چمن مدح نبی[۶۱] کے نام سے ۱۸۵۴ء میں دہلی میں طبع ہوے تھے ۔ [مرزا عبدالعلی کشمیری ملازم نواب برہان‌الملک سعادت خان ناظم لکھنئو، عبدالعظیم لاہوری شاگرد شاہ فقیراللہ ، قاضی عبدالرحمن پانی پتی (م ۱۲۹۴ھ)، یہ سب متخلص بہ تحسین تھے — قاموس‌الاعلام ۳ : ۱۶۲۹ و مصحفی : عقد ثریا ، دہلی ۱۹۳۴ء، ص ۱۸]۔

مآخذ : (۱) گارساں دُ تاسی (Garcin de Tassy) : *Histoire de la littérature hindouie et hindoustanie*، طبع دوم، ۱ : ۲۱۲، ۳۰۶؛ ۳ : ۱۹۹ وغیرہ [کریم الدین : تاریخ شعرای اردو، دہلی ۱۸۴۸ء، ص ۲۱۸] ؛ (۲) *Grundriss der iran. Phil.*، ۲ : ۳۲۴؛ (۳) شپرنگر : *A Catalogue of the....manuscripts of the Libraries of the King of Oudh*، ۱ : ۲۹۴ ؛ (۴) بلوم ہارٹ (J. F. Blumhardt) : *Catalogue of the Hindustani manuscripts of the Library of the India Office* (۱۹۲۶ء)، ص ۲۴ تا ۳۴، ۵۱ ، ۶۷ وغیرہ ؛ (۵) ایضاً : *Catalogue of Hindustani printed books in the Library of the British Museum* (۱۸۸۹)، ص ۳۳۱؛ (۶) *Catal. India Office* ii / II ؛ (۷) بلوم ہارٹ : *Hindustan Books*، ص ۱۲۴ و ۱۴۶؛ (۸) باغ و بہار ،

طبع (D. Forbes)، طبع ششم، ص *ll* ببعد؛ [(۹) سامی بک: قاموس الاعلام ۳: ۱۶۲۹]۔

(V. F. BÜCHNER و ادارہ).

تَحصِیل: فعل حَصَلَ کے باب تَفْعِیل سے اسم مصدر ہے، اور اس کا اصلی مفہوم "جمع کرنا"، "فراھمی" اور "فراگیری" ہے ۔ ھندوستان میں اس لفظ کے معنی مالیانہ جمع کرنے تک محدود ھیں ۔ صوبجات متّحدہ، مدراس [اور مغربی پاکستان۔ ادارہ] میں ایک ضلع کے ایسے حصے کو 'تحصیل' کہتے ھیں، جس کا رقبہ ۴۰۰ سے ۶۰۰ مربع میل ھوتا ھے، مگر یو۔ پی میں اس سے کچھ کم ھوتا ھے ۔ احاطۂ بمبئی میں اسے 'تعلّقہ' بھی کہتے ھیں، جو بگڑ کر "تالوکا" ھو گیا ھے ۔ تحصیل ایک انتظامی اور مالی وحدت ھوتی ھے، جو اپنی وسعت کے لحاظ سے مغلیہ دور کے "پرگنے" اور "سرکار" کے بین بین ھوتی ھے ۔ اس کے افسر اعلٰی کو تحصیل دار (تحصیل کا حاکم) کہتے ھیں جسے انتظامی اور (باستثناے مدراس) مجسٹریٹوں کے اختیارات بھی حاصل ھوتے ھیں اور وہ براہِ راست یا تو کسی سب ڈویژنل افسر کے تابع ھوتا ھے جس کے تحت میں دو یا اس سے زیادہ تحصیلیں ھوتی ھیں یا وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا کلکٹر کے ماتحت ھوتا ھے ۔

مآخذ: (۱) معیاری کتب لغۃ؛ (۲) *Imperial Gazetteer of India*، آکسفورڈ ۱۹۰۹ء؛ (۳) H. Yule اور A. C. Burnell: *Hobson Jobson*، طبع Wm. Crooke، لنڈن ۱۹۰۳ء۔

(T. W. HAIG. ھیگ)

تخت باھی: سرحدی علاقے میں شکر سازی کا ایک اھم مرکز، مردان کے قریب واقع ھے جہاں فرنٹیر شوگر ملز (Frontier Sugar Mills) تخت باھی کے نام سے شکر سازی کا ایک بڑا کارخانہ قائم ھے جس میں قریب بارہ ہزار ٹن شکر بنائی جاتی ھے۔

فرنٹیر شوگر ملز نے ۵ لاکھ روپے کے سرمایے سے عرق (سپرٹ) کشید کرنے کے آلات لگانے کا بھی انتظام کر لیا ھے ۔ کارخانے کی عمارت تیار ھو چکی ھے اور مشینیں نصب کی جا رھی ھیں ۔ ان مشینوں میں ایک لاکھ من شیرے یا راب کو کام میں لایا جا سکتا ھے ۔ اس طرح ڈھائی لاکھ گیلن صنعتی الکحل ھر سال تیار ھو سکے گا ۔ یہ صنعتی الکحل فروخت کر کے جہاں اس کارخانے کو نفع ھوگا وھاں صوبائی حکومت کو بھی محصول آب کاری کی مد میں ساڑھے دس لاکھ روپے سالانہ کی آمد ھونے لگے گی۔

فرنٹیر شوگر ملز کا ایک منصوبہ یہ بھی ھے کہ دو لاکھ روپے کے سرمایے سے شیرینی سازی (Sweets) کا کارخانہ بھی قائم کرے ۔ یہ کارخانہ روزانہ دو ٹن مختلف شیرینیاں تیار کرے گا۔

(قاضی سعید الدین)

تَخْتَجی: لفظی معنی لکڑھارا، اناطولیہ کے ایک فرقے کا نام ھے جس کا میلان مذھب شیعہ کی طرف ھے ۔ چِپنی یا چِتِنی (قب F. Babinger در *Z. D. M. G.*، جلد ۷۶ [۱۹۲۲ء]: ۱۴۱ اور F. Taeschner، وھی جلد، ص ۲۸۲ ببعد) جن کا ذکر چودھویں صدی کے اواخر جیسے قدیم زمانے میں آتا ھے اور زیبک [رَکَ بآن] اور ان تمام فرعی فرقوں کی طرح، جو قِزِلباش کے نام کے تحت میں آتے ھیں، تختجی اجناسِ بشری کی تاریخ اور تاریخ مذاھب کے لحاظ سے اناطولیہ کی آبادی کا ایک علٰحدہ اور قائم بالذات جزء ھیں جن کی ابتداء کا حال ابھی تک اطمینان بخش طریق سے واضح نہیں ھو سکا ۔ تختجی زیادہ‌تر ایشاے کوچک کے مغربی حصے میں پائے جاتے ھیں جہاں وہ گاؤوں میں آباد ھیں اور مویشی پالنے، زراعت اور لکڑی کاٹنے اور دیگر ایسے ھی پیشوں

میں مشغول رہتے ہیں؛ غالباً ان کا نام تختجی لکڑی کاٹنے کے کام ہی کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہے۔ تختجی کی اصل تاریکی میں ہے ۔ فون لوشان (F. von. Luschan) اپنی کتاب *Reisen in Lykien, Milyas und Kibyratis*، وی انا ۱۸۸۹ء، باب ۱۳ میں یہ رائے ظاہر کرتا ہے (جو بیشتر سروں کی پیمائش پر مبنی ہے) کہ وہ ملک کے اصلی باشندوں کے آثار باقیہ میں سے ہیں۔ جورج جیکب (G. Jacob) کی رائے میں (قب *Islam*، ۲ : ۲۳۲ ببعد) تختجی δενδροφόροι کی برادری کے بچے کھچے لوگ ہیں (قب F. Cumont در Pauly-Wissowa بذیل Dendrophori؛ نیز H. C. Maué : *Die Vereine der Fabri, Centenarii und Dendrophori im Römischen Reich*، فرانک فرٹ بر رود مائن ۱۸۹۶ء، فہرست) ۔ ان دونوں نظریوں کے حق میں دلائل بہت کم ہیں ۔ ترجیح اس خیال کو ہے کہ تختجی اصل میں وہ ایرانی آبادکار ہیں، جو سولھویں صدی کے اواخر میں ایران سے مغربی اناطولیہ میں آئے اور صفویہ [رک بآں] کے عقائد کے پابند تھے ۔ ان کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ شاہ اسمعیل (قب بابنگر (F. Babinger) : *Schejch Bedr ed-Din*، لیپزگ و برلن ۱۹۲۱ء، ص ۹۱ ببعد) کے عروج سے پہلے بھی ایشیاے کوچک میں بہت پھیل چکے تھے ۔ اس رائے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ شاہ اسمعیل کے زمانے کے صفویہ اور تختجی کے عادات و رسوم میں حیرت انگیز مشابہت ہے ۔ ان کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ شراب پیتے اور خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی بعض رسوم ایسی ہیں جو اصطباغ اور عشاے ربّانی کی یاد دلاتی ہیں [اگر یہ صورت ہے تو پھر صفویہ فرقے سے کیا تعلق ہوا ؟ ۔ ادارہ] ۔ ان کی عورتیں بے پردہ ان کے درمیان ادھر ادھر آتی جاتی ہیں اور ہمیشہ سے بے پردہ رہی ہیں۔ وہ ایرانی اور عیسائی مہمانوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں، مگر ترکوں کی نہیں۔ شیعی نام، علی اور اسمٰعیل، ان کے ہاں خصوصیت سے بہت مقبول ہیں، قب W. Heffening در *Der Neue Orient*، ج ۴، برلین ۱۹۱۹ء، ص ۲۶۳ ببعد ۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 'آسٹریا و ھنگری' کے قنصل متعینۂ انطالیہ (عدالیہ)، تیبر فون پوتسل Tibor v. Pözl، کے قول کے مطابق (قب *Österr. Monnatsschrift für den Orient*، ج ۱۴، وینا ۱۹۱۵ء، ص ۶۰۵ اور F. Babinger در *Isl.*، ج ۱۲ [۱۹۲۱ء]، ص ۱۰۳) تختجی ترکی سلطنت کے دائرۂ حکومت سے باھر رہے ہیں اور '' ماضیِ قریب تک پرانے دستور کے مطابق انھیں ایرانی رعایا سمجھا جاتا تھا'' ۔ یہ تمام باتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ سابقاً ان کا صفوی سلطنت سے قریبی تعلق تھا ۔ اسی قنصل کے قول کے مطابق تختجی تکہ کے سنجق (نواح انطالیہ) میں خاص کر بہت زیادہ تعداد میں آباد ہیں ۔ یہ لوگ سردیاں تو ساحل پر گذارتے مگر گرمیوں میں اپنے گلوں کو ھانک کر پہاڑوں میں واپس چلے جاتے ہیں، جہاں وہ خیموں اور حقیر سی جھونپڑیوں میں رہتے اور مویشی پال کر گذارا کرتے ہیں ۔

مآخذ : مذکورۂ بالا مآخذ کے علاوہ (۱) قب G.H. Mordtmann: *Vier Vorträge über Vorderasien und die heutige Türkei*، برلین ۱۹۱۷ء، ص ۱۰۰ ببعد؛ (۲) F. v. Luschan در *Archiv für Anthropologie*، ج ۱۹، Braunschweig ۱۸۹۱ء، ص ۳۱ ببعد؛ (۳) وہ مآخذ جن کا ذکر F. Babinger : *Scheijch Bedr ed-Dīn* ص ۹۹ ببعد میں ہوا ہے (قب نیز *Isl.*، ج ۱۲ [۱۹۲۱ء]، ص ۱۰۳ ۔

(بابنگر FRANZ BABINGER)

تَخَلُّص : لغت میں بمعنی خروج ، مگر اصطلاحِ شعراء میں :

(۱) نزدِ متقدّمین بمعنی گریزِ قصیدہ، یعنی

نسیب سے مدح وغیرہ کی طرف نکلنا بلطفِ تحیّل (یعنی ''باسلوبِ لطیف و نمط محمود'')، پھر اس مدح وغیرہ میں نہایتِ قول تک پہنچنا (ابن رشیق (م ۴۶۳ھ/۱۰۷۰-۱۰۷۱ء) : عمدۃ، قاہرۃ ۱۳۲۵ھ، ۱ : ۱۵۶) - ابن المعتزّ (م ۲۹۶ھ/ ۹۰۸ - ۹۰۹ء) طبقات الشعراء، طبع وقفیۂ گب، ص ۸۰ سطر آخر) ''التخلص من النسیب الی المدح'' کا ذکر کرتا ہے، گو قُدامۃ بن جعفر (حدود ۳۲۶ھ) نقد الشعر (طبع بونیباکر Bonebakker، لائیڈن ۱۹۵۶ء) میں یہ اصطلاح مذکور نہیں - اسی صدی کے اواخر میں اور اس سے بعد کی صدی میں بھی اس معنی میں ''الخُروج'' ہی زیادہ مستعمل معلوم ہوتا ہے (ابوہلال العسکری (م ۳۹۵ھ/ ۱۰۰۴ - ۱۰۰۵ء) : کتاب الصناعتین، قاہرۃ ۱۳۲۰ھ، ص ۳۶۱)، گو تخلّص و توصّل کا رواج بھی تھا (عمدۃ : ص ۱۵۸؛ یہیں تخلّص کے اقسام بھی ملاحظہ کیجیے) - غرض اپنے معنی —— رہائی پانے —— کی رعایت سے تخلّص قدماء کے درمیان ''خروج از غزل و دخول در مدح وغیرہ کے معنوں میں مستعمل تھا، اس لیے کہ یہ غزل سے رہائی پانا ہے'' (مؤیّد الفضلاء، بذیل کلمۂ تخلّص، قبّ احمد نگری : جامع العلوم، ۱ : ۲۸۱) - خلّاق المعانی کمال اسمٰعیل اصفہانی (م ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ - ۱۲۳۸ء) : کلیات (بمبئی، بلا تاریخ)، ص ۱۸۷ پر ایک غزل کے آخر میں کہتا ہے :

تا تخلص کنم از وصفِ رخت
بثنای (فلان الخ) ۔

بعض کے نزدیک تخلص یہ ہے کہ مادح اپنا نام مدح میں لائے یا ممدوح کا نام لائے (تہانوی : مصطلحات، ۱ : ۴۳۲ و مؤیّد الفضلاء، بذیل کلمہ، (از روی جامع الصنائع)، نیز دیکھیے عوفی : لباب الالباب، ترجمۂ حارثی، ۱ : ۲۱۰) - شاعر ذکر ممدوح کی طرف آئے تو کہیں گے ''تَخَلَّصَ اِلٰی فلانٍ''، (''تخلّص الی'' کے شاہد کے لیے دیکھیے حماسۃ، طبع فریتاغ، ص ۲۲، سطر آخر؛ باخرزی : دُمیۃ القصر، حلب ۱۳۴۹ھ، ص ۱۳۸، س ۹ اور فارسی میں ''تَخَلُّص بفلان کردن''؛ قبّ شمسِ قیس، ص ۳۳۴) - مَخْلَص بھی تخلّص کے اس معنی میں مستعمل ہے؛ ڈوزی : *Supplément*، بذیل کلمہ، از روی فریتاغ و مِہرن Mehren : *Die Rhetorik der Araber* - وارستہ : مطلع السعدین، کانپور ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء، ص ۱۸ میں ہے کہ کمال اسمٰعیل نے بھی شعر میں ''مَخْلَص'' اسی معنی میں استعمال کیا ہے (مگر مطبوعہ دیوان میں یہ شعر نہیں ملا جو وارستہ نے دیا ہے)؛ نیز دیکھیے ص ۱۷۵، وسط عمودا ۔

عرب شعراء نے جاہلیت اور اسلام میں تخلص یا گریز کو بہت اہمیت دی اور اس پر بہت زورِ طبیعت صرف کیا - اس باب میں متنبّی نے بہت نام پیدا کیا - ابوہلال عسکری (الصناعتین، ص ۳۶۱ تا ۳۷۰) نے خروجِ متّصل و غیرمتّصل بماقبل کی ستّر سے کچھ ہی کم مثالیں دی ہیں - علٰی ہذا عموماً فارسی قصیدہ گویوں کے ہاں بھی گریز مستعمل ہے - وطواط (حدائق السحر، تہران حدود ۱۳۰۸ ش، ص ۳۱ ببعد) عنصری کے اکثر تخلّصات کی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس معنی میں وہ ایرانیوں کے لیے ایسا ہے جیسے عربوں کے لیے متنبّی ۔

(۲) متاخّرین کے نزدیک شاعرانہ نام جو عموماً مختصر ہوتا ہے اور شاعر اس کا ایراد شعر میں کرتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معنی میں تخلّص کی رسم شعرائے ایران سے مخصوص ہے (روحی : دبیر عجم، ص ۴۷ ببعد) - ترکی اور اردو شعر میں شاعرانہ نام یا تخلّص کا رواج فارسی ہی کے زیر اثر ہوا - فارسی میں تخلص رکھنے کی رسم تو فارسی

شاعری کے آغاز ہی سے معلوم ہوتی ہے، مگر اس قلمی نام کو تخلص کہنے کی رسم بعد کی ہے، چنانچہ شمسِ قیسِ رازی (اوایل قرن ہفتم ہجری) اس کا ذکر ہی نہیں کرتا ۔ ہمیں اسکا ذکر نویں صدی / پندرھویں صدی کے اواخر کی بعض کتابوں میں ملا ہے ۔ محمود گاوان (م ۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء) لکھتا ہے کہ ”اس زمانے میں مستحسن ہے کہ شاعر کا نام غزل کے آخر میں مذکور ہو؛ گو متقدمین کے ہاں نام مذکور نہیں ہوا، لیکن شیخ سعدی شیرازی (م ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء) کے بعد رواج ذکر کا ہے“ (متقدمین کے ہاں جو صورت ہے اس کا ذکر بھی آتا ہے) ۔ جامی کی بہارستان (۸۹۲ھ / ۱۴۸۷ء)، ص ۸۰ پر ہے کہ فردوسی نے یہ ”تخلّص“ کیوں اختیار کیا؛ نیز دیکھیے وہی کتاب، ص ۹۶ (ایک معاصر کے تخلّص کے باب میں)؛ نیز دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ص ۳۱ و ۵۰۰ ۔ ترکی میں مَخْلَص بھی تخلص کے معنیِ دوم کے لیے مستعمل ہے (دیکھیے سامی: قاموس الأعلام، ۳ : ۱۶۵۸ بذیل تقی اصفہانی، ۱۶۵۹ بذیل تقی کاشی وغیرھما من المواضع) ۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تخلّص کے معنیِ اول میں تغیر کب نمودار ہوا، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تخلّص کا نام سے (شروع میں نام ممدوح سے) تعلق بہت پرانا ہے ۔ یہ صورت گریز میں اب بھی موجود ہے ۔ ابتدائی دور میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں ممدوح کے ساتھ مادح کا نام بھی لیا گیا ہے؛ مثلاً عنصری اور فرخی کے ہاں (مثالیں دیکھیے، ”رسم تخلص“ الخ، ص ۶ کے حاشیے میں) ۔ ممکن ہے پھر رسم عام ہوگئی ہو ۔ بعد میں جب قصیدے سے کٹ کر غزل ایک الگ صنف بن گئی تو ممدوح کے نام کا تو کوئی موقع نہ رہا، البتہ شاعر کے نام کا مقطع میں استعمال رواج پذیر ہو گیا؛ یہ محض قیاس ہے ۔

اب یہ سوال کہ تخلّص کی رسم کیسے پیدا ہوئی، اس کے متعلق بھی قیاس ہی سے کام لینا پڑتا ہے ۔ رسم تخلّص کے ارتقاء پر نظر ڈالیں تو چند مدارج سامنے آتے ہیں: بہت سے شعرائے عرب جاہلیت و اسلام میں القاب سے ملقّب تھے، بعض بالخصوص اس لیے کہ انھوں نے کسی بیت میں کوئی ایسا کلمہ کہہ دیا جس کی وجہ سے انھیں ملقّب کر دیا گیا؛ مثلاً الأعْصر، المُمَزِّق، المُتَلمِّس وغیرہ؛ ابن درید (م ۳۲۱ھ/۹۳۳ء) نے الوشاح میں اکاون سے زیادہ ایسے ملقّب شعراء کے نام گنائے ہیں (عبدالقادر البغدادی: خزانۃ ۳ : ۲۶۶)، سیوطی نے اٹھاون (المزہر، قاہرۃ ۱۳۲۵ھ، ۲ : ۲۶۸ تا ۲۷۶) اور ابن قتیبۃ نے کتاب الشعر میں ۱۶ ۔ ان کے علاوہ ابن قتیبۃ نے ۱۹ ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے جن کی تلقیب کسی بیت کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی اور سبب سے ہوئی؛ مثلاً المُحَبِّر (= طفیل الغَنَوی)، زیاد الأعْجَم وغیرہ (الشعر، ص ۲۷۵، ۲۰۷ وغیرہ) ۔

لیکن عربوں میں تخلص بمعنیِ دوم نہ جاہلیت میں موجود تھا، نہ اسلام میں، گو ان دونوں زمانوں میں بعض شعراء اپنا نام شعر میں لے آتے تھے؛ مثلاً لبید (دیوان لبید، طبع براکلمان، ص ۲۰ و طبع الخالدی، ص ۲۰)، مُتَلمِّس (الشعر، ص ۸۰)، النَمِربن تولَب (مخضرم، کتاب نقد الشعر، ص ۴۳) و ربیعۃ الرقّی (عہد ہارون الرشید، طبقات ابن المعتز، ص ۱۷ تا ۹۷، اورصرف الرقّی، ص ۴۷ پر مکرّر)، القُطامی (م ۱۱۰ھ/۷۲۸-۷۲۹ء)، دیوان القطامی، طبع Barth، ص ۰۱، بیت ۲۹) ۔

سیف الدولہ (۳۳۳ تا ۳۵۶ھ / ۹۴۴ تا ۹۶۷ء) اور سامانیوں کے دور میں (۲۷۹ تا ۳۸۹ھ / ۸۹۲ تا ۹۹۹ء) شام (اور اسی طرح عراق) اور خراسان و ماوراء النہر میں شعراء نے تخلص نما لقب اختیار کیے؛ مثلاً النامی، الناشی (از شعرائے سیف الدولۃ)، الزاہی، الناجم، الطالع،

الطاہر اور الظاہر (جو ابو علی محمد بن علی البلخی نے ان کی تقلید میں اختیار کیا؛ وہ سفر عراق و شام کے بعد نیشاپور میں آ بسا تھا) (یتیمۃ الدھر، ۴ : ۲۹۶)۔

عین ان عرب شعراء کے طریق پر دربار سامانیہ اور غزنویہ کے فارسی گو مشاہیرِ شعراء کے کلام میں بھی اولاً انکے نام یا کنیتیں کہیں کہیں نظر آنے لگیں، پھر تخلص؛ مثلاً چوتھی اور پانچویں صدی ھجری کے نامور شعراء میں سے حسب ذیل کے ہاں : رودکی (م ۳۲۹ھ/۹۴۰-۹۴۱ء) : دیوان رودکی، تہران ۱۳۱۵ھ، ص ۷ و ۷۵ و رسم تخلص الخ، ص ۱۰ (اگر تخلص والے اشعار کی نسبت صحیح سمجھیں)، نیز ملاحظہ ہو دیباچۂ دیوان رودکی، جس میں متعدد شعراء نے اس کو رودکی کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ تقریباً پہلا ایرانی شاعر ہے جو تخلص کے ساتھ مشہور ہوا [سعید نفیسی : احوال و اشعار رودکی، ۲ : ۴۶۶] ؛ فردوسی (م ۴۱۱ یا ۴۱۶ھ) (مثنوی میں)؛ عنصری (م ۴۳۱ یا ۴۴۱) (دیوان عنصری، تہران، بلاتاریخ، ص۶۶ و ۱۶۱ (قصیدوں میں)، ص۱۷۷ (غزل میں)؛ تقریباً اسی طرح کم کم اس کے معاصر منوچہری کے ہاں؛ نیز فرخی (م ۴۷۰ھ / ۱۰۷۷ - ۱۰۷۸ء) (دیوان فرخی، ص ۲۶۵ و ۲۶۸ تا ۲۷۰، و ۳۶۹ وغیرہ، قصاید خصوصاً اواخرِ قصاید میں، مگر غزل میں نہیں،) اور ناصرِ خسرو (م ۴۸۱ھ/۱۰۸۸-۱۰۸۹ء) قطعہ و مثنوی و قصائد میں 'حجت'، یا 'ناصر خسرو' تخلص لاتا ہے، دیوان، اشاریہ بذیل ناصرِ خسرو، اس کے ہاں غزل ہے ہی نہیں) ؛ ان کے بعد تقریباً چھٹی صدی کے نصف آخر کے شعرائے عراق (عہد آل سلجوق) اسی طرح قصیدے میں کہیں کہیں نام یا تخلص لاتے ہیں (دیکھیے عوفی : لباب الالباب، ۲ : ۳۹۹، ۴۲۳) ؛ ان سے زیادہ سنائی (م ۵۲۵ھ/۱۱۳۰-۱۱۳۱ء یا ۵۳۵ھ/۱۱۴۰ - ۱۱۴۱ء، قصائد و غزلیات میں)؛

مختاری غزنوی (م در حدود ۵۳۰ھ، مادح غزنویہ و سلاجقہ، دیوان، تہران ۱۳۳۶ ش، ص بیست و یک) زیادہ تر قصائد میں؛ سید حسن غزنوی اشرف (م بین ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء و ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء) (دیوان، اشاریہ بذیل حسن) قصائد و قطعات کے شروع میں، یا بیچ میں، یا اواخر میں اور متعدد غزلیات کے اواخر میں تخلص لاتے ہیں۔ انوری (م ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء) قصائد میں کم مگر غزل میں بارہا تخلص لاتا ہے۔ خاقانی (م ۵۹۵ھ) تمام اصناف کلام میں التزام کے ساتھ تخلص لاتا ہے۔ نظامی (م حدود ۶۰۰ھ/۱۲۰۳-۱۲۰۴ء) اپنی مثنویوں کی شروع اور آخر فصلوں میں بالخصوص تخلّص لاتے ہیں۔ ساتویں صدی کے وسط اور آٹھویں صدی اور اس کے بعد سے (شمس تبریزی، سعدی، عراقی، خسرو اور حافظ کے زمانے سے) تخلّص خصوصاً مقطعِ غزل میں لانا ایک مسلّم طریقہ ہو گیا، جس کی پابند شعراء آج تک کرتے چلے آتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ چوتھی اور پانچویں صدی ھجری میں بتدریج تخلّص کا استعمال زیادہ ہو گیا (یہ قصیدہ نویسی کا زمانہ تھا)۔ چھٹی صدی میں یہ دستور عام تر ہونے لگا۔ (اب غزل پہلے سے زیادہ لکھی جانے لگی) اور تمام اصنافِ سخن میں تخلص کا رواج ہوا اور ساتویں صدی کے اواسط اور اس کے بعد سے آخرِ غزل کے لیے تخلص لازمی ہو گیا ؛ گو اور اصنافِ کلام میں بھی اسکا استعمال جائز سمجھا گیا۔

اس رسم کے پیدا ہونے کی ضرورت کیا تھی ؟ شاہی درباروں میں یا عام طور پر بہت سے شعراء کی موجودگی میں امتیاز کی ضرورت ہے۔ اسی خیال نے شاعرانہ تسمیے کی رسم پیدا کی ہوگی، جس کے ساتھ عام تعارف کے لیے مقامی نسبتیں بھی شامل ہو گئیں۔ اس سے مقصود کلام کو خلط و سرقہ سے بچانا بھی ہوسکتا ہے (قبّ ہُجْویری : کشف المحجوب، فصل اول) اور چونکہ نامِ شاعر بارہا سالماً شعر میں نہیں

آ سکتا، اس لیے اس نام میں ایجاز ضروری ہوا۔
اس سلسلے میں تخلّص کی لفظی ہیئت کا ارتقاء بھی بڑا دلچسپ ہے ۔ اسدی کی لغت الفرس (۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے تک شاعرانہ نام کی مختلف صورتیں مروج تھیں: مثلاً اپنے ھی نام کا بطور تخلص استعمال جیسے حنظلۂ بادغیسی، شہید بلخی، فیروز مشرقی وغیرہ ۔ بعض کنیتوں سے یاد کیے جاتے تھے ؛ مثلاً ابو العباس ، ابو اسحاق وغیرہ ۔ بعض وطن کی نسبت سے، مثلاً رودکی؛ البتہ بعض نام بعد کی شکل کے حامل ھیں؛ مثلاً استغنائی، سروری وغیرہ ۔ بعض کیفیات کا اظہار کرنے لگے ھیں؛ مثلاً حکیم غمنا ک، قریع الدھر وغیرہ ۔
شروع شروع میں شعراء قصیدے میں تخلّص کا التزام نہ کرتے تھے (اور نام لاتے تو قصیدے کے مقطع کی پابندی نہ تھی)۔ عنصری، منوچہری وغیرہ سے زیادہ مسعودِ سعدِ سلمان کے قصاید میں اس کا استعمال ھے اور حکیم سنائی اس کو رسم و دستور کی حد تک مانتے معلوم ہوتے ھیں اور قطعہ و قصیدہ میں تخلّص بکثرت استعمال کرتے ھیں ؛ صاحبِ تنقید شعر العجم کا خیال ھے کہ ''تخلص کا رواج غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر انھیں کے ھاں پایا جاتا ھے'' (کتاب مذکور، ص ۱۷۴، طبع انجمن ترقّی اردو)، مگر مقطع کا التزام نہیں، دیگر مقامات پر بھی آ جاتا ھے ۔ یہی عادت عطّار کی تھی (تنقید شعر العجم، ص ۳۷۴)۔ ان کے بعد تو یہ رسم قانون کے درجے تک جا پہنچتی ھے ۔ معاصر ترکی شاعری کا بھی یہی عالم ھے ۔ قصیدہ، قطعہ و غزل کے علاوہ بعض شعراء گاھے رباعی میں بھی تخلص لائے ھیں، جس کے لیے کسی مصرعے کی تعین نہیں ھے (دیوان مسعود سعد سلمان، بامداد اشاریہ؛ وارستہ : مطلع السعدین، ص ۱)۔
شروع شروع میں تخلص سادہ ہوتے تھے اور نام یا نسبت یا لقب یا عرف سے اس مفہوم کو ادا کیا جاتا تھا، پھر ان میں بھی جدّت طرازی کا آغاز ہوا ۔ کوئی نفسیاتی پہلو، کوئی حالتِ واقعی، کوئی واقعاتی جہت بنیادِ تخلّص بننے لگی ۔ غرض مناسبت کا خیال ابھرا (دبیر عجم، ص ۶۰) ، مگر بڑی مدت تک نام یا کنیت سے تخلص نکالنے کا میلان غالب رہا ۔ بعد میں شاعری کا چرچا جتنا بڑھتا گیا، دوسرے محرّکات، مثلاً پیشوں کی نسبت سے یا کسی مرشد یا استاد سے نسبت، قبیلے یا مسلک کی رعایت یا سلاطین کی نسبت سے تخلّص اختیار کیے جانے لگے ۔ اگر کسی تخلّص میں فال نیک کے معنی موجود ہوں، تو اسے ترجیح دی جانے لگی (قبّ دبیر عجم، ص ۵۷)۔ جسمانی حالت بھی گاھے مدّنظر رھی ھے، مثلاً نزار اور نازك وغیرہ ۔ شاعری کا خاص میلان یا افتادِ مزاج بھی بنائے انتخاب بنتا رہا؛ مثلاً غنی کاشمیری (مرآۃ الخیال، ص ۱۶۱)، غیوری (مآثر رحیمی، ص ۹۷۶) وغیرہ ؛ بعض مضحک تخلص بھی اسی رعایت کے ماتحت رکھے گئے ھیں ۔
ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب تخلص رکھنے کی رسم ایک مجلسی تقریب کی حیثیت اختیار کر گئی ۔ استاد عموماً تخلص تجویز کیا کرتے تھے اور کبھی فال سے تخلص نکالا جاتا تھا؛ مثلاً سہیلی (دولت شاہ، ص ۵۰۹)۔ تخلص سے جذباتی لگاؤ ایسا رکھا جاتا تھا کہ بعض اوقات اس پر شاعروں میں بڑے بڑے جھگڑے بھی پیدا ہوتے رھے اور تخلّص میں تبدیلیاں بھی ہو جاتی تھیں ۔ بعض شعراء تخلّص سے شعر میں ازدیادِ معنی کا کام لیتے تھے؛ مثلاً اردو شاعر مومن تخلّص کی اس رعایت سے اکثر مضمون نکالتے ھیں ۔ اردو شعراء کے تخلص واقعیت اور حقیقت اور رنگ شاعری سے مناسبت کے خاصے ترجمان معلوم ہوتے ھیں، مگر ھر جگہ یہ استنتاج درست نہیں (سالنامۂ ادبِ لطیف ۱۹۳۶ء، مضمون اختر اورینوی : غالب کے بعد) ۔ فارسی

اردو شاعری کے آخری دور میں تخلص میں یاے نسبتی کا رواج بہت کم نظر آتا ہے اور تخلص کے کڑے قواعد میں وہ سختی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی، گو رواج اب بھی باقی ہے۔

مآخذ : علاوہ ان کتابوں کے جن کا ذکر متن میں ہے، حسب ذیل کتابیں مفید ہیں: (۱) دیوان عنصری، (تہران) بلاتاریخ، عہد ناصر الدین شاہ (۱۲۶۴-۱۳۱۳ھ/۱۸۴۸-۱۸۹۶ء)؛ (۲) دیوان منوچہری، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۳) دیوان فرخی، تہران ۱۳۱۱ ش؛ (۴) دیوان اشعار حکیم ناصر بن خسرو، طہران ۱۳۰۴ تا ۱۳۰۷ش، اشاریہ؛ (۵) دیوان مسعود سعد سلمان، تہران ۱۳۱۸ ش؛ (۶) حکیم مختاری غزنوی، تہران ۱۳۳۶ ش؛ (۷) کلیات سنائی، تہران ۱۳۲۰ ش؛ (۸) دیوان سید حسن غزنوی ملقب بہ اشرف، تہران ۱۳۲۸ ش، اشاریہ؛ (۹) کلیات نظم انوری، کانپور ۱۸۹۷ء؛ (۱۰) کلیات خاقانی، ۲ جلد، لکھنئو ۱۸۷۰ء؛ (۱۱) نظامی: سکندر نامہ، کانپور ۱۸۷۰؛ ہفت پیکر، طبع رٹر Ritter، استانبول ۱۹۳۴ء؛ خمسہ (تہران) ۱۳۲۱ھ؛ (۱۲) عوفی: لباب الالباب، لیدن ۱۹۰۶ء؛ (۱۳) جامی: بہارستان، دہلی ۱۳۱۸ھ؛ (۱۴) روحی: دبیر عجم، لاہور ۱۹۲۸ء؛ (۱۵) سید محمد عبداللہ: "رسم تخلص کے دستور اور اس کے قاعدے" در ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۴۷ء، ص ۳ تا ۲۹۔

(سید محمد عبداللہ و ادارہ)

تَدْبِیر : تدبیر عربی مادہ "د ب ر" کے باب تفعیل کا مصدر،

(۱) یعنی انتظام کرنا - سیاسة و ادارة، عربی لغت نویس تشریح کرتے ہیں کہ فعل دَبَّرَ اسم دُبُر سے بنا ہے - دُبُرُ کُلِّ شَيءٍ کے معنی ہیں: عقب و مؤخر ہر چیز، سپس پشت و آخر ہر چیز (ضدّ قُبُل)، چنانچہ عربی لغت لسان، ۵ : ۳۰۸ میں لکھا ہے کہ التّدبیر فی الامر یہ ہے: "اَنْ تَنْظُرَ اِلٰی مَا تَؤُلُ اِلَیه عَاقِبَتُہ" یعنی کسی کام میں تدبیر یہ ہے کہ تم اس کام کے نتیجے یا انجام پر نگاہ رکھو - یا تدبیر امر یہ ہے "اَنْ یَتَدَبَّرَ الرَّجُلُ اَمْرَہُ وَ یُدَبِّرَہُ؛ اَی یَنْظُرَ فِی عَوَاقِبِہ" یعنی آدمی پایان کار کا خیال کرے؛ اس کے انجام پر نگاہ رکھے - اس فعل کا استعمال اب دو معنوں میں ہوتا ہے : اول حکومت اور ادارہ [نظم و نسق] کے معنے میں — مثال کے طور پر ابن ابی الرّبیع کی ایک تصنیف کا عنوان ہے : سُلُوکُ الْمَالِک فِی تَدْبِیرِ الْمَمَالِک؛ دوسرا مفہوم جس سے ہمیں یہاں بحث ہے، وہ ہے راہنمائی کرنا، گھر بار کا انتظام کرنا، تدبیر المنزل (یعنی خانہ داری) - *οἰκονομία* مثلاً ابن خلدون اپنے مقدمے میں (ملاحظہ ہو طبع قاترمیر (Quatremére) در *N. E.*، ۱۶ : ۶۲؛ ترجمۂ ڈ یسلان (de Slane) در *N. E.*، ۱۹ : ۷۸) لکھتا ہے : "السِّیَاسَةُ الْمَدَنِیَّةُ هِیَ تَدْبِیرُ الْمَنْزِلِ وَ الْمَدِیْنَةِ الخ" یعنی سیاست مدنیہ اخلاق و حکمت کے مقتضا کے مطابق خانہ داری یا شہر کا انتظام کرنے کو کہتے ہیں تا کہ وہ سب ایک ایسے دستور ('مِنْہاج') کے مطابق زندگی بسر کریں جس میں نوع کا تحفظ اور بقا ہو۔

علم تدبیر المنزل حکمت عملی کی تین قسموں میں سے ایک ہے - مسلمانوں نے یونانی ادبیات (ہیلینیّت) میں سے حکمت عملی کو بجنسہ ان تین قسموں سمیت [اپنے ادب میں] منتقل کر لیا - وہ تین قسمیں یہ ہیں : علم الاخلاق، اقتصادیات (علم تدبیر المنزل) اور علم ملک داری مع علم السیاسة (قب مثلاً ابن سینا کا رسالہ اقسام العلوم العقلیة در مجموعة الرسائل، طبع قاہرة ۱۳۲۸ھ، صفحہ ۲۲۹ بعد اور القفطی تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ (Lippert)، ص ۵۰ اور ان کے علاوہ دیگر مصنفین) - جیسا کہ سب سے پہلے رٹر (Ritter) نے بتایا، مسلمانوں کے تمام

اقتصادی ادب (تدبیر المنزل) کا پتا ایک نوفیثاغورثی فلسفی بُرُوسَن (Bryson) کی تصنیف *Economics* تک چلایا جا سکتا ہے ۔ اس کتاب کا اصل یونانی نسخه تلف ہو گیا، البته ایک عربی ترجمه سلامت رہا (طبع شیخو (Cheikho)، در مشرق، ج ۱۹ [۱۹۲۱ء] : ص ۱۶۱ تا ۱۸۱ ۔ اس عربی ترجمے کا ذکر بہت پہلے تک ملتا ہے (دیکھیے الفہرست، صفحه ۳۱۰) [کتاب بُرُوسن فی تدبیر المنزل ۔ اداره] ۔ عربی ترجمے سے ایک عبرانی ترجمه کیا گیا (ملاحظه ہو فہرست مخطوطات عبرانی در میونخ Munich, Cod. Hebr. 263، رِٹر (Ritter) در *Isl.*، ج ۷ [۱۹۱۷ء] : ص ۱۲ ببعد) ۔ اسی عربی ترجمے سے ایک لاطینی ترجمه بھی تیار کیا گیا (ملاحظه ہو ڈُرسُڈن کا نسخهٔ جالینوس) ۔ اس لاطینی ترجمے کی جانب پلسنر (Plessner) نے توجه مبذول کرائی) ۔ پلسنر نے اس کا اڈیشن مرتب کیا ہے اور سارے متعلقه مواد کا مطالعه بھی کیا ہے ۔ اس کے نزدیک اسلامی اقتصادیات یا تدبیر منزل (economics) کے اہم خطوطِ ارتقاء حسب ذیل ہیں :

ایک گروه تو فقط ناقلین اور محض مقلّدین کا گذرا ہے (مثلاً الدمشقی : اشارة الی محاسن التجارة، طبع رِٹر (Ritter) در *Isl.*، ج ۷ : ص ۱ ببعد؛ ابن ابی الرّبیع : سُلوك المالك؛ فخرالدین الرازی : دائرۂ معارف [''یعنی جامع العلوم''، تکملهٔ براکلمان، ۱ : ۹۲۵، ایک عمده نسخه کتابخانهٔ نور عثمانیه، استانبول میں، شماره ۳۷۶۰ ۔ اداره] اور ابن الفَنَاری) ۔ اس گروه سے قطع نظر کریں تو ہم دیکھتے ہیں که نصیرالدین [طوسی] نے بروسن کی کتاب *Economics* کا اڈیشن خود مرتب کر کے اسے اپنی کتاب اخلاق ناصری میں شامل کیا اور اس میں اسلامی و عجمی خیالات کا اضافه کیا ۔ اقتصادیات طوسی کو مسلمانوں میں ہمیشه کے لیے اس موضوع کا آخری نمونه تسلیم کیا جاتا رہا ۔ اسی پر اخلاق جلالی مبنی ہے ۔ اقتصادیات سے بحث کرنے والے متأخّرین، مثلاً الغَزالی، الشّہرزوری، الآملی (جس نے متعلقین کے ساتھ اخلاق برتاؤ پر ایک فصل داخلِ کتاب کی ہے) اور الایجی کا انحصار زیادہ‌تر اسی کتاب پر ہے۔

ان اقتصادی تصنیفات میں حسب ذیل موضوعات شامل ہوتے ہیں : مال (property) کا حصول، تحفظ اور اس سے انتفاع [سیاست اقوات و اموال]؛ بچوں عورتوں اور غلاموں سے مناسب سلوك [سیاستِ اہل و عیال] ۔ ہر بحث کا مقصود یه ہے که سعادت بطریقِ اتمّ حاصل کر کے اس کی نگہداشت کی جائے۔

الفہرست کے صفحهٔ ۲۶۳ پر اقتصادیات کی ایک اور ایسی کتاب کا ذکر ہے جو بظاہر یونانی دور میں تصنیف ہوئی اور جس کا عربی میں ترجمه کیا گیا ۔ اس کا نام ہے کتٰب رُوفس فی تَدبیر المَنزِل لِعلوسوس (ع کے بجاے غالباً غ، ف یا ق پڑھنا چاہیے) یعنی ''فلاں (مشکوك الاسم) شخص کے اقتصادی نظریات پر رُوفَس کی کتاب'' ۔ اس قدیم مصنف کا نام یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتا، خصوصاً اس لیے که قدیم ماہرینِ اقتصادیات میں سے بہت کم لوگوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں ۔ گمان کیا جا سکتا ہے که شاید یه نام فلوڈیموس (Philodemus) کی طرح کا ہو ۔ *Economics* (الاقتصادیات) نام کی ایک کتاب کو غلطی سے ارسطو کی طرف منسوب کیا گیا ۔ (اب اسے عموماً ثاوفرسطس (Theophrastus) سے منسوب کیا جاتا ہے) ۔ اس کے پہلے حصے کا عربی ترجمه (یا تلخیص) بھی موجود ہے ۔ یه مخطوطه کتب خانهٔ اسکوریال کے ایک مجموعے میں شامل ہے جس میں مختلف مضامین کی کتابیں ہیں (Casiri, No. 883) ۔ وہاں اس کا نام کتابُ اَرِسْطو فی تَدبیرالمنازِل درج ہے ۔ اس کا دوسرا نسخه بیروت کے

ایک شخصی کتب‌خانے کے ایک مجموعے میں، بعنوان ثِمارُ مَقالَةِ اَرِسطُو فی تَدْبیر المنزل، موجود ہے (قبّ مَعْلُوف در مشرق ج ۱۹ [۱۹۲۱ء]، ص ۲۰۷ تا ۲۶۲) ۔ ان دونوں مخطوطوں کا ابھی تک بغور مطالعہ نہیں کیا جا سکا ۔ الفہرست، [ابن] ابی اُصَیبِعَة اور القِفْطی میں اس کتاب (Economics) کا تذکرہ نہیں آیا (اس بارے میں قبّ Baumstark : Syrisch-arabische Biographien des Aristoteles، لائپزگ ۱۹۰۰ء، ص ۵۳ ببعد) مذکر ابوالقاسم صاعِد بن احمد الاَنْدَلُسی (م ۴۶۲ھ / ۱۰۶۹ — ۱۰۷۰ء)، صاحب طَبَقات الاُمَم، طبع قاہرہ، بلا تاریخ، ص ۳۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود یا اس کا مأخذ ارسطو کی کسی کتاب (Economics) ('سیاسة المنزل') سے آشنا تھا ۔ جس طریق سے یہ ترجمہ ایک مخطوطے کی صورت میں روایت ہو کر ہم تک پہنچا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً اس ترجمے کا مصدر و منشأ نصرانی عربوں کے حلقے ہونگے ۔ مَعْلُوف کا خیال ہے کہ مترجم کا نام ابوالفرج عبداللہ بن الطَّیِّب (م ۴۳۵ھ / ۱۰۴۳ - ۱۰۴۴ء) ہے، لیکن اس دعوے کے ثبوت میں وہ کوئی سند پیش نہیں کرتا ۔ راقم اقتصادیات کی اس کتاب کی ایک طباعت تیار کر رہا ہے جس میں کتاب سے پوری بحث بھی کی جائے گی۔

مآخذ : (۱) جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغة العربیة، قاہرة ۱۹۱۲ء، ۲ : ۲۳۲ ببعد؛ (۲) رِتّر: Ein arab. Handbuch der Handelswissenschaft در Isl.، ج ۷ (۱۹۱۷ء): ص ۳ تا ۱۰؛ (۳) پْلِسْنر (Plessner): Der οἰκονομικός des Neupythagoräers Bryson und sein Einfluss auf die islamische Wissenschaft، برسلاؤ Breslau (ڈکتورہ کے لیے مقالہ)، ۱۹۲۵ء (صرف تلخیص؛ مکمل نسخہ عنقریب شائع ہوگا).

(۲) تدبیر کے دوسرے معنی ہیں " غلام کو اس طرح آزاد کرنا کہ عِتْق کا نفاذ آقا کی وفات کے بعد ہو"۔ اس صورت میں دَبَّرَ وہ فعل ہے جس کا اشتقاق اسم دُبُر سے ہے بمعنی (زندگی کا) انجام ، یعنی موت؛ قبّ لسان، ۵ : ۳۰۸؛ (مُطَرِّزی : مُغْرِب بذیل مادّہ) ۔ جزئیات کے لیے قبّ مادّۂ عبد .

اس مضمون پر مکمل ترین بحث Santillana : Istituzioni di diritto musulmano malichita، طبع روم ۱۹۲۶ء، ۱ : ۱۲۲ پر ملاحظہ ہو .

(HEFFENING ہِفِننگ)

تَدِلّیس : یا تَدِلّیس TEDELLES (Dellys)، الجزائر کے ساحل پر ایک شہر کا نام ۔ یہ مقام الجزائر کے شہر سے ۷۰ میل بجانب مشرق اور دریاے سِباؤُو (Sebau) کے دہانے سے مشرق کی طرف چار میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ سِباؤُو بلاد القبائل (Kabylia) کا سب سے بڑا دریا ہے ۔ تَدِلّیس اور بلاد القبائل کے درمیان ایک سلسلۂ کوہ حائل ہے، جو راس بیگُوت (Beugut) پر جا کر ختم ہوتا ہے — اس کا محلّ وقوع ۵۵ درجے ۲۰ دقیقے عرض‌البلد شمالی اور ۳ درجے ۵۵ دقیقے طول البلد مشرق (گرینچ) پر ہے ۔ شہر کے دو علحدہ علحدہ حصے ہیں: دیسی محلہ، جس میں تنگ بازار ہیں؛ اور یورپی محلہ، جو سطح مرتفع پر سمندر سے کوئی ۱۷۵ فٹ بلندی پر واقع اور باقاعدہ طریق سے تعمیر ہوا ہے ۔ نیچے بندرگاہ ہے، جو مغربی اور شمال مغربی ہواؤں سے بخوبی محفوظ اور جہازوں کی لنگر اندازی کے لیے مأمون و مصئون مقام ہے، لیکن یہاں صرف چند چھوٹے چھوٹے تجارتی جہاز آتے ہیں ۔ گرد و نواح کا علاقہ بلند درختوں اور بخوبی مزروعہ باغات سے گھرا ہوا ہے اور دل خوش کن نظارہ پیش کرتا ہے ۔ مجموعی آبادی ۳۸۸۴ ہے ، جس میں سے ۲۵۰۸ دیسی باشندے ہیں ۔ دیسی باشندے سب قبائلی نسل کے ہیں، لیکن ضلع بھر کے اکثر قبیلوں کی طرح صرف عربی زبان بولتے ہیں۔

شہر تدلّیس کے محل وقوع پر رومیوں کے عہد میں شہر روسکرو (Rusucurru) آباد تھا، جس کے چند آثار (دیواروں اور حوضوں وغیرہ کے بقایا) دریافت ہوے ہیں ۔ یہ شہر عرب فتوحات کے دوران میں برباد ہوا ہوگا ۔ بہت مدت تک یہ جگہ غیر آباد رہی ۔ البکری (*Description de l'Afrique*، ترجمۂ ڈیسلان de Slane، ص ۱۳۵) ضرور ایک بندرگاہ کا ذکر کرتا ہے، جو مَرْسَی الحجّاج کے مشرق میں واقع تھی اور جس کا نام وہ مدینۃ بنی جنّد بتاتا ہے، لیکن یہ جگہ تدلّیس (Dellys) کی نسبت راس جِنِت Cape Djinet سے زیادہ مطابقت کھاتی ہے ۔

یہ نام خود تَدلّست Thadellast، Thadellisth ("جھونپڑیاں") کی صورت میں شاہان بنو حمّاد (قب مقالۂ (بنو) حمّاد) کے بِجَایَۃ (Bougie) کو پایۂ تخت بنانے سے پہلے کہیں مذکور نہیں ہوا ۔ اس کا محلّ وقوع ایسا ہے کہ وادی سِباؤو کے باشندوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں اس مقام کو بہت سہولت حاصل ہے ۔ اسی وجہ سے اس چھوٹے سے شہر کو ایک حد تک تجارتی اور فوجی اہمیت حاصل ہو گئی، بلکہ اس میں بنو حمّاد کی طرف سے ایک حاکم بھی رہتا تھا ۔ (۴۹۶ھ [۱۱۰۲ - ۱۱۰۳ء] میں سلطان المنصور نے یہ عہدہ اَلْمَرِیّۃ کے ایک شہزادے کو دے دیا جس نے افریقیہ میں آ کر پناہ لی تھی) ۔ ادریسی (ص ۱۰۴) 'تَدائلیس' کا حال بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ شہر ایک بلند مقام پر واقع ہے اور اس کے ارد گرد ایک مضبوط فصیل ہے ۔ وہ گرد و نواح کے علاقے کی سرسبزی، عام ارزانی اور مویشیوں کی کثرت کا ذکر بھی کرتا ہے ۔ مویشیوں کی برآمد ملحقہ علاقوں کو ہوتی تھی ۔ بنو حمّاد کی سلطنت کے زوال کے بعد یہ شہر المُوحّدین کے قبضے میں آ گیا ۔ یحیٰی بن غانِیَۃ نے اس پر قبضہ کر لیا (۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء) ۔ اس کے بعد المُوَحّدین، بنی زَیّان، بنی حَفْص اور بنی مَرِین کے درمیان اس کے قبضے کے متعلق جھگڑا رہا اور ۱۳۹۴ء میں بنی مَرِین نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ پندرھویں صدی میں لیو افریقی [یعنی الحسن بن محمد الوَزّان الزّیّاتی] (کتاب چہارم، ترجمۂ شیفر Schefer، ۳ : ۶۹) کے قول کے مطابق تَدلّیس (Dellys) کا حال وہی ہوا جو الجزائر کا ہوا ۔ ساحل کے تمام شہروں کی طرح یہاں بھی اندلس سے کئی پناہ گزین آئے، جنھوں نے شہر کی اقتصادی اور علمی زندگی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالا ہوگا ۔ لیو (محلّ مذکور) کہتا ہے کہ باشندے رنگریزی کرتے تھے، کامیاب تاجر تھے اور عود بجانے میں بڑے مشّاق تھے ۔ اس کے قول کے مطابق ان کا طرزِ پوشش وہی ہے جو الجزائر کے لوگوں کا ہے ۔ جب اہل الجزائر نے (۱۵۰۷ء) [۱۵۰۷ء ؟ قب ۱۱، طبع اول ۱ : ۲۶۶ ب، س ۱۸ از آخر عمود ۔ ادارہ] ہسپانیہ کی اطاعت قبول کر لی تو تدلّیس کے رہنے والوں نے بھی ان کی تقلید کی، لیکن ۱۵۱۷ء میں [بابا] اوروج [رَکّ بآن بذیل عروج] نے اسے پھر فتح کر لیا ۔ ترکوں نے یہاں ایک قلعہ گیر فوج مقرر کر دی اور وادی سِباؤو کے قبائل کے خلاف فوجی کاروائی کے لیے اس مقام کو فوجی مرکز بنایا ۔ اگرچہ یہاں کے لوگوں نے سمندری راستے سے الجزائر سے سلسلۂ رسل و رسائل برابر قائم رکھا، لیکن یہاں کے لوگ ترکی حکومت کے ماتحت گیاہوار بےلطف زندگی گذارتے رہے ۔ جب ۷ مئی ۱۸۴۴ء کو فرانسیسیوں نے اس شہر پر قبضہ کیا، تو یہ ایک خراب سا بے رونق گاؤں تھا ۔ دو سال بعد یہاں یورپی محلّے کی بنیاد رکھی گئی ۔ قبائلیہ (بلاد القبائل) کی فتح اور اس کے بعد فوجی مرکز کے تیزی اوزون Teizi Uzon اور فورٹ نیتسیونال Fort National میں منتقل ہو جانے کے بعد اس مقام کی ترقی

رك گئی - ۱۸۷۱ء کی شورش میں بربری قبائل نے خشکی کی طرف سے اس شہر کی ناکہ بندی کر لی (اپریل و مئی)، لیکن سمندری راستے سے شہر کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا؛ اس لیے طرف دارانِ شورش شہر پر قبضہ نہ کر سکے - اس وقت سے آج تک اس شہر کے امن میں خلل نہیں آیا، لیکن دور افتادہ مقام ہونے اور رسل و رسائل کی مشکلات کی وجہ سے شہر کی حالت غیرمتبدل رہی اور یورپی نوآبادی میں کچھ ترقی نہیں ہو سکی۔

مآخذ : (۱) *Le Djurujura à* : S. A. Boulifa *travers l'histoire*، الجزائر ۱۹۲۵ء؛ (۲) Robin : *Notes sur l'organisation militaire des Turcs dans la Grande Kabylie* (*R. Afr.*, 1873) - قب نیز مادّہ‌ہاے الجزائر اور قبائلیہ کے مآخذ۔

(G. Yver ایور)

تَدْلِیس : [اخفاے عیب کو کہتے ہیں - ابن اثیر : نہایۃ - ادارہ]- عربی لغت کے مطابق تدلیس کے معنی ہیں ''تجارتی مال کے کسی نقص یا خرابی کو خریدار سے چھپانا'' اور محدثین کی اصطلاح میں حدیث کے کسی عیب کو چھپانا، جو یا تو متن سے یا سلسلۂ رُواۃ سے یا مأخذ سے یعنی اس شیخ سے متعلق ہو جس سے یہ روایت کی گئی ہو۔

تدلیس تین قسم کی ہوتی ہے : (۱) تدلیس فی الاسناد (سلسلۂ رواۃ میں تدلیس)، (۲) تدلیس فی المتن (متن میں تدلیس) اور (۳) تدلیس فی الشیوخ (اس شیخ کے بارے میں تدلیس جس سے کوئی حدیث حاصل کی گئی ہو)۔

(ا) تدلیس فی الاسناد : اس کی سات صورتیں ہیں :-

(۱) محدث اپنے شیخ کی سند سے ایک حدیث روایت کرتا ہے، جس سے اس نے اَور حدیثیں بھی روایت کی ہیں، لیکن یہ مُدلَّس حدیث اس نے براہِ راست اپنے شیخ سے لے کر روایت نہیں کی، بلکہ ایک ایسے شخص سے روایت کی ہے جس نے اس شیخ سے سنی تھی۔

(۲) راوی اُن تمام رُواۃ کے نام سلسلہ وار بیان کرتا ہے، جس سے کوئی حدیث پہنچی (ہا انھوں نے سلسلہ وار ایک دوسرے سے سنی)، لیکن اس ترتیب میں وہ ان لوگوں کے نام حذف کر جاتا ہے، جن کے متعلق ضعیف راوی ہونے کا گمان یا یقین ہو یا وہ نابالغ ہوں یا غیر معتبر ہوں۔

(۳) راوی ایک نام یا کئی نام اُس شیخ کے نام کے ساتھ بیان کر جاتا ہے، جس سے اس نے حدیث روایت کی، لیکن دراصل اُس نے اُس سے یا اُن سے یہ حدیث نہیں سنی۔

(۴) راوی 'حَدَّثَنَا' کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے وقفہ کرتا ہے اور اس کے بعد اس شخص کا نام بیان کرتا ہے، جس سے اُس نے وہ حدیث نہیں سنی -

(۵) ایک شخص کسی کو روایت حدیث کی اجازت دے دیتا ہے، گو یہ شخص اس شیخ کے زیرِ درس نہ رہا ہو۔

(۶) راوی 'حَدَّثَنَا' یا 'اَخْبَرَنَا' نہیں کہتا اور اسناد بیان کر کے اس حدیث کو اپنے شیخ کے نام سے منسوب کر دیتا ہے، گو اس نے اپنے شیخ سے وہ حدیث سنی نہیں ہوتی -

(۷) راوی کسی مشہور و معروف مقام کا ذکر کرتا ہے مگر اس کی مراد اس مقام سے نہیں ہوتی، بلکہ اسی نام کے کسی اور مقام سے ہوتی ہے - یہ کام اس لیے کرتا ہے کہ لوگوں کو یہ وہم ہو کہ اُس نے حدیث کی تلاش میں دور دراز مقامات کا سفر کیا ہے۔

(ب) التدلیس فی المتن : متن میں تدلیس ہو تو زیادت کو ''مُدْرَج فی المَتْن'' بھی کہتے ہیں، یعنی

متن میں الحاق شدہ یا بیگانہ عبارت جیسے دوسری عبارت کے درمیان جگہ دی گئی ہو۔

راوی حدیث بیان کرتے وقت اس میں اپنی یا کسی دوسرے شخص کی عبارت بھی شامل کر دیتا ہے، جس سے لوگوں کو گمان ہو کہ وہ بیان بھی اصل حدیث کا جزو ہے ۔ اس قسم کی تدلیس مفصلۃً ذیل صورتوں میں پیدا ہو سکتی ہے : (۱) حدیث کی ابتداء میں، جسے اصطلاح میں "المُدرَج فی اوّلِ المَتْن" کہتے ہیں ؛ (۲) حدیث کے درمیان میں، جسے اصطلاح حدیث میں "المُدرَج فی وَسْط المَتْن" سے تعبیر کرتے ہیں ؛ (۳) حدیث کے آخر میں، جو "المُدرَج فی آخر المَتْن" کہلاتا ہے۔

(ج) شیوخ میں تدلیس یہ ہے کہ محدّث روایت کرتا ہے کہ اس نے فلاں حدیث اپنے شیخ سے سنی، مگر شیخ کا عام مشہور نام بتانے کے بجاے وہ فقط اس کا نام یا اس کا کوئی عرف (نبز) یا اس کا کوئی غیر معروف لقب بیان کر دیتا ہے ۔ یہ عمل راوی اس خوف سے کرتا ہے کہ اس کا شیخ شاید ضعیف محدّث ہو ۔ وہ تدلیس سے عیب کو چھپانا چاھتا ہے، اس غرض سے کہ سامعین اس حدیث کو صحیح سمجھ لیں۔

سبط ابن العجمی (م ۸۴۱ھ / ۱۴۳۸ء) اپنی تصنیف التبیین لأسماء المدلّسین میں لکھتے ہیں کہ ۳۰۰ھ (۹۱۲ء) کے بعد شاذ ھی تدلیس کا کوئی واقعہ ہوا ہوگا ۔ الحاکم (م ۴۰۵ھ / ۱۰۱۴ء) بیان کرتے ہیں کہ بعد کے زمانے کے محدّثین میں انھیں کسی ایسے شخص کا حال معلوم نہیں، جس نے ابو بکر محمد بن محمد بن سلیمان الباغَنْدی (م ۳۱۲ھ / ۹۲۴ء) کے سوا تدلیس کی ہو۔

پہلا مصنف جس نے تدلیس کے موضوع پر کتاب لکھی، ابو علی الحسن الکَرابیسی (م ۲۴۵ھ/۸۵۹ء) تھا ۔ اس کے بعد النَّسائی (م ۳۰۳ھ / ۹۱۵ء)، الدّارَقُطْنی (م ۳۸۵ھ / ۹۹۵ء) الخطیب البغدادی (م ۴۶۳ھ / ۱۰۷۱ء) اور ابن عساکر (م ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۶ء) وغیرہ نے اس موضوع پر لکھا۔ متأخرین میں سے جن مصنفین نے تدلیس پر کچھ لکھا ہے، وہ الذّھبی (م ۷۴۸ھ / ۱۳۴۸ء)، العَلائی (م ۷۶۱ھ / ۱۳۵۹ء) وغیرہ ھیں۔ متقدمین کی کتابیں، جو اس مضمون پر تھیں، ضائع ہو گئیں۔

الذّھبی نے تدلیس پر ایک منظوم رسالہ لکھا (اس رسالے کا کچھ حصہ السُّبکی کی تصنیف الطبقات الکُبریٰ، ۵ : ۲۱۸ میں ملتا ہے) ۔ العَلائی نے نثر میں ایک رسالہ کتاب المُدلّسین کے نام سے لکھا ہے اور ان ناموں میں جو الذّھبی کی نظم میں مذکور ھیں، مزید ناموں کا اضافہ بھی کیا ہے ۔ الحافظ ابو محمود احمد بن ابراھیم المَقْدسی نے، جو الذّھبی کا شاگرد ہے، الذھبی کی نظم میں العَلائی کی تصنیف سے لیکر بعض معلومات کا اضافہ کیا ہے، تاکہ یہ نظم مکمل ہو جائے ۔ زین الدین العراقی (م ۸۰۶ھ / ۱۴۰۳ء) نے العَلائی کی کتاب کے حاشیے پر چند اور ناموں کا اضافہ کیا ۔ اسی قسم کا ایک اور ذیل ایک مستقل رسالے کی صورت میں ہے، جو ابو زُرْعَۃ (م ۸۲۶ھ / ۱۴۲۲ء) سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ سبط ابن العَجمی نے آخرالذکر ذیل میں اور ناموں کا اضافہ کیا اور ایک رسالہ التَّبْیین لأسماء المُدلّسین کے نام سے لکھا ۔ ابن حَجر العَسْقلانی (م ۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء) نے ایک تصنیف کتاب طَبَقات المَدلّسین یا تعریف اھل التقدیس لِمَراتب الموصوفین بالتدلیس کے نام سے لکھی نیز مزید نئے ناموں کے اضافے سے فہرست مُدلّسین کو مکمل کیا۔

العَلائی کی کتاب میں ایسے کل ناموں کی تعداد ۶۸ ہے ۔ ابو زُرْعَۃ نے اس پر ۱۳ ناموں کا،

سبط ابن العجمی نے ۳۲ کا اور ابن حَجَر العسقلانی نے ۹۳ ناموں کا اضافہ کیا۔ ان تمام اضافوں کو شامل کر کے کل میزان ۱۵۲ ہوتی ہے۔ ان محدّثین کی ایک مفصل فہرست ابن حجر نے کتاب طَبَقات المدلّسین میں دی ہے، جو ۱۳۲۲ھ میں مصر میں طبع ہوئی تھی۔

مآخذ: (۱) ظَفَرالأَمانی فی مُختصرالجُرجانی، ص ۲۱۳ ببعد؛ (۲) *J. A. S. B.*، ۱۸۵۶ء، ص ۲۱۸، ج ۲: ۱۹۳۶ء، ص ۱ ببعد؛ (۳) سالسبْری (Salisbury): *J. Am. O. S.*، ج ۷، ۱۸۶۲ء، ص ۹۲، i؛ (۴) Risch: *Commentar des 'Izz ad-Dīn über d. Kunstausdrücke der Traditions wissenschaft nebst Erläuterungen* (لائیڈن ۱۸۸۵ء)، ص ۲۰؛ (۵) شپرنگر: *Mohammad*، ج ۳، ص xcix؛ (۶) Goldziher: *Muhammedanische Studien*، ۲: ۴۸؛ [(۷) تھانوی، ۱: ۴۸۱ - ادارہ].

(ہدایت حسین)

تَدْمُر: رَكَ بہ پالمائرا (Palmyra).

تُدْمِیر (Todmir): الاَنْدَلُس کے اس کُورے (صوبے) کا نام جس کا مرکز ("قاعدہ") بنی امیہ کی خلافت کے انحلال تک مُرْسِیَہ (Murcia) تھا۔ اگر ہم عرب مصنفین کی بات مان لیں تو یہ لفظ وزی گوتھ Visigoth (یعنی غربی قوطیوں کے) گورنر تھیوڈومیر (Theodomir) کے نام کی تعریب ہے۔ جب عربوں نے ھسپانیہ فتح کیا تو یہ شخص مُرْسِیَہ میں روذریق (یا لُوذریق Roderick)، شاہ طُلَیْطُلَۃ، کا نمائندہ تھا۔ وہ خاص طور پر اس لیے مشہور ہے کہ اس نے موسٰی بن نُصَیر [رَكَ بآن] سے عہدنامہ کیا تھا۔ اس "کتاب الصلح" کا عربی متن الضّبّی اور ابن عبدالمنعم الحِمْیَری کے ہاں محفوظ ہے۔ یہ متن پہلے پہل Casiri (غزیری) نے *Bibliotheca Hispana*، ۲: ۱۰۶، میں شائع کیا اور گاسْپار رامیرو Gaspar Ramiro نے *Historia de Murcia musulmana*، ص ۱۱ تا ۳۷ میں اسے دقیق مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔

عرب جغرافیہ‌دانوں کے نزدیک تُدْمِیر کا کُورہ جَیّان اور البِیْرہ کے کُوروں سے ملحق واقع تھا اور اس کے بڑے بڑے شہر لُورْقَۃ (یا لُرْقَۃ) Lorca، أُورْیُولَۃ Orihuela، لَقَنْت (Alicante)، قَرْطَاجَنّۃ اور مُرْسِیَۃ تھے۔ اسلامی دور میں اَنْدَلُس کے اس حصے کی تاریخ کے لیے دیکھیے مادۂ مُرْسِیَہ۔

مآخذ: (۱) ادریسی: *Description de l'Afrique et de l'Espagne*، متن کا صفحہ ۱۷۵ اور ترجمے کا صفحہ ۲۱۰؛ (۲) یاقوت: مُعْجَم البُلْدان، ۱: ۸۳۱ تا ۸۳۲؛ (۳) ابن عبدالمنعم الحِمْیَری: [صِفَۃُ جزیرۃ الأندلس مُنتخَبۃ من کتاب الرّوض المِعْطار، طبع لیوی پرووانسال، قاھرۃ ۱۹۳۷ء، ص ۶۲، عدد ۶۴]؛ (۴) الضّبّی: بُغْیَۃُ المُلْتَمِس، عدد ۶۷۵، ص ۲۵۹؛ (۵) J. Alemany Bolufer: *La geografía de la Peninsula iberica en los escritores árabes*، غرناطہ ۱۹۲۱ء، ص ۹۵ تا ۹۶.

(لیوی پرووانسال E. LÉVI PROVENÇAL)

تِدُورے: (Tidore) جزیرہ‌نماے ملایا کے مشرقی حصے میں هَلْماهیرا کے مغرب کی طرف ایک برکانی (volcanic) جزیرہ، جو انڈونیسیا کی مختلف امارتوں (Principalities) میں سے ایک امارت ہے اور جس پر ایک سلطان حکمران ہے۔

ڈچ حکومت کے دوران میں ان امارتوں کے سلاطین کو معاھدہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ نام نہاد 'طویل المیعاد' اور 'قلیل المیعاد' معاھدے، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، مختلف قسم کے ہوا کرتے تھے؛ مگر ان دونوں قسم کے معاھدوں کا بنیادی اصول یہ ہوتا تھا کہ ان سلطانوں کو حقوق سلطانی سے محروم کر دیا جائے۔ ان میں سے بعض حکمرانوں کو نسبۃً وسیع خودمختاری حاصل تھی، لیکن عام طور پر وہ معمولی انتظامی

افسر یا رئیسِ بےنفوذ ہوا کرتے تھے جو اپنی اپنی امارتوں کے نظم و نسق کو ڈچ حکومت کی مرضی کے مطابق چلایا کرتے تھے - سابقاً تدورے مؤخرالذکر قسم کی امارت تھی جو ایک سلطان کے ماتحت، مگر ۱۹۰۹ء سے ایک مجلسِ اشراف کے ... حکومت تھی۔

اس وقت چونکہ تدورے کی امارت کا اداری رقبہ چھوٹے درجے کا تھا، اس لیے اس کا انتظام ترناتے (Ternate) کی ریزیڈنسی (مقیمیّة) کے سپرد تھا۔ تدورے کے علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے جزیروں اور ہلماہیرا کے کچھ حصے کو ملا کر سارے علاقے کو بھی تدورے ہی کہتے تھے - حکومت کی یہ اداری صورت گورنر سے کم درجے کی تھی، اس لیے سلطانِ تدورے فقط ایک رئیسِ بےنفوذ تھا اور ان کے علاقے کا انتظام ولندیزی حکومت کے ماتحت اور اس حکومت کے مقرر کردہ عہدہ‌دار کے توسط سے سرانجام پاتا تھا۔

انڈونیسیا کی خودمختاری کے وقت سلطانِ تدورے سلطان زین‌العابدین تھا - اب صورت یہ ہے کہ وہ معاہدے، جو حکمرانوں کے ساتھ ہوتے تھے، خود بخود منسوخ ہو گئے - موجودہ قانون کے ماتحت ان سلطانوں کو اپنی امارتوں میں حکومت کرنے کی اجازت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ امارتِ متعلقہ کے لوگ اس کی حکومت کے حق میں ہوں - ان علاقوں کا نظم و نسق اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ان امارتوں کے باہر کے علاقوں میں ہوتا ہے - سلاطین کو اپنے اپنے علاقے کا سردار مقرر کر دیا جاتا ہے، تا کہ وہ حکومت کا کام اس طریق پر چلائیں جو مرکزی حکومت نے طے کیا ہو - سلاطین کے جانشین ان کے ورثاء ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کی رعایا انھیں پسند کرتی ہو۔

موجودہ زمانے میں تدورے کے ملک میں وہی نظام حکومت قائم ہے جو اس سے قبل ڈچ حکومت کے زمانے میں تھا، یعنی یہ علاقہ مقیمیّة (ریزیڈنسی) ترناتے (Ternate) کے ماتحت ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ سلطان اب حکومت کا مقرر کردہ حاکم ہوتا ہے۔

چونکہ تدورے کا سابق سلطان بہت قابل آدمی ثابت ہوا، اس لیے اسے ترناتے (Ternate) کا ریزیڈنٹ مقرر کر دیا گیا - یہ منصب اس کے اپنے پہلے منصب سے، جو اسے سلطان تدورے کی حیثیت سے حاصل تھا، کہیں زیادہ بلند ہے۔

تدورے کی سلطنت صرف جزیرۂ ہلماہیرا تک محدود نہیں ہے، بلکہ مغربی نیوگنی (مغربی اِری‌اَن Irian) تک پھیلی ہوئی ہے - مغربی نیوگنی کا علاقہ اس وقت انڈونیسیا اور ڈچ حکومت کے درمیان زیرِ نزاع ہے۔

ان امارتوں کو اب سواپرجا (Swapradja) کے نام سے پکارتے ہیں - یہاں کے لوگ ہر لحاظ سے ترناتے [رک بآں] کے لوگوں کی طرح ہیں - پرتگالی مآخذ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تدورے میں اسلام ۱۴۳۰ء کے قریب آیا - مقامی روایت ہے کہ اس ملک میں اسلام کا پہلا مبلغ شیخ منصور نام ایک عرب تھا اور یہاں کا پہلا راجہ، جو ۱۴۹۵ء کے قریب اسلام لایا، جی لی آتی (Tjiliati، (نیز جی لی آتو (Tjiliatu) اور جی‌ری لیلی آتو (Tjiri Lăliatu)) تھا - اس کا اسلامی نام جمال‌الدین رکھا گیا۔

مآخذ: (۱) T. S. A. de Clercq: *Bijdragen tot de kennis der residentie Ternate*، لائیڈن ۱۸۹۰ء۔

(W. H. RASSERS — H. E. MAHMUD L. LATJUBA)

تَذْکِرَة: عربی لفظ بمعنی یادگار، یادداشت، وہ جس سے ضرورت کی چیز یاد آ جائے از فعل ذَکَرَ۔

یه لفظ بہت سی مشہور تصانیف کے ناموں میں استعمال ہوا ہے؛ مثلاً التّذکرة النّصیریّة [در ہیئت] مصنّفۂ نصیرالدین طوسی، تذکرةالاولیاء مصنفۂ فریدالدین عطّار، تذکرة الشعراء (شاعروں کے سوانح حیات، اس نوع کی کتابیں ایران میں بہت مقبول ہیں)۔

اداری اصطلاح میں تذکرے کے معنی ٹکٹ، یادداشت، پرمٹ (جواز، اجازت نامے) کے ہیں - مسافروں کے پاسپورٹ (پروانۂ راہداری، جوازِ سفر) (یول تذکرہ سی') اور محصول خانے (چونگی) کے اجازۂ خروج یا رخصت‌نامے ('مرور تذکرہ سی' جوازِ مرور از محصول خانہ) کو بھی یہی نام دیا جاتا ہے - قاضیوں کو عہدۂ قضاء سنبھالنے کے وقت جو سند ملتی ہے، اسے خاص طور پر 'تذکرہ' ہی کہتے ہیں - رجالِ دین کی اسناد کا عام نام براءات ہے - پرانے ترکی نظام حکومت میں دو 'تذکرہ جی' ہوا کرتے تھے، ایک بڑا اور ایک چھوٹا - انھیں اسنادِ تذکرہ جاری کرنے کا کام سپرد تھا - وہ بڑے افسر سمجھے جاتے تھے اور براہ راست قاضی عسکر [رک بآن] کے ماتحت ہوا کرتے تھے اور انھیں وزیر اعظم کے دسترخوان تک رسائی حاصل ہوتی تھی۔

مآخذ: (۱) کتب لغۃ اور M. d'Ohsson: *Tableau général de l'Empire Othoman*، پیرس ۱۷۹۱ء، ۳: ۵۳۹ و ۵۹۷۔

(B. Carra de Vaux کارا ڈ وو)

تذهیب: (کتابوں کی طلاکاری)، چونکہ ایک کتاب (قرآن مجید) ہی اسلام اور اسلامی تمدن کی بنیاد ہے، اس لیے کتابتِ مصاحف کو ہمیشہ مسلمانوں نے [کارِ ثواب] اور بہت ہی قابلِ تحسین شغل سمجھا ہے؛ یہاں تک کہ سلاطین اور شہزادے بھی اس باب میں سرگرمِ عمل رہے ہیں - سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن (مجید) کا ایک نسخہ مکۂ معظمہ بھیجا کرتا تھا - مشہد میں امام رضا[رضا] کے روضے سے جو عجائب‌خانہ ملحق ہے، اس میں اب تک ایک طویل و عریض نسخۂ قرآن کے اوراق محفوظ ہیں، جو امیر تیمور کے پوتے شہزادۂ بایسنغر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے - اس توقیر و احترام کے پیش نظر مخطوطوں کی تزیین کو (یعنی عموماً ان کے صفحات کی سونے سے آرائش کو) مسلم معاشرے میں خطّاطی اور تجلید کی طرح بہت فروغ ہوا، کیونکہ یہ تینوں فن کسی کتاب کو خوبصورت بنانے میں کارآمد تھے؛ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس "بدعت" کی مخالفت بھی بہت ہوئی، خصوصاً اس زمانے میں جب یہ کام شروع ہی ہوا تھا اور کہا گیا کہ کلام الٰہی کی بیرونی تزیین فضول اور بیکار ہے، لیکن بالآخر صفحاتِ کتاب کی تزیین کا فن اسلامی آرٹ کے لیے وجہِ افتخار و مایۂ نازش بن گیا۔

اس فن کی ابتدائی ترقی دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی میلادی) میں ہوئی - اس زمانے میں اور اس کے بعد کی صدی میں قرآن کے مخطوطات تقریباً ہمیشہ رَقِ مدبوغ یعنی نرم کھال کے صحیفوں، پر لکھے جاتے تھے جن کا عرض نسبۃً زیادہ ہوتا تھا اور ارتفاع کم - کتابت اس خط کی ایک صورت تھی جسے عام طور پر خطِ کوفی کہتے ہیں اور جسے عمارات پر کتبے لکھنے اور پتھروں پر عبارات کھودنے کے کام میں لایا جاتا تھا - اگرچہ اس قسم کے بہت سے مخطوطات موجود ہیں، لیکن ظاہرا سب نامکمل ہیں اور اکثر میں صرف چند اوراق ہی پائے جاتے ہیں، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ہجرت کی پہلی تین صدیوں کے مخطوطات کی معیّن تاریخیں دی جا سکیں یا انھیں

قطعیّت کے ساتھ اس زمانے کے کسی اسلامی ملک مثلاً حجاز، شام، عراق، مصر، ایران اور افریقیہ (تونس) سے منسوب کیا جا سکے۔

پہلا نمایاں آرائشی نشان اس ضرورت سے ایجاد ہوا کہ ختمِ آیت کی علامت بنا کر ایک آیت کو دوسری آیت سے علٰحدہ اور ممیّز کیا جا سکے۔ پہلے تو اس علامت کے لیے چند ترچھی لکیریں کھینچ دی جاتی تھیں، لیکن بعض اوقات تین یا زیادہ نقطے بھی (عموماً سنہری) مثلّث کی صورت میں بنا دیے جاتے تھے یا اس علامت کو رنگین گلاب کے پھول کی شکل دی جاتی تھی۔ اس کے بعد جو دوسری صورت پیدا ہوئی وہ آرائشی نقطۂ نگاہ سے اور بھی زیادہ اہمّ اور نمایاں تھی۔ یہ صورت بھی ایک عملی ضرورت یعنی مختلف سورتوں کو ایک دوسری سے علٰحدہ علٰحدہ کر کے دکھانے کی تدبیر سے پیدا ہوئی۔ اس کے لیے سرخ، نیلے، سبز اور کچھ سنہری رنگ کی چوڑی دھاریاں بنائی جانے لگیں، جو عام طور پر متشابک (باہم پیچیدہ) ہوتیں، لیکن کبھی کبھی ان میں چھوٹی چھوٹی محرابیں بھی بنا دی جاتی تھیں۔ ان سب دھاریوں کو ہر سورۃ کے آغاز پر صفحے کے اس سرے سے اس سرے تک کھینچ دیا جاتا تھا (شکل ۱)۔ ابتدا میں ان آرائشی دھاریوں کے اندر سورۃ کا نام، آیات کی تعداد اور سورۃ کا مکی یا مدنی ہونا کچھ نہیں لکھا جاتا تھا۔ یہ کڑھے ہوئے کپڑے کی سی آرائش بعض اوقات صرف اس چھوٹے سے خلا کو پر کرتی تھی، جو سطر میں سورۂ ماقبل کے آخری الفاظ کے بعد باقی رہ جاتا تھا اور اگر خطّاط سورتوں کے درمیان کسی قدر زیادہ خلا چھوڑ دیتا تھا، تو دھاری اس خلا کو پر کرنے کے لیے زیادہ عریض بھی ہو جاتی تھی؛ لیکن تیسری صدی ہجری (نویں صدی میلادی) سے شروع کر کے بعد کے زمانے میں اس آرائش میں دھاریوں کا عرض مساوی کر دیا گیا تھا۔ اس دھاری کے ساتھ، جو صفحے کی مکتوبہ سطروں کے برابر لمبی ہوتی تھی، ایک اور آرائشی صورت کا اضافہ کیا گیا۔ عام طور پر یہ رسمی طرز پر ڈھالا ہوا (stylized) پھول پتیوں کا ایک پیچیدہ گچھا سا ہوتا تھا، جو سورۃ کی سطروں سے آگے نکل کر حاشیے پر پہنچ جاتا تھا۔ تزیینِ حاشیہ کا یہ اسلوب قرآن کی طلاکاری کی تمام طرزوں کی مستقل خصوصیت قرار پا گیا۔ حاشیے کی یہ آرائش اس صورت میں بھی استعمال کی جاتی تھی، جب سورۃ کے آغاز میں سطروں کے بیچ میں کوئی تزیین دھاریوں کی شکل میں نہیں کی جاتی تھی۔ اس حالت میں حاشیے پر نکلے ہوئے آرائشی پھول پتے نئی سورۃ کے اظہار کی غرض سے سورۃ کے نام کے ایک طرف قائم کر دیے جاتے تھے (یہ نام اس زمانے میں عام طور پر سنہری لکھا جاتا تھا)۔ یہ دونوں طرف نکلے ہوئے حاشیے کے پھول غالباً ان دونوں طرف بڑھی ہوئی "دستیوں" کی نقل ہیں، جو رومیوں کی سنگین تختیوں کے پہلوؤں میں لگی ہوتی تھیں اور جن پر لاطینی کتبے ثبت ہوتے تھے (ان تختیوں کو tabula ansata یعنی دستہ‌دار تختیاں کہتے تھے) اور ان "دستیوں" کے ذریعے سے وہ تختیاں سہارا دینے والی دیوار میں جڑ دی جاتی تھیں۔ سورتوں کے نام لکھنے کی ابتداء کی تخمینی تاریخ مالک نامی ایک شخص کے مکتوب میں ملتی ہے جو ۱۷۹ھ میں فوت ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے اپنے دادا کے پاس ایک مخطوطہ دیکھا، جو خلیفہ عثمان[رض] کے عہد میں لکھا گیا تھا اور جس میں سورتوں کے نام فیتے کی طرح کی آرائشی پٹی پر روشنائی سے لکھے ہوئے تھے۔ ہر پانچویں اور دسویں آیت کے اظہار کے نشانات (علاماتِ خامسۃ

و عاشرة) بھی متن سے جہاں وہ پہلے ہوتے تھے ہٹا کر حاشیے میں قائم کر دیے گئے۔ اس جدّت کا سہرا، از روے روایت، بصرے کے نصر بن عاصم اللیثی (متوفی ۸۹ / ۷۰۸ء) کے سر ہے۔ خامسة کی علامت عام طور پر حرف ہ پر مبنی ہوتی تھی جس کی عددی قیمت بحساب ابجد ۵ ہوتی ہے، اور کبھی کبھی اسے ایک چھوٹے سے سیاہ مربع حلقے میں ایک سرخ الف بنا کر یا پھول بنا کر ظاہر کیا جاتا تھا۔ عاشرة کی علامت کے لیے اس سے زیادہ بڑے پھول یا زیادہ بڑے مربع میں آیت کا عدد لفظوں میں یا ابجد کے شمار کے مطابق ہندسوں میں لکھ دیا جاتا تھا۔ حاشیے کی مزید آرائشیں پھولوں کے نقشوں اور چوکھٹے والی دوسری تزیینی شکلوں کی صورت میں ہوتی تھیں جن سے قرآن کے مختلف حصے، مثلاً ساتواں، تیسواں یا ساٹھواں، ظاہر کیے جاتے تھے اور علاماتِ آیاتِ سجدہ بھی اسی طریق سے ظاہر کی جاتی تھیں۔ ایک اور خصوصیت بھی تھی جو اگرچہ مخصوص تزیینات قرآنی میں شامل نہ تھی، لیکن اس کے باوجود قرآن کے ابتدائی نسخوں کی چمک دمک اور رونق میں اضافہ کرتی تھی۔ متنِ قرآنی کے صامت حروف (consonant) تو تقریباً ہمیشہ سیاہ روشنائی میں لکھے جاتے تھے، مگر حرکات و اعراب جو ان پر لگائے جاتے، مثلاً ہمزہ، تشدید اور دیگر علامات، انھیں تمیز کے لیے شوخ رنگوں میں لکھتے تھے، اور فتحہ، کسرہ اور ضمہ تو قریب قریب ہمیشہ ھی سرخ ہوتے تھے۔

دوسری صدی ھجری کے اواخر سے تیسری صدی تک سورتوں کی ابتداء کی آرائشی دھاریوں کو زیادہ چوڑا بنانے لگے اور ان کے بیچ میں سورة کا نام اس طرح سے لکھا جانے لگا کہ الفاظ کے ارد گرد پتوں کے مختلف نمونے بنا دیے جاتے (شکل ۲)۔ اب رنگ زیادہ تر سنہری ہو گئے، نیلے اور سیاھی مائل بھورے رنگ (sepia) کم استعمال ہونے لگے۔ کبھی کبھی سبز رنگ بھی کام میں لایا جاتا تھا اور ڈیزائن کے نیچے کا پس منظر یعنی رَقّ (parchment) کی سفیدی بڑی حد تک نظر آتی تھی۔ تیسری صدی ھجری کے آواخر یا چوتھی صدی (نویں یا دسویں میلادی) میں بہت سے مخطوطات کے اندر پورے پورے صفحے آرائش کے نظر آتے ھیں، بلکہ اکثر کتاب یا اس کے کسی جزء کی ابتداء اور انتہا پر دو دو صفحے مُزیَّن و مُذَھب ایک دوسرے کے مقابل میں دکھائی دیتے ھیں۔ ان میں چھوٹی مستطیل شکلیں بنی ہوتی ھیں، جن میں خالص مجرّد اور خیالی نقوش نظر آتے ھیں اور عموماً ان میں کسی نہ کسی طرح کے خطوطِ متشابک کا امتزاج ہوتا ہے (شکل ۳)، مگر مضلّع (چھوٹے چھوٹے الماسی ڈیزائن کے متکرّر) نقش (diaper) بھی ملتے ھیں جو گُل بوٹوں سے لبریز ہوتے ھیں یا ان کی مختلف شقّوں میں ریزہ ھاے خاتم کاری سے مشابہ غیر مربع شکلیں (tassarae) یا صرف نقطے پائے جاتے ھیں۔ یہ صفحات اسی زمانے کی جلد بندی سے مشابہ ھیں (ملاحظہ ھو مقالۂ تجلید)۔ گمان کیا جاتا ہے کہ ان نقوش کا نقشہ جلد بندی ھی سے لیا گیا ہے؛ گو جلد بندی میں طلا کاری کی وہ شان نہیں جو صفحاتِ کتب میں ہے۔ پورے صفحے کی مستطیلی آرائشوں میں جلدوں کی طرح حاشیے کے بیل بوٹے بھی موجود ھیں، جو ہمیشہ اسی موضوع کی مختلف شکلوں میں صورت پذیر ھیں۔ یہ مجرد (یعنی تصویروں سے خالی) نقش جو مسلمانوں نے پیدا کیے گویا مبلّغانِ انجیل کی اُس نقاشی یا دوسری مذھبی تصاویر کے نظیرے تھے جو مسیحیوں کی انجیل یا بائبل کے مخطوطات کے آغاز میں پائی جاتی تھیں۔

شکل (۱) - قرآن مجید کا صفحہ، جس میں سورۃ الحج کے آغاز کو رنگوں سے آراستہ کیا گیا ہے؛ رنگ اصلی ہیں؛ دوسری صدی ہجری (آٹھویں میلادی)؛ خط کوفی ہے۔ تحریر دھندلی ہو گئی تھی، پھر کسی ناتجربہ کار شخص نے اس میں از سرِ نو سیاہی بھری ہے؛ واشنگٹن، معرض فریر (Freer Gallery of Art)، شمارہ ۳۵.۱۶.

شکل (۲) - قرآن مجید کا ایک صفحہ جس میں سورۃ الزمر کے عنوان پر طلائی آرائش کی گئی ہے؛ خط کوفی؛ تیسری صدی ہجری (نویں میلادی) کے آخر کا زمانہ؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۳۰.۶۰.
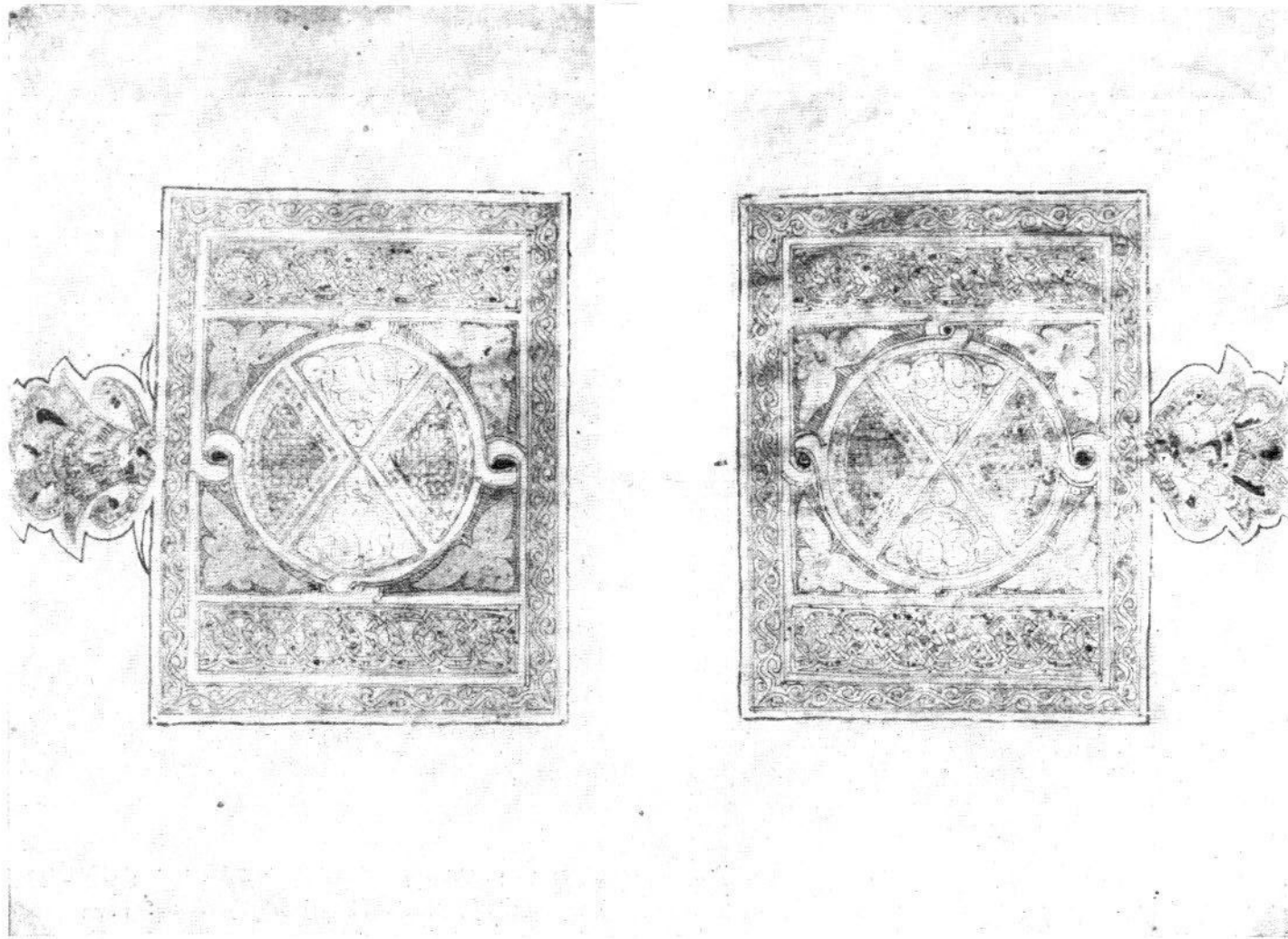
شکل (۴) ۔ صدر نسخۂ قرآن کی دوہری لوح : ایران ، چوتھی صدی ہجری (دسویں میلادی)؛ واشنگٹن ، معرض فریر ،
شمارہ ۳۴،۲۷ و ۳۴،۲۸ ۔

شکل (۵) - ایک ایرانی نسخۂ قرآن کی لوح کا دایاں نصف؛ مؤرخ ۷۳۷ھ / ۱۳۳۶ء؛ لندن، برٹش میوزیم، Add. 7214 (از روے A Survey of Persian Art).

شکل (۶) - دوہری لوحوں والے ایرانی قرآن کی لوح کا بایاں نصف؛ مؤرخ ۷۳۷ھ / ۱۳۳۶ء (وہی نسخہ جس کا ذکر شکل (۵) میں آیا ہے (از روے A Survey of Persian Art).

جس فنی اسلوب کا اب تک ذکر کیا گیا ہے وہ عباسی عہد کے انتہائی عروج اور زمانۂ زوال کے آغاز کا امتیازی نمونہ ہے ۔ خلافت بغداد کے زوال کے ساتھ ھی ساتھ مختلف علاقوں کے خاص خاص فنی اسلوب پیش پیش آنے لگے جس کی وجہ سے کتابوں کی تذھیب کے فن میں تنوّع پیدا ھو گیا ۔ یہ عظیم تغیر چوتھی صدی ھجری / دسویں میلادی میں ظاھر ھوا ۔ اس انقلابی ترقی کا ایک بڑا مرکز ایران اور بالخصوص خراسان تھا ۔ یہاں بلند زاویہ دار (angular) کوفی خط نئے انداز میں ظاھر ھوا اور بتدریج پہلے کی نسبت زیادہ کثرت سے کاغذ پر لکھا جانے لگا (قرآن مجید کا کاغذ پر لکھا ھوا پہلا معلوم نسخہ ۳۶۱ھ / ۹۷۲ء میں تحریر ھوا) ۔ اب صفحے عموماً ارتفاع میں زیادہ اور عرض میں کم ھونے لگے اور اس وقت سے مسلمانوں کے تقریباً تمام مخطوطات اور کتابوں کی شکل یہی ھو گئی ۔ قریب قریب تمام آرائشیں سنہری ھونے لگیں ۔ نقش و نگار کے ڈیزائن کا خاکہ سیاہ روشنائی سے تیار کیا جاتا تھا ۔ پس منظر کے ایک حصے کو سیاھی سے نقطہ کاری یا خطوط کشی سے پُر کر دیا جاتا تھا یا سنہری رنگ کو رگڑ کر کبھی اور رنگ (عموماً زیادہ سرخ رنگ) میں تبدیل کر دیا جاتا اور اس آرائش کے اندر رَق (جھلّی) یا کاغذ کی سفیدی بہت کم جھلکتی تھی ۔ نقش و نگار کے ڈیزائن روز بروز زیادہ پیچیدہ ھونے لگے، خصوصاً ان پورے صفحوں کی آرائش کے اندر، جو مخطوطات کے آغاز و اختتام میں لگائے جاتے تھے ۔ یہ خصوصیت خاص طور پر جالبِ نظر ہے، کیونکہ اس زمانے میں بالعموم متعدد ایسے مزیّن صفحے مخطوطات کی ابتدا میں لگائے جانے لگے (شکل ۴، ۵ اور ۶) ۔ سورتوں کے نام، حاشیے کی آرائشیں اور ھر آیت کے آخر میں چھوٹے چھوٹے ستارہ نما پھول اب زیادہ متحد اور یک شکل ھونے لگے اور پورا صفحہ زیادہ مکمّل اور منظّم نظر آنے لگا ۔ خامسة اور عاشرة کی علامات اور وہ آرائشی مربعے جن میں سورت کا مکی یا مدنی ھونا لکھا جاتا تھا اور آیات سجدہ کے نشاناتِ ان سب کو ایسی شکل دی گئی اور ان پر ایسا خوبصورت کام ھوا گویا عروسِ قرطاس نے زیورِ اقبال پہنا ہے ۔ ان میں اجزاے نقوش یا رنگ احتیاط اور کفایت سے استعمال ھوے (شکل ۷) ۔ یہ اسلوب ساتویں صدی ھجری (تیرھویں میلادی) کے اوائل کے متعدد سالوں تک برابر مقبول رھا؛ بعض نفیس ترین صفحات ایران کے عہدِ سلجوق سے دستیاب ھوے ھیں ۔

سرلوحوں (frontispieces) کے اھمّ ڈیزائنوں کے ارتقاء کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ سونے کی زمین پر متشابک سفید دائروں کا ایک سلسلہ نظر آتا تھا، لیکن پانچویں صدی ھجری (گیارھویں میلادی) کے آغاز سے ان کے بجاے پورے صفحے پر دیدہ‌ریزی اور محنت سے متشابک نقوش یا اشکالِ ھندسی کو زرِحل سے بنایا جانے لگا، جن سے چھوٹے چھوٹے نیلے ستاروں کا ایک سلسلہ بن جاتا تھا اور ان سارے نقوش کو چاروں طرف حاشیے سے گھیر دیا جاتا تھا، جو ایسا معلوم ھوتا تھا گویا اس پر بید بافی ھوئی ہے ۔ ان ستاروں میں اور صفحے کے گوشوں کی آرائش میں اللہ، للہ، محمد اور دوسرے مختصر کلماتِ تسبیح و تمجید نیلی زمین پر سونے کے حروف سے لکھے جاتے تھے (شکل ۵، ۶)؛ علاوہ بریں حاشیے کے اندر اور بھی چھوٹے چھوٹے ایسے رنگین نقوش ھوتے تھے کہ گویا جواھر پارے جڑے ھیں ۔ بعض اوقات صدر کتاب کی پہلی تزیینی لوح میں کسی آرائشی انداز سے آیات کی تعداد بھی لکھ دی جاتی تھی ۔ جگہ پُر کرنے کا مقبول عام طریقہ یہ تھا کہ بل کھائی ھوئی شاخوں

پر ''طرازِ عربی'' (''ارابسک'') کی پھول پتی بنا دی جاتی تھی؛ چنانچہ مثال کے طور پر سورتوں کے عنوانوں کے لیے پس منظر کا ڈیزائن عام طور پر ایسا ھی ھوتا تھا ۔ پانچویں صدی ھجری (گیارھویں میلادی) کے اواخر اور چھٹی صدی ھجری (بارھویں میلادی) کے قرآنوں کی ابتدائی تزیینی لوحوں میں بعض ایسے بے نظیر ''طرازِ عربی،، کے نقش و نگار موجود ھیں کہ ان سے حسین تر اور دقیق تر ڈیزائن ایران میں ایجاد نہیں ھوے اور جنھیں آیۃٌ فی الفن تصور کرنا چاھیے ۔ پتوں کا نقشہ نہایت خوب بنایا گیا ھے اور ان کے کناروں کو اکثر سفید کر دیا گیا ھے تا کہ ان کی شکلوں سے لچک اور نرمی جھلکنے لگے اور ان کی لمبی نوکیں ایک طرف کو موڑ دی گئی ھیں ۔ مخطوطات کے شروع میں اور آخر میں پورے صفحے کے جو مستطیل تزیینات ھیں اُن میں رسمی طرز پر ڈھلے ھوے (stylized) پتے اور پھول نسبۃً بہت کم بنائے جاتے تھے، لیکن اس زمانے تک بھی وہ حاشیوں کے نقشی گلابوں میں برابر نظر آتے تھے، جو روز بروز زیادہ رسمی طرز پر ڈھلے ھوے اور گول شکل کے ھوتے جا رھے تھے؛ لیکن جگہ پُر کرنے کے عام طریقے یہی تھے کہ 'عربی طرز' کے نقوش بنا دیے جائیں یا کتبات لکھ دیے جائیں۔ آرائش کا ایک نیا طریقہ، جو چوتھی صدی ھجری (دسویں میلادی) کے وسط میں شروع ھوا، اصل متن کے بین السطور کو سجانا تھا ۔ اس آرائش میں پھولوں، مار پیچ اور مرغولوں کے وافر ڈیزائن سیپیا (sepia) کے سرخی مائل مرکّب سے بنائے جاتے تھے، مگر ان کے رنگ ھلکے رکھے جاتے تھے ۔ انھیں عبارت کے گرد ایسے طریق سے سجایا جاتا تھا کہ ایک تنگ سفید پٹی سی آرایش سے خالی رھتی تھی جو اس بیرونی تزیین اور عبارت کے بیچ میں حائل کا کام دیتی تھی ۔ یہ ڈیزائن پانچویں صدی ھجری (گیارھویں میلادی) اور چھٹی صدی ھجری (بارھویں میلادی) میں زیادہ نمایاں اور واضح ھو گئے (شکل ۸)۔

پانچویں صدی ھجری / گیارھویں میلادی اور چھٹی صدی ھجری/ بارھویں میلادی میں جن دنیوی، غیرمذھبی مخطوطات کی نہایت نفیس تذھیب کی گئی تھی ان میں سے آج بہت کم محفوظ ھیں۔ ان میں سے نفیس‌ترین مخطوطوں کو دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ تقوی اور قدامت پسندی کے موانع نسبۃً کم ھو جانے کی وجہ سے تذھیب کا یہ کام شاید زیادہ شوخ اور زیادہ تخیّلی اسلوب کے ماتحت مکمّل کیا گیا ھے ۔ یہ بات بالخصوص اس طریقِ کار سے ظاھر ھوتی ھے جس کے مطابق ھندسی اشکال کو پھول بوٹوں سے پُر کیا گیا ھے۔

آرائش کتاب کا وہ انداز، جو سامانی، غزنوی اور سلجوقی عہد سے مخصوص تھا، عراق کے فنِ کتاب‌سازی پر بھی اثر انداز ھوا ۔ یہ بات ایک نسخۂ قرآن سے مشاھدے میں آ سکتی ھے جس پر مقام کتابت بغداد اور تاریخ ۳۹۱ھ/ ۱۰۰۰ء درج ھے اور خاتمۂ نسخہ کی عبارت سے معلوم ھوتا ھے کہ اس کی کتابت مشہور خطّاط علی بن ھلال (المعروف بہ ابن البوّاب) نے کی اور چونکہ وہ مُذھِّب بھی تھا اس لیے غالباً نسخے کی تذھیب بھی اسی نے کی ھوگی ۔ ھمارے علم میں یہ سب سے پہلا قرآنی نسخہ ھے جو خطِّ نسخ میں لکھا گیا ۔ رنگوں کے تنوّع اور مختلف پورے صفحے کی تزیینات کے اعتبار سے یہ نسخہ اور نسخوں سے باثروت تر (richer) اور ممتاز تر ھے اور گو اس میں سخت باقاعدہ ھندسی اشکال پر انحصارِ کار کم رکھا گیا ھے تا ھم مختلف جسامت کے متشابک دائروں یا مثمّنوں کے سلسلے کو اس میں بھی ترجیح دی گئی ھے (شکل ۹ و ۱۰) ۔ اس میں نمایاں اور برجستہ طریق پر

شکل (۷) - ایک قرآنی مخطوطے کا صفحہ، جس کے حاشیے پر طلائی تذہیب ہے (علامات مکیۃ و خامسۃ)؛ ایران، پانچویں صدی ہجری (گیارھویں میلادی)؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۲۹،۷۰ء

شکل (۸) - ایک قرآنی مخطوطے کا صفحہ، جس میں متن کے گردا گرد سیپیا سے آرائش کی گئی ہے؛ ایران، پانچویں چھٹی صدی ہجری (گیارھویں-بارھویں میلادی)؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۳۹،۵۶ء

شکل (۹)-آرائشی لوحیں ، جن میں آیات کے شمار کا خاتمہ دیا ہے؛ یہ
قرآن مجید کاغذ پر لکھا ہے اور اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ
اسے بغداد میں علی بن ھلال المعروف بہ ابن البوّاب نے ۳۹۱ھ/
۱۰۰۰ء میں لکھا تھا؛ ڈبلن ، کتب خانۂ سر چیسٹر بیٹی
(Sir Chester Beatty) (از روے رائس D. S. Rice)؛ [الفاظ بظاھر
یہ ھیں: فی عدد اھل الکوفہ المروی عن امیر المؤمنین - ادارہ].

شکل (۱۰) - قرآن مجید کے آخر کے آرائشی صفحات؛ کہا جاتا ھے کہ یہ
نسخہ ۳۹۱ھ/۱۰۰۰ء میں ابن البوّاب نے بغداد میں لکھا؛
وھی مخطوطہ جس کا ذکر شکل (۹) میں ھوا ھے؛ ڈبلن،
کتابخانۂ چیسٹر بیٹی (از روے رائس).

فاتحة الكتاب سبع ايات
بسم الله الرحمن الرحيم
الحمد لله رب العالمين الرحمن الرحيم ملك يوم الدين اياك
نعبد واياك نستعين اهدنا الصراط المستقيم صراط
الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين
بسم الله الرحمن الرحيم
الم ذلك الكتاب لا ريب فيه هدى للمتقين الذين يؤمنون
بالغيب ويقيمون الصلاة ومما رزقناهم ينفقون والذين يؤمنون
بما انزل اليك وما انزل من قبلك وبالاخرة هم يوقنون
اولئك على هدى من ربهم واولئك هم المفلحون ان الذين

شکل (۱۱) - قرآن مجید کے متن کا آغاز، اس مخطوطے میں جو کہا جاتا ہے کہ ۳۹۱ھ میں ابن البوّاب نے بغداد میں لکھا تھا؛ ڈبلن ' کتابخانۂ چیسٹر بیٹی (از روے رائس)؛ (وہی مخطوطہ جس کا ذکر شکل (۹) و (۱۰) میں آ چکا ہے)۔
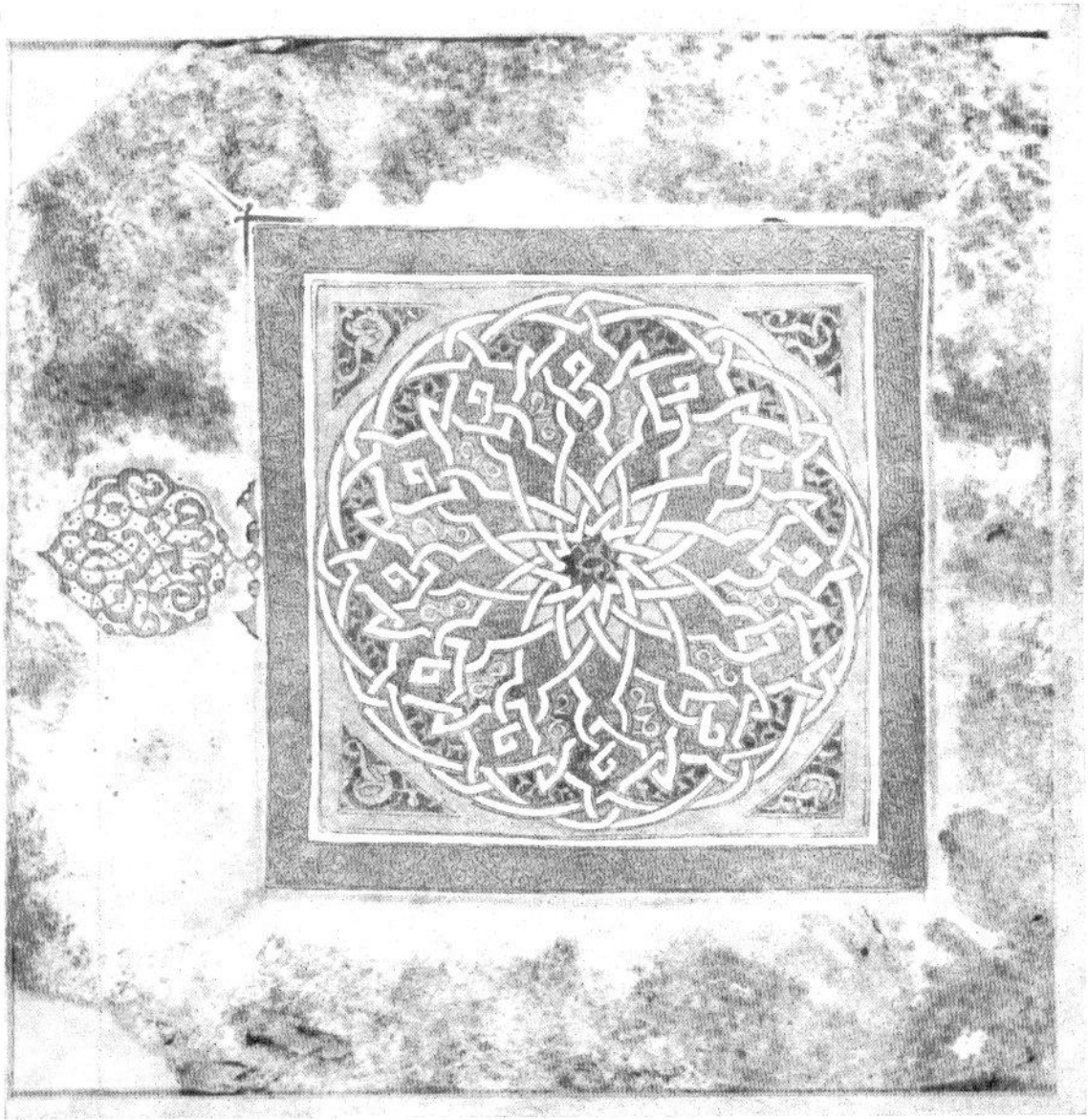
شکل (۱۲) - رق (جھلی) پر لکھے ہوئے المغرب کے ایک قرآنی نسخے کی آرائشی لوح؛ غالباً شمالی افریقہ میں چھٹی صدی ہجری (بارھویں میلادی) میں تیار کی گئی؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۹ . ۳۱ .

'' طرازِ عربی'' ('ارابسک') کے نقوش استعمال کیے گئے ہیں، اس طرح سے کہ اکثر ان کا اور چھوٹے نمونوں کے نقوش کا باہمی تضاد واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ اس دور میں بھی عباسی عہد کے قرآنوں کی طرح، جو رَقّ (جھلّی) پر لکھے جاتے تھے، اس نسخے کے ہوامش (حواشی) پر پیچیدہ گل‌کاری کی گئی ہے لیکن چند صورتوں میں اس آرائش کے ترکیبی اجزاء کو رسمی طریق پر ڈھالنے (stylization) کا رجحان واضح ہے (شکل ۱۱) ۔

افسوس ہے کہ ہمیں اب تک فاطمی دور کے نفیس و بدیع قرآنی نسخوں کا کچھ علم حاصل نہیں ہو سکا ۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی میلادی اور چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی میلادی میں مسلمانانِ مصر کی فن‌کاری کا انداز عبرانی بائبلوں سے، جن کی کتابت مصر میں ہوئی، یا ان اسلامی ملکوں کے قرآنی نسخوں سے لگایا جا سکتا ہے جو فاطمیوں کے مصر سے وابستہ تھے؛ مثلاً ملکِ یمن کے ان مصاحف سے جن کی کتابت اس دور میں ہوئی جب یمن صُلَیْحیون کے زیرِ تسلّط تھا ۔ قرآن کے ایک یمنی نسخے کی، جو اب استانبول میں موجود ہے، کتابت تو ۴۱۷ھ / ۱۰۲۶ء میں مگر اس کے بعض اجزاء کی تزیین و تذہیب ۴۵۶ھ / ۱۰۶۱ء میں ہوئی ۔ اسے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ فاطمی تذہیب عراقی تذہیب سے اثر پذیر ہوئی ۔ اس یمنی قرآن کے کاملاً مزیّن و مذہّب صفحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں تذہیب کا فن دنیاے اسلام کے دور دست علاقوں میں بھی بہت اونچے درجے تک پہنچ چکا تھا ۔

المغرب کے قرآنی مخطوطات کی تذہیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کا اپنا ایک خاص طرز ہے، بعینہٖ اس طرح جس طرح ان مصاحف کا رسمِ خط بھی انھیں کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ان کے اوراق ساتویں صدی ہجری (چودھویں میلادی) تک رَقّ (جھلّی) کے ہیں، ان کی ہیئت اکثر مربع ہے اور تقطیع بڑی نہیں ۔ پورے صفحے کی آرائش میں متشابک دائروں اور مربعوں کے سلسلوں کی بھرپور نمائش کی گئی ہے ۔ اس آرائش میں طلائی رنگ غالب ہے اور نقوش کے نیچے رَقّ کی زمین کی سفیدی ڈیزائنوں میں خاص طور پر اہمّ مقام رکھتی ہے (شکل ۱۲) ۔ قدیم تر مخطوطات میں متن ایسے قالب (فریم) سے محدود ہے جو طناب نما یا کسی اور شکل کا ہے اور حاشیوں میں گل بوٹوں کا مروّج ڈیزاین اختیار کیا گیا ہے ۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں میلادی اور چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی میلادی سے شروع کر کے حاشیوں کی آرائش کے لیے طلائی '' عربی طراز'' (ارابسک) استعمال کیا گیا ہے ۔ المغرب کی تذہیب کے متعلق ابھی بہت کم چھان بین ہوئی ہے اور غالباً مراکش اور تونس کی جوامع و مدارس کے کتاب خانوں میں ہمارے لیے ابھی تک بڑی بڑی نادر اور مُدہِش چیزیں موجود ہیں ۔

ساتویں صدی ہجری (تیرھویں میلادی) میں پوری اسلامی دنیا کے اندر تذہیب کے فن میں پھر تغیر رونما ہوا ۔ ایران میں نیا اسلوب اس وقت نمودار ہوا جب نومسلم ایلخانی خاندان کے ایک مغولی سلطان (اولجایتو خدا بندہ) نے مذہبی سرگرمی یوں دکھائی کہ بڑی بڑی تقطیع کے ضخیم و حجیم مصاحف تیار کرنے کا حکم دیا جن میں سے ہر ایک تیس تیس جلدوں پر مشتمل تھا، قرآن کے ان نسخوں کی کتابت ۷۰۴ھ اور ۷۱۳ھ (۱۳۰۴ء اور ۱۳۱۳ء) کے درمیان بغداد، موصل اور ہمدان میں ہوئی ۔ ان کے شروع میں مزیّن اور منقّش ابتدائی صفحات کا ایک بڑا سلسلہ نظر آتا ہے، جن میں انواع و اقسام کے ڈیزائن، نت نئی اشکالِ ہندسی پر مشتمل، کمال

احتیاط سے بڑے پیمانے پر کھینچے گئے ہیں اور ان کو ''طرازِ عربی'' کے نقوش اور متشابکات سے پر کیا گیا ہے اور ان کے اندر کہیں کہیں مختصر سے کلماتِ مقدسہ بھی خطِ ثُلُث میں لکھے گئے ہیں ۔ یہ ڈیزائن یا تو کسی مرکزی آرائش کے گرد ترتیب دیے گئے ہیں (centralized compositions) (شکل ۱۳) یا انھیں بیل بوٹوں اور نقوشِ طرازِ عربی کے سلسلوں میں تمام صفحے پر پھیلا دیا گیا ہے ؛ گویا دیباے زرین کے ٹکڑے صفحات پر بچھا دیے گئے ہیں (شکل ۱۴) ۔ متنِ قرآنی خطِّ ثُلُث میں بڑے بڑے حروف میں لکھا گیا ہے اور بہت سی صورتوں میں اس کی زمین آرائشی نقش و نگار سے معمور ہے، جو بشکلِ طرازِ عربی ازھار و ریاحین پر مشتمل ہیں یا کسی اور نمونے کے ہیں ۔ اس پورے ڈیزائن کے گردا گرد ایسے حاشیے ہیں جن کے آرائشی صفیحے (panels) صفحے کے اوپر اور نیچے کی جانب زیادہ عریض ہیں اور حاشیے پر نکلے ہوے شمسے (roundels) بھی بنا دیے گئے ہیں ۔ مُذَہّب ان میں پہلے کی طرح بیشتر سنہری ہی رنگ استعمال نہیں کرتا، بلکہ دیگر انواع و اقسام کے رنگ بھی کام میں لاتا ہے ۔ خالص نظرفریب بھڑک کے اعتبار سے ان مصاحف کا شمار دنیا کے ان بہترین مذہّب نسخوں میں ہے جنکی تذہیب و تزیین بغایت موثر اور کارگر طریق سے ہوئی ۔ جو مخطوطات بادشاہوں کے لیے نہیں لکھے گئے اور تقطیع میں چھوٹے ہونے کی وجہ سے ان کے تیار کرنے میں قیمتی سامان بھی کم خرچ ہوا اور جو بعض صورتوں میں اس قدر مقدس بھی نہ تھے ایسے متون کی تذہیب بھی بہت شاندار طور پر کی گئی؛ [آخرالذکر قسم کی ایک مثال [مجموعۃ الرشیدیہ] ہے، جو رشید الدین فضل اللہ کی چار تصنیفات کا مجموعہ ہے] (مؤرّخ در ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) اور پیرس کے کتاب خانۂ ملّی میں موجود ہے ۔ اس زمانے میں جس جدّت کا اضافہ ہوا (اقلاً یہ کہیے کہ اس کا استعمال زیادہ ہونے لگا) وہ لوحِ ملکِ کتاب ("book-plate" یا "ex-libris" ۔ '' برسمِ خزانۂ کتبِ فلاں'') تھی ۔ عموماً یہ ایک مدوّر قرص یا اگر تقطیعِ کتاب مستطیل ہو تو عمودی، مستطیل تختی کی شکل کا ایک آرائشی نقش تھا جو صدرِ کتاب میں پہلے ورق کی جانبِ راست بنایا جاتا تھا اور اس میں اس مربّی کا، جس کی خاطر وہ نسخہ لکھا اور مزیّن کیا گیا، نام اور کچھ القاب ہوں تو القاب بھی لکھے جاتے تھے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ غریب خطّاط کو کوئی مربّی نہ ملتا تھا، چنانچہ ایسے مخطوطات بھی موجود ہیں جن میں اس تختی کا سنہری زمین والا مرکزی دائرہ بالکل خالی نظر آتا ہے (شکل ۱۵) ۔

ایل خانی نسخہ‌ھاے قرآن جو ایران و عراق میں لکھے گئے ان کی شان و شوکت کی برابری صرف وہ بڑے بڑے مسجدی قرآن ہی کر سکتے ہیں جو مصر و شام کے مملوک سلاطین کے حکم سے لکھے گئے، اور جو آج کل بیشتر قاہرہ کے کتاب خانۂ ملّی میں محفوظ ہیں ۔ اس سلسلے کا آغاز اس قرآن سے ہوتا ہے جو سلطان حسن (۷۴۸ھ تا ۷۵۵ھ / ۱۳۴۷ء تا ۱۳۵۴ء) کے لیے کتابت ہوا؛ اس سلسلے کا اختتام اس خاندان کے خاتمے پر ہوا ۔ بڑی تقطیع کے پورے صفحے کی تذہیب میں عام طور پر ستاروں کے ڈیزائن ہوتے تھے (شکل ۱۶) ۔ اس زمانے کی جلد بندی میں بھی یہی ڈیزائن مستعمل تھا (ملاحظہ ہو مادّۂ تجلید، ص ۱۵۴) یا صُرّہ نما نقوش (ترنجوں) یا ہندسی اشکال کو مسلسل طور پر سجا کر رکھا جاتا تھا ۔ چند مخطوطوں میں ایک اور بات بھی دیکھی گئی؛ مثلاً اس قرآن میں، جو سلطان شعبان (۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء) کے لیے مذہّب کیا گیا تھا، تذہیب

شکل (۱۳) - قرآن مجید کے ایک جزء کے آغاز کا آرائشی صفحہ؛ یہ نسخہ ۷۱۳ھ/
۱۳۱۳ء (دور ایلخانی) میں سلطان اولجایتو خدا بندہ کے لئے ہمدان
(ایران) میں لکھا گیا؛ قاہرہ، کتاب خانۂ ملّی۔
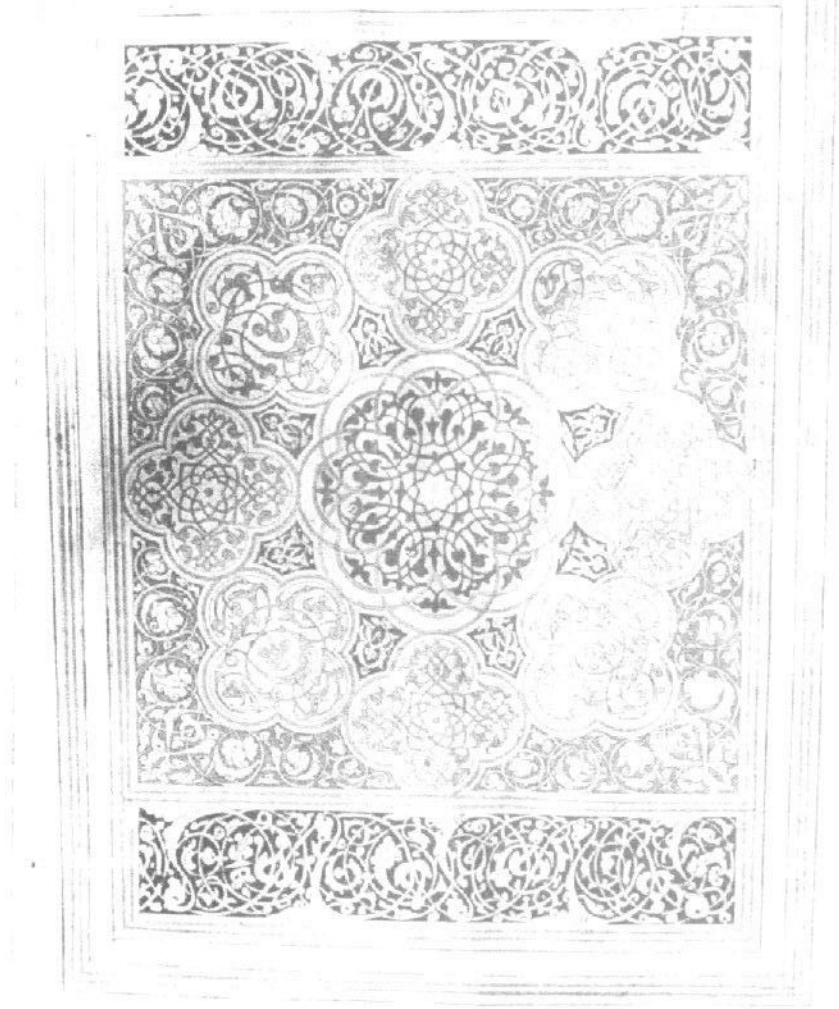
شکل (۱۴) - قرآن مجید کے ایک جزء کے آغاز کا آرائشی صفحہ؛ یہ نسخہ ۷۱۰ھ/
۱۳۱۰ء میں سلطان اُولجایتو خدا بندہ کے لئے موصل میں لکھا گیا
(ایلخانی یا مغولی دور)؛ لندن، برٹش میوزیم۔
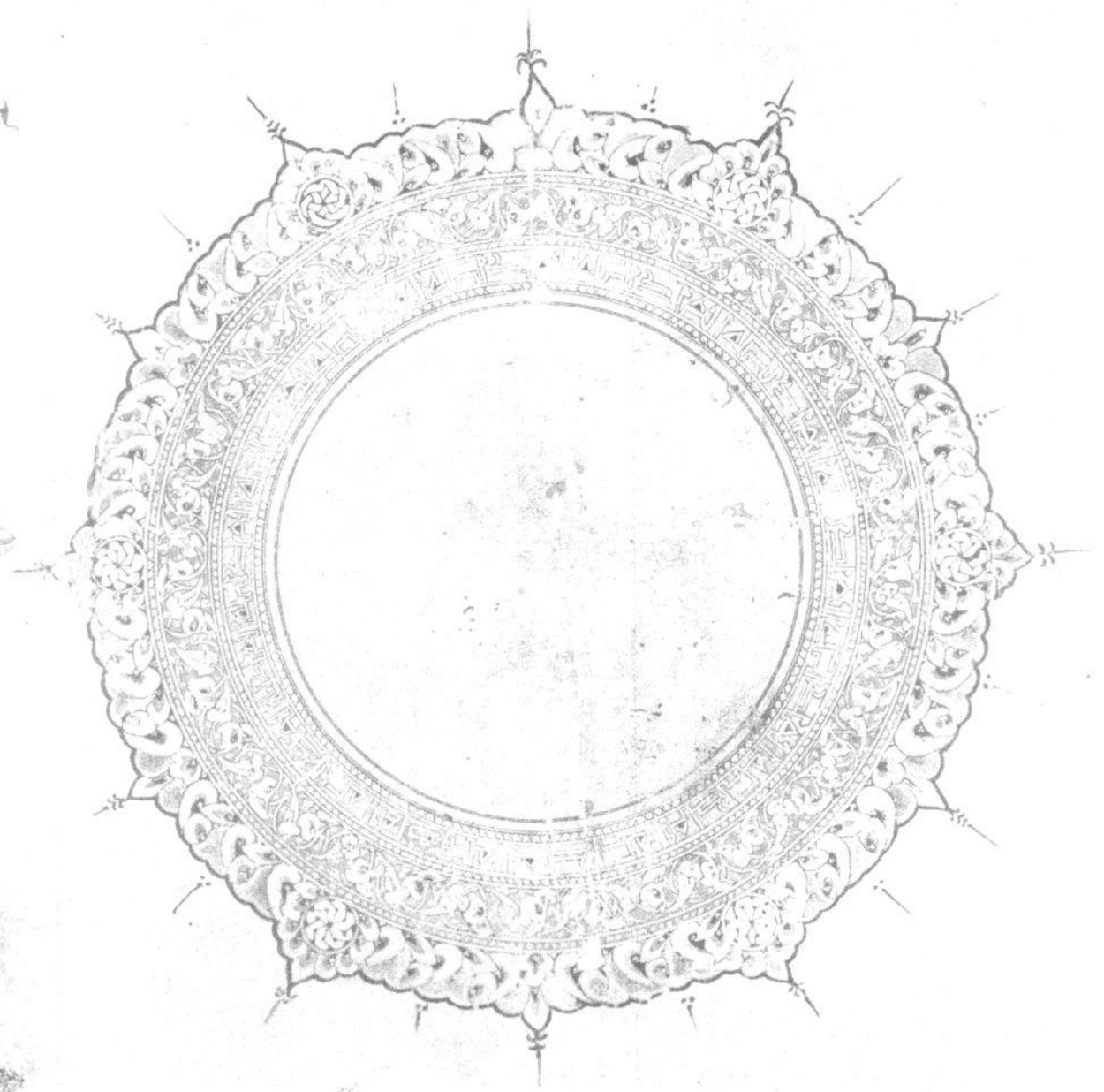
شکل (۱۵) - شمسه، جو کسی مربّی کے نام کے لئے تیار کیا گیا (لیکن اس میں نام لکھنے کی نوبت نہ آئی)؛ ایران، آٹھویں صدی ہجری (چودھویں میلادی)، عہد ایلخانی؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۳۲،۳۳۔
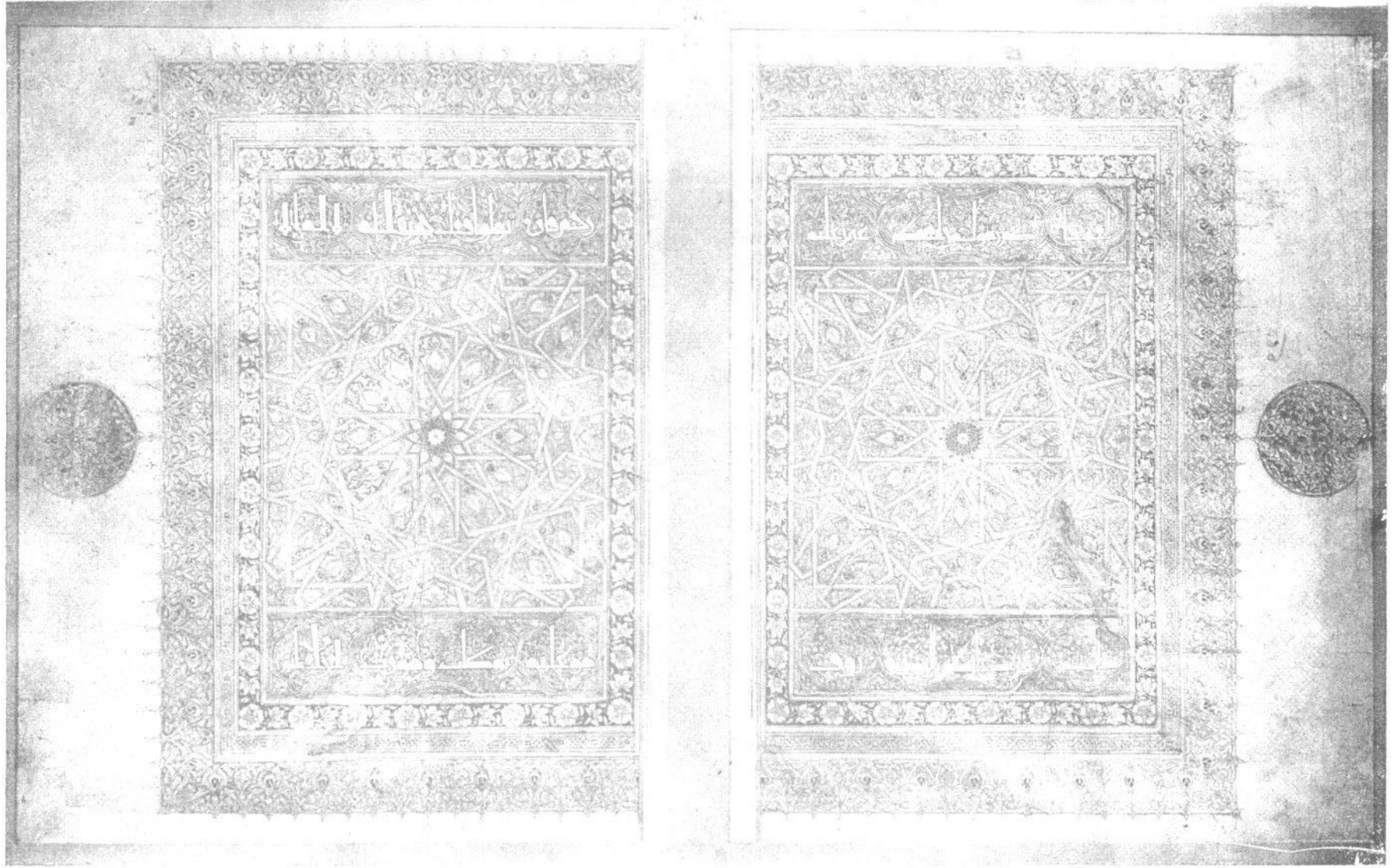
شکل (۱٦) - قرآنی مخطوطے کی دوہری آرائشی لوح [جس پر سورۃ ۹ کی آیہ ۱۲۹ و ۱۳۰ بخط کوفی لکھی ہے]؛ مصر، آٹھویں صدی ہجری (چودھویں میلادی)، دور ممالیک؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۵۵۔۳۰۔
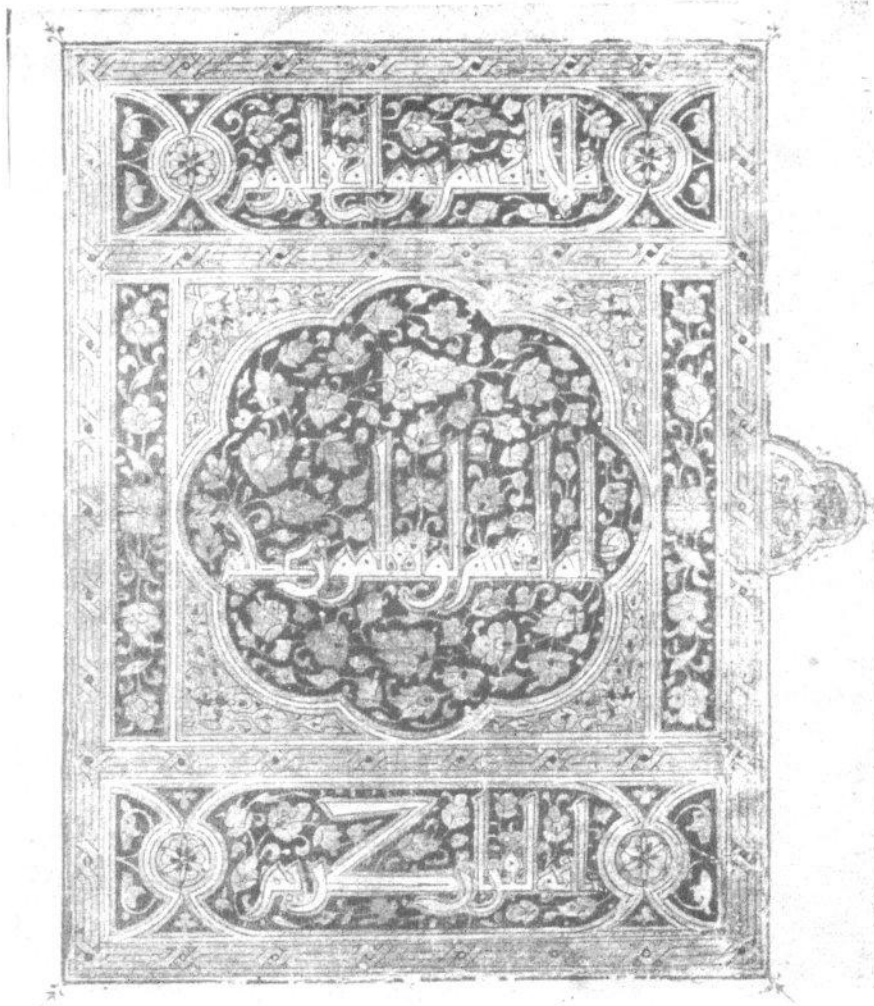
شکل (۱۷) - قرآنی مخطوطے کی آرائشی لوح کا دایاں حصہ؛ نویں صدی ہجری
(پندرھویں میلادی) ؛ عہد ممالیک ؛ واشنگٹن ، معرض فریر ،
شمارہ ۱ء۳۲. [قرآن مجید ۵۶ : ۷۴ تا ۷۶]

کرنے والے نے ابعاد ثلاثہ کے اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے - بحیثیت مجموعی یہ ڈیزائن اور دوسرے تکلف سے سجے ہوئے مخطوطات کے ڈیزائن عصر مغول کے قرآنوں کے ڈیزائنوں سے بہت زیادہ مشابہ ہیں؛ البتہ جزئیات کے اعتبار سے یہ شاید اُن سے زیادہ باثروت ہیں اور ان میں چینی اصل کے پھولوں کی ہو بہو تصویریں نسبۃً زیادہ نظر آتی ہیں (شکل ۱۶) - صرف جب دور ممالیک کے آخری سال قریب آ لگے، یعنی نویں صدی ھجری / پندرھویں میلادی کے نصف آخر کا زمانہ آ گیا، تو اس فن کی کیفیت میں زوال رونما ہوا؛ چنانچہ اس زمانے میں جگہ پُر کرنے والے طرازِ عربی کے نقش و نگار اور بیل بوٹے پہلی سی نفاست سے نہیں بنائے جاتے تھے - ان قرآنی نسخوں میں جو بادشاہوں کے لیے مرتّب نہیں ہوئے اور ان مخطوطات میں جو قرآن مجید کے علاوہ، خصوصاً نویں صدی ھجری/ پندرھویں میلادی میں تیار کیے گئے، گہری نیلی زمین پر آب زر سے پھول بوٹوں کی ہو بہو شکلیں بنائی جاتی تھیں اور اس تمام ڈیزائن کے گردا گرد قالب (فریم) کے طور پر پُر تکلّف سنہری حاشیے بنا دیے جاتے تھے (شکل ۱۷) - یہ کام خاصا بھڑکیلا ہے، لیکن اس کی تکمیل پوری احتیاط سے نہیں کی گئی - صفحاتِ متن کی تذہیب بھی ایلخانی نسخہ ہائے قرآن کے نقش و نگار سے بہت ملتی جلتی ہے (شکل ۱۸) - بعض اوقات یہ مشابہت اس حد تک پہنچ جاتی تھی کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا کہ آٹھویں صدی ھجری / پندرھویں میلادی کا فلاں قرآنی مخطوطہ ایران میں تیار کیا گیا ہے یا مصر میں.

المغرب کے قرآنی نسخوں میں ساتویں صدی ھجری / تیرھویں میلادی سے شروع کر کے عصرہائے بعد میں وہ تزیینی نظام برابر قائم رہا جو پہلے کی صدیوں میں مروج تھا - پورے صفحے کی آرائشیں، جن میں متشابک دائرے بنائے گئے ہیں، نفیس و نازک اور بدیع و دقیق ہیں - ابو یعقوب بن یوسف مرینی کے لیے جو قرآن تیار کیے گئے ان میں ان قرآنوں کی طرح، جو اس کے معاصر اولجائتو کے لیے تیار کیے گئے، مسلسل ڈیزائن تو موجود ہیں، لیکن ان میں متشابک دائرے یا الماسی شکل کی جعفریاں، جن "دو ستاروں" یا طراز عربی" (ارابسک) سے پُر کیا گیا ہے، نسبۃً سادہ تر ہیں۔ وہ "طراز عربی"، جسے المغرب کے طریق پر رسمی (stylized) بنا دیا گیا، ان نسخوں میں عام طور پر نظر آتی ہے اور اس طراز کو حاشیوں کے گول شمسوں کے پُر کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے - ایک مخطوطہ ایسا بھی ہے جس میں متن کے اطراف اور حاشیے کے سجانے کے لیے ٹہنیاں اور پھول پتے اپنی طبیعی شکل میں دکھائے گئے ہیں۔ یہ خصوصیت مشرقی اسلامی ملکوں میں نہیں ملتی اور غالباً مسیحی اثرات کا نتیجہ ہے - آٹھویں صدی ھجری (چودھویں میلادی) میں اور اس کے بعد تذہیب میں زیادہ غالب رنگ یہ ہیں: سنہری، سرخ اور نیلا.

آٹھویں صدی ھجری / چودھویں میلادی اور نویں صدی ھجری / پندرھویں میلادی میں دورِ مملوک کا اسلوبِ آرائش تو بدستور باقی رہا، لیکن آٹھویں صدی ھجری / چودھویں میلادی کے آخر میں ایرانی تذہیب کا ڈھنگ پورے طور پر بدل گیا - اس تبدیلی کا زمانہ وھی تھا جو تیمور کے عروج کا تھا - بعد کی صدی میں بھی، جب ایران یا اس کے بعض حصوں پر تیموری شاہزادے راج کر رہے تھے، یہ بدلا ہوا اسلوب جاری رہا - اس زمانے کے مخطوطات ایلخانی مخطوطوں کے مقابلے میں تقطیع کے اعتبار سے چھوٹے ہیں اور ان کی

چھوٹی تقطیع کے پیش نظر مذہب کی کوشش یہی ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ نفاست و نزاکت پیدا کرے ۔ یہ حقیقت "طرازِ عربی" (ارابسک) کے بیل بوٹوں کی نہایت پرکار مگر بدیع و لطیف و نازک نقاشی اور طبیعی شکل کی گل‌دار ٹہنیوں کی تصویرکشی سے، (جو اس زمانے میں عام ہے)، ظاہر ہوتی ہے ۔ جن طوماری حلقوں (cartouches) میں یہ ڈیزائن نظر آتے ہیں ان حلقوں کی تخطیط (outline) کو آراستہ اور گل‌دار بنایا گیا ہے ۔ مخطوطات میں ایک جدت [اس دور میں] یہ پیدا کی گئی ہے کہ متن کا ایک حصہ یا کوئی دوسرا متن اندرونی حاشیے میں مختلف زاویے سے لکھا جاتا ہے، نیز یہ رواج بھی نظر آنے لگا ہے کہ اصلی متن کی کتابت کبھی افقی طور پر ہوتی ہے اور کبھی ترچھی ۔ جب سمتِ کتابت میں یہ تبدیلی پیدا ہو تو لازمی طور پر صفحے کے مختلف حصوں میں بعض مثلث ٹکڑے آجاتے ہیں جن سے مستطیلی خلا پر ہوتی ہے ۔ ایک اور نئی بات یہ بھی پیدا ہوئی کہ سنہری رنگ کے علاوہ نیلے رنگ (ultramarine blue) کا استعمال وسیع تر ہو گیا (یہ نیلا رنگ سنگ لاجورد کے سفوف سے تیار کیا جاتا تھا) اور اس سے کم درجے پر وہ مختلف رنگ کام میں لائے جانے لگے جو گل کاری کے ڈیزائنوں میں کام آتے ہیں ۔ اس زمانے میں تصویر دار مخطوطات کی تیاری میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا اور اس کا اثر تذہیب پر بھی پڑا؛ چنانچہ "برسم خزانۂ فلان" والی لوحوں کے بعد مخطوطات میں ایک یا دو منقش صفحے اور بڑھائے گئے جن کے مرکزی "جامات" (یا ترنجوں medallions) کے اندر کتاب اور مصنف کا نام لکھا جاتا تھا اور ان کے گرد ایسے ڈیزائن بنائے جاتے تھے جو جانوروں، پریوں، پھولوں اور "طرازِ عربی" کے نقش و نگار پر مشتمل ہوتے تھے (شکل ۱۹) ۔ چونکہ اس صدی میں ایک مخطوطے کے اندر ایک ہی مصنف کے مکمل کلام (کلیات) جمع کرنے اور مختلف مصنفین کے (انتخابی) کلام کے مجموعے اور بیاضیں مرتب کرنے کا شوق بے حد عام تھا، اس لیے ان میں سے ہر ایک مخطوطے کے آغاز میں (اُن ابتدائی آرائشی صفحات کی طرح، جن میں آیات قرآنی کی تعداد درج ہوتی تھی) بعض پرکار آرائشی صفحات بھی بڑھائے جانے لگے جن میں، متعدد طوماری حلقوں (cartouches) کے اندر مختلف کتابوں کے نام [جنکے انتخابات مجموعے میں شامل تھے] درج کیے جاتے تھے (شاھنامے کے اندر ایسے آرائشی صفحات میں شاہانِ ایران کے نام لکھے جاتے تھے) ۔ اس کے علاوہ ایک اور رجحان یہ تھا کہ ان غیر مذہبی (دنیوی مطالب پر مشتمل) مخطوطات کے حاشیوں پر انسانوں، جانوروں اور پھولوں کی نفیس و نازک تصویریں بھی دی جاتی تھیں، جنھیں متن سے براہِ راست کوئی علاقہ نہیں ہوتا تھا اور صرف تزیین کا کام دیتی تھیں ۔ جیبی تقطیع کی لمبی، مگر کم عریض، مقبول عام بیاضوں میں، جن میں ایرانی شعراء کا کلام درج ہوتا تھا، حاشیے کی آرائشیں نسبۃً زیادہ رسمی طرز کی ہوتی تھیں جن میں "طرازِ عربی" کے نقش و نگار، گل‌دار ٹہنیاں، پرندوں کی شکلیں اور بے ڈھنگی طرز کی تصویریں (grotesques) ہوتی تھیں ۔ اس نمونے کے ڈیزائن اکثر دھات کی نقش ساز تختیوں (stencils) کے ذریعے ثبت کیے جاتے تھے اور ایک ہی ڈیزائن کئی مخطوطات میں کام دے سکتا تھا (شکل ۲۰)۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں میلادی کے آخر میں اسلوب میں پھر تغیر پیدا ہوا اور اب اس نے ترقی پا کر وہ صورت اختیار کر لی جو صفوی عہد کے ساتھ خاص ہے ۔ زرحل اور لاجورد کی تزیین

شکل (۱۸) - دور ممالیک کے اس قرآنی نسخے میں سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات درج ہیں : مصر، نویں صدی ہجری (پندرھویں میلادی)؛ وہی نسخہ جس کا ذکر شکل (۱۷) میں آچکا ہے : واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۵۲،۲
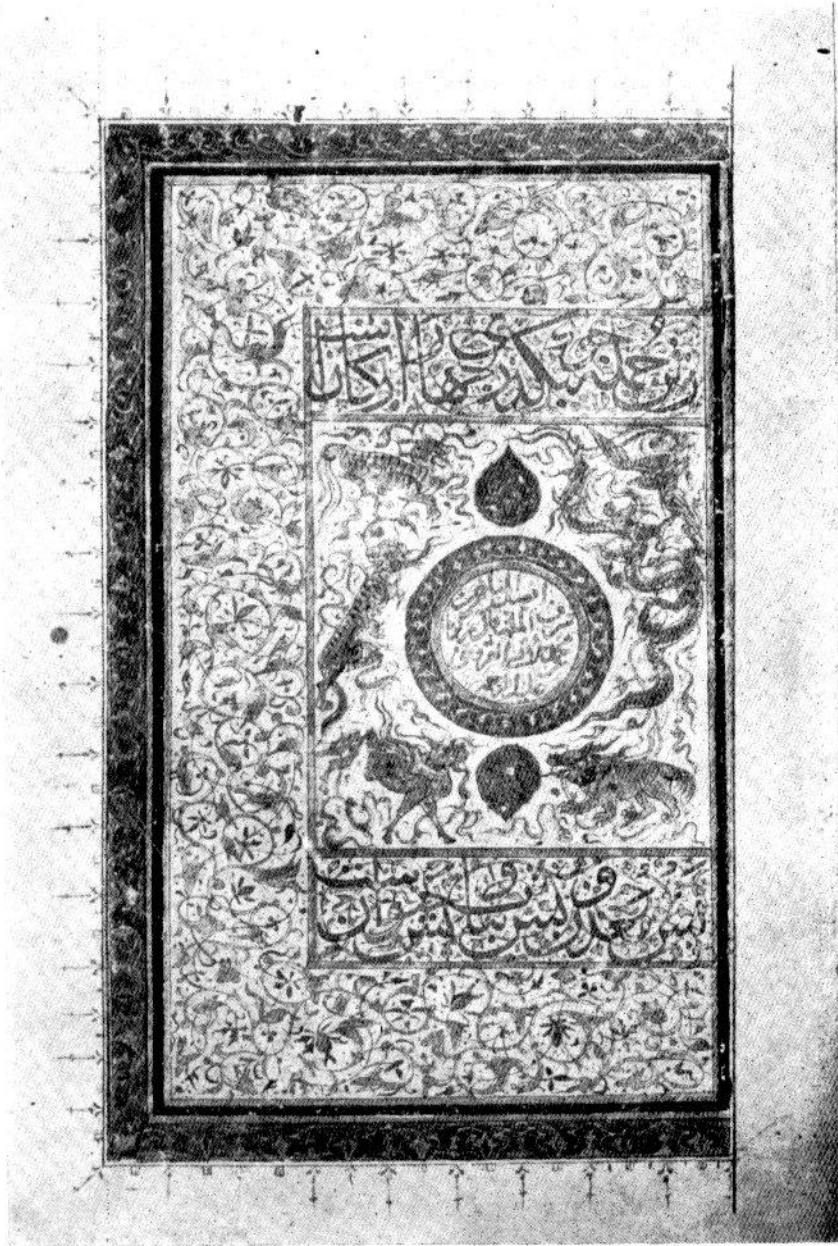
شکل (۹۱) - القزوینی کی عجائب المخلوقات کے دوهرے سرورق کا بایاں نصف؛ ایران،
نویں صدی هجری (پندرهویں میلادی) کا نصف اول ؛ نیویارک،
میٹروپولیٹن میوزیم آو آرٹ (Metropolitan Museum of Art)۔

[اس لوح کا دایاں نصف Dimand : *A Hand book etc.* ص ۳۷ پر دیکھیے : رباعی کا
پہلا شعر وهاں هے اور دوسرا یہاں؛ پوری رباعی یہ هے :

[**اول** ز مکونات عقل و جان است   و آنکه **پس** ازان فلک گردان است]
زین جمله چو بگذری چهار ارکان است   پس معدن و پس نبات و پس حیوان است

[دائیں نصف کے ترنج میں لکھا هے : ''کتاب عجائب المخلوقات تصنیف امام اعظم''
اور بائیں میں : ''افضل المتاخرین شرف الملة و الدین زکریا بن محمد الانسی (قب
تاریخ گزیده ببعد ص ۸۴۳) القزوینی علیه الرحمة'']۔

شکل (۲۰) - ایک بیاض کا صفحہ، جس کی آرائش نقش برداری کے قالب (stencil) سے کی گئی ہے (تقطیع ۷.۵×۲۱۷.۵ سانتی میٹر) : ایران، ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء (از روے *A Survey of Persian Art*)، ڈبلن، کتاب خانۂ سر چیسٹر بیٹی ۔
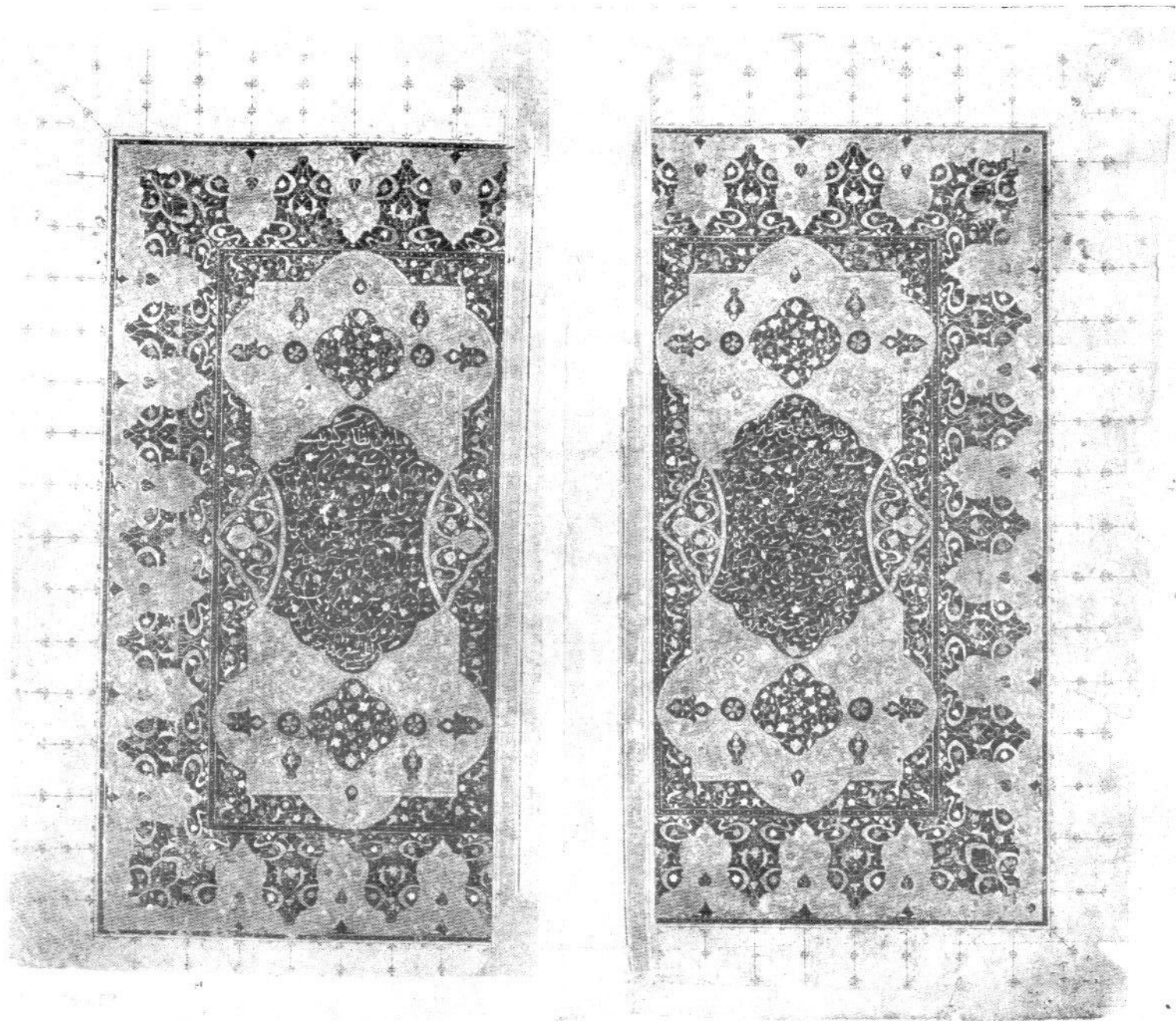
شکل (۲۱) - خمسۂ نظامی کے مخطوطے کا دوہرا سر ورق؛ ایران (شیراز)، عہد صفویہ؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ٣.٨٠

شکل (۲۲) - قرآن مجید کے آغاز میں شمسه؛ ایران، دسویں صدی ھجری (سولھویں میلادی) کا وسط یا آخر (عہدِ صفویہ)؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ٦٦ء۳۲.
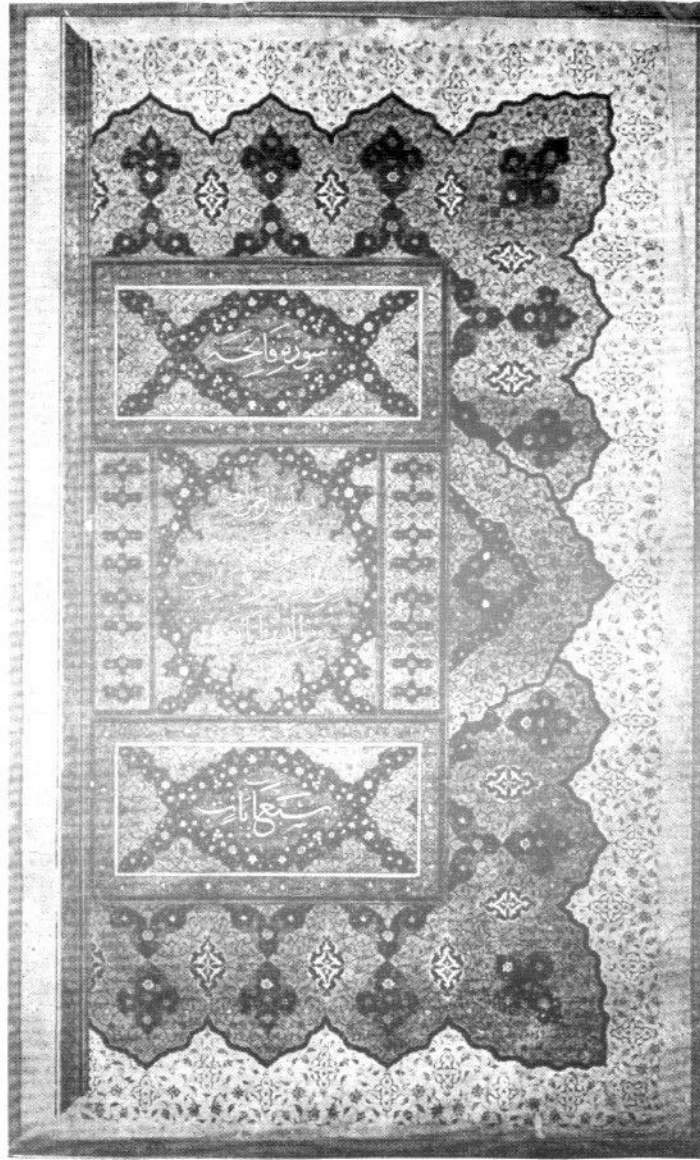
شکل (۲۳) - صفوی عہد کے قرآنی نسخے کا پہلا صفحہ (جس پر سورۂ فاتحہ کا آغاز درج ھے)؛ ایران، دسویں صدی ھجری (سولھویں میلادی)؛ وھی مخطوطہ جس کا ذکر شکل (۲۲) میں ھوا؛

شکل (۴۲) - حاشیہ، جس پر طلائی نقاشی ہوئی ہے: ایران، دسویں صدی ہجری (سولھویں میلادی) کے وسط کا زمانہ: واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۳٦٫۱۰، بایاں صفحہ.

شکل (۲۵) - حاشیہ، جس پر طلائی نقاشی ہوئی ہے؛ ایران، دسویں صدی ہجری (سولھویں میلادی) کے وسط کا زمانہ؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۷، ۴۷، دایاں صفحہ.

کے بڑے بڑے نمونے مجموعی طور پر تیموری عہد سے مشابہ ھیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب گل کاری ہر چیز میں کم ہے ۔ اس کے علاوہ طبیعی نمونے کی گل دار ٹہنیاں اب ڈیزائن کے صرف غیر نمایاں مقامات پر دکھائی جانے لگی ھیں ۔ خاکے کی نمایاں شکلیں زیادہ تر ''طراز عربی'' پر اور بادلوں کے ایک ڈیزائن پر، جو چینیوں سے لیا گیا، مشتمل ھوتی ھیں ۔ مزید برآں شوخ لاجوردی نیلے رنگ کی مقدار اب سنہرے رنگ کی مقدار پر غالب آ گئی ہے ۔ سنہری رنگ اکثر دو مختلف قسموں کا، یعنی تیز اور ھلکا استعمال ھوتا ہے یا سطحوں (texture) کی کیفیت مختلف کرنے کے لیے انھیں طلا کاری سے جزوی طور پر نقطہ دار کر دیا جاتا ہے ۔ ایک اور امتیازی شان، جو بالخصوص متن کے زرحل اور لاجورد سے آراستہ ابتدائی صفحوں پر نظر آتی ہے، یہ ہے کہ ان پر متشابک بیضوی سے حلقے (cartouches) بنائے جاتے ھیں جن میں چھوٹے چھوٹے نقوش قائم کر دیے جاتے ھیں (شکل ۲۱) ۔ قرآنی مخطوطات میں اکثر پہلے صفحے پر ایک بڑا آفتاب نما دائرہ (''شمسہ'') نظر آتا تھا جس میں قرآن ھی کی ایک آیت لکھ دی جاتی تھی (شکل ۲۲) ۔ یہ گویا '' برسم خزانۂ فلان'' والے لوحے کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی ۔ اپنی خاص صورتوں میں نہ صرف یہ نقش اکثر اس صورۃ بیضویہ (ترنج medallion) سے مشابہ ھوتا تھا جو ان بدیع و فاخر قالینوں کے مرکز میں بنایا جاتا تھا، جن کی تخلیق شاھان صفویہ اور ان کے امراء کے لیے تبریز میں ھوئی تھی، بلکہ نسخۂ قرآنی کے ابتدائی صفحوں کی تمام تزیین وھی نقشہ پیش کرتی تھی جو قالینوں کا ھوتا ہے (شکل ۲۲) ۔ حاشیے کے ''نقشی گلاب'' ("rosette") کو اب نصف ''جامات'' (ترنجوں) یا مثلثی نصف ستاروں کی شکل دی جاتی تھی اور اسے پہلووں پر اور اکثر صفحے کے بالائی اور زیریں حصوں پر ایسے طریق سے قائم کر دیا جاتا تھا کہ اس کا رخ حاشیے کی طرف رھتا تھا (شکل ۲۳) ۔ خاص کر دسویں صدی ھجری (سولھویں میلادی) کے آخر سے لے کر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ صفحے کے مستطیل حصے کے گرد، جس میں متن کا آغاز ھوتا تھا، بہت ھی تکلف سے آراستہ چوڑا حاشیہ بنا دیا جائے ۔ اس دور نے جو نئی بات پیدا کی یہ تھی کہ صفحے کے تین طرف منقش حاشیہ بنایا جانے لگا جو مناظر طبیعی یا رسوم حیوانیہ (شکل ۲۴) یا انوکھے اور عجیب نقش و نگار (grotesques)، '' طراز عربی'' اور پھول بوٹوں پر مشتمل ھوتا تھا (شکل ۲۵) ۔ یہ کام سنہرا اور کبھی کبھی روپہلا بنایا جاتا تھا ۔ عام طور پر یہ حاشیے ایسے کاغذی صفحوں کی زینت ھوتے تھے جن کا رنگ ھر صفحے پر جدا گانہ ھوتا تھا، بلکہ اکثر صفحے کے درمیانی حصے سے، جس میں متن لکھا جاتا تھا، حاشیے کا رنگ مختلف ھوتا تھا ۔ یہ مزین حاشیے اس پورے صفحے کے ارد گرد ھوتے تھے، جسے پرکار سنہری اور نیلے رنگوں سے سربسر آراستہ کر دیا جاتا تھا، مگر عموماً انھیں متن کے اطراف میں بنایا جاتا تھا ۔ تذھیب کی ایک اور قسم یہ تھی کہ وصلی پر خطّاط کی کتابت کے گرد یا اس کے پس منظر میں تذھیب اس طرح سے کی جائے کہ کتابت ایک آرائشی پس منظر کے فرش پر سجائی ھوئی نظر آئے، خواہ وہ پس منظر پھولوں کا ھو یا سنہری ابری کا (شکل ۲۶)۔

ترکان عثمانی کی تذھیب بالکل ان طرحی نقشوں (schemes) کی پیرو ہے، جو صفویوں نے ایران میں ایجاد کیے تھے؛ گو انھوں نے حاشیے کی ایسی مذھّب آرائشیں استعمال نہیں کیں جن میں طبیعی مناظر کے اندر رسوم و اشکال حیوانی دکھائے گئے ھوں ۔ بہت سی صورتوں میں صرف تذھیب

کو دیکھ کر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ ایرانیوں کا کام ہے یا ترکوں کا ؛ اس کے باوجود آرائش کی چند چھوٹی چھوٹی امتیازی اشکال (motifs) ایسی ہیں جن میں ترکوں کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے اور جہاں کسی مخطوطے میں ان نمونوں کو استعمال کیا گیا ہے اس میں دیگر آثار و علائم کے موجود نہ ہوتے ہوے بھی انھیں ترکوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ (ترکوں کے کام میں) (خاص کر بڑے قرآنوں کی پُر تکلّف سجاوٹوں میں) ایک خاص قسم کی زرق برق آرائش کی افراط نظر آتی ہے، مگر یہ یاد رہے کہ ترکی مذہّبین نے تذھیب کے کلاسیکی اسلوب کو اپنے ایرانی هم کاروں کے مقابلے میں زیادہ مدت تک اور زیادہ خالص شکل میں محفوظ رکھا ۔ ایران میں تو گیارھویں صدی ھجری/اٹھارھویں میلادی کے بعد سے کام کا مدار نقالی پر منحصر رہ گیا تھا اور اگر کھیں صفحات کی آرائش کے لیے نئے طریقے استعمال بھی کیے جاتے تھے، تو امتیازی اشکال اور رنگوں کے انتخاب کا درجه پست ھو جاتا تھا ۔ ترکی تذھیب کا ایک خاص نمونه ان آرائشوں میں ملتا ہے جن کے اندر وہ شاھی فرمانوں کے آغاز میں اپنے خلفاء کے نام بشکلِ طغرا جلی قلم سے ثبت کیا کرتے تھے ۔

دسویں صدی ھجری / سولھویں میلادی سے تیرھویں صدی ھجری / انیسویں میلادی تک المغرب میں تذھیب کے علم بردار مخطوطوں کے مزیّن صفحات میں بڑے بڑے پیچیدہ ستارے اور آرائشی گلاب کے نقش یا کتبوں والے دائروں کو استعمال کرتے تھے، نیز الماسی وضع کی جعفریوں کے ایسے ڈیزائن بھی بناتے تھے جو پورے صفحے پر سربسر بنے ھوے ھوں ۔ ان سب کو مختلف رنگوں میں (خاص کر سرخ اور زرد رنگ میں) بناتے تھے، لیکن عام طور پر سونا بہت کم کام میں لایا جاتا تھا ۔ پتوں کے ڈیزائن بھی نظر آتے ھیں جو ترکی اثرات کا نتیجه ھیں ۔

مغلوں کے عہد میں ھندوستان کی تذھیب بھی دورِ صفویه کے ایرانی فن کے نقش قدم پر بالکل اسی طرح چلی جس طرح ھمایوں کے عہد میں مصوّری ایرانی اسلوب پر شروع کی گئی، اس لیے کہ جلاوطنی سے مراجعت کے وقت ھمایوں چند ایرانی مصوّروں کو اپنے ھمراہ لے آیا تھا : تاھم مغلوں کی تذھیب کا ایک خاص نمونه مقبول عام مرقعوں میں رائج ھوکر نشو و نما پا گیا ۔ ان مرقعوں میں شہنشاہ اور اس کے امراء خطاطی کے نمونے اور کتابی تصاویر (miniatures) کے مجموعے محفوظ رکھا کرتے تھے: چنانچه حاشیه‌کاری کا ایک نازک اور نفیس ڈیزائن دسویں صدی ھجری / سولھویں میلادی کے صفوی مخطوطات کی تقلید میں جلوہ نما ھوا جسے ایرانی قلمی نسخوں کے اسی قسم کے ڈیزائنوں کی ترقی یافته صورت سمجھنا چاھیے ۔ ان حاشیوں کے بہترین نمونے مرقّعات جہانگیری میں ملتے ھیں ۔ ان میں تصویروں کے گرد نفیس مذھّب حاشیوں میں کہیں پرندے اپنے طبیعی ھیئت و ماحول میں دکھائے گئے ھیں، کہیں خطاطی کے بعض قطعوں کے گرد درباری زندگی اور شکارگاھوں کے حقیقی مناظر بنائے گئے ھیں اور بعض جگه صنعت کاروں کو اپنے اپنے کام میں مصروف دکھایا گیا ہے (شکل ۲) ۔ کبھی کبھی ایسی تصویریں بھی نظر آتی ھیں جو دور مغول کے مذھّبوں کو مسیحی اور اھل مغرب کے دیگر ڈیزائنوں کو دیکھ کر سوجھیں یا ان سے نقل کی گئیں ۔ یه ڈیزائن ایسی تصاویر سے اخذ کیے گئے تھے جو چوبی ٹھپوں یا دھات کے پتروں پر تیزاب سے بنائی گئی تھیں (woodcuts or etchings) اور فرنگی مشنری اور سوداگر لائے تھے ۔ ان سے کم درجے کے مرقعوں میں زیادہ

شکل (۲۷) - مرقع جہانگیر کا ایک ورق: درمیان میں میر علی السلطانی کی تحریر ہے اور حاشیے پر فن کاروں کو اپنے اپنے کام میں مشغول دکھایا گیا ہے؛ دور مغول کا ہندوستان، گیارھویں صدی ہجری (سترھویں میلادی) کا ربع اول؛ واشنگٹن، معرض فریر، شمارہ ۱۱۶ ۔ ۵۴، دایاں صفحہ.

شکل (۲۸) - خوش خط، مذهب وصلی؛ دور مغول کا هندوستان، گیارهویں صدی هجری (سترهویں میلادی) کے آخر کا زمانه؛ واشنگٹن، معرض فریر، شماره ۳۹ء۴۹، بایاں صفحه۔

سادہ اور بارھویں صدی ہجری / اٹھارھویں میلادی میں تو نہایت گنوارو طریق سے بنائے ہوے قدرتی مناظر (landscapes) بھی دکھائی دیتے ہیں جن میں انسانوں اور حیوانوں کی شکلیں اور خصوصاً رنگ برنگ کے پودوں کے جھنڈ نظر آتے ہیں۔ ان مرقعات میں ایک اور جدت یہ ہے کہ اشعار کے درمیان طبیعی شکل کے گلدار پودوں کے آرائشی ڈیزائن بنائے گئے ہیں۔ یہ وہی پھول ہیں جو مرقعوں کے حاشیوں پر نظر آتے ہیں (شکل ۲۸) یا گیارھویں صدی ہجری کے وسط (سترھویں میلادی) میں محلوں اور مقبروں کی سفید مرمریں دیواروں پر کم قیمت جواہرات کی پچیکاری میں دکھائی دیتے ہیں (ملاحظہ ہو مادّۂ ''تکفیت'') ۔ تیرھویں صدی ہجری / انیسویں میلادی میں رنگوں کی مخصوص آمیزش اور پارچہ بافی کے ڈیزائنوں سے اثر پذیری ہندی اسلامی تذہیب کی امتیازی خصوصیت قرار پا گئی۔

[ہم، شکل ۱ تا ۴، ۷ و ۸، ۱۲، ۱۵ تا ۱۸، ۲۱ تا ۲۸ کے لیے، سمتھسونین انسٹی ٹیوشن، فریر گیلری آو آرٹ، واشنگٹن ڈی۔سی، Smithsonian Institution 'Freer Gallery of Art, Washington D.C. کے مرہون منّت ہیں - ادارہ]

مآخذ : (۱) تصاویر کے بڑے بڑے مجموعے جن کے ساتھ کوئی (تشریحی) متن نہیں یا اگر ہے تو بہت زمانہ پرانا ہو چکا ہے : (الف) B. Moritz : Arabic palaeography ، قاہرة ۱۹۰۵ء ; (ب) F. R. Martin : The miniature painting and painters of Persia, India and Turkey from the 8th to the 18th century، لنڈن ۱۹۱۲ء، ج ۲ : (ج) P.W. Schulz : Die persisch-islamische Buchmalerei ، لیپزگ ۱۹۱۴ء، ج ۲ :

(۲) فن کتاب یا فن کتابت کے عام جائزے : (الف) Sir Thomas W. Arnold اور A. Grohmann : The Islamic Book ، لیپزگ ۱۹۲۹ء ; (ب) E. Kühnel : Islamische Schriftkunst ، برلین (بدون تاریخ) ;

(۳) خاص مطالعات: (الف) تدوین مصاحف : (i) نولڈکہ Th. Nöldeke : Geschichte des Qurans، جلد سوم ; (ii) G. Bergsträsser und O. Pretzl : Die Geschichte des Korantextes، لیپزگ ۱۹۳۸ء، ص ۲۰۷ تا ۲۷۳ ; (ب) ایران میں تذہیب : (i) R. Ettinghausen : "Manuscript illumination" در A Survey of Persian art، لنڈن و نیویارک ۱۹۳۹ء، ۳ : ۱۹۳۷ تا ۱۹۷۴ ; [(ii) زکی محمد حسن : الفنون الایرانیة فی العصر الاسلامی، قاہرة ۱۹۴۰ء، ص ۶۸ تا ۷۳] ; (ج) ترکی میں تذہیب : Celal Esad Arseven : Les arts décoratifs turcs، استانبول (غیر مؤرّخ)، ص ۳۲۲ تا ۳۳۰ ; (د) ہندوستان میں تذہیب بعہد مغلیہ : (i) E. Kühnel and Hermann Goetz : Indische Buchmalereien aus dem Jahângir-Album des Staatsbibliothek zur Berlin، برلین ۱۹۲۴ء ; (ii) J. V. S. Wilkinson and Basil Gray : Indian paintings in a Persian museum در Burlington Magazine ، جلد ۶۶ (۱۹۳۵ء)، ص ۱۶۸ تا ۱۷۷ ; (iii) Y. A. Godard : "Les marges du Murrakka' Gulshān" در Athār-e-Īrān، جلد اول (۱۹۳۶ء)، ص ۱۱ تا ۳۳ ; (iv) C. Stanley Clarke : Indian Drawings, thirty Mogul Paintings of the school of Jahāngir (17th century) and four panels of calligraphy in the Wantage Bequest ، لنڈن وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم، ۱۹۲۲ء ;

(۴) انفرادی مخطوطات : (i) D. S. Rice : The unique Ibn al-Bawwāb manuscript in the Chester Beatty Library، ڈبلن ۱۹۵۵ء ; (ii) R. Ettinghausen : "A signed and dated Seljuq Qur'ān" در Bulletin of the American Institute for Persian Art and Archaeology، جلد چہارم، عدد ۲ (دسمبر ۱۹۳۵ء)،

ص ۹۲ تا ۱۰۲؛ (III) F.R. Martin : *Miniatures from the Period of Timur in a Ms. of the poems of Sultan Ahmad Jalair*، وی انا ۱۹۲۶ء؛ (iv) Nabia Abbott : "Arabic-Persian wooden Ḳur'ānic manuscript from the Royal Library of Shah Husain Safawi I, 1105-35 *A. H.*" در *Ars Islamica*، جلد پنجم، ۱۹۳۸ء، ص ۸۹ تا ۹۳؛ (v) وہی مصنف: "Arabic Persian Koran of the late fifteenth or early sixteenth century A.D." در *Ars Islamica*، جلد ششم (۱۹۳۹ء)، ص ۹۱ تا ۹۴.

(Richard Ettinghausen اِٹنگھاؤزن)

تَرانْچی [شا Shaw : تارانچی] : مشرق ترکی کا کلمہ، جس کے معنی ہیں کاشتکار لوگ۔ اس کا اطلاق ان آبادکاروں پر ہوتا ہے جنھیں حکومت چین نے اٹھارھویں صدی کے وسط میں بلادِ کاشغر سے خانہ کوچ کر کے وادی اِیلی (Ili) میں جا بسایا تھا، قب راڈلوف (Radloff): *Wörterbuch*، ۳ : ۱۰۸۳؛ تاہم کہتے ہیں کہ ترانچی وادی ایلی میں بھی اپنے آپ کو مقامی باشندہ ('یرلیک' (*Yärlik*)، قب راڈلوف، ۲ : ۳۴۳) ہی بتاتے ہیں۔ یہ کل چھے ہزار خاندان تھے جن میں سے ۴,۱۰۰ دریاے اِیلی کے دائیں کنارے اور ۱,۹۰۰ بائیں کنارے پر آباد کیے گئے تھے۔ زیادہ تفصیل کے لیے دیکھیے راڈلوف : *Aus Sibirien*، ۲ : ۳۳۱ ببعد۔ ۱۸۳۴ء کی مردم شماری کے مطابق یہ خاندان ۸,۰۰۰ کی تعداد تک پہنچ گئے تھے۔ کاشغر میں مسلمانوں کی بغاوتوں کے آغاز تک ترانچی لوگوں کی حالت خاصی اچھی تھی، لیکن فوجی ضروریات کے لیے آئے دن کے مطالبوں کی وجہ سے ان کی خوش حالی پر بہت برا اثر پڑا۔ ۱۸۶۳ء کے بعد وادی اِیلی بھی بغاوت کی تحریک میں ملوّث ہوگئی۔ سخت جنگ و جدل کے بعد ترانچیوں کی ایک علٰحدہ ریاست سلطان ابوالعَلا [یا ابواعلٰی] خان (دیکھیے مادہ قُولجہ) کے ماتحت قائم ہو گئی۔ ۱۸۷۱ء میں روسیوں نے اس ریاست کو فتح کر لیا اور وہ ۱۸۸۲ء تک روسی قبضے ہی میں رہی۔ اس وقت ترانچیوں کی تعداد ۱۰۰,۰۰۰ تھی، مگر جب (عہد نامۂ سینٹ پیٹرز برگ، ۲۴ فروری ۱۸۸۱ء کی رو سے) وادی اِیلی چینیوں کو واپس مل گئی تو ترانچیوں میں سے ۴۵,۳۷۳ نفوس روسی علاقے میں چلے گئے اور ایالتِ سِمیرِیِنْچِنْسکایا (*Semiryenčenskaya Oblast'*) میں آباد ہو گئے۔ ان مہاجرین کا سردار ایک دولتمند سوداگر وَلی اَخُون یُلْداشُف تھا۔ شہرِ جارکَنت میں، جس کی بنیاد اسی زمانے میں ڈالی گئی تھی، زیادہ تر ترانچی لوگ ہی آباد تھے (۱۹۱۱ء میں ان کی کل آبادی ۲۰,۰۰۰ نفوس کی تھی، جن میں سے ۱۶,۰۰۰ ترانچی تھے)۔ ۱۸۸۷ء تک جو زمینیں ترانچیوں کو دی گئیں وہ کئی بار ان سے واپس لے کر روسی قازاقوں کو دی گئیں اور ترانچیوں کو دوسرے مقامات پر جانا پڑا۔ ترانچیوں کی قدر صرف اچھے کاشتکار اور باغبان ہی ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتی وہ اچھے دست کار اور مزدور بھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کچی مٹی کے مکان بنانے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ ۱۸۹۷ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ۵۵,۹۹۹ نفوس تھی۔ کچھ عرصہ بعد ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ (۸۳,۰۰۰ تک) بتائی جاتی ہے۔ ۱۹۲۰ء کی مردم شماری میں یہ تعداد ۶۲,۳۰۳ تھی۔ ۱۹۱۶ء میں قراکیرغیز [یا قراقیرغیز] کی بغاوت اور واقعاتِ انقلاب کی وجہ سے ترانچیوں کی خوش حالی کو بے حد نقصان پہنچا۔ ۱۹۱۷ء میں جارکَنت کے اداری علاقے کے شہروں میں ان کی آبادی صرف ۶,۷۳۶ تھی، حالانکہ اس سے پہلے صرف شہر جارکَنت کی آبادی ۱۶,۰۰۰ تھی۔ یہ تخفیف بہت

زیادہ تھی - سوویاتی روس میں ترانچیوں کو سیاسی وحدت حاصل نہیں ہے - وہ خود مختار جمہوریۂ قازاقستان میں رہتے ہیں - ترکمانستان میں 'بیرام - علی' میں بھی ان کی ایک نوآبادی ہے - ترکمانوں ('کاشغرلق') کی طرح، جو بعد میں کاشغر سے ہجرت کر آئے تھے، ترانچی بھی اویغور نسل سے ہونے کے مدعی ہیں، مگر یہ دعوے غلط فہمی پر مبنی ہے، کیونکہ اویغور، جن کا تاریخ میں ذکر ہے، کبھی مغرب میں اس قدر دور نہیں آئے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ان ترانچیوں کی تعداد، جو چینی علاقے ھی میں رہ گئے تھے، کوئی ۸,۲۰۰ تھی - اس وقت چینی حکّام نے یہ کوشش کی تھی (اور اس میں انھیں کچھ کامیابی بھی ہوئی تھی) کہ ترانچیوں کو، جو روس میں چلے گئے ہیں، ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے اصلی وطن میں واپس آ جائیں۔

مآخذ : (الف) (۱) راڈلوف (W. Radloff) : *Aus Sibirien*، طبع دوم، لیپزگ ۱۸۹۳ء، ۲ : ۳۳۱ ببعد؛ (۲) W. Masal'skiy : *Turkestankiy Kral*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۳ء، ص ۳۰۳ ببعد؛ (۳) *Aziatskaya Rossiya*، (سرکاری مطبوعہ) سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء، ۱ : ۱۷۳؛ (۴) *Materiali po obsl'edovaniyu tuzemnago i russkago zemlepol'zovaniya v Semiryečenskoi Oblasti*، (سرکاری مطبوعہ)؛ (۵) *T. V. Taranči Cast' I. Tekst. Cast' II. Tablicî*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء، قب نیز مآخذ مادّۂ قولجہ؛—

(ب) موجودہ حالات کے متعلق : *Spisok narodnostei Soyuza Sov. Soc. Respublik. Z pod redakciei I. I. Zarubina*، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء (جسے Acad. نے شائع کیا)، ص ۴۳؛—

(ج) زبان اور علم ادب کے متعلق : (۱) راڈلوف: *Proben der Volkslitteratur der türkischen Stämme*، ج ۶، *Dialect der Tarantschi*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۶ء؛ (۲) N. N. Pantusow : *Tarančinskiya plesni*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۰ء (*Zap. Imp. R. Geogr. Obshč. no otdel. etnogr.*, t. xvii., vip. 1).

(W. Barthold بارتولڈ).

تَرَاوِیح : (عربی) شاذ مفرد تَرْوِیْحَۃ کی جمع؛ وہ نماز جو ماہ رمضان کی راتوں میں پڑھی جاتی ہے - حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرتؐ ان نمازوں کو بڑا کار ثواب سمجھتے تھے، لیکن ساتھ ھی یہ بات بھی واضح فرما دی تھی کہ تراویح فرض نہیں (بخاری : تراویح : حدیث ۳) - حدیث ھی میں ہے کہ مدینے کی مسجد میں لوگ فرداً فرداً یا گروھوں میں تراویح ادا کیا کرتے تھے - حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے ایک قاری کی امامت میں با جماعت نماز تراویح کا رواج دیا (محلِّ مذکور : حدیث ۲)۔

فقہاء کے نزدیک تراویح کو عشاء کی نماز کے تھوڑی دیر بعد پڑھنا چاہیے - [ایک روایت کے مطابق] ان نمازوں میں دس سلام ہوتے ہیں اور ھر سلام سے پہلے دو رکعتیں [یعنی کل بیس رکعتیں]؛ ھر چار رکعتوں کے بعد کچھ دیر ٹھہرتے اور آرام کرتے ہیں [تَرْوِیْحَۃ = ایک دفعہ راحت لینا]، اسی سے اس نماز کا نام "تراویح" ہے (یعنی وہ نماز جس کے بیچ میں تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہر کر آرام لیا جائے) - مالکی مذھب کے مطابق تراویح میں چھتیس رکعتیں ہوتی ہیں - یہ نماز سنّت نمازوں میں سے ہے اور رمضان کی متعلقہ عبادات میں اسے اتنی ھی اھمیت حاصل ہے جتنی اور شعائر کو، جو رمضان میں ادا کیے جاتے ہیں - شیعہ فقہ میں نافلۂ ماہ رمضان کے طور پر پورے مہینے میں ھزار رکعت نفل ادا کرنا مستحبّ ہے۔

مکۂ مکرمہ میں لوگ ۱۰ سے ۱۵۰ آدمیوں کی جماعت میں امام (رکّ بان) کے پیچھے تراویح پڑھتے ھیں ۔ یہ امام بطریق تطوّع تراویح پڑھاتا ھے خواہ وہ حکومت کا معیّن کردہ ھی کیوں نہ ھو ۔ اس نماز میں تلاوت قرآن [مجید] کو اھمّ مقام حاصل ھے ۔ زیادہ مصروف آدمی کے لیے جائز ھے کہ وہ نماز تراویح تھوڑے ھی سے وقت میں ادا کر لے ۔ دوسرے لوگ امام کے پیچھے ماہ رمضان کی راتوں میں ایک یا کئی دفعہ پورے قرآن کی تلاوت سنتے ھیں ، بلکہ تراویح کے بعد بھی بہت سے لوگ [تزکیۂ نفس کی خاطر] اوراد و وظائف میں مشغول رھتے ھیں ۔

آچن میں ھر رات گروہ در گروہ آدمی تراویح کے لیے جمع ھوتے ھیں ۔ عام طور پر صرف تونکو (*tönku* [امام]) ھی اس میں زیادہ عملی حصہ لیتا ھے دوسرے . . . آمین پکارنے اور نبی[ص] پر درود بھیجنے ھی پر قناعت کرتے ھیں ۔ تونکو، کو اس محنت کا معاوضہ زکوٰة الفطر کی صورت میں مل جاتا ھے . . .

مآخذ: (۱) بخاری: بذیل تراویح ، مع شروح بخاری ؛ (۲) مالک: مُوطّا ، الصلوٰة فی رمضان، مع شرح زُرقانی؛ (۳) ابواسحٰق الشیرازی: تنبیہ، طبع یوئینبول Juynboll، ص ۲۷ ؛ (۴) الرّملی: نہایة ، قاہرة ۱۲۸۶ھ، ۱ : ۵۰۳ ببعد ؛ (۵) ابن حَجَرالہیتمی: تُحفة، قاہرة ۱۲۸۲ھ، ۱ : ۲۰۵ ببعد ؛ (۶) ابو القاسم الحلّی: شرائع الاسلام ، کلکتہ ۱۲۵۵، ص ۵۱ [طبع تہران سنہ ؟ ، کتاب الصّلوٰة ، رکن ۳ ، فصل ۵] ؛ (۷) کایتانی Caetani : *Annali* ، [بذیل] ۴ھ ، § ۲۲۹ ببعد؛ (۸) یوئینبول Juynboll : *Handleiding* ، لائیڈن ۱۹۲۵ء، اشاریہ (Register) ؛ (۹) سنُوک ھُرخرونیے Snouck Hurgronje : *Mekka* ، ۲ : ۸۱ ببعد ؛ (۱۰) ایضاً: *Mekkanische Sprichwörter* ، عدد ۹۴ ؛ (۱۱) ایضاً: *De Atjèhers* ، ۱ : ۲۳۷ ببعد ؛ (۱۲) d'Ohsson : *Tableau général de l'empire othoman* ، پیرس ۱۷۸۷ء، ۱ : ۲۱۴ ببعد (احتیاط سے استعمال کی جائے)؛ (۱۳) لین (Lane) : *Manners and Customs of the Modern Egyptians* ، لندن اور پیزلے (Paisley) ۱۸۹۹ء، ص ۴۸۱ [(۱۴) محمد یوسف الحنفی : تنویر المصابیح لرکعات التراویح ، لاھور ، بدون تاریخ].

(ونسنک A. J. Wensinck)

تربت حیدری: دیکھیے زاوہ۔

تربت شیخ جام: [تربت جام] ایران کے شمال مشرق (ولایت خراسان) میں ایک مقام کا نام ھے جو افغانستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں ۔ اس کا محلّ وقوع تقریباً ۶۱ درجے طول البلد مشرق اور ۳۵ درجے عرض البلد شمالی ھے ۔ اُس سڑک پر جو مشہد سے ھرات کی طرف جاتی ھے، یہ ایک پڑاؤ ھے (تربت شیخ جام سے مشہد تقریباً ۹۶ میل ھے)، یعنی وہ ھرات اور مشہد کے درمیان تقریباً نصف راہ میں واقع ھے [مشہد سے ۱۴۴ میٹر اور سرحد ایران و افغانستان سے ۶۶ میٹر]) اور ھری رُود کی ایک معاون ندی کے کنارے آباد ھے ۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں یہاں کے کل مکانات کی تعداد دو سو کے قریب بتائی گئی تھی (کونولی Conolly، حدود ۱۸۳۰ء) اور صدی کے اواخر (۱۸۹۴ء) میں ییٹ (Yate) نے ان کی تعداد ۲۰۰ کے قریب لکھی ھے ۔ آخرالذکر سیّاح نے یہ بات بھی مشاہدہ کی کہ مقامی لوگ اس مقام کو صرف جام کہتے تھے ۔ وھاں کے باشندے جامی کہلاتے ھیں ۔ ۱۸۹۴ء میں یہاں چار ہزار کے قریب کنبے آباد تھے جو سب کے سب زراعت پیشہ تھے ۔ پہلے ان کا اپنا سردار ھوا کرتا تھا، لیکن جب ییٹ Yate وھاں گیا تو یہ لوگ براہ راست حاکم ضلع کے زیر فرمان تھے ۔ تربتِ شیخ جام میں قدیم زمانے کا قلعہ بھی ھے جو کچی مٹی کا بنا ھوا ھے ۔ گاؤں کے مشرق میں حضرت شیخ جام [یعنی

شیخ الاسلام احمد جامی نامقی] (م ۵۳۶ھ/۱۱۴۲ء؛ قبّ مادۂ احمد جامی) کا مقبرہ ہے جن کے نام پر یہ جگہ آباد ہے ۔ ابن بطّوطة (طبع پیرس، ۳ : ۷۵ ببعد) انہیں شہاب الدین احمد لکھتا ہے؛ بقول اس کے یہ جگہ ان کی اولاد کی ملکیت تھی و حکومت کے دائرۂ عمل سے بالکل خارج تھی ۔ شیخ کی بابت ابن بطّوطة اور جو کچھ لکھتا ہے وہ بظاہر مقامی روایت پر مبنی ہے اور اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں [شیخ الاسلام کی اولاد کو بھی مطلع سعدین میں شیوخ الاسلام لکھا ہے ۔ ان کی اولاد کے معارف و مشاہیر کے لیے دیکھیے مرآة البلدان، بذیل جام؛ یوسف اهل : فرائد غیاثی (ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۶۹ء ص ۱۱ ببعد)۔ فرائد غیاثی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان [شیوخ] میں سے بعض کی فیروز تغلق اور محمد تغلق کے ساتھ مکاتبت ہوئی ۔ شیخ کے مقبرے اور دیگر عمارات کی تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو مرآة البلدان، ۴ : ۹۳ ببعد ۔ ادارہ]۔ مقبرے پر تیمور [اور اس کے جانشین] زیارت کے لیے کئی مرتبہ حاضر ہوے [ملاحظہ ہو مطلع سعدین، ۱ / ۲ : ۶۶، ۳۹۸؛ و ۲ / ۲ : ۱۱۲۱ و ۱۳۲۳، ۱۳۱۵؛ شاہ رخ ان شیوخ اسلام کے ساتھ خاص طور پر مہربانی کا سلوك کرتا تھا] ۔ بعد کے زمانے میں ہمایوں بھی مقبرے پر حاضر ہوا ۔

قرون وسطی میں تربتِ شیخ جام کا نام بُوزْجان تھا (نیز پُوچکان؛ یاقوت، ۳ : ۸۹۰ ببعد پر ایک اَور نام بھی لکھتا ہے : فَزّ یا فَنْز؛ چنانچه بعض علماء کی نسبت الفَزّی ہے اور البوزجانی کی نسبت تو عام ہے) ۔ یہ قصبه ولایت جام کا (جسے زام بھی لکھتے ہیں اور جو قوهستان کے شمال مشرق میں ہے) صدر مقام تھا [اور اب بھی ہے؛ اب تربتِ جام بخشِ تربت‌جام کا مرکز ہے اور یہ بخش شہرستانِ مشهد میں شامل ہے] ۔ بقول یاقوت بوزجان نیشاپور سے چار روز کی مسافت پر ہے اور ہرات اس سے چھے روز کی راہ پر ۔ الاِصْطَخْری (ص ۲۸۲) بُوزْجان سے بُوشَنْج کا فاصله چھے مرحلے بتاتا ہے ۔ یہ شہر، جس سے تقریباً ۱۸۰ مواضعات متعلق تھے، ایک سرسبز اور شاداب علاقے میں آباد تھا ۔ بقول ابن رُسْته (ص ۱۸۱) جام کا شمار ان اُنّیس رساتیق میں سے تھا جو مضاف به نیشاپور تھے ۔ المقدسی (کم از کم اس متن کے مطابق جو طبع ڈ خویه، ص ۳۱۹ کے حاشیه E پر منقول ہے) کہتا ہے کہ بُوزْجان کا نام خاص شہر ("قصر") ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے، سارے ضلع کے لیے نہیں، جس میں وہ مواضعات بھی شامل ہیں جو اس کے مضافات میں ہیں (قبّ مادۂ شہر) ۔ اس بیان کے متعلق ہمارا شک و شبه اس وجه سے اور بھی کم ہو جاتا ہے کہ ص ۳۲۱، حاشیه b پر جو مبہم سی عبارت منقول ہے اس کی رو سے بظاہر "القصر" اور "المدینة" ایک ہی چیز ہے [تاریخ جام اور بعض نامور منسوبانِ جام کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مرآة‌البلدان، ۴ : ۹۲ ببعد و فرائد غیاثی (محل مذکورة الذیل)] ۔

مآخذ : [(۱) فرهنگ جغرافیائی ایران (دایرۂ جغرافیائی ستاد ارتش)، ۱۳۳۲ش، ۹ : ۸۴ ببعد ؛ (۲) مسعود کیهان : جغرافیۂ مفصلِ ایران، تهران ۱۳۱۱، ۲ : ۱۹۶ ببعد ؛ (۳) صنیع الدوله : مرآة البلدان ناصری، [تهران ۱۲۹۶ء، ۴ : ۸۵ — ادارہ] ؛ (۴) لیسٹرینج : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۳۵۶ ببعد؛ (۵) ییٹ (E. Yate) : *Khurasan and Sistan*، ص ۳۰ ببعد ؛ (۶) رِٹر (C. Ritter) : *Erdkunde*، ۸ : ۲۶۳ ببعد، ۲۷۸ و ۲۸۶ ببعد ؛ (۷) C. Barbier de Maynard : *Dictionnaire .... de la Perse*، ص ۱۲۱، ۱۶۹ ببعد؛ [(۸) ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین لاہور، نومبر

۱۹۳۹ء، ص ۳ تا ۳۲ و فروری ۱۹۵۷ء، ص ۲۰ تا ۳۰]۔

(V. F. BÜCHNER بوخنر)

ترتوشہ TORTOSA . [رَکَ بہ طرطوشہ]۔

ترجمان : عربی لفظ تَرْجُمان کی ترکی صورت ہے (قب محمد حنیف : الغلطات المشهورة، ص ۱۱۰)، جس کے معنی ہیں بات سمجھانے والا، تأویلی۔ یہ لفظ آرامی الاصل ہے، جو بہت قدیم زمانے میں عربی میں شامل ہو گیا تھا۔ غیر ممالک سے تجارتی اور سیاسی تعلقات کے سلسلے میں ترجمانوں نے اسلامی حکومتوں میں ہمیشہ سے اہم فرائض انجام دیے ہونگے، لیکن ان کی کارگذاریاں تاریخ کی صاف تر روشنی میں صرف چھٹی (بارھویں) صدی ہی میں ظاہر ہوئیں، کیونکہ مسیحی شہروں یا ریاستوں اور سواحلِ بحیرۂ روم کی سلطنتوں کے مسلمان حکمرانوں کے درمیان قدیم ترین عہدناموں کا پتا اسی زمانے سے چلتا ہے۔ ان عہدناموں سے، جو شمالی افریقہ کی ریاستوں سے ہوے اور جن کی اشاعت اور جن کا مطالعہ ڈ ماس لاتری de Mas Latrie نے کیا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترجمان "torcimani" (اس کلمے نے لاطینی اور لاطینی سے مشتق (Romance) زبانوں میں اس وقت کی دوسری بیشمار صورتیں اختیار کیں: قب de Mas Latrie : *Introduction*، ص ۱۸۹ ببعد) ان تجارتی ایوانوں کے لیے جنھیں "douane" ('دیوان') کہتے تھے اور جو تمام غیرملکی تجارت کرنے والی بندرگاھوں میں قائم تھے، ایک نہایت ضروری اور لابد کارکن سمجھے جاتے تھے۔ تمام تجارتی کاروبار انھیں ترجمانوں کی وساطت سے ہوا کرتا تھا، جو اکثر اوقات ایک قسم کے طبقاتی نظام (hierarchy) میں منسلک تھے اور ان کی شہادت ہر جگہ قبول کی جاتی تھی۔ ایسے مالِ تجارت پر خاص قسم کے محصول ('مکوس') لگائے جاتے تھے جس کا سودا ان کی معرفت ہوا ہو۔ ان ترجمانوں کو ابتداء میں مقامی حکومت مقرر کیا کرتی تھی اور وہ مذھباً مسلمان، عیسائی یا یہودی ہوتے تھے؛ بعض مقامات میں ایک خاص ترجمان ہر اجنبی قوم کے مفاد کی حفاظت کے لیے بھی مقرر تھا۔ ان ترجمانوں میں سے بعض لوگ اس سے زیادہ اہم کام یعنی عہدناموں کی ترتیب و تدوین کے وقت حاضر رہتے تھے اور بوقت ضرورت (یعنی جب کبھی عہد ناموں کا متن سمجھنے میں کوئی دقت پیش آئے) وہ عہد ناموں کی عبارت کا مفہوم بھی بیان کیا کرتے تھے۔ ایسی صورتوں میں ترجمان کے نام کا ذکر ایسے عہد ناموں کے متون میں خاص طور پر کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ان عہد ناموں کے متون سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ترجمان خاص طور پر مقامی حکمران کے عملے سے وابستہ ہوتے تھے۔ صلیبی جنگوں کے فرانسیسی مآخذ میں ملک شام میں بھی ترجمانوں کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔

عثمانی سلطنت کے زمانے میں ترجمانوں کی حیثیت اور ان کے فرائض مختلف نظامات میں تقریباً وھی رہے جو پہلی صدیوں میں تھے، لیکن چونکہ تجارتی اور سیاسی تعلقات بہت بڑھ گئے اور آھستہ آھستہ زیادہ اہم بھی ہوتے چلے گئے اس لیے قابل اعتماد اور لائق ترجمانوں کی ضرورت بھی بڑھتی چلی گئی، یہی وجہ ہے کہ تاریخی مصادر میں ان کا ذکر زیادہ آنے لگا۔ یورپین مآخذ میں ان کے نام کی مشہورترین صورت وہ ہے جو اطالوی زبان میں مروج ہے یعنی drogman (ڈروگ مان) یا dragoman (ڈریگومان)، اس کے ساتھ ساتھ فرانسیسی نام truchement (تریشماں) بھی مدت تک مستعمل رہا۔ ترکی بندرگاھیں بتعداد کثیر تھیں۔ ان بندرگاھوں کے تمام ترکی سرکاری دفاتر میں اپنے اپنے "ڈروگ مان"

ہوا کرتے تھے اور یہی رواج وہاں کے غیر ملکی سفارت خانوں میں بھی جاری تھا ۔ دارالخلافہ میں ان ترجمانوں کی حیثیت قدرتی طور پر زیادہ اہم تھی ۔ غیر ملکی سفارت خانوں میں اس قسم کے بہت سے آدمی ملازم تھے۔

ان میں سب سے زیادہ اہم عہدہ ترجمانِ حکومتِ ترکیہ کا تھا ۔ ایک خاص عہدے کے لحاظ سے تو یہ منصب شاید سلطان محمد ثانی کے وقت ھی میں موجود تھا، لیکن باب عالی کا پہلا ترجمان، جس کا ذکر آتا ہے، صوباشی علی بیگ ہے، جو ۱۵۰۲ء کا صلح نامہ لے کر وینس میں آیا تھا ۔ اس کے بعد یونس بیگ (م ۹۴۸ھ / ۱۵۴۱ - ۱۵۴۲ء) مقرر ہوا، جو کئی دفعہ سفیر بن کر وینس آیا ۔ اس نے قسطنطنیہ میں ایک مسجد بھی بنوائی تھی، جسے ''ٹُرغمان مسجدی'' کہتے تھے ۔ (سجلِ عثمانی، ۴ : ۶۷۷ ؛ حدیقۃ الجوامع، عدد ۲۲۶) ۔ یونس بیگ یونانی الاصل تھا اور اس کا جانشین احمد اصل میں وی انا کا ایک جرمن، ہائنتس تُلمان Heinz Tulman نامی تھا ۔ سولھویں صدی میں باب عالی کا ایک اور ترجمان مراد بیگ تھا، جو ھنگری کا باشندہ تھا اور مُہاج Mohács کی لڑائی میں گرفتار ہوا تھا ۔ وہ اس لیے بھی مشہور ہے کہ اس نے اسلام کی حمایت میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا ۔ نیز ترکی، لاطینی اور ھنگری تینوں زبانوں میں ایک مناجات بھی لکھی تھی (جو بابنگر F. Babinger کی کتاب *Litteraturdenkmäler aus Ungarns Türkenzeit*، برلن ۱۹۲۷ء، میں طبع ہوئی ہے؛ قب نیز کتاب مذکور، ص ۳۸ ببعد، باب عالی کے ترجمانوں کے متعلق تاریخی مواد کے لیے) ۔ اس زمانے میں غالباً متعدد ترجمان باب عالی کی ملازمت میں تھے ۔ ان میں سے ایک ''باش ترجمان،، تھا ۔ یہ سب کے سب تقریباً بلا استثناء عیسائی تھے (یونانی، جرمن، اطالوی) ۔ عثمانی سلطنت کے تعلقاتِ خارجہ جوں جوں بڑھتے چلے گئے، پیچیدہ تر ہوتے گئے؛ لہٰذا ترجمانوں کا اثر و رسوخ بھی بڑھتا چلا گیا ، تا آنکہ اٹھارھویں صدی میں باب عالی کے ترجمانوں کا منصب دو زبردست یونانی خاندانوں ماوروگورداتو (Mavrogordato) اور غِیکہ (Ghika) کے درمیان تقریباً موروثی ہوگیا اور یہ دستور بن گیا کہ ترجمان کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد انہیں کسی نہ کسی ڈینیوبی امارت کا والی بنا دیا جاتا ۔ چونکہ اس زمانے میں ترکوں کے لیے یورپی زبانوں کا جاننا ایک نادر اور استثنائی امر تھا، اس لیے ان میانجیوں کا اثر خارجی حکمت عملی پر لازمی طور پر بہت زیادہ تھا ۔ دوسری طرف سابقہ باش ترجمانوں کا قتل بھی کوئی نادر بات نہ تھی ۔ ترکی حکومت کو ان ملازموں سے، جن کی امانت و اخلاص کچھ زیادہ قابل اعتماد نہ تھا، جب محمود ثانی کا دور حکومت آیا تب کہیں جا کر نجات ملی، اور رئیس افندی (رَئِسْ آن) کی کارکردگی کی اہمیت بھی پیش از پیش ہو گئی ۔ باب عالی کے ترجمانوں نے سیاست عثمانیہ پر کس قسم کا اثر ڈالا؟ اس کا خاص مطالعہ ابھی تک نہیں ہو سکا ۔ ان کی ایک نامکمل فہرست فان ھامر von Hammer نے تاریخ سلطنتِ عثمانیہ (*G.O.R.*، ۷ : ۶۲۷) میں دی ہے۔

اکثر موقعوں پر سفارت خانوں اور قونصل خانوں کے ترجمان بھی بین الاقوامی میانجیوں کی حیثیت سے ترجمانوں سے کچھ کم اقتدار نہ رکھتے تھے ۔ یہ لوگ بھی عام طور پر ترکی حکومت کے ملازمین کی طرح مقامی عیسائی ھی ہوا کرتے تھے ۔ عہدناموں، امتیازات (capitulations) اور برات ناموں (diplomas) میں، جو سلطان کی طرف سے انہیں عطا ہوتے تھے، اس بات کی ضمانت ہوتی تھی کہ وہ قوم، جس کی ملازمت میں وہ کسی سفارت خانے یا قونصل خانے میں کام کرتے ہیں، ان

کی حفاظت کی ذمہ دار ہوگی ۔ ان کے مخصوص فرائض میں، جن کا امتیازات میں خاص طور پر ذکر ہے، ایک فرض اس امتیاز پر مبنی تھا کہ سفیر یا قونصل کو حق ہے کہ ترکی عدالتوں میں ترجمان کو اپنے نمائندے کی حیثیت سے ایسے مقدمات کی سماعت کے وقت پیش کرے جس میں اُس قوم کی رعایا کے آدمی پر زد پڑتی ہو۔ ترجمان قرونِ وسطٰی سے جو وظائف ادا کرتے آئے تھے، اُنھیں کے تطوّر سے قدرتی طور پر ایک یہ وظیفہ بھی پیدا ہوگیا ۔ جب اٹھارھویں صدی سے دولِ یورپ اور ان کے نمائندوں کا اثر و نفوذ ترکی میں زیادہ غالب ہو گیا، تو ان ترجمانوں کی ترکی معاملات میں دخل اندازی بابِ عالی کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی ۔ اس کے علاوہ غیرملکی طاقتوں نے بھی ترکی رعایا میں سے اپنے ترجمان بھرتی کرنے کے حق کا ضرورت سے زیادہ وسیع طور پر استعمال کیا اور اس عمل سے ان ترجمانوں کو ان کی اپنی حکومت کے حیطۂ تصرف سے باھر نکال لیا ۔ بابِ عالی کی طرف سے احتجاج ہونے پر ۱۸۶۳ء میں غیرملکی ہیئاتِ ارسالیہ (مشنوں) کے ساتھ ایک قرارداد ہوئی جس کی رو سے سفیروں اور قونصلوں کے مقامی آدمیوں کو ترجمان مقرر کرنے کے اختیارات محدود کر دیے گئے؛ مگر تقریباً اسی زمانے میں اکثر دولِ یورپ نے اپنے ترجمانوں کا ایک خاص طبقہ تیار کرنا شروع کیا، جس میں وہ اپنی ہی رعایا کے آدمیوں کو بھرتی کرتے ۔ اس ملازمت کے لیے خاص تربیت درکار تھی ۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں، بلکہ بیسویں صدی کے آغاز تک قسطنطنیہ میں دولِ عظمٰی کے سفارت خانوں کے سرترجمانوں کو بابِ عالی سے ہر قسم کے معاملات پر گفت و شنید کرنے کے مسلّمہ اختیارات حاصل تھے، بالخصوص ایسے معاملات پر جن کا تعلق تفسیر و تأویلِ امتیازات سے تھا یا جو غیرملکیوں کے ایسے مختصّ امتیازی حقوق کی تطبیق (application) سے متعلق تھے جو اُنھیں اِنھیں عہدناموں کی رو سے حاصل ہوے تھے؛ مگر جب ۱۹۱۴ء میں ترکی حکومت نے امتیازات کو منسوخ کر دیا تو اس کے ساتھ ھی سفارتوں اور قنصلیتوں کے ان کارندوں کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جنھیں دروگمان (ترجمان) کہا کرتے تھے؛ چنانچہ دروگمان کا لقب اب سرکاری طور پر ترکی میں استعمال نہیں ہوتا۔

مآخذ: (۱) ڈ ماس لاتری L. de Mas Latrie: *Traités de paix et de commerce et documents divers concernant les relations des chrétiens avec les Arabes de l'Afrique Septentrionale*، پیرس ۱۸۸۶ء، ص ۱۸۶ ببعد، ۲۸۰ ببعد؛ (۲) فان ہامر von Hammer: *G. O. R.*، اشاریہ؛ (۳) Martens-Skerst: *Das Consularwesen und die Consularjurisdiction im Orient*، برلن ۱۸۷۴ء؛ (۴) G. Pelissié du Rausas: *Le Régime des capitulations dans l'Empire ottoman*، طبع دوم، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۵) H. Almkvist: *Ein Dragoman-Diplom aus dem vorigen Jahrhundert*، اپسالا Upsala ۱۸۹۱ء.

(کرامرز J. H. KRAMERS)

تَرْجُمان: ترک صوفیوں کی اصطلاح میں اس کے دو معنی ھیں: (۱) کسی طریقے کا فرد یا رکن، جو نئے مرید کو داخلِ سلسلہ ہونے اور اس کے اصولوں کی تلقین کے وقت روحانی ترجمان کے طور پر اس کے ہمراہ رہتا ہے ۔ جب کوئی مرید بکتاشیہ طریقے میں داخل ہوتا ہے، تو اسے دو ترجمان شیخِ سلسلہ کے حضور میں لے جاتے ھیں ۔ ان کے ساتھ گیارہ آدمی اَور ہوتے ھیں جو گیارہ اماموں کی نمائندگی کرتے ھیں ۔ اس تقریب کے سلسلے میں ترجمان اپنے نوآموز کی رہنمائی کرتے ھیں اور اس کی طرف سے وہ کلمات پڑھتے ھیں جو اسے اس موقع

پر پڑھنے پڑتے ہیں ۔ (قب براؤن J. P. Brown : *The Darvishes or Oriental Spiritualism*، نشرۂ H. A. Rose، لندن ۱۹۲۷ء، ص ۲۰۶ ببعد ۔

ان ترجمانوں کے فرائض اسلامی اصناف (guilds) کے نظام کے بعض عُمّال کے فرائض سے ملتے جلتے ہیں جن کا فُتُوّت کی کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے اور جنھیں نقیب، نیز تَرْجمان اللّسان، یا تَرْجُمان القَدم، کہتے ہیں ۔ ایسی صنف (guild) میں کسی نئے رکن کے داخل ہونے پر یہ ترجمان بھی ویسے ہی فرائض ادا کرتے ہیں جیسے بِکتاشیوں کے سلسلے میں مذکور ہوے (قب Thorning : *Beiträge zür Kenntnis des islamischen Vereinswesens*، برلن ۱۹۱۳ء، ص ۱۰۶ ببعد)۔

(۲) بِکتاشیوں کے ھاں ترجمان کے معنی دعا کے بھی ہیں ۔ صرف خاص دعائیں، جو خاص خاص موقع پر پڑھی جاتی ہیں، ترجمان کہلاتی ہیں ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بِکتاشیوں کے خفیہ لفظ یا جملے کا نام بھی ہے (قب براؤن Brown : *The Darvishes*، ص ۱۸۰ و ۱۹۹)۔

(J. H. Kramers (درامرز

تِرْحالہ : ترکی نام، شہر تِرکالہ یا تِرکّلہ Trik (k) ala کا، جو مغربی تِھسلی (تسالیا در یونان) میں واقع ہے، جس کا محل وقوع وولوس ۔ کَلَبکَہ (Volos-Kalabaka) ریلوے لائن پر، ترکالِسُوس کی سیراب وادی میں، سطح سمندر سے ۴۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے ۔ تِرحالہ قدیم شہر تِرکّہ سے، جو اب بالکل ناپید ہو چکا ہے، کچھ دور نہیں ۔ اس میں اَسقلِپیوس Asclepius کی مشہور ھیکل ہے ۔ ۱۸۸۱ء سے یہ شہر یونانیوں کے قبضے میں ہے ۔ اس سے پہلے وہاں عثمانیوں کی حکومت تھی ۔ سلطان بایزید اول نے اسے ۷۹۸ھ میں (اس سال کا آغاز ۱۶ اکتوبر ۱۳۹۵ء کو ہوا) سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا تھا (قب حاجی خلیفہ : *Rumeli und Bosna*، طبع فان ہامر J. v. Hammer، ص ۱۰۰ اور J. v. Hammer : *G. O. R.*، ۱ : ۲۴۹) ۔ یہ شہر اسی وقت فتح ہوا جب لارِسّا Larissa (ترکی میں یکی شہر) فتح ہوا تھا ۔ اس کے بعد یہ طُرخان اوغلو (رَکَ بہ تُرخان بیگ) کے املاک میں شامل ہوا، جن کا خاندان عثمانی امراء کے قدیم ترین اور شریف ترین خاندانوں میں سے تھا ۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں جو یہودی بوڈاپسٹ سے جلا وطن کیے گئے انھیں تِرحالۃ میں آباد کیا گیا تھا (قب F. Belon : *Les observations de plvsievrs singularitéz* etc.، پیرس ۱۵۵۵ء، ورق ۵۸ الف) ۔ یہاں عمر ابن طُرخان نے ایک مدرسہ بنوایا، جس کی چھت سیسے کی تھی؛ اس مدرسے میں دوسرے اساتذہ کے علاوہ عثمانی مؤرخ احمد المشہور بہ پرہ پرہزادہ پڑھایا کرتا تھا ۔ وہ ترحالۃ ھی میں ۹۶۸ھ (۱۵۶۰ء) میں فوت ہوا اور عمر بن طُرخان کی مسجد میں دفن ہوا ۔ اب یہ مسجد ناپید ہے (قب عطائی : الذیل علی الشقائق النعمانیۃ، ص ۲ اور بابنگر F. Babinger : *G.O.W.*، ص ۸۳ ببعد)؛ قب نعیما : تاریخ، ۳ : ۳۸ ۔ ترحالۃ میں ایک سرکاری قاضی بھی رہا کرتا تھا اور کئی مشہور علماء، مثلاً عطائی اور ویسی، قضا کے عہدے پر متمکن رہے ۔ چار جوامع (شریفہ) (یعنی غازی طُرخان، عثمان شاہ بیگ، حاجی مصطفٰی اور حسین آغا کی مساجد جامع) میں سے صرف دو باقی رہ گئی ہیں ۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو مشہور معمار سنان نے بنائی تھی ۔ یہ عثمان شاہ بیگ کی مسجد ہے، جسے قرہ عثمان شاہ کہتے ہیں اور جو سلیمان اعظم کا بھتیجا اور تھسلی کا والی تھا ۔ اس کا انتقال بھی تِرحالۃ ھی میں ہوا (۹۷۵ھ / ۱۵۶۷ء) (قب پچوی : تاریخ، ۱ : ۴۰ اور اولیاء چلبی :

سیاحت نامہ، ۱ : ۲۷۱؛ ایضًا : *Travels*، طبع J. v. Hammer، ۱ : ص ۸۷)۔ یہ مسجد، جس میں اس کے بانی کی تربت بھی ہے، اب کھنڈر ہو رہی ہے، لیکن اس میں اپنی پہلی شان کے آثار باقی ہیں۔ مشہور و معروف لوگوں کے مقابر میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں : جلال الدین بابا، سنان بابا، رمضان افندی، جعفر افندی اور اِتْلی قالقان۔ چودہ کنویں، جو محسن پاشازادہ عبداللہ پاشا نے بنوائے تھے، ثابت کرتے ہیں کہ ترحالۃ میں پانی کی کثرت ہے۔ اب مسلمانوں نے ترحالۃ بالکل چھوڑ دیا ہے اور یہاں صرف یونانی (زیادہ تر [اولاخی یا أفلاق] Wallachians) اور یہودی رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ شہر خاص طور پر صحت بخش نہیں، تاہم بوزنطی زمانے کا بلند قلعہ اور اس کے اطراف کے "باغ و باغچہ و بوستان"] کی کثرت ایک ایسا سماں پیش کرتی ہے جو آسانی سے فراموش نہیں ہو سکتا۔

مآخذ : (۱) حاجی خلیفہ : *Rumeli und Bosna*، ص ۹۹ بعد؛ (۲) سامی : قاموس الأعلام، ص ۱۶۳۷ بعد؛ (۳) سالنامۂ ولایت یانیہ سنہ ۱۲۸۸ھ، ص ۱۱۰ بعد؛ (۴) J. v. Hammer : *G. O. R.*، ۱ : ۲۷۹ بعد؛ (۵) Léon Heuzey : *Excursione dans la Thessalie turque en 1858*، پیرس ۱۹۲۷، ص ۸۰ بعد؛ (۶) Const. Chr. Vaytsakis : Σύντομος ἱστορία τῆς πόλεως Τρικκάλων، ایتھنز ۱۸۹۲ء، ۳۸ صفحات قطع نیم وزیری (octavo)، اس میں عہد عثمانیہ کو تقریبًا نظر انداز کر دیا ہے؛ (۷) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ج ۸ (استانبول ۱۹۲۸ء)، ص ۲۰۲ بعد؛ — عثمان شاہ کی مسجد پر، جو سنان نے تعمیر کی تھی، قبِ اولیاء، موضع مذکور، ص ۲۰۳ بعد؛ (۸) F. Babinger در Πρακτικὰ τῆς Ἀκαδημίας Ἀθηνῶν, iv.، ۱۹۲۹ء، جنوری؛ (۹) K. K. Orlandos : وہی کتاب، جون (مع نقشہ و تصاویر)۔

(با بنگر FRANZ BABINGER)

تُرشیز : (یاقوت : تُرشیش [و طُرشیز و طُرثیث و تُرشاش]؛ مقدسی : طُرثیث، طُریشیث؛ [بیہقی : تاریخ بیہق، تہران ۱۳۱۷ ش، ص ۲۸۱ : طریثیث] ایران کے ایک شہر کا نام، جو نیشاپور کی ولایت میں ضلع بُشت کا صدرمقام اور نیشاپور سے کوئی چار یا پانچ منزل کی مسافت پر واقع ہے۔ ۵۳۰ھ (۱۱۳۶ء) میں اسے تباہ کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں اس کا موروثی حاکم، العمید منصور (یا مسعود) بن منصور الزُّور آبادی تھا جو باطنیہ یا اسماعیلیہ فرقے کا دشمن تھا۔ اس نے ترکوں کو بلایا تا کہ مدافعت کے کام میں اسے مدد دیں، لیکن وہ اپنے معمول کے مطابق لالچ میں آ گئے۔ آخر اپنے آپ کو لڑائی جاری رکھنے کے قابل نہ پا کر اس نے اسماعیلیوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے لڑکے علاءالدین محمود نے ۵۴۵ھ (۱۱۵۰ء) میں عباسی خلفاء کی سیادت کو تسلیم کر لیا، لیکن جب ان سے اسے کچھ مدد نہ ملی، تو وہ نیشاپور کی طرف فرار ہو گیا اور اسماعیلیوں نے اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ تیمور نے اس شہر کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا (۷۸۴ھ / ۱۳۸۲ء)۔ اس کے گرد ایک گہری خندق اور اونچی فصیل تھی، جس کی وجہ سے اس شہر کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا [لیکن "نقبچیوں" نے خندق کا پانی نکال دیا، زیر حصار نقب لگائی، منجنیق و عرادہ کے پتھروں سے فصیل میں شگاف پیدا کر دیے اور اسے توڑ پھوڑ دیا۔ ناچار قلعہ گیر فوج نے اطاعت قبول کی]، ان کی جان بخشی ہوئی [یہ محافظانِ حصار غوری تھے جو سدیدی کہلاتے تھے اور بہادری اور حصار داری میں مشہور اور ملک غیاث الدین کے ملازم تھے۔ تیمور نے سرحد ترکستان کے قلعوں کے ضبط

اور محافظت کا کام ان کے سپرد کیا اور انھیں اس طرف خانہ کوچ روانہ کر دیا ۔ یزدی] ۔ تُرشیز ھی میں تیمور کے پاس شاہ شجاع مظفّری والیِ فارس کی جانب سے ایک سفیر [عمر شاہ نامی] آیا ۔ تیمور نے اس کی معرفت اپنے پوتے پیر محمد کے لیے شاہ شجاع کی لڑکی کا رشتہ مانگا ۔ عباس مرزا نے جو حملہ ھرات پر کیا تھا، اسی مہم میں خسرو مرزا نے ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں تُرشیز کو فتح کر لیا تھا ۔

اس شہر کے مشہور و معروف آدمی یہ تھے :
کاتبی نیشاپوری جو اس شہر کے نواح میں ایک گاؤں میں پیدا ھوا تھا، اھلی (م ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷ء)؛ اور ظہوری (م ۱۰۲۴ھ / ۱۶۱۵ء) ۔ نواحِ تُرشیز میں ایک گاؤں کُشمر تھا ۔ اس میں زردشت نے سرو کا ایک درخت لگایا تھا، جس نے بعد میں شہرت پائی اور خلیفہ متوکّل کے حکم سے اسے اکھڑوا دیا گیا (فردوسی : شاھنامہ، طبع Turner Macan، ص ۱۰۶۸، س ۶؛ طبع و ترجمہ مول J. Mohl، ۴ : ۳۶۴ : [بیہقی، تاریخ بیہق، طبع مذکور، ص ۲۸۱ ببعد و ۳۲۴]: Fr. Spiegel : *Erān Alterthumskunde*، ۱ : ۵۰۴، حاشیہ ۲، و ۳۰۷؛ محمد مجدی : زینۃ المجالس، در Barbier de Meynard : *Dict. de la Perse*، ص ۱۳۹۰، حاشیہ) .

مآخذ : (۱) یاقوت : معجم، ۱ : ۸۳۶؛ ۳ : ۵۲۸؛ (۲) ابن حوقل، *B. G. A.*، ۲ : ۲۹۱؛ (۳) مقدّسی، *B. G. A.*، ۳ : ۳۱۸ و ۳۵۲؛ [(۴) مطلع سعدین ۲/۲ و ۳ : ۶۳۷، ۱۰۳۵، ۱۰۴۷، ۱۲۶۸، تا ۱۲۷۰، ۱۲۸۳ تا ۱۲۸۵، ۱۳۰۸، ۱۳۲۰؛ (۵) ظفر نامۂ یزدی، طبع کلکتہ، ۱ : ۳۴۳ ببعد]؛ (۶) کاترمئر : *Hist. des Mongols*، ۱ : ۱۷۷؛ (۷) ابوالفداء : *Géogr.*، ۱ : ۴۴۳؛ [(۸) امین احمد رازی : ھفت اقلیم، بذیل ترشیز]؛ (۹) P. M. Sykes : *J. R. G. S.*، ۱۹۱۱ء؛ (۱۰) ایضاً : *Hist. of Persia*، طبع اول، ۲ : ۸۳، ۲۰۱، ۲۲۴؛ (۱۱) E. G. Browne : *Liter. Hist. of Persia under Tartar Dominion*، ص ۱۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸؛ (۱۲) ایضاً: *Liter. Hist. of Persia in Modern Times*، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۵۳.

(ایوار CL. HUART)

تُرخان بیگ : [سامی (بذیل تسالیہ): طورخان بیگ] ایک عثمانی جرنیل، فاتح تھسلی (تسالیہ) اور اس کا مرزبان ۔ اب تک تُرخان بیگ کے حقیقی نسب کے متعلق معلومات مبہم تھیں، لیکن اب اس کے آخری وصیت نامے مؤرّخ در جمادی الاولٰی ۸۵۰ھ/اگست ۱۴۴۶ء سے (جس کا مصدقہ یونانی ترجمہ Epam. G. Pharmakidis : Η Λάρισα، Volo ۱۹۲۶ء، ص ۲۸۰ تا ۲۸۷ میں موجود ھے) یہ مسئلہ حل ھو جاتا ھے ۔ اس میں وہ اپنے آپ کو "یگیت بیگ پاشا مرحوم" (τοῦ μακαρίτου Πασσᾶ Γηγὴτ Βέη) کا بیٹا بتاتا ھے ۔ پس معلوم ھوا کہ اس کا باپ مشہور و معروف یگیت بیگ تھا (اسے سرویا والے اور اطالوی Pasaythus، Basaitus وغیرہ کہا کرتے تھے؛ قب C. J. Jireček : *Staat und Gesellschaft im mittelalterlichen Serbien*، ۴ : ۷، حاشیہ ۵)، جس نے اُسکوب (Skoplje) کو (بتاریخ ۶ جنوری ۱۳۹۲ء) فتح کیا اور ۷۹۱ھ/ ۱۳۹۰ء کے بعد بوسنیا کے ایک حصے پر حکومت بھی کی (یہ علاقہ آج کل جنوبی سرویا میں ھے)، جہاں وہ سلطنت عثمانی کی طرف سے مرزبان تھا ۔ تقریباً ۱۴۱۳ء میں اس کا انتقال اسکوب ھی میں ھوا ھوگا ۔ وھاں اس کا مقبرہ ('تُربہ') اب تک موجود ھے (قب Glиša Elezović : *Turski spomenici u Skoplju*، Skoplje ۱۹۲۷ء، ص ۵، مع ایک تصویر کے) ۔ سجلِّ عثمانی، ۱ : ۳۷، کے اس بیان کی کوئی سند نہیں ملتی کہ اس کی وفات ۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء تک نہیں ھوئی تھی اور نہ اس بات کی کوئی شہادت ملتی ھے کہ

صدراعظم اسحٰق پاشا اس کا غلام (قول *köle*) تھا ۔ بدیہی طور پر یہ اشتباہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اسے ایک اور شخص اسحٰق بیگ نامی کے ساتھ ملتبس کر دیا گیا ہے جو بلاد بوسنہ کا پہلا حکمران تھا اور *Altosman. anonymen Chroniken*، طبع گیزے F. Giese، ص ۲۸، س ۳ کے ایک عجیب و غریب حاشیے میں بتایا گیا ہے کہ یگیت بک اس کا 'افندی' (آقا) تھا (جس کی تقلید غالباً صولاق زادہ: تاریخ، ص ۵۲ نے بھی کی ہے)۔ یگیت بیگ اسحٰق بیگ کا بیٹا نہیں تھا، جیسا کہ C.J. Jireček: *Geschichte der Serben*، ۲/۱ : ۱۲۷ میں لکھا ہے (اس نے غالباً Leunclavius: *Hist. Musulm. Turc.*، ص ۵۱۰، س ۱۳ کی تقلید کی ہے)، بلکہ بدیہی طور پر اس کا باپ تھا ۔ یہ امر بدون شک غازی اسحٰق بیگ کی مسجد واقع اسکوب (Skoplje) کے عربی کتبے مؤرخ ۸۴۲ھ (۱۴۳۸ - ۱۴۳۹ء) سے ثابت ہوتا ہے (قب متن کتبہ در Elezović: کتاب مذکور، ص ۱۱، پایین صفحہ)، اس لیے C. Truhelka: *Tursko-slovenski spomenici dubrovačke arhive* (سراجیوو ۱۹۱۱ء) میں جب اسحٰق بیگ کو پاشا یگیت بیگ ("Pašait-beg") کا بیٹا لکھا ہے تو اس کا بیان بالکل قرین صحت ہے، اگرچہ وہاں اسے ہرنوشچ Hranušić کا لقب دیا گیا ہے، جو ایک غیرضروری صقلبی سازی (slavisation) ہے (قب ص ۱۹۲، پایین صفحہ) ۔ پس ظاہر ہے کہ اسحٰق بیگ اور ترخان بیگ دونوں یگیت بیگ کے بیٹے تھے، یعنی آپس میں بھائی بھائی تھے ۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ترخان کب اور کہاں پیدا ہوا ۔ اگر اسے ترخان (قب [ترخان] دراسترخان) سے، جس کا ابن بطوطہ (۲ : ۴۱۰) نے ذکر کیا ہے، وابستہ نہ کیا جائے تو اس نام کے معنی بھی غیر یقینی ہیں ۔ اس کے صحیح تلفظ کی تصدیق اس کی بوزنطی شکل Τουραχάνης سے ہوتی ہے، جو G. Phrantzes، Ducas، Chalcocondyles در *Chronicon breve* میں موجود ہے ۔

ترخان بیگ کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ۔ اس کا ذکر سب سے پہلے مئی ۱۴۲۳ء میں ملتا ہے جب پیلا پنیسس Peloponnesus جزیرہ نمای موریہ میں وہ گھڑ چڑھی فوج کی کمان کرتا ہوا نمودار ہوا اور ہکسامیلیہ Hexamilia کی خاکنائے کے مخروبہ مورچوں کو توڑتا ہوا نکل گیا اور بہت سے ایسے دفاعی استحکامات پر قبضہ کر لیا جو شہنشاہ عمانویل Emanuel نے اس خاکنائے پر کچھ ھی پہلے دوبارہ تعمیر کرائے تھے ۔ چونکہ اس کا مقابلہ کسی جگہ نہ ہوا، اس لیے اس نے اندرون ملک کے بہت سے حصے کو تاخت و تاراج کر ڈالا ۔ اس نے متعدد بوزنطی شہروں، مثلاً مسترا Mistra، لیونڈاری Leondári گارڈھیکی Gardhiki، ڈبیا Dabiá (قب *Chronicon breve* طباعت بون Bonn، مرتبۂ ڈوکاس Ducas، ص ۵۱۹)، پر حملے کرکے پیلا پنیسس کو وینس والوں کی سرحدوں تک فتح کرکے ممالک عثمانیہ کے ساتھ ضم کر دیا ۔ اس ساری مہم (قب Phrantzes، ص ۱۱۷؛ Chalcocondyles، ص ۲۳۸) کا مقصد غالباً یہ تھا کہ وینس کے خلاف حملہ کرنے کے لیے علاقے کی دیکھ بھال کر لی جائے ۔ اس کے بعد (اگر ڈوکاس Ducas کا بیان درست ہے) ترخان اپنے رسالے کے ساتھ بحیرۂ اسود پر آ نمودار ہوا (ص ۲۰۰، س ۴) ۔ اس نے اهل البانیہ کے خلاف بھی فوج کشی کی اور انھیں فیصلہ کن شکست دی (قب Chalcocondyles، ص ۲۳۹، س ۲ و ۲۵۲، س ۱) ۔ اس کے بعد وہ دوبارہ پیلا پنیسس میں آ دھمکا جہاں نوپیکٹوس Naupaktos کے مقام سے اس نے مطلق العنان فرمانروا قسطنطین کو پٹریس Patras کے شہر پر قبضہ کرنے سے روک دیا (Phrantzes،

ص ۱۰۵، س ۱۸) - ۱۴۳۱ء کے آخر میں اس نے خاکنای کورنتھ Corinth کی دیواروں کو تباہ کیا اور ۱۴۳۵ء کے موسم گرما میں ثیبہ (Thebes) کا محاصرہ کرکے چند ھی روز میں اسے فتح کر لیا (قب Phrantzes، ص ۱۵۷، س ۱۸ اور ص ۱۵۹، س ۱۷) - اس زمانے میں بوزنطی مؤرخ Georgios Phrantzes ثیبہ میں اس کی خدمت میں باریاب ھوا (ص ۱۶۰، س ۳ ببعد) - نومبر ۱۴۴۳ء کے آغاز میں تُرخان بیگ نے جان ھنیادی John Hunyadi کے خلاف جنگ میں ایک عثمانی لشکر کی کمان کی - ازلادی کی لڑائی میں اس کے عجیب و غریب رویّے کی وجہ سے (قب *Altosman. Chron.*، طبع گیزے Giese، ص ۸۵؛ ترجمہ ص ۹۰) اسے شکست کا ذمہ دار گردانا گیا (قب Katoua، ۱۳ : ۲۵۳ : *Twrhambeg*؛ Chalcocondyles، ص ۳۱۵) اور اسے حراست میں لے لیا گیا اور توقات لے جا کر بدوی چرداق کے دولتی قیدخانے میں ڈال دیا گیا - اس کی عمر کے آئندہ دس سال کا حال کہیں تحریر نہیں ھوا - اکتوبر ۱۴۵۳ء کی ابتداء میں سلطان محمد ثانی نے تُرخان کو اس کے دو بیٹوں احمد اور عمر سمیت بہت بڑا لشکر دے کر پیلاپنی سس میں بھیجا، جہاں اس نے پھر خاکنائے کے بیرونی دفاعی مورچوں پر قبضہ کر لیا اور آرکاڈیا Arcadia پر حملہ کر کے اس میں لوٹ مار مچانے کے بعد آگ لگا دی، نیز ایثوم Ithóme (یعنی مسینا) سے گزرتے ھوے مسینا کی ساری خلیج کو آگ لگا دی - جب رسل و رسائل کی مشکلات پیش آئیں اور یہ ضروری ھو گیا کہ وہ اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دے تو اس کا ایک بیٹا احمد دِرْوناکی Dervenaki کے درے میں مائی سینی Mycenae اور کورنتھ کے درمیان میتائی اس آزانس Matthaeus Azanes کے بہنوئی، مطلق العنان ہٹری اس، شاہ سپارٹہ، کے ھاتھوں گرفتار ھو گیا (قب Phrantzes، ص ۲۳۵ اور W. Miller : *The Latins in the Levant*، لندن ۱۹۰۸ء، ص ۴۲۶)، لیکن ۱۴۵۴ء میں اس کے بھائی عمر نے اسے چھڑا لیا (وھی کتاب، ص ۳۸۳، س ۱۱ ببعد) - اکتوبر ۱۴۵۵ء میں تُرخان اپنے بیٹوں سمیت ادرنہ (Phrantzes، ص ۳۸۵، س ۱ ببعد) میں آ نمودار ھوا اور ۱۴۵۶ء کے وسط میں فوت ھوا - غالباً اس وقت وہ بہت عمر رسیدہ ھو چکا تھا (Phrantzes، ص ۳۸۶، س ۱) - گورنر کی حیثیت سے اس کی سرکاری قیام گاہ تِھسلی میں لاریسا کے مقام پر تھی (ترکی : یکی شہر فنار) اور یہ علاقہ اسے جاگیر میں ملا ھوا تھا - وھاں اس نے ایک مسجد اور بے شمار دوسری عمارتیں اوقاف خیریہ کے طور پر بنوائیں اور طِرنوہ (یونانی : Tyrnawos ترناواس) میں ایک گرجا بھی بنا ڈالا جو لاریسا سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا - یہ گرجا ابھی تک قائم ھے - اس کا مقبرہ جو ایک چھوٹے سے گرجا کی شکل کی ''تربہ'' ھے، شہر لاریسا کے شمال مشرق سرے پر ھے - اس کے گرد ایک قبرستان اور ایک خانقاہ بھی تھی، لیکن یہ دونوں اب معدوم ھو چکے ھیں - تُرخان بیگ کے دو بیٹے تھے، احمد اور عمر، جو اپنے باپ کے ساتھ اس کی مہمات میں شریک رھا کرتے تھے - عمر کا ذکر عثمانی مرزبانِ پیلاپنی سس کی حیثیت سے آتا ھے - اس کا بھائی احمد تھسلی میں اپنے باپ کا جانشین ھوا - محمد ثانی اسے ایک لشکر کے ساتھ ۱۴۵۶ء میں پیلاپنی سس میں چھوڑ گیا (Phrantzes، ص ۳۸۸، س ۱۱ ببعد) - اس نے ۱۴۶۳ء میں نوپیکٹوس Naupactos کے گرد و نواح کا علاقہ لے لیا اور ۱۴۶۷ء میں پہلے شکست پانے کے بعد وینس والوں کو شکست دی (Phrantzes، ص ۴۲۵،

س ۲۳ - عمر (Ὀμάρης) کا [جیسے Phrantzes همیشه Ἀμάρης لکھتا ہے] مفصل تر حال Chalcocondyles نے دیا ہے، قب اشاریه بذیلِ مادۂ Omares)۔ دونوں بھائیوں کی زندگی کے متعلق، جن میں سے احمد اپنے باپ کی طرح حج بھی کر آیا تھا، کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔

معلوم ہوتا ہے که ان دونوں بھائیوں میں سے عمر زیادہ مستعد تھا۔ ۱۴۷۷ء میں اس نے اہلِ وینس کے ساتھ ایسنزو Isonzo پر جنگ کی (قب فان هامر J. von Hammer : *G. O. R.*، ۲ : ۱۰۱) اور اس سے اگلے سال البانیوں کو شکست دی (وهی کتاب، ۲ : ۱۰۷)۔ وہ ۱۴۸۳ء تک بھی زندہ تھا۔ یه اس کی وصیت مرقومۂ محرم ۸۸۹ھ (فروری ۱۴۸۴ء) سے ثابت ہے (قب E. G. Pharmakidis : کتاب مذکور، ص ۲۸۷ تا ۳۰۳ یا ۳۰۷ تا ۳۱۰)۔ عمر بیگ کے دو لڑکے تھے: ایک کا نام حسن بیگ تھا، جس کا وجود اس کی وصیت مرقومۂ شوال ۹۳۷ھ (مئی ۱۵۳۱، قب Pharmakidis، ص ۳۱۰ ببعد) سے ثابت ہے اور دوسرا ادریس بیگ تھا، جس نے اپنے زمانے میں ہاتفی کی خسرو شیریں اور لیلٰی مجنوں کا ترکی میں ترجمه کرکے شاعر اور جید مترجم کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا (قب سہی : تذکرہ، ص ۳۹ ببعد)۔ ترخان اوغلوں کا خاندان لاریسا کے نواح میں آباد ہو گیا تھا اور تقریباً عصرِ حاضر تک وسیع جاگیروں کا مالک رہا ہے۔ بعد کے زمانے میں اس خاندان میں سے کسی نے بھی تاریخ میں کوئی اہم حصه نہیں لیا۔ ترخان بیگ کی متأخر پشتوں میں سے ایک شخص فائق پاشا تھا، جو روم ایلی کا والی رہا اور اپنے جبر و استحصال کی وجه سے بےحد بدنام ہوا۔ اس کی عمر ستر سال کی تھی که مارچ ۱۶۴۳ء میں استانبول کے شاهی محل سرا کے صحن میں اس کا

(۱) اس شجرے کی دائیں طرف کا حصه Cl. Elezović : کتاب مذکور، ص ۱۲۱ سے ماخوذ ہے۔ اس کی پڑتال کی ضرورت اس لحاظ سے ہے که ممکن ہے اورینوس اوغلو Ewrenos-oghlu کی اولاد کے ساتھ کچھ التباس ہو گیا ہو؛ کم از کم عیسٰی بیگ کے لڑکوں کے ساتھ خلط ملط کا احتمال ضرور ہے، قب نیز C. J. Jireček : *Staat und Gesellschaft*، ۴ : ۸، حاشیه ۱، جہاں اس قسم کے امکانی التباس کی طرف توجه دلائی گئی ہے۔

سر کاٹ دیا گیا (قب فان ھامر J. von Hammer : G. O. R.، ص ۳۲۲ از روی نعیما و زنکائیسن Zinkeisen، G. O. R.، م : ۵۳۵) - فالمرایر J. Ph. Fallmerayer نے ۱۸۴۲ء میں "[لاریساکی] جامع مسجد میں تُرخان بیگ کے سوانح حیات کا نسخہ دیکھا جو وھاں محفوظ تھا" (قب Fragmente aus dem Orient، طبع ثانی، ۱۸۷۷ء، ص ۳۸۱ ببعد)، لیکن معلوم ھوتا ھے کہ یہ کتاب بعد ازاں ناپید ھو گئی (جس طرح اِورینُوس اوغلوون (رک بآن) کے سِیَر کا قلمی نسخہ، جس کا ذکر بویو Beaujour نے Tableau du commerce de la Grèce، ۱ : ۱۱۷ میں کیا ھے، گم ھو چکا ھے) - مذکورۂ بالا شجرۂ نسب میں پاشا یِگِیت بیگ کی اولاد کا اجمالی ذکر ھے، جو عثمانی شرفاء کے اس خاندان کا حقیقی بانی تھا.

مآخذ : (۱) D. Urquhart : Spirit of the East، لندن ۱۸۳۸ء، ج ۱؛ قب جرمن ترجمہ (ازمتن عربی) بقلم F. G. Buck، Stuttgart اور Tubigen، ۱۸۳۹ء، ۱ : ۲۲۶ ببعد؛ یہ متن تُرخان کے سوانح حیات اور اس کے خاندان کے حالات پر مشتمل ھے اور تھسّلی میں تِرناکوس Tyrnacos کے کتب خانۂ عام میں محفوظ ھے.

(بابنگر F. BABINGER)

تَیرِک : قفقاز میں ایک بہت بڑے دریا کا نام ھے (اس کی لمبائی تقریباً ۳۰۰ میل اور چوڑائی بعض مقامات پر ۵۰۰ گز تک ھے) - بالائی حصے میں تو یہ تیز دھارے والی پہاڑی ندی ھے ھی، نیچے کے راستے میں بھی اس کی رفتار اتنی تیز ھے کہ اس میں کشتی رانی ناممکن ھے.

جب عربوں کے علم جغرافیہ کا عہد زرّین تھا اس زمانے میں (چوتھی ھجری / دسویں صدی میلادی) بلاد تیرِک ضرور خزر [رک بآن] کی مملکت میں شامل ھونگے - خزر کی مملکت کے اس حصے کا بیان عرب جغرافیہ دانوں نے نہیں کیا اور دریاے تیرِک کا ذکر بھی نہیں کیا - اس کا نام بظاھر سب سے پہلے ھُولاگُو [رک بآن] اور بِرکہ Berke کی باھمی آویزش کے سلسلے میں آیا ھے، جو ابتداے ۶۶۱ھ (نومبر، دسمبر ۱۲۶۲ء) میں ھوئی تھی (رشیدالدین، طبع کاترمئر، ص ۳۹۴) - حمد اللہ مستوفی قزوینی (G. M. S.، ۲۳ : ۲۰۹) تیرِک (ترجمۂ لیسٹرینج، ص ۲۰۰ پر اسے 'تُرک' لکھا ھے) کا ذکر اتل (والگا) کے ساتھ اس طور پر کرتا ھے کہ یہ دشتِ قپچاق کا ایک دریا ھے [یعنی بذیل دشتِ قپچاق لکھتا ھے : "از جبالش[فلان] و[فلان] مشہور است و از اودیہ اتل و ترک"] [قب قپچاق] - تیرِک کا علاقہ اس زمانے میں مغولوں کے اَلتون اُردو (Golden Horde، سنہری لشکر) کی مملکت میں شامل تھا اور غالباً اس علاقے کے لوگوں نے بھی اسی زمانے (یعنی آٹھویں صدی ھجری / چودھویں میلادی) میں اسلام قبول کر لیا ھوگا جب اَلتون اُردو نے کیا تھا۔ اَستَرا خان [رک بآن] کے فتح ھونے کے کچھ عرصہ بعد ۱۵۵۴ء میں روسی قازاق بلاد تیرِک میں نمودار ھونے لگے اور انھوں نے "تیرسکِش قازاق لشکر" (Terskoe kazačye voisko) کی صورت اختیار کر لی - پہلے تو یہ ماسکو کی حکومت سے علٰحدہ اور آزاد تھے، لیکن بعد میں انھیں روسی سلطنت میں شامل کر لیا گیا - اسلامی دنیا کی سیاست کے لحاظ سے ممالک تیرِک کو کبھی خاص اھمیت حاصل نہیں ھوئی، یہاں تک کہ تیرِک کے شمالی کنارے پر قیزلَر کا قلعہ اس کے ترکی نام کے باوجود روسیوں ھی نے ۱۷۳۵ء میں تعمیر کیا تھا.

مآخذ : متن میں جن تصانیف کا حوالہ دیا گیا ھے اُن کے علاوہ دیکھیے E. Weidenbaum : Pudevoditel' po Kavkazu، تفلیس ۱۸۸۸ء.

(بارتولڈ W. BARTHOLD)

تُرک :

الف (نظر عام)

I - تاریخی و نسلی جائزہ (بار ٹولڈ W. Barthold)

II - زبانیں (سموئیلووچ A. Samoilovitch)

III - چغتائی ادب (بارٹولڈ).

ب (اتراکِ عثمانی)

I - زبانیں (کرامرز J. H. Kramers)

II - بولیاں (کوالسکی T. Kowalski)

III - ادب (کوپریلی زادہ فؤاد)

VI - تاریخ (کرامرز).

الف۔ I۔ تاریخی اور نسلی جائزہ

لفظ ترک (چینی : توکیو Tu-küe، یونانی : Τοῦρκοι) سب سے پہلے چھٹی صدی میلادی میں ایک خانہ بدوش قوم کے نام کی صورت میں ملتا ہے ۔ اس صدی میں ترکوں نے ایک طاقتور بدوی سلطنت قائم کی جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لیکر بحیرۂ اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا بانی، جسے چینیوں نے تو۔مِن Tu-men (ترکی کتبوں میں : بو۔مِن Bu-mîn) لکھا ہے، ۵۵۲ء میں فوت ہو گیا ۔ اس کا بھائی اِستیمی Istämi (چینی شِتیِ۔مِی She-tie-mi، یونانی Διζάβουλος، Διλζίβουλος اور Σιλζίβουλος؛ طبری، ۱ : ۸۹۵ و ۸۹۶ : سِنجِبُو خاقان)، جس نے مغرب کی سمت میں فتوحات حاصل کیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۵۷۶ء تک زندہ رہا ۔ گمان ہوتا ہے کہ یہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے بالکل علٰحدہ اور خودمختار تھے، چنانچہ دونوں مذکورہ سلطنتوں کو چین والے شمالی ترکوں کی سلطنت اور مغربی ترکوں کی سلطنت کہہ کر ایک دوسری سے ممیز کرتے ہیں ۔ اس زمانے میں چینی حکمران خاندان سوی Sui نے اقتدار حاصل کر لیا ۔ اس خاندان کے زیرِ اثر ۵۸۱ء میں ترکوں کی دونوں سلطنتوں میں ایک آخری اور قطعی افتراق پیدا ہو گیا ۔ آئندہ صدی میں ان دونوں کو تانگ T'ang خاندان (۶۱۸ء - ۹۰۷ء) کی برائے نام سیادت تسلیم کرنا پڑی – شمالی ترکی سلطنت کو ۶۳۰ء کے قریب اور مغربی کو ۶۵۹ء میں ۔ پچاس سالہ غیر ملکی محکومی کے بعد ۶۸۲ء میں شمالی ترک اپنی آزادی اور گذشتہ اقتدار دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ یہ سلطنت ۷۴۴ء تک باقی رہی ۔ اسی نئی سلطنت کے وہ کتبے ہیں جو (مغولستان یا منگولیا کے دریا اُورخون کے نام پر) "کتباتِ اُورخون" کے نام سے مشہور ہیں اور جو ترکی زبان کے آثار میں سب سے قدیم ہیں۔ وقتاً فوقتاً، بالخصوص ۶۹۹ء اور ۷۱۱ء میں، ان حکمرانوں نے مغربی ترکوں کو اپنے زیرنگیں کرنے میں کامیابی حاصل کی، لیکن وہ مستقل طور پر انھیں اپنا مطیع و منقاد نہ بنا سکے ۔ مغربی ترکی قبیلوں میں سے تیورگش Türgesh سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ ان کے سرداروں نے آخری سالوں میں خانیت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ۔ تیورگش کی سلطنت کا خاتمہ ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) میں نَصر بن سیار کی قیادت میں عربوں کے ہاتھوں ہوا (طبری، ۲ : ۱۵۹۳ ببعد، ۱۶۱۳، ۱۶۸۹ ببعد).

ان قدیم‌ترین ترکوں کا اپنے مشرق اور مغربی خانہ‌بدوش پیشروؤں سے کیا تعلق تھا؟ اس باب میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے ۔ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پہلے کی صدیوں میں بھی ترکی زبانیں موجود تھیں، البتہ قدرتی طور پر ان زبانوں کے نام اور تھے ۔ اس نظریے کی وضاحت ان متفرق ترکی الفاظ کی مدد سے کی گئی ہے جو زمانۂ قبل مسیح سے باقی چلے آتے ہیں ۔ یورپ میں اکثر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ قدیم خانہ بدوش لوگ، بالخصوص ستھیائی Scythians

یا کم از کم ان کا ایک فریق، ترکوں کے ساتھ نسبتی تعلق رکھتا تھا (کرتیوس Curtius، کتاب ۷، باب ۷، پارہ ۱) اسکندر اعظم کے حالات میں ایک شخص کارتھاسیس Carthasis کا ذکر کرتا ہے جو شاہ ستھیا کا بھائی تھا اور سیحون (Yaxartes) [قب سیر دریا]) پار رہتا تھا۔ نولڈیکہ نے گوٹ شمیٹ A. Gutschmid کو بتایا کہ ممکن ہے یہ کارتھاسیس ترکی کلمۂ قرداشی (''اس کا بھائی'') ہو۔ بدیں صورت تاریخ میں شاید کسی ترکی قوم کا یہ سب سے پہلا ذکر ہے جو ہم تک پہنچا ہے (گوٹ شمیٹ : *Geschichte Irans und seiner Nachbarländer von Alexander dem Grossen bis zum Untergang der Arsaciden*، ٹوبنگن Tübingen ۱۸۸۸ء، ص ۲، حاشیہ ۱)، لیکن نولڈیکہ خود، جیسا کہ اس نے گوٹ شمیٹ کی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے، '' اب اس خیال کی تائید، جو اس نے سرسری طور پر ظاہر کیا تھا، جدّیت اور متانت سے کرنا نہیں چاہتا''.

ہیروڈوٹوس Herodotos (۴ : ۲۳) میں بعض حوالے ہیں جو اس سے بھی قدیم تر زمانے کے ہیں۔ اس نے ایک قوم بنام ایگرپّائی (Agrippaeans) یا آرگمپائی (Argimpaeans) کے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور *ἄσχυ* نام کے ایک درخت کے رس کا بھی ذکر اس میں آیا ہے جسے دودھ ملا کر پیا جاتا تھا۔ لفظ *ἄσχυ* کو بعض اوقات سب سے پرانا ترکی لفظ قرار دیا گیا ہے جو ہم تک پہنچا ہے (بقول مولنھوف Müllenhof : *Deutsche Altertumskunde*، ۳ : ۱۵)؛ یہ کلمہ ترکی کلمۂ اچی یا اچّی بمعنی ''تلخ'' ہے؛ توماشیک Tomaschek : *S.B.Ak. Wien*، ۱۱۷ : ۶۰)، اسے ایک مفروضہ لفظ آرغ بمعنی '' خوراك '' کا مساوی قرار دیتا ہے؛ قب نیز F. Braun : *Razîskaniya v oblasti gotoslavyanskikh* *otnoshenly*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۹ء، ص ۸۸)۔ چینیوں نے ترکوں کو ھیونگ نو کی اولاد (Hiung-nu = نژادھن) بتایا ہے۔ تسئین۔ ھان۔ شو (*Ts'ien-han-shu*) میں اس صلح نامے کا ذکر کرتے ہوئے، جو ۴۷ ق م میں چین کے شنہشاہ اور امیر ھن (Huns) کے درمیان پایۂ تکمیل کو پہنچا، ایک ھن لفظ کا ذکر آیا ہے جو چینی رسم الخط کی رو سے '' کنگ لو '' ہے (قدیم تلفظ : '' لنگ۔ لوک'')۔ کنگ لو اس تلوار کو کہتے تھے جس سے ھن لوگ رسمی تقریبوں پر متقلد ہوتے تھے (یعنی اسے گلے میں ڈالے ہوتے تھے)۔ اس لفظ کو ھیرتھ (Fr. Hirth: *Bulletin de l'Acad.* etc.، ۱۹۰۰ء، ص ۲۲۲) نے تلیوتی Teleut لفظ قینغیراق (*kîngîrak* = دو دھاری چھری) سے مربوط قرار دیا ہے (راڈلوف Radloff: *Wörterbuch*، ۲ : ۹۰۷) اور مشرق ترکستان کے لفظ قینغراق (= بڑی چھری) (شا R. Shaw : *A Sketch of the Turk Language*، ۲ : ۱۶۳) سے بھی۔ ان سے بھی قدیم تر چینی مآخذ میں ھنوں کا بھی لفظ ۱۰۲۲ ق م کے ایک واقعے کے بیان میں مذکور ہوا ہے، جس کی بنا پر ھیرتھ کی رائے میں یہ ''قدیم ترین ترکی لفظ ہے جو کسی تحریر میں موجود ہے '' (*The Ancient History of China*، نیویارك ۱۹۱۱ء، ص ۶۷)۔ شراتوری (K. Shiratori : *Bulletin de l'Acad.* etc.، ۱۹۰۲ء، ج ۱۷، شمارہ ۲، ص ۱ ببعد) نے بہت سے ھن الفاظ کو جو ترکی سے لیے گئے اور چینی مآخذ میں محفوظ ہیں، حل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن کچھ عرصے کے بعد اسی مصنف نے (*J. A.*، ج ۲۰۲، ۱۹۲۳ء، ص ۷۱ ببعد) یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ ھنوں کی زبان ایک منگولی زبان ہے، جس میں تونغوز (Tunguz) عناصر کی کسی حد تک آمیزش پائی جاتی ہے۔

چینی مآخذ میں سی اِنْ۔ پی (Sien-pi) کا ذکر اس حیثیت سے آیا ہے کہ وہ ہنوں کے مشرق جانب کے ہمسائے ہیں، جنھوں نے پہلی صدی میلادی کے اواخر میں ہنوں کو منگولیا سے نکال دیا تھا ۔ کچھ مزید عرصے کے بعد ہنوں نے، نیز سی اِنْ۔ پی نے، چین میں کئی حکمران خاندانوں کی بنا ڈالی ۔ سی اِنْ۔ پی خاندانوں میں شمالی وِیْ (Wei) کا خاندان (۳۸۶ تا ۵۳۴ء) خاص اہمیت رکھتا تھا ۔ سی اِنْ۔ پی کو عام طور پر تونْغُوز نسل کے لوگ شمار کیا جاتا ہے (مثلاً دیکھیے E. Chavannes : *Documents sur les Tou-kiue* [*Turcs*] *occidentaux*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۰۰، حاشیہ ۵)؛ لیکن جیسا کہ پیلیو (P. Pelliot) نے ایک خطبے (لکچر) کے دوران میں، جو سینٹ پیٹرزبرگ میں ۱۹۲۵ء کے موسم خزاں میں دیا، اعلان کیا، چینی زبان میں ایک سی اِنْ۔ پی فرہنگ اب تک موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سی اِنْ۔ پی کی زبان ترکی تھی ۔ جہاں تک مجھے علم ہے اب تک اس فرہنگ کے بارے میں کوئی چیز طبع نہیں ہوئی اور جب تک کسی ایسے مأخذ تک ہماری رسائی نہ ہو، اقوامِ متعلقہ کی اصل و نسل کا سوال قدرتی طور پر طے نہیں ہو سکتا ۔ اگر یہ حتمی طور پر ثابت ہو جائے کہ ہُن منگول تھے اور سی اِنْ۔ پی ترک، تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان دنوں میں ترک، بعد کے زمانے کے برخلاف، منگول لوگوں کے مشرق میں آباد تھے ۔ ان لوگوں کے نام کا، جو صرف چینی رسم الخط میں باقی رہ گیا ہے، حقیقی تلفظ کیا تھا اس کا ہمیں علم نہیں ۔ بلوشہ E. Blochet : (*G. M. S.*، ۱۲ : ۲۰۱) سی اِنْ۔ پی (Sien-pi) کو سبِرْ قرار دیتا ہے ۔ بوزنطی اور ارمنی مآخذ میں ہمیں ایک قوم سبِر Sabirs کا نام ملتا ہے، جس کا ذکر سب سے پہلے ۴۶۳ء میں آیا ہے اور آخری مرتبہ ۵۰۸ء میں (قب مارکار J. Marquart : *Osteuropäische und ostasiatische Streifzüge*، لائپزگ ۱۹۰۳ء، بامداد اشاریہ)؛ لیکن سی اِنْ۔ پی کے مغرب کی سمت نقلِ وطن کرنے کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ۔

پوپہ (N. Poppe) نے ابھی حال میں ترکوں کی اصل اور قدیم تاریخ سے ایک دوسرے (یعنی لسانی) نقطۂ نظر سے بحث کی ہے ۔ اس نے ایک التائی (Altaic) اُمّ الالسنہ یا ابتدائی زبان (*Ursprache*) کا وجود فرض کیا ہے، جس سے ابتدائی ترکی، ابتدائی منگولی اور ابتدائی تونغوز زبانیں مشتق ہوئیں ۔ ابتدائی ترکی زبان ارتقاء کی اسی سطح پر تھی جس پر اُورخون (Orkhon) کتبوں کی زبان ہے ۔ '' اورخون ترکی کا نظامِ صوتی (phonetic) ان تصورات سے کامل مطابقت رکھتا ہے جو ہمارے ذہن میں ابتدائی ترکی کے نظامِ صوتی کے متعلق موجود ہیں ۔'' (*Ungarische Jahrbücher*، ۶ : ۹۸) ۔

اس مصنف کا یقیناً یہ مطلب نہیں کہ دورِ حاضر کی سب ترکی زبانیں اُورخون کتبوں کی زبان سے مشتق ہیں ۔ یہ ناممکن ہوگا گو اس کی دلیل صرف یہی ہو کہ خود ان کتبوں میں ترکوں کے کئی قبائل کا ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ صرف ایک ''قدیم متروک بولی'' تھی ۔ ''قدیم ترکی زبان کا زمانہ زیادہ سے زیادہ ان صدیوں میں'' معین کیا جا سکتا ہے ''جو میلادی سنہ کے آغاز سے متصل پہلے تھیں'' (کتاب مذکور) ۔ عام طور پر ترکی زبانیں منگول زبانوں سے بلندتر سطح پر ہیں: ''منگولی دنیا میں آپ کسی ضلع کو بھی انتخاب کرلیں وھاں کی زبانِ حالیہ ان قدیم‌ترین ترکی زبانوں کے مقابلے میں جن کا ہمیں علم ہے بہت زیادہ پاستانی اور قدیم (archaic) ہے'' ۔ ادب کی منگولی زبان — لیکن اس کی زندہ بولیاں نہیں — صوتی

نقطۂ نظر سے ''ارتقاء کی تقریبا اسی سطح پر ہے جس پر قدیم ابتدائی التائی زبان (Altaic primitive language) تھی'' (کتاب مذکور، ص ۱۱۷).

مصنف نے (کتاب مذکور، قب نیز *Bulletin de l' Acad.* etc. *Asia*، ۱۹۲۳ء، ص ۲۸۹ ببعد؛ *Major*، ۱ : ۷۵ ببعد : *Kőrösi Czoma - Archiv*، ۲ : ۶۵ ببعد؛ *Ungarische Jahrbücher*، ۷ : ۱۵۱ ببعد) خاص طور پر چواس کے دوسری ترکی زبانوں سے تعلق کی جانب توجہ کی ہے (زبان کے نام کی جو صورت مصنف مذکور نے اختیار کی وہ "Čuwassisch" ہے)۔ 'چواس' ابتدائی ترکی زبان سے مشتق نہیں ہے، لیکن ترکی زبان اور چواس کی قدیم ترین شکل ایک ایسی زبان سے مشتق ہیں جو ''چواسی-ترکی زبان کی ابتدائی شکل'' ہے اور یہ سب قدیم منگولی زبان سمیت ''ایک قدیم ابتدائی التائی زبان سے مشتق ہیں''۔ مصنف نے اصلی 'چواسی-ترکی' زبان کے شاخوں میں بٹ جانے کو بہت احتیاط سے ہن قبائل کے مغرب کی جانب نقل وطن سے مربوط قرار دیا ہے - چواس مغربی ہنوں کی اولاد سے ہیں؛ لہذا ابتدائی 'چواسی-ترکی' زبان ہنوں کی زبان تھی - 'رے' کا 'زے' سے اور 'لام' کا 'شین' سے بدل جانا، جو (بخلاف زبان چواسی) ترکی زبان سے مختص ہے، چوتھی اور چھٹی صدی کے درمیان وقوع پذیر نہیں ہوا، جیسا کہ رامشٹٹ Ramstedt کا خیال تھا (*J. S. F. Ou.*، ۳۸ / ۱ : ۳۱)، بلکہ اس سے بہت پہلے، یعنی شاید سنۂ میلادی کے آغاز کے قریب، وجود میں آیا.

ٹومسن (V. Thomsen : *Z. D. M. G.*، ۷۸ : ۱۲۲) فرض کرتا ہے کہ لفظ ''ترک'' کا مفہوم ''قوت و بأس'' ہے (قب نیز مُلر F. W. K. Müller : *Uigurica*، ۲ : ۹۷ : ایرک ärk تورك türk ''قوت و بأس'')۔ کہا جاتا ہے کہ ''پہلے غالباً یہ صرف ایک قبیلے کا نام تھا، بلکہ یہ کہنا بہتر ہے کہ یہ ایک حکمران خاندان کا نام تھا'' - کتبوں میں لفظ تورك türk کا مفہوم بظاہر سیاسی ہے نہ کہ جنسی، عبارت ''میرے ترك، میرے لوگ'' (در Thomsen, i., E. 18 ; ii., E. 16; ii., S. 10) اسی طرف رہنمائی کرتی ہے - ترکوں کے ساتھ ساتھ اوغوز یا توقوز اوغوز (یعنی نو اوغوز، ان کے علحدہ علحدہ قبیلوں یا خاندانوں کی تعداد کے اعتبار سے) کا ذکر اکثر آیا ہے؛ کبھی اس حیثیت سے کہ وہ ترکوں اور ان کے حکمرانوں کے دشمن ہیں اور بعض مرتبہ خان کی قوم کی حیثیت سے، خصوصاً i., N. 4; ii., E. 30 میں، جہاں توقوز اوغوز کو خان ''اپنی قوم'' کہتا ہے اور اپنی حکومت کے خلاف ان کی سرکشی کو آسمان اور زمین کے تمام نظام و ترتیب کا درہم برہم ہو جانا قرار دیتا ہے - خان اور اس کے متبعین غالباً اصلاً اوغوز قوم کے لوگوں ہی سے تھے - جو اوغوز خان کے مخالف تھے وہ اس کی قیام گاہ کے شمال میں رہتے تھے جو جبال اُتوکان (Ötüken) کے قریب تھی (اُتوکان کے بارے میں اب دیکھیے نیز B. Vladimircov در *Comptes rendus de l'Acad.* etc.، ۱۹۲۹ء، ص ۱۳۳ ببعد)۔ اُتوکان بقول ٹومسن (*Z. D. M. G.*، ۷۸ : ۱۲۳) ''غالباً شمالی منگولیا میں اورخون کے دریائی نظام کے قریب موجودہ سلسلۂ کوہ ھانگائی Hangai کا ایک جزء تھا''۔ اویغور لوگوں کا ذکر بھی شمالی منگولیا میں آیا ہے، گو صرف ایک ہی فقرہ (ii., E. 37) ان کے متعلق ہے، بدیں مضمون کہ وہ دریاے سلنگا (Selegna) کے کنارے پر آباد ہیں - ترکوں کے اوغوزی دشمنوں کا حدود ۶۸۰ء میں اپنا علحدہ قاغان Kaghan تھا، جو شہنشاہ چین کا باج گزار تھا، آٹھویں صدی میں اس کا کچھ ذکر نہیں آتا -

امیر اویغور کے لقب میں ادّعاے بزرگی کمتر تھا ۔ اسے اِلتِبِر eltäbir کہتے تھے (مثلاً دیکھیے ii., E. 38)؛ کتبوں میں عبارت ''قاغانلیغ بودون'' kaghanlïgh budun ''لوگ جو قاغان کے تحت تھے'' (مثلاً i., E. 9, ii., E. 9) اور ''اِلتِبِرلیغ بودون'' ''لوگ جو اِلتِبِر کے زیرنگیں تھے''، (مثلاً ii., E. 38) ان دونوں کے مابین تضاد دکھایا گیا ھے ۔ علاوہ اس ترکی قاغان کے جو مشرق میں (مگر چینی نقطۂ نظر سے شمال میں) تھا، ایک اور ترکی قاغان تورگِش (Türgish یا تُرگِش Turgesh) مغرب میں بھی موجود تھا ۔ عربی مآخذ (طبری، ۲ : ۱۵۹۳) جہاں شہر نَوَاکِث کا ذکر کیا گیا ھے؛ اس کی جاے وقوع کے لیے دیکھیے B. G. A.، ج ۶، [یعنی ابن خُرداذبه] متن، ص ۲۹ و ۲۰۶) اور چینی مآخذ سے ھمیں یہ پتا چلتا ھے کہ اس کی قیام گاہ دریاے چو Ču [رَكَ بآن] کے کنارے تھی ۔ ان کے قبیلوں کی تعداد کی مناسبت سے اس کی رعایا کے لوگ ''اون اوق'' on ok ''دس تیر'' کہلاتے تھے ۔ ایک تیسرا ترکی قاغان بھی تھا؛ یعنی قاغان قِیرغیز [رَكَ بآن] جو دریاے یِنِیسے کے کنارے آباد تھے ۔ خان، جو کتبوں میں مذکور ھے، دعوے کرتا ھے کہ اس نے خود امیر قِیرغیز کو قاغان کا خطاب دیا تھا (i., E. 20; ii., E. 17) ۔ یہ خیال کہ خان (قاغان) بننے کے لیے اس خطاب کا کسی دوسرے خان کی طرف سے ملنا ضروری تھا مسلم مآخذ میں بھی موجود ھے (عوفی در بارتولڈ : Turkestan v epokhu mongol'skago nashestviya، ۱ : ۹۹) ۔

''مغربی ترکوں کے مشرق میں اور ان کے علاقے کے اندر تک کوہ اِلتائی اور دریاے اِرتِش کے بالائی مجری کے مابین'' (بقول تومسن : Z. D. M. G.، ۷۸ : ۱۴۲) قَرلُق Karluk رہتے تھے، جن کے ترکی الاصل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ۔ ۷۶۶ء میں مغربی ترکوں کے علاقے ان کے ہاتھ میں چلے گئے ۔ اس وقت ان کے حاکم کا ترکی لقب (کنارِ سیر دریا (سیحون) کے قبیلے اوغوز کے حاکم کے لقب کی طرح) یبغُو yabghu تھا (اصلاً 'یبغو' طخاری لفظ ھے، قب مارکارٹ Ērānšahr، ص ۲۰۳؛ W. Bang در Ung. Jahrb.، ۶ : ۱۰۲، حاشیہ ۳) ۔ یہ کلمہ ایک امیر کے لقب کے طور پر کتبات اورخون میں بھی آیا ھے ۔ اس وقت (کم از کم مشرق میں) وہ تنہا ترکی قوم جو ایک جگہ مقیم ہوکر زندگی بسر کر رھی تھی بیش بلق [رَكَ بآن] کے بسمیل تھے ۔ ان کے حاکم کا لقب ''ایدق.قوت'' ''مقدس صاحب الجلالة'' تھا (ii., E. 25) ۔ بیش بلق ھی کے علاقے میں امیر اویغور کا بھی تیرھویں صدی میں یہی لقب تھا؛ جب کہ اس کی اصل فراموش ہو چکی تھی ۔ یہی وجہ ھے کہ اس کی تشریح کے لیے رشیدالدین اور ابوالغازی کو زور لگانا پڑا، قب وہ اقتباسات جو کُودتکُوبیلِک(۱) طبع راڈلوف میں درج ھیں (حصۂ اول، ص xxvii و xxxix) ۔ بظاہر گرُون ویڈل A. Grünwedel نے ٹھیک اسی علاقے میں لوگوں کو اس کلمے کو 'ایدیکوت' تلفظ کرتے سنا تھا؛ اسی لیے ان کھنڈروں کا نام، جو تورفان میں ھیں، ایدیکوت شہری ہو گیا (گرون ویڈل : Berichte über archäologische Arbeiten in Idikutschari und Umgebung، میونخ ۱۹۰۵ء) ۔ تومسن (Z. D. M. G.، ۷۸ : ص ۱۴۱) بسمیل کا حال محض یوں بیان کرتا ھے : ''ایک قبیلہ جو ترکوں سے قرابت رکھتا تھا'' ۔ ان کا خالص ترکی نہ ہونا بظاہر ان کے نام ھی سے عیاں ہو جاتا ھے ۔ ارِستوف Aristow (Zam'etki ob etničeskom sostav'e tyurkskikh plemen،

(۱) ''قوتادغو بیلیگ'' در طبع استانبول ۱۹۴۳ ۔

سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۷ء، ص ۹۱ ببعد) نے بتایا ہے کہ بقول ڈوکانگ Ducange (*Glossarium ad scriptores mediae et infimae graecitatis*) بوزنطہ (Byzantium) میں ایک فرانسیسی باپ اور یونانی ماں کے بچے بسمول Basmoule یا گسمول Gasmoule کہلاتے تھے۔ گیارھویں صدی میں بھی محمود کاشغری کی تصنیف (۱ : ۳۰) میں 'بسمل' Basmil کا ذکر ان اقوام میں کیا گیا ہے جن کی اپنی ایک (غیر ترکی) زبان ہے، اگرچہ وہ ترکی بھی [اچھی طرح] جانتے ہیں .

دوسری قومیں، بالخصوص تاتار، جن کا ذکر کتبوں میں کیا گیا ہے، غالباً ترك نہیں تھیں، اگرچہ ترکی اعداد، مثلاً اوتوز (۳۰) اور طوقوز (۹) ان کے ناموں کے شروع میں لگے ہوے ہیں، جیسا کہ ٹومسن (*Z. D. M. G.*، ۷۸ : ۱۴۳) بجا طور پر کہتا ہے ، وہ '' بلا شبہ منگول قومیں '' تھیں.

۷۴۵ء کے قریب منگولیا کی حکومت اوغوز ('' اتراك '') کے ہاتھوں سے نکل کر اویغور کو مل گئی، جن کے حکمران نے اس کے بعد سے قاغان کا لقب اختیار کر لیا ۔ اس قاغان کے خاندان کی حکومت ۸۴۰ء تک رہی ۔ اس عہد کے کتبے بھی ہمارے پاس موجود ہیں، جن میں وہ کتبہ بھی شامل ہے جسے رام شٹیٹ Ramstedt نے شائع کیا (*J. S. F. Ou.*، ۳۰ : ۳)، یعنی اس قاغان کا جس نے ۷۴۶ء سے ۷۵۹ء تک حکومت کی ۔ یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اویغور Uighur لوگ اوغوز کے قبائلی وفاق میں شامل تھے اور یہ کہ کلمات اوغوز اور اویغور میں محض خفیف سا فرق ہے، جیسا لہجوں یا بولیوں میں ہوا کرتا ہے اور ٹومسن بھی اس خیال سے متفق ہے (دیکھیے *Z. D. M. G.*، ۷۸ : ۱۲۸ ببعد)؛ تاہم کتبۂ مذکور سے اس کی تائید نہیں ہوتی ؛ بلکہ اویغور کا ذکر ایک جداگانہ وفاق کے طور پر کیا گیا ہے، جو اوغوز سے علحدہ ہیں ۔ قاغان اپنے آپ کو '' اون (۱۰) اویغور '' اور '' توقوز [۹] اوغوز '' پر حکمران بتاتا ہے؛ اگرچہ چینی مآخذ کی رو سے اویغور کے قبیلوں کی تعداد بھی نو تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اوغوز منگولیا میں اویغور حکومت کے تحت رہ گئے اور بعض دوسرے مغرب اور جنوب کی سمت ہجرت کر گئے ۔ مؤخرالذکر میں قبیلۂ چول (*Čöl* چینی رسم الخط میں چئویو Č'u-yue چینی ترجمے میں شاتئو Sha-t'o ، یعنی ''ریگستان'') بھی شامل تھا، جو ابتداءً مغربی ترکوں میں سے تھا ۔ ساتویں صدی میں شاتئو Sha-t'o جھیل برکول (والصواب : برسکول) کے کنارے آباد تھے، جہاں وہ تبتیوں کے حملوں کی زد میں تھے؛ پھر مؤخر تر زمانے میں (۷۱۲ء سے) کچھ اور مغرب کی طرف بیش بلق کے علاقے میں رہتے تھے ۔ ۸۰۸ء کے بعد تبتیوں نے انہیں وہاں سے بھی نکال دیا اور انھیں چینی علاقے میں جانا پڑا ۔ چین کی تاریخ میں ان کی زیادہ تر شہرت ہؤانگ چاؤ Huang-Čao کی بغاوت (۸۷۷ - ۸۸۳ء) کو فرو کرنے کے سلسلے میں ہے ۔ مسلم مآخذ میں یہ بات تغزغز [ترك بان] قبیلے سے منسوب کی گئی ہے ۔ دسویں صدی میں ہونان کے صوبے میں شاتئو Sha-t'o ترکوں نے تین حکمران خاندانوں کی بنا ڈالی، جن کی حکومت قلیل عرصے تک رہی (''مؤخر تانگ'' the Later T'ang، ۹۲۳ تا ۹۳۶ء، ''مؤخر تسین'' the Later Tsin، ۹۳۶ تا ۹۴۶ء اور ''مؤخر ہان'' the Later Han، ۹۴۷ تا ۹۵۱ء) .

قرہ بلغاسون Karabalgasun کے چینی کتبے میں، جو اویغور قاغان (م ۸۲۱ء) نے کندہ کرایا تھا، اویغوروں کے مذہب مانی کو اختیار کرنے کا ذکر ہے ۔ اس مذہب سے اویغوروں کی واقفیت لو-ینگ Lo-Yang کے شہر

میں (ھونان کے قریب) ھوئی، جہاں وہ ۷۶۲ء میں چینیوں کے خلاف ایک مہم کے سلسلے میں گئے تھے ۔ وہاں سے واپسی کے وقت وہ اپنے ساتھ چار مانوی مبلّغوں کو اپنے وطن (منگولیا) لے گئے ۔ ''وہ ملک جہاں رسم و رواج وحشیانہ تھے اور خون کی بو آتی تھی'' ''ایک ایسے ملک میں تبدیل ھونے'' کو تھا ''جہاں لوگ سبزی ترکاری پر زندگی بسر کریں اور وہ سر زمین جہاں انسان ایک دوسرے کو قتل کیا کرتے تھے، ایک ایسی سر زمین میں تبدیل کی جانے کو تھی جہاں لوگ ایک دوسرے کو نیکی کی ترغیب دیں'' (*J. A.*، ۱ : ۱۹۳) ۔ بدھ مت اور شامی (بالخصوص نسطوری) عیسائیت نے اس زمانے میں چین میں اور ترکوں میں ایک پُر جوش مبلّغانہ سرگرمی دکھانا شروع کر دی ۔ اکتشافی مہمیں، جو چینی ترکستان گئیں، انھیں کئی ایسی ناتمام ترکی عبارتیں ملی ھیں جن سے اس سرگرمی کی تصدیق ھوتی ھے، لیکن بظاھر قرہبلغاسون کا کتبہ ھی ایک ایسا وثیقہ ھے جس میں ایک ترکی حکمران کے ان مذھبوں میں سے ایک کو قبول کرنے کا ذکر باقی رہ گیا ھے ۔ معلوم ھوتا ھے کہ خاص طور پر سُغدیوں [قبّ سُغد] نے چینیوں اور ترکوں کے درمیان مانویت کی اشاعت کی ۔ چینی کتبے کے علاوہ ایک اور مختصر سا کتبہ موجود ھے، جس کی زبان کو پہلے اویغوری تصور کیا جاتا تھا، لیکن اب اسے مُلر (W. K. Müller) نے سُغدی تسلیم کیا ھے (*Ein iranisches Sprachdenkmal aus der nördlichen Mongolei*، در *S. B. Pr. Ak. W.*، ۱۹۰۹ء) ۔ بقول گوثیو (R. Gauthiot: *Essai de Grammaire sogdienne, Première partie, Phonétique*، پیرس ۱۹۱۴-۱۹۲۳ء، ج ۱۳) ۔ اس کتبے کی زبان ''مختصراً قدیم‌ترین اور پایدارترین سغدی روایت ھے'' ۔ صغدی خط کی ترقی یافتہ صورت اویغور خط ھے، جسے آگے چل کر، غالباً نویں صدی میں، قدیم ترین ترکی رسم‌الخط، یعنی اُورخون کتبوں کے رسم‌الخط کی جگہ لینا تھی ۔ اویغور رسم‌الخط کو منگولوں نے تیرھویں صدی میں اختیار کیا ۔ مغولی سلطنت کے زمانے میں یہ خط منگولیا سے لے کر جنوبی روس اور ایران تک سب ملکوں میں مستعمل تھا .

۸۴۰ء کے قریب قیرغیزوں نے اویغوروں کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا ۔ اُن اویغوروں نے، جو منگولیا سے نکالے گئے، نویں صدی کے قریب دو نئی سلطنتوں کی بنیاد رکھی : ایک کانچو میں [دیکھیے مادۂ کانسو، بہتر تلفّظ کانچو] اور دوسری بیش بلیق اور قراخوجہ میں ۔ مانویوں کا ذکر ان دونوں سلطنتوں میں نیز ختن میں دسویں صدی میں آتا ھے (*J. A.*، ۱۱/۱ : ۲۶۵ ببعد) .

بیش بلیق اور قراخوجہ کے حکمران نے چین کے شہنشاہ کے خلاف (مسعودی : مروج، ۱ : ۳۰۰ ببعد) اور سامانی حکمران کے خلاف (فہرست، ص ۳۳۷) اپنے ھم مذھبوں کی مدافعت کا ذمہ لیا ۔ بیش بلیق اور قراخوجہ میں مانویت غالباً اویغوروں کے پیشروؤں، یعنی توقوز اوغوز کے زمانے ھی میں پھیل چکی تھی ۔ تمیم بن بَحْرالمُطّوعِی، جس سے یاقوت (معجم، ۱ : ۸۴۰، فوق) نے استشہاد کیا ھے اور جس سے یقیناً ابن خُرداذبہ (*B.G.A.*، ج ۶ متن، ص ۳۰ ببعد) نے بھی استفادہ کیا ھے، بظاھر اویغور کے علاقے میں نہیں بلکہ خاص بلاد تُغزغز (توقوز اوغوز) میں پہنچا تھا .

اس زمانے میں مانوی، بالخصوص خاقان (''قاغان'') کے دارالسلطنت میں بر سر اقتدار تھے ۔ دارالسلطنت سے مغرب کے علاقے میں بھی مانوی موجود تھے، لیکن وھاں زرتشتیوں کی آبادی ان سے زیادہ تھی ۔ یہ کہ شَوان Chavannes اور پیو

Pelliot (*J.A.*، ۱۱/۱: ۲۶۹) کے مفروضے کے مطابق اس علاقے کو، جو اب چینی ترکستان کہلاتا ہے، ترکی تہذیب کے قالب میں ڈھالنے کا کام سب سے پہلے زیادہ‌تر ("en grande partie") اویغور ہی نے انجام دیا، مشتبہ امر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ عمل اویغور کے پیشرووں ہی کے زمانے میں معتدبہ ترقی کر چکا ہو۔ عرب کاشغر اور ان سب ممالک کو، جو اس کے مشرق میں ہیں، ابتداء ہی سے خالص ترکی علاقے سمجھتے رہے ہیں۔

مذکورۂ بالا دو ترکی سلطنتوں میں سے ایک (کانچووالی) پر ۱۰۲۸ء میں قبیلۂ تنگت Tanguts کا قبضہ ہو گیا اور دوسری عہد مغول تک بھی باقی رہی۔ ۹۲۴ء میں کانچو کے اویغوروں کے سامنے قتائی [قب قرہ‌ختای] سلطنت کے بانی اپاؤکی Apaoki نے، جس نے اس سے کچھ عرصہ پہلے قیرغیزوں کو منگولیا سے نکال باہر کیا تھا، یہ تجویز پیش کی کہ وہ دریاے اورخون کے کنارے اپنے قدیم گھروں میں واپس آ جائیں، لیکن اویغور اس وقت تک اپنے نئے وطن کے حالات و ماحول سے مانوس ہو چکے تھے اور دوبارہ خانہ‌بدوش بننا نہیں چاہتے تھے (E. Bretschneider: *Mediaeval Researches from Eastern Asiatic Sources*، ۱: ۲۶۳؛ مارکار: *Guwaini's Bericht über die Bekehrung der Uighuren* در *S. B. Pr. Ak.*، ۱۹۱۲ء)۔

قیرغیز پر قتای کی فتح یابی در حقیقت منگولیا میں ترکی حکومت کے خاتمے اور منگول حکومت کے آغاز کی نشان دہی کرتی ہے۔ قیرغیز ترکی النسل قوموں میں سے آخری قوم تھے، جو منگولیا میں آباد رہے اور تنہا ایسے جن کی یاد اب تک وہاں باقی رہ گئی ہے؛ چنانچہ منگولیا میں منگول عہد سے پہلے کی سب قبریں "قیرغیز قبریں" (خیرگیز اُر khirgiz ür) کہلاتی ہیں۔ اتوکان Ötükän کی پہاڑیاں، جن کا ذکر اورخون کتبوں میں اس حیثیت سے آیا ہے کہ وہ بلادِ ترک میں سے ہیں ἴδιος χατ'، بقول محمود کاشغری (دیوان لغات الترک، ۱: ۱۲۳ [طبع انقرہ، ۱: ۱۳۸]) وہ "فیافی تتار" (steppes) میں تھیں۔

اس وقت سے شروع کر کے شعوبِ اتراک کے زیادہ‌تر حوالے مسلم مآخذ میں ملتے ہیں۔ قدیم‌تر زمانے کے بارے میں بھی جو معلومات ترکی کتبوں اور چینی سال ناموں (annals) میں درج ہیں، مغربی مآخذ سے اکثر ان میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بوزنطی ذرائع سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۵۷۶ء میں ترکوں نے خاکنای کریمیا (Tauric Bosporus) کو فتح کر لیا۔ ۵۸۱ء میں وہ خرسون Chersonesus کی دیواروں کے سامنے پہنچ گئے، لیکن جزیرہ نماے کریمیا (Tauric Peninsula) پر ان کی حکومت زیادہ عرصے تک نہیں رہی۔ ۵۹۰ء کے قریب وہاں بوزنطی حکومت دوبارہ قائم ہو چکی تھی (A. Vasil'yev در *Izv. Akad. Mater. Kul'turï*، ۵: ۱۸۵ ببعد)۔

۵۶۸ء سے ۵۹۸ء تک کے وقائع کے لیے بوزنطی Byzantine مآخذ بھی موجود ہیں۔ (۵۶۸ء میں زمرخوس Zemarchos کی سرکردگی میں ترکوں کے پاس بوزنطی سفارت بھیجی گئی اور ۵۹۸ء سے وہ خطوط متعلق ہیں، جو ترکی قاغان نے شہنشاہ موریس Maurice کے نام لکھے، ملاحظہ ہو ان خطوط کا جدید ترین مطالعہ جو شوان E. Chavannes نے بعنوان *Documents sur les Tou-Kiue [Turcs] occidentaux*، شائع کیا ہے، طبع سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص ۲۲۳ ببعد)۔

بوزنطی ایلچیوں میں سے صرف پہلے (زمرخوس) نے دریاے والگا (نہر اتل) کو عبور کیا اور مغربی ترکوں کے قاغان کی

قیام گاہ میں پہنچا، جو شوان کی تصریح کے
مطابق شہر کوچا Kuča کے شمال میں آق تاغ
(سفید پہاڑوں) میں تھی ۔ ساسانیوں کے خلاف
مشترکہ فوجی مہموں کے بارے میں اکثر گفت و
شنید ہوتی رہی، لیکن کوئی دیرپا اتحاد قائم
نہ ہوا ۔ چند ہی سال کے بعد ترک بوزنطیوں اور
ایرانیوں دونوں سے جنگ میں مصروف ہو گئے ۔
جب ترکوں نے قوم الان [دیکھیے اللان] کو فتح
کر لیا تو ساسانی سلطنت کی حدیں ترکی علاقے سے نہ
صرف وسطی ایشیا میں بلکہ بحر خزر کے مغرب میں
بھی آ ملیں ۔ غالباً یہی وہ ترک تھے جن کے خلاف
دربند [رک بآن] کی سدیں تعمیر کی گئیں ۔ خزر نے
ترکی خانہ بدوش سلطنت کی روایت کو برقرار رکھا ۔
انھوں نے ساتویں صدی میں بہت قوت حاصل کر لی
[دیکھیے مادۂ بلغار اور خزر]، بعینہ، جیسے بعد
کے زمانے میں آلتون اردو (Golden Horde) نے
چنگیز خان [رک بآن] کی سلطنت کی روایات کو قائم
رکھا ۔ چھٹی صدی کے فاتحین کی زبان نے مشرق
یورپ میں اس سے زیادہ اثرات نہیں چھوڑے جتنے
منگولی زبان نے بلاد آلتون اردو میں چھوڑے
ہیں ۔ بلغار اور خزر کی زبان ترکی کی مذکورۂ بالا
قدیم تر قسم سے متعلق ہے، جس کی نمایندگی اب
محض چواس Čuwass اور مجر Magyar زبان کے
ترکی عناصر کرتے ہیں؛ خالص ترکی زبان یورپ میں
نویں صدی کے آخر کے قریب پچنگ Pečenegs کے
ذریعے آئی ۔

بحر خزر کے مشرق کے علاقوں میں بھی
ساسانیوں نے اپنے ترک ہمسایوں کے خلاف مدافعتی
قلعے تعمیر کیے ۔ صوبۂ جرجان [رک بآن] کی حفاظت کے
لیے آجری سد ('حائط من آجر') بنائی گئی، لیکن یہ
ترکوں کے فاتحانہ حملے کی روک تھام نہ کر سکی
(بلاذری، ص ۳۳۶؛ B. G. A.، ج ۶ [ابن خرداذبہ]:
متن ص ۲۶۱ ببعد)؛ دریاے گرگان Gürgen کے داھنے
کنارے پر اس دیوار کے باقی ماندہ آثار آج کل قزیل
آلان کہلاتے ہیں (ان آثار کے حالات کے لیے دیکھیے
مثلاً I. Poslawskiy، در *Protokoll Turk Kružka*
Lyub. Arkh.، ۵ : ۱۸۵) ۔ جرجان اور طبرستان
[رک بآن] کی درمیانی سرحد پر ایک اور دیوار تعمیر
کی گئی، وہ بھی پختہ اینٹوں ['آجر'] کی تھی ۔ یہ
غالباً اس لیے بنائی گئی کہ صوبۂ جرجان ہاتھ
سے نکل گیا تھا ۔ یہ دیوار خسرو انوشیروان کی طرف
منسوب کی جاتی ہے (*B. G. A.*، ۷ [ابن رستہ] :
۱۵۰) ۔ ۹۸ھ (۷۱۶ ـ ۷۱۷ع) میں عربوں اور
ترکوں کے درمیان جنگ کے دوران میں جرجان
کے ترکوں کی قیادت دھستان کے دھقان صول
نامی نے کی تھی (طبری، ۲ : ۱۳۲۰) ۔ یہاں
صول یقیناً ایک ترکی اسم علم یا لقب ہے، جو غالباً
ترکی لفظ چور *Čur* کے بجاے استعمال ہوا ہے ۔
ساسانی عہد میں ترکوں کے خلاف جو جنگ ہوئی،
اس کا حال بیان کرتے ہوے طبری کی ایک عبارت
میں لفظ صول ایک قوم کے نام کے طور پر استعمال
ہوا ہے اور اس پر مارکار نے (*Ērānšahr*، ۵۱ و
۷۳) قبیلۂ چول کے لوگوں کے بارے میں
اپنے خیالات کو مبنی کیا ہے (دیکھیے نیز
بذیل جرجان)، لیکن یہ بیان غالباً
علاقۂ گرگان کے متعلق نہیں ہے، اس لیے کہ
صول کا ذکر الان Alans کے ساتھ ہوا ہے
(طبری، ۱ : ۸۹۵) ۔ ایک متأخر مأخذ کی رو سے
(اغانی، ۹ : ۲۱) رود گرگان کے [فلاں اور فلاں]
ترکوں نے ایرانیوں کی زبان اور ان کا مذہب اختیار
کر لیا تھا ["تمجسا و تشبّھا بالفرس"]؛ اس لیے
ساسانیوں ہی کے زمانے میں غالباً چھٹی ہی صدی
میں وہ اس علاقے کو فتح کر چکے ہوں گے،
گو کتاب الأغانی میں انھیں لوگوں (صول اور اس

کے بھائی فیروز) کا ذکر اس حیثیت سے ہوا ہے کہ وہ ان بلاد کے فاتح ہیں اور عربوں کے خلاف جنگ آزما ہیں۔

آمو دریا [رک بآن] کے جنوب میں جو محاربات ہوئے ان میں عموماً ترک غالب رہے ۔ مارکار (*Erānšahr*، ص ۵۳ وغیرہ) اور اس کے اتّباع میں شوان (Chavannes (*Documents* etc.، ص ۲۵۲) نے ثابت کیا ہے کہ اس زمانے میں ساسانی سلطنت کی انتہائی شمالی سرحد دریاے مرغاب تھا ۔ اسی علاقے میں کچھ عرصے بعد آخری ساسانی اور ان کے سرپرست ترک عربوں کے خلاف معرکہ آرائی میں اتنے زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے ۔ اس جنگ کے بیانات میں صرف "ترکوں" کا ذکر ہے، الگ الگ ترکی قبائل کا ذکر نہیں ہے ، باستثناے جبغوی قبیلۂ قرلق کہ اس کا ذکر ۱۱۹ھ (۷۳۷ء) کے واقعات میں کیا گیا ہے (قب طبری، ۲ : ۱۶۱۲ حاشیۂ صفحہ — قرلق کا نام عربی میں خرلخ اور فارسی میں خلخ لکھا جاتا ہے)۔ زیادہ تر اسی سردار کو "طخارستان [رک بآن] کا جبغو" ("جبغویه الطخاری") کہا گیا ہے ؛ اس سے ثابت ہے کہ اس وقت تک قرلقوں کی ایک جماعت ان علاقوں میں، جو آمو دریا کے جنوب میں واقع ہیں ، پہنچ گئی تھی، جہاں وہ اب تک بھی موجود ہیں (اب انھیں اوزبکوں کا ایک منفرد خاندان تصور کیا جاتا ہے) ۔ عربی سفارتیں امن و آشتی کی مہمات پر ترکوں کے پاس بھیجی گئیں؛ مثلاً خلیفہ ھشام (۱۰۵ - ۱۲۵ھ / ۷۲۴ - ۷۴۳ء) کے بارے میں روایت ہے کہ اس نے "ترکوں کے بادشاہ" کو دعوت اسلام دی تھی ۔ بد قسمتی سے اس تبلیغی سفارت کے متعلق ایک ھی بیان محفوظ ہے (یاقوت : معجم، ۱ : ۸۳۹ ۔ یاقوت کا مأخذ ابن الفقیه ہے ؛ قب *Bulletin de l'Acad.* etc.، ۱۹۲۴ء، ص ۲۴۲) اور اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس بادشاہ کا دارالسلطنت کہاں تھا ۔

علٰحدہ علٰحدہ ترکی شعوب اور ان کے عادات و اطوار کے زیادہ تفصیلی حالات ہمیں صرف تیسری (نویں) صدی کے اور بالخصوص چوتھی (دسویں) صدی کے عرب جغرافیہ نگاروں سے ملتے ہیں ۔ اس جغرافیائی ادب میں "ترک" کا نام محض شعوب کے ایک گروہ یا زبانوں کی ایک شاخ کے لیے استعمال ہوا ہے، نہ کہ اورخون کتبوں اور چینی تواریخ کی طرح ایک ھی شعب یا مملکت کے لیے ۔ خصوصیت سے پانچ شعوب کا ذکر کیا گیا ہے (*B. G. A.*، ۱ [ابو زید البلخی] : ۹) جو ایک ھی زبان بولتے تھے اور ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے : تغزغز [رک بآن]، خرخیز (قیرغیز ، رک بآن)، کیماك [قب Kımäk]، غز [رک بآن] یعنی اوغوز اور خرلخ یعنی قرلق [رک بآن] ۔ آج کل کی طرح بالائی ینسے Yenisei کے علاقے اس زمانے میں بھی ترکوں کی سر زمین کی شمال مشرق حد تھے اور انھیں علاقوں میں اس دنیا کی بھی حد قائم ہوتی تھی، جس سے عرب واقف تھے ۔ عرب نقطۂ نظر کے مطابق قیرغیز، جو اس وقت باقی سب ترکی شعوب کے مقابلے میں انتہائی شمال مشرق میں آباد تھے، سمندر تک پھیلے ہوئے تھے ۔ اویغور اور قرلق وسطی ایشیا میں بلادِ اسلام کے نزدیک ترین ہمسائے تھے ۔ اوغوز کا علاقہ مغرب کی سمت میں فاراب [رک بآن] اور اسبیجاب (موجودہ سیرام در حدود چمکنت [رک بآن]) تک جرجان کے مسلم علاقوں سے متصل تھا ۔ مشرق رخ پر اور زیادہ مشرق میں قرلق رہتے تھے ۔ چین جانے کے لیے قرلق اور تغزغز کے علاقوں میں سے گذرنا لازمی تھا ۔ پہلے فرغانہ [رک بآن] کی سرحد سے شروع کر کے بلادِ قرلق میں بلادِ تغزغز کی

سرحد تک تیس دن کا سفر کرنا ہوتا تھا؛ اس کے بعد تقریباً دو ماہ کا سفر بلادِ تُغُزغُز میں کر کے چین میں سے ہوتے ہوئے ساحلِ بحر تک پہنچتے تھے (.B. G. A، ۲ [ابن حوقل]: ۱۱، دوسرے بیانات اس سے مختلف ہیں) ۔ ابن خُرداذبہ (.B. G. A، ۶: ۲۸ ببعد) نے دو اور قوموں کے نام بھی لیے ہیں: قرلُق کی سرمائی قیام گاہ (قِشلاق) سے تھوڑے ہی فاصلے پر طَراز (موجودہ اولیا اَتا، (رِکَ بان)) کے مشرق میں خَلَج کے سرمائی مساکن تھے (خَلَج کے لیے دیکھیے مادۂ خَلَج، مگر اس مادّے میں اس شعب کی صرف جنوبی شاخ سے بحث کی گئی ہے ۔ ان خلجوں کے لیے، جو ایران کی طرف منتقل ہو گئے تھے، دیکھیے مادۂ ساوہ) ۔ طَلاس Talas اور چُو Ču دریاؤں کے درمیان 'چُو سے قریب تر' تُرگِش Türgesh کے خاقان کا شہر تھا ۔ فارسی مآخذ میں سے حدود العالم اور گردیزی [رِکَ بان] میں مزید معلومات ہیں، ان مآخذ کی رو سے تُرگِش کے دو حصے تھے: تُخْسی (بضبط محمود کاشغری) اور اَزْ ۔ تُخْسی دریائے چو [رِکَ بان] کے کنارے آباد تھے ۔ سُویاب کا شہر ان کے علاقے میں تھا ۔ ان کے مشرق میں جھیل اِسِگ کُول [رِکَ بان] پر چِگِل آباد تھے (چِگِل کا تلفّظ اس قصے سے ثابت ہے جس میں ایک مقبولِ عام اشتقاق مذکور ہے اور جسے محمود کاشغری، ۱: ۳۳۰ نے نقل کیا ہے) ۔ دریائے نَرِین [دیکھیے مادۂ سیر دریا] کے جنوب میں یغما آباد تھے، جو تُغُزغُز کی ایک شاخ تھے ۔ ان کا بادشاہ اس شعب (تغزغز) کے شاہی خاندان کی اولاد میں سے تھا ۔ شہر کاشغر ان کے علاقے میں تھا ۔ بقول محمود کاشغری (۱: ۸۰) یغما اور تُخْسی دریائے ایلی [رِکَ بان] کے کنارے آباد تھے اور اسی طرح چِگِل کا ایک حصہ بھی وہیں آباد تھا ۔ اصطلاح "تُخْسی۔چِگِل" ([کاشغری]، ۱: ۳۰۴ [ترجمۂ ترکی، ۱: ۳۲۳]) بھی پائی جاتی ہے ۔ چِگِل تین حصوں میں منقسم تھے ۔ علاوہ ان چِگلوں کے جو ایلی کے دونوں کناروں پر آباد تھے، کچھ چِگِل کاشغر کے قریب دیہات میں موجود تھے اور کچھ طَراز کے قریب ایک چھوٹے سے شہر یا قلعے میں جو چِگِل کہلاتا تھا ۔ آخر الذکر مقام ارضِ اوغوز کے قریب تھا اور وہ اکثر اس کا محاصرہ کر لیتے تھے ۔ اس لیے اوغوز ان سب ترکوں کو جو آمو دریا سے چین تک سکونت رکھتے تھے چِگِل کہتے تھے ۔ اسی مفہوم میں بعض اوقات خود کاشغری نے یہ لفظ استعمال کیا ہے ۔ اس کی سند موجود ہے کہ لفظ یَرلِیغ (فرمان)، جس سے ثقافت کے ایک خاص درجے کا اظہار ہوتا ہے، چِگِل کی زبان میں تھا، اوغوز کی زبان میں نہ تھا (۳: ۳۱ [ترجمۂ ترکی، ۳: ۴۲]) ۔ یغما کو قرایغما (سیاہ یغما) بھی کہتے تھے، طَراز کے قریب یَغْما نام کا گاؤں بھی تھا (۳: ۲۵ ببعد) ۔ جغرافیے کی کتابوں میں لفظ "تُرکمان" سب سے پہلے مقدّسی کی دو عبارتوں میں وارد ہوا ہے (.B. G. A، ۳ [مقدّسی]: ۲۷۴ ببعد)، مگر ایسے مفہوم میں جو پوری طرح سے معیّن اور یقینی نہیں ۔

مقدّسی نے سیر دریا کے کنارے سُوران سے نیچے بَلاج اور بَرُوکَت نامی شہروں کا ذکر کیا ہے "جو ترکمانوں کے خلاف سرحدی چوکیاں (ثَغْر) ہیں" ۔ ترکمانوں نے اس وقت تک "ڈر کے مارے" اسلام قبول کر لیا تھا ۔ ایک دوسری عبارت میں اس علاقے میں جو طلاس اور چُو کے درمیان تھا؛ یعنی قَرلُقوں کے علاقے میں "مُلک الترکمان" کا ذکر کیا گیا ہے، جو باقاعدگی کے ساتھ صاحبِ اِسْبِیجاب کو

هدایا بھیجا کرتا تھا ۔ کاشغری یہ بھی کہتا ہے کہ نہ صرف اُغز (۱ : ۲۷ و ۵۶؛ ۳ : ۳۰۴) بلکہ قُرلُق (۱ : ۳۹۳) بھی ترکمان کہلاتے تھے ۔ معروف اشتقاق شائع، جو رشیدالدین نے دیا ہے (*Trudī Vost. Otd. Arkh. Obshč.*، ۷ : ۲۶ پایین صفحہ : ["ترکمان اند = مُشابِهُونَ للترک"] "ترک مانند" یعنی ترکوں کے مشابہ)، کاشغری کے زمانے میں بھی پایا جاتا ہے (۳ : ۳۰۷)؛ جیسا کہ ہِیرتھ (F. Hirth) (*S. B. Bayr. Akad.*، ۱۸۹۹ء، ۲ : ۲۶۳ ببعد) نے ہمیں بتایا ہے لفظ ترکمان، جو چینی رسم الخط میں تو۔کو۔مونگ Tö-kü-möng ہے، اس سے بہت پہلے آٹھویں صدی میلادی میں دائرۂ معارفِ تونگ۔تین T'ung-tien میں مذکور ہوا ہے ۔ یہاں بھی اس کلمے کا اشارہ مغرب ہی کی طرف، یعنی الان (Alans) کے علاقے کی جانب ہے ۔ ممکن ہے کہ اوغوز یا ترکمان (یہ دونوں، نام گیارھویں صدی ہی سے ہمیں مختلط طور پر بلا تمییز استعمال ہوتے نظر آتے ہیں) ان خانہ بدوش ایرانیوں کی اولاد ہوں جنھوں نے ترکی طور طریقے اختیار کر لیے تھے اور اس سے ان کے سروں کی مخصوص مستطیل ساخت (dolychocephalic) کی توجیہ ہو جاتی ہے ۔

آیا غیر ترکی، شاید مغول، شعوب نے بھی ترکوں کے ساتھ مغرب کی سمت ہجرت کی؟ اس کی ابھی تحقیق و تفتیش ہونا باقی ہے ۔ کیماک کے سات قبائل میں تاتار کا شمار بھی ایک قبیلے کی حیثیت سے ہوا ہے (گردیزی در بارٹولڈ : .*Otčet* etc، ص ۸۲)، مگر انھیں قبائلِ تغزغز میں کا ایک قبیلہ بھی قرار دیا گیا ہے (کتاب مذکور، ص ۳۴) ۔ شعوبِ ترکیہ، ان کے علاقوں، ان کی زبانوں اور بولیوں کا مفصل بیان، بشمولیت ان عناصر کے جو خالص ترکی نہیں ہیں، سب سے پہلے محمود کاشغری نے لکھا ہے، لیکن بظاہر اس کا بیان ہر موقع پر قابل اعتماد نہیں ہے ۔ علاوہ بریں اس کی تصنیف میں اور بارہا دیگر مسلم تصانیف میں اسم ترک کا اطلاق بعض اوقات مشرق ایشیا کی غیر ترکی اقوام پر بھی کیا گیا ہے ۔

اس کی کتاب کے ایک فقرے کی رو سے (۱ : ۲۷ ببعد) کل بیس (۲۰) ترک قبائل تھے جو دس دس قبیلوں کے دو حصوں، ایک جنوبی اور ایک شمالی، میں منقسم تھے ۔ یہ تقسیم، جیسا کہ مصنف ہمیں بتاتا ہے، مشرق سے مغرب کو آئیں تو حسبِ ذیل تھی : شمالی گروہ کے دس قبیلے یہ تھے : بَجَنَک Bedjenek، قفجاق، اُغز، یَماک، بشغرت، بسمل، قای، یباقو، تتار، قرقز؛ جنوبی گروہ کے دس قبیلے یہ تھے : چِگِل، تُخسی، یغما، اغراق، جرق، جمل، اُیغر، تنکت، ختای، توغاچ (یعنی ماچین) ۔ شمالی گروہ کی یہ ت[illegible] ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہو سکتی ۔ ا[illegible]ی کی طرح (دیکھیے صفحاتِ بالا) ق[illegible]ز (دریاے ینیسے کے کنارے کے قیرغیز) کو انتہائی شمال مشرق میں سرکا دیا گیا ہے؛ حالانکہ کتاب کے ایک اور فقرے (۱ : ۱۲۳ [ترجمۂ ترکی، ۱ : ۱۳۸]) کی رو سے تتار اُتوکان Ütükan میں رہتے تھے (یعنی دریاے اُورخون کے کنارے والے Ötüken میں) جو اور زیادہ مشرق کی سمت میں ہے ۔ قبیلۂ یَماک (یمک در اصل کیماک [زَکّ بان] کا ایک قبیلہ ہے، جس کا کاشغری نے ذکر نہیں کیا) دریاے اِرتش کے کنارے رہتا تھا (۱ : ۲۷۳) ۔ بشغرت (بشکر The Bashkirs، دیکھیے بسجرت) ظاہر ہے کہ اتنی دور مشرق میں کبھی آباد نہیں ہوے تھے (جو کچھ ان کے بارے میں اب تک معلوم تھا اس میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ

ابن فضلان نے [رکٹ ہان] ۱۹۲۲ء [۳۰۹-۳۱۰ھ] میں سب سے پہلے بشکرون کو دریاے ابہ Emba کے جنوب میں، یعنی جہاں ان کا کوئی ذکر کسی مأخذ میں ملا ہے اس سے بہت زیادہ جنوب میں پایا، دیکھیے *Bull. de l'Acad.* etc.، ۱۹۲۴ء، ص ۲۴۶) - شمالی شعوب میں سے قای، یباقو، تتار اور بسمیل کی اپنی اپنی زبانیں تھیں، اگرچہ وہ اچھی ترکی بھی بول سکتے تھے (قای کے بارے میں قب سارکار در *Osttürk. Dialektstudien*، ص ۵۳، جہاں انھیں اوغوز خاندان ''قایی'' (محمود کاشغری : قیغ) سے غلط طور پر مربوط کر دیا گیا ہے؛ اس پر قب کوپریلی‌زادہ در ترکیات مجموعہ سی، ۱ : ۱۸۷ ببعد) - یباقو ایک بڑے دریا یمار کے کنارے بستے تھے (۳ : ۲۱)، مگر اس دریا کے محلِ وقوع کے متعلق بظاہر مصنف (کاشغری) کو کوئی صحیح اندازہ نہ تھا، یہ دریا غالباً اوب Ob تھا، جسے تتار اب بھی اومر Omar یا اُمور Umor کہتے ہیں - یمار کو پانچویں (گیارھویں) صدی میں ارسلان تگین کی سرکردگی میں ایک مسلم فوج نے عبور کیا (مصنف نے اس مہم میں شرکت کرنے والوں سے جنگ کے متعلق گفتگو بھی کی تھی)- یہ فوج یباقو (جن کا قائد بکا بدرج Bukā Budradj تھا) اور ان کے حلیفوں بسمیل کے خلاف ایک مہم میں گئی تھی (اس جنگ کے لیے دیکھیے خصوصاً ۳ : ۱۷۳ ببعد)؛ متفرق واقعات کے لیے دوسرے فقرات؛ دریا عبور کرنے کے بارے میں ۲ : ۵؛ قب براکلمان در *Hirth Anniversary Volume*، ص ۱۱ ببعد).

جنوبی گروہ کے دس قبائل—چگل، تخسی، یغما، اغراق، جرق، جمل (دیگر عبارتوں، مثلاً ۱ : ۳۸۲ میں جمل)، ایغر، تنکت، ختای یعنی صین اور توغاج یعنی ماصین—کے منجملہ جمل ان قبیلوں میں سے تھے جو ترکی زبان نہیں بولتے تھے، گو وہ ترکی خوب جانتے تھے، بلکہ ایغروں کے بارے میں بھی ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ علاوہ اپنی ''خالص ترکی'' زبان کے ان کی ایک اور زبان بھی تھی جس میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے تھے - تنکت (تنگت)، ختن اور تبت (تبت) کے باشندوں کی طرح سے ایسے لوگ تھے جو غیر ملکی زبان بولتے تھے، مگر بلادِ اتراک میں آباد ہو گئے تھے - ختن کی اپنی الگ زبان اور حروفِ تہجی تھے؛ وہاں لوگ اچھی ترکی نہیں بولتے تھے - صین اور ماصین میں بھی وہاں کے باشندوں کی ایک الگ زبان موجود تھی، لیکن شہروں کے لوگ ترکی بخوبی بول سکتے تھے - ترکوں کے نام ان کے خطوط ترکی رسمِ خط میں لکھے جاتے تھے - کاشغری کی ایک عبارت میں لفظ صین کا مفہوم بہت وسیع کر دیا گیا ہے (۱ : ۳۷۸ [ترجمۂ ترکی، ۱ : ۴۵۳])- صین تین تھے : بالائی صین یا توغاج (ماصین)، وسطی یا ختای (صین)، اور زیرین یا برخان؛ یہ کاشغر کے قریب ایک بلند قلعے کا نام بھی تھا، جو ایک بلند پہاڑی پر واقع تھا، وہاں سونے کی پرمایہ کانیں تھیں.

ان شعوب میں سے جرق (غالباً اس کا تلفظ چرق ہونا چاہیے) برچق (برچق) کے شہر، یعنی موجودہ ''مرل باشی'' میں رہتے تھے (۱ : ۳۱۸؛ برچق کی جاے وقوع کے لیے قب بالخصوص *Sočineniya* : Valikhanow، ص ۸۰ ببعد) - اس سے ہم جمل کی یورت کو تخمینی طور پر معین کر سکتے ہیں (برچق کے مشرق اور اویغور کے مغرب میں) - جمل اصلاً ترک نہ تھے-

دریاے یمار کے کنارے جو جنگ ہوئی اس میں جُمّل یباقو کے حلیف تھے اور اس لیے قیاس یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ارضِ اویغور میں پانچ شہر تھے، جن میں بیش بلق اور قوجو (یعنی قوچو Kočo یا قراخوجہ متصلِ تورفان) شامل تھے - اویغور بدھ مت کے پیرو تھے اور 'برخان' (اصنام) کی پرستش کرتے تھے - یہ کہ ترکوں کے یہاں عیسائیت بھی رائج تھی، اس کی تنہا شہادت لفظِ بجّاق (بچاق) کا ترجمہ ہے؛ یعنی ''صومُ النصاری'' (۱ : ۳۴۰)؛ بجاق کا لفظ مانوی متنوں میں بھی ملتا ہے (مثلاً دیکھیے *Chuastuanift*، ضمیمۂ *Abh. Preuss. Ak.*، ۱۹۱۰ء، ص ۳۹).

اپنی کتاب کے اور مقامات پر محمود کاشغری دیگر ترکی شعوب کا بھی ذکر کرتا ہے، جو بیس ترکی شعوب کی فہرست میں شامل نہیں؛ مثلاً اذکش (۱ : ۸۹)، جن کا عربوں کے جغرافیائی ادب سے بھی پتا چلتا ہے (مثلاً *B. G. A.*، ۶ [ابن خردادبہ] : ۳۱) اور کجت (۱ : ۲۹۸)، جو خوارزم میں آباد [کیے گئے] تھے اور جن سے بیہقی بھی واقف تھا (طبع مورلے Morley، ص ۹۱)- مشرق یورپ کے شعوب میں سے علاوہ ان کے جن کا ذکر ہو چکا ہے بلغار اور سوار کو بھی ترک کہا گیا ہے - خزر کا کہیں ذکر نہیں؛ غالباً اس وقت تک ان کی جداگانہ سیاسی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا - (*B. G. A.*، ۱ [اصطخری] : ۲۲۲، ۲۲۵) کے برعکس، جو کہتا ہے کہ خزر اور بلغار کی ایک مشترکہ زبان تھی، جو ترکی سے الگ تھی، کاشغری بلغار، سوار اور پچنگ Pečenegs کی بولیوں کو ایک ہی گروہ میں شامل کرتا ہے .

قیرغیز، قپچاق، اوغوز، تخسی، یغما، چگل، اغراق اور چرق کی بولیاں خالص ترکی تھیں - یماک اور بشکر کی بولیاں اس ترکی سے قریب کی نسبت رکھتی تھیں - اتِل (والگا) سے یمار تک خانہ بدوش لوگوں کی زبان حضریوں کی زبان کے مقابلے میں (جو غالباً اصلاً ترک نہیں تھے) بالعموم خالص تر ترکی تھی؛ مثلاً ارغوں کی زبان کے مقابلے میں، جو سیرام سے بلاساغون تک آباد تھے (یہاں کے شہروں میں ترکی کے پہلو بہ پہلو سغدی زبان بھی ابھی زندہ تھی)، یا کنجاکوں کی زبان کے مقابلے میں، جو کاشغر کے قریب دیہات میں رہتے تھے - مختلف زبانوں کی مختلف صوتی خصوصیات زیرِ بحث آئی ہیں، جن میں بعض ایسی بھی شامل ہیں جنھیں ترکی زبان میں اب بھی اہمیت حاصل ہے؛ مثلاً ی اور ج، ق اور خ کا ابدال وغیرہ- زبانِ اوغوز (ترکمان) کے مفردات کی اس وقت سے پہلے ہی وہ شکل ہو گئی تھی جو اب تک جنوبی ترکی بولیوں کی امتیازی خصوصیت ہے - ترکمانی زبان اس وقت بھی دوسری ترکی زبانوں سے مفردات میں اس حد تک مختلف تھی کہ ترکی اور ترکمانی میں وہی تقابل تھا جو اوغوزی اور چگلی میں تھا (۱ : ۳؛ ۲ : ۲۰۳ پایینِ صفحہ).

اگرچہ ہجرت کی پہلی صدیوں میں ترکی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی جنگ کے علاوہ ترکی علاقے میں فوج کشی بھی کی گئی، تاہم مسلمانوں کی جنگی کامیابیوں کا ترکوں کے قبولِ اسلام پر بہت کم اثر پڑا - جو اصول رسول اللہ[ص] نے حبشیوں کے بارے میں وضع کیا تھا، اسی کا اطلاق ترکوں پر بھی کیا گیا؛ یعنی [''اترکوھم ما ترکوکم''] ''جب تک وہ تم سے تعرض نہ کریں تم بھی ان سے تعرض نہ کرو'' (دیکھیے گولڈتسیہر : *Muh. Studien*، ۱ : ۲۷۰؛ ۲ : ۱۲۷)؛ پہلی عبارت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے : ''ترکوں کو ان کے حال پر

چھوڑ دو جیسا کہ انھوں نے تمھیں چھوڑ دیا ہے''؛ ایک دوسرے مفہوم میں اور ذرا مختلف شکل میں یہ حدیث *B. G. A.*، ۵ [ابن الفقیہ]: ۳۱۶ (''تارکوا التُّرک ما تارکوکم'')، ۶ [ابن خُرّداذبہ] : ۲۶۲، یاقوت : معجم، ۱ : ۸۳۸ پایینِ صفحہ میں بھی مذکور ہے) ۔ ترکوں نے چوتھی (دسویں) صدی میں اسلام خود اپنی مرضی سے قبول کیا ۔ ۲۹۱ھ (۹۰۴ء) میں اسلام کے سرحدی علاقوں، یعنی سامانی سلطنت پر کفّارِ ترک کی آخری بڑی یورش کو پسپا کر دیا گیا (طبری، ۳ : ۲۲۴۹)؛ ۳۸۲ھ (۹۹۲ء) میں مسلم ترک پہلی بار بخارا میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوے ۔ اس سے بھی زیادہ اہم سلجوقی ترکوں کے ہاتھوں پانچویں (گیارھویں) صدی میں ایشیاے کوچک کی فتح تھی ۔ اب ترکوں کے متعلق بعض اور اقوال بھی رسول اللہ[ص] کی طرف منسوب ہوے؛ مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا : ''تَعَلَّمُوا لِسَانَ التُّرک فَاِنَّ لَہُم مُلْکًا طُوالًا'' (''ترکوں کی زبان سیکھو اس لیے کہ ان کی قسمت میں مدت دراز تک حکومت لکھی ہے'') (کاشغری، ۱ : ۳) ۔ اللہ تعالٰی نے رسول اللہ[ص] سے کہا : '' اِنَّ لی جُنْدًا سَمَّیْتُہُم التُّرکَ وَ اَسْکَنْتُہُم المشرقَ فاذَا غَضِبْتُ عَلٰی قوم سَلَّطْتُہم عَلیہم'' (''میرا ایک لشکر ہے جن کا نام میں نے ترک رکھا ہے اور جو مشرق میں آباد ہے، اگر کوئی قوم مجھے خشمناک کرتی ہے تو میں اس قوم پر اس لشکر کو مسلط کر دیتا ہوں''؛ کتاب مذکور، ص ۲۹۴) ۔ ایک کثیر التعداد (دو لاکھ خیموں کی) ترکی قوم کے اسلام قبول کرنے کے قصے کے متعلق دیکھیے مادّۂ کاشغر، جہاں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہ قصہ ایلک خانوں [رَکّ بآن] یا ''آلِ افراسیاب'' کے عروج سے متعلق ہے ۔ کسی مأخذ میں ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ ایلک خانی خانوادہ کس قوم سے تھا؛ اس خاندان اور اس کی رعایا کو ہمیشہ صرف '' ترک '' کہا گیا ہے ۔ کاشغری میں بھی ان حکمرانوں کو '' الملوك الخاقانیہ '' کہا گیا ہے (۱ : ۳۰ پایینِ صفحہ، یا محض '' خاقانیہ ''؛ مثلاً دیکھیے ۱ : ۳۴۷، فوق) ۔ خُتن کو کاشغر کے مسلم حکمرانوں نے پانچویں (گیارھویں) صدی کے ابتدائی عشرات میں فتح کیا، لیکن صحیح تاریخ یا اس مہم کی جزئیات کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ۔ کاشغری کے بیان کے مطابق خُتن کی فتح کا باعث ختن کا ایک امیر جِنْکْشی [جَنْکْشی] نامی تھا (۳ : ۲۷۹) ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فتح کے متعلق کوئی کہانی مشہور تھی، جو ہم تک نہیں پہنچی ۔ کاشغری کے وقت موجودہ چینی ترکستان میں اسلام کے سرحدی شہر یہ تھے : کُسَن Kusen یا کُچا (۱ : ۳۳۹) اور شمال میں قلعۂ بُوگُز Bügür (۱ : ۳۰۱) جو ایک پہاڑی پر کُچا کے مشرق میں اور کُچا اور اُیغُر کے درمیان واقع ہے اور جنوب میں چرچِن Čerčen (کاشغری، ۱ : ۳۶۳ میں جُرجان [ترجمۂ ترکی : Gurgan]) ۔ بعد کے زمانے میں وہ ترک، جو زیادہ مغرب میں آباد تھے، اسلام لائے ۔ بقول ابن الأثیر (۹ : ۳۰۰ ببعد) ایک ترکی قبیلے نے جو بلاساغون کے قریب قشلاق اور بلغار کے علاقے سے متصل، یعنی غالباً کوہ یورال میں ییلاق کرتے تھے، صفر ۴۳۵ھ (ستمبر ۔ اکتوبر ۱۰۴۳ء) میں اسلام قبول کیا ۔ ان لوگوں کا نام نہیں بتایا گیا ۔ باوجود اس بڑے رقبے کے جو ان کے قبضے میں تھا، وہ وسطی ایشیا کے ان ترکوں سے تعداد

میں کم تھے جنھوں نے ۹۶۰ء میں اسلام قبول کیا ۔ بقول ابن الأثیر ان کے صرف دس ہزار خیمے تھے ؛ بقول ابوالفداء (مختصر ، طبع Reiske-Adler ، ۳ : ۱۲۰) محض پانچ ہزار ۔

قپچاق [رَکَ بان] جنوب مغرب میں دریاے اِرتش سے سیر دریا تک اور ایک دوسری سمت میں مشرق یورپ کی طرف بڑھے تو اس سے ترکوں کے اقسام کی نسلی کیفیت میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں ۔ جس طرح اوغوز کے نقلِ مکان سے جنوبی ترکوں کے موجودہ گروہ کی تکوین کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے، اسی طرح غالباً قپچاق کی ہجرتوں سے مغربی ترکوں کے گروہ کی تکوین کا حال بھی واضح ہو جاتا ہے۔ سیر دریا کے کنارے چھٹی (بارھویں) صدی میں ہمیں قنُگلی کے ساتھ قپچاق کی موجودگی کا بھی ذکر ملتا ہے اور دونوں کے درمیان فرق کو بہت غیر واضح اور مبہم چھوڑ دیا گیا ہے (قبّ مارکار : *Osttürk. Dialektstud.*، ص ۸۷ و ۱۷۲) ۔ محمود کاشغری کے زمانے تک کوئی قبیلہ قنُگلی نام کا نہیں تھا ۔ [دیوان لغۃالترک میں] لفظ قنُگلی کے متعلق صرف یہ لکھا ہے (۳ : ۲۸۰) کہ وہ ''قپچاق کے ایک بڑے آدمی'' کا نام ہے ۔ چھٹی (بارھویں) صدی کے نصفِ دوم میں قپچاق نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا ، اس وقت بھی نہیں جب کہ وہ سیر دریا کے کنارے مسلم ممالک کے قریب رہتے تھے ؛ ایک وثیقے (document) میں، جس میں قپچاق کے ایک امیر کے جَنْد میں آنے کا ذکر ہے (دیکھیے سیر دریا)، یہ دعا کی گئی ہے کہ خدا اسے مشرف باسلام کرے (رَزَقَہ اللہ عِزَّ الاسلام، قبّ بارتولڈ : *Turkestan* etc.، ۱ : ۹۷).

مشرق یورپ کے قبیلۂ قپچاق کے اور ان کے پیشرووں پچنگ Pečenegs اور اوغوز (یونانی : Οὖζοι ، غالباً روسی Torki؛ روسی سالناموں (annals) میں Berendeï بھی مذکور ہے، جس سے غالباً اوغوز کی شاخ بایندریۃ مراد ہے، قبّ محمود کاشغری ، ۱ : ۵۶) کے متعلق بیشتر اطلاعات یونانی اور روسی مآخذ میں موجود ہیں ۔ بارھویں صدی کے وسط سے روسی سالناموں میں مشرق یورپ کے تمام ترکی لوگوں کے لیے باستثناے قپچاق (پولووچی Polowči) چرنی قلپاقی Černi̊i Klobuki (سیاہ کلاہ) کا عام نام استعمال کیا گیا ہے (اس پر قبّ D. Rasowskiy در *Seminarum Kondakovianum* ، پراگ ۱۹۲۷ء، ۱ : ۹۵ ببعد) ۔ ناموں کی یکسانیت سے خیال کیا جا سکتا ہے کہ قرہ قلپاق چرنی قلپاقی کی اولاد ہیں، مگر اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا ۔ قرہ‌قلپاق (جن کا ذکر پہلی دفعہ سترھویں صدی میں ہوا ہے) کے مغربی الاصل ہونے کے حق میں یہ واقعہ بھی ہے کہ وسطی ایشیا کے لوگوں کے برخلاف ان کی گذر اوقات زیادہ تر مویشی پالنے پر تھی ۔ اگرچہ اس سے قبل بھی پچنگ کے درمیان ''کامیابی سے تبلیغ'' اسلام کی تو گئی (مارکار: *Osteuropäische und ostasiatische Streifzüge*، ص ۷۳) تاہم مشرق یورپ کے ترکوں میں دورِ مغول سے پہلے اشاعتِ اسلام میں کم ہی کامیابی حاصل ہوئی.

وسطی ایشیا میں اسلام کی اشاعت میں کفّارِ قرہ‌ختای [رَکَ بان] کی سلطنت کی تأسیس سے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی اور نہ اس سے کہ ساتویں (تیرھویں) صدی کے شروع میں مسلمانوں کی آزاررسانی عمل میں لائی گئی ۔ قرہ‌ختای حکومت کے قیام کے وقت (جو ۱۱۳۰ء کے جلد ہی بعد قائم ہوئی) خانِ بلاساغون کی ریاست

ان بلاد میں انتہائی شمالی اسلامی علاقہ تھا؛ جب اس سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے تو دریاے ایلی Ili کے شمال میں بھی اسلامی حکومتیں موجود تھیں، یعنی مملکتِ قرلُق [رَكَ بآن] مقامِ قیالیغ میں اور وہ مملکت، جس کی بنا اسی نسل کے ایک شخص نے موجودہ شہر قُولجہ [رَكَ بآن] کے نزدیک اَلْمالیغ Almalîgh میں ڈالی تھی - چینی سیاح چانگ چون C'ang C'un کے وقت میں (۱۲۲۱ء) شہرِ چانگ بالا (C'ang-ba-la)، یعنی اویغور کا دارالسلطنت جُنْبلق، جس کا ذکر کاشغری نے بھی کیا ہے (۱ : ۱۰۳)، مغربی سمت میں غیر مسلم علاقوں کا سرحدی شہر تھا (E Bretschneider : *Mediaeval Researches*، ۱ : ٦٧ ببعد) - ارمنی سیّاح ہیثوم Hethum کے بیان کے مطابق (تاریخِ سفر : ۱۲۵۴ء) جَمْ بَلِخْ ("Djambalekh") خُتاپای "Khutapai"، جدید نقشوں کے خُتُک بای Khutukbai، سے متصل مشرق میں تھا اور خُتاپای خود مَنَس Manas سے متصل مشرق میں ہے (کتابِ مذکور، ۱ : ۱٦۹) - اس طرح موجودہ مَنَس کے علاقے سے وسطی ایشیا میں اس زمانے میں اشاعتِ اسلام کی حد معین ہوتی ہے.

زمانۂ حاضرہ کے چینی ترکستان کے علاقوں کے برعکس، جو عرصے تک ترکی اثر کے ماتحت رہ چکے تھے، ماوراءالنہر اور خوارزم کے استراك (turkicisation) نے منگولوں کی فتح کے بعد ہی قابلِ اعتناء ترقی کی - یہ خیال بعض جغرافیائی ناموں کی موجودگی سے پیدا ہوتا ہے جو اصلاً ترکی ہیں؛ ملاحظہ ہو مثلاً شہرِ قراقُول کا نام (نَرشخی، طبع شیفر Schefer، ص ١٧)، جو دریاے زرافشان کے مجراے زیرین پر واقع ہے اور قراصُو (طبقات ناصری، ترجمۂ راورٹی Raverty، ص ۴٧۴) یا صُوْقرا (ابن الأثیر، ۱۲ : ۱۲۲) واقع خوارزم کا نام - ایشیاے کوچک [؟]اور آذربایجان میں ترکی تہذیب و تمدن سلجوقیوں کے ذریعے پہنچا - غالباً ترکوں کو پہلے یہاں اس لیے آباد کیا گیا تھا کہ وہ سرحد کی حفاظت اور بوزنطی اور گرجستانی سلطنت [قبّ مادۂ جارجیا] کی بڑھتی ہوئی فوت کے خلاف جنگ کریں - ان ملکوں میں، جو اب مکمل طور پر ترکی ہیں، ترکی تہذیب کے تدریجی ارتقاء کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں (جنوبی ایران میں ترك عام طور پر بدستور خانہ‌بدوش ہیں) - نویں (پندرھویں) صدی تک یہ ارتقائی عمل پورا ہو چکا تھا - سلطان صلاح‌الدین مصر میں ترکی سپاھیوں کے متعدد دستے لایا، ان میں سے بعض وھاں سے شمالی افریقہ اور سپین میں بھی جا پہنچے؛ سپین کے ترکوں کے بارے میں دیکھیے بالخصوص عبدالواحد المرّاکشی، طبع ڈوزی Dozy، ص ۲۱۰ - ترکی تہذیب کی اشاعت میں ان سپاھیوں کو کوئی خاص اھمیّت حاصل نہ ہوئی.

سلطنتِ مغول کا قیام بہ نسبت خود مغولوں کے ترکوں کے لیے بہت زیادہ اہم ثابت ہوا - باوجود ان کوششوں کے، جو بعد کے مصنفین نے اس کے برخلاف ثبوت بہم پہنچانے کے لیے کی ہیں، ایبل ریمیوسا Abel-Rémusat (*Recherches sur les langues tatares*، ص ۲۴۰) کے اس خیال کی تائید واجب ہے کہ چنگیز خان کے عروج کے وقت جس علاقے میں مغول آباد تھے اس کی مغربی سرحدیں وھی تھیں جو آج کل ہیں (ہاں قلماقوں [رَكَ بآن] کی بہت بعد کی مہاجرتیں اس سے مستثنی ہیں) - ان مغولوں کی اولاد میں سے جو چنگیز خان اور اس کے جانشینوں کے

زمانے میں مغرب کی سمت آ گئے صرف
افغانستان کے مغولوں نے ، جن کی بولی کے
متعلق رام شٹ نے تحقیقات کی ھے (*Mogholia*
در *J. S. Ou.*، ج ۲۳ [۱۹۰۵ء] : ص ۴)، آج تک
اپنی منگول زبان کو بدستور باقی رکھا ھے ۔
ان کے مساکن کی ابھی صحیح طور پر تحدید
نہیں ہوئی ۔ ڈاکٹر امیل ٹرنکلر (Dr. Emil
Trinkler) کو (*Afghanistan* ، گوتھا (Gotha)،
۱۹۲۸ء = *Peterm. Mitt.* ، ضمیمہ ۱۹۶، ص ۵۳
ببعد) باوجود پوری تلاش و جستجو کے افغانستان
میں کوئی قوم مغولی زبان بولنے والی نہیں ملی ۔
بیشتر مغول ترکوں میں ضم ہو گئے ھیں اور
اس طرح انھوں نے نہ صرف ترکوں کی تعداد
میں اضافہ کیا ھے بلکہ خصوصیت کے ساتھ سیاسی
حیثیت سے ان کے لیے باعثِ تقویت بن گئے ھیں ۔
چودھویں صدی میں ترکوں کے اسلام قبول کر لینے کے
بعد آلتون اردو (Golden Horde) کی سلطنت کی
تأسیس کو ترکوں کی سیاسی تاریخ میں خاص اھمیت
حاصل ہو گئی ۔ اس صدی کے آخر تک اس
سلطنت نے بالکل ترکی رنگ روپ اختیار کر لیا تھا؛
اس کے وثیقے ترکی زبان میں لکھے جاتے تھے
اور چواس Čuwass نے ، جو اس سے پہلے دریاے
اتل (Volga) کے آس پاس بولی جاتی تھی ، اپنی
جگہ ایک خالص ترکی زبان کو دے دی تھی ۔
اس سلطنت کے انحلال کے بعد تین نئی ''تاتاری''
سلطنتیں قازان [رک بان] ، استراخان اور
جزیرہ نماے قریم [رک بان] میں بن گئیں جو
عہدِ مغول ھی میں جا کر اسلام اور ترکی
اثرات کے تحت آئیں ۔ سائبیریا میں دریاے
ارتش [رک بان] کے کنارے جدید شہر ٹوبالسک
(Tobolsk) کے پاس ایک نئی '' تاتاری ''
سلطنت بھی قائم ہو گئی، اب بجاے بلغار کے یہ
ملک اسلام کی شمالی سرحدی چوکی بن گیا ۔
لفظ تاتار، جو پہلے مغولوں کے لیے استعمال ہوتا
تھا ، اب ایک ترکی قوم کا نام ہو گیا اور
خصوصاً قریم (Crimea) میں خود ترک بھی اسے
استعمال کرنے لگے ۔ روس میں لفظ ''تاتار'' کو
ایک بہت زیادہ وسیع مفہوم دے دیا گیا،
اگرچہ بالکل اُتنا وسیع نہیں جتنا چینیوں
نے یا یورپ کے ماھرینِ صینیہ (Sinology) نے دیا
(قب دیباچۂ Abel-Rémusat : *Recherches sur les
langues tartares*) ۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک
بھی (راڈلوف : *Aus Sibirien*، ج ۱، فہرست مضامین،
میں اب تک یہی استعمال موجود ھے) سب غیر عثمانی
ترکوں کو روسی علماء اور ان کے تتبع میں عام طور پر
اروپائی تاتار کہتے تھے ۔ اس طرح اصطلاح 'ترکی۔
تاتاری' ("Turco-Tartar") بن گئی ، جو اب تک
بھی بالکل ناپید نہیں ہوئی ۔ آلتون اردو
کے ممالک میں دو شعبوں، اوزبک Ozbeg اور
نوغای Noghai کا ظہور ہوا، جو جوچی
[رک بان] کے خاندان کے شاہزادوں کے نام
سے موسوم ھیں ۔ اوزبک پندرھویں صدی میں
نقلِ وطن کر کے ماوراءالنہر چلے گئے، جہاں
سولھویں صدی میں انھوں نے چغتائیوں کے
اقتدار و قوت کو ختم کر کے بخارا اور خیوہ
[رک بان] کی مملکتیں قائم کیں، جن کے ساتھ
اٹھارویں صدی میں ایک اور اوزبک سلطنت کا
اضافہ ہو گیا، یہ تھی خوانینِ خوقند کی مملکت ۔
وہ لوگ جنھیں روسی نوغای کہتے ھیں
انھیں [تیرھویں صدی میلادی میں منکقوت
(غازانی، ص ۱۵۰، س ۱)، پندرھویں صدی میں
مانکقوت (مطلع سعدین ، ص ۱۰۰، س ۱۴)]
سولھویں صدی اور بعد کے مشرقی مآخذ میں ہمیشہ
منغیت کہا گیا ھے ۔ روسی سیادت کے ماتحت

منغیت یا نوغای نے دریاے والگا (Volga) کے مجراے زیرین کے مشرق میں ایک خانہ بدوش مملکت کی تشکیل کی، جو مکمل طور پر متحد نہ تھی ۔ استرا خان کی آبادی کا مقامی ترکی عنصر اب بھی نوغای الاصل ہے ۔ سترھویں صدی میں قلماقوں نے والگا کے مشرق کے علاقوں سے نوغائیوں کو نکال دیا ۔ اصطلاح نوغای کو وسعت دے کر اب اوزبگ اسے دریاے والگا کے علاقے کے ترکی باشندوں کے لیے استعمال کرنے لگے ھیں، جنھیں روسی (اور اب خود وہ باشندے بھی) '' تاتار'' کہتے ھیں ۔ قازاق (Ḳazaḳ ۔ دیکھیے قیرغیز) پندرھویں صدی ھی میں اوزبگوں سے الگ ھو گئے تھے ۔ انیسویں صدی تک ان کے اپنے خان تھے، جن میں سے بعض کے پاس خاصی بڑی بڑی فوجیں تھیں ۔

مشرق کی مغولی سلطنت (امبراطوریہ) میں سے جس آخری ترکی مملکت کی تشکیل ھوئی، وہ مغل مملکت تھی، جو کاشغر سے چین کی سرحد تک پھیلی ھوئی تھی اور جس کا قیام چغتائی مملکت [دیکھیے مادۂ چغتائی خان (در آخر مادّہ) اور مادۂ دوغلات] کے سقوط کے بعد عمل میں آیا ۔ باوجود اپنے نام کے یہ مغل کم از کم سولھویں صدی میں ترکی بولتے تھے، اسلام انھوں نے چودھویں صدی کے وسط کے قریب جا کر اختیار کیا تھا ۔ کہتے ھیں کہ محمد خان (۱۴۰۸ تا ۱۴۱۶ء) نے ان میں اسلام کی اشاعت کے متعلق اھم وظیفہ سر انجام دیا؛ اگر کوئی مغل دستار نہ باندھتا تھا تو اس کے سر میں ''میخ اسب'' ٹھونک دی جاتی تھی (تاریخ رشیدی [نسخۂ الف، دانش‌گاہ پنجاب، ورق ۵۳ الف]، ترجمۂ راس Ross، ص ۵۸) ۔ تاھم ۸۲۳ھ (۱۴۲۰ء) میں بھی تورفان میں بدھ مت والوں کے بتوں کی موجودگی کا ذکر ملتا ھے، جن میں بعض '' نوساختہ '' بھی شامل تھے (.N.E، ۱۴ : ۱ : ۳۱۰)، المظفریۃ، ص ۲۷ [مطلع سعدین، طبع لاھور ۲ / ۱ : ۳۸۱ و ح ۳]) ۔ اسی صدی میں اویغور کی بودھی تہذیب کو اسلام کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی ۔ لفظ اویغور، قوم کے نام کی حیثیت سے، غالباً ان کے اسلام قبول کر لینے پر بتدریج متروک ھوتا گیا اور ۱۶۸۲ء میں قلماقوں نے مشرق ترکستان فتح کرلیا تو اس کے بعد 'مغول' بھی ایک قوم کے عَلَم کی حیثیت سے متروک ھونے لگا : صرف ''زرد اویغور'' (ساریغ اویغور)، جن کا نام تاریخ رشیدی میں بھی آتا ھے (دیکھیے اشاریہ [نسخۂ خطی مذکور، ورق ۹۴ الف : صاریغ ایقور]) اور جو توئن ۔ ھیوانگ (Tuen-huang)، سوجو (Su-dju)، اور کانجو (Kan-djóu) میں پائے جاتے ھیں، بدستور اسی نام سے موسوم رھے اور اب تک بدھ مت پر قائم ھیں؛ انھوں نے اویغور رسم الخط کو صرف اٹھارویں صدی میں آ کر چھوڑا اور اس کی جگہ تبتی خط اختیار کیا (*Bibl. Buddhica*، ج ۱۷، دیباچہ) ۔ صوبۂ کانسو Kan-su میں چینی بولنے والے دونگانوں Dumgan کے علاوہ ترکی بولنے والے سالار Salar بھی، جن کا ذکر تاریخ رشیدی، ص ۴۰۴، میں ھو چکا ھے، اسلام کے حلقہ بگوش ھیں [دیکھیے مادّہھاے چین، کانسو اور سالور (یا صالور)].

مغرب میں عثمانی یا اناطولی ترکوں کے علاوہ (جو خود ترکمانی نسل سے ھیں) ترکمان سیاسی تاریخ میں بغایت نمایاں رھے ھیں ۔ قرہ قویونلو (رکّ بآن) اور آق قویونلو (رکّ بآن) کی مملکتوں کو خصوصاً پندرھویں صدی میں معتد بہ قوت و اقتدار حاصل تھا ۔ ممالیک [رکّ بآن] کی سلطنت میں بھی دیارِ بکر [رکّ بآن] سے غزّہ [رکّ بآن] تک بہت سے ترکمان قبائل موجود تھے، ان کی ایک فہرست

خلیل الظّاهری (زبدۃ کشف الممالک، طبع Ravaisse، پیرس ۱۸۹۴ء، ص ۱۰۵) نے دی ھے۔ ان میں سے صرف دلگدر Dulgadir (ذوالقدر کا ترکی تلفظ، رکّ بآن) کے خاندان نے کچھ اھمیت حاصل کی: چودھویں صدی میں اس خاندان نے مملوکوں کے باجگذاروں کی حیثیت سے اپنی چھوٹی سی بادشاھت قائم کی۔

وسطی ایشیا میں کئی اور ترکی اقوام کی طرح، جن کا ذکر ابتدائی منگول عہد میں آتا ھے، ترکمان عہد مغول کی نئی قبائلی گروہ بندیوں میں ضم نہیں ھوے، اگرچہ ترکمانوں میں ایسے لوگ موجود تھے، جو اَلتون اردو کی مملکت سے ھجرت کرکے آ گئے تھے؛ سولھویں صدی میں یہ بات قبیلۂ ساین خانی (لقب ساین خان کے بارے میں دیکھیے مادّۂ باتو خان) کے نام سے ظاھر ھوتی ھے، جو بحرِ خزر کے جنوب مشرق میں آباد تھے (*Turkmeniya*، ج ۱، لینن گراڈ ۱۹۲۹ء، ص ۷۴ ببعد) ۔ وسطی ایشیا میں ترکمان اپنی کوئی علٰحدہ مملکت کبھی قائم نہ کر سکے، لیکن یہ ۱۸۸۴ء ھی میں جا کر ھوا کہ شمال سے روسیوں کی پیش قدمی اور جنوب سے افغانوں کی یلغار کی بدولت ان کی آزادی کا خاتمہ ھوگیا۔

سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں ترکمانوں کو وسطی ایشیا کی اور ترکی اقوام، خصوصاً قازاق اور قِیرغیز کی طرح، قلماقوں کے حملوں سے بہت نقصان اٹھانا پڑا ۔ قلماق وہ تھے جنھوں نے وسطی ایشیا میں آخری بڑی خانہ بدوش مملکت کی بنیاد رکھی ۔ قلماقوں نے قازاق اور قیرغیز کو ان کے علاقوں کے بعض حصوں سے نکال دیا ۔ قلماقی سلطنت کی تباھی کے بعد ھی کہیں ان علاقوں میں دوبارہ وہ حالات پیدا ھو سکے، جو سابقاً وھاں موجود تھے ۔ ترکمانوں میں سے کچھ لوگ اب تک Stawropol کی ایالت (gouvernment) میں رہتے ھیں، جہاں وہ سترھویں صدی کے خاتمے کے قریب جزیرہ نماے مَنغشلاق [رکّ بہ منگیشلاك] سے بھاگ کر آئے تھے؛ ان کے قدیم‌تر مساکن اس جزیرہ نما میں تھے، مگر قلماقوں نے انھیں وھاں سے بے دخل کر کے بھگا دیا تھا ۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے اس جزیرہ نما کے لیے ترکمانوں نے نوغائیوں اور بعد میں قازاقوں سے جنگ کی تھی، مگر ناکام رھے؛ قازاقوں کے برعکس قیرغیزوں کے اپنے خان نہ تھے، نہ دریاے ینِسے کے کنارے اور نہ سمیرچِیہ (Semirečye) میں [قبّ مادّۂ قیرغیز] ۔ ینِسے کے کنارے کے قیرغیز، جو وھاں اٹھارویں صدی کے شروع تک آباد رھے، اسلام سے بالکل غیر متأثر رھے ھیں ۔ یہی حال ان ترکی قبائل کا ھے، جو آج کل ینِسے کے علاقے میں رھتے ھیں اور جنھوں نے روسی انقلاب کے بعد سے ''خَکَس'' Khakas کا نام اختیار کر لیا ھے (اصلاً یہ کلمہ لفظ قیرغیز کی چینی رسم الخط میں مکتوبہ صورت کی غلط قراءت سے پیدا ھوا) ۔ التائی میں بالائی اوب (Ob) پر رھنے والے کوھستانی بھی غیر مسلم ترك ھیں۔ التائی کے باشندوں (*Altai Kiži*) کو روسی ''پہاڑی قلماق'' کہتے ھیں، لیکن روسی انقلاب کے بعد وہ اپنے آپ کو '' اویرات '' Oirat کہنے لگے، جو صحیح طور پر قلماقوں کا نام تھا ۔ ان کا علاقہ اب آزاد اویرات علاقہ ھے ۔ قبیلۂ یاقوت (Yakuts) کے لوگ دوسرے ترکوں سے بالکل جداگانہ ھیں، یہاں تک کہ ان کی زبان بھی علٰحدہ ھے ۔ یہ اپنے آپ کو ''سَکَہ'' یا ''سَخَہ'' کہتے ھیں اور غالباً علاقۂ ینِسے کی نسلِ سگائی (Sagai) سے تعلق رکھتے ھیں، جو ینِسے کے علاقے سے نکالے جانے کے بعد دریاے لینا (Lena) کی وادی میں نقلِ مکان کرنے پر مجبور ھوے ۔ یہ واقعہ غالباً تیرھویں صدی سے پہلے صورت پذیر نہیں ھوا ۔ قبیلۂ یاقوت

کی زبان مفردات اور نحوی ساخت کے لحاظ سے ترکی سے کئی باتوں میں مختلف ہے ، گو یہ زبان چُواس کے خلاف ابتدائی ترکی زبان سے براہِ راست نکلی ہے۔

سولھویں صدی کے نصفِ اول میں جزیرہ نماے بلقان اور بحرِ اسود کے شمالی ساحل سے لے کر چینی سرحد تک کے تمام ملک مسلم ترکوں کے زیرِ حکومت تھے ۔ اس زمانے میں تقریباً ان سب ملکوں کی اقتصادی زندگی سابقہ ادوار کے مقابلے میں ایک معتدبہ زوال کی مظہر تھی ۔ بداوت نے زراعت اور خصوصاً شہروں کے علی الرغم ترقی کی تھی ۔ ان ملکوں کے مستقبل کو اس حقیقت سے بھی بہت نقصان پہنچا کہ دنیا کی تجارت نے اب اَور راستے اختیار کر لیے تھے ۔ ترکوں میں نہ تو اقتصادی حیثیت سے اس کی صلاحیت تھی نہ ذہنی حیثیت سے کہ وہ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کر سکیں ۔ جب روسیوں نے والگا کے علاقے کو فتح کر لیا (قازان ۱۵۵۲ء میں، استرا خان ۱۵۵۴ء میں)، تو وسطی ترکوں اور ان کے بھائی بندوں کے مابین، جو مغرب میں تھے، تعلق منقطع ہو گیا ، مگر جب بحرِ خزر کے مغربی ساحل پر ترکی حکومت (۱۵۷۸ تا ۱۶۰۳ء) قائم ہوگئی تو یہ رابطہ ایک اور راستے سے دوبارہ قائم ہو گیا، گو اس کی مدت قلیل تھی ۔ سترھویں صدی ھی میں روس نے یہ اصول وضع کر لیا تھا کہ شمالی ایشیا کے سب ممالک روس اور چین کے درمیان تقسیم ہونے چاھییں، لیکن اس بندوبست کے جریان کی تکمیل کہیں فروری ۱۲ تا ۲۴، ۱۸۸۸ء میں سینٹ پیٹرزبرگ کے معاھدے سے ہوئی۔

اسلام نے ایک مذھب [قبّ مثلاً مادۂ بربہ] اور ترکی نے ایک زبان کی حیثیت سے روسی حکومت کے تحت نئی ترقی کی ہے ۔ قفقاز میں اور اسی طرح وسطی ایشیا میں ترکی زبان، شعوب کی بین الشعوبی زبان (لنگوا فرینکا) کی حیثیت سے، اب پہلے سے بہت زیادہ مروّج ہو گئی ہے ۔ تہذیب و تمدن کی سطح بھی روسیوں کی رائج کردہ اروپائی تہذیب کے زیرِ اثر بلندتر ہو گئی ہے ۔ ۱۹۱۷ء کے بعد سے اور خصوصاً ۱۹۲۴ء سے، جب کہ قومیت کے اصول پر عمل شروع ہوا، سوویاتی (اشتراکی) روس میں قومیت ھی کی بنا پر خود اپنی اپنی حکومت کے ماتحت اور اپنی اپنی روشِ ارتقاء کے خطوط پر ترکی اقوام کی جمہوریتیں قائم ہو گئیں ۔ اوزبک اور ترکمان جمہوریتیں جمہوریات اشتراکیۂ سوویاتیہ کے اتحاد (U. S. S. R.) کے جداگانہ حصے ھیں اور آذربایجان کی جمہوریت وفاقِ ماوراے قفقاز میں شامل ہے ۔ سات خود مختار جمہوریتیں (قدیم تاتار، چُواس ، بَشکُر ، تاتار ، قازاق ، قیرغیز اور یاقوت) سوویاتی مُتّحدہ جمہوریۂ روسیۂ اشتراکیہ (R. S. F. S. R.) کی ارکان ھیں ۔ یہی حال چار خود مختار علاقوں (قراچای ، بَلکَر کَبَردن ، قرہ قلپاق اور خطّۂ اویرات) کا ہے، جہاں آبادی کی اکثریت ترکوں کی ہے۔

قومیت کے اصول پر کاربند ہونے کے بعد سے بعض اقوام کے ناموں کے مدلول ایسے ہو گئے ھیں جو پہلے نہیں تھے ۔ ایک وقت میں وسطی ایشیا کے بہت سے ترک اپنے آپ کو ترکی بولنے والے مسلمان اور فلاں شہر کے باشندے کہہ دینا کافی سمجھتے تھے ۔ یہ سوال کہ کس خاص ترکی قوم میں انھیں شمار کیا جائے، ان کے نزدیک کوئی اھمیت نہیں رکھتا تھا ۔ بعض ایسے نام بھی استعمال کیے جاتے تھے جو در اصل قومیت کے مفہوم سے عاری تھے؛ مثلاً لفظ ''سارت'' [رکّ بآن]، یہ لفظ اب متروک ہو گیا ہے اور اوزبک کی اصطلاح کا مفہوم اب پہلے سے بہت وسیع ہے ۔

جو لوگ پہلے اپنے آپ کو سارت کہتے تھے اب اوزبک کہلاتے ہیں - بعض نام نئے بھی بن گئے ہیں (خَکَس Khakas کے لفظ کے متعلق اوپر دیکھیے) : ترانچی [رکّ بآن]، جو کاشغریہ کے رہنے والے ہیں اور کاشغرلیق، اب اپنے آپ کو اویغور کہتے ہیں، مگر تاریخی طور پر اس نام کا اطلاق ان پر نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اویغور کبھی مغرب میں اتنی دور نہیں آئے - سوویاتی روس کی بیشتر ترکی قومیں لاطینی رسمِ خط کے اجراء کی تحریک میں شامل ہو گئی ہیں، مگر چوّاس، خَکَس اور اویرات اس میں شرکت سے انکاری ہیں اور روسی رسمِ خط کے پابند ہیں.

اَرِسْتُوف (N. Aristow) نے ترکوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ کرنے کی کوشش کی تھی *Zam'etki ob etničeskom sostav'e tyurkskikh plemen i narodnostei i sv'ed'eniya o ikh čislennosti*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء، ص ۱۷۰) - بقول اَرِسْتُوف، ۱۸۸۰ء میں ترکوں کی تعداد دو کروڑ ساٹھ لاکھ تھی، لیکن اس کا اپنا بھی یہ خیال تھا کہ ان کی تعداد اس سے زیادہ ہونی چاھیے - آج کل محض سوویاتی روس میں رہنے والے ترکوں کی تعداد ھی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے - اس طرح کل تعداد غالباً تین کروڑ سے زائد ہے - ترکی ماھرینِ نشر و قانون اور سیاستدانوں نے اس سے کہیں بڑی تعداد بتائی ہے : احمد آغائیف Agnev نے سات سے آٹھ کروڑ (A. Samoylovič در *M. I.*، ۱۹۱۲ء، ص ۴۰۹)، مصطفٰی کمال پاشا نے دس کروڑ .

مآخذ : (متنِ مادّہ میں مندرجہ حوالوں اور کتبِ فقہ اللغۃ کے علاوہ) : (۱) راڈلوف (W. Radloff) : *Ethnographische Übersicht der Turkstämme Sibiriens und der Mongolei*، لائپزگ ۱۸۸۳ء؛ (۲) وامبیری (H. Vámbéry) : *Das Türkenvolk in seinen ethnologischen und ethnographischen Beziehungen*، لائپزگ ۱۸۸۵ء؛ (۳) N. Katanow : *Etnografičeskiy obzor turecko-tatarskikh plemen*، قازان ۱۸۹۴ء؛ (۴) I. Zarubin : *Spirok narodnostei Soyuza Sovetskikh Socialističeskikh Respublik*، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء .

(W. Barthold بارٹولڈ)

II - ترکی زبانیں.

۱ - ترکی زبان کی جماعت بندی اور ان کی جغرافیائی تقسیم .

ترکی زبانیں اپنی عام صوتی خصوصیات کی بنا پر دو اساسی نابرابر گروھوں میں منقسم ھیں : " ر " والی زبانیں (تاخار tăkhăr = نو ۹) اور " ز " والی زبانیں (توقوز = نو ۹) - قدیم زبانوں میں بُلغار یا اس کی ایک بولی پہلے گروہ سے متعلق تھی، جدید زبانوں میں صرف چُواش (Čuwash) کا اس سے تعلق ہے، لیکن " ر " کی جگہ " ز " ہونے کی پراگندہ مثالیں ھمیں سب ترکی زبانوں میں ملتی ھیں - دوسرے، یعنی " ز " والے گروہ میں، باقی سب ترکی زبانیں " قدیم و جدید " شامل ھیں، بشمولِ زبانِ یاقوت - ھُن لوگوں (Huns) کے بدویانہ وفاق کی غالب قومیّت اور وسطی ایشیا اور مشرقی یورپ کی دیگر قدیم اقوام (سی آنگ - پی، آوار، خَزَر) کی نژادی اور لسانی اصل و ابتداء کا مسئلہ اب تک یا مبہم رہا ہے یا اس کی وضاحت نامکمل طور پر ہوئی ہے - زمانۂ گذشتہ میں " ز " والی زبانیں اس علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں جو موجودہ منگولیا، جنوبی سائبیریا اور التائی کے بےدرخت میدانوں (steppes) سے مطابقت رکھتا تھا - بعد میں وہ بتدریج علاقۂ چوّاش کے ماسوا ترک اقوام کے تمام جدید مساکن میں بحر اوکوتسک (Okhotsk) سے لے کر بحرِ روم تک، پھیل گئیں .

" ز " والا گروہ پھر دو گروھوں میں منقسم

ھے: '' د '' والی زبانیں (اَدَق یا اَذَق = پاؤں) اور '' ي '' والی زبانیں (اَیَق = پاؤں) ۔ اس تقسیم کی تصدیق گیارھویں صدی میں محمود کاشغری نے بھی کی ھے، لیکن در اصل یہ اس زمانے سے بہت پہلے کی تقسیم ھے۔ '' د '' والی قسم میں یہ پرانی زبانیں شامل تھیں: قیرقیز، ترکی اس کلمے کے حقیقی معنوں میں اور اویغور۔ آج کل اس گروہ کی نمایندگی مشرق سائبیریا، منگولیا اور چینِ خاص کی معدودے چند زبانیں اور بولیاں کرتی ھیں اور یہ خود تین حصوں میں منقسم ھے: '' ت '' والی شاخ یا یاقوت (اَتَق = پاؤں)؛ '' د '' والی شاخ یا تُنُو ۔ تُوین بولی یا سویوت (Soyote) یا آریان خاے (Uriankhay)، اور قَرَغَس بولی، جو '' د '' والی شاخ سے قرابت رکھتی ھے (اَدَق = پاؤں) اور '' ز '' والی شاخ، جس میں کَمَسین (Kamasine)، قُویبَل (Koybal)، سَغای (Saghay)، قَچِینہ (Kačinc)، بلتِر (Beltir)، قیزیل، چُلیم ۔ کُویرک (Čulîm-küerik)، شور (Shor) اور ساریغ ۔ اویغور شامل ھیں (اَزَق = پاؤں) ۔ قسمت '' د '' کی '' ز '' والی شاخ کی بولیاں، جو آج کل ترکی دنیا کے شمال مشرق حصّے میں پائی جاتی ھیں، بقول محمود کاشغری گیارھویں صدی میں مشرقی یوروپ میں موجود تھیں ۔ قرونِ وسطٰی کے لغت نویسوں نے، جنھوں نے عربی زبان میں اپنی کتابیں لکھی ھیں، بُلغار کو '' ز '' والی شاخ میں شامل کیا ھے ۔ '' ز '' والی ایک بولی کا باقی ماندہ نشان مشرق یوروپ میں اُس نام میں اب بھی پایا جاتا ھے جس کا اطلاق بحرِ آزوف پر ھوتا ھے (اَزَق = 'پاؤں' یعنی دریاے ڈُون کا خلیج نما دھانہ یا خور estuary).

بقول محمود کاشغری قپچاق اور اوغوزی زبانیں، جو وسطی ایشیا کے مغرب میں بولی جاتی تھیں، گیارھویں صدی میلادی میں ترکی زبانوں کے دوسرے بڑے گروہ [یعنی '' ز '' والے گروہ] کی قسمت ''یائی'' میں شامل تھیں (اَیَق = پاؤں) ۔ آج کل یہ قسمتِ '' یائی '' سب سے بڑی ھے ، اس لیے کہ یہ ایشیا اور یوروپ کے بڑے بڑے علاقوں میں مغربی سائبیریا اور التائی سے لے کر بحرِ روم تک پائی جاتی ھے (صرف چُواش اس سے مستثنٰی ھے) محمود کاشغری نے گیارھویں صدی میں اس قسمت '' یائی '' میں دو شاخیں قائم کرنے کے لیے ایک معیار کا ذکر کیا ھے: قالغان اور قالان (= باق) ۔ دوسری شاخ میں گیارھویں صدی کے اوغوز اور ان کے موجودہ خالص یا مخلوط جانشین، یعنی ترکمان، آذربایجان اور ایران، اناطولیا اور بلقان کے دیگر ترک، بسارابیا کے گاگُوز (Gagauz) اور جنوبی قریم (Crimea) کے تاتاری یا بالفاظ دیگر ترکی دنیا کا پورا جنوب مغربی حصّہ شامل ھے ترکی زبان کی اوغوزی شاخ اس معیار ('قالان') کے ذریعے نہ صرف قسمتِ ''یائی'' کے فرقۂ اوّل ('قالغان') سے، بلکہ باستثناے چُواش اور سب ترکی زبانوں سے بھی ممیّز ھوتی ھے ۔ قسمتِ ''یائی'' کی شاخِ اوّل—'قالغان'—دوسری شاخ سے بہت زیادہ بڑی ھے اور ترکی دنیا کے وسطی حصّے کے سب، لوگ ٹوبولْسک (Tobolsk) سے لے کر باغچہ سراے تک اور قاسموف Kasimow (رَکَّ بَان، در صوبۂ ریزان Riazan) سے لے کر تورفان تک اس کی مختلف بولیاں (dialects) بولتے ھیں ۔ فرقۂ 'قالغان' کی مزید تقسیم بھی ھو سکتی ھے ۔ اس کی دو شاخیں ھیں: 'تاوْلی' اور 'تاغْلیق' (= پہاڑی) ۔ مقیاسِ''لی'' 'تاوْلی' شاخ کو قسمتِ 'قالان' سے ملحق کرتا ھے (دونوں میں 'صاری' (*Sarîe*) بمعنی زرد آتا ھے، بجاے شمال مشرق قسمت کے '' ساریغ ''، اور '' تاغلیق '' شاخ کے 'ساریق' کے) اور چُواش سے بھی، بحالیکہ مقیاسِ 'تاوْ' اسے چُواش (تُو) اور

یاقوت (تیا tïā) سے ملا دیتا ہے ۔ کورش (Korsch) کے نزدیک 'اَوْ' اور 'آغ' کا تطابق (correspondences) بہت قدیم ہے ۔ اس کی راے میں در اصل ترکی زبانیں دو گروہوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں، یعنی شمالی (اَوْ) اور جنوبی (اَغ)، لیکن اس تطابق کی تصدیق اب تک کسی قدیم وثیقے سے نہیں ہوئی۔

'تاوْلی' شاخ کی نمائندگی ترکی دنیا کے شمال مغربی حصّے میں ان بولیوں سے ہوتی ہے : تلیوت۔ اَلْتائی۔ تلنگ (Teleut-Altai-Teleng) گروہ، اور اَلتائی کی کُمَنْدی اور لیبد بولیاں، قیرغیز [رک بآن] قازاق اور قرہقلپاق [رک بآن]، بعض خالص ترین اوزبک بولیاں، توبول ۔ تُومِنہ (Tobol-Tumene) اور قازان کے تاتاروں کی بولیاں، نیز میشاروں، بشکروں، نوغائیان (استراخان [رک بآن] و سٹوروپول Stavropol وغیرہ) کی بولیاں، داغستان [رک بآن] کے قُومقوں کی بولیاں، اور شمالی قفقاز کے بلقاروں، قراچای، قریم کے بے گیاہ میدانوں کے تاتاروں، قریٔتوں Karaits (سوا ان کے جو عثمانی رنگ میں سمو گئے ہیں) اور قریمچاق (یعنی قریم کے ترکی بولنے والے یہودیوں) کی بولیاں ۔ جو بولیاں قسمت ''یائی'' کی 'تاوْلی' شاخ اور قسمت ''د'' کے درمیان عبوری حیثیت رکھتی ہیں، ان کی نمائندگی سائبیریا میں 'چُولیم' اَبَہ اور جِرْنِی (یِشْ) زبانیں کرتی ہیں، جن میں ''د'' کے بدلے ''ی'' ہے، لیکن ''اَوْ'' کے بدلے ''اَغ'' اور ''ی'' کے بدلے ''یغ'' (آیاق، تاغلیغ).

قسمت ''یائی'' کے جزء 'قالغان' کی شاخ 'تاغلیق' کا ابھی ذکر ہوا ہے ۔ اس کی نمایندگی ترکی دنیا کے جنوب مشرق حصّے میں حسب ذیل بولیاں کرتی ہیں : مغربی اور مشرق (چینی) ترکستان اور افغانی ترکستان کے ایک حصّے کی حضری آبادی کی بولیاں، اوزبگوں کی بولیاں (خیوائی اور 'تاوْلی' نمونے کی بولیاں اس سے مستثنی ہیں)، ترانچی اور اتراک نخلستانہاے کاشغر [رک بآن]، خُتن [رک بآن]، آقسو اور تورفان [رک بآن] وغیرہ کی بولیاں ۔ اس شاخ سے، جسے بعض اوقات (کچھ ناموزون طور پر ہی) چغتائی کہا جاتا ہے، شمال مغربی ''تاوْلی'' شاخ اور شمال مشرق ''د'' والی قسمت کا باہمی امتزاج نمایاں ہے ۔ خیوہ (خوارزم، رک بآن) کے خوانین کی سابقہ مملکت کی اوزبگ اور سارْت بولیاں (سارت مسترک ایرانیوں کی شاخ ہے، قب سارت)، جنوب مغرب اور شمال مغرب کی بولیوں کے درمیان ایک عبوری صورت کو ظاہر کرتی ہیں ۔ ان کے مقیاس 'قالغان' و 'تاغلی' ہیں .

مآخذ : (۱) راڈلوف : *Phonetik der nördlichen Türksprachen*، ۱۸۸۲ء، ص ۲۸۰ تا ۲۹۱ ؛ (۲) وہی مصنف : *Alttürkische Studien*، ج ۳ تا ۵ (*Bull. de l'Acad. de Sc. St.-Pétersbourg*، ۱۹۱۱ء) ؛ (۳) Korš : *Klassifikaciia turečkikh pliemen po iazykam* (*Etnografičeskoe obozrienie*, 1910) ؛ (۴) A. Samoilovič : *Nekotorye depolneniia k klassifikacii turečkikh iazykov* (پٹروگراڈ ۱۹۲۲ء) ؛ (۵) وہی مصنف : *K. voprosu o klassifikacii turečkikh iazykev* (*Bull. Org. Komissii po sozyvu I Turkolog. S'iezda*, 1926, No. 2).

۲ : ترکی زبانوں کا عام خاکہ .

ترکی زبانوں کی نحو ذیل کے اصول پر مبنی ہے : کسی ایک نحوی عبارت یا مجموعۂ عبارات کے عواملِ نحوی اپنے معمولات کے بعد آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جملے کا اہم ترین حصہ — ''مُسْنَد'' (attribute) — عموماً جملے کے آخر میں رکھا جاتا ہے ۔ روابط مفاعیل کے بعد آتے ہیں ۔ اجزاے موصوفہ اپنی صفت کے بعد رکھے

جاتے ہیں اور اصلی و اہم بیانات (جملے) عارضی بیانات (جملوں) کے بعد آتے ہیں - اس اصول کی مطابقت میں مساعد تشکیلی عناصر (auxiliary morphological elements) اس اصل (stem) کے بعد آتے ہیں جس کی طرف وہ مضاف ہیں اور اس اصل سے پہلے ان کا آنا ممکن نہیں، ان زوائد کو ان کی تاریخی اصل کی طرف رد کیا جا سکتا ہے اور وہ مصدر ہے - ان زائد یا امدادی تشکیلی عناصر سے روابط کا ایک سلسلہ بنتا ہے جو صوتی اعتبار سے غیر متغیّر رہنے والے حروفِ جرِّ لاحقہ (post-positions) سے شروع اور ان تشکیلی اور ترمیمی حروفِ لاحقہ suffixes پر ختم ہوتا ہے جو (جہاں تک نبرے (accent) اور حروفِ علّت کی ہم آہنگی کا تعلق ہے) لفظِ سابق سے مل کر ایک وحدت بناتے ہیں - اس پر تفصیلی بحث ہم بعد میں کریں گے.

خیال کیا جاتا ہے کہ ابتداء میں ترکی زبانوں میں نبرہ (accent) لفظ کے پہلے جزءِ متحرك یا مقطعِ اوّل (the first syllable) پر ہوتا تھا، جیسا کہ اب تک مغولی زبانوں میں پایا جاتا ہے - موجودہ ترکی زبانوں میں اہم ترین نبرہ (accent) عام طور پر مقطعِ اخیر پر آتا ہے، لیکن اب تک بھی مقطعِ اوّل، یعنی پہلے جزء میں، خصوصاً جس میں کچھ حرکاتِ غلیظہ (آ a، اِ e، او o، واو ö) ہوں، قدیم نبرے کا اثر ایک ثانوی نبرے کی شکل میں باقی ہے، جو بعض بولیوں میں زیادہ زور کا ہوتا ہے اور بعض میں ہلکا - پہلے جزءِ کلمہ پر ایک زمانے میں نبرے کی موجودگی سے ہم حروفِ علّت کی تدریجی ہم آہنگی کی توجیہ کر سکتے ہیں، جو دو طرح کی ہے : اوّل، قانونِ مماثلت کی رو سے حرکاتِ لاحقہ (posterior vowels) (a, ï, o, u) کے بعد حرکاتِ لاحقہ ہی آتی ہیں اور حرکاتِ سابقہ (anterior vowels) (e, i, ö, ü) کے بعد ہمیشہ حرکاتِ سابقہ - بعد میں یہ مماثلت حروفِ صحیح میں بھی برتی جانے لگی، خصوصاً ک، گ اور ل میں : قل! : ٹھیر! : قلغان، kalghan : ٹھیرا ہوا؛ kal کل : آ! ؛ کلگن : آیا ہوا (۱) (صفتِ اسمِ مفعولی (past participle) - بعض بولیوں میں ہم اس بنیادی ہم آہنگی کو کم و بیش ضعیف ہوتا دیکھتے ہیں جو دوسری زبانوں بالخصوص ایرانی زبان کے اثر کا نتیجہ ہے (مثلاً بعض ترکمانی اور آذربایجانی بولیوں، اناطولیا کی ترکی اور فارسی سے رنگی ہوئی اوزبگ بولیوں میں) - دوسری قسم کی ہم آہنگی به نسبت پہلی قسم کے بہت کم یکساں اور استوار ہے: ہماری مراد او o، او u، واو ö، وَ ü اور حرکات آ a، ای ï، اِ e، i کی باہمی مماثلت سے ہے - حروفِ مدّ عادۃً قریب ترین مقاطع میں اور ترجیحاً بند مقاطع میں بند حروفِ مدّ ü، u کے بعد آتے ہیں، بحالیکہ حرکاتِ غلیظہ a, e غیر ممدودہ رہتی ہیں، اور حروفِ غیر ممدودہ عادۃً حرکاتِ غلیظہ یا حرکات کے بعد آتے ہیں، مثلاً بِل : جان لے! ؛ بِل + دِم : میں نے جانا؛ اول öl : مرجا! ؛ اول + دوٗم öl + düm : میں مرا؛ بِش : پانچ؛ بِشتِن : پانچ سے؛ کول (köl) : جھیل؛ کول + دِن (köl + den) جھیل سے.

صرف چند بولیوں (مثلاً قره- قیرغیز) میں حروفِ علّت کی دوسری قسم کی ہم آہنگی کو سب حرکاتِ غلیظہ تک وسعت دے دی گئی ہے، مگر بعض دوسری بولیوں (مثلاً قیرغیز- قازاق) میں محض سابقہ حرکاتِ غلیظہ (e, ö) تک ہی : کول (köl) : جھیل؛ کول + دور (köl + dör) : جھیلیں (دونوں بولیوں میں)، لیکن قول : ہاتھ؛ قول + دَر (قیرغیز- قازاق) اور قول + دور (köl + dor)

---

(۱) 'آیا ہوا' چونکہ فعلِ لازم سے مشتق ہے' اس لیے ہماری اصطلاح میں صفتِ اسمِ مفعولی نہیں کہلا سکتا.

(قرہ قیرغیز) ۔ اس قسم کی ہم آہنگی استانبول کی ترکی کی بند حرکات (narrow vowels) میں اپنے انتہائی ارتقاء کو پہنچ گئی ہے، لیکن اس زبان میں اس کا اثر حرکاتِ غلیظہ (broad vowels) پر نہیں ہوتا۔

ترکی زبان میں نو بنیادی حروفِ علّت ہیں: آ *a*، اِ *ä* (دونوں کشادہ)، *e* (بند)، ـٗو *o*، و *ö*، ای *ï*، اِ *i*، ـٗو *u*، و *ü* ۔ پہلے حروفِ ممدودہ بھی تھے، لیکن سوا یاقوت اور ترکمانی کے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ بعض زبانوں (مثلاً قازان۔ تاتار) میں حروفِ علت کی تعداد نو سے زائد ہے اور ان کے سلسلے میں کچھ ترمیمات واقع ہوئی ہیں، (یعنی *o*>*u*، *ö*<*ü*، *e*<*i*، *i*<*ï*)۔ اب تک ترکی زبان کے حروفِ صامتۃ (consonants) کے نظام کا مطالعہ بھی خاطرخواہ طریقے پر نہیں ہوا؛ بے آواز صامتۃ (mute consonants) اور آوازدار صامتۃ کے علاوہ درمیانی قسم کے حروفِ صامتۃ کی موجودگی کی جانب (مثلاً جس طرح وہ ترکمانی اور آذربایجانی میں ہیں) کافی توجہ نہیں کی گئی۔ آوازدار حروفِ علّت کی بے آواز سے اور اس کے برعکس بے آواز کی آوازدار سے تدریجی مماثلت (progressive assimilation) وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہے: یاز + دِی (*yaz+dï*) = اس نے لکھا ہے؛ تُوت + تی (*tut+tï*) = اس نے پکڑا ہے؛ کوز + دا (*köz+dä*) = آنکھ میں: باش + تا (*bash+ta*) = سر پر.

حروفِ صامتۃ کی باہمی تدریجی مماثلت کے اور اقسام بھی ہیں۔ تدریجی افتراق (progressive dissimilation) کی مثالیں صرف بعض بولیوں ہی میں پائی جاتی ہیں (مثلاً قازاق، قیرغیز اورا لتائی میں): آتا + لَر *ata + tar* = والد (جمع)؛ کول + دور (*köl+dör*) = جھیلیں۔ یاقوت زبان کا ایک بہت نمایاں خاصّہ حروفِ صامتۃ کی متناقص مماثلت (regressive assimilation) ہے: آت + ایم (*at + ïm*) = میرا گھوڑا؛ آت + ک (*at + ïn*) = تیرا گھوڑا؛ لیکن آپ + پر (*ap + par*) = میرے گھوڑے کو؛ آک + کِتّان (*ak + kïttan*) = تیرے گھوڑے سے .

زیادہ تر بولیوں میں اوّلِ کلمات میں آنے والے آواز دار حروفِ صحیحہ صرف ب اور م ہیں اور مستثنی طور پر ن اور د ۔ آوازدار حروف د، و اور گ اوّلِ کلمات میں ترکمانی ، آذربایجانی اور اناطولی ترکی میں پائے جاتے ہیں اور گیارھویں صدی کی اوغوز میں بھی موجود ہیں۔ الفاظ نہ حروفِ صحیحہ ر، ل، ک اور ز سے شروع ہو سکتے ہیں (ز سوا چند دخیل الفاظ کے اوّلِ کلمات میں صرف چند ایسے الفاظ میں پائی جاتی ہے جن میں محاکاۃِ اصوات ہے ، onomatopoetic words)، نہ دو صحیح حرفوں سے ۔ کسی لفظ کے آخر میں دو صحیح حروف صرف اُن حالتوں میں جائز ہو سکتے ہیں جہاں ان میں سے پہلا حرف ر، ل یا س ہو، اسی لیے دخیل الفاظ میں ہمیں زائد حروفِ علّت نظر آتے ہیں : اَرجب (*ärädjäb*)<رجب (*rädjäh*) (عربی)، اِستاپ (*steppe* >*istäp*) (روسی)، فِیکر (*fikir*)<فکْر (عربی) .

صرفی صیغے (morphological formations) یا بنائے کلمہ میں تبدیلیاں، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، فعلی یا اسمی مصادر (roots) اور اصلوں (stems) میں، جو اس زیادت کے بغیر بھی محدود معنی رکھتے ہیں، ایک یا ایک سے زائد ترکیبی یا ترمیمی لاحقوں (suffixes) کے اضافے سے پیدا ہوتی ہیں : اصلِ فعلی (stem) حاضر واحد بصیغۂ امر (تاپ! = پالے!)، اور اصلِ اسمی (stem) — حالتِ فاعلی، اضافی یا جرّی، مفعولی اور مفرد اور جمع کی بعض اور حالتیں (آلما *alma*, :سیب، سیب سے یا سیب کا، سیب (جمع) ۔ ترکیبِ قیاسی کی مثالیں بھی ملتی ہیں : بِر = ایک، بِر + ار *bir + är* [بِر + رْ] = ایک ایک کرکے ، اور اسی پر قیاس کر کے : ایکی ≠ دو، ایکی + رر (*iki + rär*) =

دو دو کر کے (چغتائی)؛ یا بِش besh = پانچ، بِش + ار (besh + ār) = پانچ پانچ کر کے اور اسی قیاس پر: آلتی = چھے، آلتی + شر = چھے چھے کر کے.

ترکی نحو میں کلمات کی دو بنیادی قسمیں ہیں: اسم اور فعل ۔ اسماء کی ذیلی تقسیم یہ ہے: اسماءِ ضمائر، اسماءِ اعداد اور اسماءِ عامّہ ۔ اسمِ صفت کے لیے کوئی مخصوص اشتقاق (morphological) ہے، نہ اسماء اور صفات میں کسی طرح کی بیّن تمییز و تفریق موجود ہے؛ مثلاً تیمِر = لوہا اور لوہے کا (= آہنی)، تاش = پتھر اور پتھر کا (= سنگی)؛ سُو (صو) = پانی اور پانی سے متعلق (= آبی)؛ صفت اپنے موصوف سے ملے تو ایک نحوی کلّ واحد بناتی ہے ۔ اس طرح جمع کے اور مختلف حالتوں کے حروفِ لاحقہ کا صرف موصوف ھی پر اضافہ کیا جاتا ہے اور صفت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ فعلی صیغوں کی تقسیم حسبِ ذیل ہے: (۱) افعالِ تامّہ، جو تعداد میں بہت کم ہیں؛ (۲) اسماءِ فعلی، جن کے معنی کام یا آلۂ کار کے ہوں (nouns of action or of agency) اور (۳) ظروف یا فعلی توابع (gerundives) ۔ اسمی یا فعلی اصل کے توابع تعداد میں بہت کم ہیں اور ادواتِ لاحقہ (post-positions) اور حروفِ تعجّب و ندا وغیرہ کی طرح اسم اور فعل کے علاوہ ایک ثانوی اہمیت کی صنفِ نحوی کی تشکیل کرتے ہیں.

اسماء میں ملکیّت ظاہر کرنے والے مقاطعِ لاحقہ، ھندی۔یورپی زبانوں کے ضمائرِ ملکیّت (possessive pronouns) کے مماثل ہیں: آت + اِم = میرا گھوڑا، آت + اِک = تیرا گھوڑا، آت + ی = اس کا گھوڑا، اتا + م = میرا باپ، اتا + ک = تیرا باپ، اَتا + سی = اس کا باپ، آت + اِیمِز = ھمارا گھوڑا، آت + اِکز = تمھارا گھوڑا، اَتا + مِز = ھمارا باپ، اتا + کز = تمھارا باپ ۔ یہی حروفِ لاحقہ بعض اشکالِ فعلی میں بطور ضمائرِ شخصی متّصلہ کے بھی استعمال ہوتے ہیں: کِل + گو + م = میں آؤنگا، کِل + گو + ک = تو آئے گا، کِل + گو + سی = وہ آئے گا (چغتائی)؛ کِل + دِ + م = میں آیا، کِل + دِ + ک = تو آیا، کِل + دِ (کِل + دِ + ی؟) = وہ آیا.

اِسنادی (enclitic) نیم مقاطعِ مفعولیہ (متّصلہ) (demi-suffixes)، جو ضمائرِ شخصیہ سے مشتق ہوتے ہیں اور بعض بولیوں میں مقاطعِ ملکیت سے متأثر ہو چکے ہیں، اسماء کی صورت میں ھندی۔یورپی زبانوں کے افعالِ ثابتہ (substantive) کے مماثل ہوتے ہیں؛ بحالیکہ افعال کے آخر میں وہ ضمائرِ متّصلہ آتی ہیں جو بیشتر مستعمل ہیں: واحد متکلّم: بِن، مِن، بِن، مِن، اِن، اِم؛ مخاطب: سِن، سِن، سِک؛ جمع متکلم: بِز، اَز، اِز، مِز؛ مخاطب: سِز، سِکز ۔ مثالیں: آذگو ۔ بِن (بن bin، مِن، مِن) < اِیی ۔ یم = میں بخیر ہوں؛ یازار ۔ بِن (بن bin، مِن، مِن) > یازر ۔ بِن (یم) = میں لکھتا ہوں ۔ قدیم زبان میں اسمِ اشارہ "اُول" ol فعلِ اثباتی (ہونا) (substantive) کے صیغۂ غائب میں استعمال ہوتا تھا: اَذگو + اُول (ädgü + ol = وہ بخیر ہے ۔ موجودہ زبانوں میں ـــ اسنادی نیم مقطعِ لاحق دِر (دی) استعمال ہوتا ہے، و شکل (صیغۂ) فعلی، تورور = وہ سیدھا کھڑا ہے، سے بنا ہے.

جمع کا مقطعِ لاحق tar، lar، اسماء اور افعال دونوں کے ساتھ یکساں استعمال ہوتا ہے: آتلار (آت + تار) = گھوڑے، آت + تی + لار = انھوں نے پھینکا ہے.

ضمائرِ متّصلہ بافعال یوں بنتی ہیں: امر کی صورت میں خالص اصلِ فعلی (verbal stem) سے؛

دوسری حالتوں میں ایک یا دوسرے حالِ فعل (mood) یا زمانِ فعلی (tense) کے اصلوں (stems) سے - مفعولیّت اور سلکیّت کے مقاطع کے علاوہ خاص خاص مقاطعِ لاحقہ بھی ضمائرِ متّصلہ کے طور پر استعمال ہوتے ھیں : مثلاً زُو، زُونْ، سُونْ، سُونی ، صیغۂ امرِ غائب کے لیے، ق، ك، فعلِ ماضی قریب اور شرطی کے جمعِ متکلّم کے صیغے کے لیے جدید بولیوں میں (کِل + دِ + ک = ھم آ گئے ھیں، کِل + سِ + ک = اگر ھم آتے) - مؤخّرالذکر حرفِ لاحق (ق ، ک) آذربایجانی بولیوں میں، بعض اناطولی بولیوں میں اور ترکمانی کی گو/کْلنگ Gökleng بولی میں، اسماء اور افعال کے صیغۂ جمعِ متکلم کے مفعولی متصل (predicative enclitic) مقاطع کے عوض بھی کام دیتا ھے.

بیشتر جدید ترکی زبانوں میں گردان کی پانچ حالتیں ھوتی ھیں ، جن میں مخصوص آخری مقاطع استعمال ھوتے ھیں : مضاف الیہ (genitive) میں (اِک، نِک، نِنْ، نِی، اِن) ؛ مفعول بہٖ (accusative) میں (ی ، نی ، قدیم لغت میں اِگْ)، مفعول الیہ (dative) میں(قا، اَ، یا؛ غا، غان)، ظرفِ مکانی(locative) میں (دا)،مجرور(ablative) میں(دَانْ، دَاک، دن)؛ لیکن پرانی زبانوں میں اور بعض جدید زبانوں میں دلالت علی القول (directive) ، اسمِ آلہ (instrumental) اور دوسری حالتوں کے لیے بھی بعض حروف کا اضافہ کلام کے شروع میں کیا جاتا تھا.

ترکی صرف میں تذکیر و تانیث کا وجود نہیں ھے- باعتبارِ تعداد صرف دو صیغے ھیں (یعنی واحد و جمع).

ترکی زبانوں میں صوتی اور مفرداتی اختلافات بہ نسبت صرفی اختلافات کے زیادہ نمایاں ھیں - چُواش اور یاقوت کی اپنی جداگانہ حیثیّت ھے - باقی تمام ترکی زبانوں کو ایک ھی زبان کی عوامی بولیاں یا فروع کہا جا سکتا ھے.

ترکی‌زبانوں کی تمام معلومہ مدّت تاریخی میں (آٹھویں صدی کے بعد سے شروع کر کے) معتد بہ طور پر روایت کی جامد پابندی نظر آتی ھے - ترکی زبانوں کا تقابلی تاریخی مطالعہ ابھی اپنے ابتدائی مدارج میں ھے (راڈلوف Radloff، ٹومسن Thomsen، Melioranski، Bang، Grønbeck براکلمان اور Deny کی تصانیف) - رام شٹٹ (Ramstedt)، Gombocz ، نمِث (Nemeth) ، اور پوپہ (Poppe) کی تحقیق و تفتیش کی بدولت یہ بات کم و بیش مسلّم و مصدّق ھے کہ ترکی زبانیں منگولی زبان سے رشتہ رکھتی ھیں اور چُواش کا ان دونوں سے قریبی تعلق ھے - مار (N. Marr) نے ترکی زبان کی گذشتہ تاریخ پر نئی روشنی ڈالی ھے - اس نے ترکوں کو اولادِ یافث تسلیم کرنے والی رائے کے نقطۂ نظر سے چُواش کا مطالعہ کیا ھے، اور وہ ترکی زبانوں کو ایک ایسے گروہ میں رکھتا ھے جو تورانیت کے قائلین (Turanists) کے قدیم تر نظریوں کے مجوّزہ گروہ سے کچھ ایسا زیادہ بڑا نہیں ھے.

مآخذ: (۱) Böthlingk : *Ueber die Sprache der Jakuten*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۱ء؛ (۲) راڈلوف : *Vergleichende Grammatik der nördlichen Türksprachen, i., Phonetik*، لائپزگ ۱۸۸۲ء؛ (۳) V. Grønbeck : *Forstudier til tyrkisk lydhistorie*، کوپن ہاگن ۱۹۰۲ء؛ (۴) P. Melioranskii : *Arab-filolog o tureckom iazykie*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۰ء؛ (۵) N. Katanov : *Opyt issliedovania uriankhaïskogo iazyka s ukazaniem glavnieišikh rodstvennych otnoshenii ego k drugim iazykam tiurkskogo kornia*، قازان ۱۹۰۳ء؛ (۶) Bang : *Vom Köktürkischen zum Osmanischen*، نیز اس کی دیگر تصانیف؛ (۷) محمود بن الحسین الکاشغری : دیوان لغات الترک، استانبول؛ [دیوان لغة الترک (ترجمۂ ترکی مع اشاریہ)، انقرہ ؟ تا ۱۹۴۲ء]؛ (۸) مار N. Marr : *Čuvashi-iafetidy*

na Volgie، Čeboksary ۱۹۲۶ء؛ (۹) N. Poppe: O rodstvennych otnosheniiakh čuvashskogo i tiurko-taturskikh iazykov، Čeboksary ۱۹۲۵ء؛ (۱۰) وهی مؤلف: Istoriia i sovremennoe polodjenie voprosa o vzaimnom rodstvie altaïskikh iazykov (Stenograficeskii otčet Pervogo Turkologičeskogo S'iezda v Baku، Baku 1926)؛ (۱۱) M. Th. Houtsma: Ein türkisch-arabisches Glossar، لائیڈن ۱۸۹۴ء؛ (۱۲) Comes Géza Kuun: Codex Cumanicus، بوڈاپسٹ ۱۸۸۰ء؛ (۱۳) Bang: Beiträge zur Kritik des Codex Cumanicus (در Bull. de l' Acad. R. de Belgique، ۱۹۱۱ء) اور اس کی دوسری تصانیف؛ (۱۴) C. Salemann: Zur Kritik des Codex Cumanicus (Bull. de l'Ac. des Sc. de St.-Pétersb.) ۱۹۱۰ء؛ (۱۵) N. Ashmarin: Materialy dlia issledovania čuvashskogo yazyka، قازان ۱۸۹۸ء؛ (۱۶) وهی مؤلف: Opyt issled. čuvash. sintaxisa، قازان ۱۹۰۳ء؛ (۱۷) راڈلوف: Proben der Volkslitteratur der türkischen Stämme، ج ۱ تا ۱۰، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۶ تا ۱۹۰۳ء؛ (۱۸) Pekarsky: Obrazcy narodn. literatur. yakutov، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۷ تا ۱۹۱۸ء.

۳ - ادبی رسومِ خط اور زبانیں :

ترکی کے قدیم ترین محرّر اور مؤرّخ آثار کی ابتداء آٹھویں صدی سے ہوتی ہے - یہ وہ کتبے ہیں جو چھٹی سے آٹھویں صدی تک کے ترکی خاندان کے حاکموں کوُل۔تگین (Kül-Tegin) اور بِلْگہ خان کے اعزاز میں قائم کردہ نُصب (steles) پر نقش کیے گئے اور جنھیں ۱۸۸۹ء میں ایادْرِنْسف (Iadrincev) نے منگولیا میں دریاے اُورخون (Orkhon) کی وادی میں دریافت کیا - دوسرے کتبے، طویل و مختصر، اسی رسمِ خط میں منگولیا، سائبیریا اور مغربی ترکستان میں پائے گئے ہیں - سائبیریا کے آثارِ تاریخی کو مِسَّرشمِٹ (Messerchmidt) نے ۱۷۲۱ء میں دریاے ینِیسے (Yenisei) کی وادی میں دریافت کیا تھا - قلمی نسخے اسی رسمِ خط میں (تقریباً نویں صدی کے لکھے ہوئے) بزمانۂ حال چینی ترکستان کی حفریات میں پائے گئے ہیں - اس رسم خط کو ۱۸۹۳ء میں ڈنمارك کے سر برآوردہ ماہرِ لسانیات ٹومسن (V. Thomsen) نے حل کیا اور انھیں ترکی رُون (runes) (۱) (خطِ پاستانی) کا نام دیا تھا، دوسرے لوگوں نے اسے اورخونی الفباء کہا ہے - ''کوك۔تۈرکی'' (Kök-Türkisch) کا نام جیسے بانگ (W. Bang) نے تجویز کیا تھا ٹومسن، راڈلوف اور دیگر علماء نے مسترد کر دیا ہے - ترکی خطِ پاستانی آرامی الفباء سے مشتق ہے، مگر قدیم سُغدی الفباء کے توسط سے لیا گیا ہے، البتہ اُس کے بعض حروف جداگانہ اصل کے ہیں اور تصوری تحریر (ideographic) کی قسم سے ہیں: مثلاً *o (k)* [یعنی او (ق)] = تیر؛ *j (a)* [یعنی (آ) ی] = چاند؛ *(a)b* یعنی [(ا) ب] = گھر - بعض تحریریں، جو ترکی خطِ پاستانی میں ہیں، ممکن ہے کہ ساتویں بلکہ چھٹی صدی میلادی کی ہوں.

ترکی 'رُون'، خواہ وہ پتھروں پرہو یا قلمی نسخوں میں، اُن کی زبان کا نمایاں پہلو ایک طرح کی قدامت کے آثار ہیں، یعنی صوتیات میں (د *d* اور ی *j* کی آوازیں) اور صرف میں (صیغۂ قول the directive، اسمِ آلہ اور مضاف الیہ میں جو اُک (*ïn̄·*) پر ختم ہو اور مجرور جو دا (*da.*) پر ختم ہو، فعلی صیغوں میں جو 'سار' اور 'ایغما' پر ختم ہوں) اور مفردات میں (قاک = باپ، اوگ *ög* = ماں).

(۱) در اصل قدیم ٹیوٹونک رسم خط کو کہتے ہیں جو بہت ابتدائی قسم کا تھا -

اویغور الفباء، جو اویغور قوم کے ترکی قبائل میں آٹھویں اور نویں صدی میں عام طور پر مستعمل ہوگئی، سغدی زبان ھی کے توسط سے شمالی سامیوں کی ایک الفباء سے مشتق ھے - یہ قیاس کہ وہ سریانی رسمِ خط اِسترانجیلو (Estranghelo) سے ماخوذ ھے، صحیح نہیں - ،ریغور کی ادبی زبان اسی گروہ میں شامل ھے جس میں منگولی آثار کی ترکی زبان ھے، لیکن بعض لہجاتی اختلافات اس میں موجود ھیں (حالتِ مضاف الیہ منتہی بہ 'نِک'، حالتِ مجرور منتہی بہ 'دِن') - اویغور کا وہ ادب، جو کھدی ھوئی لکڑیوں کے نقوش یا قلمی نسخوں کی شکل میں موجود ھے اور جس کا پتا انگریزی، روسی، فرانسیسی، جرمن اور جاپانی ہیئاتِ اعزامی (expeditions) نے چلایا ھے، بہت وسیع ھے - چینی ترکستان کے قدیم ترک، اویغور الفباء کے علاوہ ترکی 'رون' (runes)، مانوی، سریانی اور برھمی الفباء بھی استعمال کرتے تھے - چین کے ان ترکوں میں، جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا، اویغور الفباء اٹھارویں صدی کے آغاز تک رائج رھی - جب وسطی ایشیا کے ترک [مشرّف بہ اسلام] ھوگئے اور انھوں نے عربی الفباء اختیار کر لی (دسویں سے گیارھویں صدی تک) تب بھی اویغور رسمِ خط بطور سرکاری خط کے باقی رھا - تیرھویں صدی سے پندرھویں صدی تک یہ خط التون اردو میں اور تیموری ترکوں میں قِپچاق اور چغتائی زبانوں کے لیے (یرلیغوں اور منثور و منظوم مصنّفات میں) رائج رھا - سولھویں صدی کے شروع تک استانبول میں اویغور خط کے ماھر موجود تھے (عبدالرزاق بَقشی) - مغربی یورپ میں ریمیوسا (Rémusat) کلاپروتھ (Klaproth) اور ژوبیر (Jaubert) نے انیسویں صدی کے نصفِ اول میں اویغور رسم خط کو پڑھنا شروع کیا۔

ایلک خانون [رَکَ بآن] یا قرہ‌خانیوں کے ممالک میں، جو اسلام لے آئے تھے، وسطِ ایشیا کی وہ ترکی ادبی زبان جو دورِ اسلامی کے ساتھ خاص ھے پروان چڑھی، یہ عربی رسمِ خط میں لکھی جاتی تھی اور زمانۂ قبلِ اسلام کی ادبی اویغور پر مبنی تھی - اس زبان کی قدیم ترین دستاویز، جس کا ھمیں علم ھے "(۱) کُداتغُو بِلگ" [کذا] ('علم سعادت بخشی') ھے جو گیارھویں صدی عیسوی کی ایک ادب آموز نظم ھے اور جسے یوسف خاصّ حاجب [رَکَ بآن] نے بَلاساغون اور کاشغر میں تصنیف کیا تھا - یہ تصنیف دو متأخر عربی نسخوں اور ایک اویغوری خط کے نسخے کی شکل میں، جو پندرھویں صدی میں ھرات میں لکھا گیا تھا ھم تک پہنچی ھے - اس کی زبان خالص اویغور قرار نہیں دی جا سکتی - کوپریلِی زادہ کے نزدیک کُداتغُو بلگ [کذا] کی زبان قَرلُقی ھے، لیکن اسے قرہ خانی کہنا احتیاط سے قریب تر ھوگا.

اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ دریاے قامہ (Kama) کی بُلغار سلطنت میں، جہاں اسلام دسویں صدی میں رائج ھو گیا تھا، بُلغاری زبان میں کوئی ادب تھا یا نہیں، ھمارے پاس ضروری معلومات موجود نہیں ھیں، بہر صورت والگا کے علاقے میں چودھویں صدی کے مقابر پر جو کتبے ھیں ان میں بُلغاری عناصر موجود ھیں - وسطی ایشیا کی ادبی زبان کا ارتقاء گیارھویں صدی سے شروع ھو کر بلا توقف جاری رھا؛ اگرچہ اس کے مرکز وقتاً فوقتاً بدلتے رھے.

اِدیب احمد کی ادب آموز تصنیف عیبۃ الحقائق کو ھم بارھویں صدی کی تصنیف قرار دے سکتے ھیں - یہ کتاب رباعیات کی شکل میں ھے اور اس کی

(۱) رک بہ III چغتائی ادب ص ۲۵۳، عمود ۱.

زبان کُتادغو۔ بلگ کی زبان سے قریبی تعلق رکھتی ہے، اگرچہ بعینہٖ وہ نہیں ۔ شروع زمانے کے مخطوطات کی عدم موجودگی ہمیں ترکی تصوّف کے بانی احمد یسوی (تیرھویں صدی) کی تصنیف حکمت کی زبان کا کوئی نام معین کرنے سے مانع ہے، گو کوپریلی زادہ، یسوی کو قرلق ہی سمجھتا ہے ۔ جوچی سلطنت کے مختلف حصّوں یا 'دشتِ قپچاق' میں، خوارزم میں، جس میں سیر دریا [رک بآن] کا دھانہ بھی شامل تھا، دارالسلطنت سرائے [رک بآن] میں اور بلادِ قریم (Crimea) میں ادبی سرگرمیاں چودھویں صدی کے آغاز تک معتدبہ ترقی کر چکی تھیں ۔ مملکتِ جوچی میں کوئی یکساں ادبی زبان رائج نہیں ہوئی ۔ اس زمانے کا جتنا بھی ادبی مواد ہمارے پاس موجود ہے، اس میں قرہخانی عہد کی ادبی زبان کے عناصر اُن مقامی بولیوں کے عناصر سے مخلوط ہیں جو اب تک زندہ ہیں (یعنی قپچاق اور اوغوز (ترکمان)) ۔ چودھویں صدی کا ایک منظوم رومان، خسرو شیریں، جو نظامی کی اسی نام کی مثنوی کے تتبع میں لکھا گیا ہے اور آق اردو (White Horde) کے تنی۔ بک Teni-bek اور اس کی بیوی کے نام پر معنون کیا گیا، قطب شاعر نے لکھا۔ اس کا نسخہ پیرس کے کتاب خانۂ ملّی (Bibliothèque Nationale) میں ہے ۔ اس مثنوی کی زبان کُتادغوبلگ کی زبان سے بہت نزدیک ہے، لیکن اس میں قپچاق (سلا = گاؤں، وغیرہ) اور اوغوز عناصر نمایاں ہیں ۔ خوارزمی کی نظم محبت نامہ چودھویں صدی میں سیر دریا کے کنارے لکھی گئی ۔ اس کے دو نسخے، پندرھویں اور سولھویں صدی کے زمانے کے، برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں، اس میں قرہخانی کے مقابلے میں قپچاق اور اوغوز لسانی عناصر کہیں زیادہ نظر آتے ہیں ۔

تیرھویں صدی میں دنیاے اسلام کے ترکی حصّے میں مختلف ادبی زبانیں ابھی بیّن طور پر ایک دوسری سے علٰحدہ نہیں ہوئی تھیں۔ منگول سلطنت کی تشکیل نے، جو اس زمانے کی تقریباً تمام ترکی دنیا پر مشتمل تھی، کچھ عرصے کے لیے ایک ایسی فضا پیدا کر دی جو مسلم ترکی اقوام کے خاصے بڑے حصّے کے لیے یکساں ادبی زبان کے ارتقاء کے لیے سازگار تھی ۔ ایشیاے کوچک کے بلادِ سلجوقیہ کی ادبی سرگرمیاں اپنے ابتدائی دور میں بلاشبہہ کسی حد تک وسطی ایشیا اور مشرقی یورپ کی سرگرمیوں سے وابستہ تھیں ۔ اس کی صحیح تعیین کرنا بہت دشوار ہوگا کہ تیرھویں صدی کے ایک شخص علی نامی کا تصنیف کردہ قصۂ یوسف، جو رباعیات میں لکھا گیا ہے، کہاں تصنیف ہوا تھا ۔ اس کی زبان چودھویں صدی کے التون اردو کے ادب سے، جس کی تخلیق میں اوغوز۔ ترکمانوں کا بھی حصہ تھا، بہت ملتی جلتی ہے۔ بعد کے زمانے میں یہ قصّہ والگا کے علاقے میں بہت مقبول ہو گیا ۔ مرجانی، قازان کا ایک عالم، اسے بلغاری تصور کرتا ہے، بخلاف براکلمان، جو قصۂ یوسف کو اناطولیا میں تخلیق شدہ ادبی تصانیف سے مربوط کرتا ہے ۔ چودھویں صدی کی منثور تصنیف قصص الأنبیاء مصنفۂ رباطِ اوغوز کی زبان، جس میں نظم کے ٹکڑے بھی ہیں، قرہخانی زبان سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہے ۔ اس کی زبان کو چغتائی کہنا صحیح نہ ہوگا ۔ سمیریچیہ (Semiriečie) کی قبروں پر تیرھویں۔ چودھویں صدی کے جو سریانی عیسائی ترک کتبے ہیں، ان کی زبان قرہخانی سے بہت ملتی جلتی ہے (اُوذ *ud* = بیل، یوند = گھوڑا، یرتونچو yertünču = یہ دنیا، اتا = باپ، انا = ماں)۔ ترکی عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں جو مختلف ادبی زبانیں پائی جاتی ہیں ان کے ارتقاء

کے آغاز کی تاریخ چودھویں اور پندرھویں صدی کو قرار دے سکتے ہیں۔ اس ادب کو وسطی ایشیا کے ترکی ادب سے شروع کرنا ہوگا جسے ہم اس عہد کا تنہا ترکی ادب فرض کر سکتے ہیں ۔ سب سے زیادہ ترقّی عثمانی اور چغتائی ادبی زبانوں نے کی ۔ عثمانی ترکی کی کڑیاں دَورِ سلاجقہ کے اناطولی ترکی ادب کے توسّط سے وسطی ایشیا کے ترکی ادب سے ملی ہوئی ہیں ۔ چغتائی ترکی وسطی ایشیاً کے ترکی ادب کے ارتقاء کے تیسرے دور کی نمایندگی کرتی ہے، جو طویل‌ترین (پندرھویں سے بیسویں صدی تک) اور درخشان‌ترین دَور ہے اور اپنی ابتداء کے لیے براہِ راست دوسرے دور یعنی دورِ جوچی کا رہینِ منّت ہے۔ چغتائی زبان کی نشو و نما تیموریوں کے ممالک میں ہوئی، جو چنگیز خان کے دوسرے بیٹے چغتائی [رَكّ بآن] کی یورت پر مشتمل تھے ۔ وسطی ایشیا کی ادبی ترکی زبان کے سابق دورِ ارتقاء میں قپچاق اور ترکمانی عناصر موجود تھے ، ان کی جگہ چغتائی زبان میں سلطنتِ چغتائی کی غالب مروّجہ ترکی بولیوں کے زندہ عناصر نے لے لی ۔ شہنشاہ بابر کہتا ہے کہ چغتائی ادب کی ممتازترین شخصیت میر علی شیرنوائی کی زبان شہرِ اَندجان کی بولی کے عین مطابق ہے [بابر نامہ، طبع وقفیۂ گب، ورق ۲ ب]۔ نظم کی چغتائی زبان نثر کی زبان سے اپنی صرف اور مفردات میں مختلف ہے۔

قریب کے زمانے تک بعض عالم اصطلاحِ چغتائی [رك به [III :] چغتائی ادب (در ذیل)] کا اطلاق غلط طریقے پر بارھویں صدی کے آثارِ ادبی اور مغربی و مشرقی ترکستان کی زندہ بولیوں دونوں پر یکساں طریق سے کرتے رہے ہیں ۔ انیسویں اور شروع بیسویں صدی میں خانانِ خوقند اور خیوہ کی ریاستوں میں چغتائی منثور اور منظوم ادب کی نہضت کے آثار نظر آتے تھے ۔ موجودہ زمانے میں اوزبکستان میں چغتائی زبان اوزبکی ادبی زبان سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے اور یہ ترکی وسطی ایشیا کے ادبی ارتقاء کا چوتھا دور ہے، مگر بیسویں صدی میں وسطی ایشیا کے لوگوں میں دوسری ادبی زبانوں کے رواج پانے کی وجہ سے اس ادب کا دائرہ خاصا محدود ہو گیا، سترھویں صدی میں بھی مؤرّخ ابوالغازی خان نے خیوہ میں اس زمانے کی روایت کے علی‌الرّغم اوزبکی زبان ہی میں اپنی کتاب لکھی نہ کہ چغتائی میں .

وسطی ایشیا کے ترکمان، جنھوں نے جُوچی کی سلطنت کے زمانے میں خوارزم کی ادبی زبان کی تأسیس میں حصہ لیا تھا، بعد کی صدیوں میں اپنی ہی ادبی زبان کا تتبُّع کرتے رہے، خصوصاً نظم میں، جو پندرھویں صدی کے بعد چغتائی زبان کے زیرِ اثر آگئی اور آگے ترقّی نہ کر سکی ۔ ہمارے زمانے میں ترکستان میں ایک نئی ادبی زبان نشو و نما پا رہی ہے، جو خالصۃً ترکمانی بولیوں پر مبنی ہے (خصوصاً تکہ اور یموت پر) .

آذربایجانی (آذری) نے، جو اسی اصل سے ہے جس سے اناطولیا کے سلجوقوں کی زبان، ایران کے ترکوں کے درمیان پرورش پائی ۔ سولھویں صدی میں شروع کے صفوی بادشاہوں [رَكّ به صفویه] کی سرپرستی میں خوشحالی اور سرسبزی کے ایک دور کے بعد یہ زبان بعد کی صدیوں میں بھی باقی رہی، لیکن ایک طرف سے ایرانی ثقافت کے اور دوسری طرف سے عثمانی ترکی کے اثر کے مقابلے میں وہ کوئی ترقّی نہ کر سکی ۔ آذربایجانی کا، جو عام تکلّم کی بولی سے بہت مشابہ ہے، اِحیاء اور دوبارہ استعمال ماورائے قفقاز Transcaucasia میں انیسویں صدی میں ہوا (میرزا فتح علی آخُونْدوف) ۔ بیسویں صدی کے شروع میں یہ عثمانی ترکی سے بہت متأثر

ہوئی اور اس کا نتیجہ دو متقابل دھاروں کی صورت میں برآمد ہوا، جو اب تک موجود ہیں .

الـتـون اردو پـنـدرھـویں صـدی میں مختلف خوانین کی ریاستوں میں منقسم ہو گیا ۔ اس کے باوجود قریم Crimea میں ایک ادبی زبان باقی رہی، جو قِپچاق پر مبنی تھی اور جسے عثمانی ترك قریمی یا دشت (steppe) کہتے ہیں، لیکن عثمانلی ثقافت کا اثر، جو بالخصوص تأریخی ادب اور ادبِ رفیع میں محسوس ہوا، اس زبان کی مزید ترقّی میں دخل انداز ہوتا رہا ۔ قریم میں خان کے دواوین کی سرکاری زبان نے سترھویں صدی تک جوچی روایت کو بڑی حد تک برقرار رکھا ۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں کے شروع میں میرزا غاسپرینسکی Gasprinskii نے قریم میں ایک کل ترکی (پان-ٹرکش) ادبی زبان قائم کرنے کی کوشش کی، جو آسان کی ہوئی عثمانی پر مبنی اور جنوبی قریم کی زندہ عوامی بولی سے بہت مشابہ تھی۔ غاسپرینسکی کے اخبار ترجمان کی اشاعت کاشغر تک میں ہوتی تھی ۔ آج کل قریم میں اور آذربایجان میں بھی دو حریف عناصر، یعنی عثمانی عنصر اور مقامی عنصر، کی باھمی کشمکش ادبی زبان میں جاری ہے اور صورتِ حال اس واقعے سے اور زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے کہ خود قریم کی زندہ بولیاں دو مختلف گروھوں میں بٹی ہوئی ہیں، یعنی جنوب مغربی اور شمال مغربی میں .

جوچی زبان خانیۂ قازان کو بھی ورثے میں ملی، جہاں یہ چغتائی اور قدیم عثمانی زبان سے اور انیسویں صدی میں دورِ جدید کی عثمانی سے متأثر ہوئی ۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں قیّوم نصیری کے زمانے سے قازان کے تاتاریوں میں ادبی زبان کو مقامی بولی سے ربط دینے کی تحریک کا آغاز ہوا ۔ اس تحریک نے، باوجود غاسپرینسکی کے پیرووں کی مخالفت کے، مکمّل کامیابی حاصل کر لی ہے ۔ تاتاری ادبی زبان میں روسی اثر کے سرایت کرنے کے خلاف بھی اب ایک سدّ قائم کر دی گئی ہے ۔ یہ اثر پہلے بعض مصنّفین میں نہ صرف مفردات بلکہ نحو کے اعتبار سے بھی بہت نمایاں رہتا تھا ۔ قازان کی تاتاری زبان نہ صرف تاتاریوں میں رائج ہے بلکہ استراخان کے میشار Mishars اور نوغای بھی اسے استعمال کرتے ہیں ۔ جمہوریۂ باشکر کی تأسیس سے پہلے یہ زبان باشکر اور تِپتِر (قبّ تِپتِیر TEPTYAR) قبائل میں بھی رائج تھی ۔ ان دنوں باشکر خود اپنے لیے ایک ادبی زبان تخلیق کر رہے ہیں، لیکن مختلف رجحانات کی باھمی کشمکش سے بالکل اجتناب نہیں کر سکے ۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور وہ رجحان ہے جو ایک درمیانی راستہ اختیار کرنا چاھتا ہے اور ادبی زبان کو ایسی عوامی بولیوں پر مبنی کرنے سے انکاری ہے جن کے صوتیات اور مفردات میں واضح اور نمایاں خصوصیات موجود ہیں ۔ اناطولی ترکی کے بعد قازانی تاتاری ادبی زبان سب سے زیادہ ترقّی یافتہ اور مستحکم ہے اور اناطولی ترکی کی طرح اسے وہ مقبولیّت حاصل ہے جو علاقۂ والگا کی حدود سے باھر بہت دور دور تک پہنچتی ہے .

ترکی ادبی زبانوں کی تعداد بالخصوص روس کے ۱۹۰۵ء کے انقلاب اور اس سے بھی زیادہ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد بڑھنا شروع ہوئی، یہ وہ وقت تھا جب قومیّت کا جذبہ بیدار ہوا اور ترکی دنیا کی مختلف اقوام میں اپنی ایک مخصوص ثقافت کے مالک ہونے کا احساس پیدا ہوا — ادبی (قیرغیز) قازاق زبان — نوعمر مگر پرمایہ اور لچکدار — بیسویں صدی کے شروع میں معتدبہ ترقّی کر گئی ۔ یہ عربی اور فارسی کے مستعار الفاظ سے نسبۃً پاک ہے ۔

عوامی بولی سے قریبی رابطہ رکھتی ہے اور عربی رسم خط استعمال کرتی ہے ، جس میں بای‌تورسون Baytursun نے بہت ہوشیاری سے اصلاح کر دی ہے ۔ قیرغیز جمہوریت کے قیام کے بعد سے (قرہ) قیرغیز نے اپنی ایک علٰحدہ ادبی زبان کی تخلیق کا بیڑا اٹھایا ہے، جو (قیرغیز ۔) قازاق سے الگ ہو ۔

شمالی قفقاز میں قرہ چای۔ بلقاری Ķaračai-Balķarian ادبی زبان بنائی جا رہی ہے، جس کی ترقی میں آبادی کی قلّت اور زیادہ ترقی یافتہ زبانوں، یعنی قریمی اور آذربایجانی کا قرب سدّراہ بن رہا ہے۔ آذربایجانی کا اثر داغستان میں اور بھی زیادہ نمایاں ہے، جہاں وہ سرکاری طور پر تسلیم کی جانے والی ہے اور مقامی ادبی زبان قومیق Ķumîķ کا شدید مقابلہ کر رہی ہے جو انیسویں صدی میں عربی کو، جو داغستان کی روزمرہ استعمال کی زبان تھی، خارج کر کے خود نشو و نما پانے لگی تھی۔

جہاں تک الفباء کا تعلق ہے ترکی اسلامی دنیا میں دو قوّتیں آج کل ایک دوسری کے خلاف کام کر رہی ہیں ۔ ایک تو ایسی عربی ابجد کی حامی ہے جسے اصلاح کے بعد ترکی کے نظامِ صوتی کے مطابق بنا دیا جائے اور اسے قازان۔تاتار، (قیرغیز۔)قازاق، (قرہ)قیرغیز ، اوزبک ، ترکمان اور قریم کی زبانوں کے لیے ایک جدید عربی الفباء مہیا کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہے ۔ دوسری تحریک سب ترکی زبانوں کے لیے ایک ایسی لاطینی ابجد کے حق میں ہے جس میں چند حروف کا اضافہ کر دیا جائے۔ خود ترکی میں اس تحریک کا خیر مقدم ہوا ہے ۔ آذربایجان میں اسے فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی ہے، جہاں یہ تحریک انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی تھی اور اب بھی وہ دوسری ترکی اقوام میں ترقی کر رہی ہے ۔ لاطینی پر مبنی نئی ترکی متّحدہ الفباء کو سوویاتی جمہوریتوں کی مسلم ترکی اقوام نے ۱۹۲۷ء میں باقاعدہ طور پر اختیار کر لیا تھا ۔

قدیم ترین ترکی خط ، جو رُونی Runic ابجد میں پایا جاتا ہے، بعض سامی خصائص رکھتا تھا اور بہت سی صورتوں میں اس میں حروفِ علّت نہیں ہوتے تھے (ق غ ن = قاغان، ی غ ز = یاغیز، اور قِل ن م ش = قِیلِنْمِش اور فتحہ کی آواز پہلے جزوِ کلمہ میں جبھی ظاہر کی جاتی تھی جب وہ لمبی ہو (ت = ات، گھوڑا، ات = آت، نام) ۔ اویغوری الفباء میں حروفِ علّت کا اظہار بہ نسبت 'رُونی' کے زیادہ موقعوں پر ہوتا تھا اور عربی رسمِ خط سے، جو بعد میں استعمال ہونے لگا، مقابلۃً زیادہ صحت و تعیین کے ساتھ ہوتا تھا؛ چنانچہ *ö* اور *ü* کی آوازوں کو *o* اور *u* کی آوازوں سے ممیّز کرنے کے لیے *o* اور *u* کے ساتھ صرف *i* کا اضافہ کر دیا جاتا تھا : *söz = soiz* ۔ عربی رسم خط کے اثر کے ماتحت اسلامی دور میں یہ طریقہ اویغور کتابت میں ترک کر دیا گیا ۔ قدیم‌تر اویغور کتابت میں حروفِ صحیحہ کی تحریر ، بعد کی تحریر کے مقابلے میں، زیادہ معیّن تھی، جس میں حرفِ ت و حرفِ د کا استعمال بلا امتیاز ہوتا تھا اور بعض اور چیزوں میں بھی سادگی اختیار کر لی گئی تھی، جس کی وجہ سے راڈلوف کو حروفِ صحیحہ کے اس غلط اویغور طریقے کی حمایت کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کی تصحیح بعد میں ٹومسن نے کی ۔ اویغور تہجّی orthography کو، جہاں تک حروفِ علّتہ کا تعلق ہے، *ö* اور *ü* کی خاص علامتوں کے استثناء سے وسطی ایشیا میں اسی وقت اختیار کرلیا گیا جب عربی رسمِ خط اختیار کیا گیا، اس وقت کے بعد سے چغتائی اور عثمانی حروفِ ہجاء میں تمیز کی جانے لگی ۔ ایشیاے کوچک میں

عربی تہجّی کے راست اثر کے ماتحت ایک مخصوص ترکی تہجّی نے استقرار حاصل کیا، جس میں قدیم عثمانی تحریر کا رنگ بہت نمایاں تھا (حُروفِ علّت کے لیے کسی علامت کا فقدان، عربی حرکات کا استعمال وغیرہ) ۔ یہ صحیح ہے کہ بعد میں ان عربی ھجائی خصوصیات میں سے بعض کو ترک کر دیا گیا، لیکن موجودہ زمانے تک عثمانی تہجّی حروفِ علّت کے اظہار کو بہت حد تک محدود کر دینے کی وجہ سے چغتائی تہجّی سے ممیّز ہے (عثمانی ک ل = چغتائی کِل؛ عثمانی ب ر = چغتائی بِر)؛ نیز حروفِ علّت لاحقہ سے ترکیب دے کر ترکی الاصل الفاظ میں حرفِ س اور حرفِ ت کی آواز کو عربی حروفِ ص اور ط سے ادا کرنے کی وجہ سے بھی عثمانی تہجّی کو امتیاز حاصل ہے (صو= پانی = چغتائی سو؛ طاغ = پہاڑ = چغتائی تاغ)۔ قدیم تاتار۔قازان تہجّی وسطی ایشیا کی تہجّی پر مبنی تھی، لیکن بعض حالتوں میں اس میں بھی قدیم خطِّ عثمانی کا اثر نظر آتا تھا۔

تہجّی کی اصلاح کی تحریک نے، جو ایک صوتی phonetic رسمِ خط کو اختیار کرنے کی شکل میں ظاہر ہوئی، انیسویں صدی کے آخر سے ترکی عالم اسلامی میں اپنا زور دکھانا شروع کیا، لیکن اس کے زیادہ تر نتائج ترکیہ میں نہیں بلکہ روس کی ترکی اقوام اور بالخصوص (قیرغیز۔) قازاق میں برآمد ہوے ہیں ۔ دراسات ترکیہ کی جو کانفرنس باکو میں ۱۹۲۶ء میں منعقد ہوئی، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک مخلوط تہجّی اختیار کی جائے، جو صوتی اور اشتقاق تہجّی دونوں کو ملا کر بنائی جائے۔ اسے قائم کرنے کے لیے اب اصلاح شدہ عربی ابجد اور نئی ترکی لاطینی ابجد کی مدد سے ضروری اقدامات کر لیے گئے ہیں ۔

زمانۂ حال کی غیر مسلم ترکی اقلیتوں، یعنی چُواس، یاقوت، التائی اور ینِسے کے ترکوں کو ابھی بالکل قریب زمانے تک ناخواندہ اقوام کے زمرے میں شمار کیا جاتا تھا، اس کے باوجود کہ یاقوت کے یہاں یہ روایت چلی آتی ہے کہ قدیم زمانے میں ان کی ایک الفباء تھی، اور اس کے باوجود کہ [کوھستانی] التائی کے ترکوں کے یہاں ایک منگولی الفباء، جسے ترکی زبان کی ضروریات کے مطابق بنا لیا گیا ہے، اب تک استعمال ہوتی ہے، گو اس کا استعمال بہت محدود ہے ۔ ان سب اقوام کو اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں روسیوں سے روسی الفباء ملی، جس میں ان کی مخصوص ضروریات کے پیش نظر جزئی ترمیم کر دی گئی تھی ۔ ۱۹۱۷ء میں قبیلۂ یاقوت نے روسی الفباء کی جگہ ایک لاطینی الفباء کو، جو بین الاقوامی صوتی رسمِ خط پر مبنی تھی، اختیار کر لیا، جسے ایک یاقوتی طالبِ علم نوف گوروڈوف M. Novgorodov نامی نے تیار کیا تھا۔ تُنّو۔تُوین Tunnu-Tuwins (اُوریانخائی Ouriankhais یا سیوت Soyots) لوگ، جو منگولی ثقافت سے بہت متأثر ہیں، اس وقت ایک قومی ادبی زبان کو نشو و نما دینے کی اور اپنے لیے ایک مناسب الفباء انتخاب کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں۔

یونانی ابجد، جو نویں صدی سے دریاے ڈینیوب کی ترکی بُلغاریوں کی سلطنت میں ترکی زبان کے لیے مستعمل تھی، اناطولیا اور استانبول کے مسترک یونانیوں میں ابھی زمانۂ حال تک رائج تھی ۔ مسترک ارمنیوں نے ارمنی ابجد کو ترکی زبان کی ضرورتوں کے ساتھ متوافق کر لیا ہے ۔ کچھ آذربایجانی مخطوطات ایسے ہیں جو گرجی Georgian ابجد میں لکھے گئے ہیں ۔ کرایت Karaites، جو ترکی زبان بولتے ہیں، قدیم زمانے سے عبرانی رسمِ خط استعمال کر رہے ہیں ۔

مآخذ : (۱) ٹومسن : Samlede Abhandlinger، ج ۳، کوپن ہاگن ۱۹۲۲ء؛ (۲) راڈلوف : *Die alttürkischen Inschriften der Mongolei*، Neue Folge، ۱۸۹۷ء؛ (۳) وہی مؤلف : *Alttürkische Studien*, v. (*Bull. de l'Acad. des Sciences de St. Pétersbourg*، ۱۹۱۱ء)؛ (۴) A. v. Le Coq : *Kurze Einführung in die uigurische Schriftkunde* (*Mitteil. d. sem. für or. Spr. zu Berlin*، ج ۲۲، ۱۹۱۹ء)؛ (۵) Kokowzoff : *K sirotureckoj epigrafike Semirečia* (*Bull. de l'Ac. des Sc. de St. Pétersbourg*، ۱۹۰۹ء)؛ (۶) کوپریلی زادہ : ترک ادبیاتندہ ایلک متصوفلر، ۱۹۱۸ء؛ (۷) A. Samoilovič : *Materialy dlia ukazatelia literatury po ieniseisko-orkhonskoi pismennosti* (*Trudy Troicko-savsko-kiakhtinskogo Otd'ela R. Geogr. Obščestva*، ج ۱۵، ۱۹۱۹ء)؛ (۸) وہی مصنف : *K istorii literaturnogo sredneasiatskogo tureckogo iazyka* (*Mir-ali Shir, Sbornik k piatisotlietiiu so dnia roždeniia*، لینن گراڈ ۱۹۲۸ء)؛ (۹) *Inscriptions de l'Iénisséi*، Helsingfors ۱۸۸۹ء؛ (۱۰) *Inscriptions de l'Orkhon*، Helsinghfors ۱۸۹۲ء؛ (۱۱) راڈلوف : *Arbeiten der Orkhon-Expedition, Atlas der Alterthümer der Mongolei*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۲-۱۸۹۹ء؛ (۱۲) وہی مصنف : *Kudatku Bilik*، عکسی نسخہ، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۰ء؛ *Text und Übersetzung*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۰ تا ۱۹۱۰ء [قوتادغو بیلیگ، متن از روی عکس نسخۂ وینا بخطّ اویغور و عکس‌های نسخۂ فرغانہ و مصر بخطّ عربی، ۳ جلد، استانبول ۱۹۴۲ تا ۱۹۴۳ء، طبع T. D. K.]؛ (۱۳) W. Radloff و Malov : *Suvarnaprabhāsa* (*Bibliotheca Buddhica* xvii)؛ (۱۴) F. W. K. Müller : *Uigurica*، ج ۱ تا ۳ (*Abh. Pr. Ak. W.*، ۱۹۰۸ تا ۱۹۲۲ء)؛ (۱۵) A. v. Le Coq : *Khuastuanift* (*J. R. A. S.*، ۱۹۱۱ء اور *Anhang zu Abh. Pr. Ak. W.* ۱۹۱۰ء)؛ (۱۶) Annette S. Beveridge : *The Bābar-nāma* (*G. M. S.*، ج ۱)؛ (۱۷) A. Pavet de Courteille : *Tezkereh-i evliâ*، پیرس ۱۸۸۹-۱۸۹۰ء؛ (۱۸) وہی مصنف : *Dictionnaire turk-oriental*، پیرس ۱۸۷۰ء؛ (۱۹) C. Brockelmann : *Ali's Qissa'i Jūsuf, der älteste Vorläufer der osmanischen Literatur* (*Abh. Pr. Ak. W.*، ۱۹۲۶ء)؛ (۲۰) نجیب عاصم : ہبّۃ [کذا] الحقائق، استانبول ۱۳۳۴ھ؛ (۲۱) P. Pelliot : *La version ouigoure de l'histoire des Princes Kalyānamkara et Pāpamkara* (*T'oung-pao*، ۱۹۱۴ء)؛ (۲۲) Rieu : *Catalogue of the Turkish Manuscripts in the British Museum*، لندن ۱۸۸۸ء .

۴ - ترکوں کا ہمسایہ ملکوں سے، اور اس کے برعکس ان کا ترکی زبان سے، الفاظ مستعار لینا .

ترکی زبانوں کے اُن آثارِ ادبی میں جو عہدِ اسلامی سے پہلے کے ہیں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو چینی، سغدی، سنسکرت اور شمالی سامی زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں، یہاں تک کہ ان آثار کی نحوی تراکیب میں بھی غیر ملکی اثرات مشاہدہ ہو سکتے ہیں؛ خصوصاً ان عبارتوں میں جو دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہیں - سائبیریا اور منگولیا کی جدید بولیوں میں، بالخصوص یاقوت میں، متعددِ منگولی عناصر موجود ہیں، جو یا تو بلا واسطہ مستعار لیے گئے ہیں اور یا مختلف اقوام کے باہمی امتزاج سے آئے ہیں - اسی امتزاج سے یہ بھی ہوا کہ قدیم ایشیائی لسانی عناصر اور بعض ایسے عناصر جن کی ابھی توضیح نہیں ہو سکی ان بولیوں میں داخل ہو گئے ہیں - دریاے ینیسے کا نام "کِم" Kem، جو اورخون کتبوں کے وقت سے معلوم ہے، کوت Kot زبان سے آیا ہے - کوت میں اس کے معنی

دریا کے ہیں اور یہی معنی (دریا) اس کلمے کے جدید سویوت Soyot ترکوں کی بولی میں ہیں ۔ فنّی Finnish عناصر دریاے والگا کے علاقے کی ترکی بولیوں میں پائے جاتے ہیں ۔ چنگیز خان [رک بآن] کی منگول سلطنت کے قیام کے زمانے میں چند مستعار منگولی الفاظ اکثر ترکی زبانوں میں داخل ہو گئے ۔ اس طرح یہ ہوا کہ قدیم ترکی لفظ ''یولار'' بمعنی ''پھندے والا رسّا'' یاقوت، سویوت اور اناطولیا کے ترکوں کی زبان نیز التائی ترکوں کی عورتوں کی زبان میں محفوظ رہ گیا ہے ۔ تیرھویں صدی میں رفتہ رفتہ اس کی جگہ منگول لفظ نوقتہ *nokta* نے لے لی ، جو اب سب دوسری ترکی زبانوں میں، بشمول چواس، استعمال ہوتا ہے ۔ اوزبکوں، ترکمانوں، آذربایجانیوں اور ایران کے ترکی قبیلوں کی ترکی بولیوں میں معتدبہ ایرانی اثر نظر آتا ہے، جو مختلف نسلوں اور تمدّنوں کے باھمی امتزاج کا نتیجہ ہے ۔ ایشیاے کوچک اور جزیرہ نماے بلقان کی مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے لوگوں سے ترکوں کے شاخ در شاخ امتزاج کے نتیجے کے طور پر ہمیں اناطولیہ اور بلقان کے ترکوں کی زبان میں علاوہ عربی اور فارسی کے یونانی ، صقلابی—خصوصاً سربی—، ارمنی، کردی، اطالوی، فرانسیسی اور دیگر عناصر نظر آتے ہیں ۔ شمالی اور جنوبی قفقاز کے مقامی باشندوں سے ترکوں کے میل جول نے ان کی بولیوں میں قفقازی زبانوں کی اصوات اور لغات کے عناصر داخل کر دیے ہیں ۔ وہ ترک جو شام اور مصر میں داخل ہوے تھے عربی سے بہت زیادہ متأثر ہو گئے ہیں ، جس طرح کہ داغستان کے قومیق Kumïks ، جن کے یہاں بخلاف اور مسلم ترکوں کے ھفتوں کے دنوں کے نام عربی ہیں ، ایرانی یعنی فارسی نہیں ۔ ترکی دنیا کے اور حصوں میں جب ترکوں نے اسلام قبول کیا تو عربی سے زیادہ فارسی عناصر قبولِ اسلام کے ہمراہ آئے ۔ عربی اور فارسی کے مستعار الفاظ ترکی ادبی زبان میں بعض اوقات پچاس فیصدی سے بھی زائد ہو جاتے ہیں ۔ ان الفاظ نے ایسے ترکی قبائل کی عوامی بولیوں میں بھی گھر کر لیا جن پر اسلام کا براے نام اثر ہوا تھا : مثلاً قازاق اور قیرغیز (تن = جسم، ژان (جان) = روح) .

کچھ عربی اور فارسی الفاظ غیرمسلم ترکوں میں بھی جا پہنچے ہیں— نہ صرف چواس میں بلکہ التائی اور ینیسے کے ترکوں اور نیز روسی زبان کی وساطت سے یاقوتوں میں بھی (اُمبار = انبار) ۔ روسی اثر کا احساس زیادہ تر علاقۂ والگا کی ترکی بولیوں اور ان میں سے بالخصوص بیشار میں ہوتا ہے، لیکن اتّحادِ روسی سوویاتی (U. S. S. R.) کی سب ترکی زبانوں میں روسی سے مستعار الفاظ موجود ہیں.

اس کے بالعکس ترکی زبان نے بھی—چینی زبان سے شروع کرکے—اپنی ہمسایہ زبانوں کو قدیم زمانے سے متأثر کیا ہے ۔ ترکی الفاظ منگولی زبانوں، متعدد فنّی زبانوں (خصوصاً چرمِش Čeremiss اور مَجَر Magyar)، ایرانی زبانوں، دورِ حاضر کی عربی، ارمنی، گرجی، کردی، یونانی، البانوی، رومانوی اور جزیرہ نماے بلقان اور مشرق و مغربی یورپ کی صقلابی زبانوں میں موجود ہیں ۔ تاریخ میں کسی ترکی قوم کے اپنی زبان کو کھو دینے کا ذکر نسبۃً کم پایا جاتا ہے (بلغاروں نے بلقان میں ، کومان نے ھنگری میں ، تاتاریوں نے لیتھوانیا Lithuania میں ، ڈونگان نے چین میں اور ترکوں نے ھندوستان میں ترکی زبان کھو دی) ۔ اس کے مقابلے میں دوسری اقوام کے استراك کی بہت سی مثالیں موجود ہیں؛ مثلاً سائبیریا میں،

وسطی ایشیا میں، قفقاز میں، ایشیاے کوچک میں، بلقان میں اور مشرقِ یورپ میں (میشار Mishars [کی طرف اشارہ ھے]) مسترک خانہ بدوش لوگ (gipsies) ھمیں ترکیہ میں، ماوراے قفقاز میں، قریم میں اور ترکستان میں ملتے ھیں۔

مآخذ: (۱) معاجم مؤلفۂ راڈلوف، Pekarskii (پ رت) اور Paasonen (چُواس)؛ (۲) مقالات از Korsh و Melioranskii ان الفاظ پر جو زبانِ روسی میں ترکی سے مستعار لیے گئے (Izviest. Otd. russ. iazyka i slovesnosti Ak. Nauk، ج ۷ تا ۱۱)؛ (۳) F. Miklosich: *Die türkischen Elemente in den südost- und osteuropäischen Sprachen*، وینا ۱۸۸۴ - ۱۸۸۰ء؛ (۴) Vladimircov: *Tureckie elementy v mongolskom iazyke* (*Zap.*، ج ۲۰، ۱۹۱۱ء)؛ (۵) F. v. Kraelitz - Greifenhorst: *Studien zum Armenisch-Türkischen*، وینا ۱۹۱۲ء؛ (۶) Z. Gombocz: *Die bulgarisch-türkischen Lehnwörter in der ungarischen Sprache* (MSFO، ج ۳۰، ۱۹۱۲ء)؛ (۷) Kowalski: *W sprawie zapożyczeń tureckich w jenzyku polskim* (*Seorsum impressum e Symbolis grammaticis in honorem I. Rozwadowski*, ii., 1927)؛ (۸) M. Bittner: *Der Einfluss des Arabischen und Persischen auf das Türkische*، ۱۹۰۰ء۔

(A. SAMOYLOVITCH)

III ۔ چغتائی ادب:

چغتائی سلطنت [قب چغتائی خان] کے اندر تیموریوں کے عہد میں ترکی ادب کے درخشان ارتقاء کے زیر اثر اس مشرقی ترکی ادبی زبان کا نام خود مشرق میں، نیز یورپی تصانیف میں، "چغتائی" ھو گیا ھے ۔ ایک غیر مسمّی مصنّف کی ترکی کتاب میں (جو غالباً ھندوستان میں لکھی گئی، برٹش میوزیم کا مخطوطہ شمارہ Or. 1912؛ ریو (Rieu): *Cat. Turk. MSS.*، ص ۲۶۸) سب ترکی بولیوں کو دو زبانوں میں تقسیم کیا گیا ھے: چغتائی اور/ ترکمان۔ ابن مُھنّی (طبع ترکی، ص ۳۷؛ Melioranskiy: *Arab filolog*، ص xx) اسی مفہوم میں لفظ "ترکستانی" استعمال کرتا ھے۔ جس طرح عربی حجاز سے آئی اسی طرح کہا جاتا ھے کہ ترکوں کی زبان ترکستان سے آئی۔ "ھمارے (محتملاً ایرانی) ملکوں کے ترکوں کی زبان" کا ترکستانی، نیز ترکمانی سے تضاد دکھایا گیا ھے۔ راڈلوف کی *Wörterbuch* (۳: ۱۰) میں لفظ چغتائی کو صرف جغتائی [بجیم] کی شکل میں لکھا اور اسے ایک عثمانی لفظ بتایا گیا ھے؛ قب نیز شیخ سلیمان بخاری: لغت چغتائی و ترکی عثمانی، استانبول ۱۲۹۷ - ۱۳۰۰ھ، مختصر طبع مع ترجمۂ جرمن از کُونوس Dr. S. Kúnos، بوڈاپسٹ ۱۹۰۲ء (*Publ. Sect. Orient. de la Soc. Ethn. Hongroise*، شمارہ ۱)۔

راڈلوف (*Zap.*، ۳ : ۱ ببعد) نے فرض کیا ھے کہ چغتائی ادبی زبان کی ابتداء خالصۃً مشرق میں ھوئی۔ اویغور رسم خط اور ادبی زبان دونوں مسلم ترکوں میں زمانۂ قبل اسلام سے باقی چلے آتے تھے۔ بہت سے عربی اور فارسی الفاظ اختیار کر لینے کی وجہ سے اویغور الفباء رفتہ رفتہ متروک ھو گئی۔ ھمارے پاس ایسی کتابیں موجود ھیں جو "خالص اویغور زبان" میں لکھی گئی ھیں، لیکن رسم خط عربی ھے، مثلاً ربغوزی کی قصص الأنبیاء، تصنیف ۷۱۰ھ (۱۳۱۰-۱۳۱۱ء) (راڈلوف نے اپنے نشرۂ کُدتکوبِلک [کذا] کے دیباچے میں (ص lxxviii پر) یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ھے کہ "ایلک خانیہ" کو، جن کی مملکت میں ترکی کی قدیم ترین کتابیں تصنیف ھوئیں، "بلاشائبۂ شک و ریب اویغور سلاطین سمجھنا چاھیے")۔

منگولوں کے عہد میں اویغور ابجد اور زبان دور دور تک پھیل گئی ۔ اس دور میں ''وسطی ایشیا کی بولیوں'' سے جو کلمات مستعار لیے گئے ان کی وجہ سے بہت سے ''خالص اویغور'' الفاظ اور صیغے متروک ہو گئے، لیکن اب بھی چغتائی میں اویغور اصل کے ایسے الفاظ اور صیغے موجود ہیں جو صرف ادبی زبان میں مستعمل ہیں ۔ چونکہ مشرق ترکوں کا، بخلاف جنوبی ترکوں کے (استانبول)، کوئی مشترک ادبی مرکز نہ تھا، اس لیے چغتائی ادبی زبان مختلف اقطاع میں متفرق مقامی بولیوں سے متأثر ہوتی رہی ہے ۔

اس رائے کے برعکس اب یہ ثابت کر دیا گیا ہے (خصوصاً بسعی سموئیلووچ A. Samoylovič در *Mir-Ali-Shir*، لینن گراڈ ۱۹۲۸ء، ص ۱ ببعد) کہ منگولوں کے دور سے پہلے ہی کاشغر [ارک بان] کے علاوہ، جو ترکی ادبی سرگرمی کا قدیم ترین مسلم مرکز تھا، ایک دوسرا ادبی مرکز خوارزم میں اور سیر دریا کے مجرائے زیریں کے کنارے موجود تھا ۔ اس علاقے نے منگول عہد میں خوانینِ آلتون اردو کے زیرِ حکومت بھی اپنی اہمیت کو برقرار رکھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنتِ چغتائی کا ادب اس سے بعد ہی وجود میں آیا، نیز وہ آلتون اردو کے ادب سے متأثر ہوا ۔ جمال القَرشی، مصنّف ملحقات الصراح نے، جو کاشغر میں لکھی گئی، علّامہ شیخ الاسلام حسام الدین ابو المحامد حامد بن عاصم العاصمی البارچینلغی سے ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ - ۱۲۷۴ء میں بمقام بارچکند (جسے برچین اور بارچینلغ بھی کہتے تھے اور) جو سیر دریا کے زیرین مجری پر واقع تھا، ملاقات کی تھی ۔ علاوہ عربی میں دینی تصانیف کے، شیخ نے اسلام کی تینوں ادبی زبانوں میں اشعار کہے ہیں (یہ غالباً پہلا موقع ہے کہ ہمیں ان تینوں زبانوں کا مذکور اس طرح سے یکجا ملتا ہے) ۔ ان کے عربی اشعار 'فصیحة'، فارسی اشعار 'ملیحة' اور ترکی اشعار 'صحیحة' تھے ۔ عربوں کی کامل بلاغت اور ایرانیوں کے دقیق معانی کے مابین جو تضاد ہے اسے اکثر بیان کیا جاتا ہے (احمد بن ابی طاہر طَیفور کی کتاب بغداد، ص ۱۵۸ میں یہ تضاد پہلی بار نظر آتا ہے) ۔ اس میں اب ترکی زبان کی حقیقت پسندی کا بھی اضافہ کر دیا گیا اور یہ واقعہ ہے کہ چغتائی شعراء کی تصانیف اپنی سادہ تر زبان اور سلیس تر افکار کی وجہ سے ہمارے دل پر یہ نقش باقی چھوڑتی ہیں کہ جن فارسی سرمشقوں کا تتبّع ان کے پیشِ نظر ہے ان کے مقابلے میں وہ خود زندگی کی ترجمانی بہتر طور پر کرتی ہیں (قب E. Berthels : نوای عطّار در *Mir - Ali - Shir*، ص ۲۴ ببعد خصوصاً ص ۸۰).

آلتون اردو کی سلطنت میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے خوارزمی کے محبت نامے کا (جو ۷۵۴ھ / ۱۳۵۳ء میں سیر دریا کے کنارے لکھا گیا) چغتائی ادب پر براہِ راست اثر پڑا ۔ برٹش میوزیم کے نسخے شمارۂ Add. 7914 (Rieu : *Turk. Man.*، ص ۲۸۴ ببعد) کے علاوہ ہمارے پاس محبت نامے کا ایک نسخہ اویغور رسم خط میں بھی موجود ہے، جو رجب اور شعبان ۸۳۵ھ/ مارچ-اپریل ۱۴۳۲ء میں امیر جلال الدین کے لیے یزد میں لکھا گیا تھا : شمارہ Or. 8193؛ (*Comptes Rendus de l' Acad. des Sciences*، ۱۹۲۴ء، ص ۵۷ ببعد؛ *J.R.A.S.*، ۱۹۲۸ء، ص ۹۹ ببعد) ۔ تیموری شہزادے سیدی احمد کا تعشّق نامہ جو ۸۳۹ھ/ ۱۴۳۵ - ۱۴۳۶ء میں لکھا گیا (اور اسی مخطوطے Add. 7914 کے ساتھ شامل ہے) محبت نامے ہی کے نمونے پر ہے ۔

آٹھویں (چودھویں) صدی کے چند ترکی شعراء کے نام، جو چغتائی سلطنت کے حدود کے اندر بستے تھے، معلوم ھیں - تیمور کے زمانے میں امیر سیف‌الدین سیفی تخلص تھا،جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ترکی اور فارسی میں ملمہ اشعار لکھے (دولت شاہ، طبع براؤن Browne، ص ۱۰۸) - [مگر] اب جو ذخیرۂ [اشعار]ھمارے پاس باقی ہے وہ نویں (پندرھویں) صدی یعنی تیمور کے متصل بعد کے جانشینوں کے زمانے کا ہے - سکاکی، خلیل سلطان (۱۴۰۵ تا ۱۴۰۹ء) اور الغ بیگ (۱۴۰۹ تا ۱۴۴۹ء) کے مداحوں میں سے تھا (برٹش میوزیم، Turk. Man. : Rieu : Or. 2079، ص ۲۸۴) - الغ بیگ کا ذکر لطفی شاعر نے بھی کیا ہے، جس کی نظمیں اویغوری مخطوطہ Or. 8193 میں شامل ھیں (لطفی کے بارے میں زیادہ تفصیل کے لیے دیکھیے ریو : .Turk. Man، ص ۲۸۵ و ۲۸۷ ؛ احمد زکی ولیدوف : Džagatayskiy poet Lutfiy i ego diwan، قازان ۱۹۱۴ء) - دونوں شاعر اپنا ذکر بہت فخریہ انداز میں کرتے ھیں - سکاکی الغ بیگ کو یوں مخاطب کرتا ہے : ''قرن ھاے دراز کے بعد ھی کبھی ایسا ھوگا کہ مجھ ایسا ترک شاعر یا تجھ ایسا فاضل شاهزاده دوباره ظهور میں آئے'' - لطفی کہتا ہے : ''خانِ الغ بیگ لطفی کی خدمات کی قدر کرنا جانتا ہے، جس کی درخشان نظمیں سلمان [رکنّ بان] کی نظموں سے کم پایے کی نہیں ھیں'' - (متن در بارٹولڈ : Ulugbek، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۸ء، ص ۱۲۱ ببعد) - اسی عہد کا ایک اور شاعر میر حیدر مجذوب تھا، جو تیمور کے ایک دوسرے پوتے اسکندر سلطان والی فارس (تا ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء) کا مداح تھا (دولت شاہ، ص ۳۷۱؛ Cat. Turk. Man. : Rieu، ص ۲۸۶؛ پاوہ دکورتی : A. Pavet de Courteille در P. Ec. Lang. Or. Viv.، سلسلہ ۲، ج ۶ : ص xxii ببعد) - اس نے [امیرزادہ اسکندر کے نام پر ترکی میں] نظامی کی مخزن الاسرار کا جواب لکھا (.G. I. Ph، ۲ : ۲۳۱ ببعد) - اس کے کچھ حصے ایک اویغور مخطوطے سے لے کر (جو اب برلین میں ہے) پاوہ دکورتی نے شائع کیے ھیں - یہ شاعر بھی کہتا ہے کہ گنبدِ افلاك اور معمورۂ زمین اس کی نظموں کے غلغلے سے پُر ھیں - دو اور قلمی نسخے، جو اویغور رسمِ خط میں ھیں، نویں (پندرھویں) صدی کے نصفِ اوّل میں لکھے گئے تھے : [۱] بختیار نامہ، اس کا خطّی نسخہ مؤرخہ ۸۳۸ھ / ۱۴۳۵ء اوکسفورڈ میں ہے (.G. I. Ph، ۲ : ۳۲۴) اور [۲] معراج نامہ مع ترکی ترجمۂ تذکرۃالاولیاء از فریدالدین عطّار [دیکھیے عطّار]، اس کا مخطوطہ پیرس میں ہے (.P. Ec. Lang. Or. Viv، محلّ مذکور)، جس کی تاریخ کہا جاتا ہے کہ ۱۰ جمادی الآخرۃ ۸۴۰ھ / ۲۰ دسمبر ۱۴۳۶ء ہے، مگر سالِ ھجری ترکوں کے دوری سال (cycle) کے مطابق نہیں ہے.

نویں (پندرھویں) صدی کے نصفِ آخر میں میر علی شیر (متولّد ۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ - ۱۴۴۱ء، متوفّی یک شنبہ ۱۱ جمادی الآخرۃ ۹۰۶ھ / جنوری ۱۵۰۱ء) کی ذات میں چغتائی ادب اپنے معراجِ کمال پر پہنچ گیا - اس کے دورۂ حیات اور ادبی انہماك کے معنی و مقصود کے لیے قبّ Belin : Notice biographique et littéraire sur Mīr Alī-Chīr-Nevāi (J. A.، ج ۱۷، ۱۸۶۱ء : ص ۱۷۵ تا ۲۵۶ و ۲۸۱ تا ۳۵۷)؛ E. G. Browne : A History of Persian Literature under Tartar Dominion، کیمبرج ۱۹۲۰ء، بالخصوص ص ۴۳۷ ببعد، ۵۰۵ ببعد؛ Mir-Ali-Shir، لینن گراڈ

۱۹۲۸ء ۔ دوسرے چغتائی شعراء کی طرح میر علی شیر اپنے دیوان میں نیز اپنی دوسری بہت سی نظموں میں محض فارسی شعراء کا مقلّد ہے، لیکن وہ اپنے مثالی نمونوں کی اندھی تقلید نہیں کرتا ۔ بظاہر اس کی نظمیں اس کے زمانے اور ہم وطنوں کے مذاق کے عین مطابق تھیں اور انھیں زمانۂ موجودہ تک بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے ۔ اس کی آخری تصنیف، یعنی محاکمۃ اللغتین (کاترمئر Quatremère : *Chrestomathie en turc oriental*، حصۂ ۱ و ۲، پیرس ۱۸۴۲ء) ،جو جمادی الاولی ۹۰۵ھ / دسمبر ۱۴۹۹ء میں مکمل ہوئی، اہم کتاب ہے ۔ اس میں ترکوں اور ایرانیوں کی زبان اور ثقافت کا باهمی مقابلہ کیا گیا ہے ۔ مصنّف یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ شعر گوئی کے لیے اور عام طور پر معنوی مقاصد کے لیے ترکی زبان فارسی سے کم موزون نہیں ۔ میر شیر کا ذکر اکثر یورپی تصانیف میں وزیر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی ایسے منصب پر مأمور نہیں ہوا ۔ امورِ سلطنت پر اس نے جو اثر ڈالا تھا اور جو سرگرمی اس نے بہ حیثیت علوم و فنون کے مربّی کے دکھائی، وہ اس کی اور اس کے بادشاہ سلطان حسین (۱۴۶۹ تا ۱۵۰۶ء) کی دوستی کا نتیجہ تھی (گو یہ دوستی همیشہ غیر مکدّر نہیں رہی) ۔ سلطان حسین خود بھی شاعر تھا ۔ اس کا دیوان ۱۹۲۶ء میں بمقام باکو شائع ہوا تھا [اس دیوان کے چند متفرق، نہایت مطلّا اور گل کار اوراق انڈیا آفس کے ایک مرقّع میں موجود ہیں، یہ مرقّع داراشکوہ نے اپنی بیگم نادرہ بانو کو دیا تھا، دیکھیے ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۵۵ء، ص ۱۰]۔ اس سلطان حسین کے ایک بیٹے شاہ غریب نے، جس کا تخلّص غریبی تھا (بابر نامہ، نشر بیورج Beveridge، طبع وقفیۂ گب، ۱ : ۱۶۶ میں غالباً غلطی سے غربتی درج ہے)، ایک فارسی دیوان (جس کا علم براکلمان کو نہ تھا) اور ایک ترکی دیوان چھوڑا ہے، جو ہامبورگ کے سرکاری کتب خانے (Stadtbibliothek) شمارہ ۱۰ میں ہے (براکلمان : *Katalog*، شمارہ ۱۸۳ و ۲۷۷) ۔ اس مخطوطے کی تاریخ کتابت رمضان ۹۰۴ھ/ [جنوری ۔ فروری] ۱۰۳۴ء ہے [شاہ غریب کے لیے دیکھیے تحفۂ سامی، طبع تہران ۱۳۱۴ ش، ص ۱۴] ۔ بابر [رکّ بآن]، ہندوستان میں تیموری سلطنت کا بانی، کئی نظموں کا مصنف تھا، لیکن اس کی شہرت کی بنا اس کے تذاکیر (*Memoirs*) پر ہے (موسومہ بابر نامہ، نیز وقائع یا واقعات بابری، قبّ تاریخ رشیدی، ترجمۂ راس Ross، ص ۱۷۳ ببعد)؛ تاهم دربارِ هند میں فارسی کے سوا کسی اور زبان کا استعمال نادر صورتوں هی میں ہوتا تھا ۔

تیموریوں کو وسطی ایشیا اور مشرق ایران سے اوزبکوں نے نکال باهر کیا ۔ اوزبکوں کے عہد میں، خصوصاً شروع کے زمانے میں جب تک کہ انھوں نے اپنے آپ کو ایرانی تہذیب کا پوری طرح خوگر نہیں بنا لیا، ترکی میں نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا گیا، لیکن یہ لوگ پرانے ''چغتائی'' نمونوں هی کے پابند رہے اور کوئی جدید یا ابتکاری چیز پیدا نہ کر سکے ۔ تعلیم یافتہ حلقوں میں شاعروں کے لیے میر علی شیر کا کلام سرمشق بنا رہا اور عوامی شاعری کے لیے احمد یسوی [رکّ بآن] کا کلام، جو تجدید کے بعد اس شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا جس میں اس کا دیوان اب ہمارے پاس موجود ہے ۔ مؤرّخ ابوالغازی بہادر خان [رکّ بآن] غالباً تنہا ایسا شخص تھا جس نے اپنی تصنیف (طبع Desmaisons، ص ۳۷) میں عربی فارسی اور اسی طرح ''چغتائی ترکی'' الفاظ سے اجتناب کرنے اور

ایسی زبان لکھنے کی کوشش کی ہے کہ ''ایک پانچ سال کا بچہ'' بھی اس کا مطلب سمجھ سکے۔ اوزبکوں کے عہد میں صوفی اللہ یار مقبول ترین شعراء میں سے ہے (جس کا کلام مدارس کے نصاب میں بھی داخل ہے)؛ اس کا زمانہ سترھویں صدی کا انجام اور اٹھارھویں صدی کا آغاز تھا۔ کچھ عرصہ بعد بخارا میں ترکی ادب کو فارسی نے (جو ایک حد تک مقامی تاجیکی [رک بآن] سے متأثر تھی) تقریباً بالکل خارج ہی کر دیا۔ خوقند [رک بآن] اور خیوہ [دیکھیے خوارزم] میں انیسویں صدی کے دوران میں چغتائی ادب میں ایک قابلِ ذکر نُہضت عمل میں آئی؛ قب خصوصاً ہارٹمان (M. Hartmann): M. S. O. S. As.، ے : ۸ے بعد ('نہضت' کے لیے اس نے ص ۹ے پر کلمۂ [Nachblüte] یعنی انتعاش استعمال کیا ہے)؛ A. Samoylovič :Zap.، ۱۹ : ۱۹۸، بعد.

اوزبکوں کے یہاں اویغور الفباء کا استعمال بند ہو گیا، حالانکہ تیموریوں کے زیرِ حکومت اسے اکثر حسبِ سابق برتا جا رہا تھا۔ تاہم اویغور خط کا اثر اس زمانے تک بھی عربی رسمِ خط میں دیکھا جا سکتا ہے (مثلاً حرکات کا استعمال، بجائے صوتی اشارات کے، جو جنوبی ترکی مخطوطات میں بکثرت پائے جاتے ہیں)۔ اب تک اس طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے کہ چغتائی ادب دورِ کاشغر کے قدیم ترین ادب سے کس حد تک متأثر ہوا۔ ہارٹمان کا خیال تھا (M. S. O. S. As.، ے : ۹ے) کہ قوتادغوبلک (راڈلوف کے املاء کُدتکُوبلک کے بجائے یہ املاء اختیار کرنا چاہیے) ''خود اپنے ملک میں قریب قریب بے توجہی کا شکار بن گئی اور قدیم زمانے میں اس کا نسخہ مصر میں پہنچا''، لیکن اس خیال کو اب مشکل ہی سے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ سموئیلوچ Samoylovič : (Zap. xxi. o38 Sqq.) نے ثابت کر دیا ہے کہ تیرھویں صدی کے ایک مرتبان پر، جو سرای‌چک (Saraičik) میں یورال کے زیرین مجری کے کنارے دریافت ہوا تھا، قوتادغو بلگ کی عبارتیں موجود ہیں۔ مُلّا بابا جان کی تواریخ خوارزم شاہیہ میں بھی، جو آخر ذوالقعدہ ۱۲۸۰ھ (مئی ۱۸۶۴ء) میں مکمل ہوئی (اس کا معلوم نسخہ، جو منحصر بفرد ہے، برلین میں ہے؛ یہ ۱۹۲۹ء میں حاصل کیا گیا تھا، ورق ۹ ب) ہمیں اشعارِ ذیل ملتے ہیں، جو بعینہٖ قوتادغو بلگ سے منقول معلوم ہوتے ہیں (اگرچہ اس میں موجود نہیں ہیں):

وزیر اِتکوسی دُر تمامی نظام
نظام اولمسہ عدل تاپماس قیام

[ترجمہ :] ''وزیر کی تمام فعّالیّت کو انتظام کی جانب مبذول ہونا چاہیے۔ جہاں کوئی نظام نہیں وہاں عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے''.

وہی ادبی زبان جو اوزبکوں کی مملکت میں لکھی جاتی تھی موجودہ زمانے تک چینی ترکستان (کاشغریہ) میں لکھی جاتی ہے۔ یہاں بھی ترکی ثقافت پر ایرانی ثقافت کا اثر ہوا ہے۔ کاشغریہ کی واحد اہمّ تصنیف حیدر میرزا [رک بآن] کی تاریخ رشیدی ہے، جو فارسی میں لکھی گئی۔ اس کے کم از کم دو ترکی ترجمے موجود ہیں (ایک ترجمہ محمد صادق نے اٹھارھویں صدی میں کیا اور ایک اور ترجمہ ایک نامعلوم الاسم مترجم نے خُتن میں کیا، جس کی تاریخ ۲۲ جمادی الآخرۃ ۱۲۶۳ھ/ ے جون ۱۸۴ےء ہے)۔ اسماعیل خان (۱۶ے۰ تا ۱۶۸۲ء) کے عہدِ حکومت میں بھی میرزا شاہ محمود چوراس (Zap.، ۲۲ : ۳۱۳ بعد) نے اپنی تاریخ بجائے اپنی مادری زبان ترکی کے بہت ہی خراب فارسی میں لکھی۔ کچھ ہی

عرصے کے بعد (اٹھارھویں صدی کے شروع میں) ایک تاریخ خالص اور سہل ترکی میں لکھی گئی، جس کا ایک نسخہ لینن گراڈ کے موزۂ ایشیائی میں ہے (*Zap.*، ۱۰ : ۲۳۶ ببعد ؛ ہارٹمان : *Der islamische Orient*، ج ۱، برلین ۱۸۹۹ - ۱۹۰۵ء، ص ۲۹۱ ببعد ؛ علاوہ ازیں اب اس کا ایک دوسرا نسخہ بھی، Petrovskiy 9، ایشیاٹک میوزیم میں آ گیا ہے) - کاشغر کی جدید ترین تاریخی تصانیف کے بارے میں قب مثلاً *Zap.*, xvii o188 (جو مُلّا موسٰی سیرامی کی تأریخ امانیۃ کے متعلق ہے؛ یہ تاریخ ۱۱ شوال ۱۳۲۱ھ/[۳۱] دسمبر ۱۹۰۳ء کو مکمل ہوئی).

بیسویں صدی میں یورپی (راست روسی اور تاتاری) اثرات کے ماتحت اوزبکوں میں ایک نئے ترکی ادب کی بنیاد قائم ہو گئی ہے (جسے بعض اوقات ''جدید چغتائی ادب'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) - اس ادب کی تصانیف میں تمثیلی قصے (dramatic works) بھی شامل ہیں.

مآخذ : (علاوہ ان حوالوں کے جو متن مادّہ میں دیے گئے ہیں) : (۱) وامبیری (H. Vámbéry) : *Čagataische Sprachstudien*، لائپزگ ۱۸۶۷ء؛ (۲) ہارٹمان : *Zentralasiatisches aus Stambul. Mešreb der weise Narr und fromme Ketzer. Ein zentralasiatisches Volksbuch. Ein Heiligenstaat im Islam* (سب کے سب در ''*Der islamische Orient*'' ج ۱)؛ (۳) وہی مؤلف : *Der čaghataische Diwan Hüwidā's* (*M.S.O.S.As.*، ۵ : ۱۳۲ ببعد)؛ اور ان سے بہتر (۴) M. F. Gavrilov : *Sredneaziatskiy poet i sufiy* *Khuwaido*، تاشکنت ۱۹۲۷ء؛ (۵) A. Samoylovič : *Literature tureckikh narodov*، (در *Literatura Vostoka*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۹ء).

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

(ب) ۱ - عثمانی ترک

زبان اور ابجدیات.

پندرھویں صدی کے آخر سے عثمانی ترکی ایک ایسے ادب اور ثقافت کی زبان رہی ہے جس کی مختلف صورتیں اس زبان کی چار سو سالہ زندگی میں مضبوطی سے قائم ہو گئی ہیں - اس کا ارتقاء اور اس کے حلقۂ اثر کی وسعت کا اتّصال عثمانی سلطنت کی سیاسی اور ثقافتی نشو و نما کے ساتھ مضبوط طور پر قائم رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کا شمار اسلامی دنیا کی اہم زبانوں میں ہونے لگا ہے اور اہمیّت میں اس کا مقام عربی فارسی سے دوسرے درجے پر ہو گیا ہے۔ عثمانی ثقافت نے انیسویں صدی میں باثنای دورِ 'تنظیمات' [رک بآن] اپنا رخ مغرب کی جانب موڑنا شروع کیا، اس وقت سے اور اس سے بڑھ کر امبراطوریۂ عثمانیہ کے خاتمے (۱۹۲۲ء) کے بعد سے، اسی زبان نے ایک قومی زبان کا روپ اختیار کر لیا ہے، جسے اب ترکیہ میں (''تورکچہ'') کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاتا - اس زبان کے اثر کا سراغ اب تک بھی ان مسلم اور عیسائی قوموں کی زبانوں میں ملتا ہے جو کسی زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ کا جزو تھیں.

عثمانی ترکی، ترکی زبانوں کے جنوب مغربی یا ترکمان گروہ کی ایک شاخ ہے (قب Samoylovič : *Nekotorye dopolneniya k klassifikacii tureckikh jazykow*، پٹروگراڈ ۱۹۲۲ء، ص ۵ ببعد) - اسی گروہ کا نام راڈلوف نے جنوبی بولیوں کا گروہ رکھا ہے (دیکھیے *Phonetik der nördlichen Türksprachen*، لائپزگ ۱۸۸۳ء، ص ۲۸۰) - یہ وہ بولیاں تھیں جنھیں ابتداء میں اوغوز ترک بولتے تھے - اس گروہ کی اور ''بولیوں'' یعنی آذری، ترکمانی اور عثمانی زبان میں بعض مشترک صوتی خصوصیات ہیں : مثلاً حرفِ صامت 'گ' کو کسی

اور حرف صامت کے بعد ساقط کر دینا (قب مثلاً "قالان" دوسرے گروہوں کے "قالغان" کے مقابلے میں)، اور فعل بمعنی "ہونا" کی اصل کے لیے شکل "اوْل-" بجائے "بوْل-" (جو ترکمانی میں کہیں کہیں باقی ہے) اور اشتقاق کے (morpho-logical) نقطۂ نظر سے فعل کے صیغۂ حاضر کے لیے ایک خاص میزانِ صرفی (paradigm گلیپیورم) - حروفِ علّت کی ہم آہنگی کے عائد کرنے میں یہ زبان تغیّر پذیر حروفِ آخر کے دو گروہوں میں تمیز کرتی ہے، یعنی وہ جس میں حرف e اِ حرف a اَ سے بدل جاتا ہے اور وہ جس میں حروفِ i اِ، ī ی، u اُ، ü وُ کا استعمال ایک دوسرے کے بجای شامل ہے، اس کے ساتھ کثیر آثار ایسے صرفی تغیّر کے بھی ہیں جس میں صرف u اور ü کا تبادلہ ہوا ہے (*Forstudier* : V. Grönbech *til tyrkisk Lydhistorie*، کوپن ہاگن ۱۹۰۲ء، ص۱۸ تا ۱۹) - عثمانی زبان کا فرق آذری اور ترکمانی سے بالخصوص یوں واضح ہوتا ہے کہ شروع کا حرف 'م' عثمانی میں 'ب' میں بدل جاتا ہے (بِن *ben* بجائے مِن) - قدامت پسندی کی وجہ سے جو عموماً ترکی زبان کا خاصّہ ہے، اس لیے کہ اصولِ اسماء و افعال میں بمشکل ہی کوئی تغیر ہوتا ہے، عثمانی زبان کی مختلف عوامی بولیاں ایک دوسری سے بہت کم اختلاف رکھتی ہیں [دیکھیے صفحاتِ آیندہ بذیل iii [بظاہر II. ۹ مراد ہے]].

یورپی زبانوں کی بہت سی کتابوں میں، جو ترکی صرف و نحو پر لکھی گئی ہیں، ترکی کو بولی کی حیثیت سے اُس تلفّظ پر مبنی کیا گیا ہے جو قسطنطنیہ میں رائج ہے اور جس کا خاصّہ اکثر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہلکا اور سُریلا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ قسطنطنیہ کی عام بولی میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ حروفِ لینہ غیر ممدودہ (unrounded) کو اواخرِ کلمات، خصوصاً لاحقوں میں، زیادہ استعمال کیا جائے؛ بحالیکہ وہاں بجاے "ق" "خ" کا تلفّظ بھی، جو مشرق بولیوں میں عموماً پایا جاتا ہے، مفقود ہے - غالباً عربی الفاظ مستعار کی کثرت ایک اور سبب ہے جس سے "خفیف" تلفّظ کا غلبہ ظہور میں آیا ہے - وہ زبان جو صرف و نحو کی کتابوں میں سکھائی جاتی ہے ایک رسمی اور روایتی نوعیت رکھتی ہے - یہ بات خصوصیت سے اس طرح واضح ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک ترکی اصولِ کلمات (roots) پر قانونِ حرکات عام طور پر بڑی باقاعدگی سے عائد ہوتا ہے (حرکات کے دو سلسلے یہ ہیں: a آ، ī ای، o اَو، u اُو اور e اِ، i اِ، ö وِ، ü وُ، اور اسی طرح ان کے نزدیک حروفِ علّت کی ہم آہنگی کے قواعد کی سخت پابندی کا التزام ہے، مگر یہ باقاعدگی عملی طور پر مشکل ہی سے نظر آ سکتی ہے، اگرچہ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان میں اس کی جانب میلان ضرور موجود ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربی الفباء کے استعمال نے خود ترکی نحویوں کی توجہ کو عموماً صوتی مسائل کی طرف سے ہٹا دیا - لاطینی الفباء میں تہجّی (orthography) کی تدوین سے بلاشبہ رفتہ رفتہ یہ معلوم ہو جائے گا کہ ترکی تلفّظ کے رجحانات کیا ہیں.

تاہم یہ سوال کہ کونسی عثمانی بولی معیاری اور ٹکسالی ہے ذرا پیچیدہ سوال ہے - خود ترکیہ میں عام طور پر یہ راے پائی جاتی ہے کہ قسطنطنیہ کی 'تورکچہ' (ترکی زبان) بہترین ہے - (ضیا گوکلپ : تورکجولوغوک اساسلری (*Türk djülüyün Esäslari*)، انقرہ ۱۳۳۹ھ، ص ۹۷)، لیکن یہ اس مسئلے کی ضرورت سے بہت زیادہ تسہیل ہے - قسطنطنیہ کی آبادی بہت سے

مختلف و متباین عناصر سے مرکّب ہے اور بلا شبہ سلطنت کے اس قدیم دارالحکومت کی زبان کی تشکیل میں کئی عثمانی بولیوں نے حصّہ لیا ہے۔ مذکورۂ بالا عام رائے کی بنیاد حقیقت کے زیادہ مطابق اس وقت ہو جاتی ہے جب ہم اس کا اطلاق محض تعلیم یافتہ طبقوں کی زبان پر کریں۔ جہاں تک تلفّظ کا تعلق ہے بُرگ شٹراسِر (M. Bergsträsser) کا خیال ہے کہ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ قسطنطنیہ کے تعلیم یافتہ طبقوں کی زبان کم و بیش یکساں ہے (*Z. D. M. G.*، ۷۲ : ۲۳۶)۔ تاہم اب تک معاشرے کے مختلف طبقات میں تلفّظ اور مفردات کے لحاظ سے معتدبہ اختلافات موجود ہیں؛ بولیوں کے قدیم اختلافات کے بہت سے آثار اب تک ضرور باقی ہوں گے۔ اس دلچسپ بیان کے لیے ہم وامبیری (Vámbéry) کے مرہونِ منّت ہیں کہ آلِ عثمان کے ارکان نے آپس میں گفتگو کی ایک ایسی طرز قائم رکھی تھی جو معمولی ترکی زبان سے مختلف تھی۔ تاہم تعلیم یافتہ طبقوں کی زبان کے ارتقاء کے بارے میں ہمیں زیادہ اچھے معلومات ہرگز حاصل نہیں۔ تلفّظ کے لیے ہمارے پاس پندرھویں صدی کے چند متن موجود ہیں، جو لاطینی حروف میں لکھے گئے تھے (قبّ خصوصاً Foy : *M. S. O. S.*، ج ۴ و ۵؛ اور بابنگر در *Literaturdenkmäler aus Ungarns Türkenzeit*، برلین و لائپزگ ۱۹۲۷ء، ص ۳۴)، لیکن یہ بہت دلچسپ دستاویزیں زیادہ تر عوامی بولی کے تلفّظ کو ظاہر کرتی ہیں۔ بعد کے وثیقوں میں بھی، مثلاً دیکھیے ہولڈرمان (Holdermann) کی ترکی گرامر مصنفۂ ۱۷۳۰ء میں (قبّ بابنگر: *Stambuler Buchwesen*، لائپزگ ۱۹۱۹ء، ص ۱۴ تا ۱۰) آج کل کی استانبولی زبان کے مقابلے میں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں، خصوصاً ایسے لاحقوں کے باقی رکھنے میں جن میں ممدودہ حرکات ہوں۔

جہاں تک ان مفردات کا تعلق ہے جو ترکی تعلیم یافتہ طبقات کے ہاں مستعمل ہیں ہمارے معلومات اور بھی زیادہ غیر یقینی ہیں، اس لیے کہ اچھی ترکی کے متعلق نصب العین مرورِ زمانہ کے ساتھ بہت بدل گیا ہے۔ یہ نصب العین انیسویں صدی کے وسط تک ادبی زبان سے بہت متأثر ہوتا رہا۔

اس تحریری ادبی زبان کے ارتقاء کی تاریخ یہ ہے کہ پہلے ان ترکی گروہوں کی بول چال کی زبان کو، جو ایشیائے کوچک میں تیرھویں صدی (قبّ بذیلِ IV در صفحاتِ آیندہ، [و II بذیل عثمانی - ترکی بولیاں]) میں متمکّن ہو گئے تھے، احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی؛ پھر اس نے بتدریج نشو و نما پایا۔ ظاہر ہے کہ یہ کئی عوامی بولیوں پر مبنی ہے جو ایک دوسری سے زیادہ مختلف نہ تھیں اور جب عربی رسمِ خط میں لکھی گئیں تو یہ اختلاف اور بھی کم ہو گیا، اس عربی الفباء کی بدولت آذری بولی کی تو متعدد خصوصیات غائب ہی ہو گئیں اور ادبی عثمانی زبان کی نشو و نما پر بھی یہ الفباء اثرانداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ترکی ادبی زبان میں کوئی حقیقی کلاسیک (classic) یا معیاری چیز ایسی نہیں ہے جو زبان اور اسلوب کے ایک مثالی نمونے کا کام دے سکتی ہو، جیسے عربی میں قرآن [مجید] ہے یا فارسی میں ایک زیادہ محدود مفہوم میں شاہنامہ۔ کلاسیکی کا اطلاق عام طور پر سولھویں اور سترھویں صدی کے بڑے بڑے ترکی شعراء کی زبان پر کیا جاتا ہے، لیکن اس زبان کے مبالغہ آمیز تصنّع نے اسے اس قابل نہ ہونے دیا کہ کوئی دیرپا اثر ڈال سکے۔

قدیم ادبی زبان کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی عربی اور فارسی سے مستعار الفاظ و عبارات کی بھرمار ہے اور ان کا استعمال تقریباً غیر محدود ہے ۔ دوسری ترکی زبانوں کی طرح جن کے بولنے والے مسلمان ہو گئے، عثمانی ترکی میں بھی شروع ھی سے مذھب اور ثقافت سے متعلق متعدد ایسے غیر ملکی الفاظ نظر آتے ھیں جو فارسی اور عربی سے اخذ کیے گئے ھیں۔ ترکی کا لسانی مزاج ایسے غیر ملکی الفاظ کو بڑی تعداد میں اختیار کر لینے سے مانع نہیں اور یہ قطعاً محسوس نہیں ھوتا کہ وہ الفاظ اس زبان کے نظام میں کسی طرح ناقابلِ قبول ھیں (قب مثلاً E. Sapir : *Language* ، نیویارک ۱۹۲۱ء، ص ۲۱۰)۔ اس بات نے ترکی زبان کو اسماء اور افعال میں تعمیری امکانات کے لحاظ سے بہت غنی اور پرمایہ بنا دیا ہے (وہ اس طرح کہ امدادی افعال اِتْمِک، اِیْلِمک، قیلمق، اُولْمق کو عربی مصادر کے ساتھ ترکیب دے دیا جاتا ہے) اور چونکہ ترکی ادب زیادہ تر فارسی زبان کی کتابوں کے ترجموں سے شروع ھوا، جس میں خود عربی زبان سے مواد اخذ کرنے کی ویسی ھی صلاحیت موجود ہے، اس لیے ترکی ادبی زبان نے اس سرچشمے سے اپنی تعمیری صلاحیتوں میں اضافے کے لیے بہت کچھ اخذ کیا ۔ اس طرح ادبی حسن و خوبی کا ایک نصب العین قائم ھو گیا اور اس نے جہاں تک مفردات کا تعلق ہے تحریری زبان اور بول چال کی زبان میں، جو 'قبا تورکچہ' (گنواری یا بھدی ترکی) کہلانے لگی، بہت گہری خلیج پیدا کر دی ۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے عالم ھمیشہ ملک میں موجود تھے جو اس مصنوعی زبان کی مذمّت کرتے تھے ('بسیط تورکچہ' تحریک کے بارے میں دیکھیے بذیل III ۔ عثمانی ادب، پندرھویں صدی)، لیکن ادبی زبان میں عربی فارسی کے مستعار الفاظ کے مفرط استعمال کے خلاف ردّ عمل کا آغاز انیسویں صدی کے وسط ھی میں ھوا ۔ یہ تحریک عین اس وقت شروع ھوئی جب ترکی ادب پر یورپی اثر نے زور پکڑا ، لیکن اس کے ساتھ ھی جب ترکی ثقافت مغرب کی طرف متوجّہ اور نئے معانی (فنّی، علمی، سیاسی وغیرہ) سے دوچار ھوئی تو یورپی ثقافت کے عام اثر کی وجہ سے ان معانی کے اظہار کے لیے نئی اصطلاحوں کی ضرورت محسوس کی گئی ۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے پھر عربی لغات کے لامتناھی ذخیرے اور اس کے ساتھ عربی زبان کے اشتقاق امکانات کی طرف رجوع لازم ٹھہرا؛ نتیجہ یہ ھوا کہ انیسویں صدی کے نصفِ آخر کے ترکی عالموں اور ادیبوں کو ادبی اور علمی زبان میں غیر ملکی عناصر کی پریشان کن فراوانی کا سامنا کرنا پڑا، جن کے نیچے دب کر ترکی عنصر کے دم خفا ھونے کا اندیشہ تھا اور ترکی زبان کی صلاحیت توافق (adaptation) کے باوجود ایسا معلوم ھوتا تھا کہ ترکی زبان میں ان عناصر کی آمیزش حد سے گذر گئی ہے ۔

ترکی زبان میں عربی و فارسی عناصر کا مطالعہ اس زبان اور اھلِ زبان کے ثقافتی ارتقاء کے نقطۂ نظر سے بہت دلچسپی کا موجب ہے ۔ کئی حالتوں میں موجودہ تلفّظ سے ھمیں ان الفاظ کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے جو واقعی عوام کی زبان کا جزء بن گئے ھیں؛ اس کا اندازہ یوں ھوتا ہے کہ وہ الفاظ دیگر الفاظ کے مقابلے میں حرکاتی ھم آھنگی کے قواعد کو زیادہ کامل طور پر قبول کر چکے ھیں؛ بخلاف ان کے جو محض علماء یا ادباء ھی سے مخصوص رہے ھیں (قب M. Bittner : *Der Einfluss des Arabischen und Persischen auf das Türkische* ، در *Sb. Ak. Wien* ، ج ۱۴۲ / ۳؛ G. Bergsträsser : *Zur Phonetik des Türkischen* ، *Z. D. M. G.* ، ج ۷۲؛ اور

Der Vokalismus der arabischen Fremd- : A. Schaade *wörter im osmanischen Türkish*، در *Festschrift-Meinhof*، ص ۴۴۹ ببعد) ۔ ان مستعار الفاظ کے معنوں کا مطالعہ بھی ایسا ھی اھم ھے ۔ بہت سے عربی الفاظ کا مفہوم ترکی میں عربی سے مختلف ھوتا ھے : ایسی صورتوں کو قدیم لغت نویس ''غلطاتِ مشہورہ'' کہا کرتے تھے ۔ ترکی میں کئی کتابیں اسی موضوع کے لیے وقف ھیں ۔

ترکوں کے اس طبقے کی نظر میں، جو دورِ تنظیمات میں بقید حیات تھا، یہ سوال ایک ثقافتی مسئلے کی حیثیت رکھتا تھا ۔ بالکل قدرتی طور پر ان کا یہ خیال تھا کہ اس کوچۂ سربستہ سے باھر نکلنے کی ایک ھی ممکن صورت ھے کہ عوام کی زبان کی طرف، جس میں غیرملکی عنصر ھمیشہ سے کم رھا تھا، رجوع کیا جائے ۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے سادہ تر زبان استعمال کرنے پر زور دیا ان میں ایک سلیمان پاشا تھا (م ۱۸۹۲ء)، جو روس اور ترکیہ کی جنگ کے زمانے کا [بطلِ شہیر] تھا ۔ اس نے یہ کہا کہ سپاھیوں کی سادہ زبان اختیار کر لی جائے اور ایک صرف و نحو کی کتاب شائع کی، جس کا نام اس نے لفظ ''عثمانی'' سے اجتناب کرتے ھوے صرف ترکی رکھا ؛ گو احمد جودت پاشا [رکّ بآن] نے اس زمانے میں بھی اپنی گرامر کا نام قواعدِ عثمانیہ رکھا تھا (قسطنطنیہ ۱۳۱۱ء) ۔ ایک اور نمایاں شخصیت اس عہد میں احمد وفیق پاشا [رکّ بآن] کی تھی، جس کی لہجۂ عثمانی دخیل الفاظ کے استعمال کو باقاعدہ بنانے کی ایک سنجیدہ کوشش ھے ۔ اس عہد کے ادب میں (گو اس میں جدید تر اسلوبوں سے کام لیا گیا) اب تک وھی پرانی زبان استعمال ھوتی تھی جو اخباروں اور رسالوں میں بھی زیادہ تر مستعمل تھی (معلّم ناجی کا دبستان)، لیکن جس تناسب سے عثمانی سلطنت اس صدی کے اواخر میں اپنے سیاسی بحران سے قریب آتی گئی اسی تناسب سے زبان میں لوگوں کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی ۔ اس زمانے میں ھم ایک تحریک زبان کی ''مفرط خالصیّت'' (purism) کی بھی پاتے ھیں، جسے زیادہ تر اخبار اقدام نے چلایا تھا ۔ ''تصفیہ جیلق'' کا بڑا فروغ دینے والا فؤاد رائف بک تھا ۔ اسے فقط یہ منظور تھا کہ عربی اور فارسی الفاظ و تعبیرات کو زبان سے خارج کر کے نئے ترکی الفاظ بنائے جائیں ؛ بلکہ حسبِ ضرورت انھیں ترکی زبانوں کے دوسرے گروھوں سے بھی مستعار لے لیا جائے اور اس طرح ایک نئی زبان تخلیق کی جائے، جسے ضیا گوك آلپ نے ''ترکی اسپرانٹو'' (Turkish Esperanto) کا نام دیا ھے ۔ لغات نگار سامی [رکّ بآن] بھی نظری طور پر اپنے آپ کو اس دبستان کا حامی بتاتا ھے ۔ اس مفرط ''خالصیّت'' کی جگہ جلد ھی ایک معقول ''خالصیّت'' نے لے لی، جس کی اشاعت سب سے پہلے صحیفۂ گنج قلملر نے سیلونیکا میں (۱۹۱۰ء) اور بعد میں 'تورك یوردو' نے استانبول میں کی ۔ بعض جدّت پسندوں، مثلاً عمر سیف الدین بک کا خیال یہاں تک پہنچا کہ ترکوں کی ثقافتی اصلاح میں ترکی زبان کی اصلاح سب سے اھم شق ھونی چاھیے (قبّ نوسالِ عثمانی، قسطنطنیہ ۱۳۳۰ھ، ص ۳۰۵) ۔ ۱۹۱۷ء میں جلال نوری نے اپنے کتابچے موسوم بہ تورکچہ مز ('ھماری ترکی') میں اس مسئلے سے بحث کی ۔ جنگِ عظیم کے بعد ضیا گوك آلپ نے ترکجولوغوك اساسلری میں زبان کی اصلاح کا ایک لائحۂ عمل تجویز کیا (انقرہ ۱۳۳۹ھ، ص ۱۰۰ ببعد) ۔ زبان کے بارے میں ان نئے نظریوں کی وجہ سے ادبی محاورے نے بھی ایک ایسا رخ اختیار کر لیا ھے جو اسے بول چال کی زبان کے قریب تر لے آتا

ہے، مثال کے طور پر ہم خالدہ ادیب اور روشن اشرف کی ادبی تصانیف کی زبان کو پیش کرسکتے ہیں ۔ دوسری طرف تحریری زبان کا علم اسی زمانے میں لوگوں کے بہت زیادہ بڑے طبقوں میں پھیل گیا ہے ۔ لاطینی الفباء کے اختیار کرنے کا اثر بلاشبہ تحریری زبان اور بول چال کی زبان کے باہمی تعلقات پر پڑے گا.

عربی اور فارسی مستعار الفاظ کے علاوہ عثمانی ترکی میں دوسری زبانوں سے بھی کثیر تعداد میں الفاظ لیے گئے ہیں ، مثلاً اطالوی زبان سے ترکی زبان کی بحری اصطلاحات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے ۔ علاوہ ازیں یونانی اور البانوی سے مأخوذ الفاظ کی بھی تعداد خاصی ہے ۔ فرانسیسی زبان کا اثر انیسویں صدی میں نمایاں طور پر محسوس ہونے لگا ، لیکن یہ اثر تقریباً تمام کا تمام خصوصیت سے علمی یا نیم علمی ادب پر پڑا ۔ یورپ کی بڑی بڑی زبانوں، خصوصاً فرانسیسی کا اثر بالواسطہ طور پر ادبی اسلوب کو سادہ بنانے پر پڑا ہے اور یہ رجحان بھی اسی ذریعے سے پیدا ہوا ہے کہ قدیم ترکی نثر کے ثقیل اور غیر مختتم جملوں سے اجتناب کیا جائے.

تیرھویں صدی کی قدیم ترین اناطولی دستاویزوں سے، جن کا ہمیں علم ہے، یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عربی الفباء ہی وہ الفباء تھی جس میں ترکی لکھی جاتی تھی ۔ عثمانی ترکی میں اصوات کو عربی حروف میں ادا کرنے کا طریقہ چغتائی طریقے سے مختلف ہے ؛ اس اعتبار سے کہ عثمانی زور دار عربی حروف کو زیادہ استعمال کرتی ہے (خصوصاً حرفِ ط کو، ایسے اصولِ کلمات میں جن میں تفخیم والی حرکت ہو، جو تلفظ میں ایک حقیقی فرق و تمیز کو ظاہر کرتی ہے ؛ قب مقالہ جس کا ذکر Schaade نے ص ۱۰۴ پر کیا ہے) اور ایسے اصولِ کلمات میں جن میں e اِ، i اِ، یا ï ی بلکہ اکثر a آ میں سے بھی کوئی حرفِ علّت ہو کتابتِ ناقصہ "scriptio defectiva") سے [یعنی حروفِ مدّ و لین کے بغیر] کام لیتی ہے ۔ ۱۷۲۷ء میں ترکیہ میں طباعت سرکاری طور پر رائج کی گئی (قب بابینگر : *Stambuler Buchwesen im XVIII Jahrhundert*، لائپزگ ۱۹۱۹ء)، لیکن یورپی نہضتِ علمی (Renaissance) کے دور میں طباعت کا جو دور رس ثقافتی اثر یورپ میں ہوا ترکیہ میں اس کے مقابلے میں بہت کم ہوا ۔ ترک عربی حروف میں تہجّی کی مکمّل یکسانیت کبھی بھی پیدا نہ کر سکے اور بالخصوص ۱۹۰۰ء کے بعد ہمیں کئی ایسی کوششوں کا پتا چلتا ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ عربی رسم خط میں لکھائی کو واضح تر بنایا جائے، مثلاً حرفِ علّت e اِ کے لیے صرف ہ کی اس شکل کا استعمال ہو جو آخرِ کلمات میں ہوتی ہے، لیکن ان کوششوں میں سے کسی کو بھی عام مقبولیت نصیب نہ ہوئی ۔ عربی خوش نویسی کے فنّی جزئیات کی جانب ترکیہ میں بہت توجہ کی گئی ہے ۔ کئی خط، جو ترکی زبان سے مخصوص ہیں، وجود میں لائے گئے ، جیسے خطِّ دیوانی، جو سلطان یا بڑے حکّام کی جانب سے جاری کردہ وثائقِ رسمی کے لیے استعمال ہوتا تھا یا آرایشی خط معروف بہ ثُلث اور خطِّ رُقعہ (رِقاع)، جو ایک طرح کا شکستہ (cursive) خط ہے اور بالکل قریب کے زمانے تک استعمال میں آتا رہا ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ عربی خطّاطی ('' حُسنِ خط '') کا معیار ترکیہ میں دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلے میں بلند تر رہا ہے (قب مجموعۂ تراجم موسوم بہ خطّ و خطّاطان از حبیب ، قسطنطنیہ ۱۳۰۵ھ) ۔ دوسری الفباؤں میں سے، جو عثمانی ترکی کے لیے استعمال ہوتی رہی ہیں، یونانی ہے (جیسے قرہمانلیوں نے استعمال کیا)

اور ارمنی (جیسے ترکی بولنے والے ارمنی استعمال کرتے رہے؛ قب E. Littmann : *Ein türkisches Streitgedicht über die Ehe*، در *A Vol. of Or. Stud. pres. to E. G. Browne*، کیمبرج ۱۹۲۲ء، ص ۲۶۹ ببعد) - عبرانی خط کبھی عثمانی ترکی کے لیے استعمال نہیں ہوا۔

۱۹۲۸ء میں ترکیہ میں سرکاری طور پر بجائے عربی کے لاطینی الفباء جاری کر دی گئی - نوجوان ترکوں کے انقلاب کے زمانے سے ترکوں کے استعمال کے لیے عربی الفباء کی تسہیل کی متعدد کوششیں کی گئی تھیں - عربی تہجّی (orthography) کی اس دشواری کو کہ اس میں ترکی کلمات اور عربی اور فارسی کے کلماتِ مستعار کے لکھنے کے لیے بالکل جدا جدا قواعد کی ضرورت پیش آتی تھی، عوام میں تحریری زبان کی اشاعت کی راہ میں بجا طور پر ایک سنگ سخت قرار دیا گیا - اسی لیے خود عربی تہجّی کو سادہ تر بنانے کی کئی کوششوں کے ساتھ ساتھ (قب سطور بالا) وقتاً فوقتاً بعض زیادہ انقلابی تجاویز بھی پیش ہوتی رہیں، مثلاً وہ طریقہ جسے انور پاشا نے دورانِ جنگ میں فوج میں رائج کرنے کی کوشش کی - یہ طریقہ عربی الفباء ھی پر مبنی ہے، لیکن اس میں حروف کو ایک دوسرے سے ملایا نہیں جاتا اور ہر حرکت کے لیے یکساں علامت مقرر ہے، لیکن ان طریقوں میں سے کسی کو بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوئی - دوسری طرف مذھبی حلقوں میں لاطینی الفباء استعمال کرنے کی ہمیشہ سختی سے مخالفت ہوتی رہی- یہاں تک کہ خالص علمی (scientific) مقاصد کے لیے بھی اسے پسند نہ کیا جاتا تھا- قوم پرست ترکی حکومت کے دوبارہ قیام کے بعد یہ مسئلہ چند سال تک معلّق رہا - علمائے دین کا اثر اب کسی شمار میں نہ تھا اور لاطینی

رسم خط کا مسئلہ وقتاً فوقتاً اخباروں اور رسالوں میں زیر بحث آتا رہا (کتابچہ از A. Galanti بعنوان تورکچەدە عربی ولاتین حرفلری و املا مسئلەسی، قسطنطنیہ ۱۹۲۵ء) - اس مسئلے پر دیگر ترکی اقوام کے رویّے کا، جو روس خصوصاً آذربایجان میں رہتی تھیں، اثر پڑا؛ اسی طرح مؤتمر الترکیات (Turcological Congress)، منعقدۂ باکو، فروری و مارچ ۱۹۲۶ء کے مباحث کا بھی اثر پڑا (قب *Islām*، ۱۶ : ۱۷۳ ببعد)، جہاں ترکیہ کی نمایندگی بہت ناکافی تھی، آخرکار ۱۹۲۸ء میں حکومت نے حزبِ قوم پرست (Nationalist party) کی تائید سے اس معاملے کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا - ۲۰ مئی کے ایک قانون کی رو سے سرکاری طور پر یورپی اعداد رائج کر دیے گئے - اس اثناء میں حکومت نئی الفباء پر غور کر رہی تھی، ۲۱ اگست کو مصطفٰی کمال پاشا نے قسطنطنیہ میں نئے لاطینی رسم خط پر اپنی مشہور و معروف تقریر کی - پہلی تجویز میں چند ترمیمات کے بعد آخرکار یکم نومبر کے ایک قانون کے ذریعے نئی الفباء کو جاری کر دیا گیا - اس قانون میں لاطینی زبان کے، ان قواعد کے مطابق جن کی تشریح و توضیح 'دیل انجمنی' *Dil encümeni* نے کی تھی، استعمال کا اور عربی الفباء کی تنسیخ کا حکم دیا گیا تھا، اس کے ساتھ ھی اس تبدیلی کے مدارج بھی طے کر دیے گئے تھے - اس کی رو سے یکم جون ۱۹۳۰ء آخری تاریخ تھی جس میں سب مطبوعہ وثیقوں میں لاطینی الفباء کا استعمال لازمی قرار دیا گیا (قب قانون کا متن در *Oriente Moderno*، جنوری ۱۹۲۹ء، ص ۴۱ ببعد اور مقالہ از H. W. Duda، *Die neue Lateinschrift in der Türkei*، در *O. L. Z.*، ۱۹۲۹ء، عمود ۴۴۱ تا ۴۵۳)- اخبارات ان میں یکم جنوری ۱۹۲۸ء سے شائع ہونا شروع

ہو گئے تھے ۔ اس کے ساتھ ہی آبادی کے تمام طبقوں کو چار چار ماہ کے نصاب کے ذریعے نئی الفباء کی تعلیم دینے کے لیے ضروری اقدامات کیے گئے (مِلّت مکْتبی).

ان متعاقب اقدامات میں جو عجلت برتی گئی اور ان کے خلاف جو بظاہر کمزور سی مزاحمت کی گئی، اس سے نہ صرف حکومت کی مستحکم حیثیت کا پتا چلتا ہے، بلکہ اس قسم کی انقلابی اصلاح کے قابلِ عمل ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے ۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ آبادی کا وہ حصہ جو اس تبدیلی سے گہرے طور پر متأثر ہوا نسبۃً تھوڑا تھا، لیکن دوسری طرف اس سے بھی کوئی انکار نہ کرے گا کہ لاطینی الفباء ترکی زبان کی صوتی خصوصیات کے اظہار کے لیے بہ نسبت عربی ابجد کے بہت زیادہ موزوں ہے ۔ نئے رسم خط کے اجراء کے لیے جو وقت منتخب کیا گیا وہ بھی غیر مناسب نہ تھا، لیکن یہ بات بھی ویسی ہی عیاں تھی کہ اس الفباء کو قربان کر دینا جو ایک قوم کے مذہبی، ادبی اور ثقافتی ارتقاء سے صدیوں تک توأم رہی تھی ایک بڑے ثقافتی بحران کا مرادف تھا، جس نے عوام کے قائدینِ فکر پر ایک بھاری ذمےداری عائد کر دی ۔ اس اصلاح کو ابھی اتنا تھوڑا عرصہ گذرا ہے کہ اس کے نتائج کا اندازہ کرنا دشوار ہے ۔

نئی الفباء میں کئی نئی خصوصیات پائی جاتی ہیں (مثلاً c کو ج کے لیے، ç کو چ کے لیے، ı غیر منقوط کو ı کے لیے استعمال کرنا ۔ ş کا استعمال بجاے ش کے رومانیا کی تہجّی کا اثر ظاہر کرتا ہے)؛ اس میں حرکاتِ اعرابی کا اسراف نہیں ہے ۔ ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ترکی کا رسمِ خط استوار اور طے شدہ ہے، لیکن 'دیل انجمنی' کی جانب سے جو قواعد ابتدا میں مقرر کیے گئے ان میں ایک ایسی تہجّی کا اصول قائم کیا گیا جو تا بحدِّ امکان صوتیات پر مبنی ہے اور اس اصول کا اطلاق اُن کلمات پر بھی ہوا جو دوسری زبانوں سے مستعار لے کر لاطینی رسمِ خط میں لکھے جایا کرتے ہیں (مثلاً *federasyon* بجاے fédération) ۔ اس سے عربی الفاظ کی شکل اکثر ایسی بن جاتی ہے کہ ان لوگوں کے لیے، جو عربی رسم خط کے عادی ہیں، ان الفاظ کی شناخت دشوار ہو جاتی ہے ۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نئی الفباء میں بول چال کی زبان سے مطابقت کا رجحان اس سے زیادہ ہے جتنا عربی الفباء کے ذریعے ممکن تھا؛ اس کی طرف پہلے ہی اشارہ ہو چکا ہے کہ اس حقیقت کی بدولت عثمانی زبان کے علمی مطالعے میں کئی پہلوؤں سے سہولت پیدا ہو جائیگی ۔

(کرامرز J. H. KRAMRERS)

II ۔ عثمانی ترکی عوامی بولیاں

۱ ۔ انتشار کے منطقے ۔

ضروری مفصّل پیمائش و مساحت کی کمی کے باعث اب تک ان منطقوں کی صحیح حدود کی باضابطہ تعیین ناممکن ہے جہاں عثمانی ترکی زبان بولی جاتی ہے ۔ یہ زبان یورپ میں بھی بولی جاتی ہے اور ایشیا میں بھی ۔ یورپ میں جزیرہ نماے بلقان میں یہ ایسے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں پائی جاتی ہے جن کے گردا گرد دوسری زبانیں رائج ہیں؛ انہوں نے بہت حد تک ترکی زبان والے علاقے کی جمعیت مجموعہ (bloc) میں خلل پیدا کر دیا ہے ۔ ایسے ترکی بولنے والے علاقوں میں سے ہم حسبِ ذیل کا ذکر کر سکتے ہیں: (۱) مشرقی تراقیہ Thrace، بشمولِ جزیرہ نماے گیلی پولی، جہاں ترکوں کی ایک ٹھوس جمیعت ہے اور دس لاکھ سے زائد آبادی ہے؛ (۲) مقدونیہ Macedonia کے بعض حصے، یعنی دریای وَرْدار Vardar کے بائیں کنارے کے

ساتھ ایک لمبا خطّہ، شتِپ (Stip) اور رادویش Radovišta کے درمیان کی سر زمین، بحیرۂ ایجہ Aegean کے کنارے، تخمیناً سلانیک سے لے کر ددہ آغاچ تک بالخصوص ڈراما Drama، اِسکیژہ Eskiže اور گُومُولژینہ Gümülžina (گُومُورژینہ) کے شہروں کے گرد کا علاقہ ۔ ان علاقوں میں جنگِ بلقان کے زمانے کا ایک پُرمایہ ادب موجود ہے، جس کے بعض حصّوں میں سیاسی تعصّب پایا جاتا ہے؛ قب خصوصاً *Carte ethnographique de la Macédoine du sud représentant la répartition ethnique à la veille de la guerre des Balkans*، ۱۹۱۲ء، از I. Ivanov (پیمانہ ۱ = ۲۰۰،۰۰۰)، نیز *Etnografična karta na odrinskija viljaet kəm 1912 god*، از L. Miletič (پیمانہ ۱ = ۵۰۰،۰۰۰)، اسی مصنف کا مرسوم *Etnografičeska karta na Makedonija*، (پیمانہ ۱ = ۱،۵۰۰،۰۰۰)؛ قب نیز Vasil Kančof: *Makedonija, etnografija i statistika*، صوفیا ۱۹۰۰ء۔ مگر اس کے بعد سے نسلی تناسبات میں بہت کچھ ردّ و بدل ہو گیا ہے ۔ عہد نامۂ لوزان (۱۹۲۳ء) کی رو سے ترکیہ اور یونان کے مابین آبادیوں کا مبادلہ ہوا اور یونان نے چار لاکھ ترکوں کو ترکیہ میں بھیج دیا، اس لیے ان ملکوں کے اس حصّے میں، جو اب یونان کے پاس ہے، ترکی بولنے والوں کی تعداد میں بہت کمی واقع ہو گئی؛ (۳) بلغاریا کے بعض علاقے، یعنی اضلاعِ دیلی۔اورمان Deli-Orman، توزلُق Tozluk اور گِرلوفو Gerlovo، جو شمال مشرق بلغاریا میں ہیں (قب D. G. Gadžanow: *Vorläufiger Bericht über eine im Auftrag der Balkan-Kommission der kais. Akademie d. Wiss. in Wien durch Nordost-Bulgarien unternommene Reise zum Zwecke von türkischen Dialektstudien, Anz. Wien*، در ۸ فروری ۱۹۱۱ء اور اسی مصنف کی *Zweiter vorläufiger Bericht über die ergänzende Untersuchung der türkischen Elemente im nordöstl. Bulgarien in sprachlicher, kultureller und ethnogr. Beziehung, ebd.*، ۴ جنوری ۱۹۱۲ء۔ ترکوں کے بحالیات کے مسئلے کے متعلق دیکھیے نیز L. Miletič: *Staroto bəlgarsko naselenie v sieveroiztočna Bəlgarija*، صوفیا ۱۹۰۲ء؛ نقشہ در A. Ischirkoff: *Das Bulgarentum auf der Balkanhalbinsel im J. 1912*، در *Petermanns Geogr. Mitteilungen*، سال ۱۹۱۵ء بھی بہت قیمتی ہے، لوحہ ۴۴، جہاں ترکی بولنے والوں کی منفرد بستیوں کی تقسیم بھی دکھائی گئی ہے)، نیز شمال مشرق بلغاریا میں ایک معتدبہ علاقہ ہے جو قیرژالی Kyržaly اور مستانلی Mastanly کے شہروں کے گردا گرد واقع ہے ۔ علاوہ اس کے ترک تمام بلغاریہ میں منتشر نظر آتے ہیں، مثلاً فلیپوپولس (پلوف دیو Plovdiv) کے گرد کے علاقے میں، قوجہ۔بلقان Kožu-Balkan اور دوسرے علاقوں میں؛ قب Dr. Constantin Jireček: *Das Fürstentum Bulgarien*، پراگ۔وینا۔لائپزگ ۱۸۹۱ء، ص ۱۳۳ تا ۱۴۶ (اس کتاب کی اطلاعات اب پرانی ہو چکی ہیں)؛ (۴) جدید یوگوسلاویا میں بھی ترکی بولنے والے جا بجا پائے جاتے ہیں، بیشتر مقدونیہ میں ہیں (قب J. Cvijić: *Ethnographische Karte der Balkanhalbinsel nach allen vorhandenen Quellen und eigenen Beobachtungen*, *Petermanns Mitteilungen*، مارچ وغیرہ ۱۹۱۳ء اور اسی مصنف کی *Raspored balkanskih naroda, Glasnik Srpskog Geografskog Društva*، بلگراڈ ۱۹۱۳ء، ص ۲۳۴ تا ۲۹۵) ۔ منقطع چھوٹی جماعتیں دریائے ڈینیوب کے کنارے اداقلعہ Adakale کے جاذبِ نظر جزیرے تک پائی جاتی ہیں، جو اورسووا Orsova میں واقع ہے (قب I. Kúnos: *Türkische Volksmärchen aus Adakale*، جلد اول کا دیباچہ)؛ (۵) بحیرۂ اسود کے تمام مغربی اور

شمال مغربی ساحلوں کے ساتھ ساتھ عثمانی اثر کے معتدبہ آثار نظر آتے ہیں ۔ دوبروجہ کے شہروں اور بے درخت میدانوں (stepps) میں ترکی بکثرت بولی جاتی ہے (قب St. Romansky : *Le caractère ethnique de la Dobroudja*، صوفیا ۱۹۱۷ء اور اسی مؤلف کا *Carte ethnographique de la nouvelle Dobroudja Roumaine*، صوفیا ۱۹۱۵ء) ۔ بد قسمتی سے وہاں کی عوامی زبانوں کے حالات کے بارے میں ہمارے پاس زیادہ تفصیلی معلومات نہیں ہیں ۔ یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ گاگوز Gagauz عیسائیوں کی زبان بنیادی طور پر عثمانی ترکی ہی ہے ۔ دوبروجہ کے گاگوز، جن سے میں ورنہ Varna کے شمال میں ملا تھا ، ایسی بولی بولتے ہیں جسے قسطنطنیہ کی عوامی بولی سے تمیز نہیں کیا جا سکتا ۔ بسارابیا کے گاگوزوں کی زبان بھی عثمانی ترکی کی محض ایک بولی ہی ہے؛ اس کے بارے میں ہمیں موشکوف Moškov کے پر ازمعلومات مجموعے سے اطلاعات ملتی ہیں (راڈلوف کی *Proben der Volkslitteratur der türkischen Stämme*، ج ۱۰، *Mundarten der bessarabischen Gagausen*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۴ء) ۔ اس امر کے باوجود کہ بعض دانش طلبوں نے گاگوزوں کو قومانوں Kumans کی نسل سے سمجھا ہے (C. Jireček : *Einige Bemerkungen über die Überreste der Petschenegen und Kumanen, sowie über die Völkerschaften der sogenannten Gagauzi und Surguči im heutigen Bulgarien, Sitzungsber. d. kön. böhm. Gesellschaft der Wiss.*، ۱۸۹۹ء) ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی موجودہ زبان میں کوئی بھی قومانی عنصر شامل نہیں ۔

عثمانی اثر قریم Crimea کے جنوبی ساحل پر بہت قوی ہے ۔ حال میں شاتسکایا O. Šatskaja نے باغچی سرایی اورتواق (نزد الشتہ) کی عوامی شاعری کے جو نمونے شائع کیے تھے ان کی زبان کو صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ عثمانی ترکی ہے (*J. A.*، اپریل-جون ۱۹۲۶ء، ص ۳۴۱ تا ۳۶۹) ۔ یہی بات بہت سے ان متون پر صادق آتی ہے جو راڈلوف کی کتاب *Die Mundarten der Krym* (*Proben der Volkslitteratur der nördl. türk. Stämme*، *Vol. VII*) میں درج ہیں ۔ قریم کی تاتاری ادبی زبان عثمانی تحریری زبان سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے (Samoilovič : *Opyt kratkoj krymsko-tatarskoj grammatiki*، پٹروگراڈ ۱۹۱۶ء، ص ۷ پائین) ۔

جزائر بحیرۂ روم خصوصاً اقریطش، قبرص اور بحیرۂ ایجہ کے جزیروں میں ترکی زبان کی موجودہ حالت کے متعلق ہمارے پاس صحیح معلومات کچھ بھی نہیں ہیں ۔

اناطولیا کے ترکی بولنے والے علاقے کے شمال مغرب اور جنوب میں بخوبی معین قدرتی سرحدیں موجود ہیں ۔ شمال مشرق میں وہ علاقہ بتدریج اور بظاہر کسی معین سرحد کے بغیر آذربایجانی بولنے والے علاقے میں مل جاتا ہے ۔ بہت سی لسانی خصوصیات، جنھیں فوا Foy تک نے بھی مخصوص طور پر آذربایجانی تصور کیا ہے (*Azerbajğanische Studien mit einer Charakteristik des Südtürkischen*, *M.S.O.S.As.*، ۶ : ۱۲۶ تا ۱۹۳ ؛ ۷ : ۱۹۷ تا ۲۶۵) ، ایشیاے کوچک کی بولیوں میں بھی پائی جاتی ہیں، جیسا کہ Giese [قب اآ، طباعت اول، ۱ : ۵۳۱ بذیل آذری] نے بجا طور پر بتایا ہے ۔ جنوب مشرق میں عثمانی زبان، شمالی شام کی عربی سے جا ملتی ہے ۔ شمالی عراق میں کردی زبان اس کی جمعیت مجموعہ میں جگہ جگہ خلل انداز ہے اور ایران کی آذربایجانی کا بھی کافی اثر اس پر پڑا ہے ۔

حضری ترکوں کے علاوہ ہمیں اناطولیہ

بلکہ جزیرہ‌نماے بلقان میں بھی خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش ترک دکھائی دیتے ہیں ۔ ایشیاے کوچک میں ان کی تعداد اب بھی خاصی ہے، گو یورپ کی سرزمین سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں (قب *Die Jürüken und Konjaren* : P. Traeger *in Makedonien, Ztschr. für Ethnol.*، ۱۹۰۵ء، ص ۱۹۸ تا ۲۰۶؛ بلغاریہ کے جیوْرُوکوں Jürüks اور کُنجاروں Konjars کے لیے دیکھیے *Das* : Jireček *Fürstenthum Bulgarien*، ص ۱۳۹ ببعد) ۔ اناطولیا میں ترکی خانہ بدوش لوگوں کے نام کچھ مبہم سے ہیں، مثلاً عیشر تلر (''عشائر'')، جیوْرُوْك، ترکمان، یا ان کے اپنے قبائلی نام ہیں، مثلاً اَوْشار (یا افشار) وغیرہ ۔ عام طور پر ان کی زبان ان کے حضری ہمسایوں کی زبان سے اصلاً مختلف نہیں ہے ۔

عثمانی ترکی زبان کے علاقے کی سرحدوں میں اب بھی کافی ردّ و بدل ہو رہا ہے ۔ مغرب، یعنی بلقان میں اس زبان کا استعمال برابر کم ہو رہا ہے، لیکن دوسری طرف مشرق میں بعض جگھوں میں یہ زبان زیادہ پھیل رہی ہے ۔

۲ ۔ عثمانی ترکی کے علاقے میں لسانی اقلّیتیں ۔

موجودہ جمہوری حکومت نے جو اقدامات کیے ہیں ان کے باعث جدید ترکی حدود میں لسانی اقلّیتوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے ۔ تاہم عثمانی ترکی بولنے والا علاقہ اب تک بھی کسی طرح سے یک زبان نہیں اور اس میں بہت سی دوسری زبانیں موجود ہیں ۔ بڑی بڑی اقلّیتیں یہ ہیں : [۱] یونانی، جو کسی زمانے میں بہت بڑی تعداد میں تھے ، لیکن اب مبادلۂ آبادی کے سبب سے عملی طور پر محض قسطنطنیہ ہی میں پائے جاتے ہیں ؛ [۲] ارمنی (یہ بھی تقریباً بالکل قسطنطنیہ ہی کے علاقے میں محدود ہیں) ؛ [۳] عرب (مسلمان عرب، شام اور عراق کی سرحد پر ، عیسائی عرب مِرسِین Mersin اور ناحیۂ مرسین میں)؛ [۴] کُرد مشرقی ولایتوں میں ، لیکن ایشیاے کوچک کے اور مقامات میں بھی الگ الگ جماعتوں میں موجود ہیں (شیخ سعید کی ۱۹۲۵ء والی بغاوت کے بعد ان میں بہت سے لوگوں کو سزا کے طور پر خانہ کوچ کر کے ایشیاے کوچک کے اندرونی علاقوں میں بھیج دیا گیا؛ [۵] نسطوری شامی، مشرقی ولایتوں (خصوصاً ہَکّاری Hakkiari) میں ؛ [۶] سب قسم کی قفقازی قومیں (لاز ، گُرجی، اَبخاز، چرکسی)، جو پورے ایشیاے کوچک میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں ، مگر ان کی نہایت گھنی آبادی شمال مشرق میں ہے ؛ البانوی (ارناؤط) ، قراچی (gipsies)، ہسپانوی یہودی (جو زیادہ بڑے بڑے شہروں میں رہتے ہیں) وغیرہ کم تر تعداد میں پائے جاتے ہیں ۔

ترکی اقلّیتیں ایشیاے کوچک میں بھی موجود ہیں (مثلاً قِریم تاتاری تارکینِ وطن اسکی ۔شہر اور اس کے گرد و نواح میں) ۔ اسی طرح یہ اقلّیتیں روم ایلی میں بھی (دریاے دوبروجہ اور بلغاری ڈینیوب کے کنارے) پائی جاتی ہیں ۔

۳ ۔ عثمانی ترکی اور ہمسایہ زبانوں کا ایک دوسری پر اثر۔

ابھی تک عثمانی ترکی اور اس کے ہمسایوں کے مابین ایک دوسرے پر اثر اندازی کے متعلق ہماری معلومات بہت ناقص ہیں ۔ ہم صرف بعض منفرد مظاہر کا ذکر کر سکتے ہیں، مثلاً حرف ھا *h* (χ) کا جو ابتداے کلمہ میں آتا ہے، غائب ہو جانا : اَق (= عربی حق)، آئِن (= عربی خائن)، آنہ (= فارسی خانہ)، آنی (= ھانی، قانی) وغیرہ، جو مقدونیہ کی عوامی بولیوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے (دیکھیے کووالسکی Kowalski : *Zagadki ludowe tureckie*، ص ۱۱ ؛ وہی مؤلف : *Osmanisch-türkische*

Volkslieder aus Mazedonien، *W. Z. K. M.*، ۳۳ : ۱۶۷ تا ۱۶۸)، لیکن جو بوسنه کی ترکی زبان میں بھی پائی جاتی ہے) بلاؤ Blau : *Bosnisch-türkische Sprach-denkmäler*، ص ۷۲) اور جو جنوبی سلاوی (Slavonic) زبانوں کے اثر کی طرف منسوب کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح شروع کلمه میں آنے والے e/ie کا باهمی مبادله، جو شمالی بلغاریا میں اکثر نظر آتا ہے، بلغاری اثر کا نتیجه تصور کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس کا امکان ہے که بسارابیا Bessarabia کے گاگوزوں (Gagauz) کی بولیوں میں حروف کو حلق سے نکالنے کو (موشکوف Moškov، ص ۷۲ ببعد) سربی اثرات کی جانب منسوب کیا جائے۔

بلاؤ نے بوسنه کی مخلوط ترکی سربی زبان کا مطالعه کیا ہے، لیکن اس نے بول چال کی زبان کی طرف توجه نہیں کی، بلکه محض مخطوطات کی شکل میں جو مواد تھا اسی کا گہرا مطالعه کیا ہے۔ هنگری میں ترکی دور حکومت کی عثمانی ترکی کے لیے ان بیش قیمت اطلاعات کی طرف مراجعت ممکن ہے جو *Litteraturdenkmäler aus Ungarns Türkenzeit* (طبع بابنگر، گراگر R. Gragger، مِتْووخ E. Mittwoch اور مورٹمان J. H. Mordtmann، برلین ۱۹۲۷ء) میں درج ہیں۔

کئی علماء نے یه حقیقت ملاحظه کی ہے که جنوب مشرقی علاقوں میں عربی زبان کے زیر اثر حروف حلقیه کے انواع کا رواج اور مقامات کی عثمانی ترکی کے مقابلے میں زیاده ہے اور یه که بالخصوص وهاں عربی مستعار الفاظ میں حرف عین بولا جاتا ہے (قب هارٹمان M. Hartmann، در *K. S.*، ۱ : ۱۰۴؛ بلقان اوغلو : *Dialecte turc de Kilis*، در *K.S.*، ۳ : ۲۶۳).

ترکی اور همسایه زبانوں کا باهمی فعل و انفعال الفاظ مستعار کی کثرت سے بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اب تک غیر عثمانی زبانوں میں مستعار ترکی الفاظ کی طرف زیاده اور عثمانی زبان میں غیر ترکی مستعار الفاظ کی طرف نسبةً کم توجه هوئی ہے۔ عثمانی ترکی کے جنوب مشرقی اور مشرقی یورپ کی زبانوں پر اثرات کے لیے دیکھیے خصوصاً Fr. Miklosich کی تصنیف *Die türkischen Elemente in den südost-und osteuropäischen Sprachen, Griechisch, Albanisch, Rumänisch, Bulgarisch, Serbisch, Kleinrussisch, Grossrussisch, Polnisch, Denkschriften d. Kais. Akad. d. Wiss. Wien*، ج ۳۴ تا ۳۸؛ قب اسی کے بارے میں Fr. Kraelitz-Greifenhorst : *Corollarien zu Miklosich "Die türkischen Elemente......"*، در *S. B. Ak. Wien*، ج ۱۶۶، ۱۹۱۱ء)؛ Fr. Miklosich کی کتاب *Über die Einwirkung des Türkischen auf die Grammatik der südosteuropäischen Sprachen*، در *S. B. Ak. Wien.*، ج ۱۲۰، ۱۸۹۰ء بھی بہت قیمتی کتاب ہے؛ نیز N. K. Dmitrijev کی تصنیف *Etjudy po serbsko-tureckomu jazykovomu vzaimodejstviju, Doklady Akad. Nauk. S. S. S. R.*، ۱۹۲۸-۱۹۲۹ء۔ سربی زبان میں ترکی مستعار الفاظ کے لیے دیکھیے Gj. Popović : *Turske i druge istočanske reči u našem jeziku.*، بلغراد ۱۸۸۹ء؛ اسی طرح رومانیا کی زبان میں مستعار الفاظ کے لیے Th. Löbel : *Elemente turceşti, arabeşti şi persane în limba Română*، قسطنطنیه ـ لِیْسکا ۱۸۹۴ء اور Lazare Sainéan : *L'influence orientale sur la langue et la civilisation roumaines, I., La langue, les éléments orientaux en roumain*، پیرس ۱۹۰۲ء۔ L. Ronzevalle اپنی تصنیف *Les emprunts turcs dans le grec vulgaire de Roumélie et spécialement d'Adrinople* (*J. A.*، ۱۹۱۱ء، جولائی تا دسمبر) میں عام یونانی زبان

میں ترکی سے مستعار الفاظ پر بحث کرتا ہے، اسی طرح A. Danon : Essai sur les vocables turcs dans le judéo-espagnol، (K. S.) ج ۲، ۱۹۰۳ء، ج ۵، ۱۹۰۴ء اور ج ۱۳، ۱۹۱۲ء) نے اسپین کے یہودیوں کی روزمرہ زبان میں ترکی مستعار الفاظ سے بحث کی ہے۔

بلقان کی ترکی بولیوں میں، جو بلغاریا یوگوسلاویا اور رومانیا میں رائج ہیں، سلاوی یا رومانوی مستعار الفاظ کا عنصر بہت مقدار میں پایا جاتا ہے۔ M. Bittner : (S.B. Ak. Wien، ج ۱۴۲، ۱۹۰۰ء) نے عربی اور فارسی کے ترکی پر اثر کے متعلق بحث تو کی ہے، مگر بد قسمتی سے محض تحریری زبان کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہی حال اس بحث کا ہے جو ترکی میں یونانی عناصر کے متعلق مایر G. Meyer نے کی ہے (Türkische Studien، S.B. Ak. Wien، ج ۱۲۸، ۱۸۹۳ء)۔

عثمانی ترکی کے تلفظ کے بارے میں، جو ترکیہ کی بے شمار غیر ترکی اقلیتوں میں رائج ہے، ہماری معلومات بہت ناقص ہیں۔ قراگوز تمثیلی قصوں میں جو مختلف طرز کی بولیاں استعمال ہوتی ہیں ان سے اس بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں، مگر اس میں بہت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ان قصوں کی زبانیں، جیسا کہ G. Jacob نے (Dast ürkische Schattentheater، ہانوور-برلین، ۱۹۰۰ء، ص ۲۹ تا ۳۷، Geschichte des Schattentheaters، ۱۹۲۵ء، ص ۱۴۳) بجا طور پر لکھا ہے، حقیقت سے عاری ہیں، وہ صرف روایتی مضحک خاکے ہیں، جنھیں عملی مشاہدے پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا۔ قسطنطنیہ میں رہنے والے یونانیوں اور ارمنیوں کی زبان کا ترکی مزاحیہ رسالوں میں خاکہ اڑایا جاتا تھا۔ ان روزانہ اخباروں سے بھی اہم مواد حاصل ہو سکتا ہے جو ابھی زمانۂ حال تک خاصی اہمیت رکھتے تھے اور یونانی یا ارمنی سربی حروف (ٹائپ) میں ان یونانیوں (قرہمانلی) اور ارمنیوں کے لیے جو صرف ترکی بول سکتے ہیں چھپتے تھے۔ اسی قسم کے ادبی مواد پر، باستثنائے لغت تخاطب، F. Kraelitz-Greifenhorst کے فاضلانہ مقالے Studien zum Armenisch-Türkischen (S. B. Ak. Wien، ج ۱۶۸ / ۳، وینا ۱۹۱۲ء) مبنی ہیں۔ ان میں زیادہ تر قسطنطنیہ کی ارمنی ترکی سے بحث کی گئی ہے۔ قرہمانلی (قرہمالی) کی زبان کے بارے میں قب N. Dmitrijev : Materialy po osmanskoj dialektologii. Fonetika "karamalickogo" jazyka. Zap. Kollegii Wostokowedow، ج ۳ (۱۹۲۸ء) : ص ۴۱۷ تا ۴۵۸۔

ترکی بولنے والے یونانیوں کے تلفظ میں ایک نمایاں خصوصیت ہے، یعنی ایک طرح کی تغلیب حرف ز (zeta-ism) : ش = س، چ = ج، ج = ژ جیسے جوق (چوق)، اولەزق وغیرہ (قب G. Jacob : Zur Grammatik des Vulgär-Türkischen، Z. D. M. G.، ۵۲ : ۷۰۱)۔

آدم پول واقع بوسفورس کے نزدیک مقام لازکوی کے دولازوں کی بولی میں، جن کے تلفظ کا میں نے کچھ عرصے تک مطالعہ کیا، جو چیز مجھے مدھش معلوم ہوئی وہ ان کا 'کی' کا تلفظ 'چی' تھا، مثلاً اچین (اِکین) بمعنے "بیج"، اور ج کا تلفظ ز؛ سامسون کے ایک لازکی زبان میں بھی یہی بات نظر آئی : اودہ چلیتلی در (بجای اودہ کلیتلی در)۔ شروع کے آوازدار حروف صحیح ب، د، گ کا بھی وہ بے آواز تلفظ بطور پ، ت، ك کرتے تھے (قب Jacob، کتاب مذکور، ص ۶۹۹)۔

یونانی تلفظ کی، بقول ترکوں کے، خصوصیت یہ ہے کہ وہ گ g کو جو ü, ö, i, e سے پہلے آئے نفخ کے ساتھ (spirant) تلفظ کرتے ہیں اور

آخری مقطع کے نبرہ والے یا زوردار (accented) حرکات کو مدّ حرکات سے ادا کرتے ہیں : ینِ یِلْدِیم (= یِگلدِم) باقْتِیم . . . .

۳ - موجودہ عثمانی بولنے والے علاقوں کی تشکیل کی تاریخ :

جو صورتِ حال ہمیں موجودہ عثمانی بولنے والے علاقوں میں نظر آتی ہے وہ سکونت پذیری اور گھل مل جانے کے ایک طویل اور پیچیدہ عمل کا نتیجہ ہے - یہ بات واضح ہے کہ ترکیہ اور ہمسایہ ممالک کے وہ باشندے جو اب عثمانی ترکی بولتے ہیں بہت ہی کم حد تک ان ترکوں کی اولاد میں سے ہیں جو یہاں نقلِ مکان کر کے آئے تھے، بلکہ اس کے برخلاف ان کی بہت بڑی اکثریت مقامی مستترک عناصر کی اولاد سے ہے .

ایشیاے کوچک اور جزیرہ نماے بلقان کے ترکی ناحیوں کی آبادکاری کی تاریخ ابھی لکھی جانا باقی ہے - اب تک ضروری ابتدائی کام بھی نہیں ہو سکا - ممالکِ زیرِ بحث کے عملِ استتراك کا عمومی اور اجمالی خاکہ یوں پیش کیا جا سکتا ہے :

منفرد جنوبی ترکی جماعتیں بوزنطی مملکت میں سلجوقی حملے سے بھی پہلے آباد ہو گئی تھیں ، ایشیاے کوچک میں بھی اور بلقان میں بھی - بلقان میں اُس وقت بھی خاصی بڑی جماعتیں موجود ہوں گی جو اُن شمالی ترکوں کی مہاجرتوں کا بقایا تھیں، جو قدیم تر زمانے میں بحیرۂ اسود کے شمال کی جانب سے وہاں پہنچیں، لیکن گیارھویں صدی کے اواسط ھی میں وہ مہاجرت واقع ہوئی جو بڑے پیمانے پر تھی اور جسے سلجوقی مہاجرت کہہ سکتے ہیں اور جو تیرھویں صدی کے آخر تک جاری رہی - ایشیاے کوچک میں سلجوقی سلطنت کے خاتمے کے قریب مقامی باشندوں کا استتراك شروع ہو چکا ہوگا - یہ عمل ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے عہدِ حکومت میں جاری رہا جو سلجوقی سلطنت کے خرابے پر تعمیر ہوئیں .

تیرھویں صدی میں جب عثمانی ترک آئے تو شروع میں ایشیاے کوچک کی آبادکاری میں ان کی در آمد کی اھمیت بہت ھی کم تھی، اس لیے کہ آنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی، لیکن عثمانی ریاست کی سیاسی قوت نے اس زمانے میں تیز رفتار سے ترقی شروع کر دی اور کچھ شک نہیں کہ اس کا استتراك کے عمل میں دور رس اثر پڑا - لیکن ان دیار کے استتراك کی ابتدائی شرائط تبھی وجود میں آئیں جب عثمانیوں کی بدولت بتدریج ایشیاے کوچک متّحد ہو گیا اور بلقان میں انھیں عظیم الشان فتوحات میسّر آئیں - ھمیں ذھن میں رکھنا چاھیے کہ پورے عثمانی عہدِ حکومت میں ان کی سلطنت کی حدود کے اندر آبادی کی مسلسل نقل و حرکت ہو رہی تھی، کبھی بڑے اور کبھی چھوٹے پیمانے پر - اس کے ساتھ ھی ترکی عناصر کی بیرونِ ملک، خصوصاً مشرق سے، در آمد ہو رہی تھی، کبھی تیزی سے اور کبھی آھستگی سے - ایشیاے کوچک سے آنے والے ترکوں نے بلقان فتح کیا تو وھاں کے بڑے بڑے علاقوں میں استعمار شروع کر دیا - اگرچہ آبادکاروں کی تعداد کم تھی - حکومت کے اثر سے غیر ترکی آبادی کے عوام نے فوج در فوج اسلام قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ ترکوں میں گھل مل گئے، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی زبان چھوڑ کر عثمانی ترکی اختیار کر لی - بلقان کے ترک بہت سی صورتوں میں اب تک یہ جانتے ہیں کہ آیا وہ ایشیاے کوچک سے آنے والے مہاجرین کی اولاد میں سے ہیں یا ان عیسائیوں کی جنھوں نے

تبدیلِ مذہب کر لیا اور جو کچھ عرصے بعد بالکل ترکی رنگ میں رنگ گئے۔

جب روس نے ان علاقوں میں، جہاں کی آبادی مسلم اور ترک تھی، اپنی حکومت کو وسعت دی تو اس کے بعد سے ترکی عناصر کا ترکیہ میں داخلہ زور پکڑ گیا۔ بالخصوص جب روس نے ۱۷۸۳ء میں کریمیا کا الحاق کر لیا اور ۱۸۶۴ء میں قفقازی علاقے قطعی طور پر مطیع کر لیے تو ترکی مہاجرین کی بڑی بڑی جماعتیں تمام عثمانی مملکت میں سیلاب کی طرح داخل ہونا شروع ہو گئیں، دوسری طرف بلقان کی قومیں آزاد ہو گئیں تو ترکوں کی بڑی بڑی جماعتوں کو ایشیاے کوچک میں واپس آنا پڑا، اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ عالمی جنگ کے بعد یہ عمل اور بھی زور پکڑ گیا اور یونان سے مبادلۂ آبادی کے نتیجے میں تقریباً پانچ لاکھ ترکوں کو ترکیہ کے اس علاقے سے جو اب یونان کے قبضے میں ہے منتقل کر کے تقریباً سارے ایشیاے کوچک میں منتشر کر دیا گیا۔

یہ ظاہر ہے کہ جو لسانی رقبہ ایسے پیچیدہ طریقے پر وجود میں آیا ہو اس میں بولی کے لحاظ سے یکسانیت قائم نہیں رہ سکتی اور یہ بھی عیاں ہے کہ بولیوں کے باہمی تعلّقات ضرور انتہائی طور پر پیچیدہ ہونگے۔

جہاں تک زبان کا تعلّق ہے [یہ ملحوظ رہے کہ] وہ اوغوز قبائل جو ایشیاے کوچک میں ہجرت کر آئے تھے کیفیت کے اعتبار سے ضرور یکساں ہونگے۔ اس کے متعلق جہاں تک ہماری معلومات ہیں سلجوقی ترکوں کی زبان اس زبان سے، جو قدیم عثمانی کہلاتی ہے، مشکل ہی سے تمیز کی جا سکتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف قبائل کی بولیوں میں باریک فرق موجود تھے، جو وقت گذرنے پر بعض اوقات زیادہ گہرے ہو گئے اور بعض اوقات غائب ہی ہو گئے۔ عوامی بولیوں کے مل جل جانے اور ان کے اختلافات کے ہموار ہو جانے کے عمل کا جہاں تک تعلق ہے اسے خصوصاً ایشیاے کوچک میں خالص ترکی آبادی کی خانہ بدوش یا کم از کم نیم خانہ بدوش طرزِ زندگی سے بہت مدد ملی اور یہ طرزِ زندگی بہت عرصے تک جاری رہی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اب بھی کاملاً معدوم نہیں ہوئی۔

شمالی ترکی عناصر (خصوصاً قومان Kumans کے بقایا)، جو بوزنطی عہد تک بلقان کے ملکوں میں پائے جاتے تھے، وقت گذرنے پر زبان کے معاملے میں تقریباً مکمّل طور پر عثمانی اثر سے مغلوب ہو گئے۔ بحیرۂ اسود کے مغرب کے ممالک (دلی اورمان، دوبروجا، بسارابیا) کی زبانوں میں جو بعض لسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں انہیں شاید شمالی اور جنوبی ترکی میں باہمی ربط و ضبط کا نتیجہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ملاحظہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جن لسانی خصوصیات کا ابھی ذکر ہوا ان کے مماثل چیزیں ایشیاے کوچک کے ملحقہ علاقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

ہمیں توقع ہونا چاہیے کہ مسترک جمہور کی زبان میں ہمیں ترکی اصوات کے ثانوی تغیّرات سے بھی سابقہ پڑے گا۔ ان تغیّرات کا مبدأ وہ اسالیبِ نطق ہیں جو ان مسترکوں کو ورثے میں ملے تھے۔ تاہم آبادی کی نقل و حرکت اور فوجی ملازمت میں ایک طرح کی یکسانیت پیدا کرنے کا رجحان موجود رہا ہے اور زمانۂ حال میں مدارس نے بھی یہی عمل کیا ہے۔

عوامی بولیوں کا امتزاج اور معیار کے ساتھ ان کی تطبیق اس حد سے نہ بڑھی جس پر وہ قائم نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

بطور قاعدۂ کلیّہ نئی آبادیاں پرانی آبادیوں میں مکمّل طور پر ضم نہیں ہو جاتیں بلکہ ان کے پہلو بہ پہلو قائم رہتی ہیں، نیز اس وجہ سے کہ ہر آبادی اپنی خصوصیات کو عرصے تک کسی تبدیلی کے بغیر برقرار رکھتی ہے۔

علاوہ تاریخی ماخذ کے، جن سے ترکوں کی آبادکاری کے عمل کی تاریخ مرتّب کرنے کے لیے ابھی پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا، ایک ثانوی مرجع اسمائے اماکن ہیں، جو ایشیائے کوچک اور روم ایلی کی تدریجی آبادکاری اور استراک کے مطالعے کے لیے بیش قیمت امدادی ماخذ کا کام دے سکتے ہیں۔ بد قسمتی سے اس قسم کے مطالعات میں، جو مقامی ناموں سے متعلق ہوں، اب تک بہت کم ترقی کی گئی ہے۔ زمانۂ حال میں ترکی عالموں نے اوغوز کے ایسے قبائلی ناموں کی طرف، جو اسمائے اماکن بن گئے ہیں، کچھ توجہ کی ہے (قبّ کوپرولو زادہ محمد فواد : اوگوز اِتنولوجی سینہ دائر تاریخی نوتلر، تورکیات مجموعہ سی، ۱ : ۱۸۵ تا ۲۱۱؛ ح. نہال اور احمد ناجی : انادولودہ تورکارہ عائد پر اسپلری؛ وہی مجموعہ، ۲ : ۲۴۳ تا ۲۵۹)۔ زمانۂ حال کے مہاجرین کے دیہات کے نام عام طور پر نوساختہ ہیں، جو اشخاص کے ناموں سے منسوب ہیں اور آخر میں عربی کلمۂ نسبت ''۔یـّہ'' کے اضافے سے بنائے گئے ہیں؛ مثلاً عثمانیّہ، اورخانیّہ، رشادیّہ۔

۵۔ عثمانی ترکی عوامی بولیوں کے بارے میں ہماری معلومات کے ماخذ اور ان کی قدر و قیمت۔

عثمانی مملکت کے موجودہ لسانی حالات کے متعلق ہمارے علم کا سب سے اہم ذریعہ یورپی جویندگان علم کے مشاہدات ہیں۔ اس سلسلے میں خود ترکوں نے اب تک مقابلةً بہت ہی کم کام کیا ہے۔

اگر ہم ترکیہ کے کسی نقشے کے ان مقامات پر نشان لگائیں جن کی بولیوں کے بارے میں ہمیں کچھ تھوڑی بہت معلومات حاصل ہیں تو ہمیں فوراً نظر آ جائے گا کہ اب تک اس ضمن میں کتنا اخفّ خفیف کام ہوا ہے اور پورے لسانی رقبے کے دقیق علم سے ہم ابھی کتنے دور ہیں۔

ان مشاہدات کی قدر و قیمت، جن پر ہمیں انحصار کرنا پڑتا ہے، بہت نابرابر ہے : باحثینِ مذکور نے ادبِ شعبی کے متون نقل کیے تو ان کی اکثریت کے لیے اِن متون کے محتویات ہی مقصود بالذات تھے اور لسانی فوائد بالکل ثانوی اہمیت رکھتے تھے۔ جو لسانی مظاہر ان کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان کی محلّی تعیین اکثر اس وجہ سے دشوار ہو جاتی ہے کہ ان مظاہر کے جمع کرنے والے یہ ذکر کرنا بھول جاتے ہیں کہ جس شخص سے وہ لیے گئے وہ کہاں کا باشندہ تھا۔ مواد کا سب سے بڑا ذخیرہ، جسے کونوس I. Kúnos نے فراہم کیا ہے، طریقۂ کار کے اعتبار سے اعتراض سے بالا نہیں، لہذا اسے بہت احتیاط سے اور نقد و نظر کے بعد استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

عوامی گیت اساطیرِ شعبی کے مطالعے کے نقطۂ نظر سے تو بہت دلچسپ ہوتے ہیں، مگر عوامی بولیوں کے مطالعے کے لیے ایسا مواد، جو خاص طور پر موزون و مناسب ہو، مہیا نہیں کرتے؛ اس لیے کہ پورے پورے گیت اور اسی طرح ان کے انفرادی بواعث و دواعی (motives) قابلِ ذکر سرعت سے بڑے بڑے علاقوں میں پھیل جاتے ہیں اور ان کی زبان مقامی بولی کے مطابق بن جاتی ہے، لیکن فوراً نہیں اور نہ کافی عرصہ گذر جانے کے باوجود کلّی طور پر، کیونکہ ان گیتوں میں عوامی بولی کی بعض ایسی شکلیں نظر آتی ہیں جو دور دور کے علاقوں سے منتقل ہو کر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں

ھمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ گیتوں کی زبان ایک مصنوعی زبان ہوتی ہے اور یہ بات ترک عوام کے گیتوں کے سلسلے میں اکثر ملاحظے میں آئی ہے۔ یہی حال پہیلیوں اور کہاوتوں اور بطورِ عمومی تمام شعبی ادب کے آثار کا ہے۔ ان سب میں کم و بیش ایک جامد شکل نظر آتی ہے۔

زیادہ تر ایسے متون شہروں میں مدوّن کیے گئے ہیں جہاں آبادی عام طور پر دیہات کی نسبت کافی زیادہ مخلوط ہوتی ہے اور جہاں عوامی بولیوں کے حالات صاف طور پر ممیز نہیں ہو سکتے۔ وہ نصوص، جو دیہاتیوں کے منہ سے سن کر موقع پر لکھے گئے ہوں، بہت ہی نادر ہیں؛ لہذا یہ جاے تعجب نہیں کہ ایسے حالات میں ہم ابھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ بلادِ عثمانیہ کی عوامی بولیوں کا مطالعہ صحیح علمی بنیادوں پر قائم ہوا ہے۔

۶ - زبانوں کے نمونے جو مختلف علاقوں میں ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔

اب تک جو متون شائع ہوے ہیں یا تو خاصے بڑے علاقوں سے متعلق ہیں اور یا بہت محدود چھوٹے علاقوں سے۔ پہلی قسم میں متونِ ذیل شامل ہیں: (۱) I. Kúnos : *Mundarten der Osmanen*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۹ء (*Proben der Volkslitteratur der türkischen Stämme*، طبع راڈلوف کی یہ آٹھویں جلد ہے)۔ مختلف نمونوں کا صحیح منبع و مأخذ معیّن طور پر مذکور نہیں ہے، اس لیے عوامی بولیوں کے مطالعات کے لیے یہ تصنیف کسی کام کی نہیں (سطورِ بعد میں اس کا حوالہ .*Mund* کے لفظ سے دیا گیا ہے)؛ (۲) V. Gordlevskij : *Obrazcy osmanskago narodnago tvorčestva*، موسکو ۱۹۱۶ء؛ ادبِ شعبی کے یہ نصوص زیادہ تر قسطنطنیہ میں لکھے گئے، مگر بعض ایشیاے کوچک (خصوصاً نیگدہ Nigde) میں بھی لکھے گئے۔ مختصراً *Gord.*؛ (۳) T. Kowalski : *Zagadki ludowe tureckie*، کراکاو Cracow ۱۹۱۹ء؛ ایک سو اکتالیس پہیلیوں کا مجموعہ، صوتی رسمِ خط میں، ان کے مأخذ کا بھی ٹھیک ٹھیک پتہ دیا گیا ہے۔ مختصراً *Zag.*.

علٰحدہ علٰحدہ علاقوں کے لیے ہم مصنّفاتِ ذیل کا ذکر کر سکتے ہیں:

۱ - دریاے ڈینیوب کا جزیرۂ اداقلعہ Adakale: I. Kúnos : *Ada-Kalei török népdalok*، بوڈاپسٹ ۱۹۰۶ء - ایک سو عوامی گیت جو اداقلعہ میں جمع کیے گئے، ضبط بہ کتابت اور ترجمہ بہ زبانِ ہنگری کے ساتھ - مختصراً *Adak. Lied*؛ I. Kúnos : *Materialien zur Kenntnis des Rumelischen Türkisch*، حصّۂ اوّل: *Türkische Volksmärchen aus Adakale gesammelt, in Transkription herausgegeben und mit Einleitung vers.*، لائپزگ - نیویارک ۱۹۰۷ء؛ حصّۂ دوم: *Deutsche übersetzung mit Sachregister*، مقامِ مذکور ۱۹۰۷ء - مختصراً *Adak.*.

۲ - بسارابیا: W. Moškov : *Mundarten der Bessarabischen Gagausen*، نص، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۴ء (راڈلوف کی *Proben der türkischen Volkslitteratur* کی یہ دسویں جلد ہے) - مختصراً *Gagaus.*.

۳ - بلغاریا: S. Čilingirov : *Turski poslovici, pogovorki i charakterni izrazi*, (در *Bulletin du Musée National d'Ethnographie de Sofia*، ۲ : ۱۵۷ تا ۱۷۱؛ ۳ : ۵۹ تا ۶۵)، صوفیا ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء - اس سے بلغاری ترکوں کی عوامی بولیوں کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا؛ اس پر قبّ N. Dmitrijev : *Zemetki po bolgarskotureckim govoram*، (*Doklady Akademii Nauk B*, ، لین گراڈ ۱۹۲۷ء، ص ۲۱۰ تا ۲۱۵).

۴ - مقدونیا : T. Kowalski : Osmanisch-türkische Volkslieder aus Mazedonien, در W.Z.K.M.، ج ۳۳ (۱۹۲۶ء) : ص ۱۶۶ تا ۲۳۱ - مختصراً Maz. - مقدونیا سے لیے ہوے چند نمونے Zag. میں بھی موجود ہیں۔

۵ - تراقیہ (تھریس) اور قسطنطنیہ : (۱) I. Kúnos : Oszmán-török népköltesi gyüjtemény، دو جلد، بوڈاپسٹ ۱۸۸۷ و ۱۸۸۹ء - قسطنطنیہ کے ادب شعبی کا ایک بہت سیر حاصل مجموعہ - مختصراً O. T. ؛ (۲) L. Bonelli : Locuzioni proverbiali del Turco volgare، K. S. (کلتی سزملہ)، ج ۱ (۱۹۰۰ء) : ص ۳۰۸ تا ۳۲۲ - ایک سو چالیس کہاوتوں اور محاوروں کا حرفاً حرفاً نقل کیا ہوا مجموعہ، یہ مواد قسطنطنیہ میں جمع کیا گیا : (۳) I. Halász : Török dalok, Nyelvtudományi Közlemények، ج ۲۲ (۱۸۹۲ء) : ص ۵۲۶ تا ۵۲۸ (نو چھوٹے چھوٹے گیت قسطنطنیہ کی عوامی بولی میں)۔

۶ - مغربی ایشیاے کوچک (۱) I. Kúnos : Kisázsiai török nyelv, I. Brusza-Ajdin vidéki nyelvmutatványok (népdalok), Nyelvtudományi Közlemények، ج ۲۲ (۱۸۹۰ء) : ص ۱۱۳ تا ۱۵۶ - بروسہ اور آیدین کے اضلاع سے چالیس گیت، منقول بحروف مع ترجمہ بزبان ہنگری و حواشی - مختصراً Brus.-A., II. Brusza vidéki szólások، ص ۲۶۱ تا ۳۷۲، بروسہ سے ایک سو پینسٹھ کہاوتیں مع ہنگری زبان کے ترجمے اور حواشی کے - مختصراً Brus. ؛ (۲) I. Kúnos : Nasreddin Hodsa Tréfái، بوڈاپسٹ ۱۸۹۹ء، خوجہ نصرالدین کے ایک سو پینسٹھ لطائف، جو کہا جاتا ہے کہ آیدین کی عوامی بولی میں ہیں؛ یہ بولی بقول Kúnos آیدین سے قونیہ تک پھیلی ہوئی ہے - مختصراً Aid. ؛ (۳) K. Foy : Das Aidinisch-Türkische، کلتی سزملہ، ج ۱ (۱۹۰۰ء) : ص ۱۷۷ تا ۱۹۳ اور ۲۸۶ تا ۳۰۷؛ (۴) T. Kowalski : Piosenki ludowe anatolskie o rozbójniku Czakydżum, Rocznik Orjentalistyczny، ۱ : ۳۳۳ تا ۳۵۵، انتیس چاقیجی رباعیاں جو دومانلی (قضاء اوشاق) کے ایک شخص کے املاء سے لکھی گئیں - مختصراً Dum. ؛ (۵) T. Kowalski : Cinq récits de Gilnei (Vilayet Smyrne), Rocznik Orjentalistyczny، ۲ : ۲۰۳ تا ۲۱۲ - مختصراً Gil. ؛ (۶) V. A. Maksimov : Opyt izsljedovanija tjurkskich dialektov v Chudavendgjarje i Karamanii، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۷ء - زیادہ تر ماخذ جن سے W. Heffening نے اپنے مقالے Türkische Volkslieder، Isl. ۱۳ : ۲۳۶ تا ۲۶۷ میں کام لیا ہے، مغربی ایشیاے کوچک سے متعلق ہیں۔

۷ - ولایت قسطمونی : J. Thúry : A. Kasztamuni-i török nyelvjárás، بوڈاپسٹ (Academy) ۱۸۸۵ء، زبان قسطمونی کا ایک نحوی خاکہ مع غالب کی مطایبات تورکیہ کی ایک فرہنگ کے - مختصراً Kast. ؛ قب نیز Cl. Huart : Un commentaire du Qorân en dialecte turc de Qastamoûni (پندرھویں صدی)، J. A.، سلسلہ ۱۱، ج ۱۸ (۱۹۲۱ء) : ص ۱۶۱ تا ۲۱۶۔

۸ - شمال مشرق ایشیاے کوچک (۱) V. Pisarev : Njeskolko slov o trebizondskom dialektje، Zap. Vost. Otd. Imp. Russ. Arch. Obšč.، ج ۱۳ [۱۹۰۱ء] : ص ۱۷۳ تا ۲۰۱) - مختصراً Pis. ؛ (۲) L. Bonelli : Voci del dialetto turco di Trebisonda، K. S.، ج ۳ (۱۹۰۲ء) : ص ۵۵ تا ۷۲؛ (۳) I. Kúnos : Láz dalok, Nyelv. Közl.، ج ۲۲ (۱۸۹۱ء) : ص ۲۷۵ تا ۲۹۸، گیارہ لاز ۔ ترکی گیت اور ضلع سامسون ۔ طرابزون کے لاز ۔ ترکی الفاظ کی ایک فہرست - مختصراً Laz. ؛ (۴) M. Räsänen : Eine Sammlung von Māni-Liedern aus Anatolien, J. S. F. O.،

ج ۴ (۱۹۲۶ء) : ارزِ روم، ریزہ اور طرابزون کی ولایتوں سے ۲۰۹ رباعیات صحیح صوتی رسم خط میں۔ مختصراً .Rds [نظم اور بیت درج ہوئے ہیں]؛ (۵) بلحسن اوغلو Balhassanoglu : *Dialecte turc d'Erzerum*، K. S.، ج ۵ (۱۹۰۴ء).

۹ - ولایتِ قونیہ (۱) F. Giese : *Erzählungen und Lieder aus dem Vilajet Qonjah*، Halle a. S. — نیویارک ۱۹۰۷ء۔ مختصراً .G؛ (۲) F. Vincze : *Beiträge zur Kenntnis des anatolischen Türkisch*، K. S.، ج ۹ (۱۹۰۸ء) : ص ۱۳۱ تا ۱۹۷، اس کا موادّ خود شہر قونیہ کی بولی سے متعلق ہے ۔ مختصراً .Vin.

۱۰ - علاقۂ اینٹی ٹارس Antitaurus - ڈاکٹر حامد زُبیر افشار: تؤرك آغیتلرینه دائر، تؤرك یوردو، مئی ۱۹۲۸ء : ص ۲۱ تا ۲۴، اینٹی ٹارس کے افشاروں کے مراثی کے نمونے؛ یہ مراثی 'آغیت' کہلاتے ہیں ۔ مختصراً .Avs.

۱۱ - شام اور عراق کے سرحدی علاقے (۱) بلقان اوغلو Balkanoglu : *Dialecte turc de Kilis*، K. S.، ۳ : ۲۶۱-۲۷۳، اس عوامی بولی کا مختصر خاکہ جو کِلِس (کِلس) واقع شمالی شام میں بولی جاتی ہے؛ (۲) وہی مولّف : *Dialecte de Behesni*، K.S.، ج ۴، بِہسنی کی عوامی بولی سے متعلق جو مرعش اور دیارِ بکر کے درمیان واقع ہے؛ (۳) ہارٹمان : *Zur türkischen Dialektkunde*، در K.S.، ج ۱ (۱۹۰۰ء) : ص ۱۵۴ تا ۱۵۶، شمالی شام (کلِس، عینتاب) کی عثمانی بولیوں پر چند تعلیقات؛ (۴) E. Littmann : *Ein türkisches Märchen aus Nordsyrien*، در K. S.، ج ۲ (۱۹۰۱ء)؛ (۵) Felix v. Luschan : *Einige türkische Volkslieder aus Nordsyrien*، در *Zeitschrift für Ethnologie*، ج ۳۶ (۱۹۰۴ء) : ص ۱۷۷ تا ۲۳۶، زیادہ تر عینتاب کے ایک ارمنی کے املاء سے لکھی گئی۔

مراجع کے اس مختصر سے خاکے سے ظاہر ہے کہ یورپی ترکیہ اور اسی طرح ایشیائی ترکیہ کے بہت سے اہم علاقوں کی عوامی بولیوں کا مطالعہ ابھی نہیں ہوا۔

۷ - بولیوں کے لحاظ سے عثمانی بلادِ ترکیہ کی تقسیم۔

وہ سب نام جو اب تک عثمانی ترکی بولیوں کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں، مثلاً قسطمونی، لاز ترکی، قرہمانی، خرپوتی وغیرہ، یہ سب عوامی بولیوں کے ناموں کی حیثیت سے کسی مصرف کے نہیں ۔ وہ محض جغرافیائی یا سیاسی اداری تصوّرات کے مطابق ہیں ، جن کا تعلق پہلے ان ناموں کی بولیوں کے حدود سے ثابت کرنا پڑیگا ، بشرطیکہ ایسا کوئی تعلق موجود بھی ہو۔

عثمانی ترکی زبان کی عام تقسیم بھی، جسے اکثر مسلّمہ سمجھا جاتا ہے، یعنی روم ایلی اور اناطولی، عثمانی عوامی بولیوں کے علم کے نقطۂ نظر سے کسی کام کی نہیں اور یورپی ترکیہ کی تاریخِ آبادکاری کے پیشِ نظر اسے گمراہ کن سمجھ کر ترک کر دینا چاہیے ۔ یہ ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ روم ایلی کے بعض اضلاع میں ترک ایشیاے کوچک سے آ کر آباد ہوے اور اس کے نتیجے میں ان کی بولیوں میں اب تک ان کی اناطولی اصل کے بیّن آثار نظر آتے ہیں۔

اوپر جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہم ابھی مستقبلِ قریب میں عثمانی ترکی عوامی بولیوں کی کسی منظّم تقسیم کی کوشش کی توقع نہیں کر سکتے ۔ اب تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ محض وجدان یا تخیّل پر مبنی ہے، نہ کہ امورِ محقّق پر ۔ کونوس Kúnos نے جو ایشیاے کوچک کو عوامی بولیوں کے اعتبار سے تقسیم کرنے کی کوشش کی

ہے اس پر بھی یہی بات صادق آتی ہے .

کونوس مندرجۂ ذیل سات بولیوں کو ممیّز کرتا ہے (*Kisázsia török dialectusairól*، بوڈاپسٹ ۱۸۹۶ء) : ۱ - زیبک (Zeibek) بولی، مغربی اناطولیا میں سمرنا اور بروسہ کے مابین؛ ۲ - قسطمونی بولی، بحیرۂ اسود کے ساحل کے وسطی علاقے میں؛ ۳ - 'لاز' بولی، بحیرۂ اسود کے مشرق ساحل پر قفقاز کی سمت میں؛ ۴ - خرپوتی بولی، ایشیاے کوچک کے مشرق میں ارمینیہ کے پہاڑوں کی سمت میں؛ ۵ - قرہمانی بولی، ایشیاے کوچک میں مرسین اور قونیہ کے درمیان؛ ۶ - انقروی بولی، ایشیاے کوچک کے قلب میں قیزل ایرماق کی وادی میں؛ ۷ - یوروکی ترکمانی Jürüküsh Turkoman بولی، جو خانہ بدوش قبائل ('عشیرتلر') میں رائج ہے - یہ قبائل ایشیاے کوچک کے ایک وسیع خطّے میں منتشر ہیں .

زیبک، انقروی اور یوروکی ترکمانی بولیوں کو کونوس قدیم ترکی مہاجرین کی غیرمخلوط بولیاں تصور کرتا ہے - بالخصوص یوروکوں کو وہ سلجوقی زمانے سے پہلے کے ترکمانوں کی اور زیبکوں کو سلجوق ترکوں کی اولاد سمجھتا ہے - انقروی بولی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم ترین عثمانی مہاجرین کی زبان کا بقیہ ہے - باقی چار بولیوں کو کونوس ایشیاے کوچک کی مسترك اصلی آبادی کی بولیاں تصور کرتا ہے، جو ترکی پر ان لوگوں کی اصلی بولیوں کے اثر انداز ہونے سے بن گئیں - اس کے خیال میں قسطمونی بولی پر خاص طور سے یونانی کا اثر ہوا، خرپوتی پر کردی کا، قرہمانی پر ارمنی کا، لیکن لاز پر ایک 'ہندی-جرمانی' (!) ("Indo-Germanic" (!)) زبان کا، جس کی مزید تشریح اس نے نہیں کی .

ایشیاے کوچک کی زبانوں کو تقسیم کرنے کی اس کوشش کی کوئی علمی (scientific) بنیاد نہیں ہے؛ اگرچہ بادی النظر میں یہ بہت معقول‌نما اور قابلِ قبول سی معلوم ہوتی ہے .

عثمانی زبانِ تخاطب کی نمایاں خصوصیتوں کو یک جا کرنے کی پہلی سنجیدہ کوشش یعقوب Jacob نے کی - اس نے *Z. D. M. G.*، ج ۵۲ (۱۸۹۸ء) : ص ۶۹۵ تا ۷۲۹ میں ایک مقالہ بعنوان *Zur Grammatik des Vulgär-Türkischen* لکھا اور اس میں یہ خصوصیتیں جمع کیں - J. Deny اپنی کتاب *Grammaire de la langue turque* (*dialecte osmanli*)، پیرس ۱۹۲۰ء، میں عوامی بولی کی بعض خصوصیتوں کی جانب ہماری توجہ منعطف کرتا ہے .

۸ - عوامی بولیاں اور تحریری زبان.

تحریری زبان بول چال کی عوامی بولیوں پر ہمیشہ ایک ہموارکن اثر ڈالتی رہی ہے - تحریری زبان قسطنطنیہ کے تعلیم یافتہ طبقوں کی زبان پر مبنی ہے، جسے اب تک ایک مثالی نمونہ سمجھا جاتا رہا ہے اور جس کی اشاعت عام طور پر مدارس کے ذریعے ہوتی ہے .

ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ہمیں اس زبان کا ایک مبہم ہی سا تصوّر تھا - بالکل ہی حال میں Bergsträsser نے تعلیم یافتہ طبقوں کی زندہ تحریری زبان کی (کم از کم صوتیات کے نقطۂ نظر سے) زیادہ صحیح تحدید و تعیین کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش شروع کی (G. Bergsträsser : *Zur Phonetik des Türkischen nach gebildeter Konstantinopler Aussprache*، *Z. D. M. G.*، ج ۷۲ [۱۹۱۸ء] : ۲۳۳ تا ۲۶۲) - یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ زبان اپنی صوتیات میں قطعاً یکساں نہیں ہے، اس لیے اس تصور کو کہ قسطنطنیہ کے تعلیم یافتہ طبقے

کے خاص تلفظ کا کوئی وجود ہے، بہت احتیاط سے اور ہر قسم کی قیود و شرائط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔

عثمانی تحریری زبان کی ابتداء کے بارے میں (قب صفحات بالا بذیل II) ہمیں بدقسمتی سے اب تک بہت ہی کم علم ہے ۔ ہم محض یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس زبان نے شمالی اناطولیا کے درباری حلقوں کی بولی سے رفتہ رفتہ نشو و نما پایا ۔ جب دارالسّلطنت پہلے اَدِرْنہ (Adrianople) اور پھر قسطنطنیہ میں منتقل ہو گیا تو اس بولی کی روشِ ارتقاء پر غالباً اُن بولیوں کا اثر پڑا جو وہاں مروج تھیں؛ دوسری طرف خود اس بولی نے اُن بولیوں کو بہت حد تک متأثّر کیا ۔ بہر صورت تحریری زبان تراقیہ (تھریس) اور ایشیاے کوچک کے ان حصوں کی بولیوں کے قریب تر ہے جو باسفورس اور بحیرۂ مرمرہ سے ملحق ہیں اور جو علاقے مشرق و مغرب میں دور تر ہیں ان سے نسبۃً دور تر ہے ۔

قدیم ترین ادبی آثار میں بارہا بولیوں کی ایسی خصوصیات نظر آ جایا کرتی ہیں جو ہمیں ابھی تک مختلف زندہ عوامی بولیوں میں مل سکتی ہیں ، لیکن بد قسمتی سے ابھی مشکل ہی سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی منظّم تحقیق و تدقیق شروع ہو گئی ہے ۔

ادبی زبان کی تاریخ کے لیے اور قدیم تر اور جدید عوامی بولیوں سے اس کے تعلق کے سلسلے میں قدیم عثمانی نصوص کا مطالعہ، جن کے نسخے موجود ہیں، بہت زیادہ اہمّ ثابت ہوگا [قب K. Foy : *Die ältesten osmanischen Transcriptionstexte in gothischen Lettern*، حصّۂ دوم : در *M.S.O.S.*، ج ۴ (۱۹۰۱ء) : ص ۲۳۰ تا ۲۷۷؛ ج ۵ (۱۹۰۲ء) : ص ۲۳۳ تا ۲۹۳ اور Dmitriyev، در *Zapiski Kollegii Vostokovedov*، ج ۳ (۱۹۲۸ء) : ص ۳۲۰].

۹ - عثمانی عوامی بولیوں کی عام خصوصیات.

مختلف عثمانی ترکی کی بولیوں کے باھمی اختلافات عام طور پر زیادہ اھم نہیں۔ اس امر کا تعلق اس حقیقت سے ہے کہ عام طور پر خود ترکی زبانوں کے مابین زیادہ اختلافات نہیں ہیں ۔ اس علاقے میں، جہاں آج کل عثمانی ترکی بولی جاتی ہے، بہ مشکل ہی کوئی ایسے دو مقام ملیں گے جہاں کے باشندے ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکیں۔

مختلف عوامی بولیوں کے اختلافات بیشتر یہ ہیں کہ بعض آوازوں کے تلفّظ میں خفیف سا فرق ہوتا ہے، اس کے علاوہ بعض آوازوں میں مبادلہ اور مفردات میں قابلِ اعتناء اختلافات ہوتے ہیں ۔ صرفی صیغوں کے (Morphological) اختلافات بحثیت مجموعی بہت خفیف ہیں ۔

بہت سے محقّقین پہلے ہی یہ بتا چکے ہیں کہ الگ الگ عوامی بولیوں کے اندر بہت کم یکسانیت ہے ۔ اس چیز کا ہر جگہ مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ معیّن آوازوں کے تلفّظ میں اور نحوی صیغوں میں، جو ایک ہی شخص استعمال کرتا ہے، خاصا فرق ہوتا ہے ؛ اس لیے عوامی بولیوں کے متعلق ہماری دستاویزیں تناقضات سے پر ہیں، جو اگرچہ بعض حالتوں میں انہیں قلمبند کرنے والوں کی غفلت اور بے پروائی کا نتیجہ ہیں، تاہم زیادہ تر احوالِ واقعی کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں ۔ اس تناقض کو عوامی بولیوں کے اختلاطِ عظیم کی طرف منسوب کرنا چاہیے، جو تقریباً ان سب میں پایا جاتا ہے ۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ترک قوم کے بہت سے عناصر، جو اب حضری ہو گئے ہیں، ابھی بالکل حال کے زمانے تک بدوی تھے اور ایک بہت وسیع

علاقے میں نقل و حرکت کرتے رہتے تھے ۔ تمام ترکی علاقوں کے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد عرصے سے قدیم لسانی نقشے کو ادلتی بدلتی رہی ہے ، خصوصیت کے ساتھ یہ ادل بدل ایشیاے کوچک میں ہوتا رہا ہے ۔ زمانۂ حال ہی میں اناطولیا کو بلقان سے وارد ہونے والے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کو قبول کرنا پڑا ہے ۔ جمہوری حکومت نے جو اقدامات کیے ہیں ان کا مقصد ملک میں زبان کے اعتبار سے بھی، جہاں تک ممکن ہو، یکسانیت پیدا کرنا ہے اور اس مقصد کو زیادہ تر مدرسوں اور فوجی ملازمت کے ذریعے پورا کیا جا رہا ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے مقامی بولیاں شکستہ اور تباہ ہوتی جا رہی ہیں.

تاریخی تطوّر کے بارے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اگر ہم اسے دھیان میں رکھیں تو عوامی بولیوں کا موجودہ خلط ملط طبعی اور قدرتی تصوّر کیا جا سکتا ہے .

مختلف آوازوں کے متفاوت تلفّظ کو تلفّظ کے عدمِ ضبط کی طرف بھی ایک حد تک منسوب کر سکتے ہیں ۔ یہ عدمِ ضبط ترکوں کے ساتھ خاص ہے ۔ مخرجِ صوتی اور آلاتِ نطق کے اندازے سے کھولنے اور پھیلانے میں اکثر معتدّبہ تفاوت نظر آتا ہے ۔ میں صرف حرفِ ر کے تلفّظ کی مثال دیتا ہوں کہ اسے کاہلی سے اور اختلافِ تلفّظ کے ساتھ نوکِ زبان سے ادا کیا جاتا ہے (قبّ Bergsträsser، کتابِ مذکور، ص ۲۰۱).

تلفّظ کے حقیقی تفاوت کی مثالوں سے ہمیں اُن اختلافات کو بہت احتیاط سے جدا رکھنا چاہیے جو محض محرّرین کی ناقص طرزِ تحریر سے پیدا ہو گئے ہیں؛ مثلاً ہمیں بعض اوقات ایک ایسی آواز کی، جو بجاے خود یکساں ہے، مختلف کتابت نظر آتی ہے ، جیسے ı مقبوضہ (ı) جیسے بعض دفعہ e یا i، ı لکھتے ہیں اور یا خفیف طور پر شفوی u جیسے کبھی — وu یا ی y لکھ دیتے ہیں وغیرہ .

۱۰ ۔ پایانِ سخن.

چونکہ دقیق علمی (scientific) معنی میں بولیوں کی وحدتوں کا ذکر کرنا ناممکن ہے، اس لیے ہمیں بالفعل ان لسانی دستاویزوں کی، جو زیادہ تر صوتی طرز کی ہیں ، باقاعدہ ترتیب و تنظیم ہی پر قناعت کرنا چاہیے ۔ یہ وہ دستاویزیں ہیں جن میں تحریری زبان سے کوئی فرق نظر آتا ہے اور جو مختلف ترکیبوں (combinations) میں مختلف عوامی بولیوں کی خصوصیات ظاہر کرتی ہیں ۔ مختلف (لسانی) مظاہر کے رقبۂ انتشار کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں ۔ عثمانی زبان بولنے والے علاقے کے نقشے میں صحیح تفصیلات کے اندراج کا کام مستقبل کی منظم تحقیق و تفتیش ہی کے سپرد کرنا پڑے گا.

چونکہ ہمیں عثمانی ترکی کی تاریخی گرامر کے بارے میں ابھی بہت کم علم ہے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو حقائق ہمارے مواد کے ذخائر مہیا کرتے ہیں انھیں، وقت اور زمانے کے مسائل چھیڑے بغیر، یک جا اور مرتّب کر لیا جائے.

[اس کے بعد مقالہ نگار نے عثمانی ترکی بولیوں کے دقائق سے بحث کی ہے جو ترکی نہ جاننے والوں کے لیے غیر مفید ہے اور ترکی حرکات و اصوات کو اردو میں صحت کے ساتھ ادا کرنا بھی سخت دشوار ہے، اس لیے اس حصے کا ترجمہ نہیں کیا گیا ۔ ادارہ].

(T. Kowalski کوالسکی)

III - عثمانی ترکی ادب.

وہ ادب جسے اب عموماً عثمانی ادب کے نام سے

تعبیر کیا جاتا ہے در اصل اوغوز ترکوں کا ادب ہے جو سلجوق عہد میں ایشیاے کوچک میں آباد ہوے اور بعد ازآں عثمانی سلاطین کے زمانے میں روم ایلی میں آ بسے ، جہاں انھوں نے ایک زبردست سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادب، جو سلجوقیوں کے وقت سے لے کر آج تک مسلسل ارتقاء کی منزلیں طے کرتا رہا ہے، اور بھی زیادہ قدیم لہجوں (مقامی بولیوں) کے ادب پر مبنی ہے اور اپنی نشو و نما کے سب ادوار میں ان لہجوں سے اس کا تعلق باقی رہا ہے۔ سولھویں صدی سے بالخصوص یہ ادب سب ترکی ادبوں میں زیادہ اہم اور ان کی سب سے زیادہ پُر برگ و بار شاخ بن گیا ہے اور دوسری ترکی بولیوں کے ادب پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ یہاں ہم اس ادب کے عمومی ارتقاء کا محض ایک خاکہ پیش کریں گے اور اس کے بڑے بڑے اصناف اور ان کے متعلق اہمّ شخصیتوں کا ذکر کریں گے۔ ہم نہ صرف کلاسیکی ادب (ادب رفیع) سے ھی بحث کریں گے، جو اعلٰی طبقات تک محدود تھا، بلکہ عوام کے ادب، 'شاعر گویوں' ('سازشاعرلری')اور مختلف صوفی فرقوں کے ادبوں کا بھی — ان کی عام خصوصیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوے — ذکر کریں گے۔ ہمیں ان نکات پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے جن کا اب تک قابلِ اطمینان طریقے سے مطالعہ نہیں کیا گیا یا جن کے بارے میں ابھی تک دنیاے علم کو بخوبی واقفیت نہیں ہے۔ جہاں تک اس ادب کے زیادہ معروف پہلوؤں کا تعلق ہے ان کے بارے میں ہم زیادہ تفصیل میں نہیں گئے بلکہ صرف اجمالی اور غیر تحلیلی بیان پر اکتفاء کیا ہے، مثلاً تیرھویں اور چودھویں صدی کے ادب کو لیجیے، جو اس ادب کا سب سے کم معروف دور ہے، اس کا ذکر بہ نسبت دیگر صدیوں کے ہم نے زیادہ تفصیل سے کیا ہے۔ غیر معروف نکات کو زیادہ تفصیل سے واضح کرنے کے لیے اس طریق کا اختیار کرنا ضروری تھا۔ اس مختصر اور مجمل تبصرے میں اس چیز کو غیر متناسب تصور نہیں کرنا چاہیے۔

ہم عثمانی ادب کو تین بڑے ادوار میں تقسیم کرتے ھیں جو تاریخ ترکیہ کے عام تطوّر سے مطابقت رکھتے ھیں :

(ا) اسلامی ادب، تیرھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے وسط ، یعنی ''تنظیمات'' [رَكَ بآن] کے زمانے تک.

(ب) '' یورپی '' ادب ، '' تنظیمات '' کے زمانے سے لیکر قوم پرست تحریک کے زور پکڑنے تک .

(ج) قومی ادب ، جو قوم پرست تحریک سے ظہور میں آیا.

ان تینوں ادوار کا جائزہ ہم ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے لیں گے، تا کہ بے قاعدہ تفریق و تمییز سے بچ سکیں .

ا ۔ اسلامی ترکی ادب.

تیرھویں صدی.

گیارھویں صدی میں سلجوق قبضے کے بعد اناطولیا رفتہ رفتہ ترکیت اختیار کرتا گیا اور یہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا ۔ اس کے باوجود تیرھویں صدی میں ایشیاے کوچک کے شہروں اور دیہات میں یہودی اور ارمنی کافی تعداد میں موجود تھے اور آبادی کا معتدّبہ حصہ ان سے تشکیل ہوتا تھا(Pauthier: *Le Livre de Marco Polo* ، پیرس ۱۸۶۵ء، ص ۳۳ تا ۳۹) ۔ جو ترک ایشیاے کوچک میں آ کر آباد ہوے ان میں سے بعض ترکی اقوام کی کسی ایک خاص شاخ سے تھے تو بعض کسی دوسری سے ، لیکن چونکہ اکثریت اوغوز کی تھی اس لیے اس ادبی

زبان کی بنیاد جو ایشیاے کوچک میں بنی اوغوز بولی هی پر قائم هوئی۔ یه اوغوز بولی، جو دیگر ترکی بولیوں سے دسویں صدی سے کافی پہلے علٰحدہ هو چکی تھی، اس وقت بھی ایک پرمایه عوامی ادب کی مالک تھی؛ چنانچه غزنوی عہد میں اوغوز نظموں کی موجودگی کا همیں علم ہے (کوپرولو زاده محمد فؤاد : غزنوی دورنده تورك شعری، ادبیات فاکولته سی مجموعه سی، ج ۷، شماره ۲ : ص ۸۱ تا ۸۳).

وہ اوغوز جو ایشیاے کوچک میں آباد هوے اپنے ساتھ یه سب ادبی روایات لےکر آئے تھے، لیکن اس کے علاوہ دوسری ترکی بولیوں کے ادبی آثار بھی مختلف وجوہ کی بنا پر اس ملک میں آ گئے (اس کے بارے میں قب کوپرولو زاده محمد فؤاد : تورك ادبیاتنده ایلک متصوفلر، قسطنطنیه ۱۹۱۹ء).

ان سب اثرات کا نتیجه یه هوا که عوامی ادب کے پہلو به پہلو ایشیاے کوچک میں ترکی تحریری ادب بھی بتدریج پروان چڑھتا گیا۔ یه همیں تحقیقی طور پر معلوم نہیں که آیا اس ادب کا آغاز تیرھویں صدی سے پہلے هو چکا تھا یا نہیں، یه همیں البته معلوم ہے که ایشیاے کوچک کے سلجوقیوں کے زمانے سے بارھویں صدی میں اسلامی ثقافت نے بڑے شہروں میں گھر کر لیا تھا۔ پھر جب سلجوقیوں نے دانشمندیوں کا قلع قمع کر دیا اور صلیبی مجاهدین کو بھی ٹھکانے لگا دیا، تو علم اور ادب نے ایشیاے کوچک میں معتدّ به ترقی کی۔ اس علمی و ادبی تحریک کے بعض آثار عربی میں لکھے گئے، لیکن زیاده تر فارسی میں قلمبند هوے؛ اس لیے همارے لیے اس میں شبه کی گنجایش نہیں رهتی که ادبی زبان کا مرتبه حاصل کرنے کے لیے اناطولی ترکی کو عربی اور فارسی سے عرصے تک مقابله کرنا پڑا هوگا۔ عربی کا غلبه تو صاف ظاهر ہے، یه زبانِ دین اور زبانِ مدارس (یعنی ذریعۂ تعلیم) تھی، عبّاسی خلفاء، ایوبیوں اور مملوکوں سے خط وکتابت کے لیے سرکاری زبان عربی هی تھی، اس صدی اور بعد کی صدیوں میں کتبوں اور وقف ناموں میں بھی یہی زبان مستعمل تھی۔ فارسی کا اثر اس سے بھی زیاده تھا۔ همیں یه معلوم ہے که سلاطین کے حاشیه نشینوں اور مختلف شہزادوں اور علماء کے حلقوں میں فارسی کا رواج تھا اور فارسی منظومات همیشه وهاں زیرِ مطالعه رهتے تھے۔ اسی طرح عہدِ مغول کے بعض وقف ناموں میں مغولی کے جملے ملتے هیں، اگرچه شاذ و نادر، ان کا رسم خط البته اویغوری ہے، اس کے باوجود دفتری معاملات اور سرکاری دستاویزوں میں زیاده تر عربی زبان هی رائج تھی۔

ترکی زبان کا استعمال غالباً صرف اس وقت هوتا تھا جب عوام سے معامله پڑتا تھا۔ ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۷ء میں جب قرمان اوغلو محمد بک نے قونیه پر قبضه کر لیا تو اس نے حکم دیا که دیوانی کاروبار میں صرف ترکی استعمال کی جائے؛ ایک روایت یه ہے که اس نے متعدد پرانے کاتبوں کو مروا دیا (قب سیّد لقمان : اجمالِ احوالِ آلِ سلجوق؛ *Seid Locmani ex libro turcico qui Oghuz-name inseribitur excerpta*: J.J.W. Lagus، هلسنگفورز Helsingfors ۱۸۵۴ء، ص ۱۳)۔ بقول ابنِ بی‌بی ترکی کے سوا کسی اور زبان کا استعمال، نه صرف دیوان کے کاروبار میں بلکه نجی زندگی میں بھی، ممنوع قرار دے دیا گیا تھا (سلجوق نامه، مخطوطۂ ایا صوفیا، شماره ۲۸۹۵)؛ مگر ترکی کو اس مختصر عہد حکومت میں جو اهمّیت دی گئی اس سے یقیناً یه ثابت نہیں هوتا که ترکی کو جبھی سے

دوسری زبانوں پر برتری حاصل ہو گئی تھی - اگر ہم یہ امور پیشِ نظر رکھیں کہ ایشیاے کوچک کے شرعی محکموں میں ترکی عام طور پر صرف سولھویں صدی سے استعمال ہونا شروع ہوئی اور یہ کہ بغداد میں سترھویں صدی میں بھی دیوانی کے دفاتر (رجسٹروں) میں فارسی مستعمل تھی تو ہم صورتِ حال کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے - بہر حال یہ یقینی ہے کہ ترکی نے سلطنت کے کاروبار میں تیرھویں صدی کے خاتمے سے اہمیّت حاصل کرنا شروع کر دی (قبّ تاریخ عثمانی انجمنی مجموعہ سی، شمارہ ۱۷ تا ۹۴، ۱۹۲۶ء) - اس صدی میں سلجوقی دیوان میں خطِّ ''سیاقة'' رائج تھا اور ایک اَور طریقۂ کتابت بھی موجود تھا جو دواوین ھی سے مخصوص تھا - دوسری طرف جو مسوّدات ترکی میں لکھے جاتے تھے ان میں عربی طرز کے مطابق حروفِ علّت کو کبھی حرفوں سے ظاھر نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ محض علاماتِ حرکات کو استعمال کیا جاتا تھا - اس سے شاید یہ ظاھر ہوتا ہے کہ اناطولیا کے ترکوں میں قدیم اویغوری رسم الخط کی روایت بالکل فراموش ہو چکی تھی.

یہ اِنھیں سب اسباب کا نتیجہ تھا کہ ہم ترکی ادبی تصانیف کو تیرھویں صدی کے دوران میں ظہور پذیر ہوتے دیکھتے ھیں - ان کی بہت ھی قلیل تعداد ہم تک پہنچی ہے - وہ تصانیف جو اب ھمارے پاس موجود نہیں، لیکن تاریخی حوالوں کے ذریعے ان کے وجود کا ھمیں علم ہے، یہ ھیں : قصّۂ شیخ صنعان، منظوم، جو ایک گمنام مصنّف نے لکھا؛ صلصال نامہ، نظم و نثر، جو ایک شاعر شیّاد عیسٰی نامی نے لکھا، جس میں صلصال دیو سے حضرت علی کے معرکوں کا حال بیان کیا گیا ہے؛ دانشمند نامہ، مؤلفۂ ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء از ابن علاء، کاتبِ سلجوق سلطان، جو شہزادۂ ملک عزّالدین کیکاؤس بن غیاث‌الدین کے حکم سے لکھا گیا - سیّد بطّال کی کہانیاں، جن کی نسبت معلوم ہے کہ وہ مصر میں بارھویں صدی میں بھی موجود تھیں، غالباً تیرھویں صدی میں ترکی میں ترجمہ ہوئی ہونگی - بطال نامہ اور دانشمند نامہ کے واقعات ملک دانشمند احمد غازی کی شخصیت کے گرد گھومتے ھیں، ملک وہ شیر مرد (ھیرو) تھا جس نے پہلے سلجوقی احتلال کے زمانے میں ایشیاے کوچک میں آ کر دانشمندیہ خاندان کی بنا ڈالی. یہ قصے ایشیاے کوچک میں مسلمانوں اور بوزنطیوں کی باھمی جنگ و جدال کا ثمرہ ھیں.

تیرھویں صدی میں اناطولیا کی سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال سے اور خصوصاً اس مادی اور اخلاقی بحران سے جو مغلوں کے ابتدائی حملوں سے پیدا ہوا، ان اطراف میں تصوّف کی اشاعت کو تقویت پہنچی - وہ یسوی اور حیدری درویش جو مشرق سے آئے تھے اپنے ھمراہ ایشیاے کوچک میں احمد یسوی اور ان کے مریدوں کی صوفیانہ نظمیں لے کر آئے، جو ترکی زبان میں تھیں - عربی اور ایرانی تصوف کے زیرِ اثر ترکی صوفیوں کو بھی عوام کی زبان، یعنی ترکی کی جانب رجوع کرنا پڑا، تا کہ اپنے گرد و پیش جتنے بھی زیادہ پیرو ممکن ہوں جمع کر سکیں - [اِفہام و تفہیم ھی کی غرض سے] مولانا جلال الدین رومی نے بھی چند ترکی اشعار لکھے، اگرچہ بہت کم، اور سلطان ولد نے بھی چند نظمیں ترکی میں کہیں - قریب کے زمانے تک سلجوقی ادب کے جو آثار معلوم تھے وہ یہی اشعار اور نظمیں تھیں - ہم احمد فقیہ قونوی کا ذکر بھی کر سکتے ھیں، جو اس صدی کے شروع میں گذرے ھیں اور جنھوں نے ایک خاصی طویل صوفیانہ مثنوی لکھی، جو اب تک ھمارے پاس

موجود ہے (قب کوپرولو زادہ محمد فؤاد : *Anatolische Dichter in der Seldschukenzeit, Körösi Csoma Archiv*، ج ۲) - اسی طرح ان سے کچھ ہی بعد کے شاعر شیّاد حمزہ [رَکَ بان] کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے، جنھیں ہم احمد فقیہ کا شاگرد کہہ سکتے ھیں - ان شاعروں نے اپنی نظمیں عروضی بحور میں تالیف کیں اور ایرانی صوفیوں کی تقلید کی، لیکن ایشیاے کوچک میں تحریکِ تصوّف محض ایسی تصانیف تک محدود نہ تھی جن میں کوئی بھی جدّت نہ ہو، بلکہ اس تحریک نے ایک نئی قسم کی شاعری بھی پیدا کر دی، جو خالصۃً ترکی اور ابتکاری تھی، یعنی لوگوں کی زبان میں، مقاطع ھجائی والی (syllabic) بحر(۱) اور ایسے قوالب میں تھی جو عوامی ادب کے لیے مناسب و موزون تھے - یسوی اور ان کے شاگردوں کا اس آخرالذکر قسم کی شعرگوئی کی ایجاد و تشکیل میں بہت بڑا ھاتھ تھا.

اس نوع شاعری کا بزرگ ترین نمایندہ یونس امرہ تھا، وہ چودھویں صدی کے آغاز میں بقید حیات تھا - اُس کا فن، درحقیقت اپنے جوھر کے اعتبار سے، عوام کا فن ہے، یعنی اپنی کیفیت میں ترکی ہے - اس میں ایک نو افلاطونی مُسلم عنصر کی جھلک نظر آتی ہے، جو مثال کے طور پر مولانا جلال الدین رومی کے متصوّفانہ فلسفے سے قطعاً مختلف نہیں اور اس میں ایک عوامی عنصر بھی نظر آتا ہے، جس سے اس کی زبان، اسلوب، قالب اور سجع کے سے وزن کی تعیین ہوتی ہے - یونس کے اشعار ھی کی بدولت عوام کی زبان میں اور مقبولِ عام مقاطع ھجائی والی (syllabic) بحر میں نظمیں کہنے کی روایت قائم ھو گئی، جس کی قوّت ان ادوار میں بھی بر قرار رھی جن میں ایرانی اثر اپنے عروج پر تھا - ان مختلف صحیح العقیدہ اور عام عقیدے کے مخالف فرقوں کے صوفیوں نے، جو ایشیاے کوچک میں اس کے بعد کی صدیوں میں پیدا ہوے، عوامی شاعری یونس ھی کی طرز میں کی، تا نہ عامۃالناس پر اثر ڈال سکیں، عقائد ھمگانی کے مخالف طبقے کے شعراء میں خاص طور پر بیکتاشی، حُرُوفی اور قزلباش کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے یونس کی تقلید بہت کامیابی سے کی.

تیرھویں صدی میں اناطولیا میں ایرانی ادب کے اثر کے ماتحت غیر مذھبی شاعری کا آغاز بھی نظر آتا ہے - اس نوع کی شاعری کو اس تعیُّش کی زندگی اور انتہائی خلیع العذار آزادی سے تقویت پہنچی جو اونچے طبقوں میں عام طور پر پائی جاتی تھی - عہد مغول میں یہ تحریک اور بھی قوت پکڑ گئی - اس نے سلجوقیوں کے محلّوں میں ایک اس قسم کا شعر معجون پیدا کر دیا جو طبعاً زاھدانہ اور واعظانہ رجحانات سے کلیۃً دور تھا اور ایرانی ادب نے اس میں روح پھونکی تھی - اس دبستان کا، جس کے مقاصد محض فنّی تھے، پہلا نمایندہ شاعر خواجہ دہّانی ہے - ادب کی اس غیرمذھبی شاخ کے نمایندے مشرق ترکوں میں تو بارھویں صدی میں بھی موجود تھے اور اناطولیا میں غالباً یونس سے پہلے بھی پائے جاتے تھے، اس لیے کہ اس کی نظمیں اعلٰی درجے کی مکمّل اسلوب میں لکھی گئیں

(۱) - یعنی ایسی بحروں میں جن کی بنیاد محض مقاطع ھجائی یا اجزاے کلمہ (syllables) کی ایک معیّنہ تعداد پر ہو، مثلاً ھر مصرعے میں آٹھ یا دس مقاطع ہوں، جس طرح انگریزی وغیرہ میں ہے - مثال کے طور پر یہ چار ترکی مصرعے اسی طرح کی بحر میں ھیں :

قرنفل سن قرارک یوق   غنچۂ گل سن تیمارک یوق
بن سنی چوقدن سورم   سکا بندن خبرکہ یوق

اور فنّی (اصطلاحی) نقطۂ نظر سے کمال کے ایک بلند مقام تک پہنچ گئی تھیں۔ اس لیے عثمانی ادب کی تاریخ لکھنے والے ترکی اور یورپی مصنّفین غلطی کرتے ہیں کہ وہ غیر مذہبی ترکی شاعری کے نشو کا قدیم ترین زمانہ بایزید یلدرم کے عہد کو قرار دیتے ہیں ۔ دہّانی نے اپنے ولیّ نعمت علاءالدین ثالث کے عہد میں، اس کی فرمایش پر، فارسی میں سلجوقیوں کا ایک شاہنامہ بھی نظم کیا تھا؛ وہ خراسان کا ترکمان تھا ۔ لہجے کے اعتبار سے اس کی زبان میں اناطولیا کی اوغوز بولی کی تمام خصوصیات موجود ہیں ۔ دہّانی کی تصانیف اور مثلاً اس کے ہم عصر سلطان ولِد کی ترکی تصانیف کے مقابلے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ وہ اوزانِ عروضی کس قدر کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتا تھا ، لیکن اس کی تصانیف میں ہمیں کہیں کسی صوفیانہ اثر کا سراغ نہیں ملتا (قبّ دہّانی پر میرے مقالات "حیات" شمارہ ۱ اور ۳ . ۱ میں).

یہ قدرتی بات تھی کہ اس عہد میں اناطولیا کے جمہور اور خانہ بدوش قبائل میں — جیسا کہ اس سے پہلے کی صدیوں میں بھی تھا — ایک عوامی ادب موجود ہو اور عام لوگوں کے اپنے شاعر ہوں، جنھیں قدیم اوغوز، اوزان (*ozan*) کہتے تھے ۔ یہ عوامی شاعر ہاتھ میں چوِ گوْر (*Cögür*، بھدا سا عود) لیے عوام کی محفلوں میں، خانہ بدوشوں میں اور دیہات کے درمیان پڑے پھرتے تھے ۔ وہ سلجوقیوں کی فوجوں میں بھی نظر آتے تھے۔ وہ اوغوزی رزمیہ قصّوں (ملاحم) کے مختلف حصّے پڑھتے اور گاتے تھے، مثلاً حکایات دِدہ قورقود ۔ عوامی ادب کے ان آثار کو عادةً وزنِ شعبی میں اور ایسے روایتی قالبوں میں ڈھالا جاتا تھا جو بہت قدیم زمانے سے چلے آتے تھے ۔ بعض اوقات ان قالبوں کے ناموں سے ان کا نسلی مبدأ ظاہر ہوتا ہے، مثلاً ' توْرکوْ' [ارکَ بان]، 'ترُکمانی'، 'وارساغی'؛ بعض دیگر قوالب، مثلاً قوشْمَہ، دِیِش، قَیَاباشی کے ناموں سے ان کی عوامی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے، یا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ ہمیشہ ساز پر کوئی نہ کوئی نغمہ بجایا جاتا تھا ۔ یہ عوامی شاعر معمولاً قدیم ترکی ساز 'قوبوز' استعمال کرتے تھے.

چودھویں صدی .

ہم دیکھتے ہیں کہ جو ادبی تطوّر تیرھویں صدی میں شروع ہوا وہ چودھویں صدی میں بھی انھیں طریقوں پر جاری رہا ۔ ایشیاے کوچک کی سیاسی تقسیم کے باوجود مُسلم اور ترکی تہذیب و تمدن ترقّی کرتا رہا اور ارمنیوں اور یونانیوں کا تمدن تنزل پاتا رہا ۔ عثمانی ریاست، جو اناطولیا کے مغربی سرے میں قائم ہوئی تھی، بحیرۂ مَرمَرہ کے ساحل تک پہنچ گئی؛ اس صدی کے خاتمے کے قریب اس نے اناطولیا کے ایک بڑے حصے کو پورے طور پر اپنے زیرنگین کر لیا اور ایک بار پھر ترکوں کی وحدت کو قائم کر دیا؛ بوزنطی سلطنت پر، سربوں اور بلغاروں پر اور آخرکار نیقوپولیس **Nicopolis** کے میدان میں یوروپ کی متّحدہ فوجوں پر فتح حاصل کر کے اس نے ایک عظیم‌الشّان اور زبردست سلطنت کی شکل اختیار کر لی.

ایشیاے کوچک کے متعدد بیک (حاکم) نہ تو عربی تہذیب سے آشنا تھے، نہ ایرانی تہذیب سے، یہی وجہ تھی کہ عوام کی زبان کو اہمّیت حاصل ہو گئی، ترکی زبان میں کتابیں تصنیف ہوئیں اور کئی کتابوں کا عربی اور فارسی سے ترکی میں ترجمہ کیا گیا ۔ ابن بطُّوطہ نے ترکمان حاکموں (beys) کے درباروں میں ترکی کی اہمیت اور ترکی نویس شعراء کے متعلق بعض دلچسپ نکتے بیان کیے ہیں .

یہ ہمیں معلوم ہے کہ چودھویں صدی میں مختلف مرکزوں، مثلاً قونیہ، نگدہ، لاذقیہ، قسطمونی، سنوب، سیواس، قیر شہری، بروسہ اور ازنیق میں ترکی کتابیں لکھی گئیں [مگر] اس زمانے کے بہت سے آثارِ علمی ضائع ہو گئے ہیں ۔ دوسری طرف شعراء کے تذکرے، جو سولھویں صدی میں وجود میں آنے لگے، اس قدیم زمانے کے بارے میں بہت کم معلومات مہیا کرتے ہیں اور جو کچھ معلومات وہ مہیا کرتے ہیں وہ زیادہ‌تر غیر صحیح ہیں ۔ ان مآخذ سے جو اطلاعات ہم فراہم کر سکے ہیں ان سے ذیل کی تصانیف کا پتا چلتا ہے [جو مختلف خانوادوں کے حکمرانوں کے زمانے میں لکھی گئیں]:

۱ - اینانج اوغلی، جنھوں نے دکزلی اور لاذقیہ کے علاقے میں (۱۲۷۷ ؟ تا ۱۳۶۸ء) حکومت کی، (۱) تفسیر بر سورۂ فاتحۂ، نامعلوم مصنّف کے قلم سے (محفوظ در جامعۂ استانبول) اور سورۂ اخلاص کی تفسیر (مخطوطہ انقرہ میں) غالباً اسی مصنف کی تصنیف، جو مراد ارسلان بک ابن اینانج (م قبل ۷۶۳ھ) کی فرمایش پر لکھی گئی ۔ اس خاندان کے ''مولویّہ'' سے تعلقات تھے، چنانچہ مصنّفِ تفسیر مولانا جلال‌الدین رومی کا ذکر بہت تعظیم سے کرتا ہے ۔ ہم ایک شاعر معرّف لاذقی کو بھی جانتے ہیں، جو اس صدی میں لاذقیہ میں رہتا تھا (ایلک متصوفلر، ص ۲۶۳) اور نقیب اوغلیؒ، قصۂ [امام] حسن[رض] و حسین[رض] منظوم کا مصنّف (ملّت کتب خانہ سی، شمارہ ۱۰۱۸) بھی غالباً اسی شہر کا باشندہ تھا ۔ میرا خیال ہے کہ نقیب اوغلی تاج‌الدین، جس کا ذکر افلاکی نے (*Les Saints des Derviches tourneurs*، مترجمۂ ایوار Huart، ۲ : ۳۲۹) چلبی عارف (م ۷۱۹ھ) کے معاصر کی حیثیت سے کیا ہے، بھی شخص تھا۔

۲ - آیدین اوغلی (۱۳۰۷ تا ۱۴۰۳ء).

بروسہ کی اولو جامع کے کتب خانے میں (شمارہ ۲۱) ایک ناقص الاوّل نسخہ قصصِ اولیاء کا ہے ۔ ایک مکمّل مخطوطے سے، جسے حال میں 'معارف وکالتی' نے حاصل کیا ہے، ہمیں اب یہ پتا چلا ہے کہ یہ کتاب آیدین اوغلی محمد بک (۷۰۷ تا ۷۳۴ھ) کے لیے عربی سے ترجمہ کی گئی تھی ۔ مصنّف کا نام معلوم نہیں ۔ ایک اور کتاب کلیلہ و دمنہ ہے، جسے مسعود نامی ایک مصنف نے محمد بک کے مشہور بیٹے اومور بک (Umur Bey) کے لیے ترکی کا لباس پہنایا تھا ۔ اس کا سنۂ تالیف ۷۴۳ھ سے قبل ہے (کتب خانۂ باڈلی (Bodleian) کے ترکی مخطوطات میں اس کا ایک نسخہ، Marsh ۱۸۰، موجود ہے؛ ایک اور نسخہ لالہ لی کتاب خانے میں ہے، شمارہ ۱۸۹۷).

۳ - منتشہ اوغلی (۱۳۰۰ تا ۱۴۲۵ء).

فان ہامر کے نشریہ (*Falknerklee*) کی بدولت ہمیں ایک بازنامہ کا علم ہے جسے محمد بن محمد برجینی نے محمد بک (وسط صدۂ چہاردھم) کے لیے فارسی سے ترجمہ کیا تھا ۔ حاجی خلیفہ ذکر کرتا ہے کہ محمد بن محمود شیروانی نے الیاس بن محمد بک کے لیے عربی میں ایک کتاب الیاسیہ کے نام سے تصنیف کی، جس کا بعد میں الیاس بک کے حکم سے اسی نے ترکی میں ترجمہ کیا؛ حاجی خلیفہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی زبان کرخت ہے.

۴ - گرمیان اوغلی (۱۳۰۰ تا ۱۴۲۸ء).

یہ ضبطِ تحریر میں آ چکا ہے کہ سلیمان شاہ بن محمد بک (۷۷۰ تا ۷۹۰ھ) کے لیے، جو اس خاندان سے تھا، قابوس نامہ اور مرزبان نامہ کا ترکی میں ترجمہ ہوا تھا، لیکن اس ترجمے کے کسی مخطوطے کے وجود کا علم نہیں (قبّ احمد توحید :

گرمیان بکلری، .T.O.E.M یعنی تاریخ عثمانی انجمنی مجموعه سی، شمارہ ۸)۔شیخ اوغلی اپنی عظیم‌الشان مثنوی خورشید نامہ کے مقدمے میں اس کا ذکر استطراداً کرتا ہے۔

۵ ۔ حمید اوغلی (۱۳۰۰ تا ۱۳۹۱ء)۔

انقرہ کے کتبخانے میں ایک مخطوطہ شمارہ ۴۲/۵ ہے، جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں اور جس میں سورۃ المُلک (۶۷) کی تفسیر ہے، جو ایک اناطولی امیر خِضر بن گوال بکی کے حکم سے لکھی گئی تھی ۔ ہماری دانست میں یہ خضر بک دُندار بک کا بیٹا تھا، جو خانوادۂ حمید اوغلی میں سے تھا اور جھیل اِغریدِر (اغریدرگولو) کے علاقے میں حکومت کرتا تھا اور اس دُندار بک کا لقب شاید گوال بکی تھا۔

۶ ۔ عثمان اوغلی (دولت عثمانیہ)۔

انقرہ کے ایک مصنف مصطفی بن محمّد نے اورخان کے سب سے بڑے بیٹے سلیمان پاشا کے لیے سورۃ المُلک کی تفسیر لکھی تھی، جس کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ عام بایزید میں ہے ۔ بورسہ لی طاہر بک (عثمانلی مؤلفلری، ۲ : ۳۱) کہتا ہے کہ اسی کتب خانے میں ایک اور ترکی کتاب اسی مصنف کی حِلْوالناصحین کے نام سے موجود ہے ۔ ان کے علاوہ ہم ایک دانشمند نامہ کا بھی ذکر کر سکتے ہیں، جو قلعۂ توقات کے حاکم عارف علی نے ۷۶۲ھ / ۱۳۶۱ء میں سلطان مراد اوّل کی فرمایش پر دوبارہ لکھا تھا ۔ اسی طرح کلیلہ و دمنہ کے ایک منظوم ترجمے کا بھی ذکر کرنا چاہیے جس کا مصنّف گمنام ہے اور جو مرادِ اول ہی کے نام پر لکھا گیا (Pertsch : *Die türkischen Hand-schriften .... zu Gotha*، ص ۱۶۸)۔

ان تصانیف کے ماسوا ہمارے پاس کئی دیگر تصانیف ہیں، جو اس صدی میں ایشیاے کوچک کے مختلف حصوں میں تحریر ہوئیں :

طبری کا ایک ترجمہ مؤرخہ ۷۱۰ھ (Rieu : *Catalogue of the Turkish Mss. of the Brit. Mus.*، ص ۲۲)؛

داستانِ مقتلِ حسین[رضا]، ایک شاعر شادی یا شیّاد نامی نے ۷۶۳ھ میں قسطمونی میں تصنیف کی؛

عزّالدین اوغلی کی نظم طاؤس، جو سابق الذکر کتاب کے ساتھ ھی مجلّد ہے؛

حضرت عمر دستانی، از علی؛

مثنوی مہر و وفا، جو ایک گمنام شخص نے ۷۶۰ھ میں نظم کی؛

مناجات، از خواجہ اوغلی؛

حِکَم شعریہ، از سِنان اوغلی (مخطوطہ میرے ذاتی کتب خانے میں ہے)؛

ایک مثنوی از معاذ اوغلی حسن بک پازاری مشتمل بر غزواتِ علی[رضا] اور ایک دیگر مثنوی تصنیفِ علی بعنوان فتحِ قلعۂ سلاسِل (مِلّت کتب خانہ سی، مخطوطہ شمارہ ۱۰۱۸)؛

عطّار کے تذکرۃ الاولیاء کا ترجمہ، جو ایک نامعلوم مصنّف نے ۷۱۴ھ میں مرتّب کیا اور جس کا ذکر Joseph Thury نے کیا ہے (تورك دیلی یادکارلری، ملّی تتبعلر مجموعہ سی، ۳ : ۱۰۷)؛

ایک اور مخطوطہ مشتمل بر ترجمۂ تذکرۂ اولیاء، مکتبۂ ملّیۂ پیرس (Bibliotheque Nationale) میں ہے (بذیل .Anc. Fonds Turc، شمارہ ۸۷)؛

مناقب الاحرار فی مقالات الاخیار، از احمد بن درویش، خلیفۂ مولانا سنان الدین آقشہری (مخطوطہ کوپرولو کتب‌خانے میں، شمارہ ۲۰۳/۱۱)؛

مثنوی ورقہ و گلشاہ، جو مولوی یوسف مدّاح نے ۷۷۰ھ / ۱۳۶۹ء میں سیواس میں لکھی (معہد ترکیات Institute of Turcology میں ہے)؛

مثنوی، از طُرسُون فقیه [رَکَّ بان]؛

مثنوی بعنوان حکایتِ کنعان و شِمعون، از علی (میرے ذاتی کتب خانے میں ہے)؛

تسہیل، از حاجی پاشا (Pertsch : Die türk. Handschr.. zu Gotha، ص ۷۹؛ اس کے بہت سے نسخے موجود ہیں)؛

مُنتخب الشفاء، مصنّفۂ اسحاق بن مراد، در ۷۹۰ھ (Pertsch، ص ۹۹)؛

بعض غزلیات از افلاکی، صاحبِ مناقب (ولد چلپی، سلطان ولد کے ترکی اشعار کے خاتمے پر)؛

شاطبی کا منظوم ترجمہ بعنوان کشف المعانی، جو محمد بن عاشق سلمان اللاذقی نے ۸۰۰ھ میں لکھا، اور قرآن [مجید] کے متعلق ایک اور منظوم تصنیف اسی مصنّف کے قلم سے (میرے ذاتی کتب خانے میں ہے)؛

فُتُوت نامہ، از یحیی بن خلیل (O. L. Z.، ۱۹۲۸ء، ص ۱۲)؛

ایک اور فتوت نامہ، مصنّفۂ عہدِ یلدرم (میرے ذاتی کتب خانے میں)؛

ترجمۂ منطق الطیر، از گلشہری، در ۷۱۷ھ، اور چند دیگر نظمیں (ایلک متصوفلر، ص ۲۶۸ ببعد)؛

مثنویِ سہیل و نوبہار، مصنّفۂ ۷۵۱ھ، خواجہ مسعود اور اس کے بھتیجے عزّالدین احمد کی تصنیف (طبع J. H. Mordtmann، ہانوور ۱۹۲۳ء)۔

فرہنگ نامۂ سعدی کا ترجمہ، جسے اسی خواجہ محمود (ولد چلپی) نے ۷۵۵ھ میں مرتّب کیا (طبع کلیسلی رفعت، استانبول ۱۳۲۴ھ؛ ایک قلمی نسخہ کوپن ہیگن کے کتب خانے میں ہے، قبّ ان دو مصنّفوں کے لیے کواپرولو زادہ محمد فؤاد: تورکیات مجموعہ سی، ۲ : ۳۸۱ تا ۳۸۹)۔

سلطنت ممالیک میں بھی چند کتابیں مشرق اور مغربی ترکی کی بولیوں میں لکھی گئی تھیں، مثلاً فرح نامہ، یہ مثنوی ۷۸۹ھ میں طرابلسِ شام میں ایک شاعر کمال اسماعیل اوغلی نے تصنیف کی، اس کا ایک نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے ۔ ہم اس تصنیف کا اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ یہ اناطولیا میں بھی مقبولِ عام تھی؛ عاشق چلپی اسے شیخ اوغلی کی طرف اور علی اسے احمد داعی سے منسوب کرتا ہے (قبّ Gibb : Hist. Ott. Poetry، ۱ : ۲۵۶)۔

منظومات کے ایک مجموعے بنام مجمع النظائر میں، جسے ایک شاعر عمر بن مزید نے ۸۴۰ھ میں مرتّب کیا تھا (دانش گاہِ استانبول کے کتب خانے کا منحصر بفرد مخطوطہ) اور جامع النظائر میں، جو ۹۱۸ھ میں حاجی کمال اِگِردِری نے تالیف کی اور بعض دیگر مجموعوں میں ہمیں اس صدی کے بہت سے شاعروں اور کتابوں کے نام ملتے ہیں (ان کتابوں اور ان کے مراجع کے بارے میں، جو ان میں مذکور ہیں، قبّ کواپرولو زادہ محمد فؤاد : ملّی ادبیاتک ایلک مُبشّرلری، ۱۹۲۸ء، ص ۶۰ تا ۶۲)۔

سلجوق سلاطین کی جگہ، جو ایرانی تہذیب و تمدن سے بہت متاثّر تھے، جب سیدھے سادے ترکمان بیکوں (حاکموں) نے لے لی، جو صرف اپنی مادری زبان جانتے تھے، تو انھوں نے لوگوں کو بہت ترغیب دی کہ ترکی زبان کو علم اور فن (آرٹ) کی زبانِ تحصیل کی حیثیت سے استعمال کریں ۔ بہت سے اربابِ علم، شیوخ اور شعراء نے ترکمان بیکوں (حاکموں) اور ان کی ریاستوں کے سر برآوردہ لوگوں کی، جو ان بیکوں ہی کی طرح خود بھی ثقافت سے عاری تھے، خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ترکی میں کتابیں لکھنے اور عربی اور فارسی سے ترکی زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ۔ امراء خود بھی ان مذہبی اور ادبی تصانیف

کے ترجمے کی فرمایش کیا کرتے جو انھیں دلچسپ معلوم ہوتیں؛ چنانچہ تفاسیر، کُتبِ دینیه، کتبِ تصوّف، اخبارِ اولیاء، طب، صید و شکار اور تاریخِ اسلام کی کتابوں اور فی‌الجمله اُن سب اهم کتبِ درسیّه کے، جو مدارس میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، ترکی ترجمے تیار ہونے لگے - تحریکِ تصوّف اور خصوصاً تصوّفِ مولویه کی وجه سے، جو امراء کے محلّات پر مسلّط تھا، همیں ان تمام تصانیف میں مولانائے روم اور کسی حد تک سلطان ولد کا اثر نظر آتا هے - بلکه هم یه کہه سکتے هیں که منظوم تصانیف میں یه اثر سب سے زیاده قوی اور نمایاں هے اور یه که اس عهد کے بہت سے شعراء خود مولویه میں سے تھے.

منثور ادب تو اس زمانے میں اکثر کتبِ ارشاد و تربیت (didactic) هی تک محدود رہا، لیکن اس عهد میں ادبِ منظوم نے غیرمعمولی ترقی کی؛ سب اقسام کی تصانیف، مقبولِ عام قِصوں سے لے کر، جو مخلوط مذهبی-حماسی نوعیت کے تھے، خالص فنی نصب‌العین کی حامل کتابیں تک لکھی گئیں - مذهبی-حماسی قِصوں کا ارتقاء اس عهد میں معتدبه حد تک ہوا اور ان میں ایسی عام پسند تصانیف شامل هیں جن میں غزواتِ نبی[ص] اور آپ کے معجزات کا عموماً اور [حضرت] علی[رض] کے کارناموں کا خصوصاً ذکر هے - یه تصانیف مثنوی کے قالب میں ڈھالی گئی هیں - ان کا اسلوب بہت سلیس اور بحر [رمل هے یعنی] فاعِلاتن، فاعلاتن، فاعلن - بطلِ قصه (هیرو) کا تاریخی کردار عادۃً اساطیری پردے میں غائب ہو جاتا هے؛ خارقِ عادت واقعات، دیو، جن، سحر اور اِعجاز کے عناصر تصنیف کو غریب‌الشکل نوعیت کی چیز بنا دیتے هیں - ان میں سے بعض حماسی قِصّے، جن میں اسلامی خیالات کا غلبه هے، [حضرت] حمزه[رض] کی شخصیت کے گرد گھومتے هیں - ابن تیْمیّه تیرهویں صدی کے آخر کے زمانے میں شامی ترکمانوں میں ایک حمزه نامه کے وجود کا ذکر کرتا هے (منهاج السنّة، ۴ : ۱۲؛ اسلامی ادب میں حمزه نامه کے مقام پر قبّ کوپرولو زاده محمد فؤاد : تورکیات مجموعه سی، ۱ : ۹) - قصّوں کا ایک تیسرا دَور ابومسلم سے متعلق هے (قبّ کوپرولو زاده محمد فؤاد : تورکیه تاریخی، ۱ : ۳۷۰) - بہادروں کے اُن قصوں میں جن میں اسلام کا اثر قوی هے هم بطّال‌نامه اور دانشمندنامه کو بھی شامل کر سکتے هیں.

اس صدی کی متعدّد تصانیف میں، جو اسلامی خیالات پر مبنی هیں، کتبِ سِیَر، یعنی ان تصانیف کا جو [حضرت] فاطمه[رض]، [حضرت امام] حسن[رض]، حسین[رض] اور واقعاتِ کربلا سے متعلق هیں، نیز مَولِدوں کا ذکر بھی کیا جا سکتا هے - ایسی کتابیں جو رسول اللہ[ص] اور اهلِ بیت کے بارے میں تھیں، اس اسلامی ماحول میں بہت مقبول تھیں - مملوکوں اور مصر کے امراء کے محلوں میں ایسے لوگ موجود رہتے تھے جو سیرت‌خواں تھے، یعنی انھیں سِیَر کی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے - ان میں سے ایک ضریر ارزرومی تھا جو واقدی کی فتوح الشأم کا مترجم اور ترکی میں ایک کتابِ سِیَر کا مصنّف هے، جو نثر اور نظم دونوں میں تھی اور چودھویں صدی کے نصفِ آخر میں لکھی گئی (قبّ کوپرولو زاده محمد فؤاد : فُضولی، قسطنطنیه ۱۹۲۴ء، ص ۹؛ عثمانلی مؤلّفلری، ۳ : ۳۷؛ ریو Rieu: *Turkish MSS.*، ص ۳۸) - اس کتاب کی زبان آذری بولی کے ابتدائی دور کی هے — یعنی اس زمانے کی جب یه مشرقی اوغوز بولی اناطولیا کی مغربی

اوغوز بولی سے پوری طرح علٰحدہ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مصنف اناطولیا میں اتنا مشہور ہے کہ ہم اس کا ذکر یہاں کر سکتے ہیں ۔ اس قسم کی تصانیف کی زبان سہل ہوتی تھی جسے لوگ آسانی سے سمجھ سکتے اور پسند کرتے تھے ۔ مصنّفین اکثر اپنے نام کا ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتے تھے۔

چودھویں صدی سے ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے شعراء کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی جو محض فنی مقاصد کے پیشِ نظر شعر لکھتے تھے اور کلاسیکی فارسی ادب کی تقلید کرتے تھے۔ ان میں سب سے پہلے شیخ احمد گُلشہری، باشندۂ قیرشہری کا ذکر کرنا لازم ہے، نہ صرف اس لیے کہ اس کے کلام میں فنی خوبی اور مہارت کے آثار ہیں، بلکہ زمانے کے اعتبار سے مقدم ہونے کے باعث بھی ۔ اس نے ترکی زبان میں منطق الطیرِ عطّار کو منتقل کیا اور مختلف ماخذ، خصوصاً مثنوی مولانا رومی، سے اخذ کردہ کہانیوں اور اپنے زمانے سے متعلق بعض دیگر افکار و خیالات کے اضافے سے اسے مزید پھیلایا ۔ اس کی چند متفرق نظمیں بھی ہمارے پاس موجود ہیں ۔ اگرچہ وہ صوفی تھا تاہم اس کے ادبی مقاصد محض فنی تھے ۔ اس کی مثنوی کراماتِ اخی اِوْران، جسے قریب کے زمانے میں F. Taeschner نے طبع کیا تھا (*Ein Mesnevi Gül-chehrls auf Achi Evran*، ۱۹۳۰ء)، اس کی زندگی سے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچاتی ہے، مگر کوئی ادبی قیمت نہیں رکھتی۔ اس عظیم شاعر کی شہرت سولھویں صدی کے آغاز تک قائم رہی، لیکن چودھویں صدی کے بعد لوگوں نے "فحول شعراء" میں اس کا نام شامل کرنا چھوڑ دیا ۔ ہمارے 'تذکروں' میں اس کا نام نہیں ملتا (اس کی تصنیف کے دو قلمی نسخے متحفِ آثارِ قدیمۂ استانبول کے کتب خانے میں موجود ہیں) ۔ شہر قیرشہری نے خواجہ گُلشہری کے علاوہ اور بھی مصنف پیدا کیے اور بظاہر یہ شہر تہذیب و تمدن کا اہم مرکز تھا۔ اسی شہر نے مشہور و معروف صوفی شاعر عاشق پاشا (م ۷۳۲ھ) بھی پیدا کیا ۔ اس کے غریب‌نامہ نے، جو ۷۳۰ھ میں لکھا گیا، شروع ہی سے ایشیاے کوچک میں بڑی اہمیت حاصل کر لی اور اس کے کئی قلمی نسخے موجود ہیں ۔ ہمارے تذکروں اور ہماری تاریخوں میں عاشق پاشا کو بلند پایہ صوفی دکھایا گیا ہے، لیکن شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ محض مولانا رومی اور سلطان ولد کا مقلّد ہے ۔ اس کی تصنیف ادب آموز قسم کی ہے ۔ وہ گُلشہری سے بہت کم‌تر درجے کا شاعر ہے ۔ عاشق پاشا کی لکھی ہوئی چند متفرق اِلٰہیاں (*ilāhīs*) بھی پائی جاتی ہیں، جو وزنِ وتدی (syllabic metre، 'ہجہ وزنی') کی قسم سے ہیں، لیکن غنائی خوبی میں وہ یونس اِمْرہ کے اشعار کی گرد کو بھی نہیں پہنچتیں (عاشق پاشا کے خاندان کے لیے قبّ عالی بک : تاریخِ عاشق پاشا زادہ؛ اس اثر و رسوخ کے بارے میں، جو ولی کی حیثیت سے اسے زمانۂ حال تک حاصل رہا قبّ مقالہ از V. Gordlewski : *Comptes rendus de l'Académie des Sciences de U.R.S.S.*، ۱۹۲۷ء، ج ۱ : ص ۲۰۵ تا ۲۰۸؛ عاشق پاشا کی زبان کے متعلق دیکھیے براکلمان کی تحقیق در *Z. D. M. G.*، ۱۹۱۹ء، ج ۷۳ : ص ۱ تا ۲۹)۔

یونس اِمْرہ کا ادبی اثر عاشق پاشا کی صوفیانہ نظموں تک ہی محدود نہیں ہے ۔ بہت سے درویشوں نے عوام کی زبان اور اوزانِ وتدی میں الٰہیاں لکھیں : ان میں سب سے زیادہ مشہور سعید اِمْرہ اور قایغُو سُزْ ابدال ہیں ۔ سعید اِمْرہ مشہور و معروف خاجِم سلطان کا شاگرد تھا، جو حاجی بکتاشی ولی کے خلفاء میں سے تھا اور اس کا زمانہ

چودھویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا، لہذا وہ یونس کے ہم عصروں میں سے تھا ۔ سعید اِمرہ کی ایک اور نظم جو عروضی بحر میں ہے احمد فقیہ کے چرخ نامہ کا 'نظیرہ' (جواب) ہے (سعید اِمرہ کے بارے میں قبّ کوپرولو زادہ محمد فؤاد : حیات، ۱۹۲۷ء، شمارہ ۳۲) ۔ قایغُو سُز ابدال، بکتاشی درویش ابدال موسٰی کا خلیفہ تھا ۔ اس کے کلام سے ایک حقیقی غنائی رنگ، گہرا اخلاص اور پاکیزگی منعکس ہوتی ہے اور اسے یونس سے بھی زیادہ زبان پر آزادانہ اور قادرانہ تصرف حاصل ہے ۔ بعد کی صدیوں کی طویل و عریض بکتاشی شاعری کے ارتقاء پر قایغو سز کا بہت گہرا اثر پڑا (ایلک متصوفلر، ص ۳۷٦).

اس صدی کے نصف آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہترین صوفیانہ شاعری نسیمی کی تصانیف میں اپنے اوج کمال کو پہنچی ۔ نسیمی مشرق اور مغربی اناطولیا میں یکساں مشہور تھا ۔ بولی کے اعتبار سے اس کا کلام آذری طبقے سے اتصال رکھتا ہے، لیکن چونکہ ایشیاے کوچک میں اسے بہت شہرت حاصل ہے اس بنا پر اسے اسی خطّے کے ادب سے متعلق سمجھنا چاہیے ۔ نسیمی، فضل حُروفی بانی فرقۂ حُروف کے خلفاے بزرگ میں سے تھا (اس فرقے کی تاریخ کے لیے دیکھیے کوپرولو زادہ محمد فؤاد : اناادولوده اسلامیت، ادبیات فاکولته سی مجموعه سی، ۲/٦ : ۲٦۳ ؛ خود اس فرقے کے لیے قبّ مادۂ حُروفی) ۔ فرقۂ حُروفیه کے ارتقاء میں، جو انھیں اناطولیا میں میسر ہوا، نسیمی کا بڑا ھاتھ ہے اور ۸۰۷ھ میں حلب میں جیتے جی اس کی کھال کھنچوائی گئی (اس کی تاریخ وفات کے بارے میں، جو سب ماخذ میں غلط بیان کی گئی ہے قبّ کوپرولو زادہ محمد فؤاد، در حیات، ۱۹۲۷ء، شمارہ ۲۰) ۔ وہ ایک عظیم المرتبہ شاعر تھا اور اس کی صوفیانہ غزلیں نہایت پُر تاثیر ہیں ۔ اس کا اسلوب بیان سیدھا سادہ، لیکن زوردار اور پُر آہنگ ہے ۔ بہت کم شعراء صوفیانہ عشق کے علم اور اس کی جذباتی تعبیر میں اس شاعر کی برابری کر سکے ہیں، اس کے باوجود وہ شاعرانہ اسلوب کے تمام قواعد و قوانین کی پیروی کرتا ہے اور قدیم قوالب شعر کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرتا ہے ۔ اس کے دیوان میں "تُیُوغ" بھی ہے، جو ترکی شاعری سے مخصوص ایک قالب ہے اور فارسی ادب اس سے بیگانہ ہے (اس قالب کے لیے قبّ کوپرولو زادہ محمد فؤاد : تورکیات مجموعه سی، ۲ : ۲۱۹ تا ۲۴۳).

چودھویں صدی میں بھی رومانوں اور افسانوں کے موضوعات فارسی ادب سے اخذ کیے جاتے تھے، مثلاً کلیله و دمنه [رک بآن] کا منثور ترجمه از مسعود، جس میں جگه جگه اشعار بھی دیے گئے ہیں اور اسی کتاب کا منظوم ترجمه، جو مراد اوّل کے لیے کیا گیا ۔ تاہم قصۂ سہیل و نوبہار، جسے مسعود بن احمد اور اس کے بھتیجے عزالدین نے نظم میں لکھا، زیادہ ادبی قدر و قیمت رکھتا ہے ۔ یہ مثنوی کسی ایسے فارسی متن سے ترجمه ہوئی جس کا فارسی ادب میں کہیں سراغ نہیں ملتا، مگر ہمارے نزدیک یه محض ترجمه ہی نہیں بلکه اصل موضوع میں تصرف کر کے توسیع و تطبیق بھی کی گئی ہے ۔ بجاے [بحر رمل] فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن کے، جو اس عہد کی مثنویوں میں تقریباً ہمیشه استعمال ہوتی تھی، یه مثنوی [بحر متقارب] فعولن، فعولن، فعولن، فعل میں ہے اور اس میں سربسر مختلف بحروں کی غزلیں بھی دی گئی ہیں ۔ بوستان کے منتخبات کے ترجمے کی، جو خواجه مسعود بن احمد نے کیا، ادبی قیمت مقابلۃً بہت کم ہے ۔

خواجہ مسعود کے بعد شیخ اوغلی مصطفی (مولود ۱۳۷۵) نے، بحیثیت ایک رومانی شاعر کے، سب سے زیادہ شہرت حاصل کر لی ۔ وہ خواجہ مسعود کے شاگردوں میں سے تھا اور خورشیدنامہ اس نے ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں مکمل کیا ۔ یہ شاعر، جو گرمیان کے ایک بااقتدار خاندان سے تھا، پہلے گرمیان کے بک (امیر) سلیمان شاہ کی ملازمت میں 'نشانجی' اور 'دفتر دار' تھا؛ بعد میں وہ سلطان یلدرم کے حاشیہ‌نشینوں میں شامل ھو گیا اور اس کی خدمت میں اس نے اپنے خورشیدنامہ کی ایک ترمیم شدہ صورت پیش کی (اس کے اور اس کے خورشیدنامہ کے بارے میں قبّ مادۂ شیخ زادہ) ۔ ھمارے پاس شیخ اوغلی کا پورا دیوان موجود نہیں، لیکن اس کی بہت سی نظمیں قدیم مجموعوں میں درج ھیں ۔ اس نے نثر میں بھی ایک تصنیف بعنوان کنزالکبراء چھوڑی ھے ۔ اس نے اسے ۸۰۳ھ میں مکمل کر کے اس کا انتساب پاشا آغا بن خواجہ پاشا کے نام پر کیا، جو اس زمانے کا ایک ذی وجاھت شخص تھا (کنز کا مخطوطۂ وحید کوپرولو زادہ محمد فؤاد کے کتب‌خانے میں ھے) ۔ اس تصنیف کو جگہ جگہ اشعار سے مرصع کیا گیا ھے اور اس میں یوسف مدّاح، خاصّ، دھّانی، گلشہری، خواجہ مسعود اور الوان چلبی کے قطعات بھی درج ھیں (قبّ بیان بالا، ان میں خاصّ ھی ایک ایسا شاعر ھے جس کے متعلق ھمیں کچھ معلوم نہیں) ۔ یہ ایک قسم کا سیاست‌نامہ ھے اور اس لحاظ سے اس دور کی معاشرتی زندگی کے بارے میں مفید معلومات مہیا کرتا ھے۔

احمدی [رک بآن] کو، باستثنائے نسیمی، اس دور کا سب سے بڑا شاعر تصور کرنا چاھیے ۔ وہ اسکندر نامہ کا مصنف ھے ۔ یہ تصنیف جو ۷۹۲ھ/ ۱۳۹۰ء میں مکمل ھوئی، ھمیشہ مشہور رھی ھے اور اس کے کئی قلمی نسخے موجود ھیں ۔ Joseph Thury نے اس کا تفصیلی مطالعہ کیا ھے (*Török Nyelvemlékek a XIV század végéig*، بوڈاپسٹ ۱۹۰۳ء) اور بعد میں لسانی اعتبار سے براکلمان نے بھی اس کا مطالعہ کیا (.*Z. D. M. G*، ج ۷۳، i / ۲، ۱۹۱۹ء) ۔ اسکندر نامہ کے مخطوطوں میں بہت اختلافات نظر آتے ھیں ۔ احمدی نے اپنی تصنیف کا موضوع، جو مشرق اور مغربی [ترکی] ادب میں بہت عام ھے، ایرانی مآخذ سے لیا، لیکن اس نے اس میں ایشیائے کوچک اور بالخصوص عثمانی فرمانرواؤں کی تاریخ سے متعلق ایک طویل فصل کا اضافہ کیا، اس لیے ھم اسے پہلی منظوم ترک تاریخ کا مصنف قرار دے سکتے ھیں ۔ احمدی کا دیوان فنی نقطۂ نظر سے بلا شبہ زیادہ دلچسپ ھے ۔ ان نظموں میں بعض ایسی ھیں جن کا مواد مقامی دلچسپی کی چیز ھے، مثلاً بروسہ کے شہر کا حال اور اس کے باشندوں کی ھجو ۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کی تصانیف میں اس امر کے شواھد موجود ھیں کہ شاعر کو بہت شہرت حاصل تھی اور اس عہد کے کئی شاعروں نے اس کی نظموں پر 'نظیرے' [جواب] لکھے ۔ ھمیں معلوم ھے کہ ان دنوں اس کے اسکندر نامہ کو آذربایجان، خراسان اور ماوراء النہر میں بھی لوگ پڑھتے اور پسند کرتے تھے، نیز یہ کہ شیبانی خان شاعر، خاندانِ شیبانی کا بانی، اس کا بڑا مداح تھا۔

اس صدی کی عام تصویر کی تکمیل کے لیے قاضی برھان‌الدین کا ذکر بھی ضروری ھے؛ اگرچہ اس کی تصانیف میں آذری بولی کی خصوصیات نمایاں ھیں ۔ قاضی برھان‌الدین سالور قبیلے سے اور سیواس کا سلطان تھا، اس کی ھیجانی سیاسی زندگی کی کیفیت سب کو بخوبی معلوم ھے (۷۴۵ھ تا

۸۰۱ھ، قب مادۂ برہان‌الدین) ۔ عربی میں فقہ کی اہم کتابوں اور کچھ عربی و فارسی نظموں کے علاوہ اس نے مؤرخ عینی کی روایت کے مطابق ترکی کا ایک دیوان بھی چھوڑا تھا، جس میں غزلیات، رباعیات اور 'تویوغ' تھے ۔ اگرچہ اس کی زبان میں شستگی اور صحت مفقود ہے، تاہم برہان‌الدین کی نظموں میں ایک مخصوص اخلاص اور جذبہ پایا جاتا ہے۔

جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے یہ بخوبی عیاں ہے کہ ترکی ادب نے چودھویں صدی میں بہت ترقی کی اور یہ کہ ترکی، زبانِ مذہب (عربی) اور زبانِ ادب (فارسی) کے مقابلے میں، کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی ۔ ادبِ فارسی کے مثالی نمونے کے تتبع میں کلاسیکی ترکی ادب کی بنیادیں مضبوطی سے قائم ہو گئیں؛ مگر اس کی ترقی ابھی اپنی انتہاء کو نہیں پہنچی تھی، اس لیے کہ اس وقت تک سرکاری دستاویزیں مختلف اضلاع میں ابھی فارسی ہی میں لکھی جاتی تھیں ۔ کتبوں، قانونی دستاویزوں اور وقف ناموں میں عربی استعمال ہوتی تھی ۔ شرعی اور دینی کتابیں بھی اب تک عربی میں اور تصوف کی کتابیں عربی اور فارسی دونوں میں تصنیف ہوتی تھیں ۔ تاہم سرکاری معاملات میں اب ترکی کی اہمیت بڑھتی نظر آتی ہے، چنانچہ سلطان مرادِ اول کے بعض فرامین سے یہی ثابت ہوتا ہے (Kraelitz : تاریخ عثمانی انجمنی مجموعہ سی، ۲۸ : ۲۴۲ ببعد) ۔ بہت سے مصنف اور شاعر، اگرچہ وہ یہ مانتے تھے کہ ترکی میں ابھی کافی آب و تاب پیدا نہیں ہوئی، عام رجحان کے زیرِ اثر ترکی میں لکھنے، یا یہ کہیے کہ ترکی میں ترجمہ کرنے، کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے ۔ وہ ایرانی شعراء، مثلاً فردوسی، نظامی، عطّار، سعدی، مولانا رومی، سلمان ساوجی اور کمال خجندی کی تقلید اور ان کی تصانیف کا ترجمہ کرنے لگے ۔ آہستہ آہستہ ترکی زبان فارسی اور عربی عناصر سے پُر ہوگئی، ان زبانوں کی صرف و نحو سے ترکی زبان میں بعض ایسے قواعد داخل ہو گئے جن کی وجہ سے اس زبان کی آزادی اور فطری حسن متأثر ہوے بغیر نہ رہا ۔ عروض اور اوزانِ شعر بھی فارسی سے مستعار لیے گئے، لیکن ترکی الفاظ اس وقت بھی بڑی حد تک کام میں لائے جاتے تھے اور عربی فارسی کا وہ غلبہ، جو بعد کی صدیوں میں پایا جاتا ہے، اس زمانے تک محسوس نہیں ہوتا.

پندرھویں صدی.

اس صدی کے ابتدائی سالوں میں امیر تیمور کے حملے کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے ایشیاے کوچک میں عثمانی سلطنت کی نشو و نما رک گئی، بر خلاف اس کے روم ایلی (رومیلیا) میں اس کی وجہ سے ترکی تہذیب و تمدن کو تقویت پہنچی، جہاں اس زمانے میں بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان ترکِ وطن کر کے چلے گئے.

اسلام اور ترکی ثقافت کی ترقی اس پوری صدی میں روز افزوں قوت سے جاری رہی، خصوصاً اس لیے کہ '' دیوشرمہ'' [رک بآن] کا نفاذ ہوا ۔ یہ ترقی روم ایلی میں سب سے زیادہ نمایاں تھی ۔ جنوبی اناطولیا کے ترکیت اختیار کر لینے کے بارے میں ہمارے پاس برتراندوں د لا بروکیئر Bertrandon de la Broquière (*Le voyage d'Outremer*، نشر Ch. Schefer، پیرس ۱۸۹۲ء، ص ۱۰۰، ۱۰۱) کی شہادت موجود ہے ۔ سب سے پہلی تصنیف، جو روم ایلی میں لکھی گئی، [حضرت] فاطمہ[رض] کا مرثیہ ہے، جو ۸۰۳ھ / ۱۴۰۰ء میں خلیل، ادرنہ (ایڈریانوپل) کی مسجد قرہ‌بولوت کے امام نے لکھا ۔ یہ مرثیہ چودھویں صدی کی اسی نوع کی عوام پسند تصانیف سے کسی طرح بھی مختلف

نہیں ہے (صرف ایک قلمی نسخہ معلوم ہے اور وہ میرے ذاتی کتب خانے میں ہے)۔

اس کے ساتھ ھی ادبی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے ترکی کی اہمیت بڑھ گئی ۔ گرمیان اوغلی یعقوب ثانی کے وقف کا کتبہ، مؤرخہ ۸۱۴ھ/ ۱۴۱۱ء، اس قسم کا پہلا ترکی کتبہ ہے (خلیل ادھم : تاریخ عثمانی انجمنی مجموعہ سی، ۱ : ۱۱۶) ۔ ایک لوحِ مزار کا منظوم ترکی کتبہ، مؤرخہ ۸۴۳ھ/ ۱۴۳۹ء، انقرہ میں موجود ہے، ایک دوسرا مسجّع کتبہ بروسہ میں ہے، جسے شاعر جمالی نے ۸۷۰ھ / ۱۴۶۵ - ۱۴۶۶ء میں نظم کیا تھا۔ سلطان محمد ثانی کے عہد کے دورِ اول کی تمام سرکاری دستاویزیں ترکی میں ھیں (احمد رفیق : تاریخ عثمانی انجمنی مجموعہ سی، اشاریہ)، اور یہی حال اس صدی کے چند فرامین کا بھی ہے، جن میں سے قدیم ترین فرمان کی تاریخ تحریر ۸۶۰ھ / ۱۴۵۵ء ہے (Osmanische Urkunden in : F. Von Kraelitz) türkischer Sprache، وینا ۱۹۲۲ء) ۔ اسی طرح ھمیں ایک تصنیف سے، جسے ۸۲۸ھ / ۱۴۲۵ء میں دولت اوغلی یوسف بالیکسروی نے لکھا تھا، یہ پتا چلتا ہے کہ ترکیہ کے مدارس میں بھی ترکی زبان مستعمل تھی اور ظنِ غالب ہے کہ چودھویں صدی میں بھی یہی کیفیت تھی۔ دوسری مسلم اور عیسائی سلطنتوں سے سرکاری مراسلت میں اور ان علاقوں میں جہاں غیر ترک قومیں آباد تھیں، دیگر زبانوں کا استعمال جاری رھا ۔ مؤرخ کریتوبولس Critoboulos نے سلطان محمد ثانی کے ایک یونانی کاتبِ سر کا ذکر کیا ہے۔

پندرھویں صدی کے نصفِ اول میں تین بڑے شاھی خاندان ایسے تھے جو علماء اور شعراء کی سرپرستی کرتے تھے، یعنی قرمان اوغلی قونیہ میں، جندر اوغلی قسطمونی میں اور عثمانی حکمران ادرنہ اور بروسہ میں ۔ اس صدی میں فخّار، خوجہ فقیہ قرمانی، حلیمی اور نظامی دربارِ قرمان اوغلی کے متوسّل تھے ۔ نظامی کو احمد پاشا بروسوی کا مدِّ مقابل تصور کیا جا سکتا ہے ۔ جندر اوغلی کے دربار میں مؤمن بن مقبل بن سنان سینوبی، طبّی تصنیف مفتاح النور و خزائن السرور (Bibl. Not. Anc. Fonds Turc.، شمارہ ۱۷۲) کا مصنف تھا اور ایک نامعلوم الاسم مصنف، جس نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بنام جواھر الاصداف لکھی (Un commentaire du Qoran en dialecte : Cl. Huart turc de Qastamounie، J. A.، ۱۹۲۱ء، ص ۱۶۱ تا ۲۱۶)، جس کے کئی نسخے موجود ھیں۔ اس تفسیر کی زبان کو قسطمونی بولی تصور کرنا غلط ہے ۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ اسماعیل بیگ نے، جس کا عہدِ حکومت ۱۴۴۳ سے ۱۴۵۷ء تک رھا، ایک مذھبی کتاب ترکی میں بعنوان حلویّاتِ سلطانی لکھی (قبّ ریو Rieu : Cat. of Turk. MSS.، ص ۱۱) ۔ اسی اسماعیل نے (جس کے بارے میں قبّ ترجمۂ شقائق، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۳۹) ایک مصنف عمر بن احمد سے اپنے لیے تجوید پر ترکی میں کتاب لکھوائی (مخطوطہ در ملّت کتب خانہ سی، استانبول) ۔ اس نے کیمیاے سعادت کا ایک ترجمہ بھی تیار کرایا تھا (میرے نجی کتب خانے میں ہے) ۔ جندر اوغلی کے درباری حلقے کے شعراء یہ لوگ تھے : محمد سینوبی، درویش ترابی قسطمونی؛ حمدی، خاکی، ثنائی اور داعی اسماعیل بک کے دربار میں تھے (ثنائی اور داعی بعد میں عثمانیوں کے دربار میں رہے) ۔ ایک اور کتاب خلاصۃ الطب ترکی میں ہے، جو اسی خاندان کے قاسم بک بن اسفندیار کے نام پر لکھی گئی ۔ رستم بیگ بن اسفندیار نے ایک دیوان مرتب کیا تھا ۔ سولھویں صدی کے شاعر

شمسی پاشا اور امیری اسی خاندان سے متعلق تھے [جندر اوغلی کے نسب نامے کے لیے دیکھیے زامباور، ص ۱۴۹ - ادارہ].

لیکن سب سے زیادہ ادبی ترقی عثمانیوں کی سرپرستی میں ہوئی - شعراء، مثلاً احمدی اور احمد داعی نے امیر سلیمان کی مدح میں قصیدے لکھے، اسی امیر کو ایک شخص محمد شیخ مصطفی نے ایک قوس نامہ بھی پیش کیا تھا (Bibl. Nat. Anc. Fonds Turc.، شمارہ ۱۶۳) اور محمد شاعر کی مثنوی تحفہ نامہ یا عشق نامہ بھی، جو اس شاعر نے ۸۰۰ھ / ۱۳۹۷ء میں شروع کی تھی، امیر سلیمان ہی کے نام پر لکھی گئی، یہ نظم بعض تصرفات کے ساتھ مشرقی ترکی زبان کی ایک مثنوی ہما و فرخ سے مقتبس اور چند جالب نظر خصوصیات کی مظہر ہے (Bibl. Nat. *Suppl. Turc.*، شمارہ ۳۰۶) - اسی طرح ایک اور کتاب جواھرالمعانی علم دین کے متعلق ۸۰۹ھ / ۱۴۰۶ء کی لکھی ہوئی بھی ہمارے پاس موجود ہے، جس کا مصنف خضر بن یعقوب تھا (Bibl. Nat. *Suppl. Turc.*، شمارہ ۳۹۹) - مندرجۂ ذیل کتابیں بھی اسی عہد کی ہیں : یازیجی صلاح‌الدین کی مثنوی بنام شمسیہ، جو ۸۱۱ھ / ۱۴۰۸ء میں مکمل ہوئی (قب Fleischer : *Cod. Lips.*, cclxii) ؛ مقالات حاجی بکتاشی ولی کا ایک منظوم ترجمہ، جسے خطیب اوغلی نے ۸۱۲ھ / ۱۴۰۹ء میں مرتب کیا (تورکیات مجموعہ سی، ۲ : ۳۹۳)؛ اور مقدمہ از قطب‌الدین ازنیقی (م ۸۲۱ھ [۱۴۱۸ء]، قب عثمانلی مؤلفلری، ۱ : ۱۴۴).

ترکی زبان اور ادب کی ترقی میں سب سے زیادہ کام سلطان مراد ثانی نے انجام دیا - اس کا دربار علماء اور شعراء نیز ماہرینِ موسیقی کا مرجع و مقصد تھا؛ مثلاً اس نے ایک شخص خضر بن عبداللہ سے موسیقی پر ایک رسالہ لکھوایا (اس کا ایک مخطوطہ Bibl. Nat., Anc. Fonds Turc. میں شمارہ ۱۰۵ پر ہے، ایک نسخہ برلین میں بھی ہے)؛ اسی دور کا ایک اور مصنف، جس نے موسیقی پر دو کتابیں لکھیں، احمد اوغلی شکراللہ ہے (قب Albert Lavignac : *Encyclopédie de la musique*، ص ۲۹۷۸) - شیخی کے علاوہ اس عہد کے شعراء حسب ذیل ہیں : رومی، حسامی، شمسی، حسان، صفی، ازہری، نجومی، ندیمی، علوی اور ضعیفی - یہ نام قدیم‌ترین تذکروں میں موجود ہیں - ان کے علاوہ بہت سے ایسے مصنفین اور مترجمین کے نام بھی ملتے ہیں جن کی تصانیف ناپید ہو گئیں، مثلاً شیخ زادہ احمد مصری کی قرق وزیر حکایہ سی [قب مادۂ شیخ زادہ]؛ محمد بن عمرالحلبی کا ترجمۂ الفرج بعد الشدّۃ (ریو Rieu : *Cat.*، ص ۲۲۳ ؛ وامبیری *Altosmanische Sprachstud.*، لائیڈن ۱۹۰۱ء)؛ اسی مصنف کا ترجمۂ مناقب امام اعظم (کتب‌خانہ کوپرولو زادہ محمد فواد میں ہے)؛ قابوس نامہ کا ترجمہ، از مرجمک احمد، جو ۸۳۵ھ / ۱۴۳۱ء میں تمام ہوا (Bibl. Nat. Suppl. Turc.، شمارہ ۵۳۰؛ ریو، ص ۱۱۶؛ Pertsch : *Kat. der türk. Hss. zu Berlin*، ص ۲۷۶)؛ ترجمۂ مرصادالعباد از قاسم بن محمود قرہ‌حصاری؛ ترجمۂ حیاۃالحیوان از محمد بن سلیمان (نور عثمانیہ، شمارہ ۲۹۹۸-۲۹۹۹) : ہدایہ اور وقایہ کے ترجمے، جو ۸۲۸ھ / ۱۴۲۵ء میں دولت اوغلی یوسف نے تیار کیے (متعدد مخطوطات) : ترجمۂ گلشنِ راز، از شیخ الوان شیرازی مؤرخۂ ۸۲۹ھ / ۱۴۲۶ء ؛ ایک نامعلوم مترجم کا ترجمۂ مثنوی جلال‌الدین رومی بعنوان مثنوی مرادی، جو ۸۴۰ھ / ۱۴۳۷ء میں مکمل ہوا (مخطوطہ کیمبریج میں ہے)؛ ابنِ بیطار کی مفردات کا ترجمہ، مترجم کا نام معلوم

نہیں (مخطوطہ اُپسالا Upsala میں ہے)؛ قرآن مجید کی ایک ترکی تفسیر، جو متحفِ قونیہ کے کتب خانے میں ہے اور بین السطور ترکی ترجمے کی بھی حامل ہے؛ ایک فرح نامہ، جسے ۸۲۹ھ / ۱۴۲۶ء میں خطیب اوغلی نے پیش کیا (قپ توز کیات مجموعہ سی، ۲ : ۳۸۹ تا ۳۹۶)؛ ایک جاماسپ نامہ، جسے موسی عبدی نے ۸۳۳ھ / ۱۴۳۰ء میں فارسی سے ترجمہ کیا؛ رسالہ باہ نامہ، جو موسی بن مسعود نے فارسی سے ترجمہ کیا (کتب خانۂ شہید علی پاشا، شمارہ ۲۸۳) : سعدیِ سیروزی کا سلیمان نامہ، جو ۳,۵۰۰ ابیات پر مشتمل ہے، تاریخ ابن کثیر کا ترجمہ (کتب خانۂ داماد ابراہیم پاشا)؛ ایک سلجوق نامہ، ازیازیجی زادہ علی (*Recueil de textes relatifs à l'histoire des Seldjoucides*، طبع ہوتسما Houtsma کی تیسری جلد اس کا ایک حصہ ہے)؛ مناہج الانشاء، از یحیی بن محمد کاتب، جس میں کئی اہم تاریخی دستاویزیں ہیں (.Bibl. Nat، *Suppl. Turc.*، شمارہ ۶۶۰) : ترجمۂ تفسیرِ انفس الجواہر، از ابوالفضل موسی بن حاجی حسین بن عیسی الازنیقی، جو ۸۳۸ھ میں تمام ہوا (*O. L. Z.*، ۱۹۲۷ء، ص۹) - حاجی خلیفہ، ابواللیث کی تفسیر اور عوفی کی جامع الحکایات کے ترجموں کا بھی ذکر کرتا ہے، جو ابن عرب شاہ نے کیے تھے - منثور تصنیف اعجب العجاب [کذا] ہے، جسے مَنیاس اوغلی محمود اسکوبی نے ۸۴۱ھ / ۱۴۳۷ء میں سلطان مراد ثانی کے نام سے منتسب کیا تھا (ایک مخطوطہ Bibl. Nat., Anc. Fonds Turc. میں ہے، شمارہ ۱۳)، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی ثقافت روم ایلی میں بھی ترقی کرنے لگی تھی - لیکن اس عہد کی شاعری کی تاریخ کے بارے میں سب سے اہم تصنیف مجموعۃ النظائر ہے، جو عمر بن مزید نے ۸۴۰ھ/ ۱۴۳۶ - ۱۴۳۷ء میں لکھا تھا اور جس میں تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں صدی کے تراسی شعراء کا کلام درج ہے۔

تیمور تاش پاشا کے بیٹے اومور بیگ نے بھی، جو مراد ثانی کے اعاظم امراء میں سے تھا، ترکی ادب کی نشو و نما میں بہت سرگرمی اور انہماک کا اظہار کیا - بہت سی تصانیف اس کے نام پر لکھی گئیں، مثلاً جوہر نامہ، جسے ۸۳۱ھ/ ۱۴۲۸ء میں محمد بن محمود شیروانی نے لکھا (مخطوطہ ڈریسڈن میں ہے) اور اکسیرالسعادات کا ترجمہ (مخطوطہ ڈریسڈن میں ہے) - اس آخری تصنیف کا مترجم خاص طور پر کہتا ہے کہ اس نے اومور بیگ کی خواہش کے مطابق اس میں تا حدّ امکان زیادہ سے زیادہ ترکی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انفس الجواہر کے ایک قلمی نسخے کے شروع میں، جو بروسہ کی اُولُو جامع میں ہے، ان کتابوں کی فہرست دی ہے جو اومور بیگ نے بطور وقف دی تھیں اور ان میں بہت سی ترکی تصانیف بھی شامل ہیں - ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ پندرھویں صدی کے نصفِ اول ھی میں ترکی زبان ثقافت اور علم کی زبان بن چکی تھی اور ایک ایسے ادب کی تخلیق کر چکی تھی جس میں علم و ادب کی وہ تمام شاخیں شامل تھیں جن کے نشو و نما کی طرف اس دور میں توجہ دی جا رہی تھی۔

گذشتہ صدیوں کی طرح یہ علمی تحریک و سرگرمی محض کلاسیکی اسلامی تصانیف کے ترجموں تک ھی محدود نہ تھی؛ عوامی ادب میں شامل ہونے کی حیثیت سے اس نظم (مولد) کا ذکر کر سکتے ہیں جو سلیمان چلبی [رك بآن] نے ۸۱۲ھ/ ۱۴۰۹ء میں بروسہ میں لکھی اور جو سیرت کی بہترین تصنیف ہے : اس مولد کو صدیوں تک لوگ پڑھتے رہے ہیں اور اس نظم کے، جس میں ترکی ادب کے ایک شاہکار کی تمام صفات

موجود ھیں ، ھر صدی میں متعدد 'نظیرے' (جواب) لکھے گئے ھیں - نئے صوفی 'طریقوں' کے وجود میں آنے سے صوفیانہ ادب کی اھمیت بڑھتی گئی - تصوف کی اُمّہاتِ کتب (گلشنِ راز، مِرصادالعباد، فصل الخطاب، تذکرۃ اولیاء) کے ترجموں کے پہلو بہ پہلو صوفیوں کے طرقِ ریاضت اور قواعدِ طریقت پر ھمیں کئی منثور اور منظوم کتابیں ملتی ھیں، مثلاً کتب ذیل : مثنوی ھاے مُناجات نامہ، قُنوت نامہ، عِبرت نامہ، معذرت نامہ الیست نامہ اور شیخ اِشرف بن احمد کی مثنوی حیرت نامہ، یہ نسبۃً سادہ اور بسیط نوعیت کی تصانیف ھیں، جن کی تصنیف میرے نزدیک اس (پندرھویں) صدی کے آغاز سے متعلق ھے (وہ مخطوطے جن کا علم ھے سب میرے نجی کتب خانے میں ھیں) اور یہی حال حاجی بِکتاش کے ولایت نامہ کے منظوم ترجمے کا ھے، جو خطیب اوغلی نے کیا - اس عہد کے کئی صوفیوں نے یونس اِمرہ کی طرز میں نظمیں لکھیں - ان شعراء میں شاعر مشہور امیر سلطان شامل ھے، جس نے ''اِمیر سیّد'' کے مخلص (تخلص) کے ساتھ ''ھجہ وزنی'' میں ''الٰہیاں'' لکھیں - اس نے حلقۂ ملامیّۂ بیرمیّہ کے بانی انقرہ کے حاجی بیرم ولی کے ساتھ اس نوع کے شعراء کے ایک سلسلے کی بنیاد رکھی - ان میں سے ایک یازیجی صلاح الدین کا بیٹا محمد تھا، جس کا ذکر اوپر ھو چکا ھے - وہ اپنے مخلص یازیجی اوغلی سے مشہور ھو گیا - اس کی شہرت خصوصاً اس کی نظم محمّدیہ کی وجہ سے ھے، جو ۸۵۳ھ میں مکمل ھوئی : بعد کی صدیوں میں قِریم (Crimea) میں اور قازان کے ترکوں اور باشقِردوں کے درمیان اس شاعر کے تقدّس کا بہت شہرہ ھو گیا (قب اولیاء چلبی : سیاحت نامہ، ۷ : ۸۱۲) - اس عظیم الشان نظم کی زبان ذرا ثقیل ھے اور وہ کئی بحروں میں لکھی گئی ھے؛ اس کا موضوع سِیَر کی کتابوں سے مأخوذ ھے؛ اس میں صوفیانہ اثرات کا بھی کچھ شائبہ ھے ، مگر خیالات تمام و کمال اھلِ سنت کی آراء کے مطابق ھیں - اس نظم کا ادبی اثر بہت ھی دور رس تھا - استانبول اور قازان میں اس کے کئی اڈیشن طبع ھوے اور موجود ھیں نیز (قب ع. عزیز اور علی رحیم : تاتار ادبیاتی تاریخی، ج ۱، حصہ ۲ : ص ۱۶۶ تا ۱۷۷).

اس عہد کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر صوفی شعراء میں سے ایک کمال اُمّی ھے - وہ خلوتیہ درویشوں میں سے تھا اور اس کی تصانیف اس کے ایک حقیقی شاعر ھونے کی آئینہ‌دار ھیں؛ اس کے کلام کے حلقۂ اثر کی وسعت میں قازان کے ترک، باشقِرد اور اوزبک بھی شامل تھے - عبداللہ بن اِشرف بن محمد (م ۸۷۴ھ / ۱۴۷۰ء) صوفیہ کے طریقۂ بیرمیہ کی شاخ اِشرفیّہ کا بانی الملقب بہ اِشرف اوغلی بھی ایسا ھی مشہور ھے - وہ ایک کتاب مُزکّی النُّفوس اور ایک دیوان کا مصنف ھے - بڑے بڑے صوفیہ بزرگوں کے ظہور اور نئے نئے صوفی طریقوں کی تأسیس سے ایک باقاعدہ ترکی علمِ قصصِ اولیاء کی تخلیق ھوئی، جس میں اِمیر سلطان، اِشرف اوغلی اور بعد میں حاجی بِکتاش ولی، قیغوسز اور عثمان بابا جیسے بزرگوں کے متعلق روایتوں اور قصوں کے مجموعے شامل تھے - علمِ اجتماعیات کے اعتبار سے یہ ادب بہت بیش قیمت ھے؛ سولھویں صدی سے خصوصاً اس کی فراوانی ھوئی.

حُروفی ادب، نِسیمی سے شروع ھوا - اُسے جن مصنفوں نے جاری رکھا ان میں اس کا شاگرد رِفیعی شامل تھا، جس نے ۸۱۲ھ / ۱۴۰۹ء میں اپنا بِشارت‌نامہ لکھا اور فِرشتہ اوغلی (م ۸۶۴ھ / ۱۴۵۹ء)، جو ایک عشق نامہ کا مصنف ھے، اور ویرانی بابا - حُروفی عقائد کی تبلیغ سلطان محمد ثانی کے دربار تک بھی جا پہنچی اور سلطان

بایزید ثانی کے دورِ حکومت میں ان مارق مفکرین کو سخت ایذاء اور عقوبت دی گئی ۔ باوجود اس کے پندرھویں اور سولھویں صدی میں حُروفی شعراء بکثرت موجود تھے : قیصریہ کا تِمنّائی، قرہفِریَہ کا حسن رومی، حُسینی، یَنیجَۂ واردار کا اُصولی، نِیاتی، طَرزِی بغدادی، وَحدتی بوسنوی ، پناھی تبریزی اور مُحیطی ۔ اُس خطّے میں، جہاں کی بولی آذری تھی، ھمیں حروفیوں میں شاہ اسماعیل صفوی [قبّ مادۂ خطائی]، لشکری، طِفلی اور حَبیبی کے نام ملتے ھیں ۔ حبیبی بعد میں قسطنطنیہ آ گیا ۔

غیرمذھبی ادب کی جانب رخ کریں تو اس کا قدیم ترین نمایندہ احمد داعی ھے ۔ یہ شاعر گِرمیان اوغلی اور آلِ عثمان کے درباروں میں رھا۔ بعض ترجموں کے علاوہ ھمارے پاس اس کی تصنیف کردہ ایک عربی، فارسی، ترکی لغات عُقودالجواھر بھی موجود ھے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ سلمان ساوجی اور کمال خجندی کی طرح کے ایرانی شعراء کا تتبع بہت کامیابی کے ساتھ کرتا ھے، مگر اس نے اپنے زمانے کی شاعری پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں ڈالا ۔

احمدی اور نِسیمی کے بعد اس دَور کا سب سے اھم شاعر شیخی تھا ۔ وہ قصیدہ گو شاعر تھا اور سلطان محمد اول اور سلطان مراد ثانی اس کے مربی تھے ۔ اس کا اصلی نام سِنان گِرمیانی تھا، لیکن اس کی زندگی کے حالات سے متعلق جو اطلاعات منقول ھیں وہ ایک حد تک متضاد ھیں [قبّ مادۂ شیخی] ۔ اس کی وفات کی تاریخ معلوم نہیں، مگر یہ ضرور ۸۳۲ھ /۱۴۲۹ء کے بعد واقع ھوئی ھوگی ۔ وہ دُومِلّو پِنار میں، جو کوتاھیہ کے قریب ھے، دفن ھوا (اِولیا چلبی، ج ۹) ۔ شیخی کو ایک بڑا شاعر ماننا چاھیے ۔ اس نے نظامی کی مثنوی شیریں و خسرو کا جو ترجمہ کیا اس میں ورایے ترجمہ ''چیزی دگر'' بھی ھے ۔ خرنامہ، جو اس نے سلطان مراد ثانی کے نام پر لکھا، ھجو کا ایک شاھکار ھے (قبّ کوپرولُو زادہ محمد فؤاد در یکی مجموعہ، ۱۹۱۷ء، شمارہ ۱۳) ۔ اس شاعر کو سولھویں صدی تک اثرِ عظیم حاصل رھا، چنانچہ نِجاتی اور خیالی ایسے شاعر اس کا ادب سے ذکر کرتے ھیں، اور وہ بجا طور پر 'شیخ الشعراء' کے لقب کا مستحق ھے ۔ مذھبی حلقوں میں بھی اس کی عزت کی جاتی تھی، یہاں تک کہ مصر کے ترکوں میں بھی اس کی تجلیل ھوتی تھی (ابن تَغری بِردی، طبع پوپر Popper، ۷ : ۳۲۳، س ۲۵) .

شیخی کے بعد ھم بروسہ کے عطائی کا ذکر کر سکتے ھیں، جس کا دیوان ھمارے پاس موجود ھے ۔ اس کا اصلی نام اخی چلبی تھا اور بروسہ میں اس کی لوحِ مزار پر ۸۴۱ھ /۱۴۳۷-۱۴۳۸ء تاریخ دی ھے ۔ یہ شاعر یقیناً شیخی سے متأثر تھا، لیکن اس کی نظموں میں آھنگ قنوطیت پایا جاتا ھے ۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے غزلوں میں امثال کو استعمال کیا ۔ صفی مُصوّر اسی عہد کی ایک اور نمایاں شخصیت ھے؛ اس کے دیوان میں سلطان مراد ثانی، وزیر خلیل پاشا اور دیگر امراء و کبراء کی مدح میں قصاید موجود ھیں ۔ تراجم نگار سِہی نے اس کی زندگی کے کچھ حالات بیان کیے ھیں .

اسی عہد کے دیگر شعراء یہ ھیں: عُلوی بروسوی؛ ھُمامی اِزنیقی، مصنف مثنوی سی نامہ (Bibl. Nat., Anc. Fonds turc.، شمارہ ۳۰۴)، جو خلیل پاشا کے نام پر لکھی گئی ھے؛ گیلی پولی کا احمد رومی؛ بکتاشیوں کا شاعر بابا ندیمی اور گیلی پولی کا ضعیفی، جس نے نظم میں سلطان مراد ثانی کی جنگوں کا حال بیان کیا ھے ۔ ھم جمالی کا بھی ذکر کرنا چاھتے ھیں، جس نے اپنی کتابیں سلطان محمد ثانی اور مراد ثانی کے نام پر لکھیں؛ تمام مآخذ میں اس جمالی کو

چودھویں صدی کے شاعر شیخ اوغلی مصطفی سے ملتبس کر دیا گیا ہے [قب نیز مادۂ شیخ زادہ] ۔ جمالی نے ۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء میں مراد ثانی کے لیے ایک مثنوی بنام گلشنِ عُشّاق، ایک اَور بعنوان ھُما و ھُمایوں محمد ثانی کے لیے اور ایک تیسری بنام مفتاح الفرج (Kat. d. türk. : Pertsch Hss. zu Berlin، ص ۳۰۷) نظم کی۔ اس کا ایک منظوم رسالہ بھی بنام الرسالۃ العجیبۃ فی الصنائع و البدائع موجود ہے [جس میں مختلف بحور میں سلطان محمد ثانی کی مدح درج ہے اور ہر قسم کے صنائع و بدائع بکثرت استعمال ہوے ہیں] (Cat. of Mss. : Browne in Cambridge، ۱۹۰۰ء، ص ۸۷) ۔ لطیفی اس شاعر کی تعریف کرتا ہے ۔ اُس نے بروسہ کی کئی عمارتوں کے لیے منظوم کتبے بھی لکھے (تاریخ عثمانی انجمنی مجموعہ سی، شمارہ ۱۰)۔

سلطان محمد ثانی فاتح اور بایزید ثانی کے عہد کا، جو دونوں خود بھی شاعر تھے، طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس زمانے میں عثمانیوں کی زبان اور ادب کو عظیم‌الشان ارتقاء حاصل ہوا ۔ ایشیاے کوچک میں ترکمانی حکمران خاندانوں کے غائب ہو جانے کے بعد صرف عثمانیوں اور ان کے امراء کے دربار ھی علماء اور شعراء کا ملجأ و مأوی رہ گئے تھے ۔ ان کی عظیم‌الشان فتوحات نے عثمانی اثر کو قریم (Crimea) اور جزائرِ بحرِ ایجہ (Aegean) تک پہنچا دیا ۔ ان فتوحات کے ساتھ ساتھ ترکی اور اسلامی ثقافت کی اشاعت کے لیے پہلے سے قوی تر تحریک محوِ عمل تھی۔ عین اس زمانے میں سلطنت کی اقتصادی خوشحالی بہت اونچی سطح پر پہنچ گئی اور سلطان محمد ثانی کی قانون سازی بھی اس زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی ۔ مدرسوں اور تکیوں نے اور بالخصوص صوفیوں کے فاسدالعقیدہ فرقوں، مثلاً بکتاشیوں، نے اسلام کی اشاعت میں بہت مدد پہنچائی اور حکومت کی جانب سے رعایا کی جماعتوں کو اِدھر سے اُدھر منتقل کرتے رہنے سے سلطنت کی سیاسی وحدت کو تقویت پہنچی۔

سلطان محمد ثانی اور اس کے صدرِ اعظم محمود پاشا نے شاعروں اور اربابِ علم کو بیش قرار مرسوم دیے ۔ شاعروں اور موسیقی دانوں، مثلاً نجمی، فنائی نُوری، عِشقی، خَفی، داعی، دُعایی، قُدسی، کاتبی، نحیفی، وحیدی وغیرہ کو ان کی کاوشوں کے بڑے بڑے صلے ملتے رہے ۔ مہدی، ملیحی، بروسہ‌لی [Bursali] احمد پاشا وغیرہ ہمیشہ محمد ثانی کے ہمراہ رہتے تھے ۔ حیاتی، صاریجہ کمال اور اِنوری کو محمود پاشا کی خاص سرپرستی حاصل تھی ۔ شہزادہ جم کے حاشیہ نشینوں میں شاہدی، سخایی، لَعلی، حیدر، قَندی، سعدی اور اس شہزادے کا اتالیق تُرابی شامل تھے ۔ بایزید ثانی اور اس کے بیٹوں نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا ۔ بایزید ثانی کے عہد میں تیس سے زاید شعراء کو سرکاری خزانے سے وظائف مل رہے تھے ۔ چونکہ پندرھویں صدی کے نصفِ آخر کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کا حال مختلف مآخذ میں تفصیل سے بیان اور شائع ہو چکا ہے، اس لیے ہم یہاں ان سرگرمیوں کی مختلف صورتوں اور ان کے زیادہ قابلِ ذکر نمایندوں کے بارے میں ایک عام تبصرہ کرنے ھی پر اکتفاء کریں گے۔

سلطان محمد ثانی کے عہد کا سب سے بڑا شاعر احمد پاشا بروسوی تھا [رک بآن]؛ اگرچہ اس نے نیازی، شیخی، عطایی اور اس کے استاد ملیحی کا اثر قبول کیا (قب یکی مجموعہ، ۱۹۱۸ء، شمارہ ۳۱)، تاھم وہ اپنے ھم عصروں سے غزل میں اور بالخصوص قصیدے میں بازی لے گیا ۔ شیخی کے بعد اسے ترکی شاعری کی سب سے بڑی شخصیت سمجھا جا سکتا

ہے ۔ اس کا اثر اس کے ہم عصر شعراء رسمی، حریری، قندی، وصالی، نظامی قونیوی، صافی (جزری قاسم پاشا وزیر) اور سلطان جم کے کلام میں صاف طور پر نمایاں ہے، بلکہ نجاتی اور باقی کے کلام میں بھی اور سولھویں صدی تک کے شعراء بھی اس سے متأثر ھیں ۔ اپنے زمانے کے دوسرے شعراء کی طرح احمد پاشا بھی ایرانی شاعری سے متأثر تھا جس کی بنا پر بعض تذکرہ نویسوں، مثلاً جعفر چلبی اور لطیفی، نے اس کی بےجا طور پر مذمت کی ہے ۔ بر خلاف اس کے یہ عام روایت (جو ھمیں سب سے پہلے حسن چلبی کے تذکرے میں نظر آتی ہے) کہ احمد پاشا نے اپنی مشقِ سخن کا آغاز نوائی کی بعض نظموں کے 'نظیرے' (جواب) لکھ کر کیا، بالکل غلط ہے (قب تورك یوردو، ۱۹۲۷ء، شمارہ ۲) ۔ احمد پاشا نے اپنا دیوان سلطان بایزید ثانی کے حکم سے جمع اور مرتب کیا ۔ اس میں ھجویات، قطعات اور خصوصاً بہت عمدہ ''مربّعات'' ھیں ۔

اس سے دوسرے درجے پر پندرھویں صدی کا سب سے بڑا شاعر نجاتی ہے، جو بالخصوص اپنے مرثیوں اور غزلوں کی وجہ سے مشہور ہے ۔ اس کی شہرت خاص طور سے اس بنا پر ہے کہ وہ اپنی نظموں میں امثال اکثر استعمال کرتا ہے ۔ ادریس بدلیسی اسے خسروِ روم کہتا ہے اور سب مصنفین اسے احمد پاشا کے بعد عظیم ترین عثمانی شاعر تصور کرتے ھیں (قب نیز Pertsch : *Kat. d. türk. Hss. zu Gotha*، شمارہ ۱۶۸) ۔ اس کی شہرت سلطنت کی حدود سے باھر تک جا پہنچی ۔ نجاتی کا اثر صُنعی، طالعی، شوقی، رضائی، ژاری اسکوبی، ساقی فلبی، سہی، قربی ازنیقی، وصفی، وردی اور شاور کے، جو پندرھویں اور سولھویں صدی کے شاعر تھے، نیز خود اس کے ہم عصر شعراء، مثلاً مہری، کے کلام میں نمایاں ہے ۔ بہت سے شاعروں نے اس کی نظموں کے 'نظیرے' لکھے اور ان میں سے بعض، مثلاً والہی توقاتی، تو گویا اسے پیر و مرشد سمجھتے ھیں ۔

نجاتی کے ساتھ اس کے معاصر مسیحی [رک بآن] کا ذکر بھی ضروری ہے، جو اپنے دیوان اور شہر انگیز کی بنا پر مشہور ہے : اس کی نظموں میں کم و بیش اس کے ماحول کی زندگی کا عکس موجود ہے ۔ مسیحی نے باقی پر بھی کچھ اثر ڈالا ۔

مثنوی، جس کا رواج چودھویں صدی میں شروع ھوا تھا، اس عہد میں بہت مقبول ھو گئی ۔ صوفیانہ مثنویوں میں ہم مفصلۂ ذیل کا ذکر کر سکتے ھیں : آق شمس الدین کے 'خلیفہ' ابراھیم تنوری (م ۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء) کی گلزارِ معنوی؛ وحدت نامہ از عبدالرحیم قرہ حصاری (مصنفۂ ۸۶۵ھ [۱۴۶۰ء]، قب Pertsch : *Die türk. Hss. zu Berlin*، شمارہ ۳۷۵ تا ۳۷۶)؛ مثنوی از روشنی آیدینی، جو فرقۂ خلوتیہ کا ایک مشہور درویش تھا (م در تبریز ۸۹۲ھ / ۱۴۸۷ء)؛ فرقت نامہ، جسے ۸۷۶ھ / ۱۴۷۱ء میں خلیلی دیار بکری نے ازنیق میں لکھا [قب مادۂ خلیلی] ان نظموں کے رومانی موضوع ایرانی ادب سے اخذ کیے گئے تھے؛ سب سے زیادہ معروف یہ ھیں : آق شمس الدین زادہ حمدی [قب مادۂ حمدی] کی یوسف و زلیخا؛ آھی (اس کے بارے میں قب یکی مجموعہ، ۱۹۱۸ء، شمارہ ۵۰) کی خسرو شیرین؛ روانی کا عشرت نامہ اور خصوصاً ھوس نامہ، مؤرخۂ ۸۹۹ھ / ۱۴۹۳ء، از جعفر چلبی [رک بآن] ۔ یہ آخرالذکر تصنیف بالکل ابتکاری ہے ۔ اس ممتاز شاعر کا تخیل اس کے جذبات پر غالب آ جاتا ہے ۔ اس صدی کے آخر میں خمسۂ نظامی کے موضوعات بھی بہت مقبول ھو گئے، چنانچہ اس خمسہ کا کئی

بار ترجمہ کیا گیا.

چند منظوم تاریخی تصانیف بھی اسی عہد سے متعلق ہیں ۔ گیارہ ہزار بیت کی ایک مثنوی کمال رئیس کے کارناموں کے بارے میں ہے، جو صفایی سینوبی نے لکھی تھی ۔ یہ شاعر بحری امور میں ماہر تھا اور غلطہ میں اپنے تکیے میں رہتا تھا ۔ اسی طرح پندرہ ہزار بیت کی ایک مثنوی صبایی ادرنوی نے لکھی، جس کا موضوع وہ فتوحات ہیں جو خوجہ داؤد پاشا کو بوسنہ میں حاصل ہوئیں؛ سلاطین نامہ ایک منظوم تاریخ ہے، جو صاری کمال نے سلطان بایزید ثانی کے نام پر لکھی؛ دستور نامہ ۸۶۹ھ / ۱۴۶۴-۱۴۶۵ء میں انوری نے محمود پاشا کے لیے لکھا ۔ اس کی اہمیت زیادہ تر اس لیے ہے کہ آیدین اوغلی کی تاریخ کے متعلق معلومات بہم پنہچاتی ہے (تورك تاریخی انجمنی کلیاتی، شمارہ ۵۱)؛ اور آخر میں پندرہ ہزار بیت کی ایک تاریخ سوزی پرزرینی نے میخال اوغلی علی بیگ کی فتوحات کے بارے میں لکھی ۔ ہم اس ضمن میں قطب نامہ کا ذکر بھی کر سکتے ہیں، جس کا انتساب بایزید ثانی سے ہے اور جس میں شاعر اوزون فردوسی نے جزیرۂ مدیللی کی فتح کا حال بیان کیا ہے، جو ایک بیش قیمت تاریخی مأخذ ہے ۔ اسی شاعر نے بعض اور تصانیف، مثلاً سلاحشور نامہ اور سلیمان نامہ کی بنا پر شہرت حاصل کی.

اس زمانے میں منثور ادب نے معتدبہ ترقی کی ۔ زیادہ تر فنی نثر (نثرِ مرصع) کا رواج تھا ۔ اس کا قابل ترین نمایندہ سنان پاشا [رك بآن] تھا، جو تضرع نامہ ایک رسالۂ اخلاق اور ایک تذکرۂ اولیاء کا مصنف ہے ۔ مقدم الذکر اشعار سے مرصع ہے ۔ وہ مذہبی رنگ کی غزلیں قادرانہ طور پر لکھ سکتا تھا ۔ اس کا اسلوب تحریر وہی ہے جو عبداللہ انصاری کے مشہور رسالے میں پایا جاتا ہے، یعنی فنی اعتبار سے اس کے ظاہر پر صنعت کی نمود ہے، لیکن اس کا باطن فطری خیالات اور اخلاص سے پُر ہے ۔ رنگین و مرصع نثر کے بڑے بڑے نمایندے اس دور میں یہ ہیں : صاری کمال، جس نے تاریخ معجم کا ترجمہ کیا؛ آہی، جس نے نیشاپور کے فتاحی کی مثنوی حسن و دل کو ترکی زبان کا روپ دیا؛ مسیحی، مصنف گل صد برگ اور جعفر چلبی ۔ ان کے علاوہ اور بڑے انشاء پرداز یہ تھے : صدر اعظم محمود پاشا متخلص بہ عدنی، نشانجی محمد پاشا (مخلص : نشانی) اور طورسون بیگ معروف بہ بازیجی.

نثر میں تاریخ نگاری کی ترقی بھی شروع ہو گئی اور ترکی نے عربی اور فارسی کی جگہ لے لی ۔ بایزید ثانی کے عہد میں کئی مصنفوں نے تواریخ آل عثمان لکھیں، جن کے نام معلوم نہیں ۔ ان منثور تاریخوں میں، جن میں موقع موقع پر احمدی کے اسکندر نامہ کے اشعار درج کیے گئے ہیں، ان سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ پندرھویں صدی میں عوام اور بالخصوص عسکریوں کے درمیان ایسی تاریخیں موجود تھیں جو تقریباً رزم ناموں کی طرح کی تھیں ۔ درویش احمد عاشقی، معروف بہ عاشق پاشا زادہ اور اوروج بک کی تاریخی تصانیف ان مجہول الاسم تاریخوں سے اسلوب بیان میں زیادہ مختلف نہیں ہیں ۔ کاتب شوقی، بہشتی اور نشری کی تواریخ اسی عہد کی ہیں ۔ برخلاف اس کے طورسون بک [رك بآن] کی تأریخ ابوالفتح اور بیاتی کی جام جم آئین معاشرے کے اوپر کے طبقوں کے لیے لکھی گئی تھیں اور ان دوسری تاریخوں سے بہت مختلف ہیں ۔ بازیجی علی کی تصنیف، جس نے مراد ثانی کے عہد میں ایک سلجوق نامہ لکھا، جس میں علاوہ اور چیزوں کے راوندی کا خلاصہ اور ابن بی بی کا

ترجمه بھی شامل ھیں، ایک طرح سے اس دوسری قسم کی تاریخ نگاری کا مثالی نمونہ بن گئی ھے۔ ان میں سے ادبی تاریخی تصانیف، مثلاً طورسون بیگ کی تاریخ اور جعفر چلپی کی استانبول فتح نامہ سی، زیادہ تر ایک مخصوص اسلوب بیان اور وسیع مہارتِ ادبی کی نمایش کی غرض سے لکھی گئیں، جس کا بعض منثور تاریخی کتابوں پر افسوس ناک اثر پڑا۔

اس دور کی سلیس اور سادہ نثر کا ایک عمدہ نمونہ دلی لُطفی کا رسالہ ھے، جو ترکی زبان کی قدیم ترین مزاحیہ تصانیف میں سے ھے (طبع O. Rescher : *Orientalistische Miszellen*، ج ۲، ۱۹۲۶ء: ص ۳۰ تا ۳۳، مصنف کی زندگی کے بارے میں قبّ حیات، ۱۹۲۸ء، شمارہ ۱۰۰)۔

اس دور کی متعدد کتابیں اناطولی ترکی میں لکھی ھوئی بھی ملتی ھیں، جو مصر اور شام میں تالیف ھوئیں۔ مصر میں چرکسی ممالیک، زبان اور ثقافت کے اعتبار سے، ترک تھے اور ان کے دورِ حکومت میں کتابیں مشرق اور اناطولی ترکی میں تحریر ھوئیں۔ مؤرخ عَینی [رک بان] کا ترجمۂ قُدُوری اس دوسری قسم سے متعلق ھے۔ دیگر تصانیف یہ ھیں: حکمت نامہ، منظوم، جسے ابراھیم بن بالی نے ۸۹۳ھ / ۱۴۸۸ء میں قائت بک کے نام پر لکھا؛ قانصُوہ غُوری کی ترکی نظمیں؛ شاھنامہ کا ترجمہ، جو ایک شاعر شریف نامی نے ۹۰۲ھ / ۱۴۹۷ء میں قانصُوہ غُوری کے نام پر لکھا (قلمی نسخے برٹش میوزیم، اُپسالا، لینن گراڈ، ابراھیم پاشا کے کتب خانۂ نوشہر اور قسطنطنیہ کے ملت کتب خانہ سی میں محفوظ ھیں)۔ محمد بن بالی نے کتاب گزیدہ کو مشرق ترکی سے اناطولی ترکی میں ترجمہ کیا، جو موجود ھے۔ یہ محمد بن بالی شاید وھی ابراھیم بن بالی ھے جس کا ذکر ھو چکا ھے۔ ھمارے پاس ترکی زبان میں ایک خط بھی ھے، جو قانصُوہ نے سلیم اول کے نام لکھا تھا (طبع خلیل اِدھم، تاریخ عثمانی انجمنی مجموعہ سی، ۱۹۲۸ء، شمارہ ۱۹)۔

اس بیان سے ظاھر ھے کہ ترکی نثر و نظم میں ایرانی اثر پندرھویں صدی میں بہت بڑھ گیا تھا، یہاں تک کہ فارسی نثر و نظم کی تقلید ایک فیشن بن گیا تھا۔ سلطان محمد ثانی نے اناطولی شاعر شہدی سے آلِ عثمان کا ایک شاھنامہ فارسی میں اپنے لیے لکھوایا اور بایزید ثانی نے بھی حکم دیا کہ ادریس بدلیسی کی تاریخ [ھشت بہشت] فارسی میں لکھی جائے۔ علماء اور شعراء، جو الجزیرہ، آذربایجان، ایران اور خراسان کے رھنے والے تھے، عثمانی دربار میں آنے لگے، جہاں ان کی تعظیم و تکریم ھوتی تھی اور انھیں بڑے بڑے تحائف اور صلے ملتے تھے، جس سے ترکی شاعروں کو شکایت پیدا ھوئی۔ ان شعراء میں، جو مشرق سے آئے، ایک قابلِ توجہ شخصیت حامدی (ولادت ۸۳۴ھ/۱۴۳۰ء) کی ھے، جس کے دیوان میں فارسی اور ترکی اشعار موجود ھیں۔ وہ خود ترکی الاصل تھا۔ اسماعیل بیگ قسطمونی کے دربار میں رھنے کے بعد اسے ۸۶۴ھ/۱۴۵۹ء سے سلطان محمد ثانی کا قرب حاصل ھوگیا۔ اس زمانے کی تاریخ کے لیے اس کا دیوان خاصی دلچسپی کی چیز ھے۔

سلطان محمد ثانی اور بایزید ثانی کے دربار کے تعلقات ھرات کے دربار اور دوسرے مشرق درباروں سے بہت ھی دوستانہ تھے اور وہ ثقافتی اور ادبی رشتے، جو عثمانی سلطنت کو مشرق کے اسلامی، خصوصاً ترکی ممالک سے مربوط کرتے تھے، بہت مضبوط رھے۔ محمد ثانی، بایزید ثانی اور صدرِ اعظم محمود پاشا کے خواجۂ جہان، جامی اور جلال الدین رومی ایسے شعراء سے مراسم تھے

(قب مثلاً A Literary History of Persia : Browne، ۳ : ۴۲۲ تا ۴۲۳) - اسی طرح اس صدی کے آخر میں مشرقی شاعر علی‌شیر نوائی کی شہرت پوری ترکی مملکت میں تھی - پندرھویں صدی میں قدیم ترکی روایت کے پاؤں جمائے رکھنے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس وقت تک اویغور رسم‌الخط بالکل فراموش نہیں ہوا تھا؛ ملّت کتب خانہ سی میں ایک چھوٹی سی کتاب ہے، جو سلطان بایزید ثانی کو اویغور حروف سکھانے کی غرض سے لکھی گئی تھی اور ہبة الحقائق کا ایک نسخہ بھی موجود ہے، جو اویغور رسم‌الخط میں ہے - اس صدی کے خاتمے کے قریب عربی اور فارسی الفاظ کو شعر میں حدِ مناسب سے زیادہ استعمال کرنے کے خلاف سچ مچ ایک ردّ عمل پیدا ہوا - شعراء نے عروضی وزنوں میں شعر کہنے کی کوشش تو کی، مگر غیر ترکی الفاظ و عبارات سے پرہیز کرنے لگے؛ اس تحریک کا جو ''ترکیِ بسیط'' کہلاتی تھی، ایک نمایندہ وصالی شاعر ہے ـ

عوامی ادب، جس کا ذریعۂ اشاعت 'اوزان' [عوامی شاعر] تھے، گذشتہ صدیوں کی مانند اس صدی میں بھی موجود رہا اور درباروں میں اس وقت تک بھی اس کی قدر کی جاتی تھی - اگرچہ کلاسیکی فحول شعراء کے مقابلے میں 'اوزان' صرف غریب خنیاگر ھی رہ گئے تھے، مگر عوام میں ان کی مقبولیت باقی رہی - ہم جانتے ھیں کہ اس زمانے میں 'قصہ خوان'، جنھیں 'شاھنامہ خوان' اور 'مدّاح' [قب حکایہ، قصّاص اور مدّاح] بھی کہتے تھے، موجود تھے - وہ پرانے اسلامی رزمیہ قصے سنایا کرتے تھے اور انھوں نے اپنے گرد و پیش کی روز مرہ زندگی سے موضوعات اخذ کرنا شروع کر دیے تھے - ان موضوعات کی وجہ سے ایک قسم کی رکاکت پیدا ہوگئی، جس نے انھیں فحول کی جیّد شاعری سے اور بھی دور کر دیا - اس عہد کے عوامی ادب کی کوئی تصنیف اب ھمارے پاس موجود نہیں ہے - یہ فرض کرنا بےجا نہ ہوگا کہ قرہ‌گوز کے تماشوں (theatre) نے بھی اس زمانے میں ترقی کی [قب مادہ قرہ‌گوز اور خیالِ ظلّ -

سولھویں صدی ـ

سولھویں صدی عثمانی قوت و شوکت کے اوجِ کمال کا زمانہ ہے، جس میں سلطنت کو سب سے زیادہ قوت سلطان سلیم اول اور سلیمان قانونی کے عہدِ حکومت میں حاصل ہوئی - یہ ترقی زبان اور ادب کے میدان میں بھی منعکس ہوئی - بڑے بڑے ثقافتی مرکز، جو مکتبوں، تکیوں اور مدرسوں کی تأسیس سے پیدا ہوگئے تھے، ان میں زبان اور ادب نے ترقی کی - چونکہ روم ایلی پر حکومت کی خاص توجہ مبذول رہی، اس لیے یہیں ھمیں شاعروں کا جلوہ زیادہ تر نظر آتا ہے - اسی زمانے میں ترکی زبان اور یونانی اور صقلبی (Slav) زبانوں کا ایک دوسری پر زیادہ سے زیادہ اثر پڑا - جن خطّوں پر آذری غالب تھی، مشرقی فتوحات کی وجہ سے وھاں کے لوگوں کو بھی عثمانی بولی استعمال کرنے کی ترغیب ہوئی - قریم بھی رفتہ رفتہ ترکی ثقافت کے حلقۂ اثر میں لوٹ آیا - یہاں عثمانی ترکی کے شاعر پیدا ہونا شروع ہو گئے، جن میں خود کئی خوانین بھی شامل تھے (قب ایلک متصوفلر، ص ۱۹۷) - یہی اثر کردستان کے درہ بکوں (= جاگیرداروں) تک جا پہنچا - غیر ترک آبادی کے متنوّر لوگوں کو مجبوراً ترکی زبان سیکھنا پڑی، اور دوسری طرف استانبول نے دوسرے ترکی اور اسلامی ممالک سے علماء اور شعراء کو اپنی جانب کھینچنا شروع کیا۔

آلِ عثمان کے سب سلاطین اور شہزادے علم و فن (آرٹ) کے مربی تھے اور ان کے وزراء

ان کے نقشِ قدم پر چلتے تھے ۔ سلیم اول [رکّ بآن] نے ایک فارسی دیوان کے علاوہ عثمانی اور چغتائی ترکی میں نظمیں لکھیں ۔ سلطان سلیمان [رکّ بآن] بھی شعر کہتا تھا ۔ اس کا تخلص مُحبّی تھا ۔ وہ شروع ھی سے باقی شاعر کی غیر معمولی ذہانت و قابلیت کا معترف تھا ۔ صدرِ اعظم ابراھیم پاشا، جو خود شاعر تھا ، چند شعراء (خیالی، لامِعی اور رحمی) کا مربیِ خاص تھا ۔ سلیم ثانی، مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں بھی یہی رجحانات کار فرما رہے، تا آنکہ اس صدی میں اناطولیا کی ترکی علم و فن کے اظہار و اشاعت کا بڑا ذریعہ بن گئی ۔

فارسی کے شاعر جامی اور چغتائی کے شاعر نِوائی کا اثر سولھویں صدی میں بہت نمایاں طور پر محسوس ہونے لگا ۔ ان دونوں کی متعدد نظمیں عثمانی ترکی میں ترجمہ ہوئیں ، چنانچہ لامعی شاعر کو بعض اوقات ایسے ھی ترجموں کی بنا پر ''جامیِ روم'' کہا جاتا ھے ۔ دوسری طرف چغتائی میں نظمیں لکھنا بھی فیشن میں داخل ہو گیا ۔ مشرقی شعراء، مثلاً جمالی، نے نِوائی کی عظمت و شان کے اعلان میں بڑا حصہ لیا (جمالی کا دیوان، جس میں محض نِوائی کی نظموں کے 'نظیرے' ھیں طوپ قپو کے متحف میں ھے، شمارہ ۷۰۰)۔ بہت سے آذری شعراء نے عثمانی سلاطین کے دربار کے دامن میں پناہ لی ۔ اُن میں سب سے زیادہ مشہور یہ تھے : شاھی، جس نے شاہ اسماعیل صفوی کے دربار کو خیرباد کہہ دیا تھا اور حَبیبی، جو آق قویونلو سلطان یعقوب اور شاہ اسماعیل صفوی کے دربار کا رکن رہ چکا تھا ۔ حبیبی، فُضُولی کا پیشرو تھا (حبیبی کے لیے قبّ کوپرولو زادہ محمد فواد : آذری ادبیاتنه عائد تدقیقلر، باکو ۱۹۲۶ء) ۔ ان کے علاوہ چند آذری شعراء بھی تھے، مثلاً بصیری، جنھوں نے عثمانی ترکی میں شعر لکھنا شروع کر دیا تھا ۔ بہت سے شواھد اس کے بھی موجود ھیں کہ عثمانی دربار اور صَفَوی اور شیبانی، بلکہ ھند کے مغل شاھنشاھوں کے درباروں کے درمیان بھی جو ثقافتی رشتے تھے وہ بہت قریبی اور استوار تھے ۔ ان تعلقات کی دلچسپ تفاصیل مشہور سیاح سیّدی رئیس کے سفر نامے میں درج ھیں، جو کاتِبی تخلص کرتا تھا [قبّ مادّہ علی بن حسین] ۔

ادبی چرچا نہ صرف استانبول میں تھا بلکہ بغداد، دیاربکر، قونیہ، قسطمونی، بروسہ، ادرنہ، یکیجۂ وردار اور اُسکوب میں بھی موجود تھا ۔ استانبول میں شعراء، مختلف مقامات میں، جمع ہوا کرتے تھے، مثلاً چھوٹی چھوٹی دکانوں پر، جہاں بعض شاعر اپنا تجارتی کار و بار کرتے تھے، باغوں میں (مثلاً بشیکطاش کے باغِ بخشی میں)، غلطہ کے مشہور مے خانوں میں، تکیوں میں (مثلاً سُدلُوجہ کے تکیۂ جعفر آباد میں) اور منازلِ ('قوناق') اغنیاء میں (جن میں نگاری اور زِیرکی جیسے شاعر بھی شامل تھے) ۔ قہوہ نوشی کی ترویج کے بعد قہوہ خانے بھی اجتماع کے اھم مقام بن گئے اور یہاں آنے والے سوسائٹی کے ھر طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔ ادب کی یہ ترقی معماری، نقّاشی، خوش نویسی، موسیقی اور علم کی متعدد شاخوں کے ارتقاء کے دوش بدوش ہوتی رھی ۔ رحمی، ذاتی اور خیالی اور بالخصوص باقی اور فُضُولی جیسے شاعرانِ بزرگ کی فوق العادۃ ذکاوت سے ترکی زبان کا کلاسیکی [بلند پایہ] ادب پیدا ہو گیا ۔ یہ اس ایرانی کلاسیکی [رفیع] ادب سے قدر و قیمت میں کچھ کم نہ تھا جو اس کے لیے مثالی نمونہ بنا تھا ۔ یہ دعوے کہ ترکی ادب میں جدّت نہیں غلط ھے ۔ اس ادب کے گہرے مطالعے سے ھر شخص اس میں اس زمانے کے خیالات، معاشرے

کے حالات اور سلطنت کی عظیم الشان فتوحات کے نتائج اور مقامی احوال و کوائف کا عکس دیکھ سکتا ہے ۔ اس ضمن میں ہم خاص طور پر نثر کی مختلف اصناف اور تاریخی تصانیف کی بلند پایہ اہمیت کی جانب توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں ۔

سولھویں صدی میں بھی ترکی زبان ادب بدستور عربی اور فارسی سے الفاظ و تراکیب مستعار لیتی رہی ۔ سُرُوری، سُودِی، ابن کمال اور ریاضی ایسے علماء کی مساعی سے فقہ اللغۃ پر مشتمل شروح، معاجم اور نحوی کتابیں تصنیف ہوئیں ۔ بے شمار کتابیں عربی اور فارسی سے ترکی میں ترجمہ کی گئیں ۔ جو کچھ عربی و فارسی سے مستعار لیا گیا اس کی مدد سے ترکی شعراء اس قابل ہو گئے کہ اپنی نظموں کے عروض اور اسلوب کو مذاق زمانہ کے مطابق کامل و مکمل بنا سکیں؛ تاہم اس تحریک کا ثمرہ ایک ایسی خوبصورت، مگر مصنوعی زبان تھی جس میں ترکی زبان کی بہت سی فطری خصوصیات مفقود ہو گئیں ۔ دوسری طرف ہمیں ایسے شاعر ملتے ہیں جو اپنی نظموں کو ۔۔ غالباً نِجاتی کے اثر کے ماتحت ۔۔ امثال سے بھر دیتے ہیں (مثلاً جیسا گواھی کے پند نامہ یا کنزالبدیع میں ہے) ۔ بعض اور شعراء، مثلاً دُرُونِی طرابزونی، آگیہی یکیجۂ وَرداری، عِشقِی اور یتیم کے قصیدوں اور غزلوں میں جہازرانی کی اصطلاحات کی بھرمار ہے ۔ اس تحریک کے، جو 'ترکی بسیط' کے نام سے موسوم تھی (قبّ پندرھویں صدی کے عنوان کے نیچے، ص ۲۹۸ ف)، اس صدی میں دو نمایندے نظر آتے ہیں، یعنی طَطْوْلَہ کا مَحْرمِی (م ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء) مصنف بسیط نامہ اور اِدْرِنہ کا نَظْمی (م بعد ۹۶۲ھ / ۱۵۵۵ء)؛ (قبّ کوپرولو زادہ محمد فؤاد : مِلّی ادبیات جریاننگ ایلك مبشرلری دیوانِ تورکیِ بسیط، ۱۹۲۸ء).

قصیدہ اور غزل میں سولھویں صدی کی عظیم ترین شخصیتیں بہ ترتیبِ زمانہ یہ ہیں : ذاتی، خیالی، فُضُولی اور باقی.

ذاتی نے علاوہ قصائد اور غزلیات کے بہت سے اور آثار نظم و نثر میں چھوڑے، جو قدر و قیمت میں بہت متفاوت ہیں ۔ اس کی پہلی تصانیف میں احمد پاشا اور بالخصوص نِجاتی کا اثر صاف طور پر نمایاں ہے ۔ اس کی قوتِ تخییل اور اچھوتے خیالات نے اسے بہت مقبول بنا دیا ۔ اس کے کئی ایک شاگرد تھے ۔ ترکی شاعری کے ارتقاء میں اس کا مقام نِجاتی اور باقی کے درمیان ہے.

خَیالی [رَكَ بآن] کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب ذاتی اپنی شہرت کے اوج پر تھا، لیکن بحیثیت شاعر وہ خیالی اور دوسرے بہت سے شعراء سے گوے سبقت لے گیا ہے ۔ تذکرہ جی عَہدی بغدادی اسے ''حافظ روم'' کا لقب دیتا ہے ۔ اس کا دیوان اس کے جملہ منظومات پر حاوی ہے؛ کہا جاتا ہے کہ یہ دیوان ایک شخص علی چلبی نامی نے مرتب کیا تھا، گو شاعر خود ایک قصیدے میں، جو سلطان سلیمان کی مدح میں ہے، کہتا ہے کہ اس نے خود ایک دیوان مرتب کیا تھا ۔ اپنی جوانی میں خیالی صوفیہ، خصوصاً اُصُولی، کے زیر اثر رہا تھا، لیکن اس کا صوفیانہ کلام نسبۃً تھوڑا ھی سا ہے ۔ اس کی غزل ابداع کے اعتبار سے اس کے کلام کا بہترین حصہ ہے ۔ وہ فُضُولی سے بغداد میں ملا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فُضُولی کی نظموں پر 'نظیرے' لکھے ہیں.

فضولی کو، اگرچہ وہ بغداد کے قریب پیدا ہوا تھا اور اپنے اشعار میں آذری زبان استعمال کرتا تھا، ترکی ادب کا من حیث المجموع سب

سے بڑا شاعر تصور کرنا چاہیے۔ وہ ترکی الاصل اور بیات قبیلے سے تھا۔ اس نے دیوان کے علاوہ مثنوی لیلی و مجنون بھی تصنیف کی۔ ان دونوں نے تاریخ ادب میں اس کے لیے مقام پیدا کر دیا۔ اس کے اشعار میں عشق کبھی بھی کلیۃً مجازی نہیں ہوتا اور یہ اس کے تصوف کا فیضان ہے، لیکن جیسے ہی وہ قصیدے کا رخ کرتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بےکار تکلف اور تصنع میں پڑ جاتا ہے۔ اس کی لیلی و مجنون کو ابتکاری تصنیف سمجھنا چاہیے، جو کسی دوسری تصنیف سے مقتبس نہیں ہے۔ تمام ترکی دنیا میں سوائے نسیمی اور نوائی کے کسی اور شاعر نے اس جیسی شہرت حاصل نہیں کی۔ اس کا اثر عوامی خنیاگر شاعروں ('اوزان') پر بھی پڑا (قب کوپرولو زادہ محمد فؤاد : Introduction aux Külliyāt de Fuzūli، قسطنطنیہ ۱۳۳۲ھ، ص۳ تا ۲۲، تورکیات مجموعہ سی، ۲ : ۴۳۳ تا ۴۳۶).

خیالی کی وفات کے بعد باقی بلا شبہ استانبول کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس کی شہرت بہت سرعت سے پوری سلطنت میں بلکہ ہندوستان تک بھی پھیل گئی۔ بعد کے تمام شاعروں نے، انیسویں صدی تک اسے اپنا استاد تسلیم کر کے اس کی تعریف و توصیف کی ہے۔ اس کے قصیدے، مرثیے اور غزلیں حقیقۃً درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی ہیں۔ گو اس نے اپنے متعدد پیشرووں کے کلام سے فیض پایا، وہ اپنی شخصیت برقرار رکھتا ہے۔ عواطف و امیال کے اظہار میں باقی، فضولی سے کم تر درجہ رکھتا ہے، لیکن اس کے شعر کی دل کش موسیقیت اور بے عیب سہولتِ ادا نے اسے کلاسیکی ادب کا بے نظیر استاد منوا لیا ہے.

سولھویں صدی نے غزل اور قصیدے کے اور بھی متعدد استادانِ بزرگ پیدا کیے۔ ذیل کے شعراء انھیں میں سے تھے : حیرتی، جو نہایت جدت پسند شاعر تھا، روم ایلی کے شہروں کا حال اور اپنے معاشقوں کی کیفیت بیان کرتا ہے؛ اس کا دوست اسحاق چلبی؛ رحمی بروسوی، جو ہلالی کی مثنوی شاہ و درویش کے ترجمے اور اپنی نفیس غزلوں کی وجہ سے مشہور ہے؛ فغانی، جسے ابراھیم پاشا کے حکم سے قتل کیا گیا؛ اس کا جانشین مقالی اور استانبول کا دری زادہ علوی، جو جالبِ نظر قصاید کا مصنف ہے۔ اس صدی کے نصفِ آخر میں امری، عبیدی، مؤذن ھدایی اور نوعی غزل کے استاد تھے۔ نوعی صرف استادِ غزل ھی نہ تھا، وہ ایک بڑا عالم اور انشا پرداز (stylist) بھی تھا۔ بغداد کے روحی کا ذکر بھی ضروری ہے، جس کے ترکیب بند نے اس وقت تو نہیں، مگر بعد کے زمانے میں اسے شہرت بخشی۔ ان کے بعد فوری، جنانی بروسی اور سلیقی آتے ھیں، جنھوں نے اپنے مخمسوں اور مسدسوں کی وجہ سے نام پیدا کیا۔ شمی اور مشہور و معروف قرہ فضلی نے خیام کی طرز میں رباعیات لکھیں۔ ساعتی، شہرتی، ریاضی اور عطا '' ھجو'' میں بڑھ چڑھ کر تھے۔ دیگر شاعر، مثلاً ساغری، ثانی اور غزالی، معروف بہ 'دلی برادر'، 'ھزل' و 'مزاح' لکھتے تھے (قب مادہ غزالی اور کوپرولو زادہ محمد فؤاد : یکی مجموعہ، ۱۹۱۷ء، شمارہ ۱۰)۔ اب رھیں وہ دو اصنافِ کلام جن کا اس دور کی شاعری میں بہت رواج تھا، یعنی معما اور تاریخ (chronogram)، امری شاعر ان دونوں میں ید طولیٰ رکھتا تھا.

جہاں تک مثنوی کا تعلق ہے، بےشمار ترجموں اور ایرانی تصانیف کی تقلید کے پہلو بہ پہلو ھمیں مقامی موضوعوں پر بھی بعض نظمیں ملتی ھیں، جیسے 'شہر انگیز'، صوفیانہ نظمیں اور منظوم تاریخ نامے۔ 'یوسف و زلیخا' کا موضوع

بہت مقبول تھا، خصوصاً حمدی کی مثنوی یوسف و زلیخا۔ کئی شاعروں نے 'لیلی و مجنون' کی مثنویاں بھی لکھیں، جن میں فضولی کی مثنوی اوروں سے بدرجہا بہتر تھی۔ دیگر موضوع یہ تھے: مہر و مشتری، جس کا میری نے فارسی سے ترجمہ کیا، ابکار افکار اور بہرام و زہرہ، جن دونوں پر فہری نے طبع آزمائی کی وغیرہ۔ مشہور ترین مثنوی نویس یہ تھے: قرہ فضلی استانبولی، صاحب گل و بلبل؛ یحیی بک طاشلجی اور ان سے کچھ کم مشہور لامعی [رک بآن]۔ یحیی بک کی مشہور ترین نظم ایک مرثیہ ہے، جو شہزادۂ مصطفی کی وفات پر لکھا گیا (۱۵۵۳ء)؛ اس کی مثنویاں شاہ و گدا، گنجینۂ راز، کتاب اصول، گلشن انوار اور یوسف و زلیخا ایک جالب توجہ جدت اسلوب کی بنا پر امتیاز رکھتی ہیں [قب مادہ یحیی بک]۔ ہمیں آذری ابراہیم چلبی ۹۹۳ھ / ۱۵۸۵ء)، صاحب نقش خیال، اور مصطفی جنانی بروسوی (م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء)، صاحب مخزن الاسرار، ریاض الجنان و جلاء القلوب کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہیے۔ وصف بلدان میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں ان میں سے بروسہ کے حالات چند مثنویوں میں بیان کیے گئے، جن میں سے پہلی مثنوی لامعی کی ہے۔ ایسی تصانیف ادرنہ، دیار بکر اور استانبول وغیرہ کے بارے میں بھی ہیں؛ فقیری (م ۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء) کا رسالۂ تعریفات بھی اسی صنف کی چیز ہے اور اس لحاظ سے خاصا دلچسپ ہے کہ اس میں سوسائٹی کے مختلف طبقات کا حال بیان کیا گیا ہے (قب کوپرولو زادہ محمد فؤاد: حیات، ۱۹۲۱ء، شمارہ ۲)۔ نہالی بروسوی (م ۹۴۹ھ / ۱۵۴۲ء) کی غزلیں بھی اتنی ہی دلچسپ ہیں، جن میں شاعر نے مختلف ارباب حرفہ کے نوخیز حسینوں کا ذکر کیا ہے (قب کوپرولو زادہ محمد فؤاد: یکی مجموعہ، ۱۹۱۸ء، شمارہ ۶۲)۔

صنف مثنوی اس زمانے میں بھی بدستور صوفیانہ تصانیف، سیر اولیاء، صوفیانہ حلقوں کے سنن و معمولات کے مجموعوں اور لغت کی کتابوں وغیرہ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر مثنویوں کی ادبی قیمت برائے نام ہے۔ کئی شاعروں نے جامی اور نوائی کے تتبع میں "حدیث اربعین" نظم کی۔ خاقانی [رک بآن] کا مشہور حلیہ بھی اسی صنف میں شامل ہے اور یہی حال اس مصنف کے ترجمۂ "حدیث اربعین" کا ہے۔ سلیمان چلبی کے مولد کی شہرت کی وجہ سے آق شمس الدین زادہ حمدی کو اور اس کے بعد اور کئی شاعروں کو اسی موضوع پر طبع آزمائی کا شوق ہوا، لیکن ان میں سے کوئی بھی ویسی مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ آخر میں ہم ایک مثنوی دہ مرغ نامہ کا ذکر کر سکتے ہیں، جو عطار کی منطق الطیر کی تقلید میں لکھا گیا ہے اور جسے شاعر شمسی نے ۹۱۹ھ [۱۵۱۳ - ۱۵۱۴ء] میں سلطان سلیم کے نام پر لکھا۔

چونکہ اس صدی میں تصوف کی تحریک زور پکڑ گئی اور ہر جگہ نئے 'تکیے' کھل گئے، اس لیے یہ چیز تعجب خیز نہیں کہ عربی اور فارسی صوفیانہ تصانیف کے ترجموں کے ساتھ ساتھ مختلف حلقوں سے متعلق شعراء نے سبق آموز کتابیں، صوفیانہ نظمیں اور قصص اولیاء مرتب کرنا شروع کر دیے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر 'طریقے' کا اپنا ادب تھا۔ ان ادبوں میں زیادہ اہم وہ ہیں جو مارقانہ فرقوں سے متعلق ہیں، چنانچہ بکتاشیوں کے ادب کے نمایندے، جس کا ندیمی نے پندرھویں صدی میں آغاز کیا تھا، سید غازی کے تکیے کے درویش یتیمی اور عسکری اور دیگر لوگ تھے۔ ان میں سے بہت سی شخصیتیں

تاریخ مذہب کے اعتبار سے بہت جاذب توجہ ہیں، اس لیے کہ یہ لوگ اپنے افکار کا آزادانہ اظہار کرتے تھے جس سے بعض اوقات انھیں اپنی جانیں دینا پڑیں - ان کے ملحدانہ عقاید کی اشاعت نہ صرف مارقانہ فرقوں، مثلاً بکتاشیوں اور حروفیوں میں ہوتی تھی، بلکہ تاریخی ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح العقیدہ جماعتوں، مثلاً خلوتیوں اور ملامیوں میں بھی یہ عقائد شائع ہو رہے تھے - بعض اور صوفیوں، مثلاً پشیکتاش کے یحیی افندی وغیرہ نے، بہت سیدھی سادی نظمیں لکھیں .

آخر میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ مثنوی کے طریق پر کئی تاریخی تصانیف بھی لکھی گئیں - حدیدی نے آل عثمان کی تاریخ ۹۳۷ھ / ۱۵۳۱ء میں لکھی، مگر اس کے سوا باقی تاریخی مثنویوں کا موضوع ہمیشہ صرف ایک ہی تاریخی رکعہ (فتح بوڈا Buda، فتح جربہ، تسخیر یمن وغیرہ) ہوتا ہے یا کسی ایک سلطان (خصوصاً سلطان سلیمان) یا کسی ایک قائد (خیرالدین پاشا بربروسہ، اوازدمیر اوغلی عثمان پاشا وغیرہ) کے فتوحات کا مذکور .

نثر اس صدی میں ثقیل‌تر اور مصنوع تر ہو گئی - ایرانی سرمشقوں میں اغراق کو داخل کر کے اور سادہ ترین خیالات کو تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگیوں میں الجھا کے ایسا گورکھ دھندا بنا دیا گیا کہ مطالب خبط ہو گئے - ذوق سلیم کا یہ فقدان اس عہد کے بڑے سے بڑے انشاء پردازوں میں پایا جاتا ہے، یعنی لامعی، کمال پاشا زادہ، جلال زادہ، فریدون بیگ، عظمی مترجم ہمایون نامہ، علی چلبی، قینالی زادہ علی چلبی، خواجہ سعدالدین [رک بآن] وغیرہ میں - تکلفات منشیانہ کی طرف اس رجحان کا اثر نظم کی بہ نسبت نثر کے لیے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوا - سلیس اور سادہ زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کو تعلیم یافتہ لوگ حقارت سے دیکھتے تھے، مگر سچ یہ ہے کہ زیادہ ضخیم کتابوں میں صرف دیباچہ ہی اس متکلفانہ اور بھونڈے انداز میں لکھا جاتا تھا، ورنہ اس دور میں بہت سی ادبی، تاریخی، مذہبی یا اخلاقی کتابیں خاصی سادہ زبان میں لکھی گئی تھیں - یہی حالت سرکاری مراسلات اور حکومت کی دیگر دستاویزات کی تھی - مذہبی کتابوں میں، جو عوام کے لیے لکھی جاتی تھیں، پوری کوشش کی جاتی تھی کہ طرز بیان حتی‌الامکان سادہ ہو - باقی اور فضولی کی جو نثر ہمارے پاس موجود ہے اس کی زبان شستہ اور نسبۃً سادہ ہے .

ہم تاریخی تصانیف کو پہلے لیں گے، کیونکہ یہ وہ میدان ہے جس میں اس صدی میں بہت ترقی ہوئی، اس لیے کہ تعلیم یافتہ طبقوں کو سلطنت کی فوجی کامیابیوں میں بہت دلچسپی تھی - سلجوقی روایت کے مطابق منظوم تاریخیں لکھی گئیں، مگر سلطان بایزید ثانی اور سلیم اول کے عہد سے ہمیں منثور تاریخیں بھی ملتی ہیں - ادریس بدلیسی کے لڑکے نے اس کی سرکاری تاریخ آل عثمان کا، جو فارسی میں لکھی گئی تھی، ترکی میں ترجمہ کیا - دیگر عمومی تواریخ کے مصنف ابن کمال، جلال زادہ مصطفی چلبی (اس کی تاریخ کا عنوان طبقات الممالک تھا)، محی الدین جمالی، لطفو پاشا، خواجہ سعدالدین اور عالی تھے - ان کے علاوہ بعض مخصوص تاریخیں بھی ہیں، جو خاص خاص دوروں یا خاص واقعات سے متعلق (''فتح نامہ'' کی شکل میں) لکھی گئیں - اسی طرح کچھ سیرتیں بھی ہیں (مثلاً جواہر المناقب متعلق بہ صوقوللی) - اس کے ساتھ ہی دربار میں ''شہ نامہ جی'' کا منصب بھی برقرار رہا - سلطان سلیمان کے عہد میں اس منصب پر فتح علی عارف چلبی مامور تھا اور اس کے جانشینوں میں

افلاطون شروانی، سید لقمان اور تعلیقی زادہ (م ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء) شامل تھے - یہ لوگ ترکی زبان کے شاعر بھی تھے، مگر روایت اس کی متقاضی تھی کہ 'شہ نامہ' فارسی میں اور بحر متقارب میں لکھا جائے۔ یہ سلسلہ جاری رہا، تا آنکہ محمد ثالث نے اسے ترکی میں لکھنے کا حکم دیا - تعلیقی زادہ کے وقت سے متن 'شہ نامہ' میں نثر بھی منفرق مقامات میں نظر آنے لگی - تاریخی نقطۂ نظر سے یہ سرکاری شہ نامے طبعاً غیر سرکاری تاریخوں کے مقابلے میں کم تر اہمیت رکھتے ھیں - گو سعدالدین کی تاج التواریخ کی سی تصانیف اسلوب تحریر کے مثالی نمونے ھی متصور ھوتی تھیں، لطفی پاشا [رک بان] کی تاریخ، جس کا انداز بیان قدیم تاریخوں سے زیادہ مشابہ ھے اور بالخصوص اس کا آصف نامہ، اس زمانے کی معاشری تاریخ کے علم کے لیے ھمارے واسطے بہت زیادہ اھم ھے - سِلانیکلی مصطفی اِفندی کی تاریخ سے یہ اندازہ ھو سکتا ھے کہ اس صدی کے آخر میں نظامِ حکومت کس قدر خراب تھا - عالی [رک بان] کو ھمیں اس عہد کا سب سے بڑا مؤرخ ماننا چاھیے اور اس کی دوسری تصانیف سے یہ بات صاف ظاھر ھے کہ وہ تقریباً ھمہ گیر علمیت کا آدمی تھا - نہ صرف اس کی کُنہ الاخبار، بلکہ اس کی نصیحۃ السلاطین، قواعد المجالس اور مناقبِ ھنروران سے بھی یہ پتہ چلتا ھے کہ مصنف ایک کڑا ناقد تھا، جو اپنے زمانے کے احوالِ زندگی سے بخوبی واقف تھا - اس کی تاریخی تصانیف کا اسلوب مقابلۃً سادہ ھے (اس کی زندگی اور تصانیف کے لیے دیکھیے ابن الامین محمود کمال کا مقدمہ، جو اس نے تصدیر مناقب ھنروران کے لیے لکھا، استانبول ۱۹۲۶ء) - شقائقِ نعمانیہ بھی اسی صدی سے متعلق ھے، جسے طاش کوپرو زادہ [رک بان] نے عربی میں لکھا اور جسے اِدرنہ کے مجدی اور بلغراد کے خاکی نے زیادات کے ساتھ ترکی میں ترجمہ کیا - اسی صدی میں بہت سی کتبِ تراجم بھی لکھی گئیں، جن میں ترکی صوفی شیوخ کے حالات خاصی تاریخی دلچسپی رکھتے ھیں - ایسی ھی دلچسپی کی چیزیں چند مزاحیہ ھلکی پھلکی تصانیف میں بھی موجود ھیں، مثلاً لامعی اور نیکساری زادہ کے نفس الامر نامے (قب ملّی تتبعلر مجموعہ سی، شمارہ ۳).

تاریخی کتابوں میں سے وہ جو تاریخ ادب سے متعلق ھیں انھیں ایک اھم مقام حاصل ھے۔ سب سے پہلا عثمانی تذکرہ ھشت بہشت ھے، جسے سہی نے ۹۴۵ھ / ۱۵۳۸ء میں نوائی کی مجالس النفائس کی طرز پر لکھا - اس کے بعد لطیفی [رک بان]، عاشق چلبی [رک بان]، عہدی بغدادی اور حسن چلبی [رک بان] نے تذکرے لکھے - عالی نے بھی اپنی کُنہ الاخبار میں شعراء کے تراجم دیے ھیں، جو اھم ھیں - 'نظیروں' کے مجموعوں کی تالیف کا دستور سولھویں صدی میں بھی دیکھنے میں آتا ھے ('نظیرے' دوسرے شعراء کے کلام پر لکھے جاتے ھیں)، مثلاً جامع النظائر، مصنفۂ حاجی کمال در ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء، جس میں دو سو چھیاسٹھ شعراء وغیرہ کا کلام ھے اور اس سے ترکی شاعروں کے بارے میں ھماری معلومات میں بہت اضافہ ھوا ھے۔

اسی صدی میں جغرافیے کی کتابیں اور سیاحت نامے وجود میں آنے لگے - پندرھویں صدی میں ھمیں محض ترجمے اور قزوینی اور ابن الوردی سے اقتباسات ملتے ھیں یا بطلیموس (Ptolemy) کا ترجمہ، جو یونانی سے کیا گیا - سولھویں صدی میں ان دونوں کتابوں کا پھر سے ترجمہ ھوا، اسی طرح مصنفین ذیل کی جغرافیائی کتابوں کا بھی ترجمہ ھوا :

ابوالفداء (ترجمہ از سپاھی زادہ)؛ اصطخری (ترجمہ از شریف افندی)؛ علی قوشجی، اس کی تصنیف جغرافیۂ ریاضی پر ہے)؛ اسی طرح مصر کے جغرافیائی حالات پر مشتمل کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ۔ ایک تاجر علی اکبر خطایی کی فارسی تصنیف کا چین سیاحت نامہ سی کے نام سے سلطان مراد ثالث کے لیے ترکی میں ترجمہ کیا گیا ۔ پیری رئیس [رک بآن] کی مشہور تصنیف، بحریہ، تصنیف ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۹ء، ترکی سلطنت کی بحری حکمت عملی کا نتیجہ تھی ۔ کسی حد تک یہ صفائی کی طرح کے قدیم تر نقشہ نویسوں اور اطالوی نقشوں کی رہین منت ہے ۔ سلطان سلیمان کی بڑی سہموں کی وجہ سے مطراقچی نصوح کی کتاب مرتب ہوئی، جس میں بہت سے قابل تعریف چھوٹے چھوٹے قلمی خاکے ہیں ۔ سیدی علی رئیس نے بحر ہند میں اپنی ناکام مہم کے بعد کتاب محیط لکھی، اگرچہ یہ کتاب سراسر قدیم تر عربی تصانیف پر مبنی ہے ۔ اسی مصنف کی مرآۃ الممالک میں نسبۃً بہت زیادہ ابداع ہے ۔ اس کے بعد احمد بن ابراہیم تاجر کا منظوم سیاحت نامہ آتا ہے، جس میں اس نے اپنے بحری سفر ہند کے حالات بیان کیے ہیں ۔ محمد عاشق طرابزونی کی مناظر العوالم بہت اہم کتاب ہے؛ یہ پرانے عرب جغرافیاؤں پر مبنی ہے، لیکن اس میں ممالک عثمانیہ کے بارے میں نئی اور قیمتی اطلاعات موجود ہیں ۔ آخر میں ہم ایک کتاب تاریخ ہند غربی کا ذکر کر سکتے ہیں، جو نئی دنیا کی دریافت سے متعلق ہے اور جسے محمد یوسف الھروی نے ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں کسی یورپی زبان سے ترجمہ کیا (اس ادب کے لیے قب Taeschner، در Z. D. M. G.، ج ۷۷، ۱۹۲۳ء) ۔

ترکی کے ادب رفیع کے پہلو بہ پہلو ہمیں عوامی ادب بھی بڑھتا نظر آتا ہے، جس کی اشاعت 'قصہ خوان'، 'مداح' اور 'قراگوزجی' عام پسند قہوہ خانوں اور ینکی چری کی بارکوں میں کرتے رہتے تھے ۔ کئی کلاسیکی شعراء نے بھی عوام کے لیے توُرکُو (= türkü، ترکی عوامی گیت) [رک بآن] لکھے ۔ یہ توُرکُو عروضی اوزان اور ''مربعوں'' کے قالب میں منظوم ہوے؛ بعد میں انھوں نے ''شرقی'' [رک بآن] نام پایا ۔ نظم کی یہ شکل ترکوں کی قدیم تر قوالب شعر میں سے ہے، لیکن ان پڑھ شاعروں، مثلاً انوری، ثیابی، رابی، رحیقی وغیرہ کی تصانیف، جو کلاسیکی شعراء کی تقلید میں لکھی گئی تھیں، عوام کے مذاق کے زیادہ مطابق تھیں ۔ عوام کے مجمعوں میں ایسے قصے، جیسے کہ ابومسلم، حمزہ نامہ، بطال غازی وغیرہ بہت ذوق و انہماک سے سنے جاتے تھے ۔ اس سے استانبول کے ہاشمی کو مثنوی برق و پولاد لکھنے کی ترغیب ہوئی، جو حمزہ نامہ سے ماخوذ تھی اور جس سے کئی دیگر مصنفوں اور شاعروں کو ایسی ہی کتابیں لکھنے کا خیال پیدا ہوا ۔ سلطان سلیمان نے صالح افندی سے قصۂ فیروز شاہ کا ترکی ترجمہ آٹھ جلدوں میں تیار کرایا ۔ یہی صالح جامع الحکایات کا بھی مترجم ہے ۔ قصہ خوان سلاطین کے محلوں میں بھی موجود رہتے تھے ۔ قدیم اسلامی اور ایرانی موضوعات کے ساتھ ساتھ ہمیں روز مرہ کی زندگی سے متعلق کہانیوں کے مجموعے بھی ملتے ہیں، مثلاً شاعر وحدی کی تصنیف کردہ بورسہ‌لی خواجہ عبدالرؤف افندی، حکایہ سی، جسے انا باجی حکایہ سی بھی کہتے ہیں ۔ روز مرہ کی زندگی سے متعلق سیدھے سادے اسلوب کی کہانیوں سے، جو مصطفی جنانی بروسوی نے لکھیں، ہمیں اس زمانے کے عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں کافی بصیرت حاصل ہوتی ہے ۔ اینسا ہی ایک اور شاعر سہدی

تھا، جس کا اصلی نام درویش حسن اور جو سلطان مراد ثالث کا 'مدّاح' تھا (قب ریو: *Cat. of Turk. Mss.*، ص ۴۲).

سولھویں صدی میں 'اوزان' (عوامی شاعروں) کی سرگرمیوں کے بارے میں ہمارے پاس نسبۃً زیادہ معلومات ھیں، اگرچہ اب وہ عام طور پر 'عاشق' یا 'چوؤگوزجو' کہلانے لگے تھے - یہ جگہ جگہ پھرنے والے شاعر-گویے، جہاں بھی عوام کا اجتماع ہو، وھاں نظر آتے تھے اور اپنی نظمیں، یعنی عشقیہ گیت، رزمیہ افسانے، مراثی اور 'توُرکوُ' جو وزنِ وتدی میں ھوتے تھے، سنایا کرتے تھے - اس صدی کے شروع میں بخشی نے سلطان سلیم اول کے حملۂ مصر کے متعلق ایک رزمیہ نظم لکھی، جس کا ایک حصہ ہمارے پاس موجود ھے - اس صدی کے آخر میں ھمیں جو نام ملتے ھیں وہ یہ ھیں : قُل محمد (م ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء)، اوکسوزُ دده، خیالی اور کوراوغلی، اور المغرب کی قلعہ نشین فوجوں میں چرپانلی، آرسودلو، قُل چولغہ، گدا مُصلُو (قب نیز کوپرولو زادہ محمد فؤاد : تورك ساز شاعرلری، ۱۹۳۰ء) - معاشرے کے مختلف طبقات کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض اوقات ثقافت پذیر طبقوں میں وزنِ وتدی استعمال ہونے لگا (لیکن یہ استعمال بالخصوص 'ہزل' میں ہوتا تھا) اور عروضی اوزان عوامی گیتوں میں برتے جانے لگے، عین اس طرح جیسے کبھی پہلے مذھبی نوعیت کی نظموں میں ہوتا تھا، تاھم صوفی شاعر، یونس اِمرہ کی روایت کی پیروی کرتے ہوے، اپنی 'الھیان' وتدی وزن ھی میں لکھتے رھے - آتی سِنان (م ۹۰۸ھ / ۱۵۰۱ء)، احمد ساربان (م ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء)، اِدریس مُختفِی (م ۱۰۲۴ھ / ۱۶۱۵ء) اور سید سیف اللہ خَلوتی (م ۱۰۱۰ھ / ۱۶۰۱ء) کے نام اس سلسلے میں ھم یہاں لکھ سکتے ھیں، لیکن یونس اِمرہ اور قیغوسز کے سب سے بڑے جانشین بکتاشیوں اور قزلباشوں میں پائے جاتے تھے، مثلاً قُل ھِمّت اور اس کا شاگرد پیر سلطان ابدال سیواسی، جسے ۱۶۰۰ء میں خِضر پاشا کے حکم سے قتل کیا گیا (قب سعدالدین نُزھت : پیر سلطان ابدال، ۱۹۲۹ء) - اس دَور کے عوامی ادب کے آثار میں حسن اوغلی تورکولری، قرہ اوغلان تورکوسو اور گیک دِستانی بھی شامل ھیں.

ستر ھویں صدی.

سلطنت کے سیاسی زوال کے باوجود ذھنی اور ادبی زندگی کی معمولی رفتار بدستور جاری رھی - عثمانی ادبی زبان کا علم مسلمانوں کے نیچے کے طبقوں میں اور اسی طرح غیر ترکی آبادیوں یا ایسے اضلاع میں جہاں کوئی غیر عثمانی ترکی بولی رائج تھی (مثلاً مشرق اناطولیا میں، جہاں کی بولی آذری تھی) اور قریم (Crimea) میں عام طور پر پھیل گیا - قریم میں متعدد عثمانی زبان کے شاعر پیدا ہونے لگے، جن میں خود وھاں کے خان بھی شامل تھے - ترکی ادب و تہذیب کا اثر سولھویں صدی ھی میں اس طرح سے ظاھر ہونے لگا کہ مسلمانانِ ھنگری اور کروایشا (Croatia) نے عربی رسم الخط استعمال کرنا شروع کر دیا (قب *Ungarische Bibliothek*، ۱۹۲۷ء، شمارہ ۱۴) - ایک ترکی-سربی لغات بنام پوتور شاھدیہ مصنفۂ ھوایی، بھی موجود ھے (*Bull. de la Soc. scient. de Skoplije*، ۳ : ۱۸۹ تا ۲۰۲) اور ایک ایسی ھی ترکی-بوسنوی فرہنگ مصنفۂ اُسکوفی اور کئی منظوم ترکی-یونانی فرہنگیں بھی محفوظ ھیں.

استانبول کو ھمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رھی اور تمام اقطارِ سلطنت بلکہ حدودِ سلطنت کے باھر سے بھی اصحابِ علم و فضل اس میں آ کر

جمع ہوتے رہے ۔ سلطان مراد رابع کے سوا کسی سلطان کو ادب میں دل چسپی نہ تھی اور ارباب سیاست میں سے بھی نسبۃً کم ہی لوگ ادب کے سر پرست تھے۔ ان سر پرستانِ ادب کے زمرے میں الیاس پاشا، مصاحب مصطفٰی پاشا، رامی پاشا اور شیخ الاسلام یحیٰی اور بہایی شامل تھے ۔ اس ناقدری اور مدرسوں کے انحطاط کے باوجود اس صدی میں بھی کچھ قابل علماء دیکھنے میں آتے ہیں، مثلاً صاری عبداللہ [رک بان]، اسماعیل انقروی، اسحاق خواجه سی، احمد افندی وغیرہ ۔ تاہم اس صدی میں علوم دینی کی مختلف شاخوں اور فقہ لغۃ عربی کے نامور نمایندے پیدا نہیں ہوے اور مدرسوں اور تکیوں کی باہمی کشمکش سے، جو ''قاضی زادوں کا مسئلہ'' کہلاتی ہے، یہ عیاں ہوتا ہے کہ مدارس میں اب تک بھی کتنی تنگ نظری موجود تھی، لیکن ہرچند صوفی حلقوں کو، جن کے مقاصد بعض اوقات سیاسی بھی ہوتے تھے، نشانۂ ظلم و تعدی بنایا جاتا رہا، پوری مملکت میں ان حلقوں کے بلستور پھولتے پھلتے رہنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو سکی.

سترھویں صدی کی ''کلاسیکی'' ترکی شاعری اپنے فارسی مثالی نمونوں سے کسی طرح بھی کم‌تر درجے کی نہ تھی، لیکن بجاے اپنے آپ کو تقلید و ترجمے کے لیے وقف کر دینے کے ترک شاعر اب ابتکاری موضوعوں پر کام کرنے لگے تھے ۔ اس کے برخلاف یہ بھی صحیح ہے کہ ہم عصر ایرانی اور هندی-ایرانی شعراء کا اثر ابھی تک برابر محسوس ہوتا تھا ۔ نفعی عُرفی کا، نابی صائب کا، اور نائلی قدیم شوکت کا مقلد نظر آتا ہے ۔

نفعی [رک بان] کو اس کے تخیل کی قوت، زبان کے مادۂ وافر اور متوافق اسلوب کی بنا پر ترکی قصیدہ گویوں میں سے بہترین قصیدہ گو تصور کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے برخلاف اس کی غزلیں اور ہجویں اس حد تک کامیاب نہیں ہیں ۔ نفعی کے جانشین ہمیشہ اس سے بہت متاثر رہے، اگرچہ اس کے دور میں کئی بڑے بڑے 'قصیدہ جی' (قصیدہ گو)، مثلاً نوعی زادہ عطایی، قاف زادہ فائضی، ریاضی، صبری اور رضایی بھی موجود تھے ۔ غزل کا سب سے بڑا نمایندہ شیخ الاسلام یحیٰی [رک بان] تھا، جسے باقی کا جانشین سمجھا جا سکتا ہے، بالخصوص اس لیے کہ اسے احساسات و عواطف کے اظہار پر باقی ہی کی طرح قدرت حاصل تھی ۔ اس کی شہرت بھی اسی کی طرح بعد میں آنے والی صدیوں میں قائم رہی ۔ باقی اور یحیٰی کے دبستان کے دیگر نمایندے شیخ الاسلام بہایی اور وجدی ہیں ۔ وجدی کے برعکس فہیم [رک بان]، نائلی قدیم [رک بان]، شہری، حتی که نابی [رک بان] بھی، یہ سب شاعر معاصر فارسی شاعری سے متأثر تھے ۔ نابی، جس پر صائب کے اثرات نمایاں ہیں، اپنی ''خیریہ مثنویوں'' اور غزلوں کی بدولت مشہور ہوا ۔ اس کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شعر پر عقلی نظریے غالب ہیں، لیکن اس سے اس کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا ۔ اپنی بہت سی نظموں میں وہ اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی کا حال بیان کرتا اور اس پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے ۔ اس کا نوجوان ہم عصر ثابت [رک بان] اپنی جدت پسندی کے اظہار کی کوشش میں اپنے کلام کو ایسی تعبیرات سے جو امثال کی طرح زبان زدِ خاص و عام ہیں آراستہ کرتا ہے ۔ سترھویں صدی کے غزل‌گو استادوں میں ہم نشاطی مولوی، جوری اور رامی محمد پاشا کا ذکر بھی کر سکتے ہیں.

عظمی زادہ حالتی [رک بان] کو سب اصنافِ سخن میں کمال حاصل تھا، مگر وہ سب سے زیادہ

اپنی رباعیات کی وجہ سے مشہور ہے ۔ لغز اور معمّا
کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی طرح
مادہ ہاے تاریخ (chronogram) نظم کرنے کو
بھی ۔ 'ہجو' اور 'مزاح' نے ، جو مختلف شکلوں میں
لکھی جاتی تھیں، فحول شعراء کو بھی فحش اور
رکیک چیزوں کے لکھنے پر آمادہ کیا ۔ تاہم
اس نوع کے بعض آثار کو بہ نظرِ استحسان دیکھا
جاسکتا ہے، جیسے گفتی کا تذکرہ بہ شکل مثنوی، جس
میں شاعر نے معاصر شعراء کا خاکہ کھینچا ہے ۔
نفیم اور چوری کی ہجویں، جو 'ملمّع' کی شکل میں
لکھی گئیں ہیں، اس لیے عجیب و غریب ہیں
کہ ان میں غیر ترکی زبانوں کے ٹکڑے بیچ بیچ
میں جوڑ دیے گئے ہیں.

اس صدی کے نصفِ اول کی بعض مثنویاں
قابلِ ذکر طور پر درجۂ کمال کو پہنچ گئی ہیں ۔
پرانے 'خمسوں' کے موضوعات کی جگہ رفتہ رفتہ مقامی
موضوعوں نے لے لی ہے ۔ اس طرز کا سب سے بڑا
نمایندہ نوعی زادہ عطایی [رک بآن] ہے، جس نے
اپنے خمسے کی بدولت، جس کے مضامین اس نے
اپنے زمانے کی زندگی سے اخذ کیے ہیں، بہت
شہرت حاصل کر لی ۔ اس شاعر کے کلام میں
اس کے پیش‌رووں، مثلاً یحیی تاشلیجی اور جنانی،
کے اثرات پائے جاتے ہیں (قب " سولھویں صدی") ۔
اس کے بعد ہم مندرجۂ ذیل مثنوی‌گو شعراء کا
نام لے سکتے ہیں : قاف زادہ فائضی، غنی زادہ
نادری اور ریاضی ۔ یہ زیادہ تر اسی صدی میں ہوا
کہ فارسی شاعر ظہوری کی تقلید میں 'ساقی نامے'
لکھنے کا رواج ہو گیا، اگرچہ یہ صنف اس سے
پہلے بھی دیکھنے میں آتی ہے، جیسا کہ روانی
کے عشرت نامہ (سولھویں صدی) سے ظاہر ہے ۔
'ساقی ناموں' میں خاص طور پر قابلِ ذکر عطّایی،
ریاضی اور حالیتی کے ساقی نامے ہیں ۔ یہ سب
تصوف کے رنگ میں رنگے ہوے ہیں ۔ اس طرح
گویا مثنوی روز مرہ کی زندگی کے تمام
موضوعات کو ادا کرنے کا کام دینے لگی، یعنی ایسے
موضوعات جیسے کہانیاں، اوصاف، نظری تصانیف،
حقیقی واقعات کے قصے وغیرہ .

اس صدی میں دینی اور صوفیانہ کتابوں اور
مختلف 'طریقوں' سے متعلق اخبارِ اولیاء اورسبق آموز
تصانیف بہت بڑی تعداد میں تالیف ہوئیں ۔ اکثر
انھیں شعری قالبوں میں ڈھالا جاتا تھا ۔ نادری
کی معراجیہ بہت مشہور ہے ۔ پھر رسول اللہ[ص]
کی مدح میں نعتیں، حدیثِ اربعین اور مولدوں
وغیرہ کے منظوم ترجمے ہیں ۔ صوفیانہ شاعروں میں
سے بعض ایسے تھے جنھوں نے وتدی وزن استعمال
کیا ، اس سلسلے میں ہم نیازی مصری کا ذکر
کرتے ہیں، جو طریقۂ خلوتیہ کی مصری شاخ کا
بانی تھا اور جس کی نظمیں عرصے تک مقبول رہیں۔
بکتاشیوں کے حلقے میں بھی کئی شاعر شامل تھے ۔
علاوہ ازیں بہت سی منظوم تاریخی تصانیف شاہنامے،
غزا نامے وغیرہ بھی ہیں، مثلاً سلطان عثمان ثانی کے
عہد کا شاہنامہ از نادری اور ایسی ہی دیگر تصانیف ۔
اس شہنشاہنامہ کا جسے ملہمی نے مراد رابع
کے حکم سے لکھا تھا، صرف دیباچہ ترکی میں ہے،
باقی حصہ روایتِ قدیم کے مطابق فارسی میں ہے ۔
اسی صدی میں عثمانی تواریخ کے منظوم ملخص
لکھنے کا دستور شروع ہوا: چنانچہ طالبی کی تاریخ
۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء میں لکھی گئی، نثاری
(م ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء) کی تاریخ سلطان محمد
رابع کے لیے لکھی گئی اور صولاق زادہ ہمدمی کی
فہرست شاہان محمد رابع کے نام پر لکھی گئی ۔
فہرست مذکور کے ذیلوں کا سلسلہ ضیاء پاشا تک، جو
انیسویں صدی میں تھا، متعدد شاعروں نے جاری
رکھا ۔ اس قسم کی کتابوں کی چنداں قدر و قیمت

نہیں، نہ تاریخی نہ ادبی۔

ادبی نثر انہیں راستوں پر گامزن رہی جن پر گذشتہ صدی میں تھی ۔ بڑے بڑے انشاء پردازوں مثلاً ویسی، نرگسی، اوقچی زادہ وغیرہ، نے زبان کے تکلف اور تصنع کو اور بھی زیادہ غلو کے درجے تک پہنچا دیا ۔ اس نثر کا نفیس نمونہ ان سرکاری مراسلات میں ملتا ہے جو دربار ایران کو بھیجے گئے اور جو حکمی جیسے منشیوں نے لکھے : یہی اسلوب تحریر، جو ذوق سلیم سے عاری تھا، بعض اوقات نجی خط و کتابت میں بھی مستعمل تھا ۔ وہ تصانیف جن کی اپنے زمانے میں ادبی قیمت کچھ نہ تھی، اس زمانے میں وہی سب سے زیادہ نظر استحسان سے دیکھی جاتی ہیں، مثلاً قوچی بیگ، کاتب چلبی، اولیا چلبی اور نعیما کے آثار ۔ اس صدی میں بھی منثور تصانیف میں تاریخ کی کتابیں سب سے مقدم ہیں ۔ ان میں سے کئی ایسی ہیں جن کی نوعیت نیم سرکاری کتب وقائع کی سی ہے، مثلاً وہ شہنامہ جو طاش کوپرو زادہ نے نثر میں سلطان عثمان ثانی کے لیے لکھا ۔ مراد رابع نے قابلی کو ایروان کی مہم کا وقائع نویس مقرر کیا ۔ ۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۳ء میں نشانجی عبدالرحمان پاشا کو سلطان محمد رابع نے وقائع نویسی پر مأمور کیا اور اسی طرح فندقلی کے محمد خلیفہ کو سلطان مصطفی ثانی نے مقرر کیا ۔ نعیما کو کچھ بعد ہی میں 'وقائع نویس' بنایا گیا ۔ اس زمانے کی تاریخی تصانیف چند طرح کی ہیں۔ ان میں اسلام کی عمومی تاریخوں کے تراجم، اسی موضوع پر ابتکاری تصانیف اور عثمانی تاریخ سے متعلق عمومی اور خصوصی مفرد تصانیف (mono-graphs) شامل ہیں ۔ تاریخی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہم جامع الدول، جو منجم باشی نے عربی میں لکھی، کاتب چلبی کی فذلکہ اور پچوی کی تاریخ ہیں اور سب سے اچھی تاریخ نعیما کی تصنیف ہے ۔ عظیم المرتبہ موسوعہ نویس کاتب چلبی [قب حاجی خلیفہ] بھی اپنی میزان الحق اور دستور العمل میں اپنے آپ کو ایک نافذ البصیرت مؤرخ ثابت کرتا ہے ۔ اسی طرح پچوی [رک بآن]، جس نے عیسائی مآخذ سے کام لیا ہے، اپنی صائب رائے اور بے طرفی کی بنا پر بہت قابل قدر ہے ۔ نعیما [رک بآن]، جسے وصف نگاری میں اعلی پایے کی قدرت حاصل ہے، تاریخی کرداروں کے زندہ نفسیاتی تجزیے پیش کرتا ہے ۔ قوچی بیگ [رک بآن] اپنی مشہور تصنیف رسالہ میں سلطنت کے اسباب زوال پر تبصرہ کرتا ہے ۔ قرہ چلبی زادہ کو بجائے مؤرخ کے 'منشی' کہنا زیادہ صحیح ہوگا ۔ علاوہ ازیں بعض اور وقائع نویسوں، مثلاً وجیہی، حسن بک زادہ، صولاق زادہ اور ذیل شقائق نعمانیہ کے مصنف نوعی زادہ عطایی اور ذیل کے تتمے کے مصنف عشاقی زادہ کا ذکر بھی ضروری ہے ۔

اس صدی میں 'تذکروں' کا معیار سولھویں صدی کے معیار سے بہت نیچا ہے ۔ سب سے زیادہ قابل ذکر ریاضی کا تذکرہ ہے، جو ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء میں لکھا گیا ۔ قاف زادہ فائضی کے ریاض الشعراء، مؤلفۂ ۱۰۳۰ھ / ۱۶۲۱ء، میں شعراء مترجمین کے کلام کے نمونے بھی دیے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا ذیل، مصنفۂ محمد عاصم (م ۱۰۸۶ھ / ۱۶۷۵ء) اور رضا کا مختصر تذکرہ اور گفتی کا تذکرہ (جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) بھی ہیں ۔ خصالی (م ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء) کی تصنیف مطالع النظائر صرف مطلعوں کا ایک مجموعہ ہے ۔

جغرافیے کے میدان میں اہم ترین تصنیفیں

کاتب چلبی اور ابوبکر دمشقی ہیں ہیں - انھوں نے یورپی اور اسلامی دونوں طرح کے مآخذ سے کام لیا ہے - اولیا چلبی [رک بان] کا سیاحت نامہ معاشرتی زندگی کے سب پہلوؤں کی تاریخ کے لیے اہمیت رکھتا ہے - باوجود اپنی خامیوں کے یہ تصنیف ایسی ہے کہ ترکی ادب میں اس کی مثال نہیں - اسی صدی میں 'سفارت نامے' بھی پہلی دفعہ منصۂ ظہور پر آئے۔

'شہ نامہ جی' 'مدّاح' 'قرہ گوزجی' وغیرہ کی عظیم مقبولیت اس صدی میں بھی سوسائٹی کے سب طبقوں میں باقی رہی - بروسہ میں درویش کاملی، قربانی علیسی وغیرہ نظر آتے ہیں اور ارزروم میں قصّاب کرد، قندیللی اوغلی وغیرہ - استانبول میں اسّی 'مدّاح' تھے، جو ایک برادری (اصناف = guild) میں منسلک تھے - ان میں معروف ترین دلفلی [رک بان] ہے، جو سلطان مراد رابع کا 'ندیم' تھا - اس صدی کے آخر کے قریب 'مدّاح' قریمی (م ۱۱۲۰ھ / ۱۷۰۸ء) نے شہرت حاصل کی۔

گویّے - شاعروں ('ساز شاعرلری') کی تعداد سترھویں صدی میں بہت بڑھ گئی - ہمیں وہ یکی چری سپاھیوں، لوندوں، جلالیوں اور بکتاشی اور قزلباش قسم کی مذہبی جماعتوں میں نظر آتے ہیں، فوج کے نوکروں چاکروں میں وہ ہمیشہ پائے جاتے تھے - راقم السطور نے اس صدی کے تقریباً تیس گویّے - شاعروں کی تصانیف جمع کرنے اور ان کے ناموں کا پتا لگانے میں کامیابی حاصل کی ہے؛ ان میں سب سے زیادہ ذکر کے لایق گوھری اور عاشق عمر ہیں: عاشق عمر کو تو گویا گویّے - شاعروں ('ساز شاعرلری') کا پیر پشتی بان ہی سمجھنا چاہیے (قب کوپرولو زادہ محمد فؤاد : تورک ساز شاعرلرینہ عائد متنلرو تدقیقلر، ج ۱ تا ۵، استانبول ۱۹۲۹ - ۱۹۳۰ء) - اس عوامی ادب کا اثر اوپر کے طبقات میں بھی نظر آتا ہے، مثلاً قریم (Crimea) کے خان محمد گرای متخلص بہ کامل کے کلام میں اور سلطان محمد رابع کی منظورِ نظر عفیفہ سلطان کے مرثیے میں - کئی 'کلاسیکی' شعراء نے بھی عوام کے لیے 'شرقیاں' لکھیں - گنج عثمان بطل کے بارے میں قایق جی مصطفی کی نظم پر حقیقۃً ایک عوامی قصہ مبنی ہوا، جو اب تک اناطولیا (اناضول) میں باقی ہے (کوپرولو زادہ محمد فؤاد : قایقجی قل مصطفی و گنج عثمان حکایہ سی، استانبول ۱۹۳۰ء) - یہ بھی اغلب ہے کہ کئی اور عوامی قصے بھی اسی صدی میں پیدا ہوئے، مثلاً وہ جن کے نام عاشق کرم، عاشق غریب اور شاہ اسماعیل ہیں - آخر میں اولیا چلبی کے بیانات سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ 'اورتہ اویونو' بھی اسی صدی میں عوام میں مقبول ہونا شروع ہوا۔

اٹھارویں صدی۔

ادب اور ثقافت کی اس صدی میں بھی وہی روش رہی جو گذشتہ صدیوں میں رہ چکی تھی - نظم اور نثر دونوں میں بہت کچھ لکھا گیا اور ایران اور ماوراء النہر سے عقلی تعلقات بدستور قائم رہے - فارسی شعراء، بالخصوص شوکت اور صائب، نے ترکی شاعری پر بہت گہرا اثر ڈالا - تاہم ان سب باتوں کے باوجود ایک زیادہ انفرادی ارتقاء کی جانب میلان قوت پکڑتا گیا اور زبان کو سادہ تر بنانے کی کوششوں میں جلوہ گر ہوا - یہ زیادہ تر اس صدی کے آغاز کے بڑے شاعروں ہی کے طفیل ہوا کہ ترکی زبان کی کلاسیکی شاعری نے ایک ایسی روش اختیار کر لی جو معاصر ایرانی شاعری سے بالکل جداگانہ اور مستقل بالذات تھی۔

داماد ابراہیم پاشا [رک بان] کا زمانہ بہت اہم ہے - بہت سی تصانیف اس کی یا سلطان احمد

ثالث کی فرمایش سے لکھی اور ترجمہ کی گئیں ۔ اہم کتابوں کا جلد از جلد ترجمہ کرنے کے لیے مجلسیں قائم کی گئیں ۔ اس زمانے کے شعراء میں ہم شعراے ذیل کا ذکر کر سکتے ہیں: عثمان زادہ تائب، جو ملک الشعراء کہلاتا تھا ، سید وہبی، سامی، راشد، نیلی، سلیم، کامی ادرنوی، دری، ثاقب، عارف، سالم، چلبی زادہ عاصم اور عزت علی پاشا۔ ندیم [رک بآن] نے بالخصوص اس صدی کے نصف آخر اور بعد کے زمانے میں بہت شہرت حاصل کی ۔ اس کی غزلوں اور 'شرقیوں' سے سعد آباد کے دور کی یاد تازہ ہوتی ہے اور اپنے اچھوتے مضامین، پر مایہ متخیلہ اور ہم آہنگی الفاظ کی بدولت وہ اپنے پیش رووں اور معاصروں سے گوے سبقت لے گیا ہے ۔ 'شرقی' میں وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں تک نہ اس سے پہلے ناظم اور نہ اس کے بعد فاضل اندرونی پہنچ پایا ۔ یہ بھی داماد ابراہیم پاشا ہی کی سر پرستی کا نتیجہ تھا کہ ابراہیم متفرقہ [رک بآن] ترکی کو حروف عربی سے چھاپنے کے فن کا آغاز کر سکا، لیکن کئی اسباب کی بنا پر اس صدی میں اول سے آخر تک طباعت ایک بہت ہی محدود دائرے میں محصور رہی اور اس کا کوئی خاص اثر عقلی یا فنی زندگی پر نہیں ہوا.

اس صدی کے بڑے شاعروں میں قوجہ راغب پاشا [رک بہ راغب پاشا] کا ذکر بھی خاص طور پر ضروری ہے ۔وہ نابی اور کلاسیکی دور شاعری کے آخری بڑے شاعر، شیخ غالب [رک بآن]، کے دبستان کا بزرگ ترین نمایندہ تھا ۔ قصیدے میں نفعی کا اثر غالب تھا، ادھر غزل میں ایک طرف ندیم اور سامی کے شاگردوں اور دوسری طرف نابی کے مداحوں میں رقابت اور چشمک رہی ، لیکن اس صدی کے آخر کے قریب دونوں دبستانوں میں انحطاط کے آثار نمایاں ہونے لگے؛ اس زمانے کے شاعر، مثلاً فاضل اندرونی [رک بآن] اور سنبل زادہ وہبی [رک بآن] محض نقال ہیں ۔ اس دور کے شعراء نے سبھی اصناف شعر میں طبع آزمائی کی، اور ان اصناف سخن کی جانب جو دور انحطاط سے مخصوص ہیں، مثلاً "ہجو"، "ہزل"، معمّا اور تاریخ گوئی، خاص توجہ کی گئی اور ساتھ ہی فساد اخلاق اور انحطاط ذوق سلیم میں اضافہ ہوا ۔ اس کے بر عکس حقیقی مذہبی جذبہ اب بھی باقی رہا، جیسا کہ نظیم کی مناجاتوں اور نعتوں ، نابی عثمان دده، نحیفی اور عارف سلیمان بک ایسے شاعروں کی 'معراجیوں' اور مثنوی مولانا رومی کے منظوم ترجمے سے، جو نحیفی نے کیا، عیاں ہوتا ہے ۔ اس دور کی مثنویاں بےشمار ہیں، لیکن ان کی ادبی قدر و قیمت برائے نام ہے ۔ 'خمسے' کے پرانے مضامین اب بالکل متروک ہو گئے، البتہ شیخ غالب کی مثنوی حسن و عشق اس سے مستثنی ہے، جو اس نوع کا آخری شاہکار ہے ۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کی مقفی تاریخی تصانیف اور مختلف 'طریقوں' کے مریدوں کی صوفیانہ نظمیں اہمیت سے کلیۃً عاری ہیں .

ادبی نثر کا رجحان رفتہ رفتہ سادگی کی جانب ہوتا گیا، اگرچہ نرگسی اور اوقچی زادہ کے اسلوب نگارش کی تقلید اس دور میں بھی نظر آتی ہے ۔ عثمان زادہ تائب ایسے مشہور انشاء پرداز نے نثر میں مبالغہ آمیز تصنع کے خلاف علانیہ طور پر آواز بلند کی ۔ تاریخی کتابیں صف اوّل میں آتی ہیں ۔ ان مصنفین میں، جو وقائع نویسی [رک بہ 'وقعہ نویس'] پر مامور تھے، ہم راشد، چلبی زادہ عاصم اور واصف کا ذکر کر سکتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے پیش رووں، مثلاً نعیما، کے مقابلے میں لایا نہیں

جا سکتا ، اگرچہ سیکڑوں آدمی سیرت اور تاریخ کی کتابیں لکھنے میں مصروف رہے - سلطنت کے سیاسی اور فوجی زوال کی وجہ سے بہت سے ''لایحے'' (''تذاکیر''، تاریخچے) لکھے گئے، جن میں اس زوال کے اسباب کی تفتیش مقصود تھی - ان 'لایحوں' میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر قوجہ سِکبان باشی کی تصنیف ہے - جغرافیے کے نقطۂ نظر سے ہم متعدد اہم 'سفارت ناموں' کا ذکر کر سکتے ہیں، جن میں یرمی سِکز چلبی محمد افندی کا فرانسہ سفارتنامہ سی ایک مثالی نمونہ ہے - یہ تصانیف کبھی کبھی نظم میں لکھی جاتی تھیں، گو بطور شاذ - 'سور نامے' ، جو سلاطین کے پر شوکت جشنوں کی یادگار کے طور پر لکھے گئے، اجتماعی معاملات کی تحقیق و تفحص کے اہم مآخذ ہیں - سب سے زیادہ معروف سید وہبی اور حشمت کے 'سور نامے' ہیں - شاعروں کے تذکرے گذشتہ صدی سے بھی زیادہ تعداد میں لکھے گئے؛ ان میں ہم صفایی، سالم اور بلیغ کے تذکروں کا ذکر کر سکتے ہیں، اسرار دِدہ کا تذکرہ شعرائے مولویہ سے مخصوص ہے؛ شیخی کی تصنیف وقائع الفضلاء بھی اسی صدی میں لکھی گئی - یہ شقائق کا آخری ذیل ہے - آخر میں ہم تحفۂ خطّاطین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو اسلامی اور ترکی خطاطوں کے حالات کا سب سے اہم مآخذ ہے - اس کا مصنف مستقیم زادہ ہے، جسے ہم اس صدی کا سب سے بڑا موسوعی (encyclopaedist) تصور کر سکتے ہیں - جغرافیے کے میدان میں ہمیں صرف یورپی تصانیف کے ترجمے اور خلاصے یا اقتباسات ملتے ہیں .

'مدّاح' ، 'قرہ گوزجی' اور 'اورتہ اویو نجو' کو سوسائٹی کے سب طبقوں میں وہی مقبولیت برابر حاصل رہی جو پہلے تھی - '' گوییّ-شاعروں '' کی تصانیف بھی ہر جگہ معروف و مشہور تھیں - ان میں ہم قیمتی، نوری، لونی، قباسقال محمد اور فصیحی ... نام لے سکتے ہیں، لیکن گوہری اور عاشق عمر بدستور مقبول رہے - ان میں سے بعض شاعر ارمنی ... کے تھے، مثلاً مجنون اور ورطان، جو اس صدی کے شروع میں گذرے ہیں - ترکی '' گوییے-شاعروں'' کا ارمنی '' اشوغ '' ashūgh پر یہ اثر شاید سولھویں صدی ہی سے شروع ہو جاتا ہے (قبَ کوپرولو زادہ محمد فؤاد در ادبیات فاکولتہ سی مجموعہ سی، ۱۹۲۲ء، شمارہ ۱، ص ۱ تا ۳۲) - عوام کا ادبی ذوق اونچے طبقوں میں بھی سرایت کر گیا - اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ شاعر فحل ندیم نے بھی عام پسند بحر میں ایک 'تورکو' نظم لکھی - جیسے جیسے ہم اس صدی میں آگے بڑھتے جاتے ہیں یہ میلان اور نمایاں ہوتا جاتا ہے .

انیسویں صدی.

اس صدی کے شروع میں عثمانی ادب کا معیار بہت پست ہو چکا تھا اور یہ صورت حال دورِ '' تنظیمات '' تک باقی رہی - صرف واصف اندرونی [رکّ بآن] اور عزّت ملاّ [رکّ بآن] کسی قدر جدت دکھاتے ہیں - واصف کا کلام عوام کے مذاق کے مطابق ہے اور اس میں ندیم اور اسی طرح فاضل اندرونی کا اثر نمایاں ہے، مگر عزّت ملاّ، باوجود ندیم اور شیخ غالب سے بہت متأثر ہونے کے، واصف سے زیادہ بڑے پایے کا شاعر ہے، خصوصاً اس اعتبار سے کہ اس کی زبان خالص اور آمیزش سے خالی ہے اور فنی مہارت میں بھی وہ واصف سے بہتر ہے - علاوہ قصائد اور غزلیات کے اس نے خاصی اچھی مثنویاں بھی لکھی ہیں - '' تنظیمات '' سے پہلے کے ادب رفیع کا وہ آخری بڑا '' استاد '' ہے - یہ صحیح ہے کہ '' تنظیمات '' کے بعد بھی بہت سے شاعروں نے قدیم اسلوب

میں قصیدے اور غزلیں لکھیں اور ان میں نامق کمال اور ضیاء پاشا ایسے ادبی جدت پسندی کے بڑے بڑے حامی اور داعی بھی شامل ھیں ۔ اسی دور کے اور شاعر غالب بک لِسکوفچی، عونی بک اور عارف حکمت بک ھیں۔ یہ سب کے سب نائلی اور نِیم قدیم کے مقلد ھیں، لیکن ادبی ترقی کی روش پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑا ۔ طبعاً پرانی ادبی روایت ایک دم سے غائب نہیں ھو سکتی تھی؛ چنانچہ شِناسی اور اس کے ھم نوا شاعروں کو دبستانِ قدیم کے مقابلے میں طویل اور سخت جد و جہد کرنا پڑی .

'' تنظیمات'' سے پہلے کے دور کی نثر کیفیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ قابلِ قدر نہیں ھے، گو کمیت میں وہ گذشتہ صدیوں کی نسبت کم نہ تھی ۔ تاریخ میں مُترجمِ عاصم کی تاریخ اپنے اندازِ بیان اور ناقدانہ اھلیت کی وجہ سے قابلِ ذکر ھے۔ یہ مصنف برہانِ قاطع اور قاموس کے ترجموں میں اور بھی زیادہ سادہ زبان استعمال کرتا ھے۔ وقائع نویس اِسعد افندی المُستظرف کا مترجم ھے اور اُسِ ظفر کا مصنف بھی وھی ھے جو یکی چری فوج کے قلع قمع سے متعلق ھے۔ یہ مصنف اپنی روکھی پھیکی زبان اور الجھے ھوے اسلوبِ بیان کی وجہ سے عاصم سے مرتبے میں بہت کم ھے ۔ اسی مصنف نے تقویمِ وقائع کو بھی طبع و نشر کیا تھا ۔ ایک موقع پر اس نے سلطان محمود ثانی کے ایک سفر کے حالات، وقائع نویس کی حیثیت سے مرتب کیے تو سلطان نے اسے پیچیدہ اور مغلق زبان لکھنے پر ملامت بھی کی تھی: اس کے برخلاف المستظرف کے ترجمے میں وہ عربی اور فارسی الفاظ کے بجاے ترکی لفظوں کے استعمال اور ادبی اسلوب کو سادہ تر بنانے کی سفارش کرتا ھے، جس سے یہ ظاھر ھوتا ھے کہ زبان کو سادہ اور سلیس بنانے کی تحریک کس حد تک آگے بڑھ چکی تھی ۔ آخر میں ھمیں مشہور شاعر اور انشاء پرداز عاکف پاشا [رَکّ بآن] کو ھرگز نظرانداز نہیں کرنا چاھیے، لیکن اسے عوامی وزن میں چند نظمیں لکھنے اور سادہ نثر میں بعض کتابیں تصنیف کرنے کے باوجود ادب میں نئی نئی باتوں کا اولین شائع کرنے والا نہیں تصور کرنا چاھیے ۔ واقعہ یہ ھے کہ عاکف پاشا یورپی ثقافت سے بکلّی غیر متأثر رھا اور قدیم ادب ھی کے آخری نمایندوں میں سے ھے .

عوامی ادب کے نمایندوں میں ھمارے پاس پیچ اِمین، قیز احمد، حاجی مُؤذّن، کورر حافظ وغیرہ کے بارے میں، جو سب 'مَدّاح' تھے، معلومات موجود ھیں اور اسی طرح بعض 'خیال الظلّ' کے ناٹک (shadow-plays) مرتب کرنے والوں ('خَیالْجی') کے متعلق بھی ھم بعض باتیں جانتے ھیں۔ ان میں، مثلاً شِربت جی اِمین، قاسم پاشا کے حافظ اور مصاحب سعید آفندی شامل ھیں۔ کہیں اس صدی کے آخر کے قریب جاکر کاتب صالح نے روایتِ قدیم سے علحدہ ھو کر جدید تمثیل نگاری کی تقلید شروع کی .

اس صدی کے معروف ترین '' گویے - شاعر'' دِرْدلی، ذھنی بای بورتی اور اِسراح ارزرومی تھے، جنھوں نے ایشیاے کوچک اور قسطنطنیہ کے سب طبقوں میں بہت بجا طور پر بڑی مقبولیت حاصل کی (قبَ کوپرؤلو زادہ محمد فؤاد: ارزروملو اِسراہ استانبول ۱۹۲۹ء) ۔ سلطان عبدالعزیز کے عہد کے خاتمے تک یہ '' عاشق'' طاؤوق پازاری کے ایک قہوہ خانے میں جمع ھوا کرتے تھے ۔ ان کی ایک اپنی منظّم جماعت تھی، جس کا ایک صدر ('رئیس') ھوتا تھا، جسے حکومت بھی تسلیم کرتی تھی ۔ یہ تنظیم بعد میں توڑ دی گئی، لیکن

بیسویں صدی میں بھی ''گویے۔شاعر'' ہمیں ایشیاے کوچک میں نظر آتے ھیں۔

اس کلاسیکی ترکی ادب اور بالخصوص شاعری میں ''تنظیمات'' کے شروع ہونے تک قوّت اور ابتکاریت تقریباً مفقود ہو چکی تھی۔ اپنی تنگ حدود کے اندر کلاسیکی شاعری میں کسی نئی چیز کے پیدا کرنے کی قوت زائل ہو گئی تھی اور شاعر زمانۂ قدیم کے بڑے شاعروں کے صرف 'نظیرے' ھی پیدا کر سکتے تھے یا اگر کسی قدر جدّت کے اظہار کی کوشش کرتے تھے تو تصنّع اور ابتذال میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ مسلسل اُنھیں تصوّرات کو اُنھیں محدود تعبیرات کے ساتھ دھراتے دھراتے ترکی شاعری کی ساری قوّتِ حیات سلب ھو گئی تھی۔ ندیم اور شیخ غالب ایسے بڑے فنکار بھی پرانے مثالی نمونوں کے کڑے قواعد و ضوابط کی زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔ دوسری طرف اوروں کے علاوہ فاضل اندرونی اور واصف نے عوامی زبان اور ادب سے مدد لینے اور عام لوگوں کے ذوق کو مخاطَب و ملتفت کرنے کی کوشش کی، مگر نتیجہ صرف ابتذال و رکاکت کی شکل میں رونما ھوا۔ یورپ سے اس سیاسی اور اقتصادی تعلق کے باوجود، جو صدیوں سے چلا آتا تھا، عثمانی عوام کی معاشرتی ساخت اسلامی تہذیب کے قالب سے کبھی باھر نہیں نکلی تھی۔ اور حالات نے اسے قرونِ وسطٰی کے خیالات و تصورات کے ایک نظام میں جکڑ رکھا تھا۔ یہ سچ ھے کہ مسلسل فوجی شکستوں اور تدریجی اقتصادی انحطاط کی وجہ سے اربابِ فکر کے دلوں میں یورپ کی مادی اور فنی فوقیت کا احساس پیدا ھو گیا تھا اور اٹھارھویں صدی ھی سے انھوں نے فوج اور بحری بیڑے کی تنظیمِ نو کے لیے ماھرینِ یورپ سے استفادہ شروع کر دیا تھا، لیکن یورپ کی ثقافتی فوقیت کو تسلیم کر لینا بہت زیادہ مشکل تھا۔ مدارس، جو گذشتہ صدیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پس ماندگی کی حالت میں تھے، اب تک مضبوطی سے قرونِ وسطٰی کی ذھنیت و ذوق اور عقلیت و مشرب کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ جدید سائنس صرف ان درسگاھوں میں داخل ھونا شروع ھوئی تھی جو فوجی تربیت کے لیے قائم کی گئی تھیں، مثلاً انجنیرنگ سکول ('مُہندس خانہ') اور میڈیکل سکول ('طب خانہ') میں۔ یہ نئے اقدامات بہت حد تک چند افراد، مثلاً خوجہ اسحاق افندی، گلنبری اور شانی زادہ، کے رھینِ منت تھے، جنھوں نے مغربی زبانوں اور زمانۂ حاضرہ کے جدید علوم (sciences) کا مطالعہ کیا تھا۔ سلیم ثالث اور خصوصاً محمود ثانی مدارس کی مخالفت کے باوجود ریاضیات اور علومِ طبیعیہ کی تعلیم کی اصلاح پر آمادہ ہوے، اس لیے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ سلطنت کو باج گزار رئیسوں میں بٹ جانے سے بچانے کے لیے فوج اور بحری بیڑے کی از سرِ نو تنظیم کی ضرورت ھے اور اس سے بھی چارہ نہیں کہ ایک مرکزی نظامِ اداری قایم کیا جائے۔

اٹھارھویں صدی کے آخر سے ترکیہ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو فرانسیسی زبان سے واقف اور یورپ کی ثقافتی فوقیت کے قائل تھے۔ فرانس سے معلّموں کو منگوانے اور طالب علموں کو یورپ بھیجنے سے ترکیہ میں یورپی طور طریقے اختیار کرنے کی تحریک کو فروغ ھوا۔ اس طرح قدرتی طور پر ان تمام ضروریات کے نتیجے میں یورپی اثر رفتہ رفتہ ظاھر ھونے لگا اور جس طرح وہ زندگی کے ھر شعبے میں نمودار ھوا اسی طرح فکر اور فن کے میدان میں بھی نظر آنے لگا۔

ب — "یورپی" ترکی ادب.

دور "تنظیمات" و ادبِ جدید.

یورپ کی عظیم الشان صنعتی اور سرمایہ دارانہ ترقی اور اس کے دوش بدوش یورپ کی استعمار پسند دولِ عظمٰی کی جوع الارض اور باہمی رقابت، ترکیہ جیسے وسیع اور سیر حاصل میدانِ نفع اندوزی کو زیادہ عرصے تک نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں ۔ ادھر سلطنتِ ترکیہ کے ادارے، جو قرونِ وسطٰی سے اسی طرح چلے آئے تھے، اپنی قوتِ مقابلہ کھو چکے تھے اور فرانس کی انقلابی تحریکات نے غیر مسلم عناصر میں قومیت کے اصول کی اشاعت کر دی تھی ۔ ان تمام حالات کی بنا پر فوری ضرورت محسوس کی گئی کہ سلطنت کے سب اجتماعی اور اداری معاہد میں اصلاحات نافذ کی جائیں ۔ ان اصلاحات کو خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، نہ صرف نیچے کے طبقوں کی طرف سے بلکہ تعلیم یافتہ طبقوں کے ان افراد کی جانب سے بھی جنھوں نے مدرسوں میں تعلیم پائی تھی ۔ یہ رشید پاشا اور اس کے متّبعین کی مختصر جماعت ھی کی وجہ سے ہوا کہ رفتہ رفتہ ملک میں اصلاحات نافذ ہو سکیں ۔ ترکی تاریخ میں ان اصلاحات کو "تنظیمات" [رکّ بآن] کہا جاتا ہے.

"تنظیمات" صرف نظم و نسقِ حکومت، عدالتوں اور مالیات کے میدانوں تک ھی محدود نہ تھیں: مسلمان ترکوں میں تعلیمی ترقی کی راہ پیدا کرنے کی غرض سے ابتدائی اور ثانوی مدارس کھولے گئے اور ایک جامعہ (یونیورسٹی) قائم کرنے کی تجاویز سوچی گئیں ۔ درسی کتابوں کی تیاری کے لیے ایک "انجمنِ دانش" بنائی گئی (۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء) اور طالب علموں کو یورپ بھیجا گیا ۔ 'انجمنِ دانش' کی جگہ جلد ھی 'جمعیتِ علمیۂ عثمانیہ' نے لے لی (۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء)، جس نے اپنا ایک رسالہ 'مجموعۂ فنون' شائع کرنا شروع کیا ۔ اگلے سال لڑکیوں کا سکول کھولا گیا اور ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء میں یونیورسٹی کے نصاب کی تعلیم شروع ہو گئی ۔ ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء میں ایک 'ترجمہ جمعیتی' (جمعیتِ ترجمہ) قائم کی گئی، ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں طب کے سِوِل سکول (طبیۂ ملکیّہ مکتبی) میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے بعد کے سال میں غلطہ سرائے کا لیسے (Lycée = معہد) کھل گیا، جس کا نصابِ تعلیم مغربی ثانوی سکولوں کے نصاب سے ضروری ترمیمات کے ساتھ لیا گیا تھا ۔ اس معہد میں ترکی کے ساتھ فرانسیسی بھی ذریعۂ تعلیم تھی ۔ یونیورسٹی ("دارالفنون") کا ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں افتتاح ہوا، لیکن قدامت پسند عناصر کی سازشوں کی وجہ سے دو سال بعد ھی مجبوراً اسے بند کر دیا گیا ۔ ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء میں قانون کا سکول ('حقوق مکتبی') اور ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں علوم سیاسیہ (پولیٹیکل سائنسز) کا سکول (مکتبۂ ملکیہ) بھی کھول دیا گیا ۔ اس کے ساتھ ھی کئی عجائب گھر اور کتب خانے قائم کیے گئے اور اسی طرح فنی مدارس کھولے گئے، مثلاً ہندسہ (انجنیرنگ)، زراعت اور تجارت کے مدارس ۔ اسی طرح قدیم طرز کے مدارس سے بے نیاز ایک نیا تعلیم یافتہ طبقہ رفتہ رفتہ وجود میں آتا گیا ۔ اس گونا گوں نشاطِ کار کے پہلو بہ پہلو روزانہ اخباروں کا تدریجی ارتقاء بھی صورت پذیر ہو رہا تھا ۔ ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء میں سرکاری اخبار تقویم وقائع نکلنا شروع ہوا، جس کے بعد ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں جریدۂ حوادث، ۱۲۷۶ھ / ۱۸۵۹ء میں ترجمانِ احوال اور ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں تصویرِ افکار شائع ہوا [قبّ مادۂ جریدہ] ۔ یہ دو

اخبار(ترجمان و تصویر) تقدم جدید کی تاریخ میں ایک اہم مرحلے کی نشان دہی کرتے ہیں، اس لیے کہ انہیں کے ذریعے سے نئے ادبی دبستان کا بانی شناسی اور اس کا شاگرد نامق کمال عوام کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس دور تک کہ جب سلطان عبدالحمید کی استبدادیت نے ہر قسم کے مطبوعات کی نشر و اشاعت کو روک دیا، ترکی پریس نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ یورپی زبانوں، بالخصوص فرانسیسی، سے بے شمار ادب اور سائنس کی کتابوں کا ترجمہ ہوا اور ترکی زبان میں سادگی اور سلاست پیدا ہونا شروع ہوگئی اور ساتھ ہی سائنس کی بہت سی تعبیرات سے اس کا دامن مالا مال ہونے لگا۔

جدید ادب کی تین بڑی شخصیتیں شناسی [رکّ بآں]، جس نے فرانس میں تعلیم پائی تھی، اس کے شاگرد نامق کمال [قبّ مادۂ کمال محمد نامق] اور ضیاء پاشا [رکّ بہ ضیاء گوک الپ] تھیں۔ ان میں سے نامق اور ضیاء دونوں فرانس میں بحالتِ جلاوطنی رہ چکے تھے۔ ان حالات کے سبب سے نیا دبستان اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے فرانسیسی ادب اور ان اصولوں کے رنگ میں سمو گیا جن کا اعلان فرانس کے انقلابات کے دوران میں کیا گیا تھا۔ جدت پسند ادیب قدیم جاگیردارانہ ادب کا خاتمہ کر کے وطن، آزادی (''حرّیت'')، جمہوریت (''خلقجیلق'') اور آئینی حکومت (''مشروطیت'') کے خیالات کی اشاعت کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد ''طبقۂ متوسط'' (''bourgeois'') کا ادب تخلیق کرنا تھا۔ اس طرح یہ ہوا کہ اخبار نویسی، سیاسی اور ادبی تنقید، ناٹک (تھیئٹر)، مغربی ادبی تصانیف کے ترجموں، ناول اور فلسفیانہ اور اجتماعی مقالوں کا آغاز ہوا۔ شناسی نہ تو برّاق طبیعت کا انشاء پرداز تھا، نہ کوئی بڑا شاعر، لیکن اس کا نظامِ عمل (پروگرام) اچھی طرح معین تھا۔ وہ اپنے آپ کو قدیم غیر مفہوم زبان کے پھندے سے رہا کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس کی زندگی میں اس کا یہ پروگرام تمام کا تمام پورا نہ ہو سکا، تاہم اس کے نظریوں کا اس کے گرد و پیش کے لوگوں پر بہت اثر ہوا۔ ضیاء پاشا نے، روسو Rousseau اور مولییر Molière کے ترجموں اور اپنی ادبی اور سیاسی تنقید سے اس تحریک کو بہت تقویت بخشی۔ وہ کلاسیکی ادب میں اچھی مہارت رکھتا تھا، پھر بھی اس نے یہ تک کہہ دیا کہ اس ادب کا ترکوں کے طبائع سے کوئی تعلق ہی نہ تھا؛ وہ اس نقطۂ نظر کا حامی تھا کہ انسان کو نیچر (فطرت) کی پیروی کرنا چاہیے، یعنی عوام کی زبان اور ادب سے استمداد کی جائے، مگر اس نظریے کے باوجود ضیاء پاشا میں نہ تو یہ طاقت تھی اور نہ جرأت کہ ان نظریوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔

یہ بلاشبہ نامق کمال تھا جس نے نئے دبستان کی کامیابی کو یقینی بنا دیا۔ وہ بڑا فنکار، مستعد مجاھد، کثیرالتصنیف مصنف اور عظیم المرتبہ محبِّ وطن تھا۔ فن اس کے نزدیک ملک میں نہضت پیدا کرنے کا ذریعہ تھا اور اس نے اپنے سیاسی مقالوں، اپنے تمثیلی قصوں (ڈراموں)، اپنے ناولوں، اپنی وطن پرست شاعری، اپنی تاریخی تصانیف، اپنے ناقدانہ مضامین، بلکہ اپنے نجی خطوط کے ذریعے بھی ترکیہ کے ثقافتی اور سیاسی انقلاب کو وجود میں لانے کے لیے بہت زور مارا۔ اس کا اثر بہت گہرا تھا۔ (اس کے تمثیلی قصے) وطن کا پیش کیا جانا ملک کا ایک بڑا سیاسی واقعہ تھا۔ اس نے ضیاء پاشا سے بھی زیادہ تلخی سے پرانے ادب پر حملہ کیا۔ اس کا یہ خیال تھا

کہ عروضی اوزان میں ترکی شعر لکھنا ناممکن ہے ۔ تاہم کمال بھی قدیم روایتوں کو بالکل خیر باد نہ کہہ سکا اور نہ اس کے دوست ہی یہ کر سکے ۔ اسی سبب سے سعداللہ پاشا ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں ایک مقالے میں، جس پر اس کا نام درج نہ تھا اور اخبار وقت میں شائع ہوا، یہ لکھ سکا کہ تلامذہ کو صرف مغربی کتابوں کے لفظی ترجمے پڑھنے کو دیے جائیں، اس لیے نہ ''جدید'' مصنفین درحقیقت کوئی بھی واقعی جدید چیز پیدا نہیں کر سکے ۔

نامق کمال کے شاگرد عبدالحق حامد [رَکَ بآن] نے شعر کے میدان میں، جو ابھی تک پرانے قالبوں سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکا تھا، بڑا انقلاب پیدا کر دیا ۔ اس حد سے زیادہ پرگو شاعر نے ترکی زبان میں گیت (lyric) اور تمثیل (drama) کو داخل کیا، جس میں اس کے مثالی نمونے دانتے Dante، راسین Racine، کورنائی Corneille اور شیکسپیر Shakespeare تھے ۔ خود نامق کمال نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ نئی ترکی شاعری حامد سے شروع ہوتی ہے ۔ دوسری نمایاں ہستیاں رجائی زادہ اکرم [قبَ مادۂ اکرم بک] اور سامی پاشا زادہ سِزائی [رَکَ بآن] تھے، مگر جوں جوں استبداد کا دباؤ بڑھتا گیا ''تنظیمات'' کے دور کی دوسری نسل نے زیادہ سے زیادہ خالص فنی مقاصد کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا ۔

بہت سے اور مفکرین یا مصنفین نے ملک کی ثقافتی نشو و نما میں حصہ لیا ۔ ان میں سے ہم مشہور مؤرخ احمد جَودت پاشا [رَکَ بآن]، احمد وفیق پاشا [رَکَ بآن]، سلیمان پاشا اور مصنفِ کبیر اور موسوعی احمد مِدحت افندی [رَکَ بآن] اور اسی طرح معجم نویس شمس الدین سامی بک [رَکَ بہ سامی] کا ذکر کر سکتے ہیں ۔ جودت پاشا نے، جو علومِ مشرقیہ میں اچھی مہارت رکھتا تھا اور جس نے فؤاد پاشا کی مشارکت سے ترکی نحو پر ایک کتاب مرتب کی، ترکی زبان میں خوبصورت نثر لکھی ہے ۔ احمد وفیق پر مغربی خیالات چھائے ہوے تھے اور وہ قومی تہذیب کا احیاء چاہتا تھا ۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ اناطولیا کے ترک عظیم الشان ترک قوم ہی کی ایک شاخ ہیں ۔ اس نے اناطولی ترکی کی پہلی لغت تیار کی، امثال جمع کیں اور ابوالغازی کے شجرۂ اتراک کا ترجمہ کیا ۔ مولییر Molière کے تمثیلی قصوں کی ترمیم اپنے ڈھب پر کر کے اس نے ترکی ناٹک (تھیٹر) کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ۔ سلیمان پاشا، جس نے فوجی مکاتب کی تنظیم از سرِ نو کی، بڑا محبِّ وطن تھا ۔ اس کا دعوے تھا کہ ان کی زبان اور ادب کا نام ''عثمانلی'' کے بجاے ''ترکی'' زبان و ادب ہونا چاہیے ۔ اپنی تاریخ عالم میں اس نے ایک خاص باب قدیم ترکوں کے لیے وقف کیا اور اپنا مواد زیادہ تر دِگین Deguignes اور دوسرے مصنفین سے اخذ کیا ۔

آخر میں، احمد مِدحت آیا ۔ اس نے ابجد کی کتابوں سے شروع کر کے سیکڑوں عام پسند نوعیت کی کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں ۔ اس طرح اس نے لوگوں کو پڑھنا سکھایا اور تعلیم کا معیار بلند کرنے میں مدد پہنچائی اور یہی اس کا مقصدِ وحید تھا، اس لیے کہ اس کی کتابوں کی کوئی علمی یا ادبی قیمت نہیں ہے ۔ سامی بک نے اپنی قاموس الاَعلام اور قاموسِ ترکی لکھ کر اپنے آپ کو وفیق پاشا کا قابل جانشین ثابت کیا ۔

انیسویں صدی کے آخر میں معلّم ناجی [رکّ بآں] کا ظہور ہوا، جس نے احمد مِدحت کی حمایت و سرپرستی میں عظیم‌الشان شہرت حاصل کی۔ ناجی مشرق تہذیب سے بخوبی واقف تھا اور نئی طرز کی اچھی نظموں کے ساتھ ساتھ کلاسیکی اسلوب میں اس نے غزلیں لکھیں ۔ دبستانِ قدیم کے مقلدین کو اس سے یہ توقع ہو چلی تھی کہ وہ طرزِ قدیم کو پھر زندہ کر دیگا، حالانکہ ناجی کسی ایسی رجعت پسندی کا حامی نہ تھا، جیسا کہ اس کی خوبصورت سادہ نثر سے عیاں ہے (جیسی مثلاً عُمرک چوجوقلوغی ['' عمر کا بچپن ''] میں ہے) ۔ اِکرِم بک سے اس کے مناقشات کے اسباب زیادہ تر ذاتی قسم کے تھے ۔ اسی زمانے میں نابی زادہ ناظم شہرت کی صفِ اول میں آ گیا ۔ وہ شروع جوانی ھی میں انتقال کر گیا۔ اس کے ناول زَہرا نے اسے تاریخِ ادب میں اول درجے کی اھم شخصیت بنا دیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں سب سے اھم واقعہ وہ ادبی تحریک تھی جو چند نوجوان ادیبوں نے شروع کی ۔ یہ وہ لوگ تھے جو رجائی زادہ اِکرِم کی تحریص و ترغیب سے مجلۂ ثروتِ فنون سے وابستہ ہو گئے تھے ۔ یہ تحریک ترکی ادب کو یورپی رنگ دینے کے دوسرے اور آخری مرحلے کی نشان دھی کرتی ہے ۔ اس میں سب سے نمایاں شخصیتیں توفیق فِکرت [رکّ بآں] اور خالد ضیاء کی ھیں اور اس پر فرانس کی انیسویں صدی کے آخر کی ادبی تحریکات کا اثر بہت غالب ہے ۔ یہ تحریک، جو ایک استبدادِ مطلق کے زمانے میں شروع کی گئی اور جس نے محض پانچ یا چھے برس کی مختصر عمر پائی ، عصبانی اور قنوطیت آمیز احساساتی تصانیف کے معرضِ وجود میں لانے کا باعث ہوئی ۔ اس کا شعار '' فن برائے فن '' تھا ۔ وہ تمام شاعر جو ثروتِ فنون میں لکھتے تھے توفیق فِکرت کے نقال تھے ، البتہ ذیل کے چند افراد مستثنٰی کیے جا سکتے ھیں : جناب شہاب‌الدین، جس نے انقلاب کے بعد ایک بزرگ مرتبہ نثر نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ؛ سلیمان نظیف ، جسے نامقِ کمال کا شاگرد سمجھا جا سکتا ہے، مگر جس میں مخصوص جدت بھی ہے ؛ فائق علی، جو عبدالحق حامد کا مقلّد تھا اور اسماعیل صفا، جس کی شخصیت مستقل تھی اور جو اپنے مضامین روزمرہ کی زندگی میں تلاش کرتا تھا ۔ خالد ضیاء، جو بہت پسندیدہ اسلوب کا مالک ہے، ترکی زبان میں ادبی ناول کا اصلی بانی ہے ۔ وہ اپنے موضوعات زیادہ تر درمیانی طبقے کے اوپر کے حصے سے لیتا ہے ، لیکن اس کے بعض مختصر افسانوں میں عوام کی زندگی کی بھی کیفیت بیان کی گئی ہے ۔ مختصر افسانوں کو احمد حِکمت اور حُسین جاھد نے سادہ زبان میں زیادہ کامیابی کے ساتھ نباھا ہے ۔ محمد رؤف ایک ایسا ناول نگار ہے جو بہت اعلٰی نفسیاتی تجزیے کرتا ہے، لیکن اس کی زبان صحیح نہیں ہے ۔ سائنس، فلسفے اور تنقید کے میدان میں ثروتِ فنون کے ھم کار گروہ نے صرف ترجمہ کرنے پر قناعت کی، مگر کڑی نگرانی اور اس گروہ کی مختصر زندگی نے انھیں بیشتر قوتِ عمل دکھانے کی اجازت ھی نہ دی۔

بحالیکہ توفیق فِکرت اور خالد ضیاء کا دبستان صرف اوپر کے طبقات کی زندگی کی عکاسی کرتا تھا، حُسین رَحمی [رکّ بآں] نے اپنے ناولوں میں عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویرکشی کی ہے ۔ اسی زمانے میں قابلِ ذکر جرائد نگار احمد راسم [رکّ بآں] اپنی کئی تصانیف میں اسی موضوع پر طبع آزمائی کرتا ہے ۔

اس زمانے کے شاعروں میں ہم ذیل کے اشخاص کا بھی ذکر کر سکتے ہیں : رضا توفیق [آرکے بان] جس نے ''عاشقوں'' اور ''بکتاشیوں'' کی طرز میں، لیکن وتدی وزن میں، بہترین گیت (lyrics) لکھے ہیں؛ شاعرہ نگار خانم اور آخر میں محمد امین بک [آرکے بان]، جو یونانی۔ترکی جنگ کے دوران میں اپنے دیوان تورکچه شعرلر کی بنا پر اچانک مشہور ہو گیا ۔ محمد امین وتدی وزن میں بہت ہی سیدھی سادی زبان استعمال کرتا تھا اور عوام تک براہِ راست پہنچنا چاہتا تھا (''خلقه دوغرو'')، اگرچه وہ اس زمانے کے عوامی ادب اور اس ادب کی ذہنیت، ذوق اور روایتی قالبوں سے بالکل ناواقف تھا ۔ ادیب کی حیثیت سے وہ فکرت کے دبستان کا متبع تھا، تاہم اپنے معاصرین کی طرح وہ انفرادیت پسند نہ تھا بلکه روحِ جمہوریت (''خلقچیلق'') اس پر غالب تھی ۔ یہ پہلا موقع تھا که ایک ترک شاعر عوام کی سطح تک اتر آیا تھا ۔ شاید اس پر ایک حد تک شعورِ وجدانی (lyrical feeling) کے فقدان کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے، لیکن اسے تاریخِ ادب میں ایک دلچسپ شخصیت تسلیم کرنے میں یہ امر مانع نہیں ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان کو سادہ تر بنانے کی تحریک جاری رہی، بلکه اس سے ایک مبالغه آمیز ''طُہریّت'' (purism) پیدا ہو گئی ۔ یورپی فضلاء کی تصانیف کے تراجم سے ترکوں کی قدیم تاریخ اور تہذیب سے لوگ واقف ہو گئے، درحالیکه غیر ممالک میں نوجوان ترکوں کی صحافتی سرگرمیاں ترک قومیت کو سیاسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگیں ۔ یہی وہ بڑے بڑے عناصر تھے جو ۱۹۰۸ء کے انقلاب سے پہلے ترکیه کی ثقافتی اور ادبی زندگی میں کارفرما تھے۔

بیسویں صدی۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب نے بازرسی مطبوعات (censorship) کا خاتمه کر دیا، جس سے تالیف و تصنیف کے میدان میں بہت وسعت پیدا ہوئی ۔ نامق کمال اور حامد کے قوم پرستانه ناٹک پھر اسٹیج پر دکھائی دینے لگے اور بہت سی اجتماعی، فلسفیانه اور تاریخی نوعیت کی تصانیف کا ترکی زبان میں ترجمه کیا گیا ۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم میں بڑی اصلاحات ہوئیں اور یورپ کے ساتھ تعلقات نے عام ثقافتی معیار اتنا بلند کر دیا جتنا وہ پہلے کبھی نه ہوا تھا ۔

انقلاب کے بعد اہم ترین ادبی تنظیم ''فجرآتی'' تھی، اگرچه یه ایک ایسا حلقۂ ادب تھا جو صرف تھوڑے ہی عرصے تک قائم رہا ۔ اس کے اراکین نے فکرت اور خالد ضیاء کے دبستان کی پیروی سے ابتداء کی، لیکن بالآخر ان لوگوں میں سے بیشتر قومی ادبی تحریک کے ارکان بن گئے ۔ صرف احمد ہاشم اسی راستے پر گامزن رہا جسے اس نے شروع میں اختیار کیا تھا اور اسی میں ترقی کرتا چلا گیا ۔ اس نے کبھی عروضی اوزان کو یا ''فن برائے فن'' کے نظریے کو (اس کے دقیق ترین معنی میں) ترک نه کیا ۔ علاوہ ازیں شاعری اور موسیقی کے باہمی تعلقات کے بارے میں اس کے کچھ اپنے خیالات تھے (قب *Ahmed Hāschim* : H. Duda، در W. I.، ج ۲، ۱۹۲۸ء، شمارہ ۳ تا ۴ : ص ۲۰۰ تا ۲۴۴) ۔ شاعر یحیٰی کمال کو ۱۹۱۲ء کے بعد بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل رہا ۔ اس کے ادبی نظریے احمد ہاشم سے بالکل مختلف تھے، اس لیے که وہ موسیقی کو زیادہ تر اپنی نظموں کے بیرونی عناصر میں تلاش کرتا تھا، گو اس نے ''فن برائے فن'' کے شعار کو بدستور قائم رکھا ۔ ایک اور شاعر، جو قومی ادب کے حلقے سے باہر رہا، جامعۂ

اسلامیہ (پان اسلامزم) کا حامی اور عروضی اوزان کا بے نظیر استاد محمد عاکف ہے ۔ سادہ اور سلیس زبان میں اس نے عام لوگوں کی زندگی کے بغایت حقیقی پہلوؤں کو بیان کیا ہے ۔ عاکف، جس کے گیت (lyrics) بعض اوقات بہت بلند مقام تک پہنچ جاتے ہیں، مغربی شاعری سے بالکل غیر متاثر رہا ہے؛ وہ ایک عوامی شاعر ہے جو عام لوگوں ہی میں سے پیدا ہوا ۔ ان تین شاعروں کی تصانیف میں، جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ ترکی شاعری توفیق فکرت اور اس کے دبستان کی بغایت تنگ فضا سے باہر نکلنے کی کوشش میں مصروف ہے، لیکن قومی تحریک کی اس عظیم الشان ترقی کے زیرِ اثر، جو تمام اقلیمِ فن میں رونما ہوئی، شاعری بھی آخر کار نئے راستوں پر گامزن ہو گئی ہے ۔

و ۔ قومی ادب.

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد حاکم طبقات کے دلوں کو جس مثالی تصور ('آئڈیل') نے گرما رکھا تھا وہ عثمانیت ('عثمانلیلق') کا تصور تھا، لیکن اُن سیاسی واقعات نے جو اس کے بعد بہت جلد رونما ہوے یہ ثابت کر دیا کہ یہ مثالی تصور سراب تھا اور یہ امر نہ صرف عیسائیوں بلکہ خود مسلم عناصر کے طرزِ عمل سے بھی ثابت ہوا ۔ اس طرح ترکی عنصر کو، جسے سلطنت میں غلبہ حاصل تھا، ایک نئے مثالی تصور کی ضرورت محسوس ہوئی؛ یہ قومی مثالی تصور تھا، جو پہلے ہی "تنظیمات" کے دور میں ظاہر ہو چکا تھا اور جو تمام عہدِ حمیدی میں ایک ثقافتی شکل میں موجود رہا تھا ۔ انقلاب کے بعد بھی اس تحریک کا آغاز ثقافتی صورت میں ہوا ۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو وہ جماعت جو "تورك درنیی" (*Türk Derneyi*) کے نام سے موسوم تھی قائم ہوئی ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ترك اقوام کے ماضی اور حال کا مطالعہ کیا جائے، ترکی زبان کو سادہ تر اور اسے سائنس کی زبان بنایا جائے۔ اس جماعت کو کچھ زیادہ اقتدار حاصل نہ تھا، لیکن نومبر ۱۹۱۱ء میں اخبار تورك یوردو نکلنا شروع ہوا اور ۱۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو تورك اوجاغی کی بناء ڈالی گئی ۔ یہ تحریک محض چند ترك قوم پرستوں تک محدود نہ تھی ۔ اس سے کئی دوسرے ممالک کے روشن خیال ترکوں کا بھی تعلق تھا، جو زاریت (Tsarism) کے مظالم سے بھاگ نکلے تھے، مثلاً آغا اوغلی احمد، حسین زادہ علی اور آق چورہ اوغلی یوسف ۔ اس تحریک کی ایک طرف تو ان مغرب زدوں ("غربجیلق") کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی، جو در اصل غربی حضارت کا صحیح مفہوم ہی نہ جانتے تھے اور دوسری طرف جامعۂ اسلامیہ ("اتحادِ اسلام") کے حامیوں کی جانب سے ہوئی ۔ اس کے ساتھ ہی مجلّۂ گنج قلملر نے، جو سلانیک سے شائع ہوتا تھا، ایک ایسے نام سے جس میں بہت ادّعا مضمر تھا، ترکی زبان کو سادہ بنانے کی مہم پھر سے شروع کردی اور انجمن اتحاد و ترقّی کے ایک رکن ضیاء گوك آلپ نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا ۔ جب اس اخبار کا مرکزی دفتر قسطنطنیہ میں منتقل ہو گیا تو ضیاء گوك آلپ صحیفۂ تورك یوردو کے ادارے میں شامل ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب جنگ بلقان کا انجام مصیبت ناك ہوا تو نئی پود بھی قومی تحریک میں آ شامل ہوئی۔ یہ وقت قومی مثالی تصور کی کامیابی کے لیے بہت مساعد تھا ۔ صرف ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو قومی تصور کی رہنمائی صحیح جہت میں کر سکے اور ایک لائحۂ عمل تیار کر کے اسے فلسفیانہ بنیاد پر قائم کر سکے ۔ یہ کام ضیاء گوك آلپ نے انجام دیا ۔

یونیورسٹی کے سلسلۂ خطبات، اپنے محاضرات، مقالوں اور نظموں سے اس نے نوجوانوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ۔ وہ عمر بھر، یعنی بلقان کی جنگ کے زمانے سے لے کر عارضی صلح(۱) (Armistice) کے انعقاد تک، جب کہ اسے مالٹا میں جلاوطن کر دیا گیا اور بعد ازاں دیار بکر اور انقرہ کے قیام کے دوران میں، مسلسل فعّالیت دکھاتا رہا؛ اس کی تعلیم کا خلاصہ اس کی تصنیف تورکجولوغون اساسلری (انقرہ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء) میں درج ہے ۔ اس کے جلد بعد اس کی موت تمام ملک کے لیے ایک عام سوگواری کا موجب بن گئی۔

زندگی کے سب شعبوں کی طرح قومی تحریک نے ادب میں بھی اپنا اثر محسوس کرایا؛ شاعری میں وتدی وزن کو ممتازترین جگہ حاصل ہو گئی؛ زبان سادہ کر دی گئی؛ ''فن برائے فن'' کے شعار کی جگہ ''فن برائے زندگی'' نے لے لی؛ مصنفوں نے عوامی ادب سے اور اس کے روایتی قالبوں (forms) کو مستعار لینا شروع کر دیا؛ ادب معاشرے کے سب طبقوں کی زندگی اور خصوصیات کی عکاسی کرنے لگا ۔ 'گویّے-شاعروں' کی تصانیف، عوامی ادب اور عوام کی موسیقی کا لسانی اور تاریخی لحاظ سے مطالعہ کیا گیا ۔ مختصر یہ کہ علمِ مطالعات ترکیہ (Turkology) کی بناء قائم ہو گئی [آن اہم مطالعات کا شرف تقریباً تمام تر اس مقالے کے مصنف کوپرولو زادہ محمد فؤاد ہی کا حصہ ہے] ۔ ان سب باتوں نے نئی ادبی تحریک کی ایک معین سمت کی طرف رہنمائی کرنے میں بہت مدد دی ۔

اس تحریک کے شعراء میں ہم پہلی جگہ فاروق نافذ کو دے سکتے ہیں، جو اپنی آخری نظموں میں اناطولیا کے قدرتی مناظر کی تصویر کھینچتا ہے اور اس کے بعد اورخان سیفی، اِنیس بِہیج، یوسف ضیاء، خالد فخری اور نجیب فاضل کا نام آتا ہے ۔ ان سب میں محمد امین کی نسبت ضیاء گوک آلپ اور یحیٰی کمال کا اثر زیادہ ظاہر ہوتا ہے ۔ نثر میں ترقی اور بھی زیادہ نمایاں ہے اور اس کے لکھنے والے اور زیادہ زوردار ہیں ۔ اس دور کی سب سے بڑی شخصیت خالدہ اِدیب خانم کی ہے ۔ عشق و محبت کے افسانوں کے بعد، جو خانم کے ابتدائی دور کے ساتھ خاص ہیں، اس نے آتشدن گوملک (= آتشین قمیص) قسم کی کتابیں لکھی ہیں، جن میں وہ اناطولیا کے جہادِ آزادی کی کیفیت بیان کرتی ہے ۔ عمر سیف الدین نے، جو نوجوانی ہی میں انتقال کر گیا، کئی بہت عمدہ مختصر کہانیاں چھوڑی ہیں، جن میں سے بعض، مثلاً بومبا، قومی ادب کے شاہکار ہیں ۔ رفیق خالد، جو شاید سادہ ترکی زبان کا بہترین لکھنے والا ہے، اپنی مملکت حکایہ لری میں اناطولیا کی زندگی کے مناظر کی عکّاسی حقیقت کے مطابق کرتا ہے، جس سے اب تک ادب ناآشنا تھا، لیکن اس کی واقعیّت اور حقیقت پسندی (realism) ایک بے دردانہ طنز کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، جو ہمدردی اور احساس سے بالکل معّرا ہے ۔ یعقوب قدری اپنے ناولوں میں بھی ایک انشا پرداز اور صوفی شاعر زیادہ ہے اور قصہ گو کم ۔ نئی نثر میں دوسری معروف شخصیتیں فالح رِفقی، جو آتش وگونش (= آگ اور سورج) میں جنگِ فلسطین کے واقعات بیان کرتا ہے اور روشن اشرف کی ہیں ۔ ناول نگاروں میں رشاد نوری نے اپنی کہانی چالی قوشو [= سُکسُکۃ = wren] کے قسم کے ناٹکوں کی وجہ سے شہرت حاصل کی ۔ ترکی تھیٹر کے ارتقاء میں بالفعل ناکارہ فرانسیسی چوں چوں

(۱) مراد اس عارضی صلح سے ہے جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہوئی ۔

کے مربی (vaudeville = رقص و سرود ارتجالی و مضحک) کی بے شمار بدلی ہوئی صورتوں سے رکاوٹ پڑ رہی ہے، لیکن مستقبل کے بارے میں اچھی توقعات ہیں، اس لیے کہ ترکی عورت بھی اسٹیج پر آ گئی ہے، بہت سے اچھے اداکار پیدا ہو گئے ہیں اور اب موسیقی کے اہم مغربی نغمے بجائے جا رہے ہیں۔

قوم پرست جمہوریۂ ترکیہ کے قیام سے قوم پرستانہ اصول روزمرہ کی زندگی کی چیزوں میں بھی سرایت کر گئے ہیں - زبان کی تسہیل اور ترکی زبان میں سائنس کی اصطلاحوں کی تخلیق کی طرف حکومت بہت توجہ کر رہی ہے - لاطینی رسم الخط کا اختیار کر لینا زبان کی تسہیل میں بہت ممد و معاون ثابت ہوگا۔ لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا، ابھی جاری ہے - گو قومی ادب ابھی اپنے ابتدائی مراحل ہی میں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بین الاقوامی ادب کا بھی اعلان کیا جا رہا ہے - نوجوان اور پر جوش شاعر ناظم حکمت، جو مارکس Marx کے مذہب کا پیرو ہے اور روس میں طویل قیام کے بعد ترکیہ میں واپس آیا ہے، ایک مزدور اور کسان طبقے (proletariat) کے ادب کی تخلیق ایسی نظموں سے کرنے میں ساعی ہے جن میں نہ کوئی بحر ہے اور نہ قافیہ - اس کے ساتھ ہی وہ سرمایہ داروں اور ان ادیبوں کے خلاف، جو سرمایہ داروں کی حمایت کرتے ہیں، بجلیاں گرانے میں مصروف ہے - کئی نو عمر شاعر اور ناول نویس ناظم حکمت کے گرد و پیش جمع ہو گئے ہیں، بعض اور "مستقبلیہ" (futurist) کے خیالات کی اشاعت میں کوشاں ہیں [یہ وہ لوگ ہیں جو پرانی روایات کو ترک کر کے جذبات کی ترجمانی من مانے رموز و علامات سے کرتے ہیں] - اس میں شبہ ہو سکتا ہے کہ آیا اس نئے بیج کو، جسے تیز و تند ہوائیں بحیرۂ اسود کے پار سے اڑا کر لائی ہیں، اس ملک میں حاصل خیز زمین ملے گی یا نہیں، جہاں صنعت و حرفت اور سرمایہ داری کا نشو و نما ابھی شروع ہی ہوا ہے - یہ کہنا ناممکن ہے کہ آیا نو عمر قومی ادب ان غیر ملکی اثرات کی مزاحمت کر سکے گا یا نہیں - بہر حال آئندہ جو بھی ارتقائی صورتیں پیدا ہونگی وہ ملک کے مقدر کی راہ کے متوازی ہی کوئی راستہ اختیار کریں گی۔

مآخذ: (ا) منہاج اصول بحث (Methodology): کوپرولو زادہ محمد فؤاد: تورك ادبیاتی تاریخنده اصول (در مجلۂ ملّی، ج ۱، ۱۳۲۹ھ، ص ۱ تا ۵۲؛ وہی مصنف: در ملّی تتبعلر مجموعه سی، ج ۱، ۱۳۳۱ھ، ص ۳۵ تا ۴۶)۔

(ب) متون: قدیم ادب کے زیادہ تر متون ابھی مخطوطوں ہی کی شکل میں ہیں - بعض قاہرہ اور قسطنطنیہ میں طبع ہو چکے ہیں، لیکن تنقیدی تصحیح کے بغیر - قلمی نسخوں کے لیے مشرق اور مغرب کے کتب خانوں کی فہرستیں دیکھنا چاہییں۔ بہت کم متون کا یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے - تفصیل کے لیے دیکھیے یہ مادہ اور اسی موضوع سے متعلق دوسرے مادے۔

(ج) منتخبات: مقالے میں اہم ترین انتخابات کے قلمی نسخوں کا ذکر آ چکا ہے۔ یورپ میں حسب ذیل شائع ہوئے ہیں: (۱) E. J. W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*، ج ۵ و ۶؛ (۲) W. D. Smirnoff: منتخبات آثار عثمانیه، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء؛ (۳) M. Wickerhauser: *Wegweiser zum Verständniss der türkischen Sprache*، ویانا، ۱۸۵۳ء؛ (۴) Muhieddin و A. Fischer: *Anthologie aus der neuzeitlichen türkischen Literatur*، ج ۱، لائپزگ۔ برلین ۱۹۱۹ء؛ (۵) Servan de Sugny: *La Muse ottomane*، مطبوعۂ ۱۸۵۵ء، اس میں منظوم ترجمے ہیں۔

کلاسیکی شاعری کے لیے ہمارے پاس ہیں : (۶) ضیاء پاشا: خرابات (۳ جلد، ۱۲۹۱ھ) اور (۷) منتخبات میر نظیف (بولاق ۱۲۶۱ھ)؛ اور نثر کے لیے: (۸) ابوالضیاء توفیق: نمونۂ ادبیات عثمانیه (طبع سادس، قسطنطنیه ۱۳۳۰ھ) - ترکی مدارس کے لیے بھی کئی انتخابات ہیں - ان میں جدید ترین یہ ہے : تورك ادبیات نمونه‌لری، از حفظی توفیق، حمّامی زاده احسان و حسن علی (ج ۱، قسطنطنیه ۱۹۲۷ء).

(د) شعراء کے تذکرے : شعراء کے اہم ترین تذکروں کا ذکر مقالے میں آ چکا ہے - بہت سے تذکرے ابھی طبع نہیں ہوے - اس باب کے خصوصی مآخذ کے بارے میں معلومات کے لیے دیکھیے : مقدمه صوک عصر تورك شاعرلری، از ابن الامین محمود کمال (مطبوعه T. T. E.، ج ۱، قسطنطنیه ۱۹۳۰ء) - اس میں تاریخ ادب پر قدیم اور جدید مآخذ کے متعلق معلومات مل جائیں گی - اس کے علاوہ شعراء کے بارے میں سب تاریخی مصادر، سیاحت‌ناموں اور روایتی قصوں (''مناقب ناموں'') میں اہم معلومات موجود ہیں .

(ه) عام تصانیف : صحیح علمی طریقے پر لکھی ہوئی تاریخ ادب اب تک نه تو ترکیه میں مرتب ہوئی ہے نه یورپ میں - (۱) فان ہامر J. von Hammer کی کتاب *Geschichte der osmanischen Dichtkunst* (چار جلد، ۱۸۳۶ء) میں شعراء کے جو تذکرے مصنف کو معلوم نہیں ان سے تراجم لیے گئے ہیں: (۲) و (۳) Smirnow اور Krymski وغیرہ کی تصانیف معلومات اور راؤں کے اعتبار سے ناقص ہیں : ان تصانیف کے مآخذ کی فہرست کے لیے دیکھیے : (۴) Th. Menzel : *Die türkische Litteratur* (در *Kultur der Gegenwart*)، مگر اس نے Krymski : *Istoriya Turciyi i yeya literaturī* (دو جلد، ماسکو ۱۹۱۶ء) کا ذکر نہیں کیا ہے؛ (۵) ترکیه کی قدیم شاعری پر اہم ترین کتاب E. J. W. Gibb کی *A History of Ottoman Poetry* ہے (چھے جلد، لندن ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۹ء)؛ یه تصنیف اب تک بھی بہت پر قیمت ہے، اگرچه تیرھویں سے پندرھویں صدی تک کا حال بہت ناکافی ہے؛ ایسے شعراء کے سوانح حیات کا ایک ایسا مجموعه لکھنا زیادہ صحیح ہوگا جو محض دور تنظیمات تک مکمل ہے - علاوہ ازیں : (۶) P. Horn : *Geschichte der türkischen Moderne*، لائپزگ؛ (۷) M. Hartmann : *Aus der neueren osmanischen Dichtung*، *M. S. O. S.*، ج ۱۹ تا ۲۱؛ (۸) O. Hachtmann : *Die türkische Litteratur des zwanzigsten Jahrhunderts*، لائپزگ - رہا اُن کتابوں کی قدر و قیمت کا سوال جو ترکیه میں تاریخ ادب پر شائع ہوئی ہیں (قب نیز Menzel کا مقاله جس کا ذکر ابھی ہوا) اس سلسلے میں ہم کتب ذیل کا ذکر کر سکتے ہیں : (۹) شہاب‌الدین سلیمان : تاریخ ادبیات عثمانیه، قسطنطنیه ۱۹۱۳ء؛ (۱۰) فائق رشاد : تاریخ ادبیات عثمانیه، قسطنطنیه ۱۹۱۳ء؛ (۱۱) ابراهیم نجمی : تاریخ ادبیات درسلری، ۲ جلد، قسطنطنیه ۱۳۳۸ تا ۱۳۴۱ھ؛ (۱۲) اسماعیل حبیب : تورك تجدّد ادبیاتی تاریخی، قسطنطنیه ۱۳۴۰ھ؛ (۱۳) اسماعیل حکمت : تورك ادبیاتی تاریخی، ۴ جلد، باکو ۱۹۲۵ تا ۱۹۲۶ء ، لیکن یه سب تصانیف اصول بحث اور فراہم کردہ معلومات کے اعتبار سے سطحی ہیں - کواپرولو زاده محمد فؤاد نے تورك ادبیاتی تاریخی میں ایک منظم طریقے پر مختلف ترك اقوام کے آداب کو مجتمع کرنے کی کوشش کی ہے - اب تک صرف پہلی جلد شائع ہوئی ہے (قسطنطنیه، دولت مطبعه سی، ۱۹۲۶ تا ۱۹۲۸ء) - ترکی ادب کی تاریخ میں مختلف شخصیتوں اور موضوعوں پر اہم ترین مفرد کتابوں (monographs) کا ذکر اس مادے میں اور دوسرے مخصوص مادوں میں ہو چکا ہے .

(کواپرولو زاده محمد فؤاد)

[(د) (۱) Otto Spies : *Die Türkische Pro-*

saliteratur de Gegenwart، لائپزگ ۱۹۴۳ء (اس میں ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۳ء تک کے ترکی ادب کا جائزہ مع مفصل و جامع فہرستِ مآخذ و تراجم دیا گیا ہے)؛ (۲) O. Spies : *Das Blutgeld* (ترجمہ)، لائپزگ ۱۹۴۳ء؛ (۳) O. Spies : *Das Geisterhaus*، Krefeld ۱۹۴۶ء؛ (۴) O. Spies : *Die europaisch-türkische Literatur*، در *Handbuch der Orientalistik*، مرتبۂ Spuler، آیندہ سال مطبع برل E. J. Brill، لائیڈن سے شائع ہو رہی ہے؛ (۵) Mahmut Makal : *A Village in Anatolia*، مترجمۂ Sir W. Deedes و نشر P. Stiling، لنڈن ۱۹۵۴ء؛ (۶) خالدہ ادیب : *The Daughter of Smyrna* مترجمۂ ن۔ی۔ خالد، لاہور ۱۹۳۶ء۔

[(O. Spies شپیز)]

IV ۔ تاریخ ۔

۱ ۔ عام صورتِ حالات ۔

سلطنتِ عثمانیہ سب سے زیادہ پایدار اور بڑی سلطنت ہے جو اسلامی زمانے میں ایک ترکی زبان بولنے والی قوم نے قائم کی ۔ اس کے علاوہ یہ وسیع ترین سلطنت ہے جو اسلامی تاریخ کی متأخر صدیوں میں صورت پذیر ہوئی ۔ اس کا اصلی مرکز ایشیاے کوچک تھا، جو اسلامی دنیا کے انتہائی شمال مغربی گوشے میں واقع ہے اور جس نے قدیم خلافت عباسیہ کے مشتملہ ممالک کی بہ نسبت اسلامی غلبہ و اقتدار کی چار صدیاں کم دیکھی تھیں ۔ یہ سلطنت ۱۳۰۰ء کے قریب قائم ہوئی، جب اسلامی دنیا میں ہر جگہ قدیم تر سیاسی روایات کا تار پود بکھر رہا تھا اور اس وقت جو حکومتیں موجود تھیں ان میں کوئی بھی ایسی نہ تھی جس کی پایداری پر کچھ اعتماد کیا جا سکے، پھر خود اسلامی تہذیب و تمدن بھی انحطاط کے ایک بحرانی دور سے گزر رہا تھا۔

یہ حالات بجاے خود کافی نہیں کہ انہیں ایک نئی اسلامی سلطنت کے قیام کا سبب قرار دیا جا سکے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی تخلیق اور اس کے کارناموں کی توجیہ کے لیے تاریخ عالم کے عام سیاسی واقعات کا مطالعہ کیا جائے جو قرونِ وسطٰی کی متأخر صدیوں میں رونما ہوے ۔ ملاحظہ کیا گیا ہے کہ بحیرۂ روم کے ملحقہ ملکوں میں ایک جدید زبردست سلطنت کا معرضِ وجود میں آنا صرف اس صورت میں ممکن ہو سکا جب ۱۲۵۸ء میں عباسی خلافت اور اس کی سیاسی روایات کا نام و نشان مٹ چکا اور ۱۲۰۴ء میں لاطینی قبضے کی وجہ سے بوزنطی سلطنت بھی بے حد کمزور ہو گئی (قب R. Tschudi : *Vom alten Osmanischen Reich*، Tübingen ۱۹۳۰ء)۔ ان وجوہات سے ایک نئی سلطنت معرض وجود میں آ گئی، جس نے اسلامی روایات کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ جاری رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ بوزنطی تہذیب کو بھی بہت حد تک برقرار رکھا، جس میں پہلے ھی مشرقی عناصر کی بہت سی آمیزش ہو چکی تھی۔

اس سے پیشتر کہ سلاجقۂ روم کے عہد حکومت میں عثمانی سلطنت کی داغ بیل پڑے ، ان دو ثقافتی حلقوں یعنی اسلامی تہذیب اور بوزنطی تمدن کا باھمی اختلاط و امتزاج ایک مدت سے جاری تھا ، اس لیے آلِ عثمان نے جو فتوحات بڑی سرعت اور تیزی کے ساتھ چودھویں اور پندرھویں صدی میلادی میں حاصل کیں وہ کسی غیر مہذب قوم یا وحشیوں کی کسی ٹڈی دل فوج کے ابتدائی طرز کے حملے نہ تھے ، بلکہ یہ فتوحات ایک خاص منصوبے کے مطابق تھیں ، جو ممکن ہے بایزید اول، محمد ثانی اور سلیمان اول جیسے عظیم المرتبہ فاتحین اور ان کے بعض رجالِ سیاست کے ذہن میں کسی حد تک موجود ہو۔

ان فتوحات نے اس زمانے میں ایک خاص قسم کی تہذیب کی اشاعت کی، جس نے سولھویں صدی میں جا کر ایک معین شکل اختیار کر لی ۔ جوں جوں تاریخ نے قدم آگے بڑھایا، یہ عثمانی تہذیب بھی اپنے مشرقی اسلامی ہمسایوں کے مقابلے میں روز افزوں تضاد کی کیفیت پیش کرنے لگی اور شیعہ سنی اختلاف نے جدید سیاسی معنے پہنے؛ اس کے ساتھ ساتھ ماوراء النہر کے ترکوں کے ساتھ پرانے تعلقات کا رشتہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتا چلا گیا ۔ ادھر عثمانی تہذیب اور مغربی یورپ کے تمدن کے باہمی اختلافات کی خلیج، جو پندرھویں صدی تک ناقابل عبور نہیں دکھائی دیتی تھی، مسلسل وسیع تر ہوتی چلی گئی، کیونکہ ترکی سلطنت قرون وسطٰی سے نکل کر موجودہ زمانے کی طرف منتقل ہونے والی اقوام میں شامل نہ ہوئی، بلکہ اس کے برعکس عثمانی تہذیب کی جڑیں بہت سے ملکوں میں، جو ترکی سلاطین کے زیر نگین تھے، اور زیادہ مضبوط ہو گئیں ۔ یہی عثمانی روایات بغایت واضح طور پر عین اس وقت نظر آنے لگیں جب عثمانی سیاسی طاقت رو بہ انحطاط تھی ۔ اس کی ایک عمدہ مثال مصر ہے (قب خدیو) ۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد نوجوان ترکوں نے کچھ تھوڑے سے عرصے کے لیے عثمانی تہذیب و تمدن کو دوبارہ سیاسی حقیقت میں منتقل کرنے کی کوشش کی تو یہ مساعی سراسر ناکام ثابت ہوئیں، کیونکہ مغربی قوم پرستی کا جذبہ طبائع میں سرایت کر چکا تھا اور اس کی بدولت سلطنتِ عثمانی کے جسد میں اختلال و انحلال کا عمل جاری ہو گیا تھا ۔

اگرچہ عثمانی سلطنت کی پیدائش ایسے مذہبی ماحول میں ہوئی جو ٹھیٹھ اسلام سے بہت دور تھا، عثمانی سلطنت نے سرکاری طور پر حنفی مذہب اختیار کر کے راسخ العقیدگی کی طرف قطعی طور پر رخ کر لیا، لیکن اس کے ساتھ قدیم تر روایات بھی کسی حد تک برقرار رہیں ۔ رہی اسلامی خلافت اور اسلامی دنیا کی قیادت کا دعوٰی، نیز عبدالحمید ثانی کی جامعۂ اسلامیہ کی سیاست (پین۔ اسلامک پالیسی)، تو یہ باتیں سلطنت عثمانیہ کی اصلی خصوصیات سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں، بلکہ زیادہ تر اس کی خارجی سیاست کا جزو تھیں، جس کا تعلق بالخصوص عیسائی حکومتوں سے تھا [قب مادۂ خلیفہ].

مغربی تہذیب کا اثر سلطنتِ عثمانیہ پر اٹھارویں صدی میں پڑنے لگا، یعنی ایسے زمانے میں جب یہ سلطنت اپنی ایک خاص طرز کی ثقافت اختیار کر چکی تھی اور یورپ کے مقابلے میں اسے اپنی سیاسی کہتری اور کمزوری کا احساس ہونے لگا تھا ۔ فرانس قدیمی تعلقات کی بنا پر پہلا یورپی ملک تھا جس نے ترکی کو جدید قسم کی فنی (فوجی) چیزیں بہم پہنچائیں اور یہ طریق کار بیسویں صدی کے آغاز تک برابر جاری رہا ۔ مغربی اصلاحات اور معاہد کا اجراء کبھی بھی انقلابی قسم کا نہ تھا ۔ جدید اصلاحات زیادہ تر حکومت کے اقدامات اور معاملات تک محدود رہیں اور ان کا نفاذ 'تنظیمات' [رک بآن] کے دور میں کامیابی کے ساتھ ہوتا رہا ۔ البتہ مغربی خیالات کا بلا واسطہ اثر یہ ضرور ہو کہ ترکوں میں قومیت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء کی جنگ نے ترکوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ قومیت کے اس نئے مطمح کو یکسر غیر متوقع طور پر عملی جامہ پہنا سکیں ۔ قدیم سلطنتِ عثمانیہ کے مقابلے میں موجودہ ترکی حکومت کا رقبہ بہت کم ہے، لیکن اس میں سلطنتِ عثمانیہ کی بہت سی روایات ابھی تک باقی ہیں ۔

۲ - تاریخ پر اجمالی نظر.

پہلا دور : سلطنت کا قیام اور اس کی توسیع، تیمور کے حملے سے پیدا ہونے والے عارضی انحلال تک.

عثمان اول ۱۲۹۹ تا ۱۳۲۶ء
اورخان (عثمان اول کا بیٹا) ۱۳۲۶ تا ۱۳۵۹ء
مراد اول (اورخان کا بیٹا) ۱۳۵۹ تا ۱۳۸۹ء
بایزید اول یلدرم (مراد اول کا بیٹا) ۱۳۸۹ تا ۱۴۰۲ء

عثمان اور اورخان کے عہد حکومت کی تاریخیں یقینی طور پر ثبت نہیں کی جا سکتیں - بایزید کا عہد ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء کو ختم ہوا، جب وہ انقرہ کی لڑائی میں گرفتار ہو گیا: اس کے بعد گیارہ سال کا عرصہ ایسا گزرا جس میں بایزید کے لڑکے عیسٰی، محمد، سلیمان اور موسٰی تاج و تخت کے لیے آپس میں لڑتے بھڑتے رہے - اس دور کا خاتمہ یوں ہوا کہ صوفیہ کے قریب چامورلی کے مقام پر جولائی ۱۴۱۳ء میں محمد نے موسٰی پر فتح پائی.

دوسرا دور : اس دور میں سلطنت بحال ہوئی، بڑی تیزی سے پھیلی اور اپنی انتہائی وسعت کو پہنچ گئی.

محمد اول (بایزید اول کا بیٹا) ۱۴۰۳ تا ۱۴۲۱ء
مراد ثانی (محمد اول کا بیٹا) ۱۴۲۱ تا ۱۴۵۱ء
محمد ثانی فاتح (ابن مراد ثانی) ۱۴۵۱ تا ۱۴۸۱ء
بایزید ثانی (ابن محمد ثانی) ۱۴۸۱ تا ۱۵۱۲ء
سلیم اول (ابن بایزید ثانی) ۱۵۱۲ تا ۱۵۲۰ء
سلیمان اول قانونی (ابن سلیم اول) ۱۵۲۰ تا ۱۵۶۶ء

تیسرا دور : جس میں سلطنت اپنے تمام ممالکِ محروسہ پر بدستور قابض رہی تا آنکہ ہنگری کا ملک ہاتھ سے نکل گیا.

سلیم ثانی (ابن سلیمان اول) ۱۵۶۶ تا ۱۵۷۴ء
مراد ثالث (ابن سلیم ثانی) ۱۵۷۴ تا ۱۵۹۵ء
محمد ثالث (ابن مراد ثالث) ۱۵۹۵ تا ۱۶۰۳ء
احمد اول (ابن محمد ثالث) ۱۶۰۳ تا ۱۶۱۷ء
مصطفٰی اول (ابن محمد ثالث) ۱۶۱۷ تا ۱۶۱۸ء
عثمان ثانی (ابن احمد اول) ۱۶۱۸ تا ۱۶۲۲ء
مصطفٰی اول، بار دوم ۱۶۲۲ تا ۱۶۲۳ء
مراد رابع (ابن احمد اول) ۱۶۲۳ تا ۱۶۴۰ء
ابراهیم (ابن احمد اول) ۱۶۴۰ تا ۱۶۴۸ء
محمد رابع (ابن ابراهیم) ۱۶۴۸ تا ۱۶۸۷ء
سلیمان ثانی (ابن ابراهیم) ۱۶۸۷ تا ۱۶۹۱ء
احمد ثانی (ابن ابراهیم) ۱۶۹۱ تا ۱۶۹۵ء
مصطفٰی ثانی (ابن محمد رابع) ۱۶۹۵ تا ۱۷۰۳ء

چوتھا دور : اس دور میں سلطنت بتدریج کمزور ہوتی گئی اور قوی باج گزار امیروں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا.

احمد ثالث (ابن محمد رابع) ۱۷۰۳ تا ۱۷۳۰ء
محمود اول (ابن مصطفٰی ثانی) ۱۷۳۰ تا ۱۷۵۴ء
عثمان ثالث (ابن مصطفٰی ثانی) ۱۷۵۴ تا ۱۷۵۷ء
مصطفٰی ثالث (ابن احمد ثالث) ۱۷۵۷ تا ۱۷۷۴ء
عبدالحمید اول (ابن احمد ثالث) ۱۷۷۴ تا ۱۷۸۹ء
سلیم ثالث (ابن مصطفٰی ثالث) ۱۷۸۹ تا ۱۸۰۷ء
مصطفٰی رابع (ابن عبدالحمید اول) ۱۸۰۷ تا ۱۸۰۸ء
محمود ثانی (ابن عبدالحمید اول) ۱۸۰۸ تا ۱۸۳۹ء

پانچواں دور : مغربی خیالات کے اثر سے تہذیب و تمدن اور نظامِ حکومت میں از سرِ نو جان آئی.

عبدالمجید (ابن محمود ثانی)	۱۸۳۹ تا ۱۸۶۱ء
عبدالعزیز (ابن محمود ثانی)	۱۸۶۱ تا ۱۸۷۶ء
مراد خامس (ابن عبدالمجید)	۱۸۷۶ء
عبدالحمید ثانی (ابن عبدالمجید)	۱۸۷۶ تا ۱۹۰۹ء
محمد خامس (ابن عبدالمجید)	۱۹۰۹ تا ۱۹۱۸ء
محمد سادس (ابن عبدالمجید)	۱۹۱۸ تا ۱۹۲۲ء

قومی ترکی سلطنت : ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے غازی مصطفٰی کمال پاشا کی صدارت میں جمہوری حکومت قائم ہوئی.

عثمانیہ سلطنت کی تاریخ کا ایک عمدہ خاکہ خلیل ادہم نے دولِ اسلامیہ (استانبول ۱۹۲۷ء، ص ۳۲ ببعد) میں دیا ہے.

۳ - تیرھویں صدی کے آخر میں ایشیاے کوچک کے حالات.

نسبةً قریب تر زمانے کی تحقیقات سے عثمانی سلطنت کے وجود میں آنے کے متعلق بہت سے ایسے امور کی وضاحت ہوئی ہے جو اس سے قبل ہمیں زیادہ تر عثمانی تاریخی روایات ہی کے ذریعے سے معلوم تھے - یہ روایات ان مصادر سے منعکس ہوتی تھیں جو سولھویں صدی اور اس کے بعد کے زمانے میں مرتب ہوے - کتبوں اور سکوں کی دریافت ، نیز پرانے تاریخی مصادر (مثلاً آلِ عثمان کی تاریخوں کی اختلافی روایتوں) اور نیم افسانوی مآخذ (’مناقب ناموں‘ اور اہلِ طریقت کے ’ولایت ناموں‘) کے تنقیدی مطالعے نے بہت سے ایسے تاریخی علاقات کو روشن کر دیا ہے جن کا ہمیں سان و گمان بھی نہ تھا.

اس علاقے میں، جہاں کبھی قونیہ کا سلجوقی خاندان حکومت کیا کرتا تھا، آلِ عثمان کی سلطنت کی بنیاد ایک شمال مغربی سرحدی چوکی (’اُوج‘) کی صورت میں قائم ہوئی - جب ۱۲۴۳ء میں کیخسرو ثانی پر مغولی حملہ آوروں نے فتح پائی، تو علاقۂ مذکور میں رفتہ رفتہ بد نظمی پھیل گئی - اس زمانے میں ایشیاے کوچک ترکی رنگ میں بہت حد تک رنگا جا چکا تھا - اناطولیا کے اکثر ترک اوغوز قبائل سے تھے، جو سلجوقیوں کے حملے کے دوران میں اور اس کے بعد اس علاقے میں آ کر آباد ہو گئے تھے - ان میں عیسائی ترک بھی شامل تھے، جو بوزنطی سلطنت کے یورپی حصوں کے راستے یہاں آئے تھے - اس کے علاوہ کچھ ایسے ترکی عناصر بھی تھے جو روس سے آئے تھے - مشرق میں فتوحاتِ مغول ہوئیں تو پناہ گزین ، بالخصوص سابقہ سلطنتِ خوارزم کے باشندے، جوق در جوق یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے - ان مہاجرین میں سے بہت سے مہاجر ایرانی نسل کے تھے - ہمیں صحیح طور پر یہ معلوم نہیں کہ ایشیاے کوچک کی یونانی‌مآب (graecized ، مُتأغرق) اصل آبادی کا باقی آبادی سے کیا تناسب تھا - یہ لوگ غالباً زیادہ‌تر شہروں میں آباد تھے - اس میں کوئی شک نہیں کہ قونیہ کے اصلی باشندے پیشتر ہی سے بہت بڑی حد تک اسلامی تہذیب و تمدن اختیار کر چکے تھے، لیکن مغرب میں بوزنطی حکومت کے علاقوں میں اور شمال مغرب کی طرابزونی سلطنت میں، جہاں کی آبادی کے بہت سے افراد لازوں میں سے تھے، نیز وسطی آرمینیہ کے پہاڑوں اور سائیلشیا Cilicia کی ارمنی مملکت میں (۱۰۸۰ سے ۱۳۷۵ء تک) عیسائی عنصر کی ابھی تک خاصی بہتات تھی - یہ تو ظاہر نہیں ہوتا کہ سلجوقی سلطنت کی سابقہ حدود کے اندر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کوئی شدید اجتماعی (سوشل) اختلاف موجود تھا، تاہم شہری باشندوں اور ترکی خانہ بدوش قبائل یعنی ترکمانوں (’’قرا کمۂ روم‘‘)

کے درمیان تضاد نسبۃً بہت زیادہ نمایاں ہو گیا تھا ۔ یہ ترکمان سارے ایشیاے کوچک میں، بلکہ صرف وہیں نہیں، پاس کے علاقوں یعنی ملک شام، الجزیرہ اور ایران میں بھی گردش کرتے رہتے تھے ۔ ترکی قبائل نے اسلام جس شکل میں قبول کیا تھا اس کے اندر اپنی بہت سی قدیم مذہبی روایات کو بھی باقی رکھا تھا ۔ اس طرز کا اسلام سیلانی درویشوں کی تبلیغ کا نتیجہ تھا، جو قلندریہ اور حیدریہ کے نام سے مشہور تھے اور جو گیارھویں صدی سے تمام شمالی ایران اور ماوراءالنہر میں پھیلے ہوے تھے ؛ ان کی تعلیم میں متصوفانہ عقائد کی آمیزش تھی، جس میں بہت سے شیعی عناصر بھی موجود تھے ۔ جب ترکمان ایشیاے کوچک میں ہجرت کر آئے، تو ان پر اسی تعلیم کے اثرات غالب رہے ؛ ان کے ہاں جن لوگوں کو مذہبی اقتدار حاصل تھا، وہ 'بابا' کہلاتے تھے اور اس وقت تک بھی اسلامی دور سے پہلے کے بقیسیوں سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے ۔ انھیں مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر ۱۲۳۹ء میں بابا اسحٰق کی سرکردگی میں بابائیوں کی ایک خوف ناک بغاوت برپا ہوئی تھی ۔ اس زمانے کی حکومت بالآخر اس بغاوت کو دبانے میں کامیاب رہی، لیکن نیچے کے طبقات کے ملحدانہ عقائد نے عثمانی تاریخ کی پہلی صدیوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ۔ در حقیقت ان ترکمانوں کی تعداد حکمران حلقوں اور شہری لوگوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھی ۔ یہ امر ایشیاے کوچک کے مقامات کے موجودہ اعلام سے ثابت ہے، چنانچہ بے شمار مواضعات، دریاؤں اور پہاڑوں کے نام اب خالص ترکی ہیں اور ان میں قدیم قبائلی نام، مثلاً قای، سالور، بیات اور چپنی بھی ملتے ہیں (قب کوپرولو زادہ فؤاد : اوغوز اتنولوژی سنہ تاریخی نوطلر، تورکیات مجموعہ سی، ۱ : ۱۸۵ ببعد) ۔ ترکمان قبائل ابھی ایک حد تک جنگجویانہ اوصاف کے مالک تھے، اس لیے مناسب ترین خدمت، جو ان سے لی جا سکتی تھی، یہی تھی کہ انھیں سرحدوں کی حفاظت اور جدید ملکوں کی تسخیر کے کام میں لگایا جائے ۔ بداوت چھوڑ کر جب انھوں نے حضارت اختیار کر لی، تو وہ بہت حد تک اصلی دیہاتی آبادی سے مخلوط ہو گئے ہونگے ۔ یہ اس اختلاط کا نتیجہ ہوگا کہ عجیب و غریب قسم کے، نیم عیسائی، مذہبی عقائد و رسوم بعد کے زمانے میں اناطولیا کے نیچے طبقے کے لوگوں میں موجود پائے گئے ہیں اور ایسے عقائد کا رواج عثمانی سلطنت کے عہد حکومت میں بکتاشی طریقے کے لوگوں میں بالخصوص پایا جاتا تھا ۔ بکتاشیوں کا نام ان کے بانی حاجی بکتاش ولی کے نام سے مأخوذ ہے، جس کی بابت کہتے ہیں کہ وہ بابا اسحٰق کا مرید تھا، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے (کوپرولو زادہ فؤاد : *Les origines du Bektachisme*، در *Actes du Congrès International de l' Histoire des Religions, tenu à Paris 1923*).

سلجوقیوں کے زمانے میں حاکمان وقت اور معاشرے کا اعلٰی طبقہ سنّی المذہب تھا ۔ یہی حال دوسرے سلجوقی خاندانوں کا تھا ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں مذہب اہل سنت کے اتّباع کی یہ روایت خراسان اور ماوراءالنہر کی سامانی سلطنت کے زمانے سے چلی آ رہی تھی ۔ یہ وہ ممالک تھے جن سے ایشیاے کوچک کے ترکی عنصر کے تعلقات اس ملک کے توطّن کے بعد بھی مسلسل قائم رہے ۔ سلجوقیوں کے زمانے میں ایشیاے کوچک کی اعلٰی تہذیب زیادہ تر ایرانی نمونے کی تھی ۔ انھیں تعلقات سے یہ بات

واضح ہوتی ہے کہ اناطولیا میں حنفی مذہب کو سرکاری طور پر کیوں غلبہ و اقتدار حاصل ہوا اور اس کے بعد یہی مذہب عثمانی حکومت کے عہد میں بھی کیوں غالب رہا؛ لیکن اونچے طبقوں کے لوگ بجائے خود ایک اعلٰی قسم کے تصوف کے زبردست اثر سے بھی آزاد نہ تھے۔ اس اثر کا اصلی منبع بھی خراسان ھی کا ملک تھا، جہاں سے جلال الدین رومی [رَكَ بآن] تشریف لائے تھے۔ [مولانا] قونیہ کے سلجوقی خاندان کے زیر حمایت رہتے تھے اور مولویہ سلسلے کے ذریعے سے صدیوں تک عثمانی ترکی تہذیب کو متاثر کرتے رہے۔ غرض اسی طرح شہری لوگ بھی صوفیوں کی طرح رباطات اخوان کی جماعت بندیوں سے بخوبی آشنا تھے، جو فُتُوّة [رَكَ بآن] کی ذیل میں تھیں۔ اب ہمیں ''رباطات الاخوان'' (یعنی اَخِیّوں) کے متعلق کافی معلومات حاصل ھیں (F. Taeschner، در *Islamica*، ج ۴ : ۱۹۲۹ء، کُراسه ۱)۔ اسی طرح ''غازیوں'' نے بھی اسی قسم کی ایک جماعت بنا لی تھی۔

تیرھویں صدی کے خاتمے کے بعد سے واقعات کا جو تطور ہوا، اسے اسی مذہبی اور معاشرتی اختلاف ھی پر مبنی سمجھا جا سکتا ہے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں، جو وجود میں آئیں (دورِ طوائف ملوك)، ہمیں کبھی تو صحیح العقائد عنصر کا غلبہ نظر آتا ہے اور کبھی ملحدانہ خیالات والے ترکمانوں کا۔ آخر الذکر صورت ہمیں خاص طور پر قرمان اوغلی [رَكَ بآن] کی ریاست میں نظر آتی ہے؛ کم از کم ان کے ابتدائی زمانے میں تو کیفیت یہی تھی۔

اس بات پر مؤرخین کا بالعموم اتفاق ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی بنیاد ۱۲۹۹ء میں بِثِنیا Bithynia کے مقام میں رکھی گئی۔ اسی زمانے میں چند اور خود مختار ریاستیں بھی معرضِ وجود میں آئیں، یعنی میسیا Mysia میں قرہ سی اوغلی [رَكَ بآن]، لڈیا میں صاروخان اوغلی [رَكَ بآن]، آئیونیا Ionia میں آیدین اوغلی [رَكَ بآن]، قاریا Caria میں منتشه اوغلی [رَكَ بآن]، لسیا Lycia میں تِکّه اوغلی [رَكَ بآن]۔ یہ تمام خاندان عثمان اوغلی سے صرف اس بات میں مشابہ تھے کہ جزیرہ نما کے مغربی ساحل کے بڑے بڑے علاقے ان کے قبضے میں تھے۔ ان کے علاقے سابقہ سلجوقی سلطنت کی بیرونی حدود پر واقع تھے اور یہ خاندان ان ترکمان سرداروں کی اولاد سے تھے جو سرحدوں کی حفاظت پر متعین تھے (اُوج بیگلری)۔ ایک طرف یہ علاقے اسلامی تمدن کے مرکز یعنی اناطولیا سے بہت دور تھے دوسری طرف ساحل کے یونانی اور جزائر کے اطالوی آبادکاروں کے ساتھ ان کے تعلقات اور مراسم تھے۔ ان میں سے بعض ولایات (صاروخان، آیدین، مِنْتشه) کے سکّوں پر تو مثالی پیکر اور لاطینی حروف بھی منقش تھے، لیکن ساحلی ریاستوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان کے پاس بحری بیڑے موجود تھے، جن کی مدد سے وہ یونانی جزیروں پر اور براعظم یورپ میں مورہ [موریا] سے لے کر دُبروچه تک بحری حملے کر سکتے تھے۔ آیدین اوغلی اُمور بیگ (م ۱۳۴۸ء) تو خاص طور پر بوزنطی شہنشاہ کانتا کیوزینوس (یا قانتا قوزن Cantacuzenos) کے حلیف کی حیثیت سے اپنی بحری مہمات کے لیے بہت مشہور ہے۔ مغرب کی طرف بڑھنے کا جو موقع عثمان اوغلی کو میسر تھا، اس سے انہیں بہت فائدہ پہنچا اور آخر کار انہیں تمام دیگر ریاستوں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔

ان ساحلی ریاستوں کے مشرق میں اسی زمانے میں کئی اور ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں، یعنی گرمیان اوغلی [رَكَ بآن] کی ریاست فریجیا

Phrygia میں، حمید اوغلی [رک بآن] کی پیسیڈیا میں اور ان سے کم اهم اشرف اوغلی کی ریاست بکشہر میں (جس کا بعد میں حمید اوغلی کی ریاست سے الحاق هوا) اور دکزلی اوغلی کی ریاست لاذقیه میں (جس کا الحاق بعد میں گرمیان اوغلی کی ریاست سے هوا) ۔ جندر اوغلی کا اهم خاندان — جو بعد میں اسفندیار اوغلی [رک بآن] کے نام سے مشہور هوا — پافلغونیه Paphlagonia میں متمکن اور بحیرۂ اسود اور سینوب پر قابض تھا، لیکن اسے بحری توسیع کا بہت کم موقع ملا، حالانکہ ان علاقوں کے تعلقات بھی یورپ کے براعظم سے اور بالخصوص دبروچه کے ساتھ قائم تھے ۔ جنوبی ساحل پر اس طرح کی حیثیت قرمان اوغلی [رک بآن] نے پیدا کر رکھی تھی ۔ ان کی ابتداء تقریباً ۱۲۵۶ء میں هوئی، اورچونکه ملک شام کو جانے والی بڑی سڑک ان کی ریاست میں سے گزرتی تھی، اس لیے انھیں دوسری ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ پایداری اور زیادہ اقتدار نصیب هوا (قب خلیل ادھم : دُوَلِ اسلامیه، ص ۲۷۰ ببعد).

جن علاقوں کا شمار اوپر هوا ان پر چودھویں صدی میں مغولوں نے کبھی حکومت نہیں کی ۔ مغولی گورنر، جنھیں اولجایتو (۱۳۰۴ تا ۱۳۱۶ء) اور ابوسعید (۱۳۱۶ تا ۱۳۳۵ء) نے مقرر کیا تھا، زیادہ تر قیصریه میں رها کرتے تھے اور ایشیاے کوچک کے وسطی میدانِ مرتفع پر انقره تک ان کی حکومت تھی ۔ ان میں سے آخری گورنر تیمور تاش تھا، جو ۱۳۲۷ء میں ارتنا کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے مصر کی جانب فرار هونے پر مجبور هوا ۔ یه ارتنا ۱۳۳۵ء میں خودمختار هو گیا تھا اور اس نے ارتنا اوغلی [رک بآن] کے خاندان کی بنیاد ڈالی ۔ اس زمانے کے قریب یعنی ۱۳۹۱ء میں مرعش اور البستان میں ذوالقدریه [رک بآن] کا خاندان معرضِ وجود میں آیا ۔ ایشیاے کوچک کے اس جنوب مشرقی حصے میں اس وقت مصر کے مملوک سلاطین کی سلطنت کو ایک اهم سیاسی عامل کی حیثیت حاصل تھی اور قرمان اوغلی اور ذوالقدریه دونوں امارتوں کو مملکتِ مصر کے ساتھ دوستانه اور معاندانه نوعیت کے بہت سے معاملات پیش آتے رہے.

ان تمام مذکورۂ بالا ریاستوں میں مذهبی اور تمدنی صورتِ حالات قریب قریب یکساں تھی ۔ بیگ یا امیر کی فوجی طاقت کا دار و مدار ان قبائل پر تھا جو اس وقت تک بھی کم و بیش خانه بدوش تھے اور اسی طبقے میں ان نیم مذهبی اور نیم فوجی سرداروں کا شمار هو سکتا ہے جو ان متعدد علاقوں میں 'پاشا' [رک بآن] کے لقب سے موسوم تھے، مثلاً عثمان اوغلی، تکه اوغلی، آیدین اوغلی، دکزلی اوغلی اور جندر اوغلی ۔ متعدد علاقوں میں همیں ''غازی'' بھی ملتے هیں ۔ یه لوگ بظاهر سلجوقیوں کے زمانے کے رباطاتِ فتوّة کے اراکین سے قریب تر تھے، مگر غازی ان سے زیادہ راسخ العقیده تھے ۔ بیگوں کے دربار میں نسبةً زیادہ راسخ الاعتقاد عالموں اور فاضل ادیبوں کا اجتماع بھی هونے لگا، جو اب ترکی زبان میں کتابیں لکھنے لگے (قب یہی ماده، حصۂ ادب، ب III [ص۲۴۹]) ۔ زیاده بڑے شہروں میں پرانے اجتماعی طور طریقے قائم رہے، بالخصوص انقره میں، جو مغولوں کی سلطنت کی آخری سرحد پر واقع تھا ۔ اس جگه حکومت عملی طور پر، رباطات الاخوان (اخی لوگوں) کے هاتھ میں تھی.

عثمانیوں سے قبل کی حکومت کی تاریخ کے مطالعے کے لیے کوپرولو زاده فؤاد کی یه تصانیف دیکھیے : ایلک متصوفلر، استانبول ۱۹۱۸ء اور

اناد ولو ده اسلامیت ادبیات فاکولته سی، مجموعه سی، ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء۔

۴ - پہلا دور (۱۲۹۹ تا ۱۴۰۲ء).

عثمانیوں کی تاریخی روایات نے اس امر کی یاد محفوظ رکھی ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے بانی اپنی اصل کے لحاظ سے خانہ بدوش ترکمان تھے - عثمان کے باپ اِرطُغرُل [رَكَ بآن] کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے چھوٹے سے قبیلے کے ساتھ سوِ‌گوذ Sögüd [رَكَ بآن] کے نواح میں 'اُوچ بیگی' کی حیثیت سے سکونت اختیار کی - ارطغرل اور اس کے باپ سلیمان شاہ کے شجرۂ نسب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قبیلۂ قای [رَكَ بآن] میں سے تھے، جو اوغوز ترکوں کی ایک شاخ ہے - ارطغرل اور اس کے قبیلے کے متعلق مختلف روایات افسانوی انداز کی موجود ہیں اور اسی طرح خود عثمان کی جوانی اور اس کے ابتدائی غزوات کی تفصیل بھی بجائے خود ایک داستان معلوم ہوتی ہے - ان مختلف مآخذ پر نظر ڈالنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی حیثیت سے واقعات کی صورت تقریباً یوں ہو گی کہ عثمان —— یا عثمان جِق، جو اس نام کی قدیم ترین معلوم صورت ہے —— ارطغرل کا حقیقی بیٹا بھی نہ تھا، بلکہ غالباً اس کا تعلق آبادیؔ کے ایک غیر خانہ بدوش عنصر سے تھا، جو ترکمانوں کی بہ نسبت سُننِ اسلامی کی پابندی زیادہ سختی کے ساتھ کیا کرتے تھے (J. H. Kramers : *Wer war Osman* در *A. O.*، ۶ : ۲۴۲)؛ تاہم وہ 'غازیانِ روم' میں سے ضرور تھا اور ارطغرل کی وفات کے بعد (حدود ۱۲۶۵ء میں؟) دوسرے 'غازیوں' (ترکی : 'آلْپ') کے ساتھ ساتھ قبیلے کی سرداری اس کے ہاتھ میں آئی - اس کے ارد گرد رباطات الاخوان کے لوگ بھی جمع رہتے تھے اور غالب گمان یہ ہے کہ عثمان کا خسر شیخ اِدہ بالی، خواہ اس کا حسب نسب کچھ بھی تھا، اخی لوگوں ہی میں سے تھا - ان مختلف عناصر کے باہمی تعامل کی وجہ سے اس قبیلے نے ایک خود مختار ریاست کی شکل اختیار کر لی اور اس کا مرکز قرہ‌جہ حصار قرار پایا - اس ریاست میں رفتہ رفتہ سُننِ اسلامی غالب آئے، گو مقبول عام مذہبی پیشواؤں ('بابا'، 'دِدہ'، 'ابدال') کی بھی بڑی قدر و منزلت ہوتی رہی.

عثمان خان، نیز اورخان کے عہدِ حکومت میں ان کی چھوٹی سی ریاست کی تاریخ اناطولیا کی دیگر ہم عصر ریاستوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی- اپنے قبائلیوں کی امداد نیز اپنی خوش تدبیری اور ذاتی تعلقات کی بدولت وہ اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع میں کامیاب رہا، حنانچہ عثمان کی وفات کے وقت اس کی مملکت کی شرقی سرحد دریاے سقاریا تک اور جنوب میں اس کی حکومت غالباً اِسکی شِہر تک جا پہنچی تھی، مگر وہ یونانی شہر جو ساحلِ بحر پر یا اس کے قریب واقع تھے، مثلاً اِزنیق، ازنیق مید (اِزمِد) اور آخرکار بروسہ، اورخان کے عہد کے آغاز میں فتح ہوے اور اسی وقت بروسہ صدر مقام قرار پایا - یہ تمام نئے علاقے بوزنطیوں سے اور زیادہ تر ان کی قلعہ گیر فوجوں کے مقامی سپہ سالاروں کے ہاتھوں سے چھینے گئے تھے - بوزنطی باقاعدہ افواج نے شاذ و نادر ہی (۱۳۰۱ء میں اور ۱۳۲۹ء میں) ترکوں کا مقابلہ کیا - اورخان کے عہد حکومت میں دیگر ترکمانی علاقہ بھی اس کی مملکت میں شامل ہوا، یعنی قرہ سی اوغلی [رَكَ بآن] کی ریاست؛ اس توسیعِ مملکت کی وجہ سے عثمان اوغلی کی ریاست فوراً ہی اناطولیا کی ریاستوں میں سے نمایاں‌ترین اور زبردست بحری طاقت بن گئی.

عثمان خان اور اورخان کی تاریخ میں

یہ ایک قابلِ ذکر امر ہے کہ آس پاس کے عیسائی سرداروں اور حاکموں سے بظاہر ان کے قریبی تعلقات قائم تھے ۔ کہتے ہیں کہ قلعہ خِرِینْجق کا امیر کوسہ میخال ، عثمان کا وفادار دوست تھا اور جب قرہ سی کی ریاست کا الحاق ہوا تو غازی اِوْرِنوس [رکّ بآں] بھی، جو عیسائی نسل سے تھا، اورخان کے ساتھ آ ملا ۔ ان دونوں کی اولاد بعد میں عثمانی سلطنت کے قابلِ ذکر جاگیرداروں میں شمار ہوتی رہی ۔ عیسائی رومی عناصر سے اس قسم کا اتحادِ عمل جو ابتداء ھی سے قائم ہوا ، اس سے اغلب معلوم ہوتا ھے کہ عثمانی سلطنت میں بوزنطی رسم و رواج اس ابتدائی دَور ھی میں اس طریق سے داخل ہوے جس طرح وہ بعض دوسری معاصر بحری ریاستوں میں داخل ہوے ۔ عیسائی اور خانہ بدوش ترکمانی عناصر دونوں آہستہ آہستہ سنّی علماء (''ملاؤں'') کے روزافزوں اثر سے متاثر ہوے ۔ ان علماء کو پرانے مصادر میں '' دانشمند'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ھے ۔ ان میں سے بعض تو رباطات الاخوان سے متعلق تھے، چنانچہ قاضی جَنْدرلی قرہ خلیل کے متعلق ، جو بعد میں خیرالدین پاشا کے لقب سے مراد اول کا وزیر ہوا یہی کہا جاتا ھے ۔ شاید علاءالدین پاشا بھی انھیں لوگوں میں سے تھا جو اورخان کا وزیر اور روایۃً اس کا بڑا بھائی تھا ۔

الغرض اورخان کے عہد میں، جو بحیثیت مجموعی پُر امن تھا ، ان مختلف عناصر کی امداد سے ایک مخصوص نظامِ حکومت اور تمدن کی بنیاد پڑی ، جس کی بنا پر ھی سلطنتِ عثمانیہ کے ارتقاے مابعد کی تشریح کی جا سکتی ھے ۔ اس کی جزئیات کا ھمیں بہت کم علم ھے ۔ نظامِ حکومت فوجی قسم کا تھا اور غالباً سلجوقیوں کے نظام کی طرز پر قائم ہوا ۔ جاگیر داروں کے درمیان زمین کی تقسیم غالباً قدیمی بوزنطی دستوروں کے مطابق ہوئی ہوگی (قبّ تیمار) ۔ اورخان کے عہد میں گھوڑ سواروں کے رسالوں کو جاگیریں دی گئیں، جو اسی زمانے میں مرتب کیے گئے تھے اور جنھیں '' مُسَلَّم '' کہتے تھے ۔ اسی کے عہد میں نئی نظامی پیادہ فوج بھی مرتب ہوئی، جسے '' یایا '' کہتے تھے کیونکہ آقنجی کی غیر نظامی (بے قاعدہ) فوج، جس میں خانہ بدوش ترکمان بھرتی کیے جاتے تھے، اب کافی نہ تھی ۔ اسی زمانے میں پاشا [رکّ بآں] کا لقب، جو پہلے مجاہد درویشوں کے لیے مخصوص تھا، رجالِ سیاست (مثلاً اورخان کے عہد میں سنان پاشا کو) اور سپہ سالاروں کو بھی عطا ہونے لگا ۔

اس خرد سال ریاست کی قدرتی توسیع مغرب کی طرف ہوئی اور یہ توسیع ان بحری حملوں کے تتبع میں تھی جو صاروخان اوغلی اور آیدین اوغلی نے یونان کے ساحل اور جزائر پر کیے تھے ۔ اورخان کے عہد میں درۂ دانیال (Hellespont) کی دوسری طرف کئی بار فوج کشی ہو چکی تھی اور یہ حملے زیادہ تر شہنشاہ کانتاکیوزِینوس Cantacuzenos کے ساتھ اتحاد اور اس کی خانہ جنگیوں کے سلسلے میں ہوے ۔ یورپ کی سرزمین کے شہروں پر فوجی قبضے کی ابتداء ۱۳۵۳ء سے ہوئی، جب اورخان کا بیٹا سلیمان پاشا اپنی مشہور مہم لے کر گیا؛ اس کے بعد ۱۳۵۷ء میں گیلی پولی بھی فتح ہو گیا ۔ یہ واقعات گویا مراد اول اور بایزید کی آئندہ فوجی کارروائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوے، جو سب کی سب روم ایلی کے علاقے میں ہوئیں ۔ پہلے تو بوزنطی سلطنت کا وہ تمام علاقہ فتح کر لیا گیا جو قسطنطنیہ کے مغرب کی طرف تھا، پھر ۱۳۶۱ء میں ادرنہ فتح ہوا اور

۱۳۶۵ء میں اسے سلطان مراد نے اپنا یورپی پاے تخت بنا لیا ۔ اس کے بعد اہلِ بلغاریہ اور سرویا سے لڑائیاں شروع ہوئیں، جن سے عثمانیوں کو موجودہ سلطنتِ بلغاریہ کا بہت سا حصہ مل گیا ۔ ۱۳۸۹ء میں قوصوہ Kossowo کے میدان میں سرویا کی طاقت کا قلع قمع ہوا ۔ اس لڑائی میں مراد اول مارا گیا اور وُولیکیہ Wallachia (افلاق) کی ریاست بھی باج گزار بن گئی ۔ بایزید کی فوجی مہمات اور بھی وسیع پیمانے پر شروع ہوئیں، جن کی لپیٹ میں ہنگری، بوسنہ اور جنوبی یونان کے ملک بھی آ گئے، لیکن ۱۳۹۶ء میں نیقوپولیس کے میدان میں ہنگری، فرانس اور جرمنی کے متحدہ لشکروں کے شکست کھانے کے باوجود بھی ان ملکوں میں عساکرِ عثمانی کی فتوحات پایدار ثابت نہ ہو سکیں ۔ قسطنطنیہ کی حیثیت اب محض ایک باج گزار شہر کی رہ گئی، جہاں عثمانی سلطان جس طرح چاہتا اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکتا تھا؛ ہنوز حقیقی قبضے کی نوبت نہ آئی تھی، مگر بایزید کا رویہ اس شہر کے متعلق ایک ایسے محاصرہ کرنے والے کا سا تھا جو مسلسل محاصرے میں مشغول ہو [قب F. Giese : *Türkische und abendländische Berichte zur Geschichte Sultan Bajezids I*، در *Ephemerides Orientales*، عدد ۳۴ : اپریل ۱۹۲۸ء] ۔ ایشیاے کوچک کے بارے میں عثمانی حکمت عملی کا رنگ دوسرا تھا ۔ ۱۳۵۹ء میں شہر انقرہ صلح و آشتی کے ساتھ ان کے قبضے میں آ گیا ۔ مراد کو گرمیان اوغلی کے علاقے کا ایک بڑا حصہ اپنے بیٹے کی شادی پر جہیز میں ملا اور حمید اوغلی کی ریاست اس نے خرید لی ۔ ۱۳۸۶ء اور ۱۳۹۱ء میں جو حملے قرمان اوغلی پر ہوے ان میں بھی بہت نرمی برتی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۹۲ء میں قونیہ، سیواس اور قسطمونی کو فتح کر کے ان پر مکمل قبضہ کر لینا بھی محض سیاسی ضرورت کا نتیجہ تھا، جو غالباً تیمور کی فتوحات کی وجہ سے محسوس ہوئی، جس نے بالآخر ۱۴۰۲ء کی جنگ انقرہ میں بایزید کے تہور اور تندی کو کچل کر رکھ دیا ۔ حق یہ ہے کہ بایزید کی بہت سی فتوحات ایسی ہی ناپایدار ثابت ہوئیں جیسی امیر تیمور کی.

سلاطین تو فوجی مہمات کی قیادت کرتے تھے اور انتظامات ان کے سیاست دانوں کے ہاتھ میں تھے، جن میں سے جَندَرلی قرہ خلیل، جو بعد میں خیرالدین پاشا کے نام سے مشہور ہوا، خاص طور پر اہم ہے (قب F. Taeschner و P. Wittek : *Die Vezierfamilie der Gandarlyzāde und ihre Denkmäler*، در *Der Islam*، ۱۹۲۹ء، ص ۶۱ ببعد) ۔ ینگی چری کے فوجی نظام کا وضع کرنا اسی کی طرف منسوب ہے ۔ یہ نظام سلطان کو مالِ غنیمت کا خُمس دینے کے سلسلے میں وضع ہوا ۔ ینگی چری [رک بآں] عیسائی اسیروں میں سے لیے جاتے تھے اور یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ چودھویں صدی میں دیو شِرمہ [رک بآں] کا دستور رائج تھا ۔ ان کی تنظیم و تربیت ایک برادری کی شکل میں اخی اور غازی جماعتوں کے نمونے پر ہوئی تھی ۔ اس سے اور ان روابط سے بھی، جو ان کے اور بکتاشی سلسلے کے درمیان اس بارے میں تھے، مکرّر ظاہر ہوتا ہے کہ دولتِ عثمانیہ کی مخصوص مذہبی روایات کا اثر کتنا گہرا تھا.

آلِ عثمان کے پہلے بیگوں نے، جو قدیم مصادر کے مطابق عام طور پر خُنکار (*khunk'ār*)، کے لقب سے ملقب تھے، ابتداء میں سلجوقی آداب و مراسم اختیار کر لیے تھے، مثلاً وہ ایسے القاب اختیار کرتے تھے جن میں 'دین' اور 'دنیا' کا لفظ شامل ہو: لیکن مراد اول کے عہد سے یہ

دستور متروك هو گیا ۔ مراد هی پہلا شخص ہے جس نے کتبوں میں سلطان کا لقب اختیار کیا ۔ ان ابتدائی بادشاهوں نے اناطولیا کے دیگر حکمرانوں کی تقلید کرتے ہوے اعلٰی خاندانوں کی عیسائی خواتین سے شادیاں کیں: سب سے پہلے اورخان نے ایک بوزنطی شہزادی سے شادی کی ۔ اس کے باوجود پہلے سلطانوں میں سے بعض کے ناموں (مثلاً مراد اور بایزید) میں قدیم صوفی - شیعی روایات کی محافظت ملحوظ ہے؛ اسی قدیم زمانے سے یہ رسم بھی چلی آئی ہے کہ سلاطین کی مسند نشینی کے وقت ان کی کمر سے تلوار باندھی جاتی تھی، جس میں شاید یہ رمز پنہاں تھی کہ سلطان غازیوں کے سلسلے میں داخل ہو گیا (قبِ قلج آلایی) ۔ عثمانی تاریخ کی پہلی صدی کا ایک اهم واقعہ آبادی کا جبری انتقال ہے ۔ یہ ایک قدیم مشرق دستور تھا، جسے بایزید اول نے خاص طور پر نافذ کیا ۔ آبادی کا یہ انتقال زیادہ تر مشرق سے مغرب کی طرف ہوا ۔ ممکن ہے کہ مغرب کی طرف یہ عام مهاجرت عثمان اوغلی اور قرمان اوغلی کے درمیان روز افزوں شکر رنجی کا باعث بھی بن گئی ہو اور دوسرے اثرات کے علاوہ اس سے بھی اناطولیا میں مذهبی مخالفت پیدا ہوئی ہو.

عثمانیوں کے پہلے دور کے متعلق یہ کتابیں بالخصوص دیکھی جائیں : (۱) H. A. Gibbons : *The Foundations of the Ottoman Empire*، آکسفورڈ ۱۹۱۶ء اور (۲) F. Giese: *Das problem der Entstehung des Osmanischen Reiches*، در Z. S.، جلد ۱ (۱۹۲۲ء)؛ ص ۲۴۶ ببعد؛ کوپرولو زاده فؤاد: *Othmānlī Imperatorlughunuñ Kurulushu Mes'elesi*، عثمانلی امپراطور لغنک قورولوشو مسئلہ سی در مجلۂ هفتگی حیات، عدد ۱۱ و ۱۲ (۱۰ و ۱۷ فروری ۱۹۲۷ء).

۵ ۔ دوسرا دور.

جب تیمور ایشیاے کوچک سے دوبارہ واپس گیا تو اس ملک میں ویسا هی تفرقہ برپا تھا جیسا ایک سو سال پہلے تھا ۔ مغربی ساحل کی ریاستیں اور قسطمونی اور قرمان کے علاقے ان کے سابقہ حکمرانوں کو واپس دے دیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک خاندان کے حکمران کی جگہ ۱۴۰۳ء میں ازمیر اوغلی جنید [رک بآن] نے لے لی، جو ایک من چلا اور مہم جو آدمی تھا ۔ بایزید کے بیٹوں میں سے عیسٰی بروسہ میں اور محمد اماسیہ میں مقیم تھا ۔ اگرچہ یورپ کے ان مقبوضات کو، جہاں سلیمان سکونت پذیر تھا، تاتاریوں نے هاتھ نہ لگایا تھا، مگر دولت عثمانیہ کی بحالی کا کام دوبارہ اناطولیا هی سے شروع ہوا، جہاں محمد تھوڑے هی عرصے میں ایک بڑے وسیع علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ اس میں بروسہ کا قدیم پاے تخت بھی شامل تھا ۔ اس کے بعد اس نے پہلی کوشش یہ کی کہ یورپی مقبوضات کو دوبارہ فتح کرے، جو پہلے سلیمان اور اس کے بعد موسٰی کے قبضے میں تھے، لیکن صرف ۱۴۱۳ء کے بعد هی محمد اول اس قابل ہوا کہ وہ اناطولیا کی دوسری ریاستوں کو بتدریج اپنی تازہ بحال شدہ سلطنت میں شامل کر سکے ۔ مراد ثانی اور محمد ثانی بھی اسی حکمت عملی پر کاربند رہے ۔ اس دفعہ بھی اناطولیا کی تسخیر اور تنظیم و ترتیب زیادہ خون ریزی کے بغیر عمل میں آئی، باستثنا قرمانیوں کی ریاست کے، جو آل عثمان کے پرانے رقیب تھے، لیکن یہاں بھی عثمانیوں نے نمایاں صلح جوئی کی حکمت عملی سے کام لیا ۔ ان خاندانوں کی اولاد کو یورپ میں عموماً بڑے بڑے فوجی منصب عطا ہوے ۔ محمد ثانی نے ۱۴۶۱ء میں طرابزون کی سلطنت کو سر کر کے

اناطولیا کی فتح کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور آخر کار جب ۱۴۶۸ء میں قرمان خاندان کا خاتمہ ہو گیا تو سلطنتِ عثمانیہ نے خاندان آق قویونلو کو شمال میں اور مصری حکومت کو جنوب مشرق میں اپنے جوار میں پایا ۔ ۱۴۷۲ء میں آق قویونلو اوزون حسن کے خوف ناک حملے کے نتائج ویسے تباہ کن نہ نکلے جیسے تیمور کے حملے کے نکلے تھے، کیونکہ اب سلطنتِ عثمانیہ پہلے سے قوی تر بنیادوں پر قائم ہو چکی تھی ۔ بایزید ثانی کے عہد میں اس ہمسایے نے اپنی جگہ خالی کر دی اور ایران کا نو ظہور صفوی خاندان اس کا جانشین ہوا، تاہم اس سلطان کے عہد حکومت کے خاتمے تک ایشیا کے محاذ پر سلطنت میں کسی قسم کی توسیع ممکن نہ ہوئی، گو ملک شام میں مملوک سلاطین کی افواج سے کئی دفعہ ننگ آمیز سرحدی لڑائیاں ہوئیں .

محمد اول سے لے کر بایزید ثانی کے عہد تک عثمانیوں کی بیشتر توجہ یورپ میں عثمانی طاقت کے قیام و دوام پر مبذول رہی ۔ خود سلاطین بھی زیادہ وقت یورپ ھی میں گزارتے رہے، جہاں انھوں نے بہت سی فوجی مہمات کی قیادت بذات خود کی ۔ محمد اول کے زمانے میں جب ترکوں نے البانیہ اور موریا میں پیش قدمی کی تو وینس سے ان کا تصادم ہو گیا، اسی طرح جب مراد ثانی کے عہد میں ترکوں نے صربیہ اور وَولیکیہ (افلاق) میں غزوے کیے اور فتوحات حاصل کیں تو ہنگری کی سلطنت ان کے مقابلے میں آ کودی ۔ یہ دوسری اهم عیسائی سلطنت تھی جو ان کے مقابل صف آرا ہوئی ۔ یہ غزوات اور فتوحات، جو البانیہ اور موریا میں ہوئیں، خود سلاطین کے حکم سے نہیں ہوئی تھیں، بلکہ ان کا اهتمام سرحدوں کے امراء خود ھی کیا کرتے تھے ۔ ان کے ابتدائی نتائج تو اکثر اوقات یہی نکلتے کہ چند شہروں پر قبضہ ہو جاتا، جہاں ایک ''صُوباشی'' قلعہ گیر فوج کے حاکم کی حیثیت سے متعین کر دیا جاتا تھا، مگر مفتوحہ علاقے کا بیشتر حصہ مقامی حکمرانوں کے زیر نگین رہنے دیا جاتا تھا، جو خَراج پیش کش کی صورت میں ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے تھے ۔ قسطنطنیہ اور باقی بوزنطی مقبوضات نے بھی اس طریق سے مدت دراز تک اپنی نیم خود مختارانہ حیثیت کو قائم رکھا بلکہ کئی بار انھوں نے محاصرین کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ بھی کیا، مگر آهستہ آهستہ عیسائیوں کی سیاسی اور ثقافتی آزادی کے یہ گڑھ مسخر ہوتے گئے ۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ بھی فتح ہو گیا، جس کا ترکوں اور اهلِ مغرب دونوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر پڑا، مگر اس سے محمد ثانی کے سیاسی منصوبے کے ایک جزء ھی کی تکمیل ہوئی، (اس منصوبے سے مقصد یہ تھا کہ بلقان کا سارا جزیرہ نما براہِ راست سلطنتِ عثمانیہ کے زیر نگین آ جائے)؛ البتہ محمد ثانی کی وفات کے وقت یہ منصوبہ تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا ۔ موریا اور البانیہ میں ابھی تک اهلِ وینس کی چند املاك موجود تھیں اور شمال میں بلغراد کا شہر ابھی تک ہنگری والوں کے قبضے میں تھا، لیکن اس کے ساتھ ھی بوسنہ تک پر ترکی بک ھی حکمران تھے ۔ روڈس کے سوا بحر ایجہ کے مجمع الجزائر کو بھی اسی طریق سے دولتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا ۔ صرف دریاے ڈینیوب کی ریاستیں وَولیکیہ (افلاق) اور مولڈیویا (بُغدان) اور ۱۴۷۵ء سے خان کریمیا کی ریاست بھی باج گذار رہیں.

اس تمام مدت میں یورپ کی عیسائی سلطنتیں اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہیں کہ صلیبی جنگوں کی منصوبہ بندی کر کے ترکوں کو

یورپ سے نکال دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ عثمانیوں کے ایشیائی مخالفین سے رسم و راہ پیدا کرتی رہیں ، لیکن اس سلسلے میں حقیقی معنوں میں کبھی بھی کوئی بڑی مہم تیار نہ ہو سکی، البتہ مجارستان کے ہُنیادی Hunyádi، اور وُلد دُراکول (Wlad Dracul) افلاقی اور سکندر بیگ [زِکّ بان] البانوی اور وینس (بنادقہ) کی بعض بحری مہمات نے کچھ عارضی نقصان پہنچایا۔

یورپ میں ترکوں کی یہ تمام حربی کامیابیاں ممکن نہ ہوتیں اگر ترکی اناطولیا میں ایک زبردست فوجی مرکز موجود نہ ہوتا۔ اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ترک اپنے مقبوضات پر مستقل طور پر جم گئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ سمجھنی چاہیے کہ جزیرہ نمائے بلقان ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا، اس لیے وہاں کوئی ایسی بڑی عیسائی سلطنت نہ تھی جو ترکوں کے قبضے کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے۔

بایزید ثانی کے نسبۃً پُرامن دَورِ حکومت کے بعد ایشیائے کوچک یا جزیرہ نمائے بلقان میں کسی نزاع کا کوئی سوال ھی باقی نہ رہا ۔ البانیہ اور موریا میں کش مکش جاری رہی، لیکن اس کی نوعیت مقامی تھی ۔ اب سلطنت اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اپنے جدید ایشیائی ھمسایوں کا مقابلہ کر سکے ۔ سلیم اول نے ایران کے خلاف جو جنگ کی وہ ایک لحاظ سے اُس سابقہ اندرونی مناقشت کو بین الاقوامی پیمانے پر جاری رکھنے کی کوشش تھی جو حکومت کے شیعی مخالفوں کے خلاف خود ایشیائے کوچک میں ظہور پذیر ہوئی تھی ۔ اس لڑائی میں ترک عارضی طور پر آذربایجان پر قابض ہو گئے اور کردستان اور الجزیرہ کے شمالی حصے میں ان کی مستقل حکومت قائم ہو گئی ۔ اس کے بعد ھی مصر کی مملوک سلطنت بھی، جس سے بایزید ثانی کے عہد میں عثمانی سلطنت کی لاحاصل جھڑپ ہو چکی تھی، سلطان سلیم نے ایک ھی مہم میں اپنی حکومت میں شامل کر لی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ [خدمتِ حرمین بھی ترکوں نے سنبھال لی] پھر یمن بھی عثمانیوں کے قبضے میں آ گیا۔ آخر کار سلیمان (اول) اعظم کے زمانے میں سلطنت کو سب سے زیادہ وسعت نصیب ہوئی اور ہنگری کی مملکت کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا گیا۔ یہ ملک قرونِ وسطٰی میں یورپ کی سر زمین پر عثمانیوں کے دو بڑے حریفوں میں سے تھا۔ اسی مہم میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ ترکوں نے وینا کا محاصرہ کر لیا، مگر یہ فاتحین اپنے دوسرے بڑے پرانے حریف یعنی وینس کا زور نہ توڑ سکے ۔ محمد ثانی کی وفات کے بعد وینس سے باضابطہ لڑائیاں صرف استثنائی حالات ھی میں ہوا کرتی تھیں ۔ سلطنتِ عثمانیہ کو سمندر پر کامل طور پر کسی زمانے میں فوقیت حاصل نہیں ہوئی، چنانچہ فتوحاتِ عظیم کا زمانہ گذرنے کے فوراً ھی بعد یہ کمزوری لِپانتو Lepanto کی جنگ میں ظاہر ہوئی ۔ روڈس تو فتح ہو گیا، لیکن مالٹا پر کبھی بھی ترکوں کا قبضہ نہ ہو سکا۔ بایزید کے زمانے میں کِمال رئیس [زِکّ بان] کے بحری کارنامے اور خیرالدین باربروسہ اور دوسرے لوگوں کی کارکردگیاں ، جن سے سلیمانی دور میں افریقہ کے شمالی ساحل پر نیز بحر ہند میں، ترکوں کا سیاسی اقتدار قائم ہوا ، [مقالہ نگار کی رائے میں] یہ سب بحری غارت گری کے شائبے سے کبھی خالی نہ ہوئیں۔ ایشیائی محاذ پر ایران کے ساتھ کش مکش جاری رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد اور عراق کا ملک فتح ہو گیا اور سلطان اب حقیقی طور پر "سلطان البرّین و البحرین" بن گیا۔

فتوحات کے اس دوسرے دَور میں مملکت

کا اندرونی مذہبی اور تمدنی ارتقاء اتنا ہی حیرت انگیز تھا جتنی حدود سلطنت کی بے اندازہ وسعت پذیری ۔ ابتداءً اعلٰی طبقات کے لوگوں کے عقائد قدرے مشکوک اور مبہم قسم کے تھے، لیکن آہستہ آہستہ ان میں بے عیب راسخ الاعتقادی کا دور دورہ ہو گیا ؛ بہت سے مسلمان فقہاء مشرقی ممالک سے سلطنت عثمانیہ کے جدید تمدنی مرکزوں میں آ بسے تھے اور مسیحی الاصل فقیہ (مثلاً ملا خسرو) بھی تسنن، یعنی حکومت کے سرکاری مذہب کے مقتداؤں میں بے تامل آ ملے تھے ۔ لیکن اسلام کے اس پردے کے اندر لوگوں کی ہمدردی صوفیاء کے طریقوں اور عقیدوں کے ساتھ برابر قائم رہی، صوفیانہ سلسلوں کے درویشوں کو عام مقبولیت حاصل رہی اور بہت سی باتوں میں پرانی متصوفانہ روایات کا پرتو نمایاں رہا، مثلاً لوگوں کے ناموں میں بھی روایات منعکس ہوتی رہیں ۔ غالباً ہمیں شیخ الاسلام [رک بآن] کے شاندار منصب کے قیام کو حکومت کے نظام میں صوفی پیشواؤں کے پرانے اثرات کی یادگار سمجھنا چاہیے؛ اس منصب نے مراد ثانی کے زمانے میں پہلی بار نمایاں حیثیت حاصل کی اور بعد ازاں قوانینِ ملکی نے بھی اس کی باقاعدہ توثیق و تصدیق کر دی ۔ دوسری طرف انتہا پسند تشیع کے خفیہ متصوفانہ میلانات کے خلاف، جو قدیم ہی سے ایشیائے کوچک میں پھیلے ہوئے تھے، مجادلہ جاری تھا ۔ اس مجادلے نے کئی بار حکومت کے خلاف کھلی بغاوتوں کی صورت اختیار کی، مثلاً ۱۴۱۶ء میں وہ بغاوت ہوئی جو بدرالدین اوغلی قاضی سِماونہ سے منسوب کی جاتی ہے (قب ابن قاضی سِماونہ اور بابنگر Babinger در *Isl.*، ج ۱۱) اور بایزید ثانی کے عہد میں شاہ قلی یا شیطان قلی اور اس کے قزلباشوں نے بغاوت کی ۔ آخرالذکر بغاوت کا اسی عہد کی اُس سیاسی - مذہبی تحریک سے گہرا تعلق تھا جس کی وجہ سے ایران میں صفوی خاندان کی بنیاد پڑی ۔ اس لحاظ سے قزلباشوں کی بغاوت خود سلطنت عثمانیہ کے وجود کے لیے بھی ایک بہت بڑے خطرے کا موجب تھی اور یہی وجہ ہے کہ سلیم اول کے عہد میں شیعی مذہب کے پیرووں کو انتہائی شدت کے ساتھ دبایا گیا ۔ عیسائی اور یہودی آبادی سے مسلمانوں کا رویہ رواداری کی روایت پر مبنی تھا ۔ بجز ان عیسائی بچوں کے، جو 'دیوشیرمہ' کے دستور کے مطابق لیے جاتے تھے، کسی شخص کو مذہب اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جاتا تھا ۔ یہ سچ ہے کہ کئی گرجاؤں (مثلاً ایا صوفیا) کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا گیا، مگر قسطنطنیہ کی فتح کے فوراً بعد اورتھوڈوکس یونانی کلیسا اور 'ملتِ' یہود کو خود مختارانہ حیثیت دے دی گئی ۔ یہ اس حکمت عملی کی نہایت مشہور مثال ہے جس پر سلطنت عثمانیہ میں ہمیشہ عمل ہوتا رہا ۔ مذہبی تعصب کہیں سولھویں صدی کے آخر میں جا کر رونما ہوا ۔

سلطنت کی سلامتی کے لیے سلطان کی ذات زبردست اہمیت رکھتی تھی ۔ اس دور میں یہ اہمیت اور بھی بڑھ گئی ۔ یہ بات امور ذیل سے ظاہر ہوتی ہے : تقریباً ہر سلطان کی وفات کے بعد فوجی بغاوتوں کا کھٹکا موجود ہوتا تھا اور سلطان کی وفات کو اس کے جانشین کی آمد تک مختلف حیلوں سے مخفی رکھا جاتا تھا؛ اس کے علاوہ تخت و تاج کے دعوے دار خطرناک شورشیں برپا کر دیا کرتے تھے (قب جم) ۔ برادر کشی کی رسم جو بایزید اول نے جاری کی وہ بھی اسی کا لازمی نتیجہ تھی ۔ سلطنت کے خلاف اس کے عیسائی دشمنوں کے ہاتھ میں جو کارگر حربے تھے ان میں سے

ایک بڑا کارگر حربہ یہ تھا کہ وہ عثمانی تخت کے جھوٹے دعوے داروں کی حمایت کریں ۔ عیسائی رعایا پر عثمانی فتوحات کا کوئی اثر نہ پڑتا تھا؛ کیونکہ جب سلطان محمد نے بوزنطی پایۂ تخت کو فتح کر لیا، تو اس نے ان کے جائز بادشاہ (''basileus'') کے تمام حقوق و فرائض بھی اختیار کر لیے۔

تیمور کی جنگوں کی وجہ سے ایشیاے کوچک میں پھر وسیع پیمانے پر مختلف نسل کے لوگوں کا انتقالِ مکانی ہوا اور اس کے بعد کے زمانے میں بھی؛ عثمانی سلاطین کی حکمت عملی یہی رہی کہ وہ سلطنت کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں آبادیوں کے اجزاء کو منتقل کرتے رہیں ۔ اس طرح قسطنطنیہ میں — جس شہر کی طرف اب ایشیاے کوچک کی تمام بڑی بڑی فوجی شاہراہیں جاتی تھیں — اناطولیا کے بختلف حصوں کے لوگوں کو عمداً آباد کیا گیا (استانبول = اسلام بول) ۔ اس سے پہلے اسی طرح ادرنہ بھی ایک اسلامی شہر بن چکا تھا ۔ اس کے باوجود روم ایلی کے شہری مسلمان ہمیشہ سے عیسائی آبادی کے پہلو بہ پہلو آباد رہے ہیں اور ان آبادیوں کا باہمی تناسب مختلف علاقوں میں بہت مختلف رہا ہے ۔ بوسنیہ اور البانیہ کی آبادی کے کثیر حصوں کے قبولِ اسلام کی وجوہات کچھ اور تھیں۔

درحقیقت یورپی ترکی کی اس صورتِ حالات کو بالخصوص سلطنتِ عثمانیہ کے سیاسی نظام کے ارتقاء میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے ۔ یہ نظام سلطان سلیمان اول کے عہد میں اپنے اوجِ کمال پر جا پہنچا تھا ۔ عثمانی طرز کی مذہبی راسخ الاعتقادی کے استحکام کے ساتھ ساتھ عثمانی تہذیب کے اس جدید اندرونی ارتقاء کے منابع کو مراد ثانی کے عہد میں ڈھونڈنا چاہیے ۔ دورِ جدید کے سرکردہ لوگ اور سلطانی فوج کے بیشتر امراء وہ نومسلم تھے جو اصلاً البانوی، صقلبی اور یونانی بلکہ ان سے بھی پرے کے مغربی ملکوں سے تعلق رکھنے والے تھے ۔ پرانے خاندانوں کے لوگ، جو ایشیاے کوچک سے آئے تھے، مثلاً میخال اوغلی، اورنوس اوغلی، انھیں اگرچہ دریاے ڈینیوب کے کنارے پر اور تھسلی (تسالیہ) میں بڑی بڑی وسیع جاگیریں عطا ہوئیں، مگر وہ دوسرے درجے کے امیر شمار ہوتے تھے؛ قسطنطنیہ کی فتح سے تھوڑا عرصہ بعد جب خلیل پاشا کو سزاے قتل دی گئی تو اس سے آلِ جندر کی وزارتوں کا خاتمہ ہو گیا ۔ عیسائی نو مسلم اپنی بساط کے مطابق حکومت کی بہترین خدمات ادا کرنے لگے ، لیکن سلطان کے کامل اور ہمہ گیر اختیارات اور شاید اسلام کی جمہوری روایات کی وجہ سے بھی موروثی امارتیں قائم نہ ہو سکیں ۔ رجالِ سیاست اور فوجی سپہ سالار (بگلر بیگ اور سنجق کی حیثیت سے) سلطان کے غلام (قول) ہوا کرتے تھے اور پچھلی صدی کی بہ نسبت ان لوگوں کو بہت کم آزادی حاصل تھی ۔ علماء و فقہاء کے طبقے کو نسبتۃً زیادہ آزادی حاصل تھی ۔ یہ وہ طبقہ تھا جس میں سے [قاضی، مفتی وغیرہ] رجالِ دین لیے جاتے تھے، جن کا رئیسِ اعلی شیخ الاسلام تھا ۔ اس طبقے میں مذہبی شرفاء و رؤساء کے آثار نظر آتے ہیں ۔ اس طریق سے ایک عثمانی حکمران طبقہ معرضِ وجود میں آ گیا، جس میں غالب عنصر غیر ترکی تھا اور اس میں لگاتار ان عیسائی نومسلموں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا جو لڑائی میں گرفتار ہو کر آتے تھے یا دیوشرمہ [رکّ بآن] کے دستور کے مطابق بھرتی کیے جاتے تھے ۔ ان حالات میں عثمانی نظامِ حکومت کا بوزنطی آئین و دستور سے متأثر ہونا ناگزیر تھا اور یہی صورت دربارِ سلطانی

کے نظام کی تھی ۔ 'قانون ناموں' کے ذریعے سے، جن میں محمد ثانی اور سلیمان اول کے 'قانون نامے' زیادہ مشہور ھیں، حکام کی درجہ بندی بڑے دقیق طریقے سے کی گئی تھی.

قدیم تر زمانے کے بے قاعدہ 'آقنجی' اور 'عزب' مجاھدوں کے علاوہ فوج زیادہ تر سپاھیوں پر مشتمل ھوتی تھی ۔ جن کا نظام علاقے کے فوجی نظام کے ساتھ مضبوط طور پر وابستہ ھوا کرتا تھا [قب تیمار] ۔ سپاھیوں کے علاوہ یکی چری تھے، جنھیں پہلی مرتبہ مراد ثانی کے زمانے میں دیوشرمہ [رک بان] کے اصول پر (غالباً ۱۴۳۸ء میں) بھرتی کیا گیا تھا؛ توپ خانے کا استعمال محمد ثانی نے پہلی مرتبہ قسطنطنیہ کے محاصرے کے اثنا میں کیا ۔ بحری بیڑے [قب قپودان پاشا] میں زیادہ تر 'عزب' رکھے جاتے تھے اور عیسائی اسیروں سے بیگاریوں (galley-stars) کا کام لیا جاتا تھا، مگر بحری بیڑے کو فوج کی سی اھمیت قطعاً حاصل نہ تھی.

حکومت کی آمدنی، یا یوں کہیے کہ سلطان کی آمدنی زیادہ تر روز افزوں خراج پر (جو غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جاتا تھا) اور نیم خودمختار حکومتوں کے باج پر، مشتمل تھی ۔ اسی طرح مختلف قسم کی چونگی [مکوس] کے محاصل کی مقدار بھی کثیر تھی ۔ تجارت زیادہ تر یونانیوں کے ہاتھ میں رھی اور جہاں تک غیر ملکی تجارت کا تعلق تھا وہ وینس، جنوہ اور فلورنس کے سوداگروں کی نو آبادیوں کے قبضے میں تھی ۔ ان نو آبادیوں کے ساتھ غیر مسلم ملکی رعایا کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا؛ انھیں بڑی حد تک اپنے اپنے قونصلوں کے ماتحت خود اختیاری حاصل تھی اور ان کی عدالتیں ان کے قونصلوں کے زیر اختیار تھیں ۔ یہ اختیارات سلطان نے انھیں مشہور و معروف "امتیازات" (capitulations) کی صورت میں عطا کیے تھے، جن کی ذیل میں وہ تجارتی محصولات بھی معین کیے گئے تھے جو غیر ملکیوں کو ادا کرنا پڑتے تھے ۔ ان غیر ملکیوں کو اصول شریعت اسلامیہ کے بموجب 'مستأمن' سمجھا جاتا تھا ۔ وینس سے متعدد جنگیں ھوئیں اور ھر صلح کے بعد ان امتیازات کی تجدید کرنا پڑتی تھی (۱۴۵۴ء، ۱۴۷۹ء، ۱۵۰۲ء، ۱۵۴۰ء) ۔ یہ بعد ھی کی بات ھے کہ ان امتیازات نے دو طرفہ بین الاقوامی عہد ناموں کی صورت اختیار کر لی ۔ اسی نمونے کے مطابق ۱۵۳۵ء کے مشہور و معروف امتیازات فرانس کو عطا ھوے، لیکن سیاسی لحاظ سے اس قانونی دستاویز کی اھمیت اطالوی جمہوری سلطنتوں کے امتیازات کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی؛ زمانۂ مابعد میں ترکی کی بین الاقوامی حیثیت کو جو باقاعدہ صورت دی گئی اس کی ابتداء یہیں سے ھوتی ھے.

قرون وسطی کے متأخر دور میں سلطنت عثمانیہ اور وسطی و مغربی یورپ کی ثقافتوں کے درمیان ابھی تک وہ وسیع خلیج حائل نہ ھوئی تھی جو بعد کی صدیوں کی خصوصیت قرار پائی ۔ بعض مصنفین نے تو یہ بھی کہا ھے کہ محمد ثانی اور اطالوی شہزادوں اور فن کاروں کے مابین جو دوستانہ تعلقات تھے اور سلطان کو فن مصوری کے ساتھ جو شغف تھا، اس بناء پر اس کا شمار دور نہضت (renaissance) کے ان حکمرانوں میں کیا جا سکتا ھے جو اس زمانے میں احیاے فنون لطیفہ کے سرپرست تھے (Tschudi: کتاب مذکور، ص ۱۹) ۔ [اس کے جلد بعد یہ اسلوب خیالات بدلنے لگا].

تیسرا دور (۱۵۶۶ تا ۱۶۹۹ء).

سلیمان اول کے عہد کے آخر میں عثمانی سلطنت نے اپنے آپ کو دو طاقتور بڑی ھمسایہ طاقتوں

کے درمیان پایا - ان طاقتوں میں سے ایک تو یورپ میں تھی، یعنی آسٹریا کی مملکت، دوسری ایشیا میں، یعنی سلطنتِ صفویہ - یورپ میں تو بوسنیہ اور ہنگری کے ترکی صوبے آسٹریا کے مقابلے میں پشتی بانوں کا کام دیتے رہے - ان سے اور مشرق کی جانب ٹرانسلوانیا، ولاکیہ (Wallachia، افلاق)، مولڈیویہ (بغدان) اور تاتاری کریمیا کی نیم خود مختار ریاستوں کو بحال رہنے دیا گیا - ترکی نقطۂ نظر سے پولینڈ اپنے قازاقوں (Cossacks) سمیت، اور بلادِ مسکووی (Muscovy = روس) بھی مذکورہ امارتوں کی طرح دونوں سلطنتوں (آسٹریا اور ترکیہ) کے درمیان بلادِ متوسط کی حیثیت رکھتے تھے: اس زمانے میں ترکیہ نے کئی دفعہ ان آخری دو امارتوں پر اپنا حقِ سیادت جتانے کی کوشش کی - ایشیا میں جغرافی حالات کسی فاصل ریاست کے وجود کی اجازت نہیں دیتے تھے، باستثناے گرجستان، جسے ۱۵۷۸ء میں ترکوں نے فوج کشی کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا - تاہم ایشیا میں ترکوں کے ہاں جاگیرداری کا جو نظام رائج تھا اس کی رو سے وہاں کئی چھوٹے چھوٹے مقامی حکمران ایسے رہ گئے جنھیں پاشا کا خطاب دیا گیا - اس قسم کے حکمران کردستان میں، ایران کی سرحد پر (شہزادگانِ بتلیس) اور ملکِ شام میں بھی (دُروز امیر) پائے جاتے تھے - شریفِ مکہ کی حیثیت بھی اسی طرح کے ایک باج گزار امیر کی تھی، مگر یمن جب ۱۵۶۸ تا ۱۵۷۰ء میں دوبارہ فتح ہوا، تو اُسے تا بیک حد دوبارہ نسبۃً راست عثمانی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا - ۱۵۵۰ء میں ترکوں نے مُصَوَّع (Maṣṣawā) میں، یعنی افریقہ کے ساحل پر، بھی قدم جما لیے اور ملکِ حبشہ کے معاملات میں دخل دینے لگے، لیکن یہ مواقع ۱۵۷۸ء کی ناکام جنگ کے بعد ختم ہو گئے - اس زمانے میں مصر ایک حد تک ترکی پاشا [اَلْبَ سملوك] کے قبضے میں تھا؛ بربری ریاستیں تقریباً خود مختار تھیں اور ۱۵۸۰ء میں شریفِ مرّاکش نے ترکی سلطان کی سیادت تسلیم کر لی تھی۔

سلطنت کا یہ عام سیاسی نظام تیسرے دَور میں برابر برقرار رہا اور سلطنتِ عثمانیہ اور برّاعظم کی دوسری بڑی بڑی طاقتوں میں ایک قسم کا توازن قائم رہا۔

سلیم ثانی کے عہد میں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ محمد صوقوللی پاشا کی وزارت کے دَور میں، قُبْرُص فتح ہو گیا (۱۵۷۰ تا ۱۵۷۱ء)، لیکن اس فتح کے باعث اس کے عین بعد ۱۵۷۱ء میں لیپنٹو [اینہ بختی] [رَکّ بآں] کی بحری جنگ میں ترکوں کو شکست ہوئی - شکستِ فاش کا یہ پہلا صدمۂ سخت تھا جو ترکوں کو برداشت کرنا پڑا - جب سلطنت کی مزید فوجی توسیع ناممکن ہوگئی تو اس سے سلطنت اندر ہی اندر کمزور ہونے لگی، اس کمزوری کے آثار مجموعی طور پر یوں نظر آنے لگے کہ آسٹریا کے خلاف فوجی مہمیں ناکام رہیں (کیرِزْتِس Keresztes کے مقام پر ۱۵۹۶ء میں ترکوں کو شکست ہوئی) اور ایران کے خلاف بھی انھیں ہزیمت اٹھانا پڑی (۱۶۰۳ء اور ۱۶۰۴ء میں تبریز اور اریوان ان کے ہاتھ سے نکل گئے) - اسی ضعف کا مظہر وہ خسارے والا معاہدہ بھی تھا جو سیتْواتوروك Zsitvatörök کے مقام پر آسٹریا کے ساتھ ہوا اور وہ صلح بھی جو ۱۶۱۲ء میں ایران سے ہوئی، جہاں اس وقت شاہ عباس اعظم بڑے جاہ و جلال سے فرماں روائی کر رہا تھا - سولھویں صدی کے آخری دس سال میں ٹرانسلوانیا اور رومانیہ کی ریاستیں کچھ عرصے کے لیے خود مختار بھی ہو گئیں - ۱۵۷۲ء سے سلطنت ترکی کی شمالی سرحدات کے پیچیدہ سیاسی اور فوجی معاملات میں پولینڈ نے بھی اکثر ایک

مؤثر عامل کے فرائض سرانجام دیے ۔ کریمیا میں قازاقوں (Cossaks) کے حملوں نے ابھی وہ خوف ناک صورت اختیار نہیں کی تھی جو ایک صدی بعد ظہورپذیر ہوئی، جب مسکووی طاقت سیاسی افق پر ظاہر ہونے لگی ۔ ایک بات، جو ترکیہ کے حق میں مفید ثابت ہوئی، یہ تھی کہ وسطی یورپ تیس سالہ جنگ کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا ؛ مغربی یورپ کی طاقتوں میں سے فرانس کے ساتھ تو پہلے ہی سے دوستانہ تعلقات تھے، ۱۵۸۰ء میں انگلستان سے اور ۱۶۰۳ء میں ہالینڈ سے بھی ایسے ہی مراسم پیدا ہو گئے ۔ یہ تعلقات بحیثیت مجموعی سلطنت کے لیے مفید ثابت ہوئے ۔ علاوہ ازیں اس صدی کے آخر میں ہسپانیہ بھی اس قابل نہ رہا کہ اس کی جانب سے کوئی خاص بحری خطرہ لاحق ہو ۔ ترکوں کی بحری طاقت کبھی بہت زیادہ مضبوط نہیں ہوئی، اس لیے جہاں تک وینس کا تعلق ہے دونوں جانب سے خلاف توقع واقعات کا ظہور ہوتا رہا، مثلاً سترھویں صدی میں قبرص کا الحاق ہوا، اس کے بعد کریٹ (اقریطش) فتح ہوا (۱۶۴۵ تا ۱۶۶۹ء) اور یہ کچھ کم حیرت انگیز واقعہ نہ تھا، پھر ۱۶۵۵ء کے قریب وینس نے موریا اور جزائر یونان میں فتوحات حاصل کیں اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ خود قسطنطنیہ خطرے میں پڑ گیا ۔ باوجود ان تمام باتوں کے وینس سے تعلقات مجموعی طور پر دوستانہ ہی رہے، کیونکہ ترکی اپنے بڑی مقبوضات کی وجہ سے زیادہ طاقتور ملک تھا ۔ ایشیائی سرحد پر ترکوں کی کمزوری کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۶۲۳ء میں بغداد عارضی طور پر ہاتھ سے جاتا رہا اور ایران کی طرف سے دوبارہ خطرہ پیدا ہو گیا، لیکن ان اطراف میں مراد رابع کے عہد میں فوجی طاقت کی تجدید سے سلطنت کی سابقہ شوکت پھر قائم ہو گئی ۔

شاہ عباس کی وفات کے بعد سلطان مراد رابع ہی کے عہد میں عثمانی افواج نے ایران پر حملہ کر کے اریوان، تبریز اور آخر میں بغداد دوبارہ فتح کر لیے (۱۶۳۸ء) ۔ ۱۶۳۹ء میں ایران کے ساتھ صلح و امن کا ایک طویل دور شروع ہوا ۔ ۱۶۴۰ء کے بعد سلطنت عثمانیہ کی مضبوط تر طاقت سے دو کام لیے گئے، یعنی ایک طرف اقریطش فتح کر لیا گیا اور دوسری طرف ٹرانسلوانیا اور ڈینیوب کی ریاستوں میں ترکی اقتدار دو مضبوط اور بحیرۂ اسود کی شمالی سرحدوں کو مستحکم کر لیا گیا، نیز قازاقوں سے آزوف چھین لیا گیا، جو اس وقت مسکووی حکومت کے ماتحت تھا اور ۱۶۶۰ء میں اس کی قلعہ بندی کر دی گئی ۔ اسی سال آسٹریا سے، جس نے دوبارہ طاقت حاصل کر لی تھی، پھر جنگ شروع ہو گئی ۔ پہلے پہل اس مناقشت نے صلیبی جنگ کی صورت اختیار کی؛ اس دفعہ فرانس بھی آسٹریا کا حلیف تھا، چنانچہ ترکوں کو ۱۶۶۴ء میں سینٹ گوتار St. Gothard کے مقام پر شکست ہوئی، لیکن یہ ہنگامہ آسٹریا سے اس آخری فیصلہ کن جنگ کا محض پیش خیمہ تھا جو ۱۶۶۳ء میں وینا کے ناکام محاصرے سے شروع اور ۱۶۸۸ء میں ختم ہوئی، جب کہ صوبۂ ہنگری عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور آسٹریا کی فوجیں بلقان میں داخل ہو گئیں ۔ آخر کار ۱۶۹۹ء میں کارلووٹز Carlowitz کا معاہدہ ہوا، جس کی رو سے ترکیہ کو، جو پھر بہت کمزور ہو گئی تھی، ناچار تقریباً پورے ملک ہنگری سے دست بردار ہونا اور ٹرانسلوانیا کی سیادت کا دعوے ترک کرنا پڑا اور اس کے علاوہ موریا پر وینس کا اقتدار تسلیم کرنا پڑا ۔

اس دور کی ابتداء میں عثمانی سلطنت کی کمزوری زیادہ تر خانگی امور کی وجہ سے تھی ۔

پندرھویں صدی میں یہ بات مشاھدے میں آ چکی تھی کہ سلطنت اپنی موجودہ صورت میں اسی وقت تک قائم رہ سکتی ھے جب تک کہ جنگ و جدال برابر جاری رھے؛ مگر اب ضرورت اس بات کی تھی کہ سلطنت کے اصولوں کو پُر امن حالات کے مطابق ڈھالا جائے اور یہ بات سلطان کی شخصی حکمرانی کے ممکنات کے دائرے سے خارج تھی، کیونکہ شخصی حکمرانی کا دار و مدار لازمی طور پر فوجی فتوحات پر تھا۔ سلیمان اعظم کے جانشین ان نئے حالات کا مقابلہ کرنے سے قاصر رھے: یہ سچ ھے کہ محمد ثالث، عثمان ثانی اور محمد رابع بعض اوقات اپنے لشکروں کے ھمراہ جاتے تھے، مگر مراد رابع وہ آخری سلطان تھا جس نے اپنے خاندان کی فوجی روایات کو از سر نو تازہ کیا اور حقیقی معنوں میں غازی ثابت ھوا۔ پس سلاطین کی ذاتی صفات خواہ کچھ ھی کیوں نہ تھیں، نظامِ حکومت سے ان کا راست تعلق کم ھو گیا، اس کے باوجود ان کی ذات بدستور عزت و توقیر کا مرجع بنی رھی۔ تاھم ۱۶۲۸ء میں نہ تو عثمان ثانی کا خلع اور قتل رُك سکا اور نہ ۱۶۴۸ء میں ابراھیم کی اور ۱۶۸۸ء میں محمد رابع کی معزولی رُك سکی۔ سلاطین کے بجاے مدبرین اور سپہ سالار زیادہ اھمیت اختیار کر گئے۔ ان میں سے قدامت اور اھمیت کے لحاظ سے سب سے مقدم سلیم ثانی کے عھد میں محمد صوقوللی پاشا تھا [رَكَ بہ صوقللی] اور محمد ثالث کے زمانے میں سِنان پاشا [رَكَ بآن]، جو آسٹرویوں کا جانی دشمن تھا، اسی طرح احمد اول اور عثمان ثانی کے عھد میں مراد پاشا [رَكَ بآن] اور خلیل پاشا [رَكَ بآن] تھے۔ اس صدی کے نصف آخر میں کوپرولو خاندان کے حسبِ ذیل اراکین بر سرِ اقتدار رھے: محمد پاشا اور اس کا بیٹا احمد پاشا اور ان کا عم زاد بھائی مصطفی پاشا۔ اسی زمانے میں قرہ مصطفی پاشا [رَكَ بآن] بھی تھا، جس نے ۱۶۸۳ء میں وینا کا محاصرہ کیا۔ یہ فوجی مبصرین اس قلیل جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو قبولِ اسلام کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کے اُس نظام حکومت کی حامی بنی جس کی تکمیل سلیمان اول کے عھد میں ھوئی تھی، لیکن وہ سلطنت کی مخلوط اور متنوّع آبادی کے کسی بڑے طاقتور گروہ کے نمایندے نہیں تھے، کیونکہ ابھی تک عثمانی ترکوں کی تشکیل بحیثیت ایک قوم کے نہیں ھوئی تھی۔ کئی اَور گروہ بھی امور سلطنت کی سربراھی میں جماعتِ مذکور کے حریف تھے؛ اور ان میں سب سے زیادہ طاقتور اور زبردست جماعت یکی چریوں اور سپاھیوں کے لشکر کی تھی، جو کئی بار، خصوصاً جنگ میں ھزیمتیں اٹھانے کے بعد، مثلاً ۱۶۳۲ء میں، مراد چہارم کی تخت نشینی کے موقع پر اور ۱۶۸۸ء میں محمد رابع کی معزولی پر، سیاسی صورتِ حالات پر متصرف ھو گئے تھے۔ اس زمانے میں یکی چریوں کو پہلے سے بھی کم، پرانے طریقے کے مطابق، عیسائی آبادی میں سے بھرتی کیا جاتا تھا: پھر کئی قسم کی خرابیوں نے اس فوج کا نظم و نسق تباہ کر ڈالا تھا، چنانچہ کئی وزراے کبیر ان کے غیظ و غضب کا شکار ھوے۔ ایک اَور طاقتور گروہ، جو کبھی کبھی فوجی عناصر کو اپنا آلۂ کار بنا لیا کرتا تھا، اراکینِ دربار کا حلقہ تھا۔ اس گروہ کی قیادت متعدد موقعوں پر کسی بااقتدار والدۂ سلطان یا کسی قیزلر آغاسی نے کی۔ آخر میں علماء کے گروہ کا ذکر کرنا چاھیے، جس نے شیخ الاسلام کی ھمراھی میں امور سلطنت کے روبراہ کرنے سے متعلق بار بار کامیابی کے ساتھ فیصلہ کن حصہ لیا تھا (مثلاً مفتی سعدالدین نے سلطان محمد ثالث کے عھد میں): سلطان ابراھیم کی معزولی کی توثیق شیخ الاسلام کے فتوے کے ذریعے سے عمل میں

آئی ۔ زوال کی ان علامات کا تجزیہ قوچی بک [رک بآن] نے اپنے رسالہ میں صحیح طور پر کیا تھا ۔ صرف مراد رابع ایک ایسا سلطان تھا جو ان مختلف گروہوں کو (اکثر سختی کے ساتھ) دبا دیا کرتا تھا ۔ وہ یگی چری کے ساتھ ساتھ ایک نئی فوج (سگبانوں) کے ترتیب دینے میں بھی کامیاب رہا ۔ دارالخلافہ میں کئی بار عیسائیوں کے خلاف مذہبی جوش و خروش ابل پڑا، جیسا کہ ابراہیم اول کے عہد میں ہوا، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سیاسی واقعات پر اس کا کچھ اثر پڑا؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بڑے بڑے رجالِ سیاست شان‌دار رواداری دکھایا کرتے تھے.

غیر مسلم عنصر حکومت کے کاروبار پر کسی قسم کا راست اثر ڈالنے سے گو محروم تھا، لیکن اس نے اپنے رویے کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا ۔ قسطنطنیہ میں یونانی امراء کی ایک نئی جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو اپنی دولت اور ریشہ دوانیوں کے ذریعے سے ترکی حلقوں میں بڑا اثر و رسوخ رکھتی تھی اور اسی طرح ڈینیوب کی عیسائی ریاستوں کے سرکردہ حلقوں میں بھی ان کا خاصا رسوخ تھا؛ اسی طرح یونانی بطریقوں کی نامزدگی میں بھی انھیں تصرف حاصل تھا ۔ اسی زمانے میں عثمانی سلطنت کے یونانیوں نے بطریق سیریلس لوکارس Cyrillus Lucaris کے زیرِ اثر قطعی طور پر اورتھوڈوکس یونانی مذہب کی طرف رخ کر لیا (اس بطریق کو ۱۶۳۸ء میں قتل کرا دیا گیا) ۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومی نصرانیوں کی دنیا سے ان کا تعلق بالکل قطع ہو گیا اور یہ بات بالواسطہ عثمانی سلطنت کے استحکام کا موجب بنی ۔ عثمانی ترکوں اور یونانیوں میں اس وقت تک بہت سی مذہبی روایات مشترک تھیں اور ترکی حلقوں میں بھی مسیحی قدیسوں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔ یونانیوں کے بعد دوسرا اہم عنصر یہودیوں کا تھا، جو بایزید اول کے زمانے میں ہسپانوی اور پرتگیزی یہودیوں کی آمد سے اور بھی طاقتور ہو گئے تھے ۔ انھوں نے ملک کی اجتماعی زندگی میں، بالخصوص ساہوکاروں کی حیثیت سے، بہت اہم کام سرانجام دیا ۔ اس جماعت کا سب سے مشہور نمائندہ یوسیف نسّی تھا، جو سلیم ثانی کا مقرب تھا.

ایشیاے کوچک کے ادنٰی طبقات کے لوگ یورپی ترکی کے ایسے ہی لوگوں کی طرح حکومت کے کاروبار میں بہت کم حصہ لیتے تھے، تاہم چند خطرناک بغاوتوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ تیرھویں اور چودھویں صدی کی مذہبی روایات ابھی تک پورے طور پر ختم نہیں ہوئی تھیں ۔ ۱۵۹۹ء میں قرہ‌یازیجی [رک بآن] کی تحریک رھا (Urfa) میں شروع ہوئی ۔ سلطنت کے اتحاد کے لیے اس سے کہیں زیادہ خطرناک قلندر اوغلی کی بغاوت تھی، جس کا آغاز ۱۶۰۶ء میں صاروخان میں ہوا ۔ قلندر اوغلی نے کئی سال تک مغربی اناطولیا کے ایک بڑے حصے پر خود مختارانہ حکومت کی، تا آنکہ مراد پاشا نے اسے بالکل کچل کر رکھ دیا ۔ اس کے جلدی ہی بعد ۱۶۲۳ تا ۱۶۲۸ء میں ابازہ [رک بآن] کی بغاوت رونما ہوئی، اس شخص نے یگی چریوں پر بے دردانہ مظالم روا رکھے تھے ۔ اس سے اور مشرق کی طرف اور ملک شام کے شمال میں جانبلاط الکردی [رک بآن] کی تحریکِ خود مختاری کا زور ہوا اور فخرالدین درزی نے لبنان میں اسی طرح کی شورش برپا کر دی ۔ ان دونوں سے ایک حد تک رواداری کا سلوک کرنا پڑا ۔ تصوف کی طرف رجحان اور صوفی شیوخ (جیسے محمود، ساکنِ سقوطری، جس کے شہر میں عثمان ثانی کے عہد میں کئی وزراے اعظم جا کر پناہ گزین ہوے تھے) کے

احترام کا جذبہ، آبادی کے ہر طبقے میں عرصے تک قائم رہا اور اس عہد میں صوفیوں کے کئی نئے طریقے جاری ہوے ۔ غیر ملکی تجارت حسبِ دستورِ سابق غیر ملکیوں، یعنی اہلِ وینس اور دیگر اطالویوں، کے ہاتھوں میں رہی ۔ لیپانتو کی جنگ کے بعد جب ترکی بیڑا از سرِ نو مرتب ہوا تو اس کے اکثر ممتاز افسر اطالوی الاصل تھے، مثلاً چغالہ زادہ سِنان پاشا [رَكَ بآن].

۴ - چوتھا دور (۱۶۹۹ تا ۱۸۳۹ء).

اٹھارھویں صدی میں انحطاط کے اسباب کا ناگزیر اثر سلطنت میں بیش از بیش محسوس ہونے لگا اور ایسی صورتِ حالات پیدا ہو گئی جسے بہت سطحی طور پر زوال کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ زوال کے اسباب کو زیادہ تر سلطنت کے اندر ہی تلاش کرنا چاہیے ۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اسباب اس بات کا نتیجہ تھے کہ ایک فاتح حکومت پُر امن نظام کی طرف منتقل ہوئی، لیکن خارجی طاقتوں نے ان اسبابِ زوال سے اب بیش از بیش فائدہ اٹھایا ۔ ان خارجی طاقتوں میں سے شروع شروع میں تو آسٹریا بدستور ایک زبردست مخالف تھا ، چنانچہ ۱۷۱۶ تا ۱۷۱۸ء کی جنگ کے بعد پساروونز Passarowitz کی صلح کی رو سے ہنگری اور ٹرانسلوانیا کے وہ علاقے جو ابھی تک ترکی کے پاس باقی رہ گئے تھے، حتی کہ بلغراد تک بھی، ترکوں کے قبضے سے نکل گئے، لیکن ۱۷۳۹ء کے صلح نامۂ بلغراد کی رو سے شہر بلغراد ترکی کو واپس مل گیا اور آسٹریا کی جانب سے جو حقیقی خطرہ تھا وہ دور ہو گیا ۔ علاوہ بریں جنّ علی پاشا نے ۱۷۱۵ء میں موریہ کا علاقہ اہلِ وینس (بنادقہ) سے دوبارہ لے لیا ۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وینس کا خطرہ بھی جاتا رہا ، لیکن عین اس وقت ایک نیا اور زبردست دشمن روس کی شکل میں نمودار ہوا، جس کی سلطنت بہت وسیع ہو چکی تھی ۔ رومانیہ اور سرویا کے اورتھوڈوکس عیسائیوں کو وہ ایک نیا نجات دہندہ معلوم ہونے لگا تھا ، جو اس حیثیت سے ان کے لیے آسٹریا کی بہ نسبت کہیں زیادہ خوش آیند اور بہتر تھا ۔ ۱۷۱۱ء کی جنگ میں، جو پیٹر اول کے خلاف تھی، پولتاوہ کے مقام پر ترکوں کو فتح حاصل ہوئی ۔ اس جنگ کا اس امر سے گہرا تعلق تھا کہ سویڈن کا بادشاہ، چارلس دوازدهم، ترکیہ میں آ نکلا تھا ۔ ۱۷۱۲ء میں آزوف Azov کا علاقہ ترکوں کو واپس مل گیا اور ۱۷۳۲ء کی جنگ بھی ۱۷۳۹ء کے محوّلۂ بالا معاہدۂ بلغراد کی رو سے ویسی ہی کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی اور بعد کی جنگوں کی طرح یہ جنگیں ترکیہ کے لیے تباہ کن ثابت نہ ہوئیں؛ بحیرۂ اسود میں روسی جہاز رانی کو بھی قانوناً روک دیا گیا ۔ ۱۷۳۹ء کے بعد یورپ میں سلطنت عثمانیہ کو امن کا زمانہ نصیب ہوا ۔ اس زمانے میں ایران سے فوجی اور دوستانہ تعلقات زیادہ تر اُس ملک کے سیاسی حالات کے مرہون منت تھے، جس سے ترک فائدہ اٹھانا چاہتے تھے ۔ ۱۷۳۰ء میں نادرشاہ کی کامیابیوں کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا، بلکہ اسی وجہ سے احمد ثالث کی معزولی بھی عمل میں آئی، لیکن آخرکار ۱۷۳۶ء کے صلح نامے کی رو سے مراد چہارم کے عہد کی سرحدیں بحال ہو گئیں ۔ سلطنتِ عثمانیہ کی حقیقی فوجی کمزوری کا انکشاف قطعی طور پر اس وقت ہوا جب ترکوں نے ۱۷۶۸ء میں خود روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے لڑائی شروع کی ۔ اس جنگ میں روسی فوجیں بلغاریہ کے اندر بہت دور تک گھس آئیں اور جنگ کا خاتمہ آخرکار ۱۷۷۴ء کے مشہور عہد نامۂ کوچوک قینارجہ پر

هوا، جس کی رو سے قریم (کریمیا) پورے طور پر خود مختار ہو گیا (مگر ۱۷۸۳ء میں اسے روس نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا) - اس کے علاوہ ترکوں کو ڈینیوب کی ریاستوں پر روس کا حق حمایت تسلیم کرنا پڑا - کریمیا کے مسلمانوں کے مذہبی امور کی حفاظت کا جو حق سلطان کو اس موقع پر دیا گیا اس سے ترکی کے مذہبی حقوق اور دعاوی کی ابتداء ہوئی، جنھیں انیسویں صدی کے بین الاقوامی تعلقات اور سیاسیات میں عظیم اہمیت حاصل ہوئی - ایسی ہی افسوس ناک جنگ (۱۷۷۶ء) ایران میں کریم خان سے ہوئی، جس میں بصرہ بھی ترکوں کے ہاتھ سے عارضی طور پر جاتا رہا - سلطنتِ عثمانیہ کو ایک بار پھر روسیوں سے ۱۷۸۳ تا ۱۷۹۲ء کی جنگ میں سخت نقصان اٹھانا پڑا، جس کا خاتمہ یسّی Jassy کی صلح پر ہوا؛ اب کے دونوں سلطنتوں کے درمیان دریاے ڈنیپر Dniepr سرحد قرار پایا - آسٹریا نے بھی اس جنگ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور بخارسٹ پر قبضہ کر لیا، لیکن زشتووہ Zistowa (۱۷۹۱ء) کے علحدہ صلح نامے کی رو سے آسٹریا کو متوقع فوائد حاصل نہ ہو سکے۔

اس سارے زمانے میں مغربی ممالک، یعنی فرانس، انگلستان اور ہالینڈ سے ترکوں کے تعلقات دوستانہ رہے - ان تعلقات میں سویڈن (۱۷۳۷ء میں)، ڈنمارک (۱۷۵۶ء میں) نیز پرشیا (۱۷۶۳ء میں) بھی شریک ہو گئے - یہ تعلقات ترکیہ کے لیے اکثر اوقات بہت کار آمد ثابت ہوے، کیونکہ ان ممالک نے صلح کی گفت و شنید کے متوسطین کی حیثیت سے نمایاں خدمات سرانجام دیں - ان میں سے فرانس نے بالخصوص ۱۷۴۰ء میں مشہور و معروف آخری 'استیازات' حاصل کیے - اسے ترکیہ میں بڑا رسوخ حاصل تھا، کیونکہ رومن کیتھولک عیسائیوں کے حقوق کی حفاظت کا حق اسے پہنچتا تھا، مگر اس صدی کے آخر میں مغربی طاقتوں نے جنوبی ایشیا میں نوآبادیوں کے حصول اور اپنے سیاسی اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے جو استعماری منصوبے بنائے سلطنتِ عثمانیہ کو بھی ان کا ایک جزو سمجھا جانے لگا - نوآبادیات کے ان مقاصد کے پیشِ نظر عثمانی سلطنت کے کسی علاقے پر قبضہ کرنا اس وقت مقصود نہ تھا، لیکن نوآبادیاں قائم کرنے والی طاقتوں کو، جو ابھر رہی تھیں، اس بات کی ضرورت تھی کہ ان کے اور ان کے مقبوضات کے درمیان کوئی ایسی سلطنت موجود رہے جس پر ان کا تصرف ہو - انھیں اس ضرورت کا احساس تھا کہ وہ خلیج فارس اور ہندوستان سے سلسلۂ رسل و رسائل قائم رکھنے کے لیے جنوبی بحری راستے کی بہ نسبت کوئی اور نزدیک تر راستہ اختیار کریں - ۱۷۹۸ء میں فرانس نے مصر پر قبضہ کیا تو اس کا بلاواسطہ سبب یہ تھا کہ انگلستان اور فرانس کے درمیان رقابت تھی - اس وجہ سے انگریز، بلکہ وقتی طور پر روسی بھی، ترکیہ کے حلیف بن گئے، لیکن ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو گئی اور اس کے چند سال بعد روس سے پھر جنگ چھڑ گئی اور انگریزوں سے بھی مخالفت پیدا ہو گئی (چنانچہ ۱۸۰۷ء میں انگریزی بیڑے نے دارالخلافے کے سامنے مظاہرہ کیا) - بخارسٹ کے صلح نامے کی رو سے (۱۸۱۲ء) عثمانی سلطنت کے ہاتھوں سے کچھ اور علاقہ (بسارابیا) روسیوں کے قبضے میں چلا گیا اور انگلستان وقتی طور پر اس بات سے مطمئن ہو گیا کہ فرانس کا استعماری اقتدار ہندوستان سے جاتا رہا اور مصر میں عثمانی تسلط بھی کم زور ہو گیا - اس کے بعد عثمانی سلطنت کو یونان کی بغاوت کے نشیب و فراز کی وجہ سے بھی بڑا دھکا لگا - یہ

بغاوت ۱۸۲۰ء میں شروع اور ۱۸۳۰ء میں ختم ہوئی ۔ نتیجه یه ہوا که ترکوں نے یونان کی خودمختاری تسلیم کر لی، لیکن اس سے پہلے روس سے ایک اور تباہ کن جنگ ہوئی — کیونکه روس نے ابتداء ہی سے یونان کے فسادات میں بڑا حصه لیا تھا — چنانچه ترکی کو ادرنه کی صلح (۱۸۲۹ء) پر مجبور ہونا پڑا ۔ تاہم یورپ کی دوسری طاقتوں نے روس کو توسیع سلطنت کے منصوبوں کی تکمیل سے باز رکھا؛ اسے صرف اسی بات پر اکتفا کرنا پڑا که اسے ترکی پر زبردست سیاسی تفوق حاصل رہے اور ہوا بھی یہی، جیسا که ۱۸۳۳ء کے عہدنامه خُنْکار اسکیله‌سی Hunkïār Iskelesi سے ثابت ہے ۔ اس میں ایک خفیه دفعه ایسی تھی جس کی رو سے ترکی کو بحیرهٔ اسود کی جہازرانی کے سلسلے میں مجبوراً روس کا حلیف بننا پڑا ۔ یه غیر طبعی اتحاد محمد علی، والی مصر، کے ایک اقدام سے متفرع ہوا (آغاز از ۱۸۳۱ء)، کیونکه اس نے ایک وقت یه دھمکی دی تھی که وہ سلطنتِ عثمانیه کو مصر، شام اور سائیلیشیا کے مقبوضات سے محروم کر دے گا، لیکن انجام کار یه فیصله ہوا که مصر کو اس لحاظ سے سلطنت کا ایک خاص ممتاز حصه سمجھا جائے که اس کی حکومت محمد علی کے خاندان میں بطریقِ موروثی منتقل ہوتی رہے گی (۱۸۴۰ء) ۔ اس دفعه پھر یورپی طاقتوں کی دخل اندازی اس سلطنت کے املاکِ دولت کے بارے میں فیصله کن ثابت ہوئی ۔ سلطنتِ عثمانیه کی بقاء و دوام کو بجا طور پر سیاسی لحاظ سے ضروری سمجھا گیا؛ ۱۷۸۹ء ہی میں پُرشیا اور آسٹریا کے درمیان ایک معاهده ہو چکا تھا، جس کی رو سے یه دونوں ملک سلطنت کی شمالی سرحدوں کی برقراری کے ضامن بنے تھے ۔ ۱۸۳۰ء کے نواح میں ترکیه نے 'امتیازات' کی طرز کے کئی نئے معاهدے، ممالک متحده امریکه، بلجیم، پرتگال اور هسپانیه سے کیے ۔ الجزائر کو فرانس نے (۱۸۲۷ تا ۱۸۵۷ء میں) فتح کر لیا، مگر اسے سلطنت عثمانیه کے لیے حقیقی نقصان تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

اس دور میں سلطنت کا نظام اداری قریب قریب بدستور سابق ہی رہا، مگر ہر جگه مرکزی حکومت کا اثر و رسوخ کم ہو رہا تھا، لیکن اٹھارھویں صدی کے آغاز تک یه کمی کچھ زیاده محسوس نه ہوئی ۔ قسطنطنیه ابھی تک ایک طاقتور سلطنت کا ذی شان دارالخلافه تھا، جہاں احمد ثالث کا دربار خوش گذرانی کی زندگی کا نمونه پیش کر رہا تھا ۔ اس زمانے میں گلِ لاله کی کاشت کا ایک عجیب و غریب شوق پیدا ہوا، جس کی وجه سے اس زمانے کو "لاله دوری" کا نام دیا گیا ہے ۔ اسی زمانے میں علماء کے حلقوں سے الگ اعلٰی ترکی خصوصیت سے عثمانی علم و ادب اور تہذیب و تمدن کو وسعت اور ترقی نصیب ہوئی، جس سے باسواد لوگوں کی ایک نئی جماعت ظہور میں آئی؛ یه لوگ ترکوں کے علم دوست درمیانی طبقے کے پیش‌رو تھے، جو انیسویں صدی کے آغاز میں معرضِ وجود میں آیا ۔ ۱۷۲۷ء میں ترکی طباعت کی ابتداء ہوئی ۔ یه امر بھی اعلٰی طبقوں کے ثقافتی رجحانات سے گہرے طور پر وابسته ہے ۔ ان میں سے اکثر لوگ سرکاری محکموں میں بڑے یا چھوٹے عہدوں پر مقرر تھے اور اسی طبقے سے داماد ابراہیم اور راغب پاشا ایسے اشخاص صدر اعظم کے منصب پر فائز ہوے ۔ اس سے سابقه نظامِ حکومت کی فوجی هیئت بہت حد تک بدل گئی ۔ اب سلطنت کے داخلی اور خارجی امور کا انصرام باب عالی میں پہلے سے زیاده اهل سیاست کے طور و طریق پر ہونے لگا ۔ اور رئیس الکُتّاب [رِئیس‌ آفندی/رِکَه بان] کے

معمولی عہدے کی اہمیت روز بروز بڑھنے لگی، کیونکہ اب یہ منصب‌دار امور خارجہ کے فرائض با اختیار طریقے سے سرانجام دینے لگے ۔ ان میں سے ایک، احمد رَسمی، بہت مشہور ہے ۔ اُس کا شیار آلِ عثمان کے اولین سفراء میں ہوتا ہے ۔ تاہم یہ جدید عہدہ دار ابھی تک قدیم دستور کے مطابق سلطان کے غلام ہی شمار ہوتے تھے، البتہ محمود ثانی کے زمانے میں ان کے مرتبے کو زیادہ کشادہ دلی کے ساتھ متعین لیا گیا ۔ اس جدید اعلٰی طبقے کے مہذب لوگوں کے کئی قسم کے تعلقات اپنے ہم عصر یونانی فَناریوں سے تھے، جن میں سے کئی افراد حکومت کے اعلٰی منصبوں پر بالعموم اور مترجمین کے عہدوں پر بالخصوص مأمور تھے (جیسے نیقوسیوس Nikusios اور ماورو کورداتو Mavrocordato)، لیکن نیچے کے طبقے کے مسلمانوں سے ان کے کچھ مراسم نہ تھے ۔ ان حکام کے زمانے میں ینگی چریوں اور سپاہیوں نے، جو بہت سرکش ہو چکے تھے، کئی بار امور مملکت میں بڑے خوف ناک طریقے سے دخل اندازی کی ۔ پٹرونہ خلیل Patrona Khalil کی سرکردگی میں ۱۷۳۰ء میں ینگی چریوں نے بغاوت کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمد ثالث تاج و تخت سے ہاتھ دھو بیٹھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بغاوت زیادہ تر امراء کے مذکورہ جدید طبقے کے خلاف ہوئی تھی ۔ احمد ثالث کے بعد اہل دربار کی طرز زندگی میں زیادہ اعتدال پیدا ہو گیا ۔ طبقۂ حکام اور بہت سے سلاطین کو سلطنت کی کمزوری کا احساس ہونے لگا اور انھوں نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ فوج میں جدید اصلاحات جاری کی جائیں، اس کام میں غیر ملکیوں نے بھی امداد دی، جن میں سے فرانسیسی بونوال Bonneval (م ۱۷۴۷ء) سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ د توت De Tott نامی ایک اَور فرانسیسی افسر نے بھی اسی قسم کا اصلاحی کام مصطفٰی ثالث کے عہد میں شروع کیا تھا، لیکن جب اسی سلطان کے زمانے میں روسیوں سے جنگ چھڑی تب معلوم ہوا کہ اصلاحی اقدامات کس قدر غیر مؤثر تھے ۔ سلیم ثالث نے عسکری اصلاحات کا معاملہ بہت زیادہ مستعدی کے ساتھ ہاتھ میں لیا، لیکن اس کے زمانے میں بھی قائدین ملت میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان معاملات کو بخوبی سمجھ سکتے تھے ۔ جب ایک نئی فوج (' نظامِ جدید') مرتب ہوئی تو اس سے ینگی چری کی ایک اَور زبردست بغاوت بھڑک اٹھی اور بہت سے علماء نے بھی ان کی تائید کی ۔ آخرکار سلطان محمود ثانی اصلاحات کے مسئلے کی طرف زیادہ غور و تأمل کے ساتھ متوجہ ہوا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ نفاذِ اصلاحات کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، چنانچہ اس نتیجے کے اجرا کی غرض سے ۱۶ جون ۱۸۲۶ء کو قسطنطنیہ میں ینگی چری کا مشہور قتل عام کرایا اور اس کے ساتھ ہی بکتاشی سلسلے کے درویشوں کو بھی موردِ عقوبت بنایا گیا ۔ مگر واقعات سے ظاہر ہوا کہ اُس وقت تک تعمیری کام کے مقابلے میں تخریبی کام زیادہ ہوا تھا : البتہ اس سلطان کو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ اس نے کئی ایک طاقتور، نیم خود مختار، مقامی، خاندانی امراء کو زیر کر لیا ۔ اس میں شک نہیں کہ اٹھارھویں صدی میں مرکزی حکومت کی کمزوری سلطنت عثمانیہ کی ایک خصوصیت بن چکی تھی ۔ الجزائر، تونس اور طرابلس میں بکوں کی حکومت موروثی بن گئی تھی : سلطان محمود ان میں سے صرف طرابلس کو دوبارہ براہِ راست باب عالی کے زیر نگین لانے میں کامیاب ہوا ۔ ۱۷۶۷ء میں علی بک

مصر کو غصب کر چکا تھا - روم ایلی (روسیلیه) میں بڑے بڑے جاگیرداروں کی صف میں سے چند طاقتور امیر آگے آ چکے تھے، جنھیں 'اعیان' کہتے تھے - سلیم ثالث اور محمود ثانی کے عہد میں ان میں سے ممتاز ترین امیر علی پاشا، والی ینینه اور پزوان اوغلی، والی وِدّین تھے - ۱۷۳۹ء میں اناطولیا میں صاری بیک اوغلی کی خطرناک بغاوت برپا ہوئی، جس کے بعد نام نہاد ''دِرہ بک'' duro-boya اچھے خاصے خود مختار حکمران بن گئے اور یہی حالت کردستان کی تھی - عراقِ عرب اور الجزیرہ میں بھی صورت حالات یہی تھی؛ ۱۷۰۶ء میں عراق میں بدوی حلیفانِ مُنتفق کی ایک زبردست جماعت بن گئی اور سلیم ثالث کے عہد میں بغداد میں سلیمان پاشا (م ۱۸۱۰ء) خود مختارانه طریق سے حکومت کرتا رہا۔ شام میں لبنان کے دُروز اپنے مقامی امیروں کے زیرِ فرمان تھے اور سلیم ثالث کے عہد میں ساحلِ شام پر جزّار پاشا [رک بآن] والی عکّه حکمران تھا - ۱۸۰۳ء میں وہّابیوں نے مکّے پر قبضه کر لیا اور اس دَور میں یمن اور عسیر کو مشکل ہی سے ترکی سلطنت کا حصه کہا جا سکتا ہے - بحر ایجه کے جزیروں میں مشکل ہی سے کوئی ترک نظر آتا تھا اور شام کی طرح یہاں بھی اہل یورپ کا اثر غالب تھا - گو آلِ عثمان کا تسلط ہر جگه رو بانحطاط تھا، لیکن ترکی طرز کے نظامِ اداری نے اپنی مُہر ان تمام مختلف مقامات کی ثقافتی زندگی پر ثبت کر دی تھی اور عثمانیوں کی عظیم‌الشان روایات سے ان کی شیرازہ بندی قائم تھی - انھیں روایات کی وجه سے محمود ثانی اور اس کے بعد کے رجالِ سیاست کے لیے، جو سلطنت کی مرکزی حکومت اور اس کے اقتدار کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوے، یه ممکن ہو سکا که سلطنت کی وحدت مزید ایک صدی تک بر قرار رکھیں.

۸ - پانچواں دور (۱۸۳۹ تا ۱۹۲۲ء).

اس دَور میں دولتِ عثمانیه کا تحوّل دولت قومیهٔ ترکیه کی صورت میں مکمل ہو گیا، مگر یه تحوّل ایسے طریق پر ہوا جو دُوَلِ مسیحیه کے ارادے اور منشأ کے مطابق نه تھا اور خود ترکی حکمران طبقوں کو بھی اس تبدیلی کی توقع نه تھی - نظامِ حکومت میں جدید طریق پر عمل پیرا ہو کر تنظیمات [رک بآن] کو تدریجی طور پر نافذ کرنے سے مقصد یه تھا که زیادہ تر فرانسیسی نظامِ حکومت کے نمونے پر نئی طرز کی حکومت قائم کی جائے اور اس حکومت میں تمام شہریوں کو بلا تفریقِ مذہب و ملّت، براہِ راست حکومتِ عثمانیه کے زیرِ فرمان، برابر کے سیاسی اور شہری حقوق حاصل ہوں؛ صرف مصر، ریاستہاے ڈینیوب اور سرویا (۱۸۱۰ء سے) اور ایشیا میں حجاز کو امتیازی حیثیت دینا منظور کیا گیا - مگر اس نئی سلطنت عثمانیه کا مطمحِ نظر اس جمہوری نظریے سے بہت دور تھا جو یورپ میں رائج تھا اور جس کے اثرات اب یہاں بھی، بالخصوص عیسائی رعایا میں، محسوس ہونے لگے تھے - ۱۸۴۹ء کی جمہوری انقلابی تحریک کی، جو مولڈیویه (البُغدان) اور وُولیکیه (افلاق) میں رونما ہوئی، ترکی اور روس دونوں نے یکساں طور پر مخالفت کی، لیکن اس کا نتیجه بالطّه لیمانی Balta Liman میثاق تھا جس کی رو سے ان دونوں ریاستوں میں ترکی کا اقتدار بالکل براے نام ہی رہ گیا - جب بیت‌المقدس کے مقاماتِ مقدسه کے بارے میں جھگڑا ہوا اور اس بنا پر روس نے ۱۸۸۳ء میں ان ریاستوں پر دوبارہ حمله کر دیا تو انگلستان اور فرانس نے ترکوں کا ساتھ دیا؛ یه تھی جنگ کریمیا کی ابتداء - ۱۸۵۶ء میں پیرس کے صلح نامے

کے مطابق سلطنت کی سلامتی کی بظاہر توثیق ہو گئی، مگر در حقیقت فرانسیسیوں اور انگریزوں کی مداخلت اور جلد ہی روس کی دوبارہ دخل اندازی بھی ہمیشہ کی نسبت زیادہ پختہ بنیاد پر قائم ہو گئی ۔ یہ دخل اندازی صرف سیاسی معاملات تک محدود نہ تھی، جیسی مثلاً وہ مسلّح دخل اندازی جو ۱۸۴۵ء اور ۱۸۶۰ء کے فسادات شام کے موقع پر ہوئی یا وہ دخل اندازی جو ۱۸۵۸ء میں جدّہ کی شورش کے بعد اور ۱۸۶۶ء میں کریٹ (اقریطش) کی حیثیت کے متعلق بین الاقوامی بندوبست کے موقع پر ہوئی، بلکہ خارجی حکومتیں اندرونی نظام حکومت کی بہت سی جزئیات میں بھی دخیل ہو گئیں ۔ اس قسم کی دخل اندازی ان کے لیے 'امتیازات' (capitulations) کی وجہ سے ممکن ہو گئی تھی ۔ یہ 'امتیازات'، جو ابتداءً یک طرفہ نوعیت کی رعایات تھیں، اس وقت یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ باقاعدہ باہمی عہد نامے ہیں؛ لیکن ان معاہدات کی دفعات سلطنت کے اس جدید تصور کے بالکل منافی تھیں جسے 'تنظیمات' کے ذریعے سے بروے کار لانا مقصود تھا ۔ فی الحقیقت ۱۸۵۶ء سے باب عالی نے اس بات کی بے سود کوشش کی کہ کسی طرح اس بین الاقوامی غلامی سے نجات حاصل کرے جس نے بالآخر انیسویں صدی کے اواخر میں ان تمام ممالک کی مجموعی نگرانی کی شکل اختیار کر لی جنھیں 'امتیازات' حاصل تھے ۔ آخر کار کہیں ۱۹۱۴ء میں، جب خود یورپین طاقتوں کے درمیان تصادم واقع ہوا، تو ترکوں نے ان 'امتیازات' کو منسوخ کر دیا ۔

۱۸۶۲ء میں حکومت عثمانیہ نے مونٹے نیگرو اور ہیتسے گووینہ Herzegovina میں اپنا اقتدار دوبارہ قائم کر لیا، مگر اس کے برعکس سرویا اور ڈینیوب کی دو ریاستوں نے، جو ۱۸۶۱ء میں متحد ہو کر ایک ریاست بن گئی تھیں، ۱۸۶۵ء میں تقریباً پوری خود مختاری حاصل کر لی ۔ بارہ برس بعد بلغاریہ کی شورش کی وجہ سے روس سے پھر جنگ ہوئی ۔ روس ۱۸۷۰ء میں ۱۸۵۶ء کے عہد نامے کی، جو بحیرۂ اسود کے متعلق تھا، پہلے ہی خلاف ورزی کر چکا تھا ۔ سین سٹیفانو کے عہدنامے (۱۸۷۸ء) کی مبادی کے مطابق، جس کی شرائط عہدنامۂ برلن ۱۸۷۹ء کی رو سے نرم کر دی گئی تھیں، سربیا، مونٹے نیگرو اور رومانیہ قطعی طور پر عثمانیوں کے قبضے سے نکل گئے اور بلغاریہ کو ایک نیم خود مختار حکومت کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا؛ قفقاز کی سرحد پر قارص اور باطوم بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور جزیرۂ قبرص کے نظم و نسق سنبھالنے کا انگریزوں نے بندوبست کر لیا ۔ انگلستان نے، جو اس وقت تک بلادِ عثمانی کی سالمیت کو احترام کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا، اپنی سابقہ حکمت عملی ترک کر کے ۱۸۸۲ء میں احتلال مصر کی صورت پیدا کر لی [قب خدیو]۔ یورپی ترکی کے باقی ماندہ علاقے کے حصے بخرے حسب ذیل سنین میں ہوے : ۱۸۹۷ء میں ترکوں اور یونانیوں کی لڑائی ہوئی، جس میں یونانی سلطنت کو شمال کی جانب توسیع حاصل ہوئی - ۱۸۹۸ء میں کریٹ (اقریطش) خود مختار ہوا اور ۱۹۰۹ء میں عبدالحمید کی معزولی کے بعد بلغاریہ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور آسٹریا نے بوسنیہ اور ہیتسے گووینہ کا الحاق کر لیا ۔ اس کے بعد اطالیہ سے جنگ ہوئی تو طرابلس کا علاقہ چھن گیا (۱۹۱۲ء، عہد نامۂ لوزان) اور ۱۹۱۲ و ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان میں یورپی ترکی کے مقبوضات صرف مشرقی تھریس (بشمول ادرنہ) تک محدود رہ گئے ۔ ادرنہ پر بھی کچھ مدت کے لیے بلغارویوں نے قبضہ جما لیا تھا۔

انیسویں صدی میں ایران سے ترکی کے تعلقات مجموعی طور پر پُر امن رہے؛ صرف سرحدوں کے سوال پر کبھی کبھی جھگڑا ہو جاتا تھا، مثلاً سلیمانیہ کے کُردی علاقے کی ملکیت کا سوال پیش آیا، جس کا فیصلہ ۱۸۴۷ء میں ترکی کے حق میں ہوا ۔ خلیج فارس کے ارد گرد کا علاقہ بیش سے بیش‌تر انگریزوں کے زیرِ تصرف آتا گیا، لیکن ایشیا میں عرصۂ دراز تک ترکیہ کی شاہانہ حیثیت بدستور قائم رہی [اور اس کی حدودِ سلطنت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی] ۔ اس اثنا میں ترکی آہستہ آہستہ سلطنتِ المانیہ (جرمنی) کی اقتصادی توسیع کی منصوبہ بازیوں کے پھندے میں پھنستا گیا، جیسا کہ بغداد ریلوے کے منصوبے سے عیاں ہوتا ہے ۔ اس وجہ سے عثمانی مملکت کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے بارے میں انگلستان کی دلچسپی کم ہو گئی، چنانچہ جب عالمی جنگ کے پہلے سال میں ترکیہ اپنی غیر جانبداری قائم نہ رکھ سکا اور اُسے وسط یورپ کی طاقتوں کے ساتھ شریک ہونا پڑا، تو روس اور انگلستان نے پہلی دفعہ اتحادِ عمل کرتے ہوے ترکی علاقوں پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کر لیا ۔ زمانۂ جنگ میں اتحادِ ثلاثہ کی تمام کوششیں دردانیال میں خشکی اور تری کے راستے داخل ہونے کے بارے میں ناکام رہیں، تاہم فرانسیسی اور انگریزی افواج کی متفقہ کارروائی، جو انھوں نے فلسطین اور شام میں کی اور وہ مختلف مہمیں، جو انگریزوں نے عراق اور الجزیرہ میں بھیجیں، اُن میں آخر کار کامیابی ہوئی اور یہ تمام علاقے عثمانی فوج کے ہاتھ سے چھن گئے ۔ شریف مکہ ۱۹۱۷ء میں شاہ حجاز کے لقب سے اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکا تھا؛ [illegible] اس کی فوجوں نے حملہ آوروں کی مدد کی ۔ اسی زمانے میں روس بھی شمال مشرق اناطولیا میں خاصی حد تک پیش قدمی کر چکا تھا، لیکن اس جانب سے خطرہ اچانک رفع ہو گیا؛ اس لیے کہ روس میں انقلاب ہو گیا اور بریسٹ لٹوونسک Brest Litowsk کے صلح نامے (۳ اگست ۱۹۱۸ء) کی رُو سے کھوئے ہوے علاقے ترکوں کو واپس مل گئے اور اس کے علاوہ قارص، اَرْدَہان اور باطوم بھی انھیں واپس دے دیے گئے ۔ اس کے بعد ھی مُدروس کی عارضی صلح (۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء) کی رُو سے دوسری سلطنتوں سے بھی جنگ ختم ہو گئی ۔ بعد میں اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا؛ فرانس نے تمام شمالی شام اور سِلِشیا کا علاقہ ھتھیا لیا؛ انگلستان نے شمالی عراق اور موصل کے غیر مفتوحہ علاقے بھی لے لیے اور اطالوی فوجیں آنطالیہ (Adalia) کے ساحل پر اتر آئیں ۔ مئی ۱۹۱۹ء میں یونان کو مشرقی تھریس [تراقیا] اور سمرنا [ازمیر] پر قبضہ کرنے کی اجازت مل گئی ۔ یہ سب کچھ قسطنطنیہ کی حکومت مجبوراً خاموشی سے دیکھتی رہی ۔ ترکی پارلیمنٹ کا اجلاس ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوا اور انھوں نے وہ میثاق، جسے 'میثاقِ مِلّی' کا نام دیا گیا ھے، منظور کر کے ذرا سی مدت کے لیے سخت رویہ اختیار کیا؛ لیکن جب مارچ کے مھینے میں قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ اور بھی زیادہ سخت ہو گیا تو پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا گیا ۔ آخرکار ماہ اگست میں حکومت عثمانیہ نے عہد نامۂ سِیوْرْ (Sèvres) پر مجبوراً دستخط کر دیے، جس کی رُو سے سلطنت عثمانیہ کے رھے سھے علاقوں کے بڑے بڑے حصے بھی، جن میں قسطنطنیہ اور سمرنا [ازمیر] شامل تھے، ایک یا ایک سے زیادہ طاقتوں کے تصرف میں چلے گئے ۔ اس اثناء میں حکومت عثمانیہ کے خلاف ایک داخلی دشمن نمودار ہوا؛ یہ نتیجہ تھا منظم قومی مزاحمت کا جو غیر ملکیوں کے احتلالات، خصوصاً یونانیوں کے

سمرنا میں اتر آنے کے خلاف، ظہور میں آئی ۔ ۱۹۲۰ء کے دوران میں قسطنطنیہ کی حکومت آہستہ آہستہ اناطولیا پر اپنا تسلط پوری طرح سے کھو بیٹھی اور اتحادیوں کی امداد سے حکومت کی بحالی کے لیے جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ بھی ناکام رہیں ۔ قوم پرستوں کی بڑھتی ہوئی کامیابی کے مقابلے میں سلطان کا اقتدار اور زیادہ رو بہ انحطاط ہو گیا اور انقرہ کی مجلسِ ملّی کبیر [''ترکیہ بویوك ملّت مجلسی''] نے آخرکار یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو حکومت قسطنطنیہ کی برطرفی اور سلطان محمد سادس وحیدالدین کی معزولی کا اعلان کر دیا ۔ اس پر سلطنت عثمانیہ اور عثمانی خاندان کا چراغ گل ہو گیا ۔ قسطنطنیہ اور مشرقی تھریس پر قوم پرستوں کی فوجوں نے قبضہ کر لیا اور آخری سلطان اپنا دارالخلافہ چھوڑ کر چلا گیا ۔ یہ شہر اب دارالخلافہ بھی نہ رہا ۔ عثمانی خاندان کا صرف ایک نشان باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ عبدالمجید بن سلطان عبدالعزیز خلیفہ کی حیثیت سے اس شہر میں مقیم رہا، مگر ۲ مارچ ۱۹۲۴ء کو مجلس ملّی کبیر نے ایک فرمان کے ذریعے منصبِ خلافت کو بھی منسوخ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی عبدالمجید اور آل عثمان کے تمام افراد کو ترکی سے جلا وطن کر دیا گیا.

یہ نتیجہ تھا واقعات کے اس طویل سلسلے کا جس میں بیرونی سیاسی حالات کے دوش بدوش سلطنت کے اندرونی ارتقاء نے بھی برابر کا کام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ تنظیمات سلطنت کے انحلال کے باب میں ویسا ہی مؤثّر عامل تھا جیسا اجنبی طاقتوں کے سیاسی اغراض کا ۔ سلیم ثالث اور محمود ثانی کے زمانے میں جو اصلاحات نافذ ہوئیں تنظیمات سے بھی انھیں اصلاحی تدابیر کو زیادہ سوچ سمجھ کر جاری رکھنا مقصود تھا، لیکن کسی حال میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس لائحۂ عمل کو آبادی کے کسی بڑے حصّے کی تائید حاصل تھی ۔ رشید پاشا، علی پاشا اور ان کے حامی چاہتے تھے کہ ترکیہ کو دورِ حاضر کی (ماڈرن) سلطنت میں تبدیل کر کے، مجلس وزراء کے ذریعے سے، حکومت کا کام چلایا جائے، جس کا صدر بدستور 'صدر اعظم' کہلائے، لیکن ان کے سب طریقے اس استبدادی حکومت کے سے تھے جو سلاطین کے نام پر چلائی جاتی تھی اور شروع شروع میں سلطان بھی اس میں دخل نہیں دیتے تھے، مگر جب مِدْحت پاشا نے پہلے پہل حقیقی نئے آئین کی تشکیل کی، تو نئے سلطان عبدالحمید نے خود براہِ راست حکومت کرنے کو ترجیح دی اور اپنے پیشرووں کے مستبدّانہ طریقے استعمال کرنا شروع کر دیے، گو اس فرق کے ساتھ کہ کسی یورپی مغربی مملکت کے طور طریقوں کی تقلید کا قصد اس کے دل میں روز بروز کمزور تر ہوتا گیا، اس کے بجاے وہ خود اپنے شاہانہ مقام کو اَور زیادہ محفوظ اور مستحکم بنانا چاہتا تھا، چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے بالآخر نہایت کڑی قسم کا احتساب اور جاسوسی کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے یہ دَور، ترکی تاریخ میں '' دَورِ استبداد'' کے نام سے مشہور ہو گیا ۔ اس دَور کو اس وجہ سے کہ اس میں تنظیمات کے ادارے توڑ دیے گئے رجعت پسندانہ نہیں کہہ سکتے؛ اس میں صرف اصلاحات کے بعض نتائج کی مخالفت ہوئی ۔ اصلاحات کے ذریعے سے روشن خیال لوگوں کا ایک متوسط طبقہ (middle class) پیدا ہو گیا تھا، جس کی زبان ترکی تھی اور جو اسلامی مذہبی سُنن کا حامل تھا؛ یہ لوگ زیادہ تر فوج اور عُمّالِ حکومت پر مشتمل تھے اور ان میں علماء کی بھی قلیل تعداد شامل تھی ۔ یہ مفکّرین مختلف نسل کے تھے اور انھوں نے حبِّ وطن کا ایک نیا نظریہ قائم کیا تھا، جو نامق کمال کے صحیفۂ وطن

سے توجہ احسن منعکس ہوتا ہے ۔ وہ ایک طرح کی راے عامّہ بھی پیدا کرنے لگے تھے جس کا تقاضا یہ تھا کہ حکومت وقت میں ایسے قدرے اثر و رسوخ حاصل ہو ۔ اس زمانے میں ترکی روزناموں [لُبّ جریدہ] کا اجرا بھی ہوا ۔ معاشرے کے اس طبقے نے جب رفتہ رفتہ خاص صورتیں اختیار کر لیں تو وہ مختلف عیسائی اور یہودی جماعتوں سے اور بھی الگ نظر آنے لگا ، بلکہ اس نے ایشیائی صوبوں کے مسلمانوں سے بھی مغائرت برتنا شروع کر دی، جن کی زبان ترکی نہ تھی ۔ اس کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے آغاز سے عیسائیت اور اسلام کے درمیان عام مذہبی مناقشت نے ایک شدید صورت اختیار کر لی تھی، کیونکہ کئی اسلامی ممالک عیسائی طاقتوں کے قبضے میں جا چکے تھے ۔ ان حالات میں قسطنطنیہ میں اتّحاد اسلامی کی تحریک پیدا ہوئی اور قسطنطنیہ، نسبۃً قوی‌ترین خود مختار اسلامی حکومت کا صدر مقام ہونے کی حیثیت سے، دنیاے اسلام کا سیاسی دارالخلافہ قرار پایا ۔ بہت سے روشن خیال ترکوں ، اور ان میں زیادہ‌تر علماء کی تائید سے ، اتحاد اسلامی کی تحریک ، وطنیت کی تحریک سے، جو اس وقت تک قدرے مبہم ھی سی تھی، سبقت لے گئی ۔ اس کے علاوہ ترکی آبادی کے طبقۂ زیرین نے بھی اس اسلامی جذبے کو لبّیک کہا، کیونکہ یہ طبقہ روایاتِ تصّوف سے بدستور سخت متاثّر تھا؛ اسی طرح سلطنت کے غیر ترکی مسلمان بھی اس جذبے سے بہت اثر پذیر ہوے ۔ عبدالحمید جب اپنی خلافت کے عزّ و وقار پر زور دیتا تھا تو وہ اسلامی جذبات ھی پر زیادہ اعتماد کرتا تھا؛ گو جوں جوں وقت گذرتا گیا وہ لوگ ، جو اس روز افزوں بدگمانی والے سخت شکی مزاج بادشاہ کے اردگرد جمع ہو گئے تھے، بدترینِ خلائق ھی ثابت ہوے ۔ وطن پرستی کے جذبات کے اظہار کی مخالفت بڑی سختی سے کی جاتی تھی، حتّٰی کہ کئی روشن خیال اشخاص کو بیرونی ملکوں میں جا کر پناہ لینا پڑی ۔ استبداد کے خلاف بڑھتی ہوئی تحریک کو آخر کار مقدونیہ کی ولایت میں منظّم ہونے کا موقع ملا ۔ اس ولایت کا گورنر ۱۹۰۶ء سے ایک ترک تھا، جو یورپی طاقتوں کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا ۔ سالونیکا نوجوان ترکوں کی جدید محبِ وطن اور بیدارتر تحریک کا مرکز قرار پایا ، جس کی قیادت انجمن اتحاد و ترقی کے ہاتھ میں تھی اور جسے بہت حد تک فوج کی حمایت حاصل تھی ۔ اس کے اثر سے سلطان کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ مِدحت پاشا کا ۲۳ جون ۱۹۰۸ء والا آئین دوبارہ نافذ کرے اور بازرسیِ مطبوعات (censorship) اور جاسوسی کا تکلیف دہ طریقہ یک قلم موقوف کر دے ۔ نومبر میں پہلی ترکی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا، لیکن بعد کے پُرآشوب زمانے میں اس پارلیمنٹ کو حکومت کے کار و بار پر حقیقی معنوں میں اثرانداز ہونے کا موقع ھی نہ مل سکا: ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء کو ایک بار پھر یہ کوشش کی گئی کہ سلطان کا سابقہ اختیار و اقتدار بحال ہو جائے؛ اس موقع پر نوجوان ترکوں کے مقاصد کو زندہ رکھنے کی صرف ایک ھی صورت تھی: چنانچہ مقدونیہ کی فوج نے دارالخلافہ پر قبضہ کر کے سلطان کو معزول کر دیا (۲۷ اپریل) ۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے عثمانیت، یعنی عثمانی قومیت کے سیاسی نظریے، کا دور دورہ رہا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اسلامی اور غیر اسلامی تمام عناصر کو سلطنت میں مساوی درجہ حاصل ہو، لیکن یہ بات جلد ھی واضح ہو گئی کہ ان مختلف عناصر میں ایک دوسرے سے اس قدر بُعد اور کشیدگی پیدا ہو چکی ہے کہ عثمانیت پر ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھنا ناممکن ہے ۔

نوجوان ترکوں نے ''وحدتِ ترکیہ'' (Panturkism) کے نظریے کے زیر اثر آکر اب اس مقصدِ نہائی کے پیش نظر کام کرنا شروع کیا کہ سلطنت عثمانیہ کو ایسی حکومت بنایا جائے جس میں ترکی عنصر غالب ہو، اس لیے وہ ترکی بولنے والی آبادی کے طبقات زیرین، خصوصاً ایسے طبقات کی طرف جو اناطولیا میں تھے، متوجہ ہوئے، تاکہ وہ ایک حقیقی ترکی قوم کی تشکیل کرسکیں۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بعض لوگوں نے ''اتحاد اسلامی'' (Panislamism) کی تحریک کو بھی دوبارہ زندہ کیا، لیکن یہ طریق عمل بھی رفتہ رفتہ ترک کر دیا گیا، گو بیرونی سیاسی مظاہروں کے وقت کبھی کبھی اس کا استعمال کر لیا جاتا تھا۔ انقلاب کے بعد بین الاقوامی صورت حالات بےحد ناموافق ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے نوجوان ترک حکمرانوں کو بعض ایسی تدابیر اختیار کرنا پڑیں جو ابتداء میں یقیناً ان کے لائحۂ عمل میں شامل نہ تھیں، مثلاً جنگ کے زمانے میں ارمنیوں کا قتل عام اور ملک شام میں حکومت کی سخت گیری۔ جب تقریباً تمام غیر ترکی علاقے جنگ میں ہاتھ سے جاتے رہے تو بالآخر ترکی قومیت کی تخلیق ہوئی، جو ترکی حب الوطنی کا وہ سادہ‌ترین اور مؤثرترین نمونہ تھا جس کی راہ میں مذہبی عقائد اور قدیم نسلی تعلقات کسی طرح حائل نہ تھے۔

وہ مدبرین جنھوں نے ''تنظیمات'' کے لائحۂ عمل کا نفاذ کیا، ہمیشہ اس بات میں محتاط رہے کہ بزرگانِ اہلِ سنّہ کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ غیر ملکی نمایندوں کے احتجاج کے باوجود انھوں نے کوئی ایسا اقدام نہ کیا جو شریعت اسلامیہ کے خلاف ہو، گو ممکن ہے کہ ان امور کے عملی نفاذ کے وقت صورت حال گاہے بدل گئی ہو۔ نئے ضابطۂ دیوانی (سِول کوڈ)، یعنی مجلّہ [رکّہ بان] کی بنیاد بھی شریعت ہی پر تھی۔ مدحت پاشا کے آئین میں حکومت کا مذہب اسلام ہی قرار دیا گیا تھا اور شیخ الاسلام کو وزیراعظم کے برابر کا مرتبہ دیا گیا تھا، تاہم اس دانشمندانہ مذہبی حکمت عملی کے باوجود کبھی کبھی ایسے مذہبی فساد ہو جایا کرتے تھے جس میں عیسائی نقصان اٹھاتے تھے، چنانچہ ۱۸۵۸ء میں جدّہ اور ۱۸۶۰ء میں دمشق کے فسادات میں یہی ہوا؛ یہ دونوں مقامات خالص ترکی ولایتوں سے باہر تھے۔ عبدالحمید کے عہد میں مذہبی سرگرمیاں عام طور پر ''اتحاد اسلامی'' کے نظریے کے زیر اثر تھیں؛ یہ بات ان کوششوں سے ظاہر ہے جو دنیا کے تمام حصوں کے مسلمانوں سے تعلقات پیدا کرنے کے لیے مختلف طور پر کی گئیں۔ نوجوان ترک بھی عالمی جنگ (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) میں شامل ہوتے وقت جہاد کا اعلان کرنے سے باز نہ رہ سکے۔ حکومت کے اندرونی نظام میں نوجوان ترکوں نے رجالِ دین کے اثر و رسوخ کی صریحاً مخالفت کی: اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء میں انھوں نے کوشش کی کہ تمام مدرسوں کو وزارتِ تعلیماتِ عامّہ کے ماتحت کر دیا جائے۔ اسلامی روایات کے خلاف ایک اور بات جو انھوں نے کی وہ تقویم کی اصلاح تھی۔ ۱۷۸۹ء میں یونانی تقویم یولیانی (Julian) کا رواج مالی ادارے میں سرکاری طور پر ہو گیا، لیکن ایک عجیب و غریب تسویہ و توفیق (compromise) کی بنا پر سنۂ ھجری ('سنۂ مالیّہ') کو بھی بحال رکھا گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں گریگوری تقویم اختیار کی گئی اور جنگ کے بعد آہستہ آہستہ سنۂ میلادی کا رواج عام ہو گیا۔

تنظیمات ھی کی ذیل میں ان قواعد کی رو سے جو ولایات کے لیے وضع کیے گئے فوج کا نظام، داخلی نظامِ حکومت سے علٰحدہ کر دیا گیا۔ اب بھی

مدتِ دراز تک ادارۂ داخلیہ کا کام صرف مالیانے کی وصولی رہا ۔ مالی نظام کو یورپی طرز پر لانے اور اسے مرکزیت دینے میں بڑی مشکل پیش آئی، کیونکہ اس کے ساتھ ھی اھلکاروں کی ایک قابلِ اعتبار جماعت کو اس کام کے لیے تیار کرنا ضروری تھا ۔ کریمیا کی جنگ کے بعد ترکوں نے متعدد غیر ملکی قرضوں کا بندوبست کر لیا، لیکن اس روپے کا نہ تو درست طریق پر انتظام کیا گیا، نہ اسے صحیح مصرف میں استعمال کیا گیا ۔ ۱۸۷۶ء میں سلطنت کو دیوالے کا اعلان کرنا پڑا؛ نتیجہ یہ ہوا کہ اجنبی طاقتوں کو پھر دخل اندازی کا موقع مل گیا اور قرضۂ عامّہ کا ایک نیا محکمہ قائم ہو گیا، جسے تمام ترکی حلقوں میں بے حد ناپسند کیا گیا ۔ مالیات کی بحالی میں سب سے بڑی رکاوٹ امتیازات کے فرسودہ اور پرانے قواعدِ گمرک تھے: گو تین فیصدی کے قدیمی مواجبات کئی کئی بار عائد کیے گئے، مگر معلوم ھوتا ہے کہ انقلاب کے بعد سب سے کٹھن مشکلات رفع ھو چکی تھیں ۔

ینگی چری کے خاتمے کے بعد نئی ترکی فوج کو، جو آھستہ آھستہ جبری بھرتی کے اصول پر تیار کی گئی تھی، کئی دفعہ دادِ شجاعت دینے کا موقع ملا ۔ اس کے ذریعے ترکی روحِ حب الوطنی کی تقویت میں بڑی مدد ملی اور انقلاب کے زمانے میں اس نے کارھائے نمایاں دکھائے ۔ ۱۸۵۶ء کے بعد اصولاً تسلیم کر لیا گیا تھا کہ عیسائی اور یہودی بھی فوج میں بھرتی ھو سکتے ھیں، لیکن عملاً وہ ھمیشہ بدل عسکری (ٹیکس) ادا کر کے اپنی جان چھڑا لیا کرتے تھے ۔ البتہ انقلاب کے بعد یہ صورت پیدا ھو گئی کہ غیر ترک بھی ترکی سپاھی بننے لگے ۔

۹ ۔سلطنت ملّیۂ ترکیہ (از سنہ ۱۹۲۲ء).

نئی ترکی سلطنت کا خمیر اس جذبۂ مخالفت سے تیار ھوا جو ترکوں کے دلوں میں مُدْرُوس کی عارضی صلح کے بعد غیر ملکیوں کے قبضے کی وجہ سے پیدا ھوا تھا ۔ اس مخالفت کی تنظیم ۱۹۱۹ء سے شروع ھوئی اور اس تحریک کا قائد مصطفٰی کمال پاشا تھا، جو پہلے پہل فوج کے انسپکٹر، یعنی مفتش، کی حیثیت سے ایشیاے کوچک میں گیا تھا ۔ اس تنظیم میں پہلا قدم تو یہ اٹھایا گیا کہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو ارض روم کی کانگرس اور پھر ۱۱ ستمبر کو سیواس کی کانگرس کا اجلاس ھوا۔ سیواس کی کانگرس میں "ھیئتِ تمثیلیہ"، یعنی نمائندوں کی ایک مجلس، مصطفٰی کمال کی صدارت میں بنائی گئی ۔ اس مجلس کے سپرد یہ کام ھوا کہ وہ جدید قومی پروگرام کو عملی جامہ پہنائے، چنانچہ ان "قواے ملّیہ" کی امداد کی گئی جو سمرنا پر یونانی قبضے کی مسلّح مخالفت کر رہے تھے، نیز سامسون کے مقام پر انگریزوں کی فوج کو خشکی پر اترنے سے روک دیا گیا اور قسطنطنیہ سے ازنیق پر جو حملہ کیا گیا تھا اسے بھی ناکام بنا دیا گیا ۔ ۱۹۲۰ء میں جب قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ برخاست کر دی گئی، تو اس کے کئی ارکان بھاگ کر ایشیاے کوچک میں چلے آئے جہاں "ھیئتِ تمثیلیہ" نے انقرہ میں ۲۳ اپریل کو "مجلسِ ملّیِ کبیر" کا اجلاس بلایا ۔ اس مجلس نے قانون سازی اور انتظامی امور کے اختیارات سنبھال لیے اور ایک "ھیئت وکیلہ"، یعنی مجلس حاکمہ، کمال پاشا کی صدارت میں قائم کر دی ۔ ۱۹۲۱ء میں یونانی فوجوں سے نبرد آزمائی شروع ھوئی (چنانچہ ۱۱ جنوری اور ۳۱ مارچ کو این اوکو In Önü [سامی : این اوگی] میں لڑائیاں ھوئیں) اور جولائی میں یونانی فوجیں اسکی شہر تک بڑھ آئیں ۔ یہ پیش قدمی ۱۳ ستمبر کو یونانیوں کی شکست پر ختم ھوئی ۔

اس اثناء میں نئی حکومت ملّی نے اتحادیوں کے ساتھ روابط قائم کر لیے اور ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء کے عہد نامے کے مطابق فرانس نے سِلشیا کا علاقہ ترکوں کو واپس کر دیا ۔ چونکہ دیگر گفت و شنید کا کوئی معیّن نتیجہ نہ نکلا، اس لیے حکومت انقرہ نے اگست ۱۹۲۲ء میں یونانی افواج پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دُوملُوبِنکار کے مقام پر فیصلہ کُن فتح حاصل کی ۔ ۹ ستمبر کو سمرنا [اِزْمیر] واپس لے لیا گیا اور کچھ عرصے کے لیے ایسا محسوس ہونے لگا کہ قسطنطنیہ بھی لے لیا جائے گا ۔ مُدانیہ کی عارضی صلح (۱۰ اکتوبر) کی رُو سے قومی حکومت کو تھریس [تراقیہ] اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینے کا حق حاصل ہو گیا، چنانچہ بعد کے چند ھفتوں میں انھوں نے قبضہ کر لیا ۔ جنگ کا خاتمہ ہوا اور بڑی مشکل اور پیچیدہ گفت و شنید کے بعد ۲۳ جولائی ۱۹۲۳ء کو لَوزان کا عہدنامہ طے پایا، جس کے مطابق ترکیۂ جدید اور اتحادیوں کے درمیان امن و صلح کے روابط قائم ہو گئے اور اس ملک کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تسلیم کر لیا گیا ۔ صلح نامے میں ولایت موصل کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا، جس کی واپسی کا ترکوں نے مطالبہ کیا؛ مجلس اقوام (لیگ آو نیشنز) کی سختُ کوششوں کے بعد ترکیہ اور انگلستان میں آخرکار یہ سمجھوتہ ہوا کہ موصل عراق ھی کے قبضے میں رہے (۵ جون ۱۹۲۶ء) ۔ ترکی جدید نے نومبر ۱۹۲۲ء میں روس سے ایک قنصلی معاہدہ کر لیا تھا اور لَوزان کے عہد نامے کے بعد دوسرے ممالک سے بھی یکے بعد دیگرے دوستانہ اور تجارتی تعلقات دوبارہ قائم ہو گئے ۔ ترکوں کی خارجی حکمت عملی میں اس وقت روس اور انگریزوں کے ساتھ تعلقات کو [اور اب امریکہ کے ساتھ تعلقات کو بھی] خاص اہمیّت حاصل ہے ۔

۲۰ اپریل ۱۹۲۴ء کے آئین کے بعد سے ترکی ایک جمہوری سلطنت ہے ۔ غازی کمال پاشا ابتداء ھی سے 'رئیسِ جمہوریت' رہے [ان کے بعد عصمت انونو؛ اور اب جلال بایار صدر ھیں] : قسطنطنیہ اب دارالخلافہ نہیں رہا؛ اس کی جگہ انقرہ نے لے لی ہے، جو جدید ترکی کا دارالھجرۃ ہے ۔ [''ترکیہ بویوک ملّت مجلسی''، یعنی] ملّی مجلسِ عظمٰی نے ۱۹۲۲ء سے اب تک قانون سازی میں خاصی سرگرمی دکھائی ہے، تاکہ ملک نئے حالات کے موافق وتیرہ اختیار کر کے اپنے اداروں کو موجودہ زمانے کے نمونوں کے مطابق چلا سکے ۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں ''خلافت'' توڑ دینے کے بعد مملکت کے نئے حکمرانوں نے دیدہ و دانستہ لوگوں کو عامی اور غیر روحانی طریق زندگی پر لگا دیا ۔ اب نہ کوئی شیخ الاسلام ہے، نہ کوئی وزیرِ اوقاف.

ماہ ستمبر ۱۹۲۵ء میں صوفیوں کے مختلف سلسلوں کے تکیوں کو بند کر دیا گیا اور ان سلسلوں کو بھی حکماً ممنوع قرار دیا گیا ۔ مقبولِ عام مذھبی عقائد کے مظاھر کی مخالفت میں یہ اقدامات کُردوں کی بغاوت کا ردّ عمل تھے، جو ۱۹۲۴ء کے آخر میں شیخ سعید کی سرکردگی میں برپا ہوئی ۔ اسی طرح ستمبر ۱۹۲۵ء میں رومی ٹوپی کا استعمال ممنوع ہوا اور عمامہ پہننے کی اجازت صرف علماء کو ملی ۔ ایک قابلِ ذکر اصلاح یہ ہوئی کہ لاطینی حروف کو سرکاری طور پر رائج کیا گیا اور ۱۹۲۸ء سے عربی رسم‌الخط ترک کر دیا گیا؛ اس اقدام کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ رجالِ دین کے رجحانات کی مخالفت کی جائے ۔ ان اصلاحات اور اسی طرح کے دوسرے اقدامات کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ ترکوں کا معیارِ ثقافت بلند

کیا جائے: ان قوانین کے نفاذ سے ملک کے مختلف حصوں میں پرانی روایات کے حاملین کی طرف سے متواتر مخالفت بھی ہوتی رہی ہے؛ پھر بھی جمہوری حکومت نے جس قومی ترقی کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے، اس کی کامیابی کے امکانات کسی سابقہ زمانے کی بہ نسبت اب کہیں زیادہ ہیں، کیونکہ آبادی کی بہت بڑی اکثریت اب ترک ہے یا مستترک ۔ بلقان کی جنگ کے بعد بہت سے مہاجر ایشیائے کوچک میں آ بسے تھے اور یونانیوں سے آبادی کے مبادلے کی وجہ سے ترکوں کی اکثریت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ۔

۱۹۱۸ء سے تاریخی واقعات کا مکمل اور مفصل مجموعہ G. Jäschke اور E. Pritsch کی کتاب *Geschichts-kalender 'Die Türkei seit dem Weltkriege 1918—1928*، در *Die Welt des Islams*، ج ۱۰، ۱۹۲۷ تا ۱۹۲۹ء میں ملے گا، جس میں جدید ترکی کے متعلقہ مصادر کے بارے میں وسیع اشارات موجود ہیں۔ اس دور پر ایک مستقل تبصرہ '' تورکیہ جمہوریتی '' کے عنوان سے خلیل ادہم نے اپنی کتاب دُوَلِ اسلامیہ ' استانبول ۱۹۲۷ء، ص ۳۳۱ میں کیا ہے ۔

مآخذ: عثمانیوں کی تاریخ کے مصادر میں خود عثمانیوں ہی کا سیاسی تاریخی مواد پہلے درجے پر آتا ہے ۔ اس مواد کے لیے (۱) بابنگر Babinger کی کتاب *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*، لیپزگ ۱۹۲۷ء، کا حوالہ دینا کافی ہوگا۔ اصل دستاویزات کا مطالعہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے: تاریخی دستاویزات مختلف جگہ شائع ہو چکی ہیں، مثلاً (۲) *T. O. E. M.* تاریخ عثمانی انجمنی مجموعہ سی (*T. T. E. M.* ترک تاریخ انجمنی مجموعہ سی) میں اور (۳) احمد رفیق ترکی مؤرخ کی تصانیف میں ۔ *T. O. E. M.* اور دیگر ترکی کتابوں میں چند قانون نامے شائع ہو چکے ہیں ۔ سلطنت عثمانیہ کے عہد ناموں کے متعلق ایک نہایت قیمتی مجموعہ ہے: (۴) جبرائیل افندی نوراد ونغیان Gabriel Effendi Noradounghian: *Recueil d' Actes Internationaux de l'Empire Ottoman*، چار جلد، پیرس ۱۸۹۷ تا ۱۹۰۳ء - کتبوں سے متعلق مآخذ پر اہم مفرد رسالے لکھے جا چکے ہیں، مثلاً (۵) خلیل ادہم کے رسائل: مبارک غالب کی کئی کتابیں، جو نسبةً قریب تر زمانے میں لکھی گئی ہیں ۔ عثمانی سکوں کے متعلق سب سے بڑی کتاب اب تک (۶) اسمعیل غالب کی تصنیف تقویم مسکوکات عثمانیہ، قسطنطنیہ ۱۳۰۷ھ ہی مانی جاتی ہے؛ اس کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں، مثلاً (۷) احمد رفیق: *Othmânlî Imperatorlughunda Meskūkât* (عثمانی امپراطور لغنده مسکوکات)، در *T.T.E.M.*، عدد ۶ و ۷ و ۸ و ۱۰؛ (۸) *British Museum Catal. Oriental Coins*، جلد ۸ ۔

غیر ترکی ادبی مآخذ میں سے جو کتابیں مشرق میں تصنیف ہوئیں انھیں بابنگر نے اپنی تصنیف میں، جو کتب مصادر سے متعلق ہے، جزوی طور پر شامل کر لیا ہے ۔ مغربی مآخذ میں بوزنطی مؤرخ عثمانی سلطنت کی پہلی صدیوں کے سلسلے میں بےحد اہم ہیں (مثلاً فرانتزس Phrantzes، ڈوکاس Ducas، خلکو کونڈیلس Chalcocondyles، کریٹوبولس (Critobulos) - پندرھویں صدی سے (۹) فرستادگان وینس (Venetian bailos) کے بیانات بعنوان *Relazioni* کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جو آلبیری Albéri کی مشہور مطبوعات (فلورنس ۱۸۳۹ تا ۱۸۶۳ء) اور بارزی Barozzi اور برشت Berchet (وینس ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۷ء) میں ملاحظہ کیجیے - ان تصانیف میں بتدریج ان با ضابطہ بیانات کا بھی اضافہ کر لیا گیا تھا جو دوسری حکومتوں کے ان نمائندوں نے ارسال کی تھیں جن کے تعلقات عثمانی باب عالی سے قائم

ہوے تھے - اسی ضمن میں ان بے شمار سیاحت ناموں کے بیانات کو بھی شمار کرنا چاہیے جو مغربی سیاحوں نے سلطنت عثمانیہ کی سیاحت کے بعد لکھے؛ ان کی ابتدا چودھویں صدی سے ہوتی ہے - سیاحت ناموں کے قریب قریب وہ کوائف نامے ہیں جو ترکوں اور سلطنت عثمانیہ کے متعلق لکھے گئے، جن میں سب سے زیادہ مشہور (۱۰) d'Ohsson : *Tableau Général de l'Empire Ottoman*، ج ۱ تا ۳، پیرس ۱۷۸۷ تا ۱۸۲۰ء ہے - اس قسم کی کتابیں پوری انیسویں صدی کے دوران میں (اُبی سِینی Ubicini کی اہم تصانیف) اور بیسویں صدی کے آغاز میں بھی برابر شائع ہوتی رہیں .

ترکان عثمانی کی تاریخ عمومی پر سب سے پہلی عظیم تصنیف فان ہامر کی ہے؛ (۱۱) Joseph von Hammer : *Geschichte des osmanischen Reiches*، جلد ۱ تا ۱۰، پسٹ Pest ۱۸۲۷ تا ۱۸۳۵ء؛ zweite verbesserte Ausgabe، ج ۱ تا ۴، پسٹ ۱۸۳۴ تا ۱۸۳۶ء (فرانسیسی ترجمہ از J. J. Hellert : *Histoire de l'Empire Ottoman*، ج ۱ تا ۹، پیرس ۱۸۳۵ تا ۱۸۴۳ء) - اس تصنیف کا بیشتر حصہ ترکی مآخذ پر مبنی ہے اور یہ کتاب ۱۷۷۴ء کی صُلح کوچُوك قَیْنارجِه پر ختم ہو جاتی ہے؛ دسویں جلد میں ایک مفصل فہرست ان کتابوں کی دی گئی ہے جو عثمانی تاریخ کے متعلق ۱۷۷۴ء تک یورپ میں شائع ہو چکی تھیں - اسی پیمانے کی ایک اور تصنیف بھی ہے، یعنی (۱۲) تِسنکائزن J. W. Zinkeisen : *Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*، جلد ۱ تا ۷ (۱۸۱۲ء تک) ہامبورگ ۱۸۴۰ء اور گوتا ۱۸۵۴ تا ۱۸۶۳ء؛ فان ہامر کی بہ نسبت تسنکائزن مغربی مآخذ زیادہ استعمال کرتا ہے، لیکن اصل ترکی مصادر سے بلا واسطہ استفادہ نہیں کرتا - یہی حالت (۱۳) N. Jorga : *Geschichte des Osmanischen Reiches*، ج ۱ تا ۵ (۱۹۱۲ء تک)، گوتا ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۳ء کی ہے؛ (۱۴) *Histoire de l'Empire Ottoman*، ج ۱ و ۲، پیرس ۱۹۱۴ء، مصنفۂ de la Jonquière، انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے تاریخی واقعات بیان کرتی ہے اور اس لحاظ سے اہم تصنیف ہے - ان متعدد کتابوں میں سے جو عثمانی تاریخ کے کسی خاص دور کا ذکر کرتی ہیں یہ کتاب قابل ذکر ہے ; (۱۵) G. Rosen : *Geschichte der Türkei* (۱۸۲۶ تا ۱۸۵۶ء)، لیپزگ ۱۸۶۶ء.

جنگ عظیم کے بعد ترکی تاریخ کے مطالعے میں دلچسپی بڑھ جانے کے باعث ۱۹۲۲ء میں (۱۶) P. Wittek اور F. von Kraelitz نے ایک سلسلۂ کتب *Mitteilungen zur Osmanischen Geschichte* شائع کرنا شروع کیا؛ لیکن بہت افسوس ہے کہ دو سال کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی .

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد سے تاریخ عثمانیہ کے مطالعے کا شوق خود ترکی میں بہت زیادہ بڑھ رہا ہے - ۱۹۱۰ء سے (۱۸) تاریخ عثمانی انجمنی مجموعہ سی شائع ہو رہی ہے - جنگ کے بعد اس کا نام تبدیل کر کے ترک تاریخ انجمنی مجموعہ سی رکھ دیا گیا ہے - اس کا آخری شمارہ، جو عربی رسم الخط میں طبع ہوا، عدد ۱۹ (۹۶) تھا - اس قیمتی مجموعے میں تاریخی مضامین کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے، لیکن دوسرے مجموعوں میں بھی (مثلاً مجموعۂ کلیۂ آداب اور ترکیات مجموعہ سی کی دو جلدوں، طبع استانبول ۱۹۲۵ و ۱۹۲۸ء میں) تاریخی موضوعوں پر بڑے اہم مقالے موجود ہیں - تاریخ انجمنی کے ذریعے سے بھی اس کے سلسلۂ کلیات میں خاصے بڑے مفرد تاریخی رسالوں کی اشاعت ممکن ہو گئی ہے؛ (۱۹) P. Wittek نے *O.L.Z.* میں اپنے سلسلۂ مضامین میں ترکیہ کی تازہ تاریخی تصانیف پر ایک نہایت مفصل و مکمل تبصرہ کیا ہے، جس کا عنوان ہے : *Neuere wissenschaftliche Literatur in osmanisch-türkischer Sprache* (۱۹۲۸ء سے) - ترکی میں

سلطنت عثمانیہ کی نئی مکمل تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی، گو (۲۰) نجیب عاصم اور محمد عارف کی عثمانلی تاریخی کی پہلی جلد استانبول میں ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۷ء میں چھپ چکی ہے۔

(کرامرز J. H. KRAMERS)

[دورِ حاضر میں سلطنتِ ترکیہ خود مختار جمہوریہ ہے، جو دو حصوں میں منقسم ہے: قسمتِ یورپی (تراقیہ) اور قسمتِ ایشیائی (اناضولو)۔ صدر مقام انقرہ ہے۔ ۱۹۲۵ء میں اور اس کے بعد جو اہم وقائع ظہور پذیر ہوے ان کے سنین درج ذیل ہیں:—

۱۹۲۵ء میں روس کے ساتھ غیر جانب داری، عدم جارحیت اور بین الاقوامی تعاون کا معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں دس سال کے لیے اس کی توسیع ہوئی اور روس نے ۱۹۴۵ء میں اسے منسوخ کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں نیا ضابطۂ دیوانی منظور کیا گیا، جو تمام تر سوستانی (Swiss) ضابطے پر مبنی ہے، یعنی قانونِ ملک کی مکمل تجدید کر دی گئی۔ ۱۹۳۰ء میں یونان سے معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں جزیرہ نماے بلقان کے تمام ممالک کی دوسری کانفرنس استانبول میں منعقد ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں ترکیہ مجلس اقوام (لیگ آو نیشنز) کا رکن بنا۔ ۱۹۳۳ء میں صنعتی ترقی کا ایک پنج سالہ منصوبہ مرتب ہوا اور وزیر اعظم عصمت انونو کی زیر سرکردگی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے ایک جامع پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جانے لگا۔

۱۹۳۴ء میں رومانیہ، یوگوسلاویہ اور ترکیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا۔ اس سال ہر کنبے کے لیے قانوناً لازم ہوا کہ اپنا خانوادگی نام معین کرے۔ اسی سال کے آخر میں ہر ترکی مرد و زن کو، جو ۲۳ سال کی عمر کا ہو، مجالس قانون کے لیے حقِ انتخاب دیا گیا۔

۱۹۳۷ء میں سعدآباد کے مقام پر عراق، ایران اور افغانستان کے ساتھ باہمی دوستی کے معاہدے پر دستخط ہوے۔ اسی سال عصمت انونو پندرہ سال وزیر اعظم رہنے کے بعد مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ جلال بایار مقرر ہوے۔

۱۹۳۸ء میں کمال اتاترک نے کئی ماہ کی علالت کے بعد ۱۰ نومبر کو اٹھاون برس کی عمر میں وفات پائی۔ عصمت انونو ان کے جانشین منتخب ہوے اور انھوں نے ترقی پسندانہ داخلی حکمت عملی اور امن پسندانہ خارجی حکمت عملی کو جاری رکھا۔

۱۹۳۹ء میں ترکیہ نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ کیا (اس کی رُو سے فرانس نے اسکندرونہ کا علاقہ ترکیہ کو واپس کر دیا) اور ترکیہ کو روس اور مغربی یورپ کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ماہ اگست میں روس اور جرمنی کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا اور ستمبر میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔

ایک طویل عرصے تک ترکیہ نے بڑی کامیابی سے اپنی غیر جانب داری قائم رکھی اور فریقینِ جنگ سے علٰحدہ علٰحدہ تجارتی معاہدوں کے ذریعے اپنی اقتصادی حالت مضبوط کی۔

۱۹۴۳ء میں نئی قومی اسمبلی کے انتخاب میں عصمت انونو مزید چار سال کے لیے صدر منتخب ہوے۔ سابقہ وزیرِ خارجہ سراج اوغلی وزیر اعظم بنے۔ انونو نے چرچل اور روزویلٹ سے ملاقات کی اور اعلان کیا کہ ترکی ایک ایسے عالمگیر نظام کا حامی ہے جس میں دنیا کی تمام چھوٹی بڑی قومیں پورے خلوص سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر سکیں۔

۱۹۴۴ء میں ترکیہ نے جرمنی سے اپنے

تعلقات منقطع کر لیے اور اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہو گیا ۔ جنگ کے خاتمے پر ترکیه اقوام متحده کا رکن بنا.

۱۹۴۷ء میں ریاستہاے متحدۂ امریکه نے ترکیه کو مالی امداد دینے کا معاهده کیا.

۱۹۵۰ء کے نئے انتخابات میں عصمت انونو کی جگه جلال بایار صدر منتخب هوے۔ ۱۹۵۲ء میں ترکیه تنظیم میثاق شمالی بحر اوقیانوس (NATO) میں شریک هوا.

۱۹۵۴ء میں یونان اور یوگوسلاویه سے بیس سال کے لیے اتحاد باهمی، سیاسی تعاون اور امداد باهمی کا معاهده طے پایا ۔ اسی سال پاکستان سے بھی تعاون اور دفاع کا معاهده هوا.

۱۹۵۵ء میں بغداد میں عراق سے تعاون اور دفاع کا معاهده هوا، جس میں برطانیه، پاکستان اور ایران بھی شریک هو گئے ۔ یه معاهده 'بغداد پیکٹ' کے نام سے مشهور هوا، جس کا نام انقلاب عراق (۱۹۵۸ء) کے بعد تنظیم میثاق مرکزی (CENTO) کر دیا گیا ۔ اس کا صدر دفتر انقره میں هے.

عام حالات: جمهوریۂ ترکیه کا رقبه ۷,۶۷,۱۱۹ کیلومیٹر اور آبادی ۱۹۵۰ء کی مردم شماری کی رو سے ۱,۹۳,۳۸,۲۶۹ هے، جس میں تقریباً ننانوے فیصد مسلمان هیں۔ ۱۹۲۸ء میں دستور اساسی میں ایک ترمیم منظور هوئی، جس کی رو سے جمهوریه کا مذهب اب قانوناً اسلام نہیں رها ۔ ابتدائی تعلیم جبری اور مفت هے ۔ ۵۶.۴ فی صد باشندے نوشت و خواند کر سکتے هیں ۔ مدارس سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے هیں ۔ غیر سرکاری مدارس پر وزارت تعلیم کی نگرانی هے ۔ تعلیم المعلّمین کی درس گاهیں موجود هیں ۔ فنّی تعلیم کے لیے بھی طبقۂ اعلٰی کے کچھ مدارس هیں ۔ استانبول میں دو یونیورسٹیاں هیں اور انقره اور ازمیر میں ایک ایک۔ مشرقی صوبجات اور طرابزون میں بھی یونیورسٹیاں کھل رهی هیں.

مآخذ: دور حاضر کے بارے میں معلومات کے لیے رک به مآخذ مندرجه (۱) *Encyclopaedia Britanica*، ۱۹۵۰ء، ۲۲: ۶۱۱ تا ۶۱۶؛ (۲) *The Statesman's Year Book*، ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۲۸ تا ۱۴۴۰ــ اداره].

تُرْکِسْتان: (یا تُرْکِسْتان) فارسی لفظ هے، جس کے معنی هیں "ترکوں کا ملک"۔ اهل ایران کے لیے لا محاله ترکستان کی صرف جنوبی سرحد، جو ایران کی سرحد کے مقابل میں تھی، اهمیت رکھتی تھی اور اس سرحد کی جاے وقوع طبعاً سیاسی حالات پر موقوف تھی ۔ چھٹی صدی میلادی میں جب ترک قوم کے لوگ وسط ایشیا میں پہلے هی پہل نمودار هوے تو آمو دریا [رک بآن] تک آ پہنچے؛ اس لیے ساسانی بادشاهوں کے عهد میں ترکوں کی سرحد آمو دریا کے متصل شمال هی سے شروع هو جاتی تھی ۔ جو حکایت طبری (۱: ۴۳۵ ببعد) میں بیان هوئی هے، اس کی رو سے ایرش نے ایک تیر پھینک کر ترکوں اور "عمل الفُرس" (ایرانیوں کی عمل داری) کے درمیان سرحد کی تعیین کر دی جس کی وجه سے آمو دریا ["نهر بلخ"] سرحد قرار پایا ۔ بقول سبیوس Sebēos ارمنی (ساتویں صدی میلادی) دریاے وِهروٹ Vehrot، یعنی آمو دریا کا منبع بلادِ ترکستان میں هے (*Histoire d'Héraclius par l'évèque Sebèos*، مترجمۂ Fr. Macler، پیرس ۱۹۰۴ء، ص ۴۹؛ مارکار Marquart: *Erānšahr*، ص ۴۸) ۔ اسی تصنیف میں ایک اور جگه (ص ۴۳، مارکار، ص ۴۷) T'urk'astan کا ذکر دِلھستان، یعنی دِهستان (در نواح بحیرۂ خزر، شمالِ رود آترِک [رک بآن]) کے ساتھ کیا هے.

عربوں نے اپنی فتوحات سے ترکوں کو شمال کی طرف بہت دور تک دھکیل دیا تھا، چنانچہ تیسری صدی ھجری / نویں صدی میلادی اور چوتھی صدی ھجری / دسویں صدی میلادی کے جغرافیہ دانوں کے نزدیک ترکوں کی سرحد آمو دریا کے متصل شمال سے شروع نہیں ہوتی تھی، بلکہ عربی ثقافت کے اس علاقے کے شمال سے جسے ماوراء النہر [رک بآن] کہتے ہیں۔ ترکستان، یعنی بلاد اتراك، اس وقت ان علاقوں کا نام تھا جو ماوراءالنہر کے شمال اور مشرق میں تھے، چنانچہ ''ترکستان کی سرحد'' فرغانہ [رک بآن] کے شہر کاسان سے ''شروع ہوتی تھی''، جو سیر دریا [رک بآن] کے شمال میں واقع ہے (یاقوت، ۳: ۲۲۷ [میں ہے: فی اوّل بلاد ترکستان وراء نہر سیحون])۔ جَند اور شہر کَنْد کے شہر، جو اسی دریا کے زیریں حصے پر آباد تھے، ترکستان میں تھے (کتاب مذکور، ۲: ۱۲۷؛ ۳: ۴۴۳)؛ شہر ختن بھی ترکستان ہی میں واقع تھا (کتاب مذکور، ۲: ۴۰۳)۔ کلمۂ ترکستان کا اطلاق اس طرح پر ہوتے دیکھ کر بعض مصنفین (بالخصوص ھارٹمان نے، ملاحظہ ہو اس کی کتاب *Chinesich-Turkestan* Halle، ۱۹۰۸ء، ص ۱) نے یہ نتیجہ نکالا کہ سب سے پہلے اینشیا کے روسی فاتحین ھی نے ماوراء النہر کو بھی خواہ مخواہ ترکستان میں شامل کر لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کی فتوحات کے باعث کلمۂ ترکستان بہت مدت پہلے، اپنا قدیم مدلول دوبارہ حاصل کر چکا تھا، گو اس کا اطلاق شاید اتنا کتابوں میں نہ ھوتا تھا جتنا روزمرہ کے استعمال میں۔ ایران اور افغانستان کے لیے ''ترک اھالی ترکستان'' شمال میں ان کے قریبی ھمسایے تھے، چنانچہ ایک لوری میں، جو ۱۸۸۶ء میں شیراز میں املا ھوئی، یہ ذکر ہے کہ ''دو ترك ترکستان سے آئے اور مجھے ھندوستان لے آئے'' (V. Žukovskiy: *Obrazcî persidskago narodnago tvorčestva*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۲ء، ص ۱۶۹ ببعد)۔ سولھویں صدی میں اُزبکوں کی فتوحات سے آمو دریا کے جنوب میں ایک اَور ترکستان پیدا ھو گیا اور افغانستان کی متعلقہ ولایت کا نام اب تک بھی ترکستان ھی ہے۔ بعض سیاح (R. Burslem: '*A Peep in Toorkistan*، لندن ۱۸۴۶ء، ص ۵۷ ببعد) درۂ آق رباط کو، جو بامیان [رک بآن] کے شمال میں ہے، اس ترکستان کی جنوبی سرحد قرار دیتے ھیں اور دوسرے سیاح (J. Wood: *A Journey to the Source of the River Oxus*، طبع جدید، لندن ۱۸۷۲ء، ص ۱۳۰) درۂ حاجی کک کو اس کی سرحد بتاتے ھیں جو ذرا اَور جنوب کی طرف ہے اور جہاں دریاے ھلمند [رک بآن] اور آمو دریا کے طاسوں کا فاصل آب واقع ہے۔ پھر اَور مغرب کی جانب مُرغاب اور آب میمنہ کے درمیانی علاقے میں ترکستان کی حد سلسلۂ کوہ بند ترکستان (یا تیربند ترکستان) ہے۔ انیسویں صدی میں ترکستان کا نام علمی اصطلاح کے طور پر روسیوں نے نہیں بلکہ انگریزوں نے رائج کیا تھا۔ غالباً ایرانیوں اور افغانوں کے ھاں اس کلمے کا جو مدلول تھا اس سے اثر پذیر ھو کر انھوں نے ایسا کیا ھوگا.

ادبی کتابوں، بالخصوص سیاحت ناموں، میں روسی، چینی اور افغانی ترکستان میں عام طور پر تمیز روا رکھی گئی ہے۔ اگرچہ اداری لحاظ سے ترکستان (یا ترکِستان) کی اصطلاح صرف روس اور افغانستان ھی میں مستعمل ہے، تاھم بعض اوقات ھمیں ان کے بجاے مغربی اور مشرق ترکستان کی اصطلاحیں بھی ملتی ھیں۔ روسیوں نے ۱۸۶۷ء میں ترکستان میں گورنر جنرل کا عہدہ قائم

کیا اور تاشقند [رَكَ بآن] کو گورنر جنرل کا صدر مقام بنایا ۔ گورنر جنرل کے اس صوبے کی سرحدیں کبھی تنگ ہو جایا کرتی تھیں اور کبھی وسیع ۔ ۱۸۸۲ سے ۱۸۹۸ء تک صوبۂ سمِرِیچیہ، جو ایک زمانے میں ترکستان میں شامل تھا، بے درخت میدانوں (Steppes) کے گورنر جنرل کے ماتحت رہا اور اس کا صدر مقام اومسْک Omsk تھا ۔ ۱۸۹۸ء میں سمریچیہ اور ماوراے خزر ترکْمَنیہ Turcomania کے صوبے ترکستان میں شامل کر دیے گئے۔

۱۸۸۶ء میں پروفیسر مُشکِتوف I. Mushketow نے ترکستان کے نام کو (اداری اعتبارات سے قطع نظر کر کے) معیّن جغرافیائی مدلول دینے کی کوشش کی ۔ A. Petzhold کی کتاب *Umschau im Russischen Turkestan nebst einer allgemeinen Schilderung des Turkestanischen Beckens*، لیپزگ ۱۸۷۷ء کے تتبع میں اس نے ترکستان یا طاسِ ترکستان کا نام اس علاقے کے لیے تجویز کیا جو وسط ایشیا کے وسطی پہاڑوں اور طاسِ بحیرۂ خزر، سطح مرتفع ایران اور برفانی سمندر کے درمیان واقع ہے؛ مُشکِتوف کو اس امر کے متعلق کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ سلطنت روس اور قلمروِ انگلستان کی سرحدیں مستقبل قریب میں کوہ ہندوکش [رَكَ بآن] پر قائم ہوں گی ۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ ”چینی ترکستان“ کا نام چینی ’ہان ھای‘ Han-hai رکھا جائے (یہ کلمہ Richthofen اور بعد کے یورپی علماء کے نزدیک ”بحرِ خشک“ کے معنوں میں ہے) ۔ مُشکِتوف صرف جغرافیائی حقائق اور مفروضوں سے بحث کرتا ہے؛ اسے لفظوں کے اشتقاق اور ان کے معانی یا نسلی ملحوظات سے کوئی سر و کار نہیں ۔

سوویتی روس میں ترکستان کے لفظ کا استعمال زیادہ‌تر علم اقوام کی بنا پر بتدریج متروک ہو گیا ہے ۔ انقلاب کے بعد ”جمہوریۂ ترکستان“ چند سال تک قائم رہی؛ پرانا صدر مقام، تاشقند، اس جمہوریہ کا بھی صدر مقام تھا ۔ پہلے زمانے کے گورنر جنرل کی عملداری کے مقابلے میں اس جمہوریہ کا رقبہ بہت چھوٹا تھا؛ شمال کے منفرد اجزاء جمہوریۂ قیرغیز [قبّ قیرغیز] کے ساتھ شامل کر دیے گئے تھے ۔ جب ۱۹۲۴ء میں قومیت کا اصول آخری طور پر نافذ کیا گیا تو ملک کا مشہور نام متروک ہو گیا اور وہ نام استعمال میں آئے جو قوموں کے نام سے ماخوذ تھے؛ مثلاً اوازبکستان، ترکمینستان اور تاجکستان ۔ صرف چند (بیشتر اقتصادی) مسائل، جن کا تعلق ان تمام ممالک سے ہے، اس وقت بھی تاشقند میں طے پاتے ھیں، لیکن اس صورت میں ترکستان کے لفظ کی جگہ ”وسط ایشیا“ (سِرِدْنیایا آزیا Srednyaya Aziya) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

اوازبکوں کے عہد میں سیر دریا کے وسطی حصے پر ایک شہر ترکستان کے نام سے آباد تھا ۔ عرب جغرافیہ دانوں کے بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی میلادی میں شہر شاوغر (لیسٹرینج: *Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۸۵: Shâvaghar [شاوَغر]) ضرور وهیں آباد ہوگا؛ بدقسمتی سے اس کے آثار مطلقاً نہیں ملے ۔ چودھویں صدی میلادی اور غالباً اس سے بہت پہلے بارھویں صدی میلادی میں شہر ’ترکستان‘ کو یَسی کہتے تھے اور بہت بعد کے زمانے تک، یعنی تیمور کی تاریخ (ظفرنامہ [طبع کلکتہ]، ۲ : ۹) میں بھی، اس کا ذکر ملتا ہے؛ وهاں اسے قریہ لکھا ہے ۔ اس شہر کی اهمّیت ولی [اللہ] احمد یسوی [رَكَ بآن] کے طریقۂ یسویہ کی وجہ سے بڑھ گئی — مغلوں کے عہد میں

پہلے پہل اس طریقے کا ظہور ہوا — ان [بزرگ] کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آپ ہی کی وجہ سے ترکوں نے اسلام قبول کیا (آپ کے زمانے کے متعلق دیکھیے بارتولڈ : *Der Islam*، ۱۴ : ۱۱۲) - اس شہر کی اہمیت خاص طور پر اور بھی بڑھ گئی جب تیمور نے [۱۳۹۷ء میں] وہاں آپ کا عالی شان مقبرہ تعمیر کرا دیا ۔ آپ کو بلادِ اتراک کا پیرِ پشتی بان سمجھا جاتا تھا اور آپ ''حضرتِ ترکستان'' کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے؛ غالباً یہی لقب شہر کے نئے تسمیہ کی وجہ ہے - روسی فتوحات کے زمانے میں شہر کا محیط دو میل کے قریب تھا اور آبادی تقریباً پانچ ہزار، مگر ۱۹۰۸ء میں آبادی پندرہ ہزار [اور قریب کے زمانے میں تقریباً تیس ہزار تک پہنچ گئی ہے؛ اب یہ شہر اورن برگ-تاشقند ریلوے پر واقع ہے]۔

مآخذ: متن کے حوالوں کے علاوہ (۱) Mushketow : *Turkestan*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۶ء، طبع دوم ۱۹۱۰ء؛ (۲) بارتولڈ W. Barthold: *Stand und Aufgaben der Geschichtsforschung in Turkestan* (*Die Geisteswissenschaften*، ج ۱، ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴ء، ص ۱۰۵۷ بعد)؛ (۳) مصنف مذکور: *Turkestan down to the Mongol Invasion*، ۱۹۲۸ء (G.M.S.)، سلسلۂ جدید، عدد ۷)؛ (۴) مصنف مذکور : *Istoriya kulturnoi žizni Turkestana*، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء؛ (۵) W. Masalskij : *Turkestanskij krai*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۳ء، ص ۶۰۰ بعد؛ (۶) A. Dobrosmîslow : *Goroda Sîr-Dar'inskoi oblasti*، تاشکنت ۱۹۱۲ء — مقبرے کے متعلق دیکھیے خصوصاً (۷) M. Masson، در *Izv. Sredne Az. Geograf Obshč.*، ۱۹ (۱۹۲۹ء) : ۳۹ بعد.

(بارتولڈ W. BARTHOLD)

ترکمان: وسطِ ایشیا کی ایک ترکی قوم ہے ۔ یہ نام پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی میلادی سے مستعمل ہے ۔ ابتداءً ایرانی مؤرخین نے اسے بصیغۂ جمعِ فارسی، یعنی ترکمانان کی صورت میں، استعمال کیا، مثلاً گردیزی [رَكَ بآن] (اب قبّ نیز طبع محمد ناظم، *E. G. Browne Mem.*، ج ۱، برلن ۱۹۲۸ء) اور ابوالفضل بیہقی [رَكَ بآن] نے؛ ان کے ہاں یہ ترکی لفظ اوغوز اور عربی غُزّ [رَكَ بآن] کا مرادف ہے ۔ اوغوز قبائل لاکلام مغولستان (منگولیا) کے باشندے تھے۔ جہاں اورخونی کتبوں میں ان کا ذکر آٹھویں صدی تک کے قدیم زمانے میں ملتا ہے ۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ اوغوز محض ترك ہی کہلاتے تھے نہ کہ ترکمان؛ ترکمانوں کا ذکر صرف مغربی علاقوں میں آیا ہے، سب سے پہلے ان کا ذکر آٹھویں صدی میلادی کی چینی دائرۃالمعارف تُوُنگ - تِئین T'ung-tién، باب ۱۹۳ میں آیا ہے (کلمہ کی مکتوبی صورت تو- کُو- موانگ Tö-kü-Möng) (دیکھیے F. Hirth در *Akad.*، *S. B. Bayr*، ج ۲، ۱۸۹۹ء : ص ۲۶۳ بعد) - تُوُنگ - تِئین کے بیان کے مطابق تو- کُو- موانگ سر زمینِ سُک - تک Suk-tak، یعنی اللّان کے ملک، کا دوسرا نام تھا (دیکھیے اللّان و سُغداق) - یہ علاقہ سنۂ میلادی کی ابتداء میں مشرقی سمت میں سیر دریا [رَكَ بآن] کی زیرین گذرگاہ تک پھیلا ہوا تھا، جو چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی میلادی میں اوغوز کا سب سے بڑا مرکز تھا ۔

جغرافیے کی عربی کتابوں میں ترکمانوں (التّرکمان یا الترکمانیون) کا ذکر صرف المَقدسی (یا المَقدِسی، *B.G.A.*، ۳ : ۲۷۴ بعد) کے ہاں ملتا ہے - اس نے ان کا ذکر اس جگہ کیا ہے جہاں اس نے اَسبیجاب یا سَیرام کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے متعدد شہروں کا حال بیان کیا ہے، مگر ان مقاموں کا محلِّ وقوع صحیح طور پر معیّن نہیں کیا جا سکتا ۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی

میلادی تک لفظ ترکمان کی اصلیت فراموش ہو چکی تھی - عوامی (فارسی) اشتقاق "تُرک مانَند"، یعنی ترکوں کی مثل، اتنا قدیم ہے کہ محمود کاشغری (۳ : ۳۰۷) کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ کاشغری کے زمانے کے بعد سے ان دو اصطلاحوں "ترک" اور "ترکمان" میں بسا اوقات باہمی تضاد پایا جاتا ہے - مغرب کی طرف ہجرت کر جانے سے ترکمانوں کی زبان اور خصوصاً ان کے خط و خال اس حد تک متأثر و متغیر ہوے کہ ان کے اور دیگر ترکوں کے درمیان صرف ایک ہلکی سی "مانندگی" باقی رہ گئی - جو ترکمان آج کل وسطی ایشیا میں رہتے ہیں انہیں پہچاننا خاص طور پر آسان ہے، کیونکہ ان کے سر لمبوترے ہوتے ہیں (dolichocephalic = بیضوی کھوپری کا) - کھوپری کی یہ شکل ایک حد تک گہوارے ہی میں مصنوعی تصرف سے بنائی جاتی ہے، لیکن اس کی ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ ترکمانوں کا وسطی ایشیا کے ایرانی خانہ بدوشوں سے نسلی اختلاط ہوا ہے - محمود کاشغری نے (۱ : ۸۰ اور ۳۹۳) قارلوق [رکّ بآن] کو ترکمان بھی کہا ہے اور اوغوز بھی۔

مغربی ایشیا میں ترکمانوں کا بڑے وسیع پیمانے پر منتشر ہونا نتیجہ تھا پانچویں ہجری/ گیارھویں صدی میلادی کے سیاسی حوادث کا؛ تفصیل کے لیے دیکھیے مادّہ‌های غُزّ و سلجوق - سلجوق خاندان کی سیاسی اہمیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ازمنۂ وسطٰی کی دیگر تمام ترک اقوام کے مقابلے میں ہمارے پاس خود ان کی اپنی قوم، یعنی ترکمانوں کے بارے میں زیادہ مفصل معلومات موجود ہیں، مثلاً رشیدالدین نے "غُزّ قبائل" کے انفرادی نام دیے ہیں (متن *Trudî Vost. Otd. Arkh Obshč*، ۷ : ۳۲ ببعد) - لسانی اعتبار سے ان ناموں کا قدیم املاء (مثلاً سَلور کے بجاے سَلغُر اور یَزِیر کے بجاے یزغیر) ہمیں محمود کاشغری (۱ : ۵۶ ببعد) کے ہاں ملتا ہے - رشیدالدین کے ذکر کردہ چوبیس ناموں میں سے اکیس نام محمود کاشغری کی فہرست کے مطابق ہیں - تین ناموں میں رشیدالدین منفرد ہے (یعنی یَیِرلی Yayîrli، قریق Ḳarîk اور قرقین Ḳarkîn) اور ایک نام جُرقلوغ یا چُرقلوغ صرف محمود کے ہاں ملتا ہے - رشیدالدین کے قول کے مطابق قبایل کی مجموعی تعداد چوبیس تھی (یہی تعداد بہت سی ترکی اور ترکمانی اساطیر میں بھی ہے) - محمود کا قول ہے کہ تعداد بائیس ہے، لیکن اسے اس بات کا علم ہے کہ اصل تعداد چوبیس تھی (۳ : ۳۰۷)؛ دو قبیلوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عہد اسلامی سے پہلے باقی قبائل سے الگ ہو گئے تھے اور انہیں سے خَلَج [رکّ بآن] کی قوم بنی تھی۔

مغول (منگولوں) کے عہد تک "اوغوز" نام کے بجاے "ترکمان" کا رواج نہیں ہوا تھا، چنانچہ چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی میلادی میں لفظ غُز سرکاری دستاویزوں تک میں پایا جاتا ہے (متن در بارتولڈ : *Turkestan*، ۱ : ۲۸ ببعد) - الگ الگ قبیلوں کی جاے سکونت کے متعلق نہ تو رشیدالدین نے کچھ کہا ہے، نہ محمود کاشغری نے - تاریخی حوالہ‌جات میں (مثلاً *Zap.*، ۹ : ۳۰۳؛ نسوی، طبع Houdas، ص ۳۹؛ *G.M.S.*، ۱۶ : ۱۲۰ اور ۱۲۲، جہاں 'یاق' کے بجاے 'تاق' پڑھنا چاہیے) یازُغیر Yazghîr یا یازیر Yazîr سب سے قدیم قبیلہ ہے (اواخر صدۂ ششم ہجری/اواخر صدۂ دوازدھم میلادی اور آغاز صدۂ ہفتم ہجری/آغاز صدۂ سیزدھم میلادی) جس کا کسی خاص علاقے سے تعلق ہے، یعنی بلخان [رکّ بآن] کے مشرقی جانب سے؛

قلعۂ تاق یہیں تھا جہاں بعد میں شہر دُرُون آباد ہوا، جس کے کھنڈر بُوهاردن کے ریلوے سٹیشن کے قریب پائے جاتے ہیں ۔ بقول حمداللہ قزوینی (G.M.S.، عدد سلسلہ ۲۳، ج ۱ : ص ۱۰۹ فوق ، نیز اس کے ترجمے، ۲ : ۱۰۰، میں اسے غلطی سے 'بازر' لکھا گیا ہے) اس ولایت میں غلّہ بکثرت ہوتا تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلۂ بازیر نے کاشتکاری اختیار کر لی تھی۔ بعد کے زمانے میں بھی بازیر لوگ قرہ تاشلی یا قرہ داشلی کہلائے؛ لیکن اٹھارھویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں ان لوگوں کو تِکّہ tekke قبیلے نے آخال Ākhāl (دیکھیے آخال تِکّہ) سے نکال دیا تھا.

جن ترکمانوں نے مغربی ایشیا کی طرف هجرت کی ان میں ترکمان کے نسلی نام کا استعمال بتدریج متروک ہو گیا ۔ صرف چند اضلاع ہیں جہاں وہ ابھی باقی ہے، چنانچہ ابن بطوطہ [رک بآن] (Voyages، ۲ : ۳۲۱) عثمانیوں کو بھی ترکمان ہی کہتا ہے ۔ نویں صدی هجری/ پندرھویں صدی میلادی میں خلیل الظاهری نے (G.A.L.، ۲ : ۱۳۵) ان ترکمانی قبائل کی فہرست دی ہے جو مملوکوں [رک بہ مملوك] کی سلطنت میں غزّہ [رک بآن] سے لے کر دیار بکر [رک بآن] تک آباد تھے (P.E.L.O.V.، ج ۷ : بذیل کلمہ، ۱۶ : ۱۰۵)۔ خلیل الظاهری کے ذکر کردہ قبائل میں سے صرف ایک قبیلہ دُلغادر ہے (دیکھیے ذُوالقدر) جس نے کچھ سیاسی اهمیت حاصل کی، ورنہ مغربی ایشیا میں حقیقی اهمیت رکھنے والی ترکمان ریاستیں صرف قرہ قُویُونلو [رک بآن] اور آق قُویُونلو [رک بآن] خاندانوں کی تھیں ۔ ترکمانی قالین، جو آج تک مشہور ہیں، ان کا ذکر سب سے پہلے مغرب میں ہوا (ابوالفداء، طبع Reinaud ، ص ۳۷۹، بحوالۂ ابن سعید)۔ یہ قالین عورتیں، بالعموم لڑکیاں، بناتی تھیں .

ترکمان وسط ایشیا کے ان چند ترکی الاصل قبائل میں سے ہیں جنھوں نے مغول (منگولوں) کے عہد کے بعد بھی اپنا قدیم نسلی نام برقرار رکھا، لیکن ان کے قدیم قبائلی ناموں میں سے بہت کم نام باقی رہ گئے ہیں۔ جو قبائل آج کل اهم ترین اور عظیم ترین سمجھے جاتے ہیں (یعنی تِکّہ، گوکلن، یوموت، ارساری، سَریق وغیرہ)، ان کے ناموں کا ذکر عہدِ مغول سے پہلے نہیں ملتا ۔ دوسری خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش قوموں کی طرح افراد کی ذاتی اور شخصی کوششوں سے نئی نئی جماعتوں کی تشکیل ہوتی گئی، چنانچہ طائفۂ سَریق اپنے ایک قائد کے نام پر اپنے آپ کو اب تک بھی تیرچ کہتا ہے ۔ قائد مذکور ۱۶۰۱ء ([طاوشان ییلی] خرگوش کے سال) میں مارا گیا تھا (ابوالغازی، طبع Desmaisons، ص ۳۲۴ ببعد)۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں ترکمانوں کو جو واقعات پیش آئے ان سے متعلق سب سے زیادہ معلومات ابوالغازی [رک بآن] نے اپنی بڑی تصنیف میں، نیز تاریخ ترکمانان، یعنی شجرۂ تراکمہ میں (جس کا ذکر دائرۃ المعارف میں نہیں آیا) دی ہیں ۔ یہ کتاب ابھی تک صرف روسی ترجمے (طبع عشق آباد Ashkhabad ۱۸۹۷ء) کی شکل میں دستیاب ہو سکتی ہے.

چونکہ ترکمان اپنی الگ حکومت قائم نہیں کر سکے، اس لیے وہ مختلف حکومتوں (یعنی ایران، خوارزم، بخارا نیز اٹھارھویں صدی میں افغانستان) کے علاقوں میں آباد ہوگئے اور حق بات یہ ہے کہ ان حکومتوں کے مقابلے میں وہ عملی طور پر اپنی آزادی قائم رکھنے میں بالعموم کامیاب رہے ۔ اکثر اوقات ایسا ہوا کہ ان کے خلاف جو فوجیں بھیجی گئیں انھیں ترکمانوں نے بری طرح شکستیں

دیں - یہ بھی ہوا کہ ان کے علحدہ علحدہ قبیلے آپس میں بھی اکثر ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرتے رہے - انیسویں صدی میں قبیلۂ تکّہ نے دوسرے ترکمانی قبائل پر فتحیاب ہو کر نام پیدا کیا - صرف شعر و شاعری ہی اپنی چیز تھی جو ترکمانوں کو اپنی قومی وحدت کا احساس دلاتی رہی، چنانچہ تمام قبائل مخدوم قُلی کو، جو قبیلۂ گوکلین سے تھا، اپنا مشترک قومی شاعر تسلیم کرتے تھے - اُس کا زمانہ اٹھارھویں صدی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا نصف اول تھا (اس کا باپ دولت محمد (‘دولت مَند’) بھی ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ - ۱۷۵۴ء میں شعر کہتا تھا) (*Zap.*، ۱۷ : ۱۳۶) - سترھویں صدی کے اواخر میں ترکمانوں کی ایک جماعت مَنگیشلاک [رک بآن] سے ھجرت کر گئی اور بحرِ خزر سے شمال کی جانب بڑھ کر روسی علاقے میں داخل ھو گئی، جہاں وہ رودِ کورنہ Kurna اور رودِ مَنیچ کے طاس میں ابھی تک آباد ہے - ۱۹۱۲ء میں ان ترکمانوں کی تعداد ۱۰,۵۳۴ تھی، یعنی ۱۹۰۶ء کی آبادی (۱۰,۹۹۰) سے کم - یہ ترکمان اگرچہ اپنے ہم قوموں سے قطعی طور پر جدا ہو چکے تھے، لیکن مخدوم قُلی کو وہ اب بھی اپنا قومی شاعر تصور کرتے تھے۔

وسط ایشیا میں روسیوں کی فتوحات خصوصاً کراسْنووودْسْک Krasnowodsk کی فتح (۱۸۶۹ء) اور خیوا کے خلاف مہم (۱۸۷۳ء) کے بعد ان کے لیے ترکمانوں کو زیر کرنا ناگزیر ہو گیا، چنانچہ ۱۸۸۱ء میں جب روسیوں نے گوک تپہ [رک بآن] پر ہلّہ بول دیا اور مَرو نے بھی ۱۸۸۴ء میں "رضاکارانہ" ہتھیار ڈالدیے اور ۱۸۸۵ء میں ان تمام علاقوں نے جو اس کے جنوب میں واقع ہیں از خود اطاعت قبول کر لی تو ان مراحل سے ترکمانوں کی تسخیر پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی - سنین مابعد میں، سرحدوں کی تعیین کے لیے جو معاھدے ہوے، ان کے ذریعے سے روس، ایران اور افغانستان کے مابین ترکمانوں کے علاقوں کی موجودہ تقسیم طے ہوئی - ابتداء میں روسی ترکمنیہ کا انتظام ایک علحدہ (ماوراے بحر خزر) ضلع کی حیثیت سے تھا، لیکن ۱۸۹۸ء میں اسے ترکستان کے گورنر جنرل کے زیر نگین علاقے میں شامل کر دیا گیا - انقلاب کے بعد جب مختلف قومیتوں کا مسئلہ فیصل ہوا، تو ۱۹۲۴ء میں ترکمنیہ کی تنظیم بھی سوویتی اشتراکی جمہوریت (Socialist Soviet Republic) کی حیثیت سے عمل میں آئی - ۱۹۲۶ - ۱۹۲۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس جمہوریہ کی آبادی دس لاکھ تیس ہزار چھ سو اکتالیس (۱۰,۳۰,۶۴۱) تھی : ان میں ترکمان سات لاکھ انیس ہزار سات سو بانوے (۷,۱۹,۷۹۲) تھے، شہروں اور بڑے قصبوں میں کل آبادی ایک لاکھ چھتیس ہزار نو سو بیاسی (۱,۳۶,۹۸۲) تھی، جن میں سے صرف آٹھ ہزار سات سو نوے (۸,۷۹۰) ترکمان تھے - ایران اور افغانستان میں ترکمانوں کی تعداد کے متعلق ظاہر ہے کہ صحیح اعداد و شمار موجود نہیں - ارسطوف Aristow کے اندازے کے مطابق (۱۸۹۶ء) ان کی تعداد صرف اسّی ہزار تھی، جن میں سے پچاس ہزار افغانستان میں اور تیس ہزار ایران میں آباد تھے۔

مآخذ: یعنی .د مقالے میں مذکور نہیں (۱) H. Vámbéry : *Das Türkenvolk in seinen ethnologischen und ethnographischen Beziehungen geschildert*، لیپزگ ۱۸۸۵ء، ص ۳۸۲ ببعد؛ (۲) N. Aristow : *Zametki ob etničeskom sostave tyurkskikh plemen*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء؛ (۳) A. Semenow : *Očerki iz istorii presoedineniya vol'noi Turkmenii (1881-1885)*

تاشکنت۱۹۰۹ء؛ (۴) *Unter Kirgizen und* : R. Karutz *Turkmenen*، برلن (بدون تاریخ طباعت) ؛ (۵) *Tīsyačeletnyaya davnost' dolikhocefalii* : L. Oshanin *u turkmen i vozmožnīe puti ėe proiskhoždeniya* *Izv. Sredneaz. Komiteta*، ۱ : ۱۳۱ ببعد)؛ (۶) وهی مصنف : *Nīekotorīe dopolnitel'nīe dannīe k gipoteze* *skifo-samatskogo proiskhoždeniya turkmen*، تاشکنت ۱۹۲۸ء؛ (۷) *Turkmeniya*، ج ۱، لینن گراڈ ۱۹۲۹ء؛ اسی میں دیکھیے بارٹولڈ : *Očerk istorii turkmen-skogo naroda*؛ (۸) A. Samoylovič : *Očerki po istorii turkmenskoi literaturī*؛ (۹) N. Aitakow : *Trigodo Turkmenii*، عشق آباد ۱۹۲۸ء۔

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

ترکمانی ادب ۔

اب سے کچھ مدت پہلے تک ماوراے بحر خزر کے ترکمانوں کا ادب صرف چند مقبول عوام ادبی چیزوں (ادب شعبی) تک محدود تھا، جو ضبط تحریر میں بھی نہیں آئی تھیں اور جن میں اکثر و بیشتر ''عاشقوں'' کی نظمیں شامل تھیں ۔ تحریری ادب کی پس ماندگی کا اصلی سبب یہ ہے کہ ان ترکمانوں نے کبھی اپنی سلطنت قائم نہیں کی، بلکہ وہ ہمیشہ بدوی زندگی بسر کرتے رہے اور شہری زندگی کی رسوم و عادات انہوں نے کبھی اختیار نہیں کیں ۔ اگرچہ ترکمانوں کا شعبی ادب (جس میں کہاوتیں، پہیلیاں، کہانیاں، گیت اور لوریاں وغیرہ شامل ہیں) اوغوز قبائل کے ادب سے بہت مشابہ ہے، جو اُن کی نسبت اور زیادہ مغرب میں رہتے ہیں، یعنی ترکانِ ایران و قفقاز و اناطولیہ، پھر بھی ترکمانوں کے ہاں ہمیں عہد اسلامی سے پہلے کی بہت سی باقیات نظر آتی ہیں ۔

ترکمانوں کے تحریری ادب میں غزلیں، رزمیہ نظمیں اور ایسی نظمیں ہیں جن کا رنگ مذہبی اور اخلاقی ہے، یا پھر مقبول عام رومانوی داستانیں ہیں، جنھیں بَقْشی [رَکَ بآں]، یعنی گھوم پھر کر گانے والے، ترکمانوں کی محفلوں میں سنایا کرتے تھے ۔ قالب (form) اور موضوعِ سخن کے لحاظ سے ان نظموں میں اور ان میں جو آذربایجان اور اناطولیہ میں ''عاشقوں'' کی بدولت مقبول ہوئیں بہت ہی کم اختلاف ہے ۔ یہ نظمیں وتدی بحروں میں اور رباعیات کی صورت میں لکھی گئی ہیں، جنھیں '' غوشغی'' [قبَ قوشمہ] کہا جاتا ہے ۔ ترکمانوں کے ہاں یہ لفظ مطلق نظم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ نا معلوم مصنفوں کی رومانوی داستانیں، جنھیں قبول عام حاصل ہے، موضوع کے اعتبار سے آذربایجان اور اناطولیہ کی شعبی داستانوں کے مطابق ہیں، مثلاً ماهی گیر اور اس کا ساتھی (صیّاد ایلہ همراہ)' عاشق غریب، کوراوغلی و طاهر و زهره، یوسف و احمد؛ یہ وهی موضوعات ہیں جو اصلاً اوغوز کے ہاں مروّج تھے ۔ ہمیں اس قریبی تعلق کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے جو ترکمانوں کی شعبی موسیقی اور آذربایجان کی موسیقی میں موجود ہے ۔ اوغوز ترکوں کے مختلف گروہوں کے ان رابطوں کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی قدیم مشترکہ ثقافت کا تسلسل قائم رکھا اور دوسری یہ کہ بعد کے زمانے میں بھی وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے، چنانچہ مشہور رومانی قصے یوسف و احمد (جسے اوزبکوں نے بھی اپنا لیا ہے) اور کتاب دده قورقود کی (جو قدیم اوغوزی نظمِ حماسی کی باقیات میں سے ہے) کڑیاں نمایاں طور پر آپس میں ملی ہوئی ہیں ۔ مزید برآں خراسان، خوارزم اور ترکستان میں ترکی ثقافتی مرکزوں کے ساتھ ترکمانوں کا میل ملاپ ہوا اور اس طرح سے وسط ایشیا کے ترکی ادب نے ترکمانوں کے ادب پر

اثر ڈالا ۔ ترکمان لوگ نسیمی اور فضولی جیسے اوغوز۔ آذری شعراء کا کلام پڑھتے ھیں اور چغتائیوں کے بڑے شاعر علی شیر نوائی کی نظموں کا مطالعہ بھی کرتے ھیں، چنانچہ علی شیر نوائی اور اس کے مربی سلطان حسین بایقرا کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک تازہ ھے ۔ احمد یسوی اور اس کے شاگردوں کا رنگ ترکمانوں کے سبب سے مشہور شاعر مخدوم قلی کے کلام میں نمایاں ھے (قب ایلک متصوفلر، ص ۱۹۹).

جو علاقہ آج کل ترکمنستان کہلاتا ھے، وھاں کے قدیم ترکمانی ادب کے بارے میں ھماری معلومات فی الحال بہت کم ھیں ۔ ابوالغازی نے اپنی کتاب شجرۂ تراکمہ میں ایک منظوم کتاب معین المرید کا ذکر کیا ھے ۔ اس کا بیان ھے کہ اس کے زمانے تک ترکمانوں میں یہ برابر مقبول چلی آ رھی تھی۔ یہ کتاب ۱۳۱۳ء میں مرتب ھوئی اور اس میں اگرچہ بدوی زندگی کے کچھ حوالے پائے جاتے ھیں، لیکن در اصل وہ ترکان خوارزم کے ھاں تالیف ھوئی تھی اور ترکمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد مثنوی رونق الاسلام آتی ھے، جو از روے روایت شیخ شرف خوارزمی کی طرف منسوب ھے، لیکن [احمد] زکی ولیدی نے ثابت کیا ھے کہ یہ مثنوی، جو ۸۸۹ھ / ۱۴۸۴ء میں منظوم ھوئی، ایک اور شاعر وفائی کی ھے ۔ ترکمانوں میں اب بھی یہ مثنوی متداول ھے ؛ یہ عروضی وزن میں لکھی گئی ھے، لیکن ادبی حیثیت سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ۔ یہ وفائی شاید ان شعراء میں سے ھے جو شاہ اسمعیل صفوی کے زمانے میں خراسان کے ترکمانی شہزادوں کے حاشیہ نشین تھے ۔ بہر حال ھمیں اتنا ضرور معلوم ھے کہ تیموری دور تک خراسان میں ترکمان۔ چغتائی طرز کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں ۔ تذکرۂ سام میرزا [رک بآن] اور تذکرۂ صدیقی، بزبان چغتائی، موسوم بہ مجمع الخواص سے متعدد ترکمانی شاعروں کے کلام کا پتا چلتا ھے، جو سولھویں صدی میں زندہ تھے (مجمع الخواص کے لیے دیکھیے W. Pertsch : *Die türk. HSS. zu Gotha*، عدد ۱٦۹)، مگر یہ نظمیں شہری لوگوں کے لیے لکھی گئی تھیں اور خانہ بدوشوں کو ان کا علم نہ تھا ۔ ایک اور کتاب، جو ترکمانوں میں معروف تھی، ابوالغازی کی شجرۂ تراکمہ ھے (اس کتاب کا ذکر ابوالغازی کے مقالے میں نہیں کیا گیا) ۔ یہ کتاب تومانسکی Tumanski نے ۱۸۹۷ء میں عشق آباد سے شائع کی ۔ سموئلووچ Samoilovitch نے حال ھی میں اس کتاب کا چھٹا مخطوطہ دریافت کیا ھے (قب *Comptes Rendus de l'Academie des Sciences de l' U. R. S. S.*، ۱۹۲۷ء، عدد ۲ : ص ۳۹ تا ۴۲) ۔ اس کتاب میں اگرچہ اوغوز کی تاریخی کتابوں کے کچھ اقتباسات پائے جاتے ھیں، لیکن اس میں ترکمانوں کی قدیم شعبی روایات بھی دی ھیں ۔ چونکہ موجودہ مخطوطات کی زبان میں کاتبوں نے بہت کچھ تصرف کیا ھے، اس لیے اس کی وہ قدر و قیمت نہیں ھے جو ترکمانوں کی قدیم بولی کے نمونے کی حیثیت سے ھو سکتی تھی۔

موجودہ زمانے کے ترکمانوں کی ادبی روایات اور دوسرے مصادر، جو ھمیں دستیاب ھیں، صرف اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ادب کے بارے میں مفید ھو سکتے ھیں ۔ سموئلوچ نے، جو اس موضوع پر بہترین سند ھے، ترکمانی قبائل کے تقریباً بیس شعراء کے نام اکھٹے کیے ھیں ۔ ان کی نظموں میں مختلف قبائل کی باھمی جنگوں اور رقابتوں کا ذکر ھے اور تمام ترکمان بلا استثناء انھیں پڑھتے ھیں ۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں گوکلن Göklen قبیلے نے سب سے زیادہ شعراء پیدا کیے ؛ اس کی

وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے شہری زندگی دوسروں سے پہلے اختیار کر لی تھی ۔ سرِ فہرست ان کے بزرگ ترین شاعر مخدوم قُلی کا نام ہے، پھر اس کے باپ دولت محمد مُلّا آزادی کا، پھر اس کے داماد اور شاگرد ذَلیلی کا، اور آخر میں اَرساری قبیلے کے شاعر، سیّدی کا، جس نے گوکلِن قبیلے کے ہاں پناہ لی تھی ۔ دولت محمد ملّا آزادی نے ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء میں ایک مثنوی وعظِ آزادی کے عنوان سے وزن عروضی میں لکھی ۔ اس اخلاقی مثنوی میں چغتائی ادب کا اثر نمایاں ہے ۔ اس شاعر نے ''عاشقوں'' کے رنگ میں بھی نظمیں کہی ہیں ۔ اٹھارھویں صدی کے شعراء میں معروفی اور شیدایی بھی قابل ذکر ہیں ۔ انیسویں صدی کا ایک اور شاعر عبدالستّار قاضی ہے، جو قبیلۂ تکہ سے تھا اور آزادی کی طرح 'مدرسہ' کی پیداوار تھا ۔ سمونلوویچ نے اس کا جنگ نامہ ۱۹۱۴ء میں شائع کیا ۔ [یہ مثنوی بحرِ وافر میں لکھی گئی ہے] جس کا وزن ہے : مفاعیلن مفاعیلن فعولن ۔ یہ تاریخی نظم ہے، جس میں تکہ قبیلے کے سنّیوں اور ایران کے شیعوں کی باہمی آویزش کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ نظم ترکمانوں کی عام زبان کا خالص نمونہ نہیں۔

مخدوم قُلی نے خوارزم میں شیر علی خان کے مدرسے میں تعلیم پائی تھی، لیکن اس کی زندگی کے حقیقی واقعات پر افسانوں نے تاریکی کا دبیز پردہ ڈال رکھا ہے ۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بہت سے دوسرے شعراء کی نظمیں بھی اس کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں، حتّٰی کہ ان شاعروں کی نظمیں بھی جن کے آخر میں ان کے تخلّص موجود ہیں ۔ خیوا کے ترکمانوں میں، بلکہ اوزبکوں کے ہاں بھی، ''مخدوم قُلی کا مطالعہ کرنے'' سے مراد ہوتی ہے ''ترکمانی زبان میں اخلاقی نظموں کا مطالعہ کرنا''۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مخدوم قلی کی طرف جو ۲۷۹ نظمیں منسوب ہیں، ان میں سے کون کون سی نظمیں در حقیقت اُسی کی ہیں ۔ ان میں ہمیں بعض قطعات مذہبی اور اخلاقی نوعیت کے نظر آتے ہیں اور بعض ایسی رزمیہ نظمیں ہیں جن کی تحریک ترکمانی-ایرانی لڑائیوں سے پیدا ہوئی ۔ یہی وہ نظمیں ہیں جو ترکمانوں کا تصورِ حیات معلوم کرنے کے لیے ہمارا بہترین مأخذ ہیں ۔ ذلیلی اور سیّدی کی ''غُوشغیاں'' بھی اسی حکمت کی عکّاسی کرتی ہیں جو عوام کی زبان پر جاری ہے ۔ ان غوشغیوں کے اوزان عروضی اور قالب کہیں مخمّس اور کہیں مسدّس وغیرہ ہیں.

۱۹۰۵ء کے روسی انقلاب کے بعد ترکمانوں کے ہاں ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں، لیکن اس تحریک میں استواری اور پختگی صرف ۱۹۱۷ء سے آئی ہے ۔ اس تازہ عقلی سرگرمیوں کا مرکز عشق آباد ہے ۔ مدارس کی درسی کتابیں، رسالے اور اخبار ترکمانی بولی میں شائع ہوتے ہیں اور ترکمانی ثقافت کا ایک ادارہ بھی قائم کر دیا گیا ہے ۔ علم الاقوام (ethnography)، موسیقی اور شعبی ادب کا مطالعہ ہو رہا ہے اور جس طرح اتحادِ سوویتی کے دوسرے ملکوں کا دستور ہے، یہاں بھی مارکسی ادب کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں ۔ اگرچہ اس نئے ادب کی پیداوار ابھی تک ادبی لحاظ سے کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی، تاہم گلدیف Geldiyeff اور قُل محمدوف Kulmehmedoff جیسے فاضلوں نے متعدد اہم کتابیں شائع کی ہیں، مثلاً کلیات سیّدی، کلیات ذلیلی اور کتاب صیّاد ایلہ ہمراہ حکایہ سی ۔ گمان غالب ہے کہ ترکمانی علماء کی یہ تحقیقی کوششیں، جو روسی مستشرقین کی مدد سے جاری ہیں، مستقبل قریب میں ترکمانی ادب کے غیر معروف

ادوار پر خاص روشنی ڈالیں گی.

مآخذ: (۱) ترکمانی شعراء اور مخدوم قلی کے متعلق قدیم ترین تذکرۂ احوال کے لیے ملاحظہ ہو (۱) *Specimens of the Popular Poetry of* : A. Chodzko *Persia*، ۱۸۴۲ء؛ (۲) اس کے بعد Berezin نے اپنے *Chrestomathie* میں متعدد ترکمانی نظمیں شائع کیں؛ (۳) وامبیری H. Vámbéry نے اپنے *Travels*، لندن ۱۸٦۴ء میں مخدوم قلی کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائی ھیں؛ (۴) ۱۸۷۹ء میں مصنف موصوف نے اس کی نظموں کے ۳۱ مقطوعات *Z. D. M. G.*، ج ۳۳ میں شائع کیے، لیکن اس مقالے میں نیز اس میں جو Ostroumof نے ۱۹۰۷ء میں شائع کیا، بہت سی غلطیاں پائی جاتی ھیں: (۵) اھم ترین ابحاث Samoilovitch نے ذیل کے مقالوں میں شائع کی ھیں: (i) *Turkmenskij poet-bosjak Kör Mulla i jego* ('*zhivaja Starina*, serija XVI) '*pesnja o Russkikh* سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۷ء، ص ۲۱۵ تا ۲۲۳)؛ (ii) *Zap.*) '*Pojezdka v Turkestan v 1906—1907 g.* '*Vost. Otd. Imp. Russk. Arkh. Obshč.* ج ۱۸: ص xviii تا xix)؛ (iii) *Po povodu izdaniya N. P.* '*Zap.*) '*Ostroumova "Svetoč Islama"* ۱۸: ۱۰۸ تا ۱٦٦)؛ (iv) *Materialy po Srednoaziatsko-turetskoj* '*Zap.*) '*literature* ۱۹: ۱ تا ۳۰)؛ (v) *Ukazatel k* '*pesnyam Makhtum-Kuli* '*Zap.*، ج ۱۹)؛ (vi) '*Učebnik Turkmenskago narečiya* '*Zap.*، ج ۱۸)؛ (vii) '*K statye "Ukazatel k pesnyam Makhtum-Kuli"* '*Zap.*، ۱۹: ۱۲۵)؛ (viii) *Abdu-s-Sattar Gazy, Kniga razskazov o bitvakh tekintsev Turkmenskaya istoričeskaya poema XIX veka*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء.

(٦) H. Vámbéry: *Yusuf und Ahmed*، بوڈاپسٹ ۱۹۱۱ء؛ یہ قصہ ۱۹۰۴ء میں قازان سے بھی طبع ہوا ھے، اس کے بعض حصے وامبیری نے *Čagataische Sprachstudien*، لیپزگ ۱۸٦۷ء، ص ۹۵ تا ۱۱۳ میں شائع کیے تھے؛ (۷) کتاب مُعینُ المُرید کے لیے قب [احمد] زکی ولیدی: خوارزم ده یازلمش اسکی تورکچه اثرلر، شائع شده در تورکیات مجموعه سی، ۲: ۳۱۵ تا ۳۴۵؛ (۸) سموئلووچ نے رونق الاسلام کے متعدد مخطوطات کا حال بیان کیا ھے (انیسویں صدی کا ایک نیا مخطوطہ میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ھے): یہ کتاب سب سے پہلے قازان میں ۱۸۵۰ء میں چھاپی گئی؛ ۱۹۰۵ء میں Ostroumof نے اسے تاشکنت سے دوبارہ شائع کیا؛ (۹) شیخ مُحسن فانی نے مخدوم قلی کا جو دیوان قسطنطنیہ سے ۱۳۴۰ھ میں شائع کیا اس میں وامبیری کے مرتّبہ نسخے سے زیادہ غلطیاں ھیں: (۱۰) مخدوم قلی کے کلام پر جو تصانیف ھیں ان کی تنقیدی فہرست کے لیے دیکھیے: [احمد] زکی ولیدی: تورکیات مجموعه سی، ۲: ۴٦۵ تا ۴۷۴؛ (۱۱) قُل محمدوف Kul-Mehmedof: سیدی غوشغیلری، عَشق آباد ۱۹۲٦ء؛ (۱۲) وھی مصنف: ذلیلی غوشغیلری، عَشق آباد ۱۹۲٦ء؛ (۱۳) مصنف مذکور: صیّاد ایله همراه، عَشق آباد ۱۹۲۷ء؛ (۱۴) ترکمانی ادب کے متعلق آخری اور مکمل ترین تصنیف سموئلووچ کا مقالہ *Očerki po istorii turkmenskoy literatury* ھے، جو مجلہ *Turkmeniya* میں شائع ہوا۔ یہ مجلہ اتحاد سوویتی کے مجمع علوم (Academy of Sciences) کی طرف سے شائع ہوتا ھے.

(کوپرولو زادہ فؤاد)

تُرکمان چای: (صحیح ترشکل: تُرکمان۔چای) آذربایجان کے ناحیۂ گَرم رُود Gärmärūd میں ایک گاؤں ھے۔ ترکمان۔چای، یعنی ''ترکمانوں کا دریا'' اصل میں اس ندی کا نام ھے جس کے کنارے یہ گاؤں آباد ھے۔ یہ ندی درۂ چیچکلی Čičäkli سے (جو تُرکمان چای اور

سراب کے درمیان واقع ہے) نیچے کی طرف بہتی ہے اور دریاے میانہ (شہر-چایی Shähär-čäyi) کے شمالی معاونوں میں سے ہے، جو قزل اوزن (قب مادۂ سفید رود) میں آ ملتا ہے۔ قریۂ ترکمان-چای شاہ راہ تبریز ← زنجان ← قزوین ← تہران ← خراسان کی ایک منزل ہے۔ فاصلوں کی تفصیل یہ ہے: تبریز سے ترکمان-چای تقریباً ۶۰ میل؛ ترکمان-چای سے زنجان تقریباً ۸۰ میل۔ حمداللہ (نزھۃالقلوب، طبع وقفیۂ گب، ۲۳ : ۱۸۳) ان فاصلوں کو علی‌الترتیب ۱۶ اور ۲۰ فرسخ لکھتا ہے۔ وہ اس گاؤں کا نام ترکمان-کندی بتاتا ہے؛ لفظ کند بمعنی گاؤں صرف آذربایجان میں استعمال ہوتا ہے؛ ایران کے باقی حصے اس سے نا آشنا ہیں۔ یہ لفظ اصلاً یقینی طور پر شرقی ایران کی پیداوار ہے (قب سغدی لفظ کنث، بمعنی قصبہ؛ قب بارٹولڈ: *Istoriya Kultur. Žizni Turkestana*، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء، ص ۳۸)؛ آذربایجان میں یہ لفظ ترك حملہ آوروں کے ساتھ آیا ہوگا۔ حمداللہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ گاؤں کسی زمانے میں شہر تھا اور اس کا ایرانی نام دیہ خرّان تھا (اس نام کی متعدد قراءات ہیں)۔

کلاویخو Clavijo (طبع Sreznewski، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۱ء، ص ۱۷۲ و ۳۰۴) ترکمان-چای کو *Tucelar* اور *Tunglar* لکھتا ہے (جو بظاہر ترك لر کی محرّف صورت ہے) اور بیان کرتا ہے کہ یہاں ترکمان آباد ہیں۔

تاریخ میں ترکمان-چای یوں مشہور ہے کہ یہاں ایرانیوں اور روسیوں کے درمیان ۱۰ / ۲۲ فروری ۱۸۲۸ء کو ایک عہد نامے پر دستخط ہوے تھے۔ اس سیاسی دستاویز کے دو حصے ہیں: (۱) سیاسی عہد نامے کی رو سے، جو ۱۸۱۳ء کے عہد نامے کی جگہ مرتب ہوا، روس نے اریوان اور نخچوان کے خانات (khanates) کا الحاق اپنی مملکت کے ساتھ کر لیا اور ایران نے پچاس لاکھ تومان = دو کروڑ روبل کی رقم ادا کرنے کا اقرار کیا، گو یہ رقم بعد میں کم کر دی گئی تھی؛ (۲) ایک خاص معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں میں درآمد مال کی قیمت پر پانچ فیصدی کے حساب سے محصول چونگی مقرر ہوا اور روسی رعایا کی حیثیت عرفی کے متعلق قواعد مرتب ہوے؛ یہ طے پایا کہ فوجداری مقدموں میں روسی رعایا کے مقدمات کی سماعت روسی عدالتیں کریں گی اور دیوانی مقدمات جو دونوں قوموں کے متعلق ہوں ان کی سماعت کے لیے روسی-ایرانی مخلوط عدالتیں قائم ہوں گی اور ان میں روسی قنصل خانے کے نمائندے بھی شریک ہوں گے۔ ۱۸۲۸ء کے اس خاص معاہدے سے تاریخی طور پر ایرانی امتیازات کی ابتداء ہوتی ہے۔ مرجّح ترین قوم کی دفعہ کے تحت یورپ کی سب حکومتوں نے آہستہ آہستہ یہی حقوق حاصل کر لیے۔ ۱۹۱۷ء میں جب سوویتی روس کی حکومت بر سر اقتدار ہوئی، تو وہ کل سابقہ سیاسی اور قانونی مراعات سے، جو اسے ایران میں حاصل تھیں، از خود دست بردار ہو گئی اور اس دست برداری پر ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کے معاہدۂ روس و ایران نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ۱۹۱۸ء سے ایران برابر اس خواہش کا اظہار کرتا رہا کہ غیر ملکی امتیازات کی عمومی تنسیخ کر دی جائے۔ آخر کار ۱۰ مئی ۱۹۲۷ء کو اس نے تمام حکومتوں کے نام ایک گشتی مراسلہ جاری کیا اور ان میں سے کئی ایک نے ۱۰ مئی ۱۹۲۸ء سے مساوات کے اصول پر اپنے اپنے عہد ناموں کی تجدید کر لی۔

۱۸۲۸ء میں روس اور ایران کے درمیان جو سرحد قائم ہوئی تھی (ارارات خرد ← بحیرۂ خزر)

وہ ۱۹۲۱ء کے بعد تک بھی بدستور قائم تھی۔

مآخذ : ترکمان۔ چای کا ذکر وہ تمام سیاح کرتے ہیں .جنھیں تبریز سے قزوین تک سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے، قب (۱) *Voyage* : Hommaire de Hell، پیرس ۱۸۵۴ - ۱۸۶۰ء، ۳ : ۸۳ تا ۸۴ (گاؤں میں ۲۰۰ گھر ہیں) اور اٹلس، لوحہ ۵۶ (وہ کمرہ جہاں اس عہد نامے پر دستخط ہوے)؛ (۲) *Reise* : Brugsch، لائپزگ ۱۸۶۲ - ۱۸۶۳ء، ۱ : ۱۸۱؛ (۳) Lycklama a Nijeholt : *Voyage*، ۲ : ۸۰؛ (۴) H. Schindler : *Reisen, Zeitschr. Gesell. Erdk.*، ۱۸۸۳ء، ص ۳۳۳ (۱۰۰ گھر، [سطح بحر سے] بلندی ۵,۲۸۰ فٹ)۔

۱۸۲۸ء کے عہد نامے کا متن در (۵) F. Martens : *Nouveau recueil des traités*، ۲/۷، ۱۸۳۰ء، ص ۵۶۴ تا ۵۷۲؛ (۶) صنیع الدولہ : مرآۃ البلدان، ۱ : ۴۱۰ تا ۴۱۸؛ (۷) Yużefović : *Dogovorî Rossii s vostokom*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۹ء، ص ۲۱۴ تا ۲۲۷؛ (۸) Hertslet : *Treaties concluded between Great Britain and Persia, etc.*، لندن ۱۸۹۱ء؛ (۹) عہد نامے کا تجزیہ در Greenfield : *Die Verfassung des pers. Staates*، برلن ۱۹۰۴ء؛ (۱۰) K. Vollers : *Das Orientalische Münzkabinett der Universität Jena im Jahre 1906*، ڈرسڈن ۱۹۰۶ء، ص ۷۔

(V. MINORSKY منورسکی)

تُرکمنیہ : (یا ترکمنستان) یہ ملک توران کے نشیبی خطے کے جنوبی حصے میں واقع ہے ۔ موجودہ ترکمنی سوویتی اشتراکی جمہوریت (Turkmanian Soviet Socialist Republic) کی آئینی تشکیل ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ہوئی۔

ترکمنیہ ۵۲ اور ۶۷ درجے طول بلد (مشرق) اور ۳۵ اور ۴۳ درجے عرض بلد (شمالی) کے درمیانی علاقے میں واقع ہے اور اس کے حدود اربعہ یہ ہیں : مغرب میں بحیرۂ خزر (کیسپین)، شمال میں اوست یورت Üst-yurt، جنوب میں دریاے اَتْرَک کا مجراے زیریں، کوپت داغ اور پیروپامیسس Paropamisus کی باہر نکلی ہوئی شاخیں اور مشرق میں وادی آمو دریا ۔ اس کی سیاسی حدود، جنوب میں ایران اور افغانستان سے، شمال مغرب میں قازاقستان کی اور شمال اور مشرق میں ازبکستان کی سوویتی جمہوریتوں سے ملتی ہیں ۔ ترکمنیہ، جس کا رقبہ ۱,۸۷,۰۰۰ مربع میل ہے، سوویتی وسط ایشیا کی جمہوریتوں میں (باستثناے قازاقستان) سب سے بڑی جمہوریت ہے ۔ ۱۹۳۹ء میں اس کی آبادی ۱۲,۵۴,۰۰۰ تھی، جس میں تقریباً ۱۸ فیصدی روسی اور ۵۹ فیصدی ترکمن شامل تھے ۔ یہ آبادی متواتر بڑھتی نظر آ رہی ہے ۔ اس علاقے کا ۷۰ فیصدی حصہ ریگستان قراقوم اور ۲۰ فیصدی دیگر صحرائی علاقے پر مشتمل ہے، آبادی کے بڑے بڑے مرکز وہ واحات (oases) ہیں جو ریلوے لائن کے قرب و جوار میں واقع ہیں اور خصوصاً وہ جو کوپت داغ کے دامن کی پہاڑیوں میں مُرغاب کے ڈیلٹا اور وادی آمو دریا کے وسطی اور زیریں حصوں میں واقع ہیں ۔

کاشتکاری بیشتر علمی طریق سے کی جاتی ہے اور زمینوں پر پوری پوری توجہ، محنت اور سرمایہ صرف کیا جاتا ہے (intensive agriculture) ۔ یہ کاشتکاری مصنوعی ذرائع آبپاشی پر منحصر ہے، مگر جنوبی حصے کی پہاڑی وادیوں میں، جہاں قدرتی ذرائع سے آنے والا پانی استعمال کیا جاتا ہے، کاشتکاری وسیع اور کم خرچ (extensive) قسم کی ہوتی ہے ۔ یہاں کی بڑی فصل تو کپاس ہے، مگر گیہوں، لُوسَرن اور انگور بھی اہم فصلوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اونٹ، گدھے اور بکریاں صحرائی چراگاہوں میں پالی جاتی ہیں، مگر دام پروری کی بدرجہا زیادہ اہم شاخ قراقولی بھیڑوں کی پرورش ہے، جو بیشتر ملک

کے نصف مشرق حصے میں کی جاتی ہے - بھیڑوں سے صادراتِ ملک کی اہم مدّ، یعنی کھالیں، حاصل ہوتی ہیں، ان صادرات میں، جو ترکمنیہ سے اتحاد سوویتی (سوویٹ یونین) کے دوسرے علاقوں کو بھیجی جاتی ہیں، اضافہ کرنے والی دو اور مدّیں بھی ہیں : ریشم کے کیڑوں کی پرورش اور دریاے خزر میں ماہی گیری؛ ان سے تجارت کو مزید فروغ حاصل ہوتا ہے .

پہلے پنج سالہ منصوبے سے قبل، صنعتی ترقی صرف مختصر پیمانوں کی صنعتوں، روئی اوٹنے اور زمین سے مشین کے ذریعے تیل برآمد کرنے تک محدود تھی - ان کے علاوہ خوراک اور تعمیراتی سامان کے متعلق بھی مقامی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں - ان صنعتوں کی ابتداء روسی حکومت ہی کے زمانے میں ہوئی تھی، مگر یہ سب کی سب معمولی پیمانے کی تھیں - ۱۹۲۸ء سے صنعتوں نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی، چنانچہ آج کل قیمت کے لحاظ سے صنعتی پیداوار زراعتی پیداوار سے بہت بڑھ گئی ہے - ترکمنیہ میں فلزّات بکثرت پائی جاتی ہیں اور تیل کی پیداوار کی توسیع کے ساتھ ساتھ کوئلہ، لگنائٹ (چوب‌نما پتھر کا کوئلہ)، رانگ، تانبا، پارہ، گندھک، کئی طرح کے عمارتی سامان اور کئی دیگر دھاتیں نکالی اور کام میں لائی جا رہی ہیں- ہلکی صنعتوں میں توسیع کی گئی ہے اور نئی نئی صنعتیں قائم کر دی گئی ہیں - قالین‌سازی کی قدیم، روایتی دستکاری اب تک قائم ہے .

اس علاقے پر گذشتہ زمانے میں گو پارتائی (Parthian) اور خوارزمی شہنشاہیت کا دور دورہ رہا ہے، لیکن روسی تسلط سے پہلے ترکمنوں نے اپنی متحدہ اور مستحکم حکومت کبھی قائم نہیں کی تھی - ۱۹۱۷ء میں بلشویکی انقلاب ترکمنیہ تک پہنچ گیا اور ۱۹۱۸ء میں سابقہ صوبۂ ماوراے خزر داخلی استقلال رکھنے والی سوویتی اشتراکی جمہوریت کا ترکمنی صوبہ بن گیا - یہ جمہوریت R.S.F.S.R. (روسی سوویتی فیڈریٹڈ [وفاق] سوشلسٹ ری پبلک [جمہوریت]) میں شامل تھی - ۱۹۱۸ء میں عشق آباد میں ایک انقلاب شکن (counter-revolutionary) "ماوراے خزر حکومت" قائم ہوئی تھی، لیکن فروری ۱۹۲۰ء میں اس حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں پھر سے سوویتی حکومت قائم کی گئی - ۱۹۲۴ء میں وہ علاقہ جو پہلے صوبۂ ماوراے خزر میں شامل تھا اور بخارا و خوارزم کی عوامی سوویتی جمہوریتوں کے وہ حصے جن میں ترکمن قوموں کی اکثریت تھی، ان سب کو ملا کر ترکمنی سوویتی اشتراکی جمہوریت قائم کر دی گئی اور ۱۳ مئی ۱۹۲۵ء کو اس کا شمار ان جمہوریتوں (Constituent republics) میں ہو گیا جن سے یو - ایس - ایس - آر - .U.S.S.R کی تشکیل ہوتی ہے. اور اس طرح ترکمن جمہوریت یو-ایس-ایس-آر- کے ۴ء۹۴ فیصدی ترکمن باشندوں پر مشتمل ہو گئی .

اس وقت سے اب تک یہاں اہم ترین تبدیلیاں یہ ہوئیں : زمین اور پانی کے جملہ حقوقِ ملکیت و استعمال، جو اس وقت لوگوں کو حاصل تھے، منسوخ کیے گئے، زمین اور پانی کے کل ذرائع قومی ملکیت قرار دیے گئے (۱۹۲۵ تا ۱۹۲۷ء) - اس کے بعد زراعت میں اشتراکی اصول رائج کیے گئے اور مشینوں کا زیادہ استعمال ہونے لگا - کامل خانہ‌بدوشانہ زندگی مفقود ہو گئی، صنعتی ترقی اور نوشت و خواند کی اشاعت ہوئی اور عوام کی تعلیم کے لیے ایک جامع نظامِ تعلیم کی بنیاد ڈالی گئی - عشق آباد میں، جو علاقے کا صدر مقام ہے، ۱۹۵۰ء میں ایک جامعہ کا افتتاح ہوا اور ۱۹۵۱ء میں U.S.S.R. کی اکادمی علوم کی

ترکمنی شاخ کی تشکیلِ نو عمل میں آئی، جس کا نام ترکمنیہ کی انجمنِ علوم (ترکمنین اکیڈیمی آو سائنسز) رکھا گیا۔

مآخذ: (ان میں وہ کتابیں شامل نہیں جو پورے وسط ایشیا کے بارے میں ھیں) (ا) عمومی کتابیں: (۱) *Pyatnadtsat' let Turkmenskoi SSR Statistich. sbornik*، عشق آباد ۱۹۳۹ء؛ (۲) *Materialî po istorii turkmen i Turkmenii*، جلد ۱ و ۲، ماسکو۔ لینن گراڈ ۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ء؛ (۳) Karpov, G., Shkol-nikov, E.: *Turkmenskaya SSR*، ماسکو ۱۹۴۵ء؛ (۴) Saakyan, A. A.: *25 let Turkmenskoi Sov. Sots. Respubliki*، عشق آباد ۱۹۵۰ء؛ (۵) Čerdantsev, G. N. و Zhmuida, V. B.: *Turkmenskaya SSR...*، *Bol'oh. Sov. Ents.* جلد ۵۵ (مع مقالۂ ملحقہ در مجلد راجع بہ یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔)، طبع اول؛ (۶) Freikin, Z. G.: *Turkmenskaya SSR*، ماسکو ۱۹۵۴ء؛ (۷) انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، ۱۹۵۵ء، جلد ۲۲، بذیل Turkmen Republic؛

(ب) سلسلہ وار کتابیں جن کے محتویات بیشتر ترکمنیہ سے متعلق ھیں: (۸) *Turkmenovedenie*، ۱۹۲۸ - ۱۹۳۱ء؛ (۹) *Turkmeniya*، شمارہ ۱ تا ۳، لینن گراڈ ۱۹۲۹ء؛ (۱۰) *Problemî Turkmenii*، ماسکو۔ لینن گراڈ ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ء؛ (۱۱) *Materialî Komissii ekspedits. i issledov., ser. Turkmenskaya*؛ (۱۲) *Izvestiya Turkmenskogo filiala.... AN SSSR*؛ (۱۳) Trudi Turkestanskogo *statistiko*-ekonom. obščestva عدد ۱، تاشکنت ۱۹۱۸ء؛

(ج) زراعت اور صنعت پر کتابیں: (۱۴) Teletov, A. S.: *Poleznîe iskopaemîe Turkmenskoi SSR*، عشق آباد ۱۹۲۸ء؛ (۱۵) Gubkin, I. M.: *Iskopaemîe energoresursî i drugie Poleznîe iskopaemîe Turkmenii*، لینن گراڈ ۱۹۳۴ء؛ (۱۶) *Sîrevîe resursî Turkmenii i ikh promîshlennoe ispol'zovanie*، عشق آباد ۱۹۴۳ء؛ (۱۷) Nikitin, V.V.: *Bogarnoe zemledelie Turkmenii*، عشق آباد ۱۹۳۶ء؛ (۱۸) *Kolkhoznoe zhivotnovodstvo Turkmenistana*، عشق آباد ۱۹۵۰ء؛ (۱۹) *Sel'skoe Khozyaistvo Turkmenskoi SSR za 25 let*، عشق آباد ۱۹۵۰ء۔

(آڈرے جے۔ احمد AUDREY J. AHMAD)

ترکیب بند: کلام منظوم کی ایک قسم ھے، جس میں پانچ سے گیارہ اشعار تک کے بند ھوتے ھیں۔ ھر بند میں غزل کی طرح مستقل قافیہ ھوتا ھے، یعنی ھر بند کے پہلے دو مصرعے اور بعد کے شعروں کا ھر دوسرا مصرعہ ھم قافیہ ھوتے ھیں، لیکن ھر بند کا قافیہ دوسرے بند سے مختلف ھوتا ھے اور پورے ترکیب بند کا ایک ھی بحر میں ھونا ضروری ھے۔ ھر بند کے آخر میں ٹیپ کا شعر ھوتا ھے جس کا وزن تو وھی ھوتا ھے جس میں باقی نظم ھو، لیکن اس کا قافیہ جداگانہ ھوتا ھے اور اس شعر کے دونوں مصرعے ھم قافیہ ھوتے ھیں۔ جب ٹیپ کا ایک ھی شعر ھر بند کے آخر میں دھرایا جائے تو ایسی نظم کو 'ترجیع بند' کہتے ھیں، لیکن عروض کی قدیم کتابوں میں اس شکل کے ھر کلام منظوم کو ترجیع بند ھی لکھا ھے، خواہ ٹیپ کی تکرار ھو، یا نہ ھو، یعنی بند کے آخر میں ٹیپ وھی ھو یا ھر بند کے بعد مختلف ھو۔

مآخذ: (۱) شمس‌الدین محمد بن قیس الرازی: المُعْجَم فی مَعاییرِ اَشْعار العَجَم، طبع مرزا محمد و ای۔ جی۔ براؤن، از نشریات وقفیۂ گِب؛ (۲) نصیرالدین الطوسی: معیار الاشعار، طبع مفتی محمد سعداللہ مرادآبادی، سنگی طباعت، لکھنؤ ۱۲۸۲ھ؛ (۳) گارساں دِ تاسی: *Rhétorique et prosodie des langues de l' Orient Musulman*، پیرس ۱۸۷۳ء؛

طبع ثانی.

(T. W. Haig ہیگ)

تِرْمِذ : آمو دریا [رَكَ بان] کے شمالی کنارے پر دریاے سُرْخان کے دھانے کے قریب ایک شہر ہے - سَمْعَانی، جو اس جگہ بارہ روز تک رہا، اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ خود شہر میں اس کا تلفظ ''تِرْمِیْذ'' [کذا] ہے (G.M.S.، شمارہ ۲۰، ورق ۱۰۵ ب) [مگر وہاں ہے : '' المتداول علی لسان تلک البلدة (ابن الأثیر : اللّباب فی معرفة الانساب (نسخۂ دانش گاہ پنجاب، ورق ۳۷ الف) و یاقوت : معجم) : المدینة بجای البلدة) فتح التاء (اللباب، نسخۂ مذکورہ و یاقوت : بفتح التاء و کسر المیم)، لہذا سمعانی میں ''تَرْمِذ'' کا گمان ہوتا ہے] اور اس کی توثیق چینی تلفظ تا۔می (مثلاً Hiouen Thsang : *Mémoires sur les contrées occidentales*، ۱ : ۲۰) سے بھی ہوتی ہے - ۱۸۸۹ء میں روسی افسروں نے اس کا تلفظ تِرمِذ یا تِرْمِیْذ سنا (*Sbornik materialov po Azii*، ۵۷ : ۳۹۲، ۳۹۹) - سرکاری طور پر اس شہر کا نام اب تِرمِذ Termez ہے -

معلوم ہوتا ہے کہ تِرْمِذ میں سکندر اعظم نہیں پہنچا اور نہ قدماء نے اس کا ذکر کیا ہے، اگرچہ بعد کے زمانے میں اس کی بنیاد سکندر سے منسوب کی گئی - بقول حافظ ابرو [رَكَ بان] (متن، طبع بارٹولڈ، در المظفریّہ، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء، ص ۲۰) نہ صرف تِرمِذ بلکہ بُرْداغُوی بھی، جو [آمو] دریا ہی کے کنارے واقع ہے اور ترمذ سے زیادہ دور نہیں، سکندر ہی نے تعمیر کرایا تھا - کہتے ہیں کہ بُرداغُوی ایک یونانی لفظ ہے، بمعنی '' خان '' (سہمان خانہ) (؟ یونانی πapaδυχείον).

اسلامی فتوحات کے زمانے میں ترمذ میں بدھ مذہب کا دور دورہ تھا - اس میں بارہ صومعے (monastries) اور ایک ہزار بھکشو موجود تھے (Hiouen-Thsang : تذاکیر مذکور) - اس وقت ترمذ ایک بہت بڑے حکمران کے ماتحت تھا جس کا لقب ترمذ شاہ تھا (طبری، ۲ : ۱۱۴۷؛ مکتبۂ جغرافیۂ عربیہ B. G. A.، ۶ (ابن خُرّدادبہ) : ۳۹) - دریا کے کنارے ایک مستحکم قلعہ تھا (طبری، ۲ : ۱۱۴۷) - ۷۰ھ/۶۸۹-۶۹۰ء میں ترمذ کو موسی بن عبداللہ بن خازم نے فتح کیا، جس نے حکومتِ اسلامیہ سے بغاوت کر کے اس مقام پر پندرہ سال تک خودسرانہ حکومت کی (قبّ بلاذری، ص ۴۱۷ ببعد؛ طبری، ۲ : ۱۱۴۵ ببعد) - کہیں ۸۵ھ/۷۰۴ء کے اواخر میں عثمان بن مسعود نے علاقے کے گورنر المفضّل بن المہلّب کے حکم سے یہ شہر فتح کر کے حکومت کے حوالے کیا - اس لڑائی میں اور بعد کے محاصروں اور پل بنانے کے سلسلے میں جزیرۂ ترمذ کو، جسے عربوں کے عہد میں جزیرۂ عثمان کہتے تھے، بہت اہمیت حاصل تھی؛ عہد اوزبگ میں اس ٹاپو کو اورتہ۔آرال یا اورتہ۔آرالی ('' درمیانی جزیرہ '') کہا کرتے تھے (J. Senkowski : *Supplément à l' histoire générale des Huns* etc.، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۲۴ء، متن، ص ۲۰ اور وہ اقتباسات جو بارٹولڈ نے مخطوطات سے لے کر *K istorii orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء، میں درج کیے ہیں) - ذوالکفل نبی[۱۴] (مکتبۂ جغرافیۂ عربیہ B. G. A.، ۳ [مقدسی] : ۲۹۱) سے توسّل کی رسوم، جو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں کالف میں جاری تھیں، یہاں منتقل ہو گئیں - اس توسّل کی وجہ سے اس جزیرے کو اب آرال پیغمبر (یعنی پیغمبر کا جزیرہ) کہتے ہیں.

چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی میلادی میں یہاں کے جغرافیائی حالات کے لیے قبّ بالخصوص مکتبۂ جغرافیۂ عربیہ B. G. A.، ۱ [اصطخری] :

۲۹۸ اور ۳ [مقدسی] : ۲۹۱ - ترمذ آمو دریا پر ایک اهم بندرگاہ تھی - یہاں کشتیاں بھی بنا کرتی تھیں اور باہر بھیجی جاتی تھیں (مکتبۂ جغرافیۂ عربیہ .B. G. A، ۳ [مقدسی] : ۳۲۵، س ۷) - بلخ کی طرح ترمذ کا صابون بھی مشہور تھا (کتاب مذکور، ص ۳۲۴) - ترمذ کے دو باشندوں نے اسلامی ادبیات میں بڑی شہرت حاصل کی ، یعنی مشہور مجموعۂ احادیث کے جامع ابو عیسی محمد بن عیسی الترمذی [رک بہ الترمذی] (م ۲۷۹ھ/ ۸۹۲ء) اور محدث اور صوفی ابوعبداللہ محمد بن علی [الحکیم] الترمذی [رک بآن] (م ۲۵۵ھ/ ۸۶۹ء) [براکلمان تکملہ : ۱ : ۳۵۶ میں یہ سنہ بحوالۂ سفینۃ الاولیا، مگر ۲۸۵ھ بحوالۂ ماسنیوں دیا ہے - ادارہ]؛ قب براکلمان : .G.A.L، ۱ : ۱۹۴ [قب براکلمان : تکملہ ، ص ۳۵۵] - ابو عبداللہ محمد بن علی معروف بالحکیم کا مقبرہ، جو غالباً نویں صدی هجری / پندرهویں میلادی میں تعمیر هوا، ترمذ کے آثار مخروبہ کی نفیس ترین عمارت ہے اور اس کا شمار وسط ایشیا کی خوبصورت ترین عمارتوں میں ہے (تصویر مثلاً *Izv. Geogr. Obshč*، جلد ۴۴، ۱۹۰۸ء: ص ۶۵۲ پر، جہاں کتبوں کا روسی ترجمہ بھی دیا ہے اور بارٹولڈ : *Islam* ، مطبوعۂ سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۸ء میں، ص ۷۵ پر) - ان کتبوں سے ابو عبداللہ محمد بن علی [الحکیم] کے متعلق ایک حد تک وهی باتیں معلوم هوتی هیں جو تذکرۃ الاولیا ، (*Pers. Hist. Texts*، ۵ : ۹۳) مصنفۂ [شیخ] فریدالدین عطار [رک بآن] اور نفحات الأنس [طبع کلکته، ص ۱۳۱] مصنفۂ جامی [رک بآن] میں مذکور هیں - علاوہ ازیں همیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ بھی بعض انھیں شیوخ کے شاگرد تھے جن کے البخاری تھے، لیکن سمعانی (طبع وقفیۂ گب ، شمارہ ۲۰: ۱۰۶ الف) نے یہی بات محمد بن عیسی ترمذی کی نسبت کہی ہے [نیز دیکھیے دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ترجمۂ الترمذی ابو عیسی محمد بن عیسی ، ص ۲۲۹، ح ۲].

بعد کے زمانے میں ترمذ کی سیاسی تاریخ خراسان اور ماوراء النہر کی سیاسی تاریخ کے ساتھ مشترک رهی؛ کبھی زیادہ اهمیت دریاے جیحون کی سرحد کو حاصل هوئی (اور یہ صورت آج بھی ہے) اور کبھی بلخ سے اس کا اتصال اس کے لیے زیادہ اهم رها - محمود اور اس کے متصل بعد کے جانشینوں کے عهد میں ترمذ بلخ کے ان توابع کی طرح، جو دریاے جیحون کے شمال میں واقع تھے، سلطنت غزنویہ [رک بآن] میں شامل رها - سمرقند کے نزدیک دشت قطوان کی لڑائی (۵ صفر ۵۳۶ھ / ۹ ستمبر ۱۱۴۱ء) کا نتیجہ یہ هوا کہ ماوراء النہر کی حکومت قرہ ختایوں [رک بآن] کی طرف منتقل هو گئی، مگر ترمذ سلجوقیوں هی کے قبضے میں رها - اس کا ثبوت یہ ہے کہ سلطان سنجر [رک بآن] نے ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء میں یہاں آ کر پناہ لی - بعد میں قرہ ختای اس پر قابض هو گئے، پھر عمادالدین عمر نے، جو ملوک غوریہ کی طرف سے بلخ کا حاکم تھا، ذوالقعدہ ۶۰۱ھ / جون - جولائی ۱۲۰۵ء میں اسے فتح کر لیا (ابن الأثیر، ۱۲ : ۱۳۵) - عمادالدین کا بیٹا بهرام شاہ (یہ نام نسوی، طبع هوداس Houdas، ص ۳۹، میں آیا ہے) ترمذ کا حاکم مقرر هوا - اس سے اگلے هی سال خوارزم شاہ محمد نے، جو اس وقت قرہ ختایوں کا حلیف تھا، اسے فتح کر کے قرہ ختایوں کے حوالے کر دیا - ابن الاثیر (۱۲ : ۱۵۲ ببعد) نے لکھا ہے کہ اس خبر سے تمام اسلامی دنیا میں خوارزم شاہ کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی - بقول جوینی (طبع وقفیۂ گب، ۱۶/۲ : ص ۹۴) والی ترمذ نے [اپنے باپ کی توبیخ و تحذیر پر] عثمان خان،

والی سمرقند، کو شہر کا قبضہ دے دیا ۔ میرء خواند (Hist. des sultans du Khorezm ، طبع Defrémery، پیرس ۱۸۴۲ء، ص ۵۱ ببعد) نے خان کی جگہ خوارزم شاہ لکھا ہے ۔ سلطنت قرہ ختای کے زوال کے بعد ترمذ خوارزم شاہ کی سلطنت میں شامل ہو گیا ۔ ۱۲۲۰ء کے موسم خزاں میں مغولوں نے اسے فتح کر کے کاملاً تباہ و برباد کر دیا ۔ جوینی نے اس فتح کے ذکر میں (طبع وقفیۂ گِب، شمارہ ۱۶/۱ : ۱۰۲) لکھا ہے کہ شہر کی فصیل کا آدھا حصہ دریا کے بیچوں بیچ تعمیر ہوا تھا۔

اس سے چند سال پہلے ساداتِ ترمذ کا ذکر پہلی دفعہ آتا ہے جن کی اہمیت پر حملۂ مغول کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ جب خوارزم شاہ محمد اور خلیفہ ناصر میں کشیدگی پیدا ہو گئی تو اس نے ائمۂ مملکت کے فتویٰ کا اعلان کیا کہ عباسی خلافت کے صحیح حقدار نہیں، غاصب ہیں اور اصل مستحق سادات حسینی ہیں ؛ چنانچہ علاءالملک ترمذی کو، جو ساداتِ بزرگ میں سے تھے، خلیفہ مقرر کیا گیا (طبع وقفیۂ گِب، ۱۶/ ۲ : ۹۷ و ۱۲۲) ۔ اس تقرر کا کوئی مزید نتیجہ نہ نکلا ۔ ہمیں اس مدعی خلافت کے حالاتِ زندگی اور اس کے انجام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ حمداللہ قزوینی کی تاریخ گزیدہ (طبع وقفیۂ گِب، ۱۴ / ۱ : ۴۹۶) میں اس کا نام سید عمادالدین ترمذی لکھا ہے ۔

اگلی صدی میں ابن بَطُّوطہ [رِّکْ بآن] (طبع Defrémery اور Sanguinetti، ۳ : ۴۸) چغتائی [رِّکْ بآن] مملکتوں کے واقعات قلمبند کرتا ہے۔ اس نے علاءالملک خداوند زادہ، صاحب ترمذ، کا ذکر کیا ہے جو حسینی‌النسب تھا اور لکھا ہے کہ وہ خلیل [بن سلطان یَساور] کے پاس چار ہزار مسلمان ہمراہ لے کر جا پہنچا اور خان نے اسے اپنا وزیر مقرر کر لیا ۔ اس کے گھرانے کے آدمی اس زمانے کے بعد بھی خداوند زادے ہی کہلاتے رہے (ظفر نامہ، طبع [کلکتہ]، ۱ : ۲۱۰ و دیگر مواضع کثیرہ اور بابر نامہ، نسخۂ عکسی، طبع بیورج Beveridge [ورق ۲۷ و ۲۸] میں اس کلمے کو باختصار خانزادہ یا خوان زادہ لکھا ہے ۔ پورا نام ظفر نامہ کے قدیم ترین نسخوں میں پایا جاتا ہے، جو تیمور کے عہد میں مرتب ہوے تھے [*Tekstï po istorii Sredney azii* ، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۵ء ص ۱۳۱ اور ۱۹۹]۔ ظفر نامہ میں '' خان زادہ '' ابوالمعالی اور اس کے بھائی علی اکبر کا ذکر کئی مرتبہ آیا ہے ۔ ۱۳۷۱ء میں ابوالمعالی کو تیمور (ظفر نامہ، ۱ : ۲۳۱) کے خلاف '' عصیان و غدر اندیشی '' کی ایک سازش میں حصہ لینے کی پاداش میں جلاوطن کر دیا گیا، لیکن یہ جلاوطنی زیادہ طویل نہ تھی، کیونکہ اس کے اگلے ہی سال ہم اسے تیمور کی ایک مہم میں حصارِ خوارزم (ظفر نامہ، ۱ : ۲۴۱) کے پاس جنگ کرتے ہوے پاتے ہیں ۔ اس کے بعد بھی ایک خان زادہ علاءالملک کا ذکر آتا ہے ۔ ہندوستان کی مہم سے واپس آنے کے بعد ۱۳۹۹ء میں اس نے تیمور کو دعوت دی اور اس طرح مغرب کی مہم سے ۱۴۰۴ء میں واپس آنے کے بعد تیمور نے اس کے مکان پر قیام کیا (کتاب مذکور، ۲ : ۱۹۰ و ۵۹۳)۔ [خانزادہ تاج‌الدین کو، جو ساداتِ ترمذ میں سے تھا، ۸۲۵ھ میں شاہ رخ وغیرہ کے ایلچیوں نے اتا صوفی (قریب بہ قاسل) میں مقیم پایا، اس نے وہاں لنگر بنایا تھا اور اس کے خسر امیر فخرالدین نے مسجد، مطلع، ص ۳۸۱]۔ ۱۴۸۷ء میں احمد میرزا نے ان سادات کے گھرانے میں [خانزادہ بیگم سے] شادی کی (بابر نامہ، ورق [۲۰ ب]) ۔

ابن بطوطه کے وقت میں، جب بلخ ابھی کھنڈر ھی کی صورت میں تھا، ترمذ کی حالت مغول کی تباہ کاری کے بعد سنبھل چکی تھی؛ شہر اپنی پہلی جگہ کے بجاے دریا سے کوئی دو عربی میل دور دوبارہ آباد ہوا ۔ یہ ایک عمدہ اور بڑا شہر تھا اور باشندے خوش حال تھے (ابن بطوطه، طبع Defrémery و Sanguinetti، ۳ : ۵٦ ببعد) ۔ اس شہر کے کھنڈروں میں وہ مقبرہ بھی ھے جس کا حال سمنوف A. A. Semenov (*Protokoli Turk. Kružka*، *Lyub. Arkh.*، ۱۹ : ۳ ببعد مع تصاویر) نے دیا ھے اور سیدوں کے ان مقبروں کے کوائف بھی بیان کیے ھیں جنھیں آج کل "سلطان سدت" (غالباً بجاے "سلطان سادات") کہتے ھیں ۔ سادات کی اولاد اب ترمذ کے قریب ایک گاؤں میں آباد ھے، جس کا نام صالح آباد ھے (آخری مردم شماری کے مطابق باشندوں کی تعداد ۲۷۴ ھے) ۔ سمنوف نے ان سے ان کے خاندان کا ایک قلمی شجرۂ نسب اور ان کے خاندان کی تاریخ حاصل کی، جو ۴ ذوالحجة، ۱۰۴٦ھ / ۲۹ اپریل ۱٦۳۷ء تک کے واقعات پر ختم ہوتی ھے ۔ اس قلمی نسخے کے مطابق سید حسن الامیر بن امیر حسین ۲۳۵ھ/ ۸۴۹-۸۵۰ء میں سمرقند آئے اور وھاں سے بلخ اور ترمذ ۲۴٦ھ / ۸٦۰-۸٦۱ء میں گئے ۔ سید حسن کے جو تعلقات سامانی بادشاھوں سے تھے، کتاب میں ان کا بھی کچھ ذکر ھے اور اس سلسلے میں بعض ایسے واقعات بھی مذکور ھیں جو باعتبار زمانہ غلط ھیں ۔ باقی رھا شجرہ، سو اس میں صرف نام ھی نام ھیں (اس شجرے میں "سلطان سادات" ایک خاتون کا نام ھے) اور واقعات یا تاریخی حقائق کا کچھ ذکر نہیں ۔

ظفرنامه (۱ : ۵۷) میں ترمذ کے ساتھ "ترمذ کہنه" کا ذکر بھی آتا ھے ۔ ادبی تصانیف میں، بشمول اس مخطوطے کے جس کا اوپر ذکر ھوا، اور سکوں میں، اکثر مغول کے حملے کے بعد ترمذ کو "مدینة الرجال" (یعنی مردوں کا شہر) کے نام سے یاد کیا گیا ھے ۔ تیمور کی موت کے بعد تھوڑی مدت کے لیے دریاے جیحون کی سرحد نے پھر اھمیت حاصل کی ۔ خلیل سلطان، جس نے سمرقند پر قبضه کر لیا، صرف دریاے آمو کے شمال کا علاقه اپنے قبضے میں رکھ سکا ۔ جن دنوں شاہ رخ [رَكَ بآن] اور خلیل کے درمیان جنگ کی تیاریاں ھو رھی تھیں، خلیل سلطان نے ۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء میں ترمذِ کہنه اور شاہ رخ نے قلعۂ ھندوانِ بلخ کو از سر نو تعمیر کرایا (ابن عرب شاہ، طبع مصر، ص ۲۰۵ ببعد [= طبع لائیڈن ۱٦۳٦ء، ص "شعز" (۳۷۷) ببعد و مطلع سعدین، طبع لاھور، ۱ : ۱۰۳] ۔ غالباً محمد بن علی الترمذی کا روضه اسی زمانے کی یادگار ھے ۔

دسویں / سولھویں صدی سے ترمذ اور اس کے ساتھ بلخ بھی اکثر اوزبکوں کی حکومت میں شامل رھا ۔ بلخ کی لڑائی میں جو اوزبکوں اور ھندوستان کے شہزادے (بعد ازآں شہنشاہ) اورنگ زیب [رَكَ بآن] کے درمیان ۱٦۴٦-۱٦۴۷ء میں ھوئی، ترمذ پر ھندوستانی فوجوں نے سعادت خان کے زیر قیادت قبضه کر لیا (Elliot-Dowson : *Hist. of India*، ۷ : ۹۷؛ نیز بارٹولڈ، در *Bulletin de l' Acad.* وغیرہ، ۱۹۲۱ء، ص ۳۰۴).

اٹھارھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ترمذ قنغرات خاندان کے رکن شیر علی کے قبضے میں تھا، جو شہر شیر آباد کا بانی تھا (*Z. D. M. G.*، ۳۸ : ۲۷٦) ۔ اس زمانے میں ترمذ کے 'قلعۂ کلان' اور قلعۂ قریه (؟) میں، جہاں (ترمذ کے ؟) بیشتر باشندے رھتے تھے، امتیاز پیدا ھوا ۔ زمانۂ مابعد کے فتنه و فساد کی وجه سے دوسرے شہروں

کی طرح ترمذ بھی پوری طرح برباد ہو گیا ۔ ۱۷۰۸ء میں محمد رحیم خان نے اس شہر کو دوبارہ تعمیر کرایا (بارٹولڈ : *K istorii orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء، ص ۷۴)۔ اس کے بعد یہ شہر پھر ایک دفعہ برباد ہوا ۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ترمذ کہنہ کے کھنڈروں کے نزدیک سوائے پتہ[کذا] حصار ایک حقیر سے گاؤں (آبادی ۱۲۰۷) اور صالح آباد (قب مذکورۂ بالا) کے کوئی چیز باقی نہ تھی۔ پتہ [کذا] حصار کو زیادہ اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جب اسے آمو دریا پر چلنے والے روسی دخانی جہازوں کے سفر کا نقطۂ آغاز بنا دیا گیا ۔ ۱۸۹۴ء میں روسی قلعہ ترمذ کے کھنڈروں سے کوئی پانچ میل پر تعمیر ہوا ۔ اور آہستہ آہستہ یہ ایک شہر بن گیا، لیکن اس میں اکثر آبادی مردوں کی تھی (آخری مردم شماری کے مطابق ۸۰۵۴ مرد اور ۲۰۹۹ عورتیں) - ۱۹۱۶ء میں بخارا -o- قرشی -o- ترمذ ریلوے کا افتتاح ہوا ؛ انقلاب کے زمانے میں اس ریلوے کو برباد کر دیا گیا، لیکن وہ اب پھر تعمیر ہو گئی ہے ۔ ماسکو کے موزۂ ثقافتِ مشرق کی طرف سے جو کھدائی کا کام یہاں ہوا، اس سے اہم نتائج برآمد ہوے ہیں ، چنانچہ دوسری چیزوں کے علاوہ بدھ مت کے دور کی چیزیں بھی دستیاب ہوئی ہیں ۔

[" مردانِ عالی ہمّت صاحبِ ثروت " خصوصاً شعراء کے لیے، جو خاکِ ترمذ سے اٹھے، دیکھیے رازی : هفت اقلیم ، بذیل ترمذ ، نسخۂ دانش گاہ پنجاب ، مجموعۂ شیرانی ، شمارہ ۴۵۳۸ اور زین العابدین : بستان السیاحة ، تصنیف ۱۲۴۸ھ ، طبع دوم ، ص ۱۸۹]۔

مآخذ : متن کے حوالوں کے علاوہ (۱) لیسترینج *The Lands of the Eastern Caliphate* : G. Le Strange، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۴۰ ببعد ؛ (۲) بارٹولڈ *Turkestan* : W. Barthold، از نشریات وقفیۂ گب، سلسلۂ جدید، ۵ : ۷۴ ببعد، اور اشاریہ ؛ — کھدائی کے متعلق قب (۳) *Termez* : B. Denke، *Noviy vostok*، ۲۲ (۱۹۲۸ء) : ۲۰۸ ببعد؛ (۴) *Kul'tura Vostoka*، عدد ۱ (۱۹۲۷ء) : ص ۹ ببعد؛ عدد ۲ (۱۹۲۸ء) : ص ۳ ببعد ۔

(بارٹولڈ W. Barthold)

اَلتِّرمِذی : ابوعبداللہ محمد بن علی بن حسین ، المشہور بہ الحکیم (زیرك، دانا) ـ خراسان کے ایک سنّی عالمِ دین، محدث، حنفی فقیہ اور صوفی، متوفٰی ۲۸۵ھ / ۸۹۸ء [قب براکلمان : تکملہ، ۱ : ۳۵۶] ۔ آپ کی تقریباً تیس مصنّفات ابھی تک مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں ـ طرز تحریر قدرے اطناب کی طرف مائل ہے، لیکن ان میں اَسناد مکمل طور پر درج ہیں ـ اپنی کتاب نوادرالاصول اور ختم الولایة میں آپ نے بعض ادریہ (gnostlic) مسائل کی تفسیر و توضیح مذہب اہل سنّہ کے مطابق، مگر متصوفانہ رنگ میں، کرنے کی کوشش کی ہے (یہ وہ مسائل ہیں جن میں غالی شیعوں نے بسط پیدا کی)، مثلاً نورِ محمدی کا ازل سے موجود ہونا، حقیقتِ آدمیت، ابجد کے اٹھائیس حروف کی قیمت، علم ملائکہ، ولایت کے معیار ـ انھوں نے ولایت کا مطالعہ، ان کے اپنے اقرار کے مطابق، سب سے پہلے 'ولایت' کے اصطلاحی نام کے ماتحت کیا (یہ اصطلاح آپ نے شیعوں سے مستعار لی) اور اس مبحث میں حضرت عیسیٰ [ؑ] کو شانِ خاص دی ۔

آپ نے عبادات کی مختلف صورتوں کی تشریح عقلی طریق سے کرنے کی کوشش ذیل کی تصنیفوں میں کی : علل العبودیّة (جس کی مذمت کی گئی)، شرح الصلوٰة اور الحج و اسراره ـ اپنی عجیب تصنیف کتاب الفروق میں آپ نے یہ بات ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے کہ حقیقی مترادفات کا وجود نہیں (اس باب میں ان کی رائے نیم معتزلی ہے) - وہ معاینۂ نفس پر مُصر اور بہت بلند اخلاق کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ کتاب الاکیاس [و المغترین] میں وہ نفاق کی مختلف قسموں کی سخت مذمت کرتے ہیں اور اپنے زمانے کے فقہاء کے 'حِیَل' کی بڑے زور و شور سے تردید کرتے ہیں۔

تصوف کی تاریخ میں آپ ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے طبقات صوفیہ پر سب سے پہلی کتاب لکھی، لیکن اس تصنیف کا پتا ہمیں صرف اقتباسات ہی کے ذریعے سے چلتا ہے۔

وہ ابن عربی کے صحیح پیشرو ہیں۔ تین صدی بعد [شیخ اکبر] نے ان کی مصنفات کا غور سے مطالعہ کیا اور انھیں اعجاب و استحسان کی نظر سے دیکھا۔

مآخذ: (۱) هُجویری: کشف المحجوب، طبع ژُکوسکی Shukovski، ۱۹۲۶ء، ص ۱۷۷ تا ۱۷۹ و ۲۶۵ ببعد؛ ترجمۂ نکلسن، ۱۹۱۱ء، ص ۱۴۱ تا ۱۴۲ و ۲۱۰ ببعد؛ [(۲) فریدالدین عطار: تذکرة الاولیاء، طبع نکلسن، ۲: ۹۱ تا ۹۹؛ (۳) جامی: نفحات الانس، طبع کلکته، ص ۱۳۱]؛ (۴) Amedroz: *J.R.A.S.*، ۱۹۱۲ء، ص ۵۸۴؛ (۵) L. Massignon: *Essai sur la mystique musulmane*....، ۱۹۲۲ء، ص ۲۵۶ تا ۲۶۴؛ (۶) وہی مصنف: ....*Textes inédits*، ۱۹۲۹ء، ص ۳۳ تا ۳۹ و زیادات؛ [(۷) براکلمان، ۱: ۱۶۴ و تکمله، ۱: ۳۰۰ ببعد، نیز دیکھیے مقالۂ ترمذ].

(ماسینیون L. MASSIGNON)

التِّرْمذی: ابوعیسی محمد بن عیسی سَورة بن موسی السلمی [بجاے موسی بعض روایات میں سورۃ کے والد کا نام شدّاد ہے اور بعض میں السَّکَن - مستفاد از حاشیۂ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ]؛ صحاح ستہ میں سے ایک صحیح کے مصنف - کلمۂ ترمذی منسوب به ترمذ ہے - یہ شہر آمو دریا کی بالائی گزرگاہ پر، بلخ سے ۶ فرسنگ کے فاصلے پر، واقع ہے (گرینچ سے تقریباً ۳۷ درجے عرض البلد شمالی اور ۶۷ درجے طول البلد مشرق پر؛ قب قزوینی: نزهة القلوب، طبع و ترجمۂ لیسترینج، از نشریات وقفیۂ گب، شماره ۲۳، بامداد اشاریه، بذیل ماده؛ لیسترینج: *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۴۴۰ ببعد و نقشه ۹، مقابل ص ۴۳۳) - اسی جگه ۲۷۹ھ / ۸۹۲ - ۸۹۳ء میں آپ کا وصال ہوا [میزان الاعتدال و شرح الشمائل لملّا علی القاری، مگر سمعانی نے فقط نیف و سبعین و مأتین دیا ہے]۔ دوسرے مآخذ کے مطابق آپ ۲۷۵ھ / ۸۸۸ - ۸۸۹ء میں قریۂ بُوغ میں فوت ہوے [بُوغ قراے ترمذ میں سے تھا اور ترمذ سے چھے فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا (سمعانی و یاقوت: معجم) - اسی قریے سے ان کی نسبت بوغی مأخوذ ہے، یا تو وہ اس قریے سے تھے یا اپنی وفات تک اس میں سکونت پذیر رہے (سمعانی؛ قب یاقوت: معجم)]۔

آپ کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں - کہتے ہیں کہ آپ مادر زاد نابینا تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ اپنی زندگی کے بعد کے دور میں نابینا ہوے - آپ نے خراسان، عراق اور حجاز میں احادیث جمع کرنے کے لیے طویل سفر کیے - البخاری [رکَ بآن] اور . . . . . . ابو داؤد السجستانی [رکَ بآن] آپ کے اساتذه میں سے تھے۔

آپ کی دو تصانیف چھپ چکی ہیں: مجموعۂ احادیث (قاهرة ۱۲۹۲ھ)، دو جلدوں میں، طبع سنگی، میرٹھ ۱۲۸۳ھ ببعد) اور شمائل، جس میں آنحضرت[ص] کی ذاتِ مبارك اور آپ کی صفات کے متعلق احادیث جمع ہیں (طبع قاهرة ۱۳۰۶ھ، متن مع شرح از محمد بن قاسم جسوس

موسومہ الفوائد الجلیلۃ البھیۃ علی الشمائل المحمدیۃ، اور وہیں ۱۳۱۸ھ میں یہ کتاب دو شرحوں کے ساتھ دوبارہ طبع ہوئی، پہلی کا نام الوسائل از علی بن سلطان محمد القاری، دوسری کا مصنف عبدالرؤف المناوی ہے ۔ دیگر طباعتوں اور شروح کے لیے دیکھیے براکلمان : .G. A. L ، ۱ : ۱۶۲ [تکملہ، ۱ : ۲۶۸] ۔ براکلمان محل مذکور میں چہل حدیث کے ایک مجموعے کا بھی ذکر کرتا ہے، مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ آپ ہی کا انتخاب ہے یا دوسرے لوگوں کا ۔ عربی مآخذ میں دوسرے مختلف مضامین، مثلاً زھد، اسماء و کنی، فقہ اور تأریخ پر تصانیف بھی آپ سے منسوب کی گئی ہیں، مگر ان میں سے بظاہر ایک بھی ہم تک نہیں پہنچی ۔

آپ کا مجموعۂ احادیث، طبع قاھرۃ، الصحیح ہی کے نام سے موسوم ہے، مگر دوسرے مقامات پر اس کتاب کو جامع[1] کہا گیا ہے ۔ یہ جامع اس لیے کہلائی (قب Goldziher : .Muhammadanische Stud، ۲ : ۲۳۱، حاشیہ ۲) کہ اس میں فقہی احادیث کے علاوہ دوسرے مضامین کی حدیثیں بھی ہیں ۔ اس کتاب کے ابواب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً نصف کتاب مسائلِ علمِ کلام (قدر، قیامۃ، جنۃ، جہنم، ایمان، قرآن)، معتقدات شائعہ (فتن، رؤیہ)، عبادات (زھد، ثواب القرآن، دعوات)، ترتیب و آداب (استئذان، ادب) اور سیرِ صحابہ (مناقب) سے تعلق رکھتی ہے ۔

اس تصنیف میں بخاری اور مسلم کے مقابلے میں احادیث بہت کم ہیں، مگر تکرار بھی ان سے کم ہے ۔ اس میں دو باب البتہ خاص طور پر وسیع اور مفصل ہیں، یعنی 'مناقب' اور 'تفسیر القرآن'؛ یہ ابواب باقی تین سنن میں مفقود ہیں (سنن کا اطلاق کبھی کبھی احادیث نبویہ کے ان چار مجموعوں پر ہوتا ہے جو ابو داؤد، الترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ نے ترتیب دیے) ۔ جامع ترمذی میں گو ایسی احادیث جو حضرت علی[رض] کے حق میں ہیں، شاذ نہیں، تاہم ان احادیث کی بھی کمی نہیں جو [حضرت] ابوبکر[رض]، عمر[رض] اور عثمان[رض] کے حق میں ہیں ۔

لیکن دو خصوصیات کی بناء پر جامع الترمذی ممتاز ہے : اسناد کے متعلق تنقیدی ملاحظات اور مذاھبِ فقہ کے مواضعِ خلاف کی تفصیل، جو ہر حدیث کے بعد دی ہے ۔ آخری خصوصیت کے لحاظ سے ترمذی کی تصنیف وجوہِ خلاف کے متعلق قدیم ترین کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے ۔ اس موضوع پر شافعی کے ملاحظات کتاب الأم میں نسبۃً کم مکمل ہیں ......

بقول صاحب تقریب، جس کا حوالہ گولڈ تسیہر (.Muhams. Stud، ۲ : ۲۵۲، حاشیہ ۱) نے دیا ہے، مخطوطاتِ سنن ترمذی میں ترمذی کے ملاحظات در باب اسناد (صحیح، حسن، غریب، حسن صحیح، حسن غریب، صحیح غریب) یکساں طور پر درج نہیں ہوے ۔ آپ نے اس بات کی تشریح نہیں کی کہ احادیث کو ایک دوسرے سے اس طرح تمیز کرنا کن اصول پر مبنی ہے ۔ جامع الترمذی کے آغاز میں مکمل سند درج ہے اور اسے اس راوی تک پہنچایا گیا ہے جس سے کتاب مروی ہے اور اس کے خاتمے پر ایک مختصر سا بیان اور دعا ہے ۔

---

(۱) باقی سنن اربعہ کی طرح الترمذی کی کتاب کو السنن بھی کہتے ہیں - متقدمین نے اسے کبھی کبھی الجامع الصحیح بھی کہا ہے - الحاکم صاحب المستدرک وغیرہ نے اسے یہی نام دیا ہے—حاشیہ از دائرۃ المعارف الاسلامیۃ .

مآخذ : (۱) ابن ندیم : الفہرست، ص ۳۲۵؛ (۲) السمعانی : کتاب الأنساب، از نشریات وقفۂ گب، ۲۰ : ۱۰۶ الف؛ (۳) الحازمی : شروط الائمة الخمسة، مطبوع؛ (۴) ابن خلّکان : وفیات الاعیان، طبع ویسٹنفلٹ، عدد ۶۲۴؛ (۵) ابن اثیر : الکامل، ۷ : ۱۶۴ تا ۱۶۵؛ [(۶) ولی الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب : اکمال فی اسماء الرجال، لاہور ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء، ص ۱۰۳]؛ (۷) المِزّی، الحافظ : تہذیب الکمال (مصر کے دار الکتب کا قلمی نسخہ)؛ (۸) الصلاح الصفدی: نُکت الھمیان، ص ۲۶۴ تا ۲۶۵؛ (۹) ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب (حیدر آباد ۱۳۲۶ھ)، ۹ : ۳۸۷ تا ۳۸۹، عدد ۶۳۲؛ (۱۰) وہی مصنف : تقریب التہذیب، طبع سنگی، دہلی، بدون تاریخ، ص ۲۳۰؛ (۱۱) ابن عماد : شذرات الذہب، ۲ : ۱۷۴ تا ۱۷۵؛ (۱۲) ابن تغری بردی : النجوم الزاہرۃ، ۳ : ۸۱ تا ۸۲؛ (۱۳) الذہبی : طبقات الحفّاظ، طبع ویسٹنفلٹ، ۲ : ۵۷، عدد ۳؛ (۱۴) وہی مصنف : میزان الاعتدال، قاہرۃ ۱۳۲۵ھ؛ ۳ : ۱۱۷، عدد ۱۰۲۱؛ (۱۵) طاش کپری زادہ : مفتاح السعادۃ، ۲ : ۱۱؛ (۱۶) حاجی خلیفہ : کشف الظنون، ۱ : ۵۵۷؛ (۱۷) قاضی ابوبکر [محمد ابن العربی : عارضۃ الأحوذی، ۱ : ۵ تا ۶؛ (۱۸) المقدسی، حافظ ابوالفضل : شروط الأئمة اصحاب الکتب الستة، قلمی نسخہ؛ (۱۹) ابن خطیب الدَّہْشَة : تحفة ذوی الأرَب، طبع مان T. Mann، ص ۱۳۳؛ [(۲۰) شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ : بستان المحدّثین (تاریخ طباعت ندارد)، ص ۱۰۸]؛ (۲۱) احمد محمد شاکر : مقدمہ شرح الترمذی؛ (۲۲) گولٹ تسیہر : *Muhammedanische Studien*، ۲ : ۲۵۰ ببعد؛ [(۲۳) براکلمان : *G. A. L.*، ۱ : ۱۶۱ ببعد و *G. A. L. S.*، ۱ : ۲۶۷ ببعد].

(ونسنک A. J. WENSINCK و احمد محمد شاکر
در دائرۃ المعارف الاسلامیة)

تِرْمِذی : سیّد برہان‌الدین صوفی، جو سید حسین ترمذی، سید سِرّدان، یا برہان‌الدّین محقق کے ناموں سے بھی مشہور ہیں۔ آپ ترمذ کے باشندے اور مولانا بہاءالدین وَلَد کے مرید تھے۔ کچھ عرصہ مولانا ممدوح سے استفادۂ علوم کے بعد آپ بڑی مدت تک ریاضت اور مجاہدے میں مشغول رہے اور آخرکار ترمذ ہی میں آباد ہوگئے، جہاں آپ کے پاس بہت سے ارادتمند جمع ہو گئے۔ قونیہ میں بہاءالدین وَلَد نے وفات پائی (۶۲۸ھ / ۱۲۳۱ء) تو ۶۲۹ ـ ۶۳۰ھ میں آپ قونیہ چلے گئے، کیونکہ آپ کو اپنے پیر و مرشد کی جانب سے روحانی طور پر یہی اشارہ ہوا تھا؛ وہاں پہنچ کر آپ نے نوعمر جلال‌الدین رومی کی تعلیم و تربیتِ روحانی اپنے ہاتھ میں لے لی، جو اس وقت فقہ و ادب کی تحصیل میں مصروف تھے۔ نو برس کے بعد مولانا جلال‌الدین کی منت سماجت کے باوجود آپ قیصریہ میں جا کر معتکف ہو گئے۔ آپ کے تراجم سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب مغولوں نے قیصریہ فتح کر کے وہاں قتل عام کیا تو آپ وہیں موجود تھے۔ منجّم باشی نے جامع‌الدّول میں لکھا ہے (دیکھیے مخطوطات، عدد ۵۰۱۹ اور ۵۰۲۰ در ''کتاب خانۂ عمومی'') کہ یہ واقعہ ۶۴۱ھ [۱۲۴۳ء] کا ہے؛ اس واقعے کی تفصیل کے لیے قب *Recueil de textes rel. à l' histoire des Seldj.*، طبع ہوتسما Houtsma، ۴ : ۲۴۱)۔ شمس‌الدین اصفہانی نے، جو سلجوقیوں کی طرف سے قیصریہ کا والی اور سید برہان‌الدین کا معاون و مرید تھا، آپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور اسی نے آپ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔ ہمیں نہ تو آپ کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم ہے، نہ ہم تاریخ وفات ہی صحت کے ساتھ معیّن کر سکتے ہیں۔ اولیا چلبی لکھتا ہے کہ سیّد موصوف کا

'مقام' قیصریه میں تھا اور آپ کا انتقال ۷۴۳ھ میں ہوا، جو صریحاً غلط ہے ۔ آج کل قونیه میں 'تاتار خانی لرتربه سی' کے قریب ایک اور 'تربه' ہے جسے 'برہان‌الدین تربه سی' کہتے ہیں؛ اسے ہمیشه سیّد برہان‌الدین ترمذی ہی کا مزار سمجھا جاتا رہا ہے، گو اس پر کوئی کتبه موجود نہیں ہے ۔ دولت شاہ، جو برہان‌الدین محقق کو بہاءالدین اور مولانا (روم) کا شیخ سمجھتا ہے، لکھتا ہے که آپ ملک شام کی سیاحت اور سفرِ حجاز میں ان دونوں کے ہمراہ تھے اور آپ نے ملک شام میں وفات پائی [دولت شاہ کے بیان سے قیاساً معلوم ہوتا ہے که آپ کو شام ہی میں دفن کیا گیا]، مگر یه باتیں واقعات کے خلاف ہیں (دولت شاہ، طبع براؤن، ص ۱۹۳؛ طبع بمبئی، ص ۲۸۶ اور فہیم : سفینة الشعراء [بحوالۂ دولت شاہ]، قسطنطنیه مطبعۂ عامرہ ۱۲۵۹ھ، ص ۸۲) ۔ سیّد برہان‌الدین ترمذی کی شہرت بالخصوص اس شان کی وجه سے ہے جو فرقۂ مولویه کی روایات میں انہیں حاصل ہے، اس لحاظ سے ہمیں آپ کے متعلق قابل اعتماد معلومات حاصل کرنے کے لیے سپه سالار مناقبی اور افلاکی مناقبی جیسی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جو سلسلۂ مولویه کے بارے میں سب سے قدیم اور اہم مصادر ہیں ۔

مآخذ : (ان کتابوں کے علاوہ جو متن میں درج ہو چکی ہیں) : (۱) فریدون بن احمد سپه سالار : مناقب حضرت خداوندگار، ترکی ترجمه، طبع ۱۳۳۱ھ، ص ۱۰۹ تا ۱۶۳؛ (۲) افلاکی : مناقب العارفین، فارسی مخطوطه؛ (۳) وہی مصنف : ترجمۂ ترکی از محمود دده، مخطوطه، باب ۲ (فارسی متن اور ترکی ترجمه دونوں کے خطّی نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں، [نیز دیکھیے فارسی ایڈیشن، آگرہ ۱۸۹۷ع]؛ (۴) وہی مصنف : فرانسیسی ترجمه از Cl. Huart : *Les Saints des derwiches tourneurs*، پیرس ۱۹۱۸ء، اشاریه؛ (۵) لامعی : ترجمۂ نفحات الانس، ص ۵۰۵ تا ۵۱۶؛ (۶) اولیا چلبی : سیاحت نامه، در سعادت ۱۳۱۴ھ، ۳ : ۱۸۶؛ (۷) خلیل ادہم : قیصریه شہری، قسطنطنیه ۱۳۳۴ھ، ص ۱۱۸؛ (۸) کوپرولو زادہ فؤاد : ایلک متصوفلر، قسطنطنیه ۱۹۱۸ء، ص ۲۳۵ ۔

(کوپرولو زادہ فؤاد KÖPRÜLÜ ZĀDE FU'ĀD)

ترمذی : سید علی، کبروی (مشہور به پیر بابا)، صوبۂ سرحد کے مشہور اولیاء الله میں سے ہیں ۔ ان کا نسب یه ہے : سید علی ولد قنبر علی (امیر نظر بہادر) ولد سید احمد نور ولد سید یوسف نور ولد سید محمد نور بخش ۔ وہ اصلاً ترمذ کے سادات میں سے تھے ۔ بقول ملّا درویزہ یہی محمد نور بخش امیر تیمور کے خواہر زادگان میں سے تھے ۔ اس سلسلے کے تمام بزرگ تیموری بادشاہوں سے دوستی کے تعلقات رکھتے تھے ۔ پیر بابا، یعنی سید علی، کا اپنا قول یه ہے که ان کے دادا سید احمد نور اپنے کنبے کے ساتھ ترمذ (ماوراء النہر) سے ولایت قطغن (افغانستان) کے شہر قندز میں آئے اور وہیں ۹۰۰ھ کے بعد سید علی پیدا ہوے ۔ انہوں نے قندز ہی میں اپنے دادا کے زیر تربیت پرورش پائی اور [تحصیل علم کی]، چنانچه شرح ملا جامی تک نصاب کی کتابیں اپنے دادا ہی سے پڑھیں، لیکن ان کے والد ہمایوں پادشاہ کے ساتھ ہندوستان چلے گئے اور سید علی کو اس سفر میں اپنے ساتھ لے گئے (نواح ۹۶۲ھ) [اسی زمانے میں وہ شیخ شرف‌الدین پانی پتی کے مزار پر پہنچے اور بہت متأثر ہوے]، پھر آپ ہندوستان کے علماء و صلحاء کی صحبت میں رہے، [بلدتین فاخرتین پرگنۂ مانک پور میں پہنچے اور] شیخ سلونه سے تعلیم پائی اور طریقت کے اسرار حاصل کیے ۔ ہدایه تک فقه کا درس بھی انہیں سے حاصل کیا، ازاں بعد آپ

زیادات و تصحیحات

ص ۱۷۲، عمود ۱، س ۳ کے بعد پڑھیے :

تحسین : تحسین اٹاوے کے رہنے والے اور رضوی سادات کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ ان کے گھرانے کو انگریزوں کا اعتماد حاصل تھا اور ان کے دادا سے لے کر پوتے تک سب انگریز حکّام کے ہاں ملازم رہے۔ شاعری اور تصنیف و تالیف کا شوق انھیں ورثے میں ملا تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد انھوں نے ۱۷۶۸ء میں جنرل رچرڈ سمتھ کی معیت میں الٰہ آباد سے کلکتے تک دریاے گنگا کا سفر کیا۔ اس جنرل کا شمالی ہند میں بڑا اثر و رسوخ تھا اور شاہ عالم کے دربار سے اسے زر کثیر اور خطابات بھی عطا ہوے تھے۔ ایک سال بعد سمتھ جب وطن واپس جانے لگا تو تحسین کی سفارش کرتا گیا اور انھیں پٹنے میں مقدمات نظامت کی مختاری مل گئی، لیکن وہاں وہ زیادہ عرصہ نہ ٹک سکے۔ عمادالسعادت میں لکھا ہے کہ وہ ۱۷۷۲ء میں فیض آباد کے ریزیڈنٹ کپتان ہارپر کی ملازمت میں تھے۔ ہارپر کے وسیلے سے ان کی رسائی شجاع الدولہ تک ہو گئی اور اس طرح وہ دربارِ اودھ سے منسلک ہو گئے۔ ان کی تاریخ وفات یقینی طور پر معلوم نہیں۔

تصنیفات : (۱) تحسین کو نظم و نثر دونوں کا ملکہ تھا۔ وہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی۔ شاعر کی حیثیت سے انھیں اپنے عہد میں خاصی شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور ان کا شمار ''بسیارگو و پُرگو'' شعراء میں ہونے لگا، لیکن ان کے کلام کا صرف وہی حصہ ہم تک پہنچا ہے جو نو طرزِ مرصّع میں محفوظ رہ گیا ہے۔

(۲) نو طرزِ مرصّع دبستانِ لکھنؤ کی نثر کا سب سے پہلا نمونہ ہے۔ اس ''ایجادِ تازہ'' کی تحریک انھیں ۱۷۶۸ء ہی میں ہو چکی تھی، بلکہ حقیقت میں نو طرزِ مرصع کا ابتدائی جزء انھوں نے اسی سال لکھ لیا تھا۔ اس کے بعد شاید انھیں ماحول سازگار نہ ملا جو اس کی تالیف کا سلسلہ جاری رکھتے، لیکن اس کی لگن دل میں لیے جب وہ نواب شجاع الدولہ کے دربار میں پہنچے تو نواب نے ان کی ہمت افزائی کی اور انھوں نے ۱۷۷۵ء سے پہلے پہلے اپنی کتاب کا بیشتر حصہ مکمل کر لیا، تاہم انھیں اسے نواب کی نذر کرنے کا موقع نہ ملا؛ نواب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند آصف الدولہ کو یہ کتاب پیش کی گئی۔

تحسین کے اپنے بیان کے بموجب نو طرزِ مرصع کا مأخذ وہ کہانیاں ہیں جو انھوں نے گنگا کے سفر میں اپنے ایک دوست کی زبانی سنی تھیں، لیکن شواہد سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا اصل مأخذ قصۂ چہار درویش (فارسی) ہے۔ اس قصے کا مصنف کون تھا؟ عام طور پر اسے حضرت امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے، لیکن اس کے طرزِ بیان اور دوسرے متعدد شواہد سے اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ اس کے مصنف حضرت امیر خسرو نہیں ہو سکتے (ملاحظہ کیجیے مقالات شیرانی، نیز مادہ امّن، میر)۔ انگلستان میں قصۂ مذکور کے نو قدیم قلمی نسخے مرحوم پروفیسر سید سجّاد کی نظر سے گذرے، جن میں برٹش میوزیم کا نسخہ شمارہ ۵۲۲۳ اور نسخہ شمارہ ۶۷۷۲، نیز بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ کا نسخہ شمارہ ۳۴۳ شامل ہیں۔ ان تمام نسخوں سے حکیم محمد علی معصوم کے حق میں کوئی معتبر شہادت نہ مل سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معصوم نے ہندی قصۂ چہار درویش کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، لیکن اس کا

ترجمۂ تحسین کی نو طرز مرصع کا مأخذ نہیں ہے ۔ اس کا اصل مأخذ برٹش میوزیم کا نسخہ شمارہ ۵۲۲۳ یا اس سے ملتا جلتا کوئی نسخہ ہے ۔ اس نسخے میں نہ صرف ترتیب قصص وهی ہے جو تحسین کے ہاں ملتی ہے، بلکہ انھوں نے اس کے اندازِ بیان کا بھی تتبّع کیا ہے اور جگہ جگہ محض اس کے فقروں کے لفظی ترجمے پر اکتفا کی ہے ۔ یہ نسخہ غالباً اٹھارھویں صدی کے ابتدائی دور میں لکھا گیا ہے ۔ اس کی زبان اور حسنِ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی ایرانی کی تصنیف ہے (ڈاکٹر نور الحسن هاشمی اور ڈاکٹر گیان چند جین کے نزدیک بھی معصوم کی حیثیت مشتبہ ہے، لیکن ایک قدیم قلمی نسخے کی روشنی میں، جس کا حوالہ سر ولیم اوزلے Ousley اور شپرنگر نے بھی دیا ہے اور جس کا مصنف معصوم ھی ہے، یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نوطرز کا مأخذ معصوم کا قصۂ چہار درویش ہے) ۔ بدیع الاثر حاجی ربیع مغربی المتخلص بہ انجب کے حالات اور قصے میں فرنگی عنصر سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ تحسین کے مأخذ کے ایک مصنف وہ بھی ہو سکتے ہیں ۔

نو طرزِ مرصّع کا ایک اهم پہلو یہ بھی ہے کہ میر امّن دهلوی نے اپنی مشہور کتاب باغ و بہار کی تالیف میں اس سے استفادہ کیا ہے ۔ اگرچہ باغ و بہار میں زیادہ تر اس فارسی قصۂ چہار درویش کا تتبّع ملتا ہے جو برٹش میوزیم میں شمارہ ۶۸۸۷ پر ہے ۔

نو طرز مرصّع کے متعدد قلمی نسخے یورپ کے کتاب خانوں میں ھیں : دو برٹش میوزیم میں، ایک غیر مستعمل نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں اور ایک ۱۲۰۵ھ کا مکمل اور نہایت عمدہ نسخہ Preussische Staatsbibliothek برلین میں ۔

۱۸۴۶ء کے مطبوعہ نسخے اور مذکورۂ بالا قلمی نسخوں کی مدد سے پروفیسر سجّاد نے ایک اڈیشن مرتب کیا جو طباعت کے لیے تیار ہے ۔ قصۂ مذکورہ، جو مطبوعہ نسخے میں نہ تھا، اس اڈیشن میں برلین کے نسخے سے مع تصاویر درج کیا گیا ہے۔

طباعتیں (اڈیشن) : یہ کتاب مطبع فضل الدین کھمکر، بمبئی ۱۸۴۶ء میں چھپی ۔ صفحات ۲۱۶ ۔ اس میں خواجۂ سگ پرست کا قصہ شامل نہیں ۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر سجّاد کے اور دوسرا (بروایت ڈاکٹر نورالحسن هاشمی) انجمن ترقی اردو، دهلی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے ۔

ڈاکٹر نورالحسن هاشمی نے بمبئی کے مطبوعہ نسخے اور لکھنئو کے مختلف کتاب خانوں کے سات قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے اپنا اڈیشن مرتب کیا ہے (طبع هندوستانی اکیڈمی، الٰہ آباد ۱۹۵۸ء) .

مآخذ : (۱) حافظ محمود شیرانی : مقالات شیرانی، لاهور ۱۹۴۸ء، ص ۴۲ تا ۵۸؛ (۲) سید سجّاد دهلوی: ڈاکٹر کی ڈگری کے لیے مقالہ (انگریزی)، برائے لنڈن یونیورسٹی، ۱۹۳۰ء؛ (۳) مصنف مذکور : (نو طرز مرصع کی تاریخ تصنیف کی بحث) در اسلامک کلچر، حیدر آباد ۱۹۳۹ء؛ (۴) مصنف مذکور: نو طرزِ مرصّع (اڈیشن، مسودہ بالفعل اکادمی پنجاب، لاهور کے پاس ہے)؛ (۵) سید نورالحسن هاشمی : نو طرز مرصع، الٰہ آباد ۱۹۵۸ء؛ (۶) گیان چند جین : اردو کی نثری داستانیں (انجمن ترقی اردو، پاکستان)، کراچی ۱۹۵۴ء؛ (۷) خیراتی لال بے جگر : تذکرہ (رک بہ بلوم هارٹ: فہرست مخطوطات انڈیا آفس، شمارہ ۶۴).

(سید ذاکر اعجاز)

نے [اجمیر میں سراج الدین] شیخ سالارِ رومی ["صاحب اجمیر"] سے استفادہ کیا اور تصوف و سلوک میں مصروف ہوے، حتّٰی کہ شیخ مذکور نے انھیں طریقۂ کبرویہ چشتیہ میں بیعت لینے کی اجازت مرحمت فرما دی اور نصیحت کی کہ لوگوں کی ہدایت کے لیے کوہستان جاؤ [یہ کشمیر کو روانہ ہوے ۔ کچھ عرصہ گجرات کے ایک گاؤں میں ٹھہرے ۔ شیر شاہ سے شکست کھا کر ہمایوں ادھر سے گذرا تو سید علی کی ملاقات اپنے باپ سے ہوئی ۔ سید علی پیر کی زیارت کے لیے روانہ ہوے، مگر وہ فوت ہوچکے تھے] ۔ یہ روایت کہ کوہستان جانے کی نصیحت انھیں پیر نے کی ان کے شاگرد اخوند درویزہ نے خود ان کے قول کے طور پر تذکرۃ الابرار و مخزن اسلامی میں درج کی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کے عہد میں پیر بابا نے پشاور اور کوھسار افغانان اور اَشْنَغر میں سوات و باجوڑ تک بہت اثر و رسوخ حاصل کر لیا ۔ یہی واحد بزرگ تھے کہ مغل دربار کی طرفداری میں بایزید انصاری [رکِ بآن] المعروف بہ پیر روشان=روشن کا مقابلہ کرتے رہے ۔ اکبر کے عہد کے ابتدائی ایام میں ۹۶۵ھ کے قریب سید علی ہندوستان سے پشاور کے شمالی علاقے کی طرف واپس آگئے تھے ۔ آپ نے دولت زی، یوسف زی قوم کے ایک بڑے مَلک کی بہن کو حبالۂ نکاح میں لے لیا ۔ یہی رشتہ داری ان کے اثر و رسوخ کو ترقی دینے کا موجب بنی ۔ پیر بابا نے سوات سے لے کر وزیرستان تک تبلیغ کرنے کے لیے اپنے مرید پھیلا دیے اور پیر روشن بایزید کی تکفیر اور ناکامی کے لیے تمام افغانوں میں کوشش کی اور تیس سال اسی کام میں صرف کر دیے ۔ اس کام میں انھیں دربار دھلی کی طرف سے بھی کمک ملتی تھی ۔ شیخ درویزہ کے قول کے مطابق آپ نے (۹۹۱ھ میں) پشاور کے شمال کے پہاڑوں (یعنی بُنیر کے علاقے) میں وفات پائی اور وھیں مدفون ہوے ۔ ان کا مزار اب تک مشہور انام ہے ۔ افغان لوگ افغانستان اور بلوچستان کے دُور دُور کے علاقوں سے ان کے مزار کی زیارت کے لیے آتے ہیں ۔ ان کے مشہور اور نامی گرامی مریدوں میں سے ایک اخوند درویزہ [رکِ بآن] پشاوری [اور ان کے بیٹے شیخ عبدالکریم] ہیں ۔ افغانستان کے علاقۂ کُنَر کے سادات (کہ سید جمال الدین افغانی بھی انھیں میں سے تھے) اپنے آپ کو انھیں سید علی ترمذی کی اولاد بتاتے ہیں [ان کے فرزند جناب مصطفٰے ان کے جانشین ہوے، تذکرۃ الابرار، ورق ۷۱ ب] ۔

مآخذ : (۱) اخوند درویزہ: تذکرۃ الابرار والاشرار، پشاور ۱۳۰۸ھ (نسخۂ خطی، در دانش گاہ پنجاب، خصوصاً ۷ ب ببعد)؛ (۲) اخوند درویزہ : مخزن اسلامی، پشتو مخطوطہ؛ (۳) عبیداللہ خویشگی : معارج الولایۃ، مجموعۂ آذر، در دانش گاہ پنجاب، ص ۳۳۹)؛ (۴) عبد الحی حبیبی : تاریخ ادب پشتو، ج ۲ کابل ۱۹۵۰ء؛ (۵) صدیق اللہ : مختصر تاریخ ادب پشتو، کابل ۱۹۳۶ء؛ (۶) میر احمد شاہ رضوانی : تحفۃ الاولیاء، لاھور ۱۳۲۱ھ؛ (۷) عبد الحی حبیبی : پشتانہ شعراء، ج ۱، کابل ۱۹۴۰ء؛ (۸) مفتی غلام سرور لاھوری : خزینۃ الاصفیاء (لاھور ۱۲۸۴ھ، ص ۳۶۱، بذیل چشتیہ)؛ (۹) قیام الدین خادم : نثر پشتو، مقالہ در سالنامۂ کابل، از نشریات اکادمی افغان، طبع کابل؛ (۱۰) عبد الحی حبیبی : افغانستان در عصر تیموریانِ ہند، غیر مطبوع؛ (۱۱) عبد الحی حبیبی : تاریخچۂ شعر پشتو، قندھار ۱۹۳۵ء ۔

(عبدالحی حبیبی افغانی)

ترناتہ : Ternate، ھَلْمَھیرا Halmahera کے مغرب میں چھوٹا سا بُرکانی یا آتش فشانی جزیرہ، جو مجمع الجزائر ملایا کے مشرق میں واقع ہے ۔ اداری نقطۂ نظر سے یہ جزیرہ اور کئی دوسرے

چھوٹے چھوٹے جزیرے اور جزیروں کے گروہ سب کے سب ریزیڈنسی (مقیمیۂ) ترناته کی ایک سب ڈویژن (زیر قسمت) ہیں اور مُلَقّا Moluccas کی عملداری میں شامل ہیں۔ اس جزیرے کا صرف ایک حصه [سابق] ڈچ ایسٹ انڈین گورنمنٹ، یعنی شرق الہند کی ولندیزی حکومت، کے زیر نگین [تھا - اس زمانے میں] باقی حصه ترناته کی خود مختار ریاست سے متعلق [تھا]، جس میں ہَلْمَہیرا کے متعدد حصے، مجمع الجزائر سُولُو Sulu اور چند دوسرے جزیرے بھی شامل [تھے] - زمانۂ قدیم ہی سے مسالوں کی تجارت کے سلسلے میں دوسرے ملکوں کے لوگ یہاں آتے رہے ہیں - اس لیے یہاں کی آبادی بڑی مخلوط ہے، خصوصاً اس علاقے کی جو ولندیزوں کی حکومت میں [تھا]؛ آبادی کا بڑا حصه شمالی ہَلْمَہیرا کی مقامی آبادی سے بہت مشابہت رکھتا ہے - زندگی کا معیار بلند نہیں ہے، ایک حد تک اس لیے که یہاں کے اصلی باشندے محنت پسند نہیں ہیں - ان کا گذارہ زیادہ تر ماہی گیری یا محض ابتدائی قسم کی کاشتکاری پر ہے - ترناتی (Ternatan) مجمع الجزائر ملقا کی مشترک زبان ہے - یه زبان شمالی ہَلْمَہیرا کی (غیر انڈونیشی) زبانوں کے گروہ میں شامل ہے اور یوں کہنا چاہیے که اس گروہ کا ایک بگڑا ہوا اور پست سا نمونه ہے۔

ان علاقوں کی قدیم تاریخ کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں - جس دَور میں ہمارے علم میں کچھ اضافه ہونے لگا اس دَور میں مجمع الجزائر کا شمال مشرقی گوشه چار مملکتوں میں منقسم تھا: ترناته (اُس وقت اس کا نام گاپی Gapi تھا)، جَیْلُوْلُو، تِدُورے اور بَتْجان Batjan- ان مملکتوں کا آپس میں کچھ نه کچھ تعلق ضرور ہوگا؛ از روے روایت یه مملکتیں دراصل ایک ہی مملکت میں شامل تھیں، لیکن معلوم ہوتا ہے که وہ ہمیشه آپس میں بر سر پیکار رہیں - جَیْلُوْلُو کو اول اول قدرے غلبه حاصل رہا، لیکن بعد ازاں اسے ترناته کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا - پندرھویں اور سولھویں صدی میں بالخصوص ترناته توسیعِ اقتدار کے لیے بہت خواہشمند نظر آتا ہے - یہاں اسلام کب پھیلا اور کس طریقے سے پھیلا، اس بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں اور وہ بھی ناقابل اعتماد - ایک روایت کے مطابق جاوہ کے ایک سوداگر نے، جس کا نام حسین (پاداتومولا حسین) تھا، ترناته میں اسلام کی تبلیغ کی - یه قدیم زمانے کا ذکر ہے جب یہاں (۱۴۶۵-۱۴۸٦ء میں) کَیْتجِل گاپی بَگُونا کی (جیسے 'مرحوم' بھی کہتے ہیں) حکومت تھی - یه بھی کہا جاتا ہے که حسین بادشاہ کو مسلمان کر لینے میں کامیاب ہو گیا، مگر مقامی تاریخی کتابوں میں یه بادشاہ ترناته کے مسلمان بادشاہوں میں شمار نہیں ہوتا، جن کا سلسله اس کے بیٹے زین العابدین (۱۴۸٦-۱۴۹۵ء؟) سے شروع ہوتا ہے۔ اسی نے سب سے پہلے 'کولانُو' کا قدیم لقب چھوڑ کر سلطان کا لقب اختیار کیا - کہتے ہیں که اس کی ساری رعایا مسلمان ہو گئی - یه بھی کہا جاتا ہے که اس نے جاوہ کا سفر اس مقصد سے کیا تھا که شہر گیری Giri میں جا کر اصولِ اسلام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرے - اب یہاں اسلام اسی شکل میں مروّج ہے جیسا انڈونیشیا کے دیگر حصوں میں؛ بہت سی پرانی غیر اسلامی رسوم اب بھی رائج ہیں، لیکن اسلام کے بڑے بڑے احکام کی، بالخصوص سلطان کے حاشیه نشینوں میں، نسبةً صحیح طور پر پابندی کی جاتی ہے، مگر مذہب کے معاملے میں یہاں تعصب کو مطلق دخل نہیں۔

یورپی اقوام میں سب سے پہلے پرتگیزوں نے (سولھویں صدی کے آغاز میں) ترناته سے عہد نامه کیا؛ جب سترھویں صدی کی ابتداء میں ولندیزی مُلقّا میں آ دھمکے، تو ان میں اور ھسپانویوں اور پرتگیزوں میں مسلسل کشمکش شروع ہو گئی؛ ۱۶۸۳ء میں ترناته نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تسلیم کر لی۔ ۱۹۱۵ء میں سلطان وقت کو اس کی غیر وفادارانه روش کی بنا پر تاج و تخت سے محروم کر دیا گیا؛ اس وقت سے خود مختار علاقے کی حکومت ایک مجلس شُوریٰ کے ھاتھ میں رھی [دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ترناته پر جاپانیوں کا قبضه ہو گیا تھا۔ جب انڈونیشیا کی جمہوریت قائم ہوئی تو یه مشرقی انڈونیشیا کا حصه بن گیا۔ *Everyman's Encyclopaedia*، طبع سوم (۱۹۴۹-۱۹۵۰ء)، ج ۱۲: ص ۲۴۴ کی رو سے اس جزیرے کا کل رقبه ۱٬۱۵٬۹۰۰ مربع میل ھے اور آبادی ۹۴٬۰۰۰؛ شہر ترناته کی آبادی ۸۷٬۳۰۰ ھے]۔

مآخذ: (۱) ترناته کا مفصل حال T. S. A. de Clercq: *Bijdragen tot de kennis der residentie Ternate*، لائڈن ۱۸۹۰ء میں درج ہے؛ نیز دیکھیے: (۲) *Legende en geschiedenis van Ternate*، در *Tijdschrift van het Binnenlandsch Bestuur*، ۵۱: ۳۱۰۔

(W. H. RASSERS)

تَرْوِیَۃ: ذوالحجه کی آٹھویں تاریخ کو یوم التَّرْوِیَة کہتے ھیں، ترویة کے لغوی معنی سیراب کرنے اور پانی فراھم کرنے کے ھیں (لسان: تحت مادۂ روی)۔ اس دن کو یوم الترویه اس لیے کہتے ھیں که اس روز حُجّاج مکۂ معظمه میں نمازِ فجر پڑھنے کے بعد احرام باندھ کر (جنھوں نے اس سے قبل احرام نه باندھا ہو) بعد طلوعِ آفتاب منٰی کی طرف روانه ہوتے ھیں اور چونکه وھاں اور عرفات میں پانی نہیں ملتا اس لیے وہ اپنے اونٹوں کو خوب سیراب کر لیتے اور خود اپنے لیے بھی مشکیزوں میں پانی بھر لیتے ھیں، یوم الترویه کے نام کی اَور بھی توجیہیں کی گئی ھیں؛ مثلاً یه که حضرت جبریل[ؑ] نے ابراھیم علیه السلام کو اس روز مناسکِ حج دکھائے تھے (گویا یه رؤیة سے مشتق ھے)، یا یه که اس کا تعلق حضرت ابراھیم[ؑ] کے اس رؤیا سے ھے جس میں آپ نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیه السلام کو الله تعالٰی کی راہ میں قربان کرتے ہوے دیکھا تھا (حاشیة ابن حجر الھَیْتمی، بر النووی: کتاب الایضاح فی مناسک الحج، ص ۱۳۴ تا ۱۳۵)؛ لیکن لغوی اعتبار سے پہلی وجه تسمیه ھی صحیح ھے۔ اس دن کو یومُ النَّقْلَة بھی کہتے ھیں، کیونکه اس روز حجاج مِنٰی کی طرف کوچ کرتے ھیں (وھی مصنف)۔

اس روز کے معمولاتِ حج میں سے علاوہ احرام باندھنے اور منٰی کی طرف روانگی کے، جن کا ذکر اوپر ہوچکا، یه ھے که حُجّاج منٰی میں پہنچ کر مسجد خَیْف کے قریب ٹھہریں اور مسنون ھے که یہاں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں اور رات یہاں بسر کریں۔ یه واجباتِ حج نہیں ھیں۔ اگر کوئی ایسا نه کرے تو کوئی مؤاخذہ نہیں، ھاں وہ سنت کے ثواب سے محروم ہوگا۔ رات بسر کر کے دوسرے روز، یعنی ۹ ذُوالحجه (یوم عَرَفه) کو حُجّاج بعد نماز فجر عرفات کی طرف روانه ہوتے ھیں اور یوم عَرَفَة کے معمولات ادا کرنے میں مصروف ہوجاتے ھیں۔

مآخذ: (۱) لسان العرب، ۱۹: ۶۵؛ (۲) تاج العروس، ۲۰: ۱۵۹؛ (۳) ابن الاثیر: نہایة، ۲: ۱۱۳؛ (۴) لین، ص ۱۱۹۵؛ (۵) R. Dozy: *Die Israeliten zu Mekka. Aus dem Holländischen*

übersetzt، لائپزگ - ہارلم ۱۸۶۳ء، ص ۱۱۰ تا ۱۱۵ (عبرانی سے جو تشریح پیش کی گئی ہے اسے اب قابل قبول نہیں سمجھا جاتا)؛ (۶) هوتسما Houtsma : *Het Skopelisme en het Steenwerpen te Mina* (*Verslagen en Mededeelingen der Konink-lijke Akademie van Wetenschappen*، Afdeeling Letterkunde، Reeks ۴، Deel ۶، ۱۹۰۴ء، ص ۱۸۵ تا ۲۱۷)، ص ۲۱۱ ببعد؛ (۷) Snouck Hurgronje : *Het Mekkaansche Feest*، لائڈن ۱۸۸۰ء (*Verspreide Geschriften*، ۱ : ۱ ببعد)، ص ۱۲۶ تا ۱۲۸؛ (۸) A. J. Wensinck در *Acta Orientalia*، ج ۱، ۱۹۲۳ء: ص ۱۶۳؛ (۹) وہی مصنف : *Arabic New-Year and the Feast of Tabernacles* (*Verh. A. W. Amsterdam*، N. R. Letterk.، ۲۵ : ۲)، ایمسٹرڈم ۱۹۲۵ء، ص ۲۸ : (۱۰) Gaudefroy-Demombynes : *Le pèlerinage à la Mekka*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۰۱ و ۲۳۶ اور حاشیہ ۴، نیز ص ۸۳ تا ۸۵، ۸۸؛ (۱۱) W. R. Smith : *Lectures on the Religion of the Semites*، طبع سوم، ۱۹۲۷ء، ص ۲۳۱ ببعد؛ (۱۲) ابن جبیر : رحلة، ص ۱۳۹ ببعد؛ (۱۳) محمد لبیب البَتَنُونی : الرحلة الحجازیة، طبع اول، ص ۱۰۴ (طبع دوم، ص ۱۲۷)؛ (۱۴) ابراهیم رفعت پاشا: مرآة الحرمین، قاهرة ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء، ۱ : ۳۵، ۳۱۳؛ (۱۵) النَّوَوی : کتاب الایضاح فی مناسک الحج و حاشیة ابن حجر الهَیْتَمی علی الایضاح، (مصر ۱۳۲۳ھ)؛ (۱۶) غزالی : احیاء العلوم، ج ۱ (کتاب اسرار الحج)).

(R. Paret و عابد احمد علی)

تَری : ایک طلائی سکّہ، چوتھائی دینار - جب فاطمیون نے چوتھی (دسویں) صدی کے دوسرے دھا میں صقلیه (سسلی) فتح کیا تو انھوں نے چوتھائی دینار (رُبع) خاصی تعداد میں مضروب کرائے۔ اسلامی سکّوں میں اس رقم کا سکّہ ایک نئی چیز تھی اور چونکہ اسی قسم کا سکہ فاطمیوں نے ملک شام میں بھی رائج کیا اس سے خیال ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ بوزنطی سکہ تْرِیمِسّس *tremissis* کے بجائے اسے جاری کیا جائے - اس سکّے کا رواج نارمنی امراء (Norman Dukes) نے بھی، جو فاطمیہ کے جانشین ہوئے، جاری رکھا - تری، اطالوی سکّہ بھی تھا جو یہاں زیر بحث نہیں؛ اطالوی سکّے کی تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو مارٹینوری E. Martinori کی کتاب: *La Moneta, Vocabolario Generale*، روما ۱۹۱۵ء، بذیل مادۂ *tareno* - اس لفظ کا کوئی تسلی بخش اشتقاق اب تک کسی نے پیش نہیں کیا، مگر جو اشتقاق عموماً دیا جاتا ہے وہ اسے 'درهم' سے وابستہ کرتا ہے۔

(J. Allan ایلن)

تریپولیس : Tripolis رَكَ بہ طَرابُلُس .

تَرِیم : (۱) ایک قدیم شہر، جو اب تک شمالی حَضْرَموت کے اہم شہروں میں شمار ہوتا ہے - یہ شہر اس بڑی وادی کے بائیں جانب واقع ہے جو سارے حضرموت میں سے ہو کر گذری ہے اور جسے شِبام کے مشرق میں وادی مَسِیلَة یا وادی حضرموت یا محض الوادی کہتے ہیں، بعض لوگ وادی مسیلة اور وادی حضرموت میں تمیز کرتے ہیں، لیکن ان دونوں دریاؤں کے مقام اتصال کے محلّ وقوع کے متعلق متفق نہیں (دیکھیے شْٹیلر Stieler کی دستی اٹلس *Handatlas*، طبع نہم، نقشہ ۶۰ [گوتا ۱۹۰۵ء] اور *Map of Hadramut* [جس کے لیے پیمائش امام شریف خان بہادر نے کی]، مشمولہ کتاب ٹامس بنْٹ Th. Bent : *Southern Arabia*، لندن ۱۹۰۹ء، ص ۷)- حضرموت خصوصاً اس ملک کے اندرونی حصوں کے متعلق عرب جغرافیہ دانوں کے بیانات کو جزوی طور پر

رٹر Ritter نے اپنی کتاب *Erdkunde*، ج ۱۲ [برلن ۱۸۴۶ء]، مواضع کثیرہ، میں استعمال کیا، اس کے بعد ڈخویہ نے انہیں تمام متون سے، جو اب تک دستیاب ہو سکے ہیں، جمع کر کے ان کا تنقیدی جائزہ لیا اور اسے *Hadhramaut. Revue Coloniale Internationale*، ۲ (۱۸۸۶ء) : ۱۰۱ ببعد میں شامل کیا۔ یہ بیانات نہایت قلیل و مختصر ہیں اور ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ عینی شاہدوں کی دی ہوئی اطلاعات پر مبنی ہیں، بلکہ ان میں وہی مواد ہے جو ان سیّاحوں کے متفرق اشارات پر مبنی ہے جو وردہ Wrede سے پہلے کبھی وہاں گئے تھے، یا وہ معلومات ہیں جو مذکور (وردہ) نے ان علاقوں کے متعلق حاصل کیے جہاں وہ خود نہ جاسکا۔ عرب جغرافیہ دانوں نے لکھا ہے کہ حضرموت میں دو (بڑے) شہر ہیں: شبام اور تریم، لیکن وہ اس سے آگے چل کر ان کا محلّ وقوع نہیں بتاتے، مثلاً دیکھیے یاقوت: معجم، ۲ : ۲۸۴؛ ۳ : ۲۳۷؛ ۱ : ۵۷۵؛ الادریسی (دیکھیے Jaubert : *Geographie d' Edrisi*، [پیرس ۱۸۳۶ء]، ص ۱۴۹ ببعد ، ۵۳) اور دوسرے مصنف (ذیل میں دیکھیے)۔ الہَمْدانی (جزیرہ، ص ۸۷) تریم کو بڑا شہر [''مدینة عظیمة''] بتاتا ہے (اسی طرح وہ تریس کو بھی، جو شبام کے شمال مشرق میں ہے، بڑا شہر [''مدینة عظیمة''] لکھتا ہے) اور شبام کو (ص ۸۶ پر) بڑا صدر مقام [''مدینة الجمیع الکبیرة''] بتاتا ہے۔ الہَمْدانی کی کتاب میں، ص ۱۷۷ پر، تریم اور تریس کا اور بعض اور صفحوں پر صرف تریم کا ذکر ھی آیا ہے [اور عزّۃ کُثیّر کا حوالہ بھی الہَمْدانی، ص ۱۸۲ میں دیا ہے]؛ اسی طرح البکری، ص ۱۰۷، ۱۸۴ وغیرہ میں بھی صرف حوالے ھی پائے جاتے ہیں، مگر خالی حوالے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ۱۷۶۳ء جیسے قدیم زمانے میں نیبُور نے (دیکھیے K. Niebuhur : *Beschreibung von Arabien* [کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء]، ص ۲۸۶ ببعد) صنعا اور مسقط میں عربوں سے قصے سنے، جن سے اسے معلوم ہوا کہ تریم اور شبام کے شہر واقعی موجود ہیں (اس نے اپنی تالیف کے ص ۲۸۷ پر ''حضرموت کے ان دو بڑے مشہور شہروں'' کا ذکر الادریسی : *Geographia Nubiensis* [الادریسی کی لاطینی تلخیص، پیرس ۱۶۱۹ء] اور ابوالفدا کے حوالے سے کیا ہے)۔ رٹر اور دوسرے مصنفین نے تریم کے جغرافیائی محلّ وقوع کی بابت ایسے بیان دیے ہیں جو غلط‌فہمی پر مبنی ہیں۔ حضرموت کے بہترین نقشے میں، جو ملتا ہے، (یعنی L. Hirsch کے نقشے میں) یہ شہر تقریباً ۴۹ درجہ، ۵۵ دقیقہ طول البلد شرقی اور ۱۶ درجہ، ۴۴ دقیقہ عرض البلد شمالی میں واقع ہے۔

فان ڈن برگ L. W. C. van den Berg نے بٹیویا میں سرکاری عہدے دار کی حیثیت سے حضرموت کے عربوں سے، جو ڈچ ایسٹ انڈیز میں هجرت کر آئے تھے (جیسا کہ ان کے هم وطن اب بھی کرتے رهتے ہیں)، ان کے وطن کی بابت بہت مفصل حالات معلوم کیے تھے؛ اس کے بہت سے اطلاع دهندہ شبام اور تریم کے درمیان کے علاقے کے باشندے تھے، جس میں سے بڑی وادی گذرتی ہے۔ ان معلومات کو اس نے اپنی کتاب *Le Hadhramout et les Colonies Arabes dans l'Archipel Indien*، (بٹیویا ۱۸۸۶ء) میں مرتب کر کے بیان کیا ہے، (قب C. Snouck Hurgronje : *Arabië en Oost-Indie* [لائیڈن ۱۹۰۷ء، ص ۱۹ ببعد، فرانسیسی ترجمہ در *Revue de l'Historie des Rel.*، شمارہ ۵۷ (۱۹۰۸ء): ص ۴۷ ببعد])۔ دوسرے معلومات کے علاوہ هم فان ڈن برگ کے اس لیے ممنون ہیں کہ اس کے ذریعے همیں تریم کے متعلق پہلی بار صحیح تر تفصیلات مل سکیں۔ اس کے قول کے مطابق یہ

پرانا پایۂ تخت تھا (Maltzan تریم کو نقشے پر اپنے Reise (سفر نامہ) میں ''حقیقی حضرموت کا صدر مقام'' بتاتا ہے)؛ سَیؤُن Sai'un (ص ۱۳) کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہ موجودہ صدر مقام ہے۔ صفحہ ۲۶ پر وہ ان 'وادیوں' کا ذکر کرتا ہے جو شمال کی جانب سے جبال الوطی Woti سے آتی ہیں۔ صفحہ ۱۸ ببعد پر وہ الشحْر سے تریم تک کی سڑک کی مختلف منازل کے فاصلوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک زمانے میں جن اعتبارات سے تریم کو ملک بھر میں فوقیت حاصل تھی، اس وقت سَیؤُن ان تمام اعتبارات سے اس پر سبقت لے گیا ہے، یعنی وہ آبادی، تجارت اور صنعت‌وحرفت میں تریم پر فائق ہو گیا ہے؛ یہی نہیں وہ عام طور پر بھی زیادہ ترقی‌یافتہ شہر ہے۔ تریم میں کئی گھر غیرآباد ہوچکے ہیں، گلیوں میں الّو بول رہا ہے، بہت سی مسجدوں میں کوئی نمازی نہیں جاتا یا وہ مرمت طلب ہو گئی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس شہر کا زوال پچھلی صدی کے تقریباً تیسویں اور چالیسویں سال کے درمیان شروع ہوا اور اس کی وجہ علاقے کے قبائل کی متواتر باہمی خانہ جنگی تھی۔ قسطنطینیہ کے عربی اخبار الجوائب، بابت ۱۸ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ [۸ فروری ۱۸۸۱ء] کی اطلاع کے مطابق، جو بہت اغلب معلوم نہیں ہوتی، تریم کی آبادی پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی (قب بیان وُردہ Wrede)، مگر فان ڈن برگ van den Berg کی تحقیق کے مطابق (ص ۵۲) صرف دس ہزار تھی (اور یہ اندازہ ول سٹڈ Wellsted کے بیان کے عین مطابق ہے)۔ سابقاً تریم حضر موت کی صنعتِ پارچہ بافی کا مرکز تھا۔ یہ صنعت گھریلو قسم کی تھی اور اس کے زمانے میں (ص ۸۷) ابھی اس کی اہمیت باقی تھی، گو اس میں ولایتی مال کے مقابلے کی وجہ سے زوال شروع ہوگیا تھا۔ زیٹزن Seetzen (Zach's *Monatl. Correspondenz*، ۱۸۱۱ء، ۲۸ : ۲۴۰) جیسے پرانے مصنف کو بھی معلوم تھا کہ طلائی حاشیے والی ریشمی شالیں تریم میں بنتی تھیں۔ کسی وقت یہ شہر ملک میں اعلی تعلیم (صرف و نحو، علوم شرعی و فقہ) کا مرکز بھی تھا۔ اب اس لحاظ سے بھی سَیؤُن نے اس کی جگہ لے لی ہے (ص ۸۸)۔

حضرمی کہانیوں کے مجموعے میں، جو لیند برگ C. Landberg نے وہاں کے باشندوں کی روایت سے جمع کیا (*Etudes sur les dialects de l'Arabie mēridionale, i., Hadramout*، لائیڈن ۱۹۰۱ء)، تریم کا ذکر بھی ہے (ص ۱۷۵ [۱۸۵]، ۴۳۲؛ آخری عبارت میں وہاں کے مدرسے (رباط تریم) کا حوالہ بھی ہے۔ اس کی مزید تفصیل اس نے صفحہ ۵۰۴ ببعد پر دی ہے)۔

سب سے پہلا یورپی سیاح، جو شبام، سَیؤُن اور تَریم میں پہنچ کر (جولائی ۱۸۹۳ء) اپنے چشم دید حالات قلمبند کر سکا، لیو ہِیرش Leo Hirsch تھا (*Reisen in Südarabien, Mahra Land und Hadramūt*، لائیڈن ۱۸۹۷ء) - شبام سے تَریم تک کے سفر کا حال (ص ۲۰۹ ببعد) اور شہر تریم کی کیفیت، جو اس نے لکھی ہے، معلومات سے پُر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شبام سے تریم کو جائیں تو تریم کا شہر وادی مَسِیْلَہ کے بائیں کنارے پر ایک‌پہاڑی کی ڈھلان پر واقع ہے۔ اس کے نقشے کے مطابق یہ ڈھلان جنوبی ڈھلان ہے، لہٰذا فان ڈن برگ کا یہ بیان کہ ''تریم کا شہر شمالی سلسلۂ کوہ کی شمالی ڈھلان پر واقع ہے'' قابل تصحیح ہے۔ صفحہ ۲۲۷ ببعد میں ہیرش اس شہر کی اور اس کے محلِّ وقوع کی مفصل تر کیفیت بیان کرتا ہے۔ ہم یہاں صرف اتنا

ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ شہر کے تمام محلے، بالخصوص جنوب مغربی حصہ، بالکل اجاڑ معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ فان ڈن برگ پہلے ذکر کر چکا ہے ۔ مکانات میں سے، جو زیادہ تر کھنڈر ہو چکے ہیں، بہت کم ایسے ہیں جنھیں فراغ اور اچھی حالت میں ہونے کا امتیاز حاصل ہو ۔ لیو ہیرش کے قول کے مطابق مساجد کی تعداد زیادہ نہیں، ان کے منارے اچھی حالت میں ہیں اور ان پر عمدہ سفیدی کی ہوئی ہے اور وہ گھروں کے درمیان میں سے ابھر کر نمایاں نظر آتے ہیں (فان ڈن برگ ان کی تعداد ۳۰۰ سے زائد بتاتا ہے) ۔ وہ کہتا ہے کہ ''مدرسہ، جہاں علم دین اور فقہ کی تعلیم ہوتی ہے، ''رباط مسجد'' سے ملحق ہے'' ۔ ہمیں لینڈ برگ Landberg کے بیان سے، جو مذکور ہوا، فان ڈن برگ کے تعلیقے (ص ۸۸) کا مقابلہ کرنا چاہیے، جس کا مضمون یہ ہے کہ سَیْئُون کا مدرسۂ عالیہ (high school) اور طلبہ کا دارالاقامہ، جو وہاں کی مسجد سے ملحق ہے، 'رُباط' کہلاتا ہے (قب رِباط، جس کے ایک معنی ہیں : مسلمان غریب طلبہ کا دارالاقامہ) ۔ لینڈ برگ کی اطلاع کے مطابق مدرسۂ تریم بند ہو چکا تھا اور اس کی جگہ سَیْئُون کے مدرسے نے لے لی تھی (نیز دیکھیے فان ڈن برگ)۔ ہیرش Hirsch کو اس شہر کے ایک سیّد نے، جو اس شہر کے روز افزوں زوال پر متأسّف تھا، یہ بتایا کہ قدیم زمانے سے اس شہر میں پانچ 'بلاد' (محلّے) چلے آئے ہیں اور اس وقت اس کی آبادی ۳۸۱۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ شہر کے سلطان کی حکومت برائے نام ہے اور درحقیقت کل اختیار سادات عظام کے ہاتھ میں ہے (ص ۲۳۱)۔ سَیْئُون کی طرح تَرِیْم بھی کثیری قبائل ہی کے قبضے میں ہے ۔ اس کے چاندی اور تانبے کے اپنے سکّے ہیں (ان کا مجموعہ برلن اور برٹش میوزیم میں موجود ہے؛ بعض کی تصویریں ہیرش کی کتاب کے آخر میں بھی دی ہیں، نیز دیکھیے بکنل Sir John A Bucknill : *A note on some coins struck for use in Tarim. Southern Arabia*، در *Journal of the Malayan Branch of the Royal Asiatic Society*، ج۳، جزء اول [اپریل ۱۹۲۵ء] مع، لوحہ)۔ [اَجانب کی طرف] آبادی کے مخالفانہ رویے کی وجہ سے ہیرش کو تریم پہنچنے کے صرف چند گھنٹے بعد ہی اسے خیرباد کہہ کر اگلی صبح شِبام واپس پہنچنا پڑا، لہذا اسے مکمل معائنہ اور تحقیق کا موقع نہ مل سکا ۔

اگر پہلے مصنفین کی سنی سنائی باتوں سے ہیرش کے بیانات کا مقابلہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ اُن اختلافات کے علاوہ جو ہیرش کے اور فان ڈن برگ کے بیانات میں ہیں اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، مؤخرالذکر نے اپنے نقشے میں جو مقامات شبام سے تَرِیْم تک دکھائے ہیں، ان کا محلّ وقوع بہت زیادہ مشرق کی جانب ظاہر کیا ہے اور اس نے ان تینوں اہم شہروں کی وسعت اور آبادی کا اندازہ بھی صحیح طور پر درج نہیں کیا ۔ شبام سب سے بڑا شہر ہے (اور الھَمْدانی کے وقت میں بھی ایسا ہی تھا)؛ اس کی آبادی تقریباً چھے ہزار ہے (ہیرش، ص ۱۹۸ اور بنٹ Bent : کتاب مذکور، ص ۱۴۸؛ ان کے برعکس فان ڈن برگ ص ۴۲ پر آبادی صرف دو ہزار بتاتا ہے) اور اسے حضرموت کا اہم شہر مانا جاتا ہے اور سَیْئُون (جس کے باشندوں کی تعداد تقریباً ۴۵۰۰ ہے، گو اس کے برعکس بقول فان ڈن برگ وہ پندرہ ہزار ہیں) اور تریم دونوں سے رونق اور چہل پہل کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے (ہیرش، ص ۲۰۵) ۔ شبام کو ہیرش نے سَیْئُون سے اہمیت

میں بہت ہی کم بتایا ہے اور کہا ہے کہ سیئون کا سلطان تَریم میں بھی سلطان تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہوگارتھ D. G. Hogarth اپنی تالیف *The Penetration of Arabia* (لندن ۱۹۰۵ء، ص ۲۲۲، میں یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ ''ان شہروں کی آپس کی رقابت کچھ اس قسم کی ہے اور ان میں آئے دن کے تغیرات اتنے کثیر ہیں کہ یہ بات غیر ممکن نہیں کہ فان ڈن برگ کی اطلاع اس وقت کے مطابق صحیح ہو کہ سیئون حضرموت کا صدر مقام ہے اور تریم اس کا واحد ہمسر ہے''، لیکن درمیانی عرصہ اتنا قلیل ہے کہ یہ رائے قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ یہاں ہمیں اس حوالے کا بھی ذکر کرنا چاہیے جو ''معلّم عَبُود کے سفر از گِشِن تا تَرِیم'' کے متعلق ہائن W. Hein کے *Südarabische Itinerarien*، در *M. G. G. W.*، ۵۷ [۱۹۱۴ء]: ۳ ببعد، میں موجود ہے اور ہائن کی بیوہ نے اس کے پسماندہ ادبی آثار میں سے لے کر اُسے شائع کیا۔ اس کے مطابق سَیئُون تریم سے بڑا ہے اور شبام ان دونوں سے چھوٹا، مگر باقی شہروں سے بڑا ہے (ص ۴۲)؛ یہ اندازہ فان ڈن برگ کے اندازے سے ملتا جلتا ہی ہے۔ اس خیال کے برخلاف ایسے بیانات بھی ہیں جن کی رو سے شبام اور تَریم کا درمیانی فاصلہ سات آٹھ روز کی مسافت کے بعد برابر بتایا جاتا ہے (ص ۴۲)۔ یہاں بھی ہِیرش کی شہادت قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

ورودِ ہِیرش کے بعد کے سال (۱۸۹۴ء) کے ماہ جنوری میں بنٹ Bent اور اس کی بیوی شِبام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن وہ تِریم نہ پہنچ سکے۔ بنٹ بھی (کتاب مذکور، ص ۱۱۹) فان ڈن برگ اور دوسرے مصنفین کے خلاف یہی کہتا ہے کہ سلاطین سَیئُون اور تَریم کو اپنے اپنے شہروں کی حدود سے باہر کوئی اختیار حاصل نہیں (جنوبی عرب کی 'سلطنتوں' کے متعلق قب C. Snouck Hurgronje : *L'interdit seculier .... en Hadhramôt*، در *Reveue Africaine*، ۱۹۰۵ء، ص ۹۲)۔

مآخذ: تصانیف جن کا ذکر مادہ مذکور میں آیا ہے، بالخصوص ہِیرش Hirsch، فان ڈن برگ v. d. Berg، ڈ خویہ de Goeje، ہائن Hein، شپر نگر Sprenger، Wrede-Maltzan، رٹر Ritter اور عربی جغرافیہ دان (الھَمْدانی، یاقوت، الادریسی، البکری)۔

(J. TKATSCH)

[گذشتہ ربع صدی میں عالمی جنگوں اور یورپی سیاحوں کی سیاحت کی وجہ سے حضرموت (بشمول تریم) کے متعلق ہماری معلومات میں بہت سا اضافہ ہو گیا ہے، مثلاً دیکھیے (۱) D. van der Meulen، H. von Wissmann : *Hadramaut etc.*، لائیڈن ۱۹۳۲ء، بامداد اشاریہ، خصوصاً ص ۱۲۸ ببعد (و تصویر تریم)، حضرموت کے بڑے نقشے میں ضمنی نقشہ تریم کا بھی دیا ہے؛ (۲) Freya Stark : *The Southern Gates of Arabia*، گریٹ برٹن ۱۹۳۶ء، ص ۲۰۳ ببعد، بامداد اشاریہ، خصوصاً ص ۲۰۳ ببعد؛ (۳) وہی مصنف : *Seen in Hadramaut*، لنڈن ۱۹۲۸ء، مناظر تریم کے لیے دیکھیے اس کا ص ۳۲، ۳۵، ۶۷، ۷۱، ۷۵، ۸۷، ۹۵، ۱۵۳، ۱۷۲، ۱۷۶، ۱۹۱، ۱۹۹]۔

تریم : (۲)، بقول حاجی خلیفہ (دیکھیے جہان نما، ص ۴۹۰، قب ہامر-پورگ شٹال Hammer-Purgstall : *Uber die Geographie Arabiens, Jahrbücher der Literatur*، وی انا ۱۸۳۱ء، شمارہ ۴۹، ص ۹۳ اور اس کے تتبع میں رٹر Ritter، ۱۲: ۲۷۷) ایک قلعے کا نام ہے؛ یہ اس سڑک پر واقع ہے جو بحیرۂ قلزم کے ساحلی شہر جیُزان [حاجی خلیفہ، محلّ مذکور، جازان] سے شروع ہو کر جانبِ مشرق

جاتی ہے اور ''نویدیہ Newidije اور قلعۂ فلکی Feleki'' سے ہوتی ہوئی صعدہ کو جاتی ہے؛ مطلب یہ کہ تریم بالائی یمن میں واقع ہے۔ (فان ہامر نے نویدیہ اور فلکی کو [جہان نما سے لے کر رومی حرفوں میں] اسی طرح لکھا ہے، مگر تلفظ کی صحت یقینی معلوم نہیں ہوتی)۔ کُثَیِّر کے شعر سے، جسے البکری نے ص ۱۸۳ (دیکھیے ۱۰۷ و ۱۹۶) میں نقل کیا ہے اور جس کی نسبت الہَمْدانی نے صِفَة، ص ۱۸۲، میں یہ کہا ہے: یَنْدَح و تریم من مواضع عزّة کُثَیِّر، اس مقام کا محلّ وقوع زیادہ صحت کے ساتھ مستنبط نہیں ہو سکتا۔ الہَمْدانی نے پہلے ایک حُنَین کا ذکر کیا ہے، جو مکّے اور قَرْن کے درمیان واقع ہے (یعنی جنوبی حجاز کا ایک مقام ہے) اور اس کے متصل بعد یَنْدَح اور تَرِیْم کا ذکر محض کُثَیِّر کی سند پر کر دیا ہے، لیکن اس کی جاے وقوع کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا۔ البکری (ص ۱۹۰) تِرْیَم کا ذکر کرتا ہے، جس کے لیے وہ دو شاعروں کے اشعار سے حوالے بھی دیتا ہے اور کہتا ہے (ص ۱۹۶) کہ تریم کا ذکر الأعشٰی اور کُثَیِّر کے اشعار میں آیا ہے، مگر معلوم نہیں انھوں نے ضرورت شعری اور پابندی وزن سے تِرْیَم کا تَرِیْم بنا لیا ہے یا یہ دو الگ الگ مقامات کے نام ہیں۔ یہ کہنے کے بعد ہی وہ اس تَرِیْم کا ذکر کرتا ہے جو حضرموت کا ایک قلعہ ہے (دیکھیے صفحۂ ۳۸۸ ب، بذیل تریم (۱)) تَرِیْم یقیناً تِرْیَمْ سے علیحدہ مقام ہے۔ شاعر خالص استعارے کے رنگ میں ''مَلاَ تَرِیم''، یعنی دشت تَرِیم کا ذکر کرتا ہے اور کوئی جغرافیائی تحدید اس کے پیش نظر نہیں۔ اس قسم کے اور بہت سے جغرافیائی حوالوں کی طرح، جو شعراء کے کلام میں ملتے ہیں، یہ حوالہ بھی بالکل رسمی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ شاعر کو یہاں اس مقام کے صحیح محلّ وقوع کی تعیین سے کوئی واسطہ نہیں۔ جہاں تک کُثَیِّر کا تعلق ہے، یہ بات یقینی ہے کہ حضرموت کے اس نام کے دونوں مقامات (۱ و ۲) میں سے کوئی ایک بھی اس کے پیش نظر نہ تھا۔ اسی شعر میں تِرِیم کے فوراً بعد ھی وہ الشُّعَیْبَة کا ذکر بھی کرتا ہے، جو بقول البکری (ص ۱۸۳) 'طریق الیمن' (یمن والی سڑک) پر ایک ساحلی قریہ ہے اور یہ الہَمْدانی کی ترتیب مواضع سے مطابقت رکھتا ہے۔ الأعشٰی کے شعر میں بھی تَرِیم کا ذکر ہے، مگر تحدید محلّ کے بغیر [وہ شعر یہ ہے: طالَ الثَّوَاءُ علی تریم و قد نأتْ بکْرُ بن وائل، مگر دیوان شعر الأعشٰی میمون، طبع Geyer، ص ۲۲۱ میں بَرِیْم ہے بجاے تَرِیم] - یہ شعر یاقوت نے معجم البلدان، ۱ : ۸۴۶ میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے حضرموت والا موضع مراد ہے، لیکن البکری (بذیل تِرْیَم — نہ بذیل تَرِیم (جو حصن حضرموت ہے)) کُثَیِّر کے شعر کے ساتھ ھی اعشٰی کا شعر بھی دیتا ہے، لیکن تَرِیم جس کا ذکر دونوں شاعروں نے کیا ہے، اس کے محلّ وقوع کی بابت اپنی کوئی راے نہیں دیتا۔ صاحب تاج العروس (۸ : ۲۱۱) جو ت - ر - ی - م نام کے اور مقامات کا بھی ذکر کرتا ہے، اس نام کے پہلے مقام کو تقریباً انھیں الفاظ میں جو لسان العرب (۱۴ : ۳۳۲) میں دیے ہیں، تِرْیَم ضبط کرتا ہے (بحوالۂ الجوھری؛ قاموس، بذیل کلمہ، صرف تِرْیَم والی صورت ھی کو جانتا ہے) اور دوسری صورتیں دے کر تُرْیَم (دیکھیے البکری، ص ۱۹۵ ببعد)، کو لیتا ہے اور یہ بیان درج کرتا ہے کہ تُرْیَم النَّقیع کے قریب ایک وادی ہے؛ اس پر بہت سے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وادی النّقیع تو مدینہ کی وادیوں میں سے ایک وادی ہے۔ اس کے معارض خیال یہ ہے کہ النَّقیع یَنْبُع کے

قریب حجاز کی ایک وادی ہے (دیکھیے الہَمْدانی ، ص ۱۸۱ اور یاقوت، ۱: ۸۴۶ ، اس باب میں دیکھیے البکری ، ص ۱۹۵ اور ۵۴۸) - بہر حال یہ یاقوت (معجم البلدان) والے تَرْیَمْ سے بالکل مختلف ہے، جو شمال میں مَذْیَن کے قریب ہے (انگریزی امارت بحری کے نقشے (Admirality Chart) کا تُرِیَم Turiam، اس پر دیکھیے رٹر، ۱۳ : ۲۸۲، شپر نگر، کتاب مذکور، ص ۲۳) ۔ تاج میں ہے کہ تَرِیَمْ بادیۂ بصرہ میں بھی ایک مقام کا نام ہے ۔ پھر وہ لسان سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور حضرموت کے تَرِیْم کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ملک شام میں بھی ایک تَرِیْم ہے اور پھر "یمنی تَرِیم" کا ذکر کرنے لگتا ہے ۔ ویستن فلٹ، *Yemen im XI. Jahrhundert* (*Abhandl. der Kön. Ges. d. Wissensch.*, xxxii.)، گوٹنگن ۱۸۸۵ء، ص ۹۳ میں صرف حسن پاشا کی تاریخ (مأخوذ از المُحِبّی) کے سلسلے میں یہ ذکر کرتا ہے کہ قلعوں کی فہرست میں، جو امیر سنان نے ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷ - ۱۵۹۸ء میں فتح کیے، تریْم کی جگہ یَرِیْم پڑھنا چاہیے - یہ درست ہے، مگر اس تصحیح کی وجہ جو اس نے دی ہے کہ "تَرِیْم تو حضرموت میں ہے" درست نہیں، یقیناً ایک یمنی تَرِیْم بھی ہے، لیکن ان قلعوں کا جو صنعاء کے علاقے میں واقع ہیں جغرافیائی محلّ وقوع یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ وہ تَرِیْم نہیں جو زیر بحث ہے ۔ شٹیلر Stieler کی دستی اٹلس (*Handatlas*)، نویں طباعت، گوٹا Gotha ۱۹۰۵ء، نقشۂ عرب (*Karte von Arabien*) (طبع Habenicht) میں تَرِیْم کو صَعْدَة کے مغرب میں تقریباً ۴۳ درجہ، ۲۰ دقیقہ مشرقی طول البلد اور ۱۶ درجہ، ۵۷ دقیقہ شمالی عرض البلد میں دکھایا ہے، جو جہان نما کے بیان کے مطابق ہے ۔ نقشۂ ساحل جو انگریزی جنرل سٹاف نے مرتّب کیا (نقشہ ۳، صنعاء ۱۹۱۶ء) میں یہ مقام دکھایا ھی نہیں گیا ۔

مآخذ : متن میں دے دیے گئے ہیں ۔

(J. TKATSCH)

* **تزویج** : رَكَ بہ نکاح .

* **تسبیح** : (ع)؛ مادہ س - ب - ح سے باب تفعیل کا مصدر - سبحان اللہ [رَكَ بآن] کا ذکر کرنا .

* **تُسْتَر** : رَكَ بہ شُشْتَر .

* **تَسمیہ** : رَكَ بہ بَسْمَلَة .

* **تسنیم** : (۱) بہشت کے ایک چشمے کا نام ہے، جس کے متعلق قرآن پاک کی سورۃ ۸۳ [المطفّفین] : ۲۸ میں ذکر ہے کہ اس کا پانی مقربین پییں گے ، یعنی وہ نیک بندے جنھیں اللہ تعالٰی کی حضوری کا شرف حاصل ہوگا (وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝ عَيْناً يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ)؛ نیز اهل جنت، جنھیں ابرار کا رتبہ حاصل ہوگا، ان کے مشروب میں بھی اس کی آمیزش ہوگی (اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ الخ) - اس چشمے کا نام تسنیم اس لیے ہے کہ یہ بلندی پر سے آتا ہے (لسان العرب، مادۂ سنم)، کیونکہ عربی میں لفظ "تسنیم" کے لغوی معنی بلند کرنے کے ہیں - آیت مذکور سے مجملاً یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ تسنیم کے لفظ کا اطلاق کس چیز پر ہوا ہے، مگر بہشت اور بہشت میں جو اشیاء ہیں ان کا تعلق عالَم غیب سے ہے، لہذا ان کی حقیقت پورے طور پر اس عالم مادی میں ہم پر منکشف نہیں ہو سکتی - یہ وہ چیزیں ہیں جن کے متعلق خود قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (۳۲ [سورة السجدة]: ۱۷)، چنانچہ طبری [۳۰ : ۶۰ ، س ۴] میں روایت دی ہے کہ یہ ان مخفی اشیاء میں سے ہے جو

اهل بہشت کے دلوں کو مسرور کریں گی ''خفایا اخفاہ اللہ لاهل الجنة''.

مآخذ : (۱) البخاری : تفسیر سورۃ ۶۳(؟)؛(۲) الطبری : تفسیر [۲۱ : ۵۹ و ۳۰ : ۶۰] ؛ (۳) فخر الدین الرازی : مفاتیح الغیب ، ۶ : ۵۰۲ ؛ (۴) دیگر تفاسیر قرآن؛ (۵) لسان العرب، ۱۶ : ۱۹۹ .

(عابد احمد علی — اے - جے - ونسنک)

(۲) مادہ س - ن - م کے باب تفعیل کا مصدر، سطح زمین سے قبروں کا اونچا کرنا۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت (صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم) کی قبر ''مُسَنَّم'' تھی (بخاری، جنائز، باب ۹۶) - اس کے برعکس یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنحضرت نے حکم دیا تھا کہ قبروں کو زمین کے برابر رکھا جائے (مسلم، جنائز، حدیث ۹۲ و ۹۳ [صحیح مسلم، بشرح النووی، قاہرہ ۱۳۴۹ھ، ۷ : ۳۶]؛ احمد بن حنبل : مسند، ۶ : ۱۸ مکرّر ، ۲۱) - امام شافعیؒ کی رائے یہ تھی کہ قبروں کو صرف اتنا اونچا کیا جائے کہ معلوم ہو سکے کہ وہ قبریں ہیں ، مبادا لوگ ان پر بیٹھیں یا ان پر چلیں (الترمذی، جنائز، باب ۵۶) ، مگر مالکیوں نے 'تسنیم' کو ترجیح دی ہے (النووی : شرح صحیح مسلم، قاہرہ ۱۲۸۳ھ، ۲ : ۳۴۴) .

(عابد احمد علی، اے- جے- ونسنک A.J. WENSINCK)

* تَسُوج : اور (طَسُّوج)، (۱) فارسی لفظ تَسُوک کی مُعرّب صورتیں ہیں (پہلوی تسوک دیکھیے پہلوی تسُم ''چوتھا''؛ *caθruma< دیکھیے Salemann : *Manich*، ۱ : ۱۲۸؛ Tedesco : *Studien Dialectologie der west-iranischen Turfantexte*، ص ۲۰۹)، جس سے مراد ہے بعض پیمانوں کا چوبیسواں حصہ (Vullers، ۱ : ۴۴۵) [مثلاً شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ ایک تسو ہے]۔ فرہنگ شعوری کے مطابق ۲ جَو = ایک حَبَّہ؛ ۲ حَبّہ = ایک تَسُّوج؛ ۴ تسوج = ایک دانگ؛ ۶ دانگ = ایک دینار - دیوان قاسم الانوار (Bib. Mat. de Paris, Sup. Pers. 717، ورق ۱۷۳) میں ایک شعر ہے جس میں لفظ تسُو کو کسی متصوفانہ معنی میں استعمال کیا ہے۔ [وہ شعر یہ ہے :

یک تسو و دو تسو و سہ تسو چند باشد کم دو تسُوبازگو
یک تسو باشدولی ای خواجہ تاش هرچہ باشی باش با ساید مباش

(نیز دیوان شاہ قاسم انوار، نسخۂ خطی لاهور، بذیل مقطعات، ورق ۲۷۷)]

یہ لفظ ارمنی زبان میں تَھسو (*Thasu*) اور آرامی زبان میں طسوگا (*ṭyswga*) کی شکل میں ملتا ہے ؛ دیکھیے Hübschmann : *Arm. Gram*، ۱ /۱ : ۲۶۶ .

(۲) قسمت علاقہ: نولڈکہ (*Geschichte der Perser und Araber*، ص ۱۶) تَسُّوک یا تسُّوج (بمعنی ادارہ یا عہدہ) کا، جو عراق کے ایک ضلع کے معنی میں استعمال ہوتا تھا، لفظ رُسْتاق [وہ علاقہ جس میں ایک منبر ہو] دیکھیے (''parish'') سے تضاد دکھاتا ہے، جو فارس میں کُورہ (از χώρα) کی ایک قسمت کا نام تھا - ابن خُرّداذبہ اور قُدامہ کے قول کے مطابق عراق کا ملک بارہ استان (*ostān*? اُوستان؟) میں منقسم تھا اور ہر استان میں چند تسُّوج ہوتے تھے۔ تسُّوجوں کی کل تعداد عموماً ۶۰ بتائی گئی ہے (لیسٹرینج: *Eastern Caliphate*، ص ۹۷)؛ تَسُوج کی اصطلاح (جس کی صوتی صورت در اصل ایک جنوب مغربی بولی سے متعلق ہے) سارے ایران میں سمجھی جاتی ہے - آبَرْ شہر کا صوبہ (نیشاپور) ۱۳ رُستاق اور چار تَسُو میں منقسم تھا (ابن رستہ ، ص ۱۷۱، [ولها] اربعة ارباع)، یعنی زِیوَند (Ziwand)، تکاب، بُشْت فُروشن (؟) اور مَازُل؛ ابن رُسْتہ، ص ۱۵۵ پر طَسُّوج الروذ کا ذکر کرتا ہے ، جو اصفہان کے توابع میں سے تھا - ولایت فارس میں

طَسُّوج نام کا ایک ناحیہ یا بخش بھی ہے (اصطخری، ص ۱۰۲)، جو دریاے کُرُّ کے دائیں کنارے جھیل بختگان کے نزدیک واقع ہے ۔ اس کا صدر مقام خُرّمہ ہے (قب *Persepolis* : Stolze، ۱۸۸۸ء، دیباچہ)۔ علاقے کو ضرور آبپاشی کے نظام کے اعتبار سے تسوجوں میں تقسیم کیا گیا ہوگا۔ نظری طور پر ایک دریا کا پانی ۶ دانگ پر مشتمل ہوتا ہے ، دریاے کارُون شُشتَر کے مقام پر دو نہروں (شُطَیط اور گرگر) میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ظفرنامہ (۱: ۵۹۱ و ۵۹۹) میں انھیں ''چاردانگہ'' اور ''دو دانگہ'' کہا گیا ہے ۔ تسُّوج بظاہر وہ رقبہ ہے جس کی آبپاشی چوتھائی دانگ سے ہو سکے ۔

(۳) صوبۂ آذربایجان میں ایک چھوٹے سے شہر کا نام بھی تَسُّوج ہے، جو دریاچۂ رضائیہ (جھیل اُرْمیَہ) کے شمالی کنارے پر سلسلۂ کوہ میْشو Mishow کے جنوب میں واقع ہے ۔ یہ ناحیۂ گونی Güney کا صدر مقام ہے (گونی کے معنی ترکی میں اس جگہ کے ہیں جو دھوپ کے رخ پر ہو ، مُشَمَّس) ، جس میں جھیل اُرْمیَہ کا شمالی کنارہ بھی شامل ہے ۔ اس ضلع کا پرانا نام اَرْوَنَق و اَنْزاب ہے، جو اب تک بھی سرکاری کاغذات میں استعمال ہوتا ہے ۔ چونکہ اَرْوَنَق خاص کر ناحیے کے مشرقی حصہ کو کہتے ہیں (نزهة القلوب، ص ۸۹)، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تسُّوج اَنْزاب ہی میں شامل ہوگا ۔ شہر تَسُّوج (تَسُّویچ) جھیل سے کوئی تین میل کے فاصلے پر آباد ہے اور اس کی آبپاشی ایک ندی سے ہوتی ہے، جو قزل داغ سے نکلتی ہے ۔ شہر کے ارد گرد باغات ہیں اور اس کے قریب نمک، کھریا مٹی اور چونے کے پتھر کی کانیں ہیں ۔ آبادی ایک ہزار سے زیادہ نہیں ، لیکن اس کے بارہ محلّے اور پچاس مسجدیں (؟) اس کی گذشتہ عظمت پر دلالت کرتی ہیں ۔ شہر بالضرور اسلامی زمانے سے پہلے کا ہوگا ۔ آٹھویں صدی کا ارمنی مؤرخ (Levond ، ص ۱۳۲) آذربایجان کے دوسرے مقامات کے ساتھ اس شہر کا بھی ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ شاہ گجک Gagik تھورنوان (Thornavan)[۱] (دُرواسْپورَکان) سے آتے ہوے مندرجۂ ذیل مقامات سے گذرا : زَروَنْد Zarevand، زِدْرواے Zidroy (؟)، تَسُوْک ، گزْنَک، اورمی اور سورین پَت ۔ عہد مغول میں تَسُّوج کی اہمیت اس امر سے واضح ہوتی ہے کہ نزهة القلوب میں جھیل اُرْمیَہ کو ''دریای شُورِ تَسُّوج'' لکھا ہے، لیکن اس ناحیے کا مالیانہ پانچ ہزار دینار سے زیادہ نہ تھا ۔ یہ رقم خانِ ابوسعید کے اوقاف کے اخراجات کے لیے مقرر تھی ۔

کلاویخو Clavijo کو ۱۴۰۴ء میں خُوی سے تبریز جاتے ہوے یہاں سے گزرنے کا اتفاق ہوا ۔ وہ اسے بظاہر کَزہ Caza کہتا ہے ۔ ''ایک آباد اور عمدہ شہر ، جو ایک میدان میں واقع ہے ۔ اس کے ارد گرد میووں کے بہت سے باغات ہیں ، جنھیں بہت سی ندیاں سیراب کرتی ہیں'' (ترجمۂ لیسٹرینج ، لندن ۱۹۲۸ء، ص ۱۵۰ ؛ ص ۳۵۲ پر کَزہ ۔ تَزہ کی طرح کے اعلام پر تعلیقہ بھی ہے) .

اولیا چلبی (۲ : ۲۴۲ ؛ ۴ : ۳۱۹) اس شہر کو تَسُوی Tasuy اور اس کے دریا کو [ارس][۲] لکھتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ قلعۂ تسوی ' سلتان لق ' (سلطانی) تھا، جو اہمیت سے خالی نہ تھا اور جس میں تقریباً تین ہزار سپاہی رہتے تھے ، [اسلحہ خانہ] اور توپ خانہ بھی تھا ۔ شہر میں تین ہزار مکان اور سات مسجدیں تھیں وغیرہ وغیرہ؛

[(۱) ارمنی ŕ ایک خاص آواز ہے، تھرتھرانے والی، جو ژ ۔ ر ۔ ر کی طرح سنائی دیتی ہے ۔ ہم نے اسے ر سے ظاہر کیا ہے ۔ (۲) کذا در جلد ۲ ، جلد ۴ : ۲۲۰ میں قلعۂ تسوی کے سلسلے میں دریاے اریز Iriz کا ذکر بھی ہوا ہے ۔]

دائرۂ افق
دائرۂ البروج
معدل النہار
معدل النہار

ق
و
س
ن
ج
دائرة الافق
دائرة البروج
معدل النہار
ک
حمل
میزان
عقرب
قوس
جدی
دلو
حوت
سنبلہ
اسد
سرطان
جوزا
معدل النہار
شکل ۲

باشندے شیعہ تھے۔ بقول اولیا، یزدجرد نے یہ شہر اپنی بیوی تسوبان (؟) کے نام پر بسایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کو تیمور نے تباہ کر ڈالا تھا (؟ دیکھیے کلاویخو) اور جہان شاہ (قرہقویونلو) نے اسے دوبارہ بسایا تھا۔ تسوج کے مشرق میں قریۂ قونلہ Kumla (خونلہ) ہے، جہاں [توجہ] فرہاد پاشا نے ۹۹۸ھ میں تبریز [رک بآن] کی فتح کے وقت مراد ثالث کے عہد میں قلعے بنائے تھے، دیکھیے (اولیا، محلّ مذکور).

یوروپی سیاح تسوج میں بہت کم وارد ہوے (دیکھیے ای۔ جی۔ براؤن: *A Year among the Persians*، ص ۵۶).

مآخذ: علاوہ ان کے جو متن میں درج ہیں: فرہنگ جغرافیائی ایران، طبع چاپخانۂ ارتش، سہر ماہ ۱۳۳۰ھ، ۴: ۱۳۲].

(منورسکی V. MINORSKY)

* التسییر: (دیارِ مغرب میں atazir, atacir, athacir, directio, prorogatio, 'αφεσις théorie aphétique، ایک عمل جو علم احکام نجوم (astrology) میں کام آتا ہے، اسے کسی سیّارے یا بیت یا کسی معیّن موضع فلک البروج کو مصنوعی طور پر کسی دوسرے ستارے یا اس کے انظار (aspects) یا کسی دوسرے بیت تک آگے بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان مقامات کے درمیانی فاصلے کا درجہ مطالعِ خطِ استواء سے معلوم کیا جائے اور اس کی قدر کو ایک معین جزءِ زمان میں تبدیل کرکے مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے کسی سعد یا نحس واقعے کی پیش گوئی کے لیے اس سے استدلال کیا جائے۔ علمِ احکامِ نجوم سے حاصل شدہ یہ قدر متقدمین اور عربوں اور اہل مغرب کے نزدیک بڑی اہم تھی؛ کیونکہ ایک طرف تو اس سے خاص حالات سے متعلق احکامِ نجوم کا علم ممکن ہوجاتا تھا (یعنی موالید کے احکام میں جو چیزیں سعد و نحس کے متعلق بیان ہوتی تھیں ان کے پورا ہونے کا صحیح وقت متعیّن کیا جا سکتا تھا اور خصوصیّت کے ساتھ کسی کی مدّتِ عمر کا اندازہ اور ان دنوں کا انتخاب (اختیار) ممکن ہو جاتا تھا جو سفر، شادی بیاہ، کسی شہر کی بنیاد رکھنے یا حکومت شروع کرنے کے لیے مبارک سمجھے جاتے تھے)، دوسری طرف اس میں ایک امتیازی بات یہ تھی کہ اس کا طریقۂ حساب خصوصیّت کے ساتھ پیچیدہ تھا.

ہمارے مطلب کے لیے جو قوس خاص طور سے اہمیت رکھتی ہے (اور جسے مختصراً ہم "قوس تسییر" سے تعبیر کریں گے) اس کا نجومی استخراج کچھ ایسا مشکل نہیں، بشرطیکہ ہم فلک البروج کے وہ دو مقامات دریافت کر لیں جو اس قوس کی حد بندی کرتے ہیں؛ ان میں سے ایک "پیش رو" سیّارہ یا مقام ہے اور دوسرا "مؤخر" ہے۔ پہلے کو "المتقدّم" یا "الہیلاج" (دلیل) کہتے ہیں اور دوسرے کو "الثانی" (پیش گو)؛ شکل ۱ (اور ۲) میں ا (A) دلیل ہے اور ب (B) پیش گو اور ق (P) کرۂ سماوی کا مرئی قطب ہے۔ ن ب ص NBS (ن ا ص NAS)، پیش گو (دلیل) کا دائرہ ہے، اور ج (C) وہ نقطۂ تقاطع ہے جس پر ا (ب) میں سے گذرنے والا دائرۂ عرض دائرۂ موضع سے ملتا ہے اور ا (ب) اور ج سے گذرنے والے دو دائرہ ہائے مَیل قوسِ تسییر ا جہ (ac) (بہ جہ) (bc) کو خط استواء سے الگ کر دیتے ہیں۔ اس طرح قوسِ تسییر گویا خطِّ استواء کی قوس ہے، جو عموماً ۹۰ درجے سے زائد نہیں ہوتی اور جو اس دَوران میں دائرۂ موضع کو عبور کرتی ہے، جس میں کرۂ سماوی کی ظاہری یومیّہ گردش کے باعث دلیل (پیش گو) اپنے دائرۂ عرض پر چل کر پیش گو (دلیل) کے دائرۂ موضع تک، جیسے اِس مدّت

میں ساکن تصوّر کیا جاتا ہے، منتقل ہوجاتا ھے (ان تصوّرات کے متعلق جو یہاں درج ھیں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ھو مادّۂ ''علمِ احکام النجوم'') .

دلیل اور پیش گو کے محلّ وقوع کے تقدم و تأخر کی بنا پر تسییر کی دو قسمیں ھیں :

قسم اول۔مستقیم تسییر (directo directa)، جب دلیل پیش گو سے فلک البروج میں پہلے ھو۔ یہاں دلیل موضعُ التسییر (مقام متحرّک) ہے اور پیش گو ساکن تصّور کیا گیا ھے (شکل ۱) .

قسم دوم۔غیر منقسم تسییر (directio conversa)، جب کرۂ سماوی کی روزانہ حرکت کی ترتیب میں دلیل پیش گو سے پہلے آتا ھے ۔ اس صورت میں پیش گو کو دلیل کے دائرۂ موضع پر لے آتے ھیں جو ساکن متصّور ھوتا ھے .

حسابِ تسییر کے اطلاق کا ایک خاص طریقہ (جو ایک طرح سے اس عمل کے برعکس ھے) یہ پیدا ھوا کہ کسی ایک ستارے کے محلّ وقوع کو فرض کرلیا اور مخصوص زمانہ بھی متعیّن کیا، یابالفاظ دیگر مطالع خطِ استواء کو لے لیا، جو دراصل تسییری درجات کی معین تعداد ھے ۔ حقیقت میں اس مسئلے کا انحصار اس بات پر ھے کہ قوسِ تسییر کے نقطۂ منتہی (''منزل مقصود'') کا درجہ دریافت کیا جاسکے ، جس درجہ میں دو سیّاروں کے اقتران سے احکام نجوم استنباط کیے جا سکیں .

حسابِ تسییر دراصل کُروی مثلّثات کا ایک مسئلہ ھے اور اس کا انحصار ان سادہ ضابطوں (formulae) پر ھوتا ھے جو اعتدالی (equinoctial) وقت پر مبنی ھیں ۔ مساواتِ ذیل میں، یعنی تسییر ۱ جہ = بر۱ - بر بَ - بَجہ (شکل ۱) میں، بائیں طرف کا جملہ معلوم ھے، کیونکہ بر ۱ = صعودِ مستقیم ب - صعودِ مستقیم ا اور مقادیر بر بَ و بَ جہ کو ذیل کے ضابطوں سے معلوم کیا جا سکتا ھے .

۱ - جتا بَ = جا (∢ د ص بَ) جتا ص د

. [$I.$ $\cos B' \sin (\sphericalangle DSB') \cos SD$]

۲ - جا بر بَ = ظا ب بر ظتا بَ

. [II. $\sin b B' = \operatorname{tg} B b \operatorname{cotg} B'$]

۳- جا بَ جہ = ظا جہ ج ظتا بَ

. [$III.$ $\sin B' c = \operatorname{tg} c C \operatorname{cotg} B'$]

لیکن عربوں نے اس قسم کے حسابات کے لیے بعض تقریبی طریقے استعمال کیے ھیں، جو اوسط وقت کی ساعات ('زمانیہ') پر مبنی تھے اور جو ذیل کے ضابطوں میں درج ھیں :

(البتّانی، البیرونی وغیرہ کے قاعدوں کی رو سے) :

درجات تسییر :

$| \alpha \pm (\alpha - \beta) =$

بُعد از نقطۂ بالائی (زیرین) وسط السماء / نصف قوس النہار [قوس اللیل] ب ،|

جہاں α = | صعودِ مستقیم ا۔ صعودِ مستقیم ب، | اور

β = | صعودِ مائل ا - صعودِ مائل ب | .

گول خطوط وحدانی کے شروع میں جو علامتیں ± دی گئی ھیں ان کا تعلّق اس امر سے ھے کہ α علامت β سے بڑا ھے یا چھوٹا، مربّع خطوط وحدانی کے اندر جو الفاظ ھیں اس وقت استعمال کیے جاتے ھیں جب ب افق سے نیچا ھو .

خاص صورتیں :

(ا) - جب کہ ب نصف النہار پر ھو :

تسییر = | صعود مستقیم ا - صعود مستقیم ب |

(ب) - جب ب افق پر ھو :

تسییر = | صعود مائل ا - صعود مائل ب |

۲ - (البتّانی کا دوسرا قاعدہ) :

درجات تسییر = | بُعد ب از نقطۂ بالائی [زیریں] وسط السماء × نصف قوس النہار [قوس اللیل] ا ±

(صعود مستقیم ا - صعود مستقیم نقطۂ بالائی [زیرین] وسط السماء).

جہاں گول خطوطِ وحدانی کے شروع میں علامت منفی (-) اس وقت استعمال ہوگی جب ا اور ب ایک ہی نصف کرے میں ہوں اور مثبت (+) اس وقت جب ا اور ب مختلف نصف کروں میں ہوں - مربّع خطوطِ وحدانی کے اندر جو مصطلحات (expressions) ہیں مغربی نصف کرے کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں یا اس صورت میں جب زیرین نصف اللیل ا اور ب کے درمیان واقع ہو۔

دونوں صورتوں میں تسییر اگر مستقیم ہے تو نتیجہ مثبت اور اگر غیر مستقیم ہے تو منفی رہے گا - تسییر غیر مستقیم ہے تو اوپر کے ضابطوں میں ب اور ا کو ایک دوسرے سے بدل لیا جاتا ہے - اس طرح قوس تسییر کے درجوں کی جو تعداد معلوم ہوتی ہے اسے حسبِ ذیل طریق پر وقت کے ایک دَور میں منتقل کر دیا جاتا ہے : اگر مسئلہ عمر کی طوالت کا ہو تو ایک درجے کو ایک شمسی سال کے برابر مان لیا جاتا ہے - ۵ دقیقہ [منٹ]=ایک مہینہ، ایک دقیقہ [منٹ]= ۲ دن، اور دوسری صورتوں میں ایک درجے کو ایک دن کے مساوی قرار دیا جاتا ہے۔

تسییر کے حساب میں عربوں نے جس مشکل پر مستقلاً زور دیا وہ یہ تھی کہ ایک طرف تو انہیں نجوم کے تقاضوں کو اور دوسری جانب ان جداگانہ ناگزیر فلکیاتی تخمینوں اور پیمائشوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا جن کی تفصیل یہاں نہیں دی جاسکتی؛ کیونکہ اس کے لیے بڑا وقت چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ذیل کے امور اس زمانے کے نجومی معلومات پر کامل عبور کو مستلزم تھے :-

لازمی علمِ صحیح ضبطِ موالید کے مختلف طریقوں کا ، مختلف اوقات ولادت کی تنجیمی دلالتوں کا اور بیوتِ فلک ، صُوَر البروج اور سات سیاروں کے دلالات اور ان کے مختلف انظار (aspects) کا، علی ہذا مشہور ترین کواکب ثابتہ کا علم، نہ صرف انفرادی کواکب کا بلکہ دیگر سیّاروں کے لحاظ سے بھی اور پوران کے مخصوص اوضاع (یعنی بیوت، درجۂ ارتفاع، تثلیث، وبال، ہبوط) کے اعتبار سے بھی، اس طرح کہ وہ کثیر قوانین جن کا تعلق طاقت، ضعف اور توسط سے ہے نظر انداز نہ ہو جائیں، پھر ایسے ہی مختلف سیّاروں اور ان کے مختلف انظار کے سعد و نحس اثرات کا ، بیوت کے حال کا ، سہم السعادت کا ، تاثیر والے سیاروں کے اوضاع کا لحاظ رکھتے ہوئے عمر طویل ، اوسط یا مختصر رہ جانے کے تخمینوں سے واقفیت، چند مقرّرہ قوانین کی رو سے صاحبِ مولد و طالع کا انتخاب، ہیلاج کا انتخاب،جو عمر پر دلالت کرتا ہے،'دلیل'اور 'ثانی' کا انتخاب، جو موت یا زندگی کا پیش گو ہے، کمّیتِ عمر کے دلالت کنندہ (الکدُ خدا) کا انتخاب، کسی سمتِ مقرر کے زیادہ، کم یا درمیانی اثر کا علم اور سعد و نحس سمتوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کی تعیین—جیسا اوپر کہا جا چکا ہے—ان باتوں کے لیے اس زمانے کی تنجیمی معلومات پر کامل عبور لازم تھا - پھر ان کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ منجّم مطلوبہ فلکیاتی حساب میں ماہر ہو، یعنی وقت کو اس نصف النہار پر تحویل کر سکے جس پر زیجات مبنی ہیں؛ مشہور ترین ثوابت کے طول ، عرض اور میل کا پتہ چلانے نیز سیّاروں اور ان کے انظار اور وقت ولادت پر ان کی قدروں کے اطلاق ، بیوت فلک اور صُوَر بروج اور سیّارے، جو ان میں موجود ہیں، ان سے خوب واقف ہو اور جانتا ہو کہ سہم السعادت کیا ہے ؛ اسی طرح دلیل اور پیش گو کے مواضع کے دوائر

وغیرہ سے بھی آگاہ ہو ۔ صرف قوس تسییر کے اندازہ کرنے کے لیے، جب کہ اس کی انتہائی حدیں معلوم ہوں ، ذیل کی معلومات ضروری ھیں : ا اور ب کا صعودِ مستقیم، نصف النہار سے ان کا فاصلہ، ان کا میل اور نصف قوس النہار یا نصف قوس اللیل ، دائرۂ موضع پر قطب کا ارتفاع (نصف النہار سے دائرۂ موضع اور خط استواء کے نقطۂ تقاطع کا بُعد) .

اس طویل اور کٹھن طریقے میں سہولت پیدا کرنے اور بغیر حساب لگائے رصد کرنے کے لیے عربوں نے بعض مکانیکی (nomographic) طریقوں سے کام لیا، یعنی یا تو مفرد صفائح (صفیحۃالتسییر،بقول بیرونی) استعمال کرتے تھے ، جنھیں رسم کر کے اصطرلاب میں لگا دیا جاتا تھا یا ایک خاص آلہ (قشتالہ کے الفانسو دھم کا ''estrumente del leuantamiento'') جس سے خاص کر تسییر دریافت کرتے تھے ، لیکن اس سے بعض دوسرے حسابات میں بھی آسانی پیدا ھو جاتی تھی ۔ اس آلے کا اصلی اور لازمی حصہ ایک صفیحہ تھا جس کے اوپر کے رخ پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں مواضع کے دوائر کے ظلّ (یا بالفاظ دیگر) جاے رصد کے عرض البلد کی ساعات درج ہوتی تھیں(یہ وھی صفیحۂ تسییر ھے جس کا ذکر البیرونی نے کیا ھے؛ دیکھیے شکل ۳) اور جس کی پشت کے رُخ پر منطقۃ البروج کے مطابق طول و عرض کے دائروں کے ظلّ درج ھوتے تھے (شکل ۴) ۔ اس آلے کے محور پر، جو دونوں طرف مشترک تھا، ایک غیر منقسم العضادۃ (alhidade) لگا رھتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دو متحرک سوئیاں (pointers)، جنھیں ضرورت کے مطابق اوپر کے رُخ پر یا پشت کے رُخ پر لایا جاتا تھا ، مگر جو ایک گرفت یا بندھن (الفَرَس، cavallo) کی مدد سے اپنی جگہ پر قائم رھتی تھیں ۔ پشت پر جال (عنکبوت) بھی رکھا جا سکتا تھا اور اس کے اوپر ثوابت کے مختلف مواضع کے ظلّ بھی درج کیے جاتے تھے ، بالکل اسی طرح جس طرح اصطرلاب میں درج کیے جاتے ھیں .

جب ز اور ب دو مقاماتِ فلک کے طُول اور عرض معلوم ھوں تو قوس تسییر کو مکانیکی طور پر معلوم کرنے کے طریقے یہ تھے (ملاحظہ ھو شکل ۱، ۳ اور ۴) :

۱ - العِضادۃ کی متحرک سوئی کو پُشت کے رُخ پر مقام بؔ پر رکھیے اور مطلعِ خط استواء ہر دیکھ لیجیے ، جس کی طرف اب العِضادۃ اشارہ کر رھا ھے .

۲- العِضادۃ کو سامنے کے رُخ لا کر مطلعِ خطِ استواء ب پر رکھیے اور (ب سے)دائرۂموضع کو، جس پر اب متحرک سوئی آ گئی ھے ، معلوم کیجیے .

۳- سوئی کو عقب میں مقام ز پر رکھیے اور مطلعِ خط استواء ا دیکھ لیجیے .

۴- العِضادۃ کو سامنے کے رخ پر لا کر مطلعِ خطِ استواء ا پر رکھیے اور العِضادہ کو گھماتے جائیے حتی کہ سوئی ز سے گذرتے ھوے متوازی دائرے کے ساتھ ساتھ ب کے دائرۂ موضع کی طرف (ج میں) اشارہ کرنے لگے .

۵- اب مطلعِ خطِ استواء ج کو دیکھ لیجیے ، کیونکہ اب العِضادۃ اس درجہ کو بتا رھا ھے ، قوس ا جـہ (ac) ھی مطلوبہ قوسِ تسییر ھے .

عربی زبان میں تسییر یا صفیحۂ تسییر کے متعلق ذیل کے فضلاء نے لکھا ھے : (۱) محمد بن عمر بن فُرّخان (زُوٹر H. Suter : *Die Mathematiker u. Astronomen der Araber etc.*، *Abhdlg. z. Gesch. d. math. Wissensch.* xlv، جزء ۱۰ ، ۱۹۰۰ء،

عدد ۳)؛ (۲) البتّانی (زوٹر، عدد ۸۹)؛ ابو جعفر الخازن (زوٹر، عدد ۱۲۴)؛ البیرونی (زوٹر، عدد ۲۱۸)،لیکنؔ (ابن ۤرخان) مذکور کی نجومی تصنیفات سب کی سب محفوظ نہیں رہیں ۔ فلکیات میں جو کتابیں الفانسو دھم سے منسوب ھیں ان میں Rabi Cage "Book of the Atacir" طلیطلی (اسحق بن سیٹم) کی تصنیف ہے جو زیج الفانسو (Alfonsine Tables) کا مدوّن (اڈیٹر) ھے، لیکن معلوم ھوتا ھے کہ یہ کسی عربی کتاب کا محض ترجمہ ھی ھے ۔

ابن القِفطی نے اپنی تاریخ الحکماء میں ذیل کے ھیئت دانوں کا نام بڑی عزت سے لیا ھے جو تسییر کا حساب نکالنے میں خاص مہارت رکھتے تھے : الحسن بن مِصْباح (ص ۱۶۳) ؛ المَرْوَزی (ص ۱۷۰، زوٹر، عدد ۲۲) ؛ الخاقانی (ص ۱۸۱، زوٹر ، عدد ۲۰۶) ؛ سِنَد بن علی (ص ۲۰۶ ، زوٹر عدد ۴۲) ؛ العبّاس بن سعید الجوھری (ص ۲۱۹ ، زوٹر، عدد ۲۱) ؛ ابن یونس (ص ۲۰۳، زوٹر، عدد ۱۷۸)؛ ابن الأعلم (ص ۲۳۵، زوٹر، عدد ۱۳۷)؛ محمد بن ابراھیم الفزاری (ص ۲۷۰، زوٹر، عدد ۱)؛ محمد بن خالد المروالروذی (ص ۲۸۱، زوٹر، عدد ۶۴)؛ یحیی بن ابی منصور (ص ۳۵۷، زوٹر، عدد ۳۱)؛ یحیی بن سہل السّدید ابو بِشر التّکریتی (ص ۳۶۵)؛ ابو الفضل بن یامین (ص ۴۲۶) ۔

مآخذ : (۱) البیرونی : القانون المسعودی [طبع دائرة المعارف العثمانیة، حیدر آباد دکن ۱۹۵۶ء، مقالہ ۱۱، باب ۵، ص ۱۳۹۳] : نسخۂ لندن ، موزۂ برطانیہ، Or. 1997 و برلین، فہرست اھلوارٹ ، عدد ۵۶۶۷ : (۲) البیرونی : کتاب الاستیعاب، نسخۂ لائیڈن، عدد ۱۰۶۶ (دونوں کا ترجمہ از ویڈمان E. Wiedemann)؛ [(۳) البیرونی : تمہید المستقر لتحقیق معنی الممّر فی ذکر ممرّ الطولی،طبع دائرة المعارف العثمانیة حیدر آباد دکن ۱۹۴۸ء، ص ۳]؛ (۴) وھی مصنف : کتاب التفہیم لاوائل صناعة التنجیم ، مترجمۂ رائٹ R. R. Wright، لندن ۱۹۳۴ء، متن باب ۵۲۱ تا ۵۲۳؛ (۵) غلام حسین جون پوری : زیج بہادر خانی، طبع بنارس، ۱۸۵۸ء؛ مقالہ ۶ ، باب ۳، فصل ۴ ، ص ۶۳۴]؛ (۶) A. Bouché-Leclerq: *L,astrologie grecque*، پیرس ۱۸۹۹ء؛ (۷) M. Delambre : *Histoire de l'astronomie du Moyen-âge* ، پیرس ۱۸۱۹ ؛ (۸) J. G. Job : *Anleitung zu denen curiösen Wissenschaften* ، فرانکفرٹ اور لائپزگ ۱۷۴۷ء ؛ (۹) C. A. Nallino : *Al-Battani, sive Albatenii opus astronomicum*، میلان ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۷ء ؛ (۱۰) D. Man. Rico y Sinobas : *Libros del saber de astronomia del Rey D. Alfonso X. de Castillia*، میڈرڈ ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۷ء؛ (۱۱) M.L.P.E.A Sèdillot: *Prolégoménes des Tables astronomiques d'Oloug-Beg*، پیرس ۱۸۵۳ء ؛ (۱۲) E. Wiedemann : *Zur Geschichte der Astrologie*، در *Weltall* ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء؛ Berlin-Treptow؛ (۱۳) وھی مصنف : *Beiträge zur Geschichte der Naturwissenschaften, XLVII*, "*Über die Astronomie nach den Mafâtîḥ al-'Ulûm*", *S. B. P. M. Soz. Erl.*، ایر لانگن ۱۹۱۵ء ۔

(O. SCHIRMER)

تشبیه : ذات الٰہی کے بارے میں مسلّمہ عقائد کے مخالف فرقوں میں دو ایسے متضاد نظریے ھیں جو صحیح العقیدہ مسلمانوں کے نزدیک کبیرہ گناھوں میں شمار ھوتے ھیں : (۱) تشبیہ (anthropomorphism) ، یعنی تمثیل اور تجسیم، جس سے مراد ھے خدا کو انسان جیسا سمجھنا اور (۲) تعطیل، جس سے مراد ھے خدا کی صفات کی قطعاً نفی کرنا ۔ ان دونوں تصورات کے بارے میں تند اور شدید نزاع رھی ھے اور

اس سے اہل اسلام کا عقیدہ دربارۂ قرآن بھی متاثر ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ذاتِ الٰہی کا مسئلہ دین کا اساسی مسئلہ ہے ۔ دونوں متنازع فرقوں نے بخیالِ خود قرآن مجید کی آیات سے استناد کیا ہے، جو ایک طرف تو خدا کی بے مثل وحدانیت پر زور دیتا ہے اور دوسری طرف تجسیمی اصطلاحوں کے ذریعے اس کی صفات بیان کرتے ہوے بے تکلف اس کے چہرے، آنکھ اور ہاتھ وغیرہ کا اور اس کے کلام کرنے اور بیٹھنے (عربی ''استوی''، قرآن مجید، سورۃ ۷ [الاعراف] : ۵۲) کا ذکر کرتا ہے۔ تفاسیر، مثلاً طبری میں آیۃالکرسی، ۲ [البقرۃ]: ۲۵۶ (دیکھیے نیز *Vorlesungen* : Goldziher، طبع دوم، ہائڈل برگ ۱۹۲۵ء، ص ۱۰۲ ببعد) کی نہایت مختلف تأویلات دی گئی ہیں، جن میں سے اکثر کی تصدیق کا اب کوئی خارجی ذریعہ موجود نہیں ۔ ان میں سے بعض تو کلمات کے لفظی معنی پر بدون تدبر زور دیا گیا ہے اور بعض میں ان کی تأویل تمثیل اور مجاز کے پیرائے میں دی گئی ہے۔ لفظ تشبیہ کا استعمال بہت پہلے سے شروع ہوچکا تھا اور اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ باری تعالٰی کی صفت ایسی عبارت میں بیان کی جائے جو اس لیے مبہم ہو کہ عموماً انسانوں کے لیے بھی وہی کلماتِ صفاتی مستعمل ہیں، بلکہ شاید ان کلمات صفاتی کے استعمال کی اجازت نبیؐ نے بھی دی ہو ۔ 'تشبیہ' کے بجاے 'تمثیل' کا لفظ بھی سورۃ ۴۲ [الشوریٰ] : ۹ سے اخذ کیا جاسکتا ہے، جہاں کسی شے کے خدا کے مثل ہونے کو خارج از امکان قرار دیا گیا ہے (لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ) ۔ مادۂ ش ۔ ب ۔ ہ کا باب تفعیل (تشبیہ) فقط [۴ سورۃ النساء] : ۱۵۶ میں پایا گیا ہے [وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ]، جہاں یہودیوں کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ انہوں نے عیسی [علیہ السلام] کو مصلوب کیا ہے ۔ یہ درست ہے کہ تأویل یعنی تشبیہ انسانی والے لفظی معنوں کی عقلی تشریح مسلکِ تعطیل کا ایک ذریعہ اور اس کا پیش خیمہ ہے، لیکن ہر جگہ ایسا نہیں، کیونکہ مادہ أ ۔ و ۔ ل (نَصَرَ يَنْصُرُ) کے باب تفعیل، یعنی تأویل، کا اطلاق قرآن مجید میں ملامت و تجریح کے رنگ میں نہیں ہوا ۔ اس مسئلے کے بارے میں بھی دو قسم کی حدیثیں پائی جاتی ہیں ۔ بعض ایسی احادیث ہیں جو غرض پر مبنی ہیں اور محض دورانِ بحث میں پیدا ہوئیں اور ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر وضع کی گئیں اور ایسی بھی ہیں جن سے خاص عقائد کی تائید مقصود نہ تھی [جیسا کہ ممکن ہے کہ اس تمثیل کا حال ہو، تھانوی: مُصْطَلَحَات، ص ۸۰۴ پر مذکور ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایسی تمثیل امرد پرستی سے ناشی ہو] (رٹر Ritter، در *Islam*، ۱۷ [۱۹۲۸ء] : ۲۵۷، دیکھیے نیز مخطوطات کے حوالے اس کے ابتدائی صفحات میں) ۔ ان کے علاوہ ایسی احادیث بھی ہیں جن کی تشریح سطحی طور پر کی گئی ہے اور جنھیں اس بحث میں بطور دلیل پیش کیا گیا ہے؛ مثلاً یہ حدیث کہ اللہ تعالٰی ہر رات آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے ۔ اگرچہ اس حدیث سے بذات خود انسان کے اندر روحانی جذبات اور باطنی اَحوال پیدا ہوتے ہیں، مگر حقیقۃً یہ تشبیہ و تمثیل ہے اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰی اپنے بندوں کی دعا قبول کرتا ہے ۔

ہمارے لیے اس مسئلے پر بحث کرنا بے حد مشکل ہے، کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کوئی مسلمان عالمِ دین ایسا نہیں جو خداے تعالٰی کے متعلق ان دونوں عقیدوں میں سے کسی ایک عقیدے کے حق میں صاف صاف راے ظاہر کرے ،

[ہست در وصفِ او بوقتِ دلیل
نطق تشبیہ و خامشی تعطیل

سنائی : حدیقه، لکھنئو ۱۸۸۷ء، ص ۳۱]
بلکه هر ایک عالم اس بات کا مدعی ہے که وہ
تنزیه باری تعالٰی (''براءة عن الاوصاف الجسمانیة'')
کا قائل ہے اور تشبیه کا حامی نہیں اور اس کے
ساتھ ہی تنزیل، یعنی وحی قرآنی، کی بنا پر تثبیت
کا قائل ہے (مُثبِت، یعنی تعیّنات صفاتی کا قائل)،
تعطیل کا نہیں - مزید برآں دونوں فریق ایک
دوسرے کو ایک سے یا ہر دو سے انحراف کا
مرتکب ٹھہراتے ہیں - ان دونوں اصطلاحوں کا
استعمال بالکل اضافی ہے اور ان کے مزعومه قائلین
کی گروہ بندی بھی ویسی ہی اضافی ہے - دراصل
معطّلة یا مشبّهة نام کے کوئی خاص فرقے موجود
نہیں ہیں، بلکه ذات اور صفات حق کے متعلق
تعلیمات میں جو اختلافات ہیں وہ حق تعالٰی سے
متعلق دیگر بیانات سے متوازی نہیں ہیں اور دیگر
دینی عقائد اور دینی - سیاسی نظریے سے متعلق
اختلافات کے ساتھ تو ان کے انطباق کا اور بھی
کم امکان ہے - جَعْد بن دِرْهَم کی بابت کہا جاتا
ہے که وہ پہلا مُعطّلی ہے، مگر اس شخص کے
حالات ہمیں بہت ہی کم معلوم ہیں : تاہم
اسی کو ابن تیمیه نے الفُرقان میں (قب مجموعة
الرسائل الکبرٰی، قاهرة ۱۳۲۳ھ، ۱ : ۱۳۷، س ۱۳
ببعد) آخری اموی خلیفه کے زوال کا ذمے دار ٹھہرایا
ہے اور خلیفه مذکور کو قطعی طور پر مروان الجَعْدی
کہا گیا ہے - اس کے برعکس ابن تیمیه اس جعدی
کو باوجود نمایاں تضاد کے باطنیۂ حشّاشین
کے ظہور اور رافضیۂ شام کے وجود کا بھی
ذمے دار ٹھہراتا ہے - عقیدۂ تعطیل کی اشاعت
کرنے والا، جس کا ذکر اس ضمن میں اکثر
آتا ہے، جَہْم بن صَفوان الراسبی [رک بآن] ہے،
جو عمر میں جَعْد سے کسی قدر کم تھا اور ۱۲۸ھ/
۷۴۵ء میں قتل کر دیا گیا - اس کی نسبت
شیعی عالم ابن الراوندی لکھتا ہے که وہ معتزلی
موحّد تھا اور اسے ابوالحسن الخیّاط معتزلی نے اپنی
کتاب الانتصار (طبع نُوبِرْژ Nyberg، قاهرة ۱۹۲۵ء،
ص ۱۳۳، سطر آخر ؛ ص ۱۳۴، س ۴) میں ''امام
المشبّهة'' ہونے کے سبب سے) معتزله سے خارج
کر دیا ہے اور اپنی رائے کی بنیاد بِشر بن المُعتَمِر
کی ایک نظم پر رکھی، جس میں اس سے انتفاء و
براءت کا اظہار کیا ہے
[ننفیهمُ عنّا و لسنا منهمُ - ولا همُ منّا ولا نرضاهمُ
امامهم جَہْمُ الخ . . . .
(الانتصار، ۱۳۴)]
اور اس ایک عقیدے کی بناء پر دونوں میں مشترک
ہے، یعنی یه که خدا کو اشیاء کا علم صرف اشیاء کی
پیدائش ہی پر حاصل ہوتا ہے [''عقیدۂ حَدثُ العلم'']
اسے غالی شیعه [هشام] بن الحکم (دیکھیے سطور ذیل)،
(ص ۱۲۶، س ۱۰ ''شیخ المجسمة'' کے ساتھ ایک ہی
زمرے میں داخل کیا ہے، الخیّاط اصولاً تشبیه و
تجسیم کا عقیده بالخصوص نابتة، یعنی عثمانی -
اموی گروہ سے منسوب کرتا ہے (ص ۱۴۵، س ۹
ببعد)؛ ابن حزم (فِصَل، قاهرة ۱۳۲۱ھ، ۴ : ۲۰۴،
س ۸ و ۲۰۵) جَہْم اور اشعری دونوں کو فرقۂ مرجئه
میں شمار کرتا ہے؛ شہرستانی (طبع Curoton، ص ۶۰)
اور اِباضی ابوستّة محمد القَصْبی (برهامش جَنَاوُنی :
کتاب الوَضْع، قاهرة ۱۳۳۵ھ، ص ۷۰) اسے
جبریّة میں شمار کرتے ہیں، جو قضاء و قدر کے
سامنے انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں -
اگرچه جَہْم کی بابت عام رائے یہی معلوم ہوتی
ہے که وہ معطّلی ہے، تاہم جن لوگوں نے
زندقه (heresies) پر کتابیں لکھی ہیں ان کے
بیانات کو بہت ہی احتیاط سے قبول کرنا چاہیے -
خُشَیش النسائی (م ۲۵۳ھ / ۸۶۷ء، دیکھیے
ماسینوں Massignon: *La Passian d'al Hallāj*، پیرس

۱۹۲۲ء، ص ۶۳۵ اور حاشیہ ۲) جَہْم کے کلام کو 'تَخْمِیم' (خدا کو مخلوق کی صفات سے منزّہ ماننا) کہتا ہے اور اشعری مقالات الاسلامیین میں (طبع رٹر Ritter، ص ۲۶۷، س ۱ ببعد) اور اسی طرح بغدادیؔ : الفَرق بین الفِرَق (قاہرۃ ۱۳۲۸ھ، ص ۱۹۹، س ۱۱) میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جَہْم تشبیہ کے خوف سے یہ نہیں کہتا تھا کہ اللہ کوئی شیُ ہے؛ ابنِ حزم اس سے لاشیُ کا انکار بھی نقل کرتے ہیں، یعنی جیسے اللہ شیُ نہیں ہے ایسے ہی لا شیُ بھی نہیں ہے [''ویقول لیس اللہ تعالیٰ شیئاً ولا ھو ایضاً لاشیٔ'' فِصَل، ۴ : ۲۰۰، س ۱۰] - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تعطیل یا اس کی شدید صورت 'ابطال' میں جا پڑنے سے خائف ہے - جَہْم کے خلاف جو بہت سے رسائل لکھے گئے ان میں سے امام احمد بن حنبل کی کتاب الرّد علی الزنادقۃ و الجہْمیّۃ (دیکھیے الٰہیات فیکلٹیسی مجموعہ سی، ۱۹۲۷ء، ص ۳۱۳ تا ۳۲۷) ہمارے پاس موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل اپنے مخالف کے اقوال اور دلائل بہت کم نقل کرتے ہیں، اس لیے مخالفین کے منقولہ دلائل کی صحت پر یقین تبھی ہو سکتا ہے جب مزید شواہد موجود ہوں، البتہ موضوع بحث اور اس بارے میں قرآن اور حدیث سے جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ بالکل صاف ہیں - کہا جاتا ہے کہ جَہْم نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ نیک بندوں کو جنت میں رؤیت باری نصیب ہوگی [قرآن میں لفظ ''لقاء'' آیا ہے] یا خدا نے موسٰی [علیہ السلام] سے کلام کیا یا اسے ''اسْتواء عَلَی الْعَرْش'' حاصل ہے - جَہْم اس قولؔ سے بچنا چاہتا ہے کہ اللہ [تعالیٰ] کسی خاص مقام میں ہے - اس کے اس خوف کو احمد بن حنبل

بالکل لفظی اور تَجْسیمی معنی پہناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اگر ہر جگہ ہے تو جَہْمیوں کے نزدیک اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تسلیم کریں کہ اللہ تعالیٰ جَہْمیوں کے ابدان میں، خنازیر کے پیٹ میں اور اماکنِ قذرہ میں بھی موجود ہے - با این ہمہ خود امام ابن حنبل کو انسانوں کے درمیان اللہ کے وجود ۵۸ [المجادلۃ][۱] ۷، ۲۰ [طٰہٰ] [۲]: ۳۶، ۴۶، ۹ [التوبۃ][۳] : ۴۰ وغیرہ کی تأویل کرنا پڑی اور اسے استعارہ کہنا پڑا - یہاں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ سنیّوں کی لفظی تفسیر اور معتزلہ کی تأویل کے درمیان ایک حدّ فاصل قائم کرنے کا امکان کس قدر کم ہے !

اس کے ساتھ ہی جَہْم کا امام احمد بن حنبل پر سخت اعتراض ہے کہ جیسے نصرانی اقانیم ثلاثہ کو شخصِ واحد اور قدیم فرض کرتے ہیں ایسا ہی وہ خدا کو مع اپنی تمام ازلی صفات کے واحد اور قدیم گردانتے ہیں، اور اس کے لیے وہ بلا تردد کھجور کے درخت کی مثال پیش کرتے ہیں جو جڑ، تنے، ٹہنی، شگوفے اور پتّے کے علحدہ علحدہ ہوتے ہوئے بھی واحد ہے۔

امام احمد بن حنبل نفیِ تشبیہ و تعطیل میں راسخ العقیدہ لوگوں کے ہاں بہت بڑی حجّت اور سند مانے جانے لگے - الاشعری [رِکّ بان] مقالات، ص ۲۷۷، س ۵ [؟] میں اپنے عقیدے کے بیان میں انھیں پر اعتماد کرتے ہیں - انھوں نے اس موضوع پر خصوصاً رؤیۃِ الٰہی کے امکان پر اپنی رائے بہت سے رسائل میں تحریر کی ہے - انھوں نے اس بارے میں یہ درمیانی راستہ اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ید، وجہ اور استواء علی العرش کو ''بلا کیف'' تسلیم کرنا چاہیے اور ان کے متّبعین مسلسل اس مسلک کو بسط دیتے رہے ہیں؛ چنانچہ ہر

[(۱) مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ - (۲) اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی - (۳) لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا۔

مسلمان خود بھی اس مسئلے کے متعلق یہی کہے گا، لیکن ابن حزم نے ان کے اس قول کی نسبت کہا ہے کہ وہ "قول مجسّمہ میں داخل"، ہے، گو اس کے ساتھ ہی انھوں نے [امام] احمد بن حنبل کو معتمد علیہ بھی مانا ہے (۲: ۱۶۶، س ۱۷ تا ۱۹)(۱)۔ خود ابن حزم معتزلہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے تأویل سے تصور باری کو مدّہم کر دیا ہے، مگر خود بھی ویسی ہی بے رنگ تأویل پیش کی ہے (قب ۲ : ۱۶۶، س ۱۶ ببعد تا ص ۱۶۷، س ۶ ببعد)۔ القاسم بن سعید الشّماخی نے حال ہی میں اپنی کتاب القول المتین فی الردّ علی المخالفین (قاہرۃ ۱۳۲۴ھ، قب خصوصاً ص ۷۶ ببعد) میں بوضاحت بیان کیا ہے کہ فرقۂ اباضیہ ذاتِ باری سے متعلق نظریۂ اشعری کو ہمیشہ تشبیہ سمجھتا رہا ہے۔ اس بارے میں اس کی رائے ایسی ہی سخت ہے جیسی ابن تُومَرت المُوحّدی کی، جو اس نے المرابطون کی تشبیہ کی بات ظاہر کی ہے (دیکھیے *Le livre de Mohammad Ibn Thumert* ج ۱، طبع Goldziher، الجزائر ۱۹۰۳ء: ص ۲۶۱، س ۳؛ ص ۲۳۲، س ۸).

ما تُریدیوں نے [امام] احمد بن حنبل سے حتی الامکان قریب رہنے اور تشبیہ کے شبہ سے بچنے کی کوشش میں سلبیّات پر نسبۃً زیادہ زور دیا ہے کہ اللہ [تعالیٰ] محدود نہیں، معدود نہیں، منقسم نہیں، مرکّب نہیں؛ چنانچہ ابو حفص النّسفی اسی کے قائل تھے (قب D.B. Macdonald: *Development of Muslim Theology, Jurisprudence and Constitutional Theory*، نیویارک ۱۹۰۳ء، ص ۳۰۹)۔ اس وجہ سے ان پر تاویل تعطیلی کا الزام عائد ہوا ہے، جیسا ان کے پیش رو بِشر المَریسی پر عثمان بن سعید الدارمی نے اور امام غزالی پر ابن تیمیۃ (کتاب مذکور، ۱: ۴۲۵، س ۱۶) جیسے متشدّد حنبلیوں نے عائد کیا تھا، لیکن حنبلی مذہب کے علماء ایک ہی رائے پر قائم نہیں رہے، چنانچہ ابن الجوزی نے اپنی کتاب دَفْع شُبْهَة التشبیہ و الردّ علی المجسمۃ (طبع حُسام الدین القُدْسی، دمشق ۱۳۴۳ھ، خصوصاً ص ۵ ببعد) میں اپنے تین حنبلی ہم مذہبوں [ابو عبداللہ بن حامد، ان کے متبع قاضی ابو یَعْلٰی اور الزاغونی (دائرۃ المعارف الاسلامیۃ)] پر یہ الزام لگایا ہے کہ ان کا تصوّر خالص نہیں تھا [اور انھوں نے مذہب کو عیب دار کر دیا ہے] - اس کے برعکس ابن الجوزی کا مشہور و معروف شاگرد ابن تیمیۃ اور ان کی طرح کے اَور لوگ، مثلاً ابو عامر محمد بن سَعْدون القُرَشی، غالی مشبّہۃ میں شمار ہوتے ہیں اس وقت سے جب سے ابن تیمیۃ کی نسبت ابن بطّوطۃ نے روایت کی (اور بہت لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا) کہ ابن تیمیہ نے کہا تھا "خدا آسمانِ دنیا کی طرف اسی طرح نزول فرماتا ہے جیسے میں اب منبر پر سے اتر رہا ہوں (اس کے ساتھ ہی وہ منبر سے نیچے اتر آئے)"۔ حُسام الدین [القُدْسی] در ابن جوزی: کتاب مذکور، ص ۴۸، تعلیقہ) نے اس پر ایک جالبِ توجہ تعلیقہ لکھا ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم وہ اعتراض ہے جو خود ابن تیمیۃ نے اپنی تصنیفات میں مشبّہہ کے اس عقیدے پر کیا ہے کہ "بَصَر کَبَصَری وَ یَدٌ کَیدی" (نظر میری نظر جیسی اور ہاتھ میرے ہاتھ جیسا) (رسالۃ الفرقان، ۱: ۱۱۹، س ۱۳)، نیز وہ تفسیر جو انھوں نے انسانوں کے درمیان ذاتِ حق کے وجود کی کی ہے، جسے فی الحقیقت ایک عقلی تأویل کہیں تو بجا ہے (۱، ۴۵۶ ببعد)، اور پھر ان کی دائمی کوشش کہ خدا سے متعلق تمام تشبیہی عبارتوں کو اللہ [تعالیٰ] کے ساتھ خاص

[(۱) اس مقالے میں مقالات الاسلامیین طبع رٹر کے حوالے اشتباہ سے خالی معلوم نہیں ہوتے۔ ادارہ]

اور صفاتِ عدیمُ النظیر قرار دیا جائے ۔ ان کی یہ رائے خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ایسی تمام احادیث جو خدا کے زمین پر اترنے کے متعلق اور تجسیم شدید پر مشتمل ہیں وہ زندیقوں نے جان بوجھ کر وضع کی ہیں تا کہ اہل السنّت کو مورد تضحیک بنائیں (۱ : ۲۸۰، س ۲) اور ایسے ہی عام طور پر تشبیہ اور تعطیل پر ان کے وہ مسلسل حملے بھی (۱:۲۰۷، س ۱۳ ببعد ؛ ۳۹۵، س ۲ ببعد وغیرہ) جن سے کم از کم ان کے مقصد اور ذاتی اعتقادات کا انکشاف ہوتا ہے ۔

ابو محمد ہِشام بن الحَکَم (م حدود ۱۹۹ھ / ۸۱۴ء) کا معاملہ اس سے زیادہ مشکل ہے، کیونکہ اس کی کوئی تألیف ہمارے پاس موجود نہیں ہے، البتہ [امام] اشعری کی تصنیف (مقالات الاسلامیین، ص ۲۹، س۳ ببعد) سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں جو بیانات ہیں انہیں جمع کیا جائے تو ان میں اختلاف نظر آتا ہے ۔ ان بیانات میں بہر حال اس امر کا واضح ثبوت موجود ہے کہ ہشام حقیقی تشبیہ سے مبرّا تھا اور ایک مختصر مگر بیّن اشارہ اس کی رائے کی جانب موجود ہے کہ ایک مناسبت اور علاقہ (جرجانی : شرح المواقف الایجی، طبع سو/رنسن Soerensen، لیپزگ ۱۸۴۸ء، ۲۷۴، س ۵ و ۱۱ : التشابه و المشابهة) ہے جو ابتداء مخلوق کے ساتھ خدا کے تعلقات کو ممکن بناتا ہے نیز اس کے علم کا حصول ایک نفوذی شُعاع کے ذریعے، جو اس سے صادر ہوتی ہے، ممکن ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کے علم کا تصور بغیر اس طریقے کے ممکن نہیں ۔ اس کے باوجود [امام] اشعری اقاویل المجسّمة کو ہشام کے ذکر سے اس طرح شروع کرتے ہیں کہ ”وہ اپنے معبود کو انسان سے مشابہت دیتا تھا“ ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مختلف لوگوں کو مختلف فرقوں کے ساتھ

منسوب کرنے میں بہت بے احتیاطی برتی گئی ہے، جو بعد میں تاریخ المذاہب پر لکھنے والے متأخر مصنفوں میں عام طور پر مروّج ہو گئی ہے۔ شیعوں کے طویل اور مفصل بیانات بھی بجائے خود تناقض سے خالی نہیں ۔ اس فرقے کا ایک اور ہشام، ابن سالم الجّوالیقی سب سے زیادہ سبک سر معلوم ہوتا ہے، جو حدیث ”خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ علٰی صُورتِه“ سے استشہاد کرتے ہوے اور ضمیر کا مرجع خدا کو بتاتے ہوے اللہ تعالٰی کے بالوں اور پہلووں کا ذکر کرتا ہے (کَشّی : معرفة اخبار الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ، ص ۱۸۳ ؛ استر آبادی : منہج المقال فی تحقیق الرجال، طہران ۱۳۰۶ھ، ص ۳۶۷) ۔ اس کے بر عکس ہشام بن الحَکَم نے عقیدۂ ’اثبات‘ کی رعایت اور ’ابطال‘ سے بچنے کے لیے (جس کی وجہ سے اسے مبہم کلمہ ”شیٔ“ کے پہلو بہ پہلو ”جسم“ کی اصطلاح اختیار کرنا پڑی) تشبیہ سے دور رہنے کی بہت کوشش کی ہے ۔ عام طور پر تجسیم کو بے تکلف تشبیہ کے ساتھ مساوی نہیں قرار دینا چاہیے، اس لیے کہ مجسّمہ، جن میں خود ہشام بن الحَکَم بھی تھا، جب یہ کہتے تھے کہ ”اللہ کا جسم ہے“ تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے : ”لیکن اجسام کی طرح کا جسم نہیں“ ۔ [متأخرین شیعہ نے کوشش کی کہ وہ اپنے قدماء کا دامن داغدار نہ ہونے دیں] پھر بھی استر آبادی ہشام کے خلاف یہ نفرین آمیز فیصلہ دیتا ہے کہ وہ ابی شاکر ”دَیصانی“ کا شاگرد ہے، اس ابی شاکر کے حالات پر ہشام سے بھی زیادہ افسانوی رنگ چھایا ہوا ہے ۔ شاید سب سے زیادہ معنی خیز اشارہ [امام] اشعری (ص ۳۳، س۸) کا ہے، جنھوں نے لکھا ہے کہ ہشام بن الحکم نے ایک سال کے اندر خدا کی ذات سے متعلق پانچ مختلف آراء کا اظہار کیا ۔ یہ بات ایسے آدمی سے

بالکل ممکن ہے جس کے مزاج میں شیعی روایات کے مطابق بہت تندی تھی اور ایسے زمانے میں امام جعفر الصادق(رض) کے حلقے کا رکن تھا جب کہ علم کلام نے ابھی کوئی خاص مستقل صورت اختیار نہیں کی تھی، اسی لیے اس حلقے کے افراد کے درمیان باہمی مناقشات و مجادلات بکثرت موجود تھے اور ان مناقشات میں سے کچھ دونوں ہشاموں کے درمیان تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود شیعوں کے ہاں آپس میں اختلاف عظیم رہا ہے۔ نُصَیری فرقے کو، جن کا سرگروہ ابن حَمْدان الخصیبی ہے، مشبّہین میں شمار کیا گیا ہے۔ باطنیه کی نسبت، جو آپس میں خاصا اختلاف رکھتے ہیں، بالعموم تشنیعاً یہ کہا جاتا ہے کہ گویا وہ مشبّہین مبطّله (nihilists) کی رمز و علامت ہیں، لیکن باطنی فرقے کے سر برآوردہ نمایندوں میں سے ناصرِ خسرو اپنی کتاب زاد المسافرین (برلن، ص ۱۰۰ ببعد) میں صانع عالم سے متعلق ایسے عقیدے کی تائید کرتا ہے جس میں جسم پر زور دیا گیا ہے اور اس لیے یوں کہنا چاهیے کہ ان اصولوں کی یاد دلاتا ہے جو روایةً هشام بن الحکم کی طرف منسوب ہیں، گو اُس عقیدے کو عقائد کے اس سلسلے کی شاخ قرار نہیں دیا جا سکتا؛ اس لیے کہ اس میں اثبات صانع عالم کا ذکر ہے اور اس بات کا کہ وہ مکان میں محصور نہیں اور اس کا کہ ارادۃ اللہ غیر اللہ ہے۔

یہ درست ہے کہ اثنا عشری فرقے نے تعطیل اور تشبیه کے خلاف سخت جنگ کی ہے اور اثبات پر بھی کما حقه زور دیا ہے؛ مگر اس کے ساتھ ہی وہ معتزله کی طرح تشبیه کو شک و شبه کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں، کیونکہ اس سے باری تعالیٰ کی تنقیص لازم آتی ہے۔ ان کی رائیں مجلسی کی موسوعه موسوم به بحار الانوار (حصه دوم، طهران ۱۳۰۶ھ، ص ۸۹ تا ۱۰۰) میں ذیل کی طرح کے عنوانوں کے تحت ملیں گی: ''انکار جسم و صورت و تشبیه''، ''انکار از زمان و مکان و حرکت و نقلِ مکان'' - ہم صرف کُلَینی، ابن بابُوَیه اور طُوسی سے بعد میں آنے والے متأخر مصنفین ہی کے کلام سے ان بیانات کی تصدیق کر سکتے ہیں جو اثنا عشریه سے منسوب کیے گئے ہیں۔

جن خطرات سے ہِشام بن الحَکَم نے اس قدر مختلف طریقوں سے بچنے کی کوشش کی ہے ان سے ان کلامی مشکلات کا اندازہ ہو سکتا ہے جو تشبیه اور تعطیل کی دو حدوں کے درمیان پیش آتی ہیں۔ یہ مسئله اس قدر آسان نہیں کہ اسے عام الفاظ میں صاف صاف بیان کر دیا جائے، مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مسئله در اصل خدائے تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے دو گونه منازعت ہے، جس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ باری تعالیٰ کو محض ایک روحانی ہستی تصور کیا جائے اور دوسرا پہلو یہ کہ اسے ایک معیّن اور مشخص وجود تسلیم کیا جائے۔ اس لیے کہ اگر مسئلے کی صورت یہ ہے تو اس میں مثلاً اشعری جیسے علماء کا کیا مقام ہوگا؟ اسلامی عقائد کی تاریخ سے یہ امر یقینی طور پر واضح ہے کہ اشعری فرقے کا ہر پیرو اپنے امام کو ایسی صاف اور واضح تقسیم کی دونوں شقوں میں سے کسی ایک میں داخل کرنے پر معترض ہوگا۔ تشبیه اس لیے مردود ہے کہ وہ بت پرستی اور کفر کی طرف لے جاتی ہے اور تعطیل اس لیے کہ وہ الحاد اور شرک کا پیش خیمه ہے، لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان اصل میں ایک تعلق ہے۔ چونکہ جَہْم کے تصور کے مطابق کلام کے لیے جوف، زبان اور دو لب ضروری ہیں، یعنی تجسیم ضروری ہے لہذا بقول [امام] ابن حنبل

جُہم کلامِ خداوندی سے متعلق آیات قرآنی کی تأویلات تعطیل میں مبتلا ہوگیا۔ ابن تیمیۃ نے بھی اسے ''مُعَطِّل مُمَثِّل'' کہا ہے (مجموعۃ الرسائل الکبری، ۱ : ۱۲۷، س ۹) .

مآخذ : فرقہ ہای زنادقہ سے متعلق تاریخوں میں جو فصلیں لکھی گئی ہیں اور اخبارِ متکلمین جو بیان کی جاتی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقوں کے عقائد ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف ہیں ۔ مگر انہیں یہ سمجھ کر کہ یہ مقالات محض الزام دھی کی نیت سے ایک دوسرے کے سر تھوپے گئے ہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ گو ان میں صرف قدرے مفید اشارات ھی مل سکتے ہیں ، جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ کون سے اقوال تھے جن کی نسبت گمان تھا کہ مختلف فرقے ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا کرتے تھے ۔ اسی طرح اس فرقے کے معتقدات دریافت کرنے کے لیے جس پر حملہ کیا گیا ہو ان مذہبی مجادلات کا فائدہ محض ابتدائی قسم کا ہے، البتہ ان مخاصمات اور مناظرات کو قلمبند کرنے والے علماء کے صرف اپنے خیالات معلوم کرنا مقصود ہو تو یہ مناظرات اس مطلب کے لیے قابل وثوق مآخذ تصور کیے جا سکتے ہیں ، جیسے ایک عالمِ دین کے لیے اس کی اپنی تفسیر القرآن اور اس کے اپنے عقائد و اصول دین ہی صحیح اور معیاری ہو سکتے ہیں ، مثلاً کتب ذیل : (۱) غزالی : احیاء علوم الدین ، کتاب ۱ / ۲ : قواعد العقائد اور کتاب ۴ / ۵ و ۶ : التوحید و التوکل اور المحبۃ ؛ (۲) H. Bauer : *Die Dogmatik al-Ghazālīs* ، Halle ، ۱۹۱۲ء، ۳۸ ببعد ؛ (۳) J. Obermann : *Der philosophische und religiöse subjectivismus Ghazālī's* ، وینا ۱۹۲۱ء، ص ۱۹۷ تا ۲۰۰، ۲۱۷ ؛ (۴) ابو منصور عبدالقاہر البغدادی : اصول الدین، استانبول ۱۳۴۸ھ، ۱ : ۷۳ تا ۱۳۰ (یہ اس موضوع پر کوئی باقاعدہ رسالہ نہیں ہے، بلکہ اس مصنف کی مذکورۂ بالا کتاب الفَرق بین الفِرَق کی طرح اس میں اختلافات کا بیان ہے) .

(R. Strothmann و عابد احمد علی)

تشریح : (ع) لغوی معنی کھولنا؛ بیان سے وضاحت کرنا ۔ اصطلاحی معنے (۱) کسی فن یا علم کا بیان، کسی کتاب کی تفسیر مثلِ ''شرح'' [رک بآن] اور (۲) علم تشریح الابدان، یعنی جسم کو کھولنا اور اس کی بناوٹ کی تفسیر بیان کرنا ۔ ابن القفطی کے ایک ہی جملے میں [قب تاریخ الحکماء، ص ۱۲۳ ببعد] یہ دونوں معنی ملتے ہیں : ''جالینوس علم طب کی کلید تھا ۔ وہ متقدمین کے بعد اس کا 'باسط' اور 'شارح' تھا، یعنی اس نے علم طب کی توضیح کی، مشکلات کو کھول کر بیان کیا اور اس کی توضیح کی ، . . . . اس سے پہلے کوئی بھی علم تشریح تک نہ پہنچا ۔ اس نے اس موضوع پر ۱۷ مقالے لکھے ہیں'' ۔ یہ اشارہ تشریح الابدان کی طرف ہے .

اسلام میں علمِ تشریح الابدان کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا؛ انسان کی صورت گری اسلام میں ممنوع تھی اور اسی طرح مذہبی اور اخلاقی وجوہات کی بناء پر لوگ جسدِ انسانی کے چیرنے پھاڑنے پر بھی معترض تھے ۔ شہر اسکندریہ سے قطع نظر کرتے ہوئے قدماء کے درمیان عملِ جرّاحی کا رواج کم تھا اور مسلمانوں کے ہاں بھی یہ علم قدماء کی بہ نسبت زیادہ رواج نہ پا سکا۔ جالینوس نے انسانی جسم کی تشریح کا مطالعہ کرنے کے لیے جو مواقع ملے ان سے فائدہ اٹھایا ، لیکن عام طور پر وہ بندروں ہی پر عملی تجربات کیا کرتا تھا [ابن القفطی، ص ۳۹۰، سطر ۱۱] ۔ مسلمان اہل نظر بھی ایسے اتفاقیہ مواقع سے فائدہ اٹھاتے رہے جن سے اس علم کو ترقی حاصل ہو سکے ۔ اس کی ایک مثال ہمیں عبداللطیف [البغدادی] کے سفر نامے میں ملتی ہے : مصنف

یہ سن کر کہ مصر میں مَنْفِس کے مقام پر انسانی لاشوں کا ایک انبار ہے، اپنے چند رفیقوں کے ساتھ انسانی پنجروں کے معاینے کے لیے وہاں گیا اور ضروری یادداشتیں قلمبند کیں۔

ان مشکلات کے باوجود جن کا عرب علماء کو سامنا کرنا پڑتا تھا کئی عرب علماء نے علم تشریح الابدان کا مطالعہ کیا اور اس بارے میں انھوں نے عام طور پر یونانیوں اور بالخصوص جالینوس اور اوریباسیوس Oribases اور اِیْتیوس Aetius کا تتبع کیا۔ جالینوس کی چند تصانیف سے عرب واقف تھے اور انھوں نے ان کا عربی میں ترجمہ بھی کیا [ان کے کئی مخطوطے اب تک موجود ہیں]، مثلاً کتاب تشریح *De Anatomia*، وریدوں کی کتاب *De Venae Sectione*، کتاب حرکت عضلات (*De Musculorum Dissectione*)، کتابِ عظام، *De Ossibus* اور رسالۂ نبض شناسی؛ اس مشہور مصنف کی ایک جلیل القدر کتاب (*De Anatomicis Administrationibus*) کے اجزاء ۹ تا ۱۵ صرف عربی زبان ہی میں محفوظ ہیں اور ماکْس سیمون Max Simon نے زبان جرمن میں ان کا ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔ ڈ کوننگ P. de Koning نے علم تشریح الابدان کی عربی کتابوں سے تین طویل اقتباسات شائع کیے ہیں۔ پہلے کا مصنف بوعلی سینا ہے، دوسرے کا علی بن عباس طبیب، جو ایران میں پیدا ہوا اور مذہباً مجوسی تھا (م ۳۸۴ھ) اور تیسرے کا مشہور و معروف طبیب رازی (محمد بن زکریا الرازی، م [۳۱۳ھ - براکلمان])۔ جو ابواب رازی سے منقول ہیں وہ سب سے کم محققانہ ہیں اور اس کی کتاب المنصوری سے مأخوذ ہیں۔ علی بن عباس کے اقتباسات اس کی کتاب الملکی سے نقل کیے گئے ہیں اور بوعلی سینا کا اقتباس قانون سے منقول ہے۔ ان تینوں تصنیفوں کی ترتیب تقریباً ایک سی ہے، واضح اور مدلل ہے اور قدیم کلاسیکی مصنفین کی کتابوں میں بھی وہی ترتیب موجود ہے۔ ابتدا میں ہڈیوں کا بیان ہے: پہلے ہڈیوں کی بابت عام معلومات ہیں، پھر سر سے لے کر پاؤں تک انسانی ڈھانچے کا تفصیلی بیان ہے: سر کی ہڈیاں، دندانت، ریڑھ کی ہڈیاں [عمود فقری]، سینے کی ہڈیاں، بالائی اعضاء اور ہاتھ کی ہڈیاں، اعضاے زیرین اور پاؤں کی ہڈیاں۔ اس زمانے میں دندان سازی کو ایک علیحدہ مستقل فن کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اس کے بعد عَضَلات کا مطالعہ یعنی علم العَضَلات کا بیان آتا ہے: ان کا شمار اور ان کی تشریح مذکورۂ بالا ترتیب ہی سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد نسوں اور رگوں کے نظام کا ذکر ہے: نسیں (اعصاب)، دماغ، ریڑھ کی ہڈی کا مادۂ سیّال، شریانیں اور وریدیں مذکور ہیں، پھر بیرونی اعضاء کا ذکر ہے، یعنی اعضاے بصارت، ذائقہ، سماعت، زبان، حَنْجَرہ، پھیپھڑے، دل، معدہ، انتڑیاں، جگر، تلّی (طحال)، گردے، مثانہ اور اعضاے تناسل۔

بوعلی سینا کے انھیں ابواب کے بالمقابل ڈ کوننگ نے جالینوس اور اوریباسیوس کی عبارتیں بھی نقل کر دی ہیں: دوسرے مضامین کے علاوہ ان میں مربع منحرفی عضلہ (the trapezius muscle) اور انگلیوں کے موڑنے والے پٹھوں (flector)، شریانِ شُش، صمام قلب (دریچۂ دل، valve of the heart)، آنکھ کی پتّلی اور دل کی ہڈی (کذا) کا بیان ہے۔

جو کچھ مذکور ہوا اس میں علم تشریح کی ایک خاصی ترقی یافتہ صورت نظر آتی ہے، جس میں اعضاء کا خوب تجزیہ کیا گیا ہے اور یہ بہت حد تک قطعی بھی ہے: ہر ہڈی، ہر عضو اور ہر پٹھے کو اس کے فعل اور غرض کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عربوں

کے علم تشریح الابدان کی اپنی اصطلاحات ہیں ۔ علم طب اور علم نباتات کے برعکس اس میں فارسی اور یونانی الفاظ استعمال نہیں ہوے ۔ انہوں نے علمِ ریاضی، نجوم اور کیمیا کے برعکس ہمیں [یعنی اہل یورپ کو] خاص اصطلاحات بہم نہیں پہنچائیں۔ یہ درست ہے کہ قرون وسطٰی میں عربی تالیفات کے جو لاطینی ترجمے تیار ہوے، ان میں اس قسم کی چند ایک مثالیں ملتی ہیں، مثلاً "meri" جو عربی میں مَرِیْ ہے یعنی نرخر کی نالی یا معدی نالی؛ "myrach"، جو عربی میں مَرَاقّ (۱) یعنی پیٹ ہے ؛ "siphac" صِفاق (جوفِ معدہ کے گرد کی دوہری رقیق جھلی، پوستِ شکم peritoneum)، لیکن یہ اصطلاحات ہمارے زمانے تک نہیں پہنچیں ۔

ابوالقاسم الزَّھْراوی (Abulcasis)، جو قرطبہ کے امیر عبدالرحمان ثالث (چوتھی صدی هجری/دسویں صدی میلادی) کا طبیبِ خاص تھا اور (ابن زہر، م ۵۰۹۸ Avenzoar) اشبیلی ، یہ دونوں کے دونوں نظری اور عملی اعتبار سے عربوں کے ہاں اس فن کے سب سے بڑے امام ہیں ۔ ابوالقاسم نے ایک کتاب التصریف [لِمَن عَجِزَ عن التألیف] کے نام سے لکھی تھی ۔ اس میں جراحت اور تشریح کے متعلق جو حصہ ہے وہ اس نے بیشتر پال ایجائنی (Paul of Aegina) سے لیا ہے ۔ پال بوزنطی زمانے کے آخری دور کا مصنف ہے، یعنی وہ ظہورِ اسلام کا ہم زمان تھا، اس نے عرب ملکوں کا سفر کیا اور عرب اس کے کمالاتِ جرّاحی کے معترف تھے ۔ ابوالقاسم نے اعمالِ جراحی اور آلاتِ جراحی کا حال بیان کیا ہے اور ان کی تصویریں بھی دی ہیں۔ اس کی متعدد تصانیف موجود ہیں، جن میں اس طرح کی تصویریں دی ہیں ۔ جیرارڈ Gerard نے ، جو قِرْمُونہ Cremona کا باشندہ تھا ، بارھویں صدی میں زُہراوی کی تصنیف [التصریف] کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا اور یہ ترجمہ ۱۴۹۷ء میں وینس میں اور ۱۵۴۱ء میں بال (Basle) میں شائع ہوا ۔ گِی دِ شَوْلیاک Guy de Chauliac (۱۳۰۰ تا ۱۳۶۸ء) نے اسے بتصرّف مرتب کیا، جس کا مغربی سائنس پر بے حد اثر پڑا ۔ ابن زُہْر ترقی پسند اور عملی رجحان رکھنے والا شخص تھا، جس کی مہارت درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی ، چنانچہ اس نے بہت بڑی حد تک جالینوس کی رایوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور اس کے بجاے اپنے تجربے پر اعتماد کیا ہے ۔ آرنو دِ وِیْل نَوْ Arnaud de Villeneiwe کا سب سے بڑا مأخذ اسی کی تصانیف ہیں۔ اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے ہم مغرب کے سب سے قدیم مترجم قسطنطین افریقی (Constan-tine Africanus) (۱۰۲۰ تا ۱۰۸۷ء) کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں ، جس نے علی بن عباس کی تصانیف کا ترجمہ [لاطینی میں] کیا ۔

عربوں نے علم امراضِ چشم کا مطالعہ ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے کیا ۔ انہوں نے جانوروں کے اجسام کی تشریح اور مخلوط النسل اور عجیب الخلقت جانوروں کے بارے میں بھی اپنے ملاحظات پیش کیے ، جن کے لیے ہم ان کے ممنون احسان ہیں ۔

مآخذ : (۱) P. de Koning : *Trois traités d'anatomie arabe*، متن و ترجمہ، لائیڈن ۱۹۰۳ء؛ (۲) وہی مصنف : *Traité sur le calcul dans les reins et dans la vessie*, par Abū Bekr......Al-Rāzī (Razes)، بتصحیح و ترجمہ، لائیڈن ۱۸۹۶ ؛ (۳) Max Simon : *Sieben Bücher der Anatomie des Galen*، لیپزگ ۱۹۰۶ء؛ (۴) Donald Campbell : *Arabian medicine*

[(۱) مَرَاقُّ البطن تنک و نرم جایہای شکم ، واحد مَرَقّ یا اس کا واحد نہیں آتا (منتہی الارب) ۔]

and its influence on the Middle-Ages، ۲ جلدیں، لندن ۱۹۲۶ء؛ (۵) Carra de Vaux: *penseurs de l'Islam*، جلد ۲، پیرس ۱۹۲۱ء، ص ۲۷۶ تا ۲۸۹؛ (۶) Razes: *Ad Almansorem libri X*، میلان ۱۴۸۷؛ (۷) Avicenna: *Canon*، وینس ۱۵۰۷ء، لاطینی؛ روما ۱۵۹۳ء، عربی؛ (۸) *Chyrurgia* از G. de Cauliaco (de Chauliac) وینس ۱۴۹۷ء، جس میں *Chrurgia Abulcasis* دی ہے۔

(کارا دِوو B. CARRA DE VAUX)

تَشْرِیْق: ایام حج کے آخری تین دن، یعنی ۱۱ تا ۱۳ ذی الحجّۃ، ایام التشریق کہلاتے ہیں۔ ایّام حج ۸ ذی الحجۃ سے، جس روز حُجّاج احرام باندھتے ہیں، شروع ہوتے ہیں، ۱۰ ذی الحجۃ کو بعد ادائگی مناسك حج قربانی کی جاتی ہے، دستور یہ تھا کہ قربانی کے گوشت کے ٹکڑے دھوپ میں سکھانے کے لیے ڈال دیے جاتے تھے، عربی میں اس عمل کو تشریق کہتے ہیں (یعنی اس طرح گوشت کے ٹکڑے کرکے دھوپ میں سکھانا، (۱) شَرْق اور اشراق کے معنی آفتاب کے طلوع ہونے اور بلند ہو کر روشنی پھیلانے کے ہیں اور تشریق کے لغوی معنی کسی چیز کو دھوپ میں خشک کرنے کے ہیں (لسان)؛ قرآن کریم میں ایام التشریق کو ''ایّام مَعْدُودات'' سے تعبیر کیا ہے، وَ اذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (سورہ ۲ [البقرۃ]: ۲۰۳)، حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایام معدودات سے ایام التشریق مراد ہیں اور وہ یوم النحر کے بعد کے تین دن ہیں (طبری، طبع جدید، ۴: ۲۰۸)؛ طبری نے انھیں ایامِ مُخَصّیات بھی کہا ہے، کیونکہ یہ وہ دن ہیں جن میں رَمْی جمار کی جاتی ہے، یعنی جَمرات پر کنکریاں (حَصاۃ) ماری جاتی ہیں۔ ان ایّام کے متعلق اور احکام میں سے یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں روزہ رکھنے سے منع کیا اور فرمایا کہ یہ ذکرِ الٰہی اور کھانے پینے کے دن ہیں (طبری و ابو داؤد: کتاب الصوم، باب صیام ایام التشریق)۔ یہ تین دن مِنٰی میں گذارے جاتے ہیں، لیکن فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ (سورہ ۲ [البقرۃ]: ۲۰۳).

اس میں شبہ نہیں کہ حج کے اور ارکان کی طرح یہ رسم بھی عرب میں زمانۂ قدیم سے رائج تھی، لیکن ان تمام مناسک حج کی اساس مِلّتِ ابراھیمی پر قائم ہے، جیسا کہ اس حدیث نبوی[ؐ] سے ثابت ہوتا ہے: قِفُوا عَلٰی مَشاعِرِکُمْ فَاِنَّکُمْ عَلٰی اِرْثٍ مِنْ اِرْثِ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ (تم اپنے مناسک حج پر قائم رہو، کیونکہ یہ ورثہ تمھارے باپ ابراھیم کی میراث سے ہے [سنن ابی داؤد، قاھرۃ حدود ۱۳۵۴ھ، ۲: ۱۸۹، کتاب المناسک، باب موضع الوقوف بعرفۃ]۔ قرآن کریم سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حج کو ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اللہ تعالٰی کے حکم سے قائم کیا تھا وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ الخ [سورۃ ۲۲ [الحج]: ۲۷، نیز ملاحظہ ہوں آیات ۲۶، ۲۸، ۲۹، جن میں قربانی، طواف وغیرہ کی طرف اشارہ ہے)۔ یہ گمان کرنا کہ ایام التشریق یا اور مراسم حجّ کا تعلّق رسومِ جاھلیت سے ہے غلط ہوگا۔ کسی رسم کے زمانہ جاھلیت میں مروج ہونے سے یہ لازمی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ خالصۃً رسومِ جاھلیت یا بت پرستی پر مبنی ہے۔ اسلام نے وہ تمام رسوم مناسکِ حج سے خارج کر دیں جن کا تعلق ملّتِ ابراھیمی سے نہیں تھا یا جنھیں عرب کے بت پرستوں نے مناسکِ حجّ میں شامل کر دیا تھا اور صرف انھیں رسوم کو باقی رکھا جن کا تعلق ابراھیمی دینِ حنیف سے تھا۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ تشریق عربوں کے

[(۱) شَرَقَت الشمس اذا طلعتْ و اشرقتْ اذا اضاءتْ والاضاءۃ مع الارتفاع (نہایۃ)۔]

مقولۂ ''أشْرِقْ ثَبِیر کَیما نُغِیر'' سے ماخوذ ہے ۔ ان دونوں میں اتنا تعلق تو ضرور ہے کہ ''تشریق'' اور ''أشْرِقْ'' ایک ہی مادے سے مشتق ہیں ۔ اسلام سے پہلے عرب مِنٰی سے طلوعِ آفتاب کے بعد قربانی کرنے کے لیے روانہ ہوتے تھے ، لٰہذا ان میں یہ مقولہ زبان زد عام ہوگیا تھا ، جس کا مطلب یہ تھا کہ جب ثَبِیر (جو مِنٰی کی ایک پہاڑی ہے، دیکھیے نہایۃ بذیل شرق) سورج کی روشنی سے منّور ہو جائے گی تو ہم قربانی کے لیے روانہ ہوں گے (لسان)؛ گویا انہیں کوچ کرنے کی جلدی ہوتی تھی، بجائے خود اس سے کسی خاص رسم کی ادائگی مقصود نہیں تھی ۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس کے برخلاف یہ حکم دیا کہ طلوعِ آفتاب سے قبل کوچ کرنا چاہیے تاکہ اس روز کے معمولات مثلاً جمرۂ عَقَبَۃ (یا کُبرٰی) پر کنکریاں مارنے اور قربانی کرنے کے لیے کافی وقت مل جائے ۔ لفظ تشریق کے معنے اتنے واضح ہیں کہ اس سے اور کوئی مطلب نکالنا صحیح نہیں ہوگا ۔ ایّام تشریق سے حج کی جو رسم مخصوص ہے وہ رَمْی جمار ہے ۔ جب حُجّاج مُزْدَلفہ سے کوچ کرکے مکّۂ معظّمہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو راستے میں مِنٰی میں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر تین ستون سے نظر آتے ہیں جنھیں جمرات یا جمار (جمع جَمْرۃ، دیکھیے جَمْرۃ) کہتے ہیں ۔ حُجّاج ان تین دنوں میں سات سات کنکریاں ہر جمرے پر روزانہ پھینکتے ہیں ۔ بعض مستشرقین نے لکھا ہے کہ عرب زمانۂ جاھلیت میں فقرۂ مندرجہ بالا کی تلاوت ایام التشریق میں رمیِ جِمار کے وقت کیا کرتے تھے ۔ حقیقت میں رمیِ جِمار سے اس کا کوئی تعلق نہیں، کیونکہ جیسا اوپر بیان ہوا اس کا تعلق قربانی کے لیے روانگی سے تھا ۔ اگر کسی فقرے کا زمانۂ جاھلیت میں ایامِ حجّ میں ورد زبان ہونا قرین قیاس ہو سکتا ہے تو وہ لَبَّیکَ اللّٰھُمّ لَبَّیکَ ہے، کیونکہ اس کا تعلق بھی ملّتِ ابراھیمی سے ہے ۔ یہ وہی کلمہ ہے جو ابراھیم علیہ السلام کی زبان سے نکلا تھا ، جب اللہ تعالٰی نے انھیں اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے لیے ارشاد کیا تھا (دیکھیے تکوین، ۲۲ : ۱) ۔ ان باتوں کے بعد خدا نے ابراھیم کو آزمایا اور کہا ''اے ابراھیم! وہ بولا ''لبّیک'' (میں حاضر ہوں)''۔ اسلام نے اسی فقرے (تلبیہ) کو علاوہ تکبیر و تہلیل کے حجّ میں مختلف مواقع کے لیے بحال رکھا ۔ ایام التشریق میں بھی چونکہ حُجّاج تکبیر میں مصروف رہتے ہیں، غالبًا اسی وجہ سے [امام] ابو حنیفہ نے تشریق کو تکبیر کا مترادف گردان لیا ۔ گویا انھوں نے ایام التشریق کو ایام التکبیر سے تعبیر کیا، حالانکہ لغوی اعتبار سے تشریق کا تکبیر سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اس نظریے میں وہ منفرد ہیں (تاج العروس، ۶ : ۳۹۳) ۔ ایک حدیث میں قربانی کے متعلق ارشاد ہے : مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ التَّشْرِیْقِ فَلْیُعِدْ (جو ''تشریق یعنی نمازِ عید پڑھنے سے پہلے قربانی کرے اسے چاہیے کہ وہ دوبارہ کرے ۔ تشریق شروق آفتاب سے مراد ہے جو وقتِ نمازِ عید ہے، نہایۃ بذیل شرق)، غالبًا اس حدیث سے بعض نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ تشریق سے مراد عیدالأضحٰی ہے، حالانکہ یہاں تشریق سے مراد طلوعِ آفتاب ہے (شُروق الشمس یعنی طلوع آفتاب، تاج العروس) ۔

مآخذ : (۱) لسان العرب، ۱۲ : ۴۲ ببعد ؛ (۲) تاج العروس، ۶ : ۳۹۳ ببعد؛ (۳) تفسیر طبری (سورۂ بقرۃ) (۴) صحیح مسلم، مع شرح نَوَوی، ج ۸ و ۹ (۵) ابو داؤد، ج ۲ : *An Arabic-English Lexicon* : Lane (۶) ، ص ۱۵۴۱ : *Die Israeliten zu Mekka* R. Dozy (۶) لیپزگ ۔ هارلم ۱۸۶۴ء، ص ۱۱۸ تا ۱۲۶ (یہ خیال

کہ یہ کلمہ عبرانی سے مشتق ہے اب قابل قبول نہیں سمجھا جاتا)؛ (۸) Snouck Hurgronje : Het Mekkaansche Feest، لائڈن ۱۸۸۰ء؛ (Ver-spreide Geschriften، ۱ : ۱ ببعد)، ص ۱۷۱ تا ۱۷۳؛ (۹) Wellhausen : Reste arabischen Heldentums، طبع دوم، ص ۸۰، ۹۱، حاشیۂ ۱؛ (۱۰) Th. W. Juynboll : Uber die Bedeutung des Wortes Taschrik (Z.A.)، ۲۷، ۱۹۱۲ء: ص ۱ تا ۷؛ (۱۱) Gaudefroy-Demombynes : Le pelerinage a la Mekke، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۲۷۳ و ۲۹۱ و ۲۹۹ و ۳۰۲ حاشیہ؛ (۱۲) مرآۃ الحرمین (مصر)، ج ۱؛ (۱۳) مولوی نذیر احمد : الحقوق والفرائض (۱ : ۱۹۱).

(عابد احمد علی و R. PARET)

تَشَہُّد : مصدر خماسی ہے، جو تَفَعُّل کے وزن پر مادۂ ش - ہ - د سے بنا ہے - اس کے معنے ہیں کلمۂ شہادت [رک بآن] کی تلاوت، بالخصوص نماز میں؛ تاہم یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اس صورت میں شہادۃ کے معنی 'کلمتین' ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ورد مراد ہیں : (۱) التَّحِیَّاتُ الْمُبَارَکَات، الصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہ، (۲) السَّلامُ عَلَیکَ اَیُّھا النَّبِیّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ، السَّلامُ عَلَینا وَ عَلٰی عِبادِ اللّٰہِ الصالحین اور (۳) شہادت اصلی کے دونوں کلمے (کلمتین) : اَشْہَدُ اَنْ لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ وَ اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُولُ اللّٰہ.

تشہّد کی مذکورۂ بالا صورت ابن عباس[رض] کی ایک روایت کے مطابق ہے، جس کی ابتداء یوں ہوتی ہے : آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ہمیں تشہّد اسی طرح سکھایا کرتے تھے جس طرح وہ ہمیں قرآن کی کوئی سورت پڑھایا کرتے تھے (مثلاً مسلم : الصلوۃ، حدیث ۶۰) - اسی مضمون کی حدیث میں جو ابن مسعود[رض] سے مروی ہے (کتاب مذکور، حدیث ۵۶؛ مسند احمد بن حنبل، ۱ : ۴۲۲) مذکورۂ بالا کلمات زیر شمارہ (۱) میں 'طیبات' کا لفظ نہیں ہے اور ابو موسی[رض] الاشعری سے جو حدیث مروی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں : ''التَّحِیَّاتُ الطَّیِّبَاتُ الصَّلَوٰتُ لِلّٰہ [اس کے بعد السلام علیک تا الصالحین جو اوپر بذیل (۲) مذکور ہے، پھر اَشْہَدُ ان لا اِلٰہَ الاّ اللّٰہ واشہد اَنَّ مُحَمَّداً عَبدُہ و رسولُہ].

النَّوَوی نے شرح مسلم (محلّ مذکور) میں لکھا ہے کہ علماء نے تشہّد کی تینوں صورتوں کو روا رکھا ہے، مگر اس امر میں مذاہب فقہ کا اختلاف ہے کہ ان تینوں میں سے بہترین صورت کون سی ہے [بہترین صورت کے متعلق ملاحظہ ہو النَّوَوی : شرح مسلم، طبع مصر ۱۳۴۹ھ، ۴ : ۱۱۵ و ۱۱۶].

تشہّد نماز میں دو دفعہ آتا ہے ، یعنی دوسری رکعت کے آخر میں اور پھر نماز کے آخر میں - آخری رکعت میں تشہد کے بعد ذاتی حاجات کے لیے دعائیں مانگی جا سکتی ہیں اور دائیں بائیں سلام (تسلیمَتَین) کے ساتھ نماز ختم ہو جاتی ہے .

مآخذ: (۱) کتب فقہ؛ (۲) کتب حدیث کی روایات کے حوالے در ونسنک Wensinck : Handbook of Early Muhammadan Tradition (بذیل مادۂ تشہد)؛ (۳) قب خصوصاً صحیح ترمذی کے حوالہ جات؛ (۴) موجودہ طریق عمل لین نے بیان کیا ہے : Lane : Manners and Customs of the Modern Egyptians، بذیل باب

[(۱) روایت ابن مسعود[رض] یوں ہے : التحیات للہ و الصلوات و الطّیبات ، السلام علیک ایها النبی و رحمة اللہ وبرکاته ، السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین، اشهد ان لا الٰه الا اللہ و اشهد انّ محمداً عبده و رسوله] (تعلیق احمد محمد شاکر) -]

Religion and Laws,

(A. J. WENSINCK)

تشرین : سوری تقویم کے پہلے دو مہینوں کا نام ہے ۔ یہ نام اتنا پرانا ہے کہ تدمر کے کتبوں میں ملتا ہے اور وہاں اس سے صرف ایک، یعنی پہلا، مہینہ مراد ہے (جو یہود کی تقویم میں ساتواں ہے) اور دوسرے مہینے کو کانون [رک بآن] کہا گیا ہے مگر سریانی کلیسا کی تقویم میں اس نام کا استعمال تیسرے اور چوتھے مہینوں کے لیے ہوا ہے، جو یہودی تقویم کے نویں اور دسویں مہینوں، یعنی کِسلیو Kislew اور طیبیت Tebheth [تھانوی، ۱۵۶۱ و ۱۵۵۹]، کے بالمقابل ہیں اور اصلی کانون کی جگہ ایک اور تشرین نے لے لی جس کا نام تشرین الاخر رکھ دیا گیا ہے ۔ مہینوں کے پہلے چار سریانی نام ابتداء میں الگ الگ تھے، پھر بتدریج دو دو مہینوں کو ایک ایک نام دے دیا گیا، اس طرح ان ناموں کے دو جوڑے بن گئے ۔ گوٹشمٹ A. v. Gutschmid اس تدریجی تحویل کی منازل میں سے ہلیو پولس Heliopolis کی تقویم کو ایک منزل جانتا ہے ۔ اس تقویم میں پہلے چار مہینوں کے الگ الگ نام یہ تھے : اگ Ag ، تورین Thorin، گلون Gelon، اور چانو Chanu ۔ ان میں سے آخری تین تشری، کِسلیو اور کانون کے متقابل ہیں ۔ 'گلون' کے ارتقاء پذیر ہو کر 'کانون' بن جانے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے حروف میں ادل بدل ہو گیا ۔ 'اگ' کی جگہ 'تشری' کا استعمال ممکن ہے یہودی اثر کی وجہ سے ہوا ہو ۔ سوری لوگ تشرین نام کے دو مہینوں میں مہینوں میں لفظ 'قدیم' اور 'حرای' لگا کر امتیاز کرتے ہیں (البیرونی : [آثار، ص ۶۰] میں بھی اسی طرح ہے) ۔ عربوں نے تشرین کے ساتھ الاول اور الاخر یا الثانی کہہ کر فرق کر لیا ۔ زمانے کے لحاظ سے یہ دونوں مہینے رومی تقویم کے اکتوبر اور نومبر کے مہینوں کے مطابق ہیں اور ان کے ۳۱ اور ۳۰ دن ہوتے ہیں ۔ ان دو مہینوں میں منازل قمر میں سے پہلی چار منزلوں کا سقوط ہوتا ہے اور پندرھویں منزل سے اٹھارھویں تک کا طلوع ہوتا ہے ۔ جن دنوں میں یہ سقوط اور طلوع واقع ہوتے ہیں وہ البیرونی کے قول کے مطابق تشرین اوّل کی دسویں اور تیئیسویں تاریخ ہے اور تشرین ثانی کی پانچویں اور اٹھارھویں، لیکن القزوینی کے قول کے مطابق تشرین اول کی اٹھارھویں اور اکیسویں تاریخ اور تشرین ثانی کی تیرھویں اور چھبیسویں ہے ۔ البیرونی کہتا ہے کہ تاریخ سلوقی (Seleucid) کے سنہ ۱۳۰۰ (=۹۸۹ میلادی) میں ان چار منازل قمر کے ستاروں کا طلوع یا غروب ۲۲ تشرین اول اور ۵، ۱۸ اور ۳۱ تشرتن ثانی کو ہوا .

مآخذ : (۱) البیرونی : آثار، طبع زخاو، ص ۶۰، ۷۰، ۳۴۷ تا ۳۴۹ ؛ (۲) القزوینی : عجائب المخلوقات، طبع وسٹنفلٹ، ۱ : ۴۲ ببعد و ۷۴ ببعد و ۷۵ (جرمن زبان میں ترجمۃ از ایتہ Ethe، ص ۸۸ ببعد، ۹۸ ببعد، ۱۵۳ ببعد)؛ (۳) S. A. Cook : *A Glossary of the Aramaic Inscriptions*، ۱۸۹۸ء، بذیل کلمہ תשרי ؛ (۴) G. A. Cooke : *A Text-Book of North-Semitic Inscriptions*، ۱۹۰۳ء، [ص ۲۵۲ و ۲۸۳]؛ (۵) A. v. Gutchmid : *Kleine Schrifen*، ج ۲ (۱۸۹۰ء): ص ۶۷۴ ببعد ؛ (۶) Ginzel : *Handb. d. math. u. techn. Chron.*، ۱ : ۲۶۴ ؛ ۳ : ۳۳ .

(M. PLESSNER پلسنر)

تصدیق و تصور : (۱) فلسفی نقطۂ نظر سے مسلمان فلاسفہ کے نزدیک علم منطق دو قسموں پر مشتمل ہے : تصور کا علم اور تصدیق کا علم ۔ منطق کی یہ تقسیم یونانی فلاسفہ کے ہاں نہیں

پائی جاتی، بلکہ پہلی بار مسلمان فلاسفہ کے ہاں ظاہر ہوتی ہے ۔ تصوّر کی تعریف ہے : کسی شے کی ماہیت کا ادراک بغیر اس کے کہ اس ماہیت پر حکم (Judgment) لگایا جائے ۔ تصوّری علم کا ذریعہ حد یا تعریف ہے ۔ جب دو یا دو سے زائد تصوّرات پر انھیں موضوع اور محمول کی حیثیت سے طرفین قرار دے کر نفی یا اثبات کا حکم لگایا جائے تو اسے تصدیق کہتے ہیں ۔ تصدیق کیسے معرضِ وجود میں آتی ہے ؟ اس سوال کے جواب میں مسلمان فلاسفہ ارسطو سے متفق ہیں ؛ کیونکہ عام نظریّۂ علم میں انھوں نے ارسطو کی پیروی کی ہے ۔ اس نظریے کے مطابق تصوّر تصدیق پر زمانی سبقت رکھتا ہے ۔ ذہنِ انسانی میں پہلے خیالی تصوّرات آتے ہیں اور بعد میں انھیں نفی یا اثبات کے حکم سے ''جوڑا جاتا ہے''، لیکن نظریۂ علم چونکہ ایک ''مطابقتی'' نظریہ ہے ، جس کی رو سے علم خارجی معلوم کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے، لہذا یہ ضروری ہے کہ جس رشتے سے تصورات ذہن میں جوڑے جاتے ہیں وہ بھی خارج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو ۔ بنا برآں تصوّرات کے اس طرح باہم جوڑنے کے عمل میں کسی خاص ذہنی فعل کو کوئی دخل نہیں ۔ ذہن کا کام صرف اتنا ہے کہ تصوّرات کے خارجی موضوعوں اور ان موضوعوں کے درمیان خارجی نسبت یا رشتے کا ادراک کرے ۔

لیکن اس نظریے پر ایک سنگین اعتراض وارد ہوتا ہے ۔ وہ یہ کہ تصوّرات کے مابین جو حُکمی نسبت قائم ہوتی ہے وہ کبھی یقینی ہوتی ہے اور کبھی ظنّی ۔ اس اعتراض کا جواب ''مطابقتی'' نظریہ نہیں دے سکتا، اس لیے ارسطو کے بعد فلسفۂ رُواقیہ (Stoic Philosophy) کے دبستان میں ایک نئے نظریۂ علم نے جنم لیا ۔ رُواقی فلاسفہ کے نزدیک ایک قضیّے (Proposition) کے تصوّرات یا موادّ تو خارج سے آتے ہیں ، لیکن ان کے مابین حُکمی نسبت قائم کرکے تصدیق بنانا ذہن کا کام ہے، اس ذہنی فعل کو رُواقی فلاسفہ ''تیقّن'' اور ''تصدیق'' کا نام دیتے ہیں ۔ اسلام میں متأخر متکلّمین میں ان دونوں نظریوں کا میل ہوا اور نہایت دلچسپ اور پیچیدہ بحثیں پیدا ہوئیں ۔ یہ متکلمین ارسطو سے اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ خارج میں موضوع ، محمول اور حملی نسبت موجود ہے ، لیکن وہ یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ ذہن کا کام فقط ان تینوں — موضوع، محمول اور حملی نسبت — کا ادراک ہے ۔ ان کی حجّت یہ ہے کہ اگر ذہن کا کام فقط قضیّے کا ادراک ہے تو تصوّر اور تصدیق میں ما بہ الامتیاز مفقود ہو جاتا ہے ، کیونکہ تصوّر بھی ایک شے کا ادراک ہے اور تصدیق بھی اس نظریے کے مطابق فقط قضیّے کا ادراک ہے ، لہذا ان متکلّمین کے نزدیک — جن میں امام فخرالدین رازی کی شخصیت ممتاز ہے — تصدیقی حکم انسانی ذہن کا فعل ہے ۔ اس طرح متکلّمین کی بحث نے ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ، جس سے تصدیق یا قضیّے اور حُکم کے درمیان امتیاز پیدا ہوتا ہے ۔

(۲) دینی نقطۂ نظر سے : فن دینیات میں تصدیق نبی کی دعوت کو تسلیم کرنا اور اس پر ایمان لانا ہے ۔ ان معنوں میں تصدیق ایک قلبی فعل کا نام ہے جو قلبی قوّتِ ایمانی سے سرزد ہوتا ہے ۔ عام متکلّمین اور علماء کے نزدیک یہ ایک اختیاری فعل ہے، جس کا کرنا یا نہ کرنا فاعل کے بس میں ہے اور ان کے نزدیک یہی فعل دینی اعتبار سے معتبر ہے ، اس لیے ان کے نظریے کے مطابق دینی تصدیق اور ادراک یا

معرفت میں فرق ہے - بخلاف اس کے معتزلہ اور فلاسفہ کے نزدیک معتبر دینی تصدیق اور اعتقاد کی بنیاد عقلی معرفت پر ہے - اسلام میں یہ بحثیں اسی نہج پر رہیں جس طریقے پر عیسائی آباء مثلاً اُوری‌جن Origen اور اوگسٹین Augustine کے ہاں تھیں - تصدیق و یقین کے اس دینی نظریے کا اثر فلسفیانہ نظریے پر بھی معلوم ہوتا ہے، جیسا اوپر کی بحث سے ظاہر ہے - بعض فلاسفہ نے غالباً ایسے نظریوں سے متأثر ہو کر ذہن کی ہیئتِ یقینی کو علم کا پیش خیمہ اور مبدأ قرار دیا ہے؛ مثلاً ابن سینا نے (دیکھیے الشفاء، کتاب النفس، مقالہ ۵ : فصل ۶ [*Avicenna's De Anima*' (لنڈن ۱۹۵۹ء، ص ۲۳۹ ببعد)]؛ ہیئت یقینی کو عقلِ فعّال اور خلّاقِ علم کا نام دیا ہے (یہ نظریہ کہ تصدیق، یقین اور ایمان علم و معرفت پر زمانی سبقت رکھتے ہیں ہرمسی کتب میں پایا جاتا ہے، قب اوگسٹائن کا مشہور قول کہ ''میرا ایمان میرے علم کا سبب ہے نہ کہ میرا علم میرے ایمان کا'' .

مآخذ : متکلّمین اور فلاسفہ کی کتابوں کے علاوہ دیکھیے (۱) جرجانی : کتاب التعریفات اور (۲) تھانوی : کشّاف اصطلاحات الفنون، بذیل ''تصدیق''؛ (۳) مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی : حاشیہ برقطبی ؛ (۴) خصوصاً دینی نقطۂ نظر سے مسئلہ تصدیق کی قبل از اسلام حیثیت پر دیکھیے H. A. Wolfson : *Philosophy of the Church Fathers*, Cambridge, Mass. U.S.A. II, 1956.

(فضل الرحمان)

* **تصوّف** : (۱) اشتقاق - مادۂ صُوف (= اون) سے باب تفعُّل کا مصدر ہے اور اونی لباس عادۃً پہن لینے (لُبْسُ الصّوف، [سمعانی]) کو ظاہر کرتا ہے، لہٰذا اسلامی اصطلاح کے مطابق ''صوفی'' بن کر خود کو متصوّفانہ زندگی کے لیے وقف کر دینے کو تصوف کے نام سے تعبیر کریں گے .

اسم 'صوفی' کے لیے اس کے علاوہ جتنے قدیم و جدید اشتقاقات (۱) پیش کیے جاتے ہیں اُن سب کو رد کیا جا سکتا ہے، مثلاً یہ کہ صوفیّہ منسوب بہ اہل الصُّفّہ ہیں (اہل الصفہ وہ زُہّاد تھے جو بعہدِ رسالت مدینہ [منورہ] میں مسجد نبوی کے شمالی جانب کے پیش دالان (عربی صُفّۃ) میں رہتے تھے) یا منسوب بہ صفِ اول (۲)) یا بہ بنو صُوفۃ (ایک بدوی قبیلہ) [سمعانی]، یا بہ صُوفانۃ (ایک قسم کی ترکاری)، یا بہ صَفْوَۃُ القفا (گدّی پر کے بالوں کا گچھا)، یا بہ صُوفِیَ (مادۂ صفا [سمعانی] کے باب مفاعلۃ کا ماضی مجہول بمعنی صاف کیا گیا) صَافَیَ سے صُوفِیَ بر وزن قُوبِلَ مجہولِ قَابَلَ]، بہت ابتدائی زمانے (آٹھویں صدی عیسوی) سے یہ ماضی مجہول لفظ صُوفِی [زاہد پشمینہ پوش] کے ساتھ بطور توریہ استعمال ہوتا رہا ہے، یا منسوب بہ کلمۂ یونانی σοφός (سوفوس) : (کوشش یہ بھی کی گئی کہ تصوّف کو تھیوسوفیا Theosophia سے مشتق ثابت کیا جائے)، نولڈکہ (*Z.D.M.G.* : Nöldeke' ۴۸ : ص ۴۵) نے اس آخری اشتقاق کی تردید اس بنا پر کی ہے کہ یونانی حرف sigma عربی میں ہمیشہ ''س'' کی صورت میں آتا ہے (نہ کہ ص کی صورت میں)، پھر یہ کہ آرامی میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جسے σοφός سوفوس اور صوفی

[(۱) ان کے متعلق دیکھیے دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، قاہرۃ، ۵ : ۷، ص ۲۷۶ ببعد .

(۲) وہ اللہ عز وجل کے حضور میں صف اول میں ہیں، اس لیے کہ ان کے قصد اس کی طرف بلند ہوتے ہیں اور دل ادھر متوجہ ہیں اور وہ اپنے بواطن کے ساتھ اس کے حضور میں کھڑے ہیں، قب تعرّف، مصر ۱۹۳۳ء، ص ۵].

کی درمیانی صورت سمجھا جا سکے ۔

الصّوفی کو لقب کے طور پر تاریخ میں پہلے پہل آٹھویں صدی کے نصف آخر میں کوفے کے ایک شیعہ کیمیا گر جابر بن حیّان کے نام کے ساتھ، جو زھد میں ایک مسلک خاص رکھتا تھا، استعمال کیا گیا (قبَ خشَیْش نَسائی، م - ۲۰۳ھ [۸۶۷ء] : استقامة، بذیل کلمه)، نیز ایک نامور صوفی ابوھاشم کوفی کے نام کے ساتھ ۔ اس کا صیغۂ جمع صُوفیّۃ پہلی دفعہ ۱۹۹ھ/۸۱۴ء میں اسکندریہ کی ایک معمولی سی شورش کے سلسلے میں نظر آتا ہے (الکنْدی : قُضاۃ مصر، طبع گسٹ Guest، ص ۱۶۲ و ۴۴۰) ۔ مُحاسِبی (مکاسب، فارسی مخطوطه، ص ۸)، اور جاحظ (بیان [قاهرة ۱۳۳۲ھ]، ۱ : ۱۹۵) کے مطابق، تقریباً اسی زمانے میں اس کا استعمال نیم شیعی مسلمانوں کی ایک جماعت صوفیّہ کے لیے ھوا تھا، جو کوفے میں پیدا ھوئی اور جس کا آخری امام عَبْدَك الصوفی تھا ۔ یہ شخص نبات خور اور تارك اللّحم اور خلافت میں حقِ اِرْث کا قائل تھا اور تقریباً ۲۱۰ھ / ۸۲۵ء میں بغداد میں فوت ھوا ۔ اس سے ظاھر ہے کہ ابتدا میں صوفی کا لفظ کوفے ھی تک محدود تھا ۔

اس اصطلاح کے نصیبوں میں ایک شاندار مستقبل تھا، چنانچہ پچاس سال کے اندر یہ لفظ (خراسان کے ملامتّیہ متصوفین کے مقابلے میں) تمام عراقی متصوّفین کے لیے استعمال ھونے لگا اور دو صدی بعد صوفیّۃ کی اصطلاح جملہ مسلمان متصوفین کے لیے اُسی طرح استعمال ھونے لگی جس طرح آج کل ھم صوفی اور تصوّف کے الفاظ استعمال کرتے ھیں ۔ اس درمیانی وقفے میں صوف یا ''سفید اونی خرقه'' جسے ۱۰۰ھ / ۷۱۹ء میں غیر ملکی اور ناپسندیدہ عیسائی لباس سمجھا جاتا تھا (اور جس کے استعمال کی بنا پر حسن بَصری[۲] کے مُرید فَرْقد سَبَخی کو ملامت بھی کی گئی ؛ [رك به العقد، طبع ۱۳۲۱ھ، (۱ : ۲۰۳) : (دَعْ عنك نصرانیّتك هذه]) نمایاں طور پر راسخ العقیدہ مسلمانوں کا لباس بن گیا اور آج تک یہی صورت ہے ۔ بے شمار احادیث سے (جو جویباری [احمد بن عبداللہ بن خالد، ذھبی : میزان الاعتدال، قاهرة ۱۳۲۵ھ، ۱ : ۵۰] سے مروی اور غالباً اسی کی موضوعات میں سے ھیں) تو یہ بھی ظاھر ھوتا ہے کہ آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] اسے متدیّن لوگوں کا پسندیدہ لباس تصوّر فرماتے تھے ۔

۲- منابع تصوف : تصوف کے نقطۂ نظر سے لکھی ھوئی قرآن [مجید] کی تفسیریں اور احادیث جو آنحضرت [صلی اللہ علیہ و سلم] کی متصوفانہ باطنی زندگی کے متعلق، جس کا حال ھمیں بہت کم معلوم ہے، ملتی ھیں وہ مقابلۃً بعد کے زمانے کی ھیں اور اس لیے مشتبہ ھیں، لیکن متصوفانہ زندگی بسر کرنے کے رجحانات، جو سب ملکوں اور قوموں میں پائے جاتے ھیں، عرب کے دَورِ اسلامی کی پہلی دو صدیوں میں بھی مفقود نہیں تھے اور اگر بعد کی ناقابل اعتبار روایات کو نظر انداز کر کے بھی دیکھا جائے تو جاحظ اور ابن الجوزی (قُصّاص) نے اس زمانے کے چالیس سے زیادہ مستند زھّاد کے نام محفوظ کر دیے ھیں ۔ انھوں نے ظواھرِ عبادات کی روحانی معنویت (interiorisation) کو جو اھمیت دی ہے اس سے صوفیانہ زندگی کی خصوصیات نمایاں ھوتی ھیں ۔ یہ دعوی اب قطعاً پیش نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] نے قیاس قبل از وقوع کے طور پر متصوفین کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا تھا ، اس لیے کہ اب یہ بات معلوم ھو چکی ہے کہ مشہور حدیث ''لا رَھْبانِیّۃَ فِی الاِسْلام'' (اسلام

میں رہبانیت نہیں ہے)، جسے شپرنگر نے مندرجۂ بالا معنی پہنائے تھے، ایک غیر مستند، موضوع و مجعول حدیث ہے اور زیادہ سے زیادہ تیسری صدی ہجری میں اسی لیے وضع کی گئی ہو گی کہ قرآن [مجید] کی اس مشہور آیت (سورۃ ۵۷ [الحدید]: ۲۷) کی، جس میں رہبانیت کا ذکر ہے، جدید تفسیر کر کے اس کی تقبیح اور ممنوعیت کو مؤکد بنایا جائے۔ یہ وہ آیت ہے جسے پہلی تین صدیوں کے مفسرین مثلاً مجاھد اور ابو اُمامۃ الباھلی [م ۸۶ھ] (قب میرا مقالہ *Essaie*، ص ۱۲۳ تا ۱۳۱)، اور قدیم صوفیہ میں سے محتاط تر افراد (قب جُنَید : دواء الارواح) نے متفقہ طور پر رہبانیت کے جواز اور اس کی تعریف کے معنوں میں قبول کیا ہے(۱)، تا آنکہ اس کی مخالف تفسیر شائع ہوئی اور زمخشری نے اسے مروّج کر دیا۔

صوفیای اسلام جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ [کرام][رض] میں سے ابوذر[رض] اور حُذیفہ[رض] کو تصوف کے دو حقیقی پیش رو تسلیم کرنا چاہیے۔ اُوَیس[رض] اور صُہَیب[رض] کا صوفی ہونا حتمی طور پر ثابت نہیں۔ ان کے بعد وہ لوگ پیدا ہوے جو نُسّاك، زُھّاد، بَکّاؤن (رونے والے، تائبین) اور قُصّاص (عوام کے واعظ) کہلائے۔ شروع میں یہ گروہ ایک دوسرے سے الگ رہے، لیکن مسلمانوں کے دوسرے فکری دبستانوں کے پیرووں کی طرح یہ سب بھی آہستہ آہستہ دو منفرد جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور انھوں نے بھی اپنے مرکز بصرے اور کوفے میں بنا لیے۔

بصرے کی عرب نو آبادی تمیمی الاصل تھی۔ بصریوں کے مزاج حقیقت پسندانہ (realist) اور ناقدانہ تھے۔ وہ صرف و نحو میں منطق کے، شاعری میں حقیقت نگاری کے، حدیث میں تنقید کے، علم کلام میں معتزلی اور قدری رجحانات کے ساتھ سنّت کے دلدادہ تھے۔ ان کے شیوخ تصوّف حسب ذیل تھے: حسن بصری[رض] (م ۱۱۰ھ/۷۲۸ء)، مالک بن دینار، فضل رَقاشی، رَبَاح بن عمرو قیسی، صالح مُرّی اور عبدالواحد بن زید (م ۱۷۷ھ / ۷۹۳ء) جو عَبّادان کے مشہور طائفۂ زُھّاد کے سر سلسلہ تھے۔

کوفے کی عرب نو آبادی یمنی الاصل تھی۔ یہ لوگ طبعاً مثالیت پسند (idealist) اور روایت پرست (traditionalist) تھے۔ وہ صرف و نحو میں شواذ، شاعری میں فلاطونیت (Platonism، حُبّ العُذری)، حدیث میں ظاھر (Zāhirism) کے دلدادہ تھے۔ یہ لوگ کلام میں شیعی، مگر مُرجئہ کی طرف مائل، تھے۔ ان کے شیوخ تصوّف حسب ذیل تھے: رَبیع بن خُثَیم (م ۶۷ھ/ ۶۸۶ء)، ابو اسرائیل مُلائی [سمعانی، ۵۴۳ الف] (م ۱۴۰ھ / ۷۵۷ء)، جابر بن حیّان، کُلَیب صَیداوی، منصور بن عمّار، ابوالعَتاهیه اور عَبْدَك۔ ان میں سے منصور، ابوالعَتاهیه اور عبدك نے اپنی زندگی کا آخری حصہ دارالخلافۃ بغداد میں بسر کیا، جو ۲۰۰ھ/ ۸۱۶ء کے بعد اسلامی تصوّف کا مرکز بن گیا تھا۔ یہی وہ سال ہے جس میں مذھبی مناظروں کے مرکز اور حلقے قائم ہوے اور مساجد میں پہلی دفعہ تصوّف پر درس دیے جانے لگے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب متصوّفین اور فقہاء کے درمیان پہلا کھلا تصادم ہوا اور بغداد کے قاضیوں کی عدالت میں [ابوالفیض] ذوالنون [ابن ابراهیم] مصری (۲۴۰ھ / ۸۵۴ء)، [ابوالحسن احمد بن محمد] نوری اور ابوحمزۃ [البغدادی البزّاز] (ابن الجوزی : تلبیس، ص ۱۸۳ کی روایت کے مطابق ۲۶۲ھ / ۸۷۵ء اور ۲۶۹ھ / ۸۸۲ء کے

[(۱) تفسیر طبری میں یہ جواز اور تعریف نظر نہیں].

درمیان) اور حلاج پر مقدمے چلائے گئے [نوری اور ابوحمزۃ کے مقدمے کے لیے دیکھیے ترجمۂ کشف المحجوب، از نکلسن، ص ۱۹۰] ۔

۳- اسلامی جماعت پر تصوّف کے اثرات : صوفیاے متقدّمین کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اسلامی حکومت کے اربابِ حلّ و عقد سے ٹکر لینا پڑے گی ۔ اگر وہ دانستہ طور پر گوشہ نشینی سے ہو کر فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے تو محض اس لیے کہ قرآن پر مزید غور و فکر کر سکیں (تَقَرَّاُ تَصَوَّفَ کا پرانا مرادف ہے) اور عبادت میں تقرب الٰہی حاصل کرنے کی سعی کریں ۔ تصوّف کی طرف انسان کی کشش اصولاً ضمیر کے اس اندرونی احتجاج کا نتیجہ ہے جو معاشرتی بے انصافیوں کے خلاف کیا جاتا ہے ۔ یہ احتجاج نہ صرف دوسروں کی بے انصافیوں کے خلاف ہوتا ہے بلکہ سب سے پہلے اور بالخصوص اپنی کوتاہیوں کے خلاف ہوتا ہے: اس خواہش کے ساتھ (جو تزکیۂ نفس سے اَور بھی قوی ہو جاتی ہے) کہ وصالِ باری تعالٰے ہر ممکن وسیلے سے نصیب ہو جائے ؛ یہی نکتہ ہے جو حسن بصری[رک] کی زندگی اور ان کے عِبَر و مواعظ میں واضح طور پر عیاں ہے (قب Schaeder : *Isl.*، ۱۴ : ۱ تا ۷۲) اور ماسینیوں : *Essai*، ص ۱۵۲ تا ۱۷۹) اور جس کی وضاحت بڑے نمایاں طور پر دو بلند پایہ صوفیوں کے رقّت انگیز خود نوشت سوانح (یعنی محاسبی کی وصایا (ترجمہ در ماسینیوں، ص ۲۱۶ تا ۲۱۸) اور امام غزالی کی منقذ (ترجمہ از باربیہ دِ مینار Barbier de Meynard) سے ہوتی ہے، لیکن اُس وقت تک قائم شدہ نظام کے لیے اس عقیدے میں خطرے کی کوئی بات نہ تھی ۔ خواہ حکمران کا رویہ کیسا ہی غیر عادلانہ کیوں نہ ہو لیکن فقہاء اور متکلّمین کو یہ امر سخت ناگوار تھا کہ لوگ آپس میں محاسبۂ نفس کا ذکر کریں اور اس باطنی عدالت کے ذریعے ایک دوسرے کے خلاف فیصلے صادر کریں ۔ اس لیے کہ شریعت قرآنی نے تو صرف ظاہری اعمال کا محاسبہ کیا ہے اور لوگوں کے ظاہری گناہوں کی سزائیں مقرر کی ہیں ؛ نِفاق (منافقت) کے خلاف کوئی سزا تجویز نہیں کی — چنانچہ فقہاء نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جس زندگی کی بنیاد صوفیہ کے طریقِ عمل پر ہو اس کا انجام بالآخر کجی اور گمراہی پر ہو گا، کیونکہ صوفیہ کے نزدیک نیّت عمل سے مقدم ہے اور سنّت فرض سے (یعنی عمل ، شریعت کی لفظی پابندی سے) اور اطاعت عبادت سے بہتر ہے ۔

اسلامی فرقوں میں تصوّف سے عداوت کا اظہار سب سے پہلے خارجیوں کی طرف سے حسن بَصری[رک] کے معاملے میں ہوا ۔ اس کے بعد فرقہ‌ہای امامیّہ (زیدی ، اثناعشری اور غُلاۃ) نے تیسری صدی ہجری میں تصوّف کے ہر میلان کی مذمت اس بناء پر کی کہ ان کے نزدیک تصوّف مؤمنین کے سامنے ایک طرح کی غیر معمولی زندگی (صوف، خانقاہ) کی کیفیات پیش کرتا ہے اور وہ .... ائمۂ دوازدہ سے توسّل جوئی اور تمسک با امامت کے بجاے حالت رضا (تسلیم) کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔

اہل السّنت و الجماعت نے صوفیہ کے خلاف اپنا طرز عمل ظاہر کرنے میں مقابلۃً آہستگی سے کام لیا ہے؛ علاوہ ازیں تصوّف کو مطعون کرنے کے سلسلے میں وہ کبھی متفق الراے بھی نہیں ہوئے۔ سُنیوں کے صرف دو گروہوں نے تصوّف کو ہدفِ ملامت بنایا ہے : ایک تو قدامت پسند حَشْویّہ نے : [امام] احمد بن حنبل نے اس وجہ سے تصوّف کو موردِ الزام ٹھہرایا کہ تصوّف ظاہر عبادات کے

مقابلے میں مراقبے پر زور دیتا ہے اور روح کے لیے ذاتِ خداوندی سے براہِ راست ذاتی تقرّب (خُلّة) کی راہیں نکالتا ہے اور اس کے بعد اُسے شرعی فرائض کی پابندی سے آزاد کر دیتا ہے (اباحت)؛ ان کے خاص شاگرد خُشیش اور ابوزُرْعة نے تصوّف کو زنادقه کے کفر و الحاد کی ایک شاخ (الروحانیة) میں شامل کیا ہے۔

مخالفین کا دوسرا گروہ جو معتزله اور ظاهریوں پر مشتمل تھا، عشق کے ذریعے خالق و مخلوق کو ایک ہی رشتے میں منسلک کرنے کے خیال کو لا یعنی سمجھتا ہے، کیونکه یه عقیده نظریاتی طور پر تشبیه اور عملاً مُلامسة اور حُلول کے مرادف ہے۔

مگر حقیقت میں، اهل السنّت و الجماعت نے معتدل تصوّف کو کبھی اسلام سے خارج نہیں کیا، بلکه وہ همیشه عملی اخلاق اور عبادات کے معاملے میں ابن ابی الدنیا (م ۲۸۱ھ / ۸۹۴ء) کے چھوٹے چھوٹے مقبول رسائل اور ابوطالب مکّی (م ۳۸٦ھ / ۹۹٦ء) کی قُوت القلوب اور خاص کر امام غزالی کی احیاء جیسی شاهکار تصانیف سے راهنمائی اور هدایت طلب کرتے رہے هیں۔ تصوّف کی مخالفت کے باوجود، بڑے بڑے سنّی علماء، مثلاً ابن الجوزی، ابن تیمیّة، اور ابن قیّم اخلاقیات میں غزالی کے بلند مرتبے کا احترام کرتے هیں اور اُنهیں اخلاقیات میں حجت تسلیم کرتے هیں۔ البته بعد میں [شیخ اکبر] ابن عربی کے مقلّدین کے عقیدۂ وحدت الوجود کے خلاف بعض سنّی فقهاء نے غیظ و غضب کا اظهار کیا ہے، گو انهیں زیاده کامیابی حاصل نہیں هوئی۔ اسی طرح فرقۂ وهّابیّه کے بانی، گو وہ تصوف کے خلاف تھے، پھر بھی انهوں نے صوفی شقیق کی وصیت بنام حاتم الاصمّ کی شرح لکھی۔

۴- تصوّف میں اتّحاد کے تصوّر کے ارتقاء کی تاریخ: ابتداءً تصوّف ذیل کے دو موضوعه اصولوں پر مبنی تھا: (ا) ذوق و شوق کی عبادت گذاری روح میں ایسے ''فوائد'' پیدا کرتی ہے جو غیر مادّی مگر قابلِ ادراک حقائق هوتے هیں (حَشْویّه اس اصول کے قائل نہیں)؛ (ب) علم القُلوب سے روح کو معرفت حاصل هوتی ہے، جس کے معنی یه هیں که قوتِ ارادی حصولِ فوائد کے لیے مستعد هو جاتی ہے (معتزله اس اصول کی تردید کرتے هیں، کیونکه وہ محض نظریاتی معرفتِ نفس پر قانع هیں)۔ صوفیوں کے نزدیک ''علم القلوب'' میں ایک محرّك قوت موجود ہے۔ یه علم قلوب کے سفر الی الله کی منزلوں کا سراغ دیتا ہے اور اس سفر کے باره مقامات اور احوال متعیّن کرتا ہے۔ اس سفر میں بعض فضائل کسب کیے جاتے هیں اور بعض فوائد (موهبتِ الٰہی سے) موصول هوتے هیں۔ *Scala Sancta* میں سینٹ جون قلیماقوس St. John Climacus نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ مقامات و احوال کی دُهری فهرست مختلف مصنفین کے نزدیک مختلف ہے (قبّ سرّاج، قُشَیْری، غَزالی) لیکن ان سب تفصیلات میں تقریباً همیشه توبه، صبر، توکّل اور رضا جیسی معروف اصطلاحیں ملتی هیں۔ صوفیه نے منازل سلوک کے اختلاف پر زور دیے بغیر اس منزلِ مقصود کی توضیح کو اپنا مقصد بنایا ہے جب روح تمام جسمانی علائق پر غالب آ کر ذاتِ حق کو پا لیتی ہے، جس کی وہ مشتاق تھی (لفظ الحقّ تیسری صدی هجری جیسے قدیم زمانے میں استعمال هوا اور شاید کتاب الالٰہیات سے مستعار لیا گیا هو، جو ارسطو کی طرف غلط طور پر منسوب ہے)، لیکن سوال یه ہے که اهل سنّت کی مسلّمه تعبیرات میں اس بلند حالت کو بیان کیسے کیا جائے جب که روح

حالتِ وجدان میں باری تعالٰی سے ہم کلام ہوتی ہے۔ اس وجدانی کیفیت کا اظہار سب سے پہلے رابعة ، مُحاسِبی اور یحیٰی رازی نے کیا ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فیضانِ الٰہی سے اثر پذیر ہو کر مخاطبتِ الٰہی سے سرفراز ہونے (شَطْح [رَكَّ] بآن] کا مشکل مسئلہ پیدا ہوتا ہے ۔

اس وقت سے صوفی اپنے زمانے کی مروّجہ دینی اصطلاحات استعمال کرنے پر مجبور ہوگئے ۔ وہ اپنی اصطلاحات انھیں مروّجہ دینی اصطلاحات میں سے اخذ کرنے اور انھیں کوئی متعیّن مفہوم دیے بغیر، معنی کے معمولی تغیر کے ساتھ استعمال کرنے لگے ؛ مثلاً شقیق نے 'توکّل' ، مصری اور ابن کرّام نے 'معرفة'، ذوالنون مصری اور بسطامی نے 'فناء' (ضدّ بقاء= قبّ قرآن، ٥٥ [الرحمٰن] : ٢٦-٢٧، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ الخ)، خرّاز نے 'عین الجَمْع' اور ترمذی نے 'ولایة' وغیرہ اصطلاحات استعمال کی ہیں ۔ اصطلاحات کے استعمال میں اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ اوّل کا اسلامی تصوّف ابتدائی زمانے کے متکلّمین کے مابعد الطبیعی فکر (یعنی مسائل جوھرالفرد ، مادّیت اور اتفاق (occasionalism) کی الجھنوں میں پڑ گیا، جو فکر کہ نفس کی روحانیت بلکہ اس کی بقاء سے بھی مُنکر ہے اور جس نے وجودی وحدت (ontological unity) اور عددی وحدت کو باہم خلط ملط کر دیا ہے، جس سے یہ لازم آتا ہے کہ ان تشریحی کوششوں کو جو صوفیاے اسلام کے اوّلین دبستانوں نے کیں حلولی الحاد کے ساتھ جگہ دی جائے؛ مثلاً اگر ہم فرقۂ کرّامیّہ کی مثال لیں، جو اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ فی الواقع خلقِ ارواح و نفوس میں اللہ کی ایک شأنِ خاص ہے ، تو ہم دیکھتے ہیں کہ اشعریہ انھیں یہ الزام دیتے ہیں کہ انھوں نے ذات ازلی میں أعراض کا اضافہ کر دیا ؛ یا سالمیہ کو لیں جو یہ کہنے کی طرف مائل ہیں کہ شور و شوق والی ارواح کے لیے یہ ممکن ہے کہ حضور باری تعالٰی میں واصل رہیں، تو ان کے خلاف حنبلیوں کا کہنا یہ ہے کہ ان کے نزدیک ذکرِ خدا معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے؛ یا حَلّاجِیّہ اُس مخاطبتِ الٰہی سے جو حالتِ وجد میں کی جاتی ہے اور اُس تغیر سے جو اس حالت میں صاحبِ وجد کی روح کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خدا نے اولیاء کی صورت میں اپنے زندہ شواہد پیدا کر رکھے ہیں؛ اس نظریے پر کفر و الحاد کا الزام رکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے ، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے جسمِ فانی نے الٰہیت غصب کر لی ہے ، اس لیے کہ دو ذاتیں بہ یک وقت ایک ہی مکان پر حاوی نہیں ہو سکتیں ۔

چوتھی صدی ہجری میں یونانی فلسفے کے نفوذ کی بدولت،جو شروع شروع کے قرامطۂ ادریہ gnostics اور طبیب رازی سے ابن سینا تک برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا ، روح اور نفس کی غیر مادیت ، تصوراتِ عمومی اور سلسلۂ عللِ ثانویہ سے متعلق زیادہ صحیح مابعد الطبیعاتی مصطلحات وضع ہوئیں ۔ لیکن یہ مصطلحات کتاب الالٰہیات منسوب بارسطو، افلاطون کے فلسفۂ فکریہ (idealism) اور فلوطینس Plotinus کے نظریۂ صدور (emanation) سے خلط ملط ہو گئیں، اور اس بات نے تصوف کی آیندہ نشوونما پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس دَور کے فاضل مشایخ صوفیہ مذبذب تھے کہ صوفیانہ اتحاد کی مفصلۂ ذیل تین تشریحوں میں سے کس تشریح کو قبول کریں :

(۱) اتحادیہ، ابن مَسَرّۃ اور اخوان الصفاء سے لے کر فارابی اور ابن قَسّی Ibn. Kasyi تک کی یہ راے تھی کہ نفسِ منفعل پر عقلِ فعّال کی تاثیر سے معانی کی

تشکیل کا نام اتحاد ہے (اور عقل فعّال نام ہے فیضِ الٰہی کا اور قرامطہ اور سالمیّہ کے نزدیک فیض الٰہی نور محمدیؐ ہی ہے)؛ (ب) اشراقیہ: سہروردی، حلبی اور جِلْدَکی سے دَوّانی اور صدرالدین شیرازی تک جو تجوّہرِ روح کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ روح نورِ ایزدی کا وہ شرارہ ہے جس کی زندگی عقلِ فعّال کے اشراقات سے منوّر ہوتی ہے؛ (ج) وصوفّیہ: ابن سینا سے ابن طفیل اور ابن سبعین تک، جنھوں نے اس کی تشریح میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ روح کو ذاتِ الٰہیہ سے موافقت حاصل ہو جاتی ہے اور پھر ایک ایسے وجودِ جامع کا شعور حاصل ہو جاتا ہے جس میں تعدّد اور کسی طرح کے امتیاز کا سوال ھی باقی نہیں رہتا۔ سرسری طور پر اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اتحادیہ کے اس نظریے کی جسے ابن سینا نے اوّل اوّل نجات (قاہرۃ، ص ۴۰۲ و ۴۸۱ میں) تسلیم کیا تھا، لیکن بعد ازآں اشارات (باب ۹، ص ۱۱۸؛ قبّ ابن عربی: تجلیات) میں رد کر دیا تھا، امام غزالی نے (مقاصدالفلاسفۃ، ص ۴۷ میں) تردید کی ہے۔ نیز یہ کہ ابن سبعین کو، جو نظریّۂ قِدَم مادّہ کا پکّا قائل تھا، ذاتِ باری میں مخلوقات کی صورت یا ان کے اصولِ تفرّد (اَنّیّۃ) کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

نظریۂ تصوف کے ارتقاء کے تیسرے اور آخری دَور کا آغاز ساتویں (تیرھویں) صدی میں ھوتا ہے؛ اس کے ممتاز ترین دبستان کو اس کے حریفوں نے بجا طور پر وحدتیۃ (یا وحدت الوجودیۃ) کا نام دیا ہے، اس لیے کہ وہ عقیدۂ وحدت الوجود کا قائل ہے۔ عقیدۂ وجودیہ کا دعوی ہے کہ اُس کی تاریخ بہت پرانی ہے: اس نے بعض آیاتِ قرآنی کی تأویل اپنے حق میں کر لی ہے (۲ [البقرۃ]: ۱۰۹؛ ۲۸ [القصص]: ۸۸؛ ۵۰ [ق]: ۱۰) اور اسی طرح قدیم اشعری متکلّمین کے اُس نظریّے کی بھی جس میں تمام روحانی احوال بلاواسطہ افعالِ الٰہی ھیں، اور شروع کے صوفیوں، مثلاً بسطامی اور حلّاج، کے مبالغہ آمیز بیانات کی تأویل بھی کر لی ہے (جن میں سے بعض عین القضاۃ ہَمَذانی نے اپنی کتاب تمہیدات میں جمع کیے ھیں، ان میں لفظ وُجود ''وَجْد'' سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہَمَذانی نے بھی ان صفات کے لیے ھیں جو خداے تعالی کلمۂ ''کون'' کے مقابل اپنی مخلوق کو عطا کرتا ہے، اور اس کا مطلب ہے اُس کا وجود مکان میں)، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہبِ وحدتیہ تیسری ھجری سے چلا آ رہا ہے اور اس طرح پیدا ھوا کہ یہ قرار دیا گیا کہ مسلمان ادرین (gnosticism) کا نظریۂ نورِ محمدیؐ بالکل وھی ہے جو یونانی نظریۂ بروز کے تصوّرِ عقلِ فعّال کا ہے (ابن رُشد بھی اس نظریۂ بروز سے آزاد نہیں، کیونکہ تہافۃالتہافۃ میں وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ علمِ خدا میں موجود ھونا وجودِ اشیاء کا بلند ترین درجہ ہے اور ارواح کو اس علم میں یوں متحد ھو جانا چاہیے جیسے ایک عقل منفعل عَقلِ فعّال کے ساتھ متّحد ھو جاتی ہے۔ ابن عربی (م ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء) وہ پہلے شخص ھیں جنھوں نے مذہبِ وحدت وجود کے اصول منضبط کیے۔ ابن عربی کے نزدیک جیسا کہ ابن تیمیۃ نے بجا طور پر کہا ہے ''مخلوقات کا وجود عین وجود خالق ہے'' (''وجود المخلوقات عین وجود الخالق'')۔ ان کی راے یہ ہے کہ اشیاء لازماً علم باری سے جہاں وہ پہلے ھی سے اعیان کی شکل میں موجود (ثُبُوت) تھیں ایک فیض کی شکل میں صدور کرتی ھیں، جو پانچ مراتب یا ادوار میں جلوہ گر ھوتا ہے اور یہ کہ ھر روح ایک معکوس طریق پر ایسے مراحل طے کرتی ھوئی جن میں ایک منطقی

تسلسل اور رابطہ قائم ہے پھر ذات الٰہی سے جا ملتی ہے۔ اس مذہب میں، جسے آج تک سب مسلمان صوفی مانتے ہیں، فرغانی اور جیلی نے صرف چند معمولی جزئیات کا اضافہ کیا ہے۔ فارسی شعراء نے اسی نظریے کو غیر مختتم طور پر اس سادہ اور سہل شکل میں اپنے اشعار میں جگہ دی ہے، جسے قونیوی نے عطّار کے خیالات کو ترتیب دے کر اس طرح بیان کیا ہے: ''اللہ ہی وجود ہے، اس اعتبار سے کہ وہ کلّی ہے، قائم بالغیر نہیں ہے''؛ جس طرح سمندر اپنی موجوں کے نیچے بہتا چلا جاتا ہے اسی طرح یہ افرادِ کائنات کی چلتی پھرتی صورتوں کے اندر رواں دواں ہے۔ سترھویں صدی میلادی کے آخر میں کَوْرانی اور نابُلُسی نے یہ کہہ کر راسخ الاعتقاد سنّی مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑا دی کہ شہادت ان لا الٰہ الاّ اللہ کی صحیح ترین تأویل صرف عقیدۂ وحدت الوجود ہی کے ماتحت ممکن ہے (قبّ ماسینیون Massignon: *Hallāj*، ص ۴۸۷ تا ۷۹۰)۔ ان کے نزدیک ''شہادت'' کا مطلب، جس کے ذریعے اسلام نے خدائے واحد کے کاملاً وراء الوراء ہونے کا اثبات کیا تھا، یہ ہے کہ خدا کا اتصال اپنی تمام مخلوقات کے ساتھ اتصالِ مطلق ہے اور یہ کہ جملگیِ موجودات اپنے تمام افعال میں جو اس سے صادر ہوتے ہیں جلوہ گاہ ایزدی ہے اور اس کی مستحق کہ اللہ کی عبادت اس کے توسط سے کی جائے۔ اس فلسفۂ سکون (quietism) سے، جو فقہی احکام پر مشیتِ الٰہی کی برتری قائم کرتا ہے، صوفیاء کے وہ متناقض تصوّرات مرتب ہوئے جن میں سے ایک کے ماتحت ابلیس کو فتوت کا مرتبہ دے کر پھر بحال کیا گیا (جیلی اس رائے کا مویّد تھا) اور اسی طرح بائبل کی کتاب خروج والے فرعون کو بھی پھر سے بحالی نصیب ہوئی (یہ ابن عربی کے مشہور اقوال میں سے ہے)۔

۵ - تصوّف کی دیگر امتیازی خصوصیات اور اس کے مآخذ کا مطالعہ۔

مذہبِ تصوف کی دوسری خصوصیات، جن کا ذکر ابھی باقی ہے، حسب ذیل ہیں:

(ا) اسناد، جس کے ماتحت حدیث کی طرح یہاں بھی یہ تصوّر کیا جاتا ہے کہ تعلیماتِ مشایخِ صوفیہ کا روحانی سلسلہ براہِ راست تعلیماتِ نبوی [علی صاحبہا الصلوات و السلام] سے جا ملتا ہے۔ قدیم ترین اسناد (فہرست، ص ۱۸۳) ہمیں خُلْدی (م ۳۴۸ھ/۹۵۹ء) کی ملتی ہے۔ وہ اسے ذیل کے واسطوں سے نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] تک پہنچاتے ہیں: جنید (۷)، سَقَطی (۶)، معروف کَرْخی (۵)، فَرْقَد (۴)، حسن بصری (۳) اور اَنَس بن مالک(ا) [رحمہم اللہ اجمعین] (۲)۔ بیس سال بعد دقّاق (م ۴۰۶ھ یا ۴۱۲ھ، قبّ قُشَیری، ص ۱۸۸) نے اپنے سلسلے میں بھی نام گنوائے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اس نے کرخی سے پہلے داؤد طائی (۴) [رحمہما اللہ] کا نام لیا ہے(ب)۔ سب سے آخر میں چودھویں صدی میلادی کی متفقہ اسناد (ابن ابی اُصَیْبِعة: عیون، ۲: ۲۵۰)، جسے اس وقت سے بہت بڑے بڑے صوفی سلسلے تسلیم کرتے چلے آئے ہیں، یہ ہے: جنید (۷) رُوذْباری(ج) (۸)، ابو علی کاتب یا زَجّاجی (۹)، مغربی (۱۰)، جرجانی (۱۱) اور اوپر کے حصے میں داؤد طائی[د] (۴) سے پہلے حبیب عجمی (۳)، حسن بصری (۲) [رحمہم اللہ اجمعین] اور علی[ہ] (۱)۔ ابن الجوزی اور ذہبی نے یہ ثابت کیا ہے کہ

[(ا) اس کے بعد فہرست میں صرف یہ ہے: اور مالک ستّر اہل بدر سے ملے۔ (ب) رسالۃ محلّ مذکور میں ہے: اور داؤد الطائی تابعین سے ملے۔ (ج) عیون محلّ مذکور میں نظر نہیں آیا۔]

اس اسناد میں قدیم ترین چار واسطے [یعنی ۱ تا ۴] منحول ہیں، کیونکہ یہ بزرگ کبھی آپس میں ملے ہی نہیں تھے۔ بعض مذہبی سلسلے ایک ایسی اسناد استعمال کرتے ہیں جس میں معروف کرخی سے پہلے نو شیعی امام آتے ہیں، اس اسناد کی صحت اور بھی زیادہ مشکوک ہے۔

(ب) طبقات رجال الغیب، صوفیہ کے نزدیک دنیا اس لیے قائم ہے کہ اولیاء اللہ کے ایک مستورمگر منظم سلسلے کی شفاعت سے اس کی بلائیں ٹلتی رہتی ہیں، دنیا میں ان اولیاء اللہ کی تعداد مقرر ہے۔ جب ایک ولی کا انتقال ہو جاتا ہے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس تعداد میں تین سو نُقَبَاء، چالیس ابدال، سات اُمَنَاء، چار عَمود اور ان کا قطب شامل ہیں (قطب یعنی وہ محور جس کے گرد، بخیالِ صوفیہ، دنیا کا سارا نظام گردش کرتا ہے = غوث)۔

(ج) رُخَص (رخصتیں یا رعایتیں)، جن پر صوفیہ کی جماعتی زندگی قائم ہے [قب طریقة]، بسطامی، شبلی اور ابوسعید کے زمانے سے عصرِ حاضر کے کم و بیش غیر ذمے دار اور بدنام مجذوبین تک ہمیں ایسی ایسی رعایتیں نظر آتی ہیں جو بارہا غیر معمولی بھی ہیں اور فوضوی (anarchical) بھی۔ اپنی محفلوں میں صوفیہ خاص نظمیں پڑھتے ہیں؛ اس قسم کی شاعری، جو مسلمانوں کے ادب کا خاصّہ ہے اور جس نے ہر جگہ بے حد نشو و نما پائی، عموماً بے تنوّعی اور بے ذوقی سے مبرّا نہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جمالیاتی وسائل کی مدد سے وجدانی ہیجان پیدا کر کے سامعین میں جذب و مستی کی ایک مصنوعی کیفیت پیدا کی جائے۔

یہ شاعری تصوّف کی زبان میں شراب (خمر) کی مدح سرائی کرتی ہے، حالانکہ شریعت نے اس دنیا میں اسے حرام قرار دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس میں محبت کے اس پیالے (کأس المحبت) کا ذکر ہوتا ہے جو ساقی (= شمّاس الدیر = ترسابچہ tersabeče) گردش میں لاتا اور پیش کرتا ہے۔ یہ شاعرّی اس طرح کی طویل اور مفصل تمثیلات و تلویحات سے پُر ہے جنھیں اکثر خطرناک قسم کے جوش اور سرگرمی سے پیش کیا جاتا ہے اور جنھیں اکثر یورپی مترجمین، از روے مصلحت اندیشی، اپنے تراجم میں خفیف کر کے دکھاتے ہیں۔ اس طرح کے اشعار میں حسب ذیل خاص طور پر مشہور ہیں: عربی میں ابن فارض اور تستری کی نظمیں؛ فارسی میں رباعیات ابوسعید اور عطّار اور رومی کی طویل مثنویاں (قب رومی کی وحدة الوجودی حکایت 'کیست آنجا'؟ — توئی!)، حافظ کی غزلیں اور جامی کی مختلف نظمیں؛ ترکی میں نسیمی اور نیازی کی تصنیفات۔ اس طرح کا ادب اردو اور ملائی زبانوں نے اپنا لیا ہے اور آج بھی ان میں رائج ہے۔ اگرچہ مشرقِ وسطٰی میں یہ شاعری اب معدوم ہو رہی ہے اور دورِ حاضر کے مسلمان ادیب روز بروز اسے ترک کرتے جا رہے ہیں۔

تصوّف کے مآخذ کا تنقیدی جائزہ ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچا۔ تصوف کے موجودہ عقیدۂ وحدت الوجود اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے صحیح عقائد میں جو گہرا بنیادی اختلاف ہے اس سے متحیّر ہو کر اسلام کا مطالعہ کرنے والے ابتدائی [یورپی] محققین نے تصوف کا سر چشمہ غیر اسلامی عناصر میں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ عقیدہ شامی رہبانیت سے مأخوذ ہے (مرکس Merx کا یہی خیال تھا) یا یونانی فلسفۂ اشراق سے، یا پھر اسے ایران کے زرتشتی مذہب یا ہندوستان کے ویدانت کے فلسفے سے لیا گیا ہے (یہ جونز Jones کا خیال ہے)، لیکن نکلسن کی

تحقیق کی رُو سے یہ مفروضہ کہ اُس سادہ شکل میں عقیدۂ تصوف مستعار لیا گیا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ابتداے اسلام هی سے یہ بات نظر آتی ہے کہ صوفیاے اسلام کے خصوصی نظریات کی تشکیل خود ان کے اذهان کے اندر تلاوت قرآن [مجید] و حدیث[شریف] کی مداومت اورقرآن و حدیث میں تفکر اور تدبر کے نتیجے کے طورپر اندرهی‌اندر رونما هوئی۔ ان نظریات کی تشکیل میں اسلامی معاشرے کے عین مرکز میں جو اجتماعی اور انفرادی بحران واقع هوے ان‌کا اثر بھی شامل هوا، مگر یہ تسلیم کرتے هوے بھی کہ تصوف کا ابتدائی ڈھانچا خالصۃً اسلامی اور عربی تھا، ان بیرونی عناصر کو متعین کرنا بالکل هی سعی لاحاصل نہ هوگا جو اس ڈھانچے کے حسن و زیبائش کے لیے بڑھائے گئے اور پھر وهیں پھلے پھولے ؛ چنانچہ زمانۂ حال کے بعض محققین(آزین پلاچیوس،Aisn Palacios،ونسنک Wensinck،اندریہ T. Andrae) کو بعض‌ایسی‌ریاضتوں کا سراغ ملا ہے جن کا منبع مسیحی رهبانیت ہے، اسی‌طرح متعدد یونانی‌فلسفیانہ اصطلاحات‌کا علم بھی هوا ہے جن کا ترجمہ سریانی سے کیا گیا؛ ایرانی مماثلتوں کا (جن کی طرف بلوشہ Blochet نے اشارہ کیا ہے) ابھی مطالعہ نہیں کیا گیا ۔ رہے هندوستانی عناصر (هورٹن Horten کے نظریے کے مطابق) سو البیرونی اور داراشکوہ کی ان پرانی قیاس آرائیوں کے سوا جو انھوں نے قدیم تصوّف کے تصورات اور اُپنِشَد اور یوگا سوترا میں مشابہت دیکھ کر کی تھیں بہت کم دلائل کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس جن مراحل سے هوکر آج کل مجالس صوفیہ میں ذکر رونماهوا ہے ان کا بالغ نظر مطالعہ کرنے والا اغلبًا ہے کہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تصوف میں هندو زُهّاد کے بعض طریقے داخل هوگئے هیں۔

مآخذ : تصوف کےمتعلق ان مغربی مآخذ کی‌فہرست جن کی طرف مراجعت کرنا چاهیے G. Pfannmüller نے *Handbuch der Islam-Litteratur* (لیپزگ ۱۹۲۳ء، ص ۲۶۵ تا ۲۹۲) میں بڑی احتیاط سے مرتب کی ہے۔ اس طویل فہرست میں عام مطالعے کی بہترین کتابیں آر۔ اے۔ نکلسن کی یہ تصنیفات هیں: (۱) *The Mystics of Islam*، لنڈن ۱۹۱۴ء؛ (۲) *Studies in Islamic Mysticism*، کیمبرج ۱۹۲۱ء؛ (۳) *The Idea of Personality in Sufism*، کیمبرج ۱۹۲۳ء—مسائل خصوصی کے لیے مندرجۂ ذیل تصانیف کو دیکھنا چاهیے : مصادر تصوف کے لیے : (۴) دقیق مقالات از گولٹ تسیہر Goldziher : *R.H.R.*، ۳۷ : ص ۳۱۴ ؛ (۵) *W.Z.K.M.*، ۱۳ : ۳۵ ؛ (۶) *Z.A.*، ۲۲ : ۳۱۷ ؛ (۷) *Z.D.M.G.*، ۶۸ : ۵۴۴ ؛ (۸) *Isl.*، ۹ : ۱۴۴ ؛ (۹) Massignon : *Essai sur les Origines du Lexique technique de la mystique musulmane*، پیرس ۱۹۲۲ء؛ اور (۱۰) وهی مصنف : *La Passion d'al-Ḥallāj, martyr mystique del'Islam*، پیرس ۱۹۲۲ء—غزالی کے متعلق : (۱۱) Asín Palacios : *Algazel*، سرقسطہ Saragossa ۱۹۰۱ء؛ نیز در (۱۲) *Cultura española*، ۱۹۰۶ء، ص ۲۰۹ ؛ اور (۱۳) *M.F.O.B.*، ۱۹۱۴ء، ص ۶۷؛ (۱۴) Obermann : *Der philosophische und religiöse Subjektivismus Ghazālīs*، وینا ۱۹۲۱ء؛ ابن الفارض کے متعلق : (۱۵) Nallino (بجواب Di Matteo)، در *R.S.O.*، ۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ء)؛ ابن عربی کے متعلق : (۱۶) Asín Palacios : *El místico Murciano Abenarabi*، میڈرڈ ۱۹۲۵ - ۱۹۲۶ء، تین جلدوں میں — سترهویں صدی کے هنود کے تصوف کے لیے : (۱۷) von Kremer : *J.A.*، ۱۸۶۹ء، ص ۱۰۵ — تصوف کے عام نفسیاتی طریقوں کے لیے : (۱۸) افلاکی کی دستاویزات (ترجمہ از Huart در *Les Saints des derviches tourneurs*، پیرس ۱۹۱۸ء)؛ اور (۱۹) ملاحظات از ڈی۔ بی۔ میکڈانلڈ : *The*

Religious Attitude and Life in Islam، شکاگو ۱۹۰۸ء؛ —— (۲۰) جہاں تک اصل متون کا تعلق ہے ہمارے پاس نکلسن کے (مرتب کیے ہوے) سرّاج، عطّار، ابن عربی اور رومی کے عمدہ مطبوعہ نسخے موجود ہیں اور حسب ذیل تراجم بھی ہیں: از رچرڈ ہارٹمن Hartmann (قُشیری کا)، از ایوار Huart (داراشکوہ در *J.A.*، ۱۹۲۶ء، ص ۲۸۵)؛ اسی طرح شروح بھی ہیں: (۲۱) Gairdner کی شرح مشکٰوۃ الانوار Al-Ghazzālis *Mishkāt al-anwār*، لنڈن ۱۹۲۴ء؛ سُہروردی حلبی کے فلسفے کی شرح از ہورٹن، یعنی (۲۲) Horten (*Die Philosophie der Erleuchtung nach Suhrawardi*، ہالہ Halle ۱۹۱۲ء)؛ نیز (۲۳) ترکی کے صوفیاے متقدمین سے متعلق کوپرولو زادہ محمد فؤاد (*Türk Edebiyatında ilk mutasawwifler*، استانبول ۱۹۱۹ء)؛ اور ابن عربی سے متعلق: (۲۴) نُوبرز Nyberg (*Kleinere Schriften des Ibn al-ʿArabī*، لائیڈن ۱۹۱۹ء) کی شرحیں، اور دیگر شروح۔ عربی میں بنیادی ماخذ: (۲۵) مُحاسبی، مکّی، غزّالی اور ابن عربی کی تصانیف تصوف کی حمایت میں اور اس کے دو سخت مخالفوں یعنی (۲۶) ابن الجوزی (تلبیس ابلیس، قاہرۃ ۱۳۴۰ھ) اور ابن تیمیۃ کی تصنیفات؛ [(۲۷) دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، ۵: ۲۷۵ تا ۲۹۸؛ (۲۸) اصغر علی روحی: ما فی الاسلام، لاہور ۱۳۵۰ھ، ۲: ۱۷۶ تا ۲۴۲؛ آربری: *Sufism*، ۱۹۵۰ء]۔

(LOUIS MASSIGNON ماسینیون)

تصوف (۲) - ۱ - اشتقاق: "تصوف" مادّۂ ص-و-ف کے باب تفعّل سے مصدر ہے، جس کے معنی ہیں اپنے آپ کو صوفیانہ زندگی کے لیے وقف کرنا۔ یہ کلمہ غالباً لفظِ "صوفی" سے براہِ راست وضع کیا گیا ہے، جس طرح تَنَصَّرَ براہِ راست نصرانی سے وضع کیا گیا ہے، لیکن اگر یہ لفظ "ص-و-ف" کے مادّے سے براہِ راست وضع کیا گیا ہے تو ابتداءً اس کے معنی "صُوف" یعنی اونی کپڑا پہننا ہوں گے۔ بہر کیف لسانی اعتبار سے لفظِ صوفی 'صوف' (اون یا پشم) کا اسم منسوب ہے۔ بہت سی احادیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونی کپڑے پہنے (مثلاً بخاری، لباس، ۱) - آپ کا انتقال اونی کپڑے میں ہوا (ترمذی، لباس، ۱۰؛ قبّ ابن ماجہ، لباس، ۱) - حدیث میں ہے کہ جب اللہ [تعالٰی] نے موسی[ع] سے کلام کیا تو وہ از سر تا پا اونی لباس پہنے ہوے تھے (ترمذی، محلّ مذکور) - بہر حال صوفیانہ زندگی اور ایک خاص قسم کے لباس کا باہمی تعلق اس قدر سطحی اور غیر ضروری ہے کہ اس سے اس امر کی پوری تصریح نہیں ہوتی کہ لفظ صوفی کا اطلاق علی العموم صوفیّۃ اسلام پر کیوں ہوا۔ قُشیری نے (رسالۃ، باب التصوف) "صوف" سے لفظ صوفی کے تعلق کی نسبت لکھا ہے: "یہ اس لفظ کا صرف ایک پہلو ہے، لیکن صوفیّہ نے پشم پوشی ہی کو اپنا مخصوص شعار قرار نہیں دیا ["و لکن القوم لم یختصوا بلبس الصوف"]، اور یہ امر قریب یقینی ہے کہ صوفی کی اصطلاح کبھی عام نہ ہوتی اگر "ص-و-ف" کا مادّہ صوتی دلالتوں سے مالا مال نہ ہوتا یا علم الحروف کے مطابق، جس کے صوفی بہت ماہر تھے، ان حروف صامتۃ کی عددی قدر، یعنی مادۂ "ص-ف-و" سے اس لفظ کی سِرّی مشابہت نہ ہوتی، جس سے بے شمار ایسے الفاظ مشتق ہیں جو تصوف کے بعض بنیادی پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں، مثلاً صفاء (پاکیزگی)، صفو (برگزیدہ لوگ)، صَفِی (خالص دوست)، مصطفٰی وغیرہ۔ بُندار بن حسین نے لکھا ہے: (دیکھیے کلاباذی: تعرّف، باب دوم)[1] صوفی

[(۱) "من اختارہ الحق لنفسہ فصافاہ . . . و صُوفی، علی زِنۃ عُوفی ای عافاہ ربہ فعوفی"]

وہ ہے جسے ذات حق نے اپنے لیے چن لیا ہو اور
اسے اپنا مقرب دوست بنا لیا ہو . . . . پس وہ
دوست بنا لیا گیا" (صُوفِیَ [مادہ ص۔ ف۔ و سے باب
مفاعلة میں ماضی مجہول])۔ ممکن ہے صوفی کی اصطلاح
"صوف" کے بجاے براہِ راست اسی ماضیِ مجہول سے
وضع کی گئی ہو، گو یہ غیر اغلب معلوم ہوتا ہے
کہ یہ اصطلاح دونوں لفظوں سے الگ الگ بنائی
گئی ہو، جیسے ماسینیون Massignon نے اشارہ
کیا ہے (*Essai les Origines du Lexique technique de la Mystique musulmane*، ص ۱۰۰، طبع ۱۹۵۴ء)۔
اس لفظ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی صوتی
مناسبت اھل الصُّفّة سے ہے ۔ سب سے پہلے اس کا
اطلاق ابوھاشم بن شَریک (حدود ۱۳۰ھ) اور
جابر بن حیّان، ماہرِ علم کیمیا (حدود ۱۶۰ھ)،
پر کیا گیا، جو دونوں کوفی تھے ، لیکن ممکن
ہے کہ یہ لفظ اس سے قبل بھی استعمال کیا
گیا ہو اور گو موجودہ تحریروں میں وہ شاذ طور
پر مستعمل ہوا پھر بھی ہو سکتا ہے کہ
اس کا استعمال جتنا تحریروں سے ثابت ہے اس سے
بہت زیادہ عام ہو، بہر حال چوتھی صدی میں یہ
اصطلاح عام طور پر مروّج تھی ۔

۲۔ منابعِ تصوف :۔

تصوفِ اسلامی کی تاریخ اپنے آغاز میں اسی کے
نام کی تاریخ سے بہت مختلف ہے ۔ ھُجْویری[رح] نے
(کشف المحجوب، ترجمۂ نکلسن، صفحہ ۴۴) ابوالحسن
الفُوشَنْجی (م ۳۴۸ھ) کا قول نقل کیا ہے کہ "آج کل
تصوف ایک نام ہے بغیر حقیقت کے، لیکن زمانۂ
سابق میں یہ ایک حقیقت تھی بغیر نام کے" ۔ پھر
ھجویری[رح] اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں کہ :
"صحابۂ کرام[رض] اور سلف صالحین کے زمانے میں یہ
نام موجود نہ تھا، لیکن اس کی حقیقت ہر شخص
میں جلوہ گر تھی"۔ اگر "ہر شخص" کا لفظ
کسی قدر مبالغہ آمیز بھی ہو، تب بھی یہ حقیقت ہے
(اور سب بڑے بڑے صوفی متقدّمین و متأخّرین
متفق ہیں) کہ اگرچہ متأخّرین میں ہمیشہ بے شمار
مقدّس ہستیاں (مرد و زن) مختلف اقطارِ عالم میں
موجود رہی ہیں لیکن تقدّس اتنا ہمہ گیر نہ تھا
جتنا اسلام کے قرنِ اول میں پایا جاتا تھا ۔ مزید برآں
اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ تاریخی اعتبار سے
تصوف کی جڑیں رسول اللہ[ص] کی گوشہ گیری کے
اس عمل میں پائی جاتی ہیں جو حضور[ص] اوّلین
نزول وحی سے پہلے ماہِ رمضان میں غارِ حرا میں
فرمایا کرتے تھے ۔ حُنَفاء کا (سا) یہ عمل، جس پر
آنحضرت[ص] مدینے میں اپنی زندگی کے آخری سالوں
میں بھی متواتر کاربند رہے اور ان کے بعض اصحاب[رض]
بھی اس میں ان کی پیروی کرتے رہے، گویا
ابراھیمی تصوف اور اسلامی تصوف کے درمیان
ایک رشتۂ اتّصال سمجھا جا سکتا ہے ۔

امام غزالی[رح] نے (مُنْقِذ، ص ۶۰ تا ۶۹) تصوف
کو "قُربِ" الٰہی اور "ذوق" یعنی راست روحانی
مشاھدے سے تعبیر کیا ہے ۔ قدرتی طور پر
نئے دین کی طرف سب سے پہلے قوم کے ان
افراد کو کشش ہوتی ہے جو قربِ باری تعالٰی
کے سب سے زیادہ آرزومند ہوتے ہیں اور
وہ اپنی روحانیت کی وجہ سے اس دین کے
الہامی منبع کا عرفان سب سے پہلے حاصل
لیتے ہیں ۔ ابتدائی مکّی سورتوں کے مطالعے سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایسے منتخب
اور برگزیدہ لوگ موجود تھے جن کی زندگیاں
از سر تا پا اللہ [تعم] کے لیے وقف تھیں اور صاف ظاہر
ہے کہ ان کا جذبۂ عبادت عام انسانی قوت کے
معیار سے بہت زیادہ شدید تھا ۔ اس زمانے کے
بنیادی روحانی رجحانات کا پتا اِن آیاتِ قرآنی سے
چلتا ہے : فَفِرُّوا اِلَی اللّٰهِ (۵۱ [الذّٰریٰت] : ۵۰)

[پس اللہ ہی کی طرف بھاگو]؛ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ (۹۶ [العلق] : ۱۹) [خدا کی جناب میں سجدے کرو (یعنی نماز پڑھو) اور قرب (خدا) حاصل کرو] ؛ وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (۷۶ [الدھر] : ۲۶) [رات کے بڑے حصے میں اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتے رہو]؛ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (۷۳ [المزمّل] : ۲) [رات کے وقت نماز میں کھڑے رہا کرو (سو بھی ساری رات نہیں) بلکہ ساری رات سے کم]؛ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (۷۳ [المزمّل]: ۸) [اپنے پروردگار کا نام لیتے رہو اور (سب سے) ٹوٹ کر اسی کے ہو رہو] - مسلمانوں کا مسلک اس وقت انتہائی جِدّوجُہد کا خالص متصوفانہ مسلک تھا اور ابھی اس میں فقہی اعتبار سے اقلِ عبادت کی حد بندی نہیں ہوئی تھی، اس لیے یہ ہرگز مقام تعجب نہیں کہ بہت سے صحابۂ کرام[رض]، جنھیں صوفیّہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد اپنا روحانی رہنما تسلیم کرتے ہیں، وہی تھے جنھوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا، مثلاً پہلے چار خلفاء (خصوصاً ابو بکر[رض] اور علی[رض])، چھے وہ صحابی جو ان چار سے مل کر ''عشرۂ مبشرہ'' سے موسوم ہیں اور جنھیں رسول اللہ [صلّی اللہ علیہ وسلّم] نے ان کی زندگی ہی میں جنّت کی بشارت دے دی تھی اور بہت سے دیگر صحابہ، جن میں شاید سب سے زیادہ قابلِ ذکر سلمانِ فارسی[رض] اور ابوذرّ [غفّاری[رض]] ہیں - انصار میں بھی بہت سی نہایت ممتاز مقدس ہستیاں موجود تھیں اور اس طبقے میں بھی جو حضور[ص] کے دَورِ رسالت میں نشو و نما پا کر بلوغ کو پہنچا .

خلفاے اربعہ[رض] کے زمانے تک تصوف، یعنی تقرّبِ الٰہی کی شدید خواہش، اتنی عادی چیز تھی کہ مجموعی طور پر پوری امت کے اندر نفوذ کر گئی تھی اور اس کا اثر اسی آسانی اور غیر شعوری، بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ طبیعی اور اساسی، طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا جیسے قلب کا عمل پورے جسم میں جاری و ساری ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ روحانی ترقّع میں ابھی سیاسی اقتدار بھی مضمر رتھا- اگرچہ یہ اغلب نہیں کہ اس زمانے میں جماعتوں اور گروہوں کی کوئی واضح تشکیل موجود تھی تاہم دوسرے قرن کے لوگوں (تابعین) نے خود بخود ہی صحابۂ [کرام[رض]] کے حلقوں میں اپنے آپ کو منسلک کر لیا تھا اور روایت کے مطابق اس قسم کے اہم ترین صوفی حلقوں میں جس کی طرف لوگ کھنچے چلے آتے تھے وہ حلقہ تھا جو [حضرت] علی [کرّم اللہ وجہہ] کے گرد جمع تھا - یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ . . . . . [حضرت] علی[رض] کے انتقال فرمانے کے بعد بھی مورّخین نے جس چیز کو شیعیت قرار دیا وہ [ابتدائی] تصوّف کے سوا کوئی اور شے نہ تھی اور یہ مسلم ہے کہ [حضرت] حسن[رض] (م ۴۹ھ) اور [حضرت] حسین[رض] (م ۶۱ھ) کو صوفیّہ نے ہمیشہ صدرِ اسلام کے اکابرِ اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے - ''سیدا شبابِ اہلِ الجنة'' کے علاوہ بزرگانِ ذیل کا بھی ذکر کرنا چاہیے : مُجاہد بن زُبَیر المَخْزُومی المکّی (م ۱۰۴ھ)، جو عبداللہ بن عباس[رض] (م ۶۸ھ) کے شاگرد ہیں اور جنھوں نے اپنے استاد کی تفسیرِ قرآن کی تدوین کی؛ عبداللہ بن خُثَیم کوفی (م ۷۶ھ) اور سب سے بڑھ کر حسن بصری (م ۱۱۰ھ) اور ان کے مریدین : مالک بن دینار (م ۱۲۸ھ)، ثابت البُنانی (م ۱۲۷ھ) اور حبیب العجمی (م ۱۵۶ھ)، جن میں سے ہر ایک کے متّبعین کا اپنا اپنا حلقہ تھا - رابعہ عَدَویّہ غالباً ابنِ دینار کے حلقے میں شامل تھیں .

۳- تصوف کے اعمالِ روحانی :-

ان میں کچھ تو وہ ہیں جو تمام مسلمانوں

پر فرض ھیں اور کچھ وہ ھیں جو اپنی مرضی سے ادا کیے جاتے ھیں (نافلة) ۔ تمام نوافل میں سے اسم ذات، یعنی اللہ کے ذکر کو، جس کی تاکید قرآن نے اصرار کے ساتھ کی ھے، صوفیّہ نے ھمیشہ قربِ الٰہی کے حصول کا قطعی ذریعہ تصوّر کیا ھے ۔ مشایخ تصوّف نے دوسرے اسماے حُسنٰی کے ذکر (۷ [الاعراف] : ۱۷۹)، تلاوتِ قرآن مجید اور دیگر مختلف اوراد (رک بہ وِرد) اور وظائف پر بھی خاص زور دیا ھے، جو اب مختلف صوفی سلاسل کے مقررہ معمولات میں شامل ھو چکے ھیں ۔ پوری توجہ کے ساتھ عبادت کرنے کے لیے تنہائی سب سے بڑی معاون ھے، جیسے روزے سے اَور بھی زیادہ تقویت پہنچتی ھے، یعنی مذکورۂ بالا روحانی کنارہ کشی (اعتکاف یا خَلْوَة) ۔ عبادت میں مدد دینے والا ایک اَور طریقہ یہ ھے کہ یارانِ طریقت مل کر مجالسِ ذکر منعقد کریں (دیکھیے مُسلم، ذکر، ۸) ۔ مختصر یہ کہ صوفیۂ اسلام کے اذکار و اشغال میں آخری آیت کے نزول سے لے کر آج تک کوئی بنیادی تغیّر نہیں ھوا ۔ بعض ثانوی قسم کے مرحلوں کے ارتقاء کے لیے دیکھیے ''ذکر'' اور ''وِرد''.

۴۔ عقیدۂ تصوّف کی وضع و ترکیب :-

یہ حقیقت ھے کہ تمام روحانی حقائق تمام انسانوں پر ظاھر نہیں کیے جا سکتے ۔ اس معاملے کو مختلف مذاھب نے مختلف طریقوں سے نبٹایا ھے، مثلاً [حضرت] عیسٰی[ع] اپنے مقرب پیرووں سے کہتے ھیں کہ ''تمھیں عنایت ھوا کہ آسمان کی بادشاھت کے بھید جانو پر انھیں عنایت نہیں ھوا'' (متی، ۱۳ : ۱۱) ۔ قرآن تمام ملّتِ اسلامی کو مخاطب کرکے اسی خیال کی تعمیم ان الفاظ میں کرتا ھے : نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ط وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (۱۲ [یوسف] : ۷۶) [ھم جس کو چاھتے ھیں اس کے درجے بلند کر دیتے ھیں اور (دنیا میں) ھر ایک دانا سے بڑھ کر (دوسرا) دانا (موجود) ھے] اور جیسے [حضرت] عیسٰی[ع] لوگوں کو مخاطب کرکے تمثیلیں بیان کرتے تھے قرآن [حکیم] بڑے بڑے اسرار کو بلیغ اور مُوجز کلمات کے ذریعے پیش کرتا ھے ۔ مزید برآں یہ ناگزیر تھا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی دوسرے انبیاء کی طرح خواص کو بعض اوقات ایسی تعلیمات دیں جو عام مؤمنین کے لیے مقصود نہ تھیں اور ایسی ھی تعلیمات کی طرف [حضرت] علی[رض] نے اشارہ کیا تھا کہ : ''لوگوں کو ان کے فہم کے مطابق احادیث سنایا کرو ۔ کیا تم چاھتے ھو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلائیں؟'' (بخاری، علم، ۴۹) ....

صوفیّہ کی بلند ترین روحانی کیفیت، جسے مستشرقین عام طور پر ''اتحاد متصوفانہ'' "mystic union" کے نام سے موسوم کرتے ھیں، اس لقب میں مضمر ھے جو قرآن نے درجۂ اعلٰی کے اولیاء اللہ کو دیا ھے، یعنی ''المُقَرَّبُوْن'' (وہ جو خدا کے قریب لائے گئے) ۔ اس لقب کو قربِ الٰہی کی تعریف کی روشنی میں سمجھنا چاھیے : نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰ [قٓ] : ۱۶) [ھم (اس کی) شہ رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ھیں]۔ اس آخری آیت سے صوفیوں کے اِتحاد کی تعیین بھی ھو جاتی ھے کہ وہ ایک دائم الحضور حقیقت ھے، جس کا حصول تو نہیں لیکن ادراک ممکن ھے؛ اور یہ صداقت کہ یہ ادراک صوفی کا عمل نہیں بلکہ اللہ کا عمل ھے اس آیت میں ظاھر کی گئی ھے : لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ع (۶ [الانعام]: ۱۰۳) [مخلوقات کی نظریں تو اس کو معلوم کر نہیں سکتیں اور لوگوں کی نظروں کو وہ خوب جانتا ھے] ۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ پورا تصوف اس حدیثِ قُدسی میں جمع کر دیا گیا ہے [جس کا ترجمہ یہ ہے] : ''میرا بندہ نوافل کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے (بخاری، ۸۱، رقاق : ۳۸).

جو متون گم ہو چکے ہیں ان سے تو ہم بے خبر ہیں، لیکن عمومی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی دو صدیوں تک تو مذہبِ تصوف کو جن کلماتِ قِصار (aphoristic formulations) میں پیش کیا جاتا تھا وہ کافی سمجھے جاتے تھے اور صوفیوں نے ہمیشہ اس امر کا اعتراف کیا کہ اس قسم کے کلمات میں نا قابلِ بیان حقائق کے اظہار کے دوسرے طریقوں کی نسبت محدودیت کم ہوتی ہے، لیکن جب رفتہ رفتہ اس مذہب کے اسرار روز بروز عام اور غیر عالمانہ علمی مباحثے کا موضوع بنتے چلے گئے تو مشایخ صوفیّہ کے لیے ضروری ہوگیا کہ اپنے عقائد کو واضح تر صورت میں بیان کریں ۔ صوفیۂ متقدمین کی تعلیمات مدوّن کرنے والے پہلے بزرگ مُحاسبی (م ۲۴۳ھ) تھے، جن کی کتاب رعایة (طبع وقفیۂ گب) میں مسلکِ تصوف کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس میں محاسبۂ نفس پر خاص زور دیا گیا ہے؛ چنانچہ اسی نظریۂ محاسبہ کی بناء پر وہ مُحاسبی کہلائے [قبّ سمعانی، بذیل کلمہ]۔ انھوں نے اپنی زندگی کا دوسرا [اور بیشتر] حصہ بغداد میں بسر کیا، جو بہت جلد تصوف کے سب سے بڑے مرکزوں میں سے ایک مرکز بننے والا تھا اور جہاں ایک مدت تک جُنَید[۲] (م ۲۹۷ھ) بھی ان کے مریدوں میں شامل رہے ۔ جُنَید نے ''توحید'' (اتحاد الٰہی) اور ''فناء'' (انفرادی روح کے نابود ہو جانے) کے عقائد کی اس طرح تدوین کی جس سے ان کے معاصرین اور بعد کے علماء کو اطمینان ہو گیا کہ مذہبِ تصوف سنّت کے مطابق ہے ۔ صوفیّہ کے تمام سلسلوں (دیکھیے ''طریقه'') کا اسناد آپ تک پہنچتا ہے .

چوتھی اور پانچویں صدی کے دوران میں عقیدۂ تصوف کی تدوین اور بھی وسیع پیمانے پر کی گئی، اس تدوین میں زیادہ تر اصطلاحات کی تعریفیں شامل تھیں (اور حسب ضرورت ہر اصطلاح کے صوفیانہ و فلسفیانہ مفہوم کو متمیّز کر دیا گیا تھا)۔ اس کے علاوہ اس میں صوفیۂ سلف کے متعلق حکایات اور ان کی تصانیف کے اقتباسات کا قیمتی اضافہ کر دیا گیا ۔ ابونصر سَرّاج طوسی (م ۳۷۸ھ) نے اپنی کتاب اللُّمَع غالباً کئی مختلف مقامات پر تصنیف کی، کیونکہ انھوں نے بڑے بڑے لمبے سفر اختیار کیے تھے ۔ کَلاباذی (م ۳۸۰ھ) نے اپنی کتاب التعرُّف بخارا میں لکھی؛ ابوطالب المکّی (م ۳۸۶ھ) نے قُوت القلوب غالباً بغداد میں تالیف کی ۔ سُلَمی (م ۴۱۲ھ) نے طَبَقات الصوفیّہ نیشاپور میں؛ ابو نُعَیم الاصبہانی (م ۴۳۰ھ) نے اپنی حلیةالاولیاء اصفہان میں؛ قُشَیری (م ۴۶۵ھ) نے اپنا رسالة نیشاپور میں اور ہُجْویری (م ۴۷۰ھ[؟]) نے اپنی فارسی کتاب کشف المحجوب لاہور [؟] میں لکھی ۔ بغداد میں پانچویں صدی کے اواخر کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس میں امام غزالی[۲] (م ۵۰۵ھ) کی تعلیمات و تصنیفات شائع ہوئیں؛ ان کی بعض تصنیفات، خصوصاً ان کی احیاء علوم الدین اور المُنقِذ من الضلال، میں

خطاب ساری امّت سے ہے (انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری المُنقذ کے ذریعے اس نظریے کی توثیق کی کہ تصوّف کی زندگی بلند ترین زندگی ہے) ۔ غزالی کا مقصد، نہیں یہ کہنا چاہیے کہ ان کا وظیفہ، ۔۔۔ اس لیے کہ وہ اُس انتشار کے زمانے میں اپنے مقصد میں تا حدّ امکان کامیاب ہوے ۔۔۔ یہی تھا کہ روحانیت کی عام سطح کو بلند کریں، بلکہ یہ کہ ملّتِ اسلامیہ میں اس کی اصلی متصوفانہ ذہنیت کو بحال کر دیں ۔ ان کے انتقال کے جلد بعد اس وظیفے کو شیخ عبدالقادر الجیلانی[۳] (م ۵٦۱ھ) نے سنبھال لیا ۔ تاہم اُن متفقہ بیانات کے مطابق جو ہم تک پہنچے ہیں [جناب] شیخ کی ذات [والا صفات] جس قدر نورافشانی اور ضیا باری کرتی تھی اُس کا ان فصیح و بلیغ مواعظ سے جو ہمارے پاس موجود ہیں اب صرف ایک دھندلا سا تصوّر ہی قائم کیا جا سکتا ہے ۔ وہ عام طور پر ''سلطان الاولیاء'' کے لقب سے مشہور اور قادری طریقے کے بانی ہیں، جو ان کی وفات کے بعد ایک ہی پشت میں دنیاے اسلام کے اکثر حصوں میں پھیل گیا ۔

شیخ عبدالقادر الجیلانی[۳] کی قریبی روحانی اولاد میں محی الدین ابن العربی (م ٦۳۸ھ) تھے، جنھیں صوفی ''شیخ اکبر'' کہتے ہیں ۔ وحدت الوجود کا عقیدہ انھیں سے منسوب ہے، اگرچہ کسی قدر مبالغے کے ساتھ ۔ بے شک وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے اس عقیدے کو پورے طور پر منضبط کیا، لیکن یہ عقیدہ تمام تصوّف میں مضمر ہے ۔ اس سے قبل مثال کے طور پر تُستری (م ۲۸۳ھ) اور طریقۂ سالمیّہ اسے واضح طور پر بیان کر چکے تھے ۔ ان کے علاوہ حلّاج (م ۳۰۹ھ) (اگرچہ ماسینیون Massignon نے اس کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے) اور امام غزالی[۳] بھی (مشکوٰۃ الانوار میں) اس عقیدے کے حامی تھے ۔ اسلام میں اس عقیدے کی اساس ان آیات قرآنی پر ہے: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۲ [البقرۃ]: ۱۰۹) [توجہاں کہیں منہ کر لو ادھر ہی کو اللہ کا سامنا ہے]؛ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸ [القصص]: ۸۸) [اس کی ذات کے سوا سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں]؛ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَ الْاِکْرَامِ (۵۵ [الرحمٰن]: ۲۷) جتنی مخلوقات روے زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والی ہے اور (صرف) تمھارے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی] ۔ ''حالِ ابدی'' (Eternal Present) میں ہر وہ چیز جو ہالک تھی پہلے ہی ہلاک ہو چکی ہے، ہر وہ چیز جو فانی تھی پہلے ہی فنا ہو چکی ہے اور صرف ربّ ذوالجلال والاکرام کی ذات باقی ہے ۔ اس طرح وحدت الوجود کی اصطلاح اس امر کو واضح کرتی ہے کہ خلق شدہ کثرت کے موہوم حجاب کے اندر صرف ایک حقانی وحدت موجود ہے ۔ مطلب یہ نہیں کہ اللہ کئی اجزاء پر مشتمل ہے، بلکہ ''مخلوق کائنات'' کے مختلف اور بظاہر ایک دوسرے سے منفرد مظاہر کے ماوراء لا متناہی کاملیّتِ الٰہی اپنی غیر منقسم کلّیت کے ساتھ موجود ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا، یعنی اگر کوئی ایسا وجود ہوتا جو ''حال ابدی'' کی ''حقیقت'' میں اپنے آپ کو غیر اللہ ظاہر کر سکتا، تو اللہ لا متناہی نہ ہوتا، کیونکہ ایسی حالت میں لا انتہائیت اللہ پر اور اس مخصوص وجود دونوں پر مشتمل ہوتی ۔ بلاشبہہ ابن عربی کا جزوی طور پر مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالی کی لا انتہائیت کے تصور کی حفاظت و حمایت کریں، جو اس حدیث میں ظاہر کی گئی ہے کہ: ''اللہ تھا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا'' (بخاری، ۵۹ (خلق) : ۱) اور اس کی شرح میں، جو

نبی [صلّی اللہ علیہ وسلّم] ھی سے مروی ہے : ”وہ آج بھی ویسا ھی ہے جیسا کبھی تھا (الآن کما کان)“۔ یہی وجہ ہے کہ ابن عربی نے اس عقیدے پر اپنے پیشرووں سے زیادہ زور دیا، کیونکہ روز بروز رجحان یہ ھو رہا تھا کہ عقیدۂ توحید کی توجیہ و تعبیر خالص ”عددی اعتبار“ سے کی جائے، لیکن وحدت الوجود پر اصرار کی ایک خاص اصولی اھمیّت بھی ہے، کیونکہ اس سے ہر متصوّف مجبور ھوتا ہے کہ ھمیشہ اپنے آپ کو اگر فعلاً نہیں تو کم از کم بالقوۃ ”حالِ ابدی“ میں رکھے، جو ہر قسم کے تصوف کی آخری منزل ہے اور جس کے بغیر اس عقیدے کے کوئی معنی نہیں رہتے ۔ جب ابن عربی سے سوال کیا گیا کہ ”اگر تم، مثلاً غلاظت یا مُردار کو دیکھو تو کیا یہ کہو گے کہ یہ اللہ ہے“؟ تو انھوں نے جواب دیا ”استغفراللہ، اللہ ایسا کیونکر ھو سکتا ہے، لیکن ھمارا روے سخن اس کی طرف ہے جو مردار کو مردار کی صورت میں اور غلاظت کو غلاظت کی شکل میں دیکھتا ھی نہیں ۔ ھمارا مخاطب وہ ہے جو بینائی رکھتا ہے اور پیدائشی اندھا نہیں ہے (دیکھیے رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل، ۱۹۰۱ء، ص ۸۲۳)، جس سے ظاھر ھوتا ہے کہ زیر بحث عقیدہ اس نظامِ فلسفہ سے بالکل مختلف ہے جو مستشرقین نے اسے تصور کیا ہے ۔ دوسرے صوفی مشایخ نے بھی اپنے مریدوں کو ٹھیک اسی مقصد سے یہ تلقین کی ہے کہ ”چھلکا پھینک دو اور مغز لے لو“۔ وحدت الوجود کے عقیدے کا جاذب توجہ بیان ابن عربی کے دو ھم عصر شاعروں کے کلام میں پایا جاتا ہے، یعنی عمر بن الفارض مصری (م ۶۳۲ھ) اور جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ) کے ھاں اور اس زمانے سے لے کر آج تک زیادہ تر مشایخ صوفیہ کی تعلیمات و تصنیفات میں یہ عقیدہ بہت نمایاں رہا ہے ۔

”الانسان الکامل“ کا عقیدہ قدیم زمانے سے صوفیوں کی تعلیمات میں مضمر ہے، یعنی یہ عقیدہ کہ انسانِ کامل ایک عالمگیر شخصیت کا حامل ھوتا ہے اور متصوّفانہ اتحاد کا پیکر ہے اور اس کے مصداق تمام صوفیہ کے نزدیک ھمیشہ سے محمد [مصطفیٰ[؟]] ھیں ۔ اس عقیدے پر حلاج نے کتاب الطواسین میں اور ابن عربی نے فُصوص الحِکَم میں بہت زور دیا ہے، لیکن اسے پوری وضاحت کے ساتھ عبدالکریم الجیلی (م بہ حدود ۸۱۰ھ) نے اپنے رسالے الانسان الکامل میں پیش کیا ہے ۔

۵۔ تصوّف اور ملّت اسلامی کی دوسری شاخیں :۔

تصوّف اصولاً سنّی اسلام کا لازمی جزء ہے اور بہت سے ائمۂ فقہ خود بھی تصوف کے مختلف طریقوں سے وابستہ رہے ھیں ۔ ذوالنون مصری (م ۲۴۵ھ) اور حلّاج کے خلاف بغداد کے قاضیوں کی عدالتوں میں جو مقدمے دائر ھوے ان سے جن کشمکشوں کا پتہ چلتا ہے وہ محض افراد سے یا محض عقائد کے خاص طریقۂ اظہار سے تعلق رکھتی ھیں، مثلاً ابن جوزی کو لیجیے، جنھوں نے اپنی کتاب تلبیس ابلیس میں تصوّف کے بعض مظاھر کی تنقید کی یا ابن تیمیّۃ کو، جنھوں نے ابن عربی کی مخالفت عقیدۂ وحدت الوجود کی بنا پر کی، دونوں قدیم صوفیہ کا بہت احترام کرتے تھے، درآنحالیکہ ابن تیمیّۃ کے شاگرد ابن قیّم الجوزیّۃ نے ایک حنبلی صوفی عبداللہ الہَروی (م ۴۸۱ھ) کی کتاب منازل السائرین کی شرح میں تین قسم کے صوفیوں کا ذکر کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ قسم اول کے صوفیوں کے سامنے بڑے بڑے فقہاء و متکلّمین

کے بھی سر جھکتے ھیں ۔ اسی طرح بہت بعد کے زمانے میں [مفتی] محمد عبدہ (م ۱۳۲۳ھ)، جو عام طور پر تصوف کے سخت مخالف سمجھے جاتے ھیں، حالانکہ وہ اتنے مخالف نہ تھے، ھمذانی کے مقامات کی اپنی طباعت میں (بیروت ۱۸۸۹ء، ص ۲۱، ح ۷) لفظ ''صوفی'' کے متعلق ایک تعلیقے میں لکھتے ھیں کہ ''صوفیہ میں سے وہ عارف جو سلوک کی آخری منزل تک پہنچ گئے وہ انبیاء کے بعد انسانی کمال کے بلند ترین درجے پر فائز ھیں'' ۔ سنّی عقیدے کے مسلمانوں میں سے جن افراد نے تصوّف کی بحیثیت مجموعی مخالفت کی ھے وہ [اھل حدیث] ھیں ۔ گو ماسینیون کے بیان کے مطابق (مقالۂ ''تصوّف'' (۱)) اَن کے مسلک کے بانی نے صوفی شَقِیق البَلْخی (م ۱۹۴ھ) کی وصیّۃ بنام حاتم الاصمّ (م ۲۳۷ھ) کی شرح لکھی ھے ۔

اس مقالے کے آغاز میں تصوّف کے لحاظ سے تشیّع کی ابتدا کی نسبت جو کچھ لکھا جا چکا ھے اس میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ھے کہ پہلی دو صدیوں میں دونوں فرقوں کے درمیان ھر انفرادی صورت میں فرق و تفاوت قطعاً واضح نہیں، مثلاً چھٹے امام جعفر صادق[رح] (م ۱۴۸ھ)، جن کے متعلق کہا جاتا ھے کہ ان سے احادیث کا ایک ایسا مجموعہ مروی ھے جن میں آیاتِ قرآنی کی شرح متصوفانہ انداز میں کی گئی ھے، تقریباً یقینی ھے کہ وہ بہ نسبت تشیّع کے تصوف سے قریب تر تھے ۔ تیسری صدی تک شیعی نقطۂ نگاہ نے معیّن شکل اختیار کر لی اور وہ یہ تھی کہ تصوّف قطعی طور پر ناپسندیدہ مذھب ھے . . . اس کے برعکس یہ بھی یاد رکھنا چاھیے کہ گو صفوی طریقے کی بنیاد ایک سُنّی بزرگ صفی الدین اسحاق (م ۷۳۵ھ) نے رکھی تھی، چھٹی پشت میں ان کی اولاد، یعنی صفویوں، کی قیادت میں اس طریقے کے زیادہ تر افراد عالمِ اسلام کے زبردست شیعی مجاھدین بن گئے ۔

۶- روحانی سلسلہ :-

صوفیوں کا دعوی ھے کہ تصوف رسول اللّٰہ [صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم] سے غیر منقطع سلسلے کی وساطت سے ان تک پہنچا ھے اور تاریخی اعتبار سے اس میں کوئی شبھہ نہیں کہ زمانۂ رسالت سے لے کر ھر نسل میں مشایخ تصوف مع اپنی اپنی جماعتِ مریدین کے موجود رھے ھیں ۔ مزید برآن اکابرِ صوفیہ میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں ایک سے زیادہ شیوخ سے فیض حاصل کیا ۔ لہذا متعدد مختلف اور مستند سلسلوں کا قائم کرنا ممکن ھو گیا ۔ عام طور پر خود صوفیہ جس سلسلے کا پتا دیتے ھیں اسے اگر تیسری صدی تک لیا جائے تو اس کی صورت یوں ھے:[حضرت] علی[رض] (م ۴۰ھ)← حسن بَصْری[رح] (م ۱۱۰ھ) ← حبیب العجمی[رح] (م ۱۵۶ھ) ← داؤد الطائی[رح] (م ۱۶۵ھ) ← معروف کَرْخی[رح] (م ۲۰۱ھ) ← سرِی السَّقَطی[رح] (م ۲۵۳ھ) ← جُنید[رح] (م ۲۹۷ھ) ۔ اس سلسلے کی تاریخی صداقت پر شبھہ کرنے کی کوئی صحیح وجہ موجود نہیں ۔ اس پر ذھبی کی نکتہ چینیاں محض خیالی ھیں ۔ ماسینیون (*Essai*، ص ۱۲۹) کے نزدیک ترجیح اسے ھے کہ معروف کَرّخی کے روحانی سلسلے کو بکر بن خُنَیس[رح] : ثابت البُنانی[رح] کے واسطے سے حسن بصری[رح] تک پہنچایا جائے ۔ خود حسن بصری[رح] کے متعلق ان کی رائے یہ ھے (وھی کتاب : ص ۱۷۹) کہ وہ براہِ راست [حضرت] علی[رض] کے مرید نہ تھے، جن کے وصال کے وقت حسن[رح] کی عمر صرف بیس سال تھی، بلکہ وہ ایک صحابی عِمران بن حُصَین الخُزاعی (م ۵۲ھ) سے فیض یاب

ہوے تھے .

۷- مستشرقین کی تعبیرات :

تصوف کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ زمانۂ حاضر کے محققین کے طریقے اور ان کا تصور تناسب اُسے غالباً دوسرے تمام مضامین سے کم اپنے دام میں لا سکتا ہے ـ مغربی علماء کی یہ خدمت قابلِ تعریف ہے کہ انہوں نے تصوف کی کتابوں کے ترجمے کیے، لیکن ان کی کوتاہیاں بھی اتنی عام ہیں کہ ان کی فہرست پیش کی جا سکتی ہے :

(الف) لفظ تصوف کے معنی پر اس کی وسعت کو کم کرنے والے تضمّنات عائد کرنے کا غیر شعوری رجحان جن سے انگریزی لفظ (اصطلاح) mysticism کا مدلول مغربی یورپ ہی میں محدود ہو گیا ہے؛

(ب) مذہبِ تصوف اور ایک فلسفیانہ نظام کے فرق کو سمجھنے سے قاصر رہنا؛

(ج) نتیجۃً یہ سمجھنے سے قاصر رہنا کہ صوفی مسلسل طور پر ایک نقطۂ نگاہ کو چھوڑ کر دوسرے نقطۂ نگاہ کو اختیار کرتے رہتے ہیں اور ہر نقطۂ نگاہ کو اس طرح دل و جان سے اختیار کرتے ہیں کہ صرف صوفی ہی اس کے اہل ہیں اور وہ اکثر (خاص کر جب وہ صوفی عرب ہوں) ایسے قطعیت کے لہجے میں اس نقطۂ نگاہ کی توثیق کرتے ہیں کہ گویا اس کے سوا کوئی دوسرا نقطۂ نگاہ ممکن ہی نہیں؛

(د) آج کل کے محقّقین، جو جماعت بندی کا ذوقِ مفرط رکھتے ہیں، صوفیوں کے درمیان سطحی اختلافِ آراء پر بہت زور دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دو بظاہر متضاد متصوّفانہ نظام ہاے عقاید میں جو بنیادی مطابقت ہے اسے سمجھنے سے یہ محقق قاصر رہ جاتے ہیں؛

(ہ) وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر قسم کے تصوف میں ''سکوت'' نہایت اہم فریضہ سر انجام دیتا ہے، لہذا وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ تاریخِ ادبِ تصوف کو تاریخِ تصوف کے مرادف نہیں سمجھا جا سکتا [اور تحریر شدہ مواد کسی اعتبار سے بھی تصوف کے ارتقاء کا صحیح اندازہ نہیں ظاہر کر سکتا]؛

(و) چار صدیوں میں مسلسل و متواتر تعصّب جمع ہوتا رہا، جس کا میلان پہلے مذہبِ نوع پرستی (humanism) کی جانب تھا، اس کے بعد تکاملِ تدریجی کے عقیدے (evolutionism) نے اسے بد سے بد تر کر دیا؛ لہذا مغربی علماء اس امر کے سمجھنے سے قاصر رہے کہ روحانیت کی کوئی ایسی شکل بھی ہو سکتی ہے جو کسی تدریجی ترقی کے بغیر تقریباً فی الفور درجۂ کمال کو پہنچ سکتی ہے؛

(ز) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود صوفیہ تصوف کے آغاز کے متعلق جس اتفاقِ آراء کا اظہار کرتے ہیں انہیں مستشرقین بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں .

مآخذ : ان متون کے علاوہ جن کا ذکر کیا جا چکا ہے مندرجۂ ذیل کا مطالعہ بھی مفید مطلب ہے ـ طباعتوں (ایڈیشنوں) کی تاریخیں سرورق کے مطابق ہجری یا میلادی ہیں .

(۱) خرّاز : کتاب الصدق (تصحیح و ترجمۂ آربری Arberry: *The Book of Truthfulness*، آکسفورڈ ۱۹۳۷ء)؛ (۲) جُنید : کتاب الفناء، تصحیح و ترجمہ علی عبدالقادر، در *Islamic Quarterly*، جلد اول، شمارہ ۲ (لنڈن ۱۹۵۴ء)؛ (۳) ابن عربی : الفتوحات المکّیّة (بولاق ۱۲۹۳ھ) ؛ (۴) تفسیر الشیخ الاکبر، قرآن [پاک] کی تفسیر (منسوب بہ ابن عربی، لیکن منسوب بہ عبدالرزاق کاشانی بھی) (بولاق ۱۲۸۳ھ)؛ (۵) کوپرولو زادہ محمد فواد : *Türk Edebiyatenae ilk mutaṣawwifler*، مستقدمین

صوفیۂ ترکی سے متعلق (استانبول ۱۹۱۹ء)؛ (۶) احمد بن مصطفٰے العَلَوی : رسالۃ الناصر معروف، (دمشق ۱۹۳۱ء)؛ (۷) وھی مصنف : رسالۃ القول المعروف ، مُسْتَغانم ۱۳٦۷ھ ؛ (۸) محمد مصطفٰی حِلْمِی : الحیات الروحیّۃ فی الاسلام (قاھرۃ ۱۹۴۵ء)؛ (۹) ابوبکر سراج الدین : *The Book of Certainty* (لنڈن ۱۹۵۲ء)؛ (۱۰) Titus Burckhardt : . . . . . (لاھور ۱۹۵٦ء)؛ مندرجۂ ذیل تراجم بھی اھمّ ھیں: (۱۱) کَلاباذی : *The Doctrine of the Sufis* (ترجمۂ کتاب التعرّف، از آربری Arberry، کیمبرج ۱۹۳۵ء)؛ (۱۲) غزالی : مشکٰوۃ الانوار (ترجمہ از Gairdner، لنڈن ۱۹۲۴ء)؛ (۱۳) Montgomery Watt : *The Faith and Practice of Ghazālī* (یعنی ترجمۂ المُنقذ من الضلال و بدایۃ الھدایۃ للغزالی (لنڈن ۱۹۵۳ء)؛ (۱۴) Burckhardt : *La Sagesse des Prophetes* (بعض اجزاے فصوص الحکم کا ترجمہ، پیرس ۱۹۵۵ء)؛ (۱۵) و (۱٦) ابن عربی : رسالۃ الاَحَدیۃ المعروف بہ کتاب الاَجوبۃ ؛ اور کتاب الاَلِف (ترجمہ از Weir، در JRAS، ۱۹۰۱ء، ص ۸۰۹ تا ۸۲۵)؛ (۱۷) و (۱۸) نکلسن : *The Perfect Man* (ترجمہ بعض اجزاے الانسان الکامل از جِیلی، در *Studies in Islamic Mysticism*، کیمبرج ۱۹۲۱ء)؛ Burckhardt : *De l' Homme Universel* (الانسان الکامل کے بعض اجزاء کا ترجمہ، Lyon ۱۹۵۳ء).

دوسری کتابوں کے لیے مندرجۂ ذیل مقالات کے مآخذ ملاحظہ ھوں : رابعۃ العَدَویۃ، مُحاسبی، حَلاّج، جُنَید ، غزالی ، ابن عربی ، عمر بن الفارض ، عطّار ، شاذلی ، جلال‌الدین الرُّومی ، سُہروردی (یحیٰی)، شَعْرانی ، سَنُوسی ۔

(ابوبکر سراج الدین)

تصویر(۱) : (عربی/[صورت‌دینا]ڈھالنا،بنانا؛ پیکر ، شبیہ ، شکل ، رَسْم ، تِمْثال ۔ جانداروں کی تصویرکشی کی ممانعت کے متعلق مسلم نقہاء کے نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے مادۂ صورۃ اور تصویر (۲) ۔ یہاں دنیاے اسلام کی مصورانہ سرگرمیوں کا کچھ بیان ھوگا [اسلامی ممالک میں مجسّمہ سازی اور تصویر کشی کی تو گئی مگر علماے شریعت نے اسے مورد ملامت قرار دیا] ۔ مجسّمہ سازی کے نمونے شاذ ھیں[۱]؛ مثلاً مصر میں خُمارَوَیْہ [رک بآن] نے، اپنے، اپنی بیویوں اور مُغنّیہ عورتوں کے مجسمے بنوائے تھے ۔ ھسپانیہ میں عبدالرحمٰن ثالث [رک بآن] نے بھی اپنی چہیتی بیوی الزَّھْراء کا مجسّمہ اپنے اس قصر میں نصب کیا جسے اسی بیوی کے نام کی مناسبت سے اس نے قصر الزھراء کا نام دیا اور وہ مرمریں شیر تو اب بھی موجود ھیں جن پر وہ فوّارہ قائم ھے جو الحمراء میں محمد خامس کے لیے چودھویں صدی میلادی کے اواخر میں تعمیر کیا گیا تھا ۔ ایشیاے کوچک کے سلجوقی فرمانرواؤں نے بھی دارالحکومت قونیہ [رک بآن] کی آرایش کے لیے سنگ تراشوں کی خدمات حاصل کی تھیں اور اس شہر کے عجائب گھر میں اب تک اس عہد کے بہت سے انسانی اور حیوانی سنگی مجسّمے محفوظ ھیں [مغل بادشاہانِ ھندوستان کے بنوائے ھوے بعض مجسّموں کے لیے دیکھیے V.A. Smith : *Akbar the Great*، آکسفورڈ ۱۹۱۷ء،

[(۱) مسلمانوں کے ھاں تماثیل کے وجود کے متعلق مفصل تر بیان ذیل کے مآخذ میں ملے گا : احمد تیمور پاشا : التصویر عندالعرب، ص ۱۱۹ تا ۱۳۹ ؛ زکی محمد حسن : کنوز الفاطمیین (قاھرۃ ۱۹۳۷ء)؛ وھی مصنف : الفنون الایرانیۃ فی العصر الاسلامی ؛ وھی مصنف : الفن الاسلامی فی مصر (قاھرۃ ۱۹۳۵ء)؛ قب تعلیقۂ زکی محمد حسن در دائرۃ المعارف الاسلامیۃ ، بذیل مادہ التصویر ، ص ۲۹۹)؛]

ص ۹۳ ببعد؛ توزک جہانگیری، ص ۵۰؛ عمل صالح، ص ۱۵ ۔ داراشکوہ کے باغ لاہور کے مجسموں کے متعلق دیکھیے اورینٹل کالج میگزین، لاہور، اگست ۱۹۲۷ء، ص ۳۲] ۔ مسلمان فرمانرواؤں کے ایسے مجسّمے جنھیں ہمارے علم میں پہلی بار منظرِ عام میں نصب کیا گیا، وہ تھے جو شہر قاہرة میں اسمٰعیل پاشا [رک بآں] نے نصب کیے [دورِ حاضر میں ایران اور ترکیہ میں اشخاص کے متعدد مجسمے سڑکوں وغیرہ پر نصب کیے جا چکے ہیں] ۔ مصر میں دَورِ فاطمیہ میں کانسی کے آفتابے اور بخوردان طیور و وحوش کی شکلوں میں بکثرت ڈھالے گئے تھے ۔ اس زمانے کے بلّوری ظروف پر بھی عموماً حیوانات کی صورتیں تراشی گئی ہیں ۔ موصل کے فلزکاروں (دھات کا کام کرنے والوں) اور ان کے ان ہم پیشہ صنعت گروں نے، جو اس فن کو لے کر ایران، شام اور مصر پہنچے، درباری زندگی کے منہ بولتے مرقعے پیش کیے ہیں ۔ ان میں کہیں بادشاہ اپنے خدمتگاروں اور خُنیاگروں کے درمیان پینے میں مصروف ہے، کہیں شکار کھیل رہا ہے، کہیں چوگان بازی کر رہا ہے اور کہیں میدانِ جنگ میں دشمن سے بر سرِ پیکار ہے ۔ دھات کے ان صنعت گروں میں سے اگرچہ بعض یقیناً عیسائی تھے لیکن ان کی سرپرستی کرنے والے مسلمان فرمانروا تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رَے سے ظروفِ گِلی (بارھویں اور تیرھویں صدی میلادی) ملے ہیں، جن پر نہایت تابناک رنگوں میں امیروں، مطربوں، گانے والیوں، رقاصوں، مردانِ جنگ کی نیز طرح طرح کے اصلی اور فرضی دونوں قسم کے جانوروں کی صورتیں منقوش ہیں ۔ بعض دوسرے شہروں کے ظروفِ گِلی پر بھی تصاویر پائی گئی ہیں، مگر ان میں تخیّل کی اتنی بلند پروازیاں نہیں ۔ لکڑی کی کندہ کاری میں انسانوں اور حیوانوں کی شکلیں، خاص طور سے مصر کے عہد فاطمیہ و ممالیک میں، بکثرت ملتی ہیں ۔ اسی طرح قالینوں اور عاج (ہاتھی دانت) اور شیشے کے ساز و سامان کے آرائشی نقش و نگار میں بھی تصاویر ملتی ہیں ۔ یہ مختلف اقسام کی تھوڑی سی چیزیں، جو غالی بت شکنوں کی دست برد سے اور ان طوفانوں کی زد سے جو دنیاے اسلام پر سے گذرتے رہے، محفوظ رہیں ۔ اس مجموعی مقدار کا جو کبھی موجود ہو گی غالباً بہت قلیل سا حصہ ہیں ۔

دنیاے اسلام میں فنّ صورتگری کے وجود اور [انسانی یا حیوانی] شکلوں کے بنائے جانے کی کافی و وافی شہادت ان تصویروں میں موجود ہے جو علی الخصوص ایران، ہندوستان اور ترکیہ میں پائی گئی ہیں ۔ مسلمانوں کے محلاّت شاہی میں تراسترکاری پر آرائشی تصویر کشی (fresco-painting) کے رواج کا ثبوت عہد اُموی میں تو قُصَیر عَمْرَة سے (دیکھیے عَمْرَة) ملتا ہے، جس میں بادشاہوں، رقاصوں، موسیقاروں اور بازیگروں کی تصویریں ہیں اور ابتدائی عہدِ عباسیہ میں سامرّا کی راقصات، حیوانات و طیور کی تصویروں سے (دیکھیے E. Herzfeld: *Die Malereien von Samarra*، برلن ۱۹۲۷ء) ۔ بعد کے مسلمان بادشاہوں کے محلاّت میں اس رواج کی ادبی شہادتیں بکثرت مل جاتی ہیں اور ان دیواری تصاویر کے باقیات اب تک موجود ہیں جو اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں ایرانی بادشاہوں کے لیے بنائی گئی تھیں ۔

لیکن مسلمان مصوّروں کے کارناموں کا بیشتر حصہ باتصویر قلمی کتابوں میں نیز کسی قدر وصلیوں کی شکل میں ملتا ہے ۔ کاغذ پر کھنچی ہوئی تصویروں کا کوئی ایسا نمونہ جو تیرھویں

صدی میلادی سے پہلے کا ہو، شاید ہی محفوظ رہا ہو۔ عربی زبان کی ان اوّلین کتابوں میں، جن میں مواضع کشی کی گئی، المقامات الحریریة، کلیلة و دمنة نیز ہیئت، طِبّ اور علوم آلیة کی بعض تصانیف شامل ہیں۔ فارسی تصانیف کو مصوّروں کی توجہ کا مقابلةً کہیں زیادہ حصہ ملا ہے؛ چنانچہ کثیر التعداد اور متنوّع فارسی کتابیں تصویروں سے مزیّن ہیں۔ کتب شعر کو اکثر باتصویر بنایا گیا، مثلاً شاهنامۂ فردوسی، خمسۂ نظامی، کلیاتِ سعدی اور بہت سے دیگر شعراء کے کلام کے مجموعے۔ تاریخی کتابوں کے با تصویر قلمی نسخے نسبةً کم ہیں، تاہم رشیدالدین کی جامع التواریخ، میر خواند کی روضة الصفاء، شرف الدین علی یزدی کا ظفر نامه اور تاریخ هند کی کتابوں کے مختلف نسخے مصوّر ملتے ہیں۔ ایک سے زیادہ مؤلّفین کے قِصَص الانبیاء اور مجالس العشّاق (از سلطان حسین میرزا، جو خود [بھی مصوّروں کا فیّاض سرپرست تھا) کی تصویریں اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں کہ ان میں مسلمان مصوّروں نے اسلامی تاریخ کی مقدّس شخصیتوں کی زندگی کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ بعد کے زمانے میں باتصویر نثری افسانوں کا رواج عام ہو گیا۔ عربی اور فارسی قلمی نسخوں کے علاوہ، چغتائی ترکی کے (خصوصاً وہ جو ہرات میں پندرھویں صدی کے اواخر میں لکھے گئے) نیز ہندوستانی، پشتو اور عثمانی ترکی کے قلمی نسخوں کو مسلمان نقاشوں نے مصوّر کیا۔

ان قلمی نسخوں کی تصاویر کے ذکر کے ساتھ جو بادشاہوں اور اہلِ ثروت کے لیے تیار ہوے، ایسی مثالوں کا ذکر بھی لازم ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ [بعض موقعوں پر عوام‌الناس نے بھی جانداروں کی صورت گری کی]۔ ان میں نمایاں ترین مثال ان لعبتوں کی ہے جو پتلیوں کے تماشے میں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ تماشے جاوا، مصر اور ترکی میں بہت مقبول ہیں۔ غریبوں کے گھر، بالخصوص مصر میں، اکثر جانوروں کی ان بھدی تصاویر سے آراستہ کیے جاتے ہیں جو کسی حاجی کی حج سے واپسی کی تقریب منانے کے لیے بنائی جاتی ہیں اور بُراق [رَکَ باں] کی سستی تصویریں تو ہر جگہ ملتی ہیں۔

واضح طور پر معلوم نہیں کہ مسلمانوں نے فن مصوّری کہاں سے لیا، لیکن اس میں مسیحی (یعقوبی اور نسطوری)، مانوی، ساسانی اور چینی تصویروں کے اثرات کا کچھ کھوج ملتا ہے۔ ایران میں زمانۂ قبلِ اسلام کی فنّی روایات بعد کی تصاویر میں دوبارہ ابھرنے لگیں اور ہندوستان میں جہاں ہندو مصوّروں نے مسلمان بادشاہوں کے لیے تصویریں بنائیں وہاں ان میں ایسے اجزاء بھی شامل کیے جو ہندوستان کی خصوصیات سے تھے۔

مسلمانوں کی مصوّری کے مختلف دبستانوں کو ایک دوسرے سے ممیّز کرنے کی بھی کچھ کوششیں کی گئی ہیں، لیکن کوئی پیش کردہ تقسیم متفق علیه قرار نہیں پا سکی۔ تیرھویں صدی میلادی کی اوّلیاتی تصویریں جداگانہ زمرے میں شامل ہیں اور اُن مصوّروں کے عمل کی بھی جدا جدا امتیازی خصوصیات ہیں جو پندرھویں صدی کے شروع میں ایران کے مغول حکمرانوں کی ملازمت میں تھے یا پندرھویں صدی کے تیموری فرمانرواؤں اور سولھویں صدی کے صفوی بادشاہوں اور سولھویں اور سترھویں صدی کے مغل سلاطینِ ہند کے ہاں تصویر کشی پر مأمور تھے۔

مختلف مصوّروں کی شخصیت کے بارے میں بہت ہی کم معلومات حاصل ہیں؛ ان کے کارناموں کے بیشتر حصے پر بنانے والے کا نام درج نہیں اور اگر کسی تصویر پر مصوّر کے دستخط ثبت بھی ہوے ہیں تو بالعموم اس کے حالاتِ زندگی کے متعلق کوئی مواد نہیں ملتا ۔ ایران کے مصوّرِ اعظم بہزاد [رکّ باں] تک کے متعلق جو معلومات حاصل ہیں ان سے صرف اتنا ہی پتا چلتا ہے کہ اس نے کس کس شاہی سرپرست کے لیے کام کیا ، لیکن نقّاد اس بات پر بھی متفق نہیں ہو سکے کہ اس کے دستخط والی تصاویر میں کون کون سی تصویریں اصلی ہیں ۔ ایرانی مصوّروں کے متعلق تاریخی معلومات سولھویں صدی میلادی میں اور ہندوستانی و ترکی مصوروں کے متعلق اس کے کچھ عرصے بعد دستیاب ہونا شروع ہوئیں، لیکن اس قسم کا جو مواد ملتا ہے، اس میں جزئیّات کی اتنی کمی ہے کہ کسی خاص تصویر کی شناخت میں اس ناکافی مواد سے کوئی مدد نہیں ملتی ۔

آخر میں ان سکّوں کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا جن پر مسلمان بادشاہوں کی شبیہیں کندہ ہیں ۔ اس قسم کے قدیم ترین سکّے بدیہی طور پر بوزنطی سکّوں کی نقل ہیں، اور جب سنہ ۷۷ھ کے قریب عبدالملک [رکّ باں] نے سکّے کی اصلاح کی تو ان تصویردار سکّوں کا خاتمہ ہو گیا ۔ دَورِ مابعد کے چند سکّوں کی منفرد مثالیں موجود ہیں، جن پر عبّاسی خلفاء متوکّل، مقتدر اور مطیع کی تصویریں کندہ ہیں، البتہ ایشیاے کوچک کے سلجوقیوں، دیار بکر کے اُرتُقیوں اور حلب کے زنگیوں کے زمانے میں سکّوں پر انسانی تصویروں کا رواج زیادہ عام ہو گیا، مگر یہ بھی عموماً غیر ملکی سکّوں کی نقلیں ہیں اور کسی صورت میں بھی اُن بادشاہوں کی تصویریں معلوم نہیں ہوتیں جن کے اَعلام و القاب ان سکّوں پر کندہ ہیں؛ البتہ ہندوستان میں جہانگیر [رکّ باں] نے ایسے سکّے ضرب کرائے جن پر خود اس کی شبیہ کندہ تھی، بلکہ اس نے مسلمانوں کے جذبات کو اس حد تک مجروح کرنے کی جسارت کی کہ تصویر میں اپنے آپ کو ساغرِ شراب ہاتھ میں لیے دکھایا ۔

مآخذ : (۱) اہم مصادر : K.A. Inostrantsev و J. I. Smirnov : *Materiali dla bibliographie musulmanskoe archeologie*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۴ء؛ (۲) A. Creswell : *A Provisional bibliography of painting in Muhammadan art*، لنڈن ۱۹۲۱ء؛ (۳) W. Björkman and E. Kühnel : *Kritische Bibliographie, Islamische Kunst 1914—1927* (*Isl.*,XVII)، برلین ۱۹۲۸ء — ان کے بعد کے مطبوعات میں کتب ذیل شامل ہیں : (۴) T.W·Arnold : *Painting in Islam*، آکسفورڈ ۱۹۲۸ء؛ (۵) A. Grohmann and T.W. Arnold : *Denkmäler islamischer Buchkunst*، میونخ، ۱۹۲۹ء — ذیل کے مصنّفات بغایت وسیع النطاق ہیں: (۶) E. Kühnel : *Islamische Kleinkunst*، برلین ۱۹۲۵ء ؛ (۷) E. Migeon : *Manuel d'art musulman*، طبع دوم، پیرس ۱۹۲۷ء ۔

(آرنلڈ T.W. Arnold) :

[مزید مصادر از دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، بذیل مادّۃ التصویر : (۸) L. Binyon, Wilkinson & Gray : *Persian Miniature Painting*، آکسفورڈ ۱۹۳۳ء ؛ (۹) E. Blochet : *Musulman Painting*، لنڈن ۱۹۲۷ء ؛ (۱۰) E. Diez : *Die Kunst der islamischen Völker*، برلین ۱۹۲۲ء ؛ (۱۱) M. Dimand : *A Handbook of Muhammadan Decorative Arts*، نیو یارک ۱۹۳۰ء؛ (۱۲) H. Clück und Diez : *Die Kunst des Islam*، برلین ۱۹۲۵ء، (۱۳)

E. Herzfeld : *Die Malereien von Samarra*، برلین ۱۹۲۷ء؛ (۱۴) E. Kühnel : *Die Islamische Kunst*، در A. Springer : *Handbuch der Kunstgeschichte*، *Band VI, S. 373-584*، لیپزگ ۱۹۲۹ء؛ (۱۵) E. Kühnel : *Miniatur-malerei im islamischen Orient*، برلین ۱۹۲۳ء؛ (۱۶) F. Martin : *The miniature Painting and Painters of Persia, India and Turkey from the VIII to the XVIII century*، لندن ۱۹۱۲ء؛ (۱۷) L.A. Mayer : *Annual Bibliography of Islam Art and Archaeology*، ج ۳، ۱۹۳۵ تا ۱۹۳۷ء؛ (۱۸) A. V. Pope & Ph. Ackerman : *A Survey of Persian Art*، نشر آکسفورڈ ۱۹۳۸ء؛ (۱۹) A. Sakisian : *La Miniature Persane du XIIe au XVIIe Siècle*، پیرس ۱۹۲۹ء؛ (۲۰) Ph. W. Schulz : *Die Persisch-Islamische Miniatur malerei*، لیپزگ ۱۹۱۴ء؛ (۲۱) L. Hautecoeur et G. Wiet : *Les Mosquèes du Caire*، پیرس ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۳ تا ۱۸۳ .

[زکی محمد حسن]

[تصویر کے متعلق اسلام کا موقف :-

ہم اس جگہ تصویر کی نسبت اسلام کا موقف پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ اکثر مصنفین، خصوصاً مغربی مصنفین کے ہاں یہ مشہور ہے کہ اسلام میں تصویر کی جو حرمت آئی ہے اس کا مأخذ قرآن مجید ہے مگر یہ صحیح نہیں، کیونکہ در اصل قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں جس میں جانداروں کی صورت یا مورت بنانا حرام کیا گیا ہو ۔ جس آیت سے اکثر یہ حرمت غلط فہمی کی بنا پر نکالی جاتی ہے، اُس کا ترجمہ یہ ہے: ''مسلمانو! شراب، جوا ['میسر']، تھان ['الانصاب'، اور تیر ['الازلام'] ناپاك شیطانی کام ہی ہیں ۔ تم ان سے بچو تاکہ فلاح پاؤ'' (٥ [المائدة] : ۹۰) ۔ لیکن در حقیقت لفظ انصاب (تھان) سے مراد مفسرین نے وہ بت (اصنام) یا بڑے پتھر لیے ہیں جن کی عرب میں پوجا ہوتی تھی اور جن پر قربانی چڑھائی جاتی تھی ۔

تاہم یہ راجح بات ہے کہ اسلام میں تصویر کی حرمت ان آیاتِ قرآنی سے مضبوط علاقہ رکھتی ہے جن میں تصویر کو خدائے عزّ وجلّ سے منسوب کیا گیا ہے : ''وہ وہی ہے جو رحموں میں تم کو جس طرح چاہتا ہے مصوّر کرتا ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب دانا ہے'' (۳ [آل عمران] : ٦) ۔ ''بے شک ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر تم کو مصوّر کیا، پھر ہم نے ملائکہ سے کہا : آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا (۷ [الاعراف] : ۱۱) ۔ ''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو دارالقرار اور آسمان کو عمارت بنایا اور تم کو مصوّر کیا اور کیسی اچھی صورتیں بنائیں اور تم کو پاک چیزوں میں سے رزق دیا ۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے ۔ پس اللہ جو تمام عالموں کا پروردگار ہے کس قدر بابرکت ہے'' (۴۰ [المؤمن] : ٦۴) ۔ ''وہ اللہ خالق ہے، باری ہے، مصوّر ہے، اسی کے لیے اچھے نام ہیں، اسی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب دانا ہے'' (۵۹ [الحشر] : ۲۴) ۔ ''اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تمہیں مصوّر کیا تو کیسی اچھی صورتیں بنائیں اور اسی کی طرف لوٹنا ہے'' (٦۴ [التغابن] : ۳) ۔ ان آیات سے چونکہ یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالٰی ہی خالق اور مصور ہے، اس لیے اس کی شانِ خالقیت کی مشابہت سے دور رہنے کا خیال ایک ایسا خیال ہے جس سے ہمیں انکار کرنے کی

گنجائش نہیں ۔ یہی خیال واضح طور پر احادیث نبویہ[ؐ] میں ملتا ہے جنھیں اعلام محدّثین، مثلاً امام بخاری[رح] (کتاب اللباس، کتاب التوحید، کتاب البیوع، کتاب الادب)، امام مسلم[رح] (کتاب اللباس و الزینة) اور امام احمد بن حنبل[رح]، نے روایت کیا ہے ۔ ان میں سے بعض احادیث کا ترجمہ یہ ہے : ''قیامت کے روز سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو خدا کی خالقیت سے مشابہت اختیار کرتے ہیں'' اور ''اگر کوئی شخص دنیا میں کوئی صورت مصوّر کرے گا تو قیامت کے دن اسے مجبور کیا جائے گا کہ اس صورت میں روح پھونکے، حالانکہ وہ نہ پھونک سکے گا'' اور ''ان صورتوں کے مصوّر کرنے والے قیامت کے دن عذاب میں مبتلا ہوں گے ۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو تم نے خلق (پیدا) کیا ہے اسے زندہ کرو'' اور اللہ عزّ و جلّ کا قول (حدیث قدسی) ہے : ''اس سے بڑا ظالم کون ہے جو میری طرح خلق کرتا ہے تو ذرا ذرّہ بنائیں ! ذرا دانہ بنائیں ! ذرا جَو بنائیں !'' اور ''اس گھر میں فرشتے نہیں آتے جس میں کتا یا تصویریں ہوں'' .

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث نبویہ[ؐ] نے اسلام میں تصویر کی حرمت منصوص کی ہے ! لیکن فقہاء نے ان احادیث کی تشریح میں آغاز اسلام ھی سے اختلاف کیا ہے، جس کی بنا پر ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ تصویر مطلقاً حرام نہ تھی اور یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا پہلا منشأ یہ تھا کہ لوگوں کو بت پرستی کی طرف واپس جانے سے روکا جائے ۔ امام نووی[رح] نے اس اختلاف کی طرف شرح صحیح مسلم[رح] (طبع دھلی، ۲ : ۱۹۹) میں اشارہ کیا ہے : ''باب جاندار کی شکل کو مصور کرنے کی حرمت، ایسی صورتیں بنانے کی حرمت جو فرش وغیرہ میں اہانت کی حالت میں نہ ہوں اور یہ کہ اس گھر میں فرشتے نہیں داخل ہوتے جس میں کوئی صورت یا کتّا ہو''۔ اس باب میں نووی[رح] کہتے ہیں : ھمارے اصحاب [شافعیة] اور دوسرے علماء کا قول ہے : جاندار کی صورت مصوّر کرنا حرام ہے، سخت حرام اور یہ گناہ کبیرہ ہے ، کیونکہ اس پر وہ شدید وعید کی گئی ہے جو احادیث میں مذکور ہے ۔ اب چاہے اسے ایسی جگہ بنایا جائے جہاں اس کی اہانت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو اس کا بنانا بہر حال حرام ہے، کیونکہ اس سے خداے تعالٰی کی شان خالقیت سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے، وہ چاہے کپڑے میں ہو یا بچھونے میں یا درھم یا دینار یا برتن یا دیوار پر یا کہیں اَور ۔ البتہ درختوں اور زمین کے پہاڑوں وغیرہ کی صورتیں مصوّر کرنا، جن میں کسی جاندار کی صورت نہ ہو، بے شک حرام نہیں ہے ۔ یہ حکم نفسِ تصویر کے متعلق ہوا ۔ اگر مصور نے اس میں کسی جاندار کی تصویر بنائی تو اگر وہ چیز دیوار پر لٹکی ہوئی ہے یا پہننے کے کپڑے پر ہے یا پگڑی وغیرہ پر جہاں اس کی اہانت نہیں ہوتی تو وہ حرام ہے اور اگر کسی بچھی ہوئی چیز میں ہے جیسے مسلّے ہیں یا چھوٹے بڑے تکیوں میں یا گدے (وسادة) پر ہے، جہاں اس کی اہانت ہوتی ہے، تو حرام نہیں ہے ۔ ان تمام باتوں میں چیز کے سایہ دار ہونے اور نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ یہ اس مسئلے میں ھمارے [شافعی] مذھب کا خلاصہ ہے اور یہی خیالات جمہور علماء صحابہ[رض]، تابعین اور ما بعد کے علماء نے ظاھر کیے ہیں اور یہی ثوری، مالک، ابوحنیفة وغیرہ [رحمھم اللہ تعالٰی] کا مذھب ہے ۔ سلف میں سے بعض کا قول ہے :

''ممانعت صرف ان چیزوں کی تصویر کی ہے جن کا سایہ ہوتا ہے، جن چیزوں کا سایہ نہیں ہوتا ان کی تصویر میں مضائقہ نہیں'' اور یہ باطل مذہب ہے، کیونکہ وہ پردہ جس کی تصویر پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے ناپسندیدگی ظاہر فرمائی، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی مذمت نہیں کی گئی تھی، حالانکہ اس پر جو صورت بنی ہوئی تھی اس کا سایہ نہ تھا۔ پھر صورت کے متعلق جو مطلق احادیث ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ امام زہریؒ کا قول ہے: صورت کے متعلق ممانعت عام ہے، اسی طرح جس میں وہ صورت بنی ہے اس کا استعمال اور جس گھر میں وہ ہے اس کے اندر جانا، چاہے وہ صورت کسی کپڑے میں ٹھپے سے بنی ہو یا اَور طرح اور چاہے دیوار، کپڑے، بچھونے میں، اس کی اہانت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، احادیث کے ظاہری معنی کے مطابق (سب حرام ہے) خصوصاً نُمرُقہ (وسادۃ) والی حدیث کے مطابق، جس کا ذکر مسلم [کتاب اللباس و الزینۃ] میں ہے اور یہ قوی مذہب ہے؛ بعض کا خیال ہے: تصویروں میں وہی جائز ہے جو کپڑے پر ٹھپہ لگا کر بنائی گئی ہو، چاہے اس کی اہانت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔ ان لوگوں نے ایسی چیزوں کی تصویر مکروہ قرار دی ہے جن کا سایہ پڑتا ہے یا وہ تصویریں جو دیواروں وغیرہ پر بنائی جاتی ہیں، چاہے ٹھپے سے بنی ہوں یا اَور طرح (یہ سب مکروہ ہے)۔ ان کی دلیل آنحضرت صلعم کا ایک قول ہے جو اس باب کی بعض احادیث میں وارد ہے (اور وہ یہ ہے): ''مگر وہ جو کسی کپڑے میں رقم (ٹھپے سے بنی) ہو'' (وہ ناجائز نہیں)۔ یہ امام قاسم بن محمد کا مذہب ہے اور علماء کا اجماع اس پر ہے کہ جن چیزوں کا سایہ پڑتا ہے ان کی تصویر منع ہے اور اگر کہیں ہو تو اسے بدل دینا (بگاڑ دینا) واجب ہے۔ قاضی [عیاض] کا قول ہے: ''الّا وہ جو چھوٹی لڑکیوں کے گڑیاں کھیلنے کے متعلق وارد ہوا ہے'' (یعنی گڑیاں جائز ہیں)، لیکن امام مالکؒ کے نزدیک اپنی لڑکیوں کے لیے گڑیاں خریدنا مکروہ ہے۔ بعضوں نے یہ دعوٰی کیا ہے کہ لڑکیوں کو گڑیاں کھیلنے کی جو اجازت تھی وہ ان احادیث سے منسوخ ہو گئی (دیکھیے *Painting in Islam* : Th. Arnold، ص ۹ تا ۱۰)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے اکثر فقہاء کے نزدیک تصویر کی حرمت کسی قید کے ساتھ مقیّد تھی، یعنی ایسی تصویریں حرام تھیں ''جن میں معبود کی تصویر اجسام کی تصویر کی طرح بنائی جائے (بت بنایا جائے)'' اور جو ایسی نہ ہوں ''ان کا بنانے والا خدا کے غضب اور مسلمانوں کے عتاب کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا''۔ اس کی شہادت میں وہ عبارت پیش کی جاتی ہے جو الحجّۃ فی علل القراءات از ابوعلی الفارسی نحوی (م ۳۷۷ھ/۹۸۷ء) کے ایک قلمی نسخے میں ہے: ''جس نے بچھڑا ڈھالا یا گھڑا یا کسی طرح بنایا وہ خدا کے غضب اور مسلمانوں کی وعید کا مستحق نہ ہوگا . . . . اگر کوئی کہے کہ حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ ''قیامت کے دن مصوّروں کو عذاب دیا جائے گا'' اور ایک حدیث میں ''مصوّروں کو عذاب دیا جائے گا'' سے پہلے ہے کہ ''ان سے کہا جائے گا کہ جو تم نے بنایا ہے اس میں جان ڈالو'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''مصوّروں کو عذاب دیا جائے گا'' سے مراد وہی مصوّر ہیں جو خدا کی تصویر اجسام کی طرح بنائیں (بت بنائیں)۔ اب اس

سے زائد جو کچھ ہے وہ خبر واحد میں ہے جس کا علم ضروری نہیں اور اس سے اجماع میں خلل نہیں پڑ سکتا (دیکھیے بشر فارس : سِرُّ الزُّخرُفَة الاسلامیة، ص ۳۱ تا ۳۳) .

ایک یورپی مصنف کا خیال تھا کہ شیعوں کے نزدیک تصویر حرام نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تصویرکی حرمت میں جو احادیث آنحضرت صلعم کی طرف منسوب ہیں وہ شیعی کتابوں میں بھی موجود ہیں(دیکھیے Th. Arnold : *Painting in Islam*، ص ۱۱ تا ۱۳) ؛ [لیز دیکھیے Ph. Walter Schulz : *Die persisch-Islamische Miniaturmalerie*، ص ۲، جس نے آرنالڈ سے پہلے کہا کہ شیعہ و اهل سنة دونوں کے هاں تصویر مکروہ ہے ۔ تعلیق زکی محمد حسن، در دائرة المعارف الاسلامیة، بذیل مادہ التصویر] .

لیکن مستشرقین اور علماء فنون و آثار کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ حضور صلعم نے تصویر کو نہ مکروہ جانا اور نہ منع فرمایا ۔ کراھیت کا خیال دوسری صدی ھجری/آٹھویں صدی میلادی کے فقہاء میں پیدا ہوا ؛ آنحضرت صلعم کی طرف جو احادیث منسوب ہیں سب کی سب موضوع ہیں ۔ انھیں اس عہد کے فقہاء کی غالب رائے سمجھنا چاھیے جس عہد میں وہ حدیثیں جمع کی گئیں (H. Lammens : *L'Attitude de l'Islam primitif en face des arts figurés*، در *Jonrnal Asiatique, September - October* ۱۹۱۵ء، ص ۲۳۹ تا ۲۷۹ ؛ نیز دیکھیے A. Creswell : *Early Muslim Architecture*، ۱ : ۲۶۹ تا ۲۷۱)؛ لیکن هم اس رائے سے متفق نہیں، دیکھیے Zaky M. Hassen : *The Attitude of Islam towards Painting*، در *Bulletin of the Faculty of Arts, Fouad I University*، ج ۷، جولائی ۱۹۴۴ء : ص ۱ تا ۱۳ .

همارے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ تصویر کی کراھیت حضور صلعم کے زمانے میں موجود تھی اور اسی وقت سے چلی آ رھی ہے اور اس کی بنیاد بت پرستی اور خدا کی شان خالقیت سے مشابہت اختیار کرنے کے خوف پر قائم تھی، اس کے علاوہ یہ کہ اس زمانے میں تعیّش سے بھی کراھیت تھی، کیونکہ لوگوں کی زندگیاں زھد، تقشف اور جہاد فی سبیل اللہ میں بسر ھوتی تھیں ۔ البتہ همارا یہ عقیدہ نہیں کہ اس حرمت کو ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے عام کر دینا مقصود تھا ۔ حرمت کی احادیث کی تشریح میں فقہاء کے درمیان اتنا اختلاف ہے کہ اس زمانے کے بعض بڑے مسلم مفکروں، مثلاً شیخ محمد عبدہ اور شیخ عبدالعزیز شاویش کو تصویر کے جواز کا قائل ھونا پڑا ۔ یہ لوگ اسٹیچو (تَمَاثِیل) بنانا بھی مباح سمجھتے ھیں، بشرطیکہ یہ اطمینان ھو کہ خدا کی طرح ان کی پوجا اور عزت نہیں کی جائے گی (دیکھیے سید محمد رشید رضا : تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ، ۲ : ۴۹۹ تا ۵۰۱، اور استاد شیخ عبدالعزیز شاویش کی گفتگو اسلام میں تصویر کے حکم پر در مجلّة هدایة، مصر، سال ۳، ص ۴۸۷ تا ۴۹۱)۔ کچھ شبہہ نہیں کہ یہی رائیں ان اختلافات کا تقریباً قطعی فیصلہ کر سکتی ھیں جو فوٹو (تصویر شمسی) اور مورت کی نسبت موجودہ دنیاے اسلام میں پیدا ھیں ۔ بہت سے محققوں کی راے یہ ہے کہ آغاز اسلام میں تصویر کی حرمت یہودیوں سے متاثر ھوئی ہے، جن کے هاں تصویر حرام ہے : نیز ان کی اس تفسیر سے جو وہ دس وصیتوں میں سے دوسری وصیت (دیکھیے کتاب خروج، باب ۲۰ : آیات ۴ تا ۵) کی کرتے ھیں ۔ یہ محال نہیں کہ یہودیوں کا تصویر اور مورت کو حرام سمجھنا حضور صلعم کو

پسند آیا ہو، کیونکہ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس تحریم کی وجہ سے عوام بت پرستی سے دور رہتے ہیں اور یہ بھی کہ کتاب خروج میں جو حرمت مذکور ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مورتیں بنا کر ان کی پوجا نہ کی جائے۔

لیکن دقّت یہ ہے کہ ہم ایسے علماء کے خیال سے مطمئن نہیں ہو سکتے جو یہ کہتے ہیں (دیکھیے C. H. Becker : *Christliche Polemik und islamische Dogmenbildung*، در *Zeitschrift für Assyriologie*، *Festschrift Goldziher*، xxvi، ۱۹۱۱ء : ص ۱۹۱؛ L. Hautecoeur اور G. Wiet : *Le Mosqueés du Cairo*، ص ۱۴۷ و ۱۵۰) کہ اسلام میں تصویر کی کراہیت اس تحریک کی وجہ سے پیدا ہوئی جو مورتوں اور ایقونات کے توڑنے کے متعلق جاری تھی، خصوصاً اس لیے کہ عیسائیت میں تصویروں اور مورتوں کے دشمن ان کا گرجاؤں اور دینی مقاصد میں استعمال کرنا خصوصاً حضرت مسیحؑ اور قدّیسوں (saints) اور آباء کنیسا کی مورتیں بنانا حرام سمجھتے تھے - لیکن یہی لوگ اشخاص کی مورتیں یا صنعتی نوادر پر تصویریں بنانا حرام نہیں سمجھتے تھے (دیکھیے Ch. Diehl : *Manuel d' Art Byzantine*، ۱ : ۳۶۰)؛ یوں بعض بحث کرنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ مورتوں اور ایقونات کے توڑنے کا خیال عیسائیوں میں خود اسلامی تعلیمات کے اثر سے پیدا ہوا (دیکھیے Michel le Syrien : *Chronique*، ۲ : ۴۹۱؛ Ph. Hitti : *History of the Arabs*، طبع ثانی، ص ۳۰۰)۔

یہ یاد رہے کہ اسلام میں تصویر کی حرمت نے اس فن کا مسلمانوں کے اندر بالکل خاتمہ ہی نہیں کر دیا - وہ آغاز اسلام سے عمارتوں کی دیواروں پر جانداروں کی تصویریں بناتے تھے، چنانچہ قُصَیر عَمْرہ اور سامرّا وغیرہ میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور تصویر کشی نے خاص کر ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جِلا پائی - البتہ حرمت کی وجہ سے مسلمانوں نے تصویر کو مذہبی زندگی کا عنصر نہیں قرار دیا اور قرآن مجید میں تصویریں نہیں بنائیں یا مذہبی عمارتوں، مثلاً مسجدوں اور مقبروں، کو تصویروں سے الگ رکھا۔ اس کے بر خلاف مثالیں نہایت شاذ و نادر حالات ہی میں مل سکیں گی (دیکھیے زکی محمد حسن : الصّور و النقوش و التماثیل فی الاَضْرِحَۃ و المساجد، در رسالۂ ثقافۃ، قاھرۃ، عدد ۹۰، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۰ء؛ Y. Godard : *Un L' Imamzade Zaid d' Isfahan, EdificeDécoré de Paintures Religieuses Musulmanes*، در آثار ایران، ج ۲، عدد ۲ : ص ۳۴۱ تا ۳۴۸)؛ اس کے بجائے مسلمانوں نے ان آرائشوں میں مہارت پیدا کی جو جانداروں کو مجسّم یا مصوّر نہیں کرتیں - چنانچہ فن تعمیر، عمارتوں کی آرائش اور نادر اور تحفہ چیزوں پر درخت اور ہندسی شکلیں بنانے میں مسلمان یگانۂ روزگار تھے - ان کی کوتاہ دستی صرف گھڑنے کے کام میں نظر آتی ہے - چنانچہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجسّمہ سازی وغیرہ کی طرف وہ توجہ ہی نہیں کرتے - لیکن تحریم نے خطّاطی، تذہیب اور قیمتی قلمی کتابوں کو وجود میں لانے والے تمام ہنروروں کا درجہ بہت اونچا کر دیا - گو اس تحریم کی وجہ سے تصویر اور مجسّمہ سازی کا فن اسلام میں جامد ہو کر رہ گیا اور یہ دونوں چیزیں آزادی کے ساتھ اور ان خطوط پر مستقل ترقی نہ کر سکیں جن پر انھوں نے مغرب میں، بالخصوص دور نہضۃ کے بعد، ترقی پائی۔

مآخذ : (۱) زکی محمد حسن : التصویر فی الاسلام عندالفرس (قاھرۃ ۱۹۳۶ء)، ص ۱۸ تا ۲۳؛ (۲) وھی مصنف: الفنون الایرانیۃ فی العصرالاسلامی، قاھرۃ ۱۹۴۰ء،

ص ۳۷ تا ۸۳ ؛ (۳) وهی مصنف : فنون الاسلام، قاهرة ۱۹۴۸ء، ص ۱۶۳ تا ۱۶۸ ؛ (۴) احمد تیمور پاشا کی کتاب التصویر عندالعرب میں زکی محمد حسن کے حواشی (قاهرة ۱۹۴۲ء)، ص ۱۱۹ تا ۱۳۹ ؛ (۵) بِشْر فارس : سِرّالزُخْرُفة الاسلامیة (از مطبوعات المعهد الفرنسی للآثار الشرقیة بالقاهرة، قاهرة ۱۹۵۲)، ص ۳۱ تا ۳۳؛ (۶) Th. Arnold : *Painting in Islam*، آکسفورڈ ۱۹۲۸ء؛ (۷) Th. Arnold : *The Influence of Poetry and Theology on Painting* (در *A Survey of Persian Art*، آکسفورڈ ۱۹۳۹ء، ۳ : ۱۹۰۷ تا ۱۹۱۰)؛ (۸) Zaky M. Hassan : *The Attitude of Islam towards Painting* (در *Bulletin of the Faculty of Arts Fouad I University*، ۷ جولائی ۱۹۴۴ء)، ص ۱ تا ۱۵ ؛ (۹) K. A. Creswell : *Early Muslim Architecture*، ۱ : ۲۶۹ تا ۲۷۱ (آکسفورڈ ۱۹۳۲ء)؛ (۱۰) K. A. Creswell : *The Lawfulness of Painting in Early Islam* (در *Ars Islamica*، ۱۱ تا ۱۲، ۱۹۴۶ء)، ص ۱۵۹ تا ۱۶۰ ؛ (۱۱) Creswell : *A Bibliography of Painting in Islam* (*Publication de l' Institut Francais d' Archeologie Orientale du Caire*، ۱۹۵۳ء)، ص ۸ تا ۹ ؛ [(۱۲) محمد جعفر پھلواروی : اسلام اور مصوری، در مجلۂ ثقافت، لاهور، مارچ ۱۹۶۰ء، ص ۱۳ تا ۲۸].

(زکی محمد حسن)

* **تِطْوان** : رَكَ به تیطّاوین .

* **تُطِیْلَة** : (Tudela)، هسپانیه کا ایک چھوٹا سا شہر ہے، جس کی آبادی تقریباً ۱۲,۸۷۳ (۱۹۴۰ء) نفوس پر مشتمل ہے۔ یه شہر سطح سمندر سے ۸۶۰ فٹ کی بلندی پر ہے اور سَرَقُسطه (Saragossa) سے شمال مغرب کی جانب پچاس میل کے فاصلے پر دریاے اِبْرُه Ebro کے دائیں اور اس کی ایک معاون ندی کالّش (Queiles) کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ عرب جغرافیه نگاروں کے بیان کے مطابق اس شہر کی بنیاد بنو امیّه نے امیر الحَکَم اول کے عہد (۱۸۰ تا ۲۰۶ھ/۷۹۶ تا ۸۲۲ء) میں رکھی تھی۔ اس زمانے میں اور بعد میں کئی موقعوں پر یه مسلمان باغی سرداروں کا صدر مقام رہا؛ مثلاً ۲۲۹ھ / ۸۴۳-۸۴۴ء میں امیر عبدالرحمٰن نے اور ۲۶۴ھ / ۸۷۷-۸۷۸ء میں المُنْذر نے اس کا محاصره کیا۔ عیسائیوں نے اس شہر پر کئی بار قبضه کیا، مگر مسلمانوں نے اسے بار بار واپس چھین لیا۔ ۳۰۸ھ/۹۲۰-۹۲۱ء میں جب عبدالرحمٰن ثالث نے جزیره نما کے شمال میں فوج کشی کی تو اس شہر کو اپنا فوجی مرکز بنایا۔ جنرل حُمید بن بَسِیْل کو اس بادشاه کے لیے تین سال بعد یه شہر دوباره فتح کرنا پڑا۔ عرب مؤرخین کے بیان سے یه امر واضح نہیں ہوتا که بالآخر تُطیلَة کس زمانے میں عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا .

مآخذ: (۱) ادریسی : *Description de l' Afrique et de l' Espagne*، متن، ص ۱۷۶ و ۲۰۹، ترجمه، ص ۲۱۱ و ۲۳۱؛ (۲) ابوالفداء : تقویم البلدان، متن ص ۱۸۰، ترجمه، ص ۲۵۹؛ (۳) یاقوت : معجم البلدان، ۱ : ۸۵۳؛ (۴) ابن عبدالمنعم الحِمْیَری : الرّوض المِعْطار، قاهرة ۱۹۳۷ء، ص ۶۳ و مواضع دیگر، بامداد اشاریه؛ (۵) E. Fagnan : *Extraits inédits relatifs au Maghrib*، ص ۱۲۸ ؛ (۶) ابن عِذاری : البیان المُغْرِب، ۲: مواضع کثیره، اشاریه .

(E. LÉVI-PROVENÇAL)

* **تعبیر** : رَكَ به رؤیاء .

* **تعریف** : (عربی) بمعنی توضیح، حدّ، وصف و بیان۔ مشتق ہے عرف (= جاننا) سے؛ مثلاً ''تعریف ایاصوفیا''، ایاصوفیه کا شرح حال؛

کتاب التعریفات، سید شریف جُرجانی کا مشہور رسالہ، جس میں اصطلاحات کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔

اداری زبان میں بصورت مؤنث یعنی تعریفۃ یا تَعْرِفَة (بدون یاء بعد راء) کے معنی ہیں محصول نامہ، ٹیکس، خوراک کا نرخ، نقل و حمل کی اجرت وغیرہ، مثلاً ترکی زبان میں ''گُمْرُك تعریفہ سی'' بمعنی محصول چنگی ہے اور ''دِمِر یُول تعریفہ لری'' بمعنی کرایہ ریل مستعمل ہے۔

عربی صرف و نحو میں اس لفظ کے معنی ہیں ل تعریفی، جسے حرف التعریف یا لام التعریف کہتے ہیں۔

(B. CARRA DE VAUX)

* تَعِزُّ: جنوبی عرب کا ایک اہم قصبہ ہے، جو اس سے پہلے ترکی عہدِ حکومت میں تعِزِّیّہ کے سَنْجاق یعنی ضلع، کا صدر مقام تھا، اور سنجاق مذکور تقویم وقائع (مجریہ ۵ مارچ ۱۹۱۳ء)، یعنی ادارۂ ولایات کے قانون، کے بموجب حسب ذیل قضاؤں پر مشتمل تھی: قضاء عُدَیْن، اِبّ، مُخا، قَماعِرَہ، قَعْطَبَہ، حُجَرِیّہ اور بقول مانسونی R. Manzoni اس سنجاق میں قضاء مَخاوِر، ذی سُفَل اور مَاوِیہ بھی شامل تھے، یعنی وہ تمام علاقہ جو الحُدَیْدَة اور اس خود مختار علاقے کے درمیان واقع ہے جو عدن کے شمال مشرق میں ہے۔ اس شہر کا محلّ وقوع ۴۴ درجے، ۶ دقیقے، ۴۵ ثانیے طول البلد مشرقی (گرینچ) اور ۱۳ درجے، ۳۶ دقیقے، ۵۵ ثانیے عرض البلد شمالی ہے، اور سطحِ سمندر سے ۴۵۰۰ فٹ بلند ہے۔ یہ شہر جبل صَبِر (بقول ہَمْدانی: صَبِر) کی شمالی ڈھلان پر تعمیر ہوا ہے اور اس میں کوئی دو تین ہزار نفوس [انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۱۰ء، ۲۳: ۸۸۰: تقریباً ۴ ہزار] کی آبادی ہے۔ پرتگیز اس شہر کو Teis کہتے تھے اور اطالوی سیاح لودوویکو دِ بارتیما Ludovicodi Barthema اور اندریہ کورساتی A. Corsati نے Taesa کہا ہے۔ شہر کے گرداگرد ایک فصیل ۲۰ سے ۳۰ فٹ تک چوڑی اور ۹ سے ۲۲ فٹ تک اونچی ہے، جس کے پہلو میں صنعاء کی طرح برج ہیں، جو دیوار سے چھ سے آٹھ فٹ تک بلند ہیں۔ یہ دیوار کچی اینٹوں کی ہے، مگر باہر کی طرف پختہ اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ شہر کی فصیل ایک غیر مساوی الاضلاع مستطیل کو گھیرے ہوئے ہے، جو شرقاً غرباً پھیلی ہوئی ہے۔ اس مستطیل کے مغربی جانب پہاڑ کا ایک کثیر الاضلاع حصہ باہر کو نکلا ہوا (polygonal spur) ہے، جس کے جنوب مشرق پہلو میں بہت ڈھلوان چٹان ہے، جس کی بلندی ۴۰۰ فٹ ہے اور جس کی چوٹی پر قلعة القاهرة ہے، جو اب کھنڈر ہو چکا ہے، لیکن کسی زمانے میں ایک نہایت مضبوط حصار متصور ہوتا تھا۔ پہاڑ کی اس برآمدگی (spur) کے بالمقابل دیوار کے شمال مشرق زاویے میں ایک اَور تیر کی طرح سیدھی برآمدگی کوہ ہے، جس کی چوٹی عمودی ڈھلان کا ایک ٹیلا ہے۔ شہر کی فصیل میں پانچ دروازے ہیں۔ مشرق میں باب الکبیر ہے، جس سے ماوِیہ -o- عدن اور قَعْطَبَہ -o- اِبّ -o- یَریم -o- اور صَنْعاء کی طرف سڑکیں جاتی ہیں۔ مغرب میں باب شیخ موسٰی ہے جہاں سے مُخا اور حَیْس کی جانب سڑک جاتی ہے۔ جنوب مغرب میں باب الاِمْدَاغر ہے، جو حُجَرِیّہ اور بنی عُلْوان کی جانب کھلتا ہے۔ جنوب میں باب عَین دُمَّہ ہے، جہاں سے جبل صَبِر کی طرف راستہ جاتا ہے اور جو پہاڑی کو قلعة القاهرة سے بھی ملا دیتا ہے۔ سب سے آخری دروازہ جنوب مشرق میں باب الحُدَیْرَة کے نام سے مشہور ہے، جس کے گرد اب تک دیوار قائم ہے۔ یہاں سے بھی جبل صَبِر کو راستہ جاتا ہے۔ یہ دروازے

جو ایک دوسرے سے دور نہیں ہیں، عربی طرز پر تعمیر ہوے ہیں۔ ان کے پہلوؤں پر دو دو برج ہیں، جو فصیل سے بلند تر ہیں اور عین دروازے کے اوپر ایک تیسرا برج ہے، جو داخلے کے دروازے کے حفاظت کرتا ہے۔ پینے کا نہایت عمدہ پانی شہر میں زمین دوز نالیوں کے ذریعے جبل صَبِر سے آتا ہے۔ اس میں ایک بہت بڑی منڈی بھی ہے۔ انیسویں صدی کے فسادات کے زمانے سے شہر کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ کسی زمانے میں یہاں پتھر کے یک منزلہ خوبصورت مکان تھے، مگر اب بیشتر کھنڈر بن چکے ہیں۔ مشکل سے کوئی بیس مکان اب تک کھڑے ہیں، باقی مکانوں کی جگہ منحوس جھونپڑیوں نے لے لی ہے۔

کے جنوبی حصے کو خاص طور پر نقصان پہنچا ہے اور کھنڈروں کے پتھر جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ چند خوبصورت مساجد سے خاندان رسولیة کی گذشتہ عظمت و شان کی یاد اب تک تازہ ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک کا نام مسجد اشرفیّه ہے، جس کا بانی رسولی خاندان کا حکمران الملک الاشرف اسمٰعیل بن العبّاس (۱۳۷۷ تا ۱۴۰۰ء) تھا۔ یہ چوکور شکل کی عمارت ہے، جس کے دو منار ہیں اور جس میں ستونوں کی دو قطاریں ہیں۔ اس کے تین گنبد ہیں، جن میں رنگین آرائشی کام افراط سے کیا گیا ہے۔ مسجد کے جنوبی حصے میں اس کے بانی اور اس کے بیٹے علی اور دو غلاموں کے مقبرے ہیں۔ کٹاؤ کے کام والے چوبی جنگلے کے پیچھے سنگ مرمر کے تین تابوت (sarcophagi) بنے ہوے ہیں، جن میں بانی مسجد کی سات بیویاں مدفون ہیں۔ ان کے بالمقابل اس کے ایک اور بردے کا مزار ہے جو چونے، پتھر اور اینٹوں سے بنا ہے اور اس کے گرد بھی کندہ کار لکڑی کا جنگلہ ہے۔

المظفّریّه کی وسیع اور شاندار مسجد جبل صَبِر کی ڈھلان پر واقع ہے۔ یہ مسجد بھی شکل میں چوکور ہے۔ اس میں ستونوں کی تین قطاریں، تین بڑے گنبد اور دو منار ہیں۔ اس کی سفیدی کی ہوئی دیواریں پہاڑ کی برکانی چٹانوں کے مقابلے میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اس مسجد کے سامنے کے رخ میں کئی جنگلے دار کھڑکیاں ہیں، جن کی خوبی کو ان کے سامنے کی محرابوں نے دوبالا کیا ہے، جنھیں پتلے پتلے نازک ستونوں نے سنبھالا ہوا ہے۔ مسجد کی روکار کتبوں اور بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ یہ مسجد اب بھی شہر کی جامع مسجد ہے اور بڑی اچھی حالت میں ہے۔ اگر بولونی کے سیّاح لودوویکو دِ بارتیما نے، جو ۱۵۰۸ء میں یہاں آیا تھا، اسے شہر رومه کے کنیسای سانت ماریه روتوندا کی عمارت سے تشبیه دی تھی، تو یه کچھ بیجا نه تھا۔ دوسری مساجد حسب ذیل ہیں ان سب کی حالت اچھی ہے: عبدالہادی کی مسجد، شیخ موسٰی کی مسجد، جو مغرب میں شہر کی فصیل سے باہر ہے، شیخ افضل اور اس کے خاندان کی شاندار مسجد، جو ترکی فتوحات کے دور اول میں شہر کے مشرق میں تعمیر ہوئی، مُخْدَبیّه مسجد، جو اس زمانے میں شہر کے جنوب میں تعمیر ہوئی، یه مسجد تَعِزّ کے اونچے حصے میں واقع ہے اور یه حُسین پاشا کے ایک حبشی غلام نے بنوائی تھی۔ یه ایک چوکور عمارت ہے، جس میں کوئی منار نہیں، البته وسط میں ایک بڑا کشادہ صحن ہے۔ اس کی تعمیر میں بوزنطی اور عرب طرز تعمیر کا ایک عجیب امتزاج پایا جاتا ہے۔ یه مسجد بہت سے کتبوں سے آراسته ہے، جو مرصّع کار دروازوں پر اور ان کے علاوہ ستونوں اور دیواروں پر بھی لکھے ہوے ہیں۔ بائیں جانب

بڑے بڑے حوض ہیں، جو وضو کے لیے بنائے گئے تھے، مگر اب وہاں ہسپتال کے کپڑے دھوئے جاتے ہیں - شرف الدین والی مسجد اب کھنڈر ہے اور صرف اس کا منار باقی ہے - اس کے بانی امام شرف الدین بن امام مطہّر تھے، یہ مسجد بھی اشرفیۃ مسجد کی طرح تَعِزّ کے جنوبی بلند حصے میں تعمیر ہوئی تھی .

تَعِزّ میں بے شمار باغ، کھیت اور مرغزار ہیں - ان میں سب سے زیادہ خوبصورت باغ سلیمان پاشا کا ہے، جو شہر کے وسط میں ہے - اس کا نام 'بِرْکۃ حسینیۃ' ہے - باغ کے بیچ میں خوشنما کوشک ہے، جس میں ایک عمدہ وسیع کمرہ ہے اور اس کے سامنے بڑا بیضوی حوض، جس میں فوارہ ہے - حسین پاشا اسی باغ میں ایک بلند قُبّہ دار مقبرے میں دفن ہے .

باغ میں پانی کی فراوانی ہے، جو نالیوں کے ذریعے جبل صَبْر سے آتا ہے - جو درخت اور پودے صنعاء اور روضۃ میں پائے جاتے ہیں، یہاں بھی پیدا ہوتے ہیں، البتہ جوز کا درخت نہیں ہوتا - کھجور کا درخت یہاں اچھی طرح نہیں پھلتا پھولتا، مگر کیلے کثرت سے ہوتے ہیں - تَعِزّ کے اردگرد کے میدانی علاقے میں خوب کاشتکاری ہوتی ہے - تَعِزّ کے شمال مشرق میں جبلِ صَبْر کی ڈھلانوں پر طَرْفاء (tamarisk) اور خُرنُوب (carob tree) جھنڈ کے جھنڈ ہیں اور انھیں ڈھلانوں کے قریب کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی آباد ہیں - خود جبل صَبْر کیا ہے، ایک باغ نباتات (botanical garden) ہے، جس کی نیچی ڈھلانوں پر تقریباً ہر قسم کے پھل، مثلاً املی، بہی، چکوترے اور انگور پیدا ہوتے ہیں اور اونچی ڈھلانوں پر عام درختوں اور جھاڑیوں کے علاوہ ہر قسم کے خوشبودار پودے بھی ہوتے ہیں - اس پہاڑی کی انتہائی بلندی تک کاشت ہوتی ہے اور جو اور رائی ('خَرْدَل') خاص طور پر بکثرت پیدا ہوتے ہیں - اس ملک کی اصلی دولت قات[رک بآن](باصطلاح *Celastrus*:Forsk. *edulis*) کے وسیع مزرعے ہیں - یہ وہ مبہمی چیز ہے جس کے اہلِ یمن بے حد شائق ہیں [دیکھیے لطف اللہ شیرازی ٹھٹوی: تحفۃ الباصرین (تصنیف ۱۸۵۶ء)، کراچی ۱۸۵۸ء، ص ۱۶۵] - گلازر Glaser کہتا ہے کہ تَعِزّ کا محلِّ وقوع سخت مضرِ صحّت ہے اور یہاں کی ہوا متعفّن (ملیریے کے جراثیم سے پُر) ہے - کاروانوں کے ذریعے تَعِزّ کے روابط زَبِید، یریم، اِبّ اور صَنْعاء اور ان کے علاوہ عدن سے بھی قائم ہیں - ترکی دَور حکومت میں الحُدَیْدَۃ سے ہفتہ وار ڈاک کے آنے جانے کا انتظام بھی تھا - ۱۹۱۲ء میں یہ منصوبہ تیار ہوا کہ الحُدَیْدَۃ کو صَنْعاء اور اندرون ملک کے ساتھ بذریعۂ ریل ملا دیا جائے - اس میں ایک مجوّزہ لائن یہ بھی تھی: الحُدَیْدَۃ ــ زَبِید ــ تَعِزّ ــ اِبّ ــ یَرِیم ــ صَنْعاء، لیکن ترکوں اور اٹلی کی جنگ اور اس کے بعد جنگِ عظیم کی وجہ سے یہ منصوبہ صورت پذیر نہ ہو سکا .

مقامی روایت یہ ہے کہ تعزّ جاہلیت کے زمانے میں آباد ہوا تھا - تَعِزّ کے شمال مشرق میں جبل ضربت علی ہے، جو روایۃً [حضرت] علی[رض] سے منسوب ہے .... - کہتے ہیں کہ یہ پہاڑ، جس کی اب دو چوٹیاں ہیں، کسی زمانے میں ایک ٹھوس تودہ تھا - جب [حضرت] علی[رض] تسخیرِ یمن اور تبلیغ اسلام میں مصروف تھے تو آپ تَعِزّ میں بھی تشریف لائے، مگر یہاں کے لوگوں نے آپ کی اور قرآنی تعلیمات کی پُرزور مخالفت کی - آپ نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور پہاڑ پر قیام فرمایا، جو

اب تک آپ کے نام سے مشہور ہے ۔ باشندوں نے سخت مقابلہ کیا، جس سے محاصرہ طول پکڑ گیا ۔ آپ کے فرستادوں نے رئیسانِ شہر کو بہتیرا سمجھایا، لیکن سب بے سود، بلکہ انھیں گالیاں دی گئیں اور ایک جماعت کے ساتھ تو اس سے بھی زیادہ بدسلوکی کی گئی کہ اسے مارا پیٹا بھی گیا ۔ اس پر آپ بہت غضب ناك ہوے اور آپ نے پہاڑ کی چوٹی پر اپنی مشہور و معروف تلوار سے ایسی ضرب لگائی کہ پہاڑ کی چوٹی میں ایک لمبا گہرا شگاف پیدا ہو گیا، جو اب تک بھی موجود ہے ۔ آپ کے لشکر گاہ میں تو کسی خیمے کو جنبش تک بھی نہ ہوئی اور نہ کوئی شخص مجروح ہوا، لیکن تعِزّ کے سب مکان گر پڑے اور مضبوط سے مضبوط مکان بھی زمین پر آ رہا ۔ اس وقت تعِزّ کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور . . . . انھوں نے اسلام قبول کر لیا ۔

یہ کہانی یقیناً غیر تاریخی ہے اور پہاڑی کی عجیب و غریب ساخت ہی کی وجہ سے گھڑی گئی ہے ۔ اس طرح کئی اور مقامات بھی ہیں جنھیں [حضرت] علی[رض] سے منسوب کیا گیا ہے، اہل یمن خاص طور پر محبّانِ علی[رض] میں سے ہیں: مثلاً بقول گلازر جبلِ الدار کے اوپر (جو رباط کے نزدیک ذَمار کی سڑك پر ہے) سڑك کے کنارے (غالباً سب سے اونچی جگہ) [حضرت] علی[رض] کے قدم کا نشان ('' رِجْلِ علی '') ایک چٹان پر دکھایا جاتا ہے اور اس کے قریب ہی، لیکن سڑك کے بائیں طرف، ایک اور چٹان ہے، جس میں بظاہر سوراخ ـــے گئے ہیں، اسے بھی '' ضَربتِ علی'' کہتے ہیں ۔ ـرِس تعِزّ کے متعلق ایک اور روایت بھی ہے، یعنی سات سونے والوں (اصحاب الکہف) کا قصہ ۔ ان کے طویل خواب کا محلِّ وقوع، بقول ابن المُجاور، جبل صَبِر ہی کا ایک غار ہے ۔ جنوبی عرب میں اس قصے کی یہ صورت مشہور ہے کہ ایک بادشاہ کے سات بیٹے دُقیانوس الغدّار کے پاس بطورِ یرغمال بھیجے گئے ۔ جب بادشاہ کسی جنگ میں شریک ہونے کے لیے گیا تو یہ شہزادے موقع پا کر بھاگ نکلے اور (ثَعْبَد کے نزدیک) ماحَمِید میں داخل ہو گئے اور جبل صبِر میں قَرْیَةِ المُعْقاب کی چوٹی پر جا نکلے اور وہاں رہنے لگے ۔ دقیانوس نے ان کی تلاش کی، لیکن پا نہ سکا ۔ وہ وہاں ۳۱۰ سال تک سارا وقت سوئے رہے ۔ جب بیدار ہوے تو انھیں یوں معلوم ہوا کہ گویا صرف ایک ہی دن گذرا ہے ۔ ان کے پاس کچھ روپیہ پیسہ بھی تھا، جو وہ ساتھ لائے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو کچھ نقدی دے کر کھانے پینے کا سامان لانے کے لیے بازار بھیجا ۔ شریرالنفس لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور وہ روپیہ اس کے قبضے میں پایا تو خیال کیا کہ اسے کوئی خفیہ خزانہ مل گیا ہے، اس لیے اسے پکڑ کر حُکّام وقت کے پاس لے گئے؛ وہاں کوئی شخص بھی اسے نہیں پہچانتا تھا اور چونکہ شہر میں اس کا اپنا کوئی گھر بھی نہ تھا، اسے دیوانہ سمجھ کر رہا کر دیا گیا ۔ وہ غار میں واپس چلا آیا اور ابھی تک وہیں ہے ۔ کہتے ہیں کہ اب غار میں سے تند ہوائیں آتی ہیں ۔ گلازر نے یہ مقام ۲۰ نومبر ۱۸۸۷ء کو دیکھا تھا ۔ مسجدِ اصحابِ کہف بڑی خوشنما مسجد ہے ۔ اس کے چوبی ستون حیرت انگیز ہیں اور چھت بھی بڑی اچھی ہے ۔ اصلی زیارت‌گاہ مسجد کے شمال مغربی گوشے میں ہے، یہ منشوری شکل کی ایک سادہ سی جگہ ہے، جس کے گرد دیوار ہے ۔ اس کے دائیں طرف ایک سوراخ ہے، جسے عرب لوگ مغارہ (غار) کہتے ہیں ۔ گلازر نے اس کا بڑے غور سے

معاینہ کیا، مگر اسے وہاں نہ تو ہوا کا کوئی جھونکا محسوس ہوا اور نہ اس نے کوئی بڑا سوراخ ہی دیکھا - اس کا خیال یہ تھا کہ چٹانیں آپس میں پیوست نہیں ہیں، اس لیے ہوا کے آنے جانے کی تھوڑی سی گنجائش رہ گئی ہے - مسجد کے نزدیک سادات رہتے ہیں - بوتا Botta اس مقام پر، جسے وہ غلطی سے " اهل الکهف " لکھتا ہے، ۱۸۳۷ء میں آیا تھا - جبل صبر کے دامن میں تعزّ کے قریب اسے اس غار کا راستہ دکھایا گیا تھا جہاں سے اصحاب کہف پورے پہاڑ میں سے گذرے تھے - اغلب نہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں تعزّ کا وجود ہو - اس علاقے کا صدر مقام سوّا اور بعد میں جبا [جَبأ در یاقوت] تھا - یہ دونوں مقام تعزّ سے کچھ زیادہ دور نہیں - حاجی خلیفہ، مؤلف جہان نما، کے نزدیک تعزّ کا بانی ایوبی خاندان کا بادشاہ الملک العزیز سیف الاسلام ظہیرالدین ابو الفوارس تُغتکین تھا، جو ۵۷۸ھ / ۱۱۸۲ - ۱۱۸۳ء میں یمن آیا - بقول گلازر تعزّ کی تعمیر کے لیے مسالا زیادہ تر متّصل کے چھوٹے سے قصبے ثُعبَد سے لایا گیا تھا جو وادی صالة کے بائیں کنارے پر ہے - اس کی تحقیق کے مطابق کوئی پانچ چھے سو برس پہلے تعزّ کا نام عُدَینَة تھا، لیکن اس زمانے کی دیواروں کی صرف بنیادیں ہی باقی رہ گئی ہیں؛ خود دیواریں حال کے زمانے کی تعمیر ہیں - عُدَینَة کا گاؤں بھی تعزّ کے تقریباً عین مشرق میں کوئی تین چار میل کے فاصلے پر تعزّ ہی کی طرح جبل صَبِر کی ڈھلان پر آباد ہے - اس کے متعلق مشہور ہے کہ ابتداء میں یہ بادشاہوں کا مسکن تھا، تا آنکہ اسمعیل مُلک نے، جو ایک مشہور و معروف سنّی ولی اور تعزّ کے صاحبِ کرامت سرپرست تھے، القاهرة کے ٹیلے پر اپنی مسجد اور قبر تعمیر کرائی؛

اسی مقام پر بعد ازاں قلعہ تعمیر ہوا اور شہر بھی آباد ہو گیا - چنانچہ دوسرے شہروں، مثلاً مُخا، بیت الفقیه، لُحَیّة وغیرہ کی طرح تعزّ کی بناء بھی ایک ولی سے منسوب ہے - اس کے برعکس جب ۱۸۸۷ء میں تعزّ میں قاضی یحیی سے دریافت کیا گیا تو بقول گلازر معلوم ہوا کہ یہ شہر ثُعبَد سے بھی زیادہ قدیم ہے، کیونکہ ثعبد تو رسولیّة خاندان کے عہد میں یا اس سے بھی بعد، یعنی ساتویں صدی میں، آباد ہوا تھا - گلازر کو بتایا گیا کہ شہر تعزّ عُدَینَة کے نام سے ۱۳۳ھ/۷۵۰ - ۷۵۱ء میں بھی آباد تھا اور موجودہ شہر سے بہت بڑا تھا - اس بیان کی صحت کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا - یاقوت (م ۱۲۲۹ء) بیان کرتا ہے کہ تعزّ یمن کا ایک بڑا اور مشہور قلعہ ہے اور عُدَینة تعزّ کے مضافات میں سے ہے - ابن المُجاور (جس نے اپنی کتاب حدود ۶۳۱ھ / ۱۲۳۳ - ۱۲۳۴ء میں لکھی) تعزّ کو ایک مستحکم قلعہ اور بادشاہ ملک کا مستقرّ بتاتا ہے - ابن بطُّوطة ۱۳۳۲ء میں تعزّ میں آیا تھا - وہ بھی یمنی حکمرانوں کے اس صدر مقام کو ملک کے سب سے بڑے اور خوبصورت شہروں میں شمار کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہاں کے باشندے نخوت پسند، متکبر اور بد تمیز [" ذوو تجبر و تکبُّر و فَظَاظة "] ہیں - اس شہر کے تین محلّوں میں سے ایک میں تو بادشاہ، اس کے مملوك، حاشیہ نشین اور اربابِ دولت رہتے تھے [اس کا نام ابن بطّوطة بھول گیا]، دوسرے کا نام عُدَینَة تھا، جس میں فوج اور اس کے افسر اقامت پذیر تھے اور تیسرے میں عام شہری آباد تھے اور اسی میں شہر کا بڑا بازار واقع تھا، اس کا نام المُحالِب تھا - رسولی خاندان کے پایۂ تخت کی حیثیت سے اس شہر کو بڑی رونق

اور خوش حالی حاصل ہوئی۔ انھوں نے یہاں پانچ مدرسے قائم کیے ۔ ان میں سے دو الملک المنصور عمر (۱۲۲۹ تا ۱۲۵۰ء) نے، تیسرا (جس کا نام مجاہدیّۃ تھا) اس کے جانشین الملک الفضل مجاہد نے، چوتھا موسوم بہ اشرفیۃ الملک الاشرف اسماعیل (۱۳۷۷ تا ۱۴۰۰ء) نے اور پانچواں الملک المؤیّد داؤد (۱۲۹۶ تا ۱۳۲۱ء) نے قائم کیا ۔ اس بادشاہ نے، جو اس مدرسے میں مدفون ہے، ایک کتب خانہ چھوڑا، جس میں ایک لاکھ کتابیں تھیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ بہت پختہ تعمیر نہیں ہوا تھا، کیونکہ ۱۳۹۲ء میں اس کا ایک حصہ گر گیا اور اس کے نیچے دو آدمی دب کر مر گئے ۔ ۱۵۱۶ء میں تعز کو حسین الکُردی نے فتح کر لیا ۔ یہ شخص مملوک سلطان قانصُوہ الغُوری کا سپہسالار اور امیر البحر تھا ۔ ۱۵۴۵ء میں اسے ترکوں نے فتح کیا اور ۱۵۶۷ء میں یہ صنعاء کے اماموں کے قبضے میں آ گیا ۔ فرانسیسی طبیب دِلا گرِلودِییِر De la Grélaudière، جو ۱۷۱۲ء میں اس شہر سے گذرا تھا، بیان کرتا ہے کہ یہ مشہور پرانا شہر ہے، جس کی خوبصورت دیواریں ترکوں نے تعمیر کی ہیں ۔ قلعہ، جس میں تیس توپیں تھیں، سرکاری قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا ۔ ۱۶۳۵ء میں صنعاء کے امام ترکوں کے جانشین ہوے اور ان کے عہد میں ان تمام گذشتہ نقصانات کی، جو اس شہر نے اٹھائے تھے، تلافی ہوگئی ۔ اس کے بعد تعز ذُو محمد کے قبضے میں چلا گیا، جو ایک زبردست قبیلہ ہے اور انھیں کے قبضے میں رہا، تا آنکہ ابراہیم پاشا نے اسے فتح کر لیا ۔ پھر یہ شہر ۱۸۳۵ء سے لے کر ۱۸۴۰ء تک مصریوں کے زیر نگین رہا ۔ ۱۸۷۱ء میں جب ترکوں نے یمن کو دوبارہ فتح کرنا شروع کیا تو ۲۸ اکتوبر کو یہ شہر پھر ان کے قبضے میں آ گیا اور اہلِ یمن کی عام بغاوت تک ترکوں ہی کے پاس رہا ۔ یہ عام بغاوت امام احمدالدین کی سرکردگی میں ۱۸۹۲ء میں ہوئی تو تعز زیدیوں کے ہاتھ آ گیا، مگر محض عارضی طور پر، اس لیے کہ ترکوں نے ۱۸۹۳ء میں اسے دوبارہ فتح کر لیا اور ۱۹۱۸ء کی صلح تک انھیں کے قبضے میں رہا ۔ یمن سے ترکوں کے انخلاء کے بعد تعز پھر امام صنعاء کے دائرۂ حکومت میں آ گیا ہے ۔

مآخذ: (۱) یاقوت: معجم، طبع وستن فلٹ، ۱: ۸۵۴؛ ۳: ۶۲۳؛ (۲) مراصد الاطلاع، طبع جوینبول (J. G. J. Juynboll)، ۱: ۲۰۶؛ (۳) ابن بطوطہ: رحلۃ، طبع C. Defrémery اور B. R. Sanguinetti: ج ۲، پیرس ۱۹۱۴ء: ص ۱۷۱ ببعد؛ (۴) W. Redhouse: *The Pearl-Strings; a History of the Resúliyy dynasty of Yemen*، *G.M.S.*، ۳/۲، لائیڈن ۱۹۰۷ء: ص ۲۰۵؛ (۵) *Decada decima da Asia de Diogo de Couto*، لزبن ۱۷۸۶ء، کتاب ۷، باب ۱۰؛ (۶) C. Niebuhr: *Beschreibung von Arabien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۲۴۰ ببعد؛ (۷) C. Ritter: *Die Erdkunde von Asien*، ۸/۱، برلن ۱۸۴۶ء، ص ۲۳۵، ۷۲۳، ۷۴۰ ببعد، ۷۸۱، ببعد، ۷۸۰؛ (۸) A. Sprenger: *Post-und Reiserouten des Orients, Abh. f. d. Kunde d. Morgenlandes*، ۳/۳، لائپزگ ۱۸۶۴ء: ص ۱۵۲، ۱۵۶؛ (۹) وہی مصنف: *Die alte Geographie Arabiens*، برن Bern ۱۸۷۵ء، ص ۱۸۳؛ (۱۰) H. v. Maltzan: *Reise nach Südarabien*، Braunschweig ۱۸۷۳ء، ص ۲۰۵ تا ۲۰۷ و ۳۹۸ تا ۴۰۵؛ (۱۱) P. E. Botta: *Relation d'un voyage dans l'Yémen entrepris en 1837*، پیرس ۱۸۸۰ء، ص ۱۰۹ تا ۱۱۱، ۱۳۲؛ (۱۲) R. Manzoni: *El. Yèmen, tre anni nell' Arabia felice Escursioni*

fatte dal Settembre 1877 al Marzo 1880، رومه ۱۸۸۴، ص ۱۸۰، ۳۱۳ تا ۳۱۹، ۳۴۲؛ (۱۳) A. Deflers : *Voyage au Yemen, Journal d'une excursion botanique faite en 1887 dans les montagnes de l'Arabie heureuse*، پیرس ۱۸۸۹ء، ص ۸۸ تا ۹۱؛ (۱۴) E. Glaser : *Skizze der Geschichte u. Geographie Arabiens*، ۲، برلن ۱۸۹۰ء: ص ۱۶۲؛ (۱۵) وهی مصنف : *Tagebuch*، ۱: ورق ۱۹ راست؛ (۱۶) *Tagebuch* : ۲، ۱۸۸۷ء: ورق ۲۲ چپ تا ۲۳ راست، ۲۷ راست، ۲۸ چپ، ۳۲ چپ؛ (۱۷) M. Hartmann : *Der islamische Orient, Berichte und Forschungen*، ۲، *Die arabische Frage*، لائپزگ ۱۹۰۹ء: ص ۱۶۹، ۳۱۷، ۳۶۷ ببعد، ۵۳۸، ۵۴۶؛ (۱۸) G. W. Bury : *Arabia Infelix or the Turks in Yamen*، لنڈن ۱۹۱۵ء، ص ۲۳ تا ۲۵؛ (۱۹) F. Stuhlmann : *Der Kampf um Arabien zwischen der Türkei und England, Hamburgische Forschungen*، ۱، Braunschweig ۱۹۱۶ء : ص ۳، ۷۳، ۷۷، ۱۰۱؛ (۲۰) *Handbooks prepared under the direction of the historical section of the Foreign Office, No. 61, Arabia*؛ لنڈن ۱۹۲۰ء، ص ۵۳، ۶۹، ۷۲؛ (۲۱) D. G. Hogarth : *Arabia*، آکسفورڈ ۱۹۲۲ء، ص ۱۹ ببعد، ۹۸؛ [(۲۲) سامی بک : قاموس الاعلام، ۳ : ۱۶۰۶؛ (۲۳) احمد فخری : *An Archaeological Journey to Yemen*، قاهرة ۱۹۵۲ء، ۱ : ۱، ۳؛ (۲۴) شیروانی : بستان السیاحة، ص ۱۹۱] .

(A. GROHMANN)

تَعْزِیر : لفظ تعزیر مادّۂ ''ع - ز- ر'' سے باب تفعیل ہے، عَزْر اور تَعْزِیر دونوں کے لغوی معنی تقریباً ایک ہی ہیں، یعنی منع کرنا، باز رکھنا، ملامت کرنا؛ پھر اس کے معنی ہوے تنبیہ اور تأدیب کر کے احکام (قانون) پر کسی کو قائم کرنا (التّوقیف علی الفرائض و الاحکام)، لہذا شریعت میں یہ وہ تأدیب اور سزا (عقوبت) ہے جو اس جرم پر دی جاتی ہے جس کے لیے حد متعیّن نہیں ہے، یہ عام طور پر حد سے کمتر ہوتی ہے اور اس کا مقصد بھی یہ ہوتا ہے کہ مجرم کو دوبارہ ارتکاب معصیت سے باز رکھا جائے (اَنْ یُمْنَع الجانی اَنْ یُعاوِد الذّنْب) اور قانون کا پابند بنایا جائے ۔ سزا کے لیے اس لفظ کے انتخاب ہی سے شریعت میں جو سزا کا منشأ ہے وہ بھی واضح ہو جاتا ہے، جس کی مزید وضاحت آیندہ سطور میں ہوگی .

تعزیر اور تأدیب میں یہ فرق کیا جا سکتا ہے کہ تعزیر اول تو ایک اصطلاح بن گئی ہے، دوسرے تعزیر کے متعلق امیرالمؤمنین یا حاکم وقت یعنی فقط حکومت قانون سازی کر سکتی ہے اور بعد ازآں حاکم وقت یا اس کا نمایندہ (مثلاً قاضی یا کوئی اَور عہدیدار) نوعیّتِ جرم متعیّن کرنے کے بعد مناسب عقوبت (سزا) نافذ کرتا ہے، اس کے برعکس تأدیب قانونی سزا نہیں ہے، مثلاً استاد کا اپنے شاگرد کو اور باپ کا اپنے بیٹے کو سزا دینا تأدیب ہوگا .

شریعت اسلامی میں سزا تین طرح پر ہوتی ہے : (۱) وہ سزا جسے اللہ تعالی نے متعیّن تو کر دیا ہے لیکن اس کا اجراء (نفاذ) بندے پر چھوڑ دیا ہے، یعنی کوئی خارجی طاقت (مثلاً حاکم یا حکومت) اس میں دخل انداز نہیں ہوتی، گویا بندے کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ خود اپنا تعلق احکم‌الحاکمین سے استوار کر لے، اس قسم کی سزا کو کفّارہ کہتے ہیں (دیکھیے کفّارہ)، مثلاً کفارۂ قسم (ملاحظہ ہو : کَفّارَۃُ اَیْمَانِکُم الخ : ٥ [المائدۃ] : ۹۲)، (۲) وہ سزائیں

جنھیں حاکم ، قاضی وغیرہ یعنی حکومت نافذ کرتی ہے ۔ یہ پھر دو اقسام پر منقسم ہوتی ہیں : (الف) وہ سزائیں جو کتاب اللہ یا سنت نبویہ سے ثابت اور متعیّن ہیں، انھیں شریعت میں حدّ کہتے ہیں (دیکھیے حدّ)، اور ان میں حاکم یا قاضی کی رائے کا دخل نہیں ہوتا، جیسے حدِّ زنا یا حدِّ شراب نوشی؛ (ب) وہ سزائیں جنھیں کتاب و سنت نے متعیّن نہیں کیا بلکہ حاکم وقت یا اس کی طرف سے قاضی موقع کے اعتبار سے یا ضرورت کے مطابق متعیّن کر سکتا ہے، گویا اس قسم کی سزاؤں کے بارے میں حکومت کو حقِّ قانون سازی حاصل ہے، اس قسم کی سزاؤں کو شریعت میں تعزیر کہتے ہیں، بالفاظ دیگر حدّ اور قِصاص (دیکھیے قِصاص) کے سوا جو سزائیں حاکم وقت مقرر کرے وہ تعزیر ہونگی ۔

حدّ اور تعزیر میں ایک اَور فرق کیا جاتا ہے، اول الذکر حقّ اللہ شمار کی جاتی ہے (ھو العُقُوبۃ المقدّرۃ حقًّا للہ تعالٰی)، اور مؤخرالذکر حقّ العبد ۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ حد میں بندہ تصرف نہیں کر سکتا اور تعزیر میں دو طرح بندہ تصرف کر سکتا ہے، ایک تو سزا کم و بیش ہو سکتی ہے اور اس کی نوعیت بدلی جا سکتی ہے (مثلاً دُرّوں کی تعداد یا حبس وغیرہ) باعتبار موقع و شخصیتِ مجرم وغیرہ، دوسرے چونکہ یہ حق العبد ہے مظلوم کو حق ہے کہ وہ مجرم کو معاف کر دے اور اس طرح وہ سزا سے بری ہو جائے، اس لحاظ سے قِصاص بھی حدّ شمار نہیں ہوتا، کیونکہ یہ بھی حقّ العبد ہے اور بندے کو اختیار ہے کہ مجرم کو معاف کر دے، حالانکہ قِصاص قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہے (البحر الرائق ، ۵ : ۲) ۔

شریعت اسلامی میں عقوبت (سزا) کا مقصدِ اوّلین یہ ہے کہ عباد اللہ کو مجرم کی شرّ انگیزیوں سے محفوظ رکھا جائے (الانزجار عمّا یتضرر بہ العباد، شرح فتح القدیر، ۴ : ۱۱۱)، کیونکہ اسلام فساد فی الأرض اور معاشرۂ اسلامی میں فتنے کو نہایت ناپسند کرتا ہے، دوسرا مقصد انسان کی اپنی اصلاح ہے، تا کہ مجرم کا میلانِ جرم راسخ نہ ہو جائے (کَی لا تصیرُ مَلَکات فیفحش و یستدرج اِلی ما ھُو اَقبح، ایضاً : ص ۲۱۱)، جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے اس مقصد میں مسلم اور غیرمسلم دونوں شریک ہیں، لیکن شرعی عقوبت سے مسلمان کی عاقبت بھی درست ہو جاتی ہے، کیونکہ اس سے تطہیر عن الذنب بھی ہو جاتی ہے اور یوم حساب میں اس سے اس کے متعلق بازپرس نہ ہوگی، یہی وجہ تھی کہ ابتدائے اسلام میں اگر کسی مسلمان سے گناہ سرزد ہوتا تھا تو وہ اعتراف جرم کر کے خود سزا کا مطالبہ کرتا تھا؛ قصاص اور تعزیر میں عقوبت کا ایک اَور پہلو نکلتا ہے، وہ یہ کہ انسان کی فطرت میں جو انتقامی جذبہ ہے اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن اس انتقامی جذبے کو عفو میں تبدیل کر کے اسلام نے مکارمِ اخلاق کی طرف بڑا اقدام کیا ہے ۔ الغرض اسلامی عقوبت میں وہ تینوں مقاصد شامل ہیں جنھیں علم الاخلاق (Ethics) تسلیم کرتا ہے، یعنی اسلامی عقوبت میں بیک وقت انتقامی (Retributive)، امتناعی (Deterrent) اور اصلاحی (Reformative) (ذاتی و نیز بین النّاس) تینوں مقاصد مضمر ہیں ۔

مآخذ : (علاوہ ان کے جو متن میں مذکور ہیں) (۱) 'کتاب الحدود' در کتب حدیث و فقہ بالخصوص کاسانی : بدائع الصنائع، قاہرۃ ۱۹۱۰ء، ۷ : ۶۳ ببعد؛ (۲) خلیل : مختصر ، ترجمہ از Santillana ، میلان ۱۹۱۹ء، ۲ : ۷۴۲؛ (۳) ماوردی : الاحکام السلطانیۃ،

طبع Enger، بون Bonn ۱۸۵۳ء، ص ۳۹۹ ببعد، ترجمۂ فانیان Fagnan، الجزائر ۱۹۱۵ء، ص ۳۶۹ ببعد؛ (۴) شَعْرانی : میزان، قاهرة ۱۹۲۵ء، ۲ : ۱۷۵ ببعد؛ (۵) جُوینبول : *Handbuch des islam. Gesetzes*، لائیڈن ۱۹۱۰ء، § ۶۵؛ طبع ثالث، (ڈچ) ۱۹۲۵ء § ۶۸؛ (۶) Krcsmárik : *Beiträge zur Beleuchtnug des islam. Strafrechts*، در *Z.D.M.G.*، ج ۵۸ (۱۹۰۴ء) : ۶۵، ۵۵۶ ببعد ــــ احادیث کے لیے دیکھیے Wensinck : *Handbook of Early Muhammadan Tradition*، لائیڈن ۱۹۲۷ء، بذیل *Punishment* .

(HEFFENING و عابد احمد علی)

* **تَعْزِیَہ** : لغتِ عربی میں اس کا مادّہ ”ع . ز . ی“ ہے اور مجرد عَزِیَ یَعْزِیٰ عَزَاءً، مصیبت پر صبر کرنا؛ تَعْزِیَۃٌ (تَفْعِلَۃٌ) مزید، متعدّی، تلقینِ صبر کرنا، تسلّی دینا، پُرسا دینا .

قرآن مجید میں اس مادّے کا استعمال بعض کے نزدیک سورۃ المعارج، آیت ۳۷ میں ہے: عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِیْنَ (از عَزِیَ فعل ماضی = شکیبائی کی) - فقہ و حدیث میں اس لفظ کا استعمال ابوابِ ذیل میں ملتا ہے : عبادات، جنائز، آدابِ تلقینِ صبر و تسلّی- فارسی ادب و تاریخ میں لفظ ”تعزیت“ وارثانِ میّت سے اظہارِ افسوس و اظہارِ همدردی کے لیے مستعمل ہوا ہے - مثنوی مولانای روم [طبع وقفیّۂ گب، ۵ : ۱۳۷، شعر شمارہ ۲۱۵۲] میں ہے :

سرِ سیه چون نامه‌های تعزیه
پرِ معاصی متن آن با حاشیه

اردو میں تعزیہ کے معنی ہیں امام حسین علیه السلام کی تربت، ضریح، عمارتِ روضہ کی شبیہ، جیسے سونے، چاندی، لکڑی، بانس، کپڑے، کاغذ وغیرہ سے بناتے ہیں - یہ شبیہ غم، سوگ اور علامتِ محرّم کے طور پر کبھی جلوس کی شکل میں لے کر نکلتے ہیں، کبھی گھروں، امام باڑوں یا ان کشادہ و مخصوص چبوتروں پر رکھتے ہیں جنھیں امام صاحب کا چوک کہا جاتا ہے .

حیدر آباد دکن میں تعزیہ تابوت اور ماتم و سینہ زنی کو کہتے ہیں - تعزیہ کرنا = ماتم کرنا ؛ تعزیہ دار = ماتم دار، سینہ زنی کرنے والا، وہ شخص جس کے گھر میں تعزیہ رکھا جاتا ہو اور مجلس ہوتی ہو، مُحبِّ حسین[۱۴]، شیعہ، عزا دار .

تعزیہ اپنی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے صنعت کا اچھا نمونہ ہوتا ہے اور تعزیہ بنانے والے اس کی شکل و صورت میں علاقائی خصوصیات اور کاریگری کے نمونے پیش کرتے ہیں، چنانچہ بعض تعزیے سال سال دو دو سال تک بنتے رہتے ہیں - ان کے نام بھی الگ الگ ہیں. مثلاً (۱) ضریح اور اس کی قسمیں : ان میں ممتازترین ضریح وہ ہے جو عمارتِ روضۂ امام حسین علیه السلام کی ہو بہو شبیہ ہو - ایسی ضریحیں نظام دکن، والی رامپور، راجہ محمود آباد اور کراچی کے بعض عزاخانوں میں ہیں - ایک موبی ضریح حسین آباد لکھنئو میں شاہی زمانے سے بنتی چلی آتی ہے - (۲) بنگلہ : یہ تعزیہ محملِ ناقہ یا عماریِ فیل سے مشابہ ہوتا ہے اور عموماً لکھنئو یا مضافاتِ لکھنئو میں بنتا ہے - شاید یہ نقشہ اس محمل یا ڈولی یا پالکی وغیرہ کا ہوتا ہو جس میں تبرّکات رکھ کر شاہانِ دھلی لال قلعے سے مسجدِ جامع لے جاتے تھے (رنگ به بزم آخر، ص ۵۰) - (۳) موبی تعزیے : بانس کی تیلیوں پر ضریح یا بنگلہ یا کسی اور شکل کا ڈھانچا بنا کر اس پر موم چڑھایا اور کمالِ فن کا مظاهرہ کیا جاتا ہے - (۴) جو کے تعزیے : ڈھانچے پر مٹی کی ایک هلکی تہ جما کر گیہوں یا جو کے دانے ترتیب سے چپکا دیتے ہیں، جن میں عاشور یا اربعین تک

اکھوے نکل آتے ہیں اور سارا تعزیہ ایک رنگ ہو جاتا ہے ۔ اس تعزیے پر اثنائے جلوس میں مسلسل پانی چھڑکتے جاتے ہیں ۔

تعزیے کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں : تخت، خطیرہ، تربت، عَلَم (ضریح میں گمزی) ۔ پاکستان، کشمیر، نیپال، ہندوستان، افریقہ میں عموماً ضریح اور تعزیے کا بیان کردہ فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا، لیکن دونوں خصوصی نسبت کی بنا پر مذہبی اور روایتی نقطۂ نظر سے شیعوں، بعض سنّیوں اور بہت سے ہندووں میں بھی یکساں قابلِ احترام ہیں ۔ لکھنئو وغیرہ میں '' تخت'' کے اوپر اور حظیرے کے درمیان دو تربتیں یا قبروں کی شبیہیں بھی ہوتی ہیں ۔ سبز حضرت امام حسن علیہ السلام اور سرخ حضرت امام حسین علیہ السلام کے لیے ۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ تعزیہ کسی ایسی عماری کی نقل ہے جس میں بعض مغل یا دوسرے سلاطین تربتیں رکھ کر جلوس کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہوں گے ۔

تعزیے عموماً ۲۹ ذی‌الحجۃ سے ۹ محرم تک آراستہ کرکے ایک خاص اور معیّن مقام پر رکھے جاتے ہیں، جسے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، مثلاً عزاخانہ، تعزیہ‌خانہ، امام‌باڑہ، عاشورخانہ، امام‌خانہ، چبوترہ، چوک امام صاحب ۔ جہاں تعزیہ رکھا جاتا ہے وہاں مجلسِ ماتم، سوزخوانی، مرثیہ‌خوانی، روضہ‌خوانی، واقعہ خوانی، نثّاری اور مجلسِ وعظ منعقد ہوتی ہے اور واعظ قرآنی حقائق و بیانِ خصوصیات اسلام کے بعد فضائلِ اہلِ بیت، مصائب اور واقعاتِ کربلا پر تقریر ختم کرتے ہیں ۔ پھر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر نوحہ‌خوانی و سینہ‌زنی یا ماتم بھی ہوتا ہے ۔ اہلِ سنّت شہادت نامہ اور ہندو کربلا کتھا یا دوہے پڑھتے ہیں۔

اس سلسلے میں تعزیہ داری کے لیے حسب ذیل واقعات سے استناد کیا جاتا ہے :۔

۱ ۔ جنگ اُحُد (۳ھ) میں جب حضرت حمزہ[رض] بن عبدالمطّلب اور دوسرے صحابہ شہید ہوے تو رسول اللہ[ص] نے شہیدوں پر رونے والوں کی آوازیں سن کر فرمایا ''لیکن حمزہ پر رونے والا کوئی نہیں''۔ یہ سن کر سعد[رض] بن مُعاذ و اُسَیْد[رض] بن حُضَیر نے بنی عبد الاَشْہَل کی عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے یہاں بھیج دیں، جنھوں نے جناب حمزہ پر ماتم کیا (طبری، طبع لائیڈن، ۱ : ۳ : ۱۴۲۵؛ ابن سعد : کتاب الطبقات الکبیر، لائیڈن، ص ۳۱)؛

۲ ۔ ایسے واقعات سے مثلاً ابن عباس[رض] کا حضور کو خواب میں سر برہنہ دیکھنا اس طرح کہ آپ کے ہاتھ میں شیشی ہے جس میں خون ہے یا آنحضرت[ص] کی وفات کے بعد بُرَیْدَۃ بن الحُصَیب کا، (جو حضرت اُسامۃ[رض] والی مہم میں صاحبِ لواء تھے) لواء مذکور کو دروازۂ مبارک پر نصب کرنا، جو کتبِ ذیل میں مواضع مذکورہ پر درج ہیں :

(الف) مشکوٰۃ، طبع دھلی ۱۹۳۲ء، ص ۵۷۲ (باب مناقب اھل البیت)؛ (ب) وھی کتاب، ص ۵۷۰؛ امام احمد بن حنبل : مسند، طبع قدیم مصر، ۱ : ۲۴۲ س ۹ ؛ ترمذی، لکھنئو ۱۸۸۴ء، ص ۶۲۴؛ ینابیع المودۃ، بمبئی، باب ۶۰، ص ۲۶۵؛ (ج) بحارالانوار، طبع ایران ۱۲۷۰ھ، ص ۱۶۹ (باب اخبار اللہ انبیاء و نبینا بشہادتہ)؛ ابن الأثیر : الکامل، طبع سوم، ۱۳۵۶ھ، ۳ : ۳۰۳؛ مقتل ابن نما، ص ۶؛ (د) ابن ابی الحدید : شرح نہج البلاغۃ، مصر، ۱ : ۵۳؛

۳ ۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام کے بعد مدینے میں جناب اُمّ البَنین مادر جناب

عباس بن علی[رض] جنت‌البقیع کے قبرستان میں تشریف لے جاتی تھیں اور اپنے چار بیٹوں کا، جو شہداے کربلاء میں شامل تھے، ذکر کر کے انتہائی غم و سوز سے رویا کرتی تھیں - لوگ جمع ہو جاتے تھے اور بعض سن سن کر روتے رہتے تھے (مقاتل الطالبین، مصر ۱۹۴۹ء، ص ۸۰)؛

۴ - امام زین‌العابدین، امام محمد باقر، امام جعفر صادق، امام علی رضا اور دوسرے ائمہ محرم کا چاند دیکھ کر عزاداری و سوگواری کرتے تھے (رک به بحارالانوار، ۱۰ : ۲۶۸ ؛ امالی صدوق، م ۳۸۱ھ / ۹۹۱ء).

۵ - ابوالاسود دُئلی (م ۶۹ھ) سلیمان بن قتّہ، کُمیت، ابو دَہبل [الجُمَحی]، فرزدق، دِعبِل وغیرہ نے اجتماعات میں مرثیے پڑھے اور ائمۂ اہلِ بیت نے انھیں صلے دیے اور ان کے مرثیوں کو سن کر گریہ فرمایا (رک به صواعق محرقۃ، ص ۱۱۵، تاریخ الشیعہ، طبع نجف، ص ۳۲) .

عزاداری اور اظہار غمِ حسین[رض] پہلی اور دوسری صدی ہجری تک یونہیں جاری رہے ، لیکن تیسری اور چوتھی صدی ہجری تک متعدّد موقعوں پر واقعاتِ کربلا عام اجتماعات میں رقّت انگیز و جوش آفرین طریقوں سے بیان ہوے ، چنانچہ شیعہ اور غیر شیعہ اس حد تک متأثّر ہوے کہ سادات حسنی کے خروج ، مختار اور ابومسلم خراسانی کی بغاوت میں اس تأثّر کا اظہار کیا .

۳۵۲ھ/۹۶۳ء میں بغداد پر دیلمیوں کا مکمل تسلّط تھا - اس سال روز عاشور بغداد میں بازار حکماً بند کر دیے گئے اور مردوں سے کہا گیا کہ نوحہ کریں نیز عورتوں کا جلوس عزا نکلوایا گیا، غرض سرکاری طور پر غم منایا گیا (ابن اثیر : کامل، بذیل حوادث ۳۵۲ھ؛ ابن کثیر : تاریخ، مصر، ۱۱ : ۲۴۳ وغیرہ) .

۳۶۶ھ / ۹۷۷ء میں عزیز باللہ فاطمی نے مصر میں یوم حسین[رض] منایا - (فوجی انقلاب سے پہلے مشہد رأس الحسین[رض] مصر میں اکابر علماء و عوام حتّٰی کہ خود شاہ فاروق جلوس کے ساتھ سبز چادر مزار پر چڑھانے جاتے اور غم مناتے تھے، رک به مجتبٰی حسن و زبیری : مصر کا محرم) - اس عہد کے لگ بھگ غور میں آلِ شَنْسَب عقیدت مندانِ اہل بیت میں شامل (رک به فرشتہ : تاریخ، لکھنؤ ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء، ۱ : ۵۴) اور سندھ کے مسلمان اسماعیلی مذہب سے وابستہ ہو چکے تھے، بلکہ بہت سے سادات ہجرت کر کے یہاں آ گئے تھے - دیلم و عراق میں شیعہ پھیل گئے تھے - اس لیے ان علاقوں میں عزاداری ہونے لگی اور یہ مراسم اتنے عام ہوے کہ ادب میں اس کے استعارات و تشبیہات استعمال ہونے لگے (رک به مثنوی رومی (تالیف قبل از ۶۷۰ھ)، طبع نکلسن، ۶ : ۳۱۷، نیز حریری (م ۵۱۶ھ)، مقامۃ ۱۰، و حمیدالدین : مقامات حمیدی (تألیف ۵۵۱ھ)، مقامۃ ۲۳ ''رزء الحسین'') - اس شہرت و عمومیت کے باعث ان مراسم میں مقامی خصوصیات اور نسلی و قومی روایات داخل ہوتے گئے .

بدایونی کے بقول ہمایوں کے عہد میں ایک ایرانی شاعر واردِ ہند نے تعزیت کے مضمون پر مشتمل ''نقش'' بنائے، جو بایّام عاشورا ''معارک''(۱) میں پڑھے جاتے ہیں (منتخب التواریخ، کلکتہ ۱۸۶۸ء، ۲ : ۳۸۱) - اکبر کے عہد میں بھی یہ سلسلہ باقی رہا؛ چنانچہ آگرے کے قلعے سے اب

[(۱) بظاہر 'اکھاڑے'، مراد ہیں - Ranking نے ترجمۂ بداؤنی، کلکتہ ۱۸۹۸ء، ۱: ۶۲۴ میں اس کا ترجمہ Assemblies یعنی مجالس کیا ہے]

تک ایک تعزیہ برآمد ہوتا ہے، جسے عہد اکبری سے منسوب کرتے اور 'مغل تعزیہ' کہتے ہیں .

[کہا جاتا ہے] کہ جہانگیر کے عہد میں سید معین الدین موسوی اجمیری کا عزاخانہ وجود میں آیا، چنانچہ یہ عزاخانہ مع وقف تاراگڑھ میں اب تک موجود ہے (عزاداری کی تاریخ)۔ عالمگیر کے عہد میں تعزیہ اور جلوسِ تعزیہ کا رواج تھا ۔ عالمگیر ھی نے جلوسِ تعزیہ میں شمشیر زنی کو ممنوع قرار دیا ۔ شاید اس کے بعد ان جلوسوں میں بانک بنوٹ کا رواج ہوا، جو بعض غیرشیعہ تعزیوں کے ساتھ اب بھی ہوتا ہے (عبدالواحد فرنگی محلی : ازالۂ اوھام، عزاداری کی تاریخ، ص ۳۰) .

اس کے بعد تو شاھان دھلی مراسمِ عزا میں اس حد تک اہتمام کرنے لگے کہ ساتویں محرم سے دسویں تک باقاعدہ نذریں اور زیارتیں، بہشتی اور فقیر و قیدی بننے کی رسمیں ادا ہونے لگی تھیں (بزم آخر، لاھور ۱۹۴۵ء، ص ۵۶ ببعد؛ عَلم حیدری و شوکت حیدری، لکھنؤ ۱۲۷۰ھ ؛ عزاداری کی تاریخ، ص ۳۴۔تفصیلات کے لیے دیکھیے میرا مقالہ بہادر شاہ ظفر کی عزاداری، طبع اسد، لاھور محرم ۱۳۷۸ھ).

دکنی ریاستیں عموماً شیعہ تھیں، اس لیے یہاں عزاداری نے بہت فروغ پایا، مجلسِ ماتم، جلوسِ تعزیہ، امام باڑے قائم ہوے؛ محرّم میں سوگ منایا گیا (ابراھیم زبیری : تاریخ بیجاپور، ص ۲۳۰ و ۳۳۴؛ نصیرالدین ھاشمی : دکن میں اردو، باب سوم : ص ۲۲۳؛ تاریخ بیجاپور؛ محی الدین زور : سلطان قطب شاہ؛ شیعہ جرائد کے محرّم نامے) ۔ قطب شاہ، غوّاصی، نصرتی وغیرہ کے مراثی (یورپ میں دکھنی مخطوطات، طبع حیدر آباد) بھی ابتدائی عہد کی یادگار ھیں ۔ حیدر آباد دکن اور راجپوتانے کی ریاستوں (خصوصاً جے پور) کے متعلق دیکھیے تحفۃالعالم (تصنیف ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء)، حیدر آباد ۱۲۹۴ھ، ص ۳۰۹ ببعد) .

تیرھویں صدی ھجری / اٹھارھویں صدی میلادی تک تمام ملک میں تعزیہ داری عام ہو چکی تھی ۔

اودھ میں عزاداری کا فروغ اور تعزیے کا رواج بظاھر عہد آصف‌الدولہ (م ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء) سے ہوا (رَکَ بہ تحفۃالعالم، ص ۳۴۸ و ۳۰۹)، لیکن بھرائچ میں سید سالار مسعود غازی کے مزار کا تعزیہ، سیتاپور میں '' باون ڈنڈوں کا تعزیہ '' پانچویں اور ساتویں صدی ھجری سے منسوب ھیں (محمد اکبر سیتاپوری : ''سیتاپور کی عزاداری،'' در سرفراز، محرم نمبر ۱۹۵۲ء، ص ۶۴).

آصف‌الدولہ نواب وزیر اودھ نے شجاع الدولہ کے بعد ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں فیض آباد چھوڑا اور لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا ۔ فیض آباد اور دھلی کے امراء، رؤسا اور شہزادے بھی یہاں آباد ہو گئے ۔ ہر ایک دھلی و فیض آباد میں تعزیہ دار تھا، لیکن آصف‌الدولہ حاکمِ مملکت ہونے کے باوجود عزاداری میں بہت زیادہ منہمک تھے ۔ وہ جہاں تعزیہ دیکھتے سواری سے اترتے اور تعزیہ دار کو انعام دیتے تھے۔ ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء میں انھوں نے اپنا امام باڑا بنوایا ۔ اس کے ساتھ ساتھ شہزادگان دھلی اور دوسرے امراء نے بھی عزاخانے تیار کیے ۔ یوں لکھنؤ تعزیہ داری کا مرکز بن گیا ۔ غازی‌الدین حیدر و نصیرالدین حیدر کے عہد میں مزید ترقیاں ہوئیں ۔ متعدد قیمتی ضریحیں یورپ سے فرمائش کر کے بنوائی گئیں اور فنّی مہارتوں کے اظہار و تکلّفات کا آغاز ہوا (عہد آصفی میں سرخ و بلوری تعزیے پہلی مرتبہ یورپ سے تیار ہو کر آئے ۔ سونے چاندی کی ضریحیں بنیں ۔ امراء و عوام نے ندرتیں پیدا کیں اور

ہنر دکھائے ۔ جن میں سے شاہ نجف و حسین آباد کے عزاخانوں میں سونے چاندی کی ضریحوں کے علاوہ موسی ضریح دیدنی ہے، جو ایک سال سے زیادہ مدت میں تعمیر ہو کر شاہی جلوس کے ساتھ برآمد ہوتی ہے) .

مسلمانوں کے علاوہ ہندو ریاستوں اور ہندو ابادیوں میں لوگ باقاعدہ تعزیہ‌داری کرتے تھے ۔ سر ٹامس براوٹن (Sir Thomas Broughton : *Letters written in a Mahratta Camp during the years* 1809-1892 نے اپنے خط عدد ے میں مرھٹوں اور محمد لطیف نے تاریخ لاھور (انگریزی، طبع جدید لاھور) میں سکھوں کے عہد کی عزاداری اور مہاراجہ شیر سنگھ کے تعزیے کا ذکر کیا ھے، محمد لطیف نے ص ۱۲۷ پر مہاراجہ شیر سنگھ کے تعزیے اور ذوالجناح کی تصویر بھی دی ھے، نیز دیکھیے ماہ نامۂ ماہ نو، استقلال نمبر ۱۹۵۳ء، ص ۵۰ (عزاداری کی تاریخ، ص ۲۳) .

شیعہ ریاستیں تو خیر مذھبی فرض سمجھتی تھیں، سنّی نوابین بھی ثواب کی نیّت سے تعزیہ رکھتے، امام باڑے بنواتے اور وقف کرتے تھے، جن میں نظام دکن خاص طور پر قابل ذکر ھیں ۔ ان کے محل میں اب بھی تعزیہ و تعزیہ خانہ موجود ھے ۔ غیر مسلم ریاستوں میں اندور، دھولپور، دتیہ، کپورتھلہ کے علاوہ مہاراجہ گوالیار اور مہاراجہ جے‌پور کے تعزیے مشہور ھیں .

ان ریاستوں میں تعزیہ‌داری کے لیے سرکاری اوقاف ھیں (مجلۃ العرب، بمبئی، شمارۂ محرم ۱۳۶۰ھ؛ عزاداری کی تاریخ، ص ۲۱) .

ایران میں تعزیے کا رواج نہیں، ھاں شبیہ یا تمثیل رائج ھے ۔ عراق میں عَلَم اور ذوالجناح برآمد ھوتے ھیں اور اس جلوس کو "موکب" کہتے ھیں ۔ کشمیر، نیپال اور افریقہ میں تعزیہ داری ھوتی ھے اور بڑی حد تک وھی انداز ملحوظ رکھا جاتا ھے جو پاکستان میں رائج ھے .

پاك و ھند میں تعزیے کا عام رواج ھے ۔ جلوسِ تعزیہ جس میں تعزیہ دار کی مقامی روایتیں پیش نظر رکھی جاتی ھیں؛ مثلاً لکھنئو، رام پور، جے پور وغیرہ میں تعزیے کا جلوس یوں نکلتا ھے جیسے ان کے گھر سے کسی معزز مرنے والے کا جنازہ نکلے، یعنی جلوس میں ماھی مراتب، ھاتھی، اونٹ، گھوڑے، فوجی باجے، ماتمی جھنڈیاں، با وردی سپاھی، برقنداز، عصا بردار، پھر ماتم دار و تعزیہ دار سر برھنہ، ماتمی لباس پہنے، سروں پر خاك پڑی، سینوں پر ھاتھ اور آنکھوں پر رومال رکھے، اشک افشاں آھستہ آھستہ جاتے ھیں ۔ ان کے پیچھے ایک نقیب یہ آواز دیتا جاتا ھے :

سواری ھے شہِ کرب و بلا کی
سواری ھے ھمارے بادشا کی

یا اس مضمون کو قطعے کی شکل میں بلند آواز سے پڑھتا، کوچ کا نقارہ بجاتا، خود روتا اور مجمع کو رلاتا جاتا ھے ۔ بعض جلوسوں میں ماتمی باجے بجتے ھیں ۔ ماتمی دستے سینہ زنی، قمع زنی اور زنجیر زنی بھی کرتے ھیں ۔ ایک دو جلوس بالکل خاموش بھی رھتے ھیں ۔ راجہ، نواب، شہزادے عام شرکاء کی طرح ادب سے پاپیادہ شریکِ جلوس ھوتے تھے ۔ اس وقت ملازمین پر سے آداب و رواسم شاھی ساقط ھوتے تھے .

عام تعزیوں کے اٹھانے کا طریقہ یہ ھے کہ تعزیہ دار تعزیہ سر یا کاندھوں پر رکھے خاموشی سے "کربلا" جاتے ھیں، یا ماتمی دستے یا سوزخوان بھی ساتھ تابوت، ذوالجناح یا گھوارۂ علی اصغر کی شبیہیں لیے، آنسو بہاتے، سینہ زنی کرتے جاتے ھیں اور کربلا یا قبرستان پہنچ کر قابلِ دفن تعزیوں کو دفن کر دیتے ھیں ورنہ انھیں باقی تبرکات کے ساتھ

محفوظ کر کے واپس لے آتے ہیں ۔

تعزیہ داری کا سلسلہ ۲۸ - ۲۹ ذی الحجۃ سے ۸ ربیع الاول تک جاری رہتا ہے ۔ پاکستان، کشمیر، نیپال اور افریقہ میں عموماً ۱۰ محرم (روزِ شہادت امام حسین) کو تعزیے دفن کر دیے جاتے ہیں، لیکن ھندوستان کے بعض مقامات پر، خصوصاً لکھنئو میں، یہ سلسلہ ۸ ربیع الاول (روزِ شہادت امام حسن عسکری) کو ختم ہوتا ہے اور ''چپ تعزیہ'' (کیونکہ اس کے جلوس میں مکمل خاموشی رہتی ہے) آخری تعزیہ سمجھا جاتا ہے ۔ اب پاکستان کے متعدد مقامات پر اس طرح کے جلوس نکلنے لگے ہیں.

تعزیہ روضۂ امام حسین کی نسبت سے اور ایک محترم علامت ہونے کے باعث اہل تشیّع کے نزدیک غلافِ خانۂ کعبہ اور محملِ مصری کی طرح محترم سمجھا جاتا ہے مگر وہ اسے عقیدت، روایت اور تأریخی حیثیت سے بہت اہم سمجھنے کے باوجود مذہباً اس کی پرستش کو حرام سمجھتے ہیں ۔

مآخذ: (۱) نجم الدین جعفر بن نجیب الدین محمد (م ۶۴۵ھ): مثیر الاحزان معروف بہ مقتل ابن نما، طبع ایران ۱۳۱۸ھ؛ (۲) میرزا ابراہیم زبیری: تأریخ بیجاپور، بساتین السلاطین، طبع مطبع سیدی حیدرآباد دکن، تأریخ ندارد؛ (۳) محمد حسین المظفری: تأریخ الشیعۃ، طبع نجف ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۷ء؛ (۴) عبداللطیف شوستری: تحفۃ العالم، حیدرآباد دکن؛ (۵) سید سبط الحسین ھنسوی: عزاداری کی تأریخ، طبع دوم، نظامی پریس لکھنئو ۱۹۴۱ء؛ (۶) محمد ہادی حسین حسینی: نقوشِ راہ (موجود عزاداری کا جائزہ)، کراچی، نیز ''تعزیہ داری کا رواج''، در رضاکار، محرم نمبر ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۸ء، ص ۳۲؛ (۷) مرزا حیدر شکوہ تیموری: شوکتِ حیدری (مثنوی)، سلطان المطابع لکھنئو؛ (۸) مرتضی حسین: ''عزاداری'' در عہد بنی امیّہ و عہد بنی عبّاس، علی الترتیب در مجلّۂ رضاکار، ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء، ص ۹۷ و مجلّۂ اسد لاہور، مجاہد اعظم نمبر ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۸ء؛ (۹) بلال زبیری: ''معرکۂ محرم''، در رضاکار، محرم نمبر ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۷؛ (۱۰) حافظ ذوالفقار علی شاہ: '' تعزیہ، ذوالجناح اور علم''، در رضاکار، لاہور، محرم نمبر ۱۹۵۳ء، ۱۱۷؛ (۱۱) مختلف شہروں اور علاقوں اور ملکوں اور بعض افراد کے تعزیوں کے کوائف کے لیے دیکھیے مقالات ذیل: برائے جائس: کلب مصطفیٰ: در پیام اسلام، محرم نمبر ۱۳۶۸ھ؛ برائے حیدرآباد سندھ: آنسہ ایف ۔ علی نواز بیگ، در اسد، لاہور، اربعین نمبر ۱۳۷۳ھ، ص ۷۳؛ برائے ایران: مسعود حسن ادیب: در پیام اسلام، محرم نمبر ۱۳۶۸ھ؛ برائے اردبیل: ایک انگریز، در اسد، مجاہد اعظم نمبر ۱۹۵۲ء؛ برائے عراق: سید قائم مہدی: در رضاکار، اربعین نمبر ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۱ء و عبدالصمد: در شیعہ، لاہور، اربعین نمبر ۱۹۵۸ء؛ برائے سیتاپور: محمد اکبر: در سرفراز، لکھنئو، محرم نمبر ۱۹۵۲ء؛ برائے ڈیرہ اسمٰعیل خان: ہادی حسین در رضاکار، لاہور، اربعین نمبر ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۵ء؛ برائے مصر دورِ فاطمیہ: مجتبیٰ حسن کاموں پوری: در رضاکار، لاہور، اربعین نمبر ۱۹۵۳ء؛ برائے حیدرآباد دکن: سید کمال اصغر: در سرفراز، لکھنئو، ۹ نومبر ۱۹۵۷ء؛ ریاست ڈمراؤں: فدیۂ مجتبیٰ: در استقلال، لکھنئو، محرم نمبر ۱۹۵۱ء؛ برائے ''المسلمون فی الہند'': عبدالمنعم العدوی: در مجلّۃ العرب، بمبئی، جلد ۲: نمبر ۱۰؛ برائے بہادر شاہ ظفر: مرتضی حسین: در شیعہ، لاہور، محرم نامہ ۱۹۵۸ء؛ برائے روایات راجع بہ تیمور و آل تیمور: رضاکار، محرم نمبر ۱۳۷۸ھ؛ برائے محمد حیدر شکوہ تیموری: علم حیدری، لکھنئو ۱۲۷۰ھ، ص ۱۵، عزاداری کی تأریخ، ص ۴۸، ۲۴ و ۵۰ ح؛ نیز دیکھیے مرتضی حسین: ''اسلام کی رگ حیات: عزاداری سیّد الشہداء''، در پیام عمل، لاہور،

محرم ۱۳۲۸ھ/۱۹۰۸ء؛ وشیخ تصدق حسین: ''لکھنؤ کے مآثر متبرکہ''، در روشنی، لکھنؤ، محرم نمبر ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء؛ وہی مصنف، ''محرم کا تمدنی پہلو''، در سرفراز، لکھنؤ، محرم نمبر ۱۹۵۲ء؛ اختر حسین: ''ھندوستان کے غیر معروف مآثر متبرکہ''، در سرفراز، محرم نمبر ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء.

(مرتضٰی حسین فاضل)

مزید مآخذ از آآ: (۱) W. Litten: *Das Drama in Persian*، برلن ۱۹۲۹ء؛ (۲) A. Chodzko: *Théatre persan*، پیرس ۱۸۷۸ء؛ (۳) Lewis Pelly: *The Miracle Play of Hasan and Husain*، ۲ جلد، لنڈن ۱۸۷۹ء؛ (۴) Ch. Virolleaud: *La passion de l'imam Hosseyn*، پیرس ۱۹۲۷ء؛ *The Glory of the Shiah World*، طبع و ترجمہ P. M. Sykes و خان بہادر احمد دین خان، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۵) J. Morier: *Second Voyage en Perse*، پیرس ۱۸۱۸ء؛ (۶) M. de Gobineau: *Les religions et les philosophies dans l'Asie Centrale*، طبع دوم، پیرس ۱۸۶۶ء؛ (۷) J. Lassy: *The Muharram Mysteries among the Azerbeijan Turks of Caucasia*، *Helsingfors* ۱۹۱۶ء؛ (۸) E. G. Browne: *A History of Persian Literature in Modern Times*، کیمبرج ۱۹۲۴ء، ص ۱۷۲ ببعد اور اس پر H. Ritter، در *Isl.*، ۱۵ (۱۹۲۶ء): ۱۰۷؛ (۹) B. D. Eerdmans: *Der Ursprung der Ceremonien des Hosein-Festes*، *Z.A.*، ج ۹، ۱۸۹۴ء)؛ (۱۰) G. van Vloten: *Les drapeaux en usage à la fête de Huçein à Téhéran* (*Internationales Archiv für Ethnographie*, v. [1892], 3)؛ (۱۱) E. Aubin: *Le chiisme et la nationalité persane*، در *RMM*، ۴، ۱۹۰۸ء).

(R. STROTHMANN)

* **تَعْطِیل**: علم عقائد کی ایک اصطلاح، جس کے معنی ہیں خدا کے تصور کو تمام صفات سے منزہ کرنا، دیکھیے ''تشبیہ''.

* **تَعْلِیق**: رک بہ خطّ (تأریخ ارتقاء).

* **تَعْمِیر**: رک بہ فنّ تعمیر (عمارت).

* **تَعْوِیذات**: رک بہ حمائل.

تَغَابُن: (التغابن) اس سورۃ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی نویں آیت میں 'یوم التغابن' آیا ہے، جو حشر کے دن کی نسبت استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں اٹھارہ آیات ہیں۔ ترتیبِ نزول کے لحاظ سے اس کا عددِ سلسلہ ایک سو آٹھ ہے، لیکن آنحضرت صلعم نے اسے جس ترتیب سے لکھوایا (اور جس کے مطابق عالم اسلامی کا رائج مصحف عثمانی ہے) اس کے اعتبار سے اس سورۃ کا عددِ سلسلہ چونسٹھ ہے۔ قرآن مجید میں اس سورۃ کو مدنی لکھا گیا ہے، لیکن چونکہ اس میں مکّی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے مطالب ادا کیے گئے ہیں اس لیے بعض کو خیال ہوا کہ شاید یہ مکّی سورت ہے.

سورت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو تین مطالب میں منقسم ہے۔ پہلی چار آیتوں میں اللہ تعالٰی کی خالقیّت اور اس کے بے پایاں علم کو نہایت بلیغ اور دل آویز پیرایے میں بیان کیا گیا ہے اور اس کی قدرتِ کاملہ کے ثبوت میں زمین و آسمان کی پیدایش اور انسان کی خلقت کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کافروں کو ان الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ پہلی قوموں کو دیکھو انھوں نے انبیاء و رسُل کا اور حیاتِ اُخروی کا انکار کیا اور آخر کار ان پر اس انکار کا وبال پڑا، پھر تم کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا کیوں انکار کرتے ہو؟ تمھیں لازم ہے کہ اللہ اور رسول اور نورِ منزّل پر ایمان

لاؤ، یوم الجمع میں مؤمنِ نیکوکار کو ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل کیا جائے گا اور کافر کو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اس بات کی فہمائش کی گئی ہے کہ اپنے اہل و عیال کی محبت میں خدا کو نہ بھول جائیں، کیونکہ ان سے بے جا محبت خطرے سے خالی نہیں۔ انسان کا مال و دولت اور اس کی اولاد اس کے لیے فتنہ یعنی آزمائش ہے ۔ اس آزمائش میں پورا اترنے کی یہی تدبیر ہے کہ خدا سے حتی الوسع ڈرا جائے ۔ اس کے احکام کی پابندی کی جائے اور اس کے راستے میں مال اور دولت خرچ کی جائے، کیونکہ صدقہ و خیرات میں انسان کی بہتری اور بھلائی مضمر ہے۔

مآخذ : دیکھیے تفاسیر متداولہ .

(عنایت اللہ)

تُغاتیمور : مغول خان، جس کا خاندان جُرجان میں ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء سے پہلے ایک سو سال تک حکمران رہا .

نام : اس خان کے نام کا تلفّظ تُغا یا توغا ہے ۔ ظفرنامہ میں اسے طُغی (یعنی تُغای Tughai?) لکھا ہے؛ ایک سکّے پر، جسے فراین Fraehn نے شائع کیا ہے، اسے توغان کی صورت میں لکھا گیا ہے (بخط مغولی؛ قب Howorth هوورث : کتاب مذکور در ذیل، ۳ : ۷۱۸) [سامی بک نے اسے طغان تیمور خان لکھا ہے، قاموس الاعلام، ۴ : ۳۰۱۲] .

خاندان : (۱) تُغاتیمور بن سُری (سُری کُری ؟) ابن بابا بہادر، چھٹی پشت میں چنگیز خان کے ایک بھائی کی اولاد میں سے تھا (جوچی قسر، شجرة، ص ۳۱۰، مائلز Miles نے اسے غلط سمجھا ہے)۔ ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں بابا بہادر اپنے 'تومان' (دس ہزار کنبوں) کے ساتھ خراسان میں آیا اور اُولجائتوخان کی ملازمت اختیار کر لی ۔ ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء میں اس نے خوارزم پر لشکر کشی کی ۔ سرقی قپچاق کے خان، اُوزبک کی شکایت پر اُولجائتو نے بابا اور اس کے بیٹے سُری (شجرة، ص ۳۲۱ و ۳۳۰؛ d'Ohsson : *Hist. des Mongols*، ۴ : ۵۷۲ تا ۵۷۵) کو قتل کرا دیا ۔ بابا کا قبیلہ مازندران میں مقیم رہا (اس زمانے میں مازندران میں جرجان اور طبرستان کا مشرقی حصہ شامل تھا، نُزهة القلوب : ۱۵۹) .

ابو سعید ایلخانی کی وفات (۷۳۶ھ) کے بعد ایران میں فوضویت پھیل گئی ۔ حسن بزرگ جلائری نے محمد کو، جو مدعیِ حکومت تھا، تخت پر بٹھا دیا ۔ حسن بزرگ کے امیروں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور ان میں سے کئی ایک، مثلاً اِگرینج Igrändj اویغوری (Miles نے اسے کتاب مذکور، ص ۳۱۰ و ۳۲۰ میں مصحفًا اکرپخ لکھا ہے) خراسانی امیروں (شیخ علی بن علی قوشجی، علی جعفر، ارغون شاہ) کی امداد سے تُغاتیمور کے پاس پہنچے، اور ۷۳۷ھ / ۱۳۳۷ء میں اسے خان بنا کر اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۔ تُغاتیمور اپنے اُمراء کو ساتھ لے کر آذربایجان کی طرف بڑھا؛ یہاں اس سے موسٰی بھی پھر سے آ ملا ۔ موسٰی تاج و تخت کا دوسرا دعویدار تھا اور اس کی حمایت اویرات قبیلے کے لوگ (Oyrats) کر رہے تھے ۔ تُغاتیمور اور موسٰی دونوں نے یہ تجویز کی کہ ایران کو آپس میں بانٹ لیں، لیکن حسن بزرگ نے گَرم رُود کے مقام پر ۶ ذوالحجة ۷۳۷ھ کو انھیں شکست دے دی (گرم رود میانہ کے مغرب میں ہے، شجرة الاتراك، ص ۳۱۶؛ d'Ohsson، ۴ : ۷۲۶) ۔ تُغاتیمور بسطام کی طرف ہٹ گیا، جہاں وہ مازندران (اس معنی میں جو اوپر مذکور ہوا) اور خراسان کے علاقوں پر

حکمرانی کرتا رہا ۔ اسی زمانے میں خراسان کے وزیر خوجه علاءالدین محمد کے ملازمین و متوسّلین کی زیادہ‌ستانیوں کی وجه سے بغاوت برپا ہو گئی اور سَرْبَداروں [رَکَ بآن] کو اقتدار حاصل ہو گیا ۔ انھوں نے قوت پکڑی تو تُغاتیمور کے نفوذ میں خاصی کمی واقع ہو گئی ۔ تُغاتیمور کے تعلقات هرات کے کَرْت خاندان سے دوستانه تھے، کیونکه اس کی بیٹی سلطان خاتون مُعزّالدین کَرت کو بیاهی گئی تھی (ظفرنامه، ١ : ٣٢٠) ۔

٧٣٩ھ/١٣٣٨ء میں حَسَن بُزُرگ نے خود تغاتیمور کو عراق آنے کی دعوت دی؛ چنانچه وه ارغون شاه بن نوروز کے ساتھ وهاں گیا، یه ارغون شاه مشهور و معروف ارغون آقا کا پوتا تھا (قَبْ جوینی، ٢ : ١٠٢)۔[یه خاندان نیشاپور، طُوس اور کَلات [در خابرانِ طوس، جوینی، ٢ : ١٠٩] پر حکمران تھا اور مغولی زبان میں جاؤن (جُون) غُرْبان اور ایران میں جانیِ قُربانی کے نام سے مشهور ہے]۔ حَسَن بُزُرگ تُغاتیمور سے ساوه کے مقام پر ملنے گیا، لیکن ایک طرف تو خوجه علاءالدین محمد نے، جس کے هاتھ میں مالیات کا انتظام تھا، لوگوں کو ٹھنڈا کیا، دوسری جانب خان نے خود حَسَن کُوچک چوبانی سے گفت و شنید شروع کر دی۔ حَسَن کُوچک نے موقع کو غنیمت پا کر خان اور حَسَن بُزُرگ کے درمیان غلط فهمی پیدا کر دی ۔ اس سازباز سے تنگ آ کر وه سیدھا سادھا مغول حکمران اسی رات مراغه (؟) سے کوچ کر کے خراسان واپس چلا گیا (شَجَرة، ص ٧٣٢؛ d'Ohsson، ٤ : ٧٣٢) .

٧٤١ھ/١٣٤١ء میں تُغاتیمور نے عراق پر تیسری بار حمله کیا۔ اولجائتو خان کی بیٹی شهزادی ساتی Sati اور شهزادی کا بیٹا شِبرغان، جو امیر چوبان سے تھا، اس کی حمایت پر تھے، لیکن تغاتیمور کے لشکر کو، جس کی کمان اس کے بھائی علی گاؤن کے هاتھ میں تھی، حسن کُوچک کی فوجوں نے اَبْهَر کے مقام پر شکست دی .

خراسان بهت جلد سَرْبَداروں کے تصرف میں آ گیا اور انھوں نے ارغون شاه والی نیشاپور و طُوس کو وهاں سے نکال دیا ۔ وَجیه‌الدین‌مسعود سَرْبَدار نے خان [تغاتیمور] کی افواج کو دریاے اَتْرَك پر شکست دی، علی گاؤن کو قتل کیا اور کچھ عرصے تک جُرجان پر بھی قابض رها ۔ تُغاتیمور کو اب بقول دولت شاه (ص ٢٣٦ تا ٢٣٧) '' نام و رسمِ سلطنت '' هی پر اکتفا کرنا پڑی، گو سَرْبَدار سال میں ایک مرتبه '' ملازمت و تجدیدِ عهد '' وفاداری کے لیے [بَیْهَق سے] تُغاتیمور کے دربار میں [استرآباد کے مقام پر] حاضر هوتے رہے ۔ ایک دفعه اسی قسم کی حاضری کے موقع پر سَرْبَدار یحیی کَرابی [منسوب به قریهٔ کَراب از بیهق] نے تغاتیمور کو سلطان دُوِین کے مقام پر (گرگان اور قره صُو کے درمیان) بر سرِ دربار قتل کر ڈالا ۔ [ایک عزیز نے ایک قطعے میں اس واقعے کی تاریخ (روز شنبه) ١٦ ذوالقعدة ٧٥٤ھ/دسمبر ١٣٥٣ء بتائی ہے] ۔ بقول دولت شاه تُغاتیمور [کمینے اور بد اصل لوگوں کا مربّی اور بزرگ زادوں کا مخالف تھا ۔ اس لیے اکابر اس سے بیزار هو کر سربداروں سے مل گئے] ۔ وه موسم (بهار) رادکان [کے میدان اور مرغزاروں میں] اور موسم سرما [رُودِ جرجان اور استرآباد کے موضع سلطان دُوین] میں گزارا کرتا تھا ۔ اس نے مشهد میں خوبصورت عمارتیں بنوائیں ۔ تُغاتیمور کے عهد کے سکّے نه صرف آمُل، مشهد، قزوین وغیره میں مضروب هوے بلکه بصرے (٧٤١ھ) اور بغداد میں بھی (٧٤٠ھ کے بعد) مضروب هوتے رہے ۔ اس سے ظاهر هوتا ہے که اسے کم از کم رسمی طور پر

وسیع اقتدار حاصل تھا (ملاحظہ ھو لین پول S.Lane-Poole : *Catalogue of Oriental Coins in Br. Mus.*، جلد ۶ (۱۸۸۱ء): ۹۸ تا ۱۰۱)۔ بقول مجمع الفصحاء ابن یمین شاعر [مشہور] تغاتیمور کے مدح سراؤں میں سے تھا (براؤن : *Pers. Liter. under Tartar Dominion*، ص ۲۱۶)۔ بعض مستند اقوال کے مطابق خود خان بھی شعر گوئی کا ملکہ رکھتا تھا (v. Hammer : کتاب مذکور، ص ۱۳۳)، چنانچہ سکّوں پر اس کا لقب ''السلطان العالم'' منقوش ھے [جو اس کی علمی فضیلت پر دلالت کرتا ھے] .

کچھ مدّت گزرنے کے بعد، جس کے دوران میں سَرْبَداروں نے اَسْتَرآباد میں اپنا والی مقرر کر دیا تھا، جُرجان کی عِنانِ حکومت تغاتیمور کے پرانے سپہ سالار (؟) ... ولی بن شیخ علی ھندو (یا یِسُود) کے ھاتھوں میں منتقل ھو گئی۔ امیر نَسا کی مدد سے (جو جاؤن غُربان کے خاندان سے تھا) اس نے سَرْبَداروں کو شکست فاش دی اور ایک ریاست قائم کر لی، جس میں اَسْتَرآباد [کے علاوہ]، بِسطام، دامْغان، سَمْنان اور فِیرُوز کوہ [تا رَےّ و رُستمدار] (مطلع سعدین، بذیل وقائع ۷۶۱ھ، منقول در Dorn : *Auszüge*، ص ۱۰۰ تا ۱۰۷ [و نسخۂ خطی، کتابخانۂ محمد شفیع]) شامل تھے۔ ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء میں اس نے علاقۂ رَےّ فتح کرنے کی کوشش کی، لیکن اُوَیس جَلائر نے اسے شکست دے دی۔ اس سے اگلے سال اُوَیس نے امیر ولی کو برطرف کرنے کی اس مہم کو دوبارہ شروع کیا، اس لیے کہ وہ اُسے برطرف کرنے کا سخت آرزومند تھا، لیکن وہ اُوجان سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ۷۷۴ھ میں امیر ولی نے مظفری خاندان کے حکمران شاہ شجاع کی انگیخت سے رَےّ اور ساوہ پر قبضہ کر لیا، مگر اُوَیس کی وفات (۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء) کی وجہ سے مزید فوجی تیاریاں بند ھو گئیں (مارکوف Markov : *Katalog Djelayir Monet*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۷ء، ص xiv)۔ جب ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں تیمور نے اِسْفَراین کو، جس پر امیر ولی کی حکومت تھی، فتح کر کے زمین کے برابر کر دیا (ظفر نامہ، ۱ : ۳۲۵) تو امیر ولی نے فاتح کے ایلچی کی بڑی تعظیم و تکریم کی، لیکن جونھیں تیمور سمرقند کو واپس ھوا، امیر ولی نے علی بیگ بن ارغون شاہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے، جس نے کَلات اور طُوس فتح کر لیا تھا (ظفر نامہ، ۱ : ۳۲۴)، علی مُؤَیَّد سَرْبَدار کے خلاف پیش قدمی کی۔ تیمور نے اسی سال (۱۳۸۱-۱۳۸۲ء) کے موسم سرما میں خراسان واپس آ کر کَلات کا محاصرہ کر لیا اور یہاں سے جُرجان کی طرف بڑھا چلا گیا، پھر روغی [کذا، رُوغَد ؟ رَکَ بہ نزھۃ القلوب، ص ۱۶۰] کے راستے سے کَبُود جامہ اور شاسْمان گیا (کَبُود جامہ، جسے آج کل حاجّی لَر کہتے ھیں، رُودِ گرگان کے بائیں کنارے کی معاون ندی پر ناردین اور گنبدِ کابُوس کے درمیان واقع ھے)۔ امیر ولی نے فی‌الفور تیمور کی خوشنودی کے حصول کی غرض سے تحایف بھیجے اور وہ سَمَلْقان (وادی اَتْرَک میں [ظفر نامہ : شملغان و چرمغان]) کے راستے واپس مرغزار رادکان میں جا ٹھیرا (وھی کتاب، ص ۳۴۹ و ۳۰۱)۔ اس دوران میں علی بیگ [جون غربانی] بھی مطیع و منقاد ھو گیا اور اسے اس کے متعلّقین سمیت ماوراء النھر میں جلا وطن کر دیا گیا۔ علی بیگ کو ۷۸۳ھ میں (وھی کتاب، ص ۳۰۰) اَنْدِجان میں [جہاں وہ قید تھا] قتل کر دیا گیا۔

۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء میں تیمور نے امیر ولی کے علاقوں میں اپنے لشکر بھیجے اور سیستان فتح کرنے کے بعد امیر ولی کے مقابلے میں بذاتِ خود فوج کشی کی، چنانچہ گاوَرس (ظفر نامہ : گاوکرش) کی لڑائی کے بعد قلعۂ دُرُون کو ([راابینو : دَرُون کَلا]،

جو اشک آباد اور قزل اَرْوَت [رابینو: Mazandran، ص ۱۱۸، سطر آخر و ۹۲] کے عین وسط میں ہے) فتح کر لیا (وہی کتاب، ۱ : ۳۸۲) - تیمور نے دِھسْتان اور جِیلاؤوں (= مشہدِ مصریان بر لبِ دریاے اَتْرَک، چات [رابینو: (کتاب مذکور) ص ۱۰۱] سے نیچے) میں اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور دریاے گُرگان عبور کر لیا - امیر ولی نے بڑی بہادری سے اس کی پیش‌قدمی کو قدم قدم پر روکا، لیکن اس کا شب خون (شوال ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) ناکام رہا، اور تیمور نے اَسْتَرآباد پر قبضہ کر لیا - امیر ولی نے اپنے اہل و عیال کو گِرد کوہ (نزد دامْغان) میں چھوڑا اور خود مغرب [رےّ] کی طرف فرار ہو گیا (وہی کتاب، ۱ : ۳۸۲ تا ۳۸۶) - اس نے توقْتَمِش کے خلاف تبریز [رَکَ بآن] کی مدافعت میں حصّہ لیا اور آخرکار اپنے میزبان محمود خَلْخالی کی غدّاری کی وجہ سے ۷۸۸ھ / ۱۳۸۶ء میں مارا گیا (وہی کتاب، ص ۳۹۲، ۳۹۸).

(۳) لقمان پادشاہ بن تغاتیمور کو امیر ولی نے جُرجان سے نکال دیا اور اس کا ملک غصب کر لیا تھا، مگر تیمور نے ۷۸۶ھ میں اسے اس کی موروثی جاگیر پر از سر نو بحال کر دیا [اور ساری اور آمُل کے حکّام اور والیوں کو، جو سیّد تھے، ہدایت کی کہ لقمان پادشاہ کی متابعت کریں اور (اس کی) صواب دید سے تجاوز نہ کریں] (وہی کتاب، ص ۳۸۷، ۳۹۱) .

۷۹۴ھ/۱۳۹۱ء کی مہم کے زمانے میں استرآباد کی ولایت (۴) پیر [یا پیرک] پاشا بن لقمان پاشا (= پادشاہ؛ ظفر نامہ، ۱ : ۵۷۰) کے زیر فرمان تھی، جسے تیمور نے اس کے والد کی وفات کے بعد وہاں تخت نشین کیا تھا - پیر پاشا نے بڑے وسیع پیمانے پر تیمور کی خاطر و مدارات کی اور ماہانہ سر (آمُل سے ۴

فرسخ) کی فتح کے لیے اسے جہاز بھی مہیا کیے - اس کی وفا کیشانہ خدمات کا ذکر ۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء کے واقعات میں بھی آتا ہے، جب تیمور نے مازَنْدران (وہی کتاب، ۲ : ۵۹۱) میں اسکندر چِلاوی کے خلاف فوج کشی کی تھی - شاہ‌رخ کے عہد حکومت کے آغاز میں سلطان علی سبزواری نے سَرْبَداروں کی جمعیت اکٹھی کر کے خراسان میں عَلَمِ بغاوت بلند کیا - پیر پادشاہ بھی اچانک جُوین میں آ دھمکا اور سلطان علی کے ساتھ شامل ہو گیا، لیکن سیّد خواجہ نے، جسے شاہ‌رخ نے بھیجا تھا، دونوں حلیفوں کو شکست دی (مطلع سعدین، N.E.، ۱۸۴۳ء، ص ۲۶؛ [طبع لاھور، ۲ / ۱ : ۱۸])-سلطان علی نے اپنے حلیفوں سمیت میراں شاہ کے ھاں پناہ لی، جو آذربایجان سے آیا تھا ، لیکن اس نے انھیں سیّد خواجہ کے حوالے کر دیا - اس موقع پر پیر پادشاہ کے متعدّد بیٹے سیّد خواجہ کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے (وہی کتاب، ص ۴۵، ۸۰؛ [طبع لاھور، ۲ / ۱ : ۳۴، ۵۵]) - ۸۰۸ھ میں شاہ‌رخ نے پیر پادشاہ کو جان بخشی کا وعدہ دیا اور اسے اپنے دربار میں طلب کیا - ادھر سیّد خواجہ کو تشکّر و امتنان کی وجہ سے عنایاتِ بے حساب کا مورد بنایا ، مگر سیّد خواجہ اس سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا اور ہوسناکی کے منصوبے باندھنے لگا، چنانچہ اس نے فارس کے حکمران اسکندر سے ساز باز کی اور بالآخر عَلَم بغاوت بلند کر دیا، مگر کَلات سے بھاگ کر اسے پیر پادشاہ کی پناہ میں آنا پڑا - اس سے مشتعل ہو کر شاہ رخ نے مازَنْدران پر لشکر کشی کر دی (۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء) - پیر پادشاہ کے ساتھ بہت سی فوج تھی، لیکن اس نے شکست کھائی اور وہ خوارزم کی طرف بھاگ گیا اور سیّد خواجہ شیراز چلا گیا - شاہ‌رخ نے شہزادۂ عُمر بہادر کو

مازندران کا والی مقرر کیا، لیکن وہ بھی جلد باغی ہو گیا اور اس کی جگہ اولوغ بیگ مقرر ہوا ۔ ۸۱۰ھ میں اس نے اپنے باپ شاہرخ کو اطلاع دی کہ پیر پادشاہ از سر نو تیاریاں کر رہا ہے، اس پر شاہرخ دوسری بار مازندران کی طرف روانہ ہوا اور جب پیر پادشاہ کو اس کی پیش قدمی کی خبر ملی تو رستمدار کو بھاگ گیا اور بادوسپان خاندان کے امیر کیومرث بن بیستون [زامباور، ص ۱۹۱] کی پناہ لینے پر مجبور ہو گیا اور شاہرخ نے جنگ و جدال کے بغیر استرآباد اور شاسمان پر دوبارہ اپنا تسلط جما لیا ۔

۸۱۲ھ میں پیرپادشاہ کا بیٹا (۵) سلطان علی شاہرخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سیستان کی مہم میں حصہ لیا، لیکن اپنے باپ کی وفات کی خبر پاکر وہ رستمدار کی طرف فرار ہو گیا اور وہاں امیر کیومرث کی مدد حاصل کی اور اپنے باپ کی فوجوں کو بھی جمع کیا ۔ جب شاہرخ ماوراء النہر کی طرف روانہ ہو گیا تو سلطان علی نے استرآباد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن وہاں کے والی نے اسے شکست دے کر قتل کر ڈالا اور اس کا سر ہرات بھیج دیا [مطلع سعدین، در Auszüge : Dorn ، ص ۱۹۰ ؛ [طبع لاہور، ۲/۱ : ۵۷ تا ۸۰، ۱۰۴، ۱۵۲]) .

مآخذ: (۱) قب مادہ سربداریہ ؛ (۲) دولت شاہ : تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ص ۲۳۶ تا ۲۳۷، ۲۸۰، ۲۸۲ تا ۲۸۳ ؛ بمبئی ۱۸۸۷ء، ص ۱۰۴، ۱۲۳ ؛ (۳) شجرۃ الاتراک، ترجمۂ Miles ، لنڈن ۱۸۳۸ء، ص ۳۰۵، ۳۲۰ تا ۳۲۶ [تاریخ اربعۂ الوس منسوب بہ اولوغ بیگ کی تلخیص؛ تلخیص کنندہ کا نام معلوم نہیں ، قب بارٹولڈ : Turkestān ، طبع وقفیۂ گب، ص ۵۷؛ یہ ابوالغازی کی کتاب شجرۂ ترک سے بالکل مختلف ہے]؛ (۴) میر خواند : روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء، ۵ : ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۵۱ ؛ (۵) خوندمیر : حبیب السیر، [بمبئی ۱۲۷۳ھ]، ۳/۱ : ۱۲۸، ۱۲۹، [۱۳۰، ۱۳۱] : (۶) Die : Dorn Geschichte der Serbedare nach Chondemir، ۱۸۴۹ء، ص ۱۴۶، ۱۵۰، ۱۵۵ ؛ (۷) Auszüge : Dorn aus Muham. Schriftstellern، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۸ء، قب اشاریہ تحت تغا تیمور خاں ، امیر ولی، لقمان اور پیر پادشاہ ؛ (۸) منجم باشی، ۳ : ۱۲۰ ؛ (۹) Histoire des Mongols : d'Ohsson، ۴ : ۷۲۶ ببعد؛ (۱۰) ہامر : Geschichte d. Ilchane، ۲ : ۳۱۷ تا ۳۴۲ ؛ (۱۱) Hist. of the Mongols : Howorth، ۳ : ۶۳۸، ۷۱۷ تا ۷۲۶ ؛ (۱۲) Lane - Poole : Mohammadan Dynasties، نیز بارٹولڈ کے زیادات، جو روسی ترجمے میں ہیں، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۹ء، ص ۲۴۹ ؛ (۱۳) Mazandaran : Rabino، ۱۹۲۸ء، طبع وقفیۂ گب، اشاریہ .

(V. Minorsky منورسکی)

تُغُزغُز : ترکی نسل کی ایک قوم ہے ۔ یہ نام مختلف صورتوں میں لکھا اور بولا جاتا تھا ۔ تغزغز کی آبادیوں کے متعلق جو معلومات عربی کتابوں میں درج ہیں وہ ان بیانات کے مطابق ہیں جو چینی مصنفین اور متأخر مسلم مصنفین نے اویغوروں کی آبادیوں کے بارے میں دیے ہیں ؛ چینی مصادر کے بموجب اویغور نو قبیلوں میں منقسم تھے؛ اور بقول رشیدالدین (متن در Trudî Vost. Otd. Arkh. Obshč. ، ۷ : ۱۶۱) اویغور دو بڑے گروہوں میں منقسم تھے : اون اویغور (دس اویغور) اور طوقوز اویغور (نو اویغور) ۔ انہیں حقائق کی بنا پر گرگوریف Grigoryew نے یہ نظریہ قائم کیا تھا اور اسے عام طور پر تسلیم بھی کر لیا گیا تھا (Vostočnîy Turkestan, vîp.2، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۳ء، ص ۲۰۳) کہ تغزغز کی

جگہ تغزغر پڑھنا چاہیے، جو تغز اویغور کی مختصر صورت ہے ۔ اس نظریے کو پروفیسر ھوتسما M. Th. Houtsma نے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا Encyclopaedia Britannica میں مقالۂ ("Turks") میں درج کیا اور اس طریق سے وہ مغربی یورپ میں شائع ہوا؛ اس کے بعد ذ خویہ نے بھی (de Muur van 'Gog en Magog ایمسٹرڈم ۱۸۸۰ء = Mededeelingen 'K. Ak. Wet. سلسلہ ۳ ، ۵ : ۳٦ تا ۱۲۲) اسی نظریے کو منتشر کیا ۔ المکتبة الجغرافیة العربیة (B. G. A.) کی پہلی پانچ جلدوں میں ڈ خویہ نے تغزغز [بالزاء] لکھا، چھٹی جلد (۱۸۸۹ء) میں سربسر تغزغر [بالراء] لکھا، مگر ساتویں جلد میں پھر تغزغز لکھنا شروع کر دیا ۔ اس جلد کے دیباچے میں اس نے نولڈکہ Nöldeke کے خط کے چند اقتباسات بھی دیے ھیں ، جن میں فاضل موصوف نے Pahlavi Texts ، ۲ : ۳۲۹ (Sacred Books of the East ، ج ۱۸) سے چند جملے نقل کیے ھیں ۔ نولڈکہ لکھتا ہے کہ ایران کے موبذ مانوس‌چہر نے ۸۸۱ء میں جو کتاب لکھی تھی (اب قب G. I. Ph. ، ۲ : ۱۰۳ ، جہاں اس کے نام کا املا 'مانوش سنشہر' درج ہے) اس میں بخطّ پازند بالکل صاف طور پر '' تغزغز '' لکھا ہے؛ پس اس میں مشمولہ جزء کلمے کی صورت غز ہے نہ کہ ''اویغور''۔ چند سال بعد 'توقوز-اغز' کا نام ''اورخون'' کے نو دریافت کتبوں میں ملا ۔ لہذا اب وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نام کا صحیح تلفّظ تغزغز ہی ہے ، اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ اس میں غز (اغز) کا نام شامل ہے؛ تاھم حال ہی میں اس رائے پر بھی متعدّد علماء کا اتفاق ہو چکا ہے کہ 'تغزغز' سے عربوں کی مراد 'اویغور' کے سوا اور کسی سے نہ تھی ۔ مارکار J. Marquart (Osteuropäische und ostasiatische Streifzüge، لیپزگ

۱۹۰۳ء، ص ۳۹۰) اس بات پر زور دیتا ہے کہ ابن خرداذبہ کے پہلے مبیضے کے بیان کے مطابق، جو ۲۳۲ھ/ ۸۴٦ - ۸۴۷ء کے حدود میں تیار ہوا تھا، اس علاقے میں تغزغز کے وجود کا ذکر ہے جہاں اویغور ۸٦٦ء سے پہلے نہیں آئے تھے ، چونکہ مارکار کو اس بارے میں شبہ تھا کہ تغزغز اور اویغور ایک ہی ھیں اس لیے اس نے اس کی توضیح یوں کی کہ اس کتاب کا منقح نسخہ ۲۷۲ [ھ] سے پہلے تیار نہیں ہوا تھا ۔ ان حوالوں کے علاوہ جو مادۂ غز کے تحت میں دیے گئے ھیں اور جن میں تغزغز کو معمول کے خلاف بہت دور مغرب کی طرف ظاہر کیا گیا ہے (قب نیز مقریزی : خطط، ۱ : ۳۱۳، در بارۂ طولون، پدر احمد بن طولون [ارک بان]، جو تغزغز قوم سے تھا)۔ نویں صدی میلادی کے نصف اول میں بھی تغزغز کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ وہ ابھی مشرق ہی میں موجود ھیں ۔ محمد بن موسی الخوارزمی نے بطلیموس (Ptolemy) کے ذکر کردہ دو سیتھیاؤں کو بلاد اتراك اور بلاد تغزغز سے تعبیر کیا ہے (Bibl. arab. Historiker und Geographen، ۳ : ۱۰۵، شمارہ ۱٦۰۰ ، ۱٦۰۱) ۔ جاحظ (م ۸٦۹ء) کی جس عبارت کو مارکار (کتاب مذکور، ص ۹۱) نے نقل کیا ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تغزغز کی نسبت یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ مدت دراز سے خرلخ کے ھمسایے ھیں۔ رینو Reinaud (Relation des Voyages، etc. ، پیرس ۱۸۴۵ء ، Discours préliminaire، ص cxxxvii ببعد) نے ثابت کیا ہے کہ عربی مصادر (مثلاً مسعودی : مروج، ۱ : ۲۸۸ ، ۳٦۵) میں چین کے اندر تغزغزوں کے اقدامات کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے وہ اویغوروں کے متعلق نہیں بلکہ ترکی یعنی اغز شا- تعو Sha-t'o قوم سے متعلق

ہے (اس قبیلے کے متعلق قب نیز E. Chavannes : *Documens sur les Turcs occidentaux*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص ۹٦ ببعد، ۲۷۲)۔ اگرچہ چینی مصادر میں اویغور کے نو قبیلوں کے حوالے موجود ھیں ، مگر اس کے باوجود تُقوزاویغور کی اصطلاح عہد مغول سے پہلے کے مصادر میں اب تک نہیں مل سکی؛ آٹھویں صدی میں اویغور خان نے ،جس کے متعلق ایک کتبہ رامشٹاٹ نے (Ramstadt : *Zwei uigurische Inschriften aus der Nord-Mongolei*، ھلسنگفوز ۱۹۱۳ء، ص ۱۳) شائع کیا ہے، اپنی قوم کے آدمیوں کو اون۔اویغور تقوز۔اغز کہا ہے .

معلوم ھوتا ہے کہ تُغزغز کا نام، جس کا صحیح اطلاق اویغوروں کے پیشرووں، یعنی شا۔تغو ترکوں، پر ھوتا تھا، عربوں نے اسے اویغوروں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ۔ عربوں کو بظاھر معلوم نہ تھا کہ اھل تبت نے شا۔تغو کو مار بھگایا تھا اور پھر اویغوروں نے اھل تبت کو بھگا کر ان کی جگہ خود لے لی تھی۔ ابھی تک پختہ طور پر یہ طے نہیں ھو سکا کہ تُغزغز کے حالات عربوں نے کن مآخذ سے لیے اور ان کے بیانات کس زمانے کے متعلق ھیں اور نہ اُس سفر ھی کی صحیح تأریخ معلوم ہے جو بقول یاقوت (معجم، ۱ : ۸۴۰) تَمیم بن بحر المُطَّوِّعِی نے بلاد ''خاقان التغزغزی'' میں کیا تھا ۔ بہترین مآخذ غیر معلوم مصنّف کی کتاب حدود العالم اور گردیزی کے بیانات ھیں، جنھیں مارکار نے جزوی طور پر استعمال کیا ہے (کتاب مذکور، اشاریہ بذیل ''Toguzguz s. Uiguren'')۔ ادریسی کا بیان (ترجمہ Jaubert، ۱ : ۴۰۱) اس سے بالکل مختلف ہے ۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ واحد عرب مصنّف، جو وسط ایشیا کے متعلق کتابوں کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے، وہ تُغزغز کی بابت کچھ نہیں جانتا، اس کے برعکس اس کے بیان میں اویغور کا ذکر (بغیر عدد کے) آیا ہے، جس کا علم اس کے پیشرو عربوں کو مطلقاً نہ تھا ۔ اس سے بعد کے مصنّفین بھی، جو کتابوں کے حوالے سے لکھتے ھیں، اویغور کی جگہ پھر تُغزغز لکھتے ھیں؛ قب سُغدی اور تُغزغزی رسم الخط کے بارے میں تعلیقۂ فخرالدین مبارك شاہ المروالرّودی (ساتویں صدی ھجری/تیرھویں صدی میلادی کا آغاز) (*'Adjab-Name, A Volume of Oriental Studies* etc.) کیمبرج ۱۹۲۲ء، ص ۴۰۵ ببعد، ص ۴۰۷ پر غلط حرکت دے کر : تَغزغز لکھا ہے) ۔ وسط ایشیا کے متعلق اور خاص کر اویغور کے بارے میں صحیح معلومات تو مسلمانوں کو کہیں عہد مغول میں دستیاب ھوئیں، جس کی وجہ سے تُغزغز کا نام بحیثیت قوم کے مسلمان جغرافیہ نگاروں کی کتابوں سے غائب ھوگیا؛ نزھۃ القلوب مصنفۂ حمد اللہ قزوِینی (طبع ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ - ۱۳۴۰ء) میں یہ نام نہیں آتا ۔

مآخذ : متن میں درج ھیں .

(W. BARTHOLD)

تَغْلِب : عرب قدیم میں قبائل ربیعہ میں سے بنو وائل (یعنی بکر و تغلب) اھم ترین قبیلہ تھے ۔ اس قبیلے کے بانی کا اصلی نام دِثار بتاتے ھیں ۔ ایک روز اس کے باپ نے اس کی کامیابی کے بارے میں کہا : تَغْلِبُ ''تو غالب آئےگا'' ۔ یہ لفظ اس کا نام ھی بن گیا، لیکن ''سامی زبانوں کے قیاس پر'' (قب یشْکُر، یذْکُر، یعقوب، اسحاق [عبرانی میں یצחק] قب یضْحک بمعنی ضاحک وغیرہ] ۔ اس لفظ کو فعل مضارع صیغۂ واحد مخاطب مذکّر قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ صیغۂ واحد غائب مؤنّث ہے ۔ صیغۂ مؤنّث سے پتا چلتا ہے کہ اس قبیلے کا نام اس کے اساطیری مورثِ اعلٰی والی کہانی سے قدیم‌تر ہے ۔ علاوہ بریں

قدیم تر شعراء، تا الفرزدق، تَغْلب کو وائل کی بیٹی بتاتے ہیں نہ کہ بیٹا (Robertson Smith : Kinship [کیمبرج ۱۸۸۵ء]، ص ۱۳ بعد، ص ۲۵۳ بعد]؛ [مع مآخذ]؛ Lammens : Omayyades، ص ۳۱۲؛ اس کے باوجود نولڈکہ، در Z.D.M.G.، ۴۰ [۱۸۸۶ء] : ۱۶۹ کا خیال یہ ہے کہ ''تغلب کی طرح کا نام، جو صاف طور پر فعلی صورت رکھتا ہے، اصل میں جمع کا صیغہ ہے، جس سے تمام قبیلے کو فتح مند بتایا جا رہا ہے'') ۔ بقول جوہری تَغْلب کو 'الغَلْباء' (نِسْبَۃ : غَلْباوی؛ قَلْقَشَنْدی و سُویدی، محلِ مذکور) بھی کہتے ہیں اور تَغْلب بن وائل (نیز تغلبُ وائل) سے ممیز کرنے کے لیے [چند دیگر قبائل کو جن میں] یمنی قبیلۂ تَغْلب بن حُلْوان، جن کی اولاد میں سے دوسری شاخوں کے علاوہ قبیلۂ النَّمر [بن وَبرۃ بن تغلب] (بطن : مَشْجَعَۃ، بلاذری : ص ۱۱۱) اور کَلب بن وَبرۃ بن تَغْلب، نیز تَنوخ [رکبان] اور کنانۃ بن بکر بن عوف شامل ہیں، تَغْلبُ العُلْیا (وستنفلٹ : Register، ص ۴۴۳) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ تَغْلب سے اسم منسوب تَغْلَبی (بفتحۂ لام) آتا ہے، لیکن اکثر تَغْلِبی (بکسرۂ لام) بھی کہتے ہیں (مثلاً دیکھیے لسان العرب، ۲ : ۱۴۵، سطر ۴؛ تاج العروس، ۱ : ۴۱۴، سطر ۳۴) ؛ رائٹ Wright کی Grammar، طبع سوم، ۱ : ۱۵۹ میں ہے کہ تَغْلَبی کو ترجیح ہے ۔ بطون تغلب [یعنی جماجم] سے اسم منسوب نہیں بنتے (عِقد، ۲ : ۳۸ تا ۳۹، ۴۶، سطر ۲ [طبع ۱۹۲۱ء، ۲ : ۴۶، ۵۴، س ۱۴] ؛ Lammens : M'odwia، ص ۹۹۴) ۔ بقول مسعودی : مروج، ۵ : ۱۴۸ [حضرت] علی(رض) کی ایک حرم تَغْلبیۃ تھیں، جن سے عمر اور رُقَیّۃ پیدا ہوے (یعنی الصَّہْباء [بنت ربیعۃ بن بُجَیر التغلبی]، جن کی کنیت اُمّ حبیب تھی، قب وستنفلٹ : وہی کتاب، ص ۱۴۵ [بحوالۂ معارف، ص ۱۰۷] ؛ Lammens : وہی کتاب، ص ۱۱۸، دیکھیے ذیل میں).

تَغْلب کا شجرۂ نسب یہ ہے : تَغْلب بن (بنت) وائل بن قاسط بن ہِنْب بن اَفْصی بن دُعْمی بن جَدیلَۃ بن اَسَد بن ربیعۃ بن نزار؛ ان کے بھائی بند قبیلے بکر [بن وائل] اور عنز [بن وائل] تھے (عِقد، ۲ : ۴۵، سطر ۲۲؛ سمتھ Robertson Smith کتاب مذکور، ص ۱۲ بعد) ۔ تَغْلب کے بیٹے تین تھے : عِمران، الاَوس اور غَنْم ۔ غَنْم کا بیٹا عمرو [تھا جس کے دو بیٹے تھے :] مُعاویۃ اور حُبَیب، معاویۃ کے چار بیٹوں کو ''الخَنّاقون'' (وستنفلٹ، ص ۱۲۹) کہتے تھے اور بکر بن حُبَیب (عِقد، محلِ مذکور [طبع ۱۹۲۱ء، ص ۵۳، س ۹۲] میں مالک کا نام حذف ہے) کے چھے بیٹوں کو: الاَراقم (دیوان اخطل، ص ۱۲۷ و نقائض، ص ۳۷۳ میں وجہ تسمیہ دی ہے، [عِقد : محلِ مذکور پر بھی ہے ''لانّ عیونَہم کَعیونِ الاَراقم'']؛ لائل Lyall : کتاب مذکور در ذیل، ص ۱۵؛ الاراقم کا اطلاق بارہا سارے تَغْلب پر ہوتا ہے؛ ان کے نام پر دو ایام ''یوم الاَراقم'' کہلاتے ہیں: [پہلا جس میں تَغْلب نے قیس پر سِنْجار میں فتح پائی اور دوسرا یوم اِراب، دیکھیے] نقائض : ۴۰۰، ۷۶۱) ۔ تغلب کی دو بڑی شاخیں (جنھیں نقائض، ص ۲۶۶ و ۳۷۳ میں الرَّوقان لکھا ہے) (یہ ہیں :) بنو جُشَم بن بَکر (یہ ''بیوتات العرب'' میں شامل ہیں : عِقد، ۲ : ۳۷، سطر ۱۱ [طبع ۱۹۲۱ء، ص ۴۴، س ۱۱]؛ Lammens : Mo'awia، ص ۴۰۰) اور مالک بن بکر بن حُبَیب ۔ اُسامۃ بن مالک کی اولاد میں بخطِ مستقیم حَمْدان

ابن حمدون تھا، جو [ملوک] (بنو) حمدان [رک بان] کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ بنو حمدان کے خاندان میں سے دو کا نام تغلب تھا: ابو وائل تغلب بن داؤود بن حمدان اور ابو تغلب فضل اللہ بن ناصرالدولة المعروف الغضنفر (رک بان؛ وسٹنفلٹ، ص ۴۰۹ یا ۴۳۰).

منازل تغلب: افتراقِ قبائل کے بعد دوسرے بنو ربیعة کے ساتھ تغلب بھی کوهستانِ نجد، حجاز، اور تہامة کی سرحدوں پر قابض ہو گئے۔ وہ آہستہ آہستہ اور تدریجی طریقے سے الجزیرہ میں منتقل ہوتے رہے، جس میں کئی صدیوں کا زمانہ گذر گیا اور یہ سلسلہ اسلامی زمانے میں اُس علاقے پر آ کر ختم ہوا جسے بعد میں دیارِ ربیعة کہنے لگے۔ حربِ بسوس اس زمانے میں ہوئی تھی جب بکر اور تغلب نجد ھی میں آباد تھے (پانچویں صدی میلادی کی ابتداء)، کیونکہ ان کی مہاجرت کے زمانے کا آغاز حدود سنہ ۴۸۰ء میں ذو نُواس کے عہد سے سمجھا جاتا ہے۔ اس جنگ میں جو مقامات مشہور ہوے وہ اس رقبے میں واقع ھیں جس کے جنوب میں بحرین اور سلسلۂ کوہ عارض ہے اور شمال میں وہ عرض بلد جس پر بعد کے زمانے میں بصرہ آباد ہوا (Blau، در *Z.D.M.G.* : ۲۳ [۱۸۶۹ء] : ص ۵۷۹ ببعد)۔ تغلب اور بکر کی حدِ فاصل کے متعلق ہم صرف یہی کہہ سکتے ھیں کہ تغلب زیادہ تر اس علاقے کے شمالی حصوں میں آباد تھے اور یہ علاقہ ملک ''شام کی سرحد'' کے زیادہ قریب تھا۔ وسٹنفلٹ (کتاب مذکور، ص ۴۳۴) (بکری کے حوالے سے) تغلب کی منفصلۂ ذیل بستیوں کا ذکر کرتا ہے (صرف شعراء کے اشعار ھی میں ان کا ذکر آتا ہے!) جو ''شام کی سرحد پر'' واقع تھیں: الأحفار، الأزاغب، المُوثّبِ، عالِز، عنازة، کاثرة، عنیة، اور النّهی؛ آخرالذکر کا، جس میں حرب بسوس کی ایک لڑائی ہوئی تھی، محلّ وقوع مراصد، ۳: ۲۰۰ میں بحرین اور یمامه کے درمیان بتایا گیا ہے۔ اگلی (یعنی چھٹی) صدی میں تغلب ایک حد تک اُسی رقبے پر قابض رہے، لیکن وہ آہستہ آہستہ دریاے فرات کے زیرین حصے کے ساتھ ساتھ آباد ہو رہے تھے۔ زمانۂ جاھلیت میں کَبَاث، جو الانبار کے شمال میں ہے، تغلب کی ایک منڈی تھی (مراصد، ۲: ۴۷۵)۔ پہلی صدی هجری میں ان کے علاقے کا مرکز وسطی الجزیرہ تھا، یعنی وہ علاقہ جس کے شمال میں قرقیسیا، سنجار، نصیبین اور الموصل اور جس کے جنوب میں عانه اور تکریت تھے۔ اس علاقے کو دریاے خابور، دجلہ اور فرات نے جزیرہ نما کی سی شکل دے دی تھی۔ تغلبیوں کی کچھ تعداد منبج اور الرصافة (بعد میں قنسرین اور دمشق کے نواح تک) کے مقامات پر خیموں میں رہا کرتی تھی اور جنوب میں عین التمر اور جبل الٰهة (لاهة) تک اور پھر خفّان اور العذیب کے درمیان بھی انھیں کی بستیاں تھیں اور ان کا ایک اور گروہ دجلہ پار کر کے آذربایجان میں جا بسا تھا (Lammens : *Mo'âwia*، ص ۹۶ ببعد، ۱۲۱ ببعد؛ Chantre، ص ۳۸۱، ۳۹۸ تا ۴۰۰؛ *Omayyades*، ص ۲۱۴، ۲۳۰، ۲۶۶ ببعد، Musil، بالخصوص *Euphrates*، ص ۴۲، ۱۷۰، ۲۸۵، ۳۰۹؛ *Palmyrena*، ۱۷۰، ۲۴۸، ۲۸۱ ببعد) — Musil کی تصانیف (دیکھیے مآخذ) کا مطالعہ دیار تغلب کے اوضاعِ طبیعی کو تاریخی لحاظ سے سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔

تاریخ تغلب: تغلب کا ذکر پہلے پہل شاپور ثانی کے زمانے میں آتا ہے، جس نے دیارِ بکر و تغلب پر حملہ کیا۔ یہ علاقے ''سلطنت ایران اور ملک شام میں رومیوں کی ثغور

(*limes*) " کے درمیان واقع تھے ۔ شاپور نے ان میں سے بعض کو بحرین ، کرمان ، توّج اور الاَهواز میں آباد کیا ۔ غالباً اس لیے کہ اس طریق سے انھیں زیادہ ضبط میں رکھا جا سکے (نولڈکہ : *Sasaniden* ، ص ۵۶ ببعد ، ۶۷) ۔ نجد کے خلاف اپنی مہم میں اَبرَهَه (؟) حِمیَری نے زُهیر بن جناب الکلبی کو بکر اور تغلب پر امیر مقرر کر دیا (اغانی، ۲۱ : ۹۵؛ ابن الأثیر، ۱ : ۳۶۷ ببعد) ۔ دونوں قبیلوں نے دوسرے مَعدّی قبیلوں کے ساتھ مل کر یمنیوں کا جوا گردن سے اتار نے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں السُّلّان اور خَزاز (یا خَزازَی) کی لڑائیاں ہوئیں (خَزاز کے محلّ وقوع کے متعلق قب نولڈکہ : *Fünf Mo'allaqāt* ، i : ۴۴ ، ۸۴)۔ ان لڑائیوں میں ربیعة بن الحارث یا اس کا بیٹا کُلَیب [رک بآن] ان کا قائد تھا (عقد، ۳ : ۶۶ ، سطر ۳۱ [طبع ۱۳۲۱ھ، ۳ : ۳۳ ، ۳۴]؛ Reiske : کتاب مذکور ، ۱۸۲) ۔ کُلَیب کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے مُهَلهِل نے مشہور حربِ بَسوس [رک بآن] بکر کے خلاف شروع کی (لڑائیوں کے ناموں کی تعداد، ترتیب اور قراءت میں اختلاف ہے ، قب بکری ، ص ۸۴۲ تا ۸۴۳، Reiske : ص ۱۶۴، ۱۸۱ تا ۱۹۸ ؛ اغانی، ۴ : ۱۴۳ ؛ ابن الأثیر ، ۱ : ۳۸۴ تا ۳۹۷ ب ، Blau موضع مذکور؛ ان کے محلّ وقوع کے متعلق دیکھیے ، Wetzstein ، در *Ztschr. f. allg. Erdk.*, NS, xviii [1865]، ص ۲۶۲ ببعد، ۴۱۵؛ Musil : *Palmyrena*، ص ۶۲ ببعد) بیان کیا جاتا ہے کہ قِضَة یا قُضّة کی جنگ میں (جسے یوم التَحلاق، یوم التحالُق یا یوم الثنیّة بھی کہتے ہیں) شکست کھانے کے بعد قبائلِ تغلب بکھر گئے (بکری، ص ۵۶ ؛ عقد، ۳ : ۶۹ ، سطر ۱۵؛ دیگر "ایّام" یہ ہیں : دیکھیے وہی کتاب، ص ۶۸، سطر ۲۷ ؛ جنگ با یربوع : یوم زَرود [الثانی] : وهی کتاب، ص ۵۹، سطر ۲۷، قب یاقوت، ۲ : ۹۲۸ ؛ جنگ با ریاح بن یربوع : یوم اِراب : قُطامی : دیوان، ص ۱۶ [قصیده ۷، شعر۴، و تعلیقه بر آن]؛ نقائض، ص۴۷۳ ببعد— معمولاً تغلب کی بہت تھوڑی جنگوں کا حال ضبط تحریر میں آیا ہے ۔ Lammens : *Mo'âwia* ، ۳۹۹ کے حاشیے ، شماره ۶ میں اس کا سبب [؟] بیان کیا گیا ہے ۔ کِندہ کے دَور میں تغلب کی بعد کی تأریخ اور اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّۂ بکر ۔ مُنذِر ثالث کی انگیخت پر، جس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ وہ ان دونوں قبیلوں سے اپنے غزوات میں کام لے سکے، ذوالمجاز (قب مادّۂ سُوق) میں صلح کر لی گئی (رهائن (hostages) کے متعلق دیکھیے Rothstein: کتاب مذکور، ص۱۳۷)۔ یہ صُلح حقیقةً بڑی دیرپا ثابت ہوئی ، کیونکہ اس کے بعد قبائل کے درمیان کسی خون ریز جنگ کا ہونا مسموع نہیں ہوا (قب نولڈکہ : *Fünf Mo'all.* ، ۱ : ۵۳ ببعد، ۷۳)۔ قبیلۂ بکر تو لخمیوں کا وفادار تھا لیکن تغلب نے عمرو بن ہند کی متابعت سے انکار کر دیا ، جو بنو غسّان سے اپنے باپ مُنذِر ثالث کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا ۔ کہتے ہیں کہ اس نے ان کی اس نافرمانی کی سزا الغَلّاق التمیمی کے ہاتھوں دلوائی (صواب الغلّاق ہی ہے نہ العلّاق، نولڈکہ : *Fünf Mo'all.* ، ص ۷۶) ۔ تغلب اور بکر کا ایک اَور جھگڑا بھی اسی لَخمی کے سامنے اصحابِ معلّقات میں سے دو شاعروں عمرو اور حارث نے اپنے اپنے قبیلے کے نمایندے کی حیثیت سے پیش کیا (وہی کتاب، ص ۱۰ ببعد، شاید یہ وہی شخص تھا جس نے پہلے جنگ بَسوس کا خاتمہ کرایا تھا (؟ :

اغانی، ۹ : ۱۷۸ تا ۱۸۰) ۔ عمرو بن کُلثوم کے تفاخر و غرور سے ابن ھند ناراض ھو گیا اور جب کسی اَور موقع پر اس نے عمرو بن کُلثوم کی ھتک کی تو اس نے وھیں ابن ھند کو موت کے گھاٹ اتار دیا (Rothstein ، ص ۱۰۰ ببعد، ۱۳۰) ۔ معلوم ھوتا ہے کہ اس پر تغلب نہ صرف خود منتشر ھو گئے بلکہ ان کی [بنو بکر کی] کھلم کھلا مخالفت اور دشمنی پر بھی اتر آئے ۔ تاھم یہ بات غیر یقینی ہے کہ آیا عمرو بن کُلثوم کے بھائی مُرّۃ بن کُلثوم نے منذر بن نعمان ابی قابوس لخمی کو قتل کیا (وھی کتاب، ص ۱۱۲) ۔ ذُوقار کی جنگ میں (رکّ بمادۂ ذُوقار ؛ مقاملت مذکورہ کے لیے دیکھیے وھی کتاب، ص ۱۲۱) تغلب نے اپنے سردار نُعمان بن زُرعَۃ (اس کے متعلق دیکھیے قُطامی : دیوان، ص ۳۳ [قصیدۃ ۱۷، شعر ۳ و تعلیقہ بر آں]) کی قیادت میں شرکت کی اور اس سردار نے خُسرو کو اس باب میں مشورہ دیا کہ بنو بکر پر کامیابی کے ساتھ اچانک حملہ کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے نولڈکہ : *Sasaniden* ، ۳۳۴؛ عقد، ۳ : ۸۰ ببعد) ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اَخطَل (دیوان، ص ۲۲۶) بعد کے زمانے میں مدّعی ھے کہ بکر نے ایرانیوں پر فتح پائی اور یہ امر پورے بنو وائل کے لیے مایۂ افتخار تھا، کیونکہ بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب بن وائل ایک دوسرے کے بھائی بند تھے ۔

ظہور اسلام سے کچھ ھی پہلے نصرانیوں سے اختلاط بڑھ جانے کی وجہ سے تغلب میں مسیحیت نے بھی قدم جما لیے تھے (عمرو کے معلقے میں مسیحیت کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ہے، نولڈکہ : *Fünf Mo'all.*، i : ۱۹ ، ۴۶؛ اس کے برعکس دیکھیے شیخو : النّصرانیۃ، ص ۱۲۰) ۔ اس سے قبل وہ بنو بکر کی طرح ایک دیوتا اَوال یا اُوال کی پوجا کرتے تھے (اس نام کے اشتقاق کے متعلق دیکھیے سمتھ Robertson Smith : کتاب مذکور، ص ۱۹۴) ۔ اگرچہ ان کے نئے مذھب (عیسائیت) نے ان پر کوئی گہرا اثر پیدا نہ کیا (دیکھیے سطور ذیل) لیکن اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان کے درمیان تبلیغ اسلام کی کوششوں کی انھوں نے ھر ممکن مقاومت کی ۔ صرف ایک چھوٹے سے فریق نے، یعنی ان بنی تغلب نے جو طیّ کے نواح میں رہتے تھے (شپرنگر Sprenger : *Mohammad*، ۳ : ۴۳۳ ببعد)، شاید اپنی [بھلائی] کے خیال سے، شروع ھی میں دین اسلام قبول کر لیا ھو۔ چنانچہ ھمیں بتایا گیا ھے کہ ۹ ھ میں تغلب کا ایک وفد مدینے آیا، اس میں بعض مسلمان تھے اور بعض عیسائی جو سنہری صلیبیں پہنے ھوے تھے ، اور عیسائیوں نے [حضور[ص]] سے ایک معاھدہ کیا کہ وہ اپنے مذھب پر قائم رھیں گے لیکن اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں گے ۔ غالباً یہ تغلب کی اپنی پیش کش ھوگی تا کہ وہ جزیے کی ادائگی سے بچ جائیں، ورنہ آنحضرت[ص] نے کبھی بھی عیسائیوں کو مجبور نہیں کیا کہ اپنا مذھب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیں (Wellhausen : *Skizzen*، ۴ : ۱۵۶) ۔ بعد کے زمانے میں جو [حضرت] عمر[رض] کی نسبت بھی یہی کہا گیا کہ انھوں نے تغلب کے ساتھ ایسا ھی معاملہ کیا تو وہ یقیناً بعد کی اختراع ھے (دیکھیے سطور ذیل) ۔ اسی طرح وہ قصہ بھی مشکوک معلوم ھوتا ھے جو اغانی، ۱۶ : ۵۳ (شیخو : النّصرانیۃ، ص ۴۰۴) میں مذکور ھے کہ آنحضرت[ص] نے زیدُ الخَیل کو ھدایت کی کہ وہ تغلبی امیر الجَرّار (شپرنگر، ۳ : ۳۹۱ میں الجزّار ھے) کو بزور شمشیر اسلام قبول کرنے پر مجبور کرے ۔ کہتے ھیں کہ اس نے قبول اسلام سے انکار کر دیا اور اسے اس کی

پاداش میں قتل کر دیا گیا ۔ ۱۱ھ میں جب رِدّہ کی لڑائیاں ہوئیں تو سَجاح متنبّئہ [رکّ بآن]، جس نے بنو تغلب کے درمیان مسیحی ماحول ھی میں تربیت پائی تھی، تغلب اور تمیمیوں کی بڑی تعداد ہمراہ لے کر یمامہ کی جانب روانہ ہوئی اور انھیں کے درمیان رھتے ھوے عراق میں اس کی زندگی کا خاتمہ ھو گیا [ایک روایت کی رو سے اس کا خاتمہ اسلام پر ھوا] (بلاذُری : ص ۹۹ ببعد؛ Lammens : *Mo'âwia*، ص ۳۰۴) ۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جس میں شیبان، تغلب اور النّمر کے باغی قبائل ایک شخص مَفْرُوق (طبری، ۱ : ۱۹۷۳) کی زیرِ قیادت رھے ۔ وہ تغلبی جو سَجاح کی معیّت میں مہاجرت کر گئے تھے انھوں نے ۱۲ھ میں عین التّمْر کے مقام پر ایرانیوں کی حمایت کی، جہاں خالد بن ولید نے انھیں تہ تیغ کر دیا اور ان کا سردار عَقّة بن ابی عَقّة بھی [اسیر ھو کر] قتل ھوا ۔ اس کا بدلہ لینے کی غرض سے تَغْلبیوں نے ایک اور مہم میں حصہ لیا، جو ایرانیوں نے زَرمِہر اور رُوزْبِہ کی قیادت میں بڑے پیمانے پر تیار کی تھی۔ تغلبیوں کا سردار الھُذَیْل بن عِمران مقام المُصَیَّخ (یعنی مُصَیَّخ بنی البَرْشاء) میں خیمہ زن ھوا، جہاں وہ ایرانی بھی جنھوں نے الحُصَیْد پر شکست کھائی تھی مَہبُوذان کی قیادت میں اس سے آ ملے؛ خالد بن ولید ان پر فوج کے تین دستوں (divisions) سمیت ٹوٹ پڑے اور ان میں سے معدودے چند کے سوا کوئی بھی نہ بچا ۔ پھر الثّنِی میں آپ نے ربیعة بن بُجَیر التغلبی کی فوج تِتّربِتّر کر دی (ربیعة کی اسیر لڑکی کو [حضرت] علی نے خرید لیا، دیکھیے [طبری، ۱ : ۲۰۷۲]) اور الزُّمَیْل (البِشْر) کے ایک اَور پڑاؤ پر بھی چھاپہ مارا، لیکن ھلال بن عَقّة بچ کر رُضاب کو نکل گیا ۔ دریاے فرات پر وہ الفِراض کے مقام تک بڑھتا چلا گیا [الفِراض پر شام، عراق و الجزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں ، طبری، ۱ : ۲۰۷۳]، جہاں ایرانی، بوزنطی اور عرب قبائل تغلب، اِیاد اور النَّمر بھی اپنے مشترک دشمن کے خلاف اس سے آ ملے، لیکن انھیں شکست فاش ھوئی ۔ کہتے ھیں کہ ایک لاکھ (؟) آدمی یہاں [معرکہ و طلب میں] عُرضۂ تیغ فنا ھوے (طبری، ۱ : ۲۰۶۲ تا ۲۰۷۵؛ وِلہاؤزِن : کتاب مذکور ، ۶ : ۴۵) ۔ جب خالد بن الولید [حضرت] ابوبکر[رض] کے حکم سے ملک شام کی طرف یلغار کرتے ھوے بڑھے تو المُصَیَّخ اور الحُصَیْد کے مقام پر آپ نے مرتدّ تغلبیوں کو موجود پایا ، جو ربیعہ بن بُجَیر کے تحت تھے، اور انھیں شکست دی (بلاذری، ص ۱۱۰) ۔ منحوس ''جنگ جِسر'' اور خَفّان تک مسلمانوں کی پسپائی کے بعد کا ذکر ھے کہ النُّصَیر اور حُذَیفة کی قیادت میں ایک رسالہ تَکْرِیت تک بڑھ آیا اور راستے میں تغلب کو شکست دی (وھی کتاب، ص۲۴۹) ۔ گو ان واقعات کے تمام جزئیات کی سال وار ترتیب یقینی طور پر معیّن نہیں ھو سکی (قبّ وِلہاؤزِن ، ۶ : ۴۶ ببعد؛ ڈ خویہ : *Mémoires*، عدد ۲/۲ ، ص ۳۸ ببعد؛ خالد کی مہمات کی موضع نگاری topography کے متعلق دیکھیے Musil : *Euphrates*، ص ۳۰۰ تا ۳۱۴؛ وھی مصنف : *Arabia*، ص ۵۵۳ تا ۵۷۳)؛ تاھم ان روایات سے یہ ضرور واضح ھوتا ھے کہ تغلب نے مسلمانوں پر حملے کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ۔ اندریں صورت یہ بات کچھ زیادہ قابل وثوق معلوم نہیں ھوتی کہ البُوَیب کی جنگ شروع ھونے سے پہلے بنوالنّمر اور تغلب کے سواروں نے المثنّی کو مدد دینے کی پیش کش کی (طبری، ۱ : ۲۱۸۹ ببعد)، اس معاملے میں غالباً

ہمیں C. H. Becker (در کایتانی *Annali* : Caetani، سال ۱۲، § ۳۲، حاشیہ ب) کے خیال سے متّفق ہوتے ہوئے سَیف بن عمر[رکَ بآن] کے بیان کو متمائلانہ (tendencious) تسلیم کرنا پڑے گا ۔ اسی سال المثنّی کو تغلب کے خلاف الانبار سے ایک فوج بھیجنا پڑی، جو اس وقت الکَبَاث (دیکھیے سطور بالا) میں ڈیرے ڈالے پڑی تھی اور پھر ایک اَور فوج اس نے صِفّین میں بھی تغلب اور النّمر کے خلاف بھیجی مگر وہ جان بچا کر فرار ہو گئے (طبری، ۱ : ۲۲۰۶ تا ۲۲۰۸؛ وِلھاؤزن، ۶ : ۶۹؛ Musil : *Euphrates*، ص ۳۲۱ - اس واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بکر اور تغلب کے درمیان جو پرانی دشمنی تھی وہ کاملاً فراموش نہیں ہوئی تھی) - ۱۶ھ میں، جب تَکْرِیت پر ایرانیوں، بوزنطیوں اور عرب قبائل اِیَاد، تغلب اور النّمر وغیرہ کی ایک متّحدہ فوج مستحکم مورچوں پر قابض تھی، عبداللہ بن المُعْتَمّ پانچ ہزار کا لشکر لے کر تکریت کے سامنے آ نکلا؛ طویل جھڑپوں کے بعد اس نے عیسائی عربوں سے خفیہ سازباز شروع کر دی، جب بوزنطی متواتر لڑائی سے تھک کر میدان سے ہٹ گئے تو صرف اس وقت عیسائیوں نے اس کے قاصدوں کی بات مان کر اسلام قبول کر لیا ۔ ان کی مدد سے عبداللہ ایک ایسی فوجی چال چلا جس سے اس نے دشمن کے استحکامات پر کامیابی سے قبضہ کر لیا اور الحِصْنَین بھی اس کے قبضے میں آ گیا (طبری، ۱ : ۲۴۷۴ تا ۲۴۷۷) - کہتے ہیں کہ اس سفارتی وفد کے ساتھ جو عبداللہ نے بھیجا تھا تغلب کا بھی ایک وفد مدینے میں آیا اور انھوں نے [حضرت] عمر[رض] کے ساتھ علٰحدہ معاہدہ کر لیا ۔ [حضرت] عمر[رض] نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ یا تو اسلام قبول کر کے ہر طرح سے مسلمانوں کے ہم پلہ ہو جاؤ یا جزیہ ادا کرو ۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو [حضرت] عمر[رض] نے ان پر جزیہ عائد کر دیا ''جس طرح مسلمانوں پر صدقہ عائد ہے'' اور شرط یہ قرار پائی کہ وہ ان [نومولود] بچوں کو عیسائی نہیں بنائیں گے (جن کے والدین مسلمان ہو چکے ہوں [حسب بیان طبری، ۱ : ۲۴۸۲]) (قبَ ابن الأثیر، ۲ : ۴۱۰) - عراق کی فتح کی تفصیل از روی سَیف درج کرنے کے بعد (وِلھاؤزن، ۶ : ۸۵ ببعد) طبری (۱ : ۲۵۱۰) نے مشہورِ عام قصّہ (مثلاً دیکھیے تاج العروس، ۱ : ۳۱۴، سطر ۳۲؛ ابن قتیبۃ : معارف، ص ۲۸۳) تغلب کے ''اِضعافُ الصدقۃ'' کا ذکر کیا ہے جو الولید بن عُقْبۃ کے اقدامات کا نتیجہ تھا (قبَ وُستِن فِلٹ : ص ۴۶۱ ببعد)، کیونکہ تغلب کو جزیے کے لفظ سے ننگ و عار محسوس ہوئی تھی، ان روایات کے ساتھ ہی ساتھ اَور بھی کئی روایات ہیں جو جزئیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں (مثلاً بپتسمے کی ممانعت کے متعلق؛ یہاں تک کہ Nau نے کتاب مذکور، ص ۱۱۰ ببعد میں [حضرت] عمر اول[رض] کو عمر ثانی لکھ دیا ہے!)۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں مختلف ادوار کی روایتیں مل جل گئی ہیں، جن سے در اصل اس امر کی تشریح کی کوشش سامنے آتی ہے کہ تغلب کو ایک خاص مقام کیوں حاصل ہوا اور دوسرے مسلمانوں سے ان کے تعلقات کیا تھے (بلاذری، ص ۱۸۱ تا ۱۸۲ کی یہ روایت قابل ذکر ہے کہ : ''کوئی شخص ان کا ذبیحہ نہ کھائے اور نہ ان کی عورتوں سے شادی کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہیں اور نہ اہل کتاب میں سے ہیں''— مزید تفصیلات در کایتانی *Annali* : Caetani، سال ۲۰ھ، §§ ۳۷ تا ۴۹)۔

ابتداء میں تو تغلب محبان [حضرت] علی[رض] میں سے تھے، لیکن جلد ھی وہ بنو امیّه کے طرفدار ھو گئے اور جنگ صِفّین میں وہ (امیر) معاویة کی جانب سے لڑے (جنھوں نے انھیں کوفے میں آباد کر دیا، طبری، ۱ : ۱۹۲۰؛ قبّ ۱ : ۲۴۸۲، ۲۴۸۸ تا ۲۴۹۵) - حَرّة کی جنگ میں انھوں نے یزید کا ساتھ دیا اور مرج راہط میں مروان کا (Lammens : *Mo'âwia*، ص ۹۴، ۱۱۸، ۳۸۱؛ وھی مصنف *Yazîd Ier*، ۳۰۰، ۳۳۵؛ *Marwânides*، ۲۲۹ = ۲۳۱؛ ۵۹ ببعد) - جب تک مُضریوں اور یمنیوں کے درمیان عَصَبیت (فرقه بازی) کی لڑائیاں شروع نه ھوئیں، جن میں تغلب نے حصه لیا، ان کی شہرت کا چرچا دوبارہ شعر و سخن میں تازہ نہیں ھوا (دیکھیے ربیعة) - پہلے پہل تو وہ قیس کے حلیف اور کلب کے مخالف تھے (*W.Z.K.M.*، ۱۵ [۱۹۰۱ء] : ۶) - جب کلب اپنے مقام سے ھٹا دیے گئے تو قیس اور تغلب کے درمیان نزاع پیدا ھو گئی؛ چنانچه کھلم کھلا جنگ (۶۹ تا ۷۳ھ / ۶۸۸ تا ۶۹۲ء) اس وقت شروع ھوئی جب عُمیر بن الحُباب اپنے سُلیمیوں سمیت دریاے خابور کے کنارے پر آ بسا اور اُن تغلبیوں سے بر سر پیکار ھوا جو وھاں خیمه‌زن تھے (دیکھیے قیس عیلان) - معمولی جھڑپوں کے بعد ایک جنگ ماکِسین (ماکِس) کے مقام پر ھوئی، جہاں تغلب اور النَّمر کو زبردست شکست ھوئی، پھر پہلے تو کئی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ھوتی رھیں (البلاذری : انساب، ۵ : ۳۱۳ تا ۳۲۸ میں — اس بارے میں اس کے اور ابن الأثیر، ۴ : ۲۵۵ تا ۲۶۳ کے بیانات میں مطابقت ھے — " ایام " ذیل کا ذکر بھی آیا ھے : یوم الثّرثار الاول و الثانی، الفَدَین، السُّکَیر، المَعارِك، الشرعَبیة [لیکن قبّ قُطامی : دیوان، ص ۵؛ *W.Z.K.M.*، محلّ مذکور]، البلیخ؛ قُطامی، ص ۶ پر النصف کا نام بھی دیتا ھے) - آخر میں ۷۰ھ / ۶۸۹ء میں الحَشّاك کی لڑائی ھوئی، جس میں عُمیر مارا گیا (نقائض : ص ۳۷۳، ۳۹۴، ۴۰۰، میں اسی " یوم " کو " یوم الأراقم " اور اس کے ساتھ " یوم السنجار " بھی لکھا ھے [دیکھیے سطور بالا]) - اس کی موت کا بدله لینے کے لیے زُفَر بن الحارث نے تغلب کو الکُحَیل کے مقام پر زبردست شکست دی - اس جنگ و جدل کا نتیجه یوم البِشر [رَكّ بآں] یا الرَّحُوب تھا، جسے یوم مُجاشِن [نه که مُخاشِن : بکری، ص ۱۷۹] اور یوم مرج السَّلُوطَح بھی کہتے ھیں، قُطامی : ص xiv، حاشیه ۱؛ وَستنفلٹ : ص ۴۳؛ ان تمام وقائع کے متعلق دیکھیے : اغانی، ۱۱ : ۵۷ تا ۶۳؛ ۲۰ : ۱۲۶ تا ۱۲۸؛ ولہاؤزن : *Des arabische Reich*، ۱۲۷ تا ۱۳۰؛ Lammens : *Chantre*، ۳۸۱ تا ۳۹۸؛ وھی مصنف : *Omayyades*، ۲۵۶ تا ۲۶۱؛ مقاماتِ مذکور کے محلّ وقوع کے متعلق : Musil : *Euphrates*، ۵۶ ببعد، ۶۰، ۸۲ تا ۸۴، ۳۳۶؛ وھی مصنف : *Palmyrena*، ۱۷۲ ببعد) - ان تمام " ایام " اور زمانۂ جاھلیت کے ایام میں اسلام اور نصرانیت کے اثر کے باوجود کسی طرح کا کوئی فرق نظر نہیں آتا - بلکه حقیقت یه ھے که ان معرکوں میں خونریزی جاھلیت کے زمانے سے زیادہ بے رحمی سے ھوئی؛ مثلاً قیدی عورتوں کے پیٹ چاك کر دیے گئے - کوئی تعجب کی بات نہیں که عصبیت کی پیدا کردہ اس قسم کی تلخ منافرت بہت عرصے تک باقی رھی اور یه آگ وقتاً فوقتاً برابر مشتعل ھوتی رھی۔

یه جدال و قتال تأریخی اعتبار سے تغلب کے آخری اھمّ وقائع میں سے تھا - ان کی بعد کے زمانے کی تاریخ میں جو نسبةً زیادہ اھمّ واقعات پیش آئے ان کا ذکر مختصراً یه ھے : رَوح [رَوْح ؟]

ابن صالح [جو قائدینِ موصل میں سے تھا اور] خلیفۂ ھارون الرشید کی طرف سے صدقات بنی تغلب کا محصّل تھا وہ پہلی مُڈبھیڑ میں قتل ھوا ۔ اس کی موت کا بدلہ روح کے بھائی حاتم بن صالح نے ۱۷۱ھ / ۷۸۷ء میں تغلب سے بڑی بے رحمی کے ساتھ لیا ۔ اس سے سات سال بعد تغلب نے الولید ابن طَرِیف کی سرکردگی میں بغاوت کی ۔ الولید یزید بن مَزْیَد کے خلاف لڑتا ھوا مارا گیا، جسے خلیفہ [ھارون الرشید] نے طلب کیا تھا کہ تغلب کو زیر کرنے میں مدد دے (ابن الأثیر، ۶ : ۹۷، ۹۸ تا ۹۹، ۱۰۱؛ طبری، ۳ : ۶۳۱، ۶۳۸ ؛ Charles : کتاب مذکور، ص ۹۷ ۔ وُسٹنفلٹ : کتاب مذکور، ۶۲، ۲۰۶) ۔ المأمون کے عہد میں مالک بن طوق ابن مالک بن عتّاب التغلبی نے، جو الرَّحْبة کا بانی تھا، بنو قیس کو، جو جوارِ رحبه میں رہتے تھے، مطیع کر لیا ۔ اس کے بیٹے احمد اور جمان [جَمّان ؟ جُمان ؟] التغلبی (۳۳۶ھ / ۹۴۷ - ۹۴۸ء) کی بغاوت کے متعلق دیکھیے مادّۂ 'الرَّحبة' (ابن خلدون : عِبر، ۳ : ۳۰۱ ؛ ابن الأثیر، ۶ : ۲۱۳ ؛ H.C. Kay، در *J.R.A.S.*، سلسلۂ جدید، ۱۸، ۱۸۸۶ء : ص ۵۰۴؛ Musil : *Euphrates*، ص ۳۴۰ ببعد) ۔ ۲۵۰ھ / ۸۶۴ء میں الحسن بن عمر بن خطّاب التغلبی نے جزیرۃ ابن عمر آباد کیا (یاقوت، ۲ : ۷۹؛ قبّ البلاذری : ص ۱۸۰) ۔ اسحٰق بن ایوب التغلبی نے ۲۶۷ھ / ۸۸۰ء میں تغلب ، بکر ، ربیعه اور یمنیوں وغیرہ کو جمع کر کے اسحٰق بن کُنْداج کُنْداجیق) کے خلاف جنگ کی ، لیکن شکست کھائی (طبری ، ۳ : ۱۹۹۱ ببعد ؛ ابن الأثیر، ۷ : ۲۳۱ ببعد، موصل کے تغلبیوں کے متعلق دیکھیے مادّۂ 'الموصل') ۔ اس صدی کے دوسرے نصف میں الجزیرۃ میں جو بدامنی رھی اس کی وجه سے تغلب کی ھجرت شروع ھو گئی ۔

ان کا صرف ایک فریق اس علاقے میں جو الرّحبه اور جزیرۃ ابن عمر کے گرد و نواح میں ھے باقی رہ گیا، ان میں کا ایک اور فریق شاید بوزنطی علاقے میں چلا گیا ۔ چوتھی صدی ھجری / دسویں صدی میلادی میں ھم بڑے بڑے تغلبی عشیروں کو بحرین کے علاقے میں گرمِ عمل پاتے ھیں ، جہاں سُلَیم اور عُقَیل . . . ابن عامر بن صعصعه سے ان کا سامنا ھوا ، جلد ھی وہ بغاوتِ قرامطه میں شامل ھو گئے (چونکه [حضرت] عمر[رض] کے عہد سے جزیرہ نمائے عرب میں صرف مسلمان ھی رہ سکتے ھیں [دیکھیے مثلاً طبری ، ۱ : ۲۴۸۲؛ مگر بکری ، ص ۹ کسی حد تک اس متداول رائے کی تردید کرتا ھے] انہوں نے عیسائی مذھب ترک کر دیا ھوگا) ۔ ۳۷۸ھ/ ۹۸۸ ۔ ۹۸۹ء میں قرمطیوں کی شکست کے بعد تغلبی سردار ابوالحسن الاصفر نے بنو عُقَیل کی مدد سے بنو سُلَیم کو بھگا دیا اور اس کے بعد عُقَیل کو بھی ھجرت کرنے پر مجبور کر دیا ۔ عُقَیل کو بعد کے زمانے میں سلجوقیوں نے پھر بحرین واپس ھو جانے پر مجبور کر دیا [دیکھیے مادّۂ 'بنو عُقَیل'] ، جہاں انہوں نے تغلبیوں کو، جن کی طاقت اب کمزور ھو چکی تھی، کچل دیا (Kay : وھی کتاب ، ۵۰۵ ، ۵۲۴ ببعد) ۔ غالباً تغلبیوں کا ایک حصه اس سے پہلے کسی وقت جزائر فَرَسان [رَکّ بآن] میں بھی جا بسا تھا (قبّ شپرنگر: *Geogr.*، ۳۱ ، ۲۵۴ ؛ یاقوت : ۳ : ۸۷۴،۸۹۷ ؛ اس دعوے کے متعلق که قبطی تغلب کی نسل سے ھیں دیکھیے مادّۂ 'ربیعة و مُضر')، گو احتمال ھے که ان کی اکثریت بعد میں ملک شام کے صحراء میں پھیل گئی ھو ۔ ۶۸۱ھ/ ۱۲۸۲ء میں ھم انھیں تاتاریوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ جنگ کرتے اور فتحمند ھوتے پاتے ھیں (ابن العِبْری Barhebraeus : تاریخ، طبع

صالحانی، ص ۴۰۵)، اور قلقشندی بھی لکھتا ہے کہ وہ اسی زمانے میں ملک شام میں موجود تھے۔ نویں صدی ہجری / چودھویں صدی میلادی سے اس دلچسپ قبیلے کا ذکر صفحاتِ تأریخ سے غائب ہو جاتا ہے (قب لامنز Lammens کی تحقیقات، اس کی کتاب Chantre کے آخر میں)؛ اس لیے جب دورِ حاضر کا کوئی قبیلہ (مثلاً دواسر کا ایک حصہ) اپنا شجرۂ نسب تغلب سے ملاتا ہے تو یہ بات اور بھی زیادہ جالبِ نظر ہو جاتی ہے (فؤاد حمزہ: قلب جزیرة العرب، مکة ۱۳۵۲ھ، ص ۱۰۵)۔ یہی صورت شمّر کی ہے، جو تغلب، عبس اور ہوازن سے مخلوط بتائے جاتے ہیں (Handbook of Arabia، ۱: ۷۵)؛ پالگریو W. G. Palgrave: ..... Narrative، لنڈن ۱۸۶۵ء، ۱: ۱۱۸ [مآخذ ؟ : قب ۱: ۳۵۹] کو جبل شمّر کے باشندوں سے معلوم ہوا کہ یہ اختلاط حربِ بسوس کے بعد [جنگ قضّة کے بعد ؟ دیکھیے سطور بالا] واقع ہوا ۔ اس بارے میں کہ بئر شقیق [قب رولة] "عملِ نصاریٰ" ہے [یعنی تغلب وغیرہ نے بنایا] دیکھیے پالگریو، (۱: ۸۸)۔

اس قبیلے کی معاشری زندگی کے متعلق ہمیں ان کے اپنے شعراء کے کلام اور ان کے حریفوں کی ہجووں کے ذریعے خاصی معلومات حاصل ہیں ۔ عبدالمسیح سیّد تغلب [قب مروج (۱: ۲۱۷)، جہاں اسے الغسانی لکھا ہے] نے خالد رضا سے کہا کہ ہم عرب (یعنی بدّو) نہیں بلکہ "مستعرب" نبطی ہیں (یعنی زراعت پیشہ لوگ، جنھوں نے بدووں کا رسم و رواج اختیار کر لیا ، دیکھیے مسعودی: .Hist. Encycl، طبع شپرنگر، لنڈن ۱۸۴۱ء، ۱: ۲۴۹؛ رٹّر C. Ritter: Erdkunde، ۱: ۶۴ ببعد) ۔ الاخطل (ص ۲۲۲) "منبت القمح و التمر" کا ذکر کرتا ہے (یعنی الجزیرہ کا، جو ان کا علاقہ تھا اور جس میں گندم اور کھجور پیدا ہوتی تھی) (لامنز: Chantre، ص ۹۶)؛ وہ گھوڑوں کو تربیت دینے اور پرورش کرنے میں مشہور تھے (وہی مصنف: Moʻâwia، ص ۳۹۸) ۔ زیادہ حیرت انگیز تو یہ بات ہے کہ وہ ملّاح بھی تھے [دیکھیے السّفینة] اور ان کی کشتیوں کی تجارت ان کے لیے دولت اور اثر و رسوخ کا ذریعہ تھی (قب اخطل، ص ۷۰۳؛ لامنز: Omayyades، ص ۲۱۴ ببعد، ۲۲۶، ۲۶۵ تا ۲۶۸) ۔ اگر ہمیں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ہندوستان سے تجارت کا راستہ ان کے علاقے میں سے ہو کر جاتا تھا اور یہ کہ عام طور پر ہر طرف کو جانے والی تجارتی شاہراہیں الجزیرة میں سے گذرتی تھیں تو ہمیں تبریزی کے اس قول کے سمجھنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آنی چاہیے جو اس نے عمرو کے معلّقة (طبع لائل Lyall، ص ۱۰۸، سطر ۴) کی شرح میں دیا ہے کہ [" و قالوا لو ابطأ الاسلام قليلاً لأكلت بنو تغلب الناس "] اگر اسلام کا ظہور کچھ عرصے بعد ہوتا تو تغلب نے لوگوں کو نگل لیا ہوتا " (لامنز: Chantre، ص ۹۷؛ Mo ʻâwia، ص ۳۹۸؛ Omayyades، ص ۲۶۷)، اور یہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ [حضرت] عمر رضا اس اونچی ناک والے، طاقتور قبیلے کے حق میں بردباری اور حلم سے کیوں کام لیتے تھے ۔ بعد کے زمانے میں کچھ دوسرے لوگ اس امتیازی مقام کی وجہ سے جو تغلب کو حاصل تھا ان سے قدرے حسد کرنے لگے اور ان کے خلاف روایات وضع کر لی گئیں ۔ دو روایتیں، جو [حضرت] علی رضا سے منسوب ہیں، بہت معنی خیز ہیں : ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ آپ نے تغلب کی بیخ کنی کی خواہش ظاہر کی، کیونکہ اس معاہدے کے خلاف جو

انھوں نے [حضرت] عمرؓ سے کیا تھا وہ اپنے بچوں کو برابر عیسائی بناتے رہے (بلاذری، ص ۱۸۳؛ قب عقد، ۳ : ۲۰۶، سطر ۴)؛ دوسری بہت شائع روایت یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تغلب نے عیسائی مذہب سے صرف شراب نوشی ھی سیکھی ہے (زمخشری و بیضاوی : در تفسیر، سورۃ ۵ [المائدۃ] : ۷، قب کایتانی Caetani : Annali ، سال ۲۰ ھجری، § ۳۷) - یہ حقیقت ہے کہ آخری ''اُسقُف قبائل'' چوتھی / دسویں صدی کے آغاز میں مقرّر ہوا تھا (اسقفوں کی فہرستوں کے بارے میں دیکھیے خصوصاً چارلس Charles : کتاب مذکور، ۷۶ تا ۸۳) اور گو ان کا مذھبی اعتقاد محض سطحی تھا، جیسا کہ عام طور پر بدووں کا ھوتا ہے (گولٹ‌تسیھر Goldziher : کتاب مذکور؛ لامنز : Omayyades، ۲۳۶ تا ۲۳۹، ۲۴۹)، لیکن انھوں نے صدیوں تک بڑی سختی کے ساتھ اس کی حفاظت کی (ان کے جذبۂ مخالفت کا ذکر بڑے زور کے ساتھ ھوا ہے، طبری، ۱ : ۲۵۱۰؛ بلاذری، ۱۸۱ ببعد، ان میں شہیدوں کی کمی نہ تھی؛ لامنز : Chantre، Nau : ۳۸؛ ص ۱۰۹ ببعد؛ چارلس، ۹۸ تا ۱۰۰) - اس قبیلے کا سرپرست ولی [مار] سرجس Sergius تھا؛ اور وہ الرُّصافہ [رَكَ بآن] میں اس کی قبر کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے، جنگوں میں اس کے جھنڈے تلے لڑا کرتے تھے اور اس بات پر دوسرے قبائل مدتوں ان کا مضحکہ اڑاتے رہے (لامنز : Omayyades، ۲۱۴، ۲۱۷، ۲۳۹ تا ۲۴۲؛ Mo'âwia، ص ۴۳۰؛ Musil : Palmyrena، ۲۶۷، ۲۶۹؛ شیخو : النصرانیة، ص ۹۹ ببعد) - شراب نوشی کی عادت ان کی ایک اور خصوصیت تھی، جس کی وجہ سے ان کے مخالفین اکثر انھیں عُرضۂ تحقیر بناتے رہے (گولٹ‌تسیھر : کتاب مذکور؛ قطامی، ص ix ببعد، ۹؛ ان مقامات کے متعلق جہاں بہترین شراب ملتی تھی دیکھیے لامنز : Omayyades، ۲۰۳، ۲۰۶)، اور زیادہ نمایاں طور پر ان کی طمع اور ناسہمان نوازی کی ہجو ہوتی تھی (مسعودی : مروج، ۶ : ۱۵۱ ببعد، عقد، ۳ : ۸۴، ۹۳، ۲۳۲، ۲۳۶؛ اغانی، ۷ : ۱۸۶) - اگر یہ ھجوگوئی اور طعنہ‌زنی صرف جریر کے وقتی میلانِ استہزاء پر مبنی ہے تو خیر، لیکن اگر یہ زیادہ گہری بنیادوں پر قائم ہے تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کہیں یہ صورت تو نہ تھی کہ تغلب کی خوش حالی اور جائز فخر نے (یہ وہ فضائل ہیں جن کا جامع کُلَیب تھا!) انھیں اپنے حاسد پڑوسیوں سے، جو ان سے کم سطح پر تھے، میل جول رکھنے سے باز رکھا؟

تغلب میں کئی مشہور و معروف شاعر بھی پیدا ہوے - شیخو : شعراء، ص ۱۵۱ تا ۲۰۴ میں ذیل کے تغلبی شعراء کے تراجم دیتا ہے : کُلَیب [رَكَ بآن]، مُہَلہِل (تغلب کی رائے میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے باقاعدہ قصیدہ لکھا، اصمعی لکھتا ہے کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے قصیدہ ۳۰ ابیات کا لکھا - فِرنِل : ص ۷۶، ۸۴)؛ السَّفّاح (یعنی سَلَمَة بن خالد، یوم الکُلاب میں رئیسِ تغلب) [دیکھیے مادّۂ 'بکر']؛ الاَخنس بن شِہاب؛ اُفنُون (صُرَیم بن مَعشَر کا لقب)؛ عمرو بن کُلثوم [رَكَ بآن]؛ جابر بن حُنَیّ (دیکھیے نولڈکہ : Fünf Mo'all.، ۱ : ۱۹) اور عُمَیرۃ بن جُعَیل (ابن قُتَیبۃ : الشعر، ص ۱۱۴، میں عُمَیرۃ اور عَمِیرۃ دونوں صورتیں دی ہیں)؛ ہم چند اَور ناموں کا اضافہ بھی کیے دیتے ہیں : کَعب بن جُعَیل (وھی کتاب؛ لامنز : Chantre، ص ۱۰۲ تا ۱۰۵، ۱۳۴؛

Mo'âwia ، ص ۱۸۸، حاشیہ ۸)؛ الاَخْطَل [رَکّ بآن]؛ القُطامی [رَکّ بآن]؛ العتّابی، عمرو کی نسل کے متأخّرین میں سے تھا (نولڈکہ : کتاب مذکور) اور دیگر شعراء؛ ان کے علاوہ دوسرے شعراء اور مشاہیر تغلب کے نام کتب ذیل میں دیے ھیں : ابن دُرید : الاِشتِقاق، ۲۰۲ تا ۲۰۵؛ ابن خَلدون : عِبر، ۲ : ۳۰۱ بعد؛ عِقد، ۲ : ۳۴، سطر ۲۴ بعد؛ قبّ Reiske : کتاب مذکور، ص ۱۶۱، ۲۶۹ ۔

تغلب کی زبان کے متعلق یہ کہا جاتا ھے کہ رومیوں کے قرب کی وجہ سے خالص نہ تھی (Blau : کتاب مذکور ، ص ۵۹۲؛ سیوطی : مزھر، بولاق ۱۲۸۲ھ، ۱ : ۱۰۵) - عِقد، ۲ : ۳۳، سطر ۲۶ میں ھے کہ ان کی خصوصیت کَشْکَشَۃ اور بکر کی کَسْکَسَۃ تھی - اسی کے مشابہ عبارت ۱ : ۲۰۷، سطر ۳۰ پر ھے- وھاں بکر کی خصوصیت شَکْشَۃ بتائی ھے اور تغلب کی فَشْفَشَۃ (سیوطی : ۱ : ۱۰۹ بعد میں یہ عبارت نہیں ھے؛ کَشْکَشَۃ کے لیے قبّ لسان العرب، ۸ : ۲۳۳، سطر ۱۷ بعد؛ تاج العروس، ۴ : ۳۴۵، سطر ۱۱ بعد؛ خصوصاً A. Schaade : *Sībawaihi's Lautlehre*، لائیڈن ۱۹۱۱ء، ص ۶۲ بعد ، ۷۹ ، ۸۴) - اَخْطَل کی خصوصیاتِ زبان کے متعلق دیکھیے نولڈکہ، در *W.Z.K.M.*، ۶ (۱۸۹۲ء) : ۳۴۸ بعد — قبّ نیز فریتاغ G. W. Freytag : *Einleitung....*، بون Bonn ۱۸۶۱ء، ۷۵ ، ۹۱ ۔

مآخذ : (متن مادّہ کے حوالوں کے علاوہ) (۱) عربی معاجم اور رسائل انساب؛ (۲) وستن فلٹ : *Register*، ص ۴۳۳ تا ۴۳۶ اور *Tabellen*, C and 2؛ (۳) ابن دُرید : کتاب الاشتقاق، طبع وستن فلٹ، گوٹنگن ۱۸۵۴ء، ۲۰۲ تا ۲۰۵؛ (۴) القلقشندی : نہایۃ الاَرَب فی معرفۃ اَنساب العَرب، بغداد ۱۳۳۲ھ، ص ۱۵۹ بعد، ۲۹۸؛ ('تَعلَب' کے بجاے ساری کتاب میں 'تغلب' پڑھیے) ، ۳۵۷؛ (۵) السُّوَیدی : سَبائک الذَّھب فی مَعرِفَۃ قبائل العرب، بمبئی ۱۲۹۶ھ (طبع سنگی)، ۴۴، ۵۴، ۲۳؛ (۶) ابن قُتیبۃ : کتاب المعارف، طبع وستن فلٹ، گوٹنگن ۱۸۵۰ء، ۴۶ بعد ، ۲۸۳؛ (۷) سمتھ W. Robertson Smith : *Kinship and Marriage in Early Arabia*، کیمبرج ۱۸۸۵ء، ۱۲ تا ۱۴، ۱۹۴، ۲۵۳ بعد؛—(۸) طبری؛ (۹) ابن الأثیر؛ (۱۰) بلاذری (طبع ڈ خویہ)؛ (۱۱) کتاب الأغانی؛ (۱۲) نقائض، (طبع Bevan)؛ (۱۳) یاقوت؛ (۱۴) بکری : معجم (طبع وستن فلٹ)؛ (۱۵) مراصد الاطّلاع (طبع T. G. J. Juynboll) ، بامداد اشاریات؛ (۱۶) ابن عبد ربّہ : العِقد الفرید ، قاھرۃ ۱۳۱۶ھ، خصوصاً ۱ : ۲۰۷؛ ۲ : ۳۳ ، ۳۷ تا ۳۹ ، ۴۵ بعد؛ ۳ : ۵۹ ، ۶۶ تا ۷۰ ، ۸۱ تا ۸۴، ۹۳ ، ۲۳۲ ، ۲۳۶ ، ۲۵۶؛ (۱۷) ابن خَلدون : عِبر، بولاق ۱۲۸۴ء، ۲ : ۳۰۱ تا ۳۰۳؛ ۲/۲ : ۷۲ بعد ، ۸۱ تا ۸۳ ، ۱۰۷ تا ۱۰۹ —— دورِ جاھلیت کے متعلق : (۱۸) نولڈکہ : *Geschichte der Perser und Araber zur Zeit der Sasaniden* ، لائیڈن ۱۸۷۹ء، ص ۵۶ بعد ، ۶۷، ۳۳۳ بعد؛ (۱۹) وھی مصنف : *Fünf Mo'allaqāt* ، ۱، در *Sb. Ak. Wiss. Wien, phil.-hist. Cl.* CXL/vii (1899)، مواضع کثیرہ؛ (۲۰) G. Rothstein : *Die Dynastie der Lahmiden in Al-Ḥira*، برلن ۱۸۹۹ء، ص ۱۰۰ بعد، ۱۱۲، ۱۲۰ تا ۱۲۲، ۱۳۵، ۱۳۷؛ (۲۱) J.J. Reiske : *Primae lineae hist. regn. arab...*، طبع وستن فلٹ، گوٹنگن ۱۸۴۷ء : ۱۶۱ تا ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۸۱ تا ۱۹۸؛ (۲۲) A. P. Caussin de Perceval : *Essai sur l'histoire des Arabes....*، پیرس ۱۸۴۷ - ۱۸۴۸ء ، ج ۳، اشاریہ؛ (۲۳) فرنل : *Lettres sur l'histoire des Arabes ...*، پیرس ۱۸۳۶ء ، ص ۱۵ تا ۲۸ ، ۶۷ تا ۸۴ ، (۴۶) بعد؛ (۲۴) C. J. Lyall : *Trans-*

lations of Ancient Arabian Poetry، لنڈن ۱۸۸۵ء،
اشاریه — اسلامی عهد کے متعلق : (۲۵) شپرنگر
A. Sprenger : *Das Leben und die Lehre des*،
Mohammad، برلن ۱۸۶۵ء : ۳ : ۳۹۱، ۴۳۳ ببعد؛
(۲۶) وهی مصنف : *Die alte Geographie Arabiens*،
Bern ۱۸۷۵ء، ص ۳۱، ۲۵۴؛ (۲۷) ولهاؤزن :
Skizzen und Vorarbeiten : ج ۴ (برلن ۱۸۸۹ء) :
ص ۱۵۶؛ ج ۶ (برلن ۱۸۹۹ء) : ۴ ببعد، ۶۹، ۸۵
ببعد ؛ (۲۸) وهی مصنف : *Das arabische Reich und*
Sein sturz، برلن ۱۹۰۲ء، ۱۵، ۱۲۷ تا ۱۳۰؛ (۲۹)
ڈ خویه : *Mémoires d'hist. et de géogr. orientales*،
عدد ۲ (*Conquête de la Syrie*)، طبع دوم، لائیڈن
۱۹۰۰ء : ۳۷ تا ۵۰ ؛ (۳۰) A. v. Kremer :
Culturgeschichte des Orients... ویانا ۱۸۷۵ تا ۱۸۷۷ء،
۱ : ۶۳، ۱۰۵ ؛ (۳۱) البلاذری : انساب الاشراف،
طبع S. D. F. Goitein : ج ۵ (یروشلم ۱۹۳۶ء) :
۳۱، ۳۰۸ تا ۳۰۹، ۳۱۳ تا ۳۳۱ ؛ (۳۲)
الاخطل : دیوان، طبع صالحانی، بیروت ۱۸۹۱ء،
اشاریه؛ (۳۳) القطامی : دیوان، طبع J. Barth،
لائیڈن ۱۹۰۲ء : *Einleitung* اور *Noten*، مواضع
کثیره ؛ (۳۴) ابن قتیبة: الشعر و الشعراء، طبع
ڈ خویه، لائیڈن ۱۹۰۴ء، اشاریه — ان کی عیسائیت
کے متعلق : (۳۵) I. Goldziher : *Muhammed—*
anische Studien، Halle ۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۰ء، ج ۱ : ۱۲،
حاشیه ۳؛ (۳۶) F. Nau : *Les Arabes chrétiens de*
Mésopotamie et de Syrie du VIIème au VIIIème siècle،
پیرس ۱۹۳۳ء، ص ۱۰۵، ۱۰۹ تا ۱۱۳؛ (۳۷)
H. Charles : *Le Christianisme des Arabes*
nomades sur le Limes..، پیرس ۱۹۳۶ء، اشاریه ؛ (۳۸)
شیخو L. Cheikho : النصرانیة و آدابها بین عرب
الجاهلیة، بیروت ۱۹۱۲ تا ۱۹۲۳ء، ص ۹۹
ببعد، ۱۲۵ ببعد، ۳۴۰، ۳۵۴؛ قب نیز اس کی تصنیف
(۳۹) شعراء النصرانیة، بیروت ۱۸۹۰ء، ص ۱۵۱ تا ۲۰۴
(کتاب کے نام سے غلط فهمی پیدا هوتی هے)—(۴۰)
تمدن و معاشرت کے مسائل کے متعلق قیمتی ملاحظات
لامنز H. Lammens کی تصانیف ذیل میں ملتے هیں: (ا)
Le chantre des Omiades، *J. A.*، در ۹/۴ (۱۸۹۴ء) :
ص ۹۴ تا ۱۷۶، ۱۹۳ تا ۲۴۱، ۳۸۱ تا ۴۵۹، مواضع
کثیره؛ (ب) *Études sur le règne du calife omaiyade*
Mo'âwia Ier، پیرس ۱۹۰۸ء، اشاریه؛ (ج) *Études*
sur le siècle des Omayyades، بیروت ۱۹۳۰ء، اشاریه؛
(د) *Le Califat de Yazîd Ier*، در *M. F. O. B.*، ج ۵
(۱۹۱۱ء) : ص ۲۲۹ = ۲۳۱؛ (ه) *L'avènement des Mar-*
wânides، وهی مجله، ج ۱۲ (۱۹۲۷ء) : ص ۵۹ ببعد = ۹۹
ببعد، ۶۲ ببعد = ۱۰۲ ببعد — بلاد تغلب کی جغرافیائی تفصیل
کے متعلق : (۴۱) A. Musil : *The Middle Euphrates*،
نیویارک ۱۹۲۷ء اور اس کی (۴۲) *Arabia Deserta*،
نیویارک ۱۹۲۷ء اور (۴۳) *Palmyrena*، نیویارک
۱۹۲۸ء، اشاریات، بذیل مادۂ *Taɣleb*.

(H. Kindermann)

تَغْلَق : صواب تر تُغْلُق هے، جیسا که ابن بطوطه نے صحیح طور پر ضبط کیا هے، ایک خاندان کا نام هے، جس نے دهلی میں ۱۳۲۰ء سے ۱۴۱۳ء تک حکومت کی ۔ خاندان کا یه نام اس کے بانی کے عَلَم یعنی غیاث‌الدین تُغْلُق سے ماخوذ هے، جو قرونیه ترکوں میں سے تھا، یعنی اس کا باپ ترک اور ماں هندوستانی تھی ۔ جب خلجی خاندان [رک به خلجی] کے آخری بادشاه کو اس کے فرومایه منظور نظر خسرو نے قتل کر دیا تو تغلق دهلی کی جانب بڑھا ۔ وه شمالی و مغربی سرحد پر متعین تھا اور تاتاریوں کے خلاف متعدد جنگوں مین فتح پانے کی وجه سے غازی ملک کا خطاب حاصل کر چکا تھا ۔ دهلی کے نواح میں اس نے غاصب کو شکست دے کر قتل کر ڈالا اور ۸ ستمبر ۱۳۲۰ء کو تخت

نشین ہوا - ۱۳۲۵ء کے اوائل میں کہن سال تغلق بنگال کی مہم سے واپس آ رہا تھا تو اس کے فرزند محمد نے [تغلق آباد سے چھے میل کے فاصلے پر ایک عارضی محل تین روز میں تیار کرا لیا، تا کہ بادشاہ رات کے وقت وہاں آرام کرے اور صبح کے وقت شہر میں بہ صورت جلوس داخل ہو - صبح جلوس کی تیاری ہو رہی تھی کہ محل کی چھت اچانک گر پڑی اور چھے آدمی نیچے دب کر جان بحق ہو گئے، جن میں خود بادشاہ اور اس کا ایک بیٹا بھی شامل تھے - شبہ کیا گیا کہ خود اس کے قابل ترین فرزند محمد تغلق نے، جو اس سے پہلے دکن میں ایک مرتبہ بغاوت بھی کر چکا تھا، باپ کو ختم کرنے کے لیے یہ محل بنوایا تھا، مگر اس مبینہ توجیہ کے سوا بھی زیادہ قریبی توجیہات اس حادثے کی موجود تھیں].

محمد بن تغلق [رک بآن] [بڑا ذی علم اور] ہندوستان کے بہت بڑے مسلمان بادشاہوں میں سے تھا ، مگر اس کے مزاج میں تلوّن اتنا زیادہ تھا کہ جنون کی حد تک پہنچتا تھا - تمام ہندوستان میں اپنی حکومت کا سکّہ جمانے کے بعد اس نے اپنے نئے نئے انتظامات سے تقریباً ہر صوبے میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا - ابتدائی دس سال کی حکومت کے بعد اس کی باقی زندگی صرف بغاوتیں فرو کرنے میں گزری - وہ ۱۳۵۱ء میں ایک بغاوت کی سرکوبی کے لیے سندھ پہنچا ہوا تھا کہ پیام اجل آ پہنچا اور اس کا چچیرا بھائی فیروز بن رجب [رک بآن] بادشاہ بنا .

سندھ، بنگال اور دکن کے صوبے محمد بن تغلق کے عہد میں مرکز سے الگ ہو چکے تھے - فیروز نے سندھ کو مسخّر کر لیا ، بنگال کو مسخّر نہ کر سکا اور دکن کے لیے تو کوئی کوشش بھی نہ کی، چنانچہ وہاں ایک خود مختار اور طاقتور سلطنت قائم ہو گئی - اس کا عہدِ حکومت رفاہی کاموں کے لیے مشہور ہے .

اس کے لائق فرزند فتح خان کی وفات نے فیروز کی کمر توڑ دی اور نظم و نسق کا شیرازہ بکھرنے لگا - آخری عمر میں اس نے اپنے ایک پوتے (فتح خان کے بیٹے) کو جانشین نامزد کر دیا تھا اور وہ ۱۳۸۸ء میں فیروز کی وفات پر غیاث‌الدین تغلق ثانی کے لقب سے بادشاہ بنا - اس کی نالائقی اور عیش پرستی نے امیروں کو متنفر کر دیا اور وہ تغلق ثانی کے چچیرے بھائی ابوبکر (بن ظفر خان بن فیروز) کے ساتھ ہو گئے، جو قید تھا - تغلق ثانی بھاگتا ہوا مارا گیا اور ۱۳۸۹ء میں ابوبکر تخت پر قابض ہو گیا .

کچھ مدت بعد اس کا اثر بھی گھٹنے لگا اور فیروز کے چھوٹے بیٹے محمّد نے تخت کے لیے لڑائی شروع کر دی - وہ ۲۰ جنوری ۱۳۹۴ء کو جالیسر میں فوت ہوا تو اس کا بیٹا ھمایوں خان ''علاءالدین سکندر'' کے لقب سے بادشاہ بن گیا - دو مہینے میں اس کا بھی انتقال ہوگیا تو امراء نے اس کے بھائی محمود کو تخت پر بٹھا دیا .

محمود تغلق پہلے خواجہ سرا مَلک سَرْوَر [رک بآن] کے زیر اثر رہا، جسے اس نے جون پور کا والی مقرر کر دیا، اسی مَلک نے خاندان سلاطین شرقی کی بنیاد رکھی - بعد ازاں محمود ایک اَور شخص مُلّو مُلقّب بہ اقبال خان کے کہنے پر چلنے لگا - امراء کے ایک گروہ نے محمود کے چچیرے بھائی نصرت (بن فتح خان) کی شاھی کا اعلان کر دیا ؛ چنانچہ کچھ عرصے تک دلّی اور اس کے گرد و نواح میں دو بادشاہوں کی حکومت رہی مگر وہ دونوں اپنے اپنے امراء کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھے .

یہ حالت تھی جب ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور

[رک بآں] نے ہندوستان پر حملہ کیا ۔ اس کے دلّی پہنچنے سے پیشتر ہی نصرت خان کو وہاں سے بھگا دیا گیا تھا ۔ محمود تغلق اور مُلّو نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی ۔ محمود گجرات کی طرف اور مُلّو بَرَن کی طرف چلا گیا، تیمور واپس گیا تو محمود پھر بادشاہ بن گیا، لیکن اس کی زندگی کے باقی سال ایک بے دست و پا قیدی کی حیثیت میں بسر ہوے۔ مختارِ کل مُلّو تھا ۔ ۱۴۰۵ء میں مُلّو کی وفات پر دولت خان لودھی سیاہ و سفید کا مالک بن گیا ۔ محمود نے ۱۴۱۳ء میں بمقام کیتھل انتقال کیا اور اس پر تغلق خاندان کا خاتمہ ہو گیا ۔

سولہ مہینے کے اندر اندر خِضْر خان [رک بآں] نے دولت خان کا تخته الٹ دیا اور ۲۸ مئی ۱۴۱۴ء کو دلی میں خاندانِ سادات کی حکومت کی بنیاد رکھی ۔

مآخذ : (۱) بَرَنی : تاریخ فیروز شاہی، کلکته ۱۸۹۱ء ؛ (۲) شمس سراج عفیف: تاریخ فیروز شاہی؛ کلکته ۱۸۹۱ء؛ (۳) بداؤنی: منتخب التواریخ، متن کلکته ۱۸٦۷- ۱۸٦۸ء و ترجمه از رینکنگ G.S.A. Ranking، ۱۸۹۸ء ؛ (۴) محمد قاسم فرشته : گلشن ابراهیمی، بمبئی ۱۸۳۲ء؛ [(۵) آغا مہدی حسین : *The Rise and Fall of Muhammad Bin Tughluq*، لنڈن ۱۹۳۸ء].

(ہیگ T. W. HAIG و ادارہ)

* **التَّفْتازانی** : (سعدالدین مسعود بن عمر) بلاغت، منطق، ماوراء الطبیعة، کلام، فقه اور دوسرے علوم کے مشہور ماہر، آپ کی کئی درسی کتابیں اب تک مشرق کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں ۔ وہ صفر ۷۲۲ھ / فروری ۔ مارچ ۱۳۲۲ء میں [''قریة الرجال''—مطلع] تفتازان میں پیدا ہوے، جو خراسان میں نَسا کے قریب ہے ۔ کہتے ہیں کہ وہ عضدالدین الاِیجی [رک بایجی اور براکلمان: G.A.L.، ۲ : ۲۰۸] اور قطب الدین [غالبًا قطب الدین الرازی التحتانی، دیکھیے براکلمان، ۲ : ۲۰۹] کے شاگرد تھے۔ ان کی بڑی بڑی تصانیف کی فہرستیں ابھی تک محفوظ ہیں، جن میں ان کی تاریخ تحریر اور مقام تألیف قدرے اختلاف کے ساتھ درج ہیں (مجمل فصیحی، بذیل سنه ۷۸۲ھ؛ روضات الجنّات، ص ۳۰۹ [تاریخوں میں خاصه اختلاف ہے]؛ الفوائد البَہِیّة، ص ۱۳۷؛ اہلوارٹ Ahlwardt : *Berlin Catalogue*، عدد ۱۹۰۹) اور اُن سے ان کے نقلِ مکانی کا بھی کچھ نہ کچھ حال معلوم ہوتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی پہلی تصنیف شرح التصریف العِزّی سولہ برس کی عمر میں (در شعبان ۷۳۸ھ / ۱۳۳۸ء) فَرْیُومَد میں لکھی ۔ المطوّل، المختصر المعانی اور التلویح علی الترتیب ۷۴۸ھ، ۷۵٦ھ اور ۷۵۸ھ میں بمقام ہرات، غُجْدُوان اور گلستان پایۂ تکمیل کو پہنچیں ۔ ابن عرب شاہ کے قول کے مطابق التفتازانی، قطب الدین الرّازی کی طرح ان علماء میں سے تھے جو مغربی قِپچاق کے مغول بادشاہوں کے دربار کی طرف کھچے چلے آئے ۔ مختصر المعانی، جو غُجْدُوان میں ۷۵٦ھ میں مکمل ہوئی، فی الواقع محمود جانی بیگ کو پیش کی گئی تھی ۔ خواند امیر کا بیان ہے کہ آپ خوارزم میں آ بسے تھے، اس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ جو تصانیف آپ نے ۷٦۸ھ، ۷۷۰ھ اور ۷۷۸ھ میں مکمل کیں وہ وہیں لکھی گئی تھیں۔ خواند امیر لکھتا ہے کہ ۷۷۹ھ / ۱۳۷۷ - ۱۳۷۸ء میں آپ نے الجُرجانی [رک به الجرجانی، علی بن محمد، السیّد الشریف و به براکلمان : G.A.L.، ۲ : ۲۱٦] کو فارس کے حکمران شاہ شجاع مُظفّری کی خدمت میں پیش کیا ۔ یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ جب تیمور نے

خوارزم پر حملہ کیا [۷۸۱ ھ / ۱۳۷۹ء میں] ملک محمد سَرَخْسی بن ملک معزالدین حسین کُرت نے اپنے بھتیجے پیر محمد بن غیاث‌الدین پیر علی سے، جو اس وقت تیمور کے حاشیہ نشینوں میں سے تھا، کہا کہ تیمور سے اجازت لے کر التفتازانی کو سَرَخْس بھیج دیا جائے، تیمور راضی ہوگیا، لیکن بعد میں جب اسے التفتازانی کے علم و فضل کا حال معلوم ہوا تو اس نے سَرَخْس میں کسی کو بھیج کر [علّامہ] تفتازانی سے استدعا کی کہ وہ سمرقند تشریف لے آئیں ۔ [علّامہ] نے پہلے تو یہ عذر پیش کیا کہ میں حجاز جا رہا ہوں ، لیکن دوسری طلبی پر [مطلع سعدین، ج اول میں وقایع ۷۸۱ھ کے ذیل میں طلبی کا پورا خط نقل ہوا ہے، جس کی تأریخ اواخر رمضان ۷۸۱ ھ ہے؛ نسخۂ مطلع سعدین مسجد سلیمیہ ، ادرنہ، ترکیّہ] وہ سمرقند آگئے اور تیمور نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ جب ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں تیمور نے شیراز فتح کیا تو اس کے بعد [۷۹۰ھ میں (مطلع سعدین، ۲/۲ : ۶۲۶)] ان کے دیرینہ آشنا السیّد الشریف الجُرجانی بھی سمرقند میں وارد ہوے۔ ان کی باہمی رقابت سے مناظرہ و مجادلہ کا بازار گرم ہوا، جس سے دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اس کشیدگی کی غمازی الجُرجانی کی وہ تنقیدات کرتی ہیں جو انہوں نے التفتازانی کی راؤں پر اپنی تصانیف میں کی ہیں [نیز دیکھیے مطلع سعدین، ۲/۲ : ۶۲۶ تا ۶۲۹ مع حواشی و طاش کبری زادہ : الشقائق النعمانیۃ برہامش وفیات الاعیان، ۱ : ۷۴ ببعد، طبع مصر ۱۳۱۰ھ]۔ التفتازانی سمرقند میں ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں فوت ہوے ([ابن عرب شاہ ، ص تکب]، بغیۃ الوُعاۃ) یا ۲۲ محرم ۷۹۲ھ / ۱۰ جنوری ۱۳۹۰ء میں (الفوائد البہیّۃ ، ص ۱۳۵) یا ۲۲ محرم ۷۹۳ ھ/۳۰ دسمبر ۱۳۹۰ ء میں (ایک تاریخی مادّے کے مطابق ، جسے جُرجانی سے منسوب کیا جاتا ہے، دیکھیے فہرست الکتب ... بالکُتبخانہ الخدیویۃ ، ۲ : ۲۳۲) یا ۷۹۷ھ/۱۳۹۴ - ۱۳۹۵ء میں (حبیب السِیَر) ۔ ۷۸۷ھ کی تأریخ، جو فصیحی نے دی ہے، ان کی بعض تصانیف کی تکمیل کی مبیّنہ تأریخوں سے مطابقت نہیں کھاتی اور نہ اس بیان ہی سے کہ ۷۸۹ھ میں شیراز کی فتح کے بعد آپ کی اور جُرجانی کی ملاقات ہوئی تھی ۔ التفتازانی سَرَخْس میں دفن ہوے، [۸۳۳ ھ میں شاہ رخ نے اور ۸۶۳ ھ میں سلطان ابوسعید نے ان کی قبر کی زیارت کی، مطلع سعدین، ۲/۲ : ۷۳۷؛ ۲/۳ : ۱۲۱۷۔ ان کا لڑکا شیخ الاسلام شمس الدین محمد ذی قعدۃ ۸۳۸ھ میں ہرات میں طاعون سے فوت اور گازرگاہ میں دفن ہوا ، وہی کتاب، ۲/۲ : ۶۷۹]۔

معلوم ہوتا ہے کہ التفتازانی کے شاگردوں میں سے کسی نے بھی بہت بلند نام پیدا نہیں کیا، روضات الجنّات میں جن دو شاگردوں کا ذکر ہے وہ یہ ہیں: حُسام‌الدین الحسن بن علی الابیوردی صاحبِ ربیع الجنان فی المعانی و البیان اور برہان الدین حیدر (طاش کبری زادہ : الشّقائق النعمانیۃ، ترجمہ ریشر Rescher ، ص ۳۳ و *Isl.* ، ۱۱ : ۶۱).

ابن خلدون نے التفتازانی کی بعض تصانیف مصر میں دیکھی تھیں ، چنانچہ [علّامہ] کی فضیلت سے وہ بہت متأثر ہوا؛ اس نے اپنے مقدمۃ میں ان کا ذکر کیا ہے (ترجمہ دیسلان، ۳ : ۱۲۹) ۔ انہوں نے شافعی اور حنفی فقہ دونوں پر کتابیں لکھی ہیں ۔ چند مصنفوں نے انہیں شافعی المذہب بتایا ہے (مثلاً الکَفَوی اور حسن چلبی نے) اور دوسرے انہیں حنفی المذہب لکھتے ہیں (مثلاً ابن نُجَیم اور علی بن سلطان محمد القاری).

اُن کی تصانیف مفصّلۂ ذیل ہیں (روضات

الجنات میں ان کی تصانیف کے جو سنین دیے گئے ہیں وہ دوسرے مصادر سے بہت مختلف ہیں، ہم نے بھی ان تأریخوں کا ہر جگہ ذکر نہیں کیا۔ قلمی نسخوں اور شروح کے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے دیکھیے براکلمان : .G.A.L :-

(۱) صرف و نحو

۱۔ شرح التصریف العزّی [پاکستان و ہند] میں اس کتاب کو اکثر سعدیّۃ کہتے ہیں) ، الزنجانی (عزّالدین عبدالوهاب بن ابراہیم ، دیکھیے براکلمان : .G.A.L، ۱ : ۲۸۳) کی مبادیات صرف [تعریفوں ، گردانوں وغیرہ] کی شرح، جو مصنف نے فریومد میں مکمل کی ۔ تاریخ تکمیل شعبان ۷۳۸ھ/۱۳۳۸ء ہے ، جب آپ کی عمر صرف سولہ برس کی تھی ۔ اس کے مخطوطات برلن (Ahlwardt ، عدد ۶۶۱۷ و ۶۶۱۸)، تورین (نلینو Nallino، عدد ۳۹) اور دوسرے مقامات میں موجود ہیں [مجموعۂ شیرانی، دانش‌گاہ پنجاب کا نسخہ (شمارہ ۲۱۷۹) ۹۸۰ھ میں کتابت ہوا] اور اس کی طباعتیں (ایڈیشن) حسب ذیل ہیں : قسطنطنیہ ۱۲۵۳ھ؛ طہران ۱۲۷۰ھ، ۱۲۸۳ھ (ایک مجموعے میں)؛ دھلی ۱۲۸۹ھ، ۱۲۹۵ھ (مع مفتاح السعدیة از احمد بن شاہ گُل)، ۱۸۸۶ء (مع مفتاح السعدیة)، ۱۳۱۹ھ (مع مفتاح السعدیة)؛ بمبئی ۱۲۹۲ھ؛ لکھنؤ ۱۳۰۶ھ؛ قاہرۃ ۱۳۰۷ھ؛ مذکورۂ بالا مفتاح السعدیة کے علاوہ دِدہ خلیفہ نے بھی اس کی شرح در شرح لکھی ہے (طبع بولاق ۱۲۵۵ھ).

۲۔ الارشاد یا (الـ ؟) ارشاد الہادی، حسب تسمیۂ حاجی خلیفہ، عربی نحو کی کتاب ہے، جو آپ نے اپنے بیٹے کے لیے لکھی تھی اور جو خوارزم میں ۷۷۴ھ یا ۷۷۸ھ یا ۷۸۷ھ میں مکمل ہوئی ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ وینا میں موجود ہے (فلوگل Flügel ، عدد ۲۰۶) ۔ حاجی خلیفہ نے کئی شرحوں کا ذکر کیا ہے، جن میں وہ شرحیں بھی شامل ہیں جو محمد بن علی الجُرجانی (ابن السید الشریف) اور شمس الدین محمد بن محمد البخاری نے لکھیں ۔ یہ شرحیں برلن (اہلوارٹ ، عدد ۶۷۵۴ و ۶۷۵۵) اور اسکوریال (دِرانبورغ Derenbourg ، عدد ۱۸۱) دونوں میں موجود ہیں .

(۲) البلاغة (Rhetoric)

اس فن پر التفتازانی کی تینوں تصانیف بالواسطہ یا بلاواسطہ السکّاکی کی مفتاح العلوم کے تیسرے حصے (قسم) کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، جس میں اس فن کا مستند اور معوّل علیہ بیان ہے (دیکھیے ذیل میں سکّاکی کا ذکر اور براکلمان : .G.A.L، ۱ : ۲۹۴) ۔ ان میں سے دو کتابیں قزوینی (محمد بن عبدالرحمان المشہور خطیبِ دمشق، دیکھیے براکلمان : ۲ : ۲۲) کی تلخیص المفتاح کی شرحیں ہیں .

۱۔ المطوّل، جو اس کا مشہور نام ہے، یا الشرحُ المطوّل یا شرح التلخیص المطوّل، جو ماہ صفر ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں بمقام ہرات مکمل ہوئی.

اس کی طباعتیں : قسطنطنیہ ۱۲۶۰ھ ، ۱۲۸۹ھ (الجُرجانی کے حواشی کے ساتھ) ؛ لکھنؤ ۱۲۶۵ھ (صرف حصّۂ اوّل)، ۱۲۸۷ھ (صرف حصّۂ اوّل) ۱۸۷۸ء، ۱۳۰۰ھ ، ۱۸۸۹ء (مع ازالة العَضَل از تراب علی، مطوّل کے مرویہ اشعار کی شرح)؛ طہران [؟] ۱۲۷۰ھ؛ دھلی ۱۳۲۶ھ (مع المعوّل، شرح از محمد عبدالرحمان)؛ فارسی طباعت، مطبوعہ ۱۲۷۴ھ (مع شروح الفناری، الجرجانی، السمرقندی و رضا گلپایگانی)، جس کا ذکر کتب خانۂ خدیویہ کی فہرست، ۴ : ۱۵۳ میں ہے).

اس کے علاوہ الجُرجانی کے حواشی لکھنؤ میں ۱۳۱۲ء میں اور عبدالحکیم سیالکوٹی کے حواشی ۱۲۶۶ھ میں قسطنطنیہ میں شائع ہوئے .

۲ - مختصر المعانی (اب یہ عام طور پر اسی نام سے مشہور ہے) یا مختصر شرح تلخیص المفتاح یا اختصار شرح التلخیص یا الشرح المختصر یا محض المختصر (مصنف نے اسماء مروجہ میں سے کوئی خاص نام خود تجویز نہیں کیا)۔ ایک مزدوج متن ومختصر شرح ہے، جو ۷۵۶ھ/ ۱۳۵۵ - ۱۳۵۶ء میں بمقام غجدوان مکمل اور محمود جانی بیگ کے نام سے معنون ہوئی۔ مطوّل کی طرح یہ کتاب بھی دیار مشرق کے مدرسوں میں اب تک پڑھائی جاتی ہے ، قلمی نسخے عام ہیں [ایک نسخہ نویں یا دسویں صدی کا مجموعۂ شیرانی ، دانش گاہ پنجاب میں ہے، دیکھیے شمارہ ۱۰۳۳] اور اس کی شرحوں پر کئی دیگر شرحیں لکھی جا چکی ہیں .

طباعتیں: کلکتہ ۱۸۱۳ء؛ لکھنؤ ۱۲۶۱ھ، ۱۳۱۲ھ، (البنّانی کی شرح در شرح کے ساتھ)؛ بولاق ۱۲۷۱ھ (مع شرح در شرح از الدسوقی)، [۱۸۶۰ء ؟]، ۱۲۸۵ھ (مع شرح البنانی بر شرح)؛ کانپور ۱۲۸۵ - ۱۲۸۶ھ (مع شرح الختائی [الخَتّائی ؟]، ۱۲۹۶ھ (اسی شرح در شرح کے ساتھ)؛ میرٹھ ۱۲۸۵ھ؛ قسطنطنیہ ۱۳۰۱ھ، ۱۳۰۱ھ (مع شرح در شرح از الدسوقی) : لاہور ۱۳۰۶ - ۱۳۰۷ھ؛ دھلی ۱۲۸۶ھ، ۱۳۲۳ھ۔ اس کتاب کے اقتباسات میرن Mehren نے اپنی تألیف *Die Rhetorik der Araber*، کوپن ھیگن و وینا ۱۸۵۳ء میں دیے ہیں .

۳ - علم معانی میں التفتازانی کی تیسری تصنیف شرح القسم الثالث منَ المِفتاح، یعنی خود مفتاح العلوم کے تیسرے حصے کی شرح ہے ۔ یہ ان کی سب سے آخری تصانیف میں سے ہے، جو سمرقند میں ماہ شوال ۷۸۷ھ / ۱۳۸۵ء یا ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں مکمل ہوئی، لیکن اسے مختصر المعانی اور مطوّل جیسی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ۔ اس کے قلمی نسخے اسکوریال (Derenbourg No. 26)، انڈیا آفس (Loth, Nos. 847-48)، لائیڈن (ڈ خویہ اور ھوتسما، عدد ۲۹۸)، ٹرنیٹی کالج کیمبرج (Palmer, No. 18) اور دوسرے مقامات میں محفوظ ہیں .

(۳) منطق :

۱ - شرح الرسالۃ الشمسیّۃ یا شرح الشمسیّۃ (ہندوستان میں اس تصنیف کو شرح تصریف العزی کی طرح اکثر سعدیّۃ ھی کہتے ہیں) ، الکاتبی (نجم الدین علی بن عمر القزوینی، دیکھیے براکلمان : *G.A.L.*، ۱ : ۴۶۶) کے رسالۂ منطق کی شرح ۔ یہ کتاب جمادی الآخرۃ ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء (مجمل) یا ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء ([ابن عماد اور] الفوائد البہیّۃ) یا ۷۶۲ھ / ۱۳۶۱ء (Ahlwardt، عدد ۱۹۰۹) یا ۷۷۲ھ / ۱۳۷۰ - ۱۳۷۱ء (روضات الجنات) میں بمقام جام مکمل ہوئی ۔ قلمی نسخے برلن میں (Ahlwardt ، عدد ۵۲۶۶ تا ۵۲۶۸) اور دوسرے مقامات میں محفوظ ہیں ۔ طباعت : لکھنؤ ۱۹۰۵ء / ۱۳۲۳ھ .

۲ - تہذیب المنطق و الکلام (جو اس کا مشہور نام ہے) یا غایۃ تہذیب الکلام فی تحریر المنطق و الکلام (یہ نام مصنف نے دیباچۂ کتاب میں اسے دیا ہے) ۔ یہ منطق اور علم کلام کی کتاب ہے، جو ماہ رجب ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں مکمل ہوئی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دوسرا حصّہ، جسے حاجی خلیفہ مقاصد کا اختصار بتاتا ہے ، بہت ھی کم نقل ہوا (در حقیقت قلمی نسخوں کی موجودہ فہرستوں میں اس کا کوئی نسخہ واضح طور پر درج نہیں ہوا)، اس کے بر عکس اس کتاب کا پہلا حصہ ایک مقبولِ عام درسی کتاب ہے جو کئی بار شائع ہو چکی ہے .

طباعتیں : کلکتہ ۱۲۴۳ھ (مع شرح

الیزدی)، ۱۳۲۸ھ (مع اردو ترجمه)، ۱۳۳۳ھ (اسی اردو ترجمے کے ساتھ)؛ [لکھنؤ ؟] ۱۲۶۰ھ (جس کی ابتداء میں ایساغوجی ملحق ہے)، لکھنؤ ۱۸۶۹ء (ایک مجموعۂ منطق میں)، ۱۲۸۸ھ (صرف تمہیدی حصه مع شرح الدّوانی و حواشی میر زاهد و عبدالحی لکھنوی)، ۱۲۹۳ھ (مع سابق شرح و حواشی)، ۱۳۲۱ھ (مع سابق شرح و حواشی)، ۱۲۹۰ھ (مع شرح الیزدی و حواشی عبدالحی لکھنوی بریزدی)، ۱۲۹۲ھ (اسی شرح اور انهیں حواشی کے ساتھ)، ۱۳۱۱ھ (اسی شرح اور انهیں حواشی کے ساتھ)، ۱۸۷۷ء (محمد بن محمود الشَّہرِستَانی کی فارسی شرح کے ساتھ)، ۱۸۸۴ء (اسی فارسی شرح کے ساتھ)، ۱۳۲۳ء (ایک مجموعۂ بست رسائل منطق میں)؛ دھلی ۱۲۶۴ھ، ۱۲۷۶ھ، ۱۲۸۳ - ۱۲۸۴ھ، [۱۸۶۹ء]، ۱۲۸۶ھ (دھلی کی ان تمام طباعتوں میں الیزدی کی شرح بھی دی ہے)؛ کانپور ۱۲۷۸ - ۱۲۷۹ھ (ایک مجموعۂ منطق میں)، ۱۲۹۱ھ (الیزدی کی شرح کے ساتھ، مع حواشی موسومه تحفۂ شاهجهانی از الٰهی بخش فیض‌آبادی)، ۱۲۹۶ھ (اسی شرح اور انهیں حواشی کے ساتھ)، ۱۸۸۱ء (ایک مجموعۂ منطق میں)، ۱۹۱۵ء (الشهرستانی کی فارسی شرح کے ساتھ)؛ بنارس [۱۸۹۹ء] (مع اردو ترجمه).

(۴) ماوراء الطبیعة و الکلام

۱ - المقاصد، ما بعد الطبیعة اور کلام کا ملخّص، جو مصنف کی اپنی هی شرح کے ساتھ ماہ ذوالقعدة ۷۸۴ھ / ۱۳۸۳ء میں (اور روضات الجنّات کے بیان کے مطابق ۷۷۴ھ میں) بمقام سمرقند مکمل ہوا - ۱۲۷۷ھ کی طباعت قسطنطنیه کتب‌خانۂ خدیویه کی فہرست (۲ : ۲۶) میں مذکور ہے اور برٹش میوزیم لنڈن (فہرست : ایلس و ایڈورڈز Ellis-Edwards، ص ۹)؛ انڈیا آفس (Loth : عدد ۴۶۱ و ۴۶۴) اور دوسرے مقامات میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ھیں۔ جیسا که اوپر ذکر ہو چکا ہے، یه کتاب تہذیب المنطق و الکلام کے دوسرے حصے (''قسم'') کا خُلاصه ہے.

۲ - تہذیب المنطق و الکلام (دیکھیے سطور بالا بذیل منطق).

۳ - شرح العقائد النَّسَفِیَّة جو ماہ شعبان ۷۶۸ھ / ۱۳۶۷ء میں بمقام خوارزم مکمل ہوئی، عقیدۂ مسلمین کے متعلق عمر بن محمد النَسفی (م ۵۳۷ھ / ۱۱۴۲ - ۱۱۴۳ء، دیکھیے براکلمان، ۱ : ۴۲۷) نے ایک نہایت هی مختصر رساله لکھا ہے، جس کی یه شرح ہے۔ یه کتاب ایک مقبولِ عام درسی کتاب ہے اور اس کی متعدد شروح در شروح لکھی گئی ھیں.

طباعتیں : کلکته ۱۲۴۴ھ ؛ دھلی [۱۸۷۰ء]، ۱۹۰۴ء؛ لکھنؤ ۱۸۷۶ء، [۱۸۸۸ء]، ۱۸۹۰ء، [۱۸۹۴ء]؛ قسطنطنیه ۱۲۹۷ء، (الکَسْتَلِی اور الخیالی کی شرحوں اور خیالی پر بہشتی کے حواشی کے ساتھ)؛ قاهرة ۱۲۹۷ھ، (مع شرح در شرح خیالی اور حواشی قره خلیل بر خیالی) ؛ کانپور ۱۹۰۳ء، ۱۳۳۰ھ، اس کے اقتباسات کا فرانسیسی ترجمه d'Ohsson کی کتاب *Tableau général de l'Empire Ottoman*، ج ۱ میں ہے اور جرمن زبان میں بھی ایک ترجمه J.T. Plant کی کتاب *Birgilu Risale* [sic], *oder Elementarbuch der Muhammedanischen Glaubenslehre* (استانبول و جنیوا ۱۷۹۰ء) میں موجود ہے [العقائد کے انگریزی اور اردو ترجمے کے لیے دیکھیے تکملۂ براکلمان، ۱ : ۷۵۸ ؛ اور شرح کے ترجمے کے لیے دیکھیے E.E. Elder : *Creed of Islam*، نیویارک ۱۹۵۰].

شروح بر شروح میں سے الخیالی کی دھلی میں ۱۸۷۰ء[؟] میں اور ۱۳۲۹ھ میں عبدالحکیم سیالکوٹی کے حواشی کے ساتھ شائع ہوئی تھی؛ لکھنؤ میں

۱۸۷۶ء، ۱۳۱۳ھ (مع حواشی عبدالحکیم سیالکوٹی)، ۱۳۲۶ھ (انھیں حواشی کے ساتھ)؛ قسطنطنیہ میں ۱۲۹۷ھ میں (مع حواشی الکَسْتلی و بِہشتی)؛ اور قاہرۃ میں ۱۲۹۷ھ میں (مع حواشی قرہ خلیل) شائع ہوئی ۔ ان شروح میں سے حسن شہید (ابوالحسن بن الأفضل) کی شرح بہار میں ۱۳۲۸ھ میں اور رمضان افندی کی شرح دھلی میں ۱۳۲۷ھ میں چھپی۔

۳ - ابن عربی مؤلّف فُصوص الحِکَم کے خیالات کا رد، اس کتاب کا قلمی نسخہ برلن میں محفوظ ہے (Ahlwardt ، عدد ۲۸۹۱) - اس کے ورق اول پر کتاب کا نام فضیحۃ المُلحِدین درج ہے، جو مشکوک ہے ۔

(۵) اصول فقہ :

۱ - التلویح الٰی کَشف حقائق التنقیح، جو ۹ - ذوالقعدۃ ۷۵۸ھ کو گلستان [در ترکستان] میں پایۂ تکمیل کو پہنچی- یہ کتاب صدرالشریعۃ الاصغر [یعنی صدرالشریعۃ الثانی] (عبیداللہ بن مسعود المحبوبی، م ۷۴۷ھ [۱۳۴۶ - ۱۳۴۷ء]) کی تصنیف تنقیح الأصول کی شرح ہے ، دیکھیے براکلمان ، ۲ : ۲۱۴)- طباعتین : دھلی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء (صدر الشریعۃ کی اپنی شرح التوضیح کے ساتھ)؛ لکھنؤ ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء (مع التوضیح)، ۱۸۷۱ء (مع التوضیح) ، ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ ء (مع التوضیح و شرح تلویح از حسن چلبی ، ملّا خسرو اور زکریا الانصاری)، اور قازان ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء (مع التوضیح) .

۲ - شرح شرح المختصر فی الاصول یا شرح الشرح ، جو بمقام خوارزم ذوالحجۃ ۷۷۰ھ/ ۱۳۶۹ء میں مکمل ہوئی - الایْجی [دیکھیے بیان ما سبق] نے ابن حاجب کی مختصر المُنتہی پر ایک شرح لکھی تھی، یہ اس شرح کی شرح ہے، یعنی ان کی اپنی کتاب منتہی السُّؤال و الأمل فی علمی الاصول و الجدل کی تلخیص ہے - بولاق کے ایک ایڈیشن (۱۳۱۶ تا ۱۳۱۹ھ) کا ذکر محمد بن شِنِب نے ابن الحاجب والے مقالے میں کیا ہے - مخطوطات برلن (Ahlwardt ، عدد ۴۳۷۶)، انڈیا آفس (Loth، عدد ۳۰۲ تا ۳۰۴) اور دوسرے مقامات میں موجود ھیں .

(۶) فقہ :

۱ - المِفتاح، شافعی فروع پر ہے- اس کا ایک قلمی نسخہ برلن میں محفوظ ہے (Ahlwardt، عدد ۴۶۰۴) - آپ کے سوانح نگاروں نے اس کتاب کے علاوہ مجموعۃ الفتاوی الحنفیۃ کا بھی ذکر کیا ہے ، لیکن اس کے نسخے کہیں مذکور نہیں ھیں .

۲ - اختصار شرح تلخیص الجامع الکبیر، الشیبانی کے رسالے الجامع الکبیر (دیکھیے براکلمان : G.A.L.، ۱ : ۱۷۲ اور حاجی خلیفہ ، ۲ : ۴۰۱) کا، جو فروع حنفیہ پر ہے، الخلاطی نے ملخّص لکھا - محمد بن مسعود الغُجْدوانی نے اس ملخّص کی شرح لکھی ، التفتازانی نے شرح غُجْدوانی کی تلخیص لکھی، جو ناتمام رھی، اختصار الخ وھی شرح ہے - روضات الجنات کے بیان کے مطابق یہ تصنیف ۷۸۵ھ / ۱۳۸۳ء میں بمقام سَرخَس شروع ہوئی - اس کا ایک قلمی نسخہ ینی جامع (عدد ۴۲۸ مکرر) میں محفوظ ہے .

۱۸۷۰ء (؟) میں مقدّمۃ الصلاۃ یا خلاصۃ کا ایک اڈیشن دھلی میں شائع ہوا - یہ رسالہ شعائر نماز کے متعلق ہے اور بعض اسے کَیدانی سے منسوب کرتے ھیں (دیکھیے حاجی خلیفہ، ۶ : ۸۳) - اس کے ساتھ شرحیں بھی ھیں ، جو الجُرجانی اور التفتازانی سے منسوب کی جاتی ھیں ، لیکن یہ یقینی نہیں کہ التفتازانی کے وقت میں خلاصۃ کا وجود تھا بھی یا نہیں .

(۷) تفسیر القرآن :

۱ - کشف الاسرار و عدّۃ الابرار ، فارسی زبان میں قرآن کی تفسیر (قب حاجی خلیفه ، ج ۵ : عدد ۱۰۶۷۳) - معلوم ہوتا ہے اس کا ایک قلمی نسخه ینکی جامع میں محفوظ ہے (دیکھیے فہرست، ص ۸۰، عدد ۳۴) .

۲ - شرح (یا حاشیة علی) الکشّاف، (حاجی خلیفه، ج ۵، عدد ۱۸۷، س۲)، زمخشری کی تفسیر پر حواشی (دیکھیے براکلمان : .G. A. L، ۱ : ۲۹۰)- کہتے ہیں که اس کتاب کی تألیف ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں سمرقند میں شروع ہوئی ، مگر یه تمام نه ہو سکی - یه حواشی سورۃ ۱ تا ۱۰ ، آیت ۵۸ اور سورۃ ۳۸ تا ۴۵ سے متعلق ہیں- اس کے قلمی نسخے برلن (Ahlwardt، عدد ۷۹۳)، برٹش میوزیم (Ellis-Edwards، ص ۳) ، انڈیا آفس اور دوسرے مقامات میں محفوظ ہیں .

(۸) فقه اللغة :

۱ - النعم السّوابغ فی شرح الکلم النّوابغ، زمخشری کی تألیف موسومه الکلم النوابغ کی شرح - اس شرح کے اقتباسات H. A. Schultens نے اپنی کتاب *Anthologia sententiarum arabicarum* (لائیڈن ۱۷۷۲ء) میں شائع کیے اور ۱۲۸۷ھ میں یه کتاب قاهرۃ میں [اور ۱۳۰۶ھ میں بیروت میں] چھپی.

۲ - سعدی کی بوستان کا ترجمه ترکی نظم میں سال تصنیف ۷۵۵ھ (دیکھیے گب E.J.W. Gibb : *A History of Ottoman Poetry*، ۱ : ۲۰۲) - [التفتازانی کی مصنفات ذیل کا ذکر سطور بالا میں نہیں ہے، تکلمۂ براکلمان، ۲ : ۳۰۴ میں ذیل کے نمبروں پر دیکھیے : (۴) الترکیب الجلیل؛ (۱۸)شرح البردۃ ؛ (۹) شرح رسالة فی تساوی الزوایا الثلاث؛ (۲۱) شرح ایسا غوجی] .

مآخذ : (علاوہ ان حوالوں کے جو متن میں درج ہیں دیکھیے) [(۱) کمال‌الدین عبدالرزاق : مطلع سعدین، جلد اول خطی، بذیل وقائع ۷۸۱ھ، مطبوع ۲/۲ : ۵۲۰- عبدالرزاق نے تفتازانی کے مصنفات پر ایک رساله لکھا تھا، جس میں ان کا حال بھی دیا تھا، مطلع، جلد اول، محلّ مذکور]؛ (۲)ابن عرب شاہ : عجائب المقدور، طبع Golius، ۳ : ۲۲۴؛ (۳) فصیحی : مجمل (بذیل‌سنه۷۸۷ھ؛ دیکھیے براؤن E. G. Browne، در *Le Muséon*، سلسلهٔ سوم، ج ۱ : ۵۷)؛ (۴) السیوطی : بغیة الوعاۃ، ص ۳۹۱؛ [(۵) ابن العماد : شذرات الذهب، ۶ : ۳۱۹ تا ۳۲۲]؛ (۶) سلطان حسین بن منصور : مجالس العشّاق، ص ۲۸۷؛ [(۷) الشّوکانی : البدر الطالع، ۲ : ۳۰۳ تا ۳۰۵]؛ (۸) الکفّوی : اعلام الاخیار؛ (۹) خواند امیر : حبیب السیر، ۳ / ۳ : ۸۷؛ (۱۰) محمد باقر خوانساری: روضات الجنّات، ۳۰۹؛ (۱۱) عبدالحی لکھنوی : الفوائد البهیّة، ۱۲۸ تا ۱۳۰، ۱۳۴ تا ۱۳۷؛ (۱۲) براکلمان : .G.A.L، ۲ : ۲۱۵؛ [GALS، ۲ : ۳۰۱]؛ (۱۳) براؤن : *Lit. Hist. of Persia*، ۳ : ۳۵۳ تا ۳۵۴؛ (۱۴) هدایت حسین : *Cat. of the Arabic Mss. in the Būhār Library*، ص ۳۶ تا ۳۸؛ [(۱۵) سٹوری: *Pers. Lit.*، ۱ : ۹؛ (۱۶) ابن حجر : الدرر، ۴ : ۳۵۰] .

(C. A. STOREY سٹوری)

تفسیر : (۱) (عربی)، جمع تفاسیر، فعل فسّر کا مصدر، بمعنی توضیح، تشریح - یه لفظ علمی (scientific) اور فلسفی کتابوں کی شروح کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "شرح" کا مرادف ہے؛ چنانچه ارسطو کی تصانیف کی یونانی اور عربی شرحوں کے لیے باقاعدہ استعمال ہوا ہے - ذیل کی مثالیں ابن القفطی کی تاریخ الحکماء سے پیش کی جاتی ہیں :

بنس الرومی نے ایک تفسیر المجسطی پر لکھی [مگر ابن القفطی کے ہاں تفسیر کتاب بطلیموس فی تسطیح الکرۃ کا ذکر ہے نه المجسطی کا] اور دوسری اقلیدس کے دسویں مقالے پر ہیئت

[و عددیات و حسابیات] کے مشہور ماہر ابوالوفاء البوزجانی نے دیوفنطس Diophantes کے [صناعۃالجبر اور الخوارزمی کی کتاب جبر و مقابلہ کی تفسیریں لکھیں] - مشہور طبیب محمد بن زکریا الرازی نے افلاطون کی کتاب طیماؤس Timaeus کی تفسیر مؤلفہ فلوطرخس Plutarch کی تفسیر التفسیر لکھی - مسیحی عالم حنین بن اسحاق ترجمہ و تفسیر میں ید طولی رکھتا تھا - یونانی علوم کی اکثر مشہور کتابوں اور اسی طرح عربی علوم کی چند کتابوں کی تفسیریں لکھی گئیں - ان تفسیروں کا عربی میں ترجمہ ہوا یا وہ عربی زبان میں لکھی گئیں .

دنیاے اسلام میں لفظ تفسیر سے مراد بالخصوص قرآن کی تفسیریں اور خود علم تفسیر ہے - علم کی یہ شاخ، جسے ''علم القرآن و التفسیر'' کہتے ہیں، علمِ حدیث کی ایک خاص اور اہم شاخ ہے اور مدرسوں اور جامعات (یونیورسٹیوں) میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے - فن تفسیر میں بعض تصانیف تو ایسی ہیں جو عام نوعیت کی ہیں اور باقاعدہ تفسیر کی طرز پر نہیں لکھی گئیں، لیکن بیشتر تفسیریں مسلسل ہیں، جن میں متنِ قرآن کے ایک ایک جملے بلکہ بعض اوقات ایک ایک لفظ کی تشریح ترتیب کے ساتھ کی گئی ہے - یہ تفسیریں بہت ہیں ، جن میں زیادہ مشہور طَبَری، زَمَخْشَری اور بیضاوی کی تفاسیر ہیں .

طبری (م ۳۱۰ھ) وہی [مشہور و معروف] مؤرخِ عظیم ہیں - فن تفسیر میں بھی ان کی ایک ضخیم تصنیف موجود ہے، جس میں احادیث کی بہت بڑی تعداد درج ہے، جنھیں ثقہ راویوں نے مسلسل اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے - زَمَخْشَری (م ۵۳۸ھ) کا ذہن نہایت برّاق تھا، وہ ذکیّ الحِسّ معلّم اخلاق اور فقہ لغت کا ماہرِ کامل تھا - اس کی تفسیر الکشّاف کی بڑی قدر کی جاتی ہے اور فاضل فقہاء ، مثلاً تَفْتازانی (م ۷۹۲ھ) اور سید شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ) نے اس کی شرح لکھی ہے۔ البیضاوی (م ۶۸۵ھ) کی تفسیر سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس فن کی یہی کتاب ہے جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے - اس کے ذریعے سے تفسیرِ قرآن کے بارے میں متّقی مسلمانوں کے مذاہب کی تعیین ہو گئی ہے - اس پر متعدّد بار حواشی بھی لکھے گئے ہیں - باقی تفاسیر میں سے ہم فخرالدین الرازی (م ۶۰۶ھ) کی تفسیر کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جسے التفسیر الکبیر کہتے ہیں - ان کے علاوہ اسمٰعیل حقّی ساکن بروسہ (م ۱۱۲۷ھ) کی بھی ایک تفسیر ہے، جسے ترک بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان مفسّرین میں سے بیشتر علماء دیارِ ایران کے رہنے والے تھے .

علم تفسیر ایک قدیم فن ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء صدر اسلام ہی سے ہو چکی تھی ؛ مثلاً ابن عباس [رضا] (م ۶۸ھ) کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ اس علم میں سند تسلیم کیے جاتے تھے اور ایک تفسیر بھی ان کی طرف منسوب ہے (کتب خانۂ حمیدیہ ، استانبول) - زمانۂ حال کے ناقدین ، مثلاً گولٹ تسیھر اور لامِنْس Lammens وغیرہ نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ان بے شمار احادیث کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے جو تفسیر کی ضخیم کتابوں میں مذکور ہیں - اس سوال کا جو جواب اب تک دیا گیا ہے وہ ان احادیث کے بہت زیادہ حق میں نہیں، کیونکہ ان میں موضوعات کی کثرت ہے، جو کسی فقہی مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے وضع ہوئیں یا کسی کلامی مقصد کے لیے ، یا محض توضیح کے شوق سے ، بلکہ یوں کہیں کہ صرف تفنّنِ طبع کے لیے بنائی گئیں - یہ [مغربی] نقّاد

کہتے ہیں کہ ان تفاسیر میں سے اس بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوئی زیادہ امید نہیں کہ اسباب نزول و اشاعت قرآن کیا تھے [مگر دیکھیے مقالۂ تفسیر (۲)، ص ۳۹۳]، تاہم اسلامی فقہ اور دینیات کے گہرے مطالعے کے لیے اور قِصص و فقہ لغت کی خاطر ان تفاسیر کو اہمیّت حاصل ہے ۔ ہمارے زمانے میں مصر کے ایک عالم [اجلّ] شیخ طَنْطَاوی [جوهری، م ۱۲ جنوری ۱۹۴۰ء] نے تفسیر کے مطالعے کی تجدید کی کوشش کی ہے [الجواهر فی تفسیر القرآن الکریم کے نام سے ان کی تفسیر ۲۶ جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے] ۔ اس تفسیر میں انھوں نے بہت سے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو فلسفے اور جدید سائنس سے مأخوذ ہیں (نیز قبّ تأویل) .

مآخذ: عربی مطبوعه اور قلمی کتابوں کی فہرستیں بذیل مادّۂ تفسیر، [(۱) سیوطی : کتاب الطبقات المفسرین، طبع Weijers، لائیڈن ۱۸۳۹ء]؛ (۲) Goldziher : *Muhammedanische Studien*، Halle ۱۸۹۰ء، ۲: ۲۰۶؛ (۳) وهی مصنف : *Die Richtungen der islamischen Koran-auslegung*، لائیڈن ۱۹۲۰ء، اشاریه؛ (۴) Carra de Vaux : *Les Penseurs de l'Islam*، ج ۳، پیرس ۱۹۲۳ء، باب ۱۱؛ [(۵) تکملۂ براکلمان، ۳ : ۳۲۶].

(کارا د وو B. CARRA DE VAUX)

تـفـسیر (۲) [یہ مقاله ادارۂ المعارف الاسلامیة (عربی) نے استاذ امین الخولی سے لکھوا کر شامل کیا ہے تاکہ تفسیر کی بحث کی کمی پوری اور اصل مقالے کی ضروری تشریح و تحقیق ہو جائے ۔ ہم نے اس کا ترجمه یہاں درج کر دیا ہے] :

(الف) 'ف ۔ س ۔ ر' اور 'س ۔ ف ۔ ر' دونوں مادّوں میں کھولنے اور حجاب ہٹا دینے کے معنے پائے جاتے ہیں، لیکن 'سفر' ظاهری اور مادّی اشیاء کو کھول کر سامنے لانے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور 'فسر' کا استعمال معنوی اور باطنی اشیاء کو کھول کر بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے ۔ تفسیر فسر سے باب تفْعِیل کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی عبارت کے مطلب کو واضح کرنے کے ہیں .

قدماء کی رائے ہے کہ لغت، تفسیر اور حدیث میں معلومات کے ذخیرے ان مشہور معنی میں، جن کے لحاظ سے علوم عقلیه کو علوم کہتے ہیں، علوم نہیں ہیں اس لیے بعض کے نزدیک تفسیر کی حدّ (تعریف) گھڑنے کی ضرورت نہیں اور نہ اس کے موضوع اور مسائل کے بیان کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ تفسیر چند قواعد اور ملکات کا نام نہیں ہے، جو معیّن قواعد کی پابندی اور مشق سے حاصل ہوتے ہیں، جیسا کہ دیگر علوم کی صورت میں، جو علوم عقلیه سے مشابہت رکھ سکتے ہیں، میسّر آ جاتے ہیں ۔ اس بنا پر تفسیر کی توضیح میں یه کہنا کافی ہے که وہ کلام اللہ کے مطالب بیان کرنے کا نام ہے یا یه که اس کا کام قرآن مجید کے الفاظ و معانی کی تشریح کرنا ہے (المبادیٔ النصریة، طبع الخیریة ۱۳۲۰ھ، ص ۲۵، ۲۶) ۔ بعض لوگوں نے تفسیر کی تعریف گھڑنے کی کوشش کی ہے اور اس کے ضمن میں چند دیگر علوم کا بھی ذکر کیا ہے، جو علاوہ تفسیر کے اس تعریف میں شامل ہو جاتے ہیں، مثلاً علم قراءت، اور کچھ حصّه ان علوم کا بھی آ جاتا ہے جن کی قرآن کے سمجھنے میں ضرورت پڑتی ہے؛ مثلاً فقه، صرف، نحو اور بیان ۔ پہلا طریقه سیدھا سادھا ہے، جس میں سلامتی بھی ہے اور تطویل سے گریز بھی، اور طولِ کلام غیر سودمند اور غیر فائده بخش ہے .

متقدّمین نے علوم یا مطالعاتِ شرعیّه کو

حسبِ عادت کسی نہ کسی اعتبار سے ایک ضابطے کی صورت میں جمع کر دیا ہے، انھیں میں سے تفسیر بھی ایک علم ہے، چنانچہ انھوں نے کہا ہے علوم شرعیہ میں یا الفاظ قرآن کے تلفظ کی صحت سے بحث ہوگی، اس کا نام علم قراءت ہے؛ یا حدیث نبوی کی الفاظ و سند کے اعتبار سے جانچ پڑتال ہوگی، وہ علم حدیث اور اصول حدیث ہے؛ یا قرآن کے مطالب و مقاصد کا اظہار مطلوب ہوگا، یہ علم تفسیر ہے . . . اسی طرح آخر تک علوم شرعیہ کی انواع کو مرتّب کیا ہے [شیخ الاسلام احمد بن یحیی بن الحفید الھروی : (الدر النضید من مجموعۃ الحفید، قاہرۃ ۱۳۲۲ھ، ص ۲)] .

اسی مقام پر تأویل کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تأویل اور تفسیر کے ایک ھی معنی ھیں یا یہ کہ تفسیر تأویل سے زیادہ عمومی حیثیت کی حامل ہے وغیرہ وغیرہ، مگر ہم یہاں بات کو طول نہیں دیتے - میرے خیال میں تأویل کے ذکر کی ضرورت اس لیے آ پڑی کہ خود قرآن مجید میں تأویل کا لفظ آیا ہے اور اربابِ اصول نے اس کے لیے ایک خاص اصطلاح مقرر کی ہے اور اس کے ساتھ ھی اربابِ مقالات و مذاھب میں سے متکلّمین کی زبان پر یہ لفظ رواج پا چکا ہے - میرا خیال ہے کہ کلمۂ تأویل کا مفہوم واضح کرنے کے لیے بہترین تشریح وہ ہے جو الراغب الاصفہانی نے بروایۃ ابن عباس اپنے رسالے مقدمۃ التفسیر میں بیان کی ہے - یہ رسالہ کتاب تنزیہ القرآن عن المطاعن کے ساتھ ملحق کر کے چھاپا جا چکا ہے (رسالۃ الراغب، الازھریہ ۱۳۲۹ھ، ص ۴۲) - اس کے بعد ابن تیمیّۃ نے اس مختصر رسالے کی تفصیل و توضیح اپنے رسالے الاکلیل فی المتشابہ و التأویل میں کی ہے [یہ رسالہ ابن تیمیۃ : مجموعۃ الرسائل الکبری، جزء ۲ میں شامل ہو کر چھپ چکا ہے، المطبعۃ الشرقیۃ ۱۳۲۳ھ] - اگرچہ میں نے اس میں کہیں نہیں دیکھا کہ انھوں نے الراغب الاصفہانی کے بیان کیے ہوے معانی تأویل کی طرف اشارہ کیا ہو، گو ابن تیمیۃ کے اس موضوع میں ابن تیمیۃ کے فکر کی اصل اور اس فکر کا مغز راغب ھی کا بیان ہے .

(ب) تفسیر کا ارتقاء :

ابن خلدون نے مقدمۃ میں تفسیر کی بابت اولاً جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کی راے یہ ہے کہ : ''قرآن لغتِ عرب مین نازل ہوا اور انھیں کی بلاغت کے اسلوب اس کے اندر کام میں لائے گئے، اس لیے تمام عرب قرآن مجید کو سمجھتے تھے اور اس کے مفردات اور مرکّبات کے مطالب ان پر واضح تھے''- اس قول میں کہ 'تمام عرب قرآن مجید کو سمجھتے تھے' وسیع تعمیم کر دی گئی ہے- خود متقدّمین اس بارے میں مطمئن نظر نہیں آتے؛ چنانچہ ابن‌قتیبۃ ھی کو لیجیے، جو ابن خلدون سے چند صدی پہلے کے عالم ھیں، وہ اپنے رسالے المسائل و الاجوبۃ ص ۸ میں کہتے ھیں کہ ''عرب قرآن مجید کے تمام غریب اور متشابہ کے سمجھنے میں برابر نہیں ھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فہمِ قرآن کے باب میں بعض کو بعض پر تفوق حاصل ہے''- میرے خیال میں خود ابن‌خلدون نے عبارت سابقہ سے چند سطر آگے کی عبارت میں جو کچھ کہا ہے اس سے ظاہر ہے کہ انھیں خود اس بات کا شعور تھا- وہ کہتے ھیں کہ قرآن مجید میں چند مقامات میں بیان کی حاجت پڑتی ہے- آگے کہتے ھیں : '' نبی صلی اللہ علیہ و سلّم مجمل کو بیان فرما دیا کرتے تھے، ناسخ و منسوخ کی تمیز اپنے اصحاب کو بتا دیتے تھے اور آپ کے سمجھانے سے وہ اسے سمجھ جاتے تھے،

صحابه کو نزول آیات کے اسباب اور موقع کے لحاظ سے آیات کا مقتضی، نبی صلی اللہ علیه و سلّم سے منقولات کے ذریعے معلوم ہو جاتے تھے''۔ ان امور کے اور دیگر مقامات کے، جو محتاج تشریح و بیان ہیں، پیشِ نظر عہد اسلامی کے شروع ہی سے قرآن مجید کے بیان اور تفسیر کی ضرورت پڑی۔

اس زمانے میں دین کی ہیبت، اہل زمانہ کی عقل کی سطح، ان کی عملی زندگی کی احتیاجات کا محدود ہونا اور اس کے ساتھ اس بات کا شعور کہ تفسیر کرنا اس بات کی شہادت دینا ہے کہ اللہ عزّ و جلّ کی اس لفظ سے یہی مراد ہے، ان سب امور نے لوگوں کو مجبور کیا کہ تفسیر میں صرف توقیفی باتیں کہیں (یعنی جو انھیں بتائی گئی تھیں) اور جو بذریعۂ نقل ان تک پہنچی تھیں اور رسول علیه السلام سے مروی تھیں؛ چنانچه پہلی چیز جو تفسیر کی صورت میں ظاہر ہوئی وہ تفسیر مبنی بر روایت تھی، جسے تفسیر مأثور یا تفسیر اثری کہتے ہیں، اس لیے علماء حدیث و روایت ہی وہ پہلے حضرات ہیں جو تفسیر کے میدان میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ بنا برین ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف علوم کی ابتداء کا پتا لگانے والے جب اپنی عادت کے مطابق ہر علم کا واضع ایک خاص شخص کو قرار دیتے ہیں تو واضعِ تفسیر (جس سے مراد جامع تفسیر ہے، مدوّن تفسیر نہیں) امام مالک بن اَنَس الاَصبحی کو ٹھیراتے ہیں، جو امامِ مدینه ہیں [قب المبادئ النصریة، ۲۶]۔

اس طرح تفسیر کا ارتقاء حدیث کی تدوین کی تاریخ سے مرتبط ہوتا ہے، اور یه تو معلوم ہے که امام مالک رضی اللہ عنه مدوّنینِ حدیث کی صف اوّل میں ہیں، گو جہاں تک میں دیکھتا ہوں، ان کی کتاب الموطّأ میں تفسیر سے متعلق زیادہ مواد نہیں ہے۔ بہر حال مجموعہ ہائے احادیث میں تفسیر بالروایة کی مختلف مقداریں نظر آتی ہیں؛ حتّٰی که صحیح بخاری تک میں ہم اس کے متعلق دو کتابیں دیکھتے ہیں: ایک کتاب ''تفسیر القرآن''، دوسری کتاب ''فضائل القرآن'' اور دونوں نے صحیح بخاری کا خاصا بڑا حصه گھیر رکھا ہے، جو شاید ساری صحیح کے آٹھویں حصے کے برابر ہے۔

پروفیسر کارا د وو Carra de Vaux کاتب مقالۂ تفسیر [انسائکلوپیڈیا آو اسلام لائیڈن، طباعت اوّل] نے جو یه کہا ہے که ''تفسیر علم حدیث کی ایک خاص فرع ہے جس کی عام مدرسوں اور بڑی بڑی درس گاہوں میں تعلیم دی جاتی ہے'' ... اس سے شاید تفسیر و حدیث کا یہی علاقه مراد ہے، ورنه علوم شرعیه میں تفسیر کا مقام جو اخیر میں قرار پایا ہے وہ وہی ہے جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اور وہ نقطۂ نظر بھی دکھا چکے ہیں جس کے اعتبار سے انھوں نے ان علوم کو باہم مرتبط اور مرتّب کیا۔ اس ترتیب میں تفسیر کو علمِ حدیث کی شاخ نہیں دکھایا گیا ہے اور جب ہم یه دیکھتے ہیں که آگے چل کر تفسیر روایت کی پابندی سے آزاد ہو جاتی ہے اور علماء کی کوشش اور محنت سے تفسیر غیرِ مأثور کے اندر اقوال و آراء کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے تو پھر کوئی وجه باقی نہیں رہتی که تفسیر کو فروعِ حدیث میں شمار کیا جائے، بجز اس وجه کے جس کی طرف تفسیر کے ارتقاء کے سلسلے میں ہم نے اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے که شروع شروع میں تفسیر کو محدّثوں اور راویوں سے سابقه پڑا۔

تفسیر کی روایت میں چند صحابه(رض) شہرت حاصل کر چکے ہیں اور اس روایت کو جمع کر کے ایک تفسیر مرتب ہو چکی ہے جو

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے اور وہ تفسیر وھی ہے جو الفیروز آبادی مصنّف القاموس المحیط کی تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس کی صورت میں طبع ہو چکی ہے۔ اس تفسیر کو غیر معتبر ثابت کرنے کے لیے ھمارے لیے وھی قول جو امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہو کر روایت ہوا ہے کافی ہے ؛ وہ فرماتے ھیں ابن عباس سے تفسیر کے متعلق سوائے تقریباً سو حدیث کے کچھ ثابت نہیں [ابن العماد : شذرات الذھب، ج ۱ ؛ خلاصة تذھیب الکمال فی اسماء الرجال ، طبع المطبعة الخیریة ۱۳۲۳ھ، ص ۱۵ ؛ الاتقان، ۲ : ۲۲۴] ؛ حالانکہ تنویر کا مطبوعہ نسخہ، جو ان کی طرف منسوب کر کے لکھی گئی ہے ، معمولی تقطیع کے چار سو صفحات سے کم نہیں .

بعض تابعین نے تفسیر کی روایت بہت کی ہے۔ ان میں سے بعض کا نام بار بار لیا جاتا ہے ۔ ان کے پیشروؤں میں سے ان کی روایت کی تنقید کرنے والوں نے ان کے متعلق حکم لگایا ہے کہ "لیست بذاك" وہ ثقہ نہیں [دیکھیے لسان المیزان، ۱ : ۸، برای "لیس بذاك"]۔ الضحّاك بن مُزاحِم الھلالی (م ۱۰۲ھ یا ۱۰۵ھ) کو لیجیے، بعض نے اس کی توثیق کی ہے، لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ابن عباس سے روایت کرتا ہے لیکن ابن عباس سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی ، اس لیے ابن عباس سے اس کا سلسلۂ روایت منقطع ہے ، نیز کہا ہے کہ اس کی تمام مرویّات محلِّ تأمّل ھیں، وہ تفسیر کے لیے صرف مشہور ہو گیا ہے (الاتقان ، موضع مذکور؛ التذھیب، ص ۱۳۶ ؛ الشذرات، ج ۱) ۔ اس اخیر عبارت سے کہ وہ تفسیر کے لیے مشہور ہو گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر کی روایت کی قدر کا درجہ ان کے ھاں کیا تھا : عَطِیّہ بن سعد العَوْفی (م ۱۱۱ھ) کو، جو ابن عباس سے روایت کرتا ہے، ضعیف کہا گیا ہے [التذھیب اور اس کا حاشیہ ص ۳۰] ؛ اسماعیل ابن عبدالرحمان السُّدّی الکبیر کی بابت (گو اسے قبول کرنے والے بھی ھیں) یہ کہا گیا ہے کہ وہ ضعیف، کَذّاب اور شَتّام (گالیاں دینے والا) ہے [الاتقان، موضع مذکور؛ التذھیب، ۲۲] اور تفسیر جو اس نے جمع کی ہے اس کا راوی أسباط بن نصر ہے اور اس کے ثقہ ہونے پر اتفاق نہیں ہے ، نَسائی نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں [الاتقان، موضع مذکور؛ التذھیب اور اس کا حاشیہ ص ۲۷۸]؛ محمد بن السائب الکلبی (م ۱۴۶ھ)، جو ابن عباس کے سلسلے کی کڑیوں میں سے ایک ہے، تفسیر میں مشہور ہے اور کسی کی تفسیر اس کی تفسیر سے زیادہ طویل اور پُر نہیں ، با ایں همه اگر ایک طرف ایسے لوگ ملتے ھیں جنھوں نے کہا ہے کہ " تفسیر میں اسے پسند کیا گیا ہے" تو دوسری طرف وہ بھی ھیں جو کہتے ھیں " اس کی حدیث ترك کرنے پر اجماع ہے، یہ ثقہ نہیں اور اس کی حدیث کو لوگ لکھتے نہیں" اور ایک جماعت نے تو اس پر وضع کا اِتّہام لگایا ہے . . . [التذھیب، ص ۳۰۶ ؛ الاتقان، موضع مذکور] ؛ محمد بن مروان السُّدّی الصغیر کی بابت، جو [محمد] ابن الکلبی مذکور سے روایت کرتا ہے، کہتے ھیں کہ : وہ حدیث وضع کرتا ہے، اس کی حدیث رائگان ہے اور متروك ہے اور جب سلسلۂ روایت یہ ہو " السُّدّی الصغیر عن الکلبی عن ابن صالح عن ابن عباس" تو وہ جھوٹ کا سلسلہ ہے (الاتقان، موضع مذکور؛ التذھیب اور اس کا حاشیہ ص ۳۳۱) ۔ پھر مقاتل بن سلیمان الازدی الخراسانی (م ۱۵۰ھ) کو لیجیے یہ وہ مفسّر ہے جس کی بابت کہتے ھیں کہ " لوگ تفسیر میں اس کے دست نگر ھیں" اور یہ قول خود [امام] شافعی

کی طرف منسوب ہے ۔ اس کے باوجود اس کی بابت ہمیں یہ رائیں ملتی ہیں : ''وہ مجاہد سے روایت کرتا ہے لیکن اس نے مجاہد سے کچھ نہیں سنا''؛ ''وہ الضحاك سے روایت کرتا ہے لیکن الضحاك سے اس نے کچھ نہیں سنا''، کیوں کہ الضحاك مقاتل کی پیدائش سے چار سال پہلے ھی فوت ھو چکے تھے، اسے جھوٹا کہتے ھیں اور خود وہ لوگ جو اس کی تفسیر کو اچھا کہتے ھیں اسے ضعیف قرار دیتے ھیں اور کہتے ھیں اس کی تفسیر کیا ھی خوب ھے کاش وہ ثقہ بھی ھوتا؛ اس کی بابت منقول ھے کہ وہ یہودیوں سے علم الکتاب حاصل کرتا تھا (الاتقان، محلّ مذکور) ۔ اخیر میں ابوخالد عبدالملک بن عبدالعزیز بن جُریج کو لیجیے، یہ ان لوگوں میں سے ھے جنھوں نے پہلے پہل حدیث کی تدوین کی (یعنی اسے کتابی شکل میں جمع کیا) ۔ تفسیر کے بارے میں اس سے جزء کے جزء مروی ھیں ، با ایں ھمه ناقدوں کا قول ھے کہ ابن جریج نے تفسیر میں صحت کا قصد نہیں کیا ۔ اس نے فقط یہ کیا کہ ھر آیت کے ذیل میں جو کچھ صحیح و سقیم ملا وہ جمع کر دیا.

تفسیر نقلی (مأثور) کے راویوں کی اسی طرح کی مفصّل نقد و جرح ھمیں بہت ملتی ھے اور اسی طرح ان تفسیری روایات کی بابت اجمالی تنقید بھی ملتی ھے، چنانچه احمد بن حنبل کا مشہور قول ھے کہ '' تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں، وہ ھیں: تفسیر، ملاحم اور مغازی''، یعنی ان کے لیے کوئی اِسناد نہیں ھے، کیونکہ ان میں مراسیل کا غلبہ ھے (ابن تیمیة : مقدمة فی اصول التفسیر، طبع دمشق، ص ۱۴)۔ ابن تیمیة احادیث کی وضع کا ذکر کرنے اور اِس کے کذب کے قطعی دلائل کے ذکر کے بعد کہتے ھیں : '' تفسیر میں ان موضوعات کا ایک بڑا جزء موجود ھے '' اور یہ بھی کہتے ھیں '' موضوعات کتبِ تفسیر میں بہت ھیں'' (کتاب مذکور، ص ۱۹).

اس قسم کی نقد و تمحیص سے یہ بات ظاھر ھے کہ روایات اور منقولات متعلقه به تفسیر کسی استوار اور محکم بنیاد پر قائم نہیں۔ پہلے زمانے کے قدیم ناقِدوں کے اقوال آپ نے سن ھی لیے ، اس لیے کارا د وو کا یہ کہنا کہ '' عہدِ حاضر کے نقّاد [گولٹ تسیھر، لامِنس وغیرہ] ان احادیثِ تفسیریه کی قوّت میں کلام کرتے ھیں جو ان بڑے بڑے مجموعه ھای احادیث میں وارد ھیں اور اب تک کسی ایسی رائے تک نہیں پہنچے ھیں جس سے ان احادیث کی زیادہ تائید ھوتی ھو '' ان ناقدین کا نقد میں کوئی جدید کارنامه ثابت نہیں کرتا، اس لیے کہ سطورِ بالا کی روشنی میں صاف نظر آ رھا ھے کہ الزام مذکور زمانۂ قدیم سے چلا آتا ھے .

ان منقولات اور روایات کے پیچھے ایک اَور چیز اپنا کام کر رھی تھی اور وہ یہ کہ مختلف اطراف و جوانب سے جو مذھبی قصّے منقول ھو کر اسلامی ماحول میں پہنچے ھوے تھے روایاتِ اسلامیه ان سے متأثّر ھو رھی تھیں؛ اپنے طویل عہدِ ماضی کے ایک زمانے میں یہود اپنے مصری آثارِ حیات سے بہت کچھ همراہ لے کر مصر سے مشرق کی جانب رحلت کر گئے تھے ، پھر وہ قید کے زمانے میں اَور بھی مشرق کی جانب بابل پہنچا دیے گئے، اس کے بعد جب وہ پھر اپنے وطن میں واپس آئے تو ان کے پاس اقصاے مشرق، یعنی بابل اور مغربِ بعید، یعنی مصر، کے جتنے ذخائر معلومات انھیں مل سکے تھے موجود تھے ؛ اسلامی عربی محیط میں اس معجون مرکّب میں سے جو آنا تھا آیا، پھر اس کے

علاوہ دیگر ادیان جو اس جزیرے میں داخل ہوچکے تھے ان کا مواد بھی آیا اور ان ادیان نے بھی اپنے قصص دینیہ اور دیگر اخبار دل کھول کر پھیلائے ۔ یہ سب کچھ قرآن مجید کے پڑھنے اور سمجھنے والوں کے کانوں میں اس سے پہلے کہ وہ اپنے جزیرے کے اطراف میں شرقاً غرباً بحیثیت فاتحین کے نکلیں بار بار پڑ چکا تھا ۔ پھر جب وہ بیرونی ممالک میں پہنچے اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ مل جل کر رہنے سہنے لگے تو ان کی باتوں سے بھی ان کے کان خوب بھر گئے، گو اس میں سے جس مواد کو شہرت نصیب ہوئی وہ یہودی مواد تھا؛ کیونکہ ایک تو ان کی تعداد زیادہ تھی دوسرے ان کا معاملہ زیادہ واضح تھا، اس لیے وہ زیادات جو تفسیرِ نقلی (مأثور) کی مرویات کے ساتھ ملحق ہوئیں ''الاسرائیلیات'' کہلائیں ۔

ابن خلدون اپنے مقدمۃ میں اسرائیلیات کی کثرت کے اسباب کا ذکر کرتے ہوے کہتے ہیں کہ بعض اجتماعی اور دینی حالات ایسے جمع ہو گئے جنھوں نے ان روایات کے، جن سے کتبِ تفسیر بالروایہ بھری پڑی ہیں ، لینے اور نقل کرنے پر شدّت سے آمادہ کیا اور ان میں ضعیف و قوی، مقبول و مردود، سب کا انبار لگ گیا۔ حالات اجتماعیہ میں ابن خلدون چند چیزوں کو گنتے ہیں : عرب پر بدویّت کا غلبہ اور لکھنے پڑھنے سے عاری ہونا اور اس کے ساتھ ان کا وہ فطری شوقِ معرفت جو نفوسِ بشریّہ کا خاصّہ ہے کہ دنیا کی ساری چیزیں کیوں کر بنیں ؟ پیدایش کی ابتداء کیسے ہوئی اور وجود کے اسرار کیا ہیں ؟ ظاہر ہے کہ وہ ان باتوں کی بابت صرف انھیں سے سوال کر سکتے تھے جو ان سے پہلے اہلِ کتاب تھے ۔ اس کے بعد ابن خلدون دینی حالات کا اثر یہ بتاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے عرب ان جیسی مرویّات کو بکثرت اور ان کی صحت جانچے بغیر قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے؛ انھوں نے سوچا کہ ان قصّے کہانیوں کا احکام سے تو کوئی تعلق ہے ہی نہیں کہ ان کی صحت کی جانچ پڑتال کی جائے اس کی ضرورت تو عمل کے لیے پڑتی ہے ، چنانچہ مفسّروں نے ان جیسے منقولات میں سہل‌انگاری سے کام لیا اور تورات کے ماننے والے عوام سے، جو عرب میں رہتے تھے اور عرب ہی کی طرح بدوی تھے، باتیں اور حکایتیں لے لے کر اپنی کتابوں میں بھر دیں ۔ ان باتوں سے ان کی واقفیت اتنی ہی تھی جتنی کہ عوام اہلِ کتاب کی تھی، اس سے زیادہ کچھ نہ تھی اور نہ ان کا تعلّق احکام شرعیہ سے تھا، جن کے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے (ابن خلدون : مقدمۃ، ص ۳۸۳، ۳۸۴، کسی قدر ردّ و بدل کے ساتھ) ۔ بہر حال ان نقول کا راستہ کھولنے کے اسباب سارے یہی ہوں جو بیان کیے گئے یا اس کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی ہوں، جن سے روایت اور عقیدہ، جب تک کہ وہ زندہ اور باقی ہیں، لازمی طور پر متأثّر ہوتے رہتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تفاسیر میں ان مرویّات کی نقل بکثرت موجود ہے جن کی بابت بحث یہ بتاتی ہے کہ وہ مختلف ادیان کے ترکوں کا، جو عرب کے معارف میں اِدھر اُدھر سے آ کر بھر گئے، ایک رنگ برنگ کا ملا جلا مجموعہ ہے۔

اس بات کے جاننے کے بعد کہ ہمارے پیشرو اسرائیلیات کی اس خلط و آمیزش سے اچھی طرح واقف تھے ہمارے لیے لازم نہیں کہ ان سے بچنے کی صورت اور ان کے اثر سے دور رہنے کا طریقہ بیان کریں ، اس لیے کہ بہت سے مفسّر اس کی طرف متوجہ ہوے ہیں اور اسے زیر بحث

لائے ہیں، گو ان میں سے کم یا شاذ و نادر ایسے لوگ تھے جو خود اس کا اثر قبول کرنے سے بچے ہوں.

آج کل اساتذۂ ازہر نے اہلِ علم کو ادھر متوجہ کیا ہے کہ کتبِ تفسیر کو ان اسرائیلیات سے پاك کر دیا جائے؛ یہ کام کچھ ایسا اہمّ نہیں، اس سے زیادہ مفید صورت شاید یہ ہے کہ اوّلاً تفسیر بالنقل کے سلسلے میں جتنی رطب و یابس روایات کا مجموعه پایا جاتا ہے، متن اور سند دونوں کے اعتبار سے، اہلِ فن کے قواعدِ نقد کے مطابق اس کی کڑی جانچ پڑتال کی جائے، پھر یه ڈھیر کا ڈھیر مواد، جو کسی طرح باقی رہنے کا مستحق نہیں، خود بخود ان کتب سے نیست و نابود ہو جائے گا اور کسی آیت کا مطلب سمجھتے وقت قرآن مجید کا مطالعه کرنے والوں کو اس سے سابقه ہی نه پڑیگا اور فہم قرآن بے بنیاد باتوں پر موقوف نه رہے گا .

ان نام نہاد اسرائیلیات کی بابت مشایخِ ازہر پر ایک اَور ذمه داری عائد ہوتی ہے، جس کا تعلّق ادیانِ مختلفه کی تأریخ اور ان کے باہم ارتباط کی تحقیق سے ہے ۔ یه کام انہیں، اس سے قبل که کوئی اَور سنبھالے، خود سنبھالنا چاہیے ۔ اس کا دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑنا مناسب نہیں ۔ اس کی انجام‌دہی کا طریقه یه ہے که ان تمام قصص و حکایات کو یکجا کیا جائے اور ان کے مآخذ کی روشنی میں ان کا مطالعه کیا جائے اور ان کے مصادر کو کھول کر بیان کیا جائے، تاکه اس سے یه بات بخوبی واضح ہو جائے که مختلف ادیان ایک دوسرے پر کیا اثر ڈالتے ہیں اور خود ایک دوسرے سے کتنا یا کیا اثر لیتے ہیں اور ان کے باہم ارتباط و اتّصال کے راستے کون سے ہیں .

اب ہم اسی بحث کی طرف لوٹتے ہیں جو ہم نے پہلے شروع کی تھی، یعنی تفسیرِ نقلی یا تفسیرِ مأثور جو تفسیر کی اصناف میں سب سے پہلے وجود میں آنے والی صنف ہے، پہلے تو اسے مختلف طبقے ایک دوسرے کی طرف زبانی منتقل کرتے رہے، اس کے بعد رفته رفته اس کی تدوین ہوئی، حتّٰی که اس کے لیے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں ۔ یه سلسله چلتا رہا یہاں تک که زندگی کے رخ بدل گئے اور ایسی تفسیریں پیدا ہونا شروع ہو گئیں جن میں عقلی پہلو کو نقلی پہلو پر ترجیح دی جانے لگی اور تفسیر لکھنے والے اس کا اہتمام کرنے لگے؛ گو ان کی کتابوں میں روایاتِ منقوله کے نشانات اب بھی نظر آتے تھے اور وہ وقتاً فوقتاً ان سے برابر کام بھی لیتے تھے ۔ آخر یه نوبت آئی که رفته رفته تفسیرِ مأثور کے لیے مستقل کتابیں لکھنے کے اہتمام میں ضعف آ گیا .

یہاں یه کافی ہوگا که ہم تفسیر بالروایت کی تین کتابوں کا ذکر کر دیں، جن میں سے ایک شرقی، ایک غربی اور ایک مصری ہے ۔ پہلی کتاب شرقی تو کتاب جامع البیان فی تفسیر القرآن ہے جو تیس جلدوں میں ہے اور ابن جُریر الطبری نے لکھی ہے، جو محدّث بھی تھے، مؤرّخ بھی اور فقیه بھی ۔ یه کتاب مکمّل چھپ چکی ہے ۔ کارا د وو، Carra de Vaux نے دائرة المعارف الاسلامیة، طبع لائیڈن، کے مقالۂ تفسیر میں لکھا ہے : ”اس [ابن جریر کی] ضخیم تفسیر میں بہت سی صحیح اور معتبر احادیث پائی جاتی ہیں“ ۔ گمان غالب یه ہے که یه حکم کسی خاص تحقیق و تفتیش پر مبنی نہیں؛ کیونکه ابن جریر رحمه اللہ ان راویوں سے روایت کرنے سے کیسے بچ سکتے تھے جن کی بابت ناقدینِ رجال کی جرح و نقد ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔ مثال کے طور پر ابن‌جریر کے خلاف کہا

گیا ہے کہ ان کی تفسیر میں بہت سی روایات سدّی کے واسطے سے ہیں، حالانکہ ابن ابی حاتم نے جب یہ التزام کیا کہ وہ طبری کی تفسیر کی صحیح ترین روایات جمع کرے تو اس نے ابن جریر کی سدّی کے طریق کی ایک روایت بھی نقل نہیں کی (الاتقان، ۲ : ۲۲۴) - شاید تفسیر ابن جریر بھی اسی طرح محقّقانہ تنقید کی محتاج ہے جس طرح اوروں کی بعض تفسیری روایتیں ہیں، جن کی بابت اوپر بیان ہوا - ہاں ابن جریر کی ادبی اور علمی شخصیت ان کی کتاب کو دوسری صنفِ تفسیر یعنی تفسیر بالدرایة میں ایک ایسا مرجع قرار دیتی ہے جس کی اہمیت کسی طرح کم نہیں: کیونکہ انھوں نے مختلف معانی کو ایک دوسرے پر جو لغوی اور علمی پہلوؤں سے ترجیح دی ہے وہ ان روایاتِ منقولہ سے جو انھوں نے اپنی تفسیر میں جمع کی ہیں کہیں بڑھ کر قیمتی ہے.

رہی دوسری کتاب جو غربی ہے، تو وہ ابو محمد عبدالحق بن ابی بکر غالب بن عطیة الغرناطی الاندلسی (م ۵۴۱ھ) کی کتاب ہے جو المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز کے نام سے مشہور ہے - اس مصنف کی بابت ابن خلدون اپنے مقدمة میں کہتے ہیں : ''اس نے تمام تفسیر کی کتابوں (یعنی منقول تفسیروں) کا خلاصہ نکال کر رکھ دیا ہے اور ان میں سے قصداً انھیں باتوں کو لیا ہے جو صحت سے زیادہ قریب ہیں اور ان سب کو بہت اچھی طرز کی کتاب میں مرتب کر دیا ہے، جو اہل مغرب اور اندلس میں متداول اور مقبول ہے'' - یہ کتاب بصورتِ مخطوطہ موجود ہے، جس کے چند اجزاء دارالکتب المصریة اور کتبخانۂ تیموریہ میں پائے جاتے ہیں[1] - میں نے اس کا مطالعہ کیا اور اس میں منجملہ دیگر اوصاف کے یہ صفتیں پائیں کہ مصنّف عبارات کے لیے شواہدِ ادبیّہ بیان کرنے کا خاص خیال رکھتا ہے اور تطویلِ بے جا سے اجتناب کرتے ہوئے نحوی باتوں کی طرف دھیان دیتا ہے، قراءت کی طرف جتنی توجہ کرتا ہے اتنی اوقاف کی طرف نہیں کرتا، تفسیری روایات میں سے اپنی منتخب روایات لے لیتا ہے اور رطب و یابس کی بھرمار نہیں کرتا، طبری سے نقل کرتا ہے، لیکن کبھی کبھی اس کی مرویات میں مین میخ بھی نکالتا ہے.

تیسری کتاب مصری ہے - اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفسیرِ منقول میں مصر کا قدیم سے کیا حصّہ رہا ہے - احمد بن حنبل کا قول نقل کرتے ہیں کہ مصر میں تفسیر کا ایک صحیفہ ہے، جس کی روایت علی بن ابی طلحة الهاشمی نے کی ہے اور وہ ابن عبّاس سے روایت کا جیّد طریق ہے، اگر کوئی شخص مصر کا سفر اسی ایک صحیفے کے لیے کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہو گی - بخاری نے اپنی صحیح میں مرویّاتِ ابن عبّاس درج کرتے وقت اسی صحیفے پر بہت اعتماد کیا ہے، جیسا کہ ابن حجر سے منقول ہے (الاتقان، ۲ : ۲۲۳، جس میں اس قول کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے : تحقیق یہ ہے کہ ابن ابی طلحة نے ابن عبّاس سے تفسیر خود نہیں سنی بلکہ صرف مجاهد یا سعید بن جبیر سے سن کر اخذ کی ہے - ابن حجر کہتے ہیں کہ ''چونکہ واسطہ ثقہ ہے، اس لیے اس میں کچھ ضرر نہیں'').

[جس تیسری مصری کتاب کا ذکر ہم کرنا چاہتے ہیں وہ] تفسیر منقول کی کتاب ہے جو جلال الدین السیوطی المصری (م ۹۱۱ھ) نے کتاب الدّر المنثور فی التفسیر المأثور کے نام سے یادگار چھوڑی ہے، یہ کتاب طبع ہو چکی ہے.

(۱) رک به براکلمان ۲ : ۲۱۴ ؛ تکملہ ۱ : ۷۳۲ .

ان تینوں کتابوں کا ذکر میں نے تفسیر کے ارتقاء کی بحث کے ضمن میں اس حیثیت سے کیا ہے کہ یہ تفسیرِ نقلی کی کتابیں ہیں اور یہی صنفِ تفسیر تمام اصنافِ تفسیر میں سب سے پہلے ظاہر ہوئی، گو میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ اس قدر زمانۂ دراز کے اندر، جو تیسری صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک پھیلا ہوا ہے، ان کتابوں کی قدر و قیمت اور احوال میں بہت کچھ تغیّر و تبدّل واقع ہوا ہے اور ان میں جو تفسیر مأثور درج ہے وہ اپنے ماحول، مؤثرات اور رُخ بدلنے والے عناصر (مُوجِّہات) سے ضرور متأثّر ہوئی ہے اور یہ تأثّر اس زمانے کی تفسیر و تألیف کی تأریخ لکھنے والے کو صاف صاف اور نمایاں نظر آتا ہے۔

ج۔ تفسیر کا درجہ بدرجہ ارتقاء:

یہاں تفسیر کی تأریخ بیان کرنا یا اس تأریخ کا خاکہ پیش کرنا مقصود نہیں، صرف اجمالی طور پر تفسیر کی زندگی کے ان بڑے بڑے نشاناتِ راہ کا بیان ہوگا جن سے وہ گذری۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم صحیح معنی میں تفسیر کی تأریخ لکھنے کا خیال دل میں نہیں لا سکتے تا وقتیکہ ان ازمنۂ دراز کے تأریخی میدان کے تمام تألیفی کارناموں سے واقفیت حاصل نہ کر لیں۔ یہ تألیفات اس قدر زیادہ اور اتنی ضخیم ہیں اور اس قدر گوناگون مقاصد اور اغراض کے پیشِ نظر لکھی گئی ہیں کہ ان کے بیان اور پھیلاؤ اور ان کے مؤلّفین کی عظمتِ شان کو پڑھ پڑھ کر دھشت طاری ہوتی ہے؛ چنانچہ دوسری صدی ہجری ہی میں شیخ المعتزلہ عمرو بن عبید نے حسن بصری سے سن کر ایک تفسیر مرتّب کی [ابن خلّکان: طبع بولاق، ۱: ۴۸۶] اور ان دونوں سے زیادہ اس میدان میں جلیل القدر کون ہو سکتا ہے؟ ابوالحسن الاشعری امام المتکلّمین نے کتاب المختزن لکھی، جس میں کوئی آیت جس کا سہارا کسی بدعتی نے پکڑا ہو نہیں چھوڑی جب تک کہ اس کا اس آیت سے تعلّق باطل نہ کر دیا اور پھر اسی آیت کو اہل حق کے لیے حجت نہ ثابت کر دیا۔ کسی کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس نے اس کتاب کا کچھ حصّہ دیکھا تھا اور سورۃ الکھف تک پہنچتے پہنچتے اس کی سو کتابوں تک نوبت پہنچ چکی تھی (تبیین کذب المفتری، طبع الشام، ۱۳۳)۔ تفسیر میں ایسے ہی اس امام کے اور کارنامے ہیں جن کی قدر و قیمت کی عظمت کا تذکرہ جا بجا موجود ہے۔ اسی طرح [امام] الجوینی کی بڑی تفسیر اور القشیری کی بڑی تفسیر ہیں۔ انھیں کے پہلو بہ پہلو اربابِ لغت و ادب دکھائی دیتے ہیں جن میں سے مشہور یہ ہیں: ابوطالب المُفضّل بن سَلَمَۃ الکوفی (تیسری صدی ہجری)، مؤلّف کتاب معانی القرآن۔ ابن الانباری (چوتھی صدی ہجری)، جنھیں تفاسیرِ قرآن میں سے ایک سو بیس تفسیریں مع ان کی اسانید کے ازبر تھیں: ان کی تألیف کتاب مشکل القرآن ہے، جسے وہ سالہا سال شاگردوں کو لکھواتے رہے۔ لیکن ختم نہ کر سکے اور فقط سورۃ طٰہٰ تک پہنچنے پائے۔ [ابن الانباری: طبقات الادباء، ص ۳۳۲]۔ اسی طرح ابوہلال العسکری کی کتاب المحاسن فی تفسیر القرآن ۵ جلدوں میں ہے [ان کی کتاب دیوان المعانی کے مقدمے کی رو سے یہ عنوان دیا گیا ہے]... اگر میں ان عجیب و غریب کتابوں کا، جو مختلف فنون کے ائمہ نے تفسیر قرآن کے بارے میں لکھی ہیں، کچھ تھوڑا سا بھی تذکرہ اسی طرح کرتا چلا جاؤں تو صفحے کے صفحے بھر جائیں۔ کیا اس کے بعد آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں گے کہ جب ان کتابوں کو ڈھونڈھ کر ان کے

جمع کرنے اور ان کے مطالعه کرنے میں ایک قدم بھی نه اٹھایا گیا ہو تو تأریخ تفسیر لکھنے کا خیال ایک قسم کی علمی دیده دلیری (وقاحت) ہے؟ میرا خیال ہے که آپ ضرور اس سے اتفاق کریں گے ۔ کیا علم قرآنی کے محبّ، یه تمام وسیع جمعیّات دینیه اور پھر خود حکومت یه چاھتی ہے که اس تمام موادّ کو، جو دنیا میں قرآن مجید سے متعلّق کتابی صورت میں لکھا ہوا موجود ہے، جمع کیا جائے یا اقلاً اس سے قریب کوئی صورت پیدا ہو، اس سے پیشتر که وہ بہت سی ایسی باتوں پر غور و فکر میں وقت صرف کریں جنھیں علم دینی کے بڑھانے گھٹانے سے کوئی واسطه ھی نہیں !!!

تفسیر کے درجه بدرجه ارتقاء کے بڑے بڑے نشانات راہ پر جب نظر ڈالتے ھیں تو ھمیں معلوم ہوتا ہے که حیات کے تدریجی ارتقاء کا تفسیر کے ارتقاء پر نمایاں اثر پڑا ہے ۔ وجه یه که اسلام کا حیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور مسلمانوں کے لیے مختلف احوال میں قرآن مجید مرجع اور سہارا ہے اور اس لحاظ سے مسلمانوں میں اس کی ایک خاص قدر و منزلت ہے ۔ پہلے یه حالت تھی که قرآن مجید کے معنی کی بابت اپنی طرف سے ایک لفظ بھی منه سے نکالنا گناہ سمجھتے تھے، یہاں تک که 'اَبّ' اور 'خبز' کی لفظی تفسیر بھی خود نه کرتے تھے [حضرت عمر[رض] کی حکایت اَبّ کی تفسیر کی بابت اور ابو عبیدۃ اور اصمعی کا قصّه لفظ خُبز کی تشریح کی بابت مشہور ہے] [دیکھیے ابن جریر، ۳۰ : ۳۳] ۔ پھر اتنا ہوا که تفسیر قرآن کے بارے میں اختلاف رائے ہونے لگا که ہر عالم کو اس میں غور و خوض کرنا جائز ہے یا نہیں ۔ ایک گروہ کی یه رائے ہوئی که جو زبان کے ادب سے خوب واقف ہو اس کے لیے قرآن کی تفسیر کرنے کی گنجایش ہے ۔ ایک گروہ نے کہا که تفسیر کی کسی کو مجال نہیں، خواہ کتنا ھی بڑا ادیب و عالم ہو، اس کے لیے سوا اس کے کوئی چارہ نہیں که تفسیر مأثور پر اکتفا کرے اور رسول اللّٰہ[صلعم] سے یا ان صحابه[رض] سے جو تنزیل قرآن کے وقت حاضر تھے اس بارے میں جو منقول ہے اس سے آگے نه بڑھے وغیرہ وغیرہ .... اور تحقیق یه ہے که ایک رائے میں حد سے زیادہ مبالغه اور دوسری میں کچھ کوتاھی ہے، کیونکه جو صرف منقولات پر دار و مدار رکھتے ھیں انھیں بہت سی باتیں، جن کی ضرورت ہے، چھوڑنا پڑتی ھیں؛ ان کے مدّ مقابل، جو ہر عالم کو تفسیر میں غور و خوض کا حق دیتے ھیں، تفسیر کو (خلط ملط کا نشانه بناتے ھیں [الراغب الاصفهانی : مقدمة التفسیر، ۴۲۲، ۴۲۳؛ یہاں عبارت میں کچھ گڑ بڑ ہے، جس سے بآسانی اس بات کو ترجیح دے سکتے ھیں که اس کے بعض الفاظ میں تحریف ہے ۔ میں نے اس میں سے وہ حصّه لیا ہے جو اس قسم کی تحریف سے پاک ہے] ۔ اس تحقیق کی بنیاد پر قرآن مجید کے مضامین کا تعیّن کیا گیا اور وہ علوم جن کا ایک مُفَسّر کے لیے جاننا ضروری ہے مقرر کیے گئے؛ مُفَسّر کے لیے شرطیں رکھی گئیں اور ان میں علوم لغویه، عقلیه اور وھبیه کو شامل کیا گیا، تو جس شخص میں یه شرطیں پوری ہوں وہ اگر تفسیر کرے تو تفسیر بالرائے کے دائرے سے خارج ہوگا، ورنه بصورت دیگر اپنی رائے سے تفسیر کرنے والا وھی ہوگا جو ان ذرائع سے تہی دست ہو جن سے تفسیر میں مدد لی جاتی ہے ۔ لامحاله اس کی تفسیر محض اٹکل پچو اور تخمین و ظن کی بنا پر ہوگی اور یہی اصلی معنی میں تفسیر بالرائے ہے [الراغب الاصفہانی : کتاب مذکور، ۴۲۵] ۔

یہاں سے ناظرین کو صاف نظر آئے گا کہ تفسیر کے تدریجی ارتقاء میں دو سرے ہیں، جو باہم متقابل ہیں اور ان کے بیچ میں وسط یا اوساط ہیں، جن کا ان متقابل سروں سے قُرب و بُعد متفاوت ہے - ان میں سے ایک سرا جو پہلا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں اپنی طرف سے کچھ کہنے سے پرہیز کرنا چاہیے، جیسا کہ دور صدرِ اوّل اور اس کے متّصل کے لوگوں کا رویّہ بیان کیا جاتا ہے؛ اس رویّے کی بابت جو حکایات ہم تک پہنچی ہیں وہ کچھ کم نہیں ہیں؛ ان میں سے ہمارے لیے یہی حکایت کافی ہے کہ خود امام مالک بن اَنس، جنھیں اصحابِ اوائل واضعِ تفسیر (بمعنی مدوّنِ تفسیر) بتاتے ہیں، روایت کرتے ہیں کہ سعید بن المُسیّب سے جب کسی آیت قرآنیہ کی تفسیر پوچھی جاتی تو فرماتے تھے کہ ''ہم قرآن مجید کی بابت کچھ نہیں کہا کرتے'' [ابن تیمیة : اصول التفسیر، ص ۳۱] - دوسرا اس کے مقابل کا سرا وہی ہے جس کی طرف الراغب کی مذکورۂ بالا عبارت اشارہ کرتی ہے، یعنی قرآن مجید میں غور و خوض کرنے کی ہر شخص کو اجازت ہے - الغزالی الاحیاء میں [ابوحیّان : البحر المحیط، ۱ : ۳۴۱] پہلے تو اس بات کو حُجَج و دلائل کے ساتھ باطل ٹھیراتے ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر میں ماسوائے قولِ منقول و مسموع کے کوئی کچھ نہ کہے، پھر کہتے ہیں : ''اس لیے یہ بات باطل ہو گئی کہ مطالبِ قرآن بیان کر لینے کے لیے وہی کچھ کہا جا سکتا ہے جو قرونِ اُولٰی سے سنا گیا ہو اور ہر ایک کے لیے اس بات کا جواز ثابت ہو گیا کہ وہ اپنے فہم کے اندازے اور عقل کی حد کے مطابق قرآن سے مطالب استنباط کرے''- اسی طرح اس سے پہلے غزالی لکھتے ہیں : ''قرآن کے معانی کے سمجھنے کا میدان بہت وسیع ہے اور یہ ایک بڑی فراخ جولانگاہ ہے اور پہلے لوگوں سے جو ظاھر تفسیر منقول ہے اس پر اس بارے میں ادراک کا خاتمہ نہیں ہو گیا . . .'' - یوں کہنا چاہیے کہ دونوں مذکورہ سرے ایک دوسرے کے نقیض ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں بہت سے درمیانی مدارج دیکھے جاتے ہیں، جو رفتہ رفتہ طے ہوئے : شروع میں یہ تھا کہ تفسیر کے نام سے لوگ کانوں پر ھاتھ رکھتے تھے، اس کے بعد تفسیر منقول پر آ کر ٹھیرے - یہ منقولات پہلے بہت کم تھے، اس کے بعد بڑھنے اور پھیلنے شروع ہوئے، پھر ابل پڑے، یہاں تک کہ غیرمعتبر اقوال بھی ان میں مل گئے؛ پھر منقولات میں افراد کی کوششوں کے نتائج بھی شامل ہونے لگے، جو انھوں نے فہم قرآن کے متعلق کیں اور پہلے پہل صرف وہ اقوال مقبول ہوئے جو لغت اور معانی کلمات کے دائرے کی حد میں محدود تھے . . .، اس کے بعد شخصی فہمِ معانی کے نتائج بڑھنے لگے اور ان پر طرح طرح کے معلومات کا اثر پڑنے لگا، حتّٰی کہ بعض کتبِ تفسیر میں کثیر و طویل ایسی باتیں لکھی جانے لگیں جن کی تفسیر میں کوئی ضرورت نہیں، جیسا کہ رازی نے اپنی تفسیر میں کیا، جس کی بابت کسی انتہا پسند عالم کا مبالغہ آمیز قول مشہور ہے کہ ''رازی کی تفسیر میں سوا تفسیر کے ہر چیز موجود ہے'' (ابو حیّان : البحرالمحیط، طبع الحلبی، ۱ : ۲۶۱) - الراغب الاصفہانی (پانچویں صدی کے شروع میں) کی رائے تو صرف یہ تھی کہ ہر شخص کے مطالبِ قرآنی میں دخل دینے سے قرآن مجید میں تخلیط (گڑ بڑ) کا اندیشہ ہے - ابو حیّان نے آٹھویں صدی میں صاف صاف کہہ دیا کہ رازی وغیرہ نے جو کچھ تفسیر میں لکھا ہے وہ بالکل ایک نحوی کا سا کام ہے کہ

ابھی ابھی اپنے فن میں الف منقلبة سے بحث کر رہا تھا اتنے میں لگا جنت اور نار سے بحث کرنے اور اس کے بعد کہا ہے : جس شخص کا علم کے اندر یہ طریقہ ہو وہ خلط ملط کرنے اور اندھا دھند ہاتھ پاؤں مارنے میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے (ابو حیّان : موضع مذکور) . . . . - چیزوں کو اس طرح مختلط کرنے میں مفسّرین میں سے کسی کا حصّہ کم ہے کسی کا زیادہ لیکن ایسے کم ہیں جو اس سے بالکل بچے ہوئے ہوں .

تفسیر کے بارے میں نقطۂ نظر کے ارتقاء کی طرح تفسیر کی تألیف و تدوین میں بھی ارتقاء ہوا - مصر وغیرہ میں ابھی ابھی تو تفسیر کا حجم ایک ورق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں بڑھ کر ایک جزء یا چند اجزاء تک پہنچ گیا، جن میں فقط صحابہ سے مأثور تفسیر لکھی جاتی تھی - اس کے بعد حجم اور بڑھا اور صحابہ کے ساتھ تابعین کے اقوال بھی جمع کیے جانے لگے - اس کے بعد رفتہ رفتہ تفسیر مأثور کے ساتھ عقل آرائیاں بھی شامل ہونے لگیں، جیسا کہ تفسیر ابن جریر الطبری میں یا ان تفاسیر بالنقل میں جن کا اوپر ذکر ہوا دیکھا جاتا ہے - اس کے بعد اس عقلی کوشش کا کتابوں میں غلبہ ہونے لگا، یہاں تک کہ یہی چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آنے لگی، گو اس کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں منقولات سے بھی خالی نہیں ہوتی تھیں، مثلاً شانِ نزول کے متعلق روایات اور ایسی ہی اور باتیں جو روایت سے تعلق رکھتی ہیں ان میں موجود ہوتی تھیں؛ زمخشری نے کشّاف میں یہی طرز خاص اختیار کیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں ایسا ڈھنگ اختیار کیا ہے جس سے ایک خاص مذہب کی تائید ہوتی ہے، لیکن باوجود اس کے اپنی کتاب کو منقولات سے بھی خالی نہیں چھوڑا ہے، بلکہ ضعیف آثار تک نقل کر دیے ہیں؛ مثلاً وہ حدیث جسے وہ قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل کے بارے میں لاتے ہیں، جس کے موضوع ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے (ابن تیمیة : اصول التفسیر، ص ۱۹) - اس طرح تفسیر کی دونوں قسمیں ایک دوسری میں داخل ہو گئیں اور اس کے بعد گوناگون طرز کی تفسیریں لکھی جاتی رہیں .

(۵) تفسیر کے طریقے :

تفسیرِ درایتِ عقلی کا، جو تفسیرِ روایتِ نقلی کی مدِّ مقابل ہے، ظہور ہم دیکھ ہی چکے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دونوں کیوں کر باہم ملیں اور پھر ایک دوسرے میں کیوں کر داخل ہو گئیں - ابن خلدون نے مقدمة میں اتنا ہی کہا تھا کہ " تفسیر بالدرایة تفسیر بالروایة سے شاذ و نادر ہی خالی ہوتی ہے ، کیوں کہ مقصود بالذات، تفسیر بالروایة ہی ہے، تفسیر بالدرایة تو اس وقت آئی جب لسان اور علومِ لسان ایک خاص فن بن گئے؛ ہاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ بعض تفاسیر میں تفسیر بالدرایة غالب ہے " (مقدمة، ص ۳۸۴) ، لیکن ہم اس میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ تفسیر بالدرایة نے قرآنِ مجید کو تفسیر لکھنے والوں کی ثقافت سے بہت مضبوطی کے ساتھ وابستہ کر دیا اور اس کا اثر بھی بہت سخت پڑا، یہاں تک کہ اس تخلیط کی نوبت پہنچی جس کا ذکر ابوحیّان نے کیا ہے؛ چنانچہ مختلف انواع کی تفسیریں بکثرت نمودار ہو گئیں، جن میں نقل و روایت کی کچھ اہمیت نہ رہی - یہ طریقے اتنے کثیر التعداد ہیں کہ شاید ان کا احاطہ اور ان کے انواع کا تقرّر آسان کام نہیں، کیونکہ انہیں کثیر التعداد اعتبارات [خیالات اور عقائد] سے متأثر ہونا پڑا ہے - ادھر تو بقول ابن خلدون علوم لسانیّہ نے فنّی حیثیت

اختیار کرنے کے بعد تفسیر کا رخ بدلا اور اُدھر علوم عقلیہ و نقلیہ کی کثرت نے اسے مختلف سمتوں میں موڑنا شروع کیا اور عملی زندگی کے مقاصد و اغراض، سیاسی اور غیر سیاسی نے بھی اس کا رخ بدلنے میں حصہ لیا۔ ان اسباب کی بنا پر تفسیر کے بہت سے طریقے معرضِ ظہور میں آئے، بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور ان کا اثر طرزِ زندگی و ثقافتِ اسلامیہ پر بہت تیزی سے اور بہت گہرا پڑا۔

گولٹ تسیہر نے اپنی کتاب *Die Richtungen* [etc.] ''تفسیر کے مختلف رخ'' (''اتجاهات التفسیر'') میں تفسیر کے انواع گنوائے ہیں اور تفسیر بالروایة، تفسیر اعتقادی، تفسیر متصوّفانه، تفسیر شیعی اور زمانۂ حال کی اسلامی تجدید کی تفسیر کا ذکر کیا ہے اور یہ ایسے بڑے بڑے اصول و کلّیات ہیں جن کے تحت تفسیر کے بہت سے طرز اور طریقے آ جاتے ہیں، لیکن ابھی چند اقسامِ تفاسیر ایسی بچ گئی ہیں جن کا اندراج ان کلّیات میں بآسانی نہیں ہو سکتا، جیسے تفسیر لغوی، نحوی، ادبی، فقہی، تأریخی وغیرہ۔ میری رائے میں ان میں سے ایک ایک قسم سے الگ الگ بحث کرنا، اس غرض سے کہ اس کا اثر قرآنی مطالب کے فہم کے طریقوں پر ظاہر ہو یا خود قرآن کے ساتھ ان کے اتّصال کا اثر، جو ان علوم و فنون کے نشو و نما پر پڑا ہے، واضح ہو، صحیح نہ ہوگا، جب تک کہ ایسی کتابیں اور مطالعات جو تفسیر کی ان انواعِ مختلفه پر لکھے گئے ہیں سب نہیں تو اکثر ہاتھ نہ آ جائیں اور پھر انہیں ترتیب دے کر ان کا مطالعہ غور و فکر اور پختگی کے ساتھ نہ کر لیا جائے، جس سے ان کی بابت اس جیسے ہمہ گیر فیصلے کرنا آسان ہو جائے۔

تفسیر کے اس مجمل اور سرسری خاکے میں ہم نے تفسیرِ صوفی اور تفسیرِ شیعی سے بحث نہیں کی، اور اس کے بیان کرنے کے در پے نہیں ہوے کہ ان دونوں نے قرآن کے معانی میں کیا کیا اضافہ کیا اور نہ ان دونوں کے طریقِ تفسیر پر کوئی حکم لگایا؛ ایسے ہی دوسرے طریقوں کو بھی، جو انہیں جیسے ہیں لیکن ان کی طرز کے مخالف، نہیں چھیڑا اور نہ ظاہر، باطن، حد و طرزِ خیال (المُطّلع) وغیرہ کے متعلق ہم نے کچھ کہا، نہ ان خفیه اور خاص علوم کا ذکر کیا جو لوگوں نے قرآن سے اخذ کیے ہیں۔ اس کے لیے ہمارے پاس قصدِ اختصار اور تنگیِ مجال کا عذر تو ہے ہی لیکن اس سے بڑھ کر اس کا سبب یہ ہے کہ ان باتوں سے اب زندگی کا واسطہ کم پڑتا ہے اور آج کل کی زندگی پر سے اس ابتلاء کا بوجھ بہت کچھ ہٹ گیا ہے۔ ادھر ہرچند ہم نے مختلف فنون ادبی سے بحث کرنا اور قرآنِ مجید سے ان کے تعلّق کا بیان کرنا تأریخِ ادبی کے وسیع تر میدان کے لیے چھوڑ دیا ہے، کیونکہ ان ابحاث کے لیے فرصت اور سکون اس سے زیادہ درکار ہیں جو اس مقالے کے لیے ہمیں میسر ہیں، لیکن ان سب کو چھوڑتے ہوے بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ظاہری علوم عقلیہ سے تفسیر کے تعلق کی بابت بحث کریں؛ وجہ یہ کہ ان علوم کی روشنی میں قرآنِ مجید کی تفسیر کرنے اور ان علوم کا قرآنِ مجید سے استنباط ثابت کرنے کی طرف علماےزمان قدیم و جدید دونوں نے برابر توجہ کی ہے اور اسی بنا پر ہم پروفیسر کارا د وو کی اس راے سے جو انہوں نے اپنے مقالۂ تفسیر کے آخر میں ظاہر کی ہے متّفق نہیں ہیں کہ تفسیرِ قرآنِ مجید میں فلسفۂ جدیدہ اور سائنس کے خیالات کا شامل کرنا نئے زمانے کے جدّت پسندوں کی ایجاد

ہے اور اس بات کی کوشش ہے کہ تفسیر کا نئے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے ۔ اتّفاق نہ کونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید، اور فلسفے اور علومِ عملیہ کے باہمی ارتباط کی کوشش بہت ہی قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے ۔

(و) تفسیرِ علمی :

وہ تفسیر ہے جس میں اصطلاحات علمیہ کا عبارتِ قرآن کے اندر صاف صاف موجود ہونا ثابت کیا جائے اور مختلف علوم و آراے فلسفیہ کا قرآن مجید سے استنباط کرنے کی کوشش کی جائے ۔ تفسیر کا یہ طریقہ، اس کے باوجود کہ دینی علوم کے مختلف شعبوں میں عبارتِ قرآن کے سمجھنے کے لیے قواعد مقرر کر دیے گئے تھے، رائج ہو کر رہا اور اس راے کو یہاں تک وسیع کیا گیا کہ قرآنِ مجید مجملاً تمام علوم پر حاوی ہے، چنانچہ اس میں علوم دینیہ، اعتقادی و عملی، ظاہری و مرموزی کے پہلو بہ پہلو تمام دنیوی علوم بھی موجود ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ الغزالی اپنے زمانے تک اس قول کی تشریح و تفصیل میں سب سے آگے آگے ہیں ؛ چنانچہ الاحیاء میں جہاں انھوں نے اس مسئلے کو چھیڑا ہے [طبع حلبی، ج ۱، باب چہارم : ص ۲۵۹ تا ۲۶۳ ؛ اس باب کا عنوان ''فہم القرآن و تفسیرہ بالرای من غیر نقل'' ہے] ۔ وہاں انھوں نے دعوے کیا ہے کہ ''نظریات اور معقولات کے اختلافی مسئلے کی بابت، جس کے سمجھنے میں غور و فکر کرنے والوں کو دشواری پیش آئی ہے ، قرآن میں اشارات و ہدایات موجود ہیں'' ؛ نیز یہ کہ قرآن میں سب علوم کے کلّیات کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد اپنی کتاب جواہر القرآن [طبع مصر، مطبع علمی، کردستان ۱۳۲۹ھ] میں اس کا بیان تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں ؛ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب انھوں نے احیاء علوم الدین کے بعد تألیف کی [الغزالی : جواہر القرآن، ص ۲۸، ۲۹] ۔ اس کتاب کی چوتھی فصل میں تو انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ قرآن سے جملہ علومِ دینیہ، اس تقسیم اور تفصیل کے مطابق جو انھوں نے کی ہے، کس طرح نکلتے ہیں ۔ اس کے بعد پانچویں فصل میں بیان کیا ہے کہ اس کے علاوہ باقی تمام علومِ علی الاطلاق بھی قرآنِ مجید ہی سے مستنبط ہیں ۔ جب وہ ان علومِ دینیہ اور ان علوم لُغویہ کا ، جن کی علوم دینیہ کے سیکھنے کے لیے ضرورت پڑتی ہے، ذکر کر چکتے ہیں اور اس کے بعد علمِ طب، نجوم، ہیئتِ عالم، ہیئتِ بدنِ حیوانی ، تشریح الاعضاء، علمِ سحر و طلسمات وغیرہ بھی گنوا چکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان کے سوا اور بھی علوم ہیں جن کے عنوان معلوم ہیں اور دنیا ان کے جاننے والوں سے خالی نہیں ہے اور ایسے اصنافِ علوم بھی ہیں جو ابھی تک حیّزِ امکان میں ہیں اور بالقوّہ موجود ہیں مگر ابھی بالفعل ان کا وجود نہیں ہوا ، اگرچہ ان تک پہنچنا آدمی کے بس میں ہے اور ایسے بھی علوم ہیں جو پہلے موجود تھے اور اب ان کا نام و نشان مٹ چکا ہے اور ان ادوار میں روے زمین پر اُن کا جاننے والا کوئی نہیں ہے اور ایسے علوم بھی ہیں جن کا ادراك اور احاطہ سرے سے بشر کی طاقت ہی میں نہیں ، ہاں مقرّب فرشتوں میں سے بعض ان سے بہرہ اندوز ہیں . . . ۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ ان تمام علوم کے، جو ہم نے شمار کیے یا ہمارے شمار سے رہ گئے، اصول و مبادی قرآن سے باہر نہیں ہیں، کیونکہ وہ سب خدا کی معرفت کے سمندروں میں سے ایک سمندر سے مستفیض ہیں، جس کا نام 'بحر الأفعال' ہے اور ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ ایک ایسا سمندر ہے

جو ناپیدا کنار ہے اور اگر دنیا کے تمام سمندر "اس کے کلمات کے لکھنے کے لیے سیاھی بن جائیں تو ان کلمات کے ختم ہونے سے پہلے خود ھی ختم ہو جائیں گے"؛ اس کے بعد الغزالی افعال اللہ کو بیان کرنا شروع کرتے ھیں اور ان کے سمجھنے کے لیے جن مختلف علوم کی ضرورت پڑتی ہے انھیں گنواتے ھیں، مثلاً فعلِ شفاء اور فعلِ مرض سوا علمِ طب کے کسی اَور علم سے سمجھ میں نہیں آتے اور اس کا فعل شمس و قمر اور ان کے منازل کے اندازے مقرر کرنے میں، جو ایک حساب سے مقرر ھیں، بغیر علمِ ھیئت کے معلوم نہیں ہو سکتا؛ اسی طرح گنواتے گنواتے آخر میں کہتے ھیں کہ افعال الٰھیه کی تفصیلات، جن پر آیاتِ قرآنیه دلالت کرتی ھیں، اگر بیان کرتا چلا جاؤں تو خبر نہیں بیان کتنا طول پکڑ جائے، پھر بھی صرف ان کے کلّیات ھی کی طرف اشارہ ممکن ہو سکے " (جواھر القرآن، ۳۱ تا ۳۴) - اس طرح مسلمانوں کی فلسفی اور علمی ثقافت کے آثار تفسیرِ قرآن میں ظاھر ہوے، اسی طرح ان میں آثارِ تصوّف بھی واضح طور پر ظاھر ہوے اور مختلف اصحاب نِحَل و اھواء [مثلاً فلاسفۂ دھریه، صابئه، حکماے یونان و ھند وغیرہ] کی راؤں کے آثار بھی کھلے طور پر اس میں نظر آنے لگے ... تفسیرِ علمی کا یه میلان برابر جاری رھا اور جیسا کہ ظاھر ہوتا ہے یه اعجازِ قرآن کے ثابت کرنے کا ایک اَور طریقه بن گیا یا یوں کہیے کہ اسلام میں یه بیان کرنے کی صورت پیدا ہو گئی کہ اسلام زندہ رھنے کی صلاحیت رکھتا ہے - تفسیرِ علمی کا ظھور پہلے تو کتبِ تفسیر ھی کے ضمن میں ہوا، جیسے کہ الفخر الرازی کا التفسیر الکبیر میں اس طریقے کو اختیار کرنا ظاھر کرتا ہے، اس کے بعد تمام علوم کو قرآن سے استنباط کرنے کی بابت مستقل کتابیں تصنیف کی جانے لگیں اور ان آیات کو ڈھونڈ کر نکالا گیا جو مختلف علوم کے ساتھ خصوصیت رکھتی تھیں - عصرِ متأخّر میں یه خیال عام طور پر رائج ہو گیا، یہاں تک کہ اس قسم کی کتابیں شائع ہونے لگیں جیسے کتاب کشف الاسرار النورانیة القرآنیة فی ما یتعلق بالاجرام السماویة و الارضیة و الحیوانات و النباتات و الجواھر المعدنیة، جس کے مصنف محمد بن احمد الاسکندرانی الطبیب (تیرھویں صدی ھجری) ھیں؛ اسی مصنف کی دوسری کتاب بیان الاسرار الرّبانیة فی النبات و المعادن و الخواص الحیوانیة ہے - پہلی کتاب ۱۲۹۷ھ میں قاھرة میں طبع ہوئی اور دوسری ۱۳۰۰ھ میں شام میں چھپی- اسی قسم کا ایک رساله عبداللہ فکری پاشا سابق وزیر المعارف المصریة نے لکھا، جس میں علمِ ھیئت کے بعض مباحث کا ان صریح عبارات سے جو شرع میں وارد ھیں مقابله کیا گیا ہے (فی مقارنة بعض مباحث الھیئة بالوارد فی النصُوص الشرعیة) [براکلمان: تکملة، ۲ : ۷۲۲] (قاھرة [۱۲۹۳ھ و] ۱۳۱۵ھ) - اصلاح اسلامی کی جماعت کے نامور لوگوں میں سے مرحوم سیّد عبدالرحمان الکواکبی اسی خیال کی طرف مائل ہوے اور انھوں نے قرآن میں سے جدید مکتشفات مستنبط کیے [طبائع الاستبداد، ص ۲۶ تا ۲۸) - وہ کہتے ھیں کہ: ان سب کی تصریحات یا ان کی طرف اشارات قرآن میں تیرہ سو سال سے موجود ھیں اور اب تک پردۂ خفا میں اس لیے مستور رھے کہ جب ان کے ظاھر ہونے کا وقت آئے تو وہ قرآن کا معجزہ بن کر اس بات کی شہادت دیں کہ بے شک قرآن ایسے ربّ کا کلام ہے جس کے سوا غیب کا علم کسی کو نہیں....؛ ایسے ھی ان نئی دریافتوں کا ذکر ادیب مصری مصطفٰی صادق الرافعی مرحوم اپنی کتاب [اعجاز القرآن، ص ۱۴۵

تا ۱۶۶] میں کرتے ہیں ۔ انھوں نے ''القرآن و العلوم'' کے عنوان سے ایک فصل قائم کی ہے اور اس میں وہی بحث کرتے ہیں جو پہلے گزر چکی ہے اور ثابت کرتے ہیں کہ قرآن میں اصول و کلیّات علوم موجود ہیں ۔ اس ضمن میں وہ بعید اور قریب سب کا ذکر کرتے ہیں؛ چنانچہ وہ سیوطی کا قول اتقان سے نقل کرتے ہیں، جو عالموں کے اپنے اپنے علوم کو قرآن سے لینے کے بارے میں ہے اور حوادثِ آیندہ کے اوقات کو قرآن سے معلوم کرنے کے متعلق تعلیقه لکھتے ہیں اور کہتے ہیں (اعجاز القرآن، ص ۱۵۱ ، حاشیه) : ''اگر کلماتِ قرآن کی عددی قیمت ('حساب الجُمّل') سے کام لیا جائے تو تمام زمانوں کے عجائب، ان کی تواریخ اور اسرار منکشف ہو سکتے ہیں؛ اگر ہماری کتاب کی غرض سے یه بات خارج نہ ہوتی تو ہم اس بارے میں بہت سی قدیم و جدید باتیں پیش کرتے'' : اسی طرح وہ نئی ایجادات اور علوم طبیعیه کی گہری باتوں کے قرآن سے مستنبط ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس کے شواهد لاتے ہیں، یہاں تک کہ آخر میں کہتے ہیں : ''اگر علومِ جدیده کا کوئی ماہر قرآن میں غور کرے اور جم کر فکر کرے اور سمجھ سے عاری نہ ہو اور کسی بات میں الجھ کر نہ رہ جائے تو اسے قرآن میں بہت سے ایسے اشارات ملیں گے جن سے حقائقِ علوم ظاہر ہوتے ہیں؛ گو قرآن جمله مسائل کو بشرح و بسط پیش نہیں کرتا، وہ ان حقائق کی طرف رہنمائی کرتا ہے گو ان کے نام مقرر نہیں کرتا'' (کتاب مذکور، ص ۱۶۴) : شاید وہ مصنّف جنھوں نے اپنی تفسیر میں سب سے زیادہ اس مسئلے پر لمبی چوڑی بحث کی ہے اور اس کی بابت بہت سا موادّ جمع کر دیا ہے شیخ طنطاوی جوہری مرحوم ہیں ۔ اسی سے قریبی تعلق رکھنے والی وہ مؤلّفات ہیں جن کے مؤلّفین نے اس طرف خاص توجّه کی ہے اور ان کا مقصد ہی قرآن اور علوم کی باہم تطبیق ہے، مثلاً استاذ محمد توفیق صدقی کے لکچر کائنات کے قوانینِ مقررہ اور اس کے مشابه موضوعوں پر اور اس سے ملتی جلتی دیگر مؤلّفات ۔

(ز) تفسیرِ علمی کا انکار :

اگر ایک طرف تفسیرِ علمی کی طرف رجحان قدیم سے چلا آتا ہے اور عصرِ متأخر میں اس کی طرف ایک طرح کی توجّه بہت زیادہ رہی ہے، گو شاید آج کل مہذّب لوگوں میں اس کا رواج مقابلةً نہایت کم ہے . . . تو دوسری طرف اس تفسیر کی صحّت کی مخالفت بھی قدیم سے چلی آتی ہے، چنانچه اس کا اظہار اندلس کے عالم ماہرِ اصول ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی (۷۹۰ھ؛ [براکلمان : تکمله، ۲ : ۳۷۴]) نے جہاں اپنی کتاب الموافقات [طبع السلفية ۱۳۴۱ھ، ۲ : ۶۹ ببعد] میں قرآنِ مجید کے متعلق ابحاث کے ضمن میں کیا ہے، وہاں وہ شروع اس طرح کرتے ہیں کہ یه بابرکت شریعت اُمّیّة ہے [یعنی علوم عقلی و تجربیی — فلسفه و سائنس— سے تعلق نہیں رکھتی]، کیونکه خود اہلِ شریعت (عرب) اُمّی تھے؛ چنانچه الشاطبی اس شریعت کی بنا مصلحتوں کو ٹھیراتے ہیں اور اس پر چند دلیلیں قائم کرتے ہیں، پھر اس کے بعد ایک فصل میں بیان کرتے ہیں کہ : عرب کو چند علوم کی طرف، جن کا لوگوں نے ذکر کیا ہے، توجه تھی اور ان میں سے جو عقلمند تھے وہ مکارمِ اخلاق کا بہت خیال رکھتے تھے اور اچھی خصلتیں اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے، شریعت نے آکر جو کچھ ان امور میں صحیح تھا اسے برقرار رکھا اور اس میں اضافه کیا اور جو غلط تھا اسے غلط قرار دیا، جو باتیں ان میں نفع بخش تھیں ان کے منافع بیان

کیے اور جو مضرت رساں تھیں ان کی مضرتیں بتا دیں۔ ان علوم میں سے الشاطبی نے ذیل کے علوم کا ذکر کیا ہے: علمِ نجوم، علم الانْواع، مینه برسنے کے اوقات، بادلوں کا پیدا ہونا، بادلوں کو ابھارنے والی ہواؤں کا چلنا ۔ انھیں علوم میں سے علمِ تأریخ اور گذشته اُمّتوں کے حالات بھی ہیں: انہیں میں طب اور فنونِ بلاغت ہیں۔ یه وہ علوم ہیں جو علوم صحیحه میں داخل ہیں۔ علومِ باطله میں اس مصنف نے ذیل کے علوم شمار کیے ہیں: علم عِیافه و زَجر [پرندوں سے شگون لینا]، کہانت [غیب کی باتیں بتانا] اور خطِّ رمل، کنکریاں مارنا اور شگون لینا، انھیں شریعت نے باطل قرار دیا .. الشاطبی ان سب کو بیان کرتے ہوے کہتے ہیں: صحیح علوم کو برقرار رکھنے اور باطل علوم کو باطل قرار دینے میں شریعت نے انھیں باتوں کو پیشِ نظر رکھا ہے جو عرب کو معلوم تھیں ان کی مألوف باتوں سے باہر قدم نہیں نکالا .. اس نظریے کے، جو علومِ قرآن کی بابت ان کی راے بتاتا ہے، پیش کرنے کے بعد وہ اسے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور اس پر خاص بحث شروع کرتے ہیں، اس میں وہ کہتے ہیں: "پہلے جو ثابت کیا گیا که شریعت کی بنا اُمّیّة پر ہے اور وہ انھیں لوگوں کی عادتوں اور طریقوں پر جنھیں وہ شریعت دی گئی (یعنی عرب کے دستور پر) جاری ہوئی، اس پر چند مسائل متفرّع ہوتے ہیں: ان میں سے ایک یه ہے که بعض لوگ قرآن کی طرف بعض باتوں کے منسوب کرنے میں حدّ سے تجاوز کر گئے ہیں، انھوں نے ہر اس چیز کا جسے علم کہه سکتے ہیں، خواہ متقدّمین کا ہو یا متأخّرین کا، جس میں علومِ طبیعیه، ریاضیه اور منطقیه اور علم الحروف سب کے سب اور ان جیسے جمله فنون جن میں سوچنے والوں نے عقل لڑائی ہے آ گئے، قرآن کو منبع ٹھیرایا ہے؛ ان کا یه خیال اگر گذشته ابحاث کی روشنی میں دیکھا جائے تو صحیح نہیں ٹھیرایا جا سکتا".

اس کے بعد الشاطبی علماے سلف پر ایک علمی نظر ڈالتے ہیں اور اس سے اپنے دعوے کا صحیح ہونا ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اس کے علاوہ یه بھی ہے که سلفِ صالح، یعنی صحابه، تابعین اور تبع تابعین، قرآن، علومِ قرآن اور اس کے اسرار سے ہم سے زیادہ واقف تھے، ہمیں کسی نے یه نہیں بتایا که اس دعوے کے متعلق کسی شے سے ان میں سے کسی نے بحث کی ہو [الشاطبی کے اس قول سے ہمیں وہ مقوله یاد آتا ہے جو الغزالی نے الاحیاء، ۱: ۲۶۱ میں [حضرت] علیؓ سے نقل کیا ہے: "جس نے قرآن کو سمجھ لیا وہ اس کے ذریعے ہر علم کی تشریح کر سکتا ہے" ۔ دل میں اس عبارت کی بناوٹ ہی سے بہت سی باتیں گزرنے لگتی ہیں!] اور کچھ کہا بھی ہے تو وہ اتنا ہی ہے جتنا ہم نے اوپر بیان کیا یا پھر فرائضِ انسان اور احکامِ آخرت اور ان سے قریب کی چیزوں کے متعلق ذکر کیا ہے ۔ اگر انھوں نے قرآن سے مسئلۂ استنباطِ علوم کی بابت کچھ غور و فکر کیا ہوتا تو ہمیں اس مسئلے کی اصل ضرور ہاتھ لگ جاتی، لیکن ایسا نہیں ہوا، پھر اس سے یہی نتیجه نکالا جا سکتا ہے که یه مسئله ان کے ہاں سرے سے موجود ہی نہیں تھا ۔ یه اس بات کی دلیل ہے که قرآن میں کسی ایسی بات کے ثبوت کا قصد نہیں کیا گیا جسے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں ۔ ہاں اس کے اندر ان علوم کی بابت جو علوم عرب کے زمرے میں آتے ہیں یا ان کے متعارف رسوم و عادات پر مبنی ہیں ایسی باتیں

ہیں جن سے اہلِ خرد کو حیرت ہوتی ہے اور جن تک بڑی بڑی وقیع عقلوں کی رسائی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ قرآن کے بتائے ہوے نشانہاے راہ کے ذریعے راستہ نہ ڈھونڈیں اور اس کی روشنی سے متمتع نہ ہوں ، لیکن یہ بات کہ قرآن میں وہ علوم بھی ہیں جنھیں معارفِ عرب سے کوئی تعلق نہیں ثابت نہیں ہوئی .

الشاطبی اپنے دعوے کے دلائل بیان کرنے کے بعد قائلینِ تفسیرِ علمی کے دلائل پر اعتراض کرتے ہیں۔ پہلے تو ان کے دلائل کا خلاصہ بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ : یہ لوگ اپنے دعوے پر ذیل کے طریقوں سے استدلال کرتے ہیں : (۱) اللہ تعالٰی فرماتا ہے : ''وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ'' (۱۶ [النحل] : ۸۹) (ہم نے تیرے اوپر کتاب نازل کی جس میں ہر شی کھول کر بیان کی گئی ہے)، پھر وہ فرماتا ہے : ''مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ'' (۶ [الانعام] : ۳۸) (ہم نے اس کے اندر کسی چیز کے بیان میں کمی نہیں کی) اور اسی قسم کی دیگر آیتیں ؛ (۲) وہ سورتوں کی ابتداء (یعنی حروف مقطّعات) سے دلیل لاتے ہیں کہ وہ اس طریق سے شروع کی گئی ہیں کہ اس سے عرب ناواقف تھے اور جو کچھ لوگوں سے اس باب میں نقل ہوا ہے وہ بھی پیش کرتے ہیں ؛ (۳) وہ باتیں جو اس بارے میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہیں ان سے بھی استدلال کرتے ہیں .

اس کے بعد ان دلیلوں کو ایک ایک کر کے رد کرتے ہیں۔ دلیلِ اوّل کے متعلق کہتے ہیں : ان آیات قرآنیہ میں مفسّرین کے نزدیک وہ چیزیں مراد ہیں جو فرائض انسانی یا عبادات سے تعلق رکھتی ہیں ؛ یا ''مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ'' میں کتاب سے مراد ''اللوح المحفوظ'' ہے ۔ مفسرین نے ان آیات کے ضمن میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے تمام علوم نقلیہ و عقلیہ کا قرآن [مجید] میں موجود ہونا مراد لیا جائے ....۔ دوسری بات کے رد میں کہا ہے حروف مقطّعات جو سورتوں کے شروع میں آتے ہیں ان کی بابت لوگوں نے ضرور ایسی گفتگو کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کو ان سے ایک گونہ شناسائی تھی، جیسے حروف کی عددی قیمت (حساب الجُمّل)، جس کی بابت بقول اصحاب سِیَر انھوں نے اہلِ کتاب سے سن رکھا تھا، یا یہ منجملہ ان متشابہات کے ہیں جن کی تأویل سوا اللہ تعالٰی کے کوئی نہیں جانتا و غیر ذٰلک ۔ بہر حال ان کی تفسیر اس طریقے سے نہیں کی جا سکتی جس کی عربوں کو خبر نہ تھی اور نہ اس کا ادّعا متقدّمین میں سے کسی نے کیا ہے۔ غرض اس میں بھی ان کے دعوے کی کوئی دلیل نہیں ہے؛ (۳) تیسری دلیل کے ردّ میں انھوں نے پہلے [حضرت] علی [رض] وغیرہ کے اقوال منقولہ میں سے بعض قول نقل کیے ہیں ، پھر وہ کہتے ہیں : [حضرت] علی یا کسی اور سے جو کچھ اس بارے میں نقل ہوا ہے اس میں سے کچھ بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ اس لیے یہ جائز نہیں کہ قرآن کی طرف ایسی چیزیں منسوب کی جائیں جن کا وہ اِقتضاء نہیں کرتا؛ بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ ایسی چیزوں کا انکار کرنا جائز نہیں جن کا وہ اقتضاء کرتا ہے اور یہ ضروری ہے کہ مطالبِ قرآنی کے سمجھنے کے لیے انھیں چیزوں کی استعانت پر رک جائیں جن کا علم خاص طور پر عرب میں موجود ہونا ثابت ہے ، کیونکہ احکامِ شرعیّہ کا علم حاصل کرنے کا ایک یہی ذریعہ ہے ۔ جو شخص اس علم کو اس کے ذریعۂ فہم کے سوا کسی اور طرح طلب کرے گا وہ اسے سمجھنے سے بے بہرہ رہے گا اور وہ اللہ اور رسول کی طرف ایسی باتیں منسوب

کرنے کا ذمےدار ٹھیرے گا جو دراصل اس کے اپنے قول ہیں... یہ ان تمام بیانات کا خلاصہ ہے جو الشاطبی نے الموافقات میں اپنا قاعدۂ کلیّہ بیان کرنے کے بعد متعدّد مقامات پر دیے ہیں اور ان صفحات میں بھی ملیں گے جن کی طرف ہم نے اوپر حوالے دے دیے ہیں۔

قرآن کو اس طرح سمجھنے کے متعلق جس سے وہ علومِ مختلفہ کا مأخذ اور مصدر بن جائے اور اس کے کلمات کو ان اصطلاحات کی روشنی میں دیکھنے کے متعلق جو اس کے نزول کے مدتوں بعد ایجاد ہوئیں، قدیم زمانے کی رائے اوپر بیان ہوئی، اس میں جدید نظر و فکر کی رو سے بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے، جس سے قدیم رائے کی تائید اور تقویت ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے:۔

(۱) لُغوی پہلو۔ حیاتِ الفاظ اور ان کے معانی کے تدریجی تغیّر و تبدّل پر غور کرنا؛ اگر ہمارے پاس وہ سامان موجود ہو جو معانی الفاظ کے تدریجی تغیّر و تبدّل کی حد مقرر کرنے اور ایک ایک کلمے کے مختلف معانی کے ظہور کی تاریخ اور اس معنے کا عہدِ استعمال جاننے کے لیے لازمی ہے تو ہمیں اس میں ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں الفاظِ قرآن کے فہم کے میدان کو اتنی عجیب و غریب وسعت دینے سے مانع ہوں گی اور اس بات کو جائز نہ قرار دیں گی کہ الفاظ قرآنی کے معانی اور اطلاقات ایسے مقرر کیے جائیں جو پہلے ان کے لیے مقرر نہ تھے اور نہ ان میں وہ الفاظ کبھی استعمال کیے گئے اور اگر کسی قدر کیے بھی گئے تو اس اصطلاح کی بنا پر جو ملّت کے اندر نزولِ قرآن کے صدیوں بعد نمودار ہوئی؛ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ جہاں ہم آج کل کی تفسیر اور اس کی طرز سے بحث کریں گے، اس سے یہ بات کافی واضح ہو جائے گی۔

(۲) ادبی یا بلاغی پہلو۔ بلاغت کے مشہور معنی یہ ہیں: ''کلام کا موقع اور محل کے مناسب ہونا'' (''مُطابَقَۃُ الْکَلامِ لِمُقتَضٰی الحال)، اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن [مجید] اس علمی تفسیر کے لحاظ سے جو بعد میں کی گئی ایسا کلام ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے سامنے جو اس کے مخاطَب ہیں پیش کیا جائے اور اس سے یہ تمام بیان کردہ معانی مراد ہوں جو ایسے [دقیق علمی] معانی ہیں جس سے دنیا زمانہ‌ہائے دراز کے بعد واقف ہوئی اور وہ بھی ایک لمبی چوڑی جد و جہد کے بعد، جس سے ان کے علم و عقل کا ارتقاء ہوا!!! بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ یہی معنی جس کا اب دعوٰے کیا جا رہا ہے اُس وقت بھی قرآن سے مراد تھے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس وقت کے عربیت والوں نے انھیں سمجھا یا نہیں اور یہ معنی ان کے دل میں بیٹھے یا نہیں! اگر ان معانی کا انھوں نے ادراک کر لیا تھا تو اس کی کیا وجہ کہ مختلف علومِ حیات کی پیش قدمی ظہورِ قرآن کے ساتھ فوراً شروع نہیں ہوئی اور ان آیات کی بنا پر جو مختلف علومِ حیات کے نظریوں کی شرح کرتی ہیں اور ان کے دقائق کو سمجھاتی ہیں یہ پیش قدمی یکایک کیوں نہ قائم ہو گئی!! اور اگر وہ ان معانی کو نہیں سمجھے تھے اور نہ خالص لغت دانوں نے ان آیات کی عبارات سے یہ معانی سمجھے، جیسا کہ حقیقت ہے، تو پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ قرآن سے یہی معنی مراد تھے اور اُن عبارات کو جو یہ دقیق معانی اُس وقت کے لوگوں کو سمجھانا چاہتی تھیں کیسے مقتضاے حال کے مطابق کہا جا سکتا ہے!

(۳) ایک دینی یا اعتقادی پہلو بھی ہے۔ یہ وہ ہے جو ایک دینی کتاب کی اصل غرض اور مقصدِ مبہم کو واضح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کیا یہ کتاب لوگوں کی عقلوں اور ذہنی قوّتوں کے سامنے ہستی کے مشکل مسائل کا حلّ اور موجودات کے حقائق علمیّہ پیش کرتی ہے؟ اس قسم کے حلّ اور حقائق لوگوں کی دنیاوی زندگی کا ساتھ کیونکر دیتے ہیں اور آیا وہ ان کی زندگی کی ایسی مضبوط اصل بن سکتے ہیں جس پر رسالات آسمانی ختم ہوں، جس طرح قرآن ان رسالات کا خاتمہ ہے؟ اس کے ساتھ ہی دین کے یہ پیرو ان حقیقتوں کی معرفت کے بارے میں کسی ایک مقرر حد پر ٹھیر تو نہیں جاتے اور ان حقائق کے کسی منتہٰی پر پہنچ کر رکتے تو نہیں ہیں؟ تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ طبّ، ہیئت، ہندسہ اور کیمیا کے کلیّات قرآن سے اخذ کیے جائیں، جیسا کہ بعض مفکّرین کی مذکورۂ بالا شقیں آپ نے سنیں: حالانکہ یہ کلیّات ایسے ہیں کہ آج انہیں ایک شخص ضبط کرتا ہے اور کل یا پرسوں اس ضبط کو بدلنا پڑ جاتا ہے۔ جو کچھ پچھلوں نے ضبط کیا تھا وہ پچھلے ہی زمانوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور آگے چل کر تو اس میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا!

صاف اور سچی بات تو یہ ہے کہ دینی کتاب پر انسان کی زندگی کے اس پہلو کا بار نہیں پڑتا اور نہ وہ اس کا بیان کرنا اپنے ذمے لیتی ہے، نہ اس کے اہتمام کی زحمت سے انہیں بچا سکتی ہے کہ لگیں اس میں اسے طلب کرنے اور گھڑے گھڑائے علمی اصول کا اسے منبع تصور کرنے۔

بعض نیک نیّت لوگوں نے دینی کتاب اور مختلف حقائق علمیّہ میں ربط دکھانے سے جو یہ مقصد رکھا ہے کہ اس سے اس کتاب کی سچائی، اعجاز یا قابلیتِ بقا وغیرہ ثابت کریں تو واضح رہے کہ ایسا کرنے سے اس کتاب کو نفع سے زیادہ شاید ضرر پہنچتا ہے۔ اگر یہ نیک نیت لوگ اور وہ جو ان کے مسلک پر چلتے ہیں اس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہی سمجھتے ہیں، تاکہ دین اور علم کا باہمی تعارض دور کریں، تو شاید اس کے لیے یہی کافی ہے اور اسی سے پورا مطلب حاصل ہو جاتا ہے کہ کتاب دین میں کوئی ایسی نصّ صریح نہ ہو جو کسی ایسی علمی حقیقت سے ٹکرائے جسے بحث و تفتیش نے ثابت کر دیا ہو کہ وہ قوانین قدرت اور نوامیسِ وجودِ عالم میں سے ہے۔ کتابِ دین کے لیے اتنی ہی بات اس کی بقا کی صلاحیّت، علم کے ساتھ ہم آہنگی اور نقد سے مأمونیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے.

لیکن جہاں میں ان نیک نیّت لوگوں کی دلجوئی کے لیے اس قدر کوشش جائز قرار دیتا ہوں وہاں انہیں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ حقائق کونیّہ اور مظاہرِ وجود کا کتابِ دینی میں باعتبار فن جو ذکر آتا ہے اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے وجدانات کی ریاضت اور مشق ہو اور وہ ذکر اس نوعیت کا ہوتا ہے جس سے عوام و خواص سب کی توجّہ ان کی طرف منعطف ہو جائے اور پورے عالِم، آدھے عالِم، بلکہ جہلاء تک ان پر غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ دین کا مقصد اہمّ یہی ہے اور سب کے سامنے کتابِ دین کی تلاوت کی غرض بھی یہی ہونی چاہیے۔ اس قسم کے ذکر کا تقاضا صرف یہ ہے کہ وہ نمایاں اور واضح مشاھد (مظاھر) اس حیثیت سے سامنے لائے جائیں جس سے دل پر ان کا رعب غالب ہو، حواس پر چوٹ پڑے اور لوگ متأثّر ہوں؛ نہ یہ کہ ان کے دقیق مسائل کو چھیڑا جائے

اور ان کے ضبط شدہ قوانین بیان کیے جائیں، جو الجبرے کی مساوات یا حساب کے ہندسوں کی شکل میں ہوں یا ان کی حقیقتوں اور خاصیتوں کا خشک بیان ہو ...... ۔ جب مظاہر کو، دیکھتے ہی سمجھ میں آ جانے والی باتوں کو، دل پر اثر کرنے والے انفعال انگیز مناظر کو پیش کیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ حقائق علمی کی پوری حمایت کی جائے اور کائنات عالم اور مناظر کا پورا ذکر ان کے مجرّب خواص کے اعتبار سے کیا جائے، جب کہ ان کے ذکر کا مقصد صرف یہ ہو کہ انسان کے دل میں ان کے جلال و جمال کا شعور بیدار کیا جائے اور ان کے ذریعے اس قوۃ کی عظمت دل میں بٹھائی جائے جس کے ہاتھ میں ان سب کی تدبیر ہے اور جو اس نظامِ بدیع کو قائم رکھے ہوے ہے ۔ اگر ان میں سے کسی شے کے ذکر کے ضمن میں اس [illegible] التزام بھی کر لیا جائے کہ علمی مسائل اور نتائج کو صحیح ثابت کرنا ہے تو یہ التزام فنّی حیثیت سے بہت سے دینی اور وجدانی اغراض کے حصول میں مخل ہوگا، جنھیں دین سب سے پہلے حاصل کرنا چاہتا ہے اور دینی تأمّل کے ذریعے اور عواطفِ نفسی کو اطمینان بخش فکر کے طریقے سے ان کی طرف متوجہ کر کے ان سے زندگی کو نفع پہنچانا چاہتا ہے.

یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی عبارت قرآنی میں کوئی بات علمی تحقیق کے بظاہر منافی نظر آتی ہے، اگرچہ دونوں میں تطبیق کی جا سکتی ہے ۔ [illegible]را اپنا خیال ہے کہ اس سے قرآن کا کچھ بھی نہیں بگڑتا اور نہ اس سے اسے کوئی ضرر پہنچتا ہے... اس لیے ان لوگوں کے لیے جو تفسیرِ علمی کا مذکورۂ بالا طریقہ اختیار کر کے کتاب دینی کی سچائی یا اعجاز یا صلاحیتِ بقا ثابت کرنا چاہتے ہیں بہتر راستہ یہی ہے کہ وہ کتاب دینی کو مذکورۂ بالا نقطۂ نظر سے دیکھیں اور کتاب کو سائنس کے ساتھ ربط دینے کی خواہ مخواہ تکلیف نہ اٹھائیں۔ اگر کرنا ہی ہے تو، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اسی پر اکتفا کریں کہ قرآن کی کوئی نصِ صریح سائنس کی تحقیق کے معارض نہ ہو، اس کے بغیر کہ ہر صورت میں قرآن اور سائنس میں مطابقت کا امکان ہو ...... ۔ اس اصل کو اس سے زیادہ مفصّل بیان کرنے کا یہ محل نہیں.

نظرِ جدید کے چند پہلو اور بھی ہیں جن سے فہمِ عبارتِ قرآن کی بابت قدیم رائے کی، جو الشاطبی نے بیان کی ہے، تائید ہوتی ہے اور ان کی بنا پر بھی بہتر یہی ہے کہ اس قسم کی تفسیرِ علمی کی کوشش نہ کی جائے، اس لیے کہ اس کا [illegible] کچھ نہیں اور خود قرآن اس قسم کے تکلّفات کی بدولت عزت حاصل کرنے سے بے نیاز ہے جس سے اس کی غرض اصلی کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے؛ یعنی انسانی اجتماعی زندگی کی درستی کے ذریعے اصلاحِ حیاۃ اور سب لوگوں کے نفوس کی اصلاح، خواہ علوم طبیعیۃ ریاضیۃ یا ان سے ملتے جلتے دیگر علوم میں ان کے مدارج ترقّی کتنے ہی مختلف ہوں.

(ح) الوانِ تفسیر:

اس پیش کردہ عنوان کے ذیل میں ہم ایک ظاہر اور واضح اثر رکھنے والی بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی نصّ (اصل عبارت) کی تشریح کرتا ہے، خاص کر ادبی عبارت کی، تو وہ اس عبارت پر اپنی تفسیر اور طرزِ فہم کا رنگ چڑھا دیتا ہے؛ کیونکہ جب کوئی کسی عبارت کو سمجھنا چاہتا ہے تو پہلے اپنی شخصیت کے ساتھ اس عبارت کی سطحِ فکری کی

تحدید کر دیتا ہے اور یہ تحدید وہ چیز ہے جو افقِ عقلی کو معیّن کر دیتی ہے جس سے آگے اس عبارت کے معنی اور مقصد نہیں جا سکتے، کیونکہ اس شخص کے بس کی بات نہیں کہ اپنی شخصیت کی اس حد سے باہر نکل سکے اور نہ یہ کبھی اس کے لیے ممکن ہو سکتا ہے؛ چنانچہ وہ اس عبارت سے اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتا جہاں تک اس کے فکر کی پرواز ہے اور جہاں تک اس کی عقل پہنچ سکتی ہے اور اسی کی مقدار کے مطابق وہ نصّ میں حکم لگائے گا اور اپنے بیان کی تحدید کرے گا۔ در اصل وہ عبارت کو اپنے اس محدود حلقۂ فکر کی طرف کھینچتا ہے اور اسے باندھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ کبھی اسے شمال کی طرف لے جاتا ہے، کبھی جنوب کی طرف اور کبھی اوپر کی جانب اٹھاتا ہے، کبھی نیچے کی طرف دھکیلتا ہے اور ہر حال میں اپنی شخصیّت اس کے اوپر منڈھتا رہتا ہے؛ وہ اس سے فقط اتنا ہی مطلب نکال سکے گا جتنی اس کے فکر کی طاقت اور عقل کی استطاعت ہے ۔ یہ بات اس وقت اَور بھی زیادہ نمایاں ہوگی جب لغت سے بھی اسے اس کی اجازت مل رہی ہو اور زبان کے اندر طُرقِ بیان کی بہتات ہو اور مجاز و تأویل کا دروازہ کھلا ہوا ہو ۔ اس وقت اس کی تفسیر کی کوشش بمقدارِ قابلیت ان سب سے فائدہ اٹھائے گی ۔ لغت عربیہ میں ان سب کے امکانات بہت ہی زیادہ ہیں .

اس اصل کے مطابق تفسیر کا قصد کرنے والوں کی شخصیت کے آثار ان کی تفسیر پر نقش ہوتے ہیں، خواہ وہ کسی زمانے سے تعلّق رکھتے ہوں اور ان کی تفسیر کا طرز و طریقہ کچھ ہی ہو ۔ ان کی شخصیتیں نقلی روایتی اور عقلی اجتہادی تفسیر دونوں پر اپنا رنگ چڑھا کر رہتی ہیں ۔ شاید پہلی نگاہ میں تفسیرِ مَروی پر شخصیت کا اثر نمایاں طور پر نظر نہ آئے لیکن اس بات کے سوچنے سے یہ اثر فوراً دکھائی دینے لگے گا کہ تفسیرِ مروی کا ارادہ کرنے والا کسی آیت کے گرد وہی مرویات اکٹھی کرے گا جنھیں وہ سمجھتا ہے کہ وہ مرویات اس تفسیر سے لگاؤ اور تعلّق رکھتی ہیں اور ان مرویات کے وہی معنی سمجھے گا جو انھیں دیکھتے ہی اس کے ذہن میں آئیں گے اور سرسری نظر اس کے سامنے انھیں پیش کرے گی، پھر اطمینان سے وہ اس آیت اور ان جمع کی ہوئی مرویّات میں ربط و تعلّق ظاہر کرے گا اور اس اطمینان سے وہ ذاتی اور عقلی طور پر ان مرویات کے قبول کرنے، ان کی طرف توجہ کرنے یا اگر اس کے نزدیک قابل ردّ ہوئیں تو ان کے ردّ کرنے اور ان کی طرف توجہ نہ کرنے میں یکساں متأثّر ہوگا۔ اس طریق سے مفسّرین میں، جیسا کہ ابن خلدون نے اس عبارت میں جو ہم نے اوپر [ص ۵۰۹ میں] نقل کی کہا ہے، وہ باتیں رواج پا گئیں جن کا انھیں شوق پیدا ہو گیا تھا اور جن سے انھیں دلبستگی ہو چکی تھی، مثلاً بدء خلق اور ابتداے آفرینش کی روایات و اخبار اور انسان کی ابتدائی تأریخ میں بڑی بڑی مصیبتوں اور حادثوں کی تفصیلات ۔ ان روایات کو بسرعت قبول کرنے کی وجہ ان کی اُمیّت اور ان کے اندر ان کہانیوں کی قلّت تھی؛ چنانچہ تفسیر میں اسرائیلیات کی بھرمار ہو گئی !! ان سب روایات و اخبار میں اس پہلے دَور کی ذہنیت کا نقشہ جھلک رہا ہے .

اسی بنا پر ہم یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ ہر تفسیر پر، یہاں تک کہ تفسیرِ نقلی کے رائج اور متداول ہونے پر بھی، تفسیر لکھنے والے کی شخصیت ہی کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے اور مفسّر

کی شخصیت ھی تفسیر کی ایک صِنف کو رواج دینے کا باعث ھوتی ھے .

پھر جس وقت تفسیر روایات پر مبنی نہ رھے اور اجتہادی و عقلی ھو جائے تو یہ شخصی رنگ اس پر بہت ھی واضح اور جلی نظر آتا ھے ۔ ھم پہلے اشارہ کر چکے ھیں کہ تفسیر لکھنے والے کی ثقافت کا اثر تفسیر پر کیا ھوتا ھے؛ کیونکہ اس کی ثقافت اور اس کی معلومات کی نوعیت ھی تو وہ چیزیں ھیں جو اس کی توجّہ کا رخ اور میدان نشاط و کارکردگی کی حدود معیّن کریں گی۔ عبارت سے مطلب نکالنے میں وہ اَوروں کو چھوڑ کر انہیں معانی سے کام لے گا اور یہی ایک معنی پر دوسرے معنی کو ترجیح دینے کا باعث بنیں گی اور اس کی تفسیر ان ساری باتوں سے متأثر ھوگی پھر تفسیر کی مزاولت اور اس کے اعتناء سے خود ان معارف کی تأریخ متأثر ھوگی، جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ھے۔

صاف ظاھر ھے کہ رنگ کی اس آمیزش کے نقطۂ نظر سے تفسیر ان علوم و معارف سے اثر پذیر ھوے بغیر نہیں رہ سکتی جن سے اصل عبارت کی تفسیر کرنے والے کو سابقہ پڑتا ھے اور جن سے وہ نصّ کے معنی واضح کرنے میں مدد لیتا ھے ۔ دوسری طرف ان علوم کا تفسیر سے مل جانا خود ان علوم کے لیے ایک طرح کی ثروت کا باعث ھوتا ھے جس کا اثر ان علوم کی تأریخ پر پڑتا ھے ؛ چنانچہ ماھرِ نحو قرآن پر فنِّ اعراب کے مطابق نظر ڈالتا ھے اور اس کے معانی سمجھنے کے لیے انہیں کو حَکَم ٹھیراتا ھے اور اس کے مطالب کی حد بندی کے لیے انھیں کی طرف رجوع کرتا ھے اور اس طرح تفسیر کو اپنے خاص مطالعے کی چیز کے رنگ ڈھنگ پر ڈال دیتا ھے، پھر وہ نحوی تفسیر اور نحو میں رابطہ قائم کر کے خود نحو کی زندگی پر اس ربط و پیوند کے چند اثرات باقی چھوڑتا ھے جن سے اس فن کے مطالعے پر اثر پڑتا ھے اور اس فن کی حیات کی تأریخ جاننے کے لیے ان آثار کا تتبّع ضروری ھو جاتا ھے ۔ اس طرح تفسیر گونا گون الوان سے ملوّن ھوتی گئی اور مفسّرین کے تنوّعِ ثقافت سے ھر تفسیر پر ایک خاص رنگ چھا گیا؛ چنانچہ آپ نے سنا کہ مشہور متکلّم ابوالحسن الاشعری نے اپنی کتاب میں، جو لوگوں میں المختزن کے نام سے مشہور ھوئی، کوئی ایسی آیت جس سے کسی بدعتی نے استدلال کیا ھو نہیں چھوڑی جب تک کہ اس بدعتی کا تعلق اس آیت سے کاٹ نہ دیا اور پھر اسی آیت کو اھلِ حق کی حجۃ نہ قرار دے دیا وغیرہ وغیرہ، بلکہ لوگ خود الاشعری کا قول اپنی اس کتاب کے وصف کے بارے میں نقل کرتے ھیں : " اس میں مخالفوں کے بہت سے ایسے مسئلے ھیں جو کلام کی مختلف قسموں سے تعلق رکھتے ھیں مگر مخالفین نے نہ کبھی ان کی بابت مجھ سے پوچھا ، نہ ان کی کتابوں میں لکھے ملتے ھیں اور نہ انھیں ان کی بابت سوال کرنے کی کبھی سوجھی، میں نے سوال کا جواب اللّٰہ کی توفیق سے دے دیا ھے (ابن عساکر : تَبیین کذب المفتری، طبع دمشق ، ص ۱۳۳، یہاں فقط اس کے ضمائر کو بدل دیا گیا ھے) ؛ . . . اور یہ معلوم ھی ھے کہ فخر رازی نے اپنی تفسیر میں کس قدر اقوال حکماء، فلاسفہ اور ان لوگوں کے جو کلامیات میں انہیں کی روش پر چلتے ھیں جمع کر دیے ھیں ۔ یہاں تک کہ ان کی تفسیر کے بارے میں وہ کچھ کہا گیا جس کا بیان اوپر آ چکا ھے، اسے اور اسی قسم کی اَور چیزوں کو تفسیر پر کلامی رنگ چڑھانا کہتے ھیں، اس سے قرآن سے علم کلام کا طریق منعکس ھونے لگتا ھے اور اس کی تفسیر

کا رخ بھی ادھر ھی ھو جاتا ھے اور تفسیر کو ایک خاص مذھب کے میلان کی طرف لے جاتا ھے ۔ اس میلان کی شاید مشہور ترین مثال زمخشری کی کشّاف ھے، جس میں معتزلہ کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیر کی گئی ھے . . . اسی طرح بعض تفاسیر پر فقہ کا، بعض پر بلاغت کا اور بعض پر قصص و حکایات کا رنگ غالب ھے . . اسی طرح دیگر فنون کو لیجیے جن کی کتابیں انھیں کے ساتھ مخصوص شمار ھوتی ھیں ۔ ان باتوں کے بیان کی جگہ تفسیر کی تفصیلی تأریخ ھے اور وھیں یہ بھی بیان ھوگا کہ ان تلوینات میں سے کون سی تلوین مقبول و پسندیدہ ھے اور کون سی نفرت انگیز اور مکروہ، مثلاً تلوین باطنی اور اعتدال سے متجاوز اشارات کی تلوین وغیرہ وغیرہ، جو تفسیر مردود کے زمرے میں داخل ھیں۔ یہ سب باتیں قرآن مجید کو اس کی وضع سے خارج کر دینے والی، حکمتِ الٰہیہ کی متناقص اور اس کے اصلاحی مقاصد کے منافی ھیں، جن کا تقاضا ھے کہ قرآن کو حیاۃ دینی اور دنیوی دونوں سے وابستہ قرار دیا جائے۔ متقدّمین نے ان جیسے نفرت‌انگیز قبیح الوان کا حال بیان کیا ھے اور انھیں رد کیا ھے.

ان مکروہ و قبیح تلوینات کے سوا اور تلوینات اس ردّ و انکار سے کبھی کبھی بچ بھی سکتی ھیں، لیکن تحقیق کی نظر سے یہ دیکھنا ھوگا کہ تلوین سے اس فائدے کی جو قرآن سے متوقّع ھے تائید و تقویت ھوتی ھے یا نہیں، اگر ھوتی ھے تو تلوین قابل ملامت نہیں ورنہ قابلِ ملامت ھے .

اس بارے میں ھمارے استاد امام [مفتی محمد عبدہ] رحمہ اللہ (تفسیر الفاتحۃ، طبع المنار ۱۳۲۰ھ، ص ۹، ۱۰) فرماتے ھیں ‘‘ . . . . ان مقاصد میں سے کسی خاص مقصد کے پیچھے پڑ جانا بہت سے لوگوں کو کتابِ الٰہی کے مقصود سے دور پھینک دیتا ھے ۔ وہ ایسے ایسے راستوں پر جا پڑتے ھیں جو انھیں قرآن کے اصل معنی بالکل بھلا دیتے ھیں ’’۔ دوسری جگہ اسی موضوع کے بارے میں فرماتے ھیں (کتاب مذکور، ص ۱۸) ‘‘ تفسیر کی دو قسمیں ھیں : ایک خشک تفسیر، جو آدمی کو اللہ اور اس کی کتاب سے دور پھینک دیتی ھے اور ان سے اس کا کوئی تعلّق نہیں رھتا ۔ یہ وہ تفسیر ھے جس کا مقصد الفاظ کی تشریح اور جملوں کی نحوی ترکیب کا بیان ھو اور یہ کہ اس کی عبارات اور اشارات سے فنّی نکتے کیا کیا حاصل ھوتے ھیں۔ یہ طرزِ تفسیر اس قابل نہیں کہ اسے تفسیر کہا جائے ۔ اس کا تو نحو اور معانی جیسے فنون کی مشق اور تمرین نام رکھنا چاھیے’’ ۔ تفسیر پر خاص فقھی رنگ چڑھانے کی بابت فرماتے ھیں (کتاب مذکور، ص ۱۰) : ‘‘ احکام عملیّہ، جن کا نام اصطلاح میں فقہ پڑ گیا ھے، قرآن میں سب سے کم آئے ھیں؛ اس میں تو بکثرت ان باتوں کا بیان ھے جن سے انسان کی اصلاح و تہذیب ھوتی ھے اور ارواح کو ان باتوں کی طرف دعوت ھے جن کے ساتھ ان کی سعادت وابستہ ھے ’’ ۔ لیکن استاذ رحمہ اللہ جہاں ان قسموں سے نفرت کا اظہار کرتے ھیں وھاں ایک قسم کی تلوین سے مطمئن بھی ھیں اور اس اطمینان کا اظہار کئی مقام پر کیا ھے؛ چنانچہ فرماتے ھیں (کتاب مذکور، ص ۸) : ‘‘ ھم جس قسم کی تفسیر چاھتے ھیں وہ ایسی تفسیر ھے جس کا مقصد قرآن کو اس حیثیت سے سمجھنا ھے کہ وہ ایک دین ھے، جو لوگوں کو ان باتوں کی طرف راہ دکھاتا ھے جن میں ان کی سعادت ھے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی،

کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے ۔ ان مباحث کے سوا باقی باتیں اسی مقصد کے تابع ہیں یا اس کے حصول کا ذریعہ ہیں'' ۔ اسی کی بابت دوسری جگہ فرماتے ہیں (کتاب مذکور، ص ۱۹) : '' وہ تفسیر جس کی بابت ہم نے کہا کہ وہ تمام لوگوں پر فرض ہے، گو فرض کفایہ کے طور پر ہی سہی، ایسی تفسیر ہے جس میں مفسّر کہنے والے کے کلام کی مراد سمجھنے کی طرف رجوع کرے اور عقائد، اخلاق اور احکام کی حکمتِ تشریع اس طور پر بیان کرے جو ارواح کو کھینچ کر اس عمل کی طرف اور اس ہدایت کی طرف لے جائے جو کلام کے اندر پنہاں ہے اور اس کتاب کو جیسے '' ھدًی و رحمۃ '' اور ایسے ہی دیگر اوصاف سے متّصف قرار دیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ثابت ہو جائیں اور ان تمام علوم و فنون کے پیچھے جو مقصد حقیقی ہے، یعنی '' اھتداء بالقرآن (قرآن سے زندگی کا صحیح راستہ سیکھنا)، وہ واضح ہو جائے'' ۔ یہ وہ رنگِ تفسیر ہے جسے استاذ امام مستحسن قرار دیتے ہیں ۔ اس سے ہم آگے چل کر پھر بحث کریں گے، کیونکہ اس سے پہلے ہمیں تفسیر کے ڈھنگ اور طریقے کی بابت کچھ تھوڑا سا کہنا ہے ۔

(ط) تفسیر کا طریقہ :

زمانۂ اسلام کی ابتداء ہی سے مفسروں میں تفسیر کا یہ ڈھنگ پڑ گیا تھا کہ مفسر ایک ایک سورۃ کو علی الترتیب لیتا تھا اور آیت کے ایک ٹکڑے یا ساری آیۃ یا چند آیات کے مجموعے پر ٹھہر کر اس کا مطلب بیان کرتا تھا اور اس پر اپنا پسندیدہ رنگ چڑھا دیتا تھا اور اپنی شخصیت تفسیر میں نمایاں کر دیتا تھا [عکرمۃ (م ۱۰۵ھ) مولٰی ابن عباس کہتے ہیں : '' جو ان دونوں مقوّوں کے درمیان ہے میں سب کی تفسیر کر چکا ہوں'' (اتقان، ۲ : ۲۲۵) ۔ اسی طرح ابن جریج (م ۱۵۰ھ) کی تفسیر تین بڑی بڑی جلدوں میں تھی (اتقان، ۲ : ۲۲۴) ۔ عکرمۃ کے قول اور ابن جریج کی ضخیم تفسیر کے ساتھ جب ہم اس کا بھی خیال کر لیں کہ حیاۃ اسلامی کے ساتھ قرآن کا کس قدر شدید اتّصال تھا اور مسلمان اس کتاب مقدس سے احکام وغیرہ دریافت کرنے کی طرف کتنی گہری توجہ رکھتے تھے اور ان کی ضروریات اس بات پر انہیں کس قدر مجبور کر رہی تھیں اور اسی قسم کی اور باتوں پر بھی غور کر لیں تو یہ سب کی سب ہمیں صاف بتا دیں گی کہ لوگوں کا قرآن کی تفسیر کے پیچھے پڑ جانا اور ہر سورۃ اور ہر آیۃ کی پوری پوری تفسیر کر کے رکھ دینا بہت ابتدائی زمانے ہی میں رائج ہو چکا تھا ۔ میں اس رائے کی طرف مائل نہیں ہوں کہ اس طرح کی ترتیب‌وار تفسیر کا زمانہ بہت بعد میں شروع ہوا اور قرن ثانی کے اواخر یا قرن ثالث کے اوائل میں لوگوں نے ایسی تفسیریں لکھنا شروع کیں ۔ مصنف ضُحَی الاسلام (۲ : ۱۴۱) کا میلان اس طرف ہے کہ الفرّاء (م ۲۰۷ھ) کو پہلا شخص شمار کرنا چاہیے جس نے حسبِ ترتیبِ مصحف ایک ایک آیۃ کی یکے بعد دیگرے مسلسل تفسیر کی ۔ یہ بات اس نے فہرست ابن الندیم کی ایک صریح عبارت سے اخذ کی ہے ۔ الفرّاء کی کتاب معانی القرآن ہمارے پاس موجود ہے؛ اس میں آیات کو اسی ترتیب سے لیا گیا ہے جس سے وہ سورۃ کے اندر رکھی گئی ہیں ۔ اس بات میں یہ ابوعبیدۃ (م ۲۰۹ھ یا حدود ۲۰۹ھ) کی کتاب مجاز القرآن سے ملتی جلتی ہے، کیونکہ اس میں بھی سورتیں ترتیب‌وار لی گئی ہیں، پھر ہر سورۃ میں سے جن آیات کے مجاز یعنی

ان کے مطلب کو واضح کرنے کی ضرورت ہے انھیں واضح کیا ہے، اس لیے فرّاء پہلا شخص نہیں ہے جس نے یہ طریقہ اختیار کیا، بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عصر میں یہی طریقہ رائج تھا ۔ اگر اس عصر سے پہلے کی لکھی ہوئی کوئی تفسیر ھاتھ لگ جاتی تو اس سے یہ بات راجح ہو جاتی کہ قرآن مجید کی تفسیر کا طریقہ بہ ترتیبِ سُوَر و آیات فرّاء اور ابوعبیدة سے بہت پہلے کا ہے] ۔ یہ طرزِ تفسیر نویسی عام طور پر مقبول رہا ۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب مفسّر قرآن [پاک] کی خاص خاص جہت کی طرف توجہ دینے لگے ۔ وہ ایک موضوع اختیار کرتے اور اسے قرآن کے گوشے گوشے میں سے نکال کر دکھلاتے، مثلاً ہمارے پاس الجَصّاص (م ۳۷۰ھ) کی کتاب احکام القرآن ہے، جس کا قبلۂ توجہ استنباطِ فقہی ہے ۔ وہ سب سے بڑھ کر اس پہلو کو نظر کے سامنے رکھتے ھیں لیکن اس کے باوجود وہ اس پرانے طرز کا اتباع کرتے ہوے سُوَر اور آیات کو ترتیب وار لیتے ھیں ۔ اس کے بعد ایسے مفسّر آئے ــ گو وہ تعداد میں کم تر ھیں ــ کہ خود قرآن مجید سے متعلّق ایک موضوع لیتے اور اس کے متعلق بکھرے ہوے حصّوں کو ایک جگہ جمع کرتے ۔ اس قسم کی تصنیف شمس الدین ابن قیّم الجوزیة (م ۷۵۱ھ) کی کتاب التّبیان فی اَقسام القرآن ہے، جس میں مصنف کا مقصد ایک خاص موضوع کا مطالعہ کرنا ہے، اور وہ موضوع قرآن [مجید] کی قَسمیں ہے؛ اس میں انھوں نے قرآن [مجید] میں اَقسام کے استعمال کے بارے میں عام نظریے جمع کر دیے ھیں، لیکن اس کے ساتھ نظائر کا استقصاء نہیں کیا اور نہ اَقسام کو تفسیرِ مقابل کے طریق سے حل کیا ہے، جس سے قرآن کے ایک حصے کو دوسرے حصے کی مدد سے سمجھتے ھیں ۔ اگر ایسا کیا ھوتا تو نظائر کے باھمی مقابلے اور مفاھمے سے قَسموں میں قرآن مجید کے مسلک کے بارے میں ایک خاص نظریہ نکل آتا، اسی طرح کہ جو کچھ اس باب میں وارد ھوا اس کا احصاء کر کے اس پر مجموعی طور پر نظر ڈالی جاتی ۔ انھوں نے اس بارے میں کچھ کیا تو ہے لیکن وہ سرسری ہے اور اطمینان بخش نہیں ہے . . . تفسیر کے اس طرز کے بارے میں کہ قرآن [مجید] کی سورتوں اور آیتوں کو ترتیب وار لیا جائے اور ان میں سے جو جو قابلِ غور ھوں ان کی توضیح کی جائے، ھمیں کچھ کہنا ہے جو ھم آئندہ تفسیر کے آج کل کے طرز سے بحث کرنے کے ضمن میں کہیں گے .

تفسیر کا آج کل کا طرز:

قدماء نے علوم اسلامیہ کے نشو و نما کی بابت جو کچھ کہا ہے اس میں ان علوم کو تین قسم کا قرار دیا ہے ۔ ایک وہ علم ہے جو خوب پکّا اور جل گیا، یہ علم نحو اور اصول ہے ۔ دوسرا وہ علم جو خوب پکّا لیکن جلا نہیں، وہ علم فقہ اور حدیث ہے ۔ تیسرا علم وہ ہے جو نہ پکّا نہ جلا، وہ علم بیان و تفسیر ہے . . . اللہ کو یہ منظور ہے کہ یہی علم یعنی علم بیان و تفسیر وہ پہلی چیز ھو جس کی خدمت کے لیے جامعہ فواد اول کے کلیّۃ آداب کے اندر میں کمر باندھوں. . . خود قدماء کا یہ ارشاد کہ دونوں علم ابھی پختہ نہیں ہوے اس بات کی صریح اجازت کے مترادف ہے کہ ان دونوں مادّوں کے نشو و نما میں جدید کوشش کی جائے ۔ اس تجدید کے لیے میں میدان میں نکل آیا ھوں اور اپنے لیے شعارِ کار ['motto'] یہ مقرر کیا ہے: "تجدید کی پہلی منزل یہ ہے کہ قدیم کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے" ۔ اللہ کی مرضی یہی ہوئی کہ تجدید کی کوشش کا اجمالی خاکہ پہلے

پہل [عربی] دائرۃ المعارف الاسلامیۃ میں بذیل مادّہ بلاغۃ دیا جائے ۔ اسی دائرۃ المعارف الاسلامیۃ میں پہلی مرتبہ اس سعیِ جدید کے اصول مادّۂ تفسیر میں دیے جا رہے ہیں :-

(١) قرآن [مجید] زبان عربی کی سب سے زیادہ عالیشان کتاب ہے ۔

''الوانِ تفسیر'' کی بابت پہلے جو کچھ کہا گیا اس کے ضمن میں یہ بیان بھی آ گیا ہے کہ ہر مفسّر کی ایک خاص غرض ہوتی ہے جسے وہ نگاہ میں رکھتا ہے اور دیگر چیزوں کے مقابلے میں اس کی تحقیق کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے ۔ ہم نے اپنے کانوں سے استاذ امام رحمہ اللّٰہ کو ان اغراض کی جنھیں مفسروں نے اختیار کیا تنقید کرتے سنا؛ خود ان کی اپنی رائے یہ تھی کہ تفسیر کی سب سے پہلی اور اہم غرض یہ ہے کہ قرآن کا ہدایۃ اور رحمۃ ہونا ثابت کرے اور عقائد و اخلاق و احکام کی تشریع کی حکمت اس طریقے سے بیان کرے کہ لوگوں کے روح اس کی طرف کھنچیں . . . . الخ ۔ چنانچہ استاذ کے نزدیک مقصدِ حقیقی قرآن کے ذریعے ہدایت پانا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بڑا مقصد ہے اور مسلمانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ اس مقصد کو پورا کر دکھائیں ۔

لیکن یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اس مقصد پر ذرا غور کریں اور یہ کہہ دیں کہ یہ مقصد تفسیر کا اوّلین مقصد نہیں ہے اور نہ ایسی چیز ہے جس کا اہتمام سب سے پہلے کیا جائے اور سب سے پہلے اسے مطمحِ نظر قرار دیا جائے، بلکہ ان سب سے پہلے ایک اَور مقصد ہے جو سب سے آگے بڑھا ہوا ہے اور وہی انتہائی غرض ہے جس سے باقی اغراض شاخوں کی طرح پھوٹتی ہیں اور وہ متعدد مقاصد کا مبنٰی قرار پاتا ہے ۔ ضروری ہے کہ کسی اَور مقصد کی تحصیل سے پہلے، خواہ وہ عملی ہو یا علمی، دینی ہو یا دنیوی ، اسے پورے طور پر حاصل کر لیا جائے . . . سب سے آگے بڑھا ہوا مقصد اور انتہائی غرض یہ ہے کہ قرآن کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ عربی زبان کی عظیم ترین کتاب اور اس کا بزرگ ترین اثر ادبی ہے ۔ یہی کتاب ہے جس نے عربی زبان کو زندۂ جاوید کر دیا، اس کی ہستی کو برقرار رکھا اور خود بھی اس کے ساتھ برقرار رہی ۔ اب وہ عربی کا مایۂ فخر اور اس کی میراث کا زیور ہے ۔ قرآن کی یہ ایک ایسی صفت ہے جسے ہر عربی بولنے والا جانتا ہے ، خواہ آپس میں دین کا کتنا ہی اختلاف ہو یا میلانات کتنے ہی الگ الگ ہوں، جب تک اسے اپنے عربی ہونے کا شعور باقی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ انسانوں کے درمیان اس کی بنیاد عربی ہونے پر قائم ہے اور تمام اجناس میں سے اس کی جنس یہی ہے ، اس کے بعد خواہ وہ عربی شخص مسیحی ہو یا بت پرست ، طبیعی ہو یا دھری، لا دینی ہو یا سچا مسلمان وہ اپنے عربی ہونے کی وجہ سے ضرور عربی زبان میں اس کتاب کی منزلت پہچانے گا اور لغۃ کے اندر اس کے اعلٰی مرتبے کا معترف ہوگا اور اس اعتراف کا دار و مدار ایمان پر ذرا بھی نہ ہوگا، نہ اس بات پر ہوگا کہ اسے ایک خاص دینی کتاب مانا جائے اور اس کے کسی عقیدے کی بنا پر اس کی تصدیق کی جائے؛ اور یہ کچھ عرب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جن کا نسلی لحاظ سے تو عربی خون نہیں لیکن تاریخ اور رفتارِ زندگی نے انھیں عرب سے وابستہ کیا اور پھر انھوں نے برضا و رغبت اسلام کو اپنا دین ٹھیرا لیا یا عرب سے مل جل گئے اور باھم خون کا اختلاط ہو گیا،

پھر انھوں نے عربی اپنی زبان بنا لی، یہاں تک کہ عربیت ان کی حیاۃ ادبی کے اصول کی ایک اصل ہو گئی . . . . نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام گروھوں کے درمیان جنھیں عربیت کے ساتھ ان قومی مضبوط رشتوں نے ایسا وابستہ کر دیا کہ عربیت ان کی لغوی فنّی شخصیت کا ایک لازمی رکنِ عظیم اور ٹھوس ستون بن گئی ھے - عربی کی اس کتابِ اعظم اور قرآن اکرم کا ان کے ادبی مطالعات اور لسانی فنّی آثار میں، جن کی اھمّیت ان کے نزدیک مسلّم ھے، ایک بڑا درجہ قائم ھو گیا - ان وجوہ سے ان تمام اقوام پر لازم ھو گیا کہ اس کتاب کا ادبی حیثیت سے مطالعہ کریں اور اس کے ذریعے اپنی موروثی عربیت کے اصول سمجھیں، خواہ وہ عربی الاصل ھوں یا ربیۃ سے ان کا رشتہ اتنا جان دار اور زور دار ھو گیا ھو کہ جس سے ان کی شخصیت، رفتارِ زندگی اور صورتِ حیات سب کچھ پورے طور پر متأثر ھو چکا ھو - اس کے بعد ایک خالص عربی یا وہ شخص جسے ان روابط نے عربیۃ کے ساتھ مضبوطی سے منسلک کر دیا ھے اس جلیل القدر کتاب کو خود اسی حیثیت سے پڑھے گا اور ادبی طور پر مطالعہ کرے گا جس حیثیت سے مختلف امتیں مختلف لغات کے آداب کے سرچشموں کا مطالعہ کرتی ھیں - یہ ادبی مطالعہ اس قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کی بابت پہلی چیز ھے جو مطالعہ کرنے والوں پر واجب ھے، تا کہ اس کتاب کا حق ادا ھو، گو وہ اس سے ھدایت کے خواھاں یا اس کے مضامین سے منتفع ھونے کے طلب‌گار نہ بھی ھوں؛ بلکہ یہ بات مطالعہ کرنے والوں پر سب سے پہلے واجب ھے اور اس پر انھیں عمل کرنا چاھیے، گو ان کے دل میں اس کی سکھائی ھوئی باتوں سے عقیدت نہ بھی ھو یا ان کے دلی خیالات ان کے بالکل برعکس ھوں، جس کا مسلمان، جو اسے اپنی مقدس کتاب مانتے ھیں، بار بار اعادہ کرتے ھیں - خلاصہ یہ کہ یہ کتاب فنِّ عربی کی ایک نہایت پاکیزہ کتاب ھے، خواہ اسے پڑھنے والا دینی حیثیت سے بھی اسے ایسا ھی مانتا ھو یا نہ مانتا ھو .

فنّی سطح پر قرآن کا ادبی حیثیت سے، کسی دینی حیثیت کا ذرا بھی اعتبار نہ کرتے ھوے، مطالعہ کرنا ھمارے نزدیک اور ھمارے ساتھ ان تمام لوگوں کے نزدیک جو اصل عرب ھیں یا جو عرب کے ساتھ اختلاط ھو جانے کی وجہ سے متّحد ھیں درسِ قرآن کا مقصد اوّلیں اور اس کی انتہائی غرض ھے، جس کا ھر غرض اور ھر مقصد سے مقدم رکھنا واجب ھے - جب اس درس ادبی کا پورا پورا حق ادا کر دیا جائے تو اس وقت خاص خاص اغراض و مقاصد رکھنے والوں کو یہ حق حاصل ھوگا کہ اپنی اپنی مفیدِ مطلب باتیں لینے کے لیے اس سے اقتباسات حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور تشریع (قانون سازی)، اعتقاد، اخلاق یا اجتماعی اصلاح وغیرہ کے لیے اس کی طرف رجوع کریں - یہ سب دوسرے درجے کی اغراض ھیں اور ان میں سے کوئی بھی غرض، جیسا ھونا چاھیے، پوری نہیں ھو سکتی جب تک اس کی بنیاد عربیت کی اس یکتا کتاب کے ادبی مطالعے پر نہ ھو اور یہ مطالعہ بھی پورا پورا اور صحیح ھو جس سے متنِ کتاب خود سمجھ میں آ جائے - اسی مطالعے کا نام ھم آج کل تفسیر رکھتے ھیں، کیونکہ قرآن کی غرض کا بیان کرنا اور اس کے معنی کو سمجھنا اس کے بغیر ممکن نہیں - حاصل کلام یہ ھے کہ جہاں تک میں سمجھتا ھوں آج کل تفسیر کے معنی قرآن کے ادبی مطالعے کے ھیں، جو ٹھیک طریقے کے ساتھ ھو اور تمام

ادبی پہلوؤں پر پورا پورا حاوی ہو اور اس کی تقسیم با ترتیب منظّم ہو ۔ تفسیر کا پہلا مقصد آج کل صرف ادبی ہے، جو اس کے سوا اور اعتبارات سے متأثّر نہ ہو اور یہی اس سے ہماری غرض ہے ۔ دیگر تمام اغراض کا پورا ہونا، خواہ کوئی غرض ہو، اسی پر موقوف ہے ۔ یہ آج کل کی تفسیر کی بابت ہمارا نظریہ ہے ۔ اسی اصل کو سامنے رکھ کر ہم تفسیر کا طور اور اس کے درس کا طریقہ بیان کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں ۔

(۲) قرآن کی ترتیب کا اس کی تفسیر پر اثر :

اس نظریے کو پیشِ نظر رکھتے ہوے ہم پہلے ترتیبِ قرآن کے مسئلے کو لیتے ہیں، کیونکہ تفسیر کرنے کے لیے ترتیب ایک بنیادی چیز ٹھیرتی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ آیا تفسیر کا وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو آج تک رائج چلا آ رہا ہے اور جسے ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، یعنی ترتیب وار ایک ایک سورۃ کی ایک ایک آیت کو لیا جائے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے، یا اس کے سوا کوئی اور طور زیادہ کار آمد ہوگا ؟

سب جانتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب موضوع و مسائل کے لحاظ سے نہیں ہے کہ ہر موضوع اور مسئلے کے لیے ایک باب یا فصل مقرر ہو اور اس میں اس موضوع اور اس مسئلے کے متعلق جو کچھ کہنا ہے سب جمع کر دیا جائے، مثلاً قرآن میں اصولِ عقیدہ موجود ہیں لیکن اُسے کتبِ عقائد کی طرح ترتیب نہیں دیا گیا ۔ اسی طرح اصولِ تشریع موجود ہیں لیکن اُسے تشریعی کتابوں کی طرح مرتّب نہیں کیا گیا ۔ اسی طرح اس کی ترتیب کتبِ اخلاق، تاریخ یا قصص کی طرح بھی نہیں، بلکہ بعض دینی کتابوں کی طرح بھی اس کی تبویب و تفصیل نہیں کی گئی کہ حیات کے حوادث کے لحاظ سے اَسفار مقرر کر دیے گئے ہوں اور ہر سِفْر (کتاب) کا عنوان ایک حادثے کو قرار دیا جائے، یا وہ کسی خاص فرد کی حیات کے تسلسل کے مطابق ہو، جس کا ہر حصہ ایک خاص واقعے سے وابستہ ہو ۔ اسی طرح قرآن کی ترتیب اس کی آیات کے نزول کی تأریخ کے مطابق بھی نہیں ہے ۔ اس کے برعکس قرآن [مجید] کا اپنا ایک نرالا طریق ہے اور اس میں بہت سے مواضیع سے تعرّض کیا گیا ہے لیکن ان میں سے کوئی موضوع بھی ایسا نہیں کہ اس کے متعلّق تمام مسائل از اول تا آخر جمع کر دیے ہوں اور ڈھونڈنے والے کو ایک معیّن جگہ پر سب مل جائیں ۔ قرآن [مجید] میں ہر موضوع کو جگہ جگہ بکھیر دیا گیا اور مضامین کو جگہ جگہ بانٹ دیا گیا ہے ۔ تمام احکامِ شرعیہ ایک ۔ ۔ نہیں بلکہ متعدّد جگہ ملیں گے ۔ اعتقادی اصول کو ایک سے زیادہ مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ایک ہی قصّے کے واقعات و حوادث جگہ جگہ پھیلے ہوے نظر آتے ہیں ۔ اسی طرح پڑھنے والے کو ایک سورۃ میں کئی باتیں ملتی ہیں اور ہر ایک جگہ مختلف اغراض کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں اور مختلف سورتوں میں ایک ہی قصہ اغراضِ مختلفہ کے تحت پیش کیا گیا ہے اور ایک جگہ کی غرض دوسری جگہ کی غرض کا تتّمہ ہے، اگر ان مختلف بیانات کو اکٹھا کر لیا جائے اور اغراض کا مقابلہ کر لیا جائے تو سلسلے مضمون کا تصوّر پورے طور پر سامنے آ جاتا ہے ۔ قرآن [مجید] کا طرزِ بیان ایک حکمت اور مقصد کے تحت ہے ۔ اس کا بیان اُس جگہ کیا جائے گا جہاں مطالعۂ قرآن کے سلسلے میں ترتیبِ قرآن کے مسئلے پر بحث کی جائے گی ۔

یہاں ہمیں فقط یہ دیکھنا ہے کہ اس

اسلوبِ قرآنی کا تفسیر کرنے کے طریقے پر اور قرآن کے اغراض و معانی کے سمجھنے کے لیے غور و خوض پر کیا اثر پڑتا ہے - غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ محض سورتوں اور ان کے اجزاء کو ترتیب وار لے کر تفسیر کرنے سے قرآن کو دقیق طور پر سمجھا نہیں جا سکتا اور نہ اس کے معانی اور اغراض صحیح طور پر واضح ہو سکتے ہیں، جب تک کہ مفسّر یہ طریقہ نہ اختیار کرے کہ ایک موضوع پر ٹھیر کر اس کے متعلق قرآن میں جہاں جہاں جو کچھ آیا ہے اس سب کو پورے طور پر اکٹھا کر لے اور ان کے اول و آخر کو ملا کر دیکھے اور پہلے کا پچھلے سے مقابلہ کرے؛ مثلاً سورۃ البقرۃ میں پڑھنے والے کو شروع ہی میں مؤمنوں کا ذکر اور ان کا حال ملے گا، مگر جہاں تک میرا خیال ہے وہ حال صحیح طور پر تبھی سمجھا جا سکتا ہے جب سورۃ المؤمنون پارہ ۱۸ میں جو کچھ ان کی بابت آیا ہے اسے سورۃ البقرہ کے بیان کے ساتھ ملا کر دیکھے - آگے اسی سورۃ میں اسے منافقوں کا حال ملے گا لیکن وہ اسے بھی جیسا چاہیے نہیں سمجھ سکتا جب تک سورۃ المنافقون پارہ ۲۸ میں ان کی بابت جو کہا گیا ہے وہ سامنے نہ رکھے - اسی طرح سورۃ البقرۃ میں آدم[۳] کے قصّے کی تفسیر صرف تب ہو سکتی ہے جب سورۃ الاعراف، سورۃ الحجر اور سورۃ الکہف وغیرہ میں جو کچھ اس بارے میں آیا ہے اس سب کو ملا کر دیکھ لیا جائے .

یہ بات بتوفیقِ الٰہی سوچنے سے بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ہر شخص ان تمام نصوص کا، جن کا ایک موضوع خاص سے تعلّق ہے مگر ان کا آپس میں تباعدِ زمانی ہے، ٹھیک ٹھیک اور دقیق مفہوم صرف اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب ان کے سابق و لاحق، متقدّم اور متأخّر کو خوب سمجھ لے، خاص کر جب کہ نصوص میں اتنا زیادہ تباعد ہو جتنا کہ آیات قرآنی کے درمیان ہے، جو سالہا سال تک پہنچتا ہے، پھر اس سمجھنے والے کو اس کی بھی ضرورت پڑے گی کہ ان تمام مواقع و حالات اور ان تمام اسباب و روابط کو جو ان نصوص کے مطالب کو احاطہ کیے ہوے ہیں سمجھے، کیونکہ یہ وہ روشنیاں ہیں جن کے بغیر معنی واضح نہیں ہوتے - قرآنی ترتیب میں زمانے کے تقدّم و تأخّر کی کوئی رعایت نہیں کی گئی - مکّی آیات کے بیچ میں مدنی آیات آ جاتی ہیں اور انھیں گھیرے ہوے ہوتی ہیں اور مدنی آیات مکّی کے بیچ میں موجود ہیں اور ان کا احاطہ کیے ہوے ہیں - یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن [مجید] کی سورتوں کی ترتیب، خواہ مصاحف مختلفہ کی ترتیبوں میں سے کوئی سی ترتیب ہو، قرآن سمجھنے والے مفسّر کی کوئی مدد نہیں کرتی؛ بلکہ پورے طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ٹھیرتا ہے کہ جدید نظر کے ساتھ ایک موضوع سے متعلق آیات کو خاص طور پر مرتّب کیا جائے اور یہ ترتیب ایسی ہو جس سے وہ گوشے اور پہلو بالکل واضح ہو جائیں جن کی بابت آپ سن چکے ہیں کہ مفسّر ان کی رعایت اور ان کا ٹھیک اندازہ کرنے پر مجبور ہے، تا کہ اسے فہم صحیح اور معنائے دقیق تک پہنچنا میسّر ہو.

خلاصہ یہ کہ مصحف کے اندر ترتیب قرآنی میں وحدتِ موضوع کا قطعاً خیال نہیں کیا گیا اور نزولِ آیات کی ترتیبِ زمانی کی بھی کبھی نگہداشت نہیں کی گئی اور ایک ہی چیز اور ایک ہی موضوع سے متعلّق بیانات کو چند مواقع میں بکھیر دیا گیا ہے، جن کا سیاق و سباق مختلف ہے اور مختلف مقامات میں انھیں لایا

گیا ہے، جن کے ماحول مختلف ہیں ۔ ان حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن [مجید] کی تفسیر موضوعوں کے لحاظ سے کی جائے اور ایک خاص موضوع لے کر اس کے متعلّق سب کی سب آیتوں کو ایک ایک کر کے جمع کر لیا جائے اور پھر ان کی ترتیبِ زمانی پر غور کیا جائے اور ان کی مناسبت اور ربط رکھنے والی اشیاء کو، جو انھیں احاطہ کیے ہوے ہیں، سامنے رکھا جائے؛ اس کے بعد تفسیر و تفہیم کی کوشش کی جائے ۔ ایسی تفسیر اصل مطلب کا پتا سب سے زیادہ دے گی اور معنی کی حد بندی میں سب سے زیادہ قابلِ وثوق ہوگی . . . اس کے برخلاف ایک ایک سورۃ کو الگ الگ لے کر تفسیر کرنے کا ماحصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک ہی سورۃ میں جتنے مضامین آ گئے ہیں ان سے متفرق طور پر بحث کی جائے ۔ پھر جب ایسے ہی مضامین دوسری سورۃ میں آئیں تو مفسّر ان سے پھر اسی طرح بحث کرے ۔ اب اگر مفسّر ان موضوعات میں سے جو پہلی سورۃ میں آئے ہیں پہلے موضوع کو لے کر اس پر جامع نظر ڈالتا ہے تو لامحالہ اسے تفسیرِ موضوعات کرنا پڑتی ہے اور ہر موضوع پر ٹھیرنا اور لمبا چوڑا وقفہ کرنا اور ترتیبی تفسیر کا طریق ترک کرنا پڑتا ہے اور اس سے ترتیبی تفسیر میں خلل واقع ہوتا ہے اور اگر وہ تفسیر سورۃ وار کرتا ہے تو ایک ہی موضوع کی بحث چند سورتوں میں بار بار کرنا پڑتی ہے اور اس سے وحدتِ موضوع میں خلل واقع ہوتا ہے، کیونکہ ایک ہی مقام پر ایک ہی موضوع سے متعلّق متواتر بحث نہیں کی جا سکی ۔ اس لیے ٹھیک راے یہ معلوم ہوتی ہے کہ موضوع کی وحدت کا خیال کیا جائے اور قرآن کی تفسیر موضوعوں کے لحاظ سے کی جائے اور مصحف کی سورتوں اور پاروں کی ترتیب تفسیر میں نظر انداز کر دی جائے ۔ جب اس طرح موضوع وار تفسیر مکمل ہو جائے تو پھر مفسّر وحدتِ سورۃ اور تناسبِ آیات اور سیاق کی باقاعدہ ترتیب اگر چاہے تو واضح کر سکتا ہے ۔ گویا یہ بات موضوعوں کی مکمّل تفسیر کے بعد ہونی چاہیے .

(۳) تفسیرِ ادبی کا طریقہ :

جب یہ راے معقول ٹھیری کہ اس عظیم‌الشان عربیت کی کتاب کی تفسیر کی کوشش ادبی حیثیت سے کرنا ان لوگوں کا پہلا فرض ہے جن کا عربیۃ سے ادبی اور لغوی رشتہ ہے، خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب . . اور یہ راے بھی معقول ٹھیری کہ قرآن کی تفسیر موضوع‌وار ہونی چاہیے، سُور و آیات کی ترتیب سے نہیں، تو اس بنیاد پر تفسیرِ ادبی کا طریقہ دو قسم کے مطالعے پر مشتمل ہوگا اور یہی ہر ادبی متن کے مطالعے کا بہترین طریقہ ہو سکتا ہے [اس طریقے کا واضح بیان اور اس کی تنظیم و تنسیق کا ڈھنگ کاتبِ مقالۂ ھذا کے ادبِ مصری پر لکچروں کے مجموعے میں ملے گا، جو جامعۂ فؤاد الاول کے کلیۃ الآداب میں دیے گئے (جس کا مخطوطہ وہاں موجود ہے)] ۔ وہ دو قسمیں یہ ہیں : (ا) ماحول قرآن کا مطالعہ؛ (ب) خود قرآن کا مطالعہ .

(ا) قرآن [مجید] کے ماحول کا مطالعہ :

ان میں سے بعض مطالعات خاص اور قرآن سے قریب ہیں اور بعض عام اور بعید ہیں لیکن یہ فرق فقط ظاہر ہی میں نظر آتا ہے ورنہ ادبی طریق سے صحیح اور باریک فہمِ قرآن کے لیے ان احوال کا سمجھنا یکساں ضروری ہے ۔ ایسی جلیل‌القدر کتاب کے سمجھنے کے لیے اس کے ماحول کا مطالعہ خاص ایسی ضرورت ہے جس کا

انکار نہیں ہو سکتا ۔ اس کتاب عظیم کا ظہور بیس سال یا کچھ اوپر بیس سال کی مدت میں مکمّل ہوا ۔ اس کے بعد وہ [کچھ وقت] متفرّق طور پر موجود رہی ۔ یہاں تک کہ [وہ عہد حضرت ابوبکر رضؓ] میں جمع کی گئی ۔ خود جمع کرنا اور لکھنا ایک ایسا لمبا کام تھا جو ایک مدت تک ہوتا رہا ۔ . . ۔ اس کے بعد قراءت کا سوال پیدا ہوا اور لغۃ عربیۃ میں جو ارتقاء اس اھم نہضت کی وجہ سے ہوا جو دعوتِ اسلام اور حکومتِ اسلام کی بدولت پیدا ہوئی، اس کے ساتھ ساتھ قراءت کے اختلافات بھی چلتے رہے ۔ ان قراءات کا اس کتاب کی حیاۃ پر اور اس کے مطالب کے سمجھنے پر بڑا واضح اثر ہوا ۔ نزول و جمع و قراءتِ قرآن وغیرہ کا نام حدودِ صدۂ ششم سے اصطلاحی طور پر علومِ القرآن مشہور ہوا [اس کے لیے راقمِ مقالہ کے محاضرات علوم القرآن دیکھنے چاہییں، جن کا مخطوطہ کلیۃ الآداب میں موجود ہے] ۔ یوں اس سے پہلے ایک مدت تک مفسّر ان سے مجمل طور پر بحث کرتے رہے اور ہر مفسّر کا بیان اس کی توجّہ اور اہتمام کے مطابق متفاوت طور پر پورا یا ادھورا رہا ۔ ادبی تصنیفات کے مطالعہ کرنے والوں کی نگاہ میں ان جیسی باتوں سے بحث کرنا نہایت ضروری ہے اور ادبی کتابوں کے سمجھنے اور ان سے مفید اتّصال پیدا کرنے کے لیے ان امور پر غور کرنا لازمی ہے ۔ خود متقدّمین فہمِ قرآن کے لیے ان بحثوں کے ضروری ہونے سے باخبر تھے؛ حتّٰی کہ سیوطی نے اپنی کتاب الاتقان فی علوم القرآن کے مقدّمے میں کہا "یہ کتاب میں نے اپنی ایک بڑی تفسیر کے مقدّمے کے طور پر لکھی ہے ۔ یہ تفسیر میں لکھنا شروع کر چکا ہوں اور اس کا نام ہمیں نے "مجمع البحرین و مطلع البدرین الجامع لتحریر الروایۃ و تقریر الدرایۃ" تجویز کیا ہے [یعنی یہ تفسیر روایات کی تنقیح اور درایات کی توجیہ دونوں کی جامع ہوگی] اور اللہ سے مدد، توفیق و ھدایت کی التماس ہے" (الاتقان، ۱ : ۲) ۔ اکثر مفسرین اپنی تفاسیر کے مقدّموں میں نزول، جمع اور قراءات کی بابت کچھ نہ کچھ لکھ دیا کرتے تھے ۔ فضلاے مغرب میں سے ان بحثوں سے شغل اور دلچسپی رکھنے والوں نے ماحولِ قرآن کے ان موضوعوں کی طرف خاص توجّہ کی ہے اور کتابیں لکھی ہیں ۔ ان لکھنے والوں میں سب سے بڑا شخص جرمنی کا عالم نولڈکہ Nöldeke ہے جس نے تأریخ القرآن [*Geschichte des Qorans*] لکھی ہے اور جس کی چھان بین میں اور جس کا دوسرا ایڈیشن تیار کرنے میں جرمنی کے چند علماء نے شرکت کی ہے ۔ جن میں شوالی [Schwally]، زیمرن [Heinrich Zimmern] اور برگشٹراسر [Bergsträsser] جیسے عالم شامل ہیں ۔ ہمارے کلیۃ الآداب کے ایک فارغ التحصیل نوجوان نے بڑی محنت سے اس کا ترجمہ عربی میں کر دیا ہے، جس میں کلیۃ کے جرمن پروفیسروں اور جرمن زبان جاننے والوں نے اس کی مدد کی ہے، لیکن کچھ ایسے چھوٹے موٹے موانع پیش آئے کہ یہ ترجمہ چھپ نہ سکا ۔ ان نئے زمانے کے علماء نے علمی تحقیق کے سلسلے میں ان موضوعوں پر نئے رنگ چڑھا دیے ہیں، جو اتّہام سے خالی تو نہیں پھر بھی اس میں نقد و تمحیص کی روح لازمی طور پر جلوہ فگن ہے، جس کا اس قسم کی بحثوں میں ہونا ضروری ہے ۔ بہر حال ان امورِ علمیہ کا تفسیر کرنے سے پہلے مطالعہ کرنا ضروری ہے جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہاں تک کہ جو شخص ان امور سے جو قرآن کا خاص اور قریبی ماحول ہیں جیسی چاہیے واقفیت نہ رکھتا ہو اسے مطلقاً تفسیر قرآن کے پاس پھٹکنا تک نہیں

چاہیے؛ کیونکہ قرآن کو ادبی کتاب کی حیثیت سے صحیح طور پر اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ ان مرتبط باتوں کی، جو فہم قرآن کے لیے لابدی ہیں، رہنمائی حاصل کر لی جائے .

قرآن کے ماحول اور اس کے متعلق عام امور سے واقفیت حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مادّی اور معنوی ماحول کا مطالعہ کیا جائے جس میں قرآن [مجید] نازل ہوا اور موجود رہا اور جس میں اسے جمع کیا اور لکھا گیا اور جس میں اسے پڑھا اور حفظ کیا گیا - انھیں مقامات کے باشندوں کو قرآن نے سب سے پہلے مخاطب کیا اور انھیں کو پہلے اپنا پیغام پہنچایا، تاکہ وہ اس پیغام کے ادا کرنے پر اور اسے دنیا کی تمام اقوام تک پہنچانے کے لیے کمر باندھیں - پس قرآن کی روح، اس کا مزاج اور اسلوب سب کچھ عربی ہے (قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ) "عربی قرآن جس میں کوئی کجی نہیں ہے" . . . - قرآن کے مقاصد کی تہ تک پہنچنا انسان کو صرف اسی وقت میسّر ہو سکتا ہے جب اس روحِ عربی، مزاجِ عربی اور ذوقِ عربی کا اسے پورا تصوّر اور اس سے کامل قرب حاصل ہو [کوئی شک نہیں کہ قرآن کے معانی اور مقاصد مفیدِ اجتماعِ انسانی، دور رس اور ابداً پائدار ہیں، لیکن یہ سب کے سب انسانیت کے پاس عربی لباس اور عربی عبارت میں آئے ہیں، اور عروبۃ یعنی خصوصیاتِ عرب کا پورا تصوّر حاصل کرنا ہی ایک راستہ ہے جو ان سب کے سمجھنے کے لیے اور ان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مقرّر اور متعیّن ہے] - یہاں سے اس بات کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ اس مادّی عربی ماحول سے پوری پوری واقفیت حاصل کی جائے - عرب کی زمین، اس کے پہاڑ، اس کے حرّے، صحرا اور میدان؛ عرب کا آسمان، اس کے بادل، ستارے اور انواء؛ عرب کی فضاء، اس کی گرمی، سردی، آندھیاں اور ہواؤں کے نرم جھونکے؛ عرب کے طبیعیات، اس کی خشک سالی اور سر سبزی، اس کی پژمردگی اور قوتِ نشو و نما، اس کے نباتات اور اشجار وغیرہ غرض جو کچھ اس عربی مادّی زندگی سے تعلّق رکھتا ہے اس سے واقفیت اس قرآن عربی مبین کے سمجھنے کے لیے ضروری وسائل میں سے ہے - اس کے ساتھ ساتھ معنوی محیط کا اپنے وسیع‌ترین مصداق کے لحاظ سے، جو عرب کی زندگی کے ساتھ مرتبط ہے، جاننا اس قرآن عظیم کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے - مثلاً عرب کا دور و دراز زمانۂ ماضی، اس کی جانی پہچانی تأریخ، خاندانوں اور قبیلوں کا نظام، ان کی حکومتیں، خواہ کسی مرتبے کی سہی، ان کے عقیدے، خواہ کسی رنگ کے ہوں، ان کے فنون، جس نوع کے بھی ہوں، ان کے اعمال، خواہ کتنے ہی انواع و اقسام کے ہوں، غرض وہ تمام چیزیں جن پر اس عُرُوبۃ (عربی خصوصیات) کی حیات انسانیۃ کا دار و مدار ہے 'عربی مبین' کے اس قرآن کے سمجھنے کے لیے ضروری وسائل میں شامل ہے - جب عربی ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے کوشش کرنا پڑتی ہے کہ عربی زبان اور خصائص عربی (عُرُوبۃ) کا زیادہ سے زیادہ، گہرے سے گہرا اور باریک سے باریک علم حاصل کیا جائے، کیونکہ اس کے بغیر عربی ادب صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا ، تو پھر قرآن تو اس سارے ادب کا سرتاج اور اس کا دھڑکتا ہوا دل ہے، جس کا صحیح ادبی مطالعہ، جتنا ایک مفسّر کے لیے ضروری ہے، کبھی میسّر نہیں ہو سکتا جب تک وہ عربی زندگی کے مادّی اور معنوی ماحول کا علم ہر طرح سے مکمّل نہ کر لے - جب تک ہم قرآن میں عربی تشبیہ یا عربی تمثیل پڑھتے رہیں گے ہمیں اس کا فوری

احساس ہوتا رہے گا کہ اس کا مادّہ عربی اجالے اور عربی جوّ کے مظاہر ہیں اور اس کا دار و مدار انہیں حیوانات یا جمادات پر ہے جو عرب میں پائے جاتے ہیں اور ہم ان میں سے ایک کو بھی نہیں جانتے ، نہ ہمارے اذہان میں ان کی کوئی خاص صورت ہے ۔ ان باتوں کے ہوتے ہوے ہمیں یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ ہم اس قرآن کی تفسیر کرتے ہیں یا اسے ادبی حیثیت سے سمجھنے کا ڈول ڈالتے ہیں جس سے اس کے دیگر پہلوؤں سے منتفع ہونے کا راستہ کھل جائے ۔ جب تک ہم الحِجْر، الاَحْقَاف، الاَیْکۃ ، مَدْیَن، مواطنِ ثمود اور منازلِ عاد کا ذکر کرتے ہیں اور سوائے بکھرے ہوے اشارات کے ہمارے پاس ان کے متعلّق کوئی معلومات نہیں، اس وقت تک ہمارے لیے یہ کہنا مناسب نہیں کہ ہم نے ان اماکن اور اقوام کی بابت قرآن [پاک] کا بیان سمجھ لیا ہے، یا یہ کہنا کہ قرآن کا ان اقوام و اماکن کے بیان سے جو مقصد ہے وہ ہم نے پا لیا ہے ۔ جب یہ نہیں تو ان کے تذکرے سے جو عبرت حاصل ہونی چاہیے وہ ہرگز نمایاں نہیں ہو سکتی اور جس حکمت اور ہدایت کی اس سے توقّع کی جاتی ہے وہ کبھی مفید و مؤثّر نہیں ہو سکتی ۔

قرآن تمام کتب سماوی میں سے جدید ترین کتاب ہے اور جس لغۃ میں یہ نازل ہوا وہ ایک جیتا جاگتا لغۃ چلا آتا ہے، جسے کروڑوں انسان بولتے ہیں اور اس کا ادب ایک امت کا نہیں بہت سی امتوں کا ادب ہے ، جو اپنے آپ کو زندگی کا حقدار کہتی ہیں، پھر یہ لغۃ بہت سے لہجوں اور لغتوں کی اصل اور جڑ ہے، جن کا صحیح مطالعہ اسی عربی کے سمجھنے پر موقوف ہے ۔ ان حالات کے ہوتے ہوے شاید یہ کوئی بڑا مطالبہ نہیں ہے . کہ قرآن کے عام ماحول کا بہ تفصیل گہرا مطالعہ ہونا چاہیے . . . یہ کوئی بڑا مطالبہ نہیں کہ قرآن کے ماحول کا مطالعہ کیا جائے، جب کہ اس کی اہمیت کی وہ حالت ہے جو مذکور ہوئی، اس لیے کہ دیگر کتبِ دینیہ قرآن سے صدیوں قدیم تر ہیں اور ان کے ماحول کے آثار بھی کب کے نیست و نابود ہو چکے ہیں اور ان کتابوں کے اصل لغات اپنے اصل ماحول کو خیر باد کہہ چکے ہیں، کیونکہ وہ خود ہی زندہ نہ رہے ۔ تا ہم ان کتب دینیہ کے ماحول کے آثار کے مٹ جانے کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب کتابوں میں جن چیزوں کا ذکر آیا ہے حیوان، جماد، حادثہ یا علم ان میں سے ہر ایک کو منفرد موضوعِ درس قرار دیا جا چکا ہے اور ان کی بابت بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور مکمّل فرہنگیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں ہر چیز کی بابت، جس کا جاننا ضروری ہے، پوری پوری معلومات مہیّا کر دی گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ تأریخی، ادبی، دینی، قانونی اور اجتماعی حیثیت سے ان کتابوں کے متعلق گہرے اور تقابلی مطالعات موجود ہیں ۔ ہم یہاں ان کے تراجم اور اشاعت کی بابت کچھ نہیں کہتے، کیونکہ یہ اَور پہلو ہیں اور ان سے تعرّض کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن دیگر کتب دینیہ کی خاطر ان مساعیِ جلیلہ کو دیکھتے ہوے وہ کوتاہی جو اس کتابِ جلیل [قرآن مجید] کے مطالعے میں اب تک ہوئی ہے بہت بڑا گناہ ٹھیرتی ہے، جب کہ ساتھ ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب عربیۃ کے تمام آثارِ ادبی میں سب سے زیادہ عظیم الشأن ، قدیم ترین اور سب سے بڑھ کر قابلِ وثوق اثر ہے !

قرآن [مجید] کے ماحول کے مطالعے کی بابت یہ ایک اجمالی بیان ہے، جس کے در حقیقت چند

جزء ھیں : اول متنِ قرآن کی تحقیق اور ضبط اور اس کی تأریخِ حیات؛ دوم اس محیط سے شناسائی جس میں قرآن کا ظہور ھوا، جس سے متعلق باتیں وہ بیان کرتا ھے اور جس کی مادّی اور معنوی فضا میں وہ گشت کرتا ھے ۔ ان باتوں کا پورا پورا حق ادا کرنے کے بعد خود قرآن کے مطالعے کی باری آتی ھے :-

(ب) خود قرآن کا مطالعہ :-

اس کا پہلا مرحلہ مفرداتِ الفاظ پر غور کرنا ھے ۔ الفاظ کا علم حاصل کرنے والے کو اتنی مہارت پیدا کرنی چاھیے کہ وہ صحیح اندازہ لگا سکے کہ الفاظ کے معنوں میں کیا تدریجی تغیّر واقع ھوا ۔ اس تدریجی تغیّر پر مختلف قرون کا اور نفسی اور اجتماعی عوامل کا کیا اور کتنا اثر پڑا اور امت کے ثقافتی حالات اس پر کس قدر اثر انداز ھوے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر امور و حوادث کا ٹھیک علم ھونا چاھیے، جن کے اندر سے عربی الفاظ کو اس تمام مدّت میں گزرنا پڑا جب کہ وہ پرجوش و نشاط نہضت ظہور میں آئی جس سے اسلامی دولت کی تکمیل ھوئی اور وہ دینی، سیاسی اور ثقافتی تحریک پیدا ھوئی جس نے حضارۃ کی یہ عظیم الشأن میراث چھوڑی ۔ ان سب میں لغۃِ عربیۃ کو بہت سی امتوں نے، جن کے رنگ، خون، ماضی اور حاضر سب آپس میں مختلف تھے، اختیار اور استعمال کیا اور ان سب امور نے مل کر لغۃِ عربیۃ کے الفاظ کی زندگی میں رفتہ رفتہ بڑے بڑے وسیع اور دور رس تغیّرات لاحق ھونے کا موقع پیدا کر دیا ۔ یہاں تک کہ یہ بات ایک صریح خطا ھوگی اگر علم قرآنی کا طالب اس کتابِ جلیل کی عبارت کے الفاظ کے سمجھنے میں اس تدریجی تغیّر و تبدّل کو جو الفاظ کی حیات اور معانی سے لاحق ھوا نظر انداز کر دے اور اس بات کا شعور اسے نہ ھو جائے کہ اس کا ارادہ ان الفاظ کو انھیں معنی میں سمجھنے اور لینے کا ھے جو اس کے ظہور کے وقت سمجھے جاتے تھے اور جو معنی ان لوگوں نے لیے تھے جو ان کے سب سے پہلے تلاوت کرنے والے (علیہ السلام) کے گرد جمع تھے اور یہی اعتبار ان اصلی اعتبارات میں سے ایک ھے جو قرآن کی تفسیرِ علمی کے راستے کی صفِ اوّل میں کھڑے نظر آتے ھیں اور جن سے سب سے پہلے پالا پڑتا ھے، جیسا کہ ھم پہلے اشارہ کر چکے ھیں ۔ [اس سے انکار نہیں ھو سکتا کہ اس کتاب کا دوام اور اس کا زندگی کے لیے ھمیشہ ورزش مہیا کرتے رھنا اور زندگی سے اس کا رشتہ استوار ھونا ان سب باتوں کا تقاضا یہ ھے کہ اس کے الفاظ کے معانی صاف اور متعیّن یا زمانے کے ساتھ بڑھنے والے ھوں لیکن اتنا مان لینے کے بعد بھی ھماری راے یہ ھے کہ ان معانی محتملہ میں سے صرف وھی معانی قرآن پاك کی طرف منسوب کیے جانے مناسب ھیں جو عربیۃ کے ذوقِ لغوی کے ذریعے سمجھ میں آتے ھوں ۔ ان معانی کی طرف ذھن کے متوجہ کرنے کا ذریعہ وہ اصلی معانی ھیں جو نزولِ قرآن کے وقت پہلے پہل ان سے سمجھ میں آئے تھے ۔ اس کی تشریح اور تمثیل کی یہاں گنجائش نہیں ھے] .

جب الفاظِ قرآن کے صحیح معانی سمجھنے کی پہلی اصل یہ ٹھیری تو اب یہ سوچنا چاھیے کہ اس پر عمل کرنے کا ذریعہ کیا ھے ۔ ھماری لغت کی کتابیں اور معاجم یہاں نہ ھمارے کام آتی ھیں اور نہ اس بارے میں ان سے کچھ مدد ملتی ھے ۔ سب سے بڑی لغۃ کی کتاب جو ھمارے پاس ھے وہ ابن منظور المصری کی لسان العرب ھے ۔ وہ آج کل کے محاورے میں ' قینچی اور چیپی ' کے

طریقے پر جمع کی گئی ھے (یعنی ادھر ادھر کے اقتباسات کا مجموعہ ھے) اور اس میں ایسی ایسی عبارتیں پہلو بہ پہلو دکھائی دیتی ھیں جن کے لکھنے والوں کے درمیان زمانی فاصلہ بہت زیادہ ھے: چنانچہ ابن دُرَید، جو چوتھی صدی ھجری کے ربع اول کا مصنف ھے (۳۲۱ھ)، ابن الأثیر سے، جو ساتویں صدی کی ابتداء کا مصنف ھے (۶۰۶ھ)، شانے سے شانہ ملائے بیٹھا ھے اور پہلے کی لُغَوی تحقیق دوسرے کی دینی تحقیق سے مختلف نظر آتی ھے۔ یا پھر القاموس المحیط ھے، جس کی بابت ھم جانتے ھیں کہ اس میں بہت سی متغائر اور متبائن ثقافتوں کے نکلے ھوے شیرے الگ الگ رکھے ھیں ۔ اِدھر عقلی فلسفہ ھے تو اُدھر عملی طب، ایک طرف ادبی لغوی مفہوم ھے تو دوسری طرف دینی اعتقادی معنی ھیں . . . اس کے بعد ماننا پڑے گا کہ ھماری لغت کی کتابیں اس اصل کی جس کا منشا الفاظ کے معنوں کے درجہ بدرجہ تغیّرات کا کھوج نکالنا ھے تحقیق و تفتیش میں کوئی مدد نہیں دیتیں ۔ اب اگر مفسِّر قرآن چاھے کہ الفاظِ قرآنی کے پہلے معنی تلاش کرے تو اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ اس کے لیے خود محنت کرے، گو اس کا کام وقتی اور ناتمام ھو، پھر بھی آج کل جتنا ممکن ھو سکتا ھے وہ یہی ھے کہ خود کمر کسے اور کام کرے تا آنکہ کوئی ایسی لغت وجود میں آئے جس میں اشتقاقِ الفاظ کی بحث ھو، الفاظ کے معنوں میں جو درجہ بدرجہ تبدیلی ھوئی ھے وہ دکھائی گئی ھو اور معانی لُغَویۃ کا ان کی ترتیب کے لحاظ سے معانی اصطلاحیۃ سے، جیسے جیسے وہ ظاھر ھوتے گئے ھوں، فرق ظاھر کیا گیا ھو۔ مفسّر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جس لفظ کی وہ تفسیر کرنا چاھتا ھے اس کے مادۂ لُغَویۃ میں بخوبی غور کرے تا کہ معانی لُغَویۃ ان معانی سے الگ ھو جائیں جو لُغَوی نہیں ۔ پھر مادّے کے معانی لغویۃ کے درجہ بدرجہ تغیّر کے متعلق غور کرے اور ظنّ غالب کی بنا پر ان تغیّرات میں ترتیب قائم کرے اور جو معنی زیادہ سابق اور زیادہ قدیم ھوں انھیں سابق اور قدیم پر مقدم رکھے، یہاں تک کہ اسے حتّی المقدور کلمے کے ایک معنی کو ترجیح دینے کی بابت کچھ اطمینان حاصل ھو جائے کہ اس کے لغوی معنی یہی تھے جو عرب نے سب سے پہلے قرآن کی آیت میں اسے سن کر سمجھے تھے . . . . مفسّر کے لیے یہ بھی ضروری ھے کہ ان معانیِ لغویۃ کے درمیان تمیز کرتے وقت اور ان پر غور و فکر کے اثناء میں لغات کے باھمی تعلّقات اور ان کے رشتوں کے فنّ جدید سے حتی الامکان واقفیت رکھتا ھو، تا کہ لغات کے نسب ناموں اور ان کے باھمی تعلّقات کو سمجھ کر وہ اس بات کا بھی اطمینان حاصل کر لے کہ کلمۂ زیرِ بحث اصلی عربی کلمہ ھے یا دخیل ھے، یعنی کسی اَور زبان سے لیا گیا ھے؛ اگر دخیل ھے تو اس کا پہلا ماحول اور محیط کیسا تھا اور اس کے پہلے معنی کیا تھے ۔ اسی طرح اسے اس سے بھی ھوشیار رھنے کی ضرورت ھے کہ ھمارے معاجم بعض کلمات کی کسی قدر مشابہت کی بنا پر ایک عربی اصل گھڑ لیتے ھیں اور اشتقاق اور ربط میں تکلّف سے کام لیتے ھیں [حالانکہ لفظ عربی نہیں ھوتا] .

جب مفسّر ایک لفظ کے لغوی معنی سے حسب طریقۂ بالا بحث کر چکے تو اس کے بعد اس پر غور کرنے کی نوبت آتی ھے کہ قرآن [مجید] نے اس لفظ کو کس معنے میں استعمال کیا ھے ۔ یہاں اس کی ضرورت ھے کہ قرآن [مجید] میں جتنی جگہ وہ لفظ آیا ھے ان سب مقامات کو سامنے

رکھا جائے تا کہ ان سب پر غور کر کے اس کے استعمال کی بابت کوئی رائے قائم کی جا سکے ۔ مفسر کو غور کرنا ہوگا کہ قرآن [مجید] کے مختلف ادوار اور بدلتی ہوئی فضاؤں میں اس لفظ کے معنی ایک ہی رہے یا نہیں؛ اگر ایک نہیں رہے تو اس لفظ کے لُغوی معنی یا معانی سے اس کے ان معنی یا معانی کی طرف جن میں انہیں قرآن نے استعمال کیا ہے راستہ مل جائے گا ۔ اس تمام تگ و دو سے وہ ایک نتیجے پر پہنچے گا، جس کی رو سے وہ لفظ کی اس مقام پر جہاں وہ آیتِ زیرِ بحث میں آیا ہے باطمینان تفسیر کر سکے گا .

اب سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے الراغب الاصفہانی نے اس بات کی کوشش کی کہ مفرداتِ قرآن کو ہمارے لیے ایک خاص الگ قاموس میں جمع کر دے اور اس میں اس نے ہماری بیان کردہ باتوں سے ملتی جلتی یا اپنے ابتکاری خیال کے مطابق باتوں کے جمع کرنے کی محنت اٹھائی ہے لیکن اس نے لغوی تحقیق پورے طور پر نہیں کی اور نہ قرآن [مجید] کے متعدد مقامات میں ایک لفظ کے استعمال کا باہم پورا پورا مقابلہ کیا ہے ۔ علاوہ بریں ہمارے زمانے میں جو لغاتِ عالم کا اور ان کے باہمی تعلّقات کا مطالعہ جدید طور پر ہوا ہے اس کا زمانہ اس سے خالی تھا، اس لیے وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا، لیکن بہر حال اس کی کتاب ایک ایسی ابتدائی تصنیف ہے جو اس کے بعد کے لوگوں کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہے ۔ خاص کر اس منچلے زمانے کے لوگوں کو جو یہ دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹتے ہیں کہ سوا اس ناقص قرآنی قاموس کے، جسے ابتدائی کام کہنا زیادہ موزوں ہے، کوئی اور قاموسِ قرآن ان کے پاس نہیں ۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے پیش کردہ طریق ادبی پر کاربند ہو کر اس قاموس کی تکمیل کی توقع کی جا سکتی ہے، بلکہ جدید قاموس تیار کیے جا سکتے ہیں، جن کا مطالبہ حیاتِ قرآن، جو عربی کی سب سے بڑی کتاب ہے، کر رہی ہے .

ادبی مفسّر جب مفردات میں غور و فکر کر چکے گا تو پھر مرکّبات میں غور کرنے کی باری آئے گی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بارے میں اسے علوم ادبیہ مثلاً نحو، بلاغة وغیرہ سے مدد لینا پڑے گی لیکن اس طور پر نہیں کہ فنّ نحو کوئی چیز مقصود بالذات ہے یا وہ ایک الگ رنگ ہے جسے تفسیر پر چڑھانا ہے، جیسا کہ قدیم دستور تھا، بلکہ اس اعتبار سے کہ وہ معنی کے بیان اور اس کی حد بندی کے لیے ایک آلۂ کار ہے اور ایک آیة کی مختلف قراءات میں ایک ہی معنی رہنے پر غور کرنے کا اور تمام قرآن میں ملتے جلتے استعمالوں کو باہم ملا کر دیکھنے کا بھی ذریعہ ہے ۔ پھر یہ خیال رکھنا ہوگا کہ بلاغت کے لحاظ سے ان مرکّبات پر وہ نظر نہیں ڈالی جائے گی جو نظرِ وصفی ہے اور جس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک بلاغی اصطلاح کے ساتھ قرآنی استعمال کی ٹھیک تطبیق ڈھونڈی جائے؛ یعنی یہ کہ یہ عبارت علمِ بلاغت کی فلاں صنعت کے مطابق ہے اور آیت میں اِس صنعت کے ہونے کو اُس صنعت کے ہونے پر ترجیح ہے ، یا یہ کہ یہ آیت بلاغت کی فلاں قسم میں داخل ہے فلاں قسم میں نہیں !! بلاغت کے اعتبار سے قرآن پر نظر ڈالنے کے ہرگز یہ معنے نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلاغت کا ماہرِ فن اور ادیبِ کامل اسلوبِ قرآن میں جمالِ کلام اور حسنِ ادا کی جھلکیاں بے حجاب دیکھے اور اس جمال کی ہیئت اور اس کے اوصافِ ممیّزہ صاف طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائیں، یعنی اس ماہر کے ذوق

کی آنکھوں کے سامنے جس نے عربی تراکیب کی خصوصیات کو پہچان لیا ہو اور اس کے ساتھ ہی تراکیب اور اسالیب قرآنیہ کا خوب گہرا مطالعہ کر چکا ہو اور عربی آثار کے درمیان تراکیب و اسالیبِ قرآنی میں جو مخصوص خوبیاں ہیں ان سے خوب واقف ہو چکا ہو، بلکہ فنونِ بیانِ قرآنی کے تمام شعبوں اور اس کے موضوعوں کے ایک ایک شعبے اور ایک ایک فن کی معرفت حاصل کر چکا ہو اور معرفت بھی ایسی کہ جس سے ہر ایک فن اور شعبے میں قرآن کے اسلوب کی وہ خصوصیتیں ظاہر ہو گئی ہوں جن سے اس کا جمال جلوہ گر ہوتا ہے .

اگرچہ ان باتوں کی تمنا کرنا آسان ہے اور اسے چند جملوں یا سطروں میں بیان کر دینا بھی کوئی دشوار کام نہیں لیکن اس کا پیدا کرنا اور حاصل کرنا بہت دشوار امر ہے اور اس کی بناء ادب اور بلاغت کی عام اصلاح ہی پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کل کی حیات ادبی اس بارے میں ساعی ہے اور انشاء اللہ اس میں کمال پیدا کرے گی اور قرآن کی ادبی تفسیر میں اس سے کام لے گی اور دوسری طرف اس تفسیر میں مشغول اور مصروف ہونا بجائے خود ادبی اصلاح کی تحریک کو بے حد فائدہ پہنچائے گا .

جب بات یہاں تک پہنچ چکی کہ قرآن [مجید] کی تفسیرِ ادبی کے لیے عام اصلاحِ ادبی کی ضرورت ہے تو اس موقع پر ایک اور چیز کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہیے جس کی رعایت تفسیرِ قرآن میں کرنا پڑے گی اور اسے ہم ذیل کے عنوان کے تحت پیش کرتے ہیں .

تفسیرِ نفسی :

آج کل کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ بلاغت کا علمِ نفس کے ساتھ بہت ہی گہرا تعلق ہے [بحث ''البلاغة و علم النفس'' کے عنوان سے اس مقالے کے مصنف کا ایک محاضرہ چھپ چکا ہے، دیکھیے مجلّۂ کلیة الآداب ۱۹۳۹ء، ج ۳، جزء ثانی] - اس سے قرآن [مجید] کے اعجازِ نفسی کے معترف ہونے کا دروازہ کھل گیا ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ قرآن [مجید] کی تفسیرِ نفسی کی کس قدر ضرورت ہے، جس کی بنیاد حتی الامکان ان تمام معلومات پر رکھی جانا چاہیے جو علم النفس میں ثابت ہو چکے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو میدان قرآن ان کے سامنے کھولنا چاہتا ہے ان میں نفسِ بشری کے حرکات کے اسرار کیا ہیں، یعنی وہ میدان جو قرآن کی دعوتِ دینی، اعتقادی بحث اور وجدانات و قلوب کی ورزش سے متعلّق ہیں، وہ میدان جو لوگوں کو ان کی قدیم عادات مألوفہ اور رسم و رواج سے، جو انہیں پشتہا پشت سے اور صدیوں سے ورثے میں ملتے رہے تھے، کھینچ لینے اور پھر ان کا ایمان مزیّن کرنے سے مربوط ہیں کہ جس سے ان کی قدیم مضبوط باتیں ڈھیلی پڑ گئیں اور انہیں جڑ بنیاد سے کھود کر پھینک دیا گیا . . .، قرآن نے ان تمام باتوں کو کس خوش اسلوبی سے انجام دیا اور ان وجدانی مطالب اور قلبی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کن کن نفسی حقیقتوں سے کام لیا اور اس کام لینے کا اثر دعوت کی کامیابی اور بول بالا کرنے پر کیا ہوا ان سب باتوں کی وضاحت ضروری ہے - یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیرِ نفسی ایک محکم بنیاد پر قائم ہے اور وہ بنیاد یہ ہے کہ اسلوبِ بیان کا نفس انسانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور یہ کہ تمام مختلف فنون، جن میں ادب بھی شامل ہے، نفس کے باطنی وجدانات کا ترجمہ ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں - اس مسئلے کو ہم نے اپنی جگہ پر بلاغت کے فنّی مطالعے کے

ذیل میں واضح کر دیا ہے ۔ یہاں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ قرآن کے معانی میں نفسی لحاظ سے غور کرنا بہت سے گہرے اختلافات کو شاید قوی ترین طریق سے دفع کر سکتا ہے ، یہ اختلافات مفسّرین کے درمیان شاخ در شاخ پھیلے ہوے ہیں اور ان کے لیے انھوں نے بہت سے مضبوط نظری براہین اور منطقی قیاسات گھڑ کر رکھ دیے ہیں، چنانچہ اس باب میں وہ قسم قسم کے اعراب اور پیچیدہ مسائل نحویہ، جو فن کی روح سے بہت دور ہیں، ہاتھ میں لیے ہوے ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے ہوے ہیں ؛ یا علم بیان کے خشک مسائل کا انبار لیے نظر آتے ہیں اور سوفسطائیوں کے بال کی کھال نکالنے والے لچر اور دور از کار اقوال پیش کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر دیکھیے فخر رازی، طبع بولاق، ۶ : ۵۲۱ تا ۵۳۳، تفسیر سورۃ الشعراء، آیات ۱۹۳ تا ۱۹۵ اور پھر اس کا مقابلہ انھیں آیات کی تفسیر زمخشری کی کشّاف، طبع بولاق، ۲ : ۱۳۲ سے کیجیے دونوں کے طرزِ تفسیر کا فرق بالکل عیاں ہو جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ زمخشری کا نفسی نقطۂ نظر موضوعِ زیرِ بحث کا فیصلہ قطعی طور پر کس آسانی سے کرتا ہے . . . یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسی نقطۂ نظر سے جب آیت کی ترکیب اور ساخت پر غور کیا جائے اور آیت کی فضا اور ماحول کو بھی ملا لیا جائے تو اس کا مفہوم اور مطلب بلندی میں ایک ایسے افق تک پہنچ جاتا ہے جس کی رفعت ظاہر و باہر ہے اور اگر نفسی نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے تو معنی بالکل کمزور اور کھوکھلے ہو جاتے ہیں، جس سے نہ نفس کو اطمینان حاصل ہوتا ہے ، نہ وہ اس قابل رہتے ہیں کہ انھیں مقاصدِ قرآن میں سے شمار کیا جائے ۔

تفسیرِ نفسی کے ذکر سے ہمیں استاذ امام ، خدا ان کی روح کو آرام دے!، کی وہ عبارت یاد آ گئی جو انھوں نے تفسیر اور علم الاجتماع کے باھمی رشتے کو ظاھر کرنے کے متعلق لکھی ہے .

تفسیر اور علم الاجتماع :

استاذ [مفتی محمد عبدہ مرحوم] نے فرمایا : (مقدمۃ تفسیر الفاتحۃ، ۱۶) ''احوالِ بشریہ کا علم ایک ایسی ضروری چیز ہے جس کے بغیر تفسیر مکمّل نہیں ہوتی، چنانچہ اس کتاب (قرآن مجید) میں غور کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے احوالِ بشر پر اس کے مختلف اطوار و ادوار کے لحاظ سے غور کرے اور دیکھے کہ بشر کے حالات کے اختلافات، مثلاً قوت و ضعف، عزت و ذلت، علم و جہل، ایمان و کفر، کے وجوھات کیا تھے''؟ اس بیان سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کی مراد ان باتوں سے علم الاجتماع ہے، گو انھوں نے اس کا نام نہیں لیا لیکن اس کے بعد انھوں نے یہ فرمایا کہ [مفسّر کے لیے ضروری ہے کہ] ''عالمِ کبیر کے احوال کا علم بھی رکھتا ہو ، جس میں عالمِ علوی اور عالمِ سفلی دونوں شامل ہیں ۔ اس کا علم حاصل کرنے کے لیے بہت سے فنون کی ضرورت ہے ، جن میں سے سب سے اھم ہے فن تأریخ اپنی ساری انواع کے ساتھ'' ۔ بہر حال ہمیں ان سب فنون کی طرف پوری توجہ دینا پڑے گی جن پر ادبی لحاظ سے قرآن کا سمجھنا موقوف ہے اور قرآن کا یہ فہمِ ادبی ان سب چیزوں پر مقدم ہے جو قرآن سے حاصل کی جا سکتی ہیں ۔ جب قرآن کا ادبی حیثیت سے مطالعہ مکمل ہو جائے تو اب اس سے اور مطالب کی بابت استفادہ کیا جا سکتا ہے ، جیسے خلق کی ہدایت یا ان کی حالت کی اصلاح یا ان کے لیے ایک

شرح قائم کرنا وغیرہ ۔ ان سب باتوں کی بنیاد بڑی مضبوط اساس پر رکھنا چاهیے اور وہ اساس وهی درسِ ادبی هے جسے میں نے عام طور پر اوپر بیان کیا ۔ اس درسِ ادبی کا پہلا اور قریبی تعلق فضائل و کمالاتِ نفسیه سے هے، جس کا ذکر میں کر چکا هوں ۔ اس کے بعد اس کا تعلق دوسرے مقاصد سے بھی هو سکتا هے، مثلاً علم الاجتماع وغیرہ سے ۔

یہاں تک میں نے تفسیرِ ادبی اور اس کے عظیم الشان اغراض و مقاصد کی بابت جو کچھ کہنا تھا کہا ۔ اس کے بعد میں وہ بات کہنا چاهتا هوں جسے میں مطالعۂ ادبیة یا غیر ادبیة کے باریک اور دشوار راستے کی تشریح کرتے وقت کبھی نہیں بھولتا ۔ میرا روے سخن ان حضرات کی طرف هے جو تفسیر میں کثرت کے طالب هیں ۔ جن مقاصد کو میں نے پیش کیا هے انھیں پیشِ نظر رکھنے سے جو بھی اثر پڑے، همارے قدم بوجھل هو جائیں اور همارے طریقِ مطالعه کے ثمرات بہت دن میں جا کر ظاهر هوں اور هر قدم پر اپنی کوتاهیوں کا شعور همارا دامنگیر هو اور ان پر همازا ضمیر همیں ملامت کرے ، پھر بھی حقیقت وهی هے جو میں نے عرض کی اور وهی کام کرنا واجب هے جو میں نے کہا ۔ یه حقیقت تسلیم کر لینا اس سے کہیں بہتر هے که اپنے آپ کو دھوکے میں مبتلا رکھیں اور اسلاف کی بابت غلط راے قائم کریں اور یه گمان کرنے لگیں که جو کچھ هوا یا هو رہا هے وہ بالکل کافی هے اور همارے پاس فہمِ قرآن کا مکمل سامان موجود هے ۔ اگر همارے پاس کمال کا فقط یہی شعبه رهے که همیں اپنی کوتاهی کا ٹھیک ٹھیک شعور هو جائے تو یه بھی اس سے بدرجہا بہتر هے که نکمے مال کا ڈھیر لگتا چلا جائے ۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو جو مقصد میں پیش کر رہا هوں ناممکن نہیں اور ایسا بھی نہیں که مشکل سے شکل پذیر هو ۔ خود همارے اسلاف اجمالی طور پر اس کا شعور رکھتے تھے اور قرآن [مجید] کے بارے میں انھوں نے کچھ کچھ اس پر عمل بھی کیا هے ۔ دورِ جدید کے علماء نے تو اسے بالکل اپنا نصب العین بنا لیا هے اور اپنی ادبی اور دینی کتابوں کو سراسر اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے هیں ۔ همیں ان دونوں کے درمیان کھوئے هوے عاجزوں کی ایک جماعت بن کر هرگز نہیں رهنا چاهیے ۔

میں اخیر میں کہه دینا چاهتا هوں که اس مقالے میں اکثر مقام پر ایجازِ جامع اور اجمالِ دلالت آمیز سے کام لیا گیا هے لیکن وہ اس مقصد کے لیے کافی هے که فنِّ تفسیر میں شاندار مرتبه رکھنے والے اصحاب کو درس و بحث کے وسیع میدانوں کے دروازے کھولنے کی ترغیب دے ۔ هاں اگر اس میں هر قاری کو اس کے مطلب کی بات نه مل سکے تو مجھے موردِ ملامت نه ٹھیرایا جائے ۔ یہاں پوری بحث کا موقع هی نہیں ۔

مآخذ : مقالے میں مذکورہ کتب و رسائل کے علاوہ : (۱) امین الخولی : مدخل لدرس التفسیر و بیان المنهج الجامعی فیه (مطالعۂ تفسیر کے مبادی اور اس کا جامعی پروگرام) ۔ یه لکچروں کا ایک مجموعه هے جو مصنف نے کلیة الآداب مین دیے (مخطوطه)؛ (۲) امین الخولی : دراسات لبعض موضوعات القرآن ۔ اس میں قرآن [مجید] کے بعض موضوعوں سے بحث کی گئی هے؛ مثلاً قصص، امثال، تشبیه وغیرہ ۔ یه کلیة الآداب میں بصورت مخطوطه موجود هے؛ (۳) امین الخولی : اخلاق القرآن و مَن هَدی القرآن (قرآن کے اور قرآن سے هدایت یافته لوگوں کے اخلاق) ۔ اس میں پچاس سے کچھ اوپر محاضرات هیں ، جو تفسیرِ نفسی اور اجتماعی کے رنگ میں تیار کیے گئے هیں ۔ اس میں لغوی شعور اور قرآن [مجید] کی ابتدائی ادبی فضا سے مدد لی گئی هے ۔ اس کے دس سے زائد حصے مصری ریڈیو کے مجلّے

(۱۹۳۱ء و ۱۹۳۲ء) میں شائع کیے جا چکے ھیں ۔
[از دائرۃ المعارف الاسلامیۃ ، قاھرۃ]. (امین الخولی)

تفسیر (۳) : پاکستان و ہندوستان میں تفسیر نویسی

چونکہ قرآن عربی میں ھے اس لیے عربی کے علاوہ ھر زبان میں تشریحِ مطلب کا پہلا اور ضروری مرحلہ ترجمہ ھے ۔ ترجمہ، تشریحِ معانی، بیانِ مفہوم، حلِّ لغات و ترکیب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک معنی میں تفسیر ھی ھے ، اس لیے فارسی، اردو اور انگریزی وغیرہ میں عربی تفاسیر کے انداز پر جتنی بھی تفسیریں لکھی گئی ھیں ان میں عموماً ترجمے کو اہمیّت دی گئی ھے .

پس منظر

ہندوستان میں عربی و فارسی مسلمانوں کے ساتھ آئی ۔ مسلمانوں نے دوسری صدی ھجری/ آٹھویں صدی میلادی میں یہاں پہنچ کر اسلامی عقائد کی تبلیغ کے وقت یہاں کی مقامی بولیاں استعمال کیں اور ھندیوں نے بھی دین سمجھنے کے لیے مسلمانوں سے اپنی زبان میں قرآن و حدیث سمجھنے کا مطالبہ کیا ہوگا ، چنانچہ کہتے ھیں کہ ایک ھندی راجہ مہروك بن رائق تاجدار ''الرا'' کی فرمائش سے ۲۷۰ھ / ۸۸۳ء میں عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز صاحبِ منصورہ (ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین، لاھور مئی ۱۹۵۰ء، ص ۵۳ ببعد) نے کسی عراقی الاصل سندھی عالم سے، جس کی نشو و نما ھند ھی میں ہوئی تھی اور جو وھاں کی مختلف زبانیں جانتا تھا، ''ھندیۃ'' زبان میں تفسیر قرآن لکھوائی، جو اقلًّا سورۂ یٰسٓ تک پہنچی تھی (بُزُرگ بن شہریار: کتاب عجائب الہند، لائڈن ۱۸۸۳ - ۱۸۸۶ء، ص 3) - پانچویں صدی ھجری / گیارھویں صدی میلادی تک سندھ، راجپوتانہ اور پنجاب میں علماء و صوفیہ نے درسِ قرآن و تفسیر نویسی میں کیا خدمتیں انجام دیں ؟ تأریخ اس کا جواب اشاروں ھی میں دیتی ھے ۔ دورِ غزنویہ (۳۵۱ - ۵۸۲ھ/ ۹۶۲-۱۱۸۶ء) میں لاھور نے علمی مرکزیت حاصل کی اور علمائے تفسیر میں سید محمد اسماعیل بخاری (م ۴۴۸ھ / ۱۰۵۶ء) کا نام علمائے رجال نے بڑی اھمیت کے ساتھ بیان کیا ھے (تذکرۂ علمائے ھند، ۱۷۹؛ حدائق الحنفیۃ، ۱۹۳) - اس کے بعد زمخشری (م ۵۳۸ھ/ ۱۱۴۳ء)، رازی (م ۶۰۶ھ/ ۱۲۰۹ء) اور بیضاوی (م ۶۱۶ھ / ۱۳۱۶ء) کے انداز پر فلسفیانہ و متصوّفانہ تفاسیر کا سلسلہ شروع ھوا ۔ شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) پہلے شخص ھیں جنھوں نے تفسیر کے لیے تقلیدی راستہ بدلنے کی کوشش کی اور فنِّ تفسیر پر اصولی و فکری کتاب الفوزالکبیر لکھی ۔ ان کے بعد سر سید احمد خاں (م ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۷ء) نے اصولِ تفسیر پر سوچا (مکاتبات الخُلّان، طبع محمد عثمان مقبول، ۱۹۱۰ء، نیز رك بہ مکاتیب سر سید، طبع لاھور ۱۹۵۹ء، ص ۱۳۱) اور تحریر فی اصول التفسیر (طبع آگرہ ۱۸۹۲ء) لکھی ۔ شاہ ولی اللہ اور سر سیّد کی اصولی کتابوں اور فکری تفسیروں کے بعد متّحدہ ھندوستان میں مثبت و منفی کام بڑی تیزی و فراوانی سے ھونے لگا ۔ محمد عبدالحق حقّانی دھلوی، مرزا حیرت، نواب سیّد صدیق حسن خاں وغیرہ نے اپنی اپنی تفسیروں کے مبسوط مقدّمات اور جداگانہ تألیفات میں اصولِ تفسیر پر بحث کی لیکن جمال الدین افغانی (م ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۷ء) اور محمد عبدہٗ (م ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کی تحریک نے متّحدہ ھندوستان میں جہاں اور اثر ڈالے وھاں قرآن و تفسیر کے لیے بھی ایک نئی روشنی پیدا کی ۔ (احمد) ابوالکلام آزاد

(م ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن کے مقدمے (ص۹ — ۱۹) میں نئے فکری اصول، چودہ بنیادی نکتوں میں، بیان کر کے مفسّرین کے لیے ایک نئی شاھراہ بنائی؛ اسی طرح خواجہ عبدالحی، حمیدالدین فراھی اور ان سے ذرا ھٹ کر علی نقی لکھنوی (مقدمۂ تفسیر (اردو)، طبع ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء؛ وھی کتاب، عربی، طبع ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء) نے کام کیا ۔ اس کے بعد ملکی ضرورتوں، علمی بصیرتوں اور عالم گیر دعوت و تبلیغ کے لیے قرآن فہمی کا آسان و واضح ترین طریقه دریافت کرنے کی کوشش کی گئی (رک مذاھب التفسیر الاسلامی، طبع مصر ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء، ص ۳۴۶)؛ خصوصاً انگریزی تفاسیر مرتّب کرنے میں اس ملک میں نمایاں کام ھوا ۔ آج کل، جب که اسلامی دنیا تفسیر سے قریب اور قرآن فہمی میں کوشاں ھے، پاك و ھند میں بھی اکثر اربابِ فکر و نظر علماء اس سلسلے میں مصروفِ کاوشِ فکر و قلم ھیں .

تفسیریں جو پاك و ھند میں لکھی گئیں

تأریخی لحاظ سے پاك و ھند کا موجودہ سلسلۂ تفسیر عرب و ایران کی تأریخ تفسیر سے بہت بعد شروع ھوتا ھے ۔ تفسیروں کی کثرت اور بعض تفاسیر کی تأریخِ تألیف کی نایابی کی وجه سے ان تمام تألیفات کا تأریخ وار تذکرہ دشوار ھے ، اس لیے ھم (۱) عربی (۲) فارسی (۳) اردو (۴) انگریزی اور (۵) اردو کے علاوہ بعض دیگر ملکی زبانوں کی تفاسیر میں سے چند مشہور ترین کتابوں کا مختصراً تذکرہ کریں گے .

(۱) عربی تفسیریں :

ھمارے علم میں عربی کی سب سے پہلی تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان (تہران ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء) ھے ، جو نظام‌الدین حسن بن محمد بن حسین شافعی قمّی مشہور بالنظام الاعرج (بغیة الوعاة ، ۲۳۰) یا نظام نیشاپوری دولت آبادی کی تألیف ھے ۔ یه تفسیر دولت آباد (دکن) میں مکمّل ھوئی، جلد اول و سوم ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء میں اور جلد دوم ۱۱ محرم ۷۲۸ھ/۱۳۲۷ء میں (ملاحظه ھو طبع تہران، ھر جلد کے صفحۂ آخر پر ترقیمه) ۔ مؤلف اور کتاب کا فقط اجمالی ذکر روضات الجنات، طبع اول ، ۲۲۵ ؛ حدائق الحنفیة ، ۳۱۹ ؛ فہرست کتابخانۂ آستانۂ قدس رضوی ، ۴ : ۳۳۶ ؛ براکلمان : تکملة ، ۲ : ۲۷۳ میں آیا ھے .

غرائب القرآن بلحاظِ ترتیب و مواد بڑی عمدہ تفسیر ھے اور بلا شبهه اسے کشّاف و تفسیر کبیر کے برابر کی کتاب ماننا چاھیے ۔ نظام نیشاپوری نے اگر یه تفسیر ھندوستان میں لکھی ھے تو وہ ھمارے علم میں پہلا فارسی مترجمِ قرآن بھی ھے که پہلے آیات کا ترجمه (طبع مصر ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء ، برھامش تفسیر طبری میں فارسی ترجمه نہیں ھے) پھر قراءاۃ ، وقوف ، وجوہ بلاغت، معانیِ حقیقی و مجازی، عقائد اور فقہِ شافعی وغیرہ سے تفصیلی بحث کرتا ھے ۔ عموماً اس کا اسلوب واضح اور اندازِ بیان سلجھا ھوا ھے .

نظام کے بعد عربی کی دوسری تفسیر جنوبی ھند کے مشہور صوفی شیخ زین‌الدین (علاءالدین) علی بن احمد بن علی المہائمی ھندی مشہور به مخدوم علی کی تألیف تبصیرالرحمٰن و تیسیرالمنّان ببعض ما یشیر الی اعجاز القرآن (مشہور به تفسیر رحمانی و تفسیر مہائمی) ھے ۔ مخدوم علی، مہائمِ بمبئی (ھند) کے مرکزِ عقیدت بزرگ ھیں ۔ وہ محیِ‌الدین ابن عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کے مفسّر اور فقہِ شافعی کے عالم ھیں ۔ چونکه مہائمی کی تاریخِ وفات ۸ جمادی‌الآخرة ۸۳۵ھ / ۱۴۳۱ء (حدائق الحنفیة ، ۳۱۷ ؛ تذکرۂ علمائے ھند، ۱۶۷ ؛ زبید احمد : The Contribution of India

to Arabic Literature ، ۱۰ : اکسیر ، ۵۹) ھے، اس لیے یہ ممکن ھے کہ تفسیرِ مہائمی غرائب القرآن سے کچھ پہلے تألیف ہوئی ہو ۔ تبصیرالرحمن سادہ عربی میں متوسط تفسیر ھے، جس میں ربطِ آیات، سورتوں کے تسلسل، معانی صوفیہ اور مطالب فقہیہ کا بیان موزوں انداز میں کیا گیا ھے (انور شاہ : مشکلات القرآن ، ۲٦ ؛ مجموعۂ تفاسیر فراھی، ۵۸) ۔ تفسیر رحمانی ہند و مصر (۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء) میں چھپ چکی ھے ۔ تیسری تفسیر محمد بن احمد میانجی (م ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء) نے تفسیر المحمدی کے نام سے لکھی، جس میں خصوصیت کے ساتھ ربطِ آیات کی طرف توجہ دی ھے (زبید احمد، ص ۱٦) ۔

یہاں شیخ مبارک بن شیخ خضر ناگوری (م ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۲ء) کی تفسیر کا ذکر بھی کرنا چاہیے، جو انھوں نے آخری عمر میں منبع نفائس العیون کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں لکھی، ''مانندِ تفسیر کبیر'' (بداؤنی ، ۳ : ۷۴) ۔ مآثر الکرام، ص ۱۹۷ میں اس کا نام منبع عیون المعانی دیا ھے ۔ اس کے کسی نسخے کے وجود کا ہمیں علم نہیں ھے ۔

پانچویں تفسیر ابو سعید احمد مشہور بہ ملا جیون بن عبداللہ الحنفی المالکی ساکن امیٹھی ضلع لکھنئو (م ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء) کی التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشریعۃ ھے، جس نے بڑی عظمت و شہرت حاصل کی ۔ مصنّف نے یہ تفسیر ۱۰٦۴ھ/ ۱٦۵۴ء میں شروع اور ۱۰٦۹ھ/ ۱٦۵۹ء میں امیٹھی میں مکمل کی ۔ یہ کتاب کلکتہ، قازان وغیرہ میں چھپ چکی ھے (براکلمان : تکملۃ، ۲ : ٦۱۲ ؛ حدائق، ۳۳٦، اکسیر، ۳۴) ۔

ہندوستان کی چھٹی مشہور و مقبول عربی تفسیر قاضی محمد ثناءاللہ پانی‌پتی حنفی (م یکم رجب ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) کی تالیف ھے ۔ قاضی صاحب نے اپنے مرشد مرزا مظہر جانِ جاناں دھلوی (م ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) کے نام پر کتاب کا نام التفسیر المظہری رکھا (طبع دھلی) ۔ علماء نے اس کے عارفانہ و فقیہانہ مباحث کو بہت پسند کیا ھے (مشکلات القرآن ، ۲٦ : اکسیر ، ۱۰۳ ؛ تذکرۂ علمائے ہند ، ۳۸) ۔ پھر نواب سید صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) نے فتح البیان فی مقاصد القرآن لکھی (بھوپال ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء، ۸ جلد: بولاق ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء) ۔ اس کا اردو ترجمہ ترجمان القرآن بلطائف البیان کے نام سے خود مؤلّف نے ناتمام چھوڑا مگر ان کے بعد ذوالفقار احمد صدر الصدور بھوپال (جو ۱۳۰۷ھ میں ابھی بقید حیات تھے) نے مکمّل کیا (طبع ۱۳۰٦ھ) ۔ ان کی ایک اور عربی تفسیر، جو جزئی ھے، نیل المرام فی احکام القرآن کے نام سے ہند و مصر میں مکرر طبع ہو چکی ھے (۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۹ء کی مصری طباعت میں تفسیر کا نام یوں دیا ھے : نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام) ۔ ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء میں ثناءاللہ امرتسری (م ۱۹۴۸ء) کی تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن شائع ہوئی، جو ان کی اردو تفسیر (تفسیر ثنائی) سے ذرا مختلف اور کسی قدر علمی ھے ۔ مؤلّف نے بڑی کاوش کر کے آیات کی تفسیر میں آیات مع حوالۂ رکوع وغیرہ جمع کر دی ہیں ۔ ان تفاسیر کے علاوہ ادبی تفسیروں میں ملک الشعراء فیضی (م ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء) کی غیر منقوطہ تفسیر ھے، بنام سواطع الالہام، تألیف ۱۰۰۲ھ (طبع لکھنئو ۱۳۰٦ھ / ۱۸۸۸ء) ۔ اسی طرح عبدالاحد بن امام علی الہ‌آبادی (زبید احمد، ۲۵ ؛ قب ایلّس Ellis : *Cat. of Arabic Books in the Br. Mus.*، عمود ۷۴ : امام علی (بجائے عبدالاحد بن امام علی)) نے منقوطہ تفسیر

پارۂ عمّ جبّ شغب یا فیض غیب کے نام سے لکھی، (الہ آباد ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء، صفحات ۲۰۷)۔ دونوں تفسیریں مؤلّفین کی قدرتِ قلم و مہارتِ عربی پر دلیل ہیں، لیکن مفتی محمد عبّاس (م رجب ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء [زبید احمد: ۲۰]) کی روائح (روح) القرآن فی فضائل اُمناء الرحمن (لکھنؤ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء، فہرست کتب خانۂ آستانۂ رضویہ، ۴ : ۸۸م؛ تجلّیات، ۳۸)، حمیدالدین فراھی (م ۱۹ جمادی الآخرة ۱۳۴۹ھ / ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء) کی کتاب نظام القرآن و تأویل الفرقان بالفرقان فکر و تحقیق کے علاوہ عربی اسالیبِ ادب کے پسندیدہ ترین نمونے ھیں۔ نامکمّل یا موضوعاتی عربی تفاسیر میں سید انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء) کی کتاب مشکلات القرآن کا تذکرہ بھی ضروری ھے ۔ ان کتابوں کے علاوہ مکمّل و نامکمّل مشکلات و عقائد اور منفرد سورتوں کی تفسیروں یا مشہور عربی تفسیروں پر حاشیہ لکھنا علماے ہند کا محبوب مشغلہ رہا ھے، جن کی تفصیل یہاں نہیں دی جا سکتی ۔

(۲) فارسی تفسیریں :

فارسی پاکستان و ہند کی سرکاری و علمی زبان رہی ھے ، اس لیے عام علمی تصانیف کی طرح تفسیرِ قرآن کے لیے بھی فارسی استعمال ہوئی، چنانچہ نظام نیشاپوری (رکّ به سطورِ بالا) کی عربی تفسیر میں فارسی ترجمه اس سلسلے کا پہلا نمونه ھے۔ پھر محمد بن احمد معروف به خواجگی شیرازی نے مختصر تفسیر لکھی ، جو در حقیقت تفسیر مجمع البیان (طبرسی ، م ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء) کا خلاصه ھے (مقدمۂ تفسیر القران (اردو) ، ۲۳۱؛ ایضاً عربی ، ۹۲)۔ شمالی ہند کی پہلی تفسیر بحرِ موّاج (لکھنؤ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) ھے ، جس کے مؤلّف ھیں ملک العلماء قاضی شہاب الدین احمد بن شمس الدین بن عمر زاولی غزنوی دولت آبادی (م ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء)

شاگردِ ملّا خواجگی (سٹوری، ۱ : ۱۰، ۱۱۹۳)۔ یه جونپور کے قاضی تھے ۔ یه ضخیم تفسیر ابراھیم شاہ شرقی والی جونپور کے نام معنوَن کی گئی تھی (تذکرۂ علماے ہند، ۸۸ ؛ حدائق الحنفیة، ۳۱۹؛ اکسیر، ۳۸م، ۱۱۳؛ بلاغ المبین، ۳ : ۸۲ تا ۸۵)۔ بحرموّاج ترکیبِ نحوی، مسائلِ فقه و عقائد پر مشتمل ھے اور ہندوستان کی تفسیروں میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ھے ۔ بحر موّاج کے بعد حکیم فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ / ۱۵۸۸ء) نے ایک تفسیر لکھی (دیکھیے تذکرۂ علماے ہند، ۱۶۰ ؛ اکسیر، ۱۱۳)۔

سلطان عالمگیر (م ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء) کے عہد سلطنت میں کئی تفسیریں تألیف کی گئیں ، جن میں تفسیر امینی، محمد امین صدیقی (سٹوری، ۱۹) اور مرزا نورالدین عالی (نعمت خان) (م ۱۱۲۱ھ/ ۱۷۰۹ء) کی تفسیر نعمتِ عظمیٰ کا تذکرہ ملتا ھے (سٹوری، ۱۹، ۲۰، مقدمۂ تفسیر قرآن (اردو)، ۲۳۳؛ ایضاً (عربی)، ۹۳)۔ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء میں شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) نے فتح الرحمن بترجمة القرآن کے نام سے فارسی ترجمه اور تفسیری حواشی لکھے (فتح الرحمن متعدد بار شائع ہو چکی ھے، سٹوری ، ۲۰)۔ پھر ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز دھلوی (م ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) نے فتح العزیز معروف به تفسیر عزیزی لکھی، جو ۱۲۴۸ - ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۲ - ۱۸۳۴ء ھی میں کلکتے سے شائع ہوئی (سٹوری، ۴۲؛ تذکرۂ علماے ہند، ۱۲۲؛ اکسیر، ۸۹، [اردو ترجمه، دو پارۂ آخر، طبع بمبئی و سورۂ ۱ و ۲ تا آیۂ ۱۸۰ باسم بستان التفاسیر، بمبئی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء])۔ آخری دور میں ایک ضخیم تفسیر سیّد ابوالقاسم رضوی کشمیری لاھوری (م ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۹ء) نے لوامع التنزیل و سواطع التأویل لکھنا شروع کی ۔ یه تفسیر تفاسیر کا مجموعه اور مباحثات و مناظرات،

مفسّرین اہلِ سنت و شیعہ کے اقوال کا ذخیرہ ہے ۔ مؤلف نے ہر پارے کی تفسیر ایک جلد میں شائع کرنا شروع کی، جو ان کے صاحبزادے سید علی حائری (سٹوری، ۳۰) (م ۲ جمادی الآخرة ۱۳۶۰ھ / ۲۸ جون ۱۹۴۱ء) نے چودھویں جلد سے لکھنا شروع کی ۔ موصوف کے قلم سے لکھی ہوئی ۲۷ ویں جلد سورۂ قمر کی دس آیتوں تک میری نظر سے گذری ہے، جو آخری ایام زندگی کی تحریر تھی (مطبوعہ اجزاء کے لیے ملاحظہ ہو سٹوری، محلّ مذکور) ۔

(۳) اردو تفسیریں :

اردو میں پہلا تشریحی ترجمہ حکیم محمد شریف خان (م ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء) بن محمد اکمل خان نے لکھا (حامد حسن : داستان تاریخ اردو، طبع دوم، ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۴) ۔ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء میں شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ (م ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء) نے موضح القرآن کے نام سے ترجمہ و حواشی لکھے ۔ پھر ان کے بھائی شاہ رفیع الدین (م ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء) نے ترجمہ لکھا (طبع اول، ۱۲۵۴ھ، طبع دوم، ۱۲۶۶ھ) ۔ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں سید علی مجتہد (م ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء) بن سید دلدار علی نے توضیح مجید فی تنقیح کلام اللہ الحمید کے نام سے ترجمہ اور سادہ تفسیر لکھی، جو اسی زمانے میں لکھنئو سے چھپی (سید احمد : ورثة الانبیاء، ۴۱؛ سبط الحسن : مجلۂ الواعظ، ۱۸؛ علی نقی : مقدمۂ تفسیر القران (اردو)، ۲۴۳؛ ایضاً عربی، ۹۹) ۔ دکن میں قاضی بدرالدولہ خلف شرف الملک (م ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء) نے فیض الکریم کے نام سے ایک تفسیر لکھی (داستان تاریخ اردو، ۴۶) ۔ متحدہ ہندوستان میں یہ دور تراجم و تفاسیر کے لیے بہت اہم ہے اور مختلف صوبوں میں علماء کام کر رہے تھے کہ انگریزی مبلّغین اور آئے دن کے مناظرین نے رنگ بدلا اور اس سلسلے میں پنجاب سے امام الدین مسیحی امرتسری (۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء) نے اردو ترجمۂ قرآن لکھا، جو رومن رسم الخط میں چھپا ۔ ۱۸۹۴ء میں عمادالدین مسیحی کا اردو ترجمہ چھپا (رومن رسم خط میں : لکھنئو ۱۹۰۰ء) ۔ شاید اسی لیے مسلمانوں میں تاج العلماء علی محمد (م ۱۳۱۲ھ) کا لکھا ہوا ترجمہ بلا متن نواب حاجی محمد قلی خان کانپوری نے ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں لکھنئو سے شائع کرایا ۔ ظاہر ہے کہ اپنے ترجموں کے بعد عیسائی مناظر اور زیادہ شیر ہوے ہونگے ۔ ادھر اونچے طبقوں میں عیسائی اپنے مذہب کی برتری اور اسلام کی کمتری بیان کرنے کے لیے معجزات، احادیث اور تفسیر پر بحث کرتے ہونگے ۔ اس رجحان سے متأثر ہوکر سر سید احمد خان (م ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء) نے تفسیرِ قرآن لکھنا شروع کی اور اس کی پہلی جلد ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں چھاپ دی ۔ ابھی چھے جلدیں (آخر سورة الانبیاء تک، ۱۸۹۵ء) ہی شائع ہوئی تھیں کہ پورا ملک احتجاج کرنے لگا، پھر بھی تفسیر سورۂ جنّ، تفسیر السّموات، ازالة الغین عن قصة ذی القرنین، ترقیم فی قصة اصحاب الکہف و الرقیم وغیرہ شائع کر کے رہے ۔ علماء نے ان کے خیالات، عقائد اور تألیفات کے ردّ میں کتابیں لکھیں اور مفسّرین نے اردو میں تفسیریں لکھنا شروع کیں، جن میں تفسیر عمدة البیان تألیف عمّار علی رئیس سونی پت (م صفر ۱۳۰۴ھ / اکتوبر ۱۸۸۶ء) (دھلی ۱۳۰۷ھ، ۳ جلد، *Suppl. Catal. of* : A. G. Ellis و A. S. Fulton *Arabic Printed Books*)، لنڈن ۱۹۲۶ء، عمود ۲۰۱)؛ تفسیر رؤفی تألیف رؤف احمد نقشبندی، لکھنئو ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء؛ امیر علی : تفسیر مواہب الرحمٰن (= جامع البیان)، لکھنئو ۱۳۱۹ھ /

۱۹۰۲ء اور عبدالحق حقّانی (م ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء) کی تفسیر فتح المنّان (= تفسیر حقّانی)، دھلی ۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۳ء نے بڑی شہرت پائی ۔ تفسیر حقّانی ترجمۂ آیات، بیانِ شانِ نزول، ترکیبِ نحوی، تفسیر، تفصیل و حواشی پر مشتمل ھے ۔ مسائلِ تصوف، واعظانہ انداز اور مناظرانہ اسلوب کی وجہ سے کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور صدیق حسن خاں، ثناءاللہ امرتسری، محمد احتشام‌الدین مرادآبادی، عبدالحکیم خان (م ۱۹۴۰ء) مؤلفِ تفسیر القرآن بالقرآن (طبع ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۱ء) و حمائل التفسیر (طبع ۱۹۰۵ء) اور وحیدالزماں خاں حیدرآبادی نے اردو میں تفسیریں اور مرزا حیرت، انشاءاللہ خاں لاھوری، فتح محمد خاں جالندھری، فیروزالدین سیالکوٹی اور میر محمد سعید حیدر آبادی (صاحبِ درس القرآن) نے اردو میں ترجمہ اور تفسیری حواشی لکھے مگر انھیں جو مقبولیت حاصل نہ ھو سکی وہ ڈپٹی نذیر احمد (م ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء) نے اپنے ترجمہ و تفسیرِ مختصر کی بدولت حاصل کر لی (اس تفسیر کا دسواں ایڈیشن ذرا مبسوط طریقے سے جامع المصاحف کے نام سے ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں شائع کیا گیا.

شیعوں میں اس عھد کی مشھور و مقبول تفسیر و ترجمہ تنویر البیان از سید محمد حسین (م ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء) ھے، جس کا پھلا ایڈیشن سنہ اور پریس کے تذکرے سے خالی ھے ۔ پھر اس کے دو ایڈیشن آگرے (۱۸۹۵ء و ۱۹۰۴ء) میں چھپے ۔ ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء میں حافظ فرمان علی (م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء) کا ترجمہ مع مختصر حواشی شائع ھوکر مقبول خاص و عام ھوا ۔ پھر ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء میں حاجی مقبول احمد دھلوی (۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) کے ترجمہ و تفسیر نے بڑی شھرت حاصل کی ۔ مرزا احمد علی، محمد بشیر، یوسف حسین، علی نقی اور محمد صادق صاحبان کے تراجم و تفاسیر بالکل تازہ ترین تألیفات ھیں .

محمود حسن (شیخ الھند) (م ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء) اور شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء) کا ترجمہ و تفسیر اپنے اختصار و جامعیت کی بنا پر اس قدر مقبول ھے کہ اکابر علماء درس کے لیے بھی اس کا مطالعہ کرتے ھیں ۔ حکومتِ افغانستان نے بڑے اعلٰی پیمانے پر خاص اھتمام سے اس ترجمہ و تفسیر کا فارسی ترجمہ بھی شائع کرایا ھے ۔ ۱۹۲۲ء میں محمد علی احمدی (م ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء) نے بیان القرآن کے نام سے ترجمۂ اردو مع تفسیری حواشی (۳ جلد)، لاھور سے شائع کیا ۔ اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۳ء) کا ترجمہ و مختصر تفسیر بھی اپنے مواد و بیان کے لحاظ سے بھت پسند کی جاتی ھے .

یہ سب تفسیریں در حقیقت اثری اور سابقین کے معیّن کردہ اصولوں پر مبنی ھیں، اگرچہ علم و عھد کی تبدیلی سے ھر ایک میں ندرت و خوبی ھے لیکن کامل تجدّد اور فکر آزاد کا مظاھرہ، جس کا نقشِ اول سر سید ڈال گئے تھے، اس کی اصلاح و تعمیر ابوالکلام آزاد، حمیدالدین فراھی، خواجہ عبدالحی، عبیداللہ سندھی (م ۱۹۴۴ء) اور ان کے ساتھیوں کے قلم سے ھوئی اور آج کل ھندوستان و پاکستان کے صاحبانِ فکر و نظر جس تنّوع و تحقیق کے ساتھ مصروفِ عمل ھیں وہ مستقبلِ قریب میں زیادہ سے زیادہ سودمند ھو کے رھے گا .

موجودہ ذخیرۂ تفسیر کو دیکھ کر یہ کھنا شاید مشکل نھیں کہ ھندوستان و پاکستان میں قرآن پر اس مختصر سے عرصے میں خاصا کام ھوا ھے .

ھند و پاکستان میں شعراء نے مکمّل قرآن کی منظوم تفسیریں بھی لکھی ھیں، جیسے عبدالسلام (م ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء) کی تفسیر

زادالآخرت (لکھنؤ؛ حدائق، ۳۷۳) اور آغا شاعر قزلباش دہلوی (م ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء) کی تفسیرِ منظوم (طبع لاہور و دکن) ۔ ان کے علاوہ بھی لوگوں نے کوششیں کی ہیں اور بعض حضرات اب بھی مصروفِ نظم ہیں .

(۴) انگریزی تفسیریں :

بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی طرف سے انگریزی تراجم کا آغاز ہوا ۔ بظاہر سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں ایک انگریزی ترجمہ سیالکوٹ سے شائع ہوا، جس پر مترجم کا نام نہ تھا (فُلٹن و ایلس، عمود ۵۲۶) ۔ پھر ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر عبدالحکیم خاں پٹیالوی نے اپنی تفسیر مع ترجمہ شائع کرائی، جس میں تفسیر القرآن بالقرآن پر خصوصی توجہ ہوئی ہے ۔ ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل الٰہ آبادی نے راڈویل J. M. Rodwell اور نولڈکہ Nöldeke کے انداز پر قدرے اختلاف کے ساتھ قرآن کی سورتوں کو نزولی ترتیب دے کر لفظی ترجمے اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع کیا (اجمل خاں : ترتیب نزول قرآن مجید، ص ۷۲)، جسے بعض علمی [حلقوں] نے سراہا (ڈاکٹر عبدالحلیم النجّار : مذاہب التفسیر الاسلامی، ۳۴۶، قاہرۃ ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۵ء) ۔ اس کے بعد کئی اور ترجمے شائع ہوے (رکّ بہ عبداللہ یوسف علی : مقدمۂ ترجمہ و تفسیر، ص xiv) ۔ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء میں محمد علی احمدی کی انگریزی تفسیر حامل المتن (طباعت اول ۱۹۱۷ء؛ طباعت بعد نظر ثانی ۱۹۵۵ء) شائع ہوئی ۔ ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں بادشاہ حسین سیتاپوری کا ترجمہ و تفسیر لکھنؤ سے شائع ہوا اور بادشاہ حسین کے انتقال کے بعد سید افتخار حسین جج (م ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۱ء) نے آخری پندرہ پاروں کی تفسیر و ترجمہ مکمل کیا ۔ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں عبداللہ یوسف علی (م ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء) کی مفصّل تفسیر مع متن لاہور سے شائع ہوئی ۔ شیر علی احمدی (م ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء) کا ترجمہ مع متن و مبسوط تفسیر (۱۰ پارے) لاہور سے (۱۹۴۷ و ۱۹۴۸ء میں) شائع ہو چکے ہیں، باقی زیر طبع ہیں ۔ خادم رحمانی نوری کا ترجمہ مع حواشی لاہور سے باقساط شائع ہو رہا ہے (۱۹۵۸ء ـــ) ۔ محمد مارماڈ یوک پکتھال کا ترجمہ مع حواشی حیدرآباد دکن سے ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں چھپا، جس نے بڑی شہرت حاصل کی ۔ سیٹھ محمد علی حبیب (م ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء) کا ترجمہ مع حواشی کراچی میں چھپا لیکن عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر کا، جو باقساط شائع ہو رہی ہے، شہرہ زیادہ ہے .

یہ ترجمے اور حاشیے عصری رجحانات و طریقِ افہام و تفہیم پر مبنی ہیں ۔ ہر ایک نے اپنے رجحانات کو بغیر بحث و مناظرہ اچھے سے اچھے اسلوب میں سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ ان میں نہ عام روایتی طویل قصّے ہیں نہ علمِ کلام کے الجھے ہوے مسائل و دلائل، سادہ سا اسلوب اور عام فہم باتیں، تحلیلی مطالب اور توضیحی معانی لکھے ہیں، تا کہ ماحول اور معاشرہ اگر قبول کرنا چاہے تو راستے کھلے ہوں .

(یہاں ہم قرآن مجید کے اس جرمن ترجمے اور تفسیری تعلیقات کا بھی ذکر کیے دیتے ہیں جو صدرالدین احمدی نے ۱۹۳۹ء میں برلن سے شائع کیا) .

(۵) دیگر ملکی زبانوں کی تفسیریں :

ہند و پاکستان کے ہندی تراجم میں اہم ترین ترجمہ و تفسیر وہ ہے جسے خواجہ حسن نظامی (م ۱۹۵۵ء) نے شائع کیا (۲ جلد، صفحات ۸۷۲، تقطیع کلاں) ۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ متنِ قرآن عالم گیر اورنگ زیب کے قلمی قرآن کا عکس

اور متابل میں مولوی نذیر احمد کا اردو ترجمہ ، ہندی رسم خط میں اور نیچے اس کی تفسیر ہندی زبان میں دی ہے ۔ تفسیر بعض ہندی فضلاء کی مدد سے مرتّب ہوئی (طبع دہلی) ۔ اس کے علاوہ ہندی اور بنگالی ترجموں کا ذکر *Sup. Cat. of Ar. Printed Books in the Br. Mus.*، ج ۱ : عمود ۳۸۸ - ۵۲۸ میں ہے۔ اس کے بعد بھی تراجم ہوئے ہیں اور آج کل مشرقی بنگال (پاکستان) میں تفسیر کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے ۔ تامل، مرہٹی، گجراتی، تلیگو اور سندھی میں بھی ترجمے اور تفسیریں موجود ہیں (سبط الحسن : مجلّۃ الواعظ، ص ۱۷) ، جن میں سے ایک سندھی ترجمہ و تفسیرِ مختصر عزیزاللہ متوکّلی نے لکھی، جو ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۷ء میں بمبئی میں چھپی؛ اس کے علاوہ ایک اور تفسیر کا ذکر *Sup. Cat. of Ar. Printed Books in the Br. Mus.*، ج ۱ : عمود ۵۳۷ پر ہے، جو ۱۳۱۷ھ / ۱۹۰۰ء میں بمبئی ہی میں چھپی۔

پشتو میں مخازن التفسیر (سبط الحسن : مجلّۃ الواعظ، ۱۷) اور پنجابی میں محمد بن بارك اللہ کی تفسیر محمدی (مُوضح فرقان) (لاھور ۱۲۸۸ - ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۱ - ۱۸۸۰ء) (ایلس A. G. Ellis : *Cat.* of *Ar. Books in the Br. Mus.*، ج ۱ : عمود ۸۷۹) اور ترجمہ و حواشی از ہدایت اللہ (طبع ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء)، یہ سب کتابیں چھپ چکی ہیں۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ایلس Ellis، کتاب مذکور، ج ۱ : عمود ۸۶۹ ببعد .

مآخذ : (۱) A.G. Ellis : *Catalogue of Arabic Books in the British Museum*، لنڈن ۱۸۹۴ء، مواضع عدیدہ؛ (۲) A. G. Ellis & Alexander S. Fulton : *Supplementary Catalogue of Arabic Printed books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۲۶ء، مواضع عدیدہ؛ (۳) ستوری C. A. Storey : *Persian Literature.* 1927، جزء ۱ : ص ۱ ببعد؛ (۴) زبید احمد : *The Contribution of India to Arabic Literature*، الٰہ آباد حدود ۱۹۴۶ء (اشاریہ)؛ (۵) سید سبط الحسن ہنسوی : "مختلف ممالک میں قرآن کی اشاعت اور اس کے تراجم" مجلّۃ الواعظ (لکھنؤ دسمبر ۱۹۰۱ء)، ص ۹ تا ۱۸؛ (۶) علی نقی : مقدّمۂ تفسیر قرآن (اردو) لکھنؤ ۱۳۵۹ تا ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۰-۱۹۴۱ء؛ (۷) علی نقی : مقدمۂ تفسیر القرآن (عربی)، لکھنؤ ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء؛ (۸) نواب سیّد محمد صدیق حسن خان : اکسیر فی اصول التفسیر، کانپور ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء؛ (۹) رحمان علی : تذکرۂ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء؛ (۱۰) فقیر محمد جہلمی : حدائق الحنفیة، لکھنؤ ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء؛ (۱۱) سید محمد احمد رضا : مقدمة مشکلات القرآن (عربی)، دھلی ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء .

(سید مرتضٰی حسین و عبدالمنان عمر)

تَفْضِیل : فَضَلَ (بمعنی وہ "بڑھا" یا "بڑھا تھا" یا "بڑھ گیا" یا "زائد ہو گیا" یا "باقی بچا") سے باب تفعیل ہے اور عربی نحو (گرامر) میں صفات کے باھمی مقابلے کے لیے استعمال ہوتا ہے [یعنی "دو چیزوں کا ایک صفت میں اشتراك اور ایک کا اس صفتِ مشترك میں زیادہ ہونا" یا یوں کہیں کہ] اسم التفضیل وہ اسم صفت ہے جو کسی وصف کو زیادتی یا فضیلت کے ساتھ ظاھر کرے ۔ یہ تفضیل علی البعض یا تفضیل علی الکُلّ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسے اَفْعَلُ التفضیل بھی کہتے ہیں [یعنی وزن اَفْعَل جو تفضیل کے معنے دیتا ہے]، کیونکہ یہ اسم صفت باقاعدہ طور پر اَفْعَل کے وزن پر آتا ہے .

مآخذ : (۱) لغت کی مستند کتابیں؛ (۲) Wright-de Goeje : *A Grammar of the Arabic Language*، طبع سوم، کیمبرج ۱۸۹۶-۱۸۹۸ء، ۱ : ۱۳۰ -

۱۳۱؛ (۳) Grammaire Arabe : de Sacy، پیرس ۱۸۳۱ء۔

(T. W. Haig ہیگ)

تَفْلِس Tiflis : گرجستان کا، نیز اس کے مشرقی حصے خارْتْھلِیَا [کارتیلی - عالم آرا] کا صدر مقام۔

نام : گرجی زبان میں اس شہر کو تْفلِیسی Tphilisi یا تْھبلِیسی Thbilisi کہتے ہیں، جو عام طور پر "تْفِلِی" "گرم" سے مأخوذ بتایا جاتا ہے اور اس میں تفلس کے گرم چشموں کی طرف اشارہ ہے۔ ارمنی میں اس کا نام تْفْخِیسْ Tphkhis تْفْلِس Tphlis اور عربی میں تَفْلِیس (بلاذُری : طَفْلِیس) ہے۔ ایسے ہی اور ناموں میں شہر Θιλβις یا Θάλβις کا نام بھی ہے، جس کا محلّ وقوع بطلیموس، ۷، باب ۱۱ نے البانیہ [دیکھیے اینسائکلوپیڈیا برٹانیکا، ۱۹۱۰ء، ۱ : ۵۱۳ ب] کے شمال مشرق، یعنی داغستان، میں بتایا ہے۔ اسی نام کا مقام وہ تَفْلِیس ہے جو جھیل اُرْمِیَہ کے جنوب میں ہے [قب قُدامۃ، ص ۲۱۳ : دِیْنَوَر سے آذربایجان جانے والی سڑک بَرْزَہ (= سَقّز ؟ رَکْ بآن) کے قریب دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے، یہ تَفلِیس بَرْزَہ کے شمال میں ۲ فرسخ کے فاصلے پر اُرْمِیَہ کی سڑک پر واقع تھا]۔

تفلس قبل از اسلام : گرجستان کا پرانا پایۂ تخت مْتْسْخِیتا Mtskheta (بطلیموس : Geography، v., ch. x., Μεστληταd = *Μεσχητα)، جسے عرب جغرافیہ دان بعض اوقات اشتقاق عوام کی بنا پر مسجد ذی‌القرنَین (مسعودی : مُروج، ۲ : ۵۶ : قب مارکار Marquart : Streifzüge، ۱۸۶) بھی کہتے ہیں۔ گرجی وقائع نامہ Georgian Chronicle کے مطابق وَرَزْ - بَکَر شاہ گرجستان (۳۷۹ تا ۳۹۳ ؟) کے خلاف (جو آلِ ساسان کی خسروی شاخ میں سے تھا) ایک مہم بھیجی گئی۔ اس مہم کی سرکردگی جس ایرانی "اِرِسْتَھاوْ" ("ethnarch" والی) نے کی اس نے "ابوابِ کوہ قاف کے درمیان" (یعنی دریل Darial اور دربَنْد کے درمیان) تفْلس کا شہر تعمیر کرایا "تا کہ مْتْسْخِیتا کے خلاف سدّ کا کام دے"، (Histoire de la Géorgie : Brosset، ۱ : ۱۴۰)۔

شاہ وَخْتَنگ گُرْگَسال (۴۴۶ تا ۴۹۹ ؟) کی جنگوں میں جو ایرانیوں کے خلاف تھیں، تفلس کا قلعہ Kala اور گاؤں (سوفِلی sopheli) برباد کر دیا گیا۔ وَخْتَنگ نے تفلس میں ایک شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کے بیٹے ڈَچی Dači (۴۹۹ تا ۵۱۴) نے اس کی فصیلیں مکمل کرائیں (کتاب مذکور، ص ۱۸۰، ۱۹۶، ۲۰۱)۔

۵۲۳ء کے بعد ایرانیوں نے مشرقی گرجستان کے حکمران خاندان کو کچل دیا اور تفلس میں ایرانی 'مرزْپان' مقرر کر دیا، جس کے علاوہ گرجی امراء کے نمائندوں کا بھی ملک کے انتظام میں برائے نام حصہ تھا (Brosset، ۱ : ۲۲۶؛ مارکار، کتاب مذکور، ص ۳۹۷، ۴۳۱ تا ۴۳۲؛ Djawakhow : Khrist. Vostok، ۱ : ۱۱۰)۔ والیِ مْتْسْخِیتا 'مرزپان' کے تحت تھا۔ تیوفانوس Theophanes بوزنطی (چھٹی صدی [میلادی]) پہلا بوزنطی مصنف ہے جس نے وقائع ۵۷۱ء کے ذیل میں Τίφιλις (Τιφλίς) ἡ μητρόπολις کا ذکر کیا ہے (Théoph. byz. apud Photium، در Migne : Patrologia graeca, ciii, 139؛ قب Muralt : Essai de chronologie byz.، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۵ء، ۱ : ۱۵۶)۔

ترکوں اور بوزنطیوں کے درمیان جنگیں ہوئیں تو ان کی وجہ سے ایرانیوں کی توجہ آئی‌بیریا سے ہٹ گئی۔ اس پر گرجستانیوں نے بوزنطی شہنشاہ سے کہا کہ انھیں ایک بادشاہ دیا جائے : چنانچہ گُوَرام بَگْراتی (Bagratid Guaram) (۵۷۵ تا ۶۰۰ء) کو مْتْسْخِیتا میں بادشاہ بنا دیا گیا۔ روایۃً یہ

مشہور ہے کہ '' تفلس کے کلیسائے سی اون Sion کے مبانی کی تجدید اس بادشاہ نے کی'' (۱ : ۲۲۲).

بوزنطیوں پر جب شاہ خُسرو پرویز نے (۶۰۶ء کے بعد) فتح پائی تو گُورام کا بیٹا اصطفانوس اول، (جو اِرِستہاو (=والی) کے لقب پر ہی قانع ہو گیا تھا) ایرانیوں سے مل گیا - اس کے بعد جب ۶۲۴ء میں ہرقل Heraclius اور اس کے ترک حلیفوں نے تفلس کا محاصرہ کیا تو اصطفانوس نے شہر کا دفاع بہادری سے کیا - ہرقل نے اَدَرناس Adarnases کو، جو قدیم خاندانِ خسروی کا رکن تھا، یہاں کا سردار (مْثوار *mthawar*) مقرر کیا اور اِرِستہاوْ (والی) جِبغُو (Theophanes : Ζιέβηλ ؛ بقول مارکار : تھونگ یبغُو خاقان Thong Yabghu Khakan) کو اس کا شریکِ کار مقرر کیا - قلعے پر قبضہ کر کے اصطفانوس کو قتل کر دیا گیا۔

فتح عربی : عربوں نے ارمینیہ اور گُرجستان دونوں کو آپس میں ملتبس کر دیا (قب بَلاذُری، ۱۹۴ : اور یاقوت، ۲ : ۵۸ ، جہاں جُرزان کو ارمینیہ کا ایک ' ناحیۃ ' لکھا ہے [اور بظاہر انھیں کے تتبع میں فارسی لغت نویسوں نے، مثلاً دیکھیے فرہنگ آنندراج بذیل گرج]) گُرجی وقائع نامہ (*Kharthlis tskhowreba*) میں ہے کہ شاہ اصطفانوس ثانی (۶۳۹ تا ۶۶۳ ؟) بن اَدَرْناس کے عہد میں،جو تفلس میں رہا کرتا تھا، آگاریوں (Agarians) نے سوم خیتیا پر حملہ کیا [اصل میں بجائے سوم خِیتیا ''ارمینیہ'' ہے، جو ایک مبہم اصطلاح ہے ، اس لیے کہ ''خارْتھلیا کا سوم خِیتیا'' دریائے خُرم Khram کے جنوب میں اور تفلس سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر شروع ہوتا تھا]- بادشاہ مرا تو اس کے بیٹے مِیر اور آرچل پیچھے ہٹ کر اِگرِس کی طرف آ گئے (یعنی منگریلیا کی طرف ؛ یہ وہ علاقہ ہے جو رِی اون Rion کے شمال اور اِیمرِتھیا Imerethia کے مغرب میں بحیرۂ اسود تک چلا جاتا ہے [دیکھیے *Hand-atlas*، نقشہ عدد ۲۷]) - ان کی مشترکہ حکومت کے دوران میں (۶۶۳ تا ۶۶۸ء) تُندخُو مُروان قُرو (''مروان الاَصمّ'') نے، جسے امیرالمؤمنین (= ہشام) Eshim نے بھیجا تھا ، بلاد گُرج پر حملہ کیا (ہشام کا عہدِ سلطنت در اصل ۱۰۵ تا ۱۲۵ھ/۷۲۴ تا ۷۴۳ء ہے) - اس قسم کی تأریخی غلطیاں اور اشتباہات یوں پیدا ہوئے کہ اس زمانے میں گُرجستان کی قومی زندگی کے مرکز اپنے ملک کے بجائے بہت دور مغربی ممالک میں منتقل ہو گئے تھے اور چُئورخ (کْلارجیتھیا) [بلاذُری، ۲۰۲ : قَلَرْجیت] سے وہاں پہنچنا مشکل تھا - تاہم عربی اور آرمنی بیانات کو باہم ملا لینے سے ترتیبِ حوادث ممکن ہے [قب مادۂ اَرمینیہ] .

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے فتوحات خلفائے [راشدین] ہی کے زمانے میں ماورائے بحرِ خزر تک پہنچ چکے تھے: بقول طبری (۱ : ۲۶۶۶) ۲۲ھ/ ۶۴۳ء میں سُراقہ نے شہر براز شاہ باب الابواب سے صلح کر کے حَبیب بن مَسْلَمَۃ کو تِفلِس فتح کرنے کو بھیجا - اسی سال ، بقول طبری (۱ : ۲۶۷۴)، اس شہر کے باشندوں سے صلح ہو گئی، لیکن اصل میں یہ صلح ۲۵ھ / ۶۴۵ء میں [حضرت] عثمان[رض] کے عہد میں ہوئی تھی (الیعقوبی ، ۱۹۴ ؛ بلاذری، ۱۹۸) - حبیب بن مَسْلَمۃ ارمینیہ [رَکَ بآن] فتح کرنے کے بعد گُرجستان کی طرف متوجّہ ہوا - ایک گرجستانی سفیر (نقلِی = نقولا Nicolas؟ یا تِفْلی = تیوفیلاس Theophilas؟) اس کے سامنے پیش ہوا - (اس کا مقصد یہ تھا) کہ وہ اس امر کی تصدیق کرے کہ بطْریقِ جُرْزان اور اہلِ جُرزان صلح کے خواہشمند ہیں اور امان چاہتے ہیں - جواب میں حَبیب نے (دیکھیے بیاناتِ بلاذُری،

ص ۲۰۱ اور طبری، ۱ : [۲۶۷۴]؛ یاقوت، ۱ : ۸۰۷، جو زیادہ تر بلاذری ھی کی پیروی کرتا ھے) براہِ راست تفلس کے باشندوں کو یوں مخاطب کیا تھا : بنام "اھل طَفْلیس از (رُستاق) مَنْجلیس (موجودہ مَنْگلِس Manglis) از جُرْزانْ [الہرمز]" (یعنی گرجستان Georgia در ارضِ ھرمز).

حبیب نے لوگوں کو امان دی اور اقرار کیا کہ انہیں مذھبی آزادی حاصل ھوگی لیکن اس نے تِفْلس میں ایک عالم عبدالرحمن بن جزء [السلمی] کو بھیج دیا کہ وہ وھاں جا کر لوگوں کو شریعت کے مسائل سمجھائیں اور حقیقت یہ ھے کہ تھوڑی ھی مدّت میں سارا شہر مسلمان ھو گیا.

تفلس پر قابو پا لینے کے بعد حبیب نے دوسرے علاقے بھی فتح کرنے یا ان سے عہد ناموں کے ذریعے صلح کر لینے کا کام اور وسیع کیا ۔ یہ وہ علاقے تھے جن میں گرجی یا ان کے ھمسایے آباد تھے (بلاذری، ۲۰۲ تا ۲۰۳؛ قبّ غزَریان Ghazarian، جس نے کتاب مذکور در ذیل میں ان بیانات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ھے) ۔ ان میں قوم صَنَاریّۃ نے نمایاں حصہ لیا (بطلیموس، ج ۷، باب ۸ : § ۱۳ : Σαναραῖοι ؛ ارمنی میں Tsanarkh)۔ صناریہ ایک نہایت ھی جنگجو عیسائی قوم تھی جو کاخیتھیا [بلاذری، ص ۲۰۳ : خاخیط؛ عالم آرا، ص ۶۲ : کاخت] اور اَلزَن Alazan علیا میں رھا کرتی تھی اور جو مار N.Y. Marr کے مفروضے کے مطابق آج کل کی تُھش Thush قوم ھی ھے، جن کی زبان چچنوں کی زبان سے ملتی جلتی ھے (قبّ *Izw. Akad. Nauk.*، ۱۰ / ۱۲، ۱۹۱۶ء، ص ۱۳۷۹ تا ۱۴۰۸).

حبیب کی مہم سے عہد المُتَوَکّل (۲۳۲ تا ۲۴۷ھ) تک جُرْزان (گُرجیانِ شرق) اور اَبْخاز [رَکّ بآن، ابخاز یہاں وسیع معنوں میں مستعمل ھے، اس سے وادی رِیاون Rion یعنی اِیمیرِیتھیا Imerethia کے مغربی گرجستانی مراد ھیں] تفلس کے فوجی کمانڈر (صاحبِ ثغر) کو خراج ادا کرتے رھے (مروج، ۲ : ۶۵؛ یاقوت، ۲ : ۵۸)؛ یزید ثانی (۱۰۱ تا ۱۰۵ھ) کے عہد کا ایک خط محفوظ ھے، جس میں جرّاح بن عبداللہ ان تمام مواعید کی توثیق کرتا ھے جو حبیب بن مَسْلَمَۃ نے جُرزانیوں سے کیے تھے (بَلاذُری، ص ۲۰۲؛ یہاں بھی رُستاقِ مَنْجلِیس کا ذکر موجود ھے لیکن کئی مقامات کے نام اب تک شناخت نہیں ھو سکے).

'مروان قَرُو' جس کا ذکر ارمنی اور گُرجی روایات میں آیا ھے اس کی شخصیت میں بظاھر اس نام کی دو شخصیتوں کو ضمّ کر دیا گیا ھے (مارکار) : یعنی محمد بن مروان کو (جس کا ذکر جُرزانیوں نے بظاھر ارمینیوں کی زبانی سنا) اور اس کے بیٹے مروان بن محمد کو ۔ مروان بن محمد (ھِشام کے عہد میں ۱۰۵ تا ۱۲۵ھ) زیادہ تر داغستان ھی میں لڑتا بھڑتا رھا، لیکن اس کی مہم، جو باب‌اللان کے خلاف تھی، ضرور تِفلس سے گذری ھوگی ۔ اس کا صدر مقام کِسال (؟) میں تھا، جو تفلس سے بیس فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا اور برذعہ سے ۴۰ فرسخ پر (غالباً کِسالہ Kesala مراد ھے، جو تَئوس Ta'ūs سے نیچے ھے اور جو مذکورہ بیان سے مطابقت رکھتا ھے، قبّ سطور ذیل)۔ عبدالملک کے نام کا ایک درھم ملا ھے جو ۸۵ھ / ۷۰۴ء میں بمقام تِفلس مضروب ھوا.

دورِ عباسیہ : ۱۴۱ھ / ۷۵۸ء میں خَزَروں نے رأس طَرْخان کی قیادت میں ارمینیہ پر حملہ کیا (یعقوبی، ۲ : ۴۴۶)؛ طَبَری (۳ : ۳۲۸) اسی

واقعے کا ذکر ۱۴۷ھ / ۷۶۴ء کے ذیل میں کرتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ [اَسْتَر] خان الخوارزمی (کذا) کے حملے میں کئی مسلمان اور ذمّی قید کر لیے گئے اور ترک تِفلس میں داخل ہو گئے ۔ یعقوبی ۱۴۱ھ کے فوراً بعد ھی صَنارِیّۃ کی ایک بغاوت کا ذکر کرتا ہے ۔ انھیں عامر بن اسمٰعیل نے شکست دی اور تِفلس واپس پہنچ کر جنگی قیدیوں کو قتل کرا دیا ۔

خَزروں کا ایک اَور حملہ ۱۸۳ھ / ۷۹۹ء میں ہوا ۔ ان کا بادشاہ دریاے کُرّ کے پل تک آ پہنچا اور اس نے ملک کو تاخت و تاراج کر ڈالا لیکن اس کے تِفلس کو فتح کر لینے کا کوئی ذکر عرب مصنّفین نے نہیں کیا (یعقوبی، ۲ : ۵۱۸ ؛ طَبَری، ۳ : ۶۴۸)؛ البتہ وقائع نامۂ گرجستان میں یہ لکھا ہے کہ دو بھائیوں ایون Ioane اور جوانشیر Djuanshe̱r کی مشترکہ حکومت کے زمانے میں (۷۱۸ تا ۷۸۶ء ؟) خاقان کے جرنیل بْلُوچنْ Blučan (ارمنی میں: بْلْچَاَن) نے تفلس اور خارتْھلیا کو فتح کر لیا تھا ۔

ھارون الرشید (۱۷۰ تا ۱۹۳ھ / ۷۸۶ تا ۸۰۹ء) کے زمانے میں جو والی اَرمینیہ بھیجے گئے ان سب میں سے زیادہ سخت والی [''اشدّھم ولایۃً''] خُزَیْمَۃ بن خازِم تھا (بلاذُری، ۲۱۰) ۔ گُرجی اسے C'ič'um-Asim کہتے تھے ؛ یعقوبی (۲ : ۲۱۰) بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ جب وہ دوسری مرتبہ والی بن کر آیا تو اس نے بےحد سختی کی ۔ جرجان (' جُرْزَان ' پڑھیے) اور صَنارِیّۃ باغی ہو گئے تو خُزَیْمۃ کے جرنیل سعید بن ہَیثم نے انھیں شکست دی اور انھیں ملک سے باھر نکال کر ھی وہ تفلس میں واپس آیا ۔

المأمون کے عہد (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) میں ایک شخص محمد بن عَتّاب ارمینیہ میں بادشاہ بن بیٹھا ۔ ۲۱۴ھ / ۸۲۹ء میں اس نے جُرْزان (گرجیوں) کا علاقہ فتح کر لیا اور صَنارِیّۃ اس کے ساتھ شامل ہو گئے (یعقوبی، ۲ : ۵۴۰، ۵۶۵ تا ۵۶۶) ۔ خالد بن یزید نے محمد بن عتّاب کو امان دی اور اس کے حلیفوں یعنی صَنارِیّۃ کو شکست دی لیکن ارمینیہ میں گڑ بڑ جاری رھی (یعقوبی، ۲ : ۵۶۶؛ بَلاذُری، ص ۲۱۰ تا ۲۱۱) ۔ ۲۱۵ تا ۲۳۹ھ / ۸۳۰ تا ۸۵۳ء میں اسحٰق بن اسمٰعیل نے جُرزان میں ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی ۔

اسحٰق بن اسمٰعیل : بقول مسعودی (مُروج، ۲ : ۶۵) یہ شخص قریشی [بالوَلاء] تھا ۔ اس کا باپ اسمٰعیل شُعیب کا بیٹا تھا، جو مروان ثانی (۱۲۶ تا ۱۳۲ھ / ۷۴۴ تا ۷۵۰ء) کے موالی میں سے تھا اور خلیفہ امین (۱۹۳ تا ۱۹۶ھ) کے زمانے میں گرجستان میں جا بسا تھا اور وھاں کے والی اسد بن یزید (یعقوبی، ۲ : ۵۲۸) سے لڑتا بھڑتا رھا تھا ۔ اسحٰق کے چچا علی بن شُعَیب کو، جس کا ذکر وقائع نامۂ گرجستان (۱ : ۲۶۰، ۴۹۵) میں بھی آتا ہے، (غالباً محمد بن عتّاب کے بعد) خالد نے تفلس عطا کر دیا تھا لیکن یہ بات بھی ہے کہ اس سے پہلے خالد کے دوسرے جانشین حَسن باذَغیسی کے دورِ حکومت میں بھی ھمیں اسحٰق کا نام ملتا ہے ۔ جب تھیوفیلوس (۸۲۹ تا ۸۴۲ء) کی بوزنطی افواج وَنَنْد (قرص کے قریب) پہنچیں تو ''Sahak (اسحٰق) بن اسمٰعیل نے ان کے پرخچے اڑا دیے'' (قبّ Stephen Asolik، ج ۲ : باب ۵ ؛ ترجمہ از Dulaurier، ۱۷۱) ۔ اس قسم کے کارناموں کی وجہ سے خلیفہ الواثق (۸۴۲ تا ۸۴۷ء) نے اسحٰق کو ارمینیہ کا حاکم تسلیم کرلیا لیکن یہ صورتِ حالات دیر تک قائم نہ رہ سکی ۔ خالد کے بیٹے محمد نے، جو اس کا جانشین بھی ہوا،

اسحٰق کو شکست دی اور صَنارِیّة کو نکال باہر کیا ۔ وقائع نامۂ گرجستان کے مطابق گرجی شہزادوں نے (جنھیں مرکزی حکومت کا، جو بہت دور تھی، نسبۃً کم خوف تھا) اسحٰق اور اس کے حلیفوں (اہل کاخیتھیا اور صناریّة) کے خلاف محمد کی امداد کی ۔

آخر کار المُتَوکّل کے دورِ حکومت میں ترک جرنیل بُغا الکبیرالشّرابی کو ارمینیہ بھیجا گیا ۔ ربیع الاوّل (۲۳۸ھ/خریف ۸۵۲ء) میں وہ دَبِیل سے تِفْلِس روانہ ہوا ۔ بُغا صُغْدَبِیْل کے پاس کی بلند پہاڑیوں سے معرکے کا حال خود دیکھتا رہا [یہ مَخْتھا Makhatha کی بلندیوں کا ذکر ہے، جو اِسنِی Isani کے شمال میں ہیں (اِسنِی = صُغْدَبِیل)؛ قبّ وصف تِفْلِس در ذیل [ص ۵۶۲]] .

اسحٰق نے شہر سے باہر نکل کر محاصرین پر حملہ کیا لیکن بُغا کے 'نفّاطین' (آتشگیر مادّہ پھینکنے والوں) نے شہر کو آگ لگا دی ۔ اسحٰق کا محل جل گیا ۔ اُسے اور اس کے بیٹے عَمرو کو ترکوں اور موروں نے قید کر لیا ۔ اسحٰق کی گردن اُڑا دی گئی اور تقریباً پچاس ہزار (؟) آدمی اس آتش زدگی کی نذر ہو گئے ۔ موروں نے ان لوگوں کو جو زندہ بچے قید کر لیا اور مقتولوں کے ہتھیار اور کپڑے اتار لیے ۔ اسحٰق کی بیوی، جو سَرِیْر (یعنی شمالی داغستان کے اَواروں Avars کی ریاست) کے سردار کی بیٹی تھی، اس وقت صُغْدَبِیل میں تھی، اس شہر کا دفاع الخُوَیْشِیَّة (اہل صاصُون Ṣaṣūn؛ قبّ میّافارقین) کر رہے تھے ۔ بُغا نے انھیں اس شرط پر امان دی کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور خود قلعۂ جَرْدَمان اور بَیْلَقان کی طرف متوجّہ ہوا (طبری، ۳ : ۱۴۱۴ تا ۱۴۱۶؛ قبّ Thomas Artsruni، ۳ : باب ۹ تا ۱۰، طبع Brosset، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۴ء، ص ۱۴۰ تا ۱۵۰؛ آتنی Ateni کے گرجے پر ایک گرجستانی کتبہ ہے، جو بُغا کی فتح تِفْلِس کی تأریخ ۲۳۹ھ دیتا ہے، قبّ Djawakhow : *Khrist. Vostok*، ۱۹۱۲ء، ۱ : ۲۸۴) ۔ عباسی خلافت کی یہ ایک ناقابلِ تلافی غلطی تھی کہ انھوں نے بنو امیّة کے سابق موالی کی ریاست کو، یعنی ایک ایسے مرکز کو جس کے گرد تمام مقامی عناصر مجتمع ہو جاتے تھے، برباد کر دیا ۔ عرب مصنّفین (مسعودی، ۲ : ۶۷؛ یاقوت، ۲ : ۵۸) قفقاز میں عربوں کے اقتدار کے زوال پذیر ہونے کی ابتداء اسی واقعے سے شمار کرتے ہیں ۔ بُغا کو جلد ہی واپس بلا لیا گیا؛ قبّ Brosset : کتاب مذکور، ۱ : ۲۶۶ تا ۲۶۸ اور Thomas Artsruni، محلّ مذکور .

۹۲۲ھ تک تِفْلِس میں عباسی ٹکسال موجود تھی، جس میں درہم ڈھلا کرتے تھے (۲۱۰ھ و ۲۴۸ھ و ۲۵۰ھ و ۲۹۴ھ و ۲۹۸ھ و ۳۰۴ھ و ۳۰۷ھ و ۳۱۱ھ و ۳۱۲ھ و ۳۱۴ھ و ۳۳۰ھ و ۳۳۱ھ کی ضرب کے سکّے معلوم ہیں) : قبّ Tiesenhausen : *Monnaies des khalifs orientaux*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۳ء؛ اور خاص کر (پاخوموف) Pakhomov، کتابِ مذکور .

بَگْرات Bagrat (۸۲۶ تا ۸۷۶ء) نے جو امداد خلیفہ کو اسحٰق کے خلاف دی تھی اس کے صلے میں اس کے مشرقی خاندان کو وہ انعام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ متمنّی تھے ۔ ان کے حریف خاندان موسوم بہ اَبْخازی (قبّ اس اصطلاح کی تفسیر جو اوپر مذکور ہوئی) نے خارْتھلیا پر قبضہ کر لیا، اس لیے مسعودی (جو ۳۳۲ھ/۹۴۳-۹۴۴ء میں لکھ رہا ہے) مروج (۲ : ۶۹، ۷۴) میں لکھتا ہے کہ دریاے کُرّ جَرجِین کی مملکت سے نکلتا ہے (جرجین، بگراتی ہے، مگر بازو کی شاخ سے ، متوفّی ۱۹۳۱ء: مار کار Marquart، کتاب مذکور، ص ۱۷۶)،

ارض ابخاز (کذا) کو عبور کرتا ہے اور پھر تفلس [کی سرحد پر پہنچتا ہے اور شہر کے درمیان سے گذر کر السیاوردیة کے عَلاقے میں بہتا ہے۔ یہ لوگ ارمنیوں میں سے ہیں اور بہت بہادر اور قوی ہیں] - تفلس کے باشندے گو ہر جانب سے کفّار سے گھرے ہوئے تھے لیکن انھوں نے ہمّت نہ ہاری اور وہ تعداد میں بھی کثیر تھے۔ ارمینیہ کی بگراتی سلطنت کے بانی اشوط Ashot (۸۸۵ تا ۸۹۰ء؟) نے بھی خارتھلیا کے معاملات میں دخل اندازی کی (Brosset، ۱ : ۲۷۰، حاشیہ ۱۲) - مسعودی مسجد ذی‌القرنین (= مْتْسْخیتا) کو شاہ جُرْزان (گرجستان) کا مقرّ بتاتا ہے [کلمۂ 'الطّنْبغی' میں مارکار (کتاب مذکور، ۱۸۶) نے بڑی ذہانت اور فطانت کے ساتھ ترمیم کر کے بتایا ہے کہ یہ محرّف کلمۂ ارمنی 'مْمبغی' > مْمْفلی، ہے، جو ایک گرجستانی لقب ہے].

ساجیّہ، سالاریّہ و شدّادیہ : اسی اثناء میں آذربایجان میں پہلا مسلم خاندان نمودار ہوا جس نے خلافتِ بغداد کا تسلّط تسلیم کیا۔ یہ آلِ ساج کا خاندان تھا (۲۷٦ یا ۲۷۹ھ تا ۳۱۷ھ؛ قبّ یہ مادّہ اور *O monetakh* : R. Vasmer *Sadjidow, Izwestia Obsl:č izuč. Azerb.*، باکو ۱۹۲۷ء، عدد ۵ : ص ۲۲ تا ۵۴) - ابوالقاسم یوسف ان مسلمانوں کی امداد کے لیے گیا جو شمال میں دوسرے مسلمانوں سے منقطع ہو گئے تھے - ۹۱۴ء (؟) میں وہ تفلس آیا - یہاں کے امیر کا نام جعفر بن علی (قبّ سطورِ ذیل) تھا۔ ابوالقاسم یوسف نے قلعۂ اَجرمو اور قلعہ بوچ ورمہ پر (محلِّ وقوع : بالائی ایورا Iora پر) (قبّ Brosset، ۱ : ۲۷۵، حاشیہ ۲) قبضہ کر لیا وقائع نامۂ گرجستان میں ''شرقیین (Saracens) موسوم بہ ساج Sadj'' کی ایک دوسری مہم کا بھی ذکر ہے (۹۱۸ اور ۹۲۳ء کے درمیان)، جس میں مْتْسْخیتا فتح ہو گیا تھا۔ اسلامی مآخذ میں ان مہموں کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی وقائع نامہ میں فتح مذکور کے متصل بعد بَرْذَعَہ اور آذربایجان میں سالاریوں کے ظہور کا ذکر ہے۔

بگرات Bagrat ثالث اور بگرات رابع : ان بلاد کی بادشاہیوں کے سلسلے ''بہت درہم برہم نظر آتے ہیں'' (Brosset)، تا آنکہ بگرات ثالث (۹۸۰ تا ۱۰۱۴ء) نے خارتھلیا، ابخازیہ، تاؤ (دریاے چُورُخ پر) اور اَرْدَنُج کو متّحد کر لیا۔ اس کے عہد میں شدّادیوں میں سے فَضْلون (رکّ بہ شدّاد، (بنو)) نے ارمینیہ پر حملہ کیا لیکن ایسے گرجستانیوں نے شکست دی؛ مْتْسْخیتا (مسجد ذی‌القرنین) کو ہمیشہ شاہی شہر سمجھا جاتا تھا، گو بادشاہ کوتایس Kutaïs (خُتیاتیسی Khuthathisi) میں رہا کرتے تھے - ۱۰۳۰ء (۴۲۱ھ) میں گرجستان اور کاخیتیا کے عمائد نے تفلس کے امیر جعفر کی امداد سے Phadlon شدّادی (فَضْلون گنجوی) کے خلاف ایک مہم تیار کی لیکن جب فَضْلون مر گیا تو لِیپَرِتْ اُربِلیانی Liparit Orbeliani نے، جو تْھریالیتھ Thrialeth [بلاذری، ۲۰۳ : ثْریالیت]) کا زبردست امیر تھا، ایک حیلے سے امیر جعفر کو پکڑ لیا (مقام مذکور، رودِ خْرم Khram کے بالائی حصے پر واقع ہے) اور اسے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک نوجوان بادشاہ بگرات چہارم (۱۰۲۷ تا ۱۰۷۲ء) نے اس کی سفارش نہ کی۔ بادشاہ خود یہ نہیں چاہتا تھا کہ لِیپَرِتْ جیسا جھگڑالو شخص تفلس پر قابض ہو جائے - جعفر کو دوبارہ تفلس میں متمکن کر دیا گیا لیکن خود اسی بادشاہ [بگرات] نے چند سال کے بعد تفلس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ برابر دو سال تک جاری رہا لیکن دفعةً بادشاہ نے

لِیْپرِٹ کے مشورے پر عمل کرتے ہوے جعفر سے صلح کر لی ۔ امیر جعفر کی وفات کے بعد اکابر (بیر ber) تفلس نے شہر کی چابیاں شاہ بگرات کے حوالے کر دیں، جس نے قلعۂ دارالجلال اور دو ''برجوں'' پر، جن کے نام تَسْ قَلقِن اور تھبور Thabor تھے (قَبَ صنت تفلس در اواخرِ مادّہ)، قبضہ کر لیا، تا ہم اِسَن Isan محلّے کے باشندوں نے، جو دریاے کُر کے بائیں کنارے پر رہتے تھے، دریا کا پل تباہ کر دیا، جس پر بگرات کو اپنی منجنیقوں کا رخ ان کی طرف کرنا پڑا ۔

سلاجقہ : ۱۰۳۸ء میں ابراہیم ینَال (گرجستانی میں: بہرام ۔ لام) کی فوجیں پہلی دفعہ بَسیان Basian (یعنی پَسِن Pasin میں، جو دریاے اَرَس کے بالائی حصے پر واقع ہے) آئیں؛ ۱۰۵۳ء (؟) میں سلجوقیوں نے گنجہ کے خلاف ایک مہم بھیجی لیکن بگرات رابع کے حلیف بوزنطیوں کی ایک جوابی نقل و حرکت کی وجہ سے شہر بچ گیا ۔ اس پر اھل تفلس نے بگرات کو دوبارہ دعوت دی لیکن لِیْپرِٹ کی سازباز کی وجہ سے بوزنطیوں نے شاہ بگرات کو تین سال تک قسطنطنیہ میں قید رکھا ۔ اس کے بعد بگرات نے اپنے بیشتر قلعے واپس لے لیے، مگر آلْپ آرسلان (۱۰۶۳ تا ۱۰۷۲ء) نے اچانک گرجستان پر حملہ کر دیا (Brosset، ۱ : ۳۲۶)۔ ۱۰ دسمبر ۱۰۶۸ء کو آلْپ آرسلان نے شاہ ارمینیہ اور شاہ کاخیتھیا (اَغسَرتَھن بن گگیک Aghsarthan, son of Gagik) [جاجق در بلاذری، ۲۱۲] از خاندان کوریکوز Korikoz [Chorepiscopi] جس خاندان نے ۷۸۷ سے ۱۱۰۵ء تک حکومت کی) اور امیر تفلس کو ھمرکاب لے کر بگرات کے خلاف چڑھائی کی ۔ پورے خارتھلیا پر قبضہ کر لیا گیا اور بہت سے عیسائی مارے گئے یا گرفتار کر لیے گئے ۔ شدّادیوں کو معاوضہ دیا گیا ۔ تفلس اور رستاو، فضلون گنجوی کو اور آنی، منوچہر پسر ابوالاسوار کو عطا ہوا ۔ ۱۰۶۹ء کے موسمِ بہار میں بگرات خارتھلیا میں واپس آیا ۔ فضلون نے نواحِ شہر میں دریا کے بائیں کنارے پر اِسن Isan کے مقام پر پڑاؤ ڈالا، اور اس نے ۳۳ ہزار جوانوں کے ساتھ ملک کو تاخت و تاراج کر ڈالا ۔ بگرات نے فضلون کو شکست دی اور وہ کاخیتھیا کے رستے بھاگا، لیکن اَغسَرتَھن نے اسے گرفتار کر لیا ۔ دریاے ایورا Iora کے کئی قلعوں کے عوض بگرات نے زرِ فدیہ دے کر فضلون کو رہا کرایا اور اس کے عوض اس سے تفلس کا شہر حاصل کیا، جہاں اس اثنا میں ایک سِیْتھلَرَبَہ Sithlaraba (سیدالعرب؟) کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا تھا ۔ یہ تجویز ناکام رھی، کیونکہ آلْپ آرسلان نے فضلون کو رہائی دلوا دی ۔ گیورگی ثانی (Giorgi II) بگرات کا بیٹا (جس نے ۱۰۷۲ سے ۱۰۸۹ء تک حکومت کی اور ۱۱۲۵ء تک زندہ رہا) کوتایس Kutaïs میں رہا کرتا تھا، کخیتھیا میں اغسَرتَھن اپنے مقبوضات پر بشرطِ قبولِ اسلام قابض رہا ۔

داؤد ثانی (Dawid II) : داؤد ثانی Aghmashenebeli (یعنی ''مُرجع'' یا ''مصلح'') کے زمانے میں تفلس کی سلطنت کو دوبارہ عروج حاصل ہوا ۔ اس نے ''شاہِ خارتھلیا و ابخازیہ'' کا لقب اختیار کیا (۱۰۸۹ تا ۱۱۲۵ء؟) اور باب اللان Pass of the Alans) (دَریال) کے راستے چالیس ہزار قپچاق (Polovtsi) اور پانچ ہزار غلام، جنھیں عیسائی کر لیا گیا تھا، اپنے ساتھ گرجستان میں لایا ۔ ان لوگوں کی سرکشی کے باوجود (Brosset، کتاب مذکور، ۱ : ۳۷۹) ان جنگجو عناصر ھی کی وجہ سے داؤد سلجوقیوں کے غلبے سے نجات پانے میں کامیاب ہوگیا ۔ اس نے خراج کی ادائگی روك دی اور گرجستان میں ترکوں کا مقررہ موسم میں نقلِ مکان.

کر کے آنا بھی بند کر دیا - اس نے اپنی لڑکی ثمر Thamar کی شادی شیروان شاہ [رکن بان] اخستان (گرجی زبان میں اغسرتھن Aghsarthan) سے کر دی اور اسے اپنا باجگزار امیر سمجھنے لگا۔

۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء میں تسخیر تفلس : مسلمانان تفلس کی شکایت پر محمود بن محمد سلجوق (۱۱۱۸ تا ۱۱۳۱ء) نے گرجستان میں ایک مہم بھیجی، جس میں نجم الدین غازی ارتقی، دبیس بن صدقۃ مزیدی (وقائع نامۂ گرجستان میں اسے دربیز لکھا ہے) اور سلطان طغرل کا بھائی (امیر اران و نخچوان)، جس کے ہمراہ اس کا اتابک کن - توغدی بھی تھا، سب کے سب شامل تھے - ۱۸ اگست ۱۱۲۱ء کو یہ لشکر ثریالیتھہ Thrialeth [بلاذری : ثریالیت (ثاریارلیت در اشاریۂ بلاذری)] اور منگلیس میں پہنچا - لیکن داؤد اور اس کے قپچاقوں نے اس فوج کو تباہ کر دیا - اس کے بعد ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ - ۱۱۲۲ء میں داؤد نے تفلس پر حملہ بول دیا تا کہ یہ شہر ''ہمیشہ کے واسطے اس کے بیٹوں کے لیے اسلحہ خانہ اور پایۂ تخت کا کام دے سکے''، Brosset ،۱ : ۳۶۵ تا ۳۶۷ اور Additions ، ۱ : ۲۳۰، ۲۳۶ تا ۲۴۱، قب ابن الأثیر، ۱۰ : ۳۹۸ تا ۳۹۹ ، [= Defrémery : Fragments ، ص ۲۶]؛ کمال الدین [ابن العدیم] : تأریخ حلب، در Recueil des hist. des croisades ، ۳ : ۶۲۸ ؛ یاقوت ، ۱ : ۸۵۷ (بذیل تفلیس)۔ عرب مؤرخ العینی (۱۳۶۰ تا ۱۴۵۱ء)، جو ایسے ماخذ استعمال کرتا ہے جن میں سے بعض اب دستیاب نہیں ہوتے (Brosset ، ۱ : ۲۴۱)، یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ تفلس کو آگ لگائی گئی اور اسے لوٹا بھی گیا لیکن دوسرے ماخذ کی تردید میں، جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شاہ داؤد نے مسلمانوں پر ظلم و ستم روا رکھا (متی .Matth رہاوی در Brosset ، Add. ، ۱ : ۲۳۰)، یہ کہتا ہے کہ یہ بادشاہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام مسلمان حکمرانوں سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ داؤد نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اسلامی نقوش اور عبارات سکوں پر مضروب کرائے گا، مگر اس بادشاہ کے عہد کے سکوں پر العذراء [حضرت مریم[۴]] کی تصویر بنی ہوئی ہے (قب Pakhomow : Moneti ، وغیرہ، ص ۷۷ تا ۸۱)۔ مسلمانوں کے معاملے میں خاص احتیاط برتنا لازمی تھا اس لیے کہ وقائع نامۂ گرجستان کو اعتراف ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ابھی نہایت تیز و تند لڑائیاں ہو رہی تھیں (قب Brosset ، ۱ : ۳۸۰) .

بنو جعفر : داؤد تفلس میں بنو جعفر کا جانشین ہوا، جن کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا وہ عرب تھے یا خالص گرجی الاصل - گو وقائع نامۂ گرجستان (Georgian Chronicle ، ۱ : ۳۶۷) میں تفلس کی اسلامی حکومت کا دور ۴۰۰ برس بتایا گیا ہے ، العینی صرف بنو جعفر کے خاندان کی مدت حکومت کو دو سو برس بتاتا ہے۔[سطور بالا میں] واقعۃً ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۳۰۰ھ/ ۹۱۲ء میں تفلس کے امیر کا نام جعفر [بن علی] تھا (Brosset ، ۱ : ۲۷۵) - اس کے جانشین نے تفلس میں اپنے نام کے سکے ضرب کرائے ؛ منصور بن جعفر کے نام کے درہم بھی پائے گئے ہیں، جو ۳۴۲ھ و ۳۴۳ھ میں مضروب ہوئے (اور جن پر خلیفہ کا نام المطیع للہ ہے) اور جعفر بن منصور کے عہد کے سکے بھی، جن پر ۳۶۴ھ و ۳۶۶ھ منقوش ہیں (جن پر خلیفہ کا نام الطائع للہ ہے)۔ بگرات رابع کے عہد میں (۱۰۲۷ تا ۱۰۷۲ء) امیر تفلس کا نام جعفر تھا (اس کا باپ علی متسخیتا کے کلیسائے سویتی - تسخویلی Sweti - Tskhoweli

کے اموال اٹھوا لایا تھا)۔ وقائع نامۂ گرجستان میں اسے مُخْتھه گوِرْد جَفَر Mukhath Gwerd Diaphar کہا گیا ہے (مُخْتھہ گوِرْد، مْتْسْخیتا کے قریب ایک مقام ہے)۔ داؤد کے تِفْلِس فتح کرنے سے پہلے کوئی چالیس سال تک بنو جعفر کے خاندان کے نوجوان افراد تفلس پر حکومت کرتے رہے، جن میں سے ہر ایک باری باری ایک ایک ماہ حکومت کرتا تھا (العَیْنی).

بادشاہانِ قوی: شاہ ڈیمٹْری Dimitri (۱۱۲۵ تا ۱۱۵۰ء) کے عہدِ حکومت میں خاندان اُرْبیلیانی Orbeliani کے ساتھ خانہ جنگی جاری رہی۔ اس کے ہمعصر مسلمان بادشاہ یہ تھے: آذربایجان میں اتابک ایلدگز (گرجی زبان میں ایلدِگُز: آنی Ani میں شدّادی خاندان کے بادشاہ؛ خلاط میں ظہیرالدین شاہ ارمن (۱۱۲۸ تا ۱۱۸۳ء)؛ اِرْزِ روم میں امیر صَلْتُق بن علی، جسے گرجستانیوں نے آنی کے قریب ۵۴۸ھ/ ۱۱۵۳ء میں شکست دی؛ قبّ ابن الأثیر، ۱۱ : ۱۲۶، بذیل سنہ ۵۴۸ھ؛ مُنجّم باشی، ۲ : ۵۷۷؛ Defrémery : *Fragments*، ص ۴۰۔ یہ ڈیمٹْری ہی تھا جو ۱۱۳۹ء کے زلزلے سے فائدہ اٹھا کر شہر گنجہ کا مشہور و معروف آہنی پھاٹک اٹھوا کر گِلَتھی Gelathi کی خانقاہ میں لے گیا (قبّ Fraehn : *Mém. Ac. St. Pétersbourg*، *Sc. morales*، سلسلۂ ششم، ۳ : ۵۳۱)۔ تِفْلِس کے کوائف ابن الأزْرَق مؤرِّخ میّافارِقین [اَرکَ بآن] نے لکھے ہیں، جو ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء میں تِفْلِس گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ خاص رعایت کا سلوک ہوتا تھا۔ ہر جمعے کے روز ڈیمٹْری مسجد میں آیا کرتا تھا اور خطیب کے سامنے دَکّہ (مسند) پر بیٹھ جایا کرتا تھا؛ قبّ Amedroz : *Three Arabic MSS.*، در *J. R. A. S.*، ۱۹۰۲ء، ص ۷۹۱

(ممکن ہے العَینی نے الازرق ہی سے اپنا مواد لیا ہو).

گیورگی ثالث (Giorgi III) کے زمانے (۱۱۵۶ تا ۱۱۸۴ء) میں گرجستان کے اِرد گرد کی اسلامی حکومتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور بادشاہ نے اِرْزِ روم، آنِی، دْوِیْن، نَخچوان، گنْجہ، بَرذَعہ اور بَیلْقان کے خلاف زبردست مہمّات بھیجیں۔ اپنے پھپیرے بھائی شیروان شاہ اَخْستان کی مدد کے لیے گیورگی دربند تک پہنچا، اس لیے کہ یہ شیروان شاہ گیورگی کی پُھپی (ملکہ) تَمَر کا بیٹا اور اس کا پھپی زاد بھائی تھا (قبّ Brosset، ۱ : ۳۸۳ تا ۴۰۳ اور *Add.*، ۱ : ۲۵۳ تا ۲۵۷، ۲۶۶؛ ابن الأثیر بذیل سنین ۵۵۶ھ، ۵۵۷ھ، ۵۵۹ھ، ۵۶۱ھ، ۵۶۹ھ).

تَمَر ''شمسِ خارْتھلیا'' کا عہدِ حکومت: تمر کا عہد (۱۱۸۴ تا ۱۲۱۱ء یا ۱۲۱۲ء) گرجستان کی تاریخ میں انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس کے متّصل بعد گرجستان کو سخت آزمایشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ سلاجقہ کے جانشینوں کو صلح پر مجبور کرنے کے بعد مسیحی سلطنت نے اب جارحانہ اقدامات شروع کر دیے اور اپنے گرد مسلم باج گذار جمع کر لیے۔ طرابزون کے خاندان کومْنینوای Comnenoi کی سلطنت کو وجود میں لانے میں تَمَر نے نمایاں حصہ لیا (Kunik: *Osnov. Trapez. imperii*، در *Učen. Zap. Akad. Nauk*، ج ۲، ۱۸۵۳ء، *v 1204*، ۲ : ۷۰۵ تا ۷۳۳)۔ جو افواج اَرْزِ روم اور اَرْزنجان سے جا کر لڑ رہی تھیں انھوں نے آذربایجان کے ایلدگزی اتابکوں کو شکستیں دیں۔ گرجیوں کے اردبیل کو غارت کرنے (Brosset، ۱ : ۴۶۹ تا ۴۷۳) کی تصدیق سلسلۃ النسب صفویۃ (برلن ۱۸۴۳ء، ص ۴۴؛ قبّ خانیکوف : *Mél. Asiatiques*، ج ۱، ۱۸۵۲ء: ص ۵۸۰ تا ۵۸۳) سے بھی ہوتی ہے۔

وقائع نامۂ گرجستان میں ۱۲۱۰ تا ۱۲۱۲ء کی ایک مہم کا بھی ذکر ہے جس نے تمام شمالی ایران میں رُوم گارو Romguaro (= رمجار نزدیک نیشاپور) تک یلغار کی تھی لیکن تبریز سے پرے اس یلغار کی منزلیں محض خیالی معلوم ہوتی ہیں (Brosset، ۱ : ۴٦۹ تا ۴۷۳) ۔ جرنیل زخارے Zakharé اور ایوانی Iwané، جو مخرگردزل Mkhargrdzel خاندان سے تھے (یعنی کردی الاصل ارمنی، قب Brosset : Add.، ۱ : ۲٦۷)، کی شاندار کامیابیوں کے باوجود گرجیوں کی یہ فتوحات کچھ دیر پا ثابت نہ ہوئیں اور اپنے مفتوحہ مقبوضات میں سے ثمر صرف قرص (Brosset، ۱ : ۴٦۷) ھی کو اپنے قبضے میں رکھ سکی ۔ خود اپنے ملک میں بھی (Djawakhow)، جہاں جاگیردار سرداروں کی طاقت بہت بڑھ رهی تھی، ملکہ کی توجہ کی ضرورت تھی ۔ اسلامی رسم و رواج نے گرجستان میں بھی اپنا اثر دکھایا : چنانچہ جرنیل ایوانی کو اتابک کا خطاب ملا (''جو سلاطین کے هاں مستعمل ہے'' : Brosset، ۱ : ۴۷۴) ۔ ثمر کے دورِ حکومت میں ایک باغی کا ذکر بھی آتا ہے جس کا نام گوزن Gozan بن ابوالحسن ''امیر تفلس و خارتھلیا'' تھا (کیا یہ بنو جعفر کے خاندان کی کسی شاخ سے تھا؟).

مغول : ثمر کے بیٹے گیورگی ثالث الملقب به لشا (بمعنی ''ذیشان'' یا ''جلیل'' در زبان ابخازی) نے ۱۲۱۲ سے ۱۲۲۳ء تک حکومت کی ۔ اس نے گنجہ، نخچوان، ارز روم (کرنوکلک Karnukalak) اور خلاط پر خراج عائد کر دیا لیکن ۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء میں سبتای Subutai اور جیبہ DJebe (گرجی زبان میں سبا Suba اور ایاما Iama یا جیبہ) کے مغولی لشکر ایران میں آ نمودار ہوے ۔ گرجستانیوں کو نئی مرتبہ شکست ہوئی ۔ وقائع نامۂ گرجستان (Brosset، ۱ : ۴۹۳) کی رو سے گرجی فوجیں جو اب تک مظفر و منصور چلی آتی تھیں بردج (دریاے بورچلا پر) کی شکست کے بعد سے ان کی قسمت نے پلٹا کھایا.

گیورگی اچانک مر گیا اور تاج و تخت اس کی ہمشیرہ رسدن Rusudan (۱۲۲۳ تا ۱۲۴۷ء) کو ملا [ایسے مسلمان مصنفوں نے قیز۔ملک یعنی کنواری ملکہ لکھا ہے] ۔ وہ ایک عیش پسند حسین شہزادی تھی اور کئی ہمسائے مسلم حکمران اس سے شادی کرنے کے آرزومند تھے (Brosset، ۱ : ۴۹۵) ۔ آخر کار اس نے ارز روم کے سلجوقی سلطان کے بیٹے مغیث الدین طغریل (گرجی زبان میں اُرتُھل Orthul) کو چنا، جو اپنے باپ کے حکم سے عیسائی ہوگیا (ابن الأثیر، ۲ : ۲۷۰ : ''حادثۃ غریبۃ لم یوجد مثلھا'') ۔ رسدن کے ایک خط میں، جو اس نے پاپاے انوسنٹ ثالث (Innocent III) کو لکھا (اور جو روم میں ۱۲۲۴ء میں پہنچا)، حملۂ مغول کو بادشاہ نے ایک معمولی سا واقعہ ظاہر کیا ہے، لیکن ایک نیا دشمن دروازے پر کھڑا تھا.

خوارزم شاہ جلال الدین نے اہل گرجستان کو گرنی Garni کے مقام پر شعبان ۶۲۲ھ/ اگست ۱۲۲۵ء میں شکست دی (ابن الأثیر، ۱۲ : ۲۸۳ ؛ نسوی، طبع Houdas، ۱۱۲ ؛ Brosset : Add.، ۱ : ۳۰۹) ؛ گرجی سپہ سالار شلوہ (جوینی، ۲ : ۱۵۹ : اسے اور اس کے بھائی [ایوانی دونوں کو]) قید کر لیا گیا اور ۹ مارچ ۱۲۲۶ء کو تفلس پر قبضہ ہوگیا ۔ یہ قبضہ ان ایرانیوں کی غداری کا نتیجہ تھا جو شہر میں سکونت پذیر تھے ۔ بقول جوینی [۲ : ۱٦۴]

جلال الدین نے شہر کے باشندوں کی جان بخشی کی اور انھیں 'ابخازیا' [ابخاز] میں چلے جانے کی اجازت دے دی لیکن اس نے تمام مسیحی کنشتوں کو برباد کر دیا، اس کے برعکس ابن الاثیر کہتا ہے کہ شہر پر ھلّہ بول کر قبضہ کیا گیا تھا (عَنْوَةً و قَہْراً مِنْ غَیرِ اَمَانٍ) اور سوا ان لوگوں کے جنھوں نے اسلام قبول کیا باقی سب قتل کر دیے گئے ۔ نَسوی (ص ۱۲۲) بھی تِفْلِس کے تمام گرجستانیوں اور ارمنیوں کے قتل عام کی تصدیق کرتا ہے (قبّ Brosset، ۱ : ۵۰۳ تا ۵۰۷)۔ وزیر شَرف المُلْک شہر کا حاکم مقرر ھوا اور جب وہ موسمِ سرما بسر کرنے کے لیے گنجہ چلا گیا تو گرجستانی واپس آ گئے اور انھوں نے شہر کو آگ لگا دی؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس پر قبضہ قائم رکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی (نَسَوی، ص ۱۲۵) ۔ جلال الدین اس وقت کہیں اَور مصروف تھا، اس لیے وہ ۱۲۲۸ء تک گرجستان واپس نہ آ سکا ۔ یہاں پہنچ کر اس نے لوری Loré کے قریب مِنْدَور Mindor کے مقام پر (جو گرجی زبان میں بمعنی ''میدان'' ھے) سپہ سالار ایوانی کی فوج تِتّر بِتّر کر دی، جس میں مختلف قسم کے لوگ شامل تھے، یعنی گرجستانی، اَلان، ارمنی، سَریر کے لوگ (یعنی داغستان کے اَوار)، لکز، قِپْچاق، سْوَان، اَبْخاز، جانِیت (=چَانْ ۔ ایتھی: قبّ مادّۂ لاز) اور شام و روم (ایشیاے کوچک) کے بعض لوگ وغیرہ وغیرہ (قبّ جُوینی، ۲ : ۱۷۰) ۔ وقائع نامۂ گرجستان (Brosset، ۱ : ۵۱۰) میں ھے کہ بولنِس (= مِنْدَور ؟) کی فتح کے بعد جلال الدین نے تِفْلِس میں از سرِ نو مظالم توڑے۔

مغولوں کا دوسری بار نمودار ھونا: ۶۲۸ھ/ اگست ۱۲۳۱ء میں جلال الدین میدان سے غائب ھو گیا لیکن خوارزمیوں کے بقایا نے گرجستان کے مشرقی حصے میں فساد برپا کیے رکھا، جس سے بڑے بڑے جاگیردار عمائد کو اپنے قلعوں میں بند رہنا پڑتا تھا، مگر تِفْلِس ابھی رُسُدَن ھی کے قبضے میں تھا کہ جُرمُغَان [جورماغون (نوئین)] Djurmaghan کے مغول گنجہ کے راستے سے گرجستان میں داخل ھوے ۔ یہ واقعہ ۱۲۳۶ء میں پیش آیا (Brosset، ۱ : ۳۳۳، مگر بقول d'Ohsson، ۳ : ۷۵، حدود ۶۳۲ھ/ ۱۲۳۵ء میں) ۔ رُسُدَن تِفْلِس سے کوتایس Kutaïs چلی گئی اور شہر کے والی نے شہر جلا دیا (Brosset، ۱ : ۵۱۴ ''اور اس طرح شہر تِفْلِس تباہ ھوا'')۔

نوئینوں نے، جن کی تعداد وقائع نامۂ گرجستان نے ھمیشہ چار بتائی ھے (چُرمُغان، چِغَتَر، اِیوسِر اور بِچُوی (Čaghatar ، Čarmaghan ، Bičuy ، Ioser)، ملک پر قبضہ کر لیا اور تفلس کو دوبارہ آباد کیا ۔ رُسُدَن کی حکومت اب رِی اَون Rion کی وادی تک محدود رہ گئی۔

مغولوں نے ملک کا سیاسی نظام درھم برھم کر دیا: گرجیوں کو مغولی مہمّوں میں شامل ھونے پر مجبور کیا گیا (مثلاً ان مہمّوں میں جو [سلطان] غیاث الدین (از سلاجقۂ روم)، اسماعیلیۂ اَلَموت اور بغداد کے خلاف بھیجی گئیں اور اسی طرح کی اَور مہموں میں) ۔ تمام ملک کو چھے تومانوں میں تقسیم کر دیا گیا اور گرجستانی جاگیرداروں (مْتھَوَار *mthawar*) کو، جن کی جاگیروں میں کئی تبدیلیاں ھوئیں، نوئینوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ عمائد کو پہلے باتوخان کے پاس اور پھر خان اعظم (Great Khān) کے پاس منگولیا میں جانا پڑتا، جہاں انھیں برسوں تک رہنا پڑتا تھا ۔ اس طرح وارثِ تخت داؤد (جسے منگولی زبان میں

نارین یعنی ''ذیشان'' کہا کرتے تھے) ملک بدر کر دیا گیا ۔ ایک شخص اِگ آرسْلان Egarslan نے مغولوں کے خلاف ملک کو متحد کرنے کی کوشش کی (''صرف کمی یہ تھی کہ وہ بادشاہ کے لقب سے ممتاز نہ تھا''، Brosset ، ۱ : ۵۳۲) لیکن مغولوں نے اس کے خلاف داؤد بن گیورگی لَشا کو کھڑا کر دیا، جس کی تاجپوشی مُتْسْخیتا میں ہوئی، اسے بھی باتو کے پاس اور قراقورم جانا پڑا ۔ یہ بھی مذکور ہے کہ ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء میں گیُوک خان Guyukkhan کی قورلتای میں ''دو داؤد'' حاضر تھے (قب جُوَینی، ۱ : ۲۰۵، ۲۱۲؛ رشیدالدین طبع بلوشہ Blochet، ص ۲۴۲) ۔ یہ مُونْگکے Möngke [منگو قاآن] کی تخت نشینی کے بعد (جو ۱۲۴۸ سے ۱۲۵۹ء تک حکمران رہا) گرجستان واپس آئے اور پہلے پہل اکٹھے ہی حکومت کرتے رہے ۔

چونکہ ھُولاگُو، داؤد نارین کو پسند نہ کرتا تھا اس لیے داؤد ابخاز کی طرف فرار ہو گیا ۔ وقائع نامۂ گرجستان میں مذکور ہے کہ ''یوں ہمارا ملک دو امارتوں میں تقسیم ہو گیا'' (Brosset ، ۱ : ۵۴۶) ۔ مشرق گرجستان میں دو حکمران تھے : ایک طرف تو باتو خان تھا، جو شمال قفقاز کے تمام علاقے کا مالک و مختار تھا اور گرجستان کو اپنے تسلّط میں لانا چاہتا تھا ۔ دوسری جانب ایران کے ایلخانی تھے، جو اس علاقے پر اپنا حق جماتے تھے ۔ داؤد بن لَشا نے مغولوں کے محصّل خواجہ عزیز کی زیادہ ستانیوں سے تنگ آ کر (رشیدالدین، طبع کاترمیر Quatremère، ص ۳۹۰، اسے ''گرجستان کا ایک والی'' بتاتا ہے) راہِ فرار اختیار کی اور اپنے چچازاد بھائی کے پاس چلا گیا ۔ اُویرات ارغون نوئین نے تفلس پر قبضہ کر لیا ۔ ان میں آپس میں صلح اُسی وقت ہوئی جب لَشا کے بیٹے نے ھُولاگُو کے پہلو بہ پہلو برکہ Berke خان کی فوجوں کے خلاف جنگ آزمائی کی ۔ یہ برکہ باتو کا جانشین تھا اور اس نے ۱۲۶۲ء میں شیروان پر حملہ کیا تھا (d'Ohsson ، ۳ : ۱۸۲) ۔ اَباقا کے دورِ حکومت میں برکہ پھر ماوراے قفقاز میں داخل ہو کر تفلس تک آ پہنچا، جہاں بہت سے عیسائیوں کا قتل عام ہوا (۱۲۶۶ء میں؛ قب وہی کتاب، ۴۱۸) ۔

لَشا کے بیٹے داؤد کا جانشین اس کا بیٹا ڈیمٹری ثانی (۱۲۷۳ تا ۱۲۸۹ء) ہوا، جس نے اباقا اور احمد کی کئی لڑائیوں میں حصّہ لیا لیکن ارغون کے عہدِ سلطنت میں اس کے خزانے ضبط کر لیے گئے، پہلے توسرِ اُردو اس کے تلووں پر ڈنڈے مارے گئے، پھر اس کا سر قلم کر دیا گیا ۔ گرجستانی اسے تھو ۔ دادبلی Thaw - Dadebuli کہتے ہیں، یعنی ''وہ شخص جس نے اپنا سر قربان کیا'' ۔

اس کے بعد مغولوں نے کئی اور بادشاہوں کو نامزد اور معزول کیا ۔ داؤد ششم (۱۲۹۲ تا ۱۳۱۰ء) نے آلِ باتو کے خان (اوتاخا = توختْ اوغو) سے گفت و شنید کرنے کی ناکام کوشش کی، ناچار اسے غازان کے پاس ایک سفارتی وفد بھیجنا پڑا، جو اورتھوڈوکس فرقے کے جاثلیق (یعنی بطریق اعظم) اور قاضی تفلس پر مشتمل تھا (قب Brosset، ۱ : ۶۱۵) [یہ آخری جزئی اس بات کی دلیل ہے کہ جلوسِ غازان کے بعد اسلام ازسرِ نو تازہ ہوا !] ۔ گرجستانی مغولوں کی تمام جنگوں میں بدستور حصّہ لیتے رہے لیکن اس کے باوجود وہ ظلم و تعدّی سے محفوظ نہ رہ سکے (قب عہدِ غازانی کے مسلمان نوئین نوروز کی فعالیت، Brosset، ۱ : ۶۱۷) ۔۔۔۔۔ ۔

گیورگی خامس: اَلجایتو کی موت (۱۳۱۶ء) کے بعد گیورگی خامس (برتسقنواله Brtsknwale یعنی ''ذیشان'') کو امیر چوپان کی سرپرستی میں تخت پر بٹھایا گیا (۱۳۱۶ تا ۱۳۴۶ء)۔ ایلخانیوں کے آخری سالوں کے فسادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گیورگی نے مغولوں کو نکال باھر کیا۔ اُس نے باغیوں کی بیخ کنی کی اور فوج لے کر اِیمِریتھیا Imerethia گیا اور اس نے اپنی حکومت کے ماتحت نہ صرف گرجستانی علاقوں کو سپیر Sper (جو آج کل اِسْپِر Ispir کہلاتا ھے) کی حدود تک لے لیا بلکہ ''نِکوفسیا Nikophsia سے (جو بحیرۂ اسود کے ساحلی مقام سُخُوم سے ۱۰ میل پر ھے) دربند تک'' کل علاقے کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

تیمور: بَگْرات پنجم کے طویل عہدِ سلطنت (۱۳۶۰ تا ۱۳۹۵ء) کا ذکر ھے کہ تیمور نمودار ھوا۔ اس کا درباری مؤرّخ [یزدی] گرجستان کی جنگ کو ''جہاد'' قرار دیتا ھے۔ تیمور ۷۸۸ھ / ۱۳۸۶ء کے موسمِ سرما میں (ظفرنامہ، ۱ : ۴۰۱) قَرص سے روانہ ھوا تو بگرات نے اپنے آپ کو تِفْلِس کے قلعے میں بند کر لیا۔ شہر پر قبضہ ھو گیا اور بادشاہ اور ملکہ دونوں قید کر لیے گئے۔ وقائع نامۂ گرجستان اور ٹامس المِتْسوفی Thomas of Metsoph (Exposé : Nève، ص ۳۷) دونوں بادشاہ کے عیسائیت سے انحراف اور قبولِ اسلام کا ذکر کرتے ھیں لیکن دونوں اسے ایک عیّارانہ چال ظاھر کرتے ھیں، جس کے ذریعے وہ بارہ ھزار تیموری سپاھیوں کو ٹھکانے لگا کر اپنا ملک واپس لینے میں کامیاب ھو گیا۔ اس کا بیٹا گیورگی ۱۳۹۵ء میں اس کا جانشین ھوا۔ ظفرنامہ (۱ : ۷۰۵، ۷۲۰) میں ان جزئیات کا [خصوصاً ان کے اسلام لانے کا] کوئی ذکر نہیں [بلکہ ھر جگہ ان پر جزیہ عائد کرنے کا ذکر ھے، نیز دیکھیے ظفرنامہ، ۲ : ۵۲۲ ببعد]۔ ۷۹۶ھ / ۱۳۹۴ء کے تحت میں یزدی صرف یہ کہتا ھے کہ تیمور نے آخال تْسِیْخہ Akhaltsikhe (آخِسْقَہ Akhiskha) کے علاقے کی طرف غزا کی نیت سے چار جرنیل بھیجے [اور خود وہ آلہ‌تاق کے جنگلستان کی راہ سے گُرجستان کو روانہ ھوا]۔ بالآخر تیمور نے اُن گرجستانیوں کو جنھیں قراقَلقانْلیقْ (کالی ڈھالوں والے = ''گرجستان کے کوھستانی یعنی پْشاو اور خیوسر) کہتے ھیں سزا دی اور تفلس کے راستے شِکّی [آرکَ بان] کو لوٹ آیا۔

۷۹۸ھ / ۱۳۹۵ء میں گرجستانیوں نے اپنے حلیف سِیْدی علی والی شِکّی [آرکَ بان] کے ھمراہ میران شاہ تیموری کی فوج کو شکست دی، جس نے اس وقت آلنجق (نزدِ نَخچوان) کا محاصرہ کر رکھا تھا اور سلطان طاھر جلائر [بن سلطان احمد جلائر] کو، جو آلنجق میں محصور تھا، اس کے پنجے سے نجات دلائی (یزدی، ۲ : ۲۰۳ ببعد)۔ اس کارروائی کا ردِّ عمل ۸۰۲ھ / ۱۳۹۹ء کے موسمِ سرما میں یہ ھوا کہ تیمور نے شِکّی کو فتح کر لیا اور درۂ خِمْشا (؟) کے جنگلستان کو بے رحمی سے تاراج کر ڈالا۔ یہ مقام غالباً شمالی کاخِیتْھیا میں واقع تھا، جہاں مَرِیلی میں خِمْشیا خاندان کی جاگیر تھی، جو تھِیونیتھی کے مشرق میں ھے (Brosset، ۲ / ۲ : ۳۶۴) [ظفر نامہ، ۲ : ۲۲۶ میں علاقۂ درہ کے حاکم کو بھی خمشا ھی بتایا ھے]۔ ۱۴۰۰ء کے موسمِ بہار میں تیمور نے تِفلِس کی طرف کوچ کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ شاہ گیورگی (گُرگین) سلطان طاھر کو اس کے حوالے کر دے۔ گُریز آمیز جواب پانے کے بعد تیمور نے سارے علاقے کو بالکل ویران کر دیا (یزدی، ۲ : ۲۴۱ ببعد)۔ تِفلِس میں خراسانی قلعہ‌گیر فوج آ گئی لیکن

گیورگی پھر پہاڑوں میں جا گھسا ۔ ایک گرجستانی شہزادے جانی بیگ کے بخوشی اطاعت قبول کر لینے اور قلعہ زریت (؟) کے فتح ہو جانے کے بعد تیمور کے لشکر گیورگی کے تعاقب میں روانہ ہوے اور سوانیتھیا Swanethia کو ویران کر دیا ۔ گیورگی بلاد ابخاز کو چلا گیا اور اس نے طاہر کو روم (ایشیاے کوچک) میں واپس بھیج دیا ۔ ایک مسلمان اسمٰعیل نامی کے توسّط سے ([ظفر نامہ، ۲ : ۳۴۸]؛ Brosset، ۱ : ۶۶۸) اس نے تیمور کو باج و خراج دینا قبول کر لیا ۔ تیمور نے منظور کر لیا ۔ اس کے بعد ایوانی Iwané، گرجی (جوسمتٌ سخِہ Samtskhe [بلاذری، ۲۰۲، ۱۹۵ : سمسخی] کا اتابک تھا) کے علاقے میں تیمور نے اعلام اسلام بلند کیے اور کوہ نشینان قراقلقان لیق کے علاقے کو تاخت کیا ۔ کوئی دو مہینے تک، موسم گرما کی فرودگاہ مِنْ گوال ('' ہزار جھیل'') میں، جو قرص سے قریب ہے، قیام کیا ۔ کچھ گرجستانی فرس گرد (Phanaskert جو بالائی رودِ چُورُخ پر ہے) کے قریب جمع ہو گئے تھے ۔ ان کے خلاف بھی تیمور نے فوج کشی کی (ظفر نامہ، ۲ : ۲۵۰).

۸۰۳ھ/ اواخر ۱۴۰۱ء میں تیمور سیواس ــ بغداد ــ تبریز کے راستے سے پھر ماوراے قفقاز میں آیا ۔ اس کے محصّل '' ساؤ و خراج و جزیہ '' وصول کرنے کے لیے گیورگی کے پاس پہنچے ۔ اُس نے اپنے بھائی کو پیش کش [اموال و اسباب و ہدایا و جزیہ] دے کر بھیجا ۔ تیمور نے گیورگی کو اس شرط پر امان دی کہ وہ اسے فوج مہیا کرے اور مسلمانوں [کی ایذا و تشویش کا کوئی خیال دل میں نہ لائے] (یزدی، ۲ : ۳۷۹) ۔ ۸۰۴ھ / ۱۴۰۲ء کے موسم گرما میں تیمور قراباغ سے مِنْ-گوال گیا اور قلعۂ تُرتوم Tortum ، جس پر کُرجیک کا قبضہ تھا، فتح کر لیا ۔ کُرجیک مذکور قلعۂ ترتوم کے گرجیوں کے حاکم طَغی (؟) کا نائب تھا ۔

جب ۸۰۵ھ میں تیمور اَرزِروم میں واپس آیا تو اس نے گیورگی کو اس جُرم کی پاداش میں سزا دینے کا فیصلہ کیا کہ وہ بایزید پر فتح پانے کے سلسلے میں اسے مبارکباد دینے کے لیے کیوں حاضر نہیں ہوا ۔ مِنْ-گوال کے مقام پر ایوانی Iwané ابن آق بوغا اور کُستَندِیل (قسطنطین [Constantine])، برادرِ گیورگی، جس کی اپنے بھائی سے اس وقت ناچاقی تھی، تحفے تحائف لے کر حاضر ہوے (وہی کتاب، ۲ : ۵۱۲) ۔ گرجستان کے مداخل و مخارج کا اندازہ لگانے کے لیے شیخ ابراہیم شیروانی وہاں گیا ۔ گیورگی نے نئے تحائف بھیجے لیکن تیمور نے قبول نہ کیے اور حکم دیا کہ وہ اصالۃً پیش ہو ۔ [محرم] ۸۰۶ھ / اگست ۱۴۰۳ء میں تیمور نے خود کُرتین Kürtin کے ناقابلِ تسخیر قلعے کا محاصرہ کیا، جس کا حاکم نَزال یا زَوال تھا (وقائع نامۂ گرجستان میں کُرتین کو بِرتھوس Birthwis بر لبِ دریاے آلگیت Alget [آل کیت چایی، در عالم آرا، ۷۲۳] لکھا ہے) ۔ اس قلعے کو اس نے نو دن میں فتح کر لیا (یزدی، ۲ : ۵۲۳ تا ۵۳۲) ۔ پھر فوج نے گرجستان کے ''اطراف'' کو بلاد ابخاز کی ''حدود'' تک '' جو اس ملک کی آخری حد ہے'' ویران کر دیا ۔ سات سو شہر اور گاؤں تباہ ہوے اور تیمور کا مؤرخ اس قتل و غارت اور تخریب و تقلیب کے بیان میں اپنا زورِ فصاحت بہت صرف کرتا ہے (یزدی، ۲ : ۵۳۶) ۔ تیمور نے صرف اس وقت اپنا ہاتھ روکا جب علماء اور مفتیوں نے یہ فتویٰ دیا [کہ قبولِ جزیہ اور وعدۂ عدمِ ایذاے مسلمانان کے بعد حکمِ شرع یہ ہے کہ امان دی جائے اور امراء نے بھی سفارش کی] ۔ گرجستانیوں نے ایک ہزار تنکۂ طلائی تیمور کے نام کا ضرب کرا کر ہزار گھوڑے اور ایک قطعۂ لعلِ [خوشرنگ و آبدار] وزنی ۱۸ مثقال اور دیگر تحائف تیمور کے پاس بھیجے ۔

تیمور تِفلس سے گذرا - اس نے تمام مسیحی دَیروں اور کلیساؤں کو ویران کر دیا اور (۱۴۰۳-۱۴۰۴ء کے موسمِ سرما میں) بَیلقان پہنچا اور بیلقان سے لے کر طرابزون تک کا کل علاقہ امیرزادۂ خلیل سلطان کو بطور جاگیر عطا کیا (یزدی ، ۲ : ۵۴۵).

دورِ تیموری کے بعد کا زمانہ : تیمور کی لائی ہوئی تباہی کے بعد جو عام بدنظمی پھیلی اُس کا ذکر وقائع نامۂ گرجستان کے اُس حصے میں موجود ھے جس میں مختلف حکمرانوں کے عہد کی مختصر کیفیت بیان کی گئی ھے - مسلم مآخذ (مطلع سعدین، N.E. xiv ، ص ۲۳۰ [طبع لاھور، ۲/۱ : ۲۴۲] اور میر خواند؛ قب Defrémery : *Fragments* ، ص ۲۴۵) شیخ ابراھیم شیروانی کی ایک مہم کا ذکر کرتے ھیں جو جلائری خاندان کا دوست تھا - یہ مہم قرہ قویونلو کے خلاف تھی، جس میں کُستندیل Kustândil [در مطلع بالشین، یعنی کشتندیل] شاہ گرجستان نے بھی حصہ لیا - دریاے آرس کے شمال میں اتحادی فوجوں کو شکست ھوئی اور قرہ یوسف نے کُستندیل کو اپنے ھاتھ سے قتل کیا - یہ واقعہ ۸۱۵ھ / ۱۴۱۲ - ۱۴۱۳ء کا ھے - تین سو ازناوُر (= گرجستانی شرفاء؛ قب ارمنی اَزن = نسل ، اصل) بھی قتل ھوے - صرف وَخُشت (Brosset ، ۱ : ۶۸۹) ھی ایک ایسا مؤرخ ھے جو قسطنطین کا بادشاہ کی حیثیت سے ذکر کرتا ھے اور اس کی موت کا سال ۱۴۱۴ء بتاتا ھے - ۱۴۱۳ء (۱۴۱۶ء؟) میں آخال تسِیخہ کے ایرانیوں (= مسلمانوں) کی دعوت پر قرہ یوسف نے اس علاقے پر حملہ کر کے ملک کو ویران کر دیا (ٹامس مِتسوفی Thomas of Metsoph ؛ قب Nève : موضع مذکور، ص ۹۶ ؛ Brosset : *Add.* ، ۱ : ۳۹۹) - وقائع نامۂ گرجستان کو یہ بات تسلیم ھے کہ اَلِگزانڈر (۱۴۱۳ تا ۱۴۴۲ء) کی تخت نشینی تک "کہیں سے بھی کوئی ڈھارس دینے والا پیدا نہ ھوا" - اس بادشاہ نے آھستہ آھستہ حملہ آوروں کو باھر نکالا - سْوِیتی تْسْخوِیلی Sweti Tsk͟howeli (مُتْسْخیتا) کا گرجا دوبارہ تعمیر کیا اور قلعوں کی مرمت کرائی - [دسمبر ۱۴۲۱ء میں اَلِگزانڈر کے ایلچی قرا باغ میں، پھر اپریل ۱۴۲۲ء میں اس کے اور اِیوانی وغیرہ کے ایلچی ایک اَور مقام پر شاہ رخ کی خدمت میں حاضر ھوے، مطلع سعدین ، ۲ / ۱ : ۳۲۲ ، ۳۴۱ ببعد] - گرجستانی سفراء ، جنھوں نے ۸۲۳ھ/۱۴۲۱ء میں قرا باغ کے مقام پر (قب میر خواند ، در Defrémery ، کتاب مذکور، ص ۲۵۱) شاہ رُخ کا استقبال کیا، ضرور اَلِگزانڈر ھی نے بھیجے ھونگے - جب شاہ رخ ۸۴۱ھ / ۱۴۳۷ء میں سوم خیتِھا آیا (قب سطور بالا) تو اَلِگزانڈر نے اُسے قیمتی تحائف بھیجے، جس کے بعد تیمور کا بیٹا گرجستان سے واپس چلا گیا - ۸۴۸ھ / ۱۴۴۴ء میں جہان شاہ قرہ قویونلو نے آخال تسِیخہ پر حملہ کیا (قب Brosset ، ۱ : ۶۸۳) : اور بقول ٹامس مِتسوفی اس نے تِفلس پر ۱۴۴۰ء میں قبضہ کر لیا : قب Nève ، ص ۱۴۹ [مطلع سعدین، ۲/۲ : ۱۳۱۷]).

تقسیم گرجستان : اس دَور کی گرجستانی روایات کی پیچیدگیوں کا سُلجھانا بے حد مشکل ھے (Brosset ، ۱ : ۶۷۹ تا ۶۸۹) - تأریخ وَخُشت، جو وقائع نامۂ گرجستان کا ذیل ھے اور اس کی تصحیح بھی کرتی ھے اور مسلم مؤرخین کے بیانات کے زیادہ مطابق بھی ھے، قسطنطین ثالث کے عہد سے شروع ھوتی ھے (۱۴۶۹ تا ۱۵۰۵ء) - اس زمانے میں گرجستان تین بڑی ریاستوں میں تقسیم ھو چکا تھا (Brosset ، ۲ / ۱ : ۱۱ تا ۱۸ ، ۱۴۷ ، ۲۰۸ ، ۲۴۹) : خارْتْھلیا (بر رودِ کُر (گرجستانی زبان میں مْتْکْوَر [عالم آرا، ۱۶۳ :

کارتیل] جس کا پایۂ تخت تِفلس تھا)، ایمیریتھیا Imerethia (بر لبِ رودِ رِی‌اون Rion ، پایۂ تخت کوتایس) اور کاخیتھیا Kakhethia [عالم آرا، ص ۶۳ : کاخت] (بر رودِ آلازَن، پایۂ تخت گریمی (فارسی میں گریم) اور بعد میں تھیلاو) ۔ اس کے علاوہ اتابکِ سَمتسخه نے (پایۂ تخت : آخال تسیخه Akhal-tsikhe) بغاوت کر دی اور ساآتبگو Saatabago کی امارت قائم کر لی (جس میں سَمتسخه جو دریاے کُر کی بالائی گذرگاہ پر واقع ہے اور کلرجیتھیا Klardjethia [بلاذری، ۳۰۲ : قلر جیت] جو دریاے چُورخ پر ہے شامل تھے)۔ اس ریاست کے امراء منوچہر ثالث = صفر پاشا (۱۶۲۵ء) اور اس کے جانشین سب کے سب مسلمان تھے(Brosset، ۲ : ۲۲۸)۔ بہت سے مقامی امراء بھی ایمیریتھیا کی حکومت سے آزاد ہوگئے (گوریا کے گوری ایل Guriel، منگریلیا کے دادیان Dadians ، اور سوانس Swans کے گیلووانی Gelowani: قبّ مادۂ ابخاز) ۔ خارتھلیا میں بھی قسطنطین ثالث کے عہد میں ایمیریتھیا کے بادشاہ بگرات ثانی کے حملے کی وجہ سے گڑ بڑ پیدا ہوئی ۔

آق قویونلو: اس زمانے میں اوزون حسن بھی میدان میں آ جاتا ہے۔ بقول منجّم باشی (۳ : ۱۶۰) وہ اول اول ۸۷۱ھ / ۱۴۶۶ء میں گرجستان میں آیا ، آ کر اس نے مسلمان قیدیوں کو رہائی دلائی اور قلعۂ چماقار (؟) فتح کر لیا۔ اندرونی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ آخال تسیخه فتح نہ کر سکا لیکن ۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ء میں اس نے دوبارہ حملہ کیا. شاہ بَکزاتی Bakzāti (بگرات ثانی پڑھیے جو ایمیریتھیا کا بادشاہ تھا) کو تخت سے اُتار دیا گیا اور گرجستان سے تیس ہزار آدمی قیدی بنا لیے گئے ۔ وخشت کے بیان کے مطابق قسطنطین نے تفلس اوزن حسن کے حوالے تو کر دیا مگر ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ کہیں بگرات اس پر قبضہ نہ کر لے ۔ اوزون حسن نے تفلس میں ایک قلعہ گیر فوج مقرر کر دی لیکن انتظامِ حکومت قسطنطین ھی کے پاس رہنے دیا (قبّ Brosset ، ۲ : ۱۳، ۲۰)، مگر تاریخ امینی میں صوفی خلیل بیگ کو اوزون حسن کی جانب سے علاقے کا صاحبِ ایالت بتایا ہے، جو ۱۴۷۸ء تک، یعنی اوزون کے انتقال تک، وھیں رہا ۔ اس کے بعد گرجستانیوں نے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا .

سلطان یعقوب آق قویونلو نے سَمتسخه پر ۸۹۱ھ / ۱۴۸۶ء کے موسم خزان میں حملہ کیا تا کہ اتابک قورقورہ [حبیب السیر (۳ / ۴ : ۹۲) : قرقرہ] کی گوشمالی کرے ۔ اگلے سال یعقوب نے صوفی خلیل بیگ کو گرجستان فتح کرنے کے لیے بھیجا ۔ ترکمانوں نے آغجه قلعه اور کاؤزانی کے قلعوں کی تعمیر شروع کر دی ۔ یہ قلعے دریاے دبیدہ (Borčala) کے زیرین حصے پر ایسی جگہ بنائے گئے جو گرجستان کے جنوبی مداخل پر مشرف ہے (قبّ جغرافیۂ وخشت)۔ کُستاندیل (قسطنطین ثالث) تفلس سے پیچھے ہٹ گیا ۔ صوفی خلیل نے اس کمک کی امداد سے جو موسمِ سرما میں پہنچی شہر کا محاصرہ شروع کیا ۔ اس نے سب سے پہلے قلعہ کجیر (Kodjori، در جنوبِ تفلس) پر قبضہ کیا ۔ تفلس کی اطراف میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں بہت سے مسلمان مارے گئے لیکن آخرکار ولی آغا ایشکچی آغاسی نے شہر فتح کر لیا (۳ ربیع الاول ۸۹۴ھ / ۱۴۸۹ء) (قبّ عہدِ یعقوب کی غیر مطبوعہ تأریخ ، تأریخ امینی، مخطوطۂ کتب خانۂ ملّی (Bibl. Nat.) پیرس، عدد ۱۰۱، ورق ۱۰۱ الف تا ۱۰۵ الف اور ۱۵۵ الف تا ۱۵۹ الف) ۔ وقائع نامۂ گرجستان (Brosset ، ۳۲۶ تا ۳۲۷)، جو بہت سی جزئیات کی توثیق کرتا ہے ، اس بات سے انکاری ہے کہ تفلس فتح ہوا، اس کا مصنف یہ بھی

لکھتا ہے کہ سبراتھیانو، جو دریاے اَلْگیت Alget پر واقع ہے، (اور جسے مسلمان بَرات اِیْلی کہتے ھیں) کی جاگیر کے لوگوں نے ترکمانوں کو شکست دی ۔

دَورِ صَفَویّہ : ۹۰۷ھ / ۱۵۰۱ء میں اسمعیل اول کی فوج کے ایک دستے نے خادم بیگ کے زیر کمان گرجستان پر حملہ کیا (از روے اقتباس شہنشاہ نامہ، در Dorn) - ۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء میں جب دِیْو سلطان نے حملہ کیا تو داؤد ثامن کے بیٹے رَمَز [؟] Ramaz نے شاہ اسمعیل اول کے پاس سفارت بھیجی اور حملہ رکوا دیا (قبّ حبیب السیر، بمبئی ج ۳ : جزء ۴ : ص ۹۲) - ۹۲۹ھ/ ۱۵۲۲-۱۵۲۳ء میں صفوی خاندان کے بانی نے آغجَہ قلعہ پر قبضہ کر لیا اور وعدہ وعید کر کے تفلس کا قلعہ بھی لے لیا - اس نے گرجاؤں کی بےحُرمتی کی اور '' پل کے کونے '' پر ایک مسجد تعمیر کی، قبّ وُخُشْتْ، در Brosset ، ۲ / ۱ : ۲۳ (یہ مسجد [دریا کے] دائیں کنارے پر اب تک قائم ہے) .

اسکندر منشی چار حملوں کا ذکر کرتا ہے جو شاہ طہماسْپ نے گرجستان کے خلاف بڑے پیمانے پر کیے - ۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء میں طہماسْپ نے تفلس پر قبضہ کر لیا - حاکم شہر [کلباد گرجی - عالم آرا] نے (جو لہراسپ اول (Luarsab I) کی جانب سے مقرر تھا) ایرانیوں کی اطاعت قبول کر لی اور اسلام بھی لے آیا - اس کے بعد بِرْتِیس (Birthwis ?) کا قلعہ بھی لے لیا گیا (عالم آرا [طہران ۱۳۱۴ھ]، ص ۶۳) - دوسرا حملہ ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء میں ہوا، جب گرجستانی حکّام طہماسْپ کے پاس اظہارِ اطاعت کے لیے شُورَہ گیل (نزد گوْمری Gümri = Alexandropol = Leninakan) میں آئے - تیسری مہم ۹۵۸ھ / ۱۵۵۱ء میں شِکّی سے روانہ کی گئی، کیونکہ اتابیگ کیخسرو بن قُرْقُرہ (Kwarkware) نے امداد کی درخواست کی تھی اور اُن نقصانات کی شکایت کی تھی جو لُہراسپ Luarsab نے اسے پہنچائے تھے - (اسکندر منشی نے اس کا نام لوارْصاب لکھا ہے لیکن یہ نام ایرانی ہے: لُہراسْپ ؛ قبّ مرآۃ البلدان) - بقول اسکندر منشی : (عالم آرا، ص ۶۵) ۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء کے ترکوں اور ایرانیوں کے صلح نامے کی رو سے مَسْقِی (مِسْخِی = سَمْتسْخِہ) اور کارتیل (خارتھلیا) اور کاخت (کاخیتھیا) کے علاقے شاہ طہماسپ کو سپرد ہوے اور باشی آچق Bashi-ačuk ('' برہنہ سر '' - ایمیریتھیا کے بادشاہ کا عرفِ عام) کے مقبوضات یعنی دادیان، گُوریان (Guria) تا بحدّ طرابزون و طَرابُلُس (Tire-boli) سلطان سلیمان [فرمانرواے روم] کو ملے، مگر لُہراسْپ اول تفلس کے علاقے میں دست تعرّض دراز کرتا رہتا تھا، اس کی وجہ سے چوتھے حملے کی ضرورت پیش آئی - برات ایلی (سَبَراتِھیانو Sabarathiano)، گوری Gori اور اَتینی Ateni پر قبضہ کر لیا گیا اور خود لہراسپ بھی ۹۶۳ھ کی ایک لڑائی میں مارا گیا - وَخُشْت ان چاروں مہموں کی تأریخ علی الترتیب ۱۵۳۶ء، ۱۵۴۸ء، ۱۵۵۳ء اور ۱۵۵۸ء بتاتا ہے - بروسے Brosset ، ۲ / ۱ : ۳۰۲ ان تأریخوں کو بہت اغلب سمجھتا ہے، کیونکہ یہ ترکوں اور ایرانیوں کی جنگ کے وقائع کے ساتھ خاصی مطابقت رکھتی ھیں .

شاہ سوِیمون اول (Swimon I)، جو شکست ناپذیر لہراسپ کا بیٹا تھا، کا زمانہ بڑا ہی پر آشوب تھا (۱۵۵۸ تا ۱۶۰۰ء) : اسے ایرانیوں نے شکست دی اور اس کی جگہ اس کے بھائی داؤد خان کو، جس نے مذہب بدل کر تاج حاصل کیا تھا، تخت نشین کر دیا - سُویمون کو اَلَمَوت کے قلعے میں قید کر دیا گیا، جہاں سے اسمعیل دوم

(۱۵۷۶ - ۱۵۷۷ء) نے اسے رہائی دلائی تا کہ وہ عثمانیوں کی فعّالیت کا توڑ بہم پہنچا سکے۔

آلِ عثمان کا دورِ اقتدار: ۱۵۷۸ سے ۱۶۰۳ء تک۔ ۱۵۷۸ء میں شاہ خدا بندہ کے عہد میں، جو ایک کمزور بادشاہ تھا، مصطفٰے لالہ پاشا کے ماتحت عثمانی سمتسخه کے راستے سے گرجستان میں گھس آئے اور ماہ اگست میں تفلس پر قبضہ کر لیا، جہاں سے داؤد خان پہلے ھی فرار ہو چکا تھا۔ ترکوں نے دو سو سپاھی اور ایک سو توپیں تفلس میں چھوڑیں اور تفلس کی سنجق (پاشالیق؟) محمد بن فرھاد پاشا کے حوالے ہوئی (G. O. R. : v. Hammer، طبع دوم، ۲ : ۴۸۳)۔ دو گرجاؤں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اکتوبر میں گوری میں ایک ترکی پیادہ فوج متعیّن ہوئی اور یہ سنجق سویموں کے حوالے ہوئی۔ جب مصطفٰے پاشا ارزِ روم کو واپس ہوا تو امام قلی خان نے، جس کے باپ (شمخال) کو اوزدمیر پاشا نے قتل کیا تھا، سویموں کے ساتھ مل کر تفلس کا محاصرہ کیا۔ حسن پاشا نے قلعہ گیر فوج کو رسد پہنچائی (وھی کتاب، ص ۴۸۹) لیکن شہر کے نواح میں لڑائی جاری رھی۔ ۱۵۸۰ء میں نیا سرعسکر سنان پاشا تفلس میں پہنچا اور اس نے لہراسپ کے ایک بیٹے کو بیگلر بیگ مقرر کر دیا، جو اسلام لا کر یوسف (؟) کے نام سے موسوم ہوا۔ سویموں نے ترکوں سے سمجھوتہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ اگست ۱۵۸۲ء میں محمد بک ارز روم سے روانہ ہوا تا کہ تفلس کو سامانِ رسد پہنچائے لیکن اسے ایرانیوں اور گرجستانیوں نے گوری کے مقام پر شکست دی۔ فرھاد پاشا نے ایک نئی مہم کی کمان سنبھال کر دسمبر ۱۵۸۱ء میں ان شہروں کو مستحکم کرنے کا ارادہ کیا جو ترکوں کے قبضے میں تھے۔ ۱۵۸۴ء میں رضوان پاشا تفلس کو روانہ ہوا۔ داؤد خان مزید سوچ بچار کے بعد ترکوں سے جا ملا۔ سویموں نے رضوان پاشا پر حملہ کیا مگر بے سود۔ فرھاد پاشا کے ینگی‌چری سپاھیوں نے (آخال - کلکی) میں غدر برپا کر دیا، جس کی وجہ سے اسے مجبوراً پسپا ہونا پڑا۔ ۱۵۸۵ء میں جو حملہ تبریز [رک بان] کے خلاف ہوا تھا اس کے بعد عثمانیوں نے ایران سے آذربایجان اور ماوراے قفقاز کا علاقہ بشمولِ گرجستان حاصل کر لیا (عہد نامہ مؤرّخہ ۲۱ مارچ ۱۵۹۰ء)؛ قب وقائع نامۂ کتاب الترتیلِ مشکی (Chronicle of the Psalter of Meshki) (۱۵۵۹ تا ۱۵۸۷ء)، در تکیش ویلی Takaishwili، کتاب مذکور، ص ۱۸۳ تا ۲۱۴؛ فان ھامر von Hammer، ۲ : ۴۸۱ تا ۴۹۷ (Brosset نے اس کا ترجمہ مع شرح دیا ہے، ۲ / ۱ : ۴۱۱ تا ۴۱۹)۔ فان ھامر کا سب سے بڑا مأخذ نصرت نامہ مؤلفۂ علی ھے (جنوری ۱۵۷۸ تا جنوری ۱۵۸۰ء)؛ دوسرے ترکی مآخذ کے لیے قب: G.O.W. : Babinger، ص ۱۱۷، ۱۸۱۔ محمد ثالث (۱۵۹۵ء) کی تخت نشینی کے جلد بعد سویموں ایک چپقلش میں گرفتار ہوگیا اور اسے قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، جہاں وہ ۱۶۰۰ء میں مر گیا۔ عثمانی دورِ حکومت ۱۵۹۱ء سے لے کر ۲۱ اکتوبر ۱۶۰۳ء تک کم و بیش بلا تعرّض و مزاحمت جاری رہا، مگر ۲۱ اکتوبر ۱۶۰۳ء کو شاہ عباس اول نے تفلس پر دوبارہ قبضہ کر لیا؛ ۱۶۱۲ء کے ترکی-ایرانی عہد نامے کی رو سے سلطان سلیم (۱۵۱۲ تا ۱۵۲۰ء) کے عہد کی صورتِ حالات دوبارہ قائم ہوگئی۔

شاہ عبّاس اول اور بادشاہانِ مسلم: گرجستان (اور بالخصوص کاخت (کاخیتھیا)) پر اس بادشاہ کے

عہد میں بدترین مصائب نازل ہوے ۔ گو ۱۶۰۲ء کے محاصرۂ ایروان میں گیورگی شاہ خارتھلیا اور الگزانڈر حکمران کاخیث دونوں شاہ عباس کے جھنڈے تلے لڑے تھے، عبّاس نے فتح کے بعد گرجستان میں سے لور Lore کا علاقہ لے لیا ۔ اس نے لہراسپ ثانی (۱۶۰۵ تا ۱۶۱۶ء) کی بہن سے شادی کی لیکن لہراسپ کو ایران لا کر گلاب قلعے میں اس کا گلا گھٹوا دیا ۔ ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء میں عباس بذات خود گرجستان آیا اور خارتھلیا کا علاقہ بگرات ششم (۱۶۱۶ تا ۱۶۱۹ء) کو، جو مذھباً مسلمان تھا، دے دیا ۔ اس کے بعد اس نے کاخیتھیا کو شکنجۂ عقوبت میں کھینچا ۔ اس عہد کی سرکاری تأریخ عالم آرا، ص ۶۳۵ کے مطابق مقتولین کی تعداد ساٹھ ستر ہزار تھی [اور درج دفاتر قیدیوں کا اندازہ، جن میں لڑکے، لڑکیاں اور بچے وغیرہ شامل تھے، ایک لاکھ سے زیادہ کیا گیا، بلکہ باعتقاد صاحب عالم آرا (محلّ مذکور) ۳۰ ھزار سے زیادہ اور قیدی بھی اس تعداد میں شامل کرنے چاھییں جو رجسٹروں میں درج نہ ہوسکے]۔ اس مصنف نے لکھا ہے کہ معلوم نہیں ''ظہورِ اسلام سے اب تک دیارِ اسلام کے کسی بادشاہ کے عہد میں گرجیوں کو ایسا حادثہ پیش آیا ہو'' ۔ ۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۳ء میں قرچقای خان کو گرجستان بھیجا گیا ۔ اس نے کاخیتھیا کے [تقریباً] دس ہزار آدمی بھرتی کیے اور ان سب کو ایمیریتھیا [باشی آچق] کے خلاف جنگ کے لیے لے جانے کے بجاے گھیر کر قتل کر دیا گیا، گویا وہ ان کا شکار تھے (''شکاری وار'' : عالم آرا، ص ۷۱۹) ۔ اس غداری سے مشتعل ہو کر مُوراوْ mouraw (چھوٹے درجے کا والی ، بروسے Brosset ، ۲ / ۱ : ۱۴۸ ؛ ایرانی اسے مِہْراوْ لکھتے ھیں) گیورگی ساکدزہ Giorgi Saakadze نے (جو مسلمان تھا اور اس وقت تک شاہ کا وفادار ملازم تھا خارتھلیا) میں بغاوت برپا کر دی، جسے ۱۶۲۶ء تک ایرانی فرو نہ کر سکے (Žizn mourawa : Iosselian ، G. Saakadze، تفلس ۱۸۴۸ء؛ بروسے ، ۲ / ۱ : ۵۳ تا ۵۹ اور ۴۸۹ تا ۴۹۷) ۔ ان تمام مصیبتوں کے باوجود گرجستانیوں نے ایران کی زندگی میں جو حصہ لیا وہ زیادہ سے زیادہ اھم ہوتا چلا گیا، اور عبّاس اول کے جانشین شاہ صفی کو تو تخت، شاہ بگرات کے بھائی خسرو میرزا، داروغۂ اصفہان، ھی کی امداد سے حاصل ہوا ۔

جب سویمون ثانی (Swimon II) ۱۶۲۹ء میں خانہ جنگی میں مارا گیا تو طہمورث اول (Theimuraz I) شاہ کاخیتھیا (۱۶۰۵ تا ۱۶۶۴ء) خارتھلیا میں آ گیا، جہاں اُس نے ۱۶۲۹ سے ۱۶۶۴ء تک حکومت کی (اس کا عہد حکومت نہایت پُرآشوب اور ہر قسم کے مصائب سے پُر تھا : اس کی ماں خیتھیوَن Khethewan کو ۱۶۲۴ء میں شیراز میں قتل کیا گیا (بروسے ۲ / ۱ : ۱۶۷) ۔ اس کے بعد کیخسرو، جس کا ذکر پہلے آ چکا ھے ، ایران سے آ گیا اور تفلس میں قیام کر کے رستم (۱۶۳۴ تا ۱۶۵۸ء) کے نام سے بادشاہت کرنے لگا ۔ بوڑھا بادشاہ، جس کی نشو و نما ایران میں ہوئی تھی، ایرانی لقب قُللر آغاسی اختیار کر کے اپنا دربار ایرانی طرز پر لگانے لگا ۔ گوری اور سُورم میں ایرانی فوجیں متعیّن کر دی گئیں ۔ گُرجستانی قیدی، جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، ایران سے واپس آئے اور ایرانی آداب و رسوم کا دور دورہ ہو گیا ۔ دوسری طرف گویا دونوں ثقافتوں کے اتّحاد کی تقریب منانے کے لیے رستم نے اپنی شادی مسجد

اور گرجے دونوں میں رچائی اور مْتْسْخیتا کے گرجے کی عمارت کی تجدید کی ۔

۱۶۳۶ء میں مراد رابع نے اِریوان فتح کر لیا اور ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء کے عہدنامے کی رو سے شاہ ایران قَرص اور آخال تْسیخہ کے دعوے سے دست بردار ہو گیا (تأریخ نَعیما، ۶۸۶) ۔ بقول وَخُشْت (بروسے، ۲/۱ : ۶۸) سلطان کو ایمیریتھیا اور ساآتْباگو Saatbago مل گیا اور شاہ نے خارْتْھلیا [کارتیل] اور کاخیتھیا [کاخت] کے صوبے اپنے پاس رکھے ۔

وَخْتَنْگ (مسلمانوں میں شاہ نوازِ اوّل) رستم کا لےپالک بیٹا اس کا جانشین ہوا (۱۶۵۸ تا ۱۶۷۶ء) ۔ اس کے عہد میں ایران دوستی کی پالیسی بدستور زیرِ عمل رہی ۔ شاہ عباس ثانی (۱۶۴۲ تا ۱۶۶۷ء) نے شاہ نواز کی لڑکی سے شادی کر لی ۔ شاہ نواز اگرچہ مسلمان تھا لیکن عیسائی مذہب کی رعایت ملحوظ رکھتا تھا ۔ اس نے اعترافِ معاصی (confession) اور عشاے ربّانی کی رسوم بھی پھر سے جاری کر دیں، جنھیں رستم کے زمانے میں لوگ ''باعثِ ننگ و عار جانتے تھے'' (Brosset : وہی کتاب، ۹۷) ۔ شاہ نواز کی مزید امداد کے لیے آذربایجان اور قراباغ کے مسلم قبیلوں (پندرہ ہزار جوان شیری اور بَیات) کو کاخیتھیا میں آباد کر دیا گیا (قبّ تأریخ شاہ عباس ثانی از محمد طاہر وحید، در Dorn ، ۱۰۹، ۱۱۱ = Brosset ، ۲ / ۱ : ۵۰۳ تا ۵۰۴) ۔ شاہ نواز نے اِیمیریتھیا میں جنگ کی لیکن جب اس نے اپنے بیٹے کو وہاں تخت نشیں کیا تو شاہ ایران نے صورتِ حال کو بدل کر ۱۶۳۹ء کے عہدنامے کی شرائط کے مطابق کر دیا ۔

گیورگی یازدہم (شاہ نواز ثانی) شاہ سلیمان کے حکم سے تخت نشیں ہوا مگر ۱۶۸۸ء میں وہ کاخیتھیا [کاخت] میں اپنی ہی سازشوں کا شکار ہو گیا اور شاہ نے اس کی جگہ اِرِیکْلِه اول (Erekle I) (۱۶۸۸ تا ۱۶۹۱ء؛ ۱۶۹۵ تا ۱۷۰۳ء) کو تخت پر بٹھا دیا ۔ اس بادشاہ نے، جس کی تعلیم و تربیت روس میں ہوئی تھی، اسلام قبول کر کے نظر علی خان نام رکھا ۔

ایران پر افغانی حملہ : جب بلوچ اور افغان مشرقی ایران میں فساد برپا کرنے لگے تو شاہ حسین نے شاہ گیورگی کو ایک گرجستانی فوج کی کمان دے کر اس طرف بھیجا ۔ اس نے قندھار میں امن بحال کر دیا مگر ۱۷۰۹ء میں میر وَیس [قبّ مادّۂ افغانستان] نے اُسے غدّاری سے قتل کر دیا اور نئی گرجستانی فوج کو بھی، جو گیورگی کے جانشین کیخسرو (۱۷۰۹ تا ۱۷۱۱ء) کے زیرِ قیادت تھی، شکست دی ۔ ان واقعات نے ایران پر افغان حملے کی راہ ہموار کر دی ۔

وَخْتَنْگ (حاکم خارْتْھلیا ۱۷۰۳ تا ۱۷۱۱ء، بادشاہ از ۱۷۱۱ تا ۱۷۲۴ء کچھ فترات کے ساتھ) پہلے عیسائی تھا ۔ ایرانی فوجیں بعض گرجستانی عناصر کی چشم پوشی سے بردہ فروشی کرنے لگیں ۔ وَخْتَنْگ نے یہ کار و بار روکنے کی کوشش کی (بروسے Brosset، ۲ / ۱ : ۹۷، ۱۰۱، ۱۰۵) اور عام طور پر اس نے ''مسلمانوں کو ذلیل کیا، بالخصوص انھیں جو تفلس کی قلعہ گیر فوج میں تھے'' ۔ ۱۶۱۴ء اور ۱۶۱۶ء کے درمیان اس کی جگہ ایک غیور مسلمان عیسی Iese (= علی قلی خان) کو مقرر کر دیا گیا ۔ وَخْتَنْگ کو دوبارہ تخت اس وقت ملا جب اس نے اسلام قبول کر لیا ۔

اصفہان کے قریب گُناباد کے مقام پر افغانوں کو جب قطعی اور فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی (۱۷۲۲ء) تو شاہ حسین نے وَخْتَنْگ سے

امداد طلب کی لیکن نومبر ۱۷۲۲ء میں وہ اپنی خدمات روس کو پیش کر چکا تھا (بروے Brosset، ۲ / ۱ : ۱۱۷)۔ پطرس اعظم کو، جو ۲۳ اگست ۱۷۲۲ء کو دربند میں وارد ہوا تھا، فوراً ھی روس واپس جانا پڑا ۔ دوسری طرف بادشاہ کاخیتھیا محمد قلی خان (قسطنطین ثالث) لزگیوں کا طرفدار بن کر وختنگ کے خلاف میدان میں آ دھمکا اور ۱۷۲۳ء میں اس نے تفلس پر قبضہ کر لیا، جہاں تین روز تک لوٹ مار جاری رھی ۔

عثمانیوں کا دوسرا قبضہ : (۱۷۲۳ تا ۱۷۳۴ء) ۔ ایران کے فتنۂ و فساد اور روس کی پیش قدمی سے ترکیہ کو تشویش لاحق ھوئی؛ چنانچہ شیعوں کے خلاف لڑائی کو جائز قرار دے دیا گیا ۔ جون ۱۷۲۳ء میں سر عسکر ابراھیم پاشا نے، جو وختنگ سے گفت و شنید میں مصروف تھا، اس کے بیٹے بَکَر کو تخت نشین کر دیا (فارسی میں اس کا نام شاہ نواز ھے اور اس وقت ترکی میں اسے ابراھیم پاشا کا نام دیا گیا) ۔ ینگی چریوں نے قلعے پر قبضہ کرلیا ۔ بَکَر بہت جلد باغی ھو گیا لیکن ترکوں نے بَکَر کے چچا عیسی کے ماتحت تفلس میں کمک بھیج دی (اب عیسی نے عبداللہ کا نام اختیار کر لیا تھا) .

روسیوں اور ایرانیوں کے درمیان جو عہد نامہ ۱۲ ستمبر ۱۷۲۳ء کو ھوا اسی اثناہ میں اس پر دستخط ثبت ھو گئے ۔ اس کی رو سے اطرافِ بحیرۂ خزر کے کل صوبے روسیوں کے حوالے ھوے ۔ توازن قائم رکھنے کے لیے فرانسیسی سفیر کی مساعی جمیلہ سے ۱۲ جون ۱۷۲۴ء کو روسیوں اور ترکوں کے درمیان ایک اور معاھدہ قسطنطنیہ میں ھوا : روس نے داغستان اور ساحل کا لمبا اور تنگ علاقہ اپنے پاس رکھا اور ترکیہ نے کل علاقۂ ماوراے قفقاز شَمَاخَہ تک بشمولیت علاقۂ گرجستان حاصل کر لیا (فان ھامر von Hammer : *G. O. R.*، ۴ : ۲۰۶ تا ۲۱۴) (ان واقعات کی تأریخ کا قلمبند کرنے والا عثمانی مؤرخ چلبی زادہ ھے ۔ دوسرے مآخذ کے متعلق قبّ Babinger : *G. O. W.*، ۲۸۹؛ نامی : فتح نامہ در حقِ گرجستان) .

معزول بادشاہ وختنگ اگست ۱۷۲۴ء میں چودہ سو خدم و حشم اپنے ساتھ لے کر روس چلا گیا ۔ ترکوں نے خارتھلیا پر قبضہ کر کے مردم شماری کی اور باشندوں پر ٹیکس لگا دیا ۔ تفلس میں صرف شریف النفس عثمان طوپال پاشا ھی کے قیام کی خوشگوار یاد گرجستانیوں کے دل میں باقی ھے (بروے Brosset، ۲ / ۱ : ۱۲۹) ۔ عیسی Iese کو بادشاہ کا لقب حاصل نہ تھا، اس لیے حقیقی اختیارات اسحاق پاشا کو منتقل ھو گئے، جو آخال تسیخہ [= آخسقہ] کا موروثی حکمران تھا اور تفلس میں آ کر قیام پذیر ھو گیا تھا ۔ ۱۷۲۷ء میں عیسی مرا تو اسحق پاشا کو سارے گرجستان کا والی مقرر کر دیا گیا (بروے Brosset، ۲ / ۱ : ۲۳۶) ۔ ۱۷۲۸ء میں اس نے خارتھلیا کو جاگیردار امیروں (مثور) کے درمیان تقسیم کر دیا، جن کے باھمی اختلافات کی وجہ سے اس کے لیے انھیں قابو میں رکھنا آسان ھو گیا لیکن لزگی گرجستان میں برابر غارت گری کرتے رھے (قبّ Brosset : موضع مذکور؛ فان ھامر : ۴ : ۲۲۳، ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۸۰، ۳۱۳).

نادر شاہ : ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰-۱۷۳۱ء میں جنگ کے بعد، جس میں شاہ طھماسپ کو کوئی زیادہ کامیابی نہ ھوئی، شاہ نے ایران اور ترکی کے درمیان دریاے آرس کو سرحد مان لیا (مہدی خان : تأریخ نادری، تبریز ۱۲۸۴ء، ص ۹۰ = ترجمۂ جونز Jones، ۱ : ۱۳۱؛ فان ھامر، ۴ : ۲۷۷،

نے صلح کی تأریخ ۶ فروری ۱۷۳۲ء دی ہے) ۔ نادر ناراض ہو گیا اور اس نے طہماسپ کو معزول کر کے ماوراے قفقاز کو دوبارہ فتح کرنا شروع کر دیا ۔ جب وہ (۱۱۴۷ھ؛ ۱۷۳۴ء کے موسم خزاں میں) داغستان کے خلاف فوج کشی کر رہا تھا تو تفلس کا والی اسحٰق پاشا لشکر لے کر گنجه کی امداد کے لیے روانہ ہوا ۔ طہمورث پسرِ نظر علی خاں (= اِریکْلِه Erekle اول) اور اس کے بھتیجے علی میرزا = اَلِگزانڈر (پسر امام قلی = داؤد ثالث) نے اسحٰق پاشا پر حملہ کر کے اسے تفلس کے قلعے میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا ۔ نادر بہت خوش ہوا اور اس نے دونوں شہزادوں کو تحائف دیے (وہی کتاب، ص ۱۱۳ = Jones ، ۱ : ۲۰۰) ۔ گنجه کے محاصرے کے اثنا میں نادر نے صفی خان بُغائری کو حکم دیا کہ گرجستانی امراء (مَوْراوان وازْناوُران، وہی کتاب، ۱۱۶ = Jones، ۲۰۵) کی امداد سے تفلس کا محاصرہ کرے ۔

جب عبداللہ پاشا کو ایروان کے قریب باغ آوَرْد کے مقام پر شکست ہوئی تو اسحٰق پاشا نے ۲۲ ربیع الاول ۱۱۴۷ھ / ۱۷ ستمبر ۱۷۳۴ء (وہی کتاب، ۱۲۳) کو قلعۂ تفلس حوالے کر دیا ۔ نادر نے خارْتْھلیا اور کاخیتھیا کے امیروں (''تاواداں اور اَزْناوُران'') کو بُلایا، اُن میں سے طہمورث کو سب سے زیادہ اھمیت اور حقوق حاصل تھے، تا ہم نادر علی میرزا کو خارْتْھلیا اور کاخیتھیا کا والی مقرر کیا؛ کیونکہ وہ مسلمان تھا اور اس کا بھائی محمد مرزا (= Leon) عثمان پاشا کے خلاف جنگ کرتا ہوا مارا گیا تھا ۔ طہمورث کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے بیوی بچوں ('کوچ') کو کاخیتھیا سے تفلس لے آئے ۔ یہ شخص ''صاحبِ شمشیر اور سریع العزم تھا''۔ وہ جبالِ ''قَراقَلْخَان (پشاو Pshaw)، رُوِّس (یعنی رُوِءس Ru'is، جو گوری کے مغرب میں ہے ؟) و چِرْکِس'' کی طرف فرار ہوگیا ۔ نادر نے اس کے تعاقب میں فوجیں بھیجیں اور خود ۲۹ جُمادی الاولٰی کو تفلس میں آپہنچا، جہاں اُس نے بعض کو سزائیں دیں اور بعض کو انعام و اکرام سے نوازا ۔ قِبْقِل (Abots) کے چھے ہزار گرجستانی خانہ واروں کو خراسان میں منتقل کر دیا گیا (وہی کتاب، ص ۱۲۴ = جونز Jones ، ۲۱۹)۔ ۱۷۳۶ء میں صفی خان نے طہمورث کو گرفتار کر کے ایران بھیج دیا ۔ ہندوستان کی مہم کی ابتداء میں نادر نے طہمورث کو تو رہا کر دیا لیکن اُس کے بیٹے اِرِیکْلِه Erekle کو اپنے ساتھ رکھا ۔

۱۱۵۶ھ / اواخر ۱۷۴۳ء میں طہمورث خان نے تاج و تخت کے جھوٹے مدّعی سام میرزا کو گرفتار کر لیا اور اس کے بعد (۱۷۴۴ء میں) علی قلی قلجہ (؟ گرجستانی مآخذ میں اسے خَنْجَل، قِزِل اِجلِی لکھا ہے)، تفلس کے جدید بیگلربیگی کے ساتھ مل کر آخَال تْسِیْخِه (آخِسْقه) کے یوسف پاشا کو رُوِءس) کے قریب، جو دریاے اَرَگْوِی Aragwi پر واقع ہے، شکست دی ۔ پاشاے مذکور بابِ عالی کے حکم سے داغستان جا کر ایک اور جھوٹے مدّعیِ تخت صفی میرزا کی مدد کر رہا تھا، نادر نے گوری میں پہنچ کر طہمورث کی خدمات کے صلے میں اسے خارْتْھلیا میں منتقل کر دیا اور کاخیتھیا کا علاقہ اس کے بیٹے اِرِیکْلِه کو دے دیا (وہی کتاب، ۲۰۲ = Jones، ۲ : ۱۶۳)؛ قب Brosset، ۲ / ۱ : ۷۷ (Papuna Orbeli) اور ۲/۲ : ۲۰۸ (خیر خیولدِزِه = Kherkheulidze) .

۱۷۴۵ء میں نادر نے گرجستان پر پچاس ہزار تومان کا باج عائد کر دیا ۔ طہمورث اس رقم میں تخفیف کرانے کی غرض سے روانہ ہوا ۔

تبریز پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ نادر کا انتقال ہو گیا ہے ۔ نادر کا جانشین علی قلی خان خیتیہون بنت طہمورث کا شوہر تھا ۔

کاخیتھیا کے بگراتی : نادر کی وفات (۱۷۴۷ء) کے بعد جو اضطرابات کا دور وجود میں آیا اس کی اور کریم خاں کے عہدِ حکومت کی وجہ سے، جو ایک صلح پسند شہزادہ تھا اور جس کا اقتدار دریائے ارس کے شمال تک وسعت پذیر نہ ہوا تھا، گرجستان کو دم لینے کی مہلت ملی ۔ اس موقع سے طہمورث (شاہ خارتھلیا از ۱۷۴۴ تا ۱۷۶۱ء) نے بڑی ہوشیاری سے فائدہ اٹھایا اور اسی طرح اس کے بیٹے اریکلہ یا ارکلی ثانی (شاہ کاخیتھیا از ۱۷۴۴ تا ۱۷۶۱ء و شاہ خارتھلیا و کاخیتھیا از ۱۷۶۱ تا ۱۷۹۰ء) نے بھی اس فرصت سے پورا فائدہ حاصل کیا ۔ ان عیسائی بادشاہوں کا دورِ حکومت گرجستان کی تاریخ میں انتہائی سعادت کا زمانہ ہے ۔ انھوں نے ماورائے قفقاز میں کئی مرتبہ فوج کشی کی ۔ ۱۷۵۲ء میں اریکلہ نے آزاد خان افغان کو، جو خاندان زندیہ کا مخالف تھا، اریوان کے قریب شکست دی اور پھر ۱۷۶۰ء میں اُسے قزخ کے مقام پر گرفتار کر کے کریم خان کے پاس بھیج دیا ۔ اس نے ۱۷۶۵، ۱۷۷۰ اور ۱۷۸۰ء میں اریوان کے کردوں کی سرکوبی کی اور گرجستانی فوجوں نے علاقۂ بایزید میں ان کا تعاقب کیا ۔ تقریباً ہر سال گرجستانی داغستان سے آنے والے غارت گر گروہوں کو کامیابی کے ساتھ مار بھگایا کرتے تھے (ان کا سب سے خطرناک سردار عمرخان آوار تھا) ۔ صرف خوانینِ شکی [زك بان] حاجی چلبی اور آغا کشی (۱۷۵۲-۱۷۵۳ء میں) ایسے سردار تھے جو گرجستانیوں کو زك دینے میں کبھی کامیاب ہوے ۔

ان تمام کامیابیوں کے باوجود گرجستان کی صورتِ حالات متزلزل ہی رہی؛ چنانچہ ۱۷۶۰ء میں طہمورث امداد حاصل کرنے کے لیے روس گیا لیکن وہ ملکہ الزبیتھ کی وفات کے چند روز بعد وہاں پہنچا اور خود بھی سینٹ پیٹرز برگ میں ۸ تا ۲۰ جنوری ۱۷۶۲ء کے درمیان فوت ہو گیا ۔

جب اریکلہ ان متحدہ مملکتوں کا بادشاہ بنا تو اس نے روس کا تقرب حاصل کرنے کی پالیسی جاری رکھی ۔ روسی ۔ ترکی جنگ کے شروع میں ایک روسی فوج جنرل ٹوٹلیبن Tottleben کے زیرِ قیادت (۱۷۶۹ء میں) گرجستان میں آئی اور اریکلہ کے ساتھ آخال تسیخہ کی جانب کوچ کیا مگر اتحادی آپس میں متفق نہ رہ سکے (دیکھیے کیتھرائن ثانیہ کا خط بنامِ والٹیر، مؤرخہ ۴ دسمبر ۱۷۷۰ء) اور روسی فوج ۱۷۷۲ء میں روس واپس چلی گئی ۔ اریکلہ گو اب تنہا رہ گیا تھا پھر بھی اس نے اسپندزہ Aspindza کے مقام پر خاصی کامیابی حاصل کی اور سلیمان Solomon شاہ ایمیریتھیا کے ساتھ مل کر آخال ۔ کلکی کا محاصرہ کیا ۔ سلیمان پاشا والی آخال تسیخہ نے جلد ہی مدافعت کے بجائے جارحانہ طریق اختیار کیا لیکن کوچوك قینارجہ کے روسی ۔ ترکی معاهدۂ ۱۷۷۴ء کی رو سے گرجستانی علاقوں کی سیاسی حدود میں کوئی ردّ و بدل نہ ہوا ۔ ہاں بابِ عالی نے صرف نوجوان مردوں اور عورتوں کو خراج میں لینا اور دوسرے محاصل کی وصولی موقوف کر دی (مادّہ ۲۳) ۔ لیکن اس عہد نامے کے بعد آخال تسیخہ کے سلیمان پاشا کو ایک طرف تو اپنا نمایندہ قسطنطنیہ میں بھیجنا پڑا، دوسری جانب اس نے سینٹ پیٹرز برگ میں اس مضمون کی درخواستوں کا سلسلہ دوبارہ جاری کر دیا کہ اس کے ملک کا الحاق روس کے ساتھ کر لیا جائے (*prisovokupleno*).

(دیکھیے Tsagareli : *Gramoti*، عدد ۱۴۴) .

روس پہلے تو گول مول جواب دیتا رہا مگر آخرکار ۲۴ جولائی ۱۷۸۳ء کو ایک عہد نامے پر دستخط ہوے بدین مضمون کہ یہ علاقہ روس کی حمایت میں آ گیا ۔ روس نے ذمہ لیا کہ اِرِیکْلہ کو اس کی جاگیر و املاك پر قابض رہنے دیا جائے گا اور داخلی امور میں اسے پوری آزادی حاصل ہوگی، لیکن امورِخارجہ براہ راست روس کے تحت ہو گئے ۔ کچھ روسی فوج تفلس بھیجی گئی مگر ۱۷۸۷ء میں اسے واپس بلا لیا گیا .

دورِ قاچار : اس عرصے میں زَنْدوں کی جگہ قاچاروں نے لے لی تھی ۔ ۱۷۹۵ء میں آغا محمد قاچار نے قراباغ میں شُوشَہ کا محاصرہ کیا، پھر وہ تفلس کی جانب متوجہ ہوا، جسے اس نے ۱۱ ستمبر ۱۷۹۵ء کو فتح کر لیا اور اسے بے رحمی سے لوٹا؛ قب Brosset ، ۲ / ۲ : ۲۶۰؛ Olivier : *Voyages en Orient*، ۳ : ۸۷ (ھنگری کے ڈاکٹر کی چشم دید شہادت)۔ ایرانی حملے کے بعد داغستانیوں نے بھی حملہ کیا ۔۱۷۹۵ء میں دو روسی بٹالین گُرجستان میں آئے اور مارچ ۱۷۹۶ء میں روس نے ایران کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ۔ لیکن ۶ تا ۱۸ نومبر کے عرصے میں کیتھرائن ثانیہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹے پال اوّل (Paul I) نے روسی فوجیں فوراً ھی واپس بلا لیں ۔ آغا محمد پھر ماوراے قفقاز کی طرف روانہ ھوا لیکن ۱۰ جون ۱۷۹۷ء کو شُوشَہ کے قریب قتل ہو گیا ۔ بوڑھا بادشاہ اِرِیکْلہ بھی ۱۲ - ۲۳ جنوری ۱۷۹۸ء کے درمیان مر گیا.

اس کا بیٹا گیورگی دوازدھم اس کا جانشین ہوا ۔ فتح علی قاچار اپنے مخالفین سے نپٹنے میں مصروف تھا ۔ قَرض سے گیورگی نے دو ہزار لِزگی اپنے دو بیٹوں کی کمان میں بھیجے مگر شاہی خاندان کے اندرونی سازباز کی وجہ سے اس کے اپنے حالات بہت پیچیدہ ہو گئے ۔۱۷۹۹ء میں اس نے سینٹ پیٹرز برگ میں اس مقصد کے لیے سفارت بھیجی کہ گرجستان کو محض حمایت ھی میں نہ لیا جائے بلکہ ملک دوسرے صوبوں کی طرح کاملاً شاہِ روس کے زیرِ اقتدار ہو، البتہ اس امر کی ضمانت ہو کہ گُرجستان کا تخت و تاج حکمران خاندان میں محفوظ رہے گا .

۱۸ دسمبر ۱۸۰۰ء میں پال اوّل نے گرجستان کے الحاق (*prisoyedineniye*) کے منشور پر دستخط کر دیے اور اس کا اعلان ۱۸ جنوری ۱۸۰۱ء کو کر دیا گیا ، یعنی گیورگی کی وفات کے بعد جو ۲۸ دسمبر ۱۸۰۰ء کو واقع ہوئی ۔ ۱۱ مارچ کو پال اوّل قتل کر دیا گیا ۔ اپریل میں گُرجستانی نمایندوں نے شہنشاہ اَلِگزانڈر اول کی خدمت میں التماس کی کہ ایک گرجستانی شہزادے کو حاکم مقرر کیا جائے اور اسے نائب امپراطور اور شاہِ گُرجستان کا لقب دیا جائے ۔ ۱۲ ستمبر ۱۸۰۱ء کو اَلِگزانڈر اول نے اس بات کا اظہار کرتے ہوے کہ سابق حکومت کو زیرِ حمایت مملکت کے اندر بحال کرنا ناممکن ھے پال اول کے منشور کی توثیق کر دی ۔ عہدنامۂ فِنکِن‌شٹائن Finkenstein (۱۸۰۷ء) پر ، جس کی رو سے نپولین نے گرجستان کے علاقے پر ایران کے حقوق کو تسلیم کیا تھا، کبھی عمل درآمد نہ ہوا اور ۱۸۱۳ء کے عہدنامے کی دفعہ ۳ کے ماتحت ایران سرزمینِ گرجستان پر اپنے حقوق سے دست بردار ہو گیا .

تفلس از ۱۹۱۷ء : ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب تک تفلس کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آیا ۔ ماوراے قفقاز چونکہ روس سے منقطع تھا اس نے ۱۲ اپریل ۱۹۱۸ء کو اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ تفلس جمہوریات متحدۂ روسیہ

میں سے اس جمہوریہ کا پاے تخت قرار پایا لیکن مسلمانوں نے ترکوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور ۲۶ مئی کو روسی مجلسِ نوّاب (Diet) ماوراے قفقاز کی تقسیم پر راضی ہوگئی؛ چنانچہ تین جمہوری سلطنتیں گرجستان، ارمینیہ اور آذربایجان قائم کر دی گئیں - تفلس دوبارہ گرجستان کا پاے تخت قرار پایا - ۲۸ مئی ۱۹۱۸ء کو گرجستان اور جرمنی کے درمیان ایک عارضی عہدنامہ ہوا - جرمن فوج تفلس میں آ گئی اور جب عارضی صلح ہوئی تو اس کی جگہ انگریزی فوج نے لے لی - ۲۶ جنوری ۱۹۲۱ء کو اتحادیوں نے گرجستان کی حکومت کو قانوناً (*de jure*) تسلیم کر لیا لیکن ماہ فروری میں کچھ لڑائی بھڑائی کے بعد گرجستان روسی اتحادِ سوویتی کے طرفداروں کے قبضۂ اقتدار میں آ گیا - ماوراے قفقاز میں ایک کشورِ اتحادِ جمہوری (federal republic) کی تشکیل ہوئی اور وہ بجاے خود روسی جمہوریاتِ اتحاد سوویاتی (U. S. S. R.) کا ایک حصہ بن گئی - اس طرح تفلس ماوراے قفقاز کی مرکزی حکومت (Z. S. F. S. R.) کا صدر مقام بن گیا اور اس کے ساتھ گرجستان (S. S. R. G.) کا پاے تخت بھی.

وصفِ تفلس: عرب جغرافیہ دان تفلس کا حال بہت کم بیان کرتے ہیں - بقول اِصْطَخْری (ص ۱۸۰) یہ شہر بہت بڑا تھا، اس کے گرد مٹی ('طین') کی فصیلیں تھیں، شہر کے تین دروازے تھے اور قدرتی گرم حمام بھی موجود تھے، جیسے کہ طبریّہ میں تھے - بقول مِسْعَر بن مُہَلْہِل (در یاقوت) یہ حمام مسلمانوں کے لیے مخصوص تھے، غیروں کا داخلہ ان میں ممنوع تھا - ابن حوقل [طبع ۱۹۳۹ء، ۲: ۳۴۰ تا ۳۴۲] تفلس کی پن چکّیوں ('عَرَوب') کا مقابلہ موصل اور رَقّہ کی پن چکّیوں سے کرتا ہے - اس نے تفلس میں سامانِ خوراک کی فراوانی اور باشندوں کی مہمان نوازی کی بہت تعریف کی ہے - تفلس عالمِ اسلام کا ایک سرحدی مقام [''ثغر''] تھا جس کے پرے کوئی مسلم آبادی نہ تھی (اِصطخری) - شہر دشمنوں سے گھرا ہوا تھا [''کثیر الاَعداء من کُلّ جھۃ''] (ابن حوقل) - نویں صدی میں بَلاذُری نے ایک نہایت دلچسپ بات بیان کی ہے کہ شہر کے مکانات کی تعمیر صنوبر کی لکڑیوں (pinewood) سے ہوئی تھی (بقول قَزوینی صرف مکانوں کی چھتیں صنوبر کی تھیں).

عہدِ مغول میں زکریا قَزْوِینی ہمیں بتاتا ہے کہ دریاے کُرّ کے ایک کنارے پر مؤذّن کی آواز سنائی دیتی تھی اور دوسرے کنارے پر مسیحی ناقوس بجا کرتے تھے - عیسائی شہر میں اکثریت میں تھے - حمداللہ مستوفی [نُزہۃ، ۹۳] بیان کرتا ہے کہ مکانات ایک دوسرے کے اوپر بنے ہوے تھے، یعنی ایک گھر کی چھت دوسرے کا صحن تھی.

سترھویں صدی کے لیے ہمیں نہ صرف ترکوں کی زبانی اس شہر کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، جن میں سے حاجی خلیفہ کا مختصر سا بیان ۱۶۳۰ تا ۱۶۳۵ء کے متعلق ہے اور اَوْلیا چلبی کا بیان ۱۶۴۸ء میں قلمبند ہوا، بلکہ پہلا مفصل بیان ایک یورپی [سیّاح] (شاردیں Chardin، ۱۶۷۳ء) کا لکھا ہوا بھی ملتا ہے - اولیا چلبی قلعوں کے بارے میں بہت سے جزئیات بیان کرتا ہے - ان میں سے بڑے قلعے کا (جو کُرّ کے دائیں کنارے پر تھا) محیط چھے ہزار قدم تھا اور اس کی دیواریں ۶۰ ذِراع بلند تھیں، اس میں ۷۰ بُرج تھے اور وھاں کی قلعہ گیر فوج کی تعداد تین ہزار تھی، اس کے گرد کوئی خندق نہ تھی، ایک بُرج میں قلعے کو پانی پہنچانے کا انتظام تھا (صُولُق قُلہ *suluk kule*) - بڑے قلعے میں چھے سو

مکان تھے، جن کی چھتیں مٹی کی تھیں۔ چھوٹے قلعے میں (دریا کے بائیں کنارے پر) صرف ۳۰۰ گھر تھے مگر دیواروں کی مضبوطی کی وجہ سے یہ بہت مستحکم تھا۔ شاردیں کی اٹلس (لوحہ iii) میں تفلس کا عام منظر دکھایا گیا ہے، (جس میں سیاح مذکور ۱۹ اہم مقامات ظاہر کرتا ہے، مثلاً گرجے، محل وغیرہ)۔

اٹھارھویں صدی کے متعلق ہمارے پاس تورن فورت Tournefort (۱۷۰۱ء)، ۲ : ۳۰۷ (مع منظر تفلس، ص ۳۱۳) کی کتاب ہے اور وخشت، کا جغرافیہ (جس کی مشکلات اب بروسے Brosset، ۱ : ۱۸۰ کی کتاب سے حل ہو گئی ہیں)۔ De l'Isle نے اپنی تألیف (موسوم بہ *Avertissement sur la carte générale de la Géorgie*، پیرس ۱۷۶۶ء) میں تفلس کا ایک مسلسل دور نما panoramic plan شائع کیا تھا (جو مؤلف کو اپنے زمانۂ قیام روس میں ''گرجستان کے شہزادے'' سے موصول ہوا تھا)۔ P. Iosselian (۱۸۶۶ء) کا گزیٹیر (جغرافیائی تقویم) بھی قیمتی کتاب ہے، کیونکہ اس میں قدیم عمارتوں کا محلّ وقوع بتایا گیا ہے۔

پرانے تفلس میں چار محلّے تھے، جن میں سے تین تو دریاے کُر کے دائیں کنارے پر تھے (جو یہاں شمال سے جنوب کو مڑ کر شمال مغرب کو اور پھر جنوب مشرق کو بہتا ہے)۔ وہ محلے یہ تھے: (۱) کَلَه یا کَلِسی (= عربی: قَلْعَه)، پرانا محلّہ جو شہر کی چار دیواری کے اندر اور (سولولاکی اور دَبِخانہ کی ندیوں کے درمیان واقع تھا، جو کُرّ میں جا گرتی ہیں)، نارین۔ کَلَه (قلعہ) بھی اس میں شامل تھا؛ (۲) شہر جس پر خاص طور سے تفلس (Tphilisi) کے نام کا اطلاق ہوتا تھا اور جو گرم چشموں کے گردا گرد آباد ہو گیا (بقول Brosset، ۱ / ۱ : ص lxxx، اس کی بنا ارمنی باشندوں نے ڈالی تھی) شہر کی آبادی دریاے کُرّ کے کنارے پر قلعے کے مقابل اور اس کے دامن میں تھی۔ شاہ صفی نے سادات کی ایک نو آبادی کوہ ثابور Thabor (جو دَبِخانہ کے مشرق میں ہے) کی بلندیوں پر بسائی تھی، جس سے اس علاقے کا ایرانی نام سیّد آباد ہوا؛ (۳) بیرونی محلہ گَریتھ اُبانِی Gareth-ubani گھڑ دوڑ کے میدان (اَسْپَ رِیز *asparez*) کے قریب، یعنی پہلے دو محلّوں سے اوپر بجانب شمال؛ (۴) وہ محلہ جو کَلَه کے مقابل میں تھا، اسے اِسنِی یا نِسنِی کہتے تھے (بعد میں اَوْلَبَر Awlabar کہنے لگے)، مَختَھَه کی چوٹیاں اس کے شمال میں تھیں۔ اِسنِی وھی جگہ ہے جسے عرب صُغْدَبِیل کہتے تھے۔ یہ قبرستان سَگودِبیل Sagodebel ہے، جس کے معنی گرجی زبان میں 'المَنْدب' یا 'مقامِ آہ و بُکاء' ہیں اور جس کا ذکر القدّیس آبو (St. Abo) کے سوانح حیات میں آتا ہے؛ قب Brosset : *Additions*، ۱۳۶ اور Schulze : *Das Martyrium d. hl. Abo von Tiflis, Texte und Untersuchungen*، ۱۹۰۵ء، xiii، کُراسہ ۴ : ص ۳۵؛ یہی نام دو دفعہ وقائع نامۂ گرجستان میں بھی آیا ہے (قب Brosset، ۱ : ۳۰۷، ۶۳۳)۔

تفلِس میں تین قلعوں کو ایک دوسرے سے متمیز کرنا چاہیے۔ ۱۔ ثابور کا پرانا قلعہ ('کورچی قلعہ') دَبِخانہ کے دائیں کنارے کی اونچی پہاڑی پر، جو ۱۶۱۸، ۱۷۲۵ اور آخری بار ۱۷۸۵ء میں تباہ ہوا۔ اس سے کَلَه کے جنوبی دروازے کی حفاظت ہوتی تھی، جسے باب گنجہ کہتے تھے؛ (۲) نارین قلعہ، جو کَلَه کی پہاڑی پر تھا؛ معلوم ہوتا ہے کہ عہد اسلامی سے پہلے اس قلعے کا نام شُورِش تْسِیخه تھا (وَخْشْت)،

اسے ۱۸۱۸ء میں مسمار کر دیا گیا (قب تصویر گمبہ Gamba کی اٹلس میں دی ہے) ؛ (۳) بائیں کنارے کا قلعہ (اِسنی)، جو سر پُل (bridge-head) کا کام دیتا تھا۔ ۱۷۲۸ء میں ترکوں نے آخری دفعہ اسے مستحکم کرنا شروع کیا تھا لیکن اسے نامکمل ہی چھوڑ گئے۔

شاہی محلات میں سب سے پرانا دریا کے بائیں کنارے پر محلِ میتیخی Metekhi تھا، جو پرانے پل کے سامنے واقع تھا۔ ۱۶۳۸ء میں مسلمان بادشاہ رستم نے تِفلیسی Tphilisi میں محل بنایا، جو دریاے کُرّ کے کنارے پر واقع تھا اور طول میں تقریباً چار سو فٹ تھا۔ یہاں شاہنواز نے شاردیں Chardin کو باریاب کیا تھا۔ اس سے کچھ دُور شاہ وَخْتَنگ ششم نے ایک محل تعمیر کیا تھا، جس کی آرائش و زیبائش وسیع پیمانے اور ایرانی طرز پر کی گئی تھی۔ ۱۷۲۵ء میں ترکوں نے اسے تباہ کر دیا ؛ قب Iosselian : *Opisaniye* (مساجد کے متعلق قب ص ۲۳۹).

قدیم تفلس کا محلِ وقوع ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں رقبے کی تنگی ہے، اس لیے کہ ایک طرف دریاے کُرّ ہے اور دوسری طرف دائیں کنارے کی بلندیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شہر زیادہ وسعت حاصل نہ کر سکا (قب شاردیں)۔ انیسویں صدی میں یہ شہر اپنی پرانی حدود کے باہر دور تک بڑھنے لگا، اور اب بھی بائیں کنارے پر خاص طور پر بڑھ رہا ہے، جس کے ساتھ ساتھ خطوطِ آہنی (ریلوے لائنیں) بھی جاتی ہیں (تِفلس ـ باکو، تِفلس ـ باطوم، تِفلس ـ جُلفا اور تِفلس ـ کاخیتِھیا).

آبادی : ۱۷۸۳ء میں طہمورث اور اِریکلہ کے خوشحال عہدِ حکومت کے بعد شہر میں چار ہزار مکان تھے اور ۶۱ ہزار کی آبادی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں اس میں صرف ۲۷۰۰ — ۳۰۰۰ گھر تھے اور آبادی ۳۰ ہزار رہ گئی تھی۔ اس کی وجہ آغا محمد کا ۱۷۹۵ء والا حملہ تھا، جس کے آثار ہر جگہ نظر آتے تھے، تا آنکہ وہ گمبہ کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ نسبۃً زیادہ صحیح اعداد و شمار ۱۸۳۳ء کے متعلق (دُبوا د مونت پیرے Dubois de Montpéreux) یہ ہیں : ۳,۶۶۲ مکان، ۴,۹۳۶ کنبے اور ۲۵,۲۹۰ باشندے؛ اس تعداد میں روسی شامل نہیں ہیں۔ اس کے بعد آبادی تیزی سے بڑھی : ۱۸۵۰ء : ۳۳,۸۰۰ ؛ ۱۸۶۵ء : ۷۰,۰۰۰ ؛ ۱۸۹۷ء : ۱,۶۰,۶۰۵۔ آخرالذکر اعداد و شمار میں ارمنی ۳۸۰۱ فی صد، گرجستانی ۲۶۰۳ فی صد اور روسی ۲۴۰۸ فی صد تھے ؛ ۱۹۲۲ء کی مردم شماری کے مطابق تفلس کی آبادی ۲,۳۳,۹۵۸ تھی، جن میں سے ۸۵,۳۰۹ ارمنی، ۸۰,۸۸۴ گرجستانی، ۳۸,۶۱۲ روسی، ۹,۷۶۸ یہودی، ۳,۹۸۴ ایرانی، ۳,۲۵۵ آذربایجانی ترک اور ۲,۴۰۷ جرمن وغیرہ تھے ؛ قب *Zakawkazye* ، تفلس ۱۹۲۵ء، ص ۱۵۶ تا ۱۵۷ ؛ بالآخر ۱۷ دسمبر ۱۹۲۶ء کی مردم شماری میں تفلس کے باشندوں کی تعداد ۲,۸۲,۹۱۸ تک پہنچ گئی تھی۔

مآخذ: (۱) اس مضمون پر معیاری تصنیف M. F. Brosset کی *Histoire de la Géorgie* ہے، طبع سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۴۹ تا ۱۸۵۷ء : ج ۱ / ۱ میں مصنّف کی اہم تمہید اور ۱۴۶۹ء تک کی قدیم تاریخ ہے: ج ۱ / ۲ — *Additions*، جس کے لیے ارمنی اور اسلامی مآخذ سے بھی خوب چھان بین کر کے مدد لی ہے ؛ ج ۲ / ۱ — تاریخ شہزادۂ وَخْشْت (± = حدود) ۱۴۶۹ - ۱۷۵۰ء : چار ریاستوں یعنی خارْتھلیا، کاخیتِھیا، ساآت باگو، اور اِیْمیریتھیا کی الگ الگ تاریخ)، اس کے بعد *Additions* ؛ ج ۲ / ۲ — بعد کے وقائع نامے، یادداشتیں وغیرہ (حدود

۱۶۵۹ تا ۱۸۰۶ء)، ساری کتاب قطعِ ربعی [یعنی قطع کبیر] کے ۳۳۴۰۲ صفحات پر مشتمل ہے ؛ (۲) نیز قب Laurent Brosset : *Bibliographie analytique des ouvrages de M. F. Brosset*، ۱۸۲۴ تا ۱۸۷۹ء)، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۷ء (۱۷۲ کتابوں اور بحثوں کا تجزیہ) ؛ ماخذ کی تاریخ کے متعلق (۳) قب تین وقائع نامے جن کا ترجمہ تکیش ولی Takaishwili نے *Sbornik materialow* میں کیا، تفلس ۱۹۰۰ء، xxviii، ۱ تا ۴۱۲ — ان وقائع ناموں کا تتمہ (۴) شہزادۂ وخشت کا جغرافیہ ہے [جسے اس نے ۱۷۴۵ء میں ماسکو میں تمام کیا] اور جس کا فرانسیسی ترجمہ Brosset نے *Description géographique de la Géorgie* کے نام سے شائع کیا، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۴۲ء (اصلی نقشوں سمیت)، اس کا روسی ترجمہ جنشولی Djanashwili نے کیا، طبع تفلس ۱۹۰۴ء، در xxiv ;*Zap. Kawk. Otd. Russ. Geogr. Obshč.* : کراسہ ۵ ؛ اور (۵) P. Iosselian : *Istoričeskii vzgliad*، تفلس ۱۸۴۹ء، (تاریخ گرجستان مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ۱۵۶۹ تا ۱۷۲۹ء) (۶) گرجستان کی تاریخ کی تنقیح کا کام جوخشولی Djawakhishwili نے اپنے ذمے لیا اور اسے *Kharthvel eris istora* کی ۴ جلدوں میں طبع کیا ہے، تفلس ۱۹۱۳ء (حملۂ مغول تک)؛ ج ۱، طبع سوم، ۱۹۲۸ء، جلد چہارم کا ایک حصہ (عہد تیموری کے بعد کا زمانہ)، ۱۹۲۴ء.

ان مسلم مآخذ کے علاوہ جن کا ذکر متن میں آیا ہے : (۷) یاقوت، ۱ : ۸۷ (ابخاز)؛ ۱ : ۸۵۷ (تفلیس)؛ ۲ : ۵۸(جرزان)؛ (۸) زکریا قزوینی : آثارالبلاد، طبع وستن فلٹ، ۳۴۸ (قب ڈورن Dorn : *Geographica*، ۵۳۸)؛ (۹) حمداللہ مستوفی : نزھۃالقلوب، (طبع وقفیۂ گب، عدد ۲۳) : ۹۳، ۱۸۲؛ (۱۰) حاجی خلیفہ : جہان نما، ۳۹۴؛ (۱۱) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ۲ : ۳۱۵ تا ۳۱۹؛ (۱۲) زین العابدین شیروانی : بستان السیاحۃ (۱۸۳۱ء)، تہران ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء؛ (۱۳) صنیع الدولہ : مرآۃ البلدان، ۱ : ۴۶۹ تا ۵۰۰؛ (۱۴) قب ڈورن : *Erster Beitrag z. Geschichte d. Georgier*, *Mém. Acad. de St. Pétersbourg*، sciences politiques سلسلۂ ششم : جلد ۶، ۱۸۴۳ء (صفویوں کی تاریخوں سے گرجستان کے متعلق اقتباسات کا ترجمہ)، جس کا جرمن زبان سے بروسے Brosset نے دوبارہ فرانسیسی میں ترجمہ کیا، ۲/۱ : ۳۴۴ تا ۵۰۹؛ (۱۵) ڈورن : *Geographica caucasica*, *Mém. Acad. St. Pétersbourg*، جلد ۷، ۱۸۴۷ء، ۴۶۵ تا ۵۶۱ (اصطخری، قزوینی، مستوفی : ھفت اقلیم)؛ (۱۶) Defrémery : *Fragments des géographes et historiens arabes et persans inédits relatifs aux anciens peuples du Caucase.*، در *J.A.*، ۱۸۴۹ء، ج ۱۳ : ۴۵۷ تا ۵۲۳؛ ج ۱۴ : ۴۴۷ تا ۵۱۴؛ ۱۸۵۰ء، ج ۱۶ : ۱۵۰ تا ۱۵۳، ۲۰۱ تا ۲۰۱؛ ۱۸۵۱ء، ج ۱۷ : ۱۰۵ تا ۱۶۲ (نیز علیحدہ رسالے کی شکل میں)؛ (۱۷) Karaoulow : *Swedeniya arab. pisateley o Kawkaze, Sborn. materialow dlia opisaniya Kawkaza*، ۲۹، ۳۱، ۳۲، ۳۸، (عرب جغرافیہ دانوں کے اقتباسات کا ترجمہ)؛ (۱۸) Ghazarian : *Armenien unter der arabischen Herrschaft, Zeitschr. f. armen. Philologie*، مار بورگ Marburg ۱۹۰۳ء، ۲ : ۱۴۹ تا ۲۲۵؛ (۱۹) مارکار : *Osteurop. und ostasiat. Streifzüge*، لیپزگ ۱۹۰۳ء : Exkurs iv، *Der Ursprung d. iberischen Bagratiden*، ۳۹۱ تا ۴۳۶.

عہد مغولی اور بعد مغول کا زمانہ :

(۲۰) Klaproth : *Aperçu des entreprises des Mongols en Géorgie et en Arménie*، پیرس ۱۸۳۳ء؛ (۲۱) d'Ohsson : *Histoire des Mongols*، ۱۸۳۴ تا ۱۸۳۵ء، مواضع کثیرہ ؛ (۲۲) Howorth : *History of the Mongols*، ۱۸۷۶ تا ۱۸۸۸ء، قب اشاریہ

جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا؛ (۲۳) G. Altunian : *Die Mongolen und ihre Eroberungen in kaukasischen Ländern*، برلن ۱۹۱۱ء (ارمینیہ ماخذ سے)؛ (۲۴) F. Nève : *Exposé des guerres de Tamerlan et de Schah-Rokh dans l'Asie Occidentale* (از Thomas of Metsoph) برسلز ۱۸۶۰ء (اقتباس از ج ۱۱، در *Mémoires....publiés par l'Acad. royale de Belgique*).

سکّوں کے متعلق ماخذ: (۲۵) Langlois : *Essai de classification des suites monétaires de la Géorgie*، پیرس ۱۸۶۱ء؛ (۲۶) Pakhomow : *Moneti Gruzii*، ج ۱ (تیرھویں صدی تک)، در *Zap. Numizm. Otd. Russ. Arkh. Obshč.*، ج ۱، کراسہ ۴، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۰ء (اس کی تلخیص از Djawakhow : *Khristian. Vostok*، ۱۹۱۲ء، ۱/۱، ص ۱۰۴ تا ۱۱۴)؛ (۲۷) قب بالخصوص قزوینی کی شہادت، در آثار البلاد، ص ۳۴۸ کہ تفلس میں طلائی دینار (hyperperes) موجود تھے.

روس سے تعلقات کے متعلق (جو پندرھویں صدی میں شروع ہوئے): (۲۸) *Perepiska gruzinskikh tsarei* (غیر ملکی زبانوں میں شاہان گرجستان کی روس سے خط و کتابت از ۱۶۳۹ تا ۱۷۷۰ء)، طبع Brosset، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۱ء، (ص i تا xci میں روسی گرجستانی تعلقات تا ۱۷۳۹ء کے متعلق F. Ploen کی ایک یادداشت بھی ہے)؛ (۲۹) Bergé : *Akti sobran. Kawkaz. arkhegraf. Komissiyey* (قفقاز کے متعلق سرکاری دستاویزات): دس جلدیں، قطع کامل، تفلس ۱۸۶۶ تا ۱۸۸۵ء؛ (۳۰) Butkow : *Materiali noveishey istorii Kawkaza* (۱۷۲۲ تا ۱۸۰۳ء)، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۹ء، تین جلدیں (مع مفصل و مسلسل تواریخ حوادث از L. Brosset)؛ (۳۱) Belokurow : *Snosheniya Rossii s Kawkazom*، ج ۱ (۱۵۷۸ تا ۱۶۱۳ء)، ماسکو ۱۸۸۹ء؛ (۳۲) Belokurow : *Arsenii Sukhanow*، ج ۱، ماسکو ۱۸۹۲ء؛ (۳۳) Tsagareli : *Perepiska gruz. tsarey v. XVIII veke*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۰ء؛ (۳۴) وہی مصنف: *Gramoti otnosiashčiyasia k Gruzii* (اٹھارھویں صدی)، دو جلدیں، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۱ء، ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۲ء؛ (۳۵) [Potto اور Belawski]: *Utwerždeniye russ. vladičestva na Kawkaze*، تفلس ۱۹۰۱ تا ۱۹۰۸ء، ۱۲ جلدیں؛ (۳۶) Avalow : *Prisoyedineniye Gruzii k Rossii*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۱ اور ۱۹۰۶ء (اس میں ایران کے ساتھ تعلّقات کا اجمالی خاکہ بھی ہے)؛ (۳۷) W. E. Romanowski : *Očerki iz istorii Gruzii*، تفلس ۱۹۰۲ء.

وہ تصانیف جو خاص کر تفلس سے متعلق ہیں: (۳۸) P. Iosselian : *Opisaniye drewnostey Tiflisa*، تفلس ۱۸۶۶ء (اسلامی آثار قدیمہ، ص ۲۳۸ تا ۲۷۳)؛ (۳۹) Bakrade اور Berzenow : *Tiflis v istor. i etnograf. otnosheniyakh*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۰ء؛ (۴۰) Djanashwili : *Tiflis-stolitsa Gruzii*، تفلس ۱۸۹۹ء (گرجی زبان میں).

وہ مصادر جو مغربی اور روسی سیاحوں کے سیاحت ناموں سے متعلق ہیں: (۴۱) Miansarow : *Bibliographia Caucasica*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۰ء، خصوصاً ۸۷ تا ۸۹؛ (۴۲) Dubrowin : *Istoriya woyni na Kawkaze*، ج ۱/۳، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۱ء؛ (۴۳) La *Grande Encycl. russe* (مقالات جو Masalski اور Tsagareli نے لکھے)؛ قدیم ترین شذرات تفلس کے متعلق وہ ہیں جو (۴۴) Josaphat Barbaro (۱۴۳۶ء) اور (۴۵) A. Contarini (۱۴۷۳ء) نے لکھے؛ (۴۶) شاردیں: *Voyages*، طبع Langlès، ۲: ۷۲ تا ۸۸ اور *Atlas* کا لوحہ ۳؛ (۴۷) Tournefort :

Relation d'un voyage au Levant (۱۷۰۱ء)، پیرس ۱۷۱۷ء، ۲ : ۳۰۷ تا ۳۲۰؛ (۴۸) Güldenstädt : Reisen durch Russland ، ۲ جلدیں، سینٹ پیٹرز برگ ۱۷۸۷ تا ۱۷۹۱ء ؛ (۴۹) وهی مصنف : Reisen in Georgien (۱۷۷۰ء)، طبع Klaproth ، برلن ۱۸۱۵ء، ص ۱۲۷ تا ۱۳۲؛ (۵۰) Gamba : Voyage dans la Russie méridionale، پیرس ۱۸۲٦ء ، ۲ : ۱۵۴ تا ۱۸۳ (تفلس) اور اٹلس لوحه ۳۳؛ (۵۱) Dubois de Montpéreux : Voyage autour du Caucase ، پیرس ۱۸۳۹ ء ، ۳ : ۲۲۵ تا ۲۷۵ (تفلس) وغیره؛ [(۵۲) Spuner - Menke Hand - atlas etc.، طبع سوم ، گوتا ۱۸۸۰ء)].

(منورسکی V. Minorsky)

* **تقتمیش** : Toktamish جسے تختمیش بھی لکھا جاتا ھے (مثلاً روسی سال ناموں میں بالالتزام) [حافظ ابرو: زبدة التواریخ (کتابخانۂفاتح، ۱۷۳۴/۱)تقتمیش؛ مطلعِ سعدین، نسخۂ ادرنه : تغتمش]، آلتون اُردو(Golden Horde) کا خان تھا ۔ اس نام کی صورت [تقاتمیش] کو ای ۔ جی ۔ براؤن نے درست بتایا ھے (Persian Literature under Tartar Dominion ، کیمبرج ۱۹۲۰ء، ص ۱۵۸۳ ، اس کی سند [؟] غالباً وه بیت ھے جو اُسی کتاب کے ص ۳۲۸ پر منقول ھے

[لشکر بادشاه توقتمیش
آمد و هاتف این ندا در داد]

لیکن اس کی تردید کئی ایک مخطوطات کی تحریروں اور اُویغوری سکّوں اور دستاویزات سے ھوتی ھے؛ مثلاً ابن عرب شاه (طبع مصر، ص ۱۴ اور دیگر مواضع کثیره) برابر توقتامیش خان ھی لکھتا ھے ۔ اس کے حسب و نسب کے متعلق اقوال بہت مختلف ھیں ۔ اس کے باپ کا نام یقیناً تُولِی خوجه تھا، اگرچه مخطوطات میں یه نام اکثر مسخ ھو گیا ھے، جو زمباور (E. von Zambaur) کے دیے ھوے شجرۂ نسب (Manuel de Généalogie et de Chronologie pour l'histoire de l'Islam ، ھینوور ۱۹۲۷ء، شجره S [بیت جُوچی]) اور لین پول اور دیگر مصنفین کے بیان کے مطابق خان اُرُس (اوروس) کا بھائی اور جُوچی کے بڑے بیٹے اوردَه Orda کی اولاد میں سے تھا، لیکن بقول ابوالغازی (طبع Desmaisons، ص ۱۷۸) وه جُوچی کے ایک اور بیٹے تُقای تیمور خان کی اولاد میں سے تھا ۔ تُولی خوجه کی زندگی اور اس کے بیٹے کے بچپن کے حالات کے متعلق ھمارے پاس صرف ایک ھی مأخذ ھے ۔ یه تصنیف [معین الدین نَطَنْزی] نے تیمور کے پوتے مرزا اسکندر کے لیے لکھی تھی ۔ اس کا ذکر ریو Rieu نے (Catalogue of Pers. MSS. in the British Museum ، ص ۱۰٦۲ ببعد) کیا ھے ۔ اسی تصنیف کا ایک اَور نسخه لینن گراڈ کے ایشیاٹک میوزیم میں بھی محفوظ ھے (قبّ مادۂ 'لُربزرگ' کا خاتمه [و سٹوری : Persian Literature، ۲/ ۱ : ۸٦ ، ۱۲۳۳]) ۔ اس مأخذ کے مطابق (As. Mus. ، مخطوطه ورق ۲۴۲ ب) ۔ وه مَنْگیشْلاق [رَکّ بآن] کا حاکم تھا اورخان اُرُس کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا تھا ۔ تُولِی خوجه کا بیٹا تُقتمیش پہلے تو ایک دو دفعه بھاگ نکلا لیکن پھر واپس آ گیا اور نابالغ ھونے کی وجه سے اسے معاف کر دیا گیا ۔ [لوی ئیل=] سالِ اژدھا (=[۷۷۷ھ] ۱۳۷٦ء) میں وه تیمور کے پاس چلا گیا ، جس نے سمرقند میں اس کا خیر مقدم کیا، بقول عبدالرزاق سمرقندی (رَکّ بآن؛ مخطوطۂ لینن گراڈ یونیورسٹی، ورق ۷۰ ب) ۔ تھوڑا ھی عرصه پہلے اس نے خان بیگ پُولاد سے شکست کھائی تھی ۔ تیمور نے اسے اُترار، صَبْران [زبدة : محل مذکور : ساوران] اور سِیغناق کے علاقے عطا کر دیے [مگر مطلع سعدین میں یه سب کچھ بذیل وقائع ۷۸۰ھ درج ھے] ۔ وھاں اُرُس خان کے بیٹے

قُتلُغ بُوغا نے اس پر حملہ کیا اور گو قُتلُغ بُوغا لڑائی میں مارا گیا، اس کے باوجود تُقتَمِیش نے شکست کھائی اور اسے پھر تیمور کے پاس جانا پڑا ۔ تیمور نے اسے مدد دی اور وہ دوبارہ صُبران گیا لیکن تھوڑی مدت کے بعد ھی اُرُس خان کے ایک اَور بیٹے توختہ قیا [زبدۃ و مطلع : توقتا قیا] نے اسے شکست دی اور وہ پھر تیمور کے پاس بھاگ کر چلا گیا ۔ بقول ظفرنامہ (طبع ھند، ۱ : ۲۷۸) اسی [لوی ئیل =] سالِ اژدھا کے آخر (شروع ۱۳۷۷ء) میں تیمور کو خود تُقتَمِیش کے ھمراہ خان کے خلاف معرکہ آرا ھونا پڑا ۔ دشمن کو شکست فاش ھوئی اور اس کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی ۔ اس کے بعد ھی اُرُس خان بھی مر گیا اور اس کے بیٹے اُس کے جانشین ھوے، پہلے توختہ قیا اور اس کے بعد تیمور مَلِک ۔ تیمور [ایلان ئیل یعنی] سالِ مار (=) [۷۷۸ھ] ۱۳۷۷ء) کے آغاز میں اپنے پلے تخت میں واپس آ گیا اور اس کے بعد ھی تقتمیش کو تیمور ملک نے پھر شکست دی لیکن تیمور کی خواھش کے مطابق اسے سِیغناق میں تَختِ خانی پر بٹھا دیا گیا (یزدی، ۱ : ۲۸۳) ۔ موسم سرما (۱۳۷۷ء- ۱۳۷۸ء) میں تیمور کو اطلاع ملی کہ تیمور مَلِک ھمیشہ شراب خوری میں مشغول رھتا ھے اور اپنا عزّ و وقار کھو بیٹھا ھے ۔ تُقتَمِیش کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے اسی سال کے موسم سرما میں یلغار کر کے تیمور مَلِک کی حکومت کا خاتمہ کر دیا ۔ آئندہ موسم بہار میں اس نے سِیغناق ھی سے آلتون اردو کی سلطنت کے مغربی حصے کو فتح کرنے کا تہیہ کر لیا اور بڑی اچھی طرح کامیاب ھوا ۔ (یزدی، ۱ : ۲۹۰) ۔ روسی سال‌ناموں سے ان فتوحات کے زمانے کا زیادہ صحت کے ساتھ پتا چل سکتا ھے ۔ ۸ ستمبر ۱۳۸۰ء کو آلتون اُردو کے حکمران مَمای ([کذا ایضاً در زبدۃ ، ۳۳۶]، اسے ظفرنامہ میں مَماق لکھا ھے) کو روسیوں نے دریاے دُون Don کے کنارے کولی کوفو Kulikowo کے مقام پر شکست دی اور اس کے فوراً ھی بعد تُقتَمِیش نے بھی بحیرہ اَزوف Azov کے قریب اسے ھزیمت دی، اسی سال روسیوں نے بھی نئے خان کی فتح کی خبر سنی ۔ ۱۳۸۱ء میں تُقتَمِیش نے روسیوں سے اطاعت کا مطالبہ کیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا، اس پر اگلے سال (۱۳۸۲ء میں) اس نے ملک روس کو بے دردی سے تاخت و تاراج کیا، اور ۲۶ اگست کو روس کے دارالخلافہ ماسکو کو لوٹا کھسوٹا اور مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا ۔ اس سے روس میں تاتاریوں کی حکومت ایک صدی کے لیے دوبارہ قائم ھو گئی ۔

[نَطنزی] کے قول کے مطابق (Asiat. Mus. کا مخطوطہ، ورق ۲۳۳ الف) تُقتَمِیش ایک باانصاف اور طاقتور حکمران تھا (یہ بھی بیان کیا جاتا ھے کہ وہ ایک خوش شکل آدمی تھا) لیکن تیمور کے حق میں ناسپاس ثابت ھوا، اس لیے اس کی یہ خوبیاں کسی کام نہ آئیں ۔ اپنی سلطنت کے قائم ھوتے ھی وہ تیمور کا دشمن بن گیا ۔ تیمور نے ۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء میں خوارزم فتح کیا تھا لیکن ھم دیکھتے ھیں کہ ۷۸۵ھ / ۱۳۸۳ء کے آتے آتے وھاں تُقتَمِیش کے نام کا سکّہ مضروب ھونے لگا ۔ جہاں تک ھمیں معلوم ھے اس موقع پر تیمور نے خوارزم شاہ یا تُقتَمِیش کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی؛ ظفر نامہ (۱ : ۴۱۰ ببعد) میں آیا ھے کہ تُقتَمِیش نے تیمور کے خلاف پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ۷۸۹ھ (توشقان ییل = ۱۳۸۷ء) میں دربند کی راہ سے آذربایجان پر حملہ کیا ۔ اس سے پہلے موسم سرما میں تُقتَمِیش تبریز [رَکّ بآن] کی طرف فوج روانہ کر چکا تھا (ظفرنامہ، ۱ : ۳۹۲)

لیکن تیمور ابھی تک وھاں پہنچا نہ تھا اس لیے خان کی فوج کشی سے اس کے حقوق پر براہ راست دست اندازی نہ ھوتی تھی ۔ تبریز کو نہایت خوفناک طریقے سے ویران اور پامال کیا گیا ۔ آٹھ روز تک لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم رھا (معاصر مصنف زین الدین قزوینی کا یہی بیان ھے، قب تغاتیمور) ۔ عجب یہ کہ اس موقع پر بھی تیمور نے اپنے مخالف کے خلاف بڑے تحمل سے کام لیا؛ گو اس نے اپنی سرمائی فرودگاہ قراباغ سے اپنے بیٹے میران شاہ کی کمان میں ایک لشکر تو بھیج دیا مگر فتح پانے کے بعد قیدیوں کو رھا کر دیا اور تقتمیش کو صرف ملامت اور تنبیہ کرنے پر اکتفا کی ۔

اسی سال (۱۳۸۷ء) کے آخر میں، جب تیمور ابھی ایران ھی میں تھا، تقتمیش نے تیمور کے قلب سلطنت پر حملہ کرنے کے لیے اپنے لشکر بھیج دیے ۔ اس موقع پر آلتون اردو کے لشکر ھر جگہ فتح یاب ھوے اور آمو دریا تک بڑھتے چلے گئے [نخشب (قرشی) کو جلا دیا گیا ۔ مطلع]، بخارا کا محاصرہ کر لیا گیا اور [ولایات ماوراءالنہر پامال ھوے] (ظفرنامہ، ۱ : ۴۴۳) ۔ تیمور کو بعجلت لوٹنا پڑا اور محرم ۷۹۰ھ کے آخر / آغاز فروری ۱۳۸۸ ء میں وہ ایران سے روانہ ھو گیا ۔ کہیں ۱۳۹۱ء [منتصف صفر ۷۹۳ھ : زبدۃ، ۴۹۱] میں جا کر تیمور نے آلتون اردو کے ممالک محروسہ کے خلاف انتقامی مہم شروع کی ۔ اس مہم کی ابتداء میں تقتمیش کی ایک سفارت تیمور کے دربار میں پہنچی لیکن وہ واقعات کی رفتار پر اثر انداز نہ ھو سکی ۔ ۱۵ رجب [کذا ایضاً مطلع؛ مگر زبدۃ، ۴۹۸ : ۱٦ رجب] ۷۹۳ھ / ۱۹ جون ۱۳۹۱ء کو پیر کے دن تقتمیش کو قندوزچہ [مطلع، نسخۂ ادرنہ، ۸۹ ب : قندزجہ) کے میدان میں شکست فاش ھوئی ۔ تیمور دریاے والگا [آتل] تک بڑھ آیا لیکن آلتون اردو کی سلطنت کو مطیع و منقاد کیے بغیر واپس چلا گیا ۔ تقتمیش کو تھوڑے عرصے کے لیے تخت خالی کرنا پڑا لیکن وہ بہت جلد واپس آ گیا ۔ اس نے مقام تانہ (Azov [دیکھیے *Hand-atlas*، خریطہ شمارہ ٦۸]) سے یاغلّو Yagello شاہ پولینڈ کے نام ۸ رجب ۷۹۵ھ / ۲۰ مئی ۱۳۹۳ ء کو ایک خط لکھا تھا، جس میں اس نے ان واقعات کو اپنے نقطۂ نظر سے بیان کیا ھے ۔ وہ لکھتا ھے : تیمور کو میرے دشمنوں نے بلایا تھا اور اس بات کا علم مجھے بڑی دیر کے بعد ھوا ۔ لڑائی کے شروع میں ان سازشیوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا جس سے میری سلطنت میں سخت گڑ بڑ پیدا ھو گئی تھی، مگر اب پورے طور پر امن و امان قائم ھو گیا ھے، اس لیے خراج کی رقم کا بقایا بھیج دو، تمھارے سوداگر اپنی نقل و حرکت میں آزاد ھوں گے (*Zap.*، ۳ : ۳ ببعد) .

تقتمیش اور تیمور کے درمیان اب کھلی عداوت پیدا ھو گئی ۔ ۱۳۸۵ء میں تقتمیش نے اپنے سفیروں کو تحفے دے کر مصر روانہ کیا (Tiesenhausen : *Sbornik materialov otnosyashčikhsya k istorii Zolotoi Ordi*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۴ء، ص ۴۲۷ ببعد) لیکن اس موقع پر متحدہ فوجی کارروائی کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا گیا ۔ اس کے برعکس ۱۳۹۴ اور ۱۳۹۵ ء میں جو وفد بھیجے گئے ان کا خاص مقصد یہی تھا کہ مصر اور آلتون اردو کی حکومتیں تیمور کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں (کتاب مذکور، ص ۴۲۸، ۴۴۵، اور ۴۵۰) ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تیمور مغرب کے خلاف اپنی "یورش پنج سالہ" میں مصروف تھا (۱۳۹۲ تا ۱۳۹٦ء) ۔ [۷۹۵ھ] ۱۳۹۳ء میں تیمور نے بغداد سے ایک سفارت مصر بھیجی تھی

(ظفرنامہ، ۱ : ۶۴۲ بعد) مگر سلطان برقوق [رک بان] کے حکم سے سفیر کو رحبہ کے مقام پر قتل کر دیا گیا جو دریاے فرات کے کنارے ایک سرحدی شہر تھا (یزدی، ۲ : ۲۷۵) - ۱۳۹۴ء میں تیمور ملک شام کی طرف جانا چاهتا تھا لیکن یہ ارادہ ترک کرکے اس نے مابین النهرین کے شمالی حصے کا رخ کیا ([نطنزی] ، مخطوطۂ ایشیاٹک میوزیم، ورق ۲۹۱ ب): ایک مصری مأخذ (ابن حجر العسقلانی، در Tiesenhausen) : کتاب مذکور، ۵۰۴) کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ تیمور کو تقتمیش کی بابت یہ اطلاع پہنچی تھی کہ اس نے (تیمور کی) مملکت پر حملہ کر دیا - آذربایجان کا ملک اور دیگر علاقے، جو آذربایجان کے شمال کی طرف دربند تک پھیلے ہوے تھے، ۱۳۹۲ء سے تیمور کے بیٹے میران شاہ کے زیر نگین چلے آ رہے تھے [قب مادۂ تبریز]۔ تقتمیش نے اس سے پہلے صاف طور پر دربند اور شیروان کا مطالبہ کیا تھا اور وهاں اس کے نام کے سکے بھی ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء سے لے کر ۷۹۲ھ / ۱۳۹۰ء تک مضروب ہو چکے تھے : لیکن بعد کے سال میں اس طرف سے خطرے کے ظہور پذیر ہونے کا کوئی حوالہ موجود نہیں۔ تیمور ارمینیہ اور گرجستان کی لڑائیوں کی وجہ سے خاصی مدت تک رکا رہا - ۱۳۹۴ء کے آخر میں تیمور کو شکّی کے مقام پر شیروان سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ آلتون اردو کے لشکروں نے ملک پر حملہ کر دیا ہے - تیمور نے انهیں آسانی کے ساتھ پسپا کر دیا اور قشلاق (موسم سرما گذارنے) کے لیے محمود آباد (ظفرنامہ، ۱: ۷۳۳ بعد)[کے قریب] قیام کیا - یہاں سے [۷۹۷ھ] ۱۳۹۵ء کے موسم بہار میں اس نے تقتمیش کے خلاف اپنی بڑی مہم شروع کی۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے تیمور نے شمس الدین المالیغی کو تقتمیش کے پاس سفیر بنا کر بھیجا اور سمور (بجنوب دربند ، [مذکور در بلاذری، ۲۰۶]) [زبدۃ، ۵۴۶ و شامی ، ۱۵۸ : آب سمور سے ۵ فرسخ پر] میں اس کے جواب کا منتظر رہا - یہ جواب غیر تسلی بخش تھا، لہذا مہم شروع کر دی گئی - ۲۲ جمادی الآخرۃ ۷۹۷ھ/ ۱۴ اپریل ۱۳۹۵ء کو بدھ کے دن دریاے ترک کے کنارے فیصلہ کن جنگ ہوئی (ظفرنامہ، ۱ : ۷۴۵ بعد) - تقتمیش کو پھر کچھ عرصے کے لیے غائب ہو جانا پڑا [تیمور نے اس کا تعاقب کیا اور آتل کے گذرگاہ توراتور (قب زبدۃ، ۵۴۹ : ''ازگذرگاہ ادل (کذا [یعنی اتل]) کہ ترکان تراتور می گویند'') پر پہنچ کر قویری چاق اُغلن پسر اروس خان کو اُلوس جوجی کی خانی عطا کی ، ظفرنامہ، ۱ : ۷۵۵ - مگر کسی کو خانی عطا کرنے کا ذکر زبدۃ میں نہیں ہے] - ظفرنامہ ، ۱ : ۷۶۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمور ماسکو پہنچا۔ مگر یہ درست نہیں ، وہ صرف یلک Yelec تک پہنچا [جو ماسکو سے تقریباً ۴ درجے جنوب میں ہے، دیکھیے *Hand-atlas* ، نقشہ ۶۸ - مگر صاحب ظفر نامہ کا بیان بظاہر معاصران تیمور اور قریب العهد متعدد مؤرخوں کے بیانات سے ملا کر دیکھنا چاهیے، مثلاً حافظ ابرو (زبدۃ ، ۵۵۰) : '' و امیر صاحب قران بجانب شہر اوروس مشکو نام عزم کرد و بر ہمۂ آن ولایت تاخت کردہ غارتیدند'': نظام شامی ، ۱۶۱ : ''و امیر صاحب قران بجانب شہر اوروس موشکو نام عزم کرد و بر ہمۂ آن ولایت تاخت کردہ غارتید''؛ مطلع، نسخۂ ادرنہ(ورق ۱۰۰ ب) : ''و حضرت صاحب قران از شہرهاء ارس مشکو را تاختہ غارت کرد'' ؛ ظفر نامہ، محل مذکور: ''حضرت صاحب قران بجانب مسکو کہ ہم از شہرهای روس است نہضت فرمود و آنجا رسیدہ سپاہ ظفر پناہ تمام آن ولایت را از شہر و بیرون بتاختند و مجموع امراء آنجا را منکوب و مخذول ساختند'']۔ یلک سے وہ

روسی سالناموں کے مطابق ۲۶ اگست ۱۳۹۵ء کو واپس ہوا ۔ اس کے جلد بعد آزاق (Azov) کو اور موسم سرما میں حاجی ترخان (استرخان) اورسرائے [برکہ، زبدۃ، ۵۰۰] [رک بہ سرای] کو بڑی خونریزی کےساتھ تاخت و تاراج کیا گیا [مطلع، نسخۂ مذکورہ، ۱۶۱ ب میں ہے کہ سرائے کو آگ لگا کر ویران کر دیا گیا، اس لیے کہ جب تیمور فارس و عراق کی مہم پر گیا ہوا تھا لشکرِ دشت نے نواحِ بخارا میں زنجیر سرای کو ویران کر کے آگ لگا دی تھی]۔ ۷۹۸ھ / ۱۳۹۶ء کے موسم بہار میں تیمور دربند کے راستے آذربایجان واپس آ گیا . . . ۔ تقتمیش کو ایک دفعہ پھر تخت و تاج واپس لینے کا موقع ملا ۔ ابن حَجر العَسْقلانی لکھتا ہے کہ ۷۹۹ھ/اکتوبر ۱۳۹۶ تا ستمبر ۱۳۹۷ء میں اس نے جنوہ کے فرنگیوں کے خلاف جنگ کی (Tiesenhausen : کتاب مذکور، ۱۵۳) ۔ ۳ ذوالحجۃ ۸۰۰ھ/۱۷ اگست ۱۳۹۸ء کو تیمور کے پاس تقتمیش کے حریف اور جانشین تیمور قُتلُغ بن تیمور ملک کا ایک ایلچی آیا (ظفر نامہ، ۲ : ۳۳ : یہ تاریخ اصلی ماخذ (*Tekstî po istorii Sredney Azii*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۵ء، ص ۵۳) میں دی ہے) ۔ تقتمیش بھاگ کر ویٹوٹ Witowt امیر لتھوینیا کے پاس چلا گیا ۔ امیر لتھوینیا نے اس کی حمایت کی لیکن تاتاریوں کے ہاتھوں ۱۲ اگست ۱۳۹۹ء کو دریاے وِرْسکْلَہ [معاون ڈنیپر، *Hand-atlas*، محلّ مذکور] کے کنارے شکست کھائی ۔ اس روز سے تقتمیش نے قسمت آزماؤں کی سی زندگی اختیار کر لی ۔ تیمور کی وفات سے تھوڑی مدت پہلے اس کے پاس تقتمیش کا ایک ایلچی مقامِ اُترار پر آیا، جہاں تیمور ۱۲ رجب ۸۰۷ھ/۱۴ جنوری ۱۴۰۵ء کو پہنچا تھا ۔ اس نے یقین دلایا کہ تقتمیش بے حد نادم ہے اور معافی کا خواستگار ہے ۔ تیمور نے وعدہ کیا کہ چین کی مہم کے بعد وہ آلتون اُردو کی مملکت میں پھر آئے گا اور اسے اس کا تخت و تاج واپس دلائے گا (ظفر نامہ، ۲ : ۶۳۶ ببعد) ۔ روسی مصادر کے مطابق تقتمیش ۱۴۰۶ء میں توین Tümen (سائبیریا) کے مقام پر خان شادی (۸۰۲ھ تا ۸۱۰ھ / ۱۳۹۹ - ۱۴۰۰ء تا ۱۴۰۷ - ۱۴۰۸ء) کی ایک فوج کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا، مگر [نطنزی] (نسخۂ ایشیاٹک میوزیم، ورق ۲۴۳ ب) کے قول کے مطابق وہ طبعی موت مرا ۔

مآخذ : متن میں دے دیے گئے ہیں۔ تقتمیش کے حالات جو یورپ کے قدیم تر مصنفین خصوصاً (۱) *Geschichte der Goldenen Horde* : Hammer-Purgstall اور (۲) *History of the Mongols* :Howorth، (حصۂ دوم) نے لکھے ہیں اُن معلومات کے مطابق نہیں ہیں جو اس زمانے میں ہمیں اصل مآخذ سے حاصل ہوئی ہیں : نیز دیکھیے مقالۂ ''تیمور''؛ (۳) نظام الدین شامی: ظفر نامہ، طبع فیلکس تاور بیروت ۱۹۳۷ء؛ (۴) حافظ ابرو : زبدۃ التواریخ بایسنغری؛ (۵) مطلع سعدین، نسخۂ ادرنہ].

(بارتولڈ W. Barthold)

* **تَقْدِیر** : رک بہ قدر .

* **تُقُرْت** : یا تُگُرت Tüggurt الجزائری صحرا کا ایک قصبہ، جو بِسْکْرہ Biskra سے جنوب کی طرف ۱۳۵ میل کے فاصلے پر ہے اور آج کل ریل کے ذریعے بِسْکْرہ سے ملا ہوا ہے ۔ اس کا محلّ وقوع ۳۲ درجے، ۷ دقیقے شمالی عرض بلد اور ۶ درجے، ۲ دقیقے مشرقی طول بلد ہے اور یہ سطحِ سمندر سے ۲۰۰ فٹ اونچا ہے ۔ تُقُرت وادِ رِیْر کا سب سے زیادہ اہم مقام ہے ۔ واد رِیْر شمالاً جنوباً ۱۳۰ میل لمبی تنگ وادی ہے، جس میں صحرا کے دو دریا آ کر گرتے ہیں : تدیکلت Tidikelt سے واد مُیا Wad Mya [= وادی مِیاہ] اور ھجر Hoggar سے [وادی] یغرغر Tgharghar ۔ تھوڑی سی گہرائی پر زیر زمین پانی کی

موجودگی کی وجہ سے یہاں کھجوروں کے جھنڈ خوب پھولتے پھلتے ہیں ۔ ان میں سے تُقُّرت کے جھنڈ، جن میں ۱,۷۰,۰۰۰ سے زائد درخت ہیں اور جن میں مشہور قسم کی عمدہ کھجوریں لگتی ہیں، تعداد میں سب سے زیادہ ہیں ۔ مگر چونکہ یہاں سطح زمین پر پانی جمع ہوجاتا ہے اور آسے بہ کر نکل جانے کی کہیں جگہ نہیں ملتی، اس لیے یہ علاقہ صحت کے لیے بہت مضرّ ہے اور موسمِ گرما میں یہاں ایک قسم کے خطرناك بخار کا دور دورہ ہو جاتا ہے، جسے یہاں کے باشندے *them* کہتے ہیں ۔ مزید برآں یہاں درجۂ حرارت بہت گھٹتا بڑھتا رہتا ہے (موسمِ سرما میں رات کا درجۂ حرارت — ۷ سینٹی گریڈ تک گھٹ جاتا ہے اور موسمِ گرما میں دن کو درجۂ حرارت +۵۶ سینٹی گریڈ تک بڑھ جاتا ہے ۔ ان نامساعد حالات کے ہوتے ہوے بھی تُقُّرت چونکہ کاروانوں کے راستوں کا مقامِ اتّصال ہے، اقتصادی لحاظ سے ہمیشہ بہت اہم رہا ہے اور اسی وجہ سے اس کا لقب ''بطن الصحراء'' پڑ گیا ہے ۔

تُقُّرت کا ایک حصہ تو سوادِ قصبہ ہے، جس میں متعدّد محلّے ہیں اور ایک حصہ نواحِ قصبہ ہے، جس میں قصبے کے گردا گرد دو یا تین میل کے دائرے کے اندر متعدّد گاؤں آباد ہیں (نَزْلَۃ، سِیدی بُوجَنان، تِبِسْبِسْت، زاوِیہ)۔ مکان زیادہ تر کچی اینٹوں کے ہیں ۔ بڑے بڑے بازاروں کے دونوں طرف مسلسل کمانیں ہیں یا وہ جزئی طور پر ڈھکے ہوے ہیں ۔ قابلِ ذکر عمارت صرف جامع مسجد ہے، جسے تونس کے کاریگروں نے، جو سلاطین تُقُّرت کے ملازم تھے، تعمیر کیا ۔ آبادی کا بیشتر حصہ رُوَارْءَہ پر مشتمل ہے (یعنی وادْ رِیغْ کے اصلی باشندے) ، جو بربر نسل سے ہیں لیکن بلاد سودان سے غلاموں کی بکثرت در آمد کی وجہ سے ان کا خون سیاہ خون سے اس قدر مل چکا ہے کہ ان میں سے اکثر حبشی سے معلوم ہوتے ہیں ۔ یہاں ''مہاجرین'' کا ذکر بھی مناسب ہے، یعنی وہ یہودی جنھوں نے سترھویں صدی کے اختتام یا اٹھارھویں صدی کے آغاز میں اسلام قبول کیا ۔ ان لوگوں نے یہاں آ کر ایک الگ محلّہ بسا لیا اور وہ بہ حیثیت کاتب یا دفتردار سلطان کے ھاں ملازمت کرتے تھے ۔(۱۹۲۶ء کی مردم شماری کے اعتبار سے) سوادِ قصبہ اورنواحِ قصبہ کی آبادی ملا کر ۱۲,۱۰۸ نفوس پر مشتمل ہے، جن میں سے ۱۶۸ فرنگی ہیں ۔ تُقُّرت ایک خطّے کا صدر مقام ہے ، جس کی مساحت ۱,۳۹,۰۰۰ مربّع کیلومیٹر ہے اور جس کی آ .ی ۲,۱۲,۶۸۳ ہے، ان میں سے ۶۹۱ فرنگی ہیں ۔

تاریخ : سولھویں صدی میلادی تک تُقُّرت کی تاریخ سے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی ان کی حیثیت زیادہ تر اساطیری نوعیت کی ہے ۔ اگر رومی وادْ رِیغْ تک پہنچے تھے تو ان کے قدم وہاں نہیں جمے اور ملک وہاں کے اصلی باشندوں ہی کے قبضے میں رہا ۔ ابن خَلْدون کے قول کے مطابق بربر قبیلے رِیغَۃ کے ایک حصے نے زاب اور وَارْقَلَۃ Wargla کے درمیان کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہاں زِناتہ کے دیگر قبائل کے ساتھ مختلط ہو گئے ۔ اس طرح ان کے الگ الگ گروہ بن گئے، جو خود مختارانہ طور پر چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہنے لگے ۔ ان قصبوں میں سے تُقُّرت سب سے بڑا تھا ۔ کتاب العَدْوانی *Kitāb al-Adwanī* کے بیان کے مطابق ان میں یہودیوں کی خاصی بڑی تعداد تھی ۔ ان میں سے بہت سوں نے خوارج کا مذھب اختیار کر لیا اور مدت دراز تک اسی مذھب پر قائم رہے، کیونکہ ایک مقامی روایت تُقُّرت.

کے اباضیوں کے ترکِ خارجیت اور رجوع به جماعت کو شریف سیدی محمد بن یحیٰی ادریسی کی تبلیغ کی طرف منسوب کرتی ہے ۔ سیدی مذکور تُقُرت میں پندرھویں صدی میلادی میں آ کر مقیم ہوے ۔ عربوں کے حملهٔ اوّلین سے تو تُقُرت کے باشندے بچے رہے لیکن آخر کار انھیں حُکّامِ مغرب کا اقتدار تسلیم کرنا ھی پڑا ۔ الموّحدون کے عہد میں وہ ایک والی کے زیرِ حکم تھے، جو بِسْکَرہ میں رہتا تھا ۔ اس کے بعد وہ تونس کے حفصیوں کے ماتحت رہے اور پھر بنو مُزْنی کے زیرِ اقتدار آ گئے، جو زِیْبان میں تقریباً خود مختار بن بیٹھے تھے ۔ اس قصبے کی ملکیت کے متعلق دو خاندانوں [بنو] عبیداللہ اور تیماسین Temacine کے بنو ابراھیم کے درمیان نزاع تھا ۔ اس منازعت کی وجہ سے جو فسادات ہوے انھیں دبانے کے لیے سلطان ابن الحکیم (یا ابن الحاکم ؟ Ibn al-Ḥakim) حفصی نے تُقُرت پر حملہ کر کے ۱۳۰۳ء میں اس پر قبضہ کر لیا اور خراج مقرر کر دیا لیکن تھوڑے ھی دنوں میں خانہ جنگی پھر شروع ہوگئی ۔ روایت ہے کہ یہ خانہ جنگی اس وقت ختم ہوئی جب سیدی محمد بن یحیٰی نے یہاں پہنچ کر اپنا قبضہ جمایا۔ اس کے بعد اس نے واڈ رِیْر پر چالیس سال تک حکومت کی ۔ کہتے ہیں کہ موجودہ قصبهٔ تُقُرت (تُقُرت البہاجه Tuggūrt al-Behādja، جو قدیم قصبے کے شمال میں ہے) کی بنیاد اسی زمانے میں رکھی گئی اور قدیم قصبے کی جگہ آج کل قریهٔ نَزْله واقع ہے ۔

نئے فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ضلع میں سُلیمان بن جلّاب ایک مرّاکشی شہزادہ نمودار ہوا جو مَرِینیوں کا رشتےدار تھا ۔ حج سے واپس آتے ہوے وہ تُقُرت میں اقامت‌پذیر ہو گیا اور وہاں اس نے ایک مسجد کی بنا ڈالی، اور پھر قرب و جوار کے خانہ‌بدوشوں بالخصوص اُوْلَادِ مُوْلَاة (Ūlād Moulat) اور دَواوِدَة عربوں کی مدد سے وہ اپنے آپ کو بادشاہ تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گیا ۔ یہی شہزادہ بِین [= بنی] جلّاب کا مورثِ اعلیٰ ہے، جنھوں نے انیسویں صدی تک تُقُرت میں حکمرانی کی.

متعدّد تغیّرات اور متواتر خانہ جنگیوں کے ہوتے ہوے بھی، جو خانہ بدوشوں اور بعد میں ترکوں کی مداخلت کی وجہ سے زیادہ پیچیدہ ہو گئی تھیں، بِین (بنو) جلّاب اپنی آزادی قائم رکھنے میں کامیاب رہے ۔ سولھویں صدی میں بیکلر بک صلاح رئیس نے ان کے خلاف مہم کی قیادت کی، جو کامیاب رہی، لیکن قصبے کو لُوٹنے کے بعد وہ اس پر رضامند ہو گیا کہ ۱۰ حبشی ہر سال بطور خراج اس کے پاس پہنچ جایا کریں ۔ اٹھارھویں صدی میں بِین (بنو) جلّاب نے قُسْطَنْطِیْنَة کے بیکوں (Beys) کی فرمانروائی تو تسلیم کر لی لیکن ضرائب (ٹیکس) ادا نہ کیے، چنانچہ بیکوں نے کوشش کی کہ انھیں بے دخل کر کے ان کی جگہ اپنے پروردہ بِین قانہ Ben Ghana کو لا بٹھائیں ۔ پہلے صلاح بک نے ان پر کئی حملے کیے اور ۱۷۸۸ء میں قصبے پر بائیس دن تک گولہ باری کی؛ پھر احمد مملوک نے ۱۸۲۱ء میں ان پر چڑھائی کی اور تُقُرت کے لوگوں نے کچھ دے دلا کر اس سے پیچھا چُھڑا لیا لیکن ان سب کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بِین (بنو) جلّاب کی دشمنی ترکوں سے اَور بڑھ گئی ۔ الجزائر پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان عبدالکبیر نے قسطنطینه کے بک کے خلاف جنگ میں فرانس کو اپنی خدمات پیش کیں (۱۸۳۱ء) ۔ جب فرانسیسیوں نے بِسْکَرہ میں اپنے قدم جما لیے تو عبدالکبیر کے جانشین عبدالرحمان نے فرانس کی سیادت مطلقه تسلیم کر لی ۔ آخر کار یہ خوشگوار تعلّقات ۱۸۵۲ء میں منقطع ہو گئے ۔ سابق سلطان کے بھتیجے سُلیمان بن جلّاب نے، جس نے حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا،

وارقلة کے فتنہ انگیز شریف محمد بن عبداللہ کے ساتھ اتحاد کر لیا ۔ اس پر ۳ دسمبر ۱۸۵۴ء کو فرانسیسی فوج کے ایک دستے نے تقرت پر قبضہ کر کے وہاں ایک محافظ فوج بٹھا دی۔ ۱۸۷۱ء میں پھر شورشیں برپا ہوئیں ۔ بوشوشہ نامی ایک ماجرا جو نے تقرت پر قبضہ کر لیا اور محافظ فوج تہ تیغ کر دی لیکن اسی سال کے آخر میں امن و امان قطعی طور پر قائم کر دیا گیا. . . .

مآخذ : (۱) [الحسن بن محمد الوزّان الزیّاتی] Leo Africanus : *Description de l' Afrique*، کتاب ٦ (ترجمہ شیفر Schefer ، ۳ : ۲۳۹)؛ (۲) حاجی ابن الدین الأغواطی "Itinéraire" ، ص ۱۰ ببعد ، ۱۴ ببعد ، در d'Avezac : *Études de géographie critique sur une partie de l' Afrique septentrionale*، پیرس ۱۸۳٦ء؛ (۳) Ch. Féranaud : *Kitab al-Adouani on Recueil de traditions sur la Sahara de Constantine et de Tunis*، در *Recueil de Notices et Mémoires . . . société archéol. de Constantine*, 1886؛ (۴) وهی مصنف: *Les Ben Djellab, sultans de Tougourt*، در *R. A.*، ۱۸۷۹ء؛ (۵) وهی مصنف : *La Sahara constantinois*، الجزائر ۱۸۸۷ء؛ (٦) Th. Plein : *Lettres famillières sur l' Algérie*، طبع ثانی، الجزائر ۱۸۹۳ء .

(G. YVER)

تقلید : (عربی)، ''کسی چیز کا گردن کے گرد یا کندھے پر لٹکانا'' ۔ یہ کلمہ اصطلاح کے طور پر مندرجۂ ذیل تین معنوں میں مستعمل ہے :۔

۱ ۔ تقلید : عربوں کی وہ پرانی رسم جو صدرِ اسلام اور بعد کے زمانے میں بھی باقی اور مروج رہی اور جس کا ذکر فقہ میں بھی باقی ہے اور جس کی رو سے حرمِ مکہ میں ذبح کیے جانے والے قربانی کے جانور (ھَدْی) کی گردن کے گرد کوئی شے (بطورِ قلادہ، جمع قلائد) لٹکا دی جاتی ہے ۔ قرآن مجید، سورۃ ۵ [المائدۃ]: ۲، ۹۸ میں ' قلائد ' اور ' ھَدْی ' دونوں کا ذکر ایک ساتھ اللہ [تعالٰی] کے مقرر کردہ مناسکِ حج میں آیا ہے ۔ اس رسم کا، نیز ' اِشْعار ' ([کوھان یا] کھال میں ھلکا سا زخم لگا دینے) کا مقصد یہ تھا کہ جانور کو ایک علامت کے ذریعے [یا خون نکالنے سے متمیز کر کے] حرم میں قربانی کے لیے مخصوص کر دیا جائے ۔ گویا یہ اس کے لیے ایک قسم کا اِحرام [رَکَ بآن] تھا، جسے خود حاجی کے احرام سے ایک گونہ مشابہت حاصل ہے . . . .

[قربانی کے جانور کے قلادے کے لیے حاجی کے اپنے ایک یا دونوں پاؤں کی چپل یا صرف چمڑے کا ایک ٹکڑا ھی کام دے جاتا ہے] ۔ یہ نشان دار مخصوص جانور حاجی کے ساتھ تمام ضروری شعائرِ حج مع وقوفِ عرفات پورا کرتا ہے اور مِنٰی میں ذبح کر دیا جاتا ہے ۔ صدرِ اول کے مسلمانوں میں اس باب میں عملاً اختلاف تھا کہ جو شخص قلادے والے ھَدْی کو مکے بھیجے اور خود اس کے ھمراہ جا کر حج نہ کرے تو اس کے عمل پر کیا نتائج مترتّب ہوں گے ؛ ھو سکتا ہے کہ یہ رسم خالص اسلامی ھو [اور ایامِ جاھلیت کے عرب اس سے بیگانہ ھوں] ۔ متعدد احادیث کی رو سے حج کے بغیر صرف قربانی بھیجنے والے پر اس وقت سے واجباتِ احرام عائد ھو جاتے ھیں جب سے وہ تقلیدِ ھَدْی کرے اور اس وقت تک عائد رہتے ھیں جب تک کہ وہ ھَدْی ذبح نہ ھو جائے ؛ لیکن ایسی احادیث نسبۃً بہت زیادہ ھیں (جن میں بعض کا میلان تو صریحاً مناظرے و معارضے کی طرف ہے) جن میں کہا گیا ہے کہ نبی[ص] نے اس صورت میں اپنے آپ کو محرم نہیں سمجھا [چنانچہ بخاری : اضاحی، باب ۱۰ کی حدیث میں ایک شخص نے اس مسئلے کے متعلّق حضرت عائشہ[رض] کی رائے پوچھی تھی ۔ آپ نے اسے عملِ

رسول اللہ صلعم سے خبر دی ہے، جس کا خلاصہ یہی ہے کہ ہَدْی بھیجنے سے بھیجنے والا مُحْرِم نہیں ہو جاتا اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے کہ احرام ہَدْی بھیجنے سے نہیں ہوتا، جب تک خود بالارادہ احرام نہ باندھا جائے - اور یہی بخاری کے عنوان (ترجمة الباب) کا مطلب ہے - احرام کا ذکر اس سائل کے سوال میں ہے .

حدیث کے الفاظ یہ ہیں : حدثنا احمد بن محمد اخبرنا عبداللہ اخبرنا اسمعیل عن الشَّعْبِی عن مسروق انّه اتی عائشة فقال لها یا امّ المؤمنین انّ رجلاً یَبْعَثُ بالهَدْی الی الکعبة و یجلس بالمصر فیوصی أن تُقَلَّد بدنته فلا یزَالُ من ذالک الیوم مُحْرِماً حتّی یَحِلَّ الناس ، قال فسمعتُ تَصْفیقَها من ورآء الحجاب فقالت لقد کنتُ اَفْتِلُ قلائدَ هَدْیِ رسول اللہ فیَبْعَثُ هَدْیَهُ الی الکعبة فما یَحْرُمُ علیه مما حلّ للرجل من اهله حتّی یَرجِعَ الناس - (بخاری : کتاب الاضاحی، باب ۱۰۵، باب اذا بَعَثَ بهَدْیه لِیُذْبَحَ لم یَحْرُمْ علیه شیٔ) - ان کے بین بین ایک ایسی حدیث بھی ہے جس کی رو سے التزام احرام ہر فرد کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے النسائی : حج، باب ۷۰) . . . جب فقه پورے طور پر مکمل ہوئی تو اس میں اس احرام کے لیے اب کوئی جگه نه تھی - اس لیے بہت ابتداء ہی میں یہ احرام متروک ہو چکا ہوگا - احرام اور تقلید کے مضبوط تعلق کا مزید ثبوت سفیان الثوری، [امام] احمد بن حنبل وغیرہ کی رائے سے بھی ملتا ہے ، یعنی حاجی صرف تقلید سے مُحرِم بن جاتا ہے؛ اس سے ملتا جلتا ایک اور قول بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی جب ارتکاب تقلید کرے تو اس پر واجب ہو جاتا ہے که وہ احرام بھی باندھ لے کم از کم امام مالک بن انس تو یہی کہتے ہیں کہ حاجی کے لیے احرام کو تقلید سے الگ کرنا غیر مستحبّ ہے - کتب فقه کی رو سے اونٹ یا مویشی کے قلادہ لٹکانا مستحبّ ہے - شوافع، حنبلیه، ابوثور اور داؤد کے نزدیک بھیڑ بکری کے لیے بھی قلادہ مستحبّ ہے - حنفی اور مالکی البته قلادے کی اجازت نہیں دیتے اور مالکی تو سرے سے بھیڑ بکری کی ہَدْی ہی کو جائز نہیں سمجھتے - جب سے حاجیوں نے گھر سے قربانی کے جانور لانا بند کر دیے اور مِنٰی میں جانوروں کی منڈی قائم ہو گئی تو رسمِ تقلید کو لوگ بھول بھال گئے .

آخر میں یه بتا دینا بھی مناسب ہے کہ لوگ اونٹ کی گردن میں چمڑے کا پٹّا باندھا کرتے تھے، وہ بھی قلادہ تھا - حدیث میں اس قلادہبندی کی، خصوصاً جب اس میں گھنٹی بھی لٹکی ہوئی ہو ، ممانعت آئی ہے - [امام مالک [۴] کا ظنّ ہے کہ یه قلادہبندی اس لیے کی جاتی تھی کہ اونٹ کو سفر میں نظر نه لگے] .

مآخذ : (۱) Lane : *Arab.-Engl. Lexicon*، بذیل مادّہ؛ احادیث کے لیے (۲) Wensinck : ***Handbook***، بذیل مادہ *Victims* ؛ (۳) مالک بن انس : الموطّأ، ہر دو متن میں؛ (۴) الزُّرْقانی: شرح الموطّأ ؛ (۵) الطَّحَاوی : شرح معانی الآثار [۱۳۰۰ھ، ۱ : ۳۹۹]؛ (۶) کُتُب فقه؛ (۷) Gaudefroy—Demombynes : ***Le pèlerinage à la*** *Mekke* ، ص ۲۷۹ تا ۲۸۵ (بعض غیر اہم جزئیات میں بیان بالا سے اس کتاب کا بیان مختلف ہے) .

۲ - تقلید : فوجی محکمے میں کسی شخص کو کسی عہدے پر نصب کرنا ۔ اس تقرر کی یه صورت تھی کہ اس شخص کی کمر سے تلوار باندھ دی جاتی تھی - اس کے بعد اس کا مفہوم عام ہو گیا، یعنی حکومت کے انتظامی محکمے میں کسی کو کوئی عہدہ دینا جس میں قاضی کا منصب بھی شامل ہے .

مآخذ : (۱) Lane : *Arab. Engl. Lexcion* ، بذیل مادّہ ؛ (۲) Sprenger : *Dictionary of the*

Technical Terms، (*Bibliotheca Indica*) [ص ۱۱۰۸].

۳ - [پھر تقلید کے معنے یہ بھی ھیں کہ کسی قول کو اس کی دلیل سمجھے بغیر قبول کر لیا جائے (التقلید '' اخذ القول من غیر معرفة دلیله '' تاج الدین السُبکی (م ۷۷۱ھ) : جمع الجوامع، منقول در التقریر و التحبیر، ۳ : ۳۴۱، قاھرة ۱۳۱۷ھ - یا یوں کہیں کہ] تقلید یہ ھے کہ انسان کسی غیر [حُجّت] کے قول یا فعل کو صحیح مان کر اس کی دلیل پر غور و تأمّل کیے بغیر اس کا اتّباع کرے - اس معنے میں ''تقلید'' ''اجتہاد'' [رکّ بآن] کی ضدّ ھے.

تاریخی طور پر تقلید کا آغاز ٹھیک اسی زمانے میں ھوا جس میں مذاھبِ فقه کی تکوین ھوئی (قبّ مذھب) اور کم از کم ایک حد تک اس کا ظہور بالخصوص اکابرِ فقہاء کے اتّباع سے ھوا - [امام] شافعی نے رسالة [بولاق ۱۳۲۱ھ، ص ۸، س ۱۸] میں لفظِ تقلید کو تقریباً اسی معنی میں استعمال کیا ھے جو بعد کے زمانے میں اصطلاحی طور پر پیدا ھوے - لیکن الطحاوی کے ھاں اس کلمے کا اطلاق ابھی نقدِ احادیث اور استنباطِ احکامِ فقه کے سلسلے میں تقلید کے لیے ھو رھا ھے - جب مجتہد کے متعلّق تصوّرات متعیّن ھو گئے - (یعنی وہ شخص جو اصلی مآخذ سے فقہی احکام کے استنباط کا بذاتِ خود اھل ھو) اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مان لیا گیا کہ تیسری صدی کے بعد اجتہادِ مطلق ختم ھو گیا اور کم یا زیادہ مدّت کے بعد دیگر انواعِ اجتہاد کا خاتمہ بھی تسلیم کر لیا گیا تو فقہاے متأخّرین یا عوام کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رھا کہ وہ اکابرِ متقدّمین کی تقلید کے قائل ھو جائیں - چنانچہ جمہورِ اھلِ سنّت کے عقیدے کی رو سے ھر فرد اس وقت اور کئی صدیوں سے اس بات کا پابند ھے کہ اپنے سلف نے جو باتیں مستند طور پر قرار دیں انھیں تسلیم کرے - اب کوئی آدمی اپنے آپ کو اس بات کا اھل سمجھنے کا مجاز نہیں کہ فقہی امور میں کسی سابق مجتہد کے فیصلے کی طرف رجوع کیے بغیر اپنی راے سے کوئی فیصلہ صادر کرے - بعد کے آنے والے سب لوگ مقلّد یعنی تقلید کرنے والے کہلاتے ھیں.

وجوبِ تقلید کی تائید میں یہ کہا جاتا ھے کہ فقط قرونِ اُولٰی کے فقہاء میں وہ حقیقی نظر اور تیزی فہم، وہ لازمی وسعتِ علم اور درایت پائی جاتی تھی جو اصل مآخذ سے مسائل فقه کے استنباط کے لیے ضروری ھے [اور وھی لوگ ان مسائل کے بارے میں اپنی آزادانہ راے قائم کر سکتے تھے - یہ بات متأخّرین کے حصے میں نہیں آئی] - اھلِ سنّت کا جو تصوّر ان کے عقائد کے ارتقاء کی تاریخ کے متعلق ھے یہ راے اس کے عین مطابق ھے - تقلید نے مختلف مذاھب میں اختلاف قائم رکھنے میں مدد دی ھے لیکن اس پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ زمانۂ مابعد میں فقه کی ترقی کے محرّکات کو ٹھنڈا کرنے کی ذمےدار بھی وھی ھے .

اگرچہ یہ ایک متّفقه راے ھے کہ عامی اور خاصی دونوں تقلید کے پابند ھیں لیکن بعض اوقات عالم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ھے کہ وہ اپنے مجتہد کے اجتہاد کی صحت کے دلائل سے واقف ھو- اگر مجتہد ایک سے زیادہ ھوں، جیسا کہ امرِ واقعه ھے ، تو مقلّد اپنی مرضی کے مطابق کسی ایک مجتہد کی تقلید کر سکتا ھے (بشرطیکه اجماع کی حدود سے باھر نہ نکل جائے، یعنی ایسے اجتہاد کو انتخاب نہ کرے جو اب اجماع کے نزدیک مسلّم نہیں ؛ وجوبِ تقلید کا مسئلہ بھی اجماع ھی پر مبنی ھے) - [امام] احمد بن حنبل کی راے ھے کہ مقلّد کو یہ فیصلہ کرنا ھوتا ھے کہ کس مجتہد کو ترجیح دے کر اس کی تقلید کرے (واقعه یہ ھے کہ یہ اختلاف راے در اصل اصطلاح ھی تک

محدود ہے) ۔ نظری طور پر ہر مقلّد ہر نئے مسئلے میں، جو اس کے سامنے آئے ، ایک نئے مجتہد کو اختیار کر سکتا ہے لیکن عملی طور پر وہ بالعموم چار مسلّم مجتہدوں میں سے کسی ایک کے مذہب میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاتا ہے [مگر علماء کے لیے وجوبِ اجتہاد اور منعِ تقلید کے متعلق دیکھیے ابن القیّم : اعلام الموقّعین (دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، قاہرۃ، ۵ : ۱۶۳ ح) اور کسی خاص مذہب پر استمرار کے لزوم کے متعلق قبّ محبّ اللہ بہاری حنفی در مسلّم الثبوت اور بحرالعلوم در فواتح الرّحموت شرح مسلّم الثبوت ، بولاق ۱۳۲۲ھ، ۲ : ۴۰۶، جہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر کسی معیّن مذہب کا التزام کر لیا جائے تو کیا اس مذہب پر استمرار لازم ہے اور پھر اس کا جواب مدلّل طور پر نفی میں دیا ہے] ۔ ایک مجتہد کا مذہب چھوڑ کر دوسرے مجتہد کا مذہب اختیار کر لینے کی مثالیں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں؛ لیکن اس باب میں اختلاف رائے ہے کہ نظری طور پر اس طرح کا تبدیلِ مذہب جائز ہے یا نہیں ۔ زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص مسئلے میں کسی دوسرے مذہب کے اصلح ضوابط کی پیروی کی جاتی ہے ۔ خود فقہ کی نتابیں ایسے حالات میں تقلید کے جواز کی طرف بعض مقامات میں اشارہ کرتی ہیں، لیکن بدیں شرط کہ معاملے کو اسی مذہب کے اصولوں کے مطابق انجام تک پہنچایا جائے جسے ایک مرتبہ اختیار کیا جا چکا ہے ۔

[شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ) نے عقدالجید (متن در سلکِ مروارید، دہلی ۱۳۴۴ھ، ص ۶۹) میں تقلید کی دو قسمیں واجب اور حرام بتا کر ہر ایک کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ جو شخص کتاب و سنّت سے ناواقف ہو اور تتبّع و استنباط کے ناقابل، وہ کسی متدیّن و متّقی عالم سے پوچھے کہ حکم رسول اللہ[ص] فلاں مسئلے میں کیا ہے، جب بتایا جائے تو اس پر عمل کرے، اور لکھا ہے کہ اس قسم کی تقلید کی علامت یہ ہے کہ کسی مجتہد کے قول پر گویا اس شرط سے عمل کیا جائے کہ وہ قول سنّت کے مطابق ہو، اور پھر تا حدّ امکان سنّت کی تلاش کرتا رہے، جب اسے یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ اس کے مجتہد کا قول کسی قطعی حدیث سے مطابقت نہیں رکھتا تو اس قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرے (شاہ صاحب نے اس کے بعد فرمایا ہے کہ اسی بات کی طرف ائمہ نے اشارہ کیا ہے، چنانچہ انہوں نے (امام شعرانی کی طرح) ائمۂ اربعہ میں سے ہر ایک کا قول اس کی تائید میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر قطعی حجّت کے مل جانے کے باوصف بھی مقلّد محض تقلیداً کسی امام کے خلافِ شریعت قول کو نہیں چھوڑتا تو ایسی تقلید ممنوع ہے اور اس کی شرع میں کوئی اصل نہیں اور نہ قرون سابقہ میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہے اور ابن عابدین (م ۱۲۵۲ھ) نے ردّ المحتار علی الدّرّ المختار (طبع دہلی ۱۲۸۷ھ، ۱ : ۴۶) میں (از روی شرح الہدایۃ لابن الشحنۃ) جو کچھ کہا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے]۔

یہ سب کچھ مسائلِ فقہ کے اندر تقلید کے بارے میں ہے ۔ عقلیّات، یعنی مسائلِ اصولِ دین (جیسے وجودِ باری تعالٰی) میں تقلید کے وجوب و جواز کے علاوہ ایک اور رائے بھی بہت جوش و خروش سے پیش کی جاتی ہے، یعنی عدمِ جوازِ تقلید، مثلاً ان مسائل میں جن میں علم کی ضرورت ہے، جو محض تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اس رائے کی اشاعت، جو اصل میں معتزلہ کی رائے ہے، اشاعرہ نے اسلام میں کی ہے ۔

مسائلِ فقہ میں بھی تقلید کا اصول اہلِ سنّت میں بغیر مخالفت کے جاری نہیں ہوا ۔ زمانِ متأخر

میں بھی ایسے عالم پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس بات کے قائل تھے کہ ہر زمانے میں مجتہد کا ہونا لازمی ہے، مثلاً ابن دقیق العید [م ۷۰۲ھ / ۱۳۰۲ء] یا السیوطی [م ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء]، بعض ایسے عالم بھی تھے جو اپنے لیے اجتہادِ مطلق کا دعوے کرتے تھے، مثلاً الجوینی [م ۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء] اور مذکورۂ بالا السیوطی ۔ لیکن اصولی طور پر بھی متعدد جانبوں سے تقلید کی مخالفت ہوئی، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ [امام] الغزالی اس گروہ میں شامل نہ تھے ۔ انھیں صرف باطنیہ (اسمعیلیہ) کی تقلید سے منازعت تھی، جن کے ہاں اثناعشریوں سے بھی زیادہ تقلید پر زور دیا جاتا ہے؛ الغزالی کے نزدیک باطنیہ کا اصولی طور پر ایک شخص یعنی امام کو معصوم تسلیم کرنا اہلِ سنت کے عمل سے تضاد رکھتا ہے، جو کسی [مجتہد] کو فقط قابلِ اعتماد قائد کی حیثیت سے انتخاب کرتے ہیں (مگر اسمعیلیہ کی دلیل یہ ہے کہ امام اپنے ارادے کا اظہار غیر مبہم بیان ("نص") کی صورت میں کرتا ہے ۔ اس نص کی اطاعت سے تقلید غیرضروری بن جاتی ہے) ۔ تقلید کی مخالفت کرنے والوں میں جو لوگ شامل تھے ان میں داؤد بن علی، ابن حزم اور دیگر ثقاۃ ظاہریہ کا نام البتہ آتا ہے، جو تقلید کی پرزور مذمت کرتے تھے ۔ ان کے نزدیک متأخر فقہاء کے لیے بھی واجب ہے کہ اجتہاد کریں ۔ اسی سبب سے کئی مشہور صوفیوں کا شمار بھی مذہب ظاہریہ کے پسند کرنے والوں میں تھا، کیونکہ ظاہریہ کو تقلید سے جو نفرت تھی وہ ایسے موقف پر متفرع ہوتی تھی جو ان کے اور بہت سے صوفیہ کے درمیان (بالعموم شریعت کے باب میں) مشترک تھا (قب شریعۃ) ۔ بعض متأخر حنبلی، مثلاً ابن تیمیۃ اور ابن قیم الجوزیۃ "السلف الصالح" کے متواتر حوالوں سے

اس حد تک جا پہنچے کہ بہت سے عناصر کو، جو بعد کے دَور کی فقہ میں شامل ہو گئے تھے، ردّ کر دیا اور اسی لیے ان کے ہاں تقلید کو اس کی روایتی شکل میں ردّ کر دینے کی نوبت آئی : فرقۂ وہابیہ، جو انھیں حنبلیوں کا جانشین ہے، انھیں کی طرح تقلید سے انکاری ہے اور یہ انکار اس فرقے کے بانی ابن عبدالوہاب سے شروع ہوا ۔ اجتہاد و تقلید کا سوال ان کے اور ان کے مخالفین کے درمیان اہم‌ترین متنازع فیہ سوال ہے ۔ یہی کیفیت سلفیہ کی اصلاحی تحریک کی ہے ۔ مسلمانوں میں جو لوگ امورِ دینی میں دوستدارانِ تجدید ہیں وہ بھی اپنے شدید معارضین یعنی وہابیوں کی طرح تقلید کا انکار کرتے ہیں (یہ سچ ہے کہ اس بارے میں وہابیوں ہی نے ان کے لیے راہ بنائی ہے) ۔ یہ محبانِ تجدید اجتہادِ جدید کا تقاضا کرتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں ۔ قیود سے آزادی کے اعتبار سے ان کا اجتہاد ارتقاے فقہ کے ابتدائی دَور کی انتہائی آزادی سے بھی بدرجہا آزادتر ہے ۔ اس کے برعکس حال کے مصری قانون سازوں کا، جو شریعۃ میں مستقیماً ترمیمات کرتے ہیں، مطمحِ نظر گو جدید ہے ان کا دعوی یہ ہے کہ تا حدِ امکان ان کی قانون سازی کی بناء علماے سلف کے فتووں پر ہے، مگر ان کا طریقِ کار تقلید کے روایتی طریق سے بہت ہی مختلف ہے ۔ اِباضیہ نے بھی وہابیہ سے ملتی جلتی وجوہ کی بنا پر تقلید کو ردّ کر دیا ؛ ان کے مجتہدین مجالسِ مذاکرہ میں جو فیصلے کرتے ہیں انھیں اِجماع [رَكَ بآن] کے منظور شدہ فیصلے تصور کیا جاتا ہے ۔ پھر شیعہ ہیں جو اہلِ سنت کے عقیدۂ تقلید سے اختلاف رکھتے ہیں : اثناعشریوں کے نزدیک "امام مُستتِر" کی غَیبت کے زمانے میں مجتہدین ہدایتِ مؤمنین کے فرائض بجاے امام انجام دیتے ہیں اور چونکہ مسائلِ دین

کے متعلق مؤمنین کے سامنے ہر وقت زندہ امام موجود ہوتے ہیں مجتہدِ میّت کی تقلید ان کے لیے ممنوع ہے ۔ ان مسائل کے جزئیات بالکل حال ھی کے زمانے تک شوق و ذوق سے زیر بحث لائے جاتے رہے ہیں [اسمٰعیلیوں کے متعلق دیکھیے مادّۂ اسمٰعیلیہ].

مآخذ : [مذکورۂ بالا کتابوں کے علاوہ] (۱) Lane : *Arab.-Engl. Lexicon* ، بذیل مادّہ؛ (۲) Sprenger : *Dictionary of the Technical Terms* ، [*Bibliotheca Indica* ، ص ۱۱۷۸] (پورے طور پر قابلِ اعتماد نہیں) ؛ (۳) Juynboll : *Handleiding* ، طبع سوم ، ص ۲۳ ببعد اور حاشیہ ۱۳؛ (۴) Snouck Hurgronje : *Verspreide Geschriften* ، ج ۲ ، بمواضع کثیرہ ؛ (۵) گولٹ تسیہر : *Vorlesungen über den Islam* (قبّ اشاریہ)؛ (۶) وہی مصنف : *Streitschrift des Gazālī* ، ص ۱ ببعد؛ (۷) Asín Palacios : *Abenhazam* ، ۱ : ۱۳۱ ببعد؛ (۸) R. Hartmann : *Die Krisis des Islam* — برائے اباضیّہ : (۹) Milliot and Giacobetti ، در *REI* ، برائے ۱۹۳۰ء، ۲۲۲ — برائے اثنا عشریۃ: (۱۰) C. Frank ، در *Islamica* ، ۲ : ۱۷۱ ببعد .

(از *Shorter Encyclopedia of Islam*).

(J. SCHACHT شاخت)

* **تقی الدین** : رَکَ بہ المظفّر .

* **تقی خان میرزا** : امیرِ نظام کے لقب سے زیادہ مشہور ہے ، ایران کا وزیرِ اعظم تھا ۔ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا (اس کا باپ باورچی تھا اور پھر محمد شاہ کے قائم مقام یعنی وزیر اعظم کا خوان سالار بن گیا) ۔ اس نے فوج کے سپہ سالار کی ملازمت اختیار کی اور جب خسرو میرزا سفارت پر سینٹ پیٹرز برگ گیا تو وہ بھی اس کے ہمراہ تھا ۔ وہ جلد جلد ترقی کر کے آذربایجان کی فوج کا وزیر بن گیا اور اَرْزِ روم کی تعیینِ سرحد کی ہیئت (کمیشن) میں ایران کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوا، پھر ناصرالدین، سلطنت کے ولی عہد بشرط heir presumptive کا بالاترین عہدے دار مقرر ہوا اور جب ۱۸۴۸ ء میں ناصرالدین تخت نشین ہوا تو اس نے تقی خان کو اپنا وزیرِ اعظم بنا لیا ۔ اس نے صدرِ اعظم [رَکَ بآن] کا لقب قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے امیرِ نظام کا لقب اختیار کیا .

اس نے ان خرابیوں کو دُور کرنے کا تہیّہ کر لیا جو ملک کو تباہ و برباد کر رہی تھیں ، مثلاً : رعایا پر عائد کردہ محاصل (ٹیکسوں) کی فروخت، بیشمار پنشنیں (معاشات)، جو غیر مستحق اور نا اہل افراد کو ملتی تھیں ، سرکاری روپے کا غبن، جو لشکر والوں کے حساب میں سے افسر خوردبرد کر لیا کرتے تھے ۔ وہ سلطنت کی مالیات کو مضبوط بنیاد پر قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور شاہ کا برادرِ نسبتی بھی بن گیا .

بہت سے لوگ اس کے دشمن ہو گئے تھے؛ چنانچہ اس کے قتل کی ایک سازش ہوئی، لیکن اس کا بر وقت پتا چل گیا ۔ اس نے بابی تحریک کو بہت دبایا اور اس جدید مذہب کے بڑے بڑے پیرووں کو گرفتار کر لیا اور حکومت کے افسروں کو حکم دیا کہ وہ انھیں بے تأمل قتل کر ڈالیں ۔ سپاہی، جنھیں اب باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی، اپنے سردار کے مخلص وفادار تھے ۔ اس صورتِ حالات سے ناصرالدین گھبرا اٹھا اور اس نے تقی خان کو موقوف کر دیا ۔ روسی سفیر نے کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ زارِ روس اسے اپنی حمایت میں لے لےگا، اس پر اسے کاشان میں جلا وطن کر دیا گیا ۔ لیکن دو ھی مہینے کے بعد اسے فِین کے مقام پر اس کے اپنے ھی محل میں قتل کر دیا گیا (۱۸۵۱ء) ۔ ایران کی بڑی بدقسمتی تھی کہ ایسا قابل اور کارکن شخص موت سے دوچار ہوا.

مآخذ : (۱) de Gobineau : *Trois ans en Asie* ، پیرس ۱۸۵۹ء، ص ۲۳۸ ببعد ؛ (۲) E. G. Browne :

History of Persian Literature in Modern Times، کیمبرج ۱۹۲۴ء؛ (۳) History of Persia : P. M. Sykes، ۲ : ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۸، ۳۳۹؛ (۴) Persien : Polak، لیپزگ ۱۸۶۵ء، ۲ : ۶ ببعد.

(هیوار CL. HUART)

تقی کاشی: تقی الدین محمد [متخلص به ذِکری (روزِ روشن، ۲۲۹)] ابن شرف الدین [علی] حسینی کاشانی، ایرانی تذکرہ نویس ۔ [وہ حدود ۹۴۳ھ/۱۵۳۶-۱۵۳۷ء میں کاشان میں پیدا ہوا اور ۱۰۱۶ھ / ۱۶۰۷-۱۶۰۸ء میں ابھی بقید حیات تھا] ۔ ۹۸۵ھ / ۱۵۷۷ - ۱۵۷۸ء میں اس نے خُلاصۃ الاَشْعار و زُبْدَۃ الاَفْکار کے نام سے فارسی شعراء کا عظیم الشان تذکرہ ۴ جلدوں میں مکمل کیا، [پھر ۱۰۱۶ھ میں بعد نظرثانی و زیادات اسے چھے جلدوں میں شائع کیا] ۔ علاوہ اس کے مُحْتَشَم کاشی [کی آخری وصیّت (در ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء) کے مطابق] دیوانِ مُحْتَشَم [کو ترتیب دیا اور اس] کا دیباچہ بھی لکھا [از روے دیباچۂ نسخۂ کتاب خانۂ محمد شفیع لاھوری، تحریر ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۱۸ھ] ۔ محتشم شاہ اسمٰعیل اول اور شاہ طہماسپ اول کے زمانے کا شاعر تھا ۔ [خلاصۃالاشعار میں تراجمِ شعراء مکمّل اور مفصّل دیے ھیں ۔ کلام شعراء پر خوب تنقید کی ھے اور انتخابِ کلام ذوقِ صحیح سے کیا ھے ۔ ساری کتاب میں ساڑھے تین لاکھ بیت ھیں اور شاذ ھی کسی شاعر کا انتخاب ھزار بیت سے کم ھو (شپرنگر) ۔ خلاصۃالاشعار کے دفتر چھارم کا ناقص الآخر نسخہ کپورتھلے کے سرکاری کتاب خانے میں تھا، دیکھیے *A Descriptive Catal. of Pers. MSS. . .in the Kapurthala State Libr.*, Lahore 1921، ۱۶۹)] .

مآخذ: (۱) Bland : *J.R.A.S.*، ۹ : ۱۲۶ تا ۱۳۴؛ (۲) شپرنگر : *Catal. Oudh.*، ۱۳ تا ۴۶؛ (۳) ریو Rieu : *Catal. of Persian MSS.*، ۱۰۲۳ب؛ (۴) E. G. Browne : *Literary History of Persia*، ۲ : ۳۷۰؛ (۵) W. Ivanow : *Descriptive Catal.*، (کلکتہ ۱۹۲۴ء)، ۲۹۸، ۳۰۵ [(۵) فہرست بانکی پور، ۸ : ۴۳؛ (۶) سٹوری C. A. Storey : *Persian literature*، ج ۱، لنڈن ۱۹۵۳ء : ص ۸۰۳].

(هیوار CL. HUART و ادارہ)

تَقِیّہ: [(عربی) مصدر، و.ق.ی مادّہ وَقَی یَقِی، تَقِی، تَقاۃ ''واو'' تاء سے ''ھمزہ'' یاء سے بدل گئے ۔ حذر، خوف، بچاؤ (رَكَ بہ لسان العرب، بیروت، ج ۱۵؛ قاموس؛ مجمع البحرین، ذیل مادّۂ ''وقی'') ۔ فقہ شیعہ کی اصطلاح میں ''غیر کے خوفِ ضرر سے خلافِ اعتقاد قولاً یا فعلاً کچھ کہنا یا کرنا'' (طبرسی : مجمع البیان، ۱ : ۴۲۷؛ شیخ مرتضٰی : ملحقات کتاب المکاسب، رسالۃ التقیۃ، ۳۱۹؛ الکلام فی صلوٰۃ الجماعۃ، ۱۴۱) ۔ اس اجازت یا عمل کے جواز پر اھلِ تشیّع مندرجۂ ذیل آیات قرآنی سے استدلال کرتے ھیں :

(۱) ۳ [آلِ عمران] : ۲۸، لَایَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ. . . . اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ط الخ الآیۃ، ترجمہ : مؤمن، مؤمن کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ کریں اور جو شخص ایسا کرے گا اسے اللہ سے کوئی تعلّق نہیں، مگر اس صورت میں کہ ان کافروں سے بچاؤ مقصود ھو اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ھے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ھے ۔ اس آیت میں ''تُقٰىةً'' کو ''تَقِیَّةً'' بھی پڑھا گیا ھے (رَكَ بہ بخاری، ربع ثالث، ص ۲۱۲) : ''و قال الحسن التَّقِیَّۃ اِلٰی یومِ القیٰمۃ (حسن (بصری)) نے کہا ھے تقیّہ قیامت تک جائز ھے (بخاری، ربع الرابع، کتاب الاکراہ، ۳۳۵؛ مجمع البیان، ۱ : ۴۲۷؛ طُوسی : تفسیر تبیان، ۳۰۶) .

(۲) قرآن مجید، سورۃ ۱۶ [النحل] : ۱۰۶،

ترجمہ : ایمان لانے کے بعد جو شخص اللہ کا انکار کرے اس پر اللہ کا غضب اور ایسے ھی لوگوں پر عذاب عظیم ھے ۔ اس پر نہیں جو مجبور کیا گیا ھو اور اس کا دل ایمان پر برقرار ھو [اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَ قَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ] ۔ اس آیت میں کفّار سے قولی موافقت کی استثنائی صورت جائز قرار دی گئی ھے (مجمع البیان، ۲ : ۳۷ ؛ تبیان و طبری وغیرہ در تفسیر آیة).

(۳) ۲ [البقرة] : ۱۹۵، وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۔ ترجمہ : اپنے آپ کو خود سے ھلاکت میں نہ ڈالو ۔ یہ آیت اگرچہ انفاق فی سبیل اللہ کے مورد میں ھے لیکن اسے کلّیہ قرار دیا اور مال، جان نیز عزت کی ھلاکت کو ممنوع قرار دیے جانے کے لیے دلیل مانا گیا ھے (مجمع البیان، ۱ : ۱۱۸) .

(۴) قرآن مجید، سورة ۴۰ [المؤمن] : ۲۸، ترجمہ : آلِ فرعون کے ایک مؤمن نے کہا، جو اپنا ایمان چھپاتا تھا (مجمع البیان، ۲ : ۲۱۱ ؛ تبیان، ۲ : ۵۳۱ ؛ صافی، ۴۷۱ : البرھان، ۲ : ۹۵۱).

اس آیت میں صراحةً ''کتمانِ ایمان'' کو محلِّ مدح میں بیان کیا گیا ھے، جس سے معلوم ھوتا ھے کہ صحتِ اعتقاد و خوفِ خدا کے ساتھ خلافِ ایمان کچھ کہنا یا کرنا جائز ھے ؛ لیکن یہ جواز مطلق نہیں، بلکہ پہلی شرط یہ ھے کہ خوفِ ضرر و دفعِ مضرّت مقصود ھو، خواہ وہ جان و مال کا ضرر ھو یا آبرو کا ۔ فقط جلبِ منفعت کے لیے اس قسم کے قول و فعل کو تقیّہ نہیں کہا جائے گا ۔ دوسری شرط یہ ھے کہ ان اعمال و اقوال کا تعلّق حقوق اللہ و فرائضِ دین سے ھو لیکن حقوقِ عباد میں، خصوصاً قتلِ مؤمن کے وقت تو حدیث میں ھے ''اِنَّما شُرِّعت التقیّةُ لِحَقْنِ الدماءِ فاذا بلغ الدّم فلا تَقِیّة'' (کافی ؛ سفینة البحار؛ رسائل ملحقات المکاسب) یعنی تقیہ خونریزی سے بچنے کے لیے جائز قرار دیا گیا ھے، لیکن اگر خون کرنے تک نوبت پہنچ جائے تو پھر نہیں ۔ اسی طرح اپنی آبرو کے لیے دوسرے کی آبرو ریزی یا اپنے مال کے لیے دوسرے کے مال کو ضائع کرنے کے لیے تقیّہ نہیں ۔ تیسری شرط یہ ھے کہ تقیّے سے اصلِ دین کو نقصان نہ پہنچے، مثلاً کسی فقیہ یا رھنماے دین کا ایسا عمل انجام دینا جو عوام کے لیے حجّت و سند بن جائے؛ چنانچہ فقہاء نے انھیں اسباب و شرائط کے پیشِ نظر مقاماتِ وجوب و حرمت، استحباب و کراھت و اباحت سے بحث کی ھے اور یہ بتایا ھے کہ حالتِ تقیّہ کے اعمال و احکام کیا ھیں (شیخ مرتضٰی : ملحقات المکاسب، ۳۲۲، مبحث تقیّة) .

تقیّے کا تعلق اعتقاد سے قطعاً نہیں، بلکہ احکامِ فقہ میں سے ایک حکم ھے، جس کے لیے قرآن مجید کے علاوہ اصولِ فقہ، سنّت، احادیث اور عقل سے اپنے اپنے طرز پر استدلال کیا جاتا ھے .

کبھی تقیّے کو مدارات و موالات بھی کہا گیا ھے (سفینة البحار، ج ۲، مادّۂ وقی) .

متقدّمینِ علماے شیعہ کی تصنیفاتِ فقہ و کلام میں اسے مستقل عنوان نہیں قرار دیا گیا ۔ متأخّرین میں شیخ مرتضٰی انصاری (م ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ - ۱۸۶۵ء) نے اپنے معیاری اندازِ بحث سے اپنی مشھور و متداول کتاب المکاسب کے ملحقات میں ''تقیّة'' پر فقہی استدلال میں ایک رسالہ قلمبند کیا .

تاریخی لحاظ سے تقیّة شیعوں کے ساتھ خصوصی نسبت اس لیے رکھتا ھے کہ غیر شیعی حکومتوں میں انھیں بعض صورتوں میں برا سمجھا جاتا رھا ۔ عوام کے طعن و تشنیع اور متعصّب لوگوں کی وجہ سے انھیں اپنے معتقدات و اعمال میں آزادی سے اظہار میں خوفِ جان و مال و آبرو رھا، لہٰذا

ائمۂ اھلِ بیت کی تعلیمات میں ''تقیۃ'' نے نمایاں حیثیت حاصل کر لی ۔

(سیّد مرتضی حسنین)

مآخذ : [مذکورۂ بالا کے علاوہ] (۱) Goldziher، در *Z.D.M.G.*، ۶۰، (۱۹۰۶ء) : ص ۲۱۳ تا ۲۲۶، جہاں دوسرے حوالہ جات درج ھیں؛

اساسی مآخذ :

(۲) جعفر بن حسین الحلّی : شرائع الاسلام، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۲ء، ص ۱۳۹ ببعد؛ (۳) ابن المُطَهّر العلّامة الحلّی : مختلف الشیعه، طہران ۱۳۲۳ھ ببعد، ۲ : ۱۵۸ ببعد؛ (۴) Horovitz، در *Isl.*، ۳ : ۶۳ تا ۶۷؛ [(۵) شیخ مرتضی انصاری (م ۱۲۸۱ھ) : ملحقات کتاب المتاجر مشہور به المکاسب، طبع ایران ۱۳۱۴ھ، ص ۳۱۹، ۳۲۲؛ (۶) کُلینی (م ۳۲۸ھ / ۹۳۹ء) : الکافی فی علم الدین، تہران ۱۳۷۵ھ، ج ۲؛ (۷) محسن امین عاملی (م ۱۳۷۷ھ) : اعیان الشیعه، ۱/۲، بیروت ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء؛ (۸) شیخ عباس قُمّی (م ۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء) : سفینة البحار، نجف ۱۳۵۵ھ، ج ۲، بذیل مادۂ وقی؛ (۹) فخر الدین محمد طُرَیح بن علی نجفی (م ۱۰۸۵ھ) : مجمع البحرین و مطلع النیّرین، طبع ایران، بذیل مادۂ وقی]؛

زیدی مآخذ :

(۱۰) مخطوطات برلن ۹۶۶۵، ورق ۳۰ الف، ۴۸۷۸ ورق ۹۶ ب؛ (۱۱) C. van Arendonk : *De opkomst van het Zaidietische Imamaat in Yemen*، لائڈن ۱۹۱۹ء، دیکھیے اشاریه؛ (۱۲) R. Strothmann : *Das Staatsrecht der Zaiditen*، شٹراسبورگ ۱۹۱۲ء، ص ۹۰ ببعد؛

خارجی مآخذ :

(۱۳) البَسْیوی : مختصر، زنجبار ۱۳۰۴ھ، ص ۱۲۳؛ (۱۴) جُمَیِّل بن خَمیس : قاموس الشریعة، زنجبار ۱۲۹۷ تا ۱۳۰۴ھ، ۱۳ : ۱۲۷ ببعد، ۱۵۷؛

دُرُوزی مآخذ :

(۱۵) مخطوطۂ برلن Mg 814 (اھلوارٹ Ahlwardt میں مذکور نہیں)، ورق ۱۱ ب؛

سنّی مآخذ :

[(۱۶) حسن بن منصور اوزجندی (م ۵۹۲ھ) : فتاوی قاضی خان، لکھنؤ ۱۹۲۶ء، ۴ : ۸۳۴؛ (۱۷) عبدالعلی بِرْجَنْدی (م حدود ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء) : شرح مختصر الوقایه، نول کشور ۱۳۰۱ھ، ۴ : ۱۲۰؛ (۱۸) محمد بن اسمٰعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) : کتاب الجامع الصحیح، طبع لائڈن ۱۸۶۲ تا ۱۹۰۸ء؛ (۱۹) عینی (ابو محمد بن احمد) (م ۸۶۲ھ) : عمدة القاری شرح البخاری، طبع شرکت صحافیۂ عثمانیه ۱۳۰۸ھ، ۸ : ۵۱۳]؛ (۲۰) القدوری : مختصر، قازان ۱۸۸۰ء، ص ۱۶۲؛ (۲۱) النووی : منہاج الطالبین، طبع van den Berg، بٹاویه ۱۸۸۲ تا ۱۸۸۴ء، ۲ : ۴۳۳؛

کتب تفسیر :

مثلاً [(۲۲) ابو علی الفضل بن حسن طبرسی (م ۵۴۸ھ) : مجمع البیان فی تفسیر القرآن، تہران ۱۳۸۶ھ؛ (۲۳) ابو جعفر محمد بن حسن طوسی (م ۴۶۰ھ): التبیان فی تفسیر القرآن، ۱۳۶۵ھ، بذیل آیات متعلقه؛ (۲۴) زمخشری (م ۵۳۸ھ) : کشاف، کلکته ۱۸۵۶ء، ۱۳۳، ۱۹۷؛ (۲۵) بیضاوی (م ۶۸۵ھ)، ص ۴۷، برھامش القرآن الکریم طبع وزارت داخلۂ مصر ۱۳۰۰ھ؛ (۲۶) علی بن محمد الخازن (م ۷۴۱ھ) : لباب التأویل (= تفسیر الخازن)، قاهرة ۱۳۳۷ھ، ۱ : ۲۰۱؛ ۳ : ۱۰۱؛ ۴ : ۵۰؛ (۲۷) رازی (م ۶۰۶ھ) : مفاتیح الغیب، ۲ : ۳۲۴، ۶۴۴؛ ۵ : ۳۰۰؛ ۷ : ۳۱۶؛ ۸ : ۴۱۱، اسلامبول ۱۳۰۷ھ؛ (۲۸) عبدالحق حقّانی (م ۱۳۳۵ھ) : تفسیر فتح المنّان (= تفسیر حقانی)، لاھور ۱۹۵۱ء، ۳ : ۱۰۵]؛

(۲۹) ابن حَزْم : الفِصَل فی الملل، قاهرة ۱۳۰۲ھ، ۱۳۱۷ھ، ۳ : ۱۱۲ ببعد ؛ ۴ : ۶ ؛ (۳۰) الشَّعرانی : *Balance de la loi musulmane*، طبع Perron، الجزائر ۱۸۹۸ء، ص ۳۰۶ ببعد .

مسئلے کے متعلق تحقیقات حاضرہ :

(۳۱) محمود شُکری آلوسی : مختصر التحفة الاثنا عَشَرِیّة، بغداد ۱۳۰۱ھ، ص ۱۸۸ تا ۱۹۳ .

(شٹراتھہ مان R. Strothmann و سید مرتضٰی حسین)

[دو تعلیقے]

دائرة المعارف الاسلامیة، قاهرة میں فاضلِ معاصر احمد محمد شاکر نے اس مضمون پر دو تعلیقے لکھے ہیں ۔ ان کا ترجمہ درج ذیل ہے :

(تعلیقہ، ۱) التقیة علماے اہل السنة اور ان کے متبعین کے نزدیک کوئی اصطلاح نہیں ہے، اس لیے اصطلاحات علمیہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس کلمے کا ذکر نہیں آیا ۔ یہ فقط علماے شیعہ اور ان کے پیوستگان کے نزدیک اصطلاح ہے ۔

(تعلیقہ، ۲) سورة ۳ [آل عمران] : آیة ۲۸ میں اللہ تعالٰی فرماتا ہے : لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَ مَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (ترجمہ : نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر اور جو کوئی یہ کام کرے تو نہیں اس کو اللہ سے کچھ تعلق مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو تم ان سے بچاؤ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے) .

'' تقیة '' کا لفظ قرآنی رسم خط میں تقٰة لکھا ہوا ہے ۔ چودہ قاریانِ قرآن میں سے تیرہ نے اسے تُقَاةً پڑھا ہے، یعنی تے کے پیش اور قاف کے زبر سے جس کے بعد الف ہے ۔ ابن عباس، مجاھد، ابو رجاء، قتادہ، ضحّاك، ابو حیوة، سہل، حمید بن قیس اور المفضل نے بہ روایت عاصم اور یعقوب نے، جو چودہ قاریوں میں سے ایک ہے، اسے '' تَقِيَّة '' پڑھا ہے، یعنی تے کے زبر، قاف کے زیر اور یای مفتوحہ پر تشدید سے ۔ تُقَاة اور تَقِيَّة فعل اِتَّقٰی کے مصدر ہیں ۔ تُقَاة اصل میں وُقَيَة تھا واؤ کو تے سے اسی طرح بدل لیا جیسے تُجَاة اور تُكَاة میں کیا، پھر یے کو الف کر لیا، کیونکہ وہ متحرك تھی اور اس کے پہلے حرف پر زبر تھا ۔ وُقَيَة فُعَلَة کے وزن پر مصدر ہے؛ جیسے التُّؤَدَة اور التُّخَمَة ۔ وزن فُعَل اور فُعَلَة پر مصدر کم آئے ہیں تَقِيَّة بھی فَعِيلَة کے وزن پر مصدر ہے اور اس وزن پر بھی مصدر کم آئے ہیں جیسے النَّمِيمَة اور اِفْتَعَلَ کا مصدر تو اس وزن پر نادر ہے ۔ یہ تو دونوں قراءتوں میں لفظ کی حرفی تحقیق۔ہوئی اور ابو حیّان نے تفسیر البحر المحیط، ۲ : ۴۲۴، میں یہی تحقیق کی ہے ۔ یہ آیت اور ایک اور آیت (اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ) (ترجمہ : مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل برقرار ہے ایمان پر) یہی دو آیتیں ہیں جن پر تقیّے کے ماننے والوں نے اپنے قول کی بنیاد رکھی، مگر ان کے بعد ان کے پیرووں نے ان کی معنی میں اتنی موشگافی کی کہ اصل معنی یا تو بگڑ گئے یا بگڑ نے کے قریب ہو گئے ۔ ان علماء نے جنھیں امام مانا جاتا ہے اس معنی سے جو مراد ہے اسے بیان کیا ہے ۔ امام ابو حنیفہ کے اصحاب نے کہا ہے : تقیّہ اللہ تعالٰی کی طرف سے ایک رخصت ہے؛ اس رخصت پر عمل نہ کرنا بہتر ہے اور زیادہ فضیلت رکھتا ہے ۔ اگر کسی پر زبردستی کی گئی کہ کلمۂ کفر کہہ اور اس نے مرنا منظور کیا مگر کلمۂ کفر نہ کہا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا گیا تو یہ شخص اس شخص سے افضل ہے جس نے جان بچانے کے لیے

زبان سے کلمۂ کفر کہہ دیا ۔ یہی حکم ان سب باتوں کا ہے جن میں دین کی عزت بر قرار رکھنے کا سوال درپیش آئے ۔ دین کی عزت کو برقرار رکھتے ہوے جان دے دینا اس سے افضل ہے کہ رخصت پر عمل کرے اور جان بچا لے ۔ احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا اگر آپ کے سر پر کوئی تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو آپ [اس کی بات] مان لیں گے ۔ انھوں نے کہا '' نہیں '' ۔ اس کے بعد فرمایا : اگر عالم نے تقیہ کر کے مان لیا اور جاھل تو جاھل ہے ھی تو حق کے ظاہر ہونے کی کیا صورت رہ گئی؟ پچھلے اگلوں کے جو حالات بیان کرتے چلے آئے ہیں ان میں ہمارے پاس چھوٹوں کو بڑوں کی بابت مسلسل یہی بیان پہنچا ہے کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین نے اپنی جانیں اللہ کے لیے دے دیں اور اس بارے میں ان پر ملامت کرنے والوں کی ملامت کا کوئی اثر نہ ہوا اور نہ زبردست ظالم کی سخت گیری کو انھوں نے کچھ گردانا ۔ امام رازی [۲ : ٦٣٦] کہتے ہیں : '' تقیہ انھیں صورتوں میں جائز ہے جن میں اظہارِ حق اور دین کا سوال ہو ، مگر جن صورتوں میں کسی اَور پر برا اثر پڑتا ہو، مثلاً قتل، زنا، مال کا غصب، جھوٹی گواھی، پاکدامن عورتوں پر تہمت اور دشمنوں کو مسلمانوں کے کمزور پہلووں کی بابت اطلاع دینا، ان سب صورتوں میں تقیّہ قطعاً ناجائز ہے'' ۔ ان سب علماء کے اقوال سے جو ہم نے بیان کیے اور دیگر علماء کے اقوال سے جن سے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تقیّة صرف انتہائی ضرورت کے وقت اُس کمزور ضعیف شخص کے لیے جائز ہے جو اپنی جان عذاب میں دیکھتا ہو، ایسی حالت میں وہ ظلم سے مجبور کرنے والے کے سامنے اضطراری صورت میں بظاھر زبان سے جو وہ کہلوانا چاہے کہہ سکتا ہے بشرطیکہ اس کا دل ایمان اور سچائی پر مضبوطی سے جما ہوا ہو اور ظاھری لفظ سے اس کی جان بچتی ہو اور مسلمانوں کا بھلا ہوتا ہو اور وہ شخص ایسے مرتبے والا نہ ہو کہ جس کی دوسرے لوگ پیروی کرتے ہوں ، کیونکہ اس صورت میں خوف ہے کہ انجانوں پر سچی بات کبھی ظاھر ھی نہ ہوگی، ان کا ایمان کمزور ہو جائے گا اور وہ سچی بات کی مدد نہ کر سکیں گے، کیونکہ وہ اپنے پیشوا کی، جس نے دب کر تقیّے سے بات مان لی، حق سے غافل رہ کر پیروی کریں گے ۔ یہی وہ چیز ہے جس نے پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کو کمزور کر دیا : ان کے علماء، پیشوا اور رہبر ظالموں کے روکنے کے لیے ان پر کاری ضرب نہ لگا سکے اور جہاں سچائی کے اظہار کا موقع تھا وہاں وہ دب کر پیچھے ہٹ گئے ۔ اپنے بڑوں کی یہ حالت دیکھ کر لوگ دھڑا دھڑ گرنا شروع ہو گئے ۔ ان کے دل کمزور ہو گئے، دشمنوں کا رعب ان پر چھا گیا اور وہ کسی کام کے نہ رہے، بالکل ایسے ہو گئے جیسے سیل سے کوڑا کرکٹ جھاگ وغیرہ جمع ہو جاتے ہیں ۔ ان کے نیک اسلاف ایسے نہ تھے ۔ وہ اللہ کے راستے میں طرح طرح کی بلائیں اور سخت سے سخت دکھ درد جھیلنے کے لیے سینہ تان کر سامنے آ جاتے تھے ۔ بزدلی ان کے پاس نہ پھٹکتی تھی اور نہ وہ دشمن کے سامنے سے ہٹنے کا نام لیتے تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کی سیرت پھر اسلام کی تاریخ ہمارے قول کے سب سے بڑے گواہ ہیں .

امامی شیعوں کی طرف تقیّے کے بارے میں جو مبالغہ آمیز باتیں منسوب ہیں ہمارے خیال میں وہ سب کی سب صحیح نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر باتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا شمار اس ضعف میں کیا جائے جو آخری صدیوں میں مسلمانوں کو لاحق ہو گیا تھا ۔ ہاں بعض ایسی

مصیبتیں بھی ہو سکتی ہیں جن کی سختیاں پہلے لوگوں پر پڑیں اور بعض لوگ ان کے برداشت کرنے سے کبھی عاجز بھی آ گئے - شیعوں کے سب سے قدیم اقوال میں سے امام، عالم، شاعرِ بلیغ الشریف الرضی (م ۴۰۶ھ) کا قول ہے (حقائق التأویل، نجف ۱۳۵۵ھ، ۵: ۷۳-۷۵) : ''بعض نے کہا ہے: تقیّے کا موقع یہ ہے کہ مومن کفار کے درمیان تن تنہا ہو یا تن تنہا کے حکم میں ہو، جب کہ اس کے مددگار تھوڑے سے ہوں، اس کا کوئی پشت پناہ موجود نہ ہو، ہر طرف کفّار کا غلبہ ہو، انھیں کی کثرت ہو، انھیں کا گھر بار، انھیں کا ناحیہ ہو، تو اس وقت اس کے لیے مباح ہے کہ ان سے خوش خلقی سے پیش آئے یہاں تک کہ اللہ اس کے وہاں سے نکلنے کا کوئی سامان کر دے اور اس کے لیے کشائش مہیا کر دے - تقیّے کی صورت یہ نہیں کہ کافروں میں مل کر حرام باتیں کرنے لگے یا حرام کو حلال سمجھنے لگے - تقیہ تو فقط زبانی باتوں اور لفظوں میں ہوتا ہے بشرطیکہ دل اسی عقیدے پر جما ہوا ہو جو ظاہری الفاظ کے خلاف ہو'' - اس کے بعد فرمایا ہے : ''محقق علماء اس طرف گئے ہیں کہ جس شخص کو کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا گیا لیکن اس نے نہ کہا تا آنکہ اُسے قتل کر دیا گیا وہ اس شخص سے بہتر ہے جس نے زبان سے کفر کا کلمہ کہہ دیا اگرچہ اس کے دل میں ایمان پوشیدہ ہے''.

یہ باتیں اور اس کے سوا اَور بھی اس قول میں ہماری تائید کرتی ہیں کہ شیعوں کے امام اس تہمت سے جو ان کے سر تھوپی جاتی ہے بری ہیں - اگر ان کے کسی عالم سے یا عام آدمی سے بھول چوك ہو بھی گئی تو اس کا سارے فرقے اور گروہ کی طرف منسوب کرنا ٹھیک نہیں] .

تکاثر: (التکاثر) یہ آٹھ آیات کی ایک مختصر سی سورت ہے، جس کا نام اس کے دوسرے لفظ ''التکاثر'' پر رکھا گیا ہے - یہ قرآن مجید کی قدیم‌ترین سورتوں میں سے ہے، جو جناب رسالت مآب پر ان کے عہدِ رسالت کے اوّلین دَور میں مکّۂ معظّمہ میں نازل ہوئی - ترتیبِ نزول کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا عدد سولھواں تھا لیکن آنحضرت صلعم کی ترتیب کے مطابق، جو مصحفِ عثمانی میں موجود ہے، اس سورت کا عدد ۱۰۲ ہے .

اس سورت میں مشرکینِ مکّہ کو بالخصوص اور بنی نوع انسان کو بالعموم اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ انھیں مال و دولت کی کثرت اور لذّاتِ دنیوی کی رغبت نے اس حد تک مشغول کر رکھا ہے کہ وہ امورِ دین اور تہذیبِ اخلاق سے بالکل غافل ہو گئے ہیں - اگر ان کے یہی لیل و نہار رہے تو وہ آخرکار جہنّم کا منہ دیکھیں گے، کیونکہ انھیں اس فراخی اور مال کے بارے میں جواب دہی کرنا ہو گی جو انھیں دنیا میں حاصل ہے .

مآخذ : اس سلسلے میں دیکھیے تفاسیر متداولہ .

(عنایت اللہ)

* **تکبیر:** (ع) مادّۂ ک - ب - ر سے باب تَفْعِیْل کا مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں کلمۂ اللہ اکبر کہنا۔ تکبیر ان معنوں میں قرآن [مجید] ہی میں مستعمل ہے (مثلاً سورۃ ۷۴ [المدّثّر] : ۳ [وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ]، اور سورۃ ۱۷ [الاسراء] : ۱۱۱ [وَ کَبِّرْہُ تَکْبِیْراً]۔ اسمِ جلالت کے ساتھ جو تکبیر کے ساتھ مخصوص ہے صیغۂ تفضیل ''اکبر'' کی مختلف تفاسیر کے متعلق قب لسان‌العرب (بذیل مادّۂ ک - ب - ر)۔ قرآن میں اسم تفضیل ''اکرم'' بھی کلمۂ رب کے ساتھ استعمال ہوا ہے (سورۃ ۹۶ [العلق] : ۳) اور ''اعلٰی'' بھی (سورۃ ۹۲ [اللّیل] : ۲۰؛ سورۃ ۸۷ [الاعلٰی] : ۱)، ان دونوں کے لیے بھی قب لسان‌العرب بذیلِ ہر دو کلمہ.

یہ کلمہ، جو خداے واحد کی عظمت کے اظہار کے لیے مختصر ترین کلمہ ہے، اسلامی زندگی کے مختلف حالات میں، جہاں اللہ، اس کی عظمت، رحمت اور اس کی عنایت کا تصور مسلمانوں کے ذہن میں جلوہ گر ہو، استعمال کیا جاتا ہے۔ جب آنحضرت[ص] کو وحی کے ذریعے حبشہ میں شاہ نجاشی کی موت کا علم ہوا تو آپ نے حاضرینِ مجلس کو یہ خبر سنا دی، مصلّٰی میں جا کر ان کی صفیں بندھوائیں اور چار تکبیریں کہیں [یعنی نبی اکرم صلعم نے شاہ نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی، جس میں چار تکبیریں کہیں] (بخاری، جنائز، باب ۴، ۵۵، ۶۱) - روایت ہے کہ دوسرے موقعوں پر بھی آنحضرت نے نمازِ جنازہ میں چار پانچ مرتبہ تکبیر کہی (مسلم، جنائز، حدیث ۷۲)؛ چنانچہ نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں کا دستور قائم رہا یا چار تکبیروں کا معمول ہو گیا (الشیرازی: کتاب التنبیہ، طبع جوئنبول A.W.T. Juynboll، ص ۴۷ ببعد) [البتہ شیعوں کے ہاں پانچ تکبیروں کا معمول ہے الکافی لکھنئو ۱۳۰۲، ص ۹۵]۔ اذان [رَکَ بآن] بھی چار تکبیروں سے شروع ہوتی ہے۔

روایت ہے کہ آنحضرت[ص] حج کے دوران میں کئی بار تکبیریں کہتے تھے: یعنی طواف کے شروع میں (احمد بن حنبل: مسند، ۲ : ۱۴۴)، طواف کے دوران میں (بخاری، کتاب الجہاد، باب ۱۳۲ و ۱۳۳)، لیکن بہت زیادہ بلند آواز سے نہیں، کتاب مذکور، باب ۱۳۱)، طواف کے خاتمے پر (ابن حنبل، ۲ : ۵)، کعبہ دکھائی دینے پر (ابن حنبل، ۳ : ۳۲۰)، حجر اسود کے پاس (ابن حنبل، ۱ : ۲۶۴)، منٰی اور عرفات کے درمیان (بخاری، کتاب الجہاد باب ۸۶) اور صفا اور مروہ پر (ابن حنبل، ۳ : ۳۲۰) وغیرہ.

نماز شروع کرنے سے پہلے تکبیر پڑھنا شرع میں منصوص ہے (اسے تکبیرۃالاحرام کہتے ہیں) - [پانچوں نمازوں کے دوران میں تکبیر (متعدد دفعہ) کہی جاتی ہے، رکوع میں جانے، سجدہ کرنے اور سجدے سے اٹھنے کے وقت وغیرہ وغیرہ اسی طرح تکبیر کے اور بھی مواقع ہیں۔ چار تکبیر کے لیے جو کسی چیز کے ترک سے کنایہ ہے دیکھیے فرہنگ آنند راج، بذیل کلمہ].

مآخذ: (۱) کتبِ لغة بذیلِ مادّۂ ک۔ ب۔ ر؛ (۲) Th. W. Juynboll: *Handleiding*، ص ۶۱، ۶۵؛ (۳) A. J. Wensinck: *A Handbook of Early Muhammadan Tradition*، بذیلِ کلمہ.

(A. J. WENSINCK و ادارہ)

تَکْرُور: (Tuculor، فرانسیسی میں Toucouleur)

یہ نام ان زنگی نژاد لوگوں کو دیا گیا ہے جو سینگالی فُوتہ (Senegalese Fūta) کے نشیبی علاقوں کے بڑے حصّے اور بوندو Bundu کے بیشتر علاقے میں آباد ہیں۔ بلادِ فُوتہ میں، جو دریاے سینگال Senegal کے دونوں کناروں پر لیکن زیادہ تر بائیں کنارے پر واقع ہیں، مغرب سے مشرق کو آئیں تو یہ اضلاع ملیں گے: دمار Dimār، تورو Tōro، لاؤ Lāo، یرلابہ یا ارلابہ Yirlābe or Irlabe، بوسیہ Bōseya، نگنار Ngenār یا گنار Ganār اور دَمگہ Damga۔ بوندو دریاے فلیمہ Faleme کے زیریں حصّے کے مغرب میں واقع ہے۔ تکرور (Tuculor) کی نو آبادیاں مغربی افریقہ کے مختلف حصوں میں خاص کر کایس Kayes (جو دریاے سینگال کے بالائی حصے پر واقع ہے)، نیورو Nyōro (سودانی 'ساحیل' میں)، سیگو Sēgo (دریاے نائجر Niger پر)، پنجاگارا Pandjagara (مشرقی ماسینہ Māsīna میں)، دنگرای Dingirai اور فُوتہ جالون Fūta Djallon کے مشرق میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان نو آبادیوں کی بنیاد انیسویں

صدی کے وسط میں سینگالی فُوتَہ کے باشندوں نے رکھی تھی جو فاتح الحاجّ عمر کی فتوحات کے سلسلے میں یہاں آئے تھے ۔ وہ نائیجر Niger اور چاد Chad کے درمیانی علاقے خصوصاً سُکُتُو Sokoto [رَکَہ بان] میں بھی پائے جاتے ھیں ۔ آخرالذکر اُن سینگالی فُوتَہ کے باشندوں کی اولاد ھیں جو انیسویں صدی کے آغاز میں عثمان فُوجو Fōdjo کے ھمراہ آئے تھے جب اس نے بلادِ حَوصَہ Hausa کو فتح کیا تھا ۔

کلمۂ تُکُلُر "Tuculor" تکرور کی قدرے بگڑی ھوئی صورت ھے، جو زیرین کونگو [Congo] کے قبیلۂ وُلُوف Wolof نے اپنے تلفّظ کے مطابق اس زیرِ بحث قوم کو دیا تھا ۔ ان لوگوں کے ھاں اس لفظ نے تُکُرُر Tokoror یا تُکَلُر Tokolor کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ قدیم سیّاحوں کے سفر ناموں اور پرانے نقشوں میں اسے تُوکُورُل "Toucourol" یا تُوکُورُنْیٖ "Toucourogne" لکھا ھے ۔ عربوں نے اسے تَکْرُور لکھا اور اس سے اسمِ منسوب تکروری بنایا ھے، جس کی جمع تَکارِیر آتی ھے اور سینگال کے دائیں کنارے پر بسنے والے مغاربہ Moors اسی لفظ کا اطلاق تکروریوں پر کرتے ھیں ۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ کسی زمانے میں تُکُرُر Tokoror یا تَکْرُور Takrūr ایک قصبے کا نام تھا، جو دریاے سینگال کے قریب آباد تھا اور یہی نام اس مملکت کا بھی تھا جس کا یہ قصبہ دارالسلطنت تھا ۔ عملاً یہ وھی علاقہ تھا جو اب سینگالی فُوتَہ ھے، پھر یہ اس مملکت کے باشندوں کا بھی نام تھا ۔ اب بھی تُکُرُر Tokoror نام کی ایک بستی موجود ھے، جو گیدِہ Gede سے کچھ دُور تورو Tōro یا ضلع پَدُور Podōr میں دریاے سینگال کی اس شاخ پر واقع ھے جو دریاچۂ دِ دُوْ اے marigot de Doué

کہلاتی ھے ۔ اس کا محلِّ وقوع وھی ھے جو البکری، اِدْرِیسی اور قُرونِ وسطٰی کے دیگر عرب جغرافیہ نویسوں نے شہر تکرور کا بتایا ھے ۔ رفتہ رفتہ عرب مصنّف اور ان کے تتبع میں عربی میں لکھنے والے سودانی وقائع نویس کلمۂ تکرور کے مدلول کو وسعت دے کر اس کلمے کا اطلاق بحرالکاھل سے لے کر وادیِ نیل تک (لیکن باستثناے وادی نیل) تمام بلادِ سودان پر کرنے لگے جہاں دینِ اسلام کی نشر و اشاعت ھو چکی تھی اور کلمۂ 'تکروری' کو انھوں نے کلمۂ سودانی کا مرادف بنا دیا ۔ یہی وجہ ھے کہ یورپی السنوں میں صحراے اعظم کے جنوب کے علاقے میں ایک مدت تک "تکرور یا سودان" درج ھوتا رھا ۔ لیکن مدلول کلمۂ سودان کی یہ توسیع حقائق کے مطابق نہیں ھے اور صحیح معنوں میں تکرور یا تُکُرُر Tokoror سے مراد تُکُلُروں Tuculors کا اصلی وطن یعنی سینگالی فُوتَہ ھے ۔

موجودہ تکاریر (Tuculors) کی اصل نسل کا پورے وثوق کے ساتھ علم نہیں ۔ معلوم ھوتا ھے کہ ان کی آبادی بہت ھی مخلوط ھے ۔ ان میں سے ایک فریق غالباً سینگالی فُوتَہ کے اصلی باشندوں کی اولاد سے ھے، جن کی نسل شاید وھی ھے جو وُلُوف Wolof اور سِیرِر Sērer کی ھے ۔ کچھ اُس علاقے کے قدیم سیہ فام اصلی باشندوں کی اولاد ھیں، جسے اب مغرب اقصی یا (مورِیتانیہ Mauritania) اور حوض Hodh (Hawd) کہتے ھیں جو ضرور اسی نسل سے ھونگے جن سے تکرور ھیں اور جب جنوبی صحراء [اعظم] خشک و بے آب ھونے لگا تو جنوب کی جانب ھجرت کر گئے ھونگے ۔ کچھ لوگ سَرَکُلّہ Sarakolle (یا سُنِنْکہ Soninke) اور مَانْدِینگو Mandingo (یا مالِنْکہ Malinke) کی اولاد ھیں، جو ماضی بعید میں آ کر تکرورِ قدیم کے تجارتی مرکزوں کے گرد

آباد ہو گئے اور بعض ان زنگی غلاموں کی اولاد ہیں جو رِمایِبہ Rimāibe کہلاتے تھے اور ان کے آقا ترِیس Termes (در شمال مشرقِ نیورو Nyōro) کے فُولَہ Fula تھے ۔ یہ غلام گیارھویں صدی سے پہلے اپنے آقاؤں کے ہمراہ سینگالی فُوتَہ میں آ گئے تھے ۔ فُولَہ لوگ خود تو گلہ‌بان رہے اور کوھستان میں آباد ہو گئے لیکن ان کے زنگی غلام دریا کی وادی میں کھیتی باڑی میں مصروف ہوگئے ۔

تُکُلَّر قوم کی اصل خواہ کچھ ہی ہو انھیں دوغلے فُولَہ نہیں سمجھا جا سکتا، جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں ، یہ سچ ہے کہ ان میں اس قسم کے دونسلے ضرور پائے جاتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے تُکُلَّر خالص نسل کے زنگی ہیں ۔ ان میں اور فُولَہ میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے اور وہ زبان ہے جو صاف طور پر ایک زنگی زبان ہے اور اس کا وُلُوف کی زبان سے تعلق ہے اور سیرِیر Sērer کی زبان سے تو اس کا تعلق بہت قریبی ہے ۔ یہ زبانِ فُولَہ نے ترِیس اور اس کے آس پاس کے اضلاع کے قدیم اصلی زنگیوں سے لی ہوگی ۔ تُکُلَّروں نے فُولَہ کی بولی کا، جس میں وہ بات چیت کرتے تھے، پُلار Pulār نام رکھا ہے اور بعض اوقات وہ لوگ اپنے آپ کو ''ہال پُلارِن'' *Hālpulāren* یعنی ''پُلار زبان بولنے والے'' کہتے ہیں ۔ فُولَہ [زبان] یقیناً مدت دراز سے تُکُلَّروں کی مادری زبان رہی ہے؛ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ یہ زبان فُولَہ کے سینگالی فُوتَہ میں آنے سے پہلے بھی بولتے تھے یا نہیں ۔ بہر حال البکری کے ایک ضمنی بیان سے ہمیں اتنا معلوم ہے کہ گیارھویں صدی کے اندر علاقۂ فُوتَہ میں سواحلِ دریاے سینگال پر بسنے والے لوگ دریائی گھوڑے کو ''نگابو'' *ngābu* کہتے تھے، جو فُولَہ زبان کا لفظ ہے ۔

تُکُلَّر [یعنی تکرور] عام طور پر زراعت پیشہ ہیں لیکن جنگ کے ساتھ انھیں فطری رغبت ہے۔ اٹھارھویں صدی میں انھوں نے سینگالی فُوتَہ میں قبیلۂ فُولَہ کے تسلّط کا کامیابی سے مقابلہ کیا ۔ فُولَہ کو وھاں (۱۵۰۹ تا ۱۷۷۵ء) سَتِگی *satigi* یا سَلْتِگی *saltigi* یا سِیلْتِگی *silatigi* (قدیم سیاحوں کے سیراتیق ''siratiques'') کی قیادت میں، جو دینی اَنْکہ Denianke کے فُولَہ خاندان سے تھے، اقتدار حاصل رہا ۔ اس کے بعد کے زمانے میں تُکُلَّر نے فرانسیسی فتوحات کی ایک مدت تک مزاحمت کی ۔ ۱۸۰۰ء میں عثمان فُوجُو کی فتوحات میں جو علاقۂ حوصہ Hausa میں ہوئیں اور الحاجّ عمر کی فتوحات میں، جو ۱۸۴۸ سے ۱۸۶۴ء تک بلاد ماَنْدِینگو Mandingo اور بلاد بامبارہ Bambara و ماسِینَہ Māsina میں ہوئیں، انھیں اہم شان حاصل رہی ۔ ان دونوں فاتحوں کو، جو تُورو Tōro کے باشندے تھے، تُکُلَّروں نے بہترین قائد اور عمدہ ترین سپاھی بہم پہنچائے ۔ اس وقت سے وہ سینگالی فوج میں بہ تعداد کثیر بھرتی ہو رہے ہیں اور انھوں نے فرانس کے سیاہ فام لشکر کے لیے بھی بہت بہادر سپاھی اور بے کمیشن افسر مہیا کیے ہیں ۔

تُکُلَّروں میں کچھ ذاتیں اہل حرفہ کی بھی ہیں، جو شاید باقی آبادی سے بلحاظ نسل مختلف ہیں، لیکن اب وہ ان کے ساتھ بالکل مِل جُل گئی ہیں اور انھیں کی زبان بولتی ہیں، مثلاً سُبَلْبے *Subalbe* (مفرد : تیُوبَلّو *Tyuballo*) ماھی گیر اور ملّاح، لَوبے *Lawbe* (مفرد لَبّو *Labbo*) بڑھئی اور ٹوکریاں بنانے والے، بُرنابے *Burnābe* (مفرد بُرنادیو *Burnādyo*) کوزہ گر، وَیلُبے *Wailube* (مفرد : بیلو *Bailo*) لوھار، وَلَبّے *Walabbe* (مفرد : گَلابو *Galābo*) موچی، مابُبے *Mābube* (مفرد : مبّو *Mabbo*) جولاہے، وَمْبابے *Wambābe* (مفرد : بمْبادیو *Bambādyo*)

مغنی، وَولّبے *Wawlube* (مفرد : گولو *Gåwlo*) بھاٹ، وُوسُبے *Wosube* (مفرد گوسو *Goso*) اور دیاوَمبے *Dyāwambe* (مفرد : دیاوَندو *Dyāwando*) درباری وغیرہ۔

تکُلّر بلحاظ مذہب سارے کے سارے مسلمان ہیں اور بلادِ سودان میں سب سے پہلے وہی دائرۂ اسلام میں داخل ہوے۔ سینگالی فُوتَہ میں اسلام گیارھویں صدی کے نصفِ اول کے آخر میں، جب مرابطی تحریک کے آغاز کے دن تھے، مرابطی تحریک ہی کے زیرِ اثر پہنچا۔ البکری کہتا ہے کہ اس علاقے کا پہلا حاکم، جس نے اسلام قبول کیا اور اُسے اپنے ماحول میں پھیلایا، وار۔دیابی War-Dyābi تھا - اسے وار۔دیابے Wār-Dyābē یا وار۔ندیای Wār-Ndyāi بھی لکھا گیا ہے (یہ مختلف صورتیں قلمی نسخوں کے اختلاف کی وجہ سے ہیں) - یہ حکمران ۱۰۴۱-۱۰۴۲ء میں فوت ہوا - اس کے فرزند لبّی Lebbi نے ۱۰۵۶ء میں بربر قبیلۂ لَمتونہ Lamtuna کے المرابطی قائد یحیی ابن عمر کو بربر قبیلۂ گدّالہ Goddala کے خلاف جنگ میں ایک فوجی دستہ بہم پہنچایا - اس کے برعکس مقامی روایت کی رُو سے علاقۂ سینگالی فُوتَہ میں سب سے پہلے اسلام پھیلانے والے کا نام ابو۔دردائی *Abū-Dardai* ہے، جسے کبھی کبھی جُلُف Diolof کے مبلّغ نَندیَدیَن ۔ نَندیای *Ndyadyan - Ndyāi* کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے - بہر حال تُکُلّر اسلام قبول کرنے کے بعد کبھی ارتداد کے مرتکب نہیں ہوے - بُت پرست فُولَہ کے عہد حکومت میں تُکُلّروں کو دینی اَنکہ Denianke بادشاہوں کے تسلّط سے نجات دلانے کی کوششوں کے محرّکات میں جذبۂ وطنی کے ساتھ جذبۂ دینی بھی شامل تھا۔ جس طرح فُولَہ کو ''بت پرست'' کا مرادف سمجھا جاتا تھا اسی طرح تُکُلّر کو ''مسلم'' کا ہم معنی مانتے تھے۔

تکُلّروں کی شاخ توردَبِہ *Tōrodbe* (واحد : توردو Tōrōdo) ہی نے اپنے آپ کو ہمیشہ اسلام کا سب سے زیادہ پر جوش فدائی ثابت کیا ہے - سلیمان بال، جو فُولَہ بادشاہوں کے اقتدار کو توڑنے میں کامیاب ہوا اور جس نے ۱۷۷۵-۱۷۷۶ء میں اپنی وفات سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے سینگالی فُوتَہ میں تکروری اسلامی بادشاہی کی بنیاد ڈالی، اسی شاخ سے تھا - عثمان فُوجو اور الحاجّ عمر بھی توردَبِہ میں سے تھے۔

سیاسی طور پر تَکرُور یا سینگالی فُوتَہ یکے بعد دیگرے مندرجۂ ذیل علاقوں پر مشتمل رہا ہے : ۱ - صوبوں کا ایک سلسلہ جو ایک دوسرے سے کم و بیش آزاد تھے (یہ حالت نویں صدی میلادی سے پہلے تھی)؛ ۲ - ایک طرح کی مملکت جس پر وہ شہزادے حکمران تھے جو حوض (Hodh (Ḥawḍ سے براستۂ تَگَنْت Tagant آئے تھے اور دیاؤگو Dyāogo کہلاتے تھے (نویں سے گیارھویں صدی میلادی تک)؛ ۳ - ایک امارت جو دیارہ Dyāra ('ساحِل') کی مملکت سَرکَلّہ Sarakolle کے براہ راست زیرنگیں تھی اور جس کی حکومت تکروری شہزادوں یا والیانِ سَرکَلّہ کے سپرد ہوتی تھی (گیارھویں سے تیرھویں صدی میلادی تک؛ یہ وہ زمانہ ہے جب فُولَہ ترمِس Termes سے نقلِ مکان کر کے آئے اور تُکُلّروں نے اسلام قبول کیا)؛ ۴ - اسی مملکت سَرکَلّہ کی ایک امارت، جو اس وقت مالی Mali یا ماندِینگو Mandingo سلطنت کی باجگزار تھی (تیرھویں سے سولھویں صدی تک)؛ ۵ - امارت جو بدستور دولت سَرکَلّہ کے تابع تھی لیکن اس وقت وہ دولت خود سلطنت گاو Gao یا سونگوی Songoi کے زیرِ حمایت آ چکی تھی (سولھویں صدی کے آغاز سے ۱۵۵۸ء تک)؛ ۶ - ایک آزاد مملکت، جس پر

دینی آنکہ Denianke کا بت پرست قوبہ خاندان حکمران تھا ، یعنی کولی۔ تنگلا Koli - Tengella اور اس کے جانشین (۱۵۵۹ تا ۱۷۷۵ء)؛ ۷۔ ایک آزاد دینی مسلم وفاق (federation)، جس میں حکومت تکارے کے ہاتھ میں تھی (۱۷۷۶ تا ۱۸۵۸ء)؛ ۸۔ چھوٹی چھوٹی تکروری ریاستیں جو الگ الگ تھیں اور رفتہ رفتہ فرانس کی حمایت میں آتی گئیں (۱۸۵۸ تا ۱۸۹۰ء)؛ ۹۔ صوبوں کا ایک سلسلہ جو (۱۸۹۰ء اور اس کے بعد سے) سینیگال کی نو آبادی سے ملحق کر دیا گیا .

سینیگالی فوتہ کی دینی تکروری ریاست پر، جس کی بنیاد ۱۷۷۶ء میں پڑی، ایک دیندار شیخ حکومت کرتا تھا، جسے اَلْمامی (مأخوذ از عربی الامام) کہتے تھے ۔ اسے عمائدِ قوم منتخب کرتے تھے لیکن بارہا اس انتخاب کی بدولت انھیں تھوڑے ہی دن حکومت نصیب ہوتی تھی ۔ فوتہ کا پہلا اَلْمامی (یعنی امام) عبدالقادر تھا (۱۷۷۶ تا ۱۸۰۵ء) اس کے تینتیس جانشین ہوے، جن میں بعض متعدد بار برسرِ اقتدار آئے، مثلاً یوسف نو دفعہ حکمران بنایا گیا ۔ اَلْمامی محمدو بران نے، جو جولائی ۱۸۴۱ء میں پہلی بار حکومت کے لیے منتخب ہوا، اسی سال ۷ اکتوبر کو فرانس سے دوستی کے معاہدے پر دستخط کیے ۔ سیبویہ (۱۸۵۴ تا ۱۸۵۶ء) کے عہدِ حکومت میں سینیگال کے گورنر فیڈھیربہ Faidherbe نے علاقۂ توروٗ Tōro میں پدور Podōr کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا اور فوتہ کے الگ الگ صوبوں کو وفاق سے علیحدہ کرنے اور فرانس کے زیرِ حمایت لانے کی مہم شروع کر دی ۔ اَلْمامی مصطفی (۱۸۵۸ تا ۱۸۵۹ء) کے عہد میں دمار نے فرانس کی حمایت میں آنا قبول کر لیا اور فوتہ کے وفاق سے الگ ہو گیا ۔ ۱۸۵۹ء میں اَلمامی [امام] محمدو بران، جو اس وقت پانچویں بار تختِ حکومت پر بیٹھا تھا، توروٗ اور دمگہ پر اپنے حقوق سے دست بردار ہو گیا اور اس سے اگلے سال یہ دونوں علاقے فرانسیسی حمایت میں آ گئے ۔ وفاقِ فوتہ میں اب سوا لاؤ Lāo ، یرلابہ Yirlābe ، بوسیہ Bōseya اور نگینار Ngenār کے اور کوئی ریاست باقی نہ رہی ۔ ۲۴ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو اَلمامی محمدو احمدو نے لاؤ اور یرلابہ کے علاقے فرانس کے سپرد کر دیے اور آخرکار ۱۸۸۱ء میں گورنر بریئر دِ لیل Brière de l'Isle نے اَلمامی سیرہ بابا لہ سے وفاقِ فوتہ کی باقی ریاستوں یعنی بوسیہ اور نگینار پر بھی فرانسیسی اقتدار تسلیم کرا لیا ۔ وہ آخری اَلمامی (امام) تھا جس نے ۱۸۹۰ء میں وفات پائی ۔ اس کی وفات کے بعد سینیگالی فوتہ کی تکروری سلطنت، جو سات صوبوں پر مشتمل تھی، سینیگال کی فرانسیسی نو آبادی سے ملحق کر دی گئی .

بونڈو کے تکروروں نے بھی اپنے علاقے میں ایسی ہی ریاست بنا لی تھی جس نے انیسویں صدی کے وسط میں فرانس سے اتحاد کر لیا ۔ اَلْمامی بوبکر سعدہ نے، جو اس وقت بونڈو کا حاکم تھا، ان جنگوں میں جو گورنر فیڈھیربہ Faidherbe اور الحاجّ عمر کے درمیان ہوئیں خصوصاً ۱۸۵۷ اور ۱۸۵۹ء کی لڑائیوں میں والی مذ کور کو بہت مدد دی .

۱۸۰۱ء کا واقعہ ہے کہ توروٗ کے ایک تکروری عثمان نامی نے، جو محمدو کا (جسے لوگ فوجو یعنی ''عالم'' کہتے تھے) بیٹا تھا، اپنے ہم وطن سینیگالی فوتہ کے باشندوں کی ایک فوج تیار کی اور ماسینہ Māsina ، لپتاکو Liptāko اور سونگوی Songoi سے اس میں سپاہی بھرتی کر کے اسے چیرہ دست بنایا اور بلادِ حوصہ Hausa کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، بدین عذر کہ گوبر Gōber کے گلہ بانوں نے امیرِ صوبہ کی زیادہ ستانیوں کی شکایت کی تھی؛ چنانچہ اس نے گوبر کے دارالحکومت تیساوہ Tesawa

پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد سُکّتو یا سُکوتو Sokoto، کَتْسینا Kat.ēna، زِنْدر Zinder، کانو Kāno، زاریا Zaria اور حَوصَہ Hausa کے دوسرے شہروں پر اپنا تسلط جما لیا اور نائجر Niger اور چاد Chad کے درمیانی علاقے میں ایک سلطنت قائم کر لی اور سُکوتو کے قریب بلدۂ وُرنو Wurno کو اس کا صدر مقام بنایا اور اس کی حدود جنوب مغرب میں نُوپِہ Nupe تک اور جنوب مشرق میں آدَماوہ Adamāwa تک وسیع کر دیں ۔ اس نے بورنُو [برنوح] Bornu پر بھی حملہ کیا، لیکن ۱۸۱۰ء میں مشہور و معروف کانِمی Kānemī نے اسے وہاں سے نکال دیا ۔ اس کی موت ۱۸۱۵ء میں [حالتِ وجد میں جو اس پر طاری ہوئی تھی] واقع ہوئی ۔ اس کے بھائی عبداللہ نے سلطنت کے مغربی حصے پر قبضہ کر کے گَنْدو Gando کو اپنا دارالحکومت بنا لیا اور اس کے بیٹے محمّدو بِلّو Bello کے حصے میں وسطی علاقہ آیا، جو مملکت سُکوتو Sokoto کہلاتا تھا، رہا آدَماوہ تو وہ عملی طور پر خودمختار ہو گیا ۔ محمّدو بِلّو کو، جو ۱۸۱۵ سے ۱۸۳۷ء تک حکمران رہا، اپنی رعیت کے اکثر حصّے سے لڑنا پڑا، کیونکہ انھوں نے تکروری حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور مرتدّ ہو کر پھر بت‌پرست بن گئے تھے، اسی طرح اسے بورنُو سے بھی جنگ کرنا پڑی ۔ وہ نامور عالم تھا اور اس نے کئی تاریخی اور دینی کتابیں عربی زبان میں لکھیں ۔ ۱۸۲۸ء میں اس نے کْلَیپرٹَن Clapperton سیّاح کا استقبال لطف و کرم کے ساتھ کیا ۔ اس کے بعد اس کا بھائی عاطِقو Atịku، (۱۸۳۷ تا ۱۸۴۳ء) اس کا جانشین ہوا، جو مذھبی معاملات میں بڑا سخت‌گیر تھا؛ چنانچہ اس نے اپنی مملکت میں رقص و سرود بند کر دیا تھا ۔ علی (۱۸۴۳ تا ۱۸۵۵ء)، جس نے بارتھ Barth کو باریاب کیا تھا، محمّدو بِلّو کا بیٹا تھا ۔ علی کے تغافل سے شاھی اختیارات رفتہ رفتہ مختلف صوبوں کے والیوں کے ھاتھوں میں چلے گئے اور سُکوتو کے آخری پانچ تکروری بادشاہ، جن کے نام درج ذیل ھیں، اسے دوبارہ حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے : احمدو (۱۸۵۵ تا ۱۸۶۶ء)، علیّ کَرَمی (۱۸۶۶ تا ۱۸۶۷ء)، احمدو، جو اس نام کا دوسرا بادشاہ تھا (۱۸۶۷ تا ۱۸۷۲ء)، ابوبَکری (۱۸۷۲ تا ۱۸۷۷ء) اور مُیاسو (۱۸۷۷ تا ۱۹۰۳ء) ۔ جب برطانوی فوجوں نے ۱۹۰۳ء میں سر فریڈرک لُوگارڈ Sir Frederick Lugard کی سرکردگی میں سُکوتو پر قبضہ کیا اور بلاد حَوصَہ میں ملکی شہزادوں کی حکومت قائم کر کے تکروری سلطنت کا خاتمہ کر دیا تو نام بردہ مُیاسو کو برطانوی فوجوں کے مقابلے کی ھمّت نہ ھوئی .

اُنیسویں صدی کی دوسری تکروری سلطنت الحاجّ عمر نے قائم کی مگر وہ پہلی سلطنت کی بہ نسبت کمتر مدت تک وجود میں رھی ۔ عُمَر تال ۱۷۹۷ء کے قریب علاقۂ تُورو میں بمقام اَلْوآر Alo'r پیدا ھوا ۔ ۱۸۲۰ء میں مکّۂ [معظّمہ] گیا اور حج کر کے الحاجّ کے لقب سے ملقّب اور طریقۂ تجّانیہ کے پیروؤں کی جانب سے بلاد السودان میں منصبِ خلافت پر سرفراز ھوا ۔ واپسی پر وہ ایک خاصی مدّت تک اپنے ھم وطن محمّدو بِلّو کے پاس سُکوتو میں مقیم رھا اور اس کی لڑکی سے شادی کر لی ۔ ۱۸۳۸ء میں اس نے فُوتَہ جالُون میں سکونت اختیار کی لیکن اس علاقے کے سرداروں کے عناد کی وجہ سے بلاد مانْدِینگو Mandingo کے جنوب میں بمقام دِنْگرای Dingirai قیام کیا اور قلعہ تعمیر کیا اور فوج بھرتی کی جس کے اھم ترین اجزاء اس نے سینگالی فُوتَہ سے بھرتی کیے، پھر کفّار کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے اس نے مانْدِینگو اور بَمْبک Bambuk فتح کیے اور بامباره اور کَارتَہ Kaarta لوگوں

پر چڑھائی کی اور ان کی مملکت برباد کر کے ۱۸۵۴ء میں فاتحانہ طریق سے نیورو Nyōro میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اس نے خاسو Khāso کا رخ کیا، جو فرانسیسی حمایت میں داخل تھا اور جہاں کے دارالحکومت مدینے میں گورنر فیدھیربہ Faidherbe نے فرانسیسی چوکی قائم کروا رکھی تھی۔ مدینے کے قلعہ‌دار پال ھولہ Paul Holle نے مٹھی بھر سپاھیوں کے ساتھ تین ماہ تک مقابلہ جاری رکھا۔ عین اس وقت جب خوراك اور گولہ بارود ختم ہو چکے تھے اور قریب تھا کہ پال ھولہ قلعے کو مع اس کے محافظین کے بارود سے اڑا دے، فیدھیربہ، جو دریاے سینگال کے پانی اترنے کا منتظر تھا، اچانک اپنے لشکر سمیت مدینے کے سامنے آ نمودار ہوا اور الحاج عمر کی فوج کو شکست فاش دی۔ الحاج عمر بوندو Bundu چلا گیا، جہاں اسے المامی بوبکر سعدہ سے لڑنا پڑا۔ اس کے بعد وہ سینگالی فوتہ گیا اور وہاں کی آبادی کے ایک حصے کو اس نے مجبور کیا کہ اس کی فوج میں بھرتی ہو کر اس کے ساتھ نیورو جائے۔ اس طرح سے اپنی فوج کو دوبارہ منظم کر کے اس نے سیگو Sēgu کے بامبارہ لوگوں پر چڑھائی کی اور اس مقام کو ۱۸۶۱ء میں فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی توجہ ماسینہ کے فولہ کی طرف مبذول کی، جنھوں نے مسلمان ہونے کے باوجود بت پرستان بامبارہ کی مدد کی تھی اور ان کے دارالحکومت حمداللہ پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے بادشاہ احمدو۔ احمدو کو گرفتار کر کے ۱۸۶۲ء میں قتل کر دیا۔ پھر وہ ٹمبکٹو Timbuctu کی طرف بڑھا کہ اسے تاخت و تاراج کرے، مگر اس کے بعد فولہ نے بغاوت کر دی اور اسے محاصرے میں لے لیا۔ وہ مجبور ہو کر ایک غار میں گھس گیا، جہاں باغیوں نے دھواں چھوڑ دیا اور وہ وھیں ۱۸۶۴ء میں دم گھٹ کر مر گیا۔

اس کے فرزندوں میں سے احمدو نے، جسے وہ سیگو میں چھوڑ گیا تھا، اس کا جانشین بننا چاہا لیکن اسے معلوم ہوا کہ اس کے بھائی اور رشتے دار اس کے رقیب بن کر دنگرای Dingirai، نیورو اور بنڈیاگارا Bandyagara (ماسینہ) میں تخت نشین ہو چکے ھیں، چنانچہ اس کے باپ کی سلطنت چار مملکتوں میں بٹ گئی، مگر چاروں حکومتیں ایک دوسرے سے دست و گریبان تھیں۔ احمدو نے کوشش کی کہ اپنے بھائیوں اور ان کے متعدد نائبوں کو قتل کرا کے ان سے چھٹکارا حاصل کرے لیکن وہ نہ تو کامل اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور نہ ان لگاتار بغاوتوں ھی کو فرو کر سکا جو اس کے ظلم و ستم اور حرص و آز سے بامبارہ اور فولہ لوگوں نے برپا کیں۔ اس نے پہلے تو فرانس سے مصالحت کی گفت و شنید کی خواھش کا اظہار کیا مگر پھر اس سے کچھ اس قسم کے معاندانہ افعال سرزد ہوئے جن سے فرانسیسی حکام نے اس کے جور و استبداد کو، جسے تمام ملکی لوگ ناپسند کرتے تھے، ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ احمدو کا بھائی عجیبو Agibu، جو دنگرای کا حکمران تھا، فرانسیسی حکومت سے مل چکا تھا۔ کرنل (بعد میں جرنیل) آرشنارڈ Archinard نے ۶ اپریل ۱۸۹۰ء کو سیگو پر، یکم جنوری ۱۸۹۱ء کو نیورو پر اور ۲۶ اپریل ۱۸۹۳ء کو بنڈیاگارا پر قبضہ کر لیا اور اس طرح مغربی سوڈان کی تکروری سلطنت کا خاتمہ کر کے احمدو کو بھگا دیا۔ احمدو نے سکوتو کے بادشاہ میاسو Moyāsu کے پاس پناہ لی اور ۱۸۹۸ء میں بلاد حوصہ میں ملک عدم کا راستہ لیا۔

مآخذ: (۱) Clapperton : *Journal of a second expedition into the interior of Africa*، فلاڈلفیا ۱۸۲۹ء؛ (۲) H. Barth : *Travels and Discoveries in Northern and Central Africa*، لنڈن ۱۸۵۸ء،

پانچ جلد ؛ (۳) E. Mage : *Voyage dans le Soudan occidental*، پیرس ۱۸٦۸ء ؛ (۴) Bérenger-Férand : *Les peuplades de la Sénégambie*، پیرس ۱۸۷٦ء؛ (۵) Lasnet : *Les races du Sénégal* (در *Une mission au Sénégal*)، پیرس ۱۹۰۰ء؛ (٦) P. Cultru : *Histoire du Sénégal du XVème siècle à 1870*، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۷) M. Delafosse : *Haut-Sénégal-Niger (Soudan Français) : le pays, les peuples, les langues, l' histoire, les civilisations*، پیرس ۱۹۱۲ء، تین جلد ؛ (۸) مصنف مذکور اور H. Gaden : *Chroniques du Foûta Sénégalais*، پیرس ۱۹۱۳ء ؛ (۹) A. Bonnel de Mézières : *Recherches de l'emplacement de Ghana et sur le site de Tekrour* (*Mémoires présentés par divers savants à l' Académie des Inscriptions et Belles-Lettres*، ج ۱۲، ۱۹۲۰ء، حصّهٔ اول)؛ (۱۰) M. Delafosse : *Les Noirs de l' Afrique*، پیرس ۱۹۲۱ء ؛ (۱۱) A. Brass : *Eine neue Quelle zur Geschichte des Fulreiches Sokoto*، در "*Der Islām*" ۱۹۱۰ء، ۱ تا ۳۷؛ (۱۲) R. Perry : *New Sources for research in Nigerian history*، در *Africa*، ۱۹۵۵ء، ۳۰۴ تا ۳۳۲ .

(M. DELAFOSSE)

تَکْرِیْت : (تلفّظ عوام میں تِکْرِیْت بکسرِ تاء، قبّ یاقوت : معجم البلدان [۱ : ۸٦۱، مگر سمعانی اور سیوطی (لُبّ اللّباب) صرف تِکرِیت ھی لکھتے ھیں - البته تاج العروس میں ھے : بالکسر و قیل بالفتح] - دریاے دجله کے دائیں کنارے کا قصبه، جو سامرّا کے شمال میں (بقول شٹرِك Streck سامرّا سے ایک دن کی راہ پر [اور بقول سمعانی بغداد سے ۳۰ فرسخ پر]) سلسلۂ جبلِ حمرین کے دامن میں واقع ھے - جغرافیائی لحاظ سے عراق کے اس علاقے کا محلِ وقوع عراق کی شمالی سرحد پر ھے - [اس سے اوپر کے علاقے کی طرح] اس کی زمین میں بھی کچھ نہ کچھ بلند و پست اور نشیب و فراز پایا جاتا ھے [ھموار علاقه اس حد تک بھی شروع نہیں ھوتا]۔ پرانا قصبه چند پہاڑیوں پر، جو پاس پاس ھیں، تعمیر ھوا تھا.. ان میں سے ایک پہاڑی پر، جس کے دامن میں دریا بہتا ھے، موجودہ قصبه آباد ھے - شمال کی طرف سنگ ریگی sandstone کی چٹان ھے، جو دریا کی سطح سے کوئی دو سو فٹ بلند ھے - اس پر اب تک پرانے قلعے کے آثار موجود ھیں۔ [بقول صاحب مطلع (بذیل وقائع ۷۹٦ھ) "کتبِ قصص و اخبار" میں اس قلعے کو قلعۂ سلاسل لکھا ھے] - پرانے شہر کے آثار ان دونوں پہاڑیوں کے مغرب کی طرف ایک بڑے دائرے کی شکل میں پھیلے ھوے ھیں، جس سے ظاھر ھوتا ھے که تکریت کسی زمانے میں بہت سا رقبه گھیرے ھوے تھا۔

بعض کا خیال ھے که تکریت کا نام بُخْتَ نَصّر (Nebuchadnezzar) کے زمانے کی ایک لوح میں پہچانا جا سکتا ھے (Streck، ج ۲ : ص xiii، از روی Strassmeyer)، لیکن یقینی طور پر اس کا ذکر سب سے پہلے بطلیموس Ptolemy (۵ : ۱۸، ۱۹) نے کیا ھے، جو اسے بِرْثَة کا نام دیتا ھے (یاقوت، ۱ : ۸٦۱ پر اس کا طول البلد اور عرض البلد دیتے ھوے بطلیموس کا بھی حواله دیتا ھے) - اَمیانوس مارکِلّینُوس Ammianus Marcellinus اسے وِرْته Virta کہتا ھے - حقیقت میں قلعے والی پہاڑی کو ابھی تک بُرْثَة Bur<u>th</u>a ھی کہتے ھیں - سریانی کتابوں میں اس شہر کا نام تَغْرِیْث ھے - چوتھی صدی سے یہاں یعقوبی اُسقف کی گدی قائم تھی، تا آنکه ۱۱۰۰ء میں اس اُسقفیّة کو اسقفیة الموصل میں شامل کر دیا گیا (Assemani : *Bibliotheca Orientalis*، ۱ : ۱۷۴، ۴٦۵) - عرب مصنّفین کے نزدیک اس کی بنیاد ساسانی بادشاہ سابور بن اَرْدَشیر نے ڈالی تھی - کہتے ھیں که شہر

کا نام ایک عیسائی [۔ویّة] تَکْرِیت بنت وائل [وَہِیَ اختَ بکر بن وائل (تاج العروس)] کے نام پر رکھا گیا تھا ۔ اس کی بناء کے متعلق کئی قِصے کہانیاں مشہور ہیں (یاقوت : محلِّ مذکور؛ ابوالفداء : تقویم البلدان، ۲ : ۲۸۸) ۔ دورِ اسلام سے پہلے اس شہر پر عربی قبیلۂ إیاد نے، جو مذہباً عیسائی تھا، عارضی طور پر قبضہ کر لیا تھا (البکری : معجم، ۱ : ۳۶)، پھر انہیں وہاں سے نکال دیا گیا [کیا لسان‌العرب ، ۲ : ۳۸۳ (بذیلِ تکریت) میں اسی کی طرف اشارہ ہے؟] لیکن بنو إیاد اس کے بعد بھی مدت تک اس نواح میں آباد رہے (ہَمْدانی : جزیرة‌العرب، ۱۸۰) ۔ فتوحات کے زمانے میں إیاد کے سپاہیوں نے ، جو تکریت کی قلعہ گیر فوج میں تھے، خفیه طور پر عربوں کی مدد کی (قبّ مادّۂ إیاد) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تکریت کو پہلے پہل ۱۶ھ میں عبداللہ بن [المُعْتَمّ] نے، جسے سعد بن ابی وَقّاص نے بھیجا تھا، فتح کیا ۔ پھر یہ قصبہ ۲۰ھ میں دوبارہ از روی صلح مطیع ہو گیا ۔ تاریخی روایات کی رُو سے دوسری دفعه اس قصبے پر النُّسَیر بن دَیْسَم یا اس کے نائب [عُتْبَة] بن [فَرْقد] السُّلَمی یا مسعود بن حُرَیث بن الاَبْجَر نے قبضہ کیا ۔ مسعود پہلا والی تھا اور اسی نے یہاں جامع مسجد تعمیر کرائی (یاقوت : محلِّ مذکور؛ البَلاذُری، ۲۴۸ تا ۲۴۹) .

دسویں صدی [میلادی] کے وسط تک عرب جغرافیه دان تکریت کو اداری اعتبار سے الجزیره میں شمار کرتے رہے (ابن خُرّداذبه، ۹۴؛ ابن رُسته، ۱۰۶؛ ابن الفقیه، ۱۲۹؛ قُدامة، ۲۴۵ ، ۲۵۰؛ اِصطخری، ۷۲ ، ۷۷؛ ابن حوقل، ۱۵۶؛ مسعودی : کتاب التنبیه ، ۳۶) لیکن المَقْدِسی (ص ۵۴، ۱۱۵) کے زمانے سے (ادریسی اور دمشقی کے سوا) اکثر جغرافیه نویسوں نے اس قصبے کو عراق میں داخل سمجھا ہے ۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس قصبے کے قریب قریب سبھی باشندے عیسائی تھے ۔ ابن حوقل اور مسعودی (کتاب مذکور، ۱۵۰) وہاں کے الخَضْراء نامی کنیسے کا ذکر کرتے ہیں اور شہر کے جنوب میں اسی نام کے کھنڈر اب تک موجود ہیں ۔ اس کے علاوہ یہاں مسیحی مذہب کی اَور عمارات بھی تھیں (مثلاً دیر سَعّابَة [یاقوت : دیر صباعی (بدون حرکات)، ایک اَور قراءت : صباغی] دریا کے مقابل کے (شرقی) کنارے پر [یاقوت، ۲ : ۶۷۳] اور دیر مار یُحَنّا، یاقوت، ۲ : ۷۰۱) ۔ مشہور و معروف اسلامی خانقاہ 'الاربعین' پرانے قصبے سے کوئی پاؤ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے ۔ اس کے نام سے گمان ہوتا ہے کہ پہلے زمانے میں اس جگہ کوئی مسیحی عمارت ہوگی ۔ دو طاق‌دار کمرے، جنھیں گچ کاری سے آراستہ کیا گیا ہے، اب تک کھڑے ہیں ۔ یہ عمارت تیرھویں صدی کی یادگار ہے ۔ تکریت اونی منسوجات کے لیے مشہور تھا (مَقْدِسی) ۔ [بارھویں صدی میں السمعانی (بذیل التکریتی) موصل کو جاتے ہوئے یہاں ایک دن ٹھیرا ۔ اس نے قلعے کو اندر سے دیکھنا چاھا مگر اجازت نہ ملی ۔ بستی کو ابن الأثیر کی لُباب (نسخۂ دانش گاہ پنجاب) میں '' بلدة کبیرة '' لکھا ہے ۔ غرض] تیرھویں اور چودھویں صدی میلادی میں تکریت بڑا شہر بن گیا تھا (ابن جُبَیر، ۲۳۲ ؛ ابن بطّوطة، ۲ : ۱۳۳) ۔ حمداللہ مستوفی (ص ۳۹) کہتا ہے کہ یہ اوسط درجے کا شہر ['' شہری وَسَط ''] ہے ۔ ادریسی (ترجمه Jaubert ، ۲ : ۱۴۷) نہرالدُّجَیْل کا ذکر کرتا ہے، جو تکریت کے قریب دجلے سے نکل کر بغداد کو جاتی تھی ۔ یہ غالباً وھی نہر ہے جسے 'النہرالاسحاقی ' کہتے تھے، جو بقول ابوالفداء خلیفه متوکّل کے عہد میں کھودی گئی تھی (قبّ نیز حاجی خلیفه : جِہان نما، ۴۳۴) ۔ اس

نہر کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں - بقول اولیا چلپی اسے ۱۶۵۴ء میں مرتضی پاشا نے صاف بھی کرایا تھا (اولیا کا حوالہ von Hammer : *Wiener Jahrbücher* ، ۱۸۲۱ء، ۱۳ : ۲۳۵ میں نقل ہوا ہے)

تکریت نے تاریخ میں کبھی کوئی نمایاں ... نہیں لیا [ساتویں صدی کے اواخر میں اس ... ح میں قیس و تغلب کی جنگ ہوئی، دیوان عبیداللہ ابن قیس الرقیات، طبع Rhodokanakis ، وینا ۱۹۰۲ء، ۱۴۵ مع ح ۱] - گیارھویں صدی میلادی میں یہاں تقریباً خود مختار سرداروں کی حکومت تھی، تا آنکہ طُغرل بیگ سلجوقی نے مقامی سردار کی موت سے فائدہ اُٹھا کر اس پر قبضہ کر لیا (ابن الأثیر، ۹ : ۴۴۸) - ۱۱۳۹ء سے یہ شہر بیگ تگین خاندان (Begteginids) کے علاقے میں شامل تھا [غالباً حصیانِ تکریت، جس کا ذکر عہد المقتفی (۵۳۰ تا ۵۵۵ھ) میں ابوالقاسم ھبة اللہ بن الفضل البغدادی طبیب العسکر (م ۵۵۸ھ / ۱۱۶۲-۱۱۶۳ء) نے اپنے قصیدے میں کیا ہے (دیکھیے ابن ابی اُصَیبعة : عیون الأنباء، ۱ : ۲۸۰ (= الفخری، طبع درنبرغ، ۱۴))، اسی زمانے سے متعلق ہے]- ۱۱۹۰ء میں یہ عباسی خلفاء کے قبضے میں آ گیا - تکریت صلاح الدین (ایوبی) کی جاے پیدائش ہے - اس کے والد نجم الدین ایوب کو عہد سلاجقہ میں یہاں کا والی مقرر کیا گیا تھا - جب تیمور نے [محرم ۷۹۶ھ / نومبر ۱۳۹۳ء میں] اس پر قبضہ کیا تو اس وقت یہ (عرب) مفسدانِ متمرّد اور قاطعانِ طریق کے قبضے میں تھا [جو پدر بر پدر یہاں آزادی سے حکومت کر رہے تھے] (شرف الدین [یزدی] : [۱ : ۶۴۳ بعد] ترجمہ Pétis de la Croix ، ۲ : ۱۴۱ تا ۱۵۴)- اس سے بعد کی صدیوں میں یہ ایک معمولی سا مقام رہا - [ھلاگو کی ایک فوج نے بغداد کی مہم میں دجلے کو یہاں سے عبور کیا تھا (الفخری، ۴۰۲ بعد] - عیسائیوں کا ذکر آخری مرتبہ تاورنیه Tavernier : (*Voyages* ، ۲ : ۸۷) نے کیا ہے - ترکی دورِ حکومت میں تکریت ایالتِ رَقّه کی ایک سنجق تھا (جہان نما ، ۴۳۴) لیکن انیسویں صدی کی اصلاحات کے بعد اس کی حیثیت کم کر کے اسے ولایتِ بغداد کی قضاء سامرّا کا ایک ناحیه بنا دیا گیا - انیسویں صدی میلادی میں اس کی آبادی غالباً چار پانچ ہزار نفوس سے کبھی زیادہ نہ تھی - [اسی صدی میں بستان السیاحة ، ۱۹۲ میں تکریت کو قصبه لکھا ہے : مصنّف کا بیان ہے کہ اس قصبے کے اکثر لوگ حنفی اور باقی علی اللٰهی ہیں اور سبھی ترکی بولتے ہیں] - تمام سیاحوں نے ، جنھوں نے تکریت کو دیکھا ہے ، اس کے متعلق کچھ اچھے تأثرات قبول نہیں کیے [صاحب بستان السیاحة بھی تکریت کی ہوا کو گرم بتاتا ہے]- موجودہ زمانے میں یہاں کی آبادی کی اکثریت کی گذر اوقات کلک رانی (ملّاحی) پر ہے [کلک کے لیے رَكَ به مادۂ کلک] - یہاں ملّاحوں کو بدلا جاتا ہے - آثارِ قدیمه کے نقطۂ نظر سے گمان ہوتا ہے کہ [کھودنے پر] یہاں سے قابلِ ذکر اشیاء برآمد ہونگی - ہرتس فلٹ *Herzfeld* کو یہاں سے ساسانی بادشاہوں کے زمانے اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کے سفالینه (کوزہ گری) کے دلچسپ نمونے ملے تھے - [مشاہیر علماء تکریت کے لیے دیکھیے سمعانی محلِّ مذکور و ابن الفوطی : تلخیص مجمع الآداب ، طبع در اورینٹل کالج میگزین، لاھور، کتاب الکاف ص ۲۳ و ۱۰۳، کتاب العین ، ص ۸۷؛ و عیون الأنباء، ۱ : ۳۶۵].

مآخذ : (۱) رِٹّر C. Ritter : *Erdkunde*، ۱۱ : ۶۸۰ بعد؛ (۲) Petermann : *Reisen im Orient*، لیپزگ ۱۸۶۱ء، ۲ : ۵۸؛ (۳) M. von Oppenheim : *Vom Mittelmeer zum Persischen Golf* ، برلن

۱۹۰۰ء، ۲: ۲۱۵ تا ۲۱۷؛ (۴) M. Streck: *Die alte Landschaft Babylonien nach den arabischen Geographen*، لائڈن ۱۹۰۱ء، ۲: ۱۷۵ تا ۱۸۱؛ (۵) لیسٹرینج Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ۵۷؛ (۶) Sarre-Herzfeld: *Archäologische Reise im Euphrat- und Tigrisgebiet*، ج ۱، برلن ۱۹۱۱ء: ۲۱۹ تا ۲۳۱؛ (۷) G. Lowthian Bell: *Amurath to Amurath*، طبع دوم، لنڈن ۱۹۲۴ء، ۲۱۶، ۲۱۷۔ [تکریت کے سرسری سے ذکر کے لیے دیکھیے معرّی: سقط الزند، قاہرۃ ۱۹۰۱ء، ۱۲۳].

(کرامرز J. H. KRAMERS)

تَکَش: (ترکی تلفّظ: تِکِش) بن اِیل آرسلان شاہ خوارزم [رَكَ بآن]، ۵۶۷ تا ۵۹۶ھ / ۱۱۷۲ تا ۱۲۰۰ء خوارزم شاہیوں [رَكَ بآن] کے چوتھے اور نہایت شاندار خاندان سے تھا۔ تخت نشینی سے پہلے وہ والیِ جَنْد تھا، جو سیر دریا [رَكَ بآن] کے زیرین حصے پر واقع ہے۔ تخت حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے چھوٹے بھائی سلطان شاہ سے لڑنا پڑا اور اس کشمکش میں قرہ خِتائی [رَكَ بآن] نے پہلے تَکَش کو اور بعد میں اس کے بھائی کو امداد دی۔

جب اس جنگ و جدل کا آخری فیصلہ تَکَش کے حق میں ہوگیا تو سلطان شاہ قرہ ختائی کی امداد سے مرو، سَرَخْس اور طُوس میں اپنی علٰیحدہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور ان علاقوں میں اپنی وفات کے وقت ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس عرصے میں کبھی اس کی اپنے بھائی سے صلح رہتی اور کبھی جنگ۔ خراسان کے پایۂ تخت نیشاپور پر تو تَکَش نے ربیع الاوّل یا ربیع الثانی ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء ھی میں قبضہ کر لیا تھا اور تَکَش کا سب سے بڑا بیٹا ملک شاہ وہاں کا والی بنا دیا گیا تھا۔ سلطان شاہ کی وفات کے بعد ملک شاہ کو مَرو تبدیل کر دیا گیا اور اس کے بھائی قطب الدین محمد کو اس کی جگہ نیشاپور کا والی مقرر کر دیا گیا۔ اس سے زیادہ اہم واقعہ یہ ہے کہ ۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء میں سلطان طُغْرِیل ثانی نے عراق عجمی میں شکست کھائی اور سلاجقہ کا اقتدار اس شکست کے بعد وہاں ختم ہو گیا۔ اس فتح کی وجہ سے تَکَش کا مرتبہ ایک مقامی امیر سے بڑھ کر ایک بڑی سلطنت کے بادشاہ کا سا ہوگیا اور اب وہ اپنے سکّوں پر ”خوارزم شاہ“ کا لقب موقوف کر کے ”سلطان ابن خوارزم شاہ“ نقش کرانے لگا۔ عراق عجم الرّی ہَمَذان سمیت اب تکش کے قبضے میں آ گیا اور اس نے اپنے بیٹے یونس کو ہمذان کا والی مقرر کیا؛ بعد میں اس نے ہمذان کا علاقہ ابوبکر والی آذربایجان کو اپنے باجگذار کی حیثیت سے حوالے کر دیا اور ابوبکر نے اپنے بھائی اور آیندہ جانشین اوزبک کو وہاں بھیج دیا۔ ۵۹۲ھ/ ۱۱۹۶ء میں خلیفہ ناصر کے لشکر کو ہمذان میں شکست دی گئی۔ خلیفہ کا مطالبہ یہ تھا کہ تَکَش مفتوحہ علاقہ خالی کر دے اور مشرق کی طرف واپس ہو جائے لیکن تکش نہ صرف اس مفتوحہ علاقے پر قابض رہنے کا خواھشمند تھا بلکہ وہ خلیفہ سے ولایت خوزستان بھی ہتھیا لینا چاھتا تھا۔ تکش کی بابت کہا جاتا ہے کہ اپنے پیشرو سلاجقہ (بشمول طُغْرِیل ثانی) کی طرح وہ بھی یہ مطالبہ کرتا تھا کہ بغداد کا دنیوی اقتدار تو اس کے حوالے کر دیا جائے اور خلیفہ عالم اسلام کی برائے نام بادشاھت پر قناعت کرے۔ اس موقع پر تو اس جھگڑے کا کچھ فیصلہ نہ ہوسکا، لیکن یہ تنازعہ تکش کے جانشین محمد نے جاری رکھا۔

ھمیں تکش اور قرہ ختائی کی باھمی جنگ

و جدال کا حال اس سے بھی کم معلوم ہو سکا ہے۔ ان لڑائیوں کا سب سے بڑا واقعہ، یعنی تکش کا بخارا کو تسخیر کرنا، بقول ابن الأثیر (طبع تورنبرگ Tornberg، ۱۲ : ۸۸ ببعد [طبع الاستقامۃ قاهرة، ۹ : ۲۳۲])، ۵۹۴ھ/۱۱۹۸ء میں ہوا۔ البتہ محمد بن مؤید البغدادی کے جمع کردہ وثائق رسمیہ [موسوم به التوسّل الی الترسّل، تہران ۱۳۱۵ ش، ص ۱۲۵] بابت سالہای ۵۷۶ تا ۵۷۹ھ میں ایک دستاویز اس کے متعلق بھی ہے۔ بہر صورت یہ کامیابی محض عارضی تھی، اور گو اسلامی دنیا میں تکش کو بڑا صاحبِ اقتدار بادشاہ مانا جاتا تھا، وہ اپنی وفات تک قرہ ختائی کا باجگزار ہی رہا۔

مآخذ: قب خصوصاً (۱) سلسلۂ مطبوعات وقفیۂ گب، ۱/۱۴، (حمداللہ [مستوفی] قزوینی: تاریخ گزیدہ)، ۴۹۱ تا ۴۹۳؛ (۲) وہی سلسلہ ۱۶/۲ [جوینی: تأریخ جہان گشا]، ۱۷ تا ۳۶؛ (۳) ایضاً، سلسلۂ جدیدہ، ۲، راوندی [: راحة الصدور]، ۳۷۵ تا ۳۹۹؛ (۴) ابن الأثیر: الکامل، طبع Tornberg، اشاریہ؛ (۵) بارٹولڈ W. Barthold: *Turkestan v epokhu mongol' skago nashestviya*، ۲ : ۳۶۱ تا ۳۷۴؛ (۶) وہی مصنف: *Turkestan down to the Mongol Conquest*، *G. M. S.*، سلسلۂ جدیدہ، ۵ : ۳۳۷ تا ۳۴۹؛ — محوّلۂ بالا سرکاری دستاویزات کے لیے قب *Catal. Lugd.*، ۱ : ۱۶۹ ببعد؛ اقتباسات در بارٹولڈ: کتاب مذکور، ۱ : ۷۳ ببعد، [دستاویزات کی طباعت کا ذکر اوپر آ چکا ہے]۔

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

تَکْفِیْت: (پچی کاری inlay) حبیب زیّات نے الخزانۃ الشرقیۃ (بیروت ۱۹۳۷ء، ۲ : ۱۰۵) میں لکھا ہے کہ "تَکْفِیْت" کا مطلب "پچی کاری (یا جڑت کا کام) ہے، یعنی کسی بیش قیمت دھات کو کسی ادنی دھات کے اندر پچی کر کے جما دینا"۔ یہی مصنف یہ بھی بیان کرتا ہے کہ تَکْفِیت اور تَطْعِیم (لفظی ترجمہ 'پیوند کاری') عملاً مترادف ہیں لیکن تَکْفِیت دھات کی پچی کاری ہے اور تطعیم لکڑی کے کام میں ہاتھی دانت یا آبنوس بلکہ سیپ کی پچی کاری کو بھی کہتے ہیں۔ دھات کی پچی کاری کرنے والے کو 'کُفْتِی' کہتے ہیں اور اس قسم کا کام 'کُفْت' کہلاتا ہے (جمع کُفْتات یا اَکْفات)۔ 'سوق الکُفْت' کی ترکیب سب سے پہلے ابن الوردی مؤرّخ کے ہاں اشعار میں ملتی ہے، جن میں اس آتش زدگی کا ذکر ہے جس نے (۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء میں) دمشق کے پچی کاروں کا بازار تباہ کر دیا [ابن الوَرْدی: تتمة تأریخ المختصر فی اخبار البشر، طبع مصر، ۴ : ۱۳۲ میں مصنف نے اپنے المقامۃ الدمشقیۃ = صَفْو الرحیق فی وصف الحَرِیق سے تین شعر دیے ہیں مگر 'سوق الکفت' کی ترکیب ان میں نہیں آئی]۔ سوق الکُفْتِیِّین اور کُفْت (inlay) کی اصطلاحیں مقریزی کی خِطَط میں بھی آئی ہیں (طبع بولاق ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء، ۲ : ۱۰۵)۔ یہ حوالہ اس لیے قابلِ قدر ہے کہ اس کا مصنف (م ۸۴۵ھ/۱۴۴۲ء) مُحتَسِب یعنی بازار کا ناظر (انسپکٹر) تھا۔ زیادہ عام اصطلاحیں کَفْت، تَکْفِیت اور مُکَفَّت ہیں (مگر کوفت کی اصطلاح زیادہ تر ہندوستان میں رائج ہے)۔ عربی کا کلمۂ کُفْت بلاشبہہ فارسی کے مصدر کُوبیدن یا کُوفتن سے مأخوذ ہے، جس کا مطلب ہے کوٹنا اور اس دخیل کے مخصوص فارسی مآخذ اس قسم کی مصطلحات ہیں جیسے: "زر (یا طلا) کُوفت" یعنی سونے کی جڑت والی چیز، "سیم (یا نقرہ) کُوفت" یعنی چاندی کی جڑت والی چیز، یا "مِس کُوفت" یعنی تانبے کی پچی والی چیز۔ مِس کوبی، طلا کوبی، یعنی تانبے، چاندی یا سونے

کی جڑت یا پچی کاری، ''کوفت گر'' یعنی سونے کی پچی کاری کرنے والا، ''کوفت گری'' یعنی سونے کی پچی کاری ۔ ''کُوفتہ کردن'' کسی (بیش قیمت) دھات کو (کسی ادنٰی) دھات میں جڑنے کو کہتے ہیں ۔ (عربی کی اصطلاحات کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ D.S. Rice بعنوان *Studies in Islamic Metal Work*، در *Bulletin of the School of Oriental and African Studies*، جلد ۱۷: شمارہ ۲، ۱۹۵۵ء، ص ۲۲۸ تا ۲۲۹) ۔

عملاً ہمارا مقالہ پچی کاری یا جڑت کی ان تمام شکلوں پر حاوی ہے جو اسلامی ممالک میں رائج ہیں، لہذا ہمارے موضوع (تکفیت) کی بنیادی تعریف یہ ہے کہ تکفیت یا پچی کاری تزیینی فن کا ایک اسلوب ہے، جس سے کام لے کر فن کار بیش قیمت یا زیادہ رنگین، سخت اور معمولاً زیادہ تابناک چیز کو زیادہ چوڑی زمین میں پچی کرتا ہے جو کم قیمت اور معمولاً مختلف جنس کی ہوتی ہے اور جس کی سطح نسبۃً دھندلی، بلا تزیین یا کم سے کم ادنٰی تزیین کی ہوتی ہے ۔ اس تعریف کی رو سے متعدد ملتی جلتی تزیینی صنعتیں ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہو جاتی ہیں، مثلاً فُسَیفَساء[1] کی پچی کاری (mosaic)، کیونکہ اس میں بہت سے چھوٹے مکعب (*opus tesselatum*) یا بڑے ٹکڑے (*opus sectile*) پوری سطح کو پاٹ دیتے ہیں، اسی طرح رنگ برنگ کے پلاسٹر (گچ) سے خانہ بندی، یا لعاب دار کام (انیمل) یا چاندی وغیرہ پر کندہ لکیروں میں سیاہ مسالے کی بھرتی کا کام (niello work یا میناکاری)، کیونکہ نرم یا سفوفی مادے جو لگائے جاتے ہیں وہ صرف آخری مرحلے پر پہنچ کر سخت ہوتے ہیں (مذکورہ سیاہ بھرتی (niello) بھی بہر حال اردگرد کی زمین سے مدّھم اور تیرہ‌تر ہوتی ہے) اور آخر میں تطبیق کا کام (appliqué work، مثلاً کاغذ پر کاغذ، پارچے پر پارچے، ہاتھی دانت پر دھات اور لکڑی پر چمڑے کا کام)، کیونکہ یہ تمام اشیاء ان حصوں کے بالکل اوپر لگائی جاتی ہیں جن کی تزیین مقصود ہو اور اکثر اسی جنس کی ہوتی ہیں ۔ جڑت کا کام بعض تزیینی صنعتوں کے علاوہ فنِ تعمیر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اگرچہ اسلامی دنیا میں اسے عمومیت حاصل نہیں ہوئی البتہ مخصوص ممالک میں اور مختلف زمانوں میں ایسا ہوتا رہا ہے ۔

* * *

فنِ تعمیر میں اس صنعت کی اہم مثالیں دو ہیں: ایران میں کاشی کاری اور ہندوستان میں سنگِ مرمر یا جواہرات کی نگینہ کاری یا جڑت کا کام ۔ ہو سکتا ہے کہ کاشی کاری کے کام کا خیال اس طرح پیدا ہوا ہو کہ بعض لوگ اپنے مکانوں کی دیواروں میں اور عام طور پر بیرونی دروازے کے اوپر یا قریب نیلے یا سبز چوکے یا ان کے ٹکڑے لگا دیا کرتے تھے تا کہ یہ چیزیں اپنا طلسمی اثر دکھائیں، خاص کر ارواحِ خبیثہ کو داخل ہونے سے روکیں اور گھر کے مالکوں کو نظر بد سے محفوظ رکھیں ۔ اس قسم کی سادہ پچی کاریاں اب بھی عراق کے دیہات میں پائی جاتی ہیں، بلکہ شمال مشرقی ایران کے شہر مَراغہ میں گنبدِ سرخ جیسی فنکارانہ عمارت کے باہر بھی اس قسم کے چوکے اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے اور کیفما اتفق لگے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ گنبد مذکور کی تاریخ

(۱) یہ کلمہ لغت یونانی سے مشتق ہے ۔ اس سے مراد ہیں آرائشی موضوعات جو شیشے یا پتھر کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگ کے اجزاء کو گچ یا سیمنٹ پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو جما دینے سے ترکیب پاتے ہیں ۔ یہ آرائشی موضوعات ھندسی، نباتی یا زندہ کائنات کی تصویروں پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ اکثر صورتوں میں یہ چھوٹے چھوٹے اجزاء باریک مکعّبوں کی شکل کے ہوتے ہیں ۔ (زکی محمد حسن: فنون الاسلام، قاہرۃ ۱۹۴۸ء، ص ۶۶۳) ۔

تعمیر ۵۴۲ھ / ۱۱۴۷ء ہے ـ سب سے پہلی عمارتیں جن میں روغنی چوکے جمائے گئے تھے وہ پانچویں صدی ھجری / گیارھویں صدی میلادی میں تعمیر ھوئی تھیں ـ یہ ۱۰۵۸ء کے لگ بھگ دامغان کی مسجد جامع کے منار سے شروع ھوتی ھیں ـ پھر خراسان میں تربتِ حیدری کے پاس ھمارے زمانے کے قریۂ سنجان میں ایک ویران شدہ عمارت کے قبےدار کمرے میں بھی، جو تقریباً ۵۰۰ھ / ۱۱۰۶ء میں بنا تھا، ایسے چوکے نظر آتے ھیں ـ کہیں تو یہ کیفیت ہے کہ اینٹوں یا پلاسٹر (گچ) کے کسی وسیع تر نقشے میں یہ چھوٹے چھوٹے خاص شکل و صورت کے چوکوں کے ٹکڑے جن کے لعاب (glaze) کا رنگ فیروزی سبز یا گہرا نیلگون ہے مرکزی حیثیت رکھتے ھیں ـ کہیں انھیں جوڑ کر کوفی خط میں کوئی کتبہ تحریر کیا ہے یا کسی قدر بعد کے زمانے میں پُرکار، پیچیدہ، ھندسی نقش و نگار والی سطح پر ان کے پٹکے بنائے گئے ھیں ـ مؤخّرالذکر اسلوب کا قدیم‌ترین نمونہ جو اب تک محفوظ ہے مراغہ کا وھی گنبدِ سرخ ہے جو ۵۴۲ھ میں بنا تھا ـ یہ فنی اسلوب ایران میں اور خصوصاً آذربایجان میں تو عام رھا ہے لیکن اس کے نظائر اوزجند (روسی ترکستان میں سمرقند سے کئی سو میل مشرق کی طرف) کی ایک عمارت (تاریخِ تعمیر ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء) میں بھی پائے گئے ھیں ـ آٹھویں صدی ھجری / چودھویں صدی میلادی کے آغاز میں روغنی چوکوں کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک دوسرے سے اس قدر قریب اور اس طرح سے پیوست کر کے لگائے گئے کہ انھوں نے پوری سطح پر ایک مکمّل نقش کی شکل اختیار کر لی (شکل ۱)، یعنی جو پہلے محض کاشی کی جڑت (faience inlay) کا کام تھا وہ اب، پوری سطح کی کاشی کاری (faience mosaic) بن گیا، لہٰذا ھمارے اس مقالے کے دائرے سے خارج ہے ـ یہ جدید صنعت آٹھویں صدی ھجری / چودھویں صدی میلادی سے دسویں صدی ھجری / سولھویں صدی میلادی تک ایرانی فنِ تعمیر میں عام رھی ـ اس کا قدیم ترین نمونہ سلطانیہ میں منگول سلطان الجایتو خدا بندہ کا مقبرہ تھا، جس کی تعمیر ۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ء میں شروع ھوئی ـ اگرچہ یہ صنعت پہلے سے سلجوقی اناطولیا میں بھی کامیابی سے کام میں لائی جا رھی تھی جیسا کہ قونیہ کی کئی عمارتوں سے، جو ۶۱۷ھ اور ۶۷۰ھ / ۱۲۲۰ء اور ۱۲۷۰ء کے درمیانی دور کی ھیں، ثابت ھوتا ہے ـ لعابی جڑت کے کام کے اس تمام ابتدائی ارتقاء کا حال ولبر Donald N. Wilber نے بیان کیا ہے: "*The Develpment of Mosaic Faience in Islamic Architecture in Iran*" در *Ars Islamica*، جلد ۶ (۱۹۳۹ء): ص ۱۶ تا ۴۷ ـ

مصر میں دورِ ممالیک کے ماھرینِ تعمیرات نے مسجدوں اور مدرسوں میں قبلے کی دیوار خصوصاً محراب میں اور صحن کے فرش پر تقریباً ھمیشہ بڑی تقطیع (*opus sectile*) کی خاتم بندی سے کام لیا تاکہ ان سے بڑے پُرکار نقش و نگار بنائے جا سکیں ـ کہیں کہیں ایسے حصے بھی نظر آتے ھیں جن میں مختلف رنگ کے پتھر کی تہ زمین پر رنگین مرمر کی جڑت کی ہے ـ مثال کے طور پر قاھرۃ میں بیبرسِ ثانی کی خانقاہ کے دروازے کے مرغول میں یہ چیز موجود ہے اور اس کی تاریخ ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء ہے (*Les Mosquées* : Louis Hautecoeur et Gaston Wiet *du Caire*، پیرس ۱۹۳۲ء، ج ۲ لوحہ ۹۹)ـ

ھندوستان کی یادگاری عمارتوں میں پچی کاری کی حالت یہ ہے کہ قطب صاحب والے مجموعۂ عمارات میں علائی دروازے (۷۱۱ھ / ۱۳۱۱ء) میں اور غیاث‌الدین تغلق کے مقبرے (۷۲۵ھ /

۱۳۲۵ء) میں سفید مرمر محض اس لیے استعمال کیا گیا کہ عمارت کے خاص خاص اجزاء (مثلاً بڑے دروازے، دریچے اور محرابیں) نمایاں ہو جائیں - لیکن دسویں اور گیارھویں صدی ہجری / سولھویں اور سترھویں صدی میلادی میں معلوم ہوتا ہے کہ اس رجحان نے قلبِ ہیئت سے زیادہ تزیینی صورت اختیار کر لی - نتیجہ یہ ہوا کہ سنگِ سرخ میں، جس سے یہ عمارتیں تعمیر کی جاتی تھیں، سفید سنگِ مرمر کی پیچیدہ پچی کاری کی جانے لگی- مثلاً مغل عمارتوں کو دیکھیے، جن میں آرائشی کام روز بروز زیادہ اہتمام سے کیے جانے لگے - ان کے نمونے یہ ھیں: دورِ اکبری میں : قلعۂ آگرہ (دھلی دروازہ، ۱۵۶۶ء)، جس میں رنگین چوکے بھی جڑے ھیں؛ جہانگیری محل (حدود ۱۵۷۰ء)؛ دھلی میں مقبرۂ ھمایوں (آغاز ۱۵۶۴ء میں)؛ فتح پور سیکری میں جامع مسجد اور بلند دروازہ (۱۵۷۰ تا ۱۵۸۰ء) - دورِ جہانگیری میں : سکندرے میں اکبر کا مقبرہ (مختتمہ ۱۶۱۲ - ۱۶۱۳ء)؛ آگرے میں مقبرۂ اعتماد الدولہ کا دروازہ (آغاز ۱۶۲۶ء) - دورِ شاھجہانی میں : تاج محل کا دروازہ (حدود ۱۶۳۲ء)؛ دھلی اور آگرے کی جامع مسجدیں (۱۶۴۴ تا ۱۶۵۸ اور ۱۶۴۸ء)؛ لاھور کی بادشاھی مسجد وغیرہ (۱۶۷۴ء)- یہی صنعت شیر شاہ سوری نے (جس نے مغل سلطنت پر بزور قبضہ کر لیا تھا) دھلی کے پرانے قلعے یا قلعۂ کہنہ میں استعمال کی (۱۵۴۵ء)، جس میں سفید مرمر اور دوسرے رنگوں کے پتھروں سے کام لیا گیا - آگرے میں جہانگیر کے خسر اعتمادالدولہ کے مقبرے کی ساخت (۱۶۲۶ء) میں ایک نئی صنعت سے کام لیا گیا، جسے مغربی کتابوں میں اکثر "*pietra dura*" لکھتے ھیں، یعنی [بزبان اطالوی] سفید سنگِ مرمر میں کم قیمت جواھر یا نگوں کی نگینہ کاری - یہ صنعت بعد کی بہترین مغل عمارتوں کا طرۂ امتیاز بن گئی ، خاص کر ان عمارتوں کی جو شاہ جہان نے تعمیر کرائیں، مثلاً قلعۂ دھلی میں حمّام اور خاص محلّ ؛ قلعۂ آگرہ میں دیوان خاص ، مثمّن برج ؛ تاج محلّ (حدود ۱۶۳۴ء) وغیرہ .

نسبۃً محدود تر فنی دلچسپی کی چیز چھوٹے چھوٹے آئینے جڑنے کی صنعت ھے - گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی میلادی میں ھندوستان کے مغلوں کے محلّات کے دولتی ایوانوں کی اندرونی دیواروں پر چھوٹے چھوٹے شیشے جڑے جاتے تھے (خصوصاً آگرے اور لاھور کے قلعوں کے شیش محل میں)؛ اس کے علاوہ ایران میں عہد قاچار کے شاھی محلوں اور شہروں کے عالیشان مکانات میں بھی ایسی آئینہ کاری کا رواج تھا (تیرھویں صدی ہجری/ انیسویں صدی میلادی) .

اسلامی ممالک میں تزیینی فنون کے دائرے میں پچی کاری کا سب سے زیادہ استعمال دھات ھی کے کام میں ھوتا تھا - اس کی عربی و ایرانی اصطلاحات اوپر بیان کی جا چکی ھیں؛ پیتل اور کانسی میں دھاتوں کی پچی کاری کے اسلوب کا مفصّل حال Herbert Maryon : *Metal Work and Enamelling*، طبع سوم، لنڈن ۱۹۵۴ء، ص ۱۴۸ تا ۱۶۰ میں ملے گا - کسی قدر مختصر تر بیان D. S. Rice کے مقالے "Studies in Islamic Metal Work-IV"، در *Bulletin of the London School of Oriental and African Studies*، جلد ۱۵، نمبر ۳، ۱۹۵۳ء: ص ۴۹۸ تا ۴۹۹ میں موجود ھے .

قدیم ترین مثالیں ایران میں ملتی ھیں جہاں کانسی یا پیتل کے ساسانی انداز کے برتنوں میں، جو غالباً دوسری اور چوتھی صدی ہجری / آٹھویں اور دسویں صدی میلادی کے درمیان تیار ھوے، سرخ تانبے کی پچی کاری بیل بوٹوں یا

جانوروں کی تصاویر کے خاص خاص حصوں میں کی گئی ہے ۔ چھٹی صدی ھجری/ بارھویں صدی میلادی میں پچی کاری کے ایک نئے اسلوب کا رواج ھوا اور پیتل اور کانسی کے برتنوں میں چاندی کی اور اس کے علاوہ مزید تانبے کی پچی کاری (شکل ۲) ھونے لگی ۔ قدیم‌ترین مؤرخ نمونے جو محفوظ ھیں، ان میں ۵۴۲ (یا ۵۴۳)ھ / ۱۱۴۸ء کا ایک قلمدان ھے، جس میں سادہ سی نقرئی پچّی کاری کی گئی ھے؛ اس کے علاوہ ڈول کی شکل اور نسبةً کہیں زیادہ پیچیدہ ساخت اور صنّاعی کا ایک ظرف ھے، جس سے حمام میں گرم پانی انڈیلا جاتا تھا ۔ یہ ظرف، جس میں چاندی اور تانبے کی بھرپور پچی‌کاری کی گئی ھے اور ''ظرف بوبرنسکی'' ("Bobrinski bucket") کے نام سے مشہور ھو گیا ھے، ۵۵۹ھ / ۱۱۶۳ء میں بمقام ھرات بنایا گیا تھا ۔ یہ دونوں ظرف موزۂ ھرمی ٹیج (Hermitage Museum) میں محفوظ ھیں ۔ [اس ظرف کو محمد بن عبدالواحد اور مسعود بن احمد نے بنایا، اس کے حال کے لیے دیکھیے الفنون الاسلامیة، ص ۳۴۲، شکل ۱۰۴] ۔ یہ صنعت مشرقی ایران سے ایران کے دوسرے حصوں میں، پھر 'الجزیرہ (موصل)' شام (دمشق و حلب) (شکل ۳) اور مصر (قاھرة) میں پھیل گئی ۔ اس صنعت کے نشر و اشاعت پر منگولوں کے حملے کا بہت اثر پڑا، جس نے صنّاعوں کو ایران سے نکلنے پر مجبور کیا اور اس طرح یہ صنعت اور اس کے امتیازی نقوش و موضوعات (motifs) جگہ جگہ پہنچ گئے ۔ اس معاملے میں موصل کے دبستان نے بہت ناموری حاصل کی اور بہت سے صنّاع اپنے استادانہ ساخت کے ظروف پر اپنا نام ثبت کرتے وقت فخریہ اپنے آپ کو 'الموصلی' لکھتے تھے ۔ لیکن صرف ایک ظرف ایسا ملا ھے جس پر موصلی کاریگر کے دستخط اور تاریخ کے ساتھ یہ بھی لکھا ھوا ھے کہ وہ ظرف موصل میں بنایا گیا تھا، اس ''قرابۂ بلاکاس'' ("Blacas-ewer") پر نہایت پرُ تکلّف پچی‌کاری ھوئی ھے اور یہ برٹش میوزیم میں موجود ھے ۔ اس پر تاریخ ۶۲۹ھ / ۱۲۳۲ء درج ھے ۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا نقش و نگار زیادہ دقیق اور نازك ھوتے چلے گئے، خصوصاً ساتویں صدی ھجری/ تیرھویں صدی میلادی میں؛ آٹھویں صدی ھجری/ چودھویں صدی میلادی میں یہ نقوش نسبةً زیادہ بد نما ھونے لگے اور ان میں زوال کے آثار شروع ھو گئے (شکل ۴) اور نویں صدی ھجری/پندرھویں صدی میلادی کے اواخر میں انھیں کبھی کبھار ھی بنایا جاتا تھا ۔ تاھم پیتل پر پچی‌کاری کا کام مشرقِ قریب میں کبھی کاملاً نابود نہیں ھوا اور آج کل بھی تانبے اور چاندی کی پچی‌کاری، بالخصوص قاھرة کی کارگاھوں میں، پھر کی جا رھی ھے ۔

نویں صدی ھجری/پندرھویں صدی میلادی کے وسط میں پہنچ کر ھمیں دھات کے کام اور پچی‌کاری کے ظروف کے متعلق بہترین تاریخی معلومات ملنے لگتی ھیں، یعنی مقریزی کی خِطَط سے (دیکھیے طبع بولاق ۱۲۷۰ھ، جلد دوم، صفحہ ۱۰۵) ۔ اس زمانے میں بھی قاھرة میں متعدد ایسی دکانیں موجود تھیں جو پیتل یا تانبے پر سونے اور چاندی کی جڑت ['النحاس المکفّت'] کا کام کرتی تھیں اور کثیر تعداد میں مال تیار کرتی تھیں، جو خوب فروخت ھوتا تھا، کیونکہ لوگوں کو اس مال کی طرف بے حد رغبت تھی ۔ '' قاھرة اور مصر میں شاید ھی کوئی گھر ایسا ھوگا جس میں پچی‌کاری کیے ھوے متعدد پیتل تانبے کے ظروف موجود نہ ھوں'' ۔ مقریزی نے خاص طور پر لکھا ھے کہ [مکفّت چیزوں کا ''دَکّہ'' دلھن کے جہیز کا لازمی جز تھا ۔ دَکّہ چوبی تخت ('السریر') کی طرح کی چیز تھی، جس میں عاج و آبنوس کی جڑت ھوتی تھی یا اس پر روغن کر دیتے تھے ۔

اس ڈبے پر پچی کاری والے پیتل کے سات سات بڑے چھوٹے طاس اور طبق، جو ایک دوسرے کے اندر آجاتے تھے، رکھے جاتے تھے اور اسی طرح چراغ دان اور چرخ اور اُشنان کے ڈبے ('حِقاق') اور طشت و ابریق اور بخوردان ۔ یہ سب ظروف مُکفّت ہوتے تھے اور ڈبّے میں مشمول تھے] ۔ مقریزی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس قسم کے پچی کاری کیے ہوے تانبے کے ظروف کا استعمال اُس کے اپنے زمانے میں کم ہو گیا ہے ۔ ان اشیاء کی کمیابی کی وجہ مقریزی کے نزدیک یہ تھی کہ "بعض لوگوں نے کچھ سالوں سے نفع‌اندوزی کی خاطر ان اشیاء کو تا حدّ امکان خرید خرید کر ان میں جڑی ہوئی دھاتیں نکالنا شروع کر دی ہیں" ۔ پیتل کا ایک نہایت نفیس طشت موجود ہے، جس پر ہندسی ڈیزائن کے اندر نقوشِ عربی، پھول پتے اور منّبت کاری کی آرایش ہے اور اس میں سونے اور چاندی کی پچی کاری کی گئی ہے ۔ اس پر مملوک سلطان قایت بای (۸۷۲ تا ۹۰۱ھ / ۱۳۶۷ تا ۱۴۹۶ء) کا نام لکھا ہے (یہ ظرف طوپ قاپو سراے، استانبول میں موجود ہے)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلاسیکی دَور کے اواخر میں بھی بہترین قسم کے ظروف بنائے جا سکتے تھے؛ اگرچہ ایک آفتابہ، جو اس سلطان کی ملکہ کے لیے تیار کیا گیا (اور اب لنڈن کے موزۂ وکٹوریا و البرٹ میں ہے)، اتنا ضخیم بنا دیا گیا ہے اور اُس کے نقش و نگار ایسے بے لوچ سے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ واقعۃً یہ انحطاط کا زمانہ تھا اور اکثر صنّاع بجا و درست اور موزون و مناسب کے بےخطا احساس سے بالعموم محروم ہو چکے تھے ۔

ایرانی تکفیت کے ڈیزائن کوفی اور نسخی خط کے کتبوں کے علاوہ انسانی، حیوانی اور رمزی صور و اشکال سے بھرے ہوے ہیں (بادشاہ اور اس کا دربار، شکار، جنگ اور چوگان‌بازی کے مناظر، آرائشی پٹیوں پر شکاری کتوں کی تصویریں، جانورانِ شکاری اور عجیب و غریب خیالی حیوانات اور سیاروں اور بروجِ دوازدگانہ کی رمزی اشکال) ۔ عراق کا اسلوب بھی اسی جنس کا ہے، لیکن اس میں نقوش عربی اور پیچا پیچ نقشے (fret motifs) زیادہ ہیں ۔ ملکِ شام کے اسلوب میں اشکال و صُوَر زیادہ نہیں، مگر نقوشِ عربی، خط کوفی کے نقشے اور پرندوں کی شکلیں زیادہ پائی جاتی ہیں ۔ اس کی ایک خصوصیت، جو اگرچہ اتنی عام نہیں لیکن بہر حال ہے ضرور، یہ ہے کہ اس میں مسیحی موضوعات ہیں ۔ مصری ظروف کے ممتاز اور اہمّ نقوش خط ثُلث کے جلی کتبات ہیں، جن میں عام طور پر ان لوگوں کے نام لکھے گئے ہیں جن کی فرمائش پر وہ ظرف بنایا گیا، یا کم سے کم ان کے القاب اور شعارہای خانوادگی درج کیے گئے ہیں ۔ سرخ تانبے کی پچّی کاری، جو مشرقی ایران کے کام کا مخصوص نشان تھی، ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی میلادی میں نادر و کمیاب اور اس صدی کے وسط تک بالکل ہی ناپید ہو گئی ۔ سونا جزورسی سے صرف کیا جاتا تھا اور وہ بھی صرف ساتویں سے نویں صدی ھجری/تیرھویں سے پندرھویں صدی میلادی تک ۔

ہندوستان میں ظروف کی پچی کاری کا ایک خاص طرز، جو زیادہ‌تر دکن میں استعمال کیا جاتا تھا لیکن لکھنئو، پُورنیا اور مرشدآباد میں بھی مروّج تھا، "بِدری" کہلاتا تھا (دیارِ مغرب میں اسے Bidree، اور Bidry بھی لکھا جاتا ہے)، بِدری شہر بِیدر سے منسوب ہے، جو حیدرآباد دکن سے ۷۵ میل شمال مغرب کی طرف ہے اور اس صنعت کا بڑا مرکز تھا ۔ کاریگر ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی ۔ اس صنعت میں گلاب پاش، ڈبّے، حقّے کی فرشیان اور

[پیالے] وغیرہ تیار کرنے میں جو بنیادی چیز استعمال کی جاتی وہ جست اور تانبے کی مرکّب دھات تھی، جس پر چاندی کی جڑت کے بعد ظروف کو سیاہ کر دیا جاتا تھا ۔ اس صنعت کے ظروف گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی میلادی سے پیشتر کے دستیاب نہیں ہوے اور ہندوستان کے برِّصغیر کے باہر یہ بہت کم پائے جاتے ہیں ۔ مغرب میں ان کا سب سے بڑا ذخیرہ لنڈن کے موزۂ وکٹوریا و البرٹ کے ہندوستانی شعبے میں ہے ۔ حال ہی میں بیدر کے گورنمنٹ انڈسٹریل سکول میں اس صنعت کا احیاء کیا گیا ہے ۔ سمتھ G. Smith نے بدری ظروف کے تیار کرنے کی جو کیفیت لکھی ہے وہ *Madras Lit. Soc. Journal*, new series ، ۱ : ۸۱ تا ۸۳ میں مل سکتی ہے ۔ ان کے علاوہ دو اور مآخذ بھی ہیں: Sir G. Birdwood : *The Industrial Arts of India* (لنڈن ۱۸۸۰ء)، ص ۱۶۳ ببعد اور Trailokya Nath Mukharji : "Bidri-Ware" در *The Journal of Indian Art* ، جلد ۱ (۱۸۸۱ء) : ۴۱ تا ۴۴ اور ۹۸ .

پیتل/کانسی کی بہت سی اشیاء جو مختلف وضع اور مختلف استعمال کی ہیں، جن پر پچی کاری کی گئی ہے اور جو اس فن کے بہترین عہد (یعنی چھٹی سے آٹھویں صدی ہجری تک) سے متعلق ہیں، مشرقِ قریب (قاہرۃ ، استانبول ، طہران) ، یورپ (لنڈن ، پیرس ، برلن ، لینن گراڈ ، فلارنس) اور ریاستہاے متّحدہ [امریکہ] (نیویارک ، واشنگٹن ، بالٹی مور اور بوسٹن) کے عجائب‌خانوں میں محفوظ ہیں ۔ ایک سو سال سے زیادہ عرصے سے وہ موضوعِ بحث و تحقیق ہیں (سب سے پہلا محقق مائیکل اینجلو لانچی ۔ Michel angelo Lanci اطالوی تھا، جس نے ۱۸۴۵ - ۱۸۴۶ء میں ان کے متعلق ایک کتاب بھی شائع کی) اور روز بروز مزید تحقیقات جاری ہے، کیونکہ ان میں نفیس ترین تزئینات بافراط پائی جاتی ہیں اور اس کے علاوہ ان پر اکثر اس شخص کا نام مل جاتا ہے جس کے لیے وہ چیز تیار کی گئی تھی (عموماً کوئی فرماں روا یا امیر)، نیز صنّاع کا نام اور تیاری کی تاریخ اور مقام کا نام جہاں اسے تیار کیا گیا تھا .

جس زمانے میں پیتل اور کانسی کی پچی کاری کی صنعت رو بہ انحطاط تھی (یعنی نویں صدی ہجری میں) تو ایران، ترکی، ہندوستان بلکہ سپین تک میں فولاد تک کے ہتھیاروں میں سونے اور چاندی کی پچی کاری کرنے کا مذاق (فیشن) عام ہو گیا، اسی لیے اسلحہ کے بہت سے نمونے ملتے ہیں؛ مثلاً خَود ، سپاہی اور گھوڑے کی زرہ، تلواریں، خنجر اور بندوقیں ، جنھیں اس صنعت سے مزیّن کیا گیا ہے اور جس صنعت سے خاص طور پر ایران، ترکی اور ہندوستان میں تقریباً خود ہمارے زمانے تک کام لیتے رہے ہیں۔ ان اسلحہ پر زیادہ تر کتبے لکھے گئے ہیں اور نقوش عربی سے گل کاری کی گئی ہے، لیکن جانوروں اور بعض اوقات انسانوں کی شکلیں بھی پائی جاتی ہیں .

دھاتوں میں پچی‌کاری کی ایک خاص صورت یہ ہے کہ جواہرات کو پخیں تراشنے کے بغیر جِلا دے کر (cut cabochon) سونے یا چاندی میں پچی کر دیتے ہیں ۔ شاید اس عمل کو ترصیع یا ٹنکائی کہنا زیادہ موزوں ہوگا ۔ ترکی میں گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی میلادی میں اس صنعت سے ظروف، آئینوں ، گھڑیوں ، زیوروں ، بندوقوں ، پستولوں اور درباری اور تشریفاتی اسلحہ میں کام لیتے تھے ۔ زارانِ روس کے خزانے میں ، جو اب کریملن Kremlin کا عجائب‌خانہ ہے ، ایک طلائی پایوں کی کشتی اور ایک قرابہ موجود ہے، جن میں لعل، زمرد ، الماس اور فیروزے جڑے ہوے ہیں ۔ یہ اسی قسم کی ترکی صنعت کا نمونہ ہے ۔ اس پر تاریخ ۱۶۹۲ء دی ہے ۔ اس نمونے کا کام ایران میں بھی

ہوتا تھا گو ذرا کم، جیسا کہ گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی میلادی کے ایک نقرئی گلاب پاش سے ظاہر ہوتا ہے، جس میں سونا، لعل، زمرد اور فیروزوں کی نگینہ کاری کی گئی ہے ۔ یہ گلاب پاش ''طوپ قاپو سراي موزہ سی'' استانبول میں موجود ہے ۔ خاص مقاصد کے لیے فولاد کو بھی اسی طریق سے مزیّن کیا جا سکتا تھا ۔ اس کی مثال ایک ڈھال ہے، جس میں جواھرات جڑے ھیں ۔ اس کی تاریخ بھی وھی گیارھویں صدی ھجری / سترھویں صدی میلادی ہے اور یہ سٹاک ھوم Stockholm کے شاھی اسلحہ خانے میں رکھی ہے ۔ اس قسم کے جڑاؤ کام کے لیے اصطلاحات یہ ھیں : تَرْصِیع، مُرَصَّع، 'مرصع کاری' 'مرصع کار' .

اسی صنعت کے جوڑ کا ھنر یشب کے ظروف و اشیاء میں جلا دے کر ناتراشیدہ جواھرات کی جڑائی ہے، مثلاً قلمدان، کشتیاں، حقّے کی فرشیاں، ڈبّے، دستار کے زیور، انگشتانے (تیر اندازوں کے لیے)، آئینوں کے چوکھٹے اور خنجروں کے دستے، جو گیارھویں صدی ھجری / سترھویں صدی میلادی میں عہد مغلیہ میں تیار کیے جاتے تھے ۔ ان بیش بہا اشیاء میں سے بہت سی اب تک ھندوستان اور برطانیۂ عظمٰی میں (خصوصاً موزۂ وکٹوریا و البرٹ میں) محفوظ ھیں ۔ ایک یشب کا پیالہ ایسا موجود ہے جو زر و نقرہ سے مرصّع اور عربی نقوش سے مزیّن ہے ۔ یہ تقریباً دسویں صدی ھجری / سولھویں صدی میلادی کا ہے ۔ اس کی تزئین کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایران میں بنا ہوگا، لہٰذا ہو سکتا ہے نہ یہ صنعت ھندوستان کے باھر بھی کام میں لائی جاتی رھی ھو .

ایک اور چیز جو ا نثر پچی کاری کا تختۂ مشق بنی لکڑی ہے ۔ اس قسم کے کام کے تین بنیادی نمونے ھیں : ایک نمونے میں عام طور پر ھاتھی دانت کی چھوٹی چھوٹی اکائیاں اور کوئی زیادہ قیمتی لکڑی، مثلاً آبنوس، استعمال کی جاتی ہے؛ انھیں ملا کر خاتم کاری کے طور پر لکڑی کی ایک کلاں تر اکائی میں تختۂ شطرنج، ستارہ یا کسی اور شکل میں جما دیا جاتا تھا ۔ یہ صنعت صراحةً وھی ہے جس کے لیے ''تطعیم'' کی اصطلاح استعمال کی جانی چاھیے، کیونکہ مقریزی نے دَکّہ کا ذکر کیا ہے، جس پر دلھن کا جہیز لے جاتے تھے [دیکھیے ص ۶۰۱] اور وہ چوبی اور ھاتھی دانت اور آبنوس سے ''مُطَعَّم'' ھوتا تھا ۔ اس صنعت کا ایک قدیم نمونہ مرّاکش کی قُطُبِیّۃ مسجد کا منبر ہے، جو المُوحّدی فرمان روا تاشْفِین کے لڑکے کے حکم سے بنایا گیا تھا، لہٰذا ۵۳۴ھ / ۱۱۴۰ء سے بعد کا نہیں ہو سکتا ۔ مؤخّرتر دَور کی مثالیں یہ ھیں : ایک تو وہ منبر جو سلطان لاجین نے قاھرۃ کی مسجد ابن طولون میں ۶۹۶ھ / ۱۲۹۶ء میں رکھوایا اور ایک وہ دروازہ جو غرناطہ کے [قصر] الحمراء میں آٹھویں صدی ھجری / چودھویں صدی میلادی کے Casa de los Infantes (= ''قاعۃ الأطفال'') کے اسباب آرائش (فرنیچر، الماری وغیرہ) کا ایک پٹ تھا ۔ ایک اس کے بعد کی بغایت پُرکار چیز وہ شش پہلو چوبی میز ہے جس میں ھاتھی دانت اور آبنوس جڑا ہے اور جو ۷۷۰ھ / ۱۳۶۹ء میں سلطان شعبان ثانی کی مسجد میں موجود تھا اور اب قاھرۃ کے دارالآثار العربیّۃ میں محفوظ ہے ۔ یہ صنعت سپین میں عیسائیوں کی آخری فتح (۱۴۹۲ء) کے بعد بھی جاری رھی (اسے ھسپانوی زبان میں "taracea" کہتے تھے) ۔ بالجملہ اس کا رواج عام تھا اور اغلب ہے کہ اٹلی کی نشأۃ ثانیہ میں جو یہ فن اختیار کیا گیا تو وہ اسلامی ذرائع ھی سے آیا تھا ۔ یہ ایران میں اب تک ''خاتم کاری'' کے نام سے رائج ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ جڑائی اب

بوں اور چوکھٹوں بلکہ بڑے بڑے منبروں اور قبروں کے تعویذوں کی بھی پوری سطح پر حاوی ہوتی ہے (بعینہٖ جس طرح کاشی کی جڑت کا کام بالآخر ان کی پوری سطح کی کاشی کاری میں تبدیل ہو گیا تھا).

انھیں مصنوعات سے مربوط دوسرا بنیادی نمونہ وہ ہے جس میں ہاتھی دانت کے بڑے ٹکڑوں کی جڑت کی گئی ہے اور انھیں اکثر انسانی و حیوانی اشکال اور کتبوں کی صورت دی گئی ہے - یہ صنعت خاص طور سے سپین کے بنے ہوے ڈبّوں میں اور بظاہر صقلیہ میں بھی ساتویں صدی ہجری / تیرھویں میلادی میں رائج تھی - اپنی ہنری معنویت کے لحاظ سے ایسی مصنوعات پیتل اور کانسی کے مرصّع ظروف سے مشابہ تھیں، فرق صرف اتنا تھا کہ جڑت کے اجزاء ذرا بڑے تھے - فنی اعتبار سے عہد مغلیہ میں، خصوصاً ڈبوں اور صندوقوں کے سلسلے میں، خاتم کاری کا یہ طریقہ ہندوستان میں بھی رائج رہا - پھر جب یسوعی Jesuit پادریوں نے گیارھویں صدی ہجری / سترھویں میلادی کے اوائل میں اپنا گرجا لاھور میں بنایا تو اس کی عشاء ربانی کے تبرکات رکھنے کی چھوٹی میز (credence table) پر ہندی، مغلی اور مسیحی نقوش بنے تھے اور آبنوس میں ہاتھی دانت کی ترصیع تھی - یہ میز اب گرجے سے موزۂ وکٹوریا و البرٹ میں منتقل ہو چکی ہے.

اسی صنعت کی تیسری بنیادی صورت شاید سب سے زیادہ اہم ہے - اس میں ترصیع الگ الگ چھوٹی چھوٹی نمایاں شکلوں پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ پوری چیز ہی ہاتھی دانت (یا کسی نفیس لکڑی) کی تراشی جاتی ہے اور [حشو یا بھرتی کے طور پر] بڑی بڑی چوبی اشیاء مثلاً دروازے، محراب، منبر، کرسی وغیرہ میں جما دی جاتی ہے - یہ چیزیں خاص طور پر بڑے بڑے پیچیدہ ہندسی طرح کاری کے نقشوں (lay-outs) کی درمیانی خالی جگہوں کو پر کرنے کے لیے بطور آرائش استعمال کی جاتی ہیں - ان کا استعمال پہلے پہل غالباً فاطمیوں کے عہد کے اواخر یعنی چھٹی صدی ہجری / بارھویں میلادی میں ہوا، لیکن اس زمانے کا کوئی مکمّل نمونہ نہیں ملا - صرف حشوات (inserts) ملے ہیں، جن پر نقوشِ عربی اور انسانی اور حیوانی اشکال بڑی نفاست سے کندہ کی گئی ہیں - فاطمیوں کے معمولات کے خلاف اہل السنّت و الجماعت میں جو ردِّ عمل ہوا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سو سال تک اس قسم کا ہاتھی دانت کا کام، خصوصاً جب وہ تصاویر پر مشتمل ہو، متروک رہا - اگرچہ قلعۂ حلب میں نورالدین زنگی ۵۶۳ھ/ ۱۱۶۷ء کے زمانے کے نفیس کندہ کیے ہوے چوبی ٹکڑے ملتے ہیں، جنھیں ہندسی نقشوں میں جمانا مقصود تھا - ہاتھی دانت ساتویں صدی ہجری / تیرھویں میلادی کے اواخر اور آٹھویں صدی ہجری / چودھویں میلادی کے نصف اول میں مملوکوں کے ابتدائی ایّام میں پھر نمودار ہوا، لیکن اول اول محض حشوات (یعنی بھرتی کے چوبی ٹکڑوں) کے خطوطِ جدوَل میں استعمال ہوا (مثالیں : مقبرۂ ابن سلیمان ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء ؛ مسجد آق سُنقُر (۷۴۷ - ۷۴۸ھ / ۱۳۴۶ - ۱۳۴۷ء) کے منبر کا دروازہ اور مدرسۂ سلطان حسن (۷۵۷ تا ۷۶۴ھ/ ۱۳۵۶ تا ۱۳۶۲ء) کی "کرسی" - آٹھویں صدی ہجری / پندرھویں میلادی کے اوائل سے آیندہ پورے حشوات ہاتھی دانت کے بننے لگے، جن میں عربی نقوش کندہ ہوتے تھے اور جنھیں تقابل کی خاطر کبھی کبھی آبنوس کے چوکھٹے میں رکھ دیا جاتا تھا (مثالیں : منبرِ مدرسۂ عبدالغنی ۸۲۱ھ/ ۱۴۱۸ء؛ منبر و دروازۂ مسجد المؤیّد شیخ ۸۱۸ تا

۸۲۳ھ / ۱۴۱۳ تا ۱۴۲۰ء) - مملوکوں کے عہد کے اواخر میں یہ اسلوب کمال کو پہنچا ، جب تمام بھرت ہاتھی دانت کی ہونے لگی اور نقشے کے بڑے ستارے کا مرکز بہت ابھری ہوئی گل میخ کی صورت منبّت کیا جانے لگا (منبرِ مدرسۂ غوری ۹۰۸ - ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء) - عثمانی ترکوں کی فتح کے بعد سابقہ نقوش کی نقل سادہ شکل میں ہونے لگی ، روایت جاری رہی مگر کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی (مسجد محمد بک ابو ذھب ۱۱۸۷-۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۳ - ۱۷۷۴ء) - نجّاری کے کام میں لکڑی کے ھندسی خاکے کے اندر نہایت نفیس کندہ کار حشوات جڑنے کا ھُنر سپین میں موروں کے عہد میں اور مسیحی فتحِ اندلس کے بعد بھی (چودھویں سے سولھویں صدی میلادی تک) موجود تھا - اگرچہ من حیث المجموع نقش و نگار ویسے ھی ہوتے جیسے مصر میں استعمال کیے جاتے تھے لیکن جڑت کے حصے ہاتھی دانت کے نہیں بلکہ ہمیشہ چوبی ہوتے تھے .

چوبی اشیاء میں پچی کاری کی ایک اور شکل بھی ھے جو ترکانِ آلِ عثمان ھی سے مخصوص ھے ، اسے صَدَف کاری کہتے ھیں - اگرچہ اس اسلوب کے مطابق بنائی ہوئی چیز میں سیپ کی پچی کاری نمایاں ترین خصوصیت رکھتی تھی ، لیکن جڑت میں اکثر آبنوس اور ہاتھی دانت بھی شامل کر لیے جاتے تھے - کبھی کبھی کچھوے کے خول (ذَبْل) سے بھی کام لیا جاتا تھا اور بعض زیادہ بیش بہا چیزوں میں جواھرات استعمال کیے جاتے تھے ، مثلاً سلطان احمد اول (۱۰۱۲ تا ۱۰۲۶ھ / ۱۶۰۳ تا ۱۶۱۷ء) کا تخت اسی قسم کا ھے ، جو استانبول کے '' طوپ قپو سرای مُوزہ سی '' میں محفوظ ھے - اس صنعت سے نویں صدی ھجری / پندرھویں میلادی کے اواخر سے امکاناً مگر دسویں صدی ھجری / سولھویں میلادی سے یقیناً کام لیا جانے لگا تھا - (استانبول کے اسلامی اور ترکی آرٹ کے میوزیم میں قرآن مجید رکھنے کے لیے ایک صندوقچہ ھے ، جس پر ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء تاریخ دی ھے اور اس قسم کی مصنوعات کی فہرست بھی موجود ھے ، جس کی تاریخ ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء ھے) - یہ فن زمانۂ حاضر تک بھی ایک محدود پیمانے پر رائج رہا ، چنانچہ '' اکیڈیمی آو فائن آرٹس '' میں اس فن کا ایک اُستاد بھی متعین کیا گیا - اس صنعت کا زرّین دور دسویں صدی ھجری / سولھویں میلادی اور گیارھویں صدی ھجری / سترھویں میلادی کا زمانہ ھے - کیونکہ اس کے بعد ایک تو یورپی اثرات آ گئے ، دوسرے نقش و نگار کا دائرہ نسبۃً محدود سا ہو کر رہ گیا ؛ چنانچہ انحطاط پیدا ہو گیا - بعض اوقات اس کام کے متخصّص کاریگر بڑے اچھے ماھرینِ تعمیرات ثابت ہوے - ان میں سب سے زیادہ نامور سِنان اعظم کا شاگرد دالِغِتشِ احمد Dalghitsh Ahmed (م ۱۰۱۶ھ / ۱۶۰۸ء) تھا ، جس نے ینگی والدہ جامع اور سلطان مراد ثالث کا مقبرہ تعمیر کیا - اس قسم کے کام کا سب سے بڑا محرّک یہ امر تھا کہ استانبول میں محلِّ سلطانی میں اس کی ایک کارگاہ موجود تھی - تقریباً تمام تاریخی مساجد میں دریچوں کی جھلملیاں ، دروازے ، منبر ، بڑے صندوق ، قرآن مجید رکھنے کے بکس ، نیز مُنڈھیے (tabourets) اور چوکیاں ، کرسیاں ، گھوارے ، صندوق ، خنجروں کے دستے ، کنگھیاں ، چمچے ، ناس دانیاں ، بندوقوں اور پستولوں کے کُندے اسی تکنیک میں بنائے جاتے تھے - غالباً اس فن میں بلندپروازی کا سب سے ممتاز نمونہ ایک نہایت پر تکلّف تزیین سے مزیّن شاھی بجرا تھا ، جو سلطان محمد (محمد ثالث یا محمد رابع؟) کے لیے بنایا گیا تھا - یہ بجرا اب استانبول کے موزۂ بحریہ میں محفوظ ھے - اس صنعت کے حال

اور اس کی مصنوعات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : جلال اسعد آرشیون Celal Esad Arseven : *Les Arts Decoratifs Turcs* ، استانبول، بدونِ تاریخ ، ص ۲۰۹ تا ۲۲۶ .

آخر میں ہمیں پچی کاری کے ایک نمونے کا ذکر کرنا ہے، جس کی اہمیت بہت کم ہے اور اہلِ علم نے بھی اپنی تصانیف میں اس کا ذکر شاید ہی کبھی کیا ہو ۔ ایران میں ساسانی عہد کے اواخر ، اسلامی عہد کے اوائل اور پھر سلجوقیوں کے زمانے میں (چھٹی تا آٹھویں اور پھر بارھویں صدی میلادی) سرخی مائل مٹی کے بے روغن برتن بعض اوقات نیلے اور سبز روغنی تراشوں سے آراستہ کیے جاتے تھے ۔ خصوصاً وازوں (vases) کی یا گھڑوں کی گردنوں یا دستوں یا متّصلہ مقامات کو اس طریق پر مزیّن کیا جاتا تھا ۔ ابتدائی قسم کی جمالیاتی شان پیدا کرنے کے علاوہ ان آرائشوں میں شاید سحر و طلسم کی کیفیت پیدا کرنا بھی ملحوظ ہو، اُسی طرح جیسے کاشی کی جڑت کے کام کی اوّلین شکلوں کے سلسلے میں ہم بیان کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو ص ۵۹۸) لیکن گو کاشی کی جڑت کا فن تو ترقی کر گیا مٹی کے برتنوں کی مذکورہ صنعت نے قدم آگے نہ بڑھایا ، کیونکہ پورے برتن پر رنگین روغنوں نے روغنی تراشوں کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لی .

ابھی تک کوئی جامع تحریر ایسی شائع نہیں ہوئی جس میں عمومی حیثیت سے اس بات کا جائزہ لیا گیا ہو کہ مسلمانوں کے آرٹ میں پچی کاری کا کیا مقام ہے .

انواع و اقسام کی کوفت کاری خالص اسلامی نمونے کی صنعت ہے، جس میں دوسرے کاموں (مثلاً شیشے پر میناکاری یا ظروفِ گلی پر مختلف روغنوں اور بریقِ معدنی (lustre) سے آرائش) کی طرح معمولی میلے سے رنگ کی چیز کو گہری چمکدار سطح مہیّا کی جاتی ہے ۔ اس قسم کے عمل سے گویا اس چیز پر ایک قالین سا بچھا کر — اور قالین بطورِ خود اسلامی شرق کی نفیس ترین اور بغایت اختصاصی اور امتیازی صنعت ہے — ایسے فاخر و گرانمایہ بنا دیا جاتا ہے ۔ اسلامی تہذیب کے مقابلے میں کسی تہذیب نے اِس تزیینی تصوّر کو اتنی استواری سے اور اتنے وسیع جغرافیائی منطقے میں استعمال نہیں کیا ، اس لیے کہ ہسپانیہ سے لے کر برِّ صغیر ہند تک اسی کام کے نمونے ہمیں نظر آتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس قسم کے کام کی فنّی خوبی بھی ہمیشہ اتنی بلند سطح پر رہی ہے کہ اس سے حیرت ہوتی ہے ۔ چنانچہ آج بھی اس صنعت نے مختلف وسائط (media) میں اپنے قدیم معیاروں کو قائم رکھا ہے ۔ تکفیت ان اسلامی فنون میں بھی شامل ہے جن کی مسیحی یورپ میں بڑی قدر ہوئی ہے اور اس کی بعض قسموں، مثلاً لکڑی پر کوفت کاری کی تقلید (بالخصوص ہسپانیہ اور اٹلی میں) کی جاتی رہی ہے ۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا یہ فنِ [شریف] دنیا میں ایک بلند اور محترم مقام کا مستحق ہے .

[مآخذ : علاوہ ان کتابوں کے جو متن میں درج ہیں : (۱) ڈیمانڈ M.S. Dimand : *Handbook of Muhammadan Art*، نیویارک ۱۹۴۷ء، باب ۷ و دیگر مواضع؛ (۲) زکی محمد حسن : الفنون الایرانیة فی العصر الاسلامی ، قاہرۃ ۱۹۴۰ء، ۲۴۳ ببعد ؛ (۳) وہی مصنّف : فنون الاسلام ، قاہرۃ ۱۹۴۸ء، ص ۵۰۸ ببعد] .

(ایٹنگ ہاؤزن ETTINGHAUSEN)

تکلیف : کسی پر امر و نہی عائد کرنا، ایسا فعل مخاطب پر لازم کرنا جس میں مشقّت اور کُلفت ہو [لہٰذا مندوب و مکروہ و مباح احکام تکلیفیّة میں نہیں ہیں، اس لیے کہ ان میں کسی فعل کے لازم کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا (تھانوی)] (Lane : *Suppl.* ، ص *3002 c*؛ لسان،

۱۱ : ۲۱۸ : اَمَرَہٗ بما یَشُقُّ علیہ، یعنی کسی کسو اس کے اندازۂ طاقت سے زیادہ کام کا حکم دینا) ۔ یہ فعل مختلف صیغوں کی شکل میں سات مرتبہ قرآن میں آیا ہے : ۲ [البقرہ] : ۲۳۳ ، ۲۸۶ ؛ ۴ [النساء] : ۸۶ ؛ ۶ [الانعام] : ۱۵۳ ؛ ۷ [الاعراف] : ۴۰ ؛ ۲۳ [المؤمنون] : ۶۴ ؛ ۶۵ [الطلاق] : ۷)، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کہ اللہ کسی کسو اس کی طاقت (’وُسْع‘) سے بڑھکر کسی بات کا حکم نہیں دیتا۔ اصطلاحاً اس کا مفہوم ہے : مخلوق خدا پر واجب ہونا کہ جو کچھ اللہ نے بذریعۂ وحی انہیں پہنچایا ہے اس پر ایمان لائیں اور اس کے مطابق عمل کریں ۔ اس لیے فقہاء کی اکثریت نے اس کی فقہی تحدید یہ کی ہے کہ تکلیف لازم کرنا ہے ایسی بات کا جس میں مشقّت اور کلفت ہو یعنی واجب اور حرام کا۔ لیکن بعض فقہاء نے تکلیف کی تعریف یہ کی ہے کہ یہ اس اعتقاد کا واجب کرنا ہے کہ فعل احکامِ شرعیّہ میں سے ایک حکم ہے ۔ اس صورت میں تکلیف کا اطلاق مندوب، مکروہ اور مباح پر بھی ہو جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بحث بھی ہے کہ شخصِ ’مُکَلَّف‘ کون ہے ؟ اہل الجماعۃ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر عاقل و بالغ انسان مکلّف ہے (Juynboll : *Handbuch*‘ ۶۹)، لیکن جہاں تک حضور[ص] کی نبوت کا تعلق ہے جنّ بھی مکلّف ہیں، کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ آپ جنّوں کی طرف بھی مبعوث ہوے تھے . . . . اسی طرح فرشتے بھی نبی[ص] کے بارے میں مکلّف ہیں، کیونکہ آپ ان کی طرف بھی مُرسَل ہیں، اگرچہ تکلیف کا اطلاق ان پر صرف عملی طاعات میں ہو سکتا ہے، کیونکہ ایمان تو ان میں ضروری طور پر موجود ہے [انہیں ایمان کی تکلیف دینا تحصیل حاصل ہے] ۔ مگر بعض کی راے یہ ہے کہ طاعاتِ عملیّہ ان کی فطرت میں خِلقی ہیں؛ [حضور[ص]] کی بعثت ان کی طرف محض اُن کی شان بڑھانے کے لیے (’لتشریفهم‘) تھی، قبَ البیجُوری علَی الکفایۃ للفَضالی، قاهرة ۱۳۱۵ھ، ص ۱۳) ۔ بعض ائمہ آنحضرت کی بعثت کی تکلیف میں عموم کے قائل ہیں اور اسے جَمادات تک وسیع کرتے ہیں، اس بنا پر کہ معجزاتِ نبوی کے باعث بعض بے جان چیزوں میں اس حد تک عقل و شعور مرکّب کر دیا گیا تھا کہ وہ آپ پر ایمان لے آئی تھیں ۔ تکلیف کے متعلق بحث اس میں بھی ہے کہ آیا اللہ تعالٰی کے لیے جائز ہے کہ وہ بندے کو ایسی بات میں مکلّف کرے جو اُس کی طاقت سے باہر ہو (’’تکلیف ما لایطاق‘‘) ۔ ماتُریدی فرقے کے لوگ محوّلۂ بالا آیۂ قرآنی کے پیش نظر یہ کہتے تھے کہ اللہ بندے کو اس کام کے کرنے کی تکلیف نہیں دیتا جو اس کی طاقت سے باہر ہو (’’ما لیس فی وُسْعِه‘‘؛ العقائد النَسفیّۃ، قاهرة ۱۳۲۱ھ، مع شرح التفتازانی، ۱۰۳) ۔ الایجی اپنی کتاب المواقف (بولاق ۱۲۶۶ھ، ص ۵۳۵ وسطِ صفحه، ۵۳۷ وسطِ صفحه) میں اشعری ہونے کی حیثیت سے اس بحث کو عام اصول کے تحت واپس لاکر لکھتا ہے کہ اللہ کے ارادے اور فعل کو کسی طرح محدود نہیں کیا جا سکتا، نہ اللہ پر کوئی چیز واجب ہے اور نہ کوئی شی جو اس سے صادر ہو قبیح ہو سکتی ہے اور یہ کہ امتِ اسلامی کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ نہ کوئی قبیح فعل کرتا ہے اور نہ کوئی واجب فعل ترک کرتا ہے ۔ الایجی یہ بھی کہتا ہے کہ اشعریوں کے نزدیک اللہ جو کچھ کرے وہ قبیح نہیں ہو سکتا اور نہ واجب کا اس سے کوئی علاقہ ہے ۔ رہے معتزلی تو ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جس فعل

کا اللہ سے ہونا قبیح ہو وہ اللہ نہیں کرتا اور جو فعل اس پر واجب ہو وہ کرتا ہے ۔ مذکورۂ بالا حوالوں میں ان نکات پر التفتازانی اور الایجی کی طویل کلامی بحثیں ملاحظہ کیجیے ۔

مآخذ : مذکورۂ بالا حوالوں کے علاوہ ''تکلیف'' کے تحت ملاحظہ ہو [تھانوی :] کشّاف اصطلاحات الفنون ، بذیل تکلیف، ۱۲۰۵ .

(میکڈانلڈ D. B. MACDONOLD)

تِیکُودِر : (علمی تصانیف میں اسے تَگُودر اور تِیگُودِر بھی لکھا جاتا ہے) جس کا اسلامی نام احمد تھا (مثلاً دیکھیے اس کے سکّے، جہاں اندراجات مغولی حروف اور زبان میں لکھے ھیں)، ایران کے مغولی خاندان (ایلخانیہ، رکّ بآن) کا بادشاہ تھا، جس نے ۶۸۱ - ۶۸۳ھ / ۱۲۸۲ - ۱۲۸۴ء تک حکومت کی ۔ اس کے پیش رو اور بھائی کے حالات کے لیے دیکھیے مادّۂ ''اَبَاقا'' اور اس کے زوال اور جانشین کے حال کے لیے ملاحظہ ہو مادّۂ ''اَرْغُون'' ۔ کہتے ھیں کہ جوانی میں تِکُودِر کا نام رسمِ اصطباغ کے وقت نیقولاس Nicolas رکھا گیا تھا، *Moshemii Historia Tartarorum Ecclesiastica*، Helmstedt ۱۷۴۱ء، ۷۱) ۔ جونہیں وہ تخت پر بیٹھا اس کے اسلام لانے کا اعلان کر دیا گیا ۔ بعض مآخذ میں یہ ذکر آیا ہے کہ اس نے گرجوں اور بت پرستوں کے مندروں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا ۔ اس کے برعکس ابن العِبری (Bar Hebraeus) کہتا ہے کہ وہ سب مذاھب سے رواداری برتتا تھا، بالخصوص عیسائیوں سے ۔ ایلخان کے قبولِ اسلام کے بعد جو شاھانِ اسلام کے ساتھ دینی اتحاد کی صورت پیدا ھوئی اسے سلاطینِ بلادِ مصر و شام سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی گفت و شنید کی بنا تسلیم کیا گیا [اور ایک وفد ایلخان کا خط لے کر مصر گیا]، قبّ ایلخان کا خط مؤرخ در [اواخر] جُمادَی الاولٰی ۶۸۱ھ / ستمبر ۱۲۸۲ء اور سلطان مصر [سیف‌الدین قلاوون] کا جواب مؤرخ در [اول] رمضان ۶۸۱ھ / [۳ دسمبر] ۱۲۸۲ء، جو تأریخ وصّاف میں دیا ہے اور دوساں d'Ohsson نے وھاں سے نقل کیا ہے مگر [سلطان نے تاتاریوں کے فرستادوں کے ساتھ احتیاط برتی اور کسی کو ان سے ملنے نہ دیا اور مسلمانوں اور تاتاریوں کے درمیان صلح کا انتظام نہ ہو سکا (ابوالفداء)؛ چنانچہ] اس گفت و شنید کے دوران ھی میں مصری فوجوں نے ایلخانی سلطنت کے سرحدی علاقے کے دو قلعوں پر قبضہ کر لیا.

مآخذ : (۱) [فضل اللہ رشیدالدین : جامع التواریخ، طبع عبدالکریم علی اوغلی علی زادہ، باکو ۱۹۵۷ء، ۳ : ۱۶۵ تا ۱۹۴؛ (۲) وصّاف : تأریخ، (طبع بمبئی ۱۲۶۹ھ)، ۱۰۵ تا ۱۳۷؛ (۳) مستوفی : تأریخ گزیدہ، (طبع وقفیۂ گب) ۵۸۴ تا ۵۸۶؛ (۴) ابوالفداء : المختصر، قاھرۃ ۱۳۲۵ھ، ۴ : ۱۸۶، ۱۷؛] (۵) d' Ohsson : *Histoire des Mongols*، ۳ : ۵۵ ببعد؛ (۶) Hammer : *Geschichte aer Ilchane*، ۱ : ۳۲۰ ببعد؛ (۷) Howorth : *History of the Mongols*، ۳ : ۲۸۵ ببعد.

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

تِیکہ : Teke یا تکّہ Tekke، ایک ترکمان قبیلہ ۔ یہ اوغوزوں کے ان بائیس یا چوبیس قبائل میں شامل نہیں ہے جن کی تفصیل محمود کاشغری اور رشیدالدین نے دی ہے ۔ قبائل اوغوز کا شمار محمود کاشغری نے ۱ : ۵۶ ببعد پر بائیس دیا ہے اور رشیدالدین (طبع Berezin : *Trudï Vost. Otd. Arkh. Obshč.*، ۷ : ۳۲ ببعد) نے چوبیس ۔ بعد کے زمانے میں انھیں نسلِ سالور [رکّ بآن] میں سے بتایا گیا ۔ ابوالغازی [رکّ بآن] تکہ کو دو اور قبیلوں سَریق Sarïk اور یَمُوت کے ساتھ ''بیرونی سالُور''

('تاشقی سالور'، طبع Desmaisons ، ص ۹ ۰ ۲) کی ذیل میں شامل کرتا ہے ۔ ابوالغازی تاریخ ترکمانان میں، جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی، سریق اور تکہ کو سالور توئی - توتماس Toi-Tutmas کی نسل سے بتاتا ہے (ترجمہ تومانسکی Tumanskiy ، ۶۷) - ابوالغازی کی اس جلیل القدر تصنیف سے (ملاحظہ ہو Desmaisons کے ایڈیشن کا اشاریہ) یہ ظاہر ہے کہ تکہ دسویں (سولھویں) اور گیارھویں (سترھویں) صدی میں کوھستانِ بلخان [رک بآن] و کورین [بلخان داغ اور کورین داغ] پر رہا کرتے تھے ۔ اس خانہ بدوش قبیلے میں بعض لوگ تجارت بھی کرتے تھے (کتاب مذکور، ۳۲۴ : 'سوداگر').

اٹھارھویں صدی کے آخر میں تکہ مشرق کی جانب بڑھنے لگے، جہاں انھوں نے رفتہ رفتہ قبیلۂ ایمریلی (پرانے قبیلے ایمر Eimür کی اولاد) اور قبیلۂ قردش لی (پرانے قبیلے یزغیر Yazghir یا یازیر Yazir کی اولاد) کی جگہ لے لی اور انھیں آخال [دیکھیے آخال تکہ] سے نکال دیا اور اسی طرح سریق کو سرخس [رک بآن] اور مرو سے نکال کر ان کی جگہ آباد ہو گئے ۔ اس قبیلے کا مرو پر قطعی قبضہ کہیں ۱۸۰۷ء میں اور ۱۸۵۹ء میں جا کر ہوا جب وہ قووشت خان Kowshut Khān (م ۱۸۷۸ء) کی قیادت میں تھے ۔ ۱۸۵۵ء میں جب خانِ خیوہ (دیکھیے مادۂ خوارزم) نے قووشت خان کے خلاف جنگ کی تو خانِ خیوہ سرخس میں اس کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا ۔ ۱۸۶۰ء میں ایرانیوں کو مرو میں شکست ہوئی.

جب بلخان میں روسیوں کا دور دورہ ہو گیا (انھوں نے ۱۸۶۹ء میں شہر کراسنووڈسک Krasnovodsk آباد کیا) تو اُن کے لیے تکہ کو مغلوب کرنا لازم ہوا ۔ ۱۸۷۷ء میں لڑائی شروع ہوئی (جب کہ روسیوں نے قیزیل آروت پر قبضہ کر لیا، تکہ نے چکشلر اور خود کراسنووڈسک پر ۱۸۷۸ء میں حملہ کیا) ۔ یہ جنگ کہیں ۱۸۸۴ء میں مرو فتح ہونے کے بعد ختم ہوئی، گو تکہ کی مجموعی تعداد روسی اعداد و شمار کے مطابق تین لاکھ کے قریب تھی اور انھیں سیاسی وحدت حاصل نہ تھی ۔ ان کے بہت سے سردار تھے، جن میں سے ہر ایک نے خان کا لقب اختیار کر رکھا تھا ۔ ان میں سے وہ لوگ بھی، جو اپنی ذاتی قابلیت، اھلیت اور شجاعت کی وجہ سے نام آور ہو گئے (قووشت خان کے علاوہ، خاص طور پر نور ویردی خان جو ۱۸۸۰ء میں بمقام گوک تپہ فوت ہوا)، اپنے قبیلے کے صرف چھوٹے چھوٹے گروھوں پر ھی اپنا اثر و رسوخ قائم کرسکے تھے ۔ گوک تپہ کے محاصرے اور دھاوے کے اثناء میں (۱۲ تا ۲۴ جنوری ۱۸۸۱ء) خصوصیت سے نہایت سخت معرکہ ہوا ۔ وسطِ ایشیا میں یہی ایک معرکہ ایسا ہوا جس میں روسیوں کی توپیں اور جھنڈے چھین لیے گئے .

روسی حکومت کے قیام بالخصوص انقلاب روس کے بعد سے بہت سے قبائل، جن میں تکہ بھی شامل ھیں، اپنے اپنے خاص خاص قبائلی اسماء کھو چکے ھیں اور سب عام لقب "ترکمان" سے یاد کیے جاتے ھیں.

مآخذ: (۱) وامبیری Vambéry : *Das Türkenvolk in seinen ethnologischen und ethnographischen Beziehungen*، لیپزگ ۱۸۸۵ء، ص ۳۹۵ ببعد ؛ (۲) E. O' Donovan : *The Merw Oasis* ، لنڈن ۱۸۸۲ء؛ (۳) Petrusevič : *Turkmeni mezdu starim ruslom Amudar'i i severnimi okrainami Persii, Zap. Kavk. otd. R. Geogr. Obshč.*، ۱۸۸۰ء، ج ۱۱ ، 1 vip. ؛ انگریزی ترجمہ از Marvin، طبع مرو، باب ۴ ؛ (۴) N. Grodekov : *Voina v Turkmenii*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۳ء ؛ (۵) F. H. Skrine اور E. D. Ross : *The*

The Heart of Asia، لندن ۱۸۹۹ء، ص ۲۶۲ ببعد؛ (۶) A. Semenov: *Očerki iz istorii prisoyedineniya vol'noi Turkmenii* ۱۸۸۱ تا ۱۸۸۵ء، تاشقند ۱۹۰۹ء؛ (۷) M. Terent'jev: *Istoriya zavoevaniya Srednei Azii*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۹۰۶ء، ۳ : ۱ ببعد؛ (۸) A Samojlovič: *Abdu-s-Satter Kazi. Knigarazskazov o bitvakh tekinegy*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء؛ (۹) بارٹولڈ: *Očerk istorii Turkmenskago naroda, Sbornik "Turkmeniya"*، حصۂ اول، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۲۹ء.

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

تکه اوغلی : اناطولیه کا ایک حکم ران خاندان، جس نے تکه ایلی [رک بآن] پر حکومت کی ۔ تکه اوغلی کی اصل کی ابھی تحقیق نہیں ہو سکی۔ اغلب یه معلوم ہوتا ہے که وہ تکه ترکمانوں ہی سے ملتے جلتے ہیں، جس طرح ذوالقدر اوغلی [رک بآن] طور غودلو (Torghudlus)(قب Islām، ۱۲ : ۱۰۲) سے متعلق ہیں۔ ترکمان قبیلوں کی تاریخ، جو تمام ایشیاے کوچک میں پھیل گئے اور جن میں ورسق (یعنی [کتاب] کیل کون ڈلیس Chalkondyles، ص ۲۴۳ کے Βαρσάκιδες) بھی شامل ہیں، تاریکی کے پردے میں ہے۔ جہاں تک تکه ترکمانوں کا تعلق ہے یه معلوم ہے کے انھوں نے کئی دفعه نقل مکان کیا (قب کارا باچک J. Karabaček: *Zur or. Altertumskunde*, iv. *Muhammed. Kunststudien*، در *S. B. Ak. Wien*، ج ۱۷۲، *Abhandl.* I، وینا ۱۹۱۳ء، ۳۲ ببعد)؛ وہ قیزیلباشوں میں سے تھے، جن کے متعلق یه معلوم ہے که وہ تکه ایلی میں پھیلے ہوے تھے۔ کہتے ہیں که تکه اوغلی کا مورث اعلٰی ایک نیم اساطیری شخص تکه بک یا تکه پاشا تھا، جو سلجوقی اختیار داری کے تحت انطالیه پر حکومت کرتا تھا۔ اس کا بیٹا یونس بیگ اس کا جانشین ہوا، لیکن

اس کے دورِ حکومت کا حال کچھ بھی معلوم نہیں۔ جب ۷۳۳ھ / ۱۳۳۳ء میں ابن بطّوطة انطالیه میں آیا تو یونس بیگ کا بیٹا خِضر بیگ تکه ایلی کے سردار کی حیثیت سے وہاں حکمران تھا (قب حمید) ۔ اس کے بعد اس کا بھائی محمود بیگ تخت نشین ہوا مگر اس کے دورِ حکومت کے حالات بھی اسی طرح معرضِ خفا میں ہیں۔ ۷۷۴ھ / ۱۳۷۲ء میں ہم اس کے بیٹے محمد بیگ کو اس کی جگه بر سرِحکومت دیکھتے ہیں (قب سلیمان فِکری : انطالیه تأریخی، ۶۲)۔ اولیا چلبی اپنے سیاحت نامے (قب *T.O.E.M.*، عدد ۲ [۷۹]، ص ۸۱) میں ۷۷۴ھ/ ۱۳۷۲ء کے ایک عربی کتبے کا ذکر کرتا ہے جو اسی کے عہد کا ہے۔ اس کے علاوہ محمّد بیگ کی سرگرمیوں کے متعلق ہمیں عملاً کچھ بھی معلوم نہیں ۔ ۷۹۴ھ/ ۱۳۹۲ء میں سلطان بایزید اول یِلْدِرِم نے تکه ایلی کی ریاست کو ختم کر کے سلطنت عثمانیه میں شامل کر لیا (قب سعدالدین : تاج التواریخ، ۱ : ۱۲۸ ببعد) ۔ عثمانی خاندان کی حکومت صرف ۸۰۵ھ / ۱۴۰۲ء تک قائم رہی، کیونکه اس سنه میں محمد بیگ کے ایک بیٹے عثمان چلبی نے بادشاہت سنبھال لی ۔ دو سال کے بعد اس نے کئی اور حکمرانوں سے اتحاد پیدا کر لیا جو اس اثناء میں طاقت پکڑ چکے تھے ۔ بیس سال کے بعد (یعنی ۸۲۷ھ / ۱۴۲۴ء میں) عثمان چلبی پھر سامنے آتا ہے، جب حمزہ بن فیروز بیگ (قب صولاق زادہ : تاریخ، ۱۰۰ ببعد، ہامر J.v. Hammer : *G. O. R.*، ۱ : ۴۲۰) نے، جو عثمانیوں کی طرف سے قرہ حصار ۔ صاحب [رک بآن] کا والی تھا، انطالیه کا محاصرہ کیا اور عثمان چلبی نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ عثمان چلبی کی ایک بہن کو عثمانیوں نے قید کر لیا (قب فون ہامر : *G. O. R.*، ۱ : ۴۲۰) اور غالباً اس کی وفات کے بعد تکه اوغلی

کا خاندان معدوم ہوگیا ۔ ان کا شجرۂ نسب ذیل میں درج ہے :۔

تکہ بیگ
|
یونس بیگ

خضر بیگ — محمود بیگ
|
محمد بیگ
|
عثمان چلبی

تکہ اوغلی درہ بکلر [رکّ بآن]، جن کا یورپی سیاحوں نے منطقۂ انطالیہ کے ضمن میں محمود ثانی کے عہد تک بھی ذکر کیا ہے، ان کا تکہ اوغلی کے خاندان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ۔ ان کے لیے دیکھیے F. Beaufort : *Karamania*، لنڈن ١٨١٧ء، ١١٨ : W. Turner : *Journal of a Tour in the Levant*، لنڈن ١٨٢٠ء، ٣ : ٣٨٦؛ C.R. Cockerell : *Travels in Southern Europe and the Levant*، لنڈن ١٩٠٣ء، ١٨٢ اور V. Cuinet : *Turquie d' Asie*، ١ : ٨٦٠ .

مآخذ : (١) علی : تکہ امارتی، در *T.O.E.M.*، عدد ٢ (٩٧)، ٧٧ بعد؛ (٢) سلیمان فکری : انطالیہ تاریخی، استانبول ١٣٣٠ھ، مواضع کثیرہ ؛ (٣) خلیل ادہم : دُوَل اسلامیۃ، استانبول ١٣٣٥ھ، ٢٨٦؛ (٤) E.v. Zambaur : *Manuel de Généalogie*، ہینوور ١٩٢٧ء، ص ١٥٣، ؛ (٥) احمد توحید : *Über die Inschriften von Adalia*، در (*T.O.E.M.*)، عدد ٨٣، ١٩٢٤ء، ص ٣٣٦.

(FRANZ BABINGER بابنگر)

تـکـہ ایـلی : ایشیاے کوچک کا ایک ضلع ہے، جو سابقاً تکہ اوغلی [رکّ بآن] کی سر زمین تھی اور علاقۂ پامفیلیا Pamphylia اور لسیا Lycia میں واقع تھی ۔

تکہ ایلی یعنی بکری کی سر زمین (تکہ = بکری یہ لفظ تکّہ نہیں ہے اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تکہ ایلی کو لیون کلاویوس J. Leunclavius کے وقت سے غلط طور پر اسی سے مشتق مانا گیا ہے) جنوبی اناطولیہ میں واقع ہے اور تخمیناً فنیکہ Finika ، اَلمالو Elmali ، اِستانوز Istanoz ، اِستاوروس Istawros ، اور دو 'بندرگاہوں' انطالیہ [رکّ بآن] اور علائیہ [رکّ بآن]، پر مشتمل ہے ۔ تکہ ایلی کی شمالی سرحد قرمان [رکّ بآن] اور حمید ایلی [رکّ بآن] کے اضلاع ہیں ۔ مشرقی سرحد اِنچ ایلی اور مغربی منتشا ایلی Menteshe-eli [رکّ بآن] ہے اور جنوب میں سمندر قدرتی سرحد ہے ۔ تکہ ایلی کی ابتدائی تاریخ اسی طرح قدرے تاریکی میں ہے جیسے تکہ اوغلی کے بے حقیقت سے خاندان کی تاریخ ۔ ایران سے ضرور اس کے تعلقات عہد قدیم میں ہوں گے اور دینی نقطۂ نظر سے اس علاقے کے مخصوص موقف کی توجیہ انہیں تعلقات کے اندر ڈھونڈنی چاہیے ۔ ایک بزرگ شیخ صدر الدین نامی نے یہاں ایک مضبوط دینی جماعت تیار کی تھی، جسے تیمور نے اپنے ایشیاے کوچک کے حملوں کے دوران میں صحیح و سالم چھوڑ دیا ۔ اس وقت سے تکہ ایلی اور ملحقہ علاقۂ حمید ایلی کے لوگ "ایرانی شیوخ" سے خاص طور پر عقیدت رکھتے ہیں (قبّ بابنگر : *Schejch Bedr ed-Din*، ص ٨٥ بعد، قبّ نیز J. v. Hammer : *G. O. R.*، ٢ : ٣٤٤، جہاں جنابی کی گواہی درج ہے) ۔ یہ امر واقع ہے کہ علویوں کی کئی بغاوتیں تکہ ایلی میں ظہور پذیر ہوئیں، مثلاً بابا شاہ قلی ساکن پازار جغ، (نزد انطالیہ؛ قبّ بابنگر : کتاب مذکور، ٨٨ بعد) کی عجیب و غریب بغاوت، جو اپریل ١٥١٠ء میں ہوئی اور جس کا گہرا تعلق ایران کے صفویّۃ [رکّ بآن] سے تھا اور تکہ ایلی میں شیعیانِ علی

آباد ھیں، جیسے تختجی [رَكَ بآن] جن کی حیثیت کئی لحاظ سے خصوصی ھے ۔ شرقِ بحرِ متوسّط (Levant) کی تجارت کی تأریخ میں انطالیه اور علائیه کی بندرگاھوں کو مقامِ عظیم حاصل ھے ۔ نویں ھجری / پندرھویں صدی میلادی کے دوران میں یه بندرگاھیں ایشیاے کوچک کی پیداوار اسکندریه اور دمیاط بھیجنے کے لیے اھم‌ترین مرکز تھیں ؛ انطالیه تو ۱۳۰۵ء تک ھی اپنی خودمختاری قائم رکھ سکا، لیکن علائیه ۱۴۷۲ء سے پہلے عثمانیوں کے قبضے میں نہ آ سکا ۔ تکه ایلی کی تاریخ کے لیے قبَّ مادّہ تکه اوغلی .

مآخذ : (۱) علی بک : *Teke-eli zur Zeit* (Mehemmeds) *des Eroberers*، در *T.O.E.M.*، ۲ : ۷۹، استانبول ۱۹۲۳ء؛ (۲) W. Heyd : *Histoire du Commerce du Levant*، ۲ : لیپزگ ۱۸۸۵ء، ۳۵۴ ببعد؛ (۳) Ch. Fellows : *Discoveries in Lycia*، لنڈن ۱۸۴۱ء؛ (۴) Spratt اور Forbes : *Travels in Lycia etc.*، لنڈن ۱۸۴۷ء، ۲ جلدیں؛ (۵) Petersen اور Von Luschan : *Reisen in Lykien, Milyas und Kibyratis*، وینا ۱۸۸۹ء؛ (۶) Graf Lanckoroński : *Städte Pamphyliens und Pisidiens*، وینا ۱۸۹۳ء؛ (۷) سلیمان فکری : انطالیه تأریخی، استانبول ۱۳۴۰ھ، ۱۹۶، قطع نیم و زیری (8°) مع نقشه‌جات و تصاویر.

(FRANZ BABINGER)

* **تُکُرت** : رَكَ به تقُرت.

* **تَلْبِیَة** : (عربی)، فعل لَبّی سے باب تفعیل کا مصدر، جو کلمۂ لَبَّیْکَ سے بنا ھے اور جس کے معنی ھیں لَبَّیْکَ کا کلمه ادا کرنا وغیرہ ۔ عرب لغت نویسوں نے (غالباً صحیح طور پر) لَبَّیْکَ کا تعلق لَبَّ سے بتایا ھے، جس کے معنی ھیں " طاعت پر مقیم ھونا"، جیسے لَبَّیْکَ کے معنی ھیں " میں آپ کی طاعت پر مقیم ھوں"، " حاضر جناب !"۔ عرب نحویوں کے نزدیک لَبَّیْ تثنیه ھے، جو تاکید کے لیے بنایا گیا ۔ یه بتانا مشکل ھے که اس ترکیب میں اور اسی قسم کی دوسری ترکیبوں مثلاً سَعْدَیْکَ میں ـَ یْ (یعنی یاء ساکنه با فتحۂ ماقبل) کے معنی کیا ھیں ۔ عبرانی زبان سے جو تشریح ڈوزی Dozy نے تجویز کی تھی (*De Israeliten te Mekka*، ھالم Haarlem ۱۸۶۴ء، ص ۱۲۰) کہه سکتے ھیں که اب اسے عام طور پر ترك کر دیا گیا ھے .

تَلْبِیَة مختلف صیغوں میں اور مختلف موقعوں پر استعمال ھوتا ھے ۔ روایت ھے که [حضور[۴]] کا تَلْبِیَة یه تھا : لَبَّیْکَ اللّٰھمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لاشریک لک، انَّ الحمدَ و النعمّة لک و المُلْکَ، لاشریک لک (بخاری : حج، باب ۲۶)؛ لیکن تلبیة کی اس سے مختصر صورتیں بھی ھیں، مثلاً : لَبَّیْکَ اللّٰھمّ لَبَّیْکَ و سَعْدَیْکَ وغیرہ ۔ عام طور پر تَلْبِیَة میں خطاب اللّٰہ سے ھوتا ھے مگر حدیث میں حضور[۴] اور ان کے انصار سے بھی خطاب ھوا ھے گو ایسی صورت میں یه کلمه اپنی مختصر ترین صورت یعنی 'لَبَّیْکَ' کی شکل میں استعمال ھوا ھے [مگر یه حجّ کا اصطلاحی تلبیة نہیں ھے، بلکه یه اس کلمے کا استعمال لغوی معنوں میں ھے، ایک آدمی دوسرے کو بلاتا ھے اور وہ کہتا ھے " لَبَّیْکَ "؛ جیسے وہ کہتا ھے " نعم "، " اَجَبْتُکَ " وغیرہ اور ایسے موقع پر یه کلمه آج بھی مستعمل ھے، دائرۃ المعارف الاسلامیة] (مثلاً بخاری : خُصُومات، باب ۴؛ مسلم : زکوۃ، حدیث ۳۲؛ ترمذی : صفة القیامة، باب ۳۶) اور یا لَبَّیْکَ (مسلم : جهاد، حدیث ۷۶) ۔ یه کلمه زمانۂ قدیم کے اھل تقوی مثل [حضرت] آدم[ع] اور [حضرت] نوح[ع] [نے بھی استعمال کیا ھے]؛ مسلم کی ایک حدیث کے مطابق (حجّ،

حدیث ۲۲) ۔ [حضور[ؐ]] کے زمانے میں مشرک اسے غلط طور پر استعمال کرتے تھے ۔ تلبیه خاص طور پر حجّ [رَكَ بآن] کے موقع پر اور احرام باندھنے کے ابتداء میں کہا جاتا ہے ۔ [حضور[ؐ]] اور دوسرے لوگ احرام باندھنے کے وقت یه کلمات کہا کرتے تھے : ''لَبَّیک بحَجَّةٍ و عُمْرَةٍ'' (بخاری : حج ، باب ۳۴)، یا ''لَبَّیْکَ بعُمْرَةٍ و حَجَّةٍ'' (ترمذی : حج، باب ۱۱)، یا محض حجّ کے لفظ کے ساتھ [یعنی ''لَبَّیکَ بالحجّ'' کہه کر] (بخاری : حجّ، باب ۳۵) ۔ [حضرت] عائشة[رض] کی بابت ذکر ہے که عُمْرة کی ابتدا میں آپ نے یه کلمات ادا کیے : لَبَّیکَ بالعُمْرَة (ابو داؤد : مناسک، باب ۲۳).

حجّ کے دَوران میں رمی جمار تک تَلْبِیَة بار بار کہنا ہوتا ہے (مثلاً احمد بن حَنْبل ، ۱ : ۱۱۴) اور یه ذکر بلند آواز سے ہوتا ہے (احمد بن حنبل، ۵ : ۱۹۲).

اس مسئلے کے بارے میں که تَلْبِیَة فرض ہے یا سنّت، ملاحظه ہو شرح مسلم از نَوَوی، کتاب الحج، حدیث ۲۲).

(وِینْسِنْک (A. J. WENSINCK))

* **تَلْخِیص** : عربی مصدر [فعل لَخَّصَ کا] بمعنی [بے آمیزش کرنا] خلاصه کرنا ۔ ترکی دواوین کی زبان میں اس سے مراد وہ دستاویز ہے جس میں اہم مسائل کا خلاصه سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے تیار کیا جاتا تھا ۔ وہ افسر جو ان کاغذات کی تیاری اور سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے ذمے دار تھے وہ وزیر اعظم اور شیخ الاسلام تھے ۔ مفہوم کی تبدیلی کی وجه سے ' تلخیص ' کو ' غَلَطات مشہورة' میں شامل کیا گیا ہے، قبّ محمد حفید : الدُرَر المُنْتَخبات المَنْشورة فی اِصلاح الغَلَطات المَشْهورة، (۱۲۲۱ھ، ص ۱۱۵).

(کرامرز J. H. KRAMERS)

* **تَلْخِیصْجی** : یا لغت دواوین میں تَلْخِیصی ، وہ شخص جس کے ذمے تلخیص [رَكَ بآن] کی تیاری اور اُسے محلّ تک لے جانے کا کام ہوتا تھا ۔ وہاں جا کر یه کاغذات خواجه سراؤں کے سردار کے حوالے کر دیے جاتے تھے ۔ لہذا تلخیصجی وزیراعظم کے محکمے کے عمّال میں سے ہوا کرتا تھا؛ تلخیص کی تیاری کے علاوہ وہ متعدد سرکاری تقریبوں میں بھی حصّه لیا کرتا تھا ۔ شیخ الاسلام کے تَلْخِیصجی کا — کم از کم آخری دَور میں — محلّ سے براہ راست کوئی تعلّق نه تھا ۔ اس کے پیش کردہ تمام کاغذات پہلے رئیس اِفَنْدی اور وزیر اعظم کے پاس آتے تھے .

مآخذ : (۱) d' Ohsson : *Tableau Général de l' Empire Othoman* ، ۲ : ۲۶۰؛ ۳ : ۳۴۳؛ (۲) von Hammer : *Des osmanischen Reiches Staatsverfassung* ، ۱ : ۳۱، ۴۷۵ .

(کرامرز J. H. KRAMERS)

* **تِلّ** : (Tell) ایک اصطلاح ہے جو یورپ کے جغرافیه نگار شمالی افریقه کے اُس علاقے کے لیے استعمال کرتے ہیں جو سمندر کے ساحل کے نزدیک اور اُس کے ساتھ ساتھ واقع ہے ۔ یه عربی لفظ تَلّ ہے ، جس کے معنی پہاڑی کے ہیں ۔ تِلّ کا رقبه نشیب و فراز والا ہے، جس میں پہاڑیوں کے سلسلے پھیلے ہوے ہیں، جن کا تعلق بیشتر جبال اطلس Atlas [دَرَنْ] کے نظام سے ہے اور ان پہاڑیوں کے اندر جگه جگه مختلف وسعت اور بلندی کے سطوح مرتفعه بھی ہیں ۔ بحر اوقیانوس اور بحیرۂ روم کی مرطوب ہواؤں کے فیض سے تِلّ کا خِطّه شمالی افریقه کا سب سے زیادہ شاداب اور سیراب خِطّه ہے ۔ ریگستان اور گیاہستان (prairie) کے مقابلے میں یه علاقه باقاعدہ کاشتکاری اور جنگلات کا علاقه ہے ۔ شمالی افریقه کی پہاڑیوں

کی ترتیب کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ تلّ کے علاقے کی چوڑائی ہر جگہ یکساں نہیں ہے ۔ مرّاکش کا جو حصّہ بحر اطلسی کی جانب واقع ہے، وہاں تلّ کا علاقہ بہت وسیع ہے، لیکن الجزائر اور تونس میں بہت تنگ ہو کر رہ گیا ہے ۔ قبّ مادّہ ھاے الجزائر، اطلس، بربر، مرّاکش اور تونس .

(G. Yver یور)

* **تل باشِر**: [سامی، ۳ : ۱۶۶۶، تلبشار]، شمالی شام میں ایک قلعے کا نام ہے، جو عینتاب کے قریب نہرِ ساجور پر حلب سے شمال کی طرف دو دن کی مسافت پر واقع ہے ۔ اس کا محلّ وقوع وسیع میدان ہے اور بقول [یاقوت : معجم، ۱ : ۸۶۴ و] ابوالفداء اس میں زیادہ تر ارمنی عیسائی آباد تھے؛ ارمنی اس کے نام 'تَعْل بَشْر' کی تشریح یوں کرتے تھے کہ یہ ارمنی نام T'il Aveteac کا ترجمہ ہے، یعنی تلِ بشائر ''خوشخبریوں (avetik) کی پہاڑی''، ارمنی نام جس کا ذکر ہوا وہ اس مقام کا قدیم نام تھا (Matthēos Urhayec'ci، طبع Dulaurier، ۳۳۰، ۳۳۴ ببعد) ۔ یہاں کئی منڈیاں (اسواق) تھیں اور ایک بستی ('رَبَض') (غالباً آج کل کا 'تلّ باشر مزرعہ سی' وہی قدیم ربض ہے جو قلعے سے جنوب مشرق میں ہے) اور اس کے ارد گرد شاداب و سیراب باغات بھی تھے .

اس شہر کا ذکر قدیم اشوریوں کے زمانے سے چلا آتا ہے، جب اسے تِل بسِیرے کہتے تھے (Salmanassar : *Monolith*، rev.، سطر ۱۷؛ Dussaud : *Topographie hist. de la Syrie*، ۴۶۸) ۔ اس کے برعکس اس کا نہ تو بِشری نام کی پہاڑی سے کوئی تعلق ہے اور نہ تِلسّر Telassar ہی سے، جس کا ذکر بائبل میں آتا ہے (Sayce : *P.S.B.A.*، ۳۳ : ۱۷۵؛ Dussaud : کتاب مذکور، ۴۶۴) ۔ اس کا نام قدیم یونانی یا رومی زمانے میں نہیں ملتا، لیکن لوحۂ پوٹنگریانا Tabula Peutingeriana میں تھل بسارِس *Thalbasaris* کا ذکر موجود ہے، جو (ٹگرانوسرٹا Tigranocerta سے پندرہ رومی میل کے فاصلے پر تھا (سخاؤ Sachau : *Abh. Pr. Ak. W.* 1880، برلن ۱۸۸۱ء، رسالۂ دوم، ۵۳ ؛ Markwart : *Handēs Amsōreah*، ۳۰، ۱۹۱۶ء: عمود ۱۱۸ ببعد) .

بظاہر عرب مصنفین نے صلیبی جنگوں سے پہلے تلّ باشر کا ذکر نہیں کیا ۔ ۴۸۹ھ/۱۰۹۵-۱۰۹۶ء میں رِضوان نے اپنے حلیف جَناح الدولہ کی معاونت سے یَغی شَعْبان انطاکی سے تِلّ باشر اور شیخ الدّیر کے قلعے لے لیے (کمال الدین، ترجمہ دِ ساسِی de Sacy، در Röhricht : *Beitr. z. Gesch. d. Kreuzzüge.*، ۱، برلن ۱۸۷۴ء: ۲۱۶) ۔ ۱۰۹۷ء میں قلعہ ھای تلّ باشِر و راوَندان گوڈفرے Godfrey کے بھائی کاؤنٹ بالڈُون آو بورگ Bourg. نے فتح کر کے الرّھا (Edessa) کی ریاست میں شامل کر لیے (Matthēos : کتاب مذکور، ص ۲۱۸، باب ۱۵۴) ۔ ۱۱۰۲ء میں [بَغْدَوین] بالڈُون نے قُورس (*Coritium*)، دُلُوك (*Tulupa*)، تلّ باشِر (*Turbessel*)، عینتاب (*Hatab*)، راوَندان (*Rauendel*) اور سُمَیْساط (*Samosatum*) اپنے بھتیجے جوسلِین Joscelin de (Courtenay) کو بطور جاگیر دے دیے (*Recueil hist. or. crois.*، ۳ : ۶۲۳؛ *Will. of Tyre*، ۱۰ : ۲۴؛ Röhricht : *Gesch. d. Kgr. Jerusal.*، ۴۹، حاشیہ ۸) ۔ ۴۹۶ھ / ۱۱۰۲-۱۱۰۳ء میں فرنگیوں نے تلّ باشر سے حلب کی طرف کوچ کیا، بسرفُوث پر قبضہ کر لیا اور صرف کَفَرلاثا کے مقام پر بنی عُلَیم نے انھیں ہزیمت دی (کمال الدین، در Röhricht : *Beitr.*، ۱ : ۲۳۱؛ [ابن الشِحْنَة الحلبی : الدرّالمنتخب، ۲۱۷]) ۔ حرّان کی شکست کے بعد جب جوسلِین کو [اس کے] دشمنوں نے گرفتار کر لیا اور زرِ فدیہ کی

رقم مقرر ہو گئی اور اسے یہ رقم مہیا کرنے کے لیے رهائی دی گئی تو اُس کے ساتھی، جو تِلّ باشر میں تھے، اس کی جگہ بطورِ یرغمال دشمن کی قید میں چلے گئے (Michael Syrus، ۳ : ۱۹۵؛ فرنگی مصادر کا بیان قدرے مختلف ھے، قب Röhricht : *Gesch. d. Kgr. Jerus.*، ص ۵۷، حاشیہ ۳) - ۵۰۲ھ / ۱۱۰۸ - ۱۱۰۹ء میں جوسلین اپنے چچا بغدوین (Baldwin) اور جاولی کے همراہ تِلّ باشر کو اپنا فوجی مرکز بنا کر انطاکیہ (Antioch) کے تنکری Tancred کے ساتھ، جس کا حلیف رضوان تھا، بر سرِ پیکار ہوا (*Rec. hist. or. crois.*، ۱ : ۲۶۶؛ Matthēos : کتاب مذکور، ۲۶۷؛ Röhricht : کتاب مذکور، ۵۷ ببعد) - سلطان محمد نے ترکوں کا ایک بہت بڑا لشکر امیر مودود والی موصل کی کمان میں بھیجا، جو امرائے خلاط، مراغہ وغیرہ کے همراہ تِلّ باشر کے سامنے آ موجود ہوا (۵۰۴ھ / ۱۱۱۱ء)، اس نے ڈیڑھ ماہ تک اس کا محاصرہ جاری رکھا، لیکن بے سود (*Rec. hist. or. crois.*، ۱ : ۲۸۲، ۲۸۷؛ ۳ : ۴۹۶، ۵۴۲ ببعد، ۵۹۹ ببعد؛ Matthēos : کتاب مذکور، ۲۷۵؛ Michael Syrus، ۳ : ۲۱۶؛ Röhricht، کتاب مذکور، ۹۰ ببعد).

ایل غازی اواخرِ مئی ۱۱۲۰ء میں کیسوم اور بہسنی کے درمیان جوسلین سے شکست کھا کر تِلّ باشر کی طرف بڑھا - اس نے کئی روز تک اس کا محاصرہ جاری رکھا لیکن کامیاب نہ ہوا (*Rec. hist. or. crois.*، ۳ : ۶۲۳ ببعد؛ ابوالفداء : *Annal. Mus.*، طبع Reiske، ۳ : ۳۹۶) - بعد کے سالوں میں اهلِ حلب اکثر ان غزووں کی وجہ سے جو تِلّ باشر سے کیے جاتے تھے تکلیف اٹھاتے رہے (کمال الدین، در *Rec. hist. or. crois.*، ۳ : ۶۲۵ ببعد، ۶۳۴) - نورالدولہ بلاق ۱۱۲۴ء میں تِلّ باشر کے خلاف فوج کشی کی تیاری کر رہا تھا کہ منبج [رکّ بآن] کے میدان میں مہلک طور پر زخمی ہو کر وفات پا گیا - Michael Syrus، ۳ : ۲۱۱ میں ایک غیر واضح سا تعلیقہ ھے جس سے یہ معلوم ہوتا ھے کہ نورالدولہ نے تِلّ باشر اور تین دیگر قلعے عربوں اور فرنگیوں سے چھین لیے تھے (مگر یہ غلط ھے) - جوسلین اوّل ۱۱۳۱ء کے آخر میں مر گیا (Michael Syrus، ۳ : ۲۳۲) اور جوسلین ثانی الرّھاوی اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوا، جس کی ماں ارمینیۃ الصغری کے بادشاہ لیو اول (Leo I) کی بیٹی تھی - اپنے بہادر باپ کے بالکل برعکس وہ جوانی ھی سے شراب خواری اور عیّاشی کا دلدادہ تھا اور اپنا وقت تِلّ باشر کے محلّ میں عشرت پسندی کے ہنگاموں میں گذارتا تھا (Will. of Tyre، xiv : ۳، *commessationibus supra modum deditus, Veneris operibus et carnis deserviens immunditiis, usque ad infamiae notam*) [ترجمہ : وہ حد سے زیادہ عیاشی میں کھو چکا تھا اور شہوانی خواہشات اور ناپاك بدنی لذائذ کا غلام ہونے کے باعث رسوائی کی حد تک پہنچ چکا تھا] - تِلّ باشر کا علاقہ اس وجہ سے حلب کے حکمران سیف‌الدین سوار کے بار بار کے غزوات کی جولانگاہ بن گیا (*Rec. hist. or. crois.*، ۳ : ۶۶۵؛ Michael Syrus، ۳ : ۲۳۰، ۲۳۳؛ Röhricht : کتاب مذکور، ۱۹۷ ببعد) - قیصر یوحنا ثانی کومننوس John II Comnenos نے ۱۱۴۲ء کے شروع میں شمالی شام پر حملہ کیا اور تِلّ باشر کے سامنے آ دھمکا (Will. of Tyre، xv : ۱۹ : *Turbessel; est autem praedictus locus castrum opulentissimum circa Euphraten, ab eo distans (milliaribus XXIV vel modicum amplius)* [ترجمہ : تِلّ باشر؛ مگر مقام مذکور بہر کیف ایک بڑا مضبوط قلعہ ھے، جو فرات سے چوبیس میل یا

اس سے کچھ زیادہ دور واقع ہے] ؛ جوسِلین ثانی (Joscelin II) کو کئی آدمی بطور یرغمال دینا پڑے اور اُس نے اپنی بیٹی اِزابیلا Isabella قیصر یوحنّا کے عقدِ نکاح میں دی (Will. of Tyre : محلّ مذکور).

سلطان مسعود سلجوقی کی تاخت و تاراج سے (Michael Syrus، ۳ : ۲۹۳ تا ۲۹۶؛ Röhricht، ۲۶۳، حاشیہ ۱) اور اس کے حلیف نورالدین کے حملوں سے، جس نے ۵۴۶ھ / ۱۱۵۱ - ۱۱۵۲ء (Rec. hist. or. crois.، ۴ : ۱۶، ۶۸) میں فرنگیوں کو تِلّ باشِر کے مقام پر شکست دی، جوسِلین کو اَور بھی زیادہ ضعف پہنچا۔ جب مئی ۱۱۵۰ء میں اسے گرفتار کر کے حلب میں قید کر دیا گیا تو مسعود نے، جس نے اس سے پہلے سال تِلّ باشر پر حملہ کیا تھا (Matthēos : کتاب مذکور، ۳۳۰؛ Michael Syrus، ۳ : ۲۹۶) کَیسُوم، بَہسَنی اور رَعبان کے قلعے فتح کر لیے لیکن وہ تِلّ باشر کا قلعہ فتح نہ کر سکا (Matthēos، ۳۳۳ ؛ Michael Syrus، ۳ : ۲۹۶ ببعد ؛ Will. of Tyre، xvii، باب ۱۵؛ Röhricht، ۲۶۵ ببعد) - جب مسعود وہاں سے ہٹ آیا تو شاہ یوروشلم تِلّ باشِر گیا اور جوسِلین ثانی کے بیوی بچوں کو، جن میں جوسِلین ثالث بھی شامل تھا، یوروشلم میں حفاظت کے ساتھ لے آیا - اُس نے تِلّ باشِر، عزَاز، الراوَنْدان، رُوم قلعہ، اَلبِیرہ اور سُمَیساط میں بوزنطی سپاہیوں کی فوجیں متعیّن کیں، جنھیں وہ اپنے ساتھ لایا تھا؛ لیکن وہ فرنگیوں کی حکومت کو دوبارہ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں (Michael Syrus، ۳ : ۲۹۷؛ Will. of Tyre، xvii : ۱۶) - جب دُلُوک کا قلعہ مُسخّر ہو گیا تو تِلّ باشر کی قلعہ گیر فوج نے مجبوراً ۲۰ ربیع الاول ۵۴۶ھ / ۸ جولائی ۱۱۵۱ء کو اپنے شہر کی چابیاں نورالدین کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کی؛ چنانچہ نورالدین نے حسّان المَنبِجِی کو ان کی اطاعت قبول کرنے پر مقرر کیا (Rec. hist. or. crois.، ۱ : ۲۹، ۳۱، ۴۹۷؛ ۴ : ۷۳ ببعد؛ ابوالفداء، طبع Reiske، ۳ : ۵۱۶ [ایضاً طبع قاہرۃ ۱۳۲۵ھ، ۳ : ۲۴، مدح نورالدین راجع بہ فتحِ دُلوک و تِلّ باشر]؛ Matthēos : کتاب مذکور، ۳۳۳؛ Michael Syrus، ۳ : ۲۹۷) اور فرنگیوں اور ارمنیوں کو آزاد کر دیا گیا اور اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ انطاکیہ چلے جائیں (Matthēos، ۳۳۳؛ Röhricht، ۲۸۱، تعلیقہ ۲، جہاں غلط طور پر مذکور ہے کہ قلعے کا محاصرہ اٹھارہ مہینوں تک جاری رہا) - نورالدین نے تِلّ باشِر کا قلعہ حسّان کے حوالے کر دیا، جس نے اس کے دفاعی مورچوں کو مضبوط کر کے اس میں اتنا سامانِ رسد جمع کیا جو کئی سال تک کافی ہو سکے (Rec. hist. or. crois.، ۱ : ۴۹۸) - بتاریخ ۱۲ شوال ۵۶۵ھ / ۲۸ جون ۱۱۷۰ء نورالدین عَشتَرا سے، براہِ حلب و تِلّ باشِر، موصل گیا (Rec. Hist. or. crois.، ۴ : ۱۵۰) - عینتاب، تِلّ باشر اور شمالی شام کے دوسرے مقامات کے امراء نے ۱۱۷۶ء میں صلاح الدین کی اطاعت قبول کر لی (Michael Syrus، ۳ : ۳۶۶) - جب صلاح الدین عَکّا کے بالمقابل مقیم تھا تو اُس کے امرائے خاص میں امیر بدرالدین دُلدُرِم بن بہاءالدین الیارُوقی امیرِ تِلّ باشر بھی شامل تھا، جِس نے ۵۷۹ھ / ۱۱۸۳ء میں عِمادالدین زنگی کے مقابلے میں اس مضبوط قلعے کا دفاع کامیابی سے کیا تھا (Rec. hist. or. crois.، ۳ : ۷۱) - جب ابن المُقَدَّم نے بدرالدین کے پاس جا کر تِلّ باشر میں پناہ لی تو الملک الظاہر نے اس کا تعاقب کیا اور ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ - ۱۲۰۳ء میں یہ قلعہ فتح کر لیا (کمال الدین، ترجمۂ بلوشہ

Blochet، در .R. O. L، ج ۵ (۱۸۹۷ء) : ص ۳۸) لیکن اسے پھر کھو بیٹھا (.R. O. L، ۵ : ۵۹) - ۶۱۵ھ / ۱۲۱۸ - ۱۲۱۹ء میں جب [شاہِ رُوم] کیکاؤس [بن کیخسرو] نے یہ قلعہ فتح کیا تو وہاں اس وقت بھی بدرالدین ھی حکمران تھا (.R. O. L، ۵ : ۵۷؛ .Rec. hist. or. crois، ۲ / ۱ : ۱۳۵)- اسی سال المَلک الاَشرف نے اس قلعے کو سلطان سلجوق سے دوبارہ چھین لیا اور دوسرے مقامات کے ساتھ اسے شہاب‌الدین طُغرِل کے حوالے کر دیا، جو حلب کے نوجوان شہزادے کا اتابک تھا (.R. O. L، ۵ : ۵۷، .Rec. hist. or. crois، ۲ / ۱ : ۱۳۶ ببعد؛ ۵ : ۱۶۶؛ ابوالفداء : .Annal. .Muslem، طبع Reiske، ۳ : ۲۶۶) - الملک العزیز والی حَلَب نے ۶۲۹ھ / ۱۲۳۱ - ۱۲۳۲ء میں یہ قلعہ فتح کر لیا اور اپنے اتابک شِہاب‌الدین (.R. O. L، ۵ : ۸۲) کے نائبوں کو معزول کر کے وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا.

۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ - ۱۲۴۱ء میں خوارزمیوں نے عَزاز، تِلّ باشِر اور بُرج [الرّصاص] پر حملہ کیا (R. O. L، ۶ : ۵) .

حَلَب کے والی الملک النّاصر نے ۶۳۶ھ / ۱۲۳۸ - ۱۲۳۹ء میں ایک فوج شمس‌الدین لؤلؤ ارمنی کے زیرِ کمان حِمص کے خلاف بھیجی - دو ماہ تک محاصرہ جاری رہا تو وھاں کے امیر الملک الاَشرف نے مجبوراً شہر حوالے کر دیا اور اُسے حمص کے بدلے تِلّ باشر دے دیا گیا (ابوالفداء : کتاب مذکور، ۳ : ۳۹۳)- ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء میں الملک الاَشرف حاکمِ تِلّ باشر نے حلب میں آکر ھُولَاگو کی اطاعت قبول کی، جس نے اُسے حِمْص واپس دے دیا (ابوالفداء، کتاب مذکور، ۳ : ۵۸۵؛ Weil : .Gesch. d. Chalifen، ۴ : ۱۳).

[الملک الظاھر رکن‌الدین] بَیْبَرْس [صاحب بلادِ شام و مصر] کے متعلق کہتے ھیں کہ اس نے تِلّ باشر کا قلعہ [لے کر] تباہ کرا دیا تھا (ابن الشِّحْنَة، طبع بیروت، ص ۱۷۰) .

مآخذ : (۱) یاقوت : __معجم__، طبع وُیسٹن فیلٹ، ۱ : ۸۶۳؛ (۲) صفی‌الدین : __مراصِد الاطّلاع__، طبع Juynboll، ۱ : ۲۱۰؛ (۳) ابوالفداء : __تقویم البُلدان__، طبع Reinaud، ۲۳۲؛ (۴) *Annales Muslem.*، طبع Reiske، مواضع کثیرہ؛ (۵) ابن‌الأثیر : __کامل__، طبع Tornberg، اشاریہ، ۲ : ۲۰۵؛ (۶) الدمشقی : طبع Mehren، ۲۰۶؛ (۷) کمال‌الدین، ترجمہ بلوشہ Blochet، *R.O.L.*، ۳ : ۵۲۳، حاشیہ ۲؛ (۸) ابن العِبْری Barhebraeus : *Chron. Eccl.*، طبع Abbeloos-Lamy، ۲ : ۳۸۲؛ (۹) *Chron. Syr.*، طبع Bedjan، ۳۱۶؛ (۱۰) ابن الشِّحْنَة : الدُّرّ المُنْتَخَب فی تأریخ [مملکة] حَلَب، طبع بیروت، ۹۹ ببعد؛ (۱۱) Mattheōs Urhayec'i، ترجمہ Dulaurier، اشاریہ، ۵۴۳؛ (۱۲) Michael Syrus، طبع Chabot، اشاریہ، ۷۲*؛ (۱۳) المَقریزی، ترجمہ کاترمیئر: *Hist. d. Sult. Maml.*، ۲ / ۱ : ۲۰۵؛ (۱۴) رِٹّر Ritter : *Erdkunde*، x : ۱۰۳۳؛ xvii : ۱۶۸۳؛ (۱۵) Rey : *Les colonies franques en Syrie aux XII^e et III^e siècles*، پیرس ۱۸۸۳ء، ص ۳۲۲؛ (۱۶) Sachau : *Reise in Syrien u. Mesopot.*، لیپزگ ۱۸۸۳ء، ۱۶۲ تا ۱۶۵؛ (۱۷) Ainsworth : *A personal Narrative of the Euphrates Expedition*، ج ۲، لنڈن ۱۸۸۸ء: ۱۲۳؛ (۱۸) لیسٹرینج Le Strange : *Palestine under the Moslems*، ۴۳۲، ۵۴۳؛ (۱۹) Sayce : *P. S. B. A.*، ج ۳۳، ۱۹۱۱ء : ص ۱۷۵؛ (۲۰) ھارٹ مان R. Hartmann : *Z. D. M. G.*، ج ۷۰، ۱۹۱۶ء : ۳۴، حاشیہ ۱۳؛ (۲۱) Gaudefroy-Demombynes : *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، ۱۹۲۳ء، ۹۲، ۹۵، ۲۱۹؛ (۲۲) Dussaud : *Topographie*

histor. de la Syrie antique et médiévale، پیرس ۱۹۲۷ء، ۳۳۶، ۳۶۳، ۳۶۸.

(E. Honigmann)

* **تـلّ العَمارنـة** : [مصحّفاً : تل العَمَرنة] دریاے نیل کے دائیں کنارے پر ایک جگہ ہے، جو صوبہ المِنْیَة Minya میں ایک چھوٹے سے قصبے مَلّوی کے بالمقابل واقع ہے ۔ دریاے نیل اور پہاڑوں کا (جنھیں یہاں جبل الشیخ سعید کہتے ہیں) درمیانی فاصلہ تقریباً ۳ میل ہے لیکن شمال اور جنوب کی جانب یہ پہاڑ دریا کے قریب آ جاتے ہیں اور تقریباً پانچ میل لمبا رقبہ چھوڑتے ہیں ۔ یہاں کے گاؤوں میں سے ایک کا نام التـلّ (یا التـلّ) ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ''تلّ العمرنة'' ''اہل یورپ کی گھڑنت'' ہے (فلنڈرز پِٹری Flinders Petrie) ۔ اس کا صحیح نام تلّ العَمارنَة ہے، قبیلۂ بنو عِمران (یا عَمران) کے نام پر، جو اس مقام پر اور نیل کے دوسرے کنارے پر آباد ہیں ۔ یہ جگہ اس لیے مشہور ہے کہ یہاں اَمینوفِس Amenophis رابع بیس یا تیس برس تک مقیم رہا ۔ وہ قُرصِ خورشید کی پرستش کو رواج دینے کے بعد تھیبز (یا طیبہ Thebes) چھوڑ کر یہاں آ بسا تھا اور اس کے شہر کو اخِت اتُون Ekhet-Aton نام دیا گیا تھا ۔ چونکہ اس جگہ پر کوئی دوسرا شہر آباد نہیں ہوا اس لیے اس کے آثار نسبةً اچھی حالت میں باقی ہیں ۔ کھدائی کا کام ۱۸۸۸ء سے جماعت شرقیۂ المانیہ (Deutsche Orient-Gesellschaft) اور پروفیسر فِلنڈرز پِٹری Flinders Petrie کی نگرانی میں ہوتا رہا اور جنگ کے بعد سے مصر کی اکتشافی سوسائٹی (Egyptian Exploration Society) کی طرف سے جاری ہے ۔ یہاں کے آثار میں سے مٹی کی ان تختیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے جو شہر کے مشرق میں دفتر خانے (''Rolls House'') سے بہ تعداد کثیر دستیاب ہوئی ہیں اور جن پر خطِ میخی میں وہ مکاتیب مسطور ہیں جو ایشیائی بادشاہوں کے اور شاہانِ مصر کے مابین آئے گئے تھے ۔ ان تختیوں کا بیشتر حصہ برلن کے عجائب خانے میں محفوظ ہے ۔

بظاہر تلّ العَمارنَة کے نوادرِ قدیمہ کا علم عرب مصنفین کو بہت ہی کم تھا ۔ اس کے شمال میں شہر اَنْصِنا Anṣinā واقع تھا، جو اب تقریباً ویران ہو چکا ہے ۔ نیل کے دوسرے کنارے پر الاَشْمُونَین آباد تھا؛ ابن حوقل (ص ۱۰۵) اور یاقوت (۱ : ۷۶۰) ایک مقام بُوصِیر کا ذکر کرتے ہیں جو الاَشْمُونَین کے مقابل میں تھا لیکن اس سے زیادہ اور کوئی تفصیل نہیں بتاتے ۔ التـلّ کے متعلق کاترمیئر کی یہ راے ہے کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں پسینَولا Psinaula آباد تھا اور جہاں رومیوں کے عہد میں ایک قلعہ گیر فوج بھی رہا کرتی تھی (قبّ نیز Description de l'Egypte، طبع ثانی، پیرس ۱۸۲۹ء، ج ۱۸ / ۳ : ۱۰۰).

مآخذ : علی پاشا مبارک : الخطط الجدیدة، ۱۰ : ۳۳؛ (۲) کاترمیئر : Mémoire géographique et historique sur l'Egypte، پیرس ۱۸۱۱ء، ۱ : ۳۹ ببعد؛ (۳) W. M. F. Flinders Petrie : Tell el Amarna، لندن ۱۸۹۴ء، ص ۲؛ (۴) Baedeker : Ägypten، ۱۹۲۸ء، ص ۲۳۷ ببعد.

(J. H. Kramers کرامرز)

* **تـلّ الـکـبـیـر** : مصر کے دمِیَة (ڈیلٹا) کا ایک گاؤں، جس کا سٹیشن قاهرة ـ زقازیق ـ اسمٰعیلیّة ـ سویز ریلوے لائن پر ہے ۔ یہ ریلوے سٹیشن زقازیق سے تقریباً تیس کیلومیٹر اور اسمٰعیلیّة سے پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور گاؤں سے کچھ فاصلے پر نہر اسمٰعیلیة کے شمالی کنارے پر واقع ہے ۔ ہر جمعرات کو یہاں بازار لگتا ہے ۔ گرد و نواح میں بدوی قبائل هَنادی، نَفَعات

[النُفَیعات] اور طُومیلات بستے ہیں ۔ ریت کے ٹیلوں سے پُر وسیع قطعات اور نشیب و فراز والی صحرائی زمین وادی کے شمال اور جنوب میں پھیلی ہوئی ہے ۔ قدیم قلعہ‌بندیوں کے آثار اور مدفون شہروں کی ڈھیریاں بھی ملتی ہیں ۔ یہاں کے اس نشیب میں جسے وادی طُومیلات کہتے ہیں اور جس میں سے میٹھے پانی کی نہر بہتی ہے نہایت زرخیز زرعی زمین ہے ۔ صوبے (مُدیریة) کا نام الشرقیة ہے اور ضلع (مرکز) کا زَقازِیق ۔ یہاں پولیس کی چوکی بھی ہے ۔ بقول بُوانے بک Boinet Bey باشندوں کی تعداد ۳۱۹۳ کے قریب ہے، جو تین ''عِزْب'' ezbeh اور پانچ ''کَفُوں'' میں رہتے ہیں ۔ اس میں چار زاویے اور تین کُتّاب (ابتدائی مدارس) ہیں ۔ موجودہ زمانے میں اس مقام کو اس بناء پر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۸۸۲ء میں یہاں مصریوں اور انگریزوں کے درمیان مختصر مگر خون‌ریز جنگ ہوئی ۔ مصری فوج کی قیادت عَرابی پاشا اور انگریزی فوج کی قیادت سرگارنِٹ وولزلے نے کی تھی ۔ ابھی تک وھاں ایک چھوٹا سا قبرستان موجود ہے، جس میں ان برطانوی سپاہیوں کے نام کندہ ہیں جو اس لڑائی میں کام آئے ۔

مآخذ : (۱) بُوانے بک Boinet Bey : *Géogr. Econ.*، ۲۲۳؛ (۲) C. Royle : *The Egyptian Campaigns*، لنڈن ۱۸۸۶ء، ۱ : ۳۱۲ ببعد؛ (۳) لین پُول Stanley Lane - Poole : *Watson Pasha*، ۱۰۸ ببعد؛ (۴) شہزادہ ابراہیم حِلمی : *Lit. of Egypt and the Sudan*، بذیلِ مادہ؛ (۵) C. G. Gordon : *Journals*، ۶۰؛ (۶) Milner : *England in Egypt*، ۱۱۶؛ (۷) E. L. Butcher : *Church of Egypt*، ۲ : ۳۸۹؛ (۸) W. Scawen Blunt : *My Diaries*، ۲ : ۳۸ تا ۳۹؛ (۹) Baedeker : *Egypt*، اشاریہ ۔

(واکر J. Walker)

تِلّٰه : (Telloh) عراق میں ایک جگہ کا نام ہے، جس میں بہت سے مصنوعی ٹیلے ہیں، جو چار پانچ میل تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ یہ مقام شطّ الحَیّ کے مشرق کی طرف واقع ہے، جو دجلے کو فرات سے ملاتی ہے اور ناصِریّہ سے آٹھ یا دس گھنٹے کی مسافت پر ہے ۔ سارزِک Earnest de Sarzec نے، جو فرانس کی طرف سے بصرے میں بحیثیت قونصل متعین تھا، ۱۸۷۷ء میں یہاں آثارِ قدیمہ دریافت کیے؛ چنانچہ اس کی ہدایت کے مطابق ۱۸۸۰ء میں کھدائی کا کام شروع ہوا اور یہ بات تحقیق کو پہنچی کہ اس جگہ سُمیری شہر لَگَش Lagash یا سِرپُرلا Sirpurla آباد تھا ۔ کھدائی میں جو چیزیں برآمد ہوئیں ان کا بیشتر حصہ — گُوڈیا Gudea کے بیشمار بتوں سمیت — پیرس کے عجائب خانۂ لُوور Louvre میں رکھا گیا ۔ سارزِک کی وفات کے بعد، جو ۱۹۰۱ء میں واقع ہوئی، کھدائی کا کام کروس Cros نے جاری رکھا ۔

تِلّٰه ایک مقامی نام ہے، جس میں بلا شک و شبہہ لفظِ تِل شامل ہے ۔ بقول شیفر Schefer یہ نام شاید تِلّ اللّوح (یعنی تختی کی پہاڑی) سے مأخوذ ہے ۔

مآخذ : (۱) E. de Sarzec : *Découvertes en Chaldée*، پیرس ۱۸۸۴ تا ۱۹۱۲ء ۔

(کرامرز J. H. Kramers)

تِلِمْسان : فرانسیسی Tlemcen، بربری لفظ تِلِمْس سے مأخوذ ہے، (جمع تِلِمسان اور تِلِمّسِین) بمعنی ''چشمہ، پانی کا کنواں''، پس اس کلمے کے معنی ہیں ''چشموں کا شہر'' ۔ قدیم شہر موجودہ شہر سے چند سو گز کے فاصلے پر اس کے شمال مشرق کے مشرق (E.N.E.) میں واقع ہے ۔ اس قدیم شہر کے دو نام تھے، تِلِمسِن اور اَگادِیر، اگادیر پرانا فنیقی نام ہے، جو بربری زبان میں بھی مروّج ہو گیا، ان

معنوں میں جو اوپر بیان ہوے [قب مادۂ آگادیر]؛ نیز بمعنی : ''سرازیر چٹان، یا سطح مرتفع''۔ یہ معنی اس شہر کے محلّ وقوع پر ٹھیک چسپاں ہوتے ہیں، کیونکہ یہ شہر خفیف سی ڈھلان والی سطح مرتفع پر واقع ہے، جو اُس میدان میں سے یک لخت بلند ہو جاتی ہے جس پر یہ شمال اور مشرق میں مُشرف ہے ۔ شاید آگادیر کے نام میں ہمیں عربوں کی اس روایت کی اصل نظر آ جاتی ہے جس میں تِلِمْسان کو الجدار یا مدینة الجدار کا نام دیا گیا ہے اور جس کی رو سے [حضرت] موسٰی[۴] اور الخَضِر[۴] (رک بآن اور قب قرآن [مجید]، ۱۸ [بنی اسرائیل]: ۶۴ ببعد) کی باہمی ملاقات کا مقام یہاں تھا۔ اس شہر کے اَور نام بھی ہیں، جو حسب ذیل ہیں : [۱] پوماریا Pomaria، بمعنی ''باغہاے میوہ''، یہ اس چھوٹے سے شہر کا نام تھا جو رومیوں کے زمانے میں یہاں موجود تھا اور جس کا ذکر بعض ان لاطینی کتبوں میں ملتا ہے جو آگادیر کے موقع پر دستیاب ہوے ہیں ۔ [۲] تاگْرارْت ''اردو، کمپو'' (بربری) ۔ یہ نام اسے گیارھویں صدی میلادی میں فتحمند مُرابطین نے دیا، جنھوں نے موجودہ تِلِمْسان اور اس کی شاندار جامع مسجد کی بنیاد اس وقت ڈالی جب وہ قدیم تِلِمْسان یعنی آگادیر کا محاصرہ کر رہے تھے ۔ تِلِمْسان کا سب سے آخری نام [۳] مَنْصورة یا المحلّة المنصورة ہے، جس کے معنی عربی میں ''فتحمند یا فتح مندی والی لشکر گاہ'' ہیں ۔ یہ شہر، جس کا رقبہ ۲۵۰ ایکڑ تھا، فاس کے مَرِینی سلاطین نے ایک میل مغرب کی طرف تیرھویں صدی میلادی کے آخر اور چودھویں صدی میلادی کے شروع میں اپنے پہلے عظیم الشان محاصرۂ تِلِمْسان کے وقت بنایا تھا ۔ اس کی عمارتوں میں ایک جامع مسجد، ایک محلّ شاہی اور ایک فصیل‌دار قلعہ بھی شامل تھا ۔ ان

تین شہروں میں سے، جو یکے بعد دیگرے یہاں آباد ہوے اور جن سے تِلِمْسان بنا (آگادیر مشرق میں، تاگْرارْت وسط میں، اور مَنْصورہ مغرب میں)، اب صرف وسطی شہر تِلِمْسان کے نام سے باقی ہے ۔

جغرافیائی محلّ وقوع : تِلِمْسان گرینچ سے ایک درجہ ۳۰ دقیقے طول البلد غربی اور ۳۴ درجے ۵۳ دقیقے عرض البلد شمالی پر واقع ہے، اور سطح سمندر سے ۲۶۰۰ فٹ بلند ہے ۔ یہ شہر تِلِمْسان کے پہاڑوں کے گتھے ہوے سلسلے کی ایک ماہی پشت چٹان کی شمالی ڈھلان پر آباد ہوا ہے، جس کا رخ سمندر کی طرف ہے ۔ یہ سمندر شمال کی جانب ۳۰ میل کے فاصلے پر نظر آ سکتا ہے ۔ شہر اس آب کند (کھائی) کے کنارے پر ہے جسے دریاے تَفْنَہ نے ساحل کے سلسلۂ کوہ میں بنایا ہے ۔ تِلِمْسان کے گتھے ہوے پہاڑوں کا مجموعہ جغرافی وحدت ہے، جس میں چند متوازی سلسلے شامل ہیں ۔ یہ سلسلے جنوب مغرب سے شمال مشرق کو جاتے ہیں اور جنوب کی طرف بتدریج بلند سے بلندتر ہوتے جاتے ہیں ۔ تِلِمْسان کے عین پیچھے تو ان کی بلندی ۴۰۰۰ فٹ ہے، مگر وہ آہستہ آہستہ ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں؛ وہاں وہ اَلْفَہ Alfa کے بے درخت میدان پر مُشرف ہیں، جو ان کے جنوب میں ہے ۔ اس جُوروی (Jurassic) گنجان کہسار کی جنوبی حد پر بے درخت میدان ہیں، جو قدیم رسوبی مواد سے بنے ہیں ۔ اس کے مغرب، شمال اور مشرق میں چکنی مٹی کے میدان ہیں، جن کی تکوین کَرْتینِیّہ Cartenian (مَرْنیا Marnia) دور میں ہوئی اور کَرْتینِیّہ اور دورِ جدید وسطی (Middle Myocene) (هَنایا Hennaya) اور دور عصرِ جیولوجی ثالث کے اوائل (Lower Eocene) میں ہوئی اور وہ رسوبی میدان ہیں جو دریاے لاموریسِیر Lamoricière اور بِلِ عباس Bel-Abbès

نے دورِ ہلویتی (Helvetian) اور جدید ترین عہد (Pleistocene) میں بنائے ہیں .

اس سلسلۂ کوہ کی طبقات ارضی ترتیب یوں ہے : ڈولومائٹی چونے کے پتھروں (Dolomitic limestones) کا طبقہ مسام دار ریتلے پتھروں کے طبقے پر قائم ہے اور وہ چکنی مٹی اور بجری پر قائم ہے، جو بارش کا پانی وسیع زمین دوز طاسوں میں جمع کرنے کے لیے بہت موزوں ہیں، اس لیے تلمسان کا گنجان پہاڑ گویا ایک وسیع ذخیرۂ آب ہے، جس سے طویل موسمِ گرما میں بے حد مطلوب پانی کے بے شمار چشمے پھوٹ کر پانی تقسیم کرتے رہتے ہیں - یہ چشمے کبھی خشک نہیں ہوتے اور شہر کے نواح میں میلوں تک انھیں کی بدولت خوبصورت میوہ باغ اور طرح طرح کی سبزی ترکاری کے کھیت نظر آتے ہیں، جو شہر کی خوشحالی کا موجب ہیں اور انھیں پر وہاں کے گھنے سبزہ زاروں اور خوبصورت جنگلوں کا، جو اس کی زینت ہیں، دار و مدار ہے .

ان جُورَوی (Jurassic) گنجان پہاڑوں کی ڈھلانوں پر سدا رواں، مدامی دریا بہتے ہیں (تَفْنَہ، مَفْرُوش، وادِ شُولِی، وادِ اِسِّر) اور ان میں آبشار بھی ہیں - ان پہاڑوں کے اطراف گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوے ہیں (مختلف قسم کے بلوط، سدا بہار تُھویا (thuyas، شجرالحیاۃ)، بُطْم یا تارپین کے درخت اور خودرو زیتون وغیرہ وغیرہ اور ان میں طرح طرح کے جانوروں کو بھی پناہ ملتی ہے (بن بلاؤ، چرخ، گیدڑ، لومڑیاں، جنگلی سور اور دوسرے ان سے چھوٹے چوپائے اور بےشمار پرندے) - ان پہاڑوں میں کئی زمین دوز گلیاں اور چھوٹے بڑے غار بھی ہیں، جن میں کبوتر بھرے رہتے ہیں اور بعض اوقات جانوروں کے لیے پناہ‌گاہ بلکہ مقامی باشندوں کے لیے گھروں کا کام بھی دیتے ہیں .

زمین زرخیز ہے اور قسم قسم کی نباتات اس میں پائی جاتی ہے؛ چنانچہ تلمسان کے میوہ باغوں میں بحیرۂ روم کے سواحل کے درخت اور پودے اور وسط یورپ کے کئی قسم کے درخت اور پودے نشوونما پاتے ہیں - بارش کی سالانہ اوسط ۲۶ انچ ہے - بارش تقریباً سال بھر ہر مہینے میں ہو جاتی ہے لیکن جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینوں میں بہت کم ہوتی ہے - ان مہینوں میں صرف گرج کے ساتھ تھوڑے سے چھینٹے پڑتے ہیں - موسمِ سرما میں معمولی سی برف باری بھی ہو جاتی ہے - آب و ہوا صحت بخش اور روح پرور ہے اور جن لوگوں میں خون کی کمی ہو یا جو اعصابی کمزوری میں مبتلا ہوں ان کے لیے خاص طور پر مفید ہے .

تاریخ : انسانی آبادی کے لیے جب موقع و محلّ ایسا موزوں ہو تو انسان کا وہاں ہزارہا سال سے آباد ہونا ایک قدرتی امر ہے - تقریباً ہر جگہ تاریخی زمانے سے پہلے کے انسان کے آثار یہاں دستیاب ہوے ہیں، لیکن اس علاقے میں ابھی اور بہت کچھ دریافت ہونے کی توقع ہے - اس نقطۂ نظر سے ابھی بہت کم جستجو ہوئی ہے، بالخصوص ان بےشمار غاروں میں کھدائی کا کام ہونا چاہیے جن میں سے، جہاں تک مجھے علم ہے، ایک کی بھی باقاعدہ کھدائی نہیں ہوئی.

ہمیں رومی زمانے کے شہر پوماریا کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں، کیونکہ یہاں صرف چند پتھر بچے ہیں جن پر کتبے موجود ہیں - ہمیں نہ تو ان کے دیوتا اَولِیسْوا Aulisva کا حال معلوم ہے (جسے کتبوں میں *deus invictus* [اجیت دیوتا] اور *deus sanctus* [پاک دیوتا] لکھا ہے) اور نہ ان سواروں کے رسالوں کا جو یہاں کے قلعے میں رہتے تھے .

تأریخ تلمسان کا جو دور رومی عہد اور اسلامی فتوحات کے درمیان تھا، اس کا حال معرضِ خفا میں ہے - اسی طرح ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ساتویں صدی میں اسلام اس علاقے میں کیسے داخل ہوا، نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ بنی صُفْرۃ کی بربری ریاست کی کیفیت کیا تھی، جس کا سردار اَبو قُرّۃ آٹھویں صدی میں ہو گذرا ہے؛ البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس امیر نے متعدد بار خوارج زناتہ کے سردار کی حیثیت سے مشرق کی جانب یلغاریں کیں اور زاب اور افریقیہ تک پہنچا.

آٹھویں صدی کے آخر میں مذہب اہل السنّت و الجماعت تلمسان اور اس کے نواح میں قطعی طور پر رائج ہو گیا - ادریس اوّل نے ۱۷۹ھ میں ''ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی جس میں اس نے ایک خوبصورت منبر بھی رکھوایا'' اس وقت سے تلمسان آگادیر صوبائی حکومت کا مرکز بن گیا، جسے وسطی اور مغربی مغرب کے تمام انقلابات میں سے گذرنا پڑا.

موجودہ تلمسان (تاگْرارْت) نے، جس کی بنیاد گیارھویں صدی [میلادی] کے آخر میں یوسف ابن تاشْفین نے رکھی تھی، بڑی ترقی کی اور المُوَحِّدین نے چھٹی (بارھویں) صدی میں اس شہر (تاگْرارْت) کے گرد فصیل بنوائی، کیونکہ آگادیر کی شہر پناہ پہلے ہی موجود تھی - مُرابطین کے زمانے میں تلمسان علمِ کلام اور فقہ کے درس و تدریس کا مرکز تھا (۱۰۸۱ تا ۱۱۴۴ء) اور مشہور و معروف علماء و فضلاء یہاں ہو گذرے ہیں - یہاں کی جامع مسجد، جو اسلامی مذہبی آرٹ (فن) کا عمدہ مظہر ہے ابھی باقی ہے اور اس کی محراب کے ارد گرد سنگی لوحوں پر کتبے کندہ ہیں، جن کے حروف کو قادرانہ اور نفیس گل بوٹوں کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے - تلمسان پر قبضہ کرنے کے تقریباً ۵۰ سال بعد المُوَحِّدین نے جامع مسجد کے اس حصے کی زیب و زینت کو مکمل کیا تھا جیسا کہ اس کتبے سے ظاہر ہے جو محراب کے سامنے قبے کی گردن کی کانس (cornice) پر درج ہے - جس میں ۵۳۰ھ / ۱۱۳۵ء کی تأریخ ثبت ہے.

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ المُوَحِّدین نے، جو خوبصورت اور یادگارِ زمانہ آثار کے بانی تھے، تلمسان میں اپنے عہد (۱۱۴۴ تا ۱۲۳۶ء) کی کوئی نشانی نہیں چھوڑی، سوا اس ٹھوس شہر پناہ کے جو مٹی کے قالبی چوکوں (terre pisé) سے بنی ہے - تلمسان یا اُس کے نواح کی کوئی عمارت اُن سے منسوب نہیں کی جا سکتی - اسی زمانے (۱۱۹۷ء) میں اندلس کے مشہور و معروف صوفی بزرگ ابومَدْیَن [رَكْ بآن]، جن کا یہاں مزار ہے، تلمسان کے سرپرست ولی بنے.

ساتویں (بارھویں) صدی کے پہلے نصف میں جب المُوَحِّدین کی سلطنت، حکمرانوں کے عدمِ قوّت اور ضعفِ اقتدار کی وجہ سے، کمزور ہو گئی اور اس کی مغربی سرحدیں بربری قبائل کے حملوں کی زد میں آ گئیں اور اِفریقیّہ کے حَفصی عامل بھی جادۂ اطاعت سے منحرف ہو گئے اور اُنھوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تو زناتہ کے قبائل میں سے بنو عبدالوادْ [قبّ (بنو) عبدالواد] نے مغربِ وسطی میں اور بنو مَرِین [قبّ (بنو) مرین] نے یکے بعد دیگرے دو سلطنتیں قائم کیں اور تلمسان اور فاس کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا

اگرچہ ساتویں اور آٹھویں صدی (تیرھویں و چودھویں) میں بالخصوص ان کے ہمسایہ حکمرانوں، یعنی حَفْصِیّۃ تونس اور مَرِیْنِیّۃ فاس، کی طرف سے تلمسان اور عبدالوادْ کی مملکت پر متواتر حملے ہوتے رہے اور اکثر اوقات یہ حملے کامیاب بھی رہے، تاہم تلمسان کے شاہی خاندان نے اتنا وقت نکال

ھی لیا جس میں اپنے پاے تخت کی زیب و زینت کے لیے مختلف عمارتیں بنا ڈالیں ۔ ان میں سے کئی ایک اب تک موجود ھیں ۔ انھوں نے علوم و فنون کو خوب ترقی دی اور طلبہ کے لیے مدرسے قائم کیے ۔ ان میں سے قریۃ العُبّاد کا مدرسہ، جو تلمسان کے نزدیک ھے اور جس میں بربروں کا مشہور و معروف مؤرّخ ابن خَلْدون بھی کچھ عرصے کے لیے عزلت گزین رہا ، اب تک موجود ھے ۔ ان بادشاھوں کو صحراء اور سطوح مرتفع اور تِلّ وغیرہ سے تعلّقات کے سلسلے میں تلمسان کی تجارتی اھمیت کا پورا احساس تھا ۔ انھوں نے اپنی بندرگاہ حَنین کے ذریعے ھسپانیہ کے ساتھ بھی ھمیشہ تعلق قائم رکھا ؛ مشرق اور مغرب کے ساتھ تجارت کے نقطۂ نظر سے بھی وہ اس شہر کے عمدہ محلِّ وقوع سے متمتّع ہونے سے غافل نہ رھے، اس لیے کہ مشرق سے مغرب کو جانے والا قدرتی رستا یہیں سے ہو کر گذرتا تھا .

تلمسان صرف تجارتی مرکز اور گرد و نواح کے علاقے کی پیداوار کے لیے بڑی بھاری منڈی ھی نہ تھا بلکہ وھاں کے صنّاع اور دستکار ایسی چیزیں بناتے تھے جن کی مانگ عام تھی اور اب تک ھے ۔ جب اندلسی عرب نویں (پندرھویں) صدی میں سپین سے ھجرت کر کے چلے آئے تو تلمسان میں بھی ان کی ایک بڑی تعداد آ بسی ؛ جس سے زندگی کے مختلف شعبوں (یعنی علم و فضل، صنعت و و حرفت، فنونِ لطیفہ ، علمِ ادب ، علمِ موسیقی، زراعت وغیرہ) میں نئی سرگرمی پیدا ہوگئی .

اگرچہ یہ شہر آب و ھوا کی خوبی اور قدرت کی نعمتوں سے مالا مال تھا مگر بدقسمتی سے اسلامی ثقافت کی حسبِ توقّع اشاعت میں اس زمانے میں بھی ناکام رہا جب وہ مغربِ وسطٰی کے صدر مقام کی حیثیت سے اوجِ کمال پر تھا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ شہر ھمیشہ خانہ بدوش قبیلوں، یعنی برابرۂ زِناتہ اور اَعرابِ ھلالیّہ، میں گھرا رہا، جو [سیماب کی طرح] قرار اور قیام سے عاری تھے؛ ھلالی عرب بالخصوص بہت فسادی ھمسائے تھے اور سیاسی نقطۂ نظر سے بے حد ناقابل اعتماد، نتیجہ یہ ہوا کہ اس پاے تخت کو کسی طویل مدت کے لیے وہ چین نصیب نہیں ہوا جو اس کی ثقافت کے ارتقاء کے لیے ضروری تھا .

ترکوں اور ھسپانیہ کے عیسائیوں کے درمیان دسویں (سولھویں) صدی کے آغاز میں تلمسان کی ملکیت کے متعلق نزاع پیدا ہوا ۔ خانوادۂ عبدالواد کے آخری بادشاھوں نے وَھْران میں ھسپانیوں کی بادشاھی تسلیم کر لی ۔ [صالح] رئیس، الجزائر کے پاشا، نے ترکوں کے نام پر ۱۵۵۵ء میں تلمسان پر قطعی طور پر قبضہ کر لیا .

ترکوں کے [آنے کے بعد] تلمسان میں . . . . تجارت آھستہ آھستہ زوال پذیر ہو گئی اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ نئی شاندار عمارتیں اس کے بعد تعمیر نہ ہوئیں، بلکہ متعدد عمومی عمارتیں اور محل گر کر کھنڈر ہو گئے ۔ اس دور کے لوک گیت اس پر شاھد ھیں کہ بیکوں [یا گورنروں] کی فوجی حکومت اور مالی تصرّف کے تحت تلمسان کی حالت کیا سے کیا ہو گئی :

"مشیّت ایزدی کے مطابق تلمسان کے زوال کی آخری گھڑی آ پہنچی! کیا اُس نے ھر چیز کا خاتمہ مقدّر نہیں کر دیا جس سے کوئی چارہ نہیں ؟ اس کے عروج و کمال کا زمانہ ختم ہوا ۔ اب مصیبت اور بدقسمتی کے دِن آ گئے ۔ یہ شہر برباد ہو چکا ھے، تلف ہو چکا ھے، ظلم و ستم کا شکار ہو چکا ھے ۔ اس کا لباس ماتمی ھے اور شرم اور بے عزتی اسے ڈھانپ چکی ھے ۔ اس کے فضائل

کی بنیاد شر نے اکھیڑ دی ہے ''.

تین صدیوں تک . . . ترک تلمسان پر قابض رہے اور ایک اہم نسلی عنصر پیچھے چھوڑ گئے : یعنی قول اوغلی[1] (قُرغلی بمعنی غلام زادہ یا سپاہی زادہ) یعنی ترکوں کی اولاد، جو ملکی عورتوں سے ہوئی ـ قول اوغلی ابھی تک موجود ہیں اور بلدیۂ تلمسان (commune of T.) کی بومی مسلم آبادی کا چوتھائی حصّہ اور اس آبادی کے سرگرم رکن ہیں ـ خُو خصلت میں اَوروں سے بہت زیادہ اہلِ یورپ کے مشابہ اور بڑے ترقی پسند لوگ ہیں .

تلمسان ترکوں کے تسلّط سے چھٹکارا پا کر ۱۸۳۰ سے ۱۸۳۳ء تک سلطان مرّاکش کے تابع رہا ـ مرّاکش کے شاہی حقوق کو امیر عبدالقادر نے بھی تسلیم کر لیا تھا ، جو حَضَر (عربِ مغرب اور بربر - عربوں) کی امداد سے تلمسان میں کچھ بے ثبات سا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا .

فرانسیسی پہلے پہلے ۱۸۳۶ء میں تلمسان میں داخل ہوے لیکن ۳۰ مئی ۱۸۳۷ء کو (عہد نامۂ تَفْنَہ کی رو سے) وہ اس کا قبضہ [امیر] عبدالقادر کے نائب کے حوالے کر کے یہاں سے چلے گئے ـ عہد نامۂ تفنہ کی خلاف ورزی ہونے پر بُوگُو Bugeaud آیا اور ۳۱ جنوری ۱۸۴۲ء کو شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا ـ اس وقت سے اب تک تلمسان میں امن اور خوشحالی کا دَور دورہ ہے [بشرطِ صحّت یہ حالت حدود ۱۹۳۰ء کے ہونگے]، جسے مسلمانوں (یعنی قول اوغلیوں اور حضر) کی باہمی خانہ جنگی نے کئی سال سے متواتر تباہ کر رکھا تھا ـ ۱۸۵۴ء میں تلمسان کو ایک ''خودمختار بلدیہ'' (''commune de plein exercice'') کا درجہ دیا گیا اور ۱۸۵۸ء میں اسے ایک اقلیم عام (arrondissement) کا صدر مقام بنا دیا گیا ـ [۱۹۳۰ء کے حدود میں] یہ ایک قضاء اور فوجی چھاؤنی کا صدر مقام تھا، جس میں ایک پیادہ پلٹن اور ایک رسالہ (spahis) رہتا تھا ـ یہاں کئی مدرسے، بنک اور زمینداروں کو قرض دینے کے دفاتر وغیرہ ہیں ـ آبادی، تیس ہزار مسلم، چھے ہزار یہودی اور چار ہزار یورپی نفوس پر، مشتمل ہے .

تلمسان کی دل فریبی، اس کی سرسبزی اور اس کے محلِّ وقوع کی زیبائی ہی پر موقوف نہیں، اَور بھی متعدّد چیزیں ہیں جو اُسے دل فریب بناتی ہیں : مثلاً اسلامی فن کی وہ یادگارِ زمانہ عمارتیں جن کی وجہ سے تلمسان زینت کاری کے بہترین اندلسی ـ المغربی(Hispano-Moorish) دَور کا عجائب خانہ معلوم ہوتا ہے ؛ پھر تلمسانیوں کی، جو سب کے سب مالکی مسلم ہیں، انفرادی اور جماعتی زندگی بھی دل کش ہے کہ یہ لوگ اپنے اخلاق و آداب میں اب تک اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے آ رہے ہیں ـ اس لحاظ سے الجزائر کا اَور کوئی شہر تلمسان کا مقابلہ نہیں کر سکتا .

اَگادیر (تاگْرارت) اور منصورہ کی فصیلوں کے پرہیبت آثار اور اولیاء [اللہ] کے بے شمار مقابر کے علاوہ مفصّلۂ ذیل عمارتیں بھی ماہرین آثار اور اسلامی آرٹ کے شیدائیوں کی توجّہ کے قابل ہیں : جامع مسجد، جو چھٹی صدی ھجری/ بارھویں صدی میلادی میں اور اس کا مَنار، جوساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی میلادی میں تعمیر ہوا؛ اَگادیر

[(۱) قرغلی سے مراد ہے ترکی مرد اور تلمسانی عورت کی اولاد اور یہی معنی اس لفظ کے آج کے دن تک معروف چلے آئے ہیں ، غلام یا فوجی سپاہی کی اولاد کے لیے قرغلی کی اصطلاح تو کبھی استعمال نہیں ہوئی (دائرة المعارف الاسلامیة، قاهرة).]

کی جامع مسجد کا مَنار (ساتویں ھجری / تیرھویں صدی میلادی) - یہ مسجد ادریس کی بنا کردہ قدیم مسجد کے موقع پر بنائی گئی، جو اس نے دوسری صدی ھجری / آٹھویں میلادی میں بنائی تھی مگر اب موجود نہیں؛ ساتویں صدی ھجری / تیرھویں میلادی کی مسجد سیدی بِلْحسن [ابی الحسن]، جس کی محراب لطیف و نفیس اور جس کا مَنار بدیع و زیبا ہے اور اس کی گچ پر جھالر کی طرح کے پیچ در پیچ کندہ کاری کے گل بوٹے نہایت خوش نما ھیں اور اس کا دیودار کا فرش، جو ھندسی شکلوں میں ترتیب دیا گیا ھے (سابقہ مسجد کی یہ عمارت اب اسلامی آثار قدیمہ کا عجائب خانہ ھے)؛ مسجد ''اَوْلَاد الامام'' (آٹھویں صدی ھجری [چودھویں میلادی] کے آغاز میں) المدرسة القدیمة کے پاس تھی، جو اب معدوم ھو چکا ھے؛ شہر کی چار دیواری کے اندر 'مَشْوَر' ھے، جس کی اب بھی تعریف کرنا پڑتی ھے، یہ ایک مستحکم محل ھے، جسے ساتویں صدی ھجری / تیرھویں میلادی میں شہر کے سب سے اونچے حصے میں تلمسان کے خاندان عبدالواد کے پہلے حکمران نے تعمیر کرایا تھا؛ اس کے بعد ھم مسجد و خانقاہ سِیدی بَراھیم اور سِیدی سَنُوسی اور سیدی البَنّاء کی مساجد کا بھی، ان کی فن کاری کے نقطۂ نظر سے، ذکر کیے دیتے ھیں .

حومۂ شہر میں (فصیل سے باھر) مسلم فنِ تعمیر اور فنونِ لطیفہ کے اور خزانے بھی موجود ھیں : (۱) منصورہ کے کھنڈر، یہ مغربی تلمسان، فاس کے مَرِینی بادشاھوں نے ساتویں صدی ھجری / تیرھویں میلادی کے اواخر اور آٹھویں صدی ھجری / چودھویں میلادی کے آغاز میں تعمیر کرایا تھا - یہ اس زمانے کا ذکر ھے جب وہ بنو عبدالواد کا، جو اُن کے اقرباء مگر حریف تھے، محاصرہ کر رھے تھے - فصیلِ شہر کے بازووں کے پُر ھیبت برجوں کے بقایا اور چار ھزار گز کے گھیر کی فصیلوں کے باقی ماندہ حصوں کے علاوہ ایک قدیم شاھی محل کے کھنڈر بھی موجود ھیں - یہاں کی وسیع اور عظیم الشان مسجد کی بیرونی دیوار اور اس کے تراشیدہ پتھروں والے منار کے کھنڈر بالخصوص حیرت انگیز ھیں - اس منار کا جو حصہ باقی رہ گیا ھے وہ تقریبا ۱۲۰ فٹ بلند ھے اور آٹھویں صدی ھجری / چودھویں میلادی کی تعمیر ھے - یہ مَنار اپنی مضبوطی، حسنِ تزیین اور رنگا رنگ کی کاشی کاری کی وجہ سے المُوَحّدین کے زمانے کی عمارتوں کی یاد تازہ کرتا ھے، جن میں اشبیلیة کا منار جِرَلْڈا Giralda ، رِباط کے بُرجِ حَسَن اور مَرّاکش کی جامع قُطُبِیّة شامل ھیں .

(۲) مسلمانوں کے گاؤں العُبّاد میں، جو تلمسان سے مشرق جنوب مشرق کی طرف واقع ھے، سیدی بُومْدَین [ابو مَدْین] کی مسجد اب تک صحیح سالم کھڑی ھے - یہ مسجد ابوالحسن مَرِینی نے، جو کئی سال تک تلمسان کا حکمران رھا، بنوائی تھی - اس کی تاریخِ تعمیر ۱۳۳۹ء ھے - اس کے داخلے کے بڑے دروازے کی یادگار ڈیوڑھی، دیار کے گھومنے والے دروازے، جن میں کانسی کے تراشے ھوے ٹکڑوں کی پچی کاری کی گئی ھے، ایوانِ نماز، جس کی دیواریں عربی بیل بوٹوں کے کتبوں اور گل دار نقوش سے آراستہ ھیں، اس کی چھتیں، جنھیں اُبھری ھوئی اینٹوں سے سجایا گیا ھے، محراب کے آگے کا گنبد، جس میں رنگا رنگ کے شیشے ضیاپاشی کر رھے ھیں، اس کے پہلوؤں پر مناروں کے نمونے، جو اُبھری ھوئی اینٹوں سے بنائے گئے ھیں، جن پر نقش و نگار اور نازک لعاب کی کاشی کاری کے نشان ابھی تک باقی ھیں، غرض ان تمام خصوصیتوں کی حامل یہ تاریخی یادگار، جس پر اس کی صحیح تاریخ مرقوم ھے، اس ملک اور اس عہد کی اسلامی صناعی کی بیش بہا

دستاویز ہے ۔ اس مسجد کے علاوہ جو ابوالحسن نے سیدی بومدین کے نام پر بنوائی، اس بادشاہ نے چند ایک متعلقہ عمارتیں بنوائیں : مثلاً ایک مدرسہ (۱۳۴۷ء)، جو اس امر کے باوجود کہ اس کے باہر کا پلستر اور چینی کاری معدوم ہو گئی ہے، اب تک خاصی اچھی حالت میں ہے ؛ حاجت خانے ، غسل خانے اور حمام موجود ہیں ؛ ایک محل بھی ہے، جو بہت بوسیدہ ہوگیا ہے مگر اس کی شان و شوکت اس کی دیوار کے آثاروں سے ظاہر ہوتی ہے، جس کی استرکاری اور کاشی کاری نہایت عمدہ ہے ۔ یہاں مسجد اور محل کے درمیان چھٹی صدی ھجری / بارھویں میلادی کے آخر میں تلمسان کے مشہور و معروف صوفی اور تلمسان کے سرپرست ولی سیدی بومدین دفن ہوے تھے ۔ ہر مسلمان جسے تلمسان سے گذرنے کا اتفاق ہو ان کی قبر کی زیارت کرتا ہے ۔ یہ مربع نقشے کی عمارت ہے، جس پر بارہ قاش کا گنبد ہے اور اس پر سبز رنگ کی ٹائلوں (قرامید) کی چھت ہے ۔ اندرونی دیواروں پر اٹھارھویں صدی کی اطالوی لعاب‌دار ٹائلوں کا ازارہ ہے اور اوپر کے حصے کے پلستر پر رنگین اور قالب دار کام ہوا ہے ۔ بہت سے ملوک نے ایوانِ مقبرہ کو کسی نہ کسی نئی زیبائش سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے اور معتقدین نے اسے اپنی اپنی نذروں نیازوں سے بھرپور کر رکھا ہے ۔ مقبرے کے دروازے کی محراب کے ڈھانچے کو گچ کاری کے عربی نقوش سے آراستہ کیا گیا ہے، جو ترکی عہد کی یادگار ہے ۔ مقبرے کے سامنے ایک کنواں ہے، جس کا گھیر عقیقِ یمنی کا ہے اور اس کے چاروں ستون بھی اسی پتھر کے ہیں، جن کے سرستونوں پر چھت قائم ہے ۔

(۳) شہر کے شمال کی طرف عین فصیلِ شہر کے نیچے، یعنی حومۂ سیدی الحَلْوی کے وسط میں (یہ آبادی ایک اور اندلسی صوفی بزرگ کے نام پر ہے)، مرینی زمانے کی ایک اور مسجد ہے، جو ابو عنان، یعنی ابوالحسن بادشاہ کے بیٹے اور جانشین، نے تعمیر کرائی تھی ۔ اس عمارت کی حالت بھی بہت اچھی ہے اور دیگر مساجد کی طرح ، جو تلمسان میں ابھی باقی ہیں باستثناے مسجد سیدی بل حسن (جس میں اب عجائب‌خانہ ہے)، اس میں بھی نماز ہوتی ہے ۔ یہ مسجد چودھویں صدی (۱۳۵۳ء) کے مرینی فنِ تعمیر کی ایک اور یادگار ہے ۔ اس مسجد کی اندرونی زیبائش کی صنعت گری کا مقابلہ (دیواروں پر پلستر کی پوشش ، دیودار کی چھت، جو متعدد حصوں میں منقسم ہے اور ہندسی اشکال سے ہر حصے کو آراستہ کیا گیا ہے، عقیقِ یمانی کے ستون اور سر ستون، جن پر مسجد کا ایوانِ نماز قائم ہے اور جو منصورہ سے آئے تھے)، اصولِ فن کے اعتبار سے، فاس کے مدرسۂ بوعنانیۃ سے کیا جا سکتا ہے، جو اسی بادشاہ نے اسی زمانے میں تعمیر کرایا تھا ۔ ان دونوں عمارتوں میں ہمیں بلادِ بربر کے اسلامی فنِ تعمیر کا انحطاط صاف طور پر نظر آ رہا ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اسلامی ثقافت کا اثر تلمسان سے اٹھنے لگا تھا اور یہی صورت المغرب کے دوسرے حصوں کی تھی ۔ اس موقع پر ہم اس انحطاط کے اسباب کی بحث میں نہیں پڑ سکتے لیکن جہاں تک فنونِ صغری کا تعلق ہے (مثلاً بافندگی، سنہری اور روپہلی گل دوزی ، تانبے ، اون ، لکڑی اور دھاتوں کی چیزوں کی آرائش) تلمسان نے بڑی مدت تک شمالی افریقہ کے بڑے بڑے شہروں میں اپنا وقار قائم رکھا ۔ فنون صغری میں اس کے بےشمار کاریگر اب تک مشہور چلے آتے ہیں ۔ چمڑے پر سنہری اور روپہلی گل دوزی کے کام میں وہ آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتے، ساز اور زین پوشوں کی زیبائش میں ، جو سرکاری تقریبوں میں استعمال

ہوتے ہیں ، وہ بالخصوص بڑا کمال دکھاتے ہیں .

آبادی : ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کے اس پرانے پایۂ‌تخت میں مقامی (مسلم اور یہودی) باشندوں نے، جو ہمیشہ سے سخت محافظہ‌کار اور قدامت پسند چلے آئے ہیں، اس مادّی اور ذہنی ترقی کے باوجود جو انھیں اقوامِ یورپ، خاص کر فرانسیسیوں، سے طویل تماس کی وجہ سے حاصل ہوئی، اپنی اصلی سیرت کو برابر قائم رکھا ہے .

مسلم آبادی (زراعت پیشہ ، صنعت‌کار، تاجر، مزدور، محرّر اور حکومت کے چھوٹے چھوٹے ملازم) تعداد میں سب سے زیادہ ہے - یہ آبادی مختلف الاصل عناصر پر مشتمل ہے : [۱] حَضَر (=''شہری'') یعنی عربِ مغرب (Moors) تو وہ لوگ ہیں جو ان بلاد کے قدیم بربر باشندوں اور عربوں کے باھمی ازدواج سے وجود میں آئے - [۲] ان میں ان موروں کی اولاد بھی شامل ہے جو اندلس سے آٹھویں صدی ھجری / چودھویں میلادی میں نکال دیے گئے تھے - [۳] حبشی، جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے، ان سابق غلاموں کی اولاد ہیں جو توات اور بلادِ سودان سے تلمسان میں آئے تھے - [۴] قول اوغلی، جو ترکوں کے عہد حکومت میں پیدا ہوے - ان کے علاوہ [۵] دیہاتی مضافات میں وہ لوگ بھی ہیں جنھیں 'حُوز' کہتے ہیں، اس سے نسبت 'حُوزِی' بنتی ہے - ان سب اجناس کا مجموعہ تلمسان کی مسلم آبادی ہے، جنھیں مذھب، مشترک عقائد اور شرعی قانونِ عائلہ کے اتحاد نے متحد کیا ہے ، لیکن نسلی امتیاز (صَفّ، soff) اور گھرانوں کی باھمی مناقشت نے ان میں گہرا تفرقہ پیدا کر رکھا ہے .

اھلِ تلمسان نے قدیم زمانے ھی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور عربی زبان بھی غالباً ادریسی عہد میں اختیار کر لی تھی - تلمسانی اور تلمسان کے گرد و نواح کی بستیوں کے لوگ ہمیشہ سے اولیاء پرستی اور جادو ٹونے کے بہت معتقد چلے آتے ہیں .

یہودی آبادی چند صدیوں سے یہاں کی آبادی کا اھم جزء قرار پا چکی ہے - یہ لوگ مدّتِ دراز تک مظلوم رہے ہیں، اس لیے بیگانہ اور غیر یہودی ماحول کے خلاف انھوں نے اتّفاق و اتّحاد کی عادت کو خوب قائم رکھا ہے - خود یہودی بھی زیادہ‌تر علاقۂ تلمسان یا مراکش کے بربروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں - ان میں وقتاً فوقتاً ھجرت کے موقعوں پر بیرونجات کے ، بالخصوص ھسپانیہ کے، یہودیوں کی آمیزش بھی ہوتی رہی ہے - پرانی وضع کا لباس اب بوڑھے آدمیوں کے سوا اور کوئی نہیں پہنتا - نوجوان طبقے نے، جس کی تعلیم فرانسیسی مدرسوں میں ہوئی ہے، یورپی لباس اختیار کر لیا ہے اور ان میں تحصیلِ علم سے مناسبت اور علم کا ذوق و شوق بھی پایا جاتا ہے - تاھم سب کے سب اپنے آبائی عادات و عقائد کے بدستور پابند ہیں: یہ عادات و عقائد مسلمانوں سے خاصے قریب ہیں؛ چنانچہ وہ انھیں کی طرح ارواح ، غیبی طاقتوں اور جادو کو مانتے ہیں، رسوم تجہیز و تدفین، اولیاء پرستی، حتّٰی کہ خانگی زندگی کے دستوروں میں بھی وہ مسلمانوں سے مشابہت رکھتے ہیں- تمام شمالی افریقہ کی طرح یہاں کے یہودی بھی ایک قسم کی عربی بولی بولتے ہیں؛ اس جگہ ان کی زبان پر مراکشی بولی کا بڑا اثر پڑا ہے اور اصوات، تکوین و ترکیبِ الفاظ اور اشتقاقات میں یہودی بولی اھلِ تلمسان کی بولی اور نواح کی دیہاتی بولی سے صاف طور پر مختلف ہے .

الغرض تلمسان بربروں کا ایک قدیم شہر تھا، جس نے ساتویں اور آٹھویں صدی میلادی میں اسلام قبول کیا - تیسری صدی ھجری / نویں

میلادی سے اُس میں عربی زبان بولی جاتی ہے اور تب سے آج تک اس کے باشندے مالکی مذھب کے پیرو ھیں (تلمسان میں کوئی دوسرا سنی مذھب یا دوسرا مسلم فرقہ نہیں ہے) ۔ قرون وسطٰی میں یہ ایک اھم صوبائی صدر مقام تھا؛ اس کے بعد (سدۂ ۷ / ۱۳ تا ۱۰ / ۱۵) ایک مسلمان بربری شاھی خاندان کا پایۂ تخت بنا ۔ اس کے عروج کے زمانے کی قیمتی تاریخی یادگاریں اور بے شمار بہت دلچسپ عمارتوں کے آثار وھاں اب تک صحیح و سالم موجود ھیں ۔ اسی طرح اھلِ تلمسان میں قدیم روایات اور رواج بھی باقی ھیں اور یہ سب امور تلمسان کی اپنی مستقل ثقافت کے شواھد ھیں ۔

ترکوں کی آمد سے ثقافتی نقطۂ نظر سے تو کوئی عملی نتیجہ پیدا نہ ھوا لیکن نسلی اعتبار سے ان کی آمد ضرور اھم تھی ۔ جہاں تک رسم و رواج اور مذھب کا تعلق ہے قول اوغلی (ترک) عنصر مقامی آبادی میں جذب ھو چکا ہے لیکن معاشرتی لحاظ سے ایک علٰحدہ گروہ ہے، جو صحیح مقامی عنصر یعنی حضریوں کے خلاف ھی رھتا ہے ۔ قول اوغلی اور حضری آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے اور اگر کرتے ھیں تو شاذ و نادر ھی اور ذھنی اور جسمانی خصائص کے اعتبار سے ان میں بآسانی امتیاز ھو سکتا ہے ۔

اعداد و شمار کے لحاظ سے مسلمانوں کی آبادی اَوروں سے کہیں زیادہ ہے ۔ ان کے بعد یہودی آتے ھیں؛ پھر فرانسیسی اور دوسرے یورپی باشندے ۔ شمالی افریقہ کے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی ان تینوں بڑے گروھوں کے درمیان شادی بیاہ کا دستور نہیں ۔ مذھب، جو مسلمانوں اور یہودیوں میں رسم و رواج، خانگی زندگی اور ذھنی نقطۂ نظر کے بارے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، ان دونوں بڑے گروھوں کے درمیان اور ان کے اور یورپی گروہ کے مابین بھی سدّ فاصل کا حکم رکھتا ہے، جس کا عبور کرنا ممکن نہیں اور جو باھمی اختلاط و اتحاد سے مانع ہے ۔

گو یہ لوگ اپنی روزمرّہ کی زندگی ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پوری آزادی کے ساتھ قیود و تحدید کے بغیر دوستانہ طریق پر بسر کرتے ھیں، کیونکہ باھمی کاروبار کی وجہ سے ان کے مفاد مشترک ھیں، لیکن تلمسان کی آبادی کے ان تینوں گروھوں کے مابین اپنی اپنی تربیت اور شخصی زندگی کے لحاظ سے عمیق خلیج حائل ہے اور وہ ایک دوسرے سے واضح طور پر جدا ھیں ۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ھو جائے کہ ان میں سے ایک مذھب و ملّت کا آدمی، مسلم یا یہودی، اپنا مذھب تبدیل کر کے یا صرف ازدواج کے ذریعے سے دوسری جماعتوں میں سے کسی ایک سے جا ملے تو وہ ایک حد تک برادری سے خارج سمجھا جاتا ہے اور اس جماعت سے اس کا تعلق منقطع ھو جاتا ہے جس کا وہ پہلے رکن تھا اور ایسا بھی ھو سکتا ہے کہ اس کے اپنے ھی کنبے کے لوگ اس سے قطع تعلق کر لیں ۔

مآخذ: مسلمان جغرافیہ دانوں اور مؤرّخوں کی کتابوں کے علاوہ ذیل کے مطبوعات بھی قابلِ ملاحظہ ھیں، جو تلمسان کے متعلق ھیں: (۱) L' Abbé Bargès: *Histoire des B. Zeiyan, rois de Tlemcen*، ج ۱، پیرس ۱۸۵۰ء؛ (۲) وھی مصنف: *Mémoire sur les relations commerciales de Tlemcen avec le Soudan s. le règne des B. Zeiyan*، در *Rev. de l' Orient*، پیرس ۱۸۵۳ء؛ (۳) وھی مصنف: *Complément à l'Histoire des B. Zeiyan, rois de Tlemcen*، ج ۱، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۴) Brosselard: *Les Inscriptions arabes de Tlemcen*، در *R. A.*، ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۱ء؛ (۵) وھی مصنف: *Tombeaux des Emirs Beni*

Zeyian et de Boabdil، در *J. A.*، پیرس ۱۸۷۶ء؛ (٦) Darmon : *Origine et constitution de la communauté israélite de Tlemcen*، در *R. A.* ۱۸۷۰ء؛ (۷) M. Weil : *Notice sur le cimetière israélite de Tlemcen*، باب ۱، Avignon ۱۸۸۱ء؛ (۸) Canal : *Monographie de l' Arrondissement de Tlemcen*، در *Bull. de la soc. de géographie et d' archéologie d'Oran* ۱۸۸٦ء بعد؛ (۹) Audollent : *Sur un groupe d' inscription de Pomaria (Tlemcen) en Mauritanie césarienne*، در *Mélanges Rossi, Pub. de l' Ecole fr. de Rome* ۱۸۹۲ء؛ (۱۰) A. Meyer : *Etude sur la communauté israélite de Tlemcen et ses anciens chefs religieux* ج ۱، الجزائر ۱۹۰۲ء؛ (۱۱) W. Marçais : *Musée de Tlemcen*، در *Coll. des Musées de l' Algérie et de la Tunisie*، پیرس ۱۹۰٦ء؛ (۱۲) وهی مصنف : *Le Dialecte arabe parlé à Tlemcen*، ج ۱، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۱۳) W. Marçais اور G. Marçais : *Les Monuments arabes de Tlemcen*، ج ۱، پیرس ۱۹۰۳ء؛ (۱۴) A. Bel : *Histoire des Beni 'Abd el-Wâd, rois de Tlemcen*، عربی متن اور محشّی ترجمهٔ تصنیف یحیٰی ابن خلدون، ج ۳، الجزائر ۱۹۰۳، ۱۹۱۱، ۱۹۱۳ء؛ (۱۵) وهی مصنف : *La population musulmane de Tlemcen*، پیرس ۱۹۰۸ء، ج ۱؛ (۱٦) وهی مصنف : *Un atelier de poteries et de faïences au xème siècle de. J. C. découvert à Tlemcen*، ج ۱، قُسْطَنْطِينَة ۱۹۱۴ء؛ (۱۷) وهی مصنف : *Guide illustré du touriste : Tlemcen et ses environs*، طبع ثانی، Toulouse بدون تاریخ؛ (۱۸) A. Bel اور P. Ricard : *Le travail de la laine à Tlemcen*، ج ۱، الجزائر ۱۹۱۳ء؛ (۱۹) ابوبکر احمد : *Usages de droit coutumier dans la région de Tlemcen*، ج ۱، تلمسان ۱۹۰٦ء؛ (۲۰) A. Cour : *L' occupation marocaine de Tlemcen*، باب ۱، الجزائر ۱۹۰۸ء؛ (۲۱) ابن مریم : *Jardin des Biographies des Saints et de savants de Tlemcen*، عربی متن، طبع ابن شنب، ج ۱، الجزائر ۱۹۰۸ء، فرانسیسی ترجمه، طبع پرووانسال Provençal، ج ۱، الجزائر ۱۹۱۰ء۔

(Alfred Bel)

تِلِمْسانی : اس نسبت سے کئی عرب علماء مشهور هیں لیکن عام طور پر کتبِ ادب میں ذیل کے تین اصحاب هی سے مراد هوتی هے :-

(۱) عفیف‌الدین سلیمان بن علی بن عبداللہ ابن علی بن [یاتینّی العابدی التلمسانی، ابوالربیع]۔ وہ اپنا نسب ایک ایسے خاندان سے بتاتے تھے جو کوفی الاصل تھا (مگر ذھبی کے ایک نسخه Or. 53 میں کومی الاصل لکھا ھے) ۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ ٦١٦ھ / ۱۲۱۹ء میں تلمسان (؟) میں پیدا ھوے ۔ وہ اوائلِ عمر ھی میں شام آ گئے، جھاں وہ سرکاری عھدوں پر سرفراز رھے لیکن اکثر معزول اور بےکار بھی ھو جایا کرتے تھے ۔ [پھر وہ روم (ایشیاے کوچک) میں گئے، جھاں صدرالدین القونوی کی شاگردی میں رھے ۔ الجزری نے اپنی تاریخ میں لکھا ھے کہ] بلادِ روم میں انھوں نے یکے بعد دیگرے چالیس اربعینات نکالے (یعنی چالیس چالیس دن کی چالیس صوفیانه خلوتیں مکمل کیں) ۔ اس روایت پر ذھبی نے بجا طور پر شک ظاھر کیا ھے کہ یہ تو متواتر ۱٦۰۰ دن ھو گئے ۔ ایک دفعه وہ مشرفِ مکوس (رکّ به مادّهٔ مَکْس) مقرر ھوے ۔ جب سلطان المنصور قلاوون کے ھم رکاب الاَسْعَد [بن السدید الاعزّ] دمشق میں آیا تو اس نے عفیف‌الدین سے فردِ حساب طلب کی اور بار بار تقاضا کرنے پر بھی جب یہ مہیا نہ ھو سکی تو

الاسعد نے انھیں سرزنش کی، جس پر انھیں غصہ آ گیا اور انھوں نے سلطان سے شکایت کرنا چاہی کہ اس نے خلافِ شرع ایک قبطی عیسائی کو مسلمانوں کے سر پر مقرر کر رکھا ہے، خیر انھیں ٹھنڈا کیا گیا اور غالباً انھوں نے مطلوب فردِ حساب پیھم نہ ھی پہنچائی ۔ کہتے ھیں کہ وہ ایک متورّع، خوش اخلاق اور باوقار سے انسان تھے، لیکن وہ ھمیشہ مشتبہ ھی رہے، کیونکہ ذھبی لکھتا ہے کہ کوئی شخص صحیح طور پر دریافت نہ کر سکا کہ اُن کے اعتقادات کی حقیقت کیا تھی، یہی نہیں ان پر یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ وہ نُصَیری عقیدے کے تھے [رکّ بہ مادّۂ نُصَیری] [و ابن عماد، ۵: ۴۱۲؛ نفحات، ۶۶۵ ببعد] ۔ یہ اِشکال اُن کے منظوم کلام سے پیدا ھوا، جو فصیح، سلیس اور دل خوش کن تو ضرور تھا لیکن تلمسانی کے ترجمہ نگار کہتے ھیں کہ اس میں خُفیہ زھر بھی بھرا تھا [مولانا جامی اس رائے سے متّفق نہیں، دیکھیے نفحات، ۶۶۶] ۔ ان کے دیوان میں، جس کے نسخے برٹش میوزیم، انڈیا آفس، بوڈلین آکسفورڈ، [حیدر آباد] اور دوسرے مقامات میں محفوظ ھیں، کھلے زندقہ و الحاد کی کوئی بات یقیناً نہیں پائی جاتی، لیکن دوسرے صوفیوں کے کلام کی طرح ان کے اشعار میں بھی جابجا ایک خیالی معشوق ھی کو مخاطب کیا گیا ہے ۔ [یہ دیوان قاھرۃ اور بیروت میں تین مرتبہ چھپ چکا ہے اور اس کا فرانسیسی ترجمہ پیرس میں ۔ ابن الفُوطی نے مجمع الآداب (نسخۂ منحصر بفرد در دمشق، ورق ۲۸) میں ان کا مختصر سا ترجمہ دیا ہے ۔ اس میں لکھا ہے کہ وہ علمائے عارفین میں سے تھے ۔ مغرب سے دمشق آئے اور اُس میں توطّن اختیار کیا ۔ انھوں نے کلمات ذوقیہ اور ابیاتِ شوقیہ لکھے ھیں] ۔ قطب‌الدین الیُونِینی نے نھیں خوش صحبت انسان پایا ۔ وہ لکھتا ہے کہ عفیف الدین کا دعوٰے تھا کہ انھیں 'عرفان' [رکّ بآن] حاصل ہے یعنی خدائے تعالٰی کی معرفت تامّ ۔ کہتے ھیں کہ اس امر کا اظہار اُنھوں نے اپنے بسترِ مرگ پر کیا تھا اور اسی وقت اُنھوں نے یہ الفاظ کہے تھے: ''جسے معرفتِ الٰہی حاصل ہے وہ اللہ سے خوف زدہ کیونکر ھو سکتا ہے اور چونکہ مجھے یہ معرفت حاصل ہے اس لیے مجھے اس سے خوف نہیں بلکہ خوش ھوں کہ اس کی خدمت میں شرفِ حضوری حاصل ھوگا'' [قبّ ابن عماد: محلِّ مذکور] ۔ ۵ رجب ۶۹۰ھ/۴ جولائی ۱۲۹۱ء کو ان کا انتقال دمشق میں ھوا اور انھیں شہر کے صوفیوں کے قبرستان ['مقابر الصوفیّۃ'] میں دفن کیا گیا ۔ دیوان کے علاوہ اُنھوں نے مختلف علوم پر کئی کتابیں لکھیں، مثلاً (۲) رسالۃ فی علم العروض، برلن عدد ۷۱۲۸ میں موجود ہے؛ [(۳) مقامات، اس کے نسخے موصل میں ھیں؛ (۴) شرح المَواقف للنِفَّری؛ اس شرح کی بعض عبارتوں کے ترجمے کے لیے دیکھیے کتاب المواقف، طبع وقفیۂ گب؛ شرح کے نسخوں کے لیے دیکھیے وھی طباعت، ص۲۵؛ (۵) شرح القصیدۃ النفسیۃ لابن سینا؛ (۶) شرح منازل السائرین] ۔ دیوان و رسالۃ کے علاوہ ذھبی ان تصانیف کا ذکر کرتا ہے: (۷) شرح الاسماء الحُسنٰی؛ (۸) شرح فُصوص الحِکَم (لابن العربی) ۔ ان میں سے بعض کتابوں کے نام ھی اس دبستان خیال پر دلالت کرتے ھیں جس میں اُنھوں نے پرورش پائی تھی اور ھم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ھیں کہ وہ ابن العربی کے سرگرم پیرووں میں سے تھے ۔

مآخذ: (۱) ذھبی: تاریخ الاسلام، مخطوطۂ [برٹ]ش میوزیم، شمارہ Or. 53، ورق ۷۷ چپ؛ (۲) کُتُبی: [فو]ات الوَفَیات، [طبع دوم، قاھرۃ ۱۲۹۹ھ، ۱: ۱۷۸]؛ (۳) یافعی: مرآت، حیدرآباد، ۴: ۲۱۶ تا ۲۱۸؛ [(۴) جامی: نفحات، کلکتہ، ۶۶۵ ببعد؛ (۵) ابن عماد: شذرات، ۵: ۴۱۲؛ (۶) محمد الحِفناوی: تعریف

الخَلَف، ۲ : ۲۰۱]؛ (۷) براکلمان : .G.A.L، ۱ : ۲۵۸، عدد ۱۸ ؛ [(۸) تکملۂ براکلمان، ۱ : ۴۵۸].

۲ - شمس الدین محمد بن سُلیمان، عفیف الدین مذکور کا بیٹا، جو 'الشابّ الظریف' [= جوان با ادب و با مروّت یا با ذوق و با سلیقه] کے نام سے مشہور تھا، ۶۶۱ھ / ۱۲۶۳ء میں قاهرة میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کی وفات سے دو سال پہلے یعنی رجب ۶۸۸ھ / جون ۱۲۸۹ء میں جوانی هی میں فوت هو گیا - وہ دمشق کے بیت المال میں اهل کار تھا اور بیان کرتے هیں کہ عیش پسند اور لَہو دوست تھا - اس کی شہرت اس کے اشعار کے ایک چھوٹے سے مجموعے پر موقوف ہے، یہ دیوان کئی مرتبہ طبع هو چکا ہے - اس میں بیشتر عشقیہ اشعار هیں، جن کی زبان سادہ ہے اور جن میں روے سخن امردوں اور کبھی کبھی خیالی عورتوں کی طرف ہے - ان اشعار کی متصوّفانہ تأویل ممکن تو ہے مگر تأویلِ بعید ہونے کی وجہ سے غیر اغلب معلوم هوتی ہے؛ اس کی دوسری تالیفات سے بھی، جو مخطوطوں کی صورت میں محفوظ هیں، یہی مفہوم هوتا ہے کہ اس کے دیوان کے اشعار بھی واقعیت هی پر مبنی هیں - مخطوطاتِ برلن، عدد ۳۹۵۳ میں دو خطبات هیں، جو مزاحیہ هیں اور شہوانی خیالات پر مبنی اور یہی حال دو دیگر تصنیفوں کا ہے، جو مخطوطۂ برلن، عدد ۸۵۹۴ میں محفوظ هیں اور جن کے نام فَصاحة المَسبوق فی مَلاحة المعشوق اور المقامات [الهِیتیّة] و الشِیرازیة هیں - مَقامات العُشّاق، جو مخطوطۂ پیرس، عدد ۳۹۴۷ میں محفوظ ہے اور دمشق کا مطبوعہ مَقامة غالباً المقامات الهیتیة و الشیرازیة هی ہے [مقامات العُشّاق کے نسخے اَور جگہ بھی ملتے هیں] - ذهبی نے اس کے باپ کے ترجمے میں اس کے متعلق ایک مختصر سی حکایت بیان کی ہے، جس سے اس شبهه کو تقویت پہنچتی ہے کہ عفیف الدین نے اپنے لڑکے کی بدعنوانیوں کو دیکھتے ہوے یہ خیال ظاهر کیا تھا کہ وہ ملامت [رَکَ بان] کے طریق پر گام زن ہے اور بالآخر پورا صوفی بن جائے گا، لیکن یہی بد اعمالیاں حقیقةً شاید اس کی قبل از وقت موت کا ایک باعث بنیں .

مآخذ : (۱) ذهبی : تاریخ الاسلام ، مخطوطۂ برٹش میوزیم، شمارہ 'Or. 53' ورق ۶۲ راست (۲) کُتُبی : فوات ، ۲ : ۲۶۳ ؛ [(۳) ابن عماد : شذرات ، ۵ : ۴۰۵ ؛ (۴) حِفناوی: تعریف الخَلَف، ۲ : ۴۰ ببعد]؛(۵) براکلمان: .G. A. L، ۱ : ۲۵۸ [و تکملة، ۱ : ۴۵۸]؛ (۶) سَرکِیس : معجم المطبوعات، ۱۸۷ ؛ دیوان کی مختلف طباعتیں : قاهرة ۱۲۸۱ و ۱۳۰۸ھ، بیروت ۱۸۸۵ء [نا مکمل]، [۱۸۹۱ء] اور ۱۳۲۵ھ؛ ایک مَقامة ، مطبوعۂ دمشق بدون تأریخِ طبع ، ۱۶ صفحات؛ [(۷) دیوان التَلَّعْفَری ، بیروت ۱۳۱۰ھ کے آخر میں الشاب الظریف کا ایک مقامة ساڑھے بارہ صفحے کا ہے، مع ترجمۂ حالِ مصنفِ مقامة] .

۳ - ابواسحٰق ابراهیم بن ابی بکر بن عبداللہ الانصاری : تلمسان میں اواخر جمادی الآخری یا یکم رجب ۶۰۹ھ / نومبر ۱۲۱۲ء کو پیدا ہوا لیکن وہ ابھی نو هی برس کا تھا کہ اُسے اس کا باپ غرناطہ (اندلس) لے گیا - تین سال بعد وہ مالقه (Malaga) میں چلے آئے اور ابراهیم نے اکثر علوم کی تحصیل یہیں کی - اس کے بعد وہ سبتہ (Ceuta) چلا گیا، جہاں اُس نے مالکی فقیہ مالک بن مُرحّل کی بہن سے شادی کر لی اور اسی شہر میں ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء کے بعد اس کا انتقال ہوا - وہ صاحبِ علم و فضل مالکی فقیہ تھا اور قبالوں وغیرہ کے لکھنے اور شعر کہنے میں مہارت رکھتا تھا - اکیس سال کی عمر میں اس نے احکامِ وراثت پر (۱) اُرجوزۃ لکھا، جس پر کئی شرحیں لکھی گئیں، جن کے قلمی

نسخے محفوظ ہیں ۔ اس کی دوسری تصانیف یہ ہیں : (۲) نتیجة الخیر و مُزیلة الغیر فی نظم المغازی و السیر، [حضور ﷺ] کی منظوم سیرت؛ (۳) مقالة فی العروض؛ (۴) منظومة فی المولد الکریم ؛ (۵) العشرات ۔ [براکلمان نے تکملة میں صرف دو کتابوں کا ذکر کیا ہے؛ یعنی نتیجة کا اور اس کے علاوہ المنظومة التلمسانیة فی الفرائض اور اس کی شروح کا، یہ کتاب فاس میں طبع بھی ہوئی ہے]۔

مآخذ : (۱) ابن فرحون : دیباج، فاس، ۹۰؛ (۲) ابن مریم : بستان، ۵۵ ببعد ؛ (۳) براکلمان : *G.A.L.*، ۱ : ۲۶۷، عدد ۶ اور ۳۸۵، عدد ۱۰؛ [(۴) تکملة، ۱ : ۶۶۶، ۹۷۱]۔

(F. Krenkow کرنکو)

تمتّع : رکّ بہ احرام ۔

تِمْثال : رکّ بہ تصویر ۔

التِّمْساح :(جھیل) دلدلوں اور کھڑے پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں کے سلسلے کی ایک جھیل۔ یہ جھیلیں نیل کے 'دالیہ' (ڈیلٹا) کے مشرق میں واقع ہیں ۔ نہر سویز پورٹ سعید سے جانب جنوب جا کر انھیں میں سے گذر کر سویز کے مقام پر پہنچتی ہے ۔ نہر سویز جھیل میں اسیویں کیلومیٹر پر داخل ہوتی ہے ۔ جھیل کے شمالی کنارے پر شہر اسمٰعیلیہ ہے [رکّ بآن]، جس کی تمام آبادی [حدود ۱۹۳۰ء میں] فرانسیسی [تھی، اب فرانسیسی وہاں سے جا چکے ہیں]۔ اس جھیل کا رقبہ کوئی چھے مربع میل ہے ۔گو نہر کی تعمیر سے پہلے اس کا پانی سمندر ھی کا سا اور سرکنڈوں سے بھرپور تھا، اب یہ بڑے نظارے کی جگہ ہے اور اس کا برّاق، نیلگوں پانی اور صحرائی پہاڑیوں کا پس منظر بڑا دلکش ہے۔ بحیرة التمساح کے معنے ہیں مگرمچھوں کی جھیل [قبّ مادۂ مابعد]، جھیل کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں کسی زمانے میں ان موذی جانوروں کی فرودگاہ تھی ۔ ماہرین آثار قدیمہ قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ تاریخی زمانے میں اس جھیل کی شان کیا تھی ۔ بج Wallis Budge : *History of Egypt*، ۵ : ۱۳۱ ببعد) کا یہ مفروضہ ہے کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہوتے وقت اس جھیل کے قرب و جوار سے پار ہوے ہونگے ۔ اس کی راے میں یہ وھی یم ۔ سوف יַם־סוּף یا سرکنڈوں کا سمندر ہے جس کا ذکر کتاب الخروج، ۱۳ : ۱۸ میں آیا ہے ۔

مآخذ : (۱) علی مبارک : الخطط الجدیدة، ۸ : ۴۶؛ (۲) S. W. Barker : *Ismailia*، ۱ : ۱۹۰؛ (۳) Baedeker : *Egypt*، اشاریہ ۔

(J. Walker واکر)

تِمْساح : (عربی)= مگرمچھ، یہ لفظ قدیم مصری (م ۔ س ۔ ح) یا قبطی (اِمْسَح یا باضافۂ حرف تعریف تِمْسَح سے [جو عربی میں بھی مستعمل ہے، دیکھیے مدّالقاموس بذیل تمساح اور مصراع بِشر بن المُعْتمِر، در سطور ذیل، ص ۶۳۴ ب،] عربی میں مستعار لیا گیا ہے ۔ یہ لفظ آشوری ۔ بابلی زبان میں بھی تِمْسَاحُو (Bezold : *Glossar*، ۲۹۴) کی صورت میں اور ہیروڈوٹس میں χάμψαι کی صورت میں پایا جاتا ہے ۔ مگرمچھ کا قدیم ترین تفصیلی تذکرہ ہیروڈوٹس (۲ : ۶۸) میں آیا ہے اور بہت سے نئے مواد کا اضافہ ارسطو نے کیا ہے ۔ بلیناس (Pliny) کا بیان اس کی عجائب پرستی کی وجہ سے جالب نظر ہے ۔ قدماء کے خیالات کا عکس عربی مآخذ میں پایا جاتا ہے ۔

بقول عبداللطیف مگرمچھ الصعید یعنی بالائی مصر اور دریاے نیل کے شلّالوں (بڑے آبشاروں) میں بہت کثرت سے موجود ہیں : چنانچہ چھوٹے بڑے مگرمچھ کھلے پانی میں اور آبشاروں کی چٹانوں کے درمیان کرموں کی طرح انبوہ در انبوہ

نظر آتے ھیں - جب وہ انڈوں میں سے نکلتے ھیں تو چھپکلیوں سے بڑے نہیں ھوتے، لیکن وہ جلد ھی دس ھاتھ لمبے ھو جاتے ھیں - ان کے ساٹھ دانت ھوتے ھیں، وہ ساٹھ انڈے دیتے ھیں اور ساٹھ سال تک زندہ رھتے ھیں وغیرہ وغیرہ۔ ارسطو یہ باتیں ھمیں پہلے ھی بتا چکا ھے - ان کے معدے کے آس پاس ایک سوجن سی ھوتی ھے؛ اس میں سے ایک سیّال مادّہ نکلتا ھے، جس میں مشک کی خوشبو ھوتی ھے — مگرمچھ کا مکمّل ترین حال قزوینی نے لکھا ھے اوراسی بیان کی ضروری باتیں اس کے اتّباع میں دمشقی اور دَمیری نے بھی دی ھیں - مگرمچھ کے بڑے بڑے جبڑے ھوتے ھیں۔ اُن میں ۴۰ دانت اوپر، ۴۰ نیچے اور [ھر دو دانتوں] کے درمیان چھوٹا سا چوکور دانت بھی ھوتا ھے؛ وہ سب دانت ایک دوسرے کے ساتھ خوب پیوست ھو جاتے ھیں؛ اس کا سر دو ذراع لمبا، اس کی پیٹھ آٹھ اور اس کی دُم چھ ذراع لمبی ھوتی ھے؛ اس کی پیٹھ کچھوے کی طرح ھوتی ھے۔ یہ جانور نہ تو جھک سکتا ھے اور نہ مُڑ سکتا ھے، کیونکہ اس کی ریڑھ کی ھڈیاں لچکدار نہیں ھوتیں - مگرمچھ اپنا نیچے کا جبڑا نہیں ھلاتا، بلکہ [صرف] اوپر کا جبڑا ھلاتا ھے۔ اس سوال پر مدت تک بحث ھوتی رھی، لیکن صحیح مشاھدہ یہی ھے - مگرمچھ بڑا خوفناک جانور ھے، جو آدمیوں اور بھیڑوں کو نگل جاتا ھے اور گھوڑوں اور اونٹوں کو بھی مار ڈالتا ھے - جب یہ اپنے شکار کو کنارے پر دیکھتا ھے تو چپ چاپ پانی کے اندر ھی اندر تیرنے لگتا ھے اور پھر اچانک شکار پر لپک پڑتا ھے - گوشت، جو اس کے دانتوں کے درمیان لٹکا رھتا ھے اس میں کیڑے پیدا ھو جاتے ھیں اور جب مگرمچھ اپنا جبڑا کھولتا ھے تو انھیں ایک پرندہ، جسے قَطْقَاط کہتے ھیں [دیکھیے دمیری، ۱ : ۲۹۵ بذیل التورم] ، چن لیتا ھے [ترجمۂ ھیروڈوٹس : محلِّ مذکور میں اس پرندے کا نام trochilus یعنی humming-bird یا مرغ زرّین پر دیا ھے، مگر مؤرّخ مذکور کیڑوں کے بجاے جونکوں 'کا ذکر کرتا ھے اور کہتا ھے کہ پانی میں رھنے کی وجہ سے مگرمچھ کا منہ جونکوں سے بھرا رھتا ھے]۔ یہی پرندہ اُسے شکاری کی آمد سے بھی آگاہ کرتا ھے - جب قَطْقَاط اپنا کام کر چکتا ھے تو مگرمچھ اپنے جبڑے بند کر لیتا ھے - مگرمچھ اس پرندے کو بھی نگل جائے لیکن اس کے سر پر ایک ھڈی سوئی کی طرح تیز ھوتی ھے [قبّ دمیری، محلّ مذکور: و فِی جَنَاحِہٖ شَوکَتَانِ]، جب مگرمچھ کو یہ چبھتی ھے تو وہ مُنہ کھول دیتا ھے اور پرندہ اُڑ جاتا ھے، اسی سے '' إجزاءُ التِمْسَاح'' [دمیری، ۱ : ۲۹۲ '' مکافأة التمساح''] کی مثل بنی، یعنی ''مگرمچھ کی شکر گذاری''۔ [اس پرندے کے متعلق ابوسہل بِشر بن المعتمر (م ۲۱۰ھ/۸۲۵ء، تکملۂ براکلمان، ۱ : ۳۳۸) کا قول ع

و تِمْسَحٌ خَلّلَہُ طائرٌ

اور اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے جاحظ : کتاب الحیوان، قاھرۃ ۱۳۲۵ھ، ۶ : ۱۱۳]— نر اپنی مادہ سے خشکی پر جفتی کرتا ھے مگر پہلے اپنی مادہ کو زمین پر پیٹھ کے بل لٹاتا اور بعد میں پھر اسے سیدھا کرنا پڑتا ھے، کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو اُلٹا نہیں سکتی اور شکاری اسے آسانی سے اُس وقت مار سکتا ھے - مگرمچھ انڈے بھی زمین ھی پر دیتے ھیں، اگر کوئی انڈا پانی میں گر جائے تو یا تو وہ تلف ھو جاتا ھے یا اس سے 'سَقَنْقُور' پیدا ھوتا ھے، مگرمچھ پیدا نہیں ھوتا - دریاے نیل کی طرح مگرمچھ دریاےسندھ میں بھی ملتے ھیں، لیکن وہ نیل والوں سے چھوٹے ھوتے ھیں - اس کے اعضاےبدن کے فوائد طب میں بے شمار ھیں .

مآخذ : (۱) Pauly - Wissowa : Realency-klopädie، طبع دوم، ج ۱۱، ۱۹۳۷ تا ۱۹۰۶ء ; (۲) Keller : Antike Tierwelt، ۲ : ۲۶۰ تا ۲۷۰ ; (۳) عبداللطیف : Relation de l' Égypte، ترجمۂ دِ ساسی De Sacy، ۱۸۱۰ء، ص ۱۴۱ ; (۴) قزوینی : عجائب المخلوقات، طبع وُیسٹنفلٹ، ۱ : ۱۳۱ اور ۱۸۸ ; (۵) دِمَشْقی : نُزہة الدّھر، طبع مِہرن Mehren، ۹۹ ; (۶) دَمیری : حیاة الحَیوان [طبع قاھرۃ ۱۳۳۰ھ]، ترجمۂ A. S. G. Jayakar، ۱ : ۳۵۶ تا ۳۵۸ ; (۷) I. Löw : Aramäische Lurch-namen Judaica, Festschr. f. Cohen، ۱۹۱۲ء، ۳۴۱ ; (۸) بالائی دریاے نیل سے قدرتی کیفیات کے مطابق تصاویر کے لیے دیکھیے Bengt Berg : Mit den Zugvögeln nach Afrika، برلن ۱۹۲۵ء.

(J. Ruska رُسْکا)

تِمْگاد : الجزائر میں ایک رومی شہر، جو بَتّنَہ Batna (واقع قسمتِ قُسْطَنْطِینہ) کے مشرق میں ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ پہلی صدی قبل مسیح میں تِمْگاد محض ایک چھوٹا سا فوجی مستقر تھا، جو اَوراس کی شمالی ڈھلانوں کی نِگرانی کی غرض سے قائم کیا گیا تھا ۔ ۱۰۰ء میں ٹْریجن Trajan نے یہاں ایک شہر بنانے کا فیصلہ کیا ؛ چنانچہ یہ شہر بنا اور اس کا بیشتر حِصّہ سپاہ سوم (Third Legion) کے اُن سپاھیوں نے تعمیر کیا جو لَمبیسّہ Lambessa میں متعیّن تھے اور اس کے آباد کرنے کے لیے کارآزمودہ پرانے سپاھیوں اور اردگرد کے مقامی آدمیوں کو لا کر بطور آبادکار بسایا گیا ۔ اس شہر نے بڑی تیزی سے ترقی کی؛ چنانچہ اسے نوآبادی کا درجہ دے دیا گیا ۔ چونکہ یہ شہر اپنی قدیم حدود سے آگے تک پھیل گیا تھا، اس لیے اس کی فصیل کو بھی منہدم کرنا پڑا ۔ چوتھی صدی میں اس کا زوال شروع ھوا اور پانچویں صدی کے آغاز میں وحشیانِ وِینْڈل Vandal کے حملے سے اسے بہت نقصان اُٹھانا پڑا، لیکن بوزنطی عہد میں اس کی اھمیت دوبارہ قائم ھوگئی اور بوزنطیوں نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا ۔ ساتویں صدی میں عربوں کے پہلے حملے کے دوران میں یہ شہر ویران کر دیا گیا ۔ قدیم مصنفین تِمگاد کا شاذ و نادر ھی ذکر کرتے ھیں اور ھمیں اس کی بابت کتبوں اور ان حفریات سے علم ھوا جو ۱۸۸۱ء میں کی گئیں ۔ عرب مصنف ھمیں اس شہر کی بابت کوئی اطلاع نہیں دیتے .

مآخذ : (۱) Boeswillwald، Cagnat اور Ballu : Timgad, une cité africaine sous, l' empire romain، پیرس ۱۸۹۱ تا ۱۹۰۵ء؛ (۲) R. Cagnat : Carthage, Timgad et Tebessa، پیرس ۱۹۰۹ء.

(G. Yver یْور)

تَمگْرُوْت : مَرّاکُش کے جنوب میں وادی دَرْعَہ [Dra، رَكَ بآن] کا سب سے بڑا شہر ھے، جہاں سِلسلۂ ناصِریہ [رَكَ بآن] کے برادرانِ طریقت کا اُمّ الزوایا واقع ھے ۔ یہ خاصہ بڑا شہر ھے، جس کے مکان لال مٹی کے ھیں اور ان کے گرد کھجور اور دوسرے پھل والے درختوں کے جھنڈ ھیں ۔ یہ شہر وادی دَرْعہ کے بائیں کنارے پر آباد ھے اور یہاں اس وادی کی چوڑائی ۱۲۰ فٹ سے لے کر ۲۵۰ فٹ تک ھے، لیکن گہرائی کچھ بھی نہیں ۔ یہ وادی پہاڑیوں کے درمیان بہتی ھے، جن کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۳۰۰ گز ھے ۔ تمگروت کے گرد پست سی فصیل ھے، جس میں چار دروازے ھیں ۔ شمال میں ''فمّ السّوق'' (فصیح زبان میں : فَمّ السّوق = چوک کا مُنہ)، شمال مشرق میں فُم تاٴریرت، جنوب مغرب میں باب الرِزْق اور مشرق میں ''فَمّ السّور'' ۔ سنیچر کے دن یہاں بڑا بازار لگتا ھے .

زاویۂ تمگروت کی تمام اھمیت شیخ محمد ابن ناصر کی شخصیت کی وجہ سے ھے ۔ اس زاویے کی بنیاد ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ - ۱۵۷۶ء میں وادی درعہ کے مرابط خاندان کے ایک رکن ابوحفص عمر بن احمد الانصاری نے ڈالی، جو زاویۂ سید الناس سے تھے ۔ دو مردانِ خدا سیدی عبداللہ بن حسین اور سیدی احمد بن ابراھیم کو، جو زاویۂ تمگروت میں مقیم تھے، اس قدر شہرت حاصل تھی کہ صوفی ارادت مند محمد بن ناصر کو، جو اغلان میں ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء میں پیدا ھوے تھے، یہاں آکر آباد ھونے کا شوق پیدا ھوا ۔ سیدی احمد بن ابراھیم کی وفات پر آپ شیخِ زاویہ بنے اور اپنا سلسلۂ طریقت جاری کیا، جو براہِ راست الشاذلی[۲] [رک بآں] کے طریقے پر مبنی تھا ۔ اسی جگہ صفر ۱۰۸۵ھ / مئی ۱۶۷۴ء میں آپ کا انتقال ھوا اور اس وقت سے ان کے اخلاف، باپ کے بعد بیٹا، بلا فصل، زاویۂ تمگروت کے شیخ ھوتے چلے آئے ھیں ۔ تمگروت میں محمد ابن ناصر اور ان کے جانشینوں کے مزار ایک ھی مقبرے میں ھیں، جو ۱۸۶۹ء میں آتش زدگی کے بعد دوبارہ تعمیر ھوا ۔ اس پر سبز ٹائلوں (قرامید) کا مخروطی گنبد ھے، جس کے اوپر 'جامور' [چوٹی، کلس، رک بہ ڈوزی : تکملۃ] ھے اور 'جامور' پر سونے کے تین گولے ۔ کہتے ھیں کہ زاویے میں ایک نفیس کتب خانہ بھی ھے، لیکن بدقسمتی سے اب تک اس کی فہرست تیار کرنے کی کوشش ممکن نہیں ھوئی ۔

زاویۂ تمگروت اور اس کے اولیاء کے موضوع پر، جو یہاں سکونت پذیر رھے، احمد بن خالد الناصری السلاوی [رک بآں] صاحب کتاب الاستقصاء نے طلعۃ المشتری فی النسب الجعفری (۲ جلدیں، طبع سنگی، فاس بدون تاریخ [۱۳۰۹ھ]) کے نام سے ایک کتاب لکھی ھے ۔ تمگروت ابوالحسن التمگروتی کی جاے پیدایش ھے، جو [سلاطین] بنی سعد کا ایک ممتاز عامل تھا .

مآخذ: (۱) De Foucauld : *Reconnaissance au Maroc*، پیرس ۱۸۸۸ء، ۲۹۳؛ (۲) Depont اور Coppolani : *Les Confréries religieuses musulmanes*، الجزائر ۱۸۹۷ء، ۴۶۷ ؛ (۳) H. de Castries : *Notice sur la région de l' Oued-Draa*، در *Bulletin de la Société de Géographie de Paris*، ج ۲۰، ۱۸۸۰ء : ۴۹۷ ببعد ؛ (۴) de Segonzac : *Au coeur de l' Atlas*، پیرس ۱۹۱۰ء، ۸۹ تا ۹۸ ؛ (۵) M. Bodin : *La zaouia de Tamegrout*، در *Archives Berbères*، پیرس ۱۹۱۸ء، ۲۵۹ تا ۲۹۵؛ (۶) لیوی پرووانسال E. Lévi Provençal : *Les Historiens des Chorfa, Essai sur la littérature historique et biographique au Maroc du XVIème au XXème siècle*، پیرس ۱۹۲۲ء، ۹۹، حاشیہ ۱ اور ۳۵۴ .

(لیوی پرووانسال E. Lévi-Provençal)

التمگروتی: ابوالحسن علی بن محمد بن علی بن محمد، مراکشی مصنف، از اھلِ تمگروت [رک بآں] ۔ وہ شہر مراکش میں ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۴ - ۱۵۹۵ء میں فوت ھوا اور قاضی عیاض کی درگاہ میں دفن ھوا ۔ وہ بنو سعد کے سلطان ابوالعباس المنصور الذھبی (۹۸۶ تا ۱۰۱۲ھ/ ۱۵۷۸ تا ۱۶۰۳ء) کے دربار کا ایک عہدے دار تھا ۔ المنصور نے سلطان مراد ثالث کی طرف قسطنطنیہ میں ایک سفارت بھیجی تو تمگروتی کو امیرِ سفارت مقرر کیا اور دربار کے ایک اور رکن ابوعبداللہ محمد بن علی الفشتالی (م ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ - ۱۶۱۳ء) کو اس کے ساتھ شریک کار کیا ۔ التمگروتی نے اپنا سفرنامہ (رحلۃ) مرتب کیا،

جس کا نام النفحۃ المسکیۃ فی السفارۃ الترکیۃ رکھا ۔ یہ کتاب الإفرانی (یا الأفرانی [رک بآن]) کی کتاب نزهۃ الحادی کے مآخذ میں شامل ہے۔ اس میں سولھویں صدی کے اواخر کے دربارِ مراکش کے متعلق دلچسپ معلومات ملتی ہیں ۔ [کاستریز H. de Castries (م ۱۹۲۷ء) نے اس کتاب کا مشرح ترجمہ تیار کیا، جو ۱۹۲۹ء میں پیرس میں طبع ہوا، تکملۃ (براکلمان)]۔

مآخذ : (۱) الافرانی : صَفْوَة مَن انْتَشَر، طبع فاس، تاریخ ندارد، ص ۱۰۶ ؛ (۲) القادری : نَشْرالمَثانی، فاس ۱۳۱۰ھ، ۱ : ۳۱ (ترجمہ در *Archives Marocaines*، ج ۲۱، پیرس ۱۹۱۳ء، ص ۷۰)، حرفاً منقول در ابن المُوَقّت : السّعادۃ الأبدیۃ، فاس ۱۳۳۶ھ، ۱ : ۹۰ تا ۹۱؛ (۳) لیوی پرووانسال : *Les Historiens des Chorfa, Essai sur la littérature historique et biographique au Maroc du XVI^ème^ au XX^ème^ siècle*، ۹۸؛ (۴) تکملۂ براکلمان، ۲ : ۶۸۰]۔

(لیوی پرووانسال E. LÉVI-PROVENÇAL)

تـمـن : (تِمن) رک بہ تومان.

تِموچن : Temučin رک بہ چنگز خان.

تمّوز : [یا تَمُوز] سریانی تقویم کا دسواں مہینہ ۔ اس کا نام یہودیوں کے چوتھے مہینے کے نام سے مأخوذ ہے، جس سے یہ مہینہ کم و بیش مطابق ہے ۔ تموز رومی تقویم کے ماہ جولائی سے مطابقت رکھتا ہے اور جولائی کی طرح اس کے بھی اکتیس ہی دن ہوتے ہیں ۔ بقول البیرونی تموز کے مہینے میں قمر کی آٹھویں اور نویں منزلوں کا طلوع ہوتا ہے اور بائیسویں اور تیئیسویں منزلوں کا سقوط ۔ وہ دن جن میں [تیرہ] دن کے فاصلے سے ایک کا طلوع اور دوسری کا سقوط ہوتا ہے دسویں اور تیئیسویں تاریخ کو آتے ہیں ۔ اس کے برعکس قزوینی کا قول ہے کہ ساتویں اور آٹھویں کا اور اکیسویں اور بائیسویں کا سقوط علی الترتیب ۴ اور ۱۷ تاریخ کو ہوتا ہے ۔ البیرونی لکھتا ہے کہ ۱۳۰۰ سولوقی (Seleucid) (۹۸۹ء) میں قزوینی کے بتائے ہوئے منازل کے ستاروں کا ۹ اور ۲۳ تاریخ کو علی الترتیب طلوع اور سقوط ہوا.

مآخذ : (۱) البیرونی : آثار، طبع سخاؤ Sachau، ۶۰، ۷۰، ۳۴۷ تا ۳۵۰ (انگریزی ترجمے میں عربی متن کے صفحات کے اعداد حاشیے میں درج ہیں) ؛ (۲) القزوینی : عجائب المخلوقات، طبع وستنفیلٹ، ۱ : ۴۴ ببعد، ۶۹، ۸۷ ببعد (جرمن ترجمہ اتے Ethé، ص ۹۳ ببعد، ۱۰۱ ببعد، ۱۶۰ ببعد)؛ (۳) Ginzel : *Handbuch d. meth. u. techn. Chron.*، ۱، ۱۹۰۶ء، ص ۲۶۳ ببعد .

(پلسنر M. PLESNER)

تَـمِیْم بـن مُرّ: ایک عرب قبیلہ، ان کا نسب از روے شجرات نسب تألیف وستنفیلٹ: *Geneal. Tabellen*، شمارہ K., L.) یہ ہے : تمیم بن مُرّ بن اُدّ بن طابخۃ بن الیاس بن مُضر ۔ اس طریق سے ان کا شمار مُضری قبائل میں ہوتا ہے، جہاں انہیں اوّلین درجہ حاصل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات قیس اور ربیعۃ کے مقابلے میں ان کا نام کل مُضری قبائل کا مترادف سمجھا جاتا ہے ۔ قیس اور ربیعۃ دونوں قبائل میں سے ربیعۃ ان سے قریب تر ہیں، یہ بات ان کے باقاعدہ شجروں سے تو واضح نہیں ہوتی (ان شجروں میں اس کے برعکس قیس مُضری ہیں لیکن ربیعۃ نہیں) مگر بعض تثنیہ اعلام سے ہوتی ہے: مثلاً ''الجُفّان'' (لسان العرب، ۱۰ : ۳۷۳) سے، جس سے تمیم اور بکر بن وائل بہم مراد ہیں (بکر بن وائل ربیعۃ کی سب سے بڑی شاخ ہے) ۔ بہر حال بنو تمیم، جغرافیائی اور تأریخی دونوں لحاظ سے کنانۃ [رک بآن] کی نسبت قیس اور ربیعۃ سے زیادہ نزدیک ہیں، گو روایتی شجرۂ نسب

انھیں کنانة سے قریب تر ظاہر کرتا ہے .

یونانی اور لاطینی مصنّف، جنھوں نے جزیرہ نمائے عرب کا حال لکھا ہے، تمیم کا کہیں ذکر نہیں کرتے، اس لیے ہمیں ان کی ابتدائی تأریخ کے لیے ملکی روایات ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے ۔ اس ابتدائی تأریخ کو حسب معمول متعدّد اساطیری جزئیات کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے (مثلاً یہ کہ قبیلۂ تمیم کے نام گذار ندۂ مجہول eponymous Tamīm کا مزار مرّان میں ہے ، ابن قتیبة : المعارف، طبع وُیسٹنفیلٹ، ۳۷ : یاقوت : معجم، ۴ : ۴۷۹؛ زید مناة، عمرو اور الحارث ابناء تمیم کی پیدائش کا ذکر، [تمیم کا ان کے لیے نام تجویز کرنا] ابن درید : کتاب الاشتقاق، ۵ وغیرہ میں ہے) ۔ ان روایات کی صحیح حقیقت کا دریافت کرنا ناممکن ہے اور یہ بھی تمیز نہیں ہو سکتی کہ ان کے کون سے اجزاء میں خرافات محض پیش نظر ہے اور کون سے اجزاء میں تاریخی واقعات اساطیر کی آمیزش سے مسخ ہو کر سامنے آئے ہیں ۔ چھٹی صدی میلادی سے ہمیں بنو تمیم کی تاریخ کچھ بہتر طریق سے معلوم ہونے لگتی ہے ۔ اس زمانے میں ہم تمیم کو ایک عظیم قبیلہ پاتے ہیں، جن کا وسیع علاقہ عرب کے مشرقی ساحل کے بہت بڑے حصے میں پھیلا ہوا ہے : نجد کا تقریباً سارا علاقہ ، بحرین کا ایک حصہ اور الیمامة کا ایک حصہ ۔ جنوب میں بلادِ تمیم الدَّهناء کے بے درخت میدانوں تک پھیلے ہوئے تھے اور شمال مشرق میں دریائے فُرات کے کنارے تک چلے جاتے تھے : شمال میں ان کے ہمسائے بنو اسد اور جنوب مغرب میں باھلة اور غطفان [رکّ بآن] تھے ؛ خود اپنے علاقے میں وہ بطونِ قبیلۂ عبدالقیس اور حنیفة کے ساتھ (بالخصوص مشرقی اور جنوبی ساحل پر) اور شمال میں بکر اور تغلب کے قبائل کے ساتھ بہت کچھ ملے جلے ہوئے تھے ۔ اساسی طور پر بدوی ہونے کی وجہ سے انھوں نے صحیح معنوں میں کبھی شہر نہیں بسائے : هَجَر، الَاحْساء اور الجرْعاء (وہی شہر جسے یونانی اور لاطینی مصنّفین نے "Gerra" لکھا ہے ؟ قبّ شپْرِینگر : *Die alte Geographie Arabiens*، ۱۳۲) ایسے مقامات ہیں جن کا ذکر مآخذ میں اسواق کی حیثیت سے آتا ہے کہ تمیم وہاں میلوں اور منڈیوں کے موقعوں پر اکثر آیا جایا کرتے تھے لیکن یہ مقامات دیارِ تمیم میں شامل نہ تھے (قبّ هَمْدانی : جزیرة العرب، ۱۳۶؛ نولڈکہ : *Gesch. d. Perser und Araber*، ۵۶)، اگرچہ کہتے ہیں کہ انُھوں نے بعض اوقات یہ مقامات فتح کر کے انھیں اپنے قبضے میں بھی رکھا (قبّ مُنْذِر بن سَاوِی 'صاحبِ هجر' جس نے [حضرت] محمد[۴] سے بھی مکاتبت کی تھی، تمیم کی شاخ بنودارِم سے تھا نہ کہ عبدالقیس سے ، جیسا کہ بعض روایات میں ہے، قبّ ابن حَجَر : اِصابة، قاھرة [۷۰۱۹]، [۶] : [۱۳۹]، بحوالۂ ابن الکَلْبی : جَمْهرة الأنْساب، مخطوطۂ موزۂ برطانیہ، ص ۶۰ الف) ۔ ان شہروں سے ان کا تعلق غالباً صرف اتنا ہی تھا کہ وہ یہاں کی مستقل آبادی کو بدّووں کے طریقے کے مطابق آئے دن دق کرتے رہتے تھے اور اہلِ حَضَر کو زرِ فدیہ وصول کرنے کے لیے پکڑ لیتے تھے، کبھی اُن سے صلح کرتے تھے اور کبھی جنگ ۔ بنو تمیم کی ثقافت کا ارتقاء ناقص تھا، یہ ان کے عبادات کے کوائف سے معلوم ہوتا ہے، گو اس کے متعلق ہماری معلومات بغایت کم ہیں ۔ اللّات، مَنَات اور العُزّیٰ کی پوجا، جو عربوں میں عام تھی ، اس کا پتا بنو تمیم کی قسموں اور ان اَعلام ہی سے چلتا ہے جن میں یہ نام آتے ہیں، ان کی عبادتِ شمس (قبائلی بولی میں اس کی دوسری صورت 'شُمْس' ہے)، [اس بت اور اس کے بتخانے] کا ذکر یاقوت کے ایک مختصر سے تعلقے میں ملتا ہے (مُعجم، ۳ : [۳۱۹])؛ کہتے ہیں کہ

'شَمس' کی پوجا کا بنو اُدّ یعنی تمیم، [ضَبّۃ]، عُکْل، تَیم ، عَدِی اور ثَور میں عام رواج تھا ۔ اس کی سِدانت [بنو] اَوس بن مُخاشِن التمیمی میں تھی [یعنی خادم بتخانہ (سادِن) بنو اَوس میں سے ہوتے تھے] ۔ وہ مسیحی قبائل بکر اور تَغْلِب کے قریب رہتے تھے اور اس وجہ سے ان میں مسیحی مذہب کی تبلیغ کامیاب ہونی چاہیے تھی (قب Caetani : *Annali dell' Islām* A.H. 9, § 3) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت کو عملی طور پر ان میں کوئی زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی ۔ صرف ایک تمیمی گروہ، جس کی بابت ہمیں معلوم ہے کہ وہ سارے کا سارا عیسائی ہو گیا، وہ عِبادِ حِیرہ کا ایک حصہ تھا، جن کا مشہور ترین فرد عدیِ بن زید [رکّ بآں] شاعر تھا، لیکن یہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر اور اپنے قبیلے کے باقی لوگوں سے تعلقات منقطع کر کے ایک نئی طرزِ زندگی اختیار کر چکے تھے.

جس علاقے میں تمیم آباد تھے اس کی وسعت کی وجہ سے وہ قدیم زمانے ہی میں بہت سے گروہوں اور شاخوں (اَحیاء و بطُون) میں تقسیم ہو چکے تھے اور اُن میں ہر ایک کو بالآخر اپنی اپنی جگہ خودمختار قبیلے کی اہمّیت حاصل ہو گئی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس قبیلے کے اجزاء میں کبھی قوی حِسِّ تماسک و اتحاد پیدا نہ ہوئی، یہاں تک کہ دو تمیمی شاعر جریر اور فرزْدَق، جو دو مختلف بطنوں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے لیے ممکن ہوا کہ اپنے نقائض میں ایک دوسرے کے بطنوں کو نہایت شرمناک طریق سے گالیاں دیں ۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ تمیمی قبیلے کا ایک یا دوسرا گروہ جنگوں یا محالفت میں مصروف ہوا لیکن دوسرے بطون نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا، یا مخالف گروہ کے ساتھ جا ملے ۔ اس کے برعکس ایسے خاصّ اور اہمّ مواقع بھی اکثر پیش آئے جہاں اِنھیں اپنی طاقت مجتمع کرنا پڑی لیکن جب کبھی ایسا اجتماع قوی واقع ہوا اس کی صورت ہمیشہ 'حِلف' ہی کی ہوئی، جس میں ہر ایک گروہ نے اپنی خودمختارانہ حیثیت قائم رکھی (مثلاً دیکھیے نقائض، طبع بیون Bevan، ۶۹۹، ۷۰۲، بنو یربوع اور بنو نَہْشَل کی محالفت کے باب میں) ۔ مشہور نسّابہ ابوالیَقْظان سُحَیم بن [حَفْص] (م ۱۹۰ھ) نے تمیم کی محالفت کے متعلق ایک خاص کتاب بھی لکھی (بشرطیکہ، جیسا کہ یقینی معلوم ہوتا ہے، فہرست، ص ۹۴ س ۲۲ میں کتاب حِلْف تمیم بعضِہا بعضاً میں 'حَلْق' کے بجاے 'حِلْف' پڑھا جائے، 'حَلْق' بیہودہ قراءت ہے ، جس کی تفسیر متن کی شرح کے ص ۴۴ پر اس سے بیہودہ تر ہے) ۔ تمیم کے بڑے بڑے بطون زیدُ مَنَات اور عمرو کا بڑا فَخذ عَنْبَر ہے اور زید منات کی دو شاخیں ہیں ، جو سَعْد اور مالک کے ناموں سے مشہور ہیں؛ سَعْد میں سے مِنْقَر اور عُطارِد ہیں اور [مالک سے] حَنْظَلَۃ اور دارِم، جو آگے جا کر پھر عشائر میں منقسم ہو گئے ہیں؛ حَنظلۃ کی اولاد سے یَربُوع ، جو ایک نہایت ہی اہمّ عشیرہ ہے اور جن میں کئی شاخوں کے علاوہ رِیاح اور کُلَیب (عشیرۂ جَرِیر) بھی شامل ہیں اور دارِم میں نَہْشَل اور مُجاشِع (الفرزْدَق کا عشیرہ).

ظاہر ہے کہ یہاں مختلف بطونِ تمیم کی سرگذشت بیان کرنا ممکن نہیں ، جنھیں کے کارناموں پر دورِ جاہلیت میں ان کی تاریخ مشتمل ہے ۔ جو معلومات ہمیں اس ضمن میں حاصل ہوئی ہیں وہ بہت مکمل ہیں اور مقدار میں دوسرے تمام عرب قبیلوں کی متعلّقہ معلومات سے کہیں زیادہ ہیں ۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تمیم میں بڑے بڑے مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں ۔ بعد کے زمانے میں فقہاے لغت نے ان کے اشعار جمع کر کے

ان کی تفسیر لکھی تو حسبِ دستور ان اشعار کو وہ محوری حیثیت حاصل ہوئی جس کے گرد تأریخی روایات گھومتی ہیں ۔ ہم خاص طور پر ابوعُبَیدۃ [رَکَ بآن] (اور نیز قبَ مادۂ ایام العرب) کی سرگرمی اور تبحرِ علمی کے منت پذیر ہیں کہ تمیم کے ''ایام'' یعنی ان کی جنگوں کے تاریخی حوالوں کا بیشتر حصہ محفوظ ہو گیا ۔ دوسرے حوالوں کی فراھمی ابن الکَلْبی [رَکَ بآن] کی محنت کا نتیجہ ہے ۔ اس تأریخی مواد کے لیے ہم بیشتر نقائضِ جریر و فرزدق کی شاندار شرح کے زیرِ بارِ منت ہیں (طبع بیون A. A. Bevan، لائڈن ۱۹۰۵ تا ۱۹۱۲ء) .

تمیم کی قدیم تأریخ کا کچھ حصہ کتاب الأغانی میں اور اس سے کم ابن عبد ربّہ کی العِقْد (ج ۳) کے اس حصے میں جو ایام العرب پر ہے اور ابن الأثیر کی الکامل (ج ۱) میں بھی محفوظ ہے اور اس میں دیگر تأریخی اور لغوی متون سے اضافہ ہو سکتا ہے ۔ روایات کے ذریعے پریشان جزئیات کا جو طومار تمیم کی جنگوں کے متعلق ہمیں پہنچا ہے اس سے تمیم کی جنگوں کو زمانی اور تأریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کرنا نہ صرف مشکل کام ہے بلکہ بہت زیادہ وقت طلب بھی ہے (ان ایّام کی زمانی ترتیب کی مشکلات کے لیے قبَ مادۂ ایّام العرب) : اس مضمون کا نہایت گہرا مطالعہ کرنے سے، جو کوسانْ دِ پرسِوال Caussin de Perceval کے بعد آج تک کسی نے نہیں کیا، شاید ان واقعات میں کسی قسم کی ترتیب پیدا کی جا سکے ۔ ہم اس تحقیق کو اُن واقعات سے شروع کر سکتے ہیں جن میں شاھانِ ایران و شاھانِ الحیرہ نے حصہ لیا اور جن کی ترتیب زمانی ہمیں معلوم ہے ۔ اس سے جو نتائج اخذ ہوں ان کا مقابلہ انساب کے ان شجروں سے کیا جائے جو اس زمانے کے متعلق کافی طور پر قابل اعتماد ہیں ۔ ان تمام قصّوں سے دو باتیں تو ضرور معلوم ہو سکتی ہیں: ایک طرف تو تمیم اور ان کے ہمسایوں بَکر بن وائل (اور خصوصاً ان کی شاخ عامر بن صَعْصَعَة) کی مسلسل رقابت اور دوسری طرف شاھانِ ایران سے ان کے تعلّقات ۔ شاھانِ ایران نے بَکْر اور تَغْلِب کو اپنے زیرِ اثر لانے کے بعد تمیم پر بھی اپنا سکّہ جمانا چاھا، کیونکہ تمیم کی موجودگی سے عرب کے مشرقی ساحل اور یمن کے ساتھ ان بادشاھوں کے برّی ذرائع اتصال ھمیشہ خطرے میں رھتے تھے ۔ روایات نے ساسانیوں اور تمیم کے تعلّقات کے دو واقعات کی یاد باقی رکھی ہے : شاپور ثانی کا ھَجَر پر حملہ (نولڈیکہ : *Gesch. der Perser und Araber*، ۵۶) اور دوسرے وہ سخت سزا جو خسرو پرویز ثانی کے عامل نے کشت و خون سے تمیم کو دی، جب انھوں نے ایک ایرانی قافلے پر، جو یمن سے طیسفون (Ctesiphon) کو جاتا ہوا ان کے منازل میں سے گذر رھا تھا، حملہ کر دیا (یوم المُشَقَّر، نولڈیکہ : *Gesch. der Perser und Araber*، ۲۵۶ ببعد) ۔ یہ واقعات بہت کم اھمیت رکھتے ہیں اور ساسانیوں کی استعماری حکمتِ عملی کے سلسلے میں یہ ناگزیر واقعات تھے، جن کا اعادہ عُصور و دُھور میں بلا شبھہ اکثر ھوتا رھا ۔ بیچ بیچ میں صلح کا زمانہ بھی آتا رھا، جس میں ایرانی بادشاہ اور ان کے باجگزار لَخْمیانِ حِیْرہ بدوی قبیلوں کو مراعات دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے رھے ۔ ان مراعات میں سے کم از کم ایک، یعنی رِدافہ، کا ذکر محفوظ ہے جو فوجی اور مالی قسم کی متعدّد مراعات پر مشتمل تھا ۔ مُنذِر ثالث (م ۵۴۴ء) کے زمانے میں یہ مراعات یَربُوع کو دی گئی تھیں اور یہ مُنذِر ھی تھا جس نے یَربُوع کو ان مراعات سے محروم کر کے یہی مراعات تمیم کے دوسرے بطن دارِم کو

دینا چاہیں تو اس پر طِخْفَة کی جنگ ہوئی (*Die Dynastie der Lahmiden* : Rothstein، ١١٢ تا ١١٣، ١٣٣؛ نقائض، ٦٦، ٢٩٩).

ایامِ تمیم کی مندرجۂ ذیل فہرست نقائض کے اشارے سے لی گئی ہے (نقائض کے ایڈیشن میں دوسرے مصنفین کے متوازی بیانات کے حوالے بھی ملیں گے) ۔ یہ فہرست محض اس غرض سے درج ذیل کی گئی ہے کہ وہ قاری کو مآخذ کی طرف رجوع کرنے میں مدد دے سکے اور یہ بھی دکھانا مقصود ہے کہ کن کن قبیلوں سے تمیم کی دوستی یا دشمنی تھی۔

إراب (یربوع خلافِ تَغْلِب)؛ اَقْرُن (دارِم خلافِ عَبْس)؛ اُوارة (دارِم خلافِ عمرو بن مُنْذِر شاہِ حیرہ)؛ إیاد (یربوع خلافِ شَیْبان)؛ تیاس (سَعْد بن تمیم خلافِ عمرو بن تمیم)؛ جَبَلة (تمیم و ذُبیان خلافِ عامِر و عَبْس)؛ حَوْمَل (یَرْبُوع خلافِ شیبان ؛ شیبان کا قائد بِسطام بن قَیس تھا)؛ ذو طُلُوح (یربوع خلافِ لَہازِم و شیبان)؛ ذو نَجَب (یربوع خلافِ عامِر)؛ رَحرحان (دارِم خلافِ عامِر)؛ رَغام (یربوع خلافِ کِلاب)؛ زُبالَة (تمیم خلافِ بَکْر)؛ شَیْطان (تمیم خلافِ بکر)؛ صَرائم (یربوع خلافِ عَبْس)؛ طِخْفَة (قبّ سطور بالا)؛ غَبِیط (مالک و یَرْبُوع خلافِ شیبان)؛ غَوْل (یربوع خلافِ غَسّان)؛ فَرُوق (سعد خلافِ عبس)؛ قُشاوة (یربوع خلافِ شیبان)؛ کُلابِ ثانی (سعد و رباب خلافِ مَذْحِج)؛ مَرُوت (یَرْبُوع خلافِ قُشَیْر)؛ مُلْزِق (سعد خلافِ عامِر)؛ نَباج (مِنْقَر خلافِ بکر)؛ نَسار (تمیم و عامِر خلافِ رِباب و اَسَد)؛ وَقْدان (نَہْشَل خلافِ ہلال)؛ وَقِیط (دارِم خلافِ لَہازِم).

اسلام نے دوسرے شرقی قبیلوں کی طرح تمیم کو بھی اپنے راست اثر کے دائرے سے باہر پایا ۔ جب [حضرت] محمد[۴] نے آس پاس کے قبیلوں پر فتح پائی اور وسطی عرب پر بھی مدینے کی حکومتِ دینی کا دبدبہ بیٹھ گیا تو تمیم کو بھی اسلام سے تحالف میں فائدہ نظر آیا ۔ انھوں نے ٨ھ میں مدینے میں ایک وفد بھیجا اور حضور[۴] سے دوستی کا عہد نامہ ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت اسلام نہ لائے ۔ اسی وجہ سے انھوں نے آنحضرت[۴] کے انتقال کے بعد اپنی پوری خود مختاری کا اعلان کرنے میں اَوروں پر سبقت کی ۔ رِدّہ میں جو حصہ تمیم نے لیا وہ مُتَنَبِّئہ سَجاح [رکّ بآن] کے کارناموں کی وجہ سے مشہور ہے لیکن افسوس ہے کہ سَجاح کا صحیح کردار معلوم نہیں ہو سکا، کیونکہ اس کا حال جانب دارانہ روایتوں کی وجہ سے کچھ مسخ ہو کر رہ گیا ہے ۔ بہر حال خالد بن ولید کے شدید حملوں کی وجہ سے تمیم پھر اسلام لے آئے اور متّصل بعد کی [اسلامی] فتوحات کے سلسلے میں انھیں اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع مل گیا (قبّ کایتانی Caetani : *Annali dell' Islām*، اشاریۂ جلد ١ و ٢) ۔ تمیمی مجاہدین کا بہت بڑا حصّہ قدرتی طور پر ایران کی جانب بڑھا اور پہلے کوفے اور بصرے کے دو بڑے فوجی مقامات میں آباد ہو کر وہ بعد ازاں خراسان چلے گئے، جہاں عبّاسیوں کے عہد میں عربی آبادی کی اکثریت انھیں کی تھی ۔ اگرچہ ان فتوحات کا تاریخی حال زیادہ تر سیف بن عمر [رکّ بآن] ہی سے مروی ہے، جو خود تمیمی تھا اور احتمال ہے کہ وہ تمیم کے کارناموں کا ذکر ان فتوحات میں مبالغہ آمیزی کے ساتھ کرتا ہو (قبّ *Annali dell' Islām*، ١٢ھ، § ٣٥٦، حاشیہ ٢)، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمیم نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی بدستور اسی جنگجویانہ روح کی نمائش کی جس کی وجہ سے وہ جاہلیت کے ایام میں ممتاز تھے ۔ چونکہ وہ صحیح معنوں میں بدّو اور اس لیے ہر قسم کی حکومت سے طبعاً نفور تھے انھوں نے بنواُمیّہ کے

عہد کی۔ تمام باغیانہ تحریکوں میں عملی حِصّہ لیا۔ اگر اُنھوں نے قَیس و کَلب کی باھمی آویزش میں تھوڑا حِصّہ لیا، جو حقیقت میں اُن کے لیے ایک پرایا جھگڑا تھا، تو اُنھوں نے خوارج [رَكَ بآں] کی حیثیت سے بہت زیادہ مستعدی دکھائی؛ اس تحریک کے آغاز کے غالی خارجی بنو تمیم ھی سے تھے۔ اَزارِقہ کا سردار قَطَری بن الفُجَاءَۃ [رَكَ بآں] اور اُس کے اکثر پیرو تمیمی تھے۔ اسی طرح ھم خراسان میں اُن کے بیشمار افراد کو عبّاسی دعوت کے لبّیک کہنے والوں میں شریک پاتے ھیں۔ آخر میں ھم بعد کے دَور کے ایک تمیمی ابراھیم بن الاَغلَب کی کامیابی کے ذکر کو بھی نہ بھولیں جو سعد بن زید مناۃ کی اولاد میں سے تھا، جس نے افریقہ میں خاندان بنو الاَغلَب [رَكَ بآں] کی بنیاد ڈالی۔

نحویوں اور لُغَویوں نے تمیمی بولی کی خصوصیات ھمارے لیے محفوظ کر دی ھیں، جن کی تفصیل مادّۂ قیس عیلان کے مآخذ میں مل سکتی ھے؛ نیز دیکھیے Vollers : *Volkssprache und Schriftsprache im alten Arabien*، ۸ تا ۲۳؛ احمد بن فارِس : الصاحِبی، قاھرۃ ۱۳۲۸ھ، ص ۴۲ بعد۔ اُن میں سے بہت سی خصوصیات دوسرے قبیلوں کی بولیوں میں بھی ملتی ھیں، مثلاً 'کَشْکَشَۃ'، جسے دوسرے متون ربیعہ سے منسوب کرتے ھیں، 'عَنْعَنَۃ'، جو قَیس میں بھی پایا جاتا ھے، مضارع کی ابتداء میں فتحہ کے بجاے کسرہ کا استعمال وغیرہ؛ دوسری خصوصیات یہ ھیں: یاے نسبتی کو جیم کی طرح بولنا، ''حرفِ ما بین کاف و قاف وغیرہ'' [ان خصوصیات کے لیے دیکھیے السیوطی : المزھر، قاھرۃ ۱۳۲۵ھ، ۱ : ۱۳۳ بعد]۔ یہ بات قرینِ احتیاط معلوم نہیں ھوتی کہ تمیم کی زبان کے قواعدِ کلّیہ کی بنیاد ایسے بیانات پر رکھی جائے جو اتّفاقی اور متفرّق مشاھدات پر مبنی اور مختلف بولیوں کے باقاعدہ مطالعے کا نتیجہ نہیں ھیں؛ البتہ اتنی بات یقینی ھے کہ قَیس اور بَکر کی بولیوں اور تمیمی بولی کو ملا لیں تو قدیم عرب کے مشرقی حِصّے کی بولیوں کا ایک ایسا گروہ سامنے آتا ھے جو عرب کے مغربی حِصّے کی بولیوں سے واضح طور پر مختلف ھے (قبّ Vollers : کتاب مذکور، ص ۴ ببعد)۔ اس کے علاوہ بنو تمیم کی شہرت یہ تھی کہ وہ شعر اور بلاغت میں ٹھیٹھ عربیت کے حامل ھیں: جیسا کہ پیشتر ذکر ھو چکا ھے، ھمیں تمیم میں سارے قدیم عربی ادب کے بعض مشہور ترین شاعر ملتے ھیں: مثلاً اَوس بن حَجَر، سَلامَۃ بن جَنْدَل، سُلَیک بن سُلَکَۃ، عَبْدَۃ بن طَبِیب، عَدِیّ بن زَید، مالِک اور المُتَمّم ابنا نُوَیرَۃ، المُخَلَّب [كذا، المُخَبَّل السعدیّ ؟]؛ اموی دَور میں جَریر اور فَرَزْدَق کے علاوہ البَعیث، کُثَیّر، ثابتُ قُطْنَۃ، اَوس بن مَغْراء، العَجّاج، رُؤبۃ وغیرہ۔

مآخذ : (۱) وِیستنفیلٹ : *Register*، ۴۴۲ تا ۴۴۳؛ (۲) ابن دُرید : کتاب الاشتقاق، طبع وِیستنفیلٹ، ۱۲۳ تا ۱٦۰؛ (۳) ابن قُتَیْبَۃ : المَعارِف، طبع وِیستنفیلٹ، ۳۷ تا ۳۸؛ (۴) ابن الکَلْبی : جَمھَرۃ الأنساب (مخطوطۂ برٹش میوزیم Add. 23, 297)، ورق ٦۲ راست تا ۹٦ چپ؛ (۵) نقائض جریر و الفرزدق، طبع بیوَن Bevan، بمواضع کثیرہ؛ (٦) Caussin de Perceval : *Essai sur l' histoire des Arabes*، ۲ : ۳٦۱ تا ۳۸۴، ۵٦۹ تا ٦۰۴۔

(G. Levi Della Vida)

تَمیم بن المُعِزّ [بن بادِیس] :

بنو زِیری میں سے خانوادۂ صَنْہاجہ کا پانچواں بادشاہ، جس نے دیارِ بربر کے مشرقی حِصّے میں ۴۵۴ تا ۵۰۱ھ / ۱۰٦۲ تا ۱۱۰۸ء تک حکومت کی۔ وہ [رجب ۴۲۲ھ / جولائی ۱۰۳۱ء میں] قَیرَوان کے قریب

صبرة (المنصوریة) میں پیدا ہوا تھا ۔ بقول ابن عذاری وہ بلند قامت اور وجیہ تھا ۔ اسی مصنف نے اس کے طریقِ زندگی کے متعلق عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں ۔ وہ [بہادر، صاحبِ حزم و عزم اور] اعلٰی درجے کا بافرہنگ انسان تھا اور تاجداروں میں سے جو افراد فحوا، شعراء ہو گذرے ہیں تمیم کا شمار ان میں تھا۔

۴۴۵ھ / ۱۰۵۳ء میں اس کی عمر ۲۳ برس کی تھی ۔ اس کے باپ نے اسے المہدیّة [رَکّ بآن] کا والی مقرر کر دیا ۔ یہ واقعہ بنو ہلال قبیلے کے عربوں کی آمد کے فوراً بعد کا ہے، جو المعزّ کی فوجوں کو ایک دو سخت شکستیں دے کر افریقیّة کا خاصہ بڑا حصّہ چھین چکے تھے ۔ چار سال بعد ۴۴۹ھ / ۱۰۵۷ء میں المعزّ نے اپنے دارالسلطنت قَیْرَوان کو خیر باد کہا؛ کیونکہ وہ اس کی مدافعت نہیں کر سکتا تھا اور المہدیّة میں آ کر تمیم کے پاس پناہ گزیں ہوا، جو اپنے [والد ماجد] سے بہت احترام و اکرام سے پیش آیا ۔ اب سے تمیم نے مستبدانہ حکومت کرنا شروع کی اور المعزّ کی وفات پر (۴۵۴ھ / ۱۰۶۲ء) اسے باقاعدہ طور پر بادشاہ بھی تسلیم کر لیا گیا ۔ تمیم کو نہایت ہی مشکل حالات میں اقتدار حاصل ہوا لیکن اس نے عظیم فعّالیّت اور قابلیت کا ثبوت دیا ۔ المہدیّة کے شہر سے کہ عملاً اس کی حکومت یہیں تک محدود تھی، اس نے افریقیة کے کل شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا، جنھیں سابقہ والیوں، عرب امیروں اور محض من چلے قسمت آزماؤں نے خود مختار ریاستوں کی صورت میں تبدیل کر رکھا تھا ۔ اسے اصحاب القَلْعَة بنو حمّاد سے بھی لڑنا پڑا، جو اس کے رشتے دار تھے مگر قیروان کی پرانی حکومت کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھے ۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اس نے عربوں کے مختلف گروہوں کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھایا اور بنو ریاح کی، جو ان میں سب سے زیادہ طاقتور تھے، تائید و حمایت حاصل کر لی ۔ اس تحالف کی مدد سے، جو بجائے خود خطرات سے خالی نہ تھا، وہ المہدیّة کے خلاف حمّادی خاندان کے حکمران النّاصر [بن حمّاد] کے منصوبوں کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو گیا ۔ اس امر کے علاوہ اس کی توجّہ زیادہ تر ساحلی شہروں کی طرف منعطف رہی ۔ اس نے ان کے خلاف کئی مہمّات بھیجیں لیکن ان مہموں میں کامیابی کچھ عارضی ہی نوعیّت کی ہو سکتی تھی ۔ اس نے سُوسة پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔ تونس کے بنو خراسان کو مطیع و منقاد کیا ۔ پہلے تو جنگ قابس Gabes میں ناکام رہا مگر بعد میں اسے تسخیر کر لیا اور سفاقس کے مضافات کو تباہ کرنے کے بعد اس شہر میں داخل ہوا ۔ خود المہدیّة، جو اس کا مرکز تھا، کئی بار معرضِ خطر میں آیا، چنانچہ عربوں نے ۱۰۸۴ء میں اس کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔

تمیم کی مساعی سے، جو اس نے ساحلی شہروں کے خلاف کیں، وہ مقاصد ظاہر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس زمانے میں سمندر تک پہنچنے کا اہتمام کر رہا تھا جب اس کے بری مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے ۔ اس معاملے میں اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس نے یہ کوشش کی کہ نارمن لوگ صِقِلّیَة پر قابض نہ ہو سکیں ۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو اس نے اپنی بحری غارت گری کو اور تیز کر دیا ۔ عیسائیوں میں اس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ اہلِ جنوہ اور اہلِ پیزا نے اتحاد کر کے ۶ اگست ۱۰۸۷ء کو المہدیّة پر قبضہ کر لیا اور اسے تاخت و تاراج کر ڈالا ۔ [۴۹۸ھ/] ۱۱۰۴ء میں رومیوں [' الروسانیون'] (؟) نے ایک اور حملہ اس شہر پر کیا لیکن اس

حملے کا نتیجہ ان کے حق میں تباہ کن ثابت ہوا. چار سال بعد [رجب] ۵۰۱ھ/ [مارچ ۱۱۰۸ء] میں تمیم نے ۷۹ [قمری] سال کی عمر میں انتقال کیا اور المنستیر کے قصر السیدة میں دفن ہوا.

مآخذ: (۱) ابن خلکان: وفیات [قاہرة ۱۳۱۰ء، ۱: ۹۸]، ترجمۂ دیسلان de Slane (Biographical Dictionary)، ۱: ۲۸۱ تا ۲۸۴؛ (۲) ابن عذاری: بیان المغرب، طبع ڈوزی Dozy، ۱: ۳۰۷ تا ۳۱۳، ترجمۂ فانیان F. Fagnan، ۱: ۴۴۴ تا ۴۵۴؛ (۳) ابن خلدون: Hist. des Berbères، طبع دیسلان، ۱: ۲۰۶ تا ۲۰۷؛ ترجمہ ۲: ۲۲ تا ۲۴؛ (۴) ابن الأثیر: کامل، طبع Tornberg، ج ۹: ۳۸۹؛ ج ۱۰: ۱۰، ۱۹، ۳۰، ۱۰۵، ۱۰۹ تا ۱۱۰، ۱۱۹، ۱۳۲ تا ۱۳۳، ۱۷۵، ۳۱۴ تا ۳۱۵؛ ترجمۂ فانیان (Annales du Maghreb)، ص ۴۶۰، ۴۷۰ ببعد، ۴۸۶ ببعد، ۴۹۰، ۵۰۱، ۵۰۹ تا ۵۱۰، ۵۱۵ تا ۵۱۷؛ (۵) ابن ابی دینار (القیروانی): مؤنس، ترجمہ از Pellissier و Rémusat، ص ۱۴۵ تا ۱۴۷؛ (۶) التجانی: رحلة، ترجمہ از Rousseau، در J.As.، ۱۸۵۲ء، ۲: ۱۳۰ ببعد؛ ۱۸۵۳ء، ۱: ۳۷۰ ببعد؛ (۷) Mas Latrie: Traités des paix، ۱: ۲۹ تا ۳۰؛ (۸) حسن عبدالوہاب: المنتخبات التونسیة، تونس ۱۳۳۷ھ، ص ۱۰۱ تا ۱۰۳؛ (۹) G. Marçais: Les Arabes en Berbérie، ص ۱۲۴ تا ۱۲۵، ۱۳۴ تا ۱۳۹، ۱۴۲ تا ۱۴۳.

(G. Marçais (مارسے

* **تَمِیم بن الْمُعِزّ [بن الْمَنْصور]:** [چھٹے] فاطمی خلیفہ العزیز کا بھائی ۔ کہتے ہیں کہ وہ حدود ۳۳۷ھ/ ۹۴۸ - ۹۴۹ء میں پیدا ہوا ۔ اپنے وقت میں اپنی سخاوت اور ادبی شغف کے لیے مشہور تھا ۔ وہ ایک صاحبِ فضلیت و ظرف شہزادہ تھا، جو شعر گوئی میں ذوقِ سلیم اور مہارتِ فنی رکھتا تھا اور اس اعتبار سے اپنے معاصرین میں مشہور تھا ۔ اسے ولی عہد نہ بنایا گیا اور اُس کے بھائی العزیز کو اس پر ترجیح دی گئی ۔ العزیز کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی، جس کا اندازہ اُس کے اس رنج و غم سے ہوتا ہے جو اُسے تمیم کی وفات پر ہوا ۔ تمیم ذوالقعدة ۳۷۴ھ / اپریل ۹۸۵ء میں قاہرة میں فوت ہوا ۔ قَرافَة کے قبرستان میں نمازِ جنازہ کے بعد اسے محلّ کے اُسی سردابے میں دفن کیا گیا [جہاں اُس کے باپ کی قبر تھی] ۔ اس کے انتقال کی صحیح تاریخ کے متعلق اختلاف ہے ۔ ابن تَغْری بِرْدی اسے ۳۶۸ھ کا واقعہ بتاتا ہے ۔ اس کے اشعار کا نمونہ ابن خلّکان نے اپنی کتاب وَفَیات الأعیان میں دیا ہے.

مآخذ: (۱) ابن خلّکان: وفیات [قاہرة ۱۳۱۰ھ، ۱: ۹۷]، ترجمۂ دیسلان de Slane، ۱: ۲۷۹ ببعد؛ (۲) ابن دُقْماق: کتاب الانتصار، ۴: ۸۰؛ (۳) ابوصالح: Churches and Monasteries of Egypt، ترجمہ از Evetts، ورق ۱۴ الف؛ (۴) ابن تَغْری بِرْدی: Annals، طبع Popper، ص ۲۳، س ۸؛ (۵) ابن سعید: کتاب المُغْرِب، ترجمہ از Tallquist، ۱: ۹۱ ببعد؛ (۶) یاقوت: معجم البلدان، طبع ویستنفیلٹ، ۳: ۸۶۵.

(J. Walker (واکر

* **تمیم داری** [رضہ]: ایک صحابی، جن کی نسبت الداری تھی ۔

[[خاندان: حضرت تمیم داری رضہ یمنی، قحطانی عرب، قبیلۂ لَخْم بن عدی کی شاخ الدار بن ہانئی بن حَبیب بن نُمارَة بن لَخم سے تھے، جو جُذام اور کِنْدَة کا ہم جدّ تھا ۔ لخم اور جذام کے قبیلے یمن سے نکل کر شام میں آباد ہوگئے تھے ۔ حضرت تمیم رضہ کا خاندان فلسطین میں آباد تھا ۔ ان کی نسبت الداری تو الدار بن ہانئی سے ہے اور الدَّیری دَیر سے، اس لیے کہ ۹ھ میں اسلام لانے سے پہلے آپ ایک دیر میں راہب تھے، النَّوَوی: تہذیب الاسماء، طبع

ویسٹنفیلٹ، ۱۷۸ (طبع قاهرة، ۱ : ۱۳۸؛ اصابة) .

حضرت تمیم رض کا آبائی سلسلۂ نسب یہ ہے : تمیم بن اَوس بن خارِجة (حارثة در اصابة) بن سُود (سَواد در استیعاب) بن خَزیمة (جِذیمة در اصابة و تہذیب) بن ذِراع (دَراع در اصابة، وِداع در تہذیب) بن عدی بن الدار (قب ویسٹنفیلٹ : *Gen. Tabellen*، ص ۰، س ۲۰؛ طبری، طبع ڈ خویه، ۳ : ۲۳۴۲، ۲۵۰۳؛ ابن سعد، ۷/۲ : ۱۲۹ تا ۱۳۰؛ سمعانی، ۲۱۸ ب) - ناموں کا اختلاف زیادہ اہم نہیں، کیونکہ کتابت میں تصحیف ہو گئی ہے .

آپ کی کنیت ایک صاحبزادی کے نام پر ابو رُقیّة تھی؛ اَور اولاد نہ تھی .

عـام حـالات : آپ اسلام سے پہلے اپنے تمام قبیلے کی طرح عیسائی تھے اور آپ کی زندگی ٹھیٹ مذہبی قسم کی تھی، چنانچہ آپ فلسطین والوں میں راهب اور عابد تھے، تہذیب التہذیب میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ آپ کتابیَن (عہدِ قدیم اور عہدِ جدید) کے ماننے والوں، یعنی یہود و نصارٰی کے علماء میں سے تھے .

قبـول اسـلام : غزوۂ تبوك رجب ۹ھ سنہ ہوا ہے - آپ اس غزوے سے پہلے اسی سال شام سے مدینے آئے - آپ کے ساتھ آپ کے قبیلے کے کئی آدمی تھے - سب نے اسلام کے آستانے پر سر جھکایا اور عہد نبوت میں مدینے میں مقیم رہے - ابن ہشام نے (ص ۷۷۷ پر) داریوں کے اس وفد کے نو نام شمار کیے ہیں، جن کے متعلق رسول اللہ صلعم نے خیبر کی زمین میں وصیت فرمائی .

اصابة میں ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت تمیم داری رض نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ غزوے میں شرکت کی - چونکہ آپ کے اسلام لانے کے بعد صرف ایک ہی غزوہ ہوا ہے، اس لیے قرینہ یہ ہے کہ غزوۂ تبوك میں آپ نے شرکت کی تھی، یہ رجب ۹ھ میں ہوا تھا .

حضرت تـمیم داری رض حضرت عثمان رض کے عہدِ خلافت تک مدینے ہی میں رہے اور فتنۂ عثمانی کا مشاہدہ کیا اور ۳۵ھ کے بعد شام کی سکونت اختیار کی .

شام میں وہ کس شہر میں رہے ؟ اُسدالغابَة میں ہے کہ فلسطین میں قیام کیا - تہذیب میں ہے کہ بیت‌المقدس میں مقیم ہوے، جو فلسطین ہی کا ایک شہر ہے - بیت‌المقدس کے قریب ایک مشہور گاؤں ہے، جس کا نام اُسدالغابَة میں ''عَینُون'' بتایا گیا ہے - مصنف کا بیان ہے کہ یہ گاؤں حضرت تمیم رض کـو آنحضرت ؐ نے جاگیر میں عطا فرمایا تھا اور اس کے لیے نامۂ مبارك لکھوا دیا تھا .

اصابة مـیں (بـذیـل ابـوهـنـد داری) اس کی تشریح یوں کی گئی ہے : '' تمیم اور ان کے ساتھیوں نے رسول‌اللہ صلعم سے درخواست کی کہ '' انہیں شام میں کوئی زمین عطا فرمائی جائے'' - آپ نے فرمان لکھوا دیا - ابوبکر رض کے عہدِ خلافت میں یہ لوگ فرمان لے کر ان کے پاس آئے تو انہوں نے ابوعبیدة رض کے نام حکم بھیج دیا کہ '' فرمان کی تعمیل کی جائے''! حافظ ابن حجر ؒ کا بیان ہے کہ فرمان مبارك مشہور ہے اور وہ تمیم رض کی اولاد کے پاس ہے اور میں نے اس کے متعلق ایک رسالـہ لکھا ہے، جس کا نام ہے : البناء الجلیل بحکم بَلَد الخلیل''- شام فتح ہونے سے بہت پہلے اس کی اَراضی کی نسبت فرمان عطا کرنا خصوصیاتِ نبوت میں سے ہے، ابوهند داری رض، جن کے حالات میں اس فرمان کی گـذشتہ تشریح منقول ہے، اصابة (بذیل تمیم) کی رو سے حضرت تمیم رض کے اَخیافی بھائی تھے!

شام کی فتوحات میں خاصہ وقت صرف ہوا تھا - فلسطین پر حملے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رض نے حضرت عمرو رض بن العاص کو مأمور فرمایا تھا،

لیکن یہ علاقہ عہدِ صدیقی میں فتح نہیں ہوا۔ غالباً اسی لیے حضرت تمیمؓ وغیرہ مدینے میں ٹھیرے رہے ۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں بیت‌المقدس فتح ہونے کے بعد حکومت کو استحکام میسّر آیا اور شوال ۱۹ھ میں جب حضرت معاویة کی ہمّت نے قیساریة کو فتح کر کے اسے اسلام کے قلمرو میں داخل کر دیا تو شام کا مطلع بالکل صاف ہو گیا ۔ فتوحات مکمل ہونے کے بعد یا تو حضرت عمر اور یا حضرت عثمانؓ نے فرمانِ رسالت کے مطابق حضرت تمیم کو قریۂ ''عَیْنُون'' جاگیر میں دیا ہوگا اور چونکہ وہ بیت‌المقدس سے قریب تھا اس لیے حضرت تمیم نے دین اور علم کی خدمت کے لیے بیت‌المقدس کو مرکز بنایا ۔

حضرت تمیم کی زندگی عہدِ نبوت اور دورِ خلافت میں ایک ہی نہج پر بسر ہوئی ہے ۔ مدینے اور شام دونوں جگہ وہ زاہدانہ حیثیت سے رہے ۔ مدینے کے قیام میں بسرِ اوقات کے لیے رسول اللہ صلعم کی وصیت کے مطابق (ابن ہشام، ۷۷۶؛ یہ وصیت آنحضرت صلعم نے مرض‌الموت میں فرمائی تھی) خیبر سے کچھ مل جاتا تھا اور شام پہنچ کر قریۂ عَیْنُون کی آمدنی سے وہ زندگی بسر فرماتے تھے ۔ بقیّہ اوقات عبادت میں صرف ہوتے تھے اور کبھی کبھی وعظ کا مشغلہ بھی رہتا تھا ۔ عبادت کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے (ابن حجر: تہذیب) ۔ تہجّد کی نماز بہت پڑھتے تھے ۔ ایک بار قرآن کی حسب ذیل آیت : اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ الآیة میں ساری رات ختم کر دی ۔ بار بار رکوع کرتے، سجدہ کرتے اور روتے تھے (اُسْدُالغابة) ۔

وعظ گوئی انھوں نے حضرت عمرؓ کے عہد سے شروع کی تھی، [لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ اسلام میں پہلے قاصّ (واعظ) تھے (''اوّلُ مَن قصَّ'')، اس لیے ''قاصّ'' کہلائے (قبّ گولڈ تسیہر Goldziher : *Muh. stud*، ۲ : ۱۶۱ بذیل صفحہ؛ نَوَوِی : تہذیب‌الاسماء، ۱۷۸ (طبع قاهرة، ۱۳۸))۔ حقیقت میں قصّے (رکّ بآن) کی اس ادبی قسم میں وہ قصّے شامل ہیں جن میں قیامِ قیامت، دجّال (رکّ بآن) اور جسّاسة کا ذکر آتا ہے ۔ (نووی محلّ مذکور میں بحوالۂ صحیح مسلم لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے تمیمؓ سے قصۂ جسّاسة روایت کیا اور اس منقبت شریفہ میں کوئی دوسرا تمیمؓ کے ساتھ شریک نہیں) (اسد الغابة میں لکھا ہے کہ حضرت تمیم داری نے وعظ گوئی کے لیے حضرت عمرؓ سے اجازت لے لی تھی) .

حضرت تمیم کی ایک دینی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے مسجدِ نبوی میں چراغ جلایا ۔ اس کا حال اُسْد الغابة میں (بذیل سراج) یوں بیان کیا گیا ہے : ''تمیمؓ نے مسجد نبوی میں قندیل لٹکا کر زیتون کے تیل کا چراغ جلایا، دیگر صحابہ کا چراغ یہ تھا کہ کھجور کی شاخوں میں مشعلیں جلا کر لاتے تھے'' ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات کے وقت مسجد نبوی میں روشنی تو پہلے بھی ہوتی تھی لیکن وہ قندیل کے اندر نہیں، بلکہ مشعلیں جلتی تھیں ۔ حضرت تمیم نے روشنی کو ایک باقاعدہ اور زیادہ موزوں شکل دے دی ۔ اس کے بعد سے قندیلوں کا عام رواج ہوگیا، جو آگے چل کر جھاڑ اور فانوس کی صورت میں نمایاں ہوا [قبّ Clermont-Ganneau : *R. H. R.*، شمارہ ۸۱، ۱۹۲۰ع]، ص ۲۴۷ ببعد = *Recueil d' Archéologie Orientale*، ۸ : ۲۱۶ ببعد : *La lampe et l' olivier dans le Coran*].

حضرت تمیم داریؓ کی وفات کا سنہ تہذیب

کے سوا کہیں مذکور نہیں ۔ حافظ ابن حجر نے کتاب مذکور میں لکھا ہے : ''بعض کا قول ہے کہ ان کی قبر پر یہ ملا کہ انھوں نے ٤٠ھ میں وفات پائی'' ۔ غالباً کسی نے قبر پر کتبہ لگایا ہوگا ۔ آپ کی وفات ''بیت جِبرین'' میں ہوئی، جو فلسطین کا ایک شہر ہے (اصابة) .

حضرت تمیم داری رض خاص وضع کے بزرگ تھے ۔ عابد و زاہد ہونے کی وجہ سے انھوں نے عام صحابہ کے برخلاف کوئی زاہدانہ وضع اختیار کی تھی، اسی لیے اس کا ذکر صراحةً کیا گیا ہے، ''کان لہ ھیئة و لباس'' (اُسد الغابة) .

حضرت تمیم داری رض اگرچہ دیر میں مشرف بہ اسلام ہوے، تاہم چونکہ وہ اپنے پرانے مذہب کے علماء میں سے تھے اس نئے مذہب میں داخل ہونے کے بعد ذوقِ علمی برابر قائم رہا اور وہ اسلام کے اہلِ علم میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ ان سے بہت سے صحابہ نے روایتیں کی ہیں، جن میں حضرت ابن عمر، ابن عباس، ابوہریرة، اَنس بن مالک، زُرارة بن اَوفٰی رضی اللہ عنہم اور تابعین میں عبداللہ بن مَوہَب، سُلیم بن عامر، شُرحبیل بن مسلم، قَبیصة بن ذُویب، عطاء بن یزید لَیثی، رَوح بن زِنباع، شہر ابن حَوشب، عبدالرحمٰن بن غَنم وغیرہ شامل ہیں .

ان مرویات میں ایک خاص روایت وہ ہے جو رسولِ اللہ صلعم نے حضرت تمیم رض سے نقل فرمائی ہے ۔ اس سے علماے حدیث نے یہ اصول نکالا ہے کہ متبوع کی تابع سے یا فاضل کی مفضول سے روایت جائز ہے ۔ دوسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ خبرِ واحد کو قبول کیا جا سکتا ہے ۔ اوپر مذکور ہوا کہ یہ خصوصیت کہ رسول اللہ صلعم ایک صحابی کے راوی ہیں حضرت تمیم رض کی عظیم الشان منقبت ہے .

یہ روایت حضرت فاطمة رض بنت قیس سے صحیح مسلم (کتاب الفتن و اشراط الساعة : باب فی خروج الدجال) میں منقول ہے، وہاں دیکھنی چاہیے۔ ابوداؤد (٤ : ١١٨)، ابن ماجة (٢ : ٢٦٣) اور مسند ابن حنبل (٦ : ٤١١) میں بھی تقریباً وہی الفاظ ہیں ۔ لیکن صحیح بخاری، ترمذی اور نسائی میں اس کا سراغ نہیں ملتا]] .

(سعید انصاری)

بعد کے زمانے میں اسی روایت کو نبی[ص] کی وفات سے بعد کا واقعہ قرار دے کر اس کے حوادث کو اَور طرح سے بیان کیا ہے : یہ سمندری طوفان میں جہاز کی تباہی نہ تھی جس کی وجہ سے تمیم[رض] کو دوسری دنیا کے اسرار معلوم ہوے بلکہ انھیں رات کے وقت ایک جنّ گھر سے اٹھا کر لے گیا ۔ وہ یکے بعد دیگرے مختلف نامعلوم ممالک سے گذرے ۔ ان ملکوں میں عجیب و غریب قسم کی مخلوق آباد تھی۔ غرض کہ کئی قسم کے غرائب و اہوال کا سامنا کرنے کے بعد، جن میں الدجّال اور الجسّاسة کی ملاقات محض ایک منفرد واقعے کی حیثیت رکھتی ہے، ایک فرشتہ انھیں بادل پر سوار کر کے ان کے گھر واپس لے آیا ۔ ان کی بیوی یہ خیال کر کے کہ وہ فوت ہو چکے ہوں گے دوسرا نکاح کر لیتی ہے اور اب اپنے آپ کو سخت مشکل میں مبتلا پاتی ہے ۔ تمیم یہ مسئلہ خلیفہ عمر[رض] کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ معاملہ [حضرت] علی[رض] کے حوالے کرتے ہیں ۔ آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم[ص] کو یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تمیم پر کیا گزرےگی اور یہ فیصلہ دیا کہ عورت دونوں شوہروں میں سے جسے چاہے قبول کر لے ۔ اس نے تمیم کے پاس واپس جانے کو بہتر سمجھا ۔ روایت کی یہ صورت، جس میں دو عام

عناصر شامل ھیں، یعنی بلادِ عجائب کا سفر اور اس آدمی کی واپسی جسے مرا ھوا سمجھا گیا تھا، دور دور تک پھنچی اور اس کی ترکی، ملائی اور ھسپانوی صورتیں موجود ھیں - عربی متن کا ایک نسخہ، جس سے مذکورہ روایتیں مأخوذ ھیں، باسے R. Basset نے *Les aventures merveilleuses de Temim el Dâri* کے نام سے *Giornale della Società Italiana*، ج ٥ [۱۸۹۱ء]: ۳ تا ۲٦ میں الجزائر کے مخطوطے کی بنا پر شائع کیا تھا (دیگر مخطوطات میں، جن کا پتا اس نے پیرس، آکسفورڈ، لائڈن اور تونس میں لگایا تھا، ذیل کے اور نسخوں کا اضافہ کیا جا سکتا ھے : انڈیا آفس کا نسخہ عدد ۱۰۴۴ (۸)، برلن کا نسخہ عدد ۹۰٦۹ و ۹۰۷۰ و ۹۱۰٥ تا ۹۱۲۲ - یہ متن قاھرۃ میں بھی ایک عوام پسند طباعت میں چھپ چکا ھے) - ظاھر ھے کہ یہ بتانا ناممکن ھے کہ یہ روایت کب شکل پذیر ھوئی - باسے Basset لکھتا ھے کہ الدمشقی (م ۷۲۷ھ) نے اس کہانی کا خلاصہ دیا ھے، جو بہت حد تک ھمارے متنوں سے مشابہ ھے (عجائب البرّ و البحر، طبع مہرن Mehren، ۱۳۹) [کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی (مجموعۂ شیرانی، شمارہ ۲۸۲) میں فارسی کا ایک منثور رسالہ ھے، جس میں قصۂ تمیم ''انصاری'' رضی اللہ عنہ دیا ھے - مضمون کم و بیش وھی ھے جو اوپر مذکور ھے مگر نسبت ''الداری'' کے بجاے ''انصاری'' ھے - انڈیا آفس کے فارسی مخطوطات کی فہرست مرتبۂ ایتے میں شمارہ ۸٥۹ الف (۱) پر بھی اس سے ملتا جلتا متن موجود ھے؛ نیز دیکھیے فہرست مذکور، شمارہ ۸٥۸؛ مجموعۂ شیرانی، شمارہ ۱۳٥۰ - دکھنی اردو کی ایک (ناقص الآخر) مثنوی ھے، جو اسی قصے پر مشتمل ھے - شاعر کا تخلص غلامی ھے (جس کے لیے دیکھیے اردو شہ پارے از سید محی الدین قادری، حیدرآباد دکن ۱۹۲۹ء، ص ۱۷۰؛ یورپ میں دکھنی مخطوطات از نصیرالدین ھاشمی، حیدرآباد دکن ۱۳٥۰ھ، ص ٦٦۷ - بقول غلامی یہ تخلص اس نے قصوں میں استعمال کیا تھا، مرثیوں میں اس کا تخلص غلام رسول، ریختہ میں مطلب، مناقب و مدح میں انور ھے - وہ مولداً سورتی اور سکونۃً کنبایتی ھے - دورِ آصفیہ کا یہ شاعر شاعری میں فدا کا شاگرد ھے، جس نے اصل فارسی منثور قصہ غلامی کو دیا اور غلامی نے اسے ھندی میں منتقل کیا].

ایک مختلف نوعیت کا دوسرا واقعہ بھی تمیم الداری[رض] کی شہرت کا موجب ھوا [جس کا ذکر مجملاً اوپر آیا ھے] [جب آپ آنحضرت[ص] کی خدمت میں حاضر ھوے] تو آپ نے آنحضرت[ص] سے درخواست کی کہ حِبْرون الخلیل [رَکْ بآن] کو، جہاں تمیم بال بچوں سمیت رھا کرتے تھے، انھیں اور ان کی اولاد کو جاگیر (''قطیعۃ'' قبّ مادّۂ اقطاع) کے طور پر عطا فرمایا جائے - آنحضرت[ص] نے آپ کی درخواست منظور کر لی حالانکہ فلسطین ابھی تک [رومیوں یعنی] بوزنطیوں ھی کے قبضے میں تھا، لیکن اس عطیے کی دستاویز کے ذریعے تصدیق کر دی گئی اور جب فلسطین فتح ھوگیا تو تمیم نے یہ فرمان پیش کیا (آپ اور آپ کے بھائی نُعَیم کے وارثوں کو (تمیم کی صرف ایک لڑکی ھی تھی) ناحیہ ھاے حِبْرونہ (ایک اور قراءت : حِبْرَی)، المَرْطُوم (اور قراءتیں : مَطْلُون، مَرْطَلُون، الرُّطُوم اور مَرْطُون ھیں : ان میں سے شاید آخری صورت درست ھے، جس میں کلمہ المَرْطُول = μαρτύριον صاف نظر آتا ھے، جس میں حسب معمول 'ل' کی جگہ 'ن' نے لے لی ھے، جیسے جِبْرِیل جِبْرِیْن وغیرہ)، بیت عَیْنُون اور بیت ابراھیم کا قبضہ مل گیا؛ یہ جائداد قریب ھی کے

زمانے تک آپ کے خاندان میں رہی اور آج تک خُدّام حرم الخلیل کا دعوٰی ہے کہ وہ تمیم الداری کی اولاد سے ہیں ۔ اس عطیے کی اہمیت دوہری ہے ۔سب سے پہلے تو یہ نبی [کریم ؐ] کے اعجاز کی شاہد ہے اور دوسری جانب یہ اِقطاع یعنی باقاعدہ بِٹھائے جاگیر کا قدیم ترین حوالہ ہے ۔ اس منشور کی اصل عبارت بخط [حضرت] علی[رض] ہے (اگرچہ بعض روایتوں میں [حضرت] معاویۃ بن ابی سفیان کا نام آیا ہے) اور یہ عبارت دو روایتوں میں ہم تک پہنچی ہے ۔ پہلی قدرے مختصر ہے اور اس میں صرف حِبْری اور عَیْنُون کا ذکر ہے اور اس پر صرف [حضرت] علی[رض] کے دستخط ہیں (ابن سعد، ۱ / ۲ : ۲۱، سطر ۲۷ تا ص ۲۲، سطر ۳؛ ابو یوسف : کتاب الخراج، بولاق ۱۳۰۲ھ، ص ۱۳۲)؛ دوسرا متن طویل تر ہے اور اس جملے سے شروع ہوتا ہے : ''ھذا ما اَنْطَی (ایک اَور قراءت : اَقْطَعَ) محمد'' الخ [اور اس لیے منشور کتاب الانطاء کہلاتا ہے، کتاب الاشتقاق، محل مذکورۃ الذیل] ۔ اس میں مذکورۂ بالا چار مقامات کا ذکر ہے اور اس پر پہلے تین خلفاے [راشدین] ابوبکر، عمر اور عثمان [رضی اللہ عنہم] کے نام بطور شاہد ثبت ہیں ۔ یہ طویل تر متن داریوں نے بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھا؛ جب کبھی مقامی عمّال نے ان کے املاک کے بارے میں ان سے جھگڑا کیا تو انھوں نے اسے پیش کر دیا ۔ ابن فضل اللہ العُمَری نے حرمِ خلیلی کی زیارت کے موقع پر ۷۴۵ھ میں اسے [دوسری بار] دیکھا تھا؛ (مسالک الابصار فی ممالک الامصار، قاھرۃ ۱۳۴۲ھ، ۱ : ۱۶۲ تا ۱۶۵)؛ یہ [حضرت] علی کے ایک پرانے موزے (خُفّ) کے چمڑے پر خط کوفی میں لکھا ہوا تھا؛ الفاظ تقریباً سر بسر مُدّھم ہو چکے تھے اور صرف چند مٹے مٹے سے نشانِ تحریر باقی تھے لیکن (ایک ورق پر) اس کی صحت کی تصدیق میں خلیفہ المُسْتَضِیٔ، (۵۶۶ تا ۵۷۵ھ) کی سندِ شہادۃ مع نقلِ متن موجود تھی [بقول ابن العُمَری خلیفہ کا خط معروف و مألوف ہے] ۔ یہ فرمان ایک ریشمین غلاف اور آبنوسی صندوقچے میں محفوظ تھا [ابن العمری نے اصل کو بھی پڑھا اور اسے المستضی کی نقل کے مطابق پایا] ۔ مُجیرالدین العُلَیْمی نے کوئی ڈیڑھ سو برس بعد [قبَ العُمَری : اَلْاُنس الجَلیل (تألیف ۹۰۰-۹۰۱ھ)، قاھرۃ ۱۲۸۳ھ، ص ۴۲۸ تا ۴۲۹] اسے دیکھا اور اس نے بھی عملاً یہی معلومات بہم پہنچائے؛ البتہ سندِ شہادت کی بابت اس کا قول ہے کہ تحریر خلیفہ المستنجد (۵۵۵ تا ۵۶۶ھ) کی ہے ۔ اس کے بعد عثمانیہ سلطنت کے زمانے میں تقی الدین داری نے یہ دستاویز سلطان مراد کے حوالے کر دی اور اس نے سلطانی خزانۂ کتب میں داخل کر دی اور تقی الدین کو انعام کے طور پر قاھرۃ میں قاضی مقرر کر دیا ۔ یہ سلطان مراد سلطان مراد ثالث ہو سکتا ہے (۹۸۲ تا ۱۰۰۳ھ/۱۵۷۴ تا ۱۵۹۵ء) یا مراد رابع (۱۰۳۲ تا ۱۰۴۹ھ/۱۶۲۳ تا ۱۶۴۰ء)، کیونکہ اس واقعے کا ذکر ابن دُرَید کی کتاب الاشتقاق (طبع وُیستنفیلٹ، ۲۲۶ حاشیہ) کے ایک حاشیہ نگار نے کیا ہے ۔ یہ حاشیہ نگار محمد بن عمر ہے، جو (الاشتقاق، طبع مذکور، ص ۲۱۱ ب) کہتا ہے کہ وہ محبّ الدین ابن الشِّحْنَۃ مؤرخ (م ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) کی اولاد میں سے ہے (قبَ دیباچہ [کتاب الاشتقاق]، ۷؛ وُیستنفیلٹ کا یہ خیال غلط ہے کہ محمد بن عمر محبّ الدین کا پوتا ہے [بقول محمد بن عمر، محب الدین اس کا جدّ اعلٰی ہے] ۔ طویل تر متن یاقوت نے معجم البلدان، طبع وُیستنفیلٹ، ۲ : ۱۹۵ اور ابن عساکر نے التاریخ الکبیر، دمشق ۱۳۳۱ھ، ۳ : ۳۴۴ تا ۳۵۷ میں بھی نقل کیا ہے ۔ ابن عساکر نے مختصرتر متن بھی تمیم[رض]

کے مکمل و مفصل ترجمے میں نقل کیا ہے ۔ جس پر القلقشندی نے پورا پورا اعتماد کیا ہے (صبح الاعشی، قاہرۃ ۱۳۳۷ھ، ۱۳ : ۱۱۸ تا ۱۲۲) ۔ [اس کے بعد مقالہ نگار نے زور دیا ہے کہ وثیقۂ مذکور جعلی ہے (قب کائتانی Caetani : *'Annali dell' Islām* ، ۲ : ۲۸۸ تا ۲۹۱ [۹ھ، § ۶۹، حاشیہ ۱، § ۷۰، حاشیہ ۲]؛ کرنکو Krenkow : *Islamica*، ۱ [۱۹۲۵ء]: ص ۵۲۹ تا ۵۳۲): اس کے خیال میں دو روایتوں کا وجود اس امر کی کافی دلیل ہے کہ متن مکمل طور پر اختراعی ہے ۔ وثیقہ ابو یوسف، الواقدی اور ابن الکلبی (قب سطور بالا) تینوں نے نقل کیا ہے، یعنی دوسری صدی کے آخر میں موجود تھا اور اگر بلاذری کی حکایت (فتوح، طبع ڈ خویہ، ص ۱۲۹، س ۱۳ و ۱۴) بحوالۂ ابن الکلبی (جمہرۃ الانساب، نسخۂ اسکوریال، ورق ۷۰ الف و ب میں بھی یہ موجود ہے) صحیح ہے تو وثیقہ پہلی صدی کے آخر میں بھی موجود تھا ۔ حکایت یوں بیان کی گئی ہے کہ سلیمان بن عبدالملک 'داریوں' کی جاگیر کے پاس سے گذرا تو وہاں نہ ٹھیرا، ''مبادا آنحضرت[ص] کی بددعا اسے لگے'' ۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ مختصرتر متن کی آخری سطور کی طرف ہے [''فمن ظلمهم او اخذ من احد منهم شيئاً فعليه لعنة الله و الملئكة و الناس اجمعين''، ابن عساکر، ۳ : ۳۰۳]؛ پھر یہ کہ ایک دوسری روایت موجود ہے جس کے مطابق آنحضرت[ص] نے صرف وعدہ کیا تھا کہ قطیعۂ حبرون تمیم کے خاندان کو دیا جائے گا اور وثیقہ صرف فتح کے بعد [حضرت] ابوبکر[رض] کی طرف سے مرتب ہوا (ابن سعد، ۱ / ۲ : ۷۵، بہ تتبع ابن الکلبی ۔ یہ روایت طبعاً دوسرے مصنفوں نے بھی اس سے نقل کی) ۔ [ولہاؤزن : *Skizzen u. Vorarbciten*، ۴ : ۱۲۶، حاشیہ ۱) کی رائے کے خلاف، جو اسے ''تصحیح متأخرۃ'' سمجھتا ہے، مقالہ نگار کی رائے ہے کہ یہ روایت اقدم ہے ۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے :] یہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مسلمانوں نے فلسطین فتح کرنے کے بعد یہ دیکھا کہ حبرون کا حرم خلیلی مسیحی لخمیوں کے تصرف میں ہے، جنھوں نے شاید اسے ذریعۂ آمد بنا لیا تھا اور زائرین سے روپیہ وصول کیا کرتے تھے ۔ الداری نسبت کے لحاظ سے منسوب بہ قبیلہ نہ ہوگا، خصوصاً اس لیے کہ الدار نام کا کوئی قبیلہ (بجز تمیم[رض] کے خاندان یا ان افراد کے جو آنحضرت[ص] کی خدمت میں آنے والے وفد میں شامل تھے) ہمیں معلوم نہیں ۔ البتہ یہ نسبت بڑی موزونیت کے ساتھ دار یعنی ''حرم'' پر چسپاں ہو سکتی ہے (لفظ ''دار'' کے اس معنی پر قب مادۂ قصی) ۔ یہ لخمی اسلام لے آئے اور غالباً حرم ابراہیم کی مجاوری کرتے رہے ۔ یہ جگہ مسلمانوں کے لیے بھی مقدس ہو گئی، جیسا کہ ان سے قبل یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے تھی ۔ ان مجاوروں نے اپنے دعوے کی بنا اس جاگیر پر قائم کی ہوگی جو آنحضرت[ص] نے ان کے زعم کے مطابق ان کے سردار کو عطا فرمائی ۔ تمیم الداری کی شہرت پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ انھیں ابتداے اسلام میں عقائد معاد اور شعائر دین کے ملہم کی حیثیت سے پیش کیا جانے لگا ۔

[معاصر فاضل احمد محمد شاکر نے دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (عربی)، ۵ : ۴۸۵ میں ان اعتراضات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اقطاع ان مصادر کی رو سے جن کا حوالہ مقالہ نگار نے دیا ہے ثابت ہے ۔ ان کے علاوہ اور صحیح مصادر میں بھی اس کا ذکر آیا ہے، جن میں ابوعبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) کی کتاب الاموال (قاہرۃ ۱۳۵۳ھ) اہم ترین ہے ۔ اس اقطاع کے متعلق نصوص کی روایت حفظ سے ہوئی ۔ اس لیے بعض راویوں کے الفاظ میں اختلاف کے وجود سے

چارہ نہیں - پس مقالہ نگار کی تشکیک کوئی علمی وزن نہیں رکھتی - شام میں اولاد تمیم کے پاس جو نصوص ہیں ان کی تأریخی قیمت معلوم نہیں - ان کے پڑھنے والوں نے کہا ہے کہ ان کا خط غیر واضح ہے - اس لیے شاید مختلف لوگوں نے انہیں مختلف طرح سے پڑھا ہو - محض یہ اختلاف اُن کے جعلی ہونے کی دلیل نہیں - گو ان کے صحیح اور اصلی ہونے پر بھی قطعیت کے ساتھ رائے نہیں دی جا سکتی].

[علماے تاریخ اور رُواۃِ حدیث نے تمیمؓ کا ذکر صحیح اسناد والی احادیث میں کیا ہے - تمیم الداری اور ان کے بھائی نُعَیم کا وجود، ان کے صحابی ہونے کا ذکر، غزوۂ تبوك [سے پہلے] دارِیّین میں ان کا آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونا، یہ باتیں وہ ہیں جو تاریخی ثبوت سے ہر اس شخص کے لیے جو تاریخ اسلامی اور اس کے طُرقِ روایت حدیث نبیؐ و اصحابؓ اور اس کے طریقِ اثبات سے واقف ہے ثابت ہیں].

مآخذ: ان مآخذ اور مصنفین کے علاوہ جن کا ذکر اس مادّے میں ہوا قب (۱) ابن ہشام: سیرۃ، گوٹنجن ۱۸۶۰ء؛ (۲) ابن عبدالبرّ: استیعاب، حیدرآباد ۱۳۳۶ھ؛ (۳) ابن الأثیر: اسدالغابۃ، مطبعۂ وھبیۃ ۱۲۸۰ھ؛ (۴) ابن حجر: اصابۃ، قاہرۃ ۱۳۵۸ھ؛ (۵) ابن حجر: تہذیب التہذیب، حیدر آباد ۱۳۲۷ھ؛ (۶) نووی: تہذیب الاسماء و اللغات؛ (۷) وِیسٹنفیلٹ: *Register*، ص ۱۴۴ تا ۲۴۴؛ (۸) شپرنگر: *Das Leben und die Lehre des Mohammad*، ۱: ۴۰۸، ۴۶۰؛ ۳: ۱۳؛ حاشیہ ۴۳۲؛ (۹) کایتانی Caetani: *Annali dell' Islām*، ۱۰: ۴۴۵ تا ۵۴۶؛ (۴۰۰ § ۴۵ تا ۴۰۴).

(G. Levi Della Vida و ملخصِ تعلیقِ احمد محمد شاکر [در دائرۃ المعارف الاسلامیۃ] از ادارہ)

* تَنَاسُخ: آواگون، جُون بدلنا، [''ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف نفسِ ناطقہ کا انتقال'' (تھانوی)]۔ ہندوستان میں اس اعتقاد کے لوگ عام ہیں اور اسلامی دنیا میں بھی متعدّد فرقے اس کے معتقد ہیں - مسلمان مصنفین، جو تناسخ کا ذکر کرتے ہیں، اسے پیروانِ فیثاغورث سے منسوب کرنے کی طرف اتنے مائل نہیں جتنے اہلِ ہند کی طرف منسوب کرنے کی طرف مائل ہیں.

[البیرونی نے کتاب فی تحقیق ما للہند الخ، طبع لنڈن ۱۸۸۷ء، باب ۵ میں تناسخ پر ایک باب لکھا ہے - وہ کہتا ہے جس طرح شہادت بہ کلمۂ اخلاص مسلمانوں کے ایمان کا شعار ہے، تثلیث علامتِ نصرانیت ہے اور سبت منانا علامتِ یہودیت اسی طرح تناسخ ہندو مذہب کی نمایاں علامت ہے - بیرونی باسدیو Vasūdeva اور کتاب پاتنجل کے اقوال دے کر ان کی راؤں کا مقابلہ سقراط، بروقلس Proclus اور صوفیہ کی راؤں سے کرتا ہے - وہ حکماے ہند کی یہ راے نقل کرتا ہے: ایک ہی زندگی کی مدت نفس کے لیے اتنی کم ہے کہ وہ اس میں ان کثیر چیزوں کا جن پر دنیا مشتمل ہے احاطہ نہیں کر سکتا].

شَہْرَسْتانی اپنی فصل متعلقہ '' اصحاب التناسخ '' میں اس لفظ کو اس کے وسیع معنوں میں لیتا ہے - اس کے نزدیک تناسخ سے مراد وہ عقیدہ ہے جس کی رو سے دنیا کے پے در پے ادوارِ حیات اور یکے بعد دیگرے نئے وجودِ اختیار کرنے کو مانا جاتا ہے [یعنی تناسخِ اَدوار و اَکوار کو] - اس کے نزدیک دنیا کی تمام قوموں میں سے ہند کے تناسخی دوسروں کی نسبت اس عقیدے کو زیادہ شدّت سے مانتے ہیں - وہ دیپک کی کہانی بیان کر کے کہتے ہیں کہ دنیا کا بھی یہی حال ہے؛ حرکاتِ افلاک دوری ہیں، ایک چکر پورا ہوتا ہے تو دوسرا اسی خط پر

شروع ہو جاتا ہے ۔ کیا افلاک اور کیا ستارے اسی نقطے پر دوبارہ آ جاتے ہیں جہاں سے شروع ہوے تھے اور کائنات کی زندگی کا نیا دور پہلے کی طرح دوبارہ شروع ہو جاتا ہے ۔ ہند کے اکثر لوگوں کے نزدیک اس دورۂ کبرٰی کی میعاد تیس ہزار سال ہے اور بعض کے نزدیک تین لاکھ ساٹھ ہزار سال، مسعودی (مروج، ۱ : [۱۵۱]) بھی اس دورۂ کبرٰی کا ذکر کرتا ہے اور اس کی میعاد ستّر ہزار سال قرار دیتا ہے : اس خیال سے یونانی ہیئت دان بھی آشنا تھے اور وہ اس دور کو ''سالِ کبیر'' کہا کرتے تھے۔

ایک اور معنوں میں تناسخ سے مراد ہے روحِ الٰہی کا دنیا کی مخلوق میں حلول کر جانا اور تقسیم ہو جانا ۔ غُلاۃ، جو انتہا پسند شیعہ تھے، بقول شہرستانی، تناسخ کے قائل تھے اور بعض انسانوں میں جزء الٰہی کے کلّی یا جزئی حلول [الحلولُ بجزءٍ او بکلٍّ] کو مانتے تھے ۔ اسی قسم کے تناسخ کے ماننے والے بہت سے شعوب ہیں، جنھوں نے یہ خیال مزدکیۂ مجوس، براہمۂ ہند، فلاسفہ اور صابئہ سے لیا ۔ ہُجوِیری[ؒ] صوفیوں کے ایک گروہ کا ذکر کرتے ہیں، جنھیں وہ حُلولی کہتے ہیں ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایک ہی روح فاعل و مدبّر اشیاء ہے جو 'روح الالٰہ' اور 'لم یزال' ہے، یہی روح مختلف اجسام کی مدبّر ہے اور ایک شخص سے دوسرے شخص میں منقلب ہوتی رہتی ہے ۔ بقول ہجویری[ؒ] یہی عقیدہ سب عیسائیوں کا بھی ہے، گو وہ اس عقیدے کو بیان اس طرح سے کرتے ہیں جو اس عقیدے کے خلاف ہے [''عبارت برخلاف این کنند''] ۔ سب اہلِ ہند تبتی، چینی، [ماچینی] بھی اسی عقیدے کے ہیں ۔ یہ عقیدہ شیعہ، قرامطہ اور اسمٰعیلیہ فرقے کے لوگوں میں بھی موجود ہے ۔ تناسخ کے چار درجے ہیں : نَسْخ، مَسْخ، فَسْخ اور رَسْخ (شہرستانی) [ان اصطلاحوں کی تشریح کے لیے دیکھیے تھانوی، ۱۳۱۰].

تناسخ کا عقیدہ اپنے عام معنی میں، یعنی روح کے ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل ہونے کے معنی میں، متعدّد شیعی فرقوں میں موجود ہے۔ بقولِ شہرستانی معتزلہ میں سے احمد بن حائط کے مریدوں کی یہ تعلیم تھی کہ اوّل اوّل خدا نے [ہر قسم کی مخلوق پیدا کر کے ایک قسم کو اس دار دنیا سے الگ، جس میں وہ اب ہے، کسی اور دار میں رکھا] ۔ اس کے بعد جس کسی نے کچھ نافرمانی کی اسے اس کے گناہوں کے مطابق انسان یا جانور کی شکل میں اس دنیا میں بھیجا ۔ اس کے بعد وہ ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہوتے رہیں گے، تا آنکہ ان کے گناہوں کے اثرات زائل ہو جائیں ۔

اسمٰعیلی یہ بات نہیں مانتے تھے کہ روح جانوروں کے اجسام میں منتقل ہو جاتی ہے لیکن وہ یہ ضرور مانتے تھے کہ عالمِ حیات و ممات میں زندگی متعاقب اور پے بہ پے ہوتی ہے، جن میں روحیں محوِ عمل رہتی ہیں تا آنکہ انھیں معرفتِ امام حاصل ہو؛ اس کے بعد یہ روحیں عالمِ نور میں پہنچ جاتی ہیں ۔

نُصَیریوں کا عقیدہ ہے کہ ان کی ملّت کا گنہگار آدمی یہودی، سنّی مسلمان یا عیسائی کی شکل میں اس دنیا میں واپس آئے گا اور وہ منکر جو حضرت علی[رض] کو نہیں پہنچانتے اونٹ، خچر، گدھے، کتے اور اسی قسم کے دوسرے جانور بن جاتے ہیں ۔ نُصَیریوں کے نزدیک تناسخ کے سات درجے ہیں : مومن روح، جو ساتوں منازل طے کر کے ستاروں میں صعود کر جاتی ہے جن سے اُس نے ابتداءً نزول کیا تھا ۔ Anz اور Dussaud نے اس نظریے کو عروجِ روح کے اس عقیدے سے جا ملایا ہے جس

کی رو سے روح صعود کر کے سموٰت سبع سے گذر جاتی ہے ۔ یہ عقیدہ سر زمین بابل سے نکل کر ایرانیوں کے عقائد میں ساری ہوا اور وہاں سے نو افلاطونیوں اور 'اَدْرِیَہ' (Gnostics) [یعنی اُس مسیحی فرقے میں، جس کے اعتقاد میں نجات معرفت سے ہوتی ہے نہ کہ ایمان سے]، میں بھی رائج ہو گیا ۔ فرقۂ دُرُوز کے بعض شائع عقائد نُصیریوں سے مأخوذ ہیں، گو ان کا بانی حمزہ ان عقائد کا مخالف تھا؛ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ دشمنان علی[رض] کی ارواح کتوں، بندروں اور سوروں کے جسموں میں داخل ہوں گی۔ کُرد اور یزیدی اس بات کے قائل ہیں کہ ارواح انسانوں اور جانوروں کے اجسام میں ایک دَورۂ زندگی کے بعد دوسرے دَورۂ زندگی میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اور ہر دو دَوروں میں ۷۲ سال کا فاصلہ ہوتا ہے ۔ بقول سیّد شریف جرجانی (صاحبِ التعریفات) تناسخ سے مراد روح کا نئے بدن میں انتقال کرنا ہے، تخلّلِ زمانی کے بغیر، اس لیے کہ اس روح اور اس بدن میں تعشّقِ ذاتی ہے ۔

السمرقندی مَسْخ (جو نَسْخ کی ایک صورت ہے) کے متعلق عجیب و غریب اساطیر بیان کرتا ہے، جن کی رو سے بندر، سور، اور دوسرے جانوران لوگوں کی نسل میں سے ہیں جن کی صورتیں مسخ ہو گئیں ۔ اسی طرح ستارۂ سُہیل اور زُہرہ (Venus) کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ کبھی بادشاہ اور شہزادی تھے، جنھیں خدا نے ان کے جرائم کی پاداش میں سزا دی اور انھیں ــــــ . . . . ــــــ ستاروں میں پہنچا دیا گیا ۔ آخر میں مسخ کے متعلق ان کہانیوں کا ذکر بھی کر دینا چاہیے جو الف لیلۃ اور دوسرے قصوں میں ملتی ہیں ۔

مآخذ : (۱) [البیرونی : *India*، ترجمۂ سخاؤ Sachau، لنڈن ۱۹۱۰ء، باب ۵؛] (۲) شہرستانی : کتاب المِلَل و النِحَل، طبع کیورٹن Cureton، لنڈن ۱۸۴۲ - ۱۸۴۶ء، ۴۳۹ و دیگر مواضع کثیرہ؛ (۳) ہُجْوِیری : کَشْف المَحْجُوب، ترجمۂ نکلسن، در *G.M.S.*، لائڈن و لنڈن ۱۹۱۱ء، ص ۲۶۰ ببعد؛ (۴) R. Dussaud : *Histoire et religion des Noṣairis*، پیرس ۱۹۰۰ء، ص ۱۲۰ ببعد؛ (۵) W. Anz : *Zur Frage nach dem Ursprung des Gnostizimus*، در *Texte und Untersuchungen*، از v. Gebhardt und Harnack، ۱۵، لیپزگ ۱۸۹۷ء؛ (۶) St. Guyard : *Un grand Maître des Assasins au temps de Saladin*، در *J. A.*، پیرس ۱۸۷۷ء (کہانیاں)؛ (۷) شیخ نصر بن محمد بن ابراہیم السمرقندی: بُستان العارفین، مکّۃ ۱۳۰۰ھ، ص ۲۴۰؛ (۸) J. Menant : *Les Yézidis*، در *Annales du Musée Guimet*، پیرس ۱۸۹۲ء، ص ۸۷ ۔

(B. Carra de Vaux کارا د وو)

* **التَّنَاوُتی** : اباضی [رَکْبان] فرقے کے بہت سے روحانی شیوخ کا اسم نسبت ۔ پانچویں ہجری/گیارھویں میلادی صدی کے ان شیوخ میں افرادِ ذیل شامل تھے :

[۱] ابو یعقوب یوسُف بن محمد التَّنَاوُتی، جن کا بعد کی روایات میں بھی اکثر ذکر آتا ہے ۔ آپ کے بیٹے اسمٰعیل بلکہ اُن سے بڑھ کر آپ کے پوتے ابو یعقوب یوسف بن اسمٰعیل کے متعلق مشہور تھا کہ وہ نہایت متقی و پرہیزگار اور صاحبِ کرامات تھے ۔ اس نسبت کے منسوبین میں بڑی اہم شخصیت ابو یعقوب یوسف کے صاحبزادے کی تھی، وہ تھے :

[۲] ابو عَمّار عبدالکافی التَّنَاوُتی، آپ ابو یعقوب یوسف بن ابراہیم السَّدْرَاتی [الوَارْجلانی] کے ہم سبق اور دوست تھے ۔ آپ ایک صاحبِ ثروت خاندان سے تھے اور آپ کو تُونس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک ہزار دینار سالانہ کا وظیفہ ملا کرتا تھا، جس میں سے نصف رقم آپ اپنے اساتذہ

کو دے دیا کرتے تھے ۔ حصولِ علم بالخصوص فقہ اللغت عربی کی تحصیل کا آپ کو ایسا شوق تھا کہ والدین جو روپے کے ساتھ خطوط بھیجتے آپ انھیں پڑھنے کی فرصت بھی نہ پاتے ۔ جب وطن واپس جانے لگے اور اُن خطوط کو کھول کر دیکھا تو ایک میں باپ کی وفات کی خبر تھی اور دوسرے میں ماں کی ۔ علمِ دین میں آپ کے سب سے بڑے استاد ابو زکریّا یحیٰی بن ابی بکر [الوَارْجَلانی] [رَکْ بآن] تھے، جو [آپ کے والد] ابو یعقوب کے بھی اُستاد تھے ۔ ابو عَمّار زیادہ تر [وَارْجلَة یا وَارْقَلَة یا] (وارجلان) ھی میں قیام پذیر رہے ۔ موسم بہار میں اپنے ریوڑوں کے ساتھ بہت دور جنوب کی جانب مزّاب کے نخلستانوں میں گھوما کرتے ۔ ان کے ہم مذھب ان کا بے حد ادب کرتے ھیں اور اُن کا شمار اپنے دین کے اِحیاء کرنے والوں میں سمجھتے ھیں (یعنی وہ بھی 'محی‌الدین' ھیں) ۔ [حضرت] علی[رض] کے خلاف فتوٰی دینے کے معاملے میں، جو اباضیّہ کے نزدیک اُمّہاتِ مسائل میں سے ھے، آپ کا رُجحان اعتدال کی طرف تھا ۔ اس کے برعکس دوسرے بربریوں کی طرح آپ کو مہاجر عرب بدووں [قبّ ہلال] سے، جو اُن کے علاقے میں آ گئے تھے، نفرت تھی ۔ آپ نے فتوٰی دیا کہ اُن بدووں نے جو جائداد مغرب میں حاصل کی ھے وہ سب لوٹ کا مال (ُغَصْب') ھے ۔ ایک دفعہ حج کے موقع پر اپنے دوست ابو یعقوب کی طرح آپ پر حجاز کے بدووں کو دیکھ کر تکلیف دہ اثر پڑا اور دونوں کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ جب وہ مغرب میں عربوں سے ہر قسم کے تعلقات حتّٰی کہ کاروبار وغیرہ ترک کر چکے تھے تو اب حجاز میں اُن سے خرید و فروخت کیسے کریں؛ آخر اُنھوں نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ حجاز تو ابتداء ھی سے عربوں کا ملک تھا ــ ابو عَمّار کی تصانیف میں سے مشہور یہ ھیں : المُوجِز فی تحصیل السُّؤال، جو ''ردِّ اعداء حق'' کے بارے میں ھے، یعنی کتبِ 'فَرْق' کی طرز کی تألیف، جس میں اِباضی بڑے اہتمام سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ وہ دوسرے سب فِرقوں سے ممیّز و ممتاز ھیں ۔ نیز شرح الجَہالات، خاص طور پر سیرۃ، جو Masqueray کو ''نظام نامۂ روحانیان'' (''le règle des clercs'') کی طرز کی کتاب نظر آئی ۔ یہ کتاب 'عُزّاب' [شیوخ صوفیّہ] اور اُن کے مُریدانِ حلقہ کی رُوحانی تنظیم کے لیے ایک اصولی کتاب ھے ۔ اپنی طویل عَلالت کے باعث وہ عبدالوھّاب بن محمد بن غالب ابن نُمَیر الانصاری کے سوالات کا جواب نہ دے سکے، جن میں پوچھا گیا تھا کہ اِباضیوں اور دوسرے فرقوں کے باھمی اختلافی مسائل کے متعلق اِباضی کیا کہتے ھیں ۔ ان کا جواب آپ کی اور عبدالوھّاب مذکور کی وفات کے بعد ھی ابو یعقُوب الوَارْجَلانی نے دیا اور یہ ان کی کتاب الدلیل میں شامل ھے ۔ اس کے مطابق ابو عَمّار ۵۷۰ھ / ۱۱۷۴ء سے قبل فوت ھوے ــ اُن کی تعلیمات کا سلسلہ اُن کے مریدوں نے، بالخصوص ابو یعقوب یوسف بن محمد ابن ابی عمر التَّنَاوُتِی (الصغیر) نے، جاری رکھا ۔ ان کا نام اس بزرگ کے نام کے مطابق ھے جس کا ذکر اس مقالے کے ابتداء میں ھوا ۔

[۳] عَدِی بن اللُّؤلُؤ التَّنَاوُتی، جو کچھ مدّت جزیرۂ جَرْبَة میں مقیم رہے، کہتے ھیں کہ یہ پہلا شخص تھا جسے عرب حملہ آوروں نے وَارْجَلة میں قتل کیا ۔ اس کا بھائی اُمّ المؤمن کا باپ تھا ۔ یہ خاتون صاحبۂ کرامات تھی اور اس وجہ سے لوگوں میں اس کا بہت احترام تھا ۔ مذکورۂ بالا حضرات کی طرح دونوں بھائی [۴] یحیٰی اور [۵] ابوالرّبیع سلیمان بن محمد بن ابی عَمْرو التَّنَاوُتی بھی اصحاب تقوی و کرامات ہونے کی وجہ سے تراجم نگاروں کے

لیے جالبِ توجہ بزرگ ہیں ۔ ان کے تقوے اور کرامات کا تفصیلی حال بیان کرنا نویسندگانِ مذکور کو بہت مرغوب خاطر ہے ۔

مآخذ : (۱) البّرادی : الجَواھر المنْتقات، قاہرۃ ۱۳۰٦ھ؛ اس کتاب سے ابوالعباس الشّمّاخی نے کتاب السِّیَر، مطبوعۂ قاہرۃ و قسطنطنیۃ ۱۳۰۱ھ، ص ۱۴۴ ببعد، ۴۹۸ ببعد، ۵۱۳ ببعد، ۵٦۹ میں استفادہ کیا ہے؛ (۲) ابو یعقوب یوسف بن ابراہیم [الوارْجلانی] : الدلیل، قاہرۃ ۱۳۰٦ھ، ۱ : ۵۴ ببعد؛ ۳ : ۲۸؛ Masqueray : *Chronique d' Abou Zakaria*، الجزائر ۱۸۷۸ء (یا ۱۸۷۹ء)، lxxvi اور حواشی بر ص ۱۳۰، ۱۷۷، ۲۳۵، بالخصوص ۲۵۳ ببعد؛ (۴) وہی مصنف : *Formation des cités chez les populations sédentaires de l' Algérie*، پیرس ۱۸۸٦ء، ۲۱٦؛ (۵) A. de Motylinski : در *Recueil de Mém. IV: Congr. d. Orient.*، الجزائر ۱۹۰۵ء، ۵۴۵ ۔

(R. Strothmann)

تنْجُنگ پیْراک : Tanjong-Perak یہ جَکَرْتۃ Djakarta کی بندرگاہ ہے ۔ دونوں کے درمیان ایک خاصی کشادہ سڑک ہے اور ریل کی دوھری پٹری کے ذریعے ربط قائم کر دیا گیا ہے ۔

تنجنگ پیراک میں جہازوں کے لیے تین مکمّل گودیاں (بار انداز) اور سامان رکھنے کے کافی گودام ہیں، جن کی ملکیت بندرگاہ کے سرکاری محکمے اور نجی کمپنیوں کے مابین مشترک ہے ۔

یہاں چھوٹی چھوٹی تین گودیاں ہیں ۔ ایک میں وہ جہاز لنگر انداز ہو سکتے ہیں جنھیں تیرنے کے لیے ستائیس فٹ، دوسری میں وہ جنھیں تیس فٹ اور تیسری میں وہ جنھیں چالیس فٹ گھرا پانی درکار ہوتا ہے ۔ اس طرح مجموعی طور پر ساٹھ لاکھ مربع فٹ سے زیادہ رقبہ لنگراندازی کے لیے تیار رہتا ہے ۔

ان چھوٹے گھاٹوں کی حفاظت کے لیے پتھروں کے دو طویل پشتے باندھ کر ایک بیرونی گودی بنا دی گئی ہے، جس میں پانسو پچیس فٹ کی گذرگاہ ہے ۔ ان سب سے باھر کی طرف ایک گودی ہے جہاں مچھلی پکڑنے والی مقامی کشتیاں ٹھیرتی ہیں اور پھر مغرب کی طرف اڑن کشتیوں کی پرواز کا میدان ہے ۔ بندرگاہ اور خاص شہر کے درمیان کَیْمَاجُرَن Kemajoran کا فضائی مستقّر ہے، جو [بین الاقوامی فضائی شاہ راہ پر واقع ہے ۔

مآخذ : (۱) ہال D. G. E. Hall : *A History of South-east Asia*، لنڈن ۱۹۵۵ء، ۳۴؛ (۲) B. H. M. Vlekke : *Nusantra, a History of East Indian Archipelago*، کیمبرج، میساچوسٹس ۱۹۴۵ء].

(قاضی سعید الدین احمد)

* **تَنْزِیل** : دیکھیے (۱) وحی [اور (۲) تکفیت]

* **تَنَس** : Tenes الجزائر کے ساحل پر شلِف Chelif کی وادیؔ میں ایک شہر، جو الجزائر سے ۱۲۵ میل، مستغانم Mostaganem سے ایک سو میل مشرق میں اور اُوْرلِیانْز Orleans سے ۳۰ میل شمال میں واقع ہے ۔ اس کا محلِّ وقوع ۳٦ درجہ، ۳۰ دقیقہ، ۵۰ ثانیہ عرض البلد شمالی، ایک درجہ، ۱۸ دقیقہ طول البلد مشرقی (از گرینچ) ہے ۔ یہ شہر ایک پتھریلی سطحِ مرتفع پر تعمیر ہوا ہے، جو سمندر پر مُشْرِف ہے، بندرگاہ نیچے ایک ایسی خلیج میں واقع ہے جو مشرقی ہواؤں سے رأس تِنِس کے حجم کی وجہ سے محفوظ ہے مگر شمالی اور مغربی ہواؤں سے محفوظ نہیں؛ اگرچہ جہازوں کی حفاظت کے لیے خاصے بڑے تعمیری کام کرائے جا چکے ہیں تاھم یہاں لنگراندازی اب بھی خطرناک ہے ۔ یہاں کی تجارت صرف ساحلی تجارت تک محدود ہے اور جس تجارتی

مال کا یہاں سال بھر میں معاملہ ہوتا ہے اس کی مجموعی مقدار انیس یا بیس ہزار ٹن سے بمشکل ہی زیادہ ہوگی ۔ ایک ریلوے لائن حال ہی میں [یعنی ۱۹۲۹ء سے پہلے] کُھلی ہے، جو شہر کو وادی شِلِف سے ملاتی ہے ۔ اس سے بندرگاہ کی تجارت غالباً بڑھ جائے گی ۔ یورپی آبادی سے جنوب کی طرف کوئی دو میل کے فاصلے پر مقامی باشندوں کا گاؤں ہے ۔ جس کی آبادی بارہ سو کے قریب ہے ۔ اسے تِنِس القدیمة کہتے ہیں ۔ یہ بھی سطح مرتفع پر واقع ہے، جس کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف ایک ندّی موسوم به وادالّالـه Wad Allāla ایک قدرتی خندق کی صورت بہتی ہے ۔ شہر تِنِس اپنے اندرونی انتظامی معاملات میں کاملاً خود مختار ہے (commune de plein exercise) ۔ یہاں کی آبادی ۶,۲۰۷ نفوس کی ہے ۔ جن میں سے ۴,۶۲۰ مقامی لوگ ہیں ۔ یہ ایک مخلوط ناحیے کا صدر مقام بھی ہے، جس کی کل آبادی ۵۱,۹۰۹ ہے ۔ ان میں سے ۲۸,۷۰۰ اہلِ بلاد میں سے ہیں ۔

تاریخ : موجودہ شہر اسی موقع پر آباد ہے جہاں کارتِنّا Cartennae کا قدیم شہر اور فینیقیه اور قرطاجنه والوں کی تجارتی کوٹھی تھی، جو بعد ازاں رومیوں کی قیصریّت کے زمانے میں رومی نوآبادی بن گئی ۔ پہلے ونڈالوں (Vandals) نے اسے تباہ کیا، پھر عربوں نے اسے عرضۂ تاخت و تاراج بنایا، نتیجه اس کا یہ ہوا کہ کارتِنّا تقریباً بالکل ہی نیست و نابود ہو گیا ۔ البَکْرِی کے زمانے میں یہاں صرف ایک ساحلی قلعه باقی رہ گیا تھا اور موجودہ زمانے میں تو اس قلعے کے محض آثار ہی باقی رہ گئے ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں (فصیل کے کھنڈر، حوض اور مقابر) ۔ تیسری صدی هجری / نویں صدی میلادی میں سپین کے حادثه جو اشخاص نے یہاں آ کر سمندر سے دو میل کے فاصلے پر ایک نیا شہر بسایا ۔ یہی شہر موجودہ تِنِس ہے ۔

البَکری اس کی بناء کی تاریخ ۲۶۲ھ / ۸۷۵ - ۸۷۶ء بتاتا ہے اور اسے ہسپانوی ملّاحوں سے منسوب کرتا ہے، جو سردیوں کا موسم اس بندرگاہ میں گذارا کرتے تھے ۔ انھوں نے وہاں اِلْبِیْرہ Elvira اور مُرْسِیَه Murcie کے باشندوں کو بھی بلا لیا، جن میں سے بعض تو بخاروں سے دہشت زدہ ہو کر بہت جلد جزیرہ نمائے [اندلس] میں واپس چلے گئے، باقی افریقه میں رہ گئے اور اُن میں سُوق ابراهیم کے بربر بھی آ ملے؛ یہ سوق وادی شِلِف میں ایک مقام تھا ۔ ان مہاجروں کی سادہ سی بستی نے، جو پہلے پہلے عربِ اندلس کے تعمیر کردہ قلعے ہی میں آ کر خیمه نشین ہو گئے تھے اور اسی پر قانع تھے، آہسته آہسته ایک شہر کی صورت اختیار کر لی، جس کے گرد دیواریں تھیں اور جس میں ایک مسجد تھی اور بازار بھی تھے ۔ اس کے آثار تِنِس القدیمة میں اب بھی موجود ہیں ۔ فصیل کا ایک حِصّه ابھی تک باقی ہے، ایک پُل بھی ہے اور خاص کر وہ مسجد بھی جس کا البَکْرِی نے ذکر کیا ہے ۔ آب و ہوا کی ناموافقت کے باوجود گرد و نواح کے علاقے کی زرخیزی کی وجه سے، جس سے ہر قسم کے پھل کثرت سے پیدا ہوتے تھے اور حبوبات کی بھی فراوانی تھی، یہ شہر جلد جلد ترقی کرتا چلا گیا ۔ بقولِ ادریسی، حبوبات یہاں سے باہر بھی بھیجے جاتے تھے ۔ تِنِس میں ایک عَلَوی الاصل خاندان حکمران تھا، جس نے اندلس کے اُمویوں کی اختیار داری کو تسلیم کر لیا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے که اُموی حکمران ایسے آدمیوں کو جلاوطن کر کے یہاں بھیج دیا کرتے تھے جن کے متعلق انھیں کوئی وجه شکایت ہوتی تھی ۔ چوتھی صدی هجری / دسویں صدی میلادی کے بعد مختلف خاندان یکے بعد دیگرے اس شہر پر قابض رہے، جو مغرب وسطٰی پر اپنا تسلّط قائم کرنے کے لیے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے : یعنی فاطمیّه،

صنہاجه، مغراوه، المرابطون اور الموحدون ۔ جب سلطنتِ الموحدین پارہ پارہ ہو گئی تو یہ شہر تلمسان کے بنو زیّان کے قبضے میں آ گیا، پھر پندرھویں صدی کے دوسرے نصف میں اس نے اُن کی حکومت کا جُوا اُتار پھینکا اور اس میں ایک چھوٹی سی خودمختار ریاست قائم ہو گئی، جس پر پہلے شاہی خاندان کے افراد حکومت کرتے رہے اور پھر مقامی شیوخ، جن میں سے آخری شیخ ہسپانیہ کا باجگزار بن گیا ۔ عُروج [رکّ بآن] نے اسے ۱۵۱۷ء میں فتح کیا اور چند سال بعد خیرالدین [رکّ بآن] نے قطعی طور پر یہاں ترکی اقتدار قائم کر دیا اور اس میں ایک قائد اور کچھ قلعہ گیر فوج متعیّن ہوئی ۔ اس وقت سے اس شہر کی خوشحالی بڑی تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہونے لگی ۔ غلّے کی تجارت، جو یورپ کے ساتھ سولھویں اور سترھویں صدی میں جاری رہی تھی، اٹھارھویں صدی کے آغاز میں بالکل بند ہو گئی ۔ مقامی لوگوں نے شہر کو کئی بار لوٹا اور ترکوں کے خلاف بغاوت کی.

۱۸۳۰ء کے بعد تِنِس کچھ مدّت تک خودمختار رہا ۔ عبدالقادر نے اس شہر کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا اور اس کی تجارت کو از سرِ نو فروغ دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ۔ ۱۸۴۳ء میں یہاں کی آبادی نے بلا مقابلہ فرانسیسیوں کی اطاعت قبول کر لی ۔ بوگرو Bugraud نے یہاں فوراً مکانات بنوانے شروع کر دیے تا کہ وادی شِلِف میں جو فوجیں مصروف پیکار تھیں اُنھیں رسد پہنچانے میں آسانی ہو ۔ اِنْ تعمیرات سے موجودہ شہر کی ابتداء ہوئی.

مآخذ: (۱) البَکْری: ترجمه دِسلان، و نظر ثانی از فانیان، ۱۲۸؛ (۲) ادریسی، طبع ڈوزی و ڈِ خویه، ص ۸۳؛ ترجمه ص ۹۶؛ (۳) الحسن بن محمد الوزّان الزّیّاتی (Leo Africanus) : ترجمۂ شیفر Schefer، ۳ : ۵۶؛ Dessus-Lamare اور G. Marçais : La mosquée du Vieux Ténès، در R. A. ۱۹۲۹ء.

(یُور G. Yver)

* اَلتَّنَسی : محمّد بن عبداللّٰہ بن عبدالجلیل ابو عبداللّٰہ، پندرھویں صدی کا المغربی مصنف، جو تلمسان کے زیّانی بادشاھوں کے دربار سے متعلق تھا اور بالآخر ان کا تاریخ‌نگار بنا ۔ وہ ۸۹۹ھ / ۱۴۹۴ء میں فوت ھوا ۔ کئی چھوٹی چھوٹی تصانیف، جو اب ناپید ھیں اور فتاوے کے علاوہ، جو الوَنْشَرِیْشی کی کتاب معیار میں شامل ھیں، التَّنَسی نے اپنے سرپرستوں کی ایک تأریخ بھی لکھی ۔ جس کا نام نَظْم الدُّرّ والعِقْیان فی شَرَف بنی زَیّان ھے، جس کا متن اور جزوی ترجمه Bargès نے شائع کیا : Histoire des Beni Zayan, rois de Tlemcen، پیرس ۱۸۵۲ء اور Complement de l' histoire des Beni Zeiyan, rois de Tlemcen, ouvrage du cheïkh. .al-Tenesy، پیرس ۱۸۸۷ء، یہ تصنیف اس زمانے کی طرز مروّجه پر لکھی گئی ھے، یعنی یہ صرف تاریخ ھی نہیں بلکه اس میں شعر و ادب، اخلاقی مقولے اور حکایات بھی ھیں ۔ [اَلتَّنَسی نے الطِراز فی شرح ضبط الخرّاز، بھی لکھی ۔ اس کے متعلق دیکھیے تکملۂ براکلمان، ۲ : ۳۴۱ و ۳۴۹ بذیل ابو عبداللّٰہ محمد الشریشي الخرّازی].

مآخذ: (۱) احمد بابا: نَیْل الإبْتِہاج، فاس ۱۳۱۷ھ، ص ۳۵۳؛ (۲) ابن مَرْیَم : بُستان، الجزائر ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء، ۲۴۸ ببعد؛ (۳) [الحِفْناوی : تعریف الخَلَف، ۱۶۱/۶] براکلمان : G.A.L.، ۲ : ۲۴۱؛ [G.A.L.S.، ۲ : ۳۴۱]؛ (۴) ابن شِنِب: اجازة، پیرس ۱۹۰۷ء، ۱۵۴، § ۱۰۵.

(لیوی پرووانسال E. Lévi Provençal)

* تَنْظِیمات : یا صحیح تر صورت میں '' تنظیماتِ خیریّه'' (= سودمند قانون‌سازی)، یه اصطلاح مأخوذ ھے ترکی محاورے 'قانون تنظیم اِتْمک' سے یعنی قانون کا مسوده بنانا) ۔ تنظیمات سے وه

اصلاحات مراد ہیں جو مملکتِ عثمانیہ کی حکومت اور ادارے کے سلسلے میں سلطان عبدالمجید کے عہد حکومت میں جاری ہوئیں اور جن کی ابتداء اس فرمان سے ہوئی جسے عام طور پر گلخانہ کا ''خطِّ شریف'' کہا جاتا ہے ۔ 'تنظیماتِ خیریّہ' کی ترکیب پہلے پہل سلطان محمود ثانی کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں ملتی ہے ۔ دورِ تنظیمات کا خاتمہ تقریباً ۱۸۸۰ء میں سمجھا جاتا ہے، جب عبدالحمید ثانی کی استبدادی حکومت کا زمانہ شروع ہوا.

'تنظیمات' نے ان اصلاحات کو جاری رکھا جنھیں سلطان سلیم ثالث اور محمود ثانی نے اس غرض سے شروع کیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کو، جو اندرونی اور بیرونی لحاظ سے کمزور ہو چکی تھی، بچایا جا سکے ۔ محمود ثانی اندرون ملک میں نظامِ جاگیرداری (فیوڈل سسٹم) کو منسوخ کرنے اور ینگی چری فوج کے رجعی عنصر کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح داخلی معاملات میں اس نے اپنی طاقت کو متمرکز اور مستحکم کر لیا، لیکن وہ مصر اور یونان چھن جانے کو نہ روک سکا ۔ باوجود اس کے اس کا کام ابھی تعمیری حیثیت نہ رکھتا تھا ۔ یہ کارنامہ اس کے جانشینوں یا یہ کہنا چاہیے کہ ان جانشینوں کے رجالِ سیاست کے حصّے میں آیا ؛ چونکہ خود سلاطین اصلاحات کی توجیہ و تصویب کے کام میں نا اہل ثابت ہوے، اس لیے اصلاحات کے اجراء کا کام بتدریج تُرک سرکاری عہدے داروں ہی کے ایک اصلاحی فریق کے ذمّے ہوتا گیا ۔ ۱۸۳۹ء سے لے کر کریمیا کی جنگ کے خاتمے تک اصلاحات کی روح رواں مصطفٰی رشید پاشا تھا (م ۱۸۵۸ء)، جو چھے دفعہ وزیر اعظم بنا؛ اصلاحات کے دوسرے دور میں، جس کا آغاز فرمان معروف بہ ''خطِّ ہمایون'' کے ذریعے فروری ۱۸۵۶ء میں ہوا، مصلحین کی فعّالیّتوں کی رہبری علی پاشا (رکّ بآن، م ۱۸۷۱ء) اور فؤاد پاشا (رکّ بآن، م ۱۸۶۹ء) نے کی؛ تیسرے دور (آغاز ۱۸۷۱ء سے) کی عظیم شخصیت مدْحت پاشا (رکّ بآن، م ۱۸۸۳ء) کی تھی.

گلخانہ کا ''خطِّ شریف'' کسی قسم کے افکارِ تازہ کی وجہ سے ممتاز نہ تھا ۔ اس فرمان میں سلطان نے اس بات کا اعلان کیا کہ : آج کے دن سے ما بدولت کی خواہش ہے کہ ہماری ساری رعایا کی آبرو اور مال محفوظ رہے، 'التزام' یعنی ٹیکسوں کو اجارے پر دینے کا قاعدہ موقوف ہو، فوج میں بھرتی کا کام زیادہ باقاعدگی کے ساتھ ہوا کرے؛ جملہ ملزموں کے مقدّمات کھلی عدالتوں میں پیش ہوں ۔ یہ ضابطہ صراحت کے ساتھ وضع کیا گیا کہ رعایا کے جملہ افراد بلا استثناء و بلا لحاظ مذہب (''اہلِ اسلام و مِلِلِ سائرہ'') قانون کی نظروں میں برابر سمجھے جائیں ۔ ''مجلسِ احکامِ عدلیّہ'' تو موجود ہی ہے، ضروری ایکٹ بنانے کے لیے اس کے اراکین کی تعداد میں کچھ اضافہ کیا گیا ہے ۔ [اس فرمان شاہی کے دیباچے میں یہ بیان کر دیا گیا تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کی سابقہ خوش اقبالی احترامِ قرآن کی وجہ سے تھی ۔ آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ جدید قوانین کا مقصد یہ ہے کہ ''اصولِ عتیقہ'' میں پوری پوری تبدیلی کی جائے] ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ''خطّ'' کا مسوّدہ تیار کرتے وقت رشید پاشا کا مقصد اگر ایک طرف یہ تھا کہ ملکی حکومت پر دوبارہ اعتماد قائم کیا جائے تو دوسری طرف یہ بھی تھا کہ دُوَلِ یورپ کو کسی طرح مطمئن کیا جائے، کیونکہ ملک کے داخلی امور میں ان کے آئے دن کی دخل اندازی تشویشناک صورت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی (یونان کے بحرانی قضیّے کا حل: محمد علی کے ساتھ اتفاق) ۔ اس وقت تو یہ دوہرا مقصد حاصل ہو گیا لیکن جونہیں

اصلاحات کے رائج کرنے کی کوشش کی گئی بیشمار مشکلات کا سامنا ہوا اور قدرتی طور پر حالات کا اقتضاء بھی یہی تھا ۔ نئے قوانین دولِ یورپ کے نظامِ اداری، بالخصوص فرانس کے نظام پر مبنی تھے اور جب انھیں جاری کیا گیا تو ملک میں ایسے مسائل اور امتیازات پیدا ہو گئے جو نظامِ قدیم میں کبھی اس طرح باعثِ تشویش نہ ہوے تھے ۔ چار قسم کے مصالح پیش نظر رکھنا ضروری تھے : (۱) سِوِل اور فوجی افسروں کے مصالح، یہ پرانے نظام کے ماتحت سلطان کے غلام ہوا کرتے تھے ؛ (۲) آزاد مسلمان رعایا کے مصالح ، ان میں علماء کا گروہ بہت نمایاں تھا ؛ (۳) غیر مسلم رعیّت کے مصالح ؛ (۴) غیر ملکی مصالح ۔ پہلے دو گروهوں کو یکجا کرنے میں سب سے کم مشکل پیش آئی ۔ مذہب نے انھیں متّحد کر رکھا تھا اور سلطان محمود ثانی اور عبدالمجید سرکاری ملازموں کے جان و مال پر اپنے حقوق سے دستبردار ہو چکے تھے ۔ محمود ثانی نے بھی جاگیرداری کا نظام موقوف کر کے اسلامی عناصر کو یکجا کرنے میں بڑی مدد دی ۔ لیکن عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمانوں کے برابر حقوق عطا ہونے کے باعث اس بات کا خدشہ پیدا ہو گیا کہ [سلطان] محمد فاتح کے وقت سے جو خود اختیاری یہود و نصاری کو حاصل تھی وہ اب اس سے محروم ہو جائیں گے؛ علماے اسلام کے خلاف ایسی کوششوں سے جن کے ذریعے وہ اپنے اختیاراتِ تشریع اور حقِ ادارہ سے محروم ہو جائیں اور اسی طرح ان مشکلات کے پیشِ نظر جو غیر مسلموں کو فوج میں بھرتی کرنے سے پیدا ہوئیں یہ جلد ظاہر ہو گیا کہ حقوقِ مساوات مل جانے سے خود غیرمسلموں کو نرا نفع هی نفع نظر نہیں آتا تھا بلکہ اس رعایت کی وجہ سے غیرمسلم جماعتوں کی باھمی چپقلش اور اختلافات اور زیادہ بڑھ گئے تھے اور یہ اختلاف اکثر حالات میں ایسے سنگین تھے کہ غیرمسلموں اور مسلموں کے درمیان بھی ویسے سخت اختلاف نہ تھے ۔ آخر میں غیرملکی گروہ جو تعداد کے لحاظ سے تو بہت کمزور تھا لیکن آزادیاں اور خصوصی مراعات جو انھیں امتیازات کے ماتحت حاصل تھیں ان کی وجہ سے وہ ایسی حیثیت قائم کر چکا تھا جو پہلے سے اس لیے مضبوطتر ہو گئی کہ غیرملکی طاقتوں نے اس حیثیت سے فائدہ اٹھایا ۔ یہ فائدہ صرف ان کی اپنی بہبود هی کے لیے نہیں تھا بلکہ اس غرض سے بھی تھا کہ غیرمسلم رعایا کی کشمکش کے سلسلے میں جو یہ رعایا اپنی خصوصی مراعات کو بدستور قائم رکھنے کے لیے کر رهی تھی اپنے آپ کو ان کا حامی اور محافظ بنا لیں (فرانس بوجہِ امتیازات؛ روس بوجہِ عہدنامۂ کوچک قَینارجہ Küčük Ḳainardji) ۔ جب تک غیرملکیوں کی امتیازی حیثیت معروف بہ "extra-territoriality" [حقِّ آزادی از اختیارِ حکومتِ ملکی] قائم رہتی، جس امتیازی حیثیت کو اصلاحات کے اصل مدعا، یعنی قوتِ حکومت کے تمرکز سے نمایاں تضادّ حاصل تھا، اس وقت تک اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بہت حد تک سراب میں سرِ آب ڈھونڈنے کا حکم رکھتی تھی ۔ یہی سبب ہے کہ تنظیمات کی عظیم مشکلات غیرمسلم رعایا هی کی الجھنوں کی وجہ سے پیدا ہوتی رہتی تھیں (چنانچہ اِقرِیطش (Crete) ، بوسنہ Bosnia ، هرسک (Herzegovina)، لبنان اور بلغاریہ میں بغاوتیں ہوئیں)، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولِ یورپ (باشتمال پاپاے روم) همیشہ دخل اندازی پر اتر آتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ خود ترکیّہ میں خاصہ بڑا فریق پیدا ہو گیا جو ان تنظیمات کو دولتِ ترکیّہ کے مفاد کے لیے خطرناک سمجھتا تھا، لیکن جو راستہ رشید پاشا ایک دفعہ

اختیار کر چکا تھا ترک نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ خود پرانے ادارے بھی اب خود لوگوں کے تحفظ حقوق کے متعہد نہ ہو سکتے تھے - لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے شاذ ہی کسی قسم کی مخالفت مسموع ہوتی تھی؛ 'خطِّ شریف' جب پڑھا گیا تو شیخ الاسلام خود موجود تھے، گو معلوم نہیں ہوتا کہ مختلف قوانین جو اس سلسلے میں نافذ کیے گئے ان کی منظوری انھوں نے فتوے کے ذریعے دی - اس کے بر عکس وزراء، جو اصلاحات (تنظیمات) کے نفاذ کے ذمّیدار تھے، ہمیشہ قانونِ شریعت کی بعض صریح دفعات کو منسوخ کرنے سے انکار کر دیتے تھے، مثلاً قتلِ مرتّد یا عدالت کے سامنے غیر مسلم کی شہادت کا عدمِ جواز، گو انھیں ہر ایسے قانون کے جاری کرنے میں کوئی عذر نہ تھا جس سے شریعت کا کوئی تعلق نہ ہو .

غرض 'تنظیمات' کا نفاذ بڑی پُر آشوب فضا میں ہوا - کوئی وزیر اعظم شاذ و نادر ہی کسی منصوبے (پروگرام) کو مکمل طور پر امن کے ساتھ نباہ سکتا تھا؛ اچانک وزارت معزول ہو جاتی تھی، پھر اچانک ہی بحال بھی ہو جاتی تھی - باوجودیکہ سلطان عبدالمجید اصلاحات کی طرف نسبةً زیادہ مائل تھا، رشید پاشا ۱۸۴۶ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان کم از کم کوئی چھے دفعہ وزیر اعظم بنا ہوگا - عہدوں میں اسی قسم کی تبدیلیاں [سلطان] عبدالعزیز کے زمانے میں بھی ہوئیں، جو اپنے پیشرو سے بہت زیادہ متلوّن مزاج تھا؛ مِدْحت پاشا نے ۱۸۷۳ء میں صرف تین ہفتے تک وزارت کی اور دوسری بار کل سات ہفتے (۱۹ دسمبر ۱۸۷۶ء تا ۵ فروری ۱۸۷۷ء)- ایسے وقت بھی آئے جب غیر ملکی دخل اندازی کی وجہ سے اچانک نئی جد و جہد کی ضرورت پیش آئی؛ یہ صورتِ حالات بالخصوص پیرس کی مؤتمرِ صلح (صلح کانفرنس) سے پہلے کے مذاکرات کے وقت پیدا ہوئی- ترکیہ کے حلیف اس وقت سلطان کو بین الاقوامی قرارداد کے ذریعے پابند کرنا چاہتے تھے کہ وہ اُن اصلاحات کا فوری نفاذ کرے جو ابھی تک معرضِ التوا میں پڑی ہوئی تھیں - اس کا نتیجہ ''خطِّ ہمایون'' مصدّر در فروری ۱۸۵۶ء کی شکل میں نکلا، جو کہنے کو سلطان نے اپنے ارادے سے جاری کیا تھا - معاہدۂ پیرس مؤرخہ ۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء کی دفعہ ۹ کی رو سے دُوَلِ معاہد صریح طور پر اقرار کر کے اس امر کو ذہن نشین کرتی ہیں کہ سلطنت (عثمانیہ) کے امورِ داخلی میں انھیں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا - اس ''خطِّ ہمایون'' کو غیر مسلم رعایا کے حقوق کی مساوات کے متعلق ۱۸۳۹ء کے وعدوں کی صرف مفصّل تر اور مکمّل تر توثیق ہی سمجھنا چاہیے، اس میں خاص کر یہ تحریر تھا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی مقدمات کے فیصلے کے لیے مخلوط عدالتیں قائم کی جائیں گی اور ان کے متعلق جملہ قوانین کو جتنا جلد ممکن ہو سکا منضبط کر دیا جائے گا - اسی ایکٹ میں ایک اَور اہم بات یہ درج تھی کہ غیر ملکی طاقتوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ وہ حدودِ سلطنتِ (عثمانی) میں اراضی کی ملکیّت (landed property) حاصل کر سکیں گی - تاہم یورپین طاقتوں کی دخل اندازی کا سلسلہ ۱۸۵۶ء کے بعد بھی ختم نہ ہوا اور ۱۸۵۹ء میں انھوں نے ترکیہ کی یورپی ولایات میں روشِ امور کی تحقیقات کا مطالبہ کیا - ۱۸۶۷ء میں دُوَلِ یورپ نے دولتِ عثمانیہ سے پھر باز پُرس شروع کی، لیکن وہ اس بات پر آپس میں متفق نہ ہو سکیں کہ حصولِ مقصد کے لیے کونسی تدابیر اختیار کی جائیں : روس کا مطالبہ یہ تھا کہ انتہائی لامرکزیت (decentralisation) کا نظام وجود میں لایا جائے، مگر فرانس نے بابِ عالی کو اس بات پر ابھارا کہ وہ

رعایا کے مختلف طبقات کو آپس میں ملا دینے کی حکمتِ عملی کو عمل میں لا کر دیکھے ۔ رعایا کو ملا دینے والا طریقہ وقتی طور پر مناسب حال سمجھا گیا؛ چنانچہ غَلَطه سرائے میں فرانسیسی زبان کی تعلیم کے لیے ایک ثانوی مدرسے (lycée) کا افتتاح اسی کا ایک نتیجه تھا ۔ ۱۸۷۰ء میں یورپ کے واقعات (فرانس اور پرشیا کی جنگ) کی وجه سے غیر ملکی دباؤ کچھ کم ہو گیا؛ ٹھیک یہی وہ زمانه ہے جس میں ترکیه میں لامرکزیت کی طرف زیادہ رجحان پیدا ہوا لیکن طریقِ عمل کچھ ایسا تھا که اس سے نه تو دُوَلِ یورپ خوش ہوئیں اور نه غیرمسلم رعایا ۔ تاہم اس حکمتِ عملی میں تھوڑی بہت کامیابی ضرور ہوئی؛ مثلاً طرابلس (Tripolitania) اور تونس میں عثمانی حکومت کچھ مضبوط ہو گئی لیکن اس کا ردِّ عمل بھی جلد ہی محسوس ہونے لگا ۔ سْلاوی صوبوں میں ۱۸۷۵ء میں بغاوت ہو گئی، نتیجه یه ہوا که ۱۸۷۶ء میں قسطنطنیه میں ایک ''یورپی کانفرنس (مؤتمر)'' کا اجلاس ہوا اور اس سے اگلے ہی سال روس سے تباہ کن لڑائی چھڑ گئی، جس کی وجه سے رومانیه اور سربیه کے صوبے سلطنتِ عثمانیه سے الگ ہو گئے اور بلغاریه تقریباً خودمختار بن گیا (عہدنامۂ برلن، ۱۳ جولائی ۱۸۷۹ء) ۔ وہ طریقِ حلّ جس کی رُو سے ترکی حکومت کو اس دخل اندازی کی پیش بندی منظور تھی وہ دولت عثمانیه کے دستور [آئینِ حکومت] کا اعلان تھا، جو ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو یعنی یورپی کانفرنس کے اجلاس کے پہلے دن ہوا لیکن اس علاج سے جس کے متعلق نئے سلطان عبدالحمید کو پہلے ہی سے شبهه تھا متوقّع کامیابی حاصل نه ہوئی، مِدْحت پاشا کو، جس نے یه آئین تیار کیا تھا، دو ہی مہینے بعد جلا وطن کر دیا گیا اور اس کے بعد ہی سلطان نے اس آئین کو کاملاً نظر انداز کر دیا ۔ تاہم حمیدیه دَورِ حکومت کے طویل عرصے میں جو جنگِ روس کے متّصل بعد آیا، اصلاحات کو مکمّل طور پر معطّل نه کیا گیا ۔ ۱۸۷۹ء کے قوانین سے، جو خاص کر دیوانی محکمے (judiciary) کے متعلّق تھے، 'تنظیمات' کی قانون سازی ایک لحاظ سے تکمیل پا گئی۔

اب ہم مختلف اصلاحات کا عاجلانه جائزہ لیتے ہیں: قضا کی مجلسِ اعلٰی (the grand Council of Justice) (جسے مجلسِ تنظیمات بھی کہتے تھے) کی ہیئت میں ۱۸۵۴ء، ۱۸۶۱ء اور آخرکار ۱۸۶۸ء میں کئی تبدیلیاں ہوئیں اور اس کی فعّالیّت اداری اور قضائی اعمال میں تقسیم ہو گئی — یعنی 'شورای دَولت' (Council of State) میں، جس کی صورت اسی طرح ۱۹۱۸ء تک باقی رہی اور ''دیوان احکام عدلیّه'' ('ہائی کورٹ آو جسٹس') میں ۔ ۱۸۳۹ء کے فوراً بعد ہی رشید پاشا نے فرانسیسی طرز پر صوبوں کے نظم و نسق کا ایک نیا طریقه جاری کیا اور ''التزام'' [یعنی ٹیکسوں کو اجارے پر دینے کو] منسوخ کر دیا ۔ ثابت ہوا که اس نظام میں مرکزیت کی افراط ہے اوراس لیے ۱۸۵۲ء میں گورنروں [والیوں] کے اختیارات میں دوبارہ توسیع کی گئی؛ ٹیکسوں کی اجارہ‌داری کا دستور پھر سے رائج کرنا پڑا، کیونکه براہِ راست ٹیکس لگانے سے خزانے کو کافی آمد نه ہوتی تھی ۔ ۱۸۶۴ء کے قانون ولایات (صوبجات) سے، جس کی تکمیل ۱۸۷۱ء میں ایک اَور قانون کے ذریعے کی گئی، ولایات کا نظامِ اداری مکمل کر دیا گیا اور یه قانون ۱۹۱۸ء تک جاری رہا ۔ ۱۸۶۴ء کا یه قانون اس وجه سے بھی اہم تھا که اس کے ذریعے ولایتوں (صوبوں) کو نئی عدالتیں ملیں، جو قاضیوں کی عدالتوں سے مختلف تھیں، گو ان کے جج بسا اوقات علماء ہی ہوا کرتے تھے۔

۱۸۶۳ء سے پہلے بھی قسطنطنیہ اور متعدّد بڑے بڑے صوبائی شہروں میں دو عدالتیں ایک تجارتی اور ایک مخلوط (عثمانیوں اور اجنبیوں کے درمیان مقدمات کے لیے) قائم کر دی گئی تھیں؛ ان دونوں عدالتوں کو ۱۸۶۰ء میں ملا دیا گیا لیکن ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۹ء کے قوانین کے صادر ہونے سے پہلے تمام غیرشرعی عدالتیں وزارتِ عدل کے ماتحت نہ آ سکیں - پہلا قانونِ عرف (common law) ۱۸۵۰ء کا ضابطۂ تجارت تھا، جو زیادہ تر فرانسیسی قانون پر مبنی تھا اور یہی حال ۱۸۵۸ء کے ضابطۂ تعزیرات اور ۱۸۶۳ء کے ضابطۂ قانونِ تجارتِ بحریہ اور ۱۸۶۱ء کے آئین دادرسیِ تجاری (Code of Commercial Procedure) کا تھا؛ البتہ ۱۸۶۹ء کے 'مجلّہ' یعنی ضابطۂ دیوانی میں کوشش کی گئی ہے کہ قانونِ ملکیّت اور قانونِ ضمانات وغیرہ کو حنفی مذہب کے مطابق جمع و مرتّب (codification) کر لیا جائے؛ یہ ضابطۂ دیوانی ایک مجلس نے، احمد جوْدت پاشا کے زیرِ صدارت مرتّب کیا تھا لیکن اس پر عمل درآمد لازمی متصوّر نہ ہوتا تھا، بلکہ یہ گویا اُن ججوں کے مطالعے کے لیے ایک کتابچہ ہے جنھوں نے اسلامی شریعت کا مطالعہ نہیں کیا - قانون براے اجراے فیصلہ جات اور آئین دادرسیِ حقوقی [ضابطۂ دیوانی] دونوں ۱۸۷۹ء میں وضع ہوے تھے لیکن انھیں غیرملکی سفارتوں نے تسلیم نہ کیا، اس لیے مخلوط مقدمات میں انھیں کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

مختلف غیرمسلم جماعتوں کے لیے قانون سازی کا کام بےحد پیچیدہ تھا - ان میں سے بڑی بڑی جماعتوں کے لیے جو '' بنیادی قواعد '' ۱۸۶۰ء میں شائع ہوے ان کا رجحان اس طرف تھا کہ اداری امور میں روحانی (کلیسائی) عنصر کے اقتدار کو کم کر کے غیر روحانی عنصر کو زیادہ اختیار دیا جائے - ان جماعتوں نے عام طور پر قضائی معاملات میں اپنی خودمختاری قائم رکھی - بابِ عالی کو اکثر اوقات ان جماعتوں کے اندرونی تنازعات اور رومن کیتھولک اور مشرقی کنیسوں کے متّبعین کے (جو روما کی گدی سے '' متّحد '' تھے) باھمی اختلافات کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا - یہاں بھی غیرملکی طاقتوں کو ھر وقت دخل دینے کا موقع ملتا، بالخصوص روس کو ترکیّہ کے گریگوریائی ارمنی کلیسا کی سراُسقفی (primacy) کے مسئلے میں مداخلت کا موقع ملتا تھا، اسی طرح اورتھوڈوکس بلغاریوں کی اختلافی جماعت کے مسئلے میں بھی یہی کیفیت تھی، جنھیں ۱۸۷۰ء میں ایک خود اختیار جماعت کی حیثیت دے دی گئی تھی - غیرمسلموں کو فوج میں بھرتی کرنے کا فیصلہ ۱۸۵۵ء میں ہوا تھا اور خَراج سرکاری طور پر موقوف کر دیا گیا لیکن اس فیصلے پر ' تنظیمات ' کے دوران میں کوئی عمل نہ ہوا - اس کی جگہ معافی ٹیکس (یعنی بدل) رائج ہوا۔

خارجی تعلقات کے سلسلے میں امتیازاتِ اجنبیّہ کی تنسیخ کے متعلق تمام کوششیں، جن کی ابتداء پیرس کانگرس میں ہوئی، بیکار ثابت ہوئیں - ۱۸۷۳ء کے قانون کے صدور کے موقع پر ایک خفیف سی اصولی تبدیلی کی گئی، جس کی وجہ سے غیرملکیوں کو زمین کی ملکیت حاصل کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

۱۸۴۵ء میں تعلیم کی کامل اصلاح کی غرض سے ایک 'مجلسِ معارِف' مقرر ہوئی - پہلے اس کا صدر فُؤاد پاشا تھا اور بعد میں جوْدت پاشا - اس ضمن میں مذہبی تعلیم کی روایات سے ٹکر لینا لازمی تھا - ۱۸۴۵ء میں یونیورسٹی قائم ہوئی لیکن اس کا پہلے پہل براہ راست کوئی حسبِ دلخواہ نتیجہ نہ نکلا اور 'رُشْدِیّہ' (ثانوی) اور

'اعدادیّہ' (ابتدائی) مدارس کے قیام میں بڑی مشکلات پیش آئیں ۔ ۱۸۶۸ء میں غَلَطہ سرائے کے ثانوی مدرسے (Lycée) کا افتتاح ہوا، جس میں تعلیم فرانسیسی زبان میں دی جاتی تھی، تو اس کے معنے یہ لیے گئے کہ غیرملکی ثقافت کو ملک میں داخل کیا جا رہا ہے؛ چنانچہ اس کی بڑی سختی سے مخالفت ہوئی۔ غرض کہ انیسویں صدی کے کہیں آخر میں جا کر یہ اقدامات بارآور ہونے لگے ۔

'تنظیمات' کے دَور میں اقتصادی قسم کے منصوبے بہت کم ظہور میں آئے ۔ ملک کی مالی حالت برابر افسوسناک رہی اور یہ حالت غیرملکی قرضوں (۱۸۵۴ء سے) اور سلطان عبدالعزیز کی فضول خرچیوں کے باعث بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ۔ قومی قرضے کے بین الاقوامی محاسبے پر، جس کا ان حالات میں وجود میں آنا لازمی تھا، ۱۸۷۹ء کی مالی تباہی کے بعد تک عمل شروع نہ ہوا ۔ ۲۸ محرم ۱۲۹۹ھ (/ ۲۰ دسمبر ۱۸۸۱ء قب یُونگ Young، ۵ : ۶۹) کے فرمان کے مطابق عثمانی قرضے کی مجلسِ دُوَلی (بین الاقوامی کونسل) قائم ہوئی ۔

'تنظیمات' کے جاری کردہ اہمّ قوانین کے سب مآخذ تا حدّ امکان ذیل کے گوشوارے میں دے دیے گئے ہیں ۔ مجموعۂ قوانین، یعنی ''دُسْتُور'' کے حوالے، جس میں ۱۸۸۶ء تک کے قوانین، شامل ہیں، یُونگ کی کتاب *Corps de Droit Ottoman* (آکسفورڈ ۱۹۰۵ - ۱۹۰۶ء) سے مأخوذ ہیں، جس میں اکثر متون کا فرانسیسی ترجمہ دیا گیا ہے؛ جہاں متن نہیں دیا گیا، حوالۂ متعلقہ خطوط وحدانی میں دکھا دیا گیا ہے ۔ باقی مآخذ بیشتر اِنگِل ہارٹ Engelhardt : *La Turquie et les tanzimat*، پیرس ۱۸۸۴ء سے لیے گئے ہیں ۔ اگرچہ اس کتاب کے بیانات بہت درست نہیں ہیں تاہم ان سے اصلاحات، خاص کر دَورِ اوّل کی اصلاحات کے عام جائزے کی تکمیل میں مدد مل سکتی ہے ۔

'تنظیمات' کے دَور میں ترکیّہ کے اسلامی عنصر کی نہضتِ عقلی کا بھی کچھ پتا چلتا ہے، جس سے ترکوں کی ثقافتِ جدید کی بنیاد پڑی ۔ یہی زمانہ تھا جس میں شِناسی، نامِق کمال اور احمد وِفیق محوِ عمل رہے اور ان کی مساعی سے نئی ترکی ادبی زبان پیدا ہوئی ۔ اسی دَور میں احمد جَوْدت پاشا بھی تھے، جو مشہور مؤرّخ، ادیب اور مقنّن تھے (قب فاطمہ عَلِیّہ : احمد جَوْدت پاشا و زمانی، قسطنطنیہ ۱۳۳۲ھ) ۔ ضیا گوک آلپ بھی، جس نے موجودہ ترکی قوم پرستی کی تحریک کے اصول وضع کیے، یہ تسلیم کرتا ہے کہ ترکی کے ذہنی ارتقاء کے سلسلے میں یہ دَور نہایت ہی اہم تھا (قب *Türk-djuliyiñ Esāslarî*، انقرہ ۱۳۳۹ھ، ص ۶؛ اور خالدہ اِدیب : *Memoirs*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ۲۳۸ ببعد) .

گوشوارۂ تنظیمات :-

۳ نومبر ۱۸۳۹ء / ۲۶ شعبان ۱۲۵۵ھ، خطِّ شریف گلخانہ؛ دُستور، ۱ : ۴۰۸؛ یُونگ، ۱ : ۲۹؛ لُطفی، ۶ : ۶۱

۸ مارچ ۱۸۴۰ء / یکم محرم ۱۲۵۶ھ، 'مجْلسِ احکامِ عدلیّہ' کی ترتیبِ جدید؛ لُطفی، ۶ : ۹۲

۱۸۴۰ء / ۱۲۵۶ھ، اجراے مجموعۂ قوانینِ تعزیرات؛ (اِنگِل ہارٹ، ۱ : ۴۰)

۱۸۴۰ء / ۱۲۵۶ھ، تخلیق عدالتِ تجارت ('' تجارتِ مجْلِسی'') زیرِ وزارتِ تجارت؛ لُطفی،

۶ : ۱۰۲

۶ ستمبر ۱۸۴۳ء/ ۱۲۵۹ھ، مختلف مقامات سے فوج بھرتی کرنے کا قانون (لطفی، ۷ : ۴۷؛ انگل ہارٹ، ۱ : ۱۷)

۱۸۴۵ء/ ۱۲۶۱ھ، دارالخلافہ میں مجمعِ مندوبین ولایات (انگل ہارٹ، ۱ : ۷۶)

۱۸۴۵ء/ ۱۲۶۱ھ، قیامِ یونیورسٹی و دیگر معاھد براے تعلیم ثانوی (انگل ہارٹ، ۱ : ۷۷؛ ۲ : ۷)

۱۸۴۶ء/ ۱۲۶۲ھ، نشرِ ضابطۂ اداری (انگل ہارٹ، ۱ : ۸۲)

۱۸۴۷ء/ ۱۲۶۳ھ، دیوانی اور فوجداری مخلوط عدالتوں کا قیام (انگل ہارٹ، ۱ : ۸۳)

۱۸۴۷ء/ ۱۲۶۳ھ، نظارتِ معارفِ عمومیّہ (Ministry of Public Education) کا قیام (لطفی، ۸ : ۱۳۲)

۲۴ مئی ۱۸۵۰ء/ ۱۲۶۶ھ، فرمان بحقِ مسلمانان (یونگ، ۸ ۱۰)

۲۸ جولائی ۱۸۵۰ء/ ۱۸ رمضان ۱۲۶۶ھ، ضابطۂ تجارت کا نفاذ (دستور، ۱ : ۳۷۵؛ یونگ، ۷ : ۵۵)

۲۸ نومبر ۱۸۵۲ء/ ۱۲۶۸ھ، فرمان دربارۂ ادارۂ ولایات (انگل ہارٹ، ۱۰۵)

۱۸۵۴ء/ ۱۲۷۰ھ، مجلسِ کبیر (Grand Council) کی [ذیل کے] دو حصوں میں تقسیم: (۱) مجلسِ اصلاحات اور (۲) مجلسِ عالی احکامِ عدلیہ (ہائی کونسل آف جسٹس)، (یونگ، ۱ : ۲)

۷ مئی ۱۸۵۵ء/ ۱۲۷۱ھ، غیر مسلم رعایا سے وصولِ خراج کی موقوفی اور انھیں فوج میں بھرتی کرنے کا فیصلہ

۱۸ فروری ۱۸۵۶ء/ ۱۱ جمادی الاخری ۱۲۷۲ھ، ''خطِّ ھمایوں''، نورادونغیان Noradounghian، ۳ : ۸۳

۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء/ ۲۳ رجب ۱۲۷۲ھ، عہدنامۂ صلح پیرس

۱۸۵۶ء/ ۱۲۷۲ھ، عثمانی بنک کی تأسیس (یونگ، ۵ : ۲۵)

۲۱ اپریل ۱۸۵۸ء/ ۷ رمضان ۱۲۷۴ھ، قانونِ اراضی کا نفاذ؛ دستور، ۱ : ۱۶۵؛ یونگ، ۶ : ۴۵

۹ اگست ۱۸۵۸ء/ ۲۸ ذوالحجۃ ۱۲۷۴ھ، ضابطۂ تعزیزات کا نفاذ؛ دستور، ۱ : ۵۲۷ ؛ یونگ، ۷ : ۱

۳۰ اپریل ۱۸۶۰ء/ ۹ شوال ۱۲۷۶ھ، ملحقِ قانونِ تجارت اُن عدالت‌های تجارتی کی تنظیم کے متعلق جنھیں مخلوط عدالتوں میں ملا دیا گیا؛ دستور، ۱ : ۴۴۵؛ یونگ، ۱ : ۲۲۶

۲۴ مئی ۱۸۶۰ء/ ۱۲۷۶ھ، قواعد و ضوابط متعلقۂ جماعتِ ارمنیانِ گریگوری (ان قواعد کی توثیق ۱۸۶۳ء

میں ہوئی)؛ دستور، ۲ : ۹۳۸؛ یونگ، ۲ : ۷۹

۱۸٦۱ء / ۱۲۷۷ھ، دونوں مجالس عالیہ کو ایک کر کے اس کے تین شعبے (اداری، تشریعی اور مالی) قائم کیے گئے (یونگ، ۱ : ۲، ۲۷ ؛ اِنگل ہارٹ، ۲ : ۱۸)

یکم مئی ۱۸٦۱ء / ۱۲۷۷ھ، جدید ضوابط براے لُبنان (یونگ، ۱ : ۱۳۹)

۱۴ نومبر ۱۸٦۱ء / ۱۲۷۷ھ، آئینِ دادرسیِ تجارتی؛ دستور، ۱ : ۷۸۰؛ یونگ، ۷ : ۱۵۵

۱۸٦۲ء / ۱۲۷۹ھ، ضوابطِ اساسی براے بطریرکیۂ عمومی [کیتھولک]؛ دستور، ۲ : ۹۲۲؛ یونگ، ۲ : ۲۱

۴ فروری ۱۸٦۳ء / ۱٦ شعبان ۱۲۷۹ھ، امتیاز تأسیسِ امپیریل [= امبراطوری] عثمانیہ بنک؛ دستور، ۲ : ۹۷٦؛ یونگ، ۵ : ۳۰

۲۰ اگست ۱۸٦۳ء / ٦ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ، ضابطۂ قانونِ تجارتِ بحریہ؛ دستور، ۱۰ : ۴٦٦؛ یونگ، ۷ : ۱۰۳

یکم اپریل ۱۸٦۴ء / ۱۲۸۰ھ، ضوابطِ خصوصی براے جماعتِ یہود؛ دستور، ۲ : ۹٦۲؛ یونگ، ۲ : ۱۴۸

٦ ستمبر ۱۸٦۴ء / ۱۲۸۱ھ، قواعدِ اساسی براے لُبنان؛ دستور، ٦ : ٦۹۵؛ یونگ، ۲ : ۱۴۰

۸ نومبر ۱۸٦۴ء / ۷ جمادی الاولٰی ۱۲۸۱ھ، قانونِ ولایات؛ دستور، ۱ : ۴؛ یونگ، ۱ : ۲۹

۱٦ جون ۱۸٦۷ء / ۱۳ صفر ۱۲۸۴ھ، قانون جس کی رُو سے غیرملکیوں کو حصولِ ملکیّت کا حق حاصل ہوا؛ دستور، ۲ : ۲۳۰؛ یونگ، ۱ : ۳۳۷

۱۲ اپریل ۱۸٦۸ء / ۱۸ ذوالحجۃ ۱۲۸۴ھ، قیامِ شوراىِ دولت (Council of State) و دیوانِ احکامِ عدلیّہ (ہائی کورٹ آو جسٹس)؛ دستور، ۱ : ۷۰۳؛ یونگ، ۱ : ۳ و ۱۵۹

/ ۱۲۸۵ھ، افتتاحِ مدرسۂ ثانوی (Lycée) غَلَطَہ سرای (اِنگل ہارٹ، ۲ : ۱۰)

یکم ستمبر ۱۸٦۸ء / ۱۲۸۵ھ، عثمانی قومیت کا قانون؛ دستور، ۱ : ۱٦؛ یونگ، ۲ : ۲۲٦

۱۹ جنوری ۱۸٦۹ء/۱۲۸۵ھ، قانون اختیاراتِ عدالتھاے نظامیہ؛ (یونگ، ۱ : ۱۹۷؛ اِنگل ہارٹ، ۲ : ۲۷)

۴ اپریل ۱۸٦۹ء / ۱۸ ذوالحجۃ ۱۲۸۵ھ، مجلّہ ــــ احکامِ عدلیّہ، یعنی ضابطۂ دیوانی کی تنقیح : اس قانون کے ۱٦ حصّے ۱۸٦۹ء تا ۱۸۷٦ء میں نافذ ہوے؛ یونگ، ٦ : ۱۷۰؛ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء میں مع شرح شائع ہوا

۱۸٦۹ء / ۱۲۸٦ھ، فرمانِ تخلیقِ اُسقفیۂ بُلغاریا (یونگ، ۲ : ٦۱)

[۲۲ جنوری ۱۸۷۱ء]/۲۹ شوال ۱۲۸۷ھ، ادارۂ ولایات کا قانون؛ دستور، ۱ : ٦۲۵؛ یونگ، ۱ : ۴۷

[۲۱ جنوری ۱۸۷۴ء]/۱۲۹۰ھ، اوقافِ دینیہ کے غیر دینی کاموں میں استعمال کرنے کا قانون، (اس پر کبھی عمل درآمد نہیں ہوا)، (اِنگل ہارٹ، ۲ : ۱۲۷)

۱۸۷۵ء/ ۱۲۹۲ھ، فرمان براے اصلاحِ محکمۂ عدالت: عدالتہاے تجاری وزارتِ عدل کو منتقل ہوئیں (یُونگ، ۱ : ۱۵۹)

۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء/ ۷ ذوالحجۃ ۱۲۹۳ھ، سلطنتِ عثمانیہ کے قانونِ اساسی کا نفاذ؛ متن 'سالنامہ' میں ہے

۲۰ مئی ۱۸۷۹ء/ ۲۹ جمادی الاولی ۱۲۹۶ھ، وزارتِ عدل و عبادات کا نظامِ اساسی؛ دُستور، ۴ : ۱۲۹؛ یُونگ، ۱ : ۱۶۰

[۱۸] جون ۱۸۷۹ء/ ۲۷ جمادی الثانیة ۱۲۹۶ھ، نظامِ عدالتہاے نظامیہ؛ دُستور، ۴ : ۲۳۵؛ یُونگ، ۱ : ۱۶۶

[۱۸] جون ۱۸۷۹ء/ ۲۷ جمادی الثانیة ۱۲۹۶ھ، قانونِ اجراے فیصلہ جات؛ دُستور، ۴ : ۲۲۵؛ یُونگ، ۱ : ۱۹۸

۲۲ جون ۱۸۷۹ء/ ۲ رجب ۱۲۹۶ھ، ضابطۂ دادرسی دیوانی؛ دُستور، ۴ : ۲۰۷؛ یُونگ، ۱۷۱ :

[ہدایت : ہجری سال کو اصل مان کر میلادی سال کو اس کے مطابق کیا گیا ہے ۔ تصحیح شدہ مواد کو قوسین میں درج کیا گیا ہے].

مآخذ: (۱) قوانین کے ترکی متن دُستور میں موجود ہیں؛ (۲) فرانسیسی تراجم کے لیے دیکھیے Aristarchi Bey : *Législation Ottomane*، قسطنطینیہ ۱۸۷۳ء - ۱۸۷۴ء؛ ملحق در ۱۸۷۸ء؛ (۳) یُونگ G. Young : *Corps de droit ottoman*، ۱ : ۷، آکسفورڈ ۱۹۰۵ - ۱۹۰۶ء؛ (۴) A. Heidborn : *Droit public et administratif de l' Empire Ottoman*، لیپزگ ۱۹۰۸ء؛(۵) یونانی ترجمہ **Κώδηκες Ὀθωμανικοί**، کو یُونگ نے استعمال کیا ۔ خارجی تعلقات کے لیے قب (۶) Gabriel Effendi Noradounghian : *Recueil d' Actes Internationaux de l' Empire Ottoman*، ج ۲ تا ۴، پیرس ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۳ء ۔

تنظیمات کے متعلق ترکی تاریخی مآخذ بہت نہیں: (۷) احمد لُطفی : تاریخ، (قسطنطنیہ ۱۲۹۰ تا ۱۳۲۸ھ)، ج ۶ تا ۸، جو ۱۲۵۵ تا ۱۲۶۵ھ کے حالات پر مشتمل ہے؛ (۸) عثمان نُوری : عبدالحمید ثانی و دُورِ سلطنتی، ج ۱، قسطنطنیہ ۱۳۲۷ھ؛ تنظیمات کے موضوع پر کوئی مفرد رسالہ نہیں ہے — (۹) یورپی تصانیف: Ed. Engelhardt : *La Turquie et les tanzimat*، ج ۱ و ۲، پیرس ۱۸۸۴ء؛ (۱۰) Chertier : *Les réformes en Turquie*، پیرس ۱۸۶۸ء؛ (۱۱) A Ubicini : *Letters sur la Turquie*، پیرس ۱۸۵۵ء؛ (۱۲) وہی مصنف: *La constitution ottoman*، پیرس ۱۸۷۹ء؛ (۱۳) Millingen : *La Turquie sous le règne d' Abdul Aziz*، پیرس ۱۸۶۸ء؛ (۱۴) Rosen : *Geschichte der Türkei*، ج ۲، لیپزگ ۱۸۶۷ء؛(۱۵) Jorga : *Geschichte des Osmanischen Reiches*، ج ۵، گوتھا ۱۹۱۳ء؛ (۱۶) علی حیدر مدحت بے: *The Life of Midhat Pasha*، لندن ۱۹۰۳ء؛ (۱۷) Padel اور Steeg : *La Législation foncière ottomane*، پیرس ۱۹۰۴ء؛ (۱۸) G. Pélissié du Rausas : *Le régime des Capitulations dans l' Empire Ottoman*، ج ۱، پیرس ۱۹۱۰ء؛(۱۹) Savvas

(۲۰) A. Mandelstam : *La justice ottomane dans ses rapports avec les puissances étrangères*، پیرس ۱۹۱۱ء۔
Pacha : *Le tribunal musulman*، پیرس ۱۹۰۲ء؛

(کرامرز J. H. KRAMERS)

تَنْکَہ : سنسکرت ٹنکا(چاندی کا ایک وزن = ۴ ماشہ) : ایک ہندوستانی سکّہ ۔ جب محمود غزنوی نے شمال مغربی ہندوستان فتح کر لیا تو اس نے اپنی ہندو رعایا کی سہولت کے لیے ایسے سکے ضرب کرائے جن پر دو زبانوں میں عبارت لکھی گئی؛ جہاں سکّے پر عربی نقش میں ' درھم ' کا لفظ استعمال ہوا، ناگری حرفوں میں اس کا ترجمہ ٹنکا کیا گیا ۔ شمس الدین اِیلتُتمِش، سلطانِ دھلی [۶۰۷ تا ۶۳۳ھ / ۱۲۱۰ تا ۱۲۳۵ء] نے ایک وزنی نقرئی سکّہ ۱۷۵ گرین (=۱۱٫۳ گرام) کا رائج کر کے اس کا نام تَنْکہ رکھا (حالانکہ اُسے ' تولہ ' کہنا زیادہ صحیح ہوتا) ؛ اسی وزن کا سونے کا سکہ سب سے پہلے ناصرالدین محمود [۶۴۴تا ۶۶۴ھ/۱۲۴۶ تا ۱۲۶۵ء، زامباور] نے جاری کیا تھا ۔ یہ دونوں سکے اس کے بعد ہندوستان کے معیاری سکے شمار ہونے لگے ۔ سونے کا تنکہ سب سے آخری بار معزّالدین مبارک [۸۲۴ تا ۸۳۷ھ / ۱۴۲۱ تا ۱۴۳۳ء] نے جاری کیا تھا ۔ صرف وہ چند نادر طلائی سکّے ان کے علاوہ تھے جو سُوری عہد میں مضروب ہوے ۔ یہی سکہ پھر اکبر نے ضرب کرایا لیکن اب اس کا نام ' مُہر ' [رَکَّ بآن] رکھ دیا گیا ۔ چاندی کا تنکہ محمد بن تغلق کے عہد کے بعد آہستہ آہستہ ملاوٹ کی وجہ سے کم قیمت ہو کر بد سے بدتر ہوتا چلا گیا ؛ یہاں تک کہ لودھیوں کے زمانے میں تو وہ عملی طور پر تانبے ہی کا سکہ (" تنکۂ سیاہ ") رہ گیا ۔ شیر شاہ [۹۴۶ تا ۹۵۲ھ / ۱۵۳۹ تا ۱۵۴۵ء] نے سکّوں میں بہت بڑی اصلاح کی اور اصل کی طرح خالص اور پورے وزن کا تنکہ دوبارہ مضروب کیا، لیکن اس کا نام اب رُوپیّہ ہو گیا ۔ اکبر نے روپیہ کا سکہ جاری رکھا اور اُس کا نام بھی ' روپیہ ' ہی رہنے دیا اور اب تک یہ سکہ مالی اکائی کے طور پر [پاکستان اور] ہندوستان میں استعمال ہوتا ہے ۔ اکبر نے ' تنکہ ' کا نام تانبے کے سکے کو دے دیا ۔ اس کے زمانے کا تنکہ دو دام کا ہوتا تھا (۶۴۰ گرین = ۴۱٫۵ گرام)؛ اس نے ایک اَور تانبے کا سکہ بھی جاری کیا جسے ' تنکی ' کہتے تھے جو تنکہ کے دسویں حصے کے برابر ہوتی تھی (۶۴ گرین = ۴٫۱۵ گرام).

نقرئی تنکہ اور شاذ صورتوں میں طلائی تنکہ سلاطین دھلی کے معاصرین نے بھی بنگال گجرات، مالوے اور دکن میں سکّے کے طور پر استعمال کیا ۔ بنگالی [اور اردو وغیرہ] میں یہ لفظ 'ٹکا' کی صورت میں اب تک استعمال ہوتا ہے اور بنگالی زبان میں باقاعدہ طور پر روپے کے لیے بولا جاتا ہے؛ جنوبی ہند میں گوا کے پرتگیزی سکوں پر یہ نام اب تک استعمال ہوتا ہے اور وہاں یہ ایک آنے کے برابر سمجھا جاتا ہے ۔

مآخذ : E. Thomas : *Chronicles of the Pathan Kings of Dehli*، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۲) لین پول S. Lane-Poole : *Catalogue of Coins of the Sultans of Dehli in the British Museum*، لنڈن ۱۸۸۳ء، ص xix تا xxvii .

(اَیْلَن J. ALLAN)

تَنْگَہ : (یا تَنْگَچَہ) چاندی کے ایک چھوٹے سکّے کا نام، یہ سکّہ آٹھویں صدی ھجری/چودھویں میلادی کے آخر سے دسویں/ سولھویں صدی کی ابتداء تک مغولی دنیا کے اہمّ سکّوں میں سے تھا ۔ اس کا وزن ۲۰ سے ۳۵ گرین (۱۰۳ تا ۱۰۹۵ گرام تک) تھا ۔ اس سکّے کو متأخّر

ایلخانیوں، آلتون اُردو کے خوانین، قدیم‌تر خانانِ کریمیا اور قدیم تیموریوں نے مضروب کیا ۔ روسیوں نے بھی چودھویں صدی کے آخر میں اسی قسم کے سکّے کو اور اس کے نام کو بھی بصورت دِنگہ denga مغول سے مستعار لیا : دِنگہ، جو بعد میں تانبے کا سکہ بنا دیا گیا تھا، روس میں اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل تک مضروب ہوتا رہا ۔ وسطِ ایشیا میں تنگہ کا نام اب تک زندہ چلا آتا ہے؛ یعنی ایک چاندی کے سکّے کا نام ہے، جو وزن میں کوئی پچاس گرین (۳،۲۵ گرام) کے برابر ہوتا ہے ۔ شاهانِ ایران، خانانِ خوقند اور امیرانِ بخارا پچھلی صدی تک یہ سکّہ مضروب کرتے رہے ۔ تَنْگہ کا رابطہ ترکی لفظ 'تَمْغا' کے ساتھ ہے، جو سرکاری نشان یا قالب (die) (قَبِّ سکّہ) کے معنوں میں ہے ۔ ہندوستانی لفظ 'تَنْکَہ' [رَکَ بآن] سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(J. ALLAN. ایلن)

اَلتِّنِّین : ایک مجموعۂ کواکب کا نام (The constellation of the Dragon) ۔ بقول القزوینی یہ ۳۱ کواکب پر مشتمل ہے، جن میں سے کوئی ستارہ بھی اس مجموعے سے باهر واقع نہیں ہے ۔ مجموعے کی عام شکل کے علاوہ، جو یونانی (اور وہ بجائے خود غالباً سابق‌تر بابلی) علمِ ہیئت سے مأخوذ ہے، عربوں کے هاں اس کے اندرونی کواکب کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کے علیحدہ نام بھی ہیں، مثلاً کوکب μ، جو اژدہے کی زبان پر ہے، ''الرافض'' (= تارک، وہ اونٹ جو تنہا چر رہا ہو) کہلاتا ہے ۔ چار ستارے $\beta\gamma\nu\xi$، جو اس کے سر میں ہیں، ''العَوائذ'' کہلاتے ہیں، یعنی جوان سانڈنیاں ۔ اور ان کے درمیان ایک کم روشن اور بہت چھوٹا ستارہ ''الرُّبَع'' ہے، یعنی ولد الناقۃ ۔ $\eta\zeta$ دو روشن ستارے ''الذِّئْبَیْن'' دو بھیڑیے اور دو تاریک ستارے $f\omega$ ''اَظْفارُالذِّئب'' (بھیڑیے کے ناخن) کہلاتے ہیں ۔ عربوں کے خیال میں یہ دو بھیڑیے اونٹ کے بچے [الرُّبَع] کو پکڑنا چاہتے ہیں اور اونٹنیاں اسے بچا رہی ہیں ۔ اژدہے کی دم کی جڑ پر ستارۂ ''الذِّیخ'' (نرچرخ) ہے ۔ اُلُغ بیگ کے هاں ان کی قراءت ''العَوّاد'' (عود بجانے والا) اور ''الراقص'' (ناچنے والے) سے ہوئی ہے (عجائب المخلوقات، طبع وِیستِنفیلٹ میں بھی 'الراقص' ہی ہے) ۔ اس سے زیادہ ان قراءتوں کی اَور کوئی سند نہیں اور اس کی وضاحت بآسانی یہ کی جا سکتی ہے کہ یہ ''العَوائذ'' اور ''الرافض'' کی تحریف ہیں۔

مآخذ : (۱) L. Ideler : *Untersuchungen über Ursprung und Bedeutung der Sternnamen*، ۱۸۰۹ء، ص ۳۲ تا ۴۱؛ (۲) القزوینی: عجائب المخلوقات، طبع وِیستِنفیلٹ، ۱: ۳۱؛ (۳) H. Ethé : *el-Ḳazwīnī's kosmographie*، ۱۸۶۸ء، ص ۶۵ تا ۶۶.

(J. RUSKA رُسْکا)

تَنُوخ : عربوں کے ایک قدیم مُحالِف (هم پیمان) قبائل کا مجموعہ، [جن کے شجرۂ نسب کے مشترک ہونے کی وجہ سے] عموماً انہیں ایک ہی قبیلہ شمار کیا جاتا ہے۔

اس نام کی اصل اور تنوخ کی ابتدائی تاریخ اساطیر کے ساتھ اس طرح سے مخلوط ہے کہ اسے علیحدہ کرنا ناممکن ہے اور روایات میں سے کسی تاریخی حقیقت کو چھانٹ کر الگ نہیں کیا جا سکتا؛ کیونکہ یہ روایات جزئیات کے اعتبار سے ایک دوسری سے بہت اختلاف رکھتی ہیں ۔ اگر هم کتاب الاغانی، ۱۱ : ۱۵۹ ببعد کے بیان کو اس تحقیق کی بنیاد قرار دیں (جو مآخذ ذیل کے مطابق ہے : ابن خلدون : العِبَر، ۲ : ۲۴۰.

ببعد؛ بکری: معجم، ۱۶ تا ۱۷ اور وستنفیلٹ: Register، ۴۴۴ تا ۴۴۵) تو ھمیں ذیل کی صورت نظر آتی ھے: قبائلِ قُضاعة کے انتشار کے وقت — تہامہ سے ان کے اخراج کی کہانی اس انتشار سے زماناً متقدم ھے — تیم اللہ (رک بآن؛ کہیں اس نام کی یہ صورت آئی ھے کہیں تیم اللّات) بن اَسد بن وَبرة بن تَغلب [رک بآن] بن حُلوان.... ابن قُضاعة اور رُفَیْدَة بن ثَور بن کَلْب بن وَبرة کا ایک حصہ (حَیّ) (یاقوت، ۲: ۲۸۸ میں بجاے رُفیدۂ مذکور شُکم اللّات بن رُفَیْدَة آیا ھے) اور اَشْعَر کا ایک حصہ (حَیّ) نَجْد سے روانہ ھو کر بحرین میں ھَجَر کے مقام پر جا بسا، جہاں سے انھوں نے نَبطیوں کو مار بھگایا، جو وھاں پہلے سے آباد تھے - ان کی 'کاھنة' (رک بآن) الزَّرْقاء نے، جو ان کے ایک رئیس مالک بن زُھَیر بن عمرو بن فَہْم بن تَیْم اللہ کی بہن تھی، انھیں مشورہ دیا کہ وہ وھیں ''ٹھیر جائیں اور وھیں مقیم ھو جائیں'' (''مُقام و تَنوّخ'' بجاے ''تَنُوّخ''، دیکھیے سطورِ ذیل) جب تک کہ ایک پہاڑی کوّا وھاں سے کوچ کرنے کا اشارہ نہ کرے، اس کاھنة کے قول سے ان کا نام تَنوخ پڑ گیا - اس وقت بنو ازد بھی ان سے آ ملے اور اس کے بعد وہ انھیں کے ھمراہ رھے - جب دو سال کے بعد وھاں پہاڑی کوّا نمودار ھوا تو وہ کوچ کر کے عراق میں چلے گئے اور وھاں پہنچ کر انھوں نے الحِیْرة کا شہر اپنے سردار مالک [رک بآن] کے حکم سے تعمیر کیا - جب وہ وھاں بس گئے تو گرد و نواح کے کئی 'سَوَاقِط' (گرے پڑے لوگ) بھی ان کے ساتھ مل گئے - شاپور الاکبر (ذوالاَکتاف) نے ان پر فوج کشی کی، چونکہ اس جنگ کا ['دعوٰی' یا] نعرہ 'یالَ عِبادِ اللہ' تھا ان کا نام 'عِباد' مشہور ھو گیا - شکست کھانے کے بعد ان کا زیادہ حصہ الضَّیْزَن بن معاویة التنوخی کی سرکردگی میں بین النہرین کے شہر الحَضر میں چلا گیا، جسے السَّاطِرُوْن الجَرْمَقانی نے بسایا تھا - وھاں جا کر انھوں نے شہزادی الزَّبّاء کی ملازمت اختیار کر لی اور جب اسے عمرو بن عدی نے قتل کر دیا تو وہ حکومت پر قابض ھو گئے تا آنکہ غسّانیوں [رک بآن] نے انھیں مطیع کیا.

اس بیان اور ایک اَور بیان میں، جو تفصیل کے ساتھ طبری، ۱: ۷۴۴ ببعد نے دیا ھے اور جو اختصار کے ساتھ، جس میں اختلافات بھی ھیں، ابن خَلْدون: العِبَر، ۲: ۲۳۷ ببعد؛ یاقوت، ۲: ۳۷۵ ببعد اور ابن الأثیر، ۱: ۲۴۳ ببعد میں موجود ھے، ایک بنیادی فرق قبائل کی اس فہرست میں ھے جو تہامہ سے بحرین کی طرف ھجرت کر کے چلے گئے تھے - گو پہلی فہرست میں صرف یمنی قبائل کا ذکر ھے (اَشْعَر بھی اَزْد کی طرح بنو کَہْلان میں شامل ھیں، قب ابن عبدالبرّ: کتاب مذکور، ۱۰۲ و ۱۱۵) - دوسری فہرست میں بطریقِ عمدہ صرف مَعَدیّوں کا ذکر ھے، گو تفصیلات میں مالک مذکور کے ساتھ ساتھ مالک اور عمرو [اَبنا] فَہْم بن تَیم اللہ اور ان کے رَھْط اور الحَیْقار.... بن قَنَص بن مَعَدّ مع جملہ بنو قَنَص اور اِیاد بن نزار ابن معدّ کے تین بطون کا ذکر کرتا ھے (یاقوت صرف غَطَفان بن عمرو بن الطَّمَثان بن عَوْذ مَنَاة بن یَقْدُم بن اَفْصَی بن دُعمیّ بن اِیاد کا ذکر کرتا ھے، باقی دو مآخذ میں ان ناموں کی قراءات غیریقینی ھیں اور طبری اور ابن خلدون میں وہ نام مختلف ھیں - قب نیز بْلَاوْ Blau: کتاب مذکور، ۵۶۷) - بحرین میں یہ سب قبیلے جمع ھو کر تَنَاصُر و توازُر، یعنی دفاع اور حملے میں مشارکت، کی شرط پر حلیف بنے اور تَنوخ کا نام اختیار کر لیا؛ بقول طبری و ابن الأثیر نُمَارَة بن لَخْم کے قبائل بھی یہاں ان کے ساتھ شامل ھو گئے - ازدی بھی

جَذیمة الاَبْرَش [رَكّ باَن] کی سرکردگی میں اس اتّحاد میں شامل کر لیے گئے، کیونکہ جذیمة نے مالک بن زَہیر کی ایک بہن لَمیس سے شادی کر لی تھی۔ اس روایت میں الزّرقاء کا کہیں ذکر نہیں آتا اور پہاڑی کوّے والی روایت کو تو بالکل حذف ہی کر دیا گیا ہے ۔ عربوں کو عراق کی مزروعہ زمینوں کا لالچ تھا، اس لیے ملوك الطوائف کی [جنہیں سکندر نے دارا کے قتل کے بعد تخت نشیں کیا تھا، طبری، ۱ : ۷۴۷] باھمی لڑائیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوے وہ آہستہ آہستہ عراق میں داخل ہونے لگے ۔ سب سے پہلے الحَیْقار، قَنَص اور کچھ دیگر قبیلے بہم ہو کر وہاں پہنچے؛ ان کا اَرمَانیوں [جو بقول طبری، ۱ : ۷۴۷ ارض بابل اور اس کے متّصلہ علاقے میں موصل تک آباد تھے یعنی 'انباط السواد'، طبری، ۱ : ۸۲۱] اور اَرْدَوانیوں سے [یعنی ملوكِ طوائف یا انباط الشام سے، طبری، محلِّ مذکور] مقابلہ ہوا، جن کی زمینوں پر انھوں نے جنگ کر کے قبضہ کر لیا اور اس کے بعد عرب الانبار اور عرب الحیرة کا جزو بن گئے؛ ان کے بعد تَیم اللہ اور اِیاد اپنے حلیفوں کے ساتھ الانبار پہنچے ۔ پھر نَمَارة بن قیس بن نُمَارة (؟ یا : اور نُمَارة بن لَخْم ؟) قبائلِ کِندة اور دوسرے قبیلے (طبری میں بار بار ''مالک و عمرو ابنا فَہْم'' کا ذکر آتا ہے) الحیرة میں آ گئے ۔ مختلف قبائل کی فہرستوں میں بہت التباس ہے ۔ یاقوت انھیں صرف تنوخ کے نام سے موسوم کرتا ہے، جن کے ساتھ الحیرة میں آ کر وہ جنوبی عرب بھی شامل ہوگئے جنھیں ان بلاد سے گذرتے وقت تُبّع اَسْعَد ابوکَرِب پیچھے چھوڑ گیا تھا [بکری، ۳۰۲ بحوالۂ ھمدانی] ۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ تنوخ کی کثیر تعداد الانبار اور الحیرة کے درمیان ایک ایسے رقبے میں آباد ہوئی جس کے مشرق

میں دریاے دجلہ اور مغرب میں صحراء ہے ۔ انھیں 'عربالضاحِیَة' (یعنی عرب اطراف یا سرحد نشین عرب) کہتے تھے اور وہ جھونپڑیوں ('مَظَالّ') اور بکری کے بالوں کے بنائے ہوے خیموں ('خِیَمُ الشَّعر') میں رہتے تھے ۔ مٹی کے مکانوں ('بُیُوت المَدَر') میں رھایش نہیں کرتے تھے (دیکھیے سطور ذیل) ۔ اس کے بعد ان کے ''بادشاھوں'' کی فہرست آتی ہے : سب سے پہلا مالک بن فَہْم [ابوجَذِیمة الاَبْرَش] تھا، جس کا جانشیں اس کا بھائی عمرو ہوا اور اس کے بعد جَذِیمة الاَبْرَش (لیکن دیکھیے سطور بالا!؛ جَذِیمة کی جانشینی کے متعلق قبّ Rothstein : کتاب مذکور، ۳۸ ببعد، جہاں مختلف روایتیں مذکور ہیں)، جس کی سلطنت میں الحیرة، الاَنْبار، بَقَّة، ھِیْت، عین التَّمْر، الغُمَیْر تک کا تمام علاقه، القُطْقُطَانَة اور اس سے پرے تک کا ملک شامل تھا [قبّ طبری، ۱ : ۷۵۰] ۔ اس کا بھانجا عمرو بن عَدِیّ بن نَصْر اس کا جانشین ہوا ۔ وہ بنو نُمَارَة بن لَخْم میں سے تھا اور اس طرح ملک بنو لَخْم [رَكّ باَن] میں منتقل ہو گیا ۔ یاقوت اس کہانی کے متعلق اپنا بیان جاری رکھتے ہوے لکھتا ہے (طبری نے اس کا ذکر بعد میں (۱ : ۸۲۱) کیا ہے) : جب اَرْدَشیر بن پَاپَک کو عراق میں پورا اقتدار حاصل ہوگیا تو بہت سے تنوخ نے اُس کی اطاعت کرنا قبول نہ کیا اور ملکِ شام میں جا کر قُضَاعَة میں، جو وہاں آباد تھے، مل جل گئے ۔ حمزة الاصفہانی (طبع Gottwaldt، ۹۹ ببعد [طبع کاویانی، ۶۳ ببعد]) کا بیان مختلف ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ مالک بن فَہْم بن تَیم اللہ مع جمہورِ قُضَاعَة اور مالک بن فَہْم بن غَنْم بن دَوْس بن عُدْثان (عدنان کے بجاے عُدْثانِ پڑھیے!) الازدی مع جمہورِ ازد وہ قبیلے تھے جنھوں نے بحرین میں محالفت کی اور تَنُوخ کا نام اختیار کیا، جس پر اَزْد تو

عراق چلے گئے اور قضاعة شام میں ۔ اس ''مغربی تنوخ'' کی سلطنت پر الزّبّاء (دیکھیے سطور بالا) کی موت کے بعد تین بادشاہ حکمران رہے (مسعودی : مروج، ۳ : ۲۱۵ اور ابن خلدون : العبر، ۲ : ۲۴۹ = ۲۷۸) یعنی النعمان بن عمرو بن مالک، اس کا بیٹا عمرو اور پھر اس کا بیٹا الحَوَاری بن النعمان (ابن خلدون میں غلطی سے الحَوَاری بن عمرو درج ہوا ہے)؛ اس کے بعد یہاں کی امارت سَلِیح کو منتقل ہوئی اور پھر غسّانی بادشاہ ہوے۔

مذکورۂ بالا بیانات کے متعلق زیادہ تفصیل میں جانے یا مختلف روایات میں تطبیق کی کوشش سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ تنوخ کی ابتدائی تاریخ اتنی ہی مبہم ہے جتنی کہ لخمیوں اور غسّانیوں کی اور اس لیے یہ بات اَور بھی زیادہ آسان تھی کہ انھیں لخمیوں اور غسّانیوں کی ابتدائی تاریخ میں ایک مقام دیا جائے (لیکن اس سوال پر بھی راویوں میں اتفاق نہیں ہے! قبَ روتھ شٹائن Rothstein : کتاب مذکور، ۳۹ اور کوساں دَ پرسی وال Caussin de Perceval : کتاب مذکور، ۲ : ۲۰۰) ۔ نوالڈیکہ : کتاب مذکور، ۲۳، حاشیہ ۲، مالک وغیرہ کی نسبت بجا طور پر یہ راے ظاہر کرتا ہے کہ ''ان اشخاص کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے'' ۔ اس کے علاوہ تنوخ کی اصل کا سوال جنوبی عرب کے قبائل کی عام ہجرت کے بڑے مسئلے کا ایک جزو ہے ۔ شاید تنوخ ہمیں عربی قبائل کی زیادہ بڑی تعداد کے باہم مختلط ہو جانے کی قدیم ترین مثال بہم پہنچاتے ہیں، جیسا کہ گولٹ‌تسیہر Goldziher : *Muh. Stud.*، ۱ : ۶۶ کا خیال ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ : ''تمام غیر تاریخی مواد کو صاف کر دینے کے بعد، جو اُس حِلفِ قبائل کے متعلق دوسری صدی ہجری کے فقہاے لغت اور ماہرینِ عتیقیات کی ایجاد معلوم ہوتی ہے، قبائل کا یہ برادرانہ اتحاد ہی ایک قابلِ وثوق تاریخی حقیقت باقی رہ جاتی ہے جس پر متعلقہ روایات اور داستانوں کا طومار مبنی ہے'' ۔ اُس تحالف و تعاقد کے استحکام اور امتداد کی حقیقت تو اسی بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ اس حِلف نے ایک نیا قبائلی نام اختیار کر لیا : اس نکتے کو واضح طور پر طبری، ۱ : ۷۴۶ = یاقوت، ۲ : ۳۷۷، نے بیان کیا ہے : ''وہ اَوروں کے مقابلے میں مجتمع و متفق ہو گئے ۔ تنوخ کا (مشترک) نام سب پر حاوی ہو گیا اور اس نئے نام کی وجہ سے وہ گویا عمایر میں سے ایک عمارہ اور قبیلوں میں سے ایک قبیلہ بن گئے'' (اس قسم کی اَور مثالوں اور حِلفوں کے متعلّق عام تذکرے کے لیے وہ تصانیف دیکھیے جن کا حوالہ Rothstein، ۳۲، میں موجود ہے اور اب تو خاص کر E. Braunlich، در *Islamica*، ۶ [۱۹۳۴ء] : ۱۹۱ تا ۲۰۶؛ ابن خلدون، ۲ : ۲۴۹ - ۲۵۰ = سُوَیدی : کتاب مذکور، ۱۰۱)، کو دیگر ایسے قبائل کا بھی علم ہے جن کا سلسلۂ نسب ایک مورثِ اعلٰی پر ختم نہیں ہوتا؛ بکری، ۳۷۲ میں تو تنوخ کے ایک ''حَیّ'' بنو ساطع کا بھی ذکر کرتا ہے ۔ اس طرح جو نیا قبیلہ معرضِ ظہور میں آیا اس کے لیے ایک مشترک مورثِ اعلٰی کا نام اختیار کر لیا گیا اور ہر فرد کے ساتھ تنوخی کی نسبت اس کے اپنے قبیلے کے نام کی جگہ اختیار کر لی گئی (تنوخی نسبت کے معروف ترین مشاہیر کے متعلق قبَ A. Wiener، در *Isl.*، ۴، (۱۹۱۳ء) : ۳۸۷) ۔ کلمۂ تنوخ کو بمعنی 'مقام' (دیکھیے در فوق) لینا بے شک فضول ہے (اور یہی حال کتبِ لغت کی تشریح کا ہے؛ دیکھیے مثلاً لسان العرب، [۳] : ۴۸۷، سطر ۱۱ ببعد: ابن دُرَید، ۲ : ۸ الف، سطر ۱۴ ببعد : از ت۔ن۔خ باب ۱ [فَعَلَ] [تَنَخ بالمکان : اقام بہ]، یا باب ۵

[تَفَعّل] اس معنے میں؛ جوھری [قب تاج العروس، ۲ : ۲۵۳، سطر ۶ ببعد] نیز حماسة، ۲۳۷ میں تنوخ کو مادۂ ن-و-خ سے لیا ھے (یعنی الاناخة سے تَفُعُّل کے وزن پر، جس میں صورتِ کلمه مثل تَغْلِب ھے، لیکن معنی 'مُقام' مقتضی ھے کہ تنوخ اسم ھو)۔ بهرحال یه پرانا نام ھے اور بطلیموس میں بھی اس کا ذکر آیا ھے Θανουιται, -ειται, -ηται, Θανιται (A. Sprenger : *Geogr.*، ۲۰۸؛ Blau : کتاب مذکور، ۶۷۵) - جن اجزاء سے تنوخ مرکّب ھے ان کے متعلّق کسی حد تک اگر اتّفاق پایا جاتا ھے تو وہ صرف سابق الذکر تَیم الله سے متعلّق ھے اور اس بیان سے که وہ اس حِلْف میں عراق میں آنے سے پہلے شامل ھوے (ابن خَلْدُون اور سُوَیْدِی (محلّ مذکور) میں ھے که وہ ملکِ شام میں آنے سے پہلے محالفت میں شریک نہیں ھوے) - یه بھی ممکن ھے که احتلالِ عراق کئی مرحلوں میں مکمّل ھوا ھو - بہر حال تمام روایتوں میں الحیرة کی سلطنت کی ابتداء تنوخ کے نام سے وابسته ھے اور تنوخ اس زمانے سے — یہاں ھم تاریخ کی سر زمین میں ھیں — الحیرة کی آبادی کے اھم اجزاء میں شمار ھوتے ھیں - ھِشام بن الکَلْبی (در طبری، ۱ : ۸۲۲؛ اسی طرح یاقوت، ۲ : ۳۷۹؛ ابن خلدون، ۲ : ۱۷۰؛ حمزة، ۹۸ ببعد [= طبع کاویانی، ص ۶۶]) الحیرة میں آبادی کے تین مختلف عناصر کا ذکر کرتا ھے، جو اَرْدَشیر، پہلے ساسانی بادشاہ کے زمانے میں موجود تھے (حقیقت میں یه بعد کے زمانے کی بات ھے - ابن الکَلْبی اسے اس کے اصلی زمانے سے پہلے دورِ اَرْدَشیر کی بات بتا رھا ھے) : (۱) تنوخ جو دریاے فرات کے مغرب کی طرف الحیرة اور الانبار کے درمیان اور اس سے اوپر دریا کے بالائی حصّے کی جانب بالوں کے خیموں ('بیوت الشَّعْر وَ الوَبَر') میں رھتے تھے (اور مٹی کے مکانوں میں نہیں [دیکھیے در فوق]، بالکل مقیم آبادکار قبائل کی طرح؛ بدووں اور زراعت کاروں کے بین بین کی طرز معاشرت : دیکھیے نوالڈیکه : کتاب مذکور، ۲۳، حاشیه ۳)؛ (۲) العِبَاد، حیرة کے (خاص) باشندے، جنھوں نے حیرة میں سکونت اختیار کی اور وھیں گھر بار بنا لیے؛ اور (۳) اَحْلاف یعنی وہ باشندے جن کی حفاظت وغیرہ کی ذمےداری اھلِ حیرة پر تھی، جنھوں نے اپنے آپ کو حیرة کے باشندوں سے ملحق کر لیا تھا اور ان میں شامل ھو کر وھاں آباد ھو گئے تھے، گو وہ خود تَنُوخ [الوَبَر] یا عِبَاد میں سے نه تھے - عام طور پر یه کہنا زیادہ صحیح ھے که عِبَاد سے نصاراے الحیرة مراد تھے اور وہ مختلف قبیلوں میں سے تھے (دیکھیے مثلاً لسان العرب، ۴ : ۲۶۲، سطر ۶؛ تاج العروس، ۲ : ۴۱۲، سطر ۲۶) - [طبری نے] اس سے ذرا پہلے کہا ھے که 'اَحْلاف' سے وہ لوگ مراد لیے جاتے تھے جنھوں نے اپنے قبیلوں میں کوئی خرابی کی ھو یا روزی کی تنگی کی وجه سے ھجرت کر کے الحیرة میں چلے آئے ھوں - ان تعریفات سے تنوخ بالکل خارج نہیں ھو جاتے : السُّوَیْدِی : کتاب مذکور کے نزدیک 'اَحْلاف' واقعةً تنوخ ھی کا ایک حصّه ھیں؛ العِبَاد غالباً زیادہ تر تنوخی الاصل تھے - یه تقسیم بھی کسی طرح واضح نہیں سمجھی جا سکتی اور مصنوعی اور وضعی معلوم ھوتی ھے (عِبَاد کے متعلق تفصیل میں جانے کا یه محلّ نہیں، ان کے لیے دیکھیے روتھشٹائن Rothstein کے ملاحظات : ص ۱۸ تا ۲۸؛ العِبَاد کے متعلق اس حیثیت سے که وہ ''نصاراے مشارقه'' کا غیر معمولی عام نام ھے دیکھیے مسعودی : *Historical Encyclopaedia* [مُرُوج، طبع پیرس ۱۹۱۴ء، ۲ : ۳۲۸]، ترجمۂ شْپْرِنگر Sprenger، لنڈن ۱۸۴۱ء،

۲۲۷، قب ۲۰۱)۔ یہ بات کہ تنوخی حیرہ کی آبادی کا کوئی غیر اہم جزو نہ تھے طبری کے بیان، ۱ : ۸۰۳؛ اغانی، ۲ : ۳۹، سطر ۵ ببعد سے ظاہر ہے : ایرانیوں کے بادشاہ نے نعمانِ اوّل کو (نولڈیکہ، ۸۳، حاشیہ ۳ کا خیال ہے کہ نعمان ثانی محتمل تر ہے) سواروں کے دو کتیبے یا فوجیں عطا کیں : دَوْسَر (ابن الأثیر، ۱ : ۲۸۷، [قاھرۃ ۱۳۴۸ھ، ۱ : ۲۳۳] میں دَوْسَر کے بجاے دَوْس لکھتا ہے) اور الشَّھْباء (میدانی : *Proverbia*، ۱ : ۱۹۸ [متن عربی قاھرۃ ۱۳۱۰ھ، ج ۱ : ص ۸۷] میں الأشاھب لکھتا ہے)، ان فوجوں میں سے دَوْسَر تو تنوخیوں پر مشتمل تھی اور شَھْباء ایرانیوں پر [دیکھیے ابن الأثیر، قب میدانی : محلِّ مذکور]، جن کی مدد سے اس نے ملکِ شام میں یلغاریں کیں [اور مخالف عربوں سے جنگیں کیں، ابن الأثیر : محلِّ مذکور]۔ نعمان کے سوا دیگر لخمی بادشاھوں کے عہد میں بھی ان دو فوجوں کا ذکر آتا ہے (قب روتھ شٹائن Rothstein : کتاب مذکور، ۱۳۴ تا ۱۳۶؛ بْلاؤ Blau، ۵۷۰۔ ان کے مفروضہ اشتقاق کے لیے نیز دیکھیے میدانی : کتاب مذکور)۔ بکری، ۲۸۷، میں یومِ تَحادِ (جسے عراق میں ایک ''موضع'' (جگہ) کا نام بتایا گیا ہے) کا ذکر ہے۔[یہاں تنوخِ شام نے تنوخِ حیرہ کو شکست دی پھر تنوخِ (شام) کو قابوس بن المنذر نے شام میں شکست دے کر ان سے یوم تَحاد کا بدلہ لیا] (قب Rothstein، ۱۰۵)۔ تنوخ کی بڑی اور مشہورتر لڑائیاں مذکور نہیں ھیں۔ ابوالفداء صرف بطورِ کلّی تنوخ کی ان جنگوں کا ذکر کرتا ہے جو لَخمیوں سے ہوئیں (طبع Fleischer، ۱۸۴)۔ اس کے متعلق ھمیں کچھ معلوم نہیں کہ عیسائی مذہب کی تبلیغ ان میں کب ہوئی (Nau : کتاب مذکور، ۱۶، میں بحوالۂ *Patrol. Orient.*، ۳ : ۱۹ ببعد لکھتا ہے کہ ۵۰۹ء اور ۵۷۰ء کے درمیان اَحُوذِمّہ Ahūdemmeh نے ان میں عیسائیت کی تبلیغ کی؛ حیرۃ کے پہلے اُسْقُف کا ذکر ۴۱۰ء میں آتا ہے : Rothstien، ۲۳ ببعد؛ شیخو : کتاب مذکور، ۸۷، ۱۳۴ میں عِباد کے نام کی بنا پر جن فرضی خیالات کا اظہار ہوا ہے وہ ظاہر ہے کہ قطعاً صائب متصوّر نہیں ہو سکتے)۔

اسلام کے ابتدائی زمانے کی فتوحات میں عام طور پر تنوخ سرحد کے قبیلوں بَہراء، کَلب، سَلِیْخ، غَسّان وغیرہ کے حلیف نظر آتے ھیں، جن کے کچھ افراد عیسائی تھے۔ خالد بن ولید [رضا] ۱۲ھ میں عَین التَمْر کو فتح کرنے کے بعد دُوْمَۃالجندل کی طرف متوجہ ہوے، جہاں ان کی تعداد کثیر اپنے اپنے سرداروں کے ماتحت جمع ہو گئی تھی؛ مثلاً غسّان اور تنوخ کے بعض لشکر جَبلَۃ بن الاَیْہَم کے ماتحت تھے اور انھوں نے عِیاض بن غَنْم پر بڑا دباؤ ڈال رکھا تھا۔ عربوں نے قلعے سے نکل کر مسلمانوں کی دو فوجوں پر حملہ کیا لیکن وہ بہت بری طرح ناکام ہوے اور ان میں سے کچھ ھی آدمی قلعے میں واپس جا سکے۔ تھوڑے عرصے کے بعد قلعے پر قبضہ کر لیا گیا اور عورتوں اور بچوں کے سوا باقی سب کو تہِ تیغ کر دیا گیا (طَبری، ۱ : ۲۰۶۵ ببعد؛ دُوْمَۃ اور اُکَیدِر کے مسئلے کے متعلق، جو اس مہم سے وابستہ ہے، مفصّل اور مکمّل بحث کے لیے دیکھیے کایتانی Caetani : *Annali*، سنہ ۱۲ھ، فصول ۲۳۲ تا ۲۳۴ اور وہ مصادر جو وھاں مذکور ھیں)۔

اسی سال جب خالد بن سعید ملکِ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور تَیْماء میں ایک بہت بڑا لشکر جمع کرنے میں مصروف تھا بوزنطیوں نے یہ خبر پاتے ھی سرحدی علاقے کے تمام عربوں کو بشمولِ تنوخ اس غرض سے طلب کر لیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں مدد دیں۔

مسیحی عرب، جو زیزاء کے جنوب میں تین دن کے فاصلے پر خیمہ زن تھے، کسی قسم کا مقابلہ کیے بغیر یا تو منتشر ہو گئے یا اسلام قبول کر کے خالد سے جا ملے - اس پر خالد علاقۂ البَلْقاء میں فتح مندانہ داخل ہو گیا (طبری، ۱ : ۲۰۸۰ ببعد، ابن الأثیر، ۲ : ۳۰۸) - دریاے یَرْمُوك کی لڑائی کے بعد، جہاں تنوخ اُسی غسّانی کی کمان میں تھے (بَلاذُری، ۱۳۵، ۱۳۷)، ابو عُبَیدة بن الجرّاح نے حِمْص اور قِنَّسْرِین کا رخ کیا اور اُنھیں فتح کر لینے کے بعد گرد نواح کی مستقل آبادی کو، جسے حاضر قِنَّسْرِین کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، [اسلام قبول کر لینے کی دعوت دی، قب بلاذُری، ۱۴۴]- یہاں تنوخی مستقل طور پر آباد تھے، جنھوں نے شام میں آنے کے بعد مَظالّ اور خیمے چھوڑ کر اور مکان بنا کر ان میں رہنا شروع کر دیا تھا - ان میں سے بعض تو مسلمان ہو گئے اور بعض عیسائیت ہی پر قائم رہے - چنانچہ سَلِیح، جو یہاں بسے ہوے تھے، اکثر عیسائی رہے - [ان حاضر قِنَّسْرِین کا ایک گروہ مہدی عبّاسی کی خلافت میں مسلمان ہوا] - ابو عُبَیدة نے تنوخ اور دوسرے قبائل سے، جو حاضر حَلَب میں تھے، معاہدہ کیا اور ان لوگوں پر جزیہ عائد کر دیا جو اسلام نہ لائے (بلاذُری، ۱۴۴، ۱۴۵؛ یاقوت، ۲ : ۱۸۵) - جب ۱۷ھ میں ہرَقْل نے ملکِ شام کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے ایک بڑی مہم کا اہتمام کیا تو اہالیانِ قِنَّسْرِین و حَلَب بشمولِ تنوخ و سَلِیح، جو حاضر قِنَّسْرِین و حاضر حَلَب میں سے تھے، اس کے ساتھ شامل ہو گئے - [چونکہ اہلِ الجزیرة نے رومیوں کو اہلِ حِمْص کے خلاف برانگیختہ کیا تھا، حضرت عمر رض نے ان کی تنبیہ کے لیے جُنْدِ عراق کو الجزیرة پر چڑھائی کرنے کا حکم دے دیا اور (الجزیرة کے) تنوخ اور خانہ‌بدوش قبیلے ربیعة [رک بآن] کے خلاف کارروائی کرنے کے احکام جاری کیے] - یہ کارروائی عیسائی عربوں کو پسپائی پر مائل کرنے کے لیے کافی تھی - اس کے بعد فوراً ہی بوزنطیوں کو، جنھیں تنوخ اور سَلِیح مشکل میں پھنسا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، دندان‌شکن شکست ہوئی - بوزنطیوں کے بقیّة السَّیف کو، جن کے ہمراہ غسّان، ایاد اور تَنُوخ کے بعض لوگ بھی تھے اور جو ہرَقْل سے جا ملنے کی کوشش کر رہے تھے، مَیْسَرة بن مَسْرُوق العَبْسِی نے آلیا اور ان سب کا صفایا کر دیا (طبری، ۱ : ۲۴۹۸ تا ۲۵۰۳؛ ابن الأثیر، ۲ : ۳۸۶، ۴۱۳؛ یاقوت، ۲ : ۴۷؛ ۱ : ۹۲۸ = بلاذُرِی، ۱۶۴) — زمانۂ اسلامیہ کی اس تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ الحَضْر سے روانہ ہو کر تَنُوخ بہت دُور مغرب کی طرف پہنچ چکے تھے؛ اور الہَمْدانی ان کے علاقے کا حال اسی کے مطابق بیان بھی کرتا ہے (صفة، ۱۳۲، س ۱۱) : ''ان کے (یعنی بَہراء کے، قب بلاءو، ۱۷۵) بائیں طرف، اس علاقے میں جو سمندر (بحیرۂ روم) تک پھیلا چلا گیا ہے، تنوخ رہتے ہیں - یہ دیارِ الفُضَیْض (؟ مختلف قراءات دیکھیے !) ہیں، جو تنوخیوں کے سردار ہیں اور ان کی پناہ گاہ [؟ مکودهم - ظاہراً ''مَعْكدهُم'' درست معلوم ہوتا ہے] [شپرنگر : *Geogr.*، ص ۲۰۹ اس پر یہ اضافہ کرتا ہے : ''یعنی القَصِیص [کذا] [!sic] [the Qaçyç] ان میں سے فوجی گروہ ہے'' [؟] - حاصل یہ کہ شپرنگر نے الفُضَیْض کے بجاے القَصِیْص کی قراءت اختیار کی ہے اور غالباً مَعْكَدُهم پڑھا ہے، یعنی پناہ گاہ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ القَصِیص تنوخ کا فوجی گروہ ہے] - ساحل سمندر پر اللاذِقیّة کا شہر انھیں کا ہے'' - یہ کوئی غیر اغلب بات نہیں کہ وہ نجد میں واپس جانے کے بعد جزوی طور پر جَدِیلۂ بنی طَیِّئ کے علاقے پر بھی قابض ہو گئے ہوں (نواح

٦٢٥ء ؟ : Caussin de Perceval، ٢ : ٦٢٩ تا ٦٣٢؛ ٣ : ٣٩٣ ببعد؛ قبّ حماسة، ١٧٥ تا ١٧٧؛ ابن العَدیم : کتاب مذکور، ١ : ٣٥).

دوسرے عیسائی قبیلوں (مثلاً تَغْلب) کی طرح وہ صِفّین کی جنگ میں [امیر] معاویة کے اور مَرج راھط میں مروان کے حامی بن کر لڑے تھے (مسعودی : مُروج، ٣ : ٣٥٢؛ ابن الاثیر، ٣ : ٢٦١؛ ٣ : ١٢٣ = طبری، ١ : ٣٣٢٣؛ ٢ : ٣٧٨، ٣٨٣؛ لامنس Lammens: *Mo'âwia*، ٣٢٧، ٣٣٥) - درونی جنگوں میں انھوں نے کوئی نمایاں حِصّہ نہیں لیا لیکن جنوبی عرب ھونے کی حیثیت سے ان کی ھمدردی یمنیوں کے ساتھ تھی - شاید یہ اسی ھمدردی کا نتیجہ تھا کہ نسّابوں نے ان کی رگوں میں یمنی خون کی ملاوٹ جتنی تھی اس سے زیادہ ھی ثابت کرنے کی کوشش کی (قبّ گولڈ تسیہر Goldziher : کتاب مذکور، ١ : ٩٧) - المسعودی : مُروج، ٦ : ٣٨ میں مذکور ھے کہ مروان ثانی اپنے رجالِ قیس [دیکھیے قیس عیلان] سمیت قِنّسرین اور خُناصِرة کے علاقے میں سے گذر رھا تھا کہ تنوخیوں نے اس کی فوج کے پچھلے حصے (ساقة) پر حملہ کر دیا (١٢٧ھ / ٧٤٤ - ٧٤٥ء) - بقول ابن العِبری (Barhebraeus : *Chr. syr.*، ١٣٢ ببعد، جس کی تصدیق اس کتبے سے ھوتی ھے جو شابو Chabot نے *J. A.* : سلسلہ ٩، شمارہ ١٦ [١٩٠٠ء] : ٢٨٧ پر شائع کیا) خلیفہ المہدی نے (١٥٨ تا ١٦٩ھ / ٧٧٥ تا ٧٨٥ء) ان 'تَنّوخایے' (کلمۂ سریانی یعنی تنوخیوں) کو جو حلب کے گرد و نواح میں خیمہ نشین تھے، مجبور کیا تھا کہ وہ مسلمان ھو جائیں اور ان کے [نو تعمیر؟] گرجے مسمار کرا دیے تھے - ھارون الرشید کی وفات کے بعد جو فتنے برپا ھوے ان کے دوران میں باغیوں نے ان کی آبادی پر، جو حلب کے نزدیک تھی، حملہ کر دیا [بقول بلاذری، ١٣٥، اھل حاضر نے حلب والوں سے جنگ کر کے انھیں شہر سے نکالنا چاھا] - قصّۂ میخائیل سِیروس (Michael Syrus : *Chron.*، ٣ : ٢١ تا ٣٠، در Nau : کتاب مذکور، ١٠٨ تا ١٠٩) میں اوپر کے بیان میں یہ اضافہ کیا ھے کہ اس عظیم رقبے کی وجہ سے جو ان کے قبضے تھا ان کی آبادی کے گرد فصیلیں نہ تھیں، لیکن وہ اپنی پیداوار اور تجارت کی وجہ سے بہت امیر ھو گئے تھے - یہ لڑائی پورے دس روز تک جاری رھی - آخر تنوخی رات کے وقت خفیہ طور پر قِنّسرین کی طرف روانہ ھوگئے اور ان کے گھروں کو، جن میں بہت دولت تھی، لوٹ کر تباہ کر دیا گیا - بقول البلاذری، ١٣٦، وہ قِنّسرین پر قابض نہ ھو سکے، اس لیے وہ سب کے سب منتشر ھو کر تَکْرِیت، آرمینیہ اور دوسرے مقامات کو چلے گئے.

ظاھر ھے کہ تنوخ کی مختلف بستیوں کے باھمی تعلقات اس زمانے میں بھی بہت کمزور تھے، یا جیسا کہ ان واقعات سے گمان ھوتا ھے وہ دوسرے قبائل کے درمیان چھوٹی چھوٹی بستیاں بسا کر بیٹھے ھوے تھے - ان کے مزید انتشار اور پڑوسی قبیلوں میں ان کی اکیلی ٹولیوں کے جذب ھونے کا (جو تبدیلی مذھب کا لازمی نتیجہ تھا) تتبّع اور بھی مشکل ھو گیا ھے - بقولِ ابن عبدالبرّ، کتاب مذکور، ٣٠ بعض بوزنطی قضاعة کی نسل سے ھیں یعنی تنوخ، بَھْراء اور سَلِیح کی نسل سے، جو ملکِ شام سے ھِرَقْل کے ساتھ ھی چلے گئے (دیکھیے سطور بالا) اور اس کی مملکت میں منتشر ھوگئے - جبل شمّر کے موجودہ باشندوں کے ذھنوں میں مسیحی قبائل (طیّئ، تنوخ اور تَغْلب [رکّ بآن]) کی یاد کے دھندلے نقوش جو باقی ھیں وہ بھی اوپر کے بیان سے زیادہ

اهمّیت نہیں رکھتے ۔ البتہ فُؤاد حمزۃ کا یہ دعوے (قلب جزیرۃ العرب، مکۃ ۱۳۵۲ھ، ص ۲۳۳) کہ ملک شام میں تنوخ کی اولاد اب بھی باقی ہے زیادہ توجہ کے قابل ہے، کیونکہ بقول ہارٹمان M. Hartmann یہ نام دُرُوزوں میں اب بھی پایا جاتا ہے (دیکھیے A. Wiener : کتاب مذکور) — تنوخ کا ان قبائل میں بھی ذکر آتا ہے جو ۲۱ھ/۶۴۲ء میں مصر میں داخل ہو کر وهیں آباد ہوگئے ۔ وہ عمرو بن العاص (دیکھیے ابن عبدالحکم : فتوح مصر، طبع Torrey، ۱۱۳ تا ۱۱۴، ۱۱۹ تا ۱۲۰، ۱۲۹) کے همراہ الفُسطاط کی جامع مسجد کے گرد آباد ہوے تھے ۔ [سمعانی (بذیل تنوخ) کہتا ہے کہ ان کی ایک جماعت مَعرّۃ النعمان میں بس گئی؛ ان میں سے اکثر عالم فاضل تھے ۔ معرّی (م ۱۳ ربیع‌الاول ۴۴۹ھ) انھیں میں سے تھا]۔

تنوخ کی تہذیب و تمدن کی سطح عِباد کے مقابلے میں پست‌تر تھی (ثقافتِ عِباد کی قدرشناسی کا حق روتھ شٹائن Rothstein : کتاب مذکور، ۲۴ تا ۲۸ نے ادا کیا ہے) ۔ نیم خانہ‌بدوش تو وہ تھے ہی، بادیہ میں لکھنے کا رواج شہر حِیرۃ کے مقابلے میں غالباً کم تھا، اس لیے وہ فنِ تحریر سے کم واقف تھے (قبّ G. Jacob : *Beduinenleben*، طبع دوم، ۱۶۲) لیکن بقول میخائیل سیروس انھوں نے عَقُولایے، اور طُوغایے کے ساتھ مل کر انجیل کا عربی میں ترجمہ کرنے کے کام میں حصّہ لیا (دیکھیے کایتانی Caetani، ۷ھ، فصل ۴۵؛ Nau : کتاب مذکور، ۱۰۶) ۔ آخر میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تنوخ اور عِباد کے ناموں کے استعمال سے بہت زیادہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا اور جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی بنا پر یہ فرض کر لینا چاہیے کہ بہت سی باتیں جو عِباد کے متعلق کتابوں میں درج ہیں وہ عام طور پر تنوخ کے متعلق بھی صحیح ہیں ۔

مآخذ : (درج متن مفصّل حوالوں کے علاوہ) : (۱) عربی لغت اور انساب کی کتابیں: (ا) وُیسٹنفیلٹ : *Register*، ۴۴۴ تا ۴۴۵؛ (ب) *Tabellen*، شمارہ ۲؛ (ج) القَلْقَشَنْدی : نہایۃ الأرَب فی معرفۃ انساب العرب، بغداد ۱۳۳۲ھ، ص ۱۶۱؛ (د) السُّوَیدی : سَبائک الذہب فی معرفۃ قبائل العرب، بمبئی ۱۲۹۶ھ، (طبع سنگی)، ۱۰۱؛ (ہ) ابن قُتَیبۃ : کتاب المعارف، طبع وُیسٹنفیلٹ، گوٹنگن ۱۸۵۰ء، ص ۵۱، ۵۳؛ (و) ابن عبدالبرّ : الانباہ علی قبائل الرُّواہ، قاہرۃ ۱۳۵۰ء، ۳۰، ۱۲۲— (۲) طبری؛ (۳) ابن الاثیر؛ (۴) بلاذری (طبع دَ خویہ)؛ (۵) مسعودی : (مُروج)؛ (۶) کتاب الاغانی؛ (۷) یاقوت : معجم، بامداد فہارس؛ [(۸) سمعانی، بذیل التنوخی؛] (۹) بکری : معجم، ۱۴ تا ۱۸ = (۱۰) وُیسٹنفیلٹ : *Die Wohnsitze und Wanderungen der arabischen Stämme*، در *Abh. Ges. Wiss. Gött.*، ۱۴ (۱۸۶۸ تا ۱۸۶۹ء) : ص ۱۰۷ تا ۱۱۳؛ اس کے علاوہ (۱۱) بلاؤ O.Blau، در *Z. D. M. G.*، ۲۳ (۱۸۶۹ء) : ۵۶۷ تا ۵۷۱، ۵۷۵ تا ۵۷۷ (قبّ وهی مصنّف، در مجلّۂ مذکورہ، ۲۲ [۱۸۶۸ء] : ۶۶۰، ۶۶۳، ۶۶۷، ۶۷۰)؛ (۱۲) ابن خلدون : العِبَر، بولاق ۱۲۸۴ھ، ۲ : ۱۷۰، ۲۳۷ تا ۲۴۱، ۲۴۸ تا ۲۵۰، ۲۵۹، ۲۷۸؛ ۲/۲ : ۸۲ تا ۸۴، ۱۰۷ ببعد؛ (۱۳) ابن العَدیم، در فریتاغ G. W. Freytag : *Selecta ex historia Halebi*، پیرس ۱۸۱۹ء، ص ۱ تا ۳، ۹، ۴۵؛ (۱۴) البَتَنُونی : الرِّحْلَۃ الحجازیۃ، قاہرۃ ۱۳۲۹ھ، ۱۹ تا ۲۰؛— (۱۵) شپرنگر A Sprenger : *Die alte Geographie Arabiens*، برن Bern ۱۸۷۵ء، ص ۲۰۸ تا ۲۰۹، ۲۸۸ تا ۲۹۱؛ (۱۶) نولدیکہ Th. Nöldeke : *Geschichte der Perser und Araber zur Zeit der Sasaniden*، لائڈن ۱۸۷۹ء، ۲۳ تا ۲۵، ۳۳ تا ۳۵، ۸۳؛ (۱۷)

Die Dynastie der Lahmiden in : G. Rothstein ، al-Ḥīra برلن ۱۸۹۹ء، ۱۸، ۲۸ تا ۳۰، ۶۷، ۱۰۰، ۱۳۳ تا ۱۳۶ (قدیم‌تر زمانے کے متعلق بہترین کتاب)؛ (۱۸) Essai : A. P. Caussin de Perceval ، sur l' histoire des Arabes .... پیرس ۱۸۴۷ - ۱۸۴۸ء، ۲ : ۵ تا ۳۳، ۴۲، ۴۶، ۱۸۶، ۱۹۹ تا ۲۰۳؛ ج ۳ : ۲۲۳ ببعد، ۴۹۳ تا ۴۹۸، ۵۱۱ تا ۵۱۵؛ (۱۹) ،Primae lineae hist. regn. arab....: J. J. Reiske طبع ویسٹنفیلٹ، گوٹنگن ۱۸۴۷ء، ۸ تا ۲۹، ۶۹ ببعد؛ (۲۰) فان کریمر Über die : A. von Kremar ، südarabische Sage لیپزگ ۱۸۶۶ء، ص ۴۹، ۵۸ ببعد، ۸۳، ۱۳۷ — ان کی مسیحیت سے متعلق : (۲۱) احمد بن حنبل : مسند، ۴ : ۷۵، سطر ۷ تا ۹؛ (۲۲) شیخو L. Cheikho : النصرانیّة و آدابہا بین عرب الجاھلیّة، بیروت ۱۹۱۲ تا ۱۹۲۳ء، ص ۷۸، ۹۹، ۱۲۵، ۱۲۷، ۳۵۳ تا ۳۵۶؛ (۲۳) لامنس Études sur le règne du calife : H. Lammans ، omaiyade Mu'âwia Ier پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۲۵۳، ۲۹۲، ۲۹۵، ۳۲۷، ۳۳۵؛ (۲۴) وہی مصنف : ،Études sur le siècle des Omayyades بیروت ۱۹۳۰ء، ص ۱۸، ۳۲۲؛ (۲۵) Les Arabes : F. Nau chrétiens de Mésopotamie et de Syrie du VIIème au ،VIIIème siècle پیرس ۱۹۳۳ء، ص ۱۵ تا ۱۷، ۱۰۶ تا ۱۰۹؛ (۲۶) چارلس Le Chris- : H. Charles ، tianisme des Arabes nomades sur le Limes .... پیرس ۱۹۳۶ء، ۳ تا ۴، ۵۵، ۷۷ تا ۷۸.

(کنڈرمن H. KINDERMANN)

التَّنُوخی

التَّنُوخی : ابو علی المُحَسِّن [القاضی]، ایک عرب مصنّف [ادیب، شاعر، اخباری]، جو بصرے میں پیدا ہوا ۔ اس کی تاریخ ولادت [اس کے اپنے قول کے مطابق، جو اس کے بیٹے قاضی علی نے اُس سے روایت کی، ربیع الاول ۳۲۷ھ (تاریخ بغداد)، یعنی جنوری ۹۳۹ء اور یہی تاریخ ابن خلّکان نے دی ہے؛ یا (بقول یاقوت) ۳۲۹ھ / ۹۴۰-۹۴۱ء] .. وہ بصرے کے ایک فاضل قاضی [اور صاحبِ دیوان شاعر ابوالقاسم علی بن محمد م ۳۴۲ھ / ۹۵۳ء] کا بیٹا تھا [قب سمعانی، بذیل التنوخی؛ اس کا نسب نامہ بھی وہیں (=وفیات الاعیان، ۱ : ۵۵۴) دیکھیے] ۔ اس نے ابتداء میں الصُّولی [رَكَ بآن]، ابو الفَرَج الاصفہانی [رَكَ بآن] اور دوسرے علماء سے بصرے [اور بغداد] میں علم حاصل کیا [پھر وہ بغداد ھی میں مقیم ھو گیا اور اپنی وفات تک وھیں مقیم رہا] ۔ اس نے محکمۂ قضاء اپنے لیے پسند کیا اور آھستہ آھستہ قاضی کے درجے تک پہنچ گیا ۔ پہلے قاضیِ بغداد اور بعد میں قاضیِ اھواز متعیّن ھوا؛ ۹۶۹ - ۹۷۰ء میں وزارت کی تبدیلی کی وجہ سے اس کی قضا چھین لی گئی اور اس کی جائداد ضبط کر لی گئی اور تین سال تک وہ اپنے منصب سے معزول رہا ۔ معلوم ھوتا ھے کہ اس عرصے میں وہ زیادہ تر بغداد ھی میں رہا، لیکن اُس نے مصر کا سفر بھی کیا ۔ اس کے بعد اسے پھر اپنے عہدے پر بحال کیا گیا ۔ لیکن عضدالدولة بُوَیہی [رَكَ بآن] کے عہدِ حکومت میں ۹۸۱ - ۹۸۲ء میں پھر زیرِ عتاب آ گیا ۔ کہتے ھیں کہ کچھ عرصہ وہ قید خانے میں بھی رہا، کیونکہ اس نے امام شافعی اور ان کے پیرووں کے خلاف زھر اگلا تھا ۔ اُس نے اور بھی سختیاں جھیلیں اور اسے بہت اذیت دی گئی قبل اس کے کہ [محرم ۳۸۴ھ / مارچ ۹۹۴ء] میں اس کا بغداد میں انتقال ھوا.

تنوخی کی تصانیف حسب ذیل بتائی جاتی ھیں : ایک دیوان، جو اب معدوم ھے [یہ دیوان اس کے باپ کے دیوان سے حجم میں بڑا تھا (یتیمة)]؛ اور قصوں کے تین مجموعے : کتاب نشوار المحاضرة و اخبار المذاکرة [آغاز در ۳۶۰ھ؛ یہ کا ذیل

غرس النعمة نے کتاب الربیع کے نام سے لکھا (معجم الادباء، ٦ : ٢٥١)] اور المستجاد من فعلات الأجواد اور اس کی مشہورترین کتاب الفرج بعد الشدّة (جو ٩٨٣ء سے پہلے کی تصنیف نہیں ہے)؛ یہ کتاب ضرب الامثال، حکایات اور اقوال پر مشتمل ہے جو عُسر کے بعد یُسر کے موضوع سے متعلق ہیں - مدائنی [رک بآن] نے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے اس مضمون پر اسی نام کی ایک کتاب لکھی تھی اور اس کے بعد ابن ابی الدنیا اور قاضی ابوالحسین نے بھی اس مضمون پر اس قسم کے مجموعے شائع کیے تھے - تنوخی نے ان تصانیف سے اور دوسری ادبی کتابوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ اپنی نئی تألیف میں زبانی روایات سے بھی مواد حاصل کیا - کئی کہانیاں تو خود اس کے اپنے والد اور اساتذہ کی بیان کی ہوئی تھیں، ان کے علاوہ اس نے اپنے تجربات کا نچوڑ بھی قلمبند کیا لیکن نفسِ مضمون کا زیادہ حصہ، جو اس نے ادبی مآخذ سے نہیں لیا تھا، کاتبوں اور قاضیوں سے حاصل کیا تھا - یہ تصنیف ایک مقدّمے سے شروع ہوتی ہے جو تأریخ ادب سے متعلّق ہے اور جس میں تنوخی نے اپنے پیشرووں کی تصانیف پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے - اس کے بعد علیحدہ علیحدہ حکایتیں ہیں جن کی ابتداء میں اکثر ان کے مآخذ کی طرف اختصار کے ساتھ حوالہ دے دیا ہے اور موادّ و اسلوبِ قصّہ کو مدّنظر رکھتے ہوے کتاب کو چودہ بابوں میں تقسیم کیا ہے - ابن ابی الدنیا کی کتاب کا انداز اخلاق آموزانہ ہے مگر تنوخی کا مجموعہ اس کے مقابلے میں لطیف تر ہے اور اس میں بذلہ سنجی زیادہ ہے .... یہ کتاب بہت مقبول ہوئی - بہتوں نے اسے پڑھا اور بعد میں اس کے نسخے بہت نقل ہوے اور متأخر زمانے میں فارسی، ترکی اور یہودی علم ادب پر اس نے اثر ڈالا - [الفرج کا ترکی ترجمہ قاسم بن محمد لاله لی نے کیا، دیکھیے تکملۂ براکلمان، ١ : ٢٥٣؛ فارسی ترجمے دو ہیں: پہلا ترجمہ سدیدالدین محمد العوفی (م حدود ٦٣٠ھ/١٢٣٢ء، رک بہ عوفی، محمد) نے کیا - دوسرا ترجمہ حسین بن اسعد بن حسین الدهستانی المؤیدی نے کیا - حسین مذکور "دستور اعظم ابو الطیب عزالدین طاہر بن زنگی الفریومذی (م ٦٧٦ھ) کا کاتب تھا - عزالدین مذکور ارغون آقا کی طرف سے خراسان و مازندران کا گورنر تھا - یہ جلیل الشأن شخص بقول ابن الفوطی (ولادت ٦٤٢ھ، وفات ٧٢٣ھ) (در تلخیص مجمع الآداب، طبع لاهور، ٥ : ٨٣) بقایاے رؤساے خراسان میں سے تھا اور علّامہ نصیر الدین طوسی نے ابن الفوطی کو بتایا کہ عزّ الدین طاہر مذکور طاہر بن الحسین الخزاعی کی اولاد سے تھا؛ عزّ الدین صاحبِ حلّ و عقد اور معتمد در اخذ و ردّ تھا- وہ عزالدین بن طاہر نہیں ہے، جیسا کہ دیباچۂ جامع الحکایات، (طبع وقفیۂ گب)، ١٨ ببعد میں لکھا ہے، بلکہ عزالدین طاہر، جیسا ابن الفوطی کے ہاں، نیز دیباچۂ ترجمۂ الفرج بعد الشدّة و الضیقة کے ایک قدیم نسخے میں ہے (جو بدون تاریخ اور بخطّ نسخ ہے اور کتاب خانۂ محمد شفیع لاهوری میں موجود ہے اور نہ صرف اس میں بلکہ بعض اور قلمی نسخوں میں بھی اسی طرح ہے] - [قاضی المحسّن کا لڑکا قاضی ابوالقسم علی بھی ادیب، فاضل، شاعر اور راویۂ شعر تھا اور المعرّی کا شاگرد؛ وہ محرم ٤٤٧ھ / اپریل ١٠٥٥ء میں فوت ہوا - اس کے ترجمے کے لیے دیکھیے ابن عماد: شذرات، ٣ : ٣١١]۔

مآخذ: (١) A. Wiener: *Die Farag ba'd aš-Šidda-Literatur*، در *Isl.*، iv، ١٩١٣ء: ٢٧٠ تا ٢٩٨، ٣٨٧ تا ٤٢٠، بالخصوص ٣٩٣ تا ٤١٣ (مکمل فہرستِ مآخذ: ص ٣٩٣، حاشیہ ٢ اور ٣٩٨، حاشیہ ١؛ نیز (٢) یاقوت: إرشادالاریب، طبع مارگولیتھ D. S. Margoliouth [از مطبوعات وقفیۂ

گب]، ٦ : ٢٥١ تا ٢٦٧؛ [و (٣) معجم البلدان، بامداد اشاریه (بعض حکایات دی هیں)]؛ (٣)- الفرج بعد الشدّة، دو حصے، قاهرة ١٩٠٣ء تا ١٩٠٣ء؛ [(٥) تأریخ بغداد، ١٣ : ١٥٥؛ (٦) الثعالبی : یتیمة الدهر، طبع اول، ٢ : ١٠٥؛ (٧) ابن خلّکان : وفیات، قاهرة ١٣١٠ه، ١ : ٣٣٣؛ (٨) ابن عماد : شذرات، ٣ : ١١٢؛ (٩) زکی مبارك : النثر الفنّی، ١ : ٣١٥؛ (١٠) محمد نظام الدین : Introduction to the Jawāmi' al-Ḥikāyat، از مطبوعات وقفیۂ گب، سلسلۂ نو، شمارة ٨، ص ٩٠ و ج ٢ (مع مآخذ)؛ (١١) براکلمان : ١ : ١٦١ ببعد، تکملة، ١ : ٢٥٢ ببعد (مع مآخذ مفصّل)].

(R. PARET و اداره)

التّوأمان: جڑواں [یعنی کوکبة التّوأمَین؛] (the constellation Gemini)، [صورتِ جوزاء]۔ القزوینی کے نزدیک اس میں اٹھارہ ستارے هیں اور سات اور جو اس صورت سے باهر هیں ۔ اس صورت میں همیں دو آدمی نظر آتے هیں، جن کے سر تو شمال مشرق کی طرف هیں اور پاؤں جنوب مغرب کی جانب ۔ سر کے دو روشن ستاروں کو " الذراع المبسوطة " (یعنی پھیلے هوے بازو) بھی کہا جاتا هے اور وہ چاند کی ساتویں منزل هیں ۔ دوسرے توأم یعنی جڑواں کے پاؤں میں جو دو ستارے هیں ان سے چاند کی وہ منزل بنتی هے جسے 'الهَنْعَة' کہتے هیں ۔ پوری صورت کا نام الجوزاء بھی هے، جیسے Orion کا بھی ۔ اسی وجه سے ستارہ ب β (Pollux) کو رأس الجوزاء (Ras algeuse) کہا جاتا هے ۔ آج کل هم جن ستاروں کو پولکس (Pollux) اور کیسٹر (Castor) کہتے هیں بطلیموس نے انهیں اپالو (Apollo) اور هرقلیس (Heracles) کہا هے، لیکن علی نے بطلیموس کی جو شرح لکھی اس کے لاطینی ترجموں میں یه نام Avellar اور Abracaleus

هو گئے هیں.

مآخذ : (١) القزوینی : عجائب المخلوقات، طبع وُیسٹنفیلٹ، ١ : ٣٦؛ (٢) L. Ideler : *Untersuchungen über den Ursprung und die Bedeutung der Sternnamen*، ١٨٠٩ء، ص ١٥٠ ببعد.

(J. RUSKA رُسْکا)

تـوبه : (فعل تَابَ یَتُوبُ) کے لغوی معنی " لَوٹنا "، " رجـوع کرنا " وغیرہ هیں ۔ اس لفظ کا اطلاق ذات باری تعالٰی اور بندوں دونوں کے لیے هوتا هے ۔ اللہ تعالٰی کے لیے اس طرح پر کہ وہ اپنے تائب بندے کی طرف اپنی مغفرت اور رحمت کے ساتھ متوجّه هوتا هے، یعنی وہ بندے کی توبه قبول کرتا هے، جیسا که آیت یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِه (٩ [التوبة] : ١٠٥) سے ظاهر هوتا هے؛ یه اللہ تعالٰی کی طرف سے اس کی مغفرت اور رحمت کا اظهار هے که اُس نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیا هے؛ اس کی فوقیت اور برتری کے اظهار کے لیے اس وقت اس کا صِله " عَلٰی " کے ساتھ هوتا هے اور جب بندے کے لیے یه لفظ استعمال هوتا هے تو " اِلٰی " کے ساتھ، مثلاً ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (٥ [المائدة] : ٧١) وَ تُوبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا (٢٣ [النور] : ٣١) ۔ جهاں تک بندے کا تعلق هے توبه کے معنی مختصراً اس فعل سے جو شریعت میں مذموم هے اللہ تعالٰی کی طرف لوٹنا هے، جو اسے پھر هدایت کا راسته دکھائے گا .

قرآن کریم، احادیث نبوی اور اقوال علماء و صوفیّۂ کرام سے ثابت هوتا هے که عبادات میں توبه کو بهت بڑی اهمیّت هے ۔ اس کی عمومیت وجوب اور مواظبت کے دائرے سے نه عاصی، نه اولیاء اور نه انبیاء کسی حالت میں بھی خارج نهیں هو سکتے قرآن مجید میں ارشاد هے : وَ تُوبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (٢٣ [النور] :

(۳) ۔ مؤمنینِ صالحین کے لیے توبہ اپنے رب سے تقرّب کا ذریعہ بنتی ہے اور ان کا شمار صِدّیقین اور شُہداء میں ہوتا ہے، کیونکہ جو بندہ جتنا اپنے ربّ کے قریب ہوگا اتنا ہی اسے اپنی بےبضاعتی اور ربّ کے جلال اور کمال کا احساس ہوگا؛ یہی وجہ ہے کہ انبیاء اور اولیاء توبہ و استغفار میں زیادہ مواظبت کرتے تھے ۔ لازمی نہیں کہ توبہ و استغفار ان کے لیے کسی واقعی خطاء کی بنا پر ہو، بلکہ یہ ان کے معاصی کے عمومی شعور کا نتیجہ ہوتی تھی؛ وہ اس کے ذریعے سے معاصی کے تصوّر سے اللہ تعالٰی کی طرف بھاگتے تھے اور اس طرح اپنے رب سے قریب سے قریب‌تر ہو جاتے تھے (فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ (۵۱ [الذاریات] : ۵۰) ۔ گناہ کو توبہ اس طرح زائل کرتی ہے گویا کہ گناہ‌گار گناہ کا مرتکب ہوا ہی نہیں (حدیث شریف : التائبُ حبیبُ اللّٰہ و التائبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَن لا ذَنْبَ لہ).

امام غزالی کے نزدیک توبہ ہر مومن پر ”علی الفور“ تا دمِ مرگ واجب ہے، کیونکہ کوئی بشر معصیت سے خالی نہیں اور معاصی نفسِ ایمان کے لیے مہلکات ہیں ۔ یا تو وہ اپنے جوارح سے معصیت کا مرتکب ہوتا ہے یا اس کے دل میں گناہ کا ارادہ پیدا ہوتا ہے یا شیطانی وساوس اسے اللہ تعالٰی کے ذکر سے کبھی نہ کبھی غافل کرتے ہیں ۔ یہ سب سلبی پہلو ہوے ۔ اگر ان سے محفوظ ہو گیا تو تعمیلِ احکام الٰہی اور اللہ تعالٰی اور اس کی صفات و افعال کی معرفت میں نقص رہ سکتا ہے وغیرہ ۔ کیونکہ یہ غیر متصوّر ہے کہ کوئی آدمی ان نقائص میں سے کسی سے بالکل مبرّا ہو (اِحیاء، ۴ : ۹).

توبہ اپنی تمام شرائط کے ساتھ محض رجوع عن‌المعصیت کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالٰی کی طرف رجوع کر کے بندے سے جو گناہ سر زد ہو گیا ہے اسے حال اور مستقبل میں ترک کرنے کا عزم اور تلافیِ مافات کی کوشش صحیح توبہ ہے ۔ توبہ کے لیے ضروری ہے کہ پہلے بندے کو علم حاصل ہو کہ گناہ مضرّ ہے اور یہ اس کے اور رب کے درمیان بُعد پیدا کرتا ہے ۔ جب یہ علم حاصل ہو جائے گا تو وہ رنجیدہ خاطر اور اپنے کیے پر نادم ہوگا ۔ اس طرح ندامت توبہ کی مترادف نہیں ہے ۔ بلکہ توبہ کے لیے جو ضروری کیفیّات دل پر طاری ہونا چاہییں ان میں سے ایک کیفیت ہے ۔ اس کیفیت کے طاری ہونے سے اور کیفیات قلب پر طاری ہوتی ہیں ۔ ان میں سے ایک ارادہ ہے کہ اس گناہ کو ترک کرنا چاہیے اور دوسری کیفیت عزم کہ آئندہ اس کا ارتکاب نہ ہوگا؛ تیسری کیفیت یہ کہ اگر ممکن ہو تو تلافیِ مافات کی جائے ۔ پس یہ تین چیزیں یعنی علم، ندامت اور عزم صحیح توبہ کے اہم اجزاء ہیں؛ تلافیِ مافات کے طور پر عملِ صالح لازمی ہے، کیونکہ نیکی بدی کو زائل کرتی ہے : اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْہِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱ [ہود] : ۱۱۴) ۔ ایسی توبہ صحیح توبہ ہوتی ہے : وَ مَنْ تَابَ وَ عَمِلَ الخ الآیۃ (۲۵ [الفرقان] : ۷۱) (ترجمہ : اور جو شخص توبہ کرے (اور اس کے بعد وہ) نیک عمل بھی کرے تو وہ حقیقت میں خدا کی طرف رجوع کرتا ہے) ۔ قرآن حکیم سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر نادانستہ گناہ سرزد ہو جائے اور فوراً بعد توبہ کی جائے تو اللہ تعالٰی توبہ قبول کرتا ہے : اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ الخ الآیۃ (۴ [النساء] : ۱۷) (ترجمہ : اللہ توبہ (تو) قبول کرتا (ہی) ہے مگر ان ہی لوگوں کی جو نادانی سے کوئی بری حرکت کر بیٹھے پھر جلدی سے توبہ کر لی تو اللہ بھی ایسوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے) ۔ نیز یہ بھی مترشّح ہوتا ہے کہ جو شخص معاصی کا عادۃً مرتکب ہو اور موت کے وقت توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی :

وَ لَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الخ الآیۃ (۴ [النساء] : ۱۸) (ترجمہ : اور ان لوگوں کی توبہ (قبول نہیں کرتا جو (عمر بھر) برے کام کرتے رہے یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو تو لگے کہنے کہ اب میری توبہ) ۔ اللہ تعالٰی صحیح توبہ کرنے والے کے گناہوں کو بخش ہی نہیں دیتا (نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ (۴ [النساء] : ۳۱) بلکہ اپنی رحمت سے انہیں نیکیوں سے بھی بدل دیتا ہے ۔ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ بوقتِ ارتکاب ایمان زائل ہو جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں تجدید ایمان بھی ضروری ہے : اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا الخ الآیۃ (۲۵ [الفرقان] : ۷۰) (ترجمہ : مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیگا) ۔

ہر صحیح توبہ اللہ تعالٰی قبول فرماتا ہے ۔ یہاں یہ مسئلہ معرضِ بحث میں آتا ہے کہ کیا توبہ کا قبول کرنا اللہ تعالٰی پر لازم و واجب ہے ۔ معتزلہ کے نزدیک توبہ کا قبول کرنا اللہ تعالٰی پر واجب ہے ۔ امام غزالی ان کے اس طریقے سے اس طرح اختلاف کرتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے خود توبہ کو گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنایا ہے، لہٰذا جو شخص توبہ کی شرائط کو پورا کرے گا اس سے اللہ تعالٰی کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی توبہ قبول کرے گا؛ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے : وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ الخ الآیۃ (۲۰ [طٰہٰ] : ۸۲) (ترجمہ : اور جو شخص (گناہوں سے) توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرے . . . تو ہم اس کے (گناہوں کے بھی) بڑے بخشنے والے ہیں) ۔ یہ اس بالکل غیر متصوّر ہے کہ یہ وجوب اللہ تعالٰی پر خارج سے عائد کیا گیا ہے ۔ یہ بندوں کے ساتھ اس کا خود کردہ وعدہ ہے اور اللہ تعالٰی اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے : اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ (۱۰ [یونس] : ۵۵) (ترجمہ : یاد رکھو کہ اللہ کا وعدہ بر حق ہے) وَ لَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (۲۲ [الحج] : ۴۷) (ترجمہ : اور خدا تو کبھی اپنا وعدہ خلاف کرنے کا نہیں) ۔

امام غزالی نے تائبین کو چار طبقوں میں منقسم کیا ہے : (۱) یہ کہ بندہ توبہ کرے اور اپنی توبہ پر آخری عمر تک قائم رہے، جو تقصیر ہو گئی ہے اس کی تلافی کرے اور بعد میں اس کے دل میں ارتکابِ معاصی کا خیال تک نہ آئے، سوا ان معمولی لغزشوں کے جو تقاضاے بشریت ہیں ۔ ایسے بندے کو 'سابق بالخیرات' کہتے ہیں اور ایسی توبہ کو 'التوبۃ النصوح' اور نفس کی اس کیفیت کو 'النفس المطمئنّۃ' ؛ (۲) یہ کہ تائب اُمّہات الطاعات پر عمل کرے اور کبار الفواحش سے اجتناب، لیکن کیفیت یہ ہو کہ وہ ایسے گناہوں سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا جو اس کے ماحول کے سبب سے اس پر بلا قصد وارد ہو جاتے ہیں ۔ بہر حال اسے احساس ہو اور وہ اپنے نفس کو ملامت کرے اور نادم ہو ۔ پھر تجدیدِ عزم کرے کہ وہ ان اسباب سے جن کی وجہ سے اس سے یہ گناہ سرزد ہوا اپنے آپ کو بچائے گا ۔ ایسے نفس کو النفسِ اللوّامۃ کہتے ہیں ۔ تائب کا یہ بھی اعلٰی مرتبہ ہے، اگرچہ یہ پہلے سے فروتر ہے ۔ عام تائبین اس زمرے میں آتے ہیں ؛ (۳) یہ کہ توبہ کرے اور خاصی مدت توبہ پر قائم رہے ۔ پھر بعض معاصی اسے مغلوب کر لیں، لیکن باوجود اس کے وہ اعمالِ صالحہ پر قائم رہے اور ہر وقت امید کرتا رہے کہ وہ ان معاصی سے اجتناب کرے گا ۔ وہ بار بار توبہ کرتا ہے اور نادم ہوتا ہے ۔ ایسے نفس کو "النفس المُسَوِّلَۃ" کہتے ہیں (اَلشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَھُمْ) (۴۷ [محمد] : ۲۵) (ترجمہ : شیطان نے ان کو بتے دیے)؛ بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا (۱۲ [یوسف] :

۱۸) (ترجمہ : بلکہ تمھارے دل نے تمھارے لیے ایک بات بنالی ہے) ۔ ایسے ہی بندوں کے متعلق اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے : وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِھِمْ الخ (۹ [التوبة] : ۱۰۲) (ترجمہ : اور (کچھ) اَور لوگ ہیں جنھوں نے اپنی خطا کا اقرار کیا (اور انھوں نے) ملے جلے عمل کیے (کچھ) بھلے اور کچھ برے)؛ (۳) یہ کہ مرتکب معاصی توبہ کرے لیکن بعد میں پھر معاصی میں منہمک ہو جائے حتّٰی کہ اسے پھر توبہ کا خیال تک نہ آئے اور نہ اس کے دل میں افسوس اور ندامت پیدا ہو بلکہ وہ شہواتِ نفسانی کا بندہ بن جائے ۔ ایسے نفس کو 'النفس الامّارة' کہتے ہیں۔ اگر ایسے بندے کا انجام نیکی پر ہو تو وہ عذاب دوزخ سے آخر کار نجات پا سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالٰی کی مغفرت بہت وسیع ہے (رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ) (۶ [الانعام] : ۱۴۷).

قُشَیری کے نزدیک توبہ سالکینِ طریقت کی پہلی منزل اور طالبینِ حقیقت کا پہلا مقام ہے۔ انھوں نے توبہ کے تین مدارج بیان کیے ہیں : جو بندہ عذاب سے ڈر کر توبہ کرے وہ ان کے نزدیک صاحبِ توبہ، جو حصولِ ثواب کے لیے توبہ کرے وہ صاحبِ اِنابت اور جو بندہ اللہ تعالٰی کی اطاعت اور پابندی احکام کی خاطر توبہ کرے وہ اَوّاب ہے ۔ توبہ کو وہ عام مومنین کی صفت قرار دیتے ہیں، انابت کو صفتِ اولیاء و مقرّبین اور اَوْبَہ کو صفتِ انبیاء۔

اللہ تبارك و تعالٰی نے اس طویل بحث کو ایجاز کے اعجاز میں اس طرح بیان فرما دیا ہے : وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ الخ الآیة اور اپنے بندوں کے لیے اپنی مغفرت اور اس کے حصول کا طریقہ اس طرح واضح فرما دیا : وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً الخ الآیة (۳ [آل عمران] : ۱۳۵ - ۱۳۶) (ترجمہ : اور وہ لوگ ایسے (نیک دل) ہیں کہ (بتقاضای بشریت) جب کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھتے ہیں یا (کوئی اَور بیجا بات کر کے) اپنا (یعنی اپنے دین کا کچھ) نقصان کر لیتے ہیں تو خدا کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتے ہیں اور خدا کے سوا (بندوں کے) گناہوں کا معاف کرنے والا (اَور) ہے ہی کون؟ اور (جو بیجا بات) کر بیٹھتے ہیں تو دیدہ و دانستہ اُس پر اصرار نہیں کرتے، یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت ہے (اور مغفرت کے علاوہ بہشت کے) باغ جن کے تلے نہریں (پڑی) بہ رہی ہونگی).

(عابد احمد علی)

* **تَوبُو** : دیکھیے مادّۂ تبو

* **تَوحِید** (۱) : (ع) مادّۂ و ـ ح ـ د کا مصدر فعلِ مضعَّف، لغوی طور پر اس کے معنی ہیں : ''ایک بنانا'' یا ''یکتائی کا اثبات'' (لین Lane ، ص ۲۹۲۷ الف)، اس لیے مُتکلّمین کی اصطلاح میں اللہ کی ''وحدانیّة یا تَوحُّد'' پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے (اس کلمے کے جملہ معانی میں) ۔ یہ مصدر قرآن میں نہیں آیا نہ اس مادّے سے، نہ اس کے قریبی مادّے أ ـ ح ـ د سے کوئی فعل آیا ہے، لیکن لسان (۴ : ۴۶۳، س ۱۶ تا ص ۴۶۵، س ۴ از آخر صفحہ) میں اس پر نہایت مفصّل لسانیاتی بحث ہے، جس میں ان دونوں مادّوں سے مشتق صیغوں کے استعمال کی بہت سی صورتیں نسبت بہ اللہ [تعالٰی] اور نسبت بانسان بیان کی ہیں ۔ ''علم التوحید و الصفات'' اصطلاحی طور پر علم الکلام کے مرادف ہے [دیکھیے مادّۂ کلام] اور جملہ اسلامی عقائد کی بنیاد ہے (عقائد النّسفی پر تفتازانی کا مقدمة،قاهرة ۱۳۲۱ھ، ص ۳ ببعد اور شروح بر ہامش کتاب؛ [تھانوی :] کشاف، ۲۲) ۔ اس تعریف میں سے فرقۂ معتزلہ صفات کو خارج کر کے محض توحید

کو بنیادِ عقائد قرار دیتے ھیں۔ لیکن ''توحید'' بسیط تصور ہونے سے اتنا ھی بعید ھے جتنا ممکن ھے؛ یہ خارجی اور ظاھر بھی ھو سکتا ھے اور داخلی اور باطنی بھی؛ اس سے مراد یہ بھی ھے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں ھو سکتا اور اس کا کوئی شریک نہیں ھے؛ اس کے یہ معنی بھی ھو سکتے ھیں کہ اللہ اپنی ذات میں ایک احدیّت ھے اور اس کے یہ معنی بھی ھو سکتے ھیں کہ اللہ ھی موجودِ مطلق و حقیقی ھے (الحقّ)، باقی کائنات کی ھر شے کی ھستی اعتباری ھے اور اس پر ھمہ اوست کے عقیدے [الحلول] کو بھی اٹھایا جا سکتا ھے کہ اللہ کُلّ ھے، پھر اس توحید تک یا تو بذریعۂ علم (و نظر) پہنچا جا سکتا ھے یا بذریعۂ معرفت و مشاھدہ؛ یہ معرفت و مشاھدہ بھی یا تو خالصةً مراقبہ ھو یا فلسفیانہ تحقیقاتِ نظری۔ نتیجہ یہ ھوا کہ توحید کے سیدھے سادھے معنی تو یہ ھو سکتے ھیں کہ ''سوا اللہ کے کوئی معبود نہیں ھے'' یا پھر ''توحید'' سے ''ھمہ اوست'' [الحلول] کا مطلب سمجھا جائے۔ مفہوم کے اس تطوّر و ارتقاء پر تھانوی: کشّاف، ص ۱۴۶۸ تا ۱۴۷۰ میں اچھی بحث کی گئی ھے؛ قبّ نیز ص ۱۴۶۳ تا ۱۴۶۸.

(D. B. MACDONALD میکڈونلڈ)

التوحید، علم (۲): اس کی ابتداء، اس کا ارتقاء اور اس کی بابت علمائے دین کی رائے:

تمہید: (۱) توحید کے معنی ھیں [اللہ کو ایک ماننا]، اس پر ایمان لانا۔ اس کا فعل اَحَّدَ اور وَحَّدَ ھے۔ احدتُ اللہ و وحّدتُہٗ، و ھو الواحد الاحد (لسان، بذیل مادّۂ وحد) [یعنی میں نے اللہ کو ایک مانا اور اللہ واحد اور احد ھے]۔ توحید کی حقیقت یہ ھے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ مانا جائے [یعنی یہ اعتقاد کہ اللہ ھونے میں اور الوھیت کی خصوصیات میں اس کا کوئی ساجھی نہیں] (تفتازانی: المقاصد، طبع آستانة، ۲: ۴۷)۔ ابن خلدون کی رائے ھے (مقدمة،[۱] طبع مطبعة التقدم، مصر ۱۳۲۲ھ، ۳۶۵ - ۳۶۶) — اور یہ رائے درست ھے — کہ توحید کے بارے میں فقط ایمان یا تصدیق معتبر نہیں ھے۔ کمالِ توحید یہ ھے کہ نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ھو جائے جس سے وہ بےاختیار اللہ کو اپنی ذات، صفات اور افعال میں یکتا جان لے۔ تھانوی [۲: ۱۴۶۸ ببعد] نے جو کچھ کہا ھے وہ بھی اسی کے قریب ھے۔ وہ کہتے ھیں کہ توحید کے چند درجے ھیں؛ ان میں سے ایک علمی درجہ ھے، جو دلیل اور برھان پر موقوف ھے۔ یہ مرتبہ مفکّرین کو دلائلِ نقلیّہ اور عقلیّہ کے ذریعے حاصل ھوتا ھے۔ ایک عینی درجہ ھے جو وجدان سے پیدا ھوتا ھے اس طرح کہ کوئی شخص ذوق اور مشاھدے سے خود توحید کو پا لیتا ھے (یعنی یہ کہ اللہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں یکتا ھے) اور اسے اس بات کا کہ اللہ کی ذات، صفات اور افعال کے سامنے تمام ذوات، صفات اور افعال ھیچ ھیں اور اُن ذات، صفات وغیرہ کے مقابلے میں اِن ذوات وغیرہ کا کوئی وجود ھی نہیں ایسا یقین حاصل ھو جاتا ھے جو اس کے سوا کسی کو نہیں ھوتا۔

(۲) اھل اسلام میں توحید کی تعریف علم مشہور ھونے کی حیثیت سے یہ ھے کہ توحید عقائد دینیہ کا وہ علم ھے جو یقینی دلائل سے اکتساب کیا جاتا ھے۔ ابن خلدون [مقدمة، ۳۶۳] نے اس کی تعریف یہ کی ھے کہ توحید ایک علم ھے جس میں ایمان کے صحیح عقیدوں کو دلائلِ عقلی سے ثابت

[(۱) اس سارے مقالے میں ابن خلدون کے مقدمة کے حوالے اسی اڈیشن کے ھیں (ادارہ).]

کیا جاتا ہے اور جس سے اہل بدعت [کی باتوں] کو، جو سلف [صالحین] اور اہل سنّت کے عقیدوں سے منحرف ہو چکے ہیں، ردّ کیا جاتا ہے ۔ بہر حال علماء نے جو اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ وہ علم ہے جس میں اللہ [عزّ و جلّ] اور اس کی صفات سے بحث کی جاتی ہے، رسولوں کا اور ان کی ضروری خصوصیات کا پتا لگایا جاتا ہے، آخرت اور اس کے احوال کی تفتیش کی جاتی ہے اور آخر میں ان امور سے بحث کی جاتی ہے جو ان مسائل سے متعلق کر دیے گئے ہیں؛ مثلاً مسئلۂ امامت.

(۳) علم التوحید کے متعدد نام ہیں ۔ ان میں سے بعض یہ ہیں : (i) اصول الدین؛ (ii) الفقه الاکبر؛ یہ نام اسے امام ابو حنیفه رحمة اللہ نے دیا ہے؛ (iii) علم النظر و الاستدلال اور (iv) علم الکلام (جرجانی : التعریفات، طبع الآستانة ۱۳۲۷ھ، ۱۲۴؛ تفتازانی : المقاصد، ۱ : ۴)؛ لیکن ان سب میں زیادہ مشہور (v) علم التوحید ہے، کیونکہ وحدانیت تک پہنچنا اس علم کے شریف ترین مباحث و مقاصد میں سے ہے اور (vi) علم الکلام اس کا یہ نام اس لیے کہ اس کا مشہور ترین مسئله، جس میں اختلاف ہوا، اللہ کے کلام کا مسئله ہے، جس کی وجه سے بہت تقاتل ہوا اور خون بہا، یا اس وجه سے کہ یہ علم شرعیات میں کلام کرنے کی قدرت پیدا کرتا ہے، جیسا کہ علوم فلسفیه میں منطق کا حال ہے ۔ علم کلام کا نام اس لیے مخصوص کر دیا گیا ہے کہ اس میں اور منطق میں فرق واضح ہو جائے یا اس لیے کہ اس میں عقائد [حقّه] اور مبتدعه کی بابت بحث و مباحثه ہوتا ہے اور اس میں محض گفتار (کلام) ہے، کردار (عمل) نہیں (تهانوی، طبع [کلکتة]، ۱ : [۴۲]؛ المقاصد، ۱ : ۵؛ ابن خلدون، ۳۶۸).

(۴) اگرچه اس علم کے مسائل فلسفۂ الٰہیات کے مسائل سے متأخّرین کی کتابوں میں اس قدر مختلط ہوگئے ہیں کہ دونوں پر ایک ہی علم ہونے کا گمان ہوا، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، علم کلام اور فلسفۂ الٰہیّات میں بہت بڑا فرق ہے، کیونکہ الٰہیّات میں عقل اپنی خاص روشنی میں مسائل سے بحث کرتی ہے اور جو چیز دلیل سے ثابت ہو جائے اسے بالکل درست سمجھتی ہے اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں کرتی کہ شرع میں اس کی بابت کیا وارد ہوا ہے؛ اس کے برخلاف علم کلام کا مبحث عقائد دین ہوتا ہے ۔ ان عقائد کو اوّلاً از روے شرع واجب التسلیم مان کر عقل ان عقلی دلائل کے استنباط میں لگ جاتی ہے جن سے ان شرعی عقائد کی تائید ہو یا بالفاظ دیگر جو نقلاً ہمارے پاس پہنچے ہیں: ''فلسفی پہلے دلیل ڈھونڈھتا ہے پھر یقین کرتا ہے، متکلم پہلے یقین کرتا ہے پھر دلیل ڈھونڈھتا ہے'' اور ان دو مسلکوں کے درمیان بہت فرق ہے (المقاصد، ۱ : ۹؛ ابن خلدون، ۳۹۲؛ تهانوی، ۱ : ۲۸).

(۵) اس علم کا طبعی تقاضا ہے کہ اس میں دین اور دینی عقائد سے متعلق بہت سے مسائل میں اختلاف راے ہو ۔ پھر بھی، جیسا خوارزمی نے کہا ہے، ان مختلف فیه مسائل کو بارہ مسائل اصلیّه کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے ۔ وہ مسائل یہ ہیں : (ا) اجسام حادث ہیں ۔ اس سے دھریوں کا ردّ مقصود ہے، جو زمانے کو قدیم مانتے ہیں؛ (ب) عالم کا ایک ایجاد کرنے والا ہے اور وہ اللہ ہے؛ (ج) اللہ ایک ہے ۔ اس سے دو یا تین خدا ماننے والے مجوس، زندیقوں اور نصارٰی کے مذاهب کا ردّ مقصود ہے؛ (د) اللہ کی مثل اور

مشابہ کوئی شے نہیں ہے ۔ اس سے ان لوگوں کا ردّ مقصود ہے جو تشبیہ [رکّ بآن] اور تجسیم کے قائل ہیں؛ (ہ) اللہ کے دیدار اور اس دیدار کے نفی و اثبات کی بحث؛ (و) صفات اللہ کی بحث اور ان لوگوں کا ردّ جو اللہ کی صفات کے قائل نہیں، جنھیں مُعطّلہ کہتے ہیں؛ (ز) انسان کے افعال کی بحث، کیا انسان خود افعال کو پیدا کرتا ہے یا ان کا خالق بھی اللہ ہے؛ (ح) اللہ برائیوں کا وجود چاہتا ہے یا نہیں؛ (ط) کبیرہ گناہ کرنے والے کا کیا حکم ہے اور اس کا ایمان، اس کی حدّ اور حقیقت پر کیا اثر پڑتا ہے؛ (ی) عام طور پر نبوّت کے ثبوت کے دلائل، تاکہ برھمنوں وغیرہ کا، جو اسے نہیں مانتے، ردّ کیا جائے؛ (ك) خاص طور پر محمّد صلّی اللہ علیہ و سلّم کی نبوت کا ثبوت اور اس کے دلائل؛ (ل) مسئلۂ امامت اور اس کا مستحق کون ہے ۔ خوارزمی کی رائے میں یہ بارہ اصول دین ہیں، جن کے گرد متکلّمین کے سارے مباحث اور اختلافات گھومتے ہیں، ان کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ انھیں کی فروعات، مقدّمات اور تمہیدات ہیں (مفاتیح العلوم، طبع لائڈن، ۲۹ — ۴۱) .

(۶) مسائلِ مذکورۂ بالا میں سے بیشتر پر اختلاف ہونے کے باعث اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہوگئے، جو علمِ کلام کی کتابوں میں مذکور ہیں ۔ یہ فرقے بہت سے ہیں ۔ ان میں سے بعض کبھی کبھی ایک ھی لقب کے تحت آ جاتے ہیں اور کبھی کبھی انھیں الگ الگ لقب دیا جاتا ہے ۔ کبھی بہت سے فرقے سمٹ کر ایک ھی نام کے تحت جمع ہو جاتے ہیں بنا براین اصولی فرقوں کی تعداد چھے میں منحصر ہو گئی ہے : (۱) اہل السنۃ؛ (۲) مشبّہۂ مجسّمہ؛ (۳) معتزلہ؛ (۴) مرجئہ؛ (۵) خوارج؛ (۶) شیعہ ۔ ان فرقوں کی بابت پوری معلومات حاصل کرنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، ان کا اور ان کی شاخوں کا ذکر بہ تفصیل مندرجۂ ذیل کتابوں میں موجود ہے : شہرستانی : کتاب المِلَل و النِحَل، ابن حزم : الفِصَل فی المِلَل و النِحَل، الاشعری : مقالات الاسلامیین؛ خوارزمی : مفاتیح العلوم (طبع مذکور، ۲۴ ببعد) اور ان کے سوا دیگر مؤلّفات میں، جن میں اس علم اور اس کی تاریخ کی طرف پوری توجہ کی گئی ہے ۔(اسفراینی : التبصیر، ۱۵ - ۱۶ اور ابن حزم : الفِصَل، ۲ : ۱۱۱ میں اصل فرقے چھے کے بجاے پانچ مانے ہیں، لیکن میں نے خوارزمی کے اتّباع میں المشبّہۃ کا اضافہ کر دیا ہے، کیونکہ اس جماعت کا ذات و صفات کے بارے میں خاص مذھب ہے) .

اس علم کی نشو و نما :

یہ علم ایک ھی دفعہ نشو و نما پا کر مکمّل نہیں ہو گیا بلکہ دیگر علوم کی طرح ابتداء میں اس کا دائرہ بھی محدود تھا، اس کے بعد نشو و ارتقاء کے قانون کے مطابق رفتہ رفتہ پھولنا پھلنا شروع ہوا اور اس کی پیدائش اور ارتقاء مختلف اسباب کے زیر اثر ہوے، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے کمال کی اس حد تک پہنچ گیا جو ہم آج دیکھ رہے ہیں ۔ ان اسباب مؤثّرہ میں سے بعض کا تعلّق تو قرآن و حدیث سے ہے، بعض ان نومسلم امتوں کے باھمی اختلاط سے جو عقلیت اور ثقافت میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں پیدا ہوے اور کچھ یونانی اور غیر یونانی فلسفے کے عربی میں ترجمہ ہو جانے کی وجہ سے رونما ہوے .

۱ ۔ قرآن : یہ اسلام کی بنیادی کتاب ہے، جو انسان کو سوچنے، سمجھنے، فکر اور غور کرنے کی دعوت دیتی ہے اور دوسروں کے پیچھے چلنے

اور چلنے والوں کی مذمّت کرتی ہے، اس لیے ضرور تھا کہ اہلِ اسلام خود قرآن کے سمجھنے میں اپنی عقل اور رائے سے کام لیتے اور اس طرح سنّت کو بھی، جو اس کے احکام کی تثبیت و توضیح کرتی ہے، سوچتے اور پرکھتے، لیکن جب تک رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم ان کے درمیان رہے انھیں قرآن کے سمجھنے میں بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہ ہوتی تھی، کیونکہ جب کوئی چیز سمجھ میں نہ آتی تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھتے اور آپ انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرما دیتے تھے - جب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم کے وصال کے بعد خلافت کا مسئلہ اٹھا اور فتنۂ عثمان و علی رضی اللہ عنہما کا ظہور ہوا تو اس کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوے اور مناظرے اور مجادلے اور مباحثے ہوے - پہلا اختلاف امامت اور اس کی شروط میں ہوا اور یہ کہ کون اس کا زیادہ مستحق ہے - ان میں سے شیعہ کی رائے تو یہ تھی کہ امامت صرف [حضرت] علی کا حق ہے اور ان کے بعد ان کی اولاد اس کی حق‌دار ہے - خارجیوں کی رائے یہ تھی (اور ان کے ساتھ معتزلہ بھی متفق تھے) کہ تمام مسلمانوں میں جو سب سے اصلح ہو امامت کا حق‌دار ہے، خواہ وہ غلام ہی کیوں نہ ہو - اعتدال پسند، جو جمہورِ اہلِ اسلام اور تعداد میں سب پر غالب ہیں، وہ اس طرف گئے کہ قریش میں جو سب سے اصلح ہو وہ امامت کا حق‌دار ہے - اس کے بعد [حضرت] عثمان اور [حضرت] علی کے فتنوں میں مسلمانوں نے ایک دوسرے کو کثرت سے قتل کیا تو گناہِ کبیرہ کی بابت سوچ میں پڑ گئے کہ وہ کیا ہے ؟ اور اس کا کرنے والا مؤمن رہا یا کافر ہو گیا ؟ اس کا نتیجہ طبعاً یہ ہوا کہ خود ایمان کے معنی اور اس کی تعریف میں اختلاف واقع ہو گیا - اسی اختلاف کے باعث خارجی اور مرجئہ اور بعد میں معتزلہ پیدا ہو گئے اور یہ اختلاف جو ابتداء میں سیاسی تھا آخرالامر دینی اختلاف اور علمِ کلام کا نہایت اہمّ مسئلہ بن گیا - اسی طرح امامت کا مسئلہ بھی علمِ کلام کا ایک اور اہمّ مبحث بن گیا، حالانکہ اس بحث کے لیے زیادہ موزوں علمِ فقہ تھا نہ کہ علمِ کلام، کیونکہ اس کا تعلق عمل سے ہے اعتقاد سے نہیں - اس کی بابت زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسئلۂ امامت کا تعلق سیاسی مصلحتوں سے ہے [دیکھیے شہرستانی : کتاب المِلَل، طبع لنڈن، ۱۱٦] — یعنی اس کا تعلق اس امر سے ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کے امور کا بہترین انتظام کون کر سکتا ہے — اس کا اعتقاد سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اسے اصول دین میں سے ایک اصل شمار کیا جائے - لیکن جب امامیوں، رافضیوں اور خارجیوں نے اس میں غلو کیا اور ان میں سے بعض نے اس کی بابت ایسی رائیں قائم کیں جن کے ماننے سے اسلام کے بہت سے بنیادی اصولوں کا انکار لازم آتا تھا تو متکلّمین نے اس مسئلے کو علمِ کلام میں شامل کر لیا تا کہ تعصّب اور خواہشاتِ نفسانی سے الگ ہو کر اس پر خوب بحث کی جائے اور حق کو باطل سے جدا کیا جائے، تا کہ اس طرح دین کے صحیح عقائد ہمیشہ کے لیے محفوظ و مصئون ہو جائیں» ([تفتازانی :] المقاصد، ۲ : ۱۹۹ تا ۲۰۰؛ ابن خلدون، ۳٦۸).

۲ - فتوحات کے بعد مسلمانوں کو جب قرار نصیب ہوا اور مختلف ادیان کے پیرووں میں سے متعدّد اسلام میں داخل ہو چکے تو مسلمان ایک طرف تو قرآن کے سمجھنے اور اس سے گہرے

معانی نکالنے میں منہمک ہو گئے اور دوسری طرف ان لوگوں میں سے جو اسلام میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن اس کی تہ کو نہ پہنچے تھے بعض نے اپنے بہت سے پرانے عقائد دینیہ کو، جو ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے، اچھالنا شروع کیا اور ان کی حمایت میں بحث مباحثے کرنے لگے اور وہ مسلمانوں سے بھی اس معاملے میں مجادلہ کرنے لگے - یہی موقع تھا کہ جب مفکّروں نے قرآن کی آیاتِ متشابہات کا سوال اٹھایا اور انھیں حلّ کرنے کی کوشش کی - ہر ایک مفکّر کی کوشش یہ تھی کہ ان آیات کو اپنے ھی معنی پہنائے: بعض تو الفاظ کے ظاہری معنی ھی لینے کے قائل ہو گئے اور بعض لوگوں نے ان آیات کی جن سے بہ ظاہر اللہ کی ذات و صفات میں تشبیہ کا گمان ہو [رکّ بہ تشبیہ] اللہ کو منزّہ و مقدّس ٹھیرانے کے لیے ان کی تأویل کی - کچھ اس کے قائل ہوے کہ ان پر جیسی وہ ھیں ایمان لانا چاہیے، نہ ان آیات کی تفسیر کرنی چاھیے اور نہ ان کے معانی کی تأویل - ان آیات کے بارے میں لوگوں کے ان مواقف اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے ایک فرقہ مشبّہہ اور مجسّمہ، دوسرا فرقہ معتزلۂ معطّلہ، جو اللہ کی صفات کے منکر تھے اور اللہ کو صفات سے عاری مانتے تھے، تاکہ اس کی انتہائی تنزیہ و تقدیس ہو سکے، تیسرا فرقہ صفاتیہ اور وہ جمہور متقدّمین ھیں جن کا مسلک ان دونوں کے درمیان ھے (ابن‌خلدون، ۳۶۷؛ شہرستانی: الملل و النحل[1]، ۱: ۱۱۶).

دوسری جانب ہم دیکھتے ھیں کہ جب ملحدوں کی شرارت زور پکڑ گئی، جن کا کام یہ تھا کہ مسلمانوں میں الحاد پیدا کریں اور دو خدا ماننے والوں (ثنویہ) اور انھیں جیسے اَور گمراہ لوگوں کی کتابوں کے ترجمے شائع کریں، تو متکلّمین میں سے جو لوگ بحث مباحثے میں ماھر تھے انھوں نے ضروری سمجھا کہ ان لوگوں کے مقالات کا جواب لکھا جائے اور انھیں ردّ کیا جائے - اس دفاعی جنگ کے عَلَم بردار فرقۂ معتزلہ کے منتخب فضلاء تھے، جنھوں نے اس اہمّ مقصد کو سامنے رکھ کر رسالے اور کتابیں تصنیف کیں، جو ان کی فنّی مقدرت اور حسنِ کارکردگی پر شاھد ھیں، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا.

۳ - اس اثناء میں ـــ جب کہ مختلف مذاھب، فرقے اور رائیں آپس میں ٹکرا رھی تھیں اور متکلّمین کے سربرآوردہ لوگ خاص کر معتزلہ غلط مذاھب والوں کے ردّ میں مصروف تھے ـــ ابوالحسن الاشعری میدان میں آتے ھیں اور اس مذھب کے بانی ھوتے ھیں جو انھیں کے نام سے مشہور ھے اور جسے آج تک مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد مانتی ھے - الاشعری علم التوحید کی تاریخ میں ایک نئے دَور کے بانی ھیں - الاشعری کا زمانِ ظہور و حیات تیسری اور چوتھی صدی ہجری ھے - انھوں نے محسوس کیا کہ متکلّمین کے گروھوں میں بہت سے مسائل کے بارے میں آپس میں بہت سخت اختلاف ھے، خصوصاً اللہ تعالٰی کے صفات، کلام اور رؤیت کے مسائل میں - انھوں نے دیکھا کہ ان مسائل میں جتنے فرقے ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ھیں ان میں سے ہر ایک نے افراطی راے قائم کر لی ھے اور بے جا غلو سے کام لیا ھے اور اپنی راے کو غلط ہو

[[1] - اس مقالے میں اصل مقالہ‌نگار نے الملل و النحل کے اس اڈیشن کے حوالے دیے ھیں جو ابن حزم: کتاب الفِصَل فی الملل کے حاشیے پر المطبعة الادبیة مصر نے ۱۳۱۷ھ میں طبع کی، زیادات و حواشی میں طبع لنڈن کے حوالے ھیں.]

یا صحیح ہر طریقے سے صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے ۔ یہ دیکھ کر انھوں نے یہ رویّہ اختیار کیا کہ اپنی رائے کے لیے درمیانی راستہ اختیار کریں اور اپنے رفقاء کے لیے ایک ایسا مذہب (مسلک) مقرر کریں جس پر ساری امت متفق ہو جائے ۔ جو کچھ ان کے مدِّنظر تھا اور جس بات کے لیے وہ محوِ عمل تھے، اللہ نے اس میں انھیں کامیاب کیا، چنانچہ انھیں کا مذہب بعد میں اہلِ حق کا یا اہل السّنۃ و الجماعۃ کا مذہب قرار پایا ۔

۴ ۔ امام اشعری کا مذہب بہت دُور دُور تک پھیل گیا اور متکلّمین میں انھیں بہت سے ایسے مددگار مل گئے جنھوں نے علمِ کلام میں انھیں کا مسلک اختیار کیا اور انھیں کے مقرّر کردہ طرز پر کتابیں لکھیں اور مخالفین کا ردّ شروع کیا ۔ انھیں مخالفوں میں معتزلہ بھی تھے، جو ملحدوں، دیگر ملّتوں اور باطل فرقوں (مِلَل و نِحَل[1]) کا ردّ کرنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے کہ اپنے آپ کو فلسفے کے ہتھیاروں سے مسلّح کریں؛ اس لیے اشاعرہ کے لیے بھی لازم ہوا کہ فلسفے کی طرف بہت کچھ توجہ دیں ۔ انھیں وجوہات سے علمِ توحید کی کتابوں میں فلسفے کے بہت سے احکام اور مسائل بھرے پڑے ہیں ۔ لیکن یہ گمان کرنا صحیح نہیں، جیسا کہ اکثروں نے غلط طور پر گمان کیا ہے کہ علم الکلام فلسفے سے پیدا ہوا، کیونکہ علمِ کلام اسلام میں فلسفے کی آمد سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا؛ یہ دوسری بات ہے کہ جب مسلمانوں نے فلسفے کو اپنے اندر جذب کر لیا تو علمِ کلام پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا، اس نے اسے تقویت دی، اسے مضبوط کیا اور مدد کے لیے اسے بہت سے اسلحہ، مسائل، دلائل اور براہین فراہم کر دیے ۔

اشعری کے مددگاروں میں، جنھوں نے ان کے مذہب کی تائید کی اور اسے مشرق اور مغرب میں پھیلایا، قاضی ابوبکر الباقلّانی (م ۴۰۳ھ) ہیں ۔ ان کی تصانیف کے تقریباً پچاس ہزار ورق ہیں جو انھوں نے دین کی تائید اور ملحدین اور مبتدعین کے ردّ میں لکھے ۔ یہ تصانیف غالباً قیامت تک فنا نہیں ہوں گی (الاسفرائنی : التبصیر فی‌الدین، نشر عزت العطار الحسینی، مصر ۱۹۴۰ء، ۱۱۹) ۔ حقیقت میں اس بلند مرتبہ عالم نے مذہبِ اشعری کا امام بننے کا استحقاق حاصل کرنا چاہا ۔ انھوں نے اسے منظّم اور واضح کیا اور اس علم کے مسائل اور اس کے قضیّات کے لیے عقلی مقدّمات اور قواعد وضع کیے، جن پر دلائل کی بناء رکھی جا سکتی ہے، مثلاً جوہرِ فرد اور خلاء موجود ہیں؛ عرض عرض کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتا؛ عرض دو زمانوں میں قائم نہیں رہ سکتا؛ وغیرہ وغیرہ جن پر متکلّمین کے سارے دلائل موقوف ہیں — لیکن اس تمام جودتِ طبعی اور علوِ شان کے باوجود ”انھوں نے اپنے وضع کیے ہوے قواعد پر اعتقاد رکھنا ایسا ہی واجب قرار دے دیا جیسے ایمانی عقائد واجب الاعتقاد ہوتے ہیں اور دلیل یہ دی کہ عقائد کے اثبات کی دلیلیں ان قواعد پر موقوف ہیں؛ دلیل کا باطل ہونا مدلول کے باطل ہونے کی خبر دیتا ہے، [اس لیے اگر دلائل باطل ہیں تو عقائد بھی باطل ٹھیرتے ہیں]“ (ابن خلدون، ۳۶۹) ۔ اس طرح قاضی [باقلّانی] اور ان کے ساتھیوں نے لوگوں پر میدان بہت تنگ کر دیا اور سوچ سمجھ کر آہستہ آہستہ نہیں بڑھے ۔ عقل حیران ہے کہ جس وقت تک یہ دلائل و قواعد معلوم نہ ہوے تھے اس وقت تک ان کی اپنے ایمان کی بابت اور صحابہ اور عام مسلمانوں کے ایمان کی بابت، جنھیں ان کا علم نہ پہلے تھا

[1] اہل الاہواء و النحل : اربابِ دیانات سے ان کا تقابل تقابلِ تضادّ ہے؛ شہرستانی، ۲ : ۹۳]

نہ بعد میں ہوا، کیا راے ہے (الشیخ حسین والی : کتاب التوحید، طبع اول، ۱۹۰۹ء، ۱ : ۵۳) .

۵ - مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان میں باقلّانی کے بعد امام‌الحرمین ابوالمعالی الجُوَینی اور ان سے بھی زیادہ مشہور ان کے شاگرد حجّۃ الاسلام ابوحامد الغزالی پیدا ہوے - ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں امامِ مذہب تسلیم ہوا - ان کی اور ان کے متّبعین کی وہ راے نہیں تھی جو باقلّانی کی تھی کہ دلیل کے باطل ہونے سے مدلول باطل ہو جاتا ہے - ان کے مسلک نے لوگوں پر سے استدلال کی تمام پابندیاں ہٹا دیں - یہ طریقہ طریقۂ متأخّرین کہلاتا ہے اور علمِ کلام کی درس و تدریس میں آج تک سب اسے مسلّم قاعدہ مانتے ہیں .

اس طریقے میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس نے فلسفیوں کے ان مسائل کے ردّ کے لیے جن میں انھوں نے دین سے اختلاف کیا ہے میدان وسیع کر دیا ہے - علمِ توحید کے ساتھ فلسفی ابحاث کے مل جانے کا سبب یہی ہے - "متأخّرین نے اپنی کتابوں کو فلسفے کے مسائل اور ان کے ردّ سے اس قدر بھر دیا کہ حد سے بھی تجاوز کر گئے، (آج کل جامع ازہر میں جو کتب درسیہ رائج ہیں ان میں یہ بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے) - نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دونوں علموں میں کوئی تمیز ہی باقی نہیں رہی - ایک کے مسائل دوسرے کے مسائل سے اس قدر خلط ملط ہو گئے ہیں کہ انھیں ایک سمجھا جانے لگا ہے" (قبّ ابن خلدون، ۳۶۹)، حالانکہ دونوں علم اپنے موضوع اور طریقِ بحث کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے اشارۃً کہا ہے .

علّامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمۃ، ۳۶۹ میں یہ راے ظاہر کی ہے کہ امام غزالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے کلام میں یہ طرز اختیار کی، یعنی ساتھ ساتھ فلسفیوں کا بھی ردّ کیا، لیکن میں ابن خلدون کی اس راے سے مخالفت کرنے پر مجبور ہوں، کیونکہ امام الحرمین کی بعض مؤلّفات مثلاً الارشاد فی قواعد الاعتقاد (اس کا مخطوطہ دارالکتب میں عدد ۸۱۹ توحید پر موجود ہے) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزالی نے فلسفیوں کے ردّ کا طریقہ ان سے سیکھا ہے - اس کی تصدیق مبحثِ قول در بابِ عالم (کتاب مذکور، ورق ۷) اور مبحثِ اثباتِ علم باری (کتاب مذکور، ورق ۱۲) ہی کے مطالعے سے ہو جائے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ ردِّ فلاسفہ میں غزالی نے اپنے استاد سے کس قدر سیکھا ہے - اس صورت میں غزالی کو اوّل شخص نہیں ٹھیرایا جا سکتا جس نے فلاسفہ کی ان راؤں کے ردّ کو، جو ان کے نزدیک مخالفِ دین ہیں، اپنی کلامی کتابوں میں داخل کیا - (سچائی اس بات کے اقرار کی متقاضی ہے کہ میرے ماموں علامۂ مرحوم شیخ حسین والی ابن خلدون کی اس راے سے جس کی میں نے مخالفت کی ہے اتفاق کرتے ہیں (کتاب التوحید، ۵۷)) .

متکلّمین کے اہمّ فرقے :

ہم نے دیکھ لیا کہ علمِ کلام کس طرح معرضِ وجود میں آیا ، کس طرح نشو و نما پا کر اور مختلف اَدوار میں سے گزرتے ہوے اس درجے تک پہنچا جس میں ہم آج اسے دیکھتے ہیں - اب ہم ذیل میں ان کلامیہ فرقوں کا مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں جو کچھ اہمیّت رکھتے ہیں اور جن کی اپنی تاریخ ہے .

بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشبّہہ، معتزلہ اور اشاعرہ کا ایک ساتھ ذکر کیا جائے اس لیے کہ یہ بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے ربط

رکھتے ہیں ۔ ان مسائل کے متعلق پہلے دو فرقوں (مشبہہ اور معتزلہ) کی خصوصی رائیں بالکل ایک دوسرے کی نقیض ہیں اور اشعری اور اشاعرہ کی رائے ان دونوں کے درمیان میں ہے ۔

۱ ۔ قرآن میں ایسی آیتیں موجود ہیں جن کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالٰی کا 'وجہ' اور 'ید' ہیں اور جہت ہے یعنی آسمان اور مکان ہے یعنی عرش اور دیگر باتیں جن سے تشبیہ [رَكّ بآن] اور جسمیّت کا شبہہ اور نقل و حرکت کا گمان ہوتا ہے ۔ بعض آیات سے اللہ تعالٰی کی مختلف صفات مثلاً علم، قدرت اور کلام وغیرہ ثابت ہوتی ہیں اور آیتوں کا ایک تیسرا گروہ ہے جن میں سے بعض سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت باری تعالٰی ممکن ہے ۔ ان آیتوں کے بارے میں سلفِ صالح نے وہی موقف اختیار کیا جو صحابہ اور تابعین کا تھا اور جیسے ابن خلدون نے کہا ہے '' انھوں نے ان دلائل کو جن سے اللہ تعالٰی کا مخلوق کی صفات سے پاك ہونا معلوم ہوتا ہے ترجیح دی، کیونکہ یہ تعداد میں بھی بہت زیادہ ہیں اور ان کے معنی بھی واضح ہیں اور انھوں نے بالکل یقین کر لیا کہ تشبیہ محال ہے اور چونکہ یہ طے شدہ امر تھا کہ قرآن کی تمام آیتیں اللہ کا کلام ہیں، ان سب پر وہ ایمان لائے اور ان کے معنی میں نہ کوئی بحث کی، نہ تاویل'' ۔ (مقدمۃ، ۳۶۷، قبّ الملل و النحل، ۱ : ۱۱۶ - ۱۱۷) ۔ اس مسلک کے اختیار کرنے والوں میں مالک بن انس اور احمد بن حنبل رضی اللہ عنہما ہیں؛ کہتے ہیں کہ مالک بن انس سے جب اس آیت کے معنی پوچھے گئے '' اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی '' تو انھوں نے فرمایا : '' استواء کے معنے معلوم ہیں کیفیت کا علم نہیں ۔ اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی بابت پوچھ گچھ کرنا بدعت ہے'' (المِلَل و النِحَل، ۱ : ۱۱۸) ۔

لیکن ان کے زمانے میں اور ان کے بعد ایک بدعتی جماعت ایسی بھی تھی جس نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ۔ انھوں نے ان آیات اور انھیں کی طرح کی احادیث کو ظاہری معنی پر محمول کیا اور جیسے ان کے الفاظ تھے ویسی ہی ان کی تفسیر کی، تأویل سے کام نہ لیا، لہٰذا یہ لوگ خالص تشبیہ اور صریح تجسیم میں پھنس گئے ۔ ان میں سے بعض نے تو اعتقاد کر لیا کہ اللہ کے ہاتھ، پاؤں اور چہرہ وغیرہ ہیں ۔ بعض نے مان لیا کہ اللہ ایک خاص جہت میں ہے اور وہاں سے جب چاہتا ہے نازل ہوتا ہے اور اس کا ایک عرش ہے جس پر وہ متمکّن ہے؛ اس کا کلام ہے جس کی آواز بھی ہے اور حروف بھی؛ ظاہر ہے کہ پہلوں نے اللہ کی ذات اوروں کے مشابہ مان لی اور پچھلوں نے اس کی صفات اوروں کی صفات کی مانند قرار دیں؛ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں اللہ کو ایک جسمانی شے ماننے لگے (ابن خلدون، ۳۶۷ - ۳۶۸؛ المِلل و النِحَل، ۱ : ۱۱۷) ۔ انھیں مشبہۂ مجسّمہ میں سے غالی حنبلیوں کی ایک جماعت ہے، جنھیں ظاہری الفاظ کی مفرط طرفداری اور الفاظ کے مطابق تفسیر نے اسی گڑھے میں پھینک دیا ۔ جمال‌الدین ابن الجوزی نے اپنی کتاب دفعُ شبہۃِ التشبیہ میں ان افراطیوں کی رائیں بکثرت بیان کی ہیں، جن میں الحسن بن حامد البغدادی الورّاق، جو اپنے زمانے کے شیخ الحنابلۃ تھے، قاضی ابو یعلٰی اور ابوالحسن بن الزاغونی وغیرہ شامل ہیں ۔ ابن الجوزی کتاب مذکور میں ان لوگوں کی بابت کہتے ہیں کہ ہمارے اصحابِ حنابلہ میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اصولِ دین کی بابت نامناسب باتیں زبان

سے نکالی ہیں اور اپنے آپ کو عوام کے مرتبے میں گرا دیا ہے، ان لوگوں نے صفات کو محسوسات میں شامل کر دیا ہے اور اللہ تعالٰی کی ذات کے علاوہ اس کے لیے صورت، چہرہ اور دو آنکھیں، منہ، انگلیاں، ران، دو پنڈلیاں اور دو پاؤں ثابت کیے ہیں ۔ عضدالدین الإیجی نے اس سلسلے میں ان کی ایسی باتیں نقل کی ہیں جن کے سننے سے کان اباء کرتے ہیں (المواقف، مصر ۱۳۰۷ء، ۳: ۲۷)۔

۲ ۔ متشابہ آیات و احادیث کے ظاہری معنی لے کر تشبیہ و تجسیم میں پھنس جانے والوں کے بالکل برعکس معتزلہ ہیں، جنھوں نے اللہ کی وحدت کے سمجھنے میں غلو سے کام لیا اور اس کی تنزیہ میں اتنا مبالغہ کیا کہ صفات کا بالکل انکار کر دیا اور تعطیل میں مبتلا ہو گئے۔

اس فرقے کا سرغنہ واصل بن عطاء (۸۰ھ تا ۱۳۱ھ) ہے، حتّٰی کہ بعض مؤلّفین نے سارے فرقے کا نام ہی بعض اوقات واصلیہ رکھ دیا (الشہرستانی : المِلَل و النِحَل، ۱ : ۵۷) ۔ یہ حسن بصری کا شاگرد تھا، جو اپنے وقت میں اہل سنّۃ کے امام تھے ۔ ایک دن حسن بصری سے کسی نے سوال کیا کہ ان جماعتوں کے بارے میں کیا رائے ہے جن میں ایک تو کبیرہ گناہ کرنے والے کو کافر کہتی ہے اور دوسری ان پر حکم لگانے میں التواء (ارجاء) سے کام لیتی ہے ۔ اس سے قبل کہ حسن بصری جواب دیتے واصل یوں بول اٹھا : ”میں صاحبِ کبیرہ کو نہ مؤمنِ مطلق کہتا ہوں اور نہ کافرِ مطلق، بلکہ وہ دونوں مقاموں کے درمیان ایک مقام میں ہے [فی منزلۃ بین المنزلتین]“ اور یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا اور مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے پاس جا کر اپنے جواب کی تشریح کرنے لگا ۔ اس پر کہا گیا کہ ”اعتزل عنا واصل“ واصل ہم سے علیحدہ ہو گیا ۔ اس وقت سے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا نام معتزلہ پڑ گیا (الملل و النحل، ۶۰) ۔ یہاں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم معتزلہ کی وجہ تسمیہ کی تحقیق کریں، اس لیے ہم اس کی بابت مختلف اقوال سے بحث نہیں کرتے، مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ یہ اس نام کی وجہ ایک ستون کو چھوڑ کر دوسرے ستون کے پاس چلا جانا نہیں معلوم ہوتی، بلکہ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت کے اختلافی مسئلے یعنی مرتکبِ کبیرہ کے حکم میں جو رائے مشہور تھی، انھوں نے اس رائے کو چھوڑ کر اپنی ایک الگ رائے قائم کی ۔

معتزلہ کی اصل میں دو شاخیں ہیں : بصرے کی شاخ، جس کی بنیاد اس واصل نے ڈالی، جسے مسعودی 'شیخ المعتزلۃ' کہتا ہے (مُروج الذھب، طبع دارالرجاء، مصر، ۳ : ۴۵)، اور یہ قدیم شاخ ہے ۔ دوسری کوفے کی شاخ، جو بِشر بن المُعتمِر (م ۲۱۰ھ) نے قائم کی ۔ معتزلہ کے بہت سے فرقے ہیں، جن کے اندر جزئیات اور تفاصیل میں اختلاف ہے، لیکن وہ سب کے سب پانچ اصول میں متّفق ہیں : (۱) توحید؛ (۲) عدل؛ (۳) وعد و وعید؛ (۴) المنزلۃ بین المنزلتین [یعنی ایمان و کفر کا درمیانی مرتبہ] اور (۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ۔ جو فرقہ ان پانچ اصولوں کو نہ مانتا ہو وہ معتزلہ کے لقب کا مستحق نہیں (ابوالحسین الخیّاط المعتزلی : الانتصار، نشر ڈاکٹر [نُوبِرْگ Nyberg]، و طبع دارالکتب ۱۹۲۵ء، ص ۱۲۶) ۔ بہت سے مؤلّفین نے ان اصول کی تشریح اور تجزیے میں خامہ فرسائی کی ہے جن میں سے بعض [مؤلّفین اور ان کی کتابوں] کے نام یہ ہیں : الخیّاط المعتزلی نے الانتصار میں؛ مسعودی نے مُروج الذھب (۳ : ۱۵۳ - ۱۵۴) میں، شہرستانی نے المِلَل و النِحَل میں (۱ : ۵۱ ببعد) ۔

ان کے علاوہ دیگر متکلّمین بھی ان کی بابت بہت کچھ لکھ چکے ہیں، اس لیے ہمیں یہاں ان کی تشریح و تحلیل میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں.

پہلے اصول یعنی توحید کے مطابق ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اللہ کو مخلوق کی صفات سے منزّہ ٹھیرانے میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ اس کی باطنی [اور ظاہری] دونوں قسم کی صفات کا انکار کر دیا ۔ باطنی، یعنی علم، قدرت، حیات اور ارادے کا تو اس لیے کہ اس میں بہت سی چیزیں قدیم ماننا پڑتی ہیں اور ظاہری، یعنی سمع، بصر اور کلام کا اس لیے کہ یہ جسم کے لوازم ہیں (ابن خلدون، ۳۶۸؛ تفتازانی : مقاصد، ۲ : ۴۵) ۔ انھوں نے صفات کے انکار میں اس قدر غلو کیا کہ ان کا نام 'مُعطّلة' بھی پڑ گیا (المِلَل و النِحَل، ۱ : ۱۱۶؛ مقاصد، ۴۵)، یعنی وہ لوگ جنھوں نے ذات کو اس کی صفات سے عاری کر دیا ۔ ان کے مقابل ان سلف کو جو صفات کے قائل ہیں ' صفاتیة ' لقب دیا گیا.

خود معتزلہ نے جو توحید کی تشریح کی ہے اس کی بہترین شکل وہ ہے جسے الاشعری نے اپنی نفیس کتاب مقالات الاسلامیّین (ص ۱۵۵ - ۱۵۶) میں ان سے نقل کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ : اللہ ایک ہے، اس کا مثل کوئی نہیں ہے؛ چنانچہ وہ نہ جسم ہے نہ صورت، نہ جوہر ہے نہ عرض ۔ اس کا نہ کوئی رنگ ہے نہ بو، نہ موضعِ لمس ۔ اس کا طول، عرض اور عمق بھی نہیں ہے ۔ نہ وہ متحرك ہے نہ ساکن ۔ اس کے اعضاء و جوارح کچھ نہیں ہیں ۔ اس کے لیے جہتیں نہیں ہیں، نہ کوئی مکان اسے محیط کیے ہوے ہے ۔ اسے چھونا ناممکن ہے ۔ حواس اسے محسوس نہیں کر سکتے ۔ اسے انسان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ کسی طرح مخلوق کے مشابہ ہے ۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں ۔ کان اسے سن نہیں سکتے ۔ اسی طرح ان تمام صفات سلبیہ کا بیان ہے، جنھیں معتزلہ [کے پانچ اصولوں میں سے] پہلی اصل مانتی ہے، یعنی اللہ کو ہر چیز میں یکتا جاننا اور اسے اس کی خلق کی مشابہت سے ہر بات میں، جو کسی کے خیال میں گزری ہو یا نہ گزری ہو، پاك صاف ٹھیرانا.

اس طرح معتزلہ کی رائے کی بنیاد اس مسئلے میں یہ ہوئی کہ آیاتِ تنزیْہ کو ان کے اصل معنی میں مانا جائے اور آیاتِ متشابہات کی تأویل اس طرح کی جائے کہ وہ اس تنزیْہ اور توحید کے ساتھ، جنھیں اسلام سکھانا چاہتا ہے، متّفق ہو جائیں ۔ اس کے مطابق انھوں نے ' استواء علی العرش ' کے معنی استیلاء یعنی غلبہ کے کیے، ید سے مراد قدرت یا نعمت لی اور آیت ’’ وَ لِتُصْنَعَ عَلَی عَیْنِی ‘‘ میں عین کے معنی علم کیے (مقالات الاسلامیّین، ۱۵۵) اور اس بات پر اجماع کر لیا کہ اللہ تعالٰی کو آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا (وہی کتاب، ۱۵۷)، کیونکہ ان کے نزدیک رؤیت کے لیے جہة اور جسم ضروری ہے.

اس کے ساتھ ساتھ سب فرقوں سے زیادہ یونانی فلسفے سے لگاؤ رکھنے والے اور اس سے استفادہ کرنے میں تیز رو معتزلہ ہی تھے اور اس پر وہ مجبور بھی تھے، کیونکہ انھوں نے اپنے ذمے یہ کام لے لیا تھا کہ دین اور اس کے عقائد کی حمایت کریں اور اپنے مخالفوں کا، جو دوسری ملّتوں اور نِحلوں[۱] سے متعلق ہیں، ردّ کریں ۔ اس میدان میں ان کے بہت سے قابلِ ذکر مشاہیر گزرے ہیں، مثلاً : ابوالہَذَیل العَلّاف، جو ان میں سب سے بڑا شیخ گزرا ہے، جیسا کہ شہرستانی نے کہا ہے (شہرستانی، ۱ : ۳۳) ۔ اس

[[۱] دیکھیے ص ۶۸۸ کا حاشیہ]

کا زمانہ دوسری اور تیسری صدی ہجری ہے؛ اس کا شاگرد ابراہیم بن سیّار النظّام (م ۲۲۱ھ)، جس نے اپنی زندگی کا مقصد ملحدوں اور خاص کر دھریوں کا ردّ کرنا ٹھیرا لیا تھا؛ الجاحظ جو نظّام کا شاگرد اور اس کا تیار کردہ تھا (م ۲۵۵ھ، بقول ابن خلّکان) ۔ اس کی عمر نوے سال سے زیادہ ہوئی ۔ وہ عمر بھر معتزلہ کی حمایت میں بولنے والی زبان تھا ۔ وہ یونانی فلسفے میں گزشتہ لوگوں سے زیادہ ماہر تھا ۔ اس سے اُسے اپنے حمایت کے کام میں بہت زیادہ مدد ملی ۔ دین کی مدد میں اور ملحدوں کے ردّ میں ان کی یہی کوششیں تھیں جن کی بناء پر ابو الحسین الخیّاط نے کہا : ”صاحب الکتاب (ابن الراوندی) جیسے ملحدین توحید کے دفاع پر آفت برپا کرتے، اگر مسلمانوں میں ابراہیم اور اس جیسے علماء نہ پیدا ہوتے، جنھوں نے توحید کی نگرانی اور اس کی اعانت اپنے ہاتھ میں لی اور ملحدین نے جب بھی اس پر حملہ کیا وہ اس کی حمایت کے لیے سینہ سپر ہوے ۔ یہی وہ لوگ تھے کہ جس وقت دنیادار لذّاتِ دنیوی اور عیش و عشرت کا سامان جمع کرنے میں مشغول تھے، انھوں نے اپنا شغل ملحدوں کا جواب دینا اور ان کے ردّ میں کتابیں لکھنا ٹھیرایا“ (الانتصار، [۱م]) .

ان حالات کا علم ہو جانے کے بعد اگر کوئی محقّق اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ معتزلہ ھی تھے جنھوں نے علمِ کلام کو اس نہج پر ڈالا، اس طرح پر کہ دین کی حمایت کے لیے سینہ سپر ہو گئے اور جو فرقے ان کے نزدیک حق کے مخالف تھے، خواہ وہ مسلموں میں سے تھے یا غیرمسلموں میں سے، ان کی بات ردّ کرنے کے لیے آگے آ گئے، تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا.

شہرستانی اس بارے میں لکھتا ھے : ” اس کے بعد معتزلہ کے بڑے بڑے علماء نے فلسفیوں کی تصنیفات کا مطالعہ کیا، جن کی تفسیر مأمون کے زمانے میں کی گئی اور ان کے طریقے کلام کے طریقوں سے مخلوط ہو گئے اور پھر یہ علم، علوم کا ایک مستقل شعبہ ہو گیا اور انھوں نے اس کا نام علمِ کلام رکھ دیا (الملَل و النحَل، ۱ : ۳۲) ۔ اس مقام پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس علم کی تخلیق جو معتزلہ نے کی تو یہ اچھا ہوا کہ بُرا، اس لیے کہ اس محدود بحث کے اندر اس کی گنجائش نہیں، اس فیصلے کا مقام اَور ھے .

۳ ۔ بہر حال اس عبوری دور میں اشعری کا ظہور ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب مختلف عقیدے، فرقے، مذاھب اور آراء ایک دوسرے سے بر سرِ پیکار تھیں ۔ اشعری نے آ کر اپنے طریقے کی بنیاد رکھی، جو بعد میں مذھب اھل السنة و الجماعة کے نام سے مشہور ہوا، جس میں محدّثین، اھل الرأے اور فقہاء کے تمام فرقے شامل تھے، یعنی یہ لوگ حق کے طالب تھے، جن سے مبتدعین خارج تھے (الاسفرائنی : التبصیر فی الدین، ۱۶؛ ابن حزم، ۲ : ۱۱۳) ۔ اس مذھب کا بانی ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری تھا، جو بصرے میں پیدا ہوا اور جس نے سب سے زیادہ معتبر قول کے مطابق ۳۳۰ھ میں وفات پائی.

یہاں یہ ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ الاشعری کا، جو اھل السنّة کے امام ھیں، نشو و نما اعتزال پر ہوا اور انھوں نے ابوعلی الجُبّائی کی شاگردی کی تا آنکہ اپنے زمانے میں معتزلہ کے امام بن گئے اور یہ کہ واصل بن عطاء ابتداء میں سلف کے مسلک کے پیرو اور حسن بصری [۲] کے شاگرد تھے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہی وجہ تھی کہ جب الاشعری اپنے جدید مسلک کے ساتھ سامنے آئے تو لوگ انھیں شک کی نظر سے دیکھنے لگے ۔ ان شک کرنے والوں میں ان کے

پہلے رفقاء معتزلہ اور ان کے نئے پیرو یعنی اہل السنّۃ دونوں ہی شامل تھے ۔ یہ بے اعتباری اس حد تک بڑھی کہ حنبلیوں نے انھیں کافر قرار دیا اور ان کا قتل جائز کر دیا ۔

اشعری کی کوشش یہ تھی کہ تمام متعارض اور متناقض فرقوں کی راؤں خصوصاً ان کے پہلے رفقاء یعنی معتزلہ کی آراء میں محاکمہ کرنے کے لیے عقل اور فکرِ سلیم کو حکم ٹھیرایا جائے ۔ آخر کار بہت سے مسائل میں انھیں ایک ایسی درمیانی رائے مل گئی جو جمہورِ مفکّرینِ معتبر کے نزدیک صحیح تھی ۔ اس بارے میں ابن خلدون پہلے تو مختصر طور پر مشبّھۃ اور مجسّمۃ کی آراء اور معتزلہ کے وہ عقائد جو مذہبِ سلف کے مخالف تھے بیان کرتا ہے ۔ من جملہ ان کے وہ رائے ہے جو انھوں نے قرآن [مجید] کی بابت قائم کی اور اسے مخلوق قرار دیا ، جس کی وجہ سے عہد مأمون میں اور اس کے بعد ان کے اور ان سے مختلف رائے رکھنے والوں میں مشہور خون ریز فتنہ برپا ہوا ۔ اس کے بعد ابن خلدون کہتا ہے کہ ان اسباب کے باعث اہل السنّۃ ان عقائد کے خلاف دلائلِ عقلیّہ کی تلاش میں لگ گئے تا کہ ان بدعتوں کا ردّ کریں ۔ اس کام کو امام المتکلّمین شیخ ابوالحسن الاشعری نے سنبھالا اور ان تمام طریقوں میں درمیانی طریقہ اختیار کیا ۔ انھوں نے تشبیہ کو باطل ٹھیرایا اور صفاتِ معنوی ثابت کیں اور اللہ تعالٰی کی تنزیہ کے لیے وہی حدّ قائم رکھی جو سلف نے قائم کی تھی اور جس کی عمومیت پر مخصوص دلیلیں شاھد تھیں ۔ اس بارے میں تمام بدعتوں کا ردّ کیا ۔ بعض اقوال میں، جو انھوں نے ان بدعتوں کی تمہید کے طور پر تیار کیے تھے، مثلاً اللہ وھی کرتا ہے جس میں بہتری ھو یا نسبۃً بہتری ھو، یا اچھا کسے کہتے ھیں اور برا کسے کہتے ھیں، ان سب میں ان سے بحث اور گفتگو کی اور حق واضح کیا اور مرنے کے بعد پھر جینے کا عقیدہ، جنت اور دوزخ [کی کیفیات]، ثواب و عقاب، ان سب کو مکمّل طور پر ثابت کیا اور اس کے ساتھ بحث امامت کو بھی شامل کر دیا، کیونکہ امامیّہ نے [کہا] کہ مسئلۂ امامت ایمان کے عقائد میں داخل ہے (مقدمۃ، ۳۶۸).

اشعری کی منزلت اور اس کے اس علم [کلام] پر اثر کے بارے میں حافظ ابن عساکر الدمشقی (م ۵۷۱ھ) کہتے ھیں : ”اس زمانے میں بدعتوں کا بازار گرم تھا ۔ معتزلہ جادّۂ اعتدال سے ھٹ گئے تھے ۔ انھوں نے ربّ العالمین کی ان صفات سے انکار کر دیا تھا جو اس نے خود اپنے لیے ثابت کی تھیں ۔ مشبّہہ دوسری طرف حد سے بڑھ گئے تھے ۔ وہ اس وھم میں مبتلا ھو گئے تھے کہ ان کے رب کا جسم ہے، جو مشخّص و ممیّز ھوتا ہے اور جدا جدا ھو جانے اور مل جانے دونوں کے قابل ہے ۔ آخرکار اشعری آئے اور ان لوگوں سے جنھوں نے اللہ کے اسماء و صفات میں الحاد کا قصد کیا بر سر پیکار ھوے اور سنت کے مخالفوں کو دلیل سے خاموش کیا ۔ انھوں نے نہ تعطیل کی جانب مبالغہ کیا اور نہ تشبیہ میں حد سے گزرے بلکہ ان دونوں کی درمیانی راہ اختیار کی (تعیین کذب المفتری، نشرالقدسی، دمشق ۱۳۴۷ھ، ص ۲۵ - ۲۶).

اشعری کا جادّۂ اعتدال اختیار کرنا نیز بعد کے بڑے بڑے مفکّرین کا، جنھوں نے ان کی رائے کی تائید کی اور ان کے مذھب کو مذھب اھل السنّۃ و الجماعۃ قرار دیا، بہت سے مسائل میں ظاھر ہے ۔ ھم ان میں سے تین مسائل کا یہاں ذکر کرتے ھیں جو ھمارے نزدیک ان میں سب سے اھم ھیں ۔ وہ مسائل یہ ھیں : [۱] مسئلۂ صفات؛ [۲] مسئلۂ کلام اور مسئلۂ کلام کی ذیلی بحث کہ

قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق اور [۳] مسئلۂ رؤیت باری تعالٰی .

[۱] صفات کے مشکل مسئلے میں اشعریوں نے معلوم کر لیا کہ مشبّھة اور مجسّمة نے ظاھر کو حجت قرار دے کر اپنی عقلوں کو معطّل کر دیا اور اللہ عزّ و جلّ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنے لگے جنھیں کوئی عاقل پسند نہیں کر سکتا اور کہا کہ اللہ تعالٰی کے لیے ایک خاص جہت ہے ۔ اس کے لیے مکان ہے ۔ اس کے اجزاء ھیں و علٰی ھذا اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ معتزلہ دوسری طرف حد سے بڑھ گئے اور اللہ کی صفات کا سرے ھی سے انکار کر دیا اور اس طرح یہ تعطیل کے قائل ھو گئے ۔ اشعریوں نے یہ بھی جان لیا کہ حق ان دونوں کے درمیان ہے ؛ چنانچہ انھوں نے اللہ کے لیے صفات علم و قدرت وغیرہ)، جس سے اس کو جسم ماننا یا مخلوق کے متشابہ ماننا لازم نہیں آتا، ثابت کیں اور اس طرح وہ واقعةً افراط و تفریط سے بچ کر بیچ کے سیدھے راستے پر قائم ھو گئے .

اسی طرح دوسرے مشکل مسئلے یعنی کلام کے بارے میں کہ آیا وہ حادث ہے یا قدیم اور قرآن کے بارے میں کہ آیا وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق، اشعریوں نے دیکھا کہ حنبلی اور حشویہ ادھر چلے گئے ھیں کہ آواز اور حروف باوجود ان کے اجزاء کے ایک دوسرے کے بعد پے در پے آنے کے جس میں بعد کا جزء اپنے سے پہلے جزء پر ترتیب پاتا ہے ازل میں ثابت ھیں اور اللہ تعالٰی کی ذات کے ساتھ قائم ھیں اور یہ بھی کہنے لگے کہ پڑھنے والے کی جو آواز سننے میں آتی ہے اور قرآن کی سطریں جو آنکھوں کے سامنے ھیں یہی بعینہ اللہ کا کلام قدیم ہے اور بعض تو اس سے بھی بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ قرآن کی جلد اور غلاف بھی ازلی ھیں، اور بعض لوگ کہنے لگے کہ یہ جسمانی مرکّب (سیاھی)، جس سے قرآن لکھا جاتا ہے اور حرفوں اور کلموں کی شکل میں نمایاں ھوتا ہے وہ بعینہ اللہ کا کلام ہے، جو پہلے حادث تھا اور بعد میں قدیم ھو گیا (المقاصد، ۲ : ۷۴؛ المواقف، طبع مذکور، ۲۹۳) ۔ ایسے ھی انھوں نے دیکھا کہ معتزلہ اس بات کے قائل ھو گئے کہ قرآن حادث اور مخلوق ہے کیونکہ انھوں نے کہا کہ وہ حروف سے مرکّب ہے، جن کے حادث ھونے میں کوئی شبہ نہیں، اس لیے انھوں نے کہا کہ کوئی حادث چیز اللہ کی ذات سے تعلق نہیں رکھ سکتی ۔ اسی بناء پر وہ کہتے ھیں کہ اللہ کا متکلّم ھونا مسلّم ہے، کیونکہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے معنی یہ ھیں کہ اس نے بعض خاص جسموں کے اندر کلام پیدا کر دیا، جیسے لوح محفوظ، جبریل اور نبی علیہ السلام میں (المقاصد، ۲ : ۷۴؛ المواقف، ۲۹۳ - ۲۹۴) .

اسی طرح اشعریوں نے حنابلہ اور معتزلہ دونوں کی آراء کا جائزہ لیا اور دونوں فریقوں کی دلیلوں میں غور کیا اور انھیں عقل و انصاف کے ترازو میں تولا اور اس نتیجے پر پہنچے اور فیصلہ کیا کہ حنابلہ کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ قرآن قدیم ہے لیکن ان کا یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ قرآن انھیں الفاظ و حروف کا نام ہے جنھیں ھم صحیفوں کی صورت میں لکھا ھوا دیکھتے ھیں، اپنے کانوں سے سنتے اور اپنی زبان سے پڑھتے ھیں، بلکہ قرآن صرف اس نفسی معنی کا نام ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے ۔ اسی طرح انھوں نے معتزلہ کی اس بات کو ٹھیک مان لیا کہ آواز و حروف سے ترکیب دی ھوئی عبارت اس ترتیب پر جو مشہور و معروف ہے حادث ہے لیکن یہ وہ قرآن نہیں جو محلّ نزاع ہے، کیونکہ قرآن تو، جیسا کہ ھم پہلے کہہ چکے ھیں، معنی نفسی ہے، جو اللہ کی ذات

کے ساتھ قائم ہے اور اس کے قدیم ہونے میں شک کی کوئی گنجائش ھی نہیں (مواقف، ۲۹۴؛ مقاصد، ۴۷ ببعد) ۔ اشاعرہ کی یہ راے جو ہم بیان کر رہے ہیں تمام کتب توحید میں جو ہمارے پاس ہیں درج ہے اور جامع ازہر میں اسی کی تعلیم دی جاتی ہے، خود الاشعری کی کتاب الابانة اور کتاب مقالات الاسلامیین میں موجود ہے (ص ۲۹۲) اور غزالی نے اپنی کتاب الاقتصاد میں دی ہے (ص ۵۳ ببعد).

ان دونوں مسئلوں کے بعد اب مسئلۂ رؤیت باری تعالٰی باقی رہ گیا ۔ آیا یہ جائز ہے یا ممتنع اور جائز ہے تو اس کی کیفیت کیا ہے ؟ حنابلہ اور مشبّهہ ظاہرِ آیات اور احادیث کی پیروی کرتے ہوے اسے دنیا ھی میں جائز قرار دیتے ہیں، جیسا کہ جمال الدین ابن الجوزی نے اپنی کتاب دفعِ شبہۃِ التشبیه (۲۹ ببعد) میں ذکر کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک جہت اور ایک مکان میں واقع ہو سکتی ہے (المقاصد، ۲ : ۸۲)؛ اُدھر معتزلہ اسے بالکل محال کہتے ہیں، کیونکہ اس کے لیے ان کی راے میں ایک مقررہ جہت کی ضرورت ہے، جہاں دیکھنے والا اس چیز کے بالکل آمنے سامنے ہو جسے وہ دیکھتا ہے ۔ ان کا یہ قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے (نیز دیکھیے المواقف، ۳۰۷ ببعد) ۔ پھر اشاعرہ آئے اور انھوں نے یہ راے قائم کی کہ دنیا میں رؤیت باری تعالٰی گو جائز ہے لیکن اس کا وقوع آخرت میں ہوگا اور اس کے لیے اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ جسے دیکھنا ہے وہ کسی جہت یا مکان میں ہو اور بغیر اس کے کہ جسے دیکھنا ہے اس کی صورت کا نقشہ دیکھنے والے کی آنکھ کی پتلی میں کھنچ جائے اور بغیر اس طرح کی اَور باتوں کے کہ ان سے تشبیہ لازم آتی ہے (المواقف، ۲۹۹ ببعد؛ المقاصد، ۲ : ۸۲ ببعد) ۔ چنانچہ اس مسئلے میں بھی پہلے دو مسائل کی طرح اشاعرہ کی راے دونوں فریقوں کے بین بین رہی؛ نہ تو وہ معتزلہ کی طرح مطلق نفی رؤیت کے قائل ہوے اور نہ حنابلہ کی طرح ایسے جواز (بلکہ اس کے وقوع کے بھی) قائل ہوے جس سے اللہ تعالٰی کے لیے جہۃ، مکان اور آمنا سامنا لازم آتا ہے، جیسا کہ حادث چیزوں کی صورت میں ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کا زیر بحث لانا بھی مناسب ہے کہ اشاعرہ بعض متعارض مذاهب اور آراء کے درمیان تطبیق کی کوششوں میں، جن کا تھوڑا بہت ذکر ہم نے پہلے کیا، کس حد تک کامیاب ہوے، ہماری راے میں وہ مسئلۂ صفات میں کامیاب نہیں ہوے ۔ کوئی ایسی قطعی دلیل نہیں ہے کہ اللہ کے لیے ایسی صفات جو اس کی ذات سے زائد ہوں ثابت کرتی ہو ۔ کلام کے بارے میں فقط اتنا ھی کہنا چاہیے کہ وہ متکلّم ہے، قادر ہے، عالم ہے وغیرہ ۔ اگر اشاعرہ اسی پر اکتفا کرتے اور اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتے کہ صفات ذات سے زائد ہیں تو ذات کے ساتھ اَور قدیم چیزوں کی کثرت ان کے لیے اسی طرح لازم نہ ہو جاتی کہ اس سے نہ وہ بھاگ سکتے ہیں اور نہ اس کا دفاع کر سکتے ہیں .

ہاں مسئلۂ کلامِ باری تعالٰی میں انھیں کامیابی نصیب ہوئی ۔ انھوں نے کلامِ لفظی میں، جسے ہم پڑھتے ہیں اور کلام نفسی میں، جو اللہ تعالٰی کی ذات کے ساتھ قائم ہے، فرق قائم کیا اور کہا کہ کلامِ لفظی حادث اور کلامِ نفسی قدیم ہے ۔ اس میں لغت، نقل اور عقل سب نے وھی فیصلہ دیا جو ان کا ہے ۔ اس سے ایک طرف تو قرآن کو مخلوق کہنے کی اباحت سے بچ گئے اور دوسری طرف قرآن سے متعلّق ہر چیز حتّی کہ جلد اور غلاف

تک کو قدیم کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔
اسی طرح رؤیت کے مشکل مسئلے میں بھی ان کی مساعی کامیاب ہوئیں۔ یہاں انھوں نے پہلے تو اللہ تعالٰی کو ہر اس چیز سے جس سے تشبیہ اور تجسیم کا وہم پیدا ہوتا تھا منزّہ قرار دیا جس میں مشبّہہ اور مجسّمہ مبتلا ہو گئے تھے، اس کے بعد جب آیات و احادیث میں ایسی تصریحات دیکھیں جن سے رؤیت کا جواز ثابت ہوتا ہے تو رؤیت کے قائل ہو گئے، اس طرح پر کہ اس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں اور ان عادی باتوں کے بغیر جو حادث چیزوں کے بارے میں ضروری ہیں، مثلاً مرئی کا محدود ہونا، کسی جہت میں اور مکان میں ہونا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ عقلِ سلیم کے نزدیک محال نہیں۔

اب ہم مختصر سا ذکر خوارج، مرجئہ اور شیعہ کا کرتے ہیں، تا کہ ہم اپنے وعدے کے مطابق، جو ہم نے ابتدائے بحث میں کیا تھا، متکلّمین کے کل اہمّ فرقوں کے ذکر سے فارغ ہو جائیں۔

۴۔ خارجیوں کا ظہور حضرت علی و معاویۃ رضی اللہ عنہما کے باہمی نزاع کا نتیجہ تھا۔ حزب سیاسی کی حیثیت سے ان کی تأریخ نے اسلامی سلطنت پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ چونکہ یہ سب باتیں عام طور پر معلوم ہیں اس لیے ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تو ہمیں بعض مسائل دینیہ کے بارے میں ان کی رائے کا جائزہ لینا ہے، جو انھیں اپنے سیاسی حالات کی وجہ سے قائم کرنا پڑی۔ دین میں ان کی سخت گیری سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے طے کیا کہ ایمان فقط اعتقاد کا نام نہیں، بلکہ اس کے ساتھ اللہ کے ان احکام کی تعمیل بھی ضروری ہے جو اس نے نازل کیے؛ لٰہذا جو آدمی اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرے اور اس کے بھیجے ہوے رسولوں کو سچا مانے لیکن اس کے احکام کی تعمیل نہ کرے وہ کافر ہے۔ یہاں سے سیاسی جھگڑا، جو خلافت کی بنا پر چلا اور اس پر کہ اس کا مستحق کون ہے، نہایت گہرا دینی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اسی کے گرد خوارج، شیعہ اور مرجئہ فرقے پیدا ہو جاتے ہیں۔

خوارج کے بیس فرقے ہیں جو آپس میں جزئی مسائل اور تفصیلات میں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن وہ سب دو اصل پر متّفق ہیں: [۱] علی، عثمان رضی اللہ عنہما، اصحاب جَمَل، دونوں حَکَم، [عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور ابو موسٰی الاشعری رضی اللہ عنہ] اور جو دونوں حَکَموں سے راضی ہوے سب کے سب کافر ہیں؛ [۲] مسلمانوں میں جو بھی گناہ کا مرتکب ہو وہ کافر ہے (التبصیر، ۲۶؛ شہرستانی: المِلَل و النِحَل، ۱: ۱۵۴ ببعد؛ المقاصد، ۲: ۱۸۲)، کیونکہ ایمان علم و عمل دونوں کا نام ہے۔ یہ مسئلہ علمائے کلام کے نزدیک مسئلۂ مرتکب الکبیرۃ کے نام سے مشہور ہے کہ آیا وہ کافر ہے یا مؤمن یا مؤمن اور کافر کے بَین بَین؛ اس پر خوارج، مرجئہ اور معتزلہ کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن حزم نے ذکر کیا ہے کہ خارجیوں کے مذہب کے متّفق علیہ بنیادی مسائل چار ہیں: [۱] ایمان اور کفر کی کیفیت کیا ہے؛ [۲] مؤمن اور کافر کے القاب کا مستحق کون ہے؛ [۳] وعد؛ [۴] امامت۔ ان کے علاوہ اور مسائل میں ان کا باہمی اختلاف ہے، جیسے کہ اوروں کا بھی باہمی اختلاف ہے (الفِصَل، ۲: ۱۱۳)۔ اس لحاظ سے اسفرائنی: التبصیر کے اور ابن حزم کے بیانوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

مرتکبِ کبیرہ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امّت اس کے حُکْم اور نام کے بارے میں کئی مذہبوں میں بٹ گئی ہے اور ہر ایک مذہب اپنی

معتمد علیه دلیلوں پر اعتماد کرتا ہے ۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ وہ مؤمن ہے ۔ خوارج کی رائے میں وہ کافر ہے ۔ معتزلہ ان دونوں کے بین بین ہیں ۔ ان کی رائے یہ ہے کہ وہ نہ مؤمن باطلاق ہے نہ کافر باطلاق، بلکہ ایمان اور کفر کے درمیانی مقام میں ہے (المقاصد، ۲ : ۱۸۹؛ المواقف، طبع مذکور، ۳۸۴ ببعد) ۔ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف ایمان اور کفر کی تعریف پر متفرّع ہے ۔

۵ - جیسے خوارج کے ہاں یہ مسئلہ ایمان اور کفر کی تعریف کے گرد دائر ہے مُرجِئَة کے ہاں بھی اس کا یہی حال ہے (ابن حزم : الفِصَل، ۲ : ۱۱۲) ۔ مُرجِئَة وہ فرقہ ہے جس کی رائے میں ایمان تصدیق کا نام ہے، یعنی دل سے اللہ کی معرفت ۔ اس میں زبان سے اقرار کرنا اور بدنی اعضاء سے عمل کرنا داخل نہیں ۔ بعض نے معرفت بالقلب کے ساتھ اقرار باللسان کی بھی شرط لگائی ہے اور بعض نے تو بہت غلو کیا ہے ۔ ان کے نزدیک ایمان فقط زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے، خواہ دل میں کفر ہی ہو ۔ غرض اس پر سب متّفق ہیں کہ ایمان کے مفہوم میں عمل داخل نہیں (کتاب مذکور، ۴ : ۲۰۴؛ الشہرستانی ، ۱ : ۱۸۶ - ۱۸۷) ۔ ایمان کے متعلق یہی رائے رکھنے کی وجہ سے شاید ان کا نام مُرجِئَة رکھا گیا ، یعنی وہ ایمان کے ساتھ عمل میں ارجاء اور تأخیر کے قائل ہیں : چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ایمان صحیح ہو تو گناہ سے نقصان نہیں پہنچتا، جیسے کفر ہو تو طاعت کام نہیں آتی (التبصیر، ۶۰) ۔

مُرجِئَة کے ظہور کا پہلا باعث سیاسی تھا، کیونکہ اس کی اصل مسئلۂ امامت اور علی[رض] اور معاویۃ[رض] کے باہمی جھگڑے تک پہنچتی ہے : انھوں نے دیکھا کہ خوارج نے کبیرہ گناہ کرنے والوں کو کافر قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک علی اور عثمان اور شیعہ، جو اس کے قائل ہیں کہ امام اور اس کی طاعت ایمان کے جزء ہیں، مرتکب کبیرہ ہیں اس لیے وہ انھیں کافر کہتے ہیں، جیسا کہ آگے مذکور ہوگا ، اس لیے مُرجِئَة نے خود ایمان کے بارے میں سوچا کہ ایمان کیا چیز ہے اور اس بارے میں اپنی [مشہور] رائے قائم کی اور اس بنا پر ان مختلف فرقوں میں سے انھوں نے کسی کو بھی کافر نہیں ٹھیرایا، لیکن چونکہ وہ خوارج کے بالکل نقیض تھے اس لیے دونوں کا آپس میں سخت جھگڑا تھا ۔ اسی طرح ان کا معتزلہ سے بھی شدید اختلاف تھا؛ کیونکہ خوارج اور معتزلہ دونوں نے عمل کو ایمان کا ایک ایسا جزء قرار دیا تھا جس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا ۔

یہی وجہ ہے کہ ان فرقوں میں سے بعض نے اپنے مذہب کی تائید اور مخالفین کے ردّ میں کتابیں تألیف کیں ۔ ابن الندیم نے بیان کیا ہے کہ الیمان بن رباب نے، جو خارجی تھا اور ان کے بڑے لوگوں میں سے تھا، چند کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک کتاب معتزلہ پر ہے، جس میں مسئلۂ قدر پر بحث کی ہے [کتاب علی المعتزلة فی القدر] اور دوسری مُرجِئَة کے ردّ میں ہے [کتاب الردّ علی المُرْجِئَة] (الفہرست، ۲۵۸؛ [طبع فلوگل، ۱۸۲]) ۔ اسلامی فرقوں میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

۶ - اخیر میں ہم فرقۂ شیعہ کو لیتے ہیں جو چھے بڑے بڑے فرقوں میں سے چھٹا فرقہ ہے ۔ ہم اس کی طرف پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ خلافت کا مسئلہ اُن سخت پیچیدہ مسائل میں سے ہے جس سے مسلمانوں کو سب سے پہلے پالا پڑا اور اسی اختلاف کی وجہ سے تین بڑے فرقے خوارج، شیعہ اور مُرجِئَة وجود میں آئے ۔

اصل میں شیعہ کسی آدمی کے پیرووں اور مددگاروں کو کہتے ہیں، اسی لیے ابتداء میں ایک جماعت شیعیان علی[رض] اور ایک اور جماعت شیعیان معاویۃ[رض] کہلاتی تھی ۔ [حضرت] علی[رض] کی وفات کے بعد جب [حضرت] حسن[رض] خلافت سے کنارہ کش ہوے اور [حضرت] معاویۃ[رض] ایک جماعت یا خاص فرقے کے سردار ہونے کے بجاے امت کے سردار ہو گئے تو شیعہ لفظ صرف [حضرت] علی[رض] اور ان کی اولاد کی جماعت کے لیے بولا جانے لگا ۔

. . . .

یہاں ہم فقط اس اہم اختلافی مسئلۂ امامت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جسے انھوں نے دین کا لباس پہنایا اور اس طرح وہ علمِ کلام کا ایک مسئلہ بن گیا (ابن خلدون : مقدمۃ، ٣٦٨؛ مقاصد، ٢ : ١٩٩ تا ٢٠٠) ۔ امامت کے مسئلے کو چھوڑ کر باقی بہت سے کلامی مسائل میں وہ معتزلہ سے متّفق ہیں ۔

شیعہ کے بہت سے فرقے ہیں لیکن تقریباً سب کے سب ذیل کے فرقوں میں آ جاتے ہیں : [١] غالیہ : یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے [حضرت] علی[رض] کے وصف میں حد سے بڑھ کر مبالغہ کیا اور ان کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہہ ڈالیں جن کے متعلق نہ [حضرت] علی[رض] کا منشاء تھا اور نہ اللہ تعالٰی نے اس کے متعلق اجازت دی؛ [٢] کَیْسانیہ : یہ کَیْسان کی طرف منسوب ہیں جو مختار بن عُبَید الثقفی کے لشکر کا سردار تھا یہ مختار [حضرت] حسین[رض] کے خون کا بدلہ لینے اٹھا تھا اور محمد بن الحَنَفِیّۃ[رض] کا داعی تھا؛ [٣] زیدیہ : جو زید بن علی بن زین‌العابدین بن الحسین علیہما السلام کی طرف منسوب ہیں؛ [٤] امامیہ : جو علی زین العابدین[رض] کے انتقال کے بعد خلافت کا مستحق [ان کے بیٹے امام] محمد الباقر کو مانتے ہیں [زید بن علی زین العابدین کو نہیں مانتے] ۔

ان بڑے فرقوں سے اور بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں، جو ایک دوسرے سے بعض مسائل میں اختلاف رکھتی ہیں، گو ان سب کا دار و مدار امامت و اصحاب نبی صلّی اللہ علیہ و سلّم کو ایک دوسرے پر فضیلت دینے پر ہے (ابن حزم : الفِصَل، ٢ : ١١٣ نیز قب ابن خلدون : مقدمۃ، ١٥٦ ببعد) .

شیعہ امامت کو ارکانِ دین میں سے ایک رکن مانتے ہیں، اس لیے ان کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلعم اس سے غفلت نہیں برت سکتے تھے اور نہ اس مسئلے کو امّت پر چھوڑ سکتے تھے کہ جسے چاہے امام بنا لے ۔ ان کا فرض تھا کہ امّت کے اوپر ایک امام خود مقرر کر کے جائیں اور اس عقیدے پر مزید اضافہ یوں کیا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم نے اس جلیل القدر عہدے کے لیے علی رضی اللہ عنہ کو معیّن فرمایا تھا ۔ اس کی سند میں وہ ان نصوص پر اعتماد کرتے ہیں جو ان کے ہاں رائج ہیں . . . . (دیکھیے ابن خلدون : المقدمۃ، ١٥٥؛ المقاصد، ٢ : ٢٠٧) ۔ اسی بناء پر اہل السّنۃ مجبور ہوے کہ مسئلۂ امامت کو علمِ کلام کا ایک مبحث قرار دیں اور جب تک شیعہ امامت کو ایمان کا رکن کہتے رہیں ان کے اس عقیدے کا ردّ کیا جاتا رہے (المقاصد، ٢ : ١٩٩ - ٢٠٠) ۔ سعدالدین التفتازانی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور شیعہ دلائل بیان کر کے ان کا تفصیل کے ساتھ ردّ کیا ہے (المقاصد، ٢ : ٢١٠ ببعد) ۔ جیسا کہ علماے کلام میں سے محقّقین نے کہا یہ ایک آسان بات ہے کہ ان مباحث کو ان کی جگہ پر تلاش کر کے ان کا مطالعہ کیا جائے .

خاتمہ :

یہاں تک تو کلمۂ علم التوحید یا علمِ کلام، اس کی ابتداء، اس کی ترقی کے اسباب اور مراحل، اس کے بڑے بڑے فرقوں کا اور ان میں سے ہر ایک کے اصول کا بیان ہوا ۔ اس کے بعد

اس بات کی طرف اشارہ کرنا باقی ہے کہ ان کے باعث مسلمانوں میں جو تفرقہ پیدا ہوا اسے دیکھ کر علمائے دین کی اس علم کی بابت کیا رائے قائم ہوئی ۔ تفرقہ اور باہمی اختلاف کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ۔

جب یونانیوں کا فلسفہ مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور اس فلسفے کی کتابیں عربی میں منتقل ہو گئیں تو مسلمانوں نے اس کی طرف اس کے سمجھنے کے لیے توجہ کی ۔ کچھ تو ان میں ایسے تھے جنھوں نے اس میں سے وہ باتیں لے لیں جو ان کی اپنی اصلاح یا ان کے دین کی اصلاح کے لیے کار آمد تھیں ۔ بعض ایسے بھی تھے کہ انھوں نے اپنی عقل کو پوری آزادی دے دی اور اس کے لیے کوئی ایسی حدود مقرر نہیں کیں جہاں وہ ٹھیر جاتے؛ فقط ان حدود کا خیال رکھا جو منطق کے اصول نے مقرر کی تھیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا —— اور یہ اوپر بیان ہو چکا ہے —— کہ علمِ کلام فلسفے کے ساتھ اس حد تک خلط ملط ہو گیا کہ اس سے عقیدے پر برا اثر ہونے لگا ۔ حاملانِ دین نے فلسفے کو ناپسند کیا اور انھوں نے مناسب سمجھا کہ عوام کو اس سے بچنے کی ہدایت کی جائے لیکن بعض علماء اس بارے میں بہت بڑھ گئے اور غلو سے کام لیا ۔

ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) نے امام شافعی کا ایک قول نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ : ''شرک کے سوا اگر آدمی ان تمام باتوں میں جن سے اللہ نے منع کیا ہے مبتلا ہو جائے تب بھی اس سے بہتر ہے کہ علمِ کلام کو اپنا شغل بنائے''۔ اسی طرح اس نے احمد بن حنبل سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا : ''علمِ کلام میں مشغول رہنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا ۔ علمائے کلام زندیق ہیں'' (تلبیس ابلیس، طبع النہضۃ، مصر ۱۹۲۸ء، ص ۸۲ - ۸۳؛ طاش کپری زادہ : مفتاح السعادۃ، ۲ : ۲۶) ۔ المقریزی (م ۸۴۵ھ) ایک فصل میں، جس میں اس نے مسلمانوں کے ان عقائد کا جو الاشعری کے آنے سے پہلے ان میں رائج تھے حال بیان کیا ہے، لکھتا ہے : ''بہت سے لوگ معتزلہ کی بدعتوں کے پیرو ہو گئے، اس لیے ائمّۂ اسلام نے ان کے مذہب سے لوگوں کو روکا، علمِ کلام کی مذمّت کی اور اس کے حاصل کرنے والے سے قطع تعلّق کر لیا'' (الخِطَط، مصر ۱۳۲۶ھ، ۴ : ۱۸۳) ۔ یہی مؤلّف اس فصل کے خاتمے پر لکھتا ہے : ''یہ اشعری کے اصولِ عقائد کا وہ مجموعہ ہے جس پر اسلامی شہروں کے جمہور اعتقاد رکھتے ہیں اور جو کوئی ان کے خلاف کسی اَور عقیدے کا اظہار کرتا ہے اس کی گردن اڑا دی جاتی ہے (الخِطَط، ۱۸۸) ۔

ان دونوں مصنّفوں کے بعد طاش کپری زادہ (م ۹۶۲ھ) اپنے دَور کا یوں ذکر کرتا ہے کہ اُس کے زمانے کے اکثر فقہاء علمِ کلام پڑھنے پڑھانے والوں کو بہت بُرا سمجھتے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اُس علمِ کلام میں جس میں فلسفے کی ایسی باتیں داخل ہو گئی ہیں جو کتاب اور سنّت کے مطابق نہیں ہیں، جیسے معتزلہ اور مُرْجِئَۃ جیسے لوگوں کا علمِ کلام اور اُس علمِ کلام میں جس کے مسائل کی بنیاد کتاب اور سنّت پر ہے فرق کیا جائے، اس لیے دونوں کو سامنے رکھتے ہوے دوسرے کے مقابلے میں صرف پہلے کا انکار اور مذمّت واجب ہے (مفتاح السعادۃ، ۲ : ۲۳ ببعد) ۔

ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ ان لوگوں نے اور ان کے امثال نے علمِ کلام کی مذمّت اور اس سے نفرت دلانے میں بہت کچھ زیادتی سے کام لیا ہے ۔ لیکن ساتھ ہی اس کا بھی یقین ہے کہ اس روّیے کے اختیار کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ عذر بھی موجود ہے ۔ ان آراء کی طرف ہم نے اشارہ

کیا ہے تو اس کے بعد شاید بہتر ہو کہ اس رائے کو بھی بیان کر دیں جس سے ہم بالکل متّفق ہیں اور وہ علّامۃ شیخ حسین والی مرحوم کی رائے ہے جو ہمارے اپنے زمانے کے ایک جیّد عالم ہیں۔

وہ رائے یہ ہے کہ آج کل عقائد کی درستی کے لیے قرآن کا سیکھنا اور اسی میں ان عقائد کے دلائل تلاش کرنا اس سے بہتر ہے کہ علم کلام کی کتابوں میں وقت صرف کیا جائے، کیونکہ علمِ کلام اُس زمانے کی ایجاد ہے جب دھریوں، زندیقوں، ملحدوں اور بدعتیوں جیسے دشمنانِ اسلام کے مقولات کے ردّ کرنے کی ضرورت آ پڑی تھی ۔ لیکن آج جب کہ ہمارے یہ دشمن ناپید ہو گئے اور ان کی جگہ اَور قسم کے نئے دشمنوں نے لے لی تو یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ جو جا چکے انھیں تو حاضر فرض کر لیا جائے اور جو اِس وقت موجود ھیں انھیں نظر انداز کر دیا جائے ۔ موجودہ مخالفین اسلام کے ردّ کا اللہ کی کتاب سے تمسّک کے سوا اَور کوئی طریقہ نہیں، بشرطیکہ ردّ کرنے والا اس کتاب کا مطلب اسی طرح بیان کر دے جیسا کرنا چاہیے ۔ یہ ثباتِ عزم کی بات نہیں کہ انسان اپنی تمام عمر خیالی دشمنوں سے لڑنے جھگڑنے میں گذار دے اور ان دشمنوں کو جو اُسے اِس وقت چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور نکلنے کا راستہ نہیں دیتے یونھیں چھوڑ دے ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ علمِ کلام کی کتابوں میں بہت سے ایسے موٹے موٹے پردے ہیں جو روشنی کو اندر آنے ھی نہیں دیتے اور اندھیرا کیے رہتے ہیں اور اکثر ایسا ھوتا ہے کہ اچھے خاصے جمے جمائے صحیح اعتقاد کو جگہ سے ھلا دیتے ہیں ۔ اللہ ھی سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرنے والا ہے ۔

(محمد یوسف موسیٰ، در دائرۃ المعارف الاسلامیۃ)]

[نیز دیکھیے مادۂ کلام]

* **تَوَدُّد** : اَلْف لیلۃ کی ایک حکایت کی ھیروئن (بَطَلَۃ) ۔ یہ حکایت علیحدہ بھی موجود ہے ۔ (کلمۂ تَوَدُّد اسمِ علم کی حیثیت سے عربی ادب میں اس قِصّے کے سوا اَور کہیں نہیں ملتا، گو بطور اسمِ مصدر اکثر استعمال ہوتا ہے ۔ اس کا اشتقاق ویسا ھی ہے جیسا تَمَنّي، تَجَنّي اور اسی طرح کے دیگر نسوانی ناموں کا ہے) ۔ اَلْف لیلۃ کی کہانی بتاتی ہے کہ تَوَدُّد ایک سوداگر کی لونڈی تھی، اس سوداگر کو افلاس نے تہی‌دست کر دیا تھا ۔ سوداگر نے لونڈی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اُسے خلیفہ ھارون الرشید کی خدمت میں فروخت کے لیے پیش کیا، تا کہ اپنی مشکلات سے نجات پا سکے ۔ ھارون نے اُس کی مطلوبہ قیمت دینے پر رضامندی کا اظہار کیا، بشرطیکہ تَوَدُّد علم و حکمت کے متعلّق اپنے دعوے کو حق بجانب ثابت کر سکے ۔ اس غرض کے لیے جن بڑے بڑے علماء و فضلاء نے اس کا امتحان لیا ان میں ابراھیم بن سَیّار النَّظّام بھی شامل تھا ۔ تَوَدُّد نے مسائلِ دین، ھئیت، طِبّ، اور فلسفے کے متعلّق سب سوالات کا شافی جواب دیا اور اُن تمام معمّوں کو حل کر دیا جو اُس کے سامنے پیش ہوئے ۔ شطرنج کے علاوہ وہ نرد اور [آلاتِ طرب کے استعمال] میں بھی طاق نکلی ۔ بالآخر اُس نے بھی اپنے ممتحنوں سے سوالات پوچھے، جن کے جواب سے وہ عاجز آ گئے اور اس سلسلے میں نَظّام ذی‌شان کو بھی شرمندہ ہونا پڑا ۔ اس پر ھارون نے اُس سے کہا : ”مانگ کیا مانگتی ہے“ ۔ تَوَدُّد نے کہا کہ مجھے میرے مالک کے پاس واپس بھیج دیجیے ۔ ھارون نے یہ بات منظور کر لی اور اُسے انعام و اکرام دے کر اُس کے مالک کے پاس واپس بھیج دیا اور اُس کے مالک کو اپنا ندیم بنا لیا ۔

اس افسانے کی تمام روایتوں میں، یہاں تک کہ ان روایتوں میں بھی جو شیعیوں اور عیسائیوں کے ہاں مروج ہیں، النّظّام (م ۲۳۱ھ / ۸۴۵ - ۸۴۶ء) کا نام ملتا ہے (دیکھیے سطورِ ذیل) ۔ اس سے اوپر کی حدّ نہائی قائم ہوتی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ حکایت بہر حال النّظّام کے زمانے کے بعد لکھی گئی ہے ۔ اسی طرح اس کی قدیم ترین ہسپانوی روایت سے، جو غالباً تیرھویں صدی میں تیار ہوئی، اس سے نیچے کی حدّ نہائی قائم ہوتی ہے لیکن اس کے زمانۂ تالیف کے لیے ہمیں بمشکل ہی دسویں یا گیارھویں صدی سے آگے جانے کی ضرورت ہوگی ۔ کئی قلمی نسخوں میں، جن میں یہ کہانی ایک مستقل افسانے کی صورت میں مذکور ہے، داستان گو کا نام بھی ملتا ہے مگر یہ نام سب نسخوں میں یکساں نہیں اور اب تک داستان گو کی ھویّت کا قطعی طور پر تعیّن نہیں ہو سکا ۔ اُس کی اصلی اور حقیقی خصوصیّت وہ سوالات اور جوابات ہیں جن پر کہانی کا بیشتر حصہ مشتمل ہے؛ تَوَدُّد کی کہانی محض ایک ڈھانچہ ہے، جس میں داستان گو نے ان سوالات و جوابات کو پیوست کر دیا ہے ۔ اس حکایت کے متعدّد مضامین، مثلاً خریدار کی دریا دلی اور عالی ظرفی، اَلف لیلة کی دیگر حکایات میں بھی پائے جاتے ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں لیکن تعلیمی مقصد اور وہ شکل جس میں عالمانہ مضامین کو اس کہانی میں پیش کیا گیا ہے وہ پارسیوں اور مشرق کے عیسائیوں اور قرون وسطٰی کی یورپی تصانیف اور عربی ادب کی اُن کتابوں میں مشترک ہے جو سوال و جواب کی صورت میں لکھی گئی ہیں ۔ عربی میں سوال و جواب کی طرز پر جو کتابیں مرتّب کی گئیں ہیں وہ بعض اوقات جاحظ کی کتاب التّربیع و التّدویر کی طرح صرف علماء ہی سمجھ سکتے ہیں مگر بعض اوقات تعلیم عامّہ کی غرض سے بھی ایسی کتابیں لکھی گئی تھیں؛ جیسے عبداللہ بن سَلَام کے سوالات، جس سے دوسرا اسلامی ادب بھی متأثر ہوا ۔ تودُّد کی حکایت دوسری قسم کی کتابوں میں شامل ہے، گو اس میں کہانی کے تعلیمی حصّے کا فقہی جزو سوالات پر اُس قدر غالب نہیں جتنا عبداللہ کے سوالات کی صورت میں ہے ۔ تودُّد کی کہانی کی طرز پر ایک حکایت شیعی رنگ میں ابوالفُتُوّة کی [کتاب] حَسَنِیَّة میں بھی پائی جاتی ہے، جو مَیلکم Malcolm کے زمانے میں ایران میں بڑی مقبول تھی ۔

اسی طرز پر ایک کہانی مسیحی رنگ میں ہسپانوی زبان میں بھی لکھی گئی تھی، جس کا عنوان *Historia della donzella Theodor* ہے اور جس کی ایک قدیم تر صورت اب بھی محفوظ ہے، جو بعد کے زمانے کے مسیحی زیادات سے خالی ہے ۔ کتاب *Historia..........Theodor* کی — حکایة الجاریة تودُّد کا جو قلمی نسخہ میڈرڈ میں محفوظ ہے اس میں نام Theodor کی تبدیلی واقع ہو چکی ہے — عوام پسند اشاعتیں پچھلی صدی کے تیسرے دھاکے تک بار بار شائع ہوتی رہیں اور اس کا پرتگیزی ترجمہ تو بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں تک برابر چھپتا رہا ۔

مآخذ : (۱) Chauvin : *Bibliographie* ، ۷ : ۱۱۷ ببعد؛ (۲) Horovitz، در *Z.D.M.G.*، ۵۷ : ۱۷۳ ببعد؛ (۳) Menendez : *Homenaje* *Codera*، ۴۸۳ ببعد؛ (۴) W. Suchier : *L'enfant sage* (*Gesellschaft für romanische Litteratur*، ج ۲۴)؛ (۵) G. Heinrici : *Griechisch-byzantinische Gesprächsbücher* (*Abhandlungen der sächisischen Gesellschaft der Wissenschaften*, Phil-hist. Klasse XXVIII)؛ (۶) G. F. Pijper : *Het boek der duizend*

vragen، لائڈن ۱۹۲۳ء۔

(J. HOROVITZ هورووٹز)

تورات : تورات موجودہ بائبل (کتابِ مقدّس) کا ایک حصّہ ہے ۔ کتابِ مقدّس کے دو اہم حصّے ہیں : (۱) عہدِ قدیم (*Old Testament*) اور (۲) عہدِ جدید (*New Testament*) ۔ عہدِ قدیم بمقابلۂ عہدِ جدید زیادہ ضخیم ہے ۔ کل بائبل تمام عیسائیوں کی مذہبی کتاب ہے لیکن یہودیوں کی بنیادی مذہبی کتاب عہدِ قدیم ہے ۔ یہود عہدِ جدید کو نہیں مانتے، کیونکہ یہ صحائف انجیل و دیگر صحائف پر، جو عیسائیوں کے نزدیک مقدّس ہیں، مشتمل ہے ۔

عہدِ قدیم یہودیوں کے مختلف مقدّس صحیفوں کا مجموعہ ہے ۔ عیسائیوں نے ابتداء ہی سے اسے اپنی مقدّس کتاب تسلیم کیا ہے، بلکہ پہلی دوسری صدی میلادی میں عام طور پر ان کی بھی مقدّس کتاب عہدِ قدیم ہی رہی تا آنکہ ایپی فینیس Epiphanius اور ایتھانیشس Athanasius نے چوتھی صدی میلادی میں عہدِ جدید کو اس شکل میں جس میں کہ وہ اب موجود ہے تسلیم کیا (*Chamber's Enc.*، بذیل Bible) ۔

علماے یہود نے عہدِ قدیم کو مندرجۂ ذیل تین حصّوں میں منقسم کیا ہے :۔

(۱) تورات (قانون یا شریعت Law)؛

(۲) صحائف انبیاء (Prophets) اور

(۳) صحائف مقدّسہ (Hagiographa یا محض Writings) ۔

لہٰذا تورات نہ تو کل بائبل ہی ہے اور نہ کل عہدِ قدیم، کیونکہ جیسا اوپر کی تقسیم سے واضح ہوگیا ہوگا تورات کے علاوہ اور بھی صحائف ہیں جو یہودیوں کی کتابِ مقدّس کے لازمی اجزاء ہیں لیکن ان تمام صحائف میں تورات کو خاص اہمیّت اور تقدّس حاصل ہے ۔ ذیل میں مجملاً تمام صحائفِ عہدِ قدیم سے اور خصوصاً تورات سے بحث کی جائے گی، کیونکہ یہ تمام صحائف عہدِ قدیم کے لازمی اجزاء ہی نہیں بلکہ بعض اوقات سرسری طور پر تورات سے مراد کل عہدِ قدیم ہوتی ہے، اس بنا پر کہ عہدِ قدیم میں اوّلیت، اہمیّت اور حجم کے اعتبار سے تورات کو بہت بڑا رتبہ حاصل ہے (*Ency. Americana*، بذیل Bible، ۱۹۶۳ء) ۔

تورات کو روایةً موسٰی[ع] کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ۔ اس میں بنی نوعِ بشر کی آفرینش سے لے کر بنی اسرائیل کی تاریخ تک اور بعد ازاں موسٰی[ع] کی وفات تک بحث کی گئی ہے ۔ اس تاریخی خاکے میں بنی اسرائیل کے لیے جو معاشرتی اور مذہبی قوانین وضع کیے گئے تھے وہ سب مندرج ہیں ۔

اصل تورات پانچ صحیفوں پر مشتمل ہے، جنھیں صحائف موسٰی علیہ السلام کہتے ہیں (Pentateuch یا صحائف خمسہ) ۔ ان کی تفصیل یہ ہے :۔

(۱) تکوین (Genesis) : اس میں زمانۂ قبلِ موسٰی[ع] سے مجملاً بحث کی گئی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ آلِ یعقوب کی اہمیّت نمایاں کی جائے اور مذہب میں جو رتبہ اخلاق کو حاصل ہے اس کی وضاحت کی جائے ۔

(۲) خُروج (Exodus) : یہ صحیفہ ولادتِ موسٰی[ع] سے شروع ہوتا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر طورِ سینین تک لے جاتے ہیں، جہاں پر ان سے مقدّس میثاق لیا جاتا ہے اور ان کے لیے قوانین وضع ہوتے ہیں ۔

(۳) لاویین (Leviticus) : اس میں بنی اسرائیل

کے لیے وہ قوانین ہیں جن کا تعلّق خاص طور پر عبادات سے ہے .

(۴) اعداد (Numbers) : اس میں خُروج کے بعد کا تاریخی تبصرہ ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل نے صحراء سے نکل کر اُرْدُنّ اور ماورائے اُرْدُنّ کا علاقہ فتح کیا ۔ نیز جستہ جستہ احکام و قوانین مندرج ہیں .

(۵) تثنیہ (Deuteronomy) : اس میں تاریخی پس منظر پر نظر ڈالی گئی ہے اور ایک مجموعۂ قوانین پیش کیا گیا ہے ۔ یہ صحیفہ موسیٰؑ کی وفات کے ذکر پر ختم ہوتا ہے .

یہاں بقیّہ صحائف عہدِ قدیم کی تفصیل بھی مناسب معلوم ہوتی ہے، خصوصاً اس لیے کہ تورات کے جن خصائص سے خصوصی طور پر بحث کی جائے گی وہ ان میں بھی پائے جاتے ہیں .

عہدِ قدیم کی اقسامِ ثلاثہ میں سے دوسری قسم صحائفِ انبیاء (Prophets) ہے، ان کی تفصیل یہ ہے : ۔

یہ آٹھ صحیفے ہیں جو دو اقسام پر منقسم ہیں : ۔

(الف) انبیاے اوائل : (۱) یوشع (Joshua) ؛ (۲) قضاۃ (Judges)؛ (۳) صَمُوئیل (Samuel)؛ اور (۴) ملوک (Kings) .

(ب) انبیاے اواخر : (۵) اشْعَیاء (Isaiah) ؛ (۶) اِرْمیا (Ieremiah) ؛ (۷) حِزْقِیال (Ezekiel) اور (۸) انبیاے اصاغر (Minor Prophets) ۔ (انبیاے اصاغر بارہ صحیفے ہیں لیکن یہ کل مل کر ایک صحیفہ شمار ہوتا ہے) .

تیسری قسم صُحُفِ مقدّسہ (Hagiographa) ہے ۔ یہ کل ۱۱ صحیفے، ہیں جو تین اقسام پر مشتمل ہیں :

(الف) صُحُفِ اشعار : (۱) مزامیر (Psalms)؛ (۲) امثال (Proverbs) اور (۳) ایوب (Job) ؛

(ب) مجلّاتِ خمسہ (Megilloth) : (۴) نَشیدالاَنْشاد (Song of Songs) ؛ (۵) رَاعُوت (Ruth) ؛ (۶) مراثی (Lamentation)؛ (۷) کتاب جامعۂ سلیمان (Ecclesiastes)؛ اَسْتِیر (Esther) ؛

(ج) بقیہ صحائف : (۹) دانیال (Daniel)؛ عَزْرا (Ezra) اور نَحَمْیا (Nehemia) (ان تینوں کو ملا کر ایک صحیفہ شمار ہوتا ہے) اور (۱۰ و ۱۱) ایّام (Chronicles) .

یہ کل ۲۴ صحیفے ہوے ۔ ان کی اصل زبان عبرانی ہے، سوا چند عبارتوں کے جو دانیال اور عزرا میں آرامی زبان میں ہیں ۔ یہود کے درمیان اصل عبرانی عہدِ قدیم ہی متداول ہے ۔ انگریزی بائبل میں ان صحیفوں کی مزید تقسیم کر کے انھیں ۳۹ صحائف شمار کیا جاتا ہے ۔ اس میں ''انبیاے اصاغر'' کو علیحدہ صحیفہ قرار دیا گیا ہے ۔ عَزْرا نَحَمْیا سے علیحدہ شمار کیا گیا ہے اور صَمُوئیل، ملوك اور ایّام میں مزید تقسیم کر دی گئی ہے ۔ نیز اس ترتیب میں بھی ردّ و بدل ہوتے رہے ہیں؛ مثلاً جب عہدِ قدیم کا ترجمہ یونانی زبان میں پہلی اور تیسری صدی ق م کے درمیان کیا گیا تو ان صحائف کو موضوع کے اعتبار سے اس طرح مرتب کیا گیا تھا : ۔

(۱) تأریخ؛ (۲) اشعار؛ (۳) پیش گوئیاں (Prophecy) ۔ یہ مشہور یونانی ترجمہ سبعین (Septuagint) کے نام سے معروف ہے؛ کیونکہ اس کے متعلّق روایت ہے کہ ستّر مترجموں نے مل کر یہ ترجمہ مکمّل کیا تھا، اگرچہ یہ روایت بے حقیقت ہے (*Ency. Brit.*، بذیل Septuagint) .

ہمارے پاس قرآن مجید کی شہادت ہے کہ اللہ تعالٰی نے موسٰی علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تھی، جیسا کہ بعد میں عیسٰی علیہ السلام پر انجیل اور محمد خاتم النبیین صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم

پھر قرآن کریم نازل فرمایا ۔ علاوہ تورات اور انجیل کے قرآن کریم میں دو اور صحیفوں کا ذکر ہے، یعنی صُحُف ابْراھیم (۸۷ [الاعلٰی] : ۱۹) اور زبور، جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی (وَ آتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا، ۴ [النساء] : ۱۶۲) ۔ قرآن کریم میں تورات کو بھی صُحُف (جمع صحیفہ) سے تعبیر کیا گیا ہے (بِمَا فِی صُحُفِ مُوْسٰی، ۵۳ [النجم] : ۳۶) ۔ قرآن کریم سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمام انبیاء پر اللہ تعالٰی نے وحی نازل فرمائی (کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِہٖ الخ، ۴ [النساء] : ۱۶۳) لیکن صحیفوں کا ذکر فقط چار انبیاء، یعنی ابراھیم، موسٰی، داؤد [دیکھیے سطور بالا] اور عیسٰی (وَ قَفَّیْنَا بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ وَ آتَیْنٰہُ الْاِنْجِیْلَ، ۵۷ [الحدید] : ۲۷) علیہم السلام کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ صحیفۂ ابراھیم علیہ السلام اس وقت ناپید ہے ۔ بقیّہ تین صحیفے کسی نہ کسی شکل میں موجود ھیں؛ چنانچہ تورات وحی کے اُس سلسلے کی ایک عظیم المرتبت کڑی ہے جو اللہ تعالٰی تمام انبیاء پر نازل فرماتا رہا ۔ اس کی بڑی اھمیّت یہ ہے کہ یہ ایک مکمّل شریعت یا دستورِ حیات موسٰی علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لیے دیا گیا تھا (وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ جَعَلْنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ، ۱۷ [الاسراء] : ۲؛ مَّوْعِظَۃً وَّ تَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ، ۷ [الاعراف] : ۱۴۵) ۔ اگرچہ موسٰیؑ کے بعد، جیسا اوپر بیان ھوا، دو صحیفے، یعنی زبور اور انجیل نازل ھوے لیکن شریعت موسوی برقرار رھی، حتّٰی کہ عیسٰیؑ نے بھی اسے قائم رکھا؛ چنانچہ فرمایا: ''یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ھوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ھوں'' (متی، ۵ : ۱۷) .

قرآن کریم میں تورات کا ذکر نہایت خوش آیند الفاظ میں کیا گیا ہے، مثلاً ''الْفُرْقَانَ وَ ضِیَآءً'' (۲۱ [الانبیاء] : ۴۸)؛ ''بَصَآئِرَ'' (۲۸ [القصص] : ۴۳) وغیرہ ۔ خصوصی طور پر یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالٰی نے اسے بنی اسرائیل کے لیے امام اور رحمت بنا کر نازل فرمایا ۔ قرآن کریم سے یہ بھی مترشّح ھوتا ہے کہ تورات اور دوسرے صحیفے اس اُمّ الکتاب (یا فقط الکتاب) کے پرتو ھیں جو لوح محفوظ میں ہے ۔ مکّی سورتوں میں عام طور پر تورات کو الکتاب یا بعض توصیفی ناموں (مثلاً ضیاء، فرقان، رحمت وغیرہ) سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ ان میں اس کا مجملاً ذکر ہے، لیکن مدنی سورتوں میں جہاں ان احکام کا ذکر ہے جو یہودیوں کے لیے وضع کیے گئے تھے وھاں خصوصی طور پر تورات کا ذکر ہے، غالباً اس لیے کہ احکام عموماً تورات ھی میں مذکور ھیں .

قرآن کریم کی رو سے وہ تورات جو موسٰیؑ نے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی وہ اسی طرح منزّل مِن اللہ تھی جیسے قرآن کریم؛ لہٰذا مِن جملہ اَور صحائف انبیاء کے اس پر بھی اس حیثیت سے اعتقاد مسلمانوں کے لیے لازمی ھو جاتا ہے .

قرآن کریم سے یہ بھی واضح ھوتا ہے کہ تورات موسٰیؑ پر چالیس روز میں کوہِ طور پر نازل ھوئی اور انھوں نے اسے الواح پر لکھ لیا ۔ نیز یہ کہ اللہ تعالٰی نے ان الواح پر ھر شے کے متعلّق پند و نصائح اور ھر امر کی تفصیل تحریر کرا دی : وَکَتَبْنَا لَہٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَۃً وَّ تَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (۷ [الاعراف] : ۱۴۵) ۔ یہ معلوم ھوتا ہے کہ تورات اس وقت موسٰیؑ پر نازل ھوئی جب کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دلا کر مصر سے نکال کر لا رہے تھے اور جس وقت ان کا گذر جزیرہ نماے سینا میں کوہِ طور کے پاس سے ھوا (۲۰ [طٰہٰ] : ۸۰) ۔ غالباً

یہ وحی موسیٰؑ پر بلا واسطہ نازل ہوئی، کیونکہ قرآنِ کریم میں اس طریقے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے : وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْمًا (۴ [النساء] : ۱۶۴).

اس میں شبہہ نہیں ہوسکتا کہ تورات بنی اسرائیل کے لیے موسیٰؑ کے وقت سے لے کر بعثتِ خاتم النبیینؐ تک ایک مکمّل اور مفصّل دستورِ حیات تھی، جس میں اہمّ اصولِ حیات سے لے کر جزئیاتِ زندگی تک کے متعلّق بالتفصیل احکام تھے؛ مثلاً قانونِ جنگ، دشمنوں کے ساتھ سلوک، اسیرانِ جنگ کے ساتھ برتاؤ، ازدواجی مسائل، متعدّی اَمراض سے متعلق احتیاط، رہائشی مکانات کی تعمیر سے متعلّق ہدایات وغیرہ - غالباً کسی قوم کو اللہ تعالٰی کی طرف سے اتنا جامع دستورِ حیات نہ دیا گیا ہوگا اور یہ یقیناً اسی وجہ سے تھا کہ بنی اسرائیل اللہ تعالٰی کی برگزیدہ قوم تھی اور انہیں دیگر اقوامِ عالم پر فضیلت دی گئی تھی (۲ [البقرة] : ۴۷، ۱۲۲؛ ۴۵ [الجاثیة] : ۱۶).

اب قرآنِ کریم کی روشنی میں تصویر کے دوسرے رخ پر بھی نظر ڈالنی چاہیے - ایک طرف تو ہم نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم نے تورات کو مُنزّل من اللہ کتاب کہا ہے اور تورات اور بنی اسرائیل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے، غالباً دنیا میں قرآن کریم کے سوا کوئی اَور مذہبی کتاب ایسی نہیں ہے جس نے کسی دوسرے مذہب کی کتاب کی اتنی تعریف کی ہو جتنی قرآنِ کریم نے تورات کی تعریف کی ہے، کیونکہ عام طور پر مذاہب اور مذہبی کتابیں ایک دوسرے سے بے تعلّق (mutually exclusive) ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے متضاد و متباین ہوتی ہیں لیکن چونکہ قرآنِ کریم نے سلسلۂ انبیاء اللہ اور مُنزّل من اللہ صحائف کو تسلیم کیا ہے اور دین کو ایک قرار دیا ہے، لہٰذا یہاں حقیقۃً تباین و تضاد غیر متصوّر ہیں؛ دوسری طرف قرآنِ کریم نے یہ بھی صاف و واضح اعلان کر دیا اور دنیا کو متنبّہ کر دیا کہ قومِ بنی اسرائیل اپنی سرکشی اور عصیان اور قتلِ انبیاء وغیرہ کی بناء پر مردود و مغضوب ہو گئی (۴ [النساء] : ۱۵۵ تا ۱۵۷؛ نیز متی، ۲۳ : ۳۳ - ۳۹؛ اشْعیاء، ۴۳ : ۴۸؛ اِرمْیا، ۱۹ : ۸ - ۱۵)، جہاں ان کے اسی قسم کے اعمال اور ان کی پاداش کا ذکر ہے) اور انہوں نے تورات کو محرّف و متغیّر کر کے اسے اصلی وحی کی حالت میں قائم نہیں رکھا (۴ [النساء] : ۴۵؛ ۵ [المائدہ] : ۱۳) - قرآنِ کریم نے مجملاً یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہود کس طرح تورات میں ردّ و بدل کر دیا کرتے تھے - بعض دفعہ وہ الفاظ کو اپنی جگہ سے بدل دیا کرتے تھے (يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ، ۴ [النساء] : ۴۶)، بعض دفعہ وہ صحیح مطلب سمجھنے کے بعد اسے بدل دیتے تھے (ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ، ۲ [البقرة] : ۷۵) اور پھر مطالب میں بھی تغیّر کر دیتے تھے (وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ، ۴۱ [حٰمٓ السجدة] : ۴۵) اور بعض دفعہ صحیفے خود لکھ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ مُنزّل من اللہ ہیں (يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، ۲ [البقرة] : ۷۹) اور بعض دفعہ وہ آیات کو چھپا لیا کرتے تھے (۲ [البقرة] : ۱۴۰؛ ۳ [اٰل عمران] : ۱۸۷) وغیرہ - عہدِ قدیم کے دیگر صحائف سے مترشّح ہوتا ہے کہ تحریف کا آغاز بہت ابتدائی زمانے سے شروع ہو گیا تھا - بعض انبیاے بنی اسرائیل نے خود بھی اس کی شہادت دی ہے اور یہودیوں کے اس فعل کو مذموم قرار دیا ہے : ”سرزمین ان کے نیچے جو اس پر بستے ہیں نجس ہوئی کہ انہوں نے شریعتوں کو عدول کیا، قانونوں کو بدلا، عہدِ ابدی کو توڑا“

(اشعیاء، ۴۲ : ۵)؛ '' تم نے زندہ خدا، رب الافواج، ہمارے خدا کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے'' (ارمیا، ۲۳ : ۳۶) وغیرہ .

اس سے قبل کہ دیکھا جائے کہ جدید تنقید اور تحقیق کے نتائج اور فیصلے کیا ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان کیا جائے کہ یہود و نصاری کا مذہبی عقیدہ تورات کے بارے میں کیا رہا ہے ۔ ان دونوں گروہوں کا عقیدہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ تورات مع صحائف، یعنی کل عہد قدیم، اللہ تعالی کی طرف سے لفظاً لفظاً وحی مُنزّل من اللہ ہے اور جو کچھ بھی بین الدّفّتین ہے وہ اللہ کا کلام ہے، جس کی صداقت پر کلّی اعتماد کیا جا سکتا ہے اور جو ہر لحاظ سے متناسب اور غیر متضاد ہے ۔ یہ وہ معیار ہے جس سے ہر حقیقت جانچی جا سکتی ہے ۔ ہر لفظ اس کتاب مقدّس کا بذریعہ وحی (روح القدس کے ذریعے سے) انسانوں تک پہنچا تھا اور جس طرح روح القدس اس کی تخلیق میں کارفرما رہا ہے اسی طرح وہ اس کی حفاظت کا ذمے دار ہے [۱] (*O. T.* : Kraeling *Since the Reformation*) ۔ علمائے یہود میں فیلو Philo (پیدائش تقریباً ۲۰ ق م) اور جوزیفس Josephus (حدود ۱۰۰ء) اس نظریے کے حامی تھے ۔ پہلی صدی کے عیسائیوں نے، جو اکثر نسلاً یہودی تھے، یہی عقیدہ اختیار کر لیا تھا اور تورات کو اپنی کتاب تسلیم کر لیا تھا.

غالباً اوریجن Origen (۱۸۵ - ۲۵۴ء) پہلا عیسائی عالم تھا جس پر صاف طور پر منکشف ہوا کہ بائبل خصوصاً عہد قدیم میں بعض عبارتیں ایسی ہیں جو یا تو معنوی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں یا اخلاقی معیار سے پست و مذموم ہیں (*Encycl. Brit.*، بذیل Bible) لیکن اس نے فیلو کا طریقۂ تمثیل (method of allegory) اختیار کر کے اپنی تسلّی اس طرح سے کی کہ ایسے مواقع میں بظاہر الفاظ سے ماورائے معانی کی جستجو کرنی چاہیے ۔ یہی مسلک آگسٹن Augustine (۳۵۴ - ۴۳۰ء) اور ٹامس ایکوے‌ناس Thomas Aquinas (۱۲۲۵ - ۱۲۷۴ء) نے اختیار کیا (*Encycl. Brit.*، محلّ مذکور).

یہود و نصاری نے اس نظریے میں سولھویں صدی کی عیسوی اصلاحی تحریک (Reformation) تک کوئی خاص شک و شبھہ نہیں کیا ۔ اس کے سوا کہ پرفری Porphyry (۲۳۳ - ۳۰۴ء) نے خیال ظاہر کیا تھا کہ صحیفۂ دانیال Daniel بابل کی جلاوطنی کے زمانے میں نہیں لکھا گیا بلکہ چار صدی بعد ضبطِ تحریر میں آیا ۔ اسی طرح ہسپانوی یہودی عالم ابن عزرا (۱۰۹۲ - ۱۱۶۷ء) نے تحقیق کی کہ صحائف خمسہ (Pentateuch) موسیٰؑ کے بعد کی تألیف ہیں ۔ لیکن تحقیقات کا قدم رفتہ رفتہ آگے کو اٹھتا گیا، اس قسم کا تنقیدی مطالعہ افراد میں اور مختلف مذہبی جماعتوں میں مروّج ہونے کے بعد اس قدیم مذہبی عقیدے کا ردّ عمل مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہوا اور اس ردّ عمل کو مختلف اسباب نے تقویت دی ۔ دورۂ تجدیدِ حیات علمی و ادبی (Renaissance) کے آغاز نے علوم عقلیہ کو فروغ دیا ۔ فلسفے اور تنقیدی مطالعۂ تاریخ (historial criticism) اور دیگر علوم کا نشو و نما ہوا ۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ ازمنۂ تاریک (Dark Ages یا Middle Ages تقریباً ۶۰۰ - ۱۴۰۰ء) نے انسانوں کی گردنوں میں کورانہ تقلید کے جو طوق ڈال رکھے تھے اور قلوب پر جو

(۱) اصل انگریزی میں عبارت یہ ہے : "for it was held that the Holy Ghost had been active, in its preservation as well as in its *creation*."

قفل پڑے ہوے تھے انھیں توڑ کر انسانی قوّتِ فکر کو آزاد کر دیا ۔ فرانسیسی عالم کاپیلو Capellus (تقریباً ۱۶۲۴ء) نے ثابت کیا کہ تورات کا اصل عبرانی متن بغیر ماثوری (Massoretic) اعراب کے اور طریقوں پر بھی پڑھا جا سکتا ہے نیز یہ کہ جو عبرانی متن موجود ہے وہ بھی حتمی طور پر صحیح نہیں ہے ۔ ایک اور فرانسیسی عالم مورینو Morinus (تقریباً ۱۶۳۳ء) نے ثابت کیا کہ یونانی سبعین (Septuagint : LXX) کی عبارت اکثر جگہ عبرانی متن سے زیادہ صحیح ہے ۔ ایک اور عیسائی عالم رچرڈ سائمن Richard Simon (تقریباً ۱۶۸۵ء) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بائبل کا مطالعہ تأریخی تنقید کے اصولوں پر ہونا چاھیے ۔ ان دو نظریوں نے بائبل سے متعلّق دو علوم یعنی متنی تنقید (textual criticism) اور تأریخی و ادبی تنقید یا تنقیدِ عالیہ (higher criticism) کی بنیاد ڈالی ۔ بعد ازاں مارگن Morgan (تقریباً ۱۷۳۷ء) نے بھی مطالبہ کیا کہ بائبل کا مطالعہ عقل اور علم کی روشنی میں کرنا چاھیے ۔ ایک فاضل جرمن عالم رائماروس Reimarus نے ۱۷۳۷ء میں ایک ضخیم تصنیف شائع کی، جس میں اس نے بائبل کے مُنزّل مِن اللہ (revelation) ہونے سے انکار کیا ۔ ایک اور جرمن عالم لِسِنگ Lessing (تقریباً ۱۷۲۹ - ۱۷۸۱ء) نے بھی دعوی کیا کہ واقعاتِ مندرجۂ بائبل پر تأریخ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی ۔ بائبل کی تنقیدی تحقیق کے اعتبار سے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میلادی کا زمانہ نہایت اھم ہے، کیونکہ علاوہ ان علماء کے متعدّد مشہور فلسفیوں نے بھی ایسے نظریے پیش کیے جو کم و بیش قدیمی مذھبی عقیدے سے متباین تھے ۔ ان میں سپنوزا Spinoza اور ھوبز Hobbes خاص طور پر قابل ذکر ھیں (Kraeling).

جدید تنقید و تحقیق نے بالآخر یہ ثابت کر دیا کہ موجودہ تورات اور دیگر صحائفِ عہدِ قدیم قدیم مذھبی عقیدے کے برخلاف اللہ کا کلام یا وحی مُنزّل مِن اللہ نہیں ھیں، بلکہ ان مختلف صحائف کو انسانوں نے مختلف زمانوں میں تألیف و تصنیف کیا ۔ موجودہ تورات موسٰی[۴] کے بعد کی تألیف ہے ۔ علی ھذا بائبل کی ہر کتاب یا صحیفہ بلا استثناء انسانی تألیفیں ھیں، جو ان نبیوں کے بہت بعد کے زمانے میں مرتّب ہوئیں جن کی طرف انھیں منسوب کیا جاتا ہے ۔ قرآنی شہادت کی روشنی میں اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ اصل مُنزّل مِن اللہ صحیفوں کے ضائع ہونے کے بعد علماے یہود و نصارٰی نے انھیں نئے سرے سے تألیف اور مرتّب کیا ۔ تأریخ سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ تورات حوادثِ زمانہ کے ھاتھوں کئی بار تلف ہوئی ۔ ان حوادث کی تأریخ دراصل اُن حوادث کی تأریخ ہے جو یہودی قوم پر متعدّد بار نازل ہوے اور یہ قرینِ قیاس بھی ہے اور ھمارے پاس تأریخی ثبوت بھی موجود ہے کہ ان قومی بربادیوں میں یہودیوں کے صحائفِ مقدّسہ بھی تلف و برباد ہوتے رہے ۔ مختصراً یہ کہ ۷۰۵ ق م سے ۱۳۵ء تک فلسطین متواتر مختلف حملہ آوروں اور فاتحین کی جولانگاہ بنا رہا ۔ ۷۰۰ ق م میں سِنّے کِرِب Sennacherib حملہ آور ھوا اور یوروشلم کا محاصرہ کیا ۔

۵۸۶ ق م میں بُخت نَصّر حملہ آور ھوا اور یوروشلم کو تباہ کر دیا ۔ اس تباھی میں تورات خاکستر ہو گئی اور یہودیوں کو مملکتِ بابل میں جلا وطن کر دیا گیا ۔

۵۳۸ ق م تا ۳۳۲ ق م فلسطین زیرِ اقتدارِ ایران رھا ۔ کُورش (Cyrus) نے یہودیوں کو واپس فلسطین آنے کی اجازت دی ۔

۳۳۲ تا ۳۲۳ ق م فلسطین زیرِ اقتدارِ اسکندراعظم رہا اور ۶۳ ق م تا ۳۹۵ء زیرِ اقتدارِ سلطنت روما تھا ۔ اس دوران میں ۶۳ ق م میں پومپے Pompey نے یوروشلم فتح کیا، ہیکل دوبارہ تعمیر ہوا؛ ۷۰ء میں ٹائٹس Titus رومی نے پھر یوروشلم کو مع ہیکل (Temple یا Synagogue) کے تباہ کیا ۔ ۱۳۲ تا ۱۳۵ء میں ہیڈرین Hadrian نے یہودیوں کی بغاوت فرو کر کے فلسطین میں ان کی جداگانہ حیثیت فنا کر دی۔

مذکورۂ بالا تأریخی خاکے سے ظاہر ہو گیا کہ یہودیوں کے اصل صحائفِ مقدّس حوادثِ زمانہ کی نذر ہو گئے اور موجودہ تورات بعد میں تألیف و مرتّب ہوئی، جیسا کہ ذیل میں بیان ہوگا.

ہمارے پاس کوئی محقّق تأریخی ثبوت نہیں ہے کہ موجودہ صحائفِ تورات کب مرتّب ہوے اور کس طرح مستند تسلیم کیے گئے ۔ عام خیال یہ ہے کہ عزرا Ezra نبی انھیں دوبارہ معرضِ وجود میں لائے اور از سرِ نو انھیں مرتّب کیا اور مستند قرار دیا ۔ ایک مروّجہ روایت کے مطابق عزرا نے ۹۴ صحائف ۴۰ روز میں پانچ کاتبوں کو دوبارہ لکھوائے (یعنی ۲۴ صحائفِ عہدِ قدیم اور ۷۰ صحائف جو بعد میں غیر مستند (apocryphal) قرار دیے گئے) ۔ یہ روایت تأریخی اعتبار سے محض ایک افسانے کا رتبہ رکھتی ہے (اینسائکلوپیڈیا برٹینیکا، بذیل Bible: "worthless legend"؛ اینسائکلوپیڈیا امیریکانا، بذیل Bible : "a merely fictitive outgrowth") ۔ حقیقت اس میں اتنی ہے کہ عزرا ان تلف شدہ صحائف کو دوبارہ ضبطِ تحریر میں لائے ۔ یہ نظریہ تیرھویں صدی میلادی کے بعد وجود میں آیا اور خاص کر الائی‌ایس لیوائٹا Elias Levita (۱۵۳۸ء) اور بکسٹورف Buxtorf (۱۶۶۵ء) نے اسے ایک مستند روایت کی حیثیت دے دی لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یہ محض ایک افسانوی شاخسانہ ہے (a fictitive outgrowth) .

بیانِ مذکورۂ بالا سے عیاں ہو گیا ہوگا کہ عہدِ قدیم کے اصلی صحائف کے ضائع ہو جانے کے بعد عزرا نبی نے بھی انھیں روایۃً منقول کیا ہوگا، نہ کہ اصل مُنزّل مِن اللہ صحائف کی شکل میں؛ اور یہ استنباط ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جب ہم خود موجودہ عہدِ قدیم کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ مندرجۂ بالا تأریخی خاکے سے یہ بھی ظاہر ہے کہ عزرا کے بعد فلسطین پر کم از کم تین بار اور تباھی آئی ۔ ان حالات میں تعجّب یہ نہیں کہ اصلی صحائفِ عہدِ قدیم تلف ہو گئے، بلکہ حیرت یہ ہے کہ یہ اس نقل کی صورت میں بھی ہم تک پہنچ گئے ہیں .

عہدِ قدیم کی اندرونی شہادت مذکورۂ بالا نظریے کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتی ہے ۔ اس کتاب مقدس کا عبرانی متن، جو اس وقت مخطوطات اور مطبوعات کی شکل میں موجود ہے، مأثوری متن (Massoretic Text) کہلاتا ہے ۔ یہ متن چھٹی اور آٹھویں صدی میلادی کے درمیان متعیّن کیا گیا تھا ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ متن دوسری صدی میلادی میں مرتّب ہو چکا ہو۔ لیکن یہ زمانہ تسلیم کر لیا جائے تو بھی ایک لمبا وقفہ اس متن کے منضبط ہونے اور اصل صحائف کے زمانۂ تحریر میں حائل ہے ۔ عبرانی متن کو منضبط کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اصل عبرانی کتابت (script) میں حرکات نہیں ہوتی تھیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ایک زمانہ گذرنے پر الفاظ اور عبارتوں میں خلطِ معانی ہونے لگا، کیونکہ یہ

مختلف طریقوں پر پڑھے جا سکتے تھے، لہٰذا علمائے یہود نے پانچویں اور نویں صدی میلادی کے درمیان علامات و حرکات (vowel signs) اور نشانات نَبْرَہ (accents) وغیرہ ایجاد کیے ۔ ظاہر ہے کہ جس وقت عبرانی متن کو اس طرح حرکات لگا کر منضبط کیا گیا تو اس میں تعینِ معانی اور تأویل کا بہت دخل ہوا ہوگا ۔ موجودہ عہدِ قدیم میں بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن میں غلط حرکات لگ جانے سے عبارت بے معنی ہو گئی ہے ۔ بہر حال ان علماء نے یہ بہت بڑا کام کیا کہ انھوں نے آئندہ کے لیے عبرانی متن کو متعیّن کر دیا ۔ ان علماء کو ماثوریّین (Massorites) کہتے ہیں اور ان کے ضبط کردہ متن کو ماثوری متن (Massoretic Text)؛ گویا انھوں نے ایک روایت (ماثور) کو محفوظ کر دیا ۔ اگرچہ ماثوری اعراب و حرکات بھی حتمی نہیں سمجھے جا سکتے (*O.T., A Modern Study* : Rowley) ۔ عہدِ قدیم کا قدیم ترین عبرانی قلمی نسخہ ۹۱۶ء کا تحریر شدہ ہے (Cod. Babylonicus؛ *Ency. Brit.*، بذیل Bible؛ *Ency. Amer.*، بذیل Masorah؛ Bewer : ص ۳۰۴، اس مؤخّرالذکر کتاب میں اس قسم کی اغلاط کی متعدّد مثالیں موجود ہیں) ۔ اندرونی شہادت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے سے پیشتر عبرانی متن میں ایک بڑی تعداد اختلافات کی رونما ہو چکی تھی ۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ دوسری صدی میلادی سے پیشتر جو مخطوطات تھے وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے ۔ سامری تورات سے اور خصوصاً یونانی سبعین (Septuagint) سے، جو قدیم ترین روایت (Version) ہے، اس اختلاف کا ثبوت ملتا ہے ۔ عبرانی متن میں ایسے آثار بھی پائے جاتے ہیں جن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اوائل زمانے میں مختلف وجوہ کی بناء پر متن میں ردّ و بدل کرنا جائز سمجھا جاتا تھا؛ مثلاً اسماء میں تبدیلی، عبارت میں تغییر و تبدیل وغیرہ، پھر یہ تغیّرات ایک وقت میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں ہوتے رہے ۔ اتنا تو خود علمائے یہود تسلیم کرتے ہیں کہ تورات میں ۱۸ مقامات ایسے ہیں جہاں اوائل زمانے میں کاتبوں نے عمداً تبدیلیاں کیں ۔ یہ وہ تغیّرات ہیں جن کی شہادت ہمارے پاس کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے ۔ ان کے علاوہ معلوم نہیں کتنے تغیّر و تبدّل ہوئے ہوں گے جن کا تیقّن کے ساتھ دریافت کرنا اس وقت یا آئندہ ناممکن ہے ۔ یہ بھی امرِ واقع ہے کہ اس ماثوری متن کے علاوہ قدیم زمانے میں اور بھی روایتیں (versions, recensions) تھیں جو اب ناپید ہیں اور یہ روایتیں ایک دوسری سے اہمّ اختلافات رکھتی تھیں (*Ency. Brit.*، بذیل Bible : "differed materially"؛ نیز دیکھیے *Literature* : Bewer *of the O.T.*) ۔

جب جدید تنقید و تحقیق نے یہ تسلیم کر لیا کہ تورات (مع صحائف) مُنَزَّل مِن اللہ کتاب نہیں ہے تو مختلف صحائف کی تأریخ تألیف اور ان کے حقیقی مصنّفین کے اسماء دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ۔ محقّقین کا عام طور پر خیال یہ ہے کہ عہدِ قدیم کی ثلاثی تقسیم (تورات، انبیاء اور صحائف) اس کی تدوین کے تین مراحل پر دلالت کرتی ہے ۔ سب سے پہلے تورات مدوّن ہوئی اور مستند تسلیم کی گئی ۔ بعد ازآں انبیاء اور آخر میں صحائفِ مقدّسہ ۔ خارجی شہادت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اندرونی شہادت کی بناء پر ان کی تدوین کی تاریخیں یہ ہو سکتی ہیں : (۱) تورات، موجودہ شکل میں ۴۴۴ ق م؛ (۲) انبیاء، ۲۰۰ ق م اور ۲۵۰ ق م کے درمیان؛ (۳) صحائف مقدّسہ، ۱۰۰ ق م اور ۱۵۰ ق م کے درمیان.

یہ تمام صحائف، خصوصاً جو طویل ہیں، ایک مؤلّف کے مرتّب کیے ہوے نہیں ہیں، بلکہ رفتہ رفتہ ان میں اضافے ہوتے رہے اور وہ موجودہ شکل میں بمراحل پہنچے (*Ency. Brit.*، بذیل Bible؛ Rowley : *Growth of the O.T.*).

یہ ایک طویل بحث ہے کہ جب جدید تحقیق و تنقید نے بائبل کے متعلّق یہود و نصارٰی کے قدیم مذہبی عقیدے کی بنیادیں متزلزل کر دیں تو مختلف مذہبی فرقوں میں اس کا کیا ردِّ عمل ہوا ۔ بعض نے یہ نظریہ پیش کیا کہ وحی یا مُنَزَّل مِن اللہ سے مراد لفظی وحی نہیں بلکہ معنوی وحی ہے ۔ بعض نے اسے مجموعۂ تماثیل (allegories) قرار دیا؛ چنانچہ جب مشہور ترین جرمن فلسفی کانٹ Kant نے محسوس کیا کہ تورات محض لفظی اعتبار سے بہت سے مواقع میں ''ایک ناقابل برداشت بار'' بن جاتی ہے تو اس نے طریقۂ تمثیل (allegorization) ھی میں راہِ نجات دیکھی (Kraeling، ۴۰) ۔ عام طور پر عیسائیوں کے نزدیک بائبل کی قدر و قیمت نہ تو کسی معجزے کی وجہ سے ہے، جس سے یہ معرضِ وجود میں آئی اور نہ الہام کی وجہ سے، جو صرف انبیاء پر نازل ہوا، بلکہ ان پیش گوئیوں میں ہے جو انبیاے بنی اسرائیل نے کیں اور جن کا اتمام عیسٰی علیہ السلام کی زندگی اور ان کی تعلیم میں ظہور پذیر ہوا (*Ency. Brit.*، ۳ : ۵۰۱، عمود ۲، بذیل Bible) ۔ جہاں تک جمہور نصارٰی کا تعلّق ہے پوپ لیو سیزدھم (Leo XIII : ۱۸۷۸ - ۱۹۰۳ء) نے ان کا موقف واضح کر دیا ہے : ''یہ مطلقاً غلط اور ممنوع ہے کہ وحی کو کتابِ مقدّس میں فقط چند مقامات کے لیے محدود کر دیا جائے یا یہ تسلیم کیا جائے کہ کسی صحیفے کے مصنّف سے غلطی سرزد ہوئی ہے ("It is absolutely wrong and forbidden either to narrow inspiration to certain parts only of Holy Scripture or to admit that sacred writer has erred")۔ یہ موقف، جس کا اعلان پوپ نے اپنے ایک خاص فرمان میں کیا تھا، جمہورِ نصارٰی (رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ) نے تا حال اختیار کر رکھا ہے (*Ency. Brit.*، محلِ مذکور، عمود ۱).

اس بحث کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس بارے میں قرآن کریم کا موقف اور تورات کے متعلّق اس کا فیصلہ کیا ہے : یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے جہاں مجملاً تورات کے مُنَزَّل مِن اللہ ہونے کی تصدیق کی ہے آج سے چودہ سو سال پیشتر یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ اس میں یہود نے تحریف کر دی ہے اور بعض حصّے خود بھی تصنیف کر کے اس میں بڑھا دیے ہیں ۔ یہ بھی ہم نے دیکھ لیا کہ اب محقّقینِ یہود و نصارٰی اپنی تحقیق کی بناء پر اس قرآنی دعوے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر نے تو قطعی طور پر وحی ہونے ھی سے انکار کر دیا، چہ جائیکہ وہ یہ تسلیم کریں کہ تورات لفظاً و معنًی مُنَزَّل مِن اللہ ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ یہود و نصارٰی میں یہ عقیدہ کیسے آیا کہ تورات لفظاً و معنًی وحیِ مُنَزَّل مِن اللہ ہے (اور ان کا یہ عقیدہ عین وہ عقیدہ ہے جو قرآن کریم کی روشنی میں مسلمانوں کا خود قرآن کریم یا کسی اَور الہامی کتاب کے متعلّق ہو سکتا ہے؛ کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک یہ امر غیر متصوّر ہے کہ دین اللہ کی بنیاد کسی انسانی تألیف یا تصنیف پر قائم کی جائے) ۔ یہ استنباط بالکل جائز معلوم ہوتا ہے کہ گو اصلی مُنَزَّل مِن اللہ صحائف ضائع ہو گئے تاہم وہ عقیدہ جو کسی وقت حقیقت پر مبنی تھا باقی رہ گیا ۔ جدید محقّقینِ یہود و نصارٰی اس سے بے پروا ہیں کہ بائبل مُنَزَّل مِن اللہ ہو یا انسانوں

کی تالیف ہو، بلکہ ہم نے دیکھ لیا کہ وہ مذکورۂ بالا فیصلہ اختیار کر چکے ہیں ۔ اس مادّہ پرستی کے زمانے میں بعض لوگوں کی کوتاہ بین نظر یہ دیکھنے سے قاصر رہی کہ جہاں تورات میں انسانی ہاتھوں کی لکھی ہوئی تحریریں موجود ہیں وہاں اس میں اب بھی وحی الٰہی کے جواہر ریزے جھلک رہے ہیں، جن کی تصدیق اور بعض محرّف بیانات کی تصحیح قرآن کریم کرتا ہے : وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵ [المآئدة] : ۴۸)؛ نیز فرمایا اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۲۷ [النمل] : ۷۶) ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تورات میں جو غلط روایتیں داخل ہوگئی تھیں قرآن نے ان کی تصحیح کر دی ہے، مثلاً انبیاے کرام کے متعلّق جو نازیبا باتیں اس وقت تورات میں درج ہیں[۱] قرآن مجید نے ان سے انبیاء کی بریّت کی اور ان کی عظمت اور صحیح مقام سے دنیا کو دوبارہ روشناس کرایا ۔ یہ امر خود قرآن مجید کی کتنی بڑی عظمت ثابت کرتا ہے کہ جب خود اس کتاب مقدّس اور ان انبیاء کے نام لیواؤں نے صحیح معنوں میں ان انبیاء کی نبوّت سے انکار کر دیا اور اس کتاب کو مُنَزَّل مِن اللہ ہونے کی حیثیت سے ردّ کر دیا اس وقت قرآن نے ان کی تصدیق کی اور ان کی تصدیق کو ہر مسلمان کے لیے جزو ایمان بنا دیا ۔ مندرجۂ بالا آیت وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ الخ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اصل کتاب کا کچھ حصہ محفوظ تھا اور ہے ۔ قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے کہ بوقت ظہور اسلام یہودیوں کے پاس تورات موجود تھی ۔ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ (۵ [المآئدة] : ۴۳) اور معاً یہ بھی جتا دیا کہ کُل نہیں بلکہ اس کا ایک حصّہ محفوظ رہ گیا ہے : اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (۵ [المآئدة] : ۴۴)[۲] ۔ لہٰذا قرآن کریم کا موقف یہ ہوا کہ تورات میں جو احکام الٰہی تھے ان کا محافظ اب اللہ تعالٰی نے قرآن کو بنا دیا ہے (مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ) ۔ دوسرا موقف یہ ہے کہ اس مُنَزَّل مِنَ اللہ کتاب کے بعد اور کوئی کتاب سرچشمۂ ہدایت نہیں بن سکتی ۔ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ۭ (۱۱ [ہود] : ۱۷؛ ۴۶ [الاحقاف] : ۱۲) ۔ قانون قدرت ہے کہ جب کسی چیز کی افادیت ختم ہو جاتی ہے تو وہ فناء ہو جاتی ہے، بنی نوع انسان کے لیے جو چیز مفید ہوتی ہے وہ باقی رہتی ہے : وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳ [الرعد] : ۱۷) .

مآخذ : (۱) *The Encyclopaedia Britannica*، تحت مادّہ Bible، Jews وغیرہ؛ (۲) *The Encyclopaedia Americana*، مندرجۂ بالا مادّوں کے علاوہ: Masorah؛ (۳) *An Encyclopaedia of World History* (Harrap)، تحت مادّہ Palestine؛ (۴) *Chambers's Encyclopaedia*، تحت مادّہ Bible؛ (۵) H.H. Rowley : *The Growth of the Old Testament*، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ (۶) وہی مصنف : *The Old Testament and Modern*

[۱] ان میں سے اکثر ایسی ہیں جنھیں کوئی مسلمان زبان پر لانا بھی گوارا نہیں کرتا، مثال کے طور پر یہ قطعات ملاحظہ ہوں : خروج، ۳۲ (متعلّق ہارونؑ)؛ صموئیل ثانی، ۱۱ : ۲ تا ۱۳ (متعلّق داؤدؑ)؛ ملوک اول، ۱۱ : ۴ (متعلّق سلیمانؑ)؛ تکوین، ۱۹ : ۳۱—۳۴ (متعلّق لوطؑ) وغیرہ.

[۲] قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ حجاز کے علماے یہود کے پاس تورات اس وقت ایک علیحدہ روایت (version) کی شکل میں تھی.

Study، آکسفورڈ ۱۹۰۲ء؛ (۷) J. A. Bewer: The Literature of the Old Testament، Revised Ed.، نیویارک ۱۹۰۳ء؛ (۸) Rev. Cohu: The Old Testament in the light of Modern Research، آکسفورڈ ۔ لنڈن ۱۹۰۸ء؛ (۹) H. W. Robinson: Record and Revelation، آکسفورڈ ۱۹۰۱ء؛ (۱۰) The Bible Today، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ (۱۱) Emil G. Kraeling: The Old Testament since the Reformation، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ (۱۰) Robinson: Bible in its Ancient and English Versions؛ (۱۳) Alfred Loisy: The Origins of New Testament (Chap. Bible as a Supernatural Book)؛ (۱۴) Prefaces to O.T. & N.T. (Revised Standard Version)، طابع: ٹامس نیلسن و ابناؤہ، ایڈنبرا و لنڈن؛ (۱۵) Katie Magnus: Outlines of Jewish History، لنڈن ۱۹۲۳ء؛ (۱۶) Cecil Roth: Short History of the Jewish People، لنڈن ۱۹۳۶ء؛ (۱۷) James Hosmer: The Jews, Ancient, Medieval and Modern، لنڈن ۱۹۱۷ء؛ (۱۸) [The Bible In India، (Louis Jacolliot کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ)، آلہ آباد ۱۹۱۶ء؛ (۱۹) Isaac Taylor: History of the Transmission of Ancient Books to Modern Times، لورپول ۱۸۷۹ء].

(عابد احمد علی)

تُوران: توران ایک ایرانی اصطلاح ہے، جس کا اطلاق اس ملک پر ہوتا ہے جو ایران کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس نام کی یہ صورت فارسی زبان کے درمیانی دور (Middle Persian، [پہلوی]) سے پہلے کی نہیں ہے۔ لاحقۂ ''۔ ان'' کلمۂ اسم منسوب بہ آباء (مثلاً پاپکان) اور اسم منسوب بہ بلاد (مثلاً گیلان و دیلمان) دونوں کے بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے (قب Grundr. d. iran. Phil.، ۱/۲: ۱۷۶؛ زالمان Salemann: وہی کتاب، ۱/۱: ۲۸۰ کو شک ہے کہ ''۔ ان'' ''۔ آنام'' سے، جو صیغۂ جمع مضاف الیہ ہے، مشتق ہے یا نہیں)۔

توران کے نام کے متعلق تین سوال پیدا ہوتے ہیں: (۱) اس کی اصلیت کیا ہے؛ (۲) اس کا مفہوم زمانۂ بعد میں کیا تھا، جس کی رو سے کلمۂ توران '' ترکوں کی سرزمین'' کا مرادف ہو گیا؛ (۳) موجودہ زمانے میں جغرافیائی، لسانی اور سیاسی لحاظ سے اس نام کا اطلاق کیوں کر ہوتا ہے۔

تُورہ۔ ایرانی ماحول میں لفظ ''تُوْر ۔ ان'' کے جزء '' تُوْر'' اور اَوِستا کے لفظ تُوْرَہ۔(تُرَہ۔) میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اَوِسْتا کے ان اجزاء میں جو اب تک محفوظ ہیں: (۱) لفظ تُوْرہ ملتا ہے، جو دو صالح افراد کے باپ کا نام ہے۔ ان افراد کے ایرانی نام اراجَہْوَنْت Arəjahwant اور فْرارازی Frārāzi ہیں مگر ان کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں (یَشْت، باب ۱۳: ۱۱۳ تا ۱۲۳)؛ (۲) اوستا میں وہ لوگ مذکور ہیں جنھیں تُورہ یا تُرہ کہا جاتا تھا اور جو غالباً خانہ‌بدوش تھے (یَشْت، باب ۱۷: ۵۵: ''آسُوْاَسْپہ'' یعنی تیز رفتار گھوڑوں والے)۔ [درمیان کلمے میں زیادت یاء کے بعد تُوْرہ کا اسم صفت تُوْارِیَہ ہے]۔

تُوْرِیوں کو متعدّد دفعہ ایرانیوں اور سچے مذہب کا دشمن بتایا گیا ہے (قب یَشْت، ۱۷: ۵۵، جہاں وہ اَشِی وَنْگُہِی Ashi Waŋuhi کا پیچھا کرتے ہیں)۔ تُوْرِیوں کی ایک شاخ (؟) دانُو کہلاتی ہے (یَشْت، ۱۷: ۵۵ تا ۵۶)۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلّق سنسکرت زبان کے لفظ دَانوا یعنی شیاطین سے ہو۔ ایک خاص قابل نفرت ہستی '' تُوری ڈاکو'' Fraŋrasyan (فْرَاَنْگْرَسْیَن) (= افراسیاب) کی ہے، جس نے شاہی طاقت ('' خوارَنہ'' xᵛarəna) حاصل کرنے کے لیے ناکام کوششیں کیں، جن کا ذکر یَشْت،

۱۹ : ۵۶ تا ۶۳ میں بالتفصیل آیا ہے - لیکن اسی یشت، ۱۹ : ۹۳ میں اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ شاہی طاقت ('' خوارنہ '') '' *xʷarəna* '' ایک مرتبہ افراسیاب کے قبضے میں رہ چکی تھی - اس وقت اس نے ظالم زینیگاو Zainigav کے خلاف ایران کی حفاظت کا فرض ادا کیا تھا - ہو سکتا ہے کہ فرانگرسین سے دشمنی سیاسی بناء پر ہو.

متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تورہ میں متقی لوگ بھی پائے جاتے تھے - گاتھاؤں (Gāthās) (یسنا، ۴۶ : ۱۲) میں کی ایک بہت قدیم عبارت میں فرائی یانہ Fryāna توری کے خاندان کی خاص طور پر ستائش کی گئی ہے - یشت، ۱۳ : ۱۴۳ کی یہ عبارت بہت مشہور ہے : ''ہم آریائی (ایرانی)، توری (Tūryan)، سیریمی (Sairimyan)، سائنی (Sāinyan) اور داہی (Dāhyan) علاقوں کے متقی مردوں اور عورتوں کی فروشی *Frawashi* کو قربانی پیش کرتے ہیں''.

یشت، ۵ : ۵۷ میں تورہ کے مسکن کا ضمناً ذکر آ گیا ہے - یہاں فرانگرسین Fraŋrasyan کے نائب *وئےسکہ *Vaēsaka کی اولاد کے متعلق کہا گیا ہے (شاہنامہ، طبع ولرز Vullers، ۱ : ۲۴۸، ۲۶۴، ویسہ Wēsa) کہ وہ درۂ خشاتھرو - سکہ Xšathrō-suka میں رہتے تھے، جو کانگہہ Kaŋha (= بخارا ؟: قب مارکار Marquart : *Komanen*، ص ۱۹۶؛ چینی زبان میں کھنگ Kʰang = سمرقند) میں '' بہت بلندی '' پر واقع ہے - دوسری طرف بلوک تر کا وہ نام بھی معنی خیز ہے جسے بطلیموس کے ارمنی مترجم نے خوارزم میں بتایا ہے (طبع سوکری Soukry، فصل ۳۴؛ قب سطور ذیل).

تورہ کی نسلی خصوصیات کے متعلق متعدد نظریات پیش کیے گئے ہیں - گائگر (Geiger : *Ostir. Kultur*، ۱۹۴) کا خیال ہے کہ اس نام کے ذیل میں بلا امتیاز نسل وہ تمام لوگ آ جاتے ہیں جو دشتہائے بےدرخت (steppes) میں رہتے تھے ('' ایک جامع لفظ . . . ، جو کسی نسلی فرق و امتیاز کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کے مفہوم میں وہ تمام لوگ داخل ہیں جو بحیرۂ خزر اور دریائے سیحون کے درمیانی میدانوں میں رہتے ہیں اور اس کے ورے بھی آباد ہیں'') - گائگر کے خیال میں اس امر کا بھی امکان ہے کہ تورہ میں کچھ تاتاری عناصر بھی ہوں ('' ایک قدیم تاتاری آبادی کے بقایا''؟) مگر یہ یاد رہے کہ گائگر (ص ۱۹۸) نے تورہ کے اندر ہنون کا وجود ثابت کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ اب رد کر دی گئی ہے (ہنو *hunu* '' بیٹا، اولاد''؛ Bartholomae : *Altir. Wörterb.*، عمود ۱۸۳۱).

ہو سکتا ہے کہ '' دانو'' (قب سطور بالا) کی اصطلاح کا بھی مفہوم نسلی نہ ہو بلکہ اس سے مراد صرف غیر مزدی تورہ ('' شیاطین'') ہوں [کرسٹینسن Christensen (۱۹۲۸ء) نے گائگر کی رائے کا پھر سے احیاء کیا ہے؛ اس کا گمان ہے کہ '' تورہ دراصل خانہ‌بدوش لوگوں کا نام تھا خواہ وہ نسلاً ایرانی تھے یا نہ تھے''].

برخلاف اس کے بلوشہ Blochet نے اپنے مقالے موسومۂ ''Le nom des Turks dans l' Avesta'' میں اس اشتقاق شائع کی تائید کی ہے کہ تورہ = ترك ہے - وہ توری دانو، کرہ اسبنہ اور ورہ اسبنہ کے، ناموں کی توضیح ترکی زبان کے دو لفظوں یعنی قرہ بمعنی سیاہ اور گوار (?) *gör* بمعنی چالاك سے کرنا چاہتا ہے : [وہ کہتا ہے کہ] '' ترك کا اسم یا کم از کم وہ مادہ جس سے وہ مشتق ہے [کذا!] چھٹی صدی

میلادی سے بہت پہلے موجود تھا'' ۔ اس سلسلے میں ہمیں یاد رہے کہ لسانی اعتبار سے لفظ ترک کا اشتقاق خواہ کچھ ہو (قب اَرْكْ - توْرك ärk-türk بمعنی '' قوت، طاقت'' : مُلر F. W. K. Müller، در Uigurica، ۲ : ۱۰؛ [توْرکُوْن türkün] بمعنی '' خاندان'' [تُرکُن = مجمع العشيرة و بیت الاُمّ و الاب]؛ : کاشغری، ۱ : ۳۶۸) ایرانی میں تُوْرَہ کے معنی '' جری'' اور '' بہادر'' بآسانی کیے جا سکتے ہیں، قب 'تُور' بزبان فارسی و کُردی، نیز فردوسی کا وہ معنی خیز اشارہ جو اس نے فریدون کے بیٹے تُور کی سیرت کے بارے میں کیا ہے ۔ یہ بات درست ہے کہ '' کَرَہ'' اور '' وَرَہ'' کا لسانی اشتقاق ابھی تک واضح نہیں اور یہ کہ بقول فردوسی خاندان وِیْسَہ Vēsa کے ایک فرد کا نام کُرو خان (؟) تھا (طبع وُلّرز Vullers، ۱ : ۲۶۱)، لیکن ان ناموں کے ساتھ ساتھ ایسے تُورِی نام بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن کی صورت بداھةً ایرانی ہے ۔ انھیں میں 'کَرہ' اور 'وَرَہ' کا تیسرا ساتھی دُوْرَاےکَئےتَہ Dūraēkaēta بھی ہے، یعنی '' وہ جس کی خواھش دُور تک جاتی ہے''۔ (یہ دلیل بے حیثیت ہو جائے گی اگر ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ملوکِ تُورَہ غیر ملکی تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تمام ذرائع بھی ختم ہو جائیں گے جس سے اس قوم کی شناخت ہو سکے)۔

تُورَہ کے متعلّق سب سے زیادہ مفصّل نظریّہ مارکار کا ہے (Ērānšahr، ۱۰۵ تا ۱۰۷)۔ اس کے نزدیک ایرانیوں کا قدیم وطن اِیْریانَمْ وَایجو (Airyanəm waējō) خوارزم میں تھا ۔ ایران اور تُوران کی جنگیں، جن کا ذکر اساطیر میں آتا ہے، اس کشمکش کا مظہر ہیں جو حضری آیْرانیوں (یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنی اعلٰی تہذیب پر فخر کرنے کی وجہ سے اِیْریانَا airyana کا نام اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا) اور خانہ‌بدوش ماھی خوروں (Massagetai) کے درمیان ہوئیں (قب اَوِسْتا : مَسْیا Masya = ''ماھی'' اور سیتھیائی زبان کا ملحقۂ جمع : - تَ ta) ۔ یہی وہ سیتھیائی مَسِگتاے (Scythian Massagetai) ہیں جو پہلے آمو دریا اور بحیرۂ آرال Aral کے مشرق میں رہتے تھے، انھوں نے ضرور تُوْرَہ نام اختیار کر لیا ہوگا ۔ بلوکِ تُوْر، جس کا ذکر بطلیموس کے ارمنی مترجم (آنانیاس الشِرَکِی؟ Ananias of Shirak?) نے خوارزم میں کیا ہے، یقیناً انھیں تُوْرَہ لوگوں کی یاد سے ناشی ہوا ہوگا۔ [بلوكِ تُوْر کا تعلّق باختر کے صوبے Τουριούα (سٹرابو Strabo، ۱۱ : ۵۱۷) سے کیا تھا یہ ابھی طے کرنا باقی ہے (قب Oberhummer : کتاب مذکور، ۱۹۳، ۲۰۲)] ۔ بعد کے زمانے میں مختلف اقوام کی نقلِ مکانی سے بلحاظ نسل ایشیا کا نقشہ بالکل ہی بدل گیا ۔ تُورہ کی اصطلاح رفتہ رفتہ ایرانیوں کے نئے دشمنوں، یعنی سَکَرَوکائے Sacaraucae، طخاریوں، یوْاِے - چِی Yüe-ci، کوشانیوں Kūshāns، خِی اَونیوں (Khiōnites)، ھیاطلہ اور ترکوں کے لیے استعمال ہونے لگی۔

اوستا کے سنسکرت ترجمے میں تُورہ کا ترجمہ تُرشْکَہ Turuṣkaḥ کیا گیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری لفظ سے عموماً ترك مراد ہیں لیکن چونکہ سنسکرت کا یہ ترجمہ بہت بعد کے زمانے کا ہے (Grundr. d. iran. Phil.، ۲ : ۵۰) اس لیے نسلی اصطلاحات کے متعلّق اس کے ترجمے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ۔

شاھنامے کا اثر : توران اور تُورہ کے باھمی ربط کا انکشاف بہت بعد میں ہوا (قب شپیگل Spiegel : Eranische Alterthumskunde، ۱۸۷۱ء، ۱ : ۵۵۳ اور خاص طور پر گائگر : کتابہ

مذکور، ۱۸۲۲ء، ص ۱۹۳) - ممکن ھے کہ پہلوی مصادر میں اب بھی کچھ آثار ایسے موجود ہوں جن سے معلوم ہو سکے کہ تُورہ سے لے کر توران تک ارتقائی منازل کیا ہیں، لیکن ان مصادر کا توران کی موجودہ اصطلاح کے مروّج مفہوم کی تکوین پر کوئی راست اثر نہیں پڑا؛ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس موضوع پر مشرقی اور مغربی نظریوں کا سب سے بڑا مأخذ شاھنامہ ہی رہا ھے - فارسی اور عربی زبان کے متوازی مآخذ نے بھی کہ ان کی بنیاد بھی پہلوی زبان کا خُواتای نامک *Khʷātay - nāmak* [یعنی خدای نامہ] ھے، صرف شاھنامۂ فردوسی کے تکملے اور ذیل ہی کا کام دیا ھے.

توران کا ذکر شاھنامے کے اس باب میں ھے جہاں مذکور ھے کہ فریدون (Thraētaona، یا Frēdhōn) نے، جو آخری شہریار جہان (یعنی والیِ اقلیم خُوانیرس) تھا، جہان کو تین حصّوں میں تقسیم کیا، قبّ شاھنامہ، طبع مَکان Macan، [۱ :] ۵۸؛ طبع مول Mohl، ۱ : ۱۳۸؛ طبع وُلّرز Vullers : ۱ : ۷۷ تا ۷۸.

توران اور اس کا نام گذارندہ (eponym) : یشت، ۱۳ : ۱۴۳ (قبّ سطور بالا)، جو بہت قدیم ھے، اس سے یہ تصوّر منعکس ہوتا ھے کہ دنیا کی آبادی پانچ قوموں پر مشتمل ھے - اس کے برعکس پہلوی کتاب دینکرت Dēnkart، سے پتا چلتا ھے کہ اوستا کی ایک کتاب میں، جو اب ناپید ھے، یہ مذکور تھا کہ فریدون (Tharaētaona، Frēdhōn) نے دنیا کو اپنے تینوں بیٹوں سَرم Sarm، تُوچ Tūč اور ایریچ Ērēč کے درمیان تین حصوں میں بانٹ دیا تھا (ناموں کی یہ صورتیں پہلوی ہیں) - ظاہر ھے کہ ہمارے سامنے روایتوں کے دو سلسلے ہیں، جو آپس میں اس وجہ سے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ قدیم اقوام کے لیے ایرانی الاصل نام گذارندے تو تجویز کر دیے گئے، لیکن اُس دنیا میں جسے ایرانی جانتے تھے تبدیلیاں ہو چکی تھیں؛ لہٰذا ایرانیوں نے اپنے عہد (ساسانی ؟) کی سیاسی تقسیم کے مطابق فریدون کے دو بڑے بیٹوں میں سے ایک کی یورت مغرب میں تجویز کر دی اور دوسرے کی مشرق میں؛ چنانچہ مغرب کے علاقے کو روم (یعنی بوزنطی سلطنت) سے تطبیق دے دی گئی اور مشرق کے ملک کو ترکوں سے، جو خسرو اول کے عہد میں ھیاطلہ (Hephthalites) کی شکست کے بعد (یعنی حدود ۵۵۷ء) سے ایرانیوں کے پڑوسی چلے آ رہے تھے.

قدیم اُسطوری روایات کے مطابق [فریدون] (Thraētaona) کے بیٹوں کے درمیان دنیا کا تین حصّوں میں منقسم ہونا ایک تمثیل ھے جس سے ان قدیم قوموں کا باھمی رشتہ معلوم ہوتا ھے جن کے یہ تین نام گذار تھے - فردوسی کے زمانے میں یہ افسانوی روایت اپنی نسلی اساس سے علیحدہ ہو چکی تھی اس لیے متناقض باتوں کو تجنیسِ لفظی کے پردے میں چھپانا پڑا - شاھنامے میں لکھا ھے کہ فریدون اپنے بیٹوں کو سَلْم، تُور اور اِیرَج کے نام اُس وقت دیتا ھے جب ان کی سیرت معلوم کرنے کے لیے ان کی آزمایش کر لیتا ھے - سب سے بڑا بیٹا جو ضرر اٹھائے بغیر خطرے سے صحیح ''سلامت'' نکل آتا ھے، اسے مغرب کے علاقے (روم و خاور) عطا ہوتے ہیں اور اسے 'خاور خدای' لقب ملتا ھے - دوسرا بیٹا جو جری ھے (تُور = بہادر)، اسے توران دیا جاتا ھے اور وہ 'توران شاہ' کہلاتا ھے یا شاہ چین ''سالارِ ترکان و چین'' (قبّ : شاھنامہ، طبع وُلّرز Vullers، بادشاھی فریدون، شعر ۴۰۹ و ۲۹۰) [طبع مَکان،

۱ : ۵۸] - سب سے چھوٹا بیٹا اتنا ہی دلیر ہے جتنا کہ خردمند ہے - اسے ''دشتِ گردان و ایران زمین'' (یا شاید کُردوں کا علاقہ ؛ قب طبع ولرز، شعر ۲۹۱، ۳۰۰، ۳۲۱) اور اس کا لقب 'ایران خدای' قرار پاتا ہے [قب طبع مذکور، شعر ۳۰۲] .

عربی کتابوں میں (قب طبری، ۱ : ۲۲۶) سب سے بڑے بیٹے کے نام کا املاء سرم ہی ہے جو سَیْرِمَہ سے مشتق ہے لیکن چونکہ پہلوی حروفِ تہجی میں ''ر'' اور ''ل'' کا امتیاز نہیں اس لیے فردوسی (نیز مجمل التواریخ کے مصنف) نے متبادل صورت سَلْم کو ترجیح دی ہے تا کہ لفظی حیثیت سے عربی مادے ''س - ل - م'' کے ساتھ تجنیس پیدا کی جا سکے - [*Asiatic* : Modi *Papers*، بمبئی ۱۹۰۵ء، ص ۲۴۴؛ بلوشہ Blochet : *Rev. de l'Or. Chrétien*، ۱۹۲۵ء، ۲۵ : ۳۳۱، دونوں نے کوشش کی ہے کہ سَیْرِمَہ Sairima کا ربط براہِ راست رومہ سے قائم کیا جائے (sRim*، قب ارمنی hRom) - لیکن یہ قیاس ہر لحاظ سے بے سر و پا ہے] - یہ کہ سَلْم کا تعلق مغرب کے ساتھ پھر بھی بہت کم ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ دونوں بھائی سَلْم اور تُور بحرِ خَزَر کی مشرقی جانب باہم جنگ کرتے ہیں (ثعالبی نے ان کی رزم گاہ آذربایجان میں بتائی ہے) - دونوں بھائی ایک بحری قلعے [''حصنِ دریا''] [دژ آلانان] پر قبضہ کرتے ہیں (یعنی دِہستانان صُور پر، جو رأس حَسَن قلی پر ہے، اس کے لیے ملاحظہ ہو بارٹولڈ : *K. istorii orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء، ص ۳۳) - آلانوں Alāns (جو اوسیتیوں Ossetes کے اسلاف اور سَوروماتیوں Sauromates = سَیْرِمَہ ؟ کے اخلاف تھے) کے نام کا تعلق ان علاقوں کے ساتھ صرف پہلی صدی قبل مسیح کے حدود میں ہو سکتا ہے، کیونکہ ایرانی لوگ ابھی اس وقت تک بحر خزر کے ارد گرد کے علاقے پر حکومت کرتے تھے (مارکر : *Komanen*، ص ۱۰۸).

تُور (فردوسی اور مجمل التواریخ) کا نام دینکرت *Dēnkart*، ۸ : ۱۳، میں تُوچ کی صورت میں آتا ہے اور عربی مصادر میں بھی یہی املاء غالب ہے : ابن خُرداذبہ، ص ۱۵ : طوج یا طوس؛ دِینَوری : ص ۱۱ (نمرود کے بیٹے : ایرج، سَلْم اور طُوس)؛ طبری، ۱ : ۲۲۶؛ فہرست، ص ۱۲؛ مسعودی : مروج، ۲ : ۱۱۶؛ بیرونی : الآثار الباقیة، ص ۱۰۲؛ ثعالبی، طبع زوتن برگ Zotenberg، ص ۴۱ (تُوز، تُوژ) - بہر حال تُور کا جو املاء فردوسی نے اس غرض سے اختیار کیا کہ اس اسم کے مسمّی کی یورت ہونے کی حیثیت سے 'تُوران' کی تشریح کر سکے، تو یہ املاء پہلوی اور عربی تألیفات کے خلاف ہے - بقولِ مارکار : *Beiträge*، در *Z. D. M. G.*، ۱۸۹۵ء، ص ۶۶۴ تا ۶۶۷، تُوچ tōč مشتق ہے تَورِچ Taurič سے (اور وہ مشتق ہے تُورہ سے)؛ بقول کرسٹن سن Christensen تُوچ Tūč مشتق ہے تُور + چ سے (بمعنی تُوری الاصل).

توران ایک جغرافی اصطلاح کی حیثیت سے : توران کی اصطلاح قبائلِ تُورہ کے نام سے ماخوذ ہے اور تُورہ کا نام ان کے نام گذارندہ تُوچ / تُور کے نام سے ماخوذ ہے - بالآخر اس نام کا اطلاق ترکوں کے ملک پر ہونے لگا - یہ اصطلاح ہمیں ساسانی کتاب خُواتای نامک [خدای نامہ] میں ضرور ملنی چاہیے، کیونکہ عرب مؤرخین اور فردوسی نے اسی مأخذ کو استعمال کیا - یہ بات درست ہے کہ بُندَہِش، ۱۲ : ۱۳، ۳۹ وغیرہ میں صرف ایک اصطلاح یعنی ترکستان مستعمل ہے

[وهاں ایک اور اصطلاح سَلمان بمعنی ملکِ سلم، کتاب مذکور، ۲۰ : ۱۲)، اس ملک کے لیے استعمال هوئی ہے جہاں سے دجله ([Tigris]) آتا ہے] لیکن دینکرت، باب ۸ اور کتابوں کے ناقص ٹکڑوں میں، جو تورفان سے حاصل هوے هیں، کلمۂ توران ملتا ہے (F. W. K. Müller، ۲ : ۸۷).

فردوسی کے نزدیک توران یعنی ترکوں اور چینیوں کے ملک کو دریاے جیحون ایران سے جدا کرتا ہے (شاهنامه : طبع وُلَّرز Vullers، 'بادشاهی فریدون' : شعر ۲۹۵، ۳۰۹، ۳۲۲، ۳۵۶، ۳۵۹، ۵۳۲، ۷۹۲؛ 'بادشاهی نوذر' : شعر ۱۳۳؛ طبع مول Mohl، ۵ : ۶۸۰، 'بادشاهی بهرام گور') - اس کے برخلاف افراسیاب کی شکست کے بیان میں اس کی سلطنت کی ابتداء کو ''قِپْچاق'' تک وسعت دے دی گئی ہے - مارکار (Komanen، ۱۱۰) نے مخطوطات کے ذریعے اس نام کی تصحیح کر کے اسے قُوچْقار ('باشی') کہا ہے اور پھر کہا ہے که یه بعینه اردوگاهِ قارلُغ [رکّ به قارلُوق] هی ہے، جو طراز [رکّ بآن] سے آگے پانچ فرسخ کے فاصلے پر تھی؛ قبّ ابن خُرّداذبه : ص ۲۹؛ کصری باس Kṣry bās، [طبع مطبع بریل، لائڈن ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء، ص ۲۸] - اسی طرح فردوسی نے افراسیاب کا دارالحکومت، 'کَنگ دِز' حدودِ چین کے قریب بتایا ہے مگر اس کا کَنگ (بخارا) کے علاقے سے کچھ تعلّق نہیں (شاهنامه، طبع Vullers، شعر ۱۳۸۱[؟]، قبّ Bartholomae، عمود ۳۴۷ : مارکار : Komanen، ۱۰۹) - ممکن ہے که ان جزئیات میں مغرب کی طرف ترکوں کی نقل و حرکت کے ابتدائی مدارج کی یادداشت ثبت هو - اب رہے چینی، جو شاهانِ توران کی رعایا تھے، تو هو سکتا ہے که فردوسی نے یه نام اَوِسْتائی قدیم قوم سائیناو Sāinav کے نام کی جگه استعمال کیا هو جو بندهِش میں پہلے هی سے چینیوں کی هم جنس بن چکی تھی (Darmesteter : *Le Zend Avesta*، ۲ : ۵۵۴).

مسلم مصنّفین چاهے وه عربی هوں یا فارسی یا ترکی، انهوں نے لفظِ توران کا استعمال درست طور پر نہیں کیا - لیکن چونکه عرب جغرافیه دانوں کے نزدیک ترکوں کا علاقه صرف سِیر دریا (سیحون) کے مشرق میں شروع هوتا تھا اور ماوراءالنهر کا علاقه اس میں شامل نہیں (قبّ بارٹولڈ Barthold : *Turkestan*، طبع وقفیۂ گب، ص ۶۴) اس لیے عام میلان یه معلوم هوتا ہے که توران اور ماوراءالنهر کو ایک هی ملک سمجھا جائے، یعنی وه علاقه جو آمو دریا (جیحون) اور سِیر دریا کے درمیان ہے - بقول خوارزمی : مفاتیح العلوم، ۱۱۴، ایرانی لوگ جانبِ جیحون کے علاقے کو 'مرزِ توران' کہتے هیں - یاقوت (معجم، ۱ : ۸۹۲) کے نزدیک توران ماوراء النهر کا ملک ہے؛ فریدون کے هاتھوں دنیا کے تین حصوں میں تقسیم هو جانے کے بعد ترکوں نے اپنے ملک کا نام اپنے بادشاه تُوج کے نام پر تُوران رکھا - (یاقوت نے توران نام کے ایک گاؤں کا بھی ذکر کیا ہے جو حرّان سے قریب ہے) - دِمشقی : (*Cosmographie* [عجائب البرّ و البحر]، تألیف حدود ۱۳۲۰ء)، طبع سینٹ پیٹرز برگ، ص ۱۱۴ نے جو بتکلّف اثریاتی طرز کی بات کی ہے وه بہت عجیب ہے؛ اس کی رو سے سَیحُون (سِیر دریا) هی ماوراء النهر یعنی ''سرزمینِ هَیَاطِلَه المعروف به تُولان (= توران)'' اور سرزمینِ ترکستان المعروف به فرغانه کے درمیان حدّ فاصل ہے (هَیْطَل بمعنی ماوراءالنهر کے لیے قبّ نیز *Ērānšahr*، ۳۰۷) - مسالک الأبصار (چودھویں صدی میلادی) میں اس کلمے کا استعمال اس سے بہت زیاده مبهم طریق پر

ہوا ہے ۔ وہاں دریاے والگا Volga [اِتِل] کو ’نہر توران‘ کہا گیا ہے اور توران کے شاہانِ قدیم (یعنی سابق خوانینِ قپچاق : مارکار : Komanen، ۱۳۸) کی ییلاق [گرمائی اردوگاہ] آرق تاغ (؟) میں بتائی ہے ۔ کاترمیئر Quatremere اور مارکار کے نزدیک آرق تاغ کوہ اورال ہی ہے۔

ظفرنامہ (پندرھویں صدی میلادی) میں توران کا لفظ محض شاعرانہ تقابل کے لیے آیا ہے (۱ : ۳۴، ۶۲۳ : ’’پہلوانانِ توران در ایران‘‘) ۔ ابو الغازی (سترھویں صدی میلادی) کبھی تو اسے بطور اساطیری اصطلاح کے استعمال کرتا ہے (طبع Desmaisons، ۲، ۱۲۹، ۱۳۰) اور کبھی کہتا ہے کہ یہ مغربی سائبیریا کا علاقہ ہے (ص ۱۷۷) اور بعض اوقات ایک مبہم انداز میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ محمد خوارزم شاہ کی مملکت ایران اور توران کے درمیان واقع تھی (’’ ایران برلان توران آراسی‘‘، ۹۶).

یورپ میں توران کی اصطلاح کا علم Herbelot کی کتاب : Bibliothèque Orientale، طبع پیرس ۱۶۹۷ء، ص ۶۳ سے ہوا ۔ وہاں مذکور ہے کہ افراسیاب، جو اپنی پیدائش کے لحاظ سے ترک مگر تُور بن فریدون کی نسل سے تھا، ’’ اُس تمام علاقے کا ‘‘ بادشاہ تھا ’’ جو دریاے جیحون کے پار . . . . مشرق اور شمال میں واقع ہے؛ اس ملک کو توران کہتے تھے، لیکن اس کے بعد سے اُسے ترکستان کہنے لگے ہیں‘‘۔ ترکستان کی اصطلاح اُرتیلوس Ortelius اور مرکیٹر Mercator کے نقشوں میں پائی جاتی ہے جو سولھویں صدی میلادی میں تیار ہوے (Oberhummer) ۔ یورپ میں توران کی اصطلاح صرف انیسویں صدی میں رواج پذیر ہو کر مُلکی بن گئی ۔ اس میں ابہام کی جو ایک شان ہے وہی ایک حد تک اس کی مقبولیت کا سبب بھی بنی اور اس کا استعمال ایسے تصوّرات کے لیے ہونے لگا جہاں صحّت تحدید خارج از بحث ہو [ابن خلّکان : وفیات، طبع قاهرة ۱۳۱۰ھ، ص ۱۰۰ میں توران کو ’’ترکان‘‘ کی محرّف صورت بتایا ہے !].

مآخذ : (۱) Justi : *Iran. Namenbuch*، بذیل Tūra اور Sairima؛ (۲) Bartholomae : *Altiran. Wörterbuch*، بذیل Tūra، tūirya اور Sairima؛ (۳) Spiegel : *Eranische Alterthumskunde*، ۱۸۷۵ء، ۱ : ۲۷۰، ۵۳۶، ۵۷۵، ۵۷۹؛ (۴) گائیگر Geiger : *Ostiranische Kultur im Altertum*، ۱۸۸۲ء، ص ۱۹۳ تا ۲۰۲؛ (۵) Brunhofer : *Urgeschichte der Arier in Vorder- und Central-Asien*، جلد ۱ : *Iran und Turan*، لائپزگ ۱۸۹۳ء، در سلسلۂ *Einzelbeiträge z. allg. u. vergl. Sprachwiss.* (قب Bartholomae : *Wochenschr. f. klass. Phil.*، ۱۸۹۰ء، عمود ۱۱۶۱)؛ (۶) مارکار Marquart : *Ērānšahr*، ص ۱۵۵ تا ۱۵۷؛ نیز قب مارکار : *Unters. z. Gesch. v. Eran*، ۲ : ۷۸، ۱۳۶؛ (۷) مارکار : *Über d. Volkstum d. Komanen*، برلن ۱۹۱۴ء، ۱۰۳، ۱۹۶؛ (۸) Feist : *Kultur, Ausbreitung u. Herkunft d. Indogermanen*، برلن ۱۹۱۳ء، ص ۴۰۳؛ (۹) بلوشه Blochet : *Le nom des Turks dans l'Avesta*، در *JRAS*، ۱۹۱۰ء، ص ۳۰۵ تا ۳۰۸؛ (۱۰) بلوشه : *Le pays des Tchata et les Ephtalites*، در *RRAL*، ۱۹۲۰ء، عدد ۶ : ص ۳۳۱ تا ۳۵۱؛ (۱۱) بلوشه : *Les sources grecques et chrétiennes de l' astronomie hindoue*، در *Rev. de l' Orient chrétien*، ۲۵، ۱۹۲۵ء : ص ۳۰ تا ۳۳؛ (۱۲) بلوشه *Le nom des Turks*، مجلّۂ مذکور، ج ۲۶، ۱۹۲۷ تا ۱۹۲۸ء : عدد ۱ : ص ۱۸۸ تا ۲۰۶؛ (۱۳) Oberhummer : *Die Türken u. d. osmanische Reich*، لائپزگ ۔ وینا ۱۹۱۷ء؛ (۱۴) Oberhummer

Der Name Turan, Tūrān، بوڈاپسٹ اپریل ۱۹۱۸ء، ص ۱۹۳ تا ۲۰۸؛ (۱۵) کرسٹنسن Christensen : *Etudes sur le zoroastrisme de la Perse Antique*, *D. Kgl. Danske Vid. Selskab*، کوپن ہیگن ۱۹۲۸ء، ص ۱۶؛ (۱۶) گرے Gray : *Foundations of the Iranian religion*، بمبئی ۱۹۲۹ء، در *Journ. Cama Orient. Inst.*، عدد ۱۵ : ص ۱۲؛ [(۱۷) زین العابدین شیروانی : بستان السیاحۃ، طبع دوم، اصفہان ۱۳۳۲ھ (؟)]

تورانی زبانیں: اس اصطلاح کا موجد بظاہر مؤرخ بُنسِن Bunsen (م ۱۸۵۰) ہے؛ اسی نے اس کا اطلاق ایشیا اور یورپ کی اُن زبانوں پر کیا جو اپنی اصل میں نہ تو ہندی ـ یورپی [آریائی] ہیں اور نہ سامی ـ پھر میکس مُلر (Max Müller: *The Languages of the Seat of War in the East, with a Survey of Three Families of Languages, Semitic, Arian and Turanian*، لنڈن ۱۸۵۵ء) نے اسے عام رواج دیا اور اسی زُمرے میں (چونکہ 'خاندان' کا لفظ استعمال کرنے سے اُسے گریز ہے) تمام التصاقی یا ترکیبی (agglutinative) زبانیں ڈال دیں، یعنی نہ صرف فینی اُوغری (Finno-Ugrian) اور آلتائی (Altaic) بلکہ سیامی، تبّتی اور ملائی وغیرہ زبانیں بھی اس میں شامل کر دیں ـ لینورمان (Lenormant : *La Magie chez les Chaldéens et les origines accadiennes*، پیرس ۱۸۷۴ء) نے اس اصطلاح کے منہوم کو اَور وسعت دی اور اس میں سُمیری زبان بھی داخل کر دی ـ J. Oppert نے اپنی کتاب *Les Peuples et la Langue des Mèdes*، پیرس ۱۸۸۹ء میں ھَخامَنِشی کتبوں (نو عَیلامی the Neo-Elamite) کے دوسرے عمود کی زبان کو غلطی سے مادی Median زبان سمجھا اور یہ غلط نتیجہ نکالا کہ مادی لوگ بھی "تورانی" تھے ـ غرض تورانی کو انبارِ متفرّق بنا دیا گیا اور جن زبانوں کی

طبقہ بندی کا معاملہ ابھی معلّق تھا انھیں خواہ مخواہ اس میں ڈال دیا جانے لگا لیکن تنقید کا صحیح طریقہ کاسترین Castrén (۱۸۶۲ء) پہلے ھی بتا چکا تھا ـ اس نے سب سے پہلے پانچ زبانوں والے "اُورال ـ آلتائی" زمرے کو یعنی فینی۔اُوغری، ساموییدی Samoyed، ترکی-تاتاری، منگولی اور تُونغُوزی کو زُمرۂ مذکور کی شاخوں سمیت الگ کر لیا ـ بعد کی تحقیقات سے ان کی اَور بھی زیادہ تحدید ہو گئی؛ یعنی اس گروہ کی پہلی دو زبانیں مؤخّرالذکر تین زبانوں سے الگ کر دی گئیں، جن پر آلتائی گروہ مشتمل ہے ـ رام شٹیٹ G. Ramstedt نے، جو اس گروہ کی تقابلی صرف و نحو کا بانی ہے، قدرے پس و پیش کے بعد معقول و محکم دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ ترکی زبان کا تعلّق منگولی زبان سے ہے اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان دونوں کا تعلّق تُونغُوزی زبان سے ہے، لیکن دوسری طرف اس بات کا قطعی ثبوت ابھی بہم نہیں پہنچا کہ فینی ـ اُوغری (Finno-Ugrian) اور ساموییدی زبانوں کا بھی آلتائی زبانوں سے کوئی تعلّق ہے ـ اب رہی اصطلاح "تورانی" تو آج کل کے علمِ زبان شناسی میں یہ اصطلاح قطعاً متروک ہے؛ قب Deny : *Les Langues turques, mongoles et toungouzes*، در *Les langues du Monde*، پیرس ۱۹۲۴ء؛ Poppe : *La parenté des langues altaïques, Histoire et état actuel de la question* (روسی زبان میں)، باکو ۱۹۲۶ء؛ Sauvageot : *Recherches sur le vocabulaire des langues ouraloaltaïques*، پیرس ۱۹۲۹ء.

اتّحاد تورانی یا الجامعۃ التورانیّۃ (پان-تورانین ازم) : یہ سیاسی اصطلاح ہے جو ایک طرف تحریک اتّحادِ ترک (Pan-Turkish movement یعنی تُورک ـ جولُوک Türk-Djülük "کیشِ ترکی"، "ترکیّت") کے مترادف کی حیثیت سے مستعمل

ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کا استعمال ایک ایسے مفہوم کے لیے ہوتا ہے جو اس سے بہت زیادہ مبہم ہے، یعنی "تورانی اقوام" کے درمیان مفاہمت و تقریب کا میلان۔

اس دوسرے معنی میں خاص طور پر ہنگری میں یہ کلمہ استعمال ہوا، جہاں ۱۸۳۹ء سے توران کی اصطلاح پہلی مرتبہ ایک دور افتادہ آبائی وطن کے مثالی مفہوم میں استعمال میں آئی (بقول کاؤنٹ تیلکی Count Teleki : "eine gewisse "Schwärmerei für Stammland und Stammverwandte یعنی وطن قومی اور صِلاتِ قومی کے لیے صادق جوش و خروش)۔ عالمگیر جنگ کے دوران میں انجمن تورانی *Turanische Gesellschaft* نے بوڈاپسٹ میں مجلّۂ *Turan* (توران) جاری کیا اور بلغاری اور ترکی تعریف ناموں (prospectuses) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ "ان قوموں" کی تاریخ اور تہذیب کا مطالعہ کیا جائے "جن کا ہمارے ساتھ رشتہ ہے" (ترکی میں: "بِزِم لہ قرابتی اولان مِلّتلر)۔ مگر مجلّے کے مدیر نے (۱۹۱۸ء، عدد ۱: ص ۵) اس بارے میں ذیل کے الفاظ میں خصوصی روش اختیار کی ہے: "ہمارا توران جغرافیائی وطن ہے، یعنی نہ وہ میکس مُلّر Max Müller کا توران ہے، جو بجائے خود گرم بحث کا موضوع ہے اور نہ وہ ایسا توران ہے جس کے ساتھ سیاسی آرزوئیں وابستہ ہوں"۔ کاؤنٹ تِلکی اور پروفیسر شولنوکی Cholnoky کے تصوّر کے (*Turan, ein Landschaftbegriff*، کتاب مذکور، عدد ۱: ص ۸۵) توران سے مراد وہ ملک ہے جس کی حدود حسبِ ذیل ہیں: بحرِ خَزَر، سطحِ مرتفع ایران، وہ پہاڑ جو سیر دریا اور اِیرتِش کے منبع پر واقع ہیں اور سطح مرتفع آق مولِنسک Akmolinsk ۔ اس جغرافیائی محیط کی یکسانیت اور اس کا اثر جو اس علاقے کے باشندوں پر پڑا ہے اس کے بارے میں ان مصنّفین کی رائے کی قدر و قیمت نظر انداز بھی کر دی جائے تب بھی ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مصطلحاتِ جغرافیہ (قبّ سطورِ بالا) کے نقطۂ نظر سے لفظ توران کا یہ استعمال بالکل نیا اور انفرادی ہے۔ اجمالاً کہا جا سکتا ہے کہ کلمۂ ترکستان میں کم از کم یہ خوبی تو ہے کہ وہ ایک معیّن تصوّر ذہن میں پیدا کرتا ہے لہٰذا اس کے بجائے توران کی اصطلاح اختیار کرنا بے سود ہے۔

روس میں بھی ہمیں اس قسم کے میلانات مل سکتے ہیں جو ہنگری کے "تورانیوں" کے متوازی ہوں۔ وہ گروہ جو "یُورِیشیائی" ("Eurasian") کہلاتا ہے اس نے جغرافیائی سیاست اور ان ثقافتی اثرات میں بھی جو یوریشی اقوام معرضِ ظہور میں لائیں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے؛ قبّ *L'héritage de Čingiz-khan* : I. R. (بزبانِ روسی)، برلن ۱۹۲۵ء؛ *Sur* : Prince N. Troubetskoï *l' élément touranien de la culture russe* (روسی زبان میں)، پیرس ۱۹۲۷ء۔ اگر تحریکِ اتّحادِ تورانی (Pan-Turanian) کو "اتحادِ ترکی" ("Pan-Turkish") کے محدود تر معنوں میں لیا جائے تو اس کے میلانات اصولی طور پر نسبتاً واضح تر ہیں لیکن چونکہ اس نیم ثقافتی نیم سیاسی تحریک کا ابھی تک مکمّل مطالعہ نہیں ہوا، اس لیے ہم صرف اس کے ارتقاء کے مدارج اور اس کے لائحۂ عمل کا مختصر سا خاکہ ہی پیش کر سکتے ہیں۔

عثمانی امپراطوریہ جب اپنی وسعت کی انتہائی حد پر تھی تو اس زمانے میں بھی اس میں کیشِ ترکی (Turkism) کی طرف کسی طرح کے میلانات نہیں پائے جاتے تھے۔ بڑی سے بڑی اسامیاں ایسے غیر ترکوں سے پُر کی جاتی تھیں جنھیں دائرۂ اسلام میں آئے ہوئے اکثر

صورتوں میں تھوڑی ھی سی مدّت گذری ھوتی تھی۔ عیسائی بچوں کی جبری بھرتی سے [دیکھیے دیوشرمہ] سلطنت کو ملکی اور عسکری خدمات کے لیے قابل ترین افسر مہیّا ھو جاتے تھے (قب Lybyer : The Government of . . . Suleiman the Magnificent، کیمبرج میسا چوسٹس ۱۹۱۳ء، ص ۱۰۵ تا ۵۶) ۔ چونکہ عثمانی سلاطین کو خلیفۃالمسلمین کا منصب بھی حاصل تھا اس نئے نظریے کی رو سے یہ بات خارج از امکان تھی کہ ترکی عناصر کو امپراطوریہ کی دوسری مسلم رعایا پر ترجیح دی جائے ۔ انیسویں صدی میلادی میں بھی خلافتِ عثمانیہ میں '' توُرک '' کے معنی صاف طور پر '' کسان، گنوار اور دھقان '' کے تھے (قب شائع ضرب المثلیں) ۔ اس سلسلے میں محمد امین بک کی ایک نظم ھے جو جنگِ یونان کے موقع پر ۱۸۹۷ء میں لکھی گئی؛ اس سے وہ تاریخ معین ھوتی ھے جس سے اس لفظ کا مفہوم پورے طور پر بدل گیا : بِن بِر تُوْرکُوْکم دِینم جِنسم اُلُودُر'' ۔ ''میں ترك ھوں، میرا مذھب اور میری جنس دونوں بلند ھیں''۔

متعدّد عوامل ایسے ھیں جن سے ' ترکی ' تحریک کا ارتقاء متعیّن ھوا ۔ اس تحریک کو بعض اوقات ''تورانی'' تحریک بھی کہتے ھیں:

(الف) انیسویں صدی میں بےشمار قومی تحریکوں (مثلاً یونانی، جرمنیّ، ایطالوی، سلاوی، ارمنی اور عربی) کا وجود میں آنا؛ ان میں سے متعدّد تحریکیں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف تھیں.

(ب) عثمانی سلطنت کی ھزیمتیں، جن کا نتیجہ یہ ھوا کہ وہ بلقان، افریقہ اور بالآخر ایشیا میں بھی اپنے مقبوضات سے محروم ھو گئی (شام، بلادِ عرب، عراق عرب اور موصل) ۔ عثمانی سلطنت کا جتنا علاقہ کم ھوتا گیا اسی قدر اناطولیا کا ترکی عنصر اھمیت حاصل کرتا گیا، نہ صرف آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ دولتِ ترکیہ کے لیے وھی اناطولی عنصر استوار و محکم بنیاد کا کام دے سکتا تھا.

(ج) علمِ '' تُرکی شناسی '' کی ترقّی، اسی کے ذریعے سے ترکی اقوام کی ایک فہرست مرتّب ھوئی اور ان کی زبانوں کا باھمی ربط ثابت ھوا اور اسی سے ترکوں کی ابتدائی تاریخ پر بھی روشنی پڑی ۔ [اس تحریک کو ھوا دینے میں تألیفِ کاھوں L. Cahun : *Introduction à l' histoire de l'Asie*، پیرس ۱۸۹۶ء، جو افسانوی رنگ میں لکھی گئی تھی، مستقیماً ممدّ و مددگار ثابت ھوئی ھے (جسے نجیب عاصم نے بتصرّف ترکی کا جامہ پہنایا) ۔ منجملہ ان قدیم تر تألیفات کے جو اسی طریق پر اثر انداز ھوئیں ضیاگوك آلْپ نے دو کتابیں گنائی ھیں : (۱) de Guignes : *Histoire générale des Turcs, des Mongols et des Huns*، پیرس ۱۷۵۶ء تا ۱۷۵۸ء؛ (۲) Lumley Davids : *Turkish Grammar*، لنڈن ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۶ء ۔ اس سلسلے میں قومی تحریکوں کے وہ خاکے بھی قابلِ ذکر ھیں جو *Revue du Monde Musulman* نے شائع کیے نیز ھارٹمن R. Hartmann کی تصنیف، کیونکہ ان کا رجحان اس طرف ھے کہ ترکی اقوام میں رشتۂ یگانگت ثابت کریں].

(د) روس کے اندر مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کی تشکیل جن کا اھمّ جزو '' ترکی - تاتاری '' تھا اور ۱۹۰۵ء کے واقعات جنھوں نے روس کے ترکی پریس کو قوّتِ حرکت بہم پہنچائی ۔ روسی تارکانِ وطن، مثلاً حسین زادہ (باکو)، یوسف آق چُورہ (قازان) اور احمد آغا اُوغلو (قراباغ) اس تحریک کے روح و رواں ثابت ھوے، بلکہ انھیں ترکیہ کے ترکوں کی سخت مخالفت کو مقابلہ کر کے دبانا پڑا.

بیسویں صدی کی ابتدا میں ترکوں کے سامنے تین سیاسی نظریے تھے: اتّحاد اسلامی (Pan-Islamism)، عثمانیت (Ottomanism) اور اتّحاد ترکی (Pan-Turkism) ۔ قاهرة سے ایک رساله تورك شائع ہوتا تھا ۔ یه ۱۹۰۲ - ۱۹۰۳ء کی بات هے که اس رسالے میں ان نظریوں پر کھلی بحث شروع ہوئی ۔ ''اتحاد ترکی'' کے نقطۂ نظر کی حمایت یوسف آق چوره اوغلو نے کی ۔ اس کے مقالے کا عنوان تھا: ''اوچ طرز سیاست'' (جو ۱۳۲۷ھ میں استانبول میں دوباره چھاپا گیا)؛ اس تحریک کا تفصیلی لائحۂ عمل مرتّب کرنے میں اس مقالے کا بڑا دخل هے ۔ آق چوره نے ''عثمانی تحریک'' پر نکته چینی کی اور کہا که اس سے ترکوں کے حقوق میں کمی واقع ہوتی هے اور یه تحریک اسلامی تعلیمات کے خلاف هے، کیونکه اسلام تمام مسلمانوں کے لیے برابر کے حقوق تسلیم کرتا هے ۔ دوسری طرف ''اتّحاد اسلامی'' (Pan-Islamism) هے، اس سے غیر مسلم مشتعل هو جائیں گے اور یورپ کی بعض سلطنتیں بھی اس کی مزاحمت کریں گی ۔ اس کے بعد مصنف نے ''اتّحاد ترکی'' (Pan-Turkism) **کی حمایت کی، اس بنا پر که اس راہ میں جو سب سے** بڑی مشکل هے یعنی روس کی مخالفت وه دوسری حکومتوں کی مدد سے دور کی جا سکے گی (*R. M. M.*، ۲۲: ۱۷۹ تا ۲۲۱)۔

اسی رسالۂ تورک میں حرّیت پسند علی کمال نے ''عثمانیت'' کی حمایت میں آق چوره کے نظریے پر نکته چینی کی، نیز احمد فرید نے اس وجه سے اس نظریے پر اعتراض کیا که اتحاد اسلامی اس کے نزدیک ناممکن الحصول تھا اور اتّحاد ترکی اس وقت تک کوئی وجود هی نه رکھتا تھا ۔

جولائی ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے ابتدائی ایّام میں عثمانی قومیت کا نظریه سرکاری طور پر غالب آ گیا (جو تمام نسلی عناصر کے لیے عثمانی شہریت کے حقوق یکساں طور پر تسلیم کرتا تھا) لیکن ابھی ایک سال بھی نه گذرا تھا که انجمن اتّحاد و ترقی کو با دلِ ناخواسته یه تسلیم کرنا پڑا که خلافت عثمانیه جن اقوام پر مشتمل هے ان کے رجحانات میں تطبیق و توفیق ممکن نہیں ۔ ترکی قومیت کی تحریک (Turkist movement) اس اثنا میں بڑی سرعت سے زور پکڑ رهی تھی۔

۲۴ دسمبر ۱۹۰۸ء کو استانبول میں ترکی مجلس (تورک درنکی *Türk Derneyi*) قائم کی گئی، جس کا مقصد یه تھا که تمام ترکی اقوام کے ''احوال و افعال'' کا مطالعه کیا جائے لیکن عملاً اس مجلس کی دلچسپیاں محض ان لسانی مسائل تک محدود رهیں جن پر یکی لسان، گنج اور قلملر وغیره رسالوں میں بحث کی جاتی رهی ۔ ۱۹۱۱ء میں ترویج علوم کے لیے ایک تورانی مجلس (''توران نشر معارف جمعیتی'') قائم ہوئی؛ پھر دسمبر میں رسالۂ تورک یوردی کا پہلا شماره یوسف آق چوره کی ادارت میں شائع ہوا ۔ ۲۰ مئی ۱۹۱۲ء کو تورک اوجاق لری (''ترکوں کے چولھے'') کی بنیاد رکھی گئی؛ **یه وه حلقے تھے** جہاں ترکی تہذیب و ثقافت کا مطالعه ہوتا تھا ۔

اسی زمانے میں ترکی قومیت کے نظریاتی پہلو کے سب سے بڑے علمبردار ضیا گوک آلپ [رک بآن] نے، جو ۱۹۱۰ء میں اتّحاد و ترقّی کی مرکزی کمیٹی کا رکن منتخب هو چکا تھا، اپنی سرگرمی پہلے سلانیک میں (۱۹۰۹ء) اور بعد میں استانبول میں (۱۹۱۲ء) شروع کی ۔ اس نے نظموں کا ایک سلسله شائع کیا اور ترکوں کے رگ و پے میں جو جذبات خوابیده تھے انھیں بیدار کیا اور اس ترکی مطمح نظر (آئیڈیل) کے گیت گائے جو توران کی پر اسرار سر زمین میں متمثّل تھا ۔ ضیا کہتا هے: اوغوزخان کی

اولاد اس ملک کو کبھی نہیں بھولے گی جس کا نام توران ہے'' (تُورک لُوک، ۱۹۱۱ء) ۔ یہ وہ سرزمین ہے جس کے ساتھ آیٹیلا Attila، فارابی، الغ بیگ اور ابن سینا وابستہ تھے، (مؤخر الذکر یعنی ابن سینا [رک بآں] کے ترکی الاصل ہونے کو ہرگز ثابت شدہ قرار نہیں دیا جا سکتا)۔ '' ترکوں کا آبائی وطن نہ ترکیہ ہے اور نہ ترکستان، ان کا اصلی وطن تو توران کی عظیم الشان ازلی ابدی سرزمین ہے'' (توران، ۱۹۱۴ء).

ضیا گوک آلپ کی تعلیمات کا خلاصہ اس کے اس مقولے میں ہے :'' اپنے آپ کو ترك بناؤ (یعنی ثقافت (حرث') کے لحاظ سے)، اپنے آپ کو مسلم بناؤ اور اپنے آپ کو زمانۂ حال کے رنگ میں رنگو (یعنی 'مدنیت' کے اعتبار سے)'' ۔ اس مصنف کے نظریوں کی باقاعدہ تشریح کتاب تُورک جولُوکُک اساس لَرِی ('' ترکیت کے بنیادی اصول '') میں پائی جاتی ہے، جو مصنف کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء میں انقرہ سے شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں توران کے تخیل کو نسبۃً زیادہ عملی انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ ضیا گوک آلپ نے قوم کا اطلاق افراد کی اس جماعت پر کیا ہے جو زبان، مذہب، اخلاقیات اور جمالیات کے واحد رشتے میں منسلک ہوں، گویا توران ترکوں، منگولوں، تونغوزوں، فنوں Finns اور مجاروں (ہنگری کے لوگوں) سے مرکب نہیں ہے بلکہ ''توران ایک نام ہے جس میں صرف ترکی قبائل شامل ہیں'' ۔ ترکوں کو صرف تدریجی طور پر رفتہ رفتہ متحد کیا جا سکتا ہے ۔ ترکیت کی تحریک کا اولین نصب العین یہ ہے کہ اغوز ترکوں یعنی ترکیہ کے ترکوں اور ترکمانانِ آذربایجان و ایران و خوارزم میں ثقافتی اتحاد پیدا کیا جائے ۔ فی الحال ان کا سیاسی اتحاد تو مدِ نظر نہیں لیکن مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، دوسری طرف اگر تاتاری لوگ یعنی اوزبگ اور قیرغیز اپنی اپنی خصوصی ثقافتیں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس وقت وہ اپنا اپنا نام قائم رکھیں گے مگر اس صورت میں توران مذکورۂ بالا تمام اقوام کا مشترک نام بن جائے گا اور ان کے درمیان نسلی اتحاد ('جامعہ') بھی قائم ہو جائے گا.

توران کا رومانی تخیل خالص ادبی میدان میں بھی مصنفین پر مختلف طور سے اثر انداز ہوا ہے؛ احمد حکمت : ('آلتین اُوردو')؛ خالدہ ادیب خانیم : (یکنی توران، ۱۹۱۳ء)؛ آقا گوندوز : (مُحترم قاتل، یہ ایک ڈراما ہے جو ۱۹۱۴ء میں تصنیف کیا گیا ۔ اس کا موضوع قفقاز میں ترکوں کی شورش ہے)؛ شفیدہ فرید خانیم : (آی دمر، وسطی ایشیا میں ترکوں کی شورش پر) ۔ جنگ کے زمانے میں توران کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کے لیے قب ہارٹمن M. Hartmann : *M. S. O. S.*، ۱۹۱۸ء، ۲۱ : ۱۹ تا ۲۲ .

۱۹۱۴ء کی جنگ میں نوجوان ترك یعنی انجمن اتحاد و ترقی کے اعضاء، جن کے ہاتھ میں سلطنت عثمانیہ کی زمامِ حکومت تھی، سرکاری طور پر (کم از کم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) عثمانی قومیت کے حامی تھے لیکن ارمنیوں کو ۱۹۱۵ء میں ملک بدر کر کے انھوں نے در اصل ترکیہ کو خالص ترکوں کا وطن بنانے کے لائحۂ عمل کو عملی صورت دی.

مشرق کی طرف توسع : ۱۹۱۴ء کی جنگ نے ترکیہ کے ترکوں اور ان کے ابنائے جنس کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا تھا، مگر ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب نے صورتِ حالات کو بدل دیا ۔ بْرِسْٹ لِٹُووْسْک Brest-Litowsk کے صلحنامے کی ایک دفعہ کی رُو سے، جس کا اضافہ

عین آخری لمحے میں ہوا، ترکی سلطنت کی حدود دوبارہ ماورائے قفقاز کی اس سرحد تک پہنچ گئیں جو ۱۸۷۷ء میں تھیں (اور روس مقاماتِ باطوم، قرص اور اَرْدَہان سے دست‌بردار ہو گیا) ۔ آذربایجان کے ترکوں نے عثمانیوں کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا، جس سے ماورائے قفقاز کی ریاستوں کے حِلْف (گروہ بندی) کا خاتمہ ہو گیا (۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء) اور اس کے بجائے (آذربایجان، گرجستان اور اِرْمِینِیَة کی) تین خودمختار جمہوریتیں قائم ہوئیں ۔ [غازی] انور پاشا کے بھائی کی قیادت میں ترک بڑھتے بڑھتے پیٹرووْسک Petrowsk تک جا پہنچے تھے، جو بحرِ خَزَر پر واقع ہے، مگر التوائے جنگ کے معاہدۂ مُدْرُوس Mudros (۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء) کی بناء پر ترکوں کو واپس ہونا پڑا ۔ اس پر انگریزوں نے اوّل اوّل تو ماورائے قفقاز پر قبضہ کر لیا مگر بعد میں وہاں سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دارالخلافے پر اتّحادی قابض تھے اور داماد فِرید پاشا کی حکومت اضطراب کے عالم میں عثمانیت کا لائحۂ عمل آشکار کرنے کی آخری کوشش کر رہی تھی ۔ اسی اثناء میں ایشیائے کوچک میں قومی حکومت قائم ہوئی (تابستان ۱۹۱۹ء) اور اُس تمام علاقے پر بدستور قبضہ رکھنے میں کامیاب ہوئی جو ترک نوجوانوں نے معاہدۂ بْرِسْٹ لِٹُووْسْک کی رُو سے حاصل کیا تھا ۔ جمہوریۂ اِرمینیة کو فتح کر لیا گیا (صلحنامۂ الیگیزنڈروپول Alexandropol ، مؤرّخۂ ۳ دسمبر ۱۹۲۰ء) ۔ گرجستان نے اپنے غیر جانبدار ہونے کا اعلان کر کے (۲۳ فروری ۱۹۲۱ء کے) بَلاغ نہائی (الٹیمٹم) کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، جس کا مضمون یہ تھا کہ اَرْتْوِین Artwin اور اَرْدَہان Ardahān کو خالی کر دیا جائے ۔ ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو ترکی - روسی معاہدے پر ماسکو میں دستخط ہو گئے اور ۱۳ اکتوبر کو قَرص میں اس کی توثیق کر دی گئی ۔ اس موقع پر قفقاز کی تین جمہوریتیں بھی (جواب سوویتی ہو گئی ہیں) شریک تھیں ۔ ترکیہ باطوم سے دست بردار ہو گئی، لیکن انھیں ناحیۂ اِگْدِر مل گیا، جو دریائے اَرَس (Araxes) پر واقع تھا اور جس کا بْرِسْٹ لٹووسک کے صلحنامے میں کوئی ذکر نہیں تھا (ناحیۂ اِگْدِر وہ علاقہ ہے جو ۱۸۲۸ء میں ایران نے روس کے حوالے کر دیا تھا) ۔ اس طرح سے ترکی حکومت کی سرحدیں نَخْچِوان کی سرحدوں سے متّصل ہو گئیں : نَخْچِوان کے علاقے کو آذربایجان کی سوویاتی جمہوریت کا تابع علاقہ قرار دے دیا گیا تھا ۔

انقرہ کی حکومت کو اس طرح ماورائے قفقاز میں کئی علاقے مل گئے ۔ لیکن اس نے انور پاشا کی کامیابیوں کو تسلیم کرنے سے علانیہ انکار کر دیا ۔ انور پاشا ابتداء میں تو روسی حکومت کے حلیف بنے رہے لیکن آخرکار انھوں نے ترکستان میں علمِ بغاوت بلند کر دیا، جہاں وہ ایک ترکی امپراطوریہ قائم کرنا چاہتے تھے ۔ وہ ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو مشرقی بخارا میں ایک چپقلش میں کام آئے (''وہ شہیدِ حرکتِ ترکیّت تھے''، جیسا کہ ان کے ہمکار ڈاکٹر ناظم نے اس مقدمے کے اثنا میں کہا تھا جو اگست ۱۹۲۶ء میں نوجوان ترکوں پر چلایا گیا تھا)؛ تَبّ: Castagné : *Les basmatchis*، پیرس ۱۹۲۷ء۔

ثقافتی تحریک : تورانی تحریک کے قدیم علم‌بردار انقرہ کی حکومت کی حمایت میں پہلے ہی سے جمع ہو چکے تھے (محمد امین شاعر اور آق چورہ اوغلو اپریل ۱۹۲۱ء میں انقرہ پہنچ گئے تھے) ۔ ۲۳ اپریل ۱۹۲۴ء سے جماعت ''تُورک اوجاق لری'' نے اپنی سرگرمیاں حمد اللہ صُبْحِی کی قیادت میں دوبارہ شروع کر دیں ۔ ان کی پہلی

قورلتای [یعنی مجلسِ مشاورت] ۲۸ مارچ ۱۹۲۶ء کو انقرہ میں منعقد ہوئی - ۱۹۲۸ء میں یوسف آق چورہ نے استانبول سے سالنامۂ تورك یلی (ترکی سال) شائع کیا، جس میں ممالکِ غیر میں ترکوں کی کارروائیوں کے خلاصے درج ہوتے تھے - ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ترکیّہ میں مہاجرین کی ایک نئی رَو چلی آئی - قدیم قومی حکومتیں، جنھیں سوویتوں (اشتراکیوں) نے تباہ کر دیا تھا، ان کے حامیوں نے ایک رسالہ یکی قفقازیہ (۱۹۲۳ء) جاری کیا اور مارچ ۱۹۲۹ء میں اس کی جگہ اودلو یورت شائع ہوا یعنی ''سرزمینِ آتش'' (= آذربایجان) - مگر ان رسالوں نے، جن کا نصب العین وحدت ترکی تھا، مقامی ترکی صحافت کے ساتھ ربط پیدا نہیں کیا.

اب رہے وہ ترك جو کبھی روسی امپراطوریہ میں آباد تھے، وہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد نہ صرف اپنی خصوصی تہذیب کے استقرار اور خودمختاری کے حصول میں کامیاب ہوے ہیں بلکہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھ چکے ہیں لیکن اس فطری ارتقاء کے ساتھ ساتھ سوویتی روسیہ U.R.S.S. کے ترکوں نے روسی انقلاب میں بالارادہ اور بلاارادہ ہر مرحلے میں حصّہ لیا ہے - اس وقت (یعنی ۱۹۳۰ء میں) خاص اور عام عوامل کے نتائج میں امتیاز کرنا ناممکن ہے اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ترکی نسل کے تمام لوگوں کے میلانات کس انتہائی نقطے پر جا کر منتہی اور متّفق ہوں گے.

وہ مقالے جو پیش ہوے اور بحثیں جو باکو کی پہلی ترکی کانفرنس میں ہوئیں، بہت دلچسپ تھیں - یہ کانفرنس ۲۶ فروری سے لے کر ۶ مارچ ۱۹۲۶ء تک منعقد رہی - اس میں اتّحاد سوویاتی اور بیرونی ملکوں کے کل ایک سو اکیس مندوب شریک ہوے، جن میں سے دو نمائندے ترکیہ سے بھی آئے تھے - (ان مقالوں وغیرہ کے لیے ملاحظہ ہو مختصر نویسی کے طریق پر لکھی ہوئی وہ روئدادیں جو روسی زبان میں باکو سے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئیں؛ نیز منتسل Menzel کی سیر حاصل تلخیص، جو ۱۹۱۸ء کے رسالۂ *Der Islam* میں چھپی) یہ کانگرس کی اس قرارداد نے کہ افراد کو رومن رسم الخط اختیار کرنے کی اجازت ہو (۱۹۲۸ء سے یہ اجباری ہو جائے) ترکیہ میں بھی (۱۹۲۸ء سے) نئے رسم الخط کے اجراء کے مسئلے میں بہت اثر ڈالا (قب : H. Duda : *Die neue Lateinschrift in d. Türkei*، در *O. L. Z.*، جون ۱۹۲۹ء، عمود ۴۴۱ تا ۴۵۳ : E. Rossi : *Il nuovo alfabeto* در *Oriente Moderno*، جنوری ۱۹۲۹ء، ص ۳۳ تا ۳۸).

اتّحاد ترکی کی تحریک کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنا مشکل ہے - ثقافتی اعتبار سے انقرہ جیسے عظیم مرکزِ ترکیّت میں جو کشش ہے وہ طبعی اور لابدی ہے - لیکن انقرہ اب ایک دنیاوی دارالحکومت ہے اور قدیم استانبول کی شان سے قطعاً عاری ہے، لہٰذا بنیادی طور پر اس کے اثر و نفوذ کی شدّت کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ ترکی ثقافت (''حرث'') جو وہاں نشو و نما پائے گی اس کی قدر و قیمت کیا ہے - اتنی بات بھی کوئی آسان چیز نہیں کہ ضیاگوك آلپ کے نظریے کے مطابق ان تمام ترکوں کو '' جو اوغوز کی نسل سے ہیں'' ایک ثقافت ('' حرث '') کے تحت لایا جائے، مثال کے طور پر ایرانی ترکوں کو لیں، جو ترکیہ کے قریب ترین پڑوسی ہیں، یہ بہت حد تک ایرانی ثقافت کے زیر اثر ہیں اور اس اثر کا ثبات و دوام ایک تاریخی حقیقت ہے - اب رہا ترکی اقوام کے سیاسی اتّحاد کا معاملہ، تو ہمیں اُن بغایت مختلف حالات کو پیشِ نظر رکھنا ہو گا جن کے تحت یہ لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں -

ان کے علاقے بہت منتشر ہیں، انہیں بحر خَزَر اور دشت نے جدا کر رکھا ہے ۔ ماورائے قفقاز میں وہ تنگ راہ گذر، جس کے ایک طرف گرجستان اور اَرْمِینِیَة ہیں اور دوسری طرف ایران، بہت تنگ اور بے اہمیّت ہے ۔ اِلّا اُس وقت کہ ماورائے قفقاز اور ایران دونوں ملکوں میں حالات بیک وقت مکمّل طور پر منقلب ہو جائیں، اور یہ بات خالص اور سادہ تحریک ترکیّت کے پروگرام سے بالکل خارج ہے ۔

مآخذ : (۱) آق چورہ اوغلو : اُوچ طرز سیاست، در رسالۂ Türk تُورک، قاہرۃ (طبع مکرّر در استانبول ۱۳۲۷ھ)؛ (۲) عُمر سیف الدین : یارِینکی تُوران دولتی، استانبول ۱۳۳۰ھ؛ (۳) Martin Hartmann : *Chinesisch-Turkestan*، طبع Halle ۱۹۰۸ء، بمواضع کثیرہ؛ (۴) وہی مصنف : *Unpolitische Briefe aus d. Türkei*، لائپزگ ۱۹۱۰ء، بمواضع کثیرہ؛ (۵) وہی مصنف : *Aus d. neueren osman. Dichtung*، در *M. S. O. S.*، ج ۱۹، (۱۹۱۶ء) : ص ۱۲۳ تا ۱۷۹؛ ج ۲۰، (۱۹۱۷ء) : ص ۸۶ تا ۱۴۹؛ ج ۲۱، (۱۹۱۸ء) : ص ۱ تا ۸۲؛ ج ۱۰ (= تقی زادہ) : *Les courants politiques en Turquie*، در *R.M.M.*، ج ۲۱، ۱۹۱۲ء : ص ۱۵۸ تا ۲۲۲؛ (۶) وہی مصنف : *Le panislamisme et le pantouranisme*، در *R.M.M.*، ج ۲۲، ۱۹۱۳ء : ص ۱۷۹ تا ۲۲۱؛ (۷) Tekin Alp (= Moses kohen) : *Turkismus und Panturkismus*، ویمر Weimar ۱۹۱۵ء؛ (۸) Lothrop Stoddard : *Panturanism*، در *The Amer. Polit. Science Review*، ۱۹۱۷ء، ۱۱ : ۱۲ تا ۲۳؛ (۹) *A manual on the Turanians and Pan-turanianism compiled by the Geogr. Section of the Naval intelligence Division*، Naval Staff Admiralty، لنڈن ۱۹۱۷ء (اس میں زیادہ‌تر ''تورانی'' اقوام اور قبائل کا شمار دیا گیا ہے، جن میں سامویدی اور فِن ۔ اُوغری بھی شامل ہیں)؛ (۱۰) *Muhammedan History*، عدد ۵۷، منجملۂ *Handbooks prepared under the direction of the historical section of the Foreign Office*، لنڈن ۱۹۲۰ء (اس میں ایک باب ہے : *The rise of the Turks and the pan-Turanian movement*؛ [اِن دونوں جلدوں کا مواد مصالحتی کانفرنس Peace Conference کے موقع پر جمع کیا گیا]؛ (۱۱) احمد محی الدین : *Die Kulturbewegung im modernen Türkentum*، لائپزگ ۱۹۲۱ء؛ (۱۲) احمد امین : *The development of Modern Turkey as measured by its press*، نیویارک ۱۹۲۳ء؛ (۱۳) ضیا گوک آلپ : *Türkčülüyün esāslarî*، انقرہ ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۳ء) [جس کے نہایت ہی عمدہ خلاصے کے لیے دیکھیے ہارٹمن : *Grundlagen des türk. Nationalismus*، در *O.L.Z.*، ۱۹۲۵ء، عدد ۹ تا ۱۰ : عمود ۵۷۸ تا ۶۱۰، نیز E. Rossi، در *Oriente Moderno*، ۱۹۲۵ء، ص ۵۷۴ تا ۵۹۵]؛ (۱۴) Zarevand: *Turtsiya i panturanism*، پیرس ۱۹۳۰ء (زبان روسی ہے اور نقطۂ نگاہ ارمنی، یورپی مآخذ بھی دیے ہیں)۔

(V. Minorsky مِنورسکی)

تُوران شاہ : توران شاہ بن ایّوب، الملک المعظّم شمس الدولۃ، فخرالدین، یمن کے ایّوبی خاندان کا مُورثِ اعلٰی ۔ وہ رجب ۵۶۹ھ / فروری ۱۱۷۴ء کے آغاز میں تخت نشین ہوا ۔ اس سے دو سال پہلے آخری فاطمی بادشاہ عاضِد [رَکَ بآں] کی وفات نے صلاح الدین ایّوبی کو آئین و آداب کے مطابق مصر کا حاکم بنا دیا تھا ۔ نورالدین محمود زنگی اتابک اور صلاح الدین کے درمیان حاکم و محکوم کے جو تعلّقات تھے وہ اب مصنوعی سے ہو چکے تھے، بلکہ دونوں کے درمیان لڑائی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا ۔ بیت المقدس کے بادشاہ اَملْرِک Amalrich سے صلاح الدین کی جنگ جاری تھی لیکن وہ ابھی تک مطیع نہیں ہوا تھا اور کَرَک اوز شَوبَک [رَکَ بآں] کے صلیبی محاربین

مصر کی طرف جانے والی شاہراہوں میں غارت گری کر رہے تھے ۔ ایسے وقت میں صلاح الدین کے دل میں یمن کے فتح کرنے کا خیال پیدا ہونا قابلِ ملاحظہ ہے اور مذہبی وجوہ کی بناء پر اس نبرد آزمائی کی کوئی پوری تشریح نہیں ہو سکتی، یعنی اس بناء پر کہ اس کے لیے زَبید سے خارجی [عبدالنبی بن] مَہْدِی [رَكَ به آل المهدی] اور شیعیانِ بنو کَرَم [رَكَ به کَرَم] کا اخراج ضروری ہو گیا تھا، جو عدن سے باقاعدہ طور پر فاطمی سلسلۂ مراتب میں شامل ہو چکے تھے ۔ یہ بات صلاح الدین کی پیش بینی کی واضح دلیل ہے کہ وہ اپنے لیے ایک ایسی اقلیم محفوظ کر لینا چاہتا تھا جہاں وہ ضرورت کے وقت پناہ لے سکے؛ عام صورتِ حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایسی جگہ جنوب ہی میں مل سکتی تھی اور صرف وہیں وہ اپنی فوج کو بھی مصروف رکھ سکتا تھا؛ اس لیے کہ اگرچہ نورالدین سے کھلم کھلا نبرد آزمائی پر اُتر آنا پسند نہ بھی کرتا تو بھی فلسطین کی فرنگی ریاست کو کچھ عرصے کے لیے اپنے اور نورالدین زنگی کے درمیان حائل بنائے رکھنا عین مصلحت تھا ۔ اس سے صرف ایک ہی سال پہلے اس نے اپنے پانچ بھائیوں میں سے ایک بڑے بھائی یعنی توران شاہ کو، جس کا تعلّق عام روایت کے مطابق آخری فاطمی بادشاہ کی موت سے تھا، تسخیرِ نُوبَہ کے لیے بھیجا تھا، لیکن توران شاہ نے نُوبہ کو اس لائق نہ سمجھا کہ اس کی تسخیر کے لیے اتنی مشقّت اٹھائی جائے اور اتنا خرچ برداشت کیا جائے ۔ حَرَمینِ شریفین اور مصر کے دیرینہ تعلّقات نے صلاح الدین کی توجہ جزیرہ نمائے عرب کی طرف منعطف کرا دی، جس کی شمالی سرحد پر بندرگاہِ اَیْلَة [رَكَ بآن] واقع تھی اور اُس پر ۵۶۶ھ / ۱۱۷۱ء میں پہلے ہی سے قبضہ ہو چکا تھا، اس لیے

توران شاہ کو یمن بھیج دیا گیا، جہاں اُس نے شوّال ۵۶۹ھ/مئی ۱۱۷۴ء میں زَبید فتح کر لیا اور اسی سال وہ عدن پر بھی قابض ہو گیا اور اس سے اگلے ہی سال اُس نے صنعاء سے علی بن حاتِم الوَحید ہَمْدانی کو مار بھگایا، جس کی تابِ مقاومت صَعْدَہ کے زیدی امام احمد بن سلیمان کے متواتر حملوں کی وجہ سے پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی ۔ مگر توران شاہ کو [جس کی تربیت بلادِ شام میں ہوئی تھی] ایسے ملک میں کیا آرام نصیب ہوتا جہاں نہ تو کبھی برفباری ہوتی تھی اور نہ اسے اپنی پسند کے میوے ہی مل سکتے تھے؛ اس لیے وہ اپنے بھائی کو تاکیدی درخواستیں بھیجنے کے بعد [ذی الحجة] ۵۷۱ھ [میں دمشق پہنچا اور بھائی سے کہہ سن کر] اس نے اپنی تبدیلی ملک شام میں کرا لی، جو اس اثناء میں نورالدین کی وفات کے بعد صلاح الدین کے قبضے میں آ چکا تھا ۔ ملک شام کے والی کی حیثیت سے تین سال دمشق میں گذارنے کے بعد اس کے بھائی نے اُسے اسکندریہ میں تبدیل کر دیا، جہاں وہ یکم صفر ۵۷۶ھ/۲۷ جون ۱۱۸۰ء کو انتقال کر گیا ۔

توران شاہ کا دورۂ زندگی غیراہم تو نہیں ہے لیکن حقّ پیش قدمی ہمیشہ صلاح الدین ہی کو حاصل رہا؛ توران شاہ بہت حد تک ان لوگوں میں سے تھا جو لذائذ زندگی کا خوب حظّ اٹھایا کرتے ہیں ۔ اُس نے مصر کے زمانۂ قیام ہی میں کافی دولت اکھٹی کر لی تھی؛ نُوبہ کی مہم سے وہ بہت سے غلام اپنے ساتھ لایا تھا، جن میں ایک عیسائی مُطْران (میٹروپولیٹن) بھی شامل تھا ۔ یمن کی مہم سے پہلے بَعْلَبَکّ کی بڑی بڑی پرانی خاندانی جاگیریں اُسے دے دی گئی تھیں اور خود یمن میں بھی اس کے بھائی نے اُسے ذاتی مِلک کے طور پر بیش قرار جاگیریں عطا کیں؛ یمن چھوڑتے وقت اسے

یہی فکر تھی کہ اس [کے نائب] وہاں کے محاصل اسے جلد جلد بھیجتے رہیں۔ یہ شخص باوجود اتنی جاگیروں کا مالک ہونے کے دو لاکھ دینار کا قرض‌دار مرا؛ قرض اُس کے بھائی نے ادا کیا ۔ توران شاہ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ ملک شام کو واپس جانے کی لَو لگی رہتی تھی، اِس لیے اُس کی [سگی] بہن سِتّ‌الشام زُمُرّد اُس کی لاش [مصر سے] لے آئی اور اپنے [مدرسے میں] دفن کرا دیا، جو اُس نے دمشق [کے باہر] تعمیر کرایا تھا.

ایّوبیوں کی فتح یمن کے لیے خاصی اہمّ ثابت ہوئی؛ چنانچہ وہاں کی تین چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متّحد کر کے دولتِ عظیم [ایوبی] سے ملحق کر دیا گیا اور اس ملک پر پوراً پورا تسلّط جما لیا گیا ۔ یہ سچ ہے کہ آخری ہمْدانی فرمانروا پہاڑی علاقے کی طرف فرار ہو کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن آخری مہدی عبدالنبی اور اُس کے دو بھائی اور کَرَم کے آخری حقیقی حکمران یعنی یاسر، جو اس خانوادے کا ناظرِ امور تھا، ان سب کو اطاعت قبول کر لینے کے کچھ عرصے بعد توران شاہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا ۔ فتح کے جلد بعد توران شاہ واپس چلا گیا؛ اس سے مفتوحہ علاقے کا اتّحاد کب قائم رہ سکتا تھا، چنانچہ خطرناک بغاوتیں فوراً ھی شروع ہو گئیں ۔ آخرکار جب صلاح‌الدین نے اپنے دوسرے بھائی طُغْتِگِیْن سیف الاسلام کو وہاں بھیجا اور وہ وہاں ۵۷۸ تا ۵۹۳ھ / ۱۱۸۲ تا ۱۱۹۶ء مقیم رہا تب کہیں اس ملک میں ایّوبیوں کی حکومت حقیقت سے نسبۃً قریب‌تر ہو گئی۔ سیف‌الاسلام کے بعد اس کے بیٹوں معزالدین اسمٰعیل نے ۵۹۸ھ/۱۲۰۱ء تک اور النّاصر ایّوب نے ۶۱۱ھ / ۱۲۱۴ء تک حکومت کی؛ یہ دونوں قتل ہوے ۔ ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء میں ایّوبی خاندان کے سب سے بڑے رکن، یعنی صلاح‌الدین کے بھائی العادل سیف‌الاسلام ابوبکر نے اپنے نوجوان پوتے المسعود یوسف کو وہاں بھیجا ۔ مگر خاندان کے اندرونی نظام کے درھم برھم ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس واقعے سے کچھ پہلے ناصر کے بھائی کی درخواست پر صلاح‌الدین کے بھائی کے ایک پرپوتے نورالدین شاھنشاہ الملقّب بہ المظفّر سلیمان نے یمن پر قابو پا لیا اور متصوّفہ کے بھیس میں وہاں حکومت کرنے لگا اور صوفیوں کی ایک جماعت کو اپنے گرد جمع کر لیا ۔ توران شاہ کے ہمراہ آل بنو رَسُول کے پانچ بھائی اس ملک میں آئے تھے، حکّام کے ناگزیر مُشیر اور اراضی کے مالدار مالک ہونے کی حیثیت سے وہ بہت جلد زور پکڑ گئے ۔ سلیمان اور یوسف کے درمیان جنگ ہوئی تو علی بن رسول نے یوسف کو کامیابی دلائی اور اس کے نام پر حجاز فتح کیا ۔ ۶۱۹ھ / ۱۲۲۲ء میں اسے مکّے کا والی مقرر کر دیا گیا ۔ ۶۲۶ھ / ۱۲۲۸ء میں یوسف کی وفات کے بعد، جو ایک کمزور حکمران تھا، علی کے بیٹے عمر نے المنصور کا لقب اختیار کر کے رَسُولی خاندان کی بنیاد ڈالی، جس نے یمن کے مقامی خاندان کی حیثیت سے دو سو برس سے زائد مدّت تک حکومت کی، حالانکہ اس سے پہلے ایّوبیوں کی غیر ملکی حکومت صرف نصف صدی تک قائم رہی.

مآخذ: (۱) ابن الأثیر (طبع Tornberg)، ۱۱ : ۲۶۰ ببعد، قب اشاریہ؛ (۲) ابن خلّکان، بولاق ۱۲۹۹ھ، ۱ : ۱۲۳ ببعد (ترجمۂ دیسلان، ۲ : ۲۸۳)، [طبع قاھرۃ ۱۳۱۰ھ، ۱ : ۹۹]؛ (۳) خَزْرجی : العُقُود اللُّؤلُؤِیّۃ (G.M.S.، ۳)، ۴ : ۲۶ ببعد؛ (۴) لین پول Lane-Pool : *The Mohammedan Dynasties*، ۱۸۹۳ء، ص ۹۸؛ (۵) von Zambaur : *Manuel de généalogie et de chronologie*، ھینوور Hanover ۱۹۲۷ء، ص ۹۸.

(شٹراتھ مان R. Strothmann)

* تُورغـای : تُورغای Turgai وسطی ایشیا کے

سپاٹ، بے درخت میدانوں کے دریاؤں کے ایک منظّم مجموعے اور ایک چھوٹے سے قصبے کا نام ہے - اس مجموعے کا بڑا دریا تورغای ہے، جو قارین - سالدی تورغای Karîn-saldî Turgai (جس میں تاستی تورغای Tastî Turgai بھی آ ملتا ہے) اور قره تُورغای Kara Turgai پر مشتمل ہے اور جھیل دُرکچه Durukča میں جا گرتا ہے؛ اس کے شمال میں صاری تُورغای Sarî Turgai بہتا ہے، جو اپنے بالائی مجری میں اُلکُن تامدی Ulkun-tamdî کہلاتا ہے اور جس میں مغرب کی سمت سے مویلدی تُورغای Muildî - Turgai اور صاری - بوی تُورغای Sarî-bui Turgai بھی آ ملتے ہیں - صاری تُورغای جھیل صاری قوپه Sarî - Kopa میں گرتا ہے - ترکی زبان میں لفظ تُرغای یا تُورغای کے معنی ہیں "چھوٹا پرندہ" (Radloff : *Wörterbuch*، ۳ : ۱۱۸۳، ۱۳۵۷) اور قره تُورغای زرزُور یا سار (starling) کو کہتے ہیں اورنبورغ Orenburg کی قلعه بندیاں 'تورغای قلعه' کہلاتی ہیں .

تُورغای کا جدید قصبه، جو اسی نام کے دریا پر واقع ہے، قلعۂ اورنبورغ (Orenburgsko'e Ukreplenie) کے نام سے میجر ٹومیلن Tomilin نے ۱۸۳۵ء میں تعمیر کیا تھا تا کہ وہ قلعے اور علاقۂ قیرغیز Kirgiz [رَکَ بآن] میں روسی قوّت کے مرکزوں میں سے ایک مرکز کا کام دے - ۱۸٦٥ء میں اورنبورغ کے قیرغیزوں کا علاقه دو صوبوں (*oblast'*) میں تقسیم کیا گیا، یعنی علاقۂ اورال Ural اور علاقۂ تورغای - جب ۱۸٦۸ء میں تُورغای کا صوبه ناحیوں (*u'ezd*) میں تقسیم کیا گیا تو ناحیے کا صدر مقام یه قلعه قرار پایا اور اسے تُورغای نام دیا گیا؛ چونکه خود اس صوبے میں کوئی موزوں و مناسب مرکزی مقام موجود نه تھا اس لیے صوبۂ تُورغای کا نظم و نسق اورنبورغ ہی سے متعلّق رہا - گورنر وہیں رہتا تھا اور وہیں سے ۱۸۸۱ء سے سرکاری گزٹ *Turgaiskiya Oblastnîya V'edomosti* کی اشاعت ہوتی رہی - اس صوبے کے ناحیوں کے چار صدر مقاموں میں قصبۂ تُورغای صرف تیسرے درجے پر آتا ہے اور اسے کبھی کوئی اہمیّت حاصل نہیں رہی؛ ۱۸۹۷ء کی مردم شماری کی رو سے اس کے باشندوں کی کل تعداد آٹھ سو چھیانوے اور ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ایک ہزار چھے سو ستاون تھی - صوبے کا جنوبی حصه، جس میں قصبۂ تورغای واقع ہے، سیر حاصل اراضی کی قلّت کی وجه سے شمالی حصّے کے به نسبت زراعت اور روسی آبادکاری کے لیے کم موزوں ہے، اگرچه ۱۸٦۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان پچض دریای تُورغای کے کناروں پر تیره سو ہیکٹار[1] (hectares) رقبه زیر کاشت تھا - تورغای سے تجارتی راستے شمال کی جانب اورسک Orsk اور کوستنای Kustanai کی طرف جاتے ہیں اور جنوبی سمت میں اِرغز Irgiz اور پیروسک Perowsk کی جانب (پیروسک کو اب قیزیل اورده کہتے ہیں).

روسی حکومت سے پہلے موجوده علاقۂ تُورغای میں صرف خانه بدوش لوگ آباد تھے اور ملک کی سیاسی تأریخ میں اس کا نام مشکل ہی سے ملتا ہے؛ استثنائی صورت اس سہم کے حالات کی ہے جو نَسَوی (طبع ہوداس Houdas، ص ۹ ببعد) نے دیے ہیں - اس سہم کی سربراہی خوارزم شاه [رَکَ بآن] محمد نے قپچاق کے خلاف ۶۱۲ھ / ۱۲۱۵ تا ۱۲۱٦ء میں کی تھی اور اس میں منگولوں سے چپقلش ہوئی تھی، قب بارٹولڈ Barthold : *G. M. S. = Turkestan* etc.، سلسلۂ جدید، شماره

[1] ۱ ہیکٹار = ۲،۴۷۱ ایکڑ.

۵ : ۷۰۳ ببعد؛ مارکار J. Marquart : *Osttürk-ische Dialektstudien*، برلن ۱۹۱۳ء، ص ۱۲۸ ببعد، جہاں ص ۱۳۳ پر ایک بعد کی تاریخ (وسط موسم گرما ۱۲۱۹ء) اختیار کی گئی ہے۔

اب تورغای جمہوریۂ قزاقستان میں شامل ہے ۔ صوبوں اور ناحیوں کی پرانی تقسیم کے بجائے اب اس ملک کو چند انتظامی رقبوں (*okrug*) میں بانٹ دیا گیا ہے؛ قصبۂ تورغای اب آقتین بنسک Aktynbinsk کے رقبے میں شامل ہے اور تورغای کے قدیم صوبے کا سب سے جنوبی حصہ قیزیل اوردہ کے علاقے میں شامل ہے۔

مآخذ: (۱) *Rossiya*، ج ۱۸؛ (۲) *Kirgizskiy Krai*، پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، خصوصاً ص ۱۳۳ ببعد اور نقشہ؛ (۳) مقالات از Ya. Polferov اور A. Kaufman، در *Enctklop. Slovar'*، Brokgaus-Efron ج ۳۳ (۱۹۰۲ء)؛ (۴) *Aziatskaya Rossiya*، ج ۱، پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء: ص ۳۴۷، ۳۵۱؛ — موجودہ حالات کے بارے میں مجھے معلومات زبانی بہم پہنچی ہیں۔

(بارٹولڈ W. BARTHOLD)

* **تورفان**: عام طور پر طُرفان لکھا جاتا ہے لیکن مقامی تلفّظ تورفان *Turfan* ہے ۔ یہ چینی ترکستان کا ایک قصبہ ہے ۔ پانی کی قلّت کے باوجود یہ نخلستان زرخیز ہے اور لُکچُن Lukčun کے نشیب کے، جو سطحِ بحر سے بھی پست ہے اور سلسلہ ھاے تھیان شَن Thian-shan کے درمیان واقع ہے ۔ زمانۂ قدیم سے اب تک نہ صرف چین اور مغرب کے مابین تجارت کے باعث بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی تورفان اہمّ سمجھا جاتا رہا ہے؛ مگر زمانۂ قدیم اور ابتدائی قرونِ وسطی میں جن بستیوں کا ذکر آتا ہے وہ زمانۂ حال کے تورفان کے محلِّ وقوع پر نہ تھیں، بلکہ اس کے مغرب اور مشرق میں واقع تھیں ۔ دوسری صدی ق م میں امارتِ کُوشی Kü-shi یہاں واقع تھی؛ ۶۰ ق م میں چینیوں نے اسے تاراج کیا اور آٹھ چھوٹی چھوٹی امارتیں اس کی جگہ وجود میں آئیں، بشمول کُوشی سابقہ جو تورفان کے علاقے میں تھی؛ اس کا دارالحکومت ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جسے چینی کیاؤوھو Kiaoho کہتے تھے اور تورفان سے تقریباً چار میل مغرب میں جو کھنڈر موجود ھیں اُن سے اس کے محلِّ وقوع کا پتا چلتا ہے ۔ کلیمنٹس Klementz نے اس جگہ کو یارخوتو Yarkhoto کے نام سے موسوم کیا ہے (*Nachrichten über die von der Kais. Akad. der Wiss. zu St. Petersburg im Jahre 1898 ausgerüstete Expedition nach Turfan*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۹ء، ص ۲۳ ببعد) ۔ بعد میں چینی بستی کاؤچانگ Kao-čang نے خاصی اھمیّت حاصل کر لی، جسے ترکی میں پہلے خوچو Khočo (محمود کاشغری، ۱ : ۱۰۳ : قوجو Kūdjū [نیز کجا و کسن، بر ۱: ۲۳۹]) اور بعد میں قراخوجہ Karā-Khodja کہتے تھے ۔ اب یہ تورفان سے بیس پچیس میل مشرق میں ایدی قوت شہری Idikut-shahri کے کھنڈر کی شکل میں موجود ہے ۔ جدید تورفان کے متّصل جنوب میں وہ کھنڈر واقع ھیں جنھیں کلیمنٹس Klementz (کتاب مذکور، ص ۲۸) نے تورفان قدیم قرار دیا ہے ۔ فرانکے S. Franke کے قول کے مطابق (*Eine chinesische Tempelinschrift aus Idikutšahri bei Turfan, Anhang zu. Abh. Preuss. Akad.*، ۱۹۰۷ء، ص ۳۶) یہ کھنڈر ''ضرور زمانۂ قدیم کے ہونے چاھییں اور یہ ضرور ایک غیر اھمّ مقام ہوگا''؛ لیکن ان کا رقبہ (۳ مربع کلومیٹر) تو ایدیقوت شہری سے کسی قدر زیادہ ھی ہے۔

دورِ مونگول میں تورفان کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور ۱۳۳۱ء کے چینی نقشے میں بھی یہ درج نہیں (برٹشنائیڈر E. Bretschneider : *Mediaeval*

Researches from Eastern Asiatic Sources، جلد دوم)۔ صرف اتنا اشارہ کہ زمانۂ قدیم میں بھی شاید کوئی قصبۂ تورفان موجود تھا ایک شاکائی Sāka وثیقے سے ملتا ہے، جو تُون ہوانگ Tun-Huang سے دستیاب ہوا تھا اور جسے سٹین کونو Sten Konow نے شائع کیا تھا *Oslo Etnografiske Museums Skrifter : Publications) of the India Institute*، ۳/۳، اوسلو Oslo ۱۹۲۹ء، ص ۱۳۷، ۱۳۸)۔ اس میں ایک قصبے کا ذکر ہے جسے Tturpamni کہتے تھے ۔ تورفان سے متعلّق (جو چینی زبان میں T'u-lu-fan ہے) چینی کتابوں میں سب سے پہلا حوالہ (مِنگ۔شِي [دَورِ مِنگ کی چینی تاریخ] میں) ۱۳۷۷ء میں دیا گیا ہے؛ بعض غیر ملکی سفارتوں کو، جو چین جا رہی تھیں، راستے میں بمقام تورفان لوٹ لیا گیا ۔ اس پر ایک چینی فوج روانہ کی گئی تا کہ تورفان کے بادشاہ سے انتقام لے (*Med. Res.*، ۲ : ۱۹۳) ۔ مسلمان مُصنّفین نے جو تورفان کی شرح حال پہلی مرتبہ بیان کی ہے وہ اس سے کسی قدر بعد کے زمانے سے تعلّق رکھتی ہے؛ تأریخ رشیدی میں لکھا ہے کہ خانِ مغولستان خِضْر خوجہ (حدود ۱۳۸۹ - ۱۳۹۹ء) نے [''خطا کی طرف غزا کی، طرفان اور قَراخوجہ کے خلاف جو چین کی سرحد پر دو نہایت اہم قصبے ہیں'' خطا میں شامل اور ان حدود کے سب سے بڑے مقامات ہیں، غزوے کر کے انہیں فتح کیا اور انہیں مسلمان کیا؛ چنانچہ اب وہ دار الاسلام ہے اور کاشغر کے بعد پایۂ تخت خواقینِ مغول وھاں ہے] (تأریخ رشیدی [نسخۂ خطی (الف) دانش گاہ پنجاب، ورق ۹۴ ب]، قبّ ترجمۂ متن از رَوس Ross، ص ۵۲)؛ لیکن جب تیموری [سلطان] شاہ رخ [رَكّ بآن] کی مشہور سفارت (۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء) اس ملک میں سے گذری تو باشندے اُس وقت تک بھی زیادہ تر بت پرست ھی تھے؛ وھاں ایک بڑا بتکدہ اور بدھ شاکیامُنی (شاکْمُونی Shākemūnī) کا ایک بڑا بُت تھا ۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور بُت تھے؛ بعض پرانے تھے بعض نئے (*N.E.*، ۱۴ : ۳۱۰ [مطلع سعدین، لاھور ۱۳۶۰ھ، ۲/۱ : ۳۸۱] اور بارٹولڈ : المظفریة، ص ۲۷ پر حافظ اَبرو [رَكّ بآن] کا اصل متن [نیز دیکھیے سفرنامۂ چین، در اوریئنٹل کالج میگزین، لاھور، نومبر ۱۹۳۰ء، ص ۷]) ۔ تورفان کے موجودہ باشندوں ('تورفان لیق') کو اس کا علم ہے کہ وھاں کبھی اُویغُور Uighurs رھا کرتے تھے، لیکن اب یہ خیال ہے کہ وہ اُویغُور مسلمان تھے ۔ بُدھوں کے تمام آثار یا تو قلماقوں (Kalmucks) سے منسوب کیے جاتے ھیں (کلیمنتس : کتاب مذکور، ص ۲۰) یا شاہ دَقیانُوس سے (دیکھیے اصحاب الکہف).

تورفان میں اُن دنوں پانی کی قلّت کی شکایت موجودہ زمانے سے بھی زیادہ تھی ۔ وَیْس خان کے عہد (۱۴۱۸ — ۱۴۲۸ء) میں کھیتی باڑی کا کام بالکل ابتدائی، بہت بھونڈے اور کٹھن طریقے سے کیا جاتا تھا؛ خان نے ایک گہرا کنواں کھدوا رکھا تھا ۔ [گرمیوں میں وہ خود اور اس کی لونڈیاں کنویں سے مٹی کے کوزوں میں پانی بھر کر نکالا اور اپنی زراعت کو اس سے سینچا کرتے تھے] (تأریخ رشیدی [نسخۂ خطی مذکورہ، ورق ۵۸ ب، قبّ]، ترجمۂ رَوس Ross، ص ۶۷) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں حالات بہتر ہو گئے؛ چنانچہ سترھویں صدی کے اواخر میں چالیش Čalīsh کے علاقے کو (جو اب قَراشَہر کہلاتا ہے) غلّہ تورفان ھی سے دستیاب ہوتا تھا (*Zap.*، ۱۵ : ۲۰۱، منقول در ھارٹمن M. Hartmann : *Der islamische Orient*، ۱ : ۳۰۲) ۔ کہا جاتا ہے کہ آبپاشی کی موجودہ زیر زمین کاریزیں اٹھارھویں صدی تک تعمیر نہ ھوئی تھیں، (سر آرل شٹائن، در *Geogr. Journ.*، ستمبر ۱۹۱۶ء، ص ۱۷۴).

دَورِ حاضر (پندرھویں صدی سے سترھویں

صدی تک) کے چینی ترکستان کے ان حکم رانوں کے عہد میں جو اپنا نسب چغتائی خانوں سے ملاتے تھے، تورفان کا ذکر مختلف خوانین کی اقامت‌گاہ کی حیثیت سے اکثر آیا ہے؛ بعد کے زمانے میں ملک کے باقی حصّوں کی طرح یہ پہلے قلماقوں کے زیرِ تسلّط آیا اور جب قلماقوں کی سلطنت ۱۷۵۸ء میں تباہ ہوئی تو چینیوں کے ھاتھ آ گیا۔ ۱۷۶۵ء میں قصبۂ اُچ (آقْ صُو (رِکْ بآن) کے مغرب میں)، جس نے چینیوں کے خلاف بغاوت کی تھی، تباہ کر دیا گیا اور اس کی آبادی بالکل نیست و نابود کر دی گئی؛ قصبے کو پھر سے بسانے کے لیے دوسرے قصبوں، بالخصوص تورفان کے باشندے، یہاں منتقل کیے گئے۔ اس کے بعد سے اُچ کا نام اُچ تورفان یا اُش تورفان پڑ گیا؛ ان دونوں میں امتیاز کے لیے اصلی تورفان کو کُہنہ تورفان کہتے تھے۔ یعقوب بیگ کے عہد (۱۸۶۶ - ۱۸۷۷ء) میں تورفان اس کے مشرقی مقبوضات کا سرحدی قصبہ تھا۔ ۱۸۷۶ء میں یہاں قحط پڑا اور ۱۸۷۷ء میں چینیوں نے اس پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ اب تورفان لُکْچُن کے "بادشاہ" (وانگ *wang*) کے علاقے میں شامل ھے۔ اھلِ یورپ میں سے ڈاکٹر رِیگل A. Regel (دیکھیے سطورِ ذیل) پہلا شخص تھا جو ۱۸۷۹ء میں تورفان گیا تھا۔ اس کا بیان ھے کہ تورفان کا موجودہ قلعہ یعقوب بیگ نے تعمیر کرایا تھا؛ اس کے مشرق میں چینی قلعہ ھے، جو بقول Grum-Gržimailo (*Opisanie puteshestviya v Zapadnīy Kitai*، ج ۱، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۶ء : ص ۲۷۵) ۱۸۸۶ء تک تعمیر نہ ہوا تھا، لیکن رِیگل نے اس تاریخ سے پہلے اس کا ذکر کیا ھے۔ اس کا قول ھے کہ مشرق میں اس مقام سے کچھ اَور آگے گذشتہ صدیوں کے تورفان کے کھنڈر "مع بیشمار خوش وضع مقبروں اور ایک خوب صورت منار کے" پائے جاتے ھیں۔

منار اور اُس مدرسے کی، جس سے منار متعلّق ھے، تصویریں کئی مرتبہ شائع ھو چکی ھیں ([۱] کُلیمِنتس : کتاب مذکور، ص ۹۴؛ [۲] ڈونر O. Donner : *Resa i Zentralasien 1898*، ھلْسِنگ فوز ۱۹۰۱ء، ص ۱۲۰؛ [۳] لے کوک A. v. le Coq : *Auf Hellas Spuren in Ostturkistan*، لائپزک ۱۹۲۶ء، لوحہ ۲)۔ منار عیسائیوں کے گرجے کا مزعومہ بُرجِ ناقوس (گھنٹا گھر) نہیں ھے، بلکہ اسے لُکْچُن کے ایک 'وانگ' نے ۱۷۶۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ کھنڈر غالباً اسی قصبے کے ھیں جسے کُلیمِنتس کہنہ تورفان کہتا ھے۔ اس صورت میں یہ اس زمانے سے بعد کے ھونے چاھییں جو فرینکے (دیکھیے سطور بالا) اور گُرُون ویڈل Grünwedel نے ("دورِ اویغوری کا سخت تباہ شدہ پُرانا قصبہ" کہہ کر) فرض کیا ھے؛ کُلیمِنتس نے بھی (کتاب مذکور، ص ۲۸) یہ کوشش کی ھے کہ "مِنْگ جغرافیہ دانوں کے Tu-lu-fan اور زمانۂ حال کے کہنہ تورفان کو، جو جدید چینی تورفان کے جنوب مشرق میں واقع ھے، ایک ھی قرار دے"۔ معلوم ھوتا ھے کہ پرانے قصبے کی بیشتر عمارتوں کے کھنڈر ۱۸۷۹ اور ۱۸۹۸ء کے درمیان تباہ کر دیے گئے تھے، لیکن کُلیمِنتس کے بیان سے جتنا گمان ھوتا ھے اس سے زیادہ حصّہ کھنڈروں کا بچا ھوا ھے اور یہی اولڈن برگ نے ۱۹۰۹ء میں ثابت کیا تھا۔ تجارتی مرکز کی حیثیت سے موجودہ قصبہ کچھ اھمیّت رکھتا ھے۔ آبادی کا زیادہ سے زیادہ اندازہ بیس ہزار کے لگ بھگ ھے۔

مآخذ : (مقالے میں مندرجہ حوالوں کے علاوہ) (۱) رِیگل A. Regel : *Turfan*، در *Petermanns Mitteilungen*، ج ۲۶، ۱۸۸۰ء : ص ۲۰۵ ببعد؛ (۲) سر آرل شٹائن Sir A. Stein : *Innermost Asia*، آکسفورڈ ۱۹۲۸ء، ص ۵۶۶ ببعد، جہاں مزید حوالے بھی دیے گئے ھیں؛

(۳) G. Grum-Gržimailo : Opisanie puteshestviya v Zapadniy Kitai، ج ۱، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۶ء، باب ۱۲ تا ۱۶؛ (۴) گُرُون وِیڈِل A. Grünwedel : Bericht über archäologische Arbeiten in Idikutschari und Umgebung im Winter 1902-1903، میونخ ۱۹۰۵ء، (Abh. Bayer. Akad., Kl., i، ج ۲۲، سِلسِلہ ۱) ص ۴؛ (۵) S. Oldenburg : Russkaya Turkestankaya Ekspediciya 1909-1910، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء، ص ۲۵.

(بارٹولڈ W. Barthold)

تُوْرکُوْ : (Türkü) عثمانلی ترکی میں لوک گیت کا عام نام ہے ۔ اسے ایک طرف تو ’مانی‘ [رکّ بآن] سے اور دوسری طرف ’شرقی‘ سے ممیّز کرنا چاہیے ۔ توْرکوْ اور ’مانی‘ میں فرق یہ ہے کہ توْرکوْ میں متعدّد بند ہوتے ہیں اور ’مانی‘ میں صرف ایک ۔ لیکن اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ نہیں رکھا جاتا ۔ بہت سے اضلاع میں، جہاں عثمانلی ترکی رائج ہے، لوگ صرف توْرکوْ کے نام سے آشنا ہیں اور متعدّد بند والے یا ایک بند والے سب گیتوں کے لیے اسی کلمے کو استعمال کرتے ہیں ۔ جہاں تک توْرکوْ اور ’شرقی‘ میں وجہِ امتیاز کا تعلّق ہے وہ یہ ہے کہ توْرکوْ تو حقیقی اور واقعی عوامی گیت ہوتے ہیں اور ’شرقی‘ نسبۃً زیادہ مصنوعی قسم کے ۔ پھر توْرکوْ اوّلی ترکی (proto-Turkish) نمونوں کے انداز پر ہوتے ہیں اور دوسری ترک قوموں میں ان سے بہت ملتے جلتے گیت پائے جاتے ہیں، بحالیکہ ’شرقی‘ اسلامی تہذیب کے دائرے سے وابستہ ہیں اور عربی اور فارسی نمونوں کی پیروی کرتے ہیں، اسی لیے توْرکوْ کی زبان اصولاً ’شرقی‘ کی بہ نسبت بہت زیادہ خالص ہوتی ہے .

اب رہی توْرکوْ کی ہیئت اور شکل، تو یہ گیت وزنِ وتدی (syllabie rhythm) میں یا ایسے قافیہ دار بندوں میں لکھا جاتا ہے جن کا وتدی وزن نَبْرہ دار (accented) ہو ۔ مصرعوں میں سات سے لےکر پندرہ تک مقاطع یا اجزاے کلمہ (syllables) ہوتے ہیں، جن میں سات مقاطع (۴ ـ ۳، ۳ ـ ۴، شاذ و نادر صورتوں میں ۲ ـ ۳ ـ ۲) اور گیارہ مقاطع (عموماً ۴ ـ ۴ ـ ۳ اور ۶ ـ ۵) بیشتر مستعمل ہیں ۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ نو مقاطع والا توْرکوْ، جو قازان کے تاتاریوں میں اتنا مقبولِ عام ہے، عثمانلی ترکوں کے یہاں مفقود ہے ۔ قافیہ بیشتر حالات میں خالص صرفی ہوتا ہے اور اس کی اصل، جیسا کہ عموماً ترکی زبان میں دیکھنے میں آتا ہے، دو عاملوں کے اجتماع کی رہینِ منّت ہے : [۱] بند کی ساخت دو ٹکڑوں میں اور [۲] ترکی زبان کی عام لسانی خصوصیات ۔ پہلے عامل کا اثر یہ ہوا کہ ترکی بند دو ایسے جملوں میں تقسیم ہو گیا جو قطعی طور پر ایک دوسرے کے عین متوازی ہیں اور لسانی خصائص کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ جملے، خصوصاً اپنے اواخر میں، دو ایسی صرفی صورتیں پیش کرتے ہیں جو ایک دوسرے کے متماثل ہیں ۔ مگر ترکی زبان کے التصاقی agglutinative زبان ہونے کی وجہ سے ان صرفی صورتوں کا ہم قافیہ ہونا لازمی ہے؛ اس لیے ترکی قافیہ عام طور پر کئی مقاطع پر مشتمل ہوتا ہے ۔ ایسے قافیے جن میں تین یا چار آخری مقاطع ہوں ہرگز کمیاب نہیں .

توْرکوْ کے بندوں میں دو تین یا چار مصرعے ہوتے ہیں؛ تین مصرعوں والے بند سب سے زیادہ شائع ہیں اور عام طور پر عُثمانلی ترکوں کی شاعری کی نہایت امتیازی خصوصیات میں سے ہیں ۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تین مصرعوں والا بند، جس میں ایک ہی قافیہ ’ا‘ ’ا‘ ’ا‘ چلا جاتا ہے، رباعی سے، جو سب ترکی زبانوں میں پائی جاتی ہے، پیدا ہوا، اس طرح کہ ’ا‘ ’ا‘ ’ب‘ ’ا‘ میں سے تیسرے مصرعے کو، جس میں قافیہ نہیں ہے، گرا دیا گیا ۔ اس سے

علی العموم، بند کی وہ حیثیت زائل ہو جاتی ہے جس کی رو سے وہ دو حصّوں میں منقسم ہو سکتا ہے ۔ منفرد، مجزّا گیت بطور قاعدۂ کلّیہ متشابہ بندوں سے مرکّب ہوتے ہیں : اس سے صرف وہ ٹیپ کے بند مستثنی ہیں جو عشقیہ گیتوں میں بہت عام ہیں اور وہ خاتمے کے بند جو بعض اوقات زیادہ طویل گیتوں میں پائے جاتے ہیں ۔ اَن گیتوں میں جو لوگوں کے منہ سے سن کر جمع کیے گئے ہیں ہمیں اکثر اوقات قالب نظم میں بہت سی تحریف نظر آتی ہے اور اس صورت حال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طویل نظمیں جو ایک مدت سے روایت ہوتی چلی آئی ہیں رفتہ رفتہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہیں.

جہاں تک موضوع کا تعلّق ہے تورکو زیادہ تر غنائی نظموں کی ذیل میں آتے ہیں ۔ ان میں عشقیہ گیت، سپاہیانہ گیت، حمد و نعت اور بکچی نام کے شبانہ پاسبانوں کے رمضان کے گیت (جن میں اکثر ظرافت کی چاشنی ہوتی ہے) وغیرہ شامل ہیں۔ عشقیہ گیتوں کی ایک قسم، یعنی وہ گیت جو مقبولِ عام قصّوں میں پائے جاتے ہیں، اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کہ وہ مصنوعی پیداوار نہیں ہیں (قبّ D. Spies : *Türkische Volksbücher*، لائپزگ ۱۹۲۹ء، ص ۱۴ ببعد) ۔ سپاہیانہ گیتوں میں اکثر تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہوتا ہے ۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آتی ہے کہ پرانے گیتوں کو تھوڑا سا ادل بدل کے انھیں.جیسے نئے واقعات کے ساتھ، جب وہ رونما ہوے، مسلسل طور پر تطبیق دی جاتی رہی ہے ۔ اگر حالات مساعد ہوں تو ایک شخص اس قسم کی تطبیقات کا سراغ کئی مرحلوں تک لگا سکتا ہے ۔ وہ عشقیّہ گیت جو مکالمے کی صورت میں ہوتے ہیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مثلاً تورکمانِ قیزی (''ترکمان لڑکی'') کا منظوم قصّہ، جس سے ہمیں پہلے پہل کونوس Künos نے روشناس کرایا ۔ یہ بات فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ شکل فارسی کی سوال و جواب والی غزلوں سے پیدا ہوئی ہے (Jacob : *Die türkische Volks-litteratur*، ص ۱۹) ۔ ایسی نظمیں جو ایک نوجوان مرد اور ایک دوشیزہ کے مابین مکالمے کی صورت میں ہوتی ہیں اور جنھیں پڑھ کر سنایا یا گایا جاتا ہے ترکوں کی تمام شاخوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔اس قسم کی نظموں کی ابتداء خود ترکوں کے ہاں بیرونی اثرات کے بغیر ہوئی ۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ایسے ملکوں میں بھی موجود ہیں جہاں اسلامی تہذیب کا اثر بہت کم یا بالکل ہی مفقود ہے (قبّ راڈلوف Radloff : *Aus Sibirien*، ۱ : ۳۹۳، جہاں اس نے قرغیزوں کے ہاں ایک نوجوان مرد اور ایک دوشیزہ کے مابین گانے کے مقابلوں کا ذکر کیا ہے) ۔ اس قسم کے گیت ترکانِ آلتائی میں بھی پائے جاتے ہیں (قبّ مثلاً تلیوت Teleut [یا تلنگیت] لوگوں کی مکالمے والی نظم *Myrat Pi*، در راڈلوف : *Proben der Volkslitteratur*، ۱ : ۲۰۰ تا ۲۰۴) ۔ تورکو اس لحاظ سے حقیقی گیت ہیں کہ انھیں.موسیقی کے ساتھ گانے کے لیے بنایا جاتا ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان گیتوں کے بول ان سُروں یا لحنوں سے، جن سے وہ اب متعلّق نظر آتے ہیں، کوئی مطابقت نہیں رکھتے ۔ ایسی حالتوں میں گیت کے بولوں کے مقاطع کو مصنوعی طور پر سُر یا لَے کے نغموں کی تعداد کے مطابق بنا دیا جاتا ہے ۔ گیت کے مصرعے چونکہ عموماً بہت چھوٹے ہوتے ہیں، اس لیے ان میں غیر ضروری ندائیہ کلمات، جیسے واي، واي، اَمان اَمان، والدِمْ، اَنّم وغیرہ، داخل کر کے مساوات پیدا کر دی جاتی ہے یا بالکل بے معنی آوازوں مثلاً گُگ، گُگ، لِلّا، تُرلّا وغیرہ کا اضافہ کر دیا

جاتا ہے ۔ توْرکوْ کے بولوں کا متن ایسے حشو و زوائد کے ادخال کی وجہ سے اکثر اوقات سارے کا سارا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے ۔

توْرکوْ گیت جماعاتِ ذکر کے ہمراہ وجدانی کیفیات پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال میں آتے ہیں ۔

مآخذ : (۱) G. Jacob : *Die türkische Volkslitteratur*، برلن ۱۹۰۱ء، ص ۹ ببعد : (۲) T. Kowalski : *Ze studjów nad forma poezji ludów tureckich*، ج ۱، کراکاو Krakau ۱۹۲۲ء، ص ۱۶ تا ۱۰۲ ؛ (۳) احمد طلعت : خَلْق شعرلرینک شکل و نوْعی، استانبول ۱۹۲۸ء، ص ۳۲ ببعد (قب برآن : *Archiv Orientálni*، ۲ : ۵۰ ببعد) : (۴) محمود راغب : اناضولو توْرکولری و موسیقی استقبالیمیز، استانبول ۱۹۲۸ء - عثمانلی ترکی کے عوامی گیتوں کا مکمل ترین مجموعہ J. Kúnos نے فراہم کیا ہے ۔ اس کی مندرجۂ ذیل تصنیفات کا ذکر کیا جا سکتا ہے : (۵) *Oszmán-török népköltési gyűtémény*، ۲، بوڈاپسٹ ۱۸۸۹ء، *Nyelvtudományi közlemények*، ۲۲ (۱۸۹۰ء) : ص ۱۱۳ تا ۱۵۶ اور ص ۲۷۵ تا ۳۸۲ : (۶) راڈلوف Radloff : *Proben der Volkslitteratur der türkischen Stämme*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۹ء، ج ۸ : (۷) *Chrestomathia turcica*، بوڈاپسٹ ۱۸۹۹ء : (۸) *Janua linguae ottomanicae*، بوڈاپسٹ ۱۹۰۵ء : (۹) *Ada-Kalei török népdalok*، بوڈاپسٹ ۱۹۰۶ء : اسی مصنف کے جمع کردہ چھوٹے نمونے : (۱۰) *Türkische Volkslieder*، در *W.Z.K.M.*، ج ۲ (۱۸۸۸ء) : ص ۹۳ تا ۳۲۴ ؛ ج ۳ (۱۸۸۹ء) : ص ۶۹ تا ۷۶ ؛ ج ۴ (۱۸۹۰ء) : ص ۳۵ تا ۴۲ : (۱۱) *Kisázsiai török nyelvjárások*، بوڈاپسٹ ۱۸۹۶ء : (۱۲) *Kisázsiai török dialektusairól*، بوڈاپسٹ ۱۸۹۶ء : (۱۳) *Chansons populaires turques*، در *Z.D.M.G.*، ج ۵۳ (۱۸۹۹ء) : ص ۲۳۳ تا ۲۵۵ ؛ عثمانلی ترکی لوک گیتوں کے چھوٹے یا بڑے نمونے ان تصانیف میں بھی شامل ہیں : (۱۴) W.A. Maksimow : *Opyt izsliedowanija tiurkskich dialektow w Chudawendgiarie i Karamanii*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۷ء : (۱۵) A. Alric : *Fragments de poésie turque populaire*، در *J. A.*، سلسلہ ۸، ج ۱۳ (۱۸۸۹ء) : ص ۱۳۳ تا ۱۹۲ : (۱۶) M. Bittner : *Türkische Volkslieder nach Aufzeichnungen von Schahen Efendi Alan*، در *W. Z. K. M.*، ج ۱۰ (۱۸۹۶ء) : ص ۱۴ تا ۴۵ اور ج ۱۱ (۱۸۹۷ء) : ص ۳۵۷ تا ۳۷۳ ؛ (۱۷) E. Littmann : *Türkische Volkslieder aus Kleinasien*، در *Z.D.M.G.*، ج ۵۳ (۱۸۹۹ء) : ص ۳۵۱ تا ۳۶۳ ؛ (۱۸) W. Pisariew : *Nieskolko słow o trebizondskom dialektie*، در *Zap. Wost. Otd. Imp. Russk. Arch. Ob.*، ج ۱۳ (۱۹۰۱ء) : ص ۱۷۳ تا ۲۰۱ ؛ (۱۹) B.W. Miller : *Tureckija narodnyja piesni*، در *Etnografičeskoje Obozrenije*، ج ۳ (۱۹۰۳ء) : ص ۱۱۳ تا ۱۵۵ : (۲۰) نیز Krymskij، طباعت مع مقدمہ از در *Trudy po wostokowiedieniju*، ماسکو (۱۹۰۳ء) ؛ (۲۱) F.v. Luschan : *Einige türkische Volkslieder aus Nordsyrien*، در *Zeitschr. f. Ethnologie*، ج ۳۶ (۱۹۰۴ء) : ص ۱۷۷ تا ۲۰۲ ؛ (۲۲) F. Giese : *Erzählungen und Lieder aus dem Vilajet Qonjah*، ہالہ بر رود زالہ Halle a. S.— نیویارک ۱۹۰۷ء [قب برآن Wl. Gordlewskij : *Iz nabludienij nad tureckoj piesniju*، در *Etnogr. Obozr.*، ج ۷۹، ماسکو ۱۹۰۹ء] ؛ (۲۳) Hadank : *Jungtürkische Soldaten- und Volkslieder*، در *M.S.O.S. As.*، ۱۹۱۹ء ؛ (۲۴) Wl. Gordlewskij : *Obrazcy Osmanskago tworčestwa*، ج ۱، ماسکو ۱۹۱۶ء ؛ (۲۵) *Trudy po wostokowiedieniju izd. Łazarewskim Institutom*، جز ۴۳ ؛ توْرکوْ گیتوں کا ایک مجموعہ مع حواشی کے

استانبول کے معہدِ موسیقی (Conservatoire of Music) نے (۲۶) خلق تورکولری کے عنوان سے شائع کیا تھا (استانبول ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۰ء، ۱۳ اجزاء) - لوک گیتوں کے متون ترکی زبان کے علمِ نوع بشر (ethnological) سے متعلق رسائل مثلاً (۲۷) خلق بلگیسی خبرلری (استانبول ۱۹۲۹ء بعد) اور (۲۸) خلق بلگیسی مجموعہ سی (انقرہ ۱۹۲۸ء بعد) میں شائع ہوتے رہے۔

تورکو کے غنائی پہلو پر قب (۲۹) O. Abraham اور E. Hornborstel : *Phonographierte türkische Melodien* ، در *Zeitschr. f. Ethnologie* ، ج ۳۶ (۱۹۰۴ء): ص ۲۰۳ تا ۲۲۱؛ (۳۰) B.W. Miller : *Tureckija narodnyja piesni* ؛ (۳۱) T. Kowalski : *Ze studjów nad forma poezji* ، ۱ : ۹۷ تا ۱۰۲؛ (۳۲) محمود راغب : اناضولو تورکولری.

(T. Kowalski کوالسکی)

تَوْرِیَة : (عربی)، (syllepsis)، بلاغت کی اصطلاح جو علمِ بدیع کی ایک صنعت پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہی لفظ کو استعمال کیا جائے جس کے دو مختلف معنے ہوں ایک قریب اور دوسرا بعید، لیکن دوسرے معنی پہلے معنوں میں اس طرح مستور ہوں کہ معنی اول سامع کے ذہن میں پہلے آئے - توریۃ کو ایہام بھی کہتے ہیں، کیونکہ اسے استعمال کرنے والا ثانوی معنی کو، جس کا اظہار مطلوب تھا، پہلے معنوں کے ذریعے، جو فوراً ذہن میں آتے ہیں، چھپا لیتا ہے - اسے بعض اوقات ابہام (یعنی چھپانا یا ڈھانکنا) بھی کہتے ہیں.

توریۃ کی دو قسمیں ہیں : (۱) مجردہ، یعنی وہ جو ہر ایسے قرینے سے خالی ہو جو پیشِ نظر معنی (بعید) پر دلالت کر سکے، مثلاً اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (۲۰ [طٰہٰ] : ۴) میں استوی کے معنی بعید تو ہیں اپنے آپ کو کسی شے کا مالک بنانا اور یہی معنی مقصود تھے لیکن اس آیت میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کے معنی قریب، یعنی ''آرام کرنا'' ''اپنے آپ کو متمکن کرنا'' یا ''بیٹھنا''، پر دلالت کرتی ہو؛ (۲) جس میں کچھ ایسا قرینہ موجود ہو جو معنی قریب کے مطابق ہو؛ مثلاً وَ السَّمَآءَ بَنَیْنٰھَا بِاَیْدٍ (۵۱ [الذاریات] : ۴۷) (اور ہم نے آسمان کو اپنی قوّت سے بنایا) - اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا'' - یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اَیْد (ہاتھ) کا لفظ معنی بعید میں استعمال ہوا ہے، اور اس کے معنی قوّت کے ہیں مگر اس کا فعل بَنَیْنٰھَا (بنایا یا تعمیر کیا) ''اَیْد'' کے ساتھ مل کر آیا ہے، جس سے اس کے معنی قریب کا قرینہ بھی نکلتا ہے - یہ صنعت ایرانیوں نے بھی استعمال کی ہے اور بظاہر عربوں سے لی ہے.

مآخذ : (۱) فخرالدین محمد بن عمر الرازی : نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز، قاہرۃ ۱۳۱۷ھ، ص ۱۱۳؛ (۲) محمد صدیق حسن خان بہادر : غُصنُ البان المُورق بمُحسّنات البیان، قسطنطنیہ ۱۲۹۶ھ، ص ۴۳؛ (۳) ابن حِجّۃ الحَمَوی : کشف اللّثام عن وجہ التّوریۃ و الاستخدام، بیروت ۱۳۱۲ھ؛ (۴) الجُرجانی : تعریفات، قسطنطنیہ ۱۳۰۷ھ، ص ۹۴، بذیل ''توریۃ'' اور ص ۲۷، بذیل ''الایہام'' (خصوصاً)؛ المقامات الحریریۃ، طبع د ساسی S. de Sacy ، پیرس ۱۸۴۷ تا ۱۸۵۳ء، ص ۸۸؛ (۵) یحیی بن حمزہ بن علی بن ابراہیم العَلَوی الیَمَنی : کتاب الطّراز، قاہرۃ ۱۳۳۲ھ، ۳ : ۶۲؛ (۶) ابویعقوب یوسف السّکّاکی : مفتاح العلوم، قاہرۃ ۱۳۱۸ء، ص ۱۸۰ (الإیہام)؛ (۷) قاسم البَکْرَجی : حلیۃ البدیع فی مدح النّبیّ الشّفیع، حلب ۱۲۹۳ھ، ص ۲۱۰ (توریۃ، ایہام، تَخْییل)؛ (۸) عبدالحمید قدّس بن محمد بن علی بن الخطیب : طالع السّعد الرّفیع فی شرح نُور البدیع علی نظم البدیع، قاہرۃ ۱۳۲۱ھ، ص ۵۷؛

(۹) ابن حِجّة الحَمَوی : خزانة الأدب، قاهرة ۱۳۰۴ھ، ص ۲۳۹ (ایہام، توجیه، تخییر)؛ (۱۰) عبدالغنی النّابُلسی : نَفحاتُ الأزْهار علی نَسَمات الأسحار، بولاق ۱۲۹۹ھ، ص ۱۸۸؛ (۱۱) جلال الدین القزوینی الخطیب : تلخیص المفتاح (مع حواشی از عبدالرحمٰن البَرْقُوقی)، قاهرة ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء، ص ۳۰۰؛ (۱۲) سعدالدین التفتازانی : مختصرالمعانی، قسطنطنیه ۱۳۱۸ھ، ص ۱۸۰؛ (۱۳) وهی مصنف : المطوّل، قسطنطنیه ۱۳۰۴ھ، ص ۴۲۵؛ (۱۴) طاش کبری زاده : مِفتاح السّعادة، حیدرآباد ۱۳۲۹ھ، ۲ : ۳۳۴؛ (۱۵) عبدالهادی نَجَاء الأبیاری : سُعُود المَطالِع، بولاق ۱۲۸۳ھ، ۱ : ۳۱۵ — مثالوں کے لیے دیکھیے : (۱) سعدالدین التفتازانی : مختصر علی تلخیص المفتاح؛ (۲) ابن یعقوب المغربی : مَواهب الفتّاح فی شرح تلخیص المِفتاح؛ (۳) بهاءالدین السُّبکی : عروس الأفراح فی شرح تلخیص المفتاح اور اس کا حاشیه بهی ملاحظه هو : (۴) الخطیب القزوینی : الإیضاح؛ (۵) الدُّسُوقی : حاشیة علی مختصر التفتازانی، بولاق ۱۳۱۷ھ، ۴ : ۳۲۲؛ (۶) شمس الدین محمد بن قیس الرّازی : المُعْجَم فی مَعَاییر اشعار العَجَم، لائڈن ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء، ص ۳۲۶ (ایہام)؛ [(۷) الحُمَیدی : مَنْح السمیع بشرح تملیح البدیع، نسخه بخط مصنّف در کتابخانهٔ محمد شفیع لاهوری، ورق ۲۰ ببعد (الاستخدام، الابهام، التوریة)]؛ (۸) گارسان دِ تاسی Garcin de Tassy : *Rhétorique et prosodie des langues de l'Orient musulman*، پیرس ۱۸۷۳ء، ص ۹۰؛ [(۹) شمس الدین فقیر : حدائق البلاغة (مع ترجمهٔ اردو از امام بخش صہبائی)، کانپور ۱۸۸۷ء، ص ۶۹، ۸۵؛ (۱۰) نجم الغنی : بحر الفصاحت، لکھنئو ۱۹۱۷ء، ص ۹۳۰]۔

(محمد بن شنب)

تُوزَر : [سامی : تَـوزَر] جنوبی تونس میں ایک قصبه، جو تونس کے جنوب جنوب مغرب میں کوئی دو سو تیس میل پر اور قابس کے مغرب میں ایک سو بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ عرض البلد شمالی ۳۳ درجه، ۵۴ دقیقه، ۴۸ ثانیه اور طول بلد مشرقی ۸ درجه، ۸ دقیقه (گرینچ) .

تُوزر [بلاد] الجَرِیْد میں اہم ترین مقام ہے [قبّ بلاد الجرید] اور اس خاکنائے پر واقع ہے جس کے شمال میں شطّ الغَرْسَه ہے اور جس کے جنوب میں شطّ الجرید اور وہ ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے اور شطّ الجرید کے متّصل پاس ہی ہے؛ یه ایک بڑے قصبے اور چند منتشر دیہات پر مشتمل ہے، جو نخلستان میں واقع ہیں۔ یه نخلستان جنوب کی طرف پهیلا ہوا ہے اور چار مربع میل رقبه گهیرے ہوے ہے۔ خاص قصبے کی تعمیر بڑی باقاعدگی سے ہوئی ہے، اکثر مکان پخته اینٹوں کے ہیں اور اینٹوں کو هندسی شکلوں کے مطابق ترتیب دے کر تعمیر کیے گئے ہیں۔ نخلستان کے گهر عموماً محض جهونپڑے هی ہیں، جو درختوں کے تنوں اور کهجور کی ٹہنیوں سے بنائے گئے ہیں۔ باشندے قالین بافی اور اُونی، نیز ریشمی کمبل بنانے کا کام کرتے ہیں، جنهیں بہت پسند کیا جاتا ہے لیکن ان کا گذارہ زیادہ تر اُن کے باغات اور کهجوروں کے جهنڈوں پر ہے۔ نخلستانِ مذکور الجرید کے علاقے میں سب سے زیادہ زرخیز ہے۔ اس کی زرخیزی کا سبب یه ہے که وہ بہت سے چشموں سے (جن کی تعداد ۱۹۴ ہے) سیراب ہوتا ہے جو ریت کے ٹیلوں کے مغرب سے نکلتے ہیں اور سب مل کر ایک ندی کی صورت میں شطّ shott کی طرف بہتے ہیں۔ آب پاشی کے لیے پانی کی تقسیم کے وسائل اُسی نظام کے مطابق ہیں جس کا ذکر البَکْری (مسالک، ترجمهٔ دیسلان de Slane، بنظرِ ثانی فانیانْ Fagnan، ص ۱۰۲) نے کیا ہے۔ وهی نظام اب تک بهی قائم ہے۔ کهجوروں کے

درختوں کی تعداد دو لاکھ اٹھائیس ہزار ہے - وہ انواع و اقسام کی کھجوریں مہیا کرتے ہیں - ان میں 'دِقْلت نُور' مشہور ہے - جب سے تُوزِر کو سَفَاقُس اور باقی [بلادِ مملکت] سے ملا دیا گیا ہے مالِ برآمد کی مقدار میں بہت اضافہ ہو گیا ہے - آبادی مستعرب بربروں کی ہے؛ تُوزِر کی آبادی ۱۱,۰۵۶ افراد پر مشتمل ہے، جن میں سے ۱۰,۷۲۳ مسلمان ہیں، ۱۸۱ یہودی اور ۱۵۲ یورپی (۱۹۲۶ء کی مردم شماری).

تُوزِر (لوحۂ پوتنجریانا .Tab. Peut کا *Thusurus*، بطلیموس Ptolemy کا *Thusuros*) بڑے قدیم زمانے سے آباد ہے - رومیوں نے بُلْدَۃ الحَدر Blidat al-Hader کے محلِّ وقوع سے قریب ایک شہر بسایا تھا، جس کے کھنڈر اب تک منارۂ مسجد کی بنیادوں میں پائے جاتے ہیں - ایک کنواں، ستونوں کے تیر، سرستونوں کے ٹکڑے وغیرہ بھی ملتے ہیں - پہلے اسے ونڈالوں نے فتح کر لیا تھا لیکن بوزنطیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا؛ اس میں شک نہیں کہ پہلے عرب حملہ آوروں نے تو یہاں لوٹ مار ہی کی تھی، لیکن ساتویں صدی کے اواخر میں یہ بالآخر عربوں کے قبضے میں آ ہی گیا - آبادی کو یا اسلام قبول کرنا پڑا یا جلاوطن ہونا پڑا [؟] جن لوگوں نے ہجرت اختیار کی وہ غالباً بہت تھوڑے تھے، کیونکہ التجانی (رحلۃ، ترجمہ ص ۱۳۳) اہلِ تُوزِر کو روم کی اولاد بتاتا ہے، جو مسلم فتوحات کے زمانے میں افریقیۃ میں تھے.

معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی صدیوں میں تُوزِر کو بڑی خوش حالی نصیب ہوئی - ابن حَوْقَل (*Descr. de l' Afrique*، ترجمۂ دیسلان، در *J. A.*، ۱۸۴۲ء)، جو اس علاقے کو قَسْطِیلِیَّۃ کہتا ہے اور البکری (محلِّ مذکور) اور ادریسی اس بات پر متّفق ہیں کہ یہاں تجارت فروغ پر تھی اور کھجور کے درختوں کی بڑی فراوانی تھی - بقول البکری کھجوروں کے ایک ہزار بار روزانہ باہر بھیجے جاتے تھے.

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ تُوزِر کی تاریخ حوادث سے خالی رہی - گو اہل تُوزِر برائے نام تو افریقیۃ کے مختلف حکمران خاندانوں کی رعایا شمار ہوتے تھے لیکن عملی طور پر وہ اپنی خودمختاری قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے - ابو یزید باغی کی حمایت کر کے انھوں نے فاطمیوں کے ساتھ بُغض کا اظہار کیا - زیریوں کے عہد میں امراءِ بنی فُرْخان ان کے مقامی سردار تھے - اس کے بعد بنو وَطّاس کے لوگ ان کے سردار بنے [قَبّ جَرِید] - المُوَحِّدین کے زمانے میں علی بن غانِیَۃ نے ان کے شہر میں غارتگری کی، پھر خلیفہ ابو یوسف نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا - تیرھویں صدی میلادی کے آخر میں انھوں نے حَفْصیوں کے خاندان کی بادشاہت کا جُوا اُتار پھینکا اور چودھویں صدی میں ابن یَمْلُل کی اطاعت قبول کی، جس کی سرکوبی کے لیے سلطان ابوالعبّاس کو ۱۳۷۹ء میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا - اس بادشاہ کے جانشینوں کے عہد میں ان لوگوں نے نافرمانی کی خصوصی روایت کو بدستور برقرار رکھا اور تونس کے حکمرانوں کو بہت سے موقعوں پر انھیں مطیع کرنے کے لیے تلوار نکالنا پڑی - شہریوں اور مضافات کے عربوں کے درمیان آئے دن کی لڑائی بھڑائی کی وجہ سے بھی شہر میں پریشانی رہتی تھی ([حسن بن محمد الوزّان الزّیّاتی] Leo Africanus : کتاب اول، طبع شیفر Schefer، ۳ : ۲۵۷) - ترکوں کے عہد میں بھی جو صورت حالات تھی وہ اس سے کم ھی مختلف تھی - اھلِ تُوْزِر نے سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی متعدّد بغاوتوں میں حصہ لیا - بایات کو ٹیکس وصول کرنے میں بڑی دقّت پیش آتی تھی - 'الصّف' (the Ṣoff)

کے جھگڑے بھی بدامنی کے لیے سازگار بنتے رہے۔ انیسویں صدی میں ان ' الصّف ' کے دو خاندانوں اُولاد هَدِیل اور زِبْدۃ میں سے ہر ایک نے قصبے کے ایک ایک محلّے پر قبضہ کر لیا اور آپس میں شدید نبرد آزمائی کرتے رہے، تا آنکہ فرانسیسی قبضے کی وجہ سے (۱۸۸۲ء) میں واضح طور پر امن و امان قائم ہو گیا۔

مآخذ: قبّ مآخذ مادّۂ بلاد الجرید نیز (۱) Berbrügger(A.): *Itinéraires archéologique en Tunisie*، در *Revue Africaine*، ۱۸۵۸ء؛ (۲) Dollin du Fresnel: *Le Djérid Tunisien*، در *Bulletin de la Société de géographie commerciale de Paris*، ۱۹۰۰ء؛ (۳) Grendre (Cap^ne): *De Tunis à Nefta*، در *Revue Tunisienne*، ۱۹۰۸ء؛ (۴) du Paty de Clam: *Fastes chronologiques de Tozeur*، پیرس ۱۹۰۰ء [(۵) ابویزید خارجی کے لیے جو اصل اور نشو و نما کے اعتبار سے توزری تھا دیکھیے ابن الأثیر بذیل وقائع ۳۳۳ھ]۔

(یور G. YVER)

* تُوغ: رکّ بہ طوغ

* تُوغرت: رکّ بہ تقُرت

* تَوفِیق پاشا: خدیو مصر (۱۸۷۹ تا ۱۸۹۲ء)، ۱۵ دسمبر ۱۸۵۲ء کو پیدا ہوا۔ خدیو اسمٰعیل پاشا کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کی تعلیم مصر ہی میں ہوئی اور انیس برس ہی کی عمر میں المجلس الخُصُوصی (Council of State) کے صدر کی حیثیت سے میدانِ سیاست میں داخل ہوا۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۹ء میں نُوبار پاشا کے مستعفی ہو جانے پر اس کے والد نے اسے وزیر اعظم مقرر کیا۔ اس کی مجلس وزراء میں، سابقہ مجلس کی طرح، ایک انگریز وزیرِ مال اور ایک فرانسیسی وزیر اشغالِ عمومی (پبلک ورکس) شریک تھا لیکن اسی سال ۹ اپریل کو اسمٰعیل نے ایک طرح کی ناگہانی تغییرِ حکومت (''کُودِتا'') سے اس نئی وزارت کو موقوف کر دیا اور شریف پاشا [رکّ بآن] وزیر اعظم بن گیا۔ اس کے بعد جلد ہی (۲۶ جون کو) سیاسی مشکلات کے پیشِ نظر سلطان نے اسمٰعیل کو معزول کر دیا اور ۱۸۶۶ء کے نافذ شدہ قانونِ وراثت کے مطابق توفیق پاشا تخت نشین ہوا۔

اپنی حکومت کے آغاز ہی میں توفیق پاشا کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ شریف پاشا نے نئے خدیو کی خدمت میں نظام نامے (کونسٹی ٹیوشن) کا مسودہ پیش کیا، جسے خدیو نے نامنظور کر دیا اور شریف پاشا ۱۸ اگست کو مستعفی ہو گیا۔ کچھ عرصے تک توفیق پاشا خود ہی مجلس وزراء کی صدارت کرتا رہا لیکن بہت جلد رِیاض پاشا اس عہدے پر مقرّر ہوا اور اس کی وزارت دو سال تک رہی تا آنکہ فوج نے عَرابی پاشا کی قیادت میں بغاوت کر دی۔ اس اثناء میں ملک کے مالیات پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کی '' دوگانہ نگرانی '' دوبارہ قائم ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ۱۸۸۰ء میں مصر کی خوش حالی کا جدید دَور شروع ہو گیا ہے مگر جنوری ۱۸۸۰ء ہی میں فوج میں پہلی بار بدامنی پیدا ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریف پاشا کو دوبارہ اقتدار حاصل ہو جانے پر ۹ ستمبر کو عام قومی شورش نمودار ہو گئی؛ جلد ہی اس قومی تحریک میں عَرابی پاشا [رکّ بآن] کو سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی۔ خدیو کے ساتھ کوئی ایسی زبردست جماعت نہ تھی جس کے بل بوتے پر وہ اس تحریک کے مقابلے میں اپنا اختیار و اقتدار قائم رکھ سکتا اور یہی حالت مصر کے اختیاردار (suzerain) یعنی سلطانِ روم کی تھی، جو حالات کی رو سے حکومتِ خدیویہ کا حامی و محافظ تھا؛ وہ بھی اس قدر کمزور تھا کہ اسے کچھ اہمیّت حاصل نہ تھی،

اس لیے اس کے بعد جو دور گذرا اس میں خدیو کو ساکت اور بے مقاومت ھی رھنا پڑا اور وہ ٹک ٹک دیکھتا ھی رھا اور قوم پرستوں نے جو اقدامات مناسب سمجھے کیے۔ ایک قدم انھوں نے یہ اٹھایا کہ عمائد کی ایک مجلسِ ملّی کا اجلاس طلب کیا اور گو پہلے پہل قومی رھنماؤں نے اعتدال پسندی کا ثبوت دیا، لیکن بین الاقوامی مالی مشکلات کی وجہ سے بالآخر ملک میں غیر ملکیوں کے خلاف عام نفرت اور مخالفت کا زبردست جذبہ پیدا ھو گیا جس کا نتیجہ (۱۱ جون ۱۸۸۲ء کو) اسکندریہ کے قتلِ عام کی صورت میں ظاھر ھوا، جس پر ۱۱ جولائی کو انگریزی بیڑے نے شہر پر گولہ باری کی۔ خدیو پہلے ھی ارکانِ حکومت کے ساتھ دارالخلافے سے بھاگ کر اسکندریہ کے قریب الرّملۃ میں پہنچ چکا تھا اور عرابی پاشا، جو اب خدیو کے خلاف کھلم کھلا بغاوت پر اتر آیا تھا، چند میل کے فاصلے پر کفر دوار میں مقیم ھوا۔ توفیق پاشا کے عہدِ حکومت کا یہ نازک ترین زمانہ تھا؛ اسے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ قوم پرستوں کا ساتھ دے یا غیر ملکی مداخلت قبول کرے؛ ادھر سلطان یہ سوچ رھا تھا کہ اس کے بجائے اس کے چچا عبدالحلیم کو خدیو بنائے، بلکہ اس غرض کے لیے مصر پر فوج کشی کرے لیکن دُوَلِ یورپ کے طرزِ عمل کو مدّ نظر رکھتے ھوے وہ اس ارادے سے باز رھا۔ آخرکار قوم پرستوں کی بغاوت کو انگریزی فوجوں کی مداخلت نے کچل ڈالا اور ۱۲ ستمبر ۱۸۸۲ء کو تلّ الکبیر کی جنگ کے بعد ملک پر انگریزوں کے فوجی احتلال کا دور شروع ھو گیا۔ اس لڑائی کے بعد خدیو قاھرۃ میں واپس آ گیا، لیکن ان حالات میں اس کے لیے اپنا تخت و تاج بچانے کی صرف یہی صورت تھی کہ وہ دولتِ مُحتلّہ کی خواھش کے مطابق عمل پیرا ھو۔ در حقیقت حکومتِ خدیویّہ، جس کا صدر ماہ اگست ۱۸۸۲ء سے پھر شریف پاشا ھی تھا، اب بالکل بے اختیار تھی۔ انگریزی احتلال کے بعد اسے ھر قسم کے اقدامات قبول کرنا پڑے، جو مصر کے نظامِ حکومت سے متعلّق عمل میں لائے گئے، مثلاً ۷ مئی ۱۸۸۳ء کا قانونِ اساسی، ۱۸۸۴ء میں ادارۂ مالی کی بین الاقوامی تنظیم۔ تاھم بعد کے پر آشوب دور میں خدیو اور مقیم برطانوی (برٹش ریذیڈنٹ) موسوم بہ قونصل جنرل (جو بعد میں لارڈ کرومر Lord Cromer کہلایا) کے درمیان مخلصانہ تعاون برابر قائم رھا۔ اس زمانے کا ایک نہایت ھی تباہ کن واقعہ سوڈان میں پیروانِ مہدی کی بغاوت اور اس صوبے کی مصر سے علیحدگی تھی۔ خدیو نے بہتیرا چاھا کہ کسی طرح یہ علاقہ ھاتھ سے نہ جائے لیکن مہدی کو شکست دینے کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ ناکام رھیں، چنانچہ جنوری ۱۸۸۵ء میں سقوطِ خرطوم کے بعد سوڈان ھاتھ سے نکل گیا۔ ملک میں قدرے خوشحالی کا دور کہیں ۱۸۹۰ء میں جا کر شروع ھوا۔ اس کے جلد ھی بعد ۷ جنوری ۱۸۹۲ء کو توفیق پاشا کا حُلوان کے خدیوی محل میں اچانک انتقال ھو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا عبّاس حِلمی تخت نشین ھوا۔

کہتے ھیں کہ توفیق پاشا ایسے مضبوط مزاج کا آدمی نہ تھا کہ اتنی پریشان کن سیاسی مشکلات کا سامنا کر سکتا؛ خاص کر جو کمزوری اُس نے اور اُس کی حکومت نے بغاوت کے ظہور کی ابتداء میں دکھائی اس کی وجہ سے لازمی طور پر بعد کے واقعات کی رفتار پر بھی کسی قسم کا کوئی ضبط قائم نہ رہ سکا۔ اس کے برعکس یہ خدیو نرم مزاج اور روشن دماغ مشہور تھا اور جن لوگوں کو اس سے شخصی طور پر واسطہ پڑا وہ سب کے سب اس کی تعریف کرتے ھیں۔ ان میں لارڈ کرومر اور دوسرے یورپی سیاست‌دان بھی شامل ھیں، جنھوں نے اس کا

حال بیان کیا ہے ۔ ۲۱ سال کی عمر میں اس نے خدیویہ خاندان کی ایک خاتون سے شادی کی اور تمام عمر اسی ایک شادی پر اکتفا کیا۔

مآخذ : جرجی زیدان : مشاہیر الشرق، قاہرۃ ۱۹۱۰ء، ۱ : ۳۸، ببعد؛ (۲) لارڈ کرومر : *Modern Egypt*، لنڈن ۱۹۱۱ء، خصوصاً ص ۱۵۷ ببعد؛ (۳) A. Hasenclever: *Geschichte Ägyptens im 19 Jahr-hundert*، ہالّہ بر رود زالّہ Halle a.S. ۱۹۱۷ء، خصوصاً ص ۱۹۸ ببعد؛ [(۴) عبداللہ حسین : السودان، قاہرۃ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء، ۱ : ۱۸۵ - ۱۹۴، مع تصاویر].

(کرامرز J. H. KRAMERS)

توفیق فکرت : اس کا اصلی نام محمد توفیق تھا ۔ اس نے پہلے ''توفیق نظمی'' تخلص اختیار کیا مگر بعد میں اسے فکرت میں تبدیل کر لیا ۔ وہ ترکی کے فحول شعراء میں سے ہے اور عروضی ہے، جس نے ترکی شاعری کے جدید دبستان کی بناء ڈالی۔

فکرت ۲۴ شعبان ۱۲۸۴ھ / ۲۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو قسطنطنیہ میں پیدا ہوا ۔ اس کا والد حسین افندی فاطمۃ سلطان کا سکرٹری (کاتب سرّ) تھا (اور بعد میں ''متصرف'' ہوا)؛ اصلاً وہ اناطولیہ کے چرکس عمائد کے ایک خاندان کا فرد تھا ۔ توفیق کی والدہ کا نام خدیجہ رفیعہ خانیم تھا جو جزیرۂ کائےاوس Chios کی ایک ترک خاتون تھی (اور غالباً از روی اصل یونانی تھی) ۔ فکرت کو احتیاط سے تعلیم دی گئی؛ پہلے اسے آقسرای میں محمودیّۃ والدہ رُشدیّۃ (ابتدائی مدرسے) میں بھیجا گیا ۔ جب یہ مدرسہ روسی ترکی جنگ کے مہاجرین کی بھرمار کی وجہ سے بند کر دیا گیا تو اسے نو برس کی عمر میں غلطہ ہائی سکول (غلطہ سرای سلطانی سی) میں داخل کر دیا گیا؛ اس سکول سے اس کا تعلق تقریباً عمر بھر رہا ۔ گیارہ برس کی عمر میں اس کی والدہ فوت ہو گئی ۔ جو اپنے بڑے بھائی کے ساتھ حجّ کعبہ کو گئی تھی، مگر بھائی بہن دونوں صحرا میں ہیضے سے مر گئے (فکرت کو اس صدمے کا پورا احساس اس وقت ہوا جب اس کی اپنی بہن نے وفات پائی ۔ اس کی یاد میں اس نے ایک پُر سوز مرثیہ '' ہمشیرم ایچون'' کے عنوان سے لکھا، ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء) ۔ بچپن میں فکرت بڑا خود سر اور ضدّی تھا مگر بعد میں اس نے اپنے آپ پر پورا پورا قابو پا لیا اور بے حد متین بلکہ تقریباً مردم بیزار اور بشدّت زود حسّ ہو گیا ۔ ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ - ۱۸۸۷ء میں وہ مدرسے سے نکلا تو وہاں کا ممتازترین طالب علم تھا ۔ وہ باب عالی کے ایک دفتر میں ملازم ہو گیا مگر یہ ملازمت اس نے ۱۳۱۱ھ میں ترک کر دی، کیونکہ اس وقت کی ترکی حکومت کے سرکاری دفاتر کی زندگی بے شغل زندگی تھی اور اس کی باوقار فطرت کے لیے موزون نہ تھی ۔ اسی زمانے میں وہ اُس تجارتی مدرسے میں جو گدیک پاشا میں تھا فرانسیسی اور ترکی زبانیں پڑھانے کے علاوہ خوش نویسی کی تعلیم بھی دیا کرتا تھا ۔ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ - ۱۸۸۹ء میں اسے غلطہ سرای کے ہائی سکول میں مدرّسی کی اسامی مل گئی لیکن ۱۳۱۱ھ میں اس نے اس ملازمت کو بھی ترک کر دیا، کیونکہ حکومت نے اس کی تنخواہ کم کر دی تھی ۔ ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ - ۱۸۹۵ء میں وہ رابرٹ کالج، روم ایلی حصار میں مدرّس مقرّر ہو گیا، جہاں وہ وفات کے وقت تک رہا ۔ روم ایلی حصار میں اس نے اپنا مکان تعمیر کیا اور چونکہ فن کار (آرٹسٹ) بھی تھا اس مکان کو اس نے اپنے فنی مذاق کے مطابق خوب آراستہ کیا ۔ مکان کا منظر شاندار تھا اور اس میں وہ اپنی بیوی اور اپنے بیٹے خلوق کے ساتھ ایک شاعر کی پُرلطف اور پُر امن زندگی بسر کرتا رہا ۔ اس کی بیوی اس کی بنت العمّ بھی تھی، جس سے اس نے ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء میں شادی کی تھی ۔ اس نے اپنے بیٹے خلوق کے نام سے اپنی نظموں کا ایک

مجموعہ بھی مَعنْوَن کیا (تقدیر کا یہ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ اس کی ماں تو سفر حج میں اللہ کو پیاری ہوئی تھی اور اس کا بیٹا خَلُوق گلاسگو میں عیسائی ہو گیا اور [۱۹۲۹ء کے قریب] امریکہ میں انجینئر تھا ۔ اس طرح وہ اپنے وطن ترکیّہ کے مقاصد کے لیے ضائع ہو گیا.

۱۳۰۷ھ سے توفیق نے ترکی جریدے مِرصاد میں مضامین لکھنا شروع کیے، جس کا مدیر اسمٰعیل صِفَا ایک ترکی شاعر تھا ۔ ۱۳۰۹ھ میں فِکرت نے چند ادبی مذاق رکھنے والے دوستوں کے ساتھ مل کر معلومات کی بناء ڈالی لیکن اس اخبار کے ابھی ۲۴ شمارے ھی شائع ھونے پائے تھے کہ محکمۂ احتساب نے اس کا گلا گھونٹ دیا ۔ ۱۳۱۱ھ میں اس نے مصوّر رسالے ثَروتِ فُنون کی ادارت (ادبی پہلو سے) سنبھال لی، اس رسالے کو ۱۸۹۰ء میں احمد احسان نے جاری کیا تھا ۔ توفیق کی وسیع ادبی فعّالیّت اب ظاھر ھونے لگی اور وہ جلد ھی مشہور مصنّفین میں شمار ھونے لگا ۔ اس نے [سلطان] عبدالحمید کے زمانے میں حکومت کی عائد کردہ پابندیوں سے بہت تکلیف اٹھائی مگر ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد نوجوان ترکوں کی حکومت نے اسے غَلَطہ سرای ھائی سکول کا مدیر [ڈائرکٹر] مقرر کر دیا، کیونکہ اس نے وزیر تعلیم بننے سے انکار کر دیا تھا ۔ اس نے یہ کوشش کی کہ اس مدرسے کو دَورِ جدید کی مثالی درسگاہ بنائے لیکن جلدی ھی اسے وزارتِ تعلیم کی قدامت پسندی اور قرطاس بازی سے ٹکّر لینا پڑی، بالآخر وہ ۱۳۲۷ھ/۱۹۱۰ء میں اپنے عہدے سے سبکدوش ھو گیا تاکہ وہ اپنی شاعری اور رابرٹ کالج کے درس و تدریس کے کام میں کاملاً منہمک رہ سکے ۔ اس زمانے میں اس نے اصلاحِ تعلیم کے لیے نئی طرز کے ترکی مدرسے (''یکی مکتب'') کا منصوبہ تیار کیا، جو عمل میں نہ آ سکا ۔ طویل علالت کے بعد ۱۸ اگست ۱۹۱۵ء/[۱۳۳۳ھ] کو اس کا انتقال ھو گیا.

فکْرت نے ایامِ طفولیت، یعنی ۱۴ ھی برس کی عمر میں، غزلیں لکھنا شروع کر دی تھیں، جو ظاھر ھے کہ طرزِ قدیم کی تھیں (مُنتخبات ترجُمانِ حقیقت، ص ۵۳۳) ۔ اپنے اساتذۂ ادب، فیضی، معلّم ناجی اور بالخصوص رِجائی زادہ اِکْرم کے زیرِ ھدایت اس نے اپنی ادبی قابلیتوں کو خوب ترقی دی اور اِکْرم کا دوامی اثر نہ صرف اس کی ذات پر پڑا بلکہ آئندہ کی تمام نوجوان نسل نے اس اثر کو قبول کیا ۔ اِکْرم ھی کے مشورے سے فکْرت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ رسالۂ ثروتِ فُنون کا رئیس تحریر بنے ۔ جونہیں اُس نے اس عہدے کا جائزہ لیا ثروت کے لیے ایک نیا دَور شروع ھو گیا ۔ اس جریدے نے سارے کے سارے ترکی ادب کے لیے ایک ایسا معیار قائم کر دیا جس سے اُس دَور کو (نظم میں) توْفیق فِکْرت کا دَور اور (نثر میں) خالد ضیا کا دَور کہتے ھیں ۔ تھوڑے ھی عرصے میں مکتب کے، جو حُسین جاھد کی ادارت میں مغربی طرز پر شائع ھوا کرتا تھا، تمام شرکائے کار ثروت کے عملے میں شامل ھو گئے ۔ چنانچہ اب اس رسالے کے عملے میں علی اِکْرم، عبدالحق حامد، جناب شہاب الدین، خالد ضِیا، علی نادر، حسین ناظم اور احمد رشید کام کرتے تھے ۔ اس جدید ادب میں مشرقی مذاق کی نمائندگی ''مُصوّر معلومات'' کے ذریعے ھوا کرتی تھی.

دو سال تک ان فرائض سے عہدہ برآ ھونے کے بعد فِکْرت نے اپنی مشہور تصنیف رُبابِ شِکْستہ شائع کی (ادبیّاتِ جدیدہ کُتُب خانہ سی، عدد ۲، استانبول ۱۳۱۴ھ/[۱۸۹۶ء]) ۔ اس کتاب کو بے نظیر مقبولیت حاصل ھوئی اور وہ بار بار شائع ھوئی (بعد میں فکْرت کی دوسری تصانیف بھی اس کے ساتھ ضم ھو کر شائع ھوتی رھیں) ۔ ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں اس کی سب سے زبردست نظم سِیْس (کُہر)، جو سلطان

عبدالحمید کی مستبدّانہ حکومت کے خلاف تھی، تصنیف ہوئی۔ آج کل کے زمانے میں یہ نظم کچھ بے اثر سی معلوم ہوتی ہے۔ انقلاب کے بعد اُس نے اپنی نظم جس کا عنوان رجوع تھا شائع کی۔ ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء میں اپنی بہن کا مرثیہ ھُمشیرِم ایچون کے عنوان سے لکھا۔ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں عبدالحمید کی زندگی پر ناکام حملہ ہونے کے موقع پر لحظۂ تأخُر لکھی اور ۱۹۰۸ء میں مِلّت شرقی سی تصنیف کی۔ یہ دونوں نظمیں، یعنی سِیْس اور رجوع، جو پہلے خفیہ طور پر دست بدست تقسیم ہوئی تھیں، فکْرت نے اخبار طَنین کے پہلے شمارے میں شائع کیں، جو اُس نے خود جاری کیا تھا۔ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء دوقسان بِشہ دوغرو شائع ہوئی، جسے عام مقبولیت حاصل ہوئی اور فِجْر آتی، اور رُبابک جوابی، خَلْوتک دفتری (طبع فاک سْمیل، در اَدبیات جدیدہ کتب خانہ سی، عدد ۳۱)؛ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں خوانِ یغما چھپی اور ۱۳۳۰ھ میں بچوں کے گیتوں کا مجموعہ پرمق حِسابی: شرمین میں نکلا، یہ اس کی آخری نظم تھی۔

اس کی تصانیف کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن ترکی ادبیات میں ان کی اہمیّت بے نظیر ہے۔

فِکْرت کی شخصیت کے متعلّق اب بہت کچھ اختلاف رائے ہے۔ اس کی زندگی میں تو اس کا شہرہ فلک الافلاک تک جا پہنچا اور اُسے شاعرِ فَحْل اور نابغۂ عصر مانا گیا لیکن اس کی موت کے بعد اس کی اہمیّت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ اُسے حقیقی شاعر ماننے سے بھی انکار ہو رہا ہے اور اُسے شاعری میں صرف استخوان بندی کا ماہر اور ہشیار عروضی کہا جاتا ہے۔ اوجِ شہرت پر اس کے باور نشدنی مستعجل عروج کا یہ ردِ عمل ہے۔ ذیل میں جو تنقید درج ہے اس سے جدید نظریہ، جو اس کے متعلّق قائم ہوا ہے، منعکس ہوتا ہے: ”فِکْرت ترکی علمِ ادب میں مصطلح فنِّ شعر کے عالم کی حیثیت سے زندۂ جاوید ہے اور بحیثیتِ انسان ناقابل فراموش لیکن شاعر کی حیثیت سے وہ شاید آج سے پہلے ہی فراموش ہو چکا ہے“۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شاعر کی طرح فِکْرت کو بھی اس کے زمانے اور معاشری ماحول کی روشنی میں جانچا جائے۔ وہ شاعری کے مصطلح کا اُستادِ کامل، ترکی کی نشأۃ الثانیۃ کا خالق اور مغرب پسند دبستان کا عظیم‌ترین نمائندہ ہے۔ اس سے پہلے دَور کے شاعروں (کِمال، حامد اور اِکرم) نے عربی اور ایرانی اسالیب کے غلبے کو ختم کر دیا تھا لیکن مشرقی روح قائم رکھی تھی۔ اب اِس دَور کا وظیفہ یہ تھا کہ زندگی کے متعلّق اسلامی تصوّر کی جگہ مغربی یعنی فرانسیسی تصوّر کو دی جائے، چنانچہ فکرت نے فرانسیسی مصنّفین بالخصوص فرانسئوا کوپے François Coppée، کونٹ دِ لِیل Leconte de Lisle اور صُولی پرودوم Şully Prudhomme، کو مع مُوسے لامَرتِین Musset Lamartine، بودلیئر Baudelaire اور وِرلین Verlaine کو بطور نمونہ اختیار کیا۔

اس نے شعر کے لیے نئی زبان پیدا کی۔ قوافی کے نئے قواعد اس اصول کو مدّ نظر رکھتے ہوئے وضع کیے کہ قوافی آنکھ کو محظوظ کرنے کے لیے نہیں ہوتے، جیسا کہ اَکْرم اور عبدالحق حامد کے کلام کی خصوصیت ہے، بلکہ اُن سے کانوں کو محظوظ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اپنے سلیم ذوق اور صحیح قوّتِ فیصلہ کے ذریعے اس نے زبان کو مزاج اور ساخت کے اعتبار سے خالص ترکی قالب میں ڈھال دیا اور اس طریق سے لِسانی انتشار کو ختم کر دیا اور غیر ملکی عناصر اور اوزان کو ترکی سانچے میں ڈھالا، گو ذخیرۂ الفاظ کے نقطۂ نظر سے اسے ترکی میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار پر کوئی اعتراض نہ

تھا اور اس کے کلام میں بہت سے نامانوس اور شاذ غیر ترکی الفاظ پائے جاتے ہیں ۔ فکرت نے شاعری میں زبان کی وہی خدمت کی جو نامق کمال نے نثر میں انجام دی تھی ۔ اس نے جو قواعد وضع کیے اور جن پر وہ خود بھی عمل کرتا تھا انھیں اب اس حد تک اختیار کر لیا گیا ہے کہ اُن کے متعلّق مبتدعات ہونے کا گمان بھی نہیں ہوتا ۔ دوسرے شاعروں کی بہ نسبت اُس نے زبان کی طرف بحیثیتِ زبان بہت زیادہ توجہ کی ۔ صحّتِ زبان کے لحاظ سے وہ معلّم ناجی سے مماثل ہے لیکن زبان پر قدرت کے معاملے میں سب پر سبقت لے گیا ہے ۔ وہ کسی حد تک نہ صرف اپنی زبان کے حسن و کمال اور اپنے اشعار کے بے خطا ہونے میں پلاٹن Platen کی یاد دلاتا ہے (اور یہ خصوصیات وہ ہیں جن میں احمد مدحت ایسے لوگ بھی، جو ''انحطاط'' کے مخالف تھے، کسی قسم کا نقص نہیں نکال سکے)، بلکہ اپنے اشعار کی مرمری ملاست و ہمواری اور صیقل مگر بے جان کیفیت کے لحاظ سے بھی فکرت اس سے مماثلت رکھتا ہے .

اس کی قدیم ترین غزلیات میں بھی اس کی اپنی خصوصیات ظاہر ہیں، گو اُس وقت تک وہ دبستانِ قدیم ہی کے زیرِ اثر تھا ۔ مہارتِ زبان میں اور موزونیتِ کلام کے لیے اس کی ذکاوتِ حس نے بڑی سرعت سے ترقّی کی اور یہی ایک ایسی خصوصیت ہے جو اُسے دوسروں کے مقابلے میں ممتاز کرتی اور جس کی وجہ سے دوسرے شاعروں کے لیے وہ ایک قابلِ تقلید نمونہ بن جاتا ہے .

قدیم دبستانِ شاعری کا یہ دستور تھا کہ ہر شعر بجاے خود ایک قائم بالذّات وحدت اور ایک مستقل اور جداگانہ حیثیت رکھتا تھا (اور یہی وجہ ہے کہ خاص طور پر غزلیات میں اشعار کی ترتیب بدلی جا سکتی ہے) اس کے برعکس فکرت ایک ہی عاطفے کا اظہار اشعار کے ایک پورے سلسلے میں کرتا ہے؛ چنانچہ اُس کے اشعار میں وہ لوچ اور بے ساختگی موجود ہے جو حامد کے منظوم مکالموں میں اس وقت تک مفقود ہے ۔ فکرت کے اشعار کی زبان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے نغمے کو مضمون کے ساتھ مطابقت دی جائے ۔ اس سے پہلے نفعی نے بھی ایسا ہی کرنے کی کوشش کی تھی ۔ اُس کی شاعری کے بارے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس نے ''سانیٹ'' (sonnet، ایک ہی مضمون کی چارده مصراعی نظم، جس کے قافیے خاص ترتیب سے لائے جاتے ہیں) کو رواج دیا اور اب ترکی زبان میں اس قسم کی نظم کو خاصی ترقّی حاصل ہو چکی ہے .

بحور میں وہ اس وقت تک بدستور اوزانِ مقداری (quantitative) کا پورا پورا خیال رکھتا ہے، سوا ان نظموں کے جو اس نے بچوں کے لیے لکھیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دبستانِ قدیم کے پیرو اُسے اتنی آسانی سے بلا حیل و حجّت شاعر تسلیم کرنے پر تیار نہ ہو جاتے .

فکرت کا ذہن ایک انتہا پسند نقّاد کا ذہن تھا، جس نے اپنے زمانے کے اخلاقی، مذہبی اور سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے ۔ اس بارے میں وہ ہمیشہ اپنے دل اور ضمیر کی آواز کی پیروی بلا خوف و خطر کرتا رہا ۔ مگر وہ ایک فلسفی نہ تھا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل بتاتا اور نہ وہ ماہر الٰہیات ہی تھا کہ عالمِ ارواح کی گہرائیوں تک جا پہنچتا ۔ اس کے اعمالِ ذہنی بالکل معمولی بلکہ سطحی قسم کے تھے ۔ اس کی اینانمق اِحتیاجی اور تأریخِ قدیم اس کے عہد کے فسادِ عقیدہ کا نمونہ ہیں ۔ عبدالحمید کی مستبدّانہ حکومت کی زہرآلود فضا میں اور اُس کے بعد نوجوان ترکوں کے غیر محدود اور یک طرفہ طرزِ حکومت میں اس نے اپنی خالص شخصیّت، اپنی راسخ خود اعتمادی، اپنی مکمّل فرض شناسی اور اپنی مقدّس جانفشانی کی بدولت اور اپنی نظموں کے

ذریعے اپنے ملک کی ایسی شاندار خدمت سر انجام دی کہ اُس کے زمانے کے نوجوانوں کو دعوت دی جاتی تھی کہ "تو اپنے حق میں فکرت کی طرح ہو جا اور اپنے ملک کے حق میں نامِق کمال بن جا"۔ اس کی ہر ایک نظم سے کچھ نہ کچھ سبق ضرور ملتا ہے، اس لیے ترکی کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اس کا کلام ایک مؤثر اور زبردست وسیلہ ثابت ہوا۔ فکرت تعلیم کی اہمیّت کا بہت معتقد تھا۔

توفیق فکرت شاعر ہے، گو وہ اتنا عظیم شاعر نہ تھا جتنا اُس کے معاصرین اُسے سمجھتے تھے۔ اس کے کلام میں، خاص کر اس کے دوسرے دور کی نظموں میں، نامِق کمال کے سے شاعرانہ جوش و خروش کی کمی ہے۔ اس کی پُر جوش نظم سیس، جسے اُس زمانے کے نوجوان حرفِ پیغمبر کا رتبہ دیتے تھے اور دوسری نظمیں، جن میں اُس نے مطلق العنان حکومت پر بڑی لے دے کی ہے، اب بے رنگ اور غیر حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اس سخت نا امیدی کا نتیجہ نہیں ہیں جو نامِق کے اشعار میں نمایاں ہے۔ فکرت اپنے اشعار میں چھوٹی سے چھوٹی اور نہایت معمولی اور بے مقدار چیزوں کا ذکر بھی بہت بڑھا چڑھا کر کرتا ہے، بلکہ اِکرم سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے، حالانکہ اِکرم کا دعوٰی یہ تھا کہ جو کچھ بھی ہے اُس میں شعریت ہے، گو عملاً اُس نے اپنی شاعری کا استعمال صرف پھولوں، بادلوں، پانی اور صبح تک ہی محدود رکھا ہے۔ فکرت نے وقت کے دستور کے مطابق رسالوں کی تصویروں کے لیے بھی کئی نظمیں لکھی تھیں، جو رُبابِ شکستہ میں شائع ہوئیں۔ اُن واضح اور صریح نظموں کا ذکر جو اُس نے ندیم، نَفعی، فضُولی اور حاسد کے اوصاف خصوصی کے متعلق لکھیں خاص طور پر ضروری ہے۔ اسے شعر لکھنے میں زحمت اٹھانا، نظم کی تکمیل میں الفاظ کی جُستجو اور مضمون کے لیے کدّ و کاوش کرنا پڑتی تھی۔ اُس نے نہ صرف اس بات کا خود اعتراف کیا ہے بلکہ یہ امر اس کی بہت سی نظموں کے رنگ تکلّف سے بھی عیاں ہے۔ اسی وجہ سے اُس کے کلام کی لطافت میں کمی آ گئی ہے اور یہ بات اُس کے کلام کی قلیل ضخامت سے بھی واضح ہے۔

مآخذ: توفیق فکرت کی مذکورۂ بالا تصانیف اور ان نظموں کے علاوہ جو رسالوں اور اشعار کے مجموعوں میں منتشر ہیں: (۱) اقدام: عدد ۶۶۴۸، ۲۰ اگست ۱۹۱۵ء؛ (۲) بُروسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤلّفلری، استانبول ۱۳۳۳ھ، ۲: ۳۸۰؛ (۳) نُزہت ہاشم: مِلّی ادبیّات دوغرو، استانبول ۱۹۱۸ء، ص ۱۶۹؛ (۴) رَوشن اِشرف: توفیق فکرت حیاتنہ دائر خاطرہلر، استانبول ۱۹۱۹ء؛ (۵) اسمٰعیل حَبیب: تورک تجدّد ادبیّاتی تأریخی، استانبول ۱۳۴۰ھ، ص ۴۴۰ تا ۴۵۷؛ (۶) کوپرولوزادہ محمد فُؤاد: بوگونکی ادبیّات، استانبول ۱۳۴۲ھ، ص ۳۲۴ تا ۳۲۹؛ (۷) اسمٰعیل حکمت: تورک ادبیّاتی تأریخی، باکو ۱۹۲۵ء، ص ۳۰۱ تا ۳۷۹؛ (۸) صالح نگار کرامت: فکرتک حیات و اثری، استانبول ۱۹۲۶ء؛ (۹) ابراہیم علاءالدین: توفیق فکرت بویوک آدملر سریسی، ج ۱، عدد ۴۳، استانبول ۱۹۲۷ء؛ (۱۰) دَوَل، استانبول، عدد ۷ و ۱۳؛ (۱۱) ہورن Horn: *Geschichte der türkischen Moderne*، لیپزگ ۱۹۰۲ء؛ (۱۲) Wl. Gordlewski: *Očerki po nowoi osmanskoi literatur*، ماسکو ۱۹۱۲ء؛ (۱۳) منتسل Th. Menzel: *Die türkische Literatur*، در Hinneberg: *Kultur der Gegeuwart*، ۱، جزء ۷، طبع دوم، لیپزگ ۱۹۲۵ء.

(منتسل TH. MENZEL)

توفیق محمد: جسے چایلاق توفیق کہتے ہیں، ترکی مصنّف اور اخبار نویس تھا، جو شعبان ۱۲۵۹ھ / ستمبر ۱۸۴۳ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد مصطفٰی آغا یکی چری سے

وابستہ تھا اور اس کی ماں اُمّ‌الولد تھی ۔ توفیق کا انتقال ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء میں اسی شہر میں ہوا ۔ معمولی ہی سی تعلیم کے بعد وزارتِ جنگ میں محرّر بھرتی ہو گیا ۔ فلبْ افندی نے، جو اخبار وقیت اور مخبر کا بانی اور مدیر تھا، اسے میدانِ صحافت سے روشناس کیا ۔ وہ بتدریج صحافت اور تصنیف و تألیف کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ منہمک ہوتا گیا اور اس کے انہماک میں اگر کوئی وقفہ آیا تو اس زمانے میں جب اسے قسطنطنیہ میں یا بیرونی صوبوں (بروسہ، سراجیوو اور بہچ) میں زیادہ یا تھوڑی مدّت کے لیے سکرٹری کا کام کرنا پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کہیں بھی فضا کو موافق نہ پایا؛ ناچار اُسے اُس دور میں جب کہ اخبارات اور رسائل کے خلاف حکومت مستبدّانہ اقدامات میں مصروف تھی اخبار نویسی کی زندگی کی تلخناکی کو تلچھٹ سمیت پینا پڑا ۔ بظاہر وہ علم معانی و بیان کا مدرّس بھی تھا، گو صحیفہ نگاری کی ابتداء میں اسلوبِ تحریر ہی تھا جس کی وجہ سے اُسے شدید ترین مشکلات پیش آئیں ۔ وہ مخبر، استانبول، ترقّی اور بصیرت کے لیے مضامین لکھا کرتا تھا ۔ والی بروسہ کے لیے اس نے چھاپہ خانہ بنایا اور ولایتِ مذکورہ کا ایک سرکاری اخبار خداوندگیار بروسہ سے جاری کیا اور اپنی ذاتی حیثیت میں سیاسی پرچے عصر اور عثمانلی اور مزاحیہ پرچے گوزہ، لطائفِ آثار اور چایلاق جاری کیے۔

اس کے ساتھ ساتھ اُس نے بحیثیت مصنّف کتب بھی بڑی سرگرمی کا اظہار کیا، بالخصوص حکایت نویسی میں۔ اس کی تصانیف ترکی ادبِ شعبی کے لیے خاص طور پر اہمّ ہیں، کیونکہ اس نے قدیم رسوم و عادات کو، جو آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھیں، ضبطِ تحریر میں لانے کی اھمّیت کو پوری طرح سمجھا ۔ اس کی تصنیف استامبولدہ برسنہ نے خاص طور پر اس کے نام کو بقائے دوام بخشا ۔ اس کی تصانیف عام طور پر بالاقساط شائع ہوتی رہیں اور اسی وجہ سے بعض کبھی بھی مکمل نہ ہو سکیں ۔ ان میں ذیل کی تصانیف بھی شامل ہیں : ذیلِ لطائفِ انشاء؛ آق حصاری نیک نظامِ عالم ترجمہ سی؛ قافلۂ شعراء، ۱۲۹۰ھ؛ مشاہیرِ عثمانیہ، ۱۲۹۳ھ؛ آثارِ پریشان؛ مجارستان؛ سیاحت نامہ سی، ۱۲۹۴ھ؛ غرائبِ حکایات؛ لطائفِ نصرالدین، ۱۲۹۹ھ، استامبولدہ برسنہ، ۱۲۹۹ - ۱۳۰۰ھ؛ بوآدم، ۱۲۹۹ تا ۱۳۰۲ھ: تخریجِ خرابات، ۱۳۰۰ھ؛ ایکی گلنْ اوده سی، ۱۳۰۱ھ؛ تأریخ یا خودبیک یوزیتمش جنایت لری، ۱۳۰۲ھ؛ خزینۂ لطائف، ۱۳۰۳ھ؛ لطائف الظرائف؛ اصول انشاءٗ و کتابت؛ شمروخ ادب .

مآخذ : (۱) منتسل Th. Menzel : *Türkische Bibliothek*، ج ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۰، ۱۳، بالخصوص اس کی اپنی سوانحعمری، ج ۱۰ : ۲۰ تا ۳۶؛ (۲) محمد طاہر بروسہ لی : عثمانلی مؤلفلری، استانبول ۱۳۳۳ھ، ۲ : ۱۱۷؛ (۳) ہورن Horn : *Geschichte der türkischen Moderne*، لیپزگ ۱۹۰۲ء؛ (۴) Wl. Gordlewski : *Očerki po nowoi osmanskoi literature*، ماسکو، ۱۹۱۲ء، ص ۹۶ تا ۹۹؛ [(۵) منتسل: *Mehmed Tewfiq's Istambolda bir sene*، در *Kelete Szemle*، ۱۰، بوڈاپسٹ ۱۹۰۹ء: ص ۱ تا ۶۰].

(منتسل TH. MENZEL)

* **تُوقات** (Tokat) : ایشیاے کوچک کا ایک شہر جو کپّاڈوسیا Cappadocia کے شمالی حصے میں طوزانلی صو (ندی) کی، (جو قدماء کے درمیان آئی آیریس Iris کے نام سے معروف تھی) درمیانی گذرگاہ کے جنوب میں واقع ہے ۔ یہ شہر ایک پہاڑی وادی کے دونوں طرف آباد ہے، وادی شمال کی جانب کھلتی ہے [جس کی وجہ سے اس کی سمتِ شمال وسیع ہو گئی ہے اور شہر کی عمارات پستی اور بلندی میں واقع

ہونے کی وجہ سے بھلی معلوم ہوتی ہیں - شیروانی] - شہر اور دریا کے درمیان ایک خوبصورت میدان ہے - قدیم زمانے میں شمال مشرقی جانب، رُو بہ دریا، کومانا پونٹیکا Comana Pontica کا مشہور و معروف شہر آباد تھا، جس کا نام گُومِنِگ Gümeneck گاؤں کے نام میں اب تک باقی ہے - جہاں اب توقات واقع ہے وہاں کبھی وہ قلعہ تھا جسے دازیمون کہتے تھے (دازیمون کی ہویّت کے اس اثبات کے متعلّق قبّ رامزے The Historical Geography of Asia Minor : Ramsay، لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۳۲۹ ببعد) - بوزنطی سلطنت کی سرحدی جنگوں کے زمانے میں اس قلعے کی اہمّیت اور بھی بڑھ گئی ہوگی - کہتے ہیں کہ توقات کا نام، جو مسلمان جغرافیہ دانوں کی کتابوں میں یاقوت کے وقت سے چلا آ رہا ہے (توقات : در یاقوت، ۱ : ۸۹۵؛ ابوالفداء، طبع رینو Reinaud، پیرس ۱۸۴۰ء، ص ۳۸۴ تا ۳۸۵)، یوڈوکسیا Eudoxia نام کی ارمنی صورت سے مأخوذ ہے، (Mémoire sur : St. Martin *l'Arménie*، ۱ : ۱۸۸) لیکن ان دونوں کو ایک ماننے سے تمام مشکلات حل نہیں ہو جاتیں - اولیاء چلبی کلمۂ توقات کے متعدّد اور اشتقاقات بتاتا ہے - سلجوقی فتوحات کے بعد توقات کی حربی اہمیت بدستور قائم رہی اور بعض اوقات یہاں ملوکِ سلاجقہ رہا بھی کرتے تھے - حملۂ مغول کے وقت جب ۱۲۷۵ء میں قرامان اوغلو نے قونیہ فتح کر لیا تو سلطان نے اپنا مال و دولت محفوظ رکھنے کی کوشش میں اس قلعے میں منتقل کر دیا اور یہیں اقامت اختیار کر لی (ابن بی بی : *Rec. de. textes rel. à l' hist. des Seldj.*، ۴ : ۳۲۵) - اس کے بعد توقات خاندانِ ارتنا اوغلو اور قاضی برہان الدین حاکم سیواس (دیکھیے عزیز بن اردشیر استرآبادی : بزم و رزم، طبع استانبول ۱۹۲۸ء [مثلاً ص ۴۲ ببعد]) کے قبضے میں آیا؛ ۱۳۹۲ء میں سلطان بایزید [اوّل] نے قاضی سے اس شہر کو چھین لیا - تیمور کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ اس مستحکم مقام کو فتح نہ کر سکا (اولیاء چلبی، ۵ : ۵۵)، اور اس کی واپسی کے بعد عثمانیوں نے بہت جلد اس پر قبضہ کر لیا - محمد ثانی کے عہد میں اوزون حسن کے لشکر نے ۱۴۷۱ء میں قرامانی جنگوں کے اثنا میں اس شہر کو تاخت و تاراج کیا لیکن اس زمانے کے بعد اس شہر نے ترکوں کی تاریخ میں کوئی نمایاں حصّہ نہیں لیا - بعض اوقات اس کے قلعے کا قید خانہ، جسے "چار طاقِ بدوی" کہتے تھے، سیاسی مجرموں کے لیے استعمال ہوتا رہا - بہر حال اس شہر کی اہمّیت قائم رہی، کیونکہ قسطنطنیہ سے مشرق کو جانے والی فوجی اور تجارتی شاہراہ پر واقع تھا؛ اس سڑک کے ذریعے اس شہر کا اتّصال شمال میں آماسیہ سے اور جنوب میں سیواس سے قائم تھا - دوسرے راستے بھی توقات پر آ ملتے تھے، اس لیے سترھویں صدی میں ان علاقوں میں توقات تجارتی راستوں کا سب سے بڑا سنگھم تھا (Tavernier).

مذہبی تاریخ کے لحاظ سے بھی توقات کی اپنی روایات ہیں؛ چنانچہ تیرھویں صدی میں بابا اسحٰق کے پیرووں نے اس شہر پر حملہ کیا (ابن بی بی، ۲۲۹) [بابا اور سلطان غیاث الدین کے خلاف اس کے خروج کا حال ابن بی بی، ص ۲۲۷ - ۲۳۱ پر دیکھیے] اور اولیاء چلبی بھی اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ حاجی بکتاش نے ارطغرل کے زمانے میں کافروں سے یہ شہر چھین لینے کی کوشش کی تھی، مگر یہ غالباً فرضی داستان ہے.

انیسویں صدی تک توقات سیواس کے سنجاق کی ایک قضا تھی، جو ایالتِ سیواس کے ماتحت تھی - قانون مجریۂ ۱۸۶۴ء کے مطابق یہ شہر ولایتِ سیواس میں توقات کی سنجاق کا صدر مقام بن گیا اور جمہوریۂ ترکیہ میں توقات حسب ذیل چھے

قضاؤں کی ولایت کا صدر مقام ہے: توقات، زیلہ، اربعۃ، نیک سار، رشادیہ، آرتیق، اووہ۔ انیسویں صدی کے اواخر میں یہاں کی آبادی تقریباً تیس ہزار نفوس کی تھی، جن میں ساڑھے سترہ ہزار مسلمان تھے (بقول Cuinet)۔ [زین العابدین، جس نے بستان السیاحۃ آخر ۱۸۳۲ء میں تمام کی، توقات میں کچھ مدت ٹھیرا، اس کا اندازہ ہے کہ یہاں تقریباً ۲ ہزار گھر تھے]۔ یہاں کی بڑی بڑی صنعتیں تانبے کے برتنوں کی صنعت اور پیلے چمڑے کی صنعت ہیں۔ تانبا کبان معدن اور ارغنہ معدن سے آتا ہے۔

مآخذ: (۱) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۵: ۵۳ تا ۵۷؛ (۲) حاجی خلیفہ: جہان نما، ۶۲۸؛ (۳) سامی: قاموس الأعلام، ۳: ۱۶۹۱ تا ۱۶۹۳؛ (۴) تورکیہ جمہوریتی سالنامہ سی، ۱۹۲۷-۱۹۲۸ء، ص ۸۲۷ تا ۹۲۷؛ (۵) رٹر C. Ritter: *Erdkunde*، ۱۸: ۱۱۱ بعد؛ (۶) V. Cuinet: *La Turquie d' Asie*، ۱: ۷۳۷ تا ۷۰۳؛ (۷) F. Taeschner: *Das anatolische Wegentez*، لیپزگ ۱۹۲۴ء، ۱: ۲۱۲؛ ۲: ۱۹؛ [(۸) زین العابدین شیروانی: بستان السیاحۃ، اصفہان ۱۳۴۲، طبع دوم، ۱۹۳؛ (۹) رشیدالدین فضل اللہ طبیب: مکاتبات رشیدی، لاہور، ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء، بامداد اشاریہ].

(J. H. KRAMERS کرامرز)

توقیع: (ع) اس کے لفظی معنی [لغت میں] یہ ہیں: [التأثیر القلیل الخفیف (الصولی) اور اس سے مراد ہے:] ''ایک ایسی دستاویز جس پر حکمران کے دستخط ہوں یا ایسی علامت ہو جو اس کے دستخط کے مساوی ہو''، اس لیے توقیع سے عام طور پر شاہی فرمان یا فرمان روا کا مصدّرہ حکم اور اس کی تحریری صورت کی تیاری کا طریقہ مراد لیتے ہیں۔ توقیع کے خاص معنی ہیں بادشاہ کے خطابات اور نعوت و صفات کی صورت [صولی، ص ۴۰، اس معنی میں کلمۂ ''القاب'' کے استعمال کو مکروہ سمجھتا ہے]، (توقیع سرسری طور پر آل عثمان کے ہاں کے طغرا [رک بان] کی مرادف ہے) جو چانسلری (دیوان الأختام) میں فرامین پر ثبت ہوتی ہے [دیکھیے Dozy: *Suppl.*، بذیل مادّہ: وقّع الفرمان = فرمان پر طغرائے سلطان لکھا] اور دستاویزوں کو مستند بناتی ہے۔ اس کے برعکس ''عَلامۃ'' وہ خاص نشان ہے جو بادشاہ اپنے ہاتھ سے دستاویز پر بناتا تھا اور اس کے دستخط کے مرادف سمجھا جاتا تھا مگر ان دو لفظوں کا استعمال ایک حد تک نامشخّص ہے، کیونکہ توقیع کا لفظ شعار (موٹو motto) کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

[ادب اور] انشاء کی کتابوں میں ساسانی بادشاہوں کی توقیعات (edicts) کا ذکر آتا ہے [دیکھیے مثلاً ابن عبد ربّہ: العقد، ۲: ۱۹۱ بعد؛ محمد جلال الدین طباطبائی: توقیعات کسرویّہ، ترجمہ از عربی بفارسی، کانپور ۱۸۸۶ء].

بنی امیّہ کے زمانے میں یہ دستور جاری ہوا (گو دراصل بلاشک و شبہہ یہ ایک پرانا مشرقی دستور ہے) کہ خلیفہ بنفسِ نفیس کھلے دربار میں ان استغاثوں (قِصص) کے فیصلے کیا کرتا تھا (''وقّع'') جو اس کے سامنے پیش ہوتے تھے اور پھر کاتبانِ دربار خلیفہ کی ''توقیع'' کو ضبطِ تحریر میں لاتے تھے [''و من الخطط الکتابۃ التوقیع و ھو ان یجلس الکاتب بین یدی السلطان فی مجالس حکمہ و فصلہ و یوقّع علی القصص المرفوعۃ الیہ احکامہا و الفصل فیہا متلقّاۃً من السلطان باوجز لفظ و ابلغہ'' ابن خلدون، ۲۷]۔ عبّاسی عہد کے متعلق قدامۃ ایک خاص ''دیوان التوقیع'' (دفتر فرامین) کا ذکر کرتا ہے۔ عبّاسیوں کے عہد میں اس امر کو وزیر کے اختیارات میں ایک اہمّ اضافہ سمجھنا چاہیے کہ ہارون الرشید نے پہلی دفعہ

جعفر برمکی کو توقیع (فی) القصص (یعنی فیصلوں) کا اختیار تفویض کیا [قب ابن خلدون، محلّ مذکور؛ خلفاے راشدین و امویّہ و عبّاسیّہ اور ان کے امراء و کبراء اور ملوکِ عجم کی توقیعات کے لیے دیکھیے ابن عبد ربہ : العقد، قاهرة ۱۳۲۱ھ، ۲ : ۱۸۵ تا ۱۹۲]۔ بقول ابن الصّیرفی فاطمیوں کے دیوان میں ایک خاص کاتب (سیکرٹری) اس قسم کی درخواستوں کا فیصلہ کرانے پر مقرّر تھا۔ ''توقیعات علی القصص'' والا کاتب مرتبے کے لحاظ سے بزرگترین کاتبوں میں شمار ہوتا تھا۔ مملوک سلاطین کے عہد میں کاتب السّر (پرائیویٹ سیکرٹری) کو توقیعات علی القصص کا حق تفویض ہوتا تھا، مگر عام طور پر ان اختیارات کو یہ سلاطین خود ھی استعمال کرتے تھے۔

مملوک سلاطین کے اداری نظام میں توقیع کی اصطلاح خاص خاص اسنادِ تقرّر کے لیے بھی مستعمل تھی اور بقول ابن فضل اللہ یہ لفظ بڑے چھوٹے تمام افسروں، حتّی کہ نوّاب (گورنروں) کی سندِ تقرر کے لیے بھی استعمال ھوتا تھا اور اس لیے عام طور پر ''تقرّر نامے'' کے معنوں میں استعمال ھونے لگا۔ مگر ابن فضل اللہ کہتا ھے کہ کلمۂ توقیع صرف پایین ترین درجے کے اہلکاروں کے تقرّر کے لیے استعمال ھوتا تھا۔ کچھ مدّت کے بعد ''عمامہ پوشوں'' (مُتعمّمون)، یعنی دینی عہدےداروں اور مأمورینِ دیوان کے تقرّر کے لیے بھی یہی لفظ رائج ھو گیا۔ بقول قلقشندی توقیع اسنادِ تقرّر کا چوتھا یعنی سب سے نیچے کا درجہ، نیز عہدوں (''ولایات'') کے اسنادِ تقرّر کی وسیع ترین قسم ھے۔

سلطنتِ عثمانیہ میں شاھی فرامین کا انتظام ایک خاص عہدےدار یعنی 'نشانجی' یا 'توقیعی' کے سپرد تھا، جو اُن دستاویزوں کے لیے متعہد و مسئول تھا جن پر بادشاہ کے القاب اور خطابات ثبت ھوتے تھے۔ وہ سلطنتِ محروسہ کے ''ارکانِ دولت'' یعنی سب سے بڑے عہدےداروں میں شمار ھوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ''سلطانی دیوان'' کا رکن بھی ھوتا تھا۔ سلطان کے دستِ خاص سے بنائی ھوئی علامت اب یہاں متروک ھو چکی تھی؛ عثمانیوں کی سیاسی اصطلاح میں ''علامت'' ایرانی لفظ ''نشان'' کی طرح بادشاھوں کے طغرا کے مرادف تھی۔ نشانجی کے دیوان میں ایک خاص معاون مقرّر تھا جو سلطانی طغرا بناتا تھا اور جسے 'طُغراکش' کہتے تھے۔ اس صورت میں 'علامۃ' اور توقیع ایک ھی چیز ھے۔

آخر میں یہ بتا دینا بھی ضروری ھے کہ قرون وسطٰی کے اواخر میں (یعنی بارھویں سے پندرھویں صدی تک) توقیع سے ایک خاص قسم کا رسم خط مراد تھا، [جس میں تین چوتھائی دوائر اور ایک چوتھائی خطوط ھوتے تھے؛ رقاع کے مقابلے میں توقیع جلی تھا، آئین اکبری، طبع بلخمن Blochmann، ۱ : ۱۱۳؛ ترجمۂ بلخمن، ۱ : ۱۰۰] اور مملوکوں اور عثمانیوں کے تابع بلاد میں سب وثیقے اسی خط میں لکھے جاتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانے میں (یعنی سولھویں صدی میلادی کے بعد سے) اس کی جگہ خطِ دیوانی نے لے لی۔

مآخذ: [(۱) الصُّولی : ادب الکتّاب، قاهرة ۱۳۴۱ھ، ص ۱۳۳، ۱۳۸]؛ (۲) قاموس، بذیل مادّہ؛ (۳) قلقشندی : صبح الأعشی، ۱۴ جلدیں؛ قاهرة ۱۳۳۲ تا ۱۳۳۶ھ؛ [ابن خلدون : المقدّمة، قاهرة ۱۳۲۷ھ، ص ۲۴۷ ببعد]؛ (۴) W. Björkman : *Beiträge zur Staatskanzlei im islamischen Ägypten*، ھیمبرگ ۱۹۲۸ء؛ — (۵) عثمانی نشانجی کے متعلّق قب (i) J. v. Hammer : *Des osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*، ج ۲، وی اناّ ۱۸۱۵ء: ص ۱۳۳

بعد؛ *Tableau de l'Empire* : M. d' Ohsson (ii) *Othoman*، ۳ : ۳۵۰، پیرس ۱۸۳۰ء؛ Fr. Kraelitz (iii): *Osmanische Urkunden in türkischer Sprache*، وی انّا ۱۹۲۱ء، ص ۱۸ بعد؛ — (۶) توقیع بحیثیت رسم خط قب Kraelitz (i) : کتاب مذکور، ص۸؛ L. Fekete (ii): *Einführung in die osmanisch-türkische Dipolmatik der türkischen Botmässigkeit in Ungarn*، بوڈاپسٹ ۱۹۲۶ء، ص xx؛ — (۷) توقیع اور علامة پر قب مثلاً ابوالفداء : تاریخ، طبع استانبول، ۳ : ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۸ = اسی طباعت کا نقش ثانی، قاهرة ۱۳۲۵ھ، ۳ : ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱؛ — (۸) توقیع بمعنی علامت بطور شعار (motto) کے لیے دیکھیے مثلاً [صولی، ۱۳۴]؛ ابن بی بی، طبع هوتسما Houtsma، ص ۲۸۸ [''توقیع نهادن''] (قب نیز Kraelitz، ص ۳۲، نوٹ ۲)؛ [(۹) توقیع بمعنی جواب محضر (= مکتوب) مدّعی جو مدعا علیه دے اور اس کا حجّت واضح قائم کرنا، تهانوی، ۱ : ۶۸۹].

(F. TAESCHNER)

تَوَکُّل (۱) : خدا پر بھروسه رکھنا، اس کی تاکید تو قرآن پاک میں بھی آئی ھے لیکن مُتَوَکِّلُون جنھیں خدا پیارا جانتا ھے [اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلُوْن] (۳ [آل عمران] : ۱۵۳) ان سے زُھّاد کی کوئی اُس طرح کی مخصوص جماعت مراد نہیں جیسی که دوسری یا تیسری صدی ھجری میں اس لقب سے ملقّب موجود تھی ۔ اس جماعتِ متوکّلین کے عقائد توحید [رکّ بآں] کے عقائد سے بہت قریبی تعلّق رکھتے تھے اور [ممکن ھے] ان کے عقیدے کا ارتقاء مسیحیت کے زیر اثر ھوا ھو (قب متی، ۶ : ۳۲ — ۳۴) ۔ عملاً توکّل میں کبھی کبھی تو اتنی شدّت برتی جاتی تھی که متوکّل کو ایسی لاش سے تشبیه دینا جو غسّال کے ھاتھوں میں تجھیز و تکفین کے لیے دی جا چکی ھو (قشیری : باب التوکل) [اور اس میں نه حرکت ھو نه تدبیر] بہت موزوں معلوم ھوتا ھے ۔ ان متنسک زاھد کے نزدیک توکّل مستقیماً ھر قسم کے 'کسب' (''حصول''، ذاتی جدّ و جھد اور عمل) کی ضدّ ھے : اگر کوئی شخص یقین کامل رکھتا ھو که حقیقی رزّاق خدا ھی ھے تو پھر وہ کس طرح اپنے لیے طلب و سعی کو روا رکھ سکتا ھے ؟ قشیری اس کا یه جواب دیتے ھیں که انسان کا ان وسائل و اسباب سے استفادہ کرنا جو رزّاقِ حقیقی نے ھمارے لیے مہیّا کر رکھے ھیں خدا کی شان رزّاقی پر توکّل کے منافی نہیں اور یه بات ایسی نہیں جس سے اس کے ایمان و ایقان میں کسی قسم کی کمزوری پیدا ھو ؛ چنانچه یہی وہ مسلک و منهاجِ ترقّی تھا جس پر گام‌زن ھونے سے تصوّف نے اپنا قدیم راھبانه دبستان پیچھے چھوڑ دیا .

مآخذ (۱) ابوطالب المکّی : قُوْتُ القُلُوب، ۲ : ۲ تا ۳۸؛ (۲) Goldziher : *W.Z.K.M.*، ۱۳ : ۴۱ تا ۵۶؛ (۳) وھی مصنف : *Vorlesungen über den Islam*، ص ۱۵۳ بعد؛ (۴) R. Hartmann : *Kuschairîs Darstellung des Sûfitums*، ص ۵۲ بعد؛ (۵) جلال‌الدین رومی : مثنوی، ۱ : ۹۰۰ تا ۹۹۱.

(R. A. NICHOLSON)

تَوَکُّل (۲) : لفظ توکّل کا مادّہ و ۔ ك ۔ ل ھے ۔ وَکَلْتُ اَمْرِی اِلٰی فُلَانٍ کے معنے ھیں میں نے فلاں کو اپنا معامله سپرد کیا اور اُس کے بارے میں اُس پر اعتماد کیا (لسان العرب، ۱۴ : ۲۶۱، تحت وکل) ۔ توکّل کے لفظ کا استعمال عربی زبان میں دو طرح پر ھے ۔ ایک صلهٔ لام کے ساتھ، جیسے توکّلتُ لِفلان بالنجاح (میں فلاں کی کامیابی کا ضامن ھو گیا) ، دوسرے صلهٔ علی کے ساتھ، جیسے توکّلتُ عَلَیه (میں نے اس پر اعتماد کیا) ۔ امام راغب نے لکھا ھے که اللہ تعالٰی 'وکیل' اس معنی میں ھے که وہ سب امور کا متولّی ھے (مفردات).

توکّل کے معنے سمجھنے کے بعد اُن حالات کو سمجھنے کی ضرورت ہے جن میں توکّل کیا جاتا ہے - اس کی طرف قرآن مجید کی متعدّد آیات راہ نمائی کرتی ہیں - مثلاً وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ٥ (۳ [آل عمران] : ۱۵۸) اور تم حکومت کے معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کرو اور (مشورے کے نتیجے میں) جب کسی بات کا پکّا ارادہ کر لو تو پھر اللہ تعالٰے پر توکّل کرو - یقیناً اللہ توکّل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے - یا مثلاً وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ (اور تم اے پیغمبر! پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر تمھارے ربّ کی جانب سے وحی کی گئی ہے، بے شک اللہ خبردار ہے اُن کاموں سے جن کو تم کرتے ہو - اور تم اے پیغمبر! خدا پر توکل کرو) (۳۳ [الاحزاب] : ۲، ۳) - دونوں آیتوں میں آنحضرت صلعم سے خطاب ہے - یا مثلاً يَا قَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ (اے لوگو! اگر میرا کھڑا ہونا اور آیات الٰہی کا یاد دلانا تمھیں گراں گذرتا ہے، تو میں خدا پر توکّل کرتا ہوں) (۱۰ [یونس] : ۷۱) - یہ حضرت نوح[ع] کا قصہ ہے - یا مثلاً اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَ مَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ٥ (میں نے تو جہاں تک ممکن ہے اصلاح کا ارادہ کیا ہے - اور مجھے توفیق اللہ ہی سے ملی ہے - اسی پر میں نے توکّل کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع ہوتا ہوں) (۱۱ [ھود] : ۸۸) - یہ حضرت شعیب[ع] کا قصہ ہے - یا مثلاً وہ آیت جسے بخاری میں عنوان قرار دیا گیا ہے، یعنی اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (۳ [آل عمران] : ۱۲۱) - اس میں حضرت جابر رضؓ ابن عبداللہ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت ہمارے متعلّق نازل ہوئی؛ ہم دو گروہ تھے بنوحارثة اور بنو سلِمَة؛ اگرچہ اس میں لفظ ”فَشَل“ کی کوئی تشریح نہیں ہے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں گروہوں میں وقتی حالات کو دیکھ کر ضعفِ قلب پیدا ہو گیا، لیکن چونکہ آگے وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا کہا گیا ہے اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ فَشَل کی کوئی صورت ظہور پذیر نہیں ہوئی، بلکہ جواں مردی کے ساتھ ثابت قدم رہے؛ بعد کو جب آیتیں اُتریں تو ہدایت ہوئی کہ مؤمنین کو خدا ہی پر توکّل کرنا چاہیے.

گذشتہ آیات میں کہیں عزم کے بعد، کہیں عمل کے بعد، کہیں دشمنوں کے مقابلے میں استقلال کے بعد، کہیں بقدرِ وسعت و طاقت اصلاحِ قوم کے بعد، کہیں ضعفِ قلب کو زائل کر کے جرأت ظاھر کرنے کے بعد توکّل کا اعلان کیا گیا یا تعلیم دی گئی ہے - لیکن چند آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں توکّل کے ساتھ صبر اور عمل کو جمع کیا گیا ہے، مثلاً سورة ابراھیم (۱۴ : ۱۲)، سورة النحل (۱۶ : ۴۲) اور سورة العنکبوت (۲۹ : ۵۸، ۵۹).

احادیث سے بھی اسی مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے - چنانچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ کچھ لوگ زادِ راہ لیے بغیر حج کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے اور کہا کرتے تھے : نحن المتوکّلون، ہم متوکّل ہیں - قرآن مجید نے اس طرزِ عمل کو غلط قرار دیتے ہوئے ہدایت فرمائی کہ وَ تَزَوَّدُوْا (زاد راہ لے کر چلو) - یا مثلاً ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیه و سلّم کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ کیا میں اپنی اونٹنی کو اللہ تعالٰے پر توکّل کرتے ہوئے کھلا چھوڑ دوں؟ آپ نے اس کی اجازت نہیں دی اور فرمایا : اعْقِلْهَا و تَوَكَّلْ یعنی : بر توکُل زانوی اشتر ببند (ترمذی، بولاق ۱۲۹۲ھ، ۲ : ۸۴ (ابواب صفة القیٰمة

و الرقائق و الورع) - بیہقی: شعب الایمان میں '' و قیّدہ و توکّل '' کے الفاظ ہیں).

غرض اسباب سے کام نہ لینا اور اسے توکّل قرار دینا مذہبی اپاہجوں کا کام ہے اور اسے اُس قلبی یقین سے کچھ تعلّق نہیں جس کا نام اسلام کی اصطلاح میں توکّل ہے! اوپر جو آیات نقل ہوئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سابق انبیاء علیہم السلام اور عہدِ نبوت میں توکّل کے یہ معنے نہیں سمجھے جاتے تھے کہ اسباب سے کام نہ لیا جائے! در اصل محلِ توکّل قلب ہے اور امام قُشَیری نے یہ بڑی لطیف بات لکھی ہے: انّ التوکّل محلّه القلب و الحرکة بالظاهر لا تنافی التوکّل بالقلب (الرسالة القشیریة، باب التوکّل) (توکّل کا محل قلب ہے، اور ظاہری ہاتھ پاؤں ہلانا قلبی توکّل کے منافی نہیں)۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم متوکّلانہ زندگی بسر فرماتے تھے لیکن کسب بھی آپ ہی کی سنّت تھی.

توکّل کا طبعی نتیجہ یا صبر ہوتا ہے یا شکر - اگر متوکّل کے منشأ کے مطابق معاملات ظہور پذیر ہوے تو اس سے تشکّر اور ممنونیّت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اگر ایسا نہیں تو پھر صبر کی قلبی عبادت ظاہر ہوتی ہے - حضرت ابو سعید خرّاز نے توکل کو اضطراب بلا سکون اور سکون بلا اضطراب قرار دیا ہے (اس کی تشریح کے لیے دیکھیے احیاء العلوم، ۴: ۲۲۸) - حضرت ابو علی الدّقاق فرمایا کرتے تھے کہ متوکّلانہ زندگی کے تین درجات ہیں: پہلا توکّل، دوسرا تسلیم اور تیسرا تفویض (احیاء العلوم، ۴: ۲۲۸) - ان میں سے توکّل مومنوں کی صفت ہے، تسلیم خواصِ اولیاء اللہ کی اور تفویض موحّدین یعنی خواص الخواص کی — توکّل کی تشریح میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو خدا کے ہاتھ میں ہے اُس پر وثوق اور جو بندوں کے ہاتھ میں ہے اس سے مایوسی، متوکّل انسان کی زندگی کا اصل الاصول ہے.

امام غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ توکّل کے مفہوم کا سمجھنا آسان نہیں اور اُس پر عمل بڑا ہی مشکل کام ہے - پھر لکھا ہے: و قد یُظنّ انّ معنی التوکّل ترک الکسب بالبدن و ترک التدبیر بالقلب و السقوط علی الارض کالخِرقة المُلقاة و کاللحم علی الوَضَم و هذا ظنّ الجهّال فانّ ذلک حرام فی الشرع . . . انما یظهر تاثیر التوکّل فی حرکة العبد (۴: ۲۲۸) (بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ توکل کے معنے یہ ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے کمانا اور دل سے تدبیر کرنا چھوڑ دیا جائے، زمین پر پڑا رہے جس طرح چیتھڑے پڑے رہتے ہیں یا گوشت کندے پر رکھا رہتا ہے - لیکن یہ جاہلوں کے خیالات ہیں! یہ بات شریعت میں حرام ہے! . . . توکّل کا اثر تو بندے کے ہاتھ پاؤں ہلانے ہی میں ظاہر ہوتا ہے!).

مآخذ: (۱) غزالی: احیاء علوم الدین، طبع مصر ۱۳۴۶ھ، ۴: ۲۱۰ تا ۲۵۲؛ (۲) وہی مصنف: کیمیاے سعادت، طبع نولکشور، ۵۰۸ تا ۵۳۰؛ (۳) عبدالکریم القشیری: الرسالة القشیریة، طبع مصر ۱۳۳۰ھ، ۷۵ تا ۸۰.

(عبدالمنّان عمر)

* **تَــوَکُّلی**: (تُوکلی[؟] [یا تَوَکُّلی بن حاجی اردبیلی المشتہر بابن بزّاز] بن اسمعیل) ایک درویش تھے، جو [صَفْوة] الصفا [طبع بمبئی میں صِفوة بالکسر ضبط کیا ہے] کے مصنف ہیں، یہ کتاب صفویہ خاندان کے مؤسّس شیخ المشایخ صفی الدین اَردبیلی (۶۵۰ تا ۷۳۵ھ / ۱۲۵۲ تا ۱۳۳۴ء) کی سوانح عمری ہے، جو ۷۵۰ھ / ۱۳۵۰ء میں صفی الدین کے فرزند صدرالدین کے زیرِ ہدایت لکھی گئی تھی اور مصنف بہت سی باتیں انہیں کی سند سے لکھتا ہے - پھر شاہ طَہْماسْپ اوّل کے زمانے میں ایک شخص ابوالفتح حُسینی نامی نے اس کتاب کے متن پر

نظر ثانی کی ۔ فارسی متن ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں کلکتے سے شائع ہوا ۔ صفوۃ الصّفا ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں تقریباً دو لاکھ سولہ ہزار الفاظ ہیں ۔ یہ کتاب اپنی ہیئت کے لحاظ سے کاملاً اولیاء و اصفیاء کے تذکروں کی طرز پر لکھی گئی ہے مگر اس لحاظ سے اہمّ ہے کہ اس میں ایسی جغرافیائی یا تاریخی تفصیلات بھی موجود ہیں جن سے شمال مغربی ایران کے متعلّق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے گو کرامات اور خوارق کا عنصر ان پر بھی غالب ہے، مثال کے طور پر ہمیں اس میں (چودھویں صدی کی) آذربایجان کی قدیم ایرانی بولی کے نمونے ملتے ہیں ۔ صفوۃ الصفا نے اردبیل کے شیخ المشایخ کی وھی خدمت انجام دی ہے جو افلاکی [رکّ بآن] کی مناقب العارفین نے قونیۃ کے سلسلۂ مولویہ کے اکابر شیوخ کے لیے انجام دی ۔ شاہ اسمٰعیل کی تاریخ (مصنفۂ خواجہ عبداللہ مروارید [؟]، قبّ J.R.A.S.، ۱۹۰۲ء، ص ۱۷۰) کی طرح، جس کے ابتدائی حصے کا راس E.D. Ross نے (J.R.A.S.، ۱۸۹۶ء]، ص ۲۴۹ تا ۳۴۰) ترجمہ کیا تھا [اس پر اب دیکھیے سٹوری، ۱/۲ : ۱۲۷۸ ببعد]، صفوۃ الصفا بھی ایک قیمتی دستآویز ہے، جس کے ذریعے عظیم الشان صفوی تحریک کے ان اخلاقی اور مذہبی عناصر کا مطالعہ ہو سکتا ہے جن سے موجودہ ایران معرض ظہور میں آیا ۔ اس کے ذریعے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ صفویوں کے ''خفیہ عقائد'' کیا تھے؛ [شیخ] صفی الدین کی ولایت کے عقیدے سے (جس کے متعلّق زمانۂ پیشین کے صحیح العقیدہ تاریخی لوگوں کو شک و شبہہ کی گنجائش نہ تھی) غالی شیعیوں کے عقائد وجود میں آئے، جن کا انحراف شاہ اسمٰعیل کے اشعار سے بھی منعکس ہوتا ہے [قبّ مادّۂ خطائی].

مآخذ : (۱) خانیکوف : Lettre à M. Dorn, Mél. Asiat.، ۱۸۵۲ء، ۱ : ۵۴۳ تا ۵۵۸؛ (۲) قبّ وھی مصنف : Sac d' Ardabil par les Géorgiens vers 1209، کتاب مذکور، ۵۸۰ تا ۵۸۳؛ (۳) Rieu : Catal. Pers. MSS.، ۳۴۵ تا ۳۴۶؛ (۴) ھورن Horn، در Grundriss d. iran Phil.، ۲ : ۵۸۶؛ (۵) براؤن E. G. Browne : Pers. Lit. in Modern Times، ۴۳ تا ۳۵، ۳۸ (قبّ براؤن : J. R. A. S.، جولائی ۱۹۲۱ء، ۴۱۷ : ۳)؛ [(۶) سٹوری، ۱/ ۲ : ۹۳۹ ببعد؛ (۷) مکاتبات رشیدی، طبع لاھور، بامداد اشاریہ؛ (۸) نشریۂ دانشکدۂ ادبیات تبریز، شمارہ سوم، سال دوازدھم، تبریز ۱۳۳۹، ص ۲۷۳ ببعد (تجزیہ و تحلیلی از صفوۃ از پروفیسر نیکیتین)].

(V. Minorsky منورسکی)

* **تولومبہ جی** : رکّ بہ طولومبہ جی.

* **تومان** : [تَمَنْ، تُمانْ در دیوان لغۃ الترک ترجمہ سی، انقرہ، انڈکس] اصلی (ترکی) تلفظ تُوْمِن Tümen ہے ۔ اس کلمے کو عام طور پر تومان لکھا جاتا ہے ۔ تُومان ابتداء میں '' بہت اور بے شمار '' کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا مگر بعد میں '' دس ہزار'' کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ۔ اس ترکی اسم عدد کی تشریح پہلے پہل G. Ramstedt (J.S.F.Ou.، ج ۳۲ : ۲۲) نے چینی زبان کی مدد سے کی، پھر N. Mironov نے (Zapiski، xxiii : 19)، طخاری زبان سے کی، جس میں تُمام یا تُمان کے معنے ''دس ہزار'' ہیں) ۔ محمود کاشغری (۱ : ۳۳۷) اس لفظ کے غیر معیّن معنی ھی سے آشنا ہے ۔ اس کے قول کے مطابق '' تُمِنْ تُرلُکْ '' tümen türlük کے معنی ہیں [کثیر از ھر چیز]، '' تُمِنْ مِنکْ '' tümen ming کے معنی ۱۰,۰۰۰ × ۱,۰۰۰ یعنی ایک کروڑ نہیں بلکہ ۱,۰۰۰ × ۱,۰۰۰ = ۱۰,۰۰۰,۰۰۰ (دس لاکھ) ہے ۔ بظاھر یہ لفظ '' دس ھزار'' کے معنے میں پہلے پہل عہد مغول ھی میں نظر آتا ہے [دیکھیے

جامع التواریخ، ج ۳، باکو ۱۹۵۷ء، بامداد فہرست، ۶۸۷] - لشکر کی دستہ‌بندی کے لحاظ سے [کاترمیئر کی تشریح کے مطابق] تومن دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا [.N.E، ۱۴ / ۱ : ۲۸۰ (مطلع سعدین، طبع لاہور، ۲ / ۱ : ۳۲۰)] - بعض اوقات تومن کا لفظ ایل (قبیلہ) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے؛ علاقے کی اکائی کے معنوں میں کہتے تھے کہ تومن وہ علاقہ ہے جہاں سے دس ہزار جوان مہیا ہو سکیں (مثلاً ابن عرب شاہ : عجائب المقدور، قاہرۃ ۱۲۸۵ھ، ص ۷۱)، لیکن یہ بات شاید ہی درست ہو، کیونکہ تومن کا اطلاق چھوٹی سے چھوٹی اداری وحدت یا وصول مالیہ کی وحدت پر ہوتا تھا - ہر 'ولایت' (یا صوبے) کو خواہ اس کا رقبہ کتنا ہی ہو متعدد تومنوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، مثلاً سمرقند کے سات تومن تھے - اب یہ کیسے فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ صوبہ اکیلا میدانِ جنگ میں ستر ہزار سپاہی بھیج سکتا تھا - ایران کے دورِ مغولی میں یہ لفظ انہیں معنوں میں (یعنی چھوٹے سے چھوٹے اداری رقبے کے معنے میں) استعمال ہوتا تھا (مثلاً [ولایتِ] عراقِ عجم ۹ تومان میں منقسم تھی : مطبوعات وقفیۂ گب، ۲۳/۱ [نزھۃ القلوب] : ۴۷) اور اسی طرح اُس علاقے میں جو اب روسی ترکستان ہے باستثنائے فرغانہ [رکّ بآن]؛ یہ لفظ اسی معنے میں استعمال ہوتا تھا - [غیاث اللغات میں تومان بمعنی پرگنہ ہے]؛ ترکستان میں روسی حکومت قائم ہونے کے بیس برس بعد تک بھی تومن کا لفظ اسی معنے میں استعمال ہوتا رہا [گاھے تومن = ولایت بھی آتا ہے] اور خانِ بخارا [رکّ بآن] کی مملکت اور اس کے بعد ۱۹۲۰ء کے انقلاب کے بعد بھی جمہوریۂ بخارا میں اس لفظ کا استعمال جاری رہا - پوری دیہاتی آبادی، جس پر مالیانہ کی ادائیگی واجب ہو، بعض اوقات تومن قرار دے دی جاتی ہے (تاریخ رشیدی [" تمام مردم کاشغر و ختن منقسم می شوند [بچہار قسم :] یکی تومان می گویند کہ عبارت از رعایا می باشد و آن تعلق بخان است کہ مال او را سال بسال بخان می رسانیدہ اند : نسخۂ دانش‌گاہ پنجاب، شمارہ [A Pe I, 9A]، ترجمۂ Ross، ۳۰۱) - کوہستان کے باشندوں کو، جن کے حالات بود و ماند الگ ہیں، بعض وقت گاؤں والوں سے الگ تصور کیا جاتا تھا؛ مثلاً شیبانی خان [رکّ بآن] نے سمرقند میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا، اس کے وقف نامے میں تومن کے طالب علموں اور کوہستان کے طالب علموں میں تمیز کی گئی ہے.

حسابات کے زرِ نقد کے اعتبار سے تومن یا تومان مغولوں کے عہدِ سلطنت میں دس ہزار دینار کے برابر ہوتا تھا [قبّ جامع التواریخ، ج ۳، طبع مذکور : ۵۲۲ : "دہ تومان کہ صد ہزار دینار باشد"] - مغل سلطنت سے جو تین بڑی اسلامی سلطنتیں پیدا ہوئیں ـــــ یعنی ایران کی مملکت، آلتون اردو اور بیتِ چغتائی ـــــ ان سب میں چاندی کے سکّے مضروب ہوے، چھوٹے بھی (مثلاً غازان خان [رکّ بآن] کے عہد میں ایران میں ۲ء۱۵ گرام = ۳۳ء۱ گرین چاندی کے چھوٹے درھم مضروب ہوے، جن کا وزن بعد میں اس سے کم ہو گیا) اور بڑے بھی (ایک دینار = ۶ درھم)؛ بڑی بڑی رقوم کا شمار دس دس ہزار دینار کے تومانوں یا ساٹھ ہزار درھموں کے تومانوں میں ہوا کرتا تھا؛ قبّ حمداللہ قزوینی جس نے درھموں کا بدل تومانوں میں یوں دیا ہے (مطبوعات وقفیۂ گب، ۲۳/۱ [نزھۃ القلوب] : ۲۹) : ۱۲,۸۰,۰۰,۰۰۰ درھم = ۲,۱۳۳ و کسری تومان (تفصیلات کاملہ در بارتولڈ : *Persidskaya nadpis' na st'en'e Aniyskoi mečeti Manuče*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۱ء، ص ۱۰ ببعد) - تیمور اور آل تیمور کے

عہد میں بھی حساب میں دس ہزار دینار کا تومان شمار میں آتا تھا؛ ترکستان میں ان دیناروں کو کپک خان کے نام پر کپکی کہا کرتے تھے (.N.E، ۱۴ / ۱ : ۴۷ [مگر یہاں کپکی کی وجہ تسمیہ نہیں دی ہے]؛ قب نیز تحت مادۂ چغتائی خان) ۔ اس کے بعد کے زمانے میں کچھ مدت تک ترکستان میں صرف تانبے ہی کے سکے زیرِ استعمال رہے لیکن ان کا حساب بھی دیناروں اور تومانوں ہی میں ہوا کرتا تھا؛ مثلاً بقولِ بابر (طبع فاکسمیل، مرتبہ بیورج Beveridge، ص ۵۶ ب) ولایتِ حصار کی افواج کی خوراک کے خرچ کا اندازہ تانبے کے سکوں یعنی فُلُوس کے ایک ہزار تومان کے برابر تھا ۔ [شیبانی خان کے] مذکورۂ بالا وقف نامے کے مطابق ۶ فلوس ایک دینار کے برابر تھے اور ۲۰۰ دینار کا مبادلہ ایک مثقال چاندی (تقریباً ۶۶٫۳ گرین = ۴٫۳ گرام) سے ہوا کرتا تھا ۔

ایران میں سترھویں صدی میں تومان کا لفظ پہلے زمانے کی بہ نسبت بہت کم رقم کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا ۔ ۱۶۶۰ء کے قریب Raphaël du Mans ایک تومان کی قیمت ۴۰ فرانسیسی فرانک بتاتا ہے (.P.E.L.O.V، سلسلہ ۲، ۲۰ : ص ۱۸۳) ۔ سر ٹامس ہربرٹ (۱۶۳۰ء) اور فرائر Fryer (۱۶۷۷ء) اس کی قیمت انگریزی سکے میں ۳ پونڈ ۶ شلنگ اور آٹھ پنس بتاتے ہیں ۔ طلائی تومان کا سکہ اول اول فتح علی شاہ قاجار [رک بآن] نے ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں چلایا ۔ پہلے اس کا وزن ۹۵ گرین (۶٫۱۶ گرام) تھا مگر بعد میں کم کر کے ۷۰ گرین (۴٫۵ گرام) اور پھر ۵۳ گرین (= ۳٫۴ گرام) کر دیا گیا ۔ ناصرالدین کے عہد میں، جس نے دس دس تومان کے چند بڑے سکے ضرب کرائے تھے، ایک تومان کی قیمت دس قِران یا دس ہزار دینار تھی ۔ سب جانتے ہیں کہ دینار اب سکے کی حیثیت سے استعمال نہیں ہوتا، وہ صرف حساب کی ایک بہت ہی چھوٹی سی رقم ہے ۔ احمد شاہ کے وقت تک تومان معیاری طلائی سکے کی حیثیت سے جاری رہا لیکن نئے خاندان نے اسے ترک کر دیا اور اس کی جگہ 'پہلوی' نام کا سکہ جاری کیا جس کا وزن ۲۹ گرین (۱٫۸۸ گرام) کے قریب ہے ۔

مآخذ: مقالے میں جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان کے علاوہ ملاحظہ ہوں (۱) فریتاغ Freytag، (۲) وُلّرز Vullers اور (۳) راڈلوف Radloft کی لغات بذیل "تومان" مگر اس سلسلے میں ان کے بیانات بہت ناقص ہیں؛ [نیز (۴) یول و برنل Henry Yule-A. C. Burnell، لنڈن ۱۹۰۳ء، ۹۲۸].

(W. BARTHOLD بارٹولڈ)

تُونِس Tunis [دارالملک] : (عربی میں تُونِس یا تُونُس) واقع بر ۳۶ درجہ، ۴۷ دقیقہ، ۵۹ ثانیہ عرض البلد شمالی و ۱۰ درجہ، ۱۰ دقیقہ طول البلد مشرقی (گرینج)، اسی نام کی نیابت [اب ملک] کا دارالحکومت ہے ۔ موجودہ زمانے میں تونس دو شہروں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے کے متّصل ہیں مگر ایک دوسرے سے بالکل مختلف، کیونکہ شہری زندگی ایک میں ایک طرح کی ہے، دوسرے میں دوسری طرح کی: ایک تو ملکی باشندوں کی بستی ہے لیکن اس کی آبادی خالصۃً مسلم آبادی نہیں؛ یہ بستی گذشتہ صدیوں کی یادگار ہے اور اس کے کوائف میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی، دوسرا شہر یورپی طرز کا ہے، جس کی ابتداء حال ہی کے زمانے میں ہوئی، اس کی شکل و صورت کاملاً جدید طرز کی ہے اور وہ اب بھی مسلسل اور بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے؛ پرانا شہر جھیل تونس یا 'بحیرۃ' (البُحَیرَۃ) کے کنارے سے کوئی پون میل کے فاصلے پر واقع ہے؛ یہ شہر مشرق سے مغرب کی طرف بتدریج اونچا ہوتا جاتا ہے تا آنکہ وہ ایک پایاب،

کھاری جھیل پر، جو عام طور پر خشک رہتی ہے اور جسے سَبْخَۃ السِیْجُوسِی کہتے ہیں، مشرف ہو جاتا ہے؛ مگر اس طرف مَنوبِیّۃ کی چوٹی فصیل سے باہر واقع ہے، جہاں سے دُور دُور کا منظر نظر آتا ہے ۔ جنوب مشرق کی طرف نزدیک ہی سیدی بِلْحَسَن (ابوالحسن) اور جَبَل جَلُّود کی بلندیاں ہیں اور ان سے پرے بِیْر کَسَّۃ کی پہاڑیاں ہیں؛ شمال میں بِلْوادیْر Belvédère اور رأس الطّابیّۃ کی بلندیاں ہیں اور ان سے پرے جبل احمر اور جبل نَہیل ہیں ۔ یہ معمولی سی ناہمواریاں ایک طرف تو تونس کے میدانِ مُرْناق اور دریاے مِلِینۃ Miliane کی وادی سے اتّصال رکھنے میں مانع نہیں ہیں اور دوسری طرف میدان مَنُوبَۃ اور وادی مِجِرْدہ کے ساتھ، نیز جھیل کے شمالی کنارے کی راہ سے گُولِت Goulette (حَلْق الوادی) اور قَرْطاجَنّۃ کے ساتھ سلسلۂ رسل و رسائل کی آسانیوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتیں ۔ شہر کے قدرتی استحکامات خاصے ہیں مگر بہت اچھے بھی نہیں (چنانچہ تونس کو بارہا بغیر زیادہ زحمت کے فتح کر لیا گیا ہے)؛ تالابوں کو چھوڑ کر باقی تمام پینے کا پانی دُور سے یہاں پہنچانا پڑتا ہے ۔ لیکن اقتصادی لحاظ سے اس شہر کا محلِّ وقوع بہت اچھا ہے، کیونکہ وسطی تونس سے نکلنے والے راستوں کے دھانوں پر یہ اچھے سر سبز علاقے میں آباد ہے اور سمندر سے خاصا نزدیک ہے، جس کی وجہ سے یورپ کے قریب ترین ساحلی مقامات کے ساتھ اس کا رابطہ بہت جلد قائم ہو جاتا رہا ہے ۔

ہمیں عرب مصنفین کی اُن کوششوں پر وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ کلمۂ تونس کسی عربی مادّے سے مشتق ہے ۔ وہ سب کے سب، ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہوے، یکساں سادگی سے اس بات کے مدّعی ہیں کہ یہ وہی شہر ہے جسے بائبل میں تَرْشِیْش کہا گیا ہے ۔ اس کلمے کا معقول اشتقاق تا حال دریافت طلب ہے لیکن یہ نام، خود شہر کی طرح، اگر قَرْطاجَنّی دَور سے قدیم تر نہیں تو کم از کم اُتنا قدیم تو ضرور ہے ۔ تِیْنِس Tynes کا ذکر تو ڈائی آیْڈُورَس Diodoros اور پَولِیْبِیْئَس Polybius نے بھی کیا ہے کہ ایک بہت بڑا شہر ہے جو حصون و استحکامات کے اندر تعمیر ہوا ہے ۔ اس شہر [تِینِس] کا اکثر حصّہ بلاشک و شبہہ جھیل سے کچھ فاصلے پر موجودہ 'قَصَبَۃ' کے ارد گرد ہی کہیں آباد ہوگا؛ جھیل اس زمانے میں کاملاً جہاز رانی کے قابل تھی ۔ اس شہر کا کئی دفعہ محاصرہ ہوا اور اُسے یکے بعد دیگرے اہلِ لِیْبیا نے (جو چوتھی صدی ق م میں باغی ہو گئے تھے) اور پھر آگِیتھوکْلِیز Agathocles اور رِیگیُولَس Regulus نے فتح کیا ۔ باغی اجیر سپاہیوں نے اسے اپنا صدر مقام بنایا اور بعد کے زمانے میں سِپِیؤ افریقی Scipio Africanus کے قبضے میں آ گیا ۔ غالباً اسے سِپِیؤ امِلیانی Scipio Emilianus نے تباہ کر دیا تھا (قب Gsell : *Hist. anc. de l' Afr. du Nord*.... ، ج ۱ و ۲ و ۳ بمواضع کثیرہ) .

تِینِس Tynes جو آئندہ چل کر تونس بنا (اسے ایک دوسرے تِینِس Tynes سے ملتبس نہیں کرنا چاہیے جسے تِینِس البیضاء کہتے تھے اور جو رأس بونہ Cape Bon [رأس اَدّار] پر واقع تھا)، اس کے متعلّق سوال یہ ہے کہ آیا یہ وہی شہر ہے جو بقول تِیسو Tissot اصلی باشندوں کے بڑے مرکزوں میں سے تھا . . . اور فینیقی نو آبادی یعنی ''قَرْطاجَنّۃ'' کے مقابلے میں بتمامِ معنی مدینۂ لیبیا متصور ہوتا تھا ؟

بہر حال یہ شہر عرصۂ دراز تک اپنے شاندار رقیب کے مقابلے میں بے رونق رہا اور مدّتِ مدید

کے بعد اسے اوّل درجے کا شہر بننا نصیب ہوا ۔ رومیوں، وَنْڈالوں اور بوزنطیوں کے زمانے میں اسے کوئی خاص اہمیّت حاصل نہ تھی ۔ رومی عہد کی ایک سڑک اسے قَرْطاجَنّۃ سے ملاتی تھی اور صرف چند حوالے، جو جغرافیائی اور کلیسیائی کتابوں میں ملتے ہیں، ہمیں وقتاً فوقتاً اس کے وجود کی یاد دلاتے ہیں ۔ ہمیں دورِ وَنْڈالی کی القدّیسۃ زیتونۃ (St. Olive) کی زندگی کو تاریخی سمجھنا چاہیے یا محض افسانہ؟ کہتے ہیں کہ جامع الزیتونۃ کا نام اس کے نام پر ہے ۔ اس کی نعش کی واپسی کا مطالبہ شاہ مارٹن فرمانروائے اَرَغون Aragon نے ۱۴۰۲ء میں سرکاری طور پر کیا تھا.

اسلامی فتوحات کے ساتھ ہی تونس اچانک تاریکی کے پردے سے نکل آتا اور تاریخ کی روشنی میں ایک اسلامی شہر کی حیثیت سے نظر آتا ہے ۔ کسی حد تک اسے قَرْطاجَنّۃ کی جانشینی ملی اور وہ جلد ہی قَیْرَوان کا مقابلہ کرنے لگا ۔ جب حسّان بن النُعمان نے ۶۹۸ء میں پرانے پایۂ تخت قَرْطاجَنّۃ کو فتح کر کے برباد کر دیا تو اُسے سب سے پہلے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ جھیل کے کنارے کے چھوٹے قصبے کو بحری مرکز میں تبدیل کر دے جہاں سے بحری بیڑے دور تر مہمّوں پر روانہ ہو سکیں اور ساتھ ہی قصبۂ بوزنطی بیڑے کے اچانک حملے سے بھی محفوظ رہ سکے ۔ اس نے تونس میں دارالصِناعۃ arsenal قائم کیا اور غالباً اس نے مصر سے ایک ہزار قبطی خاندان بھی لا کر یہاں آباد کیے تا کہ جہاز سازی کے اس نئے دارالصِناعۃ کے لیے تجربہ کار کاریگر مہیا ہو سکیں ۔ خود شہر کی نسبت ہمیں اِس وقت تک بھی قطعی معلومات حاصل ہونا شروع نہیں ہوے ۔ اس شہر میں جس قسم کے عناصر دوسرے مقامات سے ہجرت کر کے آئے اُن کے متعلق ہم یہاں محض اپنا مبہم سا قیاس ہی پیش کر سکتے ہیں : پہلے پہل بلا شک و شبہہ یہاں عیسائی سوداگر اور عامل آئے لیکن اس کے بعد جلد ہی علاقے کے نو مسلم باشندے بھی بڑی تعداد میں یہاں آنے لگے اور ان کے ساتھ عرب سپاہی بھی آ ملے . . . . . ۔ صحیح اسلامی طرز کا سب سے پہلا بڑا مذہبی ادارہ جو تیار ہوا وہ جامع مسجد تھی؛ یہ مسجد صدیوں تک شہر کی مذہبی زندگی کا مرکز بنی رہی ۔ از روے روایت اسے اُموی والی ابن الحَبْحَاب نے ۱۱۴ھ / ۷۳۲ء میں تعمیر کیا تھا ۔ اسی نے دارالصِناعۃ کو بھی از سرِ نو بنایا لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ فصیلیں کس نے تعمیر کرائیں؛ یعقوبی کا بیان ہے کہ ان کی تعمیر گارے (’طِین‘) اور کچی اینٹ (’لِبْن‘) سے ہوئی تھی؛ البتہ وہ حصہ جو جھیل کے نزدیک تھا تراشیدہ پتھروں (’حِجار‘) کا بنا ہوا تھا ۔ مختصر یہ کہ قَیْرَوان کی طرح تونس کسی باقاعدہ منصوبے کے ماتحت وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ شہر اچانک ظہور میں آیا اور اس کی زندگی میں اہمّ سیاسی، سماجی اور مذہبی قلبِ ماہیّت ہوئی جن سے شہر نے اپنے آپ کو مطابقت دی ـــــ شاید یہ عملِ تطبیق اتنا اچانک نہ ہو جتنا پہلے پہل گمان ہوتا ہے ـــــ اور اس تطبیق کے ذریعے تونس نے حالاتِ زمانہ اور فاتح کی دوراندیشی اور عزیمت کے تقاضوں کو پورا کیا.

آٹھویں اور نویں صدی میلادی میں تونس نے اپنے تجارتی ممکنات کو بھی قوّت سے فعل میں لانا شروع کیا تاہم اس وقت بھی اس کی شہرت خاص طور پر فقہی اور مذہبی تعلیم ہی کے لحاظ سے تھی ۔ اس سے پیشتر کہ قَیْرَوان کی شہرت قطعی طور پر قائم ہو تونس میں مشہورِ روزگار علماء و معلّمین موجود تھے، جنھوں نے اپنی تعلیمات سے تمام ملک میں اسلام کی نشر و اشاعت میں حصّہ

لیا؛ مثلاً علی بن زِیاد اور عبّاس بن الولید الفارسی جو [نامور] محدّث تھے ۔ فاطمیوں کے عہد کے آغاز میں ابوالعَرب تمیمی نے تونس کے علماء و فضلاء کے قدیم طبقات کا ایک مفید تذکرہ (کتاب طبقات علماء تونس، طبع و ترجمہ از محمد بن شِنِب مع ''طبقات علماء افریقیّۃ'') تألیف کیا ۔ جامع مسجد میں اس زمانے میں متعدّد ضروری اضافے ہوے اور مختلف طریقوں سے اس کی زیب و زینت کی گئی ۔ اس میں چند اہمّ تبدیلیاں بلا شبہہ احمد اَغلَبی نے کیں، جسے عمارات بنانے کا بہت شوق تھا؛ گنبد پر عبّاسی خلیفہ کے نام کا کتبہ نصب ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محراب کے سامنے والے گنبد کی تأریخ تعمیر ۲۵۰ھ/ ۸۶۴ء ہے ۔ یہاں سرکاری اور مذہبی عمارتوں کے لیے پتھر اور سنگ مرمر مہیا کرنا بہر حال آسان تھا ۔ قَرطاجَنّہ نزدیک ہی ہے؛ اس کے کھنڈروں سے عمارتی سامان، ستون اور سر ستون بآسانی اور کثرت سے اٹھا کر لائے جا سکتے تھے ۔

سیاسی لحاظ سے تونس قَیْرَوان کی مرکزی حکومت کی مخالفت و مزاحمت کا مرکز و مرجع تھا؛ بنو تمیم کی جو فوج ('جُنْد') اِس کی دیواروں کے اندر مقیم تھی وہ شورش کا عنصر اور بدامنی کا سر چشمہ تھی ۔ شہر نے اکثر بغاوتوں میں حصّہ لیا، جنھیں بنو امیّہ، بنو عبّاس کے وُلاۃ اور بعد ازاں اغلبی امیر برابر دباتے رہے ۔ منصور الطُّنْبُذی کی زبردست بغاوت میں یہ شہر بھی ملوّث تھا اور زیادۃ اللہ اوّل کی فوجوں نے دھاوا کر کے اسے فتح کر لیا اور اس کی فصیلوں کو ۲۱۸ھ/۸۳۳ء میں مسمار کر دیا ۔ اسی قسم کی ایک بغاوت کے بعد ابراہیم ثانی نے اسے سخت سزا دی اور اس ارادے سے کہ اس پر ضبط قائم کرے اپنا صدر مقام اور دربار ۲۸۱ھ / ۸۹۴ء میں وہاں منتقل کیا؛ اس مقصد سے اس نے کئی عمارتیں بنوائیں، جن میں 'کَسْبَۃ' (القَصَبَۃ) بھی شامل ہے لیکن دو سال بعد وہ واپس رَقّادۃ چلا گیا اور جب اس کے بیٹے عبداللہ ثانی نے تونس میں قیام کرنے کی دوبارہ کوشش کی تو وہ ۲۹۰ھ/۹۰۳ء میں اسی محلّ میں مارا گیا جو اس نے اپنی سکونت کے لیے انھی دنوں میں تعمیر کرایا ہی تھا ۔ اس کے دونوں قاتل قتل کیے گئے، ایک کو باب الجزیرۃ پر قتل کیا گیا ([الجزیرۃ =] جزیرہ نما، جس سے رأس بونہ مراد ہے) اور دوسرے کو باب القیروان پر ۔ تونس ابھی اِفْریقیّۃ کا صدر مقام بننے کے لیے تیار نہ تھا ۔

فاطمیّۃ اور اُن کے جانشین صَنْہاجی بادشاہوں نے، جن کا پایۂ تخت قَیْرَوان یا اُن کے بنا کردہ شہر مہدیّۃ میں تھا، تونس سے ارادۃً غفلت کا سلوک برتا، اس لیے کہ معلوم ہوتا ہے یہ شہر طریقِ سنّت پر قائم رہا ۔ یہ امر کچھ کم اہمیّت نہیں رکھتا کہ تونسی ولِیّ کبیر، وہ بزرگ جو اس شہر کے سرپرست ہیں اور جن کی عزت و تکریم آج کے دن تک سب کرتے ہیں، دسویں صدی میلادی کے پہلے نصف میں ہو گذرے ہیں، یعنی ٹھیک اس زمانے میں جب شیعہ حکومت اور باغی خارجیوں کے درمیان افریقیّۃ پر غلبہ پانے کے لیے سخت کش مکش جاری تھی ۔ یہ بزرگ سیدی مَحرز (مُحْرِز بن خَلَف) تھے ۔ ابن ابی زید نے (۳۲۷ھ / ۹۳۹ء میں) اُنھیں کی تحریک سے رسالۃ لکھا اور وہ انھیں موصول بھی ہوا ۔ یہ رسالۃ شمالی افریقہ کے مروّجہ مالکی مذہب کا مستند خلاصہ ہے (قبّ ابن ناجی : مَعالِم الأیمان، ۳ : ۱۳۸) ۔ جب اُبو یزید نے ۳۳۲ھ / ۹۴۴ء میں شہر پر عارضی مگر سخت تباہ کن قبضہ کر لیا تو اس کے بعد یہی بزرگ تھے جنھوں نے باشندوں کی حوصلہ افزائی کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ شہر کے گرد ایک پختہ فصیل تیار کریں اور انھیں بہتر تنظیم سے

بیوپار اور تجارت کرنے کی ترغیب دی ۔ ریشمی پارچہ‌بافوں کا قدیم احاطہ (فُنْدُق الحرائریّة)، جو ان کے زاویے کے تقریباً بالمقابل، شہر کے ایک بڑے دروازے سے کچھ فاصلے پر واقع ہے، غالباً انھیں کی تحریک سے بنا تھا اور غالباً یہی حال چھوٹی منڈی کا تھا، جس کی وجہ سے اس دروازے کا نام بھی باب سُوَیْقَه (باب السُّوَیْقَة) پڑ گیا ۔ اس روایت پر بھی سب کو اتفاق ہے کہ [سیّد مُحْرِز] نے اپنے زاویے سے کچھ فاصلے پر جامع مسجد کی جانب یہودی محلّے (حارَة) کی بنیاد رکھی : ظاہر ہے کہ اس اقدام سے مقصود یہ تھا کہ وہاں ایسے لوگوں کو بسائے رکھا جائے جو فنِ تجارت کے خاص ماہر اور شہر کی خوشحالی کا ایک بڑا ذریعہ تھے ۔

دسویں صدی میلادی میں ابن حَوْقَل نے تونس کی خوشحالی کی شہادت دی ہے ۔ وہ اس کی پیداوار کی کثرت، اس کے محلِّ وقوع کی موزونیت اور اس کے باشندوں کی دولت مندی کی تعریف کرتا ہے ۔ وہ خاص طور پر یہاں کی کوزہ گری [”غضار حسن الصباغ و خَزَف حسن کالعراقی المجلوب“] اور شہر کے گرد کے باغات کی آبپاشی کے نظام کا ذکر کرتا ہے، جو رہٹوں [’الدَّوالیب‘] کے ذریعے ہوتی تھی ۔ اس سے اگلی صدی میں البکری مزید تفصیلات بیان کرتا ہے : وہ شہر کی فصیلوں اور خندق کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ شہر کے پانچ دروازے تھے، یعنی جنوب میں باب الجزیرة، مشرق میں باب البَحْر، جو بندرگاہ کی جانب کھلتا تھا اور باب قَرْطاجَنّة (کارتھیج) مشرق میں، شمال میں باب السَّقّائین (بہشتیوں کا دروازہ) : ظاہر ہے کہ یہ وہی دروازہ ہے جسے سُوَیْقَه [باب السُّوَیْقَة] کہتے ہیں اور مغرب میں باب اَرْطَة ۔ بندرگاہ کی (جس کا داخلہ ایک زنجیر کے ذریعے بند کیا جا سکتا تھا) نگہداری شمال کی جانب سے فصیل کے ذریعے ہوتی تھی اور جنوب کی جانب سے ایک سنگین قلعے کے ذریعے، جسے قصر السِلْسِلة کہتے تھے ۔ البکری جامع مسجد کی تعریف کرتا ہے جس کے داخلے کی سیڑھیاں (بجانبِ مشرق)، آج کی طرح، تعداد میں بارہ تھیں اور بازاروں کی جو متعدّد اور بارونق تھے اور حمّاموں کی جو پندرہ تھے اور سامان خوراک (پھل اور مچھلی) کی جس کی بہتات تھی ۔ وہ بھی یہاں کی کوزہ گری کا ذکر کرتا ہے، پھر موضوع کو بدل کر وہ لکھتا ہے کہ اہلِ تونس میں فقہ کی تعلیم بڑی کامیابی کے ساتھ رائج تھی ۔

اس طرح ظاہر ہے کہ تونس میں کوئی ایک صدی تک امن اور خوشحالی کا دور دورہ رہا، تا آنکہ گیارھویں صدی میلادی کے وسط میں ایسا خوفناک سانحہ پیش آیا جس کی وجہ سے تمام ملک کی اقتصادی اور سیاسی حالت خراب ہو گئی : یعنی ہلالی عربوں نے حملہ کر دیا ۔ بیچارے زِیری نئے فاتحین سے مغلوب ہو کر مَہدِیَّة میں بند ہو کر بیٹھ گئے اور تونس ۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء میں کچھ مدّت کے لیے بنی رِیاح کے سردار عابد بن ابی الغَیث کے قبضے میں آ گیا لیکن کچھ عرصے بعد شہر القلعة کے حمّادی سردار النّاصر کی پناہ میں آ گیا، جس نے ۴۵۱ھ میں وہاں عبدالحق ابن خراسان صَنْہاجی کو والی مقرر کر کے بھیج دیا ۔ عبدالحق نے جلد ھی اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے تونس میں ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی، جو بیس برس (۱۱۲۸ تا ۱۱۴۸ء) کے وقفے کے سوا تقریباً ایک صدی تک یعنی المُوَحِّدین کی فتوحات تک برابر بر سرِ حکومت رہا ۔

پہلے تو بنو علی نے، جو قبیلۂ ریاح سے تھے اور قَرْطاجَنّة کے علاقے المَعلّقة (La Malga) میں متمکّن ہو چکے تھے، اہلِ تونس پر بڑا ظلم و ستم

روا رکھا لیکن ان کے آئے دن کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے اہلِ تونس نے ان سے مفاہمت کر لی اور سالانہ خراج کے عوض بنوعلی اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ اس ناحیے اور اہلِ ناحیہ کو آئندہ عرضۂ نہب و غارت نہ بنائیں گے، بلکہ اس کے بعد انھوں نے تونس کی منڈیوں میں خرید و فروخت کے لیے آنا جانا بھی شروع کر دیا ۔ مَہْدِیَّة کے زیری خاندان اور صِقِلّیَّة کے نارمنوں (Normans of Sicily) نے تونس پر حملے کیے مگر یہ شہر ان کی تباہ کاری کے بعد بھی بچا رہا، تاہم اندرونی خانہ جنگیوں، مخالف سیاسی گروھوں کے فسادات، صفّوں soffs کی باھمی لڑائیوں اور محلّوں کی باھمی رقابت کی وجہ سے یہاں کے امن میں خلل پڑتا رہا، تاھم اس انتہائی خلفشار کے زمانے میں بحری تجارت بڑے پیمانے پر ترقّی کرنے لگی؛ اٹلی سے تجارتی تعلّقات کی تنظیم ھوئی، ان میں ترقّی ھوئی اور کاروباری تعلّقات جو عیسائیوں سے روز بروز بڑھنے لگے اُن کے نتائج توقّع سے زیادہ امید افزا ثابت ھوے ۔ بنو خراسان نے خود بھی تونس کی ترقّی اور خوشحالی پر بڑی توجہ صرف کی ۔ ان میں سے عظیم‌ترین امیر کا نام احمد تھا؛ اُس نے بارھویں صدی کے نصفِ اوّل میں شہر کو متحصّن کیا اور مٹی کے وہ پشتے وغیرہ بنوائے جن کا ذکر الادریسی نے کیا ھے ۔ اس نے قلعہ (' القَصْر') بھی تعمیر کرایا، جس سے شاید موجودہ مسجد القَصْر ابتداءً ملحق تھی ۔ شہر کے اسی حصّے میں شارع سیدی بُوکُریسان کے قریب (جو بظاھر تحریفِ بنو خراسان ھے اور اب تک ان کے نام کو باقی رکھ رھی ھے) بنو خراسان کا قبرستان اب تک اسی نام سے موجود ھے ۔ یہ غالباً ابتداء میں قبرستان السلسلة سے ملحق تھا، جو اس جگہ تھا جہاں آج کل شفاخانۂ صِدیقی واقع ھے ۔ جامع مسجد کا صدر دروازہ اسی خاندان کے زمانے کا ھے ۔ دو بڑے بڑے مضافات باب [السُّوَیقة] اور باب الجزیرۃ ' المدینة ' یعنی خاص شہر کے شمال اور جنوب میں [بوقتِ تحریر] بڑھتے چلے جا رھے ھیں؛ اس سے تونس کی شکل کی تحدید خاصی واضح طور پر قائم ھو گئی اور اس کی بڑھتی ھوئی آبادی نے اُسے افریقیّة کا صدر مقام بنا دیا ۔ عبدالمؤمن (۵۵۴ھ / ۱۱۵۹ء) کے وقت سے اب تک اس کی یہی حالت رھی ھے اور افریقیّة کی سیاسی تاریخ اس کے بعد سے مملکتِ تونس کی تاریخ میں مدغم ھو چکی ھے ۔

۵۹۵ھ / ۱۱۹۹ء میں عبدالکریم الرَّغراغی کے ناکام حملوں کی وجہ سے پھر ۱۲۰۳ - ۱۲۰۴ء میں مرابطین کے آخری بادشاہ یحیٰی بن غانیّة کی چند روزہ حکومت کی وجہ سے یہاں خوفناک گھبراھٹ پیدا ھوئی؛ اس کے بعد یہ حفصیوں کی قسمت میں تھا کہ وہ تونس میں امن اور سلامتی کی فضاء دوبارہ پیدا کریں، اس کی پرانی یادگاروں میں اضافہ کریں اور اسے ایسا صدر مقام بنائیں جو صدر مقام کہلانے کے لائق ھو ۔ ابو محمد بن ابی حفص اس وقت تک خلفاے مرّاکش کے نام پر یہاں حکومت کر رھا تھا ۔ اس نے محلّۂ باب [السُّوَیْقَة] (کے شارع الحَلْفاوِیّین El-Halfaouine) میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی جو اب تک اس کے بگڑے ھوے نام ' بای محمد '[۱] سے مشہور چلی آتی ھے لیکن یہ اس خاندان کا

[۱] صحیح تاریخ سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ مسجد ساتویں صدی میں بنی تھی؛ بنی حَفْص میں سے ' ابو محمد ' کے لقب کا کوئی آدمی نہیں ھوا، سوا حسن بن محمد کے جو ۹۳۲ھ میں تخت نشین ھوا ۔ تونس کی تاریخوں میں مذکور ھے کہ اس جامع کی تعمیر میں ابو محمد عبداللہ المرجانی کی کوشش کا بڑا دخل ھے جو اُس زمانے کے فضلاے تونس میں سے تھے (دیکھیے تاریخ معالم التوحید، از مؤرخ محقق السید محمد ابن الخوجة، ص ۷۰)؛ تعلیق محمد الخضر حسین، در دائرۃ المعارف الاسلامیة، ۶/۱: ۳۵ ۔ اس مقالے میں آئندہ اس سلسلے کے حواشی جو اس

پہلا خود مختار بادشاہ، صاحب تقوی، ابو زکریاء ھی تھا جس کے عہد کی عمارتیں نہایت واضح طور پر یہ ظاہر کرتی ھیں کہ ایک نیا دور شروع ھو گیا تھا۔ ۱۲۳۰ء میں اس نے شہر سے باہر جنوب مغرب کی طرف ایک حصین و مستحکم 'مُصَلّٰی' ('جامع السلطان') تعمیر کرایا، جسے ایک صدی بعد ابن بطُوطہ نے بھی دیکھا۔ پھر اس نے قَصَبَة (یا کَسْبَة) کو دوبارہ تعمیر کرانا شروع کیا اور اس کے پہلو میں ایک مسجد بنوائی جو ابو زکریاء کی اپنی عبادت گاہ تھی، یعنی مسجد المُوَحّدین یا مسجد قَصَبة (یا کَسْبة)، جس کا منار خالص المُوحّدی طرز کا ھے اور جس کے بیرونی حصے پر رمضان ٦۳۰ھ / مارچ ۱۲۳۳ء کی تاریخ ایک خوبصورت کتبے میں درج ھے (قب O. Houdas اور R. Basset : *Mission Scientif. en Tunisie*، الجزائر ۱۸۸۲ء، ص ۵ تا ۹)۔ اس نے ایک عمدہ کتب خانہ بھی قائم کیا، جو اس کے ایک جانشین ابن اللّحیانی نے منتشر کر دیا۔ اس نے تونس میں پرانے سوق الشّماعین کے قریب (اب وہ سُوق البَلْغَجِیّة ھے) شَمّاعِیّة کے نام سے مشرقی طرز کا ایک مدرسہ جاری کیا، جس کی بعد میں مکمّل طور پر تجدید ھوئی، وہ شمالی افریقہ کا پہلا مدرسہ تھا۔ اسی نے یحیٰی بن غانِیَة کی تین لڑکیوں کو ایک محلّ میں پناہ دی، جو اس کے بعد سے قصر البَنات کے نام سے مشہور ھوا۔ یہی بادشاہ تھا جس نے جامع مسجد کے عین ارد گرد محلّة الاَسواق ترتیب دیا اور سوق العطّارین (سوداگرانِ عطر و روغنیّات کا بازار) تعمیر کرایا اور شاید سوق القماش (پارچہ جات کا بازار) بھی اسی نے بنایا ھو۔

تجارتی اور مذھبی معاملات میں اس قسم کی دلچسپی لینے کے بجائے اس کے بیٹے مستنصر باللہ نے، جو نمائش کا شوقین اور عیش و عشرت اور شان و شوکت کا دلدادہ تھا، ۱۲۵۳ء میں قَصَبَة یا کَسْبَه کے محلّ میں ایک ایوان عام قُبّة اَساراک کے نام سے تعمیر کرایا اور متّصلہ مضافات میں اس سڑک پر جو باردو Bardo جاتی ھے رأس الطابِیَة 'Ras-Tabia' اور ابوفِہر میں نزھت گاھیں بنوائیں (مقام ابو فِہر، بقول ابن ابی دینار، البَطُوم ھی تھا مگر اس کا محلّ وقوع اَب تک غیر یقینی ھے۔ حسن عبدالوھّاب اس کا محلِّ وقوع جبل الاحمر پر الاَرِیَنة el-Ariana کے قریب بتاتا ھے، دیکھیے اس کی طباعتِ کتاب ابن فضل اللہ، ص ۱۲، حاشیہ ۱)۔ ابن خلدون ان نزھت گاھوں کی تعریف و توصیف میں ایک درخشاں اور تابناک بیان قلمبند کرتا ھے۔ یہ دونوں باغ قَصَبَة (یا کَسْبَه) سے ایک خصوصی سڑک کے ذریعے ملا دیے گئے تھے تا کہ خواتینِ حرم پورے پردے کے ساتھ وھاں جا سکیں۔ ٦٦۵ھ / ۱۲٦۷ء میں المستنصر نے قرطاجَنّة کی قدیم گذرِ آب ('الحَنایا') کی بحالی کا کام بھی مکمّل کرا دیا اور اس تکمیل پر ابن حازم[۱] نے اشعار کہے۔ اُس نے ابو فِہر کے بڑے تالاب میں پانی لا کر وھاں سے جامع مسجد کو پہنچایا۔

اُس کی والدہ عَطف نے، جو ایک پارسا حکمران کی ستودہ خصال بیوہ تھی، ایک اور مدرسہ بنوایا جس کا نام توفیقیّة تھا۔ یہ مدرسہ جامع التوفیق یا جامع الھوٰے سے ملحق تھا، جو اسی زمانے کی عمارت ھے۔ بنوحَفْص کے عہد کی پہلی صدی میں دو مسجدیں تعمیر ھوئیں : جامع الزّیتونة البَرّانی[۲] (۱۲۸۳ء میں) بیرون باب البَحر، جو قریب کار [ابو] الفَضْل کے

[۱] جس شاعر نے مستنصر کی مدح میں قصیدہ پڑھا تھا وہ حازم بن محمد القرطاجَنّی تھا جو اندلس سے آ کر تونس میں بس گیا تھا، (منہ).]

[۲] احمد بن مرزوق بن ابی عمارة المَسیلی اس کا بانی تھا۔ وہ بد خصلت آدمی تھا۔ اس جامع کو اب جامع باب البحر کہتے ھیں۔ کیونکہ یہ سمندر کے پانی کے قریب ھے، (منہ).]

حکم سے ایک فُندُق کی جگہ بنائی گئی جہاں شراب فروخت ہوا کرتی تھی اور جامع الحلّق (حلقوں والی) جو اسی محلّے میں بطور مُصلّی تیار ہوئی ۔ ایک تیسرا مدرسۃالمَعرِض (جاے دیدار حسبِ قرار) سلطان ابواسحٰق کے بیٹے ابو زکریاء نے سوق الکُتُبیّین (بازار کتب فروشان) میں تعمیر کرایا ۔ یہ بناے خیریہ تلافیِ مافات کے طور پر ایک سابقہ فُندُق کی جگہ تعمیر ہوئی تھی، جہاں کبھی میکشوں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی لیکن یہ عمارت اب بالکل معدوم ہو چکی ہے اور اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ۔ ان کے علاوہ فصیلیں دوبارہ تعمیر ہوئیں، کم از کم جزوی طور پر اور ان میں باب جدید اور باب المنارۃ تعمیر ہوے اور غالباً باب البَنات بھی، جو اب موجود نہیں ہے.

۱۳۰۰ء کے قریب تونس کی وہی شکل و صورت قائم ہو چکی تھی جو ملکی لوگوں کے شہر کی اب ہے ۔ 'المدینۃ' جو شمالاً جنوباً آباد ہے، دو طرف سے گھرا ہوا ہے، اس کے مغرب میں قَصَبَۃ (یا کَسْبَہ) (یعنی فرمانروا کا مستحکم قلعہ یا محل ہے، جو شہر اور میدانِ المَنوبۃ دونوں پر مُشرِف ہے، 'المدینۃ' کے مشرق کی طرف باب البحر ہے جو سب سے زیادہ نشیبی حصے میں ہے اور وہ دارالصِناعۃ کی طرف کھلتا ہے اور وہاں سے جھیل lagoon کی جانب جاتے ہیں ۔ اگر اوپر کو آئیں تو آدھے فاصلے پر اور شہر کے عین مرکز میں جامع مسجد ہے جس کے دروازے نئے سوقوں میں کھلتے ہیں، جو اس کے ارد گرد واقع ہیں؛ شمالی دروازے کا نام "باب البَھور" [کذا، اھلِ تونس کا یہی تلفّظ ہے، اور بعض مؤرّخین نے بھی یہ کلمہ اسی طرح لکھا ہے، دائرۃالمعارف الاسلامیۃ] مصدّق ہے لیکن یہ سوال ابھی تک حل طلب ہے کہ آیا مغربی دروازے کا نام اس وقت بھی باب الشفاء ہی تھا یا نہیں ۔ ہر سُوق، پرانی رسم کے مطابِق، اب بھی رات کے وقت بند کر دیا جاتا ہے ۔ باب الرَّبع، جو اسی نام کے سُوق کے قریب ہے، موجودہ زمانے کی طرح اس محلّے سے باھر جانے کا جنوبی مخرج ہے ۔ مدینے کے ارد گرد اور بڑے بڑے دروازوں کے باھر بعض دستکاریوں کے مرکز ھیں ۔ باب الجزیرۃ کے اندر رنگرز رہتے ھیں، باب الجدید پر لہار اور باب المَنارۃ کے علاقے میں زین ساز [یہ سُوق سُوق السرّاجین کہلاتا ہے، دائرۃ المعارف الاسلامیۃ] ۔ باب البحر کے نزدیک بلا شبهه متعدّد فُندُق تھے، جو عیسائی سوداگروں کے ساتھ خاص کر دیے گئے تھے لیکن انھیں زیادہ جگہ کی ضرورت تھی اس لیے دروازے کے باھر انھوں نے بہت جلد مکانات تعمیر کر کے اپنا چھوٹا سا محلّہ یا رَبَض الگ بنا لیا، جو یورپی محلّے کا ابتدائی خاکہ تھا ۔ شہر کے اندر مکانات ایک دوسرے سے متّصل تھے، درمیان میں کوئی کھلی جگہ نہ چھوڑی گئی تھی اور منڈیوں اور مجالس کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رھی تھی، اس لیے بطحاء ابن مَردُوم کی حیثیت ایک چوراھے سے زیادہ نہیں ھو سکتی.

البته بیرونی محلوں میں جو نسبۃً جدید طرز کے ھیں اور ان میں ازدحام کم ہے، وھاں کے کشادہ ساحات منڈیوں کا کام دیتے ھیں : باب السُوَیقۃ کے محلّے میں گِلی ظروف اور حلفاء گھاس والوں کی منڈی (الحلفاویّین) ہے اور باب الجزیرۃ کے محلے میں جانوروں کی منڈی ہے (گھوڑوں کی منڈی : المُرکاض؛ بھیڑوں کی منڈی : رَحْبَۃ الغَنَم)، اور شاید غله منڈی Place du Marché au Blé بھی وھیں ہے ۔ ان محلّوں میں سے ھر ایک کے گرد حفاظت کے لیے ایک بیرونی دیوار ہے، جو قَصبۃ یا کَسْبَۃ پر جا کر ختم ھو جاتی ہے؛ استحکامات کی اس پہلی قطار کے دروازے جنوبی محلّے (رَبَض) کے لیے حسب ذیل ھیں : مغرب میں باب خالد (جو ابتداءً بلاشک و شبهه باب المنصور

تھا)، جنوب میں باب الجرجانی [اھل تونس اسے باب الفرجانی کہتے ھیں، دائرۃ المعارف الاسلامیۃ]، جنوب مشرق میں باب الفلّاق (جس کے باھر ایک قیساریّۃ ھے) اور باب علاوہ (Alleoua) [اھالی تونس کا باب علیوۃ، دائرۃ المعارف الاسلامیۃ]؛ شمالی محلّے کے لیے، شمال مشرق میں باب الخضراء، شمال مغرب میں باب [ابی] سعدون اور مغرب میں باب الاقواس (محرابوں والے مسقّف بازار کا دروازہ)، جو شاید باب العلوج (El-Allouche) ھی ھے، جس کا ذکر پہلی مرتبہ اس عہد کے بعد میں آتا ھے - ھم اس آخری دروازے کے پاس ھی ربض العلوج کا محلِّ وقوع متعیّن کرتے جسے "rabatins" کہتے تھے، (یہ سلاطین تونس کے تنخواہ دار عیسائی سپاھی تھے) اگر لیو افریقی [الحسن بن محمد الوزّان الزیّاتی] نے واضح طور پر اس کی تعیین باب المنارۃ کے باھر نہ کی ھوتی - باقی رھا خود قصبۃ، یا کسبۃ، اس کے دو دروازوں میں سے ایک باب الغدر تو دیہات کی طرف کھلتا تھا، دوسرا باب اِنتجمی شہر کی طرف (قب تلمسان کا باب اِیمزتجمی؛ قب بغیۃ الروّاد، طبع Bel، ۱ : ۳۴).

باب علاوۃ اور باب الخضراء کے درمیان کھلی "خندقوں" کا ایک طویل سلسلہ تھا، جن میں سب نالیاں گرتی تھیں اور بہ کر مشرق کی جانب جھیل میں جا پڑتی تھیں - قبرستان شہر کے اِرد گرد تھے - پہلے وہ مضافات کے قریب تھے پھر جب ان مضافات کے مکان وھاں تک بنتے چلے گئے تو اور پرے چلے گئے - جنوب مغرب میں جلّاز (الزّلّاج) کا وسیع قبرستان ھے، جو نسبۃً زیادہ الگ تھلگ ھے - اس کے ذریعے ابوالحسن الشاذلی صوفی (سیدی بلحسن) کی یاد محفوظ ھے، جو سلسلۂ شاذلیّۃ کے بانی تھے اور تیرھویں صدی میلادی کے نصفِ اوّل میں یہاں رھتے تھے - باب الجرجانی کے نزدیک ھنتاتۃ کے قبرستان ('المقبرۃ الھنتاتۃ') کے پاس کئی "ولیوں" کے مزار ھیں، جن کے 'مناقب' یعنی کرامتوں کے تذکروں میں، جو ابھی تک بیشتر غیر مطبوعہ ھیں، دورِ حفصی کے تونس کے اوضاع طبیعی اور اس کی ھیئت کے متعلّق مفید معلومات مل سکتی ھیں، جن سے الزّرکشی یا ابن الشّمّاع کی فراھم کردہ معلومات میں اضافہ ھو سکتا ھے - مشہور لالّۃ منّوبیّۃ [۱] (قب J. A.، ۱۸۹۹ء، ص ۳۸۵ تا ۳۹۴ اور کتاب مناقب السیّدۃ عائشۃ المنّوبیّۃ، تونس ۱۳۴۴ء)، م ۱۲٦۷ء/ [٦٦۵ - ٦٦٦ھ] کے نام پر ایک گاؤں La Apancubia بھی آباد ھے، جو جنوب مغرب کی جانب سے شہر پر مشرف ھے، عورتیں اب تک بانجھ پن کے علاج کے لیے ان کے مزار پر توسّل جوئی کے لیے جاتی ھیں.

ان مرابطین کے سیاسی اثر و رسوخ سے بھی کسی کو انکار نہیں ھو سکتا، مثال کے طور پر

---

[۱] لالّۃ تونس کے عوام میں بمعنی 'سیّدتی' مستعمل ھے - الخلاصۃ النقیّۃ میں لالّۃ منّوبیّۃ کی تاریخِ وفات ٦٦۵ھ [۱۲٦٦-۱۲٦۷ء] دی ھے یا ٦۵۳ھ [۱۲۵۵-۱۲۵٦ء] (منہ٣)؛ لالّہ کے متعلّق قب ڈوزی (Supplement، ۲ : ۵۰۸)، بقول اُس کے اِس معنی میں لالّا، لالّۃ، لالّی اور للّۃ سبھی المغرب میں مستعمل ھیں شاید یہ کلمہ بربری ھو - حضرت مریمؑ کو 'للّہ مریم' کہتے ھیں، شیوخ کی بیویوں کو بھی للّہ کہتے ھیں، سلطان مراکش کی چار بیویوں میں سے محترم ترین بیوی کو 'للّہ کبیرۃ' کہتے ھیں - ایران و ھند میں اس کلمے کا استعمال اس سے مختلف ھے، قب عالم آرای عباسی، ص ۷٦، ص ۹ و مآثر الامراء، ۱ : ۵۰۷ (لالہ = اتالیق)؛ جہانگیری (لالہ سرا = خواجہ سرا)، و بہارِ عجم (لالہ = بندہ و غلام) و فرھنگ امیر کبیر (لالہ = پرستار و مربّی)؛ نیز دیکھیے Platt بذیل لالا اور Hobson-Jobson، لنڈن ۱۹۰۳ء، ص ۵۰۱ ب؛ آٹھویں صدی ھجری میں کشمیر میں ایک شِو نارائنی لّلہ (عارفہ) ھو گزری ھے لیکن وہ لّلہ بظاھر سنسکرت کا لفظ ھے Grierson and Barnett : Lallā-Vākyanī، لنڈن ۱۹۲۰ء؛ نیز دیکھیے گریرسن : A Dictionary of the Kāshmirī Language، کلکتہ ۱۹۳۲ء، ۱: ۵۰۱ ب بذیل Lal.]

ابو محمد المَرجانی کو لیں، جو ابو عَصیدۃ کے اتالیق تھے، یہ ابو عصیدۃ بعد میں منصبِ خلافت پر فائز ہوا مگر ان بزرگوں کے علاوہ تونس کے مایۂ ناز اور باعثِ فخر وہ فقہاء، ادباء اور طلبہ تھے جو اس شہر نے روز افزوں تعداد میں پیدا کیے۔ العبدَری کے لیے بھی (۱۲۸۹ء میں) یہ امر موردِ التفات ہوا کہ علومِ دینیہ کو یہاں فروغ حاصل تھا ۔ تیرھویں صدی کے اواخر میں قاضی القضاۃ ابن زَیتُون کا نام قابلِ ذکر ہے۔ علمِ ادب اور فقہِ مالکی کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں اندلسی پناہ گزینوں نے بھی بہت قابلِ قدر حصہ لیا: ابن الأبّار اور قاضی القضاۃ ابن الغمّاز بلنسیۃ سے آئے تھے؛ اشبیلیۃ سے بنوعَصْفُور نیز بنوخَلْدُون بھی آئے، جو شمالی افریقہ کے مشہور و معروف مؤرخ (ابن خلدون، ولادت ۱۳۳۲ء) کے آباء و اجداد میں سے تھے۔

چودھویں صدی میلادی کو، فقہاء اور مفسّرین کے اجتماع کی وجہ سے، خالد البَلَوی سیّاح ([۱۳۳٦] تا ۱۳۴۰ء) نے بنظرِ استحسان و استعجاب دیکھا ہے؛ اسے تونس کا سنہری دَور قرار دینا چاہیے ۔ ان میں سے ہم ذیل کے علماء کا ذکر کرتے ہیں: قضاۃ القضاۃ ابن عبدالرفیع، ابن عبدالسّلام، اور عیسی الغُبرینی، قاضی ابن راشِد القَفصی، مفتی ابنِ ھارون اور بالخصوص امامِ جلیل ابن عَرفۃ، لیکن سیاسی لحاظ سے اس دَور میں بادشاھوں کی کمزوری، فتنہ و فساد اور بدامنی کے سوا اَور کچھ نہیں ملتا؛ خانہ بدوش عرب بڑی آسانی سے پایۂ تخت کو خطرے میں ڈال دیا کرتے تھے؛ بنی مَرِین نے دو دفعہ تونس پر قبضہ کر لیا ۔ ایک صدی پہلے شہر کے مغرب میں اور جنوب مغرب کے اطراف میں جو اس قدر پُر زور نمو نظر آ رہا تھا وہ رک گیا اور گو یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ شہر پر زوال آ گیا تھا مگر اس پر جمود ضرور طاری ہو گیا تھا، تاھم ۱۳۴۱ - ۱۳۴۲ء میں دو مدرسے قائم ہوگئے ۔ ایک تو خلیفہ

ابو یحیی ابوبکر کی ھمشیرہ نے عُنقیّۃ کے نام سے قائم کیا (بعد میں اس کی تجدید ھوئی؛ شارع ''عُنُق الجَمل'') اور دوسرا، جو اب کھنڈر ھو چکا ھے، ابن تَفْراگِین الحاجب نے بنایا تھا (شارع سِیدی ابراھیم) ۔ لیکن اس عہد کی خصوصیت یہ تھی کہ فوجی تقاضوں کو تعمیرات میں سب سے پہلے توجہ دی جاتی تھی، چنانچہ ۱۳۴۸ء میں ابوالحَسّان مَرِینی نے جب قیروان میں شکست پائی تو اس نے تونس کے استحکامات کو بحال کیا اور ان کے گرد خندق کھدوائی ۔ ابن تَفْراگِین نے بیرونی دیواروں کو خوب مستحکم کیا اور ان کے آئندہ اخراجات کے لیے خاصے بڑے حُبُوس (اوقاف) قائم کر دیے ۔

۱۴۰۰ء میں اور پندرھویں صدی میلادی میں پہنچ کر جب سیاسی حالات زیادہ پر سکون ھو گئے تو ھمیں نشاطِ تعمیر نمایاں طور پر عود کرتی ھوئی نظر آتی ھے، لیکن یہ عمارات حقیقۃً کسی باشکوہ پیمانے پر نہ تھیں ۔ ابوفارِس اور اُس کے پوتے ابو عمرو عثمان نے اپنے طویل عہد حکومت میں صرف دو کتب خانے اور چند مدرسے قائم کیے؛ ان کی توجہ زیادہ‌تر ابواب‌البِرّ کی طرف مبذول رھی، ان میں سے ایک تو مملکتِ تونس کا قدیم ترین اسلامی شفاخانہ ('مارستان') ھے جو ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں مکمّل ھوا ۔ اس کے علاوہ مضافات میں بے شمار زاویے بنائے گئے جہاں لوگ شب و روز [بد حادثہ سے] پناہ لے سکتے تھے ۔ نیز آب رسانی کا اھتمام ھوا کہ یہ بھی ایک مذھبی فریضہ تھا: مصلّٰی میں ماجِل (بہت بڑا حوض) اور سوق العطّارین میں مِیْضَاۃ (ایوانِ وضو) ۸۵۴ھ / ۱۴۵۰ء میں تعمیر ھوا، ان کے علاوہ پانی پینے کی سبیلیں (سِقایَۃ) اور 'مَصّاصے' بنائے گئے ('مَصّاصَۃ' بھی ایک طرح کی سبیل ھے جہاں لوگ ایک پتلی سی نلکی کو چوس کر پانی پیتے ھیں) ۔ ان سب

باتوں سے ایک قسم کی ضعیفانہ، زرد چہرہ پرہیزگاری کا پتا چلتا ہے جو زبردست قسم کی قوّتِ فعلیّہ سے عاری تھی، گویا مذہب آہستہ آہستہ مرابطوں اور اخوانوں کے قبضے میں جا رہا تھا ۔ اس زمانے کے نامور فقہاء میں سے خاندانِ قلْجانی[۱] اور بنو الرَّصّاع قابلِ ذکر ہیں؛ ۱۵۰۱ء میں حومۂ باب السُّوَیْقة کے اندر آٹھویں[۲] خطبے کا اہتمام ہوا ۔ اس زمانے کی مقتدر اور غالب ہستیوں میں ذیل کے لوگ تھے : [i] سیدی احمد بن عَرُوس (قبَ سیدی کے مناقب، تونس ۱۳۰۳ء)، جو مرّاکش سے آئے تھے اور ۱۴۶۳ء میں اپنے ہی زاویے میں دفن ہوے؛ آپ طریقۂ عَرُوسیہ کے بانی تھے۔[ii] سیدی قاسم الجَلِیْزی[۳] (م ۱۴۹۷ء)، جو اندلس (ہسپانیہ) سے آئے تھے، ان کا مقبرہ جو اُن کے زاویے میں ہے باب خالد کے نزدیک ہے (اس زمانے سے یہ باب بابِ سیدی قاسم کے نام سے مشہور ہے)؛ اس مقبرہ ۔ زاویہ کی چھت ہسپانوی طرز پر ٹائلوں کی بنی ہے اور [iii] سیدی منصور بن جِرْدان[۴] (م ۱۴۹۹ء).

معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی کاروبار فروغ پر تھا ۔ کئی حادثات کے باوجود یورپ سے تعلّقات نہ صرف قائم رہے بلکہ زیادہ مضبوط ہو گئے؛ صنعت و حرفت اور اندرونی تجارت کی اہمیت ابو فارِس کے عہد میں، یعنی اُس وقت بھی جب کہ اس نے ابھی اسے ہر قسم کے محصولوں اور ٹیکسوں (' مَجْبَی') سے آزاد نہیں کیا تھا، ۱۴۲۰ء کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتی ہے جو تحفة الاریب میں دیے ہیں ۔ یہ کتاب قطْلونیة Catalonia کے ایک نومسلم شخص فَرا اَنسِلْم تُرْمِیْدہ Fra Anselm Turmeda نامی نے لکھی تھی جس کا اسلامی نام عبداللہ[۵] التَّرجمان تھا اور جس کا مقبرہ اب تک باب المَنارة کے اندر موجود ہے ۔ بڑے بڑے تجارتی مرکزوں کے ذکر میں ہم دیکھتے ہیں کہ تیل، ترکاری اور لکڑی کے کوئلے کی منڈیاں (' فُنْدُق') بھی موجود تھیں۔ ایک 'سوق الصفّارین' یعنی تانبے کے برتن بنانے والوں کا تھا اور ایک 'سوق السعّزافین' یعنی ٹوکریاں بنانے والوں کا تھا، سُوق العزّافین (rue El-Azafine) اب تک موجود ہے اور ایک بازار 'القشّاشین' یعنی طُرفہ اور تحفہ اشیاء بیچنے والوں کا تھا، جو اب بھی موجود ہے ۔ ۱۳۶۱ء میں مکانات کا سرکاری اندازہ ابن الشّمّاع کے قول کے مطابق سات ہزار تھا ۔ ۱۵۱۶ء میں یہ تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی (لیو افریقی، [حسن بن محمد الوزّان الزّیّاتی]) ۔ فان غِسْتِیلہ van Ghistele سیّاح نے ۱۴۸۵ء میں تونس کے عیسائیوں کی طرزِ معاشرت کا ذکر کرتے ہوے قیمتی معلومات مہیّا کی ہیں ۔ رہے حکمران، تو وہ اپنے پیشرووں کی تقلید پر زور دیتے ہوے شہر کے باہر، زیادہ تر اپنی باردو Bardo والی املاک میں، رہنا پسند کرتے تھے۔ تونس کا یہ علاقہ، جس کا ذکر پہلے پہل ۱۴۱۰ء میں " Prado " کے نام سے آیا ہے اور جس کی صورت

[[۱] صحیح لفظ القَلْشانی ہے، محمد الخضر حسین در دائرۃ المعارف الاسلامیة ۔] [۲] یعنی وہ جامع مسجد تعمیر ہوئی جو جمعے کی نماز کے لیے مخصوص تھی اور یہ مسجد آٹھویں جامع مسجد تھی جس کی بنیاد تونس میں ڈالی گئی۔ آج کل اسے جامع التفافتة کہتے ہیں اس لیے کہ اس کے بہت سے امام فضلاے آل التفّاتی میں سے تھے، منہ۲ ۔]

[[۳] اس لفظ کا مروّج تلفّظ یہی ہے مگر علماے تونس کی ایک جماعت اسے الزلیجی اور الزلاج لکھتے ہیں؛ دیکھیے معاهد التوحید، منہ۲ ۔] [[۴] تونس میں آپ کا زاویہ تھا اور وہیں آپ کا مزار بھی ہے، منہ۲ ۔]

[[۵] یہ شخص سلطان احمد بن محمد بن بکرالحَفْصی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا، ترمیدہ قسّیس تھا اور کتاب تحفة الاریب فی الرّد علی اهل الصلیب کا مصنف، منہ۲ ۔]

میں اکثر اوقات ردّ و بدل بھی ہوتا رہا ہے، بہت جلد عمارتوں کا ایک وسیع مجموعہ بن گیا ۔ عَبْدَلِّیَہ محل جو المَرْسٰی پر ہے اور اسی نام کا ایک کتب خانہ جو جامع مسجد سے ملحق تھا یہ دونوں بنوحفص کے آخری خودمختار بادشاہ ابو عبداللّٰہ الحَفْصِی (۱۵۰۰ء) کے نام سے منسوب ہیں.

سولھویں صدی کے پُرآشوب زمانے میں یہ بدقسمت شہر ترکوں اور اہل اسپانی کی طویل جنگوں کے اثناء میں دونوں کا ایک اہمّ ہدف و مقصود بن گیا ۔ ۱۵۳۴ء میں خیرالدین [رکّ بآن] کی فوجوں نے اسے تاخت و تاراج کیا اور اگلے سال چارلس پنجم کی فتحمند فوجوں نے اس میں لوٹ مار کی ۔ باشندگانِ شہر عیسائیوں کے حملے کی تاب نہ لا کر، سب کے سب، باب الفلّاق کے راستے بھاگ کھڑے ہوے، جس سے اس دروازے کا نام باب الفَلَّة (= باب ہزیمت) پڑ گیا ۔ ظاہر ہے کہ جن حالات میں بنو حفص کا اقتدار دوبارہ بحال ہوا اور قائم رہا وہ شہر کی ترقّی کے لیے زیادہ سازگار نہ تھے ۔ حکمرانوں نے اپنی تمام تر توجہ شہر کے استحکامات کی طرف منعطف کر دی اور ساتھ ہی حَلْق الوادی (la Goulette) کو بھی مستحکم کیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تکمیل ۱۵۷۳ء کے موسمِ خزان کے بعد ہی ہوئی تھی کیونکہ اس زمانے میں آسٹریا کے ڈون جون (Don John of Austria) نے قائد رمضان کو تونس سے بھگا دیا تھا، جو علی [پاشا] [اولوج، قِلیج] کی طرف سے چار سال سے یہاں کا والی تھا ۔ قَصبة (یا کَسْبَہ) کو خوب مستحکم کیا گیا، بالخصوص اسلحہ خانے کے موقع پر، جسے شاید اس سے کچھ پہلے مِسمار کر دیا گیا تھا (قبّ Grand-champ، *R. T.*، ۱۹۱۴ء، ص ۹ تا ۱۰)؛ جھیل کے کنارے ستارے کی شکل کا ایک قلعہ تیار ہو گیا، جسے شہر کی فصیلوں کے ساتھ دُھری سنگر بندی کے ذریعے ملا دیا گیا تھا ۔ یہی قلعہ وہ برج (*Bastion*) ہے جس کا ذکر ابن ابی دینار نے کیا ہے اور جسے ۱۵۷۰ء کے ایک تخطیط (خاکے) میں *Nova Arx* کے نام سے دکھایا گیا ہے (قبّ Monchicourt : *Essai bibl. sur les plans imprimés de Tunis-Gaulette au XVI^{ème} siècle,....*، در *R. Afr.*، ۱۹۲۵ء، ص ۳۱) لیکن یہ سب محنت اکارت گئی، کیونکہ (قبّ *R. T.*، ۱۹۱۴ء، ص ۱۲) باشندے شہر چھوڑ کر چلے گئے اور اُسے ہسپانوی فوج کی غارتگری کے حوالے کر دیا؛ ستمبر ۱۵۷۴ء میں ترکوں نے اس برج پر قبضہ کر کے اسے زمین سے ہموار کر دیا ۔ سِنان پاشا نے یہاں خاصی پائدار حکومت قائم کی، جس کی وجہ سے تھوڑے عرصے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ تعمیراتِ عامّہ کا سلسلہ پھر جاری ہو جائے.

ہسپانیہ (اندلس) سے مہاجرین کی آمد یوں تو کئی صدی سے شروع تھی لیکن اس وقت ان کی تعداد اچانک بے اندازہ بڑھ گئی جب ۱٦۰۹ء میں دای (dey) عثمان نے اُن لوگوں کی آؤ بھگت کی جنھیں فلپ سوم نے ملک سے نکال دیا تھا ۔ جو مہاجر شہری زندگی کے عادی تھے وہ تونس میں دو مقامات میں آباد ہو گئے : شارع الاندلس (جنوبِ غربیِ 'مدینہ') میں اور حَوْمَۃالاندلس میں (قریبِ موضع الحلفاوِیّین) ۔ انھیں اندلسی مسلمانوں نے سرخ رنگ کی ٹوپی یا شاشِیّہ بنانے کی صنعت یہاں جاری کی ۔ ۱۷۲۴ء میں پیسونیل Peyssonnel نے لکھا ہے کہ یہ لوگ ہر سال چالیس ہزار درجن ٹوپیاں بنا لیتے تھے اور پندرہ ہزار سے زیادہ آدمی اس صنعت میں مصروف تھے ۔ ان اندلسی مسلمانوں، مشرق سے آئے ہوے حنفی ترکوں، یورپی اصل کے نومسلموں اور بحری قزّاقوں نے مل ملا کر سترھویں صدی کے تونس کو اس کے مخصوص رنگ میں رنگ دیا ۔ 'دای' یوسف اوّل پہلا شخص تھا جس نے مصالحِ عامّہ

کی طرف توجه دے کر نام پیدا کیا، ان کی فہرست ابن ابی دینار نے دی ھے: اُس نے باب البنات کے گرد ایک تجارتی محلّه قائم کیا اور اسی علاقے میں اُونی تاگے (‹الغزل›) کی منڈی دوباره آباد کی - جربة کے سوداگروں کے لیے ایک نئی منڈی بنائی اور دوسری کئی منڈیوں کی اصلاح کی اور حفصی عہد کے اسواق کو شمال کی طرف پھیلایا، یعنی سوق البشامقیّة [۱] (جو ترکی طرز کے پائنجامے بناتے تھے؛ شارع سیدی بن زیاد)، سوق البرکة [۲]، جہاں سیاه فام غلاموں کی تجارت ھوتی تھی اور سوق الترک (El-Trouk)، ترکی درزیوں کا بازار؛ ایک قہوه خانه قائم کیا اور شہر کے مختلف مقامات مثلاً جامع مسجد تک اور سوق الترک سے پرے تک آبگذروں کے ذریعے آب رسانی کا انتظام کیا - سوق الترک میں اس کے مقرّب علی ثابت نے ۱٦۲۰ء میں خوبصورت سا ‹میضأة› [جاے وضو] تعمیر کیا، جو اب بیوِدیر Belvedere [مہتابی] کی زینت ھے: علی ثابت نے ربضِ باب الجزیرة کی قدیم مسجد کی مرمت بھی کرائی تھی - غالباً جامع مسجد کے مشرقی دروازے (باب الجنائز) کی جدید تعمیر کو بھی اسی زمانے سے متعلق سمجھنا چاھیے - یوسف نے شارع سیدی بن زیاد میں حنفیوں کے لیے مدرسه (۱٦۲۲ء میں) اور مسجد بنوائی، اس مسجد کا منار مثمن ھے اور اس کے پہلو میں یوسف کی قبر بھی ھے - اس کے عہدِ حکومت کے بعد دایات کے اقتدار میں ضعف آنا شروع ھو گیا: انھوں نے پھر کسی بڑے کارِ عمومی کا اھتمام نہیں کیا - احمد خوجه (۱٦۴۰ تا ۱٦۴۷ء) نے صرف مدارسِ الشمّاعیّة و العنقیّة کی تجدید پر اکتفا کی اور محمد لاز نے ۱٦۴۹ء میں القصر کی مسجد کا عجیب و غریب منار بنوایا - ۱٦۵۳ء میں اس کی وفات پر اس کے اور اس کے خاندان کے لیے قصبة کے چوک میں ایک ‹تُرْبَة› (مقبره) تعمیر ھوا.

مُرادی خاندان کے بایات (حکمرانوں) نے بہت سی عمارتیں بنائیں؛ مثلاً حمّوده نے یوسف دای کی مسجد کی طرز پر اسی محلے کے قرب میں حنفیوں کے لیے مسجد سیدی بن عروس تعمیر کرائی، جو ۱٦۵۴ء میں مکمّل ھوئی اور اس کے پہلو میں اپنے خاندان کے لیے ایک مقبره بھی بنوایا - اُس نے جامع مسجد کے منار کو بھی از سرِ نو تعمیر کرایا اور العزّافین (El-Azafine) کے بازار میں ایک شفاخانه (مارستان) بھی بنایا اور پخته آب گذر (Aqueduct) بھی نئے سرے سے بنانا شروع کیا - اس کے بیٹے مُراد نے ۱٦۷۳ء میں مدرسة المرادیّة بزّازوں کے بازار (سوق القمّاش) میں تعمیر کرایا، اس کے دوسرے بیٹے محمد الحفصی نے سوق الشاشیّة کی بنا ڈالی اور اس کے پوتے محمد نے ۱٦۷۵ء کے بعد سیدی محرز کی اصلی مسجد تعمیر کرائی - کہتے ھیں که فرانسیسی مہندس داویله Daviler نے گنبدوں کا نقشه تیار کیا تھا - ۱٦٦٦ء میں شِوالیے در ویو Chevalier d' Arvieux نے اپنے مذکرات (memoirs، پیرس، ج ۴، ۱۷۳۵ء) میں تونس کا بہت اچھا بیان لکھا ھے - قصبة (یا کسبه)، جو پاشاؤں کے زوال سے پہلے ان کی فرودگاه تھا، دو بڑی عمارتوں پر مشتمل تھا - پہلی میں ‹ دای › کا محافظ گارڈ، ان کے افسر اور ان کے بال بچے رھا کرتے تھے - دوسری عمارت جو اس کے پیچھے تھی اس میں ایک بہت بڑا ایوان (‹السقیفة›) تھا، جس میں ‹ دای › اپنے فوجی سپاھیوں کو شرفِ باریابی بخشتا تھا اور عمارت کے دور ترین حصے میں اس

[۱] جمع بَشامقی یعنی بَشامق کے کاریگر، واحد بَشماق، اصل میں اس کلمے کے معنی ھیں صَنْدَل، سلیپر جو ترک عورتیں گھروں میں پہنا کرتی تھیں، پھر مرد بھی پہننے لگے - یه بازار اب تک قائم ھے، منه ٣ -]

[۲] اس بازار میں اب تک نادر اشیاء اور جواھرات کی تجارت ھوتی ھے -]

کی خصوصی قیام گاہ تھی ـ دیوان، جس میں آغا فوجی مجلس (کونسل) کی صدارت کیا کرتا تھا، مستطیل شکل کا بڑا سا صحن تھا (قب مفصّل بیان از لا کونڈامین La Condamine، در R.T.، ۱۸۹۸، ص ۸٦) ; عدالتِ شرع (المحکمۃ الشرعیۃ) کا اجلاس اب تک یہیں ہوتا ہے ـ المدینۃ سے مغرب اور شمال مغرب کے علاقے میں (خاص کر Rue du Pacha یعنی طریق الباشا میں) امراء و رؤساء رہا کرتے تھے اور حقیقی ترکی محلّہ یہی تھا ـ بایات (beys) اور دوسرے اعلٰی طبقے کے لوگوں کے شاندار مکانات سنگ مرمر[؟] سے آراستہ تھے؛ ان مکنوں کی ایک خصوصیّت یہ تھی کہ ان کے وسط میں ایک صحن ہوتا تھا جس میں بعض اوقات زیبائش کے لیے ایک کوشک یا ایک چھوٹا سا پانی کا حوض بنا دیا جاتا تھا؛ کمروں کے ساز و سامان اور دوسری زیبائش میں بدقسمتی سے گھٹیا قسم کے اطالوی کام کی نقل کی طرف میلان شروع ہو چکا تھا.

بحری قزاقوں (قرصان) کی بڑھتی ہوئی غیرمعمولی سرگرمیوں کی وجہ سے عیسائی غلاموں کی تعداد زیادہ ہو گئی (چنانچہ ۱٦۰۳ء میں ان کی تعداد چھے ہزار تھی ـ ان کی طرزِ زندگی کے متعلق قب پنیوں Pignon، در R. T.، ۱۹۳۰ء، ص ۱۸ ببعد) ـ اس سے ان عجیب و غریب قیدخانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا جن میں سے ہر ایک اُس قدّیس (Saint) کے نام سے موسوم تھا جس کے نام کی (مسیحی) عبادت گاہ (chapel) ان کے اندر ہوتی تھی ـ ۱٦۳۰ء میں بقول الاب دان Father Dan ان کی تعداد ۹ تھی جو جلد ہی ۱۲ تک پہنچ گئی ـ ایک روایت کے مطابق القدّیس ونسینٹ دی پال St. Vincent de Paul ۱٦۰۵ء سے لے کر ۱٦۰۷ء تک تونس میں قید رہا ـ اگر ہم گراں شاں P. Grandchamp

کے ساتھ اتّفاق کرتے ہوے (La France en Tunisie au XVII^ème siècle, Avant-propos des t. VI et VII، تونس ۱۹۲۸ تا ۱۹۲۹ء) اس روایت کو محض افسانہ سمجھیں تاہم دوسری طرف یولیاں گیران لازاری (Lazarist Julien Guérin، ۱٦۴۵ تا ۱٦۴۸ء) کے تبلیغی مشن کو خاص اہمیت دینی چاہیے، جو محمد چلبی [اصل مقالے میں : Shalabı] المعروف بہ دون فلیپ کو جو 'دای' احمد خوجہ کا بیٹا تھا، عیسائی بنانے میں کامیاب ہوا ـ اسی طرح ایک دوسرے مشنری ییان لِ واشے Jean le Vacher کا تبلیغی کام بھی قابلِ توجہ ہے، جو ۱٦۴۸ تا ۱٦۵۳ء اور ۱٦۵۷ تا ۱٦٦٦ء فرانس کی طرف سے قونصل تھا (قب R. Gleizes: *Jean le Vacher*، پیرس ۱۹۱۴ء اور در *Revue des questions histor.*، جولائی ۱۹۲۸ء) ـ یہ اسی شخص کا زمانہ تھا جس میں پہلا عام مسیحی عبادت خانہ قونصل خانے میں تعمیر ہوا اور قدّیس لوئیس St. Louis کو نذر کیا گیا؛ یہی شخص تھا جس نے قدّیس انطونیوس St. Antony کے گرجے کو، جو رومن کیتھولک قبرستان کے عین وسط میں تھا اور منہدم ہو چکا تھا، از سرِ نو تعمیر کیا اور اس کے گرد بلند دیواریں بنوا دیں ـ یہ باب البحر کے باہر واقع تھا (اُسی موقع پر جہاں موجودہ کلیسیاے جامع Cathedral بنا ہوا ہے) ـ اُسی نے قیدخانوں کی عبادت گاہوں میں عبادت کی تنظیم کی اور اُسی نے ایک قطعۂ زمین لے کر دیوان کی اجازت سے وہاں ایک نئے قونصل خانے یا فُندُق الفرنسیین کی بنیاد ڈالی، جس کی تکمیل ۱٦٦۱ء میں ہوئی (شارع الدیوان القدیم rue de l'Ancienne-Douane؛ Grandchamp : کتاب مذکور، ٦ : xxii تا xxxii) ـ ۱٦۷۲ء سے اطالوی کپوشی راہب Capucins اس مشن کے نگران رہے : ۱۷۳۰ء میں ساں گیروے St. Gervais نے ان کی سکونت گاہ کا حال بیان کیا ہے (*Mémoires*

historiques، پیرس ۱۷۳۶ء، ص ۸٦) - اس نے یونانی کلیسا اور فرقۂ ثالوثیین (Trinitarians) کے اس ہسپتال کا بھی حال بیان کیا ہے جس پر بہت سے اموال وقف تھے - پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگوں کو باب قَرْطاجَنّۃ کے باہر قدّیس جارج کے قبرستان میں دفن کیا جاتا تھا، جہاں آج کل انگریزی گرجا واقع ہے - قونصل خانے کے زیر حمایت ہونے کے باوجود عیسائی سوداگروں کی تعداد بظاہر کبھی بھی بہت زیادہ نہیں ہوئی - مدّتِ دراز تک فرانسیسی ''قوم'' کے صرف چھے سوداگر تھے - بیرونی تجارت زیادہ‌تر یہودیوں کے ہاتھ میں تھی - ان میں سے بعض ہسپانیہ یا پرتگال کے مہاجر تھے، جو ۱۴۹۲ اور ۱۴۹٦ء میں وہاں سے نکالے گئے تھے اور جو یہاں براہِ راست یا براہ اٹلی پہنچے تھے؛ یہ لوگ پرانے تونسی [یہودیوں] (تَوَانِسَۃ) سے بخوبی ممیّز ہو سکتے تھے - پرتگیزوں یا لِوْوَرنی "*Livornese*" ('گَرَانَہ') نے آخرکار اپنی علیحدہ جماعت بنا لی اور سُوق الْگَرَانَہ کا نام ان کے نام پر رکھا گیا - یہودیوں کا قبرستان شہر کی دیواروں کے باہر محلّۂ باب السُّوَیْقَۃ کے مشرق اور آج کل کے سُوق سیدی سِفیان (Rue Sidi Sifiane) کے علاقے میں تھا، اس کے بعد یہ قبرستان جنوب کی طرف پھیلا.

سترھویں صدی کے آواخر اور اٹھارھویں صدی کے آغاز کے سیاسی ہنگاموں میں تونس پر اھل الجزائر نے دو دفعہ (۱٦٨٦ اور ۱٦٩۴ء میں) قبضہ کیا اور بدامنی کے اس زمانے میں کشت و خون بھی ہوا - فصیلیں شدید حملے کی تاب نہ لا سکیں، کیونکہ ان کی تعمیر ''قلعہ بندی کے کسی اصول پر نہیں ہوئی تھی؛ کون شخص ایسی فصیل کو مستحکم قلعہ بندی قرار دے سکتا ہے جس میں فاصلے فاصلے پر مربّع برج فصیلوں سے ملحق کر دیے گئے ہوں؟'' بات یہ ہے کہ تونس اھل الجزائر کے رحم و کرم پر تھا، یہاں تک کہ حسینیوں کے زمانے میں بھی یہی صورت تھی، چنانچہ انھوں نے ۱۷۳۵ء میں یہاں لوٹ مار کی اور ۱۷۵٦ء میں بھی اھل تونس نے ان کا بے‌سود مقابلہ کیا اور وہ دفاعی استحکامات ان کے کچھ کام نہ آئے جو علی پاشا اور اس کے بیٹے محمد نے جلدی جلدی بنا ڈالے تھے - ان استحکامات میں ایک دُھس‌بندی تھی، جس میں روزنے یا کُلُوخ‌انداز بنائے گئے تھے، ایک خندق تھی جو جبل جِلّاز اور مَنُوبِیّۃ کے دو نوتعمیر قلعوں کے درمیان واقع تھی اور ایک مستحکم پشتہ بھی تھا، جو قصبۃ یا کَسْبَہ کے عقب میں تیّار کیا گیا تھا - اس زمانے میں دو اور قلعوں کا ذکر آتا ہے، جو شمال مغرب کے ٹیلوں پر بنائے گئے تھے - یہ قلعے بلا شبہہ حسب ذیل تھے: برج السَّواٰرۃ یا طاحونۃالریح (یعنی ہوائی چکی والا قلعہ جو ہسپانیوں کا تھا) اور برج الرّابطۃ ([یعنی بای کے] اناج کے مخزن والا، یہی وہ قلعہ تھا جسے Rabta کہا گیا ہے) جس کے پہلو میں تھوڑے سے فاصلے پر چھوٹا سا برج فِلفِل تھا (قبّ Plantet : *Corresp....Tunis*، ۲ : ۱۰۵؛ اور برائے سال ۱۸۲۹ء: Monchicourt : *Relations inédites*.... *Filippi*...، ص ۴۷ و ۹۱).

جنگوں کے درمیانی پُر امن وقفوں میں شہر کی رونق نئی عمارتوں کی وجہ سے بڑھتی گئی - نئے خاندان کے بانی حسین بن علی کے عہد میں شہزادی عزیزہ عثمانہ، جو 'دای' عثمان کی پرپوتی تھی، ۱۷۱۰ء میں فوت ہوئی اور مدرسۃالشّمّاعیّۃ کے قریب دفن ہوئی - بہت سے خیراتی کام اور رفاہ عامّہ کے ادارے اس کے گراں بہا عطیات سے مستفید ہوے - حسین خود بھی نئی عمارتوں کے بنوانے کا بہت شوقین تھا - اس نے (قبّ المَشْرَع المَلَکی، *R.T.*، ۱۸۹۵ء، ص ۳۲۸ تا ۳۲۹) 'مدینے' کے جنوبی محلّے میں ''جامع الجدید'' یا جامع الصّباغین

(مسجد رنگرزان) تعمیر کرائی؛ اس کا منار ہشت پہلو تھا - اس نے گلی کوچوں اور عمارتوں کے نقشے تجویز کیے، جو سُوق السَّرّاجِین (گھوڑوں کا سامان بنانے والے [تصحیف السراجین؟]) سے ملحق ہیں - اس کے عہد میں 'دای' قرہ مصطفی کا مقبرہ مسجد القَصر el-Kṣar کے پہلو میں بنا؛ یہی وہ 'دای' تھا جس نے پایۂ تخت کو [قیصر سعید] باردو میں منتقل کیا - گذشتہ صدی میں ابن ابی دینار (ص ۲۹۹، ترجمہ ص ۵۰۶) نے یہ تسلیم کیا تھا کہ تعلیم و تدریس رو بہ انحطاط تھی لیکن اس کے باوجود دای حسین نے مدارس کی تعمیر میں حقیقی دلچسپی ظاہر کی اور المدرسۃ النَّخْلَة (کھجور والا مدرسہ) المدرسۃ الحُسَینیّة اور المدرسة الجدیدة قائم کیے - اس کے متصل بعد کے جانشین علی پاشا نے اس کی پیروی میں چار مدرسے اور بنائے، یعنی الباشیّة، سُوق کتب فروشان میں، السلیمانیّة اپنے متوفی بیٹے سلیمان کی یادگار میں، مدرسۂ بئرالحجار، مدرسۂ حَوانیت عاشور اور اس کے کچھ عرصے بعد علی بای نے ایک اور مدرسۂ 'جدیدۃ' بنوایا - اس علی بای نے حُسینیوں کا مقبرہ معروف بہ "تربت البای" بھی بنوایا، جو رنگرزوں کی مسجد کے قریب تھا - اس نے ۱۷۷۵ء میں ضعیف اور غریب آدمیوں کے قیام کے لیے 'التَکیّة' (the Tekia) بھی بنوایا - ۱۸۰۰ء کے قریب یوسف صاحب الطّابع نے، جس کی تحویل میں شاہی مُہر رہا کرتی تھی، حَلْفاوِیّین کے چوک میں ایک مسجد بنوائی، جو اس کے نام سے مشہور چلی آتی ہے - یہ مسجد، جیسا کہ اس کے بیرونی بلند رواق (gallery) سے ظاہر ہے، غالباً مسجد المُعَلّق علی الحَلفاوِیّین کے محلّ وقوع پر ہی تعمیر ہوئی تھی، جس کا ذکر چودھویں صدی میں ابن ناجی (۳: ۱۴۹) نے کیا ہے - اس محلّے میں اس نے ۱۸۰۳ء میں فوّارۂ حلفاوِیّین تعمیر کرایا، جو باب سِیدی عبدالسلام کے اندر تھا اور شہر کی دوسری طرف باب اللّواء (Bāb Allewa) میں چارپایوں کو پانی پلانے کے لیے دو حوض بنوائے۔

اُس کے مولا حمُّودة پاشا نے قصبے (یا کَسْبَہ) کے ذرا اوپر دارالبای کی تکمیل کرائی، جہاں ۱۸۱۶ء میں کیرولِین برنزوکی Caroline of Brunswick ٹھیری تھی - حموده پاشا نے اپنی تمام توجہ اور سرگرمی فوجی عمارتوں اور بارکوں کی تعمیر میں صرف کر دی - تونس کی حفاظت اور خاص کر اهل الجزائر سے اسے بچانے کے لیے اس نے بیرونی فصیلیں ایک ولندیزی مہندس کی نگرانی میں دوبارہ تیار کرائیں - دروازوں کے متّصل برجوں کے کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعمیر ۱۷۹۷ سے ۱۸۰۳ء تک جاری رہی مگر جنوب کی طرف ان کی تکمیل کبھی نہ ہو سکی (قب *R.T.* : H. Hugon، ۱۹۰۵ء، ص ۳۷۳؛ *R. T.* : G. Dolot، ۱۹۰۸ء، ص ۲۹۸) - یہ لوگ اس بات پر مطمئن ہو گئے کہ جنوب کی جانب میں علی پاشا کے زمانے کا آگے بڑھا ہوا پشتہ اور مورچہ اور مکانوں کی دیواروں کا تقریباً غیر منقطع سلسلہ مدافعت کے لیے کافی ہے - حمودة نے (۱۷۹۸ء میں) اپنے عالی شان کوشک کے ساتھ ساتھ المَنوبة میں فوجی بارکیں بنوائیں اور ۱۸۱۳ء میں، یعنی اپنی زندگی کے آخری ایّام میں سُوق العَطّارِین کے وسط میں اور بارکیں بھی بنوائیں [آج کل ان میں دارالکتب العامّة (پبلک لائبریری) اور محکمۂ آثارِ قدیمہ کے دفاتر ہیں؛ قب M. Houdas : *Note sur trois inscriptions de Tunis*، در *Bull. Archéol.*، ۱۹۱۱ء] - اسی زمانے میں اور بہت سی بارکیں 'مدینے' میں بنیں، مثلاً شارع القَشْلَة (Rue de La Caserne) میں، جن میں اب ابواب البرّ کی جمعیت فرانسیسی (Société Française de Bienfaisance) کا دفتر ہے، شارع الکنیسة (Rue de l' Église) میں جہاں اب محکمۂ نظام حُبُوس یعنی ادارة الاوقاف ہے، شارع سُونِی کِت

(Rue des Moniquettes) اور شارع سیدی بن زیاد میں؛ لیکن ان سب سے بڑی بارک موسوم بہ برنجی آلای، یعنی ''پہلی پلٹن'' تھی، جو اب Caserne Saussier کہلاتی ہے اور جسے بای حسین بن محمود اور بعد ازاں اس کے بھائی مصطفے نے (۱۸۳۵ تا ۱۸۳۶ء میں) سابق مصلّی کے مقام پر المرکاض کے قریب تعمیر کیا۔ ۱۸۳۹ء میں ''جیش تونس'' کے بانی احمد بای نے شہر کے باہر توپ خانے کا ایک ڈپو (جو آج کل Caserne Forgemol ہے) بنوایا تھا۔ علی پاشا نے دو موقعوں پر (۱۷۳۳ اور ۱۷۳۳ء میں) صرف اسی بات پر اکتفا کی کہ اس نے طولون Toulon سے ایک ریختہ گر (توپیں ڈھالنے والا) منگوا لیا، جس نے ایک عارضی کارخانے میں چند توپوں کی مرمت کر دی لیکن حمودہ پاشا کے عہد میں ایک باقاعدہ کارخانہ توپیں ڈھالنے کے لیے چند فرانسیسیوں کی مستقل نگرانی میں حفصیہ محلّ کے ایک بازو میں قائم کیا گیا (the Hafsia؛ یہ محلّ اسی نام کی شارع میں ہے)۔ آخر میں احمد بای نے 'دبدابۃ' کی تنظیم کی (قب *R. T.*، ۱۹۲۲ء، ص ۲۷۶)، جہاں فوج کی ضروریات کے لیے روٹی اور تیل تیار کیا جاتا تھا (شارع دبدابۃ، دارالبای اور شارع الصبّاغین Rue des Teinturiers سے ذرا شمال کی طرف ہے)۔

عین اس زمانے میں جب فوجی تعمیرات کی وجہ سے تونس ایک فوجی مستقرّ (چھاؤنی) کی شکل میں تبدیل ہوتا معلوم ہوتا تھا الجزائر پر (۱۸۳۰ء میں) فرانسیسی قبضہ ہو جانے کی وجہ سے اور بایات کی اصلاحات کے اجراء کے باعث یورپی آبادی روز بروز زیادہ آزادی کے ساتھ ترقی کر رہی تھی، یہاں تک کہ 'مدینے' (شہر) کے اندر اس کے قدم خوب راسخ ہو گئے۔ عیسائیوں نے شہر میں دکانیں کھول لیں اور پرانے کلیسائے صلیب مقدّس کے علاوہ دیگر مذہبی عمارتیں بھی بننے لگیں (یہ گرجا شارع کنسبۃ میں واقع تھا، ۱۸۳۳ء میں اسے شارع الکنیسۃ کے سابق مارستان ثالوثیین میں منتقل کر دیا گیا)۔ اس گرجے کے رجسٹر [سجلّات] تونس میں رومن کیتھولک مذہب کی تاریخ کے لیے بہت قیمتی مواد بہم پہنچاتے ہیں۔ ۱۸۳۱ء میں سولیمۃ میں اطالوی سکول کھولا گیا اور ۱۸۴۰ء میں موورپرگو Morpurgo میں یہودی مدرسہ اور ۱۸۴۱ء میں زنقۃ البابّاص ([مشنریوں کے کوچۂ سر بستہ] Impasse du Missionaire) میں بورگاد کالج (Bourgade College) جاری ہوا۔ پلاس د لا بورس *Place de la Bourse* [یعنی میدان صرّاف خانہ] کا تمام محلّہ (جس کا نام حال ہی میں میدان کاردینال لاوگیری Place du Cardinal Lavigerie رکھا گیا ہے) موجودہ شارع الدّیوان القدیم (Rue de l'Ancienne Douane)، شارع گلاسیئیہ (des Glacières) اور شارع کومیسیئون (de la Commission) بالکل یورپی محلّے بن گئے۔ فصیلوں کے باہر موجودہ شہر جھیل کی طرف پھیلنا شروع ہوا، چنانچہ فرانس کا قونصل‌خانہ ۱۸۶۱ء میں اس عمارت میں منتقل کر دیا گیا جسے آج کل مقیمیّۃ عامّ (Résidence Générale) کہتے ہیں۔ مگر دوسرے قونصل خانے ابھی تک شہر کے اندر ہیں: ہسپانیہ کا قونصل خانہ شارع سیدی البونی میں ہے، برطانیہ کا (میدان کاردینال لاوگیری Place du Cardinal Lavigerie میں)، اٹلی کا شارع زرکون (rue Zarkoun) میں؛ یہ یہاں سے جلد منتقل ہونے والا ہے)۔

یورپ والوں کا رسوخ اتنا قوی ہو گیا کہ اس کا اثر آخرکار خود شہر کے اداری معاملات پر بھی پڑا۔ حفصیوں کے زمانے میں دونوں ربضوں میں ایک ایک شیخ تھا؛ یہ غالباً 'شیخ المدینۃ' کے تحت ہوں گے؛ ترکوں کے زمانے میں بھی یہ تینوں عہدے قائم رہے؛ اور شہرداروں کی گشتی ٹولیاں ('لوّاجۃ') باری باری سے ان کی مدد کیا کرتی تھیں؛ ان کا فرض

یہ تھا کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ رات کے وقت دروازے بند ہونے کے بعد شہر میں پہرے لگے رہیں ۔ اُن کے تحت مختلف 'مُحَرِّک' یعنی محلّوں کے چودھری تھے ۔ حُسینیوں کے زمانے میں دن کے وقت پولیس کا انتظام 'دَوْلَتلی' کے سپرد تھا ۔ اس تہسیدست 'دای' کے ماتحت ۲۰ حانبا [جانباز ؟] اور ۵۰ قَبِیجی (قب E. Pellissier : *Descr. de la régence de Tunis*، پیرس ۱۸۵۳ء، ص ۵۲ تا ۵۳) تھے اور وہ بازارِ سیدی بن عَروس کے ایک دالان میں، جسے 'دْرِیبَة' کہا کرتے تھے، پولیس مجسٹریٹ [رئیس البولیس] کے فرائض سرانجام دیتا تھا ۔ قَصَبَة کے انتظام کے لیے ایک علٰیحدہ آغا مقرّر تھا ۔ آخر ۱۸۵۸ء میں ایک مجلس بلدی (municipal council) قائم ہوئی، (جو ایک صدر، ایک نائب صدر، ایک سیکرٹری [کاتب سرّ] اور بارہ شرفاے شہر پر مشتمل تھی اور) جس کے اخراجات شراب اور الکحل (آبکاری) کے ٹیکس سے پورے ہوتے تھے ۔ ۱۸۶۰ء میں 'دَوْلَتْلِی' کی جگہ ایک فریق (division) کا جرنیل مقرّر ہوا، جس کے تحت ضَابِطیّة ("zapties") تھے ۔ شہر کو عصرِ حاضر کے مطابق بنانے کے لیے بڑی زبردست کوششیں ہوئیں : الجزائر تک تار کا سلسلہ قائم ہوا اور حلق الوادی (La Goulette) تک ریل بنائی گئی؛ شہر میں پانی کے نکاس کے لیے نالیاں بنائی گئیں اور ایک فرانسیسی انجینیر کولانْ Colin نے [جَبَل] زَغْوان Zaghouan سے پانی لانے کا بندوبست کیا ۔ بُرجِ آب نے اس مسقّف حوض ('خَزْنَة') کی جگہ لے لی جو اس سے پہلی صدی میں بیرونی فصیلوں کے دروازے، باب سیدی عبداللہ، کے پہلو میں تعمیر ہوا تھا، جو قَصَبَة (یا کَسْبَة) سے ملحق ہے ۔

اِن جدید تعمیرات میں [حُکّام کو] اتنی مصروفیت تھی کہ کسی بڑے پیمانے کی مذہبی عمارتوں [مساجد وغیرہ] کی تیّاری کے لیے انھیں مہلت نہ مل سکی، تاہم ہم سیدی ابراہیم الرِّیاحی (م ۱۸۵۰ء، قب *R. T.*، ۱۹۱۸ء، ص ۱۲۴) اور حسینی عہد کے فقہاء کے متعلق دیکھیے السَّنوسی : مُسامرات الظَّریف، تونس، بلا تاریخ) کے شاندار زاویے کا ذکر کر سکتے ہیں؛ لوگ اس شیخ سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور اس عقیدت میں آج تک بھی کوئی کمی نہیں آئی ۔ ۱۸۷۵ء میں شارع الکنیسة (rue de l'Église) کی بارکوں میں صادقی کالج کی بنیاد پڑی، جس کا نام بای محمد الصادق کے نام پر رکھا گیا ۔ ۱۸۸۰ء میں مارستانِ صادقی بھی تعمیر ہوا ۔ بڑے بڑے محلّات میں ذیل کے محلّ قابلِ ذکر ہیں : زَرُّوق محلّ (در شارع القضاۃ)، اس میں پہلے 'دایات' (deys) رہا کرتے تھے ۔ دارِ حسین (جو اب قصر الفَریق (Palais de la Division) ہے)، اسے اٹھارھویں صدی میں بای کے ایک وزیر نے تعمیر کرایا تھا اور ۱۸۷۶ء میں اس کی مرمّت ہوئی؛ محلّ خیرالدین، جو قدیم حَفْصِیّة کو توسیع دے کر بنایا گیا تھا، ایّام حمایت (protectorate) میں کچھ عرصے تک وہاں (شارع المحکمة میں) دادگاہ (court of justice) قائم تھی، مصطفٰی بن اسمٰعیل کا محلّ شارعِ پاشا میں تھا اور محلّ خَزْنَة دار (سیدان حَلْفاوِیّین، شارع القصر) یہودیوں کا شفاخانہ بن گیا لیکن اب کچھ مدّت سے یہ عمارت استعمال میں نہیں آ رہی ہے ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علی پاشا کے خلاف حسین بن علی کے بیٹوں نے جو بغاوت اس سے پہلی صدی کے وسط میں کی تھی اس کے بعد وفادار "حُسَینیّة" حَلْفاوِیّین کے محلّے میں رہا کرتے تھے اور یہ لوگ بای کے منظورِ نظر تھے لیکن محلّۂ باب الجزیرۃ پر اس کا اثر خراب پڑا، کیونکہ وہ صف soff کا گڑھ تھا، جو "باشیّہ" کے خلاف تھے (قب *R.T.*، ۱۹۱۸ء، ص ۳۱۴) ۔

فرانسیسی قبضے کی وجہ سے (۱۸۸۱ء) تونس میں بڑے وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی ہے اور ابھی تک جاری ہے - یورپی شہر باب فرانسہ Porte de France (قدیم باب البحر) سے لے کر جھیل تک پھیلا ہوا ہے، جہاں جہازوں سے مال اتارنے کی گودیاں بنی ہوئی ہیں اور دوسری طرف بلویدیر Belvedere سے جلاز تک پھیلا ہوا ہے، پھر جنوبی محلّے کے جنوب میں فصیل شہر کے اندر اور باہر تک چلا جاتا ہے اور مون فلیری Mont-fleury کی چوٹیوں پر بھی آباد ہے - باہر کی دیوار اب تک قائم ہے مگر '' مدینے '' کی تمام دیواریں، چند دروازوں کے سوا، تقریباً سربسر معدوم ہو چکی ہیں - قصبۃ یا کسبۃ، جو یکسر دوبارہ تعمیر ہوا ہے، اب صرف فوجی بارکوں کے لیے استعمال ہوتا ہے - دارالبای میں اب محکمۂ امور داخلیّہ (Direction de l' Intérieur) ہے - دوسرے دفاتر اور نیا صادقی کالج (۱۸۹۷ء) اور قصر عدلیّہ سب حال کے زمانے کی عمارتیں ہیں، جو میدان کسبۃ سے شروع ہو کر شارع باب البنات کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہیں - ایک بجلی کی ٹرام ' مدینے ' (شہر) کے گردا گرد چلتی ہے لیکن شہر کے اندر نہیں جاتی - اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ شہر کی مشرقی ہیئت قائم رہے - بہت سی عمارتیں اب اپنے اصلی مصرف کے بجائے اور کاموں کے لیے استعمال ہوتی ہیں لیکن شہر کی عام ہیئت وہی ہے جو آج سے پچاس سال پہلے تھی - مذہبی تعلیم کا مرکز بدستور جامع مسجد ہی ہے، جس کا منار ۱۸۹۴ء میں سر بسر دوبارہ تعمیر ہوا؛ ۱۸۹۶ء میں مقیم [فرانسیسی] ملّیہ (resident Millet) نے سوق العطّارین میں (مدرسۂ) خلدونیّۃ کی بنا ڈالی، تا کہ مسلم نوجوان جدید علوم کے مبادیات کی تحصیل کر سکیں - ملکی لوگوں کی تجارت اور صنعت و حرفت کے لیے مختلف اصناف (gilds) کی الگ الگ منڈیاں (سُوق) ہیں اور ہر منڈی ایک 'امین' کی نگرانی میں ہے؛ بعض میں باہر کے سیّاح بکثرت آتے جاتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ '' مشرقی '' مال و اسباب مثلاً عطریّات، قالین، چرمی اشیاء وغیرہ کی تجارت وسیع پیمانے پر ہوتی ہے، سُوق الکُتُبیّین (بازار کتب فروشاں) اور سُوق البرکۃ میں کتابوں اور زیورات کی فروخت منادی کے ذریعے ہوتی ہے - یہود کے ذلیل محلّے کو اُس کے وہ باشندے چھوڑ چکے ہیں جو زیادہ امیر ہو جانے کی وجہ سے یہاں سے اٹھ کر میدانِ پوتییہ (Place des Potiers) کے قرب میں یا یورپی شہر میں رہنے لگے ہیں، اب اس محلّے میں بہت جلد وسیع مکانات اور سڑکیں بن جائیں گی [مقالہ نگار ۱۹۳۱ء کے حدود میں یہ مقالہ لکھ رہا ہے] - اس کے برعکس مسلمان پرانے شہر ہی میں رہتے ہیں ماسوا اُن چند امیر آدمیوں کے جنھوں نے طریقِ پاریس (Avenue de Paris) کے سرے پر اپنے لیے کوشک بنا لیے ہیں یا چند امینوں کے جنھوں نے (بلویدیر Belvedere کے جنوب مغرب میں) العُمران کے نئے گاؤں میں اپنے مکان بنا لیے ہیں - آخر میں ان دورتر اُرباض (رادِس، حمّام الانف، قرطاجنّۃ المرسی) کا ذکر بھی ضروری ہے، جن کی آبادی بڑھ رہی ہے اور جہاں، یورپی، مسلم اور یہودی آباد ہیں - حقیقت میں یہ آبادیاں اب تونس ہی میں مل گئی ہیں۔

مجلس بلَدی (میونسپل کونسل) کی تشکیلِ جدید تصویب نامۂ مصدّرۂ ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۳ء کی رُو سے، بالحاقِ تصویب نامہ ہائے ۱۸۸۸ و ۱۹۱۴ء، جو علاقے بھر کی مجالسِ بلدیّہ کے متعلّق صادر ہوئے تھے، عمل میں آئی - یہ مجلس صدر، دو نائب صدر (فرانسیسی) اور ۱۷ اراکین پر مشتمل ہے، جن کا تقرّر سرکاری تصویب نامے کے ذریعے ہوا (۸ یورپی، ۸ مسلمان اور ایک تونسی

یہودی) ۔ گذشتہ مردم شماری (۱۹۲۶ء) کی رو سے تونس کی آبادی ۱,۸۰,۹۹۶ تک پہنچ گئی تھی، جس میں ۲۷,۹۲۲ فرانسیسی، ۵۱,۲۱۳ دیگر یورپی، ۸۲,۷۲۹ ملکی مسلمان اور تونس کے ۲۳,۱۳۱ یہودی شامل ہیں.

مآخذ: (۱) Saladin : *Tunis et Kairouan*، پیرس ۱۹۰۸ء (بیانات کی تصدیق کر لی جائے)؛ (۲) Dessort (بہم کاری دیگران) : *Histoire de la ville de Tunis*، الجزائر ۱۹۲۴ء (اس میں کارآمد باب صرف ایک ہی ہے، جو احتلال سے پہلے اُنیسویں صدی کے ان اہل یورپ کا حال بیان کرتا ہے جو تونس میں تھے)؛ (۳) G. Marçais : *Manuel d'art musulman, L' Architecture*، ج ۲، پیرس ۱۹۲۶ تا ۱۹۲۷ء (بڑے بڑے آثار کا نہایت عمدہ بیان، دیکھیے ص ۸۷۱ تا ۸۷۵ میں تونس کے اسلامی محلات کی معماری خصوصیتوں کا مطالعہ)؛— (۴) قب نیز وہ حوالے جو نفسِ متن یا مادۂ (تونس ملک) میں دیے گئے ہیں.

(روبرٹ برنشوگ ROBERT BRUNSCHVIG)

تُونس (ملک) Tunisia : یہ ملک بلادِ المغرب (Barbary) کی مشرقی ڈھلان پر مشتمل ہے، تقریباً وہی علاقہ جسے قرون وسطی میں اِفریقِیّۃ کہتے تھے۔[۱۸۸۱ء سے قریب کے زمانے تک تونس کی نیابت (ریجنسی) فرانس کی حمایت میں تھی].

۱ - جغرافیۂ تونس

تونس کی موجودہ سرحدوں کے حساب سے یہ ۸ اور ۱۱ درجے طول بلد شرقی اور ۳۲ اور ۳۷ درجے عرض بلد شمالی کے درمیان واقع ہے ۔ اس کا رقبہ ۱,۲۵,۱۸۰ مربع کیلومیٹر ہے ۔ اس کی مغربی سرحد پر اسے الجزائر (قسطنطینة Constantine کا ضلع) گھیرے ہوئے ہے اور جنوب میں صحرائے اعظم ہے، جنوب مشرق میں دُور جا کر اس کی حد سابق اطالوی لیبیا یعنی [طرابلس] Tripolitania سے ملتی ہے ۔ اس کے شمالی اور مشرقی ساحل بحیرۂ روم کے ساحل ہیں، جن کی سطح عموماً پست ہے ۔ مجموعی طور پر اس کی آب و ہوا متوسّط طور پر گرم ہے لیکن بارش اس کے مختلف اضلاع میں ایک سی نہیں ہوتی بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سال کہیں زیادہ ہوئی تو کسی سال کم اور اس نمایاں کمی بیشی کی وجہ یہ ہے کہ ادھر اس پر سمندر کے قُرب کا اثر ہے اور اُدھر صحراء کے قرب کا؛ چنانچہ اس کی بارش میں طول بلد اور اس سے بھی بڑھ کر مقامات کی بلندی اور پستی کے لحاظ سے فرق پڑتا ہے ۔ ملک میں بلندی اور پستی بہت ہے، گو سطح سمندر سے اس کی اوسط بلندی زیادہ نہیں ۔ اس کے پہاڑوں کے سلسلے، جو الجزائر کے سلسلہ ہائے کوہ کا امتداد اور ان کا ایک سرا ہیں، عموماً جنوب مغرب سے شمال مشرق کی طرف پھیلے ہوئے ہیں .

شمال مغرب میں خمیر (Khrumiria) اور مُگود (Mogods) کے پہاڑ، جو کھریا مٹی (چاک) اور ریتلے پتھر سے بنے ہیں، الجزائر کے رخ شاذ و نادر ہی تین ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں؛ ان پر کثرت سے بارش ہوتی ہے اور بلوط کے جنگلوں اور گھنی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے ہیں؛ ان میں جست اور لوہے ('دَوَرِیّہ' Duaria) کی کانیں ہیں ۔ یہ پہاڑ ساحل کے ساتھ ساتھ چلے گئے ہیں، جہاں علی الترتیب طَبَرْقة کی چھوٹی سی بندرگاہ، پھر نِفْزَة کے ریتلے ٹیلے رأس العَبْد (Cape Nègre) اور رأس سِرات کا چھوٹا سا جزیرہ نما ملے گا ۔ مشرق میں یہ پہاڑ گھٹتے گھٹتے ان پہاڑیوں سے آ ملتے ہیں جو بنزرت Bizerta اور ماطر Mateur کے رسوبی میدانوں کو گھیرے ہوئے ہیں ۔ ان دونوں میدانوں کی زمین سیراب و شاداب ہے اور ان میں گیہوں کی اچھی فصلیں پیدا ہوتی ہیں ۔ بنزرت کی ساحلی جھیل میں، جو ایک تنگ آبنائے کی راہ سے سمندر کے

ساتھ ملی ہوئی ہے، جہازوں کے لیے نہایت عمدہ لنگرگاہ موجود ہے اور سِسِلی کے مقابل، جو تونس سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے، سمندر کا پانی بہت گہرا ہے ۔ ماطِر کے تقریباً سارے میدان پر، چند دلدلوں کے سوا جو اب تک موجود ہیں، مٹی کی تہ چڑھ چکی ہے ۔ اس میدان پر جبلِ اَشْکِل Achkeul مُشْرِف ہے، جو گٹھے ہوئے پہاڑوں کا حیرت‌انگیز مجموعہ ہے، مشرق کی طرف اور آگے جائیں تو غار المِلْح (Porto-Farina) کے اوپر رأس سیدی علیّ المکّی ملے گی، جو شمال کی طرف خلیج تونس کی حد معیّن کرتی ہے ۔ یہ خلیج رفتہ رفتہ اس رُسُوبی مواد سے پُر ہو رہی ہے جو مَجَرْدَة اور وادِ مِلیان بہا کر لاتے ہیں : اُوتیکا، جو رومیوں کے عہد میں بندرگاہ تھی، اب سمندر سے چھے میل دُور ہے، جزیرہ‌نمائے قرطاجنّة، جو کبھی جزیرہ تھا، اب برِّاعظّم افریقہ کے ساتھ ایک خاکنائے کے ذریعے ملا ہوا ہے ۔ یہ خاکنائے سَبْخَة الرِیَنَة (el-Riana) کو جھیل تونس سے جدا کرتی ہے ۔ ساحلی جھیل (بحیرۂ تونس)، جس کے سرے پر شہر تونس آباد ہے، جو ملک کا صدر مقام ہے، سمندر کے ساتھ آبنائے حَلْق الواد (La Goulette) کے راستے ملی ہوئی ہے ۔ تونس کا ناحیہ، جہاں بارش بہت زیادہ نہیں ہوتی، اناج کی کاشت کے لیے اتنا موزوں نہیں جتنا انگور اور پھلوں کی پیداوار کے لیے مناسب ہے .

مَجَرْدَة [مَجَرْدَة]، جو شمالی تونس میں سے گذرتا اور مغرب سے مشرق کو بہتا ہے، ملکِ تونس کا ایک ہی ایسا دریا ہے جسے دریا کہنا چاہیے، گرمیوں میں یہ بہت اُتر جاتا ہے، نومبر سے اپریل تک چڑھاؤ پر اور بہت گدلا رہتا ہے ۔ تِسْتُور Testur کی گھاٹیاں اور آبکند اس کی زیرین گذرگاہ (مجاز الباب اور طُبُرْبَة Tébourba) کو اس کی درمیانی گذرگاہ سے جدا کرتی ہیں، جہاں یہ دَخْلَة (سُوق الاَرْبعاء اور سوق الخَمِیس کے علاقے) کے عظیم رُسوبی نشیب کے پانی کو بہا لاتا ہے ۔ یہ نشیبی علاقہ اناج اور چارے کی پیداوار کے لحاظ سے ایسا ہی زرخیز ہے جتنی اس کے متصل باجَة Bedja کی کھریا مٹی کی پہاڑیاں ۔ دریائے [مَجَرْدَة] کی وادی کی شمالی حد پر بجاوة اور تبرسق Tebursuk کی پہاڑیاں ہیں جو سنگِ آہک سے بنی ہیں اور اس کے جنوب میں وسطی اور مغربی تونس کے موج نما بلند و پست علاقے پر کہیں چونے کے پتھر کی مُدوّر پہاڑیاں ہیں اور کہیں وسیع میدانی نشیب ۔ یہ نشیب و فراز الجزائر کے جبالِ اطلسِ صحرای کبیر کا امتداد ہیں : اس تلِّ مرتفع High Tell میں (جس میں تُبُرسُق، الکاف السِرْس و قصور ابّہ Ebba-Ksur اور ثالۃ کے ناحیے شامل ہیں) جہاں خودرو حلبی صنوبر کے جنگل، بلند جھاڑیاں اور وسیع چراگاہیں پائی جاتی ہیں، گیہوں کی کاشت کے لیے حالات موافق ہیں، سوا جنوب مغرب کے نسبۃً خشک‌تر حصوں کے، جہاں صرف جَو کی کاشت پر قناعت کرنا پڑتی ہے ۔ ملکِ تونس کا یہی علاقہ، بالخصوص الجزائر کی سرحد کے رُخ پر، ملک کا وہ حصہ ہے جو معدنیات کی دولت سے بھی سب سے بڑھ کر مالا مال ہے (جِرِسّة اور سُلْتَة میں لوہا ملتا ہے ۔ قلعۂ جِرْدہ اور قلعۃ السنام Kelaat-es-senam میں فاسفیٹ پائے جاتے ہیں) ۔ تونس کے دریا، جن میں کچھ مَجَرْدَة کے معاون ہیں (وادی مِلوگ W. Mellegue، وادی تاسۃ، وادی سِلیانَة) اور کچھ وادی مِلیان کے (الفَحْص اور مُرْناق کے میدان)، سب کے سب مستقیماً خلیج تونس میں آ کر گرتے ہیں .

تلِّ مرتفع کے جنوب کی طرف نمایاں‌ترین کوھستانی حدِّ فاصل شروع ہوتی ہے ۔ یہ پہاڑ،

جیسے ملکِ تونس کی ''ریڑھ کی ہڈی'' کہنا چاہیے، تبسّة کے آس پاس سے شروع ہو کر جبل زغوان (بلندی ۴,۳۰۰ فٹ، فاصلہ تونس سے ۴۰ میل) اور جبل الرّصاص اور بوقرنین تک چلا گیا ہے: اس میں بلندترین چوٹیاں شامل ہیں: جبل الشّعنبی Shambi (۵,۰۱۰ فٹ) اور السّمّة جو سلسلۂ کوہ بزاسین Byzacene میں شامل ہیں، مکثّر کا حجم دار تودۂ سنگی (یا خارہ massif)، سرج، برقو، کیرینۃ اور سلسلۂ جبال زیوگتنیة Zeugitania - اس پہاڑ میں چند درّوں اور گھاٹیوں کی راہ سے جنوب کے ساتھ مواصلات بآسانی میسّر ہیں، بالخصوص کسور [قصور] سبیبة کی گذرگاہ کبیر (great corridor) کے ذریعے - دوسری طرف جنوبی ڈھلانوں پر کے ندی نالے، مثلاً وادی مرجولیل، زرود اور الحطب (جو گمودہ کے میدان کو سیراب کرتا ہے)، بےقاعدگی سے بلکه وقفے وقفے سے بہتے ہیں اور جب کبھی بہتے ہیں تو ان شورہزار نشیبوں میں داخل ہو کر کھو جاتے ہیں جنھیں سبخے کہتے ہیں؛ مثلاً قیروان کے میدان میں جنوبی کلبیة اور جنوبی سیدی الہانی - یہ شورہزار نشیب ان عظیم بے درخت میدانوں میں واقع ہیں جنھیں ارض الجمل یا سر زمینِ شتّر کہنا چاہیے جو قفصة تک پھیلا ہوا ہے - اس میدانی علاقے کو صرف سنگِ آہک کی چند پہاڑیاں قطع کرتی ہیں، جن کی بلندی کچھ ایسی زیادہ نہیں؛ مغرب کی طرف یہ میدان گیاہ حلفاء یا شیبة (white artemisia) سے ڈھکا ہوا ہے اور مشرق کی طرف عنّاب کے درختوں سے، جہاں سے یہ بتدریج ڈھلتا ہوا ساحل سفاقس کی زمینِ عقبی (hinterland) میں اس علاقے سے آ ملتا ہے جس میں [بالفاظ یاقوت: غابة الزیتون، یعنی] زیتون کے جھنڈ ہیں - تاہم اس علاقے میں بہت سی وسیع زرعی زمین بھی ہے اور بہت سے ایسے رقبے موجود ہیں جو مویشیوں کے پالنے کے لیے مناسب ہیں - قیروان کے علاوہ اس میں جتنے شہر ہیں اس پہاڑ کے درّوں کے مخارج پر واقع ہیں جیسے ہم نے اوپر ملک تونس کی '' ریڑھ کی ہڈی'' کہا ہے - ان شہروں کے نام سبیطلة Sbeitla، کسریرة اور فرینة ہیں لیکن جوں جوں جنوب کو بڑھتے جائیں یہ میدان بارش کی قلّت کے باعث صحراء کے خواص اختیار کرتے چلے جاتے ہیں اور قفصة اور فاسفیٹ کے گراں بہا ذخیروں (المتلوی اور ردیف) کے پرے جا کر نشیبِ شطوط (شط الغرسة، جو سطح سمندر سے ۸۰ فٹ نیچی ہے، شطّ الجرید، شطّ الفجیج جسے جبلِ شرب اور جبل تبگة گھیرے ہوئے ہیں) اور الجرید کے نخلستانوں (توزر Tozeur اور نفطة) اور نفزاوہ کے دو نخلستانوں (قبیلی اور دوز) پر، جہاں کھجوریں پیدا ہوتی ہیں، ختم ہو جاتا ہے؛ یہاں صحرامے [اعظم] کی ابتداء ہوتی ہے - جنوب مشرق میں اور آگے بڑھ کر جبلِ دھر ہے (بلندی ۱,۳۰۰ سے ۲,۰۰۰ فٹ تک)، جو سنگ آہک اور کھریا مٹی سے بنا ہے - جبلِ دھر مع خارۂ مطماطة، صحرامے [اعظم] میں کے ایک بہت بڑے نشیب کی صرف مشرقی حد ہے.

نیابتِ تونس [ریجنسی] کے شمال مشرقی ساحل پر، جہاں پھلتے پھولتے مزرعے قائم کیے گئے ہیں، رأس ادار (Bon) کا اہم جزیرہ نما ہے - یہ '' ریڑھ کی ہڈی '' کے امتدادات میں خلیج تونس اور خلیج الحمّامات کے درمیان واقع ہے - اس کے ساحلی میدانوں کو درّہ ہای زغوان ('' فم الخرّوبة '') اور قرنبالیة Grombalia ملاتے ہیں - پھر آگے بڑھ کر نابل اور الحمّامات کے نارنگیوں کے باغات کے جنوب میں سہل سوسة اور اس کی وادیاں ہیں - یہ 'سہل' اب بھی بڑی حد تک سیراب و شاداب ہے، جس کی وجہ سے زیتون اور دوسری فصلوں کی پیداوار کی اتنی بہتات ہے کہ یہاں کی گنجان آبادی کے لیے بھی کفایت کرتی ہے - یہ لوگ

بڑے بڑے قلعہ بند دیہات میں رہتے ہیں ۔ دیہات کے نام یہ ہیں : قلعۃ کبیرۃ، قلعۃ سریرۃ، مساکن اور مکنین ۔ اگر المنستیر اور المہدیۃ دو چھوٹے چھوٹے جزیرہ نما بیچ میں حائل نہ ہوں تو خط ساحل بالکل مستقیم ہے۔

راس کپودیا سے تقریباً الجسور el-Djeur کے برابر کی سطح پر شروع ہو کر ساحل اندر کی طرف مڑ جاتا ہے اور خلیج سفاقس میں جزائر قرقنۃ، جنھیں ساحل سے سمندر کا بہت کم گہرا پانی جدا کرتا ہے، ساحل سے علیحدہ رہ جاتے ہیں۔ اس سے آگے یہ ساحل خلیج قابس کے (جو قدیم زمانے میں Little Syrtes (سرت الصغیرۃ) کہلاتی تھی) ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ اس خلیج سے اسفنج جمع کیے جاتے ہیں، جو محاصل کی ایک مد ہے ۔ خلیج کے انتہائی سرے پر قابس کے خرما بن نظر آتے ہیں ۔ ان کے اور نخلستان الحمّۃ (متّصل بہ شطوط) کے درمیان وہ گذرگاہ ہے جو تونس کے وسطی یا مشرقی میدانوں کو انتہائی جنوبی ساحل کے میدانوں سے ملاتی ہے ۔ ان میدانوں سے ہماری مراد : سہول ارث Arad ہیں، جن کے سامنے اس پار جربۃ کا ہموار اور سرسبز جزیرۂ کبیرہ ہے اور سہول جفرۃ، جن کے سرے پر ساحلی جھیلیں ہیں جن میں سمندر خشکی کے اندر کو آ گیا ہے لیکن زیتون کے چند جھنڈ جرجیس Zarzis اور بن گردان Ben-Gardane کے ارد گرد بھی پائے جاتے ہیں ۔

مآخذ : (۱) Aug. Bernard اور de Flotte de Roquevaire : *Atlas d'Algérie et de Tunisie*، ([تحریر مقالہ کے وقت] یہ اٹلس زیر طبع و نشر تھی)؛ (۲) تالیفات ادارۂ زراعت Directions générales de l' Agriculture اور ادارۂ اشغال عامّہ Travaux publics، نیز سلامبو کے مرکز دراسۃ بحری Station Océanographique of Salammbô کی مطبوعات؛ (۳) طبقات ارض کے باب میں: مصنفات Ph. Thomas و Pervinquière کی اور M. Solignac کی مؤلفات جدیدہ؛ (۴) آب و ہوا سے متعلق: G. Ginestous کی تصانیف؛ (۵) جانور نامے (on the fauna): L. Lavauden کی تازہ تصانیف؛ (۶) گیاہ نامے (on the flora): R. Maire: *Carte phytogéographique de l'Algérie et de la Tunisie*، الجزائر ۱۹۲۶ء۔

خاص خاص خطّوں کے مطالعات : (۷) F. Bonniard : *La région de Bizerte*، (*Ann. Géogr.*، ۱۹۲۵ء)؛ (۸) Ch. Monchicourt : *La région de Tunis*، (*Ann. Géogr.*، ۱۹۰۳ء)؛ (۹) وہی مصنف : *La steppe tunisienne chez les Frechich et les Majeur*، تونس ۱۹۰۶ء؛ (۱۰) وہی مصنف : *La région du Haut-Tell en Tunisie*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۱۱) J. Weyland : *La Cap Bon*، تونس ۱۹۲۶ء؛ (۱۲) P. Burollet : *Le Sahel de Sousse*، تونس ۱۹۲۷ء؛ (۱۳) J. Despois : *Kairouan*، (*Ann. Géogr.*، ۱۹۳۰ء)؛ (۱۴) R. Blanchet : *Le Djebel Demmer*، (*Ann. Géogr.*، ۱۸۹۷ء)؛ (۱۵) Violard : *La Tunisie du Nord*، تونس ۱۹۰۵ تا ۱۹۰۶ء؛ *l' extrême-sud tunisien*، تونس ۱۹۰۶ء؛ (۱۶) A. Joly : *Notes géographiques sur le Sud tunisien*، (*Bull. soc. géogr. Alger*، ۱۹۰۷ء)؛ (۱۷) L. Pervinquière : *La Sud tunisien*، (*Revue de géogr. annuelle*، ۱۹۰۹ء)؛ (۱۸) M. Jeloux : *Notes sur le Nefzaoua*، (*Ann. Géogr.*، ۱۹۰۲ء)؛ (۱۹) J. Thomas : *A travers le Sud tunisien*، پیرس ۱۹۲۷ء۔

۲ - تاریخ

جس سر زمین کو اب ملک تونس کہتے ہیں اسے فتح کرنے کے لیے عرب حملہ آوروں کو، جو جنوب مغرب سے آئے تھے، کوئی نصف صدی تک یہاں کے بربر باشندوں اور بوزنطی عمّال کے خلاف شدید جنگیں لڑنا پڑیں ۔ بلاد مشرق کی طرح شمالی افریقہ

میں بھی اسلام کا بوزنطی سلطنت سے متصادم ہونا ناگزیر تھا لیکن ساتویں صدی کے وسط میں شمالی افریقہ کی رومی ولایت exarchate کی صورتِ حالات اس امر کے لیے خوب موزوں اور موافق تھی کہ بالآخر فتح انھیں لوگوں کی ہو جو یہاں غالب رہے: یہاں کے مذہبی اختلافات اِن جھگڑوں کی ایک دُور کی مگر سچی صدائے بازگشت کا نتیجہ تھے جو مشرق میں مسیح کی مشیئتِ واحدۃ کے قائلین کے مذاہب (monothelist doctrines) سے پیدا ہو گئے تھے - یہ اختلافات قَرطاجنّۃ (Carthage) کی عیسائی جماعت کی جمعیت کو پارہ پارہ کرنے کے علاوہ متشدّد راسخ العقیدۃ لوگوں کی اکثریت کو بوزنطہ (Byzantium) سے برگشتہ کر رہے تھے - عُمّالِ ملک آہستہ آہستہ شہنشاہ کے ضبط سے نکلے جا رہے تھے اور خود مختار ہونا چاہتے تھے؛ اس غرض سے انھیں بڑے بڑے مقامی قبیلوں کے سرداروں کی امداد کا محتاج ہونا پڑا - یہ قبائل اس صورتِ حالات کا فائدہ اٹھا کر بوزنطی اقتدار کے جوے کو بتدریج اس قدر مکمّل طور پر اپنے کندھوں سے اُتار چکے تھے کہ اسلامی فتوحات کے وقت رومی ولایتِ افریقیۃ (Byzacene) کا تمام جنوبی علاقہ عملی طور پر قَرطاجنّۃ کی حکومت سے بے نیاز ہو چکا تھا.

عربوں کے پہلے دو حملے، جن کے درمیان اٹھارہ سال کا وقفہ تھا، صرف غزوے (جنگ و غارت کی یورش) ہی تھے لیکن ان کی وجہ سے زیادہ منظّم مہمّات کے ذریعے ملک کو باقاعدہ طور پر فتح کرنے کے لیے راستہ صاف ہو گیا - اس کے علاوہ عجیب اتّفاق یہ ہوا کہ ان دونوں حملوں کے وقت بوزنطی افریقہ سیاسی بُحران میں مبتلا تھا - ۶۴۷ء میں بطریق گریگوری Gregory عین اس زمانے میں بوزنطی قیصر سے تعلّقات منقطع کر کے ساحل سے دُور بربروں کے درمیان آباد ہو چکا تھا - اس وقت عبداللہ بن سَعْد بن ابی سَرْح والیِ مصر نے سُبَیْطِلَۃ Sbeitla کے قریب اُسے کچل کے رکھ دیا اور جرید کو تاخت و تاراج کرنے لگا؛ ۶۶۵ء میں قرطاجنّۃ کے لوگوں نے بالکل غیر متوقّع طور پر بوزنطی امپراطوریہ کے خلاف کھلی بغاوت برپا کر رکھی تھی - اس وقت معاویۃ بن حُدَیج نے بِزاسِین کو تاخت و تاراج کیا اور جَلُولا کا مستحکم مقام فتح کر لیا گیا.

کیا ۶۶۷ء تک المغرب کی ولایت کا الحاق مصر کے ساتھ ہو چکا تھا؟ اصلی قبضہ تو ۶۶۹ اور ۶۷۵ء کے درمیانی عرصے ہی سے شروع ہوتا ہے، جس میں عُقبۃ بن نافع نے فتوحات سرانجام دیں اور قیروان کی بنیاد پڑی: یہی وہ زمانہ ہے جس میں بِزاسِین پر عربوں کا پورا قبضہ ہوا اور بربری قبائل نے اسلام قبول کرنا شروع کیا لیکن سب سے اہمّ واقعہ یہ ہے کہ ایک نئے اسلامی شہر کی بنیاد پڑی، جو (فوج کے لیے) اسلحہ‌خانہ، [قافلوں کے لیے] کاروان سراے اور تجارت کے لیے منڈی سبھی کچھ تھا، جس کے لوگوں نے اب مسجد تعمیر کی اور میدانی علاقے میں استحکامات بھی تیار کر لیے، جن کا رخ وسطی تونس کی ان بلندیوں کی طرف تھا جن کی مدافعت کے لیے بوزنطی قلعوں کا سلسلہ ابھی موجود تھا.

ابوالمُہاجِر کے عہدِ ولایت کے بعد، جس کا حال ہمیں بہت کم معلوم ہے، ۶۸۱ھ میں عُقبۃ واپس آ گیا لیکن دو سال بعد وہ ایک غیرمحتاط یورش کے دوران میں تِنگِتانیا Tingitania تک نکل گیا اور واپسی پر اُس نے علاقۂ زاب میں تَہُوذۃ کے سامنے باغیوں کا مقابلہ کرتے ہوے جان دی - یہ شدید بغاوت اھلِ ملک نے حملہ‌آوروں کے خلاف کی تھی؛ گو یہ بغاوت اَوراس میں شروع ہوئی

تھی لیکن اس نے قیروان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا - اس کا سرغنہ کُسَیْلَة تھا، جس کی امداد رومی کر رہے تھے؛ وہ کئی سال تک ایک وسیع بربری ریاست پر حکمران رہا اور عربوں کے نئے حملوں کا جان توڑ کر مقابلہ کرتا رہا - ۶۸۸ء میں وہ خود بھی مَمْسِیَة کے علاقے میں لڑتے ہوے مارا گیا، جہاں سے کہتے ہیں کہ [ابوشدّاد] زُہیر بن قَیس البَلَوِی آیا تھا - [یہ مردِ مجاھد راویِ حدیث اور عابد و زاھد بھی تھا، دیکھیے سمعانی، بذیل بلی (والصواب: البَلَوِیّ) اور ابن أثیر، بذیل سنة ۶۲ھ] - ۶۹۳ء ھی میں کہیں جا کر بنوامیّة اپنے داخلی حالات درست ہونے پر اس قابل ہوے کہ توسیعِ سلطنت کی حکمتِ عملی پر دوبارہ عمل پیرا ہوں؛ چنانچہ حَسّان بن النُعمان چالیس ہزار فوج اپنے ہمراہ لے کر بِزاسین پر حملہ کرنے کی غرض سے نکلا اور بڑی سرعت کے ساتھ شمال کی طرف اس نیت سے بڑھا کہ اَوراس کے وحشی بربروں کے خلاف فوج کشی کرنے کے لیے واپس لوٹنے سے پہلے بوزنطیوں کو کُچل ڈالے - ۶۹۵ء میں اس نے قرطاجَنّة پر قبضہ کر لیا لیکن دو سال بعد بطریق یوحنّا سے شکست کھانے کے بعد اُسے پھر کھو بیٹھا - اس کے بعد اس نے میدانِ باغایة Baghai میں کاھنة [رَکَ بآن] سے، جو ایک افسانوی شخصیت ھے، دوبارہ شکست کھائی - وہ بَرْقَة تک پیچھے ہٹ آیا مگر اس سے اگلے سال بحری اور بَری دونوں راستوں سے متّحد حملہ کر کے اس نے قرطاجنّة فتح کر کے اُس میں اپنے قدم پوری طرح سے جما لیے - بالآخر ۶۹۸ء میں عرب تقریباً وہ سارا علاقہ جو اب ملک تونس میں شامل ھے بوزنطیوں اور بربروں سے چھین چکے تھے - حسّان نے تونس کی ''بنیاد ڈالی''، اس کے جانشین موسٰی بن نُصَیر نے زَغوان فتح کیا اور پھر افریقیة کے بربروں کو ساتھ لے کر فتحِ المغرب کی طرف متوجّہ ہوا.

بوزنطی نوآبادی کے بیشتر باشندے سمندر کے راستے سے فرار ہوگئے اور زیادہ‌تر مالٹا اور صِقِلّیة (سسلی) میں چلے گئے - اکثر لوگ جو ملک میں رہ گئے معلوم ہوتا ھے کہ انھوں نے بہت جلد مذھب اسلام قبول کر لیا؛ صرف چند گروہ عیسائیوں ['اَفاریق'] اور یہودیوں کے اپنے اصلی مذھب پر قائم رہے - اس بات کے باوجود کہ افریقیة کے بربر اسلام لا چکے تھے، شمالی افریقہ کے دوسرے حصّوں کی طرح، اُنھوں نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح فسادِ عقیدہ کی سہل آڑ لے کر دوبارہ خودمختار بن جائیں - آٹھویں صدی کی ساری تأریخ اس قسم کی بغاوتوں کے ذکر سے پُر ھے کہ خارجی اشتراکی تحریک کا نام لے کر مقامی لوگوں کو عرب حکمرانوں کے خلاف بھڑکایا جاتا رہا؛ اس کے علاوہ خود عرب سپاھیوں کے غدر کا ذکر بھی بہت آتا ھے، جنھوں نے کئی بار انضباط و نظام کے رشتوں کو بسرعت تمام توڑ ڈالا.

حَنْظَلَة بن صَفْوان نے عُکّاشَة کی بغاوت کو تو فرو کر دیا، جو خوارجِ صُفْرِیّة میں سے تھا مگر جب عبدالرحمٰن بن حبیب الفِہْری نے بغاوت کر کے قَیْروان فتح کر لیا تو اُسے مشرق کی جانب بھاگتے ھی بن پڑی - آخری اُمَوی اس دور دراز صوبے کو، جو اُن کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا، دوبارہ فتح کرنے میں ناکام رہے؛ ان کے بعد عبّاسی خلفاء چاھتے تھے کہ اگر اندلس نے ان کی اطاعت کا جوا اتار پھینکا ھے تو کم از کم افریقیة تو وہ ابوالخَطّاب اِباضِی سے چھین کر واپس لے لیں؛ چنانچہ اُن کے جرنیل محمد بن الأشعث نے قَیروان دوبارہ فتح کیا، اس کی فصیلیں دوبارہ تعمیر کرائیں اور اسے اپنی حکومت کا مرکز بنایا، لیکن اس کی حکومت دیرپا ثابت نہ ہو سکی - عرب سپاہ اس سے برگشتہ خاطر ہوگئی اور وہ ۷۶۵ء میں واپس جانے پر مجبور ہو گیا -

اس کا جانشین الاَغلب بن سالم التّمیمی بھی، جو مشرق میں عبّاسیوں کے حامی اور اُن کے داعی ابو مسلم کا پُرانا رفیقِ کار تھا، باغی مُضریوں کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکا اور ۷۶۷ء کی شورش میں مارا گیا اور پانچ سال تک ملک میں فوضویت اور فتنہ و فساد کا بازار گرم رہا۔

۷۷۲ سے ۷۹۴ء تک افریقیة میں آلِ مُہلَّب کی حکومت رہی، جو یمنی‌الاصل تھے اور جن کا شمار عُمّالِ خلافت کے ایک مسلّم خاندان میں تھا۔ مہلّبی ایک مدّت تک کچھ نہ کچھ امن و امان قائم رکھنے میں کامیاب رہے: یزید بن حاتم نے چالیس ہزار نئی فوج کے ساتھ ابو [حاتم] اباضی کا قصّہ پاک کیا؛ قیروان کی جامع مسجد دوبارہ تعمیر کرائی (۷۷۴ء) اور پایۂ‌تخت کے اہمّ اصناف (gilds) کو منظّم کیا؛ ۷۸۸ء میں اس کے بیٹے داؤد نے کاف Kef میں وَرفَجُّومَة (وَفَرجُومة) کے بربری اتّحادیوں کو کچل ڈالا اور اس کے بھائی رَوح نے، جو اس کی جگہ حکمران ہوا، تیہرت [=تاہرت] Tiaret کے اِباضی امیر ابن رُستم سے ایک معاہدہ کر لیا، جس کی بدولت افریقیة کے بربروں میں باغیانہ جذبات کا خاتمہ ہو گیا۔

اس وقت کے بعد صرف جُند عرب ھی کا ایک عنصر ایسا رہ گیا تھا جس کی وجہ سے ملک کا داخلی امن و امان خطرے میں رہتا تھا۔ بنو مہلّب کے آخری حکمران الفضل کی وفات کے بعد پھر خونریزی اور شرّ و فساد کا دَور شروع ہو گیا۔ اس کے انسداد کے لیے بوڑھے جرنیل ہَرثَمة بن [اَعیَن] کو بھیجا گیا، جس نے خلیفۂ بغداد کا اقتدار دوبارہ قائم کیا اور رباط مُنستیر تعمیر کرایا لیکن اس کے جانشین محمد بن مُقاتل العَکّی کو تونس کی تمیمی سپاہ نے وہاں سے بھگا دیا، کیونکہ اس کی بے تدبیری نے انھیں مشتعل کر دیا تھا (اکتوبر ۷۹۹ء)۔ اس موقع پر ابراهیم [بن] الاغلب، جس کا باپ والی رہ چکا تھا اور ۷۶۷ء میں مارا گیا تھا، عبّاسیوں کے حامی کی حیثیت سے اچانک اپنے صوبۂ زاب میں آ دھمکا، وہ ابن مُقاتل کو قیروان میں واپس لے آیا۔ انعام کے طور پر اور بالآخر ایک پائدار حکومت قائم کرنے کی غرض سے خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے مشیروں کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ اسے افریقیة کا باج گذار ''امیر'' بنا دے۔ ابراهیم کو تقرر کا فرمان جولائی ۸۰۰ء کو ملا اور ایک صدی سے کچھ زیادہ مدّت تک یعنی ۹۰۹ء تک بلافصل اس کا خاندان حکمرانی کرتا رہا۔

خاندانِ اغلبیّة [رَکَ بہ (بنو) الاغلب] نے تونس میں گہرے اور پائدار نقوش چھوڑے۔ اگرچہ یہ امیر بظاهر خلیفۂ بغداد کے زیرِ نگین تھے لیکن عملی طور پر خودمختار تھے اور حکومت اُن کے خاندان میں موروثی تھی۔ وہ همیشہ تألیف و تسکینِ قلوب، حسنِ تنظیم اور توسیعِ مملکت کی حکمت عملی پر کاربند رہے۔ بنو تَمیم کی مخالفت، جن کا مرکز تونس تھا، همیشہ زوروں پر رهی۔ ابراهیم گو خود تمیمی تھا مگر اس کا مُضَر کے ان مردانِ جنگی سے تصادم ہو گیا، کیونکہ عبّاسیوں کا تسلّط، وہ دُور ہو یا نزدیک، انھیں گوارا نہ تھا، اس لیے کہ عبّاسی اُن کے قدیم یمنی حریفوں کے مربی تھے۔ ناچار ابراهیم کو ایسی سپاہ پر بھروسہ کرنا پڑا جس میں خراسان کے بہت سے عجمی شامل تھے لیکن اپنی ذاتی حفاظت کے لیے وہ زیادہ‌تر سودانی مستحفظین (گارڈ) پر اعتماد کرتا تھا، جو تازہ تازہ بھرتی کیے گئے تھے اور اپنے قصرالقدیم (یاالعبّاسیّة) کے استحکامات پر بھروسہ رکھتا تھا جو اس نے ۸۰۱ء میں قیروان کے جنوب میں ایک فرسخ کے فاصلے پر تعمیر کرایا تھا۔ غالباً اسی قصر میں اس نے شارلمین Charlemagne کے سفیروں کو

شرفِ باریابی بخشا تھا ۔ ۸۰۲ء میں ملک تونس میں بغاوت برپا ہوئی جسے اُس نے دبا دیا؛ ۸۰۵ء میں طرابُلُس کی بغاوت سے اُسے سابقہ پڑا اور ۸۱۰-۸۱۱ء میں اس کے اپنے جرنیل عِمران بن مُخَلَّد نے بغاوت کر دی اور قیروان کو بھی محاصرے میں لے لیا ۔ یہ اسی کے عہد کا واقعہ ہے کہ مشرقی ساحل کے حدود پر چھوٹی چھوٹی فوجی چوکیاں بٹھائی گئیں جنھیں ''مَحرِس'' کہا جاتا تھا ۔ جب ۸۱۲ ء میں اس کا انتقال ہوا تو طرابُلُس میں بغاوت دوبارہ پورے زوروں پر تھی .

اس کے بیٹے زیادۃاللہ (۸۱۷ تا ۸۳۸ء) نے ایک فعّال اور باھمّت مگر بے رحم اور جابر و قاھر شخص کی حیثیت سے شہرت پائی ۔ اُسے ایک طاقتور حریف منصور الطُّنبُذی سے سابقہ پڑا، جو قریب تھا کہ اسے بالکل تباہ و برباد ھی کر دے؛ چنانچہ کئی سال تک تمام شمالی علاقہ، تونس سمیت' امیر کی دسترس سے باھر رھا لیکن زیادۃاللہ کی فوق‌العادت ھوش مندی کا یہ شاہ‌کار تھا کہ اُس نے ایک ایسی چال چلی جس سے انتہائی فسادی سپاہ کی حمیّت اور طمع سے فائدہ اٹھا کر ان کی توجہ صِقِلِّیَۃ (سسلی) کے جہاد کی طرف مبذول کر دی[۱]؛ چنانچہ یہ سپاہ ۸۲۷ء میں بڑی گرمجوشی کے ساتھ مشہور و معروف (فقیہ و عالم) قاضی اَسد بن الفُرات [قاضی قَیروان، معاصر امام مالک رح] کی سرکردگی میں سُوسَۃ سے جہازوں میں سوار ہو کر روانہ ہوئی ۔ ۸۳۱ء میں بَلِرْمو [بَلارمۃ، در ابن جبیر؛ بَلَرْم، در یاقوت] فتح ہو گیا اور مَسِّینَۃ [یا مَسّینی] بارہ برس بعد مسخّر ھوا ۔ زیادۃاللہ، جس نے ۸۲۱ء میں رِباطِ سُوسَۃ تعمیر کرایا، اب زیادہ پُرامن کاموں میں مصروف ہوا؛ مثلاً قیروان میں اس نے جامع مسجد تعمیر کرائی ۔ جہاں تک عمارات کا تعلّق ھے اس کے جانشین نے اس کی سرگرمی کو وسیع پیمانے پر جاری رکھا ۔ ۸۵۰ء میں سُوس اور سَفاقُس Sfax کی جامع مسجدیں تعمیر ہوئیں اور بالخصوص امیر احمد نے حدودِ ۸۶۰ء میں ان دونوں شہروں کے گرد فصیلیں بنوائیں، اور مشہور ''صِھْرِیج الاغالبۃ'' (اغلبیوں کا تالاب) بھی تعمیر کرایا ۔ اس عظیم‌الشان حوض سے قیروان کو پانی مہیّا کیا جاتا تھا.

۸۷۴ء میں اس خاندان کا آخری عظیم‌المرتبہ امیر ابراہیم ثانی اپنے بھائی محمد کا جانشین مقرّر ھوا ۔ اسے کلنگوں کے شکار کا بے حد شوق تھا، جس کی وجہ سے وہ 'ابوالغَرانیق' کے نام سے مشہور ھو گیا تھا ۔ قصرالقدیم کو چھوڑ کر ایک جدید مسکونی قصبہ رَقّادَۃ بسایا گیا، جس میں سرکاری دفاتر تھے اور جس کا محلِّ وقوع اب بھی قیروان سے پانچ میل جانب جنوب معروف ھے، لیکن جب تونس میں بغاوت ہوئی اور شدید حملے کے بعد اسے دوبارہ فتح کر لیا گیا تو ۸۹۴ء کے بعد امیر اکثر اوقات اس مفتوحہ قصبے میں اپنے دربار سمیت چلا جایا کرتا تھا تا کہ اس پر کڑی نگرانی رکھ سکے ۔ اس کے عہد کی خارجی سیاست کے سلسلے میں چند اھمّ واقعات پیش آئے ۔ پہلے جنوب مشرق میں العبّاس بن احمد نے، جو اوّلین طولونی امیر کا بیٹا تھا، حملہ کر کے فساد برپا کیا ۔ اس نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف افریقیۃ فتح کرنے کے ارادے سے ۸۸۰ء میں مصر سے طرابلس پر فوج کشی کی مگر نَفُوسَۃ کے بربروں نے

[۱] مسلمان مؤرّخوں نے زیادۃ اللہ کے حملۂ صقلیۃ کی وجہ اس سے مختلف بیان کی ھے، دیکھیے سید ریاست علی ندوی : تاریخ صقلّیہ' اعظم گڈھ ۱۹۳۳ء، ۱ : ۱۲۳، بحوالۂ ابن الاثیر، طبع ۱۳۰۱ھ، ۶ : ۳۳۵؛ ریاض النفوس، در اماری Amari، ص ۱۸۰، ۶؛ ۱۳۷، س ۱۵.]

طرابلس کو بچا لیا اور ابراهیم نے عین وقت پر پہنچ کر طولونی دیناروں کے ایک خزانے پر بھی قبضہ کر لیا، جو اس کی حکومت کی مالی حالت درست کرنے میں کام آیا، لیکن یہ خوشحالی عارضی ثابت ہوئی، کیونکہ یہ رقم خزانے کو دوبارہ پر کرنے کے لیے کافی نہ تھی، جو اس صدی کے آغاز میں ملک کی خانہ جنگیوں اور بعد کے بھاری اخراجات کی وجہ سے خالی ہو چکا تھا ۔ ۸۹۳ء کی خوفناک شورش محض اس وجہ سے بھڑک اٹھی تھی کہ میدانِ گمودہ سے حکومت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے غلام اور گھوڑے بڑی بے رحمی سے پکڑ لیے گئے تھے ۔ البتہ صِقلّیة (سسلی) کی فتح، ۸۷۸ء میں سیراقوسه (سرقوسة) اور [۹۰۲ء] میں طَبَرمِین Taormina کے مفتوح ہونے سے پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ اهلِ تونس نے، جو همیشه ابراهیم کی مخالفت پر آماده رها کرتے تھے، جب خلیفه کے پاس شکایت کی تو خلیفۂ بغداد کے فرمان کی تعمیل میں ابراهیم اپنے بیٹے عبدالله کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے پر راضی ہو گیا اور اسی سال ۲۰ اکتوبر کو قَلَوریة Calabria کے علاقے میں کوسنزہ Cosenza کے سامنے ایک مجاهد کی حیثیت سے لڑتا ہوا مارا گیا.

اس اثناء میں مغرب میں اس مذهبی انقلاب کی تیاریاں هو رهی تھیں جو تمام افریقیة کو اپنی لپیٹ میں لینے والا تها ۔ نویں صدی میں جنوب کے کل بربر علاقے (هوّارة، لَواتة، مکناسة) اوراس سے لے کر جِربَة اور طرابلس تک اباضی تھے، خصوصاً قبیلۂ نَفوسة، جنهوں نے قابس کے جنوب میں مشرق کا راسته بند کر رکھا تھا، تا آنکه ابراهیم ثانی نے ۸۹۶ء میں ان کا قتل عام کیا لیکن ملک کے بیشتر حصے میں خوارج کو یه طاقت حاصل نه هو سکی که وہ مذهبِ سنّت کے مقابلے میں ملک کے بیشتر حصے میں غلبه حاصل کر سکیں یا ایسی شاندار هستیوں کے ظهور میں مانع آ سکیں جیسے قاضی عبدالرحمٰن بن زیاد جو ابن الاشعث کے رفیقِ کار تھے یا بُهلُولِ زاهد جو آٹھویں صدی میلادی میں ایک هر دلعزیز اور نهایت با رسوخ شخصیت کے مالک تھے ۔ اَغلَبی دَور فقهی مباحث کے لحاظ سے ایک سنهری زمانه تها اور اسی زمانے میں مختلف مذاهبِ فقه قائم هوے اور احادیث کی اُمہاتِ کتب تألیف هوئیں؛ اس دَور میں مصر کے مشهور مالکی فقیه [الامام عبدالرحمٰن] ابن القاسم کے دو شاگرد قابل ذکر هیں: [۱] اَسد بن الفُرات، جو خراسانی الاصل تھے اور ۸۲۸ء میں صِقلّیة (سسلی) میں فوت هوے اور [۲] ان کا شاگرد [الامام] سُحنُون (ابن سَعید التَنُوخی)، جو شام میں پیدا هوے اور ایک اجیر فوجی سپاهی کے فرزند تھے؛ اُنهوں نے ۸۴۹ء میں قاضی قیروان کی حیثیت سے مالکی مذهب کو خوب فروغ دیا، جس کی ترقّی حنفی مذهب کے چند علماء کی وجه سے خطرے میں پڑ چکی تھی ۔ اُن کی تصنیف مُدوّنة [کتاب کی اَسدی اور سُحنُونی صورت کے متعلّق دیکھیے المدونة الکبری، طبع اول، قاهره ۱۳۲۳ھ، دیباچه ص ۱۱ بعد، تکملۂ براکلمان، ۱ : ۲۹۹] اب تک درجۂ اوّل کی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے ۔ مالکی مذهب گو بعض ادوار میں بظاهر ماند بهی پڑ گیا لیکن اب تک تونس کا مذهبِ غالب هے ۔ یه امر قابلِ غور هے که افریقیة کے اکثر مشهور علماء اور مذاهب مشرق سے آئے ۔ اسی طرح داعی ابو عبدالله ۸۹۳ء میں اِکجَن کے قبائلِ کِتامَة (یعنی بابرس کے مشرق کے قبیلۂ صغیره (Little Kabylia)) کے پاس مشرق هی سے آیا تها که انهیں عبیدالله شیعی مهدی کا پیرو بنائے.

۹۰۲ء میں بنو اغلب نے کِتامَة کے خلاف ایک مهم بھیجی جو بمشکل تمام اپنا مقصد

حاصل کر سکی اور زیادۃ اللہ ثالث کے زمانے میں، جس نے ۹۰۳ء میں اپنے باپ عبداللہ معتزلی کو قتل کر ڈالا تھا، شیعی خطرے کا دباؤ اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگا؛ ۹۰۵ء میں جب مہدی ملکِ شام سے شمالی افریقہ کی طرف بڑی سرعت کے ساتھ جا رہا تھا تا کہ سِجِلْماسَۃ میں بیٹھ کر اپنے ظہور کے لیے مناسب ساعت کا انتظار کرے اس کا وفادار داعی امیر کی فوجوں کے پرخچے اڑانے میں مشغول تھا ۔ اس کے بعد واقعات کی رفتار تیز ہو گئی : زیادۃ اللہ نے تونس کے فقہاء کی ایک مجلس سے شیعوں کے خلاف فتوی حاصل کیا لیکن بےسود؛ اس نے عبّاسیوں کی امداد بھی طلب کی مگر ۹۰۷ء کے موسمِ بہار میں باغایۃ اس کے ہاتھ سے جاتا رہا اور مارچ ۹۰۹ء میں الأُرْبُس [یاقوت، ۱ : ۱۸۴] (Lorbcus) کی فتح کے بعد زیادۃ اللہ بغداد کو فرار ہو گیا اور علمائے اھلِ سنّت کی خاموش مخالفت کے باوجود شیعی داعی رَقادَّۃ میں داخل ہو گیا ۔ آخرکار اس سال دسمبر میں مہدی نے خود قیروان میں لوگوں سے بیعت لی ۔ اس طریق سے افریقیۃ میں محض قبیلۂ کُتامَۃ کی پیادہ فوج کی کوششوں سے فاطمی (عُبَیدی) شیعی خلافت قائم ہو گئی، جو عنقریب تمام شمالی افریقہ کے سیاسی حالات کو بدلنے والی تھی ۔اس سے پیشتر کہ وہ اپنے وطن مألوف ـــ مشرق ـــ کی طرف مراجعت کرے ۔

اس نئے خاندان کی نظریں روزِ اوّل ھی سے مصر پر جمی ہوئی تھیں اور جب تک یہ خاندان قطعی طور پر وھاں متمکّن نہ ھو گیا وہ فتح کی تمہید کے طور پر وھاں برابر فوجی مہمّات بھیجتا رھا ۔ جنوری ۹۱۱ء میں عُبیداللہ نے ابو عبداللہ کو، جس کی کوشش سے اسے تخت و تاج ملا تھا، قتل کرا دیا، ٹھیک اس طرح جس طرح المنصور عبّاسی نے اپنے داعی ابو مسلم کو قتل کرا دیا تھا ۔ [۹۱۴ء] میں ایک فوج اس کے سب سے بڑے بیٹے کی سرکردگی میں الفَیُّوم پر حملہ آور ہوئی اور ایک دوسری فوج نے اسکندریۃ فتح کر لیا ۔ جب اس پہلی کوشش میں، یعنی مشرق کی طرف مملکت کو وسعت دینے میں، رکاوٹ پیدا ہوئی تو صرف اس وقت مہدی نے افریقیۃ میں پایۂ تخت بنانے کا فیصلہ کیا مگر ساحلِ بحر پر ـــ چنانچہ مَہْدِیَّۃ [رکّ بآن] کا مستحکم شہر آباد کیا گیا، جہاں سے مشرق کی طرف بحری بیڑے بھیجے جا سکتے تھے اور جہاں اندرونِ ملک کے بربروں کے متواتر حملوں سے بھی، جن کا اندیشہ تھا، پناہ مل سکتی تھی (۹۱۶ تا ۹۱۸ء) لیکن ۹۱۹ء میں دوسری مہم گئی جس نے پھر اسکندریۃ فتح کر لیا اور کچھ مدّت تک اس پر قبضہ رکھا ۔ مغرب میں اسے بہت زیادہ کامیابیاں حاصل ہوئیں : سسلی (صِقِلّیۃ) نے بغاوت کی تو اسے مطیع و منقاد بنایا گیا اور جب عبداللہ نے ۹۳۴ء کے شروع میں وفات پائی تو المغرب کے تمام ممالک، جہاں تاھَرت کے اِباضی، فاس کے اِدریسی اور سِجِلْماسَۃ کے صُفری سب ختم ہو چکے تھے، فاطمیوں کی حکومت تسلیم کر چکے تھے ۔

ابوالقاسم نزار (القائم بامراللہ) اس وسیع سلطنت کو، جو اسے ورثے میں ملی، بڑی مشکل ھی سے اپنے قابو میں رکھ سکا ۔ یہ سچ ھے کہ ۹۳۵ء میں اس کے بحری بیڑے نے جِنوہ Genoa میں لُوٹ مار کی لیکن یہ غَزْوَۃ تھا اور اُس حملے کی طرح غیر اھم جو ٹُسکَنوں (Tuscans) نے بونیفاس اللُّقّی (Boniface of Lucca) کے زیرِ قیادت ۸۲۸ء میں قَرْطاجَنّۃ پر کیا تھا ۔ دوسری طرف وہ ابو یزید بن کَیداد الاِفرانِی النّکّاری کی زبردست بغاوت کے

مقابلے میں تباہ ہوتے ہوتے بچ گیا ۔ اس شخص کو "صاحب الحمار" کہتے تھے ۔ اس نے "شیخ المؤمنین" ہونے کا دعوی کیا اور مذہب کے بھیس میں مشرقی اَوْراس کے ہَوّارَہ قبائل کو ساتھ لے کر افریقیۃ کے شہروں پر حملے کرنے لگا ۔ خارجی بربروں نے باجہ Beja ، اُربُس Lorbeus ، قیروان (۹۴۴ء میں) اور سُوسَۃ کو تاخت و تاراج کر ڈالا، تونس پر قبضہ کر لیا اور جب ان کی فوج میں زاب اور نَفُوسَۃ کے رضاکاروں کی وجہ سے معتد بہ اضافہ ہو گیا تو (۹۴۵ء میں) خلیفہ کو اس کے اپنے پاے تخت مہدیۃ ھی میں محصور کر لیا ۔ ابوالقاسم نے ۹۴۶ء میں اس نہایت نازک موقع پر وفات پائی ۔ اس کے بیٹے اسمٰعیل (المنصور) نے اُن لوگوں کی تائید سے، جو حملہ آوروں کے مظالم سے مشتعل ہو گئے تھے، صورتِ حالات پر وفا شعار کِتامَۃ کی امداد سے دوبارہ قابو پا لیا ۔ متعدّد خونریز لڑائیوں میں متواتر شکستیں پانے کے بعد ابویزید کے ساتھی منتشر ہو گئے اور وہ خود مہلک طور پر زخمی ہو کر عین اُس مقام پر دشمنوں کے ہاتھ پڑ گیا جہاں آئندہ چل کر بنو حمّاد کا قلعہ تعمیر ہونے والا تھا (۹۴۷ء).

اس پُر آشوب زمانے کے بعد امن و امان اور خوشحالی کا دور شروع ہوا ۔ المنصور نے فوراً ھی صَبْرَۃ (المنصوریّۃ) جیسے شاندار اور با تجمّل شہر کی بنیاد ڈال کر اپنی قوت کا ثبوت دیا ۔ یہ وہ شہر تھا جس نے آخر کار اپنے ہمسایہ شہر قَیْرَوان کو بھی ماند کر دیا (۹۴۷ء) ۔ تجارت اور صنعت و حرفت نے ترقی پائی ۔ قائد رشیق کی بحری جولانیوں سے عیسائی لرزہ بر اندام تھے ۔ المُعِزّ، جو ۹۵۳ء میں تخت نشین ہوا، اس کے عہد میں وہ گھڑی جس کا مدّت سے انتظار تھا آ پہنچی : گو امویۂ قُرطبۃ کے حق میں وقتاً فوقتاً بغاوتیں ہوئیں لیکن بحیثیت مجموعی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مغرب مطیع و منقاد ہو چکا ہے ۔ ۹۵۶ء میں سُوسَۃ اور طَبَرْقَۃ کے سواحل پر اندلس کے مسلمانوں کی یلغاریں صرف انتقامی تھیں، کسی حقیقی خطرے کی علامت نہ تھیں ۔ مصر کافور اِخْشیدی کی موت سے کمزور ہو چکا تھا، اُس کی فتح کی امیدیں حق بجانب معلوم ہوتی تھیں؛ جولائی ۹۶۹ء میں کِتامہ کی افواج نے معزّ کے مولی [= آزاد شدہ غلام] جوھر کی قیادت میں فُسطاط فتح کر لیا، بعینہٖ اُسی طرح جیسے ابو عبداللہ نے اپنے آقا مہدی کے لیے قیروان فتح کیا تھا ۔ اس سے اگلے سال اس کی فوجیں دمشق میں داخل ہو گئیں ۔ اس کے بعد اِس نے اپنے بادشاہ کے لیے، جو ابھی تک المغرب ھی میں تھا، قاھرۃ کا شہر تعمیر کرایا اور باصرار اس سے درخواست کی کہ وہ بھی مصر میں آ جائے تا کہ قرامطہ کی خطرناک ترقّی کو روکا جا سکے ۔ جب المغرب میں قبیلۂ زِناتَہ کے آخری باغی کا قلع قمع ہو چکا تو فاطمی حکمران، جو اب مشرق کے دستور کے مطابق تاج پہنا کرتا تھا، اگست ۹۷۲ء میں روانگی کی تیّاریوں میں مصروف ہو گیا اور ۱۰ جون ۹۷۳ء کو اپنے خاندان کے نئے پاے تخت یعنی قاھرۃ میں وارد ہوا .

افریقیۃ کو ھمیشہ کے لیے خیرباد کہنے سے پہلے المُعِزّ نے ان بلاد کی حکومت (باستثناے سسلی) اپنے نہایت قابلِ قدر معاون بربری امیر بولوگّین (بُلُکِّین) کے سپرد کر دی، جس کا باپ زِیری بن مَناد شورش پسند زِناتہ کا بہت بڑا دشمن تھا اور جس نے اپنے صَنْہاجیوں کی خدمات ھمیشہ عُبَیدیوں کے لیے وقف کر رکھی تھیں ۔ یہ صنہاجی ناحیۂ تِیْتَری اور مِیدیَۃ سے متعلّق تھے ۔ بربری امراء کے خاندان کے واسطے سے ملک پر حکومت کرنے کا یہ طریق بے حد کامیاب ثابت ہوا ۔ زیری خاندان [رَكَ بہ (بنو) زِیری] کے عہد میں، جن کا

فرمانِ تقرّر همیشه قاهرة سے آیا کرتا تھا، افریقیة نے سادّی خوشحالی کا زمانہ دیکھا، جس میں زراعت اور ملکی صنعتوں (قالین، کپڑے اور ظروف گِلی) کی ترقّی اور بیرونی ملکوں سے تجارتی تعلّقات کی وسعت کی وجہ سے سامانِ معیشت کی فراوانی ہو گئی، بڑی بڑی رسمی تقاریب میں تزک و احتشام کا مُسرفانہ اظہار ہونے لگا، فقہ اور طب کو فروغ حاصل ہوا ۔ ان علوم میں فاطمی عہد میں ابن ابی زید، اسحاق بن سلیمان الاسرائیلی اور اس کے شاگرد ابن الجزّار جیسے مشہور فاضل پیدا ہو چکے تھے؛ علمِ ادب میں ابن رشیق جیسا شاعر پیدا ہوا اور قیروان کی یہودی آبادی کی طرف تلمُود [= مجموعۂ شرائع و سنن و تقالید یہود] کے متعدّد مشہور و معروف عالم کھنچے چلے آئے اور اسی طرح قیروانی یہودیوں میں بھی متعدّد تلمودی عالم پیدا ہوے۔

اس زمانے کی شان و شوکت پر مغرب کے زناتہ کی پیمان شکنی اور برگشتگی کے واقعات کا کم ہی اثر پڑا، گو ان واقعات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، چنانچہ مغرب کے اس قبیلے نے قُرطبة والوں کے حق میں حلفِ اطاعت لے لیا اور حمّاد [بن بُلُکّین زیری] علیحدہ ہو گیا اور اُس نے اپنے بھتیجے بادیس بن المنصور [بن بُلُکّین] کے عہدِ حکومت (۹۹۵ تا ۱۰۱۶ء) میں اپنے مشہور قلعے میں ایک خودمختار خاندان کی (۱۰۰۷ء میں) بنیاد ڈالی ۔ ان واقعات کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کی شان و شوکت اور خوشحالی المُعزّ بن بادیس کے عہدِ حکومت میں (یعنی گیارھویں صدی کے نصفِ اوّل میں) اوجِ کمال پر پہنچ گئی ۔ المُعزّ، جسے خلفاے مصر بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جس کی تعظیم سارے مغرب میں ہوتی تھی، ظاہری شان و شوکت کا حدّ سے زیادہ دلدادہ تھا ۔ اس سے یہ مہلک غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے اُن مذہبی اختلافات کو پھر سے بیدار کر دیا جن کی آڑ لے کر شمالی افریقہ کے لوگ ہمیشہ اپنے مشرقی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کیا کرتے تھے ۔ اس نے قیروان کے مالکی شہریوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور انھوں نے ایک روز اس کی آنکھوں کے سامنے شیعوں کا قتلِ عام کیا، پھر اس نے بغداد کے عبّاسیوں سے بیعت کر لی اور اس وقت سے ۱۰۵۰ء تک متعدّد اقدامات کے مرحلوں سے گذر کر وہ فاطمیوں کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا۔

جس فاطمی اختیاردار کی اطاعت سے وہ منحرف ہو گیا تھا اس کا انتقام ہولناک تھا؛ مصری وزیر الیازُوری نے المُعزّ کے اعمال کو اپنی ذاتی ہتک سمجھا، چنانچہ اُس نے اِس باغی حکمران (المعزّ) کے خلاف خانہ بدوش ہلالی عربوں کے غارت گر دستے بھیج دیے، جو دریاے نیل کے مشرق کی جانب صعید کے علاقے میں فروکش تھے ۔ سال ۱۰۵۱ء، جس میں بنوریاح جو بنوھلال میں سے سب سے پہلے افریقیة پہنچے، تونس کی تاریخ میں ایک نقطۂ انقلاب کی نشان دہی کرتا ہے ۔ المُعزّ کو قیروان میں دو دفعہ شکست ہوئی گو اس نے بڑی سرعت کے ساتھ اس شہر کے مستحکم کرنے کی بےسود کوشش بھی کی؛ جب ان خانہ بدوشوں نے سارے نشیبی علاقے تاخت و تاراج کر ڈالے تو المعزّ خفیہ طور پر عرب اسیروں کی حفاظت میں مَہدِیّة چلا گیا، جنھیں بامرِ مجبوری اُسے اپنا داماد بھی بنانا پڑا ۔ حملہ آوروں نے، جو لاکھوں کی تعداد میں آ گئے تھے، شمالی افریقہ کا حُلیہ بگاڑ دیا اور اقتصادی، نسلی اور سیاسی لحاظ سے یہاں کا نقشہ ہی بدل ڈالا : بربروں کو پرے دھکیل دیا گیا اور ملک میں عربوں کے آئین و دستور رائج ہو گئے، خانہ بدوشی کا دور دورہ اور لوگوں کا جان و مال

غیر محفوظ ہو گیا، کھیتی باڑی تباہ ہو گئی اور مرکزی حکومت کا زور بالکل ٹوٹ گیا ۔ بڑے بڑے شہر عربوں کے قبضے میں آ گئے یا خودمختار ہو گئے اور مقامی سرداروں یا والیوں نے وہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا ۔ ان میں سے بعض نے تو القلعۃ کے بنوحماد ہی کی اطاعت قبول کر لی، کیونکہ اُن کی سرپرستی انھیں مطلوب تھی ۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں : تونس میں بنوخراسان، [بنزرت =] بزرتۃ میں بنوالورد، قابس میں بنوجامع، قفصۃ میں بنوالرند نے حکومت قائم کر لی؛ مرکز میں فوضویت تھی ۔

زیری بیشمار مشکلات کے باوجود مہدیۃ میں جمے رہے مگر وہاں سے اب وہ سوسۃ اور قابس کے درمیانی ساحل ھی پر فرمانروائی کرتے رہے ۔ المعز کے بیٹے اور جانشین تمیم (۱۰۶۳ تا ۱۱۰۸ء) نے تلافیِ ما فات کی ناکام کوشش کی؛ چنانچہ اس نے بنو حماد سے صلح کر لی لیکن تونس کے خلاف وہ کامیاب نہ ہو سکا اور مہدیۃ میں قلعہ بند ہو کر عربوں اور نئے دشمنوں یعنی عیسائیوں کا بھی مقابلہ کرتا رہا ۔ ۱۰۸۶ء میں پاپائے روم کی انگیخت پر اہلِ پیزا Pisa اور اہلِ جنوہ Genoa نے املفی [در اٹلی] کے پنتالیون (Pantaleon of Amalfi) کی قیادت میں مہدیۃ پر قبضہ کر لیا؛ تمیم کو تاوان ادا کرنا پڑا اور فتحمندوں کے مالِ تجارت کا داخلہ چنگی کے محصول کے بغیر قبول کرنا پڑا ۔ یحیٰی بن تمیم (م ۱۱۱۶ء، جو غالباً قتل کیا گیا) اور پھر اس کے بیٹے علی (م ۱۱۲۱ء) نے فاطمی خلفاء کی اختیارداری قبول کر لی اور عربی قبائل کی امداد حاصل کر کے خشکی اور تری پر کچھ کامیابی بھی حاصل کی کہ اچانک ایک غیر متوقع دشمن نے انھیں مغلوب کر لیا ۔ یہ نارمن Norman لوگ تھے، جو سسلی (صقلیۃ) اور مالٹا فتح کر چکے تھے اور اب افریقیۃ کے معاملات میں بھی دخل دینے لگے تھے؛ ۱۱۱۸ء میں زیریوں سے اُن کی اَن بن ہو گئی، اس پر زیریوں نے المغرب الاقصی کے فرمانرواؤں یعنی المرابطین سے امداد مانگی ۔ الحسن بن علی اس بات پر مجبور ہوا کہ وہ روجر والی سسلی (Roger of Sicily) سے صلح کرے اور بجایۃ Bougie کے حمادیوں کے خطرے کے خلاف روجر کی حمایت قبول کرے لیکن اس کے باوجود سسلی کے امیر البحر جارج انطاکی (George of Antioch) نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے ۱۱۴۸ء میں مہدیۃ سے نکال دیا ۔ روجر ثانی اور اس کے بعد ولیم اول نے، جو جربۃ کے مالک تھے اور سوسۃ سے لے کر طرابلس تک تمام ساحلی شہروں پر قابض، اس علاقے میں ایک قسم کی روادارانہ حمایت کا نظام قائم کیا، جس کا اہم مقصد تجارت سے وابستہ تھا، لیکن یہ صورتِ حالات دیر تک قائم نہ رہ سکی، کیونکہ وہاں کے باشندے عیسائیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوے اور بہت جلد دوبارہ حصولِ آزادی میں کامیاب ہوے ؛ البتہ مہدیۃ اور سوسۃ کو ۱۱۵۹ و ۱۱۶۰ء تک انتظار کرنا پڑا تب کہیں جا کر عبدالمؤمن الموحدی نے انھیں کفار سے نجات دلائی ۔ عبدالمؤمن نے، جو مغربِ اقصی سے آیا تھا، ۱۱۵۱ء میں افریقیۃ کے عربوں کو سطیف (Setif) [میانِ تاھرت و قیروان] کے مقام پر شکست دی، یہ عرب امیر محرز بن زیاد الریاحی کی سرکردگی میں متحد ہو چکے تھے ۔ عبدالمؤمن نے تمام مخالفین کا قلع قمع کر کے قلعوں پر قبضہ کر لیا، یہودیوں اور عیسائیوں کا قتل عام کیا اور شمالی افریقہ کی سیاسی وحدت پچاس برس سے زیادہ عرصے کے لیے بحال کر دی ۔

نئے فرمانرواؤں یعنی خلفاے مراکش کے اقتدار کے باوجود افریقیۃ کو اس وقت تک بھی امن

نصیب نہ ہو سکا، کیونکہ الموحدین افریقیۃ پر براہِ راست نہیں بلکہ ایک والی کے ذریعے فرمانروائی کرتے تھے، جو تونس میں رہا کرتا تھا؛ حاکمِ وقت کا یہ نمائندہ، جو عام طور پر بادشاہ کا کوئی قریبی رشتہ دار ہوتا تھا، صوبے کے اندر امن بحال کرنے میں بہت جلد ہی ناکام ثابت ہوا؛ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ صوبے کو عربوں کا متواتر خطرہ تو پہلے ہی لاحق تھا اب اس کے علاوہ ۱۱۸۵ء کے بعد سے ارمنی طالع آزما قَراقُوش کے تُرکمانی جیش اور بیت بنو غانیہ کے مُرابطین، علی (م ۱۱۸۸ء) اور یحیٰی [ابنا اسحاق بن محمد ابن غانیۃ] کی آخری کوشش سے اختلالِ احوال رونما ہونے لگا ۔ خلفاے مرّاکش یعنی یوسف (۱۱۸۰ء میں) اور یعقوب المنصور (۱۱۸۷ء میں) بنفسِ نفیس بھاری لشکر لے کر آئے لیکن ان کی آمد سے بھی صورتِ حالات بہتر نہ ہو سکی ۔ آخرِ کار قسمت نے یحیٰی کی یاوری کی اور ۱۲۰۰ء میں اس نے اپنے سابق حلیف قَراقُوش کو ٹھکانے لگایا اور اپنے حریف ابن عبدالکریم الرَغْراغی "خلیفۂ" مہدیّہ پر غلبہ پایا اور اپنے قاعدۂ عمل سے، جو علاقۂ جرِید میں تھا، ملکِ تونس کے تمام حصّوں پر اپنی حکومت قائم کر لی ۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ خلیفہ النّاصر نے ۱۲۰۵ — ۱۲۰۷ء میں ایک مہمّ بھیجی جس نے یحیٰی کی حالت کو متزلزل کر کے المُرابطین کے دور کو ختم کیا اور ایک زبردست صوبائی حکومت قائم کر کے اسے اوّل اوّل شیخ عبدالواحد بن ابی حَفْص (۱۲۰۷ تا ۱۲۲۱ء) بطل الاَرَک Alarcos کے سپرد کیا ۔ غرض اس طرح حَفْصِیوں نے پہلی بار اقتدار و اختیار پر دسترس پائی ۔

خاندانِ بنوحفص [رَکَ بآن]، جس کا ایک اَور رکن ۱۱۸۴ء سے تونس کا والی رہ چکا تھا، ہِنْتاتَہ بربروں کے (جو مرّاکشی اَطْلَس Atlas کے قبائلِ مَصْمُودَۃ میں کا ایک قبیلہ ہے) ایک امیر کی اولاد میں سے تھا ۔ اس خاندان نے مقرّبانِ مہدی ابن تُومَرْت کی حیثیت سے اہمّ کام سرانجام دیے تھے۔ ابو محمد عبداللّٰہ کے گورنر مقرر ہونے پر وہ ۱۲۲۶ء میں افریقیۃ میں قطعی طور پر متمکّن ہو گئے تھے؛ دو سال بعد عبداللّٰہ کو اس کے بھائی ابو زکریّاء [یحیٰی] (۱۲۲۸ تا ۱۲۴۹ء) نے میدان سے دُور کر کے خود اس کی جگہ لے لی ۔ ابو زکریّاء گو آہستہ آہستہ خودمختار ہو رہا تھا لیکن اس نے صرف امیر ہی کے لقب پر اکتفا کی ۔ وہی در حقیقت تونس کے اس عظیم الشان خاندان کا بانی ہے جس نے مختلف نشیب و فراز کے باوجود تقریباً ساڑھے تین سو برس تک حکومت کی ۔ اگرچہ انھوں نے بنی عبدالمؤمن کی اختیارداری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مالکی مذہب دوبارہ اختیار کر لیا تھا، اس کے باوجود وہ ہمیشہ الموحّدین کی روایات سے اپنی غیرمتزلزل وفاداری کا اظہار کرتے اور اپنے آپ کو ان کا صحیح نمائندہ سمجھتے رہے ۔ ان کی حکومت کا نظام، خفیف تبدیلیوں کے باوجود، ہمیں الموحّدین کی ابتدائی حکومت کے نظام کی یاد دلاتا ہے ۔ گو دوسرے خودمختار امیر [ابو عبداللّٰہ محمد بن] ابی زکریّاء المعروف بہ المستنصر [باللّٰہ] کی خلافت کا اعلان ۱۲۵۰ء میں مکّۂ مکرّمہ سے ہوا، اس کے باوجود الموحّدین کی ایک اہمّ جماعت اس کے گرد جمع رہتی تھی؛ جو سلطنت کے سیاسی اور فوجی نظام میں سنگِ گوشہ (corner-stone) کا حکم رکھتی تھی، ان کے سکّے بھی مسکوکاتِ الموحّدین کے نمونے کے ہیں اور ان سکّوں کے وزن بھی وہی ہیں ۔ سرکاری محکمے تین بڑے شعبوں میں منقسم تھے : محکمۂ فوج، خزانۂ شاہی ('الاَشْغَال') اور دیوان (chancellery) ۔ صوبوں کے والی مدّت تک ترجیحاً بلکہ مُخْتَصّاً بادشاہ کے قریب ترین رشتہ‌داروں ہی میں سے چنے جاتے تھے لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا

غلط ہوگا کہ جہاں تک حکومت کے اعلیٰ اداری عہدوں اور ملک کی علمی زندگی کا تعلق تھا ''اَنْدَلُسی'' مسلمان پناہ گزینوں کی کثیر تعداد نے، جو تیرھویں صدی میں اندلس سے نکالے گئے تھے، ان میں نمایاں حصّہ لیا.

بنوحفص کو اہلِ افریقیة کی استمالت منظور تھی مگر اس باب میں انھوں نے جب بھی کوشش کی انھیں مسئلۂ عرب سے دوچار ہونا پڑا - خانہ بدوش بنوسُلَیم بنوریاح کو بھگا کر اندرونِ ملک کے مالک بن بیٹھے تھے؛ ان کے جتھے گو آپس میں دست و گریبان رہتے تھے مگر دیہاتی علاقوں سے باقاعدہ طور پر وصولیاں کر ہی لیتے تھے - ان میں سے قبائلِ کُعُوب، جو مُخْزَن میں سے تھے، اکثر اوقات خاندانِ امراء کے اندرونی جھگڑوں میں دخل انداز ہوتے رہتے تھے، تونس کو خطرے میں ڈال دیا کرتے تھے اور اپنی پسند کے دعوےٰ دارانِ حکومت کی حمایت کرتے رہتے تھے؛ ان کی ان باتوں سے اہلِ شہر کو مایوسی کے عالم میں اس سے چارہ نہ رہتا تھا کہ وہ جان پر کھیل جائیں- ۱۲۸۳ء میں ان قبائل نے ایک بادشاہ سے، جسے ان کی بدولت تخت حاصل ہوا تھا، جاگیر ('اِقطاع') کی منظوری کا فرمان حاصل کر لیا، جس کی رو سے انھیں چند شہروں کے محاصل کی وصولی کا حق مل گیا - اس خاندان کی دو شاخوں یعنی اولاد ابی اللّیل اور اولاد مُہَلْہَل [کذا] کی باہمی رقابت آئندہ چل کر چودھویں صدی میں مرکزی طاقت پر براہِ راست اثر بد ڈالنے والی تھی .

المستنصر [محمد اول] کی وفات (۱۲۷۷ء) تک اس خاندان نے بڑی شان و شوکت کے دَور دیکھے - کبھی کبھی متفرّق بغاوتیں برپا ہوتی رہیں مگر ان کے باوجود اس خاندان کی حکومت کی وسعت طرابُلُس سے لے کر الجزائر کے اندر تک تھی اور بڑے بڑے شہروں یعنی تونس، قسنطینیة اور بِجَایة Bougie میں مضبوطی سے قائم تھی - اس کا رعب و داب شمالی افریقہ کی حدود سے باہر بھی قائم تھا، چنانچہ ہسپانیہ اور مسیحی یورپ کی آنکھیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگیں- یہ اسی زمانے کی بات ہے جب بَرْشَلُونة Barcelona، مرسیلیا Marseilles، جنوہ Genoa، پِیزا Pisa، صِقِلّیة اور وینس Venice سے ان کے تجارتی تعلّقات با قاعدہ قائم ہو چکے تھے؛ تجارتی اور جہازرانی کے عہدنامے لکھے گئے، تونس میں عیسائی قونصل خانے قائم ہوے، چونگی کے محاصل کی اہمیّت بڑھی، جس کی بدولت تونس کا پہلے سسلی کو اور پھر اَرغون Aragon کو خراج دینا حق بجانب معلوم ہوتا تھا - عیسائی اجیر سپاہیوں کا ایک گروہ حَفْصی امیر کے گرد جمع تو تھا مگر ۱۲۷۰ء میں سینٹ لوئیس کے صلیبی سورماؤں نے قَرطاجَنّة پر جو حملہ کیا تھا اس کی وجہ سے اُسے سخت خطرہ لاحق گیا تھا.

مختصر یہ کہ افریقیة کو سابقہ دو صدیوں کی بہ نسبت زیادہ پائدار اور خوشحال حکومت نصیب ہوئی: اس کا ثبوت یہ ہے کہ علمِ فقہ اور فنِ تعمیر [قَبّ تونس (دارالملک)] کو خوب فروغ حاصل ہوا - بدقسمتی سے تخت و تاج کے دعوےٰ دار شہزادوں کے دعاوی کی بدولت پے در پے انقلابات ہونے لگے - ان میں سے بعض کا شاہی خاندان کے ساتھ حقیقی اور واقعی رشتہ تھا اور بعض کا مزعومہ اور جعلی — جیسا ۱۲۸۳ء میں ابن ابی عُمارة کی صورت میں ہوا — اس وجہ سے خلیفہ کا اقتدار نہ صرف تیزی کے ساتھ کمزور ہوتا چلا گیا بلکہ اس سے رعایا کی باہمی یک جہتی اور اتّحاد میں بھی کمی آنے لگی جو پہلے بھی کچھ بہت زیادہ نہ تھی اور اس بات سے عربوں نے فائدہ اٹھایا - جب المُسْتَنْصِر کا بیٹا الواثق جبراً خلافت سے معزول کر دیا گیا (۱۲۷۹ء) تو اس کے بعد اس کی نسل سے صرف ایک اَور حکمران

[محمد بن یحیی] ابوعَصیدة تخت پر بیٹھا (۱۲۹۵ تا ۱۳۰۹ء) [اس کی کنیت کی توجیہ کے لیے دیکھیے ابوالفداء، طبع مصر ۱۳۲۵ھ، ۳ : ۱۸۸] اور اس کے ساتھ ھی اس گھرانے میں خلافت ختم ھو گئی ۔ نیا خاندان ابو زکریاء کے ایک اور بیٹے ابواسحٰق ابراھیم (۱۲۷۹ تا ۱۲۸۳ء) کی اولاد میں سے تھا، جو ایک تیسرے بیٹے ابوحَفْص (۱۲۸۴ تا ۱۲۹۵ء) اور اس کے بعد ایک عمّزاد عزیز ابویحیٰی [زکریاء] بن اللِّحیانی (۱۳۱۱ - ۱۳۱۷ء) کی حکومت کے بعد آخرِ کار بر سرِ اقتدار آیا ۔ اس نئے خاندان کی ابتداء ابویحیٰی ابوبکر سے ھوئی (۱۳۱۸ تا ۱۳۴۶ء) [جو حَفْصیوں کا گیارھواں امیر تھا؛ دیکھیے زامباور، ص ۷۶].

بنو حفص کے باھمی اتّحاد و اتّفاق کو بِجَایة کی علٰیحدگی اور خود مختاری کی وجہ سے بڑا صدمہ پہنچا تھا لیکن یہ اتّحاد از سرِ نو قائم ھو گیا ۔ جِرْبَة، روجر والیِ لَوریَة Loria کی فتح (۱۲۸۴ء) کے وقت سے عیسائیوں ھی کے قبضے میں چلا آتا تھا مگر ۱۳۳۷ء میں اسے [حفصیوں نے] ان سے واپس لے لیا ۔ بنو عبدالوَاد کا خطرہ بنو مَرین سے اتّحاد ھو جانے کی وجہ سے دور ھو گیا ۔ مَرینی اس وقت قوّت و شوکت حاصل کر چکے تھے، لیکن خود اس اتّحاد میں ایک خطرہ مخفی تھا، کیونکہ مَرینی سلطان ابوالحسن نے، جو ایک رفعت جُو شخص تھا اور تِلِمْسان پر پہلے ھی قابض ھو چکا تھا، ۱۳۴۷ء میں اندرونی بدامنی سے فائدہ اٹھاتے ھوے افریقیة پر حملہ کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کیا اور اپنے فقہاء اور درباریوں سمیت آ کر اُس نے تونس کو اپنا مستقر بنا لیا ۔ ۱۳۵۰ء میں حَفْصی حکومت کو بحال کرنے کے لیے عربوں کو ایک بغاوت کرنے کی ضرورت پیش آئی جو کامیاب ھوئی ۔ کوئی سات سال کے بعد ابوعِنان مَرینی کی فوجوں نے پھر تونس پر قبضہ کر لیا، گو یہ قبضہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا.

اسی زمانے میں جب ابواسحٰق ابراھیم (۱۳۵۰ - ۱۳۶۹ء) بر سر حکومت تھا اس کے دسیسہ‌کار حاجب ابن تَفْراگِین (م ۱۳۶۴ء) کی شخصیت منصّۂ ظہور پر آنے لگی؛ تاھم اس کی مساعی سلطنت کے تمام ممالک کو دوبارہ متّحد کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہ ھو سکیں ۔ ملک کا جنوبی حصّہ بالخصوص، آھستہ آھستہ، خلیفہ کے ھاتھوں سے نکل گیا؛ وھاں مقامی خاندان متمکّن ھو گئے؛ مثلاً تَوْزَر میں بنی‌یَمْلُول، نَفْطَة میں بنوالخَلَف، قَابِس میں بنومَکّی اور طرابُلُس میں بنوثابت، لیکن ابوالعباس نے (۱۳۷۰ تا ۱۳۹۴ء)، جس نے اپنی سیاسی زندگی قُسَنْطِینیة میں شروع کی تھی، اپنے خاندان کی شان و شوکت کو بحال کر دیا اور لگاتار حملوں سے اس نے باغیوں کو مطیع و منقاد کر لیا ۔ اس کے عہد میں فرانسیسی۔جنوی محاربۂ صلیبی بھی ھوا، جو بحری قزاقوں کے مظالم کے خلاف ایک انتقامی کارروائی تھی؛ لیکن ان کی یہ کوشش ۱۳۹۰ء میں مہدیة کے بالمقابل ناکام ھو گئی.

اس کے بیٹے ابوفارِس (۱۳۹۴ تا ۱۴۳۴ء) نے بحری طاقت کو ترقّی دی، بلکہ ۱۴۲۸ء میں ایک بحری بیڑہ مالٹا پر حملہ کرنے کے لیے بھی بھیجا لیکن دوسری طرف اسے الاذفونش معروف بہ بزرگ طبع (Alfonso the Magnanimous) کے قَیْطَلُونیوں (Catalans) اور صِقِلّیوں کے خلاف اپنی مدافعت کرنا پڑ گئی ۔ انھوں نے ۱۴۲۴ء میں جزائر قَرقِنّة Kerkenna پر قبضہ کر لیا اور ۱۴۳۲ء میں جِرْبَة پر زبردست حملہ کیا ۔ ابوفارِس نے ان کے مقابلے کے لیے راس اَدّار، رَفْرَف اور حَمّامات کے قلعے تعمیر کیے اور ۱۴۲۴ء میں تِلِمسان پر قبضہ کر کے وھاں بھی اپنا تسلّط جما لیا.

حفصیوں کے عہد میں پندرھویں صدی کا زمانہ اس لیے نمایاں ہے کہ اس میں موالی (آزاد شدہ غلاموں) کی اہمیت بڑھنے لگی اور 'قائد' کا لقب پاکر وہ والیوں اور جرنیلوں کے عہدوں پر مقرر ہونے لگے ۔ حفصیوں کے عظیم الشان بادشاھوں میں سے آخری بادشاہ، ابوعمرو عثمان کا نام اس ساری صدی کے ناموں پر چھایا ہوا ہے، اس نے ۱۴۳۵ سے ۱۴۸۸ء تک حکومت کی ۔ تونس کے بحری قزّاقوں کی سرگرمیوں کے باوجود بلادِ خارجہ سے اس کے تعلّقات دوستانہ تھے ۔ قیطلونیوں اور جنویوں کو طَبَرْقَة میں مونگا نکالنے اور راس بون میں تُونَہ مچھلی (Tunny) پکڑنے کی مراعات دی گئیں ۔ ملک کے اندر طریقۂ مرابطین نے، جو مغرب سے آیا تھا، اپنا حلقۂ اثر وسیع کیا اور چونکہ پہلے کی بہ نسبت امن تھا اس لیے کاشت‌کاری میں ترقّی ہوئی، گو خانہ‌بدوش عربوں کی وجہ سے، جو شورش اور بےنظمی کا دائمی منبع تھے، بدامنی برابر جاری رہی.

عثمان کی وفات پر حالات بہت جلد خراب سے خراب تر ہوگئے؛ چند سال کے اندر ھی اندر تین خلفاء یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوے؛ پھر ابوعبداللہ (۱۴۹۴ تا ۱۵۲۶ء) کے عہد میں یہ سلطنت، جو داخلی طور پر قبائل کی یاغی‌گری کی وجہ سے بالکل پارہ پارہ ہو چکی تھی، اب آہستہ آہستہ ہسپانیوں کی ضرباتِ کاری کے سامنے دم توڑنے لگی، جو ترک بحری قزّاقوں کے تعاقب میں ان علاقوں میں آنے لگے تھے ۔ ۱۵۱۰ء میں پیڈرو ناوارو Pedro Navarro نے سلطنت کو بجَایة اور طرابلس کے صوبوں سے محروم کر دیا ۔ ۱۵۲۰ء میں ہیوز دِ مُنْکاد Hughes de Moncade نے جِرْبَة پر عارضی طور پر قبضہ کر لیا ۔ آخر کار اگست ۱۵۳۴ء میں ابوعبداللہ [محمد پنجم] کے بیٹے اور جانشین یعنی بدقسمت الحسن کو مشہور و معروف خیرالدین بربروسہ نے تونس سے مار بھگایا ۔

ابوعبداللہ حسن جون ۱۵۳۵ء تک واپس نہ آیا، چارلس پنجم نے شہر پر قبضہ جما لیا تو جولائی مذکور میں حسن اس کا باجگزار بنا اور اس نے قلعۂ حلْق الوادی (La Goullete) ھمیشہ کے لیے ہسپانیوں کے حوالے کر دیا ۔ اس حمایت کی شرطیں ۱۵۴۰ء میں اور بھی زیادہ سخت ہوگئیں جب کہ اینڈریا ڈوریا Andrea Doria نے سَفاقُس، سُوسة اور مُنَسْتِیر کو فتح کر لیا ۔ جب ہسپانیوں نے سخت ہزیمتیں اٹھائیں اور قیروانی باغی سِیدی عرفَة اور شابِیّة کی زبردست حِلْف مُرابطی کے خلاف، جس نے تمام وسطی تونس پر قبضہ جما رکھا تھا، لڑتے ہوے الحسن کی اپنی ھی فوج نے غدّاری کی تو ۱۵۴۲ء میں امداد حاصل کرنے کی غرض سے وہ یورپ چلا گیا مگر اس کی غیرحاضری میں اس کے بیٹے احمد (حَمِیْدَة) نے اسے معزول کر دیا ۔

''بےرحم اور بہادر'' حَمِیدَة نے اپنے آباء و اجداد کی سلطنت کو دوبارہ فتح کرنے کی ناکام کوشش کی ۔ ایک نئے بطل یعنی ترکی قزّاق دُرغُوث [تورغُت] کو، جسے اہلِ جنوہ سے جزیرہ طَبَرْقَة کے عوض میں رہا کرایا گیا تھا، ۱۵۵۰ء میں ہسپانیوں نے مہدِیّة سے بھگا دیا لیکن بعد کے اپریل میں وہ جِربَة کے درّوں میں بڑی چالاکی سے اینڈریا ڈوریا کی قید سے فرار ہو گیا اور طرابلس میں اپنا مرکز قائم کر کے اس نے ۱۵۵۶ء کے اواخر میں قَفْصَة پر قبضہ کر لیا اور ۱۵۵۸ء کے آغاز میں قیروان بھی لے لیا، جہاں اس نے حیدر پاشا کی کمان میں فوج چھوڑی ۔ ۱۵۶۰ء میں صِقلّیة (سسلی) کے نائب الملک، مدینۂ سالم کے ڈیوک Duke of Medina-Celi نے جِربَة کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی تو دُرغُوث نے اسے تباہ کن شکست دی لیکن ۱۵۶۵ء میں وہ خود مالٹا کے محاصرے میں مارا گیا ۔

متعدّد معاهدوں کے باوجود حمیدۃ اور حلْق الوادی (La Goulette) کے ہسپانوی عامل (’گورنر‘) کے درمیان متواتر لڑائیاں ہوتی رہیں، اس وجہ سے ۱۵۶۹ء کے آخر میں الجزائر کے والی علی پاشا Euldj ‘Ali (اولوج علی) نے تونس پر آسانی سے قبضہ کر لیا اور وہاں محافظ فوج متعیّن کر دی - ۱۵۷۳ء کے موسمِ خزاں میں جب آسٹریا کے ڈون جان Don John فاتحِ لیپنٹو Lepanto نے تونس پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو اس نے محمد بن الحسن کو تخت دلا کر حفْصی خاندان کو آخری مرتبہ بحال کر دیا اور سربلونی Serbelloni کو اس کا مشیر مقرر کیا - اگست و ستمبر ۱۵۷۴ء میں عثمانی فوجوں نے، جو قسطنطینیۃ سے سِنان پاشا کے بیڑے میں بھیجی گئی تھیں، حلْق الوادی اور تونس کو فتح کر لیا اور اس طرح ہسپانوی قبضے کا خاتمہ کر دیا، جو ہمیشہ سے محدود اور غیر یقینی ہی رہا تھا؛ اس سے قدیم حفْصی خاندان کا بھی خاتمہ ہو گیا، جو کم و بیش ’’وطنی‘‘ حکومت تھی اور جو شان و شوکت کے کئی زمانے دیکھنے کے بعد اب تدریجی طور پر بیکسی اور انحطاط کی گہرائیوں میں ڈوب چکی تھی؛ البتہ ۱۵۸۱ء میں اس نے سنبھالا لیا جب حمیدۃ واپس آیا اور تونس کے بےدرخت دشت کے علاقے اور جرید پر چند سال تک قابض رہا.

قسطنطینیۃ واپس جانے سے پہلے سِنان [پاشا] نے مملکتِ تونس کو مستقل ترکی صوبہ قرار دیا جس کا حاکم ایک پاشا ہو - پہلے تو یہ صوبہ الجزائر کے ماتحت رہا اور پھر ۱۵۸۷ء سے براہِ راست بابِ عالی کے ماتحت ہو گیا - ترکوں کی احتلالی فوج جو تونس میں مقیم تھی اس کی تعداد چار ہزار تھی، ایک ’’آغا‘‘ اس کا کماندار تھا اور ہر سو آدمی پر ایک دَایْ (داعی) مقرر تھا، لیکن ۱۵۹۱ء میں ’دیوان‘ یعنی اعلٰی افسروں کی ہیئتِ حاکمہ کے مظالم کی وجہ سے ایک خونریز انقلاب کی آگ بھڑک اٹھی، جس کے اختتام پر تمام اختیارات چالیس دایات میں سے ایک کے سپرد کر دیے گئے دایات کی حکومت میں، جنھیں یکی چری (Janissaries) منتخب کیا کرتے تھے، ’’پاشا‘‘ یعنی سلطان کے نمایندے کی حیثیت اب محض اعزازی رہ گئی تھی - اس کے برعکس ’دیوان‘ کی تنظیم بھی از سرِ نو کی گئی اور یہ ہیئت حاکِمہ بڑی با رسوخ ہو گئی، اسی طرح جس طرح بحری قزاقوں کی انجمن ’’طائفۃ الرئیس‘‘ بڑی معتبر سمجھی جانے لگی - مذہبی لحاظ سے حنفی مذہب کو سرکاری طور پر تقدّم حاصل تھا.

اس نیابت کے نظام کی تکمیل دای ثالث عثمان (۱۵۹۴ تا ۱۶۱۰ء) کی مرہونِ منّت ہے، جس نے ’’میزان‘‘ کے نام سے ایک مجموعۂ قوانین وضع اور ایک بای کی مدد سے ملک میں امن قائم کیا - بای کے فرائض منصبی یہ تھے کہ وہ مسلّح فوج (’مَحَلّۃ‘) کے ساتھ سال میں دوبار دورہ کر کے لگان وصول کرے - قپودان رئیس (*ra'īs*) کی وساطت سے حکومت بڑے بڑے سمندروں میں بحری قزاقوں پر اپنا ضبط قائم رکھتی تھی اور ان کے منافع میں بڑے پیمانے پر حصہ‌دار تھی - جب بہت سے نومسلم لٹیروں، بالخصوص وارڈ Ward نے جو انگریز تھا، اس کام کو فنّی حیثیت سے ترقی دی تو حکومت کو بہت سی آمدنی ہونے لگی - اندلس کے مسلمان، جو ۱۶۰۹ء میں وہاں سے خارج کر دیے گئے، تونس اور راس اَدّار Bon (سُلیمان Soliman، قُرنبالیۃ Grombalia) اور دوسرے مقامات (مثلاً طِبورِبۃ، مَجازالباب، تِستُور، قلعۃ الاندلس) میں آ کر آباد ہو گئے تھے - ان کی وجہ سے سبزیوں کی کاشت اور صنعت و حرفت (مثلاً موزہ سازی، اور رنگرزی) کو بڑی ترقّی ہوئی - سلطنت ترکیہ کی اطاعت بھی کچھ ڈھیلی ہی پڑ گئی؛ چنانچہ نوبت یہاں تک

پہنچی کہ فرانس نے، جسے امتیازاتِ عثمانی حاصل ہونے کی وجہ سے ساری سلطنت عثمانیہ میں خاص حیثیت حاصل تھی اور جس نے ۱۵۷۷ء سے تونس میں اپنا ایک قنصل خانہ بھی کھول رکھا تھا، دِ بریو S. de Brèves کو اپنا سفیر بنا کر تونس کے ''اولوا الامر'' سے براہِ راست معاملات طے کر نے کے لیے بھیجا.

عثمان کے داماد اور جانشین یوسف (۱۶۱۰ تا ۱۶۳۷ء) کے زمانے میں تونس کی نیابت نے طرابلس کے پاشا سے جِربۃ واپس لے لیا؛ ایک نئی سی بات یہ ہوئی کہ تونس اور الجزائر کی سرحد متعین ہو گئی، اس لیے کہ ۱۶۱۴ اور ۱۶۲۸ء میں اھل الجزائر نے [علاقۂ تونس پر] حملے کیے تھے ۔ اس کے بعد ایک اور دای، اُستا مراد، کا زمانہ (۱۶۳۷ تا ۱۶۴۰ء) آیا ۔ یہ شخص جنوہ کا نومسلم اور کہنہ مشق بحری قزّاق تھا ۔ اس نے پورتو فارِینہ Porto Farina [= غارالمِلح] کو مستحکم کر کے اندلس کے مسلمانوں کو وھاں آباد کیا ۔ لیکن دایات کے اختیارات زوال پذیر ہو رہے تھے، اس لیے ان چوبیس دایوں (مثلاً خوجہ، لاز وغیرہ) کی تفصیل دینا بےسود ہے جو ۱۶۴۰ سے ۱۷۰۲ء تک حکمران رہے اور عام طور پر بایات کے ھاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتے رہے، کیونکہ بایات انھیں نیچا دکھانے میں کامیاب ہو گئے تھے.

بای مراد (۱۶۱۲ تا ۱۶۳۱ء) اصل میں کارسیکا Corsica کا رھنے والا تھا اور پاشا کہلاتا تھا ۔ اس نے اپنی زندگی ھی میں سلطنت کے کاروبار اپنے بیٹے محمد (حَمودۃ) کے حوالے کر کے ایک مثال قائم کر دی، جس کی وجہ سے حکومت اس کے خاندان میں موروثی ہو گئی ۔ حمودۃ (۱۶۳۱ تا ۱۶۶۳ء) ۱۶۵۹ء میں اپنی باری پر پاشا بنایا گیا ۔ اس نے سپاھیوں ('الصبائحیّۃ'؛ رَکَ بہ سپاھی) کے ایک لشکر پر بھروسہ کرتے ہوئے انھیں تونس، قیروان، الکاف Le Kef اور باجہ پر تقسیم کر دیا اور تمام ملک کا حقیقی مالک بن گیا اور خاندانِ مرادی کا بانی ہوا، جس میں اس کے بیٹے مراد اور محمد الحَفصی، اس کے پوتے محمد علی اور رمضان شامل تھے ۔ ان کا اقتدار مقامی خانہ جنگیوں (مثلاً محمد بن شُکر کی بغاوت) کی وجہ سے ھمیشہ خطرے میں رہا؛ چنانچہ اس فتنہ و فساد کا انجام یہ ھوا کہ مراد بُو بالہ اس کا پرپوتا ۱۷۰۲ء میں قتل ہو گیا.

سترھویں صدی کے نصفِ اوّل میں نمایاں بات یہ ہوئی کہ یورپ کے ساتھ تجارت کا سلسلہ پھر شروع ہوا، خاص کر مارسیلیا اور لیووُرنو Livorno سے، جس کے لیے زیادہ تر ھسپانیۃ اور اطالیۃ کے عیسائی تاجر ذمے دار تھے ۔ مارسیلیا کی شرکاتِ تجاری، جو رأس الاَسْود (Cape Negro) یا بنزرت Bizerta میں قائم ہوئیں، طَبَرقَۃ کے جنوبی سوداگروں سے مونگے کی تجارت میں مقابلہ کرتی تھیں اور چمڑے اور غلّے وغیرہ کی برآمد سے بڑا نفع اٹھاتی تھیں ۔ نیابت (ریجنسی) کے خارجی تعلّقات میں وسعت پیدا ہوئی، مثلاً اَور ملکوں کے علاوہ برطانیہ کلاں اور ندرلینڈ سے بھی اس کے تعلّقات قائم ہو گئے ۔ اس صدی کے نصف ثانی میں فُرسانِ مالٹا (the Knights of Malta) کی انتقامی مہمّوں کے علاوہ یورپی افواج کے دستوں نے بحری ڈاکوؤں کے خلاف کئی دفعہ ساحل پر گولہ باری کر کے تاوان کا مطالبہ کیا.

ملک کی اندرونی حالت پہلے تو بہت آسودگی کی تھی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ تعمیراتِ عامّہ اور مذھبی عمارتیں تمام ملک میں تعمیر ہوئیں (مثلاً تونس، باجۃ، قیروان اور سِیدی صاحب کے مدارس اور مساجد) لیکن مرادی خاندان کے آخری

امراء کے عہد میں رفتہ رفتہ خرابی پیدا ہو گئی، تاآنکہ ۱۶۸۵ - ۱۶۸۶ء اور ۱۶۹۴ء میں الجزائر کے حملے ممکن ہو گئے ۔ قبائل، جن میں اولاد سعید کا خوفناک قبیلہ بھی شامل تھا، سرکشی کرنے لگے اور ایک عرصے تک الکاف بنو شنّوف کے قبضے میں رہا اور قلعة السِنام پر بنوحَنّانشة قابض رہے ۔ جبل وُسلات Dj. Ouselat بغاوت کا بڑا مرکز تھا، وبائی طاعون کے کئی حملے ہوے جن سے بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے .

ابراهیم الشریف (۱۷۰۲ تا ۱۷۰۵ء)، کی ذات میں بای، دای، پاشا اور آغاے فوج کے تمام عہدے پہلی بار جمع ہوے، اُس کے خونچکاں عہدِ حکومت کے بعد حسین بن علی ترکی کے بای بنائے جانے کا اعلان (۱۰ جولائی ۱۷۰۵ء) ہوا ۔ اس وقت الجزائر کا نیا حملہ جاری تھا ۔ اس طرح حسینی خاندان کی بنیاد پڑی، جو اب تک بر سرِ حکومت ہے ۔ حسین نے امن قائم کیا اور بہت سی عمارتیں بھی بنوائیں (مثلاً قیروان میں) لیکن جب اس نے یہ کوشش شروع کی کہ آئندہ حکومت براہِ راست اس کی صلبی اولاد ھی میں منحصر رہے اور وهی یکے بعد دیگرے اس کے جانشین ہوں تو اس کے بھتیجے علی پاشا (۱۷۳۵ تا ۱۷۵۶ء) نے الجزائریوں کی مدد سے اسے معزول کر دیا ۔ اس سے نئے مصائب پیدا ہو گئے اور اس کے ساتھ ھی یونس بن علی نے ۱۷۵۲ء میں بغاوت کر کے ان مصیبتوں میں اور اضافہ کر دیا ۔ آخرکار الجزائریوں کی مزید دخل‌اندازی کے بعد حسین کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا (۱۷۵۶ تا ۱۷۵۹ء)؛ اس کے بعد علی بای (۱۷۵۹ تا ۱۷۸۲ء) کے، جو محمد کا بھائی تھا اور پھر اس کے بیٹے حمّودة (۱۷۸۲ تا ۱۸۱۴ء) کے دورِ حکومت کی مساعیِ جمیلہ نے مملکت کے بہت سے زخم مندمل کر دیے اور تونس کی حقیقی خوشحالی پھر بحال ہو گئی.

زراعت کی طرح غیرملکی تجارت کو بھی بہت فروغ ہوا ۔ اگرچہ بای نے ۱۷۴۱ء میں رأس الأسوَد (Cape Negro) اور طَبَرْقَة کی تجارتی کوٹھیوں کو برباد کر دیا تھا پھر بھی عیسائی حکومتوں سے اس کے تعلقات بہت بڑھ گئے؛ کئی معاهدے ہوے جن پر نیابت کی طرف سے اب صرف بای هی دستخط کیا کرتا تھا اور باقاعدہ بادشاہ متصوّر ہوتا تھا ۔ فرانس والوں کی کئی موقعوں پر تونس سے جنگ ہوئی، تاهم انھوں نے بالآخر وھاں اپنا قنصلِ عام مقرر کر دیا ۔ وینس والوں سے بھی ایک جنگ ہوئی، جو آٹھ سال تک جاری رھی (۱۷۸۴ تا ۱۷۹۲ء) ۔ علی بای نے ۱۷۶۲ء میں جبلِ وُسلات کے باغیوں کو نیچا دکھا کر منتشر کر دیا تھا مگر الجزائر والوں کا کچھ بندوبست نہ کر سکا جو حمّودة [بن علی بن حسین] کو بیحد پریشان کرتے رہے ۔ حمّودة نے ''صاحب الطابع'' یوسف کی مدد سے ۱۸۱۱ء میں سرکشی اور فتنہ جو یکی چریوں کا قتلِ عام کیا اور حکومت از سرِ نو مرتّب کی .

انیسویں صدی میں نیابتِ تونس کی سیاسی حیثیت میں نمایاں تبدیلیاں ہونے والی تھیں ۔ سب سے پہلے قُرصان (corsairs) یعنی بحری قزّاقوں اور ان کی قزّاقی کا قرار واقعی انسداد ہوا، اگرچہ یہی سمندری لوٹ مار سلطنت کے محاصل کا ایک بڑا ذریعہ تھی ۔ محمود [بن محمد] (۱۸۱۴ تا ۱۸۲۴ء) ان کے انسداد پر اس لیے مجبور ہوا کہ یورپی سلطنتوں نے وِیاَنّا اور اَیْکْس لا شاپِل Aix la Chapelle کی مؤتمر (کانگرس) کے بعد انسدادِ قزّاقی پر اصرار کیا تھا ۔ اس کے بعد بعہدِ بای حسین (۱۸۲۴ تا ۱۸۳۵ء) جب ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہو گیا تو اس سے بھی اَن گِنت نتائج برآمد

ہوے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ نصف صدی تک تونس نے اپنے اندرونی نظام کی ترمیم و تجدید سے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنانے کی بےسود کوشش کی: ایک طرف ڈھیلی ڈھالی اور غیرمسلسل عثمانی اختیارداری تھی اور دوسری طرف تونس کے معاملات میں عیسائی حکومتوں کی دخل‌اندازی، جو وہ اپنے قنصلوں کے ذریعے کرتی رہتی تھیں۔ تونس کی حکومت کو ان کے بین بین چلنا پڑتا تھا.

بابِ عالی کا حقِ اختیارداری (suzerainty)، جس کی برطانیہ کی طرف سے تائید ہوتی تھی اور فرانس کی جانب سے مخالفت، صرف چند شاہی فرمانوں ھی کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا تھا جو بایات کے تقرر کے وقت جاری ہوتے تھے؛ علاوہ بریں اس حق کی اس وقت بھی کچھ نمائش ہوئی جب تونس کی فوج (۱۸۵۵ء میں) روسیوں کے خلاف کریمیا میں بھیجی گئی۔ (تونس کے ایک دستے نے ترکی بیڑے کے ساتھ شریک ہو کر ۱۸۲۷ء میں نیورینو Navarino کی لڑائی میں بھی حصہ لیا تھا)۔ اس کے برعکس فرانسیسی، انگریزی اور اطالوی اثر روز بروز بڑھتا رہا۔ یہ سچ ھے کہ فرانسیسیوں کی یہ کوشش کہ تونس کے شہزادوں کو الجزائر میں متمکّن کیا جائے کامیاب نہ ہو سکی، مگر دوسری طرف اب [نیابتِ] تونس نے اس خراج کی وصولی موقوف کر دی جو عیسائی طاقتیں سابقاً تونس کو تجارت کرنے کے لیے ادا کرتی تھیں۔ بای احمد (۱۸۳۷ تا ۱۸۵۵ء) نے، جو ایک طرح کا ''روشن دماغ استبدادی حکمران'' سمجھا جاتا تھا، غلامی کو منسوخ کر دیا؛ یہودیوں کو آزادی دی اور ''تونس کی فوج'' کو یورپی نمونے پر منظّم کیا، اس کے لیے فرانسیسی قواعدداں مقرر کیے اور ۱۸۴۶ء میں لوئی فیلیپ (Louis Philippe) سے پیرس میں ملاقات کی لیکن اس کے بےپناہ اخراجات کی وجہ سے، جس میں پورٹو فارینہ Porto Farina کے اسلحہ‌خانہ اور محلّاتِ محمدیہ کی تعمیر سے اور بھی اضافہ ہو گیا تھا، خزانہ خالی ہو گیا جس میں پہلے ھی روپیہ کم تھا؛ اس لیے نئے ٹیکس لگانا پڑے: 'محصولات'، زیتون کے درختوں پر 'قانون' اور اجارہ داریاں.

اس کے عمّ زاد بھائی محمد (۱۸۵۵ تا ۱۸۵۹ء) نے ایک ٹیکس 'مَجْبی' کے نام سے لگایا، جو ۳۶ پیاسٹر [قرش] فی کس کے حساب سے تھا اور جس سے تونس، سُوسَة، مُنَسْتیر، سفاقس اور قیروان کے شہر مستثنٰے تھے؛ لیکن اس کے عہد کا سب سے بڑا واقعہ یہ تھا کہ قنصلوں کے دباؤ کی وجہ سے ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے ''عہدالأمان'' کے تحت، جس میں ''خطِّ شریف'' [رَكَ بآن] گُلخانہ، ۱۸۳۹ء، بھی منقول تھا، اس نے یہ اعلان کر دیا کہ تونس کے کل باشندے قانون اور ٹیکسوں [محصولات] کے لحاظ سے برابر ھیں، انھیں مذھبی آزادی، حریّتِ تجارت و عمل حاصل ہوگی اور غیرملکیوں کو أملاک (غیرمنقولہ جائداد) خریدنے کا اختیار ہوگا۔ اس کے بھائی محمد الصادق (۱۸۵۹ تا ۱۸۸۲ء) نے ۲۶ اپریل ۱۸۶۱ء کو ایک دستور (constitution) جاری کیا جسے بای کی تحریک پر نپولین ثالث نے پسندیدہ قرار دیا: اس آئین کی رو سے اختیارات بای کے ھاتھ میں رہے، حکومت بای کے خاندان میں موروثی قرار دی گئی مگر اس کے ساتھ ھی وہ اپنے اعمال کا جواب دہ قرار پایا (یہ بھی قرار پایا کہ حسینی خاندان کے شہزادوں میں سے جو سب سے بڑا ہو وہ تخت کا وارث سمجھا جائے گا)۔ معاملاتِ حکومت میں بای کی امداد وزیر کیا کریں گے، جنھیں وہ خود منتخب کرے گا؛ قانون سازی کا اختیار بای اور مجلس عظمٰی میں تقسیم ہو گیا، جو ساٹھ نامزد ارکان پر مشتمل تھی۔ محکمۂ عدالت کو خود مختار رکھا گیا؛ قرار پایا کہ عدالتیں تونس کے ضابطۂ دیوانی و فوجداری پر عمل کریں؛

صوبوں کا انتظام 'قائدین' کے سپرد ہوا، جن کی امداد "شیوخ" کے ذمّے تھی، جن کا تقرّر انتخاب سے ہوگا، بای، اُس کے خاندان اور درباریوں کو صرف 'سِول لِسٹ' دی گئی [یعنی اُن کا وظیفہ مقرر ہوا] اور محصولات کی اجارہ داری کا طریقہ ترک کر دیا گیا۔

اِن اصلاحات کے باوجود حالات بسرعت تمام خراب ہی ہوتے چلے گئے؛ مصطفٰی خَزْنَہ‌دار نے (جو احمد بای کے زمانے میں وزیر مقرر ہوا تھا) قرضے طلب کرنے طریق اختیار کیا اور محصولوں کے ٹیکسوں میں بھی اضافہ کر دیا ۔ یہ اقدامات تباہ‌کن ثابت ہوے؛ چنانچہ قبائل نے ۱۸۶۴ء میں علی بن غَذاهُم کی سرکردگی میں بغاوت کر دی ۔ اس پر جولائی ۱۸۶۹ء میں ایک بین الاقوامی مالی کمیشن (جو تونس، فرانس، اطالیۃ اور مالٹا والوں پر مشتمل تھا) قائم ہوا ۔ ۱۸۶۳ء میں یہ دستور معطّل کر دیا گیا تھا ۔ اکتوبر ۱۸۷۳ء میں خَزْنَہ دار موقوف کر دیا گیا اور اس کی جگہ جنرل [قائد] خیرالدین کا تقرّر عمل میں آیا ۔ اس کی وزارت میں، جو جولائی ۱۸۷۷ء تک قائم رہی، مدبّرانہ اصلاحات ہوئیں، جن سے حالات قدرے رُو بہ اصلاح ہو گئے لیکن ملک کی آمدنی کے باقاعدہ ذرائع کچھ ایسے محدود تھے اور قرض کا بار اتنا زیادہ تھا کہ مالی کمیشن کی کوشش بےکار ثابت ہوئی؛ مصطفٰی بن اسماعیل (ستمبر ۱۸۷۸ء) کا ناقص نظم و نسق بےطاقت حکومت کی کمر توڑنے کے لیے آخری تنکا ثابت ہوا؛ اس کے علاوہ فرانسیسی اور اطالوی قونصلوں رُوستان Roustan اور ماشیو Maccio کے درمیان مصالح عامّہ کے امتیازات حاصل کرنے سے متعلّق شدید اور تلخ کشمکش جاری رہتی تھی۔

۱۸۷۸ء کی برلن کانگرس کے بعد سے برطانیہ اور جرمنی فرانس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے؛ اس وقت فرانس نے تونس میں دخل‌اندازی کی ۔ جب اهلِ [جبالِ] خُمیر Khumirs نے الجزائر پر حملے کیے اور دوسرے کئی واقعات رونما ہوے تو فرانس کے وزیر یول فیری Jules-Ferry نے اپریل ۱۸۸۱ء میں تونس پر حملہ کرنے کے لیے تیس ہزار فوج بھیج دی ۔ ۱۲ مئی کو ترکی احتجاج کے باوجود فرانسیسی جرنیل بریآر Bréart نے ایک قطرہ خون بہائے بغیر [محمد الصادق] کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ قصرِسعید Kassar-Said کے معاهدے (المعروف بہ معاهدۂ باردو Bardo) پر دستخط ثبت کر دے، جس کی رو سے نیابتِ تونس کے کل فوجی، خارجی اور مالی معاملات پر فرانس عملاً متصرّف ہو گیا اور وهاں ایک فرانسیسی وزیرِ مقیم "Minister Resident" مقرّر کر دیا گیا ۔ سب سے پہلے اس منصب پر رُوستان کا تقرّر عمل میں آیا اور یہ ضروری ہو گیا کہ حکومتِ فرانس کے ساتھ تمام معاملات اُسی کے توسّط سے طے ہوا کریں اور اگرچہ اس ملک کے لیے کلمۂ "علاقۂ زیرِ حمایت" ("Protectorate") کا استعمال نہ ہوا تاہم حمایت کی بنیاد رکھ دی گئی اور جب وسطی تونس اور جنوب میں (علی بن خلیفہ کے زیرِ قیادت) شورش ہوئی اور اُسے فرانسیسیوں نے ایک دوسری مہم کے ذریعے بڑی سرعت سے دبا دیا تو یہ ملک واقعۃً اور قطعی طور پر فرانس کی حمایت میں آ گیا اور بای نے ۸ جون ۱۸۸۳ء کے معاهدۂ المَرْسی La Marsa کی رُو سے یہ بات تسلیم کر لی کہ وہ "اُن اداری، عدالتی اور مالی اصلاحات کا اجرا کر دے گا جنھیں حکومتِ فرانس" مفید سمجھے۔

فرانس نے تونس کو علاقۂ زیرِ حمایت (Protectorate) بنا لیا تو تونس کی تاریخ میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ۔ اسلامی فتوحات کے بعد سے اب تک کوئی ایسا سیاسی واقعہ پیش نہ آیا تھا جس سے

ملک کے نظام اور باشندوں کی طرزِ معاشرت پر ایسا گہرا اثر پڑا ہو ۔ اس طرزِ حکومت کی ابتکاری خصوصیت بڑی حد تک یہ ہے کہ پرانے نظامِ حکومت کی خارجی صورت قائم رکھی گئی ہے اور اس کے گرد صرف نئے قالب اور نئے اداروں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ اس نظامِ حکومت پر اعتراض بھی ہوے ہیں مگر ان کے باوجود وہ [حدودِ ۱۹۳۱ء میں] نصف صدی سے بدستور قائم ہے ۔

العظمۃ (ہزہائنس) البای برائے نام اس نیابت کا اختیاردار امیر اور ''صاحبِ'' مملکت ہے لیکن وزیرِ مقیم (ریذیڈنٹ منسٹر)، جو ۲۳ جون ۱۸۸۵ء سے مقیمِ عام (ریذیڈنٹ جنرل) زیرِ فرمان وزیرِ خارجیۂ فرانس اور جمہوریۂ فرانس کا وزیرِ مفوّض برائے نیابتِ تونس کہلاتا ہے، عملی طور پر یہاں کا حقیقی حکمران ہے ۔ وہ بای کا وزیرِ خارجیّہ ہے اور بای پیرس سے صرف اسی کے ذریعے مکاتبت کر سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ اس کی مجلس (کونسل) کا صدر بھی وہی ہے اور وہ بای کے تمام فرامین پر بای کے بعد دستخط کرتا ہے، جن کا نافذ کرنا جنوری ۱۸۸۳ء کے ایک فرمان کے ذریعے لازمی قرار دیا گیا تھا؛ برّی اور بحری افواج کے تمام قائد اور تمام اداری محکمے اس کے حکم کے تابع ہیں ۔ بای کا اپنا محافظ فوجی دستہ نہایت قلیل ہے (۶۰۰ نفر)، اس کی رعایا کو اجباری طور پر تونسی فوج میں بھرتی ہونا پڑتا ہے (از روے فرمانِ بای مؤرخ ۱۲ جنوری ۱۸۹۲ء، جو فوجی بھرتی کے باب میں ہے) اور ایک لحاظ سے یہ فوج فرانسیسی فوج کا ایک حصہ ہے؛ چنانچہ ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء کی جنگِ عظیم میں دس ہزار تونسیوں نے فرانس کی خاطر جان دی ۔

مجلسِ وزراء میں دو (بعد میں تین) ملکی وزیروں کے ساتھ ساتھ محکموں کے فرانسیسی ڈائرکٹر ''Directeurs'' (یعنی رئیس اعلٰی) بھی اجلاس میں شریک ہوتے ہیں ۔ ان ڈائرکٹروں کی تعداد بھی بہت تیزی سے بڑھ گئی ہے ۔ ان کے علاوہ فرانسیسی احتلالی فوجوں کا سپہ سالار اور بنزرت Bizerta کی بحری فوج کا امیرِ بحریّۃ بھی اس مجلس میں شریک ہوتا ہے ۔ یہ دونوں افسر وزیرِ جنگ اور وزیرِ بحریہ کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں ۔ ان اعلٰی عہدےداروں میں سے ہر ایک ضمنی قواعد و ضوابط [لوائح by-laws] جاری کرتا رہتا ہے ۔ قبائل کو مختلف ''قائدیّات'' میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور وہ اداری تقسیمات بن گئی ہیں ہر 'قائد' کے سر پر ایک فرانسیسی مدیرِ نظارتِ داخلی ''contrôleur civil'' سوار ہے ۔

تونسی قانون سازی، جس کا اطلاق صرف ملک تونس ہی پر ہوتا ہے، اکثر امور میں اپنی نظیر آپ ہے ۔ صرف ایسے امور کا فیصلہ جن کا تعلّق مقیمِ عام (ریذیڈنٹ جنرل)، داخلی نظارتوں کے مدیروں یا فرانسیسی محکمۂ عدالت سے ہے صدرِ جمہوریۂ فرانس کے فرمان کے ذریعے سے ہوا ہے مگر سیاست، اداریات اور عدالت گستری کی موجودہ صورت، جو تدریجی طور پر مستحکم ہو چکی ہے، اس سے اس تازہ راے کی تصدیق ہوتی ہے کہ تونس میں دو عملی ''double sovereignty'' [پہلو بہ پہلو] قائم ہے؛ یعنی ایک طرف تو بای کی حکومت ہے جو روایتی ہے اور دوسری طرف فرانس کی حکومت ہے جو جدیدتر اور ترقی پسند ہے ۔ صاحبِ حمایت قوم [فرانس] کی اوّلین مہم یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو غیر ملکی مداخلت کا اس کی دونوں صورتوں (یعنی مالی اور عدالتی) میں سدّ باب کیا جائے ۔ فرانس نے تونس کے قرض کی ادائگی کی ضمانت دی تھی، اس لیے برطانیۃ اور اطالیۃ دونوں اس بات پر راضی ہو گئے کہ مالی کمیشن کو توڑ دیا جائے؛ چنانچہ اکتوبر ۱۸۸۴ء سے یہ کمیشن توڑ دیا گیا ۔

جونہیں تونس کا مالی ادارہ باقاعدہ طور پر منظّم ہو گیا اور اس کا میزانیہ (بجٹ) بھی معمول پر آ گیا تو اس سے ملک کی اقتصادی حالت دوبارہ استقرار پکڑ گئی۔ بای کو اس کے اپنے اور اس کے خاندان اور اہلِ دربار کے لیے وظائف کی معیّن رقم (''سِوِل لسٹ'') دی گئی ۔ اب تک [یعنی وقتِ تحریرِ مقالہ تک] فرانسیسی حکومت میزانیہ میں سرکاری طور پر بعض خاص قسم کے اخراجات کو شامل کرتی رہتی ہے، مثلاً اُسقُفِیّۂ قرطاجنّۃ کا اہمّ زرِ اعانت ۔ یکم جولائی ۱۸۹۱ء کے فرمان کے مطابق نقدی کی وحدت آقچہ (piastre) نہ رہی بلکہ فرانک نے اس کی جگہ لے لی.

۱۰ اپریل ۱۸۸۳ء کے فرانسیسی قانون کی رُو سے نیابتِ تونس کی فرانسیسی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا ۔ اور ۵ مئی ۱۸۸۳ء کے مرسومِ (فرمانِ) بای کی رُو سے یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ وہ تمام لوگ جو پہلے امتیازی مراعات کے مستحق تھے اب ان نئی عدالتوں کے سامنے جواب دہ ہوں گے، اس پر تمام غیر ممالک یکے بعد دیگرے قنصلوں کے عدالتی اختیارات سے دست بردار ہو گئے (۱۸۸۳-۱۸۸۴ء) ۔ اسی طرح انھیں ۱۸۹۶-۱۸۹۷ء میں چونگی کی رعایات ترک کرنا پڑیں، جو انھیں حقوقِ امتیازیہ کی رو سے حاصل تھیں ۔ صرف اطالیۃ نے اپنے حقوقِ خاص محفوظ رکھے، اگرچہ تونس سے اُس کے معاہدۂ ۱۸۶۸ء کی میعاد گذر جانے پر اور حبشۃ کے مقام عَدْوَۃ Adowa پر شکست کھانے کے فوراً بعد اسے تسلیم کرنا ہی پڑا کہ تونس حمایتِ فرانس میں ہے تاہم اس نے اس نیابت میں اپنی موقعیّتِ خوب کو قائم رکھا ہے اور نیابت کو وہ برابر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے (ترکی نے فرانس کی حمایت کو سرکاری طور پر قبول کرنے سے مسلسل انکار کیا، تا آنکہ معاہدۂ سیور Sevres ۱۹۲۰ء کی تکمیل ہوئی) ۔ اس ملک (تونس) میں اطالیۃ کی رعایا فرانسیسیوں کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں داخل ہو رہی ہے ۔ وہ نیابت میں اپنا اثر و رسوخ اخبارات (روزنامہ اُونیونہ Unione)، بنکوں اور بالخصوص ثقافتی اداروں (مدْرسوں، انجمنوں) کے ذریعے بڑھا رہی ہے، کیونکہ یہ ادارے معاہدوں کی رو سے فرانسیسی ضبط سے آزاد ہیں، تاہم اسے چند ایسے اقدامات کے متعلّق شکایت ہے جن سے اس کی رعایا کسی حد تک دوسروں کی بہ نسبت خسارے میں ہے ۔ ۱۹۱۹ء میں فرانس نے ایک معاہدے کی بنا پر اس بات کو تسلیم کیا کہ واحاتِ (نخلستانہاے) غات و غُدامِس اطالیۃ کی ملکیّت ہیں (طرابلس اور تونس کے درمیان حد بندی ۱۹۱۰ء میں ہوئی) لیکن اس معاہدے کے باوجود تونس میں '' اطالوی مسئلہ '' ابھی تک حل نہیں ہوا اور بدستور پریشانی کا باعث ہے.

مُلکِ تونس میں اُس کے نظامِ حمایت کے قائم ہو جانے سے فرانس کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ اس نیابت (Regency) کے قدرتی وسائل اور طبیعی موارد سے فائدہ اٹھانے کے متعلّق قابلِ ذکر کام کر سکے اور اس ملک کی علمی اور معاشری ضروریات (ہسپتال، عمومی دواخانے، ڈاکٹر، رفاہِ عامّہ کی انجمنیں اور مختلف سائنس کے، نیز دیگر، علمی ادارے قائم کر کے) پوری کرے۔ جدید آلات اور معقول تر معلومات اور عمدہ طریقوں کے استعمال سے اقتصادی لحاظ سے حوصلہ افزا نتائج پیدا ہوے ہیں ۔ تونس بنیادی طور پر زراعتی ملک ہے جس کے محاصل ہیں : قسم قسم کا اناج، انگور، زیتون، سبزیاں، کھجور اور اس کے ساتھ کارک (چوبِ پنبہ یا قَلّین) اور حَلْفاء گھاس — پھر یہاں لوگ مویشی بھی پالتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ تونس روز بروز لوہے، سیسے، جست اور

(ٹامس Ph. Thomas کی ۱۸۸۰ء کی دریافت کے بعد سے) بالخصوص فاسفیٹ کی برآمد میں بھی بڑی ترقی کر رہا ہے ۔ ایندھن، گرم ملکوں کی پیداوار اور مصنوعات کی خاصی مقدار باہر سے آتی ہے ۔

اس کی غیر ملکی تجارت تقریباً تین ہزار ملین [تین ارب] فرانک کی مالیّت کی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ متعدّد سالوں سے در آمد زیادہ و برآمد کم ہونے کی وجہ سے اسے تجارت میں خسارہ نظر آتا ہے اور سیّاحوں کی آمد سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ اس کمی کو پورا نہیں کر سکتی ۔

یورپی مستعمرین (آبادکاروں) کے راستے میں آسانیاں پیدا کرنے اور اراضی کے بندوبست کو جدید طرز پر لانے کی غرض سے تونس میں یکم جولائی ۱۸۸۵ء کے فرمان کی رو سے ایک اہم مالی قانون (*loi foncière*) کا اجراء ہوا، جو قانونِ تُوران (Acte Torrens) سے مأخوذ ہے : اراضی کی رجسٹری اختیاری ہے مگر اُس ''مخلوط عدالت'' کی منظوری ہی سے ہو سکتی ہے جو اس مقصد کے لیے قائم کی گئی (تونس کی عدالت میں ۷ فرانسیسی اور ۳ مسلم مجسٹریٹ تھے اور سُوسَة کی عدالت میں ۴ فرانسیسی اور ۲ مسلم مجسٹریٹ)؛ مارچ ۱۹۲۴ء کا ایک اور فرمان محکمۂ پیمایشِ اراضی کے قیام کی گویا تمہید تھی ۔ فرانسیسی احتلال کے ابتدائی زمانے میں فرانسیسی کاشت کاروں کی نوآبادکاری زیادہ تر انفرادی کوشش پر موقوف تھی ۔ فرانسیسی باشندوں کو زراعتی زمین پر آباد کرنے کی سرکاری حکمت عملی پر پرزور عملدرآمد فقط حدود ۱۹۰۰ء ہی سے شروع ہوا ۔ حکومت پہلے اراضی خود خرید لیتی ہے اور بعد ازآں فرانسیسیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتی ہے، قیمت کی ادائگی کے لیے بہت آسان نظام وضع کیا گیا ہے؛ مثلاً تونس کے مدرسۂ زراعیۂ استعماریہ École Coloniale d'Agriculture کے قدیم طالب علموں کے ہاتھ ۔ اس بارے میں فرانسیسیوں کا مقابلہ اطالوی لوگوں سے ہے، مزرعوں کی وسعت کے لحاظ سے نہیں بلکہ کسانوں کی تعداد کے لحاظ سے [ان جانب دارانہ اقدامات سے اہلِ تونس کو جو تلخ شکایات پیدا ہوئیں اور جو نتائج نکلے ان کا ذکر آگے آتا ہے].

چونکہ فرانسیسی شہری تونس کی طرف کثرت کے ساتھ نقلِ مکانی نہیں کرتے تھے اس لیے فرانس نے تونس میں فرامین مجریۂ ۸ نومبر ۱۹۲۱ء کے ذریعے قومیت کے حقوق اختیار کرنے میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں (ایک فرمان مِن‌جانبِ صدرِ جمہوریۂ فرانس اور دوسرا مِن‌جانب بایِ تونس صادر ہوا) لیکن اس معاملے کے متعلّق برطانیۂ عظمٰی نے ہیگ Hague کی عدالت میں مقدّمہ دائر کر دیا اس لیے ان فرمانوں کے بجاے ۲۰ دسمبر ۱۹۲۳ء کو ایک فرانسیسی قانون جاری ہوا؛ اس کی رو سے حقوقِ قومیّت [تجنّس] کا حصول غیرملکی لوگوں اور اجنبیوں کے لیے، جو اس کی درخواست کریں، بہت آسان ہو گیا؛ یہ حق اُن آبادکاروں کو جو اس نیابت میں آباد ہو چکے ہوں دوسری پشت میں خود بخود حاصل ہو جاتا ہے (البتہ جو چاہے اُسے ردّ بھی کر سکتا ہے) مگر تیسری پشت میں بیرونی آبادکاروں کے لیے جو نیابت میں بس گئے ہوں تجنّس (اختیارِ قومیّت) لازمی اور اجباری ہو جاتا ہے ۔ برطانیۂ عظمٰی نے اساسی اور کلّی طور پر ان قواعد کو تسلیم کر لیا ہے جو زیادہ‌تر اس کی مالطی رعایا پر اثر انداز ہوتے ہیں؛ البتہ اطالوی لوگ اپنے معاہدوں کی وجہ سے حقوقِ قومیت کے حصول پر مجبور ہونے سے بچ جاتے ہیں؛ تاہم ان میں سے بعض لوگ خود اپنی مرضی سے یہ حقوق حاصل کر لیتے ہیں ۔ ان [مُتَفَرنسوں یعنی فرنگی‌مآبوں یا] ''نوساختہ فرانسیسیوں،، ''néo-français'' کی، جن میں مسلمانوں

کی تعداد دو ہزار سے کم مگر یہودیوں کی پانچ ہزار ہے، مجموعی تعداد موجودہ فرانسیسی آبادی کا چوتھائی حصّہ ہے.

یہودی، جنْ میں یورپی نسل کے کئی ہزار افراد نے اپنی اطالوی قومیت کو برقرار رکھا ہے، زیادہ‌تر بای کی رعایا ہیں اور مقامی نظام اور مقامی عدالتوں کے ماتحت رہتے ہیں، گو اپنے شخصی معاملات کے فیصلے کے لیے انھیں تونس کی عدالتِ ربّی (''Tribunal Rabbinique'') میں جانا پڑتا ہے (جیسے نومبر ۱۸۹۸ء اور نومبر ۱۹۲۹ء کے فرامین کی رُو سے ازسرِ نو مرتّب کیا گیا تھا) - اس قسم کے معاملات '' اسرائیلی سر دفترہاے اسنادِ رسمی '' ('' notaires israélites '') کے پاس بھی جاتے تھے (جن کا تقرّر فرامین مجریۂ فروری ۱۹۱۸ء و اپریل ۱۹۲۷ء کی رو سے ہوا) - تونس کے یہودی فوجی خدمت ادا نہیں کرتے اور نہ عام طور پر انھیں سرکاری عہدے دیے جاتے ہیں - ان کے مغربی تہذیب و تمدّن بسرعت اختیار کر لینے کی وجہ سے یہ مشکل پیدا ہوتی ہے کہ اگر وہ بہ تعدادِ کثیر، یا بجملگی، فرانسیسی حقوقِ شہریت حاصل کر لیں تو کیا ہو- ۳۰ اگست ۱۹۲۱ء کے ایک فرمان کے مطابق تمام یہودیوں کے لیے جو کِشوَر تونس کے دائرۂ نظارت میں آباد ہیں، بلا تمیز جنسیت ایک '' مجلسِ ملّی '' ("Conseil de la Communauté") قائم کی گئی جو بارہ ارکان پر مشتمل ہے - ان کا انتخاب دوسرے درجے کے حق راے دھندگی کے مطابق چار سال کے لیے ہوتا ہے - انھیں یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اعانات و عبادات کے معاملات کا فیصلہ کریں - حکومت دوسری یہودی جماعتوں کے لیے مدیر و ناظم مقرّر کرتی ہے: تونس کے اعلٰی ربّی (Chief Rabbi) کا تقرّر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے - مذہب کی پابندی زوال پذیر ہے لیکن اس کے برعکس صیہونیت کو ناقابلِ انکار مقبولیت حاصل ہے.

محمیۂ تونس کی حکومت نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر ان کے وطنی اداریے اور ان کی اقتصادی اور مذہبی حالت کی اصلاح کرے (قبّ سطورِ بالا) - اس سلسلے میں بہت سے مسائل حل طلب ہیں، جن میں سے بعض پر غور ہو رہا ہے؛ بہر حال جو کام اب تک ہو چکا ہے وہ قابلِ ذکر ہے - اگرچہ تونس کی مسلم آبادی مغربی طرزِ معاشرت اختیار کرنے کے خلاف ہے تاہم اس میں بنیادی انقلاب پیدا ہو رہا ہے جس کے نتائج کے متعلّق کوئی پیش گوئی کرنا جلد بازی کے مترادف ہوگا - تحریک دستور کو (جسے تونس کے حزب آئینی نے چلایا ہے اور جس کا مقصد خوداختیاری autonomy ہے) پہلی جنگ عظیم کے بعد کے سالوں میں فروغ حاصل ہوا - اسے فرانس کے مقیمِ عام (ریذیڈنٹ جنرل) لوسیاں سانت Lucien Saint نے بڑی ہوشیاری سے دبا دیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی آبادی ان اصلاحات کے جوہر سے مطمئن ہے [!] جن کی طرف گذشتہ دس سال (۱۹۲۰ تا ۱۹۳۰ء) میں حکومتِ حمایۃ کی داخلی سیاست متوجّہ ہے.

وہ آزادی بخش اقدامات، بالخصوص ۱۹۲۲ اور ۱۹۲۸ء کے قانون، جن کی رُو سے مجلس عظمی معرضِ وجود میں آئی اور اس کی تنظیم کی تجدید ہوئی، دو اساسی اصولوں پر مبنی ہیں: ایک تو ملکی لوگوں کے راست تعاون کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش اور دوسرے منتخب شدہ مجالس کے اختیارات کی توسیع - فرانسیسی نو آبادی میں نئے حقوق دیے جا رہے ہیں: شہروں میں مجالسِ بلدیہ کا حقِ انتخاب؛

صحافت اور اجتماع کی بیش از پیش آزادی.

اس تحریر کے وقت [حدود ۱۹۳۱ء میں] تونس بڑے امن اور چین کے ساتھ "حمایة" کی جوبلی (جشن) منانے کی تیاریاں کر رہا ہے.

فرانسیسی احتلال کے وقت سے بایات کی فہرست :

محمد الصادق علی (۱۸۸۲ تا ۱۹۰۲ء)

محمد الہادی (۱۹۰۲ تا ۱۹۰۶ء)

محمد الناصر (۱۹۰۶ تا ۱۹۲۲ء)

محمد الحبیب (۱۹۲۲ تا ۱۹۲۹ء)

احمد (۱۹۲۹ء تا)

مقیمان عام (ریذیڈنٹ جنرلوں) کی فہرست :

رُوستاں Roustan

پول کامبوں Paul Cambon (مارچ ۱۸۸۲ءمیں مقرر ہوا)

ماسیکو Massicault (نومبر ۱۸۸۶ء)

رووی اے Rouvier (نومبر ۱۸۹۲ء)

میلے Millet (نومبر ۱۸۹۴ء)

ستیفاں پیشوں Stéphen Pichon (مارچ ۱۹۰۱ء)

آلاپتیت Alapetite (دسمبر ۱۹۰۶ء)

فلاں داں Flandin (اکتوبر ۱۹۱۸ء)

لوسیاں سنت Lucien Saint (جنوری ۱۹۲۱ء)

مانسیروں Manceron (جنوری ۱۹۲۹ء).

مآخذ: اگر اسلام کی عام تاریخوں (مثلاً مُلّر Müller، کائتانی Caetani وغیرہ) اور شمالی افریقہ کی تاریخوں (مثلاً Mercier اور Faure-Biguet وغیرہ) کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو ملک تونس کی تاریخیں بہت ناقص ہیں ۔ تاہم قب (۱) عبدالوہاب : خلاصة تاریخ تونس، طبع دوم، تونس ۱۳۴۴ھ (یہ عمدہ اور عالمانہ ملخص ہے).

۱ - قرون وسطی کے لیے :

(الف) عرب جغرافیہ‌دان اور سیّاح جن میں یاقوت، ابوالفداء اور ابن بطّوطة شامل ہیں لیکن ان کے علاوہ خاص طور پر دیکھیے : (۱) الیعقوبی : *Descriptio almaghribi*، طبع و ترجمہ ڈیخویہ، لائیڈن ۱۸۶۰ء؛ (۲) ابن حَوْقَل : *B. G. A.* [مکتبة جغرافیة عربی]، ۲، ترجمہ در *J. A.*، ۱۸۴۲ء؛ (۳) البکری *Description de l' Afrique septentrionale*، طبع ثانی، ترجمہ، الجزائر ۱۹۱۱ تا ۱۹۱۳ء؛ (۴) الادریسی : نُزْهَة المُشتاق، طبع و ترجمہ، لائڈن ۱۸۶۶ء؛ (۵) کتاب الاستبصار، وینا ۱۸۵۲ء، ترجمہ Rec. Constantine، ۱۸۹۹ء؛ (۶) العَبْدری : رحلة، ترجمہ در *J. A.*، ۱۸۵۴ء؛ (۷) التجانی : رحلة، [طبع تونس]، ترجمہ در *J. A.*، ۱۸۵۲-۱۸۵۳ء)؛ (۸) ابن فضل اللہ العُمَری : مسالک الابصار، طبع جزئی عبدالوهّاب، تونس [۱۳۳۱ھ ۔ تکملة براکلمان، ۲ : ۱۷۵]، ترجمہ از Gaudefroy-Demombynes، پیرس ۱۹۲۷ء؛

(ب) مسلم مؤرّخین : (۹) ابن عبدالحَکَم : کتاب فُتوح مصر، طبع Torrey، نیوہیون New Haven ۱۹۲۲ء، ترجمہ ایضاً در *Bibl. and Semitic Studies*، نیویارک ۱۹۰۱ء؛ (۱۰) ابن حمّاد : *Histoire des rois Obaidides*، طبع و ترجمہ Von der Heyden، [پیرس] ۱۹۲۷ء [تکملة براکلمان، ۱ : ۵۵۵]؛ (۱۱) ابن الاثیر : *Annales du Maghreb et de l' Espagne*، ترجمہ از فانیاں Fagnan، الجزائر ۱۹۰۱ء؛ (۱۲) ابن عذاری : البیان المُغرب، ۲ جلد، طبع ڈوزی Dozy، لائڈن ۱۸۴۸-۱۸۵۱ء، ج ۳، طبع Lévi Provençal، پیرس ۱۹۳۰ء، ترجمہ از فانیاں، ۲ جلد، الجزائر ۱۹۰۱ تا ۱۹۰۴ء؛ (۱۳) النُوَیری : *Historia de los musulmanos de España y Africa*، طبع و ترجمة Gaspar Remiro، غرناطة ۱۹۱۷ تا ۱۹۱۹ء؛ (۱۴) ابوزکریا : *Chronique*، ترجمہ، الجزائر ۱۸۷۸ء؛ (۱۵) ابن الخطیب : رَقْم الحُلَل، تونس ۱۳۱۶ھ؛ (۱۶) وهی مصنّف : أعمال الأعلام، طبع عبدالوهّاب (در *Cent. Amari*)، پلرمو ۱۹۱۰ء؛

(۱۷) ابن خَلْدُون : کتاب العبَر، طبع سوم، بولاق ۱۲۸۹ھ؛ (۱۸) وهی مصنّف : المقدّمة، بیروت و قاهرة سے باربار بتصحیح طبع هوا، ترجمۂ دیسْلان de Slane، پیرس ۱۸۶۲ تا ۱۸۶۸ء؛ (۱۹) وهی مصنّف : *Histoire des Berbères*، ترجمۂ دیسْلان، الجزائر ۱۸۵۲ تا ۱۸۵۶ء، طبع ثانی، پیرس (زیر اشاعت)؛ (۲۰) ابن قُنفُذ : الفارسیّة، طباعت و ترجمۂ جزئی *J. A.* ۱۸۴۸ تا ۱۸۵۲ء: طبع سنگی، پیرس ۱۲۶۳ھ، تصحیح شدہ متن زیرِ طبع در تونس؛ (۲۱) ابوالمحاسن : *Extraits relatifs au Maghreb*، ترجمۂ فانیان، Rec. Constantine، ۱۹۰۶ء؛ (۲۲) الزرکشی : تأریخ الدولتین، تونس ۱۲۸۹ھ، ترجمه از فانیان، قسنطینة ۱۸۹۵ء؛ (۲۳) *Extraits inédits relatifs au Maghreb*، ترجمه از فانیان، الجزائر ۱۹۲۴ء؛

(ج) کتب تراجم : (۲۴) ابوالعَرَب : طبقات علماء افریقیة، طبع و ترجمه ابن شنب، پیرس - الجزائر ۱۹۱۵ تا ۱۹۲۰ء؛ (۲۵) ابن ناجی : معالم الایمان، تونس ۱۳۲۰ء نیز : (۲۶) ابن الأبّار، ابن خلّکان، ابن فرحون، احمد بابا؛

(د) مغربی وقائع نویسوں کی کتابوں کے بے شمار فقرات، مثلاً سینٹ لوئیس St. Louis کی صلیبی جنگ کے مؤرّخ (قب شٹرن فیلٹ: *Ludwigs des Heiligen Kreuzzug nach Tunis*، برلن ۱۸۹۶ء) اور Villani 'Muntaner (قب Schiaparelli : *Dichiarazione.... Giov. Villani relativi alla storia dei Beni Hafs in Tunisi*، روما ۱۸۹۲ء)، Froissart Cabaret d' Orreville.

(ه) دستاویزات نشرِ اصحاب ذیل (۲۷) Amari : *I diplomi arabi del r. archivio fiorentino*، فلورنس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۷ء؛ (۲۸) Mas-Latrie : *Traités de paix et de commerce... de l' Afrique septentionale au moyen-âge*، پیرس ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۲ء؛ (۲۹) Marongo : *Genova e Tunisi (1388 - 1515)*، روما ۱۹۰۱ء؛ (۳۰) Giménez Soler : *Episodios.... relaciones entre la corona de Aragón y Túnez*، *Inst. Est. Catalans Anuari, 1908*، برشلونه؛ (۳۱) وهی مصنّف : *Documentos de Túnez, 1909-1910*، محلّ مذکور؛ (۳۲) Cerone : *Alcuni documenti sulla seconda spedizione di Alfonso V contro l'isola Gerba*، محلّ مذکور؛ (۳۳) Ribera : *Tratado de paz.. entre Fernando I... de Nápoles y Abuámer Otmán rey de Túnez*، در *Cent. Amari*، پلرمو ۱۹۱۰ء؛

مخصوص مفرد رسالے : (الف) اسلامی فتوحات پر : (۳۴) Fournel : *Les Berbèrs*، پیرس ۱۸۷۵ تا ۱۸۸۱ء؛ (۳۵) Diehl : *L' Afrique byzantine*، پیرس ۱۸۹۶ء؛ (۳۶) Caudel : *Les premières invasions arabes dans l' Afrique du Nord*، پیرس ۱۹۰۰ء؛

(ب) قرون وسطی پر : (۳۷) E. F. Gautier : *Les siècles obscurs du Maghreb*، پیرس ۱۹۲۷ء؛ (۳۸) Vonderheyden : *La Berbérie orientale sous la dynastie des Benou' l-Aghlab*، پیرس ۱۹۲۷ء؛ (۳۹) عبدالوهّاب : بساط العقیق فی حضارة القیروان، تونس ۱۳۳۰ھ؛ (۴۰) Chalandon : *Histoire de la domination normande en Italie et en Sicile* (بمواضع کثیرہ)، پیرس ۱۹۰۷ء؛ (۴۱) G. Marçais : *Les Arabes en Berbérie du XI[ème] au XIV[ème] siècle*، قسنطینة - پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۴۲) van Berchem : *Titres califiens d' Occident*، در *J.A.* ۱۹۰۷ء؛ (۴۳) Schaube : *Handelsgeschichte der roman. Völker des Mittelmeergebiets bis zum Ende der Kreuzzüge* (بمواضع کثیرہ)، میونخ ۱۹۰۶ء؛ (۴۴) Giménez Soler : *El comercio en tiera de infieles durante la edad media*، در *Bol. R. Acad. Buenas Letras*، برشلونه ۱۹۰۹ تا ۱۹۱۰ء؛ (۴۵) La Mantia : *La Sicilia ed il suo dominio nell' Africa settentr., dal sec.*

XI al XV, در *Arch. Stor. Sicil.*، ۱۹۲۲ء؛ (۴۶) *Le commerce des Européens à Tunis depuis* : Sayous *le XII^{ème} siècle jusqu' à la fin du XVI^{ème}*، پیرس ۱۹۲۹ء؛ (۴۷) Boissonnade : *Les relations commerciaes de la France méridionale avec l' Afrique du Nord du XII^{ème} au XV^{ème} siècle*، در *Bull. géogr. du Comité des tr. hist.*، ۱۹۲۹ء؛ (۴۸) Alemany : *Milicias christianas....del Almagreb*، در *Homenaje á Codera*، سَرَقُسْطَة ۱۹۰۴ء؛ (۴۹) Delaville De Roulx : *La France en Orient au XIV^{ème} siècle*، پیرس ۱۸۸۶ء، (ص ۱۶۶ تا ۲۰۰)؛ (۵۰) Cerone : *Alfonso il Magnanimo ed Abu Omar Othman*، در *Arch. stor. Sicil. orient.*، ۱۹۱۲ تا ۱۹۱۳ء؛

۲ - متأخّر حَفْصی حکمران اور ہسپانوی احتلال :

(الف) سیّاح اور جغرافیہ دان : (۵۱) Ghistele : *A voyage......in lande......Barbarien*، Gand (۱۴۸۵ء)؛ (۵۲) Leo Africanus : *Della descrittione dell' Africa*، طبع Ramusio، وینس ۱۵۵۰ء، ترجمہ Temporal، پیرس ۱۸۳۰ء، طبع ثانی از Schefer، پیرس ۱۸۹۶ء؛ (۵۳) Marmol : *Descripcion general de Africa*، غرناطہ ۱۵۷۳ء، ترجمہ Perrot d' Ablancourt، پیرس ۱۶۶۷ء؛

(ب) دستاویزات شائع کردۂ اصحاب ذیل : (۵۴) Bégouen : *Notes et documents .... histoire de la Tunisie*، پیرس . تُولُوز Toulouse ۱۹۰۱ء؛ (۵۵) Foucard : *Relazioni dei duchi di Ferrara e di Modena coi re di Tunisi*، مُدِنَة Modena ۱۸۸۱ء؛ (۵۶) Odorici e Amari : *Lettere di Muley Hassan a Ferrante Gonzaga*، مُدِنَة ۱۸۶۵ء؛ (۵۷) Primaudaie : *La Documents inédits sur l' histoire de l'occupation espagnole en Afrique*، در *R.A.*، ۱۸۷۵ تا ۱۸۷۷ء؛ (۵۸) Grandchamp : *Documents relatifs à la fin de l' occupation espagnole en Tunisie*، در *R.T.*، ۱۹۱۳ء؛ (۵۹) Monchicourt : *La Tunisie et l' Europe. Quelques documents relatifs aux XVI^{ème} XVII^{ème} et XVIII^{ème} siècles*، در *R. T.*، ۱۹۰۵ء؛ نیز مواضع کثیرہ در مجموعۂ گرانقدر (۶۰) *Col. de doc. ined. para la hist. de España*، طبع میڈرڈ؛

(ج) مطالعات، از (۶۱) Motylinski : *Expédition....contre Djerba (1510)*، در *Actes XIV^{ème} Congrès Orient.*، الجزائر ۱۹۰۵ء؛ (۶۲) Muoni : *Tunisie la spedizione di Carlo V*، میلان ۱۸۷۶ء؛ (۶۳) Cat : *De Caroli V in Africa rebus gestis*، پیرس ۱۸۹۱ء؛ (۶۴) Medina : *L' expédition de Charles-Quint à Tunis*، در *R. T.*، ۱۹۰۶ء؛ (۶۵) Monchicourt : *Essai sur les plans imprimés de Tripoli, Djerba, et Tunis-Goulette au XVI^{ème} siècle*، در *R.A.*، ۱۹۲۵ء؛ (۶۶) وهی مصنف : *Épisodes de la carrière tunisienne de Dragut*، در *R.T.*، ۱۹۱۸ء؛ (۶۷) Charles *Mach.*، *La conquête de Mahdia (1551)*، ۱۹۲۱ء؛ (۶۸) Monchicourt : *L' Expédition espagnole de 1560 contre l' île de Djerba*، در *R.T.*، ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴ء؛ (۶۹) Braudel : *Les Espagnols et l' Afrique du Nord de 1492 à 1577*، در *R. A.*، ۱۹۲۸ء (حواشی اور ضمیمے میں مکمّل مصادر اور دستاویزات متعلّقہ تونس)؛ (۷۰) Poinssot et Lantier : *Les Gouverneurs de La Goulette durant l' occupation espagnole*، در *R.T.*، ۱۹۳۰ء (ماخذ کے حوالے تعلیقات میں دیے ہیں).

۳ - ترکی عہد کے متعلّق : (الف) سیّاحان مسلم (۷۱) العیّاشی : رِحلَة، فاس ۱۳۱۶ھ، ترجمہ پیرس ۱۸۴۶ء (*Expl. scient. Algérie*، جلد ۹)؛ (۷۲) احمدالناصری : رِحلَة، فاس، ترجمہ رِحلَة العیّاشی والی مذکورہ طباعت میں؛ (۷۳) الوَرْثِیلانی : رِحلَة، طبع

ابن شنب، الجزائر ۱۹۰۸ء؛
(ب) مسلم مؤرخین : (۷۳) ابن ابی دینار القیروانی : کتاب المؤنس، تونس ۱۲۸۶ھ، ترجمہ پیرس ۱۸۴۵ء *Expl. scient. Algérie* (ج ۷)؛ (۷۵) الوزیر السراج : الحلل السندسیة، تونس ۱۲۸۷ء، طباعت نا تمام؛ (۷۶) محمد بن یوسف : المشرع الملکی (۱۷۰۵ تا ۱۷۶۵ء)، ترجمہ Serres اور Lasram، تونس ۱۹۰۰ء؛ (۷۷) ابن مقدیش : نزہة الأنظار، طبع سنگی، تونس ۱۳۲۱ھ؛ (۷۸) محمد الباجی : الخلاصة .... فی امراء افریقیة، تونس ۱۳۲۳ھ؛ (۷۹) ابن عبدالعزیز اور ابن ابی الضیاف، غیر مطبوع؛
(ج) یورپی مصنفین : (۸۰) Lanfreducci e Bosio : *Costa e discorsi di Barberia (1587)*، طبع و ترجمہ Monchicourt-Grandchamp، در *R.A.* ۱۹۲۵ء؛ (۸۱) Barker : *A true and certain report of .... captain Ward*، لنڈن ۱۶۰۹ء؛ (۸۲) Prévost de Beaulieu-Persac : *Mémoires*، طبع La Roncière، پیرس ۱۹۱۳ء، ص ۲۲۸ تا ۲۶۳؛ (۸۳) Pijnacker : *De reyse naer Africa, Tunis, Algiers .... in den jare 1625*، ہارلم Haarlem، ۱۶۵۰ء؛ (۸۴) Savary de Brèves : *Relation de ses voyages .... aux royaumes de Tunis et Alger*، پیرس ۱۶۲۸ء؛ (۸۵) Attardo : *Relazione della guerra .... fra Algieri e Tunisi quest' anno 1628*، طبع Roy در *R.T.* ۱۹۱۷ء؛ (۸۶) Th. d' Arcos: *Lettres inédites écrites de Tunis (1633-36)*، الجزائر ۱۸۸۹ء؛ (۸۷) Dan : *Histoire de Barbarie*، پیرس ۱۶۳۷ء؛ (۸۸) Thévenot : *Vayages ....*، پیرس ۱۶۶۳ تا ۱۶۷۴ء؛ (۸۹) Pagni : *Lettere .... di quanto egli vidde e operò in Tunisi*، فلورنس ۱۸۲۹ء؛ (۹۰) D'Arvieux : *Mémoires* (ج ۴)، پیرس ۱۷۳۵ء؛ (۹۱) Dapper : (تونس کا بحری سفر ۱۶۶۶ء)؛ *Naukeurige beschrijving der Afrikaensche gewesten*، ایمسٹرڈم ۱۶۶۸ء؛ (۹۲) Galland : *Relation de l'esclavoge d' un marchand Cassis à Tunis* تصحیح و طبع در *Magasin encyclopédique*، پیرس ۱۸۰۹ء؛ (۹۳) Coppin : *Le bouclier de l' Europe*، لیون ۱۶۸۶ء؛ (۹۴) *Histoire des dernières révolutions du royaume de Tunis*، پیرس ۱۶۸۹ء؛ (۹۵) La Faye : *Etat des royaumes de Barbarie*، رواں Rouen ۱۷۰۳ء؛ (۹۶) Lucas : *Voyage.... Afrique* (متن کے بعد ہے : *Mémoire pour servir à l' histoire de Tunis*)، پیرس ۱۷۱۲ء؛ (۹۷) Laugier de Tassy : *Histoire des Etats barbaresques*، فرانسیسی ترجمہ، پیرس ۱۷۵۷ء؛ (۹۸) Peyssonnel : *Relation d'un voyage sur les côtes de Barbarie .... en 1724*، پیرس ۱۸۳۸ء؛ (۹۹) Shaw : *Travels* (۱۷۳۷ء)، آکسفورڈ ۱۷۳۸ء؛ (۱۰۰) Tollot : *Nouveau voyage fait au Levant* (۱۷۳۱ء)، پیرس ۱۷۴۲ء؛ (۱۰۱) La Condamine : *Voyage au Levant* (۱۷۳۱ء)، طبع جزئی در *R. T.* ۱۸۹۸ء؛ (۱۰۲) Godefroy، Comelin اور La Motte : *Etat des royaumes de Barbarie*، رواں ۱۷۳۱ء؛ (۱۰۳) Hebenstreit : *Voyage à Alger, Tunis et Tripoli .. en 1732*، برلن ۱۷۸۰ء؛ (۱۰۴) St. Gervais : *Mémoires historiques .... royaume de Tunis*، پیرس ۱۷۳۶ء؛ (۱۰۵) *Lettres sur l'histoire politique de la Tunisie de 1728 à 1740*، طبع Gandolphe، در *R.T.* ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۶ء؛ (۱۰۶) Poiron : *Mémoires concernant l'état présent du royaume de Tunis* (۱۷۵۲ء)، طبع Serres، پیرس ۱۹۲۵ء؛ (۱۰۷) Des fontaines : *Fragments d'un voyage ..... Tunis et Alger* (۱۷۸۳ تا ۱۷۸۶ء)، پیرس ۱۸۳۸ء؛ (۱۰۸) Stanley : *Observations on the city of Tunis*، لنڈن ۱۷۸۶ء؛ (۱۰۹) Poiret : *Voyage en Barbarie*، پیرس ۱۷۸۹ء؛ (۱۱۰) Nyssen : *Mémoire sur Tunis*،

تونس (ملک)

(۱۷۸۸ء)، نشر Monchicourt، در *R. Hist. Col. Fr.*،
۱۹۲۳ء؛ (۱۱۱) Caroni : *Ragguaglio del viaggio....*
in Barberia، میلان ۱۸۰۵ء؛ ترجمهٔ Conor-Grand-
champ، در *R. T.*، ۱۹۱۷ء؛ (۱۱۲) Chauteaubriand :
Itinéraire de Paris à Jérusalem، (۱۸۰۷ء)، پیرس
۱۸۱۱ء؛ (۱۱۳) Maggill : *An Account of Tunis*،
گلاسگو ۱۸۱۱ء؛ (۱۱۴) Blaquière : *Letters from*
the Mediterranean، ج ۲، لنڈن ۱۸۱۳ء؛ (۱۱۵)
Frank : *Tunis* (۱۸۱۶ء)، در *l' Univers pittoresque*،
ج ۷، پیرس ۱۸۵۰ء؛ (۱۱۶) Noah : *Travels in....*
the Barbary States، نیویارک ۱۸۱۹ء؛ (۱۱۷)
Filippi : *Fragmens ....sur la Régence de Tunis*،
(۱۸۲۹ء)؛ نشر Monchicourt، در *R. Hist. Col. Fr.*،
۱۹۲۴ تا ۱۹۲۶ء؛ قب نیز (۱۱۸) تصحیح از Bauer
در *Relaciones de Africa*، ج ۳، میڈرڈ، ۱۹۲۲ء —
۱۸۳۰ء کے بعد، رسالوں اور کتابچوں کے بیشمار
مقالات کے علاوہ (*Le Tour du Monde, Revue de l'*
Orient وغیرہ) اور کتابیں بھی بہت زیادہ تصنیف
ہوئی ہیں: (۱۱۹) Grenville—Temple : *Excur-*
sions in the Mediterranean, Algiers and Tunis
(1832-33)، لنڈن ۱۸۳۵ء؛ (۱۲۰) Calligaris :
Notice sur Tunez (۱۸۳۴ء)، طبع Monchicourt،
در *R. Hist. Col. Fr.*، ۱۹۲۸ء؛ (۱۲۱) Ewans :
Reise ....von Tunis (۱۸۳۵ء)، نورمبرگ Nurem-
berg ۱۸۳۷ء؛ (۱۲۲) Puckler—Muskau : *Semilasso*
in Afrika، شٹوٹ گارٹ Stuttgart ۱۸۳۶ء؛ (۱۲۳)
Niculy : *Documenti sulla storia di Tunis*، لوورن
Livourne ۱۸۳۸ء؛ (۱۲۴) Copitaine X : *Une pro-*
menade à Tunis en 1842، پیرس ۱۸۴۴ء؛ (۱۲۵)
Kennedy : *Algeria and Tunisia in 1845*، لنڈن
۱۸۴۶ء؛ (۱۲۶) Barth : *Wanderungen durch die*
Küstanländer des Mittelmeers in 1845—47، برلن
۱۸۴۹ء؛ (۱۲۷) Chassiron : *Aperçu pittoresque*
de la Régence de Tunis، پیرس ۱۸۴۹ء؛ (۱۲۸)
Pellissier : *Description de la Régence de Tunis*، پیرس
۱۸۵۳ء، (*Expl. scient. Algérie*، ج ۱۰؛ قب نیز
R. d. Deux Mondes، مئی ۱۸۵۶ء)؛ (۱۲۹) Daumas :
Quatorze ans à Tunis، الجزائر ۱۸۵۷ء؛ (۱۳۰)
Finotti : *La Regenza di Tunisi*، Malte ۱۸۵۷ء؛
(۱۳۱) Dunant : *Notice sur la Régence de Tunis*،
جنوه ۱۸۵۸ء؛ (۱۳۲) Guérin : *Voyage archéo-*
logique dans la Régence de Tunis، پیرس ۱۸۶۲ء؛
(۱۳۳) Flaux : *La Régence de Tunis au XIX^ème^*
siècle، پیرس ۱۸۶۵ء؛ (۱۳۴) François : *Tunis et*
la Régence sous Muhammed el-Sadok Bey، پیرس
۱۸۶۷ء؛ (۱۳۵) De Gubernatis : *Lettere sulla*
Tunisia، فلورنس ۱۸۶۷ء؛ (۱۳۶) Michel : *Tunis*،
پیرس ۱۸۶۷ء؛ (۱۳۷) Maltzan : *Sittenbilder aus*
Tunis u. Algerien، لائپزگ ۱۸۶۹ء؛ (۱۳۸) وہی
مصنف : *Reise in den Regentschaften Tunis u.*
Tripolis، لائپزگ ۱۸۷۰ء؛ (۱۳۹) Zaccone : *Notes*
sur la Régence de Tunis، پیرس ۱۸۷۵ء؛ (۱۴۰)
Rae : *Barbary, Journey from Tripoli to..Kairouan*،
لنڈن ۱۸۷۷ء؛ (۱۴۱) Féraud : *Notes sur un*
voyage en Tunisie et en Tripolitaine، در *R. A.*،
۱۸۷۷ء؛ (۱۴۲) Nachtigal : *Tunis, Deutsche Rund-*
schau، ۱۸۸۱ء؛ (۱۴۳) Pinchia : *Recordi di Tunisi*،
تورین Turin ۱۸۸۱ء؛

(د) مجموعۂ دستاویزات شائع کردۂ اصحاب ذیل :
(۱۴۴) Plantet : *Correspondance des beys de Tunis*
et des consuls de France avec la Cour (1577—1830)،
۳ جلد، پیرس ۱۸۹۳ تا ۱۸۹۹ء؛ (۱۴۵) Grand-
champ : *La France en Tunisie (1582 — 1700)*،
۸ جلدیں، تونس ۱۹۲۰ تا ۱۹۳۰ء؛ (۱۴۶) Heeringa :

Bronnen tot de Geschiedenis van den Levantschen Handel (1590—1726) ، ۳ جلدیں، ہیگ ۱۹۱۰ تا ۱۹۱۷ء؛ (۱۴۷) Grandchamp : Documents relatifs aux corsaires tunisiens (1777 — 1814) ، تونس ۱۹۲۰ء؛

(ہ) خاص تصانیف : (۱۴۸) Rousseau : Annales Tunisiennes ، الجزائر ۱۸۶۴ء؛ (۱۴۹) Fitoussi : L' Etat tunisien (1525—1901) ، تونس ۱۹۰۱ء، [طبع ثانی بھی موجود ہے]؛ (۱۵۰) Masson : Histoire des établissements et du commerce français dans l' Afrique barbaresque (1560—1793) ، پیرس ۱۹۰۳ء؛ (۱۵۱) وہی مصنّف : Les Compagnies du corail ، پیرس - مارسیلیا ۱۹۰۸ء؛ (۱۵۲) La Roncière : Histoire de marine française ، ۵ جلدیں، پیرس ۱۹۰۹ تا ۱۹۲۰ء؛ (۱۵۳) Conor : Les exploits d' Alonso de Contreras [...] en Tunisie (1601—11) ، در R. T. ، ۱۹۱۳ء؛ (۱۵۴) Spont : Les Français à Tunis de 1600 1789 ، در a R. Questions Hist. ، ۱۹۰۰ء؛ (۱۵۵) Playfair : The Scourge of Christendom ، لنڈن ۱۸۸۴ء؛ (۱۵۶) Marchesi : Tunisie la Repubblica Venezia nel secolo XVIII ، وینس ۱۸۸۲ء؛ (۱۵۷) Nallino : Venezia e Sfax nel secolo XVIII ، در Cent. Amari ، پلرمو ۱۹۱۰ء؛ (۱۵۸) Grandchamp : La mission de Pléville-le-Pelley à Tunis (1793-94) ، تونس ۱۹۲۱ء؛ (۱۵۹) وہی مصنّف : Le citoyen Guiraud, proconsul de la République française à Tunis (1796) ، در R. T. ، ۱۹۱۹ء؛ (۱۶۰) Loth : Arn. Soler, chargé d'affaires d' Espagne à Tunis (1808—10) ، در R. T. ، ۱۹۰۵ تا ۱۹۰۶ء؛ (۱۶۱) Dupuy : Americains et Barbaresques (1776 — 1824) ، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۱۶۲) Hugon : Les emblèmes des beys de Tunis ، پیرس ۱۹۱۳ء؛ (۱۶۳) Serres : La politique turque en Afrique du Nord sous la monarchie de Juillet ، پیرس ۱۹۲۵ء؛ (۱۶۴) Rouard de Card : Les arrangements conclus par le général Clauzel avec le bey de Tunis (1830—31) ، پیرس ۱۹۲۷ء؛ (۱۶۵) Gonni : La regia marina sarda sulle costi di Barberia (1830) ، در Boll. Ufficio stor. ، ۱۹۳۰ء؛ (۱۶۶) وہی مصنّف : Una squadra sardonapoletana a Tunisi (1833) ، وہی سلسلہ؛ (۱۶۷) Grandchamp : Le différend de la Tunisie avec la Sardaigne et Naples en 1833 ، در R.T. ، [۱۹۳۱ء، ص ۱ تا ۹۶ Ind. Ist. شمارہ 14006]؛ (۱۶۸) Monchicourt : La mahalla d' Ahmed Zarroug dans le Sahel (1864) ، در R. T. ، ۱۹۱۷ء؛

۳ - تونس زیرِ حمایتِ فرانس اور ۱۸۸۱ء کے بعد کے تونس پر بیشمار کتابیں موجود ہیں - بڑی بڑی تصانیف حسبِ ذیل ہیں:-

(الف) تونس پر فرانسیسی حمایت کا استقرار : (۱۶۹) Documents diplomatiques, Affaires de Tunisie (1870—1881) ، پیرس ۱۸۸۱ء؛ (۱۷۰) D' Estournelles de Constant : La politique française en Tunisie ، پیرس ۱۸۹۱ء؛ (۱۷۱) Crispi : Politica Estera (1876—90) ، ترجمہ در R.T. ، ۱۹۱۳ء؛ (۱۷۲) Chiala : Pagine di storia contemporanea ، ج ۲ : Tunisi ، تورن ۱۸۹۵ء؛ (۱۷۳) Broadley : The last Punic War ، ایڈن برگ - لنڈن ۱۸۸۲ء؛ (۱۷۴) L' expédition militaire en Tunisie ، پیرس بدون تاریخ؛ (۱۷۵) Cappello : La spedizione francese in Tunisia ، ستا د کاستلو Città di Castello ۱۹۱۲ء؛ (۱۷۶) Rouard de Card : Traités de la France avec les pays de l' Afrique du Nord ، پیرس ۱۹۰۶ء؛ (۱۷۷) وہی مصنّف : La Turquie et le protectorat français en Tunisie ، پیرس ۱۹۱۶ء؛

(ب) سیاسی مسائل از ۱۹۱۸ء : (۱۷۸)

(۱۷۹) Raynaud : *La Tunisie martyre*، ۱۹۲۰ء؛ (۱۸۰) *La Tunisie sans les Français*، پیرس بلا تاریخ؛ Jung : *Les réformes en Tunisie*، پیرس ۱۹۲۶ء؛ (۱۸۱) Winkler : *Essai sur la nationalité dans les protectorats de Tunisie et du Maroc*، پیرس ۱۹۲۶ء؛ (۱۸۲) Aguesse : *Souveraineté et nationalité en Tunisie*، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۱۸۳) Tumedei : *La Questione tunisina e l' Italia*، Bologna ۱۹۲۲ء؛ (۱۸۴) Sarafatti : *Tunisiaca*، روما ۱۹۲۴ء؛ Bonura : *Gli Italiani in Tunisi*، روما ۱۹۲۹ء؛ اور (۱۸۶) بیشمار مضامین جو *Bulletin du Comité de l' Afrique française* میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے جو علیحدہ بھی چھپے ہیں وہ یہ ہیں: (i) Rodd Balek : *La Tunisie après la guerre (1919—21)*، پیرس ۱۹۲۲ء؛ (ii) Cavé : *Sur les tracés de Rodd Balek (1924—27)*، پیرس ۱۹۲۹ء؛ اور ایک (iii) *Chronique de Tunisie (1922—28)*، تونس ۱۹۲۸ء؛

(ج) وصفِ عام : (۱۸۷) Hesse-Wartegg : *Tunis*، وی انّا ۱۸۸۲ء؛ (۱۸۸) Graham اور Ashbee : *Travels in Tunisia*، لنڈن ۱۸۸۷ء (تتمّے میں تونس پر نہایت مفید فہرست مصادر *Bibliography of Tunisia* دی ہے، جس پر Rouard de Card نے اپنی کتاب *Livres français dee XVII*^ème^ *et XVIII*^ème^ *siècles concernant les Etats barbaresques*، پیرس ۱۹۱۱ء میں کوئی اضافہ نہیں کیا)؛ (۱۸۹) Lanessan : *La Tunisie*، پیرس ۱۸۸۷ء، طبع ثانی ۱۹۱۷ء؛ (۱۹۰) Faucon : *La Tunisie*، ۱۸۹۳ء؛ (۱۹۱) *La Tunisie. Histoire et description*، ۲ جلدیں، پیرس - نانسی Paris-Nancy ۱۸۹۶ء، طبع ثانی ۱۹۰۰ء؛ (۱۹۲) *La Tunisie au début du XX*^ème^ *siècle*، پیرس ۱۹۰۴ء؛ (۱۹۳) Loth : *La Tunisie et l' œuvre du Protectorat français*، پیرس ۱۹۰۷ء؛ (۱۹۴) *Notice générale sur la Tunisie (1811—1921)*، تولوز Toulouse ۱۹۲۲ء؛ (۱۹۵) Despols : *La Tunisie*، پیرس ۱۹۳۰ء؛

(د) سماجی زندگی اور ایسے ناول جن میں ملک کے رسوم و عادات کا نقشہ کھینچا گیا ہے : (۱۹۶) Lapic : *Les civilisations tunisiennes*، پیرس ۱۸۹۸ء؛ (۱۹۷) Canal : *La littérature et la presse tunisiennes de l' Occupation à 1900*، پیرس بلا تاریخ؛ (۱۹۸) Duhamel : *Le Prince Jaffar*، پیرس ۱۹۲۴ء؛ (۱۹۹) Hubac : *Les masques d' argile*، پیرس ۱۹۲۸ء—مقامی باشندگان کے بارے میں قبؔ ان تصانیف سے جو اس مقالے میں ''زبان'' کے ذیل میں مذکور ہیں اور ان بےشمار مقالوں سے جو *Revue Tunisienne* میں شائع ہوے؛

۵ - غیر مسلموں کے متعلّق : (۲۰۰) Darmon کے علاوہ (نیز ملاحظہ ہو عنوان ''مذہب'') دیکھیے :

(الف) عیسائی : (۲۰۱) Mesnage : *Le christianisme en Afrique, Eglise mozarabe*، پیرس - الجزائر ۱۹۱۰ء؛ (۲۰۲) Gleizes : *Jean Le Vacher*، پیرس ۱۹۱۴ء؛ (۲۰۳) وہی مصنف : *Captivité et œuvres De St. Vincent de Paul en Barbarie*، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۲۰۴) Anselme des Arcs : *Mémoires de la mission des capucins de Tunisie (1624—1865)*، روما ۱۸۸۹ء؛ (۲۰۵) Pons : *La nouvelle Eglise d' Afrique (depuis 1830)*، تونس ۱۹۳۰ء؛

(ب) یہودی : (۲۰۶) Cazès : *Essai sur l' histoire des Israélites de Tunisie*، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۲۰۷) Chalom : *Les Israélites de la Tunisie*، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۲۰۸) Arditti : *Recueil des testes législatifs et juridiques concernant les Israélites de Tunisie (1857—1913)*، تونس ۱۹۱۵ء؛ (۲۰۹) Tibi : *Le Statut personnel...des Israélites tunisiens*، تونس ۱۹۲۳ء؛ (۲۱۰) [Slousch] : *Un voyage d' études juives en Afrique*، پیرس ۱۹۰۹ء؛ (۲۱۱) وہی

مصنف : *Travels in North Africa*، فلاڈلفیا ۱۹۲۷ء؛

۶ - اسلامی فنونِ لطیفہ کی تاریخ کے متعلق :

(۲۱۲) G. Marçais : *Manual d' art musulman.*

L' architecture، پیرس ۱۹۲۶ - ۱۹۲۷ء؛

(۳) ادارۂ بلاد

(الف) فرانسیسی ادارہ : عہدِ حمایت کے آغاز میں اور فرمانِ بای مؤرخۂ ۴ فروری ۱۸۸۳ء کے بموجب مقیم عام (ریذیڈنٹ جنرل) کا بلا فصل معاون "دبیرِ عام (سیکریٹری جنرل) حکومتِ تونس" تھا، جو ہر قسم کے سرکاری مکاتبات کی نگرانی کرتا تھا اور وزیرِ اعظم کے باب میں اس کا وہی مقام تھا جو بای کے باب میں مقیم عام (ریذیڈنٹ جنرل) کا تھا - ۱۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو یہ عہدہ اڑا دیا گیا اور اس کی جگہ کسی حد تک " نائب مقیمِ عام " ("ڈیلیگیٹ برائے ریذیڈنٹ جنرل") نے لی اور ۱۰ فروری ۱۹۲۳ء کے ایک صدارتی فرمان (presidental decree) کی رو سے اس کے اختیارات کی تحدید کی گئی - یہ اختیارات سیکرٹری جنرل کے اختیارات سے مختلف تھے لیکن عملی طور پر زیادہ وسیع نہ تھے، گو وہ وزراء کی مجلس کا نائب صدر ہے، داخلی نظارتوں (contrôles civils) کا مفتّش (انسپکٹر) اور ریذیڈنٹ کے سفر پر ہونے یا کسی مانع کے پیش آنے کی صورت میں اس کی غیر حاضری کے وقت اس کا قائم مقام ہوتا ہے - ریذیڈنٹ کی ایک قرارداد مؤرخۂ ۱۰ نومبر ۱۹۲۶ء کے مطابق ایک دیوانی کابینہ اور ایک جنگی کابینہ ریذیڈنٹ کی معاونت کرتا ہے.

۱۹۲۶ء کی اسی قرار داد کے بموجب، جس کی تائید بای کے اسی تاریخ کے متعدّد فرامین کے ذریعے ہوئی، نیابت (ریجنسی) کے بڑے بڑے دفتروں کی جدید تنظیم ہوئی - اس میں اس بات کی تشریح و تعیین بھی موجود ہے کہ ان بڑے بڑے محکموں کا دائرۂ عمل کیا ہے جن کی تنظیم احتلال کے بعد سے ہوئی اور جو اسی زمانے سے فرانسیسی سربراہی میں کام کر رہے ہیں، مثلاً "ادارۂ عامّۂ اشغال" (Direction Générale des Travaux Publics)، جو ۳ ستمبر ۱۸۸۳ء کو قائم ہوا؛ "ادارۂ عامّۂ مال" (Direction Générale des Finances)، جو اسی سال ۴ نومبر کو معرضِ وجود میں آیا؛ "ادارۂ عامّۂ تعلیمِ عام و فنونِ لطیفہ" (Direction Générale de l' Instruction publique et des Beaux-Arts)، جو ۶ مئی ۱۸۸۳ء کو قائم ہوا؛ "ادارۂ عامّۂ زراعت و تجارت و استعمار" [نو آبادیات] (Direction Générale de l' Agriculture, du Commerce et de la Colonisation)، جو ۳ نومبر ۱۸۹۰ء کو جاری ہوا؛ "ادارۂ عامّۂ امورِ داخلیہ" (Direction Générale de l' Intérieur)، (جس میں "محکمۂ حفظِ صحت و اعانتِ عامّہ" بھی شامل ہے) اور "ادارۂ عامّۂ عدل و انصاف" (Direction de la Justice Tunisienne)، جو ۱۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو قائم ہوا (یہ آخری دو محکمے سیکرٹری جنرل کا محکمہ توڑے جانے کی وجہ سے بنائے گئے) - مزید بر آن "محکمۂ [رسل و رسائل یعنی] ڈاک اور تار" کا ذکر بھی کر دینا چاہیے، جو ۱۱ جون ۱۸۸۸ء کو قائم ہوا اور ۱۸ نومبر ۱۹۲۷ء کے فرمان کے مطابق خود مختار 'ادارہ' قرار دیا گیا.

ملک کا جنوبی حصّہ فوجی علاقہ سمجھا جاتا ہے (جس کا صدر مقام مدنین ہے)، یہاں "ادارۂ امورِ وطنیّہ" کی عملداری ہے، جو دو بلندتر مرتبے کے افسروں، ۲۰ کپتانوں یا لفٹینٹوں اور ۱۱ فوجی ترجمانوں پر مشتمل ہے - ان سب کو فرانس کے خزانے سے تنخواہ ملتی ہے - اس جنوبی حصے کو چھوڑ کر باقی ملک ۱۹۲۲ء سے اداری اغراض کے لیے پانچ "کوروں" میں منقسم ہے، (بنزرت (Bizerte)،

تونس، الکف، سوسة، اور سفاقس)، ان میں سے ہر کورة متعدد ''داخلی نظارتوں'' (''contrôles civil'') میں منقسم ہے جن کی کل تعداد ۱۹ ہے، بصورت ذیل :-
باجة - بنزرت - طبرقة - سوق الاربعاء، تونس، زغوان، قرنبالیة، تبرسق، الکف، مکثر، مجاز الباب، سوسة - قیروان - ثالة - سفاقس - قابس - قفصة - توزر - جربة - ان نظارتوں کے فرانسیسی ناظر، جن کی تعداد ۴ اکتوبر ۱۸۸۴ء کے صدارتی فرمان کی رو سے معین ہوئی، وزیر خارجه کی نامزدگی پر صدر جمہوریۂ فرانس کے فرمان سے مقرر ہوتے ہیں : ریزیڈنٹ کے گشتی فرمان مؤرخۂ ۲۲ جولائی ۱۸۸۷ء کی رو سے ان کے اہم فرائض یہ ہیں کہ وہ نظام ادارۂ وطنیه [دیکھیے ص ۸۱۲ ب] کی نگرانی کریں اور فرانسیسیوں کی آبادکاری میں امداد دیں؛ وہ نائب قونصل کہلاتے ہیں اور قونصلی وکلاء کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں - ان کے منصب کی تعیین ریزیڈنٹ کی قرارداد مؤرخۂ ۲۵ اپریل ۱۹۲۲ء کے بموجب ہوئی .

نیابت (ریجنسی) میں فرانسیسی قانون کا نفاذ دو بدائی عدالتوں (tribunals of first instance) کے ذریعے ہوتا ہے - ایک عدالت تونس میں ہے (جو چار ایوانوں پر مشتمل ہے) اور دوسری سوسة میں، اس کے علاوہ چودہ باقاعدہ ''قاضی عدل'' (Justices of Peace) ہیں، ان کے علاوہ عدالت‌های اجانب (''foraines'') ہیں، جن کے حاکم دورہ کرتے رہتے ہیں - یہ عدالتیں الجزائر کی عدالت مرافعه (''کورٹ او اپیل'') کے ماتحت ہیں - خلاف قانون افعال (offences) اور خفیف جرائم (misdemeanours) کے لیے تعزیرات کا نفاذ اصلاحی (correctional) عدالتوں کے ذریعے ہوتا ہے اور جس قسم کے مقدمات کی سماعت الجزائر میں ''قاضی عدل'' کرتے ہیں یہاں بھی کرتے ہیں - جرائم کا فیصله تونس اور سوسة کی فوجداری عدالتوں میں ہوتا ہے، جو تین پیشہ‌ور ججوں اور چھے اسیسروں (معاونوں) پر مشتمل ہیں، جن کا تقرر ۲۹ نومبر ۱۸۹۳ء کے صدارتی فرمان کے بموجب ہوتا ہے - ان کی قومیت کا انحصار ملزم کی قومیت پر ہوتا ہے، لیکن ''جوری'' (jury محلفین) نہیں ہوتے - تمام فرانسیسی مجسٹریٹ ہر لحاظ سے ویسے ہی ہیں جیسے الجزائر کے ہیں اور وہ ''امین اختام'' (''Garde des Sceaux'') کی نامزدگی پر صدارتی فرمان سے مقرر کیے جاتے ہیں .

فرانس بری اور بحری فوجوں کے میزانیه کا ذمے دار ہے - بنزرت بحری امارت کا صدر مقام ہے؛ یہ امارت تمام شمالی افریقه کے ساحل پر حاوی ہے - تونس کی ''احتلالی فوج'' کے سپہ‌سالار نے ۱۹۲۶ء میں ''سپہ‌سالار اعظم افواج تونس'' (Commandant supéri-cur des troupes de Tunisie) کا لقب اختیار کیا .

تونس کے مختلف مصالح عامه کی فہرست کی تکمیل کے لیے ان دو کمپنیوں (شرکتوں) کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنھیں تمام اہم بندرگاہوں میں مراعات حاصل ہیں : ایک شرکۂ بنزرت ہے، جو ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی - دوسری شرکۂ تونس، سوسة و سفاقس، جو ۱۸۹۴ء میں قائم ہوئی - ان کے علاوہ تین ریلوے کمپنیاں (شرکات سکة الحدید) ہیں : (الف) شرکت بونة جالمة Bône-Guelma، جسے ۲۲ جولائی ۱۹۲۲ء کے معاهدے کے مطابق Compagnie Fermière کہتے ہیں (تونس کا تقریباً سارا ریلوے نظام ان کے سپرد ہے، جس میں اولاً ذیل کی لائنیں شامل ہیں : ایک طویل ریلوے لائن جو ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی ہے، تونس - الجزائر کی دو لائنیں (خطوط راہ آہن) جو مجردہ کی وادی اور التل الکبیر (High Tell) کے دامن سے گزرتی ہیں اور ایک ریلوے لائن سوسة سے چلتی ہے اور سبیطلة اور فریانة Feriana کے

میدانوں سے ہوتی ہوئی قفصة کے مغرب میں فاسفیٹ کی کانوں کی طرف چلی جاتی ہے) - (ب) شرکۃ فاسفات قفصة (Compagnie des phosphates de Gafsa) کی تنگ پٹری کی لائن، جو سفاقس کو قابس سے اور ردیف کو توزر سے ملاتی ہے - (ج) تونس کی شرکۃ ٹرام، جس کی دو لائنیں مضافات میں بجلی کے ذریعے چلتی ہیں، ایک تونس -- المرسی اور دوسری براستۂ حلق الوادی (La Goulette) اور قرطاجنۃ.

سرکاری محکموں کے علاوہ تونس میں متعدد مجالسِ شوری بھی ہیں، جن کے ارکان یا تو نامزد ہوتے ہیں یا منتخب ہوتے ہیں - ایوان‌های تجارت و زراعت کے ارکان کو صرف فرانسیسی منتخب کرتے ہیں - انتخاب ہر چھے سال کے بعد ہوتا ہے اور ان میں سے ایک تہائی ارکان ہر دو سال کے بعد اپنی رکنیت سے دست بردار ہو جاتے ہیں : تونس کا ایوانِ تجارت (چیمبر او کامرس) اور ایوانِ زراعت، سوسۃ کا ایوانِ تجارت و زراعت، سفاقس کا ایوانِ تجارت و زراعت، یہ چاروں ایوان ۱۸۹۵ء میں قائم ہوے، بنزرت کا ایوانِ تجارت ۱۹۰۲ء میں وجود میں آیا - عورتوں کو بھی راے دینے کا حق تو حاصل ہے لیکن وہ خود رکن نہیں بن سکتیں - ایوانِ استفادہ از معادن، جس کا اجلاس تونس میں ہوتا ہے، ۱۵ جولائی ۱۹۲۲ء کی قراردادِ مقیمی کے بموجب معرضِ وجود میں آیا، بلا تمییزِ جنسیت، تونس کی کانوں کے فرانسیسی یا تونسی مالکوں، ڈائریکٹروں (مدیروں)، مینیجروں (ناظموں) یا انجنیروں (مہندسوں) پر مشتمل ہے؛ اس کے بارہ ارکان ہیں جو چھے سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں اور ان میں سے نصف ہر تین سال کے بعد اپنی رکنیت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں.

ساٹھ مقامات میں میونسپلٹیاں (بلدیات) قائم کی گئی ہیں - ۱۴ جنوری ۱۹۱۴ء اور یکم جنوری ۱۹۲۴ء کے فرامین کی رو سے مجالسِ بلدیات (municipal councils) تین تین سال کے لیے قائم ہوتی ہیں - ان میں سے صرف ایک تہائی کا انتخاب ہر سال ہوتا ہے - ان میں سے ہر مجلس میں ملکی لوگوں میں سے ایک صدر ہوتا ہے اور ایک یا زیادہ فرانسیسی نائب صدر ہوتے ہیں اور مقامی یا یورپی لوگ مختلف تعداد میں مجلس کے رکن ہوتے ہیں - ان کی کارروائی علانیہ ہوتی ہے اور وزیراعظم کی منظوری کے تابع ہے.

۱۳ جولائی ۱۹۲۲ء کے فرمان کے مطابق، جس کی جگہ ۲۷ مارچ ۱۹۲۸ء کے فرمان نے لے لی، اقلیمی بلدیات ("regional councils") کا قیام عمل میں آیا - ان کے ارکان کا انتخاب بھی ہر چھے سال کے بعد ہوا کرتا ہے - ان میں پہلے تو دستور یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ بلدیات کے ملکی ارکان اور کچھ علاقائی قائدیات کی بلدیات کے (ملکی) نمائندوں پر مشتمل ہوتی تھیں اور دوسری طرف فرانسیسیوں کی خفیف سی اکثریت پر، جو فرانسیسی ارکانِ بلدیات اور تجارتی اور زراعتی ایوانوں کے فرانسیسی ارکان سے لیے جاتے تھے، لیکن اب ان میں ہر علاقے کے صدر مقام کی بلدیہ کا ایک نائب صدر اور مجلسِ کبیر (Grand Conseil) کے مندوبین، جو عام انتخابات کے ذریعے منتخب ہوتے ہیں اور ایوانِ استفادہ از معادن اور وطنی ایوانِ تجارت کے نمائندے بھی شامل ہوتے ہیں - اقلیمی مجلس کا، جو اقتصادی اور مالی معاملات میں مشاورتی حیثیت رکھتی ہے، اجلاس سال میں دو دفعہ ہوا کرتا ہے، ہر اجلاس زیادہ سے زیادہ چھے روز تک جاری رہتا ہے، اس مجلس کا اجلاس علاقے کے صدر مقام میں اور مقیمِ عام (ریزیڈنٹ جنرل) کے مقرر کردہ ناظرِ داخلی (سول کنٹرولر) کی صدارت میں ہوتا ہے -

لیکن اُسے راے دینے کا حق حاصل نہیں ہوتا ۔ فرانسیسی رکن ایک نائب صدر اور سیکرٹری چن لیتے ہیں اور ملکی باشندے دوسرا نائب صدر اور سیکرٹری.

اہمّ ترین مجلس نمائندگان یعنی مجلسِ کبیر (Grand Conseil'') ۱۳ جولائی ۱۹۲۲ء کے فرمان کی رو سے ۱۸۹۶ء کی قائم شدہ ''مجلسِ مشاورت'' (Conférence Consultative) کی جگہ معرضِ وجود میں آئی، جو بعد میں کئی مرتبہ تجدید ترتیب کے مراحل سے گذر چکی تھی ۔ مارچ ۱۹۲۸ء کے متعدّد فرمانوں اور قراردادوں کے بموجب اس کے ارکان کی ترکیب اور اس کے اختیارات متعیّن کیے گئے ہیں ۔ یہ فرانسیسیوں اور مقامی باشندوں کی دو علیحدہ علیحدہ شِقّوں پر مشتمل ہے، جن کی کارروائی اصولاً الگ الگ ہوتی ہے ۔ فرانسیسی جماعت، جس کی صدارت مقیمِ عام (ریزیڈنٹ جنرل) کرتا ہے، باون ارکان پر مشتمل ہے (بائیس رکن اقتصادی مفاد کی نمائندگی کرتے ہیں، چھے رکن تونس کا ایوانِ زراعت منتخب کرتا ہے، دو ایوانِ تجارتِ بنزرت، دو ایوانِ تجارت تونس، چار سوسۃ کا مخلوط ایوان، چار سَفاقس کا ایوانِ تجارت، دو ایوانِ استفادہ از معادن اور تیس ارکان فرانسیسی نو آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ ان تیس فرانسیسی ارکان کا انتخاب ہر علاقے کے وہ فرانسیسی کرتے ہیں جن کی عمر اکیس سال سے زیادہ ہو اور وہ تونس کی شہریت کم از کم دو سال پہلے سے اختیار کر چکے ہوں، چھے بنزرت سے، دس تونس سے، چار الکاف سے، پانچ سوسۃ سے، پانچ سَفاقس اور سارے فوجی علاقوں سے منتخب ہوتے ہیں) ۔ مجلسِ کبیر کا رکن بننے کے لیے کم از کم پچیس سال عمر کی شرط ہے ۔ انہیں چھے سال کے لیے منتخب کیا جاتا ہے اور ان میں سے نصف ہر تین سال کے بعد منتخب ہوتے ہیں ۔ یہ مجلس میزانیہ کی پڑتال کرتی ہے اور اسے منظور کرتی ہے اور سیاسی اور آئینی مسائل کے سوا دوسرے کل معاملات پر اپنی راے کا اظہار بھی کر سکتی ہے؛ اُن مسائل پر جو حکومت کی طرف سے ان کے پاس بھیجے جائیں، راے دیتی ہے اور خود بھی مسائل کے متعلّق حکومت پر سوالات کر سکتی ہے ۔ فرانس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس مجلسِ کبیر کو ختم کر دے یا اس کے فیصلوں کو خواہ وہ میزانیہ ہی کے متعلّق ہوں مسترد کر دے ۔ مجلسِ کبیر کا معمولی اجلاس سال میں ایک دفعہ ہوتا ہے، جس کی میعاد بیس روز سے زیادہ نہیں ہو سکتی؛ اُسے غیر معمولی اجلاس کے لیے بھی طلب کیا جا سکتا ہے ۔ ہر شِقّ اپنے اپنے عہدے دار چُنتی ہے اور دو بڑی کمیٹیاں یا کمیشن مقرر کرتی ہے : مالی کمیشن اور امورِ اقتصادی کا کمیشن ۔ فرانسیسی شِقّ اس مجلس میں اقتصادی مفاد کے پانچ مندوب اور فرانسیسی نو آبادی کی طرف سے سات مندوب بھیجتی ہے ۔ مجلسِ کبیر کا جب پورا اجلاس منعقد ہو تو عوام وہاں نہیں آ سکتے ۔ ایک ''ثالثی کمیشن'' ("Commission Arbitrale") ہے، جس کی صدارت مقیمِ عام (ریزیڈنٹ جنرل) کرتا ہے، ان تمام تجاویز، آراء اور تحریکوں پر غور کرتا ہے جن میں مجلسِ کبیر کی دو شِقّوں کا باہمی اختلاف ہو ۔ اس کے چودہ ارکان میں سے نصف فرانسیسی گروہ چُنتا ہے اور نصف ملکی : متواتر اختلاف کی صورت میں مقیمِ عام راے دہندگی میں خود حصّہ لیتا ہے اور اُس کے ساتھ وزراء اور جو ڈائرکٹر (مدیر) موجود ہوں وہ بھی شریک ہوتے ہیں، یعنی دونوں شِقّوں کے اختلاف کی صورت میں حکومت کو فیصلہ کن ووٹ دینے کا اختیار ہے ۔

(ب) مالیات : تونس کے مالی ذرائع ان

ٹیکسوں [ضرائب] پر مشتمل ہیں جو راست وصول کیے جاتے ہیں اور جن کی اہمیّت بتدریج کم ہو رہی ہے :-

۱ - 'اسْتیطان' یعنی ''ذاتی ٹیکس'' جو قدیم مَجْبٰی کی جگہ عائد کیا گیا (قبّ Barthès : *Les impôts arabes en Tunisie*، الجزائر ۱۹۲۳ء) - یہ محصول ملکِ تونس کے ہر مرد پر جس کی عمر بیس برس سے زیادہ ہو لگایا جاتا ہے - ۲ - اراضی کا ٹیکس (بتفصیلِ ذیل : کھجور کے درختوں کا محصول، جو 'قانون' کہلاتا ہے - زیتون کے درختوں کا ون' - غلّہ جات کی دہ یکی، جو عُشْر کہلاتی ہے - جو نوترڑ زمینیں زیرِ کاشت لائی جاتی ہیں انھیں پانچ سال تک عُشْر معاف ہوتا ہے - 'مَراجع' یعنی وہ ٹیکس جو میوہ باغوں اور نہری اراضی پر لگایا جاتا ہے، باستثناے جزیرۂ جِرْبة - 'خُضَر' یعنی '' وہ خاص ٹیکس جو جِرْبة کی تمام زیرِ کاشت زمینوں پر لگایا جاتا ہے '' - ٹیکس جو ۱۹۱۸ء میں مویشی پر لگایا گیا - ٹیکس جو ۱۹۱۹ء میں انگور کی بیلوں پر لگایا گیا - ٹیکس جو ۱۹۲۷ء میں نادرست کردہ اراضی پر عائد کیا گیا - ٹیکس جو شہروں اور اُن کے مضافات کی جائدادوں پر ان کی اُجرت المثل یا مفروضہ کرائے (rentable value) اور موصول شدہ کرائے کے تناسب کے حساب سے ناحیوں کے مفاد کے لیے لگایا گیا) - ۳ - ٹیکس جو تجارتی اور صنعتی منافع پر لگائے گئے (۱۹۲۷ء میں لائسنس اور کان کنی کے محصول جاری ہوے) - ۴ - ذاتی جائداد کی آمدنی اور رہن وغیرہ پر ٹیکس، جو ۱۹۱۸ء میں جاری ہوا؛ کچھ اور ٹیکس بھی ہیں جنھیں '' assimilées '' کہتے ہیں .

وہ ٹیکس جو بالواسطہ ہیں اور جن کی اہمیّت بڑھ رہی ہے ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :-

(الف) اسٹام [تمغا] اور رجسٹری [تسجیل] کے رسوم؛ (ب) محاصل چونگی [مُکُوس]، جن کی شرح اس طرح مقرّر کی گئی ہے کہ فرانسیسی پیداوار اور مصنوعات کو فائدہ پہنچے؛ (ج) متعدّد رسوم، جو بعض اشیاء کی تیّاری اور فروخت پر عائد ہوتے ہیں - یہ ٹیکس ۱۹۲۰ء میں سابقہ '' محصولات '' کی جگہ لگائے گئے اور '' بالواسطہ ٹیکسوں '' کے نام سے تعبیر کیے گئے - اس کے علاوہ (د) اجارہ داریوں، (تمباکو، نمک، دیاسلائی، تاش) کی آمدنی ہے - نیز (ہ) ڈاک خانے کا منافع (و) کئی قسم کے صنعتی اقدامات اور (ز) اراضی مملوکۂ مملکت، آمدنی کی مدیں ہیں.

(ح) نظامِ ادارۂ وطنیّہ : ملکی وزیر تعداد میں تین ہیں : (۱) 'الوزیرالاکبر' جس کی امداد کے لیے (۲) وزیر القلم مع مدیر عام داخلی (ڈائرکٹر جنرل او دی انٹیریر) اور (۳) وزیرالعَدْلِیّة مقرّر ہیں - وزیرالعَدْلِیّة کا عہدہ ۲۶ اپریل ۱۹۲۱ء کو قائم ہوا - اس وزیر کو مشورہ دینے کے لیے ایک فرانسیسی افسر مقرر ہے، جسے مدیر عدلیۂ تونسیّہ ('' Directour de la Justice Tunisienne '') کہتے ہیں .

مملکتِ تونس میں تنظیم بلاد کی اساسی صورت یہ ہے کہ ملک کو قائدیات میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کی مجموعی تعداد موجودہ وقت میں سینتیس ہے - ان قائدیات کے نام حسبِ ذیل ہیں اور اُن کے اُوپر ایک ایک قائد مقرر ہے : باجَة، بَنْزَرت، ماطِر، عین دُرَہم، سُوق الاَرْبَعاء، سُوق الخَمیس، تونس المدینة، تونس الظواہر، زَغْوان، سلیمان Soliman، نابُل، تبُرْسُق، الکاف، تَجْرُوین Tadjerouine، اولادعیّار، اولاد عَون، مِجازالباب، سُوسَة، مُنَسْتِیر، مَہْدِیّة، السّواسی، القَیْرَوان، جِلاص، فراشِیْش، ماجِر، سَفاقُس، جِبِنیانَة، سُکرَة، اَرد، قَفصة، الهمامَة، جَرِید، جِربَة، مَطْماطَة، نَفزاوَة، وَرغَمَّة، تَیطّاوین - تونس المدینة میں قائد نے اپنا پرانا لقب 'شیخ المدینة' قائم رکھا ہے - قائد کا تقرّر فرمان کے ذریعے ہوتا ہے اور اس کے فرائضِ منصبی میں اداری، عدالتی اور مالی فرائض شامل ہیں :

وہ رہنما اور حکومت کے درمیان متوسط کا کام دیتا ہے اور امنِ عامّہ کے قیام کا ذمے دار ہے، دیوانی اور فوجداری امورِ خفیفہ میں فیصلے کرتا ہے اور اس کے فیصلے پر مرافعہ نہیں ہو سکتا، ٹیکس بھی وہی وصول کرتا ہے ۔ اس کے ماتحت ایک مقامی فوجی دستہ '' اوجاق '' بھی رہتا ہے، جس میں سپاہی (السبائحیّة) ہوتے ہیں، جو اُن لوگوں سے تاوان ('خدمة') وصول کرتے ہیں جو ٹیکس ادا کرنے میں کوتاہی کریں ۔ اب یہ رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ ان ٹیکسوں کے بجاے جو قائد اپنے لیے ماتحتوں سے وصول کیا کرتا تھا اسے مقرّرہ تنخواہ دی جائے ۔ اس بارے میں کچھ عملی کارروائی ہو بھی چکی ہے ۔

ایک فرمانِ تقرر کی رو سے ۲۸ نومبر ۱۸۸۹ء سے ''خلفاء'' بھی مقرر کیے گئے، وہ قائدوں کی معاونت کرتے ہیں یا قیادت کے زائد فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان خلفاء کی تعداد [بوقتِ تحریر] ۶۷ ہے اور انہیں دو درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ ان میں سے بیس درجۂ اعلٰی میں ہیں ۔ ۴ جون ۱۹۱۲ء سے ''قائدانِ کاھیا'' "kaids stagiaeres" یعنی 'امیدوار' ('پروبیشنر') قائدین کا ایک خاص فریق بنایا گیا ہے اور اسی طرح خلفاے خاص کی بھی ایک جماعت مرتّب کی گئی ہے، جن کی تعداد سولہ ہے اور وہ قائد کے بعض فرائض کی ادائگی میں اس کے قائم مقام کا کام کرتے ہیں ۔

ہر قائدیت کو متعدّد شیاخات shaikhates میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے حاکم کو شیخ کہتے ہیں ۔ ان کی کل تعداد چھے سو چار ہے ۔ ہر شیخ کا تقرّر قائد کی نامزدگی پر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے ۔ شیخ حفظِ امن کا ذمے دار ہوتا اور تحصیلِ محصولات میں مدد دیتا ہے ۔

۱۹۲۲ء کے متعدّد فرمانوں اور قراردادوں کے مطابق، جن میں ۱۹۲۸ء میں کچھ ترمیم کر دی گئی، (فوجی علاقوں کو چھوڑ کر) اطراف بلاد میں ''مجالسِ قائدیات'' "councils of kaidates" قائم ہوئیں اور ان کی تنظیم کی گئی جن کا مقصد یہ ہے کہ قائدیات کی اقتصادی ضرورتوں پر بحث کی جائے، حکومت کے سوالات کا جواب دیا جائے اور علاقائی مجالس کے لیے نمائندے منتخب کیے جائیں ۔ ہر شیاخة چار مندوب بھیجتی ہے ۔ ایک یا دو اصلی یا اساسی اور دو فرعی یا احتیاطی، جن کی عمر کم از کم تیس برس کی ہو؛ ان کا انتخاب اعیان آپس ہی میں کرتے ہیں، مگر ان کا تقرّر وزیر کی منظوری کے تابع ہے ۔ اعیان سے مراد وہ چوٹی کے ٹیکس گذار ہیں جن کی عمر پچیس برس سے زیادہ ہو اور ناحیوں سے باہر اُس خاص شیاخة میں زمین کے مالک ہوں یا وہاں رہتے ہوں ۔ اعیان کی فہرست جو قائد بناتا ہے اس پر ایک کمیشن نظر ثانی کرتا ہے، جس میں قائد کے علاوہ ناظم مدنی (سول کمپٹرولر) اور قاضی بھی ہوتے ہیں ۔ وکلاء، سرکاری عہدے دار اور محکمۂ پولیس کے ملازم اس مجلس کے مندوب نہیں بن سکتے، مجالس کے اجلاس ہر سہ ماہی میں دو روز کے لیے منعقد ہوتے ہیں اور انتخابات ہر چھے سال کے بعد ہوا کرتے ہیں ۔

ملکی لوگوں کے ایوان ہاے زراعت و تجارت کی تشکیل ۱۹۲۰ء میں ہوئی اور ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۸ء میں انہیں دوبارہ ترتیب دیا گیا: ایک ایوان کا نام ''ایوانِ زراعتِ وطنیّہ براے شمال '' (chambre d' agriculture indigène du nord) ہے ۔ اس میں ایک شعبہ زراعت کا ہوتا ہے، (ہر قائدیة سے ایک رکن لیا جاتا ہے، جس کا انتخاب خود حکومت مندوبینِ شیاخت کے بھیجے ہوے دو ناموں میں سے کرتی ہے) اور ایک شعبہ زراعی اقتصادیات کے متعلّق ہے ۔ (اس شعبے کے دو رکن ہوتے ہیں جن کا میٹریکولیٹ یا زراعتی انجنیر ہونا ضروری ہے، ان دو کو مندوبینِ شیاخة کے بھیجے

ہوے چار ناموں میں سے حکومت چن لیتی ہے)؛ '' ایوان تجارتِ علاقۂ شمال '' (Chambre de Commerce indigène du nord) میں ایک شعبۂ تجارت (بارہ انتخاب شدہ مسلم اور پانچ یہودی) اور ایک شعبۂ اقتصادیات عامّہ شامل ہیں (اس شعبے میں راے دہندوں کے پیش کردہ چار امیدواروں میں سے حکومت کے منتخب کردہ دو مسلم یا یہودی ارکان ہوتے ہیں) ۔ انتخاب کرنے والوں کی عمر کم از کم چوبیس سال اور امیدوار کی تیس سال ہونی چاہیے ۔

۱۹۲۸ء سے یہ قاعدہ بھی جاری ہوا کہ یہ دونوں مجلسیں اسی قسم کی فرانسیسی مجلسوں کے ساتھ مشترکہ اجلاس کیا کریں ۔ اس طرح سُوسَة و سَفَاقُس کے ''مشترکہ ایوانوں'' کے اندر ملکی باشندوں کا ایک فریق ہے جو سات ارکان پر مشتمل ہے ۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بلدیات اور علاقائی مجالس میں ملکی باشندوں کا حصّہ کتنا ہے ۔ مجلسِ کبیر (Grand Council) میں اُن کا ایک الگ گروہ ہے، جس میں چھبیس ارکان شامل ہیں؛ دس ارکان (دو رکن فی علاقہ کے حساب سے) پانچ علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ تین جنوبی علاقوں کی، چار شمالی علاقوں کے ایوانِ تجارت کی، چار شمالی علاقے کے ایوانِ زراعت کی، دو ملکی باشندوں کے مخلوط ایوانوں کی اور ایک تونس کی یہودی جماعت کی ۔ مجلسِ کبیر کے اس شعبے کی صدارت عموماً مقیمۂ عام (ریزیڈنس جنرل) کا مندوب کرتا ہے یا علاقۂ زیر حمایتِ فرانسہ کا کوئی اعلٰی فرانسیسی افسر جسے مقیم (ریزیڈنٹ) نے نامزد کیا ہو ۔ استثنائی طور پر کبھی ریزیڈنٹ جنرل خود بھی صدارت کرتا ہے ۔ دونوں شعبے باتفاق راے مل کر بھی کسی معاملے پر غور کر سکتے ہیں ۔ اس وقت ان کی رائیں (اصوات، ووٹ) ایک ہی ایوان کی رائیں سمجھی جاتی ہیں ۔

تونس کے قانون میں، جس کے احکام (statutes) جنوری ۱۹۲۸ء کے فرمان کی رُو سے متعیّن ہوے، اس بات کی خاص احتیاط رکھی گئی ہے کہ عام دنیوی قانون اور مذہبی قانون کی حدود اختیار میں امتیاز رکھا جائے ۔ عام قانون کی ریاست عدالت 'الأوزراء' [الوزراء] تونس کے سپرد ہے جس میں ۱۹۲۱ء سے حسب ذیل شعبے شامل ہیں :-

(الف) ایک قسم کی عدالتِ مرافعہ جو تمام مملکتِ تونس کے لیے ہے ۔ اس کی دو شاخیں ہیں : دیوانی اور فوجداری' جن میں تین تین مجسٹریٹ اجلاس کرتے ہیں؛ (ب) ایک فوجداری عدالت، جس میں بدائی مقدّمات کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی؛ (ج) فوجداری مقدّمات کی بدائی عدالت (court of arraignment)؛ (د) ایک قسم کی عدالتِ مرافعہ، جسے ہیئت نظر در ملتمسات (commission des requêsts) کہتے ہیں ۔ عدالت 'الأوزراء' ان علاقائی عدالتوں کے شامل ہونے سے مکمّل ہو جاتی ہے جن میں سے ہر ایک عدالت میں تین تین مجسٹریٹ ہوتے ہیں ۔ اس قسم کی عدالتیں ۱۸۹۶ء میں سَفَاقُس، قابِس اور قَفْصَة میں قائم ہوئیں ۔ ۱۸۹۷ء میں سُوسَة اور قَیروان میں، ۱۸۹۸ء میں الکاف میں اور ۱۹۲۶ء میں باجة میں ان کا قیام عمل میں آیا ۔ ۱۹۰۶ء میں حکومت کے مندوب (''commissaires du gouvernement'') بھی ان کے ساتھ لگا دیے گئے، یعنی ایسے فرانسیسی وکیل جو عربی زبان بولتے ہیں ۔ فریقین کی نمائندگی '' اُوکیل '' (وکیل، جمع ''اَوْکلاء'' یعنی وُکلاء) کر سکتے ہیں ۔ آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ تونس کی علاقائی عدالت کو اب تک ' دُرِیْبَة ' ہی کہتے ہیں اور تونس میں ایک عدالتِ عُرف بھی قائم ہے، جس میں شیخ المدینة اور دس اسیسر (assessors) اجلاس کرتے ہیں ۔ یہ ایک قسم کی عدالت ہے جس میں تجارتی کاروبار کے متعلّق مقدّمات پیش ہوتے ہیں ۔

مآخذ: (۱) Zeys: *Code annoté de la Tunisie*، ۱۹۰۱ء و تکملہ ہای سنوبہ تا ۱۹۱۲ء؛ (۲) Lagrange and Fontana: *Codes et lois de la Tunisie*، پیرس ۱۹۱۲ء، (تکملہ ها تا ۱۹۲۸ء)؛ (۳) *Journal Officiel tunisien*؛ (۴) A. Girault: *Principes de colonisation et de législation coloniale*؛ (ج ۵)، *La Tunisie et le Maroc*، طبع پنجم، پیرس ۱۹۲۸ء؛

۴ - مذہب اسلام

جزیرۂ جربۃ کے سوا، جس کی ۳/۵ آبادی خوارج کی ہے، تونس کے سنّی لوگ مدّت مدید سے مالکی مذہب کے پیرو چلے آتے ہیں مگر ترکوں کی اولاد یا وہ لوگ جو اپنے آپ کو ترکوں کی اولاد بتاتے ہیں حنفی مذہب کے پابند ہیں، وہ ہیں تو مختصر سی اقلیّت مگر اشراف و اعیان میں سے ہیں اور انھیں یہ شرف بھی حاصل ہے کہ بای کا خاندان بھی ان میں شامل ہے.

(الف) ادارے: شرع - بنوحفص [رکَ بآن] کے عہد میں تونس میں بلندترین مذہبی تقریبوں کو 'قاضی الجماعة' اور 'قاضی الأنكحة' سرانجام دیا کرتے تھے، جنھیں مفتیان اعظم [رکَ بہ مفتی] یا خطیب [رکَ بآن] کی طرح حکمران [بای] ہی مقرر کیا کرتے تھے - ان کے نیچے 'قاضی المعاملات' اور 'قاضی الأهلّة' ہوتے تھے - فوجی کیمپ کا قاضی ('قاضی المحلّة') میدان جنگ میں افواج کے ہمراہ جایا کرتا تھا.

ابن ابی دینار (ص ۲۷۶؛ ترجمہ ص ۴۷۰) نے وضاحت سے بتایا ہے کہ کس طرح قاضی آہستہ آہستہ مفتیوں کے زیر اقتدار آ گئے تا آنکہ وہ دونوں عدالت شرع میں (قبّ Saint Gervais، ص ۹۳ تا ۹۵) جمع ہونے لگے اور ترکوں کے زمانے میں حنفی مذہب کے مفتی اعظم ('باش مفتی') نے 'شیخ الاسلام' [رکَ بآن] کا لقب اختیار کر لیا، جسے وہ اب تک استعمال کرتا ہے؛ مالکی مذہب کے مفتی اعظم ('باش مفتی') کو بھی، جس کا مرتبہ سرکاری طور پر اتنا بلند نہیں سمجھا جاتا، بعض اوقات یہ خطاب دے دیا جاتا ہے.

عدالت شرع میں صرف ایسے مقدّمات پیش ہوتے ہیں جن کا تعلّق احوال شخصی personal law (مثلاً دیوانی قانون ['معاملات'] ،شادی، طلاق، امانت ترکہ ('ٹرسٹی شپ')، ولایت ('گارڈین شپ') وراثت) سے ہو - اس قسم کی عدالتیں ایک مالکی 'مجلس' اندرون ملک کے ہر شہر میں قائم کرتی ہے، ہر عدالت میں ایک قاضی اور ایک یا زیادہ مفتی ہوتے ہیں - تونس میں مالکی مجلس کے پہلو بہ پہلو حنفی مجلس بھی ''دیوان'' میں اجلاس کرتی ہے - یہ دونوں عدالتیں اُن مقدّمات کی سماعت کرتی ہیں جو مدّعی اندرون ملک سے اُن کے سامنے لا کر پیش کرتے ہیں یا دوسرے قاضی ان کے پاس بھیجتے ہیں.

ان عدالتوں کا طریق کار پہلے ۱۸۵۶ اور ۱۸۷۵ء کے فرامین کے مطابق ہوا کرتا تھا؛ اب اس کی تعیین ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کے فرمان کے مطابق ہوئی ہے، جس میں 'مراسلات' کے اجراء کے بارے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انھیں ایک سجِلّ (رجسٹر) میں درج کیا جائے جو سر دفترھاے اَسناد رسمی (notaries) کے پاس موجود رہتا ہے - ۶ مارچ ۱۹۲۶ء سے قانونی امداد کا ایک نظام قائم ہوا، جس کی رو سے ملکی لوگوں کو نام کے اندراج کا ٹیکس معاف کر دیا گیا، جو اسی سال ۳ مارچ کو عائد ہوا تھا - آخر میں ۲۸ جنوری ۱۹۳۰ء کو مُسَجّل (رجسٹرار) مقرر ہوے.

نظام عُدول Notariate: ملکی سر دفترھاے اَسناد رسمی notaries (عَدل، جمع، عُدول) بای کے فرمان کے مطابق مقرّر ہوتے ہیں - ان کی بھرتی

اور ان کے طریقِ کار کے قواعد و ضوابط بہت مدت سے یعنی ۳۰ ذوالقعدۃ ۱۲۹۱ھ / ۸ جنوری ۱۸۷۵ء سے منضبط ہو چکے تھے؛ ان کا تقرر قاضی کی نامزدگی پر مبنی تھا؛ جامع مسجد کے قدیم سندیافتہ طلبہ تقریباً خود بخود ہی بغیر کسی سابقہ تجربۂ کار کے عُدول مقرر ہو جایا کرتے تھے؛ مگر ۸ مئی ۱۹۲۸ء کے فرمان کے تحت پہلے قوانین میں کئی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں ۔ یکم جولائی ۱۹۲۹ء کے فرمان کی رُو سے پھر نئے احکام وضع ہوے اور ان پر یکم جنوری ۱۹۳۱ء سے عملدرآمد ہونا شروع ہوا ۔ آئندہ کے لیے یہ قانون جاری ہو گیا ہے کہ مسلمان عُدول کی عمر لازماً کم از کم ۲۳ سال کی ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ [امیدوار] عَدل نے دو یا تین سال تک کسی عَدل کے دفتر میں کام بھی کیا ہو اور یہ شرط بھی لگائی گئی (جو اپنی جِدّت کے لیے جالبِ نظر ہے) کہ اس نے کوئی ایسا امتحان بھی پاس کیا ہو جس میں تونس کے قانون کا علم لازمی مضمون ہو ۔ جامع مسجد کی سند سے ایسے عُدولِ ''درجۂ اول'' کے امتحان میں بیٹھنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے ۔ امتحان میں عَدل ''درجۂ اول'' کے حصول کی صورت میں امیدوار کسی بڑے شہر میں ''عَدل'' (notary) کا پیشہ اختیار کر سکتا ہے؛ البتہ عَدل ''درجۂ دوم'' کا امتحان پہلے امتحان سے قدرے مختلف ہوتا ہے ۔ جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں انھیں صرف کم اہمیت کے شہروں ہی میں کام کرنے کی اجازت ہوتی ہے ۔ جو سِجلّات (رجسٹر) انھیں دیے جاتے ہیں (روزنامچہ اور کارروائی کا رجسٹر یا سِجلّ) ان کی پڑتال وزارتِ عدلیہ کرتی ہے اور ان سِجلّات کا دقیق معائنہ باقاعدہ طور پر ہوتا ہے ۔

حُبُوس : تونس میں وقف [رَکّ بآن] جائدادوں کو حُبُوس "habous" کہتے ہیں ۔ خیرالدین کے وقت (۱۸۷۴ء) سے حُبُوسِ عامّہ کا انتظام ایک مرکزی دفتر موسوم بہ ''جَمْعِیّۃ'' کے ذمّے تھا ۔ جسے ۱۹ مارچ ۱۹۲۴ء کے فرمان کے مطابق از سرِ نو ترتیب دیا گیا؛ اس کا انتظام ایک مدیر (ڈائرکٹر) اور ایک مجلسِ اداری کے سپرد ہے : جمعیّۃ کا کام متعدد دفتروں میں منقسم ہے اور تونس کی نیابت (ریجنسی) کے ہر بڑے مرکز میں ایک نائب رہتا ہے، جو اصلی 'وکلاء' (ادارہ کرنے والے عاملوں) کو کارِ وکالت سپرد کرتا ہے ۔ ۱۷ جولائی ۱۹۰۸ء کے فرمان کی رو سے اس جمعیّۃ کو "conseil supérieur des habous" یعنی مجلسِ اعلٰی برائے اوقاف کے ماتحت کر دیا گیا ہے جو وزیر القلم اور مدیرِ امورِ داخلیۂ عام کی زیرِ ہدایت کام کرتی ہے ۔ 'جمعیّۃ' کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ نجی اوقاف کی بھی دیکھ بھال کرے ۔

حُبُوس کے متعلّق جملہ قوانین سے بعض لوگ بڑی ہوشیاری کے ساتھ بچ جاتے رہے ہیں ۔ مفصّلۂ ذیل تین حیلوں سے اس میں مدد ملتی ہے (قبّ *Une loi agraire en Tunisie* : H. de Montety، کاہور Cahors ۱۹۲۷ء) : (الف) 'انزال' یا ادائے کرایہ پر حُبُوس کا دوامی انتقال (۲۶ مئی ۱۸۸٦ء کا فرمان، جس میں اکثر اوقات ترمیم و اضافہ ہوتا رہا؛ ۱۹۰۵ء سے انزالی مقروض کرائے سے رہائی پا سکا ہے؛ زمین کی فروخت عام نیلام کے ذریعے ہوتی ہے ۔ البتہ دیہاتی جائدادوں کے دخیل کاروں کے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے)؛ (ب) مبادلہ بجنس یا بہ ادائے نقد (۱۱ جنوری اور ۱۳ نومبر ۱۸۹۸ء کے فرمان)؛ (ج) طویل المیعاد اجارہ داری (۳۱ جنوری ۱۸۹۸ء) .

بیت المال بھی 'جمعیّۃ' کے ماتحت ہے ۔ اس میں سے خیراتی کاموں کے لیے امدادی رقوم دی جاتی ہیں اور لاوارث ترکے اس کے حوالے کر دیے جاتے ہیں .

اُخُوّات : تونس کے اسلامی مذہبی سلاسل و

طُرُق کے متعلّق کوئی اعداد و شمار اُن کی صحّت کے یقین کے ساتھ نہیں دیے جا سکتے (قب Depont اور Coppolani : *Les confréries religieuses musulmanes*، الجزائر ۱۸۹۷ء، بمواضع کثیرہ) ۔ ہم احتیاط کے بغیر اُن اعداد و شمار کو بھی قبول نہیں کر سکتے جو *Annuaire du Monde Musulman* میں درج ہیں ۔ اہلِ اُخُوّات کی کل تعداد وہاں ۵۸,۱۴۳ دی گئی ہے مگر حقیقی تعداد یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہے ۔ مقیمیّۂ عام نے ۱۹۲۴ء میں سرکاری طور پر تحقیقات کرائی تھی، جس کی روئداد شائع نہیں ہوئی: اس کے مطابق صرف الکاف میں اٹھارہ ہزار اخوان khuān یا فقراء تھے اور ناحیۂ باجۃ میں، جہاں مسلمانوں کی کل تعداد ۶۶ ہزار ہے، آبادی کا تہائی حصّہ کسی نہ کسی اُخُوّۃ میں داخل ہے ۔ اسی طرح صرف ملحق تیطّاوین میں ان کی تعداد ۱۳,۰۰۰ سے زائد ہے ۔ چار صوفی سلسلے جو بہت دور دور تک پھیلے ہوے ہیں یہ ہیں : قادریّۃ اور رَحْمانیّۃ، پھر عیساوۃ اور تیجانیّۃ [رَکَ بآن]؛ سلسلۂ عَرُوسیّۃ میں بھی بہت سے لوگ داخل ہیں ۔ نَفْطَۃ کے بوعَلیّۃ کی طرح چند مقامی طریقے بھی ہیں، ان کے علاوہ مَدَنیّۃ، شاذلیّۃ اور طَیّبیّۃ کی کچھ منتشر جماعتیں بھی ہیں؛ طَبَرقۃ اور تَالَۃ کے اداری حکّام اپنے علاقوں کے متعلّق اس امر پر متّفق ہیں کہ وہاں کل اخوان کی تعداد کے ساتھ رحمانیّۃ اور قادریّۃ سلسلوں کا تناسب علی الترتیب پچاس اور چالیس فی صد ہے لیکن بلاشبہہ دوسرے مقامات میں یہ تناسب کم ہے، جہاں دوسرے سلسلوں کے مرید زیادہ ہیں ۔ ایک جدید سلسلے کی اشاعت کا بھی ذکر کر دینا مناسب ہوگا جو حال ہی میں وجود میں آیا ہے جسے سلسلۂ عَلَویّۃ کہتے ہیں ۔ اس کی ابتداء مُسْتَغانم میں ہوئی، جو اعمالِ الجزائر میں سے ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تونس میں اس سلسلے کا مرکز قصبۃ (Ksibet) المَدْیُونی کا زاویۃ [رَکَ بآن] ہے، قصبۂ مذکور مُنَسْتیر کے نزدیک ہے ۔ اگرچہ تونس، مِنْزِل بوزلْفَۃ اور الجرید اہمّ صوفی سلسلوں کے مرکز ہیں لیکن اکثر طریقوں کے امّ الزوایا جن کا نفوذ وسیع ترین ہے الکاف ہی میں ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ ان اداروں کی سیاسی اہمیّت عملاً صفر کے برابر ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کا مذہبی اثر بھی تدریجی طور پر کم ہو رہا ہے ۔

زاویوں کا حقّ حرم [حقِّ بست گاہ] ۶ فروری ۱۸۸۳ء سے موقوف ہو گیا ہے ۔

(ب) تعلیم : قرآنی مدارس کو 'کُتّاب' کہتے ہیں ۔ سب سے اوپر وہ مدارس ہیں جنھیں جامع مسجد کے قدیم سندیافتہ فارغ التحصیل چلاتے ہیں ۔ ان کا خرچ 'جَمعیّۃ' کے ذمّے ہے اور وہ مدیرِ معارفِ عامّہ (ڈائرکٹر آو پبلک انسٹرکشن) کی نگرانی میں ہیں ۔ ان کی موجودہ اہمیّت عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ جامع مسجد کے طلبہ کے لیے اقامت گاہوں ('ہوسٹلوں') کا کام دیتے ہیں؛ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہاں چند خصوصی قسم کے تدریبی درس (tutorial lectures) دیے جاتے ہیں ۔ صرف المدرسۃ العُصفوریۃ میں 'کُتّاب' کے لیے مؤدّبوں یعنی استادوں کو تعلیم دی جاتی ہے ۔

جامع مسجد : ترکوں کے عہد میں جامع مسجد آہستہ آہستہ ہر قسم کی مذہبی تعلیم کا مرکز بن گئی تھی اور ہمارے زمانے میں تو یہ مسجد اس قسم کی تعلیم کا واحد مرکز ہے، اس میں تونس، طرابلس، الجزائر اور بعض اوقات مرّاکش تک کے تقریباً دو ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں ۔ اس کے نصابِ تعلیم کی ترتیب موجودہ زمانے میں احمد بای کے منشور مؤرّخۂ ۲۷ رمضان ۱۲۵۸ھ / یکم نومبر ۱۸۴۲ء کے مطابق ہوئی ۔ اس منشور کو "المُعَلَّقۃ" کہتے ہیں، کیونکہ اسے جامع مسجد کے باب الشِّفاء

پر لٹکا دیا گیا تھا ۔ نظام کے اہمّ پہلوؤں کی صورت یہ تھی : ۳۰ عالم (جمع : علماء) تھے، جن میں سے ۱۵ مالکی اور ۱۵ حنفی ہوتے تھے ۔ ان میں ہر ایک مدرّس دن میں دو دفعہ درس دیتا تھا ۔ جمعرات، جمعہ، عیدین اور ماہ رمضان تعطیلات میں شمار ہوتے تھے ۔ ان کی تنخواہ دو پیاسٹر [دو قرش] یومیّہ تھی، سوا ان ایام کے جب وہ بغیر وجہ معقول غیر حاضر ہوں ۔ مالکی اور حنفی مذھب کے شیخ الاسلام ان کے ناظر (انسپکٹر) تھے، انھیں سو پیاسٹر [یا سو قرش] ماھوار ملتا تھا، ان کی امداد کے لیے دونوں مذھبوں کا ایک ایک قاضی مقرّر تھا، ان میں سے ہر ایک کا مشاھرہ تین پیاسٹر [یا تین قرش] یومیہ کے حساب سے تھا ۔ یہ چاروں بیت المال کے منتظمین کے حساب کی پڑتال بھی کرتے تھے اور بیت المال ھی سے یہ تنخواھیں دی جاتی تھیں ۔ اگر بیت المال میں خاصی فاضل رقم نظر آتی ھو تو اسے بعض شرائط کے تحت سب سے زیادہ محنتی طلبہ کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا ۔ مدرّسین کا تقرّر بای کے فرمان (' ظَہیر ') کے مطابق دونوں شیخوں اور قاضیوں کے مشورے سے ھوا کرتا تھا ۔

لیکن اس سے مفصّل تر اور مکمّل تر نظام کا پتا صرف خیرالدین ھی کے عہد سے چلتا ھے : فرمان ('' اَمرِ عالی '')، جو اس نے صادق بای سے ۲۸ ذوالقعدۃ ۱۲۹۲ھ/ ۲۶ دسمبر ۱۸۷۵ء کو جاری کرایا، اس میں ۶۷ دفعات ھیں، جن میں ان علوم کی تفصیل دی ھے جن کی تعلیم و تدریس مقصود ھے، نیز ان مصنّفین کی فہرست ھے جن کی شروح پڑھائی جائیں گی ۔ اس کے علاوہ طلبہ اور مدرّسین اور مُشرفین (سپروائزر، نگران کار) کے حقوق و فرائض اور کتب خانے کے متعلّق قواعد درج ھیں ۔ بعد میں اس میں جزوی طور پر ترمیمیں ھوتی رھیں تا آنکہ ۱۶ ستمبر ۱۹۱۲ء کے ' امرِ عالی ' نے اس کی جگہ لی؛ چنانچہ اب اس میں ۸۱ دفعات ھیں جن میں کچھ اضافہ بھی ھوا ھے اور انھیں قواعد و ضوابط کے مطابق یہ ادارہ اب تک چل رہا ھے ۔ اس فرمان میں پرانی طرز کے احکامِ تدریس کے ساتھ ساتھ راست روی اور حسنِ اخلاق کی بھی بڑی تاکید کی گئی ھے اور دفعہ ۱۹ میں ان اصول اور عقائد میں شک و شبھہ کرنے کی ممانعت کی گئی ھے جنھیں ' علماء ' بالعموم تسلیم کرتے چلے آئے ھیں .

جن علوم کی یہاں تعلیم دی جاتی ھے وہ تنوّع اور تعداد کے لحاظ سے '' علم کے گیارہ فروع '' سے زیادہ ھیں جو جامع الازھر میں ۱۸۷۲ء کے قانون کی رو سے مروّج ھیں ۔ ان کی تفصیل دفعۂ اوّل کی ترتیب کے مطابق حسب ذیل ھے : (۱) تفسیر القرآن؛ حدیث؛ سِیَر؛ قراءت؛ قراءت و تجوید؛ مُصْطَلَح ؛ اصول الفقہ؛ فقہ؛ فرائض؛ تصوّف؛ میقات یعنی نماز کے اوقات کی تعیین ؛ نحو؛ صرف؛ معانی و بیان؛ لغۃ؛ انشاء؛ ادب؛ تأریخ و جغرافیہ؛ رَسْم (ڈرائنگ) اور خطّ؛ عَروض؛ منطق؛ آداب البحث؛ حساب؛ ھَنْدَسہ؛ ھیئت؛ و مساحت ۔ ان علوم میں سے آخری علوم کی طرف قدرے اِھمال برتا جا رہا ھے ۔ جامع مسجد میں جو سخت قدامت پسندی کی روح کام کر رھی ھے اور دقیانوسی طرزِ تعلیم جو وھاں رائج ھے وہ دنیاوی علوم کی ترقّی کے لیے سنگ راہ بن رھی ھیں اور مذھبی معاملات میں ان سے کسی قسم کی آزاد خیالی کا امکان باقی نہیں رھتا ۔ تاریخ اور جغرافیے کے ضمن میں اسلامی تاریخ کے مختصر سے خلاصے کے علاوہ نصاب میں صرف دو اَور کتابیں شامل ھیں : ابن الخَطیب کی رَقْم الحُلَل اور ابن خَلْدون کا مقدّمۃ ۔ یہ دونوں کتابیں چودھویں صدی میں تألیف ھوئیں ۔ علم ھَنْدَسہ (جیومیٹری) میں ابھی تک اقلیدس داخلِ نصاب ھے، جس کے مقالات کو نصیرالدین الطُّوسی کی کتاب سے پڑھاتے ھیں (جو تیرھویں صدی میں لکھی گئی).

مسجد میں تعلیم مفت ہے اور تعلیم کے تین درجے ہیں اور ہر درجے سے دوسرے درجے میں جانے کے لیے امتحانات ضروری ہیں ۔ ذیل میں دینیات اور ادب کی ان تصانیف کی فہرست دی جاتی ہے جن کی سب سے اعلٰی درجے میں تعلیم دی جاتی ہے ([فرمانِ مذکور] دفعہ ۴).

تفسیر : (اسرار التنزیل، از بیضاوی؛ تفسیر جلالین؛

حدیث : موطّأ، مع شرح الزرقانی، صحیح البخاری، مع شرح القسطلانی، صحیح مسلم، مع شرح الآبی؛ القاضی عیاض : شفاء، مع شرح الشہاب الخفاجی ؛

سیر : مواہب اللدنیۃ از القسطلانی، مع شرح الزرقانی؛ سیرۃ الکلاعیۃ؛

توحید : عضدالدین الایجی کی المواقف پر الجرجانی کی شرح؛ عمر النسفی کی العقائد پر التفتازانی کی شرح؛ الشیخ السنوسی : الکبری؛

اصول الفقۃ : صدرالشریعۃ عبیداللہ المحبوبی : التوضیح؛ ابن الحاجب کی المختصر پر عضدالدین الایجی کی شرح؛ عبدالوہاب السبکی کی [جمع] الجوامع پر المحلّی کی شرح؛

فقہ : عثمان الزیلعی : تبیین الحقائق (کنزالدقائق از عبداللہ النسفی کی شرح)؛ درر (شرح غرر)؛ خلیل [بن اسحق الجندی] کی المختصر پر سیدی عبدالباقی [الزرقانی] کی شرح، اسی کتاب [المختصر] پر سیدی محمد الخرشی کی شرح؛

تصوف : (الغزالی) : احیاء؛

نحو : ابن ہشام : مغنی اللبیب ؛

معانی و بیان : یوسف السکاکی کی المفتاح کا حصۂ سوم، مع شرح الجرجانی؛ التفتازانی : المطوّل؛

لغت، انشاء، ادب : السیوطی : المزہر؛ عبدالملک الثعالبی : فقہ اللغۃ؛ شرح المرزوقی بر دیوان الحماسۃ؛ ابن الاثیر : المثل السائر .

مدرسے کے اصلی استادوں کو، جو تعداد میں تیس ہیں مع معلّم علم تجوید، ''مدرّسین'' درجۂ اوّل کہتے ہیں اور وہ درجۂ اعلٰی کو پڑھانے کی قابلیت رکھتے ہیں ۔ درمیانی نصاب کے لیے بارہ مدرّس دوسرے درجے کے ہیں ۔ ان میں نصف مالکی ہیں اور نصف حنفی اور ایک استاد تجوید کا بھی ہے ۔ ابتدائی نصاب رضاکار استاد (مُتَطوّع) پڑھاتے ہیں ۔ یہ لوگ جامع کے قدیم سندیافتہ طلبہ ہوتے ہیں ، لیکن انھیں کوئی تنخواہ نہیں ملتی (دفعہ ۹)۔ استادوں کو ایک سال میں دو ماہ کی چھٹی وسط جولائی سے وسط ستمبر تک ملتی ہے اور اس کے علاوہ ماہ رمضان میں بھی رخصت ہوتی ہے ۔ ذیل کے ایّام میں بھی تعطیل ہوتی ہے : جمعہ، عیدین، اور ہر عید کے بعد کے چار دن، یوم عرفۃ اور اس سے پہلے دو دن، ۱۰ محرم، ۱۱ - ۱۲ - ۱۳ ربیع الاول (دفعہ ۲۹) ۔ جمعرات کو خاص طور پر وضاحت کے ساتھ کام کا دن قرار دیا گیا ہے (دفعہ ۲۸) — ہر طالبِ علم کے پاس حاضری کی کتاب ہوتی ہے، جس پر اساتذہ مہینے میں ایک بار دستخط کرتے ہیں (دفعہ ۳۲) اور اس میں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ طالبِ علم مذکور درس میں حاضر رہا ہے (دفعہ ۳۳) — ناظروں (انسپکٹروں) کی طرف سے اس غرض کے لیے مُشرف (نگران کار) مقرر ہیں کہ وہ ضبط قائم رکھیں (دفعہ ۴۰) ۔ ان ناظروں کے فرائض منصبی کی تفصیل 'معلّقۃ' کے احکام میں بڑی احتیاط سے درج کی گئی ہے (دفعہ ۴۴ ببعد).

ایک ملحقِ امرِ عالی [یعنی فرمان] میں، جو اسی تاریخ کو بطورِ تتمہ جاری ہوا، گیارہ دفعات ہیں ۔ ان میں آخری امتحان کی تفاصیل درج ہیں ، جس کے بعد 'تطویع' کی سند دی جاتی ہے ۔ فقہ کے تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کرنے پر

بعد کی جماعتوں میں دو دوروں میں یکے بعد دیگرے داخلے کی اجازت مل جاتی ہے (دفعہ ٦) ۔ زبانی امتحان کے لیے کتب خانے میں کتابوں کی مدد سے چھے گھنٹے تیاری کے ملتے ہیں (دفعہ ۷) ۔ قرآن کی قراءت اور تجوید کے لیے ایک خاص ' تطویع ' عطا کی جاتی ہے (دفعہ ۹) .

۱۹۲۸ء سے پچاس ''معاون علی التدریس'' مقرر ہیں ۔ ان کا انتخاب ''متطوعین'' میں سے ہوتا ہے مگر انھیں مقابلے کا امتحان دینا پڑتا ہے ۔ انھیں پانچ سو فرانک ماہوار معین تنخواہ ملتی ہے ۔ یکم جنوری ۱۹۳۱ء سے دوسرے درجے کے اساتذہ کی تنخواہ تیرہ ہزار فرانک سالانہ مقرر کی گئی ہے اور اوّل درجے کے مدرّسین کی تنخواہ سولہ ہزار فرانک ۔ ۱۹۲۴ء سے تونس کے میزانیہ میں جامع مسجد کے لیے ایک امدادی رقم شامل کی گئی اور اس رقم میں برابر اضافہ ہو رہا ہے ۔ پہلے سال پچاس ہزار فرانک کی گنجائش رکھی گئی تھی مگر ۱۹۲۷ء میں اسے دو لاکھ پچاس ہزار اور ۱۹۳۰ء میں سات لاکھ ستر ہزار تک بڑھا دیا گیا .

مسلمان عدول (notariate) کے متعلق حال ہی میں جو جدید تنظیم عمل میں آئی ہے اس کے خلاف طلبہ کی جانب سے زبردست احتجاج کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اب براہِ راست اس پیشے میں داخل نہیں ہو سکتے اور جامع مسجد کی تعلیم انھیں اس قابل نہیں بناتی کہ وہ مزید تیاری کیے بغیر مستقبل کے عدول کا نیا امتحان پاس کر سکیں ۔ اس سے مذہبی تعلیم کی اصلاح کا مکمل سوال سامنے آ گیا ہے اور کم از کم یہ مسئلہ تو ضرور اٹھا ہے کہ جامع مسجد کے نصاب میں مروّجہ قانون کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے ۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں حکومت نے اصلاحات کے امکانات پر غور کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جو [تحریرِ مقالہ کے وقت] بڑی محنت اور جانکاہی کے ساتھ ایک منصوبہ تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا.

کتب خانے کی فہرست، جو عربی زبان میں ہے، زیرِ طبع ہے: ایک فہرست فرانسیسی زبان میں مگر نامکمل صورت میں رُوی B. Roy اور بل خوجہ Bel-Khodja نے بھی شائع کی تھی (تونس ۱۹۰۰ء).

جدید تعلیم: صادقی کالج میں ۱۹۲۸ تا ۱۹۲۹ء میں ۲۱۷ طلبہ تھے ۔ یہاں فرانسیسی اور عربی دونوں زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے اور نوجوانوں کو اداری عہدوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے؛ نوجوان مسلمان فرانسیسی مدارس میں روز بروز زیادہ تعداد میں داخل ہو رہے ہیں: بعض مدارس ابتدائی ہیں (جن میں فرانسیسی - عربی مدرسے اور مسلمان لڑکیوں کے خاص مدرسے شامل ہیں، قب *R. M. M.*، ٦: ۱۲۳ تا ۱۲٦) اور بعض مدرسے ثانوی ہیں (جن کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں) ۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء (قب *Statistique générale de la Tunisie*، برائے سال ۱۹۲۸ء) کو مسلم آبادی میں سے نیابت کے پرائمری مدارس میں ۲۵,۸۷٦ لڑکے اور ۲,۹۳۰ لڑکیاں تعلیم پا رہی تھیں (ان کے علاوہ ٦۷ لڑکے اور ٦۱۷ لڑکیاں نجی مدارس میں تھیں) ۔ تونس کے Lycée Carnot کے کل ۲,۰۰۰ طالب علموں میں سے ۳۰۹ طالب علم مسلمان تھے مگر لڑکیوں کے مدرسے (Lycée) میں ۱,۲۰۰ سے زائد طالبات میں سے صرف ۲۸ مسلمان لڑکیاں تھیں ۔ ان کے علاوہ تین اور تعلیمی اداروں (یعنی Collège Alaoui, École normale d' Instituteurs اور École Professionnele E. Loubet) میں ۳٦۱ طالب علم تھے.

تونس میں عربی علم و ادب کے ایک مدرسۂ عالیہ "École supérieure de langue et littérature arabes" میں یورپی طلبہ کو امتحان پاس کرنے کے

بعد عربی بول چال [دَارِجَة] کی سند دی جاتی ہے اور اسی طرح تحریری عربی [عربیّۂ فُصحٰی] کی سند بھی ملتی ہے اور عربی میں ایک اعلٰی درجے کی سند بھی اس کے طالب علموں کو دی جاتی ہے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیرمسلم.

مقیمیّۃ (ریزیڈنسی) کے زیرِ اثر یہاں ایک اسلامی انجمن ''خَلْدُونیّة'' کے نام سے قائم ہوئی تھی، جس کے ارکان تقریباً دو سو نوجوان ہیں ۔ یہ انجمن ان کے لیے مختلفْ مضامین کے متعلّق عربی زبان میں عام فہم دُرُوس (لیکچروں) کا بندوبست کرتی ہے.

تونس کا محکمۂ عدل و انصاف عربی زبان میں قانون کے دورہھائے دُرُوس (courses) کا انتظام کرتا ہے تا کہ ان سے ملکی لوگوں کی، جو قانونی پیشے اختیار کرنا چاہتے ہیں، ضروری تعلیم کا بندوبست ہو .

مآخذ : R. Darmon : *La situation des cultes en Tunisie*، طبع ثانی، پیرس ۱۹۳۰ء.

۵ ۔ آبادی

(الف) نژادھائے بلادِ تونس کا بیان : نیابتِ تونس کی آبادی میں ملکی مسلمانوں اور یہودیوں کے علاوہ اہلِ یورپ کی روز افزوں تعداد بھی شامل ہے؛ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اطالوی لوگ کثیر تعداد میں وارد ہو رہے ہیں؛ دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ ملک فرانس کی حمایت میں ہے ۔ ۱۹۲۶ء کی مردم شماری کی رُو سے کل آبادی ۲۱,۵۹,۷۰۸ تھی (یعنی ۱۷.۳ فی مربع کلو میٹر) [۱۹۵۶ء کی مردم شماری کی رُو سے کل آبادی ۳۷,۸۲,۴۸۰ تھی، اگلی سطور میں ۱۹۵۶ء کے اعداد خطوط وحدانی میں دیے گئے ہیں] ۔ ان میں سے ۱۹,۳۲,۱۸۴ [۳۴,۶۹,۳۶۲] مسلمان اور ۵۴,۲۴۳ [۵۷,۷۸۶] تونسی یہودی ہیں ۔ (ان میں وہ یہودی شامل نہیں جو یورپی قومیّت اختیار کر چکے ہیں) ۔ اہلِ یورپ کی آبادی ۱,۷۳,۲۸۱ [۲,۵۵,۳۳۲] ہے اور ان کی تقسیم اس طور پر ہے : ۷۱,۰۲۰ فرانسیسی (۴۱ فی صد) [۱,۸۰,۴۵۰]؛ ۸۹,۲۱۶ اطالوی (۵۱.۵ فی صد) [۶۹,۹۰۹]؛ ۸,۳۹۶ مالطی (انگریزی رعایا: ۴.۸ فی صد) [۷,۲۷۹] اور ۴,۶۴۹ دیگر مختلف قوموں کے لوگ (۲.۷ فی صد) [۳,۵۶۹] ۔ اطالوی، جو بیشتر سسلی (صِقلّیة) اور سردینیة Sardinia سے آئے ہیں، معمار، کانْ کن (الکاف میں) اور زراعتی مزدور ہیں، یا چھوٹے پیمانے پر انگور کی کاشت کرتے ہیں (باجة، مجاز الباب، قُرُنْبالیّة، زَغْوان) ۔ فرانسیسی زیادہ تر سرکاری عہدےدار، سوداگر اور آبادکار ہیں.

اہلِ یورپ کی بیشتر آبادی تونس کے رقبے میں ہے (ایک لاکھ تین ہزار یعنی ساٹھ فی صد) یا ساحل کے بعض شہروں میں، مثلاً بنْزَرت میں تقریباً ۶,۷۰۰ ہیں، ۴,۱۵۰ فیری‌ول Ferryville میں [اب اس کا نام منزل بورقیبة ہے]، ۶,۹۰۰ سُوسَة میں اور اتنے ہی سَفَاقِس میں ۔ تونسی یہودی، جن میں سے ۲۸,۱۳۱ (یعنی نصف سے زیادہ) تونس کے رقبےمیں آباد ہیں، سُوسَة میں ۳,۷۰۰ سے زیادہ ہیں اور تقریباً ۳,۳۰۰ سَفَاقِس میں ہیں ۔ وہ بنْزَرت، بَاجَة اور نَابُل میں بھی خاصی تعداد میں آباد ہیں مگر اندرونِ ملک میں ان کی تعداد بہت کم ہے ۔ چند ایک، جنھیں 'باحُوصِیم' کہتے ہیں، سِرس Sers کی طرف خیموں میں رہتے ہیں لیکن جنوب میں اُن کی چند خاصی بڑی جماعتیں پائی جاتی ہیں، مثلاً قابِس میں تقریباً ۲,۵۰۰، حَومَة السُوق (جربة) میں تقریباً ۳,۸۰۰ (حَومَة السوق کی کل آبادی ۴,۶۴۵ ہے) اور ۲,۵۰۰ سے کچھ زیادہ فوجی علاقوں میں ہیں.

پایۂ تخت تونس کو چھوڑ کر، جس کی آبادی ۱,۸۵,۹۶۶ [۱۹۵۶ء میں ۴,۱۰,۰۰۰] نفوس پر مشتمل ہے، بارہ [گیارہ؟] شہر اور بھی ہیں جن کی

آبادی دس ہزار سے زیادہ ہے ۔ ان کی تفصیل یہ ہے : [۱۹۵٦ء کی مردم شماری کے جو اعداد مل سکے ہیں خطوط وحدانی میں دیے گئے ہیں]۔

سَفَاقُس ۲٦,۷۲۳ [٦٥,٦۳۵] ؛ سُوسَة ۲۱,۲۹۸ [۴۸,۱۷۲] ؛ بنزرت ۲۰,۵۹۳ [۴۴,٦۸۱] ؛ قیروان ۱۹,۴۲٦ [۳۳,۹٦۸] ؛ مَساکن ۱٦,٦۲۰ [۲٦,۱۴۲] ؛ قابِس ۱۵,۱۱۹ [۲۴,۴۲۰] ؛ نَفطَة ۱۳,۲۵۰ ؛ مُکنِین ۱۲,۱۹۱ ؛ قلعۂ کبیرة ۱۱,۸۳۰ ؛ توزر ۱۱,۰۵٦ ؛ باجة ۱۰,۴٦۸ [۲۲,٦٦۸]۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مساکن اور قلعۂ کَبیرہ دونوں ساحلی شہر ہیں اور ان میں صرف مسلمان ہی آباد ہیں۔

(ب) قبائل : اپنی موجودہ معلومات کی بناء پر ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ملک تونس کی مسلم آبادی کے موجودہ شعوب کا ارتقاء کیسے وقوع میں آیا ۔ اگر ہم شہری مرکزوں اور زیادہ گھنی آبادی والے علاقوں (بنزرت، باجة تونس اور سُوسَة) کو چھوڑ بھی دیں، جہاں بہت مختلف النسل عناصر جمع اور آپس میں مخلوط ہو گئے ہیں، تب بھی بڑے بڑے قبائل کی بناوٹ واضح نہیں ہے ۔ گو اس ملک کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ان کی انفرادی حیثیت صاف طور پر نمایاں ہے، ان میں سے کئی قبائل کی اصل ہی ہمیں معلوم نہیں؛ ان کا غائب ہو جانا بھی بارہا ایک راز ہی معلوم ہوتا ہے۔

مدّت مدید تک عرب سپاہیوں کی تعداد اتنی قلیل اور ناکافی تھی کہ پرانے بربری مجموعے میں وہ کوئی حقیقی تبدیلی پیدا نہ کر سکے ۔ لیکن سب سے بڑا اور نیا واقعہ گیارھویں صدی کے وسط میں ایک عربی قبیلے بنوہلال کے حملوں اور پھر بارھویں اور تیرھویں صدی میں بنو سُلَیم کے حملوں کی صورت میں پیش آیا؛ انھوں نے ملکی بربروں کے بیشتر حصّے کو پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا اور میدانوں پر خود قبضہ کر لیا اور ملک میں عربی طرز معاش کو پورے طور پر رائج کر دیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے مقامی باشندوں کی جماعتوں سے اکثر اوقات مخلوط ہو کر انھیں پورے طور پر اپنے زیر اثر کر لیا؛ چنانچہ موجودہ زمانے میں ”عربی“ اور ”بربری“ قبائل میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے ۔ ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ تمام شمالی افریقہ میں تونس کا علاقہ، مجموعی طور پر، سب سے زیادہ عربی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

چودھویں صدی میں ابن خَلدُون ہمیں باقی ماندہ بربروں کے متعلّق کچھ معلومات بہم پہنچاتا ہے : [۱] ان کا ایک گروہ تو جزیرۂ جِربَة (جَرابَۂ خارجی) اور جنوب کے پہاڑوں میں رہتا تھا؛ [۲] لَواتَة (*Hist. des Berbers*، ترجمہ، ۱ : ۲۳۵) قابس کے جنوب کی طرف اُس جَبل میں رہتے تھے جو انھیں کے نام سے موسوم ہے؛ [۳] مَطماطَة (کتاب مذکور، ۱ : ۲۴٦) اس علاقے میں تھے جہاں وہ اب بھی رہتے ہیں؛ [۴] زَناتة نے علاقۂ طرابلس سے بھاگ کر جبل دِمّر میں پناہ لی، جہاں ان کی سب سے بڑی جمعیت حِلف وَرغَمّة (کتاب مذکور، ۳ : ۲۸۸) کے نام سے مشہور تھی؛ [۵] زَناتة کے دیگر قبیلے بنو ورتاجین (کتاب مذکور، ۳ : ۲۰۴) نے تو الحَمَّة کے نخلستان میں اپنی خودمختاری قائم رکھی؛ مگر [٦] مَرنَجیسۂ افرانیَّة (کتاب مذکور، ۳ : ۲۲۵ تا ۲٦٦)، جو کاشتکاری کے ساتھ ساتھ مویشی بھی پالتے تھے اور تونس و قیروان کے درمیان عرب و کُعُوب کی دستبرد کا شکار تھے؛ [۷] سُمّاتة (کتاب مذکور، ۱ : ۲۳۱) کے کچھ بچے کھچے آدمی اب بھی قیروان کے نزدیک آباد ہیں؛ [۸] بربروں کی سب سے زیادہ گنجان آبادی، جو بنو ہوّارة پر

مشتمل تھی (کتاب مذکور، ۱ : ۲۷۸ تا ۲۷۹) اور جزوی طور پر خانہ بدوش تھی، تلّ مرتفع میں رہتی تھی : ان میں سے تبسّة کے ونیفن مقام مَرْماجنّة (بلاشبهه موجوده برماجنّة) میں رہتے تھے اور قبیلۂ قیصر ابّه قصور اور الاُربس کے درمیان اور تبرسّق کے بصْوَة جوگر ندی پر ۔ مگر بنی ریاح کے عربوں کی کچھ تعداد بصْوَة بربروں نے اس وقت تک اپنے ساتھ شامل کر لی تھی؛ کیونکہ یہ عرب ان کے قرابت داروں یعنی بنوحَبیب کے همسائے تھے اور اسی طرح شمال کے پہاڑوں میں بنوهُذَیل جو مُضری عرب تھے بنوسُلَیم کی ایک شاخ هَوّارة سے مخلوط ہو چکے تھے۔

عرب حملہ آوروں میں سے بنوهلال تو مغرب کی طرف اور آگے نکل گئے اور افریقیة میں تونس کے قریب صرف بنوزُغبة کی تھوڑی سی جمعیت چھوڑ گئے ۔ اس کے برعکس، جیسا کہ التجانی اپنی کتاب رِحلَة (۱۳۰۶ - ۱۳۰۹ھ) میں لکھتا ہے، بنوسُلَیم کی ایک شاخ بنوعَوف تمام مشرقی ساحل پر قابض ہو گئی : نابَل سے سُوسة تک تو دَلّاج آباد ہوے، پھر الجم کے علاقے تک بنوحَکیم آباد ہوے جن سے ایک مدّت کے بعد بنوطَرود بھی آملے (طَرود کو یہاں سے بعد میں وارَقلة کی طرف جانا پڑا) اور اس کے بعد المُبارَکة کے علاقے تک الحصْن کے بوعلی آباد ہوے ۔ ساحل کے عقبی علاقے میں کَعُوب کا غلبه تھا جو ان کے رشتے دار اور آقا تھے اور جن کی دو حریف شاخوں ('صفُوں') اولاد مُهَلْهَل اور اولاد ابی اللَّیل نے بنو حفص کی سیاست میں بہت نمایاں حصّه لیا جس پر ہمارے G. Marçais نے بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے ۔ بہار اور موسم گرما میں بنو مِرْداس [بن بنی] عَوف، جن کی ایک علیحدہ شاخ باجة کے قریب جا پہنچی، بڑی باقاعدگی کے ساتھ جرید کے علاقے میں کَعُوب کی جگه اُن کی سرمائی جاے قیام میں آ کر ٹھیرتے رہے ۔ آخر میں المُبارَکة سے چل کر قبیلۂ سُلَیم کی دوسری شاخیں، جنھیں [بنو] ذَبّاب کہتے تھے، جنوبی میدانوں پر قابض ہو گئیں ۔ ان کی تفصیل یہ ہے : اندرون ملک میں اولاد احمد تھے، جنھیں حلف بنو یزید (صَحْبة، حَمارنة، خَرْجة، اصابعة)، بنو [الشَّرید] اور [بنو] زُغب کے آملنے سے تقویت پہنچی؛ ساحل پر قابس تک نَوائل آباد تھے، حلف وَشاح میں سے [المحامید] طرابُلس کی موجودہ سرحد تک پھیلے ہوے تھے.

ان ناموں سے بعض نام مِندوزا B. de Mendoza کے مذاکرات میں، جو *Les Arabes du royaume de Tunis* کے عنوان سے ۱۵۳۶ء میں شائع ہوے تھے، دوبارہ مذکور ہوے ہیں (یہ یاد داشت La Primaudaie نے شائع کی تھی) ۔ ان تمام قبیلوں میں سب سے زیادہ زبردست قبیلہ بنوعلی کا تھا ۔ جس کا ذکر لیو افریقی Leo Africanus [الحسن بن محمد الوزّان] نے بھی کیا ہے ۔ یہ قبیلہ اس وقت بنزرت سے لے کر جِربة تک سارے ساحل پر پھیلا ہوا تھا؛ اولاد ابی اللَّیل ماطر Mateur اور باجة کے علاقوں میں تھے اور قبیلۂ اولاد مُهَلْهَل، جو اولاد عَون کو اپنے آپ میں مدغم کر چکا تھا، قَیْروان اور باجة کے درمیان آباد تھا ۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ اولاد سعید کا نام بھی ملتا ہے، جن سے سب لوگ خوف کھاتے تھے اور جن کی اصل غیر معلوم ہے ۔ یہ لوگ مُنَسْتیر سے [رأس أدّار] Cape Bon کے اندر تک پھیلے ہوے تھے ۔ قبیلۂ اولاد یحیی تبرسّق کے علاقے میں آباد تھا ۔ تبسّة کے نزدیک حَنانشة آباد تھے، جو غالباً هَوّارة میں سے ہیں، جن کے سرداروں نے قلعة السّنان میں بیٹھ کر مدتوں تک اپنا سیاسی اقتدار قائم رکھا (قب Féraud : ...*Les Harār*، در *R. Afr.*، ۱۸۶۷ء).

قبائل کے بہت سے باهمی اختلاط اور کئی صورتوں میں ان کے ناپید ہو جانے کے باوجود ان کے

قدیم نام اکثر اوقات باقی رہ گئے ہیں ۔ جنوب میں، جہاں بربری عنصر ابھی تک خوش حال اور شاد و آباد ہے، اب تک غار نشین مَطْماطَة اور وَرْغَمَّة موجود ہیں۔ یہ وہ قبائل ہیں جنھوں نے میدانی علاقوں کو دوبارہ فتح کر لیا ۔ ان میں سے جرجیس Zarzis کے عَکّارَة فروری سے جون تک جَو کی فصل کاٹنے کے لیے خیموں میں رہتے ہیں اور اپنے گلّوں اور ریوڑوں کو چراتے ہیں۔ تَوازین جو پہلے خانہ بدوش تھے اب مِدنِین Medenine اور بن گَرْدان Ben-Gardane کے باغات والے علاقوں میں حضَری بنتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی حالت الجَبَلِیَّة کی ہے، جو تیطاوین کے ملحقہ علاقے کی پہاڑیوں میں آباد ہیں اور الوَدَرْنَة کی، جن میں سے کچھ حضَری بن گئے ہیں اور کچھ ابھی تک بدوی ہیں ۔ مغربی عَون اور بَنْزَرْت کی قایدیتوں میں ذو شِیاختین لَواتَة کے نام سے موسوم ہیں ۔ تلّ مرتفع (High Tell) میں الجزائر کی جانب مجمع القبائل وَنِیفَه (ونیفن) کے کئی قبیلے آباد ہیں، جن میں سے الوَرْغَة بھی ہے (یہ نام [العبر] *Hist. des Berb.* میں آیا ہے، ترجمہ، ۱ : ۲۷۵) الوَشْتاتة سے، جو اب باجَة اور سُوقُ الاَرْبَعاء کے گرد و نواح میں آباد ہیں، ابن خَلْدون ناآشنا نہیں (کتاب مذکور)؛ یہی حال النَّفْزة (۱ : ۱۸۲، ۲۹۰) کا ہے، جو ہمارے زمانے میں شمالی ساحل پر آباد ہیں۔

قرونِ وسطٰی کے ایسے قبیلوں کے نام جو عربی النسل ہیں جنوب میں اب تک اچھی طرح محفوظ ہیں؛ یہ سچ ہے کہ النَّوائل اور المَحامِید کو وَرْغَمّة کے جوابی حملوں نے ملک طرابلس کی طرف دھکیل دیا تھا لیکن [بنو] دَبّاب کی، جو بربری بن گئے ہیں، تیطاوین کے ملحقہ علاقے میں اپنی شیاخت ہے اور بنو زَیْد (یزید) کا اہم قبیلہ، جس کی ایک شاخ ابھی تک خَرْجَة کے نام سے مشہور ہے، قابس کے نزدیک الحَمارْنَة کے ہمراہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا ہے ۔ اسی طرح ذیل کے قبیلوں کے لوگ بھی منتشر اور کم تعداد میں پائے جاتے ہیں، جن کے نام پر شیاخات قائم ہیں : ھدل یا بنوھُذَیل (قائدیّة عین دُرْھَم)، الطُّرود (بَنْزَرْت)، حَکیم (سوق الاربعاء)، اولاد مُھَلْھَل (اولاد اَیر)، الکَعُوب میں سے اولادِ الحاجّ (الجلاص، قبّ [العبر] *Hist. des Berb.*، ترجمہ، ۱ : ۱۴۳) ۔ اولاد بِلّیل یا اولادِ ابی اللّیل کی کئی شاخیں باجَة کے میدان میں اور بنو رِیاح کی زَغْوان میں اب تک موجود ہیں ۔ سترھویں صدی میں الخُرُوبیر یا الخُمَیر شمال مغربی پہاڑوں میں جا کر آباد ہوے جو مُکُود یا مُقْعد سے دُور نہیں اور جن کا نام کم از کم سننے میں عربی معلوم ہوتا ہے ۔ سِرس اور اُس کے نواح میں مخزن قبیلے کی شاخ دُرَید یا دُرَیْد آباد ہے، جو بنو اَثْبَج بن ھلال کی شاخ ہے جو ایک زمانے تک الجزائر کی سرحد پر آباد رہے ۔ ابن خَلْدُون نے ساحلِ سَفاقُس کے عقبی علاقے میں بسنے والے النَّفاث قبیلے کو عرب بیان کیا ہے ([العبر] *Hist. des Berb.*، ترجمہ، ۲ : ۱۰۱، ۲۹۰).

ان شعوب میں سے جن کا بنوحفص کے آخری عہد میں ذکر آتا ہے اولادِ یحیٰی کے بعض اجزاء ابھی تک قائدیّة تِبُرسُق میں باقی ہیں ۔ اولاد سعید کا قبیلہ بہت منتشر ہے لیکن اُن کا بڑا مرکز اِنْفِدا کی ولایت میں ہے ۔ اولادِ عَون قائدیّة سِلیانة کے گرد و نواح کے پورے علاقے پر چھائے ہوے ہیں جو مُکْثَر کے شمال مشرق میں ہے۔

آج کل تونس کے رنگا رنگ قبائل میں بعض قبیلوں کی اصل غیریقینی ہے (سوا ان کے جو مرابطین میں سے ہیں) مگر وہ اتنی اھمیت ضرور رکھتے ہیں کہ ان کا یہاں ذکر کیا جائے : ساحل سے قریب ہی الْجم کے جنوب سے لے کر قابس کے شمال تک المَثالِث، العَجارْبَة اور المَھاذْبَة

آباد ھیں ۔ اندرون ملک کے بے درخت میدانوں میں قبائلِ سَواسی، جُلاص، فَراشیش، مَاجر اور حَمامَة آباد ھیں اور اُن کی اتنی ھی قائدیات بھی ھیں؛ تَلّ مرتفع میں الوَرْتَان، اولادِ عَیّار اور گوازین ھیں اور النِفْزاوَة اور تونسی صحراء میں غَرِیب، مَرازِیق، الْاَدارَة اور اولادِ یعقوب ھیں۔

(ج) ملکی لوگوں کی [اقتصادی] زندگی : تونس میں بداوت صاف طور پر ختم ھو رھی ھے؛ نقلِ مکانی [حطّ و تَرحال] بھی اب قحط سالی کے زمانے کے سوا کسی وسیع پیمانے پر یا کثیر جماعتوں (''سَمّلَس'') میں نہیں ھوتی بلکہ عام طور پر قبائل اپنے اپنے علاقے ھی میں مقیم رھتے ھیں اور صرف معدودے چند گلّہبان گلّوں کو ھانک کر لے جاتے ھیں ۔ اب صرف گلّے ھی نَقلِ مکانی کرتے ھیں ؛ چنانچہ مویشی سردی کا موسم ھموار بے درخت میدانوں میں اور گرمی کا موسم التّل میں گذارتے ھیں۔ اکثر وہ شُبَیْبَة الکاف والے دامنۂ کوہ کے چھوٹے درے کے راستے سے سفر کرتے ھیں؛ نقلِ مکانی کرنے والے کچھ عرصہ کُمُودَة میں رھنا پسند کرتے ھیں ۔ صرف المَثالث موسم گرما میں بَنْزرت تک جاتے ھیں اور جُلاص اور سَواسی باجَة کے نواح تک سفر کرتے ھیں ۔ البتہ النِفزاوة اور تونسیؔ صحراء میں اب تک صحراء نورد بدوی آباد ھیں۔

[مملکتِ تونس کی] حکومت حمایة بڑی مستعدی سے اس حکمت عملی پر کار بند ھے کہ ملکی لوگوں کو حضارت اختیار کرنے کی ترغیب دے ۔ اس غرض سے حکومت نے ان کے لیے زمین مہیا کرنے میں آسانیاں پیدا کر دی ھیں تاکہ وہ زراعت کی طرف توجہ کر سکیں ۔ خَماسَة کے قدیم قرارنامے کے رواج کے ساتھ ساتھ، جسے خیرالدین کے وضع کردہ ''قانون الفلاّحة'' کے تحت ۱۲۹۱ھ میں منضبط کیا گیا تھا (قب مآخذ در W. Marçais: *Takrouna*، ص ۲۰۲)، حکومت کی طرف سے اراضیِ شور ''terres salines'' کو (جو سَفاقُس کے اردگرد تقریباً پچاس میل نصف قطر کے گھیر میں پھیلی ھوئی ھیں) اور 'ھَنْشِیرِ' شِراحِیل (نزد قَیروان) کو جو زمینیں زیتون کی کاشت کے لیے موزوں ھیں (فرامین مجریۂ ۱۸۹۲ و ۱۹۰۵ء) قرض پر فروخت کیا جاتا ھے ؛ چنانچہ ان علاقوں میں عہدِ 'مُغارَسہ' پر عملدرآمد ھونے کا موقع نکل آیا، اس عہد کے مطابق وہ ملکی کسان جو کسی عطا کردہ زمین کے کل رقبے میں زیتون کے درخت لگانے کا ٹھیکہ لیتا ھے تو وہ درختوں کے بارآور ھونے پر آدھی زمین کا مالک بن جاتا ھے ۔ حُبُوس یعنی وقف کی زمینوں کے متعلّق جدید قانون کی رو سے یہ امر ممکن ھو گیا ھے کہ ایسی جائدادوں پر متعدّد مقامی کنبوں کو آباد کر کے انھیں ''حقوقِ دخیل کاری'' قانوناً اور قطعی طور پر دے دیے جائیں (اس کے متعلّق قریب ترین زمانے کا فرمان مجریۂ ۱۷ جولائی ۱۹۲۶ء نافذ ھوچکا ھے) ۔ جنوب کے فوجی علاقوں میں ''اراضی مشترکہ'' [شاملات] مملوکۂ قبائل کے متعلّق وہ قواعد و ضوابط نافذ ھیں جو ۲۳ دسمبر ۱۹۱۸ء کے فرمان کے مطابق جاری ھوے تھے اور جن کی ترمیم ۱۹۲۶ء میں ھوئی تھی؛ ھر مجموعۂ اراضی ایک وحدتِ زمین سمجھا جاتا ھے جس کے بارے میں عمائد کی ایک مجلسِ اعیان یا کونسل نمائندگی کرتی ھے، ھر قائدیّت کے صدر مقام میں ایک مقامی کونسل (conseil de tutelle locale) کا اجلاس ھوتا ھے، جسے مقامی اختیارات حاصل ھوتے ھیں اور جن کے فیصلوں پر تونس کی مرکزی کونسل نظر ثانی کرسکتی ھے ۔ جب زمین کا انتقال کسی ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام ھو تو ان کونسلوں میں سے ایک نہ ایک کونسل کی منظوری ضروری ھوتی ھے ۔ اسی طرح جب زمین لمبی میعاد کے لیے ٹھیکے پر دی جائے یا اسی قسم کی کوئی

اور صورت پیدا ہو تو یہ منظوری لازمی ہو جاتی ہے، تا کہ مقامی باشندوں کے حقوقِ ملکیّت کی حفاظت ہو سکے ۔ آخر میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ فرانسیسی قبضے کے بعد جو ترقّی اس سلسلے میں فنّی لحاظ سے ہو چکی ہے اس کے علاوہ تونس کے کاشت کار حکومتِ حمایۃ کے اس لیے بھی ممنون ہیں کہ انھیں آبپاشی کے لیے کمپنیاں بنانے (فرمان ۲۰ مئی ۱۹۲۰ء)، اراضی کو کاشت کاری کے لیے ملکی کسانوں میں تقسیم کرنے، ملکیوں کے زرعی ایوانِ تجارت اور ''زراعتی قرضوں کے دفتر'' قائم کرنے (فرمان ۱۰ جون ۱۹۲۰ء) کی اجازت مل گئی ہے ۔

۱۹۲۸ء میں ملکی باشندوں اور یورپی لوگوں کے مملوکہ جانوروں کی تعداد علی الترتیب یہ تھی : گھوڑے ۷۷,۰۰۰ اور ۱۰,۵۰۰؛ گدھے، ۱,۵۷,۰۰۰ اور ۲,۵۰۰؛ خچر ۲۸,۵۰۰ اور ۱۱,۵۰۰؛ مویشی ۴,۳۰,۰۰۰ اور ۵۵,۰۰۰؛ بھیڑیں ۲۰,۰۰,۰۰۰ اور ۱,۰۳,۵۰۰؛ بکریاں ۱۳,۶۰,۰۰۰ اور ۳۰,۵۰۰؛ خنزیر ۶,۰۰۰ اور ۱۳,۰۰۰؛ اونٹ ۱,۵۱,۵۰۰ اور ۳۰۰ — ملکی باشندوں کی ملکیت میں تقریباً نوے لاکھ زیتوں کے درخت ہیں جن پر ٹیکس لگتا ہے (یورپی لوگوں کے پاس ۸,۷۸,۰۰۰) اور جن پر ٹیکس نہیں لگتا ان کی تعداد اڑتالیس لاکھ ہے (یورپی ملکیّت گیارہ لاکھ) ۔ یہ بھی یاد رہے کہ چند ہزار مقامی باشندے ماہی گیری پر گذارہ کرتے ہیں.

تونس کی ساری نیابت میں 'گُربی' 'gourbi' کے مقابلے میں خیمہ معدوم ہو رہا ہے، جو اس امر کی بیّن علامت ہے کہ لوگ مستقل طور پر حضارت کی طرف آ رہے ہیں، بلکہ مکانوں کی سکونت بھی اختیار کی جا رہی ہے ۔ جنوب میں سکونت کے دو عجیب و غریب نمونے دیکھنے میں آتے ہیں ۔ اوّل غار نشین باشندوں کے زمین دوز مساکن ناحیہ ہائے مَطْمَاطَة، مِدنِین و تیطاوین میں، ان کی تعداد ساڑھے سات ہزار سے کچھ زیادہ ہے ۔ دوسرے 'الغُرفة' یعنی ''کُسُور'' (قُصُور) (کشتی نما عمارتیں جن کے پہلو قوس دار ہوتے ہیں، لمبی، تنگ اور پست، جو گوداموں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں) ۔ ان میں سے زیادہ قابلِ دید نمونے مِدنِین اور متامِر Metameur میں ہیں ۔ مقامی باشندوں میں شہری لوگ نسبۃً زیادہ ہیں، کیونکہ ان کی تعداد ۱۸ فی صد تک پہنچتی ہے؛ ملک تونس ہمیشہ سے اپنی شہری زندگی کے لیے مشہور رہا ہے ۔ تونس [دارالملک] میں غیرملکی مسلم عنصر (''بَرّانِیّة'') متعدّد علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں منقسم ہے .

ملکی لوگوں کی تجارت اب بیش از بیش تجدید کے اسباب اختیار کر رہی ہے ۔ اس سلسلے میں ان کا قابلِ توجّہ کارنامہ یہ ہے کہ جِربَة کے بَقّالوں نے، جو بہ تعدادِ کثیر تونس میں کاروبار کرتے ہیں، امدادِ باھمی کے اصولوں پر مال خریدنے کے لیے ایک انجمن بنا رکھی ہے ۔ مقامی صنعت و حرفت کو مغربی ساخت کے مال سے شدید مقابلہ در پیش ہے اور اس وجہ سے اسے ایک عرصے سے نقصان پہنچ رہا ہے، گو حکومت اس کی حمایت اور حفاظت میں جو کچھ اس سے ہو سکتا ہے کر رہی ہے، خاص کر ان صنعت کاری کی اشیاء کے متعلّق جو زیبائی کے لحاظ سے دلچسپ ہیں؛ اس مقصد کے لیے باقاعدہ تربیتی ادارے قائم کیے گئے ہیں اور مال کی تیّاری میں فنّ اور زیبائی کے نقطۂ نظر سے طریقوں کو بہتر بنایا جا رہا ہے ۔ چکّیوں، تیل اور صابون سازی کے کارخانوں کے علاوہ نیابتِ تونس کی پرانی دائر صنعتوں میں سے رنگرزی کی صنعت ہے ۔ یہ صنعت اب یورپ کے اَنیلین (کیمیاوی) رنگوں کی درآمد کی وجہ سے خطرے میں پڑ گئی ہے ۔ اس کے علاوہ ذیل کی صنعتیں بھی قدیم ہیں : اونی منسوجات (کئی ناحیوں میں : جِربَة، قَفصَة اور

الجرید میں کمبل تیار ہوتے ہیں)، سوتی مال (تونس میں)، ریشمی مال (تونس اور قصر ہلال Ksar-Hellal میں)، بکری اور اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا مال (جنوب میں)، قالین بافی (یہ کام عورتیں کرتی ہیں، خصوصاً قیروان میں)، "شاھی" "shains" (تونس میں، البطن میں انہیں دھونے اور دبیز بنانے کا کارخانہ ہے) اور کوزہ گری نابل میں - ہم یہ بھی ذکر کر دینا چاہتے ہیں کہ چھلنیاں (تونس، قیروان اور سوسة میں)، چٹائیاں، ٹوکریاں اور حلفاء (اسپارٹو) کا مال (نابل میں) تیار ہوتا ہے، چمڑے اور جوتے بنانے کا کام (تونس، قیروان اور نابل میں)، زین سازی (تونس میں)، چھری کانٹے، دھات کے کام، پتھر اور لکڑی کا کام یہ سب بھی یہاں ہوتے ہیں - ٹین کے برتن بنانے والے یہاں سب یہودی ہیں اور یہودیوں میں سے بعض موچیوں کا کام بھی کرتے ہیں - بہت سے درزی اور تقریباً سب کے سب جوہری بھی یہودی ہی ہیں .

اہل حرفہ کی انجمنوں میں سے تونس میں سب سے زیادہ اہم شاشیہ ('شواشی') بنانے والوں کی انجمن ہے - یہ حرفت ہسپانیہ سے آئی تھی - ان انجمنوں کی تنظیم بای کے امر عالی کے ذریعے ہوتی ہے - ان میں یہودی بھی شامل ہو سکتے ہیں لیکن ان کا ' امین ' ہمیشہ مسلمان ہوتا ہے - شاشیہ بنانے والوں کا مشترکہ محفوظ سرمایہ ہے - ان کے تجارتی 'نشان' یعنی ٹریڈمارک کی منظوری امر عالی کے ذریعے ہوتی ہے - فرانس، آسٹریا اور چیکوسلوویکیا کے درآمد کیے ہوئے شاشیوں کے اہم مقابلے اور ترکی منڈی کے غائب ہو جانے کے باوجود شاشیے اب بھی اسی طرح بکثرت بنتے ہیں جس طرح پچیس تیس سال پہلے بنتے تھے، یعنی تقریباً پچاس ہزار (۵۰,۰۰۰) کلوگرام؛ اس میں سے تقریباً نصف مال باہر بھیجا جاتا ہے .

ان اعداد و شمار کے مطابق جنھیں محکمۂ زراعت نے تیار کیا ہے اور جو اب تک شائع نہیں ہوے تونس کی تجارتی انجمنوں کا نظام حسب ذیل ہے :-

	استاد	کاریگر
شاشیہ بنانے والے	۲۰۰	۶۰۰
درزی	۶۰	۱۰۰
برنس ساز	۱۲۰	۱۵۰
چکی والے	۱۰	۳۰
ریشم باف	۳۰۰	۱,۲۰۰
سوت کاتنے والے	۱۰۰	۳۰۰
رنگرز	۳۰	۳۵
موچی	۲۰۰	۳۰۰
زین ساز اور چمڑے کا کام کرنے والے	۲۰	۷۰
جوہری اور سنار	۳۵	۷۰
بڑھئی	۹۰	۱۲۵
لہار	۲۰	۳۵
نقاش اور آرائش کرنے والے	۱۰۰	۲۳۰
چوڑہ کمانے والے	۲۵	۳۵

استاد اور کاریگروں کی تعداد ملا کر ۳,۶۳۰ کے قریب ہے .

مآخذ: (۱) *Nomenclature et répartition des tribus de la Tunisie*، Châlons/Saône ۱۹۰۰ء؛ (۲) *Notes sur les tribus de la Régence*، در *R.T.*، ۱۹۰۲ء؛ (۳) *Statistique générale de la Tunisie, An. 1928*، تونس ۱۹۲۹ء؛ (۴) Bertholon اور Chantre : *Recherches anthropologiques dans la Berbérie orientale*، Lyon ۱۹۱۳ء؛ (۵) عبدالوهاب : *Coup d' œil général sur les apports ethniques étrangers en Tunisie*، در *R.T.*، ۱۹۱۷ء؛ (۶) Eudel : *L' orfèvrerie algérienne et tunisienne*، الجزائر ۱۹۰۲ء؛ (۷) Atger : *Les corpora-*

tions tunisiennes، پیرس ۱۹۰۹ء؛ (۸) Bernard اور *L' évolution du nomadisme en Algérie* : Lacroix (بمواضع کثیرہ)، الجزائر- پیرس ۱۹۰۶ء؛ (۹) -Decker *L' agriculture indigène en Tunisie* : David، تونس ۱۹۱۲ء؛ (۱۰) Mzali : *L' évolution économique de la Tunisie*، تونس ۱۹۲۱ء؛ (۱۱) Aug. Bernard : *Enquête sur l' habitation rurale des indigènes de la Tunisie*، تونس ۱۹۲۴ء؛ (۱۲) Sultan : *Essai sur la politique foncière en Tunisie*، پیرس ۱۹۳۰ء.

۶ - زبان

الف : بربریۃ : تونس سے بربری لہجے تقریباً بالکل غائب ہو چکے ہیں - اگر کچھ بربر زبان بولنے والے ہیں بھی تو وہ سِند کے خطّے کے اندر محدود ہیں، جو قَفصۃ کی قائدیّۃ میں ہے - پرووُوتِل Provotelle نے اس بولی کا تَمزرد Tamezred میں قبیلۂ مَطْمَاطۃ کے درمیان رہ کر مطالعہ کیا ہے اور پھر جزیرۂ جِربۃ Djerba میں بھی، جہاں عورتوں کی زبان میں خصوصیت کے ساتھ پرانی زبان کی بعض تعبیرات باقی ہیں.

ب - بول چال کی عربی : بیانِ بالا سے ظاہر ہے کہ تونس میں لسانی استعراب عملاً مکمّل ہو چکا ہے لیکن یہ استعراب ایسے خطوط پر چلا ہے جن کی تفصیل کا ہمیں علم نہیں - مارسے W. Marçais کی رائے ہے کہ کم سے کم الساحل میں عربی اس قدر سرعت سے پھیلی ہے کہ لوگوں کو عام طور پر اس کا گمان بھی نہیں ہے - بنو ہلال اور بنو سلیم کے (گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی میں) وہاں آنے سے پہلے ہی ''شہری مرکزوں نے، جو تعریب کے مستقل نقاط ماسکہ (Foci) ہیں'' یعنی سُوسۃ Susa، مُنَستِیر Monastir اور مہدیّۃ نے، اپنے اردگرد کے علاقوں کے فلّاحین میں اپنی حضری عربی کی اشاعت شروع کر دی تھی - یہ زبان گاؤں والوں کے ہاتھ میں پڑی تو بتدریج قلبِ ہیئت سے بہت سی دیہاتی رِیفی بولیوں کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی - یہ دیہاتی بولیاں اپنے حروفِ صحیحہ اور قواعدِ نحوی کے لحاظ سے، جیسا کہ ابن خلدون نے بھی کہا ہے، حضری عربی سے مختلف ہیں اور اسی لیے الساحل کی زبان سے بھی مختلف ہیں.

فون مَلْتْسَن Von Maltzan نے بتایا ہے (*Z. D. M. G.*، ۲۳ : ۶۵۵ - ۶۵۶) کہ تونس کی بول چال کی عربی میں عربی کے قدیم حروفِ صحیحہ بہ نسبت دیگر اقطارِ مغرب کے زیادہ محفوظ ہیں، فقط اتنا فرق دیکھا جاتا ہے کہ اس میں ضاد اور ظاء کو ایک کر لیا گیا ہے؛ چنانچہ دونوں سامنے کے دانتوں کے بیچ میں سے تَفْخِیم و تمدید کے ساتھ نکالے جاتے ہیں - ق کا تلفّظ ان دخیل لفظوں میں جو مستعار لیے گئے ہیں (جیسے سِیگارو sigārrō اور گُومْرُگ gūmrug) یا جو بدوی بولیوں سے متأثر ہیں (جیسے باگْرَۃ، bágra، ناگۃ nāga) حلق کے اندرونی آخری حصّے سے گ کی طرح ادا کیا جاتا ہے - جیم کے ساتھ جو حَنَکی جَہْری حرف ہے (اور فرانسیسی میں *J* ہے) لام تعریف کے بعد حروف شمسیہ کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور ان الفاظ میں جن میں پہلے ہی زاء (کی آواز) موجود ہے اسے زاء سے ملتا جلتا نکالتے ہیں؛ (مثلاً جَوْز > زُوْز) - حروفِ لین ل - ر - ن کے تلفّظ میں جو خلط ملط دکھائی دیتا ہے وہ تقریباً تمام تر مستعار الفاظ میں پایا جاتا ہے اوروں میں نہیں.

تنوین چند نادر صیغوں کے سوا سب میں سے مفقود ہو چکی ہے، بعض الفاظ ظرفیہ میں تنوین کے بجائے لفظ کے آخری حرف کی حرکت رہ گئی ہے، جسے کبھی تمدید سے بھی بولا جاتا ہے (مثلاً دائماً > دیمَۃ یا دیمًا).

تاکُرونۃ میں جو بولی رائج ہے مارسے W. Marçais

نے اس کی بابت دقیق ملاحظات قلمبند کیے ہیں ۔ ہمارے پاس اب تک یہی ایک قابلِ اعتماد ذریعہ ہے جس سے تونس والوں کا تلفّظ حرکات ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا ہے ۔ حرکات کا ساقط کرنا یا انھیں ھلکا سا ادا کرنا ابھی ایسی حالت کو قطعاً نہیں پہنچا ہے جیسا کہ مغرب اقصی میں پہنچ چکا ہے ؛ تاہم تونس والے حرکات کا خیال بہت کم کرتے ہیں ۔ تلفّظ کے آسان کرنے کے لیے اُنھوں نے بعض درمیانی آوازیں بنا لی ہیں؛ یعنی دوسرے درجے کی انتہائی چھوٹی حرکات جن سے خاص طور پر ایسے حروف حَلْقِیّہ کے تلفّظ کے وقت، جن سے پہلے یاے معروفہ یا واو معروفہ ہو، کام لیا جاتا ہے (قبّ عبرانی کا ''پَتح حاتُوف'')۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صِنفِ نسوان نے اَیْ اور اَوْ کا پرانا تلفّظ محفوظ رکھا ہے، حالانکہ صنفِ رجال اسے بدل کر ایْ اور اُوْ بنا چکے ہیں ۔ بدوی بولیوں میں عموماً اسے پھر اصلی تلفّظ سے قریب تر کر دیا ہے یعنی اُوْ اور اِیْ کو اے اور اَو (ē, ō) کی طرح بولتے ہیں، لیکن بعض لوگ اسے ایک کاذب مرکّب آواز بنا لیتے ہیں ؛ یعنی بعد میں ایک نہایت چھوٹی سی اَور حرکت کا اضافہ کر کے ای اِیے $ī^e$ اور اَو اُو $ū^o$ کی طرح بولتے ہیں۔ بعض خانہ بدوش بدوی امالۂ ā مفتوحہ > ē کو بعض موقعوں پر ē بضمِّ شدید (closed ē) کر دیتے ہیں ۔ تعلیم یافتہ اشخاص قدیم عربی کسرہ کا تلفّظ مقطعِ مفتوح (open syllable) میں ای i کی طرح کرتے ہیں اور مقطعِ مضموم closed syllable میں فرانسیسی e کی طرح ۔

شٹمّے H. Stumme نے، جس سے ہمیں تونسی عربی کے کلمات کی تکوین و ترکیب (morphology) کی تفصیلی کیفیت معلوم ہوتی ہے، تلفّظ کے وقت حرکات پر زور دینے کے مفصلۂ ذیل قاعدے بیان کیے ہیں : کلمے کے اخیر میں دو حرف صحیح ساکن ہوں یا آخری حرف صحیح سے پہلے حرکت ممدودہ (long vowel) ہو تو نَبْرہ (accent) آخری مقطعِ ھجائی پر ہوگا ؛ باقی صورتوں میں نَبْرَۃ مقطعِ ماقبلِ آخر پر ہوگا اگر یہ مقطع ممدود یا مضموم (long or closed) ہو اور اگر ایسا نہیں تو پھر نَبْرَۃ لفظ کے پہلے مقطع پر ہوگا ۔ اس قاعدے سے مستثنیات یہ ہیں : یَفَعْلُ (بجاے یَفْعَلُوْ) جو صیغۂ فعل ہے اور فَعْلَ (بجاے فَعَلَ) جو صیغۂ فعل اور اسم دونوں ہے ۔ اگر کسی لفظ میں مقطعِ اخیر پر نَبْرَۃ ہو اور اُس کے متّصل بعد کے لفظ میں نَبْرَۃ پہلے مقطع پر ہو تو پہلے لفظ میں نَبْرَۃ مقطعِ اخیر سے مقطعِ ماقبلِ آخر کی طرف منتقل ہو جائے گا.

یہ طبعی بات ہے کہ تمام مغربی لہجوں کی اصلی خصوصیات اُن کی گردانوں سے نمایاں ہوتی ہیں ؛ اُس فعل کی حالت میں جو کسی معیّن زمانے پر دلالت نہیں کرتا متکلّم میں نَفْعِلُ سے نَفَعْلُو میں بدل جاتا ہے ۔ نولڈیکہ Th. Nöldeke نے اعراب (syntax) کی بابت تھوڑے سے ملاحظات لکھے ہیں .

تونسی زبان کے مفردات میں متعدّد کلمات ترکی اور اطالوی سے مستعار لیے گئے ہیں اور اب ہر روز فرانسیسی الفاظ کی بھرمار ہو رہی ہے ۔ لیکن فرانسیسی زبان کا اثر عرب یہودیوں کی عربی پر نسبۃً بہت زیادہ پڑ رہا ہے ۔ عجب نہیں جو یہ زبان زیرِ مطالعہ آنے سے پہلے نیست و نابود ہی ہو جائے .

ج ۔ وطنی صحائف : مدّت تک ملکِ تونس میں صحائف کا طبع و نشر حکماً بند رہا ۔ یہاں تک کہ کتابوں کی طباعت اور تجارت بھی آزاد نہ تھی ۔ دونوں اداری ضبط کے تحت تھے ۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں جامع مسجد کی تدریس کے متعلّق جو خاص ضابطہ بنایا گیا وہ اُن پر بھی عائد ہوتا تھا ۔ ۱۸۸۳ء سے الرائد [الرسمی] التونسی نے، جو سرکاری

جریدہ (the Journal Officiel) تھا، کچھ اطلاعات دینا شروع کیں مگر یہ زیادہ‌تر ملکی ادارات سے متعلق ہوتی تھیں، گو دیگر مقالات بھی اشاعت کے لیے قبول کر لیے جاتے تھے۔ [حکومت تونسیہ کے دفتری محفوظات کے اندر ایک خط موجود ہے، جو حکومتِ تونسیہ نے حکومتِ سویڈن کے قنصل کے نام لکھا ہے، اس میں مرقوم ہے کہ ''جریدہ الرائدالتونسی ۱۷ جنوری ۱۸۸۳ء سے جاری ہوگا'' لیکن ان دستاویزوں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ارادہ پورا ہوا یا نہیں۔ اُنسائکلوپیڈیا او اسلام: تکملۃ، ص XI]۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۴ء کے ضابطۂ صحافت اور خاص کر ۱۶ اگست ۱۸۸۷ء کی رو سے جو پہلے سے زیادہ آزادی پر مشتمل تھا نیابتِ تونس کے اندر فرانسیسی، اطالوی اور عربی میں صحائف کے طبع و نشر کی اجازت دی گئی، گو اس ضابطے میں بعد ازآں متعدّد دفعہ ترمیمات ہوئیں۔

۱۸۸۸ - ۱۸۸۹ء کے اندر بُوشُوشَۃ کا روزانہ اخبار الحاضرۃ اور شاذلی کا الزُّہرۃ عربی میں جاری ہوے۔ الزّہرۃ ابھی تک جاری ہے اور اب اسے قدامت پسند شمار کیا جاتا ہے، اگرچہ ابتدائی ایّام میں وہ بہت زیادہ ترقی‌پسند سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اہمّ جریدہ النّہضۃ ہے، جو دوشنبہ کے سوا ہر روز شائع ہوتا ہے۔ عربی جرائد کی کثیر تعداد اس وقت ہفتہ‌وار ہے۔ الزمان ترقّی پسندوں کا ترجمان ہے۔ لسان الشّعب اور الصّواب (دونوں کے دونوں وطن‌پسند ہیں لیکن اوّل میں یہ رجحان خاص طور پر زیادہ پایا جاتا ہے)۔ النّدیم ادبی اور ہجوی جریدہ ہے، جس کی لوگ بہت قدر کرتے ہیں۔ الزّھو فُکاھِیَہ ہے، جس کے صفحات میں عوام کی بولی میں بھی مضمون درج ہوتے ہیں۔ الوزیر کہنے کو المُنیر کی طرح ایک ماھوار جریدہ ہے مگر بہت بے قاعدہ شائع ہوتا ہے۔

حال ہی میں ایک ماھوار مصوّر مجلّہ شائع ہونا شروع ہوا ہے جس میں ادبی اور تاریخی مقالات ہوتے ہیں: اس کا نام العالَم الاُدبی ہے لیکن وہ عربی میگزین جن کی اشاعت تونس میں بہت زیادہ ہے مصر سے آتے ہیں جن میں السیاسۃ خاص طور پر مقبول ہے۔ سرکاری جریدے (the "Journal Officiel") میں، جو ۱۸۸۳ء سے فرانسیسی میں بھی شائع ہو رہا ہے، ہفتے میں دو بار صرف سرکاری قسم کے کاغذات (وثائق) شائع ہوتے ہیں۔ آخر میں الرُّوزنامۃ التونسیۃ کا ذکر بھی ضروری ہے، جو ایک قسم کی جنتری تھی۔ یہ جریدہ ۱۸۹۹ سے ۱۹۲۱ء تک شائع ہوتا رہا۔ اب اس کی جگہ ایک سرکاری سالانہ جریدے التقویم التونسی نے لے لی ہے، جو تقریباً خالص اداری کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مقامی عربی صحافت قائم کرنے کی چند کوششیں ایسی ہوئیں جو ناکام رہیں۔ سَناقِس میں العصرالجدید اور قیروان میں القیروان کا ظہور انہیں کا نتیجہ تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کا ایک گروہ سَفاقِس سے ایک چھوٹا سا صحیفہ فرانسیسی زبان میں جاری کرنے میں کامیاب ہوا، جس کا نام the *Tunisie Nouvelle* ہے۔ اس کا مالک زُہَیر عیّادی ہے۔ تونس میں بھی، جہاں باش حانبا پہلے ہی *Le Tunisien* ۱۹۱۰ء میں جاری کر چکا تھا، شاذلی خیراللہ the *Voix du Tunisien* کا مدیر ہے، یہ اخبار the *Etendard Tunisien* کی جگہ نکلنا شروع ہوا تھا، جس نے بجاے خود the *Libéral* کی جگہ لی تھی۔ اگست ۱۹۳۰ء سے عبدالعزیز لَروی جریدۂ *Croissant* طبع و نشر کر رہا ہے۔ ان جرائد میں تونس کی وطنی روح نمایاں ہے، جو خالصۃً اور انحصاری طور پر اسلامی روح ہے۔

یہود نے ایک زمانے میں یہودی عربی

(بخطِّ عبرانی) میں بتعدادِ وافر کتابیں لکھیں اور صحائف شائع کیے، ۱۹۰۷ء تک اس ادب کی تاریخ واسِل E. Vassel نے بعنوان *La Littérature populaire des Israélites tunisiens, 1905—1907* لکھی لیکن آج کل انھوں نے اس زبان میں کتابیں اور جرائد شائع کرنا چھوڑ دیے ہیں اور یہ بولی فرانسیسی کے مقابلے میں غائب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اب اس میں ایک بے قدر سے جریدے الصباح کے سوا (جو کبھی کبھی نمودار ہو جاتا ہے) اور کچھ نہیں چھپتا۔ اب ان کے تین ہفتہ وار جرائد فرانسیسی میں شائع ہوتے ہیں: (۱) *Égalité*، جو قدامت پسند ہے؛ (۲) the *Justice*، جو ملی جلی آراء شائع کرتا ہے اور (۳) نیز سب سے مشہور the *Réveil Juif*، جو صیہونی (Zionist) ہے۔ اس کی بنیاد فیلیکس الّوش Félix Allouche نے ۱۹۲۴ء میں سفاقس میں رکھی تھی۔ حال ہی میں اسے تونس میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) [البربریة یا] لغۃ بربر: مَطماطَة کی بولی: H. Stumme: *Märchen der Berbern von Tamezrat in Süd-Tunisien*، لیپزگ ۱۹۰۰ء؛ (۲) جربہ کی بولی: باسے R. Basset، در *Journ. Asiatique*، ۱۸۹۳ء؛ (۳) de Calassanti - Motylinski، در *J.A.*، ۱۸۹۸ء؛ (۴) سِنَد کی بولی: Provotelle: *Étude sur la Tamazir't....de Qalâat es-Sened*، پیرس ۱۹۱۱ء؛—

لغۃ عربیہ سے متعلّق: (۱) H. Stumme: *Tunisische Märchen u. Gedichte*، لیپزگ ۱۸۹۳ء؛ (۲) وهی مصنّف: *Tripolit.-tunisische Beduinenlieder*، لیپزگ ۱۸۹۴ء؛ (۳) وهی مصنّف: *Neue tunisische Sammlungen*، برلن ۱۸۹۶ء؛ (۴) وهی مصنّف: *Grammatik des tunisischen Arabisch*، لیپزگ ۱۸۹۶ء؛ (۵) نولڈیکہ، در *W.Z.K.M.*، ۱۸۹۴ء، ص ۲۰۰ تا ۲۷۱؛ (۶) K. Narbeshuber: *Aus dem Leben der arab. Bevölkerung in Sfax*، لیپزگ ۱۹۰۷ء؛ (۷) Sonneck: *Chants arabes du Maghreb*، پیرس ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۷ء؛ (۸) A. Guîga اور W. Marçais: *Textes arabes de Takroûna*، پیرس ۱۹۲۵ء۔

(بِرُونْشوگ R. BRUNSCHVIG)

[تونس موجودہ مگر آزادی سے پہلے]:

آج کل کے تونس کی تاریخ سے بحث کرنے والے کو ان اصول و عوامل پر ضرور نظر ڈالنا پڑے گی جو اس قدیم اسلامی سر زمین کے موجودہ احوال و کوائف سے بغایت بعید معلوم ہوتے ہیں جو ۱۸۸۱ء سے لے کر آج تک [یعنی ۱۹۵۵ء سے پہلے] ایک جدید یورپی سلطنت کے زیر اقتدار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام جب تونس اور دیگر خطّہ ہائے شرقِ قدیم میں پھیلا ہے تو وہ ایک ایسے قدیم خطّے میں پھیلا جس کی ایک خاص جغرافیائی ہیئت تھی، جسے اس خاص شکل میں پہلے فینیشیا والوں نے ڈھالا تھا اور اس کے بعد اہلِ روما نے۔ ہونے کو تو یہ خطّہ اسلامی ہو گیا لیکن باطنی یا ظاہری قوّتیں اور پوشیدہ یا علانیہ میلانات و رجحانات فتح اسلامی کے بعد بھی بہت زوروں سے اپنا کام کرتے رہے۔ ہم اس مختصر تمہید میں ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی شرح کا بیڑا نہیں اٹھا سکتے۔ اس سلسلے میں یہی کافی ہے کہ قارئین کرام کی توجّہ ہم پروفیسر گوتیہ E. F. Gautier کے اس موضوع کے مطالعات اور خاص کر اس کی قیمتی کتاب *Les Siècles obscurs du Maghreb*، پیرس ۱۹۲۷، کی جانب منعطف کریں۔

تونس نے اپنی موجودہ وضع کی طرف کب سے راستہ نکالنا شروع کیا؟ دوسرے لفظوں میں عناصرِ مؤثّرہ نے اسے شکلِ مالوف میں ڈھالنا کب سے آغاز کیا؟ اس کا جواب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی ہجری سے جب کہ دولتِ عثمانی

کا اقتدار ان اطراف پر قائم ہوا ان عناصر کا عمل شروع ہوا ۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ تھا کہ شروع ہی سے مغربِ قریب اور بعید کے خطّہ‌جات نے سیاسی - جغرافیائی تقسیم حالیہ کو قبول کیا اور دوسرا یہ کہ خطّۂ تونس اسی بنا پر عالمِ عثمانی میں جذب ہوا اور اس سے جو بڑے نتائج ظہور میں آنا تھے وہ آئے ۔

عربی اور یورپی قومیں جو عالمِ عثمانی کے دائرے میں داخل ہوئیں، انھیں ایسے حالات سے سابقہ پڑا جن سے ان سب پر یک گونہ وحدتِ تاریخی کا رنگ چھا گیا ۔ ساتھ یہ بھی ہوا کہ ان قوموں کو یورپ کی جدید مدنیّت سے روکنے کے لیے عثمانی اقتدار ایک آڑ بن گیا، گو صاحبِ انصاف محقّق کبھی اس بات کے ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ اہلِ یورپ سولھویں سترھویں صدی میں سلطنت عثمانی کی مسلم اور مسیحی رعایا کے لیے اپنی علمی ترقّی کے ثمرات کا تحفہ خالص طور پر پیش کرنے پر آمادہ تھے ۔ صاحبِ انصاف سے یہ امر پوشیدہ نہیں رہ سکتا کہ یورپی تہذیب و تمدّن کی پیش قدمی اکثر اوقات اس کے مرادف تھی کہ یورپ کے حکمران خاندان اپنی برتری اور رفعت قائم کرنے کی جنگ میں مصروف تھے ۔ مذہبی پیشوا اعلٰی برتری کے حصول کی خاطر اور متموّل طبقے حصولِ مال کے ذرائع کے بڑھانے کی غرض سے ان حکومتوں کے ممدّ و معاون تھے اور دونوں برابر بادشاہوں کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے ۔ البتہ دولت عثمانی پر یہ اعتراض صحیح طور پر وارد ہوتا ہے کہ اس نے کسی جدید سیاسی یا اجتماعی تصوّر کو استحکام نہ دیا اور اپنی کثیرالتعداد مختلف اقسام کی رعایا کے لیے کوئی ایسا راستہ نہ نکال سکی جس سے وہ اُن مبادی کے علاوہ جنھیں وہ جانتے تھے کسی اَور طریق سے ان کے مختلف علائق کی تنظیم کر سکیں ۔

اس طرح سے عالمِ عثمانی کے ہاتھ سے وہ بے نظیر افادہ و اصلاح کا موقع جو انھیں حاصل ہوا تھا نکل گیا اور ان کا یہ طرّۂ امتیاز کہ ان کی قلمرو میں وہ اُمّتیں شامل ہیں جنھوں نے انسانیت کی ترقّی و تہذیب میں اپنی اپنی باری میں عظیم‌الشان حصّہ لیا ہے کھو گیا ۔

عہد عثمانی نے تونس میں — اور ایسے ہی مصر میں — ایک ایسا حکمران طبقہ پیدا کیا جو اپنی نوعیّت میں نئی طرز کا تھا ۔ اس کی تہ میں قبیلی یا دینی عصبیّت کام نہیں کر رہی تھی بلکہ کسی قسم کا عام تصوّر اور منصوبہ بھی ان کے مدّ نظر نہ تھا ۔ ان کا مقصدِ وحید صرف یہ تھا کہ عنانِ حکومت خود ان کے قبضۂ اقتدار میں رہے ۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنے ڈھنگ کے لوگوں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ دسویں سے لے کر تیرھویں صدی کے عثمانی دایات، بایات، آغوات، اُسْطَوات [جمع اُسْطٰی = اُسْتا = استاد] اور رؤساے عثمانیہ کی تاریخ پر متصفحانہ نظر ڈالنے والا اس نتیجے پر جس پر ہم پہنچے ہیں پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ یہ سچ ہے کہ ان میں اچھے اور برے، نیکوکار اور زیاں‌کار سبھی قسم کے لوگ تھے لیکن ذاتی اقتدار کے حصول کی ہوس میں سب کے سب ایک ہی قماش کے تھے ۔

اس دور میں، جو تاریخ تونس اور مصر دونوں میں پُرآشوب دَور رہا ہے، دونوں ملکوں کی حالت ایک لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھی ۔ تونس کے اندر حکمران عنصر اور یورپ کے درمیان ہمیشہ لڑائی رہی اور مصر میں جو کچھ ہوا وہ حکّامِ مصر اور یورپی سوداگروں کے باہمی کشیدہ تعلّقات کا نتیجہ تھا ۔

اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ عثمانی حکمران طبقے میں دلاوری، سرداری کی قوّت اور امورِ مہمّہ کو اپنے سر لینے کی صفات بتمام و کمال

موجود تھیں اور انھیں صفات نے انھیں اپنی مبتلاے محنت رعایا کے سر پر مالک بنا کر بٹھا دیا تھا اور انھیں تونسِ جدید کی عہد بعہد ترقّی کا اوّلین ذریعہ بنایا ۔ صورت اس کی یہ ہوئی کہ آغا خدا حسین بن علی نے ۱۱۱۷ھ میں تونس کی حکومت سنبھالی اور بای کا عہدہ اپنے حسینی خاندان میں موروثی بنا دیا اور اسی خاندان میں وہ آج تک ہے ۔ مصر میں یہ صورت تونس سے پہلے ہی ہو چکی تھی، کیونکہ محمد علی نے ۱۲۲۰ھ میں مصر کے پاشا کا عہدہ سنبھالا اور اسی سے خاندانِ محمد علی کی بنیاد پڑی ۔

یہ دونوں خاندان حسینی اور علوی اس بات میں پورے طور پر کامیاب ہوے کہ جس نظامِ حکومت نے انھیں پروان چڑھایا تھا اسی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور ان مسلّح اور غیر مسلّح عصبیتوں کو توڑ کے رکھ دیں جنھوں نے عثمانی سیادت کے سائے میں زور پکڑا تھا اور اپنا نظام قومی نظام کے مشابہ طریق پر قائم کیا، اس طرح ان دونوں نے قومیت کے جدید مفہوم کے مطابق تونسی قومیت اور مصری قومیت کی نشو و نما کے لیے زمین ہموار کی ۔

خاندانِ حسینی کے زیرِ سایہ تونس کے دورِ تاریخی کی تحقیق کرنے والا مذکورۃ الذیل اَدوار کا ملاحظہ ضرور کرے گا جن میں سے اسے گذرنا پڑا ۔ یہ ادوار عام طور پر اسی نوع کے ہیں جن میں سے انیسویں صدی میں مصر کی تاریخ کو گذرنا پڑا ۔

تونس کے حکمران طبقے میں اس ضرورت کا قوی احساس پیدا ہوا کہ جنگی طاقت پیدا کرنا چاہیے جو جدید اسلحہ سے مسلّح ہو اور یہ طاقت ان مسلّح حزبوں کی جگہ سنبھالے جن سے وہ خود ہر وقت لرزہ بر اندام رہتے تھے، اپنی اس طاقت کے بل پر وہ مملکت کے باقی حصّوں پر بھی اپنا حکم نافذ کر سکیں گے اور سرحدوں کی حفاظت بھی خوب ہو سکے گی؛ چنانچہ انھوں نے اس تجویز کو عمل میں لانا شروع کر دیا اور وہی کیا جو سلیم ثالث اور محمود نے دولتِ عثمانیہ میں اور محمد علی نے مصر میں کیا تھا.

اس کے بعد انھیں یہ پتا چلا کہ اس امر کے انصرام کے لیے انھیں متفرّق مصالحِ عامّہ اور ادارات کی جدید تنظیم کی ضرورت پڑے گی اور اسی طرح اقتصادی ذرائع کو ترقّی دینا لازم ہوگا، تا کہ آمدنی بڑھائی جا سکے اور جو جدید طبقہ پیدا ہوگا اس کے لیے نئی تیّاری کی ضرورت ہو گی.

تونس میں جس قدر مسائل پیدا ہوے اور جتنی مشکلات کا اسے سامنا کرنا پڑا ان کا منبع یہی تحریک تھی.

من جملہ ان مشکلات کے حکمران خاندان اور ان کے محکوموں کے درمیان علاقات کا مسئلہ تھا، کیونکہ عوام میں قومی اتّحاد اور باہم پیوستگی کا شعور بڑھتا جا رہا تھا اور یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ قوم کو وہ سامان حاصل کرنا واجب ہے جس سے حکومت کو بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں سے روکا جا سکے، جس سے قومی عزّت کو غیروں سے محفوظ رکھا جا سکے اور جس سے ان کے ملک کو ان مختلف تحریکات کی جنبشوں میں، جنھوں نے عالمِ اسلامی کو پے در پے متزلزل کیا ہے، ایک مناسب مقام حاصل ہو سکے ۔ یہ اسی شعور کی بدولت تھا کہ قوم کو مختلف حقوق اور کفالتیں ملیں ۔ اس کی سب سے وسیع تر اور اہمّ مثال وہ امن و امان کا عہدنامہ ہے جو ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱-۱۸۳۲ء میں صادر ہوا ۔ اس سے ہمیں وہ عہدنامے یاد آتے ہیں جو محمد علی پاشا، سعید پاشا اور خدیو اسماعیل نے صادر کیے اور جو رعیّت کے حقوق اور کفالتوں پر مشتمل تھے اور

اس کی انتہا یہ ہوئی کہ عہدِ اسماعیل اور ابتداے عہدِ توفیق میں عوام کی نمائندہ مجلسیں [پارلیمنٹ وغیرہ] قائم ہوئیں، لیکن تونس (اور ایسے ہی مصر) میں باشندگانِ ملک، حاکم اور محکوم، دونوں کو اس کی فرصت ہی نصیب نہ ہوئی کہ قوم اور حکومت کے باہمی علاقے کو ایسی استوار بنیادوں پر قائم کریں جو سب کے نزدیک پسندیدہ ہوں، بلکہ دونوں ملکوں میں بیرونی مداخلت نے اس کام کو اور پیچیدہ کر دیا.

ایک اور مشکل جو پیش آئی وہ امراء کے دولتِ عثمانیہ سے تعلق قائم رکھنے کے متعلق تھی - حکّام ان منافع کو خوب سمجھے ہوے تھے جو انھیں دولتِ عثمانیہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے سے میسر تھے - اس رابطے سے کچھ قوت اور اطمینان حاصل تھا کہ مغربی حکومتیں ان کی آزادی پر دست درازی نہ کر سکیں گی - ساتھ ہی انھیں اس کا بھی شعور تھا کہ لوگوں کے دل میں اس کی بابت کیا خیالات جاگزیں ہیں، ان کے دل میں خلافتِ اسلامیہ کے گھرانے سے تعلق رکھنے کی کتنی وقعت ہے اور وہ قوی اور محفوظ دولتِ عثمانیہ کے باقی رہنے کے ساتھ خود کس حد تک فخر محسوس کرتے ہیں - یہاں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تونس کے حکمران سلطانِ ترکی کی بعض لڑائیوں کے دوران میں اپنے جنگی اور مالی وسائل اس کے اختیار میں کیوں دے دیا کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان خیالات سے بھی خائف تھے جو دولتِ عثمانیہ کے دل میں تونس وغیرہ کی طرح کے خطّہ‌جات کی بابت، جنھیں استقلالِ داخلی کا کچھ حصہ نصیب ہو چکا تھا، مضمر تھے - ان کے دل میں ان عواقب کا خوف تھا جن کا دولتِ عثمانیہ کی اطاعت کے غلو میں ان کے سر پڑنے کا اندیشہ تھا - ترکی سے اس قسم کا خوف ہی اس بات کا باعث تھا کہ وہ بعض دُوَلِ غربیّہ کا بھی کبھی کبھی ساتھ دینے لگتے تھے، یعنی ان اوقات میں جب وہ انھیں مستقل بادشاہوں کی طرز اختیار کرنے کی ہمت دلاتے تھے اور اپنے اپنے ملکوں میں ان کا استقبال ویسا ہی کرتے تھے جیسے خود مختار بادشاہوں کا ہوتا ہے اور ان کے ساتھ ایسے ایسے عہد و پیمان کر لیتے تھے جو ان کے اقتدار کے اہم پہلوؤں پر اپنا اثر ڈالتے تھے لیکن اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے پر امراء کو موردِ ملامت قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ انیسویں صدی میں دولتِ عثمانیہ کی سیاست کچھ اس قماش کی تھی کہ تونس کے حکمران تونس کے استقلال اور آزادی کو برباد کرنے کی ترکی پالسی کے خلاف یورپ کی امداد، خواہ وہ کتنی ہی ہو، حاصل کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے - ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہ واقعہ ان کے سامنے تھا کہ جب خدیو اسماعیل کو یورپ کی تائید حاصل نہ رہی تو دولتِ عثمانیہ نے اسے فوراً معزول کر دیا - نیز وہ دیکھ رہے تھے کہ حرکتِ عرابیہ کا قلع قمع کرنے کے لیے اس نے کیا کیا جتن کیے - ان واقعات سے دولتِ عثمانیہ کی تونس کے ساتھ حکمتِ عملی صاف عیاں تھی؛ اس میں یورپی طاقتوں کے سوا سب کا نقصان تھا.

منجملہ دیگر مشکلات کے وہ مشکلات بھی تھیں جو اجنبیوں اور یورپی حکومتوں کے ساتھ روابط رکھنے سے متعلق ہیں، کیونکہ حکّامِ صوبہ نے اجنبیوں کے داخلے کے لیے ایک وسیع دروازہ کھول دیا اور ترقّی اور دولت مندی کے حصول میں عجلت کی، چنانچہ یورپ کے ماہرینِ فنون کو انھوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا - وہ ان کے لیے بڑے بڑے کاموں کے منصوبے تیّار کرتے تھے اور پھر انھیں عملی جامہ پہنانے میں ان کی مدد کرتے تھے -

یورپ کے ذہین عقلمندوں اور یورپ کے سرمائے کو انھوں نے موقع دیا کہ خشکی اور تری کی منفعت بخش اشیاء کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالیں۔ انھوں نے جزائرِ بحر ابیض متوسّط (میڈی ٹرینین) اور اس کے سواحل کے ہر طالبِ روزگار کو آسانیاں دیں کہ وہ تونس کو اپنا وطنِ ثانی بنائے اور اپنے اندر یہ ولولہ پیدا کرے کہ وہ اسے اپنے اصلی وطن سے ملحق کرے۔ چنانچہ اجنبیوں کی نوآبادیاں بہت طاقتور ہو گئیں اور اجانب کے امتیازات [concessions] کے وہ معنے پیدا ہوے جو انھیں پہلے حاصل نہ تھے۔ نوآبادیوں کی قوت کے پشتی بان بیرونی سفراء تھے اور سفراء کے پشت پناہ لشکر اور بحری بیڑے تھے۔ اصلی باشندوں اور خود حکومت کی آمدنی کے ذرائع ہر منچلے اجنبی کی لوٹ مار کے لیے وقف ہو گئے۔

یورپ کا سرمایہ کچھ تو ان چیزوں کو ترقی دینے میں کام آیا جو واقعی استوار اقتصادی بنیادوں پر قائم تھیں اور کچھ وہمیات کی پرورش میں صرف ہوا اور ایک حصّہ صرف سامانِ عیش کی تکمیل اور غلط تقلید میں خرچ ہوا۔ یورپ کی حکومتوں نے یہ ٹھانی ہوئی تھی کہ سرمایہ اور سرمایہ داروں کی بہر صورت حمایت کی جائے۔ انھیں اس کی پروا نہ تھی کہ فقط ان کی کارروائیوں کو جانچ کر درست باتوں میں ان کی مدد کی جائے اور ناجائز افعال کو نازیبا قرار دے کر ان کی روک تھام کی جائے۔ انھوں نے حق و باطل کا سوال ھی نہیں اٹھایا، بلکہ سب کچھ ان کے نزدیک ان کی قومی مصلحت تھی اور اس کی تائید میں انھوں نے اپنا سارا زور لگا دیا۔ کاش یہ معاملہ اسی حد پر ٹھیر جاتا۔ ہوا یہ کہ دُوَلِ یورپ کی باھمی رقابت اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے شوق نے تونس کے امراء کو بہت سے فاسد بھنوروں میں پھنسا دیا۔ مثال کے طور پر اگر کسی قوم کے سرمایہ‌داروں نے ایک نئی ریل کی پٹری بچھانے کا امتیاز (concession) حاصل کیا تو دوسری قوم کے سرمایہ‌داروں کے لیے بھی اس جیسا امتیاز حاصل کرنا ضروری ہو گیا، گو ملک کو شاید اس کی ضرورت نہ تھی۔ اسی پر اور چیزوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ ایک مصری اس موقع پر سعید اور اسمٰعیل کے زمانے کے سرمایہ‌داروں کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ کہ ان حکمرانوں نے اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو ایک ایسے جال میں پھنسا لیا جس سے نکلنا ان کے بس کا نہ رہا اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا جال کے پھندے اور تنگ ہوتے گئے اور خرابی بڑھتی گئی۔

یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں کی باھمی رقابت اور تنافس سے ان حکمرانوں کو یہ امید ہوئی کہ ان کے ملک کا حکومتی استقلال ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ حقیقت میں دُوَل کا یہ تنافس ان حکمرانوں کے لیے وبالِ جان تھا، کیونکہ اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان سب کو راضی رکھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے اندر جو سرمائے کا تتر بتر ہونا اور حقوق کا تلف ہونا مضمر ہے وہ ظاہر ہے۔ وہ اس کا بھی مقتضی تھا کہ حکومتِ تونس اپنی پوری توجہ یورپ کے سیاسی افقوں کو تاکتے رہنے میں صرف کرے، اس امید پر کہ شاید لغزش سے بچنے کا کوئی صحیح راستہ سوجھ جائے۔ ایک خرابی اس میں یہ بھی تھی کہ اس میں امیر کے درباریوں کو بگاڑنے کا سامان موجود تھا۔ ان میں سے ایک کا میلان (کسی وجہ سے) ایک یورپی حکومت کی طرف ہو گیا اور وہ تونس میں اس حکومت کا آدمی بن گیا، دوسرے کا رجحان کسی دوسری یورپی حکومت کی طرف ہو گیا، اب لامحالہ وہ اپنے پہلے ہم وطن کا دشمن بن جائے گا۔ ہر یورپی حکومت کے سفیر کے لیے اپنے

تونسی طرفدار کی حمایت لازمی تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اپنے گروہ میں تونس کے اصحابِ اختیار کو اور جس جس کسو بھی حاکم کا تقرب حاصل ہے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انواع و اقسام کی ترغیب و ترھیب کا سلسلہ شروع ہو کر تمام نیتیں اور ذمےداریاں تہس نہس ہو جاتی تھیں۔

ان تمام اسباب کی وجہ سے حکومتی منصوبوں کو دینی مسائل اور اسی طرح کے دیگر مسائل کے حل کرنے میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی ۔ مصر کا حال ہمارے سامنے ہے ۔ کامیابی ہوتی بھی کیسے؟ قرضوں کے چکانے اور تونس کے مالیہ کی نگراں حکومتی کمیشنوں اور کمیٹیوں نے اپنے شغل جاری رکھنے کے لیے نئے نئے میدان اور طریقے نکال لیے تھے، جن میں حکومتوں کے نمایندوں کے درمیان باھمی نزاع و مناقشت خوب زور شور سے جاری تھی، بلکہ بعض نمایندوں کا کام ھی یہ تھا کہ وہ اس بارے میں حکومت کے غور و خوض کو ناکام کر دیں تا کہ بے چون و چرا یہ بات ثابت ہو جائے کہ ملک کی انتظامی جماعت اپنے ملک کے بگڑے ہوے حالات کی اصلاح سے بالکل عاجز ہے ۔ اصلاحات کے لیے ایک بین الاقوامی مجلس قائم کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا، کیونکہ ان سے اصلاح کے بجاے مرض اور بڑھ گیا اور جو غرض تھی وہ حاصل نہ ہوئی ۔ بس اس کا مفید حل فقط یہ ہے کہ ملکی حکومت کا انتظام کوئی یورپی حکومت اپنے ھاتھ میں لے لے ۔

یہ حکومت کونسی ہو؟ باقی حکومتوں کے لیے اس ایک حکومت کی خاطر میدان خالی کر دینا کیسے ممکن ہو؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے، اس کے بدون کہ بیرونِ تونس کسی اور مقام میں اس کا معاوضہ لیا جائے؟ یہ مقام یا مقامات کہاں ھیں؟

مطلب یہ کہ اس سے چارہ نہ رہا کہ تونس پر سارے یورپ کی نگرانی کے بجاے ایک یورپی حکومت کی نگرانی قائم ہو، اس لیے کہ یورپ کے حالات نے صورت ھی ایسی پیدا کر دی تھی کہ تمام عالمِ عثمانی کے مستقبل کی مشکلات کے رو در رو کھڑا ھونا لازمی ھو گیا، نیز یہ کہ مسئلۂ شرقیہ کو، جیسا کہ اس وقت اسے نام دیا گیا، اس وقت معرضِ بحث میں لایا جائے اور صرف اسی وقت حقائق کا سامنا کرنا واجب ھو جائے گا اور قوت امور کو نافذ کرنے کے آلات ظہور میں لائے گی اور اس قوت کے سامنے ہر شخص کو، جو اس کے برابر کی قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں، جھکنا پڑے گا۔

بلقان میں حکومتِ عثمانیہ کے خلاف جو شورشیں برپا ہوئیں اور ۱۸۲۷ - ۱۸۲۸ء میں روس اور حکومت عثمانیہ کے درمیان جو جنگ ہوئی ان سے وہ موقف پیدا ہوا جو ہم نے بیان کیا ۔ اس موقف سے تونس کے لیے فرانس کا نظامِ حمایت (Protectorate) پیدا ھوا، جیسا کہ مصر کے لیے برطانیہ کا احتلال پیدا ھوا ۔ فرانس کے زیرِ حمایت آنے سے موجودہ تونس کی تشکیل میں اسباب کی آخری کڑی نے اپنا کام شروع کر دیا ۔ ہم مناسب سمجھتے ھیں، خاص کر جب کہ یورپی حکومتوں نے دنیا کی گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد اپنی خفیہ سیاسی دستاویزوں میں سے بہت سی شائع کر دی ھیں، کہ یہاں ذرا تفصیل سے کام لیں اور دیکھیں کہ فرانس کو تونس پر اقتدار، جو اس کی من مانی مراد تھی، کیسے حاصل ھوا اور اس پر اس ملک اور اھلِ ملک کے لیے کیا کیا نتائج مرتب ھوے۔

جس تطور کی نمایاں علامات ھم اوپر بیان کر چکے ھیں اس نے تونس کو تنہا فرانس کے تصرف کے حوالے کس طرح کر دیا؟ اس انجام کی تشریح

کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے اسباب کا کھوج یورپی طاقتوں کے ان باھمی روابط میں ڈھونڈیں جو ۱۸۷۰ء میں فرانس کی شکست کے بعد ظہور پذیر ہوے اور ان اثرات میں ڈھونڈیں جو ان روابط پر مشرق کے اس بحران سے پڑے جو ۱۸۷۷ء میں ترکی کے روس سے ہزیمت پانے سے پیدا ہوا۔

یورپ کی تاریخ جدید میں ۱۸۷۰ء کے حوادث نے ایک نیا دور پیدا کر دیا ۔ فرانس کی کامل شکست اور جرمنی کی شہنشاھی حکومت کی پیدایش کی تکمیل اور فرانس کے جیتے جاگتے جسم سے ایلسیس اور لورین Alsace and Loraine کے خطے کی قطع و برید، ان تمام واقعات نے یورپی علاقوں کے باھمی روابط پر پورا اثر ڈالا اور وہ اثر آج تک جاری ہے ۔ دولِ یورپ کا جو موقف عالم میں ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ جو کچھ یورپ میں ھوتا ھو اس کی صدا سارے جہان میں گونج جائے اور وہ اقوام بھی اس کے اثر سے نہ بچیں جن کے یورپ نہ لینے میں ہے نہ دینے میں ۔

جدید جرمنی کو ۱۸۷۱ء کے بعد سب سے زیادہ فکر اس کا تھا اور تمام کوشش اس کی یہ تھی کہ فرانس اس کامیابی کو جو اس سال میں جرمنی کو میسر آئی تھی کہیں توڑ نہ ڈالے، چنانچہ اس کے عظیم بادشاہ بسمارک Bismarck کے اقدامات کا منشا یہ تھا کہ فرانس کو سیاسی میدان میں نکما کر دے اور یورپ بھر میں اسے کوئی ایسا قومی حلیف نہ مل سکے جو جرمنی کے خلاف لڑنے میں اس کا پشتیبان ھو ۔ بسمارک اسے ترجیح دیتا تھا کہ فرانس پورے طور پر جمہوریت کے بائیں گروہ [Leftists] کے زیرِ اقتدار آ جائے، کیونکہ اس کا اعتقاد یہ تھا کہ ان گروھوں کو بہ نسبت دائیں گروھوں کے یورپ کی سیاسی تائید حاصل کرنے کی اُمید کم ہے ۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ جمہوریۂ فرانس کے احزاب کی کامیابی جرمنی کے کاتھولیکیوں میں، جو اس وقت بسمارک کے خلاف صف آرا تھے، ضعف پیدا کر دے گی۔

بسمارک اس قسم کا سیاسی نہ تھا کہ امور کی منفی تنفیذ پر اکتفا کرے یا یہ اعتقاد کر لے کہ فرانسیسیوں جیسی عظیم قوم ھمیشہ ھمیش کے لیے نیست و نابود ھو سکتی ہے ۔ اس کے برخلاف ایسے قرائن موجود ھیں جن سے ثابت ھوتا ہے کہ بسمارک یہ دیکھ کر کہ فرانس اپنی ۱۸۷۱ء کی شکست اور خستہ حالی سے اس کے متصل بعد کے چند ھی سال میں پنپنے لگا حیران و پریشان ھو گیا تھا ۔ وہ اس بات کو ضروری سمجھتا تھا کہ فرانس کے زعماء کے سامنے کچھ ایسے مقاصد رکھ دے جن کے حصول کی طرف ساری قوم کی ھمّتیں لگ جائیں اور جس سے ہزیمتِ عظیمہ کی عار دُھل جائے اور فرانس کو اس مرکزِ قدیم پر لوٹا دے جو اسے دوسری قوموں کے درمیان حاصل تھا اور انتقام کے جذبے سے، جو عقلوں پر غالب آ گیا تھا، انھیں دور کر دے ۔ یہ سب اغراض مدّ نظر رکھ کر بسمارک نے فرانس کو ایک سے زیادہ دفعہ سمجھایا کہ وہ تونس کو اپنے زیرِ اقتدار لے آئے ۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس کی عقل نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ سارے یورپ کی للچاتی نگاھوں کو بلقان اور شرق ادنٰی اور اوسط کی جانب موڑ دینا ھی اس امر کا کفیل ھو سکتا ہے کہ خود یورپ میں بعدِ جنگ جو کچھ طے ھوا برقرار رہے ۔ اسی ترکیب سے یورپی مخالفات کو وجود میں آنے سے روکا جا سکتا ہے، جن کا مقصد یہ ھو کہ موجودہ حالت کو پلٹ دیا جائے؛ چنانچہ مملکتِ عثمانیہ میں روس کے نفوذ کے امتداد کو اسی وجہ سے اس نے ناپسند نہیں کیا، صرف یہ شرط لگا دی کہ آسٹریا ۔ ھنگری کو بوسنہ اور ھرسک [ھِرْتسے گووینا] میں اتنا کچھ

مل جائے جس سے وہ راضی ہو جائے اور حکومتِ انگلیشیہ قبول کر لے کہ مصر وغیرہ مشرقی علاقوں میں، جو خود اس کے لیے اہمیت رکھتے ہیں، اپنے قدم جما لے۔

بسمارک کی سیاست کو ۱۸۷۰ اور ۱۸۷۷ء کے درمیانی سالوں میں کامیابی بقدرِ محدود ہی حاصل ہوئی اور کسی طرف سے ایسی کارروائیاں جلد جلد وقوع میں نہیں آئیں جن سے ظاہر ہوتا کہ ۱۸۷۱ء والا فیصلہ صحیح معنی میں آخری مان لیا گیا ہے، یا یہ کہ فرانس، اٹلی، روس، آسٹریا اور ہنگری یا انگلستان صدقِ دل سے امور کی اس ترتیب کو جو بسمارک نے تجویز کی تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔

لیکن جس وقت بلقان میں مملکتِ عثمانیہ کی بعض ولایات کے اندر شورشیں برپا ہونے لگیں اور حکومتِ عثمانیہ نے شورش کرنے والوں اور نہ کرنے والوں سے بلا امتیاز طرح طرح کی وحشیانہ سختی کا برتاؤ شروع کر دیا اور ادھر روسی حکومت نے یورپ اور ایشیا کے اندر سرزمینِ سلطان میں جنگ جاری کر دی اس وقت دُوَلِ یورپ کو احساس ہوا کہ واقعات کا سامنا کرنے سے اب چارہ نہیں رہا: چنانچہ اُن میں سے ہر ایک سان ستیفانو San Stefano کی صلح کے چند ماہ قبل اور بعد ایسے حل کی تلاش میں لگی رہی جس سے اس کے ذاتی مفاد کی حفاظت ہو جائے اور وہی حل مسئلۂ شرقیہ کے سلجھانے کی بنیاد بھی قرار پائے۔ رہا فرانس تو اس کے سامنے اس کی اپنی مشکل تھی، جو بہت بڑی تھی۔ اسے صاف سوجھ رہا تھا کہ اسے حقیقی اطمینان اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اسے ایک طاقتور حلیف نہ مل جائے، اور جب تک ایسا حلیف میسّر نہیں ہوتا اسے لازم ہے کہ خطرناک مرحلوں سے بچے اور لغزش کے مقامات سے دور رہے؛ چنانچہ جہاں تک ہو سکا اس نے مسئلۂ شرقیہ سے متعلّق بات چیت اور بحث میں حِصّہ لینے سے پرہیز کیا۔ جس وقت یورپ کی کانفرنس اس غرض کے لیے منعقد ہوئی کہ سان ستیفانو کی صلح کا جائزہ لے اور اس صلح کو، جو روس اور ترکی کی باہمی رضامندی سے ہوئی تھی، یورپ کے ایسے تصفیے کا ذریعہ بنائے جسے سارا یورپ پسند کرے تو فرانس کو بھی اس کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی مگر فرانس کو اپنی مذکورۂ بالا حکمتِ عملی کے تحت اوّل تو شامل ہونے میں تامّل ہوا، اس کے بعد اُس نے یہ شرط پیش کی کہ کانفرنس ان امور کے سوا جو عملی یا طبیعی طور پر روس اور ترکی کی جنگ سے تعلّق رکھتے ہیں اَور باتوں سے بحث نہ کرے۔ اس شرط کی توضیح اس طرح کی کہ کانفرنس کے سامنے غربی یورپ، مصر، شام اور اماکن نقدّسہ کے حالات برائے بحث نہ پیش کیے جائیں (فرانس کے وزیر خارجہ کا اپنے سفراء مقیم برلن، لنڈن اور روما وغیرہ کی طرف مراسلہ مؤرّخ ۷ مارچ ۱۸۷۸ء، جو فرانس کی سیاسی دستاویزوں کی ج ۱، دستاویز عدد ۲۶۲ میں درج ہے)۔ جس وقت فرانس کی یہ شرط منظور کر لی گئی تو اس نے یورپی کانفرنس منعقدہ برلن کی دعوت قبول کر لی۔

رہی حکومت برطانیہ تو اس کے متعلّق کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۶ء، ۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۸ء میں جو حوادث رونما ہوے اس میں ترکی (عثمانی) حکومت کی محافظت کی پالیسی (خُطّة) ختم ہوئی، اور اس کے بجاے کئی اَور متناقض پالسیاں معرضِ وجود میں آئیں۔ ایک احرار (یعنی لبرل) پارٹی کی (جو حکومت کی مخالف پارٹی تھی) پالسی، جو یہ تھی کہ حکومت کا راهنما مسیحی انسانیت کا راهنما ہونا چاہیے، یعنی ان مغلوب الامر مسیحی قوموں کو جو سلطنتِ عثمانیہ میں رہتی ہیں آزاد

کرانا چاھیے ۔ دوسری پالسی وزیر اعظم لارڈ بیکنز فیلڈ Beaconsfield کی تھی؛ اس میں مختلف عناصر ملے ہوئے تھے: برطانیہ کی کنسرویٹو (تقلیدیہ، [یا قدامت پسند]) سیاست، اُس رنگ کی جنگی اور سیاسی مخاطرہ جویی میں پڑنا جیسی بنیامین ڈزریلی Disraeli ، ایک منچلا نوجوان اپنے ناولوں میں پیش کر کے اپنا دل بہلایا کرتا تھا (یہ ڈزریلی حکومت کے مرتبے پر اس وقت تک نہ پہنچا جب تک وہ بوڑھا نہ ہو گیا اور ضعیف العمری اور امراض نے اسے شکستہ حال نہ کر دیا) ۔ بیکنز فیلڈ کی پالسی کی طرف طبعاً ملکہ اور عوام الناس اور ایسے سب کنسرویٹو Conservatives (قدامت پسند) مائل تھے جو بچپن سے روس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے آئے تھے ۔ تیسری پالسی درمیانی پالسی تھی، وہ واقعات کے سامنے سر جھکانے کی پالسی تھی ۔ اس کا منشأ یہ خیالات تھے کہ دولتِ عثمانیہ کو مشکلات سے صحیح سلامت نجات دلانا، جس کے خواب دیکھے جایا کرتے تھے، اب ممکن نہیں اور مسیحی قوموں کی آزادی حقیقۃً ایک عمدہ مقصد ھے اور قابلِ احترام ھے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابلِ احترام یہ بات ھے کہ حصولِ آزادی کو جنگ و جدل کے بھڑکنے کا سبب نہ بننا چاھیے اور انسانی خون کے بہانے سے محترز رہنا چاھیے اور آخری بات یہ کہ جنگی اور سیاسی مخاطرہ جوئی کو انگریزی سیاست اپنے دل کی گہرائیوں میں قابلِ اعتناء نہیں سمجھتی لیکن وہ اسے پورے طور سے نظر انداز بھی نہیں کر سکتی، اس لیے واجب یہ ھے کہ ایسی عملی پالسی اختیار کی جائے جو حالات کے مطابق ہو، جو ایسا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرے جو صلح و امن پر مبنی ھو اور جسے سب پسند کریں ۔ یہ کہا جا سکتا ھے کہ یہ لارڈ سالسبری Salisbury کی پالسی تھی، جو بیکنز فیلڈ کی وزارت میں پہلے وزیر ھند اور پھر وزیر خارجہ ھوا ۔

روس اور ترکی (دولتِ عثمانیہ) کی جنگ کے دوران میں حکومتِ برطانیہ سے جو کچھ ھو سکا وہ اس نے کیا تاکہ ایک تو اُس کا نقطۂ نظر برقرار رھے اور دوسرے دولتِ عثمانیہ کی حوصلہ افزائی ھو تاکہ وہ مدّتِ دراز تک روس کے مقابلے میں ڈٹی رھے اور یہ جو کچھ ھو سکا اتنا کیا کہ حکومت کی مخالف پارٹی نے اس پر یہ الزام تک لگا دیا کہ اس کا مقصد روس کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کا ھے، پھر اس نے ایک ''اتّحادِ بحرِ ابیض متوسط'' قائم کرنا چاھا، جس میں انگلستان، فرانس، اٹلی، یونان اور آسٹریا شامل تھے، تاکہ اس سمندر میں متّحدین کے تجارتی اور سیاسی مصالح کی حفاظت کی جائے اور وہ تدبیریں اختیار کی جائیں جو انھیں ضرر پہنچنے سے بچائیں مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، کیونکہ فرانس اور اٹلی اس طرح کے اجماعی عمل کے بد نتائج سے خائف تھے؛ رھا آسٹریا تو اس کا سیاسی میدان اس سمندر کی حدود سے زیادہ وسیع تھا، روس اور جرمنی سے اس کا سمجھوتا ایک حقیقت واقعی تھی اور اکیلے یونان سے اتّحاد نہیں بن سکتا تھا ۔ اس اتّحاد کے قائم کرنے کے وقت جو باھم گفت و شنید خاص طور پر ھوئی وہ لائق توجّہ ھے ۔ حکومتِ برطانیہ کے لیے اٹلی کی سیاست خاص طور پر اطمینان بخش نہ تھی، چنانچہ اس کا اثر اس کے بعد اس وقت ظہور پذیر ھوا جب فرانس کا تونس پر تسلّط ھوا ۔

ان تدابیر کے بعد حکومتِ برطانیہ انفرادی عمل پر اتر آئی، چنانچہ ۱۳ فروری ۱۸۷۸ء کو برطانی بیڑے نے حکومتِ عثمانیہ کے احتجاج کے باوجود دردانیال کی تنگ آبنائے کو عبور کیا ۔ لارڈ ڈاربی Derby وزیرِ خارجہ نے حکومت کو اپنا استعفا

پیش کر دیا، کیونکہ وہ کوئی ایسی بات پسند نہیں کرتا تھا جس میں روس سے جنگ چھڑ جانے کا امکان ہو ۔ اس کا عہدہ سالسبری نے سنبھالا ۔ ۳ مارچ ۱۸۷۸ء کو دولت عثمانیہ (ترکی) نے صلحنامۂ سان ستیفانو San Stefano پر دستخط کیے ۔ اس کی جو شرطیں تھیں وہ سب کو معلوم ہیں ۔

حکومتِ برطانیہ اپنی طرف سے حالاتِ جدیدہ میں، جو ترکی کے سقوط سے وجود میں آئے، اپنے مصالح کی محافظت کا کام کرنے لگی ۔

ترکی کے اس سقوط سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ حکومتِ عثمانیہ کا خود اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا محال ہے، اس لیے ضروری ہو گیا کہ وہ کسی اڑواڑ پر ٹیک لگائے (مأخوذ از خطاب سالسبری بہ بیکنسفیلڈ Beaconsfield مؤرخ ۲۱ مارچ ۱۸۷۸ء، در کتاب مبانی سیاسۃ برطانیہ، دستاویز عدد ۱۳۲) ۔ اس کے یورپی مقبوضوں کا دیر یا سویر ہاتھ سے نکل جانا مقدّر ہو چکا ہے ۔ اب تو مسئلہ یہ تھا کہ سلطان (ترکی) کو اپنے ایشیائی مقبوضات کو برقرار رکھنے کے لیے ایک حلیف کی ضرورت پڑے گی ۔ ترکی کے مقبوضاتِ ایشیا کی حالت مقبوضاتِ یورپ کی حالت سے علیحدہ ہے، کیونکہ ایشیا میں ایسی قومیں نہیں ہیں جو آزادی، استقلال اور اس سے متعلّقہ امور کے لیے ساعی ہوں، اس لیے کہ ان کا زیادہ حصّہ مسلمان ہے اور عثمانی بادشاہی مناسب‌ترین صورت ہے جو انھیں میسّر آ سکتی ہے (البتہ برطانیہ کی شہنشاہی کو اس سے مستثنیٰ کر لینا چاہیے)، اس لیے ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ ترکی کی اس کے ایشیائی مقبوضات کے دفاع میں اور ان کے حالات کا بحسن و خوبی انتظام کرنے میں مدد کریں اور یہ مدد ممکن نہیں جب تک کہ ہم کسی ایسے مستقر پر قبضہ نہ کر لیں جو ترکی کے ایشیائی علاقے سے بہ نسبت مالٹا کے قریب‌تر ہو (مأخوذ از خط سالسبری بہ طرف سفیرِ انگلستان مقیم قسطنطنیۃ، مؤرخ ۹ مئی ۱۸۷۸ء، کتابِ مبانیِ سیاستِ برطانیہ [*Foundations of British Foreign Policy*]، دستاویز عدد ۱۳۵) ۔

ان آراء سے اس متّفق علیہ فیصلے کی توضیح ہو جاتی ہے جو ۴ جون ۱۸۷۸ء کو منعقد ہوا اور جس کی رو سے حکومتِ برطانیہ جزیرۂ قُبرُص (Cyprus) پر قابض ہو گئی، پھر اس سے برطانیہ اور آسٹریا کے اس اتّفاق باہمی کی بھی توضیح ہو جاتی ہے جو ان دونوں حکمتوں میں ہوا کہ وہ کانفرنس میں متّحد الاغراض رہیں گے؛ مثلاً یہ غرض کہ آسٹریا کو بوسنیا اور ہِرتسے گووینا کے علاقوں پر تسلّط جما لینے کی رعایت دی جائے ۔

ان تمہیدوں اور اسی قسم کی اَور باتوں کے بعد برلن میں کانفرنس کا اجلاس ہوا، اس کا صدر بسمارك تھا ۔ کانفرنس کے دوران میں قبرص کی بابت اتّفاقِ خاص کا اعلان کیا گیا اور فرانسیسی وفد کا ہنگامہ اٹھا ۔ کانفرنس کی کشتی کو صحیح و سالم کنارے تک پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ فرانس کو راضی کیا جائے ۔ بسمارك نے اپنی طرف سے انگلینڈ اور فرانس کے درمیان مصالحت کی کوشش کی، چنانچہ تونس کو فرانس کے آگے پیش کیا گیا ۔ یہ پیش کش بالکل کھلم کھلا طریقے سے کی گئی ۔ سالسبری نے [وَوڈِنگٹَن Waddington] سے جو برلن میں فرانسیسی وفد کا رئیس اور وزیرِ خارجہ تھا کہا : ”تونس کے ساتھ جو چاہو کرو — اس پر تو تمھیں عنقریب قبضہ کرنا ہی پڑے گا ۔ قَرطاجَنّۃ Carthage کو تم بربروں کے ہاتھ میں نہیں چھوڑ سکتے ۔ لارڈ بیکنسفیلڈ نے اس بات کو دھرایا اور پیرس میں خود برطانی ولیعہد نے اس پر زور دیا (مثال کے طور پر دیکھیے

مجموعۂ دستاویزہاے فرانس، ج ا، دستاویز عدد ۳۳۰: ووڈنگٹن کا خط بنام دارکور، سفیرِ فرانس مقیم لنڈن، مؤرّخ ۲۱ جولائی ۱۸۷۸ء).

وزارتِ دیفور de Fors نے (جس نے اس پیشکش کو منظور کیا) عطیے کو عملی صورت دینے کے لیے خود تونس ھی میں اس کی تمہید اٹھانے کی کوشش شروع کر دی؛ پھر یہ وزارت اس ارادے سے رک گئی اور جہاں تک ھمیں معلوم ھے عملی کارروائی ۱۸۸۱ء میں ھوئی اور وزارتِ جول فِرِی Jules Ferry کے ھاتھ، جو فرانس کی جدید استعماری شہنشاھیت کی بانی تھی، یہ کام انجام کو پہنچا.

کیا اس واقعے کا ظہور اس وجہ سے ھوا کہ حکومتِ برطانیہ اپنے ۱۸۷۸ء کے قول و قرار سے پھر گئی تھی؟ حقیقت یہ ھے کہ ۱۸۷۸ء کے وعدوں کی بابت قدامت پسند (یا 'محافظین'، کنسرویٹو) گورنمنٹ اور حرّیت پسند (لبرل) گورنمنٹ نے جو وتیرہ اختیار کیا اس کا فرانس کی یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں کو متردّد اور متامّل رکھنے میں ضرور کچھ نہ کچھ اثر تھا ۔ یہ وتیرہ انکار یا پھر جانے کی حد کو تو نہیں پہنچا پھر بھی مطلب اور مراد کی تنگ تر تاویل کرنا ضرور اس کے اندر آتا ھے ۔ خود لارڈ سالسبری کا بیان ھے: ''مجھے واقع میں یاد ھے کہ میں نے وہ الفاظ کہے ضرور تھے جو ووڈنگٹن نے میری طرف منسوب کیے ھیں لیکن مجھے یہ بھی یاد ھے کہ میرے دل میں یہ خیال بھی نہ گذرا تھا کہ اس کے معنی فرانس کو تونس کی پیش کش کرنے کے ھیں، کیونکہ یہ اُس کے لیے کیسے ممکن ھے کہ جو چیز اُس کی اپنی ملک میں نہ بھی ھو وہ اسے دوسرے کو عطا کر دے''۔ اس کے ساتھ اُس نے یہ بھی اضافہ کیا کہ ''انگلستان کے وعدوں کے اس سے زیادہ کوئی معنی نہیں کہ تونس کے بارے میں انگلستان فرانس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالےگا، یعنی تونس کے اندر انگلستان اپنے حقوق ترک کرتا ھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی اَور کو بھی (اس سے مراد اٹلی ھے) اپنے دعاوی سے دست برداری پر مجبور کرنا چاھتا ھے''.

انگلستان کے اس وتیرے نے اٹلی کو ابھار دیا کہ وہ تونس کے بارے میں فرانس کی کھلم کھلا دشمنی کا موقف اختیار کر لے ۔ فرانس نے طے کر لیا کہ تونس کے بارے میں اس سے قبل کہ اٹلی سبقت کرے ایک قطعی فیصلہ کن اقدام کرنا چاھیے ۔ بِسمّارک نے ایسا اقدام کرنے کے لیے فرانس کی پیٹھ ٹھونکی.

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت فرانس کی راے عامّہ، جس کی نمایندگی پارلیمنٹ یا صحافت نے کی ھو، اس طرف مائل تھی کہ فرانس استعماری منصوبہ تراشی کی صف میں جا کھڑا ھو، واقعہ یہ ھے کہ ایسا نہیں تھا، بلکہ راے عامّہ ان منصوبات میں قومیت کے مقتضاے عظیم کے ساتھ خیانت کا شائبہ دیکھتی تھی، انھیں مساعی کی پراگندگی کا باعث سمجھتی تھی اور ۱۸۷۱ء کے بندوبست یورپ کو تسلیم کر لینے کا انتہائی درجہ قرار دیتی تھی ۔ کیا اس قول کی صحّت پر اس سے زیادہ کسی اَور دلیل کی ضرورت ھے کہ ان منصوبوں کے مطابق اقدام کی حوصلہ افزائی خود بسمارك کی طرف سے ھوئی؟

حقیقت یہ ھے کہ اپنی پالسی ('خُطّۃ') سے نہ راے عامّہ منحرف ھوئی اور نہ پارلیمنٹ ۔ سچی بات یہ ھے کہ قائدانِ جمہوریّت کا ایک بہت بڑا حصّہ اس راے کی طرف جھک پڑا جس کا مقصد تھا کہ جمہوریّت کو چاھیے کہ ھمیشہ کے لیے سوگ کے کپڑوں میں لپٹی ھوئی نہ بیٹھی رھے بلکہ اس کا فرض ھے کہ جدّ و جُہد کے لیے کھڑی

ہو جائے اور اپنے مصالح اور مفاد کی نگہبانی کرے اور جو مرتبہ اس کے شایانِ شان ہے اس میں اپنا ٹھکانا بنائے.

پول فیری، لورین Lorraine کا باشندہ تھا۔ ۱۸۷۱ء کے ناگوار حادثے کا اس پر ضرور قوی اثر ہوا ہوگا، ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ موجودہ دور کے فرانسیسیوں پر فرانس کے کچھ حقوق ہیں، جنھیں انھیں پورا کرنا چاہیے۔ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ فرانس کہیں اپنے شایانِ شان مرتبے سے نیچے نہ آ جائے۔ بلاد الجزائر کے ساتھ اس کے جو مفاد وابستہ ہیں اور اس کی سرحدوں کی حفاظت اور تونس کے اندر اپنے مفاد کی نگہبانی ان سب کا تقاضا یہ ہے کہ تونس کے بارے میں کوئی قطعی کارروائی کی جائے ورنہ پھر اٹلی تونس کی طرف سبقت کر بیٹھے گا؛ یعنی اس کی رائے یہ تھی کہ فرانس کو اپنے تاریخی حقوق کے زیادہ سے زیادہ امکانی حصے پر متصرف ہو جانا چاہیے۔ کسی حق کو ترک نہیں کرنا چاہیے، کسی سے دست بردار نہ ہونا چاہیے۔ اس ذہن کی بدولت اس پر اپنے ابنائے وطن کے ہاتھوں بہت سی مصیبتیں پڑیں.

یہ بھی ظاہر ہے کہ فیری Ferry کو اپنی حکمتِ عملی میں صدرِ عظیم جمہوریت گیمبیٹا Gambetta سے بھی، جو اپنے آخر ایام میں جرمنی کے ساتھ انتقامی جنگ کے خیال سے کسی قدر ہٹ چلا تھا، تائید حاصل ہوئی.

ان مختلف اسباب نے فیری کو اس بات پر آمادہ کیا کہ تونس میں اپنے حدودِ عمل کو تا حدامکاں مخفی رکھے اور تونس کے متعلق فرانس کی ذمے داریوں کا دائرہ تنگ کرے.

فرانس کی فوجیں تونس میں اپنی سرحدوں کی حفاظت کے بہانے داخل ہوئیں اور بای کو عہد نامۂ [قصر سعید یا] باردو Bardo (مئی ۱۸۸۱ء) پر دستخط کرنے پر مجبور کیا۔ اس معاہدے کی رو سے فرانس کو احتلالِ تونس اور مسائلِ حربیہ کے انصرام کا حق حاصل ہوا۔ لیکن اس میں تونس کے فرانس کے تحت الحمایۃ (Protectorate) آ جانے کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔ سفاقس میں شورش ہو جانے کے بعد بای کو ایک اور عہد نامے پر دستخط کرنا پڑے، جس کی رو سے فرانس کو تونس پر حمایت اور داخلی امور میں دخل دینے کا حق حاصل ہو گیا۔ ۱۸۸۴ء میں ضروری اداری انتظامات کا سامان مکمل ہو گیا اور تونس کا عہدِ جدید شروع ہوا.

تونس میں فرانس کا طرزِ عمل اس طرزِ عمل کے جس پر وہ الجزائر میں کاربند تھا مخالف تھا۔ تونس میں حیاتِ اسلامیہ کو بالارادہ یا بلاارادہ ایسی شکست دینے کی کوشش نہیں کی گئی جیسی الجزائر میں کی گئی۔ تونس فرانس کے زیرِ اقتدار ایک تحت الحمایۃ (protectorate) علاقہ ہے، جس کے نظامِ حکومت کا چوکھٹا تونسی ہے۔ برخلاف اس کے الجزائر خود فرانس کا ایک ''ٹکڑا'' ہے۔ الجزائر فرانس کی نوآبادی کا خطہ ہے، جہاں ہزاروں یورپی کاشتکار (فرانسیسی اور غیرفرانسیسی) بستے ہیں اور زمین کی کاشت کرتے ہیں۔ مگر تونس دولت کمانے کی سرزمین ہے، جہاں فرانسیسی اور غیرفرانسیسی یورپیوں کے بڑے بڑے سرمایے لگے ہوے ہیں۔ تونس میں اطالوی نسل کے باشندے ایسے ایسے جھگڑے اٹھاتے رہتے ہیں جن کا اطالیہ اور فرانس کے باہمی قومی تعلقات پر اثر پڑتا ہے۔ الجزائر میں اس قسم کی مشکلات نہیں ہیں۔ تونس میں فرانسیسی حکمرانی کے قواعد و قوانین کے مرتب کرنے کا سہرا پال کامبون Paul Combon کے سر ہے، جو تونس

میں ۱۸۸۲ اور ۱۸۸۶ء کے درمیان فرانس کا مقیمِ عام (Resident General) تھا۔ ذیل میں ہم فرانس اور تونس کی دو عملی حکومت کی موجودہ صورت کو ایک نقشے کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں :-

عنصر تونسی — عنصر فرانسیسی

بای — مقیمِ عام

تین وزیر — چار وزارتیں اور پانچ ادارات عامّہ

مجلس کبیر

(اس کی دو قسموں میں سے ایک میں ۴۴ فرانسیسی شامل ہیں اور دوسری میں ۱۸ تونسی) (اسے بجٹ کے بعض حِصّوں پر رائے دینے کا حق حاصل ہے).

۵ صوبائی مجلسیں

(اس کی دو قسموں میں سے ایک میں ۱۱ فرانسیسی اور دوسری میں ۱۰ تونسی شامل ہیں)

یہ مجالس استشاری ہیں

مجالس قیادات

(یہ مجالس انتخابی استشاری ہیں اور ان کے ممبر فقط تونسی ہوتے ہیں)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرانس کی تونسی حکمتِ عملی کا رجحان اس طرف ہے کہ فرانسیسی اور ملکی باشندے مل جل کر مشترکہ مصالح خصوصاً اقتصادی معاملات کو ترقّی دینے کی کوششیں کریں ۔ اس تنظیم میں قومی پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے اور اس سے سیاسی زندگی کا نموّ معطّل ہو جاتا ہے۔ بظاہر اہلِ ملک کو شدید احساس ہے کہ اس تنظیم سے ان کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں اور اس سے اسی قسم کی تحریکات معرضِ وجود میں آئی ہیں جو دیگر اقطارِ اسلامیہ میں دیکھی جاتی ہیں ۔ مقصد یہ کہ قومی سیاسی پروگرام (برنامج) غربی اصول و نظریات کے مطابق صورت‌پذیر ہو ۔ ابھی تک ہم اس کے منتظر ہیں کہ مصر، تونس وغیرہ میں زیادہ گہری اور پائدار قسم کی تحریکیں دیکھیے کب شروع ہوں ۔ وہ تحریکیں جو کامل اسلامی زندگی کی بحالی کی فجر کہلا سکیں ۔ اس فجر کی روشنی کی ابتدائی کرنیں ابھی تک نمودار نہیں ہوئی ہیں ۔

مآخذ : [(الف) مجموعہ ھاے دستاویزات : (۱) Ministère des Affairs Etrangères. Documents diplomatiques françaises ، پہلا سلسلہ، ج ۱ و ۲ و ۳؛ شائع شدہ در ۱۹۳۰ و ۱۹۳۱ء؛ ان کا تعلّق سالھاے ۱۸۷۱ تا ۱۸۸۱ء سے ہے؛ (۲) جرمنی کی سیاسی دستاویزوں کا فرانسیسی ترجمہ بنام La politique extérieure de l' Allemagne ، ج ۱ و ۲ و ۳؛ ان کا تعلّق سالھاے ۱۸۷۰ تا ۱۸۸۲ء سے ہے، شائع شدہ در ۱۹۲۷ و ۱۹۲۸ء؛ (۳) Temperley and Penson : Foundations of British foreign Policy، کیمبرج ۱۹۳۸ء؛ یہ بہت اچھے چنے ہوے اقتباسات ہیں جن سے برطانیہ کی خارجی سیاست کی اساس کی خوب وضاحت ہوتی ہے؛

(ب) مطالعات و دراسات : (۱) ڈاکٹر محمد مصطفٰی صفوت : Tunis and the Powers ، غیر مطبوعہ رسالہ جس کی بنا اصلی مآخذ پر ہے ۔ اس کا موضوع ہے تونس اور دُوَل عظمٰی کے باھمی تعلّقات؛ (۲) Stephen H. Roberts : History of French Colonial Policy ، دو جلد، ۱۹۲۹ء ۔ اس میں استعمارِ فرانس کی تاریخ (۱۸۷۰ تا ۱۹۲۵ء) سے بہت پاکیزہ علمی بحث کی گئی ہے ۔ اُن اُمَم اسلامیہ سے بحث کرنے والا جو فرانسیسی اقتدار کے ماتحت آئیں اس کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتا؛ (۳) James Headlam Morley : (یہ مؤلّف

ایک وقت میں وزارتِ خارجہ برطانیہ کا مشیرِ مسائلِ تاریخی تھا) : *Studies in Diplomatic History*، ۱۹۳۰ء، مطالعات مہمّہ کا مجموعہ ہے، ایک میں انگلستان اور مصر کے تعلّقات کی تاریخ ہے اور ایک میں ۱۸۷۸ء کے اندر انگریزوں کے قبرص (Cyprus) پر قبضہ جمانے کی کیفیت کا بیان ہے؛ (۴) R.W. Seton-Watson : *Disraeli, Gladstone and the Eastern Question*، لنڈن ۱۹۳۵ء؛ (۵) J. L. de Lanessan : *La Tunisie*، پیرس ۱۹۱۷ء.

(شفیق غربال)

[ترجمه از دائرة المعارف الاسلامیة، عربی]

[جس دور کا سطورِ بالا میں ذکر ہوا اس میں اور اس دور کے متصل بعد جس شدید احساس کا اوپر (ص ۸۴۳) ذکر ہوا اور جو شکایات اہلِ تونس کو پیدا ہوئیں اور قومی نقطۂ نظر سے جو حالات ظہور میں آئے اور جو نتائج ان پر بالآخر مترتّب ہوے ان کی تفصیل یہاں بیان نہیں ہو سکتی - مختصراً چند باتیں درج کی جاتی ہیں : جس طرح پاکستان و ہند، مصر و شام اور دیگر ممالک میں ہوا، تونس میں بھی مغربی تعلیم سے مغربی تصوّراتِ حرّیت ذہنوں میں مرکوز ہوے اور مغربی طریقوں کو حصولِ حرّیت کے لیے اختیار کیا گیا - پہلی عالمی جنگ سے پیشتر ہی تحریکِ حرّیت شروع ہو چکی تھی لیکن اس جنگ کے بعد ان تمام ملکوں میں اس تحریک نے زور پکڑا، چنانچہ تونس میں بھی یہی ہوا مگر جب "حزبِ دستور"، جن کا مقصد حکومتِ خوداختیاری کا حصول تھا، پہلی عالمی جنگ کے بعد ہاتھ پاؤں نکالنے لگا (ص ۸۰۰، وسطِ عمود ۲) تو فرانسیسی مقیمِ عام لوسیان سنت (۱۹۲۱ - ۱۹۲۸ء) نے اسے دبا دیا اور لیڈروں کو ملک بدر کر کے تحریک ختم کر دی - ۱۹۳۰ء میں حزبِ "نو دستور" وجود میں آیا، جن کا مقصدِ اہمّ یہ تھا کہ ہندوستان کی نیشنل کانگرس کی طرح عوام تک پہنچا اور انھیں منظّم کیا جائے نیز یہ کہ الجزائر وغیرہ کے قوم‌پرستوں کو مدد دی جائے - حکومتِ فرانس نے ان پر سختی کی اور بہت سی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور دستور اور نودستور دونوں کو ختم کر دیا گیا - مگر ساتھ ہی بعض صلح جویانہ اقدامات بھی کیے گئے، اس لیے کہ دوسری عالمی جنگ کا خطرہ نظر آنے لگا تھا - جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو تونس اور متّصلہ علاقے جدال و قتال کی لپیٹ میں آ گئے - پہلے اتّحادی آ دھمکے پھر جرمن فوجیں ہوائی جہازوں میں آئیں - جب ۱۹۴۳ء میں جرمن اور اطالوی فوجوں کی حالت سقیم ہو جانے کے بعد فرانسیسی پھر تونس میں واپس آئے تو قوم پرستوں نے دوبارہ سر اٹھایا مگر انھیں پھر بزور دبا دیا گیا - بالآخر تمام قوم پرست احزاب نے باتّفاقِ کامل استقلال کا مطالبہ کیا (۱۹۴۶ء) - قوم پرستوں کو حکومت سے کئی شکایات تھیں : (ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے قوافل العروبة)، وہ کہتے تھے کہ فرانس کی روش ان معاہدات کے خلاف تھی جو بای کے ساتھ ہوے تھے - حکومت استعماری حکومت ہے اور عملاً مقیمِ عام اور عہدہ‌داران حکومت ہی کے ہاتھ میں ہے، اہلِ ملک کا حصّہ اس میں براے نام ہے، فرانسیسی ساکنانِ تونس کو ان کے تناسب سے بہت زیادہ عہدے ملے ہیں؛ چنانچہ ایک تہائی کو حکومت میں عہدے دیے گئے ہیں - انھیں یہ بھی شکایت تھی کہ ۱۹۱۴ اور ۱۹۳۹ء کی عالمی جنگوں میں تونسی فوجوں کو معاہدۂ قصرِ سعید کے خلاف محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا، نیز یہ کہ تونس کو قرضوں سے زیر بار کر دیا گیا، فرانسیسی کمپنیوں کو خصوصیّت کے ساتھ کان کنی کے حقوق عطا کیے گئے، انھیں بڑی بڑی رقمیں ریلیں جاری کرنے کے لیے دیں

حالانکہ ان ریلوں سے فائدہ فقط انہی کمپنیوں کو پہنچتا تھا مگر ریلوں کے مصارف کا بوجھ تونس کے خزانے کے کندھوں پر آ پڑا - نیز یہ کہ درآمد و برآمد کے محصول کے قانون ایسے بنائے گئے کہ تجارتی کاروبار میں حد سے زیادہ نفع اندوزی کا موقع فقط فرانسیسیوں کے ساتھ آ گیا - اوپر ذکر آ چکا ہے (ص ۸۱۲، عمود ۱، سطر آخر) کہ درآمد پر محصول بھی اس طرح لگایا جاتا تھا کہ فرانسیسی پیداوار کو فائدہ پہنچے - اوقاف اسلامی پر بھی ٹیکس لگا دیے گئے - فرانسیسیوں کو ملک میں آباد کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں تقریباً ۱۹۰۰ء سے بہم پہنچائی گئیں (دیکھیے ص ۷۹۹، عمود ۱، پائین صفحہ)؛ چنانچہ زرعی زمینوں کا تیسرا حصّہ بآسانی فرانسیسیوں کے پاس پہنچ گیا - ان زمینوں پر لگان کچھ نہ تھا - فقط بعض قسم کی پیداوار میں سے ایک فی صد حصّہ نکالنا پڑتا تھا، جب کہ تونسیوں کو اراضی پر اور پیداوار پر بڑے بڑے بھاری ٹیکس دینا پڑتے تھے - اہلِ ملک کو یہ بھی شکایت تھی کہ تعلیمات پر قبضہ فرانسیسیوں کا تھا (دیکھیے صفحات بالا میں ص ۸۱۸، عمود ۱، پائینِ صفحہ و ۸۲۹، عمود ۲) - فرانسیسی زبان اور ادبیات پر زور تھا، عربی کو ضعف پہنچایا جاتا تھا - مدارس میں سیاسی تعلیم ممنوع قرار دی گئی تھی - مدّتوں کتابوں کی طباعت اور تجارت بھی آزاد نہ تھی (دیکھیے ص ۸۲۹، محلِ مذکور) اور صحافت کی آزادی کا تو کیا ذکر ہے - سب سے زیادہ وجہِ شکایت یہ تھی کہ نو آبادکاروں نے ملکیوں سے غلاموں کا سا سلوک کیا - مثال کے طور پر مجالسِ استشاری، مجلسِ کبیر وغیرہ کا حال ملاحظہ ہو، جن کا ذکر ص ۸۱۰ ببعد پر ہوا - ان کی ترکیب، فرانسیسی اور ملکی اجزاء کی علیحدگی اور ان جماعتوں کے اختیارات کی تفصیل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں اہلِ ملک کو کس قدر فروتر مقام حاصل تھا - عالمی جنگ کے بعد اہلِ ملک کو گمان ہوتا تھا کہ فرانس تونس کو بھی الجزائر کی طرح فرانس کا جزو قرار دینا چاہتا ہے، اس لیے بعد کے سالوں میں اہلِ ملک نے تقاضا کیا کہ نیابی مجلس ہونی چاہیے اور کاروبارِ حکومت اہلِ ملک کی طرف بتدریج منتقل ہونے چاہییں - مستبدانہ قوانین جو متعدد سالوں سے جاری تھے ان کی تنسیخ اور حرّیاتِ عامّہ بحال کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا اور جنوبی حصّے میں، جسے فوجی منطقہ قرار دیا گیا تھا، (ص ۸۰۸، عمود ۲، پائینِ صفحہ) فرانسیسی فوجی چوکی کے وجود پر احتجاج کیا گیا - ۱۹۴۶ء کے بعد کے سالوں میں کچھ اصلاحات ہوئیں مگر فرانسیسی حکومت کا سست ردِّ عمل چونکہ قوم پرستوں کے مزاج کے مطابق نہ تھا ان کا جوش بڑھتا گیا اور جب حکومت نے پھر زعماء کی گرفتاریاں شروع کیں تو ملک میں خوف گردی اور دہشت انگیزی شروع ہو گئی، تب کہیں فرانس ملک کو داخلی آزادی دینے پر آمادہ ہوا (۱۹۵۴ء) - آخر سابقہ معاہدے یعنی معاہدہ ہای قصرِ سعید (مئی ۱۸۸۱ء) و المَرسٰی (۸ جون ۱۸۸۳ء) منسوخ ہوئے اور ان کی جگہ پیرس کی قراردادوں (Conventions) نے لی (جون ۱۹۵۵ء)، جس سے مملکتِ تونس کی داخلی خوداختیاری فرانس نے مان لی اور بالآخر مارچ ۱۹۵۶ء کو قراردادوں کی تنسیخ کے بعد تونس کا کامل استقلال تسلیم کیا - اس سال بعض مسائل معلّق چھوڑے گئے، جن میں سے کچھ وسط ۱۹۶۱ء میں بھی ابھی معلّق ہیں؛ مثلاً مسئلۂ انخلاء بنزرت، جو فرانسیسی بحری امارت کا صدر مقام ہے (دیکھیے ص ۸۰۹، عمود ۲) اور ابھی تک فرانس کے قبضے میں ہے اور صحرائے کبیر کے اس حصّے کے قبضے کا مسئلہ جو تونس کی جنوبی سرحد کے متّصل ہے - عام انتخاب ہوئے - مجلسِ

مؤسسان (Constituent Assembly) نے ملوکیت کو معزول اور منسوخ کر کے (جولائی ۱۹۰۷ء) جمہوریت کا اعلان کیا اور حبیب بورقیبہ کو پہلا صدرِ جمہوریہ منتخب کیا، آیینِ مملکت شائع ہوا (جون ۱۹۰۹ء) اور نومبر ۱۹۰۹ء میں مجلسِ ملّی کا انتخاب ہوا۔ اب ملک ۱۴ ولایتوں میں منقسم ہے (فرمان جون ۱۹۰۹ء، قبّ ص ۸۰۸، عمود ۲، پائینِ صفحہ)۔ ہر ولایت کا حاکم 'والی' کہلاتا ہے اور اس کے معاون 'معتمد' کہلاتے ہیں۔ آئین کی رو سے جمہوریتِ تونس کا مذہب اسلام ہے۔ تعلیم وزارتِ معارفِ ملّی کے ماتحت ہے۔ ۱۹۰۶ء میں تونسی عسکرِ ملّی بھرتی ہونے لگا مگر دو سال بعد تک اس کی تعداد چھے ہزار سے زائد نہ تھی۔ ملک کی تجارت زیادہ تر فرانس اور الجزائر کے ساتھ ہے۔ جو سکّہ اب مروج ہے اسے دینار کہتے ہیں۔

مآخذ: (۱) محمد جمیل بیہم: قوافل العروبة و مواکبها خلال العصور، بیروت ۱۹۴۸ء، ۱: ۱۸۸ ببعد؛ (۲) انسائکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۶۱ء)، ۲۲: ۵۰۸ ببعد؛ (۳) Whitaker's Almanack for 1961، لنڈن ۱۹۳۹ء، ص ۹۳۰، بذیل Tunisia؛ (۴) *The Statesman's Year-Book*، لنڈن ۱۹۶۰ء، ص ۱۴۲۸ ببعد، بذیل Tunisia.

[ادارہ]

٭ **التّونسی**: محمد بن عمر بن سلیمان، انیسویں صدی کا عربی مصنف۔ وہ ایک ایسے تونسی خاندان کا فرد تھا جو علوم و فنون بالخصوص علومِ دینیہ کے ساتھ بہت شغف رکھتا تھا۔ اس کا دادا سلیمان نسّاخ تھا، یعنی کتابیں نقل کیا کرتا تھا اور جب وہ حج کے لیے مکّۂ مکرّمہ کی طرف روانہ ہوا تو اپنے تینوں بیٹوں کو اپنے ماموں احمد بن سلیمان الأزہری کی سرپرستی میں چھوڑ گیا، جو علوم دینیہ کے بڑے عالم تھے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد چونکہ اس کا مال و متاع سب کھو گیا وہ تونس واپس نہ آیا، بلکہ اوّل اوّل کچھ روز جدّے میں مقیم ہوا، جہاں وہ نسخِ کتب سے بسرِ اوقات کرتا تھا۔ یہاں سنّار کے چند لوگوں سے اس کی ملاقات ہو گئی اور وہ ان کے مشورے سے ان کے ملک میں چلا گیا۔ والیِ ملک نے دل سے اس کی آؤ بھگت کی اور اسے مکان اور کچھ زمین دے کر اس کی معاش کا باقاعدہ سامان کر دیا۔ سلیمان نے سنّار ہی کی ایک عورت سے شادی کر لی، جس کے بطن سے ایک لڑکا (احمد زرّوق) اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

سلیمان کا دوسرا لڑکا عمر، اس کی پہلی بیوی سے تھا، جس سے اس نے تونس میں شادی کی تھی۔ جب یہ لڑکا جوان ہوا تو وہ اپنے جدّ کے بھائی کے ساتھ حجِّ بیت اللہ کو روانہ ہوا اور راستے میں اتفاقیہ طور پر اس کی ملاقات اپنے باپ سے ہو گئی، جو کاروبار کے سلسلے میں ایک قافلے کے ساتھ سنّار سے قاھرة جا رہا تھا۔ مکّے سے واپسی پر، جہاں اس کے جدّ کا بھائی فوت ہو گیا، عمر جامعۂ ازہر میں تعلیم پانے کی غرض سے قاھرة واپس آیا۔ اس کے بعد وہ سنّار میں اپنے والد سے ملنے گیا اور ازھر میں واپس آ کر تحصیلِ علم میں مشغول ہو گیا۔ ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء میں اس نے شادی بھی کر لی۔ دو سال بعد وہ اپنے وطن مألوف (تونس) واپس آیا جہاں اس کا بیٹا محمد [بن عمر] (التونسی) ۱۲۰۴ھ / [۱۷۹۰ء] میں پیدا ہوا۔ عمر صرف تین سال تک تونس میں قیام پذیر رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے بال بچوں کو لے کر دوبارہ قاھرة چلا گیا تاکہ الازھر میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ وھاں وہ جلد ھی رواق المغاربة کا نقیب منتخب ہوا (قبّ مادّۂ الأزھر: تقریباً آخرِ شقّ II)، یعنی وہ المغرب کے طلبہ کی جماعت کا محافظ یا نگران بن گیا۔ ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۷ء میں عمر کو اس کے

سوتیلے بھائی نے والد کی وفات اور اپنی زبون حالی کی اطلاع دی ۔ اس پر وہ فوراً سِنّار پہنچا اور پھر کبھی اپنے گھر واپس نہ آیا ۔ البتہ گھر والوں کی خوش قسمتی سے اسی سال عمر کا چھوٹا بھائی طاہر کاروبار کے سلسلے میں قاھرۃ آ گیا؛ وہاں سے اُس کا ارادہ بعد میں حج کو جانے کا تھا ۔ اُس نے اپنے بھائی کے گھر والوں کو اپنی کفالت میں لے لیا اور محمّد کو جو سات سال کی عمر میں قرآن [کریم] ختم کر چکا تھا الازھر میں تعلیم کے لیے بھیج دیا ۔ جب طاھر مکّے چلا گیا اور محمّد کی گذران کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو اس نے بلادالسودان میں جا کر اپنے باپ کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ قاھرۃ میں یہ خبر آئی تھی کہ سِنّار میں پہنچنے کے بعد وہ آگے دارفُور کو چلا گیا تھا ۔ دارفُور کے ایک قافلے میں، جو قاھرۃ آیا، اُسے اپنے باپ کا ایک دوست مل گیا جو اُس کی درخواست پر اسے دارفُور لے گیا ۔ یہ ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء کا واقعہ ہوگا ۔ دارفور میں پہلے تو وہ اپنے باپ کے سوتیلے بھائی احمد زرّوق سے ملا جو اسے جلتُو (از اَعمالِ ابوالجَدُل) لے گیا جہاں اس کا باپ عمر رہتا تھا ۔ اسے دربار میں بڑی وجاھت حاصل تھی ۔ وہ مالدار اور خوش حال ہو چکا تھا اور وہاں نئی شادی کر کے کنبےدار بھی بن چکا تھا ۔ بادشاہ وقت عبدالرحمٰن بن احمد (م ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء، قبّ فہرست شاہانِ دارفُور، بذیلِ مادّۂ دارفُور) کی فرمائش پر عمر نے دینیات اور فقہ کی دو کتابوں کی شرح لکھی (قبّ *Voyage au Dar-Four*، ص ۱۰۷ : عمر کی دوسری تصانیف کے متعلّق دیکھیے ص ۴۲۳) ۔ جب محمد دارفور پہنچا تو محمد کُرّا (Nachtigal : *Sahāra und Sudān*، ج ۳، برلن ۱۸۷۹ء : ص ۳۸۷، اسے ابوشیخ کُرّا لکھتا ہے) وہاں کے خرد سال بادشاہ محمّد الفضل کا نائب السلطنت (' ریجنٹ ') بن کر حکومت کر رہا تھا ۔ بعد میں کُرّا ایک بغاوت کے دوران میں مارا گیا ۔ زرّوق نے محمد کو کُرّا کی خدمت میں پیش کیا، جو اس سے مہربانی سے پیش آیا ۔ کُرّا نے عمر کے لیے بھی اس وعدے پر تونس کے سفر کا انتظام کر دیا کہ وہ اپنے رشتےداروں سے مل کر واپس آ جائے گا ۔ عمر اپنی عدم موجودگی میں جلتُو میں اپنی جائداد کا انتظام اپنے لڑکے محمّد کے سپرد کر گیا ۔

عمر پہلے وادای گیا، جہاں وہ چند سال تک مقیم رہا، کیونکہ اس نے مقامی بادشاہ سابون سلطان کے دربار میں رسوخ پیدا کر لیا اور وہ وہاں نہایت اعلٰی عہدے یعنی منصبِ وزارت پر فائز ہو گیا اور قریۂ اَبلِی میں اسے زمین بھی مل گئی ۔ وہاں اپنے بیٹے کا بے فائدہ انتظار کرنے کے بعد اُس نے تونس کی طرف سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا ۔ محمّد دارفور میں اپنے والد کی روانگی کے بعد تقریباً ساڑھے سات سال تک مقیم رہا اور بلاد دارفُور اور اھلِ بلاد سے پوری طرح واقف ہو گیا ۔ دارفُور اور وادای کے درمیان جنگ ہوئی ۔ اُس کے خاتمے ھی پر محمّد وادای جا سکا، وہ اس طرح کہ سلطانِ دارفور نے اُسے ایک وفد میں شامل کر کے وادای بھیجا ۔ وہ پہلے وَارَہ میں آیا، جہاں اُس وقت سلطان سابُون رہتا تھا ۔ سلطان اُس سے بڑی مہربانی سے پیش آیا، اُسی طرح جس طرح وہ اس کے باپ کے ساتھ پیش آیا تھا؛ چنانچہ محمّد کو اپنے باپ کی طرح وادای میں بھی خاصے عرصے تک ٹھیرنا پڑا لیکن وہاں کے حالات اس کے لیے مشکل سے مشکل‌تر ہونے لگے ۔ پہلی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے باپ عمر نے اپنی روانگی کے وقت قریۂ اَبلِی میں اپنے گھر اور بال بچوں کی نگرانی اپنے بھائی احمد زرّوق کے سپرد کر دی تھی جو عمر کے بعد وادای آ گیا تھا،

مگر احمد زرّوق عمر کے مال و متاع، اس کے مکان اور زمین وغیرہ پر پوری طرح قابض ہو گیا اور اُس کے بیٹے محمّد کو قُوت لایموت کے سوا کچھ نہ دیتا تھا ۔ دوسری مشکل یہ پیش آئی کہ احمد الفاسی سے (اس کے متعلّق قب *Voyage au Ouadāy*، ص ٦٦ ببعد، ۹۷م ببعد، ۵۰۸)، جسے عمر کے مشورے سے وزیر مقرر کر دیا گیا تھا، رنجش پیدا ہو گئی ۔ اس نے محمد کے خلاف سابُون کے کان بھر دیے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اسے شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھنے لگا اور اُس سے نظرِ عنایت پھیر لی ۔ عمر اپنے بیٹے کی درخواست پر وادای آیا اور وہ احمد الفاسی کو موقوف کرانے میں کامیاب ہو گیا لیکن جونہیں عمر رخصت ہوا احمد اپنے منصب پر دوبارہ سرافراز ہو گیا ۔ ان حالات میں سلطان کی اجازت کے ملتے ہی محمد فی‌الفور وادای سے روانہ ہو گیا، جہاں وہ اٹھارہ ماہ تک مقیم رہا تھا ۔ وہ ایک قافلے کے ساتھ شامل ہوا جو فزّان جا رہا تھا اور اس کے ہمراہ تُوبُو (تِبِسْتی) کے ملک سے ہوتا ہوا فزّان کے پایۂ تخت مرزُوق میں وارد ہوا ۔ یہاں وہ تین ماہ تک مقیم رہا اور اس عرصے میں یہاں کا بادشاہ مُنْتَصِر فوت ہو گیا ۔ اس نے اپنا سفر جاری رکھا اور مرزُوق سے وہ پہلے طرابلس اور آخرکار سَفاقِس کے راستے سے ۱۲۲۸ھ / ۱۸۱۳ء کے قریب تونس پہنچا ۔ اس وقت سے تقریباً دس سال پہلے وہ قاھرۃ سے بلادِ سُودان کی طرف گیا تھا ۔

محمّد نے پہلے تو تونس ھی میں سکونت اختیار کر لی لیکن بعد میں وہ قاھرۃ چلا آیا اور یہاں آ کر نائب‌السلطنت (وائسرائے) محمّد علی کی ملازمت میں داخل ہوا ۔ جب ۱۸۲۴ء میں محمّد علی پاشا نے اپنے سوتیلے بیٹے ابراھیم کی قیادت میں موریا Morea کو فوج بھیجی تو محمّد بھی واعظ کی حیثیت سے ایک پیادہ دستے کے همراہ گیا اور اس مہم کے خاتمے تک اس میں موجود رہا (قب *Voyage au Darfour*، ص ٦)؛ چنانچہ اس نے مِسِّیلونگی Missolonghi کے محاصرے (۱۸۲۵ تا ۱۸۲٦ء) کے ایک واقعے کا ذکر *Voyage au Ouadāy*، ص ٦٣٣ تا ٦٣۵ میں کیا ھے ۔

جنگ کے خاتمے پر محمد کو دانش کدۂ بیطاری (ویٹیرینری کالج) میں، جسے محمّد علی نے ابوزَعْبَل (قاھرۃ کے شمال مشرق) میں قائم کیا تھا، یورپ کی طبّی (علی الخصوص اصولِ دواسازی کی) کتابوں کے عربی تراجم پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ۔ وھاں ڈاکٹر پیرون Perron کے مصر آنے کے بعد تونسی سے اس کی واقفیّت ہو گئی ۔ ڈاکٹر موصوف اس سے عربی پڑھا کرتا تھا اور اسی نے محمّد کو ترغیب دی کہ وہ بلاد السودان کی سیاحت کی سرگذشت قلمبند کرے، اس سے اُس کی پہلی غرض یہ تھی کہ عربی کے مطالعے کے لیے ایک مفید کتاب ہاتھ آئے ۔ جب ۱۸۳۹ء میں پیرون قاھرۃ میں ''قصرالعَین'' کے طبّی مدرسے کا ڈائرکٹر [مدیر] بن گیا تو اس کی سفارش پر محمّد کو وھاں کے اصلاحِ تراجم کی ریاست سپرد کی گئی ۔ الفریڈ فون کریمر، جو ۱۸۵۰ء میں پہلی مرتبہ مصر میں آیا، محمّد کا ذکر اپنے اساتذہ میں کرتا ھے، جس کی وہ نہایت قدر کرتا تھا (قب فون کریمر A. v. Kremer : کتاب مذکور، قب مآخذ) ۔ وہ یہ بھی لکھتا ھے کہ محمّد قدیم عربی ادب کی اھمّ تصانیف کی تصحیح و طباعت کے کام میں بھی مشغول رہتا تھا؛ مثلاً کُتُب ذیل کی: المقامات الحریریّۃ [رک بآں]، المُستطْرَف از الابْشیہی [رک بآں، غالباً اس سے مراد بولاق کا ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵٦ء والا مطبوعہ نسخہ ھے] ۔ بقول یومار Jomard (قب *Voyage au Darfour*، ص x) محمّد کو فیروزآبادی [رک بآں] کی القاموس کی تصحیح (اڈیشن تیار کرنے) کے سلسلے میں

کلکتے والے اڈیشن ۱۲۳۰ھ / [۱۸۱۴-۱۸۱۵ع] کی نظر ثانی پر مقرر کیا گیا تھا؛ چنانچہ اس مطلب کے لیے اس نے سات یا آٹھ قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے متن درست کیا - یہ نیا اڈیشن مطبع بولاق سے ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵-۱۸۵۶ع میں شائع ہوا - اپنی عمر کے آخری ایام میں شیخ محمد ہر جمعے کے روز مسجد زینب میں حدیث کا درس دیا کرتا تھا - (بقول فون کریمر: کتاب مذکور) وہ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ع میں قاہرۃ میں فوت ہوا .

بلاد سوداں کے طویل قیام کے دوران میں محمد التونسی جن علاقوں میں گیا وہاں کے لوگوں کے عادات و خصائل کے متعلق بہت سے امور اس کے مشاہدے میں آئے اور بہت سے مسائل کے متعلق اس نے تحقیق و تفتیش کی - ان سب معلومات کو اپنے تجارب کے ساتھ اس نے پیروں Perron کی تحریک پر دو ضخیم جلدوں میں قلمبند کیا، جن کا ترجمہ پیروں نے فرانسیسی زبان میں کیا - یہ تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(۱) [سیاحت نامۂ دارفور] *Voyage au Darfour par le Cheikh Mohammad Ebn Omar el-Tounsy* [تونسی کی شائع صورت تنسی ہے؛ قب Stumme: *Gramm. des tunesisch. Arabisch*، لیپزگ ۱۸۹۶ع، ص ۶۶] *Réviseur en Chef à l'École de Médecine du Caire, traduit de l'Arabe par Dr. Perron, Directeur de l'École de Médecine du Caire*، پیرس ۱۸۴۵ع، (lxxxviii، ۴۹۲)، قطع نیم وزیری یعنی ہشت برگی (8°، مع نقشہ) - اس کتاب کا دیباچہ یومار Jomard نے لکھا (ص i تا lxxi) اور یہ دیباچہ الگ بھی بعنوان ذیل ۱۸۴۵ع میں پیرس سے شائع ہوا : *Observations sur le Voyage au Darfour, suivies d' un Vocabulaire de la Langue des Habitants et de Remarques sur le Nil-Blanc supérieur*، پیرس ۱۸۴۵ع -

پیروں اس سے پہلے اس کتاب کے متعلق کوائف اور اپنے ترجمے کے نمونے *J. A.*، سلسلہ ۳، جلد ۸، ۱۸۳۹ع : ص ۱۷۷ تا ۲۰۶ (خط بنام J. Mohl) میں اور *Bibliothèque universelle de Genève*، سلسلۂ جدید، سال پنجم، ج ۲۸، (شمارہ ۵۶)، ۱۸۴۰ع : ص ۳۲۵ ببعد میں شائع کرا چکا تھا - پیروں کی اس اشاعت پر سیر حاصل تبصرہ سیدیو Sédillot نے *J. A.*، سلسلہ ۴، جلد ۷، ۱۸۴۶ع : ص ۵۲۲ تا ۵۴۳ میں کیا ہے .

پیروں نے سیاحت نامۂ دارفور کا عربی متن اپنے قلم سے لکھ کر بعنوان ذیل طبع اور شائع کیا : تشحیذ الأذہان بسیرۃ بلاد العرب و السودان؛ (= *L' Aiguisement de l'Esprit par le Voyage au Sudan et parmi les Arabes*)، پیرس ۱۸۵۰ع، ۳۱۰ صفحات، قطع خشتی یعنی ربعی (4°)، مع ۴ صفحات تمہید بزبان فرانسیسی، ترمیمات ترجمہ و زیادات .

(۲) *Voyage au Ouadāy, par le Cheikh Mohammed Ebn Omar al-Tounsy, traduit de l' Arabe par Dr. Perron*، پیرس ۱۸۵۱ع (lxxv، ۷۵۶ صفحات، قطع نیم وزیری، مع نقشہ اور ۹ تصویردار لوحوں کے) - یومار Jomard نے اس کتاب کے ساتھ بھی ایک لمبا دیباچہ شامل کیا ہے (ص i تا lxxv)، جس میں تاریخی اور جغرافیائی ملاحظات درج ہیں - پیروں نے خود اپنی تمہید میں (ص ۱ تا ۳۰) خاص طور پر بلاد السودان کی تقسیمات سے بحث کی ہے .

پیروں کا ارادہ تھا (محل مذکور، ص ۳۴) کہ التونسی کی دوسری تصنیف کا عربی متن بھی شائع کرے مگر وہ معرض طبع میں نہ آ سکا - پیروں ۱۸۵۰ع میں پیرس واپس آ گیا تھا اور کتاب مذکور کا خطی نسخہ غالباً اس کے پاس موجود تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ۱۸۷۶ع میں جب وہ پیرس میں فوت ہوا تو وہ نسخہ کیا ہوا .

محمد التونسی پہلا شخص ہے جس نے

ہمیں بلاد السودان کے اہم ناحیوں کے متعلق پوری اور معتبر معلومات مہیا کی ہیں ۔ دارفور کے متعلق اس کے زمانے سے پہلے صرف براؤن W. G. Browne نامی سیاح اور مفتش کی چند ناکافی سی یادداشتیں موجود تھیں اور وادای کے متعلق برکہارٹ Burckhardt نے کچھ معمولی سی معلومات حاصل کی تھیں ۔ دسوں سال گذر جانے کے بعد بارث H. Barth اور نختیگال S. Nachtigal ان ملکوں میں گئے اور ان کا بیان زیادہ تفصیل سے اپنی کتابوں میں لکھا۔ التونسی کے معتبر اور قابلِ اعتماد ہونے کے متعلق شک و شبھه کی گنجائش نہیں ہو سکتی کیونکہ پیروں نے دارفور اور وادای کے کئی آدمیوں سے جو قاهرة میں آ کر آباد ہو گئے تھے اس کے بیانات کے متعلق دریافت کیا اور انھوں نے ان کی پوری پوری تصدیق و توثیق کی؛ البتہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شیخ کے بیانِ احوال میں بعض نقائص باقی رہ گئے ہیں ۔ ایک تو مواد کی ترتیب میں نسق کی کچھ خامی ہے، کسی باقاعدہ نظام کا تتبع نہیں کیا گیا ۔ وہ اصل موضوع سے انحراف کرنے کا عادی ہے اور ملک کے مسلمانوں کے عوامی معتقدات کی نسبت (مثلاً جادو وغیرہ کے متعلق) ہر بات بڑی خوش عقیدگی کے ساتھ جلد تسلیم کر لینے کی طرف مائل ہے، تاہم یہ نقائص ایسے وقیع نہیں جتنا یہ نقص کہ وہ جغرافیائی حالات، موضع نگاری، اعداد و شمار اور جوّی کیفیات وغیرہ کے متعلق کوئی صحیح اور مضبوط معلومات فراہم نہیں کرتا (قب تنقیدِ کتاب از بارث Barth : *Reisen und Entdeckungen in Nordund Centralafrika*، جلد ۳، برلن ۱۸۵۹ء : ص ۵۲۵ بعد اور نختیگال، در *Petermanns Geogr. Mitteil*، ج ۲۱، ۱۸۷۵ء : ص ۱۷۶ اور کتاب *Sahara und Sudān*، ج ۳ : ص viii میں) ۔ بہر کیف تونسی نے بلادالسودان کے جن اطراف میں سیاحت کی ان کے متعلق یہ دونوں تصانیف نسلی، ثقافتی اور سیاسی معلومات کا سرچشمہ ہیں، جن کی پوری پوری قدردانی ابھی تک نہیں ہوئی ۔ آخر میں ہم یہ امر بھی بتاکید واضح کرنا چاہتے ہیں کہ شیخ کی یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کا تکملة ہیں؛ وادای کے متعلق اس کی تصنیف طویل تر ہے اور اس میں دارفور کے بارے میں بھی بہت سے معلومات ہیں.

ضمیمے کے طور پر ہم محمد التونسی کے ایک ہم وطن یعنی شیخ زین العابدین تونسی کا مختصر تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جو کئی باتوں میں محمد التونسی سے مشابہ تھا ۔ وہ تعلیم یافتہ اور وسیع المطالعہ شخص تھا ۔ اس نے الازہر میں تعلیم پائی اور اس کے یورپی لوگوں سے مسلسل دوستانہ تعلقات رہے ۔ ۱۸۱۸ یا ۱۸۱۹ء میں جب وہ پختہ سال ہوا تو وہ بلاد السودان کو روانہ ہو گیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس نے (التونسی کی طرح) تقریباً دس سال صرف کیے ۔ اس کا شغل ایک حد تک تبلیغ تھا اور وہ عالمِ دین کی حیثیت سے دیہ بدیہ پھر کر لوگوں کو دین سکھایا کرتا تھا ۔ پہلے وہ سنّار اور کُرْدُفان گیا، پھر خاصی مدّت تک دارفور اور وادای میں مقیم رہا ۔ وہ درس و تدریس سے اوقات بسری کیا کرتا تھا ۔ وادای میں تقریباً تین سال گذارنے کے بعد وہ فِزّان کے راستے تونس واپس آ گیا ۔ اس نے اپنے مشاهدات و تجربات عربی زبان میں ایک کتاب میں لکھے جو زیادہ ضخیم نہیں اور شائع ہو چکی ہے (مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کب اور کہاں چھپی) ۔ استانبول میں ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء میں اس کا ترکی ترجمہ شائع ہوا (قب *Z. D. M. G.*، ۲ : ۳۸۲)۔ ترکی نسخے سے اس کا ترجمہ جرمن زبان میں

G. Rosen نے *Das Buch des Sudan oder Reisen des Scheich Zain el-Ābidīn in Nigritien* کے نام سے کیا، طبع لیپزگ ۱۸۴۷ء۔

اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس سے دارفور اور وادای کی تہذیب و تمدن کے حالات اور معاشرے کی تنظیم کے کوائف معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں وہاں کے دربار کے حالات، فوج کی کیفیت، ایک جنگی مہم کا تذکرہ، مقامی لوگوں، غلاموں اور حبشیوں، تجارت، توہمات اور وہاں کی ایک شادی کے حالات اور اسی طرح اور باتوں کی تفصیلات درج ہیں۔ یہ دلچسپ یادداشتیں گویا محمد التونسی کے کہیں زیادہ مفصل اور مکمل تذکرے کا ضمیمہ ہیں۔ اس میں ایک کھدائی کا بیان جالب نظر ہے، جو زین العابدین نے سلطان کی اجازت سے پاے تخت کے قریب ایک مقام پر کھنڈروں میں کرائی تھی (ص ۴۷ تا ۴۹، ۶۱ تا ۷۵) - زین العابدین وادای سے اس وقت روانہ ہوا جب وہاں ایک دوسرا حکمران تخت نشین ہوا - روزن Rosen کے ترجمے (ص ۱۰۸) میں نئے حکمران کا نام عبدالعظیم دیا ہے - اسے عبدالعزیز پڑھنا چاہیے (قب نختیگال: کتاب مذکور، ۳ : ۲۸۴، جہاں سابون کے ایک پوتے عبدالعزیز کا ذکر ہے)۔

مآخذ: (۱) محمد التونسی کی زندگی اور اس کے خاندان کے حالات کے لیے یہی دو سفرنامے ہماری معلومات کا سرچشمہ ہیں - خاص کر وہ خود نوشت سوانح عمری جو *Voyage au Darfour* (ص ۱ تا ۲۰) کے ابتدائی باب میں درج ہے - اس کے علاوہ متفرق حوالہ جات بھی ہیں، مثلاً دیکھیے کتاب مذکور، ص ۴۸ تا ۴۹ اور سفرنامۂ وادای (*Voyage au Ouadāy*)، ص ۳۷، ۳۹، ۵۰، ۶۲، ۶۶ تا ۶۷، ۱۲۹، ۱۹۹، ۲۱۱ ببعد، ۲۱۵، ۴۷ تا ۴۹۹، ۵۰۸، ۵۱۲ ببعد، ۶۴۳ تا ۶۴۵؛ (۳) یومار Jomard نے التونسی کا جو ترجمہ (*Voyage au Darfour*، ص viii تا x) دیا ہے وہ اغلاط اور فروگذاشتوں سے خالی نہیں؛ قب نیز پیرون کے تعلیقات *Voyage au Darfour*، ص lxxxi تا ixxxii اور (۳) ایلفرڈ فون کریمر : *Aegypten*، لیپزگ ۱۸۶۳ء، ۲ : ۳۲۴ - قب نیز متن مقالہ میں دیے ہوے حوالہ جات کے علاوہ (۴) وسٹن فلٹ، در Lüdde : *Zeitschr. für vergleich. Erdkunde*، ۱ (میگڈبورگ Magdeburg ۱۸۴۲ء) : ص ۶۷ اور (۵) براکلمان : *G.A.L.*، ۲ : ۴۹۱ [تکملۃ، ۲ : ۷۴۸]۔

(شٹرک M. STRECK)

تِہامۃ : ساحلِ عرب کے متصل کا وہ نشیب اور تنگ قطعۂ زمین جو جزیرہ نماے سینا سے شروع ہو کر عرب کی مغربی اور جنوبی جانب کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے - ہمیں تہامۃ کا مفصل ترین حال الادریسی نے بتایا ہے - اس کے قول کے مطابق اس میں سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ گذرتا ہے جو خلیج قُلزُم سے شروع ہوتا ہے اور ان میں سے ایک پشتۂ کوہ مشرق کی طرف چلا جاتا ہے - تہامۃ کی مغربی سرحد پر خلیج قلزم ہے اور مشرقی سرحد پر پہاڑیوں کا ایک سلسلہ، جو شمالاً جنوباً چلا جاتا ہے (جبل السَّراۃ) - یہ صوبہ، جسے تہامۃ کہتے ہیں، بقول ادریسی سَرجۃ سے عدن تک پھیلا ہوا ہے؛ ساحل کے ساتھ ساتھ بارہ دن کی راہ اور سڑک کے راستے پہاڑوں سے لے کر غلافقۃ (نہ الاَبِقۃ) کی سر زمین تک [جو غالباً بیت الفقیہ کے مغرب میں ہے] چار دن کی راہ - تہامۃ کا عریض ترین حصہ جدّہ (بندرگاہ مکّۃ) کا عقبی علاقہ ہے؛ مکّے کو بھی اکثر تہامۃ ہی میں شامل سمجھا جاتا ہے - مکّے کے حسب ذیل مخالیف (districts) تہامۃ ہی میں شامل تصور ہوتے ہیں : [ضَنکان]، عَشَم، بَیش، عَکّ [ابن خُرّداذبہ، ۱۳۳]، گو مصنفین اس مخصوص سمت میں تہامۃ کی وسعت کے بارے میں مختلف الراے ہیں - مثال کے طور پر الاصمعی کو لیں، وہ تہامۃ کو

ذاتِ عِرق [دیکھیے شپرونر - پنکہ : آٹلس، نقشہ ۸۱ ؛ مکّے سے بصرے جانے والی سڑک پر مکّے سے دوسری منزل] سے شروع کرتا ہے ۔ مگر [الشرقی] ابن القطامی اس کی سرحد کو ذاتِ عِرق اور الجُحْفَۃ اور کوہستانِ یمن میں قائم کرتا ہے اور بقول عُمارۃ بن عَقیل تہامۃ اور الغور [''و ھو کلّ ما انحدر سیلہ مغرباً''، بکری، ۱۱] سمندر سے شروع ہو کر حرّۃ سُلَیم اور حرّۃ لیلٰی تک پھیلے ہیں؛ اسی طرح المدائنی کہتا ہے کہ جو شخص وَجْرۃ [دیکھیے شپرونر - پنکہ : آٹلس، نقشۂ مذکور؛ مکّے سے بصرے جانے والی سڑک پر مکّے سے تین منزل پر، بکری، ۸۳۷]، غَمْرۃ [''بازاء وَجْرۃ''، بکری : محلِ مذکور] اور الطائف سے گذر کر مکّے کی طرف آئے وہ تہامۃ کی سر زمین میں داخل ہو چکا ہے، جسے المدائنی حجاز کے جنوب میں بتاتا ہے ۔ [ایک] اور مصنّف کی رائے میں تہامۃ کا علاقہ ذاتِ عِرق سے شروع ہو کر مکّے سے ہوتا ہوا عُسْفان [مکّے سے شمال مغرب کو، اس سڑک پر جو مدینے کو گئی ہے، دیکھیے نقشۂ عرب، سروے اوف انڈیا، ۱۹۰۸ء (مع زیادات و تصحیحات تا ۱۹۱۶ء)] تک چلا جاتا ہے [جو مکّۂ مکرّمۃ] اور مدینۂ [منوّرۃ] کے درمیان ایک مقام ہے ۔ (یہ تمام بیانات یاقوت نے معجم، ۱ : ۹۰۲ میں لکھے ہیں؛ یمنی تہامۃ [الیمن التہامیّۃ یا تہامۃ الیمن] کی وسعت اور وہاں کے لوگوں کے متعلق الھَمْدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب، ص ۵۳ ببعد، ۱۱۹ تا ۱۲۱ میں پوری تفصیل دی ہے) ۔ بہر حال جغرافیہ‌دان تہامۃ کے لفظ کو نہ صرف یہ کہ ساحل البحر، 'غَوْر' (نشیب) اور 'سافلۃ' (زمینِ پست) کا مرادف قرار دیتے ہیں بلکہ اسے یمن، الیمامۃ اور العَروض (B.G.A.، ۸ [التنبیۃ والاشراف] : ۹۷) کے ساتھ ساتھ ایک مستقل جغرافیائی یا سیاسی وحدت قرار دیتے ہیں ۔ اور امر واقع بھی یہی ہے کہ یمن کی تاریخ کے مختلف ادوار میں

تہامۃ اداری لحاظ سے ایک علیحدہ کورہ یا صوبہ شمار ہوتا رہا ہے؛ مثلاً جب ایرانیوں نے یمن کو فتح کیا (یعنی چھٹی صدی میلادی کے اواخر میں) تو اُس قدیم زمانے میں یہی صورت تھی، جو فرض کیا جا سکتا ہے کہ سَبائی نظامِ حکومت کے بقایا میں سے تھی ۔ پھر اس کے بعد کے زمانے میں زیادیہ خاندان کے عہد [۸۱۹ تا ۱۰۱۸ء] میں بھی یہی کیفیت رہی، اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے تہامۃ کو خودمختاری بھی حاصل ہوئی اور اس کا پایۂ تخت زبید قرار پایا (۱۱۵۹ تا ۱۱۷۴ء) اور بعد ازاں صنعاء کے اماموں کے ماتحت یہ دوبارہ علیحدہ صوبہ بن گیا

ابن خُرّداذبہ نے بحیرۂ قلزم کے دونوں طرف کے ساحلوں کی مشابہت کو بالکل صحیح طور پر سمجھ لیا تھا؛ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے حبشہ کے ساحلی علاقوں کو بھی تہامۃ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے (B.G.A.، ۶ [ابن خُرّداذبہ] : ۱۰۰ [و اتیوبیا و فیھا تہامۃ])، جس سے بظاہر اس کی مراد اریتریا Erythraea کے ساحل ھی سے ہے ۔ ابن الوردی تہامۃ کو کوہستانی علاقہ بیان کرتا ہے؛ یہ منفرد بیان ہے، مگر اس کی بنا بلا شبہہ وہ پہاڑیاں ہیں جو ساحل کے ساتھ کے میدان کے بیچوں بیچ چلی جاتی ہیں اور جن کا ذکر الادریسی نے بھی کیا ہے ۔ الاِصْطَخْری اور ابن حَوْقل تو اس طریق سے تہامۃ کے علاقے کو کھینچ تان کر پہاڑوں کے اندر دور تک لے گئے ہیں لیکن دوسرے مصنّف صاف طور پر تہامۃ کا اطلاق اسی سر زمین پر کرتے ہیں جو سمندر اور السَّراۃ کے درمیان واقع ہے ۔

رہا کلمۂ تہامہ کا اشتقاق، تو مثال کے طور پر موریٹز B. Moritz کو لیں، جو *Arabien*، ص ۹، حاشیہ ۱، میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ تہامۃ عربی میں عبرانی - بابلی لفظ تِیہوم תהום ''تیامتو''

tiāmtu (''سمندر'') ہی سے مأخوذ ہے ۔ اس کے برعکس تسِمّرن Zimmern : (دیکھیے *Die Keilinschr und das alte Testament*، طبع سوم، برلن ۱۹۰۲ء، ص ۴۹۲، حاشیہ ۲ میں) پورے وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا عبرانی لفظ تِہوم، عربی لفظ تہامۃ کی طرح، ساحلی علاقے کے نام کی حیثیت سے ابتداءً بابلی لفظ تیامتُو کے ساتھ علاقہ رکھتا ہے یا صورت یہ ہے (جو غالب تر ہے) کہ عبرانی اور عربی دونوں میں یہ لفظ بابلی زبان ہی سے قدیم زمانے میں مستعار لیا گیا ۔ جب یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ تیامتُو، تامتُو (Berosos میں *θαμτε*) بمعنی ''بحر'' ''نمکین سمندر'' کو عبرانی لفظ תהם 'ت ہ م' بمعنی بوی بد دینا (قب P. Jensen : *Keilinschr. Bibl.*، ۶ / ۱، ص ۵۵۹ بعد) سے ربط ہے، تو اس وقت یہ بھی بتانا چاہیے کہ لسانیات کے عرب ماہرین بھی تہامۃ کا اشتقاق تَہِم سے کرتے ہیں، جس کے معنی ہیں بوے بد دینے لگا [(اس لیے کہ وہاں کی ہوا متعفن ہے) سُمّیت تہامۃ لتغیّر ہواءِها من قولهم تَہِم الدُّھن و تَمِہ اذا تغیّرت رائحتہ ۔ بکری، ۲۰۵]. لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ بھی راے ہے کہ تَہَم [التہم هو شدّة الحرِ و رُکود الریح] بمعنی شدّتِ گرما و سکون ہوا بھی ہے (یاقوت : مُعجم، ۱ : ۹۰۲ ؛ بکری : معجم، ۱ : ۲۰۳)۔ اس کے علاوہ تہامۃ کا نام جنوبی عرب کے کتبوں میں بھی آتا ہے، چنانچہ گلازِر Glaser، عدد ۵۵۴، سطر ۳، ۶ اور ۶۱۸، سطر ۸، ۹ اور Rehatsek، ص ۲، سطر ۶ میں اس کی شکل یہ ہے : תהמת، اس کے ساتھ ההמו کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو کُرٹ ٹِنڈَن Cruttenden کی دسویں سطر میں آتا ہے ۔ بادشاہ [شَرَحبِیل] بن یَحْصُب کا کتبہ جو خط مُسنَد میں ہے اور جو یاقوت نے معجم، ۴ : ۴۰۱، میں دیا ہے، اس میں وہ اس حکمران کو سباء، تہامۃ اور ان دونوں کے بادیہ نشین عربوں کا بادشاہ ['' ملک سبا و تہامۃ و [اَعرابهما]] کے لقب سے یاد کرتا ہے ۔ ایک اور کتابۂ مُسنَد میں، جس کا صفۃ جزیرۃ العرب، ص ۲۰۸، سطر ۹ ببعد میں الہَمْدانی نے ذکر کیا ہے، ''اہل تہامۃ و طَودِم'' یعنی ''اہلِ زمینِ ساحل و کوہستان'' کا ذکر آیا ہے [الطود سے مراد جبل السراۃ '' ہے جو یمن کے نجد یعنی پہاڑی علاقے اور تہامۃ یعنی نشیبی علاقے کے درمیان ہے اور طود کہلاتا ہے ۔ ہمدانی]، یہ ''اہل تہامۃ و طودم'' گلازر کے عدد ۵۵۴، سطر ۳ و ۵ اور ۶۱۸، سطر ۸ بعد (טודם ותהמת) کی عبارت کے عین مطابق ہے۔ ان مُسنَدوں میں پہلے مُسنَد کے ساتھ (جو ظاہر ہے کہ کسی متأخر زمانے کے کتبے سے مأخوذ ہے) اس کا پیرس کی اکادیمیِ کتبات و ادب لطیف (Académie des Insriptions et Belles-lettres) کے عدد ۱۳ سے، جسے ج. اور ہ. درانبورْغ J. and H. Derenbourg نے شائع کیا ہے، مقابلہ ہو سکتا ہے، جہاں حکمرانوں کو ''شاہان سَبأ و تہامۃ'' کہا گیا ہے۔

تہامۃ کی چوڑائی مختلف مقامات پر مختلف ہے ـــــ بعض اوقات تو وہ ساحل کا ایک تنگ سا ٹکڑا ہی ہے، جیسا کہ الطُّور اور سویز کے درمیان یا قُنفُذۃ [عرب کا مغربی ساحل، عرض بلد ۱۹° سے ذرا اوپر] اور لُحَیّۃ [ایضاً، عرض بلد ۱۶° سے ذرا نیچے] کے مقامات پر ہے ـــــ، تہامۃ کی ابتداء غالباً طبقات الارض کے دَورِ جدیدِ متأخر (the middle Pliocene Period) کے درمیانی زمانے سے متعلّق ہے اور اس کا ربط بحیرۂ قلزم کی فرونشینی سے ہے ۔ اس میدان کی زمین مَرجانی تشکیلات اور جدید رسوبی مادّوں سے بنی ہے ؛ یمن کے علاقے میں تہامۃ سطحِ سمندر سے ۲,۰۰۰ فٹ تک بلند ہو جاتا ہے اور پھر اچانک تندی سے بلند ہو کر یمنی سَراۃ کی عظیم بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے ۔ تہامۂ یمن اللّیث

[دیکھیے نقشے میں یمن کا ساحلِ غربی، عرض بلد ۲۰° سے ذرا اوپر] سے شروع ہوتا ہے اور اگر اس میں عَسِیر کا تہامۃ بھی شامل کر لیا جائے تو اس کا امتداد عدن تک ہے۔ یمنی حصّے میں اس کی چوڑائی تیس میل سے لے کر پچاس میل تک ہے۔ تہامۃ کی ہلکے نشیب و فراز والی زمین سے خاص طور پر پہاڑ کی جانب جائیں تو منفرذ پہاڑیاں ملتی ہیں، جو یا تو قریب العہد چونے کے پتھر سے بنی ہیں جن میں خاصی بلندی پر متحجر چیزیں (nummuliths بشکلِ نُمّی یا مسکوکات) بھی ملتی ہیں اور یا بُرکانی چٹانیں ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا نہایت ناخوشگوار ہے، یعنی گرم اور خشک ہے اور سال کے بعض حصّوں میں درجۂ حرارت میں انتہائی افراط قیدِ ضبط و تحریر میں آتی ہے (مئی اور ستمبر میں ۳۵ تا ۴۳ درجہ سینٹی گریڈ، اپریل میں ۴۰ سینٹی گریڈ)۔ موسمِ گرما میں درجۂ حرارت بارش کی کثرت کی وجہ سے تھوڑا سا گر جاتا ہے لیکن ساحل پر ۴۰ درجہ سینٹی گریڈ دن کے وقت اور ۳۰ درجہ سینٹی گریڈ رات کے وقت ہونا کوئی غیرمعمولی بات نہیں۔ موسمِ سرما میں درجۂ حرارت ۲۰ اور ۳۰ درجے سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔ لیکن کم سے کم درجۂ حرارت سخت سردی کے دنوں میں بھی ساحل پر ۱۴ درجے سینٹی گریڈ سے کبھی نیچے نہیں اترتا۔ برسات کا موسم فروری تا مارچ یا مئی تا آخرِ ستمبر رہتا ہے۔ عرب کے مغربی ساحل کا صرف انتہائی جنوبی حصّہ ہی اس منطقے میں ہے جہاں گرمیوں میں موسمی بارش ہوتی ہے اور یہی بات جنوبی ساحل پر ۵۰ درجے طول البلد مشرقی اور ۱۵ یا ۱۶ درجے عرض البلد شمالی تک صادق آتی ہے۔ تہامۃ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سے دھند اٹھتی ہے، جسے 'سَخِیمانِی' یا 'عَمّۃ' کہتے ہیں۔ یہ دُھند صبح کے وقت اٹھتی ہے اور آہستہ آہستہ پہاڑی علاقوں کی طرف جاتی ہے اور انھیں اچھا خاصہ گرم خانہ بنا دیتی ہے، جس کے ذریعے بہت سی قیمتی فصلیں خوب تیار ہوتی ہیں، بالخصوص قہوے کی فصل۔

تہامۃ کی زمین گرم و خشک ہونے کی وجہ سے میدانی نباتات پیدا کرنے کی قدرتی اہمیت رکھتی ہے، جیسے خاردار جھاڑیاں [الغ۔۱]، گوکھرو اور طرح طرح کے گھاس وغیرہ؛ شورزار بے درخت میدان، جو ساحل سے متّصل ہے ('خَبْت')، جھاڑیوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ علاقے کے اندرونی حصّے میں بالخصوص پہاڑوں کی طرف ذُرَۃ (durra) باجرا، جو، مکئی، گیہوں، گنّا، کھجور، تل، نیل اور کپاس کی پیداوار اچھی ہوتی ہے۔ تہامۃ کی آبادی کا اندازہ کوئی پچاس لاکھ کے قریب ہے (عبدالواسع بن یحیٰی [صدۂ ۱۳/۱۴ھ]: تأریخ الیمن، ص ۲۹۲)۔ ساحل کے لوگ تجارت، جہازرانی، ماہی گیری (نیز موتی نکالنے) اور کشتیاں بنانے کا کام کرتے ہیں اور ملک کے اندرونی حصّوں میں زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ تہامی لوگ مخلوط نسل کے معلوم ہوتے ہیں اور ان کے چہرے کا رنگ زیتونی ہوتا ہے اور ان کے پشم نما بال اور موٹے ہونٹ دلالت کرتے ہیں کہ ان میں افریقی خون کی ملاوٹ بہت زیادہ ہے۔ ان کا رنگ بعض لوگوں مثلاً بوتا Botta نے بالکل سیاہ بیان کیا ہے؛ بیُور Bury اس میں زنگی خون کی آمیزش بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ تہامۃ کے لوگ چھریرے جسم کے ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا قبیلہ زِرانِیق ہے، جن کی چھوٹی چھوٹی گھونگریالے بالوں والی داڑھیاں اور کھڑے بال ہوتے ہیں (قبّ تصویر در Bury : *Arabia Infelix*، بمقابل ص ۲۸)۔ کہا جاتا ہے کہ تہامی عربوں کی زبان فصیح عربی سے بہت مختلف ہے اور اس میں **بیشمار دخیل الفاظ ہیں۔**

جنوبی تہامۃ میں، جس کی قدرتی سرحد مَخا سے مَوْزَع تک [جو مَخا سے جنوب مشرق کی طرف ہے] چلی جاتی ہے، آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلہ ہر طرف آر پار پھیلا ہوا ہے اور اس میں رسوبی چٹانوں کے ذخیرے کم ہی نظر آتے ہیں، عام طور پر اس کی بناوٹ میں اسی قسم کی چٹانیں شامل ہیں جو باقی برِاعظم میں ہیں۔ ہموار ساحلی علاقہ جو مسلسل ہو یہاں کہیں نہیں ہے۔ ایسے میدان فاصلے فاصلے پر اندرون ملک کے بلند پہاڑوں کے آگے کو نکلے ہوے حصّوں [ظُنُون spurs] کے درمیان یا ساحل کی بُرکانی الاصل نمایاں کوائف خصوصی (features) کے درمیان ملتے ہیں۔ جنوبی تہامۃ کو متمیّز کرنے والی خصوصیات یہ ہیں : یہاں چاک (کھریا مٹی) اور ریتلے پتھر کی عمودی چٹانیں ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہیں اور اُن کے بیچ بیچ میں (کھریا مٹی یا) چاک کے سفید تہ نشین ذخیرے اور ریتلے نشیب بھی آ جاتے ہیں۔ اس کی چوڑائی شاذ و نادر ہی کسی جگہ ۲۰ میل سے زیادہ ہوگی۔ جنوبی تہامۃ کے اندرونی حصّوں میں بے درخت دشت کی خصوصیتیں نسبۃً زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس گرمیوں کی زر ریز برسات کے بعد وادیوں میں پُر ثمر نخلستان نظر آتے ہیں، مثلاً لَحج کا نخلستان [عدن کے شمال مائل بہ مغرب میں] جو غیر معمولی طور پر زرخیز ہے اور وادی مَیفَعۃ کا نخلستان [طول بلد ۴۸°، عرض بلد ۱۴° کے محلّ تقاطع کے شمال مغرب میں]، جس کا گیاہ نامہ (flo...) وہی ہے جو مغربی تہامۃ کا ہے۔ جنوبی تہامۃ میں عام طور پر کم بارش ہوتی ہے۔ شاذونادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ موسم سرما کی بارشیں نہ ہوں مگر ہوتی کچھ بے قاعدہ سی ہیں۔ اپریل کے آخر میں موسلادھار بارشیں شروع ہو جاتی ہیں اور اکثر اوقات اُن کے ساتھ شدید رعد و برق بھی ہوتی ہے۔ جنوری، نومبر، دسمبر اور جولائی، اگست میں بھی اتفاقی بارش ہو جاتی ہے۔

مآخذ : کتبوں کے لیے دیکھیے : (۱) گلازر E. Glaser : *Zwei Inschriften über den Dammbruck- von Mârib*، در *M.V.A.G.*، ۲ (۱۸۹۷ء) : ص ۷، ۱۳، ۳۲، ۴۲؛ (۲) J. and H. Derenbourg : *Études sur l' épigraphie du Yémen*، *J. A.*، ج ۵، سلسلہ ۸، ج ۱ : ۲۶۳ تا ۲۶۵، عدد ۱۳؛ (۳) الاِصطخری، *B. G. A.* [= المکتبة الجغرافية العربية]، ۱ : ۱۰؛ (۴) ابن حَوْقَل : *B. G. A.*، ۲ : ۱۹، ۲۰، ۳۱، ۳۵؛ (۵) المقدّسی : *B. G. A.*، ۳ : ۶۹؛ (۶) ابن الفقیہ الہَمَذانی : *B. G. A.*، ۵ : ۲۶ ببعد، ۳۱؛ (۷) ابن خُرّداذبہ : *B. G. A.*، ۶ : ۱۲۸، ۱۳۳، ۱۵۵؛ (۸) ابن رُسْتَہ : *B. G. A.*، ۷ : ۱۷۷؛ (۹) المسعودی : *B.G.A.*، ۷ : ۹۷؛ (۱۰) الہَمْدانی : صفۃجزیرۃ العرب، طبع D.H. Müller، لائڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء، ص ۲، ۴۸، ۵۰، ۵۳ ببعد، ۱۱۹ تا ۱۲۱، ۱۳۵، ۱۹۳، ۲۰۸، ۲۳۳؛ (۱۱) ابوالفداء : کتاب تقویم البلدان، طبع Ch. Schier، ڈریسڈن ۱۸۴۶ء، ص ۶۸؛ (۱۲) یاقوت : مَعجَم، طبع وُسٹن فلْٹ Wüstenfeld، ۱ : ۹۰۲؛ ۴ : ۱۰۴؛ (۱۳) مَراصِد الاِطّلاع، طبع T. G. J. Juynboll، ج ۱، لائڈن ۱۸۵۲ء : ص ۲۲۰؛ (۱۴) البَکْری : مَعجَم، طبع وُسٹن‌فلٹ، گوٹنگن ۱۸۷۶ء، ۱ : ۷؛ ۱۱ : ۲۰۵؛ (۱۵) الاِدریسی : نُزہۃ المشتاق، ترجمہ از Jaubert، ۱ : ۱۴۵ ببعد؛ (۱٦) الدمشقی : کتاب نُخبۃالدھر فی عجائب البرّ و البحر، طبع A. F. Mehren، طبع دوم، لیپزگ ۱۹۲۳ء، ص ۲۲، ۲۱۵ ببعد، ۲۲۰؛ (۱۷) عبدالواسع بن یحیٰی الواسعی الیَمانی : تاریخ الیمن، قاھرۃ ۱۳۴٦ھ، ص ۳۱۰، ۳۲٦، ۳۳۱؛ (۱۸) نیبُور C. Niebuhr : *Beschreibung von Arabien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۲۲۱؛ (۱۹) یونار Jomard : *Études géographiques et historiques sur l' Arabie*،

در F. Mengin : *Histoire sommaire de l' Égypte sous le gouvernement de Mohammed-Aly*، پیرس ۱۸۳۹ء، ص ۲۷۴، ۳۳۱ بعد، ۳۶۳؛ (۲۰) رٹر C. Ritter : *Vergleichende Erdkunde v. Arabien*، ج ۱، برلن ۱۸۳۶ء: ص ۱۸۹ بعد، ۲۰۷ بعد، ۲۱۳، ۲۱۹ بعد، ۲۲۵، ۱۷۷؛ (۲۱) شپرنگر A. Sprenger : *Die Post- u. Reiserouten des Orients* (Abh. K. M.) ، ۳ / ۳ : لیپزگ ۱۸۶۴ء، ص ۱۰۹؛ (۲۲) فون کریمر A.v. Kremer: *Über die südarabische Sage* ، لیپزگ ۱۸۶۶ء، ص ۱ تا ۴؛ (۲۳) Ch. Millingen : *Notes of a Journey in Yemen*، در *J. R. G. S.*، ج ۴۴ (۱۸۷۴ء) : ص ۱۱۸ بعد، ۱۲۰؛ (۲۴) P.E. Botta : *Relation d'un voyage dans l' Yémen* ، پیرس ۱۸۸۰ء، ص ۱۶۰ بعد؛ (۲۵) A. Delfers : *Veyage au Yémen*، پیرس ۱۸۸۹ء، ص ۲۳، ۲۵، ۳۰؛ (۲۶) C. Landberg : *Arabica*، ج ۵، لاٹذن ۱۸۹۸ء: ص ۱۱۰ بعد؛ (۲۷) M. Hartmann : *Die arabische Frage, Der islamische Orient* (*Berichte u. Forschungen*، ج ۲، لیپزگ ۱۹۰۹ء)، ص ۱۱۳، ۲۷۸، ۵۳۲، ۵۳۷ بعد، ۵۴۰ ؛ (۲۸) G.W. Bury : *The Land of Uz* ، لنڈن ۱۹۱۱ء ، ص xxvi بعد، ۳ بعد؛ (۲۹) شمیت W. Schmidt : *Das südwestliche Arabien* (*Angewandte Geographie*، سلسلہ ۴، حصّہ ۸، فرانکفورٹ بر رُود مائنہ Frankfort a/M. ۱۹۱۳ء)، ص ۱۶ بعد؛ (۳۰) G. W. Bury : *Arabia Infelix or the Turks in Yamen*، لنڈن ۱۹۱۵ء، ص ۲، ۲۹، ۳۵، ۴۰، ۴۳، ۱۰۰، ۱۰۷ بعد، ۱۱۳، ۱۳۸؛ (۳۱) A. Grohmann : *Südarabien als Wirtschaftsgebiet* ، ج ۱ : (*Osten u. Orient*، طبع R. Geyer ، H. Übersberger اور I. Reihe : *Forschungen*، ج ۴، وی انا ۱۹۲۲ء) ص ۶ تا ۸، ۱۷ تا ۲۴، ۴۰ تا ۴۲، ۵۳ بعد؛ (۳۲) B. Moritz : *Arabien, Studien zur physikalischen u. historischen Geographie d. Landes* ، ھینوور Hanover ۱۹۲۳ء، ص ۹، حاشیہ ۱؛ (۳۳)[Map of Arabia and the Persian Gulf (سروے او انڈیا)، ۱۹۰۸ء بشمول تصحیحات و زیادات تا ۱۹۱۶ء].

تہامی عربوں کے اقسام : (۱) G. W. Bury : *Arabia Infelix*، لوحات مقابل ص ۲۸، ۱۳۳، ۱۹۳؛ (۲) A. Grohmann : *Südarabien als Wirtschaftsgebiet*، لوحہ ۴، شکل ۲.

تہامۃ کی نباتات کی تصاویر در (۳) B. Moritz : *Arabien* ، لوحہ ۲، شکل ۳ (بحیرۂ قلزم کا ساحل)، ۱۷ (حجاز کی ساحلی پہاڑیوں کی مغربی ڈھلانیں)؛ (۴) A. Musil : *The Northern Ḥeğâz* (American Geographical Society Oriental Explorations and Studies، عدد ۱، نیویارک ۱۹۲۶ء)، ص ۹۲، شکل ۳۲، ۱۲۳، شکل ۵۵، ۱۲۶، شکل ۵۶، ۱۳۲، شکل ۵۸؛ (۵) G. W. Bury : *Arabia Infelix.*، لوحہ صفحہ ۱۴ پر (حُدَیدَۃ کے مشرق کا علاقہ) ، ص ۶۴ (حَجَیلَۃ)؛ (۶) وھی مصنّف : *The Land of Uz* ، لوحہ بر صفحہ ۱۱؛ [(۷) سید لطف اللہ شیرازی تھٹوی : تحفۃ الباصرین ، کراچی ۱۸۰۸ء ص ۱۰۰ بعد، سفر نامۂ سواحلِ تہامۃ براہ دریا از جدہ تا بہ عدن، در ۱۸۰۶ و ۱۸۰۷ء].

(A. GROHMANN)

تھانیسری : مولانا احمد [بن محمد - دھلی میں پیدا ہوئے اور وھیں نشو و نما پائی، علم قاضی عبدالمقتدر بن رکن الدین الشُّریحی الکِندی سے پڑھا اور فقہ، اصول اور عربیت میں کمال حاصل کیا] - طریقت شیخ نصیرالدین محمود اودھی چراغ دھلی (م ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) سے پائی [اور نورِ معنوی کے اقتباس کے لیے مدّتوں ان کی صحبت میں رہے]- آپ اپنے علم و فضل اور زھد و تقوی کی وجہ سے مشہورِ روزگار تھے - جب تیمور (م ۸۰۷ھ/ ۱۴۰۴ء) کی آمد کی خبر دھلی میں پھیلی تو [بعض] علماء

وھاں سے نکل گئے [مثلاً مولانا خواجگی جو شیخ نصیرالدین محمود کے اخصِ خلفاء میں سے تھے اور جن کے ساتھ مولانا احمد کی مُواخاۃ تھی] لیکن تھانیسری وھیں مقیم رھے تا آنکہ وہ اپنے متوسّلین سمیت تیمور کے ھاتھوں قید ھو گئے؛ [تیمور کو آپ کے علم و فضل کا علم ھوا تو اس نے آپ کو آزاد کر دیا] اور امن قائم ھو جانے کے بعد آپ کو اپنی مجالست کے لیے منتخب کیا اور آپ سے عزت و تکریم سے پیش آیا ۔ اب یہ سوال پیدا ھوا کہ دربار کی نشست میں حقِ تقدّم آپ کا ھے یا شیخ الاسلام کا، جو الہدایۃ کے مصنّف [مولانا برھان‌الدین] علی بن ابی‌بکر المَرْغینانی (الرِیْشْتانی) (م ۵۹۳ھ / ۱۱۹۷ء) کی اولاد میں سے تھے ۔ [شیخ الاسلام سے خواجہ عبدالملک مراد ھیں یا خواجہ عبدالاوّل؟ دیکھیے ابن عرب شاہ، لائڈن ۱۶۳۶ء، ص تکا، و محمد عبدالحی: الفوائد البہیّۃ، قاھرۃ ۱۳۲۴ھ، ص ۱۴۲ و ح ۱؛ غیاث الدین علی: کتاب روزنامۂ غزوات ھندوستان، طبع لیو زیمین، پطروغراد ۱۹۱۵ء، ۱۱۵، نے اُن کا نام نہیں لیا] ۔ تیمور کی رائے شیخ الاسلام کے حق میں تھی، کیونکہ وہ صاحب الہدایۃ کی اولاد میں سے تھے ۔ اس سے مراد یہ تھی کہ ان کا حق فائق ھے اور پہلی نشست انھیں دی جائے ۔ اس پر مولانا تھانیسری نے فرمایا کہ: کوئی تعجّب کی بات نہیں اگر شیخ الاسلام سے ایک غلطی سرزد ھو کیونکہ ان کے بزرگ یعنی صاحبِ ھدایۃ نے تو بہتیری غلطیاں کی ھیں ۔ اس پر شیخ الاسلام آگ بگولا ھو گئے اور انھوں نے کہا کہ بتائیے اُن سے کیا کیا غلطیاں سرزد ھوئیں ھیں ۔ تھانیسری نے اپنے [فرزندوں اور] شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ ان کی تفصیل بیان کریں لیکن تیمور نے اس مباحثہ کو [کسی دوسری صحبت پر ڈال دیا] کہ کہیں جھگڑا بڑھ نہ جائے ۔

[تیمور کے مؤرّخوں، مثلاً غیاث الدین، حافظ ابرو، یزدی، صاحب مطلع‌سعدین اور صاحبِ حبیب‌السیر نے یہ قصّہ، جو اخبار الاخیار میں دیا ھے، بیان نہیں کیا لیکن ان سب نے ''پسرِ مولانا احمد تھانیسری (باختلاف قراءت)'' کا ذکر کیا ھے جو ضابطان اور مقدمانِ قلعۂ میرٹھ میں سے تھا، اور گمان ھوتا ھے کہ بظاھر ''پسرِ مولانا احمد تھانیسری'' سے صاحبِ ترجمہ کا لڑکا ھی مراد ھے ۔ جب آخرِ ربیع الثانی ۸۰۱ھ/۸ جنوری ۱۳۹۹ء میں تیمور نے قلعۂ میرٹھ پر خود حملہ کیا تو پسر مولانا احمد گرفتار ھوا اور تیمور کے سامنے لایا گیا (غیاث‌الدین علی: کتاب مذکور، ص ۱۳۳، ۱۳۵؛ حافظ ابرو: زبدۃ التواریخ (نسخۂ استانبول)، ورق ۵۹۱؛ یزدی، ۲: ۱۲۹ ببعد، مطلع سعدین، نسخۂ ادرنہ، ج ۱، ورق ۱۱۱ الف)].

جب تیمور ھندوستان سے چلا گیا اور حملۂ تیمور کی وجہ سے دھلی کی رونق جاتی رھی تو مولانا تھانیسری بھی دھلی چھوڑ کر [اھل و عیال سمیت] کالپی میں جا بسے [جہاں مولانا خواجگی ان سے پہلے جا بسے تھے] اور وھاں اپنے سالِ وفات ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء تک درس و تدریس میں مشغول رھے اور بعد وفات قلعۂ کالپی کے اندر [ایک گنبد میں] دفن ھوے ۔ [شیخ نصیرالدین چراغ دھلیؒ کے امام شیخ ابراھیم بھی کالپی ھی میں ایک قبے میں دفن ھیں (اذکارِ ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ، ۱۱۶)؛ نیز اور کئی اولیاء اللہ (سجان رائے: خلاصۃ التواریخ، دھلی ۱۹۱۸ء، ص ۴۰)] ۔ آپ کی تالیفات میں سے قصیدۂ دالیہ [جو نعت میں ھے] بہت مشہور ھے ۔ [اس کے ۱۴ اشعار بطور نمونہ اخبار الاخیار (= سبحۃالمرجان، مآثر الکرام، نزھۃ الخواطر) میں دیے ھیں].

مآخذ: (۱) عبدالحق دھلوی: اخبار الاخیار، دھلی ۱۳۰۹ھ، ص ۱۴۲؛ [(۲) خویشگی: معارج الولایۃ

(نسخۂ خطّی دانشگاہ پنجاب، ۱۸۶ ب)؛ (۳) آزاد بلگرامی: مآثر الکرام، آگرہ ۱۹۱۰ء، ۱: ۱۸۶]؛ وہی مصنف: سبحۃ المرجان، بمبئی ۱۳۰۳ھ، ۳۷؛ (۵) صدیق حسن [خان]: ابجد العلوم، ۸۹۲؛ (۶) حدائق الحنفیۃ، ۳۱۳؛ [(۷) رحمان علی: تذکرۂ علماء ہند، طبع دوم، ۱۹۱۴ء، ۱۸۶؛ (۸) غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۳ھ، ۳۶۸؛ (۹) عبدالحیّ الحسنی: نزھۃ الخواطر، ۳: ۸ تا ۱۰، حیدر آباد دکن ۱۹۵۱ء؛ (۱۰) وہی مصنف: الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند، دمشق ۱۹۵۸ء، ۴۵؛ (۱۱) خلیق احمد نظامی: تاریخ مشایخ چشت، دھلی ۱۹۵۳ء (؟)، ۱۸۷، ۲۰۹؛ (۱۳) زبید احمد: *The Contribution of India to Arabic Literature*، الہ آباد ۱۹۴۶ء، ۲۰۷، ۳۲۵].

(محمد ہدایت حسین [و ادارہ])

تَہجُّد: مادۂ ہ-ج-د سے باب تفعّل ہے۔ مجرّد ھَجَد ھُجُوداً اور تَہَجُّداً اضداد سے ہیں، یعنی ان کے معنی "سونا" اور "جاگنا" دونوں ہیں لیکن تَہَجُّد میں عموماً سلبی مفہوم یعنی ترکِ نوم پایا جاتا ہے، گویا تہجّد کے معنی ترکُ الھُجود [للصلوۃ] ہوئے (قبّ تَأثَّم: ترکِ اثم؛ تَحَنَّث: ترکِ حِنث (گناہ) وغیرہ (لسان: تحت ھجد؛ کشّاف، ۱: ۶۸۷) - اس طرح تہجّد کچھ دیر سونے کے بعد جاگنے کو کہتے ہیں (التھجّد التیقظ بعد نَوْمَۃ من اللّیل) ("التھجّد ما کان بعد العشاء الآخرۃ") (تفسیر طبری، ۱۵: ۸۹) - شرعی اصطلاح میں قیامِ لیل اور خصوصاً نصف رات اور فجر کے درمیان نماز (نوافل) پڑھنے کو تَہَجُّد کہتے ہیں - یہ معنی قرآن کریم کی اس آیت سے مأخوذ ہیں: وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ (قرآن مجید، طبع قاھرۃ ۱۳۷۱ھ ۱۷ [الاسراء]: ۷۹) (رات کے کچھ حصّے میں قرآن کی تلاوت کے ساتھ عبادت کر، یہ تیرے لیے زائد عبادت بطورِ عطیۂ الٰہی ہے) - نافلۃ (نَوافِل جمع) اور نَفَل (اَنْفال جمع) مالِ غنیمت اور عطیّہ اور شئی زائد کو کہتے ہیں - اس مادّے سے تَنَفُّل ہے، جس کے معنی مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت زائد حصہ لینا ہے، لہٰذا نوافل وہ عبادت ہوئی جو فرائض سے زائد ہو اور اپنی مرضی سے ابتغاءِ مَرْضات اللہ کے لیے کی جائے - جس طرح مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت کوئی کوشش کرے کہ اسے زیادہ حصّہ مل جائے، اسی طرح نیکیوں کی تقسیم کے وقت اللہ کا عبادت گذار بندہ یہ چاہے کہ وہ زیادہ نیکی حاصل کرے؛ گویا تنفّل میں مفہوم فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰت مضمر ہے - تفسیر ابن جریر (۱۵: ۸۹؛ نیز لسان، بذیلِ مادۂ نفل) میں "نافلۃً لک" کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ تہجّد کی نماز نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کے لیے فریضہ نمازوں سے زائد فرض کر دی گئی (نیز بیضاوی، ۳: ۱۲۶: فریضۃً زائدۃً لک علی الصّلوات المفروضۃ؛ کشّاف، ۲: ۶۸۷: انّ التھجّد زید لک علی الصّلوات المفروضۃ فریضۃً علیک خاصّۃً دونَ غیرِک، محلِّ مذکور) - خصوصی طور پر زائد اس لیے کہا کہ اللہ تعالٰی نے آپ کو تمام مخلوق پر فضیلت دی اور قیام لیل کو آپ کے خصائص میں قرار دیا - دوسرے، برخلاف عام مسلمانوں کے، جن کے لیے نوافل کفّارۂ ذنوب ہیں، آپ قیام لیل کی پابندی محض تعمیلِ حکمِ الٰہی و ابتغاءِ مَرْضات اللہ کے لیے کرتے تھے، کیونکہ آپ کے ساتھ اللہ تعالٰی کا وعدہ تھا: لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ [ایضاً، ۴۸ [الفتح]: ۲] (قبّ احکام القرآن، ۲: ۴۵).

قرآن کریم اور احادیث نبوی صلعم سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں صحابۂ کرام کا عام دستور قیامِ لیل تھا - ابتداے اسلام ھی میں جب سورۂ مُزّمّل کی شروع کی آیتیں نازل ہوئیں (یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ، الخ الآیۃ [ایضاً، ۷۳ [المزّمّل]:

۱، ۲]) تو مسلمانوں نے قیام لیل کو فریضہ سمجھا اور وہ نبی کریم صلعم کے ساتھ اتنا قیامِ لیل کرتے تھے کہ ان کے پاؤں متورّم ہو جاتے تھے (ابو داؤد، ۲ : ۵۶) - حضرت عائشۃ رض سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلعم رات کو تہجّد کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو اور لوگ بھی بغرضِ شرکت آ جاتے تھے لیکن آپ اتنے شفیق و رحیم تھے کہ آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر وہ اس طرح مواظبت کرتے رہے تو کہیں قیامِ لیل امّت پر ہمیشہ کے لیے فرض نہ ہو جائے، پس آپ نے فرمایا کہ لوگ اپنے گھروں میں تہجّد پڑھیں (ابو داؤد، ۲ : ۹۳) - پھر اللہ تعالٰی نے مسلمانوں پر مہربانی کی اور اس سورۃ کی آخری آیتیں (عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ) نازل فرمائیں - آپ فرماتی ہیں کہ یہ آیتیں پہلی آیتوں کے تقریباً ایک سال بعد نازل ہوئیں - اس طرح قیامِ لیل میں مسلمانوں کے لیے تخفیف کر دی گئی - حضرت ابن عباس رض (تفسیر ابن جریر، ۲۹ : ۶۸ ببعد) سے بھی تقریباً اسی طرح روایت ہے کہ اللہ تعالٰی نے سورۂ مزّمّل کی شروع کی آیتیں نازل فرما کر قیامِ لیل کو نبی کریم صلعم اور مسلمانوں کے لیے فرض کر دیا تھا (فأمر اللہ نبیّه و المؤمنین بقیامِ اللیل الّا قلیلاً)، لہٰذا مسلمان تقریباً ایک سال نہایت شدّت کے ساتھ قیامِ لیل کرتے رہے - بعض اس کی طاقت نہیں رکھتے تھے (فمنهم مَن اَطاقه و منهم مَن لم یُطقه) - طبری نے بحوالۂ حضرت عائشۃ رض بیان کیا ہے کہ بعض دفعہ صحابہ اپنے آپ کو رسّی سے باندھ لیا کرتے تھے (حتّی کان الرجل یربطُ الحَبْلَ و یتعلّقُ، ابن جریر، ۲۹ : ۶۸) ؛ بعد ازآن اللہ تعالٰی نے سورۂ مزّمّل کی آخری آیتیں نازل کر کے رخصت عطا فرمائی - ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ مسلمان دس سال قیامِ لیل

کے پابند رہے - اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مسلمان بالعموم طویل قیامِ لیل کے فریضے (قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا) سے تقریباً ایک سال بعد سبکدوش کر دیے گئے لیکن وہ اس پر کم و بیش برابر مواظبت کرتے رہے، یہاں تک کہ تقریباً تین سال قبلِ ہجرت بوقتِ معراج پانچ نمازیں فرض ہوئیں اور قیامِ لیل کو مسلمانوں کے لیے تطوّع کر دیا گیا (فصار قیامُ اللیل تطوّعاً بعد فریضۃ (ابنِ جریر؛ نیز نسائی، ۳ : ۲۰۰؛ مسلم، مصر، طبعۃ مصطفٰی البابی، ۱۰ : ۲۷۸) - حضرت عائشۃ رض سے بھی اس قسم کی روایت مروی ہے؛ وہ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالٰی نے قیامِ لیل میں پانچ فریضہ نمازوں کی وجہ سے تخفیف کر دی (خَفّفَ اللہ عنهم بالصلوات الخَمس، احکام القرآن، ۲ : ۳۸۵ ، نیز ملاحظہ ہو : ثم نُسِخَ بالصلوات الخَمس، غرائب القرآن للقُمّی، بر حاشیۂ ابن جریر، ۲۹ : ۶۸) - یہ بھی ظاہر ہے کہ قبلِ ہجرت مسلمانوں کی زندگی تمام تر ریاضت و تزکیۂ نفس میں گزرتی تھی - در اصل یہ وہ تربیت تھی جو مسلمانوں کو دی جا رہی تھی تا کہ وہ اتقیاء اور اولیاء اللہ کی ایسی منظّم جماعت بن جائیں جو اس بارِ امانت کو اٹھا سکیں جو انہیں بعد ہجرت عطا ہونے والا تھا، جس کی طرف سورۂ مزّمّل کی آخری آیتوں میں اشارہ ہے۔

اکثر مفسّرین کا اس پر اتّفاق ہے کہ سورۂ مزّمّل کی آخری آیتوں کے نازل ہونے کے بعد قیامِ لیل اگرچہ عام مسلمانوں کے لیے تطوّع ہو گیا لیکن نبی کریم صلعم کے لیے خصوصیت کے ساتھ فریضہ رہا - حضرت ابن عباس رض کی روایت ہے کہ قیامِ لیل نبی کریم صلعم پر فرض تھا (و کان قیامُ اللیلِ فرضاً علیه) - ایک اور روایت میں ہے : اُمِر بقیام اللیلِ و کُتِبَ علیه (ابن جریر، ۱۵ : ۹۰؛ البحر المحیط، ۶ : ۷۱) - صاحبِ لُبابِ التأویل

نے ایک قول دیا ہے کہ پانچ نمازوں کے فرض ہونے کے بعد قیام لیل امت کے لیے تطوع ہو گیا لیکن از روے وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ نبی کریمؐ پر فرض رہا (لُباب التأویل، ۴ : ۳۴۹، نیز ابن جریر، ۲۹ : ۶۸ میں ہے : فَرَدَّهم الی الفریضة و وضع عنهم النافلة الّا ما تطوّعوا به) ۔ قیامِ لیل کے متعلّق احادیث کو بنظرِ غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تین مدارج تھے : (۱) قیامِ لیل سورۂ مزمّل کی شروع کی آیتوں کے نازل ہونے کے بعد کل مسلمانوں کے لیے فریضہ بن گیا اور مسلمان اس شدّت سے اس پر عمل پیرا ہوے کہ رات رات بھر قیام لیل کرتے تھے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا؛ (۲) سورۂ مزمّل کی آخری آیتوں کے بعد قیام لیل میں تخفیف ہوئی از روے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ، لیکن فرضیت قائم رہی؛ (۳) نمازِ پنجگانہ کی فرضیت کے بعد (بعدِ معراج جو تقریباً تین سال قبلِ ہجرت کا واقعہ ہے) قیامِ لیل امت کے لیے تطوّع ہو گیا لیکن نبی کریمؐ کے لیے فریضہ رہا۔

اس کے باوجود کہ قیامِ لیل مسلمانوں کے لیے تطوّع کر دیا گیا احادیث میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے اور اسے افضلُ الاَعمال کہا ہے ۔ نبی کریمؐ سے کسی نے دریافت کیا کہ کون سا عمل افضل ہے تو آپ نے فرمایا : ''طول القیام'' (ابوداؤد، ۲ : ۴۹) ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا : افضل صلوٰة بعد الفریضة صلاةُ اللیلِ (الفقه علی مذاهب الاربعة، بحوالۂ صحیح مسلم، ۱ : ۳۳۵) اس طرح ترکِ قیامِ لیل کو آپ نے ناپسند فرمایا ۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے اُن سے فرمایا کہ فلاں شخص نے قیام لیل ترک کر دیا ہے لیکن تم ایسا نہ کرنا (بخاری، ۱ : ۲۹۱؛ احکام القرآن، ۲ : ۲۸۶) ۔ حضرت عائشةؓ نے بھی عبداللہ بن ابی قیسؓ صحابی سے فرمایا کہ قیامِ لیل کو ترک نہ کرنا، کیونکہ رسول اللہؐ نے کبھی اسے ترک نہیں کیا ۔ جب کبھی آپ بیمار ہوتے یا تھکے ہوے ہوتے تو بیٹھ کر نمازِ تہجّد ادا فرماتے (ابوداؤد، ۲ : ۴۴) ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالٰی کے نیک بندوں کی صفات میں آیا ہے : وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا (ایضاً، ۲۵ [الفرقان] : ۶۴) ۔ اور اسی طرح بہت سے مقامات پر شب بیداری، تسبیح و تقدیس اور استغفار بالسحر کی ترغیب دی گئی ہے (وَ مِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا، ایضاً، ۷۶ [الدهر] : ۲۶؛ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ، ۳ [اٰل عمران] : ۱۷) ۔ غرض قیامِ لیل کی اتنی تاکید و ترغیب قرآن کریم اور احادیث میں آئی ہے کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ قیامِ لیل خواہ وہ تھوڑا ہی ہو ہر مسلمان پر فرض ہے ۔ سعید بن جبیر تابعی اور ابن سیرین اور حسن بصری کا یہی مسلک ہے ۔ غالباً اس مسلک کی تصدیق میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے : لا بُدَّ من صلاةٍ بلیلٍ و لو حَلْبَ شاة (رواه الطبرانی مرفوعاً، الفقه علی مذاهب الاربعة، ۱ : ۳۳۵) ۔ اگر فقہی اعتبار سے نمازِ تہجّد فرض نہ بھی ہو تو بھی چونکہ اِتّباعِ سنّت ہر دیندار مسلمان کا شیوہ ہے ہزارہا مسلمان ہر زمانے میں قیام لیل کے پابند رہے ہیں .

آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (ایضاً، ۷۳ [المزمّل] : ۲۰) نیز وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (ایضاً، ۱۷ [الاسراء] : ۷۸) میں قراءت قرآن سے جمہور علماء کے نزدیک مراد صلوٰت یعنی نماز پڑھنے سے ہے ۔ گویا یہاں جزء کا اطلاق کل پر ہوا، کیونکہ قراءت قرآن نماز کا ایک اہم جزء ہے : لانّها رکنٌ کما سُمّیت رکوعاً و سجوداً، (کشّاف، ۲ : ۶۸۶، ۶۴۳)؛ لہٰذا اس آیت کے یہ معنی ہوے کہ فصلّوا ما تیسّر علیکم (لُباب التأویل،

۳ : ۳۴۹؛ نیز ابن جریر، ۲۹ : ۷٦ : فاقرءوا من اللیل ما تیسّر لکم من القرآن فی صلاتکم؛ قبَ بیضاوی، ۳ : ۲۲۸ (سورۂ مزمّل)، و احکام القرآن، ۲ : ۲۸٦).

حضرت عائشة رض سے بہت سی احادیث مروی ہیں جن سے نبی کریم صلّی اللہ علیہ و سلّم کے قیامِ لیل اور سَبْحًا لَیْلاً طَوِیْلاً کا اندازہ ہوتا ہے ۔ آپ کبھی تیرہ رکعتیں [بخاری، ۱ : ۲۸۷] اور کبھی گیارہ رکعتیں [ابوداؤد، ۲ : ۵۳] پڑھتے تھے، وہ اس طرح کہ نمازِ عشاء کے بعد فجر سے قبل آپ بعض دفعہ آٹھ اور بعض دفعہ دس رکعتیں تہجّد کی اور ایک رکعت وتر کی اور دو رکعتیں فجر کی سنّتیں پڑھتے تھے ۔ عام طور پر تہجّد آپ دو دو رکعتیں کر کے اور بعض دفعہ چار چار کر کے بھی پڑھتے تھے ۔ آپ کا قیام، رکوع اور سجدے نہایت طویل ہوتے تھے ۔ آپ بارگاہِ ربّ العزّت میں اتنے عرصے تک سر بسجود رہتے تھے جتنے عرصے میں کوئی قرآن کریم کی پچاس آیتیں تلاوت کر لے (ابوداؤد، ۲ : ۵۴) ۔ ایک صحابی کو حضرتِ عائشة رض نے نبی کریم ؐ کی نمازِ تہجّد کی تفصیل بتانے کے بعد فرمایا تھا : فلاتسئل عن حُسنِہنّ و طولہنّ (ابوداؤد، ۲ : ۵۵) ۔ آپ وتر نوافلِ تہجّد کے بعد پڑھا کرتے تھے اور اسی کی ترغیب بھی دیتے تھے ۔ عبداللہ بن عمر رض سے مروی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ وتر کو صلاتِ لیل کا آخری جزء بناؤ (اجعلوا آخر صلاتکم باللیل وِتْراً) ۔ پھر آپ ذرا سی دیر کے لیے استراحت فرماتے تھے اور جب مؤذّن صبح کی اذان دیتا تھا تو آپ دو مختصر رکعتیں (رکعتینِ خفیفتین) نمازِ فجر کی پڑھتے تھے، بعد ازآں آپ مسجد میں نمازِ فجر ادا فرماتے تھے ۔

حضرت عائشة رض کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلے تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے لیکن بعد میں گیارہ رکعتیں (ثم انه صلّی احدی عشرة رکعة و ترك رکعتین)، یعنی دو رکعتیں کم کر دی تھیں (ابوداؤد، ۲ : ٦۳) .

نمازِ تہجّد عام طور سے دو دو رکعت کر کے پڑھی جاتی ہے، حدیث میں مسلمانوں کے لیے اسی طرح تاکید آئی ہے ۔ اگرچہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا آپ نے چار چار رکعتیں بھی پڑھی ہیں (یصلّی اربعاً . . . . ثم یصلّی اربعاً، ابوداؤد، ۲ : ۵۵، صلاة اللیل) لیکن آپ نے ارشاد فرمایا ہے : صلاةُ اللیلِ مَثْنی مَثْنی (ابوداؤد، ۲ : ۵۰) ۔ کتبِ فقہ میں زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں اور کم از کم دو رکعتیں مذکور ہیں (فتاوی عالمگیری، ۰۴) .

امام غزالی نے احیاء العلوم (۱ : ۲۲۸) میں اورادِ لیل اور احیاءِ لیل اور فضیلتِ قیامِ لیل کی تفصیل کئی بابوں میں نہایت دل نشین انداز میں کی ہے ۔ طولِ قیامِ لیل کے سات مراتب بیان کیے ہیں، جن میں سے اعلٰی تو "احیاء کلّ اللیل" ہے، جو اتقیاء اور صوفیہ کا مسلک رہا ہے ۔ ان بزرگوں کا شیوہ تھا کہ نمازِ عشاء کے وضوء سے نمازِ فجر ادا کرتے تھے ۔ اوسط یہ مرتبہ ہے کہ ایک تہائی رات قیامِ لیل کیا جائے ۔ شب کا نصفِ اوّل اور آخری چھٹا حصّہ سوئے اور درمیان میں قیامِ لیل کرے ۔ اور کم‌تر رتبہ یہ ہے کہ چار رکعت جیسی توفیق ہو یا دو رکعت قیام لیل کرے .

مآخذ (۱) بخاری : صحیح، طبع Krehl، ۲ : ۳۸؛ (۲) مسلم : صحیح، بشرح النووی (مصر)، ٦ : ۱٦؛ (۳) ابی‌داود : سنن، (ابواب قیام اللّیل) قاهرة، ۱۹۳۵ء، ۲ : ۳۲؛ (۴) نسائی : سنن (مصر ۱۳۴۸ھ)، ۳ : ۱۹۹؛ (۵) تفسیر ابن جریر طبری، طبع میمنیّة مصر (سورۂ اسراء و مزّمل)؛ (٦) ابوحیّان الاندلسی : البحر المحیط (قاهرة ۱۳۲۹ھ)، ۸ : ۳٦٦؛ (۷) خازن : لُباب التأویل فی معانی التنزیل (مصر، دارالکتب العربیة الکبری)، ۴ : ۳۴۹؛

(۸) الزمخشری: کشاف (سورۃ اسراء و مزمّل)، قاہرۃ ۱۹۴۶ء)؛ (۹) ابن عربی: احکام القرآن (مصر ۱۳۳۱ھ)، ۲: ۲۸۶؛ (۱۰) تفسیر بیضاوی، المکتبة التجاریّة الکبری، مصر (سورۂ اسراء و مزمّل)؛ (۱۱) الجزائری: کتاب الفقه علی مذاہب الاربعة (مصر ۱۳۵۸ھ)، ۱: ۱۳۳۵؛ (۱۲) الغزالی: احیاء العلوم، قاہرۃ ۱۳۲۶ھ، ج ۱ (تفصیل احیاء اللیل)؛ (۱۳) نظام: فتاوی عالمگیری، کلکته ۱۲۴۳ھ، ۱: ۱۰۷؛ (۱۴) القمّی: غرائب القرآن، بر حاشیۂ طبری (المطبعة المیمنیّة)، ۲۹: ۶۸؛ تصانیف محوّلۂ بالا کے علاوہ قب (۱۵) شپرنگر Sprenger: *Das Leben und die Lehre des Mohammad*، ۱: ۳۲۱ ببعد؛ (۱۶) M.Th. Houtsma: *Iets over den dagelijkschen çalât der Mohammedanen*، در *Theol. Tijdschrift*، ۱۸۹۰ء، ص ۱۳۷ ببعد؛ (۱۷) R. Bell: *The Origin of Islam in its Christian Environment*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ص ۱۴۳؛

فقه کے مختلف مذاہب و عقائد کے متعلّق قب (۱۸) خلیل [ابن اسحٰق]: المختصر طبع I. Guidi، میلان ۱۹۱۹ء، ۱: ۹۷؛ (۱۹) ابواسحٰق الشیرازی: التنبیه، نشر یوئن‌بول A. W. T. Juynboll، ص ۲۷؛ (۲۰) الرّملی: نہایة المحتاج، ۱: ۳۸۸ ببعد؛ (۲۱) ابن حجر الہیتمی: تحفة، ۱: ۲۰۱ ببعد؛ (۲۲) ابوالقاسم الحلّی: کتاب شرائع الاسلام، کلکته ۱۸۳۹ء، ۱: ۲۷؛ (۲۳) A Querry: *Droit Musulman*، پیرس ۱۸۷۱ء، ۱: ۵۲ ببعد.

([عابد احمد علی] و وینسنک A. J. Wensinck)

تہران: (تہران Tĕhrān) ، ایران کا پایتخت

نام: عربی تہجّی کے مطابق اس نام کی صورت "طہران" [بالطاء] بیسویں صدی کے شروع تک باقی رہی - فارسی ناموں میں اکثر شروع کلمے کی "ت" کو عرب "ط" میں تبدیل کر دیا کرتے تھے (گویا تا مخلوط به ها کو یه صورت دی؟)، تا ہم یاقوت، جو عرب تھا، تہران کے تلفّظ کو تسلیم کرتا ہے - زکریاء قزوینی، جو ایرانی ہے، اس کلمے کی صرف یہی صورت درج کتاب کرتا ہے - موجودہ فارسی میں کسرہ (*i*) باقاعدہ طور پر خفیف "*e*" کی آواز دیتا ہے، اس لیے فرنگی املاء میں Teheran وغیرہ لکھا جاتا ہے (چنانچه کلاویخو Clavijo اور della Valle ھی کے زمانے میں یه صورت ملتی ہے؛ شاردان Chardin نے Théran (تہیران) لکھا ہے) - تاہران Tährān کے تلفّظ سے ایرانی ناآشنا ہیں لیکن قسطنطنیة کے ترک، جن کی زبان میں بعض اوقات فارسی الفاظ کی قدیم ترین صورتیں پائی جاتی ہیں، تہران بولتے ہیں.

تہران کی وجهِ تسمیه یقینی طور پر معلوم نہیں - اشتقاقِ عوام پسند: تہ + ران "وہ جو لوگوں کا زمین کی تہ تک پیچھا کرے" ظاہر ہے کہ یاقوت ھی کی بیان کردہ کہانی پر مبنی ہے - تہ کی مطابقت تہ / تہ (= گہرائی) کے ساتھ کسی شمالی بولی میں ممکن ہے - ہمیں اور بھی کئی ایسے نام معلوم ہیں جو تہ کے ساتھ مرکب ہیں (Stack، ۱: ۹۷؛ ۲: ۱۳: تہ دشک < تہ دشت) - اس لفظ کے دوسرے جزء "ران" پر غور کریں تو یه گمان ضرور دل فریب معلوم ہوتا ہے که "ران" رےّ (رغان < رے یان < ران) کا مخفّف ہے، اس لحاظ سے اس کے معنی ہوں گے "رےّ کی تہ میں"، "پایین رےّ" لیکن اس نظریے میں اشکال یه ہے که اصفہان کے قریب ایک اور تہران بھی ہے، لیکن یه عجیب بات ہے که اس دوسرے تہران کا نام تیران > تیرون ہو گیا، حالانکه پایۂ تخت کے نام کی اصلی صورت بدستور باقی ہے.

شنڈلر H. Schindler: *East. Pers. Irak*، لنڈن ۱۸۹۶ء، ص ۱۳۱ میں تہران کو تیر - آن، یعنی "میدانان" کی ایک صورت سمجھتا ہے (Vullers،

۱ : ۳۸۶)، تیر planities, desertum، یعنی میدان، دشت) ۔ تہر ۔ کی تشریح کرنے کے لیے ہمیں اس لفظ کی آخری شکل 'تیر' سے شروع کرنا پڑے گا لیکن مرتبۂ یقین اسی وقت حاصل ہوگا جب اصلی لفظ تہر کی تحریری سند کہیں ملے ۔ hr ۔ یعنی ہر (> sr) کا باقی رہ جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ لفظ شمالی علاقے کی بولیوں سے متعلّق ہے (جنوب میں hr ''ہر'' کی آواز ''س'' میں بدل جاتی ہے) ۔ شنڈلر H. Schindler تہران کے نام کا کوہ شمران (تحریری صورت میں شمیران، قب سطور آیندہ) کے نام سے مقابلہ کرتا ہے، جو اس کے نزدیک شمر کی جمع ہے [شمر = ''جای از زمین و کوہ کہ آب باران در آن جمع شود'' ''و جدول آب را نیز گفتہ اند'' یعنی]، زمین اور وہ پہاڑ جس پر مینہ کا پانی جمع ہو، ''جدول'' (یعنی جوی خرد، برہان قاطع، بدون شاہد؛) ۔ شمر معمولاً ['' حوض خرد و کوچک را گویند و آبگیر'' یعنی] چھوٹے حوض یا تالاب کے معنی دیتا ہے (Vullers، ۲ : ۳۶۲) اور یہ معنی یہاں بخوبی چسپاں ہوتے ہیں ۔ بہر صورت تہران اور دیلمی قلعۂ شمیران (قب تارم) کی وجہ تسمیہ مشترک ہی ہوگی ۔

موقعیت : تہران کا طول بلد مشرقی ۵۱ درجہ، ۲۵ دقیقہ، ۴۸ ثانیہ ہے ۔ اس کا محلّ وقوع ایک نشیب ('گود') میں کوہ البرز کے باہر کو نکلے ہوئے شعبوں (spurs) کے دامن میں واقع ہے ۔ درۂ سرتوچال، جو شہر کے شمال میں بارہ میل کے فاصلے پر ہے، بارہ ہزار فٹ اونچا ہے ۔ یہ سلسلۂ کوہ بحیرۂ خزر کے طاس [اور فلات ایران] کا فاصل آب [یا مقسم المیاہ] محسوب نہیں ہوتا ۔ سرتوچال کی پچھلی طرف سے [یعنی اس کے شمال سے] رود کرج اور رود جاجرود نکلتے ہیں جو وسطی ایرانی دشت [فلات ایران) کی طرف بہتے ہیں ۔ اس سلسلے کا ایک باہر نکلا ہوا جنوبی شعبہ (spur) جاجرود کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے اور تہران کے میدان کی شرقی حد پر سدّ کی صورت میں قائم ہے ۔ اسے سہ پایہ کہتے ہیں شاہ عبدالعظیم کا چھوٹا سا قصبہ اس کے جنوبی سرے پر واقع ہے ۔ رے [رک بآن] کے کھنڈر شاہ عبدالعظیم اور تہران کے درمیان واقع ہیں ۔ تہران کی [اوسط] بلندی ۳,۸۱۰ فٹ ہے (شنڈلر) ۔ شمال شہر کی جانب [نشیب زیادہ ہے اور] بیک دفعہ چڑھائی شروع ہو جاتی ہے اور اس چڑھائی کی تین منزلیں ہیں : یعنی تہران سے قصر قاچار تک تین میل، وہاں سے زرگندہ تک اور تین میل (بلندی ۵,۰۰۰ فٹ) اور وہاں سے توچال کے دامن تک ۔

یہاں پہاڑ کی ڈھلان پر شمران کا سرسبز علاقہ ہے، جو تہران کے لوگوں کے لیے گرمیوں (مئی تا ستمبر) میں صرف ییلاق ہی نہیں ہے بلکہ یہیں سے شہر کو پانی بھی مہیّا ہوتا ہے ۔ تہران میں کوئی دریا نہیں ہے : یہاں پانی تقریباً تیس گہری زمین دوز قناتوں یا کاریزوں کے ذریعے لایا جاتا ہے ؛ ان کی لمبائی پانچ سے دس میل تک ہے اور یہ پہاڑ کے چشموں سے آتی ہیں ۔

تہران کی آب و ہوا سردیوں کے موسم میں خوشگوار ہوتی ہے لیکن موسم گرما میں صحت کے لیے اچھی نہیں؛ تپ محرقہ (typhus) اور دوسری قسم کے بخار اور ذوسنطاریا (dysentary) تہران کی وطن گیر (endemic) بیماریاں ہیں ؛ ہر شام سیراب زمین سے بخارات نکل کر کہر کی صورت میں اوپر چڑھنے لگتے ہیں اور شہر کو گھیر لیتے ہیں ۔ اس امر کو نظر انداز کر دیں تو آب و ہوا خشک ہے ۔ شنڈلر A. Schindler کے مشاہدات [یعنی *Klimatafeln aus Persien, Pet. Milt.,* 1909

احصائیۂ آثارِ جوّیۂ ایران]، ص ۳٦١ تا ۳٧٠ کے مطابق، جو اس نے متواتر ١٧ سال (یعنی ١٨٩٢ تا ١٩٠٨ء) تہران میں کیے، سالانہ برفباری اور بارش ١۳۴٫٢٥ (١٩٠١ء) اور ۳۳٠٫٧٥ (١٩٠۴ء) ملی میٹر کے درمیان دائر رہی - ١٨٩۴ - ١٨٩٥ء کے موسم سرما میں یہ انوکھی صورت پیدا ہوئی کہ برفباری ہوئی نہ بارش؛ ١٩٠٥ - ١٩٠٦ء کے موسمِ گرما میں بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسا - موسمِ سرما کی برفباری ١٦٫٥٠ اور ٩٦٫٢٥ ملی میٹر کے بین بین تھی - اوسط برفباری ملی میٹروں میں اور درجۂ حرارت سینٹی گریڈ کے حساب سے ہر ماہ میں حسب ذیل تھا :-

نومبر : ۳٢٫٢٦ ملی میٹر، ١٠٫٨ درجہ سینٹی گریڈ
دسمبر : ۳۴٫٢٠ " "، ٥٫٨ " " "
جنوری : ۴٦٫٠۳ " "، ١٫١ " " "
فروری : ٢٨٫١٢ " "، ٥٫٥ " " "
مارچ : ۴٧٫٧٢ " "، ٨٫٦ " " "
اپریل : ۳٥٫٥٦ " "، ١٥٫٥ " " "
مئی : ١٢٫٦٦ " "، ٢۳٫٩ " " "
جون : ١٫٥٨ " "، ٢٩٫٧ " " "
جولائی : ١٫١١ " "، ٢٩٫٧ " " "
اگست : ١٫۳٠ " "، ٢٨٫٩ " " "
ستمبر : ١٫۳١ " "، ٢٥٫٥ " " "
اکتوبر : ٨٫٦۴ " "، ١٨٫٩ " " "

سالانہ اوسط درجۂ حرارت ١٦٫٩ سینٹی گریڈ ہے اور پست ترین اور عالی ترین درجۂ حرارت کی حدّیں ۴۳٫٢ + اور / ١٦٫١ - ہیں - اور مشاہدات آثارِ جوّیہ بروگش Brugsch، ٢ : ۴٧٥ تا ۴٨١ اور شتال Stahl : ص ٥٢ پر [اور مسعود گیہان، ٢ : ۳۳٥ تا ۳۴٥ پر] درج ہیں.

قاچاریوں نے جو تہران کو پایۂ تخت بنایا تو بعض مصنّفین (کنیئر Kinneir، کرزن Curzon) کے نزدیک یہ ان کی دانائی کی دلیل ہے - وہ شمالی سرحد پر قابو پانا چاہتے تھے - حقیقت میں تہران کے انتخاب کا محرّکِ اوّل اتراکِ قاچاری کی یہ خواہش تھی کہ استرآباد سے، جو ان کے بزرگوں کی اُولُوس تھی، وہ زیادہ دور نہ ہو جائیں اور شمالی ایران کے ترک قبیلوں سے ان کا میل جول قائم رہے - پہلے زمانے کے سیّاحوں کی اکثریت (اولیوی اے Olivier، ٥ : ٨٧؛ دوپرے Dupré، ٢ : ١٨٧؛ فلاں دیں، Flandin، ١ : ٢۳٥) پایۂ تخت کے محلِّ وقوع کی ناموافق صورتِ حالات (پانی کی کمی، خراب آب و ہوا، بڑی بڑی شاہراہوں سے بُعدِ مسافت) کا بڑی شدّ و مدّ سے ذکر کرتی ہے - ان میں سے بعض خرابیوں میں تو مناسب اصلاحات کی وجہ سے اُس زمانے کے مقابلے میں اب خاصی کمی ہو گئی ہے لیکن خاص دقّت جو اس پایۂ تخت کی بے مرکزی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اس وقت محسوس ہوگی جب جنوبی ایران کے قدرتی محاصل مرحلۂ تکمیل کو پہنچے اور ایرانیوں کی زندگی میں ان کی اہمیت پورے طور پر واضح ہوئی - مفصلۂ ذیل فاصلے H. Grothe : *Persien*، فرینکفورٹ Frankfurt ١٩١١ء، ص ٩٨ - ٩٩ میں شمار کیے گئے ہیں :-

تہران - اَنزَلی	٢٢٠ میل
تہران - تبریز	۳٦٠ میل
تہران - مشہد	٥٧٨ میل
تہران - محمرہ	٦٦٠ میل
تہران - بوشہر	٧٦۴ میل
تہران - بندر عباس	٩٨٠ میل

شاہراہیں : اچھے خاصے قدرتی راستے تہران کو دوسرے صوبوں سے ملاتے ہیں - مازندران جانے آنے کے لیے ایک سڑک، جس پر صرف گھوڑے خچر ہی گذر سکتے تھے، نمساوی

انجنیر Gasteiger Khān نے ۱۸۷۵ء میں بنوائی تھی۔ ۱۸۸۳ اور ۱۸۹۲ء کے درمیان ایرانیوں نے گاڑی کی سڑک بنانا شروع کی تھی؛ بعد میں اسے ایک انگریزی کمپنی لِنچ بردرز Lynch Brothers نے مکمّل کیا (۹۵ میل) ۔ روس سے رُسل و رسائل کا سلسلہ سابق میں تو قزوین ۔ تبریز ۔ جُلفا ۔ تفلس کے راستے سے قائم تھا مگر ۱۸۵۰ء میں روسی جہازوں کی ایک باقاعدہ لائن نے باکو اور اَنزلی کے درمیان آمد و رفت شروع کر دی ۔ تہران اور بحیرۂ خَزَر کا فاصلہ بخطِّ مستقیم تو صرف ۷۰ میل کا ھے لیکن کوہِ البرز کے بیچ میں حائل ہونے کی وجہ سے یہ راستہ ہمیشہ دشوار گذار رہا ھے ۔ ۱۸۹۳ء میں روسیوں نے رَشت اور تہران کے درمیان گاڑی کی سڑک تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کر لی (یہ سڑک یکم جنوری ۱۸۹۰ء میں مَنجیل تک کھل گئی اور ۱۵ ستمبر ۱۸۹۹ء کو تہران تک جاری ھو گئی) ۔ اس کے بعد سے اکثر سیّاح اسی راستے سے آنے جانے لگے ۔ یہ سڑک تجارتی لحاظ سے بھی خاصی اھمیت حاصل کر چکی ھے ۔ روس کے انقلاب کے بعد ہر قسم کے روسی کاروباری اقدامات ایران میں شروع ھو گئے ھیں ۔ ۱۹۱۷ء سے تہران سے بغداد تک موٹر سروس جاری ھوگئی ھے اور حال ھی میں یہ سلسلہ بیروت (شام) تک پہنچا دیا گیا ھے ۔ ہوائی جہاز کی سروس بھی شروع ھو گئی ھے، جو ایک دن میں باکو سے تہران پہنچا دیتی ھے ۔ جب رضا خان سریر آرائے سلطنت ھوے تو یہ منصوبہ کہ ایران کے آر پار ریل کا سلسلہ جاری کیا جائے نہ صرف زیرِ غور آیا بلکہ جزوی طور پر (۱۹۲۸ء میں) اس نے عملی صورت بھی اختیار کر لی ۔ ایک طرف تو یہ سلسلہ تہران کو خلیج فارس سے (خُور موسی براہِ لُورِستان) ملا دے گا اور دوسری جانب بحیرۂ خَزَر سے (بندر گز براستۂ فیروز کوہ)۔

ایالتِ تہران : یہ چھے اضلاع پر مشتمل ھے (شَنْدْلَر) : ۱ : شَہریار، شمال مغرب میں دریائے کَرج کے دائیں کنارے پر؛ ۲ : ساوج بلاق [رَكَ بان، عدد ۲]، شَہریار کے شمال مغرب میں؛ ۳ : قشاویہ (پشاپُویہ)، شہر کے جنوب مغرب میں رِباط کریم کی سمت میں؛ ۴ : وَرامین [رَكَ بان]، جنوب مشرق میں؛ ۵ : شِمران، شہر کے شمال میں، جس میں ٦۳ خوش حال گاؤں آباد ھیں، جن میں سے مہمّ ترین تَجْرِیْش ھے ۔ قُلْہک (گُلْہک) اور زَرگَنْدہ کے مواضعات میں انگریزی اور روسی سفارت خانے واقع ھیں یہ مواضع محمّد شاہ نے انھیں ۱۸۳۵ء میں دیے تھے؛ ٦ : [قَصْران]، شِمران کے شمال اور جاجَرود کے بالائی حصّے میں واقع ھے [؟ اصطخری، ۲۰۸ پر رَیّ کے مشہور رستاقوں میں ''قَصْرانَ الداخل و الخارج'' کو شمار کیا ھے، گو ابن الأثیر نے بذیل ۴۲۱ھ قصران کو (موضع) حصینة قرار دیا ھے، گویا وہ رستاق نہیں، ایک مقام ھے] ان سے کم اھمیت کے تقسیمات ایرانی نقشے میں حسبِ ذیل ھیں : غار، جو تہران کے متصل جنوب ھی میں ھے (اسی میں شاہ عبدالعظیم کا قصبہ ھے)؛ لواسانات، شِمران کے مشرق میں؛ کَند (کَن) اور سُولْقان شِمران کے مغرب میں : شہرِسْتانک کَند کے شمال میں؛ اَرَنْگہ (Arange)، کَنْد اور کَرج کے درمیان ۔ [جغرافیای مفصل ایران، ۲ : ۳۱۲ پر تقسیمات حکومتی تہران کی تعداد بارہ دی ھے، یعنی ۱ ۔ تہران و حومہ؛ ۲ ۔ فیروز کوہ؛ ۳ ۔ دماوند؛ ۴ ۔ لواسان و رودبار و لورا و شہرستانک؛ ۵ ۔ طالقان؛ ٦ ۔ خوار؛ ۷ ۔ وَرامین؛ ۸ ۔ غار و پشاپویہ؛ ۹ ۔ شمیران؛ ۱۰ ۔ کن و سولقان و ارنگہ؛ ۱۱ ۔ ساوجبلاغ؛ ۱۲ ۔ شہریار]۔

قدیم حوالے : ڈ خویہ (اصطخری، ص ۲۰۹ k) نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ 'بہْزان'، 'بہتان' اور

'بہنان' سے، جن کا ذکر اصطخری، ص ۲۰۹، ابن حوقل، ص ۳۶۶ [طبع دوم، ص ۳۷۹] اور مُقدّسی [ص ۳۸۶] پر آیا ہے، تہران ہی مراد ہے - محمّد خان قزوینی (کتاب مذکور، ص ۳۹) نے اس نظریے کی پھر تجدید کی ہے، لیکن بقولِ یاقوت، ۱ : ۷۶۹، (گو وہ متأخّر ہے اور اس کا بیان زیادہ صریح نہیں) بہزان اس مقام پر واقع ہے جہاں کبھی رَیّ تھا - تہران سے اس کا فاصلہ ۷ فرسخ (؟) [مکرّر در یاقوت، ۲ : ۸۹۶] ہے، حالانکہ یہی جغرافیہ دان [۳ : ۵۶۴] توقّع کے مطابق رَیّ کا فاصلہ تہران سے ایک فرسخ ہی بتاتا ہے - تہران کا قدیم ترین ذکر فارس نامہ، طبع وقفیّۂ گِب، ص ۱۳۴ میں ہے (یہ کتاب قبل از ۵۱۰ھ / ۱۱۱۶ء لکھی گئی تھی) - اس کا مصنّف تہران کے انار کی بہت تعریف کرتا ہے - السمعانی، طبع وقفیّۂ گب، ورق ۳۷۳ نے بھی (حدود ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء میں) لکھا ہے کہ تہران کا انار عمدہ ہوتا ہے [نیز ملاحظہ ہو مکاتبات رشیدی، ص ۱۹۸]، لیکن ان حوالوں سے بےنیاز ہو کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تہران کا گاؤں اصطخری (۳۴۰ھ) کے زمانے سے پہلے بھی ضرور موجود تھا، کیونکہ سمعانی اپنے [؟] ایک بزرگ ابوعبداللہ محمد بن حَمّاد الطہرانی الرازی کا ذکر کرتا ہے جو عسقلان علاقۂ فلسطین میں ۲۶۱ھ / [۸۷۵ء] میں فوت ہوے - راحة الصدور (جو ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء میں لکھی گئی)، طبع وقفیّۂ گب، ص ۲۹۳، میں ہے کہ ۵۶۱ھ [/۱۱۶۶ء] میں سلطان اَرْسلان [بن طُغرل] سلجوقی کی والدہ نے رَیّ سے نخچوان جاتے ہوے اپنا پہلا مقام'' [بالای] تہران'' کیا (یہ گویا ایرانیوں کے باقاعدہ '' نقلِ مکان'' کی صورت تھی) - خود سلطان بھی کبھی دُولاب کے نزدیک (جو تہران کے جنوب مشرق میں ایک جگہ کا نام ہے، جہاں اب روسیوں کا قبرستان ہے) ٹھیرا کرتا تھا - ابن اِسفندیار طبرستان کی تاریخ میں (جو ۶۰۳ھ / ۱۲۱۶ء میں تصنیف ہوئی، طبع وقفیّۂ گب، ص ۱۹) ایران کے حماسی دور کی جنگوں کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے کہ افراسیاب اس جگہ خیمہ زن ہوا تھا جہاں اب '' دُولاب اور تہران '' آباد ہیں - آٹھ سال بعد یاقوت نے بھی تہران کے متعلّق ایک [رازی دوست کی اطلاع کی بنا پر] مختصر سی یادداشت لکھی ہے، [یوں وہ] خود بھی حملۂ مغول سے متّصل پہلے وہاں گیا تھا - یہ ایک بڑا [قریہ] تھا، جس کے بارہ محلّے تھے - چونکہ [طہران] میں مسکونہ مکان زیرِ زمین بنائے گئے تھے اور اطرافِ قریہ کے باغات بہت گھنے تھے، یہ مقام اچھی طرح سے محفوظ تھا، ناچار حکومت باشندوں سے مدارات کے سلوک کو سختی پر ترجیح دیتی تھی - طہرانیوں کا باہمی نفاق و عناد اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ باشندے اس خوف کے مارے کہ کہیں ان کے ہمسایے ان کے مویشی نہ چرا لیں زمین میں ہل چلانے کے بجاے بیلچے استعمال کرتے تھے - قزوینی (۶۷۴ھ/ ۱۲۷۵ء میں) طہران کے مکانوں کو کلا کموشوں کے بلوں (کنافقاء الیَرْبوع) سے تشبیہ دیتا ہے اور باشندوں کی خصلت کے متعلّق یاقوت کے بیان کی تصدیق کرتا ہے، قبّ آثار البلاد، ص ۲۲۸ -

اس کے بعد کے سب مؤرّخ بھی زیرِ زمین مکانوں کا ذکر کرتے ہیں، صرف کر پورٹر Ker Porter (۱ : ۳۱۲) اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ دروازۂ قزوین سے کوئی دو تین سو گز کے فاصلے پر میں نے '' ایک کھلا میدان دیکھا جس میں وسیع اور گہری کھدائیاں بلکہ گڑھے کثرت سے موجود تھے، جو غریبوں کی پناہ‌گاہ اور بارکش جانوروں کے اصطبل کا کام دیتے تھے'' (قبّ لوحہ ۷۵، درآومیر دِ ہلِ

(Hommaire de Hell) - یہ حوالہ ضرور پرانے ''دروازۂ نو'' (''پا قاپوق'') کے متعلّق ہوگا، جس کے جنوب میں محلّۂ ''غار'' آباد ہے - ''غار کا نام اس تمام حصّے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو تہران کے جنوب میں پھیلا ہوا ہے - اطراف تہران کی غار نشینی کی زندگی کے متعلّق قبّ ایسٹ وک Eastwick ، ۱ : ۲۹۳ : پل کرج کے مشرقی جانب کا ایک گاؤں؛ اور Crawshay-Williams : *Rock-dwellings at Rainah* ، در *J. R. A. S.* ، ۱۹۰۳ء، ص ۵۵۱ : ۱۹۰٦ء، ص ۲۱۷ .

تہران کی افزایش و ترقّی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نواح کے دیگر امّہات بلاد غائب ہو گئے - رَےّ کا زوال ٦۱۷ھ / ۱۲۲۰ء سے شروع ہوا جب مغولوں نے اسے ویران کر دیا - دورِ مغول میں تہران کا ذکر کبھی کبھی جامع التواریخ میں آتا ہے : ٦۸۳ھ / ۱۲۸۳ء میں جب ارغون نے آق خواجہ (= سومیقان : نزھة القلوب، ص ۱۷۳ [قزوین سے چار فرسنگ پر]) کے قریب احمد تگودار کے جرنیل الیناق پر فتح پائی تو وہ ''طہرانِ رَےّ'' میں آیا (قبّ محمد قزوینی : کتابِ مذکور، ص ۳۸ [جامع التواریخ ، باکو ۱۹۵۷ء، ۳ : ۱۸۱]) - ٦۹۳ھ / ۱۲۹۳ء میں غازان فیروز کوہ سے آتے ہوے ''طہرانِ رَےّ'' میں ٹھیرا (Dorn : *Auszüge* ، ص ۱۳۸) - بقول نزھة القلوب (تصنیف ۷۴۰ھ، طبع وقفیّۂ گِب، ص ۵۵) تہران قصبۂ ['معتبر'] تھا اور اس کی آب و ہوا رَےّ سے بہتر تھی [اور پیداوار رَےّ کی طرح]- اس سے پہلے ('' در ما قبل'') تہران کے باشندوں کو عظیم کثرت حاصل تھی - آخری جملہ اس مفروضے کا مؤیّد ہے کہ تہران کی عینیّت وھی ہے جو بھزان(؟) کی.

عہدِ تیموری میں قریۂ ''طہرانِ رَےّ'' کا ذکر ۸۰٦ھ / ۱۴۰۳ء میں آتا ہے کہ اس جگہ شہزادۂ رستم [اور امیر سلیمان شاہ] نے بیس روز تک مقام کر کے فوج جمع کی اور اس فوج کو ہمراہ لے کر اسکندر شیخی چلاوی (ظفرنامہ، ۲ : ۵۲۷ = مطلع [سعدین]، Dorn : *Auszüge* ، ص ۱۷۵ ، [نسخۂ اڈنرہ، ۱ : ۱۴۷ ب]) کا تعاقب کیا - اسی زمانے کے قریب (٦ جولائی ۱۴۰۴ء کو) تہران ("ciudad que ha nombre Teheran") میں پہلی مرتبہ ایک یورپی سیّاح یعنی ھسپانوی سفیر کلاویخو Clavij (طباعتِ سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۱ء، ص ۱۸٦ : ترجمہ لیسٹرینج Le Strange، لنڈن ۱۹۲۸ء، ص ۱٦٦) آیا - اس وقت تیمور کا داماد امیر سلیمان شاہ (ظفرنامہ، ۲ : ۵۹۱ ، کلاویخو، ص ۱۸۹، ۳۵۱ : Zuleman or Cumalexa Mirassà) رَےّ، [فیروز کوہ اور اُن اطراف] میں حکومت کرتا تھا - وہ وَرامین (Vatami) میں رہا کرتا تھا - شہر رَےّ Xahariprey غیرآباد ("agora deshabitada") تھا - بُرجِ تہران میں حاکم (گورنر) کا نمائندہ رہا کرتا تھا اور ایک خاص عمارت تھی جس میں بادشاہ یہاں آنے پر ٹھیرا کرتا تھا ("una posada onde el Señor suele estar quando allí venia") - تہران کے گرد فصیل نہ تھی.

سلسلۂ صَفَویّہ : عہدِ صفویّہ میں پایۂ تخت پہلے اَرْدَبِیل سے تبریز اور پھر قزوین اور آخرِ کار اصفہان میں منتقل ہوا - علاقۂ رَےّ کی اب کوئی بہت زیادہ اہمیّت نہ رہی تھی - اس میں صرف دو شہر قابلِ ذکر رہ گئے تھے : [۱] وَرامین، جو شاہرخ کے زمانے میں تھوڑی مدّت کے لیے خوب چمکا مگر عروج پا کر بسرعت زوال پذیر ہو گیا اور [۲] تہران - بقول رضا قلی خان (روضة الصفای ناصری) صفوی پہلے پہلے تہران میں اس لیے آیا کرتے تھے کہ صفویّہ کے جدّ اعلٰی سیّد حمزہ جوارِ [حضرت] عبدالعظیم میں مدفون تھے - اس شہر کی خوشحالی شاہ طہماسپ اوّل کے

وقت سے شروع ہوئی، جس نے ٩٦١ھ میں یہاں بازار [بنوائے] اور شہر کے گرد ایک فصیل [''بارو''] تعمیر کرائی جس کی لمبائی بقول [صاحب] زینۃ المجالس ایک فرسخ تھی (بقول مرآۃ البلدان، ١ : ٥١١ - اس کا دورہ ٦,٠٠٠ گام تھا) - اس دیوار میں چار دروازے اور ١١٤ برج تھے، یعنی قرآن [پاک] کی سورتوں کی تعداد کے برابر، [ہر ایک برج میں ایک سورۃ دفن کی گئی] - بریزین کے طرحی خاکے (١٨٤٢ء) میں بھی ١١٤ برج دکھائے گئے ہیں، جو اُس وقت تک باقی تھے - [سابق اَرک کی] تعمیر کے لیے مٹی چال میدان اور چال حصار سے لی گئی، جس کی وجہ سے ان دو محلّوں کا نام بھی یہی پڑ گیا - [امین] احمد رازی، جو خود علاقۂ رَے کا باشندہ تھا، تہران کی جاری نہروں، [سایہ دار درختوں] اور نزہت بخش باغوں کی بے مثال کثرت کا ذکر بڑے پُر تعریف الفاظ میں کرتا ہے اور اسی طرح شِمیران کی سطح مرتفع کی مسرّت افزا فضا اور نواحی علاقۂ [کوہستان] کَند اور سُلقان کی تعریف میں بھی رطب‌اللّسان ہے [جو طہران سے دو فرسنگ پر ہے] ([ہفت اقلیم] مخطوطۂ .Bibl. Nat، .Suppl. Pers، عدد ٣٥٧، ورق ٣٣٦ تا ٣٧٤ [و نسخۂ کتابخانۂ محمّد شفیع لاہوری، ٣٥١ ب ببعد]، (ان اوراق کا خاصہ حصہ قدیم شہر رَے کے مشاہیر کے حالات کے لیے وقف ہے) - بقول صاحبِ مجالس المؤمنین قریۂ سلاغان کی بنیاد مشہور و معروف سیّد [محمّد] نور بخش نے رکھی تھی [جو شاہ رخ کی وفات (واقع ٨٥٠ھ / ١٤٤٧ء) کے بعد رَے میں آئے اور قریۂ نفیس سولغان آباد کیا (''احداث فرمودند'')] مگر قبَ ہفت اقلیم رازی، نسخۂ کتابخانۂ محمّد شفیع لاہوری، ورق ٣٦٧ ب : ''سیّد محمّد نور بخش در زمان شباب برے وارد شدہ در قریۂ سلقان کہ روضہ ایست از روضہ ہای جِنان رحل اقامت افگندہ'' - سولقان کو مجالس المؤمنین، طہران ١٩٢٩ء، ص ٣١٥ پر مصحّفاً 'سولغانی' لکھا ہے مگر اس کتاب کے نسخۂ خطی منقول ١٠٥٣ھ میں جو دانش‌گاہ پنجاب میں ہے سُولقان لکھا ہے کہ بظاہر تصحیفِ سُوْلْقان ہے) - سیّد [محمّد] نور بخش کئی مذہبی تحریکوں کے بانی تھے اور ان کی وفات ٨٦٩ھ / ١٤٦٤ء میں ہوئی.

٩٨٥ھ میں تہران نے شہزادہ [حسن] میرزا [ولد سلطان محمد میرزا جو بعد میں شاہ محمّد خدا بندہ کے نام سے موسوم ہوا] کے قتل کا منظر بھی دیکھا - اس کے دشمنوں نے شاہ اسمٰعیل ثانی سے یہ شکایت کی تھی کہ وہ تخت و تاج کا متمنّی ہے.

٩٩٨ھ/١٠٨٩ء میں شاہ عبّاس اوّل، عبدالمؤمن خان اُزْبک کے خلاف جنگ آزمائی کے لیے جا رہا تھا کہ طہران میں سخت بیمار ہو گیا (عالم آرای، ص ٢٧٥)؛ اس وجہ سے از بک مشہد پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے - کہتے ہیں کہ اس واقع سے شاہ عبّاس طہران سے متنفّر ہو گیا - تاہم چہار باغ کے محلّ کی تعمیر کا زمانہ یہی ہے اور یہ چہار باغ اس جگہ تھا جہاں موجودہ اَرکِ [سلطنتی اور عمارات دیوانی ہیں - مرآۃ البلدان، ١ : ٥١٩ پایینِ صفحہ] - Pietro della Valle ١٦١٨ء میں تہران آیا تھا؛ وہ لکھتا ہے کہ تہران کا رقبہ تو کاشان سے زیادہ ہے لیکن اس کی آبادی کاشان سے کم ہے - وہ اسے ''چنارستان'' کے نام سے موسوم کرنا چاہتا ہے - اس زمانے میں ایک بیگلر بیگی (''gran capo di provincia'') تہران میں رہا کرتا تھا - اس کا حیطۂ اختیار فیروز کوہ تک تھا - ١٦٢٧ء میں سر ٹامس ہر برٹ Sir Thomas Herbert نے اندازہ لگایا تھا کہ تہران میں تین ہزار گھر ہیں.

افاغنہ : افغانوں کے حملے سے کچھ ہی پہلے شاہ حسین صفوی تہران میں مقیم ہوا اور اسی

جگہ اس نے دُرّی افندی سفیرِ احمد ثالث سے ملاقات کی (ابتداے ۱۷۲۰ء، قب *Relation de Dourri Efendi*، پیرس ۱۸۱۰ء) ۔ تہران ھی میں وزیرِ اعظم فتح علی خاں اعتماد الدولہ (یورپیوں کے "Athemat") کو موقوف کر کے اندھا کر دیا گیا ۔ اس واقع نے ناگہانی ہزیمت اور پراگندگی کی رفتار بغایت تیز و تند کر دی، قب Krusinski (طبع Du Cerceau): *Hist. des révol. de Perse*، ۱۷۴۲ء، ۱ : ۲۹۵ ۔ شاہ حسین (بتاریخ یکم جون ۱۷۲۱ء، La Mamye Clairac ۱ : ۲۰۰) اصفہان واپس پہنچا تو اس لیے کہ تاج و تخت کھو بیٹھے ۔ طہماسپ ثانی اگست ۱۷۲۵ء میں تہران آ کر ٹھیرا، لیکن جونہیں افغان نزدیک پہنچے وہ مازندران کی جانب فرار ہو گیا ۔ یورپی مصنّفین لکھتے ھیں کہ تہران نے شدید مقابلہ کیا اور اشرف کے بہت سے آدمی مارے گئے (Krusinski: کتاب مذکور؛ ص ۳۰۱، La Mamye Clairac: *Hist. de Perse*، ۱۷۵۰ء، ۲ : ۲۵۰؛ ھینوے Hanway، ۲ : ۲۳۳) ۔ فتح علی خاں قاچار نے کمزور سی کوشش کی کہ شہر کو محاصرے کی گرفت سے نکالے مگر اس کے باوجود کچھ مدّت کے بعد تہران فتح ھو گیا (قب Olivier، ۵ : ۸۹ اور مرآۃ البلدان) ۔ بقول صاحبِ مرآۃ البلدان (۱ : ۱۱۵) دروازۂ دولت اور دروازۂ اَرْک اسی زمانے کی یادگاریں ھیں، کیونکہ افغانوں نے ھر جگہ اس بات کی بہت احتیاط کی تھی کہ پسپائی کے راستے کھلے رکھیں ۔ ظاھر ھے کہ یہاں مراد انھیں ناموں کے پرانے دروازوں سے ھے ۔

مہمان دُوست کے مقام پر اشرف کو شکست ھوئی (۶ ربیع الاوّل ۱۱۴۱ھ / ۲۰ ستمبر ۱۷۲۸ء) تو افغانوں نے عمائد شہر کو قتل کر ڈالا اور اصفہان کو روانہ ھو گئے ۔ باشندے ان کے فوجی ساز و سامان پر جو وہ پیچھے چھوڑ گئے تھے ٹوٹ پڑے اور غفلت کے باعث باروت کا ایک ذخیرہ بھک سے اڑ گیا (*Histoire de Nadir Chah*، ترجمۂ Jones، لنڈن ۱۷۷۰ء، ص ۸۷) ۔ خود اشرف کو جلد ھی وَرامین سے بھگا دیا گیا اور شاہ طہماسپ ثانی تہران واپس آ گیا ۔

نادر : ۱۱۵۴ھ / ۱۷۴۱ء میں نادر نے تہران کا علاقہ اپنے بڑے بیٹے رضا قلی مرزا کو بطور جاگیر [الوس] عطا کیا؛ وہ اب تک سارے ایران پر حکومت کر رہا تھا ۔ یہ جاگیر بخشی شہزادے کے زوال اور اندھا کرنے کی تمہید تھی، قب جونیز Jones، ۲ : ۱۲۳؛ ھینوے Hanway، ۲ : ۳۵۷، ۳۷۸؛ عبد الکریم : *Voyage de l'Inde à la Mekke*، طبع لانگ لے Langlès، ۱۸۲۵ء، ص ۹۳ ۔

نادر کے جانشینوں کی جنگوں میں علی شاہ عادل (۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء) نے تہران میں پناہ لی لیکن ابراھیم کے جانب داروں نے اسے پکڑ کر اس کی آنکھیں نکلوا دیں (تاریخِ بعد نادریہ، طبع مَین O. Mann، ص ۳۴). خاندانِ نادری کے زوال کے بعد تہران قاچاریوں کے حلقۂ اثر میں آ گیا جو کریم خاں زند کے مدّ مقابل تھے ۔

کریم خاں:- (۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء) میں سلطان محمد حسن خان قاچار شیراز کے قریب کریم خاں سے ایک ناکام لڑائی لڑنے کے بعد تہران واپس چلا گیا اور اس کا لشکر منتشر کر دیا گیا ۔ کریم خاں نے یہ سن کر کہ تہران سلطان محمّد حسن خان کے وجود سے خالی ھے اپنے بہترین جرنیل شیخ علی خاں کو مقدمۃ الجیش بنا کر وھاں بھیجا ۔ محمد خاں [دُوَلُّو] کی مدد سے محمد حسن قاچار کو قتل کیا گیا اور کریم خان اپنی فوج ('اردو') سمیت ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۹ء میں تہران میں وارد ھوا ۔ محمد حسن خان کا سر عزت و تکریم کے ساتھ شاہ عبدالعظیم میں دفن کیا گیا ۔ اگلے سال کریم خان نے حکم دیا کہ

تہران میں ایک عمارتِ سلطنتی کی بنا رکھی جائے ''جو مدائن کے ایوانِ کسری کی مدّ مقابل ہو'' اور اس میں دیوان خانہ، حرم خانہ، اور قراول خانہ، (محافظ فوج یا باڈی گارڈ کے لیے مکان) تعمیر کیے جائیں، قبّ صادق نامی : تاریخ گیتی گشای Bibl. Nat. Supl. Pers.، عدد ۱۳۷۴، ورق ۲۹ - صنیع الدولۃ (مرآۃ البلدان، ۱ : ۵۲۲) نے مذکورہ عمارتوں میں ایک باغ [''باغ جنبِ دیوان خانہ'' کا بھی اضافہ کیا، جو دیوان خانے کے پہلو میں تھا] - وہ کہتا ہے کہ کریم خان کا ارادہ یہ تھا کہ اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنائے- آقا محمّد قاچار کو، جو مازندران میں گرفتار ہوا تھا، تہران ھی میں لا کر کریم خان کے سامنے پیش کیا گیا - کریم خان اس سے بہت مہربانی سے پیش آیا مگر اس مہربانی کا بدلہ اُسے بعد میں بہت بری طرح دیا گیا - ۱۱۷۶ء میں کریم خان نے شیراز کو اپنا صدر مقام بنانے کا فیصلہ کیا، ارکانِ حکومت کو وہاں بھیج دیا اور غفور خان کو حاکم تہران بنا کر پیچھے چھوڑا .

قاچاریوں کا عروج : کریم خان کا انتقال ۱۳ صفر ۱۱۹۳ھ [/ ۲ مارچ ۱۷۷۹ء] کو ہوا - ۲۰ صفر [۹ مارچ] کو آقا محمد [خان] شاہ عبد العظیم مین آ پہنچا اور اگلے ھی دن تہران کے نواح میں تخت نشین بھی ہو گیا (''جلوس'' فرمودند) (مرآۃ، ۱ : ۵۲۴) - تا ہم تہران علی مراد خان کے حلقۂ اثر میں آ گیا، جو جعفر خان زند کا سوتیلا بھائی تھا (تاریخ زندیہ، طبع Beer، ص ۸، ۱۳، ۲۰) - ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ [-۱۷۸۴ء] میں آقا محمد خان نے تہران فتح کرنے کے لیے پہلی کوشش کی لیکن والی شہر غفور خان تہرانی کامیابی سے دفع الوقتی کرتا رہا - اس اثنا میں طاعون پھیل جانے کی وجہ سے آقا محمد [چشمۂ علی] دامغان کی طرف [جو شہر دامغان سے چار فرسخ پرے، مرآۃ، ۱ : ۵۲۵؛ ۳ : ۲۳۶] ہٹ جانے پر مجبور ہو گیا - علی مراد خان کی وفات کے بعد (جو [محرّم] ۱۱۹۹ھ / [نومبر ۱۷۸۴ء] میں واقع ہوئی آقا محمد کی فوجوں نے تہران کا محاصرہ کر لیا - باشندگان شہر اس وقت تک قلعے کا قبضہ دینا نہیں چاہتے تھے جب تک آقا محمد اصفہان فتح نہ کر لے - آقا محمد کی فوج یہ خبر سن کر کہ جعفر خان زند فارس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے تتّر بتّر ہو گئی، تاہم حکّام و عمّالِ تہران نے بکمالِ خندہ پیشانی آقا کا استقبال کیا اور اس دن سے شہر اس کا دارالملک (''مقرّ سلطنت''، ''دارالسلطنۃ'' اور بعد میں ''دارالخلافۃ'') بن گیا - یہاں سے اس نے اپنی فوجی مہمّیں اِدھر اُدھر لے جانا شروع کیں، جن کی وجہ سے کل ایران اس کے زیر نگین ہو گیا - مآثر سلطانی، ترجمۂ Brydges : *Dynastiy of the Kajars*، ص ۱۸ کے مطابق تہران ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء میں دارالخلافۃ بن گیا اور قصرِ قاچار کی داغ بیل وہاں ڈال دی گئی - شیراز فتح کرنے کے بعد زندوں کا سارا توپ خانہ اور سامانِ حرب وغیرہ نئے دارالخلافے میں بھیج دیا گیا اور زندوں کے آخری بادشاہ لطف علی خان کو، جسے نابینا کر کے تہران میں قید کیا گیا تھا، ۱۲۰۹ھ میں بعد قتل امام زادہ زید کی خانقاہ میں دفن کر دیا گیا، کتابِ مذکور، ص ۲۵، ۳۰، ۷۶، ۸۲، ۱۰۱ -

آقا محمد شاہ کے قتل (۲۱ ذوالحجۃ ۱۲۱۱ھ/ ۱۶ جون ۱۷۹۷ء) کے بعد اس کا بھائی علی قلی خان دارالسلطنۃ کے سامنے آ نمودار ہوا لیکن وزیرِ اعظم مرزا شفیع نے اسے داخل ہونے کی اجازت نہ دی - اس اثنا میں وارثِ تخت بابا خان (فتح علی شاہ) شیراز پہنچ گیا اور دوسرے دعویدار

تخت صادق خان شَقاقی کی شکست کے بعد ۱۷۹۸ء کے شروع میں اس کی تاجپوشی ہو گئی ۔ شَقاقی [رکّ بآن] قیدیوں سے دارالخلافے کی خندق کھدوائی گئی (قب Schlechta - Wssehrd : *Fath 'Ali Schah und seine Thronrivalen*، در *Sitz. A. W. Wien*، ۱۸۶۳ء، ۲ : ۱ تا ۳۱) .

انگریزی ۔ فرانسیسی رقابت کے زمانے میں متعدّد سفراء ایران میں آئے : ایک طرف تو سر جان مَیلکم Sir John Malcoem (۱۸۰۱ اور ۱۸۱۰ء) سرھرفرڈ جونز برجز Sir Harford Jones Brydges (۱۸۰۷ء)، سر گور اَوزلے Sir Gore Ouseley (۱۸۱۱ء) اور دوسری [یعنی فرانسیسوں کی] جانب سے جنرل رومیو Gen. Romieu (جو تہران میں ۱۸۰۶ء میں فوت ہوا)، اے یوبر A. Jaubert (۱۸۰۶ء) اور گاردان Gen. Gardane (۱۸۰۷ء) ۔ روسیوں کی کوششیں تبریز ھی پر مرتکز رھیں، جو ایران کے ولی عہد کی جاے قیام تھی ۔ جب ترکمان چای (رکّ بآن؛ ۱۸۲۸ء) کا عہدنامہ ہو چکا تب روسی سفیر گربویدوف A. S. Griboyedow کچھ دنوں کے لیے پاے تخت میں آیا ۔ [آغا] یعقوب نے، جو شاہ کے خواجہ سرایانِ خاص میں سے تھا اور ایروان کا ارمنی تھا اور جسے جبراً مسلمان کیا گیا تھا، روسی سفارت خانے میں حاضر ہو کر یہ درخواست کی کہ مجھے عہد نامے کی فصل ۱۳ کی رو سے [جو استردادِ اَساری پر مبنی تھا] میرے وطن پہنچایا جائے ۔ اس ''ارتداد'' کے اشتعال کی وجہ سے روسی سفارت خانے پر حملہ ہو گیا اور اس کے ۳۸ افراد قتل کر دیے گئے (گربو یدوف اس کا سکرٹری، اس کے کاسک سپاھی اور نوکر چاکر) ۔ یہ سانحہ سفارت خانے کی عمارت (منزلِ ''زَنبُور کَچی باشی'' نزدیک دروازۂ قدیم شاہ عبدالعظیم، اب وہ محلّہ زرگر آباد میں کوچۂ سر پُولک کے نام سے مشہور ھے) میں واقع ہوا ۔ (گربو یدوف روسی علم و ادب کی تاریخ میں نامور شخص ھے) اُس کے سانحۂ موت کے متعلق قب بذیلِ حوادثِ سالِ [مذکور] : رضا قلی خان : روضۃ الصفای ناصری، تہران ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء؛ میرزا تقی خان : تأریخ قاجاریہ، تہران ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء، ۱ : ۲۲۱؛ صنیع الدولۃ : تاریخ منتظم ناصری، ۳، ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء : ص ۱۴۴؛ *Relation des événements qui ont précédé et accompagné le massacre de la derniére ambassade russe en Perse*، در *Nouv. Annales des voyages*، ۱۸۳۰ء، جزء ۴۸، ص ۳۳۷ تا ۳۶۷؛ Bergé : *Smert' Griboyedova*، در *Russ. Starina*، ۱۸۷۲ء، ۸ : ۱۶۲ تا ۲۰۷؛ Malyshinsky : *Podlinnoye delo*، در *Russ. vestnik*، ۱۸۹۰ء، ۶ : ۱۶۰ تا ۲۳۳؛ ژکووسکی Žukovski : *Persidskiye Letopistsy*، در *Novoye Vremia*، ۱۸۹۰ء، عدد ۵۰۶۸؛ Allahverdiants : *Končina Griboyedova po armianskim istočnikam*، در *Russ Starina*، ۱۹۰۱ء، عدد ۱۰ و ص ۴۴ تا ۶۸؛ Minorsky : *"Tsena Krovi" Griboyedova*، در *Russ. Mysl.*، پراگ ۱۹۲۳ء، ۳ : ۱ تا ۱۵؛ قب مرآۃ البلدان ۵۵۳ .

جب فتح علی شاہ کی موت (۱۹ اکتوبر ۱۸۳۴ء) کی خبر پاے تخت میں پہنچی تو اس کے لڑکے مرزا ظِلّ سلطان نے عادل شاہ کے لقب سے اپنی شاھی کا اعلان کیا اور سکّے ضرب کرائے لیکن وارثِ تخت محمد میرزا تبریز سے آ پہنچا اور اس کے ھمراہ انگریزوں اور روسیوں کے نمائندے بھی تھے؛ وہ پاے تخت میں [''بی دردِ سرِ نیزہ و آمد شد پیکان''] ۲ جنوری ۱۸۳۵ء کو داخل ہو گیا ۔ عادل شاہ نے صرف چھے ھفتے حکومت کی (قب Tornau : *Aus d. neuesten Geschichte Persiens*، در *Z. D. M. G.*، ۱۸۴۹ء، ص ۱ تا ۱۰) ۔ اس کے بعد

تین بادشاہ یکے بعد دیگرے بغیر کسی ناگوار واقعے کے تخت نشین ہوے (قبّ مادۂ قاچار) (حتّی کہ ناصرالدین شاہ قاچار کے قتل کے بعد بھی جو یکم مئی ۱۸۹۶ء کا واقعہ ہے اس کا جانشین پُر امن طریق ھی سے تخت پر بیٹھا) ۔ ان بادشاھوں کے زمانے کے تہران کی تاریخ حقیقت میں کُل ایران کی تاریخ ھے ۔ شہر کے امن چین میں خلل ڈالنے کا موجب صرف وبائی امراض کے حملے تھے اور قحط کی پیدا کردہ نقلِ مکانی جو وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھی؛ قبّ یکم مارچ ۱۸۶۱ء کے فسادات جو ایسٹ وِک Eastwick نے کتاب مذکور میں بیان کیے ھیں اور اَشر Ussher : *Journey from London to Persepolis*، لنڈن ۱۸۶۵ء، ص ۶۲۵ ۔

اس دَور کے زیادہ اہمّ واقعات میں سے بابیوں [رَکّ بآں] کی تنگ گیری ھے جو خصوصیت کے ساتھ ۱۸۵۰ء میں ھوئی، جب ناصرالدین شاہ پر قاتلانہ حملہ ھوا ۔ تمباکو کی واحد اجارہ داری اور حقِ انحصاری (monopoly) کے سلسلے میں شرکت اجارہ داریِ تمباکو (*Tobacco Monopoly Carpora-tion*") کو ۱۸۹۱ء میں مراعات دی گئیں؛ ان کے خلاف جو تحریک رونما ہوئی اس کا آغاز بھی تہران سے ھوا؛ قبّ براؤن : *The Persian Revolution*، کیمبرج ۱۹۱۰ء، ص ۴۶ تا ۵۷ ۔

انقلاب : ایرانی انقلاب کے بعد سے دارالخلافة، جو اس سے قبل باقی صوبوں سے کچھ الگ تھلگ ھی سا تھا، بڑی تیزی کے ساتھ ملک کی سیاسی اور علمی کاوشوں کا مرکز بن گیا ھے ۔ اس زمانے کے واقعات بقیدِ ترتیبِ زمانی حسب ذیل ھیں : مسجدِ شاہ میں سوداگروں کا بسْت، دسمبر ۱۹۰۵ء ۔ مشروطہ خواھوں کا انگریزی سفارت خانے میں بسْت، ۲۰ جولائی تا ۵ اگست ۱۹۰۶ء؛ ۔ قصرِ بہارستان میں ۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مجلس کا افتتاح ۔ ولی عہد محمّد علی میرزا ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو قانونِ اَساسی (constitution) پر دستخط کرتا ھے ۔ وفات مظفرالدین شاہ (۸ جنوری ۱۹۰۷ء) ۔ قتلِ اتابِک امین الدولہ، (۳۱ اگست ۱۹۰۷) ۔ "استبدادیوں" کے جوابی مظاھرے' ۱۳ تا ۱۹ دسمبر ۱۹۰۷ء ۔ مجلس پر بمباری، ۲۳ جون ۱۹۰۸ء ۔ تہران پر ملّت پرست (nationalist) افواج نے زیرِ کمان سپہ دار اعظم رَشتی اور سردارِ اَسْعد بختیاری ۱۳-۱۵ جولائی ۱۹۰۹ء کو قبضہ کر لیا ۔ محمد علی شاہ ۱۶ جولائی کو تخت سے دست بردار ھوا اور ۱۸ جولائی ۱۹۰۹ء کو سلطان احمد شاہ تخت نشیں ھوا؛ قبّ براؤن : *Persian Revolution* اور D. Fraser : *Persia and Turkey in Revolt*، لنڈن ۱۹۱۰ء، ص ۸۲ تا ۱۱۶ - ۱۲ مئی ۱۹۱۱ء سے ۱۱ جنوری ۱۹۱۲ء تک کے واقعات کے متعلّق مورگن شُوستر Morgan Shuster کی کتاب *The Strangling of Persia*، لنڈن ۱۹۱۲ء میں معلومات ملیں گی ۔ ۱۹۱۵ء میں ایران جنگِ عظیم میں پھنس گیا ۔ وسطی طاقتوں کے نمائندے شاہ سلطان احمد کو قُم تک یوں کہنا چاھیے، کہ کشاں کشاں اپنے ساتھ لے گئے ۔ دارالخلافة فوجی کارروائی کے حلقۂ اثر سے تو باھر تھا لیکن متعدّد مرتبہ اس کے گرد و نواح میں فوجی نقل و حرکت ہوئی (۱۰ دسمبر ۱۹۱۰ء کو رِباط کریم کے نزدیک معمولی سی لڑائی روسی کاسکوں (Cossacks) اور امیر حِشْمت کے ژاندارم دستوں gendarmes کے درمیان ہوئی : یہ دستے وسطی طاقتوں کے معاون تھے؛ قبّ Emelianow : *Persidskii front*، برلن ۱۹۲۳ء) ۔ ۱۹۱۷ء تک بحیرۂ خَزر اور تہران کا درمیانی علاقہ روسی فوجوں کے زیرِ تسلّط تھا ۔ ۱۹۱۸ء سے انگریزی فوجیں ان کی جگہ

آ گئیں، قبّ ڈنسٹرول Dunsterville : *The Adventures of Dunster force*، لنڈن ۱۹۲۰ء - ایرانی کاسکوں کی ایک ڈویژن سے بھی، جس کی کمان پرانے روسی فوجی اتالیقوں کے ہاتھ میں تھی، اس غرض سے کام لیا گیا کہ اگر شمال کی طرف سے حملہ ہو تو ایران کو اُس سے بچایا جا سکے - ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو روسی افسر موقوف کر دیے گئے؛ اس ڈویژن کا زیادہ حصہ قزوین میں متعین تھا، جہاں انگریزی فوج بھی جرنیل آئرن‌سائڈ Ironside کی ماتحتی میں اُس وقت تک مقیم تھی - ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کو اڑھائی ہزار ایرانی کاسکوں نے، جو جرنیل رضا خاں کے زیر کمان قزوین سے آئے تھے، دارالخلافے پر قبضہ کر لیا - سید ضیاءالدین نے نئی وزارت بنائی (۲۴ فروری تا ۲۴ مئی) اور رضا خان کو ''سردارِ سپاہ'' مقرر کیا گیا (قبّ بیلفور J. M. Balfour : *Recent Happenings in Persia* لنڈن ۱۹۲۲ء) - ۱۹۲۳ء کے اواخر میں شاہ سلطان احمد ملک چھوڑ کر چلا گیا، یعنی اُسی زمانے میں جب قوام السلطنۃ (جو ۴ جون ۱۹۲۱ء سے وزیرِ اعظم مقرّر ہوا تھا) ملک سے چلا گیا - وزیرِ اعظم پر الزام یہ تھا کہ وہ 'سردارِ سپاہ' کے خلاف سازش کرتا ہے - رضا خاں سردارِ سپاہ نے حالات پر پورا قابو پا لیا اور ۲۵ اپریل ۱۹۲۶ء کو اس کی تاجپوشی بھی ہو گئی [قبّ پہلوی].

شہر کی ترقّی : تہران کے مکانوں کی جو کیفیت یاقوت نے بتائی ہے اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ شہر کا قدیم ترین حصہ جنوب میں ہے (یعنی محلّۂ غار [جہاں کے گھر پست اور غاروں سے مشابہ تھے] اور اس کی توسیع جنوب سے شمال کو ہوئی ہے (یعنی صحراء سے پہاڑ اور [زیرِ زمین قناتوں کے سر چشموں] کی طرف) - تہران میں کم ہی کچھ آثار ہوں گے جو عہدِ زندیّہ سے متعلق ہوں - موجودہ شہر پورے کا پورا عہدِ قاچاری کی تخلیق ہے.

اُولیوی‌اے Olivier، جو ۱۷۹۶ء میں ایران گیا، لکھتا ہے کہ شہر جس کی بابت یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سر بسر نیا آباد ہوا ہے یا مکرّر تعمیر ہوا ہے کوئی دو میل (؟) سے کچھ زیادہ مربّع کی شکل میں ہے لیکن اس میں سے صرف نصف حصّے پر عمارات ہیں - آبادی پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہے، جس میں سے تقریباً تین ہزار سپاہی ہیں - اُولیوی‌اے بجا طور پر یہ رائے‌زنی کرتا ہے کہ ''تخت کے ارد گرد جو سونا بکھیرا جاتا ہے'' اس سے آباد ہونے والے لالچ میں آ کر کھچے چلے آئے - قلعے کے اندر کا محلّ [آغا] محمّد [خان] کے وقت میں تعمیر ہوا تھا - ''تالارِ تختِ مرمر'' میں تصاویر، شیشے اور مرمر کے ستون کریم خان کے محلّ سے، جو شیراز میں تھا، لائے گئے تھے - ایک دروازے کی دہلیز کے تلے [کریم خان] کی ہڈیاں دفن کی گئی تھیں تاکہ ہر روز قاچاری بادشاہ اسے لکد کوب کرے (اُوزلے Ouseley) - رضا شاہ کے تخت‌نشین ہونے پر یہ ہڈیاں وہاں سے ہٹوا دی گئیں [اور احترام کے ساتھ حضرت عبدالعظیم میں دفن کی گئیں].

بقول جنرل گاردان (۱۸۰۸ء) موسمِ گرما میں صرف عجائز و عاجزین ہی تہران میں رہ جاتے ہیں لیکن موسمِ سرما میں آبادی پچاس ہزار تک پہنچ جاتی ہے.

موری‌ار Morier (۱۸۰۸-۱۸۰۹ء) کہتا ہے کہ تہران ۴½ یا ۵ میل کے گھیر میں تھا - کنیئر Kinneir اُسی زمانے میں اس کی آبادی موسمِ گرما میں دس ہزار اور موسمِ سرما میں ساٹھ ہزار بتاتا ہے - شہر کے گرد مضبوط فصیل اور بہت بڑی خندق تھی اور بہت بڑا سا پشتہ یا خاکریز (glacis)، لیکن دفاع کی یہ صورت صرف اسی ملک میں کچھ قابلِ قدر ہے ''جہاں لوگ فنِ جنگ سے نا واقف

ہیں " [یعنی دفاع کے نقطۂ نظر سے حصار، اسلحۂ جدید کی مقاومت نہیں کر سکتا تھا] اُوزلی (۱۸۱۱ء) کے شمار کے مطابق تہران کے چھے دروازے تھے، تیس مسجدیں اور دانش کدے (کالج) اور تین سو حمام۔ اس کے اندازے کے مطابق موسمِ سرما کی آبادی چالیس سے ساٹھ ہزار تک تھی۔ کر پورٹر Ker Porter ۱۸۱۷ء میں آٹھ (؟) دروازوں کا ذکر کرتا ہے، جن کے سامنے بڑے بڑے گول برج تعمیر کیے گئے تھے (قب نقشۂ پورٹر) تا کہ مورچوں، خندقوں وغیرہ کی محافظت کی جا سکے اور دروازوں وغیرہ کو زیر تصرف رکھا جا سکے۔ اس کے نزدیک موسمِ سرما میں آبادی ساٹھ ستر ہزار کے قریب تھی۔

فتح علی شاہ نے شہر کو بہت ترقی دی لیکن اس کی حکومت کے آخری ایام میں کچھ عرصے تک شہر سے بے پروائی برتی گئی۔ بقول فریزر Fraser (۱۸۳۸ء)، ایران میں کوئی دوسرا شہر ایسا نہ تھا جو اتنا حقیر نظر آتا ہو۔ "سارے شہر میں ایک گنبد" نظر نہ آتا تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں حالت پھر رو بہ اصلاح ہوئی.

بیریزین Berezin نے محلّ ("دربِ دولت خانہ") کا حال خصوصاً تفصیل سے بیان کیا: ہے کہ اس میں چار حیاط (یا صحن courts) اور بے شمار عمارتیں ہیں۔ (دولت خانہ، دفترخانہ، کلاہ فرنگی (پیولین "pavillion")، صندوق خانہ، زرگر خانہ، عمارت [شیر و] خورشید، سروستان، خلوتِ شاہ، گلستان)۔ یہی سیاح محلّ اور شہر کا نقشہ بھی دیتا ہے، جو تاریخی موضع نگاری (topography) کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ اس وقت یعنی ۱۸۴۲ء میں فصیل کے اندر شہر کی غربی شرقی پیمائش ۳,۸۰۰ ایرانی آرشین (یعنی تقریباً اتنے ہی گز) اور شمالاً جنوباً ۱,۹۰۰ تا ۲,۳۰۰ آرشین کے قریب، یعنی اس کا مجموعی رقبہ کوئی ۳ مربع میل کے قریب ہوگا (پولک Polak کا یہ حساب، دیکھیے کتاب مذکور، ص ۲۲۳ پر، کہ رقبہ ۸۳,۷۵۰ مربع میٹر ہے بدیہی طور پر غلط ہے)۔ 'ارک' متوازی الاضلاع کی شکل میں تھا (مغرب سے مشرق کو ۶۰۰ آرشین اور شمال سے جنوب کو ۱,۱۷۵ آرشین یعنی سارے شہر کا چوتھائی حصہ)، 'ارک' کا شمالی حصہ بیرونی فصیل کے وسطی حصے سے متصل تھا۔ فصیلِ شہر کے متصل باہر وسیع باغات تھے۔ سب سے بارونق علاقہ وہ تھا جو 'ارک' سے جنوب مشرق کو دروازۂ شاہ عبدالعظیم کی جانب تھا۔ اس نقشے میں صرف پانچ دروازے دیے ہیں۔ کھلا میدان، جسے میدانِ شاہ کہتے تھے اور جنوب میں قلعے کے قریب واقع تھا، صرف ایک ہی تھا اور یہ بھی زیادہ بڑا نہ تھا (قب لوحہ، در Hommaire de Hell)۔ بناہائے مہم میں مسجد شاہ اور امام زادہ زید اور امام زادہ یحیٰی تھیں۔ گاردان Gardane نے ۱۸۰۷ء میں مسجدِ شاہ کو تعمیر ہوتے دیکھا تھا۔ اس مسجد کے (کتبے) خطّاطِ شاہی محمد مہدی [نے لکھے]۔ [ایک پر تاریخ اتمامِ مسجد] ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء دی ہے۔ لیکن بقول شنڈلر Schindler اس مسجد کی تعمیر ۱۸۴۰ء تک ختم نہ ہوئی تھی (قب فریزر، سطورِ بالا)۔ کرزژ Križ (۱۸۵۷ء) کا نقشہ بیریزین Berezin کے نقشے سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن وہ شہر کے بیرونی حصے میں شہر کی جدید توسیع بھی نقطے دار خطوط سے دکھاتا ہے، جس کے متعلق ڈاکٹر پولک Polak اپنے ایک تشریحی نوٹ میں لکھتا ہے کہ یہ توسیع ۱۸۵۷ء سے کافی پہلے شروع ہو چکی تھی۔ خود پولک نے ۱۸۵۳ء میں شہر کے شمالی دروازے کے شمال میں ایک شفاخانہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ نئی عمارتیں معدودے چند تھیں اور کسی باقاعدہ

منصوبے کے ماتحت تعمیر نہ ہوئی تھیں - ۱۸۶۱ء میں شہر ابھی پرانے مربع کے اندر ھی اندر تھا - موسم گرما میں آبادی اسی ہزار تھی اور موسم سرما میں کوئی ایک لاکھ بیس ہزار (بُرگش Brugsch).

شہرِ نو- ۱۸۶۹ تا ۱۸۷۳ء میں شہر میں کُلّی تبدیلیاں عمل میں آئیں (قبّ کرزن، شٹال Stahl اور شِنڈلر؛ شہر کی توسیع و ترقّی کے منصوبوں پر خرچ کے سرکاری اعداد و شمار ابھی تک دریافت نہیں ہو سکے) - شہر کو ہر سمت میں توسیع دی گئی - پرانی خندق اور فصیل کا اکثر حصّہ غائب ہو گیا - تہران نے اب بے قاعدہ مثمّن کی شکل اختیار کر لی، جس کے گرد جدید استحکامات تھے (مٹی کے برج اور خندقیں)، جو پیرس کے نمونے کے مطابق تھے لیکن ان کی فوجی اہمّیت کچھ بھی نہ تھی - کرزن نے لکھا ھے (۱ : ۳۰۵) کہ یہ کام ۱۸۷۱ء کے قحط کے زمانے میں ہوا تھا، قبّ Brittlebank : *Persia during the famine*، لنڈن ۱۸۷۳ء - شہر میں بارہ دروازے بنائے گئے - شہر کے اندرونی دروازے [ایک مدّت تک] بحال رھے لیکن اُن کے ناموں کا اطلاق اس وقت نئے خطوطِ استحکامات میں اُن کے متقابل دروازوں پر ہوا - استحکامات کے یہ خطوط لمبائی میں بیس ہزار گز ھیں - تہران کا مجموعی رقبہ اب ساڑھے سات مربع میل ھے (شِنڈلر) - پرانے دروازۂ دولت کے سامنے توپخانے کی اہمّ عمارت (۲۵۰ × ۱۲۰ گز) تعمیر ہوئی؛ اس کے اطراف میں توپ خانے کی بارکیں تھیں - ایک 'میدانِ مشق' [موجودہ باغِ مِلّی]، جو توپخانے سے بھی زیادہ وسیع اور شاندار (۵۵۰ × ۳۰۰ گز) تھا، توپ خانے کے شمال مغرب میں بنایا گیا - [اب قدیم میدانِ توپخانہ کے اطراف میں بلدیّہ، بانک شاھنشاھی، ڈاکخانے اور تارگھر کی عمارتیں ھیں، مغرب کی جانب پولیس ('شہربانی') کی عمارت ھے]-

دو متوازی اور اہمّ شریانی سڑکیں "خیابانِ علاءالدولہ" اور "لالہ زار" میدانِ توپ خانہ سے شمال کی طرف جاتی ھیں، فصیلِ شہر سے باھر کی پرانی تفریح گاھیں، "لالہ زار" اور "نگارستان" وغیرہ شہر کے اندر آ گئیں - نئی آبادی نے سب سے پہلے غیر ملکی سفارت خانوں کو اپنی طرف کھینچا - فرانسیسیوں کے پہلے سفارتی وفد (گاردان) اور انگریزوں کے وفد (جونز Jones اور اُوزلے Ouseley) کو دروازۂ شاہ عبدالعظیم کے قریب امین الدولہ کے محلّ میں جگہ دی گئی تھی - اُوزلے کے وقت میں اس زمین پر، جو زَنبُورَکچی باشی کی مِلکیت میں تھی، انگریزی سفارت خانہ تعمیر ہوا - یہ زمین شاہ نے انگریزوں کو دی (یہ زَنبُورَکچی باشی وھی شخص ھے جس کی ایک اَور جائداد کے قریب گریبویدوف Griboyedow کو قتل کیا گیا تھا) - نیا انگریزی سفارت خانہ ۱۸۷۰ء میں خیابانِ علاءالدولہ کے سرے پر تعمیر ہوا تھا - جب ۱۸۳۴ء میں روسی سفارت خانہ بھی یہاں قطعی طور پر قائم ہو گیا تو اسے خود 'اَرک' کے اندر وزیراعظم حاجّی میرزا آغاسی کے مکان میں جگہ دی گئی - ۱۸۸۰ء میں روسیوں نے اپنا سفارت خانہ محلّۂ پامنار میں (جو 'اَرک' کے مشرق میں ھے) آپ بنوایا لیکن ۱۹۱۵ء میں وہ "اتابگ کے پارک" میں جا بسے، جو انگریزی سفارت خانے کے متّصل شمال میں ھے - ترکی اور فرانسیسی سفارت خانے انگریزی سفارت خانے کے مشرق اور مغرب میں ھیں - یورپی دوکانوں اور ایرانی امراء نے بھی سفارت‌خانوں کی تقلید کی ھے لیکن تجارتی مرکز ابھی تک پرانا بازار ھی ھے جس میں 'اَرک' کے جنوب کی طرف سے داخل ہوتے ھیں.

تہران میں کوئی شاندار عمومی عمارت نہیں ھے [یہ بہت پرانی بات ھے، حال میں کئی شاندار

عمومی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں، مثلاً بانکِ شاہنشاہی، متعدد مؤسّساتِ بلدی، دانش گاہ، ریلوے سٹیشن، کاخِ مرمر وغیرہ] ۔ مسجدِ سپہ سالار (میرزا حسین خان م ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء) شہر کی عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار ہے ۔ یہ نئے محلّے میں شمال مشرق کی جانب بہارستان محل سے جس میں ۱۹۰۶ء سے 'مَجلِس' [یعنی پارلیمنٹ] کا انعقاد ہوتا ہے متّصل ہے ۔ اس عمارت کی داغ بیل ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء میں ڈالی گئی، قبّ مآثرالآثار، ص ۸۳ اور اس کی تعمیر ۱۸۹۰ء میں ختم ہوئی ۔ اس کے مدرسے [مدرسۂ سپہ سالار] پر ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء کی تاریخ درج ہے .

تہران کی سب سے بڑی خوبصورتی یہاں کے وسیع نجی مکانات میں ہے، جن میں اپنے اپنے باغ اور گل و گلزار ہیں ۔ شہر کے ارد گرد بہت سے ییلاقی مکانات اور محلّات ہیں جو قاچاری اسلوب پر بنائے گئے ہیں ۔ یہ اسلوب زیبائی کے نقطۂ نظر سے بے اہمیت نہیں اور حقیقت میں عہدِ صفوی کی تعمیری روایات سے وابستہ اور اسی کی تمدید ہے ۔ [مقاماتِ ذیل کے محلّ وقوع کے لیے دیکھیے نقشۂ سیاسی تہران در جغرافیای مفصّل ایران، ۲ : ۳۰۰] ۔ عشرت آباد، جو تہران کے متّصل شمال میں ہے، اسی قسم کا محلّ ہے ۔ اس کی تصویر کے لیے دیکھیے کرزن، ۱ : ۳۴ (قبّ ص ۳۲۶ اور d' Allemagne میں شمس العمارۃ کا پیولین [یا ''کلاہ فرنگی''] جو 'اَرْک' میں ہے) ۔ قصرِ قاچار، جو ییلاقی کوشک تھی، اب کھنڈر ہو چکی ہے (قبّ لوحیں جو de Coste 'Saltykoff اور Hommaire de Hell کی کتابوں میں دی ہیں) ۔ یوشان تَپّہ (تلّ الزوفا hyssop) کا شکار گھر (عوامی دوشان تَپّہ = خرگوش کا ٹیلہ)، جو کوہ سہ پایہ کے دامن (یعنی تہران کے مشرق) میں واقع ہے اُسے شہر کے ساتھ ایک اچھی سڑک ملاتی ہے، جس کا افتتاح ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو ہوا تھا (Serena) ۔ شہر کے صلحاء شاہ عبدالعظیم کی زیارت کو جاتے ہیں جو رَےَ [رَکّ بان] کے کھنڈروں سے پرے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے ۔ تہران سے اس مقدّس مقام تک جو ریل کی لائن گئی ہے پانچ میل لمبی ہے (اور اس کی دو چھوٹی شاخیں بھی ہیں، ایک تو ایک میل لمبی ہے، دوسری ڈیڑھ میل)؛ یہ ۱۸۸۸ اور ۱۸۹۳ء کے درمیان تعمیر ہوئی ۔ ۱۹۱۵ء تک سارے ایران میں یہی ایک ریلوے لائن تھی ۔ [یہ حالات ۱۹۲۹ء کے قریب کے ہیں جب اصل مقالہ جو فرانسیسی میں لکھا گیا تھا طبع ہوا ۔ اس زمانے میں تہران ایران کے نظامِ رسل و رسائل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے ۔ مہر آباد (تہران کے مغرب میں ۵ میل پر) اب بین الاقوامی ہوائی مستقر ہے اور یورپ اور شرق اوسط و بعید، افغانستان، پاکستان وغیرہ ملکوں سے اس کا اتّصال ہے ۔ اندرونِ ملک کے بڑے بڑے شہروں اور تہران کے درمیان ہوا پیما کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے .

سڑکیں کچھ پکّی ہیں مگر زیادہ تر کچّی ہی ہیں ۔ بڑی بڑی سڑکیں جو تہران کو دیگر مقامات سے ملاتی ہیں یہ ہیں :-

تہران تا عراق
" تا اہواز و خرّم شہر (براہ اَرَک)
" تا بوشہر (براہِ قم و اصفہان و شیراز)
" تا جُلفا (سرحدِ روس پر، براہِ تبریز)
" تا مشہد
" تا ساحل بحر خزر (براہ کوہ البرز و حدودِ سوویاتی)

ان میں سے بعض سڑکوں کی شاخیں زاھدان تک اور وھاں سے کوئٹے تک اور بعض کی ترکیہ اور

شمال عراق تک جاتی ہیں .

ریلوں کے نظام میں تہران کی حیثیت بالکل مرکزی ہے۔ ریل کے ذریعے تہران کا اتصال بحر خزر کی جنوب مشرقی بندرگاہ بندرِ شاہ سے (جو شہرِ استر آباد کے شمال میں ہے) بندرِ عباس (ساحلِ خلیج فارس پر)، تبریز اور جلفا سے ہو چکا ہے]۔

۱۸۷۵ء میں ایران میں گیس کا استعمال شروع ہوا (Serena)؛ اور ۱۹۰۵ء کے قریب بجلی بھی استعمال ہونے لگی۔

پہلوی دورِ حکومت میں شہر میں رفاہِ عمومی کے کئی کام شروع ہو گئے ہیں ۔ ۱۹۲۶ء میں دارالخلافہ میں انجمنِ 'دوستانِ تہرانِ قدیم' قائم ہوئی اور امید ہے کہ عہدِ قاچار کے جو قابلِ ذکر آثار باقی رہ گئے ہیں یہ انجمن ان کا مشرح حال بیان کرنے کے علاوہ ان کی حفاظت کا اہتمام بھی کر سکے گی۔

تہران، جو ابھی تک شمال کی طرف بڑھ رہا ہے، اب ایران کا سب سے بڑا شہر متصوّر ہوتا ہے۔ [۱۹۵۳ء تک شہر کا نقشہ مکمل طرر پر بدل دیا گیا، گو میرے زمانے میں تہران اب سے حسین تر نظر آتا تھا؛ مکتوب استاد منورسکی، مؤرخ ۱۱ اگست ۱۹۶۱ء]۔ ۱۸۷۸ء میں مادیموائزل سیرینا Mme. Serena نے سرمائی آبادی کا اندازہ دو لاکھ اور گرمائی کا اسّی ہزار لگایا۔ ۱۹۰۰ء میں شٹال Stahl نے شہری آبادی کا اندازہ اڑھائی لاکھ اور ملحقہ ۶۷۰ قصبات اور دیہات [حومہ] کا تین لاکھ پچاس ہزار لگایا تھا۔ بیلفور Balfour (۱۹۲۱ء) ایک ایرانی شہادت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ تہران کی آبادی کی حدِّ اقل دو لاکھ پچاس ہزار ہے، حالانکہ "معقول حدِّ اکثر" ۳,۸۰,۰۰۰ ہو سکتی ہے [۱۹۵۶ء کی سر شماری کی رو سے تہران کی آبادی ۱۵,۱۳,۱۶۴ ہے]۔ (ایالتِ تہران کے لیے یہ حدود اکثر و اقلّ سات لاکھ اور آٹھ لاکھ ہیں)۔

مآخذ : اس مادّے کے متن میں جو مشرقی مصادر مذکور ہوئے ان کے علاوہ دیکھیے : (۱) عبدالرشید باکوئی : تلخیص الآثار، .N. E، ج ۲، ۱۷۸۹ء: ص ۷۷۳؛ (۲) زین العابدین : بستان السیاحۃ، تہران ۱۳۱۵ھ، ص ۳۰۴؛ (۳) حاجّی خلیفہ : جہان نما، استانبول ۱۱۴۵[ھ]، ص ۹۲؛ (۴) اولیا چلبی، ۴ : ۳۸۲ - ۳۸۳، بذیل کلمۂ رَیّ (بہت صحیح نہیں ہے)؛ (۵) صنیع الدولہ : مرآت البلدان، تہران ۱۲۹۴ھ، ۱ : ۵۰۸ تا ۵۹۴ (ایک اہمّ تالیف)؛ (۶) محمد خان قزوینی : تہران، در بیست مقالۂ قزوینی، بمبئی ۱۹۲۸ء، ص ۳۶ تا ۳۹؛ (۷) کاوہ ۱۹۲۱ء، عدد ۲؛ [(۸) مسعود کیہان : جغرافیای مفصّل ایران، تہران ۱۱۶۱ش، ۲ : ۳۱۱ - ۳۶۶؛ (۹) راہنمای شہر تہران، طبع دائرۂ جغرافیائی ستادِ ارتش، ۱۳۲۸ھ ش / ۱۹۵۰ء؛ (۱۰) سٹوری، ۲/۱ : ۱۸۷؛ (۱۱) جواہر کلام : تاریخ طہران، ۱/۲۱، تہران حدود ۱۳۲۷ ش؛ (۱۲) میر حسین یکرنگیان : تاریخ ری، تہران ۱۳۳۲ ش]۔

یورپی تصانیف : (۱) (Langlès) سفرنامۂ شارداں Chardin کی اُس اڈیشن میں جو لانگ لے کی تصحیح سے چھپی ۔ جلد ۸، طبع ۱۸۱۱ء: ص ۱۶۲ تا ۱۷۰ [خود شارداں صرف "Théran" کے نام کا ذکر کرتا ہے "جو بلاد Comisène کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے"، ۸ : ۱۷۴] [ایرانِ قدیم کے شمالی صوبوں میں سے ایک صوبہ Comisène تھا، جو ایران کے درمیانی دشت کے کنارے پر واقع تھا ۔ دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۰۰ء، ۱۷ : ۵۶۵]؛ (۲) رِتّر Ritter : *Erdkunde*، برلن ۱۸۳۸ء؛ ۸ : ۶۰۳ تا ۶۱۲؛ لیسٹرینج Le Strange : *The Lands of the East. Caliphat*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۲۱۷؛ (۳) شوارتس [P.] Schwarz: *Iran in Mittelalter*، ۱۹۲۶ء، ص ۸۰۷ [یہ کتاب ۱۸۹۶ سے ۱۹۳۶ء تک باقساط نشر ہوتی رہی، عربی مآخذ کی یہ نہایت عمدہ تلخیص ہے، استاذ منورسکی در مکتوب

مذکور در عمود ۱ ص ۸۲۲]؛ (۵) Pietro della Valle
(۱۶۱۸ء): Viaggi، برائٹن Brighton ۱۸۴۳ء، ۱ : ۲۰۳
(۲ parte ؛ ۴ lettera)؛ (۶) Sir Thomas Herbert
(۱۶۲۷ء): Some Years' Travels، طبع سوم، ۱۶۶۷ء،
ص ۲۰۶؛ (۷) ھینوے Hanway : Hist. Account،
لنڈن ۱۷۵۴ء، ۱ : ۲۶۳)، van Mierop کے سفرنامے
میں)؛ (۸) او لیوی اے G. A. Olivier (۱۷۹۷ء) :
Voyage، پیرس ۱۸۰۷ء، ۵ : ۸۷ تا ۹۴؛ ۶ : ۴۷؛
(۹) میلکم Malcolm : Sketches of Persia (۱۸۰۷ء)،
لنڈن ۱۸۲۷ء، ۲ : ۳۰۱ تا ۳۰۲، باب ۱۷ تا ۱۹ :
(۱۰) کنیئر Macdonald Kinneir : A geogr.
Memoir on Persia، لنڈن ۱۸۱۳ء، ص ۱۱۸؛ (۱۱)
یوبیر Jaubert : Voyage en Arménie et en Perse،
(۱۸۰۶ء)، پیرس ۱۸۲۱ء، ص ۲۲۱، ۲۲۸، ۲۳۳،
۲۳۵ تا ۲۳۱؛ (۱۲) Gén. Gardane : Journal d' un
voyage....en 1807 et 1808، پیرس ۱۸۰۹ء، ص ۴۸،
۵۵؛ (۱۳) دوپرے Dupré : Voyage (۱۸۰۸ء)، پیرس
۱۸۱۹ء، ۲ : ۱۸۶ تا ۱۹۴؛ (۱۴) برجز Sir Harford
Jones Brydges : An Account of the Transactions
of H.M.'s Mission (۱۸۰۷ تا ۱۸۱۱ء)، لنڈن ۱۸۳۴ء،
ص ۱۸۵ ببعد؛ (۱۵) موری‌آر Morier : A Journey
through Persia (۱۸۰۸ تا ۱۸۰۹ء)، لنڈن ۱۸۱۲ء،
ص ۱۸۵ تا ۱۹۷، ۲۲۴؛ (۱۶) اوزلے Ouseley :
Travels (۱۸۱۱ تا ۱۸۱۲ء)، لنڈن ۱۸۲۳ء، ۳ :
۱۱۰ تا ۲۰۰ اور اٹلس؛ (۱۷) پرائس W. Price :
Journal of the Brit. Emb. to Persia (۱۸۱۱ء)، طبع
دوم، لنڈن ۱۸۳۲ء، ص ۲۸ تا ۳۹، تہران اور
قصر قاچار کے مناظر؛ (۱۸) موری‌آر Morier : Second
journey (۱۸۱۰ تا ۱۸۱۶ء)، لنڈن ۱۸۱۸ء،
باب ۱۱ تا ۱۲؛ ص ۱۶۹ تا ۱۹۹؛ (۱۹) کر پورٹر
Ker Porter : Travels (۱۸۱۷ء)، لنڈن ۱۸۲۱ء، ۱ :
۳۰۶ تا ۳۶۵، جنوب کی جانب سے تہران کا عام منظر،
ص ۳۱۲ ؛ (۲۰) فریزر J. B. Fraser : A Winter's
Journey (۱۸۳۸ء)، لنڈن ۱۸۳۸ء، ۱ : ۲۱۶؛ (۲۱)
Baron F. Korf : Vospominaniya o Persii (۱۸۳۴
تا ۱۸۳۵ء)، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۳۸ء، ص ۱۹۷
تا ۲۶۱؛ (۲۲) Prince A. Soltykoff : Voyage en
Perse (۱۸۳۸ء)، پیرس ۱۸۵۱ء، ص ۸۵ تا
۱۱۵، گلیوں کا منظر؛ (۲۳) Berezin : Puteshestviye
po Vostoku (۱۸۴۲ء)، [قازان] ۱۸۵۲ء، ۲ : ۱۴۳ تا
۱۷۷، اس میں ایک اہم نقشہ تہران اور رَےّ کا ہے؛
(۲۴) Hommaire de Hell : Voyage (۱۸۴۶ تا
۱۸۴۸ء)، پیرس ۱۸۵۶ء، ۲ : ۱۱۵ تا ۲۱۳، اٹلس،
پیرس ۱۸۵۹ء، لوحات ۵۷ تا ۷۳ : تہران، محل اور
میدان شاہ وغیرہ کے نہایت عمدہ مناظر از قلم Laurents
(قب شمارہ ۳۰ : d' Allemagne)؛ (۲۵) Lady Sheil :
Glimpses of ....Persia - (۱۸۴۹ء)، لنڈن ۱۸۵۶ء،
ص ۱۱۸ و دیگر مواضع کثیرہ؛ (۲۶) Gobineau :
Trois ans en Asie (۱۸۴۳ء)، پیرس، ص ۲۷۵، ۲۱۱
تا ۲۲۵؛ (۲۷) A. H. Mounsey : A Journey (۱۸۶۵
تا ۱۸۶۶ء)، لنڈن ۱۸۷۲ء، ص ۱۲۷ تا ۱۴۷؛ (۲۸)
Eastwick : Journal (۱۸۶۰ تا ۱۸۶۱ء)، لنڈن
۱۸۶۴ء، ۱ : ۲۱۷ تا ۲۴۵ و دیگر مواضع کثیرہ؛ (۲۹)
برگش Brugsch : Reise d. K. Preussischen Gesandt-
schaft (۱۸۶۰ - ۱۸۶۱ء)، لیپزگ ۱۸۶۵ء، ۱ : ۲۰۷ تا
۲۴۳ و دیگر مواضع کثیرہ، کئی رنگین لوحے ؛ (۳۰)
J. Basset : Persia (۱۸۷۱ تا ۱۸۸۴ء)، لنڈن ۱۸۸۶ء؛
ص ۱۰۱ تا ۱۱۹؛ (۳۱) Mme. Serena : Hommes et
choses en Perse (۱۸۷۷ تا ۱۸۷۸ء)، پیرس ۱۸۸۳ء،
ص ۴۸ ببعد؛ (۳۲) Stack : Six Months in Persia،
لنڈن ۱۸۸۲ء، ۲ : ۱۵۱ تا ۱۶۹؛ (۳۳) Orsolle :
Le Caucase et la Perse (۱۸۸۲ء)، پیرس ۱۸۸۵ء،
ص ۲۱۰ تا ۲۹۴؛ (۳۴) S. G.W. Benjamin : Persia
and the Persians (۱۸۸۳ تا ۱۸۸۵ء)، لنڈن ۱۸۸۷ء،

ص ٥٦ تا ١٠٩؛ (٣٥) *Persia* : Curzon (١٨٨٩ تا ١٨٩٠ء)، لنڈن ١٨٩٢ء، ١ : ٣٠٠ تا ٣٥٣ (اب تک بھی بغایت اہمّ شرحِ حال)؛ (٣٦) E. G. Browne : *A Year amongst the Persians*، لنڈن ١٨٩٣ء، ص ٨٢ تا ٩٨؛ (٣٧) S. G. Wilson : *Persian life*، طبع دوم، لنڈن ١٨٩٦ء، ص ١٣٠ تا ١٥٥؛ (٣٨) Feuvrier : *Trois ans à la cour de Perse* (١٨٨٩ تا ١٨٩١ء)، تاریخِ طبع ندارد، ص ١٢٦ تا ٢١٩، (بیشمار تصاویر)؛ (٣٩) Houtum - Schindler : مقالہ *Teheran*، در *Encycl. Brit.*، ١٩١١ء، گیارھویں طباعت، ٢٦ : ٥٠٦ (بہت عمدہ ملخّص)؛ (٤٠) d' Allemagne : *Du Khorasan*, ete.، پیرس ١٩١١ء، ٣ : ٢١٥ تا ٢٦٨ اور اشاریہ : نقشۂ 'آرک'، کئی تصاویر (جن میں متعدّد تصاویرِ دستی بقلم Laurents بھی شامل ھیں، ١٨٣٨ء)، قبّ نیز Hirsch : *Téhéran*، پیرس ١٨٦٢ء؛ (٣١) Forges : *Téhéran et la Perse en 1863* در *Revue des deux mondes* بابت ١٥ مئی ١٨٦٣ء؛ (٣٢) G. Spasskii : *Nineshnii Tehran i yego okrestnosti* در *Izv. Russ. Geogr. Obshč*، ١٨٦٦ء، ٢ : ١٣٦؛ (٣٣) Vambéry : *Meine Wanderungen in Persien* پست Pesth ١٨٦٨ء، ص ١٠٦ تا ١٢٣، ٢٦٠۔

نقشہ کشی (١) : بیریزین Berezin (١٨٣٢ء) میں طرحِ شہر کا خاکہ؛ (٢) J. E. Polak : *Topogr. Bemerkungen z. Karte d. Umgebung und zu d. Plane v. Teheran*، در *Mitt. der K. K. Geogr. Gesell.*، ج ٢٠ (١٨٧٧ء)، وی انّا ١٨٧٨ء : ص ٢١٨ تا ٢٢٥ (مع نقشہ، پیمانہ ١ : ٨,٠٠٠,١ اور ایک خاکہ پیمانہ ١ : ٢٠,٧٠٠)، تیّار کردہ Comm. Krzič، در سال ١٨٥٧-١٨٥٨ء)؛ (٣) شتال A.F. Stahl : *Teheran und Umgegend* (١٨٩٠ تا ١٨٩٣ء)، در *Pet. Mitt.*، ١٩٠٠ء، ص ٩٣ تا ٩٥ مع نقشہ، پیمانہ ١ : ٢,١٠٠,٠٠٠، (دونوں مقالے دلچسپ اطّلاعات سے لبریز ھیں)؛ (٣) عبدالرزّاق خان بُغائری (حدود ١٩١٠ء ؟) کا نقشہ پیمانہ ١ : ٢,٠٠٠,٠٠٠؛ اپنی پیمائشوں کے علاوہ مصنّف نے مفصّلۂ ذیل ماخذ استعمال کیے : (و) نقشہ مرتّبۂ عبدالرسول خان جو میرزا تقی خان وزیر اعظم (١٨٣٩ تا ١٨٥١ء) کے عہد میں تیّار ھوا؛ (ب) دو نقشے از نجم الدولہ، ایک کا پیمانہ ١ : ٣,٠٠٠ اور دوسرا Krzič کی طرز پر (طبع تہران ١٢٧٥ھ [١٨٥٨ء])؛ قبّ Brugsch، ١ : ٢١٠)؛ (ج) نقشہ جو ایرانی افسروں نے لائٹنر (؟) Baron Leitner کی ہدایت کے مطابق تیار کیا، پیمانہ ١ : ٢٥,٠٠٠ (١٨٨٠ء)؛ (٣) General Weth کا نقشہ، پیمانہ ١ : ١٢,٥٠٠ (نواح ١٨٩٣ء)؛ (٥) نقشۂ شتال Stahl؛

٢ - اُسْتانِ اصْفَہان میں ایک گاؤں کا نام ھے (اصفہان کے شمال مغرب اور رُود کارْوَانِ زیرین کے علاقے میں) - سمعانی (ص٣٧٣) کو معلوم ھے کہ دو تہران ھیں - جن میں سے "تہرانِ اصفہان کی نسبت تہرانِ رَے زیادہ مشہور ھے" - وہ کئی محدّثین کا ذکر کرتا ھے جو اس گاؤں میں پیدا ھوے - ان میں سے اقدم عُقَیل بن یحیٰی بن ابی صالح تھے، جو ٢٠٨ھ/ ٨٧١ء میں فوت ھوے، قبّ نیز یاقوت - اب اس بستی کے نام کا تلفّظ 'تیْرُوْن' ھے، قبّ چِرِکُوف Cirikow (١٨٥٠ء) : *Putewoi Journal*، ص ١٥٨، لیکن بِرُگْش Brugsch، ٢ : ٣٩ 'تہران' ھی لکھتا ھے، بقول شِنڈلَر Houtum-Schindler : *East Persian Irak*، ص ١٢٣، ١٢٧، ١٣١، اصفہان کے نزدیک اب بھی ایک تہران ("تران آھنگران") ھے، نہر تران (جو وھاں سے نکلتی ھے ؟) وہ اصفہان کے محلّۂ نو اور محلّۂ بید آباد کو سیراب کرتی ھے -

(منورسکی V. Minorsky)

تَہْلِیل : اس کے لفظی معنے ھیں لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ کہنا - عربی زبان میں ھَلَّ کے معنے ھیں صاح یعنی

آواز بلند کی؛ چنانچه علامه مرتضی زَبیدی نے مادۂ ھلّ کے تحت ازھری کا یه قول نقل کیا ھے : و لا اُراه ماخوذاً الّا مِن رَفعِ قائلهِ صوتَه (تاج العروس، ۸ : ۱۷۱)، گویا ازھری کے نزدیک بلند آواز سے لا اله الّا الله کہنا تہلیل ھے (ارادَ بالتہلیلِ رَفعَ الصّوت بِالشّهادة) (حوالۂ سابق) ۔ ایک اور توجیه یه بھی ھے که عربی زبان میں اختصار کا ایک انداز یه بھی ھوتا ھے که کسی کلمے کے چند الفاظ لے کر انھیں پورے کلمے کا قائم مقام سمجھ لیا جاتا ھے (قبّ حَوْقَلَ : لا حول و لا قوّة الّا بالله کہنا، حَیْعَلَ : حَیَّ علی الصلوٰة کہنا، بلکه بعض اوقات اختصار کے لیے صرف ایک حرف کو پورے کلمے کا قائم مقام بنا دیتے ھیں، جیسے شاعر کہتا ھے :

قلتُ لها قِفی فقالتْ قافْ

میں نے اس (محبوبه) سے کہا رک جا ! وه بولی : قاف! اس کا مطلب یه ھے که میں رُک گئی، گویا اس جگه ق کا حرف وَقَفْتُ کی جگه استعمال ھوا ھے (بیضاوی، طبع مصطفٰی محمد، قاھرة، ۱ : ۴۴) ۔ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے قرآن مجید کے بعض حروف مقطّعات کی تشریح اسی اصل کی روشنی میں کی ھے، مثلاً الٓمّ کے معنی ھیں : انا الله اعلم (الرازی : التفسیر الکبیر، قاھرة ۱۳۰۸ھ، ۱ : ۱۹۱، قبّ بیضاوی، محلِّ مذکور) یعنی میں الله سب سے زیاده جاننے والا ھوں ۔ اس میں انا کا الف، الله کا لام اور اعلم کا میم لے لیا گیا ھے ۔

پس لا اِلٰه الّا الله کہنے کو اختصاراً تہلیل کہتے ھیں ۔ اس کے لیے آواز کا بلند کرنا ضروری نہیں، جیسا که ازھری کا خیال ھے ۔ امام راغب نے مفردات میں تہلیل کے تحت لکھا ھے : و من هٰذه الجملة [یعنی لا اله الّا الله] رُکّبت هٰذه اللفظة کقولهم التّبسمُل والبسملَة والتّحوقُل والحَوْقلة [والحَوْقَل] (مفردات، ۳ : ۲۶۶، علی هامش النهایة، [باضافۂ حرکات] طبع مصر ۱۳۳۳ھ)، یعنی تہلیل کا لفظ لا اله الّا الله سے اسی طرح ماخوذ ھے جیسے بسم الله الرحمٰن الرّحیم کہنے کو تَبَسْمَلَ اور لا حول و لا قوة الا بالله کہنے کو تَحَوْلَقَ [تَحَوْقَلَ] کہتے ھیں ۔

ذکرِ الٰہی میں تہلیل کا بڑا بلند مقام ھے اور احادیث میں اس کے بہت سے فضائل بیان ھوے ھیں ۔ حضرت ابو هریرةؓ کہتے ھیں نبی اکرم صلّی الله علیه و سلّم نے فرمایا : الایمان اربعة و ستّون باباً ارفعها و اعلاها قول لا اِلٰه الّا الله، یعنی ایمان کے چونسٹھ دروازے ھیں (قبّ مسند احمد، ۲ : ۳۷۹، ستّر سے اوپر دروازے، مع اختلافِ الفاظ، ۴۱۴، ۴۴۵)، ان میں سے سب سے ارفع اور اعلٰی لا اِلٰه الّا الله کہنا ھے ۔ اُسی طرح ایک حدیث میں لا اله الّا الله بکثرت کہنے کو تجدید ایمان کا ذریعه بتایا گیا ھے (قبّ مسند احمد، ۲ : ۳۵۹) اور ایک اور حدیث میں اِسے اُن چار کلموں میں شمار کیا ھے جو الله کو محبوب ترین ھیں (وھی کتاب، ۵ : ۱۰).

ایک روایت میں، جو حضرت طلحةؓ سے مروی ھے، نبی اکرم صلّی الله علیه و سلّم نے فرمایا ھے : انّی لَاَعلم کلمة لا یقولها احدٌ عند حضرة الموت الّا وَجد رُوحه لها رَوحاً حین تخرج من جسده و کانت له نوراً یوم القیٰمة (مسند احمد، ۱ : ۲۸ و ۳۷ باختلاف الفاظ)، یعنی بے شک میں ایک ایسا کلمه جانتا ھوں که اگر انسان مرتے دم اسے ادا کرے تو اس کی روح کو جسم سے نکلتے وقت ایک نئی تازگی مل جائے اور قیامت کے دن وه اس کے لیے نور کا کام دے ۔ دوسری روایت میں یه الفاظ ھیں : فَرَّجَ الله عنه کُرْبَتَه و اَشْرَقَ لونُه (۱ : ۱۶۱) وه کلمه جو موت کے وقت کا کُرب

دور کرنے کا موجب ہوگا اور اس کی وجہ سے مرنے والے کا رنگ چمک اٹھے گا ۔ یہ روایت سن کر حضرت عمرؓ نے انھیں بتایا کہ وہ کلمہ لا الٰہ الّا اللہ ہے (یہ بات حضرت طلحۃ رضؓ کو یاد نہیں رہی تھی).

ایک حدیث میں یہ حکم آیا ہے: لَقِّنوا موتاکم قولَ لا الٰہ الّا اللہ (مسند احمد، ۳ : ۳) یعنی تیمارداروں کو چاہیے کہ مرنے والے کو کلمۂ لا الٰہ الّا اللہ کی تلقین کریں.

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم جب مبعوث ہوے تو آپ اجتماع کے مقامات پر تشریف لے جاتے اور اس کلمے کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے ۔ حدیث میں ہے کہ آپ عُکاظ اور ذوالمَجاز کی منڈیوں میں تشریف لے گئے اور لوگوں سے کہا : ''یا ایّھا الناس قولوا لا الٰہ الّا اللہ تفلحوا'' (مسند احمد، ۴ : ۶۳؛ ۵ : ۳۷۱)، یعنی لوگو! توحید کا اقرار کر لو تمھاری فلاح و بہبود اس سے وابستہ ہے.

حضرت عمرؓ نے اسے کلمۂ اخلاص اور کلمۂ تقوی کہا ہے (وہی کتاب، ۱ : ۶۳) ۔ ایک حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبولیتِ دعا کے ساتھ اس کلمے کا خاص تعلّق ہے (مسند احمد، ۲ : ۱۹۷).

صوفیّہ نے لکھا ہے کہ اس کلمے کے پہلے حصّے یعنی لَا اِلٰہَ کے تین فائدے ہیں : پہلا فائدہ یہ ہے کہ جو شخص اسے بآواز بلند پڑھتا ہے ہم اسے مسلمان اور شرک سے بیزار سمجھ لیتے ہیں؛ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب اس کے مطلب پر حقیقی طور پر ایمان ہوتا ہے تو ایسا مؤمن دنیا کے تمام اسباب و ذرائع کو اس وقت ذریعہ مانتا ہے جب دیکھ لیتا ہے کہ میرے مولٰی نے انھیں اسباب بنایا اور اس میں تأثیر رکھ دی ہے؛ تیسرا فائدہ، جس کی شہادت تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام اولیاے کرام بیک زبان دیتے چلے آئے ہیں، یہ ہے کہ جب اس کلمے کی کثرت کی جائے اور اسے بار بار سمجھ کر دھرایا جائے تو وصال الٰہی کی راہ میں جو حجابات حائل ہوتے ہیں وہ بآسانی اور بتدریج اٹھتے جاتے ہیں ۔ اسی طرح یہ گناہوں کے دور کرنے اور ان سے محفوظ رہنے کا سامان بھی ہے ۔ اس کلمے کا دوسرا حصّہ الّا اللہ ہے ۔ یہ نیکیوں کے حصول کا ذریعہ ہے ۔ لا الٰہ میں تمام مطلوبوں اور محبوبوں کی نفی ہے ۔ جب کوئی چیز انسان کی نظر اور ایمان میں محبوب و مطلوب ہی نہ رہے تو وہ ان امور پر جو گناہ ہیں جھک ہی کیونکر سکتا ہے ۔ اصل اشیاء جو اس کے لیے حلال تھیں وہی جب اس کی مقصود بالذّات نہ رہیں تو جو اس پر حرام ہیں ان کی طرف وہ کیونکر توجہ کر سکتا ہے؛ اس طرح پہلا حصّہ گناہوں سے بچانے کا ذریعہ ٹھیرتا ہے.

الّا اللہ سے نیکیوں کی طرف توجّہ اس طرح ہوتی ہے کہ جب انسان دنیا کے تمام مطلوبات و محبوبات کو فانی اور ادنٰی یقین کر کے کامل الصفات خدا کے ساتھ اتّصال پیدا کرتا ہے تو تجلّیِ الٰہی اس کے تمام جذبات رضاے الٰہی کے تابع کر لیتی ہے اور اللہ تعالٰی اس کا اصل مطلوب بن جاتا ہے، پھر وہ کوئی قدم اٹھاتا ہی نہیں جب تک اللہ تعالٰی کو نہ دیکھ لے، یعنی جہاں وہ اللہ کو ایک طرف نگرانِ حال پاتا ہے وہاں دوسری طرف اس کی رضاء اور اجازت دیکھتا اور اس کی خوشنودی کے لیے آگے ہی آگے قدم بڑھاتا چلا جاتا ہے (دیکھیے مآخذ).

مآخذ: (ان کتابوں کے علاوہ جن کا حوالہ مقالے میں آچکا ہے) (۱) بخاری : الصحیح، کتاب الایمان، ۱۸، ۳۳؛ کتاب العلم، ۳۳، ۴۹؛ کتاب الصلٰوۃ، ۲۸، ۴۶؛ کتاب الجنائز، ۱، ۸۰، ۸۶؛ کتاب البیوع، ۶۸، ۵۰؛ کتاب الجهاد، ۱۳۳؛ کتاب التفسیر، سورۃ ۹ : ۱۶،

۱۴ : ۲ ؛ ۲۸ : ۱ ؛ کتاب الایمان، ۵، ۷، ۱۹ ؛ کتاب الفتن، ۲۸:۴ ؛ (۲) مسلم: الصحیح، کتاب الایمان، ۱، ۲۲، ۳۲۶ ؛ کتاب الطہارۃ، ۴ ؛ کتاب فضائل الصحابۃ، ۳۴ ؛ کتاب الذکر، ۲۷، ۲۹، ۳۱، ۳۲، ۳۵، ۶۸ ؛ کتاب التطوّع، ۱۴ ؛ (۳) ترمذی : الصحیح، کتاب الوتر، ۱۷ ؛ کتاب الدعوات، ۸۶ ؛ کتاب التفسیر، سورۃ ۱ : ۲ ؛ ۱۵ : ۵ ؛ ۳۸ : ۱ ؛ (۴) ابن ماجۃ : سنن، مقدّمۃ، ۹ ؛ کتاب الکفّارات، ۲ ؛ (۵) مالک : مؤطّا کتاب السفر، ۸۴ ؛ کتاب مسّ القرآن، ۲۳ ؛ صفۃ النبیؐ، ۲۴ ؛ (۶) غزالی : احیاء علوم الدین، ۱ : ۷۸، ۲۱۱، طبع مصر ۱۳۲۶ھ ؛ (۷) مرتضٰی زَبیدی : اتحاف السادۃ، ۵ : ۱۰، طبع مصر ۱۳۱۱ھ ؛ (۸) ابن عربی : الفتوحات المکیّۃ، ۱ : ۳۲۷، مطبع دارالکتب العربیۃ، تاریخ طبع ندارد ؛ (۹) وہی مصنّف : کتاب الجلالۃ، طبع حیدرآباد ۱۳۶۱ھ (رسائل ابن العربی رسالہ، ۴).

(عبدالمنّان عمر)

تیرانَہ : (یا تیران) : آلبانیا کی مملکت کا پایۂ تخت، جو خوش آیند اور دل نشین موقع پر سمندر سے ۴۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے ۔ اس کا محلّ وقوع کوہ مَلْئِی داجْتِتْ Mal'i Dajtit (۵,۳۷۰ فٹ) کے دامن میں ہے اور اس کے ارد گرد میدان ہے، جو [فوق العادۃ زرخیز اور] خوب مزروع ہے اور تین طرف (مشرق، جنوب اور مغرب میں) پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے ۔ یہ شہر بحیرۂ ایڈریاٹک اور اس کی بندرگاہ دُورِیتسو Durazzo [ترکی : دُوْراچ] کے ساتھ سڑک کے ذریعے (جو ۲۵ میل لمبی ہے) ملا ہوا ہے [۱۹۰۱ء میں اسے ریل کے ذریعے بھی بندرگاہ سے ملا دیا گیا ہے ۔ اب تیرانہ اور ہنگری کے دارالخلافے اور ماسکو اور مغربی یوکرین کے درمیان باد پیما کے ذریعے بھی آمد و رفت ہوتی ہے] ۔ ۱۹۲۷ء میں اس شہر کی آبادی ۱۲,۴۵۴ نفوس (بیشتر مسلم) پر مشتمل تھی [۱۹۵۵ء میں تیرانہ کی آبادی کا اندازہ ۸۰ ہزار کیا گیا تھا] ۔ اس شہر کو زیادہ اہمّیت اس وقت حاصل ہوئی جب دُورِیتسو کی جگہ اسے آلبانیا فری سٹیٹ (آزاد حکومت) اور بعد میں مملکتِ آلبانیا کا مقرِّ حکومت بنایا گیا ۔ تیرانَہ آلبانیا کے مفتیِ اعظم کا مقرّ بھی ہے [جس کے تحت آلبانیا کے چار اسلامی منطقوں کے چار مفتی ہیں]؛ بیشمار مسلمان امراء کا وطن ہونے کی وجہ سے آلبانیا میں اسے اسلام کا گڑھ مانا جاتا ہے ۔ تجارتی لحاظ سے بھی یہ ایک اہمّ مقام ہے، کیونکہ یہ شہر آلبانیائے زیریں کی تجارتی منڈی ہے ۔ مشہور ہے کہ اس شہر کی بنیاد بَارْقِین زادِہ سلیمان پاشا (نواح ۱۶۰۰ء) نے رکھی تھی، جس نے اپنی ایرانی فتوحات کی یادگار میں اس کا نام ایرانی پایۂ تخت کے نام پر تہران رکھا، جو بگڑ کر تیرانَہ ہو گیا ۔ یہ بیان (قب A. Degrand : *Souvenirs de la Haute Albanie*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۲۰۵ ببعد) قابلِ پذیرائی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس تاریخ سے کہیں پہلے یعنی ۱۵۷۲ء میں تیرانہ "*il borgo di Tirana*" کا ذکر ملتا ہے (قب M. v. Sufflay: *Städte und Burgen Albaniens*، در *Denkschr. Ak. Wien*، ج ۶۳، جز ۱، ۱۹۲۴ء، ص ۳۵) ۔ یہ بات یقینی ہے کہ قدیم زمانے میں تیرانَہ کو اپنے ملحقہ شہر کُرُوْیَہ [Kruya] کے مقابلے میں کوئی اہمّیت حاصل نہ تھی ۔ ۲ ستمبر ۱۴۷۷ء کو تیرانہ کے میدان میں وینس کا کمانڈر (قائد provveditore) موسوم بہ فرانسِسْکو کونٹارینی Francesco Contarini اڑھائی ہزار سواروں اور آلبانوی پیادہ فوج کے ساتھ ترکوں سے لڑا لیکن اس لڑائی کا نتیجہ اس کے حق میں تباہ کن نکلا (قب J. v. Hammer : *G. O. R.*، ۲ : ۱۵۱) ۔ بعد میں یہ مقام کُرُویَہ کے مقتدر خاندان تُوپْتان Toptan کے قبضے میں آ گیا، جو اٹھارھویں صدی کے آخر میں شادی بیاہ

کے تعلّقات کی بنا پر یہاں آ کر مستقل طور پر آباد ہو گیا تھا ۔ اس خاندان کا مشہور و معروف رکن قپلان احمد پاشا تھا (حدود ۱۸۰۰ء)، جو اُس جنگ میں جو قرہ محمود پاشا بُوشاتلی والیِ اشقودرۂ آلبانیا Scutari (Albania) کے خلاف لڑی گئی سلطان کی عمدہ خدمات بجا لایا اور اس کے صلے میں اسے تیرانہ کے نواح میں بڑی بڑی جاگیریں عطا ہوئیں ۔ تیرانہ کا سارا میدان اب تک تُوپتان خاندان کی ملک میں چلا آتا ہے ۔ شہر میں پرانے زمانے کی یادگاریں بہت کم ہیں ۔ ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں: مسجد حاجی اِدْہم بک، جو سلیمان پاشا موصوف کی اولاد میں سے تھا؛ جامع مسجد اَصناف (اصناف جامعی) اور ایک اور مسجد جو سلیمان پاشا نے ۱۶۰۵ء میں تعمیر کرائی تھی ۔ اس کی تُربت بھی اس کے پہلو میں ہے ۔ شہر کے جنوب مشرق میں چنار کے بڑے پرانے درختوں سے گھرا ہوا ایک چوکور کھلا میدان ہے جسے نماز گاہ کہتے ہیں، یہاں عید کی نماز پڑھی جاتی ہے ۔ ۱۸۳۰ء میں تیرانہ کو اپنی خانہ جنگی کے زمانے میں بڑا نقصان پہنچا ۔ قریب کے زمانے تک یہاں کے مسلمان شدّتِ تعصّب کی وجہ سے مشہور تھے ۔ [تیرانہ میں ۱۹۳۹ء تک شاہ (احمد بیگ) زوگ حکمران رہا مگر ۱۹۳۹ء میں اٹلی نے تیرانہ پر قبضہ کر لیا؛ احمد بیگ مُلک چھوڑنے پر مجبور ہوا اور انگلستان چلا گیا اور اٹلی اور جرمنی کی فوجوں نے ملک کو تہ و بالا کیا ۔ آلبانیا والوں نے ۱۹۴۴ء میں جرمنوں سے ملک واپس لیا ۔ ۱۹۴۶ء میں خود مختار عوامی جمہوریّت قائم ہوئی ۔ نئے محلّے آباد اور نئے کارخانے تعمیر ہوے ۔ ۱۹۵۰ء میں پن بجلی کے ذریعے شہر میں بجلی اور پانی کی بہم رسانی کا اہتمام ہوا ۔ تیرانہ میں کئی ابتدائی اور ثانوی مدارس ہیں، جن میں سے چند فنّی (ٹکنیکل) تعلیم کے لیے خاص ہیں ۔ ۱۹۵۷ء سے ایک یونیورسٹی بھی موجود ہے اور پانچ دانش کدے زراعت اور طب وغیرہ کی تعلیم کے لیے قائم ہیں]۔

مآخذ: (۱) J. Müller : *Albanien, Rumelien* پراگ Prag ۱۸۴۴ء، ص ۷۱؛ (۲) Th. A. Ippen : *Skutari und die nordalbanische Küstenebene* سَراجیوو Sarajevo ۱۹۰۷ء، ص ۸۰ بعد؛ (۳) A. Degrand : *Souvenirs de la Haute Albanie* پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۱۸۴ بعد؛ (۴) H. Louis : *Albanie* Stuttgart ۱۹۲۷ء، ص ۷۱ بعد؛ (۵) سامی بک فُراشیری : قاموس الاعلام، ص ۱۷۱۷؛ (۶) J. v. Hammer : *Rumeli und Bosna*، وی اَنّا ۱۸۱۲ء؛ (۷) *Historiya é Tiranes*، در *Shkniya e illustrume, Kalendari* ، ۱۹۲۹ء، اشقودرہ Scutari (شْہودر Shhoder) ۱۹۲۹ء، ص ۱۹ بعد (جس میں بہت سی تصویریں بھی ہیں)؛ (۸) H. Baedeker : *Dalmatien* لیپزگ ۱۹۲۹ء، فصلِ *Albanien*؛ [(۹) انسائکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۶۱ء، ۲۲ : ۲۴۲؛ (۱۰) وٹیکر Whitaker، ۱۹۶۱ء؛ (۱۱) *Statesman's Year Book 1960*]۔

(F. BABINGER بابِنگر)

* **تِیرہ** (Tire) : اناطولیہ [یا اناضول] میں ایک شہر کا نام ہے، جو ولایتِ آیدین کی [سنجاغِ اِزْمیر یا سمرنا کی] قضاء تیرہ کا صدر مقام ہے ۔ اس کا محلِّ وقوع کُوچُوک مِنْدِرِس Küçük Menderes کی وادی میں سمرنا سے ۱۸ میل جنوب مشرق میں واقع ہے؛ اور اس کا اتّصال ریل کے ذریعے سمرنا سے ہے ۔ موجودہ شہر کے محلِّ وقوع پر قدیم زمانے میں غالباً شہر ارکادیوپولس Arcadiopolis آباد تھا، جس کا نام بعد میں تِیرہ ہوا (یعنی ''شہر''، مثلاً Thyá-teira؛ قب رَیمزے W. M. Ramsay : *Historical Geography of Asia Minor*، ص ۱۰۴، ۱۱۴) ۔ بوزنطی عہد میں اس شہر کا نام ثوریا Thyrea (Θύρεα)

اور ثورائیا (Θύρα ، قب Ducas : ص ۳۸، ۴۳، ۹۷، ۱۰۹، ۱۷۵، ۱۹۶) کی شکل میں ملتا ہے اور تاریخی مہمات میں اس کا بار بار ذکر آیا ہے۔ ۱۳۰۸ء میں ساسان Sasan نے افسوس Ephcsus کے بہت سے باشندوں کو تیرہ میں منتقل کر دیا (قب Pachymeres، ۲ : ۵۸۸)۔ یہ شہر سیاحوں کی گذرگاہ رہا ہے، مثلاً ابن بطوطة (۲ : ۳۰۷ ببعد) برگی Birge کی راہ سے تیرہ میں آیا تھا، جو اس وقت میوہ باغوں، بستانوں اور ندیوں سے گھرا ہوا تھا، ''سلطانِ برگی'' [محمد بن آیدین] یعنی آیدین اوغلی کی مملکت میں تھا۔ اس طرح منچلا قیطلونی Catalonian مؤرخ رامون مونتانیر Ramon Muntaner (فصل ۲۰) تیرہ میں سے گذرا کرتا تھا۔ جب تیمور [۱۴۰۲ء میں] اس شہر کی طرف بڑھا تو یہاں کے باشندے [ازمیر یعنی] سمرنا کو فرار ہو گئے (قب Ducas، ص ۳۸، ۹۷، ۱۰۹) [یزدی (۲ : ۴۶۸ ببعد)، جس نے تیرہ کو روم کے مشہور شہروں میں شمار کیا ہے، لکھتا ہے کہ تیمور نے محصّل مقرر کر کے اہلِ تیرہ سے وجوہِ امانی وصول کیے اور ۶ جمادی الاولی ۸۰۵ھ/۲ دسمبر ۱۴۰۲ء کو اُغرُق (کیمپ) کوہِ تیرہ کے دامن میں چھوڑ کر وہ حصارِ ازمیر گبران کی طرف روانہ ہوا اور فتح ازمیر کے بعد تیرہ کو واپس لوٹا اور مع اُغرُق آگے روانہ ہوا]۔ ۸۳۰ھ/ ۱۴۲۶ء میں آیدین اوغلی کی چھوٹی سی ریاست تباہ و برباد ہو گئی اور تیرہ عثمانیوں کے قبضے میں آ گیا۔ بعد کی تاریخ میں اس شہر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ سولھویں صدی کے آخر تک یہاں شاہی ٹکسال قائم رہی اور بعض شورشوں کے سلسلے میں اس کا ذکر کبھی کبھی آتا ہے (قب J. v. Hammer : G. O. R.، ۴ : ۳۹۸ تعلیقہ اور ۵ : ۵۰ تعلیقہ)۔ تیرہ میں مشہور

عالم [عزّالدین] عبداللطیف بن عبدالعزیز بن فرشتہ کی قبر ہے (عربی میں انھیں ابن المَلَک اور ترکی میں فرشتہ اوغلی کہتے ہیں۔ سالنامۂ آیدین برائے ۱۳۰۲ء، ص ۲۳۹ کے مطابق اُس نے ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۶ء] میں وفات پائی؛ اس سلسلے میں قب شقائق النعمانیة، ص ۶۶ ببعد [ایضاً، برھان وفیات، طبع ۱۳۱۰ء، ۱ : ۳۹])۔ آپ نے ترکی زبان کی ایک منظوم لغت (لغات فرشتہ اوغلی) لکھی، جو کسی زمانے میں بہت متداول تھی۔ آپ نے النّسفی [رکّ بان] کی کتاب منارالانوار کی بھی شرح لکھی، جو اصولِ فقہ پر ہے۔ آپ یہاں ایک مدرسے میں درس دیا کرتے تھے، جو مصنّفِ شقائق کے وقت تک برابر آپ ہی کی طرف منسوبہ تھا۔ تیرہ کئی عثمانی مصنّفین کی جائے پیدائش ہے، مثلاً شیخ حیدر بن سعداللہ (قب عطائی ذیل بر شقائق، ص ۱۹۱)، ملّا نصراللہ الرومی (وہی کتاب، ص ۱۲۳)۔ اس کے علاوہ یہ شہر کئی قاضیوں کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے، جنھوں نے علمِ ادب کی ترقی میں کچھ نہ کچھ کام کیا (قب وہی کتاب، ص ۱۳۰، ۱۷۲ اور بابنگر F. Babinger : G. O. W.، ص ۱۳۶ : جراح زادہ)۔ تیرہ کا ذکر جلاوطنی کے مقام کی حیثیت سے بھی آیا ہے، مثلاً ھرفن مؤرخ شانی زادہ نے ایام حیات یہیں ختم کیے (قب بابنگر G. O. W.، ص ۳۴۶)۔ پہلے زمانے کے یورپی سیاح تیرہ میں شاذ و نادر ہی آیا کرتے تھے۔ سمرنا کی انگریزی تجارتی کوٹھی کا پادری چشل Edm. Chishull (م ۱۷۳۳ء) ان چند لوگوں میں سے ہے جو تیرہ میں آئے تھے (قب *Travels in Turkey and bach to London* [لنڈن ۱۷۴۷ء]، ص ۱۹ اور *Septem Asiae*: Thos. Smiths. *Ecclesiarum Notitia*)۔ اُس وقت یہ خیال تھا کہ

تیرہ اصل میں ثیاتیرا (Thyáteteira)(= آق حصار) ہے اور "ایشیا کے سات گرجاؤں" میں سے ایک ہے ۔ اولیا چلبی [رک بآن] اپنے سفرنامے [کی نویں جلد، ص ۱۶۲ بعد] میں تیرہ کا ذکر کرتا ہے ۔ اس شہر میں آثارِ قدیمہ میں سے بظاہر کوئی چیز باقی نہیں ہے ۔ البتہ یہاں اس کتب خانے کا ذکر کر دینا چاہیے جس میں ۱۳۲۵ جلدیں ہیں، جو نجیب پاشا والی بغداد نے بطور تحفہ دی تھیں (ان میں فرشتہ اوغلی کی مذکورۂ بالا شرح کا خود نوشت نسخہ بھی شامل ہے)۔ ترکی اور یونانی آبادی کے مبادلے کے وقت تک تیرہ میں تقریباً پندرہ ہزار نفوس کی آبادی تھی، جو بیشتر یونانی تھے (قب V. Cuinet : *Turquie d' Asie*، ۳ : ۵۰۸ بعد) اور جو قالین بافی کرتے، [گلیم و سجادہ بناتے] اور انگوروں کی کاشت کیا کرتے تھے۔

مآخذ : (مندرجۂ متن مآخذ کے علاوہ) (۱) Karl Buresch : *Aus Lydien* (لیپزگ ۱۸۹۸ء)، ص ۳۲، ۱۶۵، ۲۱۳؛ (۲) Stephanus Byz.، طبع وسٹرمان Westermann (لیپزگ ۱۸۳۹ء)، ص ۲۷۳؛ (۳) Lebeau : *Histoire du Bas Empire*، civ : ۳۸؛ (۴) Fr. V. J. Arundel : *Discoveries in Asia Minor* (لنڈن ۱۸۳۴ء)؛ (۵) وہی مصنف : *A Visit to the Seven Churches of Asia*، لنڈن ۱۸۲۸ء؛ (۶) حاجی خلیفہ : جہان نما (استانبول ۱۱۴۵ھ)، ص ۶۳۶؛ (۷) محمد عاشق : مناظر العوالم، مخطوطہ، وی انا، ورق ۲۱۳ الف؛ (۸) F Taeschner : *Anatol. Wegenetz*، لیپزگ ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۶ء، ۱ : ۱۷۶؛ ۲ : ۳۹؛ (۹) شرف الدین علی یزدی : ظفر نامہ، ۲ : ۳۶۸؛ (۱۰) وہی مصنف : ترجمہ از F. Pétis de la Croix، ڈلفٹ Delft ۱۷۲۳ء، ۴ : ۳۳؛ (۱۱) W. Tomaschek : *Zur histor. Topographie Kleinasiens im Mittelalter*، در *S. B. Ak. Wien*، ج ۱۲۴، جز ۸ : ص ۳۴۔

(بابنگر F. Babinger)

تیرہ بولی : اسی نام کی قضاء کا صدر مقام، جو اناطولیہ [اناضول] کی ولایتِ طرابزندہ (Trapezunt) میں بحیرۂ اسود کے ساحل پر واقع ہے ۔ اس کا محلِ وقوع خوشنما ہے ۔ وہ تین راسوں پر آباد ہے اور جب ملیتس Miletus کے یونانیوں نے آٹھویں صدی قبل المیلاد میں یہاں آ کر اس کی بنیاد رکھی تھی تو اسی وجہ سے اس نے تریپولیس (Tripolis) [= تین قصبے] نام پایا ۔ قرونِ وسطٰی کا ایک قلعہ شہر پر مشرف ہے؛ دو چھوٹے چھوٹے گرجاؤں کے کھنڈر اب تک بوزنطی عہد کو یاد دلاتے ہیں ۔ طرابزندہ اور کرسون (Kerasunt) کی نزدیکی کی وجہ سے تیرہ‌بولی نے قدیم یا موجودہ زمانے میں تاریخ میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ کی ۔ طرابزندہ کے کومننوی خاندان Comnenoi کے حکمران [جنھوں نے ۱۲۰۴ تا ۱۴۶۱ء طرابزون میں فرمانروائی کی] یہاں کے قلعے میں رہنا پسند کرتے تھے ۔ جب محمد ثانی نے ۱۴۶۱ء کے موسمِ خزاں میں طرابزندہ کو فتح کیا تو اس سے تیرہ‌بولی کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو گیا ۔ یہاں کے باشندے ۲۰ میل دور پتروما Petroma کے قلعے میں بھاگ گئے اور بڑے لمبے محاصرے کے بعد جب فاقوں پر نوبت آ گئی تو مطیع ہوے ۔ اس وقت سے تیرہ‌بولی عثمانی مقبوضات میں چلا آتا ہے، اگرچہ ہسپانوی سیاح کلاویخو Ruy Gonzalez de Clavijo سمرقند جاتے وقت ۱۴۰۴ء میں جب تیرہ‌بولی ("Tripil") سے گذرا تو اس نے اس زمانے میں بھی اسے بہت بڑا قصبہ پایا لیکن بعد میں یہ مقابلۃً بے اہمیت سا ہو کر رہ گیا ۔ یورپی سیاح اکثر تیرہ بولی میں آئے ہیں اور اس کا حال بیان کرتے ہیں، مثلاً تورن‌فورت J. Pitton de Tournefort (قب *Relation d' un voyage du Levant*، ۲ : [پیرس ۱۷۰۷ء] ص ۲۲۲ بعد مع تصویر)؛ Wm. J. Hamilton (قب *Researches*

in Asia Minor، لنڈن ۱۸۴۲ء، ۱ : ۲۰۰)؛ A. D. Mordtmann (قب Anatolien، طبع بابنگر V. F. Babinger، ہینوور Hannover ۱۹۲۵ء، ص ۱۱۴)؛ J. Ph. Fallmerayer (*Fragmente aus dem Orient*، طبع دوم، ۱ : ۱۳۱، ۱۳۵ ببعد) وغیرہ - تیرہ بولی میں آٹھ مسجدوں کے علاوہ متعدد یونانی کنیسے بھی ہیں، جن میں سے بعض پرانے ہیں۔ اس کے قریب ہی صاری خلیفہ کا تکیۂ درویشاں ہے، جو اب خالی پڑا ہے (اس کے متعلق قب J. H. Mordtmann در *M. S. O. S. As.*، ۲۹ : ۱۱۲ ببعد اور ۳۰ : ۲۰۶، جو شاید وہی شخص تھا جس کا ذکر ہو رہا ہے)۔ ترکی اور یونانی آبادی کے مبادلے سے پہلے یہاں تقریباً ۸,۰۰۰ باشندے رہتے تھے، جن میں سے ایک چوتھائی یونانی تھے.

مآخذ: (کتب مذکورہ کے علاوہ) (۱) V. Cuinet : *Turquie d' Asie*، ۱ : ۵۳ ببعد؛ (۲) رٹر C. Ritter : *Erdkunde von Kleinasien*، ج ۱، برلن ۱۸۵۸ء : ص ۸۲۱ ببعد؛ (۳) H. Barth : *Reise von Trapezunt nach Skutari*، گوتا ۱۸۶۰ء، ص ۴ ب؛ (۴) شاکر شوکت: طرابزون تاریخی، [استانبول] ۱۲۹۴ء؛ (۵) حاجی خلیفہ : جہان نما، استانبول، ۱۱۴۵ھ، ص ۴۲۹، س ۱۸؛ (۶) اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ۲ : ۸۰.

(F. BABINGER بابنگر)

تیط: متون میں بعض اوقات بربری '' تیط - اَنْ - فطر'' اور بعض اوقات اس کا عربی ترجمہ: '' عین الفطر'' (افطاری کا چشمہ) ملتا ہے۔ یہ مراکش میں بحر الکاہل کے ساحل پر ایک مقام ہے، جو مازگان [البریجۃ] کے جنوب مغرب میں کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے.

مقامی روایت کے مطابق تیط کے بانی ایک ولی اسمعیل امغار (بربری زبان کا لفظ بمعنی 'شیخ') تھے، جو آسمانی روشنی کی رہنمائی میں مدینے [شریف] سے یہاں تشریف لائے اور ازمور کے قبیلۂ صنہاجۃ کی شاخ گدالۃ کے درمیان آ کر آباد ہوے۔ ایک چشمے کے سامنے جو '' سمندر میں تھا'' آپ جنگل میں قیام پذیر ہوے اور جب کبھی روزہ افطار کرنا ہوتا تو سمندر کی لہروں پر چل کر وہاں جایا کرتے تھے، اسی وجہ سے اس جگہ کا نام تیط - اَن - فِطر مشہور ہو گیا ۔ اگر ہم اس روایت کے بیان کردہ ہم زمانی امور کو صحیح سمجھیں تو آپ یہاں دسویں صدی میں آ کر آباد ہوے تھے.

اسمعیل [ولی] نے علاقے کے سردار کی لڑکی سے شادی کی اور امغاریون کے خاندانِ شریفی کا مورثِ اعلی بنا (قب مادۂ شرفاء) ۔ اس خاندان کے ایک رکن مولای عبداللہ نے تیط کا اہم رباط بارھویں صدی [میلادی] کے نصف اول میں قائم کیا ۔ اس مستحکم مقام کی تاریخ اچھی طرح معلوم نہیں ۔ البکری، جو ساحلِ بحرالکاہل کے تمام شہروں اور بندرگاہوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے، اس کے متعلق کچھ نہیں لکھتا، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ازمور کا بھی ذکر نہیں کرتا ۔ چودھویں صدی میں العمری لکھتا ہے کہ تیط مراکش کے ۲۴ بڑے شہروں میں سے ہے اور پانچ ہزار مثقال ٹیکس (خراج) ادا کرتا ہے؛ یہ رقم شہر تیگیسس Tigisas کے خراج کے مساوی اور صفرو Ṣufrū کے خراج سے کچھ کم تھی - جب ۱۵۱۳ء میں پرتگیزوں نے ازمور پر قبضہ کر لیا تو تیط نے بھی اطاعت قبول کر لی اور خراج ادا کیا لیکن ۱۵۱۴ء میں اس خوف سے کہ کہیں رباط عیسائیوں کا فوجی مرکز نہ بن جائے وطاسی خاندان کے حکمران محمد الناصر نے اس کی فصیلیں مسمار کرا دیں اور باشندوں کو فاس کے علاقے میں بھجوا دیا؛ اس سے تیط کی اہمیت ختم ہو گئی اور یہ اہمیت اب مازگان [البریجۃ یا

الجدیدۃ] کی بندرگاہ کی طرف منتقل ہوگئی جو اس کے قرب و جوار میں تھی اور وہ بندرگاہ بلادِ دُکّالَۃ میں پرتگیزوں کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بن گئی ۔ آج کل یہ ایک حقیر سا گاؤں ہے، جس کے اردگرد قدیم رباط کے دروازوں اور برجوں کے کھنڈر پڑے ہیں ۔ اس کا پرانا نام اہلِ بلاد تقریباً فراموش کر چکے ہیں اور اب بانیِ رباط کے نام پر تِیط کو ''مولای عبداللہ'' کہتے ہیں ۔

معنی کی مشابہت کے باوجود اس تِیط کا ''تِیط - اَن - وَکّرامْت'' (چشمۂ شیخ ؟) سے کوئی تعلّق نہیں، جس کے متعلّق خاندان المُوحّدین کا مُؤرّخ البَیْذَق لکھتا ہے کہ وہ تامَسْنا واقع بلاد بَرْغَواطَۃ میں ہے ۔ ہمیں معلوم ہے کہ تامَسْنا اُمّ ربیع کے شمال میں واقع ہے نہ کہ جنوب میں ۔ یہ دُوسرا تِیط بظاہر وہی مقام ہے جو ادریسی کے قلمی نسخوں میں مُصحّف ہو کر ''تطن وقری'' لکھا گیا ہے،''جو ہے تو ایک چھوٹا سا مقام مگر قصبے کی خصوصیات رکھتا ہے، جس میں مخلوط نسل کے بربر رہتے ہیں اور جو اُس سڑک پر واقع ہے جو تادْلَا سے سَلَا (Sale) کی طرف جاتی ہے، تادْلَا سے چار دن اور سَلَا سے دو دن کی راہ پر''؛ لہٰذا اس کا محلِّ وقوع ضرور اس علاقے کے تقریباً جنوبی کونے میں ہوگا جہاں آج کل زاعِیر Zāʿēr قبیلے کے لوگ بستے ہیں ۔

مآخذ : (۱) بنو اَمْغار کی افسانوی روایت بڑی تفصیل کے ساتھ ایک قلمی نسخے میں موجود ہے، جسے ابن عبدالعظیم الزَّمُّوری سے منسوب کیا جاتا ہے؛ (۲) H. Basset اور H. Terrasse : *Sanctuaires et forteresses almohades : Le ribâṭ de Tīṭ* (در *Hespéris*، ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۷ تا ۱۵۶)۔

(G. S. Colin کولان)

تِیطّاوِین : (یا Tetuan تیتْوان) ۔ فرانسیسی میں TÉTOUAN، ہسپانوی میں TETUÁN اور [الحسن بن الوَزّان الزیّاتی معروف بہ] لیو افریقی Leo Africanus کے ہاں *Tetteguin*، بربری زبان میں ایک جگہ کا نام ہے، جس کے معنی ہیں '' چشمے '' (اس شہر کے ایک محلّے کا نام اب تک 'العُیُون' ہے) ۔ ادریسی نے اس کی ناقص صورت ' تِطّاوِن ' دی ہے اور آج کل کا شائع تلفّظ *Tiṭṭāwen* اور *Tiṭṭāun* ہے ۔ ہسپانویوں کا دیا ہوا نام Tetuàn ' تطوان ' سے مأخوذ ہے، جو سترھویں صدی کے آخر کے سکّوں پر ثبت ہے ۔ یہ سکّے فِیلالی خاندان کے متقدّم بادشاہوں نے ضرب کرائے تھے ۔ تِیطّاوِین کا شہر شمالی مَرّاکُش میں سَبْتَۃ (Ceuta) کے جنوب میں ۲۱ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ یہ شہر کوہ دَرْسَۃ Darsa کی باہر کو نکلی ہوئی چھوٹی سی چٹان کی ہموار سطح پر واقع ہے، جو دریاے مَرْتِین (یا مَرْتِیل) کی وادی پر مُشْرِف ہے ۔ یہ دریا یہاں سے سات میل کے فاصلے پر سمندر میں جا گرتا ہے ۔ سمندر اور تِیطّاوِین (Tetuan) کے درمیان ایک چھوٹا سا میدان ہے، جس کے گردا گرد اَنْجِرہ Andjera کے پہاڑ، کوہستان بنی حُوزْمار اور بنی مَعْدان کے تِلالِ زیرین ہیں ۔ مَرْتِین وہی جگہ ہے جسے بطلیموس Θαμούδα اور بلیناس (Pliny) *tamuda* لکھتا ہے ۔ ان پرانے ناموں کا جوڑ شاید بربری زبان کے لفظ ' تَمْدَہ ' بمعنی '' تالاب ''، '' دلدل '' سے ملتا ہو، کیونکہ مَرْتِین کی نشیبی وادی بہت مَردابی ہے ۔ بطلیموس ایک چھوٹے سے قصبے (*oppidum*) کا بھی ذکر کرتا ہے جسے تَمُودَہ Tamuda کہتے تھے ۔ یہ ضرور اس بربری ۔ رومی شہر کا نام ہوگا جس کے کھنڈر اب تک مَرْتِین کے دائیں کنارے پر تِیطّاوین (Tetuan) کے مغرب میں اڑھائی میل کے فاصلے پر موجود ہیں ۔ یہ کھنڈر اس پل کے قریب ہیں جس پر سے شَفْشَاون کو جانے والی ریل گزرتی ہے ۔

یہاں سے لیبیہ کا (Lybian) ایک پرانا کتبہ دستیاب ہوا ہے ۔ اس وقت دریا اب سے زیادہ کشتی رانی کے قابل تھا اور جہاز اس قصبے تک پہنچ سکتے تھے ۔ *Notitia Dignitatum* (.Occ، ۲۶ : ۱۳) میں مذکور ہے کہ تمودہ Tamuda کے رومانی حاکم (*praefectus*) اور *ala herculea* کا محلّ اقامت تھا ۔ اسقفوں کی فہرست میں بھی تمودہ کے اسقف *Tamudensis episcopus* کا ذکر آتا ہے ۔

عرب فتوحات کے ابتدائی زمانے میں تیطّاوین کا ذکر کہیں نہیں ملتا ۔ اس وقت ان بلاد کا حاکم یلیان (Julian?=) تھا، جس کی حکومت میں غمارۃ کا سارا علاقہ شامل تھا لیکن علاقے کا صدر مقام سبتۃ (Ceuta) تھا ۔ تیطّاوین کا ذکر مراکش کی اسلامی تاریخ میں نویں صدی ھجری سے پہلے نہیں آتا؛ یعنی اس وقت تک جب تک ۸۲۸ھ میں ادریس ثانی کی سلطنت تقسیم نہیں ہو گئی ۔ اس وقت تیطّاوین مع طنجۃ و سبتۃ، قصر مصمودۃ و حجرالنصر، القاسم کے حصّے میں آئے لیکن اس ریاست کا پایۂ تخت اس وقت طنجۃ میں تھا ۔

گیارھویں صدی میں البکری بتاتا ہے کہ تیطّاوین بنوسکّین کے علاقے کا پایۂ تخت تھا ۔ بنو سکّین ساحلی علاقے میں بسنے والے قبیلۂ مصمودۃ کی ایک شاخ تھے ۔ پرانا قلعہ اور ایک منار بھی یہاں تھا ۔

۳۴۷ھ / ۹۵۸ء میں فاطمی جرنیل (قائد) جوھر بنی امیّہ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے مراکش سے آیا اور اس نے فاس فتح کرنے کے بعد تیطّاوین اور سبتۃ پر چڑھائی کی لیکن سبتۃ کو فتح کرنے میں وہ ناکام رہا، اس لیے اور آگے نہ بڑھا اور سجلماسۃ کو لوٹ آیا ۔ [۳۶۹ھ / ۹۷۹ء] میں فاطمی سلطنت کے جرنیل بلکّین بن زیری تیطّاوین کی پہاڑی کی چوٹی تک پہنچا لیکن اس نے تیطّاوین فتح نہ کیا ۔

بارھویں صدی ھجری میں تیطّاوین کا ذکر الموحّدین کا مؤرخ البیذق دو دفعہ کرتا ہے ۔ مرابطین کا قائد ریورتر Reverter الموحّدین کی افواج کا تعاقب کرتے ہوے یہاں آ کر خیمہ زن ہوا ۔ الادریسی کہتا ہے کہ تیطاوین کے قلعے (حِصن) پر مجکسۃ قابض تھے ۔ الموحّدین کے زمانے کے وقائع میں اس شہر نے بظاھر کوئی نمایاں حصّہ نہیں لیا ۔ سبتۃ اس وقت غرناطۃ کے بادشاہ کے قبضے میں تھا، اس لیے مرینی سلطان یوسف بن یعقوب نے چاھا کہ تیطاوین کو فوجی کارروائی کا مرکز (base) بنائے؛ اس مقصد سے اس نے ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء میں تیطاوین میں ایک قلعہ تعمیر کرایا، جسے بہت اھمیت حاصل ہوئی ۔ اس کے جانشین سلطان ابوثابت عامر نے ۷۰۸ھ / ۱۳۰۸ء میں اس کے گرد ایک قصبہ آباد کرنے کا حکم دیا ۔ مؤرخین اس بات کی وضاحت نہیں کرتے کہ آیا یہ وھی تیطاوین کا پرانا قصبہ تھا جو ویران ہوگیا تھا اور جسے اب پھر سے آباد کیا گیا یا کسی اور دوسرے محلّ پر نیا قصبہ آباد کیا گیا تھا ۔ ۱۳۰۵ء میں تیطاوین میں مرینی سلطان علی بن عثمان کے بیٹے ابوعنان نے باپ سے باغی ہو کر اپنی بادشاھی کا اعلان کر دیا تھا ۔ نیا قصبہ بڑی مشکل سے ایک صدی تک قائم رہا ۔ چودھویں صدی کے آخر میں وہ بحری لٹیروں [قرصان] کا اڈہ بن گیا اور چونکہ وہ سپین کے ساحل سے قریب تھے، اس لیے یہ لٹیرے اس ملک کے لیے بالخصوص خطرے کا باعث بن گئے ۔ ۱۴۰۰ء میں ترانستمارہ Transtamare کے ھنری سوم، شاہ قشتالۃ (Castile) نے بحری جہازوں کا ایک بیڑا بھیجا، جس نے رودِ مرتین کے دھانے میں گھس کر بحری قزاقوں کے بیڑے کو تباہ کر دیا؛ فوج خشکی پر اتار دی گئی، اس نے قصبے کو فتح کر کے برباد کر دیا اور بہت سے باشندوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ

لے گئی.

تیطّاوِین اسّی برس تک غیر آباد رہا۔ ۱۴۱۴ء میں اہلِ پرتگال نے سَبْتَة میں اپنے قدم جما لیے اور یہ شہر اس وقت سے عیسائیوں کے قبضے میں آ گیا۔ جنوری ۱۴۹۲ء میں جب فرڈنینڈ نے غرناطة پر قبضہ کر لیا تو بہت سے اندلسی عرب مراکش میں آ گئے، ان میں ابوالحسن المَنْدَری بھی تھا، جس نے غرناطة کے دفاع میں بڑی بہادری سے حصّہ لیا تھا۔ فاس کے وَطّاسی بادشاہ محمّد الشیخ نے اسے تیطّاوِین اور اس کے نواح کا علاقہ عطا کر دیا اور اس نے اور بہت سے اندلسی مہاجر اپنے گرد جمع کر کے وہاں ایک قلعہ بنایا، جس کے گرد فصیلیں اور خندقیں بھی تیار کرائیں؛ چنانچہ ایک نیا قصبہ، جامع مسجد سمیت، جلد تعمیر ہو گیا۔ اندلسی سواروں اور کوہستانیوں کے امدادی دستوں کے ساتھ، جو اس سے آ ملے تھے، المَنْدَری نے پرتگیزوں کو سَبْتَة، القصرالصغیر اور طَنْجة میں اپنے غزووں سے دِق کرنا شروع کیا۔ اس نے بہت سے پرتگالی اسیر بنا لیے اور اُن سے شہر کی تعمیر میں کام لیا۔ [الحسن بن محمّد الوزّان الزّیاتی] Leo Africanus نے تیطّاوِین میں سے گذرتے ہوے ان کے تین ہزار سے زیادہ آدمی دیکھے، جو رات کے وقت سیاہ چاھوں (مطامیر) میں بند کر دیے جاتے تھے (شہر میں اب تک ایک محلّہ ہے جسے المَطامَار [یعنی 'المَطامیر'] کہتے ہیں)۔ اندلس میں مسلمانوں کی شورشیں جب دبا دی گئیں تو پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی کے شروع میں، خاص کر ۱۵۰۱ اور ۱۵۰۲ء میں، بہت سے لوگ وہاں سے آ کر المَنْدَری کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ خشکی پر اہلِ پرتگال کے خلاف جو جنگ جاری تھی اب اس میں بحری قزاقوں کے حملوں کا اضافہ ہو گیا۔ تیطّاوِین، شَفْشاوَن سمیت، جو اُس سے قریب ہی تھا، جہاد کے اہمّ مرکزوں میں سے ایک مرکز بن گیا.

المَنْدَری کی وفات کے بعد جدید تیطّاوِین کی تاریخ کا دَورِ شجاعت ختم ہو گیا؛ اس وقت سے اس کی حیثیت فقط ایسے قصبے کی تھی جس میں مہاجرینِ اندلس کے متوسّط طبقے کے لوگ آباد تھے، جن کی زندگی کا مقصدِ وحید صرف یہ تھا کہ تجارت کے ذریعے اپنی دولت بڑھائیں اور امن میں رہ کر فنونِ لطیفه سے لطف اٹھائیں اور علم ادب کے مطالعے سے محظوظ ہوں۔ بے قید اور شورش پسند تو وہ تھے ہی، ان کے قصبے کا محلّ وقوع بھی، اُس کے دُور افتادہ ہونے کی وجہ سے، ان کے مقاصد کے لیے مفید تھا؛ چنانچہ انھوں نے سلطان کے تسلّط اور بالخصوص ٹیکسوں سے بچنے کی کوشش کی مگر جب کبھی انھیں نیم خود اختیاری حاصل ہوتی ان کے دھڑے بن جاتے، جو قصبے کو ضرر پہنچاتے اور غیر ملکی دست اندازی آسان ہو جاتی.

معلوم ہوتا ہے کہ علوی سلطان مولای اسمٰعیل کے زمانے تک النَّقْسِیْس خاندان کو قصبے میں فوقیت حاصل رہی، جس کی بیخ کنی اس بادشاہ کو کرنا پڑی۔ مولای اسمٰعیل کی وفات کے بعد جو فوضویت اور بد نظمی کا دَور آیا اس میں رِیف کے قائدِ جہاد احمد بن البَطُّوِیی والیِ طَنْجة اور اہلِ تیطّاوِین کے درمیان، جو عمر الوَقّاش کے ماتحت تھے، جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا۔ رِیف کا سردار آخر کار اس میں کامیاب ہو گیا کہ تیطّاوِین کو اپنی حکومت میں شامل کر لے۔ اس کی موت کے بعد ۱۷۴۳ء میں اہلِ تیطّاوِین پھر اپنے پرانے لچھنوں پر اُتر آئے اور ہر مدّعیِ تخت کو، جو اس علاقے میں آ نکلے، تسلیم کر لینے لگے۔ انیسوِیں صدی میں تیطّاوِین کی تاریخ کا اہم واقعه ۱۸۵۹ - ۱۸۶۰ء میں والیِ مراکش اور ہسپانیه کی جنگ کا ہے۔ اس

لڑائی کے بعد اس قصبے پر اہلِ ہسپانیہ کا قبضہ ہو گیا، جو مئی ۱۸۶۲ء تک اس پر قابض رہے۔ ۱۸۹۰ء میں سلطان مولای حسن یہاں آیا۔ ۱۹۰۳-۱۹۰۴ء میں گرد و نواح کے کوہستانیوں نے ابوحمارۃ، مدّعی سلطنت، کی پیدا کردہ بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوے تیطاوین کی ناکہ بندی کر دی۔ آخر ۱۹۱۳ء میں ہسپانوی پھر اس پر قابض ہو گئے اور وہ شمالی مرّاکش میں ہسپانوی علاقۂ زیر حمایت (protectorate) کا صدر مقام بن گیا اور سلطان کا 'خلیفۃ' یہاں رہنے لگا۔

تیطاوین کی بندرگاہ سَبْتَۃ ہے اور دونوں مقاموں کے درمیان ریل چلتی ہے اور تیطاوین ہی وہ مرکزی شہر ہے جہاں سے قبائلِ غُمارَۃ اور علاقہ شَفْشاوَن کے لوگ در آمد شدہ تجارتی مال حاصل کرتے ہیں۔ مقامی صنعتیں، خصوصاً زربفت اور ریشمی کپڑے کی صنعت، زوال پذیر ہو رہی ہیں۔ [۱۹۳۰ء کے حدود میں] آبادی ۲۵,۰۰۰ کے قریب ہے، جس میں سے بارہ ہزار مسلمان اور ۴,۲۰۰ یہودی ہیں۔ [۱۹۶۰ء میں آبادی کا اندازہ ۸۰,۰۰۰ کا ہے]۔

مآخذ: تیطاوین کی تاریخ، تخطیط اور اقتصادی زندگی کی تفصیلات جولی A. Joly نے مفصلۂ ذیل تصانیف میں جمع کی ہیں: وصفِ تیطاوین کے لیے دیکھیے (۱) *Tétuan*، در *Archives Marocaines*، ۴: ۱۹۹ تا ۳۴۳؛ (۲) تاریخ کے لیے قبَ *Archives Marocaines*، ۵: ۱۶۱ تا ۲۶۴، ۳۱۱ تا ۴۳۰؛ ۸: ۴۰۴ تا ۵۳۹؛ ۳: ۲۶۶ تا ۳۰۰ (۱۹۰۳ و ۱۹۰۴ء کے محاصرے کا حال)۔ اقتصادی زندگی کے متعلق قبَ: (۳) *L' Industrie de Tétuan*، در *Archives Marocaines*، ۸: ۱۹۶ تا ۳۲۹؛ ۱۱: ۳۶۱ تا ۳۹۳؛ ۱۵: ۸۰ تا ۱۵۶؛ ۱۸: ۱۸۷ تا ۲۵۶؛ قبَ نیز: (۴) Cerdeira: *Inscripciones árabes de Tetuán*، در *Revista de tropas coloniales*، عدد ۱۱، Ceuta نومبر ۱۹۲۵ء؛ (۵) Cuevas y Espinach: *Coleccion de estudios referentes al bajalato de Tetuán*، در *Bol. Soc. Geogr. Madrid*، ج ۳۹، ۱۸۹۷ء: ص ۹۴ تا ۷۶؛ (۶) Gomez Moreno: *Descrubrimientos y antigüedades en Tetuán*، در *Revista hispano-africana*، جنوری - فروری ۱۹۲۴ء؛ (۷) H. Cohn: *Mœurs des Juifs et des Arabes de Tétuan*، طبع دوم، پیرس ۱۹۳۷ء۔

(G. S. COLIN کولان)

التِّیفاشی

التِّیفاشی: شہاب الدین ابوالعبّاس احمد ابن یوسف (م ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء)، جو کتاب اَزْھارالافکار فی جواھر [الأحجار] کا مصنّف ہے۔ یہ کتاب جواہرات پر مشہورترین تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب میں کل پچیس قسم کے جواہرات کا حال، ان کے خواص، ان کے معادن و مصادر، ان کے قدرتی اور طلسماتی خواص، حُسن و قُبح، قیمت اور مخصوص اقسام کی پہچان وغیرہ کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے اچھّے اچھّے قلمی نسخے موجود ہیں اور اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کا تصحیح شدہ متن اور ترجمہ شائع کیا جائے؛ کیونکہ کاؤنٹ رینری بِشیا (Count Raineri Biscia) نے جو اڈیشن ۱۸۱۸ء میں تیّار کیا تھا اور جو دوبارہ ۱۹۰۶ء میں [بدونِ متن] شائع ہوا، موجودہ ضروریات کو پورا نہیں کرتا [اس کتاب کا فارسی ترجمہ، جس پر مترجم کا نام نہیں، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے]۔ معدنیات کے متعلق مصنّف کی اسی قسم کی دوسری تصنیف کا قلمی نسخہ پیرس میں موجود ہے مگر اس کا حال ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ تیفاشی سے بعض فُحش تصانیف بھی منسوب کی جاتی ہیں [دیکھیے براکلمان: تکملۃ]۔

مآخذ: (۱) S. F. Ravius (Rau): *Specimen arabicum continens descriptionem et excerpta libri*

A. T. de gemmis et lapidibus pretiosis، یوٹرکٹ Utrecht ۱۸۷۳ء؛ (۲) A. R. Biscia : *Fior di Pensieri sulle Pietre preziose di Ahmed Teifascite*، Florence ۱۸۱۸ء، [طبع مکرر بدون متن] بلونیا Bologna ۱۹۰۶ء؛ (۳) C. Mullet، در *J. A.* (۱۸۶۸ء)؛ (۴) M. Steinschneider، در *Z.D.M.G.*، ۴۹ (۱۸۹۵ء): ص ۲۵۴ ببعد؛ (۵) براکلمان C. Brockelmann : *G.A.L.*، ۱ : ۴۹۵ [*GALS*، ۱ : ۹۰۴]؛ (۶) J. Ruska : *Des Steinbuch des Aristoteles*، هائیڈل برگ ۱۹۱۲ء، ص ۲۳ تا ۳۲؛ (۷) J. Ruska : *Tabula Smaragdina*، هائیڈل برگ ۱۹۲۶ء، ص ۱۰۱ تا ۱۰۵.

(J. Ruska رُسکا)

تَیم بن مُرَّة : [یا ''تیمُ قریش'' نقائض، ص ۱، س ۳ (اگرچه تیمُ الاَدْرَم بن غالب بن فِهر بهی قریش هی میں سے تهے)] مکّے کے قبیلهٔ قریش کی ایک شاخ - تَیْم، جو عرب کے متعدّد قبائل کا نام هے، ''عَبْد'' کے معنوں میں آتا هے [لسان العرب، ۱۴ : ۳۴۲] میں هے یه نام بالضرور تیمْ الله اور تیم اللّات [رک بآن] کی طرح کے اسماءِ مُعَبَّدَة (theophoric بمعنی ''عبد فلاں معبود'') کی مختصر صورت هوگی - کتبوں میں تَیمْ مَنَات، تَیمْ رُضی [دیکھیے کتاب الاصنام، طبع دوم، مصر ۱۹۲۴ء، ص ۳۰ و ح ۲] اور Θαιμηλος وغیره نام بهی آتے هیں، (قب ولهاوزن Wellhausen : *Reste*، طبع دوم، ص ۷؛ Lidzbarski : *Handbuch d. nordsem. Epigraphik*، ص ۳۸۵) - تَیم بن مُرَّة قریش البَطَائح ['آل البطاح' نقائض، ص ۶۳۷، س ۱۶] میں سے تهے، یعنی قریش کے ان بطون میں سے جنهیں مکّے میں غلبه حاصل تها لیکن اس کے باوجود بظاهر انهیں کوئی سیاسی نُفوذ حاصل نه تها، گو مَخزُوم [رک بآن] بن یَقظَة بن مُرَّة، جن کے وه بنو عَمّ تهے، اثر و رسوخ میں قُصَیّ کی اولاد کے حریف تهے - دورِ جاهلیّت میں تاریخ مکّة ان کے ذکر سے تقریباً خالی هے [اس کے سوا که مثلاً وه قریش کے 'مُطَیَّبِین' میں سے تهے (المحبّر، ص ۱۶۶؛ انساب الاشراف، ۱ : ۵۶] (قب وه قلیل حوالے جو کائتانی Caetani نے *Annali dell' Islam*، اشاریة، ج ۱ و ۲ : ص ۱۰۰۶ میں دیے هیں) - صرف چند شخص ظهورِ اسلام سے ذرا پہلے ان میں سے نامور هوے؛ مثلاً [عثمان بن کَعْب، هو شارب الذّهب اور] عبدالله بن جُدْعان جو اجواد جاهلیّة میں سے تهے [اور کچھ بعدِ اسلام کے لوگ (المحبّر، ص ۱۳۷ و ۱۵۱ ببعد) اور کچھ اور مشاهیر جن کا ذکر العقدالفرید، قاهرة ۱۳۲۱ھ، ۲ : ۳۰۹ میں آیا هے، نیز دیکھیے کتاب الاشتقاق، بذیلِ کلمه] - عبدالله بن جُدعان کا گھر وه گھر تها جس میں قریش کے مختلف بطون نے مُحالَفة کیا تها، یعنی آپس میں عهد باندها تها (حِلْف الفُضُول؛ قب Caetani : *Annali*، Introduction، فصل ۱۴۷) - اسلامی زمانے میں بهی یه گھر لوگوں کو دکھایا جاتا تها - عبدالله بن جُدْعان هی اُمیّة بن ابی الصَّلْت (اغانی، ۸ : ۲ تا ۵ : قب Schulthess : *Orientalische Studien, Th. Noldeke .... gewidmet*، ۱ : ۷۳ ببعد؛ Goldziher : *al-Ḥuṭai'a*، *ZDMG*، ۴۶ : ۷) شاعر کا سرپرست تها [اور وهی حربِ فِجار میں بنو تیم کا رئیس تها، المحبّر، ص ۱۷۰].

تَیم بن مُرَّة کی شهرت کا انحصار صرف اس بات پر هے که اکابرِ اسلام میں سے دو مشهورترین شخصیتیں اُس نے پیدا کیں، یعنی ابوبکر[رض] اور طلحة[رض] بن عبیدالله - مکّهٔ [معظّمه] کے جس محلّے میں تَیم بن مُرَّة آباد تهے اَزْرقی نے اس کا وصف مختصراً بیان کیا هے (دیکھیے *Chron. d. Stadt Mekka*، طبع وستِن فلٹ، ۱ : ۴۶۸).

مآخذ: [(۱) هشام الکلبی: جمهرة النسب، نسخهٔ موزهٔ برطانیه، ۸ الف ببعد؛] (۲) مصعب الزبیری : کتاب نسب

قریش، تصحیح لیوی پرو وانسال، قاهرة ۱۹۰۳ء، ص ۲۷۵ تا ۲۹۶؛ (۳) محمد بن حبیب : کتاب المُحبّر، حیدرآباد ۱۹۴۲ء؛ (۴) البلاذری : انساب الاشراف، تصحیح محمد حمیداللہ، قاهرة ۱۹۵۹ء، ج ۱، بامداد فهرست الاسماء و الاعلام؛ (۵) ابن عبدربّہ : العقد الفرید، بامداد فهارس العقد، ۱ : ۲۲۵، بذیل کلمه؛] (۶) وسٹن فلٹ : *Geneal. Tabellen*، شجره R. 16، (*Register*، ص ۴۴۷)؛ (۷) ابن دُرید : کتاب الاشتقاق، طبع وسٹن فلٹ، ص ۹۵ ببعد.

(لیوی دِلا ویدا G. LEVI DELLA VIDA)

تَیماء : ایک پرانی بستی، جو شمالی عرب کے ایک شاداب نخلستان میں واقع ہے اور دُومة الجندل کے جنوب میں چار دن کی مسافت پر ہے اور بقول مُقدسی حِجر سے تین دن اور وادی القُری سے چار دن کی راہ پر ہے۔ یہ جگہ ایک نشیب میں واقع ہے، جس کی لمبائی یوسن Jaussen اور ساوِینیاک Savignac کے قول کے مطابق ۲ میل اور چوڑائی ۵۰۰ گز ہے۔ زیرِ زمین پانی جمع ہو کر ایک کنویں میں جو ۴۰ یا ۵۰ فٹ گہرا اور جس کا قطر ۶۰ فٹ ہے پھوٹ پڑتا ہے؛ یہ بھی مذکورۂ بالا دو مسافروں ہی کا بیان ہے۔ تیماء کا ذکر مسماری کتبوں اور عہدِ عتیق میں بھی اس حیثیت سے آیا ہے کہ یہ کاروانوں کی شاہراہ کی ایک اہم منزل ہے (اشعیاء Isaiah، ۲۱ : ۱۴؛ ارمیا Jeremiah، ۲۵ : ۲۳؛ سِفرِ ایوب، ۶ : ۱۹)۔ قدیم آرامی زبان کا کتبہ، جو اوائٹنگ Euting کو دستیاب ہوا، ایرانی عہد سے متعلّق ہے اور اس جگہ کی ثقافتی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ قدیم عرب شعراء بھی اس کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً امرءُ القیس اپنے معلّقة (شعر ۷۶) میں کہتا ہے:

[وَتَیماءَ لَمْ یَتْرُکْ بِھَا جِذْعَ نَخْلَةٍ
وَلاَ اُطُماً اِلاَّ مَشِیداً بِجَنْدَلٍ]

"یہ (طوفانِ باد و باران) تیماء میں کسی کھجور کے درخت کو قائم نہیں چھوڑتا اور نہ کسی مکان کو، جب تک کہ وہ پتھروں کا نہ بنا ہو"۔ شمالی عرب کے دوسرے نخلستانوں کی طرح یہاں بھی مہاجر یہودی یا دین یہود کو اختیار کرنے والے (مُتہوِّد) آباد تھے۔ ان میں سے ایک سَموْءَل [رَکَ بآن] تھا، جو قلعة الاَبْلَق الفَرْد کا مالک تھا، جس کا ذکر اَعْشٰی اور دوسرے شاعروں نے کیا ہے [یہ قلعہ حَصانت و مَنَعت میں عربوں کے ہاں ضرب المثل تھا۔ بکری]۔ پہلے تو یہاں کے یہودی باشندے [حضرت] محمد[ص] سے دوستانہ تعلّق رکھنے کے حق میں نہ تھے لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے ہم‌مذہب وادی القُری کے باشندوں سے اچھا سلوک ہوا ہے تو وہ اپنی خوشی سے مطیع ہو گئے اور اس طرح انہیں اجازت مل گئی کہ وہ جزیہ کی سالانہ ادایگی کی شرط پر اپنی اراضی اپنے پاس رکھیں؛ لیکن [حضرت] عمر[رض] نے عرب کے دوسرے یہودیوں کی طرح انہیں بھی ملک سے نکال دیا۔ دسویں صدی میلادی میں ابن حَوقَل لکھتا ہے کہ اس کی آبادی تَبوک سے بھی زیادہ گنجان تھی۔ مُقَدَّسی [ص ۲۵۲ ببعد] اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ ایک شاداب اور وسیع نشیبی علاقے میں واقع ہے، جس میں ایک چشمہ اور کئی کنویں ہیں، جن میں سے کچھ ویران ہو گئے ہیں؛ بہت عمدہ باغ ہیں اور کھجور کے درخت بکثرت ہیں، جن کا پھل نہایت اچھا ہے۔ اس کے برعکس وہ باشندوں کی حرص و آز کی مذمّت کرتا ہے اور افسوس ظاہر کرتا ہے کہ اس شہر میں نہ کوئی عالم ہے، جس کی طرف رجوع کیا جائے [اور نہ کوئی حاکم جس پر بھروسہ ہو سکے۔ میں نے ان کا خطیب دیکھا جو کُنجڑا تھا اور ان کا حاکم دیکھا جو موچی تھا]۔ اس سے اگلی صدی میں البَکری لکھتا ہے

که اس میں کھجور کے درختوں، انجیروں اور انگوروں کی کثرت ہے ۔ اس گنجان آبادی والے شہر کی فصیل ایک فرسنگ لمبی تھی، جو ایک ندّی کے ساتھ ساتھ جاتی تھی ۔ موجودہ زمانے کے سیّاحوں میں سے اُوائے ٹِنگ Euting نے اس شہر کا حال اچھی طرح سے بیان کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کے کوچہ و بازار تنگ ہیں اور مکان ثمردار درختوں سے گھرے ہوئے ہیں ۔ قدیم آثار میں سے اسے وہاں معبدوں کے کھنڈر ملے اور ایک مستطیل عمارت، جس کے گوشوں میں برج تھے ۔ اسے قلعۂ ابلق کا کوئی نشان نہ ملا، جس کے کھنڈر بقولِ یاقوت اس کے زمانے تک نظر آ رہے تھے [دیکھیے ابلق] ۔ یوسَن اور ساوِینْیا ک عجیب قسم کے گول ٹیلوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کے اطراف سیڑھیوں کی شکل کے تھے اور جن پر سے چڑھ کر ایک چھوٹی سی مربع عمارت تک پہنچا جاتا تھا ۔ آج کل تیماء میں ہر طرف زوال کے آثار نمایاں ہیں۔

مآخذ: (۱) بلاذری: فتوح البلدان، طبع ڈیخویہ، ص ۳۳ ببعد؛ (۲) *BGA*، طبع ڈیخویہ، ۱ [الاصطخری]: ۲۲؛ ۲ [ابن حوقل]: ۲۹؛ ۳ [المقدسی]: ۱۰۷، ۲۰۰، ۲۵۲؛ ۷ [ابن رستہ]: [۱۷۷]؛ ۸ [التنبیہ والاشراف]: ۵۸۳؛ (۳) البکری: [المعجم فی ما استعجم]، ص ۲۰۸ ببعد؛ (۴) یاقوت: معجم البلدان، ۱: ۹۰۷ ببعد؛ (۵) Doughty: *Travels in Arabia*، ۱: ۲۸۵، ۵۳۳، ۵۴۹ ببعد؛ (۶) Euting: *Togebuch einer Reise in Inner-arabien*، ۲: ۱۳۸ ببعد، ۱۹۹ ببعد؛ (۷) یوسَن Jaussen اور ساوِینْیا ک Savignac: *Mission archéologique*، ۲، Texte: ص ۱۳۳ تا ۱۶۳ و Tafel ۶۱ تا ۶۳ ۔

(بُول Fr. Buhl)

* **تَیْمُ اللہ بن ثَعْلَبَة**: ایک عرب قبیلہ، جو قبائل ربیعۃ بن نزار [بن معدّ بن عدنان] میں شامل ہے اور بَکْر بن وائل کے بہت بڑے مجموعۂ قبائل کی ایک شاخ ہے ۔ اس قبیلے کا نسب یہ ہے: تیم اللہ بن ثَعْلَبَة بن عُکابَة بن صَعْب بن عَلِیّ بن بکر بن وائل ۔ اسے تیم اللّات بھی کہتے ہیں ۔ شاید صحیح نام تیم اللّات ہی ہو، کیونکہ مسلمانوں (یا عیسائیوں) کا کلمۂ اللّات کو بدل کر کلمۂ اللہ کر دینا قطعاً غیر اغلب نہیں، گو اس کی برعکس صورت مشکل ہی سے خیال میں آ سکتی ہے ۔ تیم اللہ نے بھی عرب کے بہت سے دوسرے قبائل کے معمول کے مطابق اپنے بنی عمّ یعنی قبیلۂ بنی قیس بن ثَعْلَبَة سے مُحالَفہ کیا ۔ ان میں سے ہر ایک کے بنی عَنَزة اور بنی عِجْل کے ساتھ گہرے روابط تھے ۔ ان اَحلاف کو 'اَللَّہازِم' کہتے تھے (لغت نویس کہتے ہیں کہ لفظ لِہْزِمَة سے کان کے پیچھے کی ابھری ہوئی ہڈّی مراد ہے اور اس قسم کے کلمات عام طور پر اتّحاد کی مضبوطی کی طرف اشارہ کرتے ہیں) ۔ اس اتّحاد میں بعد میں بنو مازِن بن صَعْب بن علی کو بلکہ بظاہر بَکْر کی دو بڑی شاخوں بنو ذُہل اور بنو شیبان کو بھی، شریک کر لیا گیا ۔ بنو بکر کی ایک اَور شاخ بنو حنیفة بھی، جو جاہلیت میں اس حِلْف میں شامل نہیں تھی، اسلام لانے کے بعد [مُتَلَہزِم ہو گئی، یعنی] اس اتّحاد میں شامل ہو گئی [المبرّد: الکامل، طبع رائٹ Wright، ص ۲۷۶، س ۱ و ۲؛ نقائض، طبع بیون Bevan، ص ۴۷، س ۱۰؛ ص ۳۰۵، س ۹؛ ص ۷۶۳، س ۹ اور بالخصوص ص [۷۲۸]، س ۱۵؛ وستِن فلْٹ Wüstenfeld کو غالباً ابن قُتیبة (کتاب المعارف، طبع وستِن فلْٹ، ص ۴۸) کے اس بیان سے غلط فہمی ہوئی ہے کہ اللّہازِم کا نام صرف تیم اللہ کے لیے مخصوص تھا [''و امّا تیم اللہ بن ثعلبة فہم اللہازم'']؛ قب نیز Reiske: *Primae Lineae*، ص ۲۰۳، تعلیقہ f، و ص ۲۰۵، تعلیقہ h] ۔ تیم اللہ اور اس کے حلیفوں نے

بکر بن وائل کی لڑائیوں میں، جو تمیم کے خلاف لڑی گئیں، حصّہ لیا اور خاص کر زُبالَة، نِباج، ثَیْتَل، جَدُود اور الوَقِیط کی لڑائیوں سے تو ان کا خاص تعلّق تھا (جَدُود اور الوَقِیط اسلامی زمانے میں ہوئیں)؛ تاہم یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان لڑائیوں میں انھوں نے کوئی خاص کارنامے دکھا کر امتیاز حاصل کیا یا ان کے سرداروں میں سے کوئی نامور شخص بھی تھا ۔ آخری دو لڑائیوں میں جنگ کی کمان الحَوْفَزان [یعنی الحٰرث] بن [شَریک الشَّیْبانی] اور اَبْجَر بن جابِر [العِجْلی] کے ہاتھوں میں تھی۔ اس سے زیادہ قدیم زمانے میں تیم اللہ باقی بنوبکر کے ساتھ مل کر الحِیرة کے بنولَخم کے خلاف لڑے تھے ۔ ان کا ذکر یوم اُوارَة کی کہانیوں میں آتا ہے۔

تَیم اللہ تقریباً سارے بکر بن وائل کی طرح سب [؟] عیسائی تھے (قب طبری : تاریخ، ۱ : ۲۰۳۲، سطرِ آخر) لیکن انھوں نے جلد ھی اسلام قبول کر لیا تھا اور ہم انھیں فتوحِ اسلام اور جنگہاے درونی میں شریک پاتے ھیں ۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک شخص اِیاس بن عَبْلَة خلیفۂ عثمان [رض] کے مقتل کے موقع پر موجود تھا [اور اس نے تمیم کے ایک آدمی کو قتل کیا] (نقائض، طبع بِیوَن، ص ۹۱۸ ببعد)، لیکن ہجرت کی پہلی دو صدیوں میں تیم اللہ نے زیادہ تر [خلافت کی] ایالاتِ شرقیہ ھی کی تاریخ میں حصّہ لیا۔ اس قبیلے کی ممتاز تاریخی شخصیتوں میں سے سب سے زیادہ مشہور اَوس بن ثَعْلَبة بن زُفَر بن وَدِیْعة ھے، جو شاعر کی حیثیت سے بھی مذکور ھے (اس کا ترجمہ ابن حَجَر نے دیا ھے، دیکھیے : اصابة، قاہرة ۱۳۲۵ھ، ۱ : ۸۲ میں بحوالۂ دِعْبِل : طبقات الشعراء و المَرْزُبانی : معجم الشعراء، نیز دیکھیے یاقوت : معجم، طبع وُسْتِن فِلْٹ، ۱ : ۸۳۰ میں تَدْمُر (Palmyra) کے دو قدیم مجسّموں کے متعلق اس کے اشعار)۔ وہ خراسان کا حاکم تھا؛ ۶۰ھ کی جنگِ درونی میں اس نے مُصْعَب بن الزبیر کے لشکر کے خلاف، جس کی کمان عبداللہ بن خازِم کے ہاتھ میں تھی، خراسان کے سارے بکر بن وائل کی امداد حاصل کر کے بڑی بہادری سے ھرات کا دفاع کیا اور سال بھر وھیں اڑا رہا تا آنکہ وہ لڑائی میں مارا گیا (طبری : تاریخ، ۲ : [۴۸۹] تا ۴۹۰؛ بلاذُری : فتوح، طبع ڈیخویہ، ص ۴۱۴ تا ۴۱۵)۔ تیم اللہ کے ایک اور شاعر نَہار بن تَوْسِعة نے (جو خراسان کے بنوبکر کا بہترین شاعر مانا جاتا تھا) قُتَیْبة ابن مسلم کی لڑائیوں میں حصّہ لیا۔ پہلے تو ایک دفعہ اس نے قُتَیْبَة کی ہجو لکھ کر اُسے ناراض کر لیا تھا لیکن آخر میں وہ اُسے [راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا] (قب ابن قتیبة : کتاب الشعر، طبع ڈیخویہ، ص ۳۴۴ ببعد؛ حماسة، طبع فریتاغ، ص ۳۳۱ ببعد؛ نقائض، طبع بِیوَن، ص ۳۵۹ ببعد، ۳۶۴ ببعد، ۳۶۸؛ طبری : تاریخ، جلد ثانی، مواضع کثیرہ؛ القالی : امالی، ۲ : ۲۰۱ ببعد وغیرہ)۔

اس کے علاوہ کئی اور قبیلے بھی تھے، خاص کر جنوب میں، جنھیں تیم اللہ یا تیم اللّات کہتے تھے؛ ابن الکلبی ذیل کے قبائل کا ذکر کرتا ھے : تیم اللہ بن اَسَد بن وَبَرة، تیم اللہ بن زَھو (؟) بن مُر بن الغَوث بن طَیّء، تیم اللہ بن حِقال . . . بن مازِن بن الأزد، تیم اللہ بن رُفَیْدَة بن ثور بن کَلْب، تیم اللہ بن عامر الأجدار . . . بن کَلْب [لانه کانت جدرة فی عنق عامر، کما فی المقتضب]، تیم اللہ بن النمر بن قاسط، تیم اللہ بن وَدْم بن وَھْب اللّات . . . [بن رُفَیدة بن ثور] بن کَلْب ۔

مآخذ : وسٹن فلٹ : *Geneal. Tabellen, B 17*، (*Register*، ص ۴۴۷)؛ (۲) ابن الکَلْبی : جَمْھَرة الأنساب، برٹش میوزیم کا مخطوطہ، شمارہ Addl. 23,297، ورق ۲۰۷ ب

تا ورق [۲۱۱] ب؛ (۳) ابن دُرید: کتاب الاشتقاق، طبع وسٹن فلٹ، ص ۲۱۲ ببعد.

(لیوی دلا ویدا G.Levi Della Vida)

تِیمار: فوجی خدمات کے عوض زمین کا عطیّہ (*beneficium*) یا زیادہ صحیح اور دقیق لفظوں میں: ایک قسم کی ترکی جاگیر یا اِقطاع، جس کے ملنے پر جاگیردار کا یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ سوار ہو کر جنگ پر جائے (سفرہ اشمک) اور سپاہی یا ملّاح مہیّا کرے، جن کی تعداد اس کی جاگیر (دِرلک) کے محاصل کے متناسب ہو.

جاگیردار ("timariot") کو 'تیمار صاحبی' یا 'اہلِ تیمار' یا 'تیمار ارِی' (عاشق پاشازادہ، طبع Giese، ص ۲۲، ۳۸، ۲۳۲) یا 'تیمار سپاہیسی' یا محض 'سپاہی' یعنی ''اسپ سوار'' کہتے تھے، جہاں سے 'تیمار' کے لیے مقبول عام نام 'سپاہی لِک' کا رواج ہوا.

فوجی جاگیروں کی، ان کی اہمیّت کے لحاظ سے، تین قسمیں تھیں: ۱ - خاصّ (جمع خاصلر یا خَواصّ)، یعنی وہ جاگیریں جو سب نہیں تو اکثر والیوں کو ملا کرتی تھیں.

۲ - زِعامت یا زَعامت، ایسی جاگیر جس کا کم سے کم حاصل بیس ہزار آقچہ یا آقچے ہوں.

۳ - 'تیمار' جس کا زیادہ سے زیادہ حاصل ۱۹,۹۹۹ آقچے ہوں.

بطریقِ توسّع تیمار کی اصطلاح گاہے آخری دو قسم کی جاگیروں بلکہ تینوں ہی قسموں کے لیے استعمال ہوتی ہے.

'تیمار' کا ترجمہ اکثر اوقات فوج کی کمان ("commandership" = *commanderie*، Meninski، Michel Baudier، Pitton de Tournefort) کیا جاتا رہا ہے - کلمۂ *commanderie* کا یہ استعمال فُرسانِ مالٹا و ٹیوٹنی نظام *commendatoriae* of the Kinghts of Malta and the Teutonic Order کے قیاس پر ہوا - مگر یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں؛ 'کمانڈر' وہ سابق فُرسان تھے جنھیں ان کی خدمات کے بدلے میں اپنے نظام (Order) کی بعض جاگیروں کے محاصل میں سے کچھ حصّہ اپنے لیے وصول کر لینے کا حق دیا جاتا تھا.

اس کے علاوہ 'تیمار' کے معنی کسی مریض یا مجنون یا زخمی آدمی یا لدّو جانور کی خبر گیری کرنا بھی ہے (یہ لفظ اب تک ان معنوں میں فارسی زبان میں استعمال ہوتا ہے) - کسی زخم کی مرہم پٹی، گھوڑے کی دیکھ بھال، جس سے 'تیمارجی' (مصری لہجہ میں تَمَرجی [با گاف مگر القاموس العصری: تَمَرجی، بذیل م - ر - ض] بمعنی مُمَرِّض (male nurse)) نکلا ہے - ان کے علاوہ اس کلمے کے معنی غلاموں اور نوکروں (خلائق - قُلْقَہ) کا علاج باستراحت یا کھلی ہوا سے علاج کرنا، کسی بڑی جاگیر یا مزرعہ یا انگوروں کے باغ کی دیکھ بھال کرنا بھی ہیں (شمس الدین سامی بک).

لفظ 'تیمار' کا اشتقاق: معلوم ہوتا ہے کہ لین کلاویوس Leunclavius پہلا شخص تھا جس نے اس کلمے کو یونانی *honorarium* τίμαριον کے ساتھ مربوط کیا، جو خود یونانی لفظ τίμη سے مشتق ہے، (*Io. Leonclavii Pandestes historiae turcicae*، عدد ۱۸۶، ج ۱، *Annales Sultanorum othmanidarum* کے آخر میں، فرینکفورٹ ۱۵۹۶ء)؛ اس مفروضے کو میشل بودیاے Michel Baudier نے قبول کر لیا تھا (*Histoire générale du serrail*، ۱۶۲۴ء، باب ۱۷) اور دُوکانژ Ducange بھی اس سے متّفق تھا.

لین کلاویوس نے سوءِ اتّفاق سے *timarion* بمعنی جاگیر کا شاہد سولھویں صدی کی ایک کتاب سے لیا (یہ اشارہ Damascenus Thessal. کی Βιβλίον ὀνομαζόμενον θησαυρὸς کی طرف ہے؛ قب

Emile Legrand : *Bibliothèque hellénique*، ج ۲، ۱۸۸۵ء: ص ۱۲) - اس قسم کے اقتباسات، جن میں یہ حوالہ بھی شامل ہے، دُوکانْی Ducange نے اپنی *Glossarium* (فرھنگ) اور اس کے تکملے میں نقل کیے ھیں، مگر، جیسا کہ سمرنوف V. D. Smirnov (*Kučibey gömür djinskiy*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۳ء، ص ۳۷، حاشیہ ۱) نے پہلے ھی بیان کر دیا ہے، یہ تمام اقتباسات بہت ھی قریب العہد ھیں اور سب کے سب عثمانی فتوحات کے بعد کے زمانے کے ھیں - بوزنطی شہنشاھوں کے ضمائم قانونِ اساسی (''novellae'') اس اصطلاح کو فوجی جاگیروں کے معنی میں استعمال نہیں کرتے بلکہ دوسرے الفاظ مثلاً στρατιωτικὰ κτήματα یا محض τοπία برتتے ھیں - جب فوجی جاگیر نے تطور کے بعد مدنی جاگیر (seignoral fief) سے قریب قریب ایک صورت اختیار کر لی تو نسبتًہ زیادہ اصطلاحی کلمات یعنی οἰνομία اور اس کے بعد πρόνοια اس مفہوم کے لیے استعمال میں آنے لگے (Ernst Stein : *Untersuchungen zur spätbyzantinischen Verfassung*، در *MOG*، ۲ : ۹).

۱۵۹۸ء میں وینس کے سینیٹر (عضو سینیٹ) لازارو سورانزو Lazaro Soranzo (*L'Ottomano*، ص ۱۲) نے یونانی اشتقاق کے خلاف یہ تجویز کیا (گو قطعی طور پر نہیں) کہ کلمۂ تیمار فارسی لفظ 'تیمار' بمعنی ''دیکھ بھال، فکر، دکھ، مرہم، پٹی کرنا'' سے مأخوذ ہے - اس لفظ کو فارسی قرار دینے پر یہ اعتراض ھو سکتا ہے (اگرچہ اس خیال سے فان ھامر von Hammer اور حال ھی میں گرزگرزوسکی Grzegorzewski بھی متفق ہے) کہ لفظ تیمار فارسی میں فوجی جاگیروں کے معنی میں کبھی استعمال نہیں ھوا اور ترکوں کا نظامِ جاگیرداری بظاھر بوزنطی نظام سے مستعار لیا گیا ہے نہ کہ ایرانیوں سے.

میری رائے میں 'تیمار' کا لفظ بوزنطی لفظ *Pronoya* (pronia) کی ایک صدائےباز گشت ہے - اور شواھد بھی ایسے ملتے ھیں جن سے ظاھر ھوتا ہے اصطلاحات کے معانی کا تطور مختلف زبانوں میں گاھے متوازی پایا جاتا ہے - *pronoya* کا لاطینی مترادف beneficium، فرانسیسی ''*provisions*'' (قب دُوکانْی اور طباعت Pachymeres، در *Corp. Script. Hist. Byz.*، ۲ : ۱۵۷) ایک ایسی اصطلاح بھی ہے جو در آمدِ کلیسائی سے متعلق ہے، جو رجالِ کلیسا کی معاش کے معنے میں مستعمل ہے - لاطینی اور متأخر لاطینی (low Latin) میں لفظ *cura* اور فرانسیسی اور انگریزی لفظ ''*cure*'' بھی (گو انطباق میں اس سے کم درجے میں) 'تیمار' کے تقریباً تمام معنوں سے منطبق ھیں (البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان میں فوجی مفہوم مطلقاً نہیں)، یعنی : ''دیکھ بھال، علاج (طبی)، املاکِ دیہی، رجالِ کنیسا کی معاش یا آمدنی''- Balise de Vegenere and Trévoux's Dictionary میں 'تیمار' کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ یہ عربی لفظ ثمار (جمع ثَمر) سے مأخوذ ہے مگر یہ تشریح اتنی بودی ہے کہ ھمیں اس پر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاھیے.

نظامِ تیمار کی ابتداء - فان ھامر کی رائے یہ ہے کہ 'تیمار' مسلمانوں کے نظامِ جاگیرداری ھی کی ایک ترمیم شدہ صورت ہے گو وہ ایرانی اثرات کی اھمیت کا بھی قائل ہے - ورمز Worms نے اپنے پیشرو فان ھامر کی متعدد اغلاط کی تصحیح کی ہے مگر اس بارے میں وہ بھی اس کا ھم خیال ہے اور یہی رائے بیلاں Belin اور تشندورف Tischendorf کی بھی ہے.

اگرچہ مؤرخ سعدالدین اس اصطلاح کو ان جاگیروں کے لیے استعمال کرتا ہے جو ترکی کے ''مُسلّم'' Musellem (قب سطورِ ذیل) میں تقسیم

ہوئیں لیکن میرے لیے یہ تسلیم کرنا دشوار ہے کہ ترکوں کی تیماروں کی ابتداء عربوں کے اِقطاع سے ہوئی۔ ترکی قانون کا خاص تر اسلامی پہلو اس فرق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو قانونی اور سیاسی لحاظ سے عُشریّۃ (دہ یکی والی زمینوں) اور خَراجیّۃ اراضی کے درمیان کیا گیا ہے۔ ''عُشریّۃ وہ املاک ہیں جو بزورِ شمشیر فتح کی جائیں اور فاتحین کے درمیان اس شرط پر تقسیم ہوں کہ وہ پیداوار کا دسواں حصّہ ادا کرتے رہیں گے''۔ اور ''خَراجیّۃ یا خراج گذار زمینیں وہ ہیں جو اطاعت قبول کر لینے کی صورت میں ذمّیوں یا کفّار ہی کے پاس بشرطِ ادائے خراج رہنے دی جائیں''۔ اس کے برعکس فوجی جاگیروں میں، جیسا کہ خود بیلاں کو اقرار ہے (*Propr. foncière*، عدد ۳۰۳)، ہر قسم کی زمین شامل ہے اور بعض فقیہوں نے تأویل کے توسّع سے ان جاگیروں کو ایسی خَراجیّۃ املاک کے متشابہ قرار دیا ہے جو فوجی ضروریات کے لیے وقف کر دی گئی ہوں (کتابِ مذکور، عدد ۲۹۸)۔ سلیمان اعظم کے عہد کے فقہاء کو — یعنی خاصے متأخّر زمانے میں — فوجی جاگیروں کی حیثیت متعیّن کرنے میں قدرے دقّت پیش آئی تھی (قبّ Steeg اور Padel، ص ۹۱ تا ۲۰۲ اور خاص کر *MTM*، ص ۵۸، ۹ ۵ [ترکی متن]، فان ہامر von Hammer، ۱ : ۳۴۲ ببعد [جرمن اڈیشن]، *Journ. As.*، جنوری۔ فروری ۱۸۴۳ء، ص ۹۸ ببعد)۔ والٹیئر Voltaire نے ٹھیک کہا ہے کہ ترکوں نے 'تیمار' کا دستور عرب خلفاء سے مستعار نہیں لیا (*Essai des Moeurs*، باب xcxi)۔

میری رائے میں اب یہ مفروضہ موجّہ نہیں ہے کہ 'تیمار' کا دستور ایرانیوں سے لیا گیا۔ فان کریمر (*Culturgesch. des Orients*، ۱ : ۱۰۹-۱۱۰) نے ثابت کیا ہے کہ ایرانیوں کا عربوں کے نظامِ جاگیرداری پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ فان ہامر یقیناً مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے جب وہ بوزنطی اور ترکی فوجی جاگیرداری کے نظام کو ایرانی اثر کی طرف منسوب کرتا ہے۔ البتہ تینوں قوموں میں ایک عام خصوصیّت ضرور مشترک ہے اور وہ یہ کہ فوجی جاگیردار تینوں صورتوں میں زرہ‌پوش سوار تھے (قبّ ایران کے متعلّق *La Perse* : Cl. Huart، ۱۹۲۵ء، ص ۱۸۴، ۲۰۴)؛ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ زرہ بکتر ایران ہی کی ایجاد ہو۔ نقفور فوکاس Nicephoras Phocas کے ایک ضمیمۂ قانونِ اساسی (novella) میں زرہ کو نئی چیز بتایا گیا ہے لیکن اس امر کو کچھ زیادہ اہمّیت حاصل نہیں۔

یہ بات بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ترکوں نے بوزنطیوں کے اس دستور کی تقلید کی، بلکہ صواب‌تر یہ ہے کہ مروّج بوزنطی دستور کو قائم رہنے دیا۔ اس خیال کی تائید قدرے اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جاگیرداروں پر یہ فرض بھی عائد تھا کہ وہ سواروں کے علاوہ بحری فوج کے لیے آدمی مہیّا کریں گے۔ یہی دستور بوزنطیوں کے ہاں بھی تھا (*Byzantinische Geschichte* : Aug. Fr. Gfrörer، ۳ : ۲۱)۔

یہاں ہمارا یہ کام نہیں کہ ہم یہ دریافت کرتے پھریں کہ بوزنطیوں کی فوجی جاگیروں کا تعلّق اہلِ روما کی *beneficia* جاگیروں یا جرمن سپاہیوں کی نوآبادیات کے ساتھ کس حد تک تھا (بوزنطی زرہ‌پوش سواروں کے متعلّق قبّ *Un* : Gustave Schlumberger *Empereur byzantin au X^ème^ siècle*، طبع جدید ۱۹۲۳ء، ص ۴۰ و ۲۸۸ اور یونان کے فوجی نظامِ جاگیرداری کے متعلّق : *L' Empire* : Rambaud *grec au dixième siècle*، ۱۸۷۰ء، باب بعنوان : *La féodalité dans l' Empire grec : les fiefs militaires*؛ Lavisse اور Rambaud کی *L' histoire générale* کی ج ۱ کا باب xiii، بقلم C. Bayet، ص ۶۶۸ ببعد؛ Zachariae von

Histoire du droit privé gréco-romain : Lingenthal، فرانسیسی ترجمہ از Eugène Lauth، پیرس ۱۸۷۰ء، ص ۶۳، ۱۲۹ ببعد؛ وہی مصنّف: *Geschichte des griechisch-römischen Reichs*، ۱۸۷۷ء؛ Gaignerot : *Des bénéfices militaires dens l'empire romain et spécialement en Orient et au X^{eme} siècle*، بوردو Bordeaux، ۱۸۹۸ء، ص ۸۱، ۸۹؛ Testaud : *Des rapports des puissants et des petits propriétaires ruraux dans l'empire byzantin au X^{eme} siècle*، بوردو ۱۸۹۸ء، ص ۵۷ ببعد؛ ۔ *Juris Graeco romani tomi duo Johannis Leunclavii Amelburni*، فرینکفورٹ ۱۵۹۶ء، ۲ : ۱۴۴ ببعد، نیز قبّ تصانیف Meursius، Mortreuil اور Daremberg اور Saglio کی تصنیف *Dictionnaire des antiquités grecques et romaines* میں مادّۂ *beneficium* کی فہرستِ مصادر ۔

رہا یہ امر کہ ایشیائے کوچک کے سلجوقیوں کا اثر طریقِ 'تیمار' پر کیا ہوا، تو اس کے متعلّق ہمیں کچھ علم نہیں اور نہ ہمیں ان کے عمومی فوجی نظام ہی کا حال معلوم ہے (تا ہم قبّ کو/پرولو زادہ محمّد فؤاد کے ملاحظات در *Milli tet. Medjm.*، عدد ۰ : ص ۲۱۳ تا ۲۱۴)۔

ترکی فوجی جاگیرداری کی تشکیل اور اس کا اداری نظام : ہمیں ابتدائی بیکوں یا عثمانی حکمرانوں کی اداری فعّالیّت کا حال بہت کم معلوم ہے ۔ اس خاندان کے بانی عثمان سے یہ قول منسوب ہے : ''جس کسی کو میں نے جاگیر دی ہے وہ بلا کسی وجہِ معقول کے واپس نہیں لی جائے گی، اگر وہ مر جائے تو اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوگا؛ اگر یہ جانشین بہت خردسال ہو تو اس کے ملازمین اس کے بجائے جنگ میں حصّہ لیں گے تا آنکہ وہ خود ہتیار اٹھانے کے قابل ہو جائے''۔

اورخان کے ماتحت علاءالدین نے سواروں کی ایک فوج تیّار کی جن کا نام مسلّم musellem تھا؛ یعنی ''وہ جنھیں مالیات کی ادائگی معاف تھی'' ۔ ان کے پاس امن کے زمانے میں کچھ زمین رہا کرتی تھی، جس پر لگان نہ تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ، کم از کم جزوی طور پر، 'تیمار' کے نظام میں جذب ہو گئے (اس فوج کے متعلّق قبّ Belin : *Fiefs Milit.*، ص ۳۹ تا ۴۰، Grzegorzewski، ص ۵۴؛ Marsigli : ان کے متعلّق ایک فرمانِ مخطوط، کتاب خانۂ ملّی پیرس، خطّی ملحق ترکی، عدد ۹۷، آخر سے گنیں تو پہلا)۔

مراد اوّل نے تمرتاش پاشا روم‌ایلی کے بیکلربیکی کی امداد سے ۱۳۷۵ء میں ایک قانون نافذ کیا، جس کی رو سے تیمارِ خرد اور 'زعامت' میں حدِّ امتیاز قائم کی گئی کتاب خانۂ ملّی پیرس، خطّی ملحق ترکی، عدد ۶۸، ورق ۶۳)۔

محمّد ثانی نے ۸۸۱ھ میں فوجی جاگیروں کی دفترداری کے نظام کو زیادہ باقاعدہ بنانے کا طریقہ ایجاد کیا ۔ اس بادشاہ کے قانون نامہ میں ان جاگیروں کا ذکر مقابلۃً کم ہے ۔ (یہ قانون نامہ تاریخ عثمانی مجموعہ سی، ۱۳۳۰ھ، کے ایک ملحق میں شائع ہوا، ۳۲ صفحات، قطعِ نیم و زیری (octavo)، قبّ فان ہامر v. Hammer : *Staatsverfassung*، ۸ : ص ۸۷ تا ۱۰۱ : *Catal. of the MSS in Vienna*، عدد ۱۸۲۰، تیسرا، اور ۱۸۱۳، تیسرا) ۔ اس قانون نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ مال کے ان افسروں کی جن کے سپرد جاگیروں کا ادارہ تھا (''سپاہ یازیجی لری'') کل ولایتوں میں پوری تنظیم ہو چکی تھی ۔ سادہ تیماروں کے لیے 'تیمار دفترداری' مقرّر تھے ۔ اور 'زعامت' کے لیے 'دفتر کتخداسی (کہیاسی *k'ah'asi*) ۔ دونوں محکموں کے افسر 'دفترِ امینی' کے تحت تھے' جو سلطنت کے 'دفتردار' کے تحت تھا (قبّ قانون مذکورۂ

بالا، ص ۹۱ : فان ھامر، ص ۹۳ اور بیلاں Belin : *Fiefs milit.*، ۴۴)۔ چھوٹے جاگیرداروں یا جبہ لؤیان کی تنظیم کی تفصیل محمد ثانی کے ایک اور فرمان میں ملے گی، جسے F. Kraelitz - Greifenhorst نے *MOG* ۱ : ۱۳، ۳۸ میں شائع کیا تھا ۔ اس قانون کا نفس مضمون قانون (قب سطور ذیل) سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔

محکمۂ 'تیمار' کی ترتیب و تنظیم کا سہرا سلیمان اعظم [قانونی] کے سر باندھا جاتا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اس نے صرف رائج الوقت قواعد ھی کو منضبط کر دیا ۔ بہر حال اس نے والیوں کو نسبۃً زیادہ اہم تیماروں کی اختیارداری سے محروم کر دیا ۔ ایسے تیماروں کو 'تذکرہ لی' کہتے تھے (قب سطور ذیل) اسی بادشاہ کے عہد میں بیشمار قانونی ضابطے (قانون، قانون نامہ، قانون نامۂ آل عثمان، قانون سلطانی) تیار ہونے لگے اور وہ ضابطے جو 'نشانجی' نے (اور شاذتر صورتوں میں 'دفتردار' اور 'دفتر امینی' نے) تیار کیے۔ یہ مجموعے شیخ الاسلام کی مدد سے مرتب ہوے اور جیسے جیسے وقت گذرتا گیا ان کی تیاری میں شیخ الاسلام کی امداد بڑھتی گئی (قب مآخذ) ۔ ان قوانین سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظام 'تیمار' کی حیثیت زراعی تھی ۔ 'میری' زمینیں، یعنی وہ املاک دولت جن پر یہ جاگیریں مشتمل تھیں، مواضعات کے نواح کے مزرعے ھی تھے۔ ان موضعوں کے مکانات لوگوں کی نجی ملک mülk ہوتے تھے (MTM، ص ۴۰)۔ اس کے علاوہ کوئی زمین جو زیر کاشت ہو، خواہ وہ رعایا کے کسی باغ یا تاکستان ھی میں کیوں نہ ہو، 'تیمار' میں شامل ہوتی تھی اور اس زمین کا لگان سپاھی کو ادا کیا جاتا تھا ۔ (MTM، ص ۸۷؛ قب JA، جنوری ۔ فروری ۱۸۴۳ء، ص ۸۷)۔

تیمار فوجی نقطۂ نظر سے : ھمیں معلوم ہے کہ مغربی طاقتوں سے پہلے ترکوں کے پاس فوق العادۃ منظم اور باقاعدہ فوج تھی ۔ انیسویں صدی کے شروع میں یعنی جب 'تیمار' کا نظام معدوم ھوا اس میں مفصلۂ ذیل عناصر شامل تھے :۔

۱ ۔ باقاعدہ مستقل فوج، جسے باقاعدہ 'علوفہ' (یعنی تنخواہ) شاھی خزانے سے ملا کرتی تھی۔ انھیں 'قپو (قپی) - قولی'، یعنی ملازمین باب (سلطان) کہتے تھے : اس میں یکی چری [الانکشاریۃ] توپچی، خمبرہجی (نارنجک انداز bombardiers)، [لغمجی] (سفرمینا)، انجنیئر (مہندس)، آگ بجھانے والے (طولومبہ جی، رکّ باان)، گولہ بارود لے جانے والے (جبیجہ جی)، سوار ('سپاھی'، تیمار کے سپاھیوں سے مراد نہیں ہے) اور 'چاؤش' شامل تھے۔

۲ ۔ رسالہ (توپراق‌لی) اور جاگیرداروں کی فوجیں۔

۳ ۔ سرت قولو ('سرحد - قولی') یا سرحد کی افواج کو عام طور پر بے قاعدہ ھی طور پر فوجی خدمت کے لیے بلایا جاتا تھا اور بے قاعدہ ھی طور پر تنخواہ دی جاتی تھی ۔ انھیں خاص طور پر تب بلاتے تھے جب خطرہ سخت ھو۔ سواروں کی حیثیت میں یہ فوج حسب ذیل لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی : گونو للو gönüllü (گومؤللو gömüllü) یا ''رضاکار''، بھاری رسالہ (بشلی یا بسلی)، ہلکا رسالہ (بقول مونتیے کوکلی Montecuculli ہنگری والوں کے رسالۂ ہزار Hussars کی طرز کا) اور دلی (دلیل) یعنی لمبے نیزوں سے مسلح سپاھی ۔ پیدل فوج کی حیثیت میں سرحد قولی ذیل کے اجزاء پر مشتمل ھوتے تھے: عزب (عزپ) یعنی منتخب قلعہ گیر فوج کے سپاھی (بقول مونتیے کوکلی Montecuculli : ہنگری کے ہیڈوک heyduks کی طرز کے)، کسان رضاکار

('سیمن') جو ڈراگونوں dragoons کی طرح پیدل یا سوار دونوں طرح سے لڑتے تھے اور مال و اسباب کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مُسلّم یعنی بیلدار (pioneers) ہوتے تھے۔

۴۔ 'یرلی قولی' یا مقامی افواج، جو پاشا، سنجق بک، یا اَعیان کی ہوتی تھیں۔ فرض تو یہی کیا جاتا تھا کہ یہ فوجیں بابِ عالی کی خاص اجازت سے بھرتی کی جاتی تھیں لیکن اکثر اوقات اس اجازت کے بغیر بھی اقتدار پسند پاشا اس قسم کی فوج سے اقتدار حاصل کرتے تھے (مثلاً علی منسوب بہ تپلن، جزّار، مصطفی، بیرقدار وغیرہ)۔ صحیح یا غلط طور پر اس قسم کی فوج کو مذکورۂ بالا تیسری قسم (سِرت قولو) سے ملتبس کر دیا جاتا ہے اور بعض مصنفین مثلاً احمد راسم نے یرلی قولی میں عَزَب سیمن اور مُسلّم کے علاوہ تُفنگجِلی ("fusiliers")، 'اجارہلی' یعنی سرحدی قلعوں کے بھاری توپ خانے بلکہ لَغمجی کو بھی شامل کر دیا ہے۔ اس دوسرے طبقے یعنی 'توپراقلی'، یا علاقائی فوج والے طبقے میں جاگیردار شامل تھے، جن کے پاس 'تیماریں' تھیں۔ ژشرو دِ سانت دِنیس Juchereau de St. Denis انھیں ''مغرب کی قدیم جاگیرداری نظام والی بادشاہیوں کی فوج'' سے تشبیہ دیتا ہے، جسے ''فوج جمع شدہ بعدِ اعلانِ عام'' (''levies of the arrière-bans'') کہتے تھے۔

سپاہیوں کی ان مختلف اقسام کے درمیان کوئی محکم حدّ فاصل نہ تھی۔ یکی چری (الانکشاریة) بھی 'تیمار' حاصل کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس سرحدی ولایتوں میں صاحبِ 'تیمار' موجود تھے اور اس شخص کے لیے جو حقیقۃً 'سپاہی' یا جبہلی، کا بیٹا نہ ہو ترقی پانے کے مختلف طریقوں میں سے ایک ہی جائز طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے رضاکار (گوانولّو gönüllü) بن کر ''سرحدوں پر'' جائے اور وہاں بہادری کے کارنامے دکھا کر امتیاز حاصل کرے۔ 'سردار' یا سپہ سالار کو اختیار حاصل تھا کہ وہ میدانِ جنگ ہی میں ایسی تیماریں تقسیم کر دے جو فوج کے جنگی نقصانات کی وجہ سے خالی ہو گئی ہوں اور اُسے یہ اختیار بھی تھا کہ کارنمایاں کرنے والے رضاکاروں کو بطور 'یولداش' یعنی ہمرکاب کے قبول کرے (قبّ بیلاں Belin : .Fiefs milit، tir. à part، ص ۶۵؛ Abesci، ص ۲۳ : Bonaparte : Mme Louise St.-Belloc et les Grecs، پیرس ۱۸۲۶ء، ص ۱۰۹، اور میری تصنیف Sommaire des archives turques du Caire، ص ۲۷، حاشیہ ۱)۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اصحابِ 'تیمار' کے واسطے سب سے بڑی لازمی شرط یہ تھی کہ جن لوگوں کی جاگیر کم سے کم کر کے قِلِج ('' تلوار'') کے درجے تک پہنچا دی جائے وہ بذاتِ خود جنگ میں شریک ہوں (اور جب یہ ناممکن ہو تو اپنا نائب بھیجیں) اور جنھیں زیادہ اونچے درجے کی جاگیر ملی ہوئی ہو اُن کے لیے لازمی تھا کہ وہ ایک یا ایک سے زیادہ 'جبہلی' بھیجیں۔

مگر جاگیرداری کا نظام اتنا بسیط اور سادہ معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ جاگیردار کو زرہ بکتر پہن کر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ خود بھی جبہلی (بعبارتِ 'قانون' 'کندو جبہلی' : قبّ TOEM، ص ۱۱) تھا اور یہی حالت اُن لوگوں کی تھی جو زیادہ امیر نہ تھے (ایک ہزار آقچہ والے ! بعبارتِ 'قانون'، لیکن اس میں تبدیلی ہو سکتی تھی)۔ باقی سب کو اپنا ''غلام'' (''squire'') اور خیمہ بھی لانا پڑتا تھا (تورنفور Tournefort، ص ۳۱۹، بھی خیموں کا ذکر کرتا ہے)۔ جو ان سے بھی زیادہ مالدار تھے انھیں ایک یا زیادہ 'جبہلی' کے علاوہ

بہتر قسم کے خیمے لانا پڑتے تھے (قب مختلف قسم کے خیموں کی تفصیل اسی 'قانون' میں).

Pétis de la Croix نصیحت نامہ کے ترجمے کے ایک حاشیے میں ص ۸۸ پر لکھتا ہے کہ 'جبہ‌لی' ''مسلح سپاہی ہوتے تھے اور زرہ پوش . . .، وہ توپ‌خانے اور خندقوں میں کام کیا کرتے تھے - وہ اس مٹی کو جو یکّی چری (الانکشاریة) کھود کر نکالتے تھے اٹھا لے جایا کرتے تھے'' اور تورنفور (ص ۳۲) لکھتا ہے کہ اصحابِ 'تیمار' اس بات پر مجبور تھے کہ ''وہ اپنے سواروں کے لیے ٹوکریاں مہیا کریں، جو مٹی ڈھونے کے کام آتی ہیں اور جن میں سوار کھائیوں اور خندقوں کے بھرنے کے لیے مٹی لاتے ہیں'' - فوج میں ایک عہدے‌دار ہوتا تھا، جسے 'جبہ‌لی آغاسی' کہتے تھے، وہ 'جبہ‌لی' کے نفروں پر ضبط قائم رکھنے پر مأمور ہوتا تھا (قب Grzegorzewski، دستاویز عدد ۱۰) - پوکول (Pouqueville: *Voy. dans la Grèce*، ص ۱۰) 'جبہ‌لی' اور gabeloux (چونگی کے زرہ پوش عہدے دار) ان دو کلموں میں اتحادِ لسانی ظاہر کرتا ہے.

جاگیرداروں کے اسلحہ کے متعلق جزئیات Abesci، ص ۱۸ میں دی ہیں - تورنفور (ص ۳۲) یہ بھی لکھتا ہے کہ ''ان کے سواروں کے رسالے ان رسالوں کی نسبت جو بطورِ درست 'سپاھی' کے نام سے مشہور ہیں زیادہ منظّم ہوتے ہیں، گو 'سپاھی' نسبةً سبک تر اور چابک تر ہوتے ہیں: 'سپاھی' اپنی اپنی پلٹن میں شامل ہو کر لڑتے ہیں اور سب سے پرانا سوار ان کا افسر ہوتا ہے لیکن زعماء اور اصحابِ 'تیمار' رجمنٹوں میں منقسم ہوتے ہیں، جن کی کمان 'کرنیلوں' کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جو پاشاؤں کے زیر فرمان ہوتے ہیں''.

فوجی جاگیروں کے طبقات؛ والیانِ ولایت کی ''خاص'' جاگیریں: جیسا کہ تورنفور کے مذکورۂ بالا اقتباس سے ظاہر ہے ولایات کے نظام حکومت اور جاگیرداروں کے درمیان ایک حدّ تک مضبوط تعلّق تھا: بلکہ حاکمانِ ولایات کو بسا اوقات اصحابِ اقطاعاتِ خاصّ (''خاصّ'' جاگیر والوں) کے ساتھ ملتبس کر دیا جاتا ہے.

مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ تمام ولایات میں 'زعامت' اور 'تیمار' موجود تھیں - درمیانی قسم کے مقبوضات، مثلاً کریمیا (قریم)، ڈینیوب کی امارتوں اور بربری ریجنسیوں [مقیمیّات] میں 'تیماریں' نہ تھیں - یہی صورت صوبجات اور بعض دور دست بیرونی مقبوضات، مثلاً مصر، بغداد، کریٹ (اقریطش)، قبرص، ورد Varad، کفّہ Caffa میں تھی - اولیا چلبی لکھتا ہے کہ جزیرہ نماے موریا [مورہ] میں بھی، ماسوا ملحقہ جزائر کے، کوئی 'تیمار' نہ تھی لیکن پوکول (*Voy. dans la Grèce*، ص ۱۲) اس کے خلاف لکھتا ہے.

دوسرے عثمانی مصنّفین اس سلسلے میں دو طرح کی ولایات میں فرق کرتے ہیں، یعنی ان ولایات میں جن پر اس حیثیت سے حکومت کی جاتی تھی کہ وہ سالیانہ (فارسی زبان میں = سالانہ) ہیں (''سالیانہ ایلہ ضبط اولونان'' یا ''سالیانہ ایلہ مضبوط ایالت'') اور ان ولایات میں جو 'خاصّ' کہلاتی تھیں - سالیانہ ولایتیں والیوں کے یا تو مکمل قبضے میں تھیں یعنی ہر طرح سے اور مستقل مکمّل قبضہ (ملکیّت او جاقلق یا یورتلق) جیسے درمیانی ولایات یا کردستان کے پانچ اضلاع، جنھیں 'حکومت' کہتے تھے یا ولایتِ دیارِ بکر کے ۱۹ سنجق، یا یہ مکمل قبضہ ایک وقت میں ایک سال کے لیے انھیں دیا جاتا تھا ('التزام ایلہ' یا 'سنوی التزام ایلہ'، جہاں سے سالیانہ کی اصطلاح شروع ہوئی) - اس نظام کے ماتحت والیوں کے مواجبات صوبے کے محکمۂ مال کے افسر

صوبے کے محاصل سے منہا کر لیا کرتے تھے (یا پھر 'اِرسالیّہ' سے وضع کر لیتے تھے - 'ارسالیّہ' وہ رقم تھی جو لشکر کی تنخواہ اور اَعطیات وضع کرنے کے بعد قسطنطنیة میں بھیجی جایا کرتی تھی، یعنی 'خَزِینہ' ترکی میں 'خَزْنَہ') اس کے بدون کہ بیکلر بیکی (وائسرائے) کے لیے ''یہ ممکن ہو کہ لوگوں سے ایک حبّہ بھی وصول کر سکے'' (مارسِگْلی Marsigli)، گو حاکمانِ ولایات جن کے پاس ''خاصّ'' جاگیریں تھیں ان جاگیروں سے عُشر (جمع اَعْشار) وصول کیا کرتے تھے.

اس فرق کو حرف بحرف درست نہیں سمجھنا چاہیے - بعض 'سالْیانہ' (اِقطاعات) والے حاکم 'خاصّ' جاگیروں کے مالک بھی ہوتے تھے اور یہ 'خاصّ' جاگیریں سب کی سب فوجی جاگیریں بھی نہ تھیں؛ مثلاً خانِ کریمیا کَفّہ Caffa کے چونگی کے محاصل پر بارہ لاکھ آقچے 'خاصّ' کے نام پر وصول کیا کرتا تھا - دوسری طرف مختلف قسم کے سنجق ایک ہی ولایت میں پائے جاتے تھے، کوئی 'سالْیانہ' ہے تو کوئی 'خاصّ'؛ یہی حالت ولایاتِ بغداد، قُبرُص (جن کے متعلّق ہم پیشتر بتا چکے ہیں کہ وہ 'خاصّ' والی ولایات میں سے ہیں)، دمشق، حلب اور چِلْدِر کی تھی - قپودان پاشا کی ایالت کو ہم نے شمار نہیں کیا - 'سالیانہ' اور 'خاصّ' ولایات کا یہ فرق زیادہ واضح ہو جاتا ہے جب سوال ایک سنجق کا ہو، کسی پوری ایالت کا سوال نہ ہو.

جاگیرِ 'خاصّ' کے تصوّر کو ''فوجی جاگیر'' کے تصوّر کے ساتھ ملتبس نہیں کرنا چاہیے - ایک تو 'خاصّ' فوجی جاگیر سے بڑی ہوتی تھی، پھر دونوں میں یہ فرق بھی ہے کہ جاگیر 'خاصّ' کسی والی کی ذات سے نہیں بلکہ اس کے منصب سے متعلّق ہوتی تھی - یہ دستور کم از کم اس وقت سے نظر آتا ہے جب سلطان مراد ثالث کے عہد میں ''سنجق بیکی'' کا عہدہ غیرقابلِ انتقال نہ رہا (قب Belin : *Propr. foncière*، عدد ۳۱۳) - سلطان کی اپنی باقاعدہ نجی 'خاصّ' (تیمار) بھی ہوتی تھی، جسے ''خاصِّ ھمایوں'' کہتے تھے.

اس قید کے ساتھ پہلی صنف کے بندگانِ سلطان میں دو قسم کے اعلیٰ حکّام ہوتے تھے: 'بیکلر بیکی' اور 'سنجق بیکی' اور یہ دونوں 'خاصّ' (جاگیروں) کے مالک ہوتے تھے.

بیکلر بیکی (قب Deny : *Sommaire des arch. turques du Caire*، ص ۱۴ تا ۲۵) 'خاصّ' (جاگیروں) کے مالک تھے جن کی سالانہ آمد ساڑھے چھے لاکھ آقچے (موریا) [= مورہ] سے بارہ لاکھ سات سو آقچے (قپودان پاشا) تک ہوتی تھی اور یہ جاگیریں ان کے مرتبے اور اقدمیّت کے مطابق ہوتی تھیں، یا یوں کہیے کہ ولایت کی فتح کی تاریخ سے متناسب ہوتی تھیں - خاصّ جاگیریں، جن کی آمدنی دس لاکھ یا اس سے زیادہ تھی، حسبِ ذیل تھیں: روم ایلی، اناطولیہ [اناضول]، دمشق، اِرزِروم، دیاربکر، وان، شِہرزور، خانیۂ کریمیا [قریم]، بغداد، بصرہ، حَبش، مصر؛ اس سے سو آقچے کم کی 'خاصّ' (جاگیریں) یہ تھیں: رودِس Rhodes، قُبرُص، الجزائر، تونس، طرابلس در بلاد الغرب، (اغلب ہے کہ بعض 'خاصّ' (جاگیروں) کا وجود صرف کاغذ ہی پر تھا اور وہ حقیقت میں موجود نہ تھیں).

ہر بیکلر بیکی کو ہر پانچ ہزار آقچے کے مقابل ایک 'مُکَمّل جِبہ‌لی' بہم پہنچانا پڑتا تھا - مارسِگْلی Marsigli اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ اس آمد کی بعض مدّوں پر فوجی فرائض معاف و مرفوع القلم بھی تھے.

بیکلربیکی اس بات کے بھی مجاز تھے کہ وہ چھوٹی 'تیماریں' ('تذکرہ سز' قب سطور ذیل) بذریعۂ برات (پروانہ) کسی کو عطا کر دیں - جب کوئی وائسرائے مر جاتا تو سرکار کی طرف سے اس کے گیارہ ملازموں کو 'تیمار' عطا ہو جاتی تھی - یہ فرض کیا جاتا تھا کہ ''سنجق بیکی'' ایسی 'خاص' (جاگیر) کے مالک ہوتے تھے جن کی سالانہ آمدنی کم از کم دو لاکھ آقچے ہوتی تھی لیکن عملی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ عینِ علی کی فہرستوں میں ایسے سنجق بھی ہیں جن کی آمدنی اس سے کم ہے - جب کوئی نیا جاگیردار ایسا عہدے دار ہوتا جسے محلات میں کوئی عہدہ ملا ہوا ہو (ایسی صورت میں ''سنجق کی طرف خروج'' یا ''سنجق پر فائز ہونے'' کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی: سنجغہ چقمق) تو جاگیر کی مالیت کی حدِ ادنٰی کو ایسے عہدے دار کی حیثیت اور مرتبے کے تناسب سے بڑھا دیا جاتا تھا - یکی چری (الانکشاریة) فوج کے آغا کی جاگیر کی آمد سب سے زیادہ یعنی پانچ لاکھ آقچے ہوتی تھی.

سنجق بیکی کی جاگیروں میں 'ترقی' (augmentations) ہر ہزار آقچے کی آمد پر ایک سو آقچے (یعنی دس فی صدی) کے حساب سے ہوتی تھی - جب کوئی خالی جاگیر کسی سنجق بیکی کے سپرد ہوتی، جسے ابھی اس کی کل آمد کی وصولی کا حق حاصل نہ ہوتا، تو فاضلہ رقم بمد 'موقوف' (رقم جو حکومت نے رکھ لی) الگ جمع ہو جایا کرتی تھی تاکہ یہ رقم ان یکی چری سپاہیوں پر خرچ کی جا سکے جنھیں 'تیمار' کا استحقاق حاصل تھا - اس کے بعد یہ بھی ممکن ہو گیا کہ ساری کی ساری 'خاص' (جاگیر) کو اسی قابض کے فائدے کی غرض سے از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور جو جاگیردار (صاحبِ تیمار) اس طرح قبضہ کھو بیٹھیں انھیں معاوضہ دیا جائے - اس طریق سے یہ جاگیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے بچ جاتی تھیں.

سنجق بیکی کی افضلیت اس کی 'خاص' (جاگیر) کی اہمیت پر مترتب ہوتی تھی لیکن سابقہ وزرائے اعظم کو ہر لحاظ سے سب پر فوقیت حاصل ہوتی تھی - ایک سنجق بیکی کو ہر ہزار آقچہ سالانہ کی آمد کے عوض ایک ''تکمیل جبہ لی'' بھی مہیا کرنا پڑتا تھا اور جب کوئی سنجق بیکی مر جاتا تو حکومت اس کے چھے نوکروں کو 'تیمار' دیتی - غالباً تیمارِ 'خاص' حاصل کرنے کے لیے سنجق بیکی ہونا ضروری نہ تھا.

تیمارِ 'خاص' کی حدِ اقل کیا تھی؟ سلطنتِ عثمانیہ کے ترک مؤرخین لکھتے ہیں کہ 'خاص' ایک ایسی جاگیر ہوتی تھی جس کی سالانہ آمدنی کم از کم ایک لاکھ آقچہ ہو - ایسی جاگیر 'امراء' کو دی جایا کرتی تھی (امراء جمع امیر = بیک، اس لقب کا اطلاق سنجق بیکی پر ہوتا ہے اور تین طوغ والے وزیر یا پاشا کے لقب کے مقابل میں دو طوغ والے بیکلر بیکی یا پاشا کا یہ لقب ہوتا تھا؛ موجودہ زمانے میں جنرل [یعنی قائد] یا پاشا سے انھیں متمیز کرنے کے لیے یہ اصطلاح نسبةً بلندتر مرتبے والے حکام کے لیے استعمال ہوتی ہے) - اگرچہ ایک لاکھ آقچے کی رقم کی تصدیق دوسرے مآخذ سے بھی ہوتی ہے (تورنفور، ص ۳۱۹) لیکن یہ حد غالباً بعد کے زمانے میں مقرر ہوئی - عینِ علی افندی کی فہرست میں ایسی خاص تیماریں بھی ہیں جو اس سے کم حیثیت کی ہیں (مثلاً کسی ولایت کے دفتردار کی 'تیمار') - اگر ہم قلمیہ عوارض (duties) (قب سطورِ ذیل) کے وضعات کی میزان سے اندازہ لگائیں، جو کسی 'خاص' 'تیمار' کو ادا کرنا پڑتی تھیں، تو

'خاصّ' کی کم سے کم ابتدائی آمدنی ساٹھ ہزار آقچے ضرور ہوگی۔

زعامت یا زِعامت: ہر اس جاگیر کی جسے 'زعامت' کے نام سے تعبیر کرتے تھے کم سے کم بیس ہزار آقچے آمد ہوتی تھی - کسی وارث یا کسی دوسرے شخص کو منتقل ہونے پر یہ آمد نہ کم ہو سکتی تھی نہ قابلِ تقسیم تھی - آمد کی اس حدِّ اقلّ کو 'قِلِیج زِعامت' کہتے اور رقوم فاضلہ کو، خواہ وہ کچھ بھی ہوں، 'حصّہ' کہتے تھے۔

ہر 'زِعامت' جو رجسٹر (یعنی 'اِجمال') میں ناقابلِ تنقیص قرار پا کر درج ہو جایا کرتی تھی اسی سبب سے اسے 'اِجمالی' کہتے تھے، بمقابلہ ''حِصّہ‌لی'' یعنی حصّوں میں قابلِ تقسیم (بیلاں Belin : *Fiefs milit.*، ص ۵۵ تا ۵۷)؛ تیمار کی بھی یہی صورت تھی؛ قبّ مارسِگلی Marsigli، ص ۹۶ تا ۹۷۔

'زِعامت' دار کو 'زَعِیم' کہتے تھے (جمع زُعماء) ''سردار'' - ہر 'زَعِیم' کو بذاتِ خود لڑائی پر جانا پڑتا تھا اور اسے ''قِلِیج زِعامت'' کی مقرّرہ آمد بیس ہزار آقچے سے اوپر ہر مکمّل پانچ ہزار آقچے کی آمد پر ایک ''جِبہ‌لی'' بھی مہیّا کرنا پڑتا تھا - پانچ ہزار آقچے سے کم رقم پر، خواہ ۴،۹۹۹ ہی کیوں نہ ہو، کچھ دینا نہیں پڑتا تھا - وہ زعیم جو کسی قضا کے صدر مقام میں سکونت پذیر ہو عام طور پر ''سُوباشی'' ہو جایا کرتا تھا۔

دَورِ جدید کے تُرک مصنّفین اور تورنفور Tournefort کے قول کے مطابق 'زِعامت' کی زیادہ سے زیادہ آمدنی ۹۹،۹۹۹ آقچے ہوتی تھی لیکن بعض 'دفترِ کَخیاسی K'aḥ'asi' ایسے بھی تھے جن کی زِعامت کی آمدنی بہت تھی (فہرستیں عینِ علی نے دی ہیں) - Grzegorzewski نے حدّ اکثر بچاس ہزار لکھی ہے - تیمار خاصّ کے ذکر میں جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے اس سے اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں اس کی حد ۵۹،۹۹۹ آقچے ہو گی۔

تیمار: اس کی دو قسمیں تھیں:-

۱ - 'تِذکِرہ‌لِی'، جو ''بِراتِ سلطانی'' کے ذریعے ملتی تھی، بشرطیکہ بیکلر بیکی یا وائسرائے کا جاری کردہ شہادت نامہ (''تذکرہ'' یا ''مِیرِ مِیران تِذکِرہ سِی'') پیش کیا جائے (قبّ Grzegorzewski کے وثیقوں میں نمونے کے 'تِذکِرے'، عدد ۷۵، ۷۸، ۸۷، ۹۱، ۱۰۰، ۱۰۲ اور ۱۰۶)۔

۲ - 'تِذکِرہ سِز'، جو بیکلر بیکی کی معمولی 'بِرات' کے ذریعے عطا ہو، یعنی شہادت نامے کے بغیر ان جاگیرداروں کو دی جائے جن کے پاس کوئی جاگیر پہلے ہی سے موجود ہو یا کبھی موجود رہ چکی ہو - پہلی 'تیمار' کے واجبات کی ادائگی یا کم از کم ان کی منظوری ہمیشہ سلطانی 'بِرات' کے ذریعے ہوتی تھی۔

دونوں قسم کی 'تیمار' کی ناقابلِ تنقیص حدِّ اقلّ (قِلِج) کے واجبات ولایات کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے تھے لیکن تِذکِرہ‌لِی 'تیمار' کے واجبات تِذکِرہ سِز 'تیمار' سے ہمیشہ زیادہ ہوتے تھے - محدود تعداد کے وہ افراد جنھیں عام حالات میں ''گِدکلی زِعامت'' ملتی تھی یہ تھے: ''دَرگاہ عالی مُتِفرّقہ لِری'' (نوجوان امراء)، ''دَرگاہ عالی بوشلری'' bawušlarî، ''دیوان کاتِب لِری''، ''دفترِ خاقانی کاتِب لِری'' (*MTM*، ص ۵۴۳، جودت، ۱ : ۳۱۳) - انھیں ''روز نامچہ جی'' الصغیر سے تنخواہ بھی ملا کرتی تھی (Hammer : *Staatsverfassung*، ۲ : ۵۴، اور 'قانون' شائع شدہ در ۱۳۳۰ھ، ص ۲۱، تعلیقہ) - ان تنخواہوں کی مقدار روم‌ایلی، بُودا، بوسنہ اور تِمِسوار کی ولایات میں علی الترتیب پانچ ہزار (یا تین ہزار اور چھے ہزار آقچے) تھی اور دوسری ولایات میں

دو ہزار آقچے۔

جاگیردار پر اپنی 'قِلج' کے عوض ذاتی خدمت پیش کرنا واجب تھا اور اس سے زائد آمد کی معیّن مقدار پر ایک 'جبہ‌لی' مہیّا کرنا بھی لازم تھا ۔ رومایلی میں، بقولِ عینِ علی، ایک صاحبِ تیمار کے لیے ہر تین ہزار آقچے کے عوض، جو 'قِلج' کے عین مساوی ہے، ایک 'جبہ‌لی' کا مہیّا کرنا ضروری تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دس ہزار آقچے کی مقرّری رقم پر التزامات معاف تھے ۔ اگر ہم ان امور پر قیاس کریں تو باقی ولایاتِ سلطنت میں ہر دو ہزار آقچے پر ایک 'جبہ‌لی' محسوب کرنا پڑے گا ۔ یہ طریقِ عمل اس قانون نامہ ص ۱۱ کے طریقِ عمل کے برعکس جو سیّدی بک سے منسوب کیا جاتا ہے زیادہ سہل اور سادہ ہے ۔ (مارسِگلی Marsigli کا اندازہ زعیم کے لیے پانچ ہزار آقچے کا ہے) ۔

''اشکون (یا اِشکِن یا اِشکِن جی) تیماری'' (تیمارِ محارب)، یہ نام، جو مذکورۂ بالا فعل اِشمک سے مشتق ہے ایسی جاگیر کے لیے استعمال ہوتا تھا جس کے عوض بوقتِ ضرورت جاگیردار بذاتِ خود، اپنے حاشیہ نشینوں سمیت، خدمت مہیّا کرنے کا ذمّے دار تھا ۔ ''اشکنجی تیمارلری'' ایک طرف تو ''بنوبت (بنوابت) تیمار لری'' سے مختلف تھیں، جو کئی افراد کو نوبت بنوبت خدمات بجا لانے کے عوض میں دی جاتی تھیں اور دوسری طرف ''مستحفظ تیمار لری'' سے بھی مختلف تھیں، یعنی ان جاگیروں سے (جن کی تعداد نسبتًا کم تھی اور) جو غیر حربی لوگوں مثلاً سرحدی شہروں میں ائمّۂ مساجد یا مؤذّنوں کو دی جاتی تھیں یا ان لوگوں کو عطا ہوتی تھیں جن کا فرض یہ ہوتا تھا کہ وہ محلّاتِ سلطانی میں گوشت یا شکار کیے ہوئے پرندے مہیّا کریں ۔

اس تعلّق کی تحقیق کی بھی ضرورت ہے جو مؤخّرالذّکر تیماروں اور ان جاگیروں ('زعامت' یا 'تیمار') کے درمیان تھا جنھیں گدکلی (*Gedikli* یعنی امتیازی یا معاف و مستثنٰی) جاگیریں کہتے تھے: کیونکہ ایسے جاگیرداروں کے لیے ایسی صورت کے سوا جب وزیرِ اعظم بذاتِ خود جنگ کی قیادت کے لیے نکلے فوجی خدمت لازمی نہ تھی (بیلان Belin : *Propr. fonc.*، عدد ۵۰۳؛ Em. Legrand : *Ephémérides daces par Constantin Dapontès*، پیرس، ۱۸۸۱ء، ۲ : ۶۲ تا ۶۳) ۔ کسی خالی 'تیمار' کو پر کرنے سے پہلے اس امر کی تحقیق ضروری تھی کہ یہ جاگیر کہیں ''گدکلی تیمار'' کے خاص رجسٹر میں تو درج نہیں ہو چکی (قب عبارتِ رسمی ''گدکلی قیدنده دگل ایسه'' ''*gedikli kaydînda deyil-ise*''، دستاویزات در Grzegorzewski، عدد ۸۷ و ۱۰۰) ۔

جن ایّام میں اصحابِ 'تیمار' کو عروج حاصل تھا، بقولِ قوچی بک، جاگیردار حدِّ لزوم سے زیادہ آدمی فوجی خدمات کے لیے لے آیا کرتے تھے، کیونکہ انھیں یہ ہوس ہوتی تھی کہ وہ فوجی کارنامے دکھا کر 'زعیم' بن جائیں؛ مثلاً بیس کے قریب قیدی پکڑ لائیں یا اتنے ہی سر کاٹ لائیں ۔

نظری طور پر تو 'تیمار' صرف مسلمانوں ہی کو عطا ہوا کرتے تھے لیکن فتح (Conquest) کے زمانے میں اس کے خلاف بھی عمل ہوتا رہا ہے اور عیسائی جاگیرداروں کو اپنی جاگیروں پر قابض رہنے کی اجازت تھی (قب سرویہ کے متعلّق : Grzegorzewski، ص ۶۲ اور موریا [مورہ] کے متعلّق : Pouqueville ، محلِّ مذکور) ۔

جاگیروں کا فوجی نظام : جاگیرداروں کی اعلٰی کمان ولایتوں کے والیوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی (جو خود شاندار جاگیردار تھے) اور اس طرح لقبِ 'میرلوا' (مرادفِ 'سنجق بکی') کا

اطلاق بریگیڈیر جنرل پر ہونے لگا۔

ان جرنیلوں کے تحت ایسے افسر تھے جن کے فرائض میں داخل تھا کہ وہ جاگیرداروں کو اکھٹا کریں اور ان کی قیادت بھی غالباً وہی کرتے تھے۔ ان افسروں کے نام حسب ذیل ہیں :-

۱ - آلای بیکی : ایک قسم کا کرنل، جس کا انتخاب سَنْجَق کے جاگیردار کرتے تھے۔ انھیں طبل و عَلم کا حق حاصل تھا (''بیرق‌دار'' یعنی علم بردار ایک طرح کا لفٹیننٹ کرنل ہوتا تھا اور 'چاؤش' ایک طرح کا میجر تھا)۔ ترک لوگ اکثر اوقات سپاهی اور وویے وودہ *woyewoda* کو (جو سلاوی زبان کا مستعار لفظ ہے) آپس میں ملتبس کر دیتے تھے مگر وہ مالیاتی سپاهی (میری سوباشی لری) اور تیمار کے سپاهی (اهلِ تیمار سوباشی لری) میں تمیز کرتے تھے (قب قانون، شائع شدہ در ۱۳۳۰ھ، ص ۲۸)۔

۲ - چری باشی اور سوباشی : معلوم ہوتا ہے (اور یہ کسی اور نے بھی کہا ہے) کہ ان دو مختلف لقبوں سے ایک ہی قسم کے افسر مراد ہیں (سو [قدیم تر سُو sü] 'چری' کے مرادف ہے، بمعنی لشکر یا فوج)۔ ہر قضا یا ناحیہ کے لیے ایک ایسا افسر مقرّر تھا۔ امن کے زمانے میں سوباشی پولیس کے افسر کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔

''چری سُوْ رُوْجُوْ لیری'' *čerî sürüdjülerî* (سُوْرمک sur-mek سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی گلّے یا فوج کو آگے آگے ہانکنا ہیں)۔ بیلاں Belin ما سبق سے تناسب قائم رکھتے ہوئے انھیں دس دس آدمیوں کا کپتان بتاتا ہے لیکن وہ اتنے باقاعدہ افسر نہ تھے جتنے پولیس والے یا سراغرسان؛ یعنی وہ ایسے سپاهی تھے جن کا کام یہ تھا کہ بھگوڑوں کو پکڑ کر فوج میں واپس لائیں (قب دستاویزات، عدد ۸۵، ۸۷، در Grzegorzewski)۔

فوج کی فراهمی کے وقت سلطان کی جانب سے بیکلر بیکانِ متعلق کے نام فرمان جاری ہو جاتا تھا کہ زعیم اور سپاهی کا عَلَم بلند کریں (قب اس قسم کے ایک فرمان سے، جس کا نمونہ نصیحت نامہ، مترجمۂ Pétis de la Croix، ص ۳۰ تا ۳۶ میں ہے۔ اسی تصنیف کے ص ۸ پر لکھا ہے کہ دو ہزار یوک *yük* یعنی ایک لاکھ آقچے کی رقم اس غرض سے علیحدہ کر دی گئی کہ رواج کے ماتحت اس میں سے فوجی آدمیوں اور خاص کر زعیموں اور اصحابِ تیمار کو عطایا اور انعامات دیے جائیں)۔

فوجی جاگیروں کا نظامِ اداری : اداری اور مالی افسروں کا ذکر تو پہلے ہی آ چکا ہے جن کے ہاتھ میں ان جاگیروں کی تقسیم تھی۔ یہ افسر جنھیں ''ولایت محرّر لری'' یعنی ''محرّرانِ ولایت'' کہتے تھے اُن کی تحویل میں رجسٹر ہوتے تھے، جن میں سے ایک کو 'اجمال' کہتے تھے (یعنی ''عام'' اعداد و شماز متعلقۂ جاگیرات) اور ایک کو ''مفصّل'' (یعنی ''تفصیلی'' اعداد و شمار)۔ ایک اور کتاب میں، جس کا نام روز نامچہ تھا، ان جاگیروں کے متعلّق احکام ('برات') درج ہوتے تھے۔ فوج ان رجسٹروں کو میدانِ جنگ میں اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی (غالباً اصل کے مثنّی) تا کہ میدانِ جنگ ہی میں جاگیروں (تیمار) کی ضروری تقسیم فوراً درج کی جا سکے (قب دستاویزات، عدد ۸۷، ۱۰۰، ۱۰۲، در Grzegorzewski)۔

ترکی محافظ خانے (archives) میں سلطان فاتح ؒ کے وقت تک کے رجسٹر محفوظ ہیں، جن کا مطالعہ خالی از فائدہ نہ ہوگا؛ قب میرا مقالہ در *Histoire et historiens depuis cinquante ans* (*Bibl. de la Revue historique*)، پیرس ۱۹۲۷ء، ج اوّل ترکی (Turquie)۔

عطاءِ جاگیر کی سند ('برات') پر 'کاغذ

امینی، k'aghat emini کی طرف سے کچھ مواجبات ('' قلمیّہ '' یعنی ''منسوب بہ قلم'' کے نام سے) عائد ہوتے تھے۔ ان کی شرح چار فیصدی تھی: ۱۲۰ آقچے، تین ہزار آقچے کی مالیّت کی 'تیمار' کے لیے اور ۸۰۰ آقچے زعیم کے لیے مقرّر تھے۔ جاگیرِ 'خاص' پر پندرہ ہزار آقچے کی رقم عائد ہوتی تھی (ہم نے اس رقم (۱۵ ہزار آقچے) کا ذکر جاگیرِ 'خاص' کی اغلب اصلی حدّ اقل کا اندازہ لگانے کے لیے کیا ہے)۔ عام رواج کے مطابق 'تجدیدِ برات' یعنی سند کی تجدید ہر سال ہوا کرتی تھی اور ہر سال وہی قلمیّہ ادا کرنا پڑتا تھا قبّ (نصیحت نامہ، ص ۴۱، ۷۸، ۷۹)۔

اس جگہ ان قواعد کا ذکر کرنے میں بڑی طوالت ہوگی جن کا مقصد یہ تھا کہ 'تیماریں' یعنی جاگیریں ان پائین تر لوگوں کو منتقل کی جائیں جو فوجی خدمت کے قابل ہوں اور جو ترجیحاً ان عطیّہ داروں کے بیٹے یا ان کی نسل سے ہوں (یعنی سپاہی زادہ، جمع میں ابناءِ سپاہیان) یا ایسے 'جبہ‌لی' اشخاص کی اولاد سے ہوں جو فوجی خدمت کر چکے ہوں۔ اُن کے صحتِ نسب کی تصدیق دس جاگیرداروں (یعنی اصحابِ تیمار) کی شہادت سے ہوتی تھی (قوچی بک)۔

جب کوئی تیماردار حکمِ طلبی کی تعمیل سے قاصر رہتا تو اسے 'معزول' کر دیا جاتا تھا، یعنی عارضی طور پر، ایک یا دو سال کے لیے وہ جاگیر سے محروم کر دیا جاتا تھا اور اس کی 'تیمار' کو ایسی صورت میں ''دیرلکی چالنمق'' کہتے تھے۔ ہر 'تیمار'، جو وارث کے موجود نہ ہونے یا حکمِ طلبی کی عدم تعمیل وغیرہ کی وجہ سے 'محلول' (خالی) ہو کر بحقِ سرکار ضبط ہوتی تھی، 'موقوف' تصور ہوتی تھی [موقوف دوشمک] اور اس کا انتظام ایک افسر کے سپرد ہو جاتا تھا، جسے 'موقوفاتچی' کہتے تھے۔ وہ اس 'تیمار' کے محاصل اس کے دوبارہ عطا ہونے تک وصول کرتا تھا۔

'سپاھی' کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنی جاگیر پر رہے؛ چنانچہ زمینوں کی نگرانی کے لیے عموماً ہر دس آدمیوں میں سے ایک کو گھر پر رہنا پڑتا تھا اور اسے 'قوروجی' یعنی محافظ کہتے تھے۔ جب جنگ طول پکڑتی تو ہر ایک سنجق کے سپاھی اپنے بیس بیس آدمیوں کو وطن بھیجتے تھے، انھیں 'خرج اوقچی' کہتے تھے۔ اُن کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ میدانِ جنگ کے ساتھیوں کو سامانِ رسد (خرجلق) وغیرہ بھیجتے رہیں۔

'رعیّہ' (raya کسان) اسی وقت صاحبِ تیمار بن سکتا تھا جب وہ میدانِ جنگ میں اپنی بہادری کا ثبوت دے اور یہ بات اسی صورت میں ممکن تھی کہ وہ رضاکار بن کر سرحدوں پر جائے (قبّ بیانِ بالا)۔

فوجی جاگیرداری کے نظام کا زوال:

کوریجہ والے (زیادہ صحیح یہ ہے کہ گوملجنہ Gümüldjina والے کہا جائے) قوچی بک (یا قوچی، یا شاید اس سے بہتر ہے 'قوچوبک') کی پیش کردہ یادداشت کے نتیجے کے طور پر ۱۶۳۲ء میں احتیاطی تدابیر اور اصلاحی مساعی عمل میں آئیں اور اس کے بعد ۱۶۵۷ اور ۱۷۷۷ء میں بھی اصلاح کی کوششیں ہوئیں مگر ان کے باوجود یہ جاگیریں نمایاں طور پر زوال پذیر ہوتی چلی گئیں۔

قوچوبک اور عینِ علی افندی ایسے ترک افسروں کے اظہار تأسّف کے علاوہ ہم مغربی مصنّفین کو بھی اکثر اوقات نکتہ چینی کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

قاعدۃً تو زعیم اور صاحبِ تیمار کو جنگ کے لیے لازمی طور پر جانا پڑتا تھا، خواہ وہ اتنا بیمار ہو کہ اُسے ڈولی میں لٹا کر پہنچایا جائے اور اس کے بال بچے بھی اس کے ہمراہ ٹوکریوں میں

لدے ہوے جائیں (تُورنفُور Tournefort)، لیکن حاضری کے بعد ایسا موقع ضرور مل جاتا تھا کہ وہ گھر واپس آ جائیں (Abesci, 88، ص ۱۸) ۔ Grzegorzewski کی کتاب میں ہمیں ایسے احکام ملتے ہیں جن میں ایسے باغی اصحابِ 'تیمار' کو فوج میں حاضر ہونے کا حکم ہے جو اپنی 'چِفتلک' ('چِفت لِک') میں چھپے بیٹھے ہوں (مثلاً دیکھیے دستاویز، عدد ۳۷).

بعض اصحابِ 'تیمار' روپیہ خرچ کر کے (اپنا پیچھا چھڑا سکتے تھے اور یہ دستور، بقولِ فیلیپ دِ فیسْن کانای Philippe du Fesne-Canaye (در *Le Voyage du Lenant en 1573*، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۱۳۷)، بعض وزراء کے لیے ایک اچّھا خاصہ ذریعۂ آمدنی بن گیا تھا.

اسی سیّاح نے ص ۶۰ پر یہ بھی لکھا ہے کہ غیر ملکی سفراء بھی اپنے تحتِ حمایہ لوگوں کے لیے واقعۃً 'تیمار' حاصل کر سکتے تھے ۔ تُورنفُور Tournefort (۲ : ۳۱۹) لکھتا ہے کہ ''وائسرائے اور والیانِ ولایات کو دربار سے ساز باز رکھنے کی وجہ سے ایسے اختیارات حاصل ہیں کہ اپنے علاقے سے باہر کی فوج کی کمان بھی وہ اپنے ایسے ملازموں کو دلا سکتے ہیں جو انہیں سب سے زیادہ روپیہ چڑھائیں''.

بیرن دِ تُوٹ Baron de Tott ہمیں بتاتا ہے کہ خانِ کریمیا ان دس ہزار سپاہیوں کی کارگذاری سے بہت بیزار تھا جو بابِ عالی نے اُسے بھیجے تھے، کیونکہ خانِ موصوف پر یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ ان میں سے بعض در حقیقت عیسائی تھے، جو محض 'تیمار' کے لالچ میں اپنے آپ کو نو مسلم ظاہر کرتے تھے (*Mémoires*، ۱۷۸۰ء، ۱ : ۱۱۲) ۔ دیگر بے قاعدگیوں کی تفصیل دوسوں Mouradjea d'Ohsson : *Tableau de l' Emp. Oth.*، ۷ : ۳۷۵ میں دی ہے.

جب یکِّی چری [الانکشاریۃ] اور رسالوں یا تنخواہ دار سپاہیوں کو سلطان محمود ثانی کے زمانے میں دبا دیا گیا تو اس سے جاگیرداری فوج بھی ٹوٹ گئی ۔ اُن حقوقِ ملکیت کی حفاظت کے لیے جو وہ حاصل کر چکے تھے اس بادشاہ نے ۱۸۳۱ء میں بے دخل شدہ جاگیرداروں میں سے بہترین لوگوں کو چار سوار دستوں میں تقسیم کیا ۔ یہ وہ ڈھانچہ تھا جس سے بعد کے زمانے میں جدید باقاعدہ گھڑ چڑھی فوج بنائی گئی ۔ باقی پرانی جاگیریں بحقِّ سرکار ضبط ہوئیں، ان کے مالکوں کو وظیفے دیے گئے اور اس کی گنجائش میزانیہ میں رکھی گئی ۔ ان وظیفوں کی مجموعی رقم پہلے ایک لاکھ بیس ہزار بدرے یا چھے کروڑ پیاسٹر تھی (بیلاں Belin) مگر ۱۸۵۰ء میں یہ رقم صرف ایک کروڑ پچاس لاکھ رہ گئی ۔ اس میں ایک کروڑ کی وہ رقم شامل نہیں جو کاشتکاروں کو بطورِ ہرجانہ ان اراضیِ خالصہ کے عوضانے میں ادا کی گئی (جو [سلطان] سلیمان کے وزیرِ اعظم رستم پاشا کے وقت سے اجارہ داری پر دی گئی تھیں) ۔ ۲۷ رجب ۱۲۸۰ھ/ ۷ جنوری ۱۸۶۴ء کو ان وظیفوں پر نظر ثانی ہوئی ۔ اس سے ان کی تعداد بعض رسمی ضوابط کی عدمِ تعمیل کی وجہ سے اور بھی کم ہو گئی (Tischendorf).

اب فوجی جاگیروں کا کوئی نظام باقی نہ تھا لیکن سرکار نے 'طاپو' *tapu* کا حق قائم رکھا، جو وہ اُس وقت سے اپنے مفاد کے لیے وصول کرنے لگی اور قانون میں پرانے نظام کی بے شمار باتیں پھر بھی باقی رہیں (قبؑ سطورِ ذیل).

تیمار اور عثمانی قانونِ اراضی : خدمات کے عوض 'سپاہی' کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ جاگیر کی اراضی سے کُلّی یا جزئی طور پر حُقوقِ شرعیّہ (جو شرعی فتوے سے اسے حاصل تھے) وصول کرے؛ اس کے علاوہ وہ رُسوم عُرفیہ وصول کرنے کا بھی حق دار تھا ۔ یہ وہ ٹیکس تھے ''جو

بادشاہ نے عائد کیے'' (یہ بھی ہمیں اس میں بڑھانا چاہیے : ''یا جنھیں رواج نے روا رکھا تھا'')۔ 'سپاھی' کو رعایا پر ''خواہ وہ مسلم کاشتکار ھوں یا عیسائی'' ایک قسم کا اربابی تسلّط حاصل تھا۔ اگر کسان یعنی کاشتکار کو زمین پر محض حقِ ''تصرّف'' (یعنی قبضہ بلا حقِ ملکیّت) حاصل ھوتا تھا تو اس کی موت پر وہ حق صرف اس کے بچوں ھی کی طرف منتقل ھو جایا کرتا تھا ۔ دوسرے تمام ورثاء یا قبضہ لینے والے اسی وقت قبضہ لے سکتے تھے جب اس مقام کے 'سپاھی' کو حقوق (''معجّلہ'') موسومہ 'طاپو' ادا کر دیں؛ اگر کوئی وارث نہ رھے تو زمین نئے وارث کو 'طاپو' کے اصول پر اور ان قواعد کے مطابق جو اس خاص غرض کے لیے وضع کیے گئے ھوں دے دی جاتی تھی (بیلان : *Prop. fonc.*، عدد ۳۰۳)۔

فوجی فرائض کے عوض میں اصحابِ 'تیمار' کو جاگیردارانہ مراعات حاصل تھیں ۔ کاشتکار کے مقابلے میں 'صاحبِ تیمار' زمین کا مالک ('صاحبِ اَرْز' یعنی 'صاحب الارض') ھوتا تھا لیکن یہ حقِ ملکیت نہ صرف فوجی خدمت پر موقوف تھا بلکہ غیر یقینی اور قابل تنسیخ بھی تھا۔

مغربی مصنّف 'رَعیّت' کا لفظ صرف عیسائیوں کے لیے استعمال کرتے ھیں مگر یہ غلط ھے ۔ کسان ('رَعیّت' [جس کی جمع 'رعایا'] واحد کے لیے بھی استعمال ھوتی ھے) مسلم ھو یا عیسائی اس کا تعلّق حکومت کے ساتھ ھوتا تھا اور وہ حکومت ھی کے ساتھ ساتھ چلتا تھا (Belin :.*Fiefs milit*، spec. repr.، خاص طبع مکرّر، ص ۵۰)۔

کسان 'سپاھی' کو مختلف مواجبات ادا کرتا تھا، جو، تا بیک حدّ، کسی علاقے میں کچھ تھے کسی میں کچھ ۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جاتا ھے :-

اِسپِنجہ یا 'پِنجیک' پانچواں حصّہ (بیلان، عدد ۳۲۳؛ Grzegorzewski، ص ۳۳۳)؛ 'بِنّاک' یا 'پِنَک' (Grzegorzewski، ص ۲۲۶، اور دستاویز عدد ۸۴؛ قانون نامہ، طبع ۱۳۲۹ھ، ص ۱۶، تعلیقہ ۲؛ ھامر : *Staatsverfassung* میں : نِیَک)؛ رسمِ چفت (بیلان، عدد ۳۱۸؛ Grzegorzewski، ص ۲۳۶؛ قانون نامہ، ص ۱۶، تعلیقہ ۲)؛ 'مجرّد' ''کنوارے'' (عدد ۳۲۱)؛ عروسانہ ''لڑکی، شادی شدہ عورت'' (عدد ۳۲۹، ۳۵۰)؛ 'دخان' یا 'تُتو تُوزن' ''ایندھن حاصل کرنے کا حق ان لوگوں کے لیے جن کا 'تیمار' سے تعلّق نہ ھو'' یا 'کَپنیتکوس' *kapniatikos* (عدد ۳۲۶، ۳۴۸)؛ 'سالاریّہ' (عدد ۳۴۸؛ قانون نامہ، ص ۱۶، تعلیقہ ۳)؛ آسیاب، یا دیرمن ''پن چکی''؛ 'اَوتْلاق' ''چراگاہ''؛ 'یای لاق' ''موسم گرما کی چراگاہ''؛ 'قشلاق' ''موسم سرما کی چراگاہ''؛ 'جلب کشان' ''بھیڑیں''؛ 'مُردہ پھلری' ''ایسے باز کی نگہ داری کا معاوضہ جو مرنے کے قریب ھو''؛ 'بدایہ' bedaya یا 'بادِ ھوا' ''غیر معمولی ٹیکس''؛ 'قوان' ''شہد کے چھتے''؛ 'کیلہ' ''گندم کے پیمانے'' (عدد ۳۴۵)۔

اس قسم کے ٹیکسوں اور محصولوں کی مفصّل تر فہرست احمد وفیق کی کتاب تکالیف قواعدی میں ملے گی۔

اُن ٹیکسوں میں سے جو اراضی پر عائد ھوتے ھیں سب سے اہم ٹیکس، مغربی مصنّفین کے نزدیک، 'عُشر' ھے ۔ لیکن قدیم عثمانی قانون دانوں کے نزدیک حسبِ ذیل اقسام میں فرق ھے :-

۱ - شرعی لگان یا محصول، جن کی مفصلۂ ذیل قسمیں ھیں :-

۱ - (الف) 'خراجِ موظّف' ''زمین کا مقررہ لگان'' یا زمین کا خراج جو عملی طور پر (یا شاید مصنوعی طور پر اور تشبیہ و تمثیل کے طریق پر) 'چِفت آقچہ سی'

(جیسے 'بیوندروق حقی' یا 'طسمه آقچه سی' بھی کہتے تھے) کی صورت میں عائد ہوتا تھا اور اسپنجہ یا ٹیکس بر رؤس یعنی وہ ٹیکس جو عیسائیوں پر عائد ہوتا تھا (وہ جزیہ ہی تھا جو شریعت نے عائد کیا تھا اور جو مصر میں 'جوالی' یا 'گوالی' کے نام سے مشہور ہے اور بعض اوقات عام لوگ اسے 'خراج' کہتے تھے، اس لیے کہ یہ ٹیکس کاملاً خراج کے معنی پر مشتمل تھا).

(ب) 'خراج مقاسمه' : ''اراضی پر پیداوار کے تناسب سے لگان'' یا پیداوار پر محصول، جس کی مثال 'عشور' ہے، مگر یہ محصول باوجود اپنے نام کے ہر جگہ مختلف تھا اور اس کی شرح آٹھویں حصے سے لے کر نصف تک تھی.

۲ - عرفیہ ٹیکس 'یعنی رواجی قانون کے مطابق ٹیکس' جس کی خصوصی مثال 'جابا بناک' کی تھی - یہ ٹیکس 'رعایا' یعنی شادی شدہ مسلمان' جن کے پاس زمین نہ ہو، ادا کرتے تھے - یہ ٹیکس اکنلو بناک سے بالکل الگ ہے (جو ایک قسم کا ''چفت آقچہ سی'' تھا، جس میں ٹیکس کی شرح تخفیف شدہ تھی) قب *MTM*، ص ۹۹، ۱۰۹، ۱۰ اور ۵۴.

یہ تقسیم جو قدرے استبدادی سی معلوم ہوتی ہے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتی جو اشخاص کی ذات پر عائد کردہ ٹیکسوں میں اور اصحاب ملک پر عائد کردہ ٹیکسوں میں ہے - دیہاتی رقبوں میں ٹیکسوں اور اراضی کے متعلق قب نیز Heidborn: *Les Finances Ottomanes*، وی انا ۱۹۱۲ء، ص ۱۷ ببعد اور ۵ تا ۱۰.

بعض حقوق و عوارض کا جاگیردار (صاحب 'تیمار') اور سوباشی کے درمیان تقسیم ہونا ضروری تھا (بیلان، عدد ۳۴۸).

اس قسم کے تھے وہ قواعد جو ان زمینوں کے متعلق تھے جن پر 'طاپو' عائد ہوتا تھا، کیونکہ یہ ایسی زمینیں تھیں جو کلیۃً 'سپاہیوں' کی ملکیت تھیں اور 'خاصہ' کہلاتی تھیں - چونکہ انھیں قلیج یری (''اراضی شمشیر'') بھی کہا جاتا تھا اور 'طاپو' پر نہیں دی جا سکتی تھیں، اس لیے میری رائے میں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس اشارے سے مقصود 'تیمار' کا ناقابل انتقال حصہ تھا، جسے قلیج (قب سطور بالا) کہتے تھے - اس میں در حقیقت تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اراضی قلیج 'طاپو' ادا کرنے کے بعد بھی ناقابل انتقال تصور ہوتی تھیں۔ اس بارے میں بیلان اور ورمز Worms کی رایوں میں اختلاف ہے اور میں سمجھتا ہوں وہ غلطی سے اراضی 'خاصہ' اور 'خاص' جاگیروں میں مشابہت اور ''مال مقاتلہ'' (محاربوں کی زمینوں) یا ''جنک مالی'' سے ان کا تقابل تجویز کرتے ہیں کہ صرف یہ وہ اراضی تھیں جو فوجی جاگیروں کے نظام کے تحت تھیں، نہ کوئی اور (بیلان، عدد ۳۱۲ تا ۳۱۳).

باوجود ان الزامات کے جو مقبول عام کہانیوں، مثلاً حکایات نصرالدین خوجه، میں 'سپاهی' یا 'آت لی' پر عائد کیے جاتے ہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کسانوں کی عام حالت بری تھی اور بقول لین کلاویوس Leunclavius (Löwenklau) ہنگری کے کسان ایسے بھی تھے جو اس بات پر آمادہ نظر آتے تھے کہ اپنی فصلوں کو آگ لگا کر ترکیہ کو بھاگ جائیں (Thornton) - ژشرو د سانت دنیس Juchereau de St. Denis اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ جاگیر کے مالک کو ''ساکنان جاگیر پر حق سیادت اور ان کے مقدمات میں حق فیصلہ قانوناً حاصل نہ تھا'' - ہم دیکھ چکے ہیں کہ جاگیردار کو بیشمار مالی اختیارات تو حاصل تھے لیکن با این همه 'رعایا' اور 'سپاهی' کے باہمی تعلقات بے حد پیچیدہ تھے - انھوں نے ان قوانین اراضی میں جو مذکورۂ بالا قوانین کا جزء ہیں (دیکھیے عدد ۳، ۴، ۵) بہت جگہ

گھیر رکھی ہے۔ ان میں سے بہت سے قواعد، اس استثناء کے ساتھ کہ ان قوانین میں سرکار نے ''سپاہی'' کی جگہ لے لی ہے، زمانۂ حال کے قانونِ اراضی (''اراضی قانونی'') میں شامل ہو گئے ہیں اور اُن ضوابط کے ساتھ مِل جُل گئے ہیں جو 'ضابطۂ نپولین' (Code Napoléon) سے ماخوذ ہیں ۔ ان قوانین کا متن ترکی دُستور کی جلد اوّل میں اور ان کے فرانسیسی تراجم بیلاں Belin کے *Propr. fonc.* میں اور پاڈل Padel کے جرمن ترجمے طبع برلن، *MSOS* (۱۹۰۱ء) میں موجود ہیں ۔ ''ضابطۂ قوانین اراضی'' کے لیے قب G. Young : *Corps de droit ottoman*، جلد ۶ (۱۹۰۶ء) : ص ۴۴ تا ۱۱۱ - زمانِ قدیم کے ان باقی ماندہ قوانین کی خصوصیات کا واضح ترین آئینہ دار 'تاپو' ہے ۔ اب ہم ''تاپو'' کے متعلق کچھ لغوی تحقیق درج کرتے ہیں ۔

تاپو : عثمانی زبان کا اسم تاپو *tap-u* ، جس کی صورت حروفِ علّت کی ہم آہنگی کے اصول پر 'طاپی' ہے (جیسا کہ باقی طبع Dvořak میں ہے، دیکھیے ص ۱۷۱ نیچے سے دوسری سطر) اور جو قائم مقام ہے قدیم تر کلمۂ لغتِ اوغوز تاپ ۔ وغ *tap-ugh* اور چغتائی تاپ ۔ وق *tap-uk* کا، فعل تاپ ۔ مق *tap-mak* سے مشتق ہے، جو حسبِ ذیل معنوں میں مستعمل ہے : (۱) اطاعت کرنا، خدا کے سامنے اظہارِ فروتنی یا امان مانگ کر کسی فاتح کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا (قب عاشق پاشا زادہ تاریخی، طبع Giese ، ص ۲۲؛ بقول نولڈیکہ : نشری، در *ZDMG*، ۱۸۵۹ء، ص ۲۱۲، 'تاپان ولایت' اسم علم نہیں؛ (۲) پوجا کرنا (کسی معبود کی)؛ (۳) کورنش بجا لانا، قب نیز تپو *tapu* ، وامبیری Vámbéry : *Alt.-Osman. Sprache*، ص ۲۱۹؛ تبو *tabu* ، Codex Comanicus ، ھوتسما Houtsma : *Ein türk.-ar. Glossar* ؛ ۲۱۷. کومانی صیغہ، جس میں دو حرکتوں کے درمیان ایک صدا دار حرف بھی ہے، کرایتی Karaite 'تبو' ۔ 'تَب ءِی' میں ملتا ہے بمعنی شکریہ یا شکرگزاری (T. Kowalski : *Karaimische Texte .... von Troki* ، کراکاؤ Cracow ۱۹۲۹ء) .

بقول کاشغری ''تپغ'' کے معنی : ہیں (۱) خدمت؛ (۲) طاعة (دیکھیے ۱ : ۳۱۱ [دیوان لغة الترك ترجمة سی، ۱ : ۳۷۳]) اور مشتقات کے لیے ۱ : ۱۰۴ [دیوانِ مذکور، ۱ : ۵۹۴]، اس کے علاوہ دیکھیے وهی کتاب، ۱ : ۳۷۶]؛ ۲ : ۱۳۲، سطر ۵ [دیوانِ مذکور، ۲ : ۱۶۸]؛ قب ۳ : ۲۷۸، پایین صفحہ [دیوانِ مذکور، ۳ : ۳۷۶]، ضرب المثل : (تؤین تپغساق، تانگری ساونچ سز) [''انَّ عِلج الکفرۃ متعبّد للّٰه تعالٰی و الله سبحانه و تعالٰی غیر راضٍ عملہ'']‏ یعنی پجاری (priest) تو ہمیشہ خدا کی عبادت کرنے کے لیے مستعد ہے لیکن خدا اس سے قطعاً خوش نہیں [دیگر حوالوں کے لیے دیکھیے دیوان لغة الترك، انڈکس، ص ۵۷۵].

[صاحبِ] برہانِ قاطع فارسی میں اس مستعار کلمے کا استعمال یوں بیان کرتا ہے : ''تابوغ یہ ہے کہ ایک شخص سلاطین کے سامنے سر برہنہ ہو کر جُھکتا ہے اور کان ہاتھ سے پکڑ کر عذرِ تقصیر چاہتا ہے ۔ یہ قاعدہ ماوراءالنہر میں جاری ہے [قب اللغات النّوائیة، ص ۱۹۳؛ نور الابصار (نسخۂ کتاب خانۂ محمّد شفیع لاهوری میں تابوغ بمعنی خدمت ہے، سند میں سلطان بابر کا شعر دیا ہے)، تسلیم و بندگی] ۔ برہانِ قاطع والے معنی کے لیے قب ترکی فعل یُوکُونمک yükün-mek [رسالۂ فضل الله خان، ص ۹۴ میں 'یوکُنمق' ہے بمعنی بہ تسلیم خَم شدن]، جو بدھوں اور فرقۂ مانویّہ کی مذہبی کتابوں کے ان متون میں اکثر آیا ہے جو موٗلّر F. K. W. Müller اور

لیے کوک Von Le Coq اور پل‌لی‌او Pelliot وغیرہ نے شائع کی ھیں ۔ یہ عبارت بطور نمونہ پیش کی جاتی ھے : اُوچ کِز اُوغوز رِسمِنچِه تاپو و خِدمت رِسمِک یِرِنه کِترِدیلر، جس کے معنی یہ ھیں کہ انھوں نے اوغوز کے طریقے کے مطابق تین مرتبہ 'سجدہ کیا' اور کورنش بجا لائے اور ایسا کرنے سے روایتی مراسم تاپو اور آداب بندگی بجا لائے (Houtsma : *Hist. des Seldj. d' Ibn Bibi*، ص ۱۰، س ۹) ۔ اس رسم میں ایک پیالے کی پیشکش بھی شامل تھی، کیونکہ 'تاپو سَغراغی' کی ترکیب کا بھی ذکر آیا ھے، جس کے معنی ''ساغرِ نیاز یا ساغرِ بندگی'' کے ھیں، کما فی کتاب برھانِ قاطع (بذیل سَغرَق، ص ۷۷۴) ۔ [برھان طبع ۱۲۰۱ھ میں یہ ترکیب نہیں ھے وھاں ص ۳۳۴ سَغراق بمعنی کوزۂ لولہ دار دیا ھے مگر تاپو سغراغی نہیں دیا ۔ البتہ پاوہ دِ کورتی نے اللغات النوائیہ میں تابو سغراقی بمعنی ساغر دیا ھے]۔

یہ بات بھی ذھن نشین کر لینے کے قابل ھے کہ بقول دیساسی Silvestre de Sacy عربی لفظ خِدمۃ (service)، جو اوپر مذکور ھے اور (بقول کاشغری) تاپو کے مترادف ھے، بعض اوقات وھی معنی دیتا ھے جو لفظ 'تیمار' کے ترکی زبان میں ھیں (*N.E.*، ۱ : ۲۱۰ تعلیقہ d، قبّ *Bibliothèque des arabisants*، قاھرۃ، ۲ : ۱۱۳، ۱۱۶) [کلمۂ 'خِدْمۃ' کا استعمال جو کاشغری نے کیا ھے اس کے لیے دیکھیے تتمّۂ صوان الحکمۃ، طبع لاھور، ص ۱۱۵، س ۵ اور ڈوزی، ۱ : ۳۵۴، عمودِ اوّل، پایینِ صفحہ]۔

مغولی زبان میں اسی لفظ (جس کا تلفّظ بقول Kowalewski 'تَیِکْ' ھے اور جس سے لازم آتا ھے کہ کلمے کی ترکی صورت تَپِغ *tap-igh* ھوگی) کے معنی ''نذر، قربانی، خدا کی عبادت، خدمت، عبادت اور تعظیم'' کے ھیں ۔

'تیمار' کی اصطلاحوں میں 'تاپو' تملیک ناموں کو بھی کہتے ھیں، جن سے زمین کی خراجی حیثیت کی تصدیق و توثیق ھوتی ھے اور جن کی تجدید بعض حالات میں لازمی ھوتی ھے اور جو حقوقِ فتح کا دوام ثابت کرتے ھیں (بیلاں، عدد ۲۹۸، حاشیہ ۲)۔

مذکورۂ بالا بیان سے ایک شخص یہ گمان کرنے کی طرف مائل ھو سکتا ھے کہ 'تاپو' کے لفظ سے ایک قسم کا اظہارِ بندگی مقصود ھے اور 'آغالق حقّی' یعنی 'حقِّ آقائی یا حقِّ سیادت' کو احمد وَفیق کلمۂ تاپو کے مترادف کے طور پر پیش کرتا ھے مگر یہ مشابہت صرف ظاھری ھے : تاپو کا علاقہ 'رعایا' اور 'سپاھی' کے درمیان تھا نہ کہ 'سپاھی' اور 'سلطان' کے درمیان، اس لیے یہ بالکل حقیقی رشتہ تھا جو زمین کے ساتھ منتقل ھوتا تھا ۔ چونکہ اس حق کے دیتے وقت پیشگی رقم (مُعَجَّلہ) دینا پڑتی تھی اس لیے 'تاپو' کا نام نہ صرف حقِّ ملکیّت کے لیے استعمال ھوتا تھا بلکہ رقم کے لیے بھی اور جب 'تیمار' کی منسوخی پر 'تاپو' کی وصولی سرکار کی طرف ھونے لگی تو 'مأمورو' *me'mūru* یا 'کاتبی' *k'ātibi* اس اھلکار کو ادا ھونے لگی جو 'تاپو' وصول کر کے [خزانۂ دولت] میں جمع کرنے پر مأمور ھوتا تھا (بیلاں، عدد ۸۸ : ۳۳۵ ببعد) ۔ 'تاپو' کا مطالبہ اسی وقت ھو سکتا تھا جب کوئی جاگیر حقیقۃً خالی ھو جاتی تھی ۔ انتقالِ جاگیر کسی وارث کے نام 'تاپو' کی ادائگی کے بغیر مفت ھوا کرتا تھا ۔

ذیل میں ھم چند جملے نقل کیے دیتے ھیں جن میں 'تاپو' کا لفظ استعمال ھوا ھے 'تاپو۔ لا۔ مَق، یا 'تاپو۔یہ وِیر۔مِک' یا 'تاپو۔ ایلہ وِیرمِک' تاپو ادا کرنے پر دینا ('سپاھی' کے متعلق ذکر کرتے ھوے) ۔ قبّ 'تاپو۔ یَہ اَلمَق' تاپو ادا کر کے لینا ('رعایا' کا ذکر کرتے وقت)؛ قبّ تاپو لِینْ ۔ دَنْ اَلمَق، M.S. Suppl. Turc، عدد ۶۸،

ورق ے؛ 'با تاپـو' یا 'تاپـو - ایـلہ' یعنی 'بعوض ادائگی تاپو، ضِدّ 'بلا تاپو یا مجّاناً' یعنی 'مفت' بلا ادائگی تاپـو؛ 'تاپو یہ مُستحق' '(اراضی) جو مستحق اعطاء ہے، یا شاید خالی ہونے کی وجہ سے ادائگی تاپـو کے بعد دوسرے شخص کو دی جانی چاہیے' (جہاں سے 'استحقاقیہ' کی اصطلاح پیدا ہوئی یعنی 'اراضی استحقاقیہ' ۔ لفظ 'اراضی' محذوف ہے، ضدّ 'اعطائیہ')؛ 'تاپو - یو بوزمق'، 'ادائے تاپو کا معاہدہ فسخ کرنا'؛ 'تاپو - سی جایز دِکل' 'تاپـو پر نہیں دی جا سکتی'؛ 'رسم تاپو' 'ٹیکس جو بطور تاپو ادا ہو'؛ 'حقّ تاپو' 'بادای تاپو زمین پر قبضہ رکھنے کا حق'؛ 'تاپوی مِثل' 'متناسب تاپـو کا حق'؛ 'دام تاپوسی' ٹیکس جو 'رعایا' کی کسی نو تعمیر عمارت پر لگایا جائے، *MTM*، ص ۸۳؛ *JA*، جنوری و فروری ۱۸۴۳ء، ص ۸۸؛ ھامـر von Hammer، ۱ : ۳۹۹).

مغربی جاگیروں سے 'تیمار' کا مقابلہ : 'تیمار' معاشرتی ادارہ ہونے کے بجائے زیادہ‌تر ایک انتظامی ادارہ ہے ۔ حکومت نے خود اس کی ابتدا کی اور وہ کبھی 'تیمار' کی راست نگرانی بلکہ اس پر اختیارداری کے حق سے دست بردار نہیں ہوئی ۔ 'تیماریں' صرف موروثی اس لیے ہیں کہ حکومت کو اس میں اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن یہ احتیاط وہ ہمیشہ پیشِ نظر رکھتی ہے کہ جاگیرداروں کا کوئی خاندان ولایتوں میں مستقل طور پر قائم نہ ہونے پائے ۔ چند خرابیوں کے باوجود جاگیر کا لازمی فوجی خدمت کے ساتھ بڑا گہرا تعلّق ہے اور رہے گا، چنانچہ اصحاب 'تیمار' سے اگر فوجی خدمت ادا کرنے میں معمولی سی کوتاہی ہو یا ان میں بغاوت کے آثار نظر آنے لگیں تو جاگیر ضبط کر لی جاتی ہے ۔ اس کا قبضہ اتنا غیریقینی ہے کہ بعض فوجی مہمّوں میں ایک ایک جاگیر آٹھ آٹھ مرتبہ حکومت کی طرف واپس ہوئی ہے (Thornton) ۔ اس قسم کی جاگیر کو وہ اجتماعی اہمّیت حاصل نہیں جو مغرب میں تھی ۔ نہ تو صاحبِ 'تیمار' اس جاگیر کی طرف منسوب ہوتا ہے اور نہ کوئی خاص درجۂ شرف 'تیمار' کی وجہ سے اسے حاصل ہوتا ہے، بلکہ تیمار کی صورت میں تو اس قسم کا قدرے غیرمتوقع رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ 'رعایا' 'رعایا' ہی رہے اور اسے 'تیمار' بھی عطا ہو جائے ۔ 'رعایا' کو اپنی حیثیت چھوڑنے کی اجازت نہ تھی، کیونکہ عطائے جاگیر کے وقت اس کی برات (سند) میں خصوصیت کے ساتھ یہ ذکر کر دیا جاتا تھا کہ 'تیمار' اسے ''یولداشلِق'' (اسلحہ پوش رفیقِ حرّ) کی حیثیت سے خدماتِ خوب ادا کرنے کے صلے میں بطورِ انعـام عـطا کی جاتی ہے (*Milli tet. m.*، ص ۳۱۱) ۔ جاگیر کے ساتھ تعلّق صرف ان جاگیروں کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے جن کا صرف ایک ناقابلِ تنقیص حصّہ قابض کو اس شرط پر دیا جاتا تھا کہ وہ فوجی خدمت ادا کرے گا؛ گـویا یـہ انعام کئی چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور انہیں باقاعدہ اضافوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جس طرح سرکاری افسروں کو باقاعدہ ترقّیاں ملتی ہیں ۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ اتنے آقچہ کی 'تیمار' ہے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ ''تیمار کے اتنے آقچوں سے'' (شو قدر آقچہ تیمار)۔ بڑے بڑے اصحابِ 'تیمار' ساتھ ساتھ عہدہ دارانِ حکومت بھی ہوتے ہیں، اور اگر حکومت اُن سے ڈرتی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بڑے جاگیردار اور امیر ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بڑی بڑی ولایتوں کے حاکم ہیں .

ان میں کوئی باجگـزار امیر نہیں ہوتا ۔ ہر جاگیـردار کو اس کی جاگیر براہِ راست سلطان عطا کرتا ہے (اُن بہت چھوٹے جاگیـرداروں کے سوا جنھیں بیکلر بیکی جاگیر عطا کرتا ہے) ۔ وہ اپنے سے زیـادہ طاقتـور جاگیـرداروں کے تحت نہیں

ھوتا، اس حالت کے سوا جب جنگی خدمت کے لیے اُسے بلایا جائے ۔ 'رعایا' پر اسے چند مالی حقوق ھی حاصل ھیں، جیسا کہ ھم ذکر کر چکے ھیں، جن میں سے بعض آرد سازی (milling) وغیرہ کے حقوق کی یاد دلاتے ھیں؛ قبّ مثلاً منگنی کا نذرانہ (عَروسانہ یا گِردِک) ۔ مادام لوئیز سان بیللوک Madame Louise Saint Belloc لکھتی ھے کہ یہ بات تسلیم کر لینا غیر معقول نہ ھوگا کہ نپولین نے اعطاء اراضی کا دستور ترکوں سے مستعار لیا۔

مآخذ: بیلاںْ Belin فرانسیسی سفارت‌خانۂ قسطنطنیۃ کا سیکرٹری (کاتب السِرّ) ھی اب تک وہ واحد شخص ھے جس نے ترکیہ کے نظامِ تیمار کے مضمون کا سیرحاصل مطالعہ کیا ھے ۔ اس مخصوص موضوع پرھم اُس کے تصنیف کردہ ذیل کے دو مفرد رسالوں کے مرھونِ منّت ھیں، (۱) *Étude sur la propriété foncière en pays musulman, et spécialement en Turquie (Rite hanéfite)*، JA، پیرس ۱۸۶۲ء سے بطبعِ مکرّر شائع ھوا؛ (۲) *Du régime des fiefs militaires dans l'islamisme, et principalement en Turquie*، JA، پیرس ۱۸۷۰ء سے بطبعِ مکرّر شائع ھوا (یہ خاص کر عینِ علی سے ماخوذ ھے، جس کے متن کا ترجمہ کیا گیا ھے)۔ (۳) ورمز Worms کی تصنیف کا بھی ذکر کرنا چاھیے: *Recherches sur la constitution de la propriété territoriale dans les pays musulmans et subsidiairement en Algérie*، در JA، ۱۸۴۲، ۱۸۴۳ اور ۱۸۴۴ء؛ (۴) Paul Andreas von Tischendorf کے مطالعات (جو *Das Lehnswesen in den moslemischen Staaten insbesondere im osmanischen Reiche*، لیپزگ ۱۸۷۲ء، ۱۲۹ صفحات، قطع نیم و زیری (8°)) میں درج ھیں؛ یہ صرف بیلاںْ کی تصانیف کا ترجمہ ھے، جس میں تھوڑا سا اضافہ بھی کیا گیا ھے؛ (۵) Truhelka کی اھمّ تصنیف: *Historička podloga agrarnog pitanja u Bosni*، جو *Glasnik Zemaljskog Muzeja u Bosni i Hercegovini*، جلد ۲۷ (۱۹۱۵ء): ص ۱۲۵ ببعد میں شائع ھوئی، ھمیں دستیاب نہیں ھو سکی ۔ اس کا جرمن ترجمہ سَراجیوو میں ۱۹۱۱ء میں شائع ھوا تھا اور اس کا نام *Die Geschichtliche Grundlage der bosnischen Agrarfrage* تھا ۔ زیادہ تفصیل کے لیے قبّ (۶) Dmitriev، در *Zapiski Kollegii Vostokovedov*، ج ۱، (۱۹۲۶ء): ص ۱۰۴ .

جن تصانیف کے اب ھم پورے نام درج کریں گے اور چند دوسری تصانیف کے بھی، جو اتنی اھمّ نہیں، ان کے اقتباسات اس مادّے کے متن میں آئے ھیں:

(۷) Joseph von Hammer (Purgstall): *Des osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*، وی انّا ۱۸۱۵ء، ۱: ۳۳۷ تا ۳۴۴ (باب ششم: *Das Lehenrecht, Kanuni timar*)؛ (۸) Pitton de Tournefort: *Relation d'un Voyage du Levant*، لی اوں Lyon ۱۷۱۷ء، ۳ جلدیں؛ (۹) Comte de Marsigli: *L'Etat militaire de l' Empire ottoman, ses progrès et sa décadence*، ھیگ و ایمسٹرڈیم ۱۷۳۲ء، قطعِ کبیر (اطالوی و فرانسیسی)؛ (۱۰) Elias Abesci: *L'Etat actuel de l' Empire ottoman*، انگریزی ترجمہ از Fontanelle، پیرس ۱۷۹۲ء، ۲ جلدیں؛ (۱۱) A. de Juchereau de Saint-Denis: *Révolutions de Constantinople en 1807 et 1808*؛ (۱۲) Th. Thornton; *Etat actuel de la Turquie*، انگریزی ترجمہ، پیرس ۱۸۱۲ء، ۲ جلدیں؛ (۱۳) J. Grzegorzewski: *Z sidzyllatow rumelijskich epoki wyprawy wiedenskiej*، Lwow ۱۹۱۲ء، ۱۴۴ صفحات ترکی متن اور ۲۶۴ صفحات لَہِسْتانی (Polish) متن (*Recueil de documents turcs des archives de Sofia, retatifs à l'expédition contre Vienne*)؛ (۱۴) W. Padel and L. Steeg: *De la législation ottomane*،

پیرس ۱۹۰۳ء۔

قانون نامہ : ان ضابطوں کی مرتّب و مدوّن فہرست (bibliography) ابھی تیار نہیں ہوئی ۔ یہاں ہم صرف ضروری ضروری قوانین ہی کا ذکر کریں گے اور وہ قوانین چھوڑ دیں گے جو فوجی جاگیروں سے متعلق نہیں اور ایسے قوانین زیادہ ہیں بھی نہیں.

محمّد ثانی کے قانون نامہ کے علاوہ، جس کا ذکر آ چکا ہے، اور ضابطے یہ ہیں :-

۱ - ضابطۂ سلیمان، شائع کردہ TOEM، بطورِ ضمیمہ بعنوانِ قانون نامۂ آلِ عثمان (صفحات ۷۲، ۱۳۲۹ھ) ۔ ناشر محمّد عارف اسے سیّدی بک سے منسوب کرتا ہے، حالانکہ ایک نسخہ عاشر افندی کے کتب خانے میں موجود ہے جس میں اس کے مصنّف کا نام 'نشانجی' جلال زادہ مصطفی دیا ہے (اور فان ہامر von Hammer نے بھی *Hist. de l'Empire Ottoman*، فرانسیسی ترجمہ، ۶ : ۲۴۷ میں یہی کہا ہے مگر ناموں کی ترتیب پلٹ دی ہے) ۔ قبّ نیز .Bibl. Nat، پیرس، MS. Suppl. Turc، عدد ۸۰، نیز Anc. fonds Turc، عدد ۳۵، ۱°؛ Suppl. Turc، عدد ۹۷، ۲°؛ مؤخّر الذّکر کی ابتداء بھی انھیں کلمات سے معلوم ہوتی ہے جو فان ہامر : *Staatsverfassung*، ج ۱ : ص xxi، بذیلِ عدد vi کے ذکر کردہ مخطوطے کی ہے؛ لیکن حاجی خلیفہ کا متن، جس کا وہ حوالہ دیتا ہے، اصل میں کانی چیزوں کے استخراج کے قوانین سے متعلق ہے.

۲ - قانونِ سابق کی ایک اور روایت (متأخّرہ؟) (وی انّا، عدد ۱۷۹۹، ۱°؛ .Bibl. Nat، پیرس، Suppl. Turc، عدد ۸۱) ہے ۔ اس کے اور سابق الذّکر روایت کے متن کا مقابلہ فان ہامر کے جرمن ترجمے کے ساتھ، جس کا نام *Straf- und Polizeygesetze* (*Staatsverfassung Suleymans* ۱ : ۱۴۳ تا ۱۶۲) ہے، کرنا چاہیے، جو اس کے قول کے مطابق (ج ۱ : ص xix) عینِ علی افندی کے ضابطۂ قوانین کا ایک حصّہ ہے، جس کا ذکر ذیل میں (عدد ۶ کے تحت) آئے گا.

۳ - اسی سلطان کا ضابطہ یا قانون، جسے عام طور پر 'جدید' کہتے ہیں (اگرچہ سابق الذّکر دو قانونوں کو بھی بعض اوقات 'جدید' کہہ دیتے ہیں)، اگر فان ہامر کی قدرے الجھی ہوئی تشریحیں (.*Hist*، ۶ : ۲۴۷ اور ۲۶۷ اور *Staatsverfassung*، ۱ : ۳۷۵ تا ۳۷۶) درست ہیں تو یہ ضابطہ، جو صرف اراضی کے متعلّق قوانین پر مشتمل ہے، عبدی اوغلو محمد چلبی نے سلطان سلیمان کے جانشین (سلیم ثانی) کے عہد کے ابتدائی سالوں میں تألیف کیا تھا ۔ اس میں مشہور و معروف شیخ الاسلام ابوالسّعود اور کمال پاشا زادہ کے 'فتاوی' کی ایک بڑی تعداد موجود ہے ۔ اس قلمی کتاب کا اصل نسخہ، جس پر تاریخ بھی ہو، دریافت کرنا سودمند ہوگا ۔ یوں اس کے بہت سے قلمی نسخے موجود ہیں، مگر وہ کم و بیش بعد کے زمانے کے نقل کیے ہوئے ہیں، (ریو Add. 7840, iii ۱۰۱۳ھ کے ایک نسخے کا ذکر کرتا ہے، لیکن بعض تیرھویں صدی هجری تک کے نسخے بھی ملتے ہیں) ۔ دیباچہ، جس میں سلطان سلیمانِ قانونی کے حکم سے ضابطے کے نفاذ کا ذکر ہے، سارے نسخوں میں ایک جیسا ہے لیکن متأخّر نسخوں میں متأخّر شیوخ الاسلام کے فتاوے کی بھرمار کر دی گئی ہے، جن کے نام یہ ہیں : (اخی زادہ) حُسین (م ۱۰۴۳ھ)؛ (زکریّا زادہ) یحیٰی (م ۱۰۵۳ھ)؛ محمد بہائی (م صفر ۱۰۶۴ھ) اور ان کے علاوہ پیر محمد (قبّ سطورِ ذیل)؛ عبدالعزیز؛ محمد سعداللہ؛ ثناء اللہ؛ شیخ محمد؛ الحاجّ محمد عبداللہ مصطفی اور محمد بروسوی ۔ یہ فتاوٰی قانون کے ساتھ مخلوط ہیں، جو ''در زمانِ'' نشانجی ہای سابق تر مثلاً (تاجی بک زادہ) جعفر چلبی (م ۹۲۱ھ)، جلال زادہ (سابق الذّکر)،

یا نسبۃً قدیم لوگوں مثلاً حمزہ پاشا (م ۱۰۸۰ھ)، معلّم زادہ لام علی افندی وغیرہ کے زمانے میں مرتّب ہوے - جن قوانین پر تاریخ نفاذ دی ہوئی ہے اُن میں سے زیادہ تر بارھویں صدی ھجری کے نصف اوّل کے ہیں - ان میں سے آخری ۱۱۲۹ھ میں نافذ ہوا؛ اس کے متن کا جزوی جرمن ترجمہ فان ہامر (کتابِ مذکور) میں دیا ہوا ہے.

یہ قانون ملّی تدقیقلر مجموعۂ سی کے عدد ۱ و ۲ میں شائع ہوا تھا - اس کے قلمی نسخے پیرس Suppl. Turc، عدد ۱۷ اور ۸۷، وی انّا، عدد ۱۸۱۶، ۱۸۱۷، ۱۸۲۲، ۲° میں اور دوسری جگہ موجود ہیں (قبّ ان کی فرد در فہرست نامۂ ریو Rieu، عدد Add. 7834).

۴ - قانون یا رسالہ از شیخ الاسلام اُوسکُوبی پیر محمد افندی بن حسن جو معین المُفتی کا مصنّف بھی ہے - یہ بھی سابق قانون کی طرح زیادہ تر ابوالسّعود کے فتاوے پر مبنی ہے - اس کا قلمی نسخہ پیرس کے مخطوطات Suppl. Turc میں عدد ۶۸ پر اور کتاب کا ایک نا تمام حصّہ وی انّا کے عدد ۱۸۰۴، ۴° میں موجود ہے.

۵ - قانون لِواءِ بوسنہ، جو سلطان سلیمان کے حکم سے مصطفٰی بن احمد کاتب الدفاتر الخاقانی نے سلخ جمادی الاولٰی ۹۷۳ھ/وسط دسمبر ۱۵۶۵ء میں زیرِ ہدایت 'زعیم' بشارت تیّار کیا - اس کا قلمی نسخہ وی انّا میں عدد ۱۸۰۴، ۶° پر ہے - اسی کتاب کا ایک اَور قلمی نسخہ بیلاں Belin نے (Propr. fonc.، عدد ۲۹۸، حاشیہ ۲، عدد ۳۱۵ ببعد) استعمال کیا تھا - یہ متن چند دوسرے متون کے ساتھ ترُوہِلکہ Truhelka نے سراجیوو کے Glasnite, xxviii میں شائع کیا تھا - مزید تفاصیل کے لیے قبّ Dimitrew، محلِ مذکور، ص ۱۰۵.

۶ - قانون معروف بہ قانونِ احمدِ اول، دفترِ امینی مؤذن زادہ عین علی نے ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں قوانین آلِ عثمان در خلاصۂ مضامین دفترِ دیوان کے عنوان سے مرتّب کیا - یکم ربیع الاوّل ۱۲۸۰ھ / اگست و ستمبر [۱۸۶۳ء] میں اسے احمد وفیق پاشا مندوب (کمشنر) سلطانی در ایشاے کوچک نے شائع کیا تھا - اس کے قلمی نسخے وی انّا (۴ جلدیں)، لیپزگ، ڈریسڈن اور پیرس (نامکمل) میں ہیں - اس کا ترجمہ بیلاں نے فرانسیسی میں اور تشندورف Tischendorf نے جرمن زبان میں کیا (قبّ مآخذ در سطورِ ذیل - ان قوانین میں سے صرف یہی ایک قانون ہے جس کا منظّم طور پر مطالعہ ہو سکا ہے - ہامر (*Staatsverfassung*، ۱ : xvii تا xx) نے ایک تصنیف کا تجزیہ کیا ہے، جس کا یہ قانون صرف پہلا حصّہ معلوم ہوتا ہے - بظاہر اولیاء چلبی نے اس سارے قانون کا نہیں تو کم از کم اُس کے ایک حصّے کا استعمال مختلف ولایتوں اور سلطنت کی تمام فوجی جاگیروں کے اعداد و شمار کے متعلّق معلومات مہیّا کرنے کے لیے کیا ہے (۱ : ۱۷۳ تا ۲۰۶).

۷ - نصیحت نامہ [معنی نام سے ظاہر ہیں] سلطان ابراہیم اوّل (۱۶۴۰ تا ۱۶۴۸ء) کے ایک وزیر نے اپنے سلطان کی خاطر لکھا - اس کا ترجمہ جرمن زبان میں بہرنوار Behrnauer نے *ZDMG*، ۱۸ : ۶۹۹ ببعد میں کیا، اس سے پہلے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا گیا تھا، جس کا نام یہ ہے : ***Canon de Sultan Sulaïman II représenté à Sultan Mourad IV pour son instruction ou état politique et militaire tiré des Archives les plus secrètes des Princes Ottomans et qui servent pour bien gouverner leur Empire. Traduit du turc par*** *M.P.**** (Pétis de La Croix)، پیرس ۱۷۲۵ء، اقتباسات در ہامر Hammer : *Geschichte*، ۵ : ۶۸۳ تا ۶۸۷؛ مخطوطات وی انّا میں ہیں، اعداد ۱۸۲۳ تا ۱۸۳۰.

۸ - تلخیص البیان فی قوانین آلِ عثمان، جو محمد رابع کے عہد (۱۶۴۸ تا ۱۶۸۷ء) میں لکھی گئی - اس کا مصنف حُسین افندی [ہزار فن] ھے - قب فہرستِ ابواب در فان ھامر (-Staats *verfassung*، ص xx تا xxi)؛ خطی نسخہ در پیرس Anc. fonds Turc، عدد ۴۰ .

۹ - حاجّی خلیفہ کی تصنیف زیرِ عنوان دستور (دُستور) العمل، قب بہرناور Behrnauer، در *ZDMG*، ۱۱ : ۱۱۱ تا ۱۳۲.

۱۰ - فوجی جاگیروں کے قواعدِ اساسی، جو [۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء] میں عبدالحمید [اوّل] نے نافذ کیے (منقول در جودت: تاریخ، ۱: ۱۸۴ تا ۱۹۲).

دوسرے قوانین کے من جملہ ہم پیرس کے کتب خانۂ مِلّی (Bibl. Nat. de Paris) کے مخطوطات ذیل کا ذکر کرتے ہیں : Anc. fonds Turc، عدد ۴۱، Suppl. Turc، عدد ۱۷۹°، (قانون جو ۱۰۱۷ھ میں پیش ہوا) اور وی اِنّا، شمارہ ۱۸۰۴، ۴° (قانون جو ۱۰۳۸ھ میں پیش ہوا)، عدد ۱۸۲۲، ۳°، وغیرہ - مختلف کتب خانوں کی فہرستوں کی چھان بین کرنے سے اس فہرست میں اضافہ ہو سکتا ھے - جہاں تک فوجی جاگیروں کے متعلّق امور کا واسطہ ھے مارسِگلی Marsigli کی تصنیف (قب مذکورۂ بالا) ایک ایسے ہی قانون سے مرتّب ہوئی ھے .

ان قوانین پر احمد رفیق بک نے *TOEM*، بابت سال چہاردھم، ص ۳۱۹ تا ۳۲۰ میں ایک اہمّ تعلیقہ لکھا ھے (جو مجھے اس وقت دستیاب نہیں ہو سکا)؛ قب نیز مقالۂ براکلمان در *Isl.*، ۸ : ۲۶۱ تا ۲۶۷ (*Der Göttinger cod. turc. 25.—Ein Beitrag zur Quellenkritik des Qânûnnâmes*) - ہر ولایت کے لیے الگ الگ قانون نامے بھی تھے - وہ ان ولایتوں کے "دفترِ مُفَصّل" کی پشت پر یا اس کے سرِ صفحہ پر درج ہوتے تھے (قب *MTM*، عدد ۱، ص ۱۰۹ - لِواھاے سِزِگِدِن Szegedin، ھتون Hatvan اور نووی گراڈ Novigrad کا قانون اسی قسم کا تھا، مخطوطہ در کتاب خانۂ مِلّی پیرس (Bibl. Nat. Paris)، Suppl. Turc، عدد ۷۶ .

وہ قانون نامے جو اس وقت تک محفوظ ہیں اُن میں سے اکثر اپنے اصلی نقائص کے علاوہ، جو بسا اوقات خاصے اہمّ ہیں، اغلاط و ابہام سے پر ہیں، جس کا باعث نقل نویسوں کی لاپروائی ھے - انہیں مجموعہ ھای منشآت یا مکاتیبِ انموذجی بالخصوص اصلی دستاویزات، فرمانوں اور براتوں وغیرہ سے مقابلہ کر کے درست کرنا چاہیے؛ مثلاً وہ جو مکتبۂ مِلّی پیرس کے ملحقِ ترکی کے عدد ۸۲۳ اور وی اِنّا کے عدد ۱۸۰۲ میں محفوظ ہیں؛ قب نیز مجموعہ Grzegorzewski - مینِنسکی Meninski نے خود تین (قوانین) کے نمونے اپنی کتاب *Institutiones linguae turcicae*، وی اِنّا ۱۷۵۶ء، ۲ : ۱۷۳ تا ۱۷۵ میں دیے ہیں - قسطنطنیۃ کے 'دفترِ خاقانی' کے کثیر محفوظاتِ محافظ خانہ (archives) کا مطالعہ یقینی طور پر بے حد سودمند ہوگا.

(J. Deny دِینی)

* تَیَمُّم (ع) [لغوی معنوں میں = قصد کرنا اور اصطلاح میں = بنیّتِ عبادت بجای وضو خاک کو ہاتھوں اور منہ پر ملنا] - بعض حالتوں میں پانی کی جگہ مٹی سے تطہّر کی اباحت کا ذکر قرآن مجید [طبع امیریہ] کی سورۃ ۴ [النساء] : ۴۳ اور سورۃ ۵ : [المائدہ] ۶ میں آیا ھے - آیۃ ۶ کا ترجمہ یہ ھے : "مسلمانو، جب نماز کے لیے آمادہ ہو تو اپنے منہ دھو لیا کرو اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں (بھی دھو لیا کرو) اور اگر تم کو

نہانے کی حاجت ہو تو غسل کر کے اچھی طرح پاک صاف ہو جاؤ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جاے ضرور سے (ہو کر) آیا ہو یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو اور تم کو پانی میسّر نہ ہو تو ستھری مٹی لے کر اس سے تیمّم یعنی اپنے منہوں اور ہاتھوں کا مسح کر لو، اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی کرنی نہیں چاہتا بلکہ تم کو صاف ستھرا رکھنا چاہتا ہے اور (نیز) یہ (چاہتا ہے) کہ تم پر اپنا احسان پورا کرے تا کہ تم (اس کا) شکر کرو'' ۔ سورۃ ۴ [النساء] : ۴۳ میں زیادہ مختصر ذکر ہے لیکن وہاں بھی یہ قانون تقریباً انھیں الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اس کے سوا کہ ''اس سے اپنے منہوں اور ہاتھوں کا مسح کر لو'' والے جملے میں لفظ ''مِنْہُ'' (یعنی ''اُس سے'') حذف کر دیا گیا ہے ۔ شافعیوں کے نزدیک (دیکھیے ۴ [النساء] : ۴۳ پر بیضاوی) ''اُس سے'' کے معنے یہ ہیں کہ ہاتھ میں کچھ مٹی ضرور ہو؛ اس کے بر عکس احناف کے نزدیک اگر کسی صاف پتھر سے ہاتھ کو چھو ہی لیا جائے تو تیمّم درست ہو جاتا ہے ۔

اس مسئلے کے متعلّق شعرانی نے اپنی کتاب المیزان الکبرٰی (قاہرۃ ۱۲۷۹ھ، ۱ : ۱۳۳ ببعد) میں بیان کیا ہے کہ تیمّم سے متعلّق چودہ مسئلے ہیں جن میں مذاہب کا اختلاف ہے : (الف) مسئلہ : مادّہ جس سے تیمّم جائز ہے (مٹی، ریت وغیرہ)؛ (ب) مسئلہ : تیمّم سے پہلے پانی کی تلاش کا وجوب؛ (ج) مسئلہ : ہاتھوں اور منہ کا مسح کس حد تک کیا جائے اور یہ عملِ مسح کن احکامِ شرعیّہ میں داخل ہے؟ (د) مسئلہ : نماز شروع کر چکنے کے بعد اگر پانی میسّر آ جائے تو تیمّم کرنے والے کو کیا کرنا چاہیے؟ (ہ) مسئلہ : آیا ایک ہی تیمّم سے دو فرض نمازیں ادا ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ (و) مسئلہ : آیا متیمم یعنی تیمّم کرنے والا دوسرے نمازیوں کی جنھوں نے وضو کیا ہو امامت کر سکتا ہے؟ (ز) مسئلہ : آیا حضر میں عیدین اور جنازے کی نماز کے لیے تیمّم ہو سکتا ہے؟ (ح) مسئلہ : اگر حَضَر میں نماز کا مقرّرہ وقت ختم ہونے کے قریب ہو اور پانی کے میسّر آنے میں اشکال ہونے کی وجہ سے کوئی شخص تیمّم سے نماز ادا کر لے تو کیا اس کے بعد پانی کے ملنے پر اُسی وقت اعادۂ نماز ضروری ہوگا؟ (ط) مسئلہ : آیا جائز ہے کہ اگر پانی تھوڑا ہو تو مکلّف اس کے ساتھ جزوی وضو کر لے اور باقی اعضاء پر تیمّم، [یا تھوڑے پانی کا استعمال واجب نہیں، اُسے چھوڑے اور تیمّم کرے]؟ (ی) مسئلہ : جس شخص کے کسی عضو میں زخم آ جائے [یا اُس کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا کسی عضو پر پھوڑے پھنسی نکل آئیں] تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟ (ك) مسئلہ : چار مختلف صورتوں میں جن میں تیمّم سے نماز ادا کی جا چکی ہو نماز دوبارہ ادا کرنی چاہیے یا نہیں.

اس بات پر مذاہب کا اتّفاق ہے کہ تیمّم صرف ہاتھ اور منہ ہی کا ہونا چاہیے خواہ چھوٹے یا بڑے حَدَث [رَكَ بآن] کے بعد ہو یا بدن کے اعضاء کے کلّی یا جزوی طریق سے دھونے کے عوض میں ہو (النووی علی صحیح مسلم، قاہرۃ ۱۲۸۳ھ، ۱ : ۳۰۶).

مختلف احادیث سے یہ ظاہر ہے کہ عبداللہ[رضا] بن مسعود اور [حضرت] عمر[رضا] کو غسلِ جنابت کے عوض تیمّم سے نماز کے جواز میں شک تھا (قبّ مثلاً بخاری 'تیمّم' باب ۷؛ مسلم 'حیض' حدیث ۱۱۰)؛ اس کے برعکس متورّع اور متّقی ابوذر[رضا] (الغفاری) [کو بھی اسی قسم کے شبہات تھے مگر ان سے روایت ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم نے یہ فرما کر ان شکوک کو رفع فرما

دیا تھا کہ جب پانی دستیاب نہ ہو سکے تو صاف ستھری [مٹی] طہارت کا ایک ذریعہ ہے، خواہ کسی کو پانی دس برس تک تلاش کرنا پڑے]، (احمد بن حنبل : مسند، ٥ : ١٣٦ ببعد)۔

کہتے ہیں کہ یہ اجازت اس وقت نازل ہوئی تھی جب ایک مہم کے موقع پر [حضرت] عائشة[رضا] کا ہار تلاش کرنے میں لوگوں کو اتنی دیر لگ گئی کہ پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔

تالمود (بِرکُوت *Berakot*، ورق ١٥ الف) میں پانی نہ ملنے کی وجہ سے ریت کے استعمال کا ذکر ہے، جیسا کہ قرآن [مجید] میں ہے اور Cedrenus: *Annales*، طبع Hylander' بال Basle ١٥٦٦ء، ص ٢٠٦ میں لکھتا ہے کہ صحرا کے ایک سفر کے دوران میں ایک دفعہ مسیحی اصطباغ کا فریضہ ریت کے استعمال سے ادا کیا گیا تھا۔

مآخذ: (١) قب نیز تفاسیر قرآن، سورۃ ٤ (النساء) : ٤٦ اور ٥ [المائدۃ] : ٩؛ (٢) Nöldeke—Schwally : *Geschichte des Korāns*، ١ : ١٩٩؛ (٣) A. Gieger : *Was hat Moh. aus dem judenthume aufgenommen?*، ص ٨٦؛ (٤) جوئنبول Th. W. Juynboll : *Handleiding*, etc.، لائڈن ١٩٢٥ء، ص ٥٨؛ (٥) A. J. Wensinck : *A Handbook of Early Muhammaden Tradition*، بذیل مادّۂ Tayammum.

(ونسنک A. J. Wensinck)

تیمور : (Tamerlane) (مقالۂ اوّل)، فاتح ایشیا، جو ماوراء النہر کے خطّۂ کَش [''ظاہرِ خطّۂ دلکشِ کش''، (یزدی)] کے نزدیک ٢٥ شعبان سالِ موش [سچقان ییل] ٧٣٦ھ / ٨ اپریل ١٣٣٦ء کو پیدا ہوا۔ وہ امیر تاراغای (یا تُرغای) [مطلع (١ : ١٨ ب) : طرغای] کا بیٹا تھا، جو تَکینَہ خاتون کے بطن سے پیدا ہوا۔ امیر تاراغای حاجی بَرلاس سے پہلے کَش اور اس کے ملحقہ علاقے کا حاکم تھا۔ [اُس کا اور] اس کے خاندان کا یہ دعوٰی تھا کہ وہ چنگز خان کی اولاد سے ہیں [دیکھیے فریدون بک : منشآت، ١ : ١٢٥)، (تیمور لکھتا ہے : ''ما خود از دودمانِ ایلخانیہ باشیم''، نیز دیکھیے نظامی شامی، ١ : ٢٢١، س ٢٣)؛ بارٹولڈ : *Turkestan*، ١٩٢٨ء، ص ٥٣؛ وامبیری Vámbéry : *History of Bokhara*، طبع دوم، لنڈن ١٨٧٣ء، ص ١٦٣، ح ٢؛ مگر اس کے برعکس دیکھیے احمد زکی وَلیدی طوغان : ''تحقیق نسب امیر تیمور'' در ارمغان علمی، لاہور ١٩٥٥ء، ص ١٠٥ ببعد اور انھیں کا مقالہ جو اس مقالے کے متّصل بعد آتا ہے۔ بقول صاحبِ مطلع (محلّ مذکور) تیمور کا پدرِ ہشتم، قجولای نویان، جو اصلِ قبیلۂ بَرلاس تھا، چِنگز خان کے پدرِ چہارم کا بھائی تھا] ۔ تیمور کے مزار پر [عربی زبان میں] کتبہ درج ہے، جس میں شجرۂ نسب [یوں دیا] ہے : تُومنای خان، قَچُولای، اِیرذُمچِی بارُولا [مطلع : ایردمجی نویان]، [زیادت در مطلع : سُوغُو چِیچَن]، قَراچار نُویان، [زیادت در مطلع : اِیچِل]، اِیلنگیر [بالراء، امّا بالزاء در مقالۂ طوغان در ارمغان علمی، ص ١٠٥ و مقالۂ آتیہ]، بُرکُل، تَرغای، تیمور۔ [مطلع اور ارمغان علمی میں بعض ناموں کے ہجے قدرے مختلف ہیں اور تیمور اور تومنای کے درمیان دو مزید نام بھی ہیں، دیکھیے سطورِ بالا ۔ بَلوشہ Blochet نے *Introduction a l' histoire des Mongols*، لنڈن ١٩١٠ء، ص ٦٠ ببعد، ح ١ میں یہ کتبہ نقل کیا ہے، سطور بالا میں ناموں کے ہجے اس کے مطابق لکھے گئے ہیں] ۔ تیمور کا غالی ہجوگو ابن عربشاہ [ص ٥ میں] لکھتا ہے کہ تیمور ایک گڈریے کا بیٹا تھا، جس کا گذارا ابتدائی زندگی میں لوٹ مار پر تھا [مگر اس کے متّصل بعد کہتا ہے (دیکھیے وھی کتاب، ص ح) کہ صحیح تر [یہ ہے کہ اس کا باپ سلطان کے ارکانِ

دولت میں سے تھا] اور 'لنگ' کا لقب اسے ایک زخم کی وجہ سے ملا جو بھیڑوں کی چوری کرتے وقت اسے آیا تھا [ابن عربشاہ، ص ۵ = ۵، قب ابن خلدون کا بیانِ تیمور کی زبانی؛ فشل، ص ۴۷] - تیمور کو [گورگان] بھی کہتے تھے، یعنی ''خاقان کا داماد'' نیز ''امیر''، ''الامیر الکبیر'' اور ''صاحب قِران'' - ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء میں اس نے قطعی طور پر سلطان کا لقب اختیار کر لیا، اس کی موت کے بعد اسے ''جنّت مکان'' کہتے تھے۔

ابھی وہ کم عمر ہی تھا کہ ذہانت، پیش بینی اور شجاعت کی وجہ سے مشہور ہوا - اوّل اوّل مقامی حکمران امیر قازغان کی ملازمت میں وہ [توغلوق] تیمور خان کے حملے کی وجہ سے حاجی برلاس کے ہمراہ فرار ہوا لیکن جلد ہی واپس آ کر اپنے ہم وطنوں کی مظلومیّت کا حال بیان کرنے کے لیے فاتحین کے سامنے پیش ہوا اور ایسی فصاحت اور دلیری سے اس قصّے کو بیان کیا کہ حملہ آوروں نے ایسے مخالف کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے اس کے اپنے وطن کی حکمرانی اس کے سپرد کر دی [اس کے بجائے یزدی، محلِّ مذکور، ۱ : ۵۹ میں ہے کہ ایک امیر جتّہ نے تیمور کی کمالِ شہامت و صرامت کا ذکر خان سے کیا، خان نے ایلچی بھیج کر تیمور کو بلوایا اور ولایت کش اور تومانِ موروثی اور توابع و لواحق کی ایالت اسے پیش کی] - اگلے سال (۷۶۲ھ / ۱۳۶۱ء) [توغلوق] تیمور نے اپنے مفتوحہ علاقوں کا انتظام کر کے اپنے بیٹے الیاس کو سمرقند کا والی مقرّر کر دیا اور تیمور کو اس کا وزیر بنایا مگر تیمور اپنے آس پاس کے لوگوں کے اجڈ پن سے کچھ ایسا متنفّر ہوا کہ وہ بہت جلد اپنے سالے [یزدی، ۱ : ۶۵] امیر حسین سے جا ملا، جو حملہ آوروں کے مقابلے کی تیّاری میں مصروف تھا۔

[توغلوق] تیمور اور الیاس کی باری بھی آخر آ گئی - ان دونوں کو شکست ہوئی اور دونوں میدانِ کارزار میں کام آئے - اب تیمور اپنے حلیف امیر حسین کے خلاف ہو گیا اور اس پر حملہ کر دیا اور ایک مصنوعی صلح کے بعد اسے قتل کرا دیا - اب وہ بلخ کا مالک بن بیٹھا - چنانچہ ۱۲ رمضان ۷۷۱ھ / ۱۰ اپریل ۱۳۷۰ء کو جانشینِ چغتائی اور آلِ چنگیز کے القاب سے وہ تخت نشین ہوا، مگر اس کا عہدِ حکومت حقیقۃً جتّہ اور خوارزم کی فتوحات ہی سے شروع ہوتا ہے، جن کے لیے وہ دس سال سے زیادہ لڑتا بھڑتا رہا (۷۷۱ تا ۷۸۲ھ / ۱۳۶۹ تا ۱۳۸۰ء) اور اسے نو بار لشکر کشی کرنا پڑی، پانچ مرتبہ بلادِ جتّہ اور چار مرتبہ خوارزم کے خلاف - حامیِ اسلام ہونے کی حیثیت سے تیمور علماء اور نوظہور سلسلۂ نقشبندیہ کی بڑی پاسداری کیا کرتا تھا اور جب کبھی وہ جنگ کے لیے نکلتا تو صلحاء، علماء، ادیبوں اور فن کاروں کا ایک جمِّ غفیر اس کے ہمرکاب ہوتا تھا۔

۷۷۷ھ / ۱۳۷۵ء میں قپچاق کی تقسیم کے وقت تیمور نے توقتامِش (رکّ بہ تُقتَمِش خان) کی حمایت کی تھی، جو کریمیا کا خان تھا اور جسے آق اوردو کے سردار اُوروس نے شکست دی تھی - ۷۸۲ھ / ۱۳۸۰ - ۱۳۸۱ء میں اس نے توقتامِش کو روسیوں کے خلاف بھیجا؛ خانِ مذکور نے موسکو فتح کر کے شہر کو تاخت و تاراج کیا مگر چار سال کے بعد توقتامِش نے اپنے محسن کے خلاف بغاوت کر دی - اس نے پہلے تو فتح پائی مگر بعد میں اسے شکست ہوئی اور گو تیمور اسے معاف کر دینے پر آمادہ تھا مگر خان جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا؛ چنانچہ ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء میں اس نے ماوراء النہر پر حملہ کر دیا اور تیمور کے بیٹے عمر شیخ اور اس کے لشکر کے قائدین کو شکست

دی، جس سے سمرقند خطرے میں پڑ گیا ۔ تیمور کو حالات درست کرنے کے لیے وہاں خود جانا پڑا ۔ ۷۹۳ھ / ۱۳۹۰ - ۱۳۹۱ء میں ایک اور حملہ ہوا ؛ اس دفعہ عمر شیخ نے اپنا بدلہ لیا اور باغی خان نے اپنا ملک چھوڑ کر گرجستان میں پناہ لی، مگر چار سال کے بعد پھر آ کر حملہ آور ہوا۔

۷۸۲ھ / ۱۳۸۰ - ۱۳۸۱ء میں تیمور نے ایران کی فتح کا عزم کیا اور اس کی ابتداء خراسان کے حملے سے کی؛ چنانچہ خراسان مطیع ہو گیا ۔ ۷۸۴ھ/۱۳۸۳ء میں کفارِ مغول کے خلاف ایک مہم سے واپس آنے کے بعد تیمور نے گرگان، مازندران اور سیستان یکے بعد دیگرے جلد جلد فتح کر لیے؛ مقامی حکمرانوں نے اطاعت قبول کی اور برائے نام ان کی بادشاهت قائم رهی ۔ اس سے اگلے سال هرات کی بغاوت کا خاتمه هوا اور اس کے ساتھ هی کُرت خاندان کا بھی خاتمه هو گیا ۔ ۷۸۶ھ / ۱۳۸۴ تا ۱۳۸۵ء میں [امیر] ولی [والیِ] مازنداران کا تخت و تاج چھن گیا ۔ ۷۸۸ھ سے لے کر ۷۸۹ھ تک (۱۳۸۶ تا ۱۳۸۷ء) تیمور فارس، عراقِ [عجم]، لُرستان اور آذربایجان کی فتح میں مصروف رها ۔ سلطان احمد جلائر شکست کھا کر فرار ہو گیا ۔ تیمور نے ایک موسم سرما تبریز میں گزارا اور جب اهل اصفهان پر سنگین تاوان عائد کیا اور انھوں نے بغاوت کی تو سزا کے طور پر وهاں ستر هزار باشندوں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور ان کی کھوپڑیوں سے کلّه منار بنائے گئے [یزدی، ۱ : ۴۴۳؛ غیاث الدین : روزنامۂ غزوات هندوستان، طبع زیمین، ص ۳۰ میں هے که کُشتوں کے سروں سے ''میل های رفیع'' جو بنائے گئے بلند عمارتوں سے بھی اونچے هو گئے] ۔ کہتے هیں که حافظ شیرازی سے بھی تیمور کی گرما گرم بحث هوئی لیکن اس حکایت کی صحت مصدّق نہیں۔

۱۰ رمضان [۷۹۴ھ] / ۳۱ جولائی ۱۳۹۲ء [یزدی، ۱ : ۵۶۸؛ غیاث الدین : روزنامۂ غزوات هندوستان، ص ۳۰] کو تیمور اپنی ''یورشِ پنج ساله'' پر روانه هوا ۔ اس مہمّ کے بڑے بڑے واقعات یه هیں : بحیرۂ خَزَر کے علاقوں کے ملاحده کا قتلِ عام ['فدائیان'، بجائے 'ملاحده' در یزدی، ۱ : ۵۷۴، ۵۷۷؛ نیز دیکھیے ظهیر الدین مَرعَشی : تاریخ طبرستان، طبع دارن B. Dorn، پطربورغ ۱۸۵۰ء، ص ۳۴۰ ببعد]، فارس کے آلِ مظفّر کی تباهی (۷۹۵ھ / ۱۳۹۳ء) اور مہمّ بین النهرین ۔ احمد جلائر اپنے حریف سے صلح کی ناکام کوشش کے بعد ملک شام کی طرف بھاگ گیا، جہاں وه سلطانِ مصر الملک الظّاهر بَرقُوق کا باج گزار بن گیا ۔ جب الملک الظّاهر نے اس پناه گزین کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر تیمور نے ایشیائے کوچک پر حمله کر کے الرُّها (Edessa) فتح کر لیا اور اسے تاخت و تاراج کر ڈالا ۔ تکْریت لیا اور اس میں کلّه منار بنایا [یزدی، ۱ : ۶۵۶] اور ماردِین اور آمِد بھی تسخیر کر لیے، مگر اس جنگ کے اثناء میں عمر شیخ مارا گیا ۔ توقتامش کے ایک نئے حملے کی وجه سے دفاع پر مجبور هو کر تیمور نے ۷۹۷ھ/ ۱۳۹۵ء میں [دشتِ] قپچاق کے خلاف فوج کشی کی اور موسکو پر ایک سال سے زیاده قابض رها ۔ بعد ازآن اس نے گُرجستان پر حمله کیا اور ایران میں کئی بغاوتوں کو دبایا۔

بقول شرف الدین [یزدی، ۲ : ۱۵] تیمور کا یه خیال تھا که هندوستان کے بادشاه حد سے زیاده روادار هیں، [اطرافِ ممالک کے کفّار سے تھوڑا سا مال لے کر انھیں کفر و ضلالت هی پر قائم رهنے دیا هے]؛ چنانچه ۸ رجب ۸۰۰ھ / ۲۷ مارچ ۱۳۹۸ء میں وه هندوستان کی طرف روانه هوا ۔ ۱۲ [محرّم] ۸۰۱ھ / ۲۴ ستمبر ۱۳۹۸ء کو اس

نے دریاے سندھ عبور کیا اور ۷ ربیع الثانی [۱۸] دسمبر] کو دھلی کو فتح کر لیا ۔ شہر کی خوبصورتی سے متاثر ہونے کے باوجود اس نے لوٹ مار کرنے کے بعد شہر کو ویران کر دیا اور اسّی هزار باشندوں کا قتلِ عام کیا ۔ سلطان محمود ثالث شکست کھا کر گنگا پار چلا گیا ۔ تیمور نے تھوڑی مدّت پہلے اپنی سلطنت کو اپنے مختلف امیروں میں تقسیم کر دیا تھا مگر اُسے نئے مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے جلد ھی واپس جانا پڑا ۔ ملکِ شام میں ابھی ابھی بغاوت ھو چکی تھی اور احمد جلائر نے دوبارہ بغداد پر قبضہ کر کے آذربایجان پر حملہ کر دیا تھا، کیونکہ یہاں تیمور کے بیٹے میران شاہ نے اپنے ظلم و تعدّی اور بے اعتدالیوں سے خطرناک صورتِ حالات پیدا کر رکھی تھی ۔ تیمور اور بایزیدِ اوّل کے درمیان بھی چشمک شروع ھو چکی تھی اور مصر کے نئے بادشاہ فَرَج نے تیمور کے ایک [قلعه دار، اتلمش توچین] کو رھا کرنے سے انکار کر دیا تھا، بلکه گفت و شنید کے لیے جو سفراء بھیجے گئے تھے انھیں والی دمشق نے قتل کرا دیا تھا [یزدی، ۲ : ۲۵۷ ببعد].

میران شاہ کے خلاف ضروری کارروائی کرنے کے بعد تیمور نے گرجستان کو غارت کیا اور محرم ۸۰۳ھ / اگست ۱۴۰۰ء میں ایشیاے کوچک کا رخ کیا ۔ سِیواس میں [مسلمانوں کو مالِ امانی دینا پڑا اور ان کی جان بخشی ھو گئی لیکن وھاں کے باشندے بیشتر ارمنی تھے، انھیں اسیر کر لیا گیا مگر اُن سپاھیوں کو (سپاھی بمعنی سوار، دیکھیے مادّۂ تیمار، ۴ : ۸۹۵ و)، جنھوں نے لشکرِ تیمور کی مخالفت کی تھی اور جن کی تعداد چار ھزار سوار تھی، کنووں میں زندہ دفن کر دیا گیا؛ نظامی شامی، ۱ : ۲۱۹، قبّ یزدی، ۲ : ۲۶۹] ۔ مَلَطیّة بھی فتح ھو گیا [وھاں بھی مسلمانوں کو مالِ امانی لے کر چھوڑ دیا گیا مگر ارمنیوں کو قید کر لیا گیا، نظامی شامی، ۱ : ۲۲۰] ۔ اس کے بعد تیمور ملکِ شام میں داخل ھوا ۔ حَلَب فتح کیا اور علماء سے یه فتوے حاصل کر کے که لڑائی میں مرنے کے بعد اُس کے آدمیوں یا اُس کے دشمنوں میں سے کسے درجۂ شہادت نصیب ھوگا [ابن عرب شاہ، ص قعو، از روی تاریخ ابن الشِّحْنَة] حکم دیا که حلب میں تین روز تک لوٹ مار جاری رہے ۔ [حافظ ابرو، جو خود حلبؔ میں موجود تھا، کہتا ھے (ص ۶۳۸) که پندرہ دن تک تمام لشکر تخریبِ دُور و قُصور اور لوٹ مار میں مصروف رھا] ۔ حماۃ، حِمْص اور بَعْلَبک باری باری فتح ھو گئے ۔ سلطان فَرَج کو شکست ھوئی ۔ دمشق نے اطاعت اختیار کر لی ۔ تیمور نے اسے تاخت و تاراج کیا اور وھاں کے باشندوں کو غلام بنا لیا ۔ [دمشق کے لشکری سب غلام تھے انھیں اور اھلِ قلعۂ دمشق اور تمام اھل دمشق کو بھی قید کر لیا گیا اور ان کا مال لوٹ لیا گیا ۔ شُہر جل کر راکھ ھو گیا ۔ دمشق سے واپس ھونے کے وقت تیمور نے دمشق اور تمام ولایتِ شام کے قیدیوں کو رھا کرنے اور انھیں دمشق کے اندر پہنچانے کا حکم دیا؛ یزدی، ۲ : ۳۳۴، ۳۳۸، ۳۴۱ ۔ مقاله نگار نے یزدی کے سوا کسی اَور مأخذ سے لے کر لکھا ھے که تیمور] نے علماء سے جبراً فتوٰی لیا که دمشقیوں کو غلام بنانا جائز تھا ۔ ۲۷ ذوالقعدۃ ۸۰۳ھ / ۱۰ جولائی ۱۴۰۱ء کو اس نے اچانک بغداد فتح کر لیا اور اپنے افسروں کی ھلاکت کے انتقام میں، جو محاصرۂ بغداد میں مارے گئے تھے، وھاں بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا ۔ ۲۰ ھزار ـ اور بقول ابنِ عرب شاہ چالیس ھزار ـــ نفوس [؟ قبّ عجائب المقدور، لائڈن ۱۶۳۶ء، ص رکح] اس ھنگامے میں تلف ھوے ۔ ابوبکر بن تیمور اس بات پر مأمور ھوا که اس علاقے کو قرا یوسف کے حملوں سے بچائے ۔

بایزید نے مصر کے عبّاسیوں سے سندِ حکومت

طلب کی تھی اور تیمور کے دوست بوزنطی بادشاہ پر حملہ کیا تھا، اب اس نے تیمور کے دوسرے حلیفوں، یعنی ایشیاے کوچک کے امیروں، سے بھی چھیڑ خانی شروع کی [مگر قب یزدی، ۲ : ۳۸۹ ببعد]۔ جب تیمور گرجستان کی تازہ مہم سے واپس آیا تو دونوں حریفوں میں لڑائی چھڑ گئی اور ان کی قسمت کا فیصلہ انقرہ کے میدان میں ہوا۔ یہ جنگ درحقیقت [چبق آباد؛ سامی، ۳ : ۱۸۶۷] میں، جو انقرہ کے شمال مشرق میں واقع ہے، ۱۹ ذوالحجۃ ۸۰۴ھ / ۲۱ جولائی ۱۴۰۲ء کو ہوئی۔ بایزید کی فوج کی ترتیب و تنسیق درست طور پر نہ ہوئی تھی اس لیے، گو ان فوجیوں نے دادِ شجاعت دی اور بے جگری سے لڑے، بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ فرار ہو رہا تھا کہ اس کا گھوڑا گر گیا اور وہ خود فاتح کے ہاتھ آ گیا۔ تیمور نے اس کے ساتھ احترام کا سلوک کیا اور جب ۱۴ شعبان ۸۰۵ھ / ۸ مارچ ۱۴۰۳ء کو بایزید کا آق شہر میں انتقال ہوا تو تیمور کو دلی رنج ہوا [یزدی، ۲ : ۴۸۹]۔ ایک فارسی شعر کے معنی غلط سمجھنے کی وجہ سے یہ روایت مشہور ہوگئی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام آہنی قفس میں گزارے مگر یہ روایت محض افسانہ ہے۔

بروسہ اور سمرنا پر جب قبضہ ہوا تو ان شہروں پر نئے نئے مظالم ڈھائے گئے۔ ایشیاے کوچک کے دورانِ قیام میں تیمور کا پوتا اور وارثِ تخت محمد سلطان فوت ہو گیا۔ مصر کے سفیر دربار میں حاضر ہوے اور مصر نے تیمور کے اقتدارِ شاہی کو تسلیم کر لیا۔ جانِ ہشتم (John VIII) بوزنطی قیصر کی طرف سے بھی سفیر آئے۔ گرجستان بھی ایک باج گزار ریاست بن چکی تھی۔ تیمور ۸۰۷ھ / ۱۴۰۴ء میں سمرقند واپس چلا گیا، جہاں کئی سفیر اس کی ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں سے ایک کلاویخو (Ruy Gonzalez de Clavijo) تھا جو قشتالہ (Castile) کے بادشاہ ہنری سوم کی جانب سے آیا تھا۔ ہم اُس کے رہینِ منّت ہیں کہ اُس نے دربارِ سمرقند اور تیمور کے متعدّد پوتوں کی شادیوں کے موقع پر جو شاندار جشن وہاں ہوے ان تمام امور کے متعلّق عمدہ کوائف بیان کیے ہیں۔

بعد ازآں تیمور ایک نئی مہم کے درپے ہوا اور اب کی بار یہ مہم چین کے خلاف تھی؛ کیونکہ تیمور اس بات سے مطمئن نہ تھا کہ اس کی حیثیت وہاں کے صرف اختیاردار ہی کی رہے۔ سمرقند میں قورلتای کا انعقاد ہوا، جس میں اعلانِ جنگ سے کامل اتّفاق کیا گیا۔ ۲۳ جمادی الاولٰی ۸۰۷ھ / [۲۷] نومبر ۱۴۰۴ء کو اس نے یہ مہم شروع کر دی اور جیحون دریا کو، جس پر برف جمی ہوئی تھی، عبور کر لیا۔ اُترار کے مقام پر توقتامش کی درخواست پر تیمور نے اُسے معاف کر دیا۔ ۱۰ شعبان ۸۰۷ھ / [۱۱ فروری ۱۴۰۵ء] کو وہ بیمار پڑ گیا اور جب اس نے دیکھا کہ اُس کا وقت قریب آ گیا ہے تو تمام امور کے بارے میں وصیّت کی اور [بوقتِ شب] ۱۷ شعبان/[۱۸] فروری کو ۷۱ [قمری] سال کی عمر میں ۳۶ سال حکومت کرنے کے بعد اس جہان سے رحلت کر گیا۔ [۲۲ شعبان کو] اس کی نعش آبنوس [؟] کے تابوت میں سمرقند لائی گئی، جہاں اس کی نمازِ جنازہ اور مراسمِ تعزیت ادا کی گئیں۔ وہ شاندار عمارت گورِ میر، جس میں اسے دفن کیا گیا تھا، اب بھی موجود ہے۔

تیمور نے دو چینی شہزادیوں سے شادی کی تھی، جنھیں ابن عرب شاہ الملکۃ الکبرٰی اور الملکۃ الصغرٰی یعنی بڑی ملکہ اور چھوٹی ملکہ لکھتا ہے۔ اس کے علاوہ تومان سے بھی شادی کی جو امیر موسٰی حاکمِ نخشب کی بیٹی تھی، اور جلبان سے بھی۔ جلبان [یزدی، ۱ : ۶۶۵ میں : چلپان] غضب کی حسین عورت تھی لیکن اسے کسی فرضی قصور کی پاداش میں

تیمور نے قتل کرا دیا تھا ۔ [ابن عرب شاہ کا گمان ہے کہ وہ اس کی محبوب لونڈی تھی] ۔ ان کے علاوہ اس کے حرم میں بہت سی لونڈیاں بھی تھیں [''السراری و الحظایا''، ابنِ عرب شاہ، ص تیط (= ۴۱۹)] ۔ اس کے بیٹوں کے نام یہ تھے : غیاث‌الدین جہانگیر [م ۷۷۷ھ/۱۳۷۵-۱۳۷۶ء؛ نظامی شامی، ۱ : ۱۴۷؛ حافظ ابرو : زبدۃ، ص ۵۳۱؛ یزدی، ۱ : ۲۷۱]، معزّالدین عمر شیخ [جو کُردستان سے گذر کر بغداد کو جا رہا تھا کہ بغداد سے چار منزل ورے قلعۂ خرماتو کے پاس مارا گیا، ۷۹۶ھ / اواخر ۱۲۹۶ء یا اوائل ۱۲۹۷ء؛ یزدی، ۱ : ۶۶۸]، جلال‌الدین [کورگان] عرف میران شاہ [م ۲۴ ذی القعدۃ ۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء]، شاہ رخ جسے قسمت نے وارثِ تخت بنایا [م ۸۵۰ھ / ۱۴۴۷ء] ۔ ان کے علاوہ ایک بیٹی بھی تھی، جس کا نام [سلطان بخت] تھا، جس نے سلیمان شاہ سے شادی کی ۔ اس خیال سے کہ اس کی حکومت ہمیشہ تک تو وہ نہیں سکتی اور اس خوف سے کہ اس کے بعد کہیں خانہ جنگی واقع نہ ھو تیمور نے اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں اور پوتوں کے درمیان برابر حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا، لیکن محمد سلطان بن غیاث‌الدین [جہانگیر] اور اس کی موت کے بعد اس کے بھائی پیر محمد جہانگیر کے لیے تقدّم تجویز کیا تھا ۔

تیمور کے مزاج میں سنجیدگی اور جدّیت تھی اور وہ لہو و لعب کے مظاہروں کو پسند نہیں کرتا تھا ۔ وہ چاھتا تھا کہ اس سے بالکل صاف گوئی برتی جائے خواہ اسے اس سے رنج ھی کیوں نہ پہنچے [قب ''لایحب المزاح والکذب ولا یستمیلہ اللھو واللعب''، ابن عربشاہ، ص شصح (= ۳۹۸)] ۔ کلاویخو اس کے انصاف کی بڑی تعریف کرتا ہے ۔ وہ یقیناً مجرموں سے بیرحمی کا سلوک کرتا تھا ۔ اس کا خداداد حافظہ بہت قوی تھا [''وہ امّی تھا، پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا، عربی سے نابلد تھا، صرف فارسی، ترکی اور مغولی جانتا تھا اور بس'' ؛ ابن عرب شاہ، ص تج (= ۴۰۳)] ۔ چونکہ اس نے خود تعلیم نہ پائی تھی وہ مردانِ عبقری و اہلِ کمال (men of genius) کی حوصلہ افزائی کرتا تھا اور انہیں ہمیشہ انعام و اکرام دیا کرتا تھا ۔ جن فنون کو ''تیموری'' کہتے ھیں ان کی ابتداء اسی کے عہد میں ھوئی ۔ سمرقند کو اس نے عالیشان عمارتوں سے زینت بخشی اور اسے بین الاقوامی منڈی بنا دیا، جس نے کم از کم اس کی زندگی میں تبریز اور بغداد کی جگہ لے لی تھی ۔ تیمور نے اپنے مفتوحہ شہروں سے اہلِ صنائع زیبا (artists) اور کاریگروں کو خانہ کوچ سمرقند بھیج دیا تھا ۔ اس نے تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقّی دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور اپنی فتوحات سے ہندوستان اور مشرقی ایران کی تجارت کے لیے خشکی کی نئی راہیں کھول دیں ۔ اپنی ساری سلطنت میں اس نے فوائدِ عامّہ کے لیے بڑے بڑے تعمیری کام مکمّل کیے، اداری انتظامات اور فوجی معاملات کو معقول اور درست بنیادوں پر قائم کیا اور اسلام کی اشاعت میں سرتوڑ کوشش کی ۔

تیمور [طویل القامت] آدمی تھا [ابن عرب شاہ، ص شصز (= ۳۹۷)] ۔ اس [کی پیشانی اور] سر بہت بڑا تھا ۔ اس کا رنگ سرخ و سپید تھا ۔ سر کے بال چھوٹی عمر ھی میں سفید ھو گئے تھے ۔ [دائیں] ھاتھ اور [دائیں] پاؤں پر دو زخم لگے تھے، اس وجہ سے اس کی بناوٹ میں قدرے نقص آ گیا تھا، [ابن عرب شاہ، ص شصح (= ۳۹۸) : اشل اعرج الیمناوین (بتصحیح)] ۔ اس کی بے شمار تصویریں موجود ھیں، جو ایرانی یا ہندوستانی مصوّروں نے بنائی ھیں لیکن زیادہ تر محض خیالی ھیں (قب Vámbéry : *Gesch. Bochara's*، ۱ : ۲۱۲ تا ۲۱۳) ۔

مآخذ : تیمور سے (۱) ملفوظات اور (۲) توزوکات بھی منسوب کی جاتی ھیں لیکن ان کا اصلی ھونا بہت

مشکوک ہے؛ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس نے اپنے عہد کی دو سرکاری تاریخیں خود مرتّب کرائی تھیں یعنی : (۳) تاریخ خانی [قب یزدی، ظفر نامہ، ۱ : ۲۰] جو ترکی نظم اور اویغور رسم الخط میں تھی ۔ یہ کتاب اب ناپید ہو چکی ہے اور (۴) نظام الدین شامی : ظفر نامہ [تا آخر ۸۰۶ھ] ۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم (Add. 23,980) میں محفوظ ہے [اور نسخوں کے لیے دیکھیے سٹوری، ج ۱، ۲/۲ : ۲۷۹]؛ [طبع بہ تصحیح فیلکس تاور و نشر از جانب چیکوسلوواک اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، پراگ، دو جلد]؛ (۵) شرف الدین علی یزدی : ظفر نامہ [جس کے مآخذ میں ظفر نامۂ شامی بھی شامل ہے اور یورپ میں تیمور کی تاریخوں میں سے یہی زیادہ مشہور ہے ؛ (۶) یزدی کی کتاب کا ذیل مرتّبۂ حافظ ابرو بھی پروفیسر فیلکس تاور نے نشر کیا، دیکھیے سٹوری، محلّ مذکور؛ (۷) ابن عرب شاہ : عجائب المقدور فی [اخبار تیمور]۔ ابن عرب شاہ تیمور کا سخت ھجو گو ہے لیکن اس کے ساتھ ھی اسے تیمور کی نہاد و سیرت کی صحیح قدر بھی ہے اور اس کی کتاب میں سمرقند کے متعلّق پر قیمت جزئی اطلاعات بھی ملتی ھیں؛ [(۸) حافظ ابرو : زبدۃ التواریخ بایسنغری، دیکھیے سٹوری، ج ۱ : حصہ ۲ : ص ۸۸]؛ (۹) کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی : مطلع سعدین، جلد اوّل، زیر تصحیح محمد شفیع لاهوری، جلد دوم، حصّہ ۱ تا ۳، طبع لاهور]؛ (۱۰) میر خواند : روضہ، جزء ۶ اور خاص کر (۱۱) خواند امیر : حبیب السیر بعد کے زمانے کے مؤرّخین میں سے بہترین مورّخ ھیں؛ (۱۲) فان ھامر von Hammer نے *Gesch. d. Osm. Reiches*، جلد ھفتم و ھشتم، میں ھمعصر عثمانی اور بوزنطی مؤرّخین کی تلخیص درج کی ہے ۔ ھمیں (۱۳) فریدون بک : منشآت کا بھی ذکر کرنا چاھیے، جو قیمتی دستاویزات کا مجموعہ ہے؛ (۱۴ تا ۱۶) یورپی سیّاحوں میں سے کلاویخو Clavijo، شلٹبرگر Schiltberger اور بوسیکو Boucicault ھیں.

مآخذ کی مزید تفاصیل کے لیے ھم ذیل کی قیمتی تصانیف کی طرف توجہ دلاتے ھیں: (۱۷) بلوشہ E. Blochet : *Introduction à l'Histoire des Mongols*؛ (۱۸) براؤن E. G. Browne : *A History of Persian Literature under Tartar Dominion*، ص ۱۸۰ تا ۱۸۵؛ (۱۹) و (۲۰) زیمین L. Zimine کے مطالعات ذیل بھی قابلِ توجّہ ھیں، یعنی *Les détails de la mort de Tīmūr* (*Protocoles et communications de la Société archéologique du Turkestan*، سالِ ھژدھم) اور *Les exploits d'Emīrzâdé 'Omar Cheikh* (در *RMM*، ۱۹۱۴ء، ۲۸ : ۲۴۴ تا ۲۴۳) ۔ انیسویں صدی تک یورپی مؤرّخین (۲۱) Petis de la Croix کے ترجمۂ شرف الدین کے سوا شاذ و نادر ھی کوئی اور کتاب استعمال کیا کرتے تھے؛ متقدّم مؤرّخوں میں سے (۲۲) D'Herbelot اور (۲۳) Gibbon اور (۲۴) De Guignes (*Hist. des Huns*، کتاب ۲۰) اھمّ ترین مؤرّخین ھیں ۔ زمانۂ حال کے مؤرّخین میں سے قابلِ ذکر یہ ھیں : (۲۵) وامبیری Vámbéry : *Gesch. Bochara's*، [متن بزبان انگریزی، لنڈن ۱۸۷۳ء؛ اردو ترجمہ، مجلس ترقّی ادب لاهور، ۱۹۵۹ء] باب ۱۰ تا ۱۱؛ (۲۶) Skrine اور Ross : *The Heart of Asia*؛ (۲۷) Sykes : *History of Persia*، باب ۵۹؛ (۲۸) E. G. Browne : کتابِ مذکور، جلد ۲؛ (۲۹) Czaplicka : *The Turks in Central Asia*؛ (۳۰) اور (۳۱) Grousset : *Histoire de l'Asie*، جلد ۲؛ [(۳۱) کارا دِ وو Carra de Vaux : *Les Penseurs de l'Islam*، پیرس ۱۹۲۱ء، ۱ : ۴۸ تا ۵۹].

(L. Bouvat بووا)

⊗ تیموْر : (مقالۂ دوم) تیموْر کا شمار ایشیا کے عظیم فاتحین میں ھوتا ہے ۔ وسطِ ایشیا میں اس کے نام کا تلفّظ عموماً تموْر Temür کیا جاتا تھا اور یہی صورت عثمانیوں سے مروی ھوئی ہے ۔ یورپ میں اس کے ساتھ فارسی لفظ لنگ (لنگڑا) کا اضافہ ھو گیا اور یوں وھاں وہ تیمرلین Tamerlane کے نام سے معروف ھوا ۔ اس

کلمے کا املا ''تیمؤر'' Timür کی صورت میں اس لیے ہوا کہ عربی میں اسے [اشباع] کسرہ سے لکھتے تھے۔ تیمور کی اپنی اولاد اسے ہمیشہ تِمرِیک کہتی تھی۔

تیمؤر ۹ اپریل ۱۳۳۶ء / ۲۵ شعبان ۷۳۶ھ کو ایک گاؤں میں پیدا ہوا، جو اُس زمانے میں خواجہ ایلغار Hoja Ilgar کے نام سے مشہور تھا (اب اسے مولُود خانہ Mevluthane کہتے ہیں) اور موجودہ شہر سبز کے قریب واقع تھا (شہر سبز کو اس زمانے میں کِش کہتے تھے)۔ تیمؤر چاہتا تھا کہ آگے چل کر یہیں اس کے دارالسّلطنت کی بنیاد رکھی جائے [وامبیری : *History of Bokhara*، ص ۲۰۴] اور [بعدِ مرگ] یہیں اُسے اُس کے خاندان کے سرپرست ولی سید [امیر] کُلال کے پہلو میں دفن کیا جائے [امیر کُلال وهی جو جامی : نفحات، ص ۳۳۶، اور علی : رشحات، لکھنؤ ۱۳۰۸ھ، ص ۲۴ میں مذکور ہیں؟]۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اُس نے یہاں کئی شاندار عمارتیں بھی بنوائیں مگر حالات سے مجبور ہو کر اسے اپنا دارالحکومت سمرقند کو بنانا پڑا۔ تیمؤر کا تعلّق مغولوں کے قبیلۂ بَرْلاس سے تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے اور چنگیز خان کے خاندان کی اصل ایک تھی اور وہ قبیلۂ برلاس پر حکمران تھا۔ یہ بات تیمؤر کی تاریخوں میں مذکور ہے اور اس کے کتبۂ مزار میں بھی درج ہے، نیز رشیدالدین کی تصنیف میں ([جس کا آغاز] تیمؤر کی پیدایش سے [۳۶] سال قبل ہوا) جن مآخذ سے کام لیا گیا ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ رشیدالدین نے قرہ چار نُویان کے متعلّق، جو چنگیز کا معاصر اور سالارانِ اعظم میں سے تھا، لکھا ہے کہ ''وہ اوروغ (خاندانِ) بوزنجار جانکمونتاق Cañmuntaq میں سے تھا''۔ مزید برآن اُس نے قرہ چار کے پدرِ سوم (پر دادا) قچولای کے متعلّق تحریر کیا ہے کہ ''وہ تومنای خان Tumene Han کے نو بیٹوں میں سے تھا اور چنگز کا پدرِ چہارم (دادا کا دادا)'' (ارمغان علمی به محمد شفیع، ص ۱۰۹-۱۱۰) [مطلع سعدین کا بیان اس سے مختلف ہے، دیکھیے مادّۂ تیمور مقالۂ اوّل، ص ۹۱۹، عمود ۲؛ اس کتاب میں چنگز خان قچولای کے بھائی کے پرپوتے کا لڑکا ہے]۔ چنانچہ تیمؤر کا تعلّق اس شاخ سے تھا جو تومنای خاف بوزنجار سے علیحدہ ہو گئی تھی اور اسے خانیّت حاصل نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ تیمؤر اور اس کے بیٹے 'بِک'، 'سلطان'، 'امیر' اور 'امیرزادہ' کے القاب پر قانع رہے اور اسی لیے خود تیمؤر نے ذاتی طور پر چنگزی نسل کے شہزادوں کو خانیّت پر فائز کیا اور انھیں کے نام پر اپنے اکثر سکّے ضرب کرائے۔ چنگز اور اس کے بیٹوں کی طرح تیمؤر اور اس کے بیٹے بھی اپنے آپ کو ایک قدیم ترک خاندان کی نسل سے سمجھتے تھے، جو اوغزخانی شاخ سے تعلّق رکھتی تھی۔ چیاؤ۔ہونگ (؟) (Çiao-Hong) کے نزدیک، جو چنگز کا معاصر اور جنوبی چین کا سفیر تھا، اس خاندان کا تعلّق گوک تورک لر کی شاخ شاتو (؟) (Şato) سے تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس کے اسلاف نے بخارایِ اتراک سے اپنی حکومت ان قبائل پر قائم کی جو لساناً مغول تھے لیکن مغولی زبان بولنے کے باوجود اپنی زبان کو ترکی سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جوینی کی تصنیف جہان کشای [مطبوعہ] اور اس کے اس نسخے میں جو لاہور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے یہ بتایا گیا ہے کہ چنگز کو مغولی اور ترکی کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ اپنی کتاب شجرۂ اتراک میں تیمؤر کے پوتے الُغ بیگ نے ایک ترکی نظم چنگز سے منسوب کی ہے۔ دوسری طرف جامع التواریخ کے اُس نسخے میں جو برٹش میوزیم (Add. 7628) میں موجود ہے الغ بیگ کے بھائی بای سُنغُر مرزا نے لفظ ترک اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور وہ کلمہ مطلّا کیا ہوا ہے۔ اسی طرح شہنشاہِ ہند

بابر اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مغولوں سے بالکل جدا خیال کرتا تھا - بہر حال تیمور کے اسلاف کے زمانے میں برلاس قوم ترک اور مغول دونوں عناصر سے مرکب تھی - نظام الدین شامی کی تصنیف میں ایک قبیلے کا نام ''دلان جاوون'' "Dulan Cavun" لکھا ہے، جو تیمور کے بزرگوں کی ملازمت میں تھا اور یہ نام مغولی ہے - اپنے سکوں پر تیمور مغولی کلمه ''آوکه مینو'' ''Üke Menu'' ضرب کراتا تھا لیکن شاہ رخ نے ترکی میں ''شاہ رخ سوزوم'' ''Şahroh sözüm'' لکھوایا - اس کے برعکس تیمور کے اسلاف میں، جو علاقۂ کش میں رہنے والے قبیلۂ برلاس پر حکومت کرتے تھے، ایسے لوگ موجود تھے جن کے نام خالص ترکی تھے، مثلاً ''توغ لوق خوجه برلاس''، ''انگز چاق برلاس''، ''توتن باشلی برلاس'' - اسی طرح آج کل سمرقند میں رہنے والی قبیلۂ برلاس کی ایک شاخ کا نام ''تورک برلاس'' ہے - قیاس کہتا ہے کہ اس کے مقابلے میں ''مغول برلاس'' بھی ہوں گے اور چونکہ اس قبیلے کی تشکیل ترک اور مغول شاخوں سے ہوئی تھی اس لیے یہ دو زبانه قبیلہ تھا - فرمانروائے اعلٰی بننے کے بعد تیمور نے جو قورولتای (مؤتمر) طلب کیے ان کا نام اس نے ''تورک لرن و چغتای اولوسونک بو یوک قورولتای'' (=ترک و چغتای قوم کی قورولتای بزرگ) رکھا - اس کی زندگی میں جس ادب کو اس نے اور اس کے بیٹوں نے نشوونما پانے میں مدد دی اسے چغتائی ادب کہتے تھے۔

سترہ برس کی عمر [یعنی حدود ۱۳۵۲ء] میں تیمور کی تین بیویاں تھیں - ان میں سے پہلی بیوی، جس کا نام اولجای ترکان تھا، ماوراء النہر کے اصل حکمران قازاغان خان کی پوتی تھی - اسے محض ایک اتفاقی بات قرار نہیں دیا جا سکتا - یہ خیال غلط ہے کہ تیمور کے باپ اور اس کے خاندان کو کسانوں اور خانه بدوشوں کے ایک قبیلے میں محض چودھریوں کی حیثیت حاصل تھی - اسی طرح یہ رائے بھی درست نہیں کہ تیمور نے اپنی صلاحیت کی بناء پر ان گروہوں اور طبقوں میں امتیاز پایا جن کا ذریعۂ معاش قزاقی تھا [قب ابن عربشاہ، ص ٥]- تیمور کا باپ امیر ترغای ایک دین دار اور متواضع آدمی تھا، جسے صرف قبیلۂ برلاس ھی میں نہیں بلکه پوری چغتائی قوم میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا - کہا جاتا ہے کہ مشرقی ترکستان کے فرمانروا توغلوق تیمور کا وزیر اور سپه سالار اعلٰی امیر حمید، [جس کی اویماق] کنورلگوت تھی، ''امیر ترغای کا قدیمی دوست تھا'' [ظفر نامه، ۱ : ۵۸، ۹۸]- ترغای کی ایک بیٹی [شرین بک آغا] عشیرۂ ارلات کے سردار مؤید ارلات سے بیاھی گئی، جو خراسان کے ایک اہم حصے پر حکمران تھا، اس کی ایک اور بیٹی [قتلغ ترکان] کی شادی امیر سلطان [دوغلات] اور بعد ازآن داؤد دوغلات سے ہوئی - یہ دونوں قبیلۂ دوغلات کے سردار تھے، جو علاقۂ کاشغر میں آباد تھا - تیمور کی پہلی تین بیویوں میں سے ترمش آغا قبیلۂ قطغان سے تھی، جو بلخ کے نواح میں آباد تھا - امیر ترغای کے قبضے میں کش اور نسف کے نواح کے بڑے بڑے املاک تھے - ان کے علاوہ تاشقند اور چغانیان اور خوارزم کے علاقۂ کات کے بالائی حصے میں بھی اس کے وسیع [اینجو، یعنی] املاک [خاصه] تھے - اس کے اسلاف میں سے، جن کا حال تاریخ ھائے تیمور میں مذکور ہے، حسب ذیل کے نام رشیدالدین کی تصانیف میں بھی آتے ھیں : قره جار نویان، جسے چنگز نے اپنے بیٹے چغتائی کی ملازمت میں دے دیا تھا؛ قره جار کا بیٹا امیر ایجل، جو چغتائی کا امیر اعلٰی بھی تھا اور بعد ازآن الغوخان کا 'امیرالامراسی' بنا، پھر ایجل کا بیٹا امیر ایلنگز، جو قبیلۂ چغتائی کے خان دوا خان [بن الغوخان] کے دربار میں اسی عہدے پر فائز تھا - یہ بات کہ تیمور کی پہلی بیوی امیر

قازاغان فرمانروائے ماوراءالنہر کی پوتی تھی اور یہ کہ تیموؔر کی اس سے سترہ ھی برس کی عمر میں شادی ھو گئی تھی ظاھر کرتی ھے کہ تیموؔر، اس کے باپ تُرَغای اور دادا امیر بَرکَل کو چغتائی قوم میں کتنی اھم حیثیت حاصل تھی ۔ تیموؔر نے اپنے حریف امیر حسین کا خاتمہ کر دینے کے بعد اس کی بیوی سرای ملک خانم سے شادی کی جو خانِ چغتائی کی بیٹی تھی اور اس طرح ''کُرِ گن'' Kuregen (= چغتائی فرمانروا کا داماد [قبّ برنی، ۳۳۰ س ۳ ۱]) کا لقب اختیار کیا ۔ جب چنگیز کی اولاد نے چین چھوڑا اور ان کی جگه خاندان مِنگ کی حکومت قائم ھوئی تو اس کے بادشاہ تیموؔر کو 'فو۔ما' کے لقب سے یاد کرتے تھے، جو چینی زبان میں کُور گان کا ھم جنس ھے ۔

قبیلۂ بَرلاس کی فوج کا جو حصّه براہِ راست تیموؔر کے اسلاف کے ماتحت تھا وہ 'اُلُغ مِنگ' (اور بعض اوقات ایرانیوں کے ھاں 'ھزارۂ کلان') کہلاتا تھا ۔ یہ بات بالکل ظاھر ھے کہ امیر تُرَغای زیادہ چست اور مستعد آدمی نہیں تھا اور یہ کہ اس کی زندگی ھی میں اس گروہ کی قیادت کسی اور شخص کے قبضے میں چلی گئی تھی ۔ تُرَغای کے انتقال کے بعد [اس کا ابنِ عم] بُورالغی کا بیٹا امیر حاجّی بَرلاس ''اُلُغ مِنگ'' کا سالار بن گیا ۔ جب چغتائی قوم کے فرمانروا تُوغلُوق تیمور خان نے ۱۳۶۱ء میں ماوراءالنہر پر، جو امیر قازاغان کے زمانے میں علیحدہ ھو چکا تھا، قبضہ کیا تو تیموؔر اس امیر حاجی بَرلاس کی طرف تھا ۔ جب مؤخّرالذّکر نے پسپا ھو کر آمو دریا کے جنوب کی طرف رخ کیا تو تیموؔر اس سے جدا ھو کر کِش لَوٹ آیا اور وھاں سے تُوغلُق تیمور خان کے پاس جا کر اپنے قبیلے کی طرف سے اطاعت کی قسم کھائی ۔ اپنے اس اقدام سے تیموؔر پچیس ھی برس کی عمر میں سیاست کے میدان میں داخل ھو گیا ۔ چنانچہ تُوغلُوق تیمور خان نے قبیلۂ بَرلاس کے اس سردار کو اپنے بیٹے اِلیاس خواجه کے ماتحت کر دیا، جسے اس نے ماوراءالنہر کا حاکم مقرّر کیا تھا ۔ اس طرح جو علاقه تیموؔر کے زیر تسلّط تھا وہ جنوب کی طرف وسعت‌پذیر ھو گیا اور سمرقند کے جنوب کی طرف کے پہاڑوں سے لے کر آمو دریا تک کا علاقه اس کے زیرِ اقتدار آ گیا ۔ امیر قازاغان کے پوتے اور تیموؔر کے برادرِ نسبتی امیرؔ حسینؒ نے چغتائی شہنشاہ کی اطاعت قبول نہیں کی تھی ۔ اس کے برعکس اس نے الیاس خواجه خان اور چغتائی فوجوں کو، جو ماوراءالنہر میں متعیّن تھیں، وھاں سے نکالنے کے لیے اپنا لشکر جمع کرنا شروع کر دیا ۔ تیموؔر بلا تأمّل اس سے جا ملا ۔ لیکن انھیں اپنے اس منصوبے میں فوری کامیابی نہیں ھوئی ۔ جب چغتائی فوجوں نے تیموؔر اور امیر حسین کو شکست دی تو وہ اس علاقے میں جو اب افغانستان کہلاتا ھے اور خوارزم میں اور بعض اوقات خراسان میں سرگردان رھے، گو وہ کبھی کبھی چغتائی لشکر کو شکست دینے میں کامیاب بھی ھو جاتے تھے اور ایک مرتبه تو وہ چغتائی فوجوں کا پیچھا کرتے کرتے سِر دریا کے شمال تک بھی جا پہنچے ۔ لیکن امیر حسین انتہا درجے کا حاسد تھا اور اس خوے بد کا اظہار سب سے زیادہ فتح کے موقعوں پر ھوتا تھا ۔ یہی بات اس کے اور تیموؔر کے درمیان اختلاف کا سبب بنی ۔ آخر کار تیموؔر نے، جب اس کی عمر چونتیس سال کی تھی، امیر حسین کو بلخ کے قریب اور پھر خود اِس شہر کے قلعے کے اندر شکستِ فاش دی اور امیر حسین کو گرفتار کر کے اُسے قتل کروا دیا اور اس کے بعد اپنے چغتائی قوم کے 'امیرالامراسی' ھونے کا اعلان کر دیا (۱۰ اپریل ۱۳۷۰ء) ۔ اس کے بعد سے تیموؔر کو ترکوں کے ھاں ''اُلُغ بیک'' یا محض ''بیک'' اور جن علاقوں میں فارسی بولی جاتی تھی وھاں ''امیر'' کے لقب سے پکارا جانے لگا ۔ تحریروں میں اس کے لیے ''امیر''

یا ''سلطان'' کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا ۔ زیادہ ذمےدارانہ نوعیت کے فیصلوں میں، با اثر قبائل کے سرداروں کی موت کے فرامین پر دستخط کرتے وقت، خطبوں میں اور سکّوں پر خاندانِ چنگزی کے بادشاہ لفظ ''خان'' کا استعمال کرتے تھے ۔ جو واقعات بلخ میں پیش آئے اُن کے دوران میں سیورغتمش کے، جس کا تعلّق اوگدای خان کے خاندان سے تھا، خانی پر فائز ہونے کا اعلان کیا گیا اور وہ ۱۳۸۸ء تک، یعنی ۱۸ برس، اس منصب پر فائز رہا ۔ اس کے بعد سلطان محمود اوغلان کو خان بنایا گیا، جو چغتائی شہزادوں میں سے تھا اور اسے ۱۴۰۲ء تک، یعنی پندرہ سال، خان تسلیم کیا گیا ۔ تاہم یہ خوانین تیمور کے لشکر میں سالارانِ کشیک کی حیثیت سے کام کرتے رہے، فقط اس وقت جب نمائندگی دولت کا سوال پیدا ہوتا تھا تو انھیں آگے بڑھا کر ریاست کے حقیقی فرمانروا کی حیثیت سے پیش کر دیا جاتا تھا ۔ جب تیمور نے شام پر قبضہ کیا تو عظیم عرب مصنّف ابنِ خلدون تیمور کی ملاقات کے لیے آیا [ابن عربشاہ، ص قصو (=۱۹۶) و تا (=۱۰۴)] اور کہا کہ آپ ھی شاھانِ دنیا کا واسطة العقد ھیں، اس پر تیمور نے سلطان محمود خان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ''اصلی بادشاہ تو یہ ہے [دیکھیے فشل W. J. Fischel، ص ۳۷ و تعلیقہ ۱۰۱ نیز قب ابنِ عربشاہ، ص تا]، میری حیثیت تو اس کے دربار میں محض ایک خادم کی ہے'' ۔ تیمور کی عملداری میں جو قانون رائج تھا وہ چنگز کا یاسا تھا [طریقۂ محمّدیہ کے بر عکس وہ اسے رواج دیتا تھا: ابن عربشاہ، ص تج (=۴۰۳)]۔ یاسا کی رو سے ریاست کی نمائندگی، خواہ برائے نام ھی سہی، صرف چنگزی خاندان کے شہزادوں ھی سے ھو سکتی تھی ۔ لہٰذا تیمور کو اس کی پابندی کرنا پڑی ۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے مجبوراً پوری ریاست کو مختلف قبائل میں تقسیم کرنا پڑتا ۔

تیمور نے بالکل ابتدائی سالوں ھی میں ایک طرف بلادِ چغتائی اور دوسری طرف مُلکِ ایلخانیہ (جو ملوک طوائف کے قبضے میں رہا تھا) دونوں پر متصرّف ہونے کا منصوبہ بنایا تھا ۔ اس بارے میں اس کی کامیابی گویا چنگز خان کے خواب کی تعبیر تھی کہ وہ ایک وسیع و عریض سلطنت کو اپنے قبضے میں کر لے ۔ ادارۂ حکومت کو یاسا کی بنیاد پر رکھ کر وہ ترک اور مغول قبائل کو اپنے زیرِ تسلّط رکھ سکتا تھا اور ایک صادق العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے شہروں میں شریعت نافذ کر کے وہ یہ امید کر رہا تھا کہ ایرانی عنصر کی ہمدردی بھی اُسے حاصل ھو جائے گی۔

سب سے پہلے ۱۳۷۰ اور ۱۳۸۰ء کے درمیان اس نے چغتائی قوم کے مشرقی حصّوں پر، جو 'جِتَہ' کے نام سے مشہور تھے، اپنا تسلّط قائم کرنے کے لیے جد و جہد کی ۔ یہاں بہت سے قبائل مغولی زبان بولتے تھے ۔ خوارزم کا علاقۂ کات بھی اسی ذیل میں آتا ہے، جو کسی زمانے میں چغتائی خوانین کے ماتحت تھا ۔ امیر قمرالدین (حماسی نظموں میں: قمر دین) جو قبیلۂ دوغلات کا سردار اور جِتَہ کا حاکم تھا اور خوارزم کے قبیلۂ قُنغرات کے حکمران ان علاقوں کے مالک تھے ۔ امیرِ قازاغان کی وفات کے بعد جو شورشیں برپا ہوئیں ان کے دوران میں جِتَہ کے حاکم سر دریا کے جنوب کی طرف چلے گئے اور قبیلۂ قُنغرات کا سردار حُسین صوفی، جو علاقۂ خوارزم کے اُس حصّے پر حکومت کرتا تھا جو خوانین آلتین اوردو (اوردوے زرّین (Golden Horde)) کے قبضے میں تھا، زبردستی علاقۂ کات پر قابض ھوگیا ۔ ۱۳۷۲ء میں تیمور نے [اس بنا پر کہ کات و خیوہ چغتائی خان سے متعلّق ھیں؛ نظامی شامی، ص ۶۵] حُسین صوفی سے اس علاقے سے دستکش

ہونے کا مطالبہ کیا، لیکن جب اس نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو تیمور نے اپنا لشکر لے کر پیش قدمی کی اور علاقۂ کات کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا ۔ اس زمانے میں جُوچی قوم کا ایک حصّہ، جو آق اوردہ کے نام سے مشہور تھا [دور دور تک پھیلا ہوا تھا]، شمال مشرق کی طرف سر دریا سے لے کر یدی سُو کے کنارے علاقۂ قراتال Qaratal تک [اس مقام کے لیے دیکھیے یزدی، ۱ : ۴۹۴؛ دریاے قراتال جھیل بالکش کے جنوب مشرق سے آ کر اس جھیل میں گرتا ہے، وہاں جہاں جھیل کی چوڑائی پانچ دس میل سے زائد نہیں ہے، دیکھیے اینسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، ۱۹۶۱ء، مادّہ بالکش (۲ : ۹۹۱)؛ سکائلر Schayler : *Turkistan*، لنڈن ۱۸۷۶ء، ۲ : ۱۰۴]، شمال میں سائبیریا کے ان مقامات تک جو تُوبن Tümen کے نام سے مشہور ہیں، نیز دریاے والگا [اِتِل] کے طاس اور مزید مغرب کی جانب آلتین اوردو (اوردوے زرّین) کے اصل علاقے تک ۔ ان تمام علاقوں میں انتہائی بے اطمینانی اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی ۔ اس کے باوجود آق اوردہ کا خان اُوروس خان Urus Han سر دریا کے پورے طاس کو اپنے زیر نگین لانے کا آرزومند تھا ۔ اس نے متعدّد ملوک کو ناراض کر لیا، بلکہ بعض کو تو موت کے گھاٹ بھی اتار دیا ۔ قبیلۂ قُنغرات کے سردار یوسف صوفی [برادرِ حُسین صوفی؛ یزدی، ۱ : ۲۴۱] نے کات پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔ ۱۳۷۳ - ۱۳۷۴ء میں تیمور نے ایک بار پھر خوارزم کا رُخ کیا اور اپنے تمام سابقہ علاقے واپس لے لیے ۔ اُوروس خان نے آق خوجہ نامی ایک چنگزی شہزادے کو قتل کر ڈالا تھا لیکن اس کا بیٹا تُقتَمِش اوغلان اُوروس خان کے پنجے سے نکل کر تیمور کے پاس آ گیا [نظامی شامی، ص ۷۴؛ یزدی، ۱ : ۲۷۳]۔ تیمور نے اسے فوجی امداد دی اور آق اوردہ پر اپنا تصرّف قائم کرنے کے لیے باصرار آمادہ کیا ۔ ۱۳۷۷ء میں اُوروس مر گیا تُقتَمِش نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ۱۳۷۹ء میں تیمور کی مدد سے آق اوردہ پر تصرّف کر لیا ۔ اس کے بعد تیمور کی مدد سے وہ علاقۂ والگا تک بڑھتا چلا گیا اور ۱۳۸۰ء میں آلتین اوردو (''اوردوے زرّین'') کا خان بن گیا [یزدی، ۱ : ۲۸۴] ۔ اپنی حکومت مستحکم کرنے کے لیے تُقتَمِش نے اپنے مخالف ملوک اور ان کے حامی سرداروں کو تباہ کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ ''اوردوے زرّین'' کے ایک شہزادے تیمور قُتلُق اوغلان نے اپنے حقیقی پشتی بان، ایدِگو Edigo، قبیلۂ منگیت [مانگقوت] کے سردار، کے ساتھ تیمور کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی ملازمت اختیار کی [قب یزدی، ۱ : ۷۴۴]۔ اسی زمانے میں ایدِگو نے قمرالدین کے خلاف، جو قبیلۂ دوغلات کا سردار تھا، تیمور کی فوج کشی میں حصّہ لیا ۔ آلتین اوردو دستانی (= رزم نامۂ اوردوے زرّین) میں جس ایدِگو کا ذکر آیا ہے، کہ اس نے قمرالدین کا کوہ آلتای میں تعاقب کر کے اسے قتل کیا تھا، وہ فی الحقیقت یہی ایدِگو تھا ۔ تُقتَمِش نے جب یہ دیکھا کہ اس کے تمام مخالفین کا تیمور کے ہاں بڑی کشادہ دلی سے خیر مقدم ہو رہا ہے تو بہت برہم ہوا ۔ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تیمور ایران کی مہمّ میں مصروف ہو تو وہ اس کے علاقوں پر قابض ہو جائے ۔ تیمور ایلخانیوں کے ملک پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا؛ چنانچہ تُقتَمِش نے اس میدان میں بھی اس کی ہمسری کی ٹھانی اور ۱۳۸۵ء میں تبریز پر قبضہ کر لیا ۔

[اواخر ۷۸۲ھ، اوائل] ۱۳۸۱ء میں تیمور [نے تسخیرِ ایران کا مصمّم ارادہ کیا اور لشکر فراہم کر کے] وہ اپنی ایرانی مہمّ پر روانہ ہوا ۔ اس نے پہلے ہرات پر قبضہ کیا اور وہاں کے [بعض

علماء اور کد خدایانِ معتبر کو جلا وطن کر کے شہر سبز بھیج دیا اور کُرتوں کے حکمران ملک غیاث‌الدین اور اس کے بیٹوں کو بھی سمرقند بھیج دیا، یزدی، ۱ : ۳۲۳، ۳۰۲]۔ حُکّامِ سبزوار، یعنی سربداروں کا [۷۸۳ھ میں] خاتمہ کرنے کے بعد اس نے بحیرۂ خزر کے جنوب میں مازندران اور جرجان کو اور علاقۂ سیستان کو، جو ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے، اپنے قبضے میں کیا ۔ [۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں تیمور نے ایران کی اس عظیم مہم کا، جو ''یورشِ سہ سالہ'' کے نام سے مشہور ہے، عزم کیا اور فراہمی لشکر کا حکم دیا؛ یزدی، ۱ : ۳۹۳] اور وہ آذربایجان پر مکمّل طور پر قابض ہو گیا؛ اور فارس، عراق اور لُرستان پر تسلّط قائم کیا ۔ آذربایجان اور عراق کا فرمانروا سلطان احمد جلائر بغداد میں پناہ گزیں ہوا ۔ تیمور تبریز میں موسمِ سرما بسر کر رہا تھا کہ اصفہان کے لوگوں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا ۔ ان بغاوتوں کو کچلتے وقت، جنھیں سلطان احمد جلائر اور دیگر مخالف سرداروں کی اعانت حاصل تھی، تیمور نے تمام عالموں اور دستکاروں کو عام لوگوں سے علیحدہ کر کے اپنے ملک میں بھیج دیا ۔ اس کے بعد اس نے ستّر دن تک [؟] پوری آبادی کا قتل عام کیا [؟ اس ساری مقتول آبادی کی تعداد ستر ہزار بیان کی جاتی ہے] اور ان مقتولین کی کھوپڑیوں کے منار بنائے [یہ واقعہ اواخر ۷۸۹ھ / ۱۳۸۹ء میں پیش آیا؛ یزدی، ۱ : ۴۴۳ ببعد] ۔ جن دنوں وہ اس مہمّ پر گیا ہوا تھا اس نے ماوراء النہر کی حکومت اپنے بیٹے عمر شیخ کے سپرد کر رکھی تھی ۔ تُقتَمِش، یہ سوچ کر کہ چغتائی قوم بغیر قائد کے رہ گئی ہے، ۱۳۸۸ء میں سمرقند اور کِش تک پیش‌قدمی کرتا چلا گیا اور ان علاقوں کو تباہ و برباد کر ڈالا ۔ چونکہ اس قسم کی تمام مہمّوں کے دوران میں تقتمش کا فوجی مستقرّ خوارِزْم تھا اس لیے تیمور نے فیصلہ کیا کہ اس خطّے کے ان تمام علاقوں پر قبضہ کر کے جو جُوچی قوم کی ملکیّت ہیں انھیں مکمّل طور پر برباد کر ڈالا جائے ۔ چنانچہ ایرانی مہمّ سے لوٹ کر [۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء] میں وہ خوارِزْم کی طرف بڑھا [یزدی، ۱ : ۴۴۷]۔ ایک بار پھر اس نے فرمان صادر کیا کہ اورگنج جیسے تمام بڑے بڑے شہروں کے عالموں اور دستکاروں کو بخارا اور کِش کے علاقوں میں بھیج دیا جائے ۔ وہ عظیم الشان سرائے [= محلّ] جو آق سرای کے نام سے معروف ہے اور آج بھی کِش میں موجود ہے خوارِزْمی کاریگروں کی تعمیر کی ہوئی ہے ۔ اورگنج کے قلعوں کو مسمار کر کے اس نے وہاں جَو اور گندم بو دیے ۔ لیکن خوارِزْم کے مکمّل طور پر غیرمسلّح ہو جانے کے باوجود تُقتَمِش کے حملوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا ۔ اس کی دھاوا مار فوجیں مشرق میں تاشکنت پر اور جنوب میں آذربایجان پر حملہ کرتی رہیں، اس لیے تیمور نے تہیّہ کیا کہ اُس کا پوری طرح قلع قمع کر دے، چنانچہ وہ ۱۳۹۱ء میں سر دریا کے طاس میں داخل ہوا ۔ اس نے دشمن کو دھوکا دینے کے لیے اپنے وسیع لشکر کے کچھ ٹکڑے مشرقی ترکستان میں مختلف مہمّوں پر بھیج دیے، حتّٰی کہ کچھ فوج چین کی سرحدوں تک روانہ کر دی اور پھر اچانک اس علاقے کے بیچ میں سے گزرتا ہوا جسے آج کل قزاقستان کہتے ہیں کوہ یورال اور والگا کے طاس تک بڑھتا چلا گیا ۔ اس پیش قدمی کے دوران میں اس نے قزاقستان کے علاقے اُولُو تاو Ulu Tav میں قُرساک بے کے مقام پر ترکی زبان میں ایک کتبہ نصب کرایا، جو اویغوری رسم خط میں لکھا ہوا حال کے زمانے تک موجود تھا اور پڑھا جا سکتا تھا ۔ ۱۸ جون کو جنوبی یورال کے پہاڑوں میں دریائے قُندُزْجہ کے کنارے، اُس مقام پر جو

اب ساماره Samara [یا Kaibyshak، اینسائکلوپیڈیا برٹینیکا، ۱۹۵۰ء، نقشہ ۵۹، قازان کے جنوب مشرق میں] کہلاتا ہے اس کا تصادم تُقْتَمِش سے ہوا ۔ تیمور نے اسے شکست فاش دی اور یہاں کے تمام قلعے اور استحکامات تباہ کر ڈالے ۔ ''اوردوے زرّین'' کے مذکورۂ بالا خان تیمور قُتْلُق نے اپنے سب سے بڑے پشتی‌بان ایدگو کے ساتھ مل کر، جو قبیلۂ منْگیت [یا مانگْقوت] کا سردار تھا، اس مہمّ میں حصّہ لیا ۔ لیکن اُزبک قبائل کی بربادی انھیں پسند نہیں آئی ۔ اس مہمّ میں تیمور نے بہت سے آدمیوں کو قیدی بنایا ۔ اس کے بعد تیمور سمرقند آ گیا اور ان قبیلوں کو اس نے وہیں آباد کر دیا .

اُس خط میں جو تیمور نے ۱۳۹۰ء میں آذربایجان سے عثمان اوغلو یِلْدرِم بایزید کو لکھا تھا تحریر ہے (اور ایسا ھی تاریخ کی کتابوں میں درج ہے) کہ تیمور کے خیال میں مشرقی ایران اور ہندوستان کا سرحدّی علاقہ اُسی طرح چغتائی بلاد کا غیرمنفکّ حصّہ تھا جس طرح اس سے سو سال پہلے چغتائی فرمانروا بَراق خان نے، جس نے ھلاگو کے بیٹے آباقا [۶۶۳ھ/ ۱۲۶۵ء تا ۶۸۰ھ/۱۲۸۲ء، قبّ جامع‌التواریخ] سے جنگ کی تھی، ایران کے متعلّق کہا تھا ۔ تیمور اپنی پہلی ''یورشِ سہ سالہ'' کے دوران ھی میں ان ایلخانی علاقوں کو اپنی عملداری میں شامل کر لیتا مگر تُقْتَمِش نے یہ بات نہ ہونے دی اور تیمور کو مجبوراً ''اوردوے زرین'' کے خلاف فوج کشی کرنا پڑی، جو بصورت دیگر غیرضروری تھی؛ چنانچہ اپنے اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے ایک علیحدہ ''یورشِ پنج سالہ'' کا منصوبہ تیّار کیا .

اُس نے اس مہمّ کا آغاز ۳۱ جولائی ۱۳۹۲ء کو کیا ۔ آذربایجان سے روانہ ہوکر وہ پورے قفقاز کو طے کر کے گرجستان اور ارمینیا پہنچا اور ان پر قبضہ کر لیا ۔ ۱۳۹۳ء میں اس نے آلِ مظفّر کا خاتمہ کر کے علاقۂ فارس کو پوری طرح تسخیر کر لیا اور اپنے بیٹے عمر شیخ کو وہاں گورنر بنا دیا [یزدی، ۱ : ۶۱۷ ببعد] ۔ بغداد پر فوج کشی کر کے اُس نے بغداد کو بھی فتح کر لیا ۔ سلطان احمد جلائر نے مصر کے فرمان‌روا ملک الظاھر بِرْقوق کے ھاں پناہ لی اور دمشق چلا آیا ۔ یہاں آ کر اس نے اور قرہ قویونلو ترکمانوں کے سردار قرا یوسف نے مل کر کوشش کی کہ مصر سے استانبول تک ایشیاے کوچک کے تمام فرمانرواؤں کو تیمور کے خلاف متّحد کر لیا جائے ۔ اس امر کا سدّ باب کرنے کے لیے تیمور نے ماردِین، دیارِ بکر اور اِرْزنجان کے ترک فرمانرواؤں کو اطاعت پر مجبور کیا، جن کے علاقے ایلخانی مملکت کے مغربی حصّے میں واقع تھے ۔ مصر کے مملوک فرمانروا بِرْقوق کا ارادہ یہ تھا کہ وہ دنیا بھر میں اعلان کر دے کہ تیمور کے ساتھ اس کی دشمنی کبھی ختم نہیں ہو سکتی؛ چنانچہ اس نے تیمور کی بھیجی ہوئی ایک سِفارت کو، جس میں بعض اہمّ علماء شامل تھے، قتل کروا دیا ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے آلْتین اوردو (اوردوے زرّین) کے سردار تُقْتَمِش کے ساتھ رشتۂ اتّحاد استوار کرنے کی تجویز پر عملدرآمد شروع کر دیا ۔ تُقْتَمِش آذربایجان جانے کے لیے تیّار تھا ۔ فروری ۱۳۹۵ء میں تیمور نے شیروان سے جو خط بایزید کو لکھا تھا اس میں اس نے بڑی تفصیل سے اپنے اس فیصلے کا ذکر کیا تھا کہ وہ بِرْقوق کے خلاف، جس نے اس کے سفیروں کو قتل کروا دیا تھا، فوج کشی کرے گا ۔ لیکن اگر اسے یقین ہو گیا کہ تقتمش صلح کی جو کوششیں کر رہا ہے وہ محض فریب ہیں، (اس لیے کہ وہ ''اوردوے زرّین'' کی سرحد پر تیمور کی فوجوں کی موجودگی کو شک و شبھہ کی نظر سے دیکھتا

تھا،) تو وہ بِرقُوق سے پہلے تُقتَمِش پر حملہ آور ہوگا۔ تقتمش اصل میں فرنگیوں کی مدد پر بھروسا کر رہا تھا؛ اُسے اُن سے مالی امداد ملتی تھی اور اُس کے عوض وہ دنیاے اسلام کے خلاف ان کے جاسوس کی حیثیت سے کام کر رہا تھا ۔ چنانچہ اس لیے جہاد کرنا ایک طرح کا مذہبی فریضہ تھا ۔ فرنگیوں کے نام سے جو مسیحی اقوام متحد تھیں ان میں لِتھوانی Lithuanians ، لِہستانی (پول) اور روسی شامل تھے اور ان کا مستقر مشرقی یورپ میں دریاے دْنِیپَر Dnieper [ترکوں کا 'اُوزِی' اور تاتاروں کا ''اکشی صُو'] کے کنارے واقع تھا ۔ تیمور نے اپنے مذکور بالا خط میں بالتّفصیل لکھا تھا کہ اگر مہمّ شروع کی گئی تو یہ ضروری ہوگا کہ بایزید علاقۂ بلقان Balkans سے ہوتا ہوا تیمور سے آملے تا کہ وہ دونوں اپنے متّحدہ لشکر سے فرنگیوں کا قلع قمع کر سکیں ۔ جب تیمور کو اس بات کا پتا چلا کہ تُقتَمِش نے جو سفارت اس کے پاس اس مقصد سے بھیجی ہے کہ اس کی بیٹیوں کی شادی تیمور کے بیٹوں سے ہو جائے وہ ایک چال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تو اس نے فوراً عملی اقدامات کا فیصلہ کر لیا ۔ اسی سال (۱۳۹۵ء) ۲ اپریل کو جو لڑائی دربند کے شمال میں دریاے تِرِک the Terek کے کنارے ہوئی اس میں تُقتَمِش نے شکست کھائی ۔ اس کے بعد تیمور نے اس علاقے کے تمام استحکامات اور بالخصوص شہرہاے استرخان اور سراے کے استحکامات، جو تُقتَمِش کے لیے فوجی صدر کیمپ کی حیثیت رکھتے تھے، تباہ و برباد کر ڈالے ۔ اس مہمّ کے دوران میں تیمور نے جو خط ایشیاے کوچک کی مملکت مَلْطِیّۃ کے فرمانروا امیر یلمان Yalman کو لکھا تھا اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی فوجیں بڑھتے بڑھتے [علاقۂ] قازان کے اس مقام تک پہنچ گئی تھیں جہاں دریاے والگا [اِتِل] اور کامَہ Kama کا سنگھم ہے ۔ یہاں سے آگے بڑھ کر وہ کِیف Kieve پہنچا، جو آج کل یوکْرِیْن (= مِنگرْمان) کا دارالحکومت ہے اور پھر وہاں سے چل کر روس کے اندرونی علاقے سے گزرتا ہوا موسکو تک پہنچ گیا اور اس کا محاصرہ کر لیا ۔ اس کے علاوہ اس نے روس کے متعدّد شہر جلا کر تباہ کر دیے ۔ اس نے ان روسی فوجوں کو بھی جو تُقتَمِش کے لشکر میں شامل تھیں تباہ و برباد کر دیا ۔ بایزید کو اس مہمّ میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ یا تو اس لیے کہ وہ یونان کو فتح کرنے میں مصروف تھا یا کسی اَور وجہ سے اس میں شریک نہیں ہوا ۔ اس سال سردیاں وقت سے کچھ پہلے شروع ہو گئیں ۔ تیمور نے اپنی فوج جنوب کی طرف پیچھے ہٹا لی اور اس نے آزاق کو، جو دریاے آزاق کے دھانے پر آباد تھا اور جینویوں Genoese کو، جو جزیرہ‌نماے قریم کے شہر کَفّہ پر متصرّف تھے، تباہ کر دیا [نظامی شامی، ۱ : ۱۶۱] ۔ اس کے بعد وہ علاقۂ بَلْجِیمَن میں، یعنی اس نواح میں جہاں آج کل شہر وَلاڈِی قفقاز Valadi Kafkas ہے، داخل ہوا اور یہاں کے وہ تمام قلعے مسمار کر دیے جو تُقتَمِش کے لیے مرکز کا کام دیتے تھے یا دے سکتے تھے اور اس طرح وہاں کے تمام قبیلوں کو مطیع کر لیا ۔ اس نے بہت سے غیر مسلم قبیلوں کو بجبر مسلمان بنایا ۔ ۱۳۹۶ء کے موسم بہار میں اس نے آذربایجان کا رخ کیا ۔ رمضان کے مہینے میں وہ نہاوند پہنچا اور ہَمَدان کے مقام پر عید منانے کے بعد ایران کے مختلف حصّوں پر حکومت کرنے کے لیے والی مقرّر کیے ۔ اسی زمانے میں یزد میں بغاوت کے آثار پیدا ہوے لیکن اُس نے بغاوت کو بڑی سختی اور سفّاکی سے کچل ڈالا ۔ اس موقع پر فارس کے تیس ہزار باشندے قتل ہوے [؟ قبَ یزدی، ۱ : ۷۹۰] ۔

بغاوت میں حصّہ لینے والوں میں سے کچھ کو نذرِ آتش کر دیا گیا، لیکن جن لوگوں نے اس بغاوت میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا ان کے ساتھ تیمور بڑی نرمی اور رحم دلی کے ساتھ پیش آیا اور اس نے ان کے وہ سب واجبات معاف کر دیے جو وہ بغاوت کی وجہ سے ادا نہیں کر سکتے تھے - ۱۸ اگست کو وہ ہمْدان سے کوچ کر کے سلطانیہ آیا اور وہاں سے سمرقند روانہ ہوا.

یہ مہمّ سرانجام دینے کے بعد تیمور نے سمرقند میں بڑا شاندار جشن منایا اور اعلان کیا کہ دارالحکومت کے تمام باشندوں کے تین سال کے تمام ٹیکس معاف کر دیے گئے - جن لوگوں نے اس کی عدم موجودگی میں لوگوں کو ستایا اور مظالم کا نشانہ بنایا تھا اُس نے اُن سب کو موت کی سزا دی اور غریبوں اور ناداروں میں کپڑے اور مال اسباب تقسیم کروایا.

تسخیرِ ایران کے بعد تیمور کا ارادہ تھا کہ وہ چین جائے اور چِنْگِزی شہزادوں کو ان کا چھنا ہوا حق واپس دلائے - ان شہزادوں کو ایک بغاوتِ عظیم کے دوران میں چین سے باہر نکال دیا گیا تھا - تیمور چغتائی قوم کا فرماں‌روا بنا تو اس کا اعلان ۱۳۷۰ء میں بلخ سے کیا گیا - چین کی مذکورۂ بالا بغاوت اس سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی - ان چِنگزیوں میں سے بعض نے چین سے نکالے جانے کے بعد تیمور کے دامن میں پناہ لی تھی اور وہ ان کی کفالت کرتا تھا - اب تیمور کا خیال تھا کہ ان کی حفاظت کرنے اور انھیں اُن کا حق دلانے کے ضمن میں وہ مشرقی ترکستان اور منگولیا پر قابض ہو کر اس تمام علاقے کو مسلمان بنا سکتا ھے - پناہ گزین چِنگِزی — بلاشبھہ تیمور کے زیرِ اثر — اسلام قبول کر چکے تھے لیکن اس مہمّ کا آغاز کرنے سے پہلے ہندوستان پر فوج کشی ضروری تھی [قبّ نظامی شامی، ۱ : ۱۷۰؛ یزدی، ۱ : ۱۵] - اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض واقعات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ اُس کی مملکت کی وہ سرحد جو ملتان اور کابل کے مقامات پر ہندوستان سے ملتی تھی زیادہ مضبوط نہیں تھی - تیمور نے اپنے پوتے پیر محمّد بن جہانگیر میرزا کو [۷۹۴ھ/ ۱۳۹۲ء میں ثُغُورِ ہند کا والی مقرر کیا تھا، جس کا صدر مقام قندھار تھا اور اپنے چند امراء بھی اس کے ساتھ کر دیے تھے، مثلاً بَرْلاس قبیلے کے امراء، سیفُل، محمّد دِرْوِیش، بِہلُول [پسر محمّد دِرْوِیش] اور قُماری اِیناق، اور قبیلۂ دوغلات کا امیر قطب‌الدین اور نایمان قبیلے کا امیر تِمُور خواجہ آقبوغا [قبّ یزدی، ۱ : ۵۵۸؛ ۲ : ۱۴] - ان امراء نے فوج میں جو سپاھی بھرتی کیے وہ اپنے اپنے قبائل ھی سے لیے، چنانچہ پیر محمّد کی فوج کی اساس انھیں مختلف قبیلوں کے لوگوں پر قائم تھی - اُس علاقے کی حکومت پیر محمّد کے سپرد کرتے ہوے، جو آج کل افغانستان کہلاتا ھے، تیمور نے کہا تھا : ''میں صرف کابل، قندھار اور زابُل ھی نہیں بلکہ وہ تمام علاقے تمھارے حوالے کر رہا ہوں جو محمود غزنوی نے فتح کیے تھے : [''ممالکِ سلطان محمودِ غازی''، یزدی، ۱ : ۵۵۸] - کہا جاتا ھے، کہ عہدِ شاہ رُخ میں ان نایمانوں اور ارغونیوں نے، جو ایک ھی قبیلے کے سردار تھے، علاقۂ سندھ کی حکومت میں، جہاں کا والی شاہ رخ کا بیٹا [سِیُورْغَتْمِش میرزا] تھا، بڑا اھمّ کردار ادا کیا [اعمالِ ہند و سندھ (سِیُورْغَتْمِش) کو ۸۲۱ھ میں تفویض ہوے؛ مطلع سعدین، طبع لاہور، ص ۳۷۶] اور یہ کہ جب یہ علاقے پیر محمّد کی عملداری میں شامل ہوے تو یہاں کی حکومت تیمور نے انھیں سرداروں کے سپرد کی [اضلاعِ پنجاب و سندھ سے تیموریوں کے ابتدائی تعلّق کے متعلّق دیکھیے مطلع سعدین،

طبع لاھور، ص ۱۴۷۰، تعلیقه بر ص ۴۰۷؛ س ۱۲؛ و یحیی سرھندی : تاریخ مبارکشاھی، کلکته ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۱ ۲]۔ سلطان دھلی سلطان محمود کی کمزوری اور تذبذب سے فائدہ اٹھا کر مُلّو خان افغان اور اس کا بھائی سارنگ ھندوستان کے اسلامی علاقے پر قبضه جما چکے تھے مگر دوسرے افغان ان کا اقتدار تسلیم کرنے کو تیّار نه تھے ۔ انھوں نے اُن ترکی قبیلوں پر حمله کر دیا جن کی پشتی بانی پر تغلقوں کو اعتماد تھا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ اکثریّت سے قریب تر ھوتے گئے ۔ کتب مآخذ سے جو معلومات فراھم ھوتی ھیں ان سے پتا چلتا ھے کہ ان حالات کا نتیجه یه تھا که غیر مُسلم اکثریّت کے علاقے میں مسلم اقلیّت کی حالت روز بروز بدتر ھوتی جا رھی تھی اور محض اسی بات کو تیمور کی ھندوستان پر فوج کشی کا کافی جواز قرار دیا جا سکتا ھے ۔ غیاث الدین علی [قب روزنامه، ۳۴ تا ۳۶] کا بیان ھے که امیر تیمور کے نزدیک دھلی کے مسلمانوں کا مشرك قوم کی اکثریّت میں گھرا رھنا اُس کی اپنی سلطنت کے لیے خطرے کا باعث تھا ۔ اسی بنا پر اس نے غیر مُسلم اکثریّت کو مٹا کر اس خطرے سے نجات حاصل کرنے کا فیصله کیا ۔ پیر محمّد نے مذکورۂ بالا سرداروں کو ساتھ لے کر پہلے افغان قبیلے سلیمان خیل کو تاخت و تاراج کیا اور پھر سندھ میں پہنچ کر علاقۂ اُچّه اور تلنبه کو تسخیر کر لیا ۔ لیکن مُلّو خان کا بھائی، جو ملتان کا حاکم تھا، چھے مہینے تک اس کا مقابله کرتا رھا؛ بالآخر وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا؛ لیکن افغان امراء کا مقامی کافر باشندوں کی مدد سے اتنی مدّت تک مقابلے پر جما رھنا تیمور اور پیر محمّد کو سخت ناگوار گزرا اور اس لیے تیمور کے لیے یه ممکن نہیں تھا که وہ جب تک ولایات ھند کو پوری طرح اپنا مطیع نه بنا لے چین پر حمله کرے ۔ ھر جگه اس بات کا ذکر ملتا ھے که اس مہم میں تیمور محمود غزنوی اور چغتائی خان ترمه شرین [بن دُوا] کے قدم به قدم چل رھا تھا ۔ لیکن اس کی حکمت عملی اس لحاظ سے ان دونوں بادشاھوں سے مختلف تھی که اس نے اوّل تو اسلام کی تبلیغ میں قوّت سے کام لیا اور دوسرے سرحدّوں پر ترک قبیلوں کو آباد کیا تا که حاکم عنصر کو آبادی میں اکثریّت حاصل ھو جائے ۔

مارچ ۱۳۹۸ء کے آخر میں تیمور سمرقند سے روانه ھوا [اور یکم ذی الحجّة ۸۰۰ھ / ۱۵ اگست ۱۳۹۸ء کو] کابل کے علاقے میں پہنچ کر اپنی عظیم الشان فوجیں پہاڑی راستوں سے روانه کیں اور دفعةً کافرستان پر چڑھائی کر دی، جہاں کے لوگ اب تک غیر مسلم تھے ۔ اس علاقے میں تیمور نے ایک سنگین کتبے پر اس غزوۂ نامدار کا حال بیان کیا اور تاریخ [رمضان ۸۰۰ھ] اُس پر لکھی، تاکه لوگ کتبے کو دیدۂ عبرت سے مطالعه کریں اور صاحب قران کے اقتدار کا کچھ حال معلوم کریں؛ اس لیے که مقامی روایت کے مطابق کسی بادشاہ نے یه علاقه فتح نہیں کیا تھا؛ یزدی، ۲ : ۲۵ ۔ [قلب کافرستان میں ایک قلعه ھے، جسے قلعۂ کَام کہتے ھیں، اس کے دروازے پر امیر عبدالرحمٰن خان کے کافرستان فتح کرنے کے اثناء (یعنی ۱۸۹۶ء) میں ایک پتھر ملا جس پر اس قسم کا کتبه موجود پایا گیا ۔ اُسی پتھر پر امیر مذکور کے ایک فوجی افسر نے ۱۸۹۶ء میں امیر کے کافرستان فتح کرنے کا ذکر بھی کنده کر دیا، دیکھیے تزك عبدالرحمانی (اردو ترجمه)، آگرہ ۱۹۰۲ء، ۲۸۹ ۔ وھاں سے تیمور ھندوکش کے راستے پنجھیر میں پہنچا اور جلگاہ باران میں مقام کیا، دیکھیے بابر نامه، ترجمۂ بیورج Beveridge، ۲ : ۲۰۳، ۲۰۲، تعلیقۂ ۳، جہاں باران کو صرف ایک رُود بتایا ھے۔ تیمور نے امیروں اور لشکریوں کو حکم دے کر دریائے غُربان (غوربند؟) سے، جو وھاں جاری ھے،

پانچ فرسخ لمبی نہر کھدوائی اور چند بڑے گاؤں اس نہر کی وجہ سے، جسے جوی ماہی گیر کہتے ہیں، آباد ہو گئے؛ یزدی، ۲ : ۳۲؛ قب بابرنامہ، ترجمۂ بیورج، ۲ : ۲۲۵ - جہاں اسی نواح میں دریاے باران کی ماہی گیری کا ذکر آیا ہے اور جو علاقہ اب تک بنجر اور ویران چلا آتا تھا باغوں اور سرسبز کھیتوں سے مالا مال ہو گیا - تیمور نے یہاں ازبک اور قپچاق قبائل کو آباد کیا، جنھیں اس نے مہم دشت قپچاق کے بعد ملک بدر کر کے علاقۂ سمرقند کی طرف بھیج دیا تھا - یہ اُزبک اس سے پہلے یُوکْرینْ Ukraine کے علاقۂ کیف میں آباد تھے اور ان کی تعداد چار سو کنبے تھی - ان لوگوں کو اس نہر کے کنارے اپنے پرانے سردار بِک یاریق اوغلان کے تحت اور اسی طرح قپچاق کو ان کے قدیم سردار شیخ حسن بک کے زیر حکومت بسایا گیا [بابر نامہ، ترجمۂ مذکورۂ بالا، ۲ : ۲۱۵ پر ترک اور مغول ایماقوں کے لیے نواح باران کے مرجع و مأوی ہونے کا ذکر آیا ہے مگر تعجب ہے کہ بابر اس سلسلے میں تیمور کا ذکر نہیں کرتا] - قیام کابل کے دوران میں تیمور نے تمور قتلق خان اور اِیدگو بک کے سفیروں کو، جنھیں اس نے ''اوردوے زرّین'' میں اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا، شرف باریابی بخشا - اس کے علاوہ تیمور کے پوتے محمّد سلطان میرزا کے سفیر بھی پیش ہوے - محمّد سلطان میرزا کو تیمور نے منگولیا اور چینی سرحدّوں پر حکومت کرنے کے لیے بھیجا تھا - اسی طرح کاشغر کے حکمرانوں کے سفیر بھی اس کی خدمت میں پیش ہوے - یہاں سے اس نے اپنے لشکر کے مَیسرے کی کمان سلطان محمود خان کے سپرد کر کے اسے بہت سے دوسرے سرداروں کے ساتھ دھلی کی جانب روانہ کیا، [ان سرداروں کی فہرست کے لیے دیکھیے روزنامہ، ص ۷۹ ببعد؛ یزدی ۲ : ۳۶ ببعد] اور اپنے باقی لشکر کو لے کر اُس نے خود ملتان کی طرف کوچ کر دیا - یہ دونوں فوجیں دھلی کے شمال میں پُلِ کُوپلہ پر یکجا ہو گئیں، [روز نامہ، ص ۹۷؛ یزدی، ۲ : ۸۲ اور ایلیٹ : *History of India* etc.، ۳ : ۴۹۳ - یہ قدیم پل دریاے گھگر پر اور سامانہ اور کیتھل کے درمیان واقع تھا - ۱۲ محرم ۸۰۱ھ / ۲۴ ستمبر ۱۳۹۸ء] کو تیمور نے دریاے سندھ [دین کوٹ سے — راورٹی : *Tab. Nāsiri*، ص ۲۹۱] عبور کیا اور اس صحرا [چُول جَرد] میں پہنچا، جو جلال الدین خوارزم شاہ کے نام پر ''چُول جلالی'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا [چول جلالی کا محلِّ وقوع *Memoir of a Map of India* : Rennel، لنڈن ۱۷۹۲ء، ص ۱۱٦ و نقشہ مقابل ص ۴٦ میں اُس مقام سے اوپر بتایا ہے جہاں دریاے سَوان دریاے سندھ میں گرتا ہے مگر یہ درست نہیں - دین کوٹ کے مقابل دریا کے مشرقی کنارے کے متّصل یعنی علاقۂ میانوالی میں یہ چول ہوگی] - راستے میں چغتائی رسم کے مطابق اس نے اِیریاب کا قلعہ دوبارہ تعمیر کرایا اور مسجدیں اور مفاد عامّہ کی دوسری عمارتیں بنوائیں [یزدی، ۲ : ۳۹] - ۷ اکتوبر کو وہ جہلم اور چناب کے سنگھم کے پاس پہنچا اور اس جگہ چغتائی خان تَرمَہ شَرین کی اَن لڑائیوں کی یاد تازہ ہوئی جو یہاں لڑی گئی تھیں - [۱۲] اکتوبر کو وہ تلمی [تلنبہ] کے قلعے پر پہنچا - اس پر پیر محمّد میرزا نے قبضہ کر لیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد یہاں بغاوت ہوئی اور [شہر] تباہ و برباد کر دیا گیا - [۲۰] اکتوبر کو دریاے بیاس پر پہنچ کر تیمور کو پتا چلا کہ [جنید بورلدای اور اس کا بھائی بایزید اور محمّد درویش طایخانی، جو مغول تھے،] ۱۳۸۸ء کی مہم خوارزم کے زمانے میں اس کی اطاعت قبول کرنے کے بجاے بلخ سے یہاں بھاگ آئے تھے، اس وقت انھوں نے حکومت دھلی سے علیحدگی اختیار کر کے پیر محمّد کی ملازمت کر لی ہے [وہ دریاے بیاس کے کنارے پیش ہوے - تیمور نے چوبِ یاساق سے

انھیں سزا دی اور معاف کر دیا، یزدی، ۲ : ۶۰
بعد]۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان فتح
کر لینے کے بعد تیمور کی فوج نے ان مقامات کا رخ
کیا تھا [جو لاہور کے جنوب اور جنوب مشرق میں
ہیں]۔ چونکہ اجودھن کے سب باشندے مسلمان
تھے اس لیے تیمور نے انھیں کوئی تکلیف نہیں
پہنچائی۔ ۱۱ [دسمبر] کو وہ جمنا کے کنارے [قصر]
جہان نمای کے سامنے پہنچا، جسے فیروز شاہ تغلق نے
تعمیر کرایا تھا۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر
ہے کہ تیمور نے اس تغلقی محلّ کے نام پر اپنے
ایک کوشک یا محلّ کا نام جہان نما رکھا، جو
اس نے سمرقند میں قرا تپہ کے مقام پر تعمیر کرایا
تھا۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب
تیمور نے قرا تپہ کا محلّ بنوایا تو اس کے تصوّر میں
دلّی کا نقشہ موجود تھا۔ اسی طرح اس سے پہلے بھی
وہ اپنے بسائے ہوے محلّوں کو تبریز، دمشق اور
بغداد جیسے شہروں کے نام سے موسوم کر چکا تھا۔
تیمور نے سلطان محمود خان کو اپنے میسرے کے
ساتھ پہلے روانہ کر دیا تھا۔ اس فوج کے ساتھ وہ
پُل کوپلہ پر آ ملا اور اس کے بعد اس نے ملّوخان
سے لڑنے کی تیّاریاں شروع کر دیں۔ جن غیر
مسلموں کو تیمور نے راستے کے قلعوں سے جمع کیا
تھا وہ سب بحالتِ اسیری اس کے لشکر میں موجود
تھے۔ جب ملّوخان کی فوجیں، گھوڑوں پر سوار،
دلّی سے نکلیں تو ان قیدیوں نے بے اختیار مسرّت کا
اظہار کیا۔ اس سے تیمور پر یہ بات واضح
ہو گئی کہ ہندوستان کے مشرکین افغانوں کو
اپنا ہی سمجھتے ہیں اور ملّوخان اور سارنگ
یہاں کے غیر مسلم باشندوں پر بھروسا کر سکتے ہیں۔
ان حالات کے پیشِ نظر اُس کے نزدیک ایک لاکھ سے
زیادہ قیدیوں کو فوج میں رکھنا دانشمندی کے بغایت
خلاف تھا، چنانچہ اُس نے اُن سب کو قتل کروا دیا۔
دلّی کی لڑائی میں شکست کھا کر ملّوخان بھاگ
نکلا اور .... تیمور شہر میں داخل ہوا۔
[شہر دلّی میں لوٹ مار کرنے اور شہر والوں کو
قتل اور قید کرنے کے متعلّق تیمور نے علماء سے فتوی
طلب کیا تھا۔ اس استفتاء اور علماء کے فتوے کے متن
کے لیے دیکھیے محمد جعفر تھانیسری: تواریخ عجیبہ،
طبع دوم، ساڈھورہ بدون تاریخ، ص ۲۲۹]۔ پندرہ دن
دلّی میں گذارنے کے بعد تیمور نے دریاے جمنا کو عبور
کیا [اور موضع کتہ (کتّہ روزنامہ، ۲ : ۲۰۳) میں پہنچا
پھر باغ پت وغیرہ سے ہوتا ہوا ۸ جنوری ۱۳۹۹ء کو
میرٹھ پہنچا] اور قلعۂ میرٹھ کے سب گبروں کو بھی
اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا (۹ جنوری ۱۳۹۹ء)۔
یہاں [پہنچنے سے پہلے اُسے اہلِ قلعہ کی طرف سے
یاد دلایا گیا تھا] کہ ترمہ شرین خان یہاں تک
آیا تھا لیکن اس قلعے کو تسخیر نہیں کر سکا تھا۔
اس کے بعد تیمور نے کوہ ہمالیہ کے دامن کے راجاؤں
کو مغلوب کیا۔ کشمیر کی سرحد پر [دریاے جہلم
سے چار کروہ ورے] جہان [روزنامہ، ۱۸۹، یا جُبہان
قب یزدی، ۲ : ۱۷۷] پہنچنے کے بعد وہ سمرقند
لوٹنے کی تیاریوں کی طرف متوجّہ ہوا۔ دلّی یا ملتان
میں تیمور نے اپنے چغتائی حاکم مقرّر نہیں کیے،
بلکہ وہاں اس نے تغلق حکّام میں سے ان لوگوں کا
تقرّر کیا جنھوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔
اس نے ملتان میں اپنی فوج کا صرف ایک حصّہ
چھوڑنا کافی سمجھا۔ ایریاب اور شنوزان کے قلعوں
کی حکمرانی اس نے قپچاق سرداروں کو سونپی۔
تیمور نے کابل کے استحکامات کی مرمّت کرائی اور
وہاں پیر محمّد کے دربار کے ایک امیر، نصرت قماری،
ایک جوچی شہزادے، یک یاریق اوغلانی اور
دو دوسرے شہزادوں کو فوجی گورنر مقرّر کیا۔
آخرِ مارچ میں کابل سے روانہ ہو کر [۲۲ شعبان ۸۰۱/
۲۹ اپریل ۱۳۹۹ء] کو وہ سمرقند پہنچ گیا۔

ہندوستان میں اس کے بہت سے کام ادھورے رہ گئے تھے لیکن ان کاموں کو ادھورا چھوڑنے اور اس جلدی میں سمرقند لوٹنے کے بعض اسباب تھے ۔ ابھی دلّی کی فتح کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ایشیاے کوچک سے بُری بُری خبریں آنا شروع ہو گئیں ۔ احمد جلائر اور بایزید یِلدرِم باہم متّحد ہو گئے تھے ۔ مصر کے مملوک فرمانروا فَرَج نے، جو بُرقُوق کے فوت ہونے کے بعد اس کا جانشین بنا، تیمور کے خلاف عملی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں اور اس کے اپنے بیٹے میران شاہ نے، جسے اُس نے آذربایجان کا والی مقرر کیا تھا، بد اطواری اختیار کر رکھی تھی ۔ تیمور کو ان سب باتوں کی اطلاع مل گئی اور وہ اپنی ہندوستانی مہمّ کو قبل از وقت ختم کرنے پر مجبور ہو گیا، لیکن اس کے تمام خیالات منگولیا اور چین پر مرکوز تھے ۔ اس نے افغان [امیر] سارنگ کو، جو ملتان کا والی تھا، قید کر کے سمرقند کے راستے اپنے پوتے محمّد سلطان مرزا کے پاس بھیج دیا، جو ان دنوں منگولی سرحد کا حاکم تھا ۔ تیمور کا ارادہ یہ تھا کہ ہندوستان میں پکڑے ہوے قیدیوں سے چین کی مہمّ میں اسی طرح کام لیا جائے جس طرح ''اوردوے زرین'' میں گرفتار شدہ اسیروں سے ہندی مہمّ میں کام لیا گیا تھا ۔ اس مہمّ کے شروع ہونے سے پہلے قایزی اوغلان چُنگِزی منگولیا [مغولستان] سے بھاگ کر پناہ لینے کے لیے [کابل میں] تیمور کے پاس چلا آیا تھا اور ہندی مہمّ میں اس کے ساتھ ہی رہا تھا [یزدی، ۲ : ۳۴؛ روزنامہ، ص ۵۶ ببعد] ۔ تیمور اس کی بڑی عزّت کرتا تھا اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا تھا جیسا آزاد ملک کے حکمران کے ساتھ ہونا چاہیے ۔ اس نے اسے ''اولوغ یورت'' یعنی چین و منگولیا کا علاقہ دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ سلطان محمود خان کی طرح، جو پہلے ہی سے تیمور کے ساتھ تھا، قایزی اوغلان مذکور کا تعلق بھی اُوگدای خان [Ügeday Han] کے خاندان سے تھا ۔ ہندوستان سے واپسی پر تیمور قایزی اوغلان کو اپنے ساتھ سمرقند لے گیا .

ایشیاے کوچک میں اس وقت جو ناسازگار حالات پیدا ہو گئے تھے ان حالات سے مجبور ہو کر تیمور کو ایک بار پھر اُس طرف کوچ کرنا پڑا ۔ اس مہمّ میں اسے اپنے اندازے سے کہیں زیادہ وقت صرف کرنا پڑا [قبّ یزدی، ۲ : ۲۰۷] ۔ وہ وہاں پورے چھے سال مقیم رہا ۔ صرف چار مہینے سمرقند میں رہ کر وہ [۱۰] ستمبر ۱۳۹۹ء کو ایک بار پھر روانہ ہوا ۔ ایشیاے کوچک میں اپنی مہمّات کے دوران میں تیمور کا دستور یہ تھا کہ وہ موسم سرما آذربایجان میں اور موسم گرما اس علاقے میں یا مشرقی اناطولیہ کے بلند پہاڑوں میں بسر کیا کرتا تھا ۔ آذربایجان پہنچتے ہی اس کا پہلا کام یہ تھا کہ میران شاہ کی طرف توجّہ کرے، جو عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا اور اُن لوگوں کو سزا دے جو اُسے اِس قسم کی زندگی بسر کرنے کی طرف مائل کر رہے تھے ۔ سب سے زیادہ سزا اس نے مرزا کے دربار کے شاعروں، اہلِ ساز، گویّوں اور اُس کے ان رفیقوں کو دی جو اس کے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے [مثلاً محمّد قُہِستانی، قطب الدین نایی، حبیب عودی، عبدالمؤمن گوینده ۔ انھیں سولی پر چڑھایا گیا؛ یزدی، ۲ : ۲۱۴] ۔ جن دنوں تیمور آذربایجان میں تھا اس کے پوتے اسکندر میرزا والیِ فرغانہ نے کاشغر کی طرف کے علاقے فتح کیے اور اس طرح تیمور کی سلطنت کو وسعت دی ۔ تیمور نے اپنے چند امراء کو اس غرض سے یِدی صُو کی طرف روانہ کیا کہ وہ چین کو جانے والی شاہراہ پر فوجی مورچے تعمیر کریں اور زرعی اراضی کو ترقّی دیں تاکہ لشکروں کو وہاں سے خوراک بہم پہنچ سکے ۔ ان امراء کا سربراہ امیر اللہداد تھا ۔ نقشے تیار کرنے کا کام

بھی اس کے سپرد کیا گیا، تاکہ سہمّ کے دوران میں
ان سے مدد ملے ۔ [محرم ۸۰۳ھ/] اگست ۱۴۰۰ء میں
تیمور گرجستان سے روانہ ہو کر سیواس آیا اور
وہاں سے مَلطِیّہ، حَلَب، حَماۃ، حِمص اور بَعْلَبَک
ہوتا ہوا شام پہنچا اور دمشق پر قبضہ کر لیا ۔ تیمور نے
مصر کے مملوک فرمانروا فَرَج کو بھی شکست دی،
حالانکہ فَرَج کے پاس توپیں بھی تھیں اور بہت بڑا
لشکر بھی ۔ مازندران اور طبرستان جیسے علاقوں میں،
جہاں کے باشندے شیعہ تھے، تیمور نے ایک کٹّر سنّی
ہونے کا ثبوت دیا ۔ اس کے برعکس دمشق میں، جہاں
کے باشندے راسخ العقیدہ سنّی تھے اور انھوں نے
شیعوں کے مقدّس مقامات پر حملہ کیا تھا، تیمور کا
طرزِ عمل ایک کٹّر شیعہ کا سا تھا ۔ تیمور دونوں فرقوں
کا احترام کرتا تھا لیکن خود ایک درمیانی راستے
پر چلتا تھا ۔ گو وہ عقیدے کے اعتبار سے پکّا سنّی
تھا دمشق میں اس کا طرزِ عمل شیعوں کا سا
معلوم ہوتا ہے [اس سلسلے میں دیکھیے ابن عربشاہ،
ص قعح (=۱۷۸): ''ھُوَ شیعیٌ'' (قولِ قائل بحضور
تیمور) و فریدون بک: مُنشآت، ۱ : ۱۳۱،
س ۲۰ : ''اعتقاد بمذهب اهلِ سنّت و جماعت
داشتن ما اظهر من الشمس است'' (قولِ تیمور)] ۔ دمشق
میں تیمور نے [دو حرمهای رسولؐ کے مزاروں پر سنگ
سفید کے قبے بنوائے؛ یزدی، ۲ : ۳۳۶] ۔ یہیں اس نے
[مشہور] وقائع نگار ابن خَلْدُون کو باریابی کا شرف
بخشا ۔ تیمور اور ابن خلدون کے درمیان بڑی
پُر لطف گفتگو ہوئی، جس کا ذکر ابن خلدون نے اپنے
سیاحت نامے [دیکھیے التعریف بابن خلدون . . . . و
رحلته الخ] میں بڑی تفصیل سے کیا ہے ۔ دمشق
سے تیمور عراق کی طرف چلا اور [۲۷ ذی القعدۃ
۸۰۳ھ / ۲۹] جولائی ۱۴۰۱ء کو دوبارہ بغداد
پر قبضہ کر کے [یزدی، ۲ : ۳۶۵] ان بیس ہزار
آدمیوں کو قتل کروا دیا جنھوں نے سلطان احمد
جلائر کی حمایت کی تھی [: قبَ ابن عربشاہ
ص رکح (=۲۲۸)] ۔ قرہ قویونلو ترکمانوں کے
سردار قرا یوسف کے تعاقب میں تیمور نے اپنے پوتے
ابوبکر میرزا کو دیارِ بکر کی طرف بھیجا جو دریاے
فرات کی بالائی گزرگاہ پر واقع ہے ۔ موسم سرما
تیمور نے آذربایجان میں بسر کیا اور ۱۴۰۲ء کے
موسمِ بہار میں پھر میدانِ عمل میں آ گیا ۔ اس نے
فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر بایزید یِلْدِرِم صلح پر
راضی نہ ہوا تو فیصلہ میدانِ جنگ میں کیا جائے گا ۔
یِلْدِرِم بلادِ بلقان میں عیسائیوں کے خلاف جہاد میں
مصروف تھا لیکن مصر کے مملوکوں، احمد جلائر
اور قرا یوسف کے ورغلانے سے، جو اس کے ہاں
پناہ گزیں تھے اور اس خیال سے کہ سلطنتِ عثمانیہ کی
حدود کو مشرق کی جانب توسیع دے، اس نے بلقان
سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں اور اناطولیہ میں
داخل ہو گیا ۔ اس نے اپنی فتوحات کا آغاز قَرَمان اوغلی،
ذوالقَدر اوغلی اور گِرْمیان اوغلی کے شہروں پر
قبضے سے کیا، جو ایلخانیوں کے زمانے سے باقی
چلے آ رہے تھے ۔ اس کے بعد اس نے اس خیال سے
اِرْزَنْجان پر فوج کشی کی کہ وہ سلطنتِ تیمور کا حصّہ
ہے اس لیے کہ وہ ایلخانیوں کا صوبہ تھا ۔ اِرْزَنْجان
کے امیر طَہَرتن کو شکست دے کر یِلْدِرِم نے اس
صوبے پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد منگولی امیر
طَہَرتن کے کنبے کو گرفتار کر کے بروسہ بھیج دیا ۔
یہ اقدام تیمور کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف
تھا ۔ عثمانی امراء کو اس بات کا اچھی طرح
احساس تھا کہ اس کا واحد نتیجہ جنگ ہوگا اور
بایزید کو اس کے بڑے ہولناک نتیجے بھگتنا
پڑیں گے لیکن وہ اس اقدام سے اُسے روک نہ سکے ۔
آخر بایزید کو ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء کو اَنْقَرَہ کے
مضافات میں ایک گھمسان کی لڑائی لڑنا پڑی ۔
بایزید کی فوج میں بلقانی عیسائیوں کی ایک کثیر

تعداد شامل تھی - بایزید بڑی بہادری سے لڑا لیکن اس نے شکست کھائی اور تیمور کے سرداروں کے ہاتھ گرفتار ہوا - خود سلطان محمود [خان] نے اُسے گرفتار کیا [۱۹ ذوالحجۃ ۸۰۴ھ/ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ع] اور فوراً ھی تیمور کے سامنے پیش کر دیا [یزدی، ۲ : ۴۳۸] - یہ واقعات ان مؤرّخین نے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ھیں جو خود اس لڑائی میں شریک تھے، مثلاً حافظ ابرو اور شہاب الدین محمد منشی (جو اُس غیاث الدین علی کا بیٹا تھا جس نے تیمور کے غزواتِ ھند کا روزنامہ قلمبند کیا ھے) - شہاب الدین محمد نے روم فتوحاتی کے نام سے مستقلاً ان فتوحات کی کیفیت لکھی ھے - لیکن [۱۴ شعبان ۸۰۵ھ/۹] مارچ ۱۴۰۳ع کو بایزید نے دمے کے عارضے سے آقشہر میں وفات پائی [یزدی، ۲ : ۴۹۸] - (قیاس غالب یہ ھے کہ اس نے خود کشی کا ارتکاب کیا تھا اور یہ سانحہ [۹] مارچ کو پیش آیا تھا، رکّ بہ آلڈرسن ‹*The Structure of the Ottoman Dynasty*: A.D. Alderson اکسفورڈ [۱۹۵۶ع، ص ۱۰۷، ۶۰ ببعد، ۳۸]) - [یلدرم کی خود کشی کے متعلق دیکھیے فؤاد کوپرولو کے دو مقالے در *Belletin*، ۲ : ۵۹۱ و ۲۷ : ۵۹۱ (بحوالۂ عاشق پاشازادہ، طبع استانبول، ص ۸۰ و طبع Giese، ص ۲۷، و اروج بک تاریخی، طبع بابِنگر Babinger، ص ۳۷، و لطفی پاشا تاریخی، ص ۵۹؛ و تواریخ آل عثمانی، طبع Giese، ص ۴۶)، از مکتوب ڈاکٹر آلڈرسن، مؤرخ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۱ع] - امن قائم کرنے کے بہانے تیمور کی فوج بروسہ اور جنوب مغربی اناطولیہ کی طرف بڑھی اور وھاں خوب لوٹ مار کی - کسی کافر ریاست کو بہ نفس نفیس فتح کرنے کے ارادے سے تیمور نے اِزْمیر [سمرنا] پر چڑھائی کی اور فُرسانِ نصارٰی (Christian Knights) کو شکست دے کر اِزْمیر کو فتح کر لیا - تیمور کے پوتے محمد سلطان اور خان سلطان محمود خان دونوں نے اناطولیہ میں وفات پائی - مملوک فرمانروائے مصر اور رومی بادشاہ (بوزنطی شہنشاہ) جان ھشتم نے تیمور کے خلاف جنگ کو بے سود سمجھ کر مصالحت کر لی - اس کے بعد تیمور قسطیلیہ کے بادشاہ ھنری سوم کے سفیر کُلاویخو Ruy Ganzales de Clavijo اور کئی دوسرے سفیروں کو ساتھ لے کر سمرقند لوٹ آیا۔

اس بار بھی تیمور سمرقند میں زیادہ دن نہیں ٹھیرا - چین کی مہمّ کے لیے جن تیّاریوں کی ضرورت تھی ان کے متعلّق اور منگولیا اور چین کی اندرونی صورتِ حال کے متعلّق اسے مکمّل اطلاعات ملتی رھتی تھیں - علاوہ ازین امیر اللہ داد کے تیّار کردہ نقشے تیمور کے قیامِ اناطولیہ کے دوران ھی میں اس کے سامنے پیش ھو چکے تھے (امیر مذکور انھیں خود لے کر آیا تھا) - سمرقند پہنچنے کے بعد تیمور نے ان تیّاریوں کو مکمّل صورت دی اور ایک عظیم الشان مُؤتَمر (قُرُلْتای Kurultay) طلب کی - یہ مؤتمر اس کے تمام امیروں اور ملک کے بڑے بڑے سرداروں پر مشتمل تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مہمّ کے سلسلے میں آخری فیصلے کر لیے جائیں - [۲۳ جُمادی الاولٰی ۸۰۷ھ/ ۲۷ [نومبر] ۱۴۰۴ع کو وہ سمرقند سے اپنی چینی مہم پر روانہ ھوا - وقتاً فوقتاً جو منگول شہزادے منگولیا سے بھاگ کر اس کے دربار میں پناہ لیتے رھے تھے ان کے علاوہ تیمور نے بہت سے علماء کو اپنے ساتھ لیا تا کہ ان کی مدد سے بدھ مذھب کے پیرووں اور چین کی راہ میں ملنے والے شامَنی مذھب والوں Shamanists کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا جائے - تیمور نے فیصلہ کیا تھا کہ چین اور منگولیا کے علاقے فتح کرنے کے بعد انھیں اپنے پوتے محمد سلطان کے سپرد کرے گا، جو اسے بہت عزیز تھا، لیکن بدقسمتی سے آق شہر میں اس شہزادے کا انتقال ھو گیا - اس کے بعد یہ طے پایا کہ تیمور کا دوسرا پیارا پوتا اُلُغ بیک

اس کی جگہ لے ۔ لیکن سر دریا عبور کرنے کے بعد سال خوردہ تیمور کو سردی لگ گئی۔ صحت بحال کرنے کی غرض سے وہ کچھ عرصے کے لیے اُترار میں ٹھیر گیا لیکن اُسے علاج اور آرام سے فائدہ نہیں ہوا اور [۱۷ شعبان ۸۰۷ھ/] ۱۸ فروری ۱۴۰۵ء کو اس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی ۔ اس کی میّت سمرقند لائی گئی اور اس مدرسے کے گنبد کے نیچے دفن کر دی گئی جو اس کے پوتے محمّد سلطان میرزا (جو اناطولیہ میں فوت ہوا تھا) کے حکم سے تعمیر کیا گیا تھا ۔ اس کے بیٹوں میں سے میران شاہ عراق کا والی تھا، شاہ رخ خراسان میں تھا اور میران شاہ کا بیٹا ابوبکر میرزا بغداد میں؛ عمر شاہ میرزا کا بیٹا پیر محمّد والی فارس تھا، پیر محمّد ثانی بن جہانگیر میرزا بن تیمور والی قندھار، ملتان و ثغور ہند۔ تیمور کا ارادہ تھا کہ پیر محمّد بن جہانگیر کو اپنا جانشین بنائے ۔ تیمور کی وفات کے بعد اس کے پوتے خلیل میرزا نے تیمور کا جانشین بننے کی کوشش کی اور پیر محمّد سے، جو ان دنوں بلخ چلا آیا تھا، اور شاہ رخ سے اس کی لڑائی ہوئی لیکن انجام کار شاہ رخ کو کامیابی حاصل ہوئی اور اسے پوری قوم نے 'اُلوغ بک' تسلیم کر لیا ۔

تاریخ کی کتابوں میں تیمور کے متعلّق ہمیشہ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اس کا دایاں ہاتھ معیوب اور اس کے دائیں پاؤں میں لنگ تھا [ابن عربشاہ، ص شصح (=۳۹۸) ; شلّ اعرجّ الیمناوین ; فشل، ص ۷۴ و ۱۱۷]۔ ۱۹۴۱ء میں پروفیسر کرینی یازوف Kariniyazov اور پروفیسر اوشانن Oshanin نے تیمور کی قبر کھدوا کر اس کی ھڈیوں کا معائنہ کیا ۔ اس معائنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ بات صحیح تھی اور یہ پتا بھی چل گیا کہ اس کے بازو، ٹانگیں اور سر کتنا بڑا تھا ۔ معاصرین کی شہادتوں کی رو سے تیمور ایک عظیم الجثّہ، (بلند قامت) شخص تھا، اس کی پیشانی اور سر بڑا تھا، وہ جہیر الصوت تھا (اُس کی آواز بھاری اور گرج دار تھی)، [ڈاڑھی کے بال سیدھے اور لٹکے ہوئے تھے؛ قبّ ''مسترسل اللحیة''، ابن عربشاہ، ص شصح (=۳۹۸) ۔ ہاتھ پاؤں بڑے تھے]، شانے چوڑے اور چہرے میں زیبائی تھی ۔ [رنگ سرخ و سپید تھا] ۔ آخر عمر میں اُس کے سر کے بال اور ڈاڑھی بالکل سفید ہوگئی تھی ۔ اسے منافقت سے سخت نفرت تھی اور ہر قیمت پر وہ راست گوئی پسند کرتا تھا ۔ بد اعمالوں اور بد اطواروں کے لیے اس کے دل میں ذرا بھی رحم نہ تھا ۔ جو لوگ کسی جگہ سے لشکر کے گزرنے کو عذر بنا کر ناجائز فائدہ اٹھاتے یا نفع اندوزی کرتے تھے انھیں وہ سخت سزائیں دیتا تھا ؛ یہاں تک کہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے سمرقند کے قصائیوں کو اس جرم کی سزا یہ دی تھی کہ انھیں ابلتے ہوئے تیل کے بڑے بڑے کڑھاووں میں ڈال دیا تھا ۔ ابن عرب شاہ نے لکھا ہے کہ تیمور اُمّی تھا، جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا لیکن اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ وہ عربی بالکل نہیں جانتا تھا [البتہ فارسی، ترکی اور مغولی زبانیں جانتا تھا اور بس، ابن عربشاہ، ص تج (=۴۰۳) و قعط (=۱۷۹)؛ قبّ فشل، ص ۳۸ ۔ مقالہ نگار کی اطلاع کے مطابق تیمور اویغور تحریریں اور عربی رسم خط پڑھ لیتا تھا] ۔ تاریخ کی کتابیں [اور قصص انبیاء اور سیر ملوک سفر و حضر میں پڑھوا کر سنتا رہتا تھا، یہ سب کتابیں فارسی میں تھیں؛ ابن عربشاہ، ص تج (=۴۰۳)] ۔ وہ تاریخ اور فنون لطیفہ، بالخصوص فن تعمیر کا بےحد شائق تھا ۔ اس نے بذات خود تاریخوں کے مقابلے سے ان کے سواد کی تنقیح و تصحیح کی ۔ [اسے مسائل علمی کی اور معارف دینی کی تحقیق کا بہت شوق تھا؛ یزدی، ۲ : ۵۶۰] ۔ اس نے کئی مسجدیں اور

محلّ تعمیر کرائے اور باغ لگوائے - ان میں سے سمرقند کے باغات — باغِ چنار، باغ دل کشا، باغ بہشت، باغ بلند، [باغ شمال، باغ نو] وغیرہ [قب وامبیری : *History of Bokhara*، ص ۲۰۵ ببعد، ترجمۂ اردو ص ۲۵۸ ببعد؛ یزدی، ۱ : ۸۰۰؛ ۲ : ۶] بہت مشہور تھے - فوج کشی کے دوران میں وہ لوگوں کی تفریح گاہوں کی طرف نظر رکھتا تھا - اپنے دارالحکومت سمرقند کو ایک بین الاقوامی مرکز بنانے کے لیے اس نے اس کے چاروں طرف بستیاں آباد کیں اور ان کے نام دمشق، سلطانیہ، بغداد، شیراز وغیرہ رکھے [دیکھیے بارٹولڈ : *Turkestan*، ص ۸۸ بسراے دمشق سمرقند، جو اب بھی موجود ہے - شیراز کا ذکر بابر نے کیا ہے، وہی کتاب، ص ۹۳، ح ۱۱] - بڑے بڑے دریاؤں سے نہریں نکالنا اس کا محبوب مشغلہ تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ نئی زمینیں زیر کاشت آ جائیں - اس سلسلے میں اس کے ممتاز ترین کارنامے یہ تھے : نہر تُوی تاتار Tuye-Tatar، جو سمرقند کے اوپر دریاے زرافشان سے نکالی گئی اور نہر بیلقان اور نہر برلاس کی تعمیر جو آذربایجان میں دریاے ارس سے نکالی گئیں [یزدی، ۲ : ۳۶۵ و ۳۹۳] - قدیم خاندان کرت کے زمانے میں ہرات کے قلعے اور شہر کے باہر کا نہری نظام تیمور ہی وجود میں لایا اور نیا شہر بھی اسی نے تعمیر کرایا تھا - بین الاقوامی تجارت کو ترقّی دینا تیمور کے نزدیک بہت اہمّ امر تھا - اس نے مصر کے مملوک فرمانروا فَرَج اور شاہ فرانس کو جو خط لکھے تھے ان سے یہ بات نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے [قب یزدی، ۱ : ۶۴۳] - تاریخی شخصیتوں میں چنگز خان اور محمود غزنوی اس کی نظر میں محبوب و محترم تھے اور رسول پاکؐ اور آل رسولؐ پر تو وہ جان دیتا تھا؛ چنانچہ اس کے عہد میں بلخ میں عکّاشۃ [بن مِحْصَن الاَسَدی صاحب رسول اللہؐ؛ قب ابن بطّوطۃ، ۳ : ۶۲] اور سمرقند میں قُثَم بن عبّاس [مدفون سمرقند] کے مقبروں کی آرائش کی گئی - تیمور نے اپنے رشتے داروں کو ان کے جوار میں دفن کیا - ان علماء میں سے جو آلِ رسول ہونے کی حیثیت سے معروف تھے سید برکہ ترمذی اور سیّد شریف جرجانی کی وہ انتہائی عزّت کرتا تھا - فقہاء میں اسے سب سے زیادہ اعتماد ایک ترک شیخ احمد یسوی پر تھا - مشکل کے وقت میں وہ اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لیے شیخ سے اس کے اشعار سنا کرتا تھا - سلطنت کے نظم و نسق کے بارے میں تو تیمور چنگز کے مثالی تصوّرات کا قائل تھا لیکن سلطنتی امور کو الگ کر دیں تو اس کی آرزو یہ تھی کہ وہ دنیا کے ان گوشوں میں بھی شمع اسلام فروزاں کرے جو اب تک اس کے نور سے محروم تھے - سرکاری دعوتوں میں، جہاں علماء بھی شریک ہوتے تھے، شراب کا دور چلتا تھا - ایک خاص طرح کی شیریں شراب، جو عورتوں کے لیے موزوں سمجھی جاتی تھی، انھیں ان کی علیحدہ محفل میں پینے کو دی جاتی تھی - ان معاملات میں وہ شریعت کے بجاے چنگزی یاسا کا پابند تھا [دیکھیے ابن عربشاہ، ص تج (= ۴۰۳)].

تیمور کے جن معاصرین نے اس کے متعلّق لکھا ہے ان میں تین مغربی مصنّف بہت ممتاز ہیں : ایک شاہ قشتالہ Castile کا سفیر کلاویخو، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، دوسرا شِلْٹ بِرگر Ivan Schiltberger، جو اس وقت بایزید کے پاس تھا جب تیمور نے بایزید کو گرفتار کیا اور تیسرا پیرس یونیورسٹی کا Pierre d'Ailly - اس آخری وقائع نگار نے تیمور کو ''اس زمانے کا ہینّی بال'' Hannibal بتایا ہے - کلاویخو کے قول کے مطابق تیمور بہت عادل بادشاہ تھا - جہاں تک شِلْٹ بِرگر کا تعلّق ہے، اگرچہ وہ ایک غیر تعلیم یافتہ سپاہی تھا تاہم اس نے تیمور اور اس کے حریفوں کے متعلّق بہت سی اہمّ باتیں بیان کی ہیں.

مآخذ : (۱) نظام الدین شامی : ظفر نامہ، طبع

ثاور F. Tauer، جلد اوّل، بیروت ۱۹۳۷ء اور (۲) ظفر نامہ اصلاحات و اضافات از حافظ ابرو : طبع ثاور، جلد دوم، پراگ ۱۹۵۶ء؛ (۳) شرف الدین یزدی : ظفرنامہ، طبع کلکتہ (تہران کی طباعت بھی ہے)؛ (۴) عبدالرزاق سمرقندی : مطلع سعدین، جلد دوم، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۹ء، (جلد اوّل ابھی تک غیر مطبوعہ ہے) [مقالے میں جلد اوّل کے حوالے ادارے نے نسخۂ ادرنہ سے دیے ہیں] : (۵) تاریخ معینی نطنزی، طبع اوبین J. Auben؛ (۶) جعفر بن محمد جعفری حسینی : تاریخ کبیر، نسخہاے کلکتہ و لینن گراڈ (فرہنگ ایران زمین، ۶ : ۸۹ تا ۹۴)؛ (۷) موسوی : اصحّ التواریخ، نسخۂ یکّی جامع،ن۔ خدیجہ ترخان، ۳۲۲؛ (۸) جامع التواریخ حسینی، فاتح ۴۳۰۷؛ (۹) خداوند شاہ حسینی : ظفر نامہ، فاتح ۴۳۲۹؛ (۱۰) تاج سلمانی : شمس الحسن، ویس باڈن Wiesbaden ۱۹۵۶ء؛ (۱۱) ابن عرب شاہ : عجائب المقدور فی اخبار تیمور، لائڈن ۱۶۳۶ء؛ [طبع مصر ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء بھی موجود ہے؛ کتاب کے نام میں بعض نسخوں میں نوائب بجاے اخبار]؛ (۱۲) غیاث الدین علی : کتاب روزنامۂ غزوات ہندوستان، طبع لیو زیمین، پیٹرز برگ ۱۹۱۵ء؛ (۱۳) میرخواند: روضۃ الصفا، بمبئی [۱۲۷۱ھ]، تہران [۱۲۷۰ تا ۱۲۷۴ھ]؛ (۱۴) خواندامیر: حبیب السیر، طبع بمبئی [۱۸۵۷ء]، تہران [۱۲۷۱ء/ ۱۸۵۵ء]؛ (۱۵) مقریزی : سلوک؛ (۱۶) بدرالدین عینی : عقد الجمان، نسخہاے بایزید عمومی و طوپقپوسرای؛ (۱۷) فشّل W.J. Fischel : Ibn Khaldun and Tamer-*lane* (برکلے ۱۹۵۲ء)؛ (۱۸) محمّد بن تاویت طنجی : تعریف بابن خلدون و رحلتہ غرباً و شرقاً (قاہرۃ ۱۹۵۱ء) : (۱۹) ابن الفرات : تأریخ، طبع یروشلم و طبع قاہرۃ؛ (۲۰) ابن ایاس : بدائع الزّھور، طبع کالے P. Kahle و محمّد مصطفٰی؛ (۲۱) یوسف ابن تغری بردی : النجوم الزاھرۃ، طبع مصر؛ (۲۲) کلاویخو Clavijo : *Travels*، بہترین طباعت ہسپانوی میں، مع طباعت ۱۸۸۱ء از جانب Russian Academy of Science؛ (۲۳) H. Schiltberger : *Bondage and Travels of John Schiltberger*، طبع Hakluyt Society، سلسلۂ قدیم، ج ۵۸، لنڈن ۱۸۷۹ء؛ (۲۴) مشرقی یورپ کے بارے میں تیمور کی حکمت عملی کے لیے دیکھیے اس کا مکتوب بنام با یزید، فروری ۱۳۹۵ء، جس پر *ZDMG*، ج ۱۰۸، ۱۹۵۹ء: ص ۲۸۰ تا ۲۹۸ میں بحث کی گئی ہے؛ (۲۵) جو ملفوظات تیمور سے منسوب کیے جاتے ہیں اور مشرق و مغرب میں کئی بار طبع ہو چکے ہیں، ان کا صرف تھوڑا سا حصّہ اصلی اور بیشتر جعلی ہے (رک بہ زکی ولیدی طوغان Z. V. Togan : *Tarihte Usul*، استانبول ۱۹۵۰ء، ص ۸۹)؛ (۲۶) *Image Mundi de Pierre d'Ailly*، ۳ : ۹۴۷؛ [(۲۷) مرقّع بایسنغری، طوپقپو سرای، شمارہ ۲۱۵۲ میں تیمور اور اس کے بیٹوں کی معاصر تصویریں ہیں، یہ تصویریں چنگزیوں کے شجرۂ نسب میں شامل ہیں، جس میں عموماً نام اویغوری اور فارسی دونوں خطوں میں دے کر ان کے نیچے دائروں میں تصویریں دی ہیں۔ ان میں چنگز خان اور تیمور کی تصویریں رنگین ہیں۔ باقی سیاہ قلم ہیں، ابناے تیمور کی یہ تصویریں جہاں تک معلوم ہے یہاں پہلی مرتبہ شائع کی جا رہی ہیں؛ دیکھیے ارمغان علمی، ۱۰۵، ح ۳].

(احمد زکی ولیدی طوغان)

تیمور، بنو : Tīmūrids، یوں تو بنو تیمور سے مراد تیمور کے تمام اخلاف ہیں مگر خاص طور پر اس سے تیموری خاندان کے وہ شہزادے مراد ہیں جنھوں نے پندرھویں صدی میں ایران اور وسط ایشیا میں حکومت کی۔ اس مقالے میں اس خصوصی مفہوم کو مدّ نظر رکھا گیا ہے۔

تیموریہ خاندان کی تاریخ دو بالکل الگ الگ دوروں میں تقسیم ہو سکتی ہے (قب براؤن :

A History of Persian Literature under Tartar Dominion، ص ۳۸۰) - پہلے دور میں تیمور کی سلطنت اس کے بیٹوں اور پوتوں میں بٹ گئی تھی مگر بہت جلد اس کے دو بڑے حصے ہو گئے - مغرب میں میران شاہ اور اس کے بیٹوں ابوبکر اور محمّد عمر کی حکومت قائم ہو گئی۔ اور مشرق میں شاہرخ کی سلطنت، جو پہلے تو خراسان تک محدود تھی لیکن چند ھی سال بعد اس میں ماوراء النہر کا اضافہ ہو گیا اور اس میں تقریباً وہ تمام ملک شامل ہو گئے جن پر امیر تیمور نے حکومت کی تھی - یہ شاندار اور نسبةً خوشحالی کا زمانہ تھا - میدانِ جنگ میں فتحمندی کے باوجود شاہرخ [بن تیمور] امن پسند بادشاہ تھا - اس کے باپ کے زمانے میں جو ضرر و خسارت اطراف و اکناف میں صورت‌پذیر ہوئی تھی اس نے چاہا کہ اس کی تلافی ہو اور حتی‌الامکان اس نے اھلِ فضل کی قدردانی اور سرپرستی کی - دوسرا دور شاہرخ کے انتقال سے جنگ شُرُور تک ھے - اس جنگ سے ایران کی وحدت مِلّی متحقّق ہوئی، جس سے تیموری حکومت کو آخری ضرب لگی اور سلطنت متواتر زوال‌پذیر ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگی - ہر شہزادہ اپنی الگ سلطنت قائم کرنے کا آرزومند تھا؛ اس طرح دشمنوں کی پیشقدمی میں آسانی ہو گئی، جو ہر جانب سے اس کمزور سلطنت پر پِل پڑنے کا موقع تاک رہے تھے لیکن یہ ایک عجیب تضاد ھے کہ نہضت جو دورِ شاہرخ کی نمایاں خصوصیت تھی وہ اپنی پوری شان کے ساتھ اس کے جانشینوں کی حکومت کے خاتمے تک برابر جاری رھی - ساری کی ساری پندرھویں صدی ادب، فنونِ لطیفہ اور علم و فضل کے لحاظ سے ایک زرّین عہد ھے، جس میں حسین بایقرا کا دربار، جو تیموریہ خاندان کے قبلِ آخر بادشاہ کا دربار تھا، شاہرخ کے دربار سے کچھ کم شاندار نہ تھا.

امراء کا خیال تھا کہ تیمور کی موت کو خفیہ رکھنے سے وہ چین کی مہمّ کامیابی سے مکمّل کر سکیں گے؛ چنانچہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مہمّ کے دوران میں شہزادہ خلیل کو حاکم بنا دیا جائے اور ایک مجلسِ نیابت (council of regency) کاروبارِ سلطنت میں اس کی مدد کرے اور مہمّ کے ختم ہونے پر خلیل تیمور کی خواہش کے مطابق حکومت پیر محمّد بن جہانگیر کے حوالے کر دے، مگر ان دو دعویداروں کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس میں پیر محمّد نے دو دفعہ شکست کھانے کے بعد اطاعت قبول کر لی اور شہزادہ خلیل نے کشادہ دلی سے اُس کا ملک اُسی کے پاس رہنے دیا - چھے مہینے گزرنے کے بعد پیر علی تاز وزیر نے پیر محمّد کو قتل کرا دیا اور خود تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اسے (۸۰۸ھ / ۱۴۰۶ء میں) اپنی جان سے ھاتھ دھونا پڑا - اُدھر فوج نے خلیل کا ساتھ چھوڑ دیا اور امراء نے، جو اُس کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے اُسے سر زنش کیا کرتے تھے، اُسے معزول کر دیا - اُس کی اشک شوئی کے لیے اُسے (۸۰۹ھ / ۱۴۰۶ - ۱۴۰۷ء) عراق کی مملکت دی گئی، جہاں اس نے اپنی زندگی کے باقی ایّام ختم کیے.

میران شاہ اپنے بیٹے ابوبکر کے ساتھ اور تیمور کے حکم کے مطابق اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمّد عمر کی نگرانی میں، اپنی سلطنت پر حکومت کرتا رھا - جس میں صوبہ‌ھاے عراق، آذربایجان، [ارّان]، مُوغان، شِیروان اور گُرجستان شامل تھے - دونوں بھائیوں میں کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا اور امیر جہان شاہ [جاکو] نے ان دونوں کو محروم کرنے کی کوشش میں اپنی جان دی - میران شاہ نے شاہرخ کی علانیہ مخالفت کی مگر آخر کار اُسے (۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ -

۱۴۰۶ء میں) شاہرخ کی اطاعت قبول کرنا پڑی۔ ۸۱۰ھ میں وہ قرا یوسف کے خلاف لڑتے ہوے مارا گیا اور اس کے بیٹے بھی تقریباً اسی زمانے میں ہلاک ہوے۔

تیمور کی وفات کے وقت شاہرخ صرف خراسان کا حاکم تھا ۔ اس نے ۸۰۹ھ / ۱۴۰۶ء میں مازندران فتح کیا اور اگلے سال سیستان اور پھر ماوراءالنہر پر بھی اپنا اقتدار جما لیا، جہاں وہ ۸۱۱ھ / ۱۴۰۹ء میں اس غرض سے گیا کہ سمرقند پر قبضہ کر لے، ملک کا انتظام درست کرے، مرو کو دوبارہ تعمیر کرے [اور جوے مرو کو، جو دریاے مُرغاب میں بند باندھ کر نکالی گئی تھی اور اس وقت بند کے ٹوٹنے سے مٹی سے پُر اور بےکار ہو گئی تھی، دوبارہ رواں کرے] ۔ اس نے اپنی سلطنت کو فارس (۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء)، کرمان [۸۱۹ھ / ۱۴۱۶-۱۴۱۷ء] اور آذربایجان تک وسعت دی ۔ آذربایجان میں وہ اپنے زبردست مخالف قرا یوسف پر حملہ کرنے کی غرض سے گیا تھا مگر قرا یوسف اچانک مر گیا اور اس کی فوج منتشر ہوگئی (۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء)، لیکن قرا یوسف کے جانشینوں اور ان کے مخالف آق قویونلو خاندان سے لڑائی جاری رہی ۔ بالآخر شام اور عربستان کے سوا تیمور کے تمام مفتوحہ ممالک شاہرخ کے قبضے میں آ گئے ۔ اس کے عہد میں کئی بغاوتیں برپا ہوئیں لیکن تمام فرو کر دی گئیں ۔ ان میں وہ بغاوتیں بھی شامل تھیں جو امیر خدایداد اور شاہ بہاءالدین [بدخشانی] (۸۱۲ھ / ۱۴۰۹-۱۴۱۰ء)، بایقرا میرزا (در شیراز) (۸۱۸ھ / ۱۴۱۵-۱۴۱۶ء)، اسکندر اور جہان شاہ (۸۳۲ھ / ۱۴۲۹ء) کی سرکردگی میں ہوئی تھیں۔

[۸۱۹ھ / ۱۴۱۶-۱۴۱۷ء] میں شاہرخ نے اپنے بیٹے بایْسُنْغُر کو دیوانِ اعلٰی کی مسند پر بٹھایا [اور وہ لوگوں کی مہمّات کا فیصلہ انصاف سے کرنے لگا، رعایا کے دعاوی سن کر وہ مناسب حکم دیتا اور ظالموں کو ظلم کی سزا ملتی] ۔ اُلُغ بیگ کے سوا شاہرخ کے باقی تمام بیٹے اس کی زندگی ھی میں فوت ہو گئے اور وہ خود بھی فِشاوَرْد [رَےّ] میں ۲۵ ذوالحجّۃ ۸۵۰ھ / ۱۲ مارچ ۱۴۴۷ء کو انتقال کر گیا اور لوگوں کے دلوں میں اپنی سخاوت، امن پسندی، شجاعت اور ہوس پزی سے صَرفِ نظر کی یاد چھوڑ گیا ۔ رفاہِ عامّہ کے کاموں میں اس کا ایک یہ کام بھی تھا کہ اس نے ہرات میں ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا [مطلع، ۱ : ۱۸۷] ۔ چین سے، جس پر اسے براے نام اختیارداری حاصل تھی، اس کے تعلّقات ہمیشہ اچھے تھے، ہندوستان پر بھی اپنے اسمی حقِّ اختیارداری پر اُسے اصرار تھا ۔ اس کے برعکس سلطنت عثمانیہ اور مصر سے اس کے تعلّقات کی راہ میں ہمیشہ مشکلات ھی حائل رہیں ۔

شاہرخ کی وفات کے بعد سلطنت کا زوال شروع ہو گیا ۔ یہ زوال بہت تیز رفتار اور لاعلاج تھا ۔ الغ بیگ ''شاہِ ہیئت دان'' (۸۵۰ تا ۸۵۳ھ / ۱۴۴۷ تا ۱۴۴۹ء) عالم و فاضل اور ادیب شخص تھا، جسے حکومت کے کاروبار کے بجاے علمی تحقیقات کے ساتھ زیادہ مناسبت تھی، لہٰذا جن مشکلات سے اسے دو چار ہونا پڑا ان سے کما حقّہ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اُسے حاصل نہ تھی ۔ اپنے بھتیجے علاءالدولۃ سے شکست کھا کر اس نے اس کا ہر مطالبہ منظور کر لیا تاکہ اپنے لڑکے عبداللّطیف کو اس کے پنجے سے چھڑا سکے لیکن فاتح نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا ۔ اوزبکوں نے ہرات اور سمرقند کو فتح کر کے انھیں تباہ کر دیا ۔ عبداللّطیف نے بغاوت کر کے اپنے باپ کو کئی بار شکست دی اور اسے گرفتار کر لیا اور اس کے خلاف نمایشی مقدّمہ چلانے کے بعد اسے قتل کرا دیا لیکن وہ خود بھی کوئی چھے مہینے حکومت کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا

[۸۵۳ تا ۸۵۴ھ / ۱۴۴۹ تا ۱۴۵۰ء؛ مطلع سعدین، ۲ / ۲ : ۹۹۳ و ۱۰۰۵] ۔ [سلطان] عبداللہ میرزا، شاہرخ کا پوتا، ابوسعید کی مخالفت کے باوجود تخت نشین ہو گیا، ابوسعید نے اوزبکوں سے مدد مانگی اور عبداللہ شکست کھا کر قتل ہوا (۸۵۳ - ۸۵۴ھ/ ۱۴۵۰ - ۱۴۵۱ء) ۔ بابر میرزا نے، جو عیّاش اور دائم الخمر تھا، اپنے آپ کو درست کرنے کا بےسود حلف اٹھایا ۔ وہ عراق، فارس اور کرمان کھو بیٹھا اور علاءالدولۃ کی آنکھیں نکلوا دیں مگر ابو سعید سے شکست کھائی اور اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے مر گیا (۸۵۵ تا ۸۶۱ھ / ۱۴۵۱ تا ۱۴۵۷ء).

ابوسعید کا عہد حکومت بالکل مختلف تھا ۔ وہ اپنے زمانے کا سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ تھا ۔ وہ [میرزا سلطان] عبداللہ کا جانی دشمن تھا ۔ عبداللہ کی وفات پر اس نے سمرقند پر قبضہ کر لیا ۔ بابر میرزا کی موت [ربیع الثانی ۸۶۱ھ / مارچ ۱۴۵۷ء] اور ابوسعید کی مزید فتوحات کی بدولت ماوراء النہر، بدخشان، کابل، قندھار، اور ثغور ہند کے اضلاع، عراق اور خراسان، جو اس نے مکمّل طور پر ۸۶۳ھ / ۱۴۵۸ - ۱۴۵۹ء میں فتح کر لیے تھے، یہ سارے علاقے اس کے قبضے میں آ گئے ۔ اس کی امنگیں بہت زیادہ تھیں لیکن مؤرّخوں کو اتّفاق ہے کہ وہ بہت عمدہ صفات کا مالک تھا، یعنی اس میں وقار، دوراندیشی، صاف گوئی، سرگرمی اور حیرت انگیز سیاسی قابلیت موجود تھی ۔ مغولوں سے لڑنے کے بعد اس نے ان سے اتّحاد کر لیا اور اس طرح اپنے خاندان کی قدیم روایات کی طرف مراجعت کی ۔ اوزون حسن کی درخواست صلح کو مسترد کرتے ہوے ابوسعید نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور قراباغ جا پہنچا، جہاں اس کی فوجیں بھوک سے مرنے لگیں اور اس کا ساتھ چھوڑ گئیں ۔ وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ۔ پہلے تو اوزون حسن [کا خیال یہ تھا کہ وہ سلطان ابوسعید کو ضرر نہ پہنچائے لیکن بعد میں امراے ترکمان وغیرہ کے اصرار پر اس نے میرزا کے قتل کا فیصلہ کیا؛ مطلع، ۲ : ۱۳۰۳] (۸۵۵ تا ۸۷۲ھ / ۱۴۵۱ تا [۱۴۶۷ء]).

سلطان احمد، جو ابوسعید کا بیٹا اور جانشین تھا، بہت سی خوبیوں کا مالک تھا ۔ وہ باوفا، صاف گو، خوش خلق اور بہادر تھا لیکن بے اقتدار ہونے کی وجہ سے اپنے عمائد، خصوصاً علماء، کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح تھا ۔ [چار لڑائیوں کے سوا، جن میں سے ایک اس کے چھوٹے بھائی عمر شیخ سے ہوئی] اور ایک مہمّ کے سوا، جس میں [بالآخر] ہندوستان کے آئندہ فاتح بابر سے صلح ہوئی، اس کا زمانہ امن ہی میں گزرا [قب حبیب السیر، ۳ / ۳ : ۱۹۲] ۔ اس زمانے میں سمرقند میں عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں اور اس کا دربار علماء و فضلاء کا مقصد و مرجع بن گیا ([۸۷۲] تا ۸۹۹ھ / [۱۴۶۷ - ۱۴۶۸ء] تا ۱۴۹۴ء).

سلطان محمود نے اپنے پیشرووں کے چار بیٹوں کو قتل کرا کے بادشاہی شروع کی ۔ اس نے [تقریباً] چھے ہی مہینے حکومت کی مگر اس عرصے میں بھی قابل نفرت و ملامت ہی سمجھا جاتا رہا ۔ اس کا ظلم، اس کا استبداد اور اس کا فسق و فجور اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی ۔ بالآخر وہ قتل کر دیا گیا ۔ بغاوت برپا ہونے ہی والی تھی کہ اس کی موت کی خبر، جسے وزیر باتدبیر خسرو شاہ نے مخفی رکھا تھا، ہر طرف پھیل گئی [تقریباً شوّال ۸۹۹ تا ربیع الآخر ۹۰۰ھ / جولائی ۔ اگست تا دسمبر ۱۴۹۴ - جنوری ۱۴۹۵ء، قب حبیب السّیر، ۳ / ۳ : ۱۹۴] ۔ یہ بادشاہ کئی بیٹے چھوڑ مرا ۔ سلطان مسعود چار سال تک حکمران رہا ۔ اسے تخت حاصل کرنے کے لیے

اپنے بھائیوں بایسنغر [بن سلطان محمود] اور علی [بن سلطان محمود] سے لڑنا پڑا اور وہ اپنے وزیر خسرو شاہ کی سازش کی بدولت کامیاب رہا (۹۰۱ تا ۹۰۵ھ/۱۴۹۵ تا ۱۴۹۹ء).

ابوسعید کے چوتھے بیٹے عمر شیخ نے فرغانہ میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی قلمرو قائم کر لی تھی، جس کا دارالملک اَخسِی تھا ۔ گو اس کی فوج صرف چار ہزار جوانوں پر مشتمل تھی وہ بہادر اور حرب و ضرب کا شائق تھا، چنانچہ اس نے کئی بار سمرقند فتح کرنے کی کوشش کی ۔ اس کے معاصر اس کے انصاف، سخاوت اور شیرینیِ مزاج کی تعریف کرتے ہیں ۔ [اگر اسے شراب نوشی اور جوے کی لت نہ ہوتی تو وہ دین دار آدمی تھا] ۔ چونکہ وہ چغتائی فرمانروا یونس خان کا داماد تھا [اس کے خسر نے اس کے اولکاء موروثی میں بعض مواضع کا اضافہ کر دیا مگر عمر شیخ کو اس سے زیادہ توقع تھی، اس لیے خسر سے تنازعہ ہوا اور جنگ کی نوبت آئی؛ حبیب السیر، ۳ / ۳ : ۱۹۰] ۔ تھوڑا عرصہ حکومت کرنے کے بعد وہ اچانک ایک حادثے کا شکار ہو کر ۳۹ ہی سال کی عمر میں ۴ رمضان ۸۹۹ھ / ۸ جون ۱۴۹۴ء کو فوت ہو گیا ۔ اس کا بیٹا ظہیرالدین بابر بادشاہ بارہ برس کی عمر میں اس کا جانشین ہوا ۔ اس نے کئی مرتبہ کامیابی کے ساتھ لشکر کشی کی اور ایک دفعہ تو سمرقند پر بھی قبضہ کر لیا لیکن شیبانی نے ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں اسے بے دخل کر دیا ۔ اس پر وہ ہندوستان چلا گیا جہاں اس نے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی.

سلطان حسین بایقرا نے ہرات میں ۳۷ برس تک حکومت کی ۔ وہ ادب و فن کا اعلٰی مذاق رکھتا تھا اور اس کے ساتھ ہی بہادر اور ظفرمند تھا؛ چنانچہ اس نے خراسان، طخارستان، قندھار، سیستان اور مازندران کے علاقے زیر کر لیے اور اپنے سب حریفوں پر فتح پائی لیکن اس کی حکومت کے آٹھ نو سال بڑے پُر آشوب ثابت ہوے ۔ وہ وجعِ مفاصل کا شکار تھا؛ پھر اُس کی سلطنت کو اوزبکوں کی طرف سے خطرہ لاحق رہتا تھا؛ ان سب کے علاوہ اس کے بیٹوں نے بغاوتیں کیں، جو اسے فرو کرنا پڑیں اور آخرکار جب وہ شیبانی کے خلاف جنگ آزمائی کے لیے جا رہا تھا تو راستے میں اس کا انتقال ہو گیا ۔ ابتدا میں وہ بڑا ریاضت کیش اور پرہیزگار مسلمان تھا لیکن بعد میں عیش و عشرت میں غرق ہو گیا ۔ اس بُری مثال کی تقلید اس کے بیٹوں اور رعایا نے بھی کی ۔ حسین بایقرا کے دربار کا ادبی حلقہ مشہورِ زمانہ ہے ۔ اس حلقے میں اس کے مشہور وزیر میر علی شیر کے علاوہ، جسے ترکی ادب کا خالق کہنا چاہیے، مولانا جامی ایسے شاعر، میر خوّاند اور خواند امیر ایسے مؤرّخ اور بہزاد اور شاہ مظفّر ایسے مصوِّر موجود تھے ۔ ہرات کے محلّات سمرقند کے محلّات کے ہم‌پایہ تھے (۸۷۳ تا ۹۱۱ھ/ ۱۴۶۹ تا ۱۵۰۶ء) ۔ سلطان حسین بایقرا کا بیٹا اور جانشین بدیع الزّمان ایران کے تیموری خاندان کا آخری بادشاہ تھا ۔ شیبانی سے شکست کھا کر وہ شاہ اسماعیل کا مہمان بنا اور آخر کار سلطان سلیم کی قید میں رہ کر ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء میں قسطنطنیۃ میں فوت ہو گیا ۔ بدیع الزّمان کا بیٹا محمّدالزّمان باپ کے مرنے کے بعد قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان چلا آیا، جہاں پرتگیزوں کی امداد سے اس نے گجرات Gudjarāt کا بادشاہ بننے کی ناکام کوشش کی اور اس کے بعد ۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء میں فوت ہو گیا.

ایران میں شاہ اسماعیل نے ظہور کیا اور شیعوں نے غلبہ حاصل کیا، جس کے نتیجے کے طور پر ایران میں وحدتِ ملّی پیدا ہو گئی ۔ اُدھر اسی زمانے میں چین اور روس دونوں ملکوں میں بھی وحدتِ ملّی معرضِ وجود میں آئی اور اسی طرح

ساوراءالنہر میں شیبانیوں کی ایک بہت بڑی امبراطوریت کا قیام عمل میں آیا ۔ ان تمام واقعات سے آلِ تیمور کے لیے حکومت کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ اب صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جس کی حکومت تیموری خاندان کے ایک فرد کے ہاتھ میں منتقل ہو رہی تھی۔

نویں / پندرھویں صدی کی نہضتِ علمی ایک حد تک تیموری بادشاہوں اور شہزادوں کی رہینِ منّت ہے، جن میں سے بہت سے بذاتِ خود شاعر، فن کار اور عالم تھے اور جن کے دربار میں فوق العادۃ کمال والے کشاں کشاں چلے آتے تھے ۔ تیموری بادشاہوں میں سے شاهرخ نے تاریخ کے مطالعے کو ترقّی دی، اُلُغ بیگ ہیئت‌دان، شاعر اور عالم دین تھا، حسین بایقرا فن کار اور شاعر تھا اور بابر نے تُزُک بابری کے علاوہ اور کئی قیمتی تصانیف یادگر چھوڑیں ۔ تیموری شہزادوں میں سے شاهرخ کا بیٹا بایسُنغُر اوّل درجے کا خوش‌نویس تھا اور فنونِ کتاب [تجلید، تذهیب، کتابت، مصوّری وغیرہ] بہت حد تک اس کے مرھونِ منّت ہیں ۔ اس دور میں ملّا جامی کا نام فارسی ادب میں مشہورترین نام تھا اور مشاہیر ذیل بھی نامورانِ عہد میں سے تھے : صوفی شعراء میں سے سیّد نعمت اللہ کرمانی اور قاسم الانوار؛ مثنوی نویسوں میں ہاتفی اور کاتبی؛ کتبِ اخلاق و تماثیلِ اخلاقی کا مصنّف حسین واعظ کاشفی اور مؤرّخین میں سے حافظ ابرو، عبدالرزّاق سمرقندی، میر خواند [محمّد] اور خواند امیر؛ ان میں سے حافظ ابرو جغرافیہ‌دان بھی تھا ۔ جامی کے علاوہ علمائے دین میں احمد تفتازانی اور محدّثین میں میر جمال‌الدین [عطاءاللہ] مُقدّس [؟] شامل تھے ۔ فقیہ، مہندس اور طبیب بھی بےشمار تھے۔

اس دور کے ترکی شعراء میں سے صرف میر علی شیر ہی کا نام مشہور ہے مگر اس کے کئی قابلِ ذکر شاگرد بھی تھے، مثلاً شَیْخَم بیگ سُہَیلی اور کمال‌الدین گازرگاہی۔

نویں صدی ھجری / پندرھویں صدی میلادی میں ایرانی فنِّ مصوّری اوجِ کمال پر پہنچ چکا تھا اور سمرقند، بخارا اور ہرات کے دبستانِ نقّاشی اپنے پورے عروج پر تھے ۔ ہم بتا ہی چکے ہیں کہ بایسُنغُر نے فنونِ کتاب میں کیا کمال کر دکھایا تھا ۔ فنِ تعمیر چینیوں کے بتکدے (pagoda) اور مغلوں کے خیمے سے متأثّر ہوا اور اس فن کے بہترین نمونے گُورِ امیر، مسجد بی‌بی خانم، مسجد اُلُغ‌بیگ اور [مقبرۂ] شاہ زندہ [= قُثَم بن عبّاس رض، دیکھیے بارٹولڈ : *Turkestan*، ص ۹۱ ببعد] ہیں اور سمرقند کی مساجد کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔ فن‌کاروں اور صنّاعوں کی نو آبادیوں کی وجہ سے، جو سمرقند اور آذربایجان میں تیمور نے بزور قائم کر دی تھیں، زیبائشی فنون بالخصوص سفال‌گری (ceramics) نے شاندار ترقّی کی ۔ اسی طرح علم موسیقی کے بھی بڑے شاندار نمائندے موجود تھے۔

مآخذ: اس سارے دَور کے لیے دیکھیے (۱) حافظ ابرو : زُبدۃ التواریخ، نسخۂ فاتح، رُبع رابع، وقائع عہدِ تیمور و شاہرخ تا ۸۳۰ھ؛ (اس کا عکسی نسخہ کتابخانۂ دانشگاہ پنجاب میں ہے) ۔ دوسرا نسخہ بھی استانبول میں ہے، جو شاہ رخ کے لیے لکھا گیا تھا]؛ اور (۲) عبدالرزّاق سمرقندی : مطلع سعدین [دو جلد، جلد اوّل ہنوز طبع نہیں ہوئی؛ جلد دوم، طبع لاہور ۱۳۶۰-۱۳۶۸ھ؛ اور (۳) میر خواند، اور (۴) خواند امیر جو بہت مفید ہیں]؛ (۵) کاتر میئر نے اپنی تصانیف *Mémoire historique sur le règne du sultan Schah-rokh*، *JA*، ۱۸۳۶ء اور *Notice de l'ouvrage persan* (یعنی *N. E.* کی چودھویں جلد کے پہلے حصّے) میں مطلع سعدین کو .... بہت استعمال کیا ہے؛ (۶) معین الدین اسفزاری [م ۸۹۷ھ / ۱۴۹۱ء]، تاریخ ہرات پر ایک

قابل قدر کتاب روضات الجنّات [تا وقائع ۸۷۵ھ] کا مصنّف (اس کے اقتباسات Barbier de Meynard نے *JA*، ۱۸۶۰-۱۸۶۲ میں دیے ہیں؛ [نسخۂ دانش گاہ پنجاب عمدہ مگر ناقص الآخر ہے، جس میں روضۂ ۲۵ نا تمام اور روضۂ ۲۶ ندارد ہے])۔

ابتدائی سالوں کے لیے دیکھیے (۷) شرف الدین علی یزدی؛ (۸) ابن عرب شاہ؛ (۹) فصیحی، مصنّف مجمل، جو اب تک طبع ہو کر شائع نہیں ہو سکی اور نا مکمل ہے، [دیکھیے سٹوری، ۱ / ۲ : ۹۰ ببعد]؛ آخری سالوں کے لیے (۱۰) تزک بابری نہایت قیمتی مأخذ ہے جس کی تطبیق و تحقیق اور تزیید و تذییل کے لیے (۱۱) مرزا حیدر دوغلات کی تأریخ رشیدی اور (۱۲) محمد صالح کا شیبانی نامہ دیکھنا چاہیے؛ عثمانیوں سے تعلّقات کے لیے (۱۳) فریدون بک اور (۱۴) منجّم باشی کی تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہیے؛ مزید جزئیات کے لیے ناظرین کو (۱۵) بلوشہ E. Blochet اور (۱۶) براؤن E. G. Browne کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کے لیے (دیکھیے مادۂ تیمور)؛ (۱۷) بووا L. Bouvat : *Essai sur la civilisation timouride*، *JA*، شمارہ ۲۰۸، ۱۹۲۶ء: ص ۱۹۳ تا ۲۹۹؛ (۱۸) وہی مصنّف: *L' Empire mongol (2e phase)*، در سلسلۂ *Histoire du monde*، ج ۸، جز ۳ شائع کردہ زیر ہدایت A. E. Cavaignac (پیرس ۱۹۲۷ء)؛

نہضۂ علمیّہ کے متعلّق قب (۱۹) تذکرۂ دولت شاہ و (۲۰) تصانیفِ میر علی شیر بالخصوص مجالس النّفائس (اقتباس Belin، در *JA*، ۱۸۶۱ء، ج ۱۸ اور ۱۸۶۶ء، ج ۷ و ۸)، [لطائف نامۂ فخری (ترجمۂ مجالس النفائس) در اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۱ء و فروری ۱۹۳۳ء؛ مجالس النفائس، طبع علی اصغر حکمت، تہران ۱۳۲۳ ہجری شمسی]؛

(۲۱) یورپی سیّاح، جنھوں نے تیموری مملکت کا ذکر کیا ہے، یہ ہیں: (الف) کلاویخو Clavijo؛ (ب) پیرو تافور Pero Tafur، ہسپانوی؛ (ج) آمبروگیو کونتارینی Ambrogio Contarini؛ (د) نکولو کونتی Nicolo Conti؛ (ہ) ہیرونیمو دی سان ستیفانو Hieronymo di San Stefano اور؛ (و) کاترینو زینو Caterino Zeno، اطالوی؛ (ز) بوسیکو Boucicault فرانسیسی؛ (ح) نیکیتین Nikitine روسی؛ (ط) شلتبرگر Schiltberger، جرمن - بڑے بڑے یورپی مؤرخ یہ ہیں: (۲۲) D'Herbelot؛ (۲۳) De Guignes؛ (۲۴) گبن Gibbon؛ (۲۵) فان ہامر von Hammer اور (۲۶) وامبیری Vámbéry : *Gesch. Bochara's*، باب ۱۲؛ (۲۷) براؤن Browne : کتاب مذکور، کتاب ۳؛ (۲۸) Skrine and Denison Ross : *The Heart of Asia*؛ (۲۹) سائکس Sykes : *History of Persia*، باب ۶۰ تا ۶۱؛ (۳۰) Czaplicka : *The Turks of Central Asia*؛ (۳۱) Grousset : *Histoire de l' Asie*، ج ۲؛ (۳۲) *Archives Marocaines*، ج ۳ (دیکھیے اشاریہ ص ۴۹ تا ۹۵) میں تیموری فنونِ لطیفہ کے متعلّق ۱۹۰۵ء تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی فہرست درج ہے - دیگر اہمّ تصانیف جو اس کے بعد شائع ہو چکی ہیں ان میں کتبِ ذیل بھی شامل ہیں: (۳۳) Cl. Huart : *Les calligraphes et les miniaturistes de l' Orient musulman*، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۳۴) بلوشہ Blochet : *Les Peintures de manuscrits arabes, persans et turcs de la Bibliothèque Nationale*، پیرس ۱۹۱۱ء؛ (۳۵) F. R. Martin : *The Miniature Painting and Painters of Persia, India and Turkey*، لنڈن ۱۹۱۲ء؛ (۳۶) T. W. Arnold and A. Grohmann : *The Islamic Book*، لنڈن ۱۹۲۹ء؛ (۳۷) آرمناگ بیگ ساکیسیان Arménag Beg Sakisian : *La miniature persane du XIIème au XVIIIème siècle*، پیرس ۱۹۲۹ء اور (۳۸) انندا کرشن کمارؔ سوامی : *Les miniatures orientales de la Collection Goloubew au Museum*

of Fine Arts de Boston، پیرس ۱۹۲۹ء۔

[نیز دیکھیے مقالات بر فنون اسلام]

(L. BOUVAT بُوْوا)

* **تِیمُور تاش** : [یا تیمُور طاش = تمُر تاش] : اُرتُقی، ابن نَجْم الدّین اِیلَغازِی بن اُرتُق، [اُرتقیوں کی] ماردِین والی شاخ میں سے تھا۔ الملک العالم العادل حُسام الدین تیمور تاش ۴۹۸ھ/۱۱۰۴ء میں پیدا ہوا اور [۵۱۱ھ] میں جب وہ [تقریباً ۱۳] برس کا تھا اس کا باپ اُسے حَلَب میں اپنا عارضی نائب بنا کر چھوڑ گیا ۔ ۵۱۵ھ میں تیمور تاش کو [جو اس وقت ۱۷ برس کا تھا] سلطان محمود سلجُوقی کے دربار میں بھیجا گیا؛ اس سفارت کا یہ نتیجہ نکلا کہ میّافارِقین [رَكْ بآن] کا علاقہ اُرتُقیوں کی مملکت میں شامل کر دیا گیا ۔ ایلغازِی [بن اُرتُق یکم رمضان ۵۱٦ھ / ۳ نومبر ۱۱۲۲ء کو] فوت ہوا تو اُس کی املاك تقسیم ہو گئیں ۔ تیمور تاش [بن ایلغازی] کو ماردِین ملا اور اس کے بھائی سلیمان کو میّافارِقین اور اس کے عمزّاد بھائی سلیمان ابن عبدالجبّار بن اُرتُق کو حَلَب ۔ ۵۱۸ھ میں بَلَك ابن بَہرام بن اُرتُق صاحبِ حَلَب مَنْبِج کا محاصرہ کرتے ہوئے مارا گیا ۔ مَنْبِج اس وقت امیر حسّان والیِ بَعْلَبَكّ کی ملکیت تھا ۔ [تیمور تاش، جو اپنے ابن عَمّ بَلَك کے لشکر میں شامل تھا، مار دھاڑ کرتا ہوا حَلَب تک چلا گیا؛ قبّ ابوالفداء : تاریخ، ۲ : ۲۳۷] اور ۲۰ ربیع الاوّل ۵۱۸ھ کو اس شہر پر قابض ہو گیا ۔ اُس نے وہاں اپنا نائب مقرّر کر دیا، کیونکہ ملکِ شام [جنگ با فرنگ کی وجہ سے] میدانِ رزم بنا ہوا تھا اور وہ [راحت پسند آدمی] تھا (ابن الأثیر: الکامل، طبع ٹورنبرگ، ۱۰ : ۴۳٦ [طبع ۱۳۴۸ھ، ۸ : ۳۱۵]) ۔ دُبَیس (مَزْیَدِی) شیعی کی سازشوں کی وجہ سے فرنگیوں نے حَلَب کا محاصرہ کر لیا ۔ اپنے آقا کی کمزوری ('الوَهْن والعَجْز'، ابن الأثیر: الکامل، طبع ۱۳۴۸ھ؛ ۸ : ۳۱٦) کو مدّنظر رکھتے ہوئے اہلِ حَلَب نے آق سُنْقُر البُرْسُقی صاحبِ موصِل سے امداد کی درخواست کی اور اُسے قلعے میں داخل کر لیا ۔

عمادالدین زنگی ۵۲۱ھ میں مَوصِل میں بُرسُقی کا جانشین ہوا اور بر سرِ اقتدار آیا تو اس کے بعد تیمور تاش کو مسلسل ہزیمتیں اٹھانا پڑیں ۔ زنگی اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے شوق میں نَصِیبِین کی طرف بڑھا، جو ماردِین کی عملداری میں تھا ۔ تیمور تاش نے اپنے عمزاد بھائی داؤد بن سُقْمان والیِ حصن کَیْفا سے مدد مانگی لیکن اس سے پیشتر کہ دونوں عمزاد بھائیوں کے لشکر وہاں پہنچیں زنگی نے ایک فوجی چال سے نَصِیْبِین پر قبضہ کر لیا ۔

۵۲۴ھ میں شام سے واپس آتے وقت زنگی نے [مدینۂ] سَرْجِی (جو ماردِین اور نَصِیبِین کے درمیان واقع تھا، قبّ قصر سِرْچِیْخن [؟]، نَصِیبِین سے ۸ میل بجانبِ مغرب) کا محاصرہ کر لیا ۔ تیمور تاش، داؤد اور والیِ دیارِ بَکْر نے بیس ہزار ترکمانوں کی جمعیّت اکٹھی کی لیکن شکست کھائی ۔ جب زنگی حصن کَیْفا لینے میں ناکام رہا تو وہ دارا کا قلعہ فتح کرنے کی طرف متوجّہ ہوا [دارا نَصِیبِین سے ایک مرحلے پر ہے؛ مقدّسی، ۱۴۹ و ۱۴۰] ۔ ان ہزیمتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ۵۲۸ھ میں تیمور تاش نے زنگی کے ساتھ ہو کر آمِد (دیارِ بَکْر) کا محاصرہ کر لیا ۔ والیِ قلعہ نے داؤد سے امداد مانگی لیکن داؤد کو شکست ہو گئی ۔ زنگی اور تیمور تاش نے آمِد کے علاقے کو ویران کر دیا لیکن قلعے والوں نے ہمّت نہ ہاری ۔ زنگی نے اس کے بدلے میں الصَّوْر [ذہبی: المشتبہ، ۳۱۷] پر قبضہ کر لیا، جو دیارِ بَکْر کی مملکت میں تھا [ابن الأثیر : الکامل، طبع ۱۳۴۸ھ، ۸ : ۳۴۳] (قبّ مادۂ ماردِین : قضاءسَوَر [صَوْر؟]) ۔

۵۱۸ھ میں تیمور تاش میّافارِقین میں اپنے

عمزاد بھائی سلیمان کا جانشین ھوا ۔ بظاھر اسے صرف یہی کامیابی حاصل ھوئی کہ اس نے الھتّاخ ([قبّ یاقوت، ۴ : ۹۶۲] یا عتّاخ؛ شرف نامہ، ۱ : ۲۴۵ عتّاق) پر، جو میّافارقین کے شمال میں ھے، قبضہ کر لیا؛ چنانچہ ۵۰۲ھ میں اس نے آلِ مروان [رکّ بہ مروان، آل] کے آخری رکن سے یہ شہر لے لیا.

تیمور تاش اور داؤد نے زنگی کی وفات (۵۴۱ھ) سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنے پہلے مقبوضات واپس لے لیے، جن کا الحاق والیِ موصل نے اپنی مملکت سے کر لیا تھا، مگر زنگی کے جانشین سیف الدین ابن زنگی نے نہ صرف یہ علاقے دوبارہ واپس لے لیے بلکہ ماردین کا محاصرہ کر لیا اور گرد و نواح کا سارا علاقہ ویران کر دیا ۔ اس پسند تیمور تاش نے اب زنگی کے زمانے کو یاد کر کے افسوس کیا ۔ وہ دن اب اُسے شادمانی و سرور کے دن معلوم ھوتے تھے ("ایامہ لقد کانت اعیادًا") [ابن الأثیر: الکامل، طبع ۱۳۴۸ھ، ۹ : ۱۸] ۔ اس نے جلد ھی سیف الدین سے صلح کر لی اور اُسے اپنی لڑکی [خاتون کا] رشتہ [دیا] لیکن سیف الدین ۵۴۴ھ میں فوت ھو گیا اور [شَو نادیدہ بیوہ] اس کے جانشین قطب الدین کے عقدِ نکاح میں آئی [الکامل، طبع ۱۳۴۸ھ، ۹ : ۴۳] ۔ تیمور تاش "صاحبِ ماردین و میّافارقین" ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء میں تیس [قمری] سال [سے کچھ اوپر] حکمرانی کر کے انتقال کر گیا ۔ اس نے تقریباً ۸۴ سال عمر پائی ۔ یہی تاریخ ابوالفرج (طبع Pococke، ص ۲۹۱)، [ابن الأثیر] اور ابوالفداء نے بھی دی ھے لیکن جو مآخذ علی امیری نے استعمال کیے ھیں (یعنی اُمّ العِبَر نام کی ایک کتاب از عبدالسلام افندی مفتی ماردین [م ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء، فردی Ferdi، تکملۂ براکلمان، ۲ : ۷۸۰ و تعلیقہ برآن در تکملۃ، ۳ : ۱۳۱۰]) اُن کی رُو سے اس کی تاریخ وفات ۵۴۸ھ ھے ۔ تیمور تاش نے ماردین میں المدرسۃ الحُسامیّۃ تعمیر کرایا اور اس کے بالمقابل جامع مسجد تعمیر کرائی ۔ تیمور تاش کے سکّوں پر (جن کا حال غالب اِدْھِم: *Catal. des Monnaies Turcomanes*، قسطنطنیۃ ۱۸۹۴ء، ص ۲۷ اور علی اَمیری: کتاب مذکور، ص ۱۸ نے بیان کیا ھے) نہ تو سال درج ھے اور نہ ٹکسال ھی کا نام ۔ جو علامت ان پر پائی جاتی ھے وہ علی امیری کی رائے میں ترکی قبیلے قایی Kayï ['قای' در دیوان لغۃ الترکی ترجمہ سی، ۱ : ۲۸؛ قبّ امیر خسرو: قران السعدین، کانپور ۱۸۷۳ء، ص ۳۷ "ترکِ قی" (مخفّف قای)] کا 'تمغا' [یعنی علامت] ھے.

مآخذ: (۱) قبّ مادّہ اُرتُقیّۃ اور ماردین؛ (۲) ابن الأثیر، ج ۱۰ : ۳۷۳، ۴۱۸، ۴۲۶، ۴۳۶، ۴۴۰، ۴۵۵، [۴۶۷]، ۵۲۶؛ ج ۱۱ : ۶، [۴۳]، ۸۱، ۹۲، ۱۱۵؛ [ایضاً قاھرۃ طبع ۱۳۴۸ھ، ج ۸ : ۲۷۹، ۳۰۴، ۳۰۹، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۲۵، ۳۳۱، ۳۴۳، ۳۶۳؛ ج ۹ : ۱۸، ۴۳، ۷۲]؛ (۳) ابوالفداء: *Annales moslemici*، طبع ریسکے Reiske [طبع قاھرۃ ۱۳۲۵ھ]؛ (۴) کاتب فردی: ماردین ملوک اُرتُقیّۃ تاریخی، (۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء]، خود کتاب تو امراء کے عہدوں کی بالکل غیر اھم فہرست ھے لیکن اس کے ناشر علی امیری نے قیمتی حواشی دیے ھیں)، استانبول ۱۳۳۱ھ.

(V. Minorsky مِنورسکی)

تِیمُورتاش: [یاتمرتاش یا تیمور طاش] عثمانی قائد اور وزیر، قرہ علی بیگ کا بیٹا، جس نے اورخان کے عہدِ حکومت کے پہلے سال میں قلعہ ھرکہ Hereke فتح کیا، جو خلیج نیقومیدیہ Nicomedia پر واقع تھا اور اَیدوس Aidos کے محاصرے میں خاص طور پر دادِ شجاعت دی، جہاں اُس نے ایک تیر، جو اس کی آنکھ میں آ لگا تھا، اپنے ھاتھ سے کھینچ لیا ۔ اس کے خاندان کی ابتداء کا حال بہت کم معلوم

ہے اور یہی حال قدیم عثمانی سلطنت کے دیگر امراء کے خاندانوں کا ہے؛ مثلاً خانوادهای چِنْدرلی [قبّ مادّۂ چِنْدرلی Čenderli، اوْرِنوس Ewrenos [رکّ بآن] اور میخال اوغلی [رکّ بآن] کا - تیمور تاش پاشا کا ذکر اوّل اوّل اُس وقت آتا ہے جب اس نے سلطان کی فتوحات کو دریاے تُنْجہ Tundja کے ساتھ ساتھ سلطان مراد اوّل کے حکم اور لالاشاہین پاشا کی امداد سے جاری رکھا - ۷۶۷ھ / ۱۳۶۵ء میں اُس نے یکیجہ قیزیل آغاج کو (قبّ حاجی خلیفۃ : Rumeli und Bosna، ص ۹۴ ببعد، جہاں اس واقعے کی تاریخ ۷۶۸ھ دی ہے) اور یانْبولی کو (کتاب مذکور، ص ۵۳ ببعد، اس واقعے کی تاریخ بھی وہی ہے) تُنْجہ کے میدان میں فتح کیا - اس کے بعد دس سال تک ماخذ میں اس کی سرگرمیوں کا کچھ پتا نہیں چلتا - جب لالاشاہین سربیہ— [صربسان یا صربیہ] - بُلغاریہ [یا بلغارستان] کی جنگ کے آخر (۷۷۷ھ/ ۱۳۷۵ء) میں فوت ہو گیا تو تیمورتاش اس کی جگہ روم ایلی کا بیگلر بیگ مقرر ہوا - اس حیثیت سے اس نے سب سے پہلے فوج کے نظام کو درست کر کے نام پیدا کیا - ''سپاہیوں'' کو (دیکھیے مادۂ تیمار) جاگیریں عطا کرنے کا نظام قائم کیا اور فوج کے سب سے نیچے کے درجوں کے لیے 'وائنق' voinak کی تخلیق کی - ان درجوں میں زیادہ‌تر بُلغاریہ کے عیسائی تھے، جو بالخصوص گاڑیبانی کا کام کرتے تھے (قبّ J. v. Hammer : G. O. R.، ۱ : ۱۸۱ ببعد) - معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیمور تاش ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا کہ نمدے کی ٹوپیاں، (جو عام طور پر بِیلہ جِک Biledjik میں بنتی تھیں اور) جو اورخان کے وقت سے عام استعمال میں تھیں، فوجوں کے لیے مخصوص ہو گئیں اور قرمزی رنگ بیگوں اور افسروں کے لباسِ سر کے لیے مقرر ہوا (قبّ J. v. Hammer : G. O. R.، ۱ : ۸۹ ببعد) - تیمور تاش پاشا کو

نمایاں حیثیت پھر اُس وقت حاصل ہوئی جب اس نے قلعۂ مُناسْتر (اسے آج کل [بزبانِ صربی] بِیتْولِیَہ Bitolj کہتے ہیں)، پرِیلِپْ [سامی: پرلپّہ]، اور اِشْتِپ [سامی : اشتپی] (موجودہ شْتِپ) فتح کیے - (اس کی تاریخ ۷۸۴ھ / ۱۳۸۲ء دی گئی ہے؛ قبّ حاجّی خلیفہ : Rumeli und Bosna، ص ۹۷، ۹۶، ۹۲، نیز اسی مصنّف کی تقویم التواریخ، استانبول ۱۱۴۶ھ، ص ۹۷ - حاجی نے بھی یہی تاریخ دی ہے لیکن اس تاریخ کی تطبیق سلطان مراد اوّل کے اُس خط سے مشکل ہے جو کہتے ہیں کہ اس نے اپنے بیٹے بایزید کے نام اِدِرْنہ سے [اوائل] ربیع الاوّل ۷۸۲ھ/ اواسط اپریل ۱۳۸۰ء میں لکھا - فریدون نے منشئات السلاطین، طبع [اوّل]، ۱ : [۱۰۰] میں اسے نقل کیا ہے، اس پر قبّ J. v. Hammer، در G. O. R.، ۱ : ۱۹۱ ببعد، جہاں اس دستاویز سے اقتباسات منقول ہیں) - جب تک سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی عہد کے واقعات کی تاریخ ترتیب زمانی کے ساتھ قطعی طور پر معیّن نہ ہو جائے اس امر کو یقینی تصوّر کرنا چاہیے کہ تیمور تاش نے دریاے واردار Wardar کو عبور کر کے موجودہ صربیہ Serbia کے جنوبی حصّے پر حملہ کیا اور وہاں سلطان کے لیے تین مستحکم مقامات فتح کیے - اس موقع پر اس نے قارْلِی اِیلِی یعنی آیتُرلیا Aetolia اور اَکَرْنانیا Acarnania [دیکھیے E. Debes : Neuer Handatlas، طبع ۱۹۳۰ء، نقشہ ۷۳] پر بھی سخت دباؤ ڈالا، جو کارلو ثانی ٹوکو (Carlo II Tocco) ''شاہ اهلِ اِپائسی اَرس'' (''King of Epirotians'') (م جولائی ۱۴۲۹ء) کا ملک تھا - کہتے ہیں کہ ۱۳۸۰ء میں تیمور تاش نے اَرْتہ Arta کے خلاف بھی ایک مہم تیّار کی تھی (یہ مقام بحر ایُونی (Ionian Sea) سے دُور نہیں ہے) [دیکھیے مذکورۂ بالا نقشہ، ۷۳] - یہ عثمانی سلطنت سے علیحدہ ہونے کی طرف مائل تھے (قبّ Epirotica،

طبع J. Bekker (بون Bonn ۱۸۴۹ء)، ص ۲۲۹، سطر ۲۲ اور Jorga، در *G. O. R.*، ۱ : ۲۷۳) - غرض کہ وہ تھسیلی [تسالیا] اور اپائی‌آرس Epirus میں برابر نقل و حرکت کرتا رہا، یعنی اُن علاقوں میں جہاں طُرخان بیگ [رک بآں] بھی کامیابی کے ساتھ لڑتا رہا تھا - ۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں طُرخان بیگ اچانک اناطولیا [اناضول] میں نمودار ہو گیا - سلطان مراد کا جو معرکہ قونیہ کے میدان میں اپنے نہایت خطرناک دشمن علاءالدین علی صاحب قرمان سے ہوا اس میں تیمور تاش عثمانی فوج کے 'پس قراول' (پچھلے حصّے rearguard) کا سپہ سالار تھا اور یہ اُسی کے بیچ میں آنے کا نتیجہ تھا کہ علاءالدین کو راہِ فرار اختیار کرنا پڑی اور عثمانیوں کو فتح حاصل ہوئی - اس خدمت کے صلے میں اسے مالِ غنیمت کا بیشتر حصّہ ملا اور وزیر کا منصب بھی عطا ہوا؛ یعنی 'پاشای سہ توغ' کا، انھیں وہ سلطنت کا بیگلر بیگ اوّل ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتا تھا - اگلے سال (۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء) جب مراد یورپ کے خلاف پھر ایک مہم لے جانے کی تیّاری کر رہا تھا تو تیمور تاش اناطولیہ ہی میں رہا اور شہزادہ یعقوب کی غَیبت کے زمانے میں گرمیان ایلی [رک بآں] کے علاقے کا نظم و نسق کرتا رہا - ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء میں تیمور تاش پھر علاقۂ بلقان میں آ نمودار ہوا - اس دفعہ حاجی خلیفہ کی تقویم التواریخ کے مطابق کراتووو Kratovo (ترکی میں Ḳarātowā قراطووہ) فتح کیا، جو اُسکوب Üsküb کے مشرق میں ہے اور چاندی اور تانبے کی کانوں کے لیے مشہور ہے - اگلے سال (۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء) قرمانیوں نے بروسہ اور انقرہ پر حملہ کیا اور تیمور تاش اسیر ہو گیا - جب اسے رہائی ملی تو اس نے اپنا بدلہ یوں لیا کہ قرمان کے شہزادے کو آق چای (علاقہ گرمیان ایلی) کے میدان میں شکست دے کر اسے بلا تأمّل تختۂ دار پر لٹکا دیا، گو وہ بایزید اوّل (یلدرم) کا بہنوئی تھا - اس سے بعد کے دور میں 'مُنَجِّم باشی'، جس نے غالباً ادریس بتلیسی (۳ : ۳۱۱) سے استفادہ کیا ہے، ہمیں بتاتا ہے کہ تیمور تاش پاشا نے بایزید اوّل کے حکم سے ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ - ۱۳۹۷ء میں علاقۂ اناطولیہ میں کانغری K'anghri [رک بہ K'anghri] کو فتح کیا اور اس سے اگلے سال ۸۰۰ھ میں (جس کا آغاز ۲۴ ستمبر ۱۳۹۷ء کو ہوا) ایتھنز اور اس کے مضافات کو (قب *Chronicon breve*، در Ducas، طبع بون، ص ۵۱۶ [Μουρτάζης] اور J. H. Mordtmann، در *Byz.-Neugr. Jahrb.*، ج ۴، طبع ۱۹۲۳ء: ص ۳۴۶ ببعد) - اس نے بہسنی Behesnī [رک بآں] اور ملطیہ [رک بآں] ترکمانوں سے اور دیورگی کردوں سے لے لیے اور دارندہ اور کماخ [رک بآں] (نیز قب سعدالدین، ۱ : ۱۵۰) بھی فتح کر لیے؛ اور وہ کبھی یورپ میں اور کبھی ایشیاے کوچک میں اسی طرح کی مہمّوں میں مصروف ہی رہا (قب فان ہامر J. v. Hammer، در *G.O.R.*، ۱ : ۲۴۸ ببعد) - انقرہ کی لڑائی میں (۱۹ ذوالحجۃ ۸۰۴ھ / ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء [یزدی، ۲ : ۴۳۷]) وہ اپنے بیٹے یخشی کے ساتھ خود بایزید اوّل کی طرح تیمور کے ہاتھوں اسیر ہو گیا - جب اُس کے جمع کیے ہوے خزانے کُوتاھیہ [رک بآں] میں دستیاب ہوے تو تیمور نے اسے بڑی لعنت و ملامت کی اور اوّل اوّل اُسے رہا کرنے سے انکار کر دیا (قب فان ہامر، در *G.O.R.*، ۱ : ۳۳۰، از روی شرف‌الدین علی یزدی : *Histoire de Timur-Bec*، ترجمہ Petis de la Croix، [طبع ۱۷۲۳ء، کتاب ۵ باب ۵۰ : ص ۲۳] [یزدی، ۲ : ۴۴۹، ۴۵۰ میں ملامت کا ذکر نہیں])- سلطنتِ عثمانیہ کے اضمحلال کے بعد وہ تھوڑا ہی عرصہ زندہ رہا - جنگ اُلوباط [اولو آباد؛ سامی بک:

(ایشیاے کوچک) میں وہ شہزادۂ عیسٰی کی فوج کی کمان کر رہا تھا کہ اس کے اپنے ہی ایک ملازم نے غدّاری سے اسے قتل کر ڈالا (۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) ۔ سلطان محمّد اوّل نے اس بوڑھے مردِ جنگی کا سر فتح کے ثبوت میں اپنے بھائی سلیمان کو بھیجا ۔ اس کی لاش کو بُروسہ پہنچایا گیا، جہاں اسے اُسی کی تعمیر کردہ مسجد میں دفن کر دیا گیا ۔ اس کے چار بیٹے تھے، جو جرنیل اور وزیر بن کر معزّز و ممتاز ہوے؛ یعنی (بقولِ سعدالدین) اوروج بیگ، اومور بیگ، علی بیگ اور یَخْشی بیگ ۔ یخشی بیگ نے بلقان کی جنگوں میں کارھاے نمایاں دکھلائے (مثلاً ۷۷۷ھ/ ۱۳۷۵ء میں تسخیر نِیش Nish کے موقع پر [قبّ فان ھامر، در G.O.R.، ۱ : ۱۸۱]، پھر تسخیر پِرووادِجَہ [ترکی میں: پرَاوادی، بلغاری میں: اُوروچ، قبّ K. Jireček: Das Fürstentum Bulgarien، ص ۵۳۹ اور Jorga، در G.O.R.، ۱ : ۲۶۹] ۱۳۸۸ء میں ۔ معلوم ہوتا ھے کہ یَخْشی انقرہ کی لڑائی کے جلد ھی بعد مارا گیا ۔ فان ھامر، در G.O.R.، ۱ : ۳۹۵ نے اس کے ایک دوسرے بیٹے عثمان بیگ کا بھی ذکر کیا ھے مگر قبّ کتاب مذکور، ص ۴۰۲، جہاں اس کا ذکر موجود نہیں) لیکن ترکی تاریخوں میں اس کا کہیں پتا نہیں ملتا ۔ شاید اسے تیمور تاش کے پوتے سے ملتبس کر دیا گیا ہو، کیونکہ اس کا بھی یہی نام تھا [دیکھیے ذیل میں] ۔ تیمور تاش کے خاندان کا شجرہ ذیل میں دیا جاتا ھے:-

قرہ علی بیگ

تیمور تاش پاشا

- اُورُوج بیگ — م ۸۲۹ھ، وہ مرنے کے وقت بیگلر بیگ تھا
- اومور بیگ — م ۸۳۸ھ، وہ مرنے کے وقت وزیر تھا
  - علی چلبی — مرنے کے وقت شہزادۂ مصطفٰی کا دِفتردار تھا
  - عثمان چلبی — کہتے ھیں کہ ۸۳۲ھ/ ۱۴۲۸ء میں، جب وہ گرمیان ایلی کا سنجق بیگ تھا، وَرْنہ Varna کے محاصرے میں مارا گیا
- علی بیگ — م ۸۳۰ھ، وہ مرنے کے وقت وزیر تھا
- یَخْشی بیگ — م نواح ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۲ء

مآخذ: تصانیف جو متن میں بیان ہوئیں اور بلیغ بروسوی: گُلدستۂ رِیاضِ عرفان، بروسہ ۱۳۰۲ھ، ص ۶۳، جہاں غلطی سے تیمور تاش نام کے دو آدمیوں کا ذکر ھے — ایک جرنیل تیمور تاش کے متعلّق، جو

عثمان اور اورخان کے عہد میں تھا، دیکھیے Zinkeisen،
G.O.R.، ۱ : ۱۱۲ .

(FRANZ BABINGER بابنگر)

* تِینْگْرِی : (Tañri) ایک ترکی لفظ ہے، بمعنی آسمان یا خدا ۔ مشرقی بولیوں میں اس لفظ کی آواز عام طور پر تالو سے ادا ہوتی ہے، چنانچہ چغتائی میں تانْگْرِی tängri ''[قدیم طریق پر] لکھنے میں تینگری'' لکھا جاتا ہے اور دوسری ترکی بولیوں میں بھی اس لفظ کی جو صورتیں ہیں وہ اسی کے مشابہ ہیں ۔ تین مقاطع والے کلمے جو تِلیوت Teleut میں بصورتِ تانْگارا *tañärä* اور التائی میں بصورت تانگارِی *tañäri* ملتے ہیں وہ قابلِ ملاحظہ ہیں؛ قازان کی بولی میں تانْگْرِی (معبود) کے ساتھ ساتھ ایک اور لفظ تارِی *täri* بھی مستعمل ہے، جس کے معنی ہیں کسی ولی کا مجسمہ، اِیقونہ (icon) (اس موقع پر اسم عَلَم تاری - بِردِی Täri-Birdi کا ذکر بے جا نہ ہوگا، جس میں تاری سے مراد خدا ہے [اور پورے کلمے کے معنے خدا بخش ہیں] ۔ عثمانلی ترکی میں اس لفظ کی آواز تالو سے ادا نہیں ہوتی (تِینْگْرِی) اور یہی صورت یاقوتی : Yakutic بولی میں بھی ہے؛ اس کے علاوہ اس میں تین مقطع (syllables) والا صیغہ بھی ہے یعنی تِینْگرا ۔

لسانی معلومات کے لیے قب پاوہ دِ کُورتَی Pavet de Courteille : *Dictionnaire Turc-Oriental*، بذیل کلمہ [تینگری]؛ راڈلف W. Radloff : *Versuch eines Wörterbuches der Türk-dialekte*، ۳ : ۱۰۴۳، ۸۲۳ بعد، ۱۰۴۷ بعد؛ ۱۰۹۵؛ O. Böhtlingk : *Über die Sprache der Jakuten : Jakutisch-deutsches Wörterbuch*، ص ۹۰؛ H. Vámbéry : *Etymologisches Wörterbuch der Turko-Tatarischen Sprachen*، ص ۱۶۸ بعد اور آخر میں الکاشغری (دیوان لغات الترک، قسطنطنیۃ ۱۳۳۳ تا ۱۳۳۵ھ، ۳ : ۲۷۸ بعد [اور اسی کتاب کا نسخۂ فاك سمیل، انقرہ ۱۹۴۱ء، ص ۹۰۶؛ و ترجمۂ ترکی، ۳ جلد و اشاریہ، انقرہ ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۳ء، ۳ : ۳۷۷]، جو کہتا ہے کہ ''تَنْکْرِی'' سے مراد اللہ عزّ و جلّ ہے ۔ کفّار ... آسمان کو ''تنکری'' کہتے ہیں اور اسی طرح ہر اس چیز کو جو انھیں متأثر کرے ''تنکری'' کہتے ہیں، مثلاً بڑا پہاڑ یا بڑا درخت اور اس لیے وہ ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں اور اسی لیے عالِم کو بھی ''تَنکْرِکان'' [*tängrikän*] کہتے ہیں ...'' ۔ لفظ تانگری کان tängrikän ایک قدیم ترکی لقب بھی ہے (قب راڈلف Radloff : *Wörterbuch*، ۳ : ۱۰۴۸؛ مُلر F.W.K. Müller : *Uigurica*، ص ۴۷ : تانگری کان=حکمران) ۔ کلمۂ تانگری کان (مذہبِ مانی میں) بمعنی معبود پایا جاتا ہے، مثلاً مانویہ کے اعترافِ معاصی کی عبارت میں (*Chuastuanift*، طبع A. von le Coq، ۱۹۱۱ء، ص ۱۰) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ تانْگْرِیمْ (یعنی تانْگْرِی باضافۂ ضمیر متکلّم) تورفان Turfan کے متون میں شہزادیوں اور شاہ بیگموں کے القاب میں استعمال ہوا ہے (قب مُلر F.W.K. Müller : *Uigurica*، ص ۴۸، جو اس کلمے کا زمانۂ حال کے مستعمل لفظوں خانم اور بیگم سے مقابلہ کرتا ہے) ۔ یہاں ہم کلمۂ تانْگْرِی کے چند مشتقات کا ذکر کرتے ہیں : تانْگْرِی چی (مانویہ کے اعترافِ معاصی میں، قب *JRAS*، ۱۹۱۲ء [؟]، ص ۲۸۹، ۲۹۹) بمعنی واعظ، برگزیدہ ہستی (لفظی طور پر : 'مردِ خدا' استعمال ہوا ہے) ۔ کومانی زبان میں ''تِنْرِی‌لک *tenrilik*'' = مقدّس؛ اور اویغوری میں ''تِنگْرِی‌لک Teñgrilik'' = متقی اور دیندار ۔ منگول لفظ ''تاگْرِی'' ترکی سے مستعار ہے (اس صیغے کے لیے قب *Bibl. Buddhica*، ۱۲ : ۵۱) .

اس ترکی لفظ کے وہ اشتقاقات جو بعض علماء (مثلاً وامبیری Vámbéry اور بارْبِیہ دِ مینارْ Barbier

de Meynard، بذیلِ مادّہ) نے تجویز کیے ہیں کچھ اہمیّت نہیں رکھتے ۔ زمانۂ حال کی اکثر وسطی ایشیائی ترکی بولیوں میں لفظ 'تانْگری' کے دونوں مفہوم یعنی 'خدا' اور 'آسمان' موجود ہیں؛ اس کے برخلاف عثمانلی ترکی میں اس (قدرے متروك) لفظ کا مفہوم بظاہر محض 'خدا' ہے ۔ تانگری *tañri* کی اصطلاحی ترکیبوں مثلاً ''تینگری دوجکی'' *tañri dewedjeyi* بمعنی ہزار پا کے لیے قبّ معاجم راڈلف Radloff اور باربیه دِ مینار (بذیلِ مادّہ) ۔

بت پرست ترکوں کے مذہبی عقائد کے لحاظ سے اس لفظ میں جو معانی مضمر ہیں ان کی تعریف و تعیین کے لیے مناسب ہوگا کہ پہلے قدیم ترکی کتبوں کا اور پھر اس مواد کا ذکر کیا جائے جو زمانۂ حال میں تِلیوت Teleut اور التای اقوام کے عقائد شامَنی (shamanism) سے فراہم کیا گیا ہے ۔

کتبوں میں کلمۂ تانگری *tañri* تقریباً ہمیشہ ایک خدائی قوّت کے معنوں میں وارد ہوا ہے، اسی کی مشیّت سے بادشاہ سطوت و جبروت حاصل کرتا ہے؛ خود بادشاہ ''تانْری'' کا مثیل ہے اور ''تانگری سے پیدا ہوا ہے'' (تانگری تاگ تانگریدا بولمش *tañritäg tañridä bolmish*) اور اسے 'تانگری' ہی نے تخت و تاج دیا ہے (تانگری یاراتمش) ۔ تانگری ترک لوگوں کی حفاظت کرتا ہے، ان کی حیثیت بطور ایک قوم کے برقرار رکھنے کا اہتمام کرتا ہے اور ترکی سرداروں کو ان کے دشمنوں پر فتح دیتا ہے : چونکہ وہ ترکوں کا خاص حامی و ناصر ہے اس بناء پر اسے ''توْرک تانگریسی'' *Türk tañrisi* کہا جاتا ہے ۔ یہ لوگ آسمان کے ربّ کے علاوہ ایک خاص قوّت کے بھی قائل ہیں جو مٹی اور پانی کی ارواح (یِر — سُوب) کی صورت میں قوم اور افراد کی قسمت پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن اعلٰی ترین معبود 'تانگری' ہی ہے ۔

تاہم بعض عبارتیں ایسی بھی ہیں جہاں اصطلاحِ 'تانْگری' سے کوئی حقیقی شخصیّت مراد نہیں ہے (اوزا کوك تانگری *özä kök tañri*، یعنی 'اوپر کا نیلا آسمان' اسی طرح مخلوق ہے جیسے کہ 'نیچے کی سیاہ زمین' (آسَرہ یاغِز یِر) اور نوعِ انسانی ۔ ان سب کو کس نے پیدا کیا اس کا کوئی ذکر نہیں ۔ ایک اہمّ عبارت (*Inscriptions* : V. Thomsen *de l'Orkhon*، ص ۱۱۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ اُوغوز Oghuz کی ایک بغاوت ہوئی ''اس لیے کہ آسمان اور زمین دونوں میں ابتری پھیل گئی تھی''۔ یہاں ہمیں صاف طور پر طبیعتِ کائنات کے بارے میں چینی خیالات کا اثر دکھائی دیتا ہے؛ یعنی اس نظریے کا جسے خِیرْاَر (Groot) نے "Universismus" یعنی ''نظریۂ کائناتی'' کا نام دیا تھا ۔ اس پر ہمیں تعجّب نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ وہ تِیہک امراء جنھوں نے اورخون Orkhon کے کتبے تیّار کرائے تھے چینی تہذیب و تمدّن کے حلقۂ اثر کے اندر ہی رہتے تھے ۔

زمانۂ حال کی ترکی شَمَنیّت (shamanism) میں 'تانگری' کے تخیّل کے بارے میں (جو زیادہ تر تِلیوت Teleut اور التائی Altai ترکوں میں موجود ہے) قبّ وامبیری کی تصنیف (*Die primitive Cultur des Turko-Tatarischen Volkes*، ۱۸۷۹ء، ص ۱۵۰ ببعد؛ راڈلف W. Radloff : *Aus Sibirien*، ۱۸۸۴ء، ۲ : ۱ ببعد) اور وہ متون جو راڈلف Radloff نے اپنی تصنیف *Proben der Volksliteratur der türkischen Stämme Süd-Sibiriens* کی پہلی جلد میں جمع کر دیے ہیں ۔ یہ وثنیّت حسبِ توقّع خارجی اثرات مثلاً عیسائی اور بدھ مت کے اثرات سے کاملاً آزاد نہیں رہی ۔ مثال کے طور پر جب ہم کسی شَمَنی کے دعائیہ منتر میں الفاظ 'پیرکَن تِنگرے' *Pyrkan Tengre* اور 'پیرکَن کَن' *Pyrkan Kan* دیکھتے ہیں (Radloff :

Aus Siberien، ۲ : ۳۳، ۴۴) تو قدرتی طور پر پیرکن *Pyrkan* میں ہم قدیم منگولی (نیز قدیم ترکی) لفظ برخن *Burkhan*، بمعنی بدھ، کو شناخت کرسکتے ہیں۔ یہ امر کہ ترکی وثنیت کے اسطورۂ تخلیق کائنات میں یہودی، عیسائی اور بدھ مت کے اثرات پائے جاتے ہیں خود راڈلف Radloff کے زیر نظر بھی تھا (کتاب مذکور، ۲ : ۵ ببعد) - جب یہ کہا جاتا ہے کہ شریر روح ارلک Erlik نے آکاش دیوتا کی طرح اپنے لیے ایک آسمان خلق کیا تو یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ یہ ضرور زرتشتی اثر ہوگا (اَھرمَن کی ''جوابی تخلیقات'')۔

ترکی شمنیت کی رو سے قوی ترین دیوتا تنگرے کیرکن Tengere Kaira Kan نے آسمانوں کو خلق کیا نیز شریر روح ارلک ''Erlik'' کو اور نیک روحوں، نوع انسانی اور زمین کو بھی پیدا کیا۔ لفظ تنگری Tengere (راڈلف Radloff کے ضبط املاء کے مطابق) تلیوت کے تانارا *Tänärä* اور التائی کے تاناری *Tänäri* کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ کیرکن Kairakan بالضرور وہی لفظ ہے جو التای میں کیرککن *Kairakkan* ہے (قب راڈلف : *Wörterbuch*، ۲ : ۲۲) اور جو دیوتاؤں اور روحوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے؛ لہذا تنگرے کیرکن Tengere Kaira Kan سے مراد ''آکاش دیوتا'' ہی ہے۔

آکاش میں سترہ مختلف طبقے ہیں، جنھیں سلسلہ وار ایک دوسرے کے اوپر مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں نیک روحیں رہتی ہیں۔ ان چھوٹے دیوتاؤں میں سب سے اعلٰی بای الگون Bäi Ülgön، کیسگن تنگرے Kysagan Tengere اور مرگن تنگرے Mergen Tengere ہیں۔ آکاش دیوتاؤں سے مٹی اور پانی کی روحوں کی طرح براہِ راست نہیں بلکہ آباء و اجداد کی روحوں کی وساطت سے توسل ہو سکتا ہے، یعنی اس مقصد کے لیے کسی شمن [کاھن] (''کم'' *kam*) کی ضرورت ہوتی ہے۔ تلیوت کے ایک شمن کی دعاء میں (راڈلف : *Volksliteratur*، ۱ : ۲۳۸) آسمانہاے بلند سے توسل کیا گیا ہے، اس حیثیت سے کہ وہ خالق ہیں۔ ایک التائی اسطورے (myth) میں (راڈلف : کتاب مذکور، ۱ : ۶۱ ببعد) ایک بہادر شخص آکاش دیوتا کی بیٹی تامان اوکو Tämän Ökö سے شادی کی خواہش کرتا ہے۔

جب قازانی بولی میں طوفان رعد کے وقت کہا جاتا ہے کہ 'تانگری بابای' یعنی ''آسمانوں کا بابا'' گرج رہا ہے تو یہ قدیم بت پرستوں کے تصورات ہی کا ایک بقیہ ہے (قب راڈلف : *Wörterbuch*، ۲ : ۱۴۲۵؛ ۳ : ۱۰۴۷؛ ۴ : ۱۰۶۴)۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ خارجی اثرات سے حتی الوسع قطع نظر کرتے ہوے ترکی تصور میں ''تانگری'' Täñgri سے مراد آکاش ہے، اس حیثیت سے کہ وہ ایک عنصر ہے اور اس سے وہ روح بھی مراد ہے جو آسمانوں میں حکمران ہے۔ اس روح کا تخیل ابتداء میں غالباً ایک قسم کی قوت کی حیثیت سے تھا، ایک ایسی چیز جسے جدید علم اجناسِ اُمم (ethnology) میں مانہ *mana* کہا جائے گا۔ ایک شخصی آکاش دیوتا (a personal god of heaven) کا تصور ضرور اسی تخیل کے ارتقاء سے پیدا ہوا ہوگا۔

جب ترکی قبائل نے دوسرے مذاہب کو قبول کر لیا تو کلمۂ تانگری ان مذاہب کے خدا یا برتر ہستیوں کا نام ہو گیا اور ''آکاش'' کے مفہوم کو قدرتی طور پر ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اب آسمان کے تصور کو ادا کرنے کے لیے لفظ 'کواک' *kök*، جو عثمانلی میں گوک *gök* ہے، استعمال ہونے لگا، جو در اصل ایک رنگ کا نام ہے (قب راڈلف Radloff : *Wörterbuch*، ۲ : ۱۲۲۰)۔ قدیم ترکی میں ہمیں ایک ترکیب کواک قالیق *kök kalïk* بمعنی نیلگوں اثیر (ether) کی بھی ملتی ہے(*Uigurica*،

ص ۸، ۱۸؛ راڈلف Radloff : Wörterbuch، ۲ : ۲۳۰).

بدھ مت کے قدیم ترکی متون میں لفظ 'تانگری' سنسکرت کے لفظ 'دیوا' بمعنی الٰہ کا مرادف ہے۔ بدھ مت کے اساطیر میں اس کا مفہوم وھی ہے جو لفظ ''فرشتہ'' سے زیادہ اچھی طرح ادا ھو سکتا ہے، اس لیے کہ اس ھستی میں کئی صفات مفقود ھیں جو ھمارے نزدیک 'الٰہ' کے تخیّل سے لازمی طور پر وابستہ ھیں۔ دیو کی مؤنث 'دیوی' کے لیے 'تانگری خاتون' tängri khatun کی ترکیب موجود ہے، 'تانگری قِیز' tängri kïz سے مراد ترکی میں 'دیوا کنّیا' (مقدّس بیٹی، اَپْسَرا) ہے۔ دیوتاوں کا بادشاہ (دیو راجا) یعنی اِنْدرا تانگری لار ایلیکی خورمزدہ tängrilär iliki Khormuzda کہلاتا ہے؛ برھما کا نام 'اَزْرُوا تانگری' Äzrua tängri ہے۔ پس ان ھستیوں کے نام ایرانی ھیں، یعنی اَوْھرمَزد Ōhrmazd اور (شاید) زَرْوان Zarwān۔ ''چِری Çrı'' دیوی 'قُوت تانگری خاتونی' Kut Tängri Khatunï یا (بغیر کلمۂ 'خاتون' کے) قُوت تانگری سی Kut Tängrisi کہلاتی ہے۔ یہ نام قُوت تانگری سی Kut Tängrisi ایسا معلوم ھوتا ہے کہ کُبیرا Kubera [دیوتا] کے لیے بھی استعمال ھوتا تھا (مثلاً دیکھیے Müller : Uigurica، ص ۴۵)۔ دھارنیوں (dhāranīs) کے ایک مجموعے Tïšastvustik میں، جو مسافروں کے لیے مرتّب کیا گیا ہے (طبع راڈلف W. Radloff و A. v. Staël-Holstein، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۰ء = Bibl. Buddhica، ج ۱۲)، ھمیں تانگری دام Tängridäm نام کا ایک دیوتا ملتا ہے اور راڈلف اُسے کُبیرا Kubera سمجھتا ہے؛ گویا مؤخرالذّکر کا ایک اَور ترکی نام بھی ہے، لیکن یہ امر مشکوک ہے؛ اس لیے کہ اس کتاب کی ایک عبارت میں (ص ۲۲) Kubera (Kupiri) کا ذکر اس کے نام سے کیا گیا ہے اور ذرا ھی آگے چل کر تانگری دام Tängridäm کا ذکر ایک اَور دیوتا کی حیثیت سے آتا ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اِس متن میں بعض اَور مقامات پر متناقض بیانات موجود ھیں (قبّ مثلاً ترکی متن، ص ۲۳ ببعد)۔ اس تصنیف میں کُبیرا Kubera کے متعلّق قبّ مثلاً ص ۷۹، حاشیہ ۲؛ خود بدھ کو اکثر تانگرِی تانگری سی Tängri Tängrisi کہا گیا ہے۔ آکاش دیوتا (دیوَلوکا) کو ترکی میں تانگْرِی یِر Tängri Yir کہا جاتا ہے۔ وِیمانکا Vaimānika دیوتاوں کو، جو عموماً جَیْن مت کے اساطیر سے مخصوص ھیں لیکن گاھے اَور جگہ مثلاً Tïšastvastile میں بھی مذکور ھیں، وَیمانُکِی۔ تانگْرِی لاز Waimanukı-tängrilär کہا جاتا ہے۔

فرقۂ مانویّہ کی ترکی اصطلاحات کی رو سے، جن پر بُدھ مت کی اصطلاحات کا اثر پڑا ہے (قبّ Chuastuanift، طبع A. v. Le Coq، برلن ۱۹۱۱ء، ص ۵؛ JRAS، ۱۹۱۱ء، ص ۲۷۸)، لفظ تانگری کا استعمال حسب ذیل معنوں میں ھوا ہے: یہاں تانگری ایرانی کلمۂ یَزْد (یا بَگ = Bag) کے مرادف ہے۔ اوّل اس سے مراد مانوی نظام کا اصل الاصول ہے اور دوسرے ثانوی درجے کی ارواحِ نُوریہ یا دیوتا (یَرْق تانگْری لاز) بمقابلۂ ارواحِ خبیثہ ('یاکْلاز' yäklär)۔ آدم اوّل کو 'بِشْ تانگری' یعنی پنج دیوتا کہا گیا ہے (اُن پانچ عناصرِ ترکیبی کی بنا پر جن کا مانوی اساطیر میں ذکر آیا ہے، یعنی اَثیر ether، ھوا، نور، پانی اور آگ)۔ تانگری tängri کا نام عناصرِ خمسہ کو بھی دیا گیا ہے، مثلاً 'اَوْت تانگری' یعنی اگنی دیوتا۔ تانگری آکاش کے معنی میں بھی آیا ہے (مثلاً Chuastuanift، ص ۱۶ = JRAS، ۱۹۱۱ء، ص ۲۹۱، س ۱۶۷)۔ بہشت کا نام 'تانگْرِی یِر' Tängri Yir ہے۔ مانویّت کی یہ اصطلاحات بدھ مت کی اصطلاحات سے خاصی مطابقت رکھتی ھیں، تاھم ایک یا دو خصوصی

اصطلاحات بھی ھیں جن کا ذکر کرنا چاھیے، یعنی مذکورۂ بالا اصطلاح 'تانگری‌کان' *tängrikän* کا استعمال (*Chuastuanift*، ص ۱۰؛ *JRAS*، ۱۹۱۱ء، ص ۲۸۱، س ۲۲) ایک دیوتا 'اَزْرُوا تانگری‌کان' *Äzrua Tägrikän* کے نام میں جس کا ترجمہ فون لے کوک von le Coq نے (*JRAS*، محلّ مذکور) ''اَزْرُوا ربّ'' "Azrua the Lord" کیا ھے اور خاص ترکیب 'آرخُون یر تانگری' *Arkhon Yir Tängri* یعنی 'آرخون Archon دھرتی دیوتا'، جس میں لفظ 'تانگری' شاید ظلمت کی قوّتوں میں سے ایک قوّت کے لیے استعمال ھوا ھے (قبّ *JRAS*، ۱۹۱۱ء، ص ۳۰۳، تعلیقہ ۱).

عیسائی ترکوں کی اصطلاح میں تانگری = خدا، ''تانگری اوغلو'' *Tängri-Oghlï* = ''ابن الالٰہ'' ھے اور مشیخا تانگری *Mshikha Tängri* = ''خداوند مسیح'' - ان عیسائی قطعات میں جنھیں مُلر F. W. K. Müller نے *Uigurica* میں شائع کیا ھمیں کلمۂ تانگری‌دام *Tängridäm* بھی ملتا ھے، جو بدھوں کی ترکی میں اکثر نظر آتا ھے؛ ان عیسائی متون میں یہ دو دفعہ آیا ھے اور یہاں بظاھر اس سے مراد محض ''خدا'' ھے - استعمالِ کومانی (Kuman) میں کوئی چیز خاص طور پر قابلِ ذکر نہیں ھے .

جہاں تک مشرقی ترکستان کے قدیم اسلامی متون کا تعلّق ھے ان میں عربی اور ایرانی اصطلاحوں (مثلاً اللہ، خدا) کو قدرتی طور پر ترکی لفظ تانگری کے مقابلے میں ترجیح دی جانے لگی - [قُوتادغُو بیلیگ] میں، جہاں تک مجھے علم ھے، عربی اسم ذات باری عربی میں شاذ و نادر ھی آیا ھے (عملی طور پر یہ نام محض عربی اقتباسات ھی میں ملتا ھے) لیکن اس متن میں خدا کا تخیّل تنہا لفظ تانگری سے ادا نہیں کیا گیا بلکہ اور ترکی الفاظ (مثلاً ''بیات'' *Bayat*) بھی استعمال کیے گئے ھیں - یہاں لفظ تانگری کلمۂ 'تعالٰی' کے اضافے کے ساتھ بھی وارد ھوا ھے -

[بابرؒ] خدا کے لیے بابر نامے میں عام طور پر (اقتباسات کے سوا) تانگری کا لفظ ھی استعمال کرتا نظر آتا ھے - یہاں بھی عربی طریقے کی پیروی میں ھمیں تانگری ''تعالٰی'' کا لفظ ملتا ھے (مثلاً ص ۸۰۴، طبع اِلمِنْسکِی Ilminsky) - شَو Shaw کے ایک ملاحظے سے [کہ یہ کلمہ (تنگری) یارقند وغیرہ میں بہت کم استعمال میں آتا ھے] شاید یہ نتیجہ نکل سکتا ھے کہ عربی اور فارسی اسماے باری تعالٰی کے مقابلے میں لفظ ''تنگری'' مشرقی ترکی سے غائب ھوتا جا رھا ھے، دیکھیے *A Sketch of the Turkish Language*، ۲ : ۶۹).

ھو سکتا ھے کہ تانگری‌بِردی *Tängribirdi* اور تانگری قُلی *Tängrikulï* کی طرح کے اَعلام فارسی ناموں مثل 'خدا داد' اور 'خدا بندہ' کے نمونے پر بنائے گئے ھوں .

(بُوخْنر V. F. Büchner).

تِیُول : ایران کے اداری نظام کی ایک اصطلاح ھے - (عام تلفّظ تُیُول اس کلمے کو عربی جمع کے وزن فُعُول پر باطل طور پر قیاس کرنے سے پیدا ھوا - شاردان Chardin نے جو اس کا ترجمہ 'دوامی' کیا ھے تو وہ بھی اسی طرح کی ایک غلط فہمی سے ناشی ھوا - اس نے غلطی سے اس لفظ کو عربی لفظ ''طَوِیل'' سے مشتق سمجھا) .

تیُول سے (کم از کم انیسویں صدی میں اور اصولاً) وہ اجازت یا اختیار مراد ھے جو حکومت کی طرف سے کسی فرد کو عطا کیا جائے، جس کی بناء پر وہ اپنی تنخواہ یا پنشن [حقوقِ تقاعُد، اِدْرار] براہِ راست کسی دیہ یا دیہات کے مجموعے کے لگان وغیرہ سے، جو قابلِ ادخالِ خزانۂ دولت ھوں وصول کر سکے - اپنی سادہ اور بسیط صورت میں یہ ایک قسم کی ضمانت تھی جس کی رو سے معاش (پنشن) کی ادائگی یقینی ھو جایا کرتی تھی - یہ ضمانت

بعض اوقات تو معاش (پنشن) کے ساتھ ھی دے دی جاتی تھی اور کبھی بعد میں زائد نوازش کے طور پر عطا کی جاتی تھی - وظیفہ خوار گاؤں میں اجنبی بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ گاؤں کا مالک ہو - ایران کی اقتصادی اور اجتماعی (سوشل) تاریخ ابھی لکھی نہیں گئی؛ اس لیے ہم یہاں صرف وھی باتیں لکھیں گے جو لفظ تیول کے اشتقاق سے متعلق ھیں یا اس رواج کی تشریح کرتی ھیں جسے یہ نام دیا گیا ھے۔

اشتقاق : یہ لفظ اصل میں مشرقی ترکی زبان سے مشتق ھے - راڈلف Radloff : *Opît Slovara*، ج ۳ : عمود ۱۳۴۳ و ۱۳۸۰ بیان کرتا ھے کہ تیول ''وہ جائداد ھے جو کسی کو تفویض کی گئی ہو، مقررہ حصّہ (*das Zuertheilte*) یا ''مِلْک مخصوص'' اور اس کا اشتقاق فعلِ تی ـ ماک *tï-mäk* (قسطنطنیۃ کی ترکی میں دِگْمِک > دیمک) سے ھے - ترکیب کو مدّ نظر رکھتے ہوے تیْ - اُوْل *tiy-ul* کا مقابلہ قَیْتْ - اُوْل *kait-ul* یعنی اوردو، مُعَسْکَر، کیمپ، سے کر سکتے ھیں - یہ لفظ فارسی میں بھی داخل ہو گیا ھے (قیتول = جای باز گشت، مرجع، قَیْتْمَق سے بمعنی واپس ہونا، عود کرنا) - تیول کا لفظ عہدِ مغول میں نہیں ملتا، مثلاً رشید الدین نے جو باب اصلاحاتِ غازان سے متعلق لکھا ھے اس میں یہ لفظ نہیں آتا (مخطوطۂ مکتبۂ ملّیۂ پیرس، .Suppl. Pers، عدد ۲۰۹، ورق ۳۰۰ الف تا ۳۴۳ ب؛ [تاریخ مبارک غازانی، طبع یان در GMS، ص ۳۸۳ ببعد و جامع التواریخ، طبع علی زادہ، باکو ۱۹۵۷ء؛ فہرست اصطلاحات] اور دوساں d'Ohsson : *Hist. des Mongols*، ۴ : ۳۷۰ تا ۴۷۷)؛ بلکہ یہ لفظ دورِ تیمور کے متعلق ظفر نامۂ یزدی میں بھی نہیں آتا - جہاں تک معلوم ہو سکا ھے یہ لفظ پہلی بار آلِ تیمور کے عہد میں سرکاری اصطلاح کے طور پر رائج ہوا؛ قبّ مطلع سعدین، بذیل سنۃ ۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء [مطلع، طبع لاہور، ۲ : ۱۰۸، و ۱۰۳۵]؛ قبّ *N. E.*، ۱۴ (۱۸۴۳ء) : ص ۱۲۴ تا ۱۲۵، جہاں کاترمیئر Quatremère اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوے اکبر نامہ کا (جو ۱۵۹۷ء میں ختم ہوا) حوالہ دیتا ھے اور عالم آرا کا (جس میں ۱۶۲۹ء تک کے واقعات درج ھیں)۔

اس نظام کی ابتداء : اگرچہ لفظ تیول نسبۃً بعد کے زمانے میں استعمال ہوا لیکن جس دستور کے لیے یہ استعمال ہوتا ھے وہ سلجوقیوں کے عہد میں بلکہ اس سے بھی پہلے رائج تھا - پرانا ترکی لفظ تیول عام زبان میں لازمی طور پر اِقطاع (جاگیر، جمع اقطاعات) کی طرح کی کسی سرکاری اصطلاح کے مترادف ھے، جس کی جگہ اس نے بالآخر لے لی - عربی اصطلاح 'اقطاع' عین اس وقت سے متروکہ ہوئی جب سیُورغال (قبّ سطورِ ذیل) اور تیول کی اصطلاحات کا استعمال عام ہو گیا۔

سیاست نامہ کے بابِ پنجم [ص ۲۸] میں نظام الملک [طوسی] 'مُقْطَعان' یعنی جاگیرداروں کے حقوق و امتیازات کو یوں متعیّن کرتا ھے : ''انھیں جاننا چاہیے کہ انھیں صرف یہی حکم ھے کہ وہ نرم طریق سے وہ واجبات ('مالِ حق') رعایا سے وصول کریں جن کی وصولی کا حق جاگیرداروں کو تفویض ('حوالت') ہوا ھے، جب یہ محصول وصول کر لیا جائے تو پھر کاشتکار آزاد ھیں؛ یعنی ان کا تن و مال، زن و فرزند ایمن ھیں - ان کی جائداد ـــ یعنی مال اور زمین (''اسباب و ضِیاع'') ـــ بھی ایمن ھیں اور مُقطَعان کو ان پر کوئی حق نہیں رہتا''- اس طرح اِقطاع کا حق صرف اسی حد تک محدود ہو کر رہ جاتا ھے کہ ''مالِ حق'' جو کاشتکار کے ذمے واجب الادا ھے وہ مُقْطَع وصول کرے - اِقطاع کی یہ صورت (ھمیں یہ معلوم نہیں کہ اقطاع کی آیا صرف یہی ایک صورت تھی!)

بعد کے زمانے کے تیول سے بہت مشابہ ھے ۔ دورِ مغول میں رشید الدین ۷۰۳ھ / ۱۳۰۳ء کے فرمانِ شاھی [یَرلیغ] کا حوالہ دیتا ھے، جس میں غازان خان نے فوجی جاگیروں (اقطاع) کا دستور جاری کیا ۔ یہ فرمان [جامع التواریخ، طبع علی زادہ، باکو ۱۹۵۷ء، ۳ : ۵۱۰؛ تاریخ مبارک غازانی، طبع یان Karl Jahn، در GMS، ۳۰۳] سرکاری اراضی ('اِینجو' اور 'دیوانی')، شخصی ملکیّت، وقف اور ان زمینوں کے درمیان جو غیر کاشت شدہ ھیں حدِّ امتیاز قائم کرتا ھے ۔ پہلی قسم کی اراضی والے کاشتکار (رعایا) اپنے حقوق سے فائدہ تو اٹھاتے تھے لیکن محاصل (بہرہ، مال، قُوبچُور، مُتوجّہاتِ دیوانی) خزانے میں داخل کرنے کے بجائے فوجی عطیہ داروں یا 'جاِیکان' کو اِدا کیا کرتے تھے (ان متعدد اصطلاحات کے معنوں کے لیے قبّ بارٹولڈ Barthold:, Nadpis na mečeti Manuče، Aniiskiya seriya، عدد ۵، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۱ء : ص ۳۲ ببعد) ۔ یہ دستور بھی تیول سے بہت مشابہ ھے، گو ۷۰۳ھ میں یہ ان امتیازات کے پورے نظام کا ایک جزو بن گیا جو فوجی خدمت کی نظیر (counterpart) تھیں (دوساں d' Ohsson، ۴ : ۴۲۴، فصول ۱ تا ۹).

[عطاء] تیول ایک مالی تدبیر expedient کی حیثیت سے ۔ باقاعدہ تیول کے بندوبست کی خصوصیت یہ ھے کہ وہ اُس سارے طریقِ عمل کو نہایت بسیط اور سادہ کر دیتا ھے جسے بتدریج ایک سادہ مالی تدبیر کی شکل میں ڈھال لیا جاتا ھے، اُسی تناسب سے جس تناسب سے کہ ادائگیوں کی تعداد بڑھتی جائے اور مرکزی خزانے کے لیے یہ مشکل ھو جائے کہ وہ اس بڑھتی ھوئی تعداد کا بھگتان نقدی کی صورت میں کر سکے ۔ مثلاً شاردان (Chardin، ۵ : ۳۱۶) ''ادائگی بذریعۂ توکیل و تحویل assignments'' کی توجیہ یہی کرتا ھے کہ بڑی حد تک نقد سکّوں کی کمی اس کا باعث تھی.

تیول کی نوعیت (یعنی کسی گاؤں کے لگان پر تصرّف کے حق کی نوعیّت) اکثر اوقات پیچیدہ ھو جایا کرتی تھی، کیونکہ اس کے ساتھ ھی تیول‌دار کو اور مراعات بھی دے دی جاتی تھیں (مثلاً سرکاری اراضی کا اپنے طور پر انتظام کرنا بھی اُسی کے سپرد ھو جاتا تھا)، یہی وجہ ھے کہ یورپی مصنّفین نے اس اصطلاح کی جو تعریفیں کی ھیں وہ مبہم ھیں.

شاردان Chardin تیول کا ترجمہ ''assignation de terre'' یعنی ''تفویضِ زمین'' کرتا ھے اور تیول کی دو قسمیں بتا کر ان کا امتیاز یوں ظاھر کرتا ھے کہ ''یہ جاگیریں یا تو کارِ مفوضہ کے ضمیمے کے طور پر دی جاتی ھیں (بڑے بڑے کارھائے مفوضہ کے ساتھ وہ تمام زمینیں دے دی جاتی ھیں جو ھمیشہ کے لیے ان خدمات یا عہدوں کے ساتھ معاوضے کی ادائگی کے لیے وابستہ ھوتی ھیں) یا یہ خزانۂ [عامرہ] کی مرضی سے تفویض ھوتی ھیں'' ۔ اگر وہ خزانے کی طرف سے تفویض ھوں تو اس صورت میں بھی یہ جاگیریں کئی سال کی مدّت کے لیے دوامی قبضے کی صورت اختیار کر لیتی تھیں ۔ شاردان بڑی بصیرت کے ساتھ اس نظام پر نکتہ چینی کرنے کے بعد اپنی تنقید ان الفاظ میں ختم کرتا ھے (ص ۳۱۸) : ''وہ زمینیں جو تنخواھوں کے معاوضے میں دی جائیں ان کی نگرانی سرکاری عُمّال نہیں کر سکتے؛ وہ گویا اُس شخص کی ذاتی مِلک کی طرح کی چیز ھے جسے یہ اراضی تفویض ھوں ۔ وہ محاصل و عوائد کے متعلّق اس جگہ کے باشندوں سے جو چاھے طے کر لے''.

اسی طرح کامپفر Kaempfer (۱۶۸۴ تا ۱۶۸۸ء) ایران میں تنخواھوں کی تین قسمیں بتاتا ھے : 'برات' (وہ رقمیں جو دُور افتادہ ولایتوں پر مُحوّل ھوتی ھیں)، 'ھمہ سالہ' (ایسی زمینیں جو صرف پنشن یعنی معاش کی رقم ادا کر سکیں) اور تیول، یہ

تیول '' tawiil seu tijuul '' زمینیں جو مجموعی طور پر اُسی ذیل میں آتی ھیں جنھیں شارداں نے قسمِ اوّل قرار دیا ھے وہ زمینیں (pagi, praedia vel fundi) ھیں جو عمائدِ سلطنت (ministris regni) کو دی جاتی ھیں، وہ اپنی ملازمت کے دوران میں ان کے قبضے سے بہرہ مند ھوتے ھیں (!) اور ان کے محصولات سے نفع اندوز (ut durante servitio eorum possessione et annonâ gaudeant) اور ان اراضی سے (جن کا مالک امیر ھوتا ھے) اپنی تنخواہ کے دو چند سے لے کر دہ چند تک رقم کی وصولی کرتے ھیں.

سِیُورغال: تیول اور اس دستاویز کے درمیان جس کے ذریعے تیول عطا ھوتی تھی تمیز کرنا ضروری ھے: اسے عام طور پر سیُورغال کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک ترکی۔ مغولی لفظ ھے، جس کے معنے نوازش (یا شاید انعام؟) ھیں، قبّ شارداں، ۶: ۶۵ (جو اس کے معنی بہت زیادہ محدود کر دیتا ھے) اور Budagov، ۱: ۶۵۰۔ شاہ حسین صفوی کا ۱۱۱۳ھ [/۱۷۰۱ء] والا فرمان (خانیکوف Khanykow، در .Mél. Asiat، ج ۳، ۱۸۵۹ء: ص ۷۰ تا ۷۶) سیُورغال کا نمونہ متصوّر ھو سکتا ھے (صرف یہی ایک نام ھے جو دستاویز کے متن میں استعمال ھوا ھے): عطیہ دار پر لازم ھے کہ شاہ کی خدمت میں سات مسلّح آدمی حاضر کرے، اس کے عوض میں اسے چھے تومان، تین ھزار، ساڑھے چھیانوے (۳۰۹۶½) دینار ملیں گے جو ناحیۂ دز مار کے محاصل کی رقم کے مساوی ھے۔ کسانوں کو ''[مال و جہات'']، ''و وجوھات و حقوقِ دیوان'' سیُورغال سے انتفاع کرنے والے کو دینے پڑیں گے [ان اصطلاحوں کے لیے دیکھیے آیینِ اکبری، طبع بلخمن H. Blochmann، ج ۱، دفتر سوم: ص ۲۹۴، و ترجمۂ جیرٹ Jarrett، ۲: ۵۷، سطر آخر ببعد، و فرہنگ انندراج، ۳: ۱۳۱] اور عمّالِ حکومت کو اس امتیاز سے استفادہ کرنے میں دخل اندازی کا حق حاصل نہ ھوگا۔ اس طرح نوازشِ شاھی (سیُورغال) عطیہ دار کی تیول بن جاتی ھے۔ [آیینِ اکبری میں سیُورغال بمعنی مدد معاش ھے اور اس سے مراد ھیں وہ زمینیں جو مخیّرانہ مطالب کے لیے دی جائیں۔ یہ زمینیں موروثی تھیں اور اس لیے جاگیر یا تیول کی زمینوں سے مختلف تھیں، جو معیّن مدّت کے لیے منصبداروں کو تنخواہ کے عوض دی جاتی تھیں؛ دیکھیے آیین، طبع مذکور، ج ۱، دفتر ۲: آیین ۱۹، ص ۱۹۸ (آیینِ سیُورغال) اور ترجمۂ بلخمن، ۱: ۲۶۸ اور مترجم کا تعلیقہ، ص ۲۸۰ ببعد پر].

انیسویں صدی: اس صدی کے شروع میں تیول کے صحیح مفہوم کے متعلّق رالنسن Rawlinson: Notes on a Journey from Tabriz، در JRGS، ج ۱۰ (۱۸۴۰ء): ص ۵ کی توثیق ملتی ھے: ''تیول کسی شہر یا ناحیے کے سرکاری مالیانے کے عطیّے کو کہتے ھیں، جس شخص کو تیول عطا کی جاتی ھے اسی کو عام طور پر اس کی وصولی کا اھتمام بھی سپرد کر دیا جاتا ھے، گو یہ لازمی نہیں۔ یہ عطیّہ بھی عطیّہ دار کے حینِ حیات ھی کے لیے ھوتا ھے، بجز اس صورت کے کہ فرمان میں اس کے برعکس کوئی تصریح ھو۔ اندازہ کیا گیا ھے کہ اس وقت ایران کی کل مالگذاری کا تقریباً پانچواں حصّہ اس طریق سے خزانۂ شاھی سے باھر رھتا ھے''۔ اکثر اوقات ایسا بھی ھوتا ھے کہ خالص تیول اسی تیول‌دار کی دوسری مراعات کے ساتھ ساتھ اس کے تصرّف میں رھتی ھے جن سے تیول کی مقدار چھپ جاتی تھی۔ ڈاکٹر پولک Polak، جو بذاتِ خود تیول‌دار بن ھی چلا تھا، تیول کی یہ تعریف کرتا ھے: ''تیول وہ خالصہ زمین ھے جس کی آمدنی سے ایک شخص کو اس کی نقد تنخواہ کے عوض میں استفادے کی اجازت دی جاتی ھے''.

نظامِ تیول سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئیں ۔ ایران کے زمیندار ایک ایسا طبقہ ھیں جو حکومت اور کسانوں کے درمیان حائل ھے ۔ کسانوں کو زمینداروں کی 'رعیّت' سمجھا جاتا ھے ۔ زمیندار یعنی 'ارباب' کو کچھ اداری اختیارات حاصل تھے، جن میں دوسری باتوں کے علاوہ کسانوں سے ہر قسم کے واجبات خود ھی وصول کرنے کا اختیار شامل تھا ۔ وصول شدہ رقم میں سے 'مالیات اربابی'، یعنی وہ رقم جو مالک ہونے کی حیثیت سے اسے واجب الادا تھی، وضع کر کے باقی خزانۂ سرکار میں داخل کر دیتا تھا ('مالیاتِ دیوانی') ۔ اگر اس نظام میں تیول کو بھی شامل کر دیا جائے تو تیول دار اور مالکِ زمین، جو دونوں غیر سرکاری افراد تھے، سرکار کی مداخلت کے بغیر آپس میں سمجھوتہ کر لیتے تھے اور اگر دونوں حیثیتیں ایک ھی شخص میں جمع ہو جاتی تھیں تو "مالکِ زمین تیول دار" حکومت کے مالی ضبط سے بچ نکلتا تھا اور ایک قسم کا جاگیردار بن جاتا تھا، جس کے املاک اس علاقے کے اندر جس کا نظام مرکزی حکومت اپنے مقامی عمّال کے سپرد کرتی ایک مستقل جزیرے کی صورت اختیار کر لیتے تھے ۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ تیول دار مالکِ زمین بن جاتا تھا، تیول (بالخصوص انیسویں صدی میں) چونکہ دربار کے منظورِ نظر اشخاص ھی کو عنایت ہوتی تھی، یہ اشخاص ان مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا اثر و رسوخ وسیع تر اور مضبوط کر لیتے تھے ۔ شاذ و نادر صورتوں میں، جہاں کسان خود ھی مالکان اراضی ('خُردہ مالک') کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے لیے طاقتور ہمسایوں یا سرکاری عمّال کے ظلم و تعدّی کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوتا تھا، اس لیے وہ کسی طاقتور تیول دار کی پناہ اور حمایت حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے ۔ لیکن اکثر اوقات اس حمایت و حفاظت کا یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ اپنی خُردہ ملکیت کے حقوق بھی کھو بیٹھتے تھے ۔ تیول اصولاً زندگی بھر کے لیے عطا ہوتی تھی اور جب کبھی تیول دار کے ورثاء اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے کہ وہ تیول ان کے نام منتقل ہو جائے تو عموماً اس تیول کا ایک تہائی حصّہ کم کر دیا جاتا تھا ۔ چند نسلوں کے بعد تیول بالکل معدوم ہو جاتی لیکن ورثاء کو ایسے ذرائع آسانی سے میسّر آ جاتے تھے جن سے وہ اپنے حقوق کی معدومیّت یا مراعات کی کمی کو روک سکیں ۔ جب کبھی حکومت نے سرکاری اراضی (یعنی خالصہ) میں سے تیول کشادہ دلی سے عطا کیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدّد مقامات میں خالصہ کا نام و نشان باقی نہ رہا، مثلاً آذربایجان میں (دیکھیے Tigranow) ۔ [جاگیروں کے معاملے میں اکبر کی روش شاہانِ ایران کے برعکس تھی، دیکھیے V. a. Smith : *Akbar The Great Mogul*، اکسفورڈ ۱۹۱۷ء، ص ۱۲۳].

صرف بوگدانوف Bogdanov ایک واحد شخص ھے جس نے تیول کی خرابیوں کو ہلکا ثابت کرنے والے حالات پر نظر کی ھے (مثلاً یہ کہ تیول دار جو نذرانہ سرکار کو ادا کرتا تھا وہ ہو سکتا ھے کہ ان محصولات کی رقم سے کچھ زیادہ ھی ہو جو معمولی حالات میں تیول والی زمینوں سے خزانے میں جمع ہوتی اور یہ کہ تیول دار عُمّالِ سرکار کی دستبرد سے کسانوں کو بچاتے تھے) لیکن قرونِ وسطٰی کے اس نظام کی بہت سی قباحتیں ایسی بیّن تھیں کہ 'مجلس' نے جون ۱۹۰۷ء کے پہلے ھی اجلاس میں فوراً یہ حکم صادر کر دیا کہ تمام تیول بحقِ سرکار ضبط ھیں، چنانچہ اس کا نفاذ کر دیا گیا۔

مآخذ : (۱) شارداں Chardin : *Voyages*، طبع Langlès، ۱۸۱۱ء، ۵ : ۳۸۰، ۳۱۱، ۳۱۶ تا ۳۲۰؛ (۲) Kaempfer : *Amoenitates exoticae*، ۶ : ۵۶؛

Lemgoviae ۱۷۱۲ء، relatio ۷، کراسه ۱، فصل ۳، ص ۹۷ تا ۹۸؛ (۳) Fraser : Journey into Khorasan، لنڈن ۱۸۲۵ء، ص ۲۱۱؛ (۴) Polak : Persien، ۲ : ۱۲۲؛ (۵) Budagov : Slovar turetsko-tatar. narečiy، ۱۸٦۹ء، ۱ : ۴۳۳؛ (٦) Curzon : Persia، ۲ : ۴۷۰، ۴۷۳، ۴۸۳، ۴۸۸؛ (۷) Greenfield : Die Verfassung des Pers. Staats، برلن ۱۹۰۳ء، ص ۳۴۹؛ (۸) Browne : The Persian Revolution، ۱۹۱۰ء، ص ۱۴۳؛ (۹) Tigranow : Iz. obshčest.-ekonom. otnosheniy v Persii، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۹ء، ص ۸۲ تا ۸۵ (ولایت اردبیل کے اجتماعی اور اقتصادی نظام کا ایک گہرا مطالعہ)؛ (۱۰) سلطان زاده : La question agraire en Perse (روسی زبان میں)، Nowyi Vostok، ماسکو ۱۹۲۲ء، عدد ۱ : ص ۱۳۸ تا ۱۴۰ ـ

(V. MINORSKY منورسکی)

التّیه : درست صورت فَحص التّیه ہے ـ جزیرہ نماے سیناء کے اندرونی حصّے میں ایک صحراء کا نام ہے، جو ملکِ شام اور مصر کے درمیان حدّ فاصل کا کام دیتا ہے ـ عرب جغرافیہ دان اسے ''تیہ بنی اسرائیل'' بھی کہتے ہیں [حدود العالم، طبع وقفیۂ گب، ٦۷ میں بھی نام کی یہی صورت ہے، البتہ تاریخ گزیدہ، طبع وقفیۂ گب، ۱ : ۹۳ و نزهة القلوب، ۱۰۵ میں اسے ''تیہ موسیٰ'' لکھا ہے اور ہمدانی کی کتاب صفة جزیرة العرب، ۸ میں ''تیہ بنی اسرائیل ایّام موسیٰ علیه السلام''؛ عُکبری نے تیہ کا نام ''بطن نخل'' بھی دیا ہے (دیوان المتنبی بشرح العکبری، قاهرة ۱۹۳٦ء، ۱ : ۳۸، ح ۲]ـ لوحۂ پیوتنگریانا (Tabula Peutingeriana) جیسے قدیم متن میں یہ [عبارت] ملتی ہے : ''Desertum ubi quadraginta annis errauerunt filii Israel ducente Moyse [یعنی ''صحراء جس میں چالیس سال تک بنی اسرائیل موسیٰ[۴] کی قیادت میں سرگرداں رہے''] اور مادَبا Mādabā کے نقشے پر یہ عبارتیں پائی جاتی ہیں Ἔρημος [ὅπου] τοὺς Ἰσραηλίτας ἔσωσ[εν] ὁ χαλκοῦς ὄφις اور Ἔρημος Σὶν ὅπου κατεπέμφθη τὸ μάννα καὶ ἡ ὀρτυ-γομήτρα. ـ اس صحرا میں ایک قلعہ بھی اسی نام کا تھا (De Guignes : Perle des Merveilles، در N. E.، ۲ : ۳۱)؛ اس کے مشرقی حصّے میں ایک ''وادی التّیه'' بھی ہے (کاترمیئر Quatremère : Mémoire sur l'Égypte، ۱ : ۱۸٦)ـ یہ صحراء، جو فلسطین کا انتہائی جنوبی علاقہ ہے، ۴۰ فرسخ لمبا اور [تقریباً] اسی قدر چوڑا [بتایا جاتا] تھا [مگر دیگر روایات میں کم، دیکھیے معجم البلدان و نزهة القلوب، محلّ مذکور] اور الجفار کے علاقے سے لے کر (جس میں الفَرَما، العَریش اور الورّادة واقع ہیں، [دیکھیے نقشه در کتاب الولاة و القضاة للکندی، طبع وقفیۂ گب]) جبالِ سینا (طُور سینا) تک پھیلا ہوا تھا ـ مغرب میں مصر کی اقلیم الرّیف اس کی حدبندی کرتی ہے (Maspéro-Wiet، در MIFAO، ۳٦ : ۱۰۱ ببعد) اور مشرق میں یروشلم اور جنوبی فلسطین کے علاقے ـ عرب جغرافیہ دانوں کے بیان کے مطابق اس میں کچھ پتھریلی اور کچھ ریتلی زمین ہے ـ اس میں نمک والی دلدلیں ['سباخ'] اور سرخ سنگِ ریگی کی پہاڑیاں اور چند کھجور کے درخت اور چشمے بھی ہیں [''رمال و سباخ و سماق و فیه نخیل و عیون''؛ مقدّسی، ص ۲۰۹]؛ الدمشقی [ص۲۱۳] نے تیہ بنی اسرائیل کے اعمال بَرّیّة میں ذیل کے یہودی شہروں کا ذکر کیا ہے : قَدَس (Kadesh Barnea)، حُوَیرق، الخَلَصَة (اَلوسا Elusa)، الخَلُوص (لِسّا Lyssa)، السّبع (بیر سَبْعة Beerseba) اور المَدَرة اور وہ بیشتر التّیه کو مملکتِ کَرَک کے ناحیوں میں شمار کر چکا ہے ـ اس سے اس کی مراد بظاہر وہ علاقے ہیں جو کسی زمانے میں شاتیّون کے رینو (Renaud of Châtillon)

کے تحت رہ چکے تھے ۔ صحرای التیہ سے مسافر اتر کر عَقَبۂ بُساق [بکری، ۱۶۵ : بُصاق] میں سے ہو کر اَیْلۃ کو جاتے تھے (یاقوت : مُعْجم، طبع وُیسٹنفلٹ، ۱ : ۶۱۰)؛ یہ راستہ سب سے پہلے خُمارَوَیْہ کے عہد (۸۸۴ تا ۸۹۶ء) میں حاجیوں کے قافلوں کے لیے قابلِ گذر بنایا گیا تھا ۔ اَیْلَۃ سے چل کر اور صحراء کے بیچوں بیچ گذر کر بحیرۂ فاران تک سوار کے لیے دو منزلوں کا سفر تھا [منزلوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سیوطی : حسن المحاضرۃ، مصر ۱۳۲۷ھ، ۲ : ۱۶۵؛ البتنونی : رحلۃ، طبع دوم، ص ۳۳ ببعد] ۔ جب ۶۵۲ھ / ۱۲۵۴ - ۱۲۵۵ء میں بحری مملوک قاہرۃ سے فرار ہوے تو ان کا ایک گروہ اس صحراء میں پانچ روز تک سرگرداں رہا ۔ چھٹے روز انھوں نے ایک غیر آباد شہر دریافت کیا، جس میں [فصیل اور دروازے سب سبز سنگ مرمر کے تھے] اور وہ شہر ریت میں دبا ہوا تھا ۔ انھیں برتن اور پہننے کے کپڑے بھی ملے لیکن وہ چھوتے ہی مٹی ہو جاتے تھے ۔ وہاں ایک حوض بھی تھا جس کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا ۔ اگلے دن [انھیں بدوی ملے، جنھوں نے انھیں کَرَک پہنچا دیا ۔ ان مملوکوں نے صرّافوں کو وہ طلائی دینار دکھائے جو انھیں] اس دبے ہوے شہر میں ملے تھے تو انھیں معلوم ہوا کہ وہ [حضرت] موسیٰ[ع] کے زمانے کے تھے اور یہ کہ جس شہر کو انھوں نے پایا وہ بنی اسرائیل کے زمانے کا ''المدینۃ الخضراء'' تھا [مقریزی : الخطط، قاہرۃ ۱۳۲۶ھ، ۱ : ۳۴۴ = طبع بولاق، ۱ : ۲۱۳؛ مصر ۱۳۴۴ھ، ۱ : ۳۴۴]۔

قاہرۃ سے ملکِ شام کو قافلوں اور فوج کے جانے کا راستہ امن کے زمانے میں الجفار ہو کر جاتا تھا اور صحراء التیہ راستے میں نہیں پڑتا تھا : صرف ان ایّام میں جب اس راستے میں فرنگیوں (Franks) کے قبضے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوئی تو سر بسر صحرائی راستے کی جنگی اہمیّت کچھ بڑھ گئی تھی، یہ امر [سلطان] صلاح‌الدین کی لشکر کشیوں اور قلعۂ صَدر کی تعمیر سے ظاہر ہے (اس قلعے کو اب قلعۂ جِنْدی کہتے ہیں ۔ [ابن جُبَیْر (رحلۃ، ص ۳۷) کا بیان ہے کہ مصر سے عقبۂ اَیْلَۃ جانے کا ایک راستہ حاجیوں کے لیے اُس کے زمانے میں بند ہو گیا تھا، کیونکہ فرنگیوں نے وہاں ایک قلعہ بنا لیا تھا المتنبّی جب کافور کو چھوڑ کر ۳۵۱ھ / ۹۶۲ء میں مصر سے کوفے کو آیا تو اس نے تیہ بنی اسرائیل کو عبور کیا اور ماہ معروفِ نخل سے گذرا، دیکھیے الواحدی : شرح دیوان المتنبّی، طبع دیتریصی، برلن ۱۸۶۱ء، ص ۶۹۹ ۔ صحراء سیناء کی آبادی (۱۹۴۷ء کی سر شماری اور ۱۹۵۷ء کی سر شماری کے ابتدائی اعداد کے مطابق) ۳۴,۰۰۳ نفوس پر مشتمل تھی، دیکھیے *The Statesman's Year-Book*، بابت ۱۹۶۰ء]۔

مآخذ : (۱) اِصْطَخْری، در *BGA* (المکتبۃ الجغرافیۃ العربیۃ)، ۱ : ۵۳؛ (۲) ابن حَوْقَل، در *BGA*، ۲ : ۱۰۳؛ (۳) المقدّسی، در *BGA*، ۳ : [۲۰۹]؛ (۴) الاِدْرِیْسی، طبع Gildemeister، در *ZDPV*، i/viii : ۲۱ (ترجمہ ص ۱۱۹، ۱۳۹)؛ (۵) یاقوت : مُعْجم، طبع وُیسٹنفلٹ، ۱ : ۹۱۲؛ (۶) صفی‌الدین : مراصد الاِطّلاع، طبع جوئنبول Juynboll، ۱ : ۱۲۳؛ (۷) دمشقی، طبع مِہْرِن Mehren، ص ۲۱۳؛ مقریزی : خِطَط، طبع بولاق، ۱ : ۲۱۳؛ ترجمہ Bouriant، در *MMAF*، xvii (۱۹۰۰ء) : ۶۳۱؛ [(۸) ابن الأثیر : کامل، قاہرۃ ۱۳۴۸ھ، ص ۱۱۰، ۱۱۳؛ (۹) المسعودی : التنبیہ، لائڈن ۱۸۹۳ء، ص ۱۹۹]؛ (۱۰) ایسترینج Le Strange : *Palestine under the Moslems*، ص ۲۷ تا ۳۰؛ (۱۱) Raym. Weill : *La presqu'île du Sinai*، (*Bibl. de l'école des haut. étud.*)، clxxi، ۱۹۰۸ء : ۱۱۴ تا ۱۱۶ و دیگر مواضع کثیرہ؛ (۱۲) R. Hartmann

در *ZDMG*، ۶۳ : ۶۷۹ تا ۶۸۳؛ (۱۳) J. Maspéro اور G. Wiet، در *MIFAO*، ۳۶ : ۶۲؛ (۱۴) Gaudefroy-Demombynes : *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۶، ۸، ۱۲۹؛ (۱۵) صَدْر کے متعلّق دیکھیے Barthoux اور Wiet، در *Syria*، ۳ : ۴۴ تا ۶۵، ۱۳۵ تا ۱۵۲؛ [(۱۶) مجانی الأدب، (ازروی آثارالبلاد قزوینی) طبعة ۲۳، ۱ : ۱۹۸؛ (۱۷) J. R. Hunter : *Map of Arabia*، (سروے او انڈیا) ۱۹۰۸ء، تصحیح شدہ تا ۱۹۱۶ء].

(ھُونِگْمان E. Honigmann)

ٹ

* ٹابولہ [تابولہ] سمارا گدینا: [= لوحِ زمردین]، سِرّی اور مخفی کیمیاگری کی تعلیمات کا انکشاف، جو ہرمیس الکبیر ثلاثاً Hermes Trismegistos سے منسوب ہے۔ دیارِ مغرب میں اس کا علم بارھویں صدی کے وسط سے ایک متأخر روایت کے ذریعے ہوا۔ علم کیمیا کی تاریخ میں ٹابولہ کے متن کے اصلی مآخذ کا مسئلہ کچھ دیر پہلے تک ایک عقدۂ لاینحل بنا رہا۔ سٹیل R. Steele نے ۱۹۲۰ء میں بیکن Bacon کی تصانیف کو شائع کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ ٹابولہ کا متن بزبانِ عربی و لاطینی کتاب سر الأسرار میں موجود ہے، جو ارسطوے دروغی سے منسوب ہے۔ ھومیارڈ E. J. Holmyard نے ۱۹۲۳ء میں یہ دریافت کیا کہ اس متن کی قدیم‌تر صورت جابر بن حیّان کی کتاب [الأسطقس] الثانی میں پائی جاتی ہے۔ ان دونوں باتوں کی مدد سے رُسکا J. Ruska یہ بات ثابت کرنے کے قابل ہو گیا کہ اس نسخے کے متن کا اصلی مأخذ، جس کے بعض حصّے اب تک اشکال پیش کرتے ہیں، ہرمیس Hermes کی کتاب سرالخلیقۃ کے آخر میں موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ کتاب سرالخلیقۃ ٹائیانا کے بلیناس (Apollonius of Tyana) کو ہرمیس Hermes کی قبر میں ملی تھی۔ اس طرح وہ ایوگو سان‌تلّی‌انسس Hugo Santelliensis، کے وقت سے لے کر موجودہ زمانے تک ٹابولہ کی تاریخ کے ادوار پر بھی روشنی ڈال سکا ہے۔ آخر میں اس نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جابر بن حیّان کو بلیناس (Appollonius) کی کتاب کا علم تھا، جس سے یہ امر کافی طور پر یقینی ہو جاتا ہے کہ اس تصنیف کی ابتداء عرفانی (gnostic) حلقوں میں ہوئی۔

مآخذ: (۱) R. Steele: *Opera hactenus inedita* *Rogeri Baconi*، اکسفورڈ ۱۹۲۰ء، v؛ (۲) ھوم یارڈ E. J. Holmyard: *The Emerald Table*، در *Nature*، ۱۹۲۳ء، ۲: ۵۲۵؛ (۳) رُسکا J. Ruska: *Tabula Smaragdina*، ہائڈل‌برگ Heidelberg ۱۹۲۶ء؛ (۴) M. Plessner: *Neue Materialien zur Geschichte der Tabula Smaragdina*، در *Isl.*، ۱۹۲۷ء، ص ۷۷ ببعد؛ (۵) رُسکا J. Ruska: *Die siebzig Bücher des Ǧābir ibn Ḥajjān*، در *Studien zur Gesch. d. Chemie, Festschrift für E. O. v. Lippmann*، برلن ۱۹۲۷ء۔

(رُسکا J. Ruska)

* ٹڈورے: رک بہ تدورے۔

* ٹمبکٹو: (Timbuktu، Timbuctoo، فرانسیسی صورتِ کلمہ Tombouctou)، مغربی افریقہ کے ایک شہر کا نام ہے۔ یہ شہر نہ صرف اس لیے دلچسپ ہے کہ یہ جنوب کی طرف اسلام کی عظیم توسیع کا شاہد ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ مسلمانوں کی سرگرم زندگی کا یہ خود ایک پُر رونق مرکز بھی رہا ہے؛ اس میں ایک مشہور و معروف دانش‌گاہ تھی، جس نے علماء اور ایسے مؤرّخ پیدا کیے جن کی تصانیف خوبیوں سے خالی نہیں ہیں۔ بلادِ سودان کی تاریخ *History of the Sudan* کے مصنّف کے قول کے مطابق اس شہر کی بنیاد قبیلۂ تُوارِگ (طَوارِق [توارق در قاموس الاعلام]) مَغشَرِن نے پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی میلادی کے اواخر میں رکھی تھی۔ یہ لوگ خانہ‌بدوش تھے، جو

ان علاقوں میں گلّے چرانے کے لیے آیا کرتے تھے ۔ موسم گرما میں وہ دریاے نائیجر کے کنارے موضع امدَغَة میں فرو کش ہوا کرتے تھے اور موسم خزاں میں اپنے وطن [اَرْوَان Arawān] کو لوٹ جاتے تھے ۔ آخر کار وہ مستقل طور پر یہیں آباد ہو گئے اور ٹُمْبُکْتُو ایک اہمّ تجارتی مرکز بن گیا ۔ دریا کے راستے سے یا قافلوں کی صورت میں ساحلِ مَرّاکُش اور صوبۂ طرابلس سے یہاں سیّاح آیا کرتے تھے ۔ وَغْدَو Waghdaw کے بہت سے باشندے بھی یہاں ہجرت کر آئے تھے ۔ ٹُمْبُکْتُو سے پیشتر وَلَاتَة Walāta تجارت کا مرکز تھا ۔ تاجروں کے پیچھے پیچھے فضلاء اور دیندار علماء بھی مصر، غدامس، تُوات، تافِیْلَالْت، فاس، سُوس وغیرہ سے آنے لگے ۔ شہر میں خوش نما عمارتیں تعمیر ہو گئیں اور اس کے گرد فصیل بھی بن گئی ۔ اس وقت اُن جھونپڑیوں کی جگہ جو کبھی ٹہنیوں اور گھاس پُھوس سے بنائی گئی تھیں مٹی کے مکان تیّار ہو گئے ۔ خود ٹُمْبُکْتُو میں [وسطِ شہر میں] وسیع [جامع] مسجد تعمیر ہوئی، [جو اب شہر کے مغربی نواح میں واقع ہے] ۔ ایک اَور مسجد جانبِ شمال [مشرق] سنْکُوره میں بنی ۔

پہلا خاندان جو مَالّی [رَكّ بآں] سے آیا ٹُمْبُکْتُو میں ۷۳۷ تا ۸۳۷ھ / ۱۳۳۶ تا ۱۴۳۳ء حکمران رہا ۔ اسی زمانے میں مشہور و معروف سیّاح ابن بَطُّوطَة بھی یہاں آیا تھا ۔ اُس نے اِس شہر کے متعلّق جو کوائف قلمبند کیے ہیں بہت دلچسپ ہیں ۔ وہ ۷۵۳ھ / ۱۳۵۲ء میں مرّاکُش کے ایک قافلے کے ہمراہ یہاں آیا تھا ۔ اس قافلے میں سِجِلْمَاسَة کے، جو اس زمانے میں بڑا خوش حال تجارتی مرکز تھا، بہت سے سوداگر بھی شامل تھے ۔ پچیس روز کے سفر کے بعد ابن بَطُّوطَة نے [قریۂ] تَغَازَی میں قیام کیا، جہاں نمک کی کانیں تھیں ۔ پھر وَلَاتَة (= ای یُوآلاتن) میں ٹھیرا، جو حبشیوں کے ملک کا پہلا مقام اور سِجِلْمَاسَة سے دو ماہ کی مسافت پر واقع تھا ۔ وَلَاتَة سے روانہ ہو کر دس روز کے بعد وہ زَاغری اور وہاں سے کارْسَخْو پہنچا، جو دریاے نائیجر کے کنارے پر واقع ہے؛ پھر وہ دریاے صَنْصَرة پر پہنچا، جو مَالّی سے تقریباً دس میل پر ہے اور دریا کو عبور کرنے کے بعد ٹُمْبُکْتُو میں وارد ہوا ۔ یہاں سے آگے اُس نے دریا کی راہ سے سفر کیا ۔ ان ملکوں کے باشندے مسلمان تھے، جن میں قبیلۂ مَسُّوفَة بہت با اقتدار تھا ۔ ابن بطّوطَة سیاہ فام لوگوں (السُّودان) کی بعض خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہاں کی مسلمان عورتیں برہنہ کیوں رہتی تھیں ۔ یہ شہر اسے کچھ زیادہ پسند نہیں آیا ۔ یہاں کے قبیلۂ مَسُّوفَة کے لوگ لِثام [رَكّ بآں] یعنی ایسی نقاب پہنتے تھے جو چہرے کے نیچے کے نصف حصّے کو چھپا لیتی تھی ۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ عرب لوگ ان بربروں کو المُلَثَّمون، یعنی نقاب پوش، کہا کرتے تھے، جو صحراء میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے اور نُوبَة تک پھیلے ہوے تھے (جوئنبول Juynboll اور دُ خُویہ de Goeje: *Descr. du Maghrib*، لائڈن ۱۸۶۰ء، ص ۳۸) .

ایک دوسرا خاندان، جو مُغْشرِن کے تَوارِگ [طوارِق] کا تھا، چالیس برس تک ٹُمْبُکْتُو میں حکمران رہا ۔ پھر فاتح مشہور سُنّی علی اس پر قابض ہو گیا ۔ اس کی حکومت چوبیس برس تک رہی (۸۷۳ تا ۸۹۸ھ / ۱۴۶۸ تا ۱۴۹۳ء) ۔ یہ ۸۷۳ھ میں فاتحانہ انداز سے شہر میں داخل ہوا اور وہاں اُس نے بڑی تباہی مچائی ۔ مقامی مؤرّخ اس پر بڑی لے دے کرتے ہیں اور اسے بد طینت، اوباش، خونخوار اور ظالم لکھتے ہیں ۔ یہ علماء پر مظالم توڑتا اور مذھب کا مذاق اڑایا کرتا تھا، اور نماز بیٹھ کر ادا کرتا تھا ۔

بااین همه سُنغای خاندان، جو اسی کی نسل سے تھا، ممتاز اور شاندار خاندان تھا، جس نے شہر کو آسودہ حالی کے بلند مقام پر پہنچا دیا تھا ۔ اس خاندان کا نامورترین بادشاہ اَسْکیا askia الہادی محمّد تھا، جو ادیبوں اور عالموں کا سر پرست تھا ۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ اَسْکیا داؤد ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں فوت ہوا ۔ اس کے بعد ٹِمبکٹو حکومتِ مرّاکش کے زیرِ تسلّط آ گیا اور ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء میں مرّاکش کے پاشا، محمود نے اسے سلطانِ مرّاکش مولای احمد سے چھین لیا ۔ مرّاکش کی حکومت اس شہر پر ۹۹۹ تا ۱۱۶۳ھ / ۱۵۹۰ تا ۱۷۵۰ء قائم رہی ۔ پاشاؤں کی جبرستانی اور تُوارِگ [طَوارِق] کے غزوات کی وجہ سے ٹِمبکٹو کے دورِ انحطاط کی علامات امتیاز ہیں ۔ ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں تُوارِگ [طَوارِق] اس شہر پر دوبارہ قابض ہو گئے ۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں یہ پُل the Pul قوم کے قبضے میں چلا گیا ۔ اور پھر اسے تکروروں the Tuculor نے فتح کر لیا ۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی میلادی میں یورپ کے لوگوں کا ٹِمبکٹو کے ساتھ اتّصال پیدا ہوا؛ اس شہر کا کاروبار اٹلی سے عموماً اور فلورنس سے خصوصاً تونس اور طرابلس کے راستے ہوا کرتا تھا ۔ یہاں سے چار بڑے بڑے کاروانی راستے نکلتے تھے : ایک کانم اور گاو Gao سے ہو کر مصر کو جاتا تھا، دوسرا ھکّار کے راستے تونس کو، تیسرا سِجِلْماسة، تافیلالت اور تُوات کے راستے مرّاکش کو اور چوتھا مالّی کے راستے بلادِ سودان کو ۔ اس زمانے میں دو مغربی مصنّفوں نے اس شہر کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک مشہور شہر تھا ۔ پہلے مصنّف کا نام بنیدِتّو دیئی Benedetto Die تھا، جو فلورنس کا رہنے والا تھا اور ۸۷۵ھ / ۱۴۷۰ء میں ٹِمبکٹو آیا تھا ۔ وہ تو صرف اتنا ہی لکھتا ہے کہ یہاں ''پہننے کے موٹے کپڑے، سَرج (دبیز صُوف) اور لُمبارڈی Lombardy کا بنا ہوا مال فروخت ہوتا ہے''، مگر اس کے چند سال بعد جب لیو افریقی Leo Africanus [الحسن بن محمّد الوزّان] یہاں پہنچا تو اس نے اس شہر کا ذکر زیادہ گرمجوشی سے کیا ۔ وہ لکھتا ہے : ''شہر میں بہت سی دکانیں ہیں ۔ ایک عبادت گاہ پتھر اور چونے سے بنی ہوئی ہے، جسے غرناطہ کے ایک اعلٰی معمار نے بنایا تھا ۔ بادشاہ کا محلّ عالیشان ہے، جو سونے کی تختیوں اور سلاخوں سے آراستہ ہے، جن میں سے بعض کا وزن ۱۳۰۰ پونڈ ہے'' ۔ اس زمانے میں وہاں سونے اور نمک کی تجارت عروج پر تھی اور لیو اس کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے ۔

دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی میلادی کے بعد ٹِمبکٹو سے یورپ کے تعلّقات منقطع ہو گئے اور یورپ میں اس کا ذکر یوں ہونے لگا گویا وہ ایک پُر اسرار شہر ہے، جہاں تک رسائی ممکن ہی نہ تھی ۔ اُن کے خیال میں ٹِمبکٹو بےحد خوبصورت اور دولتمند شہر تھا، یہ بلا شبہہ اس لیے کہ وہاں سونے، شتر مرغ کے پروں، ہاتھی دانت اور غلاموں کی تجارت ہوتی تھی ۔ کئی ناکام کوششوں اور میجر لینگ Laing کے قتل کے بعد بالآخر ایک فرانسیسی اکتشافی سیّاح (explorer) موسوم بہ رینے کائییّ René Caillié ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء کو ٹِمبکٹو کی پُر اسرار بستی میں وارد ہوا ۔ یہاں پہنچ کر جب اس پر حقیقتِ حال منکشف ہوئی تو وہ بہت مایوس ہوا اور اس سے جِنّہ Djenne کو اس نے کہیں بہتر پایا ۔ اس کے بعد بارث Barth نے یہ شہر ۱۸۵۳ء میں دیکھا ۔

اس شہر کی وضع تو دیکھنے میں اب بھی معمولی ہی سی ہے مگر مقامی فنِّ عمارت سے

خوش ذوقی مترشح ہوتی ہے۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں وہ فرانسیسی استعمار کے زیر تصرف میں آ گیا۔ موٹر کاروں کے ذریعے پہلے پہلے شہر کا اتصال الجزائر کے ساتھ ہارت۔ اودوآن۔ دوبری (Haardt - Audouin - Dubreuil) کی ہیئت اعزامی (expedition) نے قائم کیا۔ ان موٹروں میں وہ پہیے لگے ہوئے تھے جنھیں صدپا پہیے (caterpillar wheels) کہتے ہیں۔ اب یہ شہر اتنا بڑا نہیں ہے جتنا قدیم سنغای بادشاہوں کے زمانے میں تھا، جن کی یاد مقامی باشندوں کے دلوں میں اب تک تازہ ہے۔ ان دنوں دریاے نائیجر کی ایک شاخ قدیم شہر کو گھیرے ہوئے تھی لیکن اب اس شہر کے کھنڈر دریا سے کوئی دس میل جنوب کی طرف [اور موجودہ قصبے کے شمال اور مغرب میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں]۔ تاجران نمک کے [دو بڑے بڑے] قافلے، [جن میں تین چار ہزار اونٹ ہوتے ہیں، ہر سال یہاں] آتے ہیں اور اب بھی اس جنس کی تجارت خوب ہوتی ہے۔

[نومبر ۱۹۵۸ء تک علاقۂ ٹمبکٹو فرانسیسی سوڈان میں شامل تھا۔ اب، وہ اتحاد مالی میں شامل ہے۔ ٹمبکٹو کی پرانی رونق تو بحال نہیں ہوئی مگر فرانسیسی اثر کے ماتحت نئے کوچے اور نئی طرز کے مدرسے بن گئے ہیں۔ آبادی کا اندازہ ۷ ہزار نفوس کے قریب ہے، اس میں اکثریت سنغای لوگوں کی ہے، جو حبشی ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ وادی نیل سے دریاے نائیجر کے علاقے میں آ بسے تھے۔ موجودہ آبادی سابقہ آبادی کے دسویں حصے سے بھی کم ہے]۔

سوڈانی مؤلفات کے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے قلمی نسخے زیادہ تر فیلکس دوبوا Felix Dubois اور کرنیل آرشینار Colonel Archinard ہی [یورپ میں] لائے۔ ہوداس M. Houdas نے ان میں سے متعدد نسخے شائع بھی کر دیے ہیں۔ ان میں سے اہم کتابیں تاریخ السودان (History of the Sudan) اور معجم الباشوات (پاشاؤں کی معجم Dictionary of the Pashas) ہیں۔ ٹمبکٹو کا مشہور ترین مصنّف احمد بابا ہے، جس نے ایک معجم تراجم الفبائی ترتیب سے مرتّب کی۔ جب اہل مراکش نے اس شہر کو فتح کیا تو احمد بابا کو قید کر کے مراکش لے گئے، جہاں وہ ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷ء تک مقیم رہا۔ اس کی وفات ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء کو ٹمبکٹو ہی میں ہوئی [دیکھیے براکلمان، ۲: ۴۶۶ و تکملۂ براکلمان، ۲: ۷۱۵]۔ ٹمبکٹو میں انتہائی نشاط ادبی کا دور آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی میلادی سے لے کر بارھویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی میلادی تک رہا۔ یہاں تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی ملتے ہیں، مثلاً وہ قاضی جس نے کچھ سال ہوے (۱۹۱۳ء میں) چند ایسے کتبے بہم پہنچائے تھے جن سے ملک نائیجیریا میں مسلمانوں کے نفوذ کی تاریخ کا پتا چلتا ہے۔

[اب تک بھی ٹمبکٹو کا اتّصال باہر کی دنیا سے اونٹ کی سواری یا دریا کے راستے یا سڑک ہی سے ہے۔ ریلوے یا ہوائی جہاز سے وہاں نہیں پہنچا جا سکتا۔ نزدیک ترین فرود گاہ طیّارات گوندم Goundam میں ہے]۔

مآخذ: سوڈانی مؤرّخین کے لیے قب (۱) Publications de l' Ecole des Langues orientales vivantes، سلسلۂ چہارم، جلد ۱۲، ۱۳، ۱۹، ۲۰؛ (۲) ابن بطّوطة: طبع و ترجمہ Defrémery اور Sanguinetti، ۴: ۳۷۷ تا ۳۲۳؛ (۳) Ch. de La Roncière: La découverte de l'Afrique au moyen-âge, cartographes et explorateurs، ۲ جلدیں مع لوحات، قاہرة ۱۹۲۵ء؛ (۴) لیو افریقی (Leo Africanus): Description de l'Afrique، طبع شیفر Ch. Schefer، ۳: ۲۹۲؛ (۵) F. Dubois:

(۶) Père: Tombouctou la mystérieuse، ۱۸۹۷ء؛ Hacquart: Monographie de Tombouctou، ۱۹۰۰ء؛ (۷) Dr. Oskar Lenz: Timbouctou, Voyage au Maroc, au Sahara et au Soudan، فرانسیسی ترجمہ، پیرس، ۲ جلد، ۱۸۸۶ تا ۱۸۸۷ء؛ (۸) Lieutenant Pré-fontan: Histoire de Tombouctou de sa fondation à l'occupation française، در Bulletin de l' A. O. F. ۱۹۲۲ء؛ (۹) A. Lamandé اور J. Nanteuil: La Vie de René Caillié، پیرس ۱۹۲۸ء؛ (۱۰) G. M. Haardt and L. Audouin-Dubreuil: Le Raid Citroën، پیرس ۱۹۲۳ء؛ [(۱۱) Robert S. Kane: Africa A to Z، نیو یارک ۱۹۶۱ء، ص ۶۷، ۱۲۲ ببعد].

(B. Carra de Vaux کارا د ووٗ)

ٹونک: ہندوستان کی تقسیم اور تنظیماتِ جدید سے پیشتر راجپوتانے اور وسط ہند میں ایک ریاست تھی۔ اس ریاست کے چھے ضلعے تھے، جو ایک دوسرے سے جدا تھے اور جن کا درمیانی فاصلہ ۲۰ میل سے ڈھائی سو میل تک تھا ۔ ان ضلعوں میں سے تین راجپوتانے میں تھے (یعنی ٹونک، علی گڑھ (سابق رام پورہ) اور نِیْمباہَڑہ) اور تین وسطِ ہند میں (یعنی چھبّڑہ، پِڑاوہ اور سِرونْج) ۔ ریاست کا مجموعی رقبہ دو ہزار پان سو ترپن مربّع میل تھا ۔ راجپوتانے کے اضلاع کا رقبہ ایک ہزار ایک سو چودہ مربّع میل اور وسطِ ہند کے اضلاع کا رقبہ ایک ہزار چار سو انتالیس مربّع میل ۔ اضلاع کی طبعی حالت یکساں نہ تھی؛ بعض حصّے ہموار اور میدانی تھے، بعض پہاڑی ۔ ریاست میں دو قابلِ ذکر ندّیاں تھیں : ایک بَناس اور دوسری پاربتی ۔ آب و ہوا کے اعتبار سے ٹونک اور علی گڑھ کے اضلاع خشک اور صحّت بخش تھے، البتّہ برسات میں موسمی بخار شروع ہو جاتا تھا ۔ باقی اضلاع، جو مالوے میں تھے یا مالوے سے قریب، ان کی آب و ہوا عمدہ تھی ۔ ریاست بھر میں بارش کا اوسط پچیس چھبیس انچ سالانہ تھا ۔ چھبّڑہ اور سِرونْج میں نسبةً زیادہ بارش ہو جاتی تھی (امپیریل گزیٹیر، جلد ۲۳، طباعت ۱۹۲۸ء: ص ۳۰۷ تا ۳۰۹) ۔ آبادی تین لاکھ کے قریب تھی ۔

ریاست کا نام دارالحکومت کے نام پر رکھا گیا تھا [ٹونک کا ذکر تاریخ مبارک شاہی میں خضر خان کے دور میں ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء کے وقائع کے ذیل میں آیا ہے ۔ آئین اکبری (طبع کلکتہ، ۱ : ۳۶۵) میں صوبۂ اجمیر کی سرکار رنتھنبور میں وہ ایک پرگنہ ہے اور رقبے اور جمع دامی کے اعتبار سے اس سرکار کے نہایت اہمّ مقامات میں سے ہے ۔ موجودہ فصیل والے پرانے شہر کے متعلّق روایت ہے کہ وہ ۱۰۵۳ھ / ۱۶۴۳ء میں بنا ۔ اس کے جنوب میں نیا شہر ہے، جس کے محلّوں کے نام مختلف نوّابوں کے نام پر ہیں]۔

ٹونک کی ابتدائی آبادی ایک نوکدار پہاڑی کے دامن میں ہوئی، جسے ''رسّیا کی ٹیکری'' کہتے ہیں ۔ ہندی میں نوکدار پہاڑی کو ٹونک کہا جاتا ہے، اس وجہ سے آبادی کا نام ٹونکوا رکھا گیا (حدیقۂ راجستان ٹونک، مقدّمۃ، ص ۷ ببعد) ۔ رفتہ رفتہ عام زبانوں پر صرف ٹونک نام رہ گیا ۔ حدیقۃ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے دوران میں شہر ٹونک کا نام محمّد آباد رکھا گیا تھا ۔ کہیں اسے 'محمّد آباد عرف ٹونک' لکھا ہے (حدیقۃ، محلّ مذکور) اور کہیں صرف 'محمّد آباد ٹونک' (نجم الثاقب، ص ۵) .

شہر اور آس پاس کے علاقے کی حیثیت معمولی تھی ۔ مختلف راجپوت قبیلے اور رئیس مختلف اوقات میں اس پر قابض رہے ۔ اس کی تاریخی حیثیت کا آغاز انّیسویں صدی میں امیرالدّولہ نوّاب امیر خان سے ہوا (دیکھیے مادّۂ امیر خان، والی ٹونک) ۔

مرہٹوں کی خانہ جنگی کے باعث ہُلکر خاندان پر مصیبت آئی تو جسونت راؤ ہلکر نے نوّاب امیر خان سے دوستی بلکہ برادری کا عہد استوار کر لیا ۔ نوّاب زبردست جنگی قوّت کے ساتھ راجپوتانے میں سرگرمِ عمل تھا ۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مشترکہ قوّت سے جو علاقے فتح ہوں گے وہ باہم نصفا نصف تقسیم ہو جائیں گے ۔ جسونت راؤ ہلکر نے ۱۸۰۵ء میں انگریزوں سے سمجھوتا کر کے اندور کی ریاست لے لی ۔ نوّاب امیر خان مزید دس بارہ سال تک آزادانہ سرگرمیوں میں مصروف رہا ۔ نومبر ۱۸۱۷ء میں اس نے بھی انگریزوں سے سمجھوتا کر کے ریاست ٹونک کی بنیاد رکھی ۔ اس وقت نوّاب کے پاس پینتیس ہزار فوج اور ایک سو پندرہ توپیں تھیں (حدیقة، مقدّمة، ص ۱۰) .

اس زمانے کے ٹونک میں مختلف محلّ، حویلیاں، تالاب، باغ اور گنج تعمیر ہوے (حدیقة، مقدّمة، ص ۱۰ تا ۱۸) اور وہ قابلِ ذکر شہر بن گیا .

نوّاب امیر خان کا انتقال ۲۰ جمادی الاخرٰی ۱۲۵۰ھ / ۲۹ اکتوبر ۱۸۳۴ء کو ہوا اور اس کا لڑکا محمّد وزیر خان مسندِ حکومت پر بیٹھا، جسے ولیعہدی کے زمانے میں اکبر شاہ ثانی مغل فرمانروا ے دہلی نے ''وزیرالدّولہ، امیرالملک بہادر، نصرت جنگ'' خطاب دیا تھا (محلِّ مذکور، ص ۱۹) .

وزیرالدّولہ بڑا علم دوست اور دین دار حکمران تھا ۔ ملک کی ترقّی اور اہلِ ملک کی خوشحالی کا اسے خاص خیال تھا ۔ وصایاے وزیر کے نام سے ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں لکھی، جس میں مختلف عنوانوں کے تحت تاریخِ اسلام سے مستند حکایات درج کیں ۔ سیّد احمد شہید کا وہ مرید تھا ۔ سیّد شہید اور ان کے رفقاء کے متعلّق بہت سی حکایات کا واحد مأخذ یہی ضخیم کتاب ہے ۔ اس کی وفات ۱۳ محرم ۱۲۸۱ھ / ۱۸ جون ۱۸۶۴ء کو ہوئی (محلِّ مذکور، ص ۵۶) .

پھر وزیرالدّولہ کا فرزند یمین الدّولہ وزیر الملک نوّاب محمّد علی خان بہادر، صولت جنگ، والیِ ٹونک بنا ۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح بہت بڑا عالم اور دیندار تھا اور اسے سیّد احمد شہید کی جماعتِ مجاہدین سے بڑی دلبستگی تھی ۔ یہ امر حکومت کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا ۔ سوءِ اتّفاق سے [لاوہ کے] سرکش ٹھاکر کے بعض عزیز [اور تابعین] ٹونک میں مارے گئے ۔ اس بناء پر انگریزی حکومت نے نوّاب کو بتاریخ ۲۳ شعبان المعظّم ۱۲۸۴ھ / ۲۰ دسمبر ۱۸۶۷ء معزول کر دیا ۔ اس نے اپنے فرزندِ اکبر صاحبزادہ حافظ محمّد ابراهیم علی خان کو مسند پر بٹھایا اور خود حکومت کی خواہش کے مطابق بنارس میں اقامت اختیار کر لی ۔ تین لاکھ روپیے اور ضروری چیزیں ساتھ لے جانے کی اجازت ملی ۔ پانچ ہزار روپیہ ماہانہ اس کے لیے پنشن مقرّر ہوئی (محلِّ مذکور، ص ۲۷) .

نوّاب محمّد علی خان نے باقی زندگی بنارس ھی میں گزاری ۔ پورا وقت دینی کتابوں کے مطالعے اور تصانیف میں بسر ہوتا تھا ۔ متعدّد کتابیں مرتّب کیں ۔ جن میں سے امام بخاری کی الصحیح کا ترجمہ خاص طور پر قابلِ ذکر ھے ۔ ۱۶ صفر ۱۳۱۳ھ / ۸ اگست ۱۸۹۵ء کو وفات پائی ۔ اس نے ساٹھ ہزار روپیے کے خرچ سے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی ۔ اسی کے احاطے میں دفن کیا گیا (محلِّ مذکور، ص ۳۲۸ تا ۳۳۰) ۔ نوّاب ابراهیم علی خان کے زمانے میں ریاست میں بندوبستِ اراضی ھوا، ریاست کے ایک ضلع میں ریل بنی، عدالتیں، مدرسے اور شفاخانے قائم ھوے .

آبادی میں، شہر ٹونک کے سوا، ھندوؤں کی اکثریت ھے اور لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ ھیں .

اس کے بعد ریاست کا کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں ۔ ہندوستان دو آزاد دولتوں میں تقسیم ہو گیا تو دوسری ریاستوں کی طرح ٹونک بھی ہندوستان میں ضم ہو گئی اور آج کل بائیس ریاستوں کی اُس یونین میں شامل ہے جس کا نام '' راجستھان یونین '' ہے (*The Statesman's Year Book*، ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۰).

مآخذ: (۱) امپیریل گزیٹیر، جلد ۲۳، اوکسفورڈ ۱۹۰۸ء؛ (۲) حدیقۂ راجستان ٹونک، ستارۂ ہند پریس آگرہ ۱۳۱۸ھ؛ (۳) سید علی اصغر پیشکار: نجم الثاقب، بجنور ۱۹۰۳ء .

(غلام رسول مہر).

ٹھٹّہ : یا نگر ٹھٹّہ؛ فارسی عربی کتابوں میں تہتہ یا ''تتّہ'' (ہم قافیہ بہ ''البتّہ''، مثلاً دیکھیے بستان السیاحۃ، چاپ دوم، ص ۱۸۸) - پاکستان کے اس قدیم شہر کا عرض بلد ۴۴°۲۳ اور طول بلد ۶۸° ہے - وجوہِ تسمیہ کے متعلق دیکھیے تحفۃ الکرام، ۳ : ۱۸۵ - یہ شہر کوہ مَکلی کے دامن میں قدیم شہر کے کھنڈر پر آباد ہے .

سومروں کے زوال پر جب حکومت سمّوں کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے کوہ مَکلی کے دامن میں ایک شہر بسایا، جس کا نام ''ساموئی'' رکھا۔ یہ ان کا پہلا پایۂ تخت تھا - پھر اس سے چھے میل جنوب انھوں نے کوہ مَکلی کے ایک پشتے پر قلعۂ تغلق آباد تعمیر کیا (یا کسی پرانے قلعے کی مرمّت اور تجدید کی)، جسے اب کَلاّ کوٹ کہتے ہیں، اور اُسے پایۂ تخت بنایا - بالآخر دونوں کے درمیان ٹھٹّہ آباد کیا اور اس میں اپنا پایۂ تخت منتقل کیا ۔ تاریخ فیروز شاہی میں ۷۴۷ - ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء کے وقائع کے سلسلے میں اس کا ذکر آیا ہے؛ اس سے قبل اس کا ذکر نہیں ملا - اس سے ہیگ M. R. Haig نے قیاس کیا ہے کہ ٹھٹّہ حدودِ ۱۳۴۰ء (۷۴۱ - ۷۴۲ھ) میں آباد ہوا ہوگا.

سیّد محمّد معصوم (م ۱۰۱۹ھ) نے تاریخ معصومی (ص ۶) میں دیا ہے کہ بندر دیبل آج کل ٹھٹّہ و لاھری کے نام سے مشہور ہے - تحفۃ الکرام (محلِّ مذکور) میں ہے کہ دیول سے تتّے کے قرب کی وجہ سے تتّہ اغلب حکمِ دیول میں ہے - تحفۃ الکرام میں یہ بھی ہے کہ ٹھٹّہ نظام الدین المعروف بہ جام نِنْدو نے اواخر ۹۰۰ھ / ۱۴۹۵ء میں آباد کیا ۔ مگر سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں ہو سکتا .

آجکل دریاے سندھ ٹھٹّے سے تقریباً چھے میل مشرق میں بہتا ہے اور پانچ چار میل نیچے جا کر دو شاخوں میں منقسم ہو جاتا ہے، مگر ۱۷۵۸ء تک یہ دریا ٹھٹّے کے جنوب میں بہتا تھا اور اس کی ایک شاخ ٹھٹّے کے مغرب میں بہتی تھی (ہیگ، ص ۵) اور ٹھٹّے سے بھکّر تک کشتیوں کی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا تھا.

ٹھٹّہ ایک پر رونق شہر ہے - دور سے ببول اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ سے شہر کی اٹھتی ہوئی عمارتوں کا منظر بہت دلکش ہے - وھاں کے ہر مکان میں بادگیر ہے، جو آسائش کا ایک قدرتی ذریعہ ہے، مگر وھاں کے رہنے والوں نے حفظِ صحّت کے دیگر اصول کی طرف بہت کم توجّہ دی ہے.

ٹھٹّہ مدّت دراز سے تجارت کا اہم مرکز رہا ہے ۔ مغلوں کے زمانے میں بقول وِدنگٹن Withington (۱۶۱۲ تا ۱۶۱۶ء، فوسٹر، ۲۱۸) تجارت میں ٹھٹّے کی برابری ہندوستان کا کوئی شہر نہ کر سکتا تھا ۔ اس زمانے میں ملتان اور بھکّر سے اموال و اثقال براہِ دریا کشتیوں میں ٹھٹّے کو لاتے تھے اور مسافر بلکہ لشکر بھی خشکی کے راستے پر، جہاں جنگل اور پانی کی نایابی کی دشواری تھی،

دریا کے راستے کو ترجیح دیتے تھے ۔ خانخانان نے جب ٹھٹے کی طرف فوج کشی کی (۱۵۹۰ - ۱۵۹۱ء) تو بار بار لشکر کو غلّہ کشتیوں کے ذریعے لاهور سے وهاں تک پہنچایا گیا (خلاصة التواریخ، ص ۶۰، ۱۵۴)۔ ۱۶۱۴ء کے حدود میں پرتگیز لاهور سے کشتیوں میں سواریاں اور مال بھر کر ٹھٹے لاتے تھے اور وهاں سے مال ایران کو بھیجتے تھے (هیگ، ص ۸۷)؛ قبّ فوسٹر (ص ۲۱۸) جس نے بحوالۂ ودنگٹن Withington لکھا ہے کہ لاهور سے براہِ دریا سندھ تک ایک ماہ کا راستہ تھا اور بالعکس ۲ ماہ کا؛ مگر بقول فنچ Finch (۱۶۰۸ تا ۱۶۱۱ء فوسٹر، ص ۱۶۱) لاهور سے ٹھٹہ براہِ دریا چالیس دن کی راہ پر ہے؛ بہت سی کشتیاں ساٹھ ٹن اور اس سے زائد وزن کی برسات کے بعد ملتان، سیت پور (ضلع مظفر گڑھ) اور بھکر اور روھڑی کے راستے چلتی تھیں ۔ کوهستان چنبہ سے لکڑی براہِ دریا وزیرآباد اور وهاں سے کشتی هاى چوب میں اسے بھکر اور ٹھٹے پہنچاتے تھے (خلاصة التواریخ، ص ۷۷).

سیاسی تاریخ میں ٹھٹے کا نام بار بار آیا ہے ۔ ٹھٹے اور اس کے نواح میں عرب فاتحین پہلی بار خلیفة عبدالملک اُموی کے دور میں وارد ہوے اور محمّد بن القاسم نے اَلور کی مہم کے لیے ٹھٹے هی کے قریب دریاے سندھ کو پار کیا ۔ یہ علاقہ پہلے خلافتِ اُمویّہ اور پھر خلافتِ عبّاسیہ کے عاملوں کے ماتحت رہا تا آنکہ محمود غزنوی نے وسط رمضان ۴۱۶ھ / ۱۰۲۵ء میں القادر باللہ العبّاسی کے عاملوں کو ملتان اور اُچ سے نکال دیا ۔ ۴۱۷ھ / ۱۰۲۶ء میں اس کے وزیر عبدالرزّاق نے سندھ پر حملہ کیا اور ٹھٹے اور سیوستان (سہوان) کے نواح کی اقوام کو زیر کیا اور عربوں کو مار بھگایا ۔ ٹھٹے پر غزنوی خاندان کا قبضہ ۵۸۳ھ/ ۱۱۸۳ء تک رہا ۔ ٹھٹے کی تاریخ میں اس کے بعد کا دور بہت پُرآشوب رہا ۔ بد امنی کی بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ ٹھٹے کے حکّام اور عوام دونوں نے سیاست میں حصّہ لینا شروع کر دیا ۔ مثلاً خاندانِ تغلق کے عہد میں سندھ کی هندو رعایا اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگی ۔ سلطان غیاث الدین جب ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء میں ملتان سے دهلی گیا تو اُسی وقت قوم سومرہ نے بغاوت کر دی اور ٹھٹے پر تسلّط جما لیا، اس کے بعد ۷۵۱ھ میں سلطان محمّد شاہ تغلق کی وفات پر جو ٹھٹے کے قریب [۱۴ کروہ پر] هوئی [برنی، ص ۵۲۵]، طَغی نے، جو باغی هو گیا تھا، قوم سومرہ اور جاریجہ سے ساز باز کر کے فیروز شاہ تغلق (م ۷۹۰ھ) سے ٹھٹے کے قریب جنگ کی [دیکھیے دیوانِ مطہّرِ کڑہ، اقتباسات در اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۳، ۱۴۰ ببعد ۔ جام کا نام اُس میں بانْبھنِیہ پڑھیے] ۔ پھر ۷۷۲ھ میں ٹھٹے کے حاکم جام خیر الدین نے بھی بغاوت کر دی؛ چنانچہ سلطان فیروز شاہ کو ٹھٹے میں آنا پڑا ۔ جام خیر الدین قلعہ بند هو گیا ۔ چونکہ موسم سازگار نہ تھا اس لیے سلطان گجرات کی طرف بڑھ گیا ۔ واپسی پر جب وہ ٹھٹے میں آیا تو جام خیر الدین نے معافی مانگ لی ۔ سلطان نے بعد میں اس کے بیٹے جام جُونہ [۷۷۲ تا ۷۹۰ - ۷۹۱ھ] کو ٹھٹے کا حاکم بنا دیا ۔ اسی طرح جام علی شیر [۸۰۹ - ۸۱۵ھ] کو جو، ایک دانا اور بہادر حاکم تھا، اس کے بھائیوں نے دغا سے قتل کر دیا ۔ [اس زمانے میں کہتے هیں کہ سلطان علی شاہ میران خان بن سلطان سکندر بت شکن (۸۱۳ تا ۸۲۰ھ) نے ٹھٹہ فتح کیا (خلاصة التواریخ، ص ۳۹۸)] اور جام کَرَن بن

جام تُماچی (۸۱۶ھ) کو حاکم بنا لیا ۔ مگر عوام نے دوسرے ھی روز جام کَرن کو قتل کر ڈالا ۔ [جاموں کے سنین کے لیے دیکھیے مادۂ سمّہ]۔ ایک بار ٹھٹّے کے لوگوں نے دسویں صدی ھجری / سولھویں صدی میلادی کے آغاز میں صلاح الدین کو خط لکھا کہ جام فیروز بن جام نظام الدین حکومت کے لائق نہیں، ھم تمھیں ٹھٹّے کی حکومت پیش کرتے ھیں ۔ چنانچہ صلاح الدین [خویشِ فیروز] نے گجرات کے سلطان مظفّر کی مدد سے ٹھٹّے پر قبضہ کر لیا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے میرزا قلیچ بیگ فریدوں بیگ : *A History of Sind*، کراچی ۱۹۰۲، جلد دوم).

ٹھٹّے کے خود مختار حکمرانوں کا دور : شاھانِ تغلق کے بعد ٹھٹّے کے خود مختار حکمرانوں کا دور شروع ھوا ۔ یہ حکمران بھی ''جام'' کہلاتے تھے ۔ جام نِندو یعنی جام نظام الدین بن بانھبنیہ [۸۶۶ - ۹۱۴ھ / ۱۴۶۱ - ۱۵۰۸ء] کا عہد زرّین ترین عہد تھا ۔ جام نِندو بڑا نیک اور علم دوست انسان تھا ۔ شیراز سے مُلّا جلال الدین دوانی نے اپنے دو فاضل شاگردوں میر شمس الدین اور میر معین کو ٹھٹّے بھیجا ۔ جام نندو نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور جلال الدین کو بھی دعوت دی ۔ مگر جلال الدین راستے ھی میں فوت ھو گئے ۔ یہ دونوں شاگرد ٹھٹّے ھی میں مقیم ھو گئے ۔ جام نندو نے چوروں اور ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا ۔ قاضی عبداللہ کی (جس کی قبر کوہ مکلی پر حماد جمالی کے مزار کے پاس ھے) نمازِ جنازہ جام نندو ھی نے پڑھائی ۔ کہتے ھیں کہ یہ قاضی موصوف کی وصیّت کے مطابق ھوا کیونکہ جام نندو عفّت میں ضرب المثل تھا.

جام نِندو کی وفات کے بعد شاہ بیگ ارغون نے جو بھکّر کا حکمران تھا ٹھٹّے پر پہلا حملہ ۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء میں اور دوسرا حملہ ۹۲۷ھ / ۱۵۲۱ء میں کیا اور ٹھٹّے پر قبضہ کر لیا اور سمّوں کی حکومت ختم ھوئی ۔ شاہ بیگ چاھتا تھا کہ سندھ کے علاوہ گجرات کا علاقہ بھی اُس کے ھاتھ آ جائے ۔ اُسے معلوم تھا کہ بابر ھندوستان پر حملہ کیا چاھتا ھے اور اس طرح اُسے بھکّر سے نکال دیا جائے گا اس لیے وہ اپنے لیے کوئی اور ملک تجویز کر رھا تھا، مگر ۹۲۸ھ / ۱۵۲۲ء میں وہ راھیِ ملکِ عدم ھوا ۔ اس کے بیٹے میرزا شاہ حسین، (۹۳۰ - ۹۶۱ھ) نے اپنے تدبّر اور استقلال سے مغل بادشاھوں کا سندھ میں پاؤں نہ جمنے دیا ۔ توزک بابری (طبع وقفیہ گب ص ۳۳۰ الف؛ ترجمۂ انگریزی ص ۵۸۴) میں ھے کہ شاہ حسین کی درخواست پر بابر نے ۹۳۳ھ میں آگرے سے اُسے گنجفہ بھجوایا.

اس کے بعد ترخانوں کی ۳۸ سال حکومت رھی ۔ میرزا عیسی ترخان [۹۶۱ - ۹۷۵ھ] کے زمانے میں ربیع الثانی ۹۶۳ھ / مارچ ۱۵۵۶ء میں پرتگالیوں نے جمعے کے دن ٹھٹّے پر دھاوا بول دیا ۔ لوگ نماز جمعہ ادا کر رھے تھے کہ فرنگیوں نے شہر کو لوٹ کر مکانات کو آگ لگا دی ۔ میرزا عیسی اُس وقت بھکّر میں تھا ۔ اسے خبر ملی تو فوراً ٹھٹّے پہنچا ۔ اس نے شہر کی ایک فصیل دریا کے ساتھ ساتھ بنوائی اور ایک نہر کھدوا کر شہر کے اندر لایا ۔ اس نے ایک نیا قلعہ ''شاہ بندر'' بھی تعمیر کروایا.

شاھانِ مغلیہ کا دور :

ھمایون جب شیر شاہ سے شکست کھا کر بھاگا تو لاھور سے ھوتا ھوا بھکّر پہنچا، پھر وھاں سے مایوس ھو کر ٹھٹّے کی طرف آیا ۔ مگر حسین میرزا ارغون والی ٹھٹّہ نے اس سے جنگ کی اور لشکرِ بادشاھی میں غلّے کا پہنچنا

بند کرا دیا ۔ ناچار همایوں جودھ پور کی طرف چلا گیا ۔

اوپر ذکر هوا ہے کہ ۱۵۹۰-۱۵۹۱ء میں سلطان جلال الدین اکبر کے عہد میں خان خانان نے سندھ پر حملہ کیا اور ٹھٹّہ ترخانوں کے هاتھوں سے نکل گیا اور خاندانِ مغلیّہ کے مقرّر کردہ ''نوّابوں'' نے یہاں حکومت کی جنھیں ان کی قابلیت کے مطابق چار هزاری، پنج هزاری یا هفت هزاری کا مرتبہ عطا هوتا تھا۔

۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء کے لگ بھگ سندھ کا الگ صوبہ بنا دیا گیا اور ٹھٹّہ اس کا صدر مقام قرار پایا، چنانچہ آیینِ اکبری، طبع بلخمن ۱ : ۵۵۵ ببعد میں ہے کہ : یہ ملک پہلے جداگانہ تھا اب داخلِ قلمرو ہے اس کا پایۂ تخت 'تتّہ' ہے اور اسے دیبل کہتے هیں ۔ اونٹ یہاں کا بہت عمدہ اور ''بار برداری'' هوتا ہے (۱ : ۵۵۶ و ۱۳۰۱) سرکارِ تتّہ کا مدار بنگالے اور کشمیر کی طرح کشتیوں پر ہے ۔ دریاے سندھ یہاں مہران کہلاتا ہے ۔

ٹھٹّے میں دورِ مغلیّہ کی دو مسجدیں جالبِ توجّہ هیں : عہدِ جہانگیری کی مسجد جو کتبۂ محراب کی رُو سے نواب مظفّر خان (میر عبد الرزّاق الحسینی المعموری، دیکھیے مآثر الامراء، ۳ : ۳۷۶ و ۳۳۸) کے دَور میں ۱۰۲۲ھ میں مکمّل هوئی اور شاهجہان کی جامع مسجد جس کے کتبوں میں سے چار میں تاریخی قطعات دیے هیں ۔ ایک قطعے سے ۱۰۵۳ھ برآمد هوتا ہے اور دوسرے سے ۱۰۵۷ھ؛ ان مساجد کے حال کے لیے دیکھیے اوریئنٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۶ ببعد ۔

نواب سردار خان کے عہد میں یہاں قحط اور طاعون پھیلا ۔ کہتے هیں کہ اس سے تقریباً نصف شہر غیر آباد هو گیا ۔ نواب حفیظ اللہ خان نے نیا قلعہ بنوانا شروع کیا مگر وہ نا مکمّل هی رہ گیا ۔ صفر ۱۰۶۹ھ / نومبر ۱۶۵۸ء میں جب اورنگ زیب نے داراشکوہ کے تعاقب میں فوجیں بھیجیں تو داراشکوہ ٹھٹّے پہنچا مگر متعاقب فوجوں کے پہنچ جانے سے ناچار گجرات کی طرف بھاگا (خلاصة التواریخ، ص ۵۳۹ ببعد).

۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں میاں نور محمّد کلھوڑہ عبّاسی نے ٹھٹّہ شاهانِ مغلیّہ سے لے لیا ۔

سیّاح و زائرین : ابن بطّوطہ اگرچہ اس علاقے سے براہِ دریا گذرا ہے مگر وہ شاید ٹھٹّے میں نہیں اترا اور اس نے ٹھٹّے کا حال نہیں لکھا ۔ ۱۶۱۵ء میں سرٹامس رو Sir Thomas Roe کے پادری (Chaplain) ٹیری Terry نے اسے زرخیز اور خوش گوار مقام بتلایا ہے، ۱۶۶۵ء - ۱۶۶۶ء میں تیوِینو Thevenot کا ٹھٹّے میں ورود هوا ۔ اس نے یہاں کی تجارت کو سراها ہے ۔ ۱۶۶۶ء میں تراورنیے Travernier بھی یہاں سے گذرا ۔ اس کی راے یہ تھی کہ یہاں کی تجارت اب رو بہ انحطاط ہے کیونکہ دریا کا دھانہ زیادہ خطرناک هو چکا ہے اور جا بجا جوھڑ بن رہے هیں ۔

بقول راورٹی ڈ وٹ de Witt کی اٹلس (مطبوعہ اسٹرڈم ۱۶۸۸ء) نقشہ ۴۷ میں دیبل اور ٹھٹّے کو دریا کے دائیں کنارے پر ظاهر کیا گیا ہے ۔

۱۶۹۹ء [۱۱۱۰ - ۱۱۱۱ھ] میں هملٹن Alexander Hamilton ٹھٹّے سے گذرا اس کے اندازے کے مطابق شہر تین میل لمبا اور نصف میل چوڑا تھا اور اس کی آبادی ۸۰ هزار نفوس پر مشتمل تھی ۔

بارهویں صدی هجری میں ٹھٹّہ مردم خیز شہر تصوّر هوتا تھا، وهاں کے خاندانهای کرام اور اولیاء و علماء اور دیگر نامور اهلِ کمال کی

تفصیل کے لیے دیکھیے تحفۃ الکرام (تألیف ۱۱۸۲ھ، ۳ : ۱۸۶ تا ۳۰۸، جہاں ان کا حال بلحاظ طبقات دیا ہے)۔ ۱۷۵۸ء میں یہاں ایک برطانوی فیکٹری (تجارتی کوٹھی) قائم ہوئی، جو ۱۷۷۵ء میں بند کر دی گئی۔ ۱۷۹۹ء میں اسے پھر سے قائم کرنے کی کوشش کی گئی، جو ناکام رہی۔ ۱۸۳۹ء میں ایک برطانوی فوج کا دستہ یہاں متعین کیا گیا اور اسی فیکٹری کی عمارت میں اقامت پذیر ہوا۔ آب و ہوا کی خرابی اور بالخصوص مچھروں کی بہتات سے ان فوجیوں کو بہت تکلیف اٹھانا پڑی۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ٹھٹے کی آبادی ۱۲,۷۸۶ ہے۔ کوہ مکلی کی بہت سی قبریں اور ان کے کتبے ملبے کے نیچے آ گئے تھے، اس ملبے کو محکمۂ آثار قدیمہ نے صاف کرایا ہے اور کتبوں کی فہرست زیر تألیف ہے۔ [مکلی نامہ میں ان اولیاء اللہ کا ذکر ہے جو کوہ مکلی پر دفن ہیں، اسی طرح محمد اعظم ٹھٹوی: تحفۃ الطاہرین (تألیف ۱۱۹۴ھ/۱۷۹۰ء) میں مدفونان مکلی و ٹھٹہ کا ذکر ہے؛ طباعت از انتشارات سندھ ادبی بورڈ، کراچی]۔

مآخذ: (۱) علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی: چچنامہ (فتح نامۂ سند)، طبع عمر بن محمد داؤد پوتہ، دہلی ۱۹۳۹ء؛ (۲) سید محمد معصوم بھکری: تاریخ معصومی، طبع عمر بن محمد داؤد پوتہ، بمبئی ۱۹۳۸ء؛ (۳) ابوالفضل العلامی: آئین اکبری، طبع بلخمن ۱۸۷۲ء، ۱ : ۵۵۵ ببعد (ترجمہ از جیرٹ H. Jarrett، کلکتہ)؛ (۴) تاریخ طاہری: (ٹھٹے کی تاریخ) تألیف ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء، جو نگارندہ کے پیش نظر نہیں؛ (۵) میرزا قلیچ بیگ فریدون بیگ: *Chachnamah (History of Sind)*، کراچی ۱۹۰۰ و ۱۹۰۲ء؛ (۶) ضیاء برنی: تاریخ فیروزشاہی، طبع ناسو لیس W. Nassau Lees، بامداد اشاریہ؛ (۷) صمصام الدولہ شاہ نواز خان: مآثر الامراء، کلکتہ ۱۸۸۸ - ۱۸۹۵ء؛ (۸) سجان رائے: خلاصۃ التواریخ، دہلی ۱۹۱۸ء؛ (۹) کننگھم A. Cunningham : *The Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۱۰) راورٹی H. G. Raverty : *The Mihran of Sind*، کلکتہ ۱۸۹۲ء، ص ۳۲۱ ببعد؛ (۱۱) ہملٹن: *A New Account of the East Indies (1699)*، لنڈن ۱۷۴۴ء، ۱ : ۱۱۷ تا ۱۲۳؛ (۱۲) J. B. Travernier : *Travels in India* (ترجمۂ بال Dr. Ball)، لنڈن ۱۸۸۹ء، ۱ : ۱۰، ۱۲؛ (۱۳) *Memoirs on Shikarpur*، نشر کردۂ Bombay Government، بمبئی ۱۸۵۵ء، ص ۳۸۲ - ۳۸۳؛ (۱۴) F. S. Manrique : *Travels of F. S. Manrique* (= ترجمۂ E. Luard اور F. H. Hosten) اوکسفورڈ ۱۹۲۷ء، ص ۲۳۶ ببعد؛ (۱۵) W. Foster : *Early Travels in India 1583-1619*، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۱ء، بامداد اشاریہ؛ (۱۶) Ed. Thornton : *A Gazetteer of the territories under the Government of East India Co.*، لنڈن، ص ۹۶۰ - ۹۶۱؛ (۱۷) سمتھ W. Smith : *New Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*، لنڈن ۱۸۵۳ء، ص ۵۳۱؛ (۱۸) M. R. Haig : *Indus Delta Country*، لنڈن ۱۸۹۴ء، ۵، ۶، ۷۶ ببعد؛ (۱۹) *Encyclopaedia Britannica*، طبع ۱۹۶۱ء، ۲۱ : ۸۳۳؛ (۲۰) محمد ادریس صدیقی: *Thatta* (از مطبوعات محکمۂ آثار قدیمۂ پاکستان)، کراچی ۱۹۵۸ء؛ (۲۱) تاریخ فرشتہ، ۱۸۳۲ء، ۲ : ۶۱۳ ببعد؛ (۲۲) علی شیر قانع: تحفۃ الکرام، جلد سوم، طبع دلہائی (= دہلی)، حدود ۱۳۰۴ھ، ۳ : ۱۸۰؛ (۲۳) H. Cousens : *The Antiquities of Sind*، کلکتہ ۱۹۲۹ء، ص ۱۱۰ - ۱۳۰، لوحہ ۳۳ تا ۶۵؛ (۲۴) بلیموریہ N. M. Billimoria : *Bibliography of Publications on Sind*، جون ۱۹۳۰ء، بامداد اشاریہ؛ (۲۵) محمد شفیع: سندھ کے کتبے، در اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۵ ببعد۔

(احسان الٰہی رانا)

⊗ ٹیپو سلطان : حیدر علی خان بانیِ سلطنت میسور کا فرزند اکبر، ۱۰ نومبر ۱۷۵۰ء/ ۲۰ ذی الحجۃ ۱۱۶۳ھ جمعے کے دن دیون ہلی (بنگلور سے بیس میل شمال میں) [فاطمۃ معروف به فخر النساء کے بطن سے] پیدا ہوا؛ اس مقام کا نام بعد میں ٹیپو سلطان نے یوسف آباد رکھا - حیدر علی خان نے نرینہ اولاد کی آرزو میں آرکاٹ کے ایک مشہور بزرگ ٹیپو مستان ولی کے مزار پر حاضر ہو کر دعا کی - خدا نے بیٹا دیا تو اس کا نام تیمناً بزرگ موصوف کے نام پر رکھا (نشانِ حیدری، ص ۱۹، ۲۰، ۲۹۹).

۱۷۶۷ء میں حیدر علی خان نے نظام کے پاس ایک وفد گراں بہا تحائف کے ساتھ بھیجا تھا، جس کا رئیس شہزادہ ٹیپو سلطان ہی تھا - نظام نے شہزادے کو ''نصیب الدولہ'' (نشانِ حیدری، ص۱۲۹) اور ''فتح علی خان بہادر'' (محبّ الحسن خان، از روی تاریخ حمید خان، ص ۱۱) خطاب دیے - مرہٹوں اور نظام سے جنگ (۱۷۸۶ - ۱۷۸۷ء) کے بعد مصالحت کے لیے گفت و شنید ہوئی تو سلطان کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ اسے ''بادشاہ'' کہہ کر خطاب کیا جائے - چنانچہ فیصلہ ہو گیا کہ آئندہ سلطان کو ''نواب ٹیپو سلطان فتح علی خان بہادر'' کہا جائے گا (محبّ الحسن خان، از روی حدیقۃ العالم، ص ۳۷۲ ببعد) - اس سے واضح ہے کہ فتح علی خان کم از کم خطاب کے وقت سے نام بن گیا تھا - اس میں دادا (فتح محمّد) اور باپ (حیدر علی) دونوں کے نام کا ایک ایک جزو شامل تھا - سلطان کے دوسرے بھائی کے بھی دو ہی نام تھے، ایک صفدر علی خان، دوسرا عبدالکریم (کارنامۂ حیدری، ص ۳۴۲) - ابوالفتح سلطان کی کنیت تھی، جو ممکن ہے بڑے بیٹے فتح حیدر کے نام پر یا محض تیمناً اختیار کر لی گئی ہو - ایک روایت ہے کہ نام کے ساتھ کنیت بھی باپ ہی نے رکھی تھی (تاریخ سلطنتِ خدا داد، طبع اوّل، ص ۱۶۶).

پانچویں سال تعلیم شروع ہوئی - اسلامی علوم کے علاوہ عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل کر لی (ٹیپو سلطان، مصنفۂ اشہری، ص ۲۳۱، از روی حملاتِ حیدری) - انگریزی اور فرانسیسی بھی سیکھ لی تھی (اشہری، ص ۲)، کنڑی مقامی بولی تھی، جس سے سلطان بخوبی آگاہ تھا - اردو بھی رائج ہو رہی تھی - فوج کے لیے جو ترانے تجویز ہوئے تھے ان میں فارسی ترانوں کے علاوہ اردو ترانے بھی شامل تھے (فتح المجاهدین)؛ گویا سلطان، اس کے درباری اور سپاہی اردو بھی جانتے تھے.

استادوں کے نام معلوم نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ حیدر علی خان نے علم و ادب کی ہر شاخ اور دانش و ہنر کے ہر شعبے کے استادانِ کامل و ماہر بیٹے کی تعلیم کے لیے بلا لیے تھے اور ٹیپو سلطان نے بہ عہد صغر سنی ہی تمام علوم میں بہرۂ وافی حاصل کر لیا تھا (کارنامۂ حیدری، ص ۸۶۴ ببعد).

اس زمانے کے فنونِ سپہ گری میں شمشیر زنی، تیر افگنی، نیزہ بازی، تفنگ اندازی اور شہسواری کے علاوہ بانک، بنوٹ، لکڑی (ڈنڈا)، کشتی (مصارعت) اور تیراکی بھی شامل تھے - ٹیپو سلطان نے ان سب میں لاثانی مشق بہم پہنچائی (اشہری، ص ۲۳۱، از روی حملاتِ حیدری) - رام چندر پنگنوری کے بیان کے مطابق شہزادے کی فوجی تعلیم و تربیت غازی خان سے متعلق تھی، جو حیدر علی خان کے فوجی ہواخواہ افسروں میں سب سے بہتر تھا (محبّ الحسن خان، ص ۱۰) - سنِ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے ٹیپو سلطان حرب و ضرب کے آداب اور رزم و پیکار کے فرنگی طور طریقہ بخوبی سیکھ چکا تھا (کارنامۂ حیدری، ص ۸۶۵) -

وِلْکْس Wilks کے بیان کے مطابق شہسواری میں سلطان کو خاص برتری حاصل تھی اور اسے اسپ سواری ہی پسند تھی۔ پالکی میں سوار ہونے کا وہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ بیماروں اور کمزوروں کے لیے بھی اس نے پالکی میں سوار ہونے کی بڑی حد تک ممانعت کر دی تھی (وِلْکْس، جلد دوم، ص ۷۶۱)۔ حیدر علی خان جب فوج کا معاینہ کرتا ٹیپو سلطان کو ساتھ رکھتا، تاکہ اسے عسکری ضبط و نظم اور فنونِ حرب، خصوصاً مغربی فنونِ حرب، کی تربیت ملتی جائے (پُنْگَنُوری، ص ۳۳؛ سٹیوارٹ، ص ۳۴: وِلْکْس، ۲: ۳۰۰، از روی محبّ الحسن خان، ص ۱۰)۔

سلطان کے ابتدائی دَور کے متعلّق معلومات بہت کم ہیں۔ اس کی ولادت سے پیشتر حیدر علی خان اولوالعزمی کی زندگی کا پُرخار راستہ اختیار کر چکا تھا، جس میں ہر قدم پر کشمکش اور ہر گام پر نشیب و فراز کا پیش آنا ناگزیر تھا۔ ایک مرتبہ اسے جان بچانے کے لیے اچانک رات کے وقت مرکزِ حکومت (سرنگاپٹم) سے نکلنا پڑا (۱۲ اگست ۱۷۶۱ء) اور وہ اہل و عیال کو مجبوراً وہیں چھوڑ گیا (پُنْگَنُوری اور وِلْکْس کی تاریخِ میسور، ۱: ۴۶۹)۔ سرنگاپٹم پر دوبارہ قابض ہوا تو اہل و عیال کے مستقل قیام کے لیے بنگلور پسند کیا، جہاں نسبةً کم خطرہ تھا۔ ۱۷۶۳ء میں بِدْنُور فتح ہوا تو ٹیپو سلطان کو وہاں بھیج دیا (پُنْگَنُوری، ص ۳۳)۔

۱۷۶۵ء میں حیدر علی خان نے ملیبار پر حملہ کیا تو ٹیپو سلطان کو ساتھ رکھا۔ یہ جنگ کے عملی تجربے کا پہلا موقع تھا (پُنْگَنُوری، ص ۳۳)۔ اگرچہ شہزادہ صرف پندرہ سال کا تھا مگر حوصلہ‌مندی اور گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ صرف دو تین ہزار سپاہی لے کر غنیم کا تعاقب کرتا ہوا گھنے جنگل میں جا گھسا اور اسے حوالگی پر مجبور کر دیا۔ حیدر علی خان نے وہیں بہادر فرزند کو پانچسو سواروں کا کماندار بنا کر اپنی محافظ فوج میں شامل کر لیا نیز موزوں جاگیر عطا کی (پُنْگَنُوری، ص ۳۳)۔

پہلی جنگِ میسور میں حیدر علی خان نے ٹیپو سلطان کو غازی خان اور بعض دوسرے سالاروں کے ہمراہ مدراس کی جانب بھیج دیا تھا (۱۹ جون ۱۷۶۷ء)، تاکہ انگریزوں کی جنگی سرگرمیوں کے مرکز میں ہراس پیدا کیا جائے۔ شہزادے نے میسوری رسالے کے چھاپوں سے مدراس کے مضافات میں تہلکہ مچا دیا اور خود شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ عین اس موقع پر حیدر علی خان کی طرف سے تاکیدی بلاوا آ گیا اور سلطان کو لوٹنا پڑا (نشانِ حیدری، ص ۱۳۲)۔ ترپاتّور اور وانم‌باڑی Vaniyam badi کی تسخیر میں وہ والد کے ساتھ رہا۔ آنبور کے محاصرے میں بھی شریک تھا۔ انگریزی فوج نے پیش قدمی کی تو محاصرہ چھوڑنا پڑا۔ کرنیل سمتھ سے لڑائی پیش آئی تو ٹیپو سلطان رسالے کے ساتھ دائیں بازو پر متعیّن تھا۔ اس نے انگریزوں پر اس طرح حملہ کیا جیسے شیر ہرنوں پر حملہ کرتا ہے۔ سیکڑوں کو موت کے گھاٹ اتارا، ان کی جمعیّت درہم برہم کی، چند انگریز سرداروں کو پالکیوں اور گھوڑوں کے ساتھ گرفتار کیا اور مظفّر و منصور والد کے پاس وانم‌باڑی پہنچ گیا (نشانِ حیدری، ص ۱۳۴ ببعد)۔

جب اطلاع ملی کہ انگریزی فوج نے ملیبار کی جانب بندر کوڑیال (منگلور) پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ بِدنُور کی طرف بڑھ رہی ہے تو ٹیپو سلطان کو ادھر بھیج دیا گیا۔ وہ بطریقِ یلغار منگلور پہنچا اور دیکھا کہ انگریزوں نے ارد گرد ایک ایک فرسنگ پر توپیں نصب کر رکھی ہیں۔ پھر حیدر علی خان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دس بارہ

دن میں آبنوس کی لکڑی سے بندوق نما آلے بنوائے ۔ بیس ہزار آدمی جمع کر کے وہ آلے انھیں دے دیے اور ایک ایک ہزار کی جمعیت کے لیے الگ الگ پرچم مقرّر کیے ۔ ان کے پرے فوجی انداز میں انگریزی توپخانے کے سامنے جما دیے اور شہزادے کو ایک طرف کے مورچے پر حملے کا حکم دیا ۔ اس کی تعمیل ہوئی ۔ مورچے کے تمام سپاہی ٹیپو سلطان نے تہ تیغ کر دیے۔انگریز توپیں چھوڑ کر بھاگے اور قلعے کے اندر پہنچ گئے ۔ سلطان نے یہ خبر والد کو بھجوائی اور خود تعاقب کرتا ہوا قلعے کے اندر داخل ہو گیا ۔ پیچھے پیچھے حیدر علی خان بھی پہنچ گیا ۔ انگریز فوجی قلعہ چھوڑ کر ساحل کی طرف بھاگے ۔ میسوری فوج نے انھیں قتل کیا یا قیدی بنا لیا ۔ البتہ سالار فوج جہاز پر سوار ہو کر بمبئی چلا گیا (نشان حیدری، ص ۱۳۸ ببعد) ۔ اس کے بعد حیدر علی خان واپس ہو گیا ۔ ٹیپو سلطان اس محاذ پر رہا ۔

پھر حیدر علی خان تین روز میں ایک سو تیس میل کا فاصلہ طے کر کے یکایک مدراس کے دروازے پر جا پہنچا اور حکومتِ مدراس کو صلح نامے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کر دیا (۴ اپریل ۱۷۶۹ء) ۔ اس کے مطابق فریقین نے بوقتِ ضرورت ایک دوسرے کی امداد کا اقرار کیا ۔ تمام مفتوحہ علاقے چھوڑ دیے ۔ صرف کڑوڑ حیدر علی خان کے قبضے میں رہا (سنہا Haidar Ali : Sinha، ص ۹۰) ۔ اس جنگ پر کمپنی کے ڈائرکٹروں کا تبصرہ وقت کے عام تأثرات کا آئینہ ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی متعدّد طاقتیں ہمارے کام اور جنگی قوّت سے خوفزدہ تھیں ۔ اب ان کے سامنے یہ منظر آیا کہ ایک ملکی طاقت نے مدراس کے دروازے پر پہنچ کر گورنر کو صلح کی شرطیں لکھوائیں ۔ کمپنی کا وقار و اثر اتنا گر گیا کہ شاید اس کے ملازموں کی سالہا سال کی محنت بھی اسے بحال نہ کر سکے (سنہا : *Haidar Ali*، ص ۹۳) ۔

انگریزوں سے لڑائی ختم ہوئی تو مرہٹوں نے میسور پر حملہ کر دیا ۔ مادھو راؤ پیشوا خود تو بیماری کے باعث نہ آ سکا، اپنے ماموں تْرمْبک راؤ کو بھیج دیا ۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار سوار اور پیادے تھے اور سو توپیں تھیں ۔ مختلف پالیگار اور حا کمان ساونور و کڑپہ بھی شامل تھے (نشان حیدری، ص ۱۰۰) ۔ حیدر علی خان کا فیصلہ یہ تھا کہ مرہٹوں سے صرف چھاپہ مار جنگ کی جائے، چنانچہ ٹیپو سلطان کو حکم ملا کہ مرہٹوں کے راستے میں رسد کی ہر چیز تباہ کر دی جائے ۔ کنوؤں اور تالابوں میں زہر ڈلوا دیا جائے اور لوگوں سے کہا جائے کہ آبادیاں چھوڑ کر آس پاس کے قلعوں میں جا ٹھیریں ۔ خود بِدْنُور کے حوالی میں رہے، تاکہ مرہٹوں کے قافلہ ہائے رسد پر چھاپے مار سکے ۔ سلطان نے مفوّضہ خدمت بڑی مستعدّی سے انجام دی ۔ پھر اسے واپس بلا لیا گیا (محبّ الحسن خان، ۱۲ ببعد، از روی وِلْکْس Wilks : ۱ : ۶۸۵) ۔ مرہٹے سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ حیدر علی خان ملکوٹہ میں ٹھیر گیا، تاکہ عقب سے مرہٹوں پر چھاپا مارے ۔ یہ خبر چھپی نہ رہ سکی اور مرہٹوں نے پلٹ کر جنگ شروع کر دی ۔ حیدر علی خان نے مشیروں کی رائے کے خلاف سرنگاپٹم پہنچنا چاہا ۔ اس میں بعض حوادث کے باعث سامان جنگ بری طرح تباہ ہو گیا ۔ جانی نقصان بھی خاصا ہوا ۔ افراتفری میں ٹیپو سلطان الگ ہو گیا ۔ حیدر علی خان سرنگاپٹم پہنچ گیا، مگر بیٹے کے متعلّق سخت رنج و قلق کا پیکر بنا ہوا تھا ۔ جب ٹیپو دو تین سواروں کے ساتھ پنڈاروں کے بھیس میں داخلِ قلعہ ہوا تو حیدر علی نے خزانے کا دروازہ کھول دیا اور سب کو انعام و

اکرام سے نہال کر دیا (نشانِ حیدری، ص ۱۰۳؛ حیدر نامہ، ص ۹۲؛ ولکس، ۱ : ۶۹۸).

تینتیس روز سرنگاپٹم کا محاصرہ جاری رہا ۔ پھر ترنبک راؤ رسد کی قلت کے باعث محاصرہ چھوڑ کر لوٹ مار کی غرض سے تنجور چلا گیا ۔ جولائی ۱۷۷۲ء میں حیدر علی خان نے پچاس لاکھ روپے اور خاصے بڑے علاقے دے کر صلح کر لی (سنہا، ۱۱۲ ببعد).

۱۷۷۲ء میں مادھوراؤ پیشوا کی وفات پر دربارِ پونا کشمکش کا مرکز بن گیا ۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر حیدر علی خان نے وہ تمام علاقے دوبارہ مسخّر کر لیے جو مرہٹوں نے چھینے تھے بلکہ وہ علاقے بھی لے لیے جو دریاے تنگ بھدرا اور کرشنا کے درمیان تھے ۔ ٹیپو سلطان ان میں سے اکثر مہموں میں شریک رہا.

۱۷۸۰ء میں انگریزوں سے دوبارہ جنگ چھڑ گئی (اسباب اور تفصیلات کے لیے دیکھیے مقالہ حیدرعلی خان)۔حیدرعلی خان نوّے ہزار فوج کے ساتھ بجلی کی طرح کرناٹک پر جا گرا۔ ٹیپوسلطان ساتھ تھا۔ انگریز سپہ سالار ہیکٹر منرو Hector Munro کانجی‌ورم پہنچ کر اس فوج کا انتظار کرنے لگا جو گنٹور سے کرنیل بیلی Baillie کی سرکردگی میں آ رہی تھی۔ یہ سن کر حیدر علی خان نے ٹیپو سلطان کو دس ہزار فوج دے کر بیلی پر حملے کی غرض سے بھیج دیا (Gleig : *The Life of Sir Thomas*، ۲۳) اور خود کانجی ورم کی طرف بڑھا تاکہ منرو کو نگاہ میں رکھے ۔ بیلی کانجی‌ورم سے پندرہ میل پر تھا جب ٹیپو سلطان نے اس پر حملے شروع کیے ۔ ادھر بیلی کے پاس کمک پہنچ گئی ۔ ادھر حیدر علی خان نے ٹیپو سلطان کے پاس مزید فوج بھیج دی ۔ کانجی‌ورم سے نو میل پر بیلی ٹھیر گیا اور منرو کا انتظار کرنے لگا ۔ سلطان نے رات کے وقت توپیں بیلی کے راستے کے آس پاس مناسب مقامات پر لگا دیں ۔ پھر شدید گولہ باری شروع کر دی ۔ آخر بیلی حوالگی پر مجبور ہوا ۔ تقریباً چار ہزار فوج میں سے دو سو یورپی بچے، جو قید ہوے ۔ ان میں پچاس افسر تھے (نشانِ حیدری، ص ۱۹۸؛ فورٹسکیو Fortescue، ۳ : ۴۷۷) ۔ بیلی کی شکست کے متعلّق اعتراف کیا گیا کہ یہ شدیدترین ضرب تھی جو ہندوستان میں انگریزی قوّت پر لگی (Gleig : کتاب مذکور، ۲۵).

بیلی کی شکست کے بعد حیدرعلی خان نے منرو پر حملہ نہ کیا اور وہ بچ نکلا ۔ آئر کوٹ Sir Eyre Coote اس وقت انگریزوں کا بہترین جرنیل تھا ۔ اس نے لکھا : ''اگر حیدر علی فتح کے بعد مدراس کی طرف پیش قدمی کرتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس نہایت اہمّ حصار پر قابض ہو جاتا'' (*Secret Proceedings*، ص ۲۳۷ ببعد) ۔ حیدر علی خان نے منرو پر حملے اور مدراس کی جانب پیشقدمی کے بجاے آرکاٹ کا محاصرہ کر لیا ۔ ٹیپو سلطان اور مہا مرزا خان کی کوشش سے شہر فتح ہو گیا ۔ پھر سلطان نے آنبور اور بعض دوسرے قلعے مسخّر کیے ۔ بعد ازآں اسے حکم ملا کہ وندیواش پر قبضہ کرتا ہوا اس انگریزی فوج کو جا روکے جو بنگال سے خشکی کے راستے مدراس آ رہی تھی ۔ وندیواش کا محاصرہ اس لیے چھوڑنا پڑا کہ آئرکوٹ قریب پہنچ رہا تھا اور ٹیپو سلطان کے نزدیک بنگال سے آنے والی فوج کو روکنا ضروری تھا، چنانچہ وہ مدراس اور بنگلور کے درمیان شاہراہ پر جا بیٹھا، مگر انگریزی فوج دوسرے راستے سے گزر گئی اور سلطان اوائل اگست ۱۷۸۱ء کو والد کے پاس آرکاٹ پہنچ گیا (*Secret Proceedings*، ص ۲۰۷۱) ۔ فروری ۱۷۸۲ء میں اسے تنجور بھیج دیا گیا ۔ جہاں

اس نے کرنیل بریتھویٹ Braithwaite کو شکست فاش دی ۔ اس فوج کے جتنے آدمی اسیر ہوے سلطان نے ان سے بڑا عمدہ برتاؤ کیا (لارنس Lawrence : *Captives*، ص ۱۲۶؛ مِل Mill : *Hist. of British India*، ۳ : ۱۷۳) ۔ بریتھویٹ کی شکست نے آئر کوٹ کا پورا نقشۂ جنگ درہم برہم کر ڈالا ۔

اس اثنا میں مغربی محاذ سے تشویشناک خبریں ملیں، اس لیے ٹیپو سلطان کو ملیبار بھیج دیا گیا ۔ اس وقت تک انگریزی فوج ساحلِ ملیبار کے تین چار مقامات پر قابض ہو چکی تھی اور اس نے اندرونِ ملک میں پیش قدمی کرتے ہوے پال گھاٹ کا محاصرہ کر لیا تھا ۔ سلطان کے ملیبار پہنچنے سے پیشتر پال گھاٹ کو انگریز خالی کر چکے تھے ۔ سلطان نے تیزی سے انگریزوں کا تعاقب کیا اور مشہور ساحلی مقام پونانی پہنچا دیا ۔ اس اثنا میں انگریزوں کے پاس کمک پہنچ گئی ۔ سلطان نے پونانی کی ناکہ بندی کر لی ۔ حملے کی تیاری ہو رہی تھی کہ حیدر علی کے انتقال کی خبر پہنچ گئی ۔

حیدر علی خان پر سرطان کا حملہ ہوا تھا ۔ طبیبوں، ویدوں اور فرانسیسی ڈاکٹروں کے علاج سے کچھ افاقہ نہ ہوا ۔ اس وقت وہ آرکاٹ سے سولہ میل شمال میں ٹھیرا ہوا تھا ۔ بیماری بڑھی تو مشیروں نے بار بار عرض کیا کہ ٹیپو سلطان کو بلا لیا جائے ۔ حیدر علی خان نے جواب دیا اس کی کیا ضرورت ہے ۔ سرکاری کام میں خلل ہوگا ۔ خدا چاہے گا تو وہ خود آ پہنچے گا ۔ وفات سے ایک روز پہلے اسے خط لکھوا دیا کہ ادھر کا بندوبست ٹھیک ٹھاک کر کے جلد یہاں آ جاؤ ۔ دولت و ثروت کے تمام لوازم پر گہری نظر رکھنی چاہیے ۔ اگر امداد کے لیے خرچ کی ضرورت ہو تو منگا لو ۔ ہم نے تمھیں دولت کے تمام انتظامات کا مختار بنا دیا ہے ۔ سرکاری کام میں تھوڑے سے وقت بلکہ ایک لمحے کا بھی تغافل نہ ہونا چاہیے (نشانِ حیدری، ص ۲۰۸).

دوسرے روز ذی الحجّۃ ۱۱۹۶ھ کی آخری تاریخ کو شام کے وقت حیدر علی خان نے وفات پائی (۷ دسمبر ۱۷۸۲ء) ۔ اس سے پیشتر دو ہزار سوار شمالی آرکاٹ کے پالیگاروں کی سرکوبی کے لیے بھیجے اور پانچ ہزار سواروں کو مدراس کی جانب پیش قدمی کا حکم دیا (نشانِ حیدری، ص ۲۰۹) ۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سرداروں سے فرمایا : جس وفاداری سے میری خدمت انجام دیتے رہے ہو اسی طرح میرے بیٹے ٹیپو سلطان کی خدمت انجام دینا (محبّ الحسن خان، ص ۲۶ از روی حیدر نامہ، ص ۱۰۰).

سرداروں نے فوراً مہا مرزا خان کو ٹیپو سلطان کے پاس بھیج دیا ۔ میّت کو غسل دے کر تابوت میں رکھا اور مناسب پہرے کے ساتھ تابوت کولار بھیج دیا، جہاں حیدر علی خان کا خاندانی قبرستان تھا ۔ بعد میں میّت کو سرنگاپٹم منتقل کیا گیا ۔ چھوٹے بیٹے عبدالکریم کو عارضی طور پر مسند نشین کر دیا گیا ۔

ٹیپو سلطان کو ملیبار میں پانچویں روز (۱۱ دسمبر ۱۷۸۲ء) یہ خبر مل گئی تھی اور مہا مرزا خان نے تمام سرداروں کی طرف سے خلوص و وفا کے متعلّق اطمینان دلا دیا تھا (نشانِ حیدری، ۲۰۹) اور وہ ۲۵ دسمبر ۱۷۸۲ء کو چکملور پہنچ گیا، جہاں لشکر ٹھیرا ہوا تھا ۔ اس نے والد کے ماتم کے باعث رسمی استقبال کی ممانعت کر دی تھی ۔ بعد غروبِ آفتاب چپ چاپ لشکر گاہ میں داخل ہوا اور فرش پر بیٹھ کر سرداروں کو باریابی بخشی (وِلکس Wilks، ۲ : ۱۷۱ ببعد) ۔ ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ / ۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء کو جمعرات کے دن مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی (نشانِ حیدری، ص ۲۰۹).

ٹیپو سلطان جس سلطنت کا مالک بنا وہ (شمال

میں) دریاے کرشنا سے (جنوب میں) ریاست ٹراونکور اور ضلع تناولی تک پھیلی ہوئی تھی ۔ مشرق میں مشرقی گھاٹ اس کی حد تھی اور مغرب میں اس کا دامن سمندر کو بوسہ دے رہا تھا ۔ یقیناً یہ بہت بڑی اور شاندار سلطنت تھی ۔ پھر آبادی، زرخیزی اور حسن انتظام کے علاوہ قدرتی دولت کی فراوانی کے اعتبار سے بھی اس کا پایہ بہت بلند تھا، لیکن اس کے ساتھ رزم و پیکار کا بھی ایک لامتناہی سلسلہ چلا آ رہا تھا ۔ نظام اور مرہٹے اسے کھا جانے کے درپے تھے ۔ انگریز اسے ہندوستان پر اقتدار کامل میں سب سے بڑی، بلکہ واحد، رکاوٹ سمجھتے تھے ۔ اس کی گراں قدر ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے خاص عزم و حوصلہ کے فرمانروا کی ضرورت تھی، جو تمام خطروں کا مقابلہ تنہا کر سکتا ۔ ٹیپو سلطان شہزادگی کے زمانے میں ان جوہروں کے ثبوت پے در پے پیش کر چکا تھا اور سترہ سال کی مدت حکومت میں بھی اس کے عزم و حوصلہ کو کوئی قوت شکست نہ دے سکی، یہاں تک کہ خون شہادت سے ان پر دائمی مہر لگ گئی.

سب سے پہلے وہی جنگ خاص اہتمامات کی محتاج تھی جس کے دوران میں حیدر علی خان نے وفات پائی تھی اور جس کا محاذ کارومنڈل سے ملیبار تک پھیلا ہوا تھا ۔ سلطان نے عنان حکومت سنبھالتے ہی فوج کی بقایا تنخواہ ادا کر دی اور اعلان کر دیا کہ آئندہ ہر فرد کو تیس روز کے بعد باقاعدہ تنخواہ ملتی رہے گی ۔ ایک فرانسیسی افسر کو بےقاعدہ فوج نئے نمونے پر مرتب کرنے کا حکم دیا ۔ توپ خانے کی تنظیم نو بھی اس کے ذمے لگا دی ۔ رسد کی قیمتیں بطور خود مقرر کرنے کا پرانا دستور منسوخ کر دیا ۔ اس سے فوج کو رسد بافراط ملنے لگی (*Military Consultations*، جلد ۸۵ اے : ص ۲۸) ۔ اسیران جنگ سے نرمی کے برتاؤ کی تاکید کر دی.

عام روایت کے مطابق اس وقت سرنگاپٹم کے خزانے میں جواہرات اور دوسری قیمتی جنسوں کے علاوہ تین کروڑ روپے جمع تھے (ولکس Wilks، ۲ : ۱۷۲) ۔ بدنور Bednur کا خزانہ اس کے علاوہ تھا، جسے آیاز خان اور میتھیوز Matthews نے تباہ کیا.

اٹھاسی ہزار باقاعدہ فوج تھی ۔ صوبائی اور قلعہ نشین فوجیں اس کے علاوہ تھیں (وہی کتاب، ۲ : ۱۷۲).

انگریزوں ہی کو نہیں بلکہ میسور کے تمام دشمنوں کو یقین تھا کہ حیدر علی خان کی وفات پر افراتفری مچے گی اور اس میں مختلف علاقے بہ آسانی ہاتھ آ جائیں گے ۔ کچھ سازشیں ہوئیں بھی، مگر مستعدی سے دبا دی گئیں اور حیدر علی خان کے قائم کردہ نظم و نسق کی پختگی اور ٹیپو سلطان کی مستعدی دیکھ کر سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی.

مشرقی محاذ پر انگریز جرنیل نے نقل و حرکت شروع کی تو سلطان خود فوج لے کر مقابلے کے لیے نکلا ۔ انگریز جرنیل دو اہم مقامات چھوڑ کر پس پا ہو گیا (محب الحسن خان، ص ۳۰ از روی حکم نامہ)، سلطان اس پس پائی سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ اسے مشرقی محاذ چھوڑ کر دفعۃً مغربی محاذ پر جانا پڑا.

حکومت بمبئی نے جنرل میتھیوز Matthews کی سرکردگی میں از سر نو ملیبار پر حملہ کر دیا تھا اور میتھیوز اس وجہ سے بہ سہولت کامیاب ہوا کہ بدنور کے حاکم آیاز خان نے (جو نو مسلم اور حیدر علی خان کا پروردہ تھا) نہ صرف شہر و قلعہ بلکہ پورا صوبۂ بدنور اس شرط پر انگریزوں

کے حوالے کر دیا کہ اس کی حکومت بدستور اسی کی تحویل میں رکھی جائے - وہاں بہت سی دولت جمع تھی ، نیز قیمتی چیزوں کے ذخیرے تھے - یہ پوری دولت افسروں نے باہم بانٹ لی اور کمپنی کو اس میں سے کچھ نہ ملا (*Secret Proceedings*، ۱۲ مئی ، نیز ۲۶ مئی ۱۷۸۳ء) .

سلطان نے لطف علی بیگ کو دفاع کی غرض سے بھیجا - اس وقت تک انگریز ایاز خان سے سمجھوتے کے مطابق بڑے علاقے پر قابض ہو چکے تھے - لطف علی بیگ نے باقی علاقے کو بچانے کی کوشش کی، چنانچہ اننت پور کے قلعدار نے حوالگی سے انکار کر دیا - انگریزوں نے فتح کے بعد وہاں نہایت خوفناک مظالم توڑے (مِل J. Mill : *Hist. of British India*، ص۱۸۸؛ سکرّی Scurry : *The Captivity, etc.*، ص ۹۸؛ *Authentic Memoirs of Tipu Sultan*، ص ۳۴).

سلطان تک یہ خبریں پہنچیں تو وہ طوفان کی طرح ملیبار پہنچا - مختلف قلعوں پر قبضہ کیا - دروں پر پہرے بٹھائے اور سمندر سے انگریزی فوج کا سلسلۂ ربط کاٹ دیا (*Secret Proceedings*، ۲۳ جولائی ۱۷۸۳ء) - ایک ہی ہلّے میں بِدْنُور شہر لے لیا - قلعے کا محاصرہ کر لیا اور تیرہ مختلف مقامات پر توپیں نصب کر کے گولہ باری شروع کر دی - ناکہ بندی نے چند ہی روز میں محصورین کو دردناک صورت حال پر پہنچا دیا (دیکھیے، وِلْکْس، ۲ : ۲۱۲؛ *Secret Proceedings*، ۲۳ جون ۱۷۸۳ء) - رسد، پانی اور گولہ، بارود کی کمی تھی ہی ، گولہ باری سے سب عمارتیں ڈھے گئیں - بیماروں اور زخمیوں کے لیے بھی کوئی سایہ دار جگہ باقی نہ رہی (شین Sheen کا خط، *Sheen's Letter in Narrative of Captain Oakes* ص ۸۳ ببعد) - آخر انگریزی فوج نے ہتھیار ڈال دیے - سلطان نے فوج کے لیے خوراک، رسد، نیز زخمیوں اور بیماروں کے لیے موزوں سواری کے انتظام کا وعدہ فرما لیا تھا - سب کو ذاتی روپیہ بھی ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن میتھیوز Matthews نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ جتنا روپیہ اٹھا سکتے ہو اٹھا لو، چنانچہ افسروں اور سپاہیوں میں سے بعض نے ایک ایک ہزار بعض نے دو دو ہزار پگوڈا (جنوبی ہند کا سونے کا سکّہ) اٹھا لیے، حالانکہ یہ روپیہ خود شین Sheen کی شہادت کے مطابق سرکاری تھا - جب انگریز فوجیوں کی تلاشی لی گئی تو ان سے چالیس ہزار پگوڈا برآمد ہوے (شین Sheen کا خط، ص ۸۸) - تاریخ سلطنتِ خداداد کا بیان ہے کہ جواہرات اور روپے بھیڑ بکری کے جبڑوں، ڈبل روٹیوں اور اعضاے مخصوصہ میں چھپا رکھے تھے (ص ۱۲) - معاہدے کی خلاف ورزی محض اتنی نہ تھی بلکہ انگریزوں نے سرکاری ذخیرے لوٹے اور دفتر جلائے (*Military Sundry Book*، ۱۷۸۴ء، ۶۱ : ۸۸۵ تا ۸۹۴).

بِدْنُور سے ٹیپو سلطان بنگلور پہنچا، جہاں انگریزی فوج کا سالار کیمْبِل Campbell موجود تھا، وہ قلعہ بند ہو گیا - ۲۰ مئی سے قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا - اس اثنا میں یورپ سے خبریں آ گئیں کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان (ریاستہاے امریکہ کی جنگی آزادی کے سلسلے میں) جو لڑائی چھڑ گئی تھی اس میں صلح ہو گئی ہے - چنانچہ فرانس کے تمام فوجی سلطان سے الگ ہو گئے - ۲ اگست ۱۷۸۳ء کو محصورین و محاصرین نے متارکہ پر دستخط کر دیے.

سلطان ملیبار میں مصروف تھا - حکومتِ مدراس نے ایک مجہول شخص کو نواب کڑپہ Cuddapah بنا کر ہنگامہ بپا کر دیا - میر قمر الدین خان نے اسے بھی شکست دی اور جو

انگریزی فوج اس کی امداد کے لیے جا رہی تھی اسے بھی مار بھگایا ۔ پھر انگریزوں نے میسور پر حملہ کیا ۔ سرنگاپٹم میں راجا کو گدی پر بٹھانے کے لیے سازش کرائی گئی ۔ ان میں سے کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی ۔ آخر متارکہ ہوا، جس کی خلاف ورزی انگریزوں نے کئی مرتبہ کی، تا آنکہ ۱۱ مارچ ۱۷۸۴ء کو معاہدے پر دستخط ہو گئے ۔ اس کے مطابق فریقین نے مفتوحہ علاقے واپس کر دیے ۔ اسیرانِ جنگ چھوڑ دیے ۔ خود ایک ذمے دار انگریز لارڈ میکارٹنی Macartney نے اعتراف کیا کہ ہمارے لیے صلح ضروری تھی، کیونکہ جنگ چند ماہ اور باقی رہتی تو ہم اپنے مصارف کے بوجھ سے دب کر ڈوب جاتے (*Secret Proceedings*، ۲۳ نومبر ۱۷۸۴ء).

ادھر انگریزوں سے جنگ ختم ہوئی اُدھر مرہٹوں کے مشہور مدبّر نانا فرنویس نے میسور پر حملے کے لیے نظام سے ساز باز شروع کر دی ۔ سلطان نے نانا کو لکھا کہ آپ کو میرے خلاف لڑنے کے بجائے انگریزوں سے جنگ شروع کرنی چاہیے ۔ نظام سے کہا کہ آپ پر تو میری امداد واجب ہے، کیونکہ میں مسلمانوں کو تقویت پہنچا رہا ہوں ۔ سلطان کی باتوں پر کسی نے کان نہ دھرا ۔ نظام اور مرہٹوں کے درمیان اتّفاق ہو گیا کہ حیدر علی خان کے تصرّفات سے پیشتر جتنا علاقہ میسور کا تھا اسے چھوڑ کر باقی سب کا سب متّفقہ حملے سے چھین لیا جائے اور بہ حصّۂ برابر تقسیم کر لیا جائے (محبّ الحسن خان، ص ۹۳ از روی حدیقۃ العالم) ۔ نظام کا ایک مطالبہ مرہٹوں سے یہ تھا کہ بیجاپور اور احمدنگر اُسے واپس دیے جائیں ۔ اس مطالبے کو مرہٹے کب منظور کر سکتے تھے ۔ تاہم نظام نے ٹیپو سلطان کے بجائے مرہٹوں کا ساتھ دیا ۔ سلطان نے اس لڑائی کو روکنے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا، کیونکہ یہ ملکی قوّت کے لیے سراسر نقصان رساں اور صرف انگریزوں کے لیے فائدہ‌مند تھی، لیکن نہ نانا فرنویس پر کچھ اثر ہوا اور نہ نظام پر ۔ جب سلطان کے علاقے پر حملہ ہو گیا تو وہ بھی فوج لے کر مقابلے کے لیے نکل پڑا اور اَدھونی Adoni کی طرف پیش قدمی کی، جس پر مہابت جنگ (برادر زادہ و دامادِ نظام) حاکم تھا ۔ مہابت جنگ نے اپنے دیوان کو سلطان کے پاس بھیجا ۔ سلطان نے کہا کہ مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں ۔ نظام خواہ مخواہ آمادۂ جنگ ہوا ہے اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر اسلامی مملکت کو پامال کر رہا ہے ۔ مسلمانوں اور غریبوں کے مکان، مسجدیں اور عبادت‌گاہیں نذرِ آتش کی جا رہی ہیں (نشانِ حیدری، ۳۰۱ ببعد).

سلطان کو یقین تھا کہ اَدھونی پر حملہ ہوتے ہی نظام اور مرہٹے سب کچھ چھوڑ کر اس کے بچاؤ کے لیے دوڑیں گے ۔ یہی ہوا ۔ اتّحادیوں کی بڑی فوج اَدھونی کی طرف بڑھی تو سلطان نے یہ مقام چھوڑ دیا ۔ اتّحادیوں نے خود یہی مناسب سمجھا کہ مہابت جنگ کے اھل و عیال کو وہاں سے ھٹا لیں ۔ چنانچہ وہ اَدھونی کو خالی کر گئے اور سلطان دوبارہ اس پر قابض ہو گیا .

پھر سلطان نے دریاے تُنگ بھدرا کو طغیانی کے عالم میں عبور کیا اور دھاڑواڑ میں مرہٹوں پر کئی مرتبہ چھاپے مارے ۔ اس جنگ سے فائدہ اٹھا کر ساونور کا نواب بھی مرہٹوں سے مل گیا تھا، حالانکہ ٹیپو سلطان کے بھائی عبدالکریم کی شادی اس کے ہاں ہوئی تھی اور اس کے ذمّے سرکار میسور کا روپیہ تھا ۔ آخر فروری ۱۷۸۷ء میں متارکے پر دستخط ہو گئے ۔ پھر صلح نامے میں سلطان نے اپنے کچھ علاقے چھوڑ دیے اور کچھ نئے علاقے لے لیے، نیز مرہٹوں اور نظام کے ساتھ دفاعی اور

جارحانہ اتّحاد کر لیا ۔ سلطان چاھتا تو زیادہ کڑی شرطیں بھی منوا سکتا تھا، مگر اس کا مقصد یہ تھا کہ ان دونوں ھمسایوں سے، جو وسیع قوّت کے مالک تھے، تعلّقات مستحکم ھو جائیں تاکہ انگریزوں کے مقابلے میں ساتھ دے سکیں یا کم از کم انگریزوں کا ساتھ نہ دیں ۔ اس وقت انگریز گورنر جنرل لارڈ کارنوالس Cornwallis سلطان کے خلاف سیاسی جوڑ اور جنگی تیّاریاں شروع کر چکا تھا ۔ صلح کے بعد ٹیپو سلطان نے ان پالیگاروں کی گوشمالی کی جو جنگ کے موقع پر حاضر نہیں ھوے تھے یا معلوم ھو چکا تھا کہ انھوں نے غنیم سے خفیہ خفیہ سلسلۂ ربط قائم کر لیا تھا ۔

سلطان نے اسی زمانے میں بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور خطبے میں مغل بادشاہ کی جگہ اپنا نام داخل کیا (تاریخ ٹیپو سلطان، نیز ولکس Wilks، ۲ : ۲۹۳) ۔ نیا روپیہ جاری کیا، جسے ''امامی'' کہتے تھے ۔ ھر شہر، قصبے اور قلعے سے ایک ایک فرسنگ پر مضبوط خاربندی کا انتظام کر دیا، جس میں آنے جانے کے چار دروازے رکھے اور ان پر پہرے بٹھا دیے ۔ سرنگاپٹم میں ''مسجد اعلٰی'' کی تعمیر ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء میں شروع ھوئی تھی ۔ اس مقام پر پہلے ایک معمولی بت خانہ تھا ۔ سلطان نے اس کے متولّیوں کو روپیہ دے کر جگہ خریدی اور علی عادل شاہ بیجاپور کی مسجد کے مطابق مسجد بنوائی ۔ ۱۲۰۴ھ کی نماز عیدالفطر (۱۴ جون ۱۷۹۰ء) اسی مسجد میں ادا کی ۔ ''سنۂ ھجری'' کی جگہ ''سنۂ محمّدی'' جاری کیا، جو آغاز نبوّت سے شروع ھوتا تھا (نشانِ حیدری، ص ۳۲۶ ببعد) ۔ مہینوں کے نئے نام رکھے ۔

۱۷۸۴ء میں سلطان نے عثمان خان کو سفیر بنا کر قسطنطنیۃ بھیجا تھا ۔ وھاں سے امید افزا جواب آیا تو غلام علی خان، شاہ نور اللہ، لطف علی بیگ اور محمّد حنیف کو بھیجا اور حکم دیا کہ یہ سفارت قسطنطنیۃ سے فارغ ھو کر فرانس اور انگلستان جائے (ولکس Wilks، ۲ : ۳۶۱)؛ لیکن یہ سفارت قسطنطنیۃ ھی سے لوٹ آئی ۔ اس کے ذمّے مختلف کام تھے، مثلاً فوجی اعانت، تجارت کی توسیع، ماھرینِ فن کا حصول، تاکہ اپنے ملک میں اعلٰی پیمانے پر صنعت و حرفت جاری کی جا سکے ۔ ایک غرض یہ بھی تھی کہ عثمانی سلطان سے، جو خلیفۃ المسلمین تھا، اپنی بادشاھی کے لیے پروانۂ تصدیق حاصل کیا جائے ۔ پروانہ مل گیا تو سلطان نے سونے اور جواھرات سے شیر نما تخت تیار کرایا (نشانِ حیدری، ۳۲۸)، نیز توپ، بندوق، چاقو، گھڑی وغیرہ کے کارخانے جاری کیے ۔ اسلحہ کے کارخانے کا نام تارا منڈل رکھا اور یہ کارخانے چار مقامات پر قائم ھوے : سرنگاپٹم، بنگلور، چیتل درگ اور نگر (نشانِ حیدری، ۳۲۸) ۔ اس سفارت کے لیے سلطان نے اپنے چار جہاز مقرّر کر دیے تھے، جو بصرے پہنچے، وھاں سے کچھ سفر کشتیوں پر طے کیا، کچھ سواریوں پر ۔ عین اس زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی، نیز قسطنطنیۃ میں طاعون پھوٹ پڑا تھا، اس لیے سفارت وھاں سے اسکندریۃ، قاھرۃ اور حرمین شریفین ھوتی ھوئی واپس آ گئی ۔ اسی طرح کریم خان زند، حاکمِ ایران، زمان شاہ درّانی فرمانروا ے افغانستان اور شاہِ فرانس کے پاس سفارتیں بھیجی گئیں ۔

انگریزوں کی حالت عجیب تھی ۔ وہ کسی ایک پالیسی پر کاربند نہ تھے ۔ انھوں نے مختلف مقامی حاکموں سے متناقض معاھدے کر رکھے تھے ۔ جب ضرورت سمجھتے معاھدے کا مفہوم بدل لیتے، مثلاً ٹیپو سلطان کے ساتھ ۱۷۸۴ء کے معاھدے میں اقرار کیا تھا کہ سلطان کے دشمنوں کو بالواسطہ یا بلا واسطہ کوئی مدد نہ دیں گے، مگر جب مرھٹوں اور نظام نے سلطان

کے خلاف جنگ شروع کی اور نانا فرنویس نے انگریزوں سے امداد کا تقاضا کیا تو قائم مقام گورنر جنرل پانچ پانچ بٹالین دونوں کے علاقوں کی حفاظت کے لیے بھیجنے پر آمادہ ہو گیا (*Secret Proceedings*، ۱۴ فروری ۱۷۸۶ء) ۔ یہ ٹیپو سلطان کے ساتھ معاہدے کی صریح خلاف ورزی تھی ۔ حکومتِ انگلستان نے اس کی منظوری نہ دی ۔ وہ چاہتی تھی کہ کمپنی بالکل غیرجانبدار رہے اور صرف اس وقت عملی قدم اٹھائے جب فرانسیسی کسی ایک فریق کے طرفدار بن جائیں (*Secret Proceedings*، ۲۱ جولائی ۱۷۸۶ء) ۔ لارڈ کارنوالس مستقل گورنر جنرل بن کر آیا تو اسے بھی یہی ہدایت دی گئی تھی، چنانچہ اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے ہی اس نے قائم مقام گورنر جنرل کے وعدے منسوخ قرار دیے ۔ البتہ مرہٹوں اور نظام کو یہ یقین دلا دیا کہ فرانسیسیوں نے سلطان کو کسی قسم کی مدد دی تو انگریز ضرور حقِ اعانت ادا کریں گے (*Poona Residency Correspondence*، ۲۶ فروری ۱۷۸۷ء) ۔

یہاں کے حالات دیکھ کر کارنوالس کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر ہندوستان میں انگریزی قوت کو برتر بنانا منظور ہے تو ٹیپو سلطان سے لڑے بغیر چارہ نہیں، کیونکہ تمام ملکی قوتوں میں سے صرف سلطان کی قوت مستحکم و ترقی پذیر تھی ؛ چنانچہ کارنوالس نے ایک طرف فوجی تیاریاں شروع کر دیں، دوسری طرف نظام اور مرہٹوں کو ساتھ ملانے کے لیے گفت و شنید جاری کر دی ۔ سلطان نے بھی مرہٹوں اور نظام سے رابطہ استوار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ مرہٹوں سے تو خیر کی توقع ہی نہ تھی، مگر نظام سے موافقت کی امید خاصی خوشگوار تھی ۔ خصوصاً اس لیے کہ شمس الامراء رئیس پایگاہ سلطان سے معاہدے کا زبردست حامی تھا ۔ اس کے برعکس میر عالم انگریزوں کا خاص آدمی تھا اور وہ ہر معاملے میں انھیں کی طرفداری کرتا تھا ۔ ۱۱ جنوری ۱۷۹۰ء کو شمس الامراء نے وفات پائی (حدیقۃ العالم، ص ۳۷۹)، اس طرح میر عالم کے لیے من مانی کارروائیوں کا دروازہ کھل گیا اور ٹیپو سلطان سے موافقت کا مطلعِ امید تاریک ہو گیا.

نظام اور مرہٹوں سے انگریزوں کی گفتگو جاری ہی تھی کہ ٹراونکور کا واقعہ پیش آ گیا ۔ ٹراونکور کے راجا نے انگریزوں سے دوستی کا معاهدہ کر کے سلطنتِ میسور کے خلاف سرگرمیاں جاری کر رکھی تھیں، مثلاً ملیبار کے قدیم رؤساء کو، جو سلطنتِ میسور کے باجگزار تھے، شہ دے کر بغاوت پر ابھارا جاتا اور انھیں اپنے ہاں پناہ دے دی جاتی ۔ ۱۷۷۸ء میں انگریزی فوج نے ٹراونکور ہی میں سے گزر کر ماہی پر قبضہ کیا تھا، جو حیدر علی خان کی حفاظت میں تھا ۔ ۱۷۸۸ء میں راجا نے انگریزی فوج کے دو دستے منگوا لیے اور وہ مخالفانہ سرگرمیوں میں اور بھی بےباک ہو گیا (محبّ الحسن خان، ص ۱۰۴)، یہاں تک کہ مدراس کے گورنر سے کہا ملیبار کے رؤساء کو مدد دے کر ٹیپو سلطان کی محکومی سے آزاد کرایا جائے (*Military .... Correspondence*، جلد ۳۸، نمبر ۵۹) .

پھر ٹراونکور کی شمالی سرحد پر ایک حفاظتی لائن تھی جو رفتہ رفتہ سالہا سال تک بنتی رہی ۔ ٹیپو سلطان جب مرہٹوں اور نظام کی لڑائی سے فارغ ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ اس لائن کا ایک حصہ کوچین کے علاقے میں آ گیا ہے، جو سلطان کے ماتحت تھا، چنانچہ سلطان نے لائن وہاں سے ہٹا لینے کے لیے کہا تو راجا نے جواب دیا کہ یہ زمین کوچین کے راجا سے لے لی گئی تھی اور

لائن پچیس سال پیشتر بن چکی تھی (Madras Records، ۱۸ نومبر ۱۷۸۹ء، جلد ۱۳۳ اے: ص ۵، نیز یکم جنوری ۱۷۹۰ء، جلد ۱۳۳ اے: ص ۵)؛ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں، کیونکہ لائن ۱۷۶۴ء سے ۱۷۷۷ء تک بنتی رہی تھی(Dutch Records، نمبر ۱۳: ص ۵۰) اور اس حالت میں کوچین سے کوئی زمین لینے کا سوال بالکل خارج از بحث تھا ۔ غرض اس بیان میں ٹراونکور نے اعتراف کر لیا تھا کہ لائن کا ایک حصّہ کوچین کی زمین پر بھی ہے ۔ صرف قبضے کا جواز و علاجِ جواز زیرِ بحث تھا.

یہ مسئلہ چل ھی رہا تھا کہ ٹراونکور نے ولندیزوں سے دو قلعے یعنی جیا کوٹہ اور کرنگانُور Cranganur خرید لیے ۔ سلطان بھی ان قلعوں کا خریدار تھا اور پال گھاٹ کی حفاظت کے لیے یہ ضروری تھے ۔ راجا نے مدراس کے گورنر سے قلعوں کی خرید کے متعلّق مشورہ لیا تھا تو اس نے راجا کو خریدنے سے منع کر دیا ۔ پھر ٹراونکور کے انگریز ریزیڈنٹ نے حکومتِ مدراس کو لکھا کہ سلطان کی طرف سے کرنگانُور پر حملے کا خطرہ ھے ۔ گورنر نے صاف صاف جواب دے دیا کہ راجا کو صرف اس صورت میں امداد دی جا سکتی ھے جب ٹراونکور پر حملہ ھو اور موجودہ نازک حالت میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا چاھیے جو سلطان کے لیے حملے کی دستاویز بن جائے (Madras Records، جلد ۱۲۹ سی: ص ۱۳۴۷ ببعد).

راجا نے قلعے خرید لیے ۔ کارنوالس نے اس سودے پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ھوے قلعے ولندیزوں کو واپس کر دینے کے لیے لکھا اور اس معاملے میں انگریز ریزیڈنٹ کے طرزِ عمل کی بھی مذمّت کی(Madras Records، جلد ۱۳۱ بی: ص ۲۶۵۹ تا ۲۶۶۷) ۔ پھر راجا نے یہ کہا کہ مدراس کے سابق گورنر سے اجازت لے لی گئی تھی ۔ جب کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس گورنر سے پوچھا تو اس نے کہا کہ نہ کبھی یہ مسئلہ میرے سامنے پیش ھوا اور نہ میں نے کبھی قلعوں کی خرید کا مشورہ دیا (کابٹ W. Cobbett : Parliamentary History of England، ۲۸ : ۱۲۸۹).

یہ حالات تھے جب سلطان سلطنت کا دَورہ کرتا ھوا ۱۴ دسمبر ۱۷۸۹ء کو ٹراونکور کی دفاعی لائن سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر پہنچا اور اس نے ایک خط راجا کو بھیجا کہ اوّل ملیبار کے جن رئیسوں کو پناہ دے رکھی ھے انھیں حوالے کر دیا جائے ۔ دوم جیا کوٹہ اور کرنگانُور چھوڑ دیے جائیں ۔ سوم دفاعی لائن کا جتنا حصّہ کوچین کی زمین پر ھے اسے ڈھا دیا جائے (Poona Residency Correspondence، جلد سوم، نمبر ۳ : ۵۳) ۔ راجا کا جواب اطمینان بخش نہ تھا ۔ اس اثنا میں سلطان نے کچھ فوج بعض باغیوں کے تعاقب میں بھیج دی جو ٹراونکور کی سرحد سے ملی ھوئی پہاڑیوں اور جنگلوں میں پناہ گزیں تھے ۔ ٹراونکوریوں نے اس فوج پر گولیاں چلائیں، میسوریوں نے جوابی کارروائی کی ۔ بس اتنے سے واقعے کو کچھ کا کچھ بنا لیا گیا، حالانکہ ابتداء میں مدراس کے گورنر کو بھی اعتراف تھا کہ یہ ایک اتّفاقی حادثہ تھا، نیز حملہ سلطان کے حکم سے نہیں ھوا تھا (Political Proceedings، ۲ اپریل ۱۷۹۰ء؛ National Archives of India) ۔ جنرل میڈوز Meadows کی راے میں بھی یہ ایک معمولی معاملہ تھا اور اسے باقاعدہ جنگ نہیں سمجھا جا سکتا تھا(Military Despatches to Court ۲۰ : ۶۹).

اس جھڑپ کے بعد میسوری فوج نے کوئی قدم نہ اٹھایا ۔ جولائی ۱۷۹۰ء میں مدراس کے گورنر نے کارنوالس کی ھدایت کے مطابق سلطان کو لکھا کہ جھگڑے کے تصفیے کے لیے کمشنر مقرّر کر دیے

جائیں۔ سلطان نے اتفاق کیا اور کہا کہ بہتر ہے۔ کمشنر میرے پاس بھیج دیے جائیں (Military Country Correspondence، ۲۲ فروری ۱۷۹۰ء، نمبر ۵۹، جلد ۳۹: ص ۱۲۵ ببعد)۔ گورنر نے یہ بات مان لی، مگر چند روز بعد میڈوز Meadows گورنر بن گیا۔ اس کی رائے تھی کہ کمشنر ٹیپو سلطان کے پاس بھیجے جائیں گے تو کمپنی کی وقعت کم ہو جائے گی (Political Proceedings، ۱۷ مارچ ۱۷۹۰ء)۔ جب سلطان نے خود وکیل بھیجنے چاہے تو جواب دے دیا گیا کہ اب گفت و شنید نہیں ہو سکتی اور صلح چاہتے ہو تو تاوان ادا کرو۔

اس اثنا میں ٹراونکوری فوج دو مرتبہ (مارچ ۱۷۹۰ء اور اپریل ۱۷۹۰ء) میسوری علاقے پر حملے کر چکی تھی اور دونوں مرتبہ ذلت خیز شکست کھا کر لوٹی تھی (میکنزی Mackenzie، ۱: ۲۹ تا ۳۱)۔ آخر سلطان نے تنگ آ کر ۱۲ اپریل ۱۷۹۰ء سے دفاعی لائن پر گولہ باری شروع کر دی۔

انگریزوں کی روش یکایک اس لیے بدلی کہ مرہٹوں اور نظام سے ساز باز ہو چکی تھی اور وقت کی یہ بڑی طاقتیں متحد ہو کر سلطنت خداداد پر حملے کا عزم کر چکی تھیں۔ کارنوالس اپنی خوشی کو چھپا نہ سکا اور اس نے مدراس کے گورنر میڈوز Meadows کو لکھا کہ اس وقت ہمیں ملکی طاقتوں سے امداد کی یقیناً امید ہے اور اسے (سلطان کو) فرانس سے کسی اعانت کی امید نہیں ہو سکتی (Political Proceedings، ۱ مارچ ۱۷۹۰ء)۔ یہ حالات تفصیل سے بیان کیے بغیر تیسری جنگِ میسور کی حقیقی کیفیت واضح نہیں ہو سکتی تھی۔

تین طاقتوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کا مفاد یہ تھا کہ کڑپہ نظام کو ملے؛ پیشوا کے تمام علاقے اس کے حوالے ہوں؛ یہ تمام زمیندار اور پالیگار بحال کیے جائیں؛ ان کی بحالی کا نذرانہ نیز ٹیپو سلطان کا علاقہ خالصہ تینوں فریقوں میں بحصۂ مساوی تقسیم ہو (*Secret Proceedings*)۔

اس سلسلے میں نانا فرنویس کا یہ ''کارنامہ'' درخورِ فراموشی نہیں کہ وہ ادھر انگریزوں سے معاہدے کا فیصلہ کر چکا تھا، ادھر سلطان کے وکیلوں کو چکمہ دیتا رہا کہ میں انگریزوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس طرح ان سے پندرہ لاکھ روپے وصول کر لیے تو کہا کہ بس اب رخصت ہو جاؤ (*Poona Residency Records*، ۱۴۰، ۱۴۷)۔

بہر حال ٹراونکور کا معمولی سا واقعہ تیسری جنگِ میسور کا سبب بنا۔ یقیناً یہ جنگ ٹراونکور کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ کمپنی کے علاقے کی توسیع کے لیے ہوئی تھی۔ اس کے تین دور ہیں:

۱۔ پہلے دور میں مدراس کے گورنر جنرل میڈوز Meadows نے فوج کی کمان سنبھالی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ کوئمبٹور پر قبضہ کر کے اسے مرکز بنائے اور جنوبی سمت سے میسور پر حملہ کرے۔ سلطان نے زبردست مزاحمت کی۔ کئی مقامات پر انگریزوں کو شکستیں دیں۔ مئی سے دسمبر (۱۷۹۰ء) تک انگریزی منصوبہ ناکام رہا۔ اس دور پر خود کارنوالس کا تبصرہ یہ تھا کہ ہم نے وقت ضائع کیا اور غنیم نے شہرت حاصل کر لی۔ جنگ میں یہ دونوں چیزیں حد درجہ بیش قیمت ہیں (راس C. Ross: *Correspondence of Charles, First Marquis of Cornwallis*، لنڈن ۱۸۵۹ء، ۲: ۵۱)۔

۲۔ پھر کارنوالس نے خود فروری ۱۷۹۱ء میں فوج کی کمان سنبھال لی۔ وہ سیدھا بنگلور پر بڑھا۔ سلطانی فوج کاٹھے کاٹھے انگریزی فوج پر چھاپے مارتی رہی مگر اسے روک نہ سکی۔ کارنوالس نے شہر کو لوٹا۔ قلعہ لے لیا۔ یہاں سے بہت سا سامانِ جنگ ہاتھ آیا۔ پھر وہ نظام کی فوج کے ساتھ اتصال کی غرض سے چوراسی میل شمال کی جانب چلا گیا۔

دونوں فوجوں نے مل کر مئی ۱۷۹۱ء میں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا - مرہٹے اس وقت تک نہیں پہنچے تھے - موسم مویشیوں کے لیے ناسوافق تھا - ان میں بیماری پھیل گئی اور بیل بکثرت مرنے لگے - نیچے کے طبقے کے لوگ مردہ بیلوں کا سڑا ہوا گوشت کھاتے تھے، کیونکہ رسد کی قلت تھی - پھر کیمپ میں چیچک پھوٹ پڑی (ڈائروم Dirom، ص ۲) - آخر محاصرہ چھوڑنے کا فیصلہ ہو گیا - جہاں اتحادی فوج چھے روز ٹھیری تھی وہاں میلوں میں گھوڑوں اور بیلوں کی لاشیں پڑی تھیں - جو سامان ساتھ نہ لے جایا جا سکا اسے نذرِ آتش کر دیا گیا (Dirom، ص ۳ و ۴) .

۳ - اب لڑائی کا تیسرا دور شروع ہوا - کارنوالس تھوڑی ھی دور گیا تھا کہ مرہٹے آ گئے اور وہ بہ اصرار پوری فوج کو واپس لائے - ان کے ساتھ رسد کے وسیع ذخیرے تھے اور انھوں نے اتحادیوں کی ضرورت سے فائدہ اٹھا کر بھاری رقمیں وصول کیں - فروری ۱۷۹۲ء میں دوبارہ سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا گیا - آخر مصالحت کی گفتگو شروع ھو گئی اور ردّ و کد کے بعد قرار پایا کہ :

(الف)- سلطان نصف سلطنت اتحادیوں کے حوالے کر دے -

(ب) - تین کروڑ تیس لاکھ تاوان دے - اس میں سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ کی رقم فی‌الفور ادا کر دی جائے اور باقی رقم چار چار مہینے کی تین قسطوں میں دی جائے -

(ج)- تمام اسیرانِ جنگ رہا کر دیے جائیں -

(د)- معاھدے کی شرطیں پوری ھونے تک سلطان کے دو بیٹے بطورِ یرغمال اتحادیوں کے پاس رھیں .

اس سلسلے کا ایک عبرت انگیز واقعہ یہ ھے کہ نظام کا نمائندہ مشیر الملک کہتا تھا، سلطان کے پاس صرف ایک کروڑ کے مالیے کا ملک چھوڑا جائے باقی سب لے لیا جائے - اور پندرہ کروڑ روپے تاوان وصول کیا جائے، حالانکہ اسے علم تھا کہ ملک اور روپے میں سے دو تہائی انگریزوں اور مرھٹوں کے حوالے ھوگا - کارنوالس اور ہری‌پنت (مرھٹے سالار) کو بھی کہنا پڑا کہ یہ شرطیں سخت ھیں (*Military Sundries*، ۱۰۶ : ۶ تا ۱۱؛ نیز پارسنس کی اتہاس، سنگراھہ، ہری‌پنت کا خط نانا فرنویس کے نام، مرقوم ۲۵ فروری ۱۷۹۲ء) .

سلطان کی پوری سلطنت کے مالیے کا اندازہ دو کروڑ سینتیس لاکھ روپے کیا گیا تھا اور جو علاقہ اتحادیوں کے حوالے ہوا وہ تخمیناً ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ پچاس ہزار دو سو چورانوے روپے سالیہ کا تھا (محبّ الحسن خاں، ۲۶۹)، لیکن بعض انگریز اس صلح پر بھی مطمئن نہ تھے - مثلاً میڈوز، جو شرطوں کی نرمی سے اتنا رنجیدہ ھوا کہ خود کشی کی کوشش کی (محبّ الحسن خاں، ص ۲۶۹)- منرو Hector Munro نے کہا : ”جب تک اس کی (سلطان کی) قوّت خلل سے محفوظ رھے گی صرف یہی نہیں کہ ھم اپنے مقبوضات کو وسعت نہ دے سکیں گے بلکہ جو کچھ قبضے میں آ چکا ھے وہ بھی چھن جانے کے خطرے میں برابر مبتلا رھیں گے - پھر جب موقع حاصل ھے تو کیوں اس خطرناک دشمن سے نجات حاصل نہ کر لیں ؟ اگر اس کا نظام درھم برھم نہ کر دیا گیا تو ممکن ھے کل اسے والیِ حیدر آباد کا کوئی جانشین یا کوئی اور مسلمان فرمانروا اختیار کر لے جو آئندہ دکن میں اقتدار حاصل کر لے گا - اگر اس نظام کو ایک مرتبہ تباہ کر دیا گیا تو پھر اس کے دوبارہ قائم ھونے کا کوئی خطرہ نہیں (Gleig : *The life of Sir Thomas Munro*، ۱ : ۱۲۳ ببعد) .

خود کارنوالس بھی سلطان پر مہربان نہ تھا -
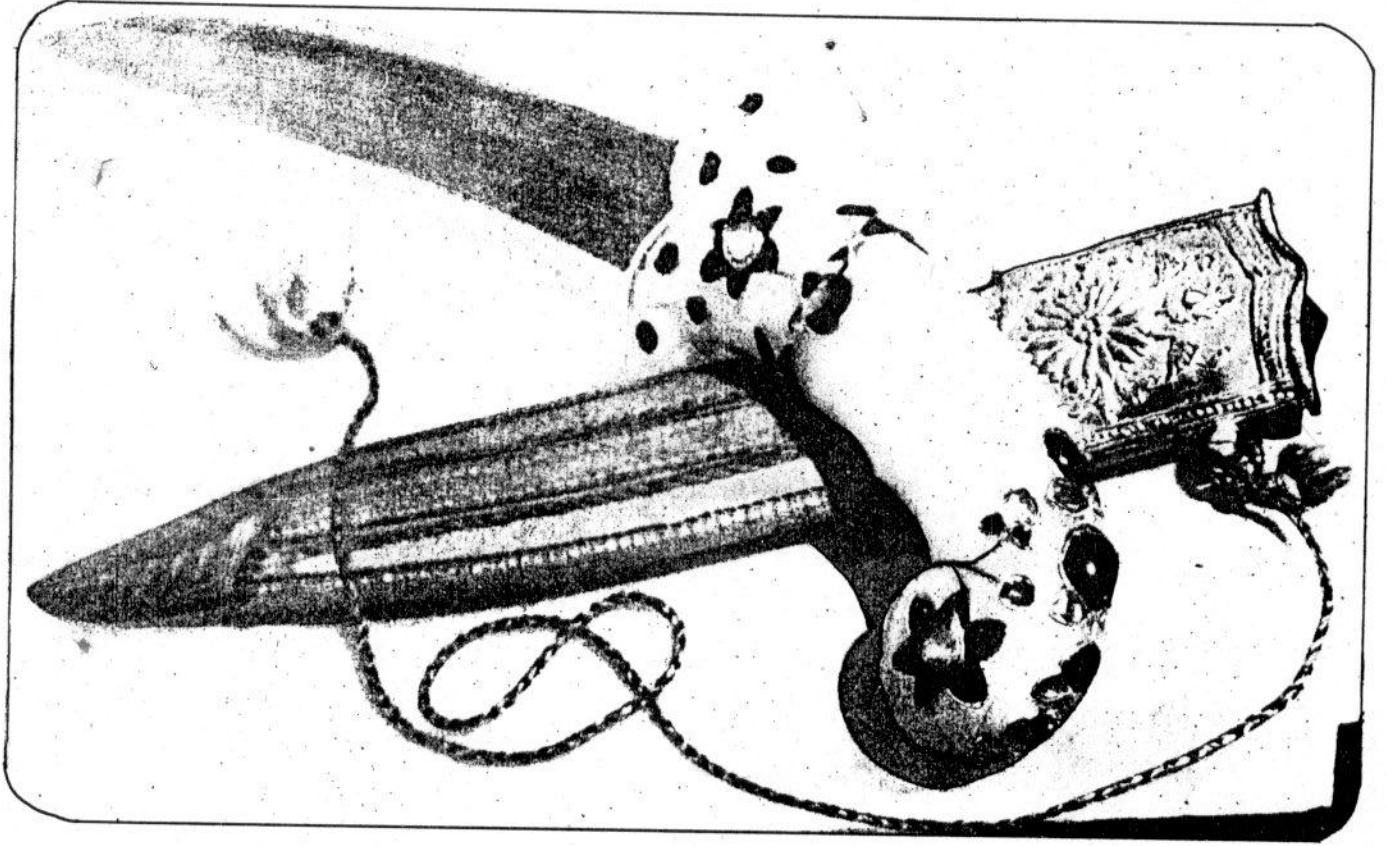
ٹیپو سلطان نے یہ پیش قبض (جس کی نسبت گمان ہے کہ اسے شہنشاہ جہانگیر بن اکبر نے بھی استعمال کیا تھا) دیگر تحائف کے همراہ اپنے ماموں زاد بھائی میر محمود علی خان کے ہاتھ نیپولین بونا پارٹ کو بھیجا تھا، مگر دورانِ سفر میں انگریزوں کے حملہ‌آور ہونے کے باعث میر محمود علی خان کو وطن واپس آنا پڑا - اب یہ پیش قبض ٹیپو سلطان کے خاندان کے ایک رکن اقبال علی خان کے قبضے میں ہے (یہ عکس میر محمد باسط علی خان بیرسٹر ایٹ لاء حیدر آباد دکن نے بھیجا).

اسے یہ خطرہ تھا کہ پوری سلطنت لے لینے کے بعد اتحادیوں میں تقسیم کے متعلق خوفناک جھگڑے پیدا ہو جائیں گے Gleig : کتاب مذکور، ۱ : ۱۳۱).

نصف ملک دے دینے سے سلطان پر سیاسی، اقتصادی اور انتظامی اعتبار سے سخت ضرب لگی تھی مگر وہ مستعدی سے اصلاح احوال میں مصروف ہو گیا ۔ خود ویلزلی Wellesley کے اعتراف کے مطابق اس نے تاوان کا بقایا باقاعدگی سے ادا کیا، شکست سے افسردہ خاطر نہ ہوا، بلکہ جنگ کے نقصانات کی تلافی میں لگ گیا ۔ رسالے اور پیادہ فوج کو درست کیا، پائے تخت کے استحکامات مکمل کیے ۔ سرکشوں کو سزا دی ۔ زراعت کی حوصلہ افزائی کی اور ملک کی سابقہ خوشحالی بحال کر دی (ویلزلی کے ڈسپیچز، ۱ : ۶۶۹).

سلطان کی یہی مستعدی، اولوالعزمی اور سخت ناخوشگوار حالات کے مقابلے میں انتہائی حوصلہ مندی انگریزی حکومت کے لیے اضطراب افزا تھی ۔ معاہدۂ سرنگاپٹم پر چھے سال گزر گئے تھے کہ مارکوئیس ویلزلی گورنر جنرل مقرر ہو کر آیا ۔ جس کے نزدیک ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کی توسیع کے لیے سازگار وقت آ گیا تھا (فلپس Philips : *East India Company* ، ۱۰۳) ۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ سلطان کی تمام سرگرمیاں بدستور جاری تھیں ۔ اس کے پاس بندرگاهیں تھیں اور وہ ہر بیرونی طاقت سے براہ راست روابط قائم رکھ سکتا تھا ۔ تجارت، صنعت و حرفت اور فوج کی اصلاح کے لیے بھی فرانسیسیوں کے سوا اور کسی سے امداد لے سکتا تھا. انگریز اس وجه سے بھی پریشان تھے له نپولین مصر فتح لر چکا تھا اور اس نے جو خط ٹیپو سلطان کو لکھے تھے وہ وقت کے شریف مکّہ کے ذریعے سے انگریزوں کے قبضے میں آ گئے تھے (وڈ Appendix B '*War in Mysore*' : Wood).

[میر باسط علی خاں بیرسٹر ایٹ لاء حیدرآباد دکن نے جولائی ۱۹۰۰ء میں ادارۂ دائرۂ معارف اسلامیه اردو کو بونا پارٹ کے ایک دستخطی خط کا ترجمه بھیجا جو بونا پارٹ نے ۲۶ جنوری ۱۷۹۹ء کو قاهرۃ سے ٹیپو سلطان کو بھیجا تھا، ترجمه درج ذیل ھے :

بنام جلیل القدر سلطان، ھمارے عزیز ترین دوست، ٹیپو صاحب

سال ھفتم جمہوریّه، جو متّحد اور ناقابل تقسیم ھے.

ایک لاتعداد اور ناقابل شکست فوج کے ساتھ آپ کو انگلستان کے آهنی پنجے سے نجات دلانے کی خواهش کے ساتھ بحر احمر کے کنارے پر آیا هوں ۔ میں یه معلوم کرنے کا دلی آرزومند هوں که آپ کا سیاسی موقف کیا ھے ۔ میں چاھتا ھوں که آپ اپنے کسی قابل اعتبار آدمی کو سویز جلد روانه کر دیں جس سے گفتگو کر سکوں.

خدا آپ کی طاقت میں اضافه فرمائے اور آپ کے دشمنوں کو تباہ کرے.

(دستخط) بونا پارٹ]

ویلزلی نے هندوستان پہنچتے ھی جنگی تیّاریاں شروع کر دیں، ساتھ ھی مرھٹوں اور نظام سے بھی نامه و پیام جاری ھو گئے ۔ ابتداء میں ویلزلی کی روش سلطان کے متعلق مصالحانه رهی ۔ نظام اور مرھٹوں سے عہد و پیمان ھو گئے تو ایک دم اس نے خطوں میں تہدید آمیز انداز اختیار کر لیا اور ایک سفیر بھیجنے کا فیصله کیا ۔ سلطان اپنی آزادی بحال رکھتے ھوے ھر شرط قبول کرنے پر آمادہ تھا مگر نظام کی طرح فرانسیسی دستے کو توڑ کر اس کی جگه انگریزی فوج قبول کرنے کے لیے تیّار نه تھا ۔ اس اثنا میں ویلزلی نے جنرل ھیرس Harris کو حکم دیا که سلطان سے گفت و شنید ختم کر دی جائے اور میسور پر حمله کر کے سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا جائے ۔ سلطان سفیر سے بات چیت کے لیے تیّار تھا

مگر جواب ملا کہ اب صرف جنرل ہیرس سے بات چیت ہو سکتی ہے ، چنانچہ اچانک میسور پر دو انگریزی فوجیں مشرق و مغرب سے بڑھیں ۔ مرہٹے الگ تھلگ رہے ۔ نظام نے انگریزوں کا ساتھ دیا ۔

ویلزلی نے مصالحت کے دو مسودے ہیرس کے حوالے کیے تھے اور ہدایت کر دی تھی کہ سرنگاپٹم پر گولہ باری سے پیشتر پہلا مسودہ اور گولہ باری کے بعد دوسرا مسودہ سلطان کے سامنے پیش کیا جائے ۔ ہیرس نے ۲۲ اپریل ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم پر گولہ باری سے پیشتر دوسرا مسودۂ مصالحت سلطان کے حوالے کیا، جس کی شرطیں بہت سخت تھیں، یعنی نصف سلطنت چھوڑ دی جائے ۔ دو کروڑ تاوان دیا جائے، جس میں سے ایک کروڑ فوراً ادا ہو ۔ چار بیٹے اور چار جرنیل بطور یرغمال دیے جائیں اور ان کا انتخاب ہیرس کی صوابدید پر موقوف ہوگا ۔ ساتھ ہی کہہ دیا گیا کہ چوبیس گھنٹے میں جواب دیا جائے ۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر یرغمال اور روپے حوالے کر دیے جائیں ۔ سلطان نے یہ شرطیں قبول نہ کیں (*Military Sundry Book*، ۱۰۹ اے، ص ۱۰۳ ببعد) .

سلطان کے عہدیداروں اور درباریوں میں سے ایسے بھی تھے جو حالات کا انقلاب دیکھ کر خفیہ خفیہ انگریزوں سے مل گئے تھے؛ مثلاً پورنیا، قمرالدین خان اور میر صادق؛ ایسے بھی تھے جنھیں کامیابی کی بظاہر کوئی امید نہ تھی، تاہم وہ جان کے ساتھ اداے فرض کے لیے تیار تھے، مثلاً سید غفار .

قلعے پر گولہ باری کے بعد شگاف ہوا تو حملے سے پیشتر انگریز اندر کے متعلق اطمینان کر لینا چاہتے تھے ۔ میر صادق سے بات چیت کے بعد قرار پایا کہ ۴ مئی کو دوپہر کے وقت حملہ کیا جائے ۔ دریاے کاویری کے درمیان ایک جزیرے پر سرنگاپٹم واقع ہے ۔ انگریزی فوج دریا سے کوئی ایک سو گز کے فاصلے پر تھی، سامنے دریا کا پاٹ دو سو اسی گز تھا ۔ دریا سے گزرنے کے بعد پتھر کی ایک دیوار تھی اور اس دیوار کے اندر ساٹھ گز چوڑی خندق تھی (فورٹسکیو *Fortescue*، ۴ / ۲ : ۷۴۷)، گویا شگاف تک پہنچنے کے لیے انگریزی فوج کو چار سو چالیس گز یا دو فرلانگ فاصلہ طے کرنا تھا ۔ سلطان نے شگاف کی حفاظت کے لیے فوج متعین کر دی تھی اور اس کی درستی کا حکم دے دیا تھا .

ادھر انگریزوں نے مقررہ وقت پر حملہ کیا، ادھر میر صادق نے محافظ فوج کو تنخواہ بانٹنے کے بہانے ہٹا لیا، شگاف خالی رہ گیا اور انگریزی فوج بے تکلف اندر داخل ہو گئی ۔ یہ ایک انگریزی فوج کی کیفیت تھی ۔ حملے کے دوسرے مقام پر انگریزوں کو زبردست مزاحمت سے سابقہ پڑا .

سلطان نے دوپہر کا کھانا منگوایا ۔ ایک ہی نوالہ کھایا تھا کہ آہ و بکا کی صدا کان میں پہنچی ۔ پوچھا کیا ہوا ؟ عرض کیا گیا کہ سید غفار شہید ہو گئے ۔ سلطان نے جان نثار سالار کے متعلق یہ سنتے ہی کھانا چھوڑ دیا ۔ ہاتھ دھوئے اور کہا ہم بھی عنقریب جانے والے ہیں (نشانِ حیدری، ۳۹۱) .

اس وقت تک انگریزی فوج اندر داخل ہو چکی تھی ۔ سلطان ڈڈی دروازے (پانی کے دروازے) کی طرف بڑھا ۔ اسے میر صادق نے بند کرا دیا تھا کہ سلطان باہر نہ نکل سکے ۔ خود یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا کہ کمک لاتا ہوں ۔ ایک شخص نے اسے جاتے ہوے دیکھا تو یہ کہہ کر تلوار ماری کہ بادشاہ کو دشمنوں کے حوالے کر کے خود کہاں جا رہا ہے ؟ میر صادق گھوڑے سے گر پڑا، دوسروں نے اسے ختم کر ڈالا (نشانِ حیدری، ۳۹۱ ببعد) .

سلطان تگ و دو میں مصروف تھا اور دو زخم لگ چکے تھے - تیسرے زخم نے بالکل نڈھال کر دیا - وفاداروں نے پالکی میں ڈال کر اٹھانا چاھا - ھجوم کے باعث اٹھا نہ سکے - اسی حالت میں ایک گورے نے سلطان کے مرصّع شمشیر بند پر ھاتھ ڈالا، سلطان نے تلوار ماری، اس نے فوراً پستول داغ دیا (وِلْکْس Wilks، ۳: طباعت ۱۸۱۷ء، ۴۴۳ ببعد) - بیٹسن Beatson : *A View of the Origin etc.*، ص ۱۶۳ ببعد کا بیان ہے کہ تلوار کی پہلی ضرب ھاتھ ڈالنے والے گورے کی بندوق پر پڑی اور دوسری ضرب نے ایک اور گورے کو زخمی کیا - اس اثناء میں سلطان کے گولی لگی - کرمانی کا بیان ھے کہ سلطان تنگ جگہ میں لڑتا رھا - دو تین آدمیوں کو گولی اور تلوار سے موت کے گھاٹ اتارا - روے مبارک پر کاری زخم کھا کر شہادت پائی (نشانِ حیدری، ۳۹۲) - صحیح یہی معلوم ھوتا ھے کہ موت گولی سے ھوئی، جو دائیں کان سے ذرا اوپر لگی تھی (ایلن Allan، ۸۰ ببعد) - میّت کو حیدر علی خان کے پہلو میں اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

۶ مئی تک لوٹ کا سلسلہ جاری رھا - سپاھی محل کے خزانے سے بے شمار روپیہ اور جواھرات لے گئے - جواھرات کی صرف ایک کشتی کی قیمت پینتالیس لاکھ روپے بتائی گئی تھی - ایک سپاھی کو سلطان کا بازو بند ملا، جسے کمپنی کے ایک سرجن نے ڈیڑھ ھزار روپے میں خرید لیا اور خود دو ھزار پونڈ میں بیچا (ڈاڈویل Dodwell، ۶۷) - سونے چاندی کے علاوہ مرصّع بندوقوں اور تلواروں، بیش بہا قالینوں اور قیمتی پارچوں کے تھانوں کا وسیع ذخیرہ تھا - ان سب سے بڑھ کر چاندی کا ایک خوبصورت ھودہ اور ایک شاندار تخت تھا، جو اب بھی انگلستان میں موجود ھے - عربی، فارسی، اردو اور ھندی کے دو ھزار مخطوطات تھے - بیس لاکھ پونڈ کی رقم لوٹ سے فراھم ھوئی، جس میں سے جنرل ھیرس کا حصّہ ایک لاکھ بیالیس ھزار نو سو دو پونڈ تھا (محبّ الحسن خان، ۳۲۲)۔

سلطان خود عالم اور اھلِ علم کا قدردان تھا - اوضاع و اطوار بڑے پسندیدہ تھے - اھلِ اسلام کی پرورش پر خاص توجّہ تھی - نمازِ صبح کے بعد التزاماً قرآن مجید کی تلاوت کرتا - ھر وقت با وضو رھتا - حیاداری کا یہ عالم تھا کہ حمّام میں بھی کپڑا باندھ کر نہاتا تھا - عمر بھر میں پاؤں اور ھاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصّہ برہنہ نہ ھوا - کبھی ایسا کپڑا نہ پہنا جس میں نماز جائز نہ تھی - دستار پر سفید رومال رکھ کر ٹھوڑی کے نیچے باندھ لیتا - آخری دور میں سبز رنگ کی شملہ دار دستار پہنتا تھا - قلمرو کی اکثر ھندو عورتیں سر و سینہ کھولے پھرنے کی عادی تھیں - حکم دے دیا تھا کہ کوئی عورت کرتے اور اوڑھنی کے بغیر باھر نہ نکلے - شجاعت میں سب پر فائق تھا - شہسواری اور نیزہ بازی میں اس کا نظیر کوئی نہ تھا - اختراعات میں اسے کمال حاصل تھا - [سنۂ مولودی (آغاز از بعثت نبوی) سنۂ ھجری کے ساتھ جاری کیا]؛ شہور کی ایجاد کا ذکر پہلے آ چکا ھے - نئے سکّے جاری کیے اور ان کے نئے نام رکھے [احمدی، صدیقی، امامی، عابدی وغیرہ] - نئی وضع کی بندوقیں اور توپیں بنوائیں، ڈھالیں ایسی تیار کرائیں جن پر تیر یا گولی کا اثر نہیں ھوتا تھا - مکروھات اور منہیّات سے ھمیشہ احتراز رھا - تمام فرامین کی پیشانی پر اپنے ھاتھ سے بسم اللہ خط طغرا میں لکھتا اور نیچے دستخط کرتا تھا (نشانِ حیدری، ۳۹۱ - ۴۰۲)۔

معاھدۂ سرنگاپٹم میں نصف سلطنت چھوڑنا

پڑی تو پلنگ پر سونا ترک کر دیا۔ کھادی کے تھان فرش پر بچھا کر سو جاتا (نشانِ حیدری، ۲۹۷ ببعد)۔

ملک کی رونق اور آبادکاری پر خاص توجّہ تھی ۔ تجارت کی توسیع کے لیے بیرونی ملکوں سے روابط پیدا کیے۔ دور دور سے کاریگر بلا کر اپنے ہاں ہر قسم کی صنعتیں جاری کیں ۔ [میسور کی موجودہ صنعتی و تجارتی ترقّی کی سب سے پہلی اینٹ سلطان ھی نے رکھی ۔ ریشمی صنعت، جس پر آج میسور کو واجبی طور پر ناز ہے، سلطان ھی کی رائج کردہ ہے ۔ اسی نے دوسرے ممالک سے ریشم کے کیڑے منگوا کر ان کی پرورش و پرداخت کا طریقہ اپنی رعایا کو سکھایا ۔ اس نے جواھرتراشی اور اسلحہ سازی کے کارخانے بھی قائم کیے ۔ میر محمّد باسط علی خان] ۔ زراعت بہت ترقّی کر گئی ۔ کیونکہ افتادہ زمینیں نرم شرطوں پر مزارعین کو دی جاتی تھیں ۔ آبپاری کے لیے جا بجا تالاب بنوائے ۔ کاویری پر ایک بند بنانے کا سنگ بنیاد بھی رکھا تھا [اور ایک کتبے پر کندہ کرایا کہ بند کی وجہ سے جو آمدنی ھو اس کا معتدبہ حصّہ رعایا کی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ میر محمّد باسط علی خان]۔

گنّے، گندم، جو اور پان کی کاشت سے خاص دلچسپی تھی ۔ درختوں میں سے چیڑ، سال، ساگوان، سپاری، صندل اور ناریل لگانے پر زور دیا جاتا تھا ۔ ریشم کے کیڑے پالنے کا خیال آیا تو بارہ محل میں بکثرت توت لگوائے ۔ رأس امّید سے شاہ بلوط منگوائے ۔ روئی اور نیل کی کاشت بھی کرائی ۔ پھل والے درختوں میں سے آم، سنترے، سیب اور امرود بطورِ خاص قابلِ ذکر ھیں ۔ غریب کاشتکاروں کو تقاوی پر روپیہ دیا جاتا تھا (محبّ الحسن خان، ۳۴۰ ببعد) ۔

حکومت کے مختلف محکموں کے لیے کچہریوں کا نام تجویز کیا تھا، مثلاً میر آصف کچہری (مالگزاری اور فینانس)، میر میران کچہری (فوج)، میر صدر کچہری (توپخانہ اور قلعہ نشین افواج)، ملک التجّار کچہری (تجارت)، میر یمّ کچہری (بحریّات)، میر خزائن کچہری (خزانہ اور دارالضرب) ۔ توشے خانے کے دو حصّے تھے : نقدی اور جنسی ۔ بحریّات کا مستقل محکمہ سلطان ھی نے قائم کیا ۔ [فوجی تنظیم کے لیے ایک کتاب فتح المجاھدین لکھوائی، جس میں نہ صرف فوجی نقل و حرکت کے وہ تمام قواعد درج ھیں جو یورپ میں رائج تھے بلکہ اس میں خود سلطان کے اختراع کردہ قواعد بھی ھیں ۔ سلطان کو فنّ جہازسازی سے بھی شغف تھا ۔ وہ جہازوں کے نقشے خود تیار کرتا تھا ۔ مقناطیسی پہاڑوں سے جہازوں کے بچانے کے لیے لوھے کے بجائے تانبے کے استعمال کا طریقہ سلطان ھی نے ایجاد کیا ۔ اس نے بندرگاھوں کو وسیع کیا ۔ ساحلی حفاظت کے لیے سمندری فوجیں قائم کیں۔ میر محمّد باسط علی خان]۔ حیرت ھوتی ہے کہ جس فرمانروا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ شہزادگی سے آخر تک مسلسل خوفناک لڑائیوں میں گذرا اسے ان تمام معاملات پر توجّہ کا وقت کیوں کر ملتا تھا ۔ حق یہ ہے کہ سلطان حکومت کو خدا کی طرف سے امانت سمجھتا تھا اور اس امانت کا حق ادا کرنے کی جیسی عملی مثال اس نے پیش کی اس کی نظیریں بہت کم ملیں گی۔

اسلامی حمیّت بدرجۂ اعلٰی موجود تھی اور سچّے مسلمان کی طرح تعصّب سے بالکل پاک تھا ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آخری وقت تک سیکڑوں غیرمسلم اس کے ھاں ذمےداری کے اونچے عہدوں پر مأمور تھے ۔

[ٹیپو سلطان نے اپنے دارالسلطنت کا نام ٹیپو نگر یا ٹیپوپٹن نہ رکھا بلکہ "گنجِ عام" رکھا، جو عوام میں اب تک "گنجام" مشہور ہے؛ کیونکہ یہ وہ مقام تھا جہاں ہر ملک، ہر فرقے، ہر قوم اور

ھر قسم کے فنکار آ کر بسنے لگے تھے اور جہاں عالیشان شاھی محلات، فوجی، دیوانی اور عدالتی دفاتر تعمیر کیے گئے تھے مگر آج وھاں کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ۔ اب صرف ایک محل موسومہ ''دریا دولت باغ'' دریاے کاویری کے کنارے باقی رہ گیا ھے، جس کے برآمدے کی مغربی دیوار پر ایک تصویر میں کرنل بیلی کو سلطان سے شکست کھا کر اپنی انگلیاں دانتوں میں دبائے ھوے دکھایا گیا ھے ۔ مشرقی دیوار کی تصاویر سے سلطان کی روزمرہ زندگی کا حال ظاھر کیا گیا ھے ۔ اس عمارت میں لارڈ ڈلہوزی کا کتبہ بھی لگا ھوا ھے ۔ اسی نمونے کا اب صرف ایک محل، محمود علی خان کا، شہر میسور میں موجود ھے ۔ میر محمد باسط علی خان]۔

سلطان کی شہادت کے وقت شہزادہ فتح حیدر باھر تھا ۔ وفادار مشیروں کی راے تھی کہ لڑائی جاری رکھی جائے، مگر جنرل ھیرس اور بعض دوسرے لوگوں نے یقین دلا دیا کہ اسی کو مسند پر بٹھا دیا جائے گا ۔ پورنیا کی راے بھی یہی تھی، کیونکہ اس کے نزدیک باشندوں کے مقتدر حصے کو مطمئن کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی (*Military Sundry Book*، ۱۰۹ اے، ص ۱۳۰) ۔ میر عالم اور مشیر الملک، نمائندگان حیدر آباد، ٹیپو سلطان کے خاندان میں سے کسی کو مسند پر بٹھانے کے سخت خلاف تھے (*Secret Proceedings*، ۲۲ جون ۱۷۹۹ء)۔

ویلزلی نے پورنیا کی تجویز مسترد کر دی اور قدیم راجا کو گدی پر بٹھا دیا ۔ سلطان شہید کے شہزادوں کے لیے دو لاکھ چالیس ھزار پگوڈا کی رقم مقرر ھو گئی ۔ انھیں پہلے ویلور میں رکھا گیا ۔ ۱۸۰۶ء میں وھاں فوجی بغاوت ھوئی تو شہزادوں کو کلکتے منتقل کر دیا گیا ۔

مآخذ: (۱) حسین علی خان کرمانی: نشان حیدری، (فارسی)، معروف بہ تاریخ ٹیپو سلطان، بمبئی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء، ضخامت ۲۰۰ صفحات (دوسری کتابوں پر اس کتاب کی برتری کا خاص پہلو یہ ھے کہ مصنف نے حیدر علی خان اور ٹیپو سلطان دونوں کو دیکھا تھا)؛ (۲) غلام محمد ابن ٹیپو سلطان: کارنامۂ حیدری، (فارسی)، (یا سیر سروری یا مآثر صفدری یا تواریخ گزیدہ = ۱۸۴۸ء) ۔ اس کتاب میں انگریزی، فارسی اور ھندوستانی روایات جمع کر دی گئی ھیں ۔ طبع کلکتہ ۱۸۴۸ء، تقریباً ایک ھزار صفحات؛ (۳) تاریخ حمید خان، (فارسی)، مصنف کارنوالس کے پرائیویٹ سکرٹری کا میر منشی تھا: ۱۷۹۱ - ۱۷۹۲ء کی مہم میں گورنر جنرل کے ساتھ تھا اور اس جنگ کے مفصل حالات لکھے (مخطوطۂ کتب خانۂ بانکی پور پٹنہ)؛ (۴) حسین خان لوھانی: تاریخ کورک، (فارسی)، مخطوطۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (مصنف کا رجحان ٹیپو سلطان کے خلاف ھے)؛ (۵) سلطان التواریخ، (فارسی)، ایک مخطوطہ انڈیا آفس میں ھے اور ایک گورنمنٹ اوریئنٹل لائبریری مدراس میں (مصنف کا رجحان ٹیپو سلطان کے خلاف ھے)؛ (۶) تاریخ خدا دادی، (فارسی)، انڈیا آفس کا مخطوطہ، اول و آخر ناقص؛ (۷) تاریخ ٹیپو سلطان، (فارسی)، انڈیا آفس کا مخطوطہ؛ (۸) وقائع منازل روم، (فارسی)، روزنامچۂ غلام علی خان، مصنف کو ایک وفد کے ساتھ قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا (طبع ۱۷۸۶ء)؛ (۹) زین العابدین ششتری: فتح المجاھدین، (فارسی)، نسخۂ کتابخانۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، عدد ۱۶۶۹؛ (۱۰) میر عالم ششتری: حدیقۃ العالم، (فارسی)، انگریزوں نے مصنف کی خدمات خصوصی کے عوض اس کے لیے چوبیس ھزار روپے وظیفہ مقرر کر دیا تھا ۔ دو جلدیں ۔ آخری جلد سرنگاپٹم کے سقوط (۱۷۹۹ء) پر ختم ھوتی ھے، طبع ۱۸۵۰ء؛ (۱۱) سید امجد علی اشہری: سوانح حیدر علی سلطان، (اردو)، امرتسر ۱۹۲۰ء؛ (۱۲) وھی مصنف: ٹیپو سلطان، (اردو)، امرتسر ۱۹۱۱ء؛ (۱۳) محمود خان محمود بنگلوری: تاریخ سلطنت خداداد، (اردو)، بنگلور ۱۹۳۴ء (؟)؛ (۱۴) حیدر نامہ،

(لنڈن)، میسور آر کیالاجیکل رپورٹ، طبع ۱۹۳۰ء:
(۱۵) Allan : *An Account of the Campaign in Mysore* (1799)، کلکتہ ۱۹۱۲ء: (۱۶) J. Bristow :
A Narrative of the Sufferings of James Bristow Written by Himself، کلکتہ ۱۷۹۲ء: (۱۷)
A. Beatson : *A view of the Origin and Conduct of the War with Tippoo Sultan*، لنڈن ۱۸۰۰ء: (۱۸)
Major Dirom : *A Narrative of the Campaign in India which terminated the war with Tippoo Sultan in 1792*، لنڈن ۱۷۹۳ء: (۱۹) B. Crisp : *The Mysorean Revenue Regulations*، کلکتہ ۱۷۹۲ء: (۲۰)
R. Mackenzie : *A Sketch of the War with Tippoo Sultan*، دو جلدیں، کلکتہ ۱۷۹۳ - ۱۷۹۴ء: (۲۱)
Extracts from Captain Mackenzie's work، طبع ۱۸۰۴ء: (۲۲) E. Moor : *A Narrative of the Operations of Captain Little's Detachment, and of the Mahratta Army Commanded by Purseram Bhow*، لنڈن ۱۷۹۴ء (اس میں بعض نادر تصویریں ہیں): (۲۳) I. Munro : *A Narrative of the Military Operations on the Coromandel Coast, 1780-1784*، لنڈن ۱۷۸۹ء (اس کتاب کے ساتھ نہایت عمدہ نقشے ہیں): (۲۴) Ramchandra Punganuri : *Memoirs of Hyder and Tippoo*، ترجمۂ براؤن C. P. Brown، مدراس ۱۸۴۹ء: (۲۵) J. Scurry : *The Captivity, Sufferings and Escape of James Scurry Written by Himself*، لنڈن ۱۸۲۴ء: (۲۶) Forrest : *Selections from the State Papers Preserved in the Bombay Secretariat*، ج ۱ و ۲، ۱۸۸۵ و ۱۸۸۷ء: (۲۷) G.R. Glieg : *The Life of Sir Thomas Munro*، جلد ۱، ۲، لنڈن ۱۸۳۰ء: (۲۸) W. Kirkpatrick : *Select Letters of Tippo Sultan*، لنڈن ۱۸۱۱ء: (۲۹) *Poona Residency Correspondence*، جلد ۲ و ۶ و ۸،
بمبئی ۱۹۳۶ - ۱۹۴۳ء: (۳۰) H. H. Dodwell : *The Nabobs of Madras*، لنڈن ۱۹۲۶ء: (۳۱) J. W. Fortescue : *History of the British Army*، جلد ۳، لنڈن ۱۹۱۱ء، جلد ۴، حصّہ ۲، لنڈن ۱۹۱۵ء: (۳۲) J. Mill : *History of British India*، طبع ولسن H. H. Wilson، جلد ۳ تا ۶، لنڈن ۱۸۴۸ء: (۳۳) N. K. Sinha : *Haider Ali*، جلد ۱، کلکتہ ۱۹۴۱ء، مکمّل طبع دوم ۱۹۴۹ء: (۳۴) M. Wilks : *Historical Sketches of the South of India in an Attempt to Trace the History of Mysore*، طبع M. Hammick، ۲ جلدیں، میسور ۱۹۳۰ء: (۳۵) M. M. D. L. T. : *History of Hyder Ali Khan*، (یہ کتاب فرانسیسی میں لکھی گئی تھی - اس کا انگریزی ترجمہ ۱۷۸۲ء میں شائع ہوا - پھر ۱۸۵۵ء میں ایک طباعت شائع ہوئی، جس میں ٹیپو سلطان کے حالات بھی شامل کر دیے گئے): (۳۶) Wood : *A Review of the Origin, Progress and Result of the Late Decisive war in Mysore*، طبع ۱۸۰۰ء (ابتدا میں تینتیس صفحے کا ایک خط ہے، جس میں جنگ کی سرسری کیفیت بتائی گئی ہے - پھر ایک سو سینتیس صفحے ہیں، جن میں بہت سی قیمتی دستاویزیں آ گئی ہیں، مثلاً زمان شاہ درّانی کے حالات، فرانس سے سلطان کی خط و کتابت، سفارت قسطنطنیہ کے حالات وغیرہ: (۳۷) Mohibbul Hasan Khan : *History of Tipoo Sultan*، کلکتہ - ڈھاکہ ۱۹۵۱ء، نگارندۂ مقالہ نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے: (۳۸) Oakes : *An authentic Narrative of the Treatment of the English who were taken Prisoners on the Reduction of Bednore by Tippoo Sahib*، لنڈن ۱۷۸۵ء: (۳۹) C. H. Philips : *The East India Company 1784-1834*، مانچسٹر ۱۹۴۰ء: (۴۰) R. M. Martin : *Despatches, etc. of the Marquis Wellesley*، جلد اوّل، لنڈن ۱۸۳۶ء: (۴۱)

، لنڈن *Captives of Tipu Sultan* : A. W. Davrenge ۱۹۲۹ء؛ علاوہ بریں نیشنل آرکائوز آو انڈیا اور دوسرے غیر مطبوعہ رِکارڈز [سِجلّات] اور مختلف مجموعہ ھاے معلومات *Secret proceedings, Military Sundry Book* *1780-1799* وغیرہ [اور *Cat. of the Or. Lib.* : Stewart *of Tippoo Sultan* ، کیمبرج ۱۸۰۹ء، ۳۳ تا ۹۳ پر سوانح حیات]. (غلام رسول مہر)

ٹیک چند : بَہار، لالہ، لغت نویسِ مشہور؛ فارسی اور اردو کا شاعر بھی تھا، لیکن اس حیثیت سے مشہور نہیں ھوا ـ عربی سے مناسبت اور فارسی میں مہارت رکھتا تھا (گلزار، ص ۳۶) ـ اس کی تصنیف بہارِ عجم فارسی زبان کی ایک اہم اور مستند لغت ھے.

بہار کے حالاتِ زندگی کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی ـ حدود ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۸ - ۱۶۸۹ء میں پیدا ھوا (قبَ بہارِ عجم، لکھنؤ ۱۹۱۶ء، دیباچہ ص ۲، تحریرِ دیباچۂ بہارِ عجم کے وقت یعنی ۱۱۵۲ھ میں زندگی کے ترپنویں (۵۳) سال میں تھا).

دھلی کا باشندہ تھا، نہرِ نوّاب سعادت خان کے قریب رھتا تھا (ترقیمۂ بہارِ عجم، طبع ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۲ء، ۲ : ۸۰۳؛ بحوالۂ لالہ برج لال، جو ایک واسطے سے بہار کا شاگرد تھا) ـ اس بارے میں اختلاف ھے کہ اس کی ذات کیا تھی ـ اکثر تذکرہ نگاروں نے (بشمولِ گارساںْ دِ تاسی) اسے کھتری لکھا ھے، البتہ میر تقی میر (نکات الشعراء، تألیف ۱۱۶۵ھ)، جو بہار کے دوست تھے، اس کے خاندان کے بارے میں لکھتے ھیں : ''برھمنِ رنگین بہارِ سخن''، اس ترکیب سے اس کے برھمن ھونے کی طرف خیال جاتا ھے ـ قائم نے مخزنِ نکات (تألیف ۱۱۶۸ھ، ص ۲۵ ببعد) میں اسے زرگر قوم کا فرد قرار دیا ھے، لیکن قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز (تألیف ۱۲۲۱ھ)، ۱ : ۱۱۴ ببعد میں اس کی تردید کی ھے ـ ان کی راے میں بہار کھتریوں کی گوت سنّارہ سے تعلق رکھتا تھا [کھتری ھونے کے متعلق سناروں کے دعاوی کے لیے دیکھیے روز *A Glossary of Tribes, etc.*: H.A. Rose، ۳ : ۴۳۹ ببعد؛ وھاں سناروں کی ایک مجلس کا ذکر ھے، جس کا نام ''مائر Mair و ٹانک، کشتریہ راجپوت سبھایک سبھا'' ھے] ـ متأخر تذکرہ نگاروں میں نوّاب صدّیق حسن خان (صبحِ گلشن، ۱۲۹۵ھ، ص ۶۹ اور بظاھر اس بنا پر سامی : قاموس الاعلام) اور لالہ سری رام (خمخانۂ جاوید، ۱ : ۶۱۲) انھیں کایتھ (کائستھ) تسلیم کرتے ھیں، جو قابلِ قبول نہیں.

بہار فارسی زبان و ادب کے حصول میں مولانا ابوالخیر خیراللہ وفائی [بظاھر خیر اللہ بن لطف اللہ مہندس لاھوری مراد ھے، جس کے لیے دیکھیے روئداد ادارۂ معارف اسلامیہ، لاھور ۱۹۳۳ء، ص ۴۱ و ۴۷، جہاں اُسے خیرالشارحین لکھا ھے] اور خان آرزو کا شاگرد تھا؛ اگر یہ تعلّق شاعری میں ھوتا اور خود بہار کی فارسی شاعری کو کچھ اھمّیت ھوتی تو خان آرزو اپنے تذکرے مجمع النفائس میں (بذیلِ سروری کاشانی) بہار کا ذکر بطور شاعر ضرور کرتے ـ انھوں نے اس کا ذکر صرف ضمناً اور لغت نویس کی حیثیت سے کیا ھے.

قدرت اللہ قاسم نے لکھا ھے کہ بہار کا ایک ھاتھ کسی حادثے میں کٹ گیا تھا اس لیے خان آرزو اسے ''رستمِ یک دست'' کہا کرتے تھے (مجموعۂ نغز، ص ۱۱۴ ببعد) ـ شْپْرِنگر (۱۸۵۴ء) نے علی ابراھیم (گلزار) کے حوالے سے بہار کے سفرِ ایران کا ذکر کیا ھے ـ گارساںْ د تاسی نے بھی اس کے سفرِ ایران کا تذکرہ کیا ھے (د تاسی : *Histoire de la Lit. Hindouie* ، ۱ : ۲۸۱)، جو بظاھر درست نہیں معلوم ھوتا ـ بعض تذکرہ نگار اس کی فارسی شاعری کا ذکر کرتے ھیں لیکن نمونۂ کلام بہت کم دیتے ھیں، سبب غالباً یہی ھے کہ بہار کا اصل مقام فارسی شاعری میں نہیں

لغت نگاری میں ہے ۔ اردو تذکرہ نگار بھی خال خال اس کی اردو شعر گوئی کا ذکر کرتے ہیں لیکن اردو شاعری میں بھی اس کی شہرت زیادہ نہیں ہے ۔ اکثر تذکروں میں ایک ایک دو دو شعر دیے ہیں ۔ زیادہ سے زیادہ شعر چمنستان شعراء (شفیق) میں ہیں، یعنی ۳۱، تذکرۂ ریختہ گویان (گردیزی) میں ۲۹ ، خمخانۂ جاوید (سری رام) میں قلمی بیاض مکتوبۂ ۱۱۸۸ھ کے حوالے سے ۲۱ ۔

بہار کی وفات کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہے ۔ اتنا قطعی ہے کہ وہ میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو کی تألیف (۱۱۸۸ھ) کے وقت تک وفات پا چکا تھا ۔ بہار عجم (۱۱۸۲ھ) کے مرتب اندرمن کے بیان سے بھی کچھ وضاحت نہیں ہوتی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۸۰ھ تک ضرور زندہ تھا کہ مصطلحات وارستہ سے استفادہ کر سکا ۔ مولوی عبدالمقتدر خان نے ۱۱۸۰ھ میں اس کی وفات لکھی ہے (فہرست بانکی پور (فارسی)، ۹ : ۴۳)، جس کا کوئی ثبوت نہیں ۔

تصانیف : بہار کو صاحب تصانیف کثیرہ کہا جاتا ہے (میر : نکات الشعراء) لیکن اب ان کی طرف منسوب صرف چھے کتابوں کا پتا چلتا ہے :-

۱ - بہار عجم؛ ۲ - نوادر المصادر؛ ۳ - جواہر الحروف؛ ۴ - ابطال ضرورت؛ ۵ - شرح نصاب بدیع؛ ۶ - جواہر الترکیب، (نایاب) ۔

۱ - بہار عجم : بلخمن کے قول کے مطابق بہار عجم ان کتب لغت میں سے جو کسی ایک فرد نے مرتب کی ہو سب سے زیادہ شاندار کارنامہ ہے (بلخمن، ص ۲۸) ۔ متأخرین میں ٹامس روبک Thomas Roebuck نے اشاعت برہان قاطع میں اور وُلرز Vullers نے اپنی لغت میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے؛ ریو، ص ۵۰۳ (از روے بلخمن) ۔ اس کے علاوہ لغت نگاران ہند نے بھی بہار عجم سے بہت استفادہ کیا ہے یا اسے پیش نظر رکھا ہے۔ مثلاً قب عزیز جنگ بہادر : آصف اللغات (حیدر آباد دکن ۱۳۲۳ھ)، ۱ : ۵، ۶ - بہار عجم کے بعد ہندوستان میں جو لغت کی کتابیں مرتب ہوئیں وہ بھی بہار کی خوشہ‌چین ہیں.

یہ کتاب اس کی عمر بھر کی محنت کا نتیجہ ہے ۔ اس کا اپنا بیان ہے (دیباچۂ بہار عجم) کہ بیس برس کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچی (پہلے دیباچے میں ۱۰ سال لکھا تھا، قب ریو، ۲ : ۵۰۳) ۔ ''یادگار فقیر حقیر بہار، مادۂ سال تاریخ اتمام اوست''، پس تکمیل کی تاریخ ۱۱۵۲ھ ہے ۔ [طبع ۱۹۱۶ء، ۲ : ۲۶۲ پر بذیل ''قتل عام'' ۱۱ ذی الحجۃ ۱۱۵۱ھ کو دھلی میں نادر شاہ کے حکم سے قتل عام ہونے کا ذکر ہے] ۔ ریو، ۲ : ۵۰۳ میں 'مادّہ' کو 'بادہ' پڑھ کر ۱۱۵۲ + ۱۰ = ۱۱۶۲ھ تاریخ اتمام بتائی ہے اور زخاؤ Sachau نے (فہرست کتابخانۂ بادلی، ۱ : ۱۰۱۸)، اس کی تقلید کی ہے، مگر تمام مطبوعہ نسخے 'مادّہ' لکھ رہے ہیں اور وہی صحیح ہے ۔

سطور بالا سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بہار عجم کی تألیف کا آغاز ۱۱۳۲ھ میں ہوا ہوگا ۔ ایک مرحلے پر جب مؤلف نے کتاب کا کوئی مسوّدہ مرتب کیا اس کے پیش نظر متأخرین کی کتابوں میں سے صرف خان آرزو کی تنبیہ الغافلین اور میر افضل ثابت [م ۱۱۵۰ یا ۱۱۵۲ھ ۔ شپرنگر، ۱۵۰] کا رسالہ تھے ۔ آرزو کا رسالہ ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء اور ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء کے مابین لکھا گیا (منوہر سہاے انور، مقالۂ مذکور، ص ۱۴۶) ۔

بہار عجم کے مآخذ : اس سلسلے میں آرزو کا بیان ذیل دلچسپ ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب بہار عجم نے کہ ''یکے از یاران فقیر است'' پندرہ سولہ سال ہوے بہار عجم تألیف کی، میں (''فقیر سراج الدین علی'') نے اپنی دو تصنیفیں

سراج اللغۃ و چراغ ہدایت اُسے دیں کہ ان دونوں کتابوں میں سے جو کچھ پسند آئے اپنی فرہنگ میں شامل کر لے اور اس بارے میں کبھی بخل و خسّت نہ کی (دیکھیے مجمع النفائس، نسخۂ دانش گاہِ پنجاب، مجموعۂ شیرانی، شمارہ ۱۳۸۹، ورق ۱۰۶ ب؛ گویا سراج اللغۃ(آغاز ۱۱۴۰ھ، تکمیل ۱۱۴۷ھ) اور چراغ ہدایت (دفتر دوم سراج اللغۃ) (منوہر سہائے انور، ''رسالۂ ڈکٹری''، ص ۶۰؛ ریو، ص ۵۰۲) کی تکمیل کے فوراً ہی بعد بہار نے انہیں استعمال کیا تھا اور خان آرزو کو کسی سرقے کے الزام کا ان کے بارے میں خیال نہیں.

معاصر تذکرہ نگار بہارِ عجم اور سراج اللغۃ وغیرہ کے سلسلے میں یہ بیانات دیتے ہیں : قائم کہتے ہیں : ''وقتیکہ خان آرزو سراج اللغۃ تصنیف می کردند بعضے غلطی‌ها (کذا) بر آورد - ایشان از غایتِ انصاف کہ خاصّۂ کمال است دخلہاے وی ...... برداشتند'' - گردیزی (تألیف ۱۱۶۶ھ) لکھتے ہیں : ''بہارِ عجم تألیف نمودہ در بعض مواقع دخلہا بر سراج اللغۃ خان آرزو و دیگر کتب لغت فرمود''؛ نیز دیکھیے تذکرۂ مسرّت افزا (تألیف ۱۱۹۱ھ).

ثابت کے رسالے سے مراد غالباً معارضۂ حزین و آرزو ہی کے سلسلے کا کتابچہ ہے، جو کم و بیش اسی زمانے میں لکھا گیا، گویا بہار عجم کا کوئی مسوّدہ ۱۱۵۴ یا ۱۱۵۶ھ کے گرد و پیش تحریر کے مدارج طے کر رہا تھا - اشاعتِ ۱۱۵۲ھ میں مصطلحاتِ وارستہ اور رسالۂ مخلص کا نام لیتے ہیں - مصطلحاتِ وارستہ (بقولِ مرتّبِ فہرست مخطوطات بانکی پور، ص ۳۳) ۱۱۸۰ھ میں تکمیل کو پہنچی (قبّ ریو، ۲ : ۵۰۳؛ بلخمن کا بیان راجع بہ لغت نگاری، ص ۳۰، میں ۱۱۸۰ھ سالِ آغازِ مصطلحات ہے، لیکن یہ غالباً صحیح نہیں، کیونکہ اسی سال وارستہ کا انتقال ہوتا ہے) - رسالۂ مخلص سے مؤلّف کا اشارہ مرآۃ الاصطلاح کی طرف ہے - مخلص (م ۱۱۶۴ھ) کی مرآۃ الاصطلاح [تکمیل کا مادّۂ تاریخ ''تحقیقِ اصطلاحات'' = ۱۱۵۸ھ] سے بہار نے بہت فائدہ اٹھایا ہے - ''مصطلحات وارستہ کا کوئی قلمی نسخہ یا نسخے کا کچھ حصّہ صاحبِ بہارِ عجم کے پاس ضرور تھا ، کیونکہ بہار نے اس میں کا بہت کچھ داخلِ لغت کر لیا ہے'' (بلخمن، ص ۳۰).

بہار نے اس لغت کے یکے بعد دیگرے سات ایڈیشن تیار کیے - جب بوڑھا ہو گیا اور آٹھویں ایڈیشن کی ہمّت نہ رہی تو اس نے یہ کام اپنے شاگرد رائے اندرمن باشندۂ حصار کو سونپا - اندرمن نے ساتویں ایڈیشن کو کہ ''ناسخِ جمیعِ مسوداتِ سابق'' اور پریشان و غیرمرتّب تھا دیکھا، اس کا انتخاب کیا اور ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء میں آٹھواں ایڈیشن پایۂ تکمیل کو پہنچایا (دیباچۂ اندرمن، ص ۲) - اسی اشاعتِ خاص کا ایک نسخہ، جو اندرمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، بانکی‌پور، پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے - نسخہ شوّال ۱۱۸۴ھ کا مکتوبہ ہے (فہرست مخطوطات ، ص ۳۵).

اندرمن کے ایڈیشن سے الگ بھی مؤلّف کے ساتویں نسخے سے ایک اَور متن تیّار کیا گیا، جس کا مرتّب دھرم چند بن منشی دیپ چند ابن برج لال تھا - اس متن کے ترقیمے کے بعض اہمّ مطالب یہ ہیں : بہار نے اپنی کتاب کو اصلاح و ترمیم کے بعد بخطِّ نستعلیق سات بار لکھا - آٹھواں ایڈیشن، ضعفِ پیری سے مجبور ہو کر مرتّب نہ ہو سکا تو اندرمن نے، جو دستور الحساب کا مصنّف اور بہار کا خاص شاگرد تھا، آخری نسخہ مع نوادر المصادر اور چند اَور کتب کے، جو مصنّف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، حاصل

کر لیا - بہار عجم کا انتخاب کیا اور ایک خاتمے کا اضافہ کر کے اسے اپنا مال بنا لیا اور استاد پر زیادتی کی - اندرمن ہی کے شاگرد لالہ برج لال آنجہانی (بیکنٹھ باشی) نے بہار کا اصل نسخہ اپنے استاد سے حاصل کیا اور دلّی اور مندسور (صوبۂ مالوا) میں، سرکاری فرائض کی کثرت کے باوجود، کسی کی امداد و اعانت کے بغیر مصنّف کے نسخے کی مدد سے تین بار از سرنو ترتیب دیا اور اصل کے مطابق بنا کر رائج کر دیا - جس سے اندرمن کا نسخہ غیر مقبول ہو گیا (بہار عجم، طبع ۱۸۵۳ء، ۲ : ۸۰۳).

اندرمن پر یہ الزام صحیح نہیں کہ اس نے استاد کا مال ھتھیا لیا - اندرمن نے تو اس پر دیباچہ بھی لکھا اور اس کے مصنّف بہار کا ذکر بھی کر دیا - بظاہر مروّجہ مطبوعہ نسخے اندرمن اور برج لال کے متون کا مرکّب معلوم ہوتے ہیں.

بہار عجم کے مطبوعہ نسخے : پہلی اشاعت، بقول گارساں دِ تاسی، جلد اوّل، مطبع قران السعدین، [کشمیری دروازہ] دھلی میں ہوئی (*Histoire de la Lit. Hindouie, etc.*، طبع دوم، ۱ : ۲۸۲) - کتاب‌خانۂ دانش‌گاہ پنجاب کے دو نسخوں کے ترقیموں سے بھی اس طباعت کی تائید ہوتی ہے - دوسرا ایڈیشن مطبع العلوم میرٹھ سے ۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو نکلا - مطبع سراجی سے بھی ایک ایڈیشن شائع ہوا (جلد اوّل، ۲۱ ذی القعدۃ ۱۲۸۲ھ؛ جلد دوم، ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء/ ۵ شعبان ۱۲۸۳ھ) - لیکن ان سب نسخوں کے ترقیمے نقل در نقل کے اصول پر درج ہوے ہیں - ہر جگہ کاتب کا نام دولت رام، مہتمم مولوی کریم بخش اور مرتّب دھرم چند بیشتر نسخوں میں موجود ہے، عبارتیں بھی بادنٰی تغیّر (خصوصاً مطبع کا نام چھوڑ کر) اسی طرح درج ہیں - کمال یہ ہے کہ اندرمن کا دیباچہ بھی موجود ہے اور دھرم چند کا ترقیمہ بھی - بہار کا دیباچہ مختصر ہے (گو نولکشور پریس کے نسخے میں دیباچہ مفصّل ہے اور منابع کا تفصیلی ذکر بھی اُس میں ہے) - مطبع العلوم کی طباعت کے بعد "۱۲۶۷ھ میں کانپور سے بھی اس کی اشاعت ہوئی" (بلخمن، ص ۲۹) - مطبع نول کشور سے اوّل بار مولوی ہادی علی کی تصحیح سے (ان کے انتقال کے بعد) ستمبر ۱۸۷۹ء میں بہار عجم شائع ہوئی، جس میں اندرمن کا دیباچہ شامل ہے - ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مطبع محمّدی کے نسخے پر مبنی ہے - یہ لغت بعد میں نولکشور پریس سے کئی بار چھپی : چنانچہ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء میں بھی ایک ایڈیشن چھپا .

بہار عجم کی خصوصیّت : بہار عجم کی سب سے بڑی خصوصیّت اس کی جامعیّت ہے - ہمیں بہار عجم کے علاوہ کوئی ایسی کتاب معلوم نہیں جس میں فارسی کی اصطلاحوں کو اس استیعاب و احاطہ کے ساتھ جمع کیا گیا ہو - وارستہ اعلٰی ناقد سہی، مگر تھوڑے سے جدید و قدیم محاورات کی چھان بین اُسے ایک جامع لغت کا رتبہ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی.

۲ - نوادر المصادر : فارسی مصادر پر، بقولِ خودِ مصنّف یہ پہلی کتاب ہے - جس میں ایک مقدّمہ، چوبیس باب اور ایک خاتمہ ہے - مصادر کو مشتقّات کے اعتبار سے نہیں بلکہ حروفِ تہجّی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے اور مشتقّات مصادر کے ذیل میں درج کیے ہیں - مصنّف کا مملوکہ نسخہ مصطفائی دھلی میں ۱۲۷۲ھ میں چھپا، تعداد صفحات ۱۲۰.

نوادر اور اِبطالِ ضرورت غالبًا ایک ہی زمانے میں تألیف ہوئیں (طلوعیدن کی بحث ص ۳ کا مقابلہ اِبطالِ ضرورت ص ۶۱ سے کیجیے، عبارتیں

مِن و عن وہی ہیں).

اس کتاب کے اندراجات کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ خانِ آرزو کے نام سے زوائد الفوائد کا ایک نسخہ رامپور کے کتابخانے میں موجود ہے، جو 'نشستن' کے مصدر پر یک لخت ختم ہو گیا ہے - اس کے بعض اقتباسات ڈاکٹر منوہر سہاے انور نے اپنے تحقیقی مقالے میں درج کیے ہیں: وہ کم و بیش وہی ہیں جو نوادر المصادر میں ہیں - معلوم نہیں اصل عبارتیں بہار کی ہیں یا خانِ آرزو کی - ایک قلمی نسخہ بانکی پور، پٹنے کے کتابخانے میں موجود ہے (فہرست مخطوطات، ص ۳۲).

۳ - جواہر الحروف: بہار نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ دورانِ تألیفِ بہارِ عجم میں کتبِ لغت مثلِ سراج اللغة وغیرہ اور شروح سے حروف کے سلسلے میں جو کچھ حاصل ہوا اسے اس میں یک جا کر دیا ہے - یہ کتاب ایک مقدمہ، دو باب اور خاتمے پر مشتمل ہے - اس کتاب کی تألیف کے زمانے ہی میں رسالہ ابطالِ ضرورت بھی لکھا گیا (دیباچۂ جواہر الحروف، ص ۲)، تعداد صفحات ۱۰۰، طبع کانپور (۱۲۶۷ھ، بلخمن، ص ۲۹) - بلخمن (ص ۳۰) نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے.

۴ - ابطالِ ضرورت: ضرورتِ شعری کے موضوع پر یہ رسالہ (تعداد صفحات ۸۷) لکھا گیا - اس میں بعض ضمنی مباحث بڑے اہم ہیں (مثلاً ص ۵۷ پر ملتانی کی توضیح، ص ۶۶ پر استعمالِ ہند، ص ۶۷ پر توافقِ لسانین وغیرہ) - یہ کتاب ۱۲۶۸ھ میں دہلی میں طبع ہوئی.

۵ - شرح نصابِ بدیع: محمد شریف کے نصابِ بدیع کی شرح لکھی ہے، جس میں عربی اور فارسی کے مشترک الشکل اور مختلف المعانی الفاظ درج ہیں - اس کا قلمی نسخہ بانکی پور، پٹنے کے کتب خانے میں ہے (فہرست مخطوطات، فارسی، ص ۵۰).

۶ - جواہر الترکیب: دیکھیے [فیلن و کریم الدین: تذکرۂ شعراے ہند، ص ۶۵:] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۱۶۵.

مآخذ: بہار کی تصانیف کے علاوہ مندرجۂ ذیل مآخذ استعمال کیے گئے ہیں:-

(۱) خانِ آرزو: مجمع النفائس، قلمی، دو نسخے در کتابخانۂ دانش گاہ پنجاب، شمارہ ۲۳ PFI، ص ۳۱۱ و ذخیرۂ شیرانی، شمارہ ۱۳۸۹، ورق ۱۵۶ب: (۲) میر تقی میر: نکات الشعراء، طبع دوم، دکن ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۳ ببعد: (۳) قائم: مخزن نکات، طبع اوّل، ص ۲۷، ۲۶: (۴) قدرت اللہ قاسم: مجموعۂ نغز، لاہور ۱۹۳۳ء، ص ۱۱۴ ببعد: (۵) میر حسن: تذکرۂ شعراے اردو، دہلی ۱۹۴۰ء (طبع ثانی)، ص ۲۶: (۶) غلام ہمدانی مصحفی: ریاض الفصحاء، دہلی ۱۹۳۴ء، ص ۴۰: (۷) فتح علی حسینی: تذکرۂ ریختہ گویان، (طبع انجمن ترقی اردو)، حیدر آباد دکن ۱۹۳۳ء، ص ۲۱ تا ۲۳: (۸) امراللہ الہ آبادی: تذکرۂ مسرّت افزا، (باقساط معاصر میں طبع ہوا) پٹنہ ۱۹۵۸ء ببعد: (۹) شپرنگر Sprenger: *Oudh Catalogue*، کلکتہ ۱۸۵۴ء، ص ۲۱۱: اردو ترجمہ از طفیل احمد: یادگار شعراء (طبع ہندوستانی اکیڈیمی)، الہ آباد ۱۹۴۳ء، ص ۴۰: (۱۰) علی ابراہیم خلیل: گلزار ابراہیم، مع گلشن ہند، علی گڑھ ۱۹۳۴ء / ۱۳۵۲ھ، ص ۴۳: (۱۱) سید علی حسن خان: بزم سخن، آگرہ ۱۲۹۸ھ، ص ۲۳: (۱۲) عبدالغفور خان نسّاخ: سخن شعراء، لکھنؤ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء، ص ۶۹: (۱۳) شفیق اورنگ آبادی: چمنستان شعراء، دکن ۱۹۲۸ء، ص ۴۴ تا ۴۸: (۱۴) صدیق حسن خان: صبح گلشن، بھوپال ۱۲۹۵ھ، ص ۶۹: (۱۵) سری رام:

خمخانۂ جاوید، جلد اوّل، دھلی ۱۹۰۸ء، ص ۶۱۲ تا ۶۱۳؛ (۱۶) ڈاکٹر سیّد محمّد عبداللہ: ادبیات فارسی میں ھندوؤں کا حصّہ، دھلی ۱۹۴۲ء؛ (۱۷) کیفی چڑیا کوٹی: جواھر سخن، جلد اوّل، الہ آباد ۱۹۳۳ء، ص ۱۸۸؛ (۱۸) بلخمن Blochmann: *Contributions to Persian Lexicography*، در *JRAS*، ج ۱، ۱۸۶۸ء؛ (۱۹) گارساں د تاسی Garcin de Tassy: *Histoire de la Littérature Hindouie et Hindoustanie*، طبع دوم، ۱: ۲۸۱ ببعد: ۳: ۳۰۹ (صرف تذکرۂ نسخۂ دلکشا، کلکتہ ۱۸۷۰ء، ج ۱ میں بہار کے ترجمے کا حوالہ)؛ [اسی کتاب کا ترجمہ، از فیلن و کریم الدین: تذکرۂ شعراء ھند، ۵۶ ببعد]؛ (۲۰) نظامی بدایونی: قاموس المشاھیر، جلد اوّل، طبع اوّل، تاریخ طباعت ندارد، ص ۱۶۳؛ (۲۱) عبدالحمید: جامع اللغات، حصّۂ دوم، لاھور، تاریخ طبع ندارد، ص ۳۱۸؛ (۲۲) زخاؤ Sachau: *Catalogue of Persian, Turkish, Hindustani and Pashtu MSS. in the Bodleian Library*، طبع ۱۸۸۹ء، حصّۂ اوّل، ص ۱۰۱۸، شمارہ ۱۶۵۷؛ (۲۳) ریو Rieu: *Catalogue of the Persian MSS. in the British Museum*، جلد دوم، (طبع ۱۸۸۱ء)، ص ۵۰۲؛ (۲۴) M. Abdul Muqtadir Khan Bahadur: *Catalogue of the Arabic and Persian MSS. in the Oriental Public Library of Bankipur*، ۹: ۳۲، ۳۳، ۳۹؛ (۲۵) منوھر سہائے انور: *Siraj ud Din Ali Khan Arzu, his Life and Works* (رسالۂ ڈاکٹری، ٹائپ شدہ مخطوطہ، در دانش گاہ پنجاب)، ص ۶۰، ۱۳۶، ۱۳۹۔

(وحید قریشی)

* **ثاء**: عربی حروفِ تہجّی کا چوتھا حرف، جس کے اعدادِ جُمّل ۵۰۰ ہوتے ہیں ۔ اس کی شکل ایک متوازی الافق خط کی سی ہے، جس کے سرے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے ہوں ۔ اس پر تین نقطے ہوتے ہیں اور یہی تین نقطے اسے تہجّی کے تیسرے حرف ''تاء'' سے، جس پر صرف دو نقطے ہوتے ہیں، متمیّز کرتے ہیں ۔ اسی مشابہت کی وجہ سے [عربی ابجد میں] اس کی جگہ تاء کے فوراً بعد رکھی گئی ہے۔

عربی کے علاوہ دوسری سامی ابجدوں میں صرف جنوبی عربی ابجد ایسی ہے جس میں ''ث'' کی آواز کے لیے ایک مخصوص حرفی شکل موجود ہے۔

علمِ اشتقاق کے اعتبار سے کنعانی زبان کا ש، آرامی ת (قدیم آرامی ש)، آشوری ش اور حبشی زبان کا ሰ عربی ثاء کے عین مطابق ہے ۔ عربی میں بعض دفعہ ''ثاء'' بدل کر ''فاء'' ہو جاتی ہے [مثلاً ثُوْم سے فُوْم ۔ تلفّظ کے اعتبار سے ثاء کا شمار حروفِ سِنّیہ میں ہے]۔

(A. J. Wensinck وِینسِنک)

* **ثأر**: رکّ بہ قِصاص.

* **ثابت**: عثمانیوں کے عبوری دور کے اس اہمّ شاعر کا نام علاء الدین تھا ۔ اس کا زمانہ زیادہ‌تر سلطان احمد ثالث کے عہد (۱۷۰۳ تا ۱۷۳۰ء) میں گذرا ۔ اس کا اندازِ بیان خاص اور ممیّز ہے، جس میں نمایاں جدّت ہے ۔ ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء کے قریب وہ بوسنہ کے قصبۂ اُوزیجہ میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا ۔ اس کے والدین صَرْبی۔خَرْواتی (Serbo-Croat) نسل کے تھے ۔ یہ شاعر وُصْلَتْ علی بک پاشیچ اُوزیْجوِی اور شاعری عبداللہ سِراجیواوی کے رشتے داروں میں سے تھا ۔ وہ ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ - ۱۷۱۳ء کو قسطنطنیہ میں فوت ہوا ۔ [ابتداءً] اس نے رجالِ دین میں شامل ہونا چاہا اور تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ قسطنطنیہ میں وارد ہوا ۔ شعر و سخن کے طبعی سلکے کو اس نے مشق سے خوب جلا دی تھی، اس لیے وہ بہت جلد مشہور ہو گیا ۔ اسے کئی سرپرست مل گئے اور ساتھ ہی اس کے ہمکاروں میں کئی حاسد بھی پیدا ہو گئے ۔ ان دنوں سرکاری ملازمتوں کے حاصل کرنے میں اقرباء پروری اور رشوت‌ستانی کا بازار گرم تھا، اس لیے مسلّمہ قابلیّت کے باوجود وہ ''مُلازِم'' کے عہدے سے آگے ترقّی نہ کر سکا، یہ رتبہ اسے ۱۰۸۹ھ میں ملا ۔ اس لیے اس نے مدرّسی کے عہدے سے استعفٰی دے دیا اور یہ استعفٰی ہی اعلٰی عہدوں کے حصول کے لیے پہلا زینہ ثابت ہوا ۔ اس نے عدل و انصاف کے محکمے میں ملازمت شروع کی، جس کی وجہ سے اسے متعدّد مقامات میں جانا پڑا، یعنی چورلی، برجاس، ادرنہ (۱۰۹۷ھ)، کَدِنْبہ، رودستو [تکفور طاغی]، سِراجیوو (۱۱۱۲ھ)، قونیہ (۱۱۱۷ھ) اور دیاربکر میں (۱۱۱۹ - ۱۱۲۱ھ، جہاں جانے کے لیے وہ بالخصوص خواہشمند تھا) ۔ حسبِ قواعد چونکہ میعادِ ملازمت صرف ایک سال کی ہوا کرتی تھی اور ہر تقرّر کے ختم ہونے

کے بعد اسے خاصی مدّت تک بیکار رہنا پڑتا تھا (معزُول) اور اس دوران میں آسے کوئی وظیفہ بھی نہیں ملتا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ مالی پریشانیوں اور مشکلات میں مبتلا رہتا تھا: اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ناجائز ذرائع استعمال کر کے امیر بننے کو وہ قابلِ شرم بات سمجھتا تھا۔ اس کے اعلٰی اخلاق کا لوہا اس کے دشمن بھی مانتے تھے۔ پھر تقدیر نے بھی اسے کاری ضربیں لگائیں: مثلاً جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے اُس کا سب مال و متاع جاتا رہا اور اس کے گھرانے کے چند افراد کو ذبح کر دیا گیا اور کئی قیدی بنا لیے گئے۔ اُس کا سلسلۂ ملازمت اُس کی وفات (۱۱۲۴ھ) سے خاصا عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا۔

ثابت کی زبان میں لُکنت تھی، جو ملازمت کے اثناء میں اس کی آئندہ ترقّی میں مزاحم بن گئی لیکن لُکنت کی تلافی یوں ہوئی کہ اس کے قلم میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی۔ اُس کی تصنیفات میں متعدّد لسانی خصوصیّات ایسی ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ترکی النسل نہیں تھا۔ الفاظ اور زبان پر اسے زبردست قدرت حاصل تھی۔ ترکی الفاظ کے وسیع ذخیرے خصوصاً محاورات کے لحاظ سے اس کا کلام تمام ترکی ادب کے غنی ترین اور پُر قیمت ترین اجزاء میں سے ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً ضرب الامثال اور ایسے مقولے استعمال کرتا ہے جو زبان زد خاص و عام ہوں، خواہ مطالب کے لحاظ سے وہ کتنے ہی مبتذل کیوں نہ ہوں۔ اُس کی زبان کا جوانانہ زور، اُس کی قوّت بیان اور تشبیہات و استعارات کی افراط دیکھ کر انسان حیرت میں کھو جاتا ہے۔

مشہور تو تھا کہ وہ سلسلۂ ملامتیہ۔ بیرامیہ کا رکن تھا، پھر وہ عموماً صوفیانہ مصطلحات بھی استعمال کیا کرتا تھا لیکن ان باتوں کے باوجود اس میں صوفیوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ حقیقت کے متعلّق اس کے احساسات نہایت نمایاں تھے، مگر یہ صفت دیگر عثمانی شعراء میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ خاص چیز جس نے اس کے کلام کو امتیازی خصوصیّت عطا کی اور دیگر عثمانی شعراء سے آسے بمراتب بلند کر دیا، اس کا اسلوب بیان ہے، جس سے اس کی انفرادی شخصیّت اس کے اشعار میں جھلکتی ہے۔ اس نے ترکوں کی خالی از آہنگ شاعری میں، جو عموماً حد درجے کی مجرّد اور خیالی تھی، نئی زندگی بھر دی اور اس میں اپنی رنگین شخصیت سمو دی، جو اس کے کلام سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے اور اس کی شاعری میں ایک گرم خون شاعر کی روح پھونک رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ لفّاظی کی نمایاں شعبدہ بازی کی وجہ سے اُس کے احساسات میں زیادہ گہرائی موجود نہیں، تاہم وہ حقیقی شاعر ہے۔ جس چیز نے آسے ہمیشہ محبوب اور یقینی طور پر مقبول بنایا وہ اس کا غیر مختتم طنز و مزاح ہے، جس سے بے اختیار ہنسی آتی ہے اور یہ خوبی بایں انداز دیگر عثمانی شعراء کے ہاں نہیں ملتی۔ اُسے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں انہماک اور ذو المعنیین کنایات اور صنعتِ ایہام کے استعمال میں ید طولٰی حاصل ہے مگر یہ کنائے وغیرہ ہمیشہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ تضادِ کلّی، جو وہ کلام میں پے در پے لاتا ہے، اس کی خصوصی چیز ہے، یعنی وہ سادہ کلام کے بعد پیچیدہ بلکہ پیچ در پیچ کلام لائے گا، حسین کلام کے بعد پست کلام اور تعبیرات متقیانہ کے بعد پوچ گوئی بلکہ فحّاشی پر بھی اُتر آئے گا۔

اگرچہ ہم اسے مروّجہ اصطلاح کے مطابق ایک عوامی شاعر نہیں کہہ سکتے (اس لیے کہ مثلاً اُس نے کوئی ''شرقی'' نہیں لکھی اور

اس کے وسیع علم و فضل کی وجہ سے اس کی نظموں کو سمجھنا آسان نہیں ہے) پھر بھی وہ ہمیشہ بہت سے حلقوں میں مقبول رہا ۔ اس کے کلام کے قلمی نسخے بیشمار ہیں، کیونکہ اس کا دیوان اکثر نقل ہوتا رہا ہے اور اس کی تصانیف کے طبع نہ ہونے کی وجہ بھی غالبا یہ ہے کہ اس کے دیوان کے بہت سے مخطوطے موجود ہیں ۔ موجودہ دور میں ترکیہ کی ادبی تنقید کا رخ اس کے خلاف ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بالکل بجا اور درست بات ہے.

اس کی تصانیف میں سے ایک دیوان ہے، جس میں ۳۷ قصیدے ہیں (ان میں ''معراجیّہ'' شامل ہے، جس کی سنگی طباعت بھی موجود بتائی جاتی ہے اور دو نعتیں بھی)؛ ان کے علاوہ تقریباً ۳۶۴ غزلیں ہیں (غزلیں اس کی شاعری کا کمزورترین حصّہ ہیں) اور چند تخمیسات، کچھ مُعمّیات، ۶۰ رباعیاں، ۱۰۰ مُفردات، ۵۰ تأریخی قطعات ۔ دیوان کے علاوہ اُس نے متعدّد مثنویاں بھی لکھیں ۔ ایک ظفر نامہ بھی ہے، جو اس نے سلطان سلیم گرای کے لیے لکھا تھا ۔ (طبع استانبول ۱۲۹۹ و ۱۳۱۱ھ) ۔ دیگر تصنیفات یہ ہیں : اِدہم و ہُما (اَدہم نامہ)، بِربِر نامہ، دِرہ نامہ (حکایت خوجہ فِساد، حکایتِ دُونـاو دِرہ) اور حکایت عمرولیث.

مآخذ : (۱) Hammer-Purgstall : *Geschichte der osmanischen Dichtkunst*؛ (۲) Gibb : *A History of Ottoman Poetry*، ج ۴ : (۳) بروسہ‌لی محمد طاہر : عثمان لی مؤلّفلری، استانبول ۱۳۳۳ھ، ۲ : ۱۱۸؛ (۴) بالخصوص مفرد رسالہ Jan Rypka : *Beiträge zur Biographie, Charakteristik und Interpretation des türkischen Dichters Sabit*، پراگ Prag ۱۹۲۴ء، جس میں ضروری تذکروں اور دیگر ادبی ماخذ پر مفصّل بحث کی گئی ہے : [(۵) سامی : قاموس الاعلام، ص ۱۷۳۵].

(مینشیل TH. MENZEL)

ثابت بن قُرّة : ماہر ریاضیّات، طبیب اور فلسفی تھا ۔ اس کا شمار تیسری صدی ہجری / نویں صدی میلادی کی اُن عظیم‌المرتبت ہستیوں میں ہے جنہوں نے دانشِ عرب کے ارتقاء میں حصّہ لیا ۔ وہ [حدود ۲۱۹ھ / ۸۳۴ء (تکملۂ بـرا کلمان)] میں بمقام حرّان پیدا ہوا، جو سیّارہ پرست [صابیوں] کا قدیم مرکز تھا ۔ وہ ایک سربرآوردہ خاندان کا فرد تھا، جو حرّان میں آباد تھا ۔ اس خاندان میں یکے بعد دیگرے متعدّد فضلاء پیدا ہوے ۔ اس کے شجرۂ نسب کے اوپر کے نام (ثابت بن قرّہ بن زہرُون [مـرْوان؟]، [ہارون؟ شذرات، ۲ : ۱۹۶] بن ثابت بن [ابراہیم بن: وفیات] کرایا بن ماریِنُوس بن مالاغریوس ([Μελέαγρος]) ہمیں اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں جب اس قصبے کی زندگی کی یونانی خصوصیات لوگوں کے ناموں کی صورت سے عیاں تھیں : کو مزید تحقیق کے بغیر یہ فرض کر لینا صحیح نہ ہوگا کہ ثابت یونانی آبادکاروں کی نسل سے تھا ۔ اصحاب تراجم کا بیان ہے کہ ثابت ابتدا میں صرّافی کا کام کرتا تھا ۔ بہرحال اپنی موروثی ثروت ہی کی بناء پر اس نے اپنے قیام بغداد کے دوران میں فلسفے اور ریاضی میں مہارتِ تامّہ حاصل کی ۔ فلسفیانہ آزاد خیالی کی وجہ سے اس کی اپنے قصبے کے سیّارہ پرستوں سے آویزش ہوئی ۔ وہ مذہبی عدالت کے رو برو پیش کیا گیا اور اپنی فلسفیانہ ضلالت آمیز رایوں سے تائب ہونے پر مجبور ہوا ۔ بعد ازآن دارا [کیسترینج، ص ۹۶] کے قریب موضع کفرتوثا میں منتقل ہو جانے کی وجہ سے وہ مزید اذیّت سے محفوظ رہا ۔ کہتے ہیں کہ یہاں اس کی ملاقات محمّد بن موسٰی ابن شاکر سے ہوئی، جو اس وقت بلادِروم (بوزنطہ)

سے بغداد واپس آ رہا تھا ۔ جب ریاضی میں ثابت کی صلاحیّت اور اس کی لسانی قابلیّت سے محمّد آگاہ ہوا تو وہ اُسے اپنے ہمراہ بغداد لے گیا، تاکہ اسے خلیفہ معتضد کے حضور میں باریاب کرے؛ چنانچہ خلیفہ نے اسے اپنے درباری منجّموں کے زمرے میں شامل کر لیا ۔ بغداد میں ثابت نے زندگی کا بیشتر حصّہ یونانی علماء کی تصانیف کے ترجمے اور شرح نویسی میں صرف کیا؛ اس کے علاوہ اس نے خود بھی ریاضی میں کتابیں تألیف کیں، فلسفے کا مطالعہ اور مطبّ کا شغل بھی جاری رکھا ۔ آخرکار اس نے وہیں [۲۶ صفر ۲۸۸ھ/] ۱۸ فروری ۹۰۱ء کو ۶۷ [شمسی] سال کی عمر میں وفات پائی (تکملۂ براکلمان، ۱: ۳۸۴، مگر قبّ ابن ابی اُصَیْبِعَۃ، ۱: ۲۱۷)۔

خلیفہ کے دربار میں ثابت کے اثر و رسوخ سے حرّان اور دوسرے مقامات کے صابیوں کو بہت فائدہ پہنچا ۔ ثابت کی سریانی تصانیف، جو اس نے غالباً حرّان ہی میں اپنے ہم مذہبوں کے عقائد اور طریقِ عبادت کے متعلّق لکھی تھیں، ابن العبْری Barhebraeus (م ۱۲۸۶ء) کو ایک حد تک معلوم تھیں لیکن اب وہ بظاہر ناپید ہیں ۔ متأخّر ہیلینیّت (Hellenism) کی مذہبی تاریخ مرتّب کرنے میں آج وہ تصانیف بےانتہا قیمتی ثابت ہوتیں ۔ ثابت کی عربی تصانیف کی فہرستیں خُوْوُل زُون D. Chwolsohn، زوٹر Suter، شْتائن شنائڈر Steinschneider، براکلمان Brockelmann اور ویڈیمان Wiedemann نے کتب مذکورۃ الذّیل میں درج کی ہیں ۔ بہت سا قیمتی اور قابلِ اشاعت مواد اب بھی مخطوطات کی صورت میں موجود ہے ۔ زوٹر نے اپنی تألیف *Mathematiker und Astronomen der Araber*، ص ۳۶ ببعد میں اس مواد کی اجمالی فہرست دی ہے ۔ ویڈیمان نے رسالۂ *Beiträge*, lxiv., *Über Thābit ben Qurra, sein Leben und sein Wirken*، مشمولہ (*SBPMS*)، ارلانگن Erlangen ۱۹۲۰—۱۹۲۱ء، کے ص ۲۱۰ تا ۲۱۷ پر ثابت کی تصانیف کی مضمون‌وار فہرست دی ہے، جو مجمل جائزے کی حیثیت سے مفید ہے ۔ [براکلمان نے *GALS*، ۱: ۳۸۴ تا ۳۸۶ میں مفصّل مضمون‌وار فہرست دی ہے] ۔ ثابت کی نشر شدہ یا ترجمہ شدہ تصنیفوں کو سطور آیندہ میں بذیل مآخذ دیا گیا ہے ۔ سنان بن ثابت اور اس خاندان کے متأخّر افراد کے پورے حالات کے لیے خُوْوُل زُون Chwolsohn کی کتاب: *Die Ssabier*، ۱: ۵۶۶ تا ۶۱۰ ملاحظہ ہو ۔

مآخذ: (۱) ابن النّدیم: الفہرست، طبع فلوگل، ۱۸۷۰ء، ۱: ۲۷۲؛ [(۲) علی بن زید البیہقی: تتمّۃ صوان الحکمۃ، لاہور ۱۳۵۱ھ، ص ۶، ۱۷۷، ۲۱۹]؛ [۳] ابن القِفْطی: تاریخ الحکماء، طبع Lippert، ۱۹۰۳ء، ص ۱۱۵ تا ۱۲۲؛ [۴] ابن خلّکان: وفیات [طبع قاہرۃ ۱۳۱۰ھ، ج ۱: ۱۰۰]، ترجمہ دیسلان M. de Slane، ۱۸۴۳ء، ۱: ۲۸۸؛ [۵] ابن ابی اُصَیْبِعَۃ، طبع A. Müller، ۱: ۲۱۵ تا ۲۲۴؛ (۶) الشَّہْرِسْتانی: کتاب المِلَل و النِّحَل، طبع Cureton، ۱۸۴۶ء، ۲: ۲۰۲ تا [۲۱۵]؛ (۷) Haarbrücker: *Religionspartheien*، ۲: ۴ تا ۱۶؛ (۸) وُسْتَنْفِیلْٹ Wüstenfeld: *Geschichte der arabischen Ärzte*، ۱۸۴۰ء، ص ۳۴ تا ۳۶؛ (۹) D. Chwolsohn: *Die Ssabier*، ۱۸۵۶ء، ۱: ۵۴۶ تا ۵۶۷؛ ج ۲، دیباچہ؛ (۱۰) M. Steinschneider: *Die arabischen Übersetzungen aus dem Griechischen*، در *ZDMG*، ج ۵۰ (۱۸۹۶ء): ص ۱۶۵ ببعد و ۳۰۹ ببعد؛ (۱۱) H. Suter: *Das Mathematiker-verzeichnis*، ۱۸۹۲ء، ص ۲۵؛ (۱۲) وہی مصنّف: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber*، ۱۹۰۰ء، ص ۳۴ تا ۳۸؛ (۱۳) C. Brockelmann: *GAL*، ۱: ۲۱۷؛ [و تکملۃ، ۱: ۳۸۴ ببعد]؛ (۱۴)

Über Thābit ben Qurra, sein Leben: E. Wiedemann und Wirken, Beiträge, lxiv، در SBPMS، ارلانگن Erlangen ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۱ء، ص ۱۸۹ تا ۲۱۶؛ (۱۵) G. Sarton: Introduction to the History of Science، ج ۱، (۱۹۲۷ء): ص ۵۹۹؛ (۱۶) M. Cantor: Vorlesungen، ج ۱، طبع ثانی، ۱۸۹۴ء: ص ۶۶۳؛ (۱۷) A. Braunmühl: Vorlesungen über Geschichte der Trigonometrie، ۱۹۰۰ء، ص ۴۶؛ (۱۸) L. E. Dickson: History of the Theory of Numbers، ۱۹۱۹ء، ۱ : ۵، ۳۶؛ (۱۹) F. Woepcke: Notice sur une théorie ajoutée par Thābit à l'arithmétique spéculative des Grecs، در JA، ج ۲۰، (۱۸۵۲ء): ص ۴۲۰ تا ۴۲۹؛ (۲۰) L. Nix: Das fünfte Buch der Conica des Apollonius von Perga etc.، لائپزک Leipzig ۱۸۸۹ء؛ (۲۱) P. Duhem: Les origines de la statique، ج ۱ (۱۹۰۵ء): ص ۹۷ تا ۹۲؛ (۲۲) Dreyer: Planetary Systems، ۱۹۰۶ء، ص ۲۶۷؛ (۲۳) E. Wiedemann: Über die Hebelgesetze bei den Muslimen، در Arch. f. G. d. Nw.، ج ۱، (۱۹۰۹ء): ص ۲۱۱؛ (۲۴) C. Prüfer اور M. Meyerhof: Die angebliche Augenheilkunde des Thābit، در Centralbl. f. Augenheilkunde، ج ۳۵، (۱۹۱۱ء): ص ۳ و ۳۸؛ (۲۵) E. Wiedemann: Die Schrift über den Qarasṭūn، در Bibl. Math.، ج ۱۲، (۱۹۱۲ء): ص ۲۱ تا ۳۹؛ (۲۶) Duhem: Système du Monde، ۲، (۱۹۱۳ء): ص ۱۱۷ تا ۱۱۹، ۲۳۸ تا ۲۴۶؛ (۲۷) زوٹر H. Suter: Über die Ausmessung der Parabel von Thābit، در SBPMS، ج ۴۸، ارلانگن Erlangen ۱۹۱۸ء: ص ۶۵ تا ۸۶؛ (۲۸) F. Büchner: Die Schrift über den Qarasṭūn، در SBPMS، ج ۵۲، ارلانگن Erlangen ۱۹۲۰ء: ص ۱۴۱ تا ۱۸۸؛ (۲۹) E. Wiedemann اور J. Frank: Über die Konstruktion der Schattenlinien auf horizontalen Sonnenuhren von Thabit ben Qurra، در Kgl. Danske Vid. Selskab، ج ۴، ۱۹۲۲ء؛ (۳۰) A. Björnbo: Thabits Werk über den Transversalensatz، Erlangen ۱۹۲۴ء؛ (۳۱) G. Schoy: Graeco-arabische Studien، در Isis، ج ۸، ۱۹۲۶ء: ص ۳۵ تا ۴۰؛ (۳۲) C. Schoy: Die trigonometrischen Lehren des.... al-Bīrūnī، ہانوور Hanover ۱۹۲۷ء، ص ۷۴ ببعد؛ [(۳۳) تا (۳۵) آس کی کتاب الذخیرہ کی طباعت اور تلخیص اور ریاضی کی ایک کتاب تینوں کے متعلق دیکھیے Fulton-Lings، ص ۶۱۷؛ نیز (۳۶) F. J. Carmody: The astronomical works of Thābit b. Qurra، برکلے Berkeley ۱۹۶۱ء]۔

(J. Ruska رُسکا)

* **ثروت** Servet: رک بہ طاہر بک.

* **اَلثُّرَیَّا**: یعنی مجمع الکواکب [پروین]: القزوینی کے قول کے مطابق اس مجموعے میں دو زیادہ روشن ستارے ہیں اور ان کے درمیان تین اور ستارے اکٹھے اور قریب قریب ہیں، جیسے خوشے میں انگور۔ یہ مجموعہ محض 'النّجم' کے نام سے بھی موسوم ہے اور اس کا بڑا ستارہ (η = یہ الکیّونہ Alkyone) وسط، جوزہ، یا نیّرالثریّا کہلاتا ہے، یعنی ثریّا کا قلب، درمیانی یا روشن ستارہ۔ لفظ ثُرَیّا، ثَروی کی تصغیر ہے، جس کے معنی ''متموّلۃ، مال دار'' کے ہیں [ثریّا میں تصغیر اس لیے ہے کہ مذکور ستاروں میں قدرے کثرت ہے، یا اس مجمع کواکب کے ستاروں کی خردی کے لحاظ سے یا تصغیر بجہت تعظیم (دیکھیے فرہنگ انند راج، ۱ : ۳۸۷)]۔ یونانی میں ثریّا کو Pleiades کہتے ہیں۔ لہٰذا لفظ ثریّا یونانی لفظ πλεῖος کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے،

بشرطیکہ اس نام کو πλεός سے متعلق کیا جا سکے، نہ کہ πλεῖν سے، جس کے معنی ''جہاز رانی'' ہے [یا اس کا تعلق πελειάδες سے ہے، جس کے معنی ''فاختہ'' ہیں؛ قب G. E. Marindin : *A Smaller Classical Dictionary* etc. طباعت سیزدہم، لنڈن ۱۹۱۰ء، ص ۱۲۷]۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس مجمع کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ بوقت طلوع آفتاب اس کے نکلنے پر اگر بارش ہو تو وہ پیداوار کی بہتات کا باعث ہوتی ہے [''فی المطر عند نوءها ثروۃ'' : قزوینی]۔ بہر حال قدیم زمانے سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ ثریّا کا موسم پر، نیز قدرت کے ان مظاہر پر جن کا موسم پر انحصار ہے، بہت اثر پڑتا ہے۔ ہیئت دان ابن ابی الرّجال Abenragel کا، (جو گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی میلادی میں ہوا ہے) قول یہ ہے کہ اس مجموعے کا زیادہ مقبول نام دَجاجۃ السّماء مع بَناتہا ہے، جس کے معنی ہیں آسمان کی مرغی اور اس کے چوزے۔ چنانچہ انگریزی میں بھی اس کا جو نام رائج ہے (یعنی Hen and Chickens) اس کا ترجمہ مُرغی اور چوزے ہی ہے [مگر مسیحی آرٹ میں مرغی اور چوزے فضلِ ایزدی کی علامت بھی ہے، دیکھیے متی، ۲۳ : ۳۷ ; E. C. Brewer : *Dic. of Phrase and Fable*]۔ اس مجمع کو اب کو ایک مرصّع تاج بھی تصوّر کرتے ہیں اور شعراء کے کلام میں اس کا بکثرت ذکر آتا ہے۔ لفظ ثریّا بطور افراد کے نام کے بھی مستعمل ہے، چنانچہ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ افغانستان کی ایک ملکہ کی وجہ سے، جو اسی نام سے موسوم تھیں، یہ نام بہت مشہور ہوا تھا۔

مآخذ: (۱) القزوینی: عجائب المخلوقات، طبع وُستنفیلٹ Wüstenfeld، ۱ : ۳۵، ۴۳ ; ترجمہ از ایتے H. Ethé، موسوم بہ *Kosmographie*، ص ۷۵، ۹۰ ; (۲) L. Ideler : *Untersuchungen über den ursprung und die Bedeutung der Sternnamen*، ص ۱۴۶۔

(J. Ruska رُسکا)

ثُریّا: محمّد، ترک سیرت نویس، جو استانبول میں پیدا ہوا۔ حُسنی بک کا بیٹا تھا (قب سجلِ عثمانی، ۲ : ۱۲۸)۔ اُس نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور ۱۹ ذوالحجّۃ ۱۳۲۶ھ / ۱۲ جنوری ۱۹۰۹ء کو دورانِ ملازمت میں، جب وہ محکمۂ تعلیم کے مأمورین میں سے تھا، اپنے وطن میں فوت ہوا۔ اُس کا مزار سقوطری کے قبرستان قرجہ احمد میں ہے۔ محمّد ثریّا نے عثمانیوں کے تراجم قومی کی معجم تألیف کر کے لا زوال شہرت حاصل کی۔ اس معجم کا نام سجلِّ عثمانی ہے، جو چار جلدوں میں استانبول سے ۱۳۰۸ و ۱۳۱۵ھ کے درمیان شائع ہوئی۔ اس تصنیف کی ترتیب، مندرجات اور مؤرخین کے لیے اُس کی اہمیت کے متعلق قب بابنگر F. Babinger : *G. O. W.*، ص ۳۸۶ ببعد۔ یہ بات کہ سجلِ عثمانی کے بیانات کو استعمال کرتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے، اس علمی کارنامے کی عظمت کو کم نہیں کر سکتی، اس لیے کہ اس کی تکمیل ایک آدمی کے ہاتھوں حیرت انگیز ہے۔ مگر محمّد ثریّا کی تألیف نے تراجم قومی کی ایسی عثمانی معجم کی تألیف کو جو علمی اصولوں کے مطابق مرتّب کی جائے تحصیلِ حاصل نہیں بنا دیا [اور اُس کی جگہ ابھی خالی ہے]۔ محمّد ثریّا نے نُخبۃ الوقائع (استانبول، پانچ حصّے، جن میں ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء تک کا ذکر ہے) کے عنوان سے ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء تا ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء کے زمانے کے سرکاری عہدوں اور عہدےداروں کے مختصر تراجم لکھنا شروع کیے، مگر یہ کتاب ناتمام رہی۔ اُس کی ادبی باقیات میں تراجم کی متعدّد تصانیف اور تاریخ عصری پر تحریریں ملیں، جو اس نے شروع کر رکھی تھیں، مگر ان تصانیف کی اشاعت یا ان سے استفادہ کا ابھی انتظار ہے؛ قب *G. O. W.*، ص ۳۸۷۔

مآخذ: (۱) محمّد طاہر: عثمانلی مؤلّفلری،

۳ : ۳٦ ببعد (۲) بابنگر F. Babinger : G. O. W.، ۳۸۵ ببعد.
(بابنگر FRANZ BABINGER)

* **الثّعالبیّ** : تین [مشہور] عرب مصنّفین کا اسم نسبتی [جو 'ثعالب' سے مأخوذ ہے، یعنی لومڑیوں کی کھالوں کے سینے اور انہیں تیّار کرنے والا].

(الف) ابو منصور عبدالملک بن محمّد بن اسمعیل [''جاحظ نیشاپور''، دُمْیۃ القصر، تتمّۃ الیتیمۃ، ۲ : ۲۱، س ۳ میں ایک معاصر نے شعر میں اُسے کہا ہے :

ع فانت الیوم جاحظ اہل عصرک]

پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی میلادی کا [فصیح و بلیغ کاتب اور شاعر جس کے مُثمر دماغ نے پچاس سے زیادہ تألیفات یادگار چھوڑیں؛ قب تکملۂ براکلمان، ۱ : ۴۹۹؛ کتاب المتشابہ، لاہور ۱۹۰۵ء، صہ ۱، ح ۳] - اس کی زندگی کے حالات کے متعلّق ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ ۳۵۰ھ / ۹٦۱ء کو نیشاپور میں پیدا ہوا اور اُس نے ۴۲۹ھ/۱۰۳۸ء میں [یا ۴۳۰ھ / ۱۰۳۹ء میں بقول دمیری و یافعی؛ بقول ابن عماد : ۴۳۰ھ میں یا ۴۲۹ھ میں] وفات پائی - [اس کی اپنی تصنیفات اور بعض دیگر مآخذ سے لے کر چند متفرق باتیں، جو اس کے حالات سے متعلّق ہیں، اس مقالے کے آخر میں ص ۱۰۱۴ پر ایک تعلیقے کی صورت میں درج کر دی گئی ہیں] - [اپنی تألیفات میں، جو بے شمار ہیں، وہ] اپنے پیش رووں کی ذہنی تخلیقات کے معاملے میں بہت زیادہ احتیاط نہیں برتتا؛ [مثلاً دیکھیے اس کی فقہ اللغۃ مذکور در سطور ذیل، جس میں وہ ابن درید، خوارزمی ابوالحسن جرجانی کی فصول بعینہٖ نقل کرتا ہے، کو ان کا نام لیتا ہے : یہی حکم اس کی انشاء کے بہت سے جملوں اور ان کے معانی کا ہے] اور بارہا ایک کتاب کے مضامین کا دوسری کتاب میں اعادہ کرتا ہے - ان تألیفات میں وہ زیادہ‌تر اپنے زمانے کے شعر کا ذکر کرتا ہے اور علومِ لغت و بلاغت سے بھی بحث کرتا ہے.

اس کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف، جو ہمارے لیے نہایت اہم بھی ہے، یتیمۃ الدہر فی محاسن اہل العصر ہے [جو اس نے ہارون بن المنجّم کی کتاب البارع کے ذیل کے طور پر لکھی : ابن خلّکان، قاہرۃ ۱۳۱۰ھ، ۲ : ۷۵، بذیل عمادالکاتب الاصفہانی] - اس میں اس کے ہم زمانہ اور اس سے پہلی نسل کے شعراء کا تذکرہ ہے، جس کی ترتیب شعراء کے اوطان کے لحاظ سے کی گئی ہے - یہ تذکرہ زیادہ‌تر منتخب اشعار کا مجموعہ ہے، جس میں شعراء کے سوانح حیات عموماً نہایت ہی اختصار سے بیان کیے گئے [اور مترجمین کے وفیات عموماً نہیں دیے گئے اور مصنّف اکثر یہ بھی نہیں بتاتا کہ ان میں سے جس سے وہ ملا اُس سے ملاقات کب ہوئی، گویا یہ کتاب ادب و نقد ادبی ہے نہ کتاب تأریخ ادب - مصنّف کے تعریفی کلمات مبالغہ آمیز ہیں اور ان کلمات کا استعمال مختلف شعراء اور ادیبوں کے لیے اس طرح کیا ہے کہ ان سے تشخیص و تمیز میں مدد نہیں ملتی - مصنّف جب ان میں سے کسی کے خلاف کچھ کہتا ہے تو کم ہی اس کا ثبوت پیش کرتا ہے؛ قب النثر الفنّی، ۲ : ۱۸۸ ببعد] - اس قسم کی اکثر تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی کئی بار کی ترمیم اور اصلاح و زیادت کے ساتھ شائع ہوئی؛ چنانچہ یاقوت کے بیان (ارشاد، ۲ : ۳۲۰) سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک حکایت (جو دمشق کے مطبوعہ نسخے میں ۳ : ۳۳ پر موجود ہے) اس نے قاہرۃ میں اُس نسخے میں پڑھی تھی جو خود مصنّف نے یعقوب بن احمد بن محمّد کو پیش کیا تھا مگر یہ حکایت دوسرے نسخوں میں نہیں ملتی - [جناب عبّاس اقبال ناشر تتمّۃ الیتیمۃ کے تصرّف میں یتیمۃ الدہر کا ایک نسخہ ہے، جس کا مقدّمہ دمشق کے مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے -

اس مقدّمے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا ربع آخر بہت بعد میں مرتب ہوا ۔ اس کی فی الجملہ تائید اس نسخے سے ہوتی ہے جو محمّد شفیع لاہوری کے کتابخانے میں ہے اور کتاب کے تقریباً صرف پہلے تین چوتھائی حصّے پر مشتمل ہے ۔ جناب عبّاس اقبال والے نسخے کے دیباچے میں ثعالبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یتیمة الدھر کی تکمیل مؤلف نے امیر ابوالعباس مأمون خوارزمشاہ کے لیے کی ۔ اس لیے کہ امیر کو اس کی تکمیل کے بارے میں رغبتِ تمام تھی (دیکھیے تتمّة الیتیمة، طہران ۱۳۵۳ھ، ج ۱، مقدمۂ ناشر، ص ۵ ح) ۔ یتیمة الدھر، کے مطبوعہ دیباچے میں (۱ : ۳ پر) مصنّف کا اپنا بیان یہ ہے کہ اس نے کتاب کی تألیف ۳۸۴ھ میں شروع کی ۔ پھر اس میں برسوں کاٹ چھانٹ اور اضافے کرتا رہا ۔ آخر اس نے ۴۰۳ھ کے حدود میں کتاب کو جرجان میں تمام کیا (دیکھیے تتمّة الیتیمة، ۱ : ۱۴۵)] .

جن مخطوطات کی تفصیل پرٹش Pertsch : *Verz. der ar. Hss. zu Gotha*، عدد ۲۱۲۷ اور *GAL*، ۱ : ۲۸۴ میں دی ہے ان میں ذیل کے مخطوطات کا اضافہ کر لیجیے : وہ جو پیرس میں ہے (Blochet : *Catalogue des mss. ar. des nouvelles acquisitions*، پیرس ۱۹۲۵ء) عدد ۶۳۴۲ اور جو کیمبرج میں ہے (E. G. Browne : *Handlist*، ۱۹۰۰ء) عدد ۱۲۲۴ اور وہ جو نکلسن کے قبضے میں ہے (*JRAS*، ۱۸۹۹ء، ص ۹۱۲) [اور وہ جو محمّد شفیع لاہوری کے کتابخانے میں ہے، اس میں پوری کتاب کا تقریباً پہلا تین چوتھائی حصّہ موجود ہے (جلد ۱ و ۲ کامل اور جزء ۳ کا اکثر حصّہ)، نسخۂ مطبوعۂ دمشق کے آخری دس ورق کا مواد اس میں نہیں ہے، تاریخ ۸۳۲ھ فہرستِ اعلام کے آخر میں دی ہے مگر فہرست کا صرف آخری ورق موجود ہے باقی ضائع ہوگئے ہیں ۔ نسخۂ اخیرہ سے پہلے کا نسخہ] ۔ ان کے علاوہ برٹش میوزیم میں عدد *Descriptive List* : Or. 7743، ص ۶۱) ۔ اس کتاب کا ایک خلاصہ بھی موجود ہے، جس پر مؤلف کا نام درج نہیں ۔ مطبوعہ نسخے (طبع دمشق ۱۳۰۴ھ) کے ساتھ مولوی ابو موسی احمد الحق کا اشاریہ [موسومۂ فریدة العصر، کلکتہ ۱۹۱۴-۱۹۱۵ء] [نیز ریشر Rescher : فہرست یتیمة الدھر، قسطنطنیہ ۱۹۱۴ء] کو بھی شامل کر لینا چاہیے؛ [فریدة العصر] یتیمة الدھر کے رجال، قبائل، امکنہ، کتب وغیرہ کا [تحلیلی اور] جامع اشاریہ ہے (طبع مکتبۂ ہندیہ، *Bib. Ind.*، سلسلۂ جدید، عدد ۱۲۱۵) ۔ یتیمة الدھر کا پہلا ذیل خود مصنّف نے تتمّة الیتیمة کے نام سے لکھا تھا، جس کا اقتباس یاقوت : ارشاد، ۶ : ۱۱۴ اور پیرس کے مخطوطے شمارہ ۳۳۰۸ میں دیا ہے (دیکھیے حاشیۂ مرزا محمّد بر چہار مقالۂ سمرقندی، ص ۱۲۹؛ [تتمّة الیتیمة، نشر بتصحیح عبّاس اقبال، تہران ۱۹۳۴ء] نیز دیکھیے مخطوطۂ حلب سے متعلق .*Revue de l'ac. ar. de Damas*، ۷ : ۵۲۹ تا ۵۳۰) ۔ دوسرے مخطوطات، مثلاً مخطوطۂ برلن، میں (دیکھیے *GAL*، محلّ مذکور) اس کا نام صرف ذیل ہی لکھا ہے، نیز دیکھیے البدر (تونس ۱۳۴۰ھ)، ۱ : ۲ و ۳۸ ببعد ۔ یتیمة کا ایک اور ذیل، جو جزوی طور پر تتمّة کے مطابق ہے، الباخرزی [رکّ بآن] نے لکھا تھا [موسوم بہ دُمیَة القصر و عُصرَة اہل العصر، دمیة کا ذیل سعد بن علی الحظیری (م ۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء)، تکملة برا کلمان، ۱ : ۴۴۱ نے زینة دمیة القصر کے نام سے لکھا ۔ زینة کا ذیل عماد الکاتب الاصفہانی (م رمضان ۵۹۷ھ / جون ۱۲۰۱ء) نے خَریدة القَصر و جَریدة العَصر کے نام سے لکھا؛ ابن خلّکان، قاہرة ۱۳۱۰ء، ۳ : ۵ نیز دیکھیے زیادات] ۔ الثعالبی نے مضامین کے لحاظ سے ایک مجموعۂ اشعار بھی مرتّب کیا، جس کا نام کتاب احسن ما سمعتُ ہے ۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ

کوپرولو میں ہے، جو اُس مطبوعہ نسخے کی نسبت جو کتب خانۂ خدیویہ کے قلمی نسخے کی بنا پر شائع کیا گیا تھا [نشر محمّد افندی صادق عنبر، (قاہرۃ ۱۳۲۳ھ)] ضخیم تر ہے (دیکھیے ریشر Rescher، در .MSOS As، ۴ : ۱۶۴) - اس کتاب کا ترجمہ ریشر نے کیا تھا - ملاحظہ ہو *Et-Ta'alibi*، جزء ۳، لیپزگ ۱۹۱۶ء - اسی تصنیف کی ایک فرع کتاب مَنْ غابَ عَنْہُ المُطرِب ہے - مصنّف کا خودنوشت نسخہ استانبول کی مسجد لالہلی میں (عدد ۱۹۴۶ پر قبّ ریشر، Rescher در *MO*، ۷ : ۱۰۵) موجود ہے - یہ کتاب مجموعۂ موسوم بہ التُحفَۃ البہیّۃ، ص ۲۳۰ تا ۲۹۴ (استانبول ۱۳۰۲ھ) میں مشمول ہے اور بیروت میں بھی ۱۳۰۹ھ میں طبع ہوئی - اس کا ترجمہ بقلم ریشر، *MO*، ۱۷ : ۳۱ تا ۱۹۸؛ ۱۸ : ۸۱ تا ۱۰۹ میں چھپ چکا ہے - اسی قسم کے اور منتخبات نظم [و نثر، منسوب و غیر منسوب] یہ ہیں: کتاب خاصّ الخاصّ، [بنام الشیخ ابوالحسن مسافر بن الحسن صدر نیشاپور، دیکھیے یہی کتاب دیباچہ و خاتمہ] قاہرۃ ۱۳۲۶ھ؛ کتاب المُنْتحل، جو الفاظ کی شرح لغوی اور تراجم شعراء، از قلم احمد ابو علی موسومہ المنتخل فی تراجم شعراء المنتحل کے ساتھ چھپی ہے، اسکندریۃ ۱۳۲۱ھ [دیکھیے اس کتاب کی صحیح نسبت کے متعلّق مقدّمۂ شارح در المنتحل، ص ۳] اور کتاب طَرائف الطُرَف، جو آیاصوفیہ کے مخطوطے عدد ۳۷۶۷ میں (*ZDMG*، ۶۴ : ۵۰۴) اور کوپرولو عدد ۱۳۳۶ (.*MSOS As*، ۱۴ : ۱۷۶) اور طوپ قپو سرائے (*RSO*، ۴ : ۶۹۶) میں موجود ہے - اس نے کاتبوں (سیکرٹریوں) کے استعمال کے لیے ایک کتاب کَنْزُ الکُتّاب مرتّب کی - اس میں ۲۵۰ شعراء کے ۲۰۰۰ اقتباسات درج ہیں؛ دیکھیے Flügel : *Die ar.* etc. *Hss. der K. K.* *Hofbibliothek zu Wien*، عدد ۳۴۲ - ترکی کے ایک شاعر لامعی نے اس کی ایک شرح لکھی ہے: دیکھیے Toderini : *Lit. Turch.*، ۲، ضمیمہ ۳۴ - یہاں یہ ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ ثعالبی نے انتخابی اشعار کے ایک مجموعے کی، جس کا نام [اُس نے] مُؤنسُ الاُدَباء لکھا ہے، ابوالعباس خوارزم شاہ کے حکم سے نثر میں شرح کی - ثعالبی نے کتاب کا نام یہ رکھا: نَثْرُ النَظْم و حلّ العقد من مُخْتار الشِّعر الّذی یَشْتمل علیہ الکتاب المُتَرجم بمؤنس الأُدَباء، طبع دمشق ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء] و قاہرۃ ۱۳۱۷ھ [اس کے ہامش پر ثمار القلوب دی ہے: دیکھیے برا کلمان: تکملۃ، ۱ : ۵۰۱، شمارہ ۱۱].

ثعالبی کا ایک اَور سلسلۂ تصانیف تفریحی ادب پر مشتمل ہے، جس میں ہر قسم کی مفید معلومات اور بالخصوص تأریخی کہانیاں بھی موجود ہیں - ان میں سے بعض یہ ہیں: کتاب لطائف المعارف، طبع P. de Jong، لائڈن ۱۸۶۷ء؛ کتاب الفرائد و القلائد یا کتاب العقد النفیس و نزھۃ الجلیس، طبع قاہرۃ ۱۳۰۷ھ، (برہامش نشرالنظم) [۱۳۲۷ھ]؛ کتاب المُبْہِج (یا المُبْہَج) طبع استانبول، تاریخ ندارد، و قاہرۃ ۱۳۲۴ھ اور دو کتابیں مختلف اشیاء کی مدح و ذمّ میں، جو پرانے دبستانی ادب سے متعلّق ہیں: کتاب اللطائف والظرائف اور یواقیت المواقیت؛ ان مخطوطات میں جو *Cat. codd. ar. bibl. ac. Lugd. Batavae*، عدد ۴۵۵ میں درج ہیں ان نسخوں کو بھی شامل کر لینا چاہیے: پیرس کتاب مذکور، عدد ۳۹۳۵؛ پیٹرز برگ، عدد ۸۵۷؛ نکلسن: در *JRAS*، ۱۸۹۹ء، ص ۹۱۳؛ Haupt، عدد ۲۶۸ - ان دونوں کتابوں کو کسی غیر معلوم کاتب نے لائڈن کے مخطوطے عدد ۴۵۶ میں ایک کر دیا ہے اور ابو نصر احمد بن عبدالرزّاق المَقْدِسی نے بھی ایسا ہی کیا ہے: مقْدِسی کی کتاب اللطائف والظرائف کے نام سے ۱۲۸۲ھ کو بغداد میں طباعت سنگی

سے نشر ہوئی تھی اور جماعة فیما بین کتابی الثعالبی الخ کے نام سے ۱۲۹۶ھ کو بولاق میں اور ۱۳۰۰ھ [اور ۱۳۱۰ھ] کو قاہرۃ میں بھی شائع ہوئی تھی ۔ آخر میں کتاب غُرر البلاغة و طُرف البراعة کا ذکر بھی ضروری ہے، مخطوطۂ برلن، عدد ۸۳۴، یا اس کا نام ہے غُرر البلاغة [فی النظم] و النثر (کما فی مخطوطة کوپرولو، ۱۲۹۰ : دیکھیے Rescher، در *MSOS As.*، ۱۴ : [۳۴، دیکھیے *GALS*، ۱ : ۵۰۰، عدد ۸] یا والبراعة کے اضافے کے ساتھ، جیسا برٹش میوزیم، عدد ۸۵۷۷ میں ہے (*Descriptive List*، ص ۶۳) ۔ اس کتاب کا ایک اور قلمی نسخہ نکلسن کے قبضے میں ہے (*JRAS*، ۱۸۹۹ء، ص ۹۱۳) ۔ خمس رسائل، طبع استانبول ۱۳۰۷ھ میں اور نثر النظم، طبع قاہرۃ ۱۳۱۷ھ کے ہامش پر مندرجۂ ذیل کتابیں ثعالبی کے نام سے غلط طور پر منسوب کی گئی ہیں : کتاب الأمثال، قاہرۃ ۱۳۲۷ھ، کتاب الفرائد و القلائد، مصنّفۂ الاهوازی [م ۴۴۶ھ / ۱۰۵۵ء، دیکھیے یاقوت : ارشاد، ۳ : ۱۵۲ ببعد و براکلمان : تکملة، ۱ : ۲۷] اور گوتھا کے قلمی نسخے عدد ۱۸۷۳ میں محاسن المحاسن : دیکھیے *ZS*، ۳ : ۲۵۳، ۷۸ ۔

اس نے متعدّد امثال و کلمات کے مجموعے بھی مرتّب کیے ہیں ۔ ان میں قابل ذکر کتاب التمثّل (یا التمثیل) و المحاضرة (مخطوطات مندرجۂ *Cat. Ludg.*، عدد ۴۰۴، اور پیرس، عدد ۶۰۱۹) کو بھی شامل کر لیا جائے [یہ کتاب ۱۳۰۱ھ میں آستانہ میں طبع ہوئی] اور کتاب أحاسن کلم النبی (صلعم) والصحابة والتابعین و ملوک الجاهلیّة و ملوک الاسلام و الوزراء والکتّاب و البلغاء و الحکماء و العلماء، (*Cat. Ludg.*، عدد ۴۰۳ : پیرس عدد ۱۰۸۲، شمارہ ۲)، *Talibii syntagma dictorum brevium et acutorum*، طبع J. J. Ph. Valeton، لائڈن ۱۸۴۴ء اسی کتاب سے مأخوذ ہے ۔ اس کتاب کو بعد میں اس سے ایک بڑی تصنیف کتاب الاعجاز و الایجاز میں، جو خمس رسائل، استانبول ۱۳۰۱ھ کے ضمن میں طبع ہوئی تھی، شامل کر لیا گیا تھا، وہ قاہرۃ میں بھی ۱۸۹۷ء میں طبع ہوئی ۔ اسی صنف کی کتابوں میں سے کتاب حِلیة المحاضرة و عنوان المذاکرة و میدان المسامرة، پیرس، عدد ۳۹۱۵ اور کتاب لطائف الصحابة و التابعین بھی ہیں، قب *Selecta ex Thaalebii libro facetiarum*، طبع P. Cool، در Chrestomathy (یعنی کتاب منتخبات)، جو Roorda : *Gramatica arbica*، لائڈن ۱۸۳۵ء کے همراہ شائع کی گئی ۔ شیخو Cheikho نے اسی قسم کے افکار دانشمندانہ کا مجموعہ مجلّۂ مشرق، جلد ۵ : ۸۳۱ تا ۸۳۴ میں شائع کیا تھا۔آخر میں الثعالبی نے ایک اور ادبی تصنیف مؤنس الوحید کے نام سے بھی لکھی، (حاجی خلیفة، عدد ۱۳۳۵۴) جو بظاہر کیمبرج کے ایک مخطوطے میں محفوظ ہے، (*Suppl. Handlist* : Browne) عدد ۱۲۸۷) لیکن جو متن فلوگل Flügel نے *Der Vertaute Gefährte des Einsamen* کے نام سے شائع کیا ہے وہ راغب الاصفہانی کی کتاب محاضرات کا ایک حصّہ ہے : دیکھیے Gildemeister، در *ZDMG*، ۳۴ : ۱۷۱ ۔ بقول حاجی خلیفه، عدد ۳۳۴۷، اس نے بادشاہوں کے لیے ایک ہدایت نامہ بھی لکھا تھا، جس کا نام تھا سیرة الملوک یا الکتاب الملوکی [یہ کتاب بنام امیر نصر بن ناصر الدین سُبُکتگین لکھی گئی] ۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ کتاب وہی تو نہیں جو سراج الملوک کے نام سے برٹش میوزیم، عدد Or. 6368 میں موجود ہے ۔ سراج الملوک اخلاقی کتاب ہے اور *Descriptive List*، ص ۶۴ میں الثعالبی کی طرف منسوب ہے ۔ اس کتاب کی نظیر اس کی ایک اور کتاب ہے جس کا نام کتاب الوزراء ہے؛ دیکھیے گوتھا، عدد ۱۸۸۶ ۔ چند چھوٹی چھوٹی ادبی تصانیف بھی ہیں : مثلاً کتاب مرآة المروءات

و اعمال الحسنات، طبع قاهرۃ ۱۳۱۸ھ اور کتاب برد الاکباد فی الاعداد، استانبول ۱۳۰۱ھ۔

ان تصانیف کے علاوہ ایک تیسری صنف بھی ہے، جس کا تعلق فقہ اللغۃ (فلولوجی) سے ہے، اگر اس مرکب کو اس کے محدود معنوں میں لیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب عربی کے مترادفات پر ہے، جو اس نے اپنی عمر کے آخری حصّے میں مرتّب کی تھی اور پہلے اس کا نام شمس الادب فی استعمال العرب رکھا تھا۔ اس کے دو حصّے ہیں: پہلے میں مترادفات پر (اس کلمے کے محدودتر معنوں میں) بحث کی گئی ہے۔ اس کا نام ہے اسرار اللغۃ العربیۃ و خصائصہا اور دوسرے میں اسلوب بیان کے متعلّق کچھ تصریحات ہیں۔ اس کا نام ہے مجاری کلام العرب برسومہا و ما یتعلّق بالنحو و الاعراب منہا و [الاستشہاد] بالقرآن علی اکثرہا۔ اس دوسرے حصّے کا اکثر سواد حرف به حرف احمد بن فارس کی کتاب فقہ اللغۃ سے مأخوذ ہے۔ یہ تصنیف اپنی قدیم ترین شکل میں صرف لائڈن کے مخطوطے عدد ٦٦ اور برلن کے قلمی نسخے عدد ۷۰۳۲ و ۷۰۳۳ کی صورت میں ملتی ہے۔ اس نے بعد میں پہلا حصّہ فقہ اللغۃ کے نام سے علیحدہ شائع کیا اور اس طرز میں یہ کتاب بہت ہی زیادہ مقبول ہوئی [گو مصنّف نے اس میں مثالیں نہیں دیں]؛ قب *Prooemium et specimen lexici synonymici arabici atthalibi* ed., vertit, notis ilustravit (J. Seligmann)، اُپسالا Upsala ۱۸٦۳ء؛ فلائشر Fleischer: *Kleine Schriften*، ۳: ۱۵۲ تا ۱٦٦ اور مختلف طباعتیں پیرس ۱۸٦۱ (بتصحیح رشید دحداح)، و قاهرۃ ۱۲۸۴ھ و ۱۳۱۷ھ (اسرار اللغۃ اپنی ابتدائی شکل میں، بر هامش) و ۱۳۲۵ھ و بیروت ۱۸۸۵ء (اس طباعت میں قابل اعتراض حصّے حذف کر دیے گئے ہیں)۔ قاهرۃ کے ایڈیشن ۱۲۸۴ھ، [۱۳۱۸ھ] اور ۱۳۲۵ھ میں اصل کتاب کا دوسرا حصّہ بھی چھپا ہے، جس کا نام سرّ العربیۃ فی مجاری کلام العرب و صلتہا [سننہا] و [الاستشہاد] بالقرآن علی اکثرہا ہے۔ طہران میں یہ کتاب میدانی کی کتاب السامی فی الاسامی کے ساتھ سرّ الادب فی مجاری علوم العرب کے نام سے سنگی طباعت سے چھپی ہے، جس پر کوئی تاریخ درج نہیں اور پیرس کے قلمی نسخے عدد ۵۹۸۹ میں علیحدہ بھی موجود ہے لیکن اس میں کتاب کے نام کو محرّف کر کے مجاری کی جگہ مجازی لکھ دیا ہے۔ یہ غلطی اور جگہ بھی ملتی ہے (مثلاً حاجی خلیفۃ، طبع فلوگل Flügel، ۳: ۵۹۰ میں)۔ ۷۳۲ھ/۱۳۳۱ء میں کسی نا معلوم شخص نے اس کتاب کو نظم فقہ اللغۃ کے نام سے منظوم بھی کیا تھا، جو مخطوطۂ لائڈن، عدد ٦۷ میں محفوظ ہے: قب Weijers: *Orient*، ۱: ۳٦۰ ببعد۔

۴۰۰ھ میں اس نے نیشاپور میں فنّ بلاغت پر ایک کتاب خوارزم شاہ مأمون بن مأمون کے لیے لکھی تھی، جس میں خاص طور پر [کنایۃ] سے بحث کی گئی تھی۔ اس کتاب کو مخطوطات میں بعض اوقات الکفایۃ فی الکنایۃ کا نام دے دیا جاتا ہے: مثلاً پیرس، عدد ۴۳۳۵ میں)، کبھی النہایۃ فی التعریض و الکنایۃ کا (مثلاً فہرست موزۂ برطانیہ، تکملۃ، عدد ۱۱۱۰/۱ میں) اور کبھی صرف الکنایۃ و التعریض کا (مثلاً برلن، عدد ۷۳۳٦ میں)۔ آخری نام کے ساتھ یہ کتاب ۱۳۰۱ھ کو مکّۃ مکرمۃ میں اور ۱۳۲٦ء کو جرجانی کی کتاب المنتخب من کنایات الادباء و اشارات البلغاء کے ساتھ قاهرۃ میں طبع ہوئی۔

النہایۃ فی الکنایۃ کا انتخاب تین اور رسائل یعنی التمثیل و المحاضرۃ، المبہج اور سحر البلاغۃ کے انتخاب کے ساتھ ۱۸۸۴ء میں قسطنطنیۃ سے شائع ہوا۔

[اسی ذیل میں ثعالبی کا ایک چھوٹا سا رسالہ کتاب المتشابہ آتا ہے (طبع در ضمیمۂ اورینٹل کالج

میگزین، لاہور ۱۹۰۵ء بر بنای نسخۂ منقولہ در حماۃ، در ۸۹۰ھ/ ۱۴۸۵ء و نسخۂ منقولہ در مصر، در ۱۲۰۵ھ: رک بہ فہرست الخدیویۃ ۱۳۰۸ھ، ۷ : ۶۵۳، نمبرۃ متسلسلۃ ۱۳)، جو اس نے صاحب الجیش نصر ابن سبکتگین (م ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء) کے نام لکھا، جس میں 'المتشابہ الذی یشبہ التصحیف'، 'المتشابہ من التجنیس الصحیح' اور 'المتشابہ لفظاً و خطاً' سے بحث کی ہے]۔

اس نے ایک کتاب میں شستہ عربی مقولے جمع کیے اور کتاب سحر البلاغۃ و سر البراعۃ اس کا نام رکھا [برائے مخطوطات دیکھیے G. A. L.، ۱ : ۲۸۵، شمارہ ۷؛ نیز تکملۃ، ۱ : ۵۰۰، شمارہ ۷] - یہ کتاب دمشق میں ۱۳۵۰ھ میں طبع ہوئی - اس کے کئی اقتباسات پیرس کے مخطوطے کی بناء پر استانبول میں شائع ہو چکے ہیں (Reuther : *Verz.*، ۱ : ۳۲، س ۳) - ثعالبی نے مستقل مرکبات اضافی اور اسمائے منسوب کا ایک مجموعہ مع حواشی بھی مرتب کیا، جس کا نام ثمار (ثمر) القلوب (فی) المضاف و المنسوب ہے اور اسے امیر عبید اللہ بن احمد المیکالی (م ۴۳۶ھ / ۱۰۴۴ء) کے نام پر معنون کیا - براکلمان، ۱ : ۲۸۵، عدد ۹ کے مخطوطات کے ساتھ پیرس، ۵۹۴۲؛ فہرست کیمبرج کے تکملۃ عدد (۴۰۳) اور بروسہ B.K.O.، ۷ : ۸۱ کو بھی شامل کر لیا جائے [نیز دیکھیے براکلمان : تکملۃ، ۱ : ۵۰۰، عدد ۹ - یہ کتاب قاہرۃ (۱۳۲۶ھ) میں طبع ہوئی]- اس کتاب کا ایک ضمیمہ التذییل المرغوب من ثمر القلوب ہے، جس میں مشاہیر کے کنی اور القاب جمع کیے گئے ہیں، پیرس کے مخطوطے کا عدد ۶۰۲۹ ہے - اس کا ایک خلاصہ عبدالرؤف المناوی (م ۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۲ء) نے عماد البلاغۃ کے نام سے مرتب کیا تھا، قب *Codd. ar. bibl. reg. Hafn.*، عدد ۲۰۶؛ *Revue de lac. ar. de Damas*، ۷ : ۵۴۷؛ فہرست دارالکتب المصریۃ، ۳ : ۳؛ *ZDMG*، ۶۸ : ۵۵۸ (اس کتاب کے ایک مخطوطے کے بارے میں جو بروسہ میں ہے) - اس کتاب کو ابجدی ترتیب سے محمد امین [بن فضل اللہ] المحبی (م [۱۱۱۱ھ/] ۱۶۹۹ء) نے مرتب کیا اور اس کا نام ما یعول [یا یتعول] علیہ فی المضاف و المضاف الیہ رکھا تھا. فہرست دارالکتب المصریۃ، طبع دوم، ۳ : ۲۸۵؛ طوپ قپو، عدد ۲۳۵۵؛ عاطف، عدد ۲۲۴۷ (*R.S.O.*، ۴ : ۷۲۴؛ *M.F.O.B.*، ۵ : ۴۹۶)؛ آیاصوفیہ، عدد ۴۱۳۶؛ *MO*، ۷ : ۱۳۲)؛ [دیگر نسخ کے لیے دیکھیے تکملۃ براکلمان، ۲ : ۴۰۴].

[ثعالبی کے اشعار کی ایک جلد باخرزی صاحب دمیۃ القصر کو ملی؛ دیکھیے دمیۃ، طبع دمشق، ۱۸۳ تا ۱۸۵ ببعد، جس میں سے متعدد اشعار باخرزی نے نقل کیے ہیں (= یتیمۃ، طبع دمشق، ۴ : ۳۲۹) - اس کے بعض اور اشعار کے لیے دیکھیے تاریخ یمینی، طبع لاہور، ص ۱۱۰، ۱۳۱ (مدح نصر بن سبکتگین)، ۵۲، ۸۶ (یہ سب تاریخی واقعات کے متعلق ہیں)؛ خاص الخاص، ۱۷۹ تا ۱۹۱؛ ابن خلکان، طبع ۱۳۱۰ھ، ۱ : ۲۹۱].

مآخذ : (۱) ابن خلکان : وفیات، بولاق ۱۲۹۹ھ، عدد ۳۵۴؛ (۲) الدمیری : کتاب الحیوان، ۱ : ۱۶۳ ببعد؛ [(۳) زکی مبارک : النثر الفنی فی القرن الرابع، قاہرۃ ۱۳۵۲ھ، ۲ : ۱۷۹]؛ [۴] وستنفلٹ : *GGA*، ۱۸۳۷ء، ص ۱۱۰۳، عدد ۱۰۵؛ [۴] وہی مصنف : *Geschichtschreiber der Araber*، عدد ۱۹۱؛ [۵] *G.A.L.*، ۱ : ۲۸۴ تا ۲۸۶؛ [تکملۃ، ۱ : ۴۹۹ تا ۵۰۲؛ (۶) دولت شاہ : تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن، ۳۴؛ (۷) ابن کثیر : البدایۃ و النہایۃ، طبع مصر، ۱۲ : ۲۸].

[تعلیقہ

ثعالبی کے شخصی حالات کے متعلق جس تعلیقے کا ابتدائی مقالے میں ذکر کیا گیا تھا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ثعالبی فراء تھا،

یعنی لومڑی کی کھال کی پوستینیں سیا اور بنایا کرتا تھا ۔ ابن کثیر (۱۲ : ۲۸) نے بھی لکھا ہے : ''کان رفّاء یخیط جلود الثعالب''، اس پر زکی مبارک [النثرالفنی، ۲ : ۱۷۹] نے لکھا ہے کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب اس کا ادبی کمال ابھی ظاہر اور اس کا ستارہ ابھی بلند نہیں ہوا تھا اور اس کی شہرت ابھی دور دور تک نہیں پہنچی تھی ۔ فقه اللغة کی ایک جدید طباعت کا ناشر لکھتا ہے کہ ثعالبی بچوں کو ادب پڑھایا کرتا تھا ۔ معلّمانِ مکتب کے دستور کے مطابق وہ تأدیب و تعلیم کے ساتھ ساتھ لومڑی کی کھال کی خیاطت بھی کیا کرتا تھا ۔ اس سلسلے میں شاید وہ شعر دلچسپی سے خالی نہیں جو اس نے کھالوں کے متعلّق دیے ہیں (یتیمة، ۴ : ۲۹۴، س ۱۰، نیز تتمّة الیتیمة، ۲ : ۱۲، س ۴) ۔ جب اس نے کاتب، ادیب اور شاعر کی حیثیّت سے کمال حاصل کر لیا تو ملوک و امرائے وقت کے ہاں اسے تقرّب کے موقعے حاصل ہوے؛ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں : (۱) امیر، صاحب الجیش، ابوالمظفّر نصر بن ناصرالدین (برادر سلطانِ محمود) م ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء ۔ ثعالبی نے کتاب المتشابه اس کے نام پر لکھی اور غُرَر اخبار ملوک الفرس بھی (اگر اس کتاب کی نسبت ثعالبی کی طرف صحیح ہے ۔ اس میں وہ خود کو امیر کا عبد، خادم، پروردہ اور اُسے خداوند نعمت بتاتا ہے) ۔ یمینی، ص ۱۴۱ میں ثعالبی کا قصیدہ دیا ہے، جو امیر نصر کی ایک فتح پر لکھا گیا تھا ۔ ثعالبی نے خاصّ الخاصّ، ص ۳۸ پر امیر سے سن کر ایک حکایت نقل کی ہے اور اعجاز، ص ۹۶ بعد (نیز ثمار القلوب، قاہرۃ ۱۳۲۶ھ، ص ۱۱۴) میں اس کے بعض اقوال نقل کیے ہیں ۔ (۲) سلطان مسعود ابن محمود (۴۲۱ تا ۴۳۲ھ / ۱۰۳۰ تا ۱۰۴۰ء) کی مدح میں اُس کے اشعار خاصّ، ص ۱۸۵ پر دیے ہیں ۔ (۳) ابوالعبّاس مأمون بن مأمون خوارزم شاہ (۳۹۰ھ/ ۹۹۹ - ۱۰۰۰ء تا ۴۰۷ھ / ۱۰۱۶ - ۱۰۱۷ء) ۔ اس کے طلب کرنے پر ثعالبی ۴۰۳ھ کے قریب جرجان سے جرجانیه گیا ۔ یتیمة الدهر کے ربع آخر کی تحریر اسی زمانے میں جرجان میں تمام ہوئی تھی ۔ ثعالبی نے کتاب کا نسخه اُس کے خزانةالکتب کے لیے پیش کیا (تتمّة الیتیمة، ۱ : ۱۳۵، ۱ : ۵ ح) ۔ کتابُ نثر النظم اُسی کے حکم سے لکھی گئی اور دیباچے میں وہ اپنے آپ کو 'عبدُہ المخلوق لخدمته' لکھتا ہے اور کتاب میں جا بجا اُسے 'ولی النعم' لکھتا ہے ۔ اور کہتا ہے کہ اس کے خدّام میں شامل ہے : دیکھیے مثلاً طبع ۱۳۱۷ھ، ص ۴۳ : اُس کی فرمائش سے ثعالبی نے ایک قطعه لکھا (خاصّ، ۱۸۸) اور اُس سے سن کر بعض اقوال روایت کیے : مثلاً دیکھیے خاصّ، ۱۴؛ اعجاز، ۹۶ ۔ (۴) خلف بن احمد سِجزی (۳۴۴ھ / ۹۵۵ - ۹۵۶ء تا ۳۹۹ھ/۱۰۰۸ - ۱۰۰۹ء) ۔ عوفی نے جوامع الحکایات میں لکھا ہے کہ ثعالبی کو امیر خلف نے اُس کے ہر شعر کے عوض سو دینار عطا کیے (محمّد نظام الدین : *Introd. to the Jawāmiʿal-Ḥikāyāt*، طبع وقفیّهٔ گب، ص ۲۰۳) ۔ (۵) الشیخ ابوالحسن محمّد بن عیسی الکرجی (سلطان محمود غزنه کا معتمد اور رازدار (دیکھیے تتمّة الیتیمة، ۲ : ۶۷ بعد) ۔ اس کے لیے ثعالبی نے بعجلت تمام یتیمة الدهر کو مرتّب کیا، یعنی موجودہ طباعت کے پہلے تین چوتھائی حصّے کو، دیکھیے یتیمة، مقدّمهٔ مصنّف، ص ۳۱۰؛ و تتمّة، دیباچهٔ مصنّف، ص ۱۰ و مقدمهٔ ناشر، ص ۵ ح ۔ (۶) امیر ابوالفضل عبیداللہ بن احمد المیکالی ۔ یہ ثعالبی پر بہت مہربان تھا، یہاں تک کہ ثعالبی کی مدح میں اس نے شعر بھی لکھے (یتیمة، ۳ : ۳۶۴ : درج، ۵۴) ۔ ثعالبی نے فقه اللغة امیر کی فرمائش سے اور اس کی ہدایت کے مطابق لکھی اور اس سلسلے میں امیر نے اُسے اپنے کتاب خانے سے استفادے کی اجازت بھی دی ۔ امیر نے چار ماہ تک ثعالبی کو قریهٔ فیروزآباد

(رستاق جوین) میں، جس کا وہ مالک تھا، مہمان رکھا۔ کتاب کا طویل دیباچہ امیر مذکور کی مدح سے پر ہے (فقہ اللغۃ، قاہرۃ ۱۳۱۸ھ، ص ٦)۔ ثعالبی نے ثمار القلوب بھی اسی امیر کے نام پر لکھی اور بہت سے اشعار بھی اس کی مدح میں کہے (دیکھیے دمیۃ، ۱۸۳؛ خاص، ۱۸٦؛ درج الغرر، ۹۹ و ۱۰۱ تا ۱۰۳ و ۱۳۳)۔ یتیمۃ الدہر، ۳ : ۲۴۷ تا ۲٦۸ امیر کے ذکر کے ساتھ خاص ہے۔ ثعالبی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر نے اس کے تاکستان میں آبپاشی کرائی (خاص، ۱۸٦) اور ایک موقع پر اسے گھوڑا بھی انعام میں دیا (خاص، محل مذکور؛ دمیۃ، ۱۸۵)۔ (۷) ابوالحسن مسافر بن الحسن (العارض، 'بدر الصدور' اس کے حال کے لیے رک بہ تتمۃ، ۲ : ٦۸ تا ۷۱)۔ ثعالبی نے نظم و نثر میں اس کی بہت تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ آڑے وقت میں یہ رئیس و ادیب و فاضل اس کے بہت کام آیا۔ ثعالبی اس کا بہت شکر گذار ہے۔ اس نے بھی ثعالبی کی تعریف اشعار میں کی ہے۔ کتاب خاص الخاص ثعالبی نے اس کے نام پر لکھی: دیکھیے خطبۂ کتاب اور اس کا صفحہ ۱۸٦ اور ۱۹۱۔ (۸) الوزیر ابونصر احمد بن محمد، خاص، ۱۸۵ ببعد پر ثعالبی کے مدحیہ اشعار اس کے متعلق دیے ہیں۔ (۹) اسی طرح دمیۃ، ۱۸۴ میں چند اشعار ہیں جن میں اس نے امیر ابونصر سہل ابن المرزبان وزیر کو مخاطب کیا (اس ابونصر کے لیے دیکھیے یتیمۃ بامداد فریدۃ العصر، ص ٦۷۲ ببعد)۔

ان ملوک و امراء کے ساتھ خصوصیت کے علاوہ ثعالبی کے دوستانہ تعلقات کتاب و ادباء و شعراء کے ایک وسیع حلقے سے تھے اور اس نے اپنی کتابوں خصوصاً یتیمۃ اور تتمۃ الیتیمۃ میں اکثر ان سے مجالست و مکاتبت، ان کا کلام ان سے سننے یا ان سے کلام موصول ہونے پر ان سے روایت کرنے اور ان سے ان کے دیوان لینے اور کلام کے انتخاب کرنے کا ذکر کیا ہے: مثلاً دیکھیے یتیمۃ، ۴ : ۳۰۲ (ابوالفتح بستی): ۱۹۵ و ۱۹٦ (بدیع ہمذانی، م ۳۹۸ھ): ۳۴ تا ۱۰۵ و خاص، ۷۷، ۸۳۷ (الخوارزمی، م ۳۸۳ھ): یتیمۃ ۴ : ۸۳، س ۳ و ۲۰۵، س ۲ (العتبی): ۹۳ (المأمونی م ۳۸۳ھ) و غیرہم۔ امام ابو سلیمان احمد بن محمد خطابی (م ۳۸٦ھ / ۹۹٦ء) صاحب معالم السنن و شرح البخاری وغیرہ سے اس کی دوستی کے ذکر کے لیے دیکھیے خزانۃ الأدب، ۱ : ۲۸۲ ببعد۔ ابوالفتح بستی نے اس کی بے مثل اخوت، مہذب اخلاق، خردمندی، علم اور ظرف کی تعریف کی ہے (یتیمۃ، ۴ : ۲۱۹، نیز دیکھیے ابوالفتح بستی کے اشعار اس کے متعلق، خاص، ۱۰۰)۔ صاحب دمیۃ ابوالحسن باخرزی کے باپ الحسن سے، جو ثعالبی کا پڑوسی تھا، اس کی دوستی تھی اور ابوالحسن سے وہ ایسی شفقت سے پیش آیا تھا کہ یہ بچہ اسے باپ کی طرح سمجھتا تھا (دمیۃ، ۱۸۸)۔ ثعالبی نے اپنی تصنیفات میں جا بجا معاصرین کے اشعار دیے ہیں، جو انہوں نے اس کی مدح میں کہے ہیں۔ بعض شخصی باتیں، جو اس نے اپنے متعلق بیان کی ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ اسے بہت اشعار حفظ تھے (خاص، ۱۱۸)۔ اس نے اپنی خوش حالی اور بدحالی دونوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایک مزرعے ('ضیعۃ') کا مالک تھا (فقہ اللغۃ، دیباچہ، ص ۹)، مگر ایک اور مقام پر وہ اپنے مقروض ہونے، زمانے کے ظلم اور کفاف کی نایابی کا سخت شاکی ہے (دمیۃ، ص ۱۸۵؛ خاص، ۱۸۹ ببعد)۔ وہ ایک مصیبت کا ذکر کرتا ہے (''وکانت النائبۃ'') جس کی وجہ سے نیشاپور چھوڑ کر ۴۰۳ھ میں وہ جرجان پہنچا اور محمد بن منصور رئیس جرجان کے ہاں مہمان رہا۔ عتبی (ص ۳۰۹؛ نیز مادۂ کرامیۃ) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۳ھ میں سلطان محمود نے کرامیۃ کو دبانا چاہا اور ان کے سرخیل ابوبکر

محمّد بن اسحٰق بن محمشاذ رئیسِ نیشاپور کو معزول کر کے اس کی جگہ ابو علی الحسن بن العبّاس (معروف بہ حسنک میکالی) کو دی ۔ کرامیہ نیشاپور میں بہت طاقتور ہو گئے تھے ۔ کہتے ہیں کہ زہد کے پردے میں وہ لوگوں کو لوٹتے تھے؛ ابوبکر مذکور کے حاشیہ نشینوں سے لوگوں کا مال اور ان کی عزّت محفوظ نہ تھی ۔ کرّامیوں کی تعداد نیشاپور میں بیس ہزار سے بھی زیادہ تھی ۔ حسنک رئیس مقرّر ہوا تو اس نے کرّامیوں سے ان کا لوٹا ہوا مال اگلوایا اور انھیں مختلف قلعوں میں قید کر دیا ۔ بظاہر اسی موقع پر ثعالبی نیشاپور چھوڑنے پر مجبور ہوا ۔ معلوم نہیں وہ خود کرامی تھا یا اور کسی طرح سے اس پر زد پڑتی تھی یا بقولِ عتبی ایسے موقعوں پر جب ''بری'' بھی ''سقیم'' کی طرح خائف ہو جاتا ہے اس نے خوف ہی سے ترکِ وطن کیا ۔ تتمّۃ، ۲ : ۶۹ پر بھی اس نے ایک مصیبت کا ذکر کیا ہے جس سے وہ غم و غصّہ سے مرنے کے قریب ہو ہی چکا تھا اور جس سے ابوالحسن مسافر نے اس کی گلو خلاصی کرائی تھی ۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ مصیبت یہی تھی یا کوئی اور ۔

ثعالبی نے صرف یہ ۴۰۳ھ والا سفر ہی نہیں بلکہ اور کئی سفر بھی کیے اور بظاہر مدّتوں وطن سے دور رہا ۔ یتیمۃ اور تتمّۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ تألیفِ کتاب کے اثناء میں وہ بعض اوقات سفر میں تھا (مثلاً دیکھیے یتیمۃ، ۴ : ۲۰۰، س ۱۰، ۱۵۵، سطر آخر، ۱۶۲، ۲۹۷)۔ وہ ایک طویل مدّت غزنہ میں مقیم تھا (تتمّۃ، ۲ : ۵۷)۔ ۳۸۲ھ / ۹۹۲ - ۹۹۳ء میں وہ بخارا میں بھی رہا، جہاں ادیب و شاعر المأمونی سے اس کی معاشرت رہی تھی ۔ ثعالبی اس سے رخصت ہوا تو اس سے جلد بعد ۳۸۳ھ میں المأمونی فوت ہوا (یتیمۃ، ۴ : ۹۴، نیز دیکھیے ۸۱) ۔ وہ ۴۰۳ھ کے حدود میں خوارزم شاہ کے طلب کرنے پر جرجان سے جرجانیہ گیا ۔ دولت شاہ (ص ۳۴ و ۶۱۷) نے تاج الفتوح کے حوالے سے اس کے بغداد کے سفر کا ذکر کیا ہے (تاج الفتوح بیہقی کی تاریخ آلِ سبکتگین کے اس جزء کا نام ہے جس میں عہدِ سلطان محمود کی تاریخ دی ہے، دیکھیے غُرر اخبار ملوک الفرس، ص xi، ح ۳ ؛ ایلیٹ : *Hist. of India* etc.، ۲ : ۵۳ ؛ دیوان عنصری، نشرِ یحیٰی قریب، طہران ۱۳۶۳ھ، ص ۲۸۰ س ۶، ص ۲۸۶، س ۱۲) اور لکھا ہے کہ ثعالبی کو محمود نے بغداد اس لیے بھیجا کہ وہ سلطان کے لیے لقب متعین کرانے کی کوشش کرے اور وہ تقریباً ایک سال اس مہم کے لیے دارالخلافہ میں تردّد کرتا رہا ۔

(ادارہ)]

۲ ۔ اَبُو مَنْصور الحُسَین بن محمّد المَرْغَنی (المَرْغَنی یعنی منسوب بہ مَرْغَن، جو غُور افغانستان میں ہے) ۔ ایک عرب مؤرّخ، جس کی بابت ہماری معلومات صرف اتنی ہی ہیں کہ اس نے اپنی کتاب غُرَرُ السِّیَر [یا الغُرَر فی سِیَر الملوک واخبارہم] کو [امیر] نَصْر برادر سلطان محمود غزنوی کے نام پر مُعَنون کیا اور ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء میں فوت ہوا ۔ اس کتاب میں بنی نوع آدم کی تاریخ، حضرت آدم سے لے کر محمود سُبُکْتگِین کے زمانے تک، درج ہے ۔ اس کا پہلا حصّہ کتب خانۂ ابراہیم پاشا، استانبول، عدد ۹۱۶ اور پیرس، عدد ۵۰۵۳ میں ہے ۔ زوتنبرگ Zotenberg نے اس میں سے تاریخ ایران کا جزء شائع کیا (*Histoire des rois des Perses*، پیرس ۱۹۰۰ء) ۔ تمہید میں وہ یقین دلانے والے دلائل پیش کیے بغیر لکھتا ہے کہ یہ کتاب اسی نام کے ایک اور شخص نے، جو نسبۃً زیادہ شہرت کا مالک تھا، [یعنی عبدالملک بن محمّد ثعالبی نے] لکھی تھی ۔ کتاب کا یہ حصّہ خاص طور پر اس لیے زیادہ اہمّ ہے کہ اس سے ان مآخذ کا پتا چلتا ہے جو فردوسی نے اپنے شاہنامہ کے لیے استعمال کیے تھے اور بہت جگہ تو طَبَری سے بھی زیادہ صحّت کے ساتھ انھیں استعمال کیا

ہے ۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب ملوک کا لفظی ترجمہ کیا ہے جو ۱۰۵۰ع کے لگ بھگ چار آدمیوں نے مل کر والی طوس ابو منصور محمد بن عبدالرزاق کے لیے فارسی میں لکھی تھی؛ مزید برآن اس نے طبری، جوالیقی اور دوسرے عرب مؤرخین کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا، مگر کسی تنقید کے بغیر ان کا مواد شامل کر لیا ۔ ان چار جلدوں میں سے جو حاجی خلیفہ کے عدد ۸۵۹۲ میں مذکور ہیں ([کشف الظنون] طبع فلوگل Flügel، ۴ : ۳۱۹، جہاں اسے غلطی سے المرعشی لکھ دیا گیا ہے) صرف ایک جلد کتب خانۂ بادلی (Bodleian) میں محفوظ ہے (.d'Orv، ۱ : ۲) ۔ اس جلد میں ۳۲۷ھ تا ۸۵۱ھ کے واقعات درج ہیں ۔ عرب تاریخ نویسی کی پرانی رسم، یعنی واقعات کو خالصةً سال وار لکھنے کی قیود، سے آزاد ہو کر تأریخ کو نفسیاتی اصولوں کے مطابق قلمبند کرنے کی یہ ایک قابل تعریف کوشش ہے ۔ اسی تصنیف سے ہوتسما Houtsma نے [بہ آفرید] کا حال شائع کیا تھا (WZKM، ۳ : ۳۰ تا ۳۷) .

مآخذ : (۱) Th. Nöldeke : *Das iranische Nationalepos*، طبع دوم، ص ۱۴ ببعد؛ (۲) Caetani : *Un manoscritto arabo non identificato della Bodleiana in Oxford, il "Ghurar al Siyar"*، در *Centenario della nascita di Michele Amari*، پلرمو ۱۹۱۰ع، ۲ : ۳۶۴ تا ۳۷۲؛ (۳) گابری ایلی Gabriele نے *R.R.A.L.* سلسلہ ۵، جلد ۲۵ : ص ۱۱۳۸ ببعد میں اس کتاب کے مضامین کی ایک صحیح فہرست دی ہے ۔ اس کی رائے میں مذکور بالا عدد ۲ [ابوالمنصور الحسین المرغنی] اور عدد ۱ [یعنی ابو منصور عبدالملک الثعالبی] دونوں ایک ہی ہیں ۔ اس کا ثبوت اس کے نزدیک یہ ہے کہ مروان ثانی کے لقب الحمار کی تشریح غرر اور ثمار القلوب میں (اور لطائف المعارف، ص ۳۰؛ دیکھیے v. Mžik، در *WZKM*، ۲۰ : ۳۱۰ میں) ایک ہی ہے؛ [(۴) براکلمان، ۱ : ۳۴۲ و تکملہ، ۱ : ۵۸۱] ۔ [رأی آرای، فارسی ترجمۂ غرر السیر کے لیے دیکھیے محمد نظام الدین : *Introduction of the Jawāmi 'ul-Ḥikāyat*، طبع وقفیۂ گب، ص ۶۸].

۳ ۔ عبدالرحمن بن محمد بن مخلوف، الجعفری الجزائری، شمالی افریقہ کے ایک عالم دین، جو الجزائر میں ۷۸۸ھ / ۱۳۸۶ع کو پیدا ہوے ۔ بجایۃ، تونس اور قاہرۃ میں تعلیم پائی (از ۸۰۲ھ / ۱۳۹۹ع)، وہاں سے آپ حج کو چلے گئے ۔ پھر تونس میں واپس آئے اور ۸۷۳ھ / ۱۴۶۸ع میں وفات پائی (یہ تاریخ آپ کے لوح مزار پر دی ہے، مگر احمد بابا ان کا سنۂ وفات ۸۷۵ھ لکھتے ہیں) ۔ آپ کی اہم تصنیف قرآن [مجید] کی تفسیر ہے، جو ۲۵ ربیع الاول ۸۳۳ھ / ۲۳ دسمبر ۱۴۲۹ع کو پایۂ تکمیل تک پہنچی ۔ اس تفسیر کا نام الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن ہے [اس کے مخطوطات کے لیے دیکھیے براکلمان، ۲ : ۲۴۹، عدد ۵ : تکملۂ براکلمان، ۲ : ۳۵۱، عدد ۱] ۔ یہ تفسیر طبع ہو چکی ہے ۔ اس کے علاوہ آپ کی حسب ذیل کتابیں بھی طبع ہو چکی ہیں :

مسائل معاد پر العلوم الفاخرۃ فی النظر فی امور الآخرۃ، قاہرۃ ۱۳۱۷ تا ۱۳۱۸ھ اور مسائل اخلاق پر ان کی تصنیف جامع الامہات فی احکام العبادات کا ایک حصہ، بعنوان نبذۃ من الجامع الکبیر، بدون مقام طباعت، ۱۹۱۱ع ۔ براکلمان کی کتاب *G.A.L.* (محل مذکور) میں ان کی دوسری چھوٹی تصانیف کی جو فہرست دی ہوئی ہے اس میں ایک رسالۂ تعریفات کا بھی اضافہ کر لینا چاہیے، جو توبنگن Tübingen میں ہے (Seybold : *Verz.*، شمارہ ۱۹، ۲)؛ اس کے علاوہ رسالۂ الانوار المضیئۃ الجامعۃ بین الشریعۃ و الحقیقۃ، فاس، قرویین، عدد ۱۰۶۱.

مآخذ: (۱) احمد بابا التنبکتی: نَیْل الابتہاج فی تطریز الدیباج، طبع سنگی، فاس ۱۳۱۷ھ، ص ۱۳۸ تا ۱۵۱؛ (۲) محمد الحفناوی: تعریف الخلف برجال السلف، قاہرہ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء، ص ۶۳ تا ۶۸؛ (۳) A. Devoux: *Les édifices religieux de l'ancien Alger*، الجزائر ۱۸۷۰ء، ص ۳۷ تا ۳۸؛ (۴) Bargès: *Complément à l'histoire des Beni Zeiyan*، ص ۳۹۳ تا ۳۹۶؛ (۵) Cherbonneau: *Essai sur la littérature arabe au Soudan*، در *Annuaire de la société archéologique de Constantine*، ۱۸۵۵ء، ص ۵۴ تا ۶۴؛ (۶) باسے R. Basset: *Giorn. d. soc. as. it.*، ۱۰: ۵۴.

(براکلمان C. Brockelmann)

ثَعْلَب: ابوالعباس احمد بن یحیی بن زید بن سیار (یا یسار) الشیبانی (مولاے بنی شیبان)، عرب نحوی: کو اس کا شمار نحاۃ کوفہ میں ہے (ملاحظہ ہوں سطور ذیل) اس نے اپنی زندگی بغداد میں گذاری - ۲۰۰ھ/۸۱۵ء میں پیدا ہوا - [زبیدی، ۱۶۳ میں ہے کہ اس نے ۲۰۹ھ میں لغت و عربیت کا مطالعہ شروع کیا؛(مگر قب ابن الانباری، ۲۹۳) - جب ۱۸ سال کا ہوا تو الفراء (م ۲۰۷ھ) کی حدود میں نظر شروع کی]- ابو عبداللہ [محمد بن زیاد المعروف بہ] ابن الاعرابی اور الزبیر بن بکار اس کے شیوخ میں سے ہیں - اس نے کسائی کی تصانیف بڑے انہماک کے ساتھ پڑھیں- اور الفراء کے مصنفات کا خاص طور پر مطالعہ کیا - کہا جاتا ہے کہ ثعلب نے الفراء کی تمام تصنیفات ۲۵ سال کی عمر میں حفظ کر لی تھیں - اس کے بعد [۲۲۵ھ سے - ابن القفطی: انباہ] مدارس میں اور نجی طور پر تدریس شروع کر دی اور اسے وزیر [ابوالصقر] اسمعیل بن بلبل کی تجویز پر بحیثیت معلم دیوان حکومت سے کافی مشاہرہ ملنے لگا - ابوبکر بن الانباری اور ابوعمر الزاہد اس کے مشہور ترین شاگرد ہیں - [وہ حنبلی المذہب تھا] - [ثقہ، دین دار اور راست بازی، حفظ، معرفت غریب اور روایت شعر قدیم کے لیے مشہور — ابن الانباری].

ثعلب [۲۲۳ سے ۲۲۵ھ تک احمد بن سعید ابن سلم کے پاس رہا اور] [ابتداے سنہ ۲۳۴ھ/اپریل ۸۴۷ء سے لے کر] تیرہ برس تک محمد بن عبداللہ ابن طاہر والی بغداد کے بیٹے کا اتالیق رہا - اس کی علمی و فنی سرگرمیوں کا اظہار ان متعدد تصانیف سے ہوتا ہے جن کا موضوع علم لغت، خصوصاً علم نحو ہے - آج ان تصنیفات میں سے اکثر کے صرف نام ہی باقی رہ گئے ہیں - ان میں سے صرف دو کتابیں طبع ہوئی ہیں: یعنی کتاب الفصیح اور قواعد الشعر- [مصنفات ثعلب کی مفصل فہرست کے لیے دیکھیے ابن القفطی: انباہ اور اس کے حواشی] - [کتاب اختیار الفصیح کے معلوم خطی نسخوں میں ذیل کے نسخے کا اضافہ کیجیے جو محمد شفیع لاہوری کے کتاب خانے میں ہے - یہ نسخہ پانچ رسالوں کے ایک مجموعے میں شامل ہے، جو یاقوت حموی کے خط سے منقول ہے - اس کے ترقیمے میں ہے کہ یاقوت نے اس کی کتابت رمضان ۶۱۵ھ / دسمبر ۱۲۱۸ء میں مروالشاھجان میں کی اور اس کا منقول منہ "ابن الجرادی عن الانباری (کذا)" اور یوسف بن الحسن السیرافی کو ۳۸۹ھ (قب بغیۃ، ص ۴۲۱) میں پڑھ کر سنایا اور مقابلے سے اس کی تصحیح کی گئی تھی اور سماع الانباری (کذا) والے نسخے سے حواشی بھی نقل کیے گئے تھے - موجودہ نسخے کا دو بار اصل سے مقابلہ کیا گیا در ۱۰۷۹ھ - خط یاقوت والے نسخے کا اکثر حصہ اب بھی موجود ہے، دیکھیے Chester Beatty Monographs No. 3] - بڑھاپے میں ثعلب کی سماعت بہت خراب ہو گئی تھی اور یہی خرابی ایک حادثے کا سبب بن گئی - وہ ایک روز مسجد سے اپنے گھر آ رہا تھا کہ راستے میں یہ حادثہ پیش آیا [تفصیل کے لیے دیکھیے ابن القفطی، ۱: ۱۵۰]؛

جس کی وجہ سے وہ [۲۹۱ھ/۹۰۴ء کو بعہد المکتفی ابن المعتضد فوت ہوا۔ اس کی وفات کے دن اور مہینے میں اختلاف ہے]۔ چونکہ ثعلب نے بہت سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی بسر کی تھی اس لیے اپنی لڑکی [نواسی؛ زُبیدی] کے لیے کافی دولت ترکے میں چھوڑ گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا عظیم الشان کتب خانہ وزیر القاسم بن عبیداللہ نے [سستا] خرید لیا تھا [جو خود بھی اسی سال فوت ہوا]۔

بعد کے عرب نحوی کہتے ہیں کہ ثعلب نحو میں مفروضہ مذہب کوفیین کا متبع تھا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مذہب مذکور کا انتہائی عروج ثعلب کی وجہ سے ہوا تھا اور پھر اس کا خاتمہ بھی اس کی وفات سے ہوا۔ ثعلب نے خود تو یہ ضرور کہا تھا کہ وہ الفرّاء امام کوفیین (κατ' ἐξοχήν) کا پر جوش پیرو ہے؛ یہ بھی درست ہے کہ اپنے مشہور معاصر المبرّد سے، جو مذہب ''بصریّین'' کا متبع تھا، اُس کی ہمیشہ مناقشت رہی، لیکن، جیسا کہ وائیل G. Weil نے واضح کیا ہے، ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ نُحاۃ کوفہ کا بھی کوئی باقاعدہ اور مستقل دبستان تھا۔ جب اس کے مفروضہ نمایندوں کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ نحو میں ان کا ایک مستقلّ مذہب ہے تو اسے بعد کے نُحاۃ کی محض اختراع تصوّر کرنا چاہیے، جو اپنے آپ کو طبعاً روایات بصرہ کا متمّم سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ متعارض دبستانہاے نحو میں مطالعات نحویہ کا جو حال اُن کے زمانے میں تھا عہد ماضی میں بھی بالکل ویسا ہی حال ہوگا۔ بلاشبہہ ثعلب نے الفرّاء کی روایت کی تتمیم کی لیکن وہ اس کے نحوی طریق کو متمکّن کرنے میں دوسرے ''کوفیوں'' سے کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوا، چہ جائیکہ یہ کہیں کہ وہ اسے نشوونما دینے میں کامیاب ہوا۔ اُس کی توجّہ قابلِ حفظ مواد جمع کرنے اور مخصوص لغوی صیغوں کے مطالعے پر اس قدر مرکوز رہی کہ وہ نحوی طریق کے متعلّق کوئی مفید کام نہ کر سکا۔

مآخذ: [(۱) السیرافی: اخبار اللّغویّین البصریّین، طبع کرنکو Krenkow، بیروت - پیرس ۱۹۳۶ء (متفرق حکایات و روایات)؛ (۲) زُبیدی: طبقات النحویّین و اللّغویّین، طبع مصر ۱۹۵۴ء، ص ۱۰۵ تا ۱۶۷]؛ [۳] الفہرست، طبع فلوگل، ص ۷۴؛ [۴] ابوالبرکات ابن الانباری: نُزہۃ الالبّاء، [طبع سنگی]، مصر ۱۲۹۴ھ، ص ۲۹۳ تا ۲۹۹؛ [(۵) ابن القفطی: انباہ الرّواۃ، قاہرۃ ۱۹۵۰ء، ۱: ۱۳۸ و مواضع مذکور در حاشیۂ آن صفحہ؛ (۶) ابن الخطیب: تاریخ بغداد، ۵: ۲۰۴ ببعد]؛ [۷] یاقوت: ارشاد الاریب، (*GMS*، ۶)، ۲: ۱۳۳ تا ۱۵۴؛ [۸] ابن خلّکان، طبع وُیستنفلٹ، عدد ۴۴، [طبع قاہرۃ ۱۳۱۰ھ، ۱: ۳۰]؛ ترجمۂ دیسلان de Slane، ۱: ۸۳ تا ۸۶؛ [۹] سیوطی: بغیۃ الوعاۃ، قاہرۃ ۱۳۲۶ھ، ص ۱۷۲ تا ۱۷۴؛ [(۱۰) ابن العماد: شذرات الذہب، ۲: ۲۰۷]؛ [۱۱] محمّد باقر: روضات الجنّات، تہران ۱۳۰۷ھ، ۱: ۵۶ ببعد؛ [۱۲] F. Krenkow : *Il "Libso delle Classi" di Abu Bakr Az-Zubaidi* (در *RSO*، ۱۳: ۱۰۷ تا ۱۵۶)، عدد ۸۷؛ [۱۳] G. Flügel : *Die grammatischen Schulen der Araber* (در *Abh. für die Kunde des Morgenlands*، ۲/۴)، ص ۱۶۳ تا ۱۶۷؛ [۱۴] G. Weil : دیباچہ *Abu'l-Barakāt Ibn al Anbārī, Die grammatischen Streitfragen der Basrer und Kufer*، لائڈن ۱۹۱۳ء، خصوصاً ص ۶۵ ببعد اور ۷۵ تا ۸۱؛ [۱۵] براکلمان: *G. A. L.*، ۱: ۱۱۸؛ [تکملہ، ۱: ۱۸۱ تا ۱۸۲]؛ [۱۶] سرکیس J.E. Sarkis: مُعجم المطبوعات العربیّۃ و المُعرّبۃ، قاہرۃ ۱۹۲۸ء ببعد، عمود ۶۶۲ ببعد؛ [۱۷] ثَعلَب: کتاب الفصیح، طبع J. Barth، لیپزگ ۱۸۷۶ء؛ [۱۸] C. Schiaparelli : *L' Arte poetica di Abu 'l-ʿAbbās Aḥmad b. Yaḥyā Thaʿlab....*، طبع *Actes du Huitième Congrès International des Orientalistes* : ۲/۱، A،

ص ۱۷۳ تا ۲۱۳)، لائڈن ۱۸۹۳ء؛ [(۹) Chester
A volume in the : Beatty Monographs No. 3
Autograph of Yaqut the Geographer ، نشر آربری
A.J. Arberry، لنڈن ۱۹۵۱ء].

(R. Paret پارے)

* ثَعْلَبَة : ایک عام اور قدیم عربی اسم علم (شاذ طور پر : ثعْلَب)، جس کا اطلاق قدیم عرب کے متعدّد قبائلِ کبیرہ کی بڑی بڑی شاخوں کے نام گذارندوں (eponym) پر ہوا ہے ۔ اس کے شاهد هیں ذیل کے ثعلبة نام کے قبیلے : مثلاً ثَعْلَبَة بن عُکَابَة، جو بَکْر بن وائل کے بڑے قبیلے کی اهمّ شاخ هے (اور یمامة سے بحرین تک کے علاقے میں آباد هے)؛ ثَعْلَبَة بن سَعد بن ذُبیان، جو غطفان کی شاخ هے اور علاقۂ نفود میں آباد هے؛ ثعلبة بن یربوع، تمیم کا ایک قبیله؛ ثعالبِ طیّء، طیّء [رکّ بآن] کے عشائر میں سے هیں ۔ ایک اور شخص ثَعْلَبة بن عَمرو بن مُجالِد، خاندان غسّان کا پہلا رئیس (phylarch) بتایا جاتا هے ۔ زاهد مناره نشین یوشع (Joshua Stylites) نے ''بیت ثَعْلَبه کے عربوں'' کے متعلّق لکھا هے کہ وہ لخمیوں کی جنگوں میں حصّه لیا کرتے تھے ۔ وہ یا تو غسّانی الاصل (نولڈیکه Nöldeke) اور یا ثَعلَبۂ بکر بن وائل سے تھے (*Die Dynastie der Lakhmiden in al-Hira* : Rothstein)۔ جنوبی عرب کے قبائل میں ثعلبۂ اَزْد اور ثعلبۂ کنانة ملتے هیں ۔ ثعلبة نام کے دو اور قبائل بھی قابلِ ذکر هیں : اوّل یثرب میں اَوْس کا ایک قبیلۂ ثعلبة اور دوم ثعلبة بن الفِطْیَوْن (کَوسان Caussin کی کتاب میں غلطی سے انھیں غُواطیون لکھا هے)، جو یہود بنی قَینُقاع سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس قبیلے کا ایک رکن مُخَیریق نامی بڑا عالم تھا ۔ یه عام طور پر نبی[ص] کا مخالف رهتا تھا ۔ کہا جاتا هے که یه شخص مشرّف به اسلام هوکر جنگ اُحد میں شہید هوا (طَبَری، ۱ : ۱۴۲۳؛ ابن الاثیر، ۳ : ۲۴ ببعد).

مآخذ : (۱) ابن دُرَید : کتابُ الاشتقاق، طبع وُیسٹنفلٹ؛ (۲) طَبَری، طبع ڈخویه، اشاریه بذیلِ مادّه؛ [(۳) القلقشندی : نہایة الارب، ص ۱۸۰ ببعد]: [۴] وُیسٹنفلٹ : *Register zu d. Geneal. Tabellen*؛ [۵] *Histoire des Arabes* : Caussin de Perçeval

(بُراو یعنی براے H. H. Bräu)

* اَلثَّعْلَبی ۔ احمد بن محمّد بن ابراهیم ابواسحٰق النیشاپوری ۔ ائمۂ دین میں سے ایک مشہور امام اور مفسّر تھے ۔ محرّم ۴۲۷ھ / [نومبر] ۱۰۳۵ء میں [فوت] ہوے ۔ آپ کی مشہور تصنیف تفسیرِ قرآن هے، جس کا عنوان الکَشْفُ وَ الْبَیَان عَنْ تفسیر القرآن هے ۔ اس تفسیر پر ابن الجَوْزی نے (بقول ابن تَغْرِیبَرْدی، ص ۶۶۰؛ طبع Popper، ۲ : ۱۶۶) اس بنا پر تنقید کی هے که اس میں، بالخصوص ابتدائی سورتوں کی تفسیر میں، ضعیف احادیث سے کام لیا گیا هے لیکن شوالی Shwally (دیکھیے Nöldeke : *Geschichte des Qorâns*، ۲ : ۱۷۴) کی راے یه هے که یه تفسیر اس مضمون پر مفیدترین کتابوں میں سے هے، کیونکہ اس میں طَبَری کے علاوہ تقریباً ایک سو دیگر مآخذ کو بصیرت مندانه طریق سے استعمال کیا گیا هے اور گو تصنیف کو مکمّل بنانے میں هر ممکن کوشش کی گئی هے پھر بھی یه تفسیر حجم میں [تفسیر] بیضاوی سے صرف دگنی هی هے ۔ یه کتاب یاقوت کے زمانے تک وسیع پیمانے پر استعمال هوتی رهی اور اس پر احمد بن المختار الرّازی نے حدود ۶۳۱ھ/ ۱۲۳۳ء میں (دیکھیے فہرست کتب خانۂ خدیویّة، ۱ : ۱۹۸) تنقید بھی لکھی تھی لیکن اب زمانه اسے بھول چکا هے اور وہ کبھی طبع نہیں هوئی ۔ اس سے مقبول تر کتاب مصنّف کی کتاب قصص انبیاء موسوم به [تاج العرائس] هے، جو ثَعْلَبی کی تفسیر هی کے مواد سے مأخوذ اور بعد اضافه مرتّب هوئی اور تفسیر کے ذیل کے طور پر

معرض تحریر میں لائی گئی ۔ اس میں (انبیاء کی) تمام کہانیاں نہایت تفصیل سے درج ھیں مگر وہ قُصّاص کی اُن ناقابلِ تسلیم خیال آرائیوں سے بڑی حد تک پاک ھیں جن کے کئی نمونے الکسائی [رَكَ بآں] کے ھاں ملتے ھیں ۔ یہ کتاب کئی بار طبع ھو چکی ھے، مثلاً قاهرة ١٢٩٧ھ، ١٣٠٣ھ، ١٣٠٦ھ، ١٣٠٨ھ، ١٣١٠ھ، ١٣١٤ھ، ١٣٢١ھ، ١٣٢٤ھ، ١٣٤٠ھ، بمبئی ١٣٠٦ھ ۔ اس کا ایک تاتاری ترجمہ محمّد امیر ابن عبداللہ الیعقوبی نے کیا تھا (قازان ١٩٠٣ء) ۔ چونکہ یہ تصنیف مقبول عام ھو گئی تھی اس لیے صحّتِ متن کی پروا نہ کی گئی، چنانچہ پیرس کے قلمی نسخے [عدد ١٩٢٣] میں اسے الکسائی سے مخلوط کر دیا گیا ھے ۔

مآخذ: (١) یاقوت: ارشادالأریب، ٢: ١٠٣؛ (٢) ابن خلّکان، قاهرة ١٢٩٩ھ، عدد ٣٠؛ (٣) السُّیوطی: *Die interpretibus Corani*، طبع Meursinge، عدد ٥؛ (٤) السُّبکی: طبقات، ٣: ٢٣؛ (٥) السُّیوطی: بُغْیة، ١٥٤؛ (٦) وھی مصنّف: طبقات المفسّرین، ٧؛ [٧] وُسْتنفلْت: *Geschichtschreiber der Araber*، عدد ١٨٥؛ [٨] *G.A.L.*، ١: ٣٥٠؛ [تکملة، ١: ٥٩٢].

(C. BROCKELMANN براکلمان)

الثُّغور: (عربی، ثَغْر کی جمع = ''شگاف ـ دَرَہ'')، قلعوں کا ایک سلسلہ، جو شام اور عراق کی سرحدوں پر بوزنطی حملوں سے بچاؤ کے لیے بنایا گیا تھا (اسی لیے اسے 'الثُّغور الرّومیّة' بھی کہتے تھے) ۔ Constantinos Porphyrogennetos نے انھیں τὰ Στόμια بتایا ھے (*De Cerimon.*، طبع بون، ١: ٦٥٧؛ قب Reiske کا تعلیقہ، در ٢: ٧٧٧ = Migne: *Patrol. Graec.*، ١١٢: عمود ١٢٢، تعلیقہ ٣٨) اور سوریہ والے اسے ''ارض تگرا Tagra'' کہتے ھیں (Michael Syrus، طبع Chabot، ٣: ٢٠ ببعد و ٤٦٧؛ ابن العِبْری Barhebraeus: *Chron. Eccles.*، طبع Abbeloos-Lamy، ١: ٣٣٩ ببعد) .

یہ سرحدی علاقہ سلیسیا Cilicia میں طَرَسُوس [رَكَ بآں] سے شروع ھو کر طوروس Taurus کے ساتھ ساتھ اور وھاں سے مَلَطْیّة [رَكَ بآں] تک جاتا تھا اور آگے دریائے فرات تک پہنچتا تھا اور سرحدی صوبۂ عواصم [رَكَ بآں] کو دشمن کے حملے سے بچاتا تھا ۔ اس کی غرض و غایت (گو محلِّ وقوع مختلف تھا) وھی تھی جو پرانے زمانے میں *limes* (= خطِ سرحد) کی تھی ۔ جس طرح *limes* کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، یعنی Limes Arabicus اور [Limes] Syriacus وغیرہ، اسی طرح الثغور کو بھی تمیز کے لیے الثُّغور الشأمیّة اور الثغور الجزیریّة کا نام دیا گیا تھا ۔ شامی ثغور کا بلادِ اعداء سے قریب ترین شہر مَرْعَش [رَكَ بآں] تھا، اور ثغور الجزیریّة کا مَلَطْیّة [رَكَ بآں] ۔ الاَصْطَخْری نے ثغور میں ذیل کے قلعوں کے نام دیے ھیں: مَلَطْیّة الْحَدَث، مَرْعَش، الْهارُونیّة، الکَنیسة (= الکَنیسة السَّوداء)، عین زَرْبة، المَصِّیصة، اَذَنة اور طرسوس ـ الدِّمَشْقی ثغور الجزیریّة کے مندرجۂ ذیل قلعوں کے نام گنواتا ھے: مَلَطْیّة، کَماخ، شِمْشاط، البِیرة، حصن منصور، قلعة الرُّوم، [الحدث] الحمراء اور مَرْعَش اور اسی طرح الثغور الشأمیّة کے مندرجۂ ذیل قلعوں کے نام دیتا ھے: طَرَسُوس، اَذَنَة، المَصِّیصة، الهارُونیّة، سِیس اور [آیاس یا ایاغ] ۔ آٹھویں صدی هجری/چودھویں صدی میلادی میں مملوک سلطنت کے سرحدی علاقوں میں عواصم اور ثغور [اور متّصله علاقے] (بقول القَلْقَشَنْدی: صبح الأعشٰی، قاهرة، ٣: ٢٢٨، اس جگہ فقط ثغور لکھنا درست تر ھوتا) کی آٹھ [معتبر] نیابتیں شامل تھیں، یعنی: دِبْرِکی (دِوْرِکی)، دَرَنْدہ، اَبُلُسْتین، آیاس، طَرَسُوس، اَذَنة، سِرْفَنْدکار اور سِیس اور حدودِ بلادِ الجزیرہ میں تین [معتبر] نیابات شامل تھیں، یعنی: البِیرة، قلعةُ جَعْبَر اور الرُّها ۔ اس زمانے میں کلمۂ

''ثغور'' علمی روایات کے سوا غالباً کہیں اور باقی نہیں رہا تھا.

عہد ممالیک میں دَرَۂ بَیلان [رکؔ بان] کا مشہور نام ثَغْرالْاِسکَنْدَرِیّۃ تھا (H.E. Weijers : *Summa operis Durrat al-Aslāk fī Dawlat al-Atrāk* (دُرَّۃ الْاَسلا ك فی دولۃ الْاَتراك)، در *Orientalia*، طبع جوئنبول Juynboll، ۲، ۱۸۴۶ء: ص ۳۲۳، ۳۲۹، ۳۵۱، ۳۶۴، ۳۶۸، ۳۸۹)؛ کبھی کبھی دیار بَکْر کی سرحد کو الثغور البَکْرِیّۃ لکھا جاتا ہے (قُدامۃ : *BGA*، ٦ [ابن خرداذبہ] : ۲۵۴).

ابو الفداء کے قول کے مطابق (تقْوِیم، ترجمۂ Reinaud-Guyard، ۲/۱ : ۱۳؛ ۲/۲ : ۲۵۷) اَنْدَلُس اور ماوراء النّہر کے سرحدی علاقوں کے لیے بھی الثغر یا الثغور کی اصطلاح استعمال ہوتی رہی ہے.

مآخذ : (۱) الاِصْطَخْری : *BGA*، ۱ : ۵۵ ببعد؛ (۲) ابن حَوْقَل : *BGA*، ۲ : ۱۰۸؛ (۳) یاقوت : مُعْجَم، طبع وِیستنفیلْٹ Wüstenfeld، ۱ : ۹۲۷؛ (۴) صَفِیّ الدّین : مَراصد الْاَطّلاع، طبع جُوئنبول Juynboll، ۱ : ۲۲۸؛ (۵) البَلاذُری : طبع ڈ خویہ De Goeje، ۱۶۳ تا ۱۷۱، ۱۸۳ تا ۱۹۲؛ (٦) ابن الاَثِیر : کامل، طبع تورْنبِرگ Tornberg، اشاریہ، ۲ : ۲۰۷؛ (۷) الطَّبَری، طبع ڈ خویہ، اشاریہ، ص ۳۸٦؛ (۸) الدِّمشْقی، طبع مِہرن Mehren، ص ۲۱۴؛ (۹) ابوالفداء : *Annales Muslem.*، طبع Reiske، ۲ : ٦۰؛ ۳ : ۸٦ [یہاں: الثَّغْر]؛ (۱۰) کمال الدّین، در فریتاغ Freytag : *ZDMG*، ۱۱ : ۱۸۳، تعلیقہ؛ (۱۱) ابن الشِّحْنَۃ : الدُّرّالْمُنتَخَب فی تاریخ حَلَب، طبع بیروت، ص ۱۷۸؛ (۱۲) Rosen : *Zapiski Inp. Akad. Nauk*، ۴۴ : ۲، ۹۰، ۱۳۰، ۱۳۲، ۲۳۳، ۳۱۱، ۳۱۵؛ (۱۳) زخاؤ Sachau : *S.B. Akad.* *Berlin* ۱۸۹۲ء، ص ۳۱۹؛ (۱۴) Le Strange : *Palestine under the Moslems*، ص ۲٦ ببعد، ۳۷ ببعد؛ (۱۵) وہی مصنّف : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۱۲۸؛ (۱٦) Gaudefroy-Demombynes : *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، ص ۹٦.

(E. HONIGMANN)

ثَقِیف عرب نسب نگاروں اور مؤرّخوں کے قول کے مطابق ثقیف بن مُنَبّہ بن بَکر بن ہوازن، قبائل عدنان کی ایک شاخ تھی ۔ عہد نبوی کے اواخر میں عُروۃ ابن مسعود (بن مُعَتّب بن مالک بن کعب بن عمرو ابن سعد بن عوف بن ثقیف) نے اپنے بڑھاپے میں اسلام قبول کیا تھا ۔ اس طرح ثقیف کا زمانہ اسلام سے کم از کم تین سو سال قبل کا زمانہ قرار پاتا ہے.

عربی روایتیں اس پر بھی متّفق ہیں کہ ثقیف نے، جس کا نام (بقول بعض، جس کا لقب) قَسِیّ بھی ہے، اپنے کسی بھائی یا ابن عَمّ کو (جو قبیلۂ ایاد سے بیان کیا جاتا ہے) کسی بات پر قتل کر کے فرار اختیار کیا تھا اور گھومتے گھامتے طائف پہنچا تھا، جہاں سردار علاقہ عامر بن الظَّرِب العَدْوانی (معارف، ۳۸، ۲۷۴) نے اُسے پناہ دی اور اپنا داماد بھی بنایا ۔ اس مشہور عرب حَکَم کے نسب سے بھی ثقیف کا زمانہ اسی مذکورہ مُدّت پر متعیّن ہوتا ہے ۔ عربی افسانوں کے مطابق اپنی خانہ بدوشی کے زمانے میں ثقیف چند روز حجاز میں ایک یہودن کے ہاں بھی رہا اور اُسی یہودن نے اُسے عمدہ انگور کی ایک شاخ بھی دی، جس سے اب تک علاقۂ طائف بارآور ہے [قَبّ بکری، ۴۳ ببعد].

اس بارے میں قدیم سے اختلاف ہے کہ ثقیف کا تعلّق قبیلۂ ایاد سے ہے یا ہَوازن سے، یا خود ثمود سے ۔ (سُہَیلی : رَوْض الْاُنُف، ۱ : ۴۳ [قَبّ بکری، ۱۵])۔ اُمَیّۃ بن ابی الصَّلْت الثَّقَفِیّ کے (جو بروایت بلاذُری : انساب، یہودی تھا) کچھ اشعار ابن اسحاق (ابن ہشام : سیرۃ، ص ۳۲) نے نقل کیے ہیں ۔ ان میں ایاد سے نسبی تعلّق کا دعوی کیا گیا ہے ۔ بہ ظاہر ان اختلافات کا پس منظر یہ ہے کہ ثقیف

ایک مفرور پناہ گزیں تھا، جس نے مصلحةً اپنا صحیح نسب پوشیدہ رکھا ہوگا۔ بعد کے زمانے میں اس سوال نے علمی اہمیت اختیار کی تو ثقفیوں کے موافقوں اور مخالفوں دونوں کو خیال آرائی کا موقع ہاتھ آیا ۔ یمن کے قبیلۂ کندۃ کی حکومت نے اس علاقے کو فتح کیا؛ پھر ایک خونریز جنگ کے بعد اس کا قبضہ ختم ہوا ۔ یقیناً کندی تسلّط کی تلخ یاد لوگوں کے ذہن میں ہوگی۔ ابرهۂ حبشی کے حملۂ مکّہ میں ثقیف نے حبشیوں سے تعاون کیا تھا اور ابورغال نے فوج کی رہبری کی تھی ۔ ابورغال طائفی کی قبر کو مکّے کے قریب مغمس میں صدیوں پتھراؤ کیا جاتا رہا ۔ زمانۂ مابعد میں الحجّاج بن یوسف ثقفی کی سفّاکیاں بھی عام مسلمانوں میں اس قبیلے کو بدنام سے بدنام تر ہی کرنے کا باعث ہوئیں ۔ ممکن ہے ثقیف کا تعلّق ثمود، ایاد یا ہوازن میں سے کسی سے بھی نہ ہو ۔ یا سب ہی سے ہو کہ باپ کا نسب کچھ ہو، ماں کا کچھ اور ہو، یا خود بغیر ازدواج کے کسی کی اولاد ہونے کے باعث اصل میں کچھ اور ہی ہو ۔ ویسے ایاد اور ہوازن ہم جدّ قبائل ہیں۔ اُمیّة بن ابی الصّلت کے علاوہ قُسّ بن ساعدۃ ایادی بھی یہیں کا باشندہ سمجھا جاتا ہے اور نبیؐ کا نوعمری میں عُکاظ میں اس کے فصیح و بلیغ خطبات کو سننا احادیث میں مروی ہے (المسعودی : مروج، طبع یورپ، ۱ : ۱۳۳ تا ۱۳۵).

عربی خانہ جنگیوں کے سلسلے میں عامر بن الظّرب کے قبیلۂ عَدْوان کو علاقۂ طائف سے جلا وطن ہونا پڑا ۔ لیکن ہوشیار ثقیف اور اس کی اولاد کو کسی نے نہ چھیڑا .

طائف کے مضافات میں ماقبلِ تاریخ دور کے باشندوں نے چٹانوں پر جانوروں کی تصویریں کھودی ہیں ۔ ان کے فوٹو اور ان پر ایک مقالہ بعنوان ذیل شائع ہوا ہے : Bruce Howe : *Two Groups of Rock Engravings from Hijāz*، در *Journal of Near Eastern Studies, (U.S.A.)*، ج ۹، عدد ۱، جنوری ۱۹۵۰ء: ص ۸ تا ۱۷ .

ثقفیوں میں اسلام سے پہلے ہی اچھی خاصی حضریّت آ گئی تھی۔انھوں نے وادی وجّ میں نہ صرف لِیّة [ھَمْدانی، ۱۲۱]، وَھْط [بکری، ۸۴۸] وغیرہ میں باغبانی اور تاکستانوں کو بڑی ترقّی دی تھی بلکہ آب رسانی کی خاصی مہارت کا بھی مظاہرہ کیا تھا ۔ مزید برآں اپنے دیار کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط فصیل بھی اپنے شہر کے اطراف میں کھڑی کر لی تھی ۔ اغانی (۱۲ : ۴۸ ببعد) کے مطابق یہ کسرائے ایران کے فرستادہ مہندس کا کارنامہ تھا، لیکن سُہیلی (رَوْض الاُنُف، ۲ : ۳۰) نے اسے البکری کے حوالے سے [قبّ ص ۴۴ س ۱۰، ص ۵۰ س ۱۷، ص ۵۱۴ س ۸] بعض یمنی (کندی) کاریگروں کی طرف منسوب کیا ہے ۔ قدیم عرب کا ممتاز طبیب، جس کی مہارت سے معزّزین ایران تک مستفید ہوتے تھے (یاقوت : معجم البلدان، [۲ : ۹۵۲] بذیل زَنْدَوَرْد) یعنی الحارث بن کَلَدة، بھی ثقفی ہی تھا اور کہتے ہیں کہ جندیسابور کا تعلیم یافتہ تھا ۔ ابن ابی اُصَیْبِعَة [۱ : ۱۱۳] نے حفظ صحت پر اس کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے [جس کا نام کتاب المحاورة فی الطبّ بینہ و بین کسری انوشروان ہے]۔ الغُزُوْلی (م ۸۱۵ھ/ ۱۴۱۲ء) نے مطالع البدور (۲ : ۱۰۱ تا ۱۰۴) میں جو اقتباس دیے ہیں وہ [ابن ابی اصیبعة کے اقتباسات کی طرح] غالباً اسی کتاب کے ہیں ۔ عمرو بن اُمیّة بن العلاج الثقفی [اپنے زمانے میں فوق‌العادۃ صاحب ہوش (genius) سمجھا جاتا تھا] (ابن ھشام، ص ۱۳۱) ۔ النابغة الجعدی بھی انھیں میں کا شاعر تھا ۔ غَیْلان بن سَلِمة ثقفی کے متعلّق لکھا ہے کہ سُوقِ عُکاظ میں وہ ایک دن

عدل گستری کرتا، ایک دن محفل شعر و سخن منعقد کرتا اور ایک دن ملاقاتیوں کو باریاب کرتا ۔ کتاب المحبر (ص ۳۰۷) میں ابن حبیب نے ایک پوری فصل ان ثقفیوں پر لکھی ہے جن کی عہد اسلام کے آغاز پر دس دس بیویاں تھیں۔

خاندان عبد یالیل سے خود پیغمبر اسلامؐ کا ننھیالی رشتہ تھا ۔ دیگر اهل مکہ و ثقیف کا باھمی ازدواج بھی بہ کثرت نظر آتا ہے ۔ طائف کی زرخیزی اور تجارتی اھمیت کے باعث یہاں بہت سے یہودی بھی نامعلوم زمانے میں آ بسے تھے اور عہد اسلام کے آغاز پر وھاں موجود تھے (بلاذری: فتوح، ص ۵٦) ۔ اھل طائف میں سودخواری کا وجود اور اطاعت ثقیف کے معاھدے میں آنحضرتؐ نے سود کے متعلق جو خصوصی احکام دیے تھے وہ غالباً انھیں یہودیوں سے متعلق ہوں گے ۔

ثقیف کی اولاد ابتدا میں اتنی کثیر نہ ہوگی کہ ساری قابل کاشت زمین سے تنہا استفادہ کر سکتی ۔ جلدی ہی دوست قبائل کو وھاں آ بسنے دیا گیا اور یہ اَحلاف کہلانے لگے ۔ شروع میں آپس کے تعلقات اچھے رہے ہوں گے، بعد میں رقابت کا پیدا ہونا ناگزیر تھا ۔ معاھدۂ اسلام طائف میں صراحت سے ذکر ہے کہ بنی مالک (ثقیف) کا سردار الگ ہوگا اور اَحلاف کا الگ۔

دیگر عربوں کی طرح ثقیف بھی بت پرست تھے ۔ عکاظ میں جہار نامی بت [عوف بن نصر بن معاویة انھیں کے بنوالعم کے زیر سدانت تھا، یاقوت: معجم البلدان، ۲ : ۱٦۷] ۔ اپنے اصل مرکز طائف میں تو انھوں نے لات نامی بت کے سلسلے میں ایک کعبۂ ثانی بھی بنا لیا تھا [ھشام ابن الکلبی: کتاب الاصنام، قاھرۃ ۱۳۴۳ھ، ص ۱٦.؛ یاقوت: معجم، ۲ : ۱٦۷] اور اپنے شہر کو بھی ایک حرم قرار دے دیا تھا، جہاں پرند پرند کا شکار اور جنگلی درختوں کا کاٹنا جرم تھا۔

آغاز اسلام کے کچھ عرصہ بعد، ھجرت سے شاید چار سال قبل، حضور علیه السلام طائف گئے تھے تاکہ اپنے ماموؤں سے تائید حاصل کریں، مگر توقعات بری طرح ناکام ہوئیں ۔ حتّٰی کہ ۵ھ میں جب جنگ خندق [رَکَ بآن] ہوئی اور سارا عرب مدینے پر چڑھ دوڑا تو بلاذری: انساب (۱ : ۳۴۳) کے مطابق حملہ آوروں میں ثقیف کا بھی ایک دستہ موجود تھا ۔ ٦ھ کی مہم حُدَیبِیَة (بہ ذیل مادّہ) میں اگر ھمیں مُغیرۃ بن شُعبۃ وغیرہ چند ثقفی مسلمان بھی نظر آتے ھیں تو خود اھل مکہ کے وفد گفت و شنید میں عروۃ بن مسعود ثقفی بھی ہے ۔ صلح نامۂ حدیبیۃ میں مدینے اور طائف کی تجارت کا بھی ذکر ہے ۔ مشہور ابو بُصیر [عُتبۃ بن اَسید حلیف قریش؛ بلاذری: انساب، ۱ : ۲۱۱؛ ابن ہشام، ۱ : ۷۵۰]، جو اھل مکہ کی قید و محن سے بھاگ کر اسلام میں پناہ گزیں ہوے مگر جنھیں حسب معاھدہ آنحضرتؐ نے قریش کے سپرد کیا اور پھر وہ مکرّر فرار ہو کر قریش کے کاروانوں کو ھراساں کرتے رہے، وہ بھی ثقفی ہی تھے [لیکن قب طَبری، ۱/۳ : ۱۵۵۱ ببعد]۔

۸ھ میں فتح مکہ کے بعد خبر ملی تھی کہ ھوازن مسلمانوں پر حملہ کرنا چاھتے ھیں ۔ اس کے تدارک میں اولاً حُنَین (بہ ذیل مادّہ) کا معرکہ پیش آیا ۔ پھر بقیۃ السیف کا خود طائف میں محاصرہ کیا گیا ۔ چند دن بعد بعض مؤثر سیاسی انتظامات کر کے آنحضرتؐ مدینے واپس ہوے ۔ سال بھر بھی نہ گذرا تھا کہ ثقیف وغیرہ اھل طائف کا وفد مدینے آیا اور اسلام قبول کر لیا ۔ ان کے اصرار پر دلداری کے لیے آنحضرتؐ نے انھیں زکوٰۃ اور فوجی خدمات سے مستثنٰی کیا ۔ سود اور بازار کے متعلق بھی بعض رعایتیں منظور کیں (متن معاھدہ ابو عبید: کتاب الاموال میں ملے گا)۔

خلافت صدیقی میں مرتدوں سے مقابلے کی

تیاری ہوئی تو اہلِ ثقیف نے بخوشی فوجی رضاکار مدینے بھیجے (طبری)۔ غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ خلافت فاروقی میں بہ کثرت اہلِ طائف گورنری نیز دیگر ذمے دار خدمات پر فائز کیے گئے۔ عُمان کے ثقفی گورنر نے مغربی ہند کے ساحلوں پر اوّلین اسلامی بحری مہم اسی زمانے میں بھیجی (بلاذری: فتوح، ۴۳۱)۔ الحجّاج بن یوسف [رکّ بآن] بھی ثقفی تھا۔ اور اسی کے بھتیجے محمّد بن قاسم [رکّ بآن] نے سندھ و پنجاب (ملتان) کا الحاق کر کے کچھ ایسی دادِ فرمانروائی دی کہ سندھی غیر مسلم اس کے بعد اس کا بت بنا کر پوجنے لگے۔ عربی خط میں نقطے اور اعراب لگا کر الحجّاج بن یوسف نے خود قرآن مجید کی اتنی بڑی خدمت کی کہ بعض خوش مذاق صوفی بے محابا کہنے لگے کہ شاید خدا اس کی سفّاکیوں کو بالکل ہی معاف کر دے۔

ثقفی مزارعین تیسری صدی ہجری میں یمن وغیرہ میں بھی نظر آتے ہیں اور زیدیوں کو بھی قبضۂ یمن میں مدد دیتے ہیں، جس کی تفصیل van Arendonk نے دی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ہمیں مدینۂ منوّرہ کے بعض بڑے باغوں میں ثقفی باغبان ملازم نظر آئے، جو طائف سے بلائے گئے تھے۔

انیسویں صدی میلادی کے شروع میں سیّاح برکہارٹ Burckhardt نے بیان کیا کہ ثقیف بڑا طاقت ور قبیلہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''طائف کے نواح کا زرخیز علاقہ اور حجاز کی مشرقی گھاٹیوں کے عمدہ مقامات اسی قبیلے کی ملکیّت ہیں۔ طائف کی حضری آبادی کا نصف حصہ اب بھی بنوثقیف ہیں؛ اگرچہ وہ کچھ خانہ بدوش بھی ہیں۔ ان کے پاس گھوڑے اور اونٹ تو بہت کم ہیں لیکن بھیڑ بکریاں خاصی تعداد میں ہیں۔ ضرورت پڑے تو وہ رائفلوں سے مسلّح دو ہزار مُقاتل میدانِ جنگ میں لا سکتے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۰۳ء میں طائف کے دفاع میں وہّابی نجدیوں کا مقابلہ کیا تھا''

نو مسلم انگریز مسٹر فِلبی Philby نے جبلِ کَرا [یا کَرآء؛ بکری، ۱۷۴] پر، جو مکّے اور طائف کے درمیان واقع ہے، ثقفیوں کو آباد اور زراعت میں مشغول پایا۔ ۱۹۳۲ء میں ہمیں یہاں ایسے لوگ ملے جو مکّے اور طائف کے مابین گدھوں پر تجارتی درآمد و برآمد کرتے اور خود مسافروں کی حمل و نقل میں حصّہ لیتے تھے۔ جبلِ کَرآء پر بعض قدیم عربی کتبے بھی ہیں۔

مآخذ: (۱) Burckhardt: *Voyage en Rabie*، فرانسیسی ترجمہ از Eyriès، پیرس ۱۸۳۵ء، ۳: ۳۰۹ تا ۳۱۰؛ (۲) Philby: *The Heart of Arabia*، لنڈن ۱۹۲۲ء، ۱: ۱۸۹، ۱۹۴؛ (۳) ہَمْدانی: صفة جزیرة العرب (طبع مُلّر Müller)، ص ۵۳، ۹۱، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۳۶؛ (۴) محمّد حمید اللہ: الوثائق السیاسیّة فی العہد النبوی و الخلافة الراشدة، مصر ۱۹۴۱ء، عدد ۱۸۱ تا ۱۸۴؛ (۵) وہی مصنّف: رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی، (کراچی ۱۳۶۹ھ)، ص ۳۸۲ تا ۳۹۲؛ (۶) وہی مصنّف: عہد نبوی کے میدان جنگ، (حیدر آباد ۱۹۴۰ء)، ص ۴۹ تا ۵۳ (با تصویر)۔۔۔نیز رکّ بہ مادہ ہاے حُنین و طائف۔

(محمّد حمیداللہ)

ثُلا: جنوبی عرب کا ایک قصبہ ہے، جو سُرخی مائل پہاڑیوں کے ایک سلسلے کے دامن میں واقع ہے۔ یہ سلسلہ کَوکَبان، حَضُور الشّیخ اور ذی بِین کے بڑے زنجیرے سے ایک شاخ کی صورت میں جدا ہو کر مشرق (جنوب مشرق) کو جاتا ہے اور البَوْن کی جنوبی حد اُس سے شکل پذیر ہوتی ہے۔ گلازر E. Glaser کے قول کے مطابق، جو یہاں ۵ دسمبر ۱۸۸۳ء کو وارد ہوا تھا، قصبہ بہت صاف ستھرا ہے۔ گلیاں تنگ اور مکان بہت اونچے اونچے ہیں جو زردی مائل سرخ رنگ سنگ آہک [کے پارچوں] سے باقاعدہ تعمیر ہوے ہیں، اس طرح کہ پتھر کو تراش کر تقریباً ۱۰ انچ × ۴ انچ چوکور قطعے بنا لیے گئے ہیں اور یہی خصوصیتیں قصبے بھر میں

نظر آتی ھیں ۔ یہ قصبہ سنگِ ریگی کی ہزار فٹ اونچی ڈھلوان چٹان ['جُرُف'] کے مشرقی پہلو کے سہارے تعمیر ہوا ہے ۔ چٹان کے اوپر ایک قلعہ ('حِصْن') بنا ہوا ہے، جو اَلنّاصرِہ کہلاتا ہے ۔ قلعے کے گرد فصیل ہے، جس میں چار دروازے ھیں، جن کا سلسلہ اس ڈھلوان چٹان کے مقابل ہی سے شروع اور ختم ہوتا ہے ۔ یہ قصبہ شِبام سے کم از کم دُگنا اور کَوکَبان سے ڈیوڑھا ہے ۔ صَنعاء کے بعد یہ یمن کا بزرگ ترین اور حسین ترین قصبہ ہے ۔ قلعے میں داخلے کے لیے ایک گہرے شگاف پر بڑی سی طاقدار گذرگاہ تعمیر کی گئی تھی، جو بعد میں مسمار کر دی گئی ۔ قلعہ غیر معمولی طور پر مستحکم اور بظاہر نہایت قدیم ہے ۔ کہتے ھیں کہ اس کا نام پہلے حُصْن [حصن] الغُراب (کوّے کا قلعہ) تھا، جو ساحل کے اس مشہور قلعے کا نام بھی ہے جو کانہ Kane (المجذَحة) کے پرانے بندرگاہ پر واقع ہے ۔ اس کا شمار یمن کے بہترین قلعوں میں ہوتا ہے ۔ ترکوں نے جب یہ علاقہ فتح کیا تو بدقسمتی سے انھوں نے اس کے تمام بیرونی استحکامات تباہ کر دیے تھے ۔ قلعے میں داخلے کا دروازہ ۶۰ سے ۱۰۰ فٹ تک گہری آب کَنْد (ravine) کے اوپر ایک کُلِّیَۃً عمودی دیوار میں ۱۰ فٹ کی بلندی پر موجود ہے ۔ قلعے کے اندر ایک خوبصورت مسجد ہے اور انتہاے مشرق میں پہاڑی کے بلندترین مقام پر وسیع سکونتی مکان بھی ہے، جو دور سے پست سا مربع برج نظر آتا ہے ؛ اس کے پاس ہی کسی قدر نیچے کو ایک بلند تر برج بھی ہے اور وہ بھی مربع ہی ہے ۔ پانی چار پانچ گہرے حوضوں سے بہم پہنچایا جاتا تھا، جنھیں اچھی طرح سے سیمنٹ کیا گیا ہے ۔ پندرہ بیس کوٹھیوں ('مَدافِن') سے، جو مخروطی شکل کے غاروں پر مشتمل ھیں اور سنگِ ریگی کو کاٹ کر بنائی گئی ھیں، اشیاے خور و نوش کے گوداموں کا کام لیا جاتا تھا ۔ کوٹھیوں کا مُنہ تنگ سرے کی جانب رکھا گیا تھا ۔ ان کی گہرائی اٹھارہ بیس فٹ ہے ۔ تہ پر قُطر بارہ فٹ ہے ؛ دھانے پر پورا تین فٹ نہیں ہے ۔ پہاڑ کی چوٹی پر، جہاں قلعہ واقع ہے، ہر طرف ڈھلوان چٹانوں (جُرُوف) کو کاٹ کر غار بنائے گئے ھیں ۔ ان کے اندر باقاعدہ سکونتی مکان بنے ہوے ھیں، جن میں کھڑکیاں، طاق اور دروازے موجود ھیں ۔ بعض مکانوں پر سفیدی کی گئی ہے ۔ ہر ایک میں مختلف ناپ کے پانچ پانچ چھے چھے کمرے ھیں ۔ مکان پرانے معلوم ہوتے ھیں اور ایک زمانے میں قلعے کے عرب محافظ دستے کی سکونت کے کام آتے تھے ۔ مذکورہ تباہ شدہ بُرج نُما مربّع عمارت کے مغرب میں کئی بڑے بڑے مزار ھیں، جو سنگِ ریگی پر بنے ہوے ھیں ۔ مزاروں پر عربی زبان کے قدیم کتبے ھیں ۔ کہتے ھیں کہ ان میں سے ایک مزار کسی ولی کا مدفن ہے ۔

مقامی روایت کے بموجب ابتدا میں یہاں کوئی قصبہ اس نام کا نہ تھا، بلکہ صرف دیہات کا ایک مجموعہ تھا؛ ان گاؤوں کی تعداد چالیس سے زیادہ بتائی جاتی ہے ۔ یہ ترکوں کی فتح تک ثُلا کے زیرِ حکومت تھے ۔ نیبُور C. Niebuhr کے زمانے میں ثُلا (نیبُور نے اِسے تَلّہ لکھا ہے) کے حوزۂ اداری میں شمال کے علاقے بھی شامل تھے، مثلاً کُحلان، عفّار، حَجة، ضُفیر Dofir، کَوکَبان (نزد حَجة)، جِبل شِریف، حبور، سُودہ اور جِبل شَہارۃ (تقریباً ۳۰۰ دیہات سمیت) ۔ لہٰذا یہ علاقہ انیسویں صدی کے اواخر کے مقابلے میں اس وقت بہت زیادہ وسیع تھا ۔

مآخذ : (۱) نیبور C. Niebuhr : *Beschreibung von Arabien*، کوپن ہاگن ۱۷۷۲ء، ص ۲۰۱ ببعد؛ (۲) گلازر E. Glaser : *Geographische Forschungen Jemen 1888/84*، (مخطوطہ) ورق ۶۱ .

(گروماں GROHMANN)

* ثُلْث : دیکھیے مادۂ Arabia، ۱ : ۳۸۶ ب، ۳۸۷ الف.

* ثُمامَة بن اَشْرَس : متکلّم اور عبّاسی دور اوّل میں اہلِ حریّتِ فکر کا امام، اسے پہلے ہارون اور پھر مأمون نے اُس کے تبحّرِ علمی اور ذہنی قابلیت کے باعث حاضرِ دربار ہونے کی دعوت دی۔ اس میں شک نہیں کہ قدامت پسندانہ نظریوں پر اس کی کڑی تنقید بھی انہیں بہت پسند تھی۔ اس سے قدامت پسند طبقہ اس کا دشمن ہو گیا۔ متوکّل کے عہد میں جب یہ لوگ پھر دربار میں پیش پیش آنے لگے تو انھوں نے کوشش کی کہ ثمامة کی شہرت کو نقصان پہنچائیں۔

اپنے زمانے کے اہمّ حل طلب مسائل پر ثمامة نے نہایت مدلّل طریق سے آزادنہ رائے قائم کی، جو بسا اوقات منفرد اور مستبدّانہ معلوم ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر افعال کے نتائج کو لیجیے، جب کوئی شخص کنجی گھماتا ہے تو یہ فعل اُس آدمی سے صادر نہیں ہوتا (ورنہ خدا کی طرح وہ اس بات پر قادر سمجھا جائے گا کہ نئے حقائق کو وجود میں لائے، یعنی ان کی تخلیق کرے) اور نہ اس فعل کا اضافہ خدا ہی کی طرف کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ خدا فعلِ قبیح کا بھی خالق ہے [اور یہ محال ہے] نیز یہ کہ اُس کے افعال مخلوق کے ارادے سے سرزد ہوتے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ گویا نتائج (''مُتولّدات'') وہ افعال ہیں جن کا کوئی فاعل نہیں ہوتا اور ان کی بنیاد طبیعت (’طباع‘) پر ہوتی ہے۔ حریّتِ فکر والے طبقے نے ان ’متولّدات‘ کا سلسلہ ’تولید‘ سے (یعنی انسان کے انہیں ''پیدا کرنے'') سے جا ملایا ہے لیکن انہیں اس تولید کو ''علّیت'' کہنے میں تأمل ہے۔ لہٰذا ثمامة کی رائے میں علمِ انسانی [حَدَث بلا مُحدِث ہے، یعنی] وہ چیز ہے جس کی ابتدا وقت میں ہوتی ہے لیکن جس کی کوئی علّتِ اَوّلی (جو اس کی مُحدِث ہو) نہیں ہے جو وقت میں کام کر رہی ہو۔ نفسِ انسانی خود اسے پیدا نہیں کر سکتا، کیونکہ اس صورت میں وہ گویا ایک ایسا فعل سرانجام دیگا جو خدا کا فعل ہے۔

ہمارے پاس جو کچھ ہے اور ہمیں جس چیز پر اختیار حاصل ہے وہ صرف ہماری قوّتِ ارادی کا باطنی فعل ہے؛ اس فعل کے نتائج اس میں شامل نہیں۔ خدا نے عالَم کو ''طِباع'' (physis) سے، جو ''طبیعی'' ضرورت کا مترادف ہے، پیدا کیا۔ اس لیے [شہرستانی نے بجا کہا کہ ثُمامة کے اس عقیدے سے قِدمِ عالَم کا ماننا لازم آتا ہے، اسی طرح جس طرح فلاسفہ کے قول سے لازم آتا ہے؛ اس لیے کہ مُوجَب مُوجِب سے جدا نہیں ہو سکتا]۔ ہماری فطری عقل ہمارے افعال کی اخلاقی اَقدار طے کرتی ہے (یہی ہے جسے ہم ''تحسین العقل'' کہتے ہیں) اور ان اقدار کی تعیین اللہ کی طرف سے آمرانہ رنگ میں نہیں ہوتی۔

ہمارے تمامَ معارف (عقلی مُدرَکات) ضَروری ہیں، اِتّفاقی نہیں۔ جس شخص کو خدا کی وہ معرفت حاصل نہیں جس پر منطق اُسے مجبور کرتی ہے تو وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل پر مأمور نہیں؛ لیکن عدمِ تعمیل کی صورت میں وہ شرفِ انسانی سے محروم ہو کر حیوانوں کی سطح پر آ جائے گا [اور حیوانوں کی طرح انسانوں کے لیے مسخّر ہوگا] اور اگلے جہان میں خاک میں مل جائے گا؛ اس کی روح غیر فانی نہ ہو گی۔ [کفّار، مشرکین] یہودیوں، عیسائیوں، دہریوں، زنادقہ [یعنی مزدکیوں]، مجوسیوں (آتش پرستوں، یعنی پارسیوں)، [بہائم و طیور] اور [مسلمانوں کے بچوں] کا یہی حال ہوگا۔

ابن المرتضٰی نے اپنی تصنیف المُنیَة و الأمَل فی شرح المِلَل و النِّحَل (طبع آرنلڈ T. W. Arnold، لیپزگ ۱۹۰۲ء، ص ۳۵ ببعد) میں ثمامة کو

ساتویں طبقے میں شمار کیا ہے، جو العلاف (م ۸۴۹ھ) کے بعد شروع ہوتا ہے - وہ بشر بن المعتمر (م بہ حدود ۸۴۰ء) کا شاگرد تھا - ''علم و ادب میں اپنے زمانے کا یکتا'' مانا جاتا تھا [''واحد دھرہ فی العلم و الادب''؛ ابن المرتضی] اور مناقشات میں لوگ اس کا لوہا مانتے تھے - اس کی (کنیت اور نسبت) ابو معن النمیری تھی۔

مآخذ: (اس کے متعلق تمام‌تر مواد اس کے مخالفین یعنی قدامت پسند علماے دین کی تصانیف سے ماخوذ ہے)؛ (۱) ایجی: کتاب المواقف، طبع Sφrensen، بمواضع کثیرہ؛ (۲) شہرستانی: کتاب الملل و النحل، طبع کیورٹن Cureton، لنڈن ۱۸۴۲ تا ۱۸۴۶ء، ص ۴۹ ببعد؛ (۳) [اسفراینی] مخطوطۂ برلن، تقطیع ربعی، ورق ۵۰ ببعد؛ (۴) البغدادی: [الفرق] بین الفرق، طبع قاھرۃ، بمواضع کثیرہ؛ (۵) جرجانی: [التعریفات] *Definitiones*، طبع فلوگل Flügel، لیپزگ ۱۸۴۵ء، ص ۷۶، سطر ۴؛ (۶) [ابن عبدربہ: العقد، بامداد فہارس العقد، ۱: ۲۲۹]؛ [۷] M. Horten: *Die Theologie des Islam*، لیپزگ ۱۹۱۲ء، ص ۲۸۵؛ [۸] وہی مصنف: *Die philosophischen Systeme*، بون Bonn، ۱۹۱۲ء، ص ۳۰۹ تا ۳۱۷؛ [۹] وہی مصنف: *Die philosophischen Probleme*، بون Bonn ۱۹۱۰ء، ص ۵۰، ۱۷۶ وغیرہ۔

(هورٹن M. HORTEN)

[تعلیقه بر ثمامة بن اشرس

مندرجۂ بالا مقالے کے متعلق فاضل معاصر محمد یوسف موسی نے لکھا ہے کہ اس میں پیچیدگیاں اور اشتباہات ہیں - ان کے رفع کرنے کے لیے موصوف نے مختصر مگر مفید تعلیقہ لکھا ہے، جو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، ۶ / ۶: ۲۰۹ میں درج ہوا ہے - اس کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے - موصوف نے ابوالحسین عبدالرحیم [بن محمد] الخیاط المعتزلی (م آخر صدۂ سوم ھجری) کی کتاب الانتصار (طبع نوبرژ Nyberg، قاھرۃ ۱۹۲۵ء) سے بھی استفادہ کیا ہے، جو غالباً ہورٹن Horten کے پیش نظر نہ تھی - جناب محمد یوسف موسی فرماتے ہیں:

(۱) ابن حزم کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ لغت اور قرآن دونوں بہت سے کاموں ('افعال') کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، انسان کی طرف بھی اور جمادات کی طرف بھی؛ قرآن میں آیا ہے کہ آگ جھلس دیتی ہے: ''تلفح وجوھھم النار'' [قرآن مجید، ۲۳ [المؤمنین]: ۱۰۶] [''جھلس دے گی ان کے چہرے آگ''] اور پانی جلا دیتا ہے: ''یغاثوا بمآء کالمھل یشوی الوجوه'' [۱۸ [الکھف]: ۲۸] [''مدد کیے جائیں گے وہ ایک پانی سے جو پگھلی دھات کی طرح ہوگا اور منہ کو جلا دے گا'']، نیز آدمی کا نام، اس سے ایک فعل سرزد ہو جانے کی بنا پر، قاتل رکھا گیا گو اس کا ارادہ قتل کا نہ تھا: ''و من قتل مؤمنا خطأ فتحریر رقبة مؤمنة'' [قرآن مجید، ۴ [النسآء]: ۹۲] [''اور جس نے کسی مومن کو نادانستگی میں قتل کر دیا تو اس کے اوپر ایک ایمان‌دار غلام کا آزاد کرنا لازم ہے'']، اس میں صرف اس کا قاتل نام رکھنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس پر اس کی وجہ سے ایک حکم یعنی (غلام) آزاد کرنا بھی عائد کیا گیا ہے؛ باوجود اس کے ضروری ہے کہ ہر فعل اور اثر کو جو عالم میں ظہورپذیر ہو اللہ کی طرف منسوب کیا جائے اور اسی سے یہ کہنا بھی لازم آ جاتا ہے کہ فعل کی نسبت اللہ کی طرف اس لیے ہے کہ اس نے اس فعل کو پیدا کیا اور کرنے والے کی طرف اس لیے ہے کہ اس نے یہ فعل کیا اور وہ اس سے ظاہر ہوا - اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر فعل اللہ کی طرف بھی منسوب ہے اور فعل کے کرنے والے کی طرف بھی، مگر الگ الگ حیثیتوں سے (ابن حزم: الفصل فی الملل و الأھواء و النحل، طبع خانجی، مصر ۱۳۲۱ھ،

۵ : ۵۹، ۶۰) ۔

مسئلے کو اس طرح سمجھنے سے وہ بات لازم نہیں آتی جس سے ثُمامَۃ کو ڈر پیدا ہوا کہ (الافعال المتولّدۃ یعنی نو پیدا افعال یا) حوادث کو انسان یا اللہ کی طرف منسوب کرنے سے مشکل پیدا ہو جائے گی ۔ نیز اس شبھہ سے بھی نجات ملتی ہے کہ اگر تولّد (پیدائشِ نو) کو مان لیا گیا تو باری تعالٰی کا انکار لازم آئے گا، جیسا البغدادی (الفرق بین الفرق، طبع مصر، ۱۵۷) اور اسفراینی (التبصیر فی الدین، طبع عزّت عطّار، مصر ۱۹۴۰ء، ۴۸) نے کہا ہے ۔ مشہور ہے کہ اسفراینی نے البغدادی سے یہ رائے اخذ کی ہے ۔

(۳) ثُمامۃ نے جو کہا کہ ''اللہ نے عالم کو اپنی 'طِباع' سے بنایا ہے''، اس سے اس کی مراد وہی ہے جو فلسفیوں نے اپنے اس مقولے سے مراد لی ہے کہ باری تعالٰی نے عالم کو اپنی ذات سے پیدا کیا ارادے سے نہیں (شہرستانی : المِلَل و النِحَل، [طبع کیورٹن، ص ۵۰ و] طبع مصر، ۱ : ۹۱) لیکن خیّاط یہ نہیں مانتا کہ اللہ تعالٰی کی بابت ثُمامَۃ نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے، کیونکہ جو ذات افعال پر مطبوع ہے وہ ان افعال سے منحرف ہونے پر قادر نہیں ہو سکتی اور نہ وہ افعال متغیّر ہو سکتے ہیں؛ مثلاً آگ کا کام گرم کر دینا ہے اور وہ ہمیشہ یہی کرے گی ۔ چونکہ اللہ اشیاء (متغیّرہ) کو پیدا کرنے والا ہے اور اُسے اپنے افعال پر اختیار ہے اور وہ افعال اللہ کے طبعی تقاضے سے نہیں ہیں تو عالم اللہ کی طبیعت سے کیسے صادر ہوسکتا ہے (الانتصار، ص ۳۲) ۔ اس کے علاوہ ثُمامَۃ اس کا قائل ہے کہ ''طِباع والا'' جسم ہوتا ہے اور اللہ جسم نہیں ہے (الانتصار، ص ۱۷۲)؛ (۳) ثمامۃ کا مذھب یہ ہے، جیسا کہ مقالے کے اندر بیان ہوا کہ ہماری ساری معلومات ضروری ہیں ۔ ان میں 'صُدْفَۃ' یعنی اتّفاق (chance) کا دخل نہیں، نیز یہ کہ جس شخص نے اطمینان کے ساتھ منطق [یعنی استدلال] کے زور سے اللہ کو نہیں مانا، وہ اللہ کے پہچاننے کا مکلّف نہیں ہے ۔ ان دونوں اقوال میں الجھن اور ابہام ہے، جس کا دور کرنا ضروری ہے ۔ ثُمامَۃ کا مذھب اس مسئلے میں یہ ہے کہ جس نے ضروری طور پر اللہ کو نہیں پہچانا اس کے لیے نہ کوئی امر ہے نہ کوئی نہی؛ یعنی اس پر تعمیلِ احکام کا حکم عائد نہیں ہوتا، وہ صرف خدمت اور دوسروں کی عبرت کے لیے پیدا ہوا ہے ۔ اور وہ اپنی اس جہالت کے بارے میں معذور ہے، اُس کے لیے نہ ثواب ہے نہ عذاب (التبصیر، ص ۴۸) ۔

مصنّف انتصار اُن کتبِ علم کلام سے جن کے مصنّف محافظ بر قدیم (کنسرویٹو) قسم کے ہیں اس بارے میں اختلاف کرتا ہے جو اُن کے مصنّفین سے منقول ہے اور اُن کی کتابوں میں ثبت ہے کہ مذکورۂ بالا رائے کا نتیجہ ثُمامَۃ کے نزدیک یہ ہے کہ یہود اور نصارٰی اور ان جیسے اَور لوگ، مثلاً کفّار اور کمسن بچّے، جنھیں معرفتِ اشیاء کی طاقت نہیں ہوتی، یہ سب عنقریب مٹی ہو جائیں گے اور انھیں آگ کا عذاب نہ ہوگا ۔ خیّاط معتزلی اُس شخص کو جو ثمامۃ کی طرف اس رائے کی نسبت کرتا ہے جھوٹا قرار دیتا ہے ۔ وہ اس بات کی تایید کرتا ہے کہ ثُمامَۃ مانتا ہے کہ یہود، نصارٰی اور تمام کفّار کو عذاب نار ہوگا، کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ انھیں کیا کرنے کا حکم ملا ہے اور کس چیز سے روکے گئے ہیں، اس کے باوجود وہ قصداً اللہ کا انکار کرتے ہیں ۔ البتہ جسے معرفت کا کوئی راستہ ھی نہیں مل سکا تو اس پر کوئی الزام نہیں ۔ وہ نہ یہودی ہے، نہ نصرانی اور نہ کافر (الانتصار، ص ۸۶، ۸۷، ۱۸۲) ۔

ہمارا اعتقاد ہے کہ انصاف پسند طالبِ حق کے لیے بہتر یہ ہے کہ کسی شخص کی بابت اُس کے دشمن کا قول نہ سنے اور نہ اُن باتوں کو باور کرے

جو دشمن دشمن کی طرف منسوب کرتا ہے ۔ ہمارے لیے مناسب یہ ہے کہ ثمامة سے متعلق خیّاط کی تحقیق کو مانیں کیونکہ وہ ثمامة کے اصحاب میں سے ہے اور اسے سب سے زیادہ جانتا ہے ۔ مذاہب اسلامیہ کے مآخذ میں بغدادی کی کتاب الفَرق بین الفِرَق اور شہرستانی کی کتاب الملل و النحل کی بڑی اہمیت ہے لیکن حال یہ ہے کہ پہلا مصنّف، فخرالدین الرازی کے قول کے مطابق، اپنے مخالفوں سے سخت تعصّب رکھتا تھا اور وہ ان کے مذاہب کو صحیح شکل میں پیش نہیں کرتا ۔ رہا دوسرا (شہرستانی) تو اس نے اسلامی فرقوں کے مذاہب کا بیان بغدادی ہی سے اخذ کیا ہے [الانتصار، ص ۸۶، ۸۷، ۱۸۲]۔

ثَمُود : عرب کی ایک قدیم قوم کا نام ہے، جو آنحضرت [صلعم] کی بعثت سے پہلے قوم عاد، اِرم (Aram)، وبار (Jobaritae?) کی طرح معدوم ہو چکی تھی ۔ حوالوں کے ایک قدیم تر سلسلے سے، جو غیر عربی مآخذ میں ملتے ہیں، ثمود کے نام اور اس قوم کے تاریخی وجود کی تصدیق ہوتی ہے؛ مثلاً ۷۱۵ قبل مسیح کے [آشوری فرمان روا] سارگون [ثانی] Sargon[II] کے کتبے میں تَمُود [ثمود] کا ذکر بھی اُن اقوام کے سلسلے میں ملتا ہے جو مشرقی اور وسطی عرب میں آباد تھیں اور جنھیں آشوریوں نے مطیع کیا تھا ۔ اَرِسْطُو Aristo، بطلیموس (Ptolemy) اور بلیناس(Pliny) کی تصانیف میں بھی Thamudaei اور Thamudenes یعنی ثمودوں کا ذکر آتا ہے ۔ بلیناس Dómatha اور Hegra میں ثمودیوں کی بستیوں کا ذکر کرتا ہے، جن کی تطبیق موجودہ زمانے میں غالباً جَوْف کے دُومَةُ الجَنْدَل اور الحِجْر سے ہوتی ہے، جو اَلعُلا کے شمال میں حجاز ریلوے کا سٹیشن ہے ۔ [چھٹی صدی میلادی میں بوزنطی افواج کے ثمودی سواروں کا ذکر ملتا ہے؛ قبّ نکلسن : *Lit. Hist. of the Arabs*، ص ۳]۔

پرانی عرب روایات میں بھی ثمود کا وطن مؤخّرالذّکر مقام (یعنی الحجْر) ہی بتایا گیا ہے ۔ قدیم شعراء ثمود اور عاد کا ذکر دُنیاوی شان و شوکت کی بےثباتی کے سلسلے میں کرتے ہیں؛ مثلاً الاَعْشٰی اور اُمیّة بن ابی الصَّلْت (جو ان کی روداد کے کئی افسانوی پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے) ۔ [قرآن میں تنذیری واقعات دو طرح کے ہیں : ایک وہ جو مقامی تاریخ سے متعلّق ہیں، مثلاً عاد و ثمود کا انجام اور دوسرے وہ جو غیرعرب سے متعلّق ہیں اور بائبل میں بھی ان کا ذکر موجود ہے]، مثلاً (قرآن) ۷ [اعراف] : ۷۱ تا ۷۷؛ ۱۱ [ھُود] : ۶۴ تا ۷۱؛ ۱۵ [الحجْر]: ۸۰ تا ۸۶؛ ۵۴ [القمر] : ۲۳ تا ۳۱ ۔ زوالِ ثمود کی عربی روایت کو قدیم ترین مفسّرین نے قرآنی اشارات کی بنا پر اَور زیادہ پھیلا لیا تھا ۔ [قصّے کے نمایاں خطوط یہ ہیں :] جس طرح قوم عاد میں ایک نبی آئے تھے، جن کا نام ہود تھا، اسی طرح قوم ثمود کی طرف بھی [حضرت] صالح (بن عُبید بن عامر بن سام [رک بان]) مبعوث ہوئے تھے ۔ آپ کے مخالفین نے، جن کا سردار جُنْدَع بن عَمْرو تھا، [حضرت] صالح [ع] سے بطریقِ تحدّی کہا کہ وہ اپنی نبوّت کے ثبوت میں کوئی معجزہ دکھائیں، چنانچہ آپ نے ایک چٹان سے ایک حاملہ اونٹنی نکال دکھائی ''ناقة اللہ'' [اللہ کی اونٹنی] ہونے کی وجہ سے اس کی حرمت و حصانت مسلّم تھی، لیکن مضحکہ اڑانے والوں نے اُس کی اور اس کے بچے کی کونچیں کاٹ ڈالیں ۔ اس کی سزا میں اس قوم کو اللہ نے ہلاک کر دیا ۔ جس طریق سے وہ ہلاک ہوئی اس کی تفصیل سورۃ ۷ [اعراف] : ۷۶ میں یہ ہے کہ رَجْفَة یعنی بھونچال نے انھیں آ لیا اور سورۃ ۴۱ [فُصِّلَتْ] : ۱۲، ۱۶ میں صاعقة یعنی بجلی گرنے کا ذکر ہے ۔ [آلوسی بغدادی نے تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ : الرَّجْفَة =

الزلزلة الشدیدة (الفَرّاء اور الزَّجّاج)؛ الصَّیحة = آواز بلند (مجاھد اور السُّدّی)؛ ان دو اقوال کو یوں جمع کر سکتے ھیں کہ زلزلے نے انھیں نیچے سے آ لیا اور آواز بلند نے اوپر سے - بعض کا قول ھے کہ الرَّجْفة = خَفقان قلب و اضطراب جو خارقِ عادت صیحۂ عظیمہ سے پیدا ھوا، (روح المعانی، ۸ : ۱۶۵)؛ اسی تفسیر (۲۴ : ۱۰۹) میں ھے کہ ''صاعقة'' ''مثلَ صاعقة عاد و ثمود'' = عذاباً مثلَ عذابھم، قال قتادة؛ پھر تفسیر ۱۴ [حٰمٓ السَّجْدة] : ۱۶ میں کہا ھے کہ ''صاعقةُ العَذاب الْھُوْن'' کا کلمۂ صاعقة = ذلّت، جو صفت عذاب یا اس کا بدل ھے، یا اس سے مراد بجلی ھے، یا الصیحة، جیسے اور آیات میں آیا ھے]- ان بیانات سے [جو قرآن مجید] میں وارد ھیں یہ کہنا جائز معلوم ھوتا ھے کہ ثمود کی تباھی کی روایت کا تعلّق ان آتش فشاں پہاڑوں کی کسی آتش فشانی سے ھوگا جن سے لاوے (آتش فشاں پہاڑ کے پھینکے ھوے مادے) کی وسیع ندیاں بھیں اور کم و بیش وسیع میدانوں پر پھیل گئیں، جن میدانوں کو عرب میں حرّة کہتے ھیں - اس قسم کے بہت بڑے حرّوں میں سے ایک الحجر کے مغرب میں موجود ھے (قب B. Moritz : *Arabien*، ھانوور ۱۹۲۳ء، ص ۲۸)- گلازر E. Glaser کی راے یہ ھے کہ ثمود اور لحیان [رَکّ بآن] (بلیناس کے ھاں لخینی Lechieni) کا آپس میں گہرا تعلّق تھا اور یہ کہ لحیان کا پرانا نام ثمود تھا، بعد میں ان کا نام لحیان ھوا - آج بھی بنوھُذَیل کے دو ایسے بطن موجود ھیں جنھیں لحیان کہا جاتا ھے [دیکھیے وُیسٹنفلٹ : *Register*، ص ۲۷۵]؛ نیز یہ کہ ثمود کا زوال ۴۰۰ اور ۶۰۰ء کے درمیان مملکتِ لحیان کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ھی ھوا تھا - چٹانوں پر کھدے ھوے وہ کتبے جو ھیوبر Huber، اَوایے ٹنگ Euting اور دوسروں کو العُلا، الحجر اور اس کے نواح میں ملے تھے ماھرینِ علمِ کتبات کے ھاں لحیانی یا ثمودی کتبے کہلاتے ھیں.

مآخذ : (۱) آیات محولۂ بالا پر تفاسیر؛ (۲) طَبَری : [تأریخ] *Annales*، ۱ : ۲۱۹ ببعد، ۲۴۴ ببعد؛ (۳) اَلْمَقْدِسی : [کتاب الخَلْق و البَدْء] *Livre de la Création*، طبع ایوآر Huart، ۳ : ۳۹ ببعد؛ (۴) مسعودی : مُروج، طبع Barbier de Meynard، ۳ : ۸۴ ببعد؛ (۵) الثّعلبی : قِصص الانبیاء، قاھرة ۱۲۹۰ھ، ص ۸۵ ببعد؛ (۶) ابوالفداء : *Historia anteislamica*، طبع Fleischer، بامداد *register*؛ (۷) Caussin de Perceval : *Histoire des Arabes*، ۱ : ۲۳ ببعد؛ (۸) Sprenger : *Alte Geographie Arabiens*؛ (۹) E. Glaser : *Skizze zur Geschichte und Geographie Arabiens*، ج ۲؛ [(۱۰) البَتَنونی : الرحلة الحجازیّة، طبع دوم، مصر ۱۳۲۹ھ، ص ۳۱۲ ببعد؛ (۱۱) S and NR : *Canucise Enc.*، ص ۵۲۳].

(H. H. BRÄU براؤ)

ثَناء اللّٰہ پانی پتی : قاضی، حنفی، مجدّدی، از اولادِ جلال الدین چشتی صابری پانی پتی (م ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء) - ان کا نسب حضرت عثمان بن عفّان رضؓ پر منتھی ھوتا ھے - آپ پانی پت (مشرقی پنجاب) میں ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ - ۱۷۳۱ء میں پیدا ھوے - سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا - پھر علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل میں مشغول رھے - اس سلسلے میں دھلی گئے، جہاں شاہ ولی اللہ محدّث دھلوی (م ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) سے حدیث سنی - پھر صغر سنی ھی میں حافظ محمّد عابد لاھوری، سنّامی، احمدی، نقشبندی (م ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء [نزھة الخواطر، ۶ : ۳۲۷]) سے علمِ طریقت (نقشبندیہ) اخذ کیا - ان کی وفات کے بعد (اور ایک روایت کے مطابق حافظ محمّد عابد کی ھدایت پر) میرزا مظھر جانِ جاناں دھلوی (۱۱۱۱- ۱۱۹۵ھ / ۱۶۹۹ - ۱۷۸۱ء) کی خدمت میں حاضر ھوے اور ان سے بھی علمِ طریقت (احمدیّہ) حاصل

کیا ۔ میرزا مظہر ان کے جوہر سے بہت متأثر ہوے اور انھیں ''عَلَم الھُدیٰ'' کا لقب دیا ۔ میرزا جانِ جاناں نے ان کے حق میں ایک بار یہ بھی فرمایا کہ : اگر اللہ نے مجھ سے بروزِ حشر پوچھا کہ ہماری درگاہ میں کیا تحفہ لائے ہو تو عرض کروں گا کہ ثناء اللہ پانی پتی لایا ہوں.

تحصیلِ علم کے بعد ثناءاللہ وطن پہنچے اور باقی عمر افتاء، تصنیف و تألیف اور نشرِ علوم میں گذار دی ۔ متعدّد کتب، نافع، مفید، مقبول اور مشہور ان کے قلم سے نکلیں ۔ فقہ و اصول میں مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے، تفسیر و کلام و تصوّف میں انھیں یدِ طولٰی حاصل تھا، صفاءِ ذہن، جودتِ طبع، قوّتِ فکر اور سلامتِ عقل کے لیے مشہور تھے ۔ آپ نے پانی‌پت میں منصبِ قضا اور فصلِ قضایا بھی اختیار کیا اور اس مرتبے کا حق ادا کیا ۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے انھیں ''بیہقیِ وقت'' کا خطاب دیا ۔ قاضی ثناء اللہ نے یکم رجب ۱۲۲۵ھ/ ۲ اگست ۱۸۱۰ء کو وفات پائی ۔ خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۴۹ میں ان کی تاریخِ وفات ۱۲۱۶ھ درج ہے، جو درست نہیں.

قاضی صاحب نے تیس سے زیادہ تألیفات چھوڑیں، جن میں کتب و رسائلِ ذیل بھی شامل ہیں :

(۱) وصیّت نامہ، جو آپ نے ۸۰ سال کی عمر میں لکھا، یہ ان کے خانگی حالات پر خاصی روشنی ڈالتا ہے.

(۲) التفسیر المظہری (عربی، سات جلد)، ان کی معروف ترین تصنیف ہے، جو انھوں نے بظاہر میرزا جانِ جاناں کی وفات کے بعد لکھنا شروع اور انھیں کے نام سے مَعنون کی ۔ یہ تفسیر پہلے دہلی پھر دوسری بار حیدرآباد (دکن) سے دس جلدوں میں شائع ہوچکی ہے ۔ تفسیر کا رنگ محدّثانہ ہے ۔ اور حنفی مذاق کے مطابق ہے ۔ متداول تفاسیر میں سے ابن جریر، البیضاوی اور البَغَوی کی تصانیف کی طرف زیادہ اشارے ملتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قاضی صاحب نے محمّد بن اسحاق اور الکلبی کی تألیفات پر بھی انحصار کیا ہے اور لُغوی بحث کے لیے اکثر الاَخْفش، ابن کَیسان، الزمَخشری اور الفیروز آبادی پر اعتماد کیا ہے، قراآت کے سلسلے میں انھوں نے مشہور قاریوں کے علاوہ ہشام (ابو الولید) کو بھی قابلِ قبول سمجھا ہے ۔ شاہ غلام علی نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر قدماے مفسّرین کے اقوال اور تأویلات جدیدہ کی جامع ہے، جو ان کے لطیفۂ روحانی پر مبدأ فیاض سے انڈیلے گئے ہیں ۔ قلمی نسخوں کے لیے دیکھیے براکلمان ۔ قاضی ثناء اللہ کی دیگر اہمّ تصنیفات درج ذیل ہیں:

(۳) ما لا بُدّ منہ، فقہ حنفیہ پر فارسی میں ہے، (زبید احمد، ۱۷)، طبع کانپور ۱۸۷۳ و ۱۸۸۰ و ۱۸۸۴ء ۔ کشف الحاجۃ اسی کا اردو ترجمہ ہے، طبع میرٹھ ۱۳۲۳ھ.

(۴) ارشادالطالبین، تصوّف پر معتبر کتاب ہے، (زبید احمد، ۷۳).

(۵) جواہرالقرآن، آیات قرآنی کا اشاریّہ، (زبید احمد، ۲۴۸).

(۶) حقوق (یا حقیقت) الاسلام، (زبید احمد، ۳۳۶)، ہر صاحبِ حق کا حق سالم و کامل ادا کرنے کے بارے میں (بزبان فارسی)؛ اس کا خطّی نسخہ دانشگاہ پنجاب میں موجود ہے، طبع لکھنؤ ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء.

(۷) شہاب ثاقب.

(۸) تذکرۃ الموتٰی و القبور، (فارسی)، مختصر سا رسالہ ہے، طبع لاہور ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء و ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء.

(۹) تذکرۃ المعاد، (فارسی)، بہت مختصر، طبع کانپور ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء.

(۱۰) رسالہ در اباحت و حرمت سرود.

(۱۱) رسالہ در مسئلۂ سماع و وحدت وجود، ۱۲ صفحے کا رسالہ، دھلی ۱۸۹۱ء۔

(۱۲) السیف المسلول (= شمشیر برھنہ) (درباب امامیّہ)، (زبید احمد، ۳۳۶؛ فہرست مخطوطات، فارسی، ریو Rieu، ص ۳۶۳؛) طبع دھلی ۱۲۶۲ھ/۱۸۵۲ء۔

(۱۳) ردّ مذھب شیعہ۔

(۱۴) رسالۂ حرمت متعہ۔

مآخذ: (۱) غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، لاھور ۱۲۸۴ھ، ص ۶۹۹؛ (۲) فقیر محمد: حدائق الحنفیّۃ، لکھنئو ۱۹۰۶ء، ص ۴۶۵ ببعد؛ (۳) رحمان علی: تذکرۂ علمائے ہند، لکھنئو ۱۹۱۴ء، ص ۳۸؛ (۴) نعیم اللہ بھڑائچی: بشارات مظہریہ (سٹوری، ۱: ۱۰۳۴)؛ (۵) شاہ غلام علی: رسالہ در بیان حالات و مقامات جناب مرزا جان جاناں، ۱۲۶۹ھ، ص ۵۷، (قبّ نوّاب صدّیق حسن خان: اتحاف النّبلاء، ص ۴۲۰)؛ (۶) محمّد حسن: حالات مشایخ نقشبندیہ مجدّدیّہ، مراد آباد ۱۳۲۲ھ، ص ۷۰۴؛ (۷) Beale: *Oriental Biographical Dictionary*، مدراس ۱۸۸۱ء، ص ۲۳۶؛ (۸) زبید احمد: *Contribution* etc.، الٰہ آباد (بامداد فہرست)؛ (۹) براکلمان: *G. A. L. S.*، ۲: ۸۴۹ (اس میں چند نام مسوخ ھیں، جلال الدین قاضی صاحب کے اجداد میں تھے، نہ کہ والد)۔

(م - ن - احسان الٰہی رانا)

ثَنَوِیَّۃ: (Dualism، دو خدا شناسی)، ایک عقیدہ ھے جس کی تعلیم یہ ھے کہ نور اور ظلمت دو مساوی اور دوامی اصل خلق کنندہ ھیں - اسلام میں کوئی باقاعدہ ثنوی فرقہ یا مذھب ثنوی نہیں - ایک خاص مکتب خیال کے اصطلاحی نام کی حیثیت سے یہ اصطلاح تین غیر مسلم افراد ابن دَیصان، مانی، مَزْدَک [رکّ بہ ھر سہ مادّہ] اور ان کے پیرووں تک محدود ھے۔

ایرانی جب فوج در فوج اسلام میں داخل ھوے تو [ان میں سے بعض] لوگوں کے میلان ثنویت سے اسلام کی صفوں میں بھی انتشار کا خطرہ پیدا ھو گیا، مثلاً یہ صورت عبّاسی دور کی ابتداء میں پیدا ھوئی، جب ابن المُقَفَّع کی فتنہ‌انگیز شخصیّت سامنے آئی، چنانچہ اس کے ردّ میں اور لوگوں کے علاوہ القاسم بن ابراھیم طَبَاطَبَا زَیدی معتزلی نے بھی (الردّ علی الزندیق ابراھیم المقفّع، طبع گوُیدی M Guidi، روم ۱۹۲۷ء) لکھی [دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، ۶/۶: ۲۱۹ عمود ۲ میں ابن المقفّع کے سوا کئی اور نام متکلّمین و شعراء وغیرہ کے گنوائے ھیں جن پر ثنویت کا الزام لگا تھا]- پھر جوں جوں اصول و عقائد کے متعلّق بحث و نظر کا دروازہ کھلتا گیا مباحثہ کرنے والے جَدَلی ثنویّت کا الزام لوگوں پر اکثر عائد کرنے لگے اور یہ کسی ایک فرقے کی خصوصیت نہ تھی [یہاں تک کہ آپس ھی میں ایک دوسرے کو ثنویّت سے مطعون کرنے کی نوبت بھی آئی]- تیسری صدی ھجری/نویں صدی میلادی کے متعدّد غالی شیعہ، مثلاً ابو حَفْص الحدّاد، ابن ذَرّ [الصَیْرفی] اور ابوعیسی الورّاق، ثنویّت سے متّہم ھوے - الورّاق مذکور، جو زندقہ و الحاد کے ھر پہلو سے اچھی طرح آگاہ تھا اور اس پر سند سمجھا جاتا تھا، ابتداء میں مزدکی تھا اور کہا جاتا ھے کہ قبول اسلام کے بعد بھی "اس نے اپنی کتابوں میں ثَنَوِیّت کی حمایت کی" - لیکن اسے مانویوں کی صف میں اس لیے جگہ دی جاتی ھے کہ مابعد الطبیعیّاتی مسائل میں تو نہیں اور مسائل مثلاً حرمت قتل کے مسئلے میں یہ مانویوں سے متّفق الرأی تھا، حتّٰی کہ رافضی ابو شاکر الدَیْصانی کو، جس کی عَام نسبت [یعنی 'الدیصانی'] ایک ثنوی جماعت سے مأخوذ ھے، جہاں تک ھمیں معلوم ھو سکا ھے محض اس بنا پر دیصانی کہا گیا کہ وہ تجسیم کا قائل تھا، حالانکہ عقیدۂ تجسیم بجاے خود ثنویوں کے عقائد میں شامل نہیں اور فہرست (طبع فلوگل Flügel، ص ۳۳۸، س ۸) میں اسے مبہم طور پر اُن لوگوں کے زمرے میں

شمار کیا گیا ہے جو در پردہ زندیق تھے (''الذین یظهرون الاسلام و یبطنون الزندقة'')، بلکه واقعه یه ہے که اس عقیدے کا جو مسلّم طور پر دیصانیوں کا بخصوص اور امتیازی عقیدہ ہے که تمام اجسام سیاہ و سفید عناصر سے خلق ہوے (دیکھیے اشعری : مقالات الاسلامیین، [طبع رِٹر Ritter]، ص ۳۳۰)، ابو شاکر کے ہاں ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا. . .

ان ہر سه افراد پر الزامات بالا الخیّاط کی تصنیف کتاب الانتصار "Le Livre du Triomphe" (طبع نوبرژ Nyberg، قاہرۃ ۱۳۴۴ھ، ص ۱۰۰، س ۴، ص ۱۴۹، س ۹، ص ۱۵۵، س ۱۰ و ۱۴؛ قب نیز اشاریه بذیل اعلام مذکورۂ بالا و مذکورۂ پایین) سے لیے گئے ہیں ۔ لیکن الخیّاط کی رایوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں یه یاد رکھنا چاہیے که اس کی یه رائیں ابن الراوندی کے اُن حملوں کے ردّ میں ظاہر کی گئی تھیں جو اس نے اپنی کتاب فضیحة المعتزلة میں کیے تھے اور جس میں اس نے معتزله [رک بآن] کے متعدد ائمه کو ثنویّت سے متّہم کیا تھا ۔ یه درست ہے که ان حلقوں میں ثنویوں ، مانویوں اور دیصانیوں کے خلاف کئی تردیدی کتابیں لکھی گئی تھیں، مگر ابن الراوندی معتزله پر محض اس لیے برس پڑا تھا که یه لوگ خدا کو خالق شرّ نہیں مانتے تھے، حتّٰی که الجاحظ کے بارے میں بھی یه کہا جاتا ہے که اس نے یه کہه کر که ''اجسام خود اپنی طبیعت ہی سے عمل کرتے ہیں'' (''تفعل طباعاً'') اور ''خدا اجسام کو فنا اور نیست و نابود نہیں کر سکتا'' عقیدۂ توحید کے افساد کا موجب بنا (کتاب الانتصار، ص ۱۶۸ [یه جھوٹا الزام ہے ۔ خیّاط]) ۔ ابن الراوندی نے الجاحظ کے استاد ابراہیم النظّام کو، جس نے ثنویّت کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے (کتاب مذکور، ص ۱۷، س ۱۲)، خاص طور پر پکّا ثنوی، مانوی اور دیصانی کہه ڈالا ہے (کتاب مذکور، ص ۳۸، س ۳، ۲۰، س ۶ و ۱۷ ببعد و ص ۴۳، س ۱۷ ببعد و مواضع کثیرہ)، بہت حد تک اس لیے که النظّام کی رائے میں خیر و شرّ ویسے ہی ایک دوسرے کی ضدّ ہیں جیسے خفیف اور ثقیل ۔ لیکن جب تک النظّام کی اصل تصنیفات نہیں ملتیں ہمیں نه تو ابن الراوندی کی اُن عبارتوں پر بدون احتیاط اعتماد کرنا چاہیے جو به تحریف اس نے اپنے مخالف سے منسوب کی ہیں جو النظّام کے عقائد پر مشتمل ہیں اور نه ان کے متعلّق الخیّاط کی گریز آمیز شرح و تفسیر پر توجه دینا چاہیے ۔ بہر حال صرف مخالفین کی جماعت ہی نہیں تھی جو معتزله کو، جنھیں سچّے اہل توحید ہونے پر ناز تھا، ثنویّت سے متّہم کرتی تھی اور یه اتّہام صرف مذکورۂ بالا معتزلیوں ہی پر عائد نہیں ہوا تھا بلکه علیّ [الاسواری] اور ابوبکر الاصمّ جیسے کئی بزرگ بھی اس سے محفوظ نہیں رہے تھے (قب نیز de Boer: *Geschichte der Philosophie im Islam*، Stuttgart ۱۹۰۱ء، ص ۴۷؛ ہورٹن Horten : *Die Philosophischen Systeme der spekulativen Theologen im Islam*، بون Bonn ۱۹۱۲ء اور اس کی دوسری تصانیف بامداد اشاریه بذیل Dualismus ۔ اس کے جواب میں معتزله نے بھی سنّیوں کے اس عقیدے پر که قرآن ذات الٰہیه کی طرح قدیم ہے کڑی تنقید کی .

کہا جاتا ہے که النظّام کے بعض تلامذہ صریحاً ثنویّت کی تعلیم دیا کرتے تھے اور جس طرح وہ اس کے شیعی رجحانات کے متعلّق غلوّ سے کام لے کر بالآخر غالی شیعه بن گئے اسی طرح انھوں نے نظریۂ کلام (logos-theory) کے بارے میں، جو مسیحیّت سے متأثر تھا، اس کے مذہب کو وسعت دے کر دو خالقوں کے عقیدے تک جا پہنچے [ایک قدیم یعنی الله تعالٰی اور ایک حادث یعنی کلمة الله عزّ و جلّ المسیح عیسٰی بن مریم؛ جس کلمة الله سے جہان پیدا ہوا؛ الفصل، ۴ : ۱۹۷] ۔ کلمة الله کو عین مسیح قرار

دینے سے توحید کا افساد کامل نہیں ہوتا، کیونکہ وہ صرف ایسا خالق ہے جو خود مخلوق ہے اور اس کی حیثیت محض ایک واسطے کی ہے [مگر ابن حزم محلّ مذکور کے نزدیک : ھٰذا کلّہ کفرٌ محضٌ] - [توحید تو خلق و تدبیر عالم میں اللہ کی وحدت کا نام ہے، دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، ۶ / ۶ : ۲۲۰؛ پھر صورت مذکورہ کیسے مفسد توحید نہیں؟] - ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں ان زندیقوں کے نام بھی معلوم نہیں - شہرستانی کی کتاب (طبع کیورٹن Cureton، ص ۴۲، س ۶) میں ابن الراوندی کی سند سے ان کے نام احمد بن [الحائط] اور الفَضْل الحَرْبی دیے ہیں - مسعودی : مروج، (طبع Barbier de Meynard) ۳ : ۲۶۶ میں بھی احمد بن حائط کا نام آتا ہے لیکن کسی دوسرے زمرے میں؛ ابن حزم کی [فصل] (قاھرۃ ۱۳۲۱ھ) ۴ : ۱۹۷، س ۲۰ بعد، میں احمد بن خابط اور الفَضْل الحَرْبی کے نام [یا الحذاء یا الحدثی یا الحدیثی؛ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، ۶ / ۶ : ۲۲] درج ہیں (قبّ نُوبِرْژ Neberg، ص ۲۲۲ بعد، دربارۂ خیّاط، ص ۱۴۸ اور Friedländer : *The Hetero-doxies of the Shiites*، در *JAOS*، ۲۹، [۱۹۰۹ء]: ص ۱۰ و اشاریہ) - البَیَان بن سِمْعَان التّمیمی کے متعلّق، جو غالی شیعہ تھا، مشہور ہے کہ اس نے سورۃ ۴۳ [الزخرف] : آیۃ ۸۴ [وَ ھُوَ الَّذِی فِی السَّمَاءِ اِلٰہٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ] کی تفسیر یوں کی تھی کہ ایک تو خدائے عرش ہے اور دوسرا، گو وہ خدائے عرش سے کم تر ہے، خدائے ارض ہے - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابو الخَطّاب بَزِیْغ اور ایک اَور شخص السَّرِی نے اس تفسیر سے اتّفاق کیا تھا (الکَشّی : معرفۃ اَخْبار الرِّجال [بمبئی ۱۳۱۷ھ]، ص ۱۹۶، س ۸ بعد) - اس نظریے کا رجحان اُن غُلاۃ (قبّ نُصَیْرِیَّۃ) کے عقائد کی طرف ہے جو اس حد تک تو نہیں جاتے کہ [حضرت] علی [رضا] میں اللہ کا حلول ہوا لیکن [حضرت] علی [رضا] کو ایسا گماشتۂ خدا یا الٰہ ضرور سمجھتے ہیں جو الٰہِ اعلٰی کے تحت ہے - متکلّمین و فلاسفہ نے اس امر پر زور دیا ہے (قبّ ابن حزم : [فصل]، ۴ : ۳۷، نیز رکّ بہ Schreiner، در *ZDMG*، ۵۲، [۱۸۹۸ء] : ۴۹۰ بعد اور نَلّینو Nallino، در *Encyclopaedia of Religion and Ethics*، ۲ : ۹۱ بعد) کہ نظمِ کائنات میں ستاروں کو قوائے ثانیہ کی حیثیت سے خدا کا شریک سمجھنا کفر ہے، کیونکہ یہ ثنویّت ہے اور ان لوگوں کے خالص کفر سے کسی طرح کم نہیں جو خدا کے منکر ہیں اور ان کے نزدیک سب کچھ کواکب کے ھاتھ میں ہے۔

اسلام نے چونکہ توحید پر زور دیا ہے لہٰذا اس کے نزدیک ثنویّت کا مطلب خدا کے تصوّر کی نفی ہے (قبّ سورۃ ۱۶ [النحل] : آیۃ ۵۳ کی تفسیر در الرازی : مَفَاتِیحُ الغیب [قاھرۃ ۱۳۰۸ھ]، ۵ : ۳۲۷، س ۲۴ و ۳۶؛ البَیْضاوی : اَنْوار التَنْزِیل، [طبع Fleischer]، ص ۵۱۷، س ۱۲؛ النَّیسابوری تفسیر : [بر حاشیۂ تفسیرِ طَبَری، بُولاق، ص ۱۳۲۳ بعد]، ۱۴ : ۷۴) - اس طرح سے لفظ ثنویّۃ اہانت و خواری کا کلمہ بن کر رہ گیا، لیکن ان معنوں میں وہ ابہام سے کلیّۃً خالی نہیں تھا اور کسی حد تک زندیق کا مترادف تصوّر کیا جاتا تھا، جو عام تر اور وسیع تر اصطلاح ہے اور جس کا اطلاق ملحدوں پر ہوتا تھا - جہاں تک مذاہبِ فلسفہ کا تعلّق ہے اسلامی علمِ کلام میں ثنوی مابعد الطبیعی تصوّر مشّائیوں نے داخل کیا - الغزّالی نے نہایت وضاحت سے کہا ہے [کہاں کہا ہے؟] کہ مسائل میں علمِ کلام کا موقف نیمۂ راہ کا موقف ہے (half-way position) [یعنی غیر قطعی] اور بتایا ہے کہ یہ علم تناقضات سے پر ہے اور اس کا مقام توحید اور کفرِ صریح کے درمیان تذبذب کا مقام ہے -

[اس پر دیکھیے دائرة المعارف الاسلامیة، ۶ / ۱۶ : ۲۲ ببعد] اور یہی تعلیم دہریت [رک بآں]، مذہب طبیعت naturalism کی بھی ہے، یہ سمجھ میں آ سکتا ہے، گو اس کے غلط ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ۔ ''فلسفی کہتے ہیں کہ دنیا قدیم ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک صانع کا وجود بھی مانتے ہیں ۔ یہ قضیہ متناقض بالذّات ہے، جس کی تردید کی ضرورت ہی نہیں'' ۔ الغزّالی اس امر پر زور دیتا ہے کہ مشّائی، جو اصحابِ تجربیّت ہیں [اور دانش کو آزمایش و تجربہ سمجھتے ہیں]، جب اخوان الصفاء [قبّ اخوان الصفاء] کی طرح نو افلاطونیوں کے نظریۂ صدور [از ذاتِ خداوندی] کا سہارا لیتے ہیں اور ایک ایسی ہستی کا وجود تسلیم کرتے ہیں جو خدا اور کائنات کے درمیان واسطے کا حکم رکھتی ہو تو اس سے یہ مسئلہ سلجھتا نہیں بلکہ اور زیادہ اُلجھ جاتا ہے ۔ علّتِ اُولی کے پہلو بہ پہلو ایک معلول [علّتِ وَسَط] [واسطۂ تخلیق] کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ خالق دو ہیں اور دونوں قدیم ہیں ۔ (قبّ تہافۃ الفلاسفۃ [وہ طباعت جس میں ابن رُشد اور خواجہ‌زادہ کی اسی نام (تہافۃ الفلاسفۃ) کی تصانیف بھی شامل ہیں؛ قاہرۃ ۱۳۱۹ھ]، ص ۳۳، س ۲۷ اور اُس پر J. Obermann: *Der philosophische und religiöse Subjectivismus Ghazālis* [وی اَنّا ۔ لیپزگ ۱۹۲۱ء] ص ۳۴ ببعد و ۷۰ ببعد و ۹۳ ببعد)؛ ساتھ ہی (ص ۵۰) الغزّالی نے شدّ و مدّ سے یہ بات بھی کہی ہے کہ الفارابی یا ابن سینا کے ارسطاطالیسی نوافلاطونی نقطۂ نظر سے توحید کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ابنِ سینا نے ''دوسرے واجب الوجود'' کے خطرے کو ٹالنے کے لیے، جس کا خود اُسے بھی احساس تھا، جو کوششیں کی ہیں الغزّالی اُن سے بالکل متأثّر نہیں (رک بہ Horten: *Die Metaphysik Avicennas*، [ہالے Halle ۱۹۰۷ء]، ص ۵۴۲ ببعد، خصوصاً ص ۵۵۱ بر ابن سینا : کتاب الشّفاء، جلد ۴، رسالہ ۹) ۔ ابن‌سینا نے اپنی تصنیف کتاب‌النّجاۃ (قاہرۃ ۱۳۳۱ھ)، ص ۳۲۷ ببعد و ۳۵۶ ببعد و ۳۷۴ ببعد وغیرہ کے تنگ‌تر دائرے میں توحیدِ باری کے متعلّق جو کچھ کہا ہے وہ اس سے بھی زیادہ غیر یقینی معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ وہ حاملِ ہیولانی hylic substratum یا ہیولاے اوّل کو مستقل بالذّات تسلیم کر لیتا ہے [النّجاۃ میں ہے کہ ابعاد اور صورتِ جسمیّۃ کو ہیولٰی لازم ہے، جس میں وہ قائم ہوں اور حادثِ زمانی سے اس کا مادّہ پہلے ہوگا ۔ کسی شے کا حاملِ قوّت وجود اس کا ہیولٰی ہے ۔ پس حادث سے جو پہلے زماناً موجود نہ تھا وہ مادّہ جس سے وہ حدوث میں آیا قدیم‌تر تھا ۔ حاصل تعلیقۂ جناب محمّد یوسف موسٰی در دائرة المعارف الاسلامیة] ۔ اس کی ایک جھلک ہمیں اس کلام میں بھی دکھلائی دیتی ہے جو ابن‌سینا نے مذہبِ ثنوی کے مطابق انسانِ اوّل کی پیدایش کے متعلّق درجِ کتاب کیا ہے ۔

اسلام کا تصوّرِ توحید غیراسلامی ثنویّت سے جس طرح ملوّث ہوا سنّی اشاعرہ کا ردّ عمل اس پر کیا ہوا؟ اس کی ایک مثال ہمیں عبدالقاہر البغدادی کے یہاں ملتی ہے ۔ الفرق بین الفرق (قاہرۃ ۱۳۲۸ھ) میں وہ ابن‌الرّاوندی (رک بہ الخیّاط، ص ۳۰، س ۱) سے بھی زیادہ طنزیّہ انداز میں تعجّب کا اظہار کرتا ہے کہ النظّام نے مہا ثَنوی (الفرق، ص ۱۲۰ و ۱۲۱ : قبّ ''[ھذا] تحقیق [بعینہ] قول الثنویة'') ہونے کے باوجود ثنویّہ اور مانویّہ کا ردّ لکھا [الفرق] ص ۱۱۷، س ۵ و ۱۲۰، س ۱۲، ص ۱۲۳ سطر آخر، ص ۱۲۴، س ۸) ۔ البغدادی نے اُصول الدین (استانبول ۱۹۲۸ء، ص ۴۴) میں صاف طور پر النظّام کا شمار راست ان ثنویوں کے ساتھ کیا ہے جو اسلام سے خارج ہیں لیکن بے‌احتیاطی سے اس نے کتبِ نِحَل پر لکھنے والے دیگر مصنّفین کے خلاف مَرقیونیّۃ (Marcionites) کو بھی ان میں شامل

کر لیا ہے ۔ [اس پر جناب محمّد یوسف موسٰی کہتے ہیں کہ ابن الندیم، ۳۳۹؛ شہرستانی، ۱۹۵ اور رازی در اعتقادات فرق المسلمین و المشرکین، ص ۸۹ مرقیونیوں کے متعلّق وہی کہتے ہیں جو بغدادی نے کہا ہے] ۔ وہ باطنیّة [رَكْ بان] کو بھی کسی قید و شرط کے بغیر ثنوی قرار دیتا ہے (ص ۲۲۳) [اور کہتا ہے:] ''ابتدا میں وہ مجوسی اور ثنوی تھے ۔ پھر المأمون کے زمانے میں ان کے [داعیون] مثلاً عبداللہ بن میمون القدّاح [رَكْ بان] اور حمْدان بن قرْمط نے اس امر کی تعلیم دی کہ خالق دو ہیں اوّل [اللہ] اور دوم [نفس]، جسے خلق کر کے اللہ نے بقول ان کے خلق و تدبیر میں شریک کیا؛ جناب محمّد یوسف موسٰی بحوالۂ البغدادی صاحب الفرق و اسْفراینی صاحب التبصیر] ۔ ثنویوں کے عقیدۂ نور و ظلمت کا مآل اور مجوس کے اصولِ یزدان و اھرمن کا جوہر بھی یہی ہے'' ۔ یہ دو خالق کون ہیں؟ اس سوال کا جواب اس مختصر اور عام ملاحظے سے یقین کے ساتھ نہیں دیا جاسکتا [مگر دیکھیے سطورِ بالا] ۔ البغدادی نے اس خیال سے کہ باطنیّة کو مجوس ثابت کیا جا سکے افاضۂ ذات کے سلسلے کی متعدّد چیزوں کے من جملہ بغیر کسی دلیل کے [رَكْ بہ قرامطی فرقہ] ''نُورِ شَعْشَعانی'' اور ''نورِ ظّلامی'' پر زور دے دیا ہے ۔ معلوم ہے کہ باطنی ناصر خسرو کا رجحان توحید کی طرف تھا (زادالمسافرین، برلن ۱۹۲۳ء، ص ۴۷ ببعد، ۱۵۰ ببعد و ۱۶۰ ببعد) اور وہ اس قسم کی ثنویت کی تائید کو تسلیم نہیں کرتا (قبّ نیز Schaeder : *Die islamische Lehre von vollkommenen Menschen* در *ZDMG*، سلسلۂ جدید، جلد ۴، [۱۹۲۵ء] : ص ۲۲۲ ببعد، خصوصاً ص ۲۳۱) ۔ ان کا یہ عقیدہ کہ خالقِ دوم خالقِ اوّل کے تحت ہے بغدادی کی رائے کا مؤید نہ تھا کہ ثنویہ مجوس سے مشابہ ہیں، مگر نحل پر لکھنے والے اسلامی مصنّفوں کی اصطلاح میں عین عقیدۂ مذکور کی بنا پر ان کی ثنویت کو صحیح اور متعارف ثنویت قرار نہ دیا جائے گا ۔ چنانچہ ان علماء نے مجوس کو صریحاً ثنویّة کے زمرے سے خارج کیا اور ان تین فرقوں سے الگ کر دیا جن کا ذکر اس مقالے کے شروع میں آ چکا ہے، اس لیے کہ متحرّک یک ۔ بادشاہی عقیدے dynamic monarchianism کی رُو سے وہ اس بات کے قائل تھے کہ اھرمن (ظلمت) یزدان (نور) کی ثانوی تخلیق ہے ۔ زرتشتیوں کے ایک ضمنی فرقے کا خیال یہ تھا کہ یہ دونوں خدا ہم مرتبہ ہیں، لیکن ایک اور الٰہ اعلٰی کے تحت ہیں، جس نے سب سے پہلے انہیں کو پیدا کیا تھا ۔

مآخذ : متن میں ذکر کردہ کتابوں کے علاوہ اُن تصانیف کو دیکھیے جن کا ذکر ان مادّوں میں آیا ہے جن کا حوالہ دیا گیا ہے ۔

(شتروتمان R. STROTHMANN)

ثَوْبان بن ابراھیم : دیکھیے مادۂ ذوالنّونؒ.

الثَّوْر : (Taurus)، یہ مجمع الکواکب دائرة البروج میں دوسرا برج ہے ۔ اس کی شکل بیل کے اگلے نصف حصّے کے مانند ہے جس کا سر اس طرح سے ایک طرف کو مڑا ہوا ہے کہ سینگوں کا رخ مشرق کے مقابل میں ہے ۔ اس مجمع کی شکل کے اندر ۳۲ اور باہر ۱۱ ستارے ہیں ۔ اس کے موضعِ قطع (*kaf*, ἀποτομή) پر چار ستاروں کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک خط مستقیم میں واقع ہیں مگر فی الحقیقت ان ستاروں سے جنھیں ف، س، ظ، ھ (f s ξ o) کہتے ہیں ایک خط منحنی بنتا ہے ۔ شمالی سینگ کا روشن ستارہ مجمع الکواکب مُمْسِک الاعِنَّة (constellation of the Steersman) میں بھی شامل ہے ۔ عَیْن الثَّور (بیل کی آنکھ)، جس کی روشنی سرخ ہوتی ہے، قَدرِ اوّل کا ستارہ ہے ۔ اس کے لیے علامت عـہ (α) مقرّر ہے ۔ یہ چھوٹے چھوٹے ستاروں کے ایک گھنے جھرمٹ کے مرکز میں ہے، جسے یونانیوں نے ھائیایڈیز Hyades کے نام سے موسوم کیا تھا ۔

عربوں نے اس ستارے کے کئی نام رکھے تھے؛ مثلاً الفَنیق (شتر بزرگ)، جو خالص عربی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے گرد دوسرے ستارے جمع ہیں، جنھیں القِلاص (چھوٹے اونٹ) کہتے ہیں۔ عـہ (α) کے دوسرے نام ثریّا سے تعلّق رکھتے ہیں۔ چونکہ اُس مجمع کو عرب 'النجم' کہتے ہیں اس لیے عہ (α) کے نام 'حادی النّجم' یعنی 'ستاروں کو ھانکنے والا'، 'تالی النجم' اور 'الدَّبران' رکھے گئے، جن کے معنی ''ستاروں کے پیچھے آنے والا'' ہیں۔ آخرالذّکر نام ستاروں کے یورپی نقشوں میں Aldebaran کی شکل میں درج ہوا۔ ستارے نہ (υ) اور خہ (κ)، جو بیل کے کان کے قریب ہیں، اَلْکَلْبَیْن (دو کُتّے) کہلاتے ہیں، یعنی ھانکنے والے کے کُتّے۔

مآخذ: (۱) القزوینی: عجائب المخلوقات، طبع وِیسْتَنْفَلْٹ Wüstenfeld، ۱: ۳۰؛ ترجمہ از اِیتے H. Ethé، موسوم بہ *Kosmographie*، ص ۶۷؛ (۲) L. Ideler: *Untersuchungen über den Ursprung und die Bedeutung der Sternnamen*، ص ۱۳۶۔

(J. RUSKA رُسکا)

زیادات و تصحیحات

زیادات

صفحہ	عمود	سطر	
(کراسہ ۱)			
۳	۲	۱	[''طغٔ'' قب حافظ ابرو : پنج رسالۂ تاریخی، نشر فیلکس تاور، پراگ ۱۹۵۸ء، ص ۱۰، س ۱۹ : طاط (بمعنی تازیک)].
۱۹	۱	۲۲	شیخ محمّد علّان [۱۰۳۱ھ میں فوت ہوے، (کِشمی، محلّ مذکور)؛ کِشمی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ تاج الدین مکرّر حجاز سے ہند آئے پھر واپس گئے اور آخری مرتبہ لَحسا اور بصرے بھی گئے].
۱۹	۲	۳	[تعریب رشحات ؛ کِشمی : زبدة المقامات، کانپور ۱۸۹۰ء، ص ۷٦ میں شیخ محمّد علّان مرید شیخ تاج الدّین کی طرف منسوب ہے].
(کراسہ ۲)			
۹۷	۲	۲۲	کے بعد اضافہ کیجیے : [مغلیہ دور میں بعہد شاھجہان تسخیر تبّت خرد کی روداد کے لیے دیکھیے بادشاہ نامہ، (دور اوّل، ۱۰۴۷ھ)، ص ۲۸۱ ببعد اور تبّت کلان (لدّاخ) کی مہم کے لیے بادشاہ نامہ، (دور دوم، ۱۰۴۹ھ)، ص ۱۵۹ ببعد۔ ۱۰۷۵ھ/۱٦٦۴ء میں بعہد اورنگ زیب تبّت کلان نے سیادت سلطنت مغلیّہ قبول کی ۔ اس کے متعلق دیکھیے مآثر عالمگیری، ص ۵۲ ۔ اسی عہد کی ۱۰۹۵ تا ۱۰۹٦ھ/ ۱٦۸۱ تا ۱٦۸۳ء والی مہم کی تفصیل کے لیے دیکھیے *The Tibetan-Ladakhi Moghul* : L. Petech، *War of 1681-83* در *The Indian Historical Quarterly* Vol. XXIII, No. 3, Sep. 1947, p. 169-199.]
(کراسہ ۳)			
۱٦۲ کے بعد مقالۂ تجلید کے اشکال کی تشریح	۲	۲٦	جلد کی ''بینی'' کو ایران میں ''زبانۂ مجلّد'' لکھ رہے ہیں.
۱٦۳	۱	۵	فہرستِ مصادرِ مذکور اب طبع ہو چکی ہے، یعنی : E. Gratzl, K. A. C. Creswell and R. Ettinghausen، *Bibliographie der islamischen Einbandkunst*, 1871

صفحه	عمود	سطر	
			bis 1956، در *Ars Orientalis*، ج ۲ (۱۹۵۷ء) : ص [illegible] تا ۵۴۰.
۱۶۳	۱	۴	(۱۰) اینگھاوزن : *Near Eastern Book Covers and their influence on European bindings*، در *Ars Orientalis*، ج ۳ (۱۹۵۹ء) : ص ۱۱۳ تا ۱۳۱].
۱۷۰	۲	۲۰	[۱۱۸۹ھ کے بجاے ۲۴ ذی قعدۃ ۱۱۸۸ھ ہونا چاہیے، ملاحظہ ہو محمد فیض بخش: تاریخ فرح بخش، (انگریزی ترجمہ از William Hoey، ۲ : ۲۱۲، الہ آباد ۱۸۸۹ء : مگر محمّد نجم الغنی : تاریخ اودھ، مراد آباد ۱۹۱۰ء، ۲ : ۲۷۷ میں ۲۵ ذی قعدۃ دیا ہے (بجاے ۲۴ ذی قعدۃ)].
۱۷۲	۲	۱	بارہ ہزار ٹن الخ، — سال ۱۹۵۸ - ۱۹۵۹ء میں کی شکر جو بنائی گئی اس کی مقدار ۸۰۰، ۱۲،۷۰، ۳۴ ٹن ہے.
۱۷۲	۲	۷	ڈھائی لاکھ الخ، ۱۹۵۸ - ۱۹۵۹ء میں جو سپرٹ تیار کی گئی اس کی مقدار ۳، ۰۳۶، ۶۰، ۲ بلک گیلن ہے.
(کراسہ ۷)			
۴۲۶	۲	۱۴	[اس حکایت کے لیے دیکھیے مثنوی معنوی، طبع نکلسن، ۱ : ۱۸۸ ببعد (بیت ۳۰۵۶ تا ۳۱۰۰). خصوصاً یہ بیت : بانگ زد یارش که بر در کیست آن گفت بر در هم تویی ای دلستان (به شکریۂ پروفیسر لوئی ماسینیون)]
۵۰۲	۱	۱۱	[بجاے ''اتّجاهات التفسیر''، جو کتاب کے نام کا لفظی ترجمہ ہے، ڈاکٹر عبدالحلیم النّجّار نے اس کتاب کے عربی ترجمے کا نام مذاهب التفسیر الاسلامی رکھا ہے، دیکھیے ص ۵۳۱، عمود ۱، سطر ۱۱].
۵۴۰	۲	۱۵	[ملکۂ ثمر کی تصویر کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ جارجیا (در زبان روسی)، Tbilisi (تفلس) ۱۹۶۰ء، مقابل ص ۱۱۲ - ثمر کے متعلّق شعراے گرجستان کی مدحیہ نظموں کے لیے دیکھیے Venera Urokadze : *Anthology of Georgian Poetry*، تفلیس ۱۹۵۸ء، ص ۱۱، ۳۹].

صفحه	عمود	سطر	
٥٣٧	١	٢٣	[صفر ٥٩٩ھ / اکتوبر - نومبر ١٢٠٢ء میں طبیب فاضل ابوبکر عبیداللہ المعروف به ابن المارستانیّة دیوانِ (خلافت) سے تفلیس کی رسالت کے لیے نامزد ہوا اور ادائے رسالت کے بعد بغداد کی جانب واپس ہوا، مگر راستے میں ذی الحجّة ٥٩٩ھ / اگست ١٢٠٣ء میں فوت ہوا (ابن ابی اُصَیْبِعَة، ١ : ٣٠٣].
(کراسه ٨)			
٥٥٦	١	سطر آخر	''ایرانی اسے سهراو لکھتے ہیں'' کے بعد درج کیجیے : [مگر شاہ عبّاس کے ایک فرمان میں اسے موراو ہی لکھا ہے؛ دیکھیے *The Georgian-Persian Historical Documents*، (در زبان گرجی)، طبع V. S. Putridze، تفلیس ١٩٥٥ء، ص ٥٢].
(کراسه ٩)			
٥٧١	٢	٢٠	Tuggurt کے بعد بڑھائیے : [سامی (٣ : ١٦٥٦) : تُغرت یا تغورت].
(کراسه ١٠)			
٥٩٥	٢	٢٨	١ : ٣٦٥ کے بعد بڑھائیے : (و سامی : قاموس الاعلام، ٣ : ١٦٦١، بذیل تکریتی).
٦١٣	١	٢	'' استعمال کرتے تھے '' : دیکھیے ابن الکلبی : کتاب الاصنام، ص ٧ :
٦١٨	١	قبل آخر	[طبیب فاضل نجم الدین بن المِنْفاخ (م ذی القعدة ٦٥٢ھ/ دسمبر ١٢٥٣ء) آخری عمر میں اسی الملک الاشرف ابن الملک المنصور ایوبی کی خدمت میں طبیب کی حیثیت سے تلّ باشر میں حاضر رہا (ابن ابی اصیبعة، ٢ : ٢٦٦)].
(کراسه ١١)			
٦٧٧	٢	٣	٩٥٣ء کے بعد بڑھائیے : [دیکھیے الفوائد البهیة، ص ١٢٧ و ١٥٣].
٦٨٢	٢	١١	اس کے بعد بڑھائیے : مآخذ : (١) [غزالی : احیاء العلوم، قاهرة ١٣٢٦ھ؛ [٢] L. Massignon : *La Passion d' el-Hallaj*، ص ٦٦٥ ببعد؛ [٣] ھجویری : کشف المحجوب، طبع Schukovski، ص ٣٧٨ ببعد؛ [٤] انگریزی ترجمهٔ کشف المحجوب از نکلسن، *G. M. S.*، ١٧ : ٢٩٣ ببعد؛ [٥] R. Hartmann : *Al-Kuschairîs Darstellung des Sûfîtums*، ص ٧٠ تا ١١٠؛ (٦) القشیری : الرسالة القشیریّة، قاهرة ١٣٠٣ھ؛ Margaret Smith : *Rabi'a the mystic*، کیمبرج ١٩٢٨ء، ص ٥٣ تا ٥٨؛ (٧) R. A. Nicholson :

صفحه	عمود	سطر	
(کراسه ۱۲)			
			Mystics of Islam، ص ۳۰ تا ۳۲].
۷۳۰	۱	۱۷	مقالۂ توزر کے مآخذ کے آخر میں بڑھائیے : [(۶) Boli Alleg: *Reflexions d'un Saharien sur les anciens habitants de Tozeur* (در *Revue Tunisienne*، ۱۹۲۱ء، ص ۱۳ تا ۴۳)].
۷۳۶	۲	۶ از آخر صفحه	مقالۂ توفیق فکرت میں بڑھائیے : [(۱۴) A. Fischer: *Drei Gedichte von Tevfiq Fikret und zwei von Mehmed Ākif*، در *Islamica*، (۱۹۳۱ء)، ص ۱۸۳ تا ۱۹۹؛ (۱۵) رضا نور: توفیق فکرت، در *Rev. Turcologie*، (۱۹۳۲ء)، ص ۹۸ تا ۱۱۹ (قب Pearson، رقم ۲۰۶۰۷ و ۳۰۶۳۵)].
(کراسه ۱۲)			
۷۵۰	۱	۶	میں بڑھائیے : [و الثعالبی : کتاب خاص الخاص، قاهرة ۱۲۲۶ھ / ۱۸۰۹ء، ۶۶ ببعد].
۷۵۳	۲	۲۱	'تا ۸۰.' کو یوں لکھیے : [تا ۸۰؛ (۶) وینسنک : *Handbook ..... Tradition*، لائیڈن ۱۹۲۷ء، بذیل Trust؛ (۷) شاه ولی الله : حجة الله، قاهرة ۱۳۵۵ھ، ۲ : ۹۲].
۷۵۹	۱	۳	'تمیمی' [بظاهر تمامی درست ہے (دیکھیے *GALS*، ۱ : ۲۲۸؛ کتاب کا نام اس میں ذکر علماء اهل تونس دیا ہے)].
(کراسه ۱۳)			
۷۸۹	۲	۱	'اس کا رعب و داب الخ'، [اس پر دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۶۱ء)، ۲۲ : ۵۵۷ الف].
۸۰۱	۱	۱۰	بجائے ''احمد (۱۹۲۹ء تا ء)'' پڑھیے : احمد بای (۱۹۲۹ء تا [۱۹۴۲ء)؛ منصف بای Moncef Bey (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء)؛ لامین بای Lamine Bey (۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۷ء)].
۸۰۲	۱	۲۲	کے بعد اضافه کیجیے : [مانس رون Manceron (۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۳ء) پیے روتون Peyrouton (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء) گیون Giillon (۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء) لابون Labonne (۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۰ء)

صفحہ	عمود	سطر	
			پیے روتوں Peyrouton (اپریل - جولائی ۱۹۴۰ء)
			استیوا Esteva (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۳ء)
			ژوین (قائم مقام) Juin (مئی - جولائی ۱۹۴۳ء)
			ماشت Mast (۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء)
			مونس Mons (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء)
			پیریلئے Périllier (۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء)
			د ھوت کلوک de Hauteclok (۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۳ء)
			واےزار Voisard (۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۴ء)
			بوائیے د لاتور Boyer de Latour (۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۵ء)
			سیےدو Seydoux (۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۶ء)]
۸۲۲	۲		[بربر قبائل کے ناموں کی صورتوں اور ان کے اوطان کے متعلق دیکھیے القلقشندی : نهایة الارب فی معرفة قبائل العرب، ۱۹۵۸ء - نیز دیکھیے ابو الفوز محمّد امین السویدی : سبائک الذهب، طبع سنگی، قاهرة بدون تاریخ، ص ۱۰۰ و ۱۰۲ ببعد]؛
(کراسہ ۴۰)			
۸۲۸	۲	۲۹	[Schwarz : *Iran im Mittelalter* کا مزید حال از روی مکتوب استاذ منورسکی، مؤرخ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۱ء: یہ عالمانہ کتاب پہلے درجۂ ڈاکٹری کے مقالے کی شکل میں ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی - یہ مقالہ فارس پر تھا - ۱۹۲۹ء میں یہ قسط مکرر طبع ہوئی - اس کے بعد مصنّف نے فارس، کرمان، خوزستان اور الجبال کے متعلّق مزید مواد جمع کیا اور کتاب کی جلد اوّل (سات کراسے، ۷۰۵ صفحے) ۱۹۲۷ء میں طبع کی - اس کا اشاریہ (ٹائپ کر کے اور اس کا فوٹو لے کر) مصنّف نے ۱۹۲۹ء میں طبع کیا - اس کی نئی جلد آذربایجان پر ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان ۹ کراسوں میں طبع ہوئی (صفحات ۹۰۹ تا ۱۶۰۰) - مصنّف نے مواد کی کتابت اپنے خط سے کی اور کتاب کو پتھر پر چھاپا - حواشی (صفحات ۱۳۴۲ تا ۱۶۰۰) بھی مصنّف نے اپنے خط میں لکھے - یہ حواشی نسبةً باریک خط میں لکھے گئے].

صفحه	عمود	سطر	
۸۷۹	۲	۲۶	[طهرانِ آهنگران کے لیے دیکھیے یزدی، ۱ : ۴۳۲.]
(کراسه ۱۵)			
۹۲۲	۱	۳	'باوجود' کے بجائے پڑھیے : باوجود [قبّ برنی، ص ۳۱۴ ببعد].
(کراسه ۱۶)			
۹۶۴	۲	۱	یونانی عبارت کا ترجمہ: [وہ صحرا جہاں تانبے کا سانپ بھاگ گیا].
۹۶۴	۲	۳	یونانی عبارت کا ترجمہ : [صحرائے سین جہاں منّ و سلوی بھیجے گئے تھے].
۹۹۷	۱	۷	میں بڑھائیے : نیز دیکھیے *Dreams of Tipu Sultan* (انگریزی ترجمہ، شائع کردۂ پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی).
۱۰۱۰	۲	۴ از آخر	[ابن خلّکان نے یتیمة الدهر کے ذیلوں اور ذیلوں کے ذیلوں کا ذکر کیا ہے مگر ان سے مفصّل تر فہرست کمال بن الشعّار الموصلی (م ۶۵۴ / ۱۲۵۶ء) نے عقود الجمان میں دی ہے، جس کی نقل (مجموعۂ اسعد افندی، استانبول کے نسخے (عدد ۲۳۲۳ ورق ۳) سے ڈاکٹر احسان الٰہی نے لی اور وہ ملخّصاً ذیل میں ترتیب وار درج کی گئی :

ابو عبیدالله محمد بن عمران المرزبانی الکاتب : کتاب معجم الشعراء

الثعالبی : یتیمة الدهر فی محاسن شعراء العصر

[علیّ بن الحسن] ابوالحسن بن ابی الطیّب الباخرزی : دُمیة القصر و عُصارة اهل العصر

ابو المعالی سعد بن علیّ بن القاسم الحظیری الکُتُبی : زینة الدهر فی لطائف شعراء العصر

ابو حامد محمّد بن محمّد بن حامد الکاتب الاصفهانی : خریدة القصر و جریدة العصر

ابو القاسم علی بن جعفر بن علی السّعدی الصِقلّی النحوی المعروف بابـن القطّاع : کتاب المُلَح العصریّة (الدرّة الخطیرة فی شعراء الجزیرة)

ابو علی الحسن بن رشیق الازدی المهدوی : کتاب الانموذج فی شعراء القیروان

الحکم ابو الصّلت امیّة بن ابی الصلت : کتاب الحدیقة (فی شعراء العصر)

القاضی ابن العلاء محمد بن محمود بن ابی الحسن بن الحسین الغزنوی [بیان الحق] : سرّالسّرور

عُمارة بن ابی الحسن علی بن زیدان الیمنی [کتاب فی شعراء عصره]

ابن بشّرون الصِقلّی : کتاب المختار فی النظم و النثر لافاضل اهل العصر

القاضی ابوالحسن علی بن زید بن محمد الحسینی البیهقی : وِشاح دُمیة القصر [و درّة الوِشاح = تتمة وشاح دمیة القصر ـ رکّ به تتمّة صوان الحکمة، ص ۱۷۱]

کمال ابن الشّعّار الموصلی : عُقود الجُمان فی فرائد الشعراء هذا الزمان (المذیّل علی کتابه معجم الشعراء لمحمّد بن عمران المرزبانی)]

تصحیحات

صفحہ	عمود/سطر	خطا	صواب
(کرّاسہ ۱)			
الف	۲/۷	قاتر میر	کاتر مئر
ج	۲/۱۰	ڈ کورتی	د کورتی
ح	۱/۳	* == مقالے پر مقالہ‌نگار نے خود نظرثانی کی ہے	اس علامت اور عبارت کو حذف سمجھیے
۱	۱/۲۵	فرینیل	فرینل
۲	۱/۱۸		
۲	۱/۱۳	الکریوس [؟] غوطۃ العرب [؟] ص ۴۷ ببعد	اسکاریوس (اسکندر آغا): روضۃ الادب فی طبقات شعراء العرب، بیروت ۱۸۵۸ء، ص ۴۷ ببعد
۲	۱/۲۷	براؤ	برائے
۹	۲/۱۶	(و مواضع دیگر) مار کوارٹ	مارکار
۱۱	۲/۷	ھلسنفورز	ھلسنگفورز
۱۶	۲/۱۱	کارا باسک	کارا باچک
۲۰	۲/۱۸	المقامات	زبدۃ المقامات
۳۰	۲/۱۲	سپرنگر	شپرنگر
(کرّاسہ ۳)			
۱۲۹	۱/۲۹	[illegible]	ای ور
۱۳۹	۱/۹	نے اور	نے
۱۳۹	۲/۱۰	عربون <ערבין< αρραβών,	عربون > ערבין < ἀρραβών ؛
۱۳۶	۲/۲۳	دبیر	[illegible]
۱۴۷	۲/۲۵	نہ ہی اس کی پیدائش	نہ اس کی پیدائش ہی
۱۴۹	۲/۲	تجاجنۃ	تجاجنہ
۱۵۰	۲/۸	طریقہ کو	طریقے کو
۱۵۶	۱/۲۵	مثلث نما کے	مثلث نما
۱۵۷	۱/۱	دارالسطنت	دارالسلطنت
۱۶۲	۱/۲۱	فریڈرک	فریدرش
۱۶۹	۱/۳۰	فتح	فتح
۱۶۹	۲/۳۰	جب کہ تک	جب تک کہ
۱۷۰	۱/۱۱	مدارالمہام	نائب السلطنۃ
۱۷۰	۲/۱	محمد عطا حسین خان	رسالۂ معاصر، پٹنہ، شمارہ ۱۵، ص ۸۷ نے ''حسین عطا خان'' صحیح نام قرار دیا ہے
۱۷۱	۱/۵	ایک اور ترجمہ میر امن دھلوی نے	متن نوطرز مرصع کو سامنے رکھ کر میر امن دھلوی نے مرتب کیا.
۱۷۱	۱/۷	ترجمہ	کتاب
۱۷۱	۲/۲۲	تاریخ شعرائے اردو	تذکرۂ شعرائے ھند
۱۷۲	۱/۲۹	تخت باھی	تخت بھائی
۱۸۱	۲/۱۲	کاروانی	[illegible]
۱۸۸	۲/۱	سہزی	سنہری
۱۸۹	۱/۱۰		

صفحہ	عمود/سطر	خطا	صواب
(کرّاسہ ۳)			
١٩٣	شکل ١٩/٧	بس	بس
٢١١	١٠/١	بویو	بزیور
٢٣٨	٢٥/٢	ی	جو
سر ورق ۳	نیچے سے		
	س ٤	اگست ١٩٥٩ء	نومبر ١٩٥٩ء
(کرّاسہ ٥)			
٢٦٨	٥/٢	انہ	خانہ
٢٧٣	٢٧/٢	کرتے ہیں	کرتی ہیں
(کرّاسہ ٦)			
٣١٥	١٣/١	تشوّد کا مادّہ تصدیق و تصوّر سے پہلے اور تشریح ص ٦١٣ ب س ٢٨ کے بعد آنا چاہیے تھا۔	
(کرّاسہ ۷)			
٤٠٧ حاشیہ		معالات	مقالات
٤٣٦	٢٣/٢	اَشاریہ	اشاریّہ
(کرّاسہ ٨)			
٣٥٥	٦/١	Beleuchtmug	Beleuchtung
٣٥٦	١١/٢	لائیڈن ص ٣١ بعد	لائڈن، ٣/١ : ٥
٣٦١	٩/١	Persian	Persien
٣٦١	٥/١ و ٦ از آخر صفحہ	Ethnogra-v. phie [1882], 3)	Ethnographie, v. (1892), 3)
٣٦٠	٥/٢ از آخر صفحہ	انبیاء و رُسُل	اللہ کے رسولوں
٣٦٣	١١/٢	سربدار	سربدار
٣٦٩	١/سطر آخر	تَغلبیة	تَغلبیّة
(کرّاسہ ۹)			
٥١٦	١٨/١	کے روح	کی روحیں
٥٣٩	١/سطر آخر	منگریلیا	مِنگریلیا

صفحہ	عمود/سطر	خطا	صواب
٥٣٠	٢٥/١	بُلاذری	بَلاذُری
٥٣٨	٣/١	کُنشتوں	کُنشتوں
٥٥٣	٣/١	کاخیتھیا	کاخیتھیا
٥٥٦	٢/٢	خارتھلیا)	)خارتھلیا
٥٦٠	٣٠/١	گرجستانیوں	گرجستانیوں
٥٨٢	١٣/٢	البحاری	البخاری
	١٥/٢	محتصر	مختصر
٥٩٣	١٢/١	یاد	ایاد
٥٩٧	١٢/١	ختائی	ختائی
٦٠٦	٢٣/٢	منڈھیے	منڈھیاں
٦٢٨	٢٨/٢	تامساں	تامسان
٦٣١	١/سطر آخر	نہیں	انہیں
٦٣٣	١٨/١	حھیلیں	جھیلیں
٦٣٩	٢٥/٢	جنھیں	جن
٦٤٣	٢٦/٢	بن ھانئی	ابن ھانی
٦٤٣	٣٠/٢	ھانئی	ھانیٔ
٦٤٧	٢١/١	ذُویب	ذُؤیب
٦٥٠	٣/١ از آخر صفحہ	*Vorarbciten*	*Vorarbeiten*
٦٥٢	٩/٢ از آخر صفحہ	گنہنگار	گنہگار
٦٥٣	٣/١ از آخر صفحہ	سخاؤ	زخاؤ
٦٥٥	١١/١	Masqueray	Masqueray (٣)
٦٥٥	١٧/١	*IV*	*IV*،
٦٦٩	١٨/٢	معدیوں	معدّیوں
٦٦٩	٢/٢ از آخر صفحہ	نبائل	قبائل
٦٧٣	٢٣/١ و ٨/٢	ہرقل	ہِرَقل
٦٧٥	٧/٢	قبضے تھا	قبضے میں تھا

صفحه	عمود/سطر	خطا	صواب
٦٨٠	١/٣ (از آخرِ صفحه)	٣ : ٩	٣ : ٨
٦٨١	٢/٢١	النفس	النفس
٦٨٣	١/٢٨	وحدته	وحدته
٦٨٦	٢/٨	نه کے	نه که
٦٩٧	١/١٥	حوارج	خوارج
	٢/١٣	بو	جو
٧١٣	١/٢٠	آله آباد	اله آباد
٧٢٥	٢/٦	برسٹ	برسٹ
٧٣٥	٢/سطرِآخر	وغمره	وغیره
٧٣٧	٢/٢١	التوربة	التورية
٧٥٥	١/١٢	وصول	وصول
٧٥٦ تا ٧٧٥	٢/سرِ صفحه ١	تونس	تونس (دارالملک)
٧٦٣	حاشیه ٣	بربری	بربری
٧٧٠	١/٢٣	آواخر	اواخر
٧٧٢	١/١١	طولون	طولون
٧٧٢	٢/١٢	لاو گری	لاوی ژری
	٢/٢٣	لاو گری	لاوی ژری
٧٧٢	٢/١٣	گلاسیئه	گلا سیئیر
٧٧٣	١/٢٨	سیدی عبدالله	سیدی عبدالله
٧٧٣	١/٢٩	مله	میلے
٨٠١	١/١٧	میلے	میلے
٧٧٥ تا ٧٩٢	٢/سرِ صفحه پر	تونس	تونس (ملک)

صفحه	عمود/سطر	خطا	صواب
٧٨٣	١/١٠	نـ	نے
٧٨٩	٢/١٥	گیا	هو گیا
٧٩٨	١/سطرِآخر	سیور	سیور
٧٩٩	١/١٣	مالی	ملکیت اراضی کے
٨٠١	١/٢٠	فلانْ دانْ	فلانْ دیْن
٨٠١	١/٢٢	مانکیرون	مانس رون
٨١٢	١/١٢	نوترز	نوتوژ
٨٢٣	١/٢٩	مرداس	مرداس
٨٢٨	٢/٧	سلشتن	مالت ئسان
٨٣١	٢/١١	بسمارک	بسمارک
٨٣٣	١/١٨	س	جس
٨٣٥	٢/٦	چاهین	چاهییں
٨٥٠	١/٧	دسون	دسیون
٨٨١	١/٢ از آخرِ صفحه	اس میں	ان میں
٨٨٢	١/٨	مؤطّا	موطّا
٨٩٢	١/١٦	ساوِینیاک	ساوینیاک
٩٠٥	١/٦ از آخرِ صفحه	نسبتهٌ	نسبةً
٩٧٨	٢/٣١	طریقہ	طریقے
٩٨٣	١/٣	مع	جمع
٩٩١	١/٣	Gleig	Gleig)
٩٩٧	١/٣٢	گوت ،	گوت سنار
١٠٠١	٢/١	نسخهٔ	نسخه
١٠٠٣	٢/١٨	مدّرس	مدرس
١٠١١	١/٢٧	کوپرولو	کوپرولو
١٠٢٣	٢/٣	ثقیف	ثقیف :

طبع: اوّل

ناشر: مسٹر اے رحیم، رجسٹرار، دانش گاہِ پنجاب، لاہور

مقام اشاعت: لاہور

سال طباعت: ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء

مطبع: مطبعة المكتبة العلمیہ، ۱۵۔ لیک روڈ، لاہور
خان عبید الحق ندوی، ناظم مطبع
صفحہ ۱ تا ۲۵۶

مطبع: نیولائٹ پریس، ۳۰۔ افتخار بلڈنگ بہاول شیر روڈ، چوبرجی، لاہور

طابع: چوہدری محمد سعید، ناظم مطبع
صفحہ ۲۵۷ تا ۳۲۰

مطبع: پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

طابع: امجد رشید منہاس، ایم پی ڈی (لیڈز)، ناظم مطبع
صفحہ ۳۲۱ تا آخر و سرورق

باردوم: (رجب ۱۴۲۶ھ/اگست ۲۰۰۵ء)

ناشر: ڈاکٹر محمد نعیم
رجسٹرار دانش گاہ پنجاب، لاہور

طابع: محمد خالد خان
سپرنٹنڈنٹ پریس، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

زیرِ نگرانی: ڈاکٹر محمود الحسن عارف
صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

جلد ساز: انبالہ بک بائنڈر، شیش محل روڈ، لاہور

Urdu

Encyclopaedia of Islam

Under the Auspices

of

The University of The Punjab Lahore
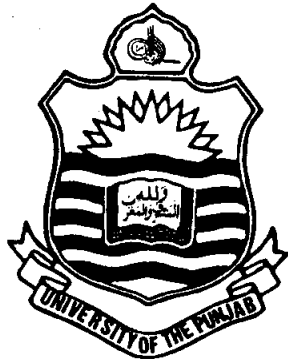
Vol. Vi

(Ta` ...... Al-Thaur)

1381/1962

2nd Print 1426/2006